

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ - القرآن

مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ - الحديث

الْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ - نسائی

تحفۃ الباری

فی الفقہ الشافعی

مسائل و دلائل کا مستند مجموعہ

مؤلف

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ

ناشر

مجلسِ اشاعت،

ممبئی - ۱۰

تُحفَـــةُ البَـــارِی

فی الفقہ الشافعی

جلدأول

مؤلف

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ

ترتیب وپیشکش

محمد یوشع محتشم

عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْد

تحفۃ الباری فی الفقہ الشافعی کی اشاعت اور آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے ہم اللہ وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں بے انتہا شکر ادا کرتے ہیں کہ اسی کی توفیق، ہمت اور استعانت کے بعد ہی ہم اس قابل ہوئے کہ اس عظیم کتاب کو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کریں۔

اس کتاب کی ضرورت کا خیال ہمیں آج سے تقریباً پانچ چھ سال قبل پیش آیا۔ چونکہ ساکنینِ خطہ کوکن عموماً شافعی مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ تقریباً ۳۵۔۴۰ سال قبل جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن، ضلع رائے گڑھ کے قیام کے علاوہ کوکن میں عرصہ دراز سے نہ علمی دور دورہ تھا نہ کوئی علمی مرکز اور نہ ہی علمی اور تاریخی کتابوں کا ذخیرہ تھا نہ کوئی حقائق سے روشناس کرانے والا تھا اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کی ضرورت کے لحاظ سے فقہ شافعی کے تعلق سے عام فہم اردو میں کوئی ایسی جامع کتاب موجود تھی۔ گرچہ عربی زبان میں فقہ شافعی پر کثیر کتابیں موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فقہ شافعی میں کوئی مستند، مفصل و مدلل کتاب عام فہم اردو زبان میں ہوتا کہ عوام الناس کا ہر طبقہ اس سے استفادہ کر سکے۔ اس مقدس جذبہ اور تمنا کی یہ چنگاری تھی جس نے عزم و ارادہ میں ہلکی سی رمق پیدا کی۔ دن گزرتے گئے اور یہ تمنا ارادوں کے سہارے پروان چڑھی تا آنکہ اس کتاب کی تکمیل نے عملی شکل اختیار کی اور **تحفۃ الباری فی الفقہ الشافعی** کے نام سے مدلل و مفصل کتاب منظر عام پر آ گئی۔

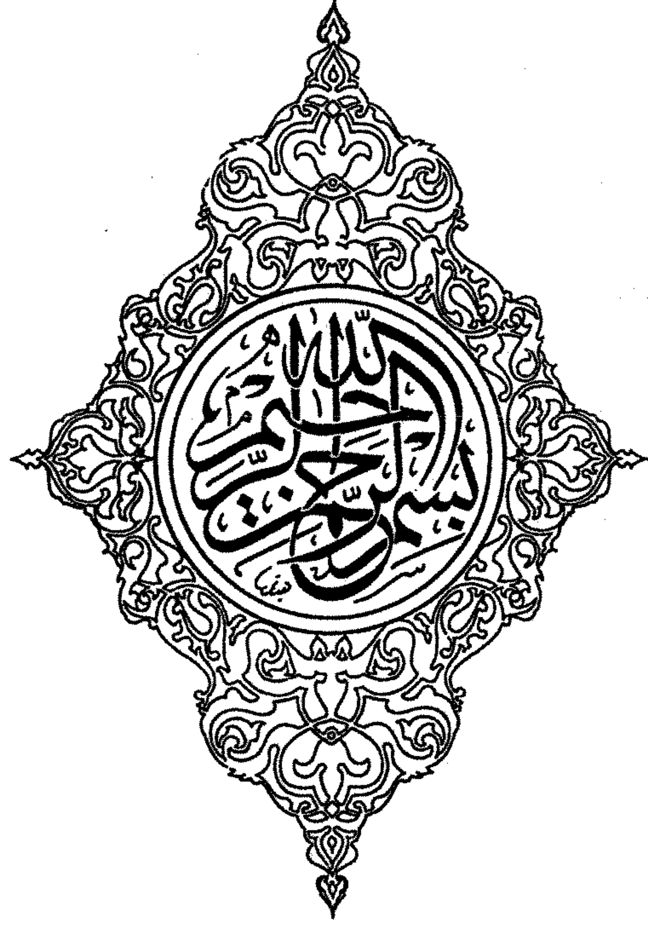
پہلے تو ہم صاحبِ کتاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ کے بے انتہا مشکور و ممنون ہیں، جنہوں نے ہماری درخواست قبول کی۔ اور مسندِ حدیث کی ذمہ داریوں اور بے انتہا مصروفیت کے باوجود اس اہم ترین کام کو پورا کرنے کے لئے عرق ریزی کی اور قرآن و سنت اور فقہ کی کتابوں سے مسائل اخذ کر کے عقائد و ایمانیات سے لے کر فرائض تک غرضیکہ تمام ابواب پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے امت کے لئے یہ بیش بہا تحفہ تیار کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ کتاب کو صحت و سلامتی اور دارین میں فلاح و کامرانی سے نوازے۔ نیز اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشے اور اس کے نفع کو عام کرے۔ آمین

بعدہٗ ہم ان تمام افراد کے مشکور ہیں جنہوں نے اس عظیم کام کی ابتداء تا انتہا ہر قسم کا تعاون نیز مالی مدد دی اور جنہوں نے گرانقدر وقت اور کوششوں کے بعد نشر و اشاعت کے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فرداً فرداً نام لکھنا ان تمام مخلصین کے خلوص کو تکلیف پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا ہم ان کے لئے صرف بہ صمیم قلب یہی دعا کرتے ہیں کہ خدائے ذوالجلال والاکرام انہیں دارین کی فلاح و سعادت سے شرف یاب کرے۔ اور ان کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ بخشے۔ آمین

والسلام

ناشر

(مجلسِ اشاعت، ممبئی۔ ۱۰)



شروع اللہ کے نام سے، جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے

فہرس

نام کتاب	:	تُحفۃُ البَارِی فی الفقہ الشافعی
مؤلف	:	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ (شیخ الحدیث جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن)
صفحات	:	۹۴۴
ناشر	:	مجلسِ اشاعت پہاڑ والی مسجد، واڑی بندر، ممبئی۔ ۱۰

(اراکینِ مجلس : شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب، جناب مولانا محمد فاروق اسماعیل معلم ، جناب مولانا محمد رضوان کبیر الدین ملاّ، جناب محمد حسین اسماعیل ملاّ، جناب ڈاکٹر محمد فاروق لوکھنڈے)

تعداد	:	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
سنِ اشاعت	:	ستمبر ۲۰۰۲ء
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	جاوید یوسف
طباعت	:	غزالی آفسیٹ پریس اینڈ پرنٹرس Ph. 2663495

ملنے کے پتے

مولانا محمد فاروق اسماعیل معلم

امام وخطیب پہاڑ والی مسجد، واڑی بندر، ممبئی۔ ۱۰

مولانا محمد رضوان کبیر الدین ملّا

امام وخطیب وڈالا شافعی مسجد، یونائیٹڈ ایسوسی ایشن، ایس. ایم. ڈی روڈ، انٹاپ ہل، وڈالا ممبئی۔ ۳۷، فون: 4189407

مولانا عبدالسلام نجے القاسمی

ناظم مدرسہ فیض العلوم، نیرل، تعلقہ کرجت، ضلع: رائے گڑھ، و امام وخطیب جالی محلہ شافعی مسجد، باپوکھوٹے اسٹریٹ، ممبئی۔ ۳

جامعہ حسینیہ عربیہ

مقام پوسٹ وتعلقہ: شریوردھن، ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر)

تُحفَۃُ البَارِی

فی الفقہ الشافعی

جلد اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

از: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ العالی

یہ غالباً شعبان ۱۴۲۰ھ کی بات ہے کہ راقم الحروف کو ایک ایسے علاقہ کے سفر کی سعادت نصیب ہوئی جو اس کے لئے بالکل نیا خطہ تھا۔ یعنی ''بمبئی اور گوا'' کے درمیان وہ پہاڑی علاقہ جو ''کوکن'' کہلاتا ہے۔ یہ بڑی خوبصورت، سبز دوپٹوں میں ملبوس، بلند قامت پہاڑیاں ہیں، کہیں کہیں ان کے دامن میں دودھ کی طرح سفید وشفاف آبشار اور جھیلیں بھی ہیں۔ یہ پورا علاقہ ساحل سمندر پر واقع ہے اور بل کھاتی ہوئی موجیں ان ساحلوں سے کھیلتی رہتی ہیں۔ آپ جب کسی پہاڑی پر کسی جانب سے چڑھیں تو تصور بھی نہ ہوگا کہ اس پہاڑی کے اوپر بھی انسانوں کی کوئی بستی آباد ہوگی، لیکن جب آپ کہیں تنگ اور کہیں کشادہ کہیں ہموار اور کہیں ناہموار پگڈنڈیوں سے گذرتے ہوئے سرو پہاڑی کے کاندھوں پر چڑھیں گے، تو وہاں آپ کو جنگلات کے درمیان ایک اچھی خاصی آبادبستی نظر آئے گی، خوبصورت مکانات، سیمنٹ کے ساتھ ساتھ لکڑیوں کی چھتیں، اکثر مکانات کے چاروں طرف باغیچے، ناریل اور کیلی کے دراز قامت درخت دور سے استقبال کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ان راستوں اور بستیوں سے گذرتے ہوئے راقم الحروف اپنے عزیز دوست مولانا عمر بن یوسف فلاحی سلمہ اوران کے رفیق باتوفیق اور صاحبِ ذوق عالم مولانا محمد رفیق پورکر کے ساتھ ''شری وردھن'' پہنچا۔ یہ شہر سمندر کے ساحل پر ہے، بلکہ کچھ اس وضع پر ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ سمندر نے اسے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ اسی شہر میں ایک بڑی دیدہ زیب عمارت اور سرسبز وشاداب، ہری بھری پھلواریوں پر مشتمل یہ ''جامعہ'' جس کے ایک جانب پہاڑی، دوسری جانب کسی قدر فاصلہ پر گہری جھیل اور قریب ہی سمندر کا ساحل واقع ہے۔ بڑا خوش منظر اور جاذبِ قلب ونظر آتا ہے، طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد اس میں زیر تعلیم ہے۔ میں اس مدرسہ میں جلسہ تقسیم اسناد میں مدعو تھا، یہاں مختلف دوستوں اور بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ خود مدرسہ کے گرامی قدر اور فعال مہتمم حضرت مولانا محمد امان اللہ صاحب میرے دیوبند کے دورۂ حدیث کے ساتھی نکلے۔ یہاں جن بزرگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ایک حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب خطیب ہیں۔ جواں سال، سانولا رنگ، دوہرا بدن اور سرتاپاؤں سفید پوش، مطالعہ میں وسعت اور علم میں گہرائی لیکن تواضع اور انکسار کے پیکر، حدیث وفقہ اور خاص کر فقہ شافعی پر اچھی نظر کے حامل، پہلے جواں عمری اور کسر نفسی حجاب بنی رہی، لیکن جب گفتگو اور تبادلۂ خیال کی نوبت آئی تو ان کی شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آسکی، اصل وطن کیرالہ ہے لیکن اب نسبتی شہر ''شری وردھن'' ہی وطن مالوف قرار پایا ہے۔

مولانا ''دارالعلوم اشرفیہ۔ راندیر'' کے فاضل ہیں اور طویل عرصہ سے ''جامعہ حسینیہ'' میں شیخیتِ حدیث جیسے اعلیٰ وباوقار عہدہ پر فائز ہیں۔ طلبہ میں آپ کے اسباق بہت مقبول ہیں اور بہت سے فضلاء دامنِ تربیت سے وابستہ رہ کر آج ''کوکن'' کے علاقوں میں اعلیٰ دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مولانا نے مجھے اس موقع پر اپنا زیرِ تالیف مسودہ بھی دکھایا اور مجھ کوتاہ علم سے خواہش فرمائی کہ اپنے کچھ تاثرات قلم بند کریں۔

یہ کتاب '' فقہ شافعی'' کے نقطۂ نظر سے احکام شرعیہ کے بیان پر مشتمل ہے۔اردو زبان میں گو کہ فقہ شافعی کی اور بھی کئی کتابیں ہیں، لیکن امید ہے کہ جزئیات کے احاطہ،مواد کی کثرت اور استناد کے اعتبار سے انشاء اللہ یہ کتاب نقش ثانی نقش اول سے بہتر کا مصداق ہوگی۔ مصنف نے فقہی احکام کے ساتھ ساتھ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اسلام کے مزاج و مذاق کو بھی واضح کیا گیا، مسئلہ کے متعلق ضروری دلائل بھی ذکر فرمائے ہیں، زبان بھی سہل اور عام فہم ہے۔امید ہے کہ یہ کتاب تمام مسلمانوں کے لئے عموماً اور شافعی بھائیوں کے لئے خصوصاً مفید ثابت ہوگی۔

راقم الحروف کو اپنی حقیر مطالعہ کی روشنی میں اس کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کہ فقہ شافعی اپنے استدلال اور توازن کے اعتبار سے ایک عظیم الشان فقہ ہے۔حضرت امام شافعیؒ اپنے زمانہ کے ذکی ترین لوگوں میں تھے اور ان کو ایک طرف امام مالکؒ سے فقہ حجازی اور دوسری طرف امام محمدؒ سے فقہ عراقی کو حاصل کرنے اور دونوں علمی حلقوں کے سرمایہ کا حامل بننے کا موقع ملا، اس لئے شافعی دبستانِ فقہ دونوں حلقوں کے مزاج و مذاق کی جامع ہے، نہ ظاہر نص پر جمود اور قیاس سے پہلو تہی ہے اور نہ نصوص کے مقابلہ قیاس ورائے کی اتباع ہے، نہ نصوص کے الفاظ پر قناعت اور شریعت کے مصالح و مقاصد سے اغماض ہے، نہ لوگوں کی ضرورتوں اور چاہتوں سے بے اعتنائی ہے گویا یہ فقہ منقول اور معقول دونوں کی جامع ہے۔

اس لئے شافعی مکتبِ فقہ سے ہر عہد میں جلیل القدر محدثین، فقہاء اور مجددین امت پیدا ہوتے رہے ہیں اور اس نے اپنے زمانہ کے ذہین ترین اہل تحقیق علماء کو متاثر کیا ہے، جس کی روشن مثال حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر حنفی ہونے کے باوجود فقہ شافعی کی گہری چھاپ کا پایا جانا ہے۔

پوری دنیا میں اہل سنت والجماعت میں مجموعی اعتبار سے احناف کے بعد سب سے بڑی تعداد سیدنا امام شافعیؒ ہی کی متبعین کی ہے، خود برِ صغیر میں غالب ترین اکثریت حنفیہ کی ہے، پھر شوافع اس کے بعد کچھ غیر مقلدین ہیں۔اس فقہ کی عظمت، مسلمانوں کی کثیر تعداد کی اس سے وابستگی ہے اور برِ صغیر میں فقہ حنفی کے بعد اس فقہ کے رواج و شیوع کا تقاضا ہے کہ اردو زبان میں بھی کام ہو، مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب اس ضرورت کی تکمیل میں اہم حصہ ادا کرے گی اور بندگانِ خدا کو اس سے نفع پہونچے گا۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۱رذوالحجہ ۱۴۲۱ھ، ۷رمارچ ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

از: مولانا نثار احمد عبدالشکور دروگے صاحب مدظلہ العالی

الحمدلله رب العلمين والصلوٰة والسلام على خاتم الانبياء والمرسلين وعلى آله للطيبين للطاهرين و صحابة للغرالميامين۔ امابعد

اسلام دین حنیف اور دین فطرت ہے۔قال تعالیٰ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً (سوره روم ۳۰)
تم یک سو ہوکر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو بدلنا نہیں چاہئے، پس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اسلام دراصل ایک عقیدہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی ذات ہی معبودِ برحق ہے اس کے علاوہ کوئی بھی قابلِ عبادت نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اس کے تحت شریعتِ مطہرہ کا ظہور ہوتا ہے جو حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں اور جمیع اطراف وجوانب کو منظم کر کے سجاتی سنوارتی اور نکھارتی ہے، اسی شریعت پر اللہ تعالیٰ نے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اِلخ کے ذریعہ اپنی رضا کی مہر ثبت فرمائی پھر شریعت نے ولادت سے وفات سے جملہ ادوار مراحل من کل الوجوہ روشن تعلیمات اور واضح ہدایات عطا کی ہیں ان میں سے کچھ چیزیں ضروریاتِ دین میں سے ہیں جن کا سیکھنا اور علم حاصل کرنا طلب العلم فريضة على كل مسلم کے سبب فرض ہے۔ ہر مکلّف (یعنی عاقل و بالغ مسلمان مرد وعورت) پر من جانب اللہ چند فرائض وواجبات اور احکام عائد ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ اس سے صادر ہوتے ہیں اور کچھ اس کے پیشے اور معاملات سے وابستہ ہوتے ہیں، ان کو حکم شرع کے مطابق ادا کرنا فرض وضروری ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ عمل خواہ کتنا ہی عظیم ہو یا حقیر اگر شرعی اصول وضوابط کے بنا کیا جائے تو مقبول ومعتبر نہیں۔اس ضرورتِ شدیدہ اور امرِ اہم کے پیش نظر علماء کرام وفقہاء عظام نے بڑی ہی جدوجہد، کدوکاوش، محنت ولگن سے روزمرہ پیش آنے والے مسائل کے احکام خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ کتابوں میں جمع کر کے امت مسلمہ پر نہایت عظیم احسان فرمایا۔

ان کی وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتابیں آج تک دنیا میں عظمت اور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔اللہ تعالیٰ ان تمام علماء وفقہاء کی نفوس طیبہ کو اعلیٰ علیین کے مراتبہ عالیہ میں اپنی جوار رحمت ورضوان میں جگہ مرحمت کرے اور امت مسلمہ کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

برصغیر ہندوپاک میں مسلک حنفیت کی اکثریت کے باعث علماء وفقہاء احناف نے اردو زبان میں چھوٹی بڑی بے شمار کتابوں کے ذریعہ اپنے مسلک کو فروغ دیا اور فقہ حنفی بیش بہا اور گرانقدر خدمت انجام دے کر اصحاب احناف پر عظیم احسان کیا۔

اس کے بالمقابل شافعی مسلک کے علماء و پیروکار کی تعداد نسبتاً قلیل رہی بناء بریں اردو زبان میں فقہ شافعی کی زیادہ کتابیں منظر عام

پرنہ آسکیں اور چھوٹی بڑی جو چند کتابیں طبع ہوئیں وہ بھی نا قابل اور تفصیل طلب تھیں شوافع کے لئے یہ ایک لمحہ فکر اور تشویشناک مرحلہ تھا۔

اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور شیخ الحدیث مولانا ابراہیم صاحب (زادہ اللہ علما وفضلا وفقها) جیسی عالمانہ فقیہانہ اور محققانہ شخصیت کے ذریعہ اس خلا کو پُر فرمایا۔ مولانا موصوف نے برسوں کی غواصی وغوطہ زنی، کتب بینی و ورق گردانی اور شب بیداری سے ایسا بیش بہا علمی شاہکار اور دُرِ تاجدار پیش کیا ہے جس سے ہر گھر کو روشن ہونا از حد ضروری ہے۔ یہ کتاب بے شمار مسائل اور دلائل و براہین کا عظیم مجموعہ ہے جو اس سے قبل ناپید تھا، ربّ کریم مولانا کو اپنی رحمت کے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے، علم وفضل میں زیادتی و کمال اور صحت و عافیت اور سلامتی کے ساتھ عمر میں برکت دے اور کتاب ہذا کو مقبولیت تام اور لوگوں کو اس سے نفع عام بخشے۔

امت مسلمہ کو اس سے مستفیض فرمائے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

مولانا علم کا بحر زخار ہیں جس میں بلا کی گہرائی ہے۔

اور بقول شخصے

کہہ رہا ہے موج دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

کا مظہر ہیں۔ موصوف نے جب مجھ سے فرمایا کہ اس کتاب کے متعلق چند کلمات تحریر کروں تو سوچ میں پڑ گیا کہ اس قدر قدآور نامور ہستی کی بلند پایہ اور علمی کتاب پر مجھ جیسا بے علم و بے مایہ کیا لکھ سکتا ہے۔ پھر جب فون پر بُعد مسافت (جو تعلق قلب کے قرب سے مانع نہیں) کے سبب اصرار ہوا تو اس امید پر کہ علماء کے زمرے میں شامل ہو کر انہیں کی صف میں شمار کیا جاؤں اور جنت میں داروقرار مل جائے۔ یہ چند باتیں خامہ فرسا کر دیا ہوں۔

والسلام

نثار احمد عبدالشکور وروگے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّد بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ خَاتِمِ النَّبِيِّنِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ" اَمَّا بَعْد

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے " اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا "(فاطر ۲۸)(اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جن کو سمجھ (علم) ہے)

نیز ارشاد ہے۔"قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ"(زمر ۹)(تو کہہ، کوئی برابر ہوئے ہیں علم وسمجھ والے اور بے سمجھ)

علم کی فضیلت واھمیت: آیات ربانی اور آیات انفس وآفاق سے صحیح نصیحت اور عبرت انگیزی کا اہل علم کے ساتھ خاص ہونا، جہل اور لاعلمی کی مذمت اور گمراہی کا باعث بننا اور باوجود علم کے حق کو ٹھکرانے کی وعید وتہدید کے متعلق قرآن کریم کی بکثرت آیات سے دلالت حاصل ہوتی ہے، مثلاً: ملاحظہ فرمائیں۔ سورۂ بقرہ کے آیت نمبر ۴۲۔۷۸۔۳۱۔۱۵۱۔۲۲۹۔۲۵۱۔ سورہ آل عمران کے آیت نمبر ۱۹۔۶۱۔ سورۂ نساء کے آیت نمبر ۱۶۲۔ سورۂ یونس کے آیت نمبر ۵، سورۂ یوسف کے آیت نمبر، ۸۶۔۶۸۔ سورۂ رعد کے آیت نمبر، ۴۳۔ سورۂ اسراء کے آیت نمبر، ۳۶۔۱۰۷۔ سورہ کہف کے آیت نمبر، ۶۵۔۶۶۔ سورۂ طٰہٰ کے آیت نمبر ۱۱۴۔ سورۂ انبیاء کے آیت نمبر ۷۔ سورۂ نمل کے آیت نمبر ۱۵۔۴۰۔ سورۂ محمد کے آیت نمبر ۱۹۔ سورۂ رحمٰن کے آیت نمبر ۲۔ سورۂ علق کے آیت نمبر ۵۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے!" اللہ تعالی جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دینی علم وسمجھ سے نوازتے ہیں"(متفق علیہ) صحیحین کی ایک حدیث میں اس شخص کو قابلِ رشک بتلایا جو علم دین کی دولت سے مالا مال ہو، اور اس کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتا اور دوسروں تک اس دولت کو پہنچاتا ہو۔ نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے!" جب انسان کی وفات ہوتی ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ بھی ختم ہوجاتا ہے سوائے تین اسباب کے، صدقہ جاریہ، نفع بخش علم، یا نیک اولاد جو اس کے حق میں دعا کرے"(مسلم) مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تحصیل علم میں سفر کرے اللہ تعالی اس کی وجہ سے جنت کا راستہ اس پر آسان کردیتے ہیں۔ بعض روایات میں آگے یہ بھی ارشاد ہے" یقیناً فرشتے طالب علم کی رضامندی میں اپنے پر بچھادیتے ہیں، اور بلاشبہ ایک عالم کے لئے آسمان وزمین والے اور پانی کے اندر مچھلیاں استغفار کرتے ہیں۔ اور ایک عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے، جیسے چودھویں کے چاند کی دیگر ستاروں پر، اور علماء انبیاء کرام کے وراث ہیں اور انبیاء کرام نے درہم اور دینار کی میراث نہیں چھوڑی، انھوں نے تو علمی میراث چھوڑی ہے سو جو اسے حاصل کرلے اس نے کافی حصہ حاصل کرلیا"(احمد۔ ترمذی۔ ابوداوٗد۔ ابن ماجہ۔ دارمی)

آپ ﷺ نے فرمایا!" اللہ تعالی علم کو اس طرح نہیں اٹھاوے گا کہ بندوں (کے دل) سے اسے نکال دے، بلکہ علماء کو اٹھائے گا، اور (ان کے صحیح جانشین نہ ہونے کی وجہ سے) اس طرح علم اٹھ جائیگا، پھر جب کوئی عالم باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار (یعنی مفتی وقاضی وغیرہ) بنائیں گے پھر ان سے مسائل پوچھے جائیں گے، اور وہ بلا علم فتوی دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے"(متفق علیہ) ابن ماجہ اور بیہقی کی ایک روایت میں طلب علم کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا ہے ترمذی کی حدیث میں ہے۔" جو طلب

علم میں نکلے۔تو لوٹنے تک وہ اللہ کے راستہ میں (جہاد میں) ہے"

آپ ﷺ کا ارشاد ہے!"ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے گراں ہے۔" (ترمذی۔ ابن ماجہ) نیز ارشاد ہے۔"حسنِ اخلاق اور دینی فقاہت وسمجھ، یہ دونوں صفتیں کسی منافق میں جمع نہیں ہوسکتیں۔" (ترمذی) ایک حدیث میں فرمایا!"اگر کسی سے ایسی بات پوچھی جائے جو اسے معلوم ہو" (اور سائل کو اس دینی مسئلہ کی ضرورت ہو) لیکن یہ اُسے چھپائے، تو بروزِ قیامت اسکو آگ کی لگام پہنائی جائیگی" (احمد۔ابوداؤد۔ترمذی۔ابن ماجہ)

جو شخص علماء کے مقابلہ کیلئے، یا بیوقوفوں سے لڑنے کیلئے، یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے علم حاصل کرے، اس کے متعلق وارد ہے کہ اللہ اسے جہنم میں داخل کردیں گے۔ (ترمذی۔ابن ماجہ) "اسی طرح دینی علوم کو محض دنیا کی تحصیل کی نیت سے حاصل کرنے والے کے متعلق ارشاد ہے کہ اسے جنت کی خوشبو تک نہ ملے گی" (احمد۔ ابوداؤد، ابن ماجہ)

علم دین کی فضیلت میں صحابہ وتابعین اور دیگر اسلاف وعلماء سے بھی بکثرت اخبار وآثار منقول ہیں۔

مذکورہ بالا آیات واحادیث کی روشنی میں دینی علوم کی اہمیت اور نیک نیتی کے ساتھ اس کے تعلیم وتعلّم کی فضیلت بالکل واضح ہے۔ اور اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل واحکام کی حد تک علم کا حصول ہر مسلمان کے حق میں فرض ہے۔لہٰذا وہ لمحات اور اوقات بڑے قیمتی ہیں" جو آدمی ان علوم کی تحصیل میں صرف کرے۔

خطہ کوکن میں عموماً شافعی مسلک پر عمل ہے، اور عربی زبان میں فقہ شافعی کا کافی وافی ذخیرہ موجود ہے۔ وقت کی ضرورت، اور بعض حضرات کی تعمیلِ فرمائش میں یہ ایک حقیری کوشش اردو زبان میں اسے پیش کرنے کی ہے۔ جس میں حتی الامکان عوام کے پیشِ نظر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ سہل اور عام فہم انداز میں مسائل کو پیش کیا جائے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے عبارت کا انداز بدل جائے۔ اور بات طویل ہوجائے۔ نیز قرآن وحدیث کے واضح دلائل سے بھی مسائل کو مدلّل کیا گیا ہے دقیق اور عقلی دلائل سے عموماً گریز کیا گیا ہے، کیونکہ یہ عام ذہن سے اونچی سطح کی بات ہوجائے گی۔ اور اس کتاب کا اصل مقصد عوام کی اِفادیت اور علمی تشنگی کی سیرابی کا سامان ہے اہلِ علم کے لئے عربی زبان میں ہر طرح سے اطمینان بخش مواد موجود ہے۔ اور وہ حضرات براہ راست مُراجعت کرسکتے ہیں۔ مقدمہ میں امام شافعی کے حالات، شریعت کے مصادر، فقہی تدریجی دور، اختلافات کے اسباب تقلید واتباع اور شافعی کتب فقہ میں ترتیب وغیرہ مباحث پر مختصر روشنی ڈالی گی ہے۔

ابتداء میں مزید افادیت کیلئے مختصراً اہم عقائد کا نچوڑ خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ بغیر صحیح عقائد کے سب کچھ فضول ہے اور عقائد کی درستگی واصلاح اوّلین واہم ترین فریضہ ہے۔

طہارت سے جنائز کے آخر تک ابواب کو امام نوویؒ کی مشور ومعروف کتاب روضۃ الطالبین کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ تاہم نادر الوقوع اور دقیق مسائل کو نظر انداز کیا گیا ہے، بقیہ کتابوں کے اضافوں کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ تاہم صلوۃ الخوف کا باب مختصراً فتح الوہاب کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے آگے عبادات کے دیگر ابواب یعنی زکات، روزہ اور حج کے مسائل کی ترتیب میں فتح الوہاب (للشیخ زکریا انصاریؒ) مع حاشیہ الجمل کو اصل قرار دیا گیا ہے، اور دیگر کتابوں سے ماخوذ مسائل کا حوالہ دیا گیا ہے۔

معاملات کے ابواب کی ترتیب میں دورِ حاضر کی ایک تصنیف "الفقہ المنہجی" (مصطفی الحق۔مصطفی البغا۔علی الشربجی) کو اصل قرار دیتے ہوئے بقیہ مسائل کے مآخذ کا حوالہ دے دیا گیا ہے، دیگر ابواب (مثلاً نکاح، قربانی، قسم وغیرہ) کو مختلف کتب کی روشنی میں

مرتب کیا گیا ہے، جس کا اجمالی حوالہ ہر باب کے اختتام پر درج ہے۔

تمام مسائل معتبر کتب سے ماخوذ و مستفاد ہیں۔ جہاں اپنی جانب سے مزید افہام وتشریح کی ضرورت محسوس کی، عموماً اسے واضح کردیا ہے، یا پھر بین القوسین لکھا گیا ہے۔

بعض مسائل مختلف ابواب سے مناسبت کی وجہ سے مزید افادیت کی خاطر ایک سے زائد مقامات پر درج کئے گئے ہیں۔

جمعہ کے باب سے لے کر جنائز تک (صلوٰۃ الخوف مستثنیٰ) مولوی شعیب عبدالرحمٰن مانڈلیکر اور کتاب الفرائض (میراث کا بیان) مفتی محمد عمر یوسف امیر کران حضرات کے درخشاں قلم اور عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔

اسلام کی رہنمائی کسی ایک باب اور شعبہ تک محدود نہیں، بلکہ وہ ماں کی گود سے لے کر قبر کی گود تک تمام لمحات اور شعبوں پر حاوی اور مسائل میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکہ یہی اسلام ایک کامل مذہب اور دین فطرت ہے، اور اس کا مطالبہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ ورسول کی مکمل اطاعت وفرمانبرداری کرے۔ عقائد یا عبادات ہوں، یا معاملات اور معاشرتی مسائل حدود وسزا کے ابواب ہوں یا عدالت وسیاست کے مسائل، تمام امور میں اسلام کی درخشاں تعلیمات موجود ہیں۔ اور ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام امور میں اسلامی احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے، تاہم عدالت وسیاست اور حدود وغیرہ کا تعلق چونکہ ایک اجتماعی اسلامی نظام سے ہے، جو فی الوقت ان علاقوں میں ناپید ہے۔ جس کی وجہ سے انفرادی حیثیت سے اس پر عملی موقع فراہم ہونے کا سوال نہیں، اور اس کتاب کا مقصد چونکہ عام حضرات کو فی الحال پیش آنے والے مسائل کی تفصیلات سے آگاہ کرنا ہے۔ اس لئے سردست ان ابواب کو داخل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن بعض احباب کے اصرار ومشورہ کی وجہ سے مختصراً ان ابواب کو بھی داخل کیا جارہا ہے تاکہ کتاب ان مسائل سے تشنہ نہ رہے اور فی الجملہ ان مسائل سے بھی آگہی حاصل ہوجائے۔

تحریک وتائید، مشورہ، ہمت افزائی، جانچ واصلاح اور کتاب کی ترتیب وتالیف اور طباعت کی تکمیل تک مختلف خیر خواہ احباب کا تعاون شامل حال رہا، جسے اللہ کی علیم وخبیر ذات بخوبی جانتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا گوہوں کہ ان تمام معاونین کو اجر جزیل وثواب عظیم عطا فرمائے، اور دارین کی خیر وبرکات سے ان کا دامن بھردے (آمین)۔ (ان احباب کے اسماء کی تصریح شاید ان کی مخلصانہ طبیعت گوارا نہ کرے، اس لئے صراحت سے گریز کررہا ہوں)

اللہ تعالیٰ کا کروڑہا کروڑ، بلکہ بے انتہا شکر ادا کرتا ہوں کہ محض اپنے فضل وکرم اور دستگیری سے اس خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے خوب خوب قبول فرمائے، لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر کرے، نفع عام وتام فرمائے اور دارین کی فلاح وکامرانی کا سبب بنائے (آمین)

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمَ (آمین)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمۃ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

نام ونسب: محمد بن ادريس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبيد بن عبد يزيد بن هاشم بن المطلب بن عبد مناف الامام عالم العصر ناصر الحديث فقيه الملت ابوعبد الله القريشي ثم المطلبي الشافعي المكي۔

امام شافعی کے نسب میں جو مطلب بن عبد مناف ہیں، وہ آپ ﷺ کے پردادا ہاشم کے بھائی ہیں، تو گویا عبد مناف پر جاکر آپ ﷺ کے ساتھ مل جاتے ہیں امام شافعی مطلبی سادات میں سے ہیں۔

پیدائش: امام شافعیؒ کی ولادت باسعادت ۱۵۰ھ میں بمقام غزہ (فلسطین) ہوئی۔ ان کے والد ادریس نوجوانی میں ہی انتقال کر گئے، لہٰذا امام صاحب نے اپنی والدہ کے گود میں یتیمی کی حالت میں پرورش پائی۔ والدہ دو سال کی عمر میں انھیں لے کر مکہ مکرمہ تشریف لائیں، اور یہیں وہ پروان چڑھے، تیراندازی کی طرف توجہ دی۔ اور تمام ہم عصروں پر اس فن میں فوقیت لے گئے، پھر عربی زبان واشعار کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بلند مقام حاصل کیا۔

پھر ان کا دل فقہ کی طرف مائل ہوا، اور اس میں تمام ہم عصروں پر تفوق حاصل کی۔

تحصیل علم اور اساتذہ: مکہ مکرمہ میں مسلم بن خالد زنجی (مفتی مکہ)، داود بن عبد الرحمان عطار، محمد بن علی شافع، سفیان بن عینیہ، عبد الرحمان بن ابی بکر الملیکی، سعید بن سالم، فضیل بن عیاض اور دیگر کئی علماء سے علم حاصل کیا۔

جب امام شافعیؒ کی عمر بیس سال سے کچھ اوپر ہوئی، تو مدینہ منورہ کی طرف رختِ سفر باندھا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان کے روبرو حفظاً موطا سنا کر اس کی سند حاصل کی، نیز ابراہیم بن ابی یحییٰ، عبد العزیز الدراوردی، عطاف بن خالد، اسمٰعیل بن جعفر اور ابراہیم بن سعد وغیرہ حضرات سے کسبِ فیض فرمایا۔

یمن میں حضرات مطرّف بن مازن، ہشام بن یوسف القاضی اور دیگر علماء سے تحصیل علم کیا۔ اور بغداد میں امام محمد بن حسن، عبد الوہاب ثقفی اور دیگر کئی افراد سے علم حاصل کیا۔ امام صاحب نے طلب علم میں مکہ مدینہ کے بعد کوفہ، بغداد، فارس اور اطراف کے عجمی علاقے پھر ربیعہ ومصر کے علاقے، شمالِ عراق پھر جنوب روم پھر حران پھر فلسطین اور دیگر علاقوں کا سفر اختیار کیا۔

امام شافعی نے بکثرت کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اور علم کو مدون کیا۔ اور احادیث کی اتباع کرتے ہوئے دیگر حضرات کا رد کیا۔ نیز اصول فقہ اور فروع فقہ پر کتابیں تحریر کیں۔ اور حضرت کی کافی شہرت ومقبولیت ہوئی۔ اور بکثرت طلبہ خدمت میں تحصیل علم کے لئے حاضری دینے لگے۔

شاگرد: درج ذیل علماء کرام نے امام شافعی سے احادیث روایت فرمائی ہے۔

حمیدی، ابوعبید قاسم بن سلام، احمد بن حنبل، سلیمان بن داود، ہاشمی، ابو یعقوب بویطی، ابوثور، حرملہ، موسیٰ بن ابی الجارود مکی،

عبدالعزیز مکی، حسین بن علی کرابیسی، ابراہیم بن المنذر، حسن بن محمد زعفرانی، احمد بن محمد ازرقی، احمد بن سعید ہمدانی، احمد بن ابی شریح الرازی، احمد بن یحیٰی مصری، احمد بن عبدالرحمٰن وہبی، ابراہیم بن محمد شافعی، اسحاق بن راہویہ، اسحاق بن بہلول، ابوعبدالرحمٰن احمد بن یحیٰی شافعی ،حارث ابن سریج، حامد بن یحیٰی بلخی، سلیمان بن داود، مہری، عبدالعزیز بن عمران، علی بن معبد، علی بن سلمہ، عمرو بن سواد، ابوحنیفہ قحزم بن عبداللہ، محمد بن یحیٰی، سعود بن سہل، ہارون ابن سعید، احمد بن سنان، احمد بن عمرو، یونس بن عبدالاعلی، ربیع بن سلیمان مرادی، ربیع بن سلیمان جیزی، محمد بن عبداللہ بن الحکیم، بحر بن نصر خولانی، اوران کے سواایک جم غفیر۔

امام دار قطنی نے امام شافعی سے روایت کرنے والوں کے متعلق دو جزو میں ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے۔قدیم وجدید اکابر علماء نے اس امام کی شان اور مناقب میں کتابیں لکھی ہیں۔

مناقب: امام ابوعبید نے فرمایا!'' میں نے امام شافعی سے بڑھکر عقلمند کسی کونہیں دیکھا''

جب امام صاحب کی عمر پندرہ سال ہوئی تو امام مسلم بن خالد زنجی (مفتی مکہ) نے انھیں فتوی دینے کی اجازت دی۔

مامون نے کہا: میں نے ہر چیز میں امام شافعی کا امتحان لیا تو انھیں کامل پایا۔

امام سفیان بن عینیہ کے پاس تفسیر یا فتوی سے متعلق کوئی سوال آتا تو امام شافعی کی طرف متوجہ ہوکر ان سے پوچھنے کا حکم دیتے۔

فرمودات

امام شافعیؒ نے فرمایا: قرآن وحدیث کی روشنی میں کلام کرنے والا برحق ہےاس کے علاوہ سب بکواس ہے، نیز فرمایا: اصل کے متعلق کیوں اور کیسا سوال نہیں اٹھایا جائیگا۔

فرمایا: اصل قرآن یا حدیث ہے۔ ورنہ پھر ان دونوں پر قیاس، حدیث اگر صحیح ہوتو وہ سنت ہے۔اور اجماع تنہا حدیث سے بڑھکر ہے۔حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہوگی، اگر کسی حدیث میں کئی مفہوم کا احتمال ہو، تو جو ظاہر کے زیادہ مشابہ ہو، وہ مراد لیں گے، منقطع حدیث کا کوئی اعتبار نہیں۔ بجز ابن المسیب کی منقطع روایت کے۔

فرمایا: حدیث کا پڑھنا نفل نماز سے بہتر ہے، نیز فرمایا: تحصیل علم نفلی نماز سے افضل ہے، فرمایا: میں نے ہر کسی سے محض خیرخواہی کی نیت سے مناظرہ کیا ہے۔

فرمایا: اگر تم میرے کتاب میں آپ ﷺ کی سنت کے خلاف کچھ پاؤ۔تو سنت کو اختیار کرواور میرا قول چھوڑ دو۔

فرمایا: اگر حدیث صحیح ہو، تو وہی میرا مذہب ہے، اور جب حدیث صحیح ہو، تو میری بات کو دیوار پردے مارو۔

امام شافعی کا ارشاد ہے۔'' جب میں آپ ﷺ سے کوئی صحیح حدیث روایت کروں، اور اس پر میرا عمل نہ ہو تو تم کو اس بات پر گواہ رکھتا ہوں کی میری عقل ماری گئی ہے''

نیز ارشاد ہے: کون آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا، اور کون سی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی۔ جبکہ آپ ﷺ کی کوئی حدیث روایت کروں، لیکن اسے اختیار نہ کروں۔

عبادت: امام شافعیؒ نے رات کے تین حصہ کئے تھے، پہلی تہائی میں لکھتے، دوسری میں نماز پڑھتے اور تیسری میں سو جاتے۔امام ذہبی فرماتے ہیں کہ نیت کی وجہ سے تینوں اعمال عبادت ہیں۔

امام شافعیؒ ماہِ رمضان میں نماز میں ساٹھ قرآن ختم فرماتے۔

زھد وتقویٰ: امام شافعی نے فرمایا: ۱۶ رسال کی مدت سے میں صرف ایک مرتبہ شکم سیر ہوا ہوں، اس وقت ہاتھ ڈال کرا سے قئی کر دیا، کیونکہ شکم پُری بدن کو ثقیل وگراں اور دل کو سخت کرتی ہے۔ ذہانت کا ازالہ کرتی ہے، نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور عبادت میں کوتاہی ہوتی ہے اپنے شاگرد امام ربیع سے فرمایا! ''زہد اختیار کرو، کیونکہ زاہد کے لئے زہد ایک نوعمر دوشیزہ کے بدن پر زیورات سے بڑھ کر حسین وخوبصورت ہے۔''

اپنے جوشِ سخاوت کی وجہ سے کم ہی کوئی چیز ان کے پاس رہتی تھی۔

بعض زرین اقوال

امام شافعیؒ کاارشاد ھے: بندوں پر ظلم وزیادتی آخرت کے لئے بدترین توشہ ہے۔

ارشاد ھے۔ علم تو وہ ہے جو نفع دے، نہ کہ جو حفظ کرلیا جائے۔

فرمایا: جسے تقوی عزت نہ بخشے تو اس کی کوئی عزت نہیں۔

بکثرت اپنے ہاتھ میں لاٹھی رکھنے کا سبب بتلایا! تا کہ یہ یاد رہے کہ میں ایک مسافر ہوں۔

فرمایا: جو شہوتوں کا پابند ہوگا اسے دنیا پرستوں کی غلامی لازم ہوگی۔

فرمایا: بھلائی پانچ باتوں میں ہے۔ نفس کی بے نیازی، کسی کو تکلیف نہ دینا، حلال کمانا۔ تقوی۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔

فرمایا: بہترین ذخیرہ تقوی اور بدترین ظلم وزیادتی ہے۔

ارشاد ھے: گناہوں سے پرہیز اور بے مقصد امور کا ترک دل کو منور کرتا ہے۔ تم تنہائی اور کم کھانے کی عادت اختیار کرو، بیوقوفوں اور ناانصافوں کی صحبت سے دور رہو جب تم فضول و بے مقصد معاملہ میں بات کرو گے، تو وہ بات تمہاری مالک بن جائیگی۔ تم اس کے مالک نہ رہو گے۔

فرمایا: عاقل وہ ہے جس کی عقل اسے ہر مذموم سے روکے۔

ارشاد ھے: مرؤت کے چار ارکان ہیں۔ خوش اخلاقی، سخاوت، تواضع، اور عبادت

فرمایا: دوست کی علامت یہ ہے کہ اپنے دوست کے دوست کا بھی دوست ہو۔

فرمایا: جو تمھارے پاس چغلی کرے، وہ تمھاری بھی چغلی کرے گا۔

فرمایا: تواضع شریفوں کی عادت ہے، اور تکبر کمینوں کی خصلت ہے، تواضع محبت پیدا کرتی ہے اور قناعت راحت کا باعث ہے۔

فرمایا: لوگوں میں قدر ومنزلت اور فضیلت میں وہ شخص سب سے بڑھکر ہے جو خود اپنی کوئی قدر ومنزلت نہ سمجھے۔

ارشاد ھے: کسی شخص کی غلطی پر لوگ ہنسے، تو اس کی صحیح صورت اس کے دل میں جم جاتی ہے۔

امام صاحب کے متعلق کلمات ائمه

امام عبدالرحمن بن مهدی: میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں، امام شافعی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

امام مالک: میرے پاس امام شافعی سے بڑھکر کوئی فہیم قریشی نہیں آیا۔

امام احمد: میں بوقتِ سحر چھ حضرات کے لئے دعا کرتا ہوں، جن میں ایک امام شافعیؒ ہیں،......امام شافعیؒ دنیا کیلئے سورج کی طرح اور لوگوں کے لئے عافیت کی طرح تھے۔

امام قتیبه: شافعی امام ہیں۔

امام ابوثور: میں نے امام شافعیؒ کے مثل نہیں دیکھا۔ اور نہ خود انھوں نے اپنے مثل دیکھا ہے۔

امام احمد بن حنبل: اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں ایک ایسی شخصیت کو لوگوں کے لئے کھڑا کر دیتے ہیں، جو انھیں آپ ﷺ کی سنتوں کی تعلیم دے، اور آپ ﷺ کی طرف منسوب جھوٹ اور غلط باتوں کی تردید کرے، پس ہم نے دیکھا تو پہلی صدی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور دوسری صدی میں حضرت امام شافعیؒ اس رتبہ پر فائز ہیں۔

امام حرمله: میں نے امام شافعیؒ سے سنا مجھے بغداد میں ناصر الحدیث (حدیث کی نصرت کرنے والے) کے خطاب سے نوازا گیا۔

امام احمد: امام شافعیؒ سب سے زیادہ فصیح تھے، علم فقہ مقفل تھا، جسے امام شافعیؒ نے کھول دیا۔

امام ابوزرعة رازی: امام شافعیؒ کے پاس کوئی غلط حدیث نہیں ہے۔

امام ابوداؤد: مجھے امام شافعیؒ کی کسی حدیث میں خطا کا علم نہیں ہے۔

ابن هشام لغوی: امام شافعی کے ساتھ ہماری طویل مصاحبت رہی، لیکن کبھی بھی ایک لحنہ (لغت کی غلطی) نہیں ہوئی۔

امام علی بن المدینی: امام شافعیؒ کی کتابوں کو لازم پکڑو۔

امام صاحب کی تصانیف: امام شافعی کی کئی مشہور و معروف اور قیمتی مقبول تصانیف یادگار ہیں، جن میں سے کافی طبع ہو چکی ہیں، امام مروزی فرماتے ہیں کہ بقولِ بعض: امام شافعیؒ نے تفسیر، فقہ اور ادب وغیرہ فنون میں ۱۱۳ رکتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱۔المسند فی الحدیث ۲۔السنن فی الحدیث ۳۔احکام القرآن ۴۔الفقه الاکبر ۵۔الام (جو کافی مشہور ومعروف کتاب ہے) ۶۔اختلاف الحدیث ۷۔ الاسماء والقبائل فی اختلاف العراقیین ۸۔ اثبات النبوة والرد علی البراهمة ۹۔ المسبوط فی الفقه ۱۰۔ المسبوط (ایک دوسری کتاب) ۱۱۔کتاب الجدید ۱۲۔کتاب القدیم ۱۳۔ الامالی الکبیر فی الفقه ۱۴۔الاملاء الصغیر ۱۵ تعظیم قدر الصلاۃ ۱۶۔ التنقیح فی علم القیافة ۱۷۔ الحجة العراقی ۱۸۔ رساله فی بیان الناسخ والمنسوخ من القرآن والسنه ۱۹۔ مختصر البویطی ۲۰۔ مختصر الربیع ۲۱۔ مختصر المزنی ۲۲۔مدافع القرآن

خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مختلف فضائل ومحاسن اور کمالات میں اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ نسبی اعتبار سے وہ قریشی اور مطلبی سادات میں سے ہیں، جائے ولادت ارض مقدسہ ہے، پرورش مکہ مکرمہ میں ہوئی، مختلف مکتبِ فکر کے کتابوں کی تصنیف وتالیف اور احکام کی تقریر وتنقیح کے بعد ان کا زمانہ ہے، لہٰذا متقدمین کے مذاہب میں غور وتامل فرمایا۔ ماہر وفائق اساتذہ سے تحصیل علم وکمال حاصل کیا، حاذق وپختہ ائمہ سے علمی بحث ومناظرہ کیا، ان کے مذاہب وطریقہ کار میں غور وفکر اور صبر وتحقیق اور اس سے صحیح آگہی کے بعد ان سب کی روشنی میں اپنا ایک معتدل فقہی اصول ومسلک ترتیب دیا جو قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس کو جامع ہے۔ اور اپنی کمالِ قوت، بلندئی ہمت اور تمام علوم وفنون میں براعت وتفوق اور پختگی وگہرائی کے ساتھ اختیار وترجیح اور تکمیل وتنقیح کیلئے اپنے آپ کو فارغ کیا۔ اور اس طرح ایک معتدل، جامع اور بہترین فقہی مسلک کی دولت سے امت کو روشناس کرایا۔

وفات: امام شافعیؒ کا وصال ماہِ رجب کی آخری تاریخ کو ۲۰۴ھ میں ہوا،

(امام شافعیؒ کے حالات کیلئے دیکھیے۔ سیرا علام البلاء للذهبي. حلية الأولياء- ۹/۶۳-۱۶۲، الانتقاء- ۶۵-۱۲۱ تاریخ بغداد - ۲/۵۶-۷۳، صفة الصفوة ۲ ۹۵۱ تهذيب الاسماء ۱/۴۴-۶۷، تذكرة الحفاظ ۱/۳۶۱-۳۶۳، مقدمة الحاوى الكبير، تهذيب ۹/۲۵، تهذيب الكمال، مقدمة المجموع للنوويؒ، مقدمة معرفة السنن)

شریعت اسلامیہ کے مصادر

اللہ تبارک تعالیٰ نے بندوں کو اپنی عبادت وتوحید کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے" وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ "(الذاريات آيت ۵۶) ترجمہ: "اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی، سو اپنی بندگی کو"

اور اللہ تعالیٰ نے ہر فعل وعمل کا ایک حکم مشروع فرمایا ہے۔ یعنی واجب، حرام، مکروہ مستحب، صحیح، فاسد وغیرہ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان اصولوں کی حفاظت کا ذمہ لے کر جن سے احکام شرعیہ کا استنباط ہوگا، امت کے لئے اس دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

فرمان باری ہے۔"إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ "(الحجر ۹) ترجمہ: "ہم نے آپ پر اتاری ہے یہ نصیحت (قرآن مجید) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"

شریعت کے چار اہم مآخذ ومصدر ہیں: قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع

(۱) قرآن (کتاب اللہ): قرآن مجید اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے۔ جو آپ ﷺ پر نازل ہوا۔ جس کی تلاوت بھی عبادت ہے، اور چھوٹی سی سورت بھی معجزہ ہے، جو سورۃ الفاتحہ سے شروع ہو کر سورۃ الناس پر مکمل ہوتی ہے اور یہ تواتر وصحت کے ساتھ ثابت اور نقل در نقل ہوتا آرہا ہے۔ اس میں کسی باطل اور تحریف کا قطعاً امکان وگذر نہیں ہے۔

بالا جماع قرآن شریف تشریع کا اوّل مصدر، اور شریعت کا کلیہ وبنیاد ہے، اور دین کی حقیقت اور شریعت کے اصول تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اور دیگر تمام دلائل کا انحصار اسی پر ہے۔

حدیث (سنت رسول): یعنی آپ ﷺ کے مبارک فرامین نورانی، اعمال وافعال آپ کے اخلاق حسنہ، آپ کا سراپا، آپ کی سیرت ومغازی اور بعثت سے قبل آپ ﷺ سے متعلق اخبار،

قرآن کی طرح اللہ نے آپ ﷺ کو سنت کی بھی وحی فرمائی، یہ بھی دین کا اہم اصل وبنیاد ہے، جس کی اتباع واجب، اور مخالفت حرام ہے، اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے نیز آیات قرآنی بھی اس کی مؤید ہیں کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، جو اس کا انکار کرے، اس نے مؤمنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ پس حدیث قرآن کے بعد شریعت واحکام کا دوسرا مصدر ہے۔

بکثرت آیات حدیث کی حجیت واہمیت اور واجب الاتباع ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ فرمانِ ربانی ہے۔"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا"(الحشر آیت ۷) ترجمہ: "اور تم کو رسول جو دے، سو لے لو، اور جس سے منع کرے، سو چھوڑ دو" (یعنی مال وجائداد وغیرہ جس طرح پیغمبر اللہ کے حکم سے تقسیم کرے، اُسے بخوشی ورغبت قبول کرو، جو ملے لے لو، اور جس سے روکا جائے رُک جاؤ اور اسی طرح اس کے تمام احکام اور اوامر ونواہی کی پابندی رکھو)

ایک جگہ ارشاد ہے "فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" (النور، ۶۳) ترجمہ: "سو ڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں اس کے (یعنی رسول کے) حکم کا، اس سے کہ آپڑے ان پر کچھ خرابی یا پہنچے ان کو

عذاب دردناک"

(مزید آیات کے لئے دیکھئے، سورۂ نساء آیت نمبر، ۸۰۔ ۶۵۔ ۵۹۔ احزاب آیت نمبر، ۲۱۔ ۳۶۔ سورۂ آل عمران آیت نمبر، ۳۱، نمل آیت نمبر، ۴۴)

احادیث میں آپ ﷺ نے آپ کے فرامین کو سن کر یاد کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی بڑی فضیلت بتلائی ہے۔ اور اس کا حکم دیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس تک حدیث پہنچے تو وہ دلیل و حجت ہوگی، نیز سنن وغیرہ کی روایات میں آپ ﷺ کے فرامین سے منہ موڑ کر صرف قرآن پر اکتفاء و اقتصاء کرنے کے دعوی کی سخت مذمت و تردید وارد ہے امام بیہقی نے معرفۃ السنن کے مقدمہ میں امام شافعی سے حدیث کی حجیت اور واجب العمل ہونے کے متعلق کافی روایات و دلائل کو نقل فرمایا ہے۔

قرآن وحدیث کا تعلق اور رشتہ: امام ابن قیمؒ نے فرمایا کہ آپ ﷺ سے ایک بھی صحیح حدیث ایسی وارد نہیں ہے، جو قرآن کے منافی و مخالف ہو، اگر بظاہر مخالفت نظر آئے، تو یہ مجتہد پر مخفی ہونے کی وجہ سے ہے۔ قرآنی احکام کے متعلق احادیث کا انداز درج ذیل مختلف وجوہ پر ہے۔

(۱) بطور تاکید قرآن کے موافق (۲) قرآن کے کسی حکم کی وضاحت، یعنی کسی اجمال کی تفصیل، یا مطلق کی تقیید، عام کی تخصیص یا کسی شکل کی توضیح (۳) کسی ایسے حکم پر دلالت جس کے متعلق قرآن ساکت ہو،

اجماع: یعنی آپ ﷺ کے بعد کسی بھی دور میں امت مسلمہ کے تمام مجتہدینِ کرام کا کسی شرعی مسئلہ کے حکم پر اتفاق و اجماع کرنا، اگر اکثر مجتہدین متفق ہوں تو اس سے اجماع ثابت نہ ہوگا۔

تمام شرائط کے ساتھ کسی مسئلہ میں اجماع پایا جائے تو یہ واجب العمل شرعی قانون ہوگا جس کی مخالفت جائز نہیں ہے اجماع کے حجت ہونے پر قرآن وحدیث کے درج ذیل نصوص دلیل ہیں۔ ارشاد باری ہے۔ "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (آل عمران نمبر ۱۰۳) ترجمہ: "اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو"

اور فرمایا: "وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ" (الشوری، ۱۰) ترجمہ: "اور جس بات میں اختلاف کرتے ہو، تم لوگ کوئی چیز ہو، تو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ ہے۔" اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جس پر تمہارا اتفاق ہو، وہ برحق ہے، نیز ارشاد ہے۔ "وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا" (النساء نمبر ۱۱۵) (اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، جبکہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ، اور چلے سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف، تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی، اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا)

آپ ﷺ نے فرمایا: "میری امت ہرگز گمراہی پر متفق نہ ہوگی۔ (طبرانی) یہی مفہوم ابوداوٗد کی ایک حدیث سے بھی ثابت ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ میری امت گمراہیہ پر مجتمع و متفق نہ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے، جو شذوذ اختیار کرے (جماعت سے کٹ کر جدا ہو) اسے الگ تھلگ جہنم میں ڈال دیا جائیگا" (ترمذی)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے! میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہیگا" (صحیحین) نیز ارشاد ہے" جو جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا۔ تو اس نے اپنے گلے سے اسلام کا حلقہ اتار دیا" (احمد۔ ابوداؤد۔ حاکم)

قیاس: نصوص محدود، اور پیش آنے والے مسائل بکثرت، جو کسی حد پر ٹھہرنے والے نہیں، لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ قیاس سے کام لیا

جائے، سو، صحابۂ کرام کے دور سے جمہور علماء کرام نے شریعت کے عام مقاصد اور قواعدِ کلیہ کی روشنی میں ان مسائل کا حل پیش کیا، جو صراحتاً قرآن وحدیث میں موجود نہیں، جس مسئلہ کا حکم معلوم نہ ہو، دوسرے کسی معلوم الحکم مسئلہ کے اور اس کے درمیان علت کے اشتراک کی وجہ سے وہی حکم یہاں بھی لگانا قیاس کہلاتا ہے۔ حضرات، صدیق اکبرؓ، عمرؓ، زید بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذؓ بن جبلؓ وغیرہ اکابر صحابۂ کرام نے مختلف مسائل میں قیاس کی روشنی میں جواب دیا۔ قیاس کی حجیت پر قرآن وحدیث سے استدلال کیا گیا ہے۔ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ ہر دور میں جمہور امت کا طبقہ مشرق ومغرب میں قیاس پر عمل کرتا رہا ہے، جو مشہور ومعروف ہے۔ شاذ ونادر متاخرین کے علاوہ کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ قیاس کے حجت پر قوی ترین دلیل ہے۔

امام شافعی کا طریقۂ استنباط: امام شافعیؒ نے مختلف فقہی مکاتبِ فکر سے استفادہ کے بعد ایک معتدل فقہی طریقہ ومسلک کو اپنایا، اور اس سلسلہ میں اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''اصل قرآن یا سنت ہے، ورنہ پھر ان دونوں پر قیاس، اگر آپ ﷺ کی کوئی حدیث بسند صحیح موصول ہو، تو اسی کو اختیار کیا جائیگا، تنہا حدیث سے اجماع بڑھ کر ہے۔ حدیث کو اپنے ظاہر پہ رکھا جائیگا۔ اگر اس میں کئی مفہوم کا احتمال ہو، تو جو ظاہر کے زیادہ مشابہ ہوگا وہ مقدم ہوگا، ایک سے زائد احادیث ہوں تو جو صحت میں فائق ہو، وہ مقدم ہوگا، منقطع حدیث کا کوئی اعتبار نہیں۔ سوائے حضرت ابن المسیب کے منقطع حدیث کے، کسی اصل کو دوسرے اصل پر قیاس نہیں کیا جائیگا، اور کسی اصل کے متعلق یہ سوال نہ ہوگا کہ کیوں اور کیسے؟ کیوں کا سوال تو فرع کے متعلق ہوگا اگر اس فرع کا صحیح طریقہ سے اصل پر قیاس ہو تو، وہ صحیح ہے، اور وہ حجت بنے گی۔''

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے اصول قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہیں۔ امام شافعیؒ نے قیاس کے متعلق ایک معتدل راہ اختیار کی، نہ تو اس میں تشدد سے کام لیا اور نہ زیادہ توسع اختیار فرمایا۔

مسائل میں صحابۂ وتابعین کے اختلاف کے اسباب

واضح رہے کہ آپ ﷺ کے دورِ مسعود میں نہ تو احکام فقہ جمع ہوئے تھے اور نہ اس وقت مسائل میں میں ایسی بحثیں ہوئی تھیں، جیسی یہ فقہا کرتے ہیں کہ نہایت کوشش سے ارکان وشروط اور ہر شئی کے آداب ایک دوسرے سے جدا جدا مع دلائل کے بیان کرتے ہیں، اور صورتیں فرض کر کے ان مفروضہ صورتوں میں گفتگو کرتے ہیں...... آپ ﷺ کے عہد میں آپ وضو کرتے تھے اور صحابۂ کرام اسے دیکھ کر اس پر عمل کرتے تھے، بغیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے کہ یہ رکن ہے اور وہ مستحب ہے اسی طرح آپ ﷺ کی نماز اور حج وغیرہ کو دیکھ کر اسی طرح صحابۂ کرام ان اعمال کو انجام دیتے، عام طور پر فرائض وسنن کی فقہی انداز میں حد بندی نہ ہوتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قضایا آتے تھے، تو آپ فیصلے کر دیا کرتے تھے، لوگوں کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتے تو تعریف کرتے اور برائی دیکھتے تو منع فرماتے، یہ تمام امور مجلسوں میں انجام پاتے تھے، یہی حالت شیخین یعنی حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی تھی، ان حضرات کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تھا، تو لوگوں سے آپ ﷺ کی حدیث دریافت کرتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے جدّہ (دادی، نانی) کے میراث کے متعلق حدیث کی تحقیق کی، حضرت عمرؓ نے وبا کے متعلق حضرت عبدالرحمٰنؓ کی حدیث کو اختیار کیا۔ اور حضرت ابوموسیٰؓ سلام کے بعد حضرت عمرؓ کے گھر میں داخلہ کی اجازت چاہتے ہیں، اجازت نہ ملی، تو لوٹ گئے، اس پر حضرت عمرؓ نے باز پرس کی تو انھیں حدیث کا حوالہ دیا، جس کی حضرت ابوسعیدؓ خدری نے تصدیق کی اس طرح کے بے شمار واقعات صحیحین اور سنن وغیرہ کی احادیث میں موجود ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت حمیدہ یہی تھی کہ ہر صحابی نے، جس قدر اس کو توفیق الٰہی ہوئی آپ کی عبادت، فتاویٰ و فیصلوں کو دیکھا، سمجھ لیا اور خوب حفظ کر لیا، اور ان امارات اور قرائن کی وجہ سے جو اس صحابی کو معلوم تھے، بعض امور کو اباحت پر اور بعض کو نسخ پر محمول کیا۔

آپ ﷺ کے مبارک دور کے بعد صحابہ کرام تمام علاقوں میں پھیل گئے، اور ہر شخص ایک ایک علاقہ کا مقتدیٰ اور رہبر ہو گیا، اب واقعات زیادہ پیش آتے گئے، اور لوگوں نے مسائل دریافت کرنا شروع کئے، ہر صحابی نے اپنی یادداشت اور استنباط کے موافق جواب دیا، ضرورت پڑی تو اپنی رائے سے اجتہاد کر کے جواب دیا، اس وقت ان کے درمیان اختلاف کے چند پہلو ہو گئے، جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ایک صحابی نے کسی معاملہ میں کوئی حکم یا فتوی سن لیا، دوسرے نے نہیں سنا، جسکی وجہ سے اپنی رائے سے اس میں اجتہاد کیا، پھر کبھی تو اجتہاد حدیث کے موافق ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک عورت کے لئے مہرِ مثل کا فتویٰ دیا، جس کا مہر مقرر نہ تھا اور شوہر انتقال کر گیا، نیز اس پر عدت لازم ہے۔ اور اسے ورثہ ملے گا، تو حضرت معقلؓ نے گواہی دی کہ آپ ﷺ نے بھی ایک عورت کے حق میں ایسا ہی فیصلہ دیا تھا۔ (نسائی وغیرہ)

(۲) اور کبھی یہ اجتہاد حدیث کے موافق نہ ہوتا، پھر اس صحابی کو معتبر طریقہ سے حدیث ملتی تو اس کی طرف رجوع کرتے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کا فتوی یہ تھا کہ جس نے جنابت کی حالت میں صبح کی ہو، اس کا روزہ نہیں ہے، لیکن جب بعض ازواجِ مطہرات نے اس کے خلاف حدیث بیان کی، تو حضرت ابوہریرہؓ نے اس فتوی سے رجوع فرمایا۔

(۳) صحابی کو حدیث تو پہنچی، لیکن اس طرح سے ظاہر نہ ہو، جس سے اس کے حدیث ہونے کا ظنِ غالب ہو، اس واسطے وہ صحابی اپنے اجتہاد کو ترک نہ کرے، مثلاً: حضرت عمرؓ و عائشہؓ کا مطلقہ ثلثہ کے لئے عدم سکنی کے متعلق حضرت فاطمہ بنتِ قیس کی حدیث کو قبول نہ کرنا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس عورت کے قول سے کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتا، اسی طرح صحیحین میں ہے کہ حضرت عمرؓ جنبی کے لئے تیمم کے قائل نہ تھے، تب حضرت عمارؓ نے اس کے جواز میں خود اپنا واقعہ مرفوعاً پیش کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے تسلیم نہ کیا، اور ایک مخفی سبب کی وجہ سے انھوں نے اس حدیث کو حجت قرار نہ دیا، لیکن دوسرے طبقہ میں مختلف طرق سے اس حدیث کی شہرت ہو گئی، اور ضعف کا سبب مضمحل ہو گیا۔ لہٰذا تمام علماء نے اس پر عمل کیا۔

(۴) صحابی کو حدیث پہنچی ہی نہیں، مثلاً! مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ عورتوں کو غسل کے وقت بالوں کو کھولنے کا حکم دیتے تھے، حضرت عائشہؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار فرمایا۔ اور آپ ﷺ کے روبرو اپنا عمل یہ بتایا کہ اپنے سر پر تین بار پانی بہایا کرتی تھی۔

(۵) صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فعل کرتے دیکھا، پس بعضوں نے اسے عبادت پر اور بعضوں نے اباحت پر محمول کیا، مثلاً حج کے بعد مقام ابطح میں آپ ﷺ کے قیام کو حضرات، ابوہریرہ و ابن عمر رضی اللہ عنہم نے عبادت پر محمول کیا اور اسے سننِ حج میں شمار کیا جبکہ حضرات عائشہؓ و ابن عباسؓ نے اسے محض اتفاقی امر شمار کیا، اور سنن حج میں داخل نہیں کیا۔ اسی طرح جمہور کے نزدیک طواف میں رمل کرنا مستقل سنت ہے۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ کا خیال یہ ہے کہ ایک وقتی سبب کی وجہ سے عارضی عمل تھا، جو آئندہ مطلوب و سنت نہیں ہے۔

(۶) سہو و نسیان اور بھول کی وجہ سے بھی صحابہ میں اختلاف ہوا، مثلاً حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ نے ایک عمرہ رجب

میں کیا تھا، حضرت عائشہؓ نے سنا تو فرمایا کہ وہ بھول گئے، آپ ﷺ کا کوئی بھی عمرہ رجب میں نہ تھا۔

(۷) اختلاف ضبط کی وجہ سے بھی صحابۂ کرام میں اختلاف ہوا۔ مثلاً: حضرت عمر وابن عمرؓ سے حدیث مروی ہے۔ کہ گھر والوں کے رونے سے مردہ کو عذاب ہوتا ہے، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ آپ ﷺ ایک یہودیہ کے جنازہ کے پاس سے گذرے، اس پر اس کے گھر والے رورہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا'' یہ لوگ اس عورت پر رورہے ہیں حالانکہ اسکو قبر میں عذاب ہورہا ہے'' پس بقول عائشہؓ ان لوگوں نے رونے کی عذاب قبر کی علت سمجھ کر اس حکم کو ہرمیت کے لئے عام کیا۔

(۸) صحابہ کا کسی حکم کی علت میں اختلاف ہوجانا، مثلاً جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا، بعضوں نے کہا کہ یہ قیام فرشتوں کی تعظیم کے لئے ہے، اس لئے مومن وکافر دونوں کے جنازہ کو شامل ہے اور بعض نے کہا کہ یہ قیام موت کے خوف کی وجہ سے ہے، تب بھی دونوں کو شامل ہے، اور حضرت حسن بن علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی کا جنازہ آپ ﷺ کے پاس سے گذرا، اور آپ ﷺ کھڑے ہوئے، اس کراہت کی وجہ سے کہ اس کا جنازہ آپ ﷺ کے سر کے اوپر سے گذرے، پس یہ حکم صرف کافر کے ساتھ خاص ہے۔

(۹) دو مختلف امور کے جمع کرنے میں صحابۂ کرام کا اختلاف، مثلاً: آپ ﷺ نے بول وبراز کے وقت قبلہ کی طرف رُخ یا پشت کرنے کی ممانعت فرمائی، اور حضرت جابرؓ نے آپ ﷺ کو وصال سے ایک سال قبل قبلہ رو پیشاب کرتے دیکھا، اور حضرت ابن عمرؓ نے آپ ﷺ کو قبلہ کی طرف پشت کئے قضاء حاجت فرماتے دیکھا، تو بعضوں نے آپ ﷺ کے ممانعت کو ترجیح دی اور ہر حال میں اسے ممنوع سمجھا، بعضوں نے حضرت جابر کی حدیث سے اس ممانعت کو منسوخ قرار دیا، اور بعض حضرات نے تمام روایات میں تطبیق وجمع پر عمل کیا، اور ممانعت کو کھلی جگہ کے ساتھ مخصوص قرار دیا، پائخانوں میں اس کی اجازت دی۔

تابعین وغیرہ: خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا اسباب سے صحابہ کے مذاہب مختلف ہوئے اسی طرح تابعین نے توفیق خداوندی وسہولت کے مطابق احادیث اور صحابۂ کرام کے مسلک کو حاصل کیا، اسے یاد کیا اور سمجھنے کی کوشش کی، اور حتی الامکان مختلف امور کو جمع کیا، اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو اپنی نظر میں ضعیف سمجھا، اس طرح تابعین میں سے ہر ایک عالم کا ایک مذہب قائم ہوگیا، اور ہر شہر میں ایک (یا زائد) امام قائم ہوگئے، جیسے مدینہ میں سعید بن المسیب اور سالم بن عبداللہ ابن عمر، ان کے بعد امام زہری وغیرہ، مکہ میں عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی وشعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس اور شام میں مکحول، پس خدا نے بہت سے قلوب کو ان کے علوم کا گرویدہ کردیا، اور لوگوں نے نہایت رغبت سے ان سے حدیث صحابۂ کرام کے فتوی، اور خود ان کے مذاہب وتحقیقات کو حاصل کیا، اور ان سے مسائل کا استفسار کیا، ان میں مسائل کا خوب تذکرہ رہا اور تمام معاملات کے وہ مرجع رہے۔

سعید بن المسیب اور ابراہیم اور ان کے ہم مرتبہ لوگوں نے تمام ابواب فقہ کو مرتب کردیا تھا، اور ہر بات کے متعلق ان کے پاس اصول وقواعد مرتب تھے، جن کو انھوں نے اپنے اسلاف سے حاصل کیا تھا، سعید بن المسیب اور ان کے اصحاب اس کے قائل تھے کہ فقہ میں حرمین میں علماء سب سے پختہ ہیں، اور ان کے مسلک کی بنیاد حضرات عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ وابن عباسؓ کے فتوے اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں ان سب علوم کو انہوں نے بقدر استطاعت جمع کیا اور ان میں غور وفکر کیا اور بنظر تفتیش اس کا مطالعہ کیا، جن مسائل پر علماء مدینہ کا اتفاق دیکھا ان کو خوب مستحکم طور پر اختیار کیا، اور جو مسائل ان کے نزدیک اختلافی تھے، ان میں سے قوی اور راجح کو اختیار کیا۔ جب انھیں اس جمع شدہ علمی ذخیرہ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملا، تو اس کو ان کے کلام سے حاصل کیا، اور قرآن وحدیث کے ایماء واقتضاء کا تتبع کیا، اور اس طرح ہر باب میں ان کو بکثرت مسائل حاصل ہوگئے۔

ابراہیم اوران کے شاگردوں نے حضرت ابن مسعودؓ اوران کے شاگردوں کو فقہ میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا، اور امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اصل عبداللہ بن مسعودؓ کے فتوے، حضرت علیؓ کے فیصلے وفتوے اور قاضی شریح اور دیگر قضاۃ کوفہ کے فیصلے ہیں، انھوں نے بقدرِ امکان مسائل فقہیہ کو جمع کیا، اور اہلِ کوفہ کے آثار سے مسائل کی تخریج کی، اور اس طرح ہر باب کے متعلق فقہی مسائل مرتب ہوگئے۔

فقہاء کے مذاہب: آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''بعدوالےنسل میں سے عادل لوگ اس دین کو حاصل کریں گے۔'' اس فرمان اور پیشن گوئی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تابعین کے بعد حاملینِ علم کی ایک جماعت کو پیدا کیا، انھوں نے احادیث مبارکہ، کثیرالوقوع احکام اور مختلف شہروں کے قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے سن کر جمع کیا، اور تمام امور میں انتہائی جانفشانی اور عرق ریزی کا ثبوت دیا، اس طرح وہ مسلمانوں کے مقتداء اور تمام امور کے مرجع بن گئے، کسی مسئلہ میں صحابہ وتابعین کے اقوال مختلف ہوتے تھے، تو ہر عالم کے نزدیک اپنے مشائخ کا مذہب پسندیدہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کے صحیح وسقیم اقوال کو وہ خوب جان سکتا ہے، اور ان اقوال کے مناسب اصول کو خوب یاد رکھ سکتا ہے۔ اور ان کے فضل وتبحر کی جانب اس کا قلبی میلان زیادہ ہوتا ہے۔

پھر جب ان علماء کو اپنی یاداشت میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تھا، تو ایماء اور اقتضاء کا تتبع کر کے قدماء کے ہی کلام سے مسئلہ کا جواب حاصل کرتے تھے، اسی زمانہ میں علماء کو تدوین وتالیف کا الہام ہوا، پس مدینہ میں امام مالک اور ابن ابی ذئب، مکہ میں ابن جریج وابن عُیَینَہ، کوفہ میں سفیان ثوری، بصرہ میں ربیع بن صبیح نے تصنیف کرنا شروع کیا، اور سب نے تصنیف میں مذکورہ طرز اختیار کیا۔

علماء مدینہ میں اپنے وقت میں امام مالک علم وحدیث میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تھے، حضرات صحابہ مثلاً عمرؓ، ابن عمرؓ، عائشہؓ اور ان کے اصحاب فقہاء سبعہ کے اقوال کو امام مالک سب سے زیادہ یاد رکھنے والے تھے، ان سے اور انہی جیسے علماء کی وجہ سے روایت اور فتوی کا علم قائم ہوا ہے، امام مالک کے شاگردوں نے ان کی روایات اور پسندیدہ اقوال کو جمع کیا، اور ملخص کر کے لکھا، ان کی شرح کی اور ان سے مسائل کا اخراج کیا، اور اقوال کے اصول اور دلائل میں گفتگو کی اور ان کے شاگرد مغربی ممالک اور اطراف عالم میں پھیل گئے۔

امام ابوحنیفہ، ابراہیم نخعی اور ان کے ہم عصر علماء کے مذہب کے زیادہ پابند تھے، اور ابراہیم نخعی کے مذہب سے بہت کم تجاوز کرتے تھے، اور انکے مذہب کے موافق مسائل کی تخریج کرنے میں عظیم الشان، تخریجات کی وجوہ دریافت کرنے میں دقیق النظر اور فروعات کی جانب نہایت درجہ متوجہ تھے، امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد کے ذریعہ ان کا مسلک مختلف علاقوں میں معمول بہ ہوا۔

مالکی اور حنفی مسلک کے ظہور کے ابتداء میں امام شافعیؒ کا نشو ونما ہوا، جب انھوں نے متقدمین کی روش میں غور کیا۔ تو انھوں نے بہت سے ایسے امور کو پایا جن کی وجہ سے وہ متقدمین کے طریق کی (من وعن) پیروی نہ کر سکے، امام شافعی نے ان امور کو اپنی کتاب الام کے اول میں ذکر کیا ہے۔

مثلاً: متقدمین مرسل ومنقطع حدیث پر عمل کرتے تھے، حالانکہ یہ خلل سے محفوظ نہ تھیں، کیونکہ جب حدیث کے تمام طرق وسند جمع کئے جائے، تو یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ بہت سی مرسل احادیث بالکل بے اصل ہیں، اور بہت سی مرسل احادیث مسند احادیث کے مخالف تھیں، اس واسطے امام شافعیؒ نے مرسل حدیث پر عمل کے لئے بعض شرائط کو ضروری قرار دیا: جو کہ اصول کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اسی طرح متقدمین کے دور میں مختلف احادیث کے درمیان جمع وتوفیق اور تطبیق کے قواعد منضبط نہ تھے، لہٰذا ان کے اجتہادی مسائل میں بعض مرتبہ خلل رہا کرتا، اسے دور کرنے کے لئے امام شافعیؒ نے اصول مقرر کئے اور ان کو ایک کتاب میں جمع کردیا، اصول فقہ میں سب سے پہلی تصنیف یہی

کتاب ہے۔

ایک امر یہ تھا کہ بعض صحیح احادیث علماء تابعین کے مفتیوں کو نہ پہنچیں، اس لئے ان کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑا، انھوں نے عام الفاظ کا لحاظ کیا، یا انھوں نے گذشتہ صحابہ کی پیروی کی اور اسی کے موافق فتوی دے دیا، لیکن تیسرے طبقہ میں یہ احادیث مشہور ہوگئیں، تو انھوں نے ان احادیث پر عمل نہ کیا، یہ سمجھ کر کہ یہ احادیث ان کے علماء شہر کے عمل کے خلاف ہیں، اور اس طریقہ کے خلاف ہیں جس پر وہ سب متفق ہیں، اور یہ بات ان احادیث میں طعن کی وجہ بن گئی اور ان احادیث کے غیر معتبر ہونے کی علت ہوگئی، یا وہ احادیث تیسرے طبقہ میں مشہور نہیں ہوئی تھیں، بلکہ اس کے بعد ان کی شہرت ہوگئی، جبکہ محدثین نے احادیث کے تمام طرق کو جمع کیا، اور مختلف علاقوں کا سفر کر کے علماء حدیث سے ان کی تفتیش کی، پس اکثر احادیث ایسی ظاہر ہوتی گئیں، جن کی روایت صحابہ میں سے ایک یا دو اشخاص نے کی تھی اور ان صحابہ سے بھی صرف ایک یا دو راویوں نے ان کی روایت کی تھی، حکم پس بہت سی احادیث فقہاء کرام کی نظر سے مخفی رہیں اور ان حفاظ حدیث کے زمانہ میں مشہور ہوئیں، جنھوں نے تمام طرق حدیث کو جمع کیا تھا، مثلاً بہت سی احادیث کو اہلِ بصرہ نے روایت کیا، اور دیگر علاقے ان احادیث سے بے خبر رہے، پس امام شافعیؒ نے اس بات کو واضح کر دیا کہ علماء صحابہ اور تابعین کی ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں حدیث کے متلاشی رہتے تھے، جب کوئی حدیث ان کو نہ ملتی تھی تو وہ کوئی اور استدلال اختیار کرتے تھے، لیکن اس کے بعد جب کوئی حدیث ان پر ظاہر ہو جاتی تھی تو وہ حدیث کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے، پس جب انکی ایسی حالت تھی تو ان کا کسی حدیث پر عمل نہ کرنا اس کیلئے قادح نہیں ہوسکتا، تاہم وہ کوئی علت قادحہ بیان کر دیں تو اس وقت قادح ہوسکتا ہے۔

اس کی مثال حدیث قلتین ہے، یہ حدیث صحیح ہے جو کئی طریقوں سے مروی ہے تاہم یہ حدیث امام سعید ابن المسیب و امام زہری کے زمانہ میں مشہور نہ ہوئی اور اس پر مالکیہ وحنفیہ نے عمل نہ کیا، اور امام شافعیؒ نے اس پر عمل کر لیا، اسی طرح خیار مجلس کی حدیث ہے، جو صحیح اور کئی طرق سے مروی ہے، اور صحابہ میں ابن عمرؓ وابو ہریرہؓ نے اس پر عمل کیا تھا، لیکن فقہاء سبعہ اور ان کے معاصرین میں اس کی شہرت نہ ہوئی پس وہ اس حدیث کے قائل نہ تھے، لہٰذا امام مالک و امام ابو حنیفہ نے اس امر کو مذکورہ حدیث میں علت قادحہ سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا، البتہ امام شافعیؒ نے اس پر عمل کیا۔

مذکورہ امور اور دیگر اسباب کی وجہ سے امام شافعیؒ نے فقہ کو از سرِ نو مرتب کیا، اس کے اصول کو ترتیب دیا، اور ان پر فروع کو متفرع کیا، عمدہ کتابیں تصنیف فرمائیں اور لوگوں کو فائدہ پہنچایا، فقہا ان کی خدمت میں جمع ہوگئے، ان کی کتابوں کا اختصار کیا، ان پر شروح لکھیں، دلائل بیان کئے اور مسائل کی تخریج کی اور پھر یہ لوگ تمام شہروں میں پھیل گئے، اس طریقہ کا نام شافعیؒ مذہب ہوگیا، واللہ اعلم۔ (تلخیص از حجۃ اللہ۔ البالغہ)

ائمہ کرام کا اختلاف: امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ کے مقبول و معروف ائمہ کرام میں سے کوئی بھی دانستہ کسی چھوٹی یا بڑی بات میں آپ ﷺ کی مخالفت نہ کرے گا، کیونکہ یہ تمام حضرات یقیناً اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ کی اتباع واجب ہے، نیز یہ کہ ہر کسی کی بات کو اختیار اور ترک کیا جاسکتا ہے سوائے آپ ﷺ کے (کہ آپ کی تمام باتوں کو اختیار کرنا لازم ہے) تاہم ان میں سے کسی کا قول، کسی صحیح حدیث کے خلاف ہو، تو حدیث کے ترک کرنے میں ضرور اس کے پاس کچھ عذر ہوگا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) وہ حدیث اس امام کو نہ ملی ہو، اور جسے حدیث نہ ملی ہو اس کے مطابق حکم کے علم کا مکلف نہیں، ایسی صورت میں وہ کسی آیت یا دوسری حدیث کے ظاہر کے مطابق، یا قیاس وغیرہ کی روشنی میں فتوے دے گا۔ جو کبھی تو اس حدیث کے موافق ہوگا، اور کبھی مخالف اسلاف

سے حدیث کے خلاف مروی اقوال کا غالب سبب یہی ہے، کیونکہ تمام احادیث کا احاطہ کسی امام کو حاصل نہ تھا، جو خود خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کو ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بعض درپیش مسائل سے متعلق احادیث کا انھیں علم نہ ہوتا۔ پھر دریافت کرنے پر دیگر صحابہ کے ذریعہ علم ہوتا، تو اس پر عمل فرماتے، مثلاً: صدیق اکبر کو دادی کی میراث کا علم نہ تھا، حضرت عمرؓ کو استئذان (گھر میں داخل کی اجازت)، شوہر کی دیت میں بیوی کی وراثت، مجوس سے جزیہ لینا، طاعون کے علاقوں میں داخل ہونا، اور نماز کی رکعت میں شک کی صورت کا حکم معلوم نہ تھا، دیگر صحابہ کے ذریعہ معلوم ہوا، تو ان حضرات نے اس پر عمل کیا۔

(۲) حدیث تو ملے لیکن اس کے نزدیک وہ ثابت نہ ہو، مثلاً راوی مجہول، متہم یا ضعیف الحفظ وغیرہ ہو، اسی لئے ائمہ کرام بعض مرتبہ یہ فرماتے ہیں، اگر فلاں حدیث صحیح طریقہ سے ملے، تو میں اس پر فتوی دونگا۔

(۳) اپنے اجتہاد کے اعتبار سے حدیث کو ضعیف سمجھے، جس میں دوسروں کو اس سے اختلاف ہو، خواہ بات اس کی صحیح ہو یا دوسرے کی۔

(۴) عادل کے خبر واحد میں بعض شرائط کو ضروری قرار دے، جس سے دوسروں کو اختلاف ہو، مثلاً بعضوں کی یہ شرط کہ حدیث قیاس اصول کے مخالف ہو تو راوی فقیہ ہو، یا بعضوں کا عموم بلوی کے مسائل میں حدیث کے انتشار وظہور کی شرط لگانا۔

(۵) حدیث تو پہنچی ہو لیکن بھول جائے، جیسے تیمم کا ایک واقعہ حضرت عمارؓ نقل کرتے ہیں، جسمیں خود حضرت عمر بھی شریک تھے لیکن انھیں یاد نہ رہا (صحاح ستہ) اسی طرح حضرت علیؓ نے جنگ جمل کے دن آپ ﷺ کی ایک وصیت حضرت زبیرؓ کو یاد دلائی، اور انھیں یاد آ گئی، جس کی وجہ سے وہ میدان سے ہٹ گئے۔ (ابویعلی۔ بیہقی۔ عبدالرزاق۔ البدایة والنهایه لابن کثیر ۷/۲۴۰)

(۶) حدیث کی دلالت سے ناواقفیت، کیونکہ حدیث میں کبھی غریب لفظ ہوگا، جیسے مزابنہ، مخابرہ، محاقلہ، ملامسہ، منابذہ، اور غرر وغیرہ جیسے الفاظ، جن کی تشریح میں علماء کا اختلاف ہوجاتا ہے، نیز جیسے یہ حدیث: ''اغلاق میں طلاق وآزادی (معتبر) نہیں'' (احمد۔ ابوداؤد۔ حاکم۔ ابن حبان)

کیونکہ علماء نے اغلاق کا مفہوم اکراہ (زبردستی) بیان کیا ہے۔ اور جو اس مسئلہ سے اختلاف کرتے ہیں وہ اس تشریح کو نہیں جانتے۔ اور کبھی اس امام کی لغت اور عرف میں آپ ﷺ کی لغت کے علاوہ دوسرا مطلب ومفہوم اس لفظ کا ہوگا اور وہ اپنی لغت کے مفہوم پر اسے محمول کرے گا، اسی طرح بعض اوقات لفظ مشترک، مجمل یا حقیقت ومجاز کے درمیان متردد ہوگا، اور وہ اپنے اعتبار سے اقرب صورت پر اسے محمول کریگا۔ گو اس سے دوسرا مفہوم مراد ہو، جیسا کہ ابتداءً بعض صحابہ کرام نے خیط الابیض اور خیط اسود کو رسی پر محمول کیا، اور بعضوں نے تیمم میں ہاتھ کے مسح کو بغل تک مسح پر محمول کیا۔

(۷) یہ نظریہ کہ حدیث میں اس مسئلہ پر دلالت نہیں ہے۔ مثلاً: اس لئے کہ عام مخصوص حجت نہیں ہے، یا مفہوم حجت نہیں ہے۔ یا کسی سبب سے وارد عموم کو سبب تک محدود رکھیں گے، یا امر مجرد وجوب کو مقتضی نہیں، یا فوراً ادائیگی کو مستلزم نہیں یا معروف باللام میں عموم نہیں، یا منفی افعال سے اس کے ذات اور تمام احکام کی نفی نہیں کرتی، وغیرہ۔

(۸) یہ نظریہ کہ حدیث سے آپ جو دلالت لے رہے ہیں۔ اس کے معارض دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلالت مراد نہیں ہے۔ مثلاً: عام کا خاص سے یا مطلق کا مقید سے معارض ہونا، یا امر مطلق کے معارض وجوب کی نفی کرنے والی دلیل، یا حقیقت کے معارض مجاز کی دلیل وغیرہ۔

(۹) یہ نظریہ کہ حدیث کے معارض ایسی دلیل ہے جو حدیث کے ضعف یا نسخ یا تاویل پر دلالت کر رہی ہے۔ مثلاً اس کے معارض کوئی آیت، یا دوسری حدیث یا اجماع۔

(۱۰) حدیث کے معارض ایسی دلیل جو اس کے ضعف، یا نسخ یا تاویل پر دلالت کرے، اور دوسرا عالم اس دلیل کا قائل نہ ہو۔ مثلاً کئی اہلِ کوفہ کا یہ نظریہ کہ قرآن کا ظاہر یعنی عموم وغیرہ نصِ حدیث پر مقدم ہوگا یا بعض اہل مدینہ کا علماء مدینہ کے عمل اور اجماع کو صحیح حدیث پر مقدم کرنا۔

کئی صحیح احادیث کے متعلق کسی عالم کے عمل نہ کرنے کی کوئی وجہ اور دلیل اس کے پاس ہوگی، جس کا ہمیں علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہ وسیع میدان ہے، اور علماء کے تمام مافی الضمیر کا ہمیں علم نہیں۔ ایک عالم کبھی اپنی حجت ظاہر کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا ظاہر کرنے کے بعد کبھی وہ ہم تک پہنچتی ہے اور کبھی نہیں پہنچتی اگر اس کی حجت ہم تک پہنچ بھی جائے، تو ضروری نہیں کہ اس کے انداز احتجاج تک ہمارے فہم کی رسائی ہو جائے، خواہ اس کا احتجاج فی نفسہ صحیح ہو یا نہ ہو۔

کسی امام کا کسی حدیث کے ترک کے اسباب کے متعلق مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی حدیث میں کسی حلال یا حرام وغیرہ کا حکم ہو، اور کسی عالم کا اس پر عمل نہ ہو تو اس کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ گنہ گار نہ ہوگا، اپنے اجتہاد کی وجہ سے اس سے مستحق ثواب ہوگا، قرآن مجید نے حضرت داوٗد علیہ السلام وحضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک فیصلہ کے متعلق فرمایا۔

آیت: " وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ اِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ، وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِيْنَ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ، وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا "(الانبیاء: ۷۸-۷۹)

ترجمہ: '' اور داؤ داور سلیمان (علیہما السلام کے قضیہ) کا تذکرہ کیجئے، جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارہ میں (جس میں غلہ تھا یا انگور کے درخت تھے) فیصلہ کرنے لگے، جبکہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اس کو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے۔ سو ہم نے فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دی اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا''

('' یعنی داود علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا) تو سلیمان علیہ السلام کو فہم کے ساتھ مختص فرمایا'' لیکن دونوں کے حکمت وعلم کی تعریف فرمائی۔

صحیحین کی ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ جب حاکم اجتہاد کرے اور صحت تک پہنچے تو اسے دوہرا اجر ہوگا۔ اور اگر اجتہاد میں غلطی ہو جائے تو ایک اجر ملے گا۔ تو واضح ہوا کہ مجتہد کو باوجود غلطی کے ایک ثواب ملے گا، یہ ثواب اس کے اجتہاد وکوشش کے عوض ہے۔ اور غلطی معاف ہوگی، کیونکہ تمام احکام میں ہو بہو صحت تک رسائی متعذر یا کافی دشوار ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ " مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ '' (الحج: ۷۸) (تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) نیز ارشاد ہے: "يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (البقرہ: ۱۸۵) (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے۔ اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں......)

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے سال صحابہ کرام سے فرمایا کہ کوئی بھی بنو قریظہ پہنچنے سے قبل ہرگز عصر کی نماز نہ پڑھے، اب راستہ ہی میں عصر کا وقت ہو گیا۔ تو بعضوں نے کہا ہم تو بنی قریظہ میں جا کر ہی عصر ادا کریں گے، اور بعضوں نے کہا: اصل مقصود یہ نہ تھا (بلکہ جلد بنو قریظہ چلے جانا مقصود تھا)، تو انھوں نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی، پس کسی گروہ پر گرفت نہ ہوئی۔ پہلے

گروہ نے عموم خطاب کو اختیار کیا۔اور نماز کے قضاء کی صورت کو بھی اس عموم میں داخل کیا۔اور دوسرے گروہ کے ہاتھ ایسی دلیل تھی، جس کی وجہ سے یہ صورت اس عموم سے خارج ومستثنیٰ تھی۔ کیونکہ اصل مقصد یہود بنوقریظہ کی طرف مبادرت ومسارعت تھی۔

اسی طرح حضرت بلالؓ نے دوصاع کھجور ایک صاع کے عوض فروخت کیا تو آپ ﷺ نے اسے لوٹانے کا حکم دیا،(متفق علیہ) لیکن اس پر سود کھانے کا حکم یعنی فسق اور لعنت وغیرہ مرتب نہ فرمایا۔ کیونکہ وہ حرمت سے ناواقف تھے۔اسی طرح حضرت عدی بن حاتم اور بعض صحابہ نے سحری کے اختتام کے متعلق قرآن کے لفظ خیط ابیض وخیط اسود (دیکھئے سورۂ بقرہ آیت نمبر ١٨٧) کو اپنے ظاہر پر رکھتے ہوئے اپنے تکیہ کے نیچے سفید اور سیاہ رسی رکھی، اور دونوں ایک دوسرے سے نمایاں ہونے تک سحری کرتے رہے۔تو آپ ﷺ نے عدی سے فرمایا ''تب تو تمہارا تکیہ کافی چوڑا ہوگیا۔اس سے تو دن کا اجالا اور رات کی تاریکی مراد ہے۔(متفق علیہ)'' پس آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ کلام کا صحیح مفہوم تم سمجھ نہ سکے، تاہم اس پر رمضان میں عمداً روزہ توڑنے اور نہ رکھنے کی مذمت کا مرتب نہ ہوا'' ہوا'' جو بہت بڑا گناہ ہے۔

اس کے برعکس ایک زخمی شخص کو بعضوں نے سخت ٹھنڈی میں غسل کے وجوب کا فتوی دیا۔اور غسل کی وجہ سے وہ مرگیا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:'' ان لوگوں نے اسے قتل کردیا۔اللہ تعالیٰ ان کو قتل کردے۔جب معلوم نہ تھا تو پوچھا کیوں نہیں؟ جو خود عاجز ہو، اس کا علاج یہی ہے کہ (اہل علم سے) سوال کرے'' (ابوداؤد، دارقطنی۔ ابن ماجہ۔حاکم۔ابن خزیمہ۔ ابن حنبل) کیونکہ یہ اہل علم نہ تھے اس لئے بلا اجتہاد خطا کرگئے۔اسی طرح حضرت اسامہ نے ایک غزوہ میں کلمہ پڑھ لینے کے باوجود ایک شخص کو قتل کیا۔تو ان پر قوَد (قصاص)، دیت یا کفارہ واجب نہیں کیا، کیونکہ ان کے خیال میں اس کا اسلام صحیح نہ تھا۔اور قتل کرنا جائز تھا۔حالانکہ اس کا قتل حرام تھا۔(تلخیص از رفع الملام عن الائمة الاعلام لشیخ الاسلام ابن تیمیہؒ)

سبب اختلاف: اجتہادی مسائل میں علماء کرام کے اختلاف کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے علام مناوی فرماتے ہیں۔ اس اختلاف کے مختلف اسباب ہیں۔بعض درج ذیل ہیں۔جس سے بقیہ پر روشنی پڑتی ہے۔

(١) لغت میں کسی کلمہ کے مدلول میں اختلاف:۔ مثلاً یہ اختلاف کہ قرائن کی عدم موجودگی میں امر وجوب کے لئے ہوگا۔یا استحباب کے لئے ہوگا۔یا قدر مشترک کے لئے ہوگا۔یا کسی اور کے لئے، یا لفظ کے دومدلول میں سے کسی ایک پر محمول کرنے کے متعلق اختلاف، جیسے عدت کے متعلق قرآن نے '' ثلاثة قروء'' (البقرہ: ٢٢٨) (یعنی تین قروء) کا لفظ استعمال کیا۔جو طہر اور حیض دونوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔امام شافعیؒ اسے طہر پر اور حنفیہ حیض پر محمول کرتے ہیں۔یا مثلاً محاربین کی مختلف سزاؤں کو قرآن نے (اَوْ) (یعنی یا) کے ساتھ بیان کیا۔(دیکھئے سورۂ مائدہ: ٣٣) تو امام مالک وغیرہ بعض علماء نے اسے حاکم کے اختیار پر محمول کیا۔ اور شوافع وحنفیہ وغیرہ نے تفصیل وتبعیض پر محمول کیا۔

(٢) ناسخ ومنسوخ میں اختلاف: ایک حکم کو بعض اہل علم ناسخ اور دوسرے منسوخ سمجھتے ہیں

(٣) راوی کی تعدیل وتجریح: حدیث کے کسی راوی کو بعض علماء عادل اور معتبر قرار دیتے ہیں۔لیکن بعض دیگر علماء کی تحقیق میں وہ مجروح وضعیف شمار ہوگا۔مثلاً ابراہیم بن یحییٰ کو امام شافعیؒ نے معتمد قرار دیا اور ان کی روایت کو قبول کیا لیکن دیگر حضرات انھیں مجروح سمجھ کر ان سے مروی احادیث کو رد کرتے ہیں۔

(٤) تعارض کے وقت مرجحات میں اختلاف: بعض حضرات دومتعارض میں سے ایک کو اختیار کرکے

دوسرے کے مقابلہ میں بہتر سمجھتے ہیں۔ جبکہ دوسرے علماء اس کے برعکس ترجیح دیتے ہیں، مثلاً: اہل مدینہ کے عمل اور خبر واحد میں تعارض ہو، تو مالکی حضرات اہل مدینہ علی صاجہا افضل الصلاۃ والسلام کے عمل کو مقدم رکھتے ہیں۔ جبکہ دیگر حضرات اس کے برعکس خبر واحد کو مقدم رکھتے ہیں۔ جیسا کہ شوافع کا خیار مجلس کی روایت کو جو صحیحین میں سے اہل مدینہ کے عمل پر مقدم رکھنا، اسی طرح حقیقت مرجوح اور مجاز راجح میں تعارض وغیرہ۔

اختلاف کا ایک عام سبب ان دلائل کے متعلق اختلاف ہے۔ جن سے احکام کی تحصیل ہوتی ہے۔ مثلاً: عموم کو اختیار کرنا یا نہ کرنا۔ صفت وشرط وغیرہ کے مفہوم مخالف کا اعتبار کرنا یا نہ کرنا۔ متفق جملوں کے بعد استثناء کا تعلق تمام سے ہونا۔ یا صرف آخری جملہ سے ہونا۔ استثناء کے بعد بقیہ کا خارج کے مقابلہ میں زیادہ ہونا ضروری ہے یا اس سے کم بھی جائز ہے۔ اسی طرح یہ اختلاف کہ اصل میں حکم کی علت کیا ہے۔ لہٰذا ہر فریق جس علت کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس کے مطابق اس حکم کو متعدی کرے گا...... یا فقہاء کا ایک شائبہ کے دوسرے پر غلبہ کے متعلق اختلاف مثلاً حوالہ کے متعلق اختلاف کہ اس میں۔ استیفاء کا شائبہ غالب ہے یا معاوضہ کا۔ اور لقطہ اکتساب (کمانا) ہے یا امانت اور ولایت۔

اسی طرح علماء کا سبب کے مانع کی تاثیر میں اختلاف، مثلاً صاحب نصاب پر قرض، بعضوں کے نزدیک یہ مانع ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے درحقیقت مالداری باقی نہیں رہتی۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ زکات واجب نہ ہو بعض اسے مانع نہیں سمجھتے۔ پس نصاب کی ملکیت کی وجہ سے زکات کو واجب قرار دیتے ہیں۔

یا جیسا کہ اجماع سکوتی کے متعلق اختلاف: بعض ساکت کی طرف کسی قول کو منسوب نہیں کرتے۔ تو یہ ان کے نزدیک اجماع نہ ہوگا۔ اور بعضوں کے نزدیک سکوت موافقت پر دلالت کرتا ہے۔ پس وہ اسے اجماع شمار کریں گے۔

اسی طرح آپ ﷺ سے (بظاہر) دو متعارض (متضاد) روایات مروی ہوں، اور تاریخ کا علم نہ ہو، اور ایک حکم نسبتاً سخت اور دوسرا آسان وخفیف ہو تو کس پر عمل کیا جائے؟ نیز یہ اختلاف کہ عموم کی تخصیص کن امور سے جائز ہے؟ اور عموم بلوی کے مسائل میں خبر واحد پر عمل کیا جائیگا یا نہیں۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ائمہ کرام کے اختلاف کے اسباب کے متعلق تھا، اصل مقصد بہر حال اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ تاکہ ایک مکلف اوامر ونواہی میں اس کی فرمانبرداری کرے اور اصحاب حقوق تک ان کے حقوق پہنچائے، واللہ اعلم (تلخیص از فرائد الفوائد ص ١٠٠۔ ص ١٠٣)

تقلید واتباع

دین کی اصل دعوت یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی اس لئے واجب ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے قول وفعل سے احکام الٰہی کی ترجمانی فرمائی ہے تمام معاملات میں خالصتاً اللہ اور رسول کی اطاعت کرنی ہے۔ اور جو شخص رسول ﷺ کے بجائے کسی اور کی اطاعت کرنے کا قائل ہو اور اس کو مستقل بالذات مطاع سمجھتا ہو، وہ یقیناً دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

قرآن وحدیث میں بعض احکام تو وہ ہے۔ جنہیں ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی سمجھ سکتا ہے۔ ان میں کوئی اجمال، ابہام یا تعارض نہیں۔ مثلاً قرآن کریم کا ارشاد "لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً" (تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے) یا آپ ﷺ کا فرمان: "لَا فَضْلَ

لِعَرَبِی عَلٰی عَجَمِی ''(کسی عربی کو عجمی میں فضیلت نہیں)

اس کے برعکس بہت سے احکام وہ ہیں جن میں کوئی ابہام یا اجمال ہے۔ بظاہر آپس میں تعارض ہے۔ مثلاً: قرآن کریم کا ارشاد ہے: "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ" (اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی وہ تین ''قروء'' گذرنے تک انتظار کریگی) اس میں مطلقہ کی عدت تین ''قروء'' بتلائی گئی ہے۔ اور یہ لفظ عربی زبان میں حیض اور طہر دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں فرمایا ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں'' (مشکوٰۃ کتاب الصوم) اور ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا: ''بحالتِ سفر جی چاہے روزہ رکھلو، جی چاہے افطار کرلو'' (مشکوٰۃ)

نماز کی رکعات میں شک کی صورت میں ایک حدیث میں استیناف (از سر نو لوٹانا) کا حکم دیا، اور دوسری حدیث میں تحری (اٹکل لگانا) کا اور دوسری ایک روایت میں شک کو نظر انداز کر کے یقین (یعنی اقل) کا حکم دیا (مشکوٰۃ) صحیحین کی ایک حدیث میں قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ یا پشت کرنے کی ممانعت ہے۔ اور صحیحین ہی میں آپ ﷺ کا قبلہ کی طرف پشت کر کے قضائے حاجت فرمانا موجود ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ قرآن وحدیث سے مسائل واحکام کے استنباط میں اس طرح الجھن اور دشواری پیش آتی ہے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ہم اپنی فہم وبصیرت پر اعتماد کر کے خود ہی کوئی فیصلہ کرلیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ جلیل القدر اسلاف اور ماہرین کی فہم وبصیرت پر اعتماد کر کے ان کی سمجھ کے مطابق عمل کریں۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ واضح رہے کہ پہلی صورت خامی خطرناک ہے اور دوسری حد درجہ محتاط وبہتر، کیونکہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ علم وفہم ذکاوت وحافظہ، امانت ودیانت، اور تقویٰ وپرہیز گاری ہر اعتبار سے ہم اس قدر تہی دست ہیں کہ قرون اولیٰ کے علماء سے ہماری کوئی نسبت نہیں پھر جس مبارک ماحول میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اسلاف علماء اس سے بھی قریب ہیں اور اس قرب کی بناء پر ان کے لئے قران وحدیث کی مراد کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ اس کے برخلاف ہم عہد رسالت سے اتنی دور جا پڑے ہیں کہ ہمارے لئے اس زمانے کے طرز معاشرت وگفتگو وغیرہ کا ہو بہو اور بعینہ تصور بڑا مشکل ہے۔ حالانکہ کسی شخص کی بات کو سمجھنے کے لئے اس کے پورے پس منظر کا سامنے ہونا بے حد ضروری ہے۔

ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے، اگر ہم اپنے فہم پر اعتماد کرنے کے بجائے مختلف التعبیر پیچیدہ معاملات میں اس مطلب کو درست قرار دیں، جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے، تو کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کسی امام ومجتہد کی تقلید واتباع صرف اس موقع پر کی جاتی ہے جہاں قرآن وسنت سے کسی حکم کے سمجھنے میں اجمال واتباع وابہام یا تعارض وغیرہ کی وجہ سے کوئی الجھن یا دشواری ہو، اور جس حکم میں ایسی کوئی پیچیدگی نہ ہو۔ وہاں کسی کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں۔

نیز یہ بھی واضح ہوا کہ کسی کی تقلید کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کے حکم کو شارع کی حیثیت سے مانا گیا ہے۔ بلکہ پیروی تو قرآن وحدیث کی ہے۔ لیکن صحیح مطلب اور مراد سمجھنے کے لئے ایک شارع کی حیثیت سے ان کی تعبیر وتشریح پر اعتماد کیا گیا ہے۔ بنظر انصاف غور فرمائیں تو اس میں کوئی ایسا پہلو نہیں۔ جسے گناہ یا شرک کہا جاسکے، تاہم کوئی شخص کسی امام کو شارع (شریعت پیش کرنے والا) کا درجہ دے کر اسے واجب الاتباع قرار دیتا ہو، تو بلاشبہ اسے مشرک کہا جاسکتا ہے۔ لیکن کسی کو شارع قانون قرار دے کر اپنے مقابلہ میں اس کی فہم وبصیرت پر اعتماد کرنا تو علمی افلاس کے اس دور میں اس قدر ناگزیر ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں۔

تقلید کی دو صورتیں: تقلید کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی خاص امام ومجتہد کو معین نہ کیا جائے بلکہ اگر اس مسئلہ میں ایک

عالم کا مسلک اختیار کیا ہے تو دوسرے میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کرلی جائے۔ اسے تقلید مطلق کہا جاتا ہے۔اور دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد کو متعین کرلیا جائے، اور تمام مسائل میں اسی کی رائے اختیار کی جائے۔اسے تقلید شخصی کہا جاتا ہے۔ان دونوں قسموں کی حقیقت یہی ہے۔کہ جو براہِ راست قران وحدیث سے احکام مستنبط کرنے (یعنی کسی حکم کلی سے جزئیات نکلنے) کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ جسے قرآن وحدیث کا ماہر سمجھتا ہے، اس کے فہم وبصیرت اور تفقہ پر اعتماد اور اس کی تشریحات کے مطابق عمل کرتا ہے۔اور یہ وہ چیز ہے، جس کا جواز بلکہ وجوب قران وحدیث کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے:

دلائل

۱) ارشاد باری ہے۔ '' فَاسْئَلُوْا اَهلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ''(اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو)

۲) نیز ارشاد ہے۔ '' وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُوْلِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ ''(اور اگر یہ لوگ اس امر کو رسول ﷺ کے اور اولی الامر کے حوالے کرے تو جو لوگ استنباط کے اہل ہیں وہ اسے جانتے)(اور بعض بتلا دیتے) اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ خود استنباط کی اہلیت نہیں رکھتے۔انھیں چاہیے کہ وہ ان لوگوں کی تقلید کریں جو اجتہاد واستنباط کے اہل ہیں۔

۳) ایک جگہ ارشاد ہے۔'' فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ''(ان کے ہر فرقہ میں ایک چھوٹی سی جماعت اس مقصد کے لئے کیوں نہ ہو کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور واپس آکر اپنی قوم کو بیدار کرے تاکہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے بچیں) اس آیت سے واضح ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوم میں واپس پہنچ کر انھیں دین وشریعت کے احکام بتلائیں اور ان کی قوم پر واجب ہے کہ وہ ان کی باتوں پر اعتماد کر کے اس پر عمل کریں، اس کا نام تقلید ہے۔

۴) ایک اور جگہ ارشاد ہے۔'' اِتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَىَّ ''(اس شخص کے راستے کی پیروی کرو جو میری طرف رجوع کیے ہوئے ہے) اس میں یہ نہیں فرمایا کہ ''میرے راستے کی پیروی کرو'' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستے کو ٹھیک اور بعینہٖ سمجھنا ہر شخص کے بس میں نہیں۔اس لئے یہ طریقہ بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کی طرف دل وجان سے راغب ہے اور اللہ کی پسند وناپسند کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے، اس کی اِتباع کرنے سے اللہ کی اطاعت ہوجائے گی۔

۵) ایک آیت میں فرمایا۔'' يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اَطِيْعُوا اللهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ''(اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ اور اولوالامر کی اطاعت کرو) اولوالامر میں ائمہ مجتہدین بھی داخل ہیں۔

۶) ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔مجھے معلوم نہیں ہیں کب تک تم لوگوں میں زندہ رہوں لہٰذا میرے بعد ان دو شخصو ں یعنی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنا، (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ شریف ۵۶۰) اس حدیث میں اقتدا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔جو انتظامی امور میں اطاعت کرنے کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوتا اس کا مفہوم بعینہٖ وہ ہے جو تقلید کے ضمن میں گذر چکا۔

۷) ایک حدیث میں علماء کو انبیاء کرام کا وارث قرار دیا ہے (احمد، ابو داود، ترمذی، مشکوٰۃ شریف ۳۴) پس جس طرح انبیاء کی اتباع فرض ولازم ہے، اسی طرح علماء کی اتباع بھی لازم ہے۔کیونکہ وہ علم وشریعت کے وارث اور حامل ہیں۔

عہد صحابہ:۔ عہد صحابہ میں تقلید مطلق کی مثالیں بکثرت موجود ہیں، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے جو فقیہ نہ تھے، وہ فقہاء صحابہ سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے۔ اور دلیل کی تحقیق ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بطور نمونہ ایک واقعہ پیش خدمت ہے:۔

عبید کہتے ہیں کہ میں نے دار نخلہ والوں کے ہاتھ کچھ گیہوں فروخت کئے اور قیمت کے لئے ایک میعاد مقرر کی، پھر میں نے کوفہ جانا چاہا تو لوگوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کو کچھ دام چھوڑ دوں اور وہ لوگ مجھے نقد قیمت ادا کر دیں۔ میں نے حضرت زید بن ثابت سے سوال کیا انھوں نے فرمایا کہ نہ میں اس فعل کی تم کو اجازت دیتا ہوں نہ کھانا کھلانے کی۔ (مؤطا امام مالک)۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ ''صحابہ کرام سے لے کر مذاہب اربعہ کے ظہور تک یہی دستور اور رواج رہا کہ کوئی عالم مجتہد مل جاتا تو اسی کی تقلید کر لیتے تھے، کسی بھی معتبر و مستند شخصیت نے اس پر نکیر نہیں کی، اگر یہ تقلید باطل ہوتی تو وہ حضرات اس پر ضرور نکیر فرماتے'' (عقدالجید ص ۲۹ مترجم)

بقول ابن خلدوں تمام صحابہ کرام مجتہد (اہل فتوی) نہ تھے، بلا جماع ان کے علمی معیار میں تفاوت تھا، بعض مفتی و مجتہد تھے، جو نسبتاً قلیل تھے، دیگر حضرات مستفتی و مقلد تھے۔ اور مفتی صحابی حکم کے ساتھ دلیل کی وضاحت و بیان کا التزام نہ رکھتا تھا۔ آپ ﷺ کسی ایک صحابی کو ایسے علاقہ میں روانہ کرتے جہاں کے لوگ صرف اسلامی ارکان سے واقف ہوتے۔ پھر وہ حضرات عبادات و معاملات اور حلال و حرام کے تمام مسائل میں اسی صحابی کی اتباع کرتے۔ اگر کسی مسئلہ کا جواب اسے قران وحدیث سے صراحتاً نہ ملتا تو وہ اپنی اجتہاد کے بل بوتے پر جواب دیتا۔ اور وہ حضرات اس کی تقلید کرتے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع تھا۔ وہ عوام کو فتوی دینے اور کسی کو درجہ اجتہاد کے تحصیل کا حکم نہ دیتے۔ یہ بات ان کے علماء و عوام کے تواتر سے یقیناً معلوم و واضح ہے۔ (المستصفی ۲/ ۳۸۵)

امام آمدی کا فرمان ھے: ''صحابہ و تابعین کے دور سے عوام مجتہدین سے مسئلہ پوچھ کر احکام شرعیہ میں ان کی متابعت کرتے رہے ہیں، اور وہ علماء دلیل کے تذکرہ کے بغیر ان کو مسئلہ بنا دیتے'' ان کو کبھی اس سے منع نہیں کیا تو گویا کہ مطلقاً ایک عامی کے لئے مجتہد کے اتباع کے جواز پر اجماع تھا۔ (الاحکام الآمدی ۳/ ۱۷۱)

اس سلسلہ میں ایک واضح عقلی دلیل یہ ہے کہ جو اجتہاد کا اہل نہ ہو، اسے کوئی فرعی مسئلہ درپیش ہو تو یا تو اس کے لئے اس میں کوئی شرعی حکم نہ ہو جو کہ اجماع کے خلاف ہے۔ اور اگر شرعی حکم کی پابندی کا تعلق ہے۔ تو ایک صورت یہ ہوگی کہ خود اس حکم کے متعلق دلائل میں غور و فکر کرتے اور دوسری صورت یہ ہوگی کہ کسی مجتہد کی تقلید کرے، پہلی صورت ممتنع ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اور دیگر تمام بندگانِ خدا کو دلائل کی تحقیق میں لگ کر تمام معاشی اور صنعت وحرفت کے مشاغل سے دستبردار ہو کر تمام دنیوی امور کو ویران و معطل کر دینا پڑے گا۔ اور تقلید کی نفی ہی اس کا سبب ہوگا۔ پس دوسری ہی صورت پر عمل کرنا لازم ہوگا یعنی کسی مجتہد کی تقلید و اتباع کی جائے۔

عھد صحابہ میں تقلید شخصی: اس کی بعض امثلہ درج ذیل ہیں۔

۱) اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس سے اس عورت کے بارے میں سوال کیا جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہوگئی ہو۔ (کہ وہ طواف وداع کے لئے پاک ہونے تک انتظار کرے یا اس سے ساقط ہو جائے گا اور بغیر طواف کئے واپس آنا جائز ہوگا) ابن عباس نے فرمایا وہ جاسکتی ہے! اہل مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کا قول اختیار نہ کریں گے اور حضرت زید کا قول نہ چھوڑیں گے (بخاری شریف ۔ کتاب الحج)

فتح الباری اس واقعہ میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ''آپ فتویٰ دے یا نہ دیں حضرت زید بن ثابت تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف کے) واپس نہیں جاسکتی۔

اور مسند ابوداود طیالسی نے یہ نقل فرمایا ہے: ''انصار نے کہا کہ ہم زید بن ثابت کے خلاف قول میں آپ کی اتباع نہ کریں گے۔
ابن عباس نے فرمایا کہ آپ لوگ ام سلیم سے دریافت کریں کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے'' (فتح الباری ۳/ ۴۶۳)

اس واقعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اہل مدینہ زید بن ثابت کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے۔ ان کے قول کے مخالف کسی قول پر عمل نہیں کرتے تھے۔ نیز حضرت ابن عباس نے بھی ان حضرات پر یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ تم تقلید کے لئے ایک شخص کو معین کر کے گناہ، یا شرک کے مرتکب ہو رہے ہو۔ بلکہ حضرت ام سلیم سے مسئلہ کی تحقیق کا حکم دیا۔ لہٰذا انہوں نے ام سلیم سے واقعہ کی تحقیق کر کے دوبارہ حضرت زید کی طرف مراجعت کی، جس کے نتیجے میں حضرت زید نے مکرر حدیث کی تحقیق فرما کر اپنے سابقہ فتوی سے رجوع فرمالیا۔ (فتح الباری ۳/ ۴۶۴)

۲) صحیح بخاری، مسلم، ابوداود اور ترمذی میں حضرت ہزیل بن شرحبیل سے ایک طویل واقعہ مروی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ سے کچھ لوگوں نے مسئلہ پوچھا، پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعود سے پوچھا اور ان کے سامنے حضرت ابوموسیٰ کی رائے بھی ذکر کر دی گئی۔ ابن مسعود کا فتویٰ ابوموسیٰ کے فتوی سے مختلف تھا۔ جب ابوموسیٰ کے سامنے یہ بات آئی تو فرمایا: جب تک یہ تبحر عالم (یعنی حضرت ابن مسعود) تم میں موجود ہیں، تم مجھ سے مت پوچھا کرو'' (مشکواۃ ص ۲۶۴)

حضرت ابوموسیٰ کے اس ارشاد سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انھوں نے ہر مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اور یہی تقلید شخصی ہے۔

۳) آپ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ کیا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آئے تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دونگا۔ فرمایا کہ اگر کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو تو، عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت (حدیث) سے فیصلہ کرونگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر اسمیں بھی نہ ملے تو؟ عرض کیا اس وقت اجتہاد و استنباط کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کرونگا اور کوئی کوتاہی نہ کرونگا، آپ ﷺ نے اس پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔ (ترمذی، ابو داود، مشکوۃ ۳۲۴)

یہ واقعہ تقلید و اجتہاد کے مسئلے میں ایک ایسی شمع ہدایت ہے کہ اس پر جتنا غور کیا جائے اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں خاص توجہ طلب بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے فقہاء صحابہ میں سے اہل یمن کے لئے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا، اور انھیں حاکم و قاضی معلم و مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کر دیا کہ وہ اُن کی اتباع کریں، انھیں صرف قرآن و حدیث ہی نہیں بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق فتوی صادر کرنے کی اجازت عطا فرمائی اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی اجازت دی بلکہ اس کو ان کے لئے لازم فرما دیا۔

غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تقلید کی دونوں قسموں پر صحابہ کرام کے عہد مبارک سے عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن و حدیث سے براہِ راست احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز تھیں۔

لیکن بعد کے ادوار کے اعتبار سے فقہاء کرام نے جو اپنے اپنے زمانے کے نبض شناس تھے یہ محسوس فرمایا کے دیانت اور احتیاط و تقوی کا معیار روز بروز گھٹتا جا رہا ہے ایسی صورت میں تقلید مطلق کا دروازہ چوپٹ کھول دیا گیا تو بہت سے جان بوجھ کر اور بہت سے غیر

شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مثلاً: سردی میں وضو کے بعد خون نکل آئے تو امام شافعی کا مسلک اختیار کرے گا یعنی وضو نہیں ٹوٹا، پھر کسی عورت کو چھولیا تو امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے وضو باقی سمجھے گا، غرض اسی طرح جس قول میں اسے فائدہ نظر آئے گا اختیار کرے گا، اور جس میں کوئی تکلیف کا پہلو ہوگا اُسے چھوڑ دیگا، اور ایسا بھی ہوگا کہ اِس کا نفس اس کو اسی قول کے صحت کی دلیلیں سجھائیگا جو اس کے لئے زیادہ آسان ہیں اور حاصل یہ نکلے گا کہ احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا ایک کھلونا بن کے رہ جائیں گے، اور یہ وہ چیز ہے جس کے حرام قطعی ہونے میں آج تک کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہوا۔ علامہ ابن تیمیہؒ اسی چیز کی خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ لوگ ایک وقت اُس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے اور دوسرے وقت میں اُس کی جو اِسے درست قرار دیتا ہے اور اس طرح کا عمل باتفاق اِمت ناجائز ہے"

آگے اس طرح کی چند مثالیں اور لکھ کر فرماتے ہیں...... یہ باجماع مسلمین ناجائز ہے...... کیوں کہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانے کا دروازہ کھولتا ہے اور اس بات کا سبب بنتا ہے کہ حرام وحلال کا مدار محض خواہشات پر ہو کر رہ جائے" (فتاوی ابن تیمیہ ۲/ ۲۴۰-۲۴۱)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں "یاد رکھئے کہ پہلی اور دوسری صدی میں تقلید شخصی کا (عام) رواج نہ تھا پھر دوسری صدی کے بعد تقلید شخصی پر عمل شروع ہوا اور اس وقت بہت کم ایسے لوگ ہونگے جو کسی متعین مجتہد کے مذہب پر عمل نہ کرتے ہوں اور اس زمانے میں یہی چیز واجب تھی"

اگر کسی کو شبہ ہو کہ ایک چیز صحابہ اور تابعین میں ضروری نہ تھی، تو بعد میں کیسے ضروری قرار پائی، تو اس اعتراض وشبہ کا تسلی بخش جواب دیتے ہوئے شاہ صاحب نے بڑی اچھی بات فرمائی: "اصل میں تو اس شخص کی تقلید کرنا ضروری ہے جو فرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جانتا ہو، اس پر اہل حق کا اجماع ہے، پھر واجب ادا کرنے کے کئی راستے ہوں، تب تو انسان اس میں سے کوئی بھی اختیار کرلے واجب ادا ہو جائے گا، ان راستوں میں سے کسی ایک کو متعین کرنا واجب ہوگا لیکن اگر واجب کو ادا کرنے کا صرف ایک راستہ ہو تو وہی راستہ واجب ہو جائے گا، مثال کے طور پر ہمارے اسلاف حدیثوں کو لکھتے نہیں تھے۔ مگر ہمارے زمانہ میں حدیث کا لکھنا واجب ہو گیا، کیونکہ روایت حدیث کی اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں رہی کہ انہی کتابوں کی طرف مراجعت کی جائے اسی طرح ہمارے اسلاف صرف ونحو اور لغت کے علم حاصل کرنے میں مشغول نہیں ہوتے تھے، اس لئے کہ ان کی عربی زبان مادری زبان تھی، لیکن ہمارے زمانے میں ان علوم کی تحصیل واجب ہوگئی ہے لہٰذا اگر کوئی جاہل انسان ہندوستان یا ماوراء النہر کے کسی ایسے علاقے میں ہو جہاں نہ تو کوئی شافعی ومالکی یا حنبلی عالم ہے اور نہ ان مذاہب کی کتابیں پائی جاتی ہیں (بلکہ صرف حنفی مسلک کا عالم یا کتابیں ہیں) تو اس کے لئے امام ابوحنیفہ کی تقلید ہی واجب ہو جائیگی اور ان کے مذاہب سے خروج اس کے لئے حرام ہوگا (کیونکہ دیگر مذاہب کے احکام معلوم کرنے کی اس کے پاس کوئی شکل نہیں ہے) اس کے برخلاف کوئی شخص حرمین میں ہو تو ان مذاہب میں سے کسی کی تقلید کرلینا کافی ہوگا کیونکہ وہاں ہر مذہب کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہے (الانصاف ص ۵۹)

حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ چار مذاہب جو مدون ہو کر تحریری شکل مین موجود ہیں، ان کی تقلید کے جائز ہونے پر تمام اُمت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں رہ سکتیں، بالخصوص اس زمانے میں جبکہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں، خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے، اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر گھمنڈ کرنے لگا ہے۔"

سات حروف: بخاری وغیرہ کی صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ ابتداً لوگوں کی سہولت کے خاطر قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا (سات حروف سے یہاں کیا مراد ہے اس کے متعلق شروحات میں بڑی تفصیل ہے) پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلام کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور مختلف لوگ مختلف طریقے سے پڑھنے لگے اور یہ ان میں آپس میں اختلاف کا سبب بننے لگا، تو بعض صحابہ کرام کے توجہ دلانے پر حضرت عثمانؓ نے صدیق اکبرؓ کے وقت یکجا مرتب مصحف شریف کی مختلف نقول بنا کرا ہم اسلامی شہروں میں روانہ فرمایا اور تمام کو اس کا پابند بنایا کہ اس مصحف کے مطابق تلاوت کرے، اور اس کے علاوہ کسی کے پاس کچھ ہو تو اسے جلا دے، حالانکہ تلاوت کے دیگر طریقے اور حروف بھی منزل من اللہ تھے، لیکن حالات و مصلحت کے تقاضے کے تحت حضرت عثمانؓ نے تمام کو ایک طریقہ کا پابند بنایا، اور آئندہ امت کا اس درجہ اتفاق و اجماع ہوا کہ آج دیگر حروف سے کوئی واقف ہی نہیں، بلکہ اس کی تشریح میں علماء کے متعدد اقوال ہیں۔

اس واقعہ سے حالات کے پیش نظر مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی کی اہمیت پر روشنی واضح طور پر پڑتی ہے اور وقت کی مصلحت کے مطابق نبض شناش علماء کے اس فیصلہ کی حقانیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔

مختلف قرأت: علامہ محمد سعید رمضان بوطی فرماتے ہیں: آپ ﷺ سے دس قراءات متواتر ہیں، جن کے مطابق تلاوت کی جاتی ہے، ان میں سے ہر ایک قرأت کی خدمت کیلئے ایک امام نے اپنے آپ کو فارغ کر لیا، اور مختلف اعتبار سے اس کی خدمت انجام دی، اور بالاتفاق ایک مسلمان ان میں سے کسی بھی ایک قرأت کے مطابق تلاوت کر سکتا ہے جیسا کہ اجتہاد سے عاجز ایک مسلمان ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کر سکتا ہے، کیا ایک مسلمان پر یہ لازم ہے کہ روز الگ الگ قرأت کے مطابق تلاوت کرے، اور کیا ایک ہی قرأت کی پابندی اس پر حرام ہے؟ کیا قریب و بعید زمانہ میں کسی بھی مسلمان نے یہ بات کہی ہے؟ فروعی اور جزئی مسائل میں کسی ایک امام کی اتباع اور قرأت میں کسی ایک امام کی اتباع دونوں میں کیا فرق ہے کہ اول ناجائز ہو جائے اور دوم جائز قرار پائے؟

صحابہ و تابعین کا دور اور بعد میں ائمہ اربعہ کا دور گذر گیا، لیکن ہم نے کسی بھی دور کے کسی امام کے متعلق یہ نہیں سنا کہ اس نے کسی مقلد کو اس بات سے منع کیا ہو کہ وہ ایک عالم کی اتباع و تقلید کرے، اور وقتاً فوقتاً اپنا مسئلہ بدلتا رہے۔ (اللامذھبیہ ملخصاً ص ۷۸)

تقلید پر کچھ شبہات اور ان کے جواب: تقلید پر وارد عام طور پر شبہات و جواب درج ذیل ہیں:

(۱) قرآن کریم ارشاد ہے: "وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ" ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے اللہ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے، جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بھلا ان کے باپ دادے عقل و ہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی"

جواب: اللہ تعالیٰ نے باپ دادوں کی تقلید پر مذمت کے دو سبب فرما دیئے ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام کو برملا رد کرتے انھیں نہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں، اور صاف کہتے ہیں کہ ہم اس کے بجائے اپنے باپ دادوں کی بات مانیں گے، دوسرے یہ کہ اُن کے بزرگ عقل و ہدایت سے کورے تھے،

ہم جس تقلید پر گفتگو کر رہے ہیں اس میں یہ دونوں سبب مفقود ہیں، کوئی مقلد اللہ و رسول کے احکام کو رد کر کے کسی بزرگ کی بات نہیں مانتا، بلکہ وہ اپنے بزرگ کو شارح قرآن و حدیث سمجھتا ہے، نیز دوسرے سبب کا تو کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے کوئی اہل حق انکار نہیں کر سکتا کہ جن ائمہ مجتہدین کی تقلید کی جاتی ہے، ان سے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو، مگر ہر اعتبار سے ان کی جلالتِ قدر ہر

ایک کومسلم ہے، اس لئے اس تقلید کو کافروں کی تقلید پر منطبق کرنا بڑے ظلم کی بات ہے،

(۲)ارشادِ ربانی ہے: "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ترجمہ: "انھوں نے اپنے علماء اور تارک الدنیا زاہدوں کو اللہ کے بجائے اپنا پرودگار بنا رکھا ہے"

لیکن گذشتہ تفاصیل سے یہ معلوم ہو چکا کہ کسی مجتہد کی تقلید اسے شارع یا قانون ساز سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ اسے شارحِ قانون قرار دے کر کی جاتی ہے، اسے اپنے ذات کے اعتبار سے واجب الاتباع قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ خود اللہ و رسول کے کلام اور ان کے مراد و احکام کے سمجھنے کے لئے ان کی تشریحات پر اعتماد کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کافروں کی تقلید سے کوئی تعلق و مناسبت ہی نہیں،

بعض حضرات کے ذہن میں یہ خلش رہتی ہے کہ ائمہ مجتہدین نے خود فرمایا ہے کہ ہمارے قول پر اسوقت تک عمل نہ کرو جب تک اس کی دلیل معلوم نہ ہو جائے، لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ اس ارشاد کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو اجتہاد کی صلاحیت سے محروم ہیں، ورنہ ان کا یہ ارشاد خود ان کے دوسرے اقوال سے معارض ہوگا کیونکہ ان کی سوانح حیات اس قسم کے واقعات سے پُر ہیں کہ لوگ ان سے مسئلہ پوچھتے تھے اور وہ دلیل بیان کئے بغیر جواب دیتے تھے، اگر یہ چیز ان کے نزدیک جائز نہ ہوتی، تو وہ خود اس کا سبب کیوں بنتے۔

(۴)بعض حضرات کا یہ اعتراض ہے کہ آپ ﷺ صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں تقلید کا رواج نہ تھا اسلئے یہ بدعت ہے، لیکن گذشتہ صفحات میں یہ ثابت ہو چکا کہ تقلید کی دونوں قسمیں عہدِ صحابہ میں پائی جاتی تھیں اور قرآن و حدیث دونوں سے اس کا جواز بلکہ وجوب معلوم ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ تقلید شخصی آئندہ ضروری کیسے ہوگی؟ تو اس کا جواب بھی گذر چکا۔

(۵)بعض کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث بہت آسان ہے، لہٰذا ان سے احکام کو سمجھنے میں کسی کے واسطے کی ضرورت نہیں، قرآن کریم کا خود ارشاد ہے "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ" (سورہ قمر) (ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان بنایا ہے) لیکن خود اس آیت کے الفاظ پر غور فرمایئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم کی وہ آیات آسان ہیں، جو وعظ و تذکیر اور نصیحت و عبرت کے مضامین پر مشتمل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "الذکر" کا لفظ استعمال فرمایا، یعنی قرآن نصیحت کے لئے آسان کیا گیا ہے۔

رہیں وہ آیات جو احکام پر مشتمل ہیں، سو ان کا دقیق ہونا بالکل ظاہر ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہے، اور ایک باطنی اور ہر حد کیلئے اطلاع کا طریقہ جداگانہ ہے" (یعنی ظاہری کیلئے عربی زبان اور باطنی کیلئے قوت فہم)

تقلید میں جمود: جس طرح تقلید کا انکار درست نہیں، اسی طرح اسے حدِ اعتدال سے بڑھا دینا بھی غلط اور خطرناک ہے مثلاً تقلید میں کوئی اس حد تک پہنچ جائے کہ فقہاء مجتہدین کو خدا کی طرح واجب الاطاعت والاتباع سمجھنے لگے تو وہ بھی انتہائی قابلِ مذمت ہے اور خطرہ ہے کہ یہ چیز شرک سے مل نہ جائے۔

یا کسی متبحر عالم کو جو قرآن و حدیث پر گہری نظر رکھتا ہو، اور اس سے متعلق تمام علوم کا ماہر ہو، اپنے امام مجتہد کا قول واضح طور سے کسی صحیح حدیث کے خلاف نظر آئے، وہ صحیح حدیث واضح بھی ہو، اس کے معارض کوئی حدیث نہ ہو، تو اسے چاہیئے کہ امام مجتہد کا قول ترک کر کے صحیح حدیث پر عمل کرے، اور مجتہد کی شان میں گستاخی نہ کرے، اس کے بجائے کوئی شخص اگر مجتہد کے قول کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو، تو یہ تقلید میں غلو ہے اور اس کا یہ عمل ہر لحاظ سے غلط ہے۔ چنانچہ تمام فقہی مذاہب میں کئی مسائل ایسے ہیں جن پر اسی مذہب کے متبحر علماء نے ان کی نظر میں ان کے مسائل کے بظاہر حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے فتویٰ نہیں دیا۔

لیکن حدیث کے مخالف ہونے کا فیصلہ کرنے کیلئے تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے ایک تو یہ کہ فیصلہ کرنے والا متبحر عالم ہو، اور اسے قرآن وحدیث کے علوم سے پوری واقفیت ہو۔ دوسرے یہ کہ جو حدیث اس کے مخالف پڑھ رہی ہے وہ واضح المعنی ہو، تیسرے یہ کہ اس حدیث کے معارض کوئی مقبول حدیث نہ ہو اگر ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو تو نہ حدیث کی مخالفت کا فیصلہ درست ہوگا، اور نہ اس کی بنا پر امام کے قول کو چھوڑنا۔

امام نوویؒ المجموع میں فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے ان کے فتویٰ کے خلاف صحیح حدیث ملنے پر حدیث پر عمل کی کو وصیت فرمائی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی بھی شخص کسی صحیح حدیث کو دیکھ کر اسے امام شافعیؒ کا مذہب قرار دے اور اس کے ظاہر پر عمل کرے، بلکہ اس کا حق اسی کو ہے جو (علمی صلاحیت میں کمال کی وجہ سے) اجتہاد فی المذہب کے رتبہ تک یا اس کے قریب پہنچ چکا ہو، نیز یہ بھی شرط ہے کہ اس کا غالب گمان یہ ہو کہ امام شافعیؒ کو اس حدیث کا یا اس کی صحت کا علم نہ تھا، اور یہ بات امام شافعیؒ کی تمام کتابیں اور ان کے شاگردوں کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہی حاصل ہوگی اور یہ شرط کافی مشکل ہے، اور کم ہی کوئی ان شرائط سے متصف ہوگا، علماء نے یہ شرط اس لئے لگائی ہے کہ امام شافعیؒ نے کافی روایات سے واقفیت کے باوجود ان کے ظاہر پر عمل کو ترک کیا، کیونکہ ان کی تحقیق میں اس میں کوئی طعن، نسخ، تخصیص یا تاویل وغیرہ کا ثبوت تھا (جس کی وجہ سے اس ظاہر پر عمل درست نہ تھا) (المجموع للنووی ۱/۶۴)

بہر حال تقلید کے متعلق افراط وتفریط اور غلو وجمود کے بجائے اعتدال کا راستہ اپنانا ہی برحق اور درست ہے۔

(تقلید کے موضوع پر مزید تفصیل کے لئے ان مآخذ کے طرف رجوع کریں، تقلید کیا ھے (مفتی تقی عثمانی صاحب) الاعتقاد فی التقلید والاجتهاد ''للتھانویؒ'' حجة الله البالغه، وعقدالجيد والانصاف للشاہ ولی اللہ دہلوی'' تقلید شرعی کی ضرورت،، مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب، اللامذهبية دكتور محمد سعيد بوطی اجتہاد اور تقلید قاری طیب صاحب)

(اس مضمون سے مقصود نزاع وجدال ہرگز نہیں، بلکہ دور حاضر میں ایسے موضاعات پر نزاع دین کے بلند بالا مقاصد کے لئے انتہائی مضر ہے اسلام کو مختلف خطرات اور چیلنج اپنے نرغہ میں لئے ہوئے ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فروعی مسائل کو نزع واختلاف کا موضوع بنانے کے بجائے تمام امتِ مسلمہ اتحاد و یکجہتی کے ساتھ ان درپیش خطرات اور مخالف قوتوں سے ٹکرا کر انھیں پاش پاش کرے۔)

بعض فوائد: (۱) جو مکلف مجتہد مطلق نہ ہو، اس پر اجتہادی فروعات میں ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے کسی امام کی تقلید لازم ہے۔ جو خود مجتہد ہو، اسے جن مسائل میں اجتہاد کی قدرت ہے ان میں کسی امام کی تقلید حرام ہے، لیکن تمام شرائط کے ساتھ مجتہد مستقل کا وجود کافی صدیوں سے (تقریباً ۷۰۰ سال سے،) مفقود ہے، فقہی مسالک چار ہی میں محدود نہیں، کیونکہ اس امت کے مجتہدین کی کثرت کی انتہا نہیں، قدیم زمانے میں گیارہ مسلک زیادہ مشہور اور ان کی کتابیں مدون تھیں، نیز ان کے مقلدین پائے جاتے تھے، حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مسالک، نیز سفیان ثوری، ابن عُیَینَہ، لیث، اسحاق بن راھویہ، ابن جریر، داؤد اور اوزاعی کے مسالک ان حضرات کے متبعین ان کے اقوال کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے، پانچویں صدی ہجری کے بعد ابتدائی مشہور چار مسلک کے علاوہ بقیہ مسلک ختم ہوگئے۔ اور علماء نے ان چار مسالک کے علاوہ دیگر کی تقلید سے منع فرمایا، کیونکہ معتبر سند کے نہ ہونے کیوجہ سے ان مسائل کی متعلقہ ائمہ کی طرف نسبت پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس کے برعکس رائج چاروں مسلک کے علماء نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ائمہ کے اقوال کو ضبط کر کے اس کی تشریح وتفصیل فرمائی، اور صحیح وضعیف کی وضاحت کی، لہٰذا یہ مسالک تغیر وتحریف سے محفوظ ہوگئے۔

جو شخص کسی ایک مسلک کا پیرو ہو، بعض مسائل میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی یا دیگر کسی امام کی تقلید کرسکتا ہے، جس کا مذہب ومسلک

اس مسئلہ میں محفوظ ہو، اور وہ مسئلہ مدون ہو، حتی کہ اس کے تمام شرائط وغیرہ بھی معروف ہوں، پس کئی علماء نے صحابہ کی تقلید سے منع کیا ہے، وہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ اس کی صحیح نسبت کا علم نہ ہو یا اُن کے نزدیک اس کے دیگر شرائط کا علم نہ ہو،

کسی قول کو ترجیح دینے یا اختیار کرنے کی جن میں صلاحیت ہے مثلاً امام نووی، ابن منذر اور سیوطی ان کے اختیارات وترجیح پر عمل کرنا جائز ہے۔

ایک مسلک سے کسی دوسرے مدون مسلک کی طرف منتقل ہونا جائز ہے، خواہ مستقل منتقل ہو، یا بعض حادثہ ومسائل میں، جبکہ اس کیوجہ سے تلفیق لازم نہ آئے۔ بشرطیکہ رخصتوں کو تلاش نہ کرے یعنی ہر مسلک میں سے آسان آسان مسئلوں پر عمل کرے ورنہ فاسق قرار پائے گا، بعض علماء نے فرمایا کہ جو وساوس میں مبتلا ہوا سے آسان مسائل ورخصتوں پر عمل کی گنجائش ہوگی تا کہ وساوس بڑھ کر شریعت کے دائرہ سے نہ نکل جائے اور جو اس کے برعکس ہو وہ مشکل (محتاط) صورت کو اختیار کرے۔

کسی حاجت یا عام مصلحت کی وجہ سے مرجوح قول پر فیصلہ وفتوی دینا جائز ہے، جو عام شخص کسی مسلک کا پیرو ہو، اسے اس مسلک کے راجح اقوال کے متعلق علماء سے پوچھ کر عمل کرنا چاہیئے، ایسے شخص کو بلا حاجت ومصلحت مرجوح قول پر فتوی دینا جائز نہیں ہے اپنے مسلک کے دو معتبر وقابل عالم ہوں۔ تو کسی سے بھی پوچھ کر عمل کرے، اگر دونوں کا جواب الگ الگ ہو تو جس پر چاہے عمل کرے، جبکہ اس کی نظر میں دونوں مساوی درجہ کے ہوں جو عام شخص کسی مسلک کا پابند نہ ہو، مثلاً کوئی نومسلم جو ابھی ان تفاصیل سے ناواقف ہے، اس پر لازم ہے کہ جو بھی معتبر عالم میسر ہو، اس کے فتوی پر عمل کرے، اگر دو مختلف مسلک کے عالم موجود ہوں تو جس سے چاہے رجوع کرے۔

ائمہ کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ اختلافی مسائل میں جو امام کسی مسئلہ کی حلت کا قائل ہو، اس کی تقلید کے بغیر اسے اختیار کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ابن حجر وغیرہ نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے خواہ یہ اختلاف ایک مسلک میں ہو یا مختلف مسالک میں، نیز مسئلہ عبادات کا ہو یا دوسرے کسی اور باب کا تاہم وہ شخص اس وقت گنہگار ہوگا، جبکہ باوجود امکان کے اس پر لازم مسائل کے سیکھنے میں کوتاہی برتے، یا مسئلہ مشہور ومعروف ہو کہ جس سے ناواقفیت میں کوئی بھی معذور شمار نہ ہو۔

(۲) کتب شافعیہ میں ترجیح وترتیب: علامہ ابن حجر مکی وغیرہ متاخرین شافعی علماء نے فرمایا کہ محققین کا اس پر اجماع کہ شافعی مسلک کے شیخین یعنی امام رافعی اور امام نووی سے قبل تصنیف شدہ کتابوں کے مسائل کا اسی وقت اعتبار ہوگا، جبکہ مکمل بحث وتحقیق کے بعد شافعی مسلک میں اس کے راجح ہونے کا ظن غالب ہو جائے، اور یہ حکم ان مسائل کا ہے، جن سے شیخین یا کسی ایک نے تعرض نہ کیا ہو، اگر کسی مسئلہ پر شیخین کا اتفاق ہو، تو تمام محققین کے نزدیک وہی معتمد ہوگا، اگر ان دونوں کا اختلاف ہو تو امام نووی کا قول معتمد ہوگا، امام نووی سے کچھ منقول نہ ہو تو امام رافعی کا قول معتمد ہوگا۔

اگر امام نووی کی کتابوں میں اختلاف ہو، معتمد قول کے متعلق غالباً یہ ترتیب ہوگی پہلے تحقیق پھر تنقیح پھر روضہ اور منہاج اور ان کے فتاوی پھر شرح مسلم پھر تصحیح التنبیہ اور نکت التنبیہ۔

اگر متاخرین کا اتفاق ہو کہ شیخین کا قول سہو (بھول) پر مبنی ہے تو اس صورت میں ان کا قول معتمد نہ ہوگا، لیکن ایسا شاذ ونادر ہی ہوا ہے۔

صاحب اعانہ نے فرمایا کہ امام نوویؒ کے کتابوں میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو، تو متبحر شخص کسی کتاب کا پابند نہیں، (بلکہ تبحر علمی کی بنیاد پر ترجیح دیگا)

دیگر حضرات ان میں سے بعد والی کتاب پر اعتماد کریں۔ جس میں اصحاب شافعی کے کلام کا تتبع زیادہ ہو جیسے مجموع پھر تحقیق، پھر تنقیح پھر روضہ پھر منہاج۔ ان کتابوں میں سے جس (مسئلہ) پر اکثر کا اتفاق ہو وہ اقل کے مقابلہ میں مقدم ہوگا۔ اور جو اسی باب میں بیان ہوا ہو دوسرے باب میں بیان شدہ مسئلہ کے مقابلہ میں غالباً مقدم ہوگا جیسا کہ ابن حجر و ابن علان وغیرہ نے فرمایا۔

اگر شیخین سے ترجیح منقول نہ ہو اور مفتی ترجیح کا اہل نہ ہو، جیسا کہ دور حاضر کا حال ہے، تو شیخ محمد الرملی کی نہایۃ المحتاج اور علامہ ابن حجر مکی کی تحفۃ المحتاج پر اعتماد کیا جائے گا۔ پھر ابن حجر کی فتح الجواد پھر امداد پھر شرح العباب اور ان کے فتاوے کا اعتبار ہوگا تاہم شرح بافضل ان دونوں پر مقدم ہوگی۔ بعضوں نے فرمایا کہ نہایہ اور تحفہ کے خلاف فتوی دینا جائز نہیں ہے، جن مسائل سے ان دونوں نے تعرض نہ فرمایا ہو، ان میں ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ پہلے شیخ الاسلام زکریا انصاری کے کلام پر فتوی دیا جائے، پہلے ان کے نہج کی شرح صغیر اور پھر فتح الوھاب لیکن اس میں بعض مسائل ضعیف سے ہیں (ان میں سے کوئی نہ ہو تو) پھر 'خطیب' پھر 'حاشیہ الزیادی' پھر 'ابن قاسم' پھر 'عمیرہ' پھر 'شبر املسی' پھر 'حلبی' پھر 'شوبری' پھر 'عنانی' کا کلام معتمد ہوگا، جبکہ یہ حضرات اصول مذھب کی مخالفت نہ کریں۔

اگر تحفہ اور نہایہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو، اور مفتی میں ترجیح کی اہلیت نہ ہو، تو اسے اختیار ہے کہ جس پر چاہے فتوی دے، ان دونوں کتابوں کے مخالف ان کی دیگر کتابیں یا دیگر علماء کے کتابوں کے موافق فتوی دینا جائز نہیں ہے۔

اگر ابن حجر اور رملی کا اختلاف ہو، تو بعض علماء کا خیال کہ مسئلہ پوچھنے والا دین میں پختہ، محتاط اور عزائم پر عمل پیرا ہو تو اُسے سخت حکم بتائے اور وہ دین میں کمزور ہو اور صرف سخت حکم بتانے کی صورت میں اُسے ٹالنے والا ہو، تو اُسے آسان وخفیف حکم بتائے، البتہ بدنیتی یا شرعی احکام میں لا پرواہی کے طور پر نہیں، بلکہ اس پر شفقت اور ترس کھاتے ہوئے، تاکہ وہ بالکل دین کی مخالفت کر کے تباہ وبرباد نہ ہو جائے۔

تنبیہ: مذکورہ بالا کتابوں میں، بلکہ خود تحفہ ونہایہ میں بھی بعض غلط یا کافی ضعیف مسائل آگئے ہیں، پس ان پر مطلقاً فتوی دینا جائز نہیں ہے۔

تلفیق: مسئلہ گذر چکا کہ بعض مسائل میں دوسرے مسلک کی اتباع جائز ہے، بشرطیکہ تلفیق نہ ہو، تلفیق کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی باب کے دو مسئلوں میں الگ الگ امام کی پیروی کرے، اور اس سے مرکب صورت جو سامنے آئے، اِسکا کوئی دونوں میں سے کوئی بھی قائل نہ ہو، پس کسی مسلک میں ایک امام کی پیروی کرے، تو ابن حجر مکی فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ سے متعلق تمام مسائل میں اسی امام کی تقلید لازم ہے، لہذا جو شخص حنفی مسلک کی تقلید کرتے ہوئے عین کعبہ سے ہٹ کر صرف جہت کعبہ کی طرف نماز پڑھے تو اس پر لازم ہے کہ وضو میں چوتھائی سر کا مسح کرے، اور وضو کے بعد اس کے بدن سے خون نہ بہے، (کیونکہ یہ دونوں حنفی مسلک میں ضروری ہیں) ورنہ اس کی نماز دونوں مسلک کے مطابق باطل قرار پائے گی، اس اصول کی ابن دقیق العید، سبکی، عراقی اور قاضی حسین وغیرہ کئی محققین نے صراحت فرمائی ہے۔

امام ابن زیاد اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں کہ علماء کرام کی مثالوں سے اس مسئلہ میں جو بات ہمارے سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ دو مسلک کی ترکیب اسی وقت مانع ہوگی جبکہ کے ایک ہی قضیہ میں ہو، مثلاً: وضو کے بعد امام ابوحنیفہ کی تقلید میں بیوی کو چھوئے اور امام شافعی کی تقلید میں پچھنے لگوائے، پھر نماز پڑھے تو یہ نماز باطل ہے، کیونکہ دونوں امام کے نزدیک یہ وضو باطل ہے، امام ابوحنیفہ کی نزدیک پچھنے کی وجہ سے اور امام شافعی کے نزدیک بیوی کو چھونے کی وجہ سے۔

اس کے برعکس دو مختلف قضیوں میں ایسی ترکیب پیش آئے تو وہ تقلید سے مانع نہ ہوگی، مثلاً کوئی شافعی وضو میں چوتھائی سر سے کم کا مسح کرے پھر حنفی مسلک کی اتباع میں قبلہ کی جہت پر نماز پڑھے تو یہ نماز بظاہر صحیح ہوگی، کیونکہ وضو کے بطلان پر دونوں متفق نہیں ہیں، اور نماز دوسرا قضیہ ہے یہی بات امام بلقینی کے فتاوی میں موجود ہے (خلاصہ یہ ہے کہ گو وضو نماز کیلئے شرط ہے لیکن دونوں جدا جدا قضیہ ہیں لہٰذا وضو ایک مسلک کے مطابق اور نماز دوسرے مسلک کے مطابق ہو تو صحیح ہے)

(۴) **احتیاط:** حتی الامکان علماء کے نزدیک اتفاقی شکل پر عمل کرنا اور ان کے اختلاف سے بچ نکلنے کی کوشش کرنا مطلوب وہ بہتر ہے، تاہم ہمیشہ یہ ممکن نہ ہوگا، نیز بعض اوقات دوسرے کے دلیل کی واضح کمزوری کی وجہ سے یا کسی فضیلت کے چھوٹ جانے کی وجہ سے اختلاف کی رعایت نہ کی جائیگی۔

مثلاً: (۱) کسی چیز کے جائز یا حرام ہونے میں اختلاف ہو تو اسے ترک کرنا افضل ہے۔

(۲) کسی عمل کے واجب یا مستحب ہونے میں اختلاف ہو تو اس کو کرنا افضل ہے۔

(۳) کسی عمل کے ترک کرنے یا کرنے کی مشروعیت میں اختلاف ہو تو اسے کرنا افضل ہے۔ جیسے سورہ فاتحہ میں بسم اللہ کا پڑھنا، کیونکہ یہ امام شافعی کے نزدیک واجب اور امام مالک کے نزدیک (فرض نماز میں) مکروہ ہے، لیکن کئی مالکی حضرات نے احتیاطاً بسم اللہ کے پڑھنے کو اختیار فرمایا ہے۔

(۴) صحیح حدیث سے کوئی حکم ثابت ہو اور مخالف قیاس خفی کی وجہ سے اس سے اختلاف کرے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائیگا جیسے گھوڑے کے گوشت کی حلت، ماں کے ذبح کی وجہ سے جنین کی حلت اور گوہ کی حلت۔

(۵) تقلید کا مطلب ہے دوسرے کے قول کو اس کی تفصیلی دلیل کی معرفت کے بغیر قبول کرنا، پس اپنے عمل کی حد تک ضعیف قول کی تقلید جائز ہے مثلاً اصح، معتمد، اوجہ اور متجہ کے بالمقابل قول، نہ کہ صحیح کے بالمقابل، کیونکہ وہ غالباً فاسد ہوتا ہے۔

ایک غیر مجتہد عدم تقلید کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے، تاہم اس کا عمل کسی معتبر مسلک کے مطابق ہو، تو کئی علماء کے نزدیک اس کی عبادات اور معاملات مطلقاً صحیح ہوں گے اور بعضوں نے مطلقاً عدم صحت کو اختیار کیا، اور بعضوں کا خیال ہے کہ معاملات تو صحیح ہوں گے، نہ کہ عبادات، کیونکہ اس میں بالجزم (حتمی) نیت نہ ہوگی۔

ائمہ کے کلام وعمل سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عام شخص شرعی حکم سمجھ کر کسی مسئلہ پر عمل کرے اور یہ کسی معتبر مسلک کے موافق ہو، گرچہ وہ متعین طور پر اس قائل سے واقف نہ ہو، تب بھی وہ عمل صحیح ہوگا، جبکہ بوقت عمل کسی دوسرے کا صحیح مقلد نہ ہو۔

امام سیوطیؒ نے کئی علماء کرام کے متعلق نقل فرمایا کہ وہ عوام جو کسی مسلک کے پابند نہ ہوں، اور اس کے نصوص وقواعد سے واقف نہ ہوں، چاروں مسلک کے مطابق ان کو فتویٰ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کا عمل کسی عالم کے فتویٰ کے مطابق ہو، تو کافی ہے تاہم علامہ کروی فرماتے ہیں کہ اپنے مسلک کے ضعیف قول یا وجہ کی تقلید اس کی شرط کے ساتھ دوسرے مسلک کی تقلید سے بہتر ہے، کیونکہ اس کے لئے مطلوبہ تمام شرائط کا وجود کافی دشوار ہے۔ (قلائد ۲/۷۴۴۔ ترشیح المستفدین ۳-۷، فتح المعین مع الاعانہ ۴/۲۱۷-۲۲۰، ۱/۱۹

بعض فقہی مبادیات

فقہ کی تعریف: لغت میں فقہ فہم اور سمجھ کو کہتے ہیں، اور اصطلاح میں تفصیلی دلائل کی روشنی میں عملی احکامِ شرعیہ کے متعلق

حاصل کردہ علم کو فقہ کہا جاتا ہے۔

استمداد : قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس

فائدہ : اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالانا اور ممنوعات سے بچنا

موضوع : طاری ہونے والے احکام کے اعتبار سے مکلفین کے افعال

حکم : وجوب عینی یا کفائی

مسائل : قضایا، مثلاً نیت واجب ہے، وضو نماز کی صحت کے لئے شرط ہے، دخولِ وقت، نماز کا سبب ہے۔

واضع : ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ۔ (اعانة ۱/۱۴)

واللہ اعلم باالصواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی عقائد

۱۔ آیات قرآنی

۱۔"شَهِدَاللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّاهُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم" (آل عمران آیت نمبر ۱۸) گواہی دی ہے اللہ تعالی نے اس کی کہ بجز اس ذات (پاک) کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور (دوسرے) اہل علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان سے ہیں کہ (ہر چیز کا) اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

۲۔"فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ" (سورہ محمد آیت ۱۹) ---تو آپ اس کا (بہ اکمل وجوہ) یقین کیجئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں۔

۳۔"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "(الانبیاء ۲۵) (اور یہ توحید کوئی نئی بات نہیں جس سے توحش ہو بلکہ شرع قدیم ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں پس میری (ہی) عبادت کیا کرو۔

معلوم ہوا کہ توحید تمام انبیاء ورسل کا دین اور تمام اولین وآخرین اہل صدق ویقین کی راہ ہے

۴۔"لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّااللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ "(الانبیاء ۲۲) زمین (میں) اور آسمان میں اگر اللہ تعالی کے سوا کوئی اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں (کبھی کے درہم برہم ہوجاتے کیونکہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہوتا لہٰذا اس کے لئے فساد لازم ہے لیکن فساد واقع نہیں ہے اس لئے تعدد الٰہ بھی منفی ہے) سو (ان تقریرات سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالی جو کہ مالک ہے عرش کا ان امور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کررہے ہیں۔

۵۔"هُوَاللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّار" (زمر۔۴) وہ ایسا اللہ ہے جو واحد ہے زبردست ہے۔

۶۔اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الاِسْلَام (آل عمران۔۱۹) بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالی کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

۷۔"اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهٖ" (البقرۃ ۲۸۵) اعتقاد رکھتے ہیں رسول ﷺ اس چیز (کے حق ہونے) کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مومنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جاوے گا) سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مومنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات وصفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ۔ کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ یہ کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں کسی کو نہ سمجھیں)

حدیث جبریل علیہ السلام

جبریل امین کا سوال: ایمان کیا ہے آپ ﷺ کا جواب: ''ایمان (شرعی) یہ ہے کہ تم اللہ تعالے پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی ملاقات پر (یعنی اس دارِ فانی سے کوچ کر جانا یا دیدارِ الٰہی) اور اس کے رسولوں (پیغمبروں) پر (بعض روایات میں ''نبیوں پر اور کتابوں پر ایمان'' کے الفاظ ہیں) اور قیامت پر ایمان لاؤ (بخاری مسلم ابوداود وغیرہ) بعض روایات میں مزید یہ بھی ہے ''اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لانا''

جبریل امین کا سوال: اسلام کیا ہے؟

آپ ﷺ کا جواب: ''اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو (یعنی کلمہ شہادت کا اقرار) اور (پنجوقتہ فرض) نمازوں کی پابندی کرو اور فرض زکات ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو'' بعض روایات میں ہے بصورتِ استطاعت بیت اللہ کا حج کرو۔'' (بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ)

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان:

(۱) اس کی گواہی کہ اللہ تعالے کے سوا کوئی معبود برحق (عبادت کے لائق) نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔
(۲) (پنج وقتہ فرض) نمازوں کی اقامت (یعنی صحیح ادائیگی اور پابندی) (۳) زکوۃ کی ادائیگی (۴) رمضان کے روزے رکھنا (۵) حج کرنا۔ (بخاری۔ مسلم)

''**اسلام**'' اس لفظ کے لغوی معنی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور عالم ابن الانباری (متوفی ۳۲۸ھ) فرماتے ہیں کہ مسلم سے مراد وہ شخص ہے جو کلی طور پر اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت و عبادت کے لئے وقف کردے۔ عربی میں مسلم کے معنی ہیں کسی چیز کا کلیۃً (مکمل) کسی کا ہو جانا اسی طرح اسلام کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا دین اور عقائد مکمل طور پر خدائے واحد کی ملکیت بن جائیں۔ آپ ﷺ نے اسلام کی تشریح میں فرمایا 'مسلم یعنی اسلام کی راہ پر چلنے والا وہ ہے جو اللہ پر دل و جان سے یقین رکھے اور اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں'' (مسند احمد)

'**ایمان**' آپ ﷺ جو کچھ اللہ کی طرف سے لے آئے ہیں اس کی تصدیق کرنا (فتح الباری)

ایمان جب معتبر اور صحیح ہوتا ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کو سب باتوں میں سچا سمجھے اور ان سب کو مان لے، اللہ و رسول کی کسی بات میں شک کرنا اس کو جھٹلانا یا اس میں عیب لگانا یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا ان سب سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ اس کارخانۂ قدرت (ساری کائنات) کا ایک قدیم صانع اور پیدا کرنے والا ہے جو ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا، اس کا وجود حتمی اور اس کا معدوم ہونا محال ہے، وہ تمام صفات کمال سے متصف اور تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ تمام معلومات اس کے علم میں ہیں، تمام ممکنات پر وہ قادر ہے اور تمام کائنات اسی کے ارادہ سے ہے، وہ حیات سے متصف ہے سمیع (سننے والا) ہے بصیر (دیکھنے والا) ہے۔ اس کا کوئی شبیہہ و نظیر اور مثل نہیں، نہ اس کا کوئی مقابل اور ہمسر، وہ بے مثل ہے اس کا کوئی مددگار نہیں، واجب الوجود ہونے اور عبادت کے مستحق ہونے اور تمام مخلوقات کی پیدائش اور پوری کائنات کے انتظام و انصرام میں اس کا کوئی شریک و معین نہیں۔ وہ جو چاہے کرتا ہے، کوئی اس کو روک ٹوک کرنے والا نہیں، عبادت (یعنی غایت تعظیم و تقدیس) کا صرف وہی مستحق ہے۔ صرف وہی ہے جو مریض کو شفا دیتا، مخلوق کو رزق عنایت فرماتا، اور ان کی تکلیفوں کو دور کرتا ہے، اس کی شان ہے۔

"اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ "(سورہ یٰس ۸۲) (اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے "ہوجا" تو وہ ہوجاتی ہے۔)

اللہ تعالیٰ حلول واتحاد سے پاک ہے (وہ نہ کسی دوسرے کے قالب میں اتر جاتا ہے نہ کسی سے متحد ہوتا ہے) اس کی ذات وصفات حدوث سے مبرا ہیں (یعنی ذات وصفات قدیم ہیں) وہ نہ جوہر ہے نہ عرض نہ جسم (جوہر وہ چیز ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو اور کسی چیز میں ہو اور عرض وہ چیز ہے جو کسی ایسے محل کا محتاج ہو جس پر وہ قائم ہوسکے) وہ کسی جگہ اور سمت میں محدود نہیں وہ عرش کے اوپر ہے (مستوی علی العرش ہے) قیامت کے دن مومنوں کو اس کا دیدار ہوگا، جو وہ چاہتا ہے سو ہوتا ہے، جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا، وہ غنی ہے کسی چیز کا محتاج نہیں اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا اس سے پوچھا نہیں جاسکتا کہ وہ کیا کر رہا ہے (برخلاف مخلوق کے کہ اس سے پوچھا جاسکتا ہے) کسی کے واجب کرنے سے کوئی چیز اس پر واجب نہیں ہوتی، حکمت اس کی صفت ہے، اس کا ہر فعل حکیمانہ ہے، اس کے علاوہ کوئی حاکم (حقیقی) نہیں۔

تقدیر اچھی ہو یا بری اللہ کی طرف سے ہے (صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اس وقت تک کوئی بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ تقدیر پر (اچھی ہو یا بری) ایمان نہ لائے اور جب تک یہ جان نہ لے کہ جو کچھ اس کو پہنچا ہے وہ اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا اور جس سے بچ کر نکل گیا وہ اس تک پہونچ نہیں سکتا تھا (ترمذی شریف)

عالم (جہان ودنیا) میں جو کچھ ہوتا ہے بھلا ہو یا برا سب کو اللہ تعالیٰ اس کے ہونے سے پہلے ہمیشہ سے جانتا ہے اور اپنے جاننے کے موافق اس کو پیدا کرتا ہے تقدیر اسی کا نام ہے۔ اور بری چیزوں کو پیدا کرنے میں بہت سے بھید ہیں، جن کو ہر ایک نہیں جانتا مخلوق کی صفتوں سے وہ پاک ہے، اور قرآن وحدیث میں بعض جگہ جو ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہے (مثلاً پنڈلی، ہاتھ، استواء علی العرش، آسمانِ دنیا پر نزول فرمانا وغیرہ) تو ان کے معنی اللہ کے حوالے کریں کہ وہی اس کی حقیقت جانتا ہے اور ہم کھود کرید کے بغیر اس طرح ایمان لاتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ جو کچھ اس کا مطلب ہے وہ ٹھیک اور برحق ہے۔

اس کا ازلی وذاتی علم ہر اس واقعہ کو جو وجود میں آچکا ہے یا آئے گا محیط ہے۔ وہی واقعات کو ان کے وجود سے پہلے قابل وجود بناتا ہے۔ اس کے بلند مرتبہ اور مقرب فرشتے ہیں اور دوسرے وہ فرشتے ہیں جن کو بندوں کے اعمال لکھنے اور مصیبتوں اور آفتوں سے ان کی حفاظت کرنے اور خیر کی طرف بلانے پر مامور کیا گیا ہے، وہ بندہ کیلئے خیر کا سبب بنتے ہیں۔ فرشتے کبھی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ اور اس کی مخلوقات میں سے جنات بھی ہیں۔

قرآن اللہ کا کلام ہے اس کے الفاظ ومعانی سب اللہ کی طرف سے ہیں وہ مکمل ہے تحریف (نقص واضافہ اور تبدیلی) سے محفوظ ہے جو اس میں تحریف یا کمی زیادتی کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں۔ قرآن وحدیث کے کھلے کھلے مطلب کو نہ ماننا اور اینچ پینچ کرکے اپنا مطلب بنانے معنی گھڑنا بددینی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے صفات میں انحراف وتحریف یعنی جو صفت نازیبا ہے اس سے اس کو موصوف کرنا اس کی صفات کی ایسی تاویل کرنا جو اس کے شایانِ شان نہیں، جائز نہیں اور اس بارے میں صرف شریعت کا فیصلہ معتبر ہے، اس دنیا میں جاگتے ہوئے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے۔

معاد جسمانی برحق ہے (یعنی آخرت میں جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے گا) (آخرت میں) جزا وسزا اور (اعمال کا) حساب برحق ہے، پل صراط قرآن وسنت سے ثابت ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، وہ (دونوں) پیدا کی جاچکی ہیں۔

کبائر (کبیرہ گناہوں) کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا، شفاعت (سفارش) ان کے حق میں برحق ہے جن کے بارے میں اللہ اجازت دے، کبائر کے مرتکب امتیوں کیلئے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت برحق ہے، آپ کی شفاعت قبول کی جائیگی۔ فاسق کے لئے عذاب قبر اور مومن کے لئے قبر کا آرام وراحت حق ہے، (قبر میں) منکر ونکیر کا سوال کرنا برحق ہے۔

مخلوق کی طرف انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت برحق ہے اور انبیائے کرام کی زبان اور ان کے واسطہ سے اللہ تعالے کا اپنے بندوں کو امر ونہی کا مکلف قرار دینا برحق ہے انبیاء کرام مجموعی طور پر کچھ ایسی امتیازی صفات سے متصف ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں میں نہیں پائی جاتیں، اور وہ ان کے نبوت کی دلیل ہوتی ہیں۔ جن میں خوارق عادات (عام عادت کے خلاف امور کا ظہور جیسے شق القمر، انگلیوں سے پانی نکلنا وغیرہ) جن کو معجزات (آیات) کہا جاتا ہے، سلامتی فطرت اور مثالی اخلاق وغیرہ صفات ہیں انبیاء اکرام کفر، کبائر کے عمداً ارتکاب اور ان پر قائم رہنے سے محفوظ کردیئے گئے ہیں ان میں اول سیدنا آدم علیہ السلام اور آخری حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ باقی درمیان میں جو ہوئے ان کے بارے میں یوں عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ہم ایمان لاتے ہیں جو معلوم ہیں ان پر بھی اور جو ہم کو نہیں معلوم ان پر بھی، اللہ تعالیٰ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں آسمان سے جبریل علیہ السلام کی معرفت بہت سے پیغمبروں پر اتاریں، جن میں چار بہت مشہور ہیں: توریت، حضرت موسی علیہ السلام پر، زبور، حضرت داود علیہ السلام پر، انجیل، حضرت عیسی علیہ السلام پر، اور قرآن، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر، قرآن آخری کتاب ہے اب کوئی کتاب آسمان سے نہ آئے گی، قیامت تک قرآن مجید کا ہی حکم چلتا رہے گا۔ دوسری کتابوں کو گمراہ لوگوں نے بہت کچھ بدل ڈالا ہے۔ مگر قرآن مجید کی نگہبانی کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے اس کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

سیدنا محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ آپ کی دعوت ساری دنیا تمام انسانوں اور جنات کے لئے ہے۔ اس امتیازی خصوصیت میں اور اسکے علاوہ اس جیسی دوسری خصوصیات میں وہ سب نبیوں میں افضل ہیں۔ آپ کی رسالت پر ایمان لائے بغیر ایمان معتبر نہیں۔ اسلام ہی واحد دین حق ہے، اس کے سوا کوئی دین اللہ کے یہاں مقبول اور آخرت میں ذریعہ نجات نہیں۔ معراج برحق ہے آپ کو بحالت بیداری رات میں بیت المقدس اور وہاں سے جہاں اللہ نے چاہا لے جایا گیا۔

اولیائے عظام کی (اللہ کے وہ مومن بندے جو خدا تعالی کی ذات وصفات کے عارف اور اپنی ایمان میں مقام احسان تک پہنچے ہوئے ہیں) کرامات حق ہیں جس کو اللہ چاہتا ہے ان سے نوازتا ہے اور اللہ تعالی جسکو چاہتا ہے اپنی رحمت خاصہ سے سرفراز فرماتا ہے تکلیف شرعی (یعنی اوامر ونواہی خداوندی کا مخاطب اور شرعی فرائض کا مکلف ہونا اور ان کے نتیجہ میں آخرت میں جزا وسزا کا مستحق ہونا) کسی سے ساقط نہیں ہوتی، خواہ وہ ولایت، مجاہدہ اور جہاد کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو وہ فرائض کا ہمیشہ مکلف رہے گا۔ کوئی حرام چیز یا معصیت جب تک آدمی صحیح الحواس اور عاقل ہے اس کے لئے جائز نہ ہوگی، نبوت ولایت سے مطلقاً افضل ہے کوئی ولی خواہ کتنا ہی بڑا ہو کسی صحابی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا، خواہ وہ صحابی اکابر صحابہؓ میں سے نہ ہو، صحابہ کرام کی اولیاء عظام پر فضیلت ثواب کی کثرت اور اللہ تعالی کے یہاں مقبولیت کی عظمت پر ہے نہ کہ کثرت عمل پر (صحیح حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میرے اصحاب کو برا بھلا نہ کہو تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کردے تو وہ ان میں سے کسی کے مدّ اور آدھے مد برابر بھی نہ ہوگا۔) آپ ﷺ کو جس مسلمان نے دیکھا ہے یا آپؐ کی ملاقات کی ہو ان کو صحابی کہتے ہیں ان کی بڑی بزرگی اور مناقب وارد ہیں ان سے محبت اور اچھا گمان رکھنا چاہئے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے بعد بہترین مخلوق اور بہترین مومنین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ عشرہ مبشرہ (جن دس صحابہ کو ایک ہی حدیث میں جنت کی بشارت دی گئی ہے) کیلئے جنت اور خیر کی ہم شہادت دیتے ہیں، اہل بیت اور ازواج مطہرات کی (جو

امہات المومنین ہیں) عظمت وتوقیر کرتے ہیں۔ان سے محبت رکھتے ہیں۔اور اسلام میں ان کے بلند مقام کے معترف ہیں۔اسی طرح اہل بدر اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں کے مقام کے معترف ہیں اہل سنت تمام صحابہ کرام کی عدالت کے قائل ہیں۔ان کی عصمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔اور ان کے نزاعات اور اختلافات کے بارے میں کف لسان (زبان بند رکھتے ہیں) اور احتیاط سے کام لیتے ہیں ان کی کوئی برائی نہیں کرتے۔

آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ امام وخلیفہ برحق تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ، پھر علی رضی اللہ تعالی عنہ پھر خلافت علی منہاج النبوۃ ختم ہوگئی۔حضرت ابوبکر وحضرت عمر امت محمد یہ ﷺ میں علی الترتیب سب سے افضل ہیں، ہم صحابہ کرام کا صرف ذکر خیر ہی کرتے ہیں وہ ہمارے دینی قائد ورہنما ہیں۔ان کو برا کہنا حرام ہے اور ان کی تعظیم واجب ہے۔

ہم اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیتے (متکلمین کی اصطلاح میں "اہل قبلہ" وہ لوگ ہیں جو ضروریات دین پر یعنی وہ امور جن کا ثبوت کتاب وسنت واجماع سے قطعی طریقہ پر ہو چکا ہے ایمان رکھتے ہیں۔اگر کوئی محض ضروریات دین میں سے کسی چیز کا مثلاً عالم کے حدوث، قبروں سے اٹھائے جانے، اللہ کے تمام جزئیات سے واقف ہونے، نماز، روزہ کی فرضیت وغیرہ کسی امر کا منکر ہو تو اہل قبلہ میں شمار نہیں کیا جائے گا خواہ وہ کتنے ہی مجاہدات وریاضات کرتا ہو۔اسی طرح اگر کوئی انکار کی علامتوں مثلاً بت کے سامنے سجدہ کسی حکم شرعی کا مذاق وتمسخر جیسی کوئی حرکت کرتا ہے تو وہ اہل قبلہ میں سے نہیں۔جو اللہ تعالی کے اس کائنات کے خالق اور قادر ومختار ہونے کا انکار کرے یا غیر اللہ کی عبادت کرے یا آخرت یا (کسی بھی) نبی کا انکار کرے یا ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے وہ کافر ہے ضروریات دین یعنی وہ امور جن کا ثبوت دین میں معلوم ومشہور ہے دین کے وہ حقائق واحکام جو قرآن سنت متواتر اور صریح اجماع کی بنیاد پر دلیل قطعی ویقینی سے ثابت ہوں۔) معصیت کو جائز سمجھنا (بشرطیکہ اس کا معصیت ہونا ثابت ہو) کفر ہے شریعت کا مذاق اڑانا اور اس کے احکام کے ساتھ تمسخر کفر ہے۔امر بالمعروف اور نهی عن المنكر (نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا) بشرطیکہ فتنہ کا سبب نہ ہو۔اور بات مان لینے کا گمان غالب ہو واجب ہے۔ہم تمام انبیاء ورُسل اور ان پر نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، اور انبیاء میں باہم تفریق نہیں کرتے ایمان زبان سے اقرار اور دل کی تصدیق کا نام ہے۔بندوں کے افعال اللہ تعالی کے "خلق" اور بندوں کے "کسب" سے ہیں۔علامات قیامت پر جیسا کہ حدیث میں وارد ہے ہم یقین رکھتے ہیں اجتماعیت اور اتحاد کو ہم حق اور ثواب کی چیز اور انتشار وافتراق کو گمراہی وکج روی اور عذاب کا سبب سمجھتے ہیں۔

مذکورہ عقائد سے متعلق بعض آیات۔

۱۔"لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْئٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" (الشوری۔۱۱) کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے۔

۲۔"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْئٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهُ كَانَ عَلِيْماً قَدِيْراً" (فاطر ۴۴) اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کو ہرا دے، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں، وہ بڑے علم والا، بڑی قدرت والا ہے۔

۳۔"وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيِ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ" الحديد ۱-۳) اور وہ زبردست، حکمت والا ہے، اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، وہی حیات دیتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے۔

۴۔"وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ" (الحج۷) اور قیامت آنے والی ہے اس میں

ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ قبر والوں کو دوبارہ پیدا کرے گا۔

۵۔ ''لَمْ يَتَّخِذْ وَلَداً وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْئٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيراً '' (الفرقان - ۲) اس نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اس کا شریک ہے حکومت میں، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا۔

۶۔ ''قُلْ يٰـاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا نِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ يُحْيِ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ''(الاعراف ۱۵۸) آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے۔ سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی اُمّی پر (بھی ایمان لاؤ) جو کہ اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان (نبی) کا اتباع کرو تا کہ تم راہ (راست) پر آجاؤ۔

۷۔ ''مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ ''(الاحزاب - ۴۰) محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن (ہاں ایک دوسری ابوۃ روحانی بیشک حاصل ہے چنانچہ) آپ اللہ کے رسول ہیں۔ (اور رسول روحانی مربی ہونے سے روحانی باپ ہوتا ہے) اور (اس ابوۃ روحانیہ میں اس درجہ کامل ہیں کہ سب رسولوں سے اکمل و افضل ہیں چنانچہ آپ) سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔

۸۔ ''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ''(القیمۃ ۲۲/۲۳) بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

۹۔ '' قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ''(سورہ اخلاص) آپ کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کے اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

توحید، دین خالص اور شرک کی حقیقت

عبودیت کی بنیاد عقائد اور ایمان کی تصحیح پر ہے۔ جس کے عقائد میں خلل اور ایمان میں بگاڑ ہو اس کی نہ کوئی عبادت مقبول، نہ اس کا کوئی عمل صحیح مانا جائے گا۔ اور جس کا عقیدہ درست اور ایمان صحیح ہو اس کا تھوڑا عمل بہت ہے۔ اس لئے ہر شخص کو اس کی پوری کوشش کرنا چاہئے کہ اس کا ایمان وعقیدہ صحیح ہو اور صحیح ایمان وعقیدہ کے حصول اور اس پر اطمینان اس کا مقصودِ عمل اور منتہائے آرزو ہو اس کو ناگزیر اور بے بدل سمجھے اور اس میں ایک لحہ بھی تاخیر سے کام نہ لے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ توحید کے چار درجات ہیں۔

۱- صرف اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود قرار دنیا لہذا کوئی اور واجب الوجود نہیں۔

۲- عرش آسمان، زمین اور تمام قائم بالذات اشیاء کا خالق صرف اللہ کو سمجھنا (اسی کو توحید الربوبیۃ کہا جاتا ہے) یہ دو درجے وہ ہیں۔ جن سے آسمانی کتابوں نے بحث کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ مشرکین عرب اور یہود ونصاریٰ کو ان کے بارے میں اختلاف وانکار تھا بلکہ قرآن کریم اس کی صراحت کرتا ہے کہ یہ دونوں مرتبے ان کے نزدیک مسلمات میں سے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) ''وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ''(الزخرف - ۹) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس

نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ ان کو زبردست جاننے والے نے پیدا کیا ہے۔)

۳۔ آسمان وزمین کے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اس کے انتظام وانصرام کو صرف خدا تعالےٰ کے ساتھ خاص سمجھنا۔

۴۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی کو مستحق عبادت نہ گردانا (اس کو توحید الوہیت کہا جاتا ہے) یہ دونوں درجے طبعی ربط کی وجہ سے باہم دیگر پیوست اور لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں انھیں دونوں درجوں یاقسموں سے قرآن عظیم نے بحث کی ہے اور کافروں کے شکوک وشبہات کا شافی ووافی جواب دیا ہے (حجة الله البالغه ۱/۵۹۔۶۰ باختصار)

اس سے معلوم ہوا کہ شرک کے معنی صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کو اللہ تعالےٰ کا ہم مرتبہ وہم سر قرار دیا جائے بلکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ وہ کام یا وہ معاملہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بلند وبالا ذات کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ اور جس کو ''عبودیت'' بندگی کا شعار بنایا ہے جیسے کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا، کسی کے نام پر قربانی کرنا، یا نذریں ماننا، مصیبت وتنگی میں کسی سے مدد مانگنا، اور یہ سمجھنا کہ وہ ہر جگہ حاضر وناظر ہے، اور اس کو کائنات میں متصرف سمجھنا یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے شرک لازم آتا ہے اور انسان ان سے مشرک ہو جاتا ہے، خواہ اس کا یہ اعتقاد ہی کیوں نہ ہو کے یہ انسان، فرشتہ یا جن جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو رہا ہے، یا جس کے نام پر قربانی کر رہا ہے نذریں مان رہا ہے۔ اور جس سے مدد مانگ رہا ہے اللہ تعالےٰ سے بہت کم مرتبہ اور پست مقام ہے اور چاہے یہ مانتا ہو کہ اللہ ہی خالق ہے اور یہ اس کا بندہ اور مخلوق ہے۔

شرک کے مظاہر واعمال اور جاهلی رسم ورواج: ہمہ گیر علم، ارادۂ مطلقہ، اور آزاد وغیر محدود تصرف اور قدرتِ کاملہ اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہے، اور عبادت کے اعمال اور شعائر جیسے سجدہ یا رکوع کسی کے سامنے کرنا، کسی کے نام پر اور اس کی خوشنودی کیلئے روزہ رکھنا، دور دور سے اہتمام کے ساتھ کسی جگہ کے لئے شد رحال (طول طویل سفر کر کے جانا) اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرنا جو بیت اللہ کو زیبا ہے۔ اور وہاں قربانی کے جانور لے جانا، نذریں اور منتیں ماننا شرک کے کام اور شرک کے مظاہر ہیں۔ تعظیم کے وہ طریقے اور علامتیں جو عبودیت اور غایت ذلت کی مظہر ہوں، صرف اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہیں۔ علم غیب صرف خدا تعالیٰ کو ہے اور انسانی قدرت سے باہر ہے دلوں کے بھیدوں اور خیالات اور نیتوں کا علم ہر وقت کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سفارش قبول کرنے اور اہل وجاہت اور با اثر واقتدار لوگوں کو راضی وخوش کرنے میں دنیا کے بادشاہوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی ہر چھوٹی اور بڑی بات میں (ان کے بجائے) اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ شاہان دنیا کی طرح کائنات کے انتظام اور درباریوں اور وزراء واعوان سے مدد لینا اللہ کے شایان شان نہیں ہے۔ کسی قسم کا سجدہ سوائے اللہ کے کسی کے لئے جائز نہیں۔ حج کے مناسک واعمال۔ غایت درجہ کی تعظیم کے مظاہر اور محبت وفنائیت کے تمام شعائر بیت اللہ اور حرم محترم کے ساتھ خاص ہیں۔ صالحین اور اولیاء کے ساتھ جانوروں کی تخصیص، ان کا احترام کرنا ان کی نذریں چڑھانا، اور ان کی قربانی کے ذریعہ ان سے تقرب حاصل کرنا، حرام ہے۔ عاجزی وانکساری کے ساتھ غایت درجہ کی تعظیم صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ تقرب وتعظیم کے جذبہ سے قربانی کرنا صرف اللہ کا حق ہے۔ کائنات میں آسمانی برجوں (نچھتروں) سیاروں کی تاثیر پر اعتقاد رکھنا شرک ہے۔ کاہنوں، نجومیوں اور غیب کی باتیں بتانے والوں پر اعتماد کرنا کفر ہے۔ کفر کو پسند کرنا کفر کی باتوں کو اچھا جاننا کسی دوسرے سے کفر کی کوئی بات کرانا کسی نبی یا فرشتے کی حقارت کرنا ان کو عیب لگانا اللہ کے سوا کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی۔ کسی کو نفع نقصان کا مختار سمجھنا کسی سے مرادیں مانگنا یا روزی یا اولاد مانگنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، جن یا بھوت پریت وغیرہ کے چھوڑ دینے کے لئے ان کی بھینٹ دینا، بکرا وغیرہ ذبح کرنا کسی جگہ کا کعبہ کے برابر ادب وتعظیم کرنا، کسی کے نام پر بچے کے کان ناک چھیدنا، وغیرہ کسی کے نام کا بازو پر پیسہ

باندھنا، یا گلے میں ناڑا ڈالنا، کسی جانور پر کسی بزرگ کا نام لے کر اس کا ادب کرنا، کسی مہینہ یا تاریخ کو منحوس سمجھنا، کسی بزرگ کا نام بطور وظیفہ جپنا، کسی کے نام یا سر کی قسم کھانا، کسی بزرگ وغیرہ کی تصویر برکت کے لئے رکھنا، اور اس کی تعظیم کرنا، یہ سب کفر اور شرک کی باتیں ہیں۔

نام رکھنے میں مسلمانوں کو توحید کے شعار کا اظہار کرنا چاہیے۔ غلط فہمی پیدا کرنے والے اور جس سے مشرکانہ اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے ایسے الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھانا شرک ہے۔ غیر اللہ کی نذریں ماننا حرام ہے۔ اسی طرح کسی ایسے مقام پر قربانی کرنا جہاں کوئی بت تھا، یا جاہلیت کا کوئی جشن منایا جاتا تھا ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم میں افراط وتفریط اور نصاری کے اپنے نبی کے بارے میں غلو ومبالغہ کی تقلید، اور اولیاء وصالحین کی تصویروں اور شبیہوں کی تعظیم کرنے سے پرہیز اور مکمل احتیاط کرنا چاہیے۔

نبوت کا بنیادی مقصد

اللہ تعالی کے بارے میں عقیدہ اور عبد اور معبود کے باہمی تعلق کی تصحیح اور صرف ایک کی بندگی کی دعوت ہر زمانہ میں اور ہر ماحول میں انبیائے کرام علیہم السلام کی پہلی دعوت اور ان کی بعثت کا اولین اور اہم ترین مقصد رہا ہے ہمیشہ ان کی تعلیم یہی رہی ہے کہ اللہ ہی نفع ونقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور صرف وہی عبادت، دعاء، توجہ اور قربانی کا مستحق ہے۔

قرآن کریم کی روشنی میں بالکل واضح ہے کہ شرک وبت پرستی کے خلاف صف آرائی اُن سے جنگ کرنا نبوت کا بنیادی مقصد تھا قرآن کبھی تو ان کے بارے میں اجمالاً کہتا ہے۔

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ" (سورة انبیاء ۲۵)

"(اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری عبادت کرو)"

اور کبھی تفصیل کے ساتھ ایک ایک نبی کا نام لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کی دعوت کی ابتداء اسی توحید کی دعوت سے ہوئی تھی۔ سورہ اعراف میں حضرات نوح، ہود، صالح، شعیب، علیہم الصلوۃ والسلام کا نام لے لے کر ان کی اس دعوت توحید کا ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ "قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں" (الاعراف ۵۹) (دیکھئے سورۃ اعراف از رکوع ۸ تا رکوع ۱۲ نیز سورہ ہود رکوع ۳ تا رکوع ۸)

یہ ہرگز جائز نہیں کہ نئے اصلاحی دعوتی تقاضوں اور زمانہ کی نئی ضرورتوں کے اثر سے "شرک جلی" کی اہمیت کو کم کر دیا جائے اور دعوت وتبلیغ کے بنیادی اصولوں میں اس کو ضمنی حیثیت دی جائے یا "سیاسی اطاعت" اور انسانوں کے وضع کئے ہوئے کسی نظام وقانون کے قبول کرنے کو اور غیر اللہ کی عبادت کو ایک درجہ میں رکھا جائے، اور دونوں پر ایک ہی حکم لگایا جائے۔ (شرک جلی یعنی واضح اور کھلا ہوا شرک، اور ریاکاری جیسے امر کو شرک خفی کہیں گے، جو حقیقی شرک نہیں ہے)

بدعت

کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ رسول نے دین میں شامل نہیں کیا اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا، اس کا ایک جزء بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لئے کرنا، اور اس کے خود ساختہ شرائط وآداب کی اسی طرح پابندی کرنا، جس طرح ایک حکم شرعی کی پابندی کی جاتی ہے، بدعت ہے۔ بدعت اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی، امام مالکؒ نے خوب فرمایا: جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کر دی، اور اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے (نعوذ باللہ) پیغام پہنچانے میں خیانت کی، اس

لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا'' پس جو بات عہد رسالت میں دین نہیں وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔(روایت ابن الماجشون عن الامام مالکؒ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شریعت کی خصوصیت، اس کی سہولت، اور اس کا ہر ایک کے لئے ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ہے۔ اس لئے کہ جو دین کا شارع ہے وہ انسان کا خالق بھی ہے۔

'' اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ''(الملک۔ ۱۴) ''(اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے۔''

آپ ﷺ نے بدعت سے بچنے اور سنت کی حفاظت کی تاکید بلیغ فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ'' (متفق علیه) جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد (مردود و غیر مقبول) ہے'' ''اِیَّاکُمْ وَالْبِدْعَۃَ'' ''فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ''(مشکوۃ المصابیح/ بروایت ابوداود واحمد) ''بدعت سے ہمیشہ بچو، اس لئے کہ بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی۔''

اور یہ حکیمانہ پیشگوئی بھی فرمائی، ''مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَۃً اِلَّا رُفِعَ بِھَا مِثْلُھَا مِنَ السُّنَّۃِ''(مسند احمد) ''جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت ضرور اٹھ جاتی ہے'' صحابہ کرام اور ان کے بعد ائمہ وفقہائے اسلام اور اپنے اپنے وقت کے مجددین و مصلحین اور علمائے ربانی نے ہمیشہ اپنے اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے ممانعت کی اور اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول و رواج پذیر ہونے سے روکنے کی جان توڑ کوشش کی۔

بعض بدعتوں اور بری رسموں کا بیان

قبروں پر دھوم دھام سے میلہ کرنا، چراغ جلانا، چادریں ڈالنا، پختہ قبریں بنانا، بزرگوں کے راضی کرنے کو قبروں کی حد سے زیادہ تعظیم کرنا، تعزیہ کو چومنا، چاٹنا، خاک ملنا، طواف یا سجدہ کرنا، قبروں کی طرف نماز پڑھنا، مٹھائی وغیرہ چڑھانا، تعزیہ یا علم وغیرہ رکھنا، کسی چیز کو اچھوتی سمجھنا، محرم کے مہینہ میں سوگ کی صورتیں، تیجا، چالیسواں وغیرہ کو ضروری سمجھ کر کرنا، عورت کے دوسرے نکاح کو معیوب سمجھنا۔ نکاح، ختنہ اور بسم اللہ وغیرہ میں وسعت نہ ہونے کے باوجود ساری خاندانی رسمیں کرنا، ہولی دیوالی کی رسمیں کرنا، سلام کی جگہ بندگی وغیرہ کہنا، یا صرف سر پر ہاتھ رکھ کر جھک جانا، دیور، جیٹھ، پھوپھی زاد، خالہ زاد بھائی کے سامنے بے حجابانہ یا کسی اور نامحرم کے سامنے آنا، راگ باجا، گانا سننا، ناچ دیکھنا، نسب پر فخر کرنا، کسی بزرگ سے منسوب ہونے کو نجات کیلئے کافی سمجھنا، کسی کے نسب میں کسر ہو اس پر طعن کرنا، پیشہ کو ذلیل سمجھنا، حد سے زیادہ کسی کی تعریف کرنا، شادیوں میں فضول خرچی اور خرافات کے کام کرنا، ہندوؤں کی رسمیں کرنا، دولھا کو خلاف شرع پوشاک پہنانا، کنگنا، سہرا باندھنا، مہندی لگانا، آتشبازی (پٹاخے) وغیرہ کا سامان کرنا، فضول آرائش کرنا، گھر کے اندر عورتوں کے درمیان دولھا کو بلانا، شیخی سے (بڑائی میں) مہر زیادہ مقرر کرنا، غمی میں چلا کر رونا، منہ اور سینہ پیٹنا، محاسن بیان کر کے رونا، جو کپڑے اس کے بدن سے لگیں سب کو دھلوانا، برس روز تک یا کچھ زیادہ اس گھر میں اچار نہ پڑنا، کوئی خوشی کی تقریب نہ کرنا، مخصوص تاریخوں میں پھر غم کا تازہ کرنا، حد سے زیادہ زیب و زینت میں مشغول ہونا، سادی وضع معیوب سمجھنا، مکان میں تصویریں لگانا، بہت باریک کپڑا پہننا۔ بجتا زیور پہننا، عورتوں کا مردوں کی وضع اختیار کرنا، اور اس کے برعکس، بدن گودوانا، وغیرہ۔

(عقائد کا اکثر حصہ دستور حیات سید ابوالحسن علی الندوی اور بہشتی زیور سے ماخوذ ہے بعض دیگر کتب سے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین سید نامحمد ن النبنی الامی و علی اٰل محمد وصحبه اجمعین امابعد

کتاب الطہارۃ (پاکی و صفائی کا بیان)

باب۔ پاک پانی

ارشادخداوندی ہے ''وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَھُوْرًا'' (الفرقان ۴۸) ترجمہ:- ''اور ہم نے آسمان سے پاکی حاصل کرنے کا پانی اتارا''

حدیث: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ'' جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہارت ہے'' (رواہ احمد عن جابر مشکوۃ ج ۱/، ص ۳۹)

اسی طرح صحیح مسلم شریف کی ایک طویل روایت میں آپ ﷺ نے طہارت کونصف ایمان قرار دیا ہے۔

لفظ'' طہارت'' عربی لغت میں نظافت کیلئے اور حسی میل اور معنوی عیب سے صاف ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے مثلاً نجاست، تھوک، بلغم، حسد، کبر، بغض وغیرہ سے پاک وصاف ہونا اور شرعاً وضو غسل، تیمم، اور نجاست کے ازالہ کے لئے اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں (بشری ۱۴/ ۱) وضو، غسل اور نجاست کے ازالہ کے لئے مطلق پانی (ماء مطلق) کا ہونا ضروری ہے وہ پانی جس میں کوئی لازمی قید نہ ہو اسے مطلق پانی کہیں گے۔

(اگر لازمی قید آ جائے، مثلاً گلاب کا پانی۔ شکر کا پانی وغیرہ تو یہ مطلق نہ ہونے کی وجہ سے طہارت میں استعمال نہیں ہوسکتا، گلاب کے پانی کو آپ صرف پانی نہیں کہہ سکتے، لہٰذا اس قید کو قید لازم کہیں گے البتہ کنویں یا ندی یا بارش کے پانی کو آپ بغیر قید کے صرف پانی بھی کہہ دیں گے، معلوم ہوا یہ قید لازمی نہیں اور اسی کو مطلق پانی کہا جائے گا۔)

مستعمل پانی: رفع حدث کے لئے (یعنی وضو یا غسل کے فرض میں) جو پانی استعمال ہو وہ طاہر (یعنی پاک تو) ہے لیکن طہور نہیں (یعنی پاک کرنے والا نہیں لہٰذا ایسے پانی کو پھر وضو وغیرہ کے لئے استعمال نہیں کرسکتے) جو پانی نفل طہارت میں استعمال ہو وہ طہور بھی ہے مثلاً تجدید وضو (باوضو ہوتے ہوئے پھر وضو کرنا) سنت غسل، وضو یا غسل میں دوسری یا تیسری مرتبہ اعضاء کا دھونا، مضمضہ (کلی) کا پانی۔ نفل نماز پڑھنے کے لئے کئے گئے وضو کا پانی اور نابالغ کے وضو کا پانی بھی طہور نہیں ہے۔

جو مستعمل پانی رفع حدث میں استعمال نہیں کرسکتے، اس سے نجاست کا ازالہ بھی نہیں ہوگا (اس پانی سے کسی نجس کپڑے کو اچھی طرح دھویا جائے تب بھی وہ کپڑا شرعاً ناپاک ہی رہے گا، جب تک اس پر طہور پانی نہ بہایا جائے، پاکی حاصل نہیں ہوگی) اگر مستعمل پانی جمع کرنے کے بعد وہ قلتین کی مقدار کو پہنچ جائے تو پھر وہ طہور شمار ہوگا۔

قلتین کی مقدار ص ۱۵ پر آرہی ہے (تقریباً ۱۹۳ کلو پانی) قلتین پانی میں کوئی جنبی (جس کو غسل کی ضرورت ہو) اتر کر غسل کرے تو وہ پانی طہور ہی رہے گا۔ قلتین سے کم پانی میں کوئی جنبی اتر جائے، یہاں تک کہ مکمل بدن پانی میں ہو پھر غسل کی نیت کرے تو اس کا غسل صحیح ہوا۔ لیکن اب وہ پانی دوسرے کے حق میں مستعمل بن چکا۔ اگر قلتین سے کم پانی میں دو جنبی اشخاص پورے طور پر ڈوب جائیں، پھر دونوں بہ

یک وقت (ایک ہی وقت میں) غسل کی نیت کریں تو دونوں کا غسل صحیح ہوگا۔

جنبی کا بعض بدن پانی میں اور بعض پانی سے باہر ہو، اور وہ غسل کی نیت کرے، تو داخل حصہ تو پاک ہوا، اسی حال میں اگر بقیہ حصہ کو بھی پانی میں داخل کرے تو مکمل غسل ہو جائیگا، لیکن غسل مکمل کرنے سے پہلے پانی سے الگ ہوا تو وہ پانی مستعمل شمار ہوگا، لہذا بقیہ غسل اس سے حاصل نہیں ہوگا۔

دو جنبی قلیل پانی میں غوطہ لگائیں اور ان میں سے ایک نے پہلے نیت کی تو اس کا غسل تو صحیح ہوا، لیکن دوسرے کے حق میں وہ پانی مستعمل شمار ہوگا۔

دو جنبی کے بدن کا کچھ حصہ پانی میں اور کچھ خارج میں تھا اور دونوں نے ساتھ میں نیت کی تو داخل حصہ دونوں کا پاک ہوا البتہ خارجی اعضاء کے لئے وہ پانی مستعمل ہو جانے کی وجہ سے کام نہیں دے گا۔

پانی جب تک کسی عضو پر ہی رہے (ابھی جدا نہیں ہوا) تو وہ مستعمل نہیں کہلائے گا (اگر وضو کرنے والا چلو میں پانی لے تا کہ کہنیوں سمیت ہاتھوں کو دھوئے اور چلو سے اسے کہنیوں کی طرف بہائے تو اگر چہ ہتھیلی اور آگے کے حصے کی طہارت ہو رہی ہے، لیکن ابھی وہ پانی مستعمل نہیں سمجھا جائے گا اور کہنیوں تک دھونے کے لئے کام دے گا۔ یہی پانی نیچے گرنے کے بعد اسے لیکر آپ ہاتھ کا بقیہ حصہ دھونا چاہیں تو صحیح نہیں ہے۔)

اگر پانی متوضی (وضو کرنے والا) کے ایک عضو سے دوسرے عضو کی طرف بہے تو وہ مستعمل کہلائے گا، یہاں تک کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی طرف منتقل ہو تو وہ مستعمل ہو چکا۔ مکمل چہرہ دھونے سے پہلے متوضی پانی میں ہاتھ ڈبوئے تو وہ مستعمل نہیں ہوگا، چہرہ مکمل دھونے کے بعد رفع حدث کی نیت سے ہاتھ قلیل پانی میں ڈالے تو وہ مستعمل ہو جائیگا۔ (یعنی ہاتھ کے حدث کو دور کرنے کی نیت سے جب پانی میں ہاتھ ڈالا تو اتنا ہاتھ پاک ہو چکا۔ اور اس استعمال سے وہ پانی مستعمل ہو گیا۔ وضو کے بقیہ اعمال کو اس پانی سے انجام نہیں دے سکتے، البتہ ہاتھ اگر ابھی پانی سے جدا نہیں ہوئے ہیں۔ تو ان کو کہنیوں تک اندر داخل کرے تو ہاتھ کی طہارت کے لئے یہ کافی ہوگا، اس لئے کہ استعمال کا حکم عضو سے جدائی کے بعد لگے گا اسی طرح ایک مرتبہ چہرہ دھونے کے بعد دوسری یا تیسری مرتبہ بھی دھونے کے ارادے سے ہاتھ پانی میں داخل کرے تو وہ مستعمل نہیں ہوگا)

لیکن مذکورہ صورت میں چلو میں پانی لینے کی نیت سے (تا کہ ہاتھ باہر دھوئے) ہاتھ اندر داخل کیا ہے تو وہ پانی مستعمل نہیں ہوگا۔

اور اگر بغیر کسی نیت کے داخل کیا ہے تو صحیح یہ ہیکہ مستعمل ہو جائے گا لیکن امام بغویؒ، کا فیصلہ یہ ہے کہ اس صورت میں بھی مستعمل نہیں ہوگا۔

امام شاشیؒ، امام غزالیؒ، امام ابن عبدالسلامؒ، ابو عجیلؒ، ابو شکیلؒ اور قعیبیؒ وغیرہ حضرات نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ بلا نیت ہاتھ ڈبونے سے وہ پانی مستعمل نہ ہوگا۔ (ترشیخ المستفیدین ص ۱۴)

جنبی جب غسل کی نیت کرے تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو محدث (بے وضو) کا چہرہ دھونے کے بعد ہے۔ (یعنی فرض غسل کی نیت کے بعد قلیل پانی میں چلو سے پانی نکالنے کی نیت سے ہاتھ داخل کرے تو صحیح ہے ورنہ پانی مستعمل ہو جائے گا۔)

جو آدمی وضو کی نیت کو فرض نہیں مانتا ہو مثلاً کوئی حنفی اس کے وضو کا پانی بھی مستعمل ہوگا۔

کسی نے سر کا مسح کرنے کی بجائے سر دھو دیا تو وہ پانی بھی مستعمل ہے، کوئی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرے تب بھی سارا پانی

مستعمل قرار پائے گا۔

فصل: پانی میں کسی دوسری چیز کا گرنا اور شامل ہونا

اس سلسلہ میں ایک عام ضابطہ اور اصول یہ ہے کہ جن چیزوں کے شامل ہونے کے بعد صرف پانی (یعنی ماءِ مطلق) نہیں کہہ سکتے، ایسے پانی سے طہارت ممنوع ہے، ورنہ صحیح ہے۔

جن چیزوں سے پانی کو بچانا آسان ہو (اور عام حالات میں ان چیزوں کے خود بخود پانی میں شامل ہونے کی نوبت نہ آتی ہو،) ایسی چیزوں کے پانی میں گرنے کی وجہ سے پانی میں ہلکا سا تغیر (تبدیلی) آجائے، تو وہ پانی طہور ہی ہے۔ (جبکہ وہ چیز پاک ہو۔)

جو چیز پانی میں شکر، نمک وغیرہ کی طرح گھلتی نہ ہو، بلکہ اپنی حالت پر باقی رہتی ہو، اس کو ''مُجاوِر'' (پڑوس میں رہنے والا) کہیں گے جیسے لکڑی پتھر وغیرہ۔

تو کسی مجاور کی وجہ سے جو کہ پانی میں مختلط (گھلتا) نہ ہو، زیادہ تغیر آجائے تب بھی وہ طہور ہی رہے گا جیسے لکڑی، تیل، موم وغیرہ کی وجہ سے کافور کی دو قسم ہیں۔ ایک پانی میں گھلتا ہے۔ دوسرا نہیں گھلتا۔ پہلی قسم کے کافور کی وجہ سے زیادہ تغیر آجائے تو طہارت کے قابل نہیں رہیگا، لیکن دوسری قسم کا کافور لکڑی وغیرہ کے حکم میں ہے جن اشیاء سے پانی کو محفوظ رکھنا عام مدت میں ممکن نہ ہو، جیسے پانی کے بہنے یا رکنے کی جگہ میں موجود مٹی، کائی، گندھک، نورہ، (چونے کا پتھر) ھڑتال وغیرہ، ان اشیاء کی وجہ سے زیادہ تغیر بھی آجائے تو حرج نہیں، پانی طہور ہے۔

پانی میں پیدا ہونے والی مٹی کا تغیر بھی طہارت سے مانع نہیں۔

اسی طرح مدت دراز تک ایک ہی جگہ رکے رہنے سے پانی میں جو تغیر پیدا ہوتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں، گرم کیا ہوا پانی بھی طہور ہے۔

مذکورہ متغیر پانی، سمندری پانی، زم زم کا پانی اور گرم پانی اگر چہ کسی نجس چیز کو جلا کر گرم کیا گیا ہو، کو استعمال کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

زیادہ گرم یا زیادہ سرد پانی استعمال کرنا مکروہ ہے۔

ماءِ مشمس: حوض اور تالاب کا پانی سورج کی تپش سے گرم ہو تو بالاتفاق اس کا استعمال مکروہ نہیں ہے۔ البتہ کسی برتن کا پانی سورج کی تپش اور دھوپ سے گرم ہو تو ان شرائط کے ساتھ مکروہ تنزیہہ ہے (سورج کی تپش سے گرم ہونے والے پانی کو مشمس پانی کہیں گے۔)

(۱) علاقہ گرم ہو (۲)۔ برتن کا مادہ ایسا ہو جسے ڈھال کر بنایا جاسکتا ہو جیسے تانبا ہتھوڑے وغیرہ سے کوٹ کر جس کو پھیلا سکتے ہو عموماً دھات اس میں آجائے گی لیکن سونا چاندی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (۳)۔ بدن میں استعمال کیا جائے (کپڑا وغیرہ دھونے میں استعمال کرنا مکروہ نہیں) یہی پانی ٹھنڈا ہونے کے بعد اس کی کراہت ختم ہو جائے گی۔

(دلیل کے اعتبار سے امام نوویؒ نے عدم کراہت کو زیادہ ترجیح دی ہے، مگر شافعی مسلک کے اعتبار سے کراہت کا قول راجح ہے، کیونکہ امام شافعی اور دار قطنی وغیرہ نے بسند صحیح حضرت عمرؓ سے اس پانی سے غسل کی کراہت کو روایت کیا ہے)

متفرق: مذکورہ بالا صورت میں دھوپ کی شدت کی وجہ سے برتن سے ذرات جدا ہو کر پانی میں شامل ہوتے ہیں، جو گرمی کی حالت میں بدن سے چھو جائے تو چمٹ کر برص (سفید داغ) کی بیماری کا سبب بن سکتا ہے اور یہی سبب کراہت ہے۔

مٹی کے پکے ہوئے برتن میں، سرد یا معتدل علاقہ میں، بدن کے علاوہ کپڑے زمین یا کھانے وغیرہ میں اور اسی طرح ٹھنڈا ہونے کے بعد مشمس پانی کا استعمال مکروہ نہیں ہے (فتح الوھاب مع الجمل ۱/۳۶)

جن اشیاء کے پانی میں شامل ہونے کی نوبت عموماً نہیں آتی مثلاً زعفران ایسے اشیا کی وجہ سے پانی میں اتنا تغیر آجائے کہ اب وہ ماء مطلق نہیں کہلائے گا، تو وہ طہور نہیں ہے۔

اگر کسی نے پانی نہ پینے کی قسم کھائی ہو تو اس حد تک متغیر پانی کے پینے سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔

پانی کے مزہ، رنگ، یا بو میں سے کسی ایک وصف کا بدل جانا کافی ہے۔ قصداً مٹی پانی میں پھینکنے سے تغیر آیا ہو تب بھی وہ طہور ہے۔

پانی سے بننے والے نمک کی وجہ سے اگر تغیر پیدا ہو تو حرج نہیں، دیگر نمک مضر ہوں گے۔ درختوں کے پتے پانی میں گر کر تغیر پیدا کریں، چاہے ریزہ ریزہ ہوں یا نہ ہوں تو وہ طہور ہے۔ اور قصداً پتے پانی میں پھینکے گئے اور اس کی وجہ سے تغیر پیدا ہو تو یہ مضر ہے۔

سیال کی آمیزش (تقدیری تغیّر)

قلیل یا کثیر پانی میں ایسا پاک مائع (بہنے والی چیز سیال) شامل ہو جائے، جو صفات میں پانی کی موافق ہو، (پانی سے الگ اس میں کوئی رنگ یا مزہ یا بو نہ ہو) جیسے گلاب کا پانی جس کی خوشبو ختم ہو چکی ہو، درخت کا پانی، مستعمل پانی وغیرہ تو مذکورہ مائع کی مقدار اتنی ہو کہ اگر اس کا مزہ یا رنگ یا بو پانی کے مخالف ہوتا، تو پانی میں مؤثر تغیر پیدا کرتا۔ (یعنی ایسا تغیر جو سابقہ تفصیلات کی روشنی میں طہوریت کو ختم کرنے والا ہو) تو اس پانی کی طہوریت ختم ہو جائے گی۔ (اس تغیر کو تقدیری تغیر کہیں گے۔)

(مذکورہ مائع کو اوسط درجہ میں پانی کے مخالف اوصاف والا سمجھ کر چلیں گے اور اگر نجس چیز شامل ہو رہی ہے تو اشد درجہ میں پانی کا مخالف تصور کریں گے۔) اور پانی کے مقابلہ میں اس مائع کی مقدار اتنی ہو کہ اوصاف میں مخالف تصور کرنے کے باوجود تغیر مؤثر پیدا نہیں کرے گا، تو پانی طہور ہے اور اس صورت میں مکمل پانی طہارت میں استعمال کر سکتے ہیں، مائع کی مقدار کو آخر میں باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

کسی کے پاس اتنا پانی ہو کہ طہارت کیلئے ناکافی ہو اور تھوڑا سا مائع ملا لینے کی صورت میں کافی ہو جاتا ہو تو ملا لینا لازم ہے، لیکن اگر مائع کی قیمت طہارت کیلئے درکار پانی کی قیمت سے زیادہ ہو تو ملانا ضروری نہیں، اس فصل میں مذکورہ مسائل میں پانی کے قلتین سے کم زیادہ ہونے کی کوئی قید نہیں ہے۔ (سارے ہی صورتوں کا یہی حکم ہوگا) پانی کو جوش دینے کی وجہ سے بخارات (بھاپ) بلند ہوا اور پھر وہ پانی میں تبدیل ہو تو وہ پانی بھی طہور ہے۔ لیکن اگر کسی دوسرے مائع کے بخارات سے ٹپکا ہوا پانی ہو تو طہور نہیں ہے جیسا کہ پسینہ طہور نہیں ہے۔

باب۔ نجاستوں اور نجس پانی کے بیان میں

نجاست لغت میں ہر گندگی کو کہا جائیگا، شریعت میں نجاست سے ایسی گندگی مراد ہے جس کی موجودگی میں عام حالات میں نماز صحیح نہیں ہوتی۔

نجاست کی دو قسمیں ہیں: (۱) نجاست حکمی جو اپنے محل سے آگے بڑھ جائے جیسے جنابت۔ (۲) نجاست عینیہ جو اپنے محل سے تجاوز نہ کرے (پیشاب وغیرہ) جس نجاست عینیہ کا کوئی اثر باقی نہ ہو۔ (جیسے پیشاب کپڑے پر لگ جائے جس میں نہ بدبو ہے نہ مزہ نہ رنگ) اس کو بھی نجاست حکمیہ کہتے ہیں (جمل ۱/۱۶۸)

ساری اشیاء کی ہم دو تقسیم کر سکتے ہیں ۱۔ جماد ۲۔ حیوان

جماد کا مطلب جو نہ حیوان ہو نہ حیوان تھا نہ کسی حیوان کا جزء ہے نہ کسی حیوان سے نکلا ہے۔
شراب اور نشہ لانے والی نبیذ کے علاوہ سارے جمادات پاک ہیں۔ حیوانات میں کتا، خنزیر (سور) اور ان دونوں سے کسی ایک کے بھی دوسرے جانور سے ملاپ کی وجہ سے جو پیدا ہو نجس ہے۔ اس کے علاوہ سارے جاندار اپنی زندگی میں پاک ہیں۔ مردار میں پیدا ہونے والے کیڑے بھی پاک ہیں۔ جن حیوانات کو شرعی طریقے سے (ذبح شکار وغیرہ کے ذریعے) حلال نہ کیا گیا ہو اور روح نکل چکی ہو تو اس کو مردہ (میتہ) کہا جائیگا۔ (جمل ۱۷۳/۱)
مردار میں صرف مچھلی، ٹڈی اور انسان پاک ہیں کسی جانور کو ذبح کرنے کے بعد پیٹ سے مردہ جنین برآمد ہو، تو وہ بھی پاک ہے۔ (خلقت مکمل ہونے کے بعد برآمد ہونے والے جنین کو اپنے ماں کے تابع سمجھتے ہوئے کھانا جائز ہے لیکن علقہ اور مضغہ کا کھانا ناجائز ہے) (جمل ۱۷۳/۱)
شرعی طریقہ سے شکار کئے ہوئے جاندار کو ذبح کرنے کا موقع نہ ملے اور مر جائے، تب بھی وہ پاک ہے۔ (اور اس کا کھانا حلال ہے۔)
اس کے علاوہ سارے مردار نجس ہیں۔ مردار کے تمام اجزاء (ہڈی بال، اون وغیرہ) نجس ہیں۔ کیونکہ ان سب میں تر زندگی ہوتی ہے (مغنی المحتاج، ج ۷۸/۱)
وہ جاندار جن کو اگر زندگی میں کاٹا جائے تو ان کے بدن سے خون نہ بہے (یا تو خون نہ ہونے کی وجہ سے یا اس لئے کہ معمولی سا ہے، بہنے جیسا نہیں) جیسے مکھی وغیرہ، ان کا مردہ بھی نجس ہی ہے، لیکن یہ پانی یا دوسری سیال چیز میں گر جائے (اور اس میں کوئی تغیر اس مردار کی وجہ سے پیدا نہ ہو) تو وہ سیال چیز نجس نہیں ہوگی۔ البتہ کسی نے اس طرح کے مردہ کو پانی وغیرہ میں ڈال دیا تو وہ نجس ہو جائے گا۔ اگر اس طرح کے مردہ جانوروں کی کثرت کی وجہ سے تغیر پیدا ہوا تو پھر وہ پانی یا مائع نجس ہو جائیگا۔ (مغنی المحتاج ۷۸/۱) سرکہ یا سیب وغیرہ پھل میں جو کیڑے پڑتے ہیں ان کا مردار بھی نجس ہے۔
البتہ اس کی وجہ سے وہ چیز نجس نہ ہوگی، کیونکہ اس سے بچنا مشکل ہے، نیز ان اشیاء کو ان کیڑوں سمیت کھانا جائز ہے کیونکہ اسے جدا کرنا کافی دشوار ہے۔ جن جانوروں کو کھانا حرام ہے انھیں ذبح کیا جائے تب بھی وہ نجس ہیں (مغنی المحتاج ۷۸/۱)

حیوان کے اجزاء کا حکم

ایک عام اصول یہ ہے کہ کسی بھی زندہ حیوان سے جو حصہ جدا ہو وہ نجس ہے، البتہ مندرجہ ذیل اشیاء اس اصول سے مستثنیٰ ہیں۔
(۱)۔ "ماکول اللحم" (جن جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے۔) حیوانات کے بال، اون اور پر جو زندگی میں کاٹ لئے گئے ہوں یا خود بخود جھڑے ہوں۔ (۲)۔ انسان کے بال (۳)۔ انسان، مچھلی اور ٹڈی کے بدن کا کوئی بھی حصہ ۴۔ انسان کا مشیمہ (وہ جھلی جس میں بچہ ہوتا ہے۔)

حیوان کے باطن سے نکلنے والی اشیاء کا حکم

لعاب (تھوک) آنسو، پسینہ اور بلغم کا وہی حکم ہوگا جو اس حیوان کا ہے۔ اگر حیوان نجس ہو تو مذکورہ اشیاء بھی نجس، ورنہ طاہر (کتے اور سور کا تھوک وغیرہ بھی نجس ہے، مویشیوں وغیرہ کا تھوک، پسینہ سب پاک ہے۔)
خون، پیشاب، پاخانہ، بیٹ اور قئی جیسی چیزیں تمام حیوانات کی نجس ہیں۔ آپ ﷺ کے بدن اطہر سے نکلے ہوئے ان فضلات

کو بھی جمہور نے نجس کہا ہے۔

لیکن امام بغوی قاضی، سبکی، بارزی، زرکشی، ابن الرفعہ، بلقینی، حافظ ابن حجر اور رملی وغیرہ حضرات نے اس کے برعکس طہارت کے قول کو ترجیح دی ہے۔(حاشیہ الجمل ۱/۱۷۴)

مچھلی اور ٹڈی کا خون اور بیٹ، ایسے جانداروں کا پاخانہ جن میں بہنے والا خون نہ ہو، اور تلی اور جگر سے ٹپکنے والا خون نجس ہے۔

''ماکول اللحم'' (جن کا گوشت جائز ہے۔) جانوروں کا دودھ پاک ہے۔ اور ''غیر ماکول اللحم'' (جن کا گوشت جائز نہیں) ان جانوروں کا دودھ نجس ہے۔

کتّے اور سوّر اور ان کے فرع کی منی ناپاک ہے۔ انسانوں سمیت بقیہ سارے جانداروں کی منی پاک ہے۔

انڈے پاک ہیں، چاہے ''غیر ماکول اللحم'' پرندے کے ہوں۔

مشک پاک ہے، مشک کا نافہ اگر ہرنی کی زندگی میں جدا ہوا ہو تو پاک ہے ورنہ نجس ہے۔ جو کھیتی اور پودے نجاست پر اُگے ہیں نجس العین نہیں، لیکن نجاست کے لگنے سے نجس ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا دھونے سے پاک ہو جائیں گے۔ ان پودوں کی بالیوں میں تیار ہونے والے دانے پاک ہیں۔

پیپ نجس ہے، اسی طرح زخموں کا پانی اگر متغیر ہو تو نجس ہے، ورنہ نہیں۔ اور نجاست کا دھوں بھی نجس ہے۔

عورت کے فرج (اگلی شرمگاہ) کی رطوبت (تری) علقہ (جما ہوا خون) اور مضغہ پاک ہیں۔ صفراء اور جگالی نجس ہیں۔

نیند کی حالت میں منہ سے بہنے والی رال حلق کے کوے سے نکلے تو پاک ہے اور معدے سے نکلے تو نجس ہے۔ طویل نیند کی صورت میں رال بہنا بند ہو تو وہ کوّے سے نکلنے والا سمجھا جائے گا، اگر شک ہو تو نجس نہیں سمجھیں گے، البتہ احتیاطاً دھو دینا بہتر ہے۔

جس شخص کو ہمیشہ نیند کی حالت میں کثرت سے رال کی شکایت ہو، باوجود نجس ہونے کے اس کے حق میں اسے معاف رکھا جائے گا۔

دانہ کسی جانور کے کھانے کے بعد پاخانہ میں صحیح سالم نکل آئے اور اس کی سختی اس حد تک باقی ہو کہ بونے کی صورت میں اُگ سکتا ہے تو وہ دانہ پاک ہے۔ صرف اوپری حصہ دھو دینا ضروری ہے۔

لیکن اب دوبارہ اُگنے کے قابل نہیں رہا تو نجس العین ہو چکا۔

فصل : ٹھہرا ہوا پانی

اگر کسی جگہ ٹھہرا اور رکا ہوا پانی (خواہ برتن میں ہو یا حوض میں و تالاب اور گڑھے وغیرہ میں) قلتین (دو قلہ) یا اس سے زائد ہو تو اسے کثیر کہیں گے اور دو قلہ سے کم ہو تو اسے قلیل کہا جائے گا۔

قلتین (دو قلہ) کی مقدار= قلتین ۵۰۰ رطل بغدادی کے مساوی ہوتا ہے۔ اگر کسی مکعب کے ہر ضلع کے لمبائی ۶۰ سینٹی میٹر ہو تو یہ قلتین کے مساوی ہوگا (ضمیمہ عمدۃ السالک) لمبائی، چوڑائی اور گہرائی سوا ذراع (ایک ہاتھ اور پاؤ ہاتھ) ہو تو یہ قلتین کی مقدار ہے (ایک ذراع= ۴۸ سینٹی میٹر) کلوگرام کے اعتبار سے قلتین (۱۹۲ء۸۵۷) کلوگرام ہوگا (الفقہ المنہجی ۱/۳۴)

حدیث : اگر پانی قلتین (کی مقدار) ہو تو وہ نجس نہ ہوگا۔ (الشافعی، احمد سنن، اربعہ ابن خزیمہ، بیہقی، ابن حبان، حاکم، دار قطنی تلخیص ۱/۲۸)

قلیل اور کثیر پانی کی یہ حد صرف تقریبی ہے لہٰذا قلتین میں اگر ایک دو رطل کی کمی بھی ہو تو اس پر قلتین اور کثیر کا حکم لگایا جائے گا۔ کسی

پانی میں نجاست گرے اور اسکے دوقلہ ہونے میں شک ہوتو پانی نجس نہیں ہوگا، بلکہ اپنی طہارت پر باقی رہے گا۔

نجاست مؤثرہ (اثر کرنے والی یعنی جو معاف نہ ہو) اگر قلیل پانی میں مل جائے تو وہ پانی نجس ہو جائے گا، چاہے نجاست کی وجہ سے پانی میں کوئی تغیر نہ پیدا ہوا ہو۔ غیر مؤثرہ نجاست کی وجہ سے پانی نجس نہیں ہوگا، جیسے وہ مردار جس میں بہنے والا خون نہ ہو اور ایسی نجاست جو عام نظروں سے دکھائی نہ دے۔ اور بلی کا منہ نجس ہونے کے بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہی ہو پھر آکر پانی میں منہ ڈال دے اور اس مدت میں اس کے منہ کی طہارت کا احتمال بھی ہو (تو اس کے منہ ڈالنے سے پانی نجس نہ ہوگا) کثیر پانی میں نجاست گرنے سے تغیر پیدا ہو جائے تو بالا جماع پانی نجس ہو جائے گا۔ تغیر کم ہو یا زیادہ۔ مزہ، رنگ، بو میں سے کوئی بھی وصف متغیر ہو۔ چاہے گرنے والی نجاست مخالط (گھلنے والی) ہو یا مجاور (جو پانی میں نہ گھلے) نہر کے کنارے پانی سے جدا مردہ پڑا ہوا ہو اور اس کی وجہ سے پانی میں بدبو محسوس ہو تو وہ پانی نجس نہیں ہے اس لئے کہ نجاست پانی سے جدا ہے۔

نجاست کے باوجود کثیر پانی میں تغیر نہ ہو، نجاست کی مقدار کم ہونے اور پانی میں فنا و نابود ہونے کی وجہ سے، تو وہ پانی نجس نہیں ہوگا۔ اور سارا پانی استعمال کرنا صحیح ہے۔ (یعنی قلتین میں ایک لیٹر پیشاب شامل ہو گیا اور پھر بھی کوئی تغیر نہ آیا تو اب مکمل پانی کا استعمال کرنا درست ہے آخر میں ایک لیٹر باقی رکھنے کی ضرورت نہیں جو کہ شامل ہونے والے پیشاب کی مقدار ہے۔) نجاست کے اوصاف پانی ہی کی طرح ہونے کی وجہ سے تغیر نہیں پیدا ہو رہا ہے، تو اس نجاست کو پانی کے مخالف اوصاف کا تصور کر کے اندازہ لگانا ضروری ہے۔

(اس اندازے کی تفصیل صفحہ ۸۶ پر تقدیری تغیر کے نام سے گذر چکی ہے) پانی میں نجاست کے گرنے کی وجہ سے کچھ پانی متغیر ہوا اور کچھ نہ ہوا تو ایسی صورت میں اگر غیر متغیر پانی کی مقدار کم از کم قلتین ہے تو اتنا حصہ پاک ہی رہے گا۔ نجاست کی وجہ سے متغیر ہونے والے کثیر پانی کا تغیر اگر بذات خود (بغیر کسی چیز کے ملائے) زائل (ختم) ہو جائے تو پھر وہ پانی پاک ہو جائے گا۔

پانی میں مشک ملانے کی وجہ سے نجاست کی بدبو ختم ہو جائے یا سرکہ ملانے سے نجاست کا مزہ ختم ہو جائے یا زعفران ملانے سے نجاست کا رنگ زائل ہو جائے تو ان صورتوں میں پانی پاک نہیں ہوگا۔

اسی طرح مٹی اور گچ وغیرہ کی وجہ سے تغیر کا زوال بھی کافی نہیں۔ نجاست اتنی قلیل مقدار میں ہو کہ معتدل بینائی سے نظر نہ آئے تو پانی اور کپڑے دونوں میں معاف ہے، جیسے پیشاب کا باریک قطرہ، مکھی کا نجاست پر بیٹھنے کے بعد اڑ کر پانی یا کپڑے سے چھونا۔ نجس قلیل پانی میں پانی کے علاوہ کسی اور چیز کے ملانے سے وہ قلتین تک پہنچ جائے تب بھی پاک نہیں ہوگا بلکہ قلتین سے کم پاک پانی میں گلاب کا پانی ڈال کر قلتین تک پہنچایا جائے پھر اس میں کوئی نجاست گر جائے تو بھلے ہی پانی میں تغیر نہ آئے پانی نجس ہو جائے گا۔ صرف پانی کی مقدار اگر قلتین ہے تو پھر بغیر تغیر کے نجاست اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔

قلتین سے کم نجس پانی میں دوسرا پانی چاہے وہ مستعمل ہو یا غیر مستعمل پاک ہو یا نجس۔ شامل کر کے قلتین کی مقدار ہو جائے اور پانی میں کوئی تغیر نہیں ہے۔ تو یہ پانی اب مطہر ہو گیا۔ (وضو، غسل وغیرہ میں اسے استعمال کر سکتے ہیں۔) اگر نجاست کی وجہ سے تغیر ابھی باقی ہو، یا ابھی تک قلتین سے کم ہی مقدار ہو، تو پھر سارا پانی نجس ہی رہے گا۔

مذکورہ جن صورتوں میں قلتین تک پہنچنے کے بعد پانی طہور ہو جاتا ہے،، بعد میں تقسیم یا استعمال کی وجہ سے مقدار قلتین سے کم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، بلکہ پانی طہور ہی رہے گا۔

ٹھہرے ہوئے کثیر پانی میں جامد نجاست (ٹھوس نجاست جو پانی میں گھلتے نہیں جیسے مردہ) گرے تو اس پانی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔نجاست اور طہارت کے مسائل مین کنویں کے پانی کا حکم بھی دوسرے پانی کی طرح ہے۔لہٰذا کنویں کا قلیل پانی نجس ہو جائے تو پانی بڑھکر جب قلتین تک پہنچ جائے اور نجاست کا اثر نہ ہو تو طہور ہوگا۔چاہے پانی کنویں سے ہی نکلے یا باہر سے ڈالا جائے۔اور اگر کثیر پانی تغیر سے نجس ہو جائے تو خود بخود یا مزید پانی کے ملانے سے تغیر ختم ہو جائے تو طہور ہوگا،اسی طرح پانی کے گھٹانے سے تغیر ختم ہو اور بقیہ پانی قلتین سے کم نہ ہو تو طہور ہو جائے گا۔

پانی کے علاوہ دیگر مائع اور سیال اشیا میں نجاست کے گرنے سے وہ نجس ہو جائے گا،چاہے قلیل ہو یا کثیر،پانی میں ہی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی قوت کی وجہ سے کثیر ہونے کی صورت میں وہ نجس نہیں ہوتا۔

کسی کنویں سے وضوء کرتا رہا پھر اس میں پھولی ہوئی مرغی ملی،تو جو نمازیں بالیقین کنویں کا پانی نجس ہونے کے بعد اس سے وضو کر کے پڑھی ہیں،صرف انہیں کا اعادہ کافی ہے۔

نجاست کا ازالہ (نجاست دور کرنا)

نجس کی دو قسمیں ھیں۔ (۱)نجس العین (۲)غیر نجس العین

(نجس العین سے مراد وہ اشیاء ہیں جو بذات خود ہی نجس ہوں۔کسی نجاست کے لگنے سے نجس نہیں ہوئیں۔جیسے پیشاب،پاخانہ، خون وغیرہ،اور غیر نجس العین سے مراد وہ نجس اشیاء ہیں جو اپنے اصل کے اعتبار سے تو پاک ہیں،لیکن نجاست کے لگنے کی وجہ سے نجس ہوئی ہیں۔جیسے۔کپڑا جس پر پیشاب لگا ہو۔)

نجس العین میں سے صرف دو ہی چیزیں پاک ہو سکتی ہیں۔

۱)شراب جبکہ سرکہ بن جائے۔

۲)مردار کا چمڑا جبکہ اسے دباغت دیجائے۔

غیر نجس العین کی دو قسمیں ہیں۔(۱)نجاست حکمیہ (۲)نجاست عینیہ

(۱)جس نجاست کا ہونا یقینی ہے،لیکن کسی طرح محسوس نہیں ہوتی،اسے نجاست حکمیہ کہیں گے۔جیسے کپڑے پر پیشاب لگ کر خشک ہو چکی۔اور اس کی بدبو یا کوئی اور اثر باقی نہیں ہے،ایسی نجاست کے اوپر ایک مرتبہ پانی بہانا کافی ہے،وہ جگہ پاک ہو جائے گی۔ دوسری اور تیسری مرتبہ بھی پانی بہانا سنت ہے۔

(۲)جس نجاست کا اثر باقی ہو،اسے نجاست عینیہ کہا جائے گا۔

اس کے رنگ اور بو اور مزہ میں سے جو بھی اثرات موجود ہوں،اس کے مکمل ازالہ کی کوشش کرنا ضروری ہے۔باوجود کوشش کے نجاست کا مزہ باقی ہو تو ابھی جگہ پاک نہیں ہوئی۔اچھی طرح دھونے کے باوجود رنگ یا بو میں سے کوئی ایک وصف باقی ہو تو حرج نہیں،جگہ پاک ہو جائے گی،البتہ دونوں باقی ہوں تو وہ جگہ پاک نہ ہوگی۔

(اگر صرف پانی سے نجاست کے اثرات کا ازالہ ہو جاتا ہو تو دوسرے اشیاء کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں،لیکن صابون وغیرہ کے بغیر ازالہ ناممکن ہو تو پھر اس کا استعمال بھی ضروری ہوگا۔)(جمل ۱/ ۱۹۲)

اچھی طرح دھوکر جب عین کا ازالہ ہو جائے (یعنی نجاست کے سارے اثرات حسب بالاختم ہو جائیں) تو دوسری اور تیسری مرتبہ دھونا سنت ہے۔

طہارت کے حصول کیلئے دھونے کے بعد کپڑے وغیرہ کو نچوڑنا ضروری نہیں ہے۔

ازالہ کی کیفیت ۔ قلیل پانی کا نجس مقام پر ڈالنا و بہانا اور گرانا (یا خود بخود گرنا) ضروری ہے۔ اسکے برعکس نجس چیز کو قلیل پانی میں ڈال دیا تو طہارت حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ وہ پانی بھی نجس ہو جائے گا۔

(مثلاً ڈول میں قلتین سے کم پانی ہے اور نجس کپڑا اس ڈول میں ڈبو دیا تو پانی بھی نجس اور کپڑا بھی پورا نجس، لیکن ڈول کے پانی کو کپڑے پر گرا کر دھویا تو پاکی حاصل ہو جائے گی۔) (کثیر پانی میں نجس چیز کو ڈبو کر بھی دھویا جائے تو پاکی حاصل ہو جائے گی، لیکن پانی میں تغیر کا پیدا نہ ہونا ضروری ہے۔)

متفرق مسائل: زمین پر پیشاب ہو تو اس پر اچھی طرح پانی بہاوے، جو کہ اس پر غالب آئے اور اسے ڈھانک لے تو طہارت حاصل ہوگی۔

چکنی چیز جیسے تلوار، چھری، آئینہ وغیرہ پر نجاست لگ جائے تو صرف پونچھنے سے وہ پاک نہ ہوگی، بلکہ دھونا ضروری ہے۔

نجس پانی میں پکایا ہوا گوشت ظاہراً اور باطناً نجس ہو جائے گا۔ گوشت کو اوپر سے اچھی طرح دھونے سے اندر بھی پاک ہو جائیگا۔

چھری کو خوب گرم کر کے نجس پانی اس پر ڈال دیا گیا اور اس نے اس کو جذب کر لیا تو چھری نجس ہوگئی، بعد میں اوپر سے اچھی طرح پاک پانی سے دھو دینے سے وہ پاک ہو جائے گی۔ بدن پر لگی ہوئی نجاست کو جلد از جلد دور کرنا مستحب ہے۔ نماز وغیرہ کی ادائیگی کے ارادہ کے وقت واجب ہے، نجاست کے بدن پر لگانے میں اگر وہ گنہگار ہے، تو پھر فوراً اس کا ازالہ ضروری ہے۔

امام متولی وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب پانی نجاست پر وارد ہوتا ہے (واقع ہوتا ہے) تو اس میں قوت ہوتی ہے لہٰذا نجاست پر لگنے کے بعد بھی نجس نہیں ہوگا، بلکہ مطہر ہی رہے گا۔ لہٰذا اگر پانی کو کپڑے کے نجس حصہ پر گرا دیا جس کی وجہ سے رطوبت (تری۔ گیلا پن) پھیل جائے تو وہ جگہ نجس نہ ہوگی۔

پانی کو کسی نجس برتن میں ڈال دیا اور نجاست سے وہ متغیر نہ ہو تو وہ طہور ہی رہے گا۔ بعد میں برتن میں چاروں طرف پانی کو پھرائے تو سب پاک ہو جائے گا۔

نجاست کی وجہ سے کپڑا دھو کر نچوڑنے کے بعد اس پر دوبارہ نجاست گرے تو صرف اتنی جگہ کا دھونا کافی ہے مکمل کپڑا دھونے کی ضرورت نہیں۔

نجاست کے ازالہ اور دور کرنے کیلئے غسل یعنی دھونا اور محل نجاست پر پانی کا بہانا ضروری ہے۔ (صرف مسح یا چھڑکاؤ کافی نہیں ہے۔)

لیکن وہ لڑکا جس کی عمر دو سال سے کم ہو، اور غذا کے طور پر دودھ کے علاوہ کوئی اور چیز کھاتا پیتا نہ ہو، اسکے پیشاب پر اتنا پانی چھڑکنا کہ پیشاب کے سارے محل کو گھیرے اور اس پر غالب ہو جائے کافی ہے، جگہ پاک ہو جائے گی۔ اتنا پانی ڈالنا کہ بہنے لگے ضروری نہیں۔ (فتح الوهاب مع الجمل ۱/ ۱۸۸)

لڑکی کے پیشاب کو دوسری نجاستوں کی طرح دھونا ہی ضروری ہے۔

احادیث : (۱) حضرت ام قیس رضی اللہ عنہا اپنے ایک چھوٹے بیٹے کو جس نے ابھی کھانا شروع نہ کیا تھا، آپ ﷺ کی

خدمت میں لے گئیں تو آپ ﷺ نے اسے اپنے گود میں بٹھایا تو اس نے پیشاب کردیا، تو آپ ﷺ نے پانی منگوا کر اس پر چھڑک دیا اور اسے دھویا نہیں۔ (بخاری و مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا ''لڑکی کا پیشاب لگ جائے تو دھویا جائے گا، اور لڑکے کے پیشاب کی وجہ سے پانی چھڑک دیا جائے گا'' (ترمذی و حسنہ والحاکم و صححۂ۔الفتح مع الجمل ۱۸۹/۱۔شرح التنبیہ للسیوطی ۸۷/۱)

کتے اور خنزیر کی نجاست دور کرنے کا طریقہ

حدیث: ''کتا کسی کے برتن سے پیئے تو اسے سات مرتبہ دھوڈالے'' (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں مزید ہے، اس میں پہلی مرتبہ مٹی سے (تلخیص) ''کتے نے کسی چیز میں منہ ڈالا، یا اس کے خون یا پیشاب یا پسینہ یا بال یا کسی اور جزاور فضلہ کی وجہ سے کوئی چیز نجس ہوجائے تو طہارت کے لئے سات مرتبہ دھونا ضروری ہے جس میں ایک مرتبہ پاک مٹی کا ہونا ضروری ہے۔خنزیر کا حکم بھی کتے ہی کی طرح ہے۔مٹی کی جگہ صابون یا کوئی اور چیز استعمال کرنا کافی نہیں۔یا صرف پانی سے آٹھ مرتبہ دھوڈالے تو کافی نہیں ہے۔ان نجاستوں سے آلودہ کپڑے اور برتن کو صرف ماء کثیر میں ڈبونا کافی نہیں ہے۔اسی طرح نجس یا مستعمل مٹی کا استعمال کرنا بھی کافی نہیں ہے۔ایسی زمین میں جس پر مٹی ہو، مذکورہ نجاست لگ جائے تو وہاں پھر مٹی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں مٹی کو پانی میں گھولکر اس پانی کو نجس مقام پر بہائے۔صرف مٹی کو نجس مقام پر رکھنا کافی نہیں ہے۔(بلکہ رکھنے کے بعد اس پر پانی کا بہانا ضروری ہے) ایک ہی برتن میں کتے نے کئی مرتبہ منہ ڈالا، یا کئی کتوں نے منہ ڈالا، تب بھی سب کی طرف سے سات مرتبہ مذکورہ طریقہ سے دھونا کافی ہے۔کتے کی نجاست کے ساتھ کوئی اور نجاست بھی لگی ہو تو سات ہی مرتبہ دھونا کافی ہے۔(اس نجاست کی وجہ سے الگ سے ایک مرتبہ دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔) اگر کتے کی نجاست عینی ہو، جیسے اسکا خون یا پاخانہ تو اس عین کے ازالہ کیلئے جتنی مرتبہ بھی دھونا پڑے گا، وہ ایک شمار ہوگا۔

(مثلاً خون کا رنگ وغیرہ دور کرنے کیلئے پانچ چھ مرتبہ دھونا پڑا تو یہ سب ملکر ایک شمار ہوگا۔دوبارہ مستقل چھ مرتبہ اور دھونا پڑے گا۔)

مستحب یہ ہے کہ مٹی آخری مرتبہ استعمال نہ کرے بہتر یہ ہے کہ پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ دھوئے۔(گویا سب سے بہتر پہلی مرتبہ مٹی کا استعمال ہے ورنہ پھر آخری مرتبہ سے پہلے کسی بھی مرتبہ)

مسلم کی حدیث میں پہلی مرتبہ، ابوداود کی روایت میں آخری مرتبہ اور دارقطنی کی روایت میں کسی ایک مرتبہ مٹی کے استعمال کا حکم ہے، لہٰذا کسی بھی مرتبہ میں مٹی شامل کرنا کافی قرار دیا گیا۔(شرح التنبیہ للسیوطی ۸۶/۱)

کتے نے ایسے پانی میں منہ ڈالا، جو اسکے پینے کے باوجود دو قلے سے کم نہیں ہوا تو وہ پانی طہور ہی رہے گا اس برتن کو بھی دھونا ضروری نہیں۔

کتے کی نجاست سے نجس ہونے والی چیز اگر کسی دوسرے مقام پر لگ جائے تو اس مقام کو بھی اسی طرح سات مرتبہ دھونا ضروری ہوگا۔

(جیسے کتے کے منہ ڈالنے کی وجہ سے پانی نجس ہوگیا۔اب وہ پانی کسی کے کپڑے کو لگ جائے تو اس کپڑے کو بھی اسی ترتیب سے سات مرتبہ دھونا پڑے گا۔)

کسی جامد چیز میں کتا منہ لگائے۔(جیسے کھانا) تو جن حصوں پر اس کا منہ لگا ہے، الگ کردینے سے بقیہ چیز اپنی طہارت پر باقی رہے گی۔

جس برتن میں کتے نے منہ ڈالا ہو فی الحال اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً اس نجس پانی کو بہانا کوئی ضروری نہیں ہے۔
نجاست کی وجہ سے متغیر ماء کثیر میں کتے نے منہ ڈالا پھر وہ پانی کپڑے کو لگ گیا تو اسے سات مرتبہ دھونا، جس میں ایک مرتبہ مٹی بھی استعمال کرنا ضروری ہے۔

بلی: بلی کا جسم چونکہ پاک ہے اس لئے اسکا جھوٹا بھی پاک ہے اس میں کوئی کراہت بھی نہیں بلی کا منہ نجس ہونے کے بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہی پھر آ کر قلیل پانی یا کسی دوسری چیز میں اس نے منہ ڈبویا تو اس صورت میں اگر وہ اتنی دیر غائب رہی ہے کہ کسی اور جگہ پانی میں منہ داخل کر کے اس کے منہ کی پاکی کا امکان ہے تو مذکورہ پانی وغیرہ نجس نہ ہوگا، ورنہ نجس ہو جائیگا۔

نجاست کا دھون (غُسالہ)

(نجاست کے دھلنے میں نکلنے والے پانی کا حکم)

نجاست کو دھو کر پاک کرتے وقت جو پانی نکلے گا۔ اگر نجاست کے اثر سے وہ متغیر ہو تو نجس ہے اگر اس کی مقدار قلتین ہے اور کوئی تغیر بھی نہیں تو وہ پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ قلتین سے کم ہو تو دھونے کے بعد اس نجس جگہ کا جو حکم ہو گا وہی اس غسالہ (دھون) کا بھی حکم ہوگا۔ (دھونے کے بعد جگہ پاک ہو چکی ہے، تو غسالہ بھی پاک ہے، ابھی پاکی حاصل نہیں ہوئی، تو غسالہ بھی نجس ہے۔)
غسالہ میں تغیر تو نہ ہو لیکن نجاست کی وجہ سے اسکا وزن بڑھ چکا ہو تو وہ نجس ہوگا۔

ظروف (برتن)

ظروف کی تین قسمیں ہیں۔

(ا)۔ **کھال سے بنے ہوئے:** کھال دو صورتوں میں پاک ہوتا ہے۔ (الف) ''ماکول اللحم'' (وہ جانور جنکا گوشت حلال ہے) جانور کو ذبح کیا جائے تو اس کے گوشت کی طرح کھال بھی پاک ہے۔ غیر ماکول اللحم (جن جانوروں کا گوشت حرام ہے) کو ذبح کرنے کے باوجود کھال اور گوشت دونوں نجس ہوں گے۔

جزئیہ: اپاہج گدھے یا کسی اور غیر ماکول اللحم جانور کو اس کے کھال کی دباغت کیلئے ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔

(ب) مردار کے کھال کو دباغت دی جائے، کتے اور سور اور ان میں سے کسی کی اولاد کے علاوہ تمام مردہ جانوروں کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے، ماکول اللحم ہو یا غیر ماکول اللحم (ان کا گوشت حلال ہو یا حرام) دباغت میں کھال کے فاسد مادے مثلاً گوشت اور خون وغیرہ کو اچھی طرح دور کر کے ایسی حالت میں لانا ضروری ہے کہ بعد میں اگر پانی میں ڈالا جائے تو اس میں بگاڑ اور بدبو نہ پیدا ہو۔

دباغت: تیز اشیاء جیسے مازو، انار کا چھلکا، درخت سلم کے پتے سے ہونی چاہئے۔ صرف مٹی یا سورج کی دھوپ سے دباغت حاصل نہیں ہوتی۔ دباغت کے دوران پانی کا استعمال ضروری نہیں ہے۔ نجس اشیا جیسے کبوتر کی بیٹ سے بھی دباغت حاصل ہوگی۔ دباغت کے بعد یہ کھال نجس کپڑے کی مانند ہے۔ اب اسے پانی سے دھونے پر وہ پاک ہو جائے گا۔

دباغت سے کھال کا ظاہر و باطن پاک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی خرید و فروخت، تر چیزوں کیلئے استعمال کرنا اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ دباغت سے مردار کی کھال پاک تو ہو جائے گی، لیکن اس کا کھانا حرام ہے۔ مردار کی کھال دباغت سے پہلے ہی کراہت کے

ساتھ خشک اشیاء کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔اسی طرح اس کا ہبہ کرنا اور وصیت کرنا بھی جائز ہے۔

(۲) بال اور ھڈی: بال، اون، پر اور ہڈی موت کی وجہ سے نجس ہو جاتے ہیں۔انسان کے بال موت یا بدن سے جدائی کے بعد بھی نجس نہ ہوں گے۔نجس بال عرفاً قلیل ہوں تو پانی اور نمازی کے کپڑے میں وہ معاف ہے۔کھال پر بال ہوں تو دباغت سے وہ بال پاک نہ ہوں گے، لیکن قلیل مقدار میں ہو تو معاف ہے۔

''مأکول اللحم'' کو شرعی طریقے سے حلال کرنے سے اس کی ہڈیاں بھی پاک ہوں گی ان ہڈیوں سے بنے برتن کا استعمال جائز ہے۔نجس ہڈیوں کے برتن کو کراہت کے ساتھ خشک اشیاء کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔(لیکن پانی یا کوئی اور تر چیز ان برتنوں میں ڈالتے ہی نجس ہوں گے۔)

آپ ﷺ نے (حجۃ الوداع میں) سر کا دایاں جانب نائی کے سامنے کیا اور وہ بال حضرت ابوطلحہؓ کو عنایت فرمائے، پھر بایاں سامنے کیا اور اس نے مونڈھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے لوگوں میں تقسیم کرو۔(متفق علیه)(خلاصة البدر ۱/ ۲۴)

مردار کی ہڈیوں کو جلانا جائز ہے۔اگر بال نظر آئے لیکن پاک ہے یا نجس معلوم نہیں تو یہ دیکھئے کہ ماکول اللحم کا ہے یا غیر ماکول اللحم، ماکول اللحم کا ہے تو پاک، ورنہ ناپاک ہے۔یہی اندازہ نہ ہو کہ ماکول اللحم کا ہے یا نہیں تو وہ پاک ہے۔مردار کی کھال پر دباغت کے بعد بال ہوں تب بھی اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ کا گذر ایک مردہ بکری کے پاس سے ہوا تو فرمایا ''اس کی کھال کو دباغت دے کر اس سے نفع کیوں نہ اٹھایا'' (متفق علیه)

(۲) کھال کو دباغت دی جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔(رواه مسلم)

(۳) جس کھال کو بھی دباغت دی جائے تو وہ پاک ہے۔(رواه الشافعي والترمذي وقال حسن صحيح) (خلاصة البدر ۱/۲۳)

(۳) سونے اور چاندی کے برتن: سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال مرد و عورت دونوں پر حرام ہے، ان برتنوں سے کھانا پینا وضو کرنا، چاندی کے چمچے سے کھانا، چاندی کی بوتل سے گلاب پانی کی خوشبو کا استعمال اور چاندی کی انگیٹھی (عود سوز) سے دھونی لینا سب حرام ہے۔دور سے خوشبو آ رہی ہو تو حرج نہیں۔

حدیث: ''سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا منع ہے'' (متفق علیه) (خلاصة البدر ۱/ ۲۵)

مذکورہ برتنوں کے استعمال کے بغیر صرف ان کا بنانا اور رکھنا بھی حرام ہے۔لہٰذا ان کا بنانے والا اُجرت کا مستحق بھی نہیں۔اور کوئی اس طرح کے برتن کو توڑ ڈالے تو اس پر کوئی تاوان بھی نہیں آئے گا۔اور ان سے گھر وغیرہ کو مزین کرنا بھی حرام ہے۔چھوٹا اور معمولی سا برتن مثلاً سرمہ دانی، عطر دانی وغیرہ بھی سونے چاندی کا حرام ہے۔

فیروز، یاقوت اور زبرجد جیسے نفیس جواہرات سے بنے برتن حرام نہیں، البتہ مکروہ ہیں۔اسی طرح کاریگری اور صناعی کی باریکی کے اعتبار سے نفیس اور قیمتی برتن بھی حرام نہیں۔

سونے یا چاندی کا طلا (پانی چڑھانا): کسی چیز پر سونے یا چاندی کا طلا مطلقاً حرام ہے، کم ہو یا زیادہ، عورت کا زیور ہو یا کوئی اور شی۔

اس طرح طلا شدہ چیز کے استعمال کا حکم یہ ہے کہ اگر آگ پر تپانے سے سونا چاندی بالکل حاصل نہیں ہوسکتا تو جائز ہے۔اور طلائی مقدار زیادہ ہونے کی وجہ سے آگ پر تپانے سے سونا چاندی حاصل ہوسکتی ہے،تو عورتوں کے زیورات کی حد تک ان کو استعمال کی اجازت ہے۔بقیہ چیزوں میں ایسی صورت میں استعمال بھی حرام ہے۔آگ کے علاوہ کسی کیمیائی مادّے سے سونے یا چاندی کو جدا کرنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

سونے یا چاندی پر طلا: چاندی یا سونے پر کسی اور دھات کا طلا کیا گیا اور طلا کی مقدار اتنی کم ہے کہ آگ سے اسے جدا کر کے حاصل نہیں کر سکتے تو اسکا استعمال حرام ہے۔ورنہ جائز ہے سونے یا چاندی کو تنہا یا کسی اور شی میں ملا کر بطور دوائی اور علاج کے استعمال کرنے میں حرج نہیں۔(کانچ کے گلاس وغیرہ پر بھی سونے یا چاندی کا پانی چڑھانا جائز نہیں ہے۔اور استعمال کے متعلق مندرجہ بالا تفصیل کو مدنظر رکھے۔)

تضبیب (برتن میں پیوند لگانا)

کسی برتن میں سوراخ وغیرہ کی وجہ سے یا اس کے بغیر کسی دھات کا ٹکڑا چپکا دینا تضبیب (پیوند کاری) کہلاتا ہے۔اگر چاندی کے ذریعے تضبیب ہو تو اس کا حکم حسب ذیل ہے۔

(۱) چاندی قلیل مقدار میں بقدر حاجت استعمال ہوئی ہو تو اس برتن کے استعمال میں کوئی حرمت یا کراہت نہیں ہے۔

(۲) چاندی زیادہ مقدار میں اور حاجت سے زائد ہو تو استعمال حرام ہے۔

(۳) چاندی کم لیکن حاجت سے زیادہ ہو تو مکروہ ہے۔

(۴) چاندی زیادہ لیکن بقدر حاجت ہو تو مکروہ ہے۔

یہاں حاجت سے ٹوٹے ہوئے حصے کی اصلاح اور درستگی مراد ہے۔چاندی کے کم یا زیادہ ہونے کا فیصلہ عرف کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

تضبیب کیلئے سونے کا ٹکڑا استعمال کرنا مطلقاً حرام ہے۔کوئی اپنے چلو سے پانی پئے اور اس کی انگلی میں انگوٹھی ہو تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔سونے چاندی کے برتن فروخت کرے تو بیع صحیح ہوگی (اگر چہ جائز نہیں ہے) اسی طرح ان برتنوں سے وضو کرے تو ہو جائے گا،لیکن اس حرکت کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔ان برتنوں میں کھانا پینا تو حرام ہے۔لیکن جو چیز (مثلاً غذا یا پانی) اس میں رکھی ہو تو وہ حلال ہی رہے گی۔

صفة الوضو (وضو کے مسائل اور تفصیلات)

آیت: "يٰا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلوٰةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ أَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَ إِنْ كُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوْا وَ إِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى أَوْ عَلٰى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْداً طَيِّباً فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ أَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"۔(سورہ مائدہ۔آیت ۶)

ترجمہ: اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو بھی کہنیوں سمیت اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرد

اور اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارا بدن پاک کرو۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے (ملامسہ کیا ہو) قربت کی ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو۔ یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر ہاتھ پھیر لیا کرو، اس زمین پر سے، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں، لیکن اللہ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک وصاف رکھے اور یہ کہ تم پر انعام فرماوے تا کہ تم شکر یہ ادا کرو۔

احادیث : (۱) آپ ﷺ نے فرمایا۔ جس نے بہترین طرز پر وضو کیا، اس کے گناہ اس کے بدن سے نکل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسکے ناخن کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں (متفق علیه، عن عثمان، مشکوۃ ۱ / ۳۸)

(۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضوء کے وقت دونوں ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی بہایا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالکر اسے صاف کیا، پھر تین مرتبہ چہرہ دھویا پھر دایاں ہاتھ کہنیوں سمیت تین مرتبہ دھویا، پھر بایاں ہاتھ کہنیوں سمیت تین مرتبہ دھویا، پھر سر کا مسح کیا پھر دایاں قدم تین مرتبہ پھر بایاں قدم تین مرتبہ دھویا، اور اسکے بعد فرمایا کہ میں نے آپ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ" جو میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے، پھر دو رکعت نماز اس طرح ادا کرے کہ پوری نماز میں اپنے جی میں کسی طرح وسوسہ نہ لائے، تو اس کے گذشتہ سارے گناہ بخشے جائیں گے۔" (متفق علیه ،مشکوۃ ۱ /۳۹)

تشریح: اس حدیث کے ضمن میں علماء کرام نے لکھا ہے کہ خود بخود کوئی وسوسہ آئے اور اس سے اعراض کرے تو بھی یہ فضیلت ان شاء اللہ حاصل ہو جائے گی۔ جن روایتوں میں وضو نماز یا دیگر عبادتوں کی وجہ سے گناہوں کی بخشش کا وعدہ ہے، علماء نے اسے دلائل کی روشنی میں صغیرہ گناہوں کے ساتھ خاص کیا۔ کبیرہ گناہوں کی بخشش کیلئے اصولاً صحیح توبہ ضروری ہے۔

(۳) "آپ ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ جو مسلمان بہترین اور کامل وضو کر کے ظاہراً و باطناً پوری توجہ کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرے یقیناً اس کے لئے جنت واجب ہو چکی۔" (مسلم عن عقبه ،مشکوۃ ۱ /۳۹)

لفظ وضوء، وَضَاءۃ سے مشتق ہے، جس کا مطلب لغت میں پاکیزہ اور خوبصورت ہونا ہے۔ شرعاً نیت سے شروع کرتے ہوئے بعض مخصوص اعضاء میں پانی کے استعمال کو وضو کہتے ہیں، جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ چونکہ اس کی برکت سے گناہوں کی تاریکی چھٹ کر نورانیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اسے وضوء سے تعبیر کیا گیا۔ صحیح احادیث سے ثابت ہیکہ سابقہ شریعتوں میں بھی وضو مشروع تھا۔ اس لئے معراج کے واقعہ سے قبل بھی مسلمان باوضو ہی نماز ادا کیا کرتے تھے، لیکن بطور استحباب یا نظافت کے، ہجرت سے کچھ قبل شب معراج میں نماز کے ساتھ ساتھ وضو بھی فرض کیا گیا۔ مخصوص کیفیات کے ساتھ، یا اعضاء وضو کا قیامت کے دن پر نور ہونا امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کی خصوصیت میں داخل ہے۔

اعضاء اربعہ کی حکمت۔ (وضو میں صرف چار اعضاء کے پاکی کی حکمت) سارے بدن کو دھونے کا حکم باعث مشقت ہوتا اس لئے شریعت نے تخفیفاً وضو میں صرف چار اعضاء کو مشروع کیا، اور اس لئے بھی کہ خیر و شر کا صدور انہیں اعضاء سے ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ حور عین سے صحبت کی خاطر استنجاء کو مشروع کیا گیا، جنت کے دستر خوان سے تناول کیلئے ہاتھ دھونا، رب العالمین سے کلام کیلئے کلی کرنا، جنت کی خوشبوؤں سے لطف اندوز ہونے کیلئے ناک میں پانی لینا، دیدار الٰہی کی دولت سے سرفراز ہونے کیلئے چہرہ کا دھونا، کنگن سے مزین ہونے کے لئے کہنیوں سمیت ہاتھ دھونا، تاج پہننے کیلئے سر کا مسح، اللہ رب العزت کے کلام سے محظوظ ہونے کیلئے کان کا مسح اور جنت کی سیر کیلئے قدموں کا دھونا مشروع کیا گیا۔ (حاشیه الجمل ۱ /۱۰۰)

وضو میں کچھ فرائض اور کچھ سنتیں ھیں۔

وضو کے فرائض: وضو کے فرائض چھ(٦) ہیں۔(١)نیت

حدیث: ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔'' (صحاح ستہ)

شرعاً کسی فعل کے ابتداء میں متصلاً اس فعل کے قصدوارادہ کو نیت کہتے ہیں۔

نیت کا اصل مقام دل ہے، لہٰذا جہاں بھی نیت کو فرض کہا جائے گا۔تو اس سے قلبی اور دلی نیت مراد ہے، زباں سے ادائیگی مراد نہیں ہے۔

نیت وضو وغسل میں ضروری ہے۔نجاست کے دور کرنے کیلئے نیت کی ضرورت نہیں۔کافر کا وضو وغسل صحیح نہیں ہے۔وضو یا غسل کرنے کے بعد کوئی مسلم مرتد ہو جائے (اسلام چھوڑ بیٹھے) تو اس کا وضو اور غسل باطل نہ ہوگا۔لیکن تیمم کے بعد کوئی مرتد ہو جائے تو تیمم باطل ہوگا۔

نیت کا وقت: چہرہ کا کچھ حصہ دھلنے کے بعد نیت کافی نہیں، ایسی صورت میں نیت سے پہلے جتنا دھلا اسکا اعتبار نہ ہوگا، اس کا دوبارہ دھونا ضروری ہے۔چہرہ دھونا شروع کرتے وقت نیت پائی جائے، نہ اس سے پہلے نیت تھی اور نہ بعد میں رہی تو وضوء صحیح ہوگا۔لیکن چہرہ سے پہلے وضو کی سنتوں کا ثواب نہیں ملے گا۔وضو کے ابتداء سے نیت ہو اور چہرہ دھونا شروع کرنے تک وہ نیت موجود ہے تو صحیح ہے۔اور سنتوں کا بھی ثواب ملے گا۔وضو کے ابتدائی سنتوں میں سے کسی سنت کے ساتھ نیت پائی گئی (جیسے بسم اللہ پڑھنا، مسواک، ہتھیلیوں کا دھونا، کلی، ناک میں پانی لینا) پھر چہرہ دھونے سے پہلے نیت غائب ہو جائے، دل میں موجود نہ ہو تو وضوء صحیح نہ ہوگا۔کلی یا ناک میں پانی لیتے وقت وضو کی نیت ہو اور چہرہ کا بھی کچھ حصہ ساتھ میں دھل جائے۔تو بعد میں نیت غائب ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

چہرہ کا وہ حصہ دھلتے وقت چہرہ کی نیت تھی تو اسے دوبارہ دھونا ضروری نہیں ہے۔ورنہ ضروری ہے۔

نیت کی کیفیت: جو دائم الحدث نہیں ہے، اس کے لئے حدث دور ہونے کی یا حدث سے پاکی کی یا اداء وضو یا فرض وضو کی نیت کرنا کافی ہے جیسے نَوَیْتُ فَرْضَ الْوُضُوءِ اسی طرح ہر وہ فعل جو وضو کے بغیر ناجائز ہو، اسے مباح اور جائز کرنے کی نیت کرتا ہوا وضو شروع کرے تو بھی صحیح ہے، جیسے نماز جائز ہونے کیلئے سجدہ تلاوت یا سجدہ شکر یا طواف کعبہ مباح اور جائز ہونے کیلئے۔لہٰذا عربی میں یوں کہیں گے ''نَوَیْتُ اِسْتِبَاحَةَ الصَّلٰوةِ یا نَوَیْتُ اِسْتِبَاحَةَ سَجْدَةِ التِّلَاوَةِ یا نَوَیْتُ اِسْتِبَاحَةَ الطَّوَافِ'' کسی نے وضو کے وقت تلاوت قرآن یا حدیث یا سلام یا بازار کا دخول جائز ہونے کی نیت کی تو وضو صحیح نہ ہوگا۔اس لئے کہ مذکورہ امور کیلئے وضو ضروری نہیں ہے (فتح الوھاب وغیرہ) حدث کے شک کی وجہ سے احتیاطاً وضو کرنے کے بعد حدث کا یقین ہوا تو یہ وضو کافی نہیں، اس لئے کہ تردد کے ساتھ کیا تھا۔اب یقین حاصل ہوا تو دوبارہ وضو ضروری ہے۔حدث کا یقین ہو اور طہارت میں شک ہو، پھر وضو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ بے وضو ہی تھا، تو یہ وضو کافی ہے۔

دائم الحدث: جس کو بار بار ریح خارج ہونے (گیس نکلنے) یا پیشاب کے قطرے ٹپکنے کی شکایت ہو یا کوئی اور مرض جس کی وجہ سے وضو بالکل ٹھہرتا نہ ہو، اسے دائم الحدث کہیں گے۔دائم الحدث کیلئے صرف حدث دور کرنے یا فرض وضو وغیرہ کی نیت کافی نہیں، اسکے لئے استباحۃ الصلوٰۃ کی نیت ضروری ہے، اسکے ساتھ رفع حدث یا فرض وضو کی نیت کا بھی ملا لینا افضل ہے۔

دونیتیں: وضو یا غسل کی معتبر نیت کے ساتھ کسی ایسی چیز کا بھی قصد کرے جو بغیر قصد کے بھی حاصل ہوتی ہو، تو وضو صحیح ہوگا۔

جیسے وضو کے ساتھ ٹھنڈک حاصل کرنے کی نیت کرے۔ جنبی شخص جمعہ کے دن جنابت اور جمعہ دونوں کی نیت سے ایک غسل کرے تو دونوں غسل حاصل ہو جائیں گے۔ صرف جنابت کی نیت کرے تو جمعہ کا غسل حاصل نہ ہوگا مسجد میں داخل ہونے کے بعد فرض نماز کے ساتھ تحیۃ المسجد کی بھی نیت کرلے تو دونوں حاصل ہو جائیں گے۔

متفرق: تین تین مرتبہ وضو کر رہا تھا، پہلی مرتبہ کسی عضو کے دھونے میں تھوڑا حصہ خشک رہ گیا، پھر دوسری یا تیسری مرتبہ جب بطور نفل دھو رہا تھا تو وہ حصہ دھل گیا تو یہ کافی ہے۔ وضو کرتے وقت کوئی حصہ خشک رہے، بعد میں تجدید کی نیت سے پھر وضو کرے اور اس وقت وہ خشک حصہ دھل جائے تو یہ کافی نہیں (تجدید کا مطلب ہے باوضو ہونے کے باوجود دوبارہ وضو کرنا) لیکن اس صورت میں مذکورہ شخص اگر اپنے اس وضو کو بھول کر رفع حدث وغیرہ کی نیت سے از سرنو وضو کرتا ہے تو اس کا وضو صحیح ہے۔ وضو کی نیت کو اعضاء وضو پر تقسیم کر دے، یعنی ابتداءً مکمل وضو کی نیت نہ کرتے ہوئے ہر عضو کے دھونے کے وقت صرف اس عضو کے حدث کو دور کرنے کی نیت کرے تو وضو صحیح ہو جائے گا۔ (مثلاً چہرہ دھوتے وقت چہرہ کے رفع حدث کی ہاتھ دھوتے وقت ہاتھ کے رفع حدث کی نیت کرے) شوافع علماء کا قول یہ ہے کہ دل اور زبان دونوں سے نیت کرنا مستحب ہے۔ اگر صرف دل میں نیت ہو تو کافی ہے، لیکن صرف زبان سے الفاظ ادا کرلے، لیکن دل میں نیت نہیں، تو یہ ناکافی ہے۔ دل اور زبان کی نیت میں فرق ہو تو دل کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ کوئی صرف طہارت کی نیت کرے (حدث سے طہارت کی نیت نہ کرے) تو یہ کافی نہیں۔ عورت حیض سے پاکی کے غسل میں شوہر کے لئے وطی (صحبت) کے جواز کی نیت کرے تو غسل صحیح ہے۔ وطی کے ساتھ نماز وغیرہ بھی جائز ہوں گے۔ کسی کو زبردستی نہر میں ڈال دیا گیا اور اس نے نہر میں وضو کی نیت کرلی تو وضو ہو گیا۔ وضو کرنے والا پیروں کے علاوہ سارے اعضاء دھونے کے بعد نہر میں گر جائے اور دونوں پیر دھل جائے تب اس کے ذہن میں وضو کی نیت حاضر ہو تو وضو صحیح ہو گیا، ورنہ پیروں کا دھونا ابھی باقی رہے گا۔ نماز اور قرض خواہ کو ٹالنے، دونوں نیت سے نماز شروع کی تو صحیح ہے۔ وضو کے بعد وضو کے توڑنے کی نیت کر لینے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔

(۲) چہرہ دھونا: مکمل چہرہ دھونا ضروری ہے۔ چہرہ کے حدود۔ لمبائی میں پیشانی کے آخری سرے پر عموماً بال اگنے کے مقام سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک اور عرض میں ایک کان سے دوسرے کان تک، کان چہرہ میں داخل نہیں ہے۔ پیشانی کے دونوں طرف اوپری حصے میں سر کا کچھ حصہ عموماً بالوں سے عاری (خالی) ہوتا ہے۔ وہ چہرہ میں داخل نہیں ہے۔ اسی طرح سر کے آگے کے بال جھڑ جائیں تو وہ چہرہ کے حد میں نہیں سمجھا جائے گا، لیکن ان دونوں کا دھونا مستحب ہے۔ اگر پیشانی پر بال اُگ آئیں تب بھی وہ چہرہ کے حد میں داخل ہے۔ اور اس کا دھونا فرض ہے۔ چہرہ کے حد میں اگنے والے وہ بال جو عموماً ہلکے ہوتے ہیں، زیادہ گھنے اور گنجان نہیں ہوتے جیسے ابرو، پلک، مونچھ اور رخسار پر کان کے مقابل بال، ان کا ظاہر و باطن مع اندرونی کھال کے دھونا ضروری ہے گرچہ یہ بال کسی کے گنجان ہوں۔ داڑھی اور رخسار کے بال اگر خفیف اور ہلکے ہیں تو اندرونی کھال سمیت ظاہر و باطن کا دھونا ضروری ہے اور اگر کثیف اور گنجان ہوں تو صرف ان بالوں کے ظاہر کا دھونا واجب ہے۔ اگر کچھ حصہ خفیف اور کچھ کثیف ہو تو دونوں کا اپنا حکم ہوگا۔ یعنی کثیف کے صرف ظاہر کو دھونا اور خفیف کو کھال سمیت مکمل دھونا ضروری ہے۔

فرق: گفتگو کے وقت اندرونی کھال نظر آئے تو بال خفیف، اور نظر نہ آئے تو کثیف۔ عورت کے داڑھی اُگ آئے اور کثیف ہو تب بھی اسکے باطن و کھال کا دھونا ضروری ہے، اس لئے کہ یہ ایک نادر صورت ہے۔ ریش بچہ (داڑھی بچہ) کثیف ہونے کے باوجود باطن و کھال کا دھونا ضروری ہوگا۔ داڑھی، رخسار، مونچھ یا رخسار پر کان کے مقابل بال بڑھ کر چہرہ کے حد سے باہر نکل جائیں تو ان کے ظاہر کا

دھونا ضروری ہے۔ چہرہ دھوتے وقت سر، گردن اور ٹھوڑی کے نیچے کا کچھ حصہ بھی دھونا ضروری ہے۔ تاکہ بالیقین مکمل چہرہ دھل جائے۔ کسی کی ناک یا ہونٹ کٹا ہو، تو کٹنے کے بعد جو حصہ کھل چکا ہے، وضو اور غسل میں اس کا دھونا ضروری ہے۔ چہرہ میں پھوڑا یا رسولی نکلے اور بڑھ کر چہرہ کے حد سے نیچے چلا جائے تو اسے مکمل دھونا ضروری ہے۔ چہرہ دھونے کیلئے دونوں ہاتھ سے پانی لینا مستحب ہے۔

(۳) دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت دھونا: کہنی کے اوپر سے ہاتھ کٹا ہوا ہو تو دھونا فرض نہیں ہے، لیکن باقی بازو کا دھونا مستحب ہے، تاکہ وہ عضو طہارت سے خالی نہ رہے۔ اگر کہنیوں سے نیچے کٹا ہو، تو بقیہ حصہ کا دھونا واجب ہے اگر کہنی کے جوڑ سے کٹا ہو تو بقیہ ہڈی کے کنارے کا دھونا واجب ہے۔ کسی کو ایک ہی جانب دو ہاتھ ہوں، اور اصلی ہاتھ اور زائد ہاتھ واضح ہو تو ایسی صورت میں زائد ہاتھ اگر اصلی ہاتھ کے محل فرض (یعنی وہ حصہ جس کا وضو میں دھونا فرض ہے۔ جیسے بازو یا کہنی) سے نکلا ہے تو اصلی سمیت اس کا دھونا بھی واجب ہے۔ اس کی لمبائی اصلی سے کم ہو یا زائد جیسے کہ زائد انگلی یا رسولی کا دھونا واجب ہے۔ زائد ہاتھ اگر محل فرض سے بھی اوپر نکلے (جیسے کاندھے سے) اور محل فرض کی محاذات اور سیدھ میں نہ ہو تو اسے بالکل دھونے کی ضرورت نہیں اگر محل فرض کی سیدھ میں ہو تو جتنا حصہ سیدھ میں ہے اس کا دھونا واجب۔ زائد اور اصلی میں فرق نہیں کر سکتے تو ہر حال میں دونوں کا دھونا واجب ہے۔ ایک ہاتھ کا کافی چھوٹا ہونا (جبکہ دوسرا معتدل ہو۔) یا اس کی انگلیاں کم ہونا یا قوت گرفت (کسی چیز کو پکڑنے کی قوت) بالکل نہ ہونا یا کم ہونا اس ہاتھ کے زائد ہونے کی علامتوں میں سے ہے، ناخن کافی لمبے ہو کر انگلیوں کے سروں سے آگے نکل جائے تو ان کا دھونا واجب ہے۔ بازو یا پیر پر گھنے بال ہوں تب بھی اس کے ظاہر و باطن اور کھال کا دھونا واجب ہے۔ وضو کے بعد ہاتھ یا پیر کٹے یا سر مونڈے، تو کھلے ہوئے حصہ کو دوبارہ دھونا لازم نہیں ہے۔ دوبارہ وضو کرتے وقت ان حصوں کا دھونا ضروری ہے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں سوراخ یا چھید ہو، تو اسکے اندر بھی دھونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی ظاہر ہو چکا۔ ہاتھ کٹا ہوا شخص یا مریض خود وضو کرنے پر قادر نہ ہو، تو کسی ایسے شخص کا سہارا حاصل کرنا ضروری ہے، جو اسے وضو کرائے جبکہ ایسا سہارا مفت مل رہا ہو یا مناسب اجرت (مزدوری) پر اور مذکورہ شخص اجرت بھی دے سکتا ہو۔ اگر وضو کرانے والا کوئی سہارا ہی نہیں۔ یا وہ اجرت مانگ رہا ہو اور یہ دے نہیں سکتا یا دے تو سکتا ہے لیکن وہ زیادہ اجرت مانگ رہا ہے تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ لیکن چونکہ اس طرح کا عذر نادر ہے (کبھی کبھار ہی پیش آتا ہے) اس لئے بعد میں اس نماز کا اعادہ (لوٹانا) ضروری ہے۔ اگر تیمم بھی نہیں کر سکتا تو اسی حال پر نماز پڑھ لے اور آئندہ اس نماز کو دوہرائے۔

(۴) سر کا مسح کرنا: صرف اتنا مسح کرنا جسکو مسح کہا جا سکے کافی ہے، اگر چہ ایک بال کے کچھ حصہ کا یا اسکے بقدر سر کی کھال کا مسح ہی ہو، سر پر مکمل بال ہوں اور صرف کھال کا مسح کرے تب بھی کافی ہے۔ صرف انھیں بالوں پر مسح معتبر ہوگا جو کھینچے جانے کی صورت میں سر کے حد سے باہر نہ نکل جائیں۔ مسح کرنے کے بجائے کسی نے سر دھو دیا، یا پانی کا ایک قطرہ ٹپکا دیا، یا تر ہاتھ سر پر صرف رکھا، پھیرا نہیں، تو بھی کافی ہوگا۔ مسح کے بجائے سر دھونا نہ تو مستحب ہے اور نہ مکروہ ہے۔ مسح ہاتھ سے ہی ہونا ضروری نہیں، بلکہ صرف انگلی، لکڑی یا کپڑے کے ٹکڑے وغیرہ سے مسح کرنا بھی جائز ہے کسی اور نے سر پر مسح کیا تو یہ بھی کافی ہے۔ مسح میں عورت کا حکم بھی مرد ہی کی طرح ہے۔ کسی کو دو سر ہوں تو کسی ایک پر مسح کافی ہے۔

(۵) دونوں قدم ٹخنوں سمیت دھونا: زائد پیر کا وہی حکم ہے جو زائد ہاتھ کا۔ جس پر حدث اصغر اور اکبر دونوں ہوں، (یعنی وضو اور غسل دونوں ضروری ہوں) تو صرف غسل کی نیت سے سارا بدن دھونا کافی ہے، ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں (غسل کے ضمن میں وضو بھی حاصل ہو جائے گا جدا وضو کرنا ضروری نہیں) پیر کے علاوہ سارا بدن دھونے کے بعد وضو توڑنے والا کوئی سبب

پایا جائے، تو اسے پیروں کو جنابت کی طرف سے دھونا اور بقیہ اعضاء وضو کو حدث اصغر کی طرف سے دھونا ضروری ہے۔ مذکورہ صورت میں ابتدائی تینوں اعضاء میں ترتیب ضروری ہے، لیکن پیر کبھی بھی دھوسکتا ہے۔

(۶) ترتیب: جیسے بتایا گیا اسی ترتیب سے وضو کرنا ضروری ہے، یعنی پہلے نیت کرنا، پھر چہرہ دھونا، پھر ہاتھ، پھر سر کا مسح اور آخر میں پیر دھونا۔ بھول کر یا عمداً ترتیب کی خلاف ورزی ہو، تو وضو صحیح نہ ہوگا۔ البتہ چہرہ کا دھونا معتبر ہوگا اور اس کے بعد ترتیب سے جو ادا کرے وہ بھی معتبر ہوگا چار اشخاص نے کسی کے چاروں اعضاء وضو کو اس کی اجازت سے بیک وقت دھودیا تو صرف چہرہ کا دھونا شمار ہوگا۔ کسی نے پانی میں غوطہ لگا کر وضو کی نیت کرلی تو کافی ہے، ترتیب کے تحقق کیلئے تھوڑی دیر پانی میں ٹھہرنا ضروری نہیں ہے۔

منی یا مذی میں تردد: کسی کی شرمگاہ سے ایسی تری نکلے جس کے منی یا مذی ہونے میں اشتباہ وشک ہو تو اسے اختیار ہے کہ اسے منی سمجھتے ہوئے غسل کرلے، یا مذی سمجھتے ہوئے جہاں جہاں وہ لگا ہوا سے دھوڈالے اور وضو کرلے۔

وضو کی سنتیں

(۱) مسواک کرنا: لکڑی جیسی چیز سے دانتوں کو اور اطراف کے مقامات کو رگڑ کر صاف کرنے کو مسواک کرنا کہتے ہیں۔ (حاشیة الجمل ۱/۱۱۶)

احادیث

(۱) آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر میری امت کی تکلیف کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انھیں عشاء کو تاخیر سے پڑھنے کا اور ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔'' (متفق علیه ۔عن ابی هریرة مشکوة ۱/ ۴۴)

(۲) حضرت حذیفہؓ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ رات جب تہجد کیلئے بیدار ہوتے تو مسواک سے دندان مبارک کو اچھی طرح رگڑ کر دھوتے۔ (متفق علیه۔ مشکوة ۱/۴۴)

(۳) آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''مسواک منہ کی پاکی کا سبب اور رضاء الٰہی کے حصول کا باعث ہے۔'' (رواه الشافعی۔واحمد۔والنسائی عن عائشه ۔ورواه البخاری معلقاً مشکوة ۱/ ۴۴)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے'' مسواک کرکے پڑھی جانے والی نماز بغیر مسواک کے نماز پر ستر درجہ فوقیت رکھتی ہے'' (رواه البیهقی فی شعب الایمان عن عائشه ۔مشکوة ۱/ ۴۵)

صرف روزہ دار کیلئے زوال کے بعد سے غروب تک مسواک کرنا مکروہ ہے، بقیہ تمام اوقات میں مسواک کرنا مستحب ہے، بعض خاص مواقع میں مسواک کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، جو درج ذیل ہیں۔ نماز کے وقت اگر چہ منہ میں بدبو نہ ہو، وضو کے وقت، اگر چہ اس وقت نماز نہ پڑھے۔ قرآن کی تلاوت کیلئے۔ دانتوں میں زردی آجائے تو، چاہے منہ میں بدبو نہ ہو۔ نیند۔ طویل خاموشی۔ کچھ نہ کھانے یا کسی بدبودار چیز کے کھانے سے یا کسی اور سبب سے منہ میں بو پیدا ہوجائے۔ گھر میں داخل ہوتے وقت اور نیند سے بیدار ہونے پر بھی مسواک کی تاکید ہے ان مواقع میں بھی مسواک کی تاکید ہے۔ سجدہ تلاوت کیلئے تلاوت کے بعد اور سجدہ سے قبل، کوئی شخص دو دو رکعت نماز پڑھ رہا ہو تب بھی ہر نماز کیلئے مسواک مطلوب ہے۔ اگر نماز سے پہلے مسواک کرنا بھول جائے اور دوران نماز یاد آجائے تو خفیف حرکت کے ساتھ تلافی کرے۔ (کثیر حرکت کی صورت میں نماز باطل ہوگی۔) فاقد الطهورین (جو وضو اور تیمم دونوں نہ کرسکے) اور تیمم کرکے نماز

پڑھنے والے کیلئے بھی مسواک سنت ہے۔ نماز جنازہ کیلئے۔ سجدہ شکر کیلئے۔ ذکر کیلئے۔ تعلیم و تعلم (سکھانا اور سیکھنا) اور حدیث و دیگر شرعی علوم سننے کیلئے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت۔ سوتے وقت۔ بھوک و پیاس کے وقت۔ کھانے کے بعد۔ سحری کے وقت۔ وتر کے بعد۔ سفر کیلئے۔ سفر سے واپسی پر۔ سکرات کے وقت تاکہ روح کے نکلنے میں آسانی ہو۔ جماع کے وقت۔ مذکورہ تمام اوقات کی پابندی دشوار ہو تو جتنا ممکن ہو انجام دے۔ وضو کے ابتداء میں مسواک بھول جائے تو دوران وضو یاد آنے پر اس کی تلافی کرے۔ (حاشیہ الجمل ۱/۱۲۱)

مسواک کپڑے کے ایک ٹکڑے اور ہر کھردری چیز سے حاصل ہوگا۔ (لہٰذا برش سے بھی مسواک کی اصل سنت حاصل ہوگی) لیکن لکڑی افضل ہے۔ اَرَاک (پیلو) کی لکڑی سے زیادہ بہتر ہے۔ پیلو کی خشک لکڑی جو پانی سے تر شدہ ہو، اولیٰ ہے۔ کھردری انگلی سے مسواک کی فضیلت حاصل نہ ہوگی۔ دوسرے کی کھردری انگلی سے مسواک کی فضیلت حاصل ہوگی، امام رویانیؒ وغیرہ کے نزدیک اپنی انگلی سے بھی حاصل ہوگی۔ اسی قول کو مجموع میں امام نوویؒ نے ترجیح دی ہے۔ (فتح الوھاب مع حاشیۃ الجمل ۱/۱۱۹) مستحب ہے کہ مسواک دانتوں کے عرض میں کرے، طول میں کرنا مکروہ ہے، لیکن زبان پر طول میں کرے۔ منہ کے دائیں جانب سے مسواک کی ابتداء کرے، چھوٹے بچوں کو بھی مسواک کی عادت ڈالے۔ دوسرے کی اجازت سے اس کا مسواک استعمال کر سکتے ہیں۔ حلق کے اوپر کی طرف نرمی سے مسواک پھیرنا مستحب ہے۔ مسواک کے وقت سنت کی ادائیگی کی نیت رہے۔

روزہ دار کیلئے زوال کے بعد سے لے کر غروب تک مسواک کرنا مکروہ ہے۔ بخاری و مسلم وغیرہ کی روایتوں میں روزہ دار کے خلوف (خلوف یعنی معدہ کے خالی ہونے کی وجہ سے زوال کے بعد سے منہ میں پیدا ہونے والی بو) عند اللہ مشک سے بھی بہتر بتایا گیا ہے، اور مسواک کرنے سے اس محمود بو کا ازالہ ہو جائے گا، اس لئے اسے مکروہ قرار دیا گیا۔ زوال کے بعد سونے کی وجہ سے منہ میں بد بو پیدا ہو تو اس کے دور کرنے کیلئے مسواک کرنا مکروہ نہیں ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۱۱۹۔ ترشیح المستفیدین)

(دلیل کے اعتبار سے امام مزنی ابوشامۃ۔ ابن عبدالسلام اور امام نوویؒ جیسے شافعی علماء نے زوال کے بعد بھی عدم کراہت کو ترجیح دی ہے۔ لیکن شافعی مسلک میں کراہت کا قول راجح ہے۔)

مسواک کے دیگر آداب: مسواک کے وقت پہلی مرتبہ تھوک نگل لے، یہ بیماریوں کو دور کرتا ہے، بعد میں نہ نگلے، ورنہ وسوسہ کا سبب بنے گا۔ مسواک کو نہ چوسے، ورنہ بینائی کو نقصان پہنچائے گا۔ مسواک کو کھڑا رکھے نہ کہ لٹا کر۔ لکڑی کے دونوں طرف سے مسواک نہ کرے۔ بغیر اجازت اور رضامندی کے دوسرے کا مسواک استعمال کرنا حرام ہے۔ دوسرے کا مسواک اجازت کے بعد بھی استعمال کرنا نسیان کا باعث ہے۔ بطور تبرک استعمال کرے تو کوئی حرج نہیں۔ استعمال کے بعد مسواک دھو کر رکھنا چاہئے۔ چھنگلیا کے برابر موٹی اور تقریباً ایک بالشت لمبی ہو۔ مسواک دائیں ہاتھ سے کرے، مسواک کرتے وقت انگوٹھا۔ اور چھنگلیا نیچے اور بقیہ تمام انگلیاں اس کے اوپر ہوں۔

نقصان دہ لکڑیوں سے مسواک کرنا مکروہ ہے۔ مسواک سے قبل یا بعد کھانے کے ذرات کو خلال کے ذریعے دور کرنا بہتر ہے۔ دانت نہ ہوں تب بھی مسواک کرنا سنت ہے۔ (ترشیح ص ۲۰ وغیرہ)

مسواک کے بعض فوائد: منہ پاک و صاف ہوتا ہے، رب کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ دانت سفید ہوتے ہیں، اور منہ کی بو بہتر ہوتی ہے مسوڑھوں کو مضبوط کرتا ہے، صحت و ذکاوت کا سبب ہے، رطوبتوں کو ختم، نگاہوں کو تیز، بڑھاپے کو مؤخر، پشت کو مضبوط، ثواب کو دو چند، اور سکرات کی تکلیف کو آسان کرتا ہے، اور موت کے وقت کلمہ شہادت کو یاد دلاتا ہے۔ کشادگی اور مالداری کا باعث ہے۔

سر درد اور سر کے رگوں کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔ دانتوں کے درد اور زردی کو ختم کرتا ہے۔ معدہ کو درست اور قوت فصاحت وعقل کو تیز، دل کو پاک، بدن کو قوی، اور مال واولاد کو بڑھاتا ہے۔

(۲) تسمیہ: وضو کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھے۔ اگر بھول جائے تو وضو مکمل ہونے سے پہلے جب بھی یاد آئے پڑھ لے۔ عمداً بھی چھوڑ دے تو وضو کی تکمیل سے پہلے پڑھ کر تلافی کرلے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ جو وضو کے وقت اللہ کا نام نہ لے، اس کا وضو نہیں (رواہ الترمذی۔ و ابن ماجہ۔ عن سعید بن زید و۔ رواہ احمد و ابوداود۔ عن ابی ھریرۃؓ۔ (و فی سندہ ضعف۔ مشکوۃ۔ ۱/۴۶)

علماء کے نزدیک دیگر روایات کی روشنی میں اس حدیث میں وضو کی نفی سے صرف کمال کی نفی مراد ہے۔ یعنی بغیر تسمیہ کے وضو تو ہو جائے گا، لیکن کامل نہ ہوگا۔ (اور سند کے اعتبار سے اس روایت میں کچھ ضعف ہے) صرف بسم اللہ پڑھنے سے سنت ادا ہو جائیگی، لیکن ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھنا اکمل اور بہتر ہے۔ جب وضو کے ابتداء میں ہتھیلیاں دھونا شروع کرے، اس وقت بسم اللہ پڑھے۔ تسمیہ سے پہلے تعوذ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنا سنت ہے۔ وضو کے علاوہ دیگر تمام اہم امور کے ابتداء میں بھی تسمیہ سنت ہے، عبادت ہو یا غیر عبادت۔ جیسے غسل، تیمم، تلاوت، جماع، ذبح، گھر سے نکلنا، وغیرہ نماز حج اور اذکار سے پہلے سنت نہیں ہے۔ مکروہ کام کیلئے بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے اور حرام کام کیلئے حرام ہے۔ (حاشیۃ الجمل۔ ۱/ ۱۲۲)

(۳) ہتھیلی دھونا: چہرہ سے قبل دونوں ہتھیلیوں کا دھونا سنت ہے۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد ہاتھ کے نجاست میں شک ہو اور ہاتھ پانی میں ڈبونا ہو یا ایسی کوئی بات نہ ہو، بہر حال دونوں ہتھیلیوں کا دھونا سنت ہے۔ لیکن ہاتھ کی پاکی یقینی نہ ہو تو دھونے سے پہلے پانی میں ڈبونا مکروہ ہے۔ اور تین مرتبہ دھونے سے پہلے یہ کراہت ختم نہ ہوگی۔ بخاری ومسلم میں آپ ﷺ سے نیند سے بیدار ہونے کے بعد تین مرتبہ دھونے سے پہلے ہاتھوں کو پانی کے برتن میں داخل کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اور اگر ہاتھ بالیقین پاک ہوں تو ڈبونا مکروہ نہیں۔

پانی کسی بڑے برتن میں ہو کہ اس سے ہاتھ پر نہیں ڈال سکتے اور نکالنے کیلئے کوئی چھوٹا برتن، جگ وغیرہ بھی نہیں، تو دوسرے سے مدد لے یا منہ یا صاف کپڑے کے کنارے وغیرہ سے پانی نکالے۔

(۴) مضمضہ اور استنشاق: (مضمضہ یعنی کلی کرنا اور استنشاق یعنی ناک میں پانی لینا) منہ اور ناک میں صرف پانی پہنچانے سے اصل سنت حاصل ہو جائے گی۔ صحیحین وغیرہ کی روایات کی روشنی میں ہر چلو سے پہلے کلی پھر بقیہ پانی سے استنشاق اس طرح تین مرتبہ کرنا زیادہ افضل طریقہ ہے۔ (گویا تین چلو پانی لیا جائے گا اور ہر چلو سے کلی کرنے کے بعد باقی پانی کو ناک میں داخل کریں گے) پہلے تین چلو سے تین مرتبہ کلی بعد میں تین چلو سے تین مرتبہ استنشاق کرے تو یہ بھی صحیح ہے۔ ایک چلو سے تین مرتبہ کلی اور دوسرے چلو سے تین مرتبہ استنشاق کرنا بھی کافی ہے۔ مضمضہ کا استنشاق سے پہلے ہونا ضروری ہے (بعد میں ہو تو سنت ادا نہ ہوگی۔)

(۵) مضمضہ اور استنشاق میں مبالغہ: کلی کے پانی کو تالو کے آخری سرے اور دانتوں کے کنارے تک پہنچائے، دانتوں پر انگلی پھیرے، استنشاق میں سانس کے ذریعہ پانی ناک کی جڑ تک کھینچے اور بائیں ہاتھ کی چھنگلیا (چھوٹی انگلی) سے گندگی صاف کرے۔ روزہ دار مضمضہ اور استنشاق میں مبالغہ نہ کرے۔ پانی صرف منہ میں رکھا، پھیرا نہیں تب بھی کلی کی سنت ادا ہو جائے گی۔

(۶) تثلیث (تین تین مرتبہ کرنا): وضو کے افعال کو ایک ایک مرتبہ کرنا فرض ہے، دوسری مرتبہ کرنا بہتر ہے اور تین

تین مرتبہ کرنا سنت ہے۔ دھونا اور مسح کرنا اور وضو کے دوسرے افعال، خواہ فرض ہوں یا سنت تین تین مرتبہ کرنا سنت ہے۔ کتنی مرتبہ دھویا اس میں شک ہو، تو کم تعداد پر عمل کریں گے۔ (وضو میں چہرہ دھوتے وقت کسی کو شک ہو جائے کہ ایک مرتبہ دھویا یا دو مرتبہ تو ایک شمار کریں گے۔ اسی طرح دو یا تین میں شک ہو تو دو شمار کرتے ہوئے ایک مرتبہ اور دھو دیں گے۔) تین مرتبہ سے زائد کرنا مکروہ ہے۔

موقوفہ پانی کو تین سے زائد مرتبہ استعمال کرنا حرام ہے صحیحین وغیرہ کی روایات میں آپ ﷺ سے وضو کے افعال کو ایک مرتبہ سے تین مرتبہ تک ادا کرنا مروی ہے۔ لہٰذا ایک مرتبہ ادا کرنا ضروری، اور دوسری اور تیسری مرتبہ سنت ہوا۔ (حاشیة الجمل۔ ۱/۱۲۷)

(۷) تخلیل: چہرہ کے جن بالوں کے جڑ میں پانی پہنچانا ضروری نہیں، انگلیوں سے ان کا خلال کرنا سنت ہے۔

مثلاً: مرد کی گھنی داڑھی جیسا کہ ترمذی، ابوداود اور ابن ماجہ کی روایت سے ثابت ہے دائیں چلو میں پانی لیکر انگلیوں کو کشادہ کر کے داڑھی کے نیچے کی جانب سے اندر داخل کرے۔

(۸) دائیں کو بائیں پر مقدم رکھنا: ہاتھ اور پیر دھوتے وقت پہلے دایاں پھر بایاں دھونا سنت ہے۔ (صحیحین کی روایت سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ طہارت کنگھی کرنا، اور جوتے پہننا سارے ہی امور میں حتی الامکان دائیں کو مقدم کرنا پسند فرماتے تھے۔) دونوں کان اور سر کا مسح اور رخسار اور ہتھیلی کا دھونا ایک ساتھ انجام دیں گے، اگر ایک ہاتھ سے معذور ہونے کی وجہ سے بیک وقت انجام نہیں دے سکتا، تو ان اعضاء میں بھی دائیں کو بائیں پر مقدم رکھیں گے۔

(۹) فرض سے زائد مقدار کا دھونا: چہرہ کے ساتھ سر کے اگلے حصہ اور گردن کے کنارے کا دھونا، ہاتھ دھوتے وقت کہنیوں سے اوپر بازو کا کچھ حصہ دھونا، اور قدم دھوتے وقت پنڈلی کا کچھ حصہ بھی دھونا سنت ہے۔ مکمل بازو کاندھے کے قریب تک اور مکمل پنڈلی کا دھونا زیادہ بہتر ہے۔

صحیحین وغیرہ کی روایتوں میں اس کا حکم موجود ہے، اس لئے کہ اعضاء وضو قیامت کے دن منور ہونگے۔ صحیح مسلم میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا وہاں تک مومن کے زیورات (زینت اور نورانیت) پہنچیں گے۔

(۱۰) پورے سر کا مسح کرنا: پورے سر کا مسح کرنا سنت ہے، جیسا کہ صحیحین کی روایت سے ثابت ہے۔ دونوں شہادت کی انگلی کو ایک دوسرے سے ملا کر سر کے اگلے حصے پر اور دونوں انگوٹھے کو کنپٹی پر رکھے پھر دونوں ہاتھ گدی تک لے جائے پھر واپس آگے تک لائے، یہ ایک مرتبہ مسح ہوا۔ گدی سے واپس لوٹانا اس شخص کیلئے مستحب ہے جس کے سر پر ایسے بال ہوں، جو لوٹاتے وقت پلٹیں اور ان کے نچلے حصہ کا مسح ہو جائے، اگر بال ہی نہ ہوں یا کافی چھوٹے یا بڑے ہونے کی وجہ سے پلٹنے کا سوال ہی نہ ہو، تو ایسا شخص مسح کرتے ہوئے ہاتھوں کو صرف گدی تک لے جائے، واپس نہ لائے۔ اگر واپس لائے تو یہ دوسرا مسح شمار نہ ہوگا، اگر سر پر عمامہ (دستار۔ پگڑی) وغیرہ ہو، جسے نکالنے کا ارادہ نہ ہو تو واجب مقدار سر کا مسح کرنے کے بعد بقیہ مسح اس عمامہ کے اوپر مکمل کرنا سنت ہے۔

اگر عمامہ پر مسح کی تکمیل سے پہلے ہاتھ سر سے اٹھائے تو نیا پانی لینا شرط ہے، نیز سر کی واجب مقدار کا مسح عمامہ سے قبل ہونا بھی شرط ہے، (ترشیح) (افضل یہ ہے کہ ناصیہ (سر کے اگلے حصے) سے کم پر اکتفاء نہ کرے) سر کا مسح نہ کرتے ہوئے صرف عمامہ کے اوپر مسح کر لینا کافی نہیں ہے۔

(۱۱) کان کا مسح کرنا: نئے پانی سے دونوں کان کے ظاہر و باطن کا مسح کرنا۔ جیسا کہ بیہقی اور حاکم کی روایت میں موجود ہے۔ (یعنی سر کا مسح سے بچی ہوئی تری سے کان کا مسح کرنا کافی نہیں ہے) انگلیوں کو سر کے مسح کیلئے تر کرنے کے بعد سر کے مسح کے

وقت بعض انگلیوں کو جدا رکھا (یعنی ان انگلیوں سے سر کا مسح نہیں کیا) پھر اس جدا انگلی کی تری سے کان کا مسح کرلیا تو کافی ہے۔ کان کے سوراخ کا مسح کرنا بھی سنت ہے۔

مسح کا طریقہ: مسح کا سنت طریقہ یہ ہے کہ شہادت کی دونوں انگلی کو دونوں کان کے سوراخ میں داخل کر کے اس کو کان کے اندرونی شکنوں پر پھیرتے ہوئے اس کا مسح کرلے اور دونوں انگوٹھے سے بیرونی حصے کا مسح کرلے۔ مسح کی مکمل ادائیگی کے لئے اس کے بعد دونوں ہتھیلی کو کان سے چپکا دے۔(فتح الوھاب و غیرہ)

چہرہ کے ساتھ کانوں کا دھونا اور سر کے وقت بھی اسکا مسح کرلینا سنت ہے۔(جمل ۱/ ۱۲۹) گردن کا مسح نہیں کیا جائے گا۔(بعض شافعی علماء کی رائے میں سر یا کان کے مسح کے بعد اسی تری سے گردن کا مسح بھی مندوب ہے۔ ترشیح المستفیدین ص ۲۱)

(۱۲) ہاتھ اور پیر کی انگلیوں کا خلال کرنا: ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں آپ ﷺ نے وضو میں انگلیوں کے خلال کا حکم دیا ہے۔ اچھی طرح انگلیوں کے درمیان پانی پہنچانے کا اہتمام کرنے سے خلال کی فضیلت حاصل ہوگی۔ لیکن ہاتھ میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے خلال کرے۔ اور پیر میں بائیں ہاتھ کی چھنگلیاں سے پیر کے نیچے کی طرف سے خلال کرے۔ دائیں پیر کی چھنگلیاں سے شروع کر کے بالترتیب بائیں پیر کی چھنگلیاں پر ختم کرلے۔ اگر انگلیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوں اور بغیر خلال کے درمیان میں پانی نہ پہنچے تو تخلیل کر کے پانی پہنچانا ضروری ہے، لیکن اگر ایک دوسرے سے جڑی اور چپکی ہوئی ہوں تو ان کو چیرنا پھاڑنا جائز نہیں ہے۔

(۱۳) ترک استعانت: وضو کرتے وقت کسی سے مدد نہ لینا سنت ہے، اگر پانی ڈالنے یا لانے کیلئے مدد لے تو اس میں کراہت نہیں۔ (اسے بھی بعض علماء نے خلاف اولیٰ قرار دیا ہے) اعضاء کے دھونے کا کام دوسرے سے کرانا مکروہ ہے، اگر معقول عذر ہو تو کسی طرح کی مدد لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(۱۴) اگر کوئی عذر نہ ہو تو وضو کے پانی کو نہ پونچھنا مستحب ہے۔ شرح مسلم میں امام نوویؒ نے اس کے اباحت کو ترجیح دی ہے۔

(۱۵) وضو کے پانی کو نہ جھاڑے: جھاڑنے کو امام نوویؒ نے تحقیق، شرح مسلم، اور شرح وسیط میں خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، لیکن روضہ اور مجموع میں مباح قرار دیا ہے، کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔

(۱۶) دیگر مستحبات: تسمیہ کے بعد "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَ الْمَاءَ طَهُوراً" (حمد اس اللہ کی جس نے پانی کو طہور بنایا) پڑھنا، وضو کے سارے افعال میں نیت کو موجود رکھنا، دل کے ساتھ زبان سے بھی نیت کرنا، آنکھ کے کنارے اہتمام سے پانی پہنچانا، انگوٹھی کو حرکت دینا جہاں پانی جلد نہ پہنچے وہاں احتیاط کے ساتھ پہنچانا، چہرہ دھوتے وقت اوپر کی طرف سے شروع کرنا، سر کا مسح آگے سے شروع کرنا، ہاتھ اور پیر کو انگلیوں کی طرف سے دھونا شروع کرے، جبکہ خود ہی پانی لے، کوئی دوسرا پانی ڈالے تو کہنی اور ٹخنے کی طرف سے شروع کرے۔ (علامہ ابن حجرؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں انگلیوں کی طرف سے شروع کرے۔ ترشیح)

وضو کا پانی ایک مد سے کم نہ ہو (تقریباً ۵۲۵ گرام) پانی کے استعمال میں اسراف وفضول خرچی نہ کرے، کسی فعل کو تین سے زیادہ نہ کرے، دوران وضو بلا حاجت کلام (بات چیت) نہ کرے، پانی چہرہ پر نہ مارے، ایسی جگہ وضو نہ کرے کہ چھینٹے اڑے۔

اگر آنکھوں میں کیچڑ ہو، اور پانی کنارے نہ پہنچے تو اسے دور کر کے پانی پہنچانا واجب ہے۔ آنکھوں کا اندرونی حصہ دھونا سنت نہیں ہے۔ بلکہ نقصان کے پیش نظر بعضوں نے مکروہ قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ نجاست کا معاملہ نسبتاً سخت ہے، اس لئے اندر نجاست لگے تو دھونا

ضروری ہے۔ وضو کے بعد بقیہ پانی تھوڑا سا تہبند پر (محل استنجا کے مقابل) چھڑکنا مسنون ہے کسی جگہ پینے کے لئے جو پانی رکھا گیا ہو، اسے وہاں سے لے جانا یا اس سے وضو کرنا حرام ہے۔ مکمل وضو کرنے کی صورت میں (وقت کی تنگی کی وجہ سے) پوری نماز وقت میں نہ ملے، تو وضو میں صرف فرائض پر اکتفاء کرنا واجب ہے، تثلیث اور دیگر مستحبات کی ادائیگی جائز نہیں، جماعت کے چھوٹنے کا اندیشہ ہو، تو صرف فرائض پر اکتفاء مندوب ہے۔ (فتح المعین) بخاری شریف کی روایت سے بوقت غسل آپ ﷺ کا حضرت ام ہانیؓ سے گفتگو کرنا ثابت ہے، اس لئے امام نوویؒ وغیرہ نے صراحت فرمائی ہے کہ وضو اور غسل کے وقت گفتگو مکروہ نہیں ہے، لیکن نہ کرنا اولیٰ ہے۔ علماء کے کلام میں عریاں وغیر عریاں دونوں اس میں شامل ہیں۔ (قلائد ۔ ۱/ ۲۶)

اعضاء کو ہاتھ سے رگڑ کر دھوئے، وضو کے افعال کو پیاپے (پے در پے مسلسل) ادا کرے، تمام حالات میں پہلا عضو خشک ہو جانے سے پہلے دوسرے عضو کو دھوئے، قبلہ رو ہو کر وضو کرے، وضو سے بچے ہوئے پانی میں سے کچھ پی لے، وضو سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھے۔

دعا: "اَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَ اَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ" صحیح مسلم میں آپ ﷺ سے مروی ہے کہ "جو اچھی طرح وضو کرنے کے بعد اس دعا کو پڑھ لے، اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دئے جائیں گے، جس دروازے سے جی چاہے داخل ہو" ترمذی کی روایت میں اس کے بعد یہ الفاظ بھی وارد ہیں۔ (اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡنِیۡ مِنَ التَّوَّابِيۡنَ وَاجۡعَلۡنِیۡ مِنَ الۡمُتَطَهِّرِيۡنَ) پھر یہ دعا بھی پڑھے۔ "سُبۡحَانَكَ اَللّٰهُمَّ وَ بِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَ اَتُوۡبُ اِلَيۡكَ" (النسائی فی عمل الیوم واللیلة ، والحاکم فی المستدرک۔ تلخیص ۱/ ۱۱۲) ترجمہ (اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں میں، اور بہت پاک رہنے والوں میں شامل فرما، اے اللہ تو پاک ہے اور میں تیری تعریف بیان کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ صرف تو ہی معبود ہے۔ اور میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیرے سامنے توبہ کرتا ہوں۔

اس کے بعد درود شریف اور تین مرتبہ سورہ "انا انزلنا" اور یہ دعا پڑھنا سنت ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِیۡ ذَنۡبِیۡ وَ وَسِّعۡ لِیۡ فِیۡ دَارِیۡ وَ بَارِكۡ لِیۡ فِیۡ رِزۡقِیۡ وَ لَا تَفۡتِنِّیۡ بِمَا زَوَيۡتَ عَنِّیۡ" (حاشیة الجمل ۱/ ۱۳۴) (اے اللہ میرے گناہ بخش دے اور میرے گھر میں کشادگی عطا فرما، اور میرے رزق میں برکت دے اور جس سے محروم ہوں اس کے فتنہ میں نہ ڈال) مذکورہ تمام اذکار و دعا قبلہ رو ہو کر نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر دونوں ہاتھ اٹھا کر پڑھے۔ حاشیة الجمل ۱/ ۱۳۵) مستغفری کی ایک حسن روایت کی وجہ سے بعضوں نے ہر عضو کے وقت کلمہ شہادت کو مستحب قرار دیا ہے۔ (ترشیح) بعض کتابوں میں ہر عضو کے لئے الگ الگ دعائیں ہیں ثبوت کے اعتبار سے امام نووی اور بعض دیگر علماء اسے کافی ضعیف سمجھتے ہیں، اور اس کے پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، لیکن بعض دیگر حضرات اسکا پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں اور بعضوں نے کہا کہ بطور دعا پڑھنا اچھا ہے لیکن سنت نہ سمجھے (ترشیح)۔

واللہ اعلم بالصواب

وضو سے متعلق متفرق مسائل

وضو میں آنکھوں کے اندر پانی نہ ڈالے، اگر کسی کے ہاتھ میں کہنی یا پیر میں ٹخنہ نہ ہو تو مقدار کا اندازہ لگایا جائے گا۔ پیر پھٹنے کی وجہ سے اس میں موم یا مہندی بھر دے تو وضو کیلئے اس کا دور کرنا ضروری ہے، مہندی کا رنگ باقی ہو تو حرج نہیں، اگر عضو پر سیال تیل ہو جس کی

وجہ سے پانی فوراً بہہ جائے اور عضو پر ٹھہرے نہیں تو وضو صحیح ہے۔ ناخن کے اندر ایسا میل ہو جس کی وجہ سے وہاں پانی نہیں پہنچتا تو وضو صحیح نہ ہو گا۔ دوران وضو کسی عضو کے دھونے میں شک ہو جائے تو اس کا دوبارہ دھونا ضروری ہے۔ وضو ہونے کے بعد کسی عضو کے دھونے میں شک آئے تو حرج نہیں۔ مضمضہ اور استنشاق کے بعد ہتھیلی دھوئے تو یہ دھونا شمار نہ ہوگا۔ جن اعضا کو دھونے کا حکم ہے ان پر پانی کا بہانا ضروری ہے (صرف تری کا لگنا اور مسح کرنا کافی نہیں ہے) کسی بھی وقت وضو کرنے کے بعد دو رکعت پڑھنا مستحب ہے۔ دوران وضو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں، اگر کوئی سلام کرے تو جواب دینا ضروری ہے، لیکن غسل کرنے والے کو سلام نہ کرے، ہمیشہ با وضو رہنا مستحب ہے۔ (حاشیۃ الجمل و غیرہ ۱/ ۱۳۵)

تجدید وضو: (باوضو شخص کا پھر سے وضو کرنا) وضو کر لینے کے بعد کوئی سی نماز پڑھ چکا ہو، چاہے ایک ہی رکعت یا نماز جنازہ یا تحیۃ المسجد پڑھے تو تجدید وضو سنت ہے۔ اس سے پہلے تجدید وضو مکروہ ہے۔ بلکہ مستقل عبادت سمجھ کر کرے تو بعض علماء نے حرام قرار دیا ہے۔ صرف سجدۂ تلاوت یا سجدہ شکر کے بعد تجدید وضو مستحب نہیں ہے۔ ابوداود وغیرہ کی حدیث میں تجدید وضو پر دس نیکیاں لکھے جانے کا وعدہ مروی ہے (جمل ۱/ ۱۶۵)

استنجاء کا بیان

شرمگاہ سے نکلنے والی نجاست کو پانی یا پتھر (ڈھیلا) سے دور کرنے کو استنجاء کہتے ہیں، استنجاء کرنا واجب ہے۔

قضاء حاجت (بول و براز) کے آداب: اوروں کی نگاہ سے عورت (بدن کا وہ حصہ جو دوسروں سے چھپانا ضروری ہے ستر) کو کسی بھی آڑ سے چھپالے، اگر کھلی جگہ بیٹھا ہے تو آڑ اس سے تین ہاتھ یا اس سے کم فاصلہ پر ہونا چاہئے۔ اگر جانور کے ذریعے آڑ کرے یا کسی گڑھے میں بیٹھ گیا، یا خود اپنے دامن کو لٹکا کر آڑ کر لیا تو یہ بھی کافی ہے۔ کھلے میدان میں ہو یا عمارت میں، سورج اور چاند کی طرف رخ یا پشت نہ کرے، اس لئے کہ یہ مکروہ ہے۔ کھلے میدان میں بغیر آڑ کے قبلے کی طرف رخ یا پشت کر کے قضاء حاجت کرنا حرام ہے۔ بیت الخلاء کے اندر یا کھلے میدان میں آڑ کے ساتھ اس طرح قضاء حاجت حرام نہیں ہے۔

کھلے میدان میں جب قبلہ رو یا پشت بیٹھے تو اس کے اور قبلہ کے درمیان ایسا آڑ ہونا ضروری ہے جو کم از کم دو تہائی ۲/ ۳ ہاتھ اونچا ہو اور اس سے تین ہاتھ سے زیادہ دور نہ ہو۔ اگر اپنے دامن سے آڑ کر لیا تب بھی حرمت ختم ہو جائے گی۔

صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ یا پشت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

صحیحین ہی کی روایت میں آپ ﷺ کا حضرت حفصہؓ کے مکان میں شام کی طرف رخ اور کعبہ کی طرف پشت کر کے قضاء حاجت کرنا مروی ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ کی ایک حسن حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے یہ تذکرہ ہوا کہ بعض لوگ اپنی شرمگاہ کو قبلہ رو کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ تو آپ نے اس کا انکار فرماتے ہوئے اپنے قضاء حاجت کی نشست اور بیٹھک کو قبلہ رو کرنے کا حکم دیا۔ ان مختلف روایات کو سامنے رکھ کر علماء نے وہ تفصیل بیان کی جو اوپر آپ کے سامنے آچکی۔ (فتح الوھاب ص ۹ و غیرہ) جس جگہ بیٹھ کر لوگ گفتگو کرتے ہوں قضاء حاجت نہ کرے، صحیح مسلم میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب پاخانہ نہ کرے، قلیل پانی میں کرنا اور سخت ہے، رات کے وقت زیادہ برا ہے۔ کسی بل یا سوراخ میں پیشاب نہ کرے، پھل آور درخت کے نیچے پیشاب پاخانہ نہ کرے، ہوا کے رخ پر بیٹھ کر پیشاب نہ کرے، (ورنہ ہوا کی وجہ سے پیشاب بدن پر اڑے گا) اپنے بائیں پیر پر زور دے کر بیٹھے (اور دائیں کے صرف

نیچے کوزمین پر رکھ کر بقیہ حصہ الگ رکھے) استنجاء کے ڈھیلے پہلے ہی تیار رکھے۔

ڈھیلے سے استنجاء کے لئے قضاء حاجت کی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ بیت الخلاء میں قضاء حاجت کرنے والے کو پانی سے استنجاء کرنے کے لئے وہاں سے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ دوسری جگہ ہو تو ہٹنا بہتر ہے۔ تاکہ چھینٹیں نہ اڑیں۔ ایسی کوئی چیز قضاء حاجت کے وقت اپنے ساتھ نہ رکھے، جس میں قرآن یا اللہ و رسول کا کچھ ذکر موجود ہو، جیسے انگوٹھی وغیرہ اگر رکھے تو مکروہ ہے۔ کوئی ایسی انگوٹھی پہلے نکالنا بھول جائے۔ تو اب اپنی ہتھیلی سے اسے چھپائے رکھے۔ (کسی کا نام محمد ہو مثلاً، اور اپنے نام کے طور پر اسے انگوٹھی پر نقش کرے تو اسے قضاء حاجت کے وقت لے جانا مکروہ نہیں ہے۔ (قلائد) انگوٹھی پر اللہ کا نام ہو اور استنجاء کے وقت اس پر نجاست لگتی ہو تو یہ حرام ہے۔ (حاشیة الجمل ۱/ ۸۲)

بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت پہلے بایاں پیر اندر رکھے اور باہر نکلتے وقت پہلے دایاں پیر باہر نکالے، میدان میں قضاء حاجت کی صورت میں جس جگہ بیٹھنا ہو، وہاں پہلے بایاں پیر رکھے اور اٹھنے کے بعد دایاں پیر ہٹائے۔ پیشاب کے بعد کھنکھار کر اور ذکر (مرد کی اگلی شرمگاہ) پر انگلی پھیر کر قطرات سے اچھی طرح صفائی حاصل کرے۔ بول و براز کے وقت بیت المقدس کی طرف رخ یا پشت کرنا مکروہ ہے، حرام نہیں ہے کسی بھی جگہ میں قبلہ کی طرف رخ یا پشت کر کے جماع (صحبت) کرنا مکروہ نہیں ہے۔

بیت الخلاء میں داخل ہونے کی دعا: ترمذی کی روایت میں یہ ہے۔ کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بسم اللہ پڑھنے سے انسانوں کی شرمگاہ کا جنات کے نگاہوں سے پردہ ہو جاتا ہے۔

صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت (یعنی داخل ہونے سے پہلے) یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ " اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ " (اے اللہ مذکر و مونث شیاطین سے تیری پناہ چاہتا ہوں) لہذا پہلے "بسم الله" پھر اس دعا کا پڑھنا مستحب ہے۔ ابن السنی اور طبرانی کی کتاب الدعا میں یہ الفاظ مروی ہیں " اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الرِّجْسِ النَّجِسِ وَالْخَبِيْثِ الْمُخْبِثِ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم " (الاذكار صفحه ۲۷۔۲۸) داخل ہوتے وقت دعا بھول جائے تو اندر دل میں ہی پڑھ لے۔ (قلائد ۱/ ۲۶)

بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد کی دعا: سنن ابوداود، ترمذی کی صحیح روایت میں آپ ﷺ سے "غفرانك" کہنا مروی ہے۔ نسائی اور ابن ماجہ میں یہ دعا موجود ہے۔ " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِی " ابن السنی اور طبرانی کی روایت میں آپ ﷺ سے یہ دعا پڑھنا منقول ہے۔ " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی اَذَاقَنِیْ لَذَّتَهٗ وَ اَبْقٰی فِیَّ قُوَّتَهٗ وَ دَفَعَ عَنِّی اَذَاهُ " (الاذكار ص ۲۷۔۲۸)

بیت الخلاء اور میدان دونوں جگہ ان دعاؤں کو پڑھے۔ بیٹھتے وقت زمین سے قریب ہونے سے پہلے ہی اپنا کپڑا نہ اٹھائے، اسی طرح اٹھ کر کھڑا ہونے سے پہلے ہی کپڑا درست کرے۔ بغیر کسی مجبوری کے وہاں سے نکلنے سے پہلے ذکر یا بات کرنا مکروہ ہے۔ اگر قضاء حاجت کے وقت چھینک آئے تو دل میں " الحمد الله " پڑھ لے، زبان سے ادا نہ کرے۔ جماع کے وقت چھینک آئے تو یہی حکم ہے۔

سنت یہ ہے کہ قضاء حاجت کیلئے لوگوں سے دور نکل جائے (بیت الخلاء اس سے مستثنیٰ ہے) اور نرم زمین پر پیشاب کرے، تاکہ چھینٹے بدن پر نہ اڑیں۔ سڑک پر اور قبروں کے قریب پیشاب کرنا مکروہ ہے۔ قبروں کے اوپر اور مسجد میں پیشاب کرنا حرام ہے۔ مستحب ہے کہ ننگے پیر اور ننگے سر بیت الخلا نہ جائے اور نہ نکلنے والی نجاستوں کو دیکھے، اور نہ اپنی شرمگاہ کو، اور نہ آسمان کی طرف، ہاتھوں سے بے کار

حرکتیں نہ کرے، کسی برتن میں پیشاب کرنا مکروہ نہیں۔ بغیر عذر کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مکروہ ہے۔ بیت الخلاء میں زیادہ دیر بیٹھے رہنا مکروہ ہے۔

قضاء حاجت کے وقت کھانے پینے مسواک کرنے اور پیشاب میں تھوکنے سے احتراز کرے (جمل ۱/ ۹۲)

فصل : استنجاء کن چیزوں سے کیا جائے گا۔

جس نجاست کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس میں پتھر اور ڈھیلے سے استنجاء کافی نہیں ہے (لہٰذا زخم سے پیپ خون وغیرہ نکلے تو ڈھیلے کے ذریعہ اس سے پاکی حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ پانی ہی استعمال کرنا پڑے گا) اگر ریح (گیس، ہوا) خارج ہو تو استنجاء کی ضرورت نہیں۔ سبیلین (اگلی اور پچھلی شرمگاہ) سے نکلنے والی چیز ایسی ہو کہ جگہ بالکل تر اور نجاست سے ملوث نہ ہو تو استنجاء کرنا واجب نہیں ہے، لیکن سنت ہے جیسے کیڑا یا کنکر بغیر رطوبت کے نکلے یا مینگنی بالکل خشک نکلے۔ (اگر خروج ریح کے وقت وہ جگہ تر ہو تو استنجاء مسنون ہے، ورنہ مکروہ ہے۔) (قلائد ۱/۰ ۲۵)

سبیلین سے نکلنے والی چیز اس مقام کو نجس کرے تو پتھر یا پانی سے استنجاء کرنا واجب ہے۔

صرف پتھر (ڈھیلے) سے استنجاء کے شرائط۔ (۱) نجاست شرمگاہ سے نکلے، کسی اور جگہ سے نکلے تو پتھر کافی نہیں۔ (۲) نجاست خشک نہ ہو جائے، خشک ہونے کے بعد پانی استعمال کرنا ضروری ہے۔ (۳) کھڑے ہونے کی حالت میں دونوں سرین کا جو حصہ ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ پاخانہ اس حصہ سے آگے نہ بڑھ چکا ہو، اور پیشاب ختنہ کے مقام سے آگے نہ پھیلا ہو، ورنہ پورا پانی سے دھونا ہوگا۔ (۴) مذکورہ بالا حد کے اندر بھی اگر نجاست الگ الگ ہو جائے۔ (یعنی ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہ ہو۔) تو جو نجاست اصل جگہ سے جدا ہے، اس میں پانی ضروری ہے (۵) نکلنے کے بعد نجاست جس جگہ ٹھہر چکی پھر وہاں سے آگے نہ بڑھے ورنہ پانی ضروری ہوگا (۶) اس نجاست میں باہر سے کوئی نجس یا پاک چیز شامل نہ ہوئی ہو ورنہ پانی استعمال کرنا ہوگا۔ (۷) تین مرتبہ محل نجاست کو صاف کرے، یا تو تین پتھر استعمال کرے، یا ایک ہی بڑے پتھر کے تین کناروں سے تین مرتبہ مسح کرے۔ صحیح مسلم کی روایت میں آپ ﷺ نے تین سے کم پتھر سے استنجاء کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور تین الگ الگ کناروں سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اصل مطلوب تین مرتبہ مسح کرنا اور پونچھنا ہے۔ (۸) تینوں مرتبہ پورے محل نجاست پر مسح کرے۔ (۹) جگہ اچھی طرح صاف ہو جائے۔

اگر تین مرتبہ مسح کرنے سے اچھی طرح صاف نہ ہو تو صاف ہونے تک مزید پتھر استعمال کرنا ضروری ہے نجاست کا صرف اتنا اثر باقی رہے کہ پانی یا باریک ٹھیکریوں کے بغیر جدا نہ ہو تو اس میں حرج نہیں۔

سنتیں: (۱) اچھی طرح صفائی کیلئے تین سے زیادہ مسح کرنا پڑے تو طاق عدد پر ختم کرے۔ (مثلاً ۴ ڈھیلوں میں صفائی حاصل ہو جائے تو طاق عدد کی رعایت کیلئے پانچواں بھی استعمال کرنا سنت ہے۔)

صحیحین میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ تم میں سے کوئی استنجاء کیلئے ڈھیلے استعمال کرے تو طاق تعداد میں استعمال کرے۔ (۲) دبر (پچھلی شرمگاہ) کیلئے پہلے ڈھیلے کو دائیں کنارے سے آگے کی طرف نجاست کے بالکل قریب رکھ کر آہستہ آہستہ پھراتے ہوئے اسی جگہ لے آئے پھر دوسرے ڈھیلے کو بائیں طرف سے اسی طرح استعمال کرے۔ دونوں ڈھیلے پورے محل نجاست سے گذرنا ضروری ہے۔ تیسرے ڈھیلے کو دونوں کنارے اور درمیان سے گذارے۔ ذکر (اگلی شرمگاہ) کی پاکی میں اسے ڈھیلے کے تین الگ الگ مقام پر مسح کرنا کافی ہے۔ ایک ہی مقام پر دو مرتبہ ذکر سے مسح کرے تو اب پانی ضروری ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ پانی سے استنجاء کرنے والا اگلی شرمگاہ کو

مقدم، اور ڈھیلے سے استنجاء کرنے والا دبر کو مقدم رکھے۔

(۳) بائیں ہاتھ سے استنجاء کرے جیسا کہ ابوداود وغیرہ میں موجود ہے، مسلم کی روایت میں آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے سے روکا ہے، لہٰذا یہ مکروہ ہے۔ استنجاء کرتے وقت درمیانی انگلی پر زور دے۔ استنجاء کے بعد ہاتھوں کو زمین وغیرہ پر رگڑ کر دھونا اور شرمگاہ اور تہبند پر پانی چھڑکنا سنت ہے۔ استنجاء کے بعد ہاتھ میں بدبو محسوس ہو تو اسے دھونا ضروری ہے۔ لیکن دبر پر نجاست کا حکم نہیں لگے گا۔

(۴) پہلے ڈھیلا پھر پانی دونوں استعمال کرے، تا کہ ڈھیلے سے نجاست دور ہو جائے، اور ہاتھوں کو نجاست سے ملوث کئے بغیر پانی سے نجاست کا اثر دور ہو جائے۔ اس صورت میں ڈھیلے کا پاک ہونا یا تین مرتبہ ہی استعمال کرنا ضروری نہیں (اس لئے کہ بعد میں پانی استعمال کر ہی رہا ہے، لیکن کامل فضیلت کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے) صرف ایک پر اکتفاء کرنا ہو تو پانی افضل ہے۔

استنجاء سے فارغ ہونے کے بعد احیاء العلوم میں یہ دعا درج ہے۔ "اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِىْ مِنَ النِّفَاقِ وَ حَصِّنْ فَرْجِىْ مِنَ الْفَوَاحِشِ" (اے اللہ میرے قلب کو نفاق سے اور شرمگاہ کو حرام کاریوں سے پاک صاف کرنا۔) (فتح الوهاب مع حاشية الجمل جلد ۱ ص ۹۷ تا ۱۰۰)

فصل۔ پانی کے علاوہ کس چیز سے استنجاء کیا جائے

عموماً ہم پتھر یا ڈھیلے کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن دوسری جامد (ٹھوس) چیزوں سے بھی استنجاء جائز ہے۔ مائع سے جائز نہیں۔ لہٰذا اس فصل میں اسی کے شرائط بیان کئے جا رہے ہیں۔

(۱) وہ چیز پاک ہو۔ اگر نجس چیز کو استنجاء کیلئے استعمال کیا تو بعد میں پانی ہی استعمال کرنا ضروری ہے۔ (۲) نجاست کو پونچھ کر اچھی طرح صاف کرنے والی ہو۔ لہٰذا شیشہ (کانچ)، بانس، چکنا لوہا، نرم کوئلہ اور جھڑنے والی مٹی وغیرہ کافی نہیں، کوئلے اور مٹی کا ڈھیلا سخت ہو تو کافی ہے۔

پتھر، دباغت دی گئی کھال، گھاس، ٹھیکری، اینٹ، ایسے اوراق جسمیں کوئی محترم علم یا محترم نام نہ ہو، جیسے فلسفہ وغیرہ کے اوراق، یہ اشیاء استنجاء کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ پتھر وغیرہ کا تر نہ ہونا ضروری ہے۔ (جمل وغیرہ)

(۳) محترم نہ ہو، مطعوم (کھائی جانے والی چیز جیسے روٹی اور ہڈی) سے استنجاء جائز نہیں، جس چیز پر حدیث وفقہ وغیرہ کا علم لکھا ہو، اس سے بھی استنجاء جائز نہیں۔ حیوانات سے متصل اجزاء (جیسے بکری وغیرہ کا پیر یا دم) سے استنجاء جائز نہیں، حیوانات سے جدا اور پاک اجزاء سے استنجاء کر سکتے ہیں جیسے بال اور پر۔ سونے چاندی کا ٹکڑا یا کسی دوسرے قیمتی جواہرات کا ٹکڑا جس میں کھر دراپن ہو، اور ریشم کا کپڑا بھی جائز ہے۔

محترم چیز سے استنجاء کرنے سے پاکی حاصل نہ ہوگی اور گنہگار بھی ہوگا۔ لیکن نجاست دوسری جگہ منتقل نہ ہوئی ہو تو اس کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا کافی ہے۔ پتھر سے استنجاء کرنے کے بعد اس پتھر کو دھو کر خشک ہونے کے بعد پھر استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک ہی پتھر سے نجاست اچھی طرح دور ہوگئی، پھر دوسرا اور تیسرا پتھر استعمال کیا جن پر کچھ گندگی نہیں لگی تو ان دونوں پتھروں کو بغیر دھوئے بھی دوبارہ استعمال کر سکتے ہیں۔

وضو اور تیمم سے پہلے ہی استنجاء کر لینا چاہئے، استنجاء سے پہلے وضو کر لیا تو صحیح ہوگا، لیکن تیمم صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح تیمم کے وقت ہاتھ

پر نجاست ہو تو تیمم صحیح نہ ہوگا۔ نکلنے والی نجاست بدن سے جدا ہونے کے بعد پھر اسی جگہ جا کر لگ جائے تو پانی ہی استعمال کرنا چاہئے۔ استنجاء کیلئے اتنا پانی استعمال کرے کہ نجاست کے ازالہ کا غالب گمان حاصل ہو جائے اندرونی حصے کو دھونے کی کوشش نہ کرے۔

حدث (بے وضو ہونا) کے احکام و مسائل

لغت میں حدث نئی چیز کو کہتے ہیں، شرعاً جن اسباب سے طہارت ختم ہوتی ہے۔ اسے حدث کہتے ہیں (فتح الوھاب ۱/۷) اگر وضو ٹوٹ جائے تو اسے حدث اصغر (چھوٹا حدث۔ چھوٹی ناپاکی) کہیں گے۔ اور ایسے اسباب پائے جائیں جن سے غسل واجب ہو جائے تو اُسے حدث اکبر (بڑا حدث۔ بڑی ناپاکی) کہیں گے۔ صرف حدث کہنے میں دونوں آ گئے، لیکن عموماً صرف حدث کا لفظ بے وضو ہونے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آیت: " وَ اِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ " (سورہ المائدہ ۶) ترجمہ: اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو اس زمین پر سے، شافعی مسلک میں سبیلین (اگلی اور پچھلی شرمگاہ) کے علاوہ بدن کے کسی اور حصے سے کسی بھی چیز کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح نماز میں قہقہہ لگانے۔ (ٹھٹھا مار کر ہنسنا) اونٹ کا گوشت کھانا اور آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا (بعض دیگر ائمہ کرام کے نزدیک ان اسباب سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔)

چار اسباب میں سے کسی ایک کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ھے۔

(۱) سبیلین سے کسی بھی چیز کا نکلنا: عورت یا مرد کے اگلے یا پچھلے شرمگاہ سے ہوا، پیشاب، پاخانہ، خون، کیڑا، سنگریزہ وغیرہ پاک یا ناپاک، عموماً نکلنے والی یا نادر (کبھی کبھار بیماری یا کسی عذر سے نکلنے والی) کسی بھی طرح کی چیز نکلے، وضو ختم ہو جائے گا۔ لیکن صرف منی نکلنے سے وضو ختم نہ ہوگا۔ (مثلاً بیداری میں غلط خیالات ذہن میں آنے سے یا سرین کو زمین سے ٹکا کر بیٹھ کر سونے میں کسی کی منی نکل جائے تو اس سے غسل تو واجب ہوگا لیکن وضو نہ ٹوٹے گا۔) کسی چیز کے داخل ہونے سے وضو پر اثر نہ ہوگا لہٰذا شرمگاہ سے کوئی دوا وغیرہ اندر داخل کی گئی تو وضو نہ ٹوٹے گا۔ اس کی کچھ مقدار باہر نکل آئے تو ٹوٹ جائے گا (ترشیح المستفیدین) عام شرمگاہ کا راستہ بند ہو جائے اور معدہ سے نیچے کوئی دوسرا سوراخ اور راستہ کھل جائے۔ تو اس راستے سے کسی چیز کے نکلنے سے وضو ختم ہوگا، لیکن عام شرمگاہ کا راستہ بھی کھلا ہو تو پھر اس نئے راستے سے کسی چیز کے نکلنے سے وضو نہیں جائے گا۔ معدہ سے اوپر سوراخ ہو تو اس میں سے کسی بھی چیز کے نکلنے سے وضو نہیں جائے گا، چاہے پیشاب، پاخانہ نکلے یا اور کوئی چیز، اصلی شرمگاہ کا راستہ جاری ہو یا بند، یہ اس وقت ہے جبکہ اصلی راستہ عارضی طور پر بند ہو۔ اگر پیدائشی طور پر ہی اصلی راستہ بند ہو تو پھر نیا راستہ معدہ سے اوپر ہو تب بھی اس میں سے کسی چیز کے نکلنے سے وضو ختم ہو جائے گا، اور دیگر سارے احکام میں وہ اصلی ہی کی طرح ہوگا۔ (فتح الوھاب مع الجمل ۱/ ۶۵)

اگر سوراخ ناف سے نیچے کی طرف ہے تو اسے معدہ سے نیچے سمجھیں گے اور ناف کے سیدھ میں یا اس سے اوپر ہے تو اُسے معدہ سے اوپر سمجھا جائے گا۔ عارضی راستے سے نکلنے میں جن صورتوں میں وضو ٹوٹتا ہے، صرف ڈھیلے سے استنجاء ناکافی ہے۔ اس جگہ کو چھونے سے وضو نہ ٹوٹے گا۔ اور اس راستے میں صحبت کرنے سے صحبت کے احکام ثابت نہ ہوں گے۔ کیڑا شرمگاہ سے باہر سر نکالنے کے بعد اندر جائے تب بھی وضو ختم ہوگا۔

(۲) عقل کا زائل ہونا (ختم ہونا) یعنی عقل کی قوت تمیز و پہچان کا ختم ہونا۔ جنون (پاگل پن) بے ہوشی اور نشہ کی وجہ سے ہر حال میں وضو ٹوٹے گا۔ نشہ سے وہ کیفیت مراد ہے جس میں شعور ختم ہو جائے، صرف مستی کی ابتدائی کیفیت مراد نہیں۔ ایسی نیند جس میں بدن ڈھیلا پڑ جائے، پاس والے کا کلام سمجھ نہ سکے اور شعور ختم ہو جائے وضو کو ختم کر دے گا۔ اونگھ اور وساوس سے وضو ختم نہ ہوگا۔ اپنے دونوں سرین کو نیچے کی طرف اچھی طرح جما کر سونے سے وضو نہیں جائے گا۔ چاہے کسی چیز سے اس طور پر ٹیک لگا کر سویا ہے کہ اگر وہ چیز ہٹ گئی تو گر جائے گا۔ (فتح المعین مع تر شح ص ۲۷) لیٹ کر سونے سے جماؤ حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا لیٹ کر کسی بھی طرح سونے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ شافعی مسلک میں کم یا زیادہ سونے میں کچھ فرق نہیں ہے، جن صورتوں میں وضو ٹوٹتا ہے زیادہ سونے سے بھی ٹوٹتا ہے، اور کم سونے سے بھی۔ اسی طرح جن صورتوں میں وضو نہیں ٹوٹتا، کم سوئے یا زیادہ، نہیں ٹوٹے گا۔ گوٹ مار کر جماؤ کے ساتھ سو جائے تو وضو باقی رہے گا۔ (سرین اور قدم زمین پر رکھ کر پنڈلیوں کو کھڑا رکھے اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لے یا کسی کپڑے سے پشت کے پیچھے سے باندھ دے تو ایسی بیٹھک کو گوٹ مار کر بیٹھنا کہتے ہیں۔)

سرین کے جماؤ کے ساتھ سویا ہوا تھا، لیکن بیداری سے پہلے ایک سرین ہٹ گئی تو وضو ختم ہو گیا۔ بیدار ہونے کے بعد یا بیداری کے ساتھ ہٹے یا شک ہو کہ پہلے ہٹی یا بعد میں تو ان صورتوں میں وضو باقی رہے گا۔ اگر شک پیدا ہو کہ سویا تھا یا صرف اونگھا تھا یا سرین جما کر سویا تھا یا نہیں تو وضو باقی رہے گا۔ کوئی پیٹھ کے بل لیٹ کر سرین کو اچھی طرح زمین سے جما کر سوئے تب بھی وضو نہ رہے گا، چاہے لنگوٹ وغیرہ کس کر باندھا ہو، امام شافعیؒ اور دیگر علماء شوافع کا کہنا ہے کہ نیند کی جن صورتوں میں ہمارے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، وضو کر لینا مستحب ہے، اس لئے کہ بعض دوسرے ائمہ کرام کے نزدیک تمام صورتوں میں وضو ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا انکے اختلاف سے بچنا بہتر ہے۔

(۳) مذکر و مونث (مرد و عورت) کی چمڑی کا آپس میں مس ہونا، چھوجانا: ایسی صورت میں دونوں کا وضو ختم ہوگا۔ دونوں کی عمر اتنی ہونا ضروری ہے کہ عرفاً ایک سلیم الفطرت کو انہیں دیکھ کر غالباً شہوت آسکتی ہے (اس کے جذبات ابھر سکتے ہیں) بال، دانت، ناخن اور بدن سے جدا عضو کو چھونے سے وضو ختم نہ ہوگا۔ یا دونوں میں سے ایک بھی کم سن (کم عمر) ہو، حد شہوت کو نہ پہنچا ہو تو ایسی صورت میں وضو نہ جائے گا۔ نسبی۔ رضائی (دودھ کا رشتہ) یا سسرالی اعتبار سے آپس میں محرمیت کا رشتہ ہو (ایسا رشتہ جس کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہمیشہ کیلئے نکاح حرام ہو۔ جیسے بیٹی، بہن، رضائی ماں، ساس وغیرہ) تو ایک دوسرے کے چھونے سے وضو ختم نہ ہوگا۔ کسی مردہ یا بالکل بڑھیا یا شل (خشک۔ لنجا) یا زائد عضو (جیسے چھٹی انگلی یا تیسرا ہاتھ) کو مس کرے یا بغیر شہوت کے یا بغیر قصد و ارادہ کے مس کرے تو ان تمام صورتوں میں وضو ختم ہو جائے گا۔ ارادہ کے بغیر بھی آپس میں چمڑی چھو جانے سے وضو ختم ہوتا ہے۔ قریب البلوغ یا خصی یا نامرد کے چھونے سے دونوں کا وضو ختم ہوگا۔ کوئی شخص کسی خوبصورت امرد (ابھی جس کو داڑھی نہ آئی ہو) کو شہوت سے چھوئے تو وضو ختم نہ ہوگا (اگر چہ یہ فعل معصیت ہے) شک ہو کہ محرم عورت کو مس کیا یا غیر محرم کو تو وضو ختم نہ ہوگا۔ محرم کو کسی نے شہوت سے بھی مس کیا تو وضو باقی رہیگا۔ زبان اور دانت کے قریب کا گوشت چمڑی کے حکم میں ہے۔ ان کو چھونے سے وضو ختم ہوگا۔

(۴) انسان کی شرمگاہ کو چھونا : حدیث (۱) جو شخص اپنی شرمگاہ کو چھوئے اسے وضو کرنا چاہئے (رواہ الترمذی و صحیحہ)

(۲) تم میں سے کوئی بغیر آڑ اور پردہ (حائل کے اپنے ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو چھوئے تو وہ وضو کر لے۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

ہتھیلی کے بطن (پیٹ۔اندرونی حصہ) سے اپنے یا کسی دوسرے مرد یا عورت، چھوٹا یا بڑا زندہ یا مردہ کی اگلی یا پچھلی شرمگاہ کو چھونے سے وضوختم ہو جائے گا۔ پچھلی شرمگاہ سے مراد پچھلے راستے کے دونوں کناروں کے ملنے کی جگہ ہے۔ (لہٰذا ران اور سرین کے بقیہ حصے کو چھونے سے وضوختم نہ ہوگا) شرمگاہ کٹ کر جدا ہو چکی ہو، (لیکن اتنا حصہ کٹا ہو کہ اسے شرمگاہ کہا جاسکے) یا شل ہو، یا شل ہاتھ سے مس کیا ہو، یا بھول کر مس کیا ہو، تب بھی وضوختم ہو گا زائد انگلی دیگر انگلیوں کے سیدھ میں ہو تو اس سے بھی وضوٹوٹے گا۔ کسی اور جگہ ہو تو نہیں ٹوٹے گا ۔ایک ہاتھ میں دو ہتھیلی ہوں اور دونوں یکساں کام دیتے ہوں تو دونوں سے وضوٹوٹے گا، اور ایک زائد ہو تو صرف اصلی سے ٹوٹے گا، زائد سے نہیں۔

کسی جانور کے شرمگاہ کو چھونے سے وضوختم نہ ہو گا۔ مذکورہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ ہتھیلی کے باطن سے چھوئے، انگلیوں کے سرے سے یا دو انگلیوں کے درمیانی حصے سے، یا انگلی کے کنارے کی طرف سے، یا ہتھیلی کے کنارے کی طرف سے چھونے سے وضونہیں ٹوٹے گا۔ دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے پر ہلکے دباؤ کے ساتھ رکھنے پر جتنا حصہ اندر چلا جاتا ہے، اس سے چھونا وضو کو ختم کرے گا۔ جو حصہ باہر رہے اس سے وضوختم نہ ہوگا۔

کسی دوسرے کی شرمگاہ کو چھونے کی صورت میں صرف چھونے والے کا وضوٹوٹے گا۔ سامنے والے کا وضو باقی رہے گا۔

وضو کا استحباب : شرمگاہ کے اطراف کے بال، سرین کا قریبی حصہ، ران کا اوپری سرا، کمسن لڑکی، امرد، برص کا مریض اور یہودی کو چھونے کے بعد وضو کر لینا مستحب ہے۔ اسی طرح فصد، (نشتر سے رگ کھولنا) کسی کی طرف شہوت سے دیکھنا، گناہ کی بات زبان سے نکالنا، غصہ، میت کو اٹھانا اور چھونا، ناخن تراشنا، مونچھ تراشنا اور سر مونڈنے کے بعد وضو کرنا مستحب ہے۔

مندرجہ ذیل اوقات میں بھی وضو مستحب ہے: قرآن کی تلاوت، قرآن سننا، حدیث پڑھنا، حدیث سننا، حدیث روایت کرنا، کسی شرعی علم کا پڑھنا یا پڑھانا، تفسیر وحدیث اور فقہ کی کتاب کو اٹھانا، یا لکھنا، ذکر، ذکر کی مجلس میں حاضری، اذان، اقامت، مسجد میں داخل ہونا، مسجد میں بیٹھنا، جمعہ کے علاوہ دوسرے خطبے دینا، وقوف عرفہ سعی، کسی بھی نبی کے قبر کی زیارت، سونے سے پہلے بیداری کے بعد، قے، اونٹ کا گوشت کھانا، نماز میں قہقہہ لگانا، ایک مرتبہ صحبت کے بعد غسل کرنے سے پہلے دوبارہ صحبت کرنا، ہو غیبت، چغلی، بہتان تراشی، فحش وگندی باتیں، جھوٹ، اور کوئی بھی قبیح بات زبان سے نکالنا (الفتح مع التشریح ص ۲۷ حاشیة الجمل ۱/۱۳۵)

ایک اہم قاعدہ اور اصول

یقینی حکم کو باقی سمجھا جائے گا، اور شک کو نظر انداز کیا جائے گا، لہٰذا کسی کو پاکی کا یقین ہے، بعد میں حدث ہونیکے متعلق صرف شک یا گمان ہے تو یقین کو لیتے ہوئے وہ پاک ہے۔ اس کے برعکس حدث کا یقین ہے، بعد میں پاکی حاصل کیا یا نہیں شک ہے، تو وہ ابھی مُحدث (بغیر پاکی کے) ہے وضو کے بعد کسی مرد نے عورت کو چھوا، لیکن جلد یا بال میں شک ہے تو وضو باقی ہے۔ کسی کو اچھی طرح یاد ہے کہ سورج نکلنے کے بعد اس نے وضو بھی کیا ہے اور پیشاب بھی، لیکن پہلے کیا انجام دیا یاد نہیں تو ایسی صورت میں سورج نکلنے سے پہلے وہ بے وضو تھا تو اب باوضو ہے اور اگر پہلے باوضو تھا اور تجدید وضو کا عادی تھا تو اب بے وضو ہے اور تجدید وضو کا عادی نہیں تھا تو باوضو ہے سورج نکلنے سے پہلے کی حالت یاد نہیں تو بے وضو ہے۔

خنثی مشکل (هجڑا) کا بیان

(کسی کو مرد وعورت دونوں کے اعضاء مخصوصہ ہوں وہ خنثی ہے۔ مرد یا عورت کے فیصلے کیلئے کوئی واضح علامت نہ ہوتو خنثی مشکل ہے) خنثی مشکل کے مرد یا عورت ہونے کا فیصلہ درج ذیل تفصیل کی روشنی میں کیا جائے گا۔ صرف مرد کی شرمگاہ سے پیشاب نکلے تو وہ مرد ہے۔ صرف عورت کی شرمگاہ سے پیشاب نکلے تو وہ عورت ہے۔ دونوں شرمگاہ سے نکلے اور دونوں کا سلسلہ ایک ساتھ ختم ہو، تو جس شرمگاہ سے پہلے نکلنا شروع ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔ دونوں کا سلسلہ ساتھ شروع ہوتا ہو لیکن آگے پیچھے ختم ہوتا ہو تو جس شرمگاہ سے بعد میں ختم ہو اس کا اعتبار ہوگا۔ ایک سے شروع پہلے ہو، اور دوسرے سے ختم بعد میں ہو تو پہلے شروع ہونے والی شرمگاہ پر حکم لگے گا۔ دونوں کی ابتداء وانتہا ساتھ ہو تو پیشاب سے استدلال نہیں کرسکتے۔ بلوغ کی عمر کے بعد صرف مرد کی شرمگاہ سے منی نکلے تو وہ مرد ہے، صرف عورت کی شرمگاہ سے منی نکلے یا حیض آئے تو وہ عورت ہے، جبکہ بار بار اسطرح ہو دونوں سے منی خارج ہو تو اس کی صفت کے مطابق حکم لگے گا۔ اگر مرد کی منی کے صفات ہیں تو مرد، اور عورت کی منی کے صفات ہیں تو عورت۔

ایک راستے سے مرد کی صفت پر اور دوسرے راستے سے عورت کی صفت پر خارج ہو تو منی سے استدلال ممکن نہیں۔ کسی خنثی کو بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کا عورت ہونا بالکل قطعی ہے اور اس علامت کو دیگر تمام علامات پر مقدم رکھیں گے۔ پیشاب اور حیض یا منی میں تعارض ہو تو ان کی روشنی میں فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ داڑھی اُگنے، پستان ابھرنے، اور پسلیوں کے تعداد کی کمی بیشی سے فیصلہ نہیں کرسکتے۔ اوپر بیان کردہ علامتوں سے فیصلہ نہ ہو پائے تو عقل کی حالت میں بالغ ہونے کے بعد اگر اپنا میلان اور رجحان عورتوں کی طرف بتاتا ہے تو وہ مرد ہے، اور مردوں کی طرف میلان بتاتا ہے تو وہ عورت ہے۔

چند جزئیات: بالغ ہونے کے بعد کسی ایک صنف کی طرف میلان ہو تو فوراً اس سے آگاہ کرنا چاہئے۔ اگر اس نے تاخیر کی تو گنہگار ہوگا۔ (۲) من چاہی خبر دینا حرام ہے، جیسا میلان ہو وہی بتائے (۳) اگر کہتا ہے کہ دونوں کی طرف میلان ہے یا کسی کی طرف بھی نہیں، تو اشکال باقی رہے گا (۴) ایک مرتبہ کسی ایک جانب میلان کی خبر دینے کے بعد اس سے رجوع نہیں کرسکتا۔ البتہ مرد ہونے کی خبر کے بعد بچہ جننے یا حمل ٹھہرنے سے اس کا قول باطل ہو جائے گا۔ جیسے کہ دیگر ظاہری علامتوں کی روشنی میں مرد کا فیصلہ دینے کے بعد حمل ظاہر ہو، تو یہ فیصلہ غلط قرار پائے گا۔ (۵) اس کے خبر کے مطابق فیصلہ کے بعد اس کے خلاف کوئی علامت ظاہر ہو۔ (حمل کی علامت کے علاوہ) تو ان کا اعتبار نہ ہوگا۔ اس کے خبر ہی کو معتبر سمجھیں گے۔ اپنے میلان کی خبر کے مطابق عورت یا مرد ہونا طے پایا تو پھر سارے مسائل میں اس کے ساتھ اسی فیصلہ کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ (محض تہمت کی وجہ سے اس کے خبر کو جھٹلانے کی ضرورت نہیں۔

وہ امور جو بے وضو حرام هیں (محدث کے لئے حرام امور)

محدث (بے وضو) پر یہ امور حرام هیں۔: ہر طرح کی نماز، سجدہ تلاوت، سجدہ شکر، طواف، قرآن پاک کو چھونا یا اٹھانا، اور لے جانا، قرآن کے کنارے یا سطروں کے درمیانی حصہ میں ہاتھ لگانا، کسی لٹکا نیکی چیز سے قرآن کو اٹھانا، قرآن پاک کی جلد کو چھونا، کسی جزدان، صندوق وبکس یا تھیلی میں قرآن ہو تو اس جزدان وغیرہ کو چھونا۔

کسی لکڑی وغیرہ سے قرآن کے صفحات کو الٹنا جائز ہے۔ اپنی آستین کو ہاتھ پر لپیٹ کر اس سے صفحات کا پلٹنا حرام ہے۔ مختلف اسباب (سازوسامان) کے درمیان قرآن بھی ہو تو ان اسباب کا قرآن سمیت اٹھانا حرام نہیں ہے، لیکن مکروہ ہے۔ کاغذ وغیرہ کو سامنے

رکھ کر بغیر چھوئے اور اٹھائے اس پر قرآن پاک لکھنا جائز ہے۔ تورات وانجیل اور قرآن کی ان آیتوں کو جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے۔ بے وضو چھونا اور اٹھانا جائز ہے (البتہ مکروہ ہے)۔ آپ ﷺ کی حدیث کو چھونا اور اٹھانا جائز ہے لیکن وضو کر لینا اولیٰ (بہتر) ہے۔

پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے کسی چیز پر قرآن کی آیت تحریر کی گئی جیسے سکہ، کپڑا، عمامہ، کھانا، اور دیوار وغیرہ پر، اس کا چھونا اور اٹھانا حرام نہیں ہے۔ فقہ واصول کی کتابوں میں قرآنی آیات موجود ہونے کے باوجود ان کا چھونا اور اٹھانا حرام نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر میں تفسیر کے الفاظ قرآن کے الفاظ سے زائد ہوں تو کراہت کے ساتھ چھونا وغیرہ جائز ہے۔ اگر دونوں الفاظ برابر ہوں یا قرآن کے الفاظ زائد ہوں تو حرام ہے جس تختی وغیرہ پر سیکھنے کیلئے قرآن کی آیت لکھی گئی ہو، کسی بالغ کیلئے اس کا چھونا اور لے جانا حرام ہے۔ کسی باشعور بچے کے سرپرست یا استاد پر اسے سیکھنے کے کیلئے (بے وضو) قرآن کے چھونے اور اٹھانے سے روکنا واجب نہیں، البتہ سنت ہے۔ جس روٹی وغیرہ پہ قرآن پاک لکھا ہو۔ اسے کھانا حرام نہیں۔ قرآن لکھی ہوئی دیوار کو گرانا حرام نہیں ہے۔ جس لکڑی پر قرآن کندہ ہوا سے جلانا مکروہ ہے۔ مسجد یا کسی دوسرے دیوار پر اور کپڑوں پر قرآن کا لکھنا مکروہ ہے کسی نجس چیز سے قرآن پاک، حدیث یا دیگر شرعی علوم کا لکھنا حرام ہے۔ بدن کے کسی حصہ پر نجاست لگی ہو تو صرف اس حصے سے قرآن کو چھونا حرام ہے۔ دوسرے اعضاء سے چھونا جائز ہے۔ کسی کو پانی اور مٹی دونوں میسر نہ ہوں (یعنی نہ وضو کر سکتا ہے اور نہ تیمم) تو اس کو وقت کی حرمت کا خیال رکھتے ہوئے فرض نماز کو ویسے ہی پڑھنا چاہئے، لیکن قرآن کو چھونا وغیرہ حرام ہوگا۔ قرآن مجید کے ڈوبنے، جلنے، اس پر نجاست کے لگنے یا کافر کے قبضہ میں چلے جانے کا خطرہ ہو، اور جلدی سے وضو کر کے بچا نہیں سکتا۔ تو اس مجبوری کی وجہ سے بے وضو اٹھا لینے کی اجازت ہوگی۔ بے شعور بچہ جو قرآن کے احترام کو نہیں سمجھتا اسے قرآن دینا جائز نہیں ہے۔ اگر اس عمر میں وہ قرآن سیکھ سکتا ہے تو استاد یا سرپرست کی موجودگی میں سیکھنے کیلئے اسے قرآن دینے کی بعض علماء نے گنجائش دی ہے۔ اس لئے کہ ان کی موجودگی میں بے حرمتی ہونے سے وہ روکیں گے۔ اگر قرآن پاک کفار کے ہاتھ لگنے کا اندیشہ ہو تو قرآن لے کر ان کے علاقہ میں جانا حرام ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید لے کر دشمن کے علاقہ کی طرف سفر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری شریف)

قرآن پاک کو بطور تکیہ سر کے نیچے رکھ لینا، اس کے صفحات کو ایک دوسرے سے چپکا دینا، کسی چیز کے حفاظت کے لئے استعمال کرنا۔ (چاہے علمی کتاب کی حفاظت کیلئے ہو۔) کھانے کی چیز اس پر رکھنا، بغیر چبائے اسے کھا جانا (یعنی ہر وہ چیز جس پر قرآن تحریر ہو) سکے وغیرہ اس میں رکھنا اور نجس جگہ اسے رکھنا حرام ہے۔ قرآن بوسیدہ ہونے کے بعد بے حرمتی سے بچانے کے لئے اسے جلانے میں حرج نہیں۔ قرآن پر نجاست لگ جائے تو دھو کر صاف کرنا ضروری ہے۔ چاہے اس کی وجہ سے قرآن تلف ہو جائے۔ قرآن سے فال نکالنا مکروہ ہے۔ قرآن کے علاوہ شرعی علوم کی دیگر کتابوں کو بے وضو چھونا و اٹھانا حرام نہیں ہے۔ بقیہ احکام میں یہ کتابیں بھی قرآن کی طرح ہیں اس لئے کہ ان میں ان کتابوں کی توہین معلوم ہوتی ہے۔

قرآن لکھی چیز کو چبا کر کھانا یا دھو کر پینا جائز ہے، اس لئے کہ اندر پہنچنے تک قرآن کی تحریر باقی نہیں رہتی۔ لیکن نگلنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اسی حال میں اندر پہنچ کر وہاں کی نجاست اس پر لگے گی۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۷۸)

باب: غسل کے احکام (نہانا)

آیت: "وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوْا" (سورہ المائدہ ۔ آیت ۶) ''اوراگرتم جنابت کی حالت میں ہوتو سارا بدن پاک کرو'' لغت میں کسی بھی چیز پر پانی کے بہنے کو غسل کہتے ہیں۔شریعت میں نیت کے ساتھ پورے بدن پر پانی کے بہنے کو غسل کہتے ہیں۔(حاشیۃ الجمل ۱/۱۴۱)

چار اسباب سے غسل واجب ہوتا ہے

(۱) موت، اس کی تفصیل جنازہ کے باب میں آئے گی۔ **(۲) حیض** عورت کو حیض کا خون آنے کی وجہ سے خون کا سلسلہ بند ہونے کے بعد غسل کرنا واجب ہے۔حدیث: آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیشؓ سے ارشاد فرمایا! ''جب حیض آئے تو نماز چھوڑ دو، اور ختم ہو جائے تو غسل کر کے نماز پڑھو'' (متفق علیه عن عائشه) غسل اور اکثر احکام میں نفاس (ولادت کے بعد کا خون) بھی حیض کی طرح ہے۔ **(۳) ولادت**، حاملہ عورت کے بدن سے بچہ، علقہ یا مضغہ باہر آجائے اور خون نہ آئے تب بھی غسل کرنا ضروری ہے۔ **(۴) جنابت**۔ جنابت دو وجہ سے ہوگی۔(الف) جماع (صحبت) (ب) انزال۔ (منی کا نکلنا)

(الف) جماع: حشفہ (عضو تناسل کی سپاری) کے بقدر مرد کی اگلی شرمگاہ کسی بھی فرج میں داخل کرنے کو جماع کہیں گے۔ عورت، مرد، جانور، زندہ، مردہ، عمر میں کم ہو یا زیادہ، ان میں سے کسی کے بھی اگلی یا پچھلی شرمگاہ میں داخل کرے، جنبی (بڑی ناپاکی والا) کہلائے گا۔عورت کی شرمگاہ میں کسی بھی عضو تناسل کے داخل ہونے سے اس پر غسل واجب ہوگا۔اگرچہ جانور، مردہ یا بچہ کا عضو تناسل داخل ہو۔اور اس مرد پر بھی غسل واجب ہے جس کے دبر میں عضو تناسل داخل ہو۔اگر میت کے ساتھ جماع کیا ہے۔تو میت کو اس کی وجہ سے دوبارہ غسل دینا واجب نہیں (صرف جماع کرنے والے پر غسل واجب ہے) کم سن یا پاگل جماع کرے یا ان سے کوئی جماع کرے تو یہ بھی جنبی کہلائیں گے۔اگر بچہ ممیز (باشعور) ہو تو اس کا غسل صحیح ہوگا۔

بالغ ہونے کے بعد دوبارہ غسل واجب نہیں ہے۔جس طرح ممیز بچے کے سرپرست پر اس کو وضو کا حکم دینا ضروری ہے، اسی طرح جنابت کی صورت میں غسل کا حکم دینا بھی ضروری ہے۔بچہ بالغ ہو جائے یا پاگل کا جنون ختم ہو جائے اور ابھی جنابت کا غسل نہیں لیا، تو غسل لینا واجب ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔! مرد عورت کے شعب اربعہ کے درمیان بیٹھے اور دونوں کے ختنہ کی جگہ ایک دوسرے کو چھو جائے (یعنی مرد عورت سے جماع کرے) تو غسل واجب ہو گیا'' (مسلم ۔ الشافعی ۔ ترمذی ۔ ابن حبان وغیرہ) یہ ساری تفصیلات اس وقت ہیں جبکہ حشفہ کے بقدر داخل کیا جائے، اگر اس سے کم حصہ داخل کرے تو غسل واجب نہیں ہے۔عضو تناسل پر کپڑا وغیرہ لپیٹ کر اندر داخل کیا تب بھی غسل واجب ہے، اسی طرح دیگر احکام میں بھی اسے جماع سمجھا جائے گا۔

(ب) منی کے انزال کی وجہ سے جنابت۔ حدیث: (۱) پانی پانی کی وجہ سے ہے۔(مسلم ۔ ابو داود ۔ نسائی ۔ ابی خزیمہ ابن حبان وغیرہ) مفہوم: منی نکلنے کی وجہ سے غسل کرنا واجب ہے۔(۲) حضرت ام سُلیمؓ کے سوال پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! عورت کو پانی (منی) نظر آئے، (یعنی نیند میں انزال ہو جائے) تو غسل واجب ہوگا (متفق علیه) منی عام راستے سے نکلے یا پشت یا خصیہ کے سوراخ سے، آدمی جنبی ہو جائے گا۔مرد کی پشت یا عورت کی پسلیوں کے نیچے سے منی نکلنے سے جنابت حاصل ہوگی، جبکہ

اصل راستہ بند ہو۔(فتح الوهاب السراج۔ ص ۲۰)

منی کے کچھ خواص ھیں (۱) اگر منی تر ہے تو اس کی بو گوندھے ہوئے آٹے اور کھجور کے شگوفہ کی طرح ہوگی اور خشک ہے تو انڈے کی سفیدی کی طرح (۲) اچھل کر نکلنا (۳) نکلنے سے لذت کا حاصل ہونا اور نکلنے کے بعد عضو مخصوص کا سست اور شہوت ماند پڑ جانا۔ سارے خواص کا پایا جانا ضروری نہیں۔ کوئی ایک خاصیت بھی موجود ہے تو وہ منی ہے۔ منی کے دیگر بھی صفات ہیں۔ جیسے کہ اعتدال کی حالت میں مرد کی منی کا سفید اور گاڑھا ہونا اور عورت کی منی کا پتلا اور زرد ہونا۔

لیکن یہ صفات خواص میں داخل نہیں، لہٰذا ان کے نہ ہونے سے منی نہ ہونا یا ان کے ہونے سے منی ہی ہونا ضروری نہیں۔ کسی مرض کی وجہ سے گاڑھا پن اور سفیدی ختم ہو جائے، یا کثرت جماع کی وجہ سے خون کی رنگت پر نکلے، تب بھی بعض خواص پر اعتماد کرتے ہوئے غسل واجب ہوگا۔ انزال کی وجہ سے غسل کرنے کے بعد بقیہ منی نکلے تو دوبارہ غسل کرنا ضروری ہے۔ چاہے پیشاب سے پہلے نکلے یا بعد میں، عورت کی منی نکلے تو اس پر بھی غسل واجب ہے، صحیحین میں ام سُلیمؓ سے مروی ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ سے عورتوں کے احتلام کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ! اگر منی نظر آئے تو اسے غسل کرنا ضروری ہے۔

امام الحرمین اور امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کی منی صرف تلذذ سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ (یعنی دیگر خواص اس میں نہیں ہوتے) دیگر اکثر حضرات کے نزدیک اس کی منی بھی خواص میں مرد کی طرح ہے۔ **جماع کی وجہ سے غسل کرنے کے بعد عورت کے بدن سے مرد کی منی نکلے تو ان دو شرطوں کے ساتھ اس پر غسل واجب ھے۔**

(۱) عورت بالغہ ہو، کمسن نہ ہو۔ (۲) مذکورہ جماع میں اس کی بھی شہوت پوری ہو چکی ہو (اس صورت میں اس میں عورت کی منی کا بھی امکان ہے۔) اگر ایک شرط بھی نہ ہو تو غسل واجب نہیں (اس لئے کہ وہ صرف مرد کی منی ہوگی) عورت نے کسی کی منی کو اپنے فرج میں داخل کیا (بغیر صحبت کے) تو اس پر غسل لازم نہیں ہے۔

متفرق : میت کو غسل دینے کے بعد اور جنون و بے ہوشی ختم ہونے کے بعد غسل کرنا واجب نہیں ہے۔ اپنے کپڑے یا بستر میں ،جس کو دوسرا کوئی استعمال نہیں کرتا، منی نظر آئے اور احتلام یاد نہیں تب بھی اس پر غسل واجب ہے۔ اور ہر وہ نماز جس کے بعد اس منی کے نکلنے کا احتمال نہیں لوٹانا ضروری ہے اور جن نمازوں سے پہلے نکلنے کا احتمال ہے ان کا لوٹانا مستحب ہے۔ (جیسے کسی نے جمعہ کو کپڑے پہنے پھر اتوار کی شام منی نظر آئے تو اتوار کی فجر ظہر اور عصر کو لوٹانا ضروری ہے۔ سنیچر کی فجر سے عشاء تک کی نماز لوٹانا مستحب ہے۔) اگر اس بستر میں کوئی اور بھی سوتا ہو اور اس کی منی ہونے کا بھی احتمال ہو تو اس پر غسل واجب نہیں، البتہ مستحب ہے کہ دونوں بھی غسل کر لیں۔ منی اپنے مقام سے نکلنے اور انزال کے قریب ہونے کا احساس ہوتے ہی عضو مخصوص کو مضبوطی سے پکڑ لیا جس کی وجہ سے منی فی الحال باہر نہیں آئی۔ اور نہ بعد میں آنے کا علم ہوا تو غسل واجب نہیں۔

فصل : جنبی پر حرام امور : جو امور محدث (بے وضو) کے لئے حرام ہیں جنبی کے لئے بھی حرام ہیں۔ جنبی کیلئے مزید قرآن پاک کی تلاوت اور مسجد میں رکنا بھی حرام ہے۔ قرآن کی آیت کا ایک حصہ بھی قرآن کے قصد سے پڑھنا حرام ہے۔ کسی جنبی کو پانی اور مٹی دونوں میسر نہ ہوں، (جو وضو اور تیمّم نہ کر سکے) وہ فرض نماز میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھے گا۔ **حدیث :** (۱) آپ ﷺ نے فرمایا جنبی اور حائضہ قرآن میں سے کچھ نہ پڑھیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دار قطنی)

(۲) حضرت علی کا فرمان ہے: جنابت کے علاوہ کوئی چیز آپ ﷺ کو قرآن (کی تلاوت) سے نہ روکتی تھی،، (احمد، اصحاب السنن، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، بزار، دار قطنی، بیہقی و صححہ الترمذی و غیرہ)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد (میں رکنا) حلال نہیں۔ (ابوداود، ابن ماجہ، طبرانی، صححہ ابن خزیمہ، حسنہ ابن القطان، تلخیص ۱/۱۴۸)

قرآن کے ارادہ کے بغیر قرآن میں سے کچھ پڑھے تو جائز ہے۔ جیسے "بِسْمِ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" یا سواری کے دعا کے طور پر "سُبْحَانَ الَّذِی سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ" آیت پڑھے، تلاوت وذکر کی نیت کے بغیر کوئی یہ آیت اس کی زبان سے جاری ہو تو جائز ہے۔ جنبی کی طرح حیض ونفاس والی عورت پر بھی تلاوت حرام ہے۔ کسی پاک آدمی کا منہ نجس ہو تو اسے تلاوت کرنا مکروہ ہے۔ حمام میں تلاوت مکروہ نہیں ہے۔ تلاوت کی نیت کے بغیر وعظ ونصیحت، بیان یا (شیاطین وغیرہ کے شر سے) حفاظت کے خاطر قرآن پڑھنا حرام نہیں ہے۔ (تسر شیح ص ۳۰/) مسجد میں ٹھہرنا اور رکنا تو جنبی پر حرام ہے، لیکن مسجد سے گذر جانا حرام نہیں ہے۔ البتہ بغیر کسی ضرورت کے یہ مکروہ ہے۔ جنبی مسجد میں ٹہلتا رہے یہ بھی حرام ہے۔ مجبوری کی وجہ سے رکنے کی اجازت ہے، جیسے کوئی مسجد میں سو گیا اور احتلام ہو گیا، بعد میں دروازہ مقفل (بند) ہونے یا کسی خوف کی وجہ سے باہر نکلنا ممکن نہیں، ایسی صورت میں اگر ممکن ہو تو تیمم کر لینا چاہئے۔ (مسجد میں کنواں وغیرہ ہو تو اندر ہی غسل کرنا ضروری ہے، مسجد کا فرش یا دیوار مٹی کی ہے تو اسے تیمم میں استعمال کرنا جائز نہیں) امام شافعیؒ نے الأم (اُم امام شافعیؒ کی شہرہ آفاق کتاب ہے) میں اور دیگر علماء نے یہ تصریح کی ہے کہ جنبی اور حائضہ (حیض والی عورت) کے علاوہ دوسرے حضرات مسجد میں سو سکتے ہیں۔ (جبکہ نمازیوں کیلئے تنگی وتشویش کا باعث نہ ہو) بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ، حضرت علیؓ اور ایک خاتون کا آپ ﷺ کے زمانہ میں مسجد میں سونا مروی ہے۔ ایسی مسجد میں احتلام ہو، جس میں دو دروازے ہوں، ایک اس سے قریب اور دوسرا دور تو قریبی دروازہ سے نکلنا اولیٰ ہے۔

جنبی اور حائضہ کے غسل سے بچا ہوا پانی طہور ہے، اس کے استعمال میں کوئی کراہت نہیں، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ اور وہ ایک ہی برتن سے جنابت کا غسل کیا کرتے تھے۔ جنبی کیلئے (غسل سے پہلے) جماع کرنا، سونا، اور کھانا پینا جائز ہے، لیکن سنت ہے کہ شرمگاہ کو دھونے اور وضو کرنے سے پہلے یہ امور انجام نہ دے۔ صحیحین اور دیگر کتب حدیث میں حضرات عائشہؓ، جابرؓ، ام سلمہؓ اور ابو ہریرہؓ سے جنبی کیلئے کھانے یا سونے کا ارادہ ہو تو درمیان میں وضو کر لینے کا حکم مروی ہے (تلخیص ۱/۱۴۹-۱۴۸) حیض و نفاس کا خون جاری ہو تو اس کے لئے مذکورہ وضو سنت نہیں ہے، جب خون بند ہو جائے (اور ابھی غسل نہیں کیا) تو وہ بھی جنبی کی طرح ہے (یعنی سونے اور کھانے پینے کیلئے وضو کر لے۔)

غسل کی کیفیت

غسل کا ادنی درجہ: غسل کے دو فرض ہیں۔ (۱) **نیت** ۔نیت سے متعلق جزئیات وضو کے بیان میں گذر چکے، کسی فرض حصے کے دھونے کے بعد نیت کافی نہیں۔ اس کے ساتھ متصل ہو تو کافی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ادا کی جانے والی غسل کی سنتوں کا ثواب نہیں ملے گا۔ فرض حصہ دھونا شروع کرنے سے پہلے نیت کر لی اور شروع کرنے تک نیت حاضر ہے تو کافی ہے ورنہ کافی نہیں (جیسا کہ وضو میں تفصیل گزر چکی)

اگر رفع جنابت (جنابت دور کرنا) یا سارے بدن سے رفع حدث یا حائضہ نے حدثِ حیض کے دور کرنے کی نیت کی تو غسل صحیح ہے۔صرف رفع حدث کی نیت کی، جنابت وغیرہ سے تعرض نہ کیا، تو غسل ہو جائے گا۔اگر عمداً حدث اصغر کے دور کرنے کی نیت کی تو غسل صحیح نہ ہوگا اور غلطی سے اپنے حدث کو حدث اصغر خیال کرتے ہوئے یہ نیت کی تھی تو صرف چہرہ، ہاتھ اور پیر (سر کے علاوہ تینوں اعضاء وضو) کی جنابت دور ہوگی، بقیہ بدن کی دور نہ ہوگی۔ایسا فعل جائز قرار دینے کی نیت کرے جو بغیر غسل کے جائز نہیں جیسے نماز۔طواف۔تلاوت قرآن تو کافی ہے، حائضہ وطی (صحبت) جائز قرار دینے کی نیت کرے تو غسل صحیح ہوگا۔

جن امور کے لئے غسل واجب نہیں (مستحب ہو یا نہ ہو) جیسے اذان۔مسجد سے گذرنا وغیرہ۔ایسے امور کے جواز کی نیت سے صحیح نہ ہوگا۔فرض یا غسل کے فریضہ کو انجام دینے کی نیت کرے تو کافی ہے۔

(۲) پورے بدن پر پانی بهانا: کان کے سوراخ میں سے جو حصہ ظاہر ہے، بدن کی شکنیں اور سلوٹیں، غیر مختون کے ختنہ میں کٹنے والی کھال کے نیچے کا حصہ، کسی کی ناک کٹنے کی وجہ سے جو حصہ کھل چکا ہو، قضاء حاجت کیلئے بیٹھتے وقت ثیبہ کے فرج کا جتنا حصہ ظاہر ہوتا ہے، ان تمام اعضاء پر پانی بہانا ضروری ہے۔کلی اور استنشاق ضروری نہیں، کھال پر اگنے والے تمام بالوں اور اس کی جڑوں میں چاہے گھنے ہوں، پانی پہنچانا ضروری ہے۔آنکھ کے اندر اگے بال کو دھونا ضروری نہیں، بلکہ حدث کی وجہ سے آنکھ کے اندر پانی پہنچانا سنت بھی نہیں ہے، لیکن نجاست لگی ہو تو دھونا ضروری ہے۔ناک کے اندورنی بال چاہے لمبے ہوں، دھونا ضروری نہیں۔(بشری ۱/۳۸) بالوں میں گرہ پڑی ہو تو اس کے اندر پانی کا نہ پہنچنا معاف ہے۔(البتہ کسی نے گرہ لگائی ہو تو تھوڑی مقدار میں معاف ہے زیادہ ہو تو معاف نہیں) چوٹیوں کے اندر بغیر کھولے پانی نہ پہنچے، تو ان کا کھولنا ضروری ہے، ورنہ ضروری نہیں۔

اکمل غسل کا طریقه: (۱) اگر نجاست لگی ہو تو غسل سے پہلے اس کا دھونا واجب نہیں ہے، غسل کی نیت سے ایک مرتبہ دھو دیا تو نجاست کا ازالہ اور غسل دونوں حاصل ہونگے۔لیکن بدن پر لگی گندگی جیسے منی وغیرہ کو پہلے دور کرنا بہتر ہے۔

(۲) پھر نماز کی طرح وضو کرے، جیسا کے بخاری شریف میں حدیث مروی ہے، مکمل وضو کر لینا بہتر ہے، اگر قدموں کو باقی رکھے اور غسل سے فارغ ہونے کے بعد دھولے تب بھی کافی ہے۔

اگر صرف جنبی ہے (بے وضو نہیں ہے) تو اس وضو میں سنت غسل کی نیت کر لے، اور بے وضو بھی ہے تو حدث اصغر کے دور کرنے کی نیت کر لے۔باوضو شخص اگر عضو مخصوص پر کپڑا لپیٹ کر جماع کرے اور بدن عورت کے بدن سے بالکل مس نہ ہو، یا نظر و فکر کی وجہ سے انزال ہو تو ان صورتوں میں جنبی تو ہوگا، لیکن وضو نہ ٹوٹے گا (۳) موڑ اور پیچ والے مقامات مثلاً کان، پیٹ کی شکنیں، بالوں کی جڑ وغیرہ کا خصوصی خیال رکھے۔پانی بہانے سے پہلے بال کی جڑوں کا پانی سے خلال کرے۔

(۴) پانی پہلے سر پر ڈالے، پھر دائیں طرف پھر بائیں طرف، اس کیفیت کو بخاری شریف و مسلم نے حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے مرفوعاً پیش کیا ہے، وضو کی طرح تین مرتبہ پورے بدن پر پانی بہانا، پہلے سر پر تین مرتبہ، پھر دائیں طرف تین مرتبہ، پھر بائیں طرف تین مرتبہ نہر وغیرہ میں غسل کر رہا ہو تو تین غوطے لگائے۔ہر مرتبہ جہاں تک ہاتھ پہنچتا ہو بدن کو اچھی طرح رگڑے۔غسل کی تجدید (بغیر سبب کے دوبارہ غسل کرنا) مستحب نہیں ہے۔(۵) حیض یا نفاس کا غسل ہو تو غسل کے بعد خوشبو کی روئی جیسی چیز میں لیکر اپنے فرج میں داخل کرے۔(فرج کا وہ حصہ مراد ہے جس کا غسل میں دھلنا ضروری ہے) مشک استعمال کرنا بہتر ہے، ورنہ دوسری کوئی خوشبو۔خوشبو میسر نہ ہو تو مٹی، ورنہ صرف پانی بھی کافی ہے (خوشبو کا یہ حکم شوہر کی وفات پر سوگ منانے والی عورت، روزہ دار اور محرم کیلئے نہیں ہے۔) ایک صحابیہ نے آپ

ﷺ سے غسل حیض کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے مشک کے استعمال کی طرف رہنمائی فرمائی۔(متفق علیہ)

(۶) وضو اور غسل کیلئے پانی کی مقدار متعین نہیں ہے، البتہ ایک معتدل بدن والے کیلئے مستحب یہ ہے کہ وضو کا پانی تقریباً ایک مد اور غسل کا پانی تقریباً ایک صاع سے کم نہ ہو، جیسا کہ حضرت سفینہ سے صحیح مسلم کی حدیث میں اور حضرت انس سے صحیحین میں مروی ہے۔

(۷) غسل مکمل ہونے تک نیت کا باقی رکھنا مستحب ہے، رکے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے غسل سے فارغ ہونے کے بعد یہ پڑھے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ"

وضو کے باب میں بیان کردہ کئی سنتیں یہاں بھی جاری ہوں گی۔ وضو وغسل کے وقت گفتگو مکروہ نہیں، البتہ گفتگو نہ کرنا اولیٰ ہے۔(قلائد ۱/۲۶) دوسروں کے سامنے غسل کرتے وقت ستر کا کھلا رکھنا جائز نہیں ہے (میاں بیوی ایک دوسرے کے حق میں مستثنیٰ ہیں) تنہائی میں عریاں (ننگا) نہانا جائز ہے، جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق مروی ہے، لیکن افضلیت کے خلاف ہے۔ غسل کرنے والے کا مضمضہ، استنشاق یا وضو کو چھوڑنا بُری بات ہے، اس کی تلافی کرے، غسل میں ترتیب واجب نہیں ہے۔ لیکن پہلے وضو کے اعضاء کو پھر سر اور بدن کے اوپر کے حصہ پر پانی بہانا مستحب ہے۔ انزال منی کی وجہ سے پیشاب کرنے سے پہلے غسل کرلینا جائز ہے۔ البتہ پیشاب کے بعد غسل کرنا افضل ہے، تاکہ غسل کے بعد پھر منی نہ نکلے ایک ہی غسل سے فرض اور سنت (جیسے جنابت اور جمعہ کا غسل) کی نیت کرے تو دونوں حاصل ہونگے۔ ایک ہی کی نیت کی تو ایک ہی غسل حاصل ہوگا۔ کسی پر حیض و جنابت دونوں کا غسل ہو تو کسی ایک کی نیت سے غسل کرلینے سے دونوں غسل ادا ہونگے۔ عید، جمعہ۔ سورج گہن وغیرہ کے سب غسل جمع ہوجائیں اور سب کی نیت سے غسل کرے تو سب حاصل ہونگے، بلکہ کسی ایک کی نیت سے بھی دیگر غسل حاصل ہوجائیں گے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۱۶۶)

جو شخص جنبی اور بے وضو دونوں ہو، صرف غسل کرلینے سے اس کو دونوں پاکی حاصل ہوں گے، خواہ وضو کی نیت نہ کرے اور اعضاء وضو میں ترتیب کا خیال نہ رکھے۔ (حاشیۃ الجمل ۱۶۷)

کتاب التیمم

تیمم کا مطلب عربی زبان میں قصد ہے، اور شرعاً چہرہ اور ہاتھ پر مخصوص شرائط کے ساتھ وضو اور غسل یا کسی ایک عضو کے بدلہ میں مٹی پہنچانے کو تیمم کہتے ہیں (حاشیۃ الروضہ)

آیت:" وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْداً طَيِّباً فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ" (سورة النساء آیت ۴۳) ترجمہ: اور اگر تم بیمار ہو، یا حالت سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص استنجا سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے، تو تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو، یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیرلیا کرو۔

پہلا باب تیمم کے اسباب

پانی استعمال نہیں کرسکتے تو تیمم کرنا جائز ہوگا۔ اس مجبوری کے درج ذیل سات اسباب ہیں۔(۱) پانی موجود نہ ہونا۔ اس سلسلہ میں مسافر کی چار حالتیں ہونگی۔(الف) اپنے اطراف پانی نہ ہونا یقینی ہو، ایسی صورت میں پانی کی تلاش کے بغیر بھی تیمم کرسکتا ہے۔(ب) اطراف میں پانی ہونے کا امکان ہو، اس صورت میں نماز کا وقت ہونے کے بعد پانی کی تلاش ضروری ہے، خود تلاش کرے یا کسی اور معتبر

شخص سے کروائے۔اپنے طور پر کسی دوسرے شخص کا تلاش کرنا کافی نہیں۔پہلے اپنی قیام گاہ میں تلاش کرے پھر دائیں بائیں۔اور آگے پیچھے دور تک نگاہ دوڑائے جبکہ سطح زمین ہو(ٹیلے وغیرہ نہ ہوں) سرسبز مقامات اور جہاں پرندے موجود ہوں، وہاں خصوصاً توجہ دے اور اگر زمین سطح نہ ہو(ٹیلے اور گڑھے وغیرہ ہوں) لیکن پانی کی تلاش میں آگے نکل جانے کی صورت میں اپنے جان یا مال کا خطرہ ہو تو جانا واجب نہیں ہے۔اور ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے تو چاروں طرف اتنی دور تک پانی کی تلاش میں جانا ضروری ہے کہ وہاں سے کسی ضرورت سے اپنے ساتھیوں کو آواز دے اور وہ اپنے کام اور گفتگو میں مصروف ہوں تو اس کی آواز پر مدد کو پہنچ سکیں۔زمین کے نشیب وفراز (اونچ نیچ) کے اعتبار سے اس مسافت (دوری) میں فرق آئے گا۔

اسی مسافت کو'منہاج' میں یوں بتلایا کہ سطح زمین پر جہاں تک نظر جاتی ہے وہاں تک جانا ضروری ہے اور شرح صغیر میں اس کو تیر کی انتہا سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایک تیر زیادہ سے زیادہ جتنی دور جاتا ہو۔بعض حضرات نے کہا کہ یہ مسافت ۳۰۰ سے ۴۰۰ ہاتھ تک ہوتی ہے (۱۲۰ تا ۱۶۰ میٹر)اس مسافت کو اصطلاح فقہ میں حد غوث کہتے ہیں۔(حاشية الجمل مع الفتح ۱/ ۱۹۹)

سفر میں ساتھی ہوں، تو تمام ساتھیوں سے بھی پانی کے متعلق دریافت کرے۔اتنی بلند آواز سے جو ساتھیوں تک پہنچے یہ اعلان کرے کہ کسی کے پاس پانی ہے جو بطور ہبہ یا قیمت سے مجھے دیدے، ہر ساتھی سے فرداً فرداً پوچھنا ضروری نہیں۔تمام ساتھی مل کر کسی ایک آدمی کو پانی تلاش کرنے روانہ کریں تو کافی ہے۔یہ تفصیلات اس وقت ہیں جبکہ اس سے پہلے تلاش اور تیمم نہ کر چکا ہو۔اس سے پہلے پانی تلاش کر کے نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کر چکا ہو اور اس کے بعد کوئی ایسی بات پائی جائے جس کی وجہ سے پانی کا احتمال ہو جیسے اس جگہ سے ہٹ چکا ہو، یا نیا قافلہ نظر آئے یا بادل چھا جائے تو پھر تلاش کرنا ضروری ہے۔لیکن ہر وہ مقام جہاں ایک مرتبہ تلاش کے بعد پانی نہ ہونا یقینی ہو چکا اور بعد میں پانی کی موجودگی کا کوئی احتمال بھی نہیں تو وہاں دوبارہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

اگر پانی کے احتمال کا سبب پایا نہ جائے اور پانی کے نہ ہونے کا گمان ہو (یقین نہ ہو) تو تلاش کرنا ضروری ہے، لیکن پہلی مرتبہ کے مقابلہ میں کمتر درجہ میں۔

مذکورہ بالا مسائل میں دونوں تیمم کے درمیان مدت طویل ہو یا کم، یا بغیر مدت کے معاملہ پیش آئے نوعیت یہی رہے گی۔

(ج) اطراف میں پانی کا ہونا یقینی ہو۔پانی اتنی دوری پر ہو جہاں تک کسی جگہ پڑاؤ ڈالنے والے مسافر ایندھن اور گھاس چارہ کیلئے جاتے ہوں۔تو پانی تک (جانے میں نماز قضاء نہ ہو تو) جا کر وضو کر کے نماز پڑھنا ضروری ہے، تیمم کرنا جائز نہیں۔یہ مسافت سابقہ حد غوث سے زائد ہے۔اس مسافت کا نام حد قرب ہے جو تقریباً نصف (فرسخ ڈیڑھ میل ہاشمی، ۳ کلومیٹر سے کچھ کم) ہوتا ہے۔

حد قرب کی مقدار ۶۰۰۰ (چھ ہزار) قدم ہے۔(مقدمہ الحضرمیہ) اس صورت میں پانی تک پہنچنے میں نماز کا وقت نکل جاتا ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے لیکن کسی کے پاس پانی ہو اور وقت اتنا تنگ ہو چکا ہو کہ وضو کرنے تک نماز قضاء ہوتی ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، وضو ہی کرنا ضروری ہے۔اگر پانی مذکورہ حد قرب سے بھی دور ہو تو پانی تک جانا ضروری نہیں ہے، بلکہ تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے اس مسافت کو حد بعد کہیں گے۔(فتح الوهاب ۱/ ۲۲) مقیم شخص کو پانی تک پہنچنے میں وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تب بھی تیمم کرنا جائز نہیں اس لئے کہ اس کو تو قضاء لازم ہے۔

جن صورتوں میں مسافر کو تیمم کی اجازت ہے، اگر اسے قضاء ہونے سے پہلے پانی ملنے کا یقین ہو، تو نماز کو مؤخر کرنا، تاکہ وضو کر کے پڑھ لے افضل ہے۔پانی کا یقین نہ ہو صرف امید ہو تو تیمم کر کے اوّل وقت پڑھ لینا افضل ہے۔اس صورت میں بعد میں پانی مل

جائے تو وضو کر کے پھر پڑھ لینا بڑی اچھی بات ہے۔ اگر پانی نہ ہونے کا گمان ہو یا دونوں کا یکساں احتمال ہو، تو اوّل وقت تیمم کر کے پڑھ لینا افضل ہے۔

اوّل وقت میں تنہا نماز پڑھنی پڑتی ہو اور تاخیر کی صورت میں جماعت ملتی ہو، تو سب سے بہتر یہ ہے کہ اوّل وقت میں تنہا نماز پڑھ کر بعد میں جماعت سے دوبارہ پڑھ لے۔ جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی احادیث میں آئندہ ائمہ کے نماز مؤخر کرنے کی صورت میں آپ ﷺ نے یہ رہنمائی فرمائی ہے کہ اصل وقت (اوّل وقت) میں اپنی نماز پڑھ لی جائے، پھر جماعت کے ساتھ بھی (بطور نفل) ادا کرے۔ اگر ایک ہی نماز پڑھنا ہو تو تاخیر زیادہ نہ ہوتی ہو، تو جماعت کے ساتھ پڑھنا ورنہ اوّل وقت پڑھنا افضل ہے۔

(د) کسی ایسے کنویں پر سارے مسافروں کا اژدہام ہو جائے جس سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی پانی لے سکتا ہے (جگہ کی تنگی یا ایک ہی ڈول ہونے کی وجہ سے) اور نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے اپنی باری آنے کی توقع ہو، تو تیمم کرنا جائز نہیں اور اگر یہ یقین ہو کہ اپنی باری وقت کے بعد ہی آئے گی تو وقت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لے پھر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کئی لوگ عریاں (ننگے) ہوں اور ان کے پاس ایک ہی کپڑا ہو جس کو باری باری پہن کر نماز پڑھ رہے ہوں اور اپنی باری تک وقت نکل جاتا ہو تو عریاں ہی وقت کے اندر نماز ادا کر لے پھر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کئی آدمی ایسی تنگ جگہ ہوں، جہاں کھڑے ہو کر صرف ایک ہی آدمی نماز پڑھ سکتا ہو اور اپنی باری وقت کے بعد آئے گی تو وقت کے اندر بیٹھ کر نماز پڑھ لے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

پانی کی قلت: جنبی یا محدث کو اتنا پانی ملے جو اس کی طہارت کے لئے ناکافی ہے، تو پہلے وہ پانی استعمال کرے پھر بقیہ اعضاء کے لئے تیمم کرے۔ لہٰذا محدث پہلے چہرہ پھر ہاتھ جتنا ہو سکے ترتیب سے دھوتا جائے اور جنبی بدن کے جس حصے کو چاہے دھولے (اس لئے کہ غسل میں ترتیب ضروری نہیں ہے) لیکن پہلے اعضاء وضو کو دھونا اولیٰ ہے۔ کوئی محدث اور جنبی دونوں ہو، تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (یعنی اعضاء وضو کو مقدم کرنا ضروری نہیں ہے۔) محدث کو برف یا اولہ ملے جسے پگھلا نہیں سکتا، تو اس کا استعمال ضروری نہیں ہے، جبکہ تیمم کے لئے مٹی موجود ہو، ورنہ اس کا استعمال واجب ہے۔ مٹی پورے تیمم کو ناکافی ہو، تو جتنی ہے استعمال کرنا واجب ہے۔ صحیحین میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ میں تم کو کسی بات کا حکم دوں، تو جتنا تم سے ہو سکے اس پر عمل کرو' برف کی صورت میں اگر اتنا پانی ہو کہ چہرہ اور ہاتھ دھل سکتے ہیں تو اس برف سے سر کا مسح لازم ہے، اور پانی نہ ہو تو مسح کی بھی ضرورت نہیں (حاشیة الجمل ۱/۲۰۲) تیمم کے بعد پانی نظر آئے تو تیمم باطل ہو جائے گا۔ کسی کے بدن پر کئی نجاستیں ہوں، اور اتنا پانی میسر ہو کہ اس میں سے کچھ ہی دھل سکتا ہے، تو اتنا دھونا ضروری ہے۔ کوئی جنبی یا محدث یا حائضہ ہو اور بدن پر نجاست بھی ہو اور پانی صرف کسی ایک کو کافی ہو تو اس سے نجاست دور کرنا ضروری ہے، نجاست کو اس سے دھو کر پھر تیمم کرے۔

فصل: کسی کے پاس طہارت کیلئے کافی پانی تھا، اس پانی کو نماز کے وقت سے پہلے یا بعد میں کسی حاجت کی وجہ سے یا بغیر حاجت کے ختم کر دیا، یا وہ پانی نجس ہو گیا، تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے، لیکن وقت کے بعد بغیر غرض کے پانی تلف کرنے سے گنہگار ہوگا۔

(ا) نماز کے وقت میں پانی کے پاس سے گذرا لیکن وضو نہیں کیا، پانی سے کافی دور نکل جانے کے بعد تیمم کر کے نماز پڑھ لی تو اعادہ کی ضرورت نہیں، وقت ہونے کے بعد بغیر حاجت (پیاس وغیرہ) کے کسی کو پانی ہبہ یا فروخت کرنا صحیح نہیں جبکہ فروخت کرنے والے کو قیمت کی ضرورت نہ ہو۔ لہٰذا جب تک پانی مشتری (خریدار) یا موہوب لہ، (جس کو ہبہ کیا) کے پاس باقی ہو، تیمم صحیح نہ ہوگا بلکہ پانی واپس لے لے، اگر نہیں لے سکتا تو قضا واجب ہے۔ وقت میں تیمم سے پڑھنا صحیح نہیں بلکہ پانی ملنے تک یا ایسی حالت جس میں تیمم سے فرض ساقط

ہو جاتا ہو، آنے تک نماز کو مؤخر کردے۔ جس صورت میں ہبہ صحیح نہیں، موہوب لہ کے پاس وہ پانی تلف ہو جائے تو اس پر کوئی ضمان (تاوان) نہ آئے گا۔

(۲) اپنے جان یا مال پر خوف وخطرہ ہو، اگر قریب ایسا درندہ یا دشمن ہو جو اس کی جان لے گا، یا کسی عضو کو نقصان پہنچائے گا، یا اپنے مال پر غاصب یا چور حملہ آور ہوگا یا کشتی میں ہو اور سمندر سے پانی لینے میں خطرہ ہو تو ان صورتوں میں تیمم کر سکتا ہے۔ اگر پانی تک جانے میں سفر کے ساتھی چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو تیمم کرلے۔ خادم کو پانی ھبہ کیا تو قبول کرنا ضروری ہے۔ پانی نکالنے کیلئے کوئی ڈول اور رسی عاریۃً دے تو قبول کرنا واجب ہے۔ کوئی پانی قرض دے تو لینا واجب ہے، اگر کوئی پانی یا ڈول وغیرہ کی قیمت ہبہ کرے تو قبول کرنا واجب نہیں۔ کسی تنگدست کو یا ایسے مالدار کو جس کا مال غائب ہے (پاس موجود نہیں) کوئی پانی کی قیمت قرض دے رہا ہو تو قبول کرنا واجب نہیں۔ کسی تنگدست کو پانی ادھار قیمت پر مل رہا ہو تو خریدنا ضروری نہیں، لیکن مالدار کو ضروری ہے، جبکہ قیمت کی ادائیگی کے لئے اتنی مہلت رکھی گئی ہو جس میں وہ اپنے مال تک پہنچ سکتا ہے۔

پانی کی قیمت پاس ہے لیکن قرض کی ادائیگی، ساتھ موجود حیوان محترم کا نفقہ، یا سفر کی آمد ورفت کے خرچ کے لئے اس کی ضرورت ہے، تو اس سے پانی خریدنا واجب نہیں۔ (حیوان محترم سے وہ جاندار مراد ہیں۔ شرعاً جن کے مارنے کی اجازت نہیں۔ انسان ہو یا جانور۔ مرتد حربی وغیرہ غیر محترم ہیں۔ ان کی رعایت کی اجازت نہیں) مذکورہ بالا ضروریات سے زائد رقم ہو اور ثمن مثل (مناسب قیمت) پر پانی مل جاتا ہو، تو خریدنا واجب ہے۔ موقع محل اور وقت کے اعتبار سے مناسب قیمت سے زائد قیمت پر ملتا ہو تو خریدنا واجب نہیں، چاہے زیادتی کی مقدار کم ہی ہو۔ اگر ادھار خریدنے کی وجہ سے مدت کے مناسب قیمت بڑھ جاتی ہو، تو یہ بھی ثمن مثل ہی ہے موقع محل اور وقت کے اعتبار سے مناسب قیمت کو ثمن مثل کہیں گے۔ اگر پانی نکالنے کا آلہ (ڈول وغیرہ) ثمن مثل یا اجرت مثل (مناسب کرایہ) پر مل جاتا ہو تو لینا واجب ہے۔ صرف ایک کپڑا موجود ہے۔ اسے ڈول سے باندھ کر پانی حاصل کر سکتا ہے، تو کرنا لازم ہے، ڈول نہیں ہے اور کپڑے ہی کو پانی میں لٹکا کر بھگونے کے بعد نچوڑ کر وضو کر سکتا ہے، تو ایسا کرنا واجب ہے۔

اگر کپڑا پانی تک نہیں پہنچتا، لیکن چاک (پھاڑ) کر کے جوڑنے سے پہنچ سکتا ہے تو اس طرح کرنا ضروری ہے۔ لیکن مذکورہ امور اس وقت واجب ہیں جبکہ ان کی وجہ سے پانی کی قیمت یا (ڈول کی) رسی کی اجرت سے زیادہ کپڑے کا نقصان نہ ہو۔

(اگر وضو کے پانی کا ثمن مثل پانچ روپے ہے اور مذکورہ کسی طریقے سے کپڑے کے استعمال سے کپڑے کا پانچ روپے تک کا نقصان ہوتا ہو، تب بھی واجب ہے، اس سے زائد نقصان ہوتا ہو تو واجب نہیں) (۳) پیاس جیسے امور کے لئے پانی کی ضرورت ہو، اس میں کئی مسائل ہیں (الف) پانی ہو لیکن اپنے یا ساتھی یا کسی حیوان محترم کے پیاس کیلئے فی الحال یا آئندہ اس کی ضرورت ہو تو تیمم جائز ہے مذکورہ صورت میں پانی دوسرے کو بغیر عوض کے دے یا عوض سے (لیکن جو شخص سفر کی وجہ سے گنہگار ہو، اسے توبہ کرنے تک تیمم جائز نہیں، جب توبہ کرے تو پانی پینا اور تیمم کرلینا جائز ہے۔ (حاشیۃ الروضہ) پیاس کے باوجود کوئی پانی نہ دے تو جبراً اور زبردستی لینا جائز ہے (غیر محترم حیوان یعنی حربی مرتد۔ سؤر، کاٹ کھانے والا کتا۔ چوہا۔ کوا، چیل، بچھو اور ان جیسے جاندار)

پانی سے وضو کر کے مستعمل پانی کو جمع کر کے پینا ضروری نہیں، بلکہ تیمم کرنا کافی ہے۔ کسی کے پاس پاک اور نجس پانی ہو تو پاک پانی پینے کیلئے استعمال کرے اور تیمم کرے۔ آئندہ کل پانی ملنے کا امکان ہو، لیکن یقین نہ ہو، تو پانی کل (پینے) کیلئے رکھ کر تیمم کرنا جائز ہے۔

(ب) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کوئی انسان انتقال کر جائے اور اس کے ساتھ پیاسے ہوں تو اس میت کے پانی کو خود پینے کے لئے

استعمال کر کے میت کو تیمم کرایا جائے اور پانی کی قیمت اس کی میراث میں داخل کی جائے۔

(ج) کسی نے وصیت کی یا کسی کو وکیل بنایا کہ پانی اس آدمی پر صرف کیا جائے جو پانی کا زیادہ حقدار ہو۔ اور میت، جنبی، حائضہ، جس کے بدن پر نجاست ہو اور محدث جمع ہو جائیں تو میت زیادہ حقدار ہے۔ میت کے مستحق ہونے کے لئے وارث کی طرف سے اس وصیت کو قبول کرنا شرط نہیں ہے، جیسا کہ کوئی تطوعاً (بغیر عوض کے) اسے کفن دے۔ دو آدمی آگے پیچھے انتقال کر جائیں، اور ان کے انتقال سے پہلے ہی صرف اتنا پانی میسر ہے جو ایک کو کافی ہو تو پہلے انتقال کرنے والا اس کا زیادہ مستحق ہے۔ دونوں ایک ساتھ انتقال کر جائیں یا انتقال کے بعد پانی ملے تو دونوں میں جو افضل ہو، وہ مستحق ہے، فضیلت میں دونوں برابر ہوں تو قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا۔

مذکورہ وصیت و توکیل کی صورت میں جنبی اور حائض جمع ہوں تو حائضہ زیادہ حقدار ہے۔ اور اگر جنبی اور محدث جمع ہوں اور پانی صرف وضو کے لئے کافی ہو، غسل کے لئے ناکافی ہو، تو محدث زیادہ مستحق ہے، دونوں کو ناکافی ہو تو جنبی زیادہ مستحق ہے، پانی کے ضرورت مند مذکورہ افراد کسی مباح پانی پر پہنچ کر ایک ساتھ اپنے قبضہ میں لے لیں، تو سب برابر برابر اس پانی کے مالک بن گئے، اور کسی کیلئے اپنا حصہ دوسرے کو دینا، چاہے وہ زیادہ ضرورت مند ہو، یا پانی ناقص ہو جائز نہیں ہے۔

(۴) پانی کے متعلق لاعلمی کی وجہ سے پانی استعمال نہ کر سکنا۔ اس کی مختلف صورتیں ہوں گی۔

(الف) اپنے سامان سفر میں موجود پانی بھول جائے، یا قیام گاہ کے قریب کنویں کا علم تھا، لیکن اس وقت بھول گیا، لہٰذا تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ اس صورت میں یاد آنے پر وضو کر کے نماز کا اعادہ ضروری ہے جیسے کوئی طہارت میں کوئی عضو بھول جائے یا کپڑا پہننا بھول جائے، پانی کی قیمت پاس تھی لیکن بھول گیا تو یہی حکم ہے۔

(ب) سامان سفر میں پانی بھی رکھ دیا گیا تھا، جس کا اسے علم نہیں تھا، اس لئے تیمم کر کے نماز پڑھ لی، پھر معلوم ہوا یا تیمم کرنے کے بعد قریب میں ایسے کنویں کی موجودگی کا علم ہوا جو پہلے معلوم نہیں تھا، تو اس صورت میں اعادہ کی ضرورت نہیں (البتہ شرح مہذب میں امام نوویؒ نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر کنواں واضح تھا تو اعادہ ضروری اور مخفی تھا تو ضروری نہیں ہے۔ حاشیۃ الروضہ)

ج) پانی اپنے اسباب سفر میں کھو گیا، اور تلاش کے باوجود نہ ملنے پر تیمم کر کے نماز پڑھ لی پھر پانی مل گیا، تو اعادہ واجب ہے۔ (اور نہ ملے تو واجب نہیں کما فی الحاشیۃ)

(د) اپنا اسباب سفر ہی دیگر مسافروں کے اسباب میں گم ہو جائے، اس صورت میں خوب مبالغہ کے ساتھ تلاش کیا تھا تو اعادہ کی ضرورت نہیں، اور سرسری تلاش کیا تھا تو اعادہ واجب ہے۔

(۵) مرض (بیماری) اس کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) مرض ایسا ہو کہ وضو کرنے کی وجہ سے وفات پانے کا، یا کسی عضو کے فوت ہونے کا، یا کسی عضو کے منفعت کے فوت ہونے کا ڈر ہو، تو تیمم کرے گا۔ خوفناک مرض کا اندیشہ ہو تو بھی تیمم کر لے۔

(ب) وضو کی وجہ سے درد کی زیادتی، شفا اور صحت میں تاخیر، دائمی مرض جو اسے لنجا بنا دے یا چہرہ جیسے ظاہری اعضا جو کام کاج کے وقت کھلے رہتے ہیں، اس پر بدنما (مثلاً سیاہ داغ وغیرہ) عیب کا اندیشہ اور خطرہ ہو، تو تیمم جائز ہے۔

(ج) وضو کی وجہ سے معمولی عیب کا خطرہ ہو جیسے چیچک کا داغ، معمولی سی سیاہی، یا ظاہری اعضاء کے علاوہ میں بدنما عیب کا اندیشہ ہو، یا ایسا مرض ہو کہ پانی کی وجہ سے کسی خطرناک نتیجہ کا اندیشہ نہیں۔ بھلے ہی فی الحال زخم یا ٹھنڈک یا گرمی کی وجہ سے پانی استعمال کرنے

میں تکلیف ہوتی ہوتو، ان تمام صورتوں میں تیمم کی اجازت نہیں (بعض علماء نے بدنما عیب کی وجہ سے مطلقاً تیمم کی اجازت دی ہے، ظاہر و باطن کی قید کے بغیر۔ کمافی الحاشیة)

مرض کا فیصلہ : مریض خود طب سے واقف ہوتو اپنی واقفیت کی بنیاد پر مرض کے سبب تیمم ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کر کے اس پر عمل کرسکتا ہے۔ اسی طرح ماہر طبیب (حکیم، ڈاکٹر) کی بات پر بھی اعتماد کرسکتا ہے۔ جبکہ وہ مسلمان بالغ اور عادل (جو کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے اور صغائر پر اصرار نہ کرے) شخص ہو، عورت یا غلام ہونے میں حرج نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک صرف اپنے تجربہ کی بنیاد پر فیصلہ کافی نہیں۔ امام اسنوی اور ابن حجر وغیرہ بعض علماء اسے کافی سمجھتے ہیں، یہی زیادہ مناسب ہے۔ طبیب کے نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھ لی تو ان نمازوں کا اعادہ ضروری ہے گرچہ بعد میں طبیب ملے اور تیمم کے جواز کا فیصلہ دے۔ (حاشية اجمل ۱ / ۲۰۸)

اگر بیماری تمام اعضاء طہارت کو گھیرے تو صرف تیمم کافی ہے۔ بعض اعضاء بیمار ہیں، تو تندرست اعضاء کو دھونا واجب ہے اور بیمار اعضاء کا مسئلہ زخمی کے مسئلہ کی طرح ہے امام نووی ابوعلی السنجی کا فتویٰ نقل کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق کوئی طبیب نہ ملے، تو تیمم کی اجازت نہیں (فتاوی بغوی میں تیمم کی اجازت ہے اور روضہ کے محشی اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔) مرض کے سبب تیمم کرنے میں مقیم و مسافر اور حدث اصغر و اکبر میں کوئی فرق نہیں، اور بعد میں اعادہ کی ضرورت نہیں (۶) جبیرہ باندھنا۔ (جبیرہ یعنی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے باندھنے کی لکڑی یا پٹی۔ پلاسٹر) جبیرہ ہڈی کے ٹوٹنے یا جگہ سے ہٹنے اور اکھڑنے کی وجہ سے لگایا جاتا ہے۔ کبھی تو جبیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی نہیں، ضرورت کے سلسلے میں مرض میں گذری ہوئی تفصیلات کا اعتبار کیا جائے گا۔

پھلی حالت : ضرورت کی وجہ سے جبیرہ باندھنا۔ اب یا تو طہارت کے وقت مرض کے بیان میں گذرے ہوئے تکلیف اور ضرر کے بغیر اسے نکال سکیں گے یا نہیں، نہیں ہٹا سکتے تو ہٹانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن طہارت میں کئی باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ (۱) عضو کے تندرست حصہ کا دھونا واجب ہے۔ یہاں تک کہ جبیرہ کے نیچے کے تندرست حصے کو بھی حتی الامکان دھوئے۔ جیسے کپڑے کا تر ٹکڑا اس پر رکھ کر نچوڑے تاکہ قطرات سے وہ حصے دھل جائیں۔

(۲) جبیرہ پر پانی سے مسح کرنا واجب ہے، اگر جنبی ہے تو جب چاہے مسح کرے اور محدث (بے وضو) ہے تو جب جبیرہ والے عضو کے دھونے کی باری آئے گی مسح کرے۔ پورے جبیرہ پر مسح کرنا ضروری ہے۔

(۳) چہرہ اور ہاتھ کا تیمم کرنا واجب ہے۔ جبیرہ عضو تیمم (یعنی چہرہ یا ہاتھ) پر ہے تو جبیرہ پر مٹی سے مسح کرنا واجب نہیں۔ اب اگر یہ جنبی ہے تو تیمم سے پہلے تندرست اعضاء کو دھوئے یا بعد میں اسے اختیار ہے۔ (بعد میں دھونا مستحب ہے تاکہ مٹی کا اثر ختم ہوجائے۔ (حاشية الروضه) اور محدث ہے تو ایک عضو کی طہارت پوری ہونے سے پہلے آگے نہیں بڑھ سکتا، لہٰذا اگر جبیرہ چہرہ پر ہے تو ہاتھ دھونے سے پہلے تیمم واجب ہے۔ اب چاہے چہرہ کے تندرست حصے کو پہلے دھوئے پھر بیمار حصے کی طرف سے تیمم کرے، یا اس کے برعکس اگر جبیرہ ہاتھ پر ہے تو سر کے مسح سے پہلے اور چہرہ دھونے کے بعد تیمم واجب ہے۔ جبیرہ دو یا تین اعضاء پر ہو تو اتنے ہی تیمم بھی واجب ہیں۔ کسی کے چہرہ اور ہاتھ پر جبیرہ ہے تو چہرہ کے تندرست حصے کو دھوئے اور بیمار حصے کی طرف سے تیمم کرے پھر ہاتھ میں بھی اسی طرح دھوئے اور تیمم کرے۔ (جہاں بھی تیمم کا لفظ آئے تو اس سے چہرہ اور ہاتھ کا تیمم مراد ہے۔ بیمار عضو پر مٹی پھیرنا مراد نہیں ہے)

وضو کے چاروں اعضاء مکمل زخمی ہوں (کسی حصے میں بھی پانی استعمال نہیں کرسکتے) تو چاروں کی طرف سے ایک تیمم کافی ہے۔ اس لئے کہ دھونا ساقط ہونے کی وجہ سے ترتیب ساقط ہوگئی۔ اگر سر پورا زخمی ہو اور بقیہ تینوں اعضاء کا بعض حصہ، تو اعضاء کے تندرست حصوں کو

دھونا، اور چار تیمم کرنا ضروری ہے۔

دونوں ہاتھ میں زخم ہو تو مستحب ہے کہ ہر ہاتھ کو ایک عضو سمجھے، لہٰذا چہرہ دھونے کے بعد دائیں ہاتھ کا تندرست حصہ دھوئے اور بیمار حصے کے بدلے تیمم کرے، پھر اسی طرح بائیں کو دھوئے اور تیمم کرے۔ اسی طرح دونوں پیروں کی صورت میں کرے، یہ بہتر شکل ہے۔ اس لئے کہ طہارت میں دائیں کو مقدم رکھنا سنت ہے، اور صرف ایک ہی تیمم (دونوں ہاتھ کیلئے) کرنے میں دونوں بیک وقت پاک ہوئے۔ (اگر چہ یہ صورت بھی کافی ہے) جبیرہ کی صورت میں مذکورہ تینوں اُمور درج ذیل دو شرائط کے ساتھ کافی ہونگے۔ (۱) جبیرہ کے نیچے تندرست حصہ صرف اتنا آیا ہو جو جبیرہ کے باندھنے میں لابدی اور ضروری ہے۔ (۲) جبیرہ پاکی کی حالت میں (باوضو) باندھا ہو۔ اگر پاکی میں نہیں باندھا اور نکالنا ممکن ہو تو نکال کر پاکی کے بعد باندھے۔ ممکن نہ ہو تو رہنے دے، لیکن صحت کے بعد نمازوں کی قضاء واجب ہے۔ اگر پاکی میں باندھا ہو تو بعد میں قضاء کی ضرورت نہیں۔ مذکورہ ساری تفصیل اس وقت ہے جبکہ پاکی کیلئے جبیرہ نہ ہٹا سکے۔ اگر بغیر ضرر کے ہٹا سکتا ہے تو ہٹانا واجب ہے۔ اب ممکن ہو تو تندرست حصہ دھوئے۔ اگر دھو نہیں سکتے اور عضو تیمم میں ہے۔ تو تیمم کے طور پر مسح کرے۔

دوسری حالت۔ جبیرہ کی ضرورت نہ ہو وہ اور پانی لگنے میں خطرہ ہو۔ اس صورت میں تندرست حصے کو ممکنہ حد تک دھوئے۔ یہ ترکیب اپنائے۔ کہ کپڑے کا ٹکڑا رکھ کر اس پر زور دے تاکہ نکلنے والے قطرات سے تندرست حصہ دھل جائے خود یہ عمل کرنا یا اجرت دے کر کروانا اس پر لازم ہے۔ اور تیمم کرنا بھی واجب ہے تاکہ ٹوٹا ہوا حصہ بغیر طہارت کے نہ رہے۔ اگر مرض مذکور عضو تیمم میں ہے، تو اس پر مٹی پھیرے، اسی طرح زخم کے منہ کھلے ہوں اور اس پر مٹی پھیر سکتے ہیں، تو پھیرنا واجب ہے۔

(۷) **زخم**: زخم پر کبھی مرہم یا پٹی چپکانے کی ضرورت پڑے گی۔ اس وقت اس کا حکم بھی جبیرہ کی گذشتہ تفصیلات کے مطابق ہوگا۔ اور کبھی مرہم وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس صورت میں تندرست حصہ دھوئے اور زخم کے بدلے تیمم کرے۔ زخم پر پانی سے مسح کرنا واجب نہیں اور نہ تو زخم پر مرہم یا جبیرہ لگا رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس پر مسح کرے۔

تندرست حصہ دھوئے، اور مرض یا ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے تیمم کرے اور حائل پر یا براہ راست مسح کرے، اور اس طہارت سے ایک فریضہ ادا کرے، تو نوافل جتنی چاہے پڑھ سکتا ہے۔ دوسرا فرض ادا کرنا ہو تو تیمم کا اعادہ ضروری ہے لیکن وضو یا غسل کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جنبی کے زخم اعضاء وضو پر نہ ہوں، اور تندرست اعضاء کو دھو کر زخم کیلئے تیمم کرنے کے بعد فرض نماز پڑھنے سے پہلے وضو ٹوٹے تو صرف وضو کرنا لازم ہے۔ تیمم لازم نہیں، اس لئے کہ اس کا تیمم اعضاء وضو کی طرف سے نہیں ہے، لہٰذا حدث کی وجہ سے اس پر اثر نہیں پڑے گا۔ فرض نماز پڑھنے کے بعد وضو ٹوٹے تو اب نفل نمازوں کیلئے صرف وضو کرے تیمم کی ضرورت نہیں۔ (لیکن دوسرا فرض پڑھنے کیلئے تیمم بھی کرنا ہوگا۔ (حاشية الجمل)

مذکورہ تفصیل کے مطابق کسی مریض نے طہارت حاصل کی۔ بعد میں وہ تندرست ہوا۔ اور طہارت ابھی باقی ہے۔ تو (جنبی ہو یا محدث) محل عذر کو دھوئے اور محدث محل عذر کے بعد کے اعضاء کو بھی دھوئے (اس لئے کہ وضو میں ترتیب ضروری ہے۔ لہٰذا عذر ہاتھ میں تھا تو اب ہاتھ دھونے کے بعد سر کا مسح اور پیر کا دھونا ضروری ہے۔) طہارت کے بعد معلوم ہوا کہ عذر ختم ہو چکا تھا تو تیمم باطل ہوا اور محل عذر کا دھونا واجب ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ زخم مندمل (اچھا) ہو چکا ہوگا۔ مرہم نکالا تو معلوم ہوا کہ ابھی مندمل نہیں ہوا تو تیمم باطل نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس پانی نہ ہونے سے تیمم کرنے کے بعد پانی ہونے کا وہم گذرے، تو تیمم باطل ہوگا۔

دوسرا باب ۔ تیمم کی کیفیت

تیمم کے سات ارکان ھیں۔

(۱) مٹی (بعض علماء نے مٹی کو تیمم کے رکن میں شمار نہیں کیا۔ کما فی الحاشیۃ) مٹی پاک، خالص، اور غیر مستعمل ہونا شرط ہے۔ مٹی ہونا بالکل متعین ہے۔ سرخ، سیاہ، زرد، خاکستری، ارمنی مٹی، جو بطور دوا کھائی جاتی ہے، نالہ کی مٹی، شورزمین کی مٹی، جس پر کچھ اُگے نہیں یہ ساری انواع اس میں داخل ہیں۔ کپڑے یا دیوار وغیرہ پر ہاتھ مارنے سے گرد اڑتی ہو تو یہ کافی ہے۔ مٹی کے ڈھیلے سے دیمک جو مٹی نکالتی ہے۔ اس سے تیمم جائز ہے۔ جیسا کہ سرکہ سے گندھی ہوئی مٹی خشک ہونے کے بعد اس سے تیمم جائز ہے۔

چونے کا پتھر، گچ، ہڑتال، دیگر معدنیات، ذریرہ (ایک قسم کی خوشبو) اور پسے ہوئے پتھر جیسے اشیاء سے تیمم صحیح نہ ہوگا۔ مٹی کو جلا کر راکھ کر دیا، یا ٹھیکری کو کوٹ کر ملائم کر دیا، تو اس سے تیمم جائز نہیں۔

گارے کو بھون کر کوٹا یا مٹی آگ سے سیاہ ہوئی، جلی نہیں تو اس سے تیمم جائز ہے۔ ریت اگر سخت ہو، اسمیں گرد نہ ہو، تو تیمم کیلئے اس پر ہاتھ مارنا کافی نہیں، ہاتھ مارنے سے گرد اٹھے تو کافی ہے۔ مٹی پاک ہونا لازم ہے، نجس مٹی سے تیمم صحیح نہ ہوگا۔ اگر کتے کی پشت پر مٹی ہو جو اس کے بدن پر کی کسی رطوبت مثلاً پانی یا پسینہ وغیرہ سے ملی ہوئی۔ ہو تو اس سے تیمم جائز نہیں، ورنہ جائز ہے۔ رطوبت سے ملی ہے یا نہیں معلوم نہ ہو تب بھی تیمم جائز ہے۔ مٹی خالص ہونا لازم ہے۔ زعفران آٹا وغیرہ اس میں شامل ہو تو اس سے تیمم جائز نہیں۔ قلیل وکثیر کا کوئی فرق نہیں۔ مٹی غیر مستعمل ہونا بھی ضروری ہے۔ تیمم کے وقت عضو سے چپکی ہوئی اور جھڑنے والی مٹی مستعمل ہے۔

(۲) مٹی کا قصد کرنا ضروری ہے۔ کوئی ہوا کے رخ پر کھڑا ہو جائے اور ہوا مٹی اڑا کر اس کے بدن پر ڈال دے پھر یہ تیمم کی نیت سے ہاتھ پھیرے تو یہ کافی نہیں چاہے مٹی ہی کی نیت سے ہوا میں کھڑا ہو۔

کسی دوسرے نے بغیر اجازت کے تیمم کرایا، تو صحیح نہ ہوگا۔ اجازت سے کرایا ہے تو صحیح ہے، کوئی عذر ہو یا نہ ہو۔

(۳) جس مٹی سے مسح کرنا ہے۔ اسے عضو کی طرف منتقل کرنا۔ چہرہ پر مٹی تھی، تیمم کی نیت سے اسے ہی پھیر دیا تو یہ کافی نہیں۔ اگر چہرہ سے ہاتھ کی طرف یا ہاتھ سے چہرہ کی طرف منتقل کیا، چہرہ سے مٹی لے کر پھر چہرہ پر پھیر دیا، یا کسی بھی عضو پر کی مٹی کو لے کر چہرہ یا ہاتھ پر پھیر دیا۔ یا ہوا نے آستین پر مٹی ڈال دی اور اس سے چہرہ کا مسح کر لیا، یا ہوا میں اڑ کر آنے والی مٹی کو لے کر پھر استعمال کیا، تو ان تمام صورتوں میں تیمم صحیح ہے۔ عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے زمین پر لوٹ پوٹ ہوا تو جائز ہے۔

(۴) نیت واجب ہے، رفع حدث کی یا جنبی نے رفع جنابت کی نیت کی تو تیمم صحیح نہ ہوگا۔ اگر "اِسْتِبَاحَۃُ الصَّلٰوۃِ" (نماز مباح اور جائز ہونے) کی نیت کی ہے۔ تو اس کی چار صورتیں ہوں گی۔

(الف) فرض اور نفل دونوں نمازوں کے استباحت کی نیت کرے۔ اس صورت میں دونوں جائز ہوں گے۔ فرض سے پہلے اور بعد میں وقت کے اندر اور بعد میں جب چاہے نفل پڑھ سکتا ہے۔

فرض کے تعین کی ضرورت نہیں (یعنی ظہر کی نماز یا عصر کی نماز کے استباحت کی نیت) صرف فرض کی نیت کی تو کوئی بھی فرض پڑھ سکتا ہے۔ معین فرض کی نیت کی ہے تو اس تیمم سے دوسری فرض نماز پڑھ سکتا ہے (معین پڑھنا ضروری نہیں)

(ب) پنجوقتہ نماز یا منذورہ نماز میں سے کسی فرض نماز کے استباحت کی نیت کی، نفل نماز سے تعرض نہیں کیا، تب بھی فرض کے ساتھ

نفل، پہلے یا بعد، وقت میں یا وقت گذرنے کے بعد، پڑھنا جائز ہے۔

دو قضاء نماز یا دو منذورہ نماز کی نیت سے تیمم کیا تو ایک نماز پڑھنا جائز ہے۔ قضاء نماز کیلئے تیمم کیا۔ لیکن اس کے ذمہ قضاء نہیں تھی یا ظہر کی قضاء کیلئے تیمم کیا اور عصر کی قضاء ذمہ تھی تو تیمم صحیح نہیں ہوگا۔

اپنے اوپر قضاء نماز کا گمان تھا، جس کے لئے تیمم کیا۔ پھر قضاء یاد آئی (یعنی تیمم کے بعد گمان یقین سے بدل گیا۔) تو یہ تیمم صحیح نہیں ہے۔

(ج) نفل کی نیت سے تیمم کرے، اس تیمم سے فرض نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، نفل جائز ہے۔ مس مصحف، یا سجدۂ تلاوت، یا شکر کی نیت سے، یا جنبی اعتکاف، یا تلاوت کی نیت سے تیمم کرے، تو یہ نفل کی نیت کی طرح ہے، فرض نماز اس سے جائز نہیں جس کی نیت کی وہ جائز ہے۔ نماز جنازہ کی نیت سے تیمم کیا تو یہ نفل کی نیت کی طرح ہے۔

حیض کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد عورت وطی (صحبت) مباح ہونے کی نیت سے تیمم کرے تو صحیح ہوگا، اور نفل کے تیمم کی طرح ہوگا۔

(د) صرف نماز کی نیت کرے (یعنی فرض ونفل کی صراحت نہ کرے) اس کا حکم نفل کی نیت کی طرح ہے خلاصہ یہ کہ فرض نماز کی نیت کی ہو تو تمام امور جائز، نفل نماز یا نماز جنازہ یا خطبۂ جمعہ کی نیت ہو تو فرض عین نماز کے علاوہ سب جائز، اور نماز کے علاوہ کسی چیز کی نیت سے نماز جائز نہ ہوگی، بقیہ امور جائز ہونگے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۲۲۰)

اگر تیمم یا فرض تیمم، کی ادائیگی کی نیت کرے تو صحیح نہ ہوگا۔ استباحت نماز کی نیت سے تیمم کیا، یہ گمان کرتے ہوئے کہ حدث اصغر ہے، حالانکہ حدث اکبر تھا، یا اس کے برعکس، تو تیمم صحیح ہوگا عمداً اس طرح کرنے سے صحیح نہ ہوگا۔

سفر میں جنبی ہوا اور بھول گیا، پھر بعض نمازوں کو تیمم سے اور بعض کو وضو سے ادا کیا تو یاد آنے پر وضو سے پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ کرے گا۔ (اس لئے کہ جنابت وحدث کی صورت میں تیمم میں کوئی فرق نہیں)

تیمم کے پہلے فرض سے نیت کا مؤخر ہونا جائز نہیں ہے، اور تیمم کا پہلا فرض مٹی منتقل کرنا ہے۔ (لہٰذا مٹی منتقل کرتے وقت ہی نیت ہونی چاہیئے۔) مٹی منتقل کرتے وقت نیت تھی لیکن چہرہ کا مسح شروع کرنے سے پہلے ہی غائب ہوئی۔ تو یہ کافی نہیں (بلکہ مٹی کے منتقل کرنے سے چہرہ کا مسح شروع ہونے تک نیت کا موجود رہنا ضروری ہے۔ فتح الوھاب وغیرہ) اوّل فرض سے پہلے ہی نیت کرلی تو وہی تفصیل ہے جو وضو میں گذر چکی۔

(۵) چھرہ کا مسح کرنا : پورے چہرہ کا مسح ضروری ہے وضو میں جن بالوں کی جڑ میں پانی پہنچانا ضروری ہے، تیمم میں مٹی کا وہاں پہنچانا ضروری نہیں ہے۔ البتہ داڑھی کے لٹکتے بالوں کے ظاہر پر مٹی کا مسح ضروری ہے۔

ہونٹ کے اوپر ناک کے اگلے حصے پر بھی مسح ضروری ہے۔ ناخن کے نیچے مٹی پہنچانا واجب نہیں ہے۔

(۶) دونوں ھاتھ کا مسح کرنا: دونوں ہاتھ کا کہنیوں سمیت مکمل مسح کرنا واجب ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۲۲۰)

تیمم کیلئے دو ضرب واجب ہیں۔ (یعنی دو مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارنا) حقیقتاً ضرب کا پایا جانا واجب نہیں ہے، بلکہ نرم مٹی پر صرف ہاتھ رکھ دیا اور اس پر غبار لگ گیا تو یہ کافی ہے۔

حدیث: "اَلتَّیمُّمُ ضَرْبَتَانِ، ضَربَۃٌ لِلْوُجْہِ وَ ضَربَۃٌ لِلْیَدَینِ اِلَی الْمِرْفَقَینِ"

ترجمہ: تیمم کیلئے دوضرب ہیں، ایک ضرب چہرہ کیلئے، اور ایک ضرب کہنیوں سمیت دونوں ہاتھ کیلئے (رواہ الدارقطنی، والحاکم والبیھقی)

اصل مقصود یہ ہے کہ دو مرتبہ مٹی منتقل کرنا پایا جائے، ایک ہی مرتبہ منتقل کر کے مکمل تیمم کر لینا کافی نہیں۔ دو سے زیادہ مرتبہ منتقل کرنا مکروہ ہے۔ چہرہ کا مسح اوپر کی طرف سے شروع کرنا مستحب ہے۔

ہاتھ کے مسح کی کیفیت: بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے علاوہ دیگر انگلیوں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے علاوہ دیگر انگلیوں کے پشت پر اس طرح رکھے، کہ دائیں انگلیوں کے پورے بائیں کے شہادت کی انگلی سے آگے نہ نکلیں پھر ہتھیلی کے پشت پر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسح کرتے ہوئے آگے بڑھے، جب ہتھیلی کے کنارے پر پہنچے تو انگلیوں کے کناروں کو بازو کے کنارے سے ملائے اور اس طرح کہنی تک پھیرتا چلا جائے پھر ہتھیلی کو بازو کے باطن کی طرف پھرا کر واپس گٹے تک لائے، انگوٹھا جدا ہی رہے، گٹے تک آنے کے بعد بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے بطن سے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے پشت پر مسح کرے، پھر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اسی طرح بائیں ہاتھ کا مسح کرے، اس کیفیت کے ساتھ مسح کرنا واجب نہیں، مستحب ہے۔

دونوں ضرب کی ابتداء میں انگلیوں کو کشادہ رکھنا مستحب ہے۔ دونوں میں یا دوسری ضرب میں کشادہ رکھا تو ہاتھ کے مسح کے بعد انگلیوں کا خلال مستحب ہے، ورنہ واجب ہے۔ پھر ایک ہتھیلی کا دوسرے پر پھیرنا مستحب ہے۔ اصل واجب مٹی کا چہرہ اور ہاتھ تک پہنچانا ہے، ہاتھ سے، کپڑے سے، یا لکڑی سے، کسی بھی طرح پہنچائے، ہاتھ کا عضو پر پھیرنا ہی کوئی شرط نہیں۔ مسح کے دوران ہاتھ اٹھالیا پھر واپس رکھ کر مسح مکمل کیا تو کافی ہے، نئی مٹی لینا واجب نہیں۔

(۷) ترتیب: چہرہ کا مسح ہاتھ سے قبل کرنا واجب ہے۔ اگر بھول سے بھی اس کے برعکس ہوا تو تیمم صحیح نہیں ہوگا۔ مٹی کے لینے میں ترتیب واجب نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دائیں سے پورے چہرے کا مسح کر پائے اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کا مسح کر لے تو جائز ہے۔

مٹی لینے کے بعد چہرہ کے مسح سے قبل حدث (وضو توڑنے والا کوئی سبب) واقع ہوا، تو یہ مٹی لینا باطل ہوا، دوبارہ مٹی لینا ضروری ہے۔ تیمم کیلئے ایسی عورت کے بدن پر ہاتھ مارے جس کی کھال کو مس ہونے سے وضو ختم ہوگا، اور اس کے بدن پر مٹی اتنی زیادہ لگی ہوئی ہے کہ دونوں کی کھال مس نہیں ہوگی، تو تیمم صحیح ہے، اور مٹی کی کمی کی وجہ سے کھال کو مس ہو تو تیمم صحیح نہیں ہے۔

تیمم کی سنتیں

بعض سنتوں کا ذکر چہرہ اور ہاتھ کے مسح کی کیفیت میں گذر چکا۔ دیگر سنن درج ذیل ہیں۔

تیمم کے ابتداء میں ''بسم اللہ'' پڑھنا، دائیں کو بائیں پر مقدم رکھنا، کہنیوں سے اوپر بازو کے بقیہ حصہ کا بھی مٹی سے مسح کرنا، موالات۔ (تیمم کے افعال کو پے درپے کرنا) لی ہوئی مٹی زیادہ ہو تو جھاڑ کر کم کرنا۔

ایک سے زیادہ مرتبہ مسح نہ کرنا، (مسح میں تکرار مکروہ ہے) مسح مکمل ہونے سے پہلے عضو پر سے ہاتھ نہ اٹھانا۔ پہلی مرتبہ ہاتھ مارتے وقت انگشتری ہو تو اُتارنا۔ دوسری مرتبہ ہاتھ مارنے کے وقت انگشتری اتارنا واجب ہے۔ صرف اسے حرکت دینا کافی نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مٹی اندر داخل ہونے والی نہیں، (بخلاف وضو کے، وضو میں انگشتری کو صرف حرکت دینے سے پانی اندر چلا جائے گا اس لئے وہ کافی

ہے) درحقیقت مقصود دوسری مرتبہ مسح کے وقت انگوٹھی کا نہ ہونا ہے، تاکہ مکمل ہاتھ کا مسح ہو سکے۔ مٹی منتقل کرتے وقت انگوٹھی ہو اور مسح سے پہلے اتار دے تو کافی ہے۔ انگلی میں ہی کچھ آگے کر کے اس حصے تک مٹی پہنچا دینا بھی کافی ہے۔ انگوٹھی کافی چوڑی ہو کہ حرکت دینے سے مٹی اندر پہنچ جائے۔ تو اتارنا واجب نہیں۔(حاشیہ الجمل ۱/۲۲۶)

دیگر سنتیں: استقبال قبلہ، تیمم کے بعد شہادتین کا پڑھنا، تیمم سے قبل مسواک کرنا، وضوء کے بعد کے اذکار پڑھنا، تیمم کے بعد دو رکعت پڑھنا، تیمم میں اور نماز میں زیادہ فاصلہ نہ ہو، ابتداء میں ''بسم اللہ'' پڑھنا اگر بھولے، تو دوران تیمم یاد آنے پر پڑھ لے، بہتر یہ ہے کہ تیمم کے بعد نماز سے فارغ ہونے تک مٹی کے اثرات کو اعضاء سے صاف نہ کرے۔(حاشیۃ الجمل ۱/ ۲۲۱)

تیمم کی صحت کیلئے بدن پر کسی نجاست کا نہ ہونا شرط ہے، بدن پر نجاست ہوتے ہوئے یا استنجاء سے قبل تیمم کرے تو صحیح نہ ہوگا۔ تیمم کرنے کے بعد بدن پر نجاست لگنے سے تیمم باطل نہ ہوگا۔

کپڑے پہننے پر قادر ہوتے ہوئے پہننے سے قبل تیمم کرلے، تو صحیح ہوگا۔ قبلہ کی تعین کیلئے اجتھاد کرنے سے پہلے تیمم کرے تو صحیح ہے۔(حاشیۃ الجمل ۱/۲۲۰)

تیسرا باب۔ تیمم کے احکام

(۱) جن اسباب سے وضو ٹوٹتا ھے تیمم بھی ٹوٹتا ھے۔ پھر تیمم کی دو قسمیں ہے۔(الف) وہ تیمم جو پانی کی موجودگی میں بھی جائز ہے۔ جیسے مریض کا تیمم (ب) صرف پانی کی غیر موجودگی، یا اس کی تحصیل میں خطرہ، یا پانی کی ضرورت، جیسی صورتوں میں جائز ہے۔ پہلی قسم میں پانی نظر آنے سے تیمم پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ دوسری قسم میں نماز شروع کرنے سے پہلے پانی پر قدرت کا وہم بھی حاصل ہو، تو تیمم باطل ہوگا۔ جیسے کوئی سراب (ریگستانی ریت جو دوپہر کے وقت دھوپ کی تیزی کی وجہ سے پانی جیسا نظر آتا ہے) دیکھ کر پانی سمجھے، یا اطراف میں بادل گھر جائیں، یا چند لوگ نمودار ہوں جن کے پاس پانی ہونے کا امکان ہو لیکن پانی کے وہم کے ساتھ اس کے استعمال سے کوئی امر مانع (رکاوٹ) ہو، تو تیمم باطل نہ ہوگا، جیسے پانی نظر آئے لیکن پیاس کیلئے اس کی ضرورت ہے یا پانی کی تحصیل میں کسی درندہ یا دشمن کی وجہ سے رکاوٹ ہے یا کنویں کی گہرائی کی وجہ سے پانی نظر آتے وقت ہی اس کا حصول متعذر ہونا معلوم ہو۔ یا کسی کو یہ اعلان کرتے سنا۔ فلاں شخص نے بطور ودیعت (امانت) میرے پاس پانی رکھا ہے۔ اور یہ اس فلاں کے وہاں موجود نہ ہونے سے واقف ہو اور اس طرح کی دیگر رکاوٹیں۔

ایسی نماز میں پانی نظر آئے۔ جس کا بعد میں قضاء کرنا ضروری ہے تو تیمم باطل ہوگا، جیسے مقیم کا تیمم سے نماز پڑھنا۔ اور بعد میں قضاء کی ضرورت نہیں جیسے مسافر کی نماز، تو پانی نظر آنے کی وجہ سے نماز اور تیمم باطل نہ ہونگے (جبکہ تکبیر تحریمہ کی راء کے بعد نظر آئے، تکبیر تحریمہ کے دوران بھی نظر آئے تو تیمم باطل ہوگا۔(حاشیۃ الجمل)

پانی ملنے کے بعد دوران نماز اقامت کی نیت کرلی یا قصر کی نیت سے نماز پڑھتے وقت پانی ملا، پھر پوری نماز کی نیت کی، تو دونوں صورتوں میں نماز باطل ہوگی۔ جن صورتوں میں نماز میں پانی ملنے سے نماز باطل نہیں ہوتی، اگر پانی ملے تو نماز کو توڑ کر وضو کر کے از سرنو اس فرض کو ادا کرنا افضل ہے، جبکہ وقت کے اندر مکمل نماز باوضو ادا کر سکے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے وضوء کر کے از سرنو پڑھنے میں مکمل نماز وقت کے اندر نہیں ہوسکتی، تو پھر نماز کو توڑنا حرام ہے۔ (تیمم کر کے جماعت سے نماز پڑھ رہا تھا، اب توڑ کر وضو سے پڑھنے کی صورت میں

جماعت نہیں ملے گی، اکیلے پڑھنی ہوگی، تو اس صورت میں نہ توڑ کر تیمم ہی سے جماعت کے ساتھ نماز مکمل کرنا بہتر ہے۔ حاشیۃ الجمل ۱/ ۲۲۵) تیمم سے فرض نماز مکمل کرے، اور سلام پھیرنے تک وہ پانی موجود ہے تو اب تیمم باطل ہو گیا۔ اس تیمم سے نفل نہیں پڑھ سکتا، بلکہ سلام سے پہلے ہی وہ پانی ختم ہو جائے، تب بھی اس تیمم سے نفل نہیں پڑھ سکتا (تیمم باطل ہو گیا۔)

سلام پھیرنے کے بعد نماز کا کوئی چھوٹا ہوا رکن یاد آئے تو اس کی تلافی کرے گا لیکن سجدہ سہو یاد آئے تو اس کے لئے واپس نماز میں نہیں لوٹے گا۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۲۲۴) نفل نماز میں پانی نظر آئے اور نفل کی متعین رکعات کی نیت تھی، تو ان رکعتوں کو مکمل کرے، اس سے زائد نہ پڑھے اور نیت میں رکعات کی تعیین نہیں کی تھی، تو صرف دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرے۔ (لیکن دو کے بعد کسی رکعت میں پانی نظر آئے، تو اس رکعت کو مکمل کر کے سلام پھیرے (فتح الوھاب)

(۲) تیمم سے جائز ہونے والے امور: ایک تیمم سے صرف ایک ہی فرض ادا کر سکتا ہے، ایک سے زائد کی گنجائش نہیں، متفق ہوں یا مختلف (ایک ہی قسم کے فرض ہوں یا الگ الگ) جیسے، دو فرض نمازیں، دو فرض طواف، فرض نماز اور طواف، دو ظہر کی قضا، مکتوبہ اور منذورہ یا دو منذورہ، کو ایک تیمم سے ادا کرنا جائز نہیں، کم سن بھی اس حکم میں بالغ کی طرح ہے (حضرت علی، ابن عباس اور ابن عمرؓ سے ہر نماز کے لئے تیمم مروی ہے) ایک ہی تیمم سے ایک فرض اور کئی سنتوں کو ادا کر سکتا ہے طواف کے بعد کی دو رکعت نماز سنت ہے، اس لئے ایک تیمم سے طواف اور اس نماز کو ادا کر سکتے ہیں۔ جمعہ کے خطبہ اور نماز کو ایک تیمم سے نہیں ادا کر سکتے۔ ایک تیمم سے کسی فرض کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر سکتے ہیں۔

کسی نماز کو بھول جائے جیسے ہفتہ میں کسی دن کی ظہر، تو تیمم کر کے ایک ظہر پڑھ لے۔ پنجوقتہ نماز میں سے ایک نماز قضاء ہو اور کونسی ہے۔ یاد نہیں، تو پانچوں نماز پڑھنا واجب ہے۔ ان پانچوں کیلئے ایک ہی تیمم کافی ہے۔

پنج وقتہ میں سے دو مختلف نمازیں قضاء ہوں، اور کون کون سی ہیں یاد نہیں، تو بہتر یہ ہے کہ دو تیمم کرے۔ ایک تیمم کر کے فجر، ظہر، عصر، مغرب، پڑھے پھر دوسرا تیمم کر کے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء پڑھ لے۔ اگر پانچ تیمم سے پانچ نماز پڑھ لے تب بھی کافی ہے۔ دو متفق قضاء نمازوں کو بھول جائے (جیسے کسی کی دو دن ظہر قضاء ہوئی، پھر یاد نہیں رہا کہ کونسی نماز قضاء ہوئی تھی۔) تو پانچوں نمازوں کو دو مرتبہ پڑھنا ضروری ہے۔ ایک تیمم کر کے پانچ نمازیں، پھر دوسرے تیمم سے پانچ نمازیں ادا کرے۔ اگر یہ یاد نہ ہو کہ دو قضا نمازیں متفق ہیں یا مختلف تو احتیاطاً متفق سمجھتے ہوئے اسی کیفیت کے ساتھ ادا کرنا لازم ہے۔ ایک فرض نماز یا کوئی فرض طواف چھوٹنے کے درمیان اشتباہ واقع ہو، تو ایک تیمم کر کے ایک طواف اور پانچوں نمازیں پڑھ لے۔ تیمم کر کے تنہا نماز پڑھ لی، پھر اسی تیمم سے اس نماز کو جماعت کے ساتھ دوبارہ پڑھ سکتا ہے۔ تیمم سے کسی فرض کو ایسے طور پر پڑھے کہ پھر اعادہ لازم ہے تو اسی تیمم سے اعادہ کرنا جائز ہے۔ (کوئی بندھا ہوا تھا۔ تیمم کر کے اسی حال میں نماز ادا کی پھر چھوٹ گیا تو اسی تیمم سے صحیح طریقے سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ جمل)

فرض کیلئے تیمم کا وقت: کسی فرض کیلئے وقت سے پہلے تیمم جائز نہیں ہے۔ اگر کیا تو فرض یا نفل کیلئے یہ تیمم صحیح نہیں ہے۔ جمع بین الصلاتین (مسافر کا ظہر و عصر یا مغرب و عشاء کو ایک وقت پڑھنا) میں پہلی نماز کے وقت دوسری بھی تیمم سے پڑھ لینا صحیح ہے۔ اس لئے کہ پہلی کا وقت ہی اس صورت میں دوسری کا بھی وقت ہے۔ تیمم کر کے ظہر پڑھ لی پھر عصر کو جمع کر کے پڑھنے کیلئے تیمم کرنے کے بعد عصر کا وقت شروع ہو گیا تو جمع اور تیمم باطل ہو گئے۔ (اب پھر تیمم کر کے عصر پڑھ لے۔) قضاء نماز کا وقت یاد آنے پر ہے۔

کسی ادا نماز کیلئے اوّل وقت میں تیمم کر کے آخری وقت میں نماز پڑھی تو جائز ہے۔ کسی قضاء نماز کیلئے چاشت کے وقت تیمم کیا، پھر

اس کے پڑھنے سے پہلے ظہر کا وقت شروع ہو جائے تو اس تیمم سے ظہر کی نماز ادا کر سکتا ہے۔ظہر کیلئے تیمم کرنے کے بعد کوئی قضاء نماز یاد آئے تو اس تیمم سے پڑھ سکتا ہے۔

سنتوں کیلئے تیمم کا وقت: سنتیں مؤقت ہونگی یا غیر مؤقت (وقت متعین ہے تو مؤقت ورنہ غیر مؤقت کہیں گے) فرائض کے ساتھ پڑھی جانے والی رواتب سنتیں، نماز عید، سورج گہن یا چاند گہن کی نماز مؤقت نمازیں ہیں، جن کے اوقات معروف ہیں۔استسقاء کی نماز کا وقت اس کے لئے میدان میں جمع ہونا ہے، جنازہ کی نماز کا وقت میت کے غسل سے فارغ ہونا ہے، ان مؤقتہ سنت نمازوں کیلئے وقت سے پہلے تیمم کیا تو صحیح نہ ہوگا۔

غیر مؤقت نمازوں کیلئے (جو کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں) مکروہ اوقات کے علاوہ کسی بھی وقت تیمم کرنا صحیح ہے، مکروہ وقت میں کیا تو صحیح نہ ہوگا (مکروہ اوقات کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) مکروہ وقت سے پہلے تیمم کرنے کے بعد مکروہ وقت شروع ہونے سے یہ تیمم باطل نہ ہوگا، مکروہ وقت ختم ہونے کے بعد اس تیمم سے مذکورہ سنت نماز پڑھ سکتے ہیں۔

فرض نماز کے وقت سے پہلے مٹی ہاتھ میں لی، پھر وقت ہونے کے بعد اس سے چہرہ کا مسح کیا تو صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ مٹی لینا بھی تیمم کے واجبات میں داخل ہے، لہٰذا وقت سے پہلے صحیح نہ ہوگا۔وقت شروع ہونے میں شک ہو اور تیمم کرے، تو حقیقتاً وقت میں تیمم واقع ہوا ہو، تب بھی صحیح نہ ہوگا۔اسی طرح وقت ہونے میں شک ہوتے ہوئے پانی کی تلاش کافی نہیں، چاہے حقیقتاً وقت میں تلاش واقع ہو۔

(۳) نماز کی قضاء: عذر یا تو عام ہوگا یا نادر (کبھی کبھار پیش آنے والا)

عام عذر: عام عذر کی صورت میں نماز کی قضاء نہیں ہے، جیسے محدث یا جنبی مسافر کا وضوء یا غسل کیلئے پانی نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھنا، جبکہ گناہ کا سفر نہ ہو۔گناہ کے سفر میں تیمم اور قضاء دونوں واجب ہیں۔

گناہ کے سفر میں پانی ہوتے ہوئے پیاس یا مرض کی وجہ سے تیمم کرے، تو صحیح نہیں ہے، بلکہ پہلے اس گناہ سے توبہ کرے پھر تیمم کرے گا۔اور حقیقتاً پانی ہے ہی نہیں تو تیمم صحیح ہوگا، لیکن بعد میں قضاء واجب ہے۔(حاشیة الروضه والجمل ۱/ ۲۳۳) طویل وقصیر (مختصر) سفر کا ایک ہی حکم ہے۔

اسی طرح مریض کا تیمم کر کے یا بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنا، اور شدت خوف کے وقت اشارہ سے نماز پڑھنا عام اعذار میں داخل ہیں۔

نادر عذر: یہ دو طرح کے ہیں۔(۱) جو غالباً دائم رہتا ہے (۲) جو دائم نہیں رہتا۔دائم عذر کی صورت میں قضاء کی ضرورت نہیں، جیسے استحاضہ، سلسلة البول، سلسلة المذی، ایسا زخم جس سے مسلسل خون بہتا ہو، ہمیشہ ریح خارج ہوتی رہے، چاہے اس کا کچھ بدل ہو یا نہ ہو۔غیر دائم عذر کی دو قسمیں ہیں۔(۱) جس میں بدل ہو (۲) جس میں بدل نہ ہو۔جس غیر دائم عذر میں بدل نہیں قضاء واجب ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) پانی اور مٹی دونوں نہ ملے۔تو فرض نماز پڑھنا اور بعد میں قضا کرنا دونوں واجب ہیں۔لیکن قرآن کو چھونا۔جنبی یا حائضہ کا تلاوت کرنا، حائضہ سے (حیض کے بعد) وطی کرنا ناجائز ہے۔نماز میں پانی یا مٹی ملے تو نماز باطل ہو جائے گی۔

(۲) کسی ستون سے بندھا ہوا یا زمین سے مضبوط بندھا ہوا ہو، ایسا شخص اشارہ سے نماز پڑھے۔اور بعد میں اعادہ کرے، اسی طرح سمندر میں کسی تختے کے سہارے ڈوبنے سے بچنے والا اشارہ سے نماز پڑھے، بعد میں دوہرائے۔

(۳) کسی کے زخم میں نجاست ہو جس کے دھونے سے تلف ہونے کا خطرہ ہو یا کوئی نجس جگہ مقید ہو تو یہ دونوں اسی حال میں نماز پڑھ کر بعد میں اعادہ کریں گے۔

جس غیر دائم عذر میں بدل ہے اس کی درج ذیل صورتیں ہیں۔

(۱) مقیم پانی نہ ہونے کے سبب تیمم کرلے تو اس پر اعادہ واجب ہے۔ اس لئے کہ حالت اقامت میں پانی نہ ملنا نادر ہے۔ مسافر پر اس صورت میں اس لئے قضاء نہیں ہے کہ سفر میں پانی نہ ملنا عام عذر ہے۔ یہ ضابطہ علماء عموماً پیش کرتے ہیں حالانکہ دراصل سفر و اقامت کی تخصیص نہیں، لہٰذا کوئی بے آب بیابان یا کسی اور جگہ جہاں غالباً پانی نہیں ملتا قیام کرے، اور طویل مدت تک وہاں مقیم رہ کے تیمم سے نماز پڑھتا رہا، تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور اگر مسافر دوران سفر کسی بستی میں داخل ہوا اور پانی نہ ہونیکی وجہ سے تیمم سے نماز پڑھی تو اعادہ واجب ہے، حالانکہ سفر کا حکم باقی ہے۔ لیکن چونکہ اقامت میں غالباً پانی میسر اور سفر میں اس کے برعکس ہوتا ہے، اس لئے علماء یوں تعبیر کر دیتے ہیں۔

(۲) بعض اعضاء میں عذر کی وجہ سے تیمم کرنا، اگر اس عضو پر جبیرہ یا مرہم وغیرہ ساتر نہ ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں، اور اگر ساتر ہو جسے پاکی کی حالت میں رکھا گیا ہے، تو اعادہ واجب نہیں، ورنہ واجب ہے۔ لیکن یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ جبیرہ تیمم کی جگہ میں نہ ہو۔ اگر تیمم کے عضو پر جبیرہ ہو تو ہر حال میں بعد میں اعادہ واجب ہے۔

(۳) سخت سردی کی وجہ سے تیمم کرنا، اس صورت میں بعد میں اعادہ واجب ہے۔

جبیرہ کی وجہ سے نماز کا اعادہ: اگر جبیرہ اعضاء تیمم (چہرہ یا ہاتھ) میں ہو، تو ہر حال میں اعادہ واجب ہے بدل اور مبدل منہ (تیمم اور وضو) دونوں کے ناقص ہونے کی وجہ سے۔ اعضاء تیمم کے علاوہ میں ہو، اور جبیرہ کے باندھنے کیلئے تندرست حصہ جتنا ناگزیر تھا اس سے زائد جبیرہ کے نیچے چلا گیا ہے تو اعادہ واجب ہے، چاہے جبیرہ حدث کی حالت میں باندھا ہو یا طہارت کی حالت میں، اسی طرح صرف بقدر ضرورت تندرست حصہ نیچے چلا گیا ہے۔ لیکن جبیرہ حدث کی حالت میں باندھا ہے تو اعادہ واجب ہے، اور طہارت کی حالت میں باندھا ہے تو اعادہ واجب نہیں ہے۔ اور تندرست حصہ بالکل ہی جبیرہ کے نیچے نہ آیا ہو تو اعادہ واجب نہیں، حدث کی حالت میں باندھا ہو یا طہر کی حالت میں، اوپر کے جملوں میں طہر (طہارت) سے، اگر جبیرہ اعضاء وضو میں ہے تو حدث اصغر اور اکبر دونوں سے طہارت مراد ہے، اعضاء وضو کے علاوہ میں ہے تو حدث اکبر سے طہارت مراد ہے (ترشیح المستفیدین ۲۵)

جو ستر عورت سے عاجز ہو وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے، اور رکوع وسجدہ کو مکمل ادا کرے (صرف اشارہ نہ کرے) سفر میں ہو یا حضر میں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کپڑا نجس ہو تو عریاں (ننگے) نماز پڑھے اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کپڑا پاک ہے لیکن نماز کی جگہ نجس ہے تو کپڑے کو بچھا کر اس پر عریاں نماز پڑھ لے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مریض کو کوئی ایسا شخص نہ ملے جو اس کو (نماز کیلئے) قبلہ رو کرے تو جس رخ پر ہے نماز پڑھ لے بعد میں اعادہ واجب ہے۔ امام الحرمین وغیرہ کا ارشاد ہے کہ جن اعذار کے دائم ہونے کی وجہ سے ہم نے فرض کو ساقط کیا تھا، اگر جلد ختم ہو جائیں تب بھی دائم ہی کے حکم میں ہیں۔ اور جن کے متعلق غیر دائم کا فیصلہ تھا، کسی کے حق میں دائم بن جائیں، تب بھی غیر دائم کے حکم میں ہوں گے۔

جن نمازوں کا وقت میں پڑھنا اور بعد میں اعادہ کرنا دونوں واجب ہیں، حقیقتاً فرض دوسری نماز ہے۔ بعض علماء کے نزدیک دونوں بھی فرض ہیں۔ ہاتھ کٹا ہو تو تیمم میں بھی اس کا حکم وضو کی طرح ہے یہاں تک کہ کسی کا ہاتھ کہنی کے اوپر سے کٹا ہو تو بازو کے بقیہ حصے کا مسح

کرنا مستحب ہے۔ راستے میں گھڑے میں مسافروں کو پینے کیلئے پانی رکھا ہو، تو اس سے وضو جائز نہیں، بلکہ تیمم کرے۔ کسی مرنے والے کے پاس اتنا پانی ہو جو اس کے غسل کو نا کافی ہو، تو اسے غسل میں استعمال کریں گے (بقیہ بدن کی طرف سے بعد میں تیمم کریں گے) مرض کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھ رہا تھا، دورانِ نماز شفایاب ہو گیا، تو مسافر کو دوران نماز پانی نظر آنے کی طرح ہے۔ (جس کی تفصیل گذر چکی)

جنابت یا حیض کی وجہ سے تیمم کیا پھر وضو ٹوٹا تو محدث پر جو امور حرام ہیں، وہ سب حرام ہونگے۔ تلاوت قرآن اور مسجد میں ٹھہرنا حرام نہیں۔

جنبی نے (پانی نہ ہونے کے سبب) تیمم کیا، پھر پانی نظر آیا، تو تلاوت اور دیگر جو امور حرام تھے غسل کر لینے تک حرام رہیں گے۔ امام جرجانیؒ فرماتے ہیں کہ صرف ان تین صورتوں میں فرض کا پڑھنا صحیح ہے اور نفل منع ہے (دیگر صورتوں میں فرض صحیح ہے تو نفل بدرجہ اولی صحیح ہے) (۱) فاقد الطھورین (جسے وضو کیلئے پانی اور تیمم کیلئے مٹی میسر نہ ہو) (۲) پاک ستر موجود نہ ہو (۳) بدن پر ایسی نجاست ہو جسے دور کرنے سے عاجز ہو۔

باب : موزوں پر مسح کرنا

حدیث : حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ فرماتے ہیں "میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے پیشاب کی پھر وضو فرمایا اور موزوں پر مسح کیا۔" (متفق علیه)

موزوں پر مسح دو شرط کے ساتھ جائز ھے: (۱) موزے کامل طہارت کی حالت میں پہنے ہوں۔ ایک پیر دھو کر اس میں موزہ پہن لیا پھر دوسرا دھویا تو مسح جائز نہیں ہے۔ اگر پہلا موزہ اتار کر پہن لیا تو اب مسح کر سکتے ہیں۔ دھونے سے پہلے پیروں کو موزے کی پنڈلی میں داخل تو کیا، (یعنی اس حصے میں جو پوری طرح موزہ پہننے پر پنڈلی پر آتا ہے) پھر دھونے کے بعد پوری طرح اندر داخل کیا تو یہ پہننا صحیح ہے اور مسح کرنا جائز ہے۔

طہارت کی حالت میں موزہ پہننا شروع کیا، لیکن موزے کے قدم تک پیروں کے پہنچنے سے قبل ہی وضو ختم ہو گیا، تو مسح کرنا جائز نہیں۔

شرائط کے ساتھ موزے کا مسح کرنے کے بعد پیر کو موزے سے نکالنا شروع کیا لیکن ابھی محل فرض (پیر کا وہ حصہ جو وضو میں دھونا فرض ہے) میں سے کچھ ظاہر نہیں ہوا تو مسح کرنا جائز ہے۔

مستحاضہ (وہ عورت جسے بیماری کی وجہ سے شرمگاہ سے خون آتا ہو) نے اپنی وضو کے بعد موزے پہنے پھر استحاضہ کے علاوہ کوئی وضو توڑنے والا سبب پایا گیا تو وہ بھی موزے پر مسح کر سکتی ہے، لیکن اس کے خون کا سلسلہ بند ہو جائے اور مسح سے پہلے ہی یہ بیماری ختم ہو جائے تو اب مسح کی اجازت نہیں ہے۔ مستحاضہ موزے پر مسح کر کے نوافل جتنی چاہے پڑھ سکتی ہے، جس وضو کے بعد موزے پہنے، اس وضو سے مستحاضہ نے فرض نماز نہیں پڑھی تھی۔ مثلاً وضو کے بعد موزہ پہن لیا۔ اور فرض نماز کی ادائیگی سے قبل ہی وضو ختم ہو گیا تو اب وضو میں موزے پر مسح کر کے ایک فرض نماز ادا کر سکتی ہے۔ اور فرض نماز کی ادائیگی کے بعد وضو ختم ہوا تو مسح کر کے نوافل تو پڑھ سکتی ہے۔ لیکن کسی بھی فرض نماز کی گنجائش نہیں۔ فرض نماز پڑھنا ہو تو موزے نکال کر طہارت کی حالت میں دوبارہ پہننے ہونگے۔

مستحاضہ ہی کے مثل سلسلۃ البول، دائم الحدث، اور زخم وغیرہ کی وجہ سے وضو کے ساتھ تیمم بھی کرنے کی صورتوں کا حکم ہے۔ صرف

تیمم کرے وضو نہ کرے اور اس کا سبب پانی کی عدم موجودگی کے علاوہ کچھ ہو تو اس کا حکم بھی مستحاضہ کے مثل ہے۔ اور پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہو تو اس کو مسح کی بالکل گنجائش نہیں۔

(۲) **موزہ مسح کی صلاحیت رکھتا ہو:** (مسح کے قابل ہو) جس کیلئے درج ذیل شرائط ہیں۔ (۱) پیر کے محل فرض کو چھپانے والا ہو۔ (یعنی دونوں پیر ٹخنوں سمیت موزے کے اندر چھپ جائیں) تھوڑا بھی حصہ کھلا رہتا ہو تو مسح جائز نہیں، موزے پھٹنے کی وجہ سے پیر کے محل فرض کا تھوڑا سا حصہ بھی کھل جائے تو مسح جائز نہیں صرف استر یا ابرا (موزہ کی اندرونی تہہ یا بیرونی تہہ) پھٹ جائے اور بقیہ گف موٹا، گاڑھا ہو، تو مسح جائز ہے ورنہ نہیں۔ اسی طرح استر کچھ پھٹے اور دوسری طرف ابرا پھٹے (دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل نہ ہوں کہ پیر کھل جائے۔) اور دونوں گف (موٹے) ہوں تو مسح جائز ہے۔

موزے کے پھٹے ہوئے کناروں کو ملا کر باندھ دیا جائے اور پیر بالکل ظاہر نہ ہو، تو مسح جائز ہے، پیر کا کچھ حصہ نظر آئے تو مسح نہیں کرسکتا۔

(۲) موزے قوی اور مضبوط ہوں کہ مسافر اترنے اور سوار ہونے کے وقت بقدر احتیاج (بغیر چپل کے) اس کو پہن کر مسلسل چل سکے۔ لہٰذا صرف اون اور بال سے بنے پائتابے پر مسح ناکافی ہے (آج کل عموماً جوتے چپل میں پہنے جانے والے موزوں میں بھی یہ شرط نہیں پائی جاتی اس لئے اس پر مسح کی گنجائش نہیں ہے۔) موزہ بہت زیادہ کشادہ یا تنگ ہونے کی وجہ سے اسے پہنکر چلنا متعذر ہو تو اس پر مسح جائز نہیں۔ اسی طرح موزے کے موٹاپے یا وزن کی وجہ سے چلنا دشوار ہو جیسے لکڑے یا لوہے کا موزہ تو مسح جائز نہیں۔

لکڑے یا لوہے سے باریک موزہ بنائے جس میں چلنا ممکن ہو تو مسح جائز ہے۔ جس کو موزہ نہ کہا جا سکے جیسے چمڑے کے ایک ٹکڑے کو لپیٹ کر باندھ دینا اس پر مسح جائز نہیں۔

(۳) مغصوبہ یا چوری کا موزہ اور سونے چاندی کے موزے پر مسح صحیح ہے۔ کتے کی کھال، یا دباغت سے پہلے مردار کی کھال کے موزے پر مسح صحیح نہیں ہے، نہ مس قرآن کیلئے نہ کسی اور مقصد کیلئے۔ موزے میں دیگر شرائط ہوں لیکن پانی اندر سرایت کرتا ہو تو اس پر مسح جائز نہیں ہے۔ موزے کا اوپری سرا اتنا کشادہ ہو کہ اندر قدم نظر آتے ہوں یا موزہ کانچ کا ہو، لیکن اسے پہن کر چل پھر سکتے ہوں تو ایسے موزوں پر مسح جائز ہے۔

جُرمُوق: غالباً ٹھنڈی کی شدت کی وجہ سے موزے کے اوپر پہنے جانے والے موزے کو جرموق کہا جاتا ہے۔ اس کی چار صورتیں ہیں (۱) اوپر کے موزے میں مسح کے شرائط ہوں، اندر کے موزے میں نہ ہوں، کمزور یا پھٹے ہونے کی وجہ سے، اس صورت میں صرف اوپر کے موزے پر مسح صحیح ہے۔

(۲) پہلے کے برعکس صورت ہو تو صرف اندرونی موزہ پر مسح صحیح ہے۔ اوپری موزہ پر صرف اسی پر مسح کے ارادہ سے مسح کرلے تو مسح صحیح نہیں، خواہ تری اندرونی موزہ تک پہنچے، لیکن دونوں کے قصد سے یا اندرونی موزہ کے قصد سے مسح کرے اور تری اندرونی موزہ تک پہنچے تو کافی ہے۔ اسی طرح کسی موزہ کے قصد کے بغیر فی الجملہ مسح کے ارادہ سے مسح کرے تب بھی کافی ہے۔

(۳) دونوں میں سے ایک میں بھی مسح کے شرائط نہ ہوں، تو مسح ممکن نہیں۔

(۴) دونوں میں مسح کے شرائط موجود ہوں تو صرف اوپری موزہ کا مسح ناکافی ہے۔ دونوں کے درمیان ہاتھ داخل کر کے اندرونی موزہ کا مسح کرلیا تو یہ جائز ہے۔ جبیرہ کے اوپر موزہ پہن لے تو اس پر مسح کافی نہیں۔

فصل ۔ مسح کی کیفیت

کم سے کم جسے مسح کہا جائے وہ ضروری ہے۔ پیر کے تلوے کنارے اور ایڑی کا حصہ چھوڑ کر وضو کے محل فرض پر کہیں مسح ہونا ضروری ہے۔ اوپری حصہ اور تلوا دونوں طرف مسح کرنا اکمل ہے۔ لیکن پورے موزے کا مکمل مسح سنت نہیں ہے۔ ایڑی کی طرف بھی مسح کر لینا سنت ہے۔ مسح کے وقت موزے کے نیچے نجاست ہو تو یہ مسح کافی نہیں ہے۔ مسح کے بجائے موزے کو دھو دیا تو کافی ہے، لیکن مکروہ ہے، اسی طرح ایک سے زائد بار مسح کرنا بھی مکروہ ہے۔ ہاتھ سے ہی مسح کرنا ضروری نہیں ہے، کپڑے یا لکڑی وغیرہ سے بھی کرنا جائز ہے۔ صرف تر ہاتھ موزے پر رکھ دیا، مسح نہیں کیا یا پانی ٹپکا دیا تو یہ کافی ہے، جیسا کہ سر کے مسح میں گذرا۔

فصل ۔ مسح کا حکم

نماز اور دیگر وہ امور جن کیلئے وضو ضروری ہے، موزہ پر مسح جائز ہے۔ مسح کی چار مدتیں ہیں۔ (۱) مقیم کیلئے ایک دن رات گذرنا، اور مسافر کیلئے تین دن اور تین رات۔ موزہ پہننے کے بعد حدث (وضو ٹوٹنا) سے مدت شمار کریں گے۔ مقیم اگر جمع نہ کرے تو زیادہ سے زیادہ چھ/۶ نمازیں پڑھ سکتا ہے، بارش کی وجہ سے جمع کیا تو سات نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ مسافر بغیر جمع کے سولہ/۱۶ اور جمع کے ساتھ سترہ/۱۷ نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ قضاء نمازوں کی کوئی تحدید نہیں۔ مسافر کو تین دن کی رخصت اس وقت ملے گی جبکہ اس کا سفر طویل ہو اور گناہ کا نہ ہو۔ اگر سفر قصیر ہے یا گناہ کا ہے تو صرف ایک دن رات مسح کرے گا۔

حدیث : آپ ﷺ نے اگر طہارت کے ساتھ موزے پہنے ہوں تو مسافر کے لئے تین شب وروز اور مقیم کے لئے ایک شب و روز اس پر مسح کرنے کی رخصت دی ہے۔ (ابن خزیمہ ، ابن حبان، ابن الجارود ، الشافعی، ابن ابی شیبہ دار قطنی، بیھقی وصححہ الخطابی، تلخیص) حالت اقامت میں موزے پہننے کے بعد سفر شروع ہوا اور سفر میں مسح کیا تو مسافر کی مدت پوری کرے گا، حدث اقامت میں ہوا ہو یا سفر میں، حدث اور نماز کا وقت ختم ہونے کے بعد سفر شروع کیا یا قبل۔

اقامت میں مسح کرنے کے بعد سفر شروع کیا تو مقیم کی مدت پوری کرے۔ ایک موزہ پر اقامت میں مسح کے بعد سفر شروع کیا اور سفر میں دوسرے پر مسح کیا تو یہ مقیم کی مدت تک ہی مسح کر سکتا ہے، اس لئے کہ مسح کی ابتداء اقامت میں ہو چکی تھی۔

سفر میں مسح کرنے کے بعد مقیم ہو جائے اور ایک دن رات یا اس سے زائد مدت گذر چکی ہو، تو مسح کی مدت ختم ہو چکی۔ اور سابقہ نمازیں صحیح ہیں۔ ایک دن رات مکمل ہونے سے پہلے مقیم ہو جائے، تو اس کے مکمل ہونے تک مسح کر سکتا ہے۔ سفر یا اقامت میں مسح کرنے والے کو مدت کے ختم ہونے کے متعلق شک ہو تو مدت کو ختم سمجھے گا۔

مسافر کو شک ہو کہ مسح اقامت میں شروع کیا تھا، یا سفر میں، تو اقامت پر عمل کرتے ہوئے ایک شب وروز ہی مسح کریگا۔

باوجود شک کے دوسرے دن بھی مسح کر کے نماز پڑھے، پھر تیسرے دن یہ معلوم ہو جائے کہ مسح سفر میں شروع کیا تھا، تو دوسرے دن کی نمازیں قضاء کرنا لازم ہے۔ تیسرے دن مسح کر سکتا ہے۔ پہلے دن مسح کرنے کے بعد دوسرے دن بھی وہ طہارت برقرار ہو اور حدث نہ ہو تو تیسرے دن اس مسح سے نماز پڑھ سکتا ہے، کیونکہ وہ صحیح ہے۔ دوسرے دن حدث ہو اور شک کے ساتھ مسح کرے اور وہ طہارت باقی ہو تو مسح صحیح نہ ہوگا۔ لہٰذا مسح کا اعادہ واجب ہے۔

(۲) دونوں یا ایک موزہ اتارنا : اس صورت میں مسح کی طہارت باقی ہو تو پیروں کا دھونا لازم ہے از سر نو وضو لازم

نہیں ہے۔موزہ میں کمزوری یا پھٹن وغیرہ کی وجہ سے مسح کی صلاحیت باقی نہ رہے تو یہ موزہ اتارنے کے حکم میں ہے۔(لہٰذا پیر دھونا واجب ہے) نماز کے دوران مسح کی مدت ختم ہو جائے یا پیر ظاہر ہو جائے تو نماز باطل ہوگی۔

صرف ایک رکعت کے بقدر مدت باقی ہو اور دو رکعت کی نیت سے نماز شروع کرے تو نماز منعقد ہوگی۔(اور دوران نماز مدت ختم ہو جائے تو باطل ہو جائے گی)

(۳) مسح کرنے والے پر جنابت یا حیض یا نفاس کا غسل واجب ہو، تو غسل کے بعد از سر نو موزے پہننا لازم ہے۔(۴) موزہ میں پیر نجس ہو جائے اور موزے کے اندر اسے دھونا ممکن نہ ہو تو موزے اتار کر دھونا واجب ہے۔اسی میں دھونا ممکن ہو اور دھو لیا تو مسح باطل نہ ہوگا۔

جس کے دونوں قدم صحیح سالم ہوں، ایک ہی میں موزہ پہنے تو اس پر مسح صحیح نہیں ہے۔اگر کسی کو ایک ہی پیر ہو، تو اس پیر کے موزے پر مسح صحیح ہے۔دوسرے قدم کا کچھ حصہ بھی موجود ہو تو جب تک اس حصے کو کسی ایسی چیز سے جو مسح کے شرط کے مطابق ہو، نہ چھپائے، مسح جائز نہ ہوگا دو پیروں میں ایک ایسا بیمار ہو کہ اسکا دھونا واجب نہیں اور دوسرے میں موزہ پہن لے تو اس پر مسح صحیح نہیں ہے، کیونکہ بیمار پیر کی جانب سے تیمم واجب ہے، لہٰذا وہ بھی صحیح کی طرح ہے۔

کتاب الحیض: (حیض کا بیان)

آیت: وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ، قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَ لَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ، فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللهُ (البقرہ۔ ۲۲۲) ترجمہ: اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ (حیض) گندی چیز ہے تو (حالت) حیض میں تم عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علیحدہ رہا کرو۔اور (اس حالت میں) ان سے قربت مت کیا کرو، جب تک کہ وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جاویں تو ان کے پاس آ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے اللہ نے تم کو اجازت دی ہے۔

عربی میں حیض کا لفظ بہنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔عربی میں اس کے دس نام ہیں حیض، طمث، ضحک، اِکبار، اعصار، دراس، عراک، فراک، طمس اور نفاس۔اور شریعت میں عورت کے رحم کے اندرونی حصے سے فطری طور پر مخصوص اوقات میں (فرج کے راستے) نکلنے والے خون کو حیض کہا جاتا ہے۔رحم کے اندر ایک رگ سے جس کا نام عاذل ہے، بیماری کی وجہ سے نکلنے والے خون کو استحاضہ کہتے ہیں۔ اور ولادت کے بعد نکلنے والے خون کو نفاس کہا جاتا ہے (حاشیۃ الروضہ)

عورت پر حیض اور دیگر ضروری مسائل کا سیکھنا واجب ہے، اگر شوہر وغیرہ عالم ہے تو اس کو سکھانا لازم ہے ورنہ کسی سے پوچھ کر اسے مسئلہ بتا دے۔ان واجب کے سیکھنے کے لئے عورت گھر سے باہر جا سکتی ہے۔اس کے علاوہ کسی کام کیلئے (جیسے ذکر کی مجلس کی شرکت) شوہر کے اجازت کے بغیر نہیں نکل سکتی، بستی سے باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو محرم کا بھی ساتھ ہونا ضروری ہے۔(الانوار السنیہ ۷۵)

اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔

باب (۱) حیض اور استحاضہ کا حکم ۔ حیض کی کم سے کم عمر ۹/ سال قمری ہے۔اس عمر سے پہلے عورت کے فرج سے خون نکلے تو وہ دم فساد (فساد کا خون۔ بیماری کا خون) ہے اگر خون کے نظر آنے اور ۹ سال مکمل ہونے کے درمیان اتنی مدت ہو، جس میں ایک حیض اور طہر نہیں آ سکتا۔(یعنی ۱۵/ دن یا اس سے کم) تو وہ خون حیض ہے، ورنہ نہیں۔

تشریح: خون کے اور ۹ سال مکمل ہونے کے درمیان اتنی مدت ہو جس میں ایک حیض اور طہر آ سکتا ہو۔ (۱۶ دن یا اس سے زیادہ) تو وہ دم فساد ہے۔ حیض کی کم سے کم عمر میں گرم ممالک و سرد ممالک کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

حیض کی اقل و اکثر مدت۔ حیض کی اقل مدت ایک دن رات ہے۔

تشریح: ایک عورت کو کم سے کم ۲۴ گھنٹے حیض آئے گا حیض کا خون اس سے کم نہیں ہو سکتا۔

حیض کی اکثر مدت ۱۵ شب و روز ہیں۔

تشریح۔ ایک مرتبہ جب حیض شروع ہو تو اسکا سلسلہ مکمل ۱۵ روز سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اور حیض کی غالب مدت ۶ یا ۷ دن ہیں (یعنی عموماً اکثر عورتوں کو ۷۔۶ دن حیض آتا ہے)

اقل طهر۔ دو حیض کے درمیان طہر (پاکی) کی کم سے کم مدت ۱۵ دن ہیں اور غالب مدت حیض کے بعد ماہ کے بچے ہوئے ایام۔

تشریح: عموماً ایک ماہ میں ایک مرتبہ حیض آتا ہے۔ لہٰذا حیض کے بعد بقیہ سارے ایام طہر کے رہتے ہیں، جیسے کسی کو ۶ دن حیض ہو تو تقریباً ۲۴ دن اس کے طہر کے ہوتے ہیں۔

طہر کی اکثر مدت۔ طہر کی اکثر مدت کی کوئی حد نہیں ہے۔ (ممکن ہے کہ کسی کو مہینوں اور سالوں حیض نہ آئے ایسی صورت میں یہ ساری مدت طہر ہی کہلائے گی۔

اگر کسی عورت کو مستقل ایک دن سے کم یا ۱۵ دن سے زیادہ حیض آئے یا ۱۵ دن سے کم طہر ہو، تب بھی اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(فصل) حائضہ کیلئے حرام امور:

حدیث: ایک روایت میں آپ ﷺ نے عورت کے دینی نقصان کی وضاحت میں فرمایا! کیا وہ حیض میں نماز و روزہ ترک نہیں کرتی۔ (متفق علیہ)

جو امور جنبی کیلئے حرام ہیں، حائضہ کے حق میں بھی حرام ہیں۔ عورت حیض کے ایام کی نمازوں کی قضاء نہیں کرے گی۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ حائضہ کے مسجد میں سے گذرنے کی صورت میں مسجد میں گندگی لگنے کا اندیشہ ہو تو گذرنا حرام ہے۔

اسی طرح مستحاضہ، سلسلۃ البول، اور زخم سے خون بہنے والا شخص مسجد سے گذرنے کی صورت میں مسجد میں نجاست لگنے کا خطرہ ہو تو ان لوگوں کو بھی مسجد سے گذرنا حرام ہے۔ حائضہ اور دیگر مذکورہ افراد کے گذرنے سے اس طرح نجاست و گندگی کا اندیشہ نہ ہو تو ان کو مسجد سے گذرنا جائز ہے۔ حیض کے ایام میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ لیکن بعد میں ان روزوں کی قضاء کرے گی۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ حائضہ سے استمتاع (زن و شوئی تعلقات) کی دو نوعتیں ہیں۔

(۱) فرج میں جماع کرنا (صحبت کرنا): یہ حرام ہے۔ حیض کا سلسلہ ختم ہو کر غسل یا بصورت عذر تیمم کرنے تک یہ حرمت باقی رہے گی، جیسا کہ آیت میں علیحدگی کا اور عدم قربت کا حکم دیا گیا، نیز مسلم وغیرہ کی حدیث میں بھی جماع کی ممانعت موجود ہے۔ پانی اور مٹی دونوں میسر نہ ہو تو صرف فرض نماز پڑھ لے گی، لیکن اس سے جماع حرام ہے۔

حیض کی حالت میں جماع کا حرام ہونا معلوم ہوتے ہوئے عمداً کوئی جماع کرے تو کوئی مالی تاوان اور کفارہ واجب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے خوب توبہ واستغفار کرے، لیکن حیض کے ابتدائی ایام میں جماع کی صورت میں ایک دینار (تقریباً سوا چار گرام سونے کے برابر) صدقہ کرنا مستحب ہے۔ آخری ایام میں جماع کیا ہو تو نصف دینار صدقہ کرنا مستحب ہے۔ یہ مقدار فقراء و مساکین کو دے، ایک ہی فقیر کو دینا

بھی کافی ہے۔صدقہ کا حکم دار قطنی ،بیہقی ،احمد اور سنن میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔(تلخیص / ۱۷۵)

(۲) جماع کے بغیر استمتاع : اس کی دوصورتیں ہیں۔(۱) حائضہ کے ناف اور گھٹنے کے درمیانی حصے سے استمتاع کرنا حرام ہے ابوداود وغیرہ میں تہبند سے اوپر استمتاع کی اجازت مروی ہے۔(۲) بقیہ حصے سے استمتاع جائز ہے۔

حیض کے دیگر احکام ۔ حیض کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد غسل واجب ہے، جب تک خون جاری ہو طہارت حاصل نہ ہوگی، لیکن وہ تمام مشروع غسل، جن کے لئے طہارت کی قید نہیں، حیض میں بھی مستحب ہیں، جیسے احرام کا غسل، وقوف عرفہ کا غسل، حیض آتے ہی عورت بالغہ شمار ہوگی، حیض سے عدت اور استبراء کا تعلق ہے۔ بلوغ، عدت، اور استبراء کے علاوہ دیگر تمام احکام میں نفاس بھی حیض کی طرح ہے۔

حیض کی حالت میں طلاق بدعی ہے۔(مکہ سے نکلتے وقت) حیض جاری ہو تو اس پر طواف وداع واجب نہیں ہے۔ کفارہ کے روزہ کا تتابع حیض کی وجہ سے منقطع نہیں ہوتا۔ حیض ختم ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے ہی روزہ اور طلاق کی حرمت ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح اب نماز چھوٹی تو قضاء ضروری ہے، البتہ استمتاع (جماع وغیرہ) اور دیگر وہ سارے امور جن کے لئے طہارت ضروری ہے، بغیر غسل کے جائز نہ ہوں گے۔

فصل استحاضہ کا بیان

استحاضہ دو طرح ہے۔ کبھی تو حیض و نفاس کے علاوہ آنے والے ہر خون کو استحاضہ کہتے ہیں۔ حیض کے بعد متصل ہو یا نہ ہو، جیسے سات سال میں خون آئے، اور کبھی صرف حیض سے متصل مزید خون کو استحاضہ کہتے ہیں، اس صورت میں دوسرے خون کو دم فساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال ساری صورتوں کے احکام یکساں ہیں۔ استحاضہ سلسلۃ البول کی طرح دائمی حدث ہے۔ لہٰذا اس حال میں روزہ نماز سے کوئی رکاوٹ نہیں، اور وطی (صحبت) کرنا جائز ہے۔ دائمی حدث کی وجہ سے طہارت اور ازالہ نجاست میں خاص احتیاط ضروری ہے۔ وضو یا تیمم سے پہلے مستحاضہ (وہ عورت جس کو استحاضہ کی شکایت ہو) اپنی اگلی شرمگاہ کو دھو کر اس جگہ کپاس یا کپڑے کا ٹکڑا رکھ دے، تا کہ نجاست رکے اور کم ہو۔ اس سے خون رکے تو یہ کافی ہے، ورنہ ایک ٹکڑا کمر میں باندھ کر دوسرے ٹکڑے کو لنگوٹ کی طرح کس کر باندھ دے یہ سب کرنا اس کے لئے واجب ہے۔ کس کر باندھنے میں تکلیف ہو تو نہ باندھے، روزے کی حالت میں شرمگاہ میں کپاس وغیرہ نہ رکھے صرف باندھنے پر اکتفاء کرے۔ سلسل البول (جس کو ہمیشہ پیشاب کا قطرہ آتا ہو) اپنے عضو مخصوص کے سوراخ میں روئی داخل کرے، اس سے قطرے نہ رکیں تو سرے کو باندھ بھی دے۔

مذکورہ احتیاطی تدابیر کے بعد مستحاضہ وضو کرے، اس احتیاط کا وضو سے پہلے ہونا ضروری ہے۔ اور ہر فرض نماز کیلئے وضو واجب ہے، نوافل جتنی چاہے پڑھ سکتی ہے۔ مستحاضہ کا طہارت نماز کا وقت ہونے کے بعد ہی ہونا چاہئے۔ طہارت کے بعد اسے جلد ہی نماز پڑھ لینی چاہئے۔ اوّل وقت طہارت حاصل کر کے آخری وقت یا اس کے بعد نماز پڑھے، اور اس تاخیر کا سبب نماز ہی کا کوئی سبب ہو، جیسے اذان، قبلہ کیلئے اجتہاد، کپڑے پہننا، جمعہ اور جماعت کا انتظار وغیرہ تو حرج نہیں، ورنہ ممنوع ہے۔ ہر فرض نماز کیلئے از سر نو شرمگاہ کا دھونا، روئی رکھنا اور باندھنا، وضو کرنا ضروری ہے، چاہے پٹی اپنی جگہ سے زیادہ کھسک گئی ہو یا اس کے اطراف خون نظر آئے، یا ایسی کوئی بات پیش نہ آئی ہو۔ باندھنے کے بعد خون کے غلبہ کی وجہ سے خون نکل پڑے، تو اسکا وضو باطل نہ ہوگا۔ اگر باندھنے میں کمی کی وجہ سے نکل پڑا تو وضو

باطل ہوگا۔

اسی طرح پٹی ٹھیک نہ باندھنے سے اپنی جگہ سے سرک جائے اوراس کی وجہ سے خون کا نکلنا بڑھ جائے، تو وضوختم ہوگا۔اگر نماز میں ایسا اتفاق ہوتو نماز باطل ہوگی۔اگر فرض کے بعد ہوتو اب نفل پڑھنا حرام ہوگیا۔

مستحاضہ کی شفاء: مستحاضہ کی بیاری ختم ہوجائے، تواس کی طہارت باطل ہوگی۔نماز میں شفاء ہوجائے، تو نماز باطل ہو گی۔کسی مستحاضہ کا خون طہارت کے بعد رک جائے اور اسکواس طرح خون رکنے اور پھر دوبارہ شروع ہونے کی عادت ہو، یا عادت تو نہیں تھی لیکن کسی معتبر واقف شخص نے یہ بتادیا کہ پھر شروع ہوگا، تو ان دونوں صورتوں میں اگر خون رکنے کی مدت اتنی کم ہو، کہ اسمیں طہارت اور جس نماز کیلئے طہارت حاصل کی ہے نہیں ہوسکتی تو وہ (دوبارہ طہارت کئے بغیر) نماز شروع کرسکتی ہے۔لیکن خون رکا ہی رہا تو معلوم ہوا کہ طہارت باطل تھی۔اور نماز قضاء پڑھنی ہوگی۔اور رکنے کی مدت میں طہارت اور متعلقہ نماز کی گنجائش رہتی ہے۔تو خون رکنے کے بعد وضو لازم ہے۔خلاف عادت اتنی مدت سے پہلے ہی پھر خون جاری ہوتو وضو کا اعادہ واجب نہیں، لیکن خون رکنے کے بعد نماز شروع کرچکی اور وضو کا اعادہ نہیں کیا اور نماز ہونے سے پہلے ہی پھر خون شروع ہوتو نماز کا اعادہ واجب ہے۔البتہ خون رکے اور رکنے لوٹنے کی اسے عادت نہ ہو اور کسی معتبر شخص نے لوٹنے کی خبر بھی نہ دی، تو وضو کا اعادہ لازم ہے۔لیکن وضو اور نماز کے امکان سے قبل ہی پھر خون شروع ہوتو سابقہ وضو باقی سمجھا جائے گا۔

مذکورہ بالا اعادۂ وضو کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خون رکنے کے بعد وضو کے اعادہ کے بغیر نماز شروع کرے، تو نماز صحیح نہیں، خون لوٹے یا نہ لوٹے نیز طہارت و نماز کے امکان کے بعد لوٹے یا اس سے قبل۔مستحاضہ اپنی طہارت سے مستقل نوافل بھی پڑھ سکتی ہے، فرض کے تابع بھی، وقت کے اندر بھی، اور بعد میں بھی، مستحاضہ (اور دیگر دائمی حدث والے افراد) کی طہارت سے نماز جائز ہوجاتی ہے لیکن یہ طہارت حقیقتاً حدث (ناپاکی) دور نہیں کرتی۔

کسی کو کبھی خون آتا ہے اور کبھی رکتا ہے۔تو خون کے بہاؤ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں، بلکہ جس وقت رکے وضو و نماز ادا کرنی چاہئے۔

سلسل البول کھڑے ہوکر نماز پڑھے تو پیشاب ٹپکتا ہے اور بیٹھ کر پڑھنے کی صورت میں رک جاتا ہے تو طہارت کے خاطر بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔

باب ۔۲ مستحاضہ کی مختلف قسمیں

ان کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) اَلْمبتداۃُ اَلْمیز ہ (جس کو پہلی مرتبہ ہی خون ۱۵ دن سے زائد آئے اور قوی وضعیف خون میں تفریق کرسکے) اسکو مختلف رنگ کا خون آتا ہے، جسمیں ایک رنگ قوی ہوتو اُسے تمیز پر عمل کرنا ہے۔یعنی قوی خون کے ایام میں حائضہ ہوگی۔اور ضعیف خون کے ایام میں مستحاضہ، تمیز پر عمل کیلئے درج ذیل تین شرائط ضروری ہیں۔

قوی خون ۱۵ر دن سے بڑھ نہ جائے (۲) ایک شب وروز سے کم نہ ہوتا کہ اسے حیض شمار کرسکیں۔(۳) ضعیف خون ۱۵ر دن سے کم نہ ہوتا کہ اسے دو حیض کا درمیانی طہر قرار دیا جاسکے اور یہ ۱۵ر دن (یا اس سے زائد) مسلسل ہونا ضروری ہے، لہٰذا ایک دن سیاہ اور دو دن

سرخ اس ترتیب سے سارا ماہ گذر جائے تو ضعیف خون کی مجموعی مدت ۱۵ دن سے بھی بڑھ گئی (۲۰ دن ہو چکی) لیکن یہ تمیز نہیں ہے کیونکہ اتصال نہیں پایا گیا۔ قوت کیلئے ان تین صفات میں سے کسی صفت کا اعتبار کیا جائے گا۔ رنگ، بو، گاڑھا پن، سیاہ رنگ، اشقر (سرخ وزردی مائل) سے قوی ہے۔ اور اشقر زرد اور اکدر (گدلے) سے قوی ہے۔ بدبودار خون غیر بدبودار خون سے قوی ہے۔ اسی طرح گاڑھا خون پتلے سے قوی ہے۔

لہٰذا بعض خون میں قوت کے تینوں صفات ہوں۔ اور بعض تینوں سے خالی تو قوت کے صفات کا خون قوی ہوگا (اور دوسرا ضعیف) بعض میں ایک صفت اور بعض میں دو صفتیں ہوں، تو دو صفات والا قوی ہے، بعض میں دو اور بعض میں تین صفت ہوں، تو تین صفات والا قوی ہے۔

تشریح : کسی کو پہلے دس دن سیاہ، خون آئے پھر ۲۰ر دن زرد، تو پہلے دس دن حیض ہے، دس دن بدبودار اور ۲۰ دن غیر بدبو دار تو ۱۰ دن حیض اور ۲۰ دن استحاضہ ہے۔ ۵ دن گاڑھا اور ۲۵ دن پتلا خون آئے تو ۵ دن حیض اور ۲۵ دن استحاضہ ہے۔ ۱۰ دن سیاہ اور بدبودار ہو اور ۲۰ دن پتلا خون ہو تو ۱۰ دن حیض اور بقیہ استحاضہ اسی طرح دیگر مختلف صورتوں کو سمجھ لیجئے۔

تمیز کی صورت میں کبھی پہلے قوی خون آئے گا اور کبھی پہلے ضعیف، قوی مقدم ہو اور بعد میں ایک قسم کا ضعیف خون آتا ہے جیسے ۱۵ دن تک سیاہ خون پھر سرخ مسلسل تو اس کا حیض سیاہ خون ہے اور سرخ طہر ہے، چاہے کافی مدت تک آتا رہے۔

اگر قوی کے بعد دو ضعیف خون (یکے بعد دیگرے) آئے اور اس میں سے پہلے ضعیف کو قوی کے ساتھ ملا کر حیض قرار دے سکتے ہیں تو ایسا ہی کریں گے۔

جیسے ۵ دن سیاہ خون آیا پھر ۵ دن سرخ، پھر زرد مسلسل آتا رہا، (تو سیاہ اور زرد دونوں ملا کر ۱۰ دن حیض) (حاشیہ الروضہ) لیکن ان دونوں کو ملا کر حیض نہیں قرار دے سکتے تو صرف قوی حیض ہوگا۔ جیسے ۵ دن سیاہ، پھر ۱۱ دن سرخ، پھر زرد کا سلسلہ، (تو صرف ۵ دن حیض ہے)

کسی کو ضعیف پہلے آئے، جیسے ۵ دن سرخ، پھر ۵ دن سیاہ، پھر سرخ، کا سلسلہ تو اس کا حیض صرف سیاہ خون کے پانچ دن ہیں، قبل و بعد کے ایام طہر ہیں۔

اگر سیاہ خون ۱۶ دن آئے تو پھر یہ "فاقِدۃُ التمیز" (جس کے خون سے تمیز کر کے حیض ونفاس کا حکم نہ لگا سکیں) کہلائے گی۔

کسی مبتداۃ کو پہلی مرتبہ ۱۵ دن سرخ پھر ۱۵ دن سیاہ خون نظر آئے تو مکمل ماہ نماز روزہ ترک کرے گی۔

تشریح : پہلی مرتبہ کسی رنگ کا خون آئے تو حیض شمار کرے گی، جب ۱۵ سے آگے بڑھا اور بعد میں ۱۵ دن تک قوی ہے تو معلوم ہوا کہ پہلے پندرہ دن استحاضہ تھا، اور اب یہ پندرہ دن حیض ہے، تو گویا بعد میں پندرہ دن کے نمازوں کی قضاء لازم ہوگی۔ مذکورہ صورت میں سیاہ خون ۱۵ دن سے بھی آگے بڑھ جائے تو اب اس کی تمیز کا اعتبار نہیں، لہٰذا صرف ایک دن رات حیض شمار ہوگا، تو اس ایک صورت میں مستحاضہ ۳۱ دن تک نماز نہیں پڑھے گی۔

پہلی مرتبہ خون ۔ حیض کی عمر ہونے کے بعد محض خون نظر آتے ہی نماز روزہ اور جماع سے رکنا ضروری ہے۔ اب مکمل ایک دن سے پہلے ہی رک جائے تو معلوم ہوا کہ حیض نہیں تھا، لہٰذا نماز قضا کرے گی۔

مبتداۃ ممیّزہ کا خون قوت سے ضعف کی طرف پلٹے تو وہ نماز روزہ شروع نہیں کرے گی، ہوسکتا ہے کہ خون پندرہ دن سے آگے نہ

بڑھے،تو ایسی صورت میں سارا حیض ہوگا۔لہٰذا پندرہ دن ہونے تک رکی رہے گی۔ پندرہ کے بعد بھی خون جاری رہا،تو اب معلوم ہوا کہ وہ مستحاضہ ہے،اب اسے قوی خون کے بعد کے ایام کی نماز قضاء کرنی ضروری ہے۔یہ حکم پہلی ماہ کا ہے،(جب پہلی ماہ اس کا مستحاضہ ہونا ثابت ہوا تو) دوسرے ماہ سے قوی خون ختم ہوتے ہی غسل کر کے نماز روزہ شروع کرے گی،بعد میں کسی ماہ شفاء ہوئی اور ۱۵ دن کے اندر خون رک گیا تو اس ماہ قوی اور ضعیف دونوں خون حیض ہے۔

امام الحرمینؒ کی تصریح اور دیگر علماء کے کلام سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب مکمل ضعیف خون آنا شروع ہو تو اسے ضعیف شمار کریں گے یہاں تک کہ کچھ سیاہ دھاریاں اور کچھ سرخ آنا شروع ہو،تب بھی حیض کا حکم ختم نہ ہوگا جب سیاہی بالکل نہ رہے تو حیض کا حکم ختم ہوگا۔(اور ضعیف کا سلسلہ جاری ہوگا جو استحاضہ شمار ہوگا۔)

(۲)وہ مبتدأۃ جس کو تمیز حاصل نہ ھو: کسی کو ایک ہی صفت کا خون مسلسل آئے،یا قوی وضعیف آئے، لیکن تمیز کے شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو اس کا حکم اس قسم میں بیان ہو رہا ہے۔

اگر ایسی عورت کو اپنے خون کی ابتدا کب سے ہوئی معلوم نہیں تو اس کا حکم متحیرہ کی طرح ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب آئے گی اور ابتداء معلوم ہے تو پہلا ایک دن رات حیض ہے اور بقیہ ۲۹ دن استحاضہ ہے۔

پہلی مرتبہ ۱۵/ ایام تک روزہ نماز کے ترک میں غیر ممیزہ بھی ممیزہ کی طرح ہے۔۱۵ دن سے آگے بڑھا،تو استحاضہ ہونا معلوم ہوا، لہٰذا ۱۴ دن کے نمازوں کی قضاء کرے گی۔دوسرے ماہ اور اس کے بعد سابقہ شرائط کے مطابق تمیز موجود ہو تو اب مبتداۃ ممیزہ ہوگی، بعد میں بھی تمیز نہ ہو تو مدت گذرنے پر غسل اور صوم وصلوۃ واجب ہے۔

کسی ماہ اسے ۱۵ دن گذرنے سے قبل شفاء ہو جائے،تو اس ماہ میں وہ مستحاضہ نہیں ہے، بلکہ سارے ایام حیض ہیں۔لہٰذا ان ایام میں رکھے گئے روزوں کی قضاء کرے اور اس سے پہلے کیا ہوا غسل بھی صحیح نہیں ہے۔مدت کے بعد صوم وصلوۃ اور وطی پر گناہ نہ ہوگا گرچہ حقیقتاً حیض میں ہو رہا ہے۔اس لئے کہ لاعلمی سے یوں ہوا ہے۔

(۳)معتادہ غیر ممیزہ:(جس کو حیض کی پہلے سے ایک عادت بندھی ہو اور خون کے رنگ میں فرق نہ ہو) ایسی عورت حیض وطہر کے سلسلہ میں اپنی سابقہ عادت پر عمل کرے گی۔اس کی دو حالتیں ہوں گی (۱) اس کی عادت میں اختلاف نہ ہو۔کئی مرتبہ حیض وطہر کی عادت گذر چکی ہو تو حیض وطہر کی مقدار اور مدت میں اسی عادت پر عمل کرے گی،چاہے مہینے میں چند روز حیض آتا ہو،یا سال میں یا اس سے زائد مدت،میں صرف ایک مرتبہ ہی پہلے حیض وطہر آچکا ہے،تو اس کو بھی عادت شمار کر کے اس پر عمل کرے گی۔

کسی کو پانچ دن حیض آتا تھا۔کسی ماہ ۶/ دن آیا،اس کے بعد والے ماہ میں استحاضہ شرع ہوا تو ۶ دن حیض کی عادت شمار کریں گے۔

پہلی مرتبہ خون عادت سے آگے بڑھے،تو مبتداہ کی طرح روزہ نماز سے رکی رہے،ہوسکتا ہے ۱۵ سے آگے نہ بڑھے (ایسی صورت میں پورا حیض ہی ہوگا) اب اگر ۱۵ سے بھی آگے بڑھے تو عادت سے زائد ایام کے نماز کی قضاء کرے آئندہ مہینوں میں عادت ختم ہوتے ہی غسل کر کے نماز روزہ شروع کرے۔

(۲) دوسری حالت یہ کہ عادت مختلف ہو۔اس کی کئی صورتیں ہیں۔

مختلف عادتیں ترتیب کے ساتھ جاری ہوں۔جیسے ایک ماہ تین دن حیض پھر ۵ دن پھر ۷ دن پھر چوتھے ماہ ۳ دن۔پھر ۵ دن پھر سات دن۔پھر اسی طرح ہمیشہ۔اب استحاضہ شروع ہو تو اسی عادت کی طرف لوٹایا جائے گا۔صرف ایک مرتبہ اس ترتیب سے حیض آنے

سے عادت ثابت نہیں ہوگی۔ کم از کم دو مرتبہ یہ ترتیب پیش آنا چاہیئے۔ لہٰذا مذکورہ مثال میں کم از کم چھ ماہ میں عادت ثابت ہوگی۔ اب تین دن حیض والے ماہ کے بعد استحاضہ شروع ہو جائے تو استحاضہ کے پہلے ماہ ۵ روز اور دوسرے ماہ ۷ روز اور تیسرے ماہ ۳ دن حیض شمار ہونگے۔ ۵ دن حیض والے ماہ کے بعد استحاضہ شروع ہو جائے تو پہلے ماہ ۷ روز، پھر تین روز، پھر ۵ روز، حیض شمار ہونگے۔ ۷ روز حیض کے بعد دوسرے ماہ سے استحاضہ شروع ہو تو پہلے ماہ ۳ دن دوسرے، ماہ ۵ دن او تیسرے ماہ، ۵ دن اور تیسرے ماہ، ۷ دن حیض ہونگے۔ اس صورت میں ایک عادت اور اکثر عادت کے درمیانی ایام میں احتیاط واجب نہیں ہے۔ یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ سابقہ عادت اسے یاد ہو۔ اگر بھول جائے تو ہر ماہ ۳ دن حیض گذار کر غسل کر کے نماز روزہ شروع کرے، پھر ۵ روز مکمل ہونے پر غسل کرے، پھر سات روز مکمل ہونے پر غسل کرے، اس دوران ہر فرض نماز کیلئے وضو کرے۔

حیض وطہر کا سلسلہ مکرر آ چکا لیکن ترتیب ونظم کے بغیر، اس صورت میں آخری حیض کی مدت یاد نہیں تو کم سے کم جو حیض گذر چکا ہو اس پر عمل کرے گی اور زائد میں احتیاط پر عمل کرے گی۔ اور آخری حیض کی مدت یاد ہے تو اسی پر عمل کریگی۔ اور اس سے زائد مدت ہو تو اس میں احتیاط پر عمل کرے گی۔ مثلاً مذکورہ مثال میں استحاضہ سے قبل آخری حیض تین دن تھا۔ (تو ہر ماہ تین دن حیض شمار کرے گی۔ البتہ ۵ دن اور ۷ دن ہونے پر غسل دہرائے گی لیکن آخری حیض ۷ دن تھا تو ہر ماہ ۷ دن حیض شمار کرے گی، اس سے زائد اس کیلئے کبھی رہا نہیں، اس لئے احتیاط کا سوال ہی نہیں۔) حیض وطہر کا اختلافی سلسلہ مکرر آیا ہی نہیں، مثلاً ایک ماہ تین، پھر پانچ، پھر سات دن حیض آیا پھر چوتھے ماہ استحاضہ شروع ہو گیا اور آخری مدت بھول چکی تو کم سے کم مدت (مذکورہ مثال میں تین دن) حیض شمار کرے اور زائد میں احتیاط کرے، اور آخری مدت یاد ہے تو ہر ماہ وہی مدت حیض شمار کرے، کم ہو یا زیادہ، اس صورت میں احتیاط کی ضرورت نہیں۔ (بعض علماء نے اس صورت میں بھی احتیاط کو واجب قرار دیا ہے) (حاشية الجمل على فتح الوهاب ۱/ ۲۵۱)

(۴) ایسی معتادہ ممیزہ جس کو عادت یاد ہو: اگر عادت اور تمیز متفق ہوں، جیسے ہر ماہ کے ابتداء میں پانچ ایام حیض آتا تھا اور باقی طہر، اب کسی ماہ استحاضہ شروع ہو گیا، اور ابتدائی پانچ ایام سیاہ خون اور بقیہ ماہ سرخ خون آئے، تو وہی پانچ ایام حیض کے ہیں۔

اگر عادت اور تمیز متفق نہ ہوں، اور عادت اور تمیز کے درمیان اقل طہر (۱۵ دن) کا فاصلہ نہ ہو تو تمیز پر عمل کرے گی۔ جیسے پانچ روز حیض آتا تھا پھر کسی ماہ دس روز سیاہ خون اور بقیہ ایام سرخ خون جاری رہا تو اسکا حیض دس روز ہوگا (سیاہ خون کے ایام)

اور اگر عادت وتمیز کے درمیان اقل طہر کا فاصلہ ہو، تو عادت کی مقدار بھی حیض ہے، اور قوی خون بھی حیض ہے، اس لئے کہ دونوں کے درمیان کامل طہر کی مدت مل جاتی ہے، جیسے ۲۰ یا زائد دن ضعیف خون آئے پھر پانچ دن قوی پھر ضعیف اور اس کی قدیم عادت ۵ روز کی ہے تو پہلے پانچ دن عادت کی وجہ سے حیض، اور قوی خون کے ۵ دن تمیز کی وجہ سے حیض ہے۔

(۵) تمیز سے عادت کا فیصلہ: معتادہ کو جس عادت پر عمل کرنا ہے، وہ بغیر استحاضہ کے صحیح حیض اور طہر ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور کبھی تمیز کی روشنی میں بھی عادت کا فیصلہ ہوتا ہے جیسے مبتداء کو ۵ دن سیاہ پھر ۲۵ دن سرخ خون آئے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے پھر کسی ماہ صرف سیاہ یا سرخ خون مسلسل جاری رہے تو سابقہ تمیز کی بنیاد پر ہر ماہ ابتدائی ۵ دن حیض اور بقیہ استحاضہ ہے۔ مذکورہ صورت میں کسی ماہ دس روز سیاہ خون آئے بقیہ سرخ اور بعد کے ماہ مسلسل سیاہ کا سلسلہ جاری رہا تو حیض ۱۰ دن ہیں۔ کسی کو پانچ دن سیاہ خون کی عادت تھی، پھر خون مستمر رہا اور کسی ماہ ۱۰ روز سیاہ خون آیا تو اس ماہ دس روز حیض ہے۔

فصل زرد اور مٹیالے رنگ کا خون

عادت کے ایام میں زرد یا مٹیالے رنگ کا خون آئے تو یہ بھی حیض شمار ہوگا، دیگر ایام میں اسکا حکم سیاہ خون کا حکم ہے۔

باب ۳- مستحاضہ معتادہ جو اپنی عادت بھول چکی ہو:

اس کی دو صورتیں ہونگی۔ ممیّزہ۔ غیر ممیّزہ

ممیّزہ تمیز پر عمل کرے گی (قوی خون کو حیض اور ضعیف کو استحاضہ شمار کرے گی) غیر ممیّزہ کی کئی حالتیں ہونگی۔

(۱) غفلت یا جنون وغیرہ کی وجہ سے اپنی عادت کے مقدار اور وقت کو بھولے، ایسی عورت کو مُتَحَیِّرَہ اور مُحَیِّرَہ کہتے ہیں۔ (اس لئے کہ خود بھی احکام کے متعلق تحیّر کا شکار اور دوسرے کو بھی تحیر میں ڈالنے کا سبب) محیرہ کو چھ اشیاء میں احتیاط لازم ہے۔

(۱) اس سے جماع کرنا ہمیشہ حرام ہے (یعنی جب تک استحاضہ کی وجہ سے وہ متحیرہ ہے) دیگر استمتاع کے متعلق متحیرہ حائضہ کے حکم میں ہے۔

(۲) اس پر قرآن چھونا اور نماز کے باہر تلاوت کرنا حرام ہے، نمازوں میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورۃ پڑھنا حرام نہیں ہے، دخول مسجد میں حائضہ کی طرح ہے۔

(۳) پنج وقتہ نمازیں ہمیشہ (ہر روز) واجب ہے نوافل پڑھنا حرام نہیں ہے۔ نفل روزے اور طواف بھی حرام نہیں، ہر فرض نماز کے لئے غسل واجب ہے، جبکہ حیض کا خون رکنے کا وقت معلوم نہ ہو۔ غسل نماز کے وقت میں ہونا شرط ہے۔ غسل کے بعد فوراً نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

اگر اتنا یاد ہو کہ فلاں وقت حیض رک جاتا تھا۔ مثلاً غروب کے وقت تو ہر دن رات صرف ایک مرتبہ غروب کے وقت غسل لازم ہے اور اس سے مغرب پڑھ لے اور بقیہ فرائض کیلئے صرف وضو کرے۔ مستحاضہ کو درمیان میں خون رکتا رہتا ہو تو ظاہر ہے کہ ان اوقات میں غسل کی ضرورت نہیں ہے۔ (فتح الوھاب ۱/ ۸۲)

نمازوں کو بعد میں قضا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴) ماہ رمضان کے مکمل روزے رکھنا واجب ہے ۳۰ کا مہینہ ہو تو اس کے ۱۴ روزے شمار ہونگے اور ۲۹ کا ہو تو ۱۳ روزے شمار ہو نگے (دونوں صورت میں ۱۶ روزوں کی قضاء لازم ہے)

بعد میں مکمل ایک ماہ (۳۰ دن) مسلسل روزہ رکھے۔ اب اس پر دو روزے باقی رہیں گے، جبکہ رات میں خون رکنے کی عادت نہ تھی (یعنی دن میں رکنے کی عادت تھی یا شک ہے کہ رات میں رکتا تھا یا دن میں) لہٰذا ان دو روزوں کے قضاء کی یہ صورت ہوگی کہ ۱۸ دن میں سے ابتداء میں تین دن اور آخر میں تین دن روزہ رکھے۔ یا ۱۸ دن میں سے ابتداء میں چار دن اور آخر میں دو دن روزہ رکھے۔ یا اس کے برعکس یا دو دن ابتداء میں دو آخر میں اور دو درمیان میں رکھے۔ یا ان دو کی قضاء میں ۵ روزے رکھے۔ پہلا۔ تیسرا۔ پانچواں۔ سترھواں۔ اور انیسواں۔ اگر رات میں حیض رکتا تھا تو اس پر کوئی قضاء باقی نہیں۔ (فتح الوھاب ۱ / ۲۸)

(۵) ایک دن کا روزہ قضاء رکھنا ہو تو کم از کم تین روزے رکھنے ہونگے۔

ایک دن روزہ رکھے گی پھر ایک دن افطار پھر تیسرے دن روزہ پھر سترھویں دن روزہ رکھے گی۔ دوسرا روزہ تیسرے دن اور تیسرا روزہ سترھویں دن ہی لازم نہیں ہے۔ بلکہ وہ تیسرے دن کے بجائے اس کے بعد پندرھویں دن تک کسی بھی روز روزہ رکھ سکتی ہے اور

سترھویں کی بجائے اس کے بعد انتیسویں کے آخری دن تک کسی بھی دن روزہ رکھ سکتی ہے۔شرط یہ ہے کہ پندرہ کے بعد (سولہ سے) تیسرے روزے کا فاصلہ پہلے اور دوسرے روزے کے درمیان فاصلہ کے برابر یا اس سے کم ہو۔

لہٰذا اگر پہلا اور تیسرا اور اٹھارواں روزہ رکھے تو کافی نہیں اس لئے کہ پندرہ کے بعد دو دن کا فاصلہ ہے۔اور ابتدائی دونوں روزے میں صرف ایک دن کا فاصلہ ہے۔اگر پہلے دن۔چوتھے دن۔اور اٹھارویں یا سترھویں دن روزہ رکھے تو جائز ہے۔اگر پہلے دن اور پندرھویں دن روزہ رکھے تو دونوں روزوں میں ۱۳ دن کا فاصلہ ہوا۔لہٰذا وہ ۲۹/انتیسواں یا اس سے قبل ۱۶ کے علاوہ کسی دن روزہ رکھے تو کافی ہے۔

ایک دن سے زائد قضا رکھنا ہو تو قضا روزوں کی تعداد کو دوگنا کر کے اس میں دو جمع کریں گے، جو حاصل ہوگا اس کے نصف تعداد روزے کبھی بھی پے در پے (مسلسل) رکھے گی، اور بقیہ نصف روزے سولھویں دن سے شروع کرے گی۔لہٰذا دو روزے رکھنا ہو تو تین روزے مسلسل کبھی بھی رکھے پھر چوتھے دن سے پندرہ تک روزہ ترک کرے پھر ۱۶۔۱۷۔اور ۱۸ کو روزہ رکھے۔

اگر تین روزے رکھنا ہیں تو پہلے چار روزے رکھے پھر ۱۶/سولھویں دن سے چار روزے اور رکھے۔

اگر ۱۴ روزے رکھنا ہو تو مکمل ماہ روزہ رکھے۔

اگر کسی نے سارے روزوں کو بغیر زیادتی کے مسلسل کسی بھی وقت رکھا پھر سترھویں دن سے دوبارہ سارے روزے رکھے اور ان دونوں کے درمیان دو روزے ایک ساتھ یا الگ الگ پہلے سلسلے یا دوسرے سلسلے کے ساتھ متصل یا غیر متصل رکھے تب بھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگی۔

یہ تمام تفصیل ان روزوں کے قضاء میں تھی جس میں تتابع (مسلسل ہونا) ضروری نہیں تھا۔اگر نذر وغیرہ سے تتابع ضروری ہو اور ایک ماہ میں ہو سکتے ہوں تو ان روزوں کو مسلسل رکھے۔پھر دوبارہ سترھویں سے رکھے۔

مثال: کسی پر دو روزے مسلسل ہیں تو دو روزے رکھے اور ۱۷ اور ۱۸ کو رکھے اور درمیان میں دو مسلسل رکھے۔اگر مسلسل دو ماہ کے رکھنا ہیں تو اسے مسلسل ۱۴۰ دن روزے رکھنا ہوں گے۔

(۶) متحیرہ کی عدت: متحیرہ فی الحال ۳ ماہ کے اعتبار سے عدت گذارے گی (سن یاس تک انتظار کی ضرورت نہیں)

بعض متفرق مسائل

کسی پر دو روزے ہوں تو سابقہ ترتیب کے علاوہ یہ ترتیب بھی صحیح ہے کہ پہلے۔تیسرے۔۱۷/سترھویں اور ۱۹/انیسویں دن روزہ رکھے۔چوتھے اور سولہویں روز روزہ نہ رکھے۔درمیان میں ۱۱/ایام باقی رہے۔ان میں سے کسی بھی ایک دن روزہ رکھے۔متحیرہ کے شوہر پر اس کا نفقہ (خرچ) ضروری ہے، متحیرہ ہونے کی بنیاد پر شوہر نکاح فسخ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ آئندہ جماع متوقع ہے بخلاف رتقاء کے (رتقاء یعنی گوشت بڑھنے سے جس کا فرج بند ہو چکا ہو اور اس سے صحبت ممکن نہ ہو) متحیرہ کی اقتداء میں کسی دوسرے متحیرہ یا غیر متحیرہ کی نماز صحیح نہ ہوگی۔

دودھ پلانے کے عذر سے یہ اگر روزہ نہ رکھے تو اس پر فدیہ ضروری نہیں ہے۔سفر یا بارش کے عذر کی وجہ سے پہلی نماز کے وقت کے درمیان جمع نہیں کر سکتی (جمع تقدیم نہیں کر سکتی)

ایک دن روزہ واجب ہونے کی صورت میں سابقہ تفصیل کے مطابق روزہ رکھنا شروع کیا اور ایک روزہ رکھنے کے بعد نیت کی تھی یا

نہیں، شک ہوا تو حرج نہیں، وہ روزہ صحیح ہے۔

(۲) حیض کا وقت یاد ہے لیکن مدت اور مقدار بھول چکی ہے۔ اس صورت میں اصول یہ ہے کہ جو حیض کا مدت ہونا یقینی ہے اس میں حیض کے سارے احکام ثابت ہونگے۔ اور جو مدت بالیقین طہر ہے اس میں طہر کے احکام ثابت ہونگے لیکن دائم الحدث شمار ہوگی۔

اور وہ مدت جس میں حیض و طہر دونوں کا احتمال ہو، اس مدت میں استمتاع کے اعتبار سے حائضہ شمار ہوگی اور عبادات لازم ہونے کے اعتبار سے طاہرہ (غیر حائضہ) شمار ہوگی۔ اب اس مدت میں حیض کے انقطاع کا احتمال ہو تو ہر فرض کیلئے غسل واجب ہے، اور مناسب حال احتیاط ضروری ہے۔

اگر عورت تیس دن کی تعین کرے اور کہے کہ ابتداء میں حیض شروع ہوتا تھا اس طرح بعد کے ہر تیس دن میں تو تیس دن کا پہلا دن اور رات بالیقین حیض ہے اس کے بعد ۱۵ دن مکمل ہونے تک حیض و طہر اور انقطاع کا احتمال ہے اس کے بعد ماہ کے آخر تک بالیقین طہر ہے، اسی طرح ہر تیس روز کا حکم ہوگا، یہاں ماہ سے قمری ماہ مراد نہیں، بلکہ عورت ہی ایام کی تعین کرے، اگر عورت تیس ایام کی تعین کر کے کہے کہ اتنا مجھے یاد ہے کہ ہر ماہ کے آخر میں حیض کا سلسلہ ختم ہوتا تھا تو ان تیس ایام کے ابتدائی ۱۵ روز بالیقین طہر ہے آخری دن اور رات بالیقین حیض ہے درمیانی ۱۴ ایام میں حیض اور طہر دونوں کا احتمال ہے نہ کہ انقطاع کا، اگر عورت کہے کہ میں ہر ماہ کے آخر اور دوسرے ماہ کے ابتداء میں حائضہ رہتی تھی تو ہر ماہ کا ابتدائی لحظہ طہر اور آخری لحظہ بالیقین حیض ہے، ۱۵ کا آخری لحظہ اور ۱۶ کی شب کا ابتدائی لحظہ بالیقین طہر ہے ابتدائی لحظہ اور ۱۵ کے آخری لحظہ کا درمیانی وقت حیض طہر اور انقطاع کا احتمال رکھتا ہے۔

۱۶ کے ابتدائی لحظہ اور ماہ کے آخری لحظہ کا درمیانی وقت حیض و طہر دونوں کا احتمال رکھتا ہے نہ کہ انقطاع کا، اگر عورت کہے کہ ایک ماہ کا آخر اور دوسرے کا ابتداء طہر رہا کرتا تھا تو اس کے لئے یقینی حیض نہیں۔ ہر ماہ کا ابتدائی و آخری لحظہ بالیقین طہر ہے ان دو لحظوں کے بعد اقل حیض کی مقدار میں انقطاع کا احتمال نہیں اس کے بعد احتمال ہے۔ (۳) حیض کے مقدار کی عادت یاد رہے، یہ تحیر سے اسی وقت نکلے گی جبکہ دور کی مقدار ابتداء اور حیض کی مقدار اسے یاد ہو۔

اگر وہ کہے کہ میرا حیض پانچ دن ہے اور میرے دور میں اسے گم کر چکی۔ (یعنی کون سے ایام تھے پتہ نہیں) اور اس کے علاوہ کچھ مجھے پتہ نہیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہر وقت حیض۔ طہر اور انقطاع کا احتمال موجود ہے، اسی طرح اگر کہے کہ میرا حیض ۵ روز، اور دور تیس ایام ہیں جس کی ابتداء میں نہیں جانتی (تو یہی حکم ہے)

باب ۔ ۵ نفاس کا بیان

عورت کو ولادت کے بعد جو خون آتا ہے، اسے نفاس کہتے ہیں۔ نفاس کی اکثر مدت ۶۰ دن ہیں (یعنی زیادہ سے زیادہ کسی عورت کو ۶۰ دن نفاس آسکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں)

اور نفاس کی غالب مدت ۴۰ دن ہیں۔ (یعنی عام طور پر عورتوں کو ۴۰ دن تک خون آتا ہے) اور نفاس کی اقل (کم سے کم) مقدار کی کوئی حد نہیں جتنی دیر بھی نکلے خواہ بالکل کم ہو نفاس ہوگا۔

بچہ مکمل پیدا ہو یا ناقص، زندہ ہو، یا مردہ، اس کے بعد جاری ہونے والا خون نفاس ہے۔ اگر کسی عورت کے بطن سے علقہ (خون کا لوتھڑہ) یا مضغہ (بوٹی) نکلے اور دایا یہ بتادے کہ یہ انسانی خلقت کی ابتداء ہے تو اس کے بعد نکلنے والا خون نفاس ہے۔

فصل: حاملہ کو حیض کے مطابق خون آئے تو وہ حیض ہے، حمل کی حرکت سے قبل ہو یا، بعد اور اس کی وجہ سے نماز روزہ کی حرمت اور حیض کے دیگر احکام جاری ہونگے، لیکن اس حیض میں طلاق دینا حرام نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ سے عورت کی عدت ختم نہ ہوگی (لیکن صاحب حمل کے علاوہ دوسرے کسی کی عدت عورت پر واجب ہو جائے تو ایسی صورت میں دوسری عدت اس حیض سے ختم ہوگی۔ (حاشیة الروضہ)

خون کے نکلنے کے بعد پندرہ روز سے، یا اس سے قبل یا خون سے متصل ہی ولادت ہو تو ان تمام صورتوں میں وہ حیض ہے۔ زچگی کے وقت ولادت سے پہلے نکلنے والا خون نہ نفاس ہے اور نہ حیض اسی طرح عین ولادت کے وقت کا خون بھی نفاس و حیض نہیں ہے، ولادت کے بعد نکلنے والا خون نفاس ہوگا جب بچے کے ساتھ ساتھ نکلنے والا خون نفاس نہیں ہے، تو اس خون کی وجہ سے نہ غسل واجب ہوگا اور نہ روزہ باطل ہوگا۔ ان مسائل سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں سے جدا ہونے کے بعد سے نفاس کے خون کی ابتداء شمار کی جائیگی۔

دو جڑواں بچوں کے درمیان (ایک کی ولادت کے بعد دوسرے کی ولادت سے پہلے) نظر آنے والا خون نفاس نہیں۔

فصل: نفساء کا خون ۶۰ دن سے آگے بڑھ جائے، تو اس کا نفاس استحاضہ سے مل گیا، اب نفاس و استحاضہ کے فرق کیلئے حیض و استحاضہ کی سابقہ تفصیل کو مدنظر رکھا جائے گا۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں مستحاضہ کی ۵ قسمیں ہونگی۔

(۱) معتادہ (جس کی اس سے قبل نفاس کی متعین عادت رہی ہو) مثلاً کسی کی عادت اس سے قبل ۴۰ دن نفاس کی تھی تو اب اس کا نفاس ۴۰ دن شمار ہوگا۔ حیض کے اعتبار سے اس کی دو صورتیں ہونگی یا تو معتادہ ہوگی، اس صورت میں ۴۰ دن کے بعد طہر کی سابقہ عادت کی مدت تک طہر اور حیض کی مدت میں حیض شمار ہوگا، یا پھر وہ مبتداء ہوگی، لہٰذا ۴۰ دن کے بعد مبتداء کی طہر، کی مقدار تک اس کا طہر ہوگا، اور اس کے بعد حیض کی مدت حیض ہوگی۔ عادت و تمیز دونوں ہو، تو حیض کی سابقہ تفصیل کی روشنی میں فیصلہ ہوگا۔

کئی مرتبہ ولادت کے بعد خون نہ نکلا پھر ایک مرتبہ استحاضہ شروع ہو جائے تو خون نہ نکلنے کو عادت سمجھتے ہوئے بالکل نفاس کی نفی نہیں کریں گے بلکہ پہلی ولادت کی طرح اسے مبتداء سمجھیں گے۔

(۲) اور (۳) مبتداء ممیزہ اور غیر ممیزہ۔ غیر ممیزہ کا صرف ایک لحظہ نفاس ہوگا۔ اب یہ نفساء حیض کے سلسلہ میں معتادہ تھی۔ تو نفاس کے بعد حیض و طہر کے مطابق سابقہ عادت پر عمل کرے گی اور مبتداء ہے تو مبتداء کے طہر اور حیض کا حکم یہاں بھی جاری ہو گا۔ اور اگر ممیزہ ہے تو تمیز کے شرائط کی موجودگی میں تمیز پر عمل کرے گی، جیسا کہ حائضہ کے متعلق گذر چکا۔

نفساء کی تمیز کی شرط یہ ہے کہ قوی خون ۶۰ دن سے زائد نہ ہو قوی اور ضعیف کے اقل کا کوئی ضابطہ نہیں۔

(۴) معتادہ ممیزہ ۔ معتادہ میں اسکا حکم بیان ہو چکا۔

(۵) اپنے نفساء کی سابقہ عادت کو بھولنے والی، اسکا حکم حیض کی عادت کو بھولنے والی کی طرح ہے، اب اگر یہ حیض میں مبتداء ہے یا حیض کی عادت کو بھول چکی ہے تو ہمیشہ احتیاط لازم ہے اور اگر حیض کی عادت یاد ہے تو اسکا حکم حیض کے وقت کو بھولنے والی اور مقدار کو یاد رکھنے والی کی طرح ہے، جس کا بیان گذر چکا ہے۔

نفاس کا خون درمیان میں رکے تو اس کی دو صورتیں ہونگی۔ (۱) کل مدت ۶۰ دن سے زائد نہ ہو، اس صورت میں دو خون کے درمیان انقطاع (خون نہ نکلنے) کی مدت اقل طہر (۱۵ دن رات) سے کم ہو، جیسے ایک دن خون آئے اور ایک دن رکے تو مکمل (خون نکلنے اور نہ نکلنے کی مدت) نفاس ہے۔

اور درمیانی انقطاع اقل طہر کے برابر ہو مثلاً ولادت کے بعد کئی روز خون آئے پھر ۱۵ دن سے زائد رک جائے، پھر دوبارہ شروع ہو جائے، تو یہ حیض کا خون ہے۔(اور درمیانی انقطاع کی مدت طہر ہے) ولادت کے بعد ۱۵ دن یا اس سے زائد خون نہ آئے پھر آنا شروع ہو جائے تو یہ حیض ہے گویا اسے نفاس آیا ہی نہیں۔اس صورت میں بعد میں آنے والا خون اقل حیض (ایک شب و روز) سے کم ہو تو وہ دمِ فساد ہے، اور آنے والا خون اکثر حیض (۱۵ دن رات) سے زائد ہو جائے تو پھر یہ مستحاضہ ہے جس کا تفصیلی حکم گذر چکا ہے۔

(۲) کل مدت ۶۰ دن سے آگے بڑھ جائے، اس صورت میں ۶۰ دن کے دوران انقطاع کی مدت ۱۵ دن رہی اور پھر آنے والا خون ۶۰ دن سے آگے بڑھ جائے تو یہ حیض ہے اور ۱۵ دن کی مدت سے کم رہی اور یہ عورت مبتداء ممیزہ ہے تو تمیز پر عمل کرے ممیزہ نہیں ہے تو مبتداء کے سابقہ حکم پر چلے۔معتادہ ہے تو عادت کی طرف رجوع کرے۔

ولادت کے بعد صفرہ و کدرۃ (زرد یا مٹیالے) رنگ کا خون ہو تو وہ بھی نفاس ہی ہے۔نفساء خون رکنے کے بعد غسل یا تیمم (جہاں تیمم کی گنجائش ہو) کرلے تو شوہر کیلئے فی الحال بغیر کراہت کے اس سے وطی (صحبت) کرنا جائز ہے۔

ولادت کے بعد صرف ایک گھڑی خون نظر آئے اور رک جائے تو اسے غسل کرنا لازم ہے اور اس سے وطی (صحبت) حلال ہے، لیکن پھر خون شروع ہونے کا اندیشہ ہے تو وطی سے توقف (رکنا) مستحب ہے۔

کتاب الصلوٰۃ (نماز کا بیان)

صلوٰۃ لغت میں دُعا کو کہتے ہیں۔

اور شرع میں نیت کے ساتھ تکبیر سے شروع کر کے سلام کے ساتھ مکمل کی جانے والی چند اقوال و افعال کے مجموعہ کا نام صلوٰۃ ہے۔جس میں مخصوص شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

اس میں سات ابواب ہیں۔

باب (۱) نماز کے اوقات کا ذکر

آیت: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَ قُرْآنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل ۷۸)

ترجمہ: آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں ادا کیا کیجئے (اس میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء آ گئیں) اور صبح کی نماز بھی (ادا کیا کیجئے)

ظہر: ظہر کا وقت زوال سے شروع ہوتا ہے۔

زوال: استواءِ شمس (سورج کا آسمان میں ٹھیک درمیان میں پہنچنا) کے بعد سایہ کا بڑھنا، یا استواء کے وقت سایہ نہ ہو تو بعد میں سایہ پیدا ہونا۔استواء کے وقت بالکل سایہ کا نہ ہونا سال کے سب سے طویل دن بعض علاقوں میں ہوتا ہے جیسے مکہ، صنعاء یمن، زوال کے وقت سایہ ہو تو اس سایہ کے علاوہ کسی کا سایہ اسی کے برابر ہوتے ہی ظہر کا وقت ختم ہو جائے گا۔مثال۔زوال کے وقت کسی ۵ فٹ طویل شخص کا سایہ ایک فٹ ہے تو جب سایہ ۶ فٹ (۱+۵) ہو جائے گا تو ظہر کا وقت ختم ہو جائے گا۔زوال کے وقت بالکل سایہ نہ ہو تو ۵ فٹ سایہ ہوتے ہی وقت ختم ہوگا۔مذکورہ ابتدائی اور انتہائی وقت کا درمیانی وقت وقتِ اختیاری ہے۔

عصر: ظہر کا وقت ختم ہوتے ہی عصر کا وقت شروع ہوگا۔اور سورج غروب ہونے تک باقی رہے گا۔عصر کے چار اوقات ہیں۔

(۱) وقت فضیلت، اوّل وقت ۔ (۲) اختیاری وقت دو مثل (دوگنا) سایہ ہونے تک (زوال کا سایہ چھوڑ کر) (۳) وقتِ جواز بلا کراہت، اختیاری وقت کے بعد سے سورج میں زردی آنے تک (۴) وقت کراہت۔ اصفرار (زردی) سے غروب تک۔

شرح مسلم اور تحقیق میں عصر کا پانچواں وقت بھی بیان کیا ہے۔ اور وہ ہے وقت عذر یعنی سفر یا بارش کی وجہ سے جمع تقدیم کر کے ظہر کے ساتھ پڑھ لینا۔ (حاشیۃ الروضہ ۲۹)

مغرب: سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اصل سورج کی ٹکیہ کا غروب ہو جانا ہے جو کہ کھلے میدانوں میں نظر آئے گا۔ بستی اور پہاڑ کی چوٹی میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ کہ سورج کی شعاعیں دیواروں پر نظر نہ آئے اور مشرق کی جانب سے تاریکی چھانا شروع ہو جائے۔ شفق احمر کے غائب ہونے تک مغرب کا وقت رہے گا۔ (شفق احمر یعنی غروب کے بعد مغرب کی سمت جو سرخی نظر آتی ہے) **حدیث:** شفق کے غائب ہونے تک مغرب کا وقت ہے۔ (مسلم عن عبد الله بن عمر)

عشاء: شفق احمر کے غائب ہوتے ہی عشاء کا وقت شروع ہوگا۔ جس علاقہ میں رات مختصر ہونے کی وجہ سے شفق غائب نہیں ہوتی وہاں سے قریب ترین علاقہ کے شفق کے غائب ہونے کا اعتبار کیا جائے گا۔ عشاء کا اختیاری وقت تہائی رات تک ہے۔ (شرح مسلم میں امام نوویؒ نے نصف رات تک لکھا ہے) اور جواز کا وقت صبح صادق تک ہے (یعنی صبح صادق سے پہلے کسی بھی وقت پڑھنا جائز ہے۔)

فجر: صبح صادق ہوتے ہی فجر کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اِسفار (روشنی پھیلنے) تک وقت اختیاری ہے اور سورج طلوع ہونے تک وقت جواز ہے۔ فجر کے چار اوقات ہونگے ۔ (۱) وقتِ فضیلت اول وقت (۲) وقتِ اختیاری ۔ اِسفار تک (۳) وقتِ جواز بلا کراہت ۔ سرخی آنے تک (۴) وقتِ کراہت ۔ سرخی سے سورج طلوع ہونے تک، جبکہ عذر نہ ہو۔

فجر کی نماز دن کی نمازوں میں شمار ہے۔ مغرب کی نماز کو عشاء اور عشاء کی نماز کو عَتَمَہ کہنا مکروہ ہے (کیونکہ اول کو بخاری شریف میں اور دوم کو مسلم شریف میں منع فرمایا ہے۔ مغنی المحتاج) فجر کی نماز کیلئے صبح یا فجر کا لفظ استعمال کرنا بہتر ہے۔ "صَلٰوۃُ الْغَدَاۃِ" کہنے کے مقابلہ یہ دونوں الفاظ اولیٰ ہیں۔ بغیر عذر کے عشاء سے قبل سونا اور عشاء کے بعد گفتگو کرنا مکروہ ہے (کیونکہ یہ دونوں آپ ﷺ ناپسند فرماتے تھے۔ (متفق علیہ) نیکی کی بات (جیسے قرآن وحدیث پڑھنا پڑھانا وغیرہ) مکروہ نہیں ہے۔ (جیسا کہ حاکم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔)

اگر وقت کے اندر جاگنے کا گمان نہ ہو تو سونا حرام ہے، وقت ہونے سے قبل سونا حرام نہیں، خواہ وقت میں نہ جاگنے کا گمان غالب ہو، کیونکہ یہ ابھی اس نماز کا مخاطب نہیں، وقت کے بعد نیند کے غلبہ سے بالکل مجبور ہو جائے اور ادائیگی کا پختہ ارادہ ہو تو (سونے میں) کوئی حرمت اور کراہت نہیں ہے۔ نیند کے اقسام (۱) غفلت کی نیند، ذکر کی مجلس میں سونا (۲) بدبختی کی نیند نماز کے وقت سونا (۳) لعنت کی نیند صبح کے وقت سونا (۴) عقوبت کی نیند فجر بعد سونا (۵) راحت کی نیند ظہر سے قبل سونا (۶) رحمت کی نیند عشاء کے بعد سونا (۷) حسرت کی نیند شب جمعہ سونا۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۱۷۴)

صَلٰوۃ الوسطیٰ: قرآن پاک میں جس صلوۃ الوسطیٰ کا خصوصی ذکر آیا ہے صحیح احادیث سے یہ عیاں ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔

احادیث: (۱) حدیثِ امامتِ جبرئیل علیہ السلام: آپ ﷺ نے فرمایا! حضرت جبرئیل نے بیت اللہ کے پاس دو مرتبہ (دو دن) میری امامت فرمائی (معراج سے تشریف آوری کے بعد) پس میرے ساتھ زوال کے وقت ظہر ادا کی جبکہ سایہ تسمے کے

برابر تھا اور عصر کی نماز اس وقت ادا کی جبکہ ہر شئی کا سایہ اس کے برابر ہوا، اور مغرب پڑھائی جبکہ روزہ دار نے افطار کیا، (افطار کے وقت) اور عشاء شفق غائب ہونے کے بعد پڑھائی، اور فجر اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار پر کھانا حرام ہو جائے (یعنی صبح صادق ہوتے ہی) پھر دوسرے دن سایہ مثل پر ظہر ادا فرمائی، اور دو مثل سایہ ہونے پر عصر پڑھائی، مغرب (کل کی طرح) افطار کے وقت پڑھائی اور عشاء تہائی رات تک (مؤخر کر کے) ادا کی اور فجر کو اسفار (روشنی اور اجالے) کے وقت ادا فرمایا، پھر میری جانب متوجہ ہو کر فرمایا اے محمد ﷺ یہ آپ سے قبل انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا وقت ہے۔ اور وقت ان دونوں کے درمیان ہے (یعنی پہلے اور دوسرے دن کے اوقات کا درمیانی وقت) (ابو داود۔ ترمذی)

(۲) جسے غروب سے قبل عصر کی ایک رکعت مل جائے وہ اپنی نماز مکمل کر لے اور طلوع سے قبل فجر کی ایک رکعت ملے تو وہ اپنی نماز مکمل کر لے (بخاری شریف)۔ (۳) فجر کی نماز کا وقت طلوع فجر (صبح صادق) سے طلوع آفتاب تک ہے۔ (مسلم)

فصل: نماز کا وقت شروع ہوتے ہی نماز واجب ہو جاتی ہے لیکن فوراً ادا کرنا ضروری نہیں، وقت ختم ہونے سے پہلے کبھی بھی ادا کرنا کافی ہے، (ایسے واجب کو واجب مُوَسَّع کہتے ہیں) وقت کے اندر مؤخر کرنے میں کوئی گناہ نہیں، بغیر عذر کے بھی مؤخر کرے اور دوران وقت مر جائے، تو اس تاخیر کی وجہ سے گنہگار نہ ہوگا (البتہ شرح مہذب اور تحقیق میں مؤخر کرنے کی صورت میں ادائیگی کے عزم اور ارادہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ (کما فی حاشیۃ الروضہ)

بعض نماز وقت میں اور بعض خارج میں ہو تو اسکا حکم

وقت کے اندر ایک رکعت یا زائد ادا ہو تو پوری نماز ادا شمار ہوگی، البتہ بغیر عذر کے اتنا مؤخر کرنا کہ نماز کا کچھ حصہ وقت سے باہر جائے جائز نہیں۔ اور ایک رکعت سے بھی کم وقت کے اندر ادا ہو تو پوری نماز قضاء شمار ہوگی۔

حدیث: جسے نماز کی ایک رکعت ملی اسے وہ نماز ملی (یعنی مکمل ادا شمار ہوگی اب بقیہ رکعتوں کو ادا کرے) (صحیحین)

ایسے وقت نماز شروع کرے کہ مکمل نماز وقت کے اندر ادا ہو سکتی ہے، لیکن طویل تلاوت کی وجہ سے وقت نکل گیا تو نہ گنہگار ہوگا اور نہ اس میں کراہت ہے (لیکن بعض فقہاء نے اس سے منع فرمایا ہے)

فصل۔ اوّل وقت کی فضیلت

آیت: "سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" (حدید ۲۱) **ترجمہ:** تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو۔ اول وقت نماز ادا کرنا افضل ہے۔ نماز کا وقت ہوتے ہی نماز کے اسباب میں مصروف ہو جائے، جیسے طہارت اذان وغیرہ، پھر نماز پڑھ لے تو اس سے اوّل وقت کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ اس فضیلت کیلئے ستر عورت کو وقت سے پہلے انجام دینا ضروری نہیں ہے۔ چند لقمے کھانا اور کچھ گفتگو کرنا وغیرہ جیسے معمولی اشغال سے یہ فضیلت فوت نہ ہوگی۔ عام عادت کے برخلاف ان امور کو جلد اور عجلت کے ساتھ انجام دینے کی ضرورت نہیں۔

تشریح: مقصود یہ بتانا ہے کہ اول وقت کی فضیلت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری تیاریاں پہلے ہی مکمل کر کے نماز کا وقت ہوتے ہی فوراً نماز شروع کرے، بلکہ متوسط طور پر مذکورہ امور وقت ہونے کے بعد انجام دے کر نماز ادا کرے تو بھی اسے اول وقت ہی سمجھیں گے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ ظہر کی نماز سخت گرمی میں (اول وقت) ادا کرتے اور عصر اس وقت ادا کرتے کہ سورج زندہ ہوتا (یعنی پوری طرح ضیا پاش رہتا) اور مغرب جبکہ سورج غروب ہو جاتا اور عشاء کی نماز لوگ کثیر ہوتے تو جلد پڑھاتے اور کم ہوتے تو تاخیر فرماتے اور فجر کی نماز غلس میں (یعنی اول وقت میں جبکہ رات کی تاریکی کا اثر باقی ہو) ادا کرتے۔ (متفق علیه)

(۲) حضرت رافع بن خدیج کا ارشاد ہے۔ ہم لوگ آپ ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ کر لوٹتے تو اپنے تیر کے گرنے کی جگہ نظر آتی تھی۔ (یعنی ابھی کافی روشنی باقی رہتی) (متفق علیه)

(۳) آپ ﷺ کی سحری اور نماز میں تقریباً ۵۰ آیتوں کی تلاوت کے بقدر فاصلہ ہوتا۔ (بخاری شریف)

(۴) حضرت رافع کا ارشاد ہے ہم آپ ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد اونٹ ذبح کرتے، پھر اس کے دس حصے کرتے پھر اسے پکا کر غروب آفتاب سے قبل کھاتے۔" (متفق علیه)

پانچوں نمازوں کو اول وقت پڑھنا افضل ہے، البتہ نماز ایسی مسجد (یا کسی اور جگہ) باجماعت ادا ہو جہاں لوگ دور سے چل کر آتے ہوں، تو گرمی کی شدت میں ظہر کی نماز میں ابراد سنت ہے۔

(ابراد کا مطلب کچھ تاخیر کر کے گرمی کی شدت کم ہونے کے بعد پڑھنا) اتنی تاخیر کرے کہ دیواروں کے سایہ میں نمازی چل کر مسجد پہنچ سکے" نصف اول سے زیادہ مؤخر نہ کرے، اگر جماعت میں شریک ہونے والے نمازیوں کے مکانات مسجد سے قریب ہوں یا کچھ حضرات کسی جگہ جمع ہیں، جہاں کوئی اور جماعت کیلئے نہیں آئے گا تو ابراد سنت نہیں ہے۔ اسی طرح مسجد میں پہنچنے کے لئے سایہ موجود ہو، یا گھر ہی میں نماز پڑھتا ہو، تو ابراد سنت نہیں ہے۔ صرف گرم علاقوں میں ابراد کیا جائے گا۔ جمعہ کی نماز میں ابراد نہیں کیا جائے گا۔

حدیث: جب شدید گرمی ہو تو (ظہر کی) نماز میں ابراد کرو (اسے نسبتاً ٹھنڈے وقت ادا کرو) (متفق علیه)

فصل ۔ وقت میں اشتباہ

بادل یا تاریکی میں قید ہونے یا اس طرح دیگر اسباب کی وجہ سے نماز کا وقت مشتبہ ہو تو اس کے لئے اجتہاد سے کام لے تدریس، اعمال اور وظیفہ جیسے امور سے صحیح انداز لگانے کی کوشش کرے۔

تشریح: کسی کو یہ اندازہ ہے کہ مغرب کے بعد بارہ رکعت پڑھنے تک شفق رہتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے تو اب کسی دن بادل کی وجہ سے شفق کا اندازہ نہ ہو تو وہ عادت کے مطابق بارہ رکعت پڑھ لینے کے بعد عشاء کے وقت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح دیگر اعمال سے اندازہ کر کے وقت کی تعین کرے گا۔ اگر مرغ صحیح وقت پر اذان دینے کا عادی ہے، تو اس کی اذان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ کئی مؤذن اذان دیں اور انکی کثرت کی وجہ سے گمان غالب ہو کہ وقت کی تعین میں غلطی نہیں کریں گے، تو ان کی اذان کا اعتبار کیا جائے گا۔ نابینا بھی بینا کی طرح اجتہاد سے کام لے۔ مذکورہ اجتہاد اس وقت کیا جائے گا جبکہ مشاہدہ کی روشنی میں وقت کی اطلاع دینے والا کوئی معتبر آدمی نہ ہو۔ اگر کوئی معتبر آدمی کہے کہ میں نے طلوع فجر ہوتے، یا شفق غروب ہوتے دیکھا ہے، تو اجتہاد کی گنجائش نہیں، بلکہ اس کی بات پر عمل کریں گے۔ لیکن اجتہاد سے بتائے، تو اس بینا شخص کو جو خود اجتہاد کر سکتا ہے اس کی تقلید جائز نہیں (یعنی وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرے، دوسرے کے اجتہاد کی پیروی جائز نہیں ہے) البتہ نابینا کیلئے جائز ہے نماز کے اوقات سے واقف مؤذن کی اذان کا اعتبار کیا جائیگا۔ جن صورتوں میں وقت کیلئے اجتہاد کرنا لازم ہے بغیر اجتہاد کے نماز پڑھے، اور وقت میں ادا ہو، تب بھی اس کا اعادہ لازم ہے۔ کوئی علامت اور دلالت وقت کے متعلق نہ ہو یا ہونے

کے باوجود غلبہ ظن حاصل نہ ہو، تو دل میں وقت ہونے کا غلبہ حاصل ہونے تک انتظار کرے۔ احتیاط یہ ہے کہ اتنا تاخیر کرے کہ اس سے زیادہ تاخیر کی صورت میں نماز قضاء ہوجانے کا گمان غالب ہو۔

دخول وقت کا یقین حاصل ہونے کا امکان ہونے کے باوجود اجتہاد کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ مُنَجِّم اپنے حساب سے دخول وقت کو جانتا ہے تو اپنی حد تک اس پر عمل کرسکتا ہے دوسرا اس کی پیروی نہیں کرے گا۔

جن صورتوں میں اجتہاد جائز ہے، اجتہاد کے ذریعے نماز پڑھنے کے بعد کچھ پتہ نہ چلا (کہ نماز وقت میں ہوئی تھی یا آگے پیچھے) تو اس پر کچھ لازم نہیں ہے۔ (نماز دہرانے وغیرہ کی ضرورت نہیں) بعد میں معلوم ہو کہ نماز وقت کے اندر یا وقت کے بعد واقع ہوئی تھی تو قضاء کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بعد میں واقع ہوئی ہے تو وہ قضا شمار ہوگی۔

لیکن وقت سے پہلے نماز ادا ہوچکی ہو تو اسکا اعادہ لازم ہے، خواہ وقت کے اندر معلوم ہو یا بعد میں، کسی نے اسے مشاہدہ اور علم کی بنیاد پر وقت سے پہلے نماز ہونے کی خبر دی تو اعادہ واجب ہے، اور اجتہاد کے ذریعے خبر دی ہے، تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔

فصل ۔ نماز کے وجوب سے مانع اسباب

درج ذیل اسباب ہوں تو نماز واجب نہ ہوگی۔

بچپن (نابالغ ہونا) کفر، جنوں، بے ہوشی، حیض، نفاس، ان کو مانع کہتے ہیں۔

احادیث: (۱) ایک حدیث کے ضمن میں آپ ﷺ نے عورتوں کے دینی نقصان کی وضاحت یوں فرمائی: کیا وہ حیض کی حالت میں نماز روزہ نہیں چھوڑتی۔ (متفق علیه)

(۲) حضرت عائشہ کا ارشاد ہے: ہم کو (ایام حیض کے) روزوں کی قضاء کا حکم تھا، نماز کی قضاء کا حکم نہیں تھا (متفق علیه)

(۳) تین لوگ مرفوع القلم ہیں (یعنی غیر مکلف ہیں ان پر گناہ لکھا نہ جائیگا) بچہ، بالغ، ہونے تک، سونے والا بیدار ہونے تک، اور پاگل، پاگل پن ختم ہونے تک (احمد ابو داود نسائی ، ابن ماجه)

ان اسباب کی تین حالتیں ہوں گی۔ (۱) وقت کے ابتداء میں سبب پایا جائے، اور آخر میں نہ پایا جائے، جیسے کوئی عورت نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے حیض یا نفاس سے پاک ہوجائے اس صورت میں اتنا وقت بھی باقی ہو جسمیں صرف تکبیر تحریمہ کہہ سکے، تو یہ نماز اس پر فرض ہوجائے گی۔ لیکن یہ شرط ہے کہ مانع اتنی دیر تک دوبارہ نہ پایا جائے جس میں طہارت حاصل کر کے وہ نمازہ پڑھی جاسکے۔ اتنی مدت سے پہلے ہی مانع لوٹ آئے تو نماز واجب نہ ہوگی۔

مثال: عصر کی نماز کے آخری وقت کوئی بچہ بالغ ہوا، پھر پاگل ہوا یا پاگل اچھا ہوا، پھر دوبارہ پاگل پن کا دورہ پڑا، یا عورت پاک ہوئی پھر پاگل ہوئی، یا پاگل عورت اچھی ہوئی، پھر حیض شروع ہوا تو درمیانی سلامتی کی مدت اتنی ہو کہ اسمیں طہارت اور چار رکعات ادا ہو سکتے ہیں تو عصر کی نماز واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

فجر، ظہر یا عشاء میں یہ صورت پیش آئے تو صرف وہی نماز واجب ہوگی۔ اگر عصر کے وقت یہ صورت پیش آئے تو عصر کے ساتھ ظہر بھی اور عشاء میں پیش آئے تو عشاء کے ساتھ مغرب بھی واجب ہوگی۔

حدیث: حائضہ عورت طلوع فجر سے ایک رکعت (کی ادائیگی کے بقدر) پہلے پاک ہوجائے تو اس پر مغرب اور عشاء دونوں

لازم ہیں اور غروب آفتاب سے قبل پاک ہوجائے تو ظہر اور عصر دونوں پڑھے گی (اثرم ، بیھقی فی المعرفه)(تلخیص ۱ /۲۰۳)

بچہ فرض نماز پڑھنے کے بعد وقت ختم ہونے سے پہلے بالغ ہوجائے تو دوبارہ اس نماز کو پڑھنا مستحب ہے۔ نماز کے دوران عمر کے اعتبار سے بالغ ہوجائے، اس نماز کو مکمل کرنا واجب ہے، اور اعادہ مستحب ہے۔

(۲) اول وقت اعذار مذکورہ نہ ہوں، پھر حیض نفاس جنون اور بے ہوشی میں سے کوئی عذر طاری ہوجائے، وقت ہونے کے بعد مختصر ترین انداز میں متعلقہ نماز کی ادائیگی کے بقدر وقت گذرنے کے بعد حیض شروع ہوجائے تو پاک ہونے کے بعد اس نماز کی قضاء واجب ہے۔

کسی نے طویل نماز شروع کی اور نماز پوری ہونے سے پہلے حیض شروع ہوگیا اور اتنا وقت نماز کا گذر چکا ہے کہ مختصر پڑھنے کی صورت میں مکمل نماز ل جاتی تو اس نماز کی قضاء واجب ہے۔

مسافر پر قصر والی نماز کے دو رکعت کی مقدار وقت گذرنے کے بعد جنون یا بے ہوشی طاری ہو تو اس نماز کی قضاء ضروری ہے۔

تشریح: ظہر، عصر یا عشاء میں اوپر کی صورت میں مسافر کے حق میں ۴ رکعات کا لحاظ نہیں کریں گے، چونکہ وہ قصر کر کے دو رکعت پڑھ سکتا ہے، اس لئے ابتداء میں مختصر دو رکعت کا وقت بھی مل جائے تو قضاء لازم ہے۔ جن لوگوں کو وقت ہونے کے بعد طہارت حاصل کرنا ضروری ہے، جیسے تیمم کرنے والا، مستحاضہ وغیرہ ان کے حق میں طہارت کا وقت بھی ملنا ضروری ہے۔ (صرف بقدر نماز وقت ملنے سے ان پر قضاء لازم نہ ہوگی۔) دیگر حضرات کے حق میں طہارت کے وقت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ابتداء میں مختصراً اس نماز کو ادا کرنے کی مدت سے بھی پہلے مانع آجائے تو قضاء لازم نہیں۔

ظہر کا وقت ملنے سے عصر، اور مغرب کا وقت ملنے سے عشاء کی نماز واجب نہیں ہے۔ مذکورہ نماز کے وجوب کا حکم صرف ابتداء کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ درمیان میں کسی بھی وقت اتنی مہلت مل جائے کہ وہ نماز ادا ہوسکتی تھی تو وہ لازم ہوجائے گی، جیسے پاگل کو وقت کے دوران افاقہ ہوا اور پھر وقت میں پاگل پن لوٹ آئے، یا بچہ بالغ ہوجائے، اور پھر مجنون ہوجائے، یا مجنونہ کو افاقہ ہوا اور پھر حیض شروع ہو جائے (ان صورتوں میں درمیانی سلامتی کی مدت میں مختصراً نماز کی ادائیگی کی گنجائش تھی اور ادا نہ کی گئی تو بعد میں عذر ختم ہونے کے بعد اس کی قضاء لازم ہے۔)

جس طرح عصر کا آخری وقت ملنے سے ظہر بھی فرض ہوجاتی ہے اسی طرح عصر کا ابتدائی وقت ملنے سے بھی ظہر فرض ہوگی۔ جیسے کوئی بے ہوش، عصر کا اتنا وقت جس میں ظہر اور عصر کے ادائیگی کی گنجائش ہو گذرنے کے بعد افاقہ پائے۔

(۳) مکمل وقت سبب پایا جائے۔

حیض و نفاس کی وجہ سے نہ نماز واجب ہوگی اور نہ جائز ہے۔ بعد میں قضاء بھی نہیں کی جائے گی۔ کافر اصلی۔ (جو ابتداء سے کافر ہو کبھی مسلمان نہ رہا ہو) نماز اور دیگر شرعی فروعات کا مکلف ہے، لیکن اسلام لے آئے تو ایام کفر کے نماز وغیرہ کی قضاء اس پر واجب نہیں ہے۔

تشریح: جس طرح کافر پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح نماز، روزہ وغیرہ فرائض بھی لازم ہیں، لیکن بغیر اسلام لائے ان کی ادائیگی معتبر نہ ہوگی۔ اب کوئی کافر ہی مرتا ہے تو اس کو کفر کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ کے ترک پر بھی عذاب ہوگا اور مرنے سے قبل کبھی بھی اسلام لے آئے تو قرآن و حدیث کی رو سے سابقہ سارے گناہ ختم ہوجاتے ہیں، کفر کے ایام کی نمازوں وغیرہ کو قضاء کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مرتد (جو اسلام سے پھر جائے اس) پر ردّت کے ایام کے نمازوں کی قضاء واجب ہے۔

نابالغ بچہ پر نہ نماز ادا کرنا واجب ہے اور نہ اس کی قضاء۔ جن لوگوں پر نماز فرض نہیں، ان کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا جائے گا، سوائے نابالغ لڑکے اور لڑکی کے، بچہ جب سات سال کا ہو جائے اور باشعور ہو تو اسے نماز کا حکم دیا جائے گا، اور دس سال کا ہونے کے بعد نماز کی پابندی نہ کرے تو اسے مار لگائی جائے۔

حدیث : بچوں کی عمر سات سال ہو جائے تو ان کو نماز کا حکم دو، اور دس سال کی ہو جائے تو نماز (کے چھوڑنے) پر ان کو مار لگاؤ۔(ابو داود ، صححه في المجموع ، ترمذی،حاکم ، دار قطنی ۔ تلخیص ۱ / ۹۵)

مذکورہ تنبیہ اور مار سرپرست (باپ، دادا، یا وصی۔) پر واجب ہے (فتح الوهاب ۱ / ۳۲) علماء کرام نے کہا ہے کہ والدین پر بچہ سات سال کا ہونے کے بعد اسے طہارت، نماز اور دیگر شرعی باتوں کی تعلیم دینا واجب ہے اور دس سال کا ہونے کے بعد کوتاہی کی صورت میں مارنا واجب ہے، اگر روزہ کی طاقت ہے تو اس کا حکم بھی نماز کی طرح ہے۔

تشریح : سات سال کی عمر میں روزہ کی طاقت ہے تو رکھنے کا حکم دیں گے۔ دس سال ہونے پر باوجود طاقت کے نہ رکھے تو سزا دیں گے۔ اگر بچہ کا اپنا مال ہے (وراثت یا ہبہ وغیرہ طریقے سے ملا ہوا) تو فرائض اور دیگر شرعی تعلیم کی اجرت اسی مال سے دی جائے گی۔ (یعنی والدین کو اپنے جیب سے دینا ضروری نہیں، خوشی سے دیں تو کوئی حرج بھی نہیں) بچہ کا اپنا کچھ مال نہ ہو (جیسے عموماً ہوتا ہے) تو والد کے ذمہ ہے، وہ نہ ہو تو پھر والدہ کے ذمہ اجرت ہوگی۔

جنون کی وجہ سے کسی کی عقل زائل ہو جائے یا بے ہوش ہو اور نماز کا وقت اس میں گذر جائے تو اس پر نماز واجب نہ ہوگی اور نہ بعد میں قضاء واجب ہوگی۔ کسی حرام سبب سے عقل زائل ہو، جیسے شراب پینا یا عقل کو زائل کرنے والی کوئی دوا استعمال کرنا تو قضاء واجب ہے، جبکہ بغیر حاجت کے دوا استعمال کرے اور یہ جانتا ہو کہ وہ دوا عقل کو زائل کرے گی اور شراب جان بوجھ کر پی ہو۔ اگر حاجت کی وجہ سے، یا لاعلمی میں اس طرح ہو جائے تو قضاء واجب نہیں ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہ شراب اور نشہ لانے والی چیز ہے لیکن جتنی مقدار استعمال کر رہا ہے اس کے متعلق یہ گمان ہے کہ اس سے نشہ نہ آئے گا، لیکن آ گیا تو نماز کی قضاء واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ اس کی صریح غلطی ہے۔

کہیں سے کسی ضرورت سے کود پڑا، جس سے عقل زائل ہوئی، تو نماز کی قضاء لازم نہیں، لیکن یہ حرکت فضول اور بلا وجہ کی تھی تو قضاء واجب ہے۔

مرتد ہونے کے بعد پاگل ہو جائے، پھر اچھا ہونے کے بعد دوبارہ اسلام لے آئے تو اس صورت میں پاگل پن کے نمازوں کی بھی قضاء لازم ہے، اس کے ارتداد کی وجہ سے یہ سخت حکم اس پر لگایا جائے گا۔ شراب پی کے نشہ آنیکے بعد پاگل ہو جائے تو پاگل پن کے نماز کی قضاء لازم نہیں ہے اس کے علاوہ نشہ کی مدت کی قضاء لازم ہے۔ عورت پر ارتداد یا نشہ کے ایام میں حیض کی نمازوں کی قضاء لازم نہیں ہے۔

کسی دوا کے استعمال سے حیض آئے یا بچہ ساقط ہو جائے اور نفاس آئے، تو ان ایام کے نمازوں کی قضاء واجب نہیں ہے، اس لئے کہ حیض و نفاس میں نماز ترک کرنا عزیمت ہے۔ (رخصت نہیں ہے۔)

مکروہ اوقات کا بیان

مکروہ اوقات پانچ ھیں۔

پانچ کا عدد اصلی اوقات کے اعتبار سے ہے ورنہ اقامتِ جماعت کے وقت اور خطیب کے خطبہ کیلئے چڑھنے کے وقت بھی نفل مکروہ

ہے۔(حاشية الروضه)

(۱) سورج طلوع ہوتے وقت یہاں تک کہ ایک نیزہ کے برابر بلند ہو جائے (یعنی ظاہری نظر میں تقریباً ۷ ہاتھ کی مقدار بلندی ہونے تک)

(۲) استواءِ شمس کے وقت (سورج کے آسمان میں ٹھیک درمیان میں پہنچنے کے وقت)

(۳) شام کو سورج میں زردی آنے کے وقت سے مکمل غروب ہونے تک۔

(۴) فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے تک۔

(۵) عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ فجر (کی نماز) کے بعد سورج طلوع ہونے تک نماز نہیں اور عصر کے بعد غروب تک نماز نہیں۔(متفق عليه عن ابی سعید الخدریؓ)

آخری دونوں وقت میں اگر فجر اور عصر کو اول وقت ادا کرے تو کراہت کی مدت بڑھ جائے گی، اور مؤخر کرے تو کم ہو جائے گی۔

مذکورہ اوقات میں صرف وہ نماز مکروہ ہے، جس کا کوئی سبب نہ ہو، جیسے نفل مطلق۔ جس نماز کا سبب پہلے یا مقارن (نماز کے ساتھ ساتھ) پایا جائے، وہ ان اوقات میں مکروہ نہیں ہے۔ (کیونکہ آپ ﷺ کی ظہر کی دو رکعت سنت فوت ہوئی تو آپ ﷺ نے اسے عصر بعد پڑھی۔(بخاری شریف و مسلم) سبب والی نمازوں میں قضاء نماز داخل ہے۔ ان اوقات میں فرائض وسنن اور وہ نفل جن کو بطور وظیفہ پابندی سے پڑھتا ہو ان کی قضاء جائز ہے۔ (ایک صحابی نے سنت فجر کو فجر کے بعد ادا فرمایا تو آپ ﷺ نے اس کی تصویب فرمائی۔ ترمذی، ابوداود)

اسی طرح نماز جنازہ، سجدہ تلاوت، سجدۂ شکر، طواف کی سنت اور سورج گہن کی نماز ان اوقات میں جائز ہے۔ ان اوقات میں وضو کرلے تو سنت وضو کی دو رکعت پڑھ سکتا ہے۔ استسقاء کی نماز ان اوقات میں پڑھ سکتا ہے۔ احرام کی دو رکعت سنت ان اوقات میں مکروہ ہے، اعتکاف، درس، انتظار نماز وغیرہ کسی سبب سے کوئی ان اوقات میں مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد مکروہ نہیں ہے۔ دوسرے کسی حاجت کے بغیر صرف تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنے کے ارادے سے مکروہ اوقات میں مسجد میں داخل وہ تو تحیۃ المسجد پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ کسی قضاء نماز کو عمداً ان اوقات میں قضاء کرنے کیلئے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔ کسی سنت کو ان اوقات میں قضاء کر لیا تو بعد میں ہمیشہ اس سنت کو ان اوقات میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

تشریح: مثلاً ظہر کی سنت چھوٹ گئی جسے عصر کے بعد قضاء کر لیا تو اب روزانہ عصر کے بعد چار رکعات پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ آئندہ بھی اگر اس طرح قضاء ہو تو اس کی تلافی میں کوئی حرج نہیں، بغیر قضاء ہوئے آئندہ کیلئے مستقل عادت بنانا ممنوع بتایا جا رہا ہے۔

مذکورہ مکروہ اوقات میں بعض وقت اور مقام کے اعتبار سے کچھ استثناء بھی ہے۔

وقت: جمعہ کے دن استواء کے وقت کسی کیلئے بھی نفل مکروہ نہیں ہے۔

دلیل: آپ ﷺ نے نصف النہار کے وقت نماز سے منع فرمایا بجز یوم جمعہ کے (الشافعی، بیہقی) امام شافعیؒ نے ثعلبہ سے روایت پیش کی ہے۔ کہ صحابہ کرام عموماً بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز پڑھا کرتے۔ بخاری وغیرہ کی روایت میں امام کے خطبہ تک نماز میں مشغول رہنے کا ذکر ہے ابوداود کی ایک مرسل روایت میں جمعہ کے استثناء کا یہ سبب بتایا کہ اس روز استواء کے وقت جہنم بھڑکائی

نہیں جاتی۔(تلخیص الحبیر ۱/ ۲۰۰)

مقام : مکہ مکرمہ اور اس کے حرم میں کسی بھی وقت کوئی نماز مکروہ نہیں، طواف کی نماز ہو یا کوئی اور نماز۔

حدیث: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے بنی عبد مناف! تم میں سے کوئی لوگوں کے کسی بھی معاملہ کا ذمہ دار بنے تو ہرگز کسی کو دن رات کی کسی بھی گھڑی میں کعبہ کے طواف اور (وہاں) نماز سے نہ روکے۔(رواہ الشافعی، والاربعہ قال الترمذی حسن صحیح رواہ ابن حبان والحاکم و قال صحیح علی شرط مسلم)

کراہت کے باوجود کوئی نماز شروع کرے تو منعقد ہی نہ ہوگی۔ جیسے عید کے دن روزہ، ان اوقات میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو نذر منعقد ہی نہ ہوگی۔ مطلق نماز کی نذر مانی (ان اوقات میں پڑھنے کی نہیں) تو ایسی منذورہ نماز کو ان اوقات میں پڑھ سکتے ہیں اس لئے کہ سبب (یعنی نذر) پایا گیا۔ ان اوقات میں جو کراہت ہے وہ تحریمی کراہت ہے۔

حدیث : (۱) آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی تحری (جستجو) کر کے (قصداً) طلوع شمس اور غروب شمس کے وقت نماز نہ پڑھے۔(بخاری و مسلم عن ابن عمرؓ)

(۲) فجر کی نماز کے بعد سورج بلند ہونے تک اور عصر کے بعد سورج غروب ہونے تک نماز (پڑھنی) نہیں ہے۔(متفق علیہ عن ابی سعید الخدریؓ)

باب (۲) اذان

احادیث ۔ (۱) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان اور صف اول میں کیا (فضیلت اور ثواب) ہے پھر بغیر قرعہ اندازی کے اسے حاصل نہ کر سکیں، تو قرعہ اندازی کریں" (رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ)

(۲) ارشاد نبوی ﷺ ہے۔ اذان دی جاتی ہے "تو شیطان گوز مارتا ہوا (ہوا چھوڑتا ہوا) بھاگ جاتا ہے تاکہ اسے اذان سنائی نہ دے۔(رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ "قیامت کے دن مؤذن کی گردن سب سے اونچی ہوگی"۔(رواہ مسلم عن معاویہؓ)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مؤذن کی آواز جس جن یا انسان یا چیز تک پہنچتی ہے، وہ قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دے کر رہے گا" (رواہ البخاری عن ابی سعید الخدریؓ)(من الاذکار ص ۳۵)

اذان اور اقامت سنت ہیں پنج وقتہ فرائض میں سے کسی بھی نماز کی مردوں کی پہلی جماعت کیلئے اذان بالاتفاق مشروع ہے۔ بستی میں یا جنگل میں منفرد (اکیلے نماز پڑھنے والا) کیلئے اذان و اقامت سنت ہے۔

کسی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھ کر نمازیوں کے جانے کے بعد کسی کو نماز پڑھنی ہو تو بلند آواز سے اذان نہ دے تاکہ اوروں کو غلط فہمی نہ ہو، ورنہ بلند آواز سے دے سکتا ہے۔

جماعت ثانی : کسی مسجد میں جماعت ہونے کے بعد چند لوگ آئیں اور اس مسجد میں کوئی امام راتب (پابندی کے ساتھ امامت کیلئے متعین شخص) نہ ہو، تو ان حضرات کو جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ اور اگر امام راتب موجود ہے۔ تو بعد میں پھر جماعت کرنا مکروہ ہے، جبکہ غیر مطروق مسجد ہو، اگر مسجد مطروق ہو تو مکروہ نہیں۔(حاشیۃ الروضہ)

مسجد میں دوبارہ مکروہ، یا غیر مکروہ جماعت ہو، تو اس کے لئے اذان مسنون ہے، لیکن بلند آواز سے نہیں دیں گے، تاکہ اوروں کو اشتباہ نہ ہو، چاہے مسجد مطروق ہو یا غیر مطروق، اگر بلند آواز سے دے تو خلاف اولیٰ ہے۔

تنہا عورت کیلئے اور عورتوں کی جماعت کیلئے صرف اقامت مستحب ہے، اذان مستحب نہیں ہے، اگر عورت ذکر کی نیت سے عورتوں کی جماعت کیلئے اتنی آواز سے اذان دے کہ صرف عورتیں سن سکیں، تو یہ مکروہ نہیں ہے، اور نہ مستحب ہے اگر شرعی اذان کی نیت سے دے یا بلند آواز سے دے تو حرام ہے۔(جمل ۱/ ۲۹۹)

نومولود کے کان میں عورت کا اذان دینا کافی ہے (بغیۃ ص ۳۷) پنجوقتہ فرائض کے علاوہ کسی بھی نماز کیلئے اذان اور اقامت مشروع نہیں ہے۔ منذورہ ہو یا سنت، جماعت سے پڑھی جانے والی نماز ہو جیسے عیدین، کسوفین اور استسقاء، یا بغیر جماعت کے جیسے ضحیٰ (چاشت)، البتہ عید، کسوف (سورج گہن) اور استسقاء (پانی مانگنے) کی نماز کیلئے'' الصلاۃ جامعۃ '' کہہ کر آواز دیں گے۔(کسوف کیلئے اس طرح اعلان صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔) اسی طرح تراویح کی نماز جماعت سے ہو رہی ہو تو اس کے لئے بھی الصلاۃ جامعۃ کہہ کر پکارا جائے گا۔ لیکن جنازہ کی نماز کیلئے اس طرح پکارنا مستحب نہیں ہے۔ فرض نماز کی قضاء کیلئے بھی اذان و اقامت مستحب ہے۔

مسلسل کئی قضاء نمازیں پڑھے، تو صرف پہلی نماز کیلئے اذان کہے اور اقامت ہر نماز کیلئے پڑھے۔

پہلے ادا نماز اور اس کے بعد قضاء پڑھے تو اذان صرف ادا کیلئے دے اقامت دونوں میں کہے گا۔ اس کے برعکس پہلے قضا اور پھر ادا پڑھے تو قضاء کیلئے اذان و اقامت دے، ادا کیلئے اذان نہ دے، صرف اقامت کہے لیکن دونوں میں زیادہ فاصلہ ہو جائے تو ادا کیلئے بھی اذان دے۔

سفر یا بارش کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کرے تو جمع تقدیم ہو یا تاخیر پہلی نماز کیلئے اذان اور دونوں کیلئے اقامت کہے۔

شیخین کی روایت میں حضرت جابرؓ سے مزدلفہ میں آپ ﷺ کا مغرب و عشاء کو ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھنے کا ذکر موجود ہے۔

قضاء نماز کی اذان کے بعد ادا کا وقت شروع ہو تو ادا کیلئے بھی اذان دے گا۔ ایک ادا نماز کو بالکل آخری وقت پڑھے، پھر دوسری نماز کو اول وقت پڑھے تو دوسری نماز کیلئے بھی اذان مستحب ہے۔

فصل: اذان کی صفت

(۱) اذان کے اکثر کلمات دوہرے اور اقامت کے اکہرے ہیں۔ اذان کے ابتداء میں تکبیر چار مرتبہ اور آخر میں '' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ '' ایک مرتبہ ہے۔ اقامت میں اول و آخر تکبیر، اور اقامت کے الفاظ (قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃِ) دو دو مرتبہ ہیں۔

(۲) اذان کو ٹھہر ٹھہر کر واضح انداز میں ادا کرنا مستحب ہے۔ اقامت کو بغیر فاصلہ کے جلد پڑھنا مستحب ہے۔

(۳) **ترجیع** ۔ اذان میں ترجیع سنت ہے۔(مسلم، ابوداود اور ترمذی وغیرہ میں اسکا ثبوت ہے۔) یعنی ابتداء میں چار مرتبہ تکبیر کہنے کے بعد پہلے دو مرتبہ "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ "پھر دو مرتبہ" اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰـهِ" پست آواز میں کہت (پست آواز سے مراد یہ ہے کہ اس کے قریب والے سن سکیں یا متوسط رقبہ کی مسجد ہو اور مسجد میں اذان دے تو اہل مسجد سن سکیں۔

(جمل ۱/ ۳۰۵) پھردوبارہ" اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "دومرتبہ" اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ"دومرتبہ بلندآواز سے دیگر کلمات کی طرح ادا کرے، پھرآگے بڑھے۔(خلاصہ یہ کے پہلے شھادتین کو دودومرتبہ پست آواز سے پھراسی طرح بلندآواز سے ادا کرے۔)ترجیع کے بغیر بھی اذان درست ہے۔اگر پہلے پست آواز میں شھادتیں کوادا کرے،تو بلندآواز سے ادا کرنے کے بعد ادا کرے۔(حاشیۃ الجمل ۱/ ۳۰۴)

(۴) **تثویب:** تثویب سنت ہے(ابوداود وغیرہ میں اچھی سند سے مروی ہے)یعنی فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعددو مرتبہ" اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌمِّنَ النَّوْمِ "(نماز نیند سے بہتر ہے)کہنا،فجر میں دواذان کہےتو دونوں میں تثویب مسنون ہے۔تثویب کے بغیر بھی اذان ہوجائے گی۔

(۵)اذان واقامت قبلہ روکھڑے ہوکر دینا سنت ہے،بغیرعذر کےاس کی خلاف ورزی کرےتواذان واقامت صحیح ہے،لیکن مکروہ ہے،مسافر سواری پراذان دےتو کوئی حرج نہیں۔لیٹ کراذان دینا بیٹھ کردینے سے بھی شدید مکروہ ہے۔

(۶)**حَیْعَلَتَیْنِ** (حَيّ عَلَى الصَّلَاة اور حَيّ عَلَى الْفَلَاحِ)میں سرپھیرنا سنت ہے۔" اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ" کہنے کے بعد دائیں طرف سرپھیرکردومرتبہ حَيّ عَلَى الصَّلَاة کہے،پھربائیں طرف پھیرکردومرتبہ حَيّ عَلَى الْفَلَاح کہے،سینہ کو قبلہ کے رخ سے نہ ہٹائے،اورقدموں کوبھی اپنی جگہ رکھے۔اقامت میں بھی حَيّ عَلَى الصَّلَاة کےوقت دائیں طرف اورحَيّ عَلَى الْفَلَاح کےوقت بائیں طرف رخ کرنا سنت ہے۔

(۷)بہتر یہ ہے کہ بغیرزیادہ مشقت کے ممکنہ حدتک بلندآواز سے اذان دے،صرف اپنی نماز کیلئے اذان دے رہاہےتو اتنی آہستہ آواز میں دینا بھی کافی ہے،کہ صرف خودسن سکےاور جماعت کیلئے اذان دے رہاہےتو آہستہ دینا کافی نہیں ہےاسی طرح اقامت بھی آہستہ ناکافی ہے۔البتہ اذان کے مقابلے میں اقامت میں آواز کچھ پست رکھے۔

(۸)اذان کے الفاظ میں ترتیب شرط ہےاس کے بغیراذان صحیح نہ ہوگی، لیکن ترتیب والےکلمات پربناء کرسکتا ہے۔

تشریح : کسی نے پہلے" اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا الله " کوادا کیا پھرتکبیرکوتو تکبیر کا تواعتبار ہوگا،شھادت کانہیں اب تکبیر کے آگے کےکلمات کوترتیب سے ادا کرے۔اذان کے دوران کچھ الفاظ چھوٹ جائیں توان الفاظ کوادا کر کے بعد کے الفاظ کا پھراعادہ کرے۔

تشریح : مثلاًکسی نےاذان دی اور"حَيّ عَلَى الصَّلَاة "چھوٹ گیاتو"حَيّ عَلَى الصَّلَاة "ادا کرکےآگے کےبھی سارےالفاظ لوٹانے پڑیں گے۔

(۹)اذان کے الفاظ کے درمیان تسلسل ہونا چاہیے۔دوران اذان تھوڑی دیرچپ رہایامعمولی کلام کرلیاتو اذان باطل نہ ہوگی۔زیادہ دیرچپ رہایازیادہ بات کی تواذان باطل ہوگی۔اذان کے دوران نیندیابےہوشی طاری ہواورجلدہی ختم ہوجائےتو حرج نہیں(لیکن از سرنواعادہ بہتر ہے۔اعانۃ)اورزیادہ دیرطاری رہے،تواس اذان کااعتبارنہیں۔

مؤذن کواذان کے دوران بالکل ہی کچھ نہ کہنا مستحب ہے،اگرچھینک آئےتودل میں" اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ " پڑھ لے،اگراذان کے دوران مؤذن کوکسی نے سلام کیاتو مستحب یہ ہے کہ اذان مکمل ہونے تک جواب نہ دےاسی طرح کسی نے چھینک کر" اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ "کہاتو اذان مکمل ہونے تک اس کو"یَرْحَمُكَ اللّٰہِ "نہ کہے۔لیکن کسی نے جواب دیایاکسی مصلحت سے بات کی تو مکروہ نہیں ہےاستحباب کے خلاف ہے۔

کسی نابینا کے کنویں میں گرنے کا اندیشہ ہو (یا اس طرح کی کوئی اور ضروری بات ہو) تو اذان میں ہی اسے متنبہ کرنا واجب ہے۔

اذان دینے کے بعد کوئی اسلام سے پھرے، پھر اسلام لاکر اقامت کہے تو جائز ہے۔ لیکن مستحب یہ ہے کہ اس کی اذان واقامت سے نماز نہ پڑھے۔ بلکہ دوسرا کوئی اذان واقامت کو دوہرائے، اس لئے کہ اس کی ردت اس کے متعلق شبہ پیدا کرتی ہے۔ دوران اذان کوئی مرتد ہو، تو وہ اس پر بناء نہیں کرسکتا۔ اگر پھر اسلام لے آئے، اور زیادہ فاصلہ نہ ہوا ہو، تو بناء کی گنجائش ہے۔

فصل مؤذن کی صفت

مؤذن کا مسلمان، عاقل اور مذکر ہونا شرط ہے کوئی (کافر) اذان میں شہادتین کو ادا کرے تو اسے مسلمان سمجھیں گے (اب یہ شخص دوبارہ اذان دے تو اس اذان کا اعتبار ہوگا۔) (مغنی) لیکن عیسویہ فرقہ کا ہو تو اس سے اس کے اسلام کا فیصلہ نہیں دیا جائیگا۔ (عیسویہ یہودیوں کا ایک فرقہ ہے، جو ابوعیسی اسحٰق بن یعقوب اصبہانی کی طرف منسوب ہے جس کا یہ اعتقاد ہے کہ آپ ﷺ صرف عرب کیلئے مبعوث ہوئے ہیں۔ (مغنی) جو نشہ میں ہو اس کی اذان درست نہیں ہے، نشہ کی ابتدائی کیفیت میں اذان درست ہے۔ مردوں کیلئے عورت اور خنثی کی اذان معتبر نہ ہوگی۔ ممیز بچہ کی اذان صحیح ہے۔ البتہ نابالغ اور فاسق کی اذان مکروہ ہے۔

آداب

مستحب ہے کہ باوضو اذان دے۔ (ترمذی، دارقطنی، بیھقی) اگر بے وضو یا جنبی نے اذان دی تو مکروہ ہے، جنابت کی صورت میں کراہت شدید ہے اور اقامت میں اذان سے بھی بڑھ کر کراہت ہے۔ مستحب ہے کہ مؤذن بلند اور شیریں آواز ہو۔ منارہ یا چھت جیسی کسی بلند جگہ کھڑے ہو کر اذان دے، اور دونوں شہادت کی انگلی کا سرا دونوں کان کے سوراخ میں داخل کرے۔ مؤذن عادل اور معتبر شخص ہو۔ آپ ﷺ نے یا کسی صحابی نے جن کو مؤذن کا رتبہ دیا ان کی اولاد میں جو عادل اور مؤذن کیلئے مناسب ہوں، ان کو ترجیح دی جائے، موذن اور اذان سننے والے، اذان کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں درود پاک بھیجیں، پھر یہ دعا پڑھیں۔ "اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ ا الْوَسِیْلَةَ وَالْفَضِیْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَ عَدْتَّهٗ"

(اے اللہ: اس پوری پکار کے رب اور قائم ہونے والی نماز کے رب، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ عطا فرما اور ان کو فضیلت عطا فرما۔ اور ان کو مقام محمود پر پہنچا، جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔) (بخاری۔ مسلم)

سنت ہے کہ اذان سننے والا ہر شخص اذان کا جواب دے (مسلم شریف) جنبی یا حائضہ ہی کیوں نہ ہو۔ پوری اذان اور اقامت میں جیسے مؤذن کہتا ہے خود بھی کہے، لیکن حیعلتین (حی علی الصلوٰة اور حی علی الفلاح) کے جواب میں "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ" کہے (مسلم) "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةِ" کے جواب میں "اَقَامَھَا اللّٰہُ وَ اَدَامَھَا وَ جَعَلَنِی مِنْ صَالِحِیْ اَھْلِھَا" کہے (ابوداود) "اَلصَّلَاةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" کے جواب میں "صَدَقْتَ وَ بَرَرْتَ" کہے۔ مؤذن کے ہر جملہ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا جواب دے۔ اگر کوئی تلاوت یا ذکر میں ہو تو اذان کا جواب دینے کیلئے اس سے رکنا مستحب ہے۔ نماز میں ہو تو فارغ ہونے تک جواب نہ دے۔ نماز میں جواب دینا مکروہ ہے، نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن "حَیَّ عَلَی الصَّلَاة یا اَلصَّلَاةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ "یا" صَدَقْتَ وَ بَرَرْتَ" کہا تو نماز باطل ہوگی، کیونکہ یہ کلام میں داخل ہے۔

نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کے دوران اذان کا جواب دیا ہے، تو سورہ فاتحہ کو از سر نو پڑھنا واجب ہے کیونکہ نماز میں جواب

پسندیدہ نہیں ہے۔ مغرب کی اذان سننے کے بعد یہ پڑھنا مستحب ہے۔ اَللّٰھُمَّ ھٰذَا اِقْبَالُ لَیْلِکَ وَ اِدْبَارُ نَھَارِکَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِکَ فَاغْفِرْلِیْ "(اخرجہ ابو داود والترمذی و صححہ الحاکم و اقرہ الذھبی) (اے اللہ یہ تیری رات کے آنے اور تیرے دن کے جانے کا وقت ہے اور تیرے پکارنے والوں کی آوازیں ہیں، سو تو مجھے بخش دے۔)

اذان اور اقامت کے درمیان دعا مستحب ہے۔ (ترمذی) مؤذن کو اقامت کیلئے جگہ بدلنا مستحب ہے۔

اذان کی افضلیت: اذان اور امامت دونوں میں بڑی فضیلت ہے۔ لیکن اذان زیادہ افضل ہے کیونکہ مؤذنوں کے حق میں آپ ﷺ نے" اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِیْنَ " (اے اللہ مؤذنوں کو بخش دے) کہہ کر دعا دی ہے اور امام ضامن ہونے کی وجہ سے اس پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، امام رافعیؒ وغیرہ نے امامت کو ترجیح دی ہے۔ امام نوویؒ نے ترمذی شریف کی ایک روایت کی وجہ سے ایک ہی شخص کے اذان وامامت کی ذمہ داری ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے(رواہ الترمذی من حدیث ابی ھریرہ ، احمد فی المسند و ابو داود و ابن حبان)

معاوضہ: مؤذن کیلئے مستحب ہے کہ بغیر معاوضہ کے اذان دے، اگر ایسا مؤذن نہ ملے تو امام مصالح کے مال سے اسے رزق دے۔ اگر فاسق مؤذن بغیر معاوضے کے اور امین مؤذن معاوضہ کے ساتھ اذان دے، تو امین کو مؤذن رکھ سکتے ہیں۔ ایک مؤذن امین بغیر عوض کے اذان دے اور دوسرا امین اس سے بہتر آواز والا عوض کے ساتھ اذان دے، تو مصلحت کے پیش نظر بہتر آواز والے کو مقرر کیا جاسکتا ہے، ایک بستی میں کئی مساجد ہوں، اور تمام نمازی ایک ہی مسجد میں جمع ہو سکتے ہوں تب بھی ساری مساجد میں مؤذن مقرر کر کے ان کو تنخواہ دے، تا کہ مسجد معطل نہ رہ جائیں۔ بیت المال میں تنخواہ کی گنجائش نہ ہو۔ (یا بیت المال کا نظام ہی نہ ہو) تو ذمہ دار یا رعایا میں سے کوئی تنخواہ دے سکتا ہے، اس صورت میں مقدار وغیرہ دینے والے کی مرضی پر منحصر ہے۔ ایک مسجد میں دو مؤذن ہونا مستحب ہے اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ایک صبح صادق سے پہلے فجر کی اول اذان دے گا اور دوسرا صبح صادق کے بعد دوسری اذان دے گا۔ مصلحت کے مطابق دو سے زائد مؤذن رکھ سکتے ہیں۔ ایک سے زائد مؤذن ہوں تو یکے بعد دیگرے اذان دیں گے۔ ابتداء میں اختلاف ہو تو قرعہ اندازی سے فیصلہ کریں گے وقت تنگ ہو اور مسجد بڑی ہو تو الگ الگ کونے میں اذان دیں، اور مسجد چھوٹی ہو تو ایک ہی ساتھ کھڑے ہو کر اذان دیں۔ لیکن اس طرح ایک ساتھ اذان اس وقت دیں گے جبکہ انکے آواز کے اختلاف سے تھویش (اضطراب، گڈمڈ ہونا) نہ پیدا ہو، ورنہ ایک ہی مؤذن اذان دے تعیین میں اختلاف ہو تو قرعہ اندازی کی جائیگی۔ اقامت کیلئے ان مؤذنوں میں سے کوئی مقرر ہے تو وہی اولیٰ ہے ورنہ بالترتیب اذان کی صورت میں پہلے اذان دینے والا اقامت کیلئے اولیٰ ہے۔ جس کا حق تھا اس کے علاوہ نے اقامت دی تو اس کا بھی اعتبار ہوگا (پھر اقامت دوہرانے کی ضرورت نہیں) ایک ساتھ اذان دینے کی صورت میں کوئی ایک اقامت کہے۔ اختلاف ہو تو قرعہ اندازی کریں۔ ایک مسجد میں ایک ہی شخص اقامت دے (مسجد بہت بڑی ہونے کی وجہ سے ضرورت ہو تو ایک سے زائد کی بھی گنجائش ہے۔) اذان کے وقت کا تعلق مؤذن سے ہے۔ اس سلسلہ میں امام سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اقامت کا تعلق امام سے ہے اس کے اشارے سے ہی موذن اقامت دے۔

فجر کی اذان وقت سے پہلے دے سکتے ھیں: نصف شب گذرنے کے بعد کبھی بھی فجر کی اذان دی جاسکتی ہے۔ البتہ اقامت صبح صادق سے قبل نہیں دے سکتے۔ فجر کے لئے دو اذان سنت ہیں۔ ایک صبح صادق سے قبل اور دوسری صبح صادق کے بعد، صرف ایک اذان بھی جائز ہے۔ صبح صادق سے قبل دے یا بعد، یا کچھ الفاظ صبح صادق سے قبل اور کچھ بعد، ایک ہی اذان دینا ہو تو بہتر یہ

ہے کہ صبح صادق کے بعد دے۔ فجر کے علاوہ دیگر اذانوں میں تثویب مکروہ ہے۔ اذان میں کسی ذکر کے بڑھانے یا اس کے مقدار کو بڑھانے سے اذان فاسد نہ ہوگی۔

مستحب ہے کہ موذن دو تکبیر (اللّٰہ اکبر) کو ایک سانس میں ادا کرے (پہلی تکبیر کے بعد معمولی سا سکتہ کرے، اگر سکتہ نہ کرے تو پہلے 'اکبرُ' کے راء پر پیش پڑھے (اور اسے لام کے ساتھ ملالے) (جمل ۱ / ۳۰۴) بقیہ ہر جملہ کو ایک ایک سانس میں ادا کرے۔

بارش کی رات یا تاریک ہوا دار رات ہو تو اذان کے بعد۔ "اَلَا صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ" (اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو) کہنا مستحب ہے۔ (یا اَلَا صَلُّوْا فِی الرِّحَالِ یا اَلَا صَلُّوْا فِی بُیُوْتِکُمْ کہے، بعضوں نے اذان مکمل ہونے کے بعد اس اضافہ کو بہتر کہا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ جماعت کے ترک کے کسی بھی عذر کی صورت میں یہ اضافہ مطلوب ہے شربینی کی رائے میں حیعلتین کو ترک کر کے اس کی جگہ اسے پڑھنا کافی ہے۔ (بشری الکریم ص ۶۲) ان الفاظ کو حی علی الفلاح کے بعد کہنا زیادہ بہتر ہے۔ (اس کے جواب میں "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ" پڑھے۔ (جمل ۱/ ۳۰۱)

کسی نابینا کا تنہا موذن ہونا مکروہ ہے۔ اس کے ساتھ کوئی بینا ہو (جو اسے وقت سے آگاہ کرے) تو مکروہ نہیں۔ اذان مسجد سے قریب دینا سنت ہے۔ اذان میں حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ (نیک کام کی طرف آؤ) کہنا مکروہ ہے۔ کسی کے کہنے پر اذان کے الفاظ دوہرائے جائیں تو اذان صحیح ہوگی۔ عربی میں اذان دینے والے کی موجودگی میں غیر عربی میں اذان صحیح نہ ہوگی۔ کوئی بھی عربی میں دینے پر قادر نہ ہو تو دوسری زبان میں بھی صحیح ہوگی۔ اللہ اکبر کی جگہ اللہ الاکبر کہے تو اذان صحیح ہوگی۔ حضر میں سفر کے مقابلہ میں اذان کی زیادہ اہمیت ہے۔ عورت کے مقابلے میں مرد کے حق میں اقامت زیادہ اہم ہے۔

باب ۳ ۔ استقبال قبلہ (کعبۃ اللہ کی طرف رخ کرنا)

فرض نماز صحیح ہونے کیلئے قبلہ کی طرف رخ کر کے پڑھنا شرط ہے۔ مباح قتال یا کسی اور سبب سے شدت خوف ہو تو یہ صورت مستثنٰی ہے۔ اسی طرح مباح سفر اور شدت خوف کے علاوہ صورتوں میں نفل نماز صحیح ہونے کیلئے استقبال قبلہ شرط ہے۔ جو استقبال قبلہ سے مجبور ہو جیسے کوئی مریض جسے قبلہ کی طرف کرنے کیلئے کوئی موجود نہ ہو یا وہ شخص جس کو باندھ دیا گیا ہو اپنے رخ پر نماز پڑھ لیں گے۔ بغیر مجبوری کے فرض نماز کو سواری پر ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر فرض نماز کیلئے زمین پر اترنے کی صورت میں ساتھیوں سے پیچھے رہنے کا خوف ہو یا جان ومال کا کچھ خطرہ ہو تو سواری پر ہی پڑھ لے لیکن بعد میں اس نماز کا اعادہ کرے۔ منذورہ اور جنازہ کی نماز بھی سواری پر جائز نہیں ہے۔

فرض نماز میں استقبال

فرض نماز کو ٹھہر کر اور رک کر پڑھنا ضروری ہے۔ لہٰذا پیدل قبلہ کی طرف رخ کر کے اور سوار ہو کر قیام یا استقبال کے بغیر صحیح نہ ہوگی۔ اگر قبلہ کی طرف رخ کر کے سارے ارکان کو مکمل ادا کرے اور سواری رکی ہوئی ہو تو فرض نماز صحیح ہوگی۔ جیسے اونٹ پر ہودج میں یا تختہ پر باقاعدہ نماز پڑھے۔ اگر جانور چل رہا ہو تو اس کی پشت پر فرض نماز صحیح نہ ہوگی اس جہاز یا کشتی میں جو جاری ہو یا ساحل سے بندھی ہو اور اس تختہ پر جسکو لوگوں نے کاندھے پر اٹھا رکھا ہو اور رسی سے بندھے ہوئے جھولے میں فرض نماز صحیح ہے۔

نفل نماز میں استقبال

طویل یا قصیر سفر میں نفل نماز پیدل اور سواری پر اپنے سفر کے رخ پر پڑھنا جائز ہے البتہ حضر (اقامت) میں جائز نہیں ہے۔ حضر میں قیام کے علاوہ بقیہ تمام مسائل میں نفل نماز بھی فرض کی طرح ہے۔ جہاز میں چونکہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممکن ہے، اس لئے اس کے بغیر نفل کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ ملاح اپنی ذمہ داری کی وجہ سے جہاز کے رخ پر نفل پڑھ سکتا ہے۔ جانور پر ہودج وغیرہ میں قبلہ رو نماز پڑھ سکتا ہو تو اس کے بغیر نفل کی اجازت نہیں ہے۔

سوار شخص نفل نماز باقاعدہ نہیں ادا کر سکتا ہو تو بصورت سہولت تکبیر تحریمہ کے وقت قبلہ کی طرف رخ کرنا واجب ہے۔ تکبیر تحریمہ کے علاوہ بقیہ نماز کو قبلہ کی طرف نہ ادا کرے۔ تو سفر کے رُخ پر ادا کرنا ضروری ہے۔ کسی اور طرف رخ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو بے مقصد ادھر ادھر گھومتا ہے، کسی متعین منزل کے سفر کا ارادہ نہیں ہے۔ اس کو بغیر قبلہ رو نفل ادا کرنے کی رخصت نہیں ہے۔ (ایسا مسافر سفر کے دیگر رخصتوں پر بھی عمل نہیں کر سکتا۔) (حاشیة الروضه)

زمین پر نماز پڑھنے والا شخص عمداً قبلہ کی طرف سے پھر جائے تو نماز باطل ہوگی۔ اگر بھول کر قبلہ کی طرف سے پھر جائے اور جلد ہی دوبارہ قبلہ رو ہو جائے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ اگر زیادہ دیر گذری تو نماز باطل ہوگی۔ کسی نے زبردستی اسے قبلہ کی طرف سے موڑ دیا تو جلد یا بدیر دوبارہ قبلہ رو ہونے کے باوجود نماز باطل ہوگی، کیونکہ یہ ایک نادر صورت ہے جیسا کہ زبردستی بات چیت پر مجبور کرنے سے نماز باطل ہوتی ہے۔

پیدل یا سواری پر نفل پڑھنے والا اپنا رخ سفر کی جہت سے قبلہ کی طرف موڑ دے تو حرج نہیں، کسی اور طرف عمداً موڑے تو نماز باطل ہوگی۔ بھول کر یا غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو، اور جلد تلافی کرے تو نماز باطل نہ ہوگی اور سجدہ سہو کرنا مشروع نہیں ہے۔ زیادہ دیر اسی حالت پر گذری تو نماز باطل ہوگی۔ جانور کے اڑیل پن کی وجہ سے رخ مڑ جائے تو زیادہ دیر گذرنے کی صورت میں نماز باطل ہوگی، جلد رخ درست کرے تو باطل نہ ہوگی۔ اور اس صورت میں سجدہ سہو کرنا مشروع ہے۔ سواری پر نماز پڑھنے کی صورت میں سجدہ کیلئے سواری پر پیشانی ٹیکنے کی ضرورت نہیں بلکہ رکوع اور سجدہ کو آگے کی طرف جھک کر ادا کرے گا۔ سجدہ میں رکوع کے کے مقابلے میں کچھ زیادہ جھکے گا۔ دونوں کے جھکاؤ میں کچھ فرق ہونا ضروری ہے۔ آخری ممکنہ حد تک جھکنا واجب نہیں ہے۔ دیگر ارکان کی کیفیت واضح ہے۔

جہاز یا کسی ایسی چیز میں سوار جو استقبال اور دیگر ارکان کو مکمل ادا کر سکتا ہو، اس پر باقاعدہ قبلہ رو ہو کر تمام ارکان کی ادائیگی واجب ہے۔ پیدل نماز پڑھنے کی صورت میں تکبیر تحریمہ، رکوع اور سجدہ میں قبلہ رو ہونا واجب ہے۔ سلام میں واجب نہیں ہے۔ رکوع اور سجدہ باقاعدہ ادا کرے تشہد کو چلتے ہوئے پڑھنا کافی ہے۔ خلاصہ یہ کہ پیدل نماز پڑھنے والا چار ارکان میں استقبال کرے، تکبیر تحریمہ، رکوع سجدہ اور دو سجدوں کے درمیان کی بیٹھک، اور چار ارکان میں چلتا رہے۔ قیام، اعتدال، تشہد اور سلام (باجوری ۱/ ۱۴۹ جمل ۱/ ۳۱۹)

سواری کا جو حصہ نماز کے بدن یا کپڑے سے چھوئے اسکا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر جانور پیشاب کرے یا نجاست پر چلے یا زین پر نجاست ہو اور اس پر کچھ بچھا کر نماز پڑھے تو حرج نہیں۔ سوار خود جانور کو نجاست پر چلائے تب بھی حرج نہیں۔ پیدل نماز پڑھنے والا عمداً نجاست پر چلے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ پیدل نمازی لاعلمی میں خشک نجاست پر چلے اور فوراً وہاں سے ہٹ جائے تو نماز درست ہو

گی، تر نجاست پر چلنے سے مطلقاً نماز باطل ہوگی۔ (بشری الکریم ۱/۱۹۰)
سوار یا پیدل نفل کے جواز کیلئے نماز مکمل ہونے تک سفر جاری رہنا شرط ہے۔ دوران نماز اپنی منزل پر پہنچ جائے تو قبلہ رو ہو کر با قاعدہ بقیہ نماز کو مکمل کرنا ضروری ہے اگر سوار ہے اور سواری پر با قاعدہ تمام ارکان نہیں ادا کر سکتا تو اس سے اترنا ضروری ہے۔ سفر میں کسی بستی سے ہو کر گذرے۔ (وہاں اترنے اور قیام کرنے کا ارادہ نہ ہو) تو سواری پر ہی نماز مکمل کر سکتا ہے۔ ایسے افعال سے پرہیز واجب ہے۔ جن کی ضرورت نہیں۔ اگر حاجت کی وجہ سے جانور کو ایڑ لگائے تو حرج نہیں۔ بغیر عذر کے جانور کو چلائے، یا پیدل نمازی بغیر عذر کے دوڑے تو نماز باطل ہوگی۔

فصل۔ زمین پر نمازی کا قبلہ رو ہونا

آیت: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۔ (سورۃ البقرۃ ۱۴۴)

ترجمہ: پھر اب سے اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجئے اور تم سب لوگ (پیغمبر بھی، امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (ہر جگہ نماز کے اندر) اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو۔

اس کی کئی حالتیں ہیں: (۱) (کعبہ کے اندر نماز پڑھنا) کعبہ کے اندر فرض اور نفل دونوں صحیح ہیں۔ باہر نفل پڑھنے کے مقابلے میں کعبہ کے اندر پڑھنا افضل ہے۔ باہر فرض نماز پڑھنے میں جماعت ملتی ہو تو باہر پڑھنا افضل ہے۔ ورنہ کعبہ کے اندر فرض پڑھنا افضل ہے۔ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کی صورت میں کسی بھی دیوار کی طرح رخ کر سکتا ہے۔ دروازہ کی طرف رخ کر کے بھی نماز پڑھ سکتا ہے، جبکہ دروازہ بند ہو یا کھلا ہو تو اس کی چوکھٹ تقریباً دو تہائی (۲/۳) ہاتھ بلند ہو۔

(۲) کعبۃ اللہ منہدم ہو جائے (والعیاذ باللہ) : اور وہ جگہ بغیر عمارت کے کھلی پڑی ہو تو باہر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لے تو جائز ہے۔ اگر اندر نماز پڑھے تو اس کا حکم کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے کی طرح ہے۔ (جو تیسری حالت میں واضح ہے)

(۳) کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا: اس صورت میں سامنے کوئی ابھری ہوئی چیز نہ ہو تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ اگر کعبہ کا ہی کچھ حصہ سامنے ابھرا ہوا ہو، جو دو تہائی ذراع ہو تو جائز ہے، اس سے کم ہو تو جائز نہیں۔ سامنے کچھ سامان رکھ کر اس کی طرف رخ کرنا کافی نہیں ہے۔ دیوار کے بقیہ حصے کی طرف یا کسی درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لے تو جائز ہے۔ اگر اسی میدان کی مٹی جمع کر کے اس کی طرف رخ کرے یا گڑھا کھود کر اس میں نماز کیلئے کھڑا ہو جائے، یا چھت یا میدان کے آخری کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرے کنارے کی طرف رخ کرے اور دوسرا کنارہ اس کے قیام کی جگہ سے اونچا ہو تو جائز ہے۔

اگر اس پر اگی ہوئی گھاس پھوس کی طرف یا ایسی لکڑی یا لاٹھی کی طرف رخ کرے جسے میخ سے مضبوط نہ کیا ہو، تو کافی نہیں، اگر میخ سے مضبوط کر دیا ہے تو اس کی طرف رخ کرنا کافی ہے۔

(۴) رکن کعبہ کے کنارے : اس طرح نماز پڑھنا کہ بدن کا کچھ حصہ اس کے محاذات سے نکل جائے، اس صورت میں نماز صحیح نہ ہوگی امام کعبہ کے قریب مقام ابراہیم کے پاس یا کسی اور جگہ کھڑا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے بیت اللہ کے چاروں طرف کھڑے ہوں تو جائز ہے۔ امام کے قریب کھڑے ہونے والے مقتدیوں کی صف طویل ہو تو جو کعبہ کی محاذات سے خارج ہوں انکی نماز باطل ہے۔

(۵) مکہ میں مسجد حرام سے باہر کہیں نماز پڑھے : اگر کعبہ نظر آ رہا ہو جیسے جبل ابی قبیس (مکہ کے

ایک پہاڑ کا نام) پر نماز پڑھنے والا تو کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھے کعبہ کو دیکھ کر محراب بنایا ہے تو ہمیشہ اس کے مطابق نماز پڑھے گا۔ ہر نماز کیلئے کعبہ کا دیکھنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح جو مکہ میں پرورش پائے اور کعبہ کی رخ کا اسے یقین ہو، گرچہ نماز کے وقت کعبہ نظر نہ آرہا ہو، تو وہ اس رخ پر نماز پڑھے گا۔ اگر نظر نہ آرہا ہو اور یقین بھی نہیں تو دلائل پر اعتماد کرنا اور اجتہاد پر عمل کرنا جائز ہے جب کہ کعبہ کے اور اس کے درمیان کچھ حائل ہو، کیونکہ اس صورت میں مشاہدہ کا مکلف بنانا باعث مشقت ہے۔

(۶) مدینہ میں نماز پڑھے: اس صورت میں آپ ﷺ جس مقام پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے وہ کعبہ کے قائم مقام ہے، جس کو وہ مقام نظر آرہا ہو اس کے مطابق اپنے محراب اور نماز کے رخ کی تعیین کرے گا، اجتہاد کی بنیاد پر اس سے عدول جائز نہیں ہے۔

ہر وہ مقام جہاں آپ ﷺ نے نماز ادا کی ہے، اور آپ ﷺ کا رخ معلوم ہے، اس کا بھی یہی حکم ہے اسی طرح مسلمانوں کے علاقوں کے محراب اور انکے راستوں کے محراب پر بھی اعتماد کیا جائے گا اور اجتہاد کی گنجائش نہ ہوگی۔ علامت ایسے راستوں میں ہو جہاں سے لوگ بہت کم گذرتے ہوں یا مسلمان و کفار دونوں یکساں طور پر گذرتے ہوں، یا کسی ویران بستی میں ہو، جسے مسلمانوں نے بسایا تھا یا کفار نے کچھ پتہ نہیں، تو ایسی علامت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ اجتہاد کریگا آپ ﷺ نے جہاں جس رخ پر نماز ادا کی ہے وہاں اجتہاد کر کے ذرا بھی دائیں یا بائیں جانب مڑنا جائز نہیں ہے، قبلہ کی معرفت کا ماہر اگر اس طرح کا خیال کرے تو اس کا خیال باطل ہے۔ دیگر شہروں میں اصل جہت سے کچھ دائیں یا بائیں جانب کی حد تک اجتہاد جائز ہے۔

(۷) ایسی جگہ ہو جہاں قبلہ کے رخ کا کوئی یقین نہیں:

جو قبلہ کے رخ کو یقینی طور پر معلوم کر سکتا ہو اسے اجتہاد کی اجازت نہیں۔ کعبہ کی طرف رخ کرنے کے امکان کے باوجود حجر (حطیم) کی طرف رخ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کا بیت اللہ کا حصہ ہونا قطعی نہیں ہے، بلکہ مظنون ہے اسی طرح یقین کے امکان کی صورت میں کسی اور کے قول پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے، لیکن جو یقین پر قادر نہ ہو، اور کوئی اسے علم کی بنیاد پر قبلہ کی اطلاع دے، تو اس پر اعتماد کرے، اجتہاد نہ کرے جبکہ خبر دینے والا عادل ہو، مرد ہو یا عورت۔ کافر، فاسق، بچے اور ممیز کی بات کا اعتبار نہ ہوگا۔

خبر پر عمل کرنے میں اہل اجتہاد اور دیگر حضرات برابر ہیں قبلہ کے متعلق صحیح اطلاع دینے والا کوئی نہ ہو تو اجتہاد سے جو رخ متعین ہو اس پر عمل کرے۔ قبلہ کے دلائل کی روشنی میں اجتہاد کرنا ضروری ہے۔ جو خود اجتہاد کر سکتا ہو اسے دوسرے کی تقلید کی اجازت نہیں ہے، وقت میں گنجائش ہو یا نہ ہو اگر دوسرے کی تقلید کی تو نماز کی قضاء واجب ہے۔ لیکن وقت تنگ ہو تو کسی طرف نماز پڑھ لے پھر اعادہ واجب ہے۔ بادل یا تاریکی یا دلائل کے تعارض کی وجہ سے مجتہد پر دلائل مخفی ہوں تب بھی دوسرے کی تقلید نہ کرے۔ (بلکہ جس طرف چاہے نماز پڑھ لے اور بعد میں اعادہ کرے۔) (جمل) جو اجتہاد پر قادر نہ ہو اور دلائل کے سیکھنے سے عاجز ہو، جیسے نابینا یا وہ بینا جو دلائل سے ناواقف ہو اور اس میں سیکھنے کی قابلیت بھی نہیں، تو ان پر کسی مکلف عادل مسلم کی تقلید واجب ہے جو دلائل سے واقف ہو، اس کے قول کو جو کہ اجتہاد پر مبنی ہو قبول کرنے کو تقلید کہیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے مسلمانوں کے جم غفیر کو اس رخ پر نماز پڑھتے دیکھا ہے تو اس قول پر عمل کرنا خبر کو قبول کرنا ہے نہ کہ تقلید۔

دو مجتہد کا اجتہاد الگ الگ ہو تو کسی بھی ایک کی تقلید کرے، زیادہ معتبر اور عالم کی تقلید بہتر ہے، قبلہ کے دلائل سیکھنے پر قادر شخص اگر سفر کا ارادہ رکھتا ہے، تو اس پر ان دلائل کا سیکھنا فرض عین ہے، کیونکہ مسافر کو اس کی عموماً ضرورت پیش آتی ہے، اور بڑی آسانی سے رخ کی تعیین ہر جگہ نہیں ہو پاتی، ورنہ ان دلائل کا سیکھنا فرض کفایہ ہے، کیونکہ آپ ﷺ اور اسلاف نے نماز کے ارکان و شروط کی طرح ہر کسی کو ان دلائل کے سیکھنے کا پابند نہیں بنایا۔

اجتھاد سے نماز پڑھنے کے بعد غلطی سامنے آئے تو اس کی کئی صورتیں ھیں۔

(۱) نماز شروع کرنے سے پہلے ہی غلطی ظاہر ہو، اگر غلطی یقینی ہو تو اس سے اعراض کر کے بعد میں جو رخ سامنے آیا ہے اس پر عمل کرے۔ اگر غلطی یقینی نہ ہو صرف ظن ہو کہ صحیح رخ دوسرا ہے، تو دوسرے اجتہاد کی دلیل اس کے نزدیک پہلے کے بالمقابل زیادہ واضح ہو، تو دوسرے اجتہاد پر اعتماد کرے، اور پہلے کی دلیل زیادہ واضح ہے تو اس پر عمل کرے، اور دونوں یکساں درجہ میں ہے تو اسے اختیار ہے (دونوں میں سے کسی بھی رُخ پر پڑھ لے)

(۲) نماز مکمل ہونے کے بعد غلطی ظاہر ہو اگر غلطی یقینی ہے تو اعادہ واجب ہے۔ غلطی یقینی نہیں صرف ظن ہے تو اعادہ واجب نہیں۔ اجتہاد کر کے چار نمازوں کو چار الگ الگ رخ پر ادا کرے تب بھی کسی کا اعادہ واجب نہیں ہے۔

دوران نماز غلطی ظاھر ھو: اس کی دو صورتیں ہیں۔

(الف) غلطی ظاہر ہوتے وقت صحیح رخ بھی ظاہر ہو اب اگر غلطی یقینی ہے تو نماز باطل ہو گی۔ اگر غلطی یقینی نہیں ہے صرف مظنون ہے تو جو رخ ابھی ظاہر ہوا ہے، اس طرف مڑ کر اسی نماز کو مکمل کر لے (توڑنے کی ضرورت نہیں) اس صورت میں کسی نے اگر اجتہاد کر کے چار رکعات چار الگ الگ سمت پڑھی تب بھی اعادہ کی ضرورت نہیں۔

(ب) غلطی کے ساتھ صحیح سمت ظاہر نہ ہو، اجتہاد کر کے جلد صحیح سمت کا فیصلہ نہ کر سکا تو نماز باطل ہو گی اگر فیصلہ کر سکا تب بھی از سر نو اس سمت میں نماز پڑھے گا۔

اجتھاد سے کیا مطلوب ھے؟

اجتہاد سے عین کعبہ مطلوب ہے (یعنی اصل مقصود یہ ہو کہ کعبہ کی طرف رخ ہو جس سمت میں کعبہ ہے صرف اس سمت رخ ہونا تھوڑا دائیں یا بائیں مڑ کر کافی نہیں۔)

نماز کے بعد کعبہ سے کچھ دائیں یا بائیں ہونا اجتہاد سے ظاہر ہو، تو کوئی حرج نہیں۔ دورانِ نماز ظاہر ہو تو اس طرف مڑ کر بقیہ نماز پوری کرے۔

اجتہاد سے سمت کی تعیین کر کے نماز پڑھ لے، پھر دوسری کوئی فرض نماز ادا ہو یا قضاء (یا منذورہ یا جنازہ کی نماز) پڑھنے کا ارادہ ہو تو پھر اجتہاد کرنا واجب ہے۔ نفل نماز کیلئے اجتہاد کے اعادہ کی ضرورت نہیں، دو اشخاص کا اجتہاد الگ الگ سمت ہو تو ہر ایک اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرے۔ اور دوسرے کی اقتداء نہ کرے۔ کئی لوگوں کا اجتہاد یکساں ہو اور ان میں سے ایک امامت کرے پھر کسی مقتدی کا اجتہاد بدل جائے تو اُسے امام سے جدا ہونا واجب ہے۔ اور وہ دوسری طرف رخ کرے گا۔ اگر امام کا اجتہاد بدل جائے تو وہ دوسری طرف رخ کرے اور مقتدی حضرات اس سے جدا ہو جائیں۔ (دل میں اس کے اقتداء سے نکلنے کی نیت کر کے تنہا اپنی نماز مکمل کر لیں۔)

باب ۴۔ نماز کی صفت

شرط: نماز کیلئے جو امور واجب ہیں لیکن نماز کی ماہیت میں داخل نہیں، انھیں شرط کہتے ہیں۔

رکن: جو امور نماز کے اندر واجب ہیں، اور نماز کی ماہیت میں داخل ہیں، انھیں رکن کہتے ہیں۔

سنت: جو امور نماز میں مطلوب اور باعثِ ثواب ہیں، لیکن واجب نہیں، اسے سنت اور مندوب کہیں گے۔ جس سنت کی تلافی

سجدہ سہو کے ذریعے ہوتی ہے، اسے سنتِ بعض کہیں گے اور جس سنت کے ترک پر سجدہ سہو مشروع نہیں ہے اسے سنت ہیئت کہا جاتا ہے۔
نماز کا رکن سر کی طرح، شرط زندگی کی طرح، سنن ابعاض اعضاء کی طرح، اور سنن ہیئات بالوں کی طرح ہیں۔(حاشیۃ الجمل ۱/ ۳۲۸)

نماز کے سترہ ارکان ھیں: نیت، تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، (تلاوت) رکوع، رکوع میں طمانینت (ٹھہراؤ) اعتدال، اعتدال میں طمانینت سجود، سجود میں طمانینت، دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا اس میں طمانینت، نماز کے آخر میں بیٹھنا، اس بیٹھنے میں تشہد پڑھنا۔ آپ ﷺ کی خدمت میں درود بھیجنا، سلام پھیرنا، مذکورہ ترتیب کو ملحوظ رکھنا۔

نماز میں چھ سنن ابعاض ھیں: (۱) فجر کی نماز میں اور رمضان کی آخری نصف ماہ کی وتر میں دعاء قنوت پڑھنا (۲) قنوت کیلئے کھڑے رہنا۔ (۳) پہلا تشہد (۴) پہلے تشہد میں بیٹھنا (۵) تشہد اول میں آپ ﷺ پر درود بھیجنا (۶) آخری تشہد میں آپ ﷺ کے آل پر درود بھیجنا، انکے علاوہ جو سنن ہیں وہ ابعاض نہیں ہیں۔ (بلکہ ہیئات سنتوں میں شمار ہیں)

فصل۔ نیّت کے متعلق

نیت تکبیر تحریمہ سے مقارن (ساتھ پائی جانا) اور تکبیر مکمل ہونے تک اسکو برقرار رکھنا واجب ہے۔ نیت قصد کو کہیں گے، لہٰذا نمازی اپنے ذہن میں نماز اور وہ صفات جن کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، جیسے ظہر کی نماز اس کی فرضیت وغیرہ کو حاضر رکھے۔ ان امور کا قصد تکبیر کے ابتداء سے پایا جائے۔ کئی علماء کے نزدیک عوام کے حق میں عرفی مقارنت کافی ہے۔ یعنی اسے نماز کا فی الجملہ استحضار ہو۔ (حاشیۃ الروضہ)

تکبیر کے بعد نیت کا باقاعدہ برقرار رکھنا واجب نہیں ہے، لیکن یہ شرط ہے کہ نیت کے منافی کوئی بات پائی نہ جائے، لہٰذا کسی نے نماز کے دوران نماز سے نکلنے کی نیت کی تو نماز باطل ہوگی۔ نماز سے نکلنے اور نہ نکلنے میں تردد کرے، تب بھی نماز باطل ہوگی، وسوسہ کے درجہ میں پائے جانے والے تردد کا کوئی اعتبار نہیں۔

پہلی رکعت میں یہ نیت کرے کہ میں دوسری رکعت میں نماز سے نکل جاؤنگا، یا نماز سے نکلنے کو کسی ایسی چیز پر معلق کرے جس کا نماز میں پایا جانا یقینی یا محتمل ہو، تو فوراً ہی نماز باطل ہوگی (اس چیز کا پایا جانا ضروری نہیں بلکہ نیت کرتے ہی نماز باطل ہوگی) کسی فرض یا سنّت راتبہ کی نیت سے نماز شروع کی، پھر نماز میں کسی اور فرض یا سنّت کی نیت کی، تو وہ نماز باطل ہوگی، اور جس دوسری نماز کی نیت کی ہے وہ بھی حاصل نہ ہوگی۔

روزہ دار روزہ چھوڑنے کے متعلق تردد کرے، یا کسی چیز پر معلق کرے، یا چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرے، تو ان صورتوں میں روزہ نہ ٹوٹے گا۔ یہی مسئلہ حج کی صورت میں بھی ہوگا۔

نماز میں شک پیدا ہو کہ مکمل نیت کی یا نہیں یا نیت کے کسی شرط کو ترک کیا ہے، پھر جلد ہی شک کی حالت میں کسی رکن کو ادا کرنے سے پہلے یاد آجائے کہ نیت مکمل طور پر کر چکا ہے، تو نماز باطل نہ ہوگی، شک کی حالت میں کافی دیر گذر جائے، یا کسی فعلی رکن (جیسے رکوع۔ سجدہ) یا قولی رکن (جیسے قرأت۔ تشہد) کے ادا کرنے، کے بعد یاد آجائے تو نماز باطل ہوگی۔ یہ شک پیدا ہو کہ ظہر کی نیت کی تھی، یا عصر کی، تو دونوں میں سے کوئی بھی شمار نہ ہوگی۔ اگر یاد آجائے کہ کونسی نیت کی تھی، تو مندرجہ بالا تفصیل یہاں بھی جاری ہوگی۔

نیّت کی کیفیت

فرض نماز میں ان امور کا قصد واجب ھے۔ (۱) نماز پڑھنا (۲) جو نماز پڑھ رہا ہے اس کی تعیین، صرف یہ نیّت کافی نہیں کہ اس وقت کی فرض نماز پڑھ رہا ہوں، کیونکہ کوئی قضاء نماز اس وقت یاد آجائے تو یہ اس قضاء کا بھی وقت ہے، ظہر کی نیت سے جمعہ یا جمعہ کی نیت سے ظہر کی نماز صحیح نہ ہوگی۔ (۳) فرضیت کی نیت، چاہے بالغ ہو یا نابالغ، نماز ادا ہو یا قضاء، اللہ کی طرف منسوب کرنا، یعنی یہ کہنا کہ میں اللہ کیلئے نماز ادا کر رہا ہوں ضروری نہیں ہے۔ استقبال قبلہ اور رکعات کی تعداد سے تعرض واجب نہیں ہے۔ لیکن مثلاً ظہر میں تین یا پانچ رکعات کی نیت کی تو نماز منعقد نہ ہوگی۔ قضاء نماز میں ادا کی یا ادا میں قضاء کی نیت کرے اور اس کے حقیقی معنی کا قصد نہ ہو تو نماز صحیح ہو گی ورنہ ایک طرح کا مذاق ہونے کی وجہ سے نماز صحیح نہ ہوگی۔ بادل وغیرہ کے سبب وقت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے ادا یا قضاء کی نیت میں غلطی ہو، تو نماز صحیح ہوگی۔ یعنی وقت باقی سمجھ کر ادا کی نیت سے نماز پڑھی، حالانکہ وقت نکل چکا تھا، تو یہ نماز صحیح ہے یا یہ سمجھ کر کہ وقت نکل چکا، قضاء کی نیت سے پڑھی، حالانکہ وقت ابھی باقی تھا تو یہ نماز بھی درست ہے۔

ادا: کسی عبادت کیلئے شریعت نے جو وقت متعین کیا ہے اس وقت میں اس عبادت کو مکمل یا بعض انجام دینا، اور اس سے پہلے کسی خلل کے ساتھ وہ عبادت انجام نہ دی گئی ہو۔

قضاء: متعینہ وقت کے بعد عبادت کو انجام دینا۔ (حاشیة الروضه)

نفل کی دو قسمیں ھیں

(۱) وہ نفل جس کے لئے وقت یا سبب ھو۔ ایسے نفل کیلئے نماز پڑھنے کی نیت اور نفل کی تعیین واجب ہے۔ لہٰذا استسقاء، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، ضحیٰ (چاشت) وغیرہ کی نیت کرے۔

رواتب: (وہ سنتیں جو پنجوقتہ فرائض سے قبل یا بعد پڑھی جاتی ہیں) میں فرض نماز کی طرف منسوب کر کے تعیین کرے گا جیسے سنّت فجر، سنّت ظہر، یا سنّت عشاء وغیرہ وتر کی نماز میں سنت وتر کی نیت کرے اسے عشاء کی طرف منسوب نہ کرے کیونکہ وہ مستقل نماز ہے۔ (عشاء کے تابع نہیں ہے)

وتر کی نماز ایک رکعت سے زائد پڑھے تو ساری رکعتوں کیلئے وتر کی نیت کرے جیسا کہ تراویح میں۔

دیگر امور میں وہی تفصیل ہے جو فرض کے سلسلے میں گذر چکی، البتہ نفلیت کی نیت ضروری نہیں ہے۔

(۲) نفل مطلق: (وہ نفل نماز جو وقت وسبب کی قید کے بغیر، ثواب کیلئے انسان اپنی مرضی سے ادا کرتا ہے) ایسی نفل نماز کیلئے صرف نماز کی ادائیگی کی نیت کافی ہے۔

محل نیّت: تمام عبادات میں نیت کے سلسلے میں دل کا اعتبار کیا جائے گا۔ دل کی غفلت کے ساتھ محض زبان سے ادائیگی کافی نہیں ہے۔ زبان سے دل کی نیت کے خلاف لفظ نکل جائے تو حرج نہیں جیسے ظہر کی نماز کیلئے دل میں ظہر کا قصد کرے لیکن زبان سے عصر کا لفظ نکلے، تو ظہر کی نماز منعقد ہوگی۔ نیت کے بعد دل یا زبان سے انشاء اللہ ادا کرے اور تبرک کا قصد ہو، یا یہ کہ سب کچھ اللہ کی مشیت سے ہی ہوتا ہے، تو حرج نہیں۔ اگر شک کے ارادے سے ان الفاظ کو ادا کرے تو نماز صحیح نہ ہوگی۔

فرض نماز کے ابتداء میں یا دوران میں ایسا کام کرے جو فرضیت کے منافی ہو، نفلیت کے منافی نہ ہو تو فرض باطل ہوگا بطور نفل شمار

ہونے میں یہ تفصیل ہے۔

(۱) زوال سے پہلے عمداً (جان بوجھ کر) ظہر کی نیت سے نماز شروع کرے تو بالکل باطل ہے۔ اگر غلطی سے یوں ہوا ہے تو نفل شمار ہوگی۔

(۲) مسبوق نے امام کو رکوع میں پایا اور اپنی تکبیر تحریمہ کا کچھ حصہ رکوع میں ادا کیا تو فرض منعقد نہ ہوگا۔ جانتے ہوئے یوں کیا ہے تو بالکل باطل ہوگی ورنہ بطور نفل منعقد ہوگی۔

(۳) کسی فرض نماز کو تنہا شروع کرنے کے بعد جماعت کھڑی ہوئی تو اسے پانے کیلئے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو یہ نفل شمار ہوگی۔

(۴) کسی مرض کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز میں طبیعت کچھ ٹھیک ہوگئی پھر بھی کھڑا نہ ہوا، یا جو کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکتا ہے، وہ فرض نماز بیٹھ کر شروع کرے، یا فرض نماز پڑھنے والا بغیر سبب کے اسے نفل سے بدل دے تو ان تینوں صورتوں میں نماز باطل ہوگی۔

فصل ۔ تَکْبِیْرَۃُ اُلاحْرَام ۔ (تکبیر تحریمہ)

حدیث: (۱) آپ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے۔ (بخاری عن ابن عمر، ترمذی عن علی)

حدیث: (۲) ایک طویل حدیث میں نماز کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا! پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر کہو۔ (مسلم عن ابی ھریرہ)

حدیث: (۳) ایک حدیث کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا" نماز کی تحریمہ تکبیر ہے" (شافعی ، احمد و ابو داود ترمذی ، ابن ماجہ و صححہ الحاکم) جو تکبیر کے کلمہ کو ادا کرسکتا ہو (اللہ اکبر کہہ سکتا ہو) اس پر وہی واجب ہے، اس سے ملتے جلتے دیگر الفاظ کافی نہیں، جیسے" الرَّحْمٰن اَجَلّ ۔ الرَّبُّ اَعْظَمُ ۔ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اَکْبَرُ"۔ اگر "اللّٰہُ الاَکْبَرُ یَااَللّٰہُ اَکْبَرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یَااَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ اَجَلُّ وَ اَعْظَمُ یَا اَللّٰہُ الْجَلِیْلُ اَکْبَرُ" کہے تو کافی ہے۔

اسی طرح اللہ اور اکبر کے درمیان اللہ کے صفات میں سے کوئی صفت مختصر لفظ کے ساتھ داخل کرے تو تکبیر صحیح ہوگی۔ جیسے "اَللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ اَکْبَرُ" اگر الفاظ بڑھ جائیں تو تکبیر صحیح نہ ہوگی جیسے "اَللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ اَکْبَرُ "کیونکہ طوالت کی وجہ سے اسے تکبیر نہ کہا جائے گا۔ اگر" اَکْبَرُ اَللّٰہُ "یا" اَللّٰہُ اَکْبَرُ" اللہ کہے تو نماز منعقد نہ ہوگی۔ تکبیر کے الفاظ میں دونوں کلمہ (اللہ اور اکبر) کے درمیان وقفہ نہ کرنا ضروری ہے۔ ایسی زیادتی سے پرہیز واجب ہے، جس سے معنی میں خلل واقع ہو۔ جیسے "اللہ و اکبر" (اللہ کے ہمزہ کو مد کے ساتھ ادا کرنا، کیونکہ اس صورت میں ترجمہ ہوگا، کیا اللہ سب سے بڑے ہیں) یا اَللّٰہُ اکبار یا دونوں کے درمیان واو کا بڑھانا۔

تکبیر کو ایسے ادا کرنا کہ خود سن سکے واجب ہے جن نمازوں میں قیام واجب ہے، مکمل تکبیر قیام کی حالت میں ادا کرنا واجب ہے۔ عربی میں تکبیر ادا کرسکتا ہو تو کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ ادا کرنا کافی نہیں ہے۔

جو عربی میں پوری تکبیر ادا نہ کرسکتا ہو اس کی دو حالتیں ہونگی ۔

(۱) ادا کرنے کی قدرت حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ گونگا ہونے کی وجہ سے ایسا ہے تو اپنے زبان ہونٹ اور کوے کو تکبیر کیلئے بقدر امکان حرکت دے گا۔ بات چیت کرسکتا ہے لیکن باوجود کوشش کے تکبیر کیلئے زبان ساتھ نہیں دیتی تو تکبیر کا تر

جمہ کرے۔ کسی اور ذکر کو اس کی جگہ اختیار نہ کرے۔ ترجمہ کسی بھی زبان میں ادا کرسکتا ہے۔ بعد میں ان نمازوں کا اعادہ واجب نہیں ہے۔

(۲) سیکھ کر تکبیر کی صحیح ادائیگی کی قدرت حاصل کر سکتا ھے، تو اس پر سیکھنا لازم۔ کسی جنگل یا ایسی جگہ ہے جہاں سکھانے والا کوئی نہیں تو سیکھنے کیلئے سفر کرنا لازم ہے۔ جو نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے سیکھ سکتا ہو، اس کے لئے اول وقت میں ترجمہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

ذہن کی کمزوری یا وقت کی تنگی کی وجہ سے ترجمہ کے ذریعے نماز پڑھ لی، تو بعد میں اعادہ لازم نہیں ہے۔ باوجود امکان کے سیکھنے میں تاخیر کی اور وقت تنگ ہوا تو ترجمہ سے نماز پڑھ لے، لیکن بعد میں اعادہ واجب ہے۔ نماز شروع کرنے کی نیت سے ایک سے زائد تکبیر کہے اور دو تکبیروں کے درمیان نماز سے نکلنے کی نیت نہ کرے تو طاق عدد سے نماز میں داخل ہوگا، اور جفت سے نماز باطل ہوگی، لہٰذا پہلی تکبیر سے نماز شروع ہوگی دوسری تکبیر سے باطل پھر تیسری تکبیر کہے، تو نماز میں داخل ہوگا اور چوتھی تکبیر سے نکل جائے گا اور اسی ترتیب سے آگے کی تکبیرات کا حکم ہوگا۔ پہلی تکبیر کے بعد والی تکبیروں سے نماز شروع کرنے یا توڑنے کی نیت نہ کرے تو پہلی تکبیر سے نماز شروع ہوگی۔ بقیہ تکبیرات ذکر شمار ہوگی، اس سے نماز باطل نہ ہوگی۔

رفع یدین۔(دونوں ھاتھ اٹھانا)

حدیث: (۱) آپ ﷺ نماز کی ابتداء میں دونوں دست مبارک کاندھوں تک اٹھایا کرتے، اور جب رکوع کی تکبیر کہتے، ''اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اسی طرح دونوں ہاتھ اٹھاتے'' (متفق علیہ، عن ابن عمر) بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے'' وفات تک آپ ﷺ کے نماز کی یہی کیفیت رہی'' اور بخاری کی روایت میں مزید یہ بھی ہے ''سجدے میں جاتے وقت اور سجدے سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین نہ کرتے۔''

(۲) آپ ﷺ نے تکبیر تحریمہ کے وقت کاندھا کے بالمقابل ہاتھوں کو بلند کیا۔(شافعی، احمد)

تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانا سنّت ہے۔ ہاتھوں کو اس طرح اٹھائے کہ انگلیوں کے سرے کان کے اوپری کنارے کے بالمقابل، دونوں انگوٹھے کان کی لو کے بالمقابل، اور ہتھیلی کاندھے کے بالمقابل آجائے۔ رفع یدین کے وقت دونوں ہتھیلی قبلہ کی طرف ہو۔ اگر دونوں یا ایک ہتھیلی کٹی ہوئی ہو تو بازو کو اٹھائے، کہنیوں سے ہاتھ کٹا ہو تو بقیہ حصے کو اٹھائے۔

اگر کسی عذر سے مذکورہ حد کی پابندی نہیں کرسکتا، بلکہ کچھ کم یا زیادہ ہی اٹھانا پڑتا ہے، تو جیسا ممکن ہو عمل کرے۔ کم اور زیادہ دونوں ممکن ہو تو زیادہ پر عمل کرے۔

رفع یدین ہر نمازی کیلئے سنت ہے۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھے یا بیٹھ کر، فرض نماز ہو یا نفل، امام ہو یا مقتدی، افضل صورت یہ ہے کہ ہاتھ اٹھانا شروع کرتے وقت تکبیر کہنا بھی شروع کرے (اور بہتر ہے کہ ہاتھ مذکورہ حد تک پہنچتے ہی تکبیر بھی مکمل ہو چکی ہو۔ (حاشیۃ الروضہ)

تکبیر شروع کرے اور رفع یدین نہ کرے تو تکبیر مکمل ہونے سے پہلے رفع یدین کرے۔ اگر تکبیر مکمل ہو چکی تو اب رفع یدین نہ کرے۔ (کیونکہ اس کا محل فوت ہو چکا)

مستحب ہے کہ رفع یدین کے وقت دونوں ہاتھ کھلے ہوں (چادر وغیرہ میں چھپے نہ ہوں) اور انگلیوں کو متوسط درجہ میں جدا اور کشادہ رکھے۔ تکبیر اتنی جلدی نہ ادا کرے کہ سمجھ میں نہ آئے اور نہ زیادہ مد کرے۔

ہاتھ باندھنا

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے تکبیر کے بعد دایاں ہاتھ بائیں پر رکھا۔ (مسلم) (۲) آپ ﷺ قیام میں دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتے (نسائی) (۳) بعض روایات میں ہاتھ باندھنے کو انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سنتوں میں شمار کیا (دار قطنی۔ بیہقی۔ طبرانی) تکبیر کے بعد اب ہاتھوں کو سینے کے نیچے تک لا کر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے نچلا حصہ کچھ گٹا اور بازو کو پکڑے۔ پھر سینے کے نیچے اور ناف سے اوپر رکھے۔

فصل۔ قیام (نماز میں کھڑے ہونا)

حدیث: بخاری شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھو، یہ نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھو، یہ نہ ہو سکے تو کروٹ کے بل (لیٹ کر) پڑھو" نسائی کی روایت میں آگے یہ بھی ہے کہ "یہ نہ ہو سکے تو چت لیٹ کر پڑھو، ہر کسی کو اللہ اس کی حیثیت کے مطابق ہی مکلف بناتا ہے۔ (مغنی المحتاج ۱/ ۱۵۳) قیام نماز کا رکن ہے۔ نفل نماز میں بیٹھنا قیام کے قائم مقام ہے۔ مجبوری کی صورت میں فرض نماز میں بھی بیٹھنا قیام کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ استقلال کے ساتھ بغیر سہارے کے کھڑے رہنا شرط نہیں ہے۔ کسی دیوار یا انسان سے ایسے ٹیک لگا کر کھڑا ہو کہ اس کے ہٹائے جانے کی صورت میں وہ گر جائے گا تو نماز کراہت کے ساتھ صحیح ہوگی۔ اگر بغیر ٹیک اور سہارے کے کھڑا نہیں رہ سکتا تو سہارے سے کھڑا رہنا واجب ہے۔ صرف سر جھکانے سے قیام میں خلل نہ ہوگا۔ اصل اعتبار ریڑھ کی ہڈی کو کھڑے رکھنے کا کیا جائیگا۔ لہٰذا جو صحیح قیام کر سکتا ہو اسے قیام کی ہیئت سے ہٹ کر دائیں یا بائیں جانب جھکنے کی یا آگے کی طرف رکوع کی حد تک جھکنے کی اجازت نہ ہوگی۔ آگے اتنا جھکے کہ رکوع کی حد تک نہ پہنچے، لیکن کھڑے ہونے کے مقابلے میں رکوع سے قریب ہو تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

بغیر کسی کی مدد کے کھڑے نہیں ہو سکتا، لیکن کھڑے ہونے کے بعد زیادہ تکلیف نہیں ہوتی، تو کسی کی مدد سے کھڑے ہو جانا لازم ہے۔ اگر مفت میں کوئی اس طرح تعاون نہ کرے اور اس کے پاس مناسب اجرت موجود ہے تو اجرت دے کر مدد لینا لازم ہے۔ مذکورہ تفصیلات اس کیلئے ہے جو اس پر قادر ہو۔ کوئی مجبور ہو مثلاً اپاہج پن یا بڑھاپے کی وجہ سے کسی کی کمر اتنی جھک چکی ہے کہ رکوع کے حد تک پہنچی ہے تو وہ اسی حال پر قیام کرے گا، جب رکوع کا وقت آئے اور مزید جھک سکتا ہے، تو رکوع کیلئے مزید جھکے قیام تو کر سکتا ہے لیکن پشت میں کسی تکلیف کی وجہ سے رکوع اور سجدہ سے عاجز ہے تو اس پر قیام لازم ہے اور رکوع اور سجدہ کو حسب گنجائش ادا کرے۔ ممکنہ حد تک پشت کو جھکائے اس کی گنجائش نہ ہو تو سر اور گردن کو جھکائے اس کے لئے کسی چیز پر ٹیک لگانے یا پہلو کی طرف جھکنے کی ضرورت پڑے تو یہ لازم ہے بالکل ہی جھکا نہیں سکتا تو رکوع سجدہ کی طرف اشارہ کرے قیام اور لیٹنا ممکن ہو لیکن بیٹھ نہ سکتا ہو تو بیٹھنے کی جگہ قیام کرے گا۔ بغیر عذر کے صرف ایک پیر پر کھڑے ہونا صحیح ہے لیکن مکروہ ہے۔ دونوں پیروں کو آپس میں ملا کر رکھنا مکروہ ہے۔ مستحب یہ ہے کہ دونوں میں فاصلہ ہو۔ رکوع سجدہ کو طویل کرنے کے مقابلے میں قیام کو طویل کرنا افضل ہے۔ اور رکوع کے مقابلہ میں سجدہ کو طویل کرنا افضل ہے۔

جو قیام سے عاجز ہو

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا! "نماز کھڑے ہو کر پڑھو اگر اس کی قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر (پڑھو) ورنہ پھر پہلو کے بل (پڑھو)

(بخاری شریف) نسائی میں آگے یہ بھی فرمایا ورنہ چت لیٹ کر۔(تلخیص ۔ ۱/ ۲۴۰)

فرض نماز میں قیام سے عاجز ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے، اوراس سے ثواب میں کمی نہ ہوگی، کیونکہ وہ معذور ہے، عاجز ہونے سے یہ مراد نہیں کہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا بلکہ قیام سے ہلاکت کا خوف ہو، مریض کو شدید مشقت پیش آئے، سمندری سفر میں غرق ہونے کا خطرہ ہو، یا سر گھومنے اور چکرانے لگے، تو بیٹھ کر نماز پڑھے۔کھڑے ہوکر نماز پڑھنے میں دشمن کا خطرہ ہو، تو بیٹھ کر نماز پڑھے، لیکن بعد میں اعادہ واجب ہے، کیونکہ یہ نادر عذر ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کیلئے کسی خاص طرز اور ہیئت پر بیٹھنا متعین نہیں ہے، کسی بھی طرح بیٹھ کر نماز پڑھنا کافی ہے۔لیکن اقعاء کا انداز اختیار کرنا نماز میں مکروہ ہے۔

اقعاء: دونوں سرین پر بیٹھ کر ران اور گھٹنے کو کھڑا رکھنا، اقعاء کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ اسمیں کتے اور بندر سے مشابہت پائی جاتی ہے، جیسا کہ بعض روایات میں صراحت ہے (حاشیۃ الجمل ۱/ ۳۴۲) افضل یہ ہے کہ افتراش کی ہیئت میں بیٹھے (یعنی جیسے تشہد اول میں بیٹھتے ہیں جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔)

بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں رکوع کیلئے کم از کم اتنا جھکے کہ چہرہ (یا صرف پیشانی) گھٹنے سے آگے کی جگہ کے بالمقابل آجائے۔ اکمل رکوع کے لئے اتنا جھکے کہ پیشانی سجدہ کی جگہ کے مقابل آجائے۔سجدہ میں کچھ فرق نہیں ہے۔کھڑے ہوکر نماز پڑھنے والے کی طرح ہی سجدہ کرے گا۔مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ اس پر قادر ہو، کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے اس طرح رکوع سجدہ نہیں کرسکتا تو جتنا ممکن ہو جھکے، اگر سجدہ نہیں کرسکتا صرف رکوع کرسکتا ہے، تو سجدہ کے وقت بھی رکوع کی طرح جھکے سجدہ نہیں کرسکتا لیکن کامل رکوع سے کچھ زیادہ جھک سکتا ہے تو رکوع کیلئے کامل طریقے سے زیادہ نہ جھکنا واجب ہے۔اور سجدہ کیلئے جتنا زیادہ جھک سکتا ہو، جھکنا واجب ہے۔حتی کہ اگر کنپٹی یا پیشانی سے اوپر سر کی ہڈی کے بل سجدہ کرسکتا ہو، اوراس طرح کرنے سے پیشانی زمین سے زیادہ قریب ہوتی ہو تو اس طرح کرنا لازم ہے۔

کوئی شخص تنہا مکمل نماز کھڑا ہوکر پڑھ سکتا ہو (مختصر پڑھنے کی وجہ سے) لیکن باجماعت پڑھنے کی صورت میں نماز کا کچھ حصہ بیٹھ کر پڑھنے کی نوبت آتی ہو تو اسے تنہا پڑھنا افضل ہے۔باجماعت کچھ بیٹھ کر پڑھے تب بھی نماز صحیح ہوگی۔اگر کسی کی حالت ایسی ہو کہ صرف سورہ فاتحہ پڑھنے کی صورت میں قیام ممکن ہو اور دوسری سورت ملالینے کی صورت میں بیٹھنا پڑتا ہو، تو صرف سورہ فاتحہ سے نماز پڑھ لے۔اگر سورت بھی شروع کردی پھر عاجز ہوا تو بیٹھ جائے۔رکوع کی خاطر سورت چھوڑنا لازم نہیں ہے۔

جو بیٹھنے سے عاجز ہو

عاجز ہونے سے مراد بیٹھنا مشکل ہو یا بیٹھنے میں شدید مشقت ہوتی ہو جیسا کہ قیام کے سلسلہ میں گذرا۔جو بیٹھ کر نماز پڑھنے سے عاجز ہو دائیں کروٹ پر چہرہ اور بدن کے اگلے حصہ کو قبلہ رو کر کے لیٹے جیسا کہ میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے (بغیر عذر کے) بائیں کروٹ پر لیٹے تو نماز صحیح ہوگی لیکن سنت کے خلاف ہوگا اگر کروٹ کے بل نہیں لیٹ سکتا تو پیر کے تلووں کو قبلہ رو کر کے چت لیٹے اور سر کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھدے تاکہ چہرہ قبلہ رو ہوجائے اور نماز ادا کرے۔ (مغنی المحتاج ۔ ۱/ ۱۰۰)

رکوع سجدہ کرسکتا ہو تو کرے ورنہ آگے کی طرف جھک کر جتنا ممکن ہو پیشانی کو زمین کے قریب کر کے اشارے سے ادا کرے۔سجدہ کو رکوع کے مقابلہ میں زیادہ پست رکھے سر سے اشارہ نہ کرسکتا ہو تو آنکھ اور پلک کے اشارے سے ادا کرے اس سے بھی عاجز ہو تو نماز کے افعال اپنے دل پر جاری کرے (دل میں رکوع سجدہ وغیرہ کا تصور کرے)

اگر زبان بند ہو جائے تو قرآن اور دیگر اذکار کو دل پر جاری کرے بہر حال جب تک ہوش باقی ہے نماز ساقط نہ ہوگی۔ قیام پر قادر شخص آشوب چشم میں مبتلا ہو اور کوئی معتبر طبیب یہ کہے کہ بیٹھ کر یا چت یا کروٹ لیٹ کر نماز پڑھنے کی صورت میں علاج ہو سکتا ہے، ورنہ نابینا ہونے کا خطرہ ہے تو اس کے مشورہ پر عمل کرنا جائز ہے۔

دوران نماز قیام سے عاجز ہو جائے تو بیٹھ کر بقیہ نماز مکمل کرے۔ (عذر کی وجہ سے) بیٹھ کر نماز پڑھنے کے دوران قیام پر قادر ہوا تو بقیہ نماز کھڑا ہو کر مکمل کرے گا۔ اسی طرح لیٹ کر نماز پڑھنے کے دوران بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر قادر ہو جائے تو بقیہ نماز بیٹھ کر یا کھڑا ہو کر پوری کرے (یعنی ساری صورتوں میں بقیہ نماز کو قدرت کے مطابق ادا کرنا کافی ہے۔ از سر نو دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔) اگر حالت نقص سے کمال کی طرف بدل جائے مثلاً بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے مرض کے افاقہ کی وجہ سے قیام کی قدرت حاصل ہو جائے اور قرأت سے پہلے ہی ایسا ہو جائے تو کھڑا ہونے کے بعد قرأت کریگا۔ اگر دوران قرأت ایسا ہو تو بقیہ سورہ فاتحہ کھڑا ہونے کے بعد پڑھے گا۔ کھڑے ہوتے ہوئے پڑھنا منع ہے، اگر پڑھ لیا تو مکمل کھڑا ہونے کے بعد اس کو دوہرانا واجب ہے۔

سورہ فاتحہ مکمل ہونے اور رکوع کرنے سے قبل قیام پر قادر ہو جائے تو اب قیام واجب ہے تا کہ قیام سے رکوع کیلئے جھکے۔ لیکن اس قیام میں طمانینت لازم نہیں ہے۔ کیونکہ اصل مقصود قیام نہیں ہے۔ (بلکہ قیام سے رکوع میں جانا مقصود ہے۔ لہٰذا کھڑا ہو کر فوراً ہی رکوع میں جانا کافی ہے) مذکورہ صورتوں میں قیام میں پوری سورہ فاتحہ پڑھ لینا مستحب ہے، تا کہ کمال کی حالت میں قرأت حاصل ہو۔ بیٹھ کر رکوع میں جانے کے بعد طمانینت سے پہلے طبیعت میں افاقہ ہو تو قیام سے رکوع میں جانے کی حد تک اٹھ جانا واجب ہے۔

تشریح: اتنا اٹھ جائے کہ قیام سے رکوع میں جانے کی صورت میں جو کیفیت اور ہیئت ہوتی ہے وہ حاصل ہو جائے، سیدھے کھڑے ہو کر پھر رکوع میں جانا جائز نہیں ہے تا کہ ایک رکوع زائد نہ ہو اگر ایسا کیا تو نماز باطل ہوگی۔ اور بیٹھ کر رکوع میں جانے اور طمانینت حاصل ہونے کے بعد طبیعت میں افاقہ ہو تو رکوع مکمل ہو چکا، لہٰذا سابقہ طرز پر رکوع کیلئے کھڑا ہونے کی ضرورت نہیں اعتدال میں آنے کے بعد افاقہ ہوا اور ابھی طمانینت حاصل نہ ہوئی ہو تو کھڑا ہونا لازم ہے، تا کہ اعتدال اور طمانینت حاصل ہو۔ اگر طمانینت کے بھی بعد افاقہ ہو تو قیام لازم نہیں ہے، تا کہ اعتدال طویل نہ ہو جائے حالانکہ وہ قصیر (مختصر) رکن ہے۔ فجر کی دوسری رکعت میں اس طرح کا اتفاق ہو (یعنی اعتدال و طمانینت کے بعد افاقہ ہو) تو قنوت بیٹھ کر نہ پڑھے ورنہ نماز باطل ہوگی۔ بلکہ کھڑا ہو جائے اور قنوت پڑھ لے۔ اگر نماز کے دوران کمال سے نقص کی طرف لوٹنا پڑے، یعنی نماز میں کوئی مجبوری پیش آ جائے (بیمار ہونا وغیرہ) تو جسطرح ممکن ہو نماز پڑھ لے۔

تشریح: باقاعدہ قیام وغیرہ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز میں کسی بیماری کی وجہ سے قیام سے عاجز ہو گیا تو بیٹھ جائے، بیٹھنے سے بھی عاجز ہو تو بقیہ نماز لیٹ کر پوری کرے۔ اسی طرح رکوع سجدہ وغیرہ کا بھی حکم ہے سورۂ فاتحہ کے دوران عاجز ہو تو بیٹھتے بیٹھتے قراءت کا جاری رکھنا واجب ہے۔

بیٹھ کر نفل پڑھنا

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''کھڑے ہو کر نماز پڑھنا افضل ہے، اور جو بیٹھ کر پڑھے اسے کھڑے ہو کر پڑھنے والے سے نصف ثواب ملے گا، اور جو لیٹ کر پڑھے اسے بیٹھنے والے سے نصف ثواب ملے گا'' (بخاری شریف) قیام پر قادر ہونے کے

باوجود نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔لیکن اس صورت میں قیام کے مقابلے میں نصف ثواب حاصل ہوگا۔قیام اور بیٹھنا ممکن ہوتے ہوئے لیٹ کر نفل نماز پڑھ سکتا ہے،لیکن قدرت ہوتو رکوع وسجدہ کیلئے بیٹھنا لازم ہے،صرف اشارہ کافی نہ ہوگا،اسی طرح کروٹ لیٹنا ممکن ہوتو چت لیٹ کر پڑھنا صحیح نہیں ہے،ورنہ صحیح ہے۔(مغنی المحتاج ۱/ ۱۵۵)ان مسائل میں سارے نوافل کا یہی حکم ہے سنن راتبہ،عید،کسوف اور استسقاء وغیرہ کی نماز ہو یا کوئی اور نفل۔

فصل ۔ دعاء استفتاح

تکبیر تحریمہ کے بعد نمازی کو دعاء استفتاح پڑھنا سنت ہے۔درج ذیل صورتوں میں دعاء استفتاح پڑھنا سنت نہیں ہے۔

(۱)دعاء استفتاح پڑھنے کی صورت میں امام کے پیچھے پوری سورۂ فاتحہ نہ ملنے کا اندیشہ ہو۔

(۲)نماز کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو۔

(۳) قیام کے علاوہ کسی اور رکن میں آ کر امام کے ساتھ شامل ہوجائے البتہ امام کے آخری تشہد میں کوئی آ کر شامل ہو جائے،اور اس کے بیٹھنے سے پہلے امام سلام پھیر دے،یا تشہد اول میں شامل ہوجائے اور بیٹھنے سے قبل ہی امام اٹھ جائے،یا امام کی موافقت کرنے سے قبل ہی حدث وغیرہ کی وجہ سے وہ نماز سے نکل جائے تو ان صورتوں میں دعاء استفتاح پڑھنا مسنون ہے۔

(۴)نماز جنازہ میں دعاء استفتاح سنت نہیں ہے۔(مغنی ۱/ ۱۵۶،حاشیۃ الروضہ)

دعاء استفتاح:"وَجَّهْتُ وَ جْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيفاً مُسلِماً وَّ مااَنَا مِنَ الْمُشرِكِيْن اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ العٰلَمِيْنَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ بِذَالِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِين"

(**ترجمہ:** میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا سارے باطل ادیان سے منہ موڑ کر صرف اس کی طرف مائل ہوتے ہوئے،مسلمان بن کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں،یقیناً میری نماز وعبادت اور جینا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے۔جو تمام عالم کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔) امام اس سے زیادہ نہ پڑھے،اگر مقتدی اس سے زائد پڑھنے کی اجازت دیں یا کوئی تنہا نماز پڑھ رہا ہو تو اس دعاء کے بعد مزید یہ پڑھنا بھی مستحب ہے۔

"اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ اَنْتَ رَبِّي وَ اَنَاعَبْدُكَ ظَلَمْتُ " **ترجمہ:** یااللہ تو ہی بادشاہ ہے،تیرے سوا کوئی معبود نہیں،تسبیح اور حمد تیرے ہی لئے ہے،تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں"نَفْسِي وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي فَاغْفِرلِي ذُنُوبِي جَمِيْعًا اِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اَنْتَ وَاهْدِنِي " **ترجمہ:** اپنے نفس پر ظلم کیا اور اپنے گناہ کا اعتراف ہے،پس میرے تمام گناہ بخش دے یقیناً تیرے علاوہ کوئی گناہ نہیں بخش سکتا،اور" لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِاَحْسَنِهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ لَبَّيكَ وَ سَعْدَيْكَ وَ الْخَيرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ وَ الشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ اَنَا بِكَ وَاِلَيْكَ تَبارَكْتَ وَ تَعَالَيْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَ اَتُوبُ اِلَيْك " **ترجمہ:** مجھے بہترین اخلاق کی ہدایت فرما،جو تو ہی فرما سکتا ہے۔اور برے اخلاق کو مجھ سے ٹال دے جسے تو ہی ٹال سکتا ہے۔میں تیری اطاعت وفرمانبرداری پر ہمیشہ قائم ہوں اور تمام خیر تیرے ہاتھ ہے،اور شر تیری طرف منسوب نہیں،تو ہی توفیق بخشنے والا ہے اور تجھ سے التجاء ہے تو بابرکت اور اعلی ہے تجھ سے مغفرت کا طالب اور تیری بارگاہ میں تائب ہوں۔

تنہا نماز پڑھنے والے کیلئے اور اس امام کیلئے جس کے مقتدی محدود و متعین اور تطویل سے راضی ہوں اور دیگر مقتدیوں کا آ کے شامل

ہونے کا امکان نہ ہو، مندرجہ بالا دعاء کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی درج ذیل دعاء پڑھنا بھی مستحب ہے۔

حدیث: آپ ﷺ تکبیر اور قرأت کے درمیان یہ دعاء پڑھا کرتے تھے۔

'' اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَ بَيْنَ خَطَايَایَ كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ ۔ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَایَ بِالْمَاءِ وَ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ''(رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ)

ترجمہ: یا اللہ میرے اور میرے گناہوں کے درمیان مشرق و مغرب کی طرح دوری فرما یا اللہ مجھے گناہوں سے ایسا پاک وصاف فرما جیسے سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ یا اللہ میرے گناہوں کو پانی اور برف اور اولے سے دھولے۔

استفتاح کے متعلق دیگر روایات بھی مروی ہیں، ان میں سے کسی بھی دعاء کو پڑھ لینے سے استفتاح کی سنّت حاصل ہوگی۔ لیکن شوافع کے نزدیک افضل حضرت علیؓ سے مروی حدیث (یعنی وَجَّهْتُ الخ) اور اس کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت (اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ الخ) ہے۔ (شرح مہذب ۳/ ۳۱۹۔ ۳۲۱)

امام نوویؒ نے۔ الاذکار میں استفتاح کے متعلق وارد تمام روایات کو جمع کیا ہے اور لکھا ہے۔ کہ منفرد یا، وہ امام جس کے مقتدی تطویل کی اجازت دیں، ان تمام دعاؤں کو پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے۔ (الاذکار ص ۴۲ تا ص ۴۴) کسی نے عمداً یا بھول کر دعاء استفتاح چھوڑ دی اور تعوذ (اعوذ باللہ) شروع کردی تو اب دعاء استفتاح نہ پڑھے، اور نہ کسی اور رکعت میں اس کی تلافی کرے گا۔

مسبوق (بعد میں آکر امام کے ساتھ شامل ہونے والا مقتدی) آخری تشہد میں امام کے ساتھ نماز میں شامل ہوا اور تکبیر کہہ کے بیٹھ جائے اور بیٹھتے ہی امام سلام پھیردے تو کھڑا ہو لیکن اب دعاء استفتاح نہ پڑھے۔ کیونکہ اس کا محل فوت ہو چکا۔ اگر بیٹھنے سے قبل امام سلام پھیردے تو نہ بیٹھے اس صورت میں دعاء پڑھ لے دعاء استفتاح فرض نماز اور تمام نفل نمازوں میں پڑھنا سنّت ہے۔ (صرف جنازہ کی نماز میں سنّت نہیں ہے) مسبوق کے نماز میں داخل ہوتے ہی امام آمین کہے تو یہ بھی امام کے ساتھ آمین کہے، پھر دعاء استفتاح پڑھے۔

فصل۔ تعوذ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

آیت: ''فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُراٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ''(النحل ۔ ۹۸)

ترجمہ: تو جب آپ قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔'' دعاء استفتاح کے بعد ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' کہنا مستحب ہے۔ تمام نمازوں میں تعوذ سراً (آہستہ) ادا کرے۔

تعوذ ہر رکعت میں مستحب ہے۔ لیکن پہلی رکعت میں اس کی زیادہ تاکید ہے۔

حدیث: مسند احمد، اصحاب سنن، حاکم ابن حبان، دار قطنی اور بیہقی وغیرہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ آپ ﷺ کا تعوذ پڑھنا وارد ہے۔ (تلخیص الحبیر ۔ ۱ ۔ص ۔ ۲۴۴ ؍ ۲۴۵)

فصل (قرأت (تلاوت)

تعوذ کے بعد قرأت کرے نمازی یا تو سورہ فاتحہ کی قرأت پر قادر ہوگا یا نہیں۔ جو سورہ فاتحہ کی تلاوت کرسکتا ہو اسے قیام یا قیام کے بدل (بیٹھنے یا لیٹنے) میں سورۂ فاتحہ ہی کی تلاوت لازم ہے۔ ترجمہ یا سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن میں سے کچھ اور پڑھ لینا کافی نہ ہوگا۔

امام، مقتدی اور منفرد (تنہا نماز پڑھنے والا) سب پر سورہ فاتحہ کی تلاوت متعین ہے، چاہے سری نماز ہو، یا جہری، جہری نماز میں بھی مقتدی آہستہ اس طرح تلاوت کرے کہ خود اس کا نفس سن سکے۔ امام کو جہری نماز میں اپنی فاتحہ کے بعد اتنی دیر چپ رہنا مستحب ہے جس میں مقتدی فاتحہ پڑھ سکے۔

سورہ فاتحہ کی فرضیت کی دلیل

حدیث: (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو سورہ فاتحہ کی تلاوت نہ کرے اس کی نماز (درست) نہیں'' (صحاح ستہ بسند عن عبادة بن الصامت) امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث آپ ﷺ سے تواتر منقول ہے۔ (جزء القرأة)

(۲) وہ نماز کافی نہیں جس میں سورہ فاتحہ کی تلاوت نہ ہو'' (ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم باسناد صحیح)

(۳) ایک صحابی کو نماز کی تعلیم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا..... ''پھر سورہ فاتحہ پڑھو.....'' (ابوداؤد، احمد ابن حبان) مکمل نماز سکھلانے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر رکعت میں اسی طرح کرو۔ (بخاری، ترمذی، بسند اسحاق، بیہقی)، (تحفة الاحوذی جلد دوّم)

مقتدی پر سورہ فاتحہ کے وجوب کے دلائل

احادیث: (۱) حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''آپ ﷺ نے فجر کی نماز ادا کی تو آپ ﷺ پر قرأت گراں ہوئی، نماز کے بعد فرمایا!'' میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے امام کے پیچھے (اقتدا میں) قرأت کرتے ہو؟'' ہم نے کہا۔ یا رسول اللہ باللہ ہم تلاوت کرتے ہیں'' تو فرمایا'' سورہ فاتحہ کے علاوہ تلاوت نہ کرو کیونکہ جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز (درست) ہی نہیں'' (احمد بخاری، فی جزء القراء۔ وصححه ابوداود۔ رواه الترمذی والدارقطنی وابن حبان والحاکم والبیهقی)

امام خطابی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر بالکل صریح دلالت کرتی ہے کہ سورہ فاتحہ کی تلاوت مقتدی پر واجب ہے، خواہ امام جہراً تلاوت کرے یا سراً۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا'' جو ایسی نماز پڑھے جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ ناقص و ناتمام ہے'' تین مرتبہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں (تو اس وقت کیا کریں) تو فرمایا: اپنے جی میں (آہستہ) پڑھو۔ (مسلم)

(۳) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے یہ پوچھا کہ تم لوگ امام کی تلاوت کے دوران تلاوت کرتے ہو؟ پھر صحابہ نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا'' یوں نہ کرو، اور تم اپنے جی میں سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرو'' (بخاری فی جزء القرأة۔ بیهقی فی کتاب القرأة، ابن حبان، طبرانی فی الاوسط)

بیہقی نے کتاب القرأۃ میں حضرت ابو قتادہ اور عمر بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے بھی اس طرح کی حدیث نقل فرمائی ہے۔

آثار: (۱) یزید بن شریک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مقتدی کے لئے تلاوت کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا:'' سورہ فاتحہ پڑھو'' پوچھا گرچہ آپ امام ہو؟ فرمایا: گو میں ہوں، پوچھا: اگرچہ آپ جہراً تلاوت کریں (بلند آواز سے پڑھیں)، فرمایا: جی، جہراً پڑھوں۔ (دارقطنی۔ باسناد صحیح)

(۲) حضرت علی کا فرمان ہے: "ظہر، عصر کی نماز میں امام کے پیچھے پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورت پڑھو اور آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھو" (دارقطنی، حاکم، بیهقی باسناد صحیح)

(۳) ابونعیم جہراً تلاوت کر رہے تھے اور پیچھے حضرت عبادہ بن صامت سورہ فاتحہ پڑھ رہے تھے، استفسار کرنے پر حضرت عبادہ نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ جہری نماز میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ مت پڑھو۔ (دارقطنی وحسنه)

(۴) حضرت جابرؓ کا فرمان ہے: "ہم لوگ امام کے پیچھے ظہر وعصر کی پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ اور دوسری ایک سورت اور آخری دو رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔" (ابن ماجه بسند صحیح)

(۵) حضرت انسؓ خود بھی امام کے پیچھے سورہ کی تلاوت فرماتے اور شاگردوں کو بھی اس کا حکم فرماتے۔ (بیهقی فی کتاب القرأة)

(۶) حضرت ابوسعید خدری نے مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے کا فتویٰ دیا۔ (بیهقی بسند حسن)

(۷) حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے: "امام کے پیچھے (سورہ فاتحہ کی) تلاوت کرو، نماز جہری ہو یا نہ ہو"۔ (بیهقی بسند صحیح)

(۸) حضرت عمران بن حصین نے بھی مقتدی وغیر مقتدی کو سورہ فاتحہ کی تلاوت کا حکم دیا۔ (بیهقی)

(۹) حضرت سعید بن جبیر سے بسند صحیح مروی ہے کہ سلف امامت کی صورت میں مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے کا موقع دیتے تھے۔ (کتاب القراء للبخاری) حضرت سعید نے کافی صحابہ کرام اور اکابر تابعین کا زمانہ پایا ہے۔

(۱۰) حضرت عروہ بن زبیر (تابعی) کا فرمان ہے: "امام کے سکتہ میں تلاوت کرو" کیونکہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز مکمل نہ ہوگی" (بیهقی)

جن احادیث میں مقتدی کے لئے تلاوت کی ممانعت ہے۔ امام بیہقی وغیرہ فرماتے ہیں کہ اسے سورہ فاتحہ کے علاوہ دوسرے سورت کی تلاوت یا جہراً تلاوت پر محمول کریں گے جیسا کہ مفصل روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

(اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں تحفة الاحوذی شرح ترمذی ۲/۲۲۶-۲۵۳، تحقیق الکلام (اردو) مولانا عبدالرحمن مبار کپوری، البار المنن، تلخیص الحبیر کتاب القرأة خلف الامام للبخاری جزو القرأة للبیهقی، امام الکلام عبدالحی لکھنوی، مرعاة المفاتیح شرح مشکوٰة لعبید الله مبار کپوری وغیره)

فاتحہ ہر رکعت میں واجب ہے، لیکن امام کے رکوع کے وقت جو مسبوق آکر نماز میں شامل ہو اس پر واجب نہیں ہے۔ بغیر سورہ فاتحہ پڑھے امام کے ساتھ رکوع ملنے کی صورت میں وہ رکعت مقتدی کے حق میں اسی وقت شمار ہوگی۔ جبکہ امام کیلئے شمار ہو۔ اگر امام بے وضو تھا یا غلطی سے پانچویں رکعت پڑھ رہا تھا تو صرف رکوع میں شامل ہونے سے وہ رکعت شمار نہ ہوگی۔

مقتدی کے تلاوت کی رفتار سست ہو، یا وہ اپنے نماز میں ہونے کو بھول جائے، یا بھیڑ کی وجہ سے وقت پر سجدہ نہ کر پائے، یا امام کے رکوع کے بعد فاتحہ پڑھنے میں شک ہوا، اور اس کے لئے پیچھے رہا، اور ان تمام صورتوں میں امام سے تین طویل رکن پیچھے رہا اور عذر ختم ہونے تک امام دوسری رکعت کے رکوع میں پہنچ چکا ہے تو ان صورتوں میں بھی یہ مقتدی امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہوگا اور اسے یہ رکعت مل جائیگی۔ کوئی امام کے ساتھ قیام میں آکر شامل ہوا اور سورہ فاتحہ شروع کرے لیکن مکمل ہونے سے پہلے امام رکوع میں جائے تو بقیہ فاتحہ کو مکمل کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ امام کے ساتھ رکوع میں چلا جائے اور یہ رکعت بھی شمار ہوگی۔ (حاشیة الروضه، الجمل ۱/ ۳۴۵)

بسمله : " بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ "سورہ فاتحہ کے ابتداء میں ایک مکمل آیت ہے۔ اسی طرح سورہ برأت (توبه) کے علاوہ بقیہ تمام سورتوں کے ابتداء میں بھی مکمل آیت ہے۔ آپ ﷺ نے " بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ "کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت شمار

کیا۔(رواہ ابن خزیمہ،والحاکم،جمل ۱/ ۳۴۵)

خطیب،ابن حجر۔اور ابن عبدالحق نے فرمایا کہ سورہ برأت کے ابتداء میں بسم اللہ کی تلاوت حرام اور درمیان میں مکروہ ہے۔(جمل ۱/ ۳۴۵)جہری نماز میں سورہ فاتحہ اور بعد والی سورت کے ابتداء میں"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "کو بھی جہراً ادا کرنا سنّت ہے۔سورہ فاتحہ کو تمام حروف اور تشدیدات کی رعایت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔کسی حرف یا تشدید کو چھوڑ دیا یا ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھا تو قرأت صحیح نہ ہوگی۔چاہے حرف ضاد کو بدلے یا کسی اور حرف کو قرأت میں ایسا لحن (غلطی) کرے جس سے معنی بدل جائے جیسے اَنْعَمْتُ تا کے پیش یا زیر کے ساتھ پڑھے یا اِيَّـاكِ کاف کے زیر کے ساتھ پڑھے تو صحیح نہیں ہے۔اگر عمداً اس طرح پڑھے تو نماز باطل ہوگی اور عمداً نہیں پڑھا تو دوبارہ صحیح قرأت کرنا واجب ہے۔قرأت سبعہ (سات قرأتوں) میں سے کسی بھی قرأت کو اختیار کر سکتے ہیں۔

سورہ فاتحہ کی تلاوت میں ترتیب واجب ہے۔اگر عمداً آگے پیچھے پڑھا تو قرأت باطل ہوگی۔دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔غلطی سے اس طرح ہوا تو ابتدائی مرتب آیات کا اعتبار ہوگا۔اس پر بنا کر کے بعد والی آیات کو پھر پڑھے لیکن زیادہ دیر گذری ہو تو مکمل فاتحہ از سر نو پڑھے۔

تشریح: مثلاً کسی نے" اِيَّاكَ نَعْبُدُ "سے آخر تک پہلے پڑھا پھر" بِسْمِ اللّٰهِ "سے" مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ " تک پڑھا اور عمداً اس طرح کیا ہے تو نئے سرے سے مکمل سورت ترتیب سے پڑھ لے۔غلطی سے اس طرح ہوا تو بعد میں" بِسْمِ اللّٰهِ "سے "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ " تک پڑھنا معتبر ہے،اب اس کے آگے" اِيَّاكَ نَعْبُدُ "سے آخر تک ترتیب سے پڑھ لینا کافی ہے۔کسی نے" بِسْمِ اللّٰهِ "سے مکمل پڑھی پھر "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ"چھوڑ کر بقیہ آیتوں کو پڑھتا رہا اور کافی دیر ہوئی تو اب" بِسْمِ اللّٰهِ "کے بعد سے پڑھنا کافی نہیں، بلکہ "بِسْمِ اللّٰهِ"سے شروع کرنا واجب ہے۔

اگر عمداً تشہد کی ترتیب کو ایسا بگاڑ دے کہ معنی غلط ہو جائے تو نماز باطل ہوگی (اور عمداً نہیں ہے تو نماز باطل نہ ہوگی۔لیکن اس کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ تشہد کو صحیح دوہرانا واجب ہے)اور معنی نہ بگڑے تو اس طرح پڑھنا کافی ہو جائے گا۔

تشریح: کسی نے تشہد کو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ "سے"مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ "تک پڑھا پھر" اَلتَّحِيَاتُ"سے "لِلّٰهِ"تک پڑھا تو چونکہ اس سے مفہوم نہیں بگڑا،اس لئے نماز درست ہوگی۔لیکن کسی نے "اَلتَّحِيَاتُ الْمُبَارَكَاتُ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ "وغیرہ پڑھ دیا تو مفہوم بگڑ جائے گا۔اسلئے عمداً ہے تو نماز باطل ہوگی ورنہ پورے تشہد کو از سر نو صحیح پڑھے۔

سورہ فاتحہ کی ترتیب میں عمداً ایسی تبدیلی کرے جس سے مفہوم بدل جائے تو نماز باطل ہوگی۔

تسلسل: سورہ فاتحہ کی آیتوں کے درمیان میں موالات و تسلسل (پے در پے پڑھنا) واجب ہے۔اگر عمداً دوران فاتحہ زیادہ دیر چپ رہا، جیسے تلاوت کا سلسلہ ختم کر رہا ہو، یا کسی عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے تلاوت کی طرف سے اعراض و پہلوتہی برت رہا ہو تو تلاوت باطل ہوگی اور از سر نو تلاوت لازم ہوگی۔دوران تلاوت تھوڑی دیر چپ رہنے میں حرج نہیں۔تلاوت ختم کرنے کی نیّت کرے لیکن چپ نہ رہے تو تلاوت باطل نہ ہوگی۔لیکن ختم کرنے کی نیّت کے بعد تھوڑی دیر بھی چپ رہے تو تلاوت باطل ہوگی۔

سورہ فاتحہ کی تلاوت کے دوران تسبیح یا تہلیل "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه" پڑھے یا کوئی آیت پڑھے تو قرأت باطل ہوگی۔کم پڑھے یا زیادہ، یہ اسوقت ہے جبکہ نمازی کو ان کے پڑھنے کا حکم نہ ہو۔البتہ جس چیز کے پڑھنے کا نماز میں حکم ہو،اور اس کا تعلق نمازی ہی کی مصلحت سے ہو،اس سے قرأت باطل نہ ہوگی، جیسے امام کے ساتھ آمین کہنا،امام کے ساتھ سجدہ تلاوت کرنا،امام کو لقمہ دینا،امام رحمت کی آیت

پڑھے تو اللہ سے رحمت کی دعاء کرنا، عذاب کی آیت پر عذاب سے پناہ مانگنا۔ لہٰذا یہ امور اگر مقتدی کی سورہ فاتحہ کے دوران پیش آئیں تو موالات باطل نہ ہوگی (بعد میں آگے کی آیتوں کا پڑھنا کافی ہے)

نماز میں چھینک آنے پر" الحمد للہ" کہے تو موالات ختم ہوگی۔ اگر بھول کر دورانِ فاتحہ زیادہ دیر چپ رہا تو موالات ختم نہ ہوگی۔ بعد میں صرف آگے کی آیتوں کا پڑھ لینا کافی ہے۔

جو سورہ فاتحہ نہیں پڑھ سکتا۔

جو سورہ فاتحہ پر قادر نہ ہو اسے سیکھنا یا قرأت کا حاصل کرنا تا کہ اس میں دیکھ کر پڑھ سکے لازم ہے۔ تاریکی کی وجہ سے دیکھ کر پڑھنے کیلئے چراغ اور روشنی کی ضرورت ہو، اور اس کا انتظام اس کے بس میں ہو، تو یہ بھی واجب ہے اس کے بس میں ہوتے ہوئے بغیر سورہ فاتحہ کے نماز پڑھے، تو ان تمام نمازوں کا اعادہ واجب ہے۔ اگر سورہ فاتحہ پڑھنے سے عاجز ہو، مثلاً وقت کی تنگی، یا ذہنی کمزوری کی وجہ سے سیکھ نہیں سکتا، یا کوئی سکھلانے والا نہیں ہے، یا قرآن موجود نہیں، وغیرہ صورتیں۔ تو ایسی صورت میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ پڑھنا جائز نہیں ہے اگر کہیں اور سے قرآن پڑھ سکتا ہو تو سات آیتیں پڑھیگا، سات سے کم کافی نہ ہوگے اگر چہ طویل ہوں ان سات آیتوں کے حروف کی مجموعی تعداد سورہ فاتحہ کے حروف سے کم نہ ہونا شرط ہے۔

دو آیتوں کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت کے جگہ پڑھنے میں حرج نہیں۔

"بسم اللہ" سمیت سورہ فاتحہ کے حروف کی تعداد ۱۶۵/ ہے جبکہ مالک کو (الف) کے ساتھ پڑھیں۔ (فتح الوهاب ۱/ ۴۰)

مذکورہ شرط کے مطابق مسلسل سات آیات تلاوت کر سکتا ہو، تب بھی متفرق آیات کا پڑھنا کافی ہے۔ اگر سات آیات سے کم پڑھ سکتا ہو جیسے ایک دو آیتیں تو اتنا پڑھ لے اور بقیہ کی طرف سے ذکر پڑھے۔ جو قرآن میں سے کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا ہو اسے تسبیح وتہلیل وغیرہ ذکر پڑھنا واجب ہے، کسی خاص ذکر کی تعیین نہیں البتہ یہ شرط ہے کہ اس کے حروف کی تعداد سورہ فاتحہ کے حروف سے کم نہ ہو اور سات انواع کے ذکر ہوں تا کہ ہر نوع ایک آیت کے قائم مقام ہو اسی طرح آخرت سے متعلق دعائیہ کلمات کا ادا کرنا بھی کافی ہے، ان اذکار یا دعاء سے سورہ فاتحہ کے بدل کی نیت ضروری نہیں ہے، البتہ یہ لازم ہے کہ ان سے کسی اور چیز کی نیت نہ کرے، جیسے دعاء استفتاح کو استفتاح کی سنت حاصل ہونے کی نیت سے یا تعوذ کی نیت سے پڑھے، تو اس سے سورہ فاتحہ کا بدل نہ ہوگا۔

حدیث: ایک شخص قرآن پڑھنے سے عاجز تھا لہٰذا آپ ﷺ نے اسے نماز میں" سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ " کا حکم دیا۔ (رواہ ابو داود، احمد، النسائی وغیرھم۔ تلخیص ۱/ ۲۵۱) جو کسی ذکر اور دعا کے پڑھنے سے بھی عاجز ہو (وہ ذکر و دعاء کا ترجمہ پڑھے ورنہ) اسے سورہ فاتحہ کی مقدار کھڑا رہنا واجب ہے، پھر رکوع میں جائیگا جس کو سورہ فاتحہ کچھ یاد ہو، اور دوسرا کچھ یاد نہ ہو تو جتنا یاد ہے اسے بار بار پڑھ لے کہ سورہ فاتحہ کے برابر ہو جائے۔ اگر دوسرا بھی کچھ یاد ہے تو جتنی سورہ فاتحہ یاد ہے پڑھ کر بقیہ کی طرف سے بدل کو پڑھے۔ اس صورت میں اگر کسی کو سورہ فاتحہ آخری نصف یاد ہے، ابتدائی نصف یاد نہیں، تو ابتدائی نصف کی طرف سے بدل (ذکر وغیرہ) کو ادا کرنے کے بعد آخری نصف کی تلاوت کرے اس کے برعکس کرے تو کافی نہیں، اور صرف نصف اول یاد ہے تو پہلے اسے ادا کر کے بعد میں بدل کو ادا کرے۔ یہ ساری تفصیل اس وقت ہے کہ جبکہ نماز

کے آخر تک وہ سورہ فاتحہ پڑھنے سے عاجز ہو۔

اگر دوران نماز کسی کے کہلوانے یا قرآن مل جانے وغیرہ کی وجہ سے سورہ فاتحہ پر قادر ہو جائے اور ابھی بدل سے فارغ نہیں ہوا یا بدل کو شروع ہی نہیں کیا۔ تو سورہ فاتحہ کی تلاوت لازم ہے۔

رکوع کے بعد اس طرح قدرت حاصل ہوتی ہے، تو یہ رکعت صحیح ہو چکی۔ رکوع سے سورہ فاتحہ پڑھنے کیلئے لوٹنا جائز نہیں ہے۔ رکوع سے قبل اور بدل سے فارغ ہونے کے بعد قدرت حاصل ہوئی ہے تو سورہ فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے۔

آمین: سورہ فاتحہ پڑھنے والے ہر شخص کو، چاہے نماز کے اندر پڑھے یا خارج نماز سورہ فاتحہ کے بعد آمین (قبول کر) کہنا سنّت ہے۔ "ولا الضآلین" اور "آمین" کے درمیان معمولی سا سکتہ مستحب ہے تا کہ آمیں اور قرآن میں فرق معلوم ہو۔

امام، مقتدی اور منفرد (تنہا نمازی) ہر ایک کیلئے آمین کہنا مستحب ہے، یہ تینوں بھی جہری نماز میں آمین کو جہراً ادا کریں۔ مقتدی کی آمین امام کے آمین کے ساتھ ہونا مستحب ہے، نہ کہ اس کے پیچھے۔ اگر ساتھ فوت ہو جائے تو اس کے بعد کہہ لے۔ کسی نے آمین کو ترک کر دیا اور دوسری چیز (مثلاً سورت کی تلاوت) میں مشغول ہو گیا تو آمین فوت ہو چکی اب لوٹ کر اسے ادا نہ کرے۔

احادیث: (ا) آپ ﷺ "امُّ القرآن" (سورہ فاتحہ کی تلاوت سے فارغ ہونے پر بلند آواز سے آمین کہتے تھے (قال الدارقطني. اسناده حسن والحاكم صحيح على شرطها ۔)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز پڑھائی جب "ولا الضالين" پر پہنچے تو آمین کہا پھر (نماز کے بعد) فرمایا کہ تم سب سے بڑھ کر میری نماز آپ ﷺ کی نماز سے مشابہ ہے۔ (رواه النسائي و علقه البخاري)

(۳) حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے نماز میں "ولا الضالين" کے بعد بلند آواز سے آمین کہی" (رواه ابوداود ،والدارقطني، و ابن حبان)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد ہے جب امام آمین کہے تم بھی آمین کہو۔ اس لئے کہ ملائکہ آمین کہتے ہیں، لہٰذا جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہو (اسی وقت ادا ہو) اس کے سابقہ گناہ معاف ہونگے۔ (متفق علیہ۔ تلخیص ۲۵۲۔۳۵۴) امام مطلوبہ وقت پر آمین کہے تو مقتدی آمین نہ کہہ لے (فتح الوهاب)

سورہ فاتحہ کے بعد تلاوت

فجر کی نماز اور دیگر نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں امام اور منفرد کیلئے سورہ فاتحہ کے بعد کچھ اور تلاوت کرنا سنّت ہے۔ نفل نماز دو رکعت سے زائد ادا کرے، اور دو رکعت پر تشہد نہ پڑھے، تو بقیہ رکعتوں میں بھی فاتحہ کے بعد تلاوت کرے۔ (حاشیۃ الجمل۔ شرح مہذب ۳ /۳۸۷) سورت کی تلاوت سنّت ہے، لہٰذا نہ پڑھے تو نماز صحیح ہوگی، اور سجدہ سہو بھی نہیں کرے گا۔ نماز جنازہ میں سورت کی تلاوت مستحب نہیں ہے۔ (الاذکار ص ۴۶)

کسی سورت کا کچھ حصہ پڑھ لینے سے بھی اصل استحباب حاصل ہو جائے گا۔ لیکن مکمل سورت پڑھنا افضل ہے، حتیٰ کہ کسی چھوٹی سورت کا مکمل پڑھ لینا اس کے بقدر بڑی سورت میں سے چند آیات پڑھ لینے سے اولیٰ (بہتر) ہے۔ سنّت ہیکہ پہلی رکعت کی قرأت دوسری رکعت کی قرأت سے طویل ہو۔ (جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت سے ثابت ہے۔ فتح الوهاب)

فجر کی نماز میں طِوالِ مفصل (جیسے سورہ حجرات) کی تلاوت، ظہر میں فجر کے قریب، عصر اور عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل کی تلاوت مستحب ہے۔ مذکورہ ترتیب نسائی میں موجود ہے۔ (محلی ۱/۱۵۴ فتح الوهاب)

تلاوت کی مذکورہ ترتیب منفرد اور اس امام کیلئے مستحب ہے جس کے مقتدی متعین ومحدود اور تطویل سے راضی ہوں، عام ائمہ تخفیف پر عمل کریں۔ (حاشية القليوبي وغيره)

سورہ حجرات سے سورہ عم يتساء لون تک طِوالِ مفصل، وہاں سے سورہ والضحیٰ تک اَوْساط مفصل، پھر آخر تک (سورہ ناس تک) قِصار مفصل ہے۔ (شرح ۱/ ۱۵۴۔ تحفه المحتاج)

صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ قاف اور مرسلات جیسی سورتیں طوال مفصل، جمعہ جیسی سورتیں اوساط مفصل، اور والعصر جیسی سورتیں قصار مفصل ہیں۔ صاحب مغنی فرماتے ہیں۔ کہ حجرات، اقتربت، الرحمن، جیسی سورتیں طوال مفصل، والشمس وضحاها، اور والّيل اذا يغشى، جیسی سورتیں اوساط مفصل، اور والعصر، اور اخلاص، جیسی سورتیں قصار مفصل ہیں۔ (حاشية الشرواني-علی التحفه ۲ /۵۵)

جمعہ کے دن فجر کی پہلی رکعت میں الٓمّ تَنْزِيْل (سورہ سجدہ) اور دوسری رکعت میں "هَلْ اَتٰی عَلَی الْإِنْسَانِ" (سورہ دہر) مکمل پڑھنا سنّت ہے۔

مذکورہ دونوں سورتوں کا پڑھنا شیخین کی روایت سے ثابت ہے (محلی ۱/۱۵۴) اگر پہلی رکعت میں سورہ دہر کی تلاوت کی تو دوسری رکعت میں سورہ سجدہ کی تلاوت کرے۔ پہلی رکعت میں کسی اور سورت کو پڑھ لیا تو دوسری رکعت میں دونوں سورتوں کو پڑھ لے۔ اگر یہ دونوں سورتیں نہ پڑھے تو اس کے بدلہ میں "سَبِّحِ اسْمِ اور هَلْ اَتَاكَ" پڑھ لے، ورنہ سورہ کفرون اور اخلاص پڑھ لے (حاشية القليوبي ۱/۱۵۴)

جن نمازوں میں بعض سورت (یعنی کسی سورت کے کچھ حصہ) کا پڑھنا ثابت ہے، وہاں وہی افضل ہے جیسے فجر کی سنّت میں سورہ بقرہ اور آل عمران کی ایک ایک آیت، اور تراویح کی نماز اسلئے کہ ماہ رمضان میں تراویح میں مکمل قرآن کی تلاوت مطلوب ہے، البتہ کہیں قرآن مکمل نہ پڑھا جائے تو مکمل سورت کا پڑھنا افضل ہوگا (حاشية القليوبي علی المحلی ۱/ ۱۵۴۔ حاشية الجمل ۱/۲۵۹)

جہری نماز میں امام کی تلاوت کی آواز سنائی دے رہی ہو تو مقتدی سورت کی تلاوت نہ کرے بلکہ امام کی تلاوت کو بغور سنے۔ سری نماز میں اور جہری نماز میں جبکہ دوری یا بہرہ پن کی وجہ سے امام کی آواز سنائی نہ دے تو مقتدی کو بھی سورت کی تلاوت مسنون ہے۔ سورت کو سورہ فاتحہ سے قبل پڑھ لیا تو اس کا اعتبار نہ ہوگا (اس سے سورت کی سنّت حاصل نہ ہوگی)

جس جگہ غیر محرم (اجنبی) مرد تک آواز پہنچتی، ہو عورت جہراً تلاوت نہ کرے، اگر تنہا ہو یا صرف عورتیں ہوں، یا محرم مرد ہوں، تو جہر کر سکتی ہے۔

دن کی مطلق نفل نمازوں میں سراً تلاوت کی جائے۔ رات کی نفل نمازوں میں جہر اور سر کے بین بین (درمیان) تلاوت کی جائے البتہ قریب میں کسی نمازی یا سونے والے کو تلاوت کی آواز سے تکلیف ہو تو سراً تلاوت کرے لیکن تراویح مستثنیٰ ہے اسمیں جہراً تلاوت ہوگی۔

تلاوت کے مستحبات: قرآن پڑھنے والے کیلئے چاہے نماز میں پڑھے یا خارج نماز، یہ امور مستحب ہیں: جب آیت رحمت پڑھے تو رحمت کی دعاء کرے، جب آیت عذاب پڑھے تو اس سے پناہ چاہے، تسبیح کی آیت پڑھے تو تسبیح پڑھے، جس آیت میں مثال ہو اس پر غور کرے جب "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الحَاکِمِیْنَ" (سورہ والتین) پڑھے "تو بَلیٰ وَاَنَا عَلٰی ذٰالِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ" پڑھے "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُوْمِنُوْنَ" (المرسلات) پڑھے تو "آمَنَّا بِاللّٰہِ" کہے امام کی تلاوت پر مقتدی بھی ان امور کو انجام دے۔

تلاوت کے متعلق بعض مسائل: امام اور منفرد کے لئے فجر، مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں، جمعہ، عید، خسوف، قمر، (چاند گہن) استسقاء، تراویح، رمضان کی وتر، اور طواف کی دو رکعت میں (جبکہ اسے رات یا فجر کے وقت ادا کیا جائے) جہراً تلاوت کرنا سنّت ہے۔ دیگر تمام نمازوں میں سراً تلاوت سنّت ہے۔ البتہ رات کی نفل مطلق میں درمیانی صورت اختیار کرے۔ (فتح الوھاب مع جمل ۱/ ۳۶۰)

سورت کی تلاوت میں مصحف کی ترتیب کو ملحوظ رکھنا مستحب ہے۔ لہٰذا دوسری رکعت میں پہلی رکعت کی سورت سے (متصل) بعد والی سورت پڑھے (جس نماز میں مستقل سورتیں وارد ہیں۔ وہ اس سے مستثنیٰ ہے) اگر اس کی خلاف ورزی کی تو جائز ہے (لیکن خلاف اولیٰ ہے) (الأذکار ص ۴۶)

جمعہ کی فجر کی پہلی رکعت میں مکمل "الٓمٓ تَنْزِیْل، السَّجْدَہ" اور دوسری رکعت میں مکمل "ھَلْ اَتیٰ عَلَی الْاِنْسَانِ" (سورہ دھر) کی تلاوت سنّت ہے۔ بعض عوام کا دونوں سورت کا صرف کچھ حصہ پڑھ لینا خلاف سنّت ہے۔ (عام جماعت کے امام کیلئے بھی مذکورہ سورتوں کا پڑھنا سنّت ہے۔) عید اور استسقاء کی نماز میں پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ ق، اور دوسری رکعت میں سورہ "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ" سنّت ہے، یا پھر پہلی رکعت میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلیٰ" اور دوسری رکعت میں "ھَلْ اَتَاکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ" پڑھے دونوں بھی سنّت ہے۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورہ "منافقون" سنّت ہے، یا پھر پہلی میں سبح اسم اور دوسری میں "ھل اتاک" دونوں بھی سنّت ہے۔ ان مقامات میں مذکورہ سورت کے بعض حصہ پر اکتفاء نہ کرنی چاہے، اگر تخفیف (ہلکی نماز) کا ارادہ ہے تو تلاوت کی رفتار کچھ اعتدال کے ساتھ تیز کرے فجر کی سنّت کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد "قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰہِ وَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِیَ مُوْسیٰ وَ عِیْسیٰ وَ مَا اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِنْھُمْ وَ نَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ" (سورہ بقرہ آیت ۱۳۶) اور دوسری رکعت میں "قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ م بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئاً وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ" (سورہ آل عمران آیت ۶۴) پڑھنا سنّت ہے یا پہلی رکعت میں "قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ" اور دوسری رکعت میں "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" پڑھنا سنت ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ان دونوں ترتیب کا آپ ؐ سے عملاً ثبوت ہے، سنت مغرب، طواف، اور استخارہ کی پہلی رکعت میں "قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ" اور دوسری میں "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" پڑھے۔ اگر تین رکعت وتر ادا کر رہا ہے تو پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلیٰ" اور دوسری میں قُلْ یٰاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ، اور تیسری میں "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" اور معوذتین "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" پڑھنا سنّت ہے۔ مذکورہ تمام تفصیل مشہور احادیث سے ثابت ہیں (الاذکار ص ۴۸)

مذکورہ تفصیل کے مطابق کسی نماز کی پہلی رکعت میں مسنون سورت نہ پڑھے تو دوسری رکعت میں دونوں سورتوں کو پڑھ لے تا کہ اس کی نماز ان دونوں سورتوں سے خالی نہ رہے۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ منافقون پڑھ لی۔ تو اب دوسری رکعت میں سورۂ جمعہ پڑھ لے۔ سورہ منافقون کو نہ دوہرائے، رات کی نماز کی قضاء دن میں یا اس کے برعکس ہو تو جہر اور سر کے سلسلے میں قضاء کے وقت کا اعتبار ہوگا۔ (لہٰذا ظہر کی نماز رات میں قضاء کرے تو جہراً تلاوت کرے، اور عشاء کی نماز دن کو قضاء کرے تو سراً تلاوت کرے) جہری نماز میں جہراً اور سری نماز میں سراً تلاوت کرنا سنت ہے۔ واجب نہیں ہے، لہٰذا اس کے برعکس کیا تو نماز صحیح ہے، لیکن مکروہ تنزیہی کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور سجدہ سہو نہیں کرے گا۔

نماز میں آہستہ تلاوت کرنے اور دیگر مشروع اذکار کے پڑھنے میں خود کو سنائی دینا لازم ہے۔ بغیر عارض کے ایسا پڑھے کہ خود نہ سن سکے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ (الاذکار ص ۴۸)

سکتے: امام کیلئے جہری نماز میں چار سکتے مستحب ہیں (۱) تکبیر تحریمہ کے بعد تا کہ دعاء استفتاح پڑھ لے۔
(۲) سورہ فاتحہ کے بعد فاتحہ کے آخر اور آمین کے درمیان، بہت ہلکا سا سکتہ کرے تا کہ یہ واضح ہو کہ آمین فاتحہ میں داخل نہیں۔
(۳) آمین کے بعد اتنا طویل سکتہ کرے کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ سکے۔
(۴) تلاوت اور رکوع کی تکبیر کے درمیان مختصر سکتہ کرے۔ (الاذکار ص ۴۹)

فصل: رکوع کے متعلق

کم سے کم رکوع کیلئے ایک معتدل الخلقت اور ہاتھ پیر کی سلامتی والے شخص کو آگے کی جانب اتنا جھکنا ضروری ہے کہ دونوں ہتھیلی گھٹنوں تک پہنچ سکے۔ اگر کوئی پیچھے کی طرف سٹ کر گھٹنوں کو آگے نکالے اور ایسی ہیئت اختیار کرے کہ ہتھیلی گھٹنے تک پہنچ سکے، تو اس سے رکوع حاصل نہ ہوگا۔ اس ہیئت کے ساتھ آگے کی طرف جھکنا بھی پایا جائے اور دونوں کی مجموعی شکل سے ہتھیلی گھٹنے تک پہنچ سکے تب بھی یہ رکوع معتبر نہ ہوگا۔ مذکورہ صحیح رکوع کیلئے کسی اور کی مدد کی ضرورت ہو یا کسی چیز کا سہارا لینے کی ضرورت ہو، تو یہ لازم ہے۔ اتنا رکوع نہ کر سکے تو جتنا ممکن ہو جھکے، بالکل ہی عاجز ہو تو قیام ہی میں آنکھ کے اشارے سے رکوع کرے۔

یہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے رکوع کا بیان ہے۔ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے رکوع کی تفصیل قیام کے فصل میں گذر چکی ہے۔

رکوع میں طمانینت واجب ہے۔ کم سے کم طمانینت یہ ہے کہ سارے اعضاء کو استقرار (ٹھہراؤ) حاصل ہو اور اس کے جھکنے اور اٹھنے میں فصل (جدائی) ہو جائے۔ اگر کوئی اقل رکوع کی حد سے آگے جھکتا چلا جائے اور پھر واپس اٹھ جائے اور حرکتیں متصل ہوں (یعنی اس دوران اعضاء میں ٹھہراؤ نہ ہو) تو اس سے طمانینت حاصل نہ ہوگی، اور یہ زیادہ جھکنا طمانینت کے قائم مقام نہ ہوگا۔ رکوع کیلئے جھکنے کے وقت کسی اور ارادے سے نہ جھکنا شرط ہے، اگر نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کر کے سجدہ تلاوت کے ارادے سے جھکے، اور رکوع کی حد کو پہنچنے کے بعد سجدہ کا ارادہ بدل کر اسے ہی رکوع میں شمار کرنا چاہے تو یہ صحیح نہ ہوگا، بلکہ واپس قیام کی طرف لوٹ کر پھر رکوع کرنا چاہیئے۔

اکمل رکوع

ہیئت: اتنا جھکے کہ اس کی پشت اور گردن تخت کی طرح بالکل ایک سیدھ میں آجائے، اور پنڈلیوں کو کوکھ تک سیدھا کھڑا رکھے، اور گھٹنوں کو نہ موڑے اور دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑے۔ انگلیوں کے درمیان معمولی فاصلہ رکھے، اور ان کا رخ قبلہ کی طرف رکھے، اگر

ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو یا بیمار ہو تو دوسرے ہاتھ سے مذکورہ امور انجام دے، ہاتھوں کو گھٹنے پر رکھنا ممکن نہ ہو تو ایسے ہی لٹکائے رکھے۔ مرد رکوع میں اپنی کہنی کو پہلو سے دور رکھے لیکن عورت اور خنثیٰ ایسا نہ کرے۔

ذکر: جیسے ہی جھکنا شروع کرے تکبیر کہنا اور مکمل رکوع تک تکبیر کو دراز کرنا مستحب ہے تاکہ نماز کا کوئی حصہ ذکر سے خالی نہ رہے۔ دیگر تکبیرات انتقالات کا بھی یہی حکم ہے۔ تکبیر کی ابتداء کے ساتھ رفع یدین (دونوں ہاتھوں کو اٹھانا) جیسا کہ تکبیر تحریمہ میں گذر چکا مستحب ہے۔ رکوع میں تین مرتبہ 'سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ یا سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ" پڑھنا مستحب ہے۔ (جیسا کہ مسلم اور سنن کی روایتوں میں وارد ہے)

احادیث: (۱آپ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تکبیر کہتے (صحیحین عن ابی ہریرہ ایک روایت میں ہے۔" ہر اٹھنے اور جھکنے میں تکبیر کہتے" صحیحین میں حضرت علیؓ اور بخاری میں حضرت ابن عباس سے بھی اس طرح مروی ہے۔ (۲ آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہر جھکنے اور اٹھنے اور قیام اور بیٹھنے میں تکبیر کہا کرتے۔ (رواہ الترمذی و رواہ احمد والنسائی) (تلخیص ۱/ ۲۵۸)

اس کے بعد یہ دعاء پڑھنا افضل ہے۔" اَللّٰھُمَّ لَکَ رَکَعْتُ وَبِکَ آمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَکَ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَمُخِّیْ وَعَظْمِیْ وَعَصَبِیْ وَشَعْرِیْ وَبَشَرِیْ وَمَااسْتَقَلَّتْ بِہٖ قَدَمِیَّ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" **ترجمہ:** اللہ میں نے تیرے لئے رکوع کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرا فرمانبردار ہوا میرے کان، آنکھ، مغز، ہڈی، پٹھے، بال، کھال اور تمام اعضاء رب العالمین کے آگے جھک گئے) منفرد کیلئے تین تسبیحات سے زیادہ پڑھنا مستحب ہے۔ امام تین سے زیادہ نہ پڑھے البتہ مقتدی تطویل سے راضی ہوں تو پڑھ سکتا ہے۔ رکوع اور سجدہ میں تلاوت مکروہ ہے۔ مستحب ہے کہ رکوع کی تکبیر کو سورہ کے آخر سے نہ ملائے بلکہ دونوں کے درمیان معمولی سکتہ کرے۔ قیام کی حالت میں تکبیر اور رفع یدین دونوں ایک ساتھ شروع کرے اگر تکبیر مکمل ہونے تک رفع یدین نہیں کیا تو اب نہ کرے، مکمل ہونے سے پہلے یاد آ جائے تو کر لے، اگر کسی کی ہتھیلی کٹی ہو تو ہاتھ کے بقیہ حصے کو گھٹنے تک نہ لے جائے تاکہ رکوع کی ہیئت میں تبدیلی نہ ہو۔ تکبیر تحریمہ، رکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین ہر نمازی کے لئے مستحب ہے، چاہے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہو یا بیٹھ کر یا لیٹ کر یا اشارے سے جیسا کہ اُمّ میں اس کی صراحت ہے۔ رکوع میں ذکر کی اقل مقدار ایک تسبیح ہے۔ بکثرت صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ رکوع کیلئے تکبیر کہتے تھے یہ تکبیر سنت ہے، اسے ترک کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ لیکن اس سے نہ نماز باطل ہوگی اور نہ سجدہ سہو کرے گا۔ تکبیر تحریمہ کے علاوہ نماز کے سبھی تکبیرات کا یہی حکم ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ رکوع اور سجدہ میں "سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اِغْفِرْلِی "(ترجمہ۔ یا اللہ اے ہمارے رب پاکی اور تعریف تیرے ہی لئے ہے یا اللہ مجھے بخش دے) پڑھتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ رکوع میں یہ پڑھتے "اَللّٰھُمَّ لَکَ رَکَعْتُ وَبِکَ آمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَکَ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَمُخِّیْ وَعَظْمِیْ وَعَصَبِیْ "سنن میں یہ الفاظ ہیں" خَشَعَ سَمْعِی وَ بَصَرِیْ وَ مُخِّیْ وَ عَظْمِیْ وَ مَا اسْتَقَلَّتْ بِہٖ قَدَمِیَّ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ رکوع اور سجدہ میں یہ تسبیح پڑھتے۔"سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَآئِکَۃِ وَالرُّوْحِ" ترجمہ: پاک ہے، مقدس ہے، فرشتوں اور روح الامین کا رب ہے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہوا آپ ﷺ نے سورہ بقرہ تلاوت فرمائی جب رحمت کی آیت پڑھتے تو رک کر رحمت کی دعاء کرتے، اور آیت عذاب پڑھتے تو پناہ چاہتے، پھر قیام کے بعد رکوع کیا اور رکوع

میں یہ پڑھتے رہے۔ "سُبْحَانَ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ " پھر سجدہ میں بھی یہی پڑھتے رہے۔ (هذا حدیث صحیح رواه ابوداود والنسائی، فی سننهما والترمذی فی کتاب الشمائل باسانید صحیحه)

صحیح مسلم کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے تعظیم کا حکم دیا ہے، لہٰذا اصل مقصود رکوع میں مذکورہ کسی بھی ذکر کے ذریعے تعظیم الٰہی ہے، البتہ اگر ممکن ہو تو ان تمام اذکار کا پڑھنا افضل ہے۔ پہلے تسبیح "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" پڑھے مختصر پڑھنا ہو تو تسبیح کو ترجیح دے کمال کا ادنی درجہ تین تسبیح پڑھنا ہے۔ صرف ایک مرتبہ بھی پڑھے تو اصل تسبیح پر عمل ہوگا۔ ان میں سے بعض اذکار پر اکتفا کرنا ہو تو مستحب ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف اذکار کو پڑھے تا کہ سبھی پر عمل کا موقع ملے۔ دیگر مواقع کے اذکار میں بھی اسی طرح کرے۔ (یعنی ایک ہی وقت تمام اذکار کو نہیں پڑھ سکتا ہو تو مختلف اوقات میں مختلف اذکار پڑھے تا کہ سبھی پر عمل ہو جائے صحیح مسلم میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے رکوع یا سجدہ میں تلاوت سے منع فرمایا! اس لئے رکوع وسجدہ میں تلاوت مکروہ ہے اگر کوئی پڑھے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ (الاذکار ۵۰۔ ۵۱)

فصل ۔ اعتدال

اعتدال رکن ہے لیکن براہ راست مقصود نہیں ہے۔ اعتدال کی واجب مقدار یہ ہے کہ رکوع کے بعد دوبارہ رکوع سے پہلے جو حالت تھی اس طرف لوٹ جائے چاہے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہو یا بیٹھ کر۔ اگر قیام سے رکوع میں گیا اور طمانینت سے پہلے ہی گر پڑا تو واپس رکوع میں لوٹ کر طمانینت حاصل کرنے کے بعد اعتدال میں لوٹنا واجب ہے۔ اور اگر طمانینت کے بعد گرا تھا تو سیدھے کھڑا ہو جائے اور سجدہ کرے۔ رکوع سے سر اٹھانے کے بعد سجدہ کرلے، اور شک ہو کہ اعتدال صحیح ہوا یا نہیں تو پھر قیام کی طرف لوٹنا واجب ہے، بعد میں سجدہ کرے۔

رکوع کی طرح اعتدال میں بھی طمانینت واجب ہے، کسی اور ارادے سے رکوع سے نہ اٹھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی رکوع میں سانپ دیکھ کر گھبراہٹ میں کھڑا ہو جائے، تو یہ اعتدال میں شمار نہ ہوگا۔

اعتدال کو طویل نہ کرنا واجب ہے۔ اعتدال کے وقت سابقہ کیفیت کے مطابق رفع یدین مستحب ہے۔ جیسے ہی رکوع سے سر اٹھانا شروع کرے رفع یدین بھی شروع کرے اور جب مکمل اعتدال میں پہنچ جائے تو ہاتھوں کو نیچے لائے اٹھتے وقت "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہنا مستحب ہے۔

جب سیدھا کھڑا ہو جائے تو "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" یا "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" اور "مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْأَ الْاَرْضِ وَمِلْأَ مَاشِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ" پڑھے۔ **ترجمہ**: اے رب ہماری ساری تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں آسمان اور زمین اور جو ان کے درمیان ہے وہ بھر کر اور ان کے علاوہ تیری چاہت کے برابر (صحیح مسلم) یہ دونوں ذکر امام، مقتدی اور منفرد سبھی کیلئے مستحب ہے امام کے علاوہ کیلئے یہ پڑھنا بھی مستحب ہے مقتدی حضرات راضی ہوں تو امام کیلئے بھی مستحب ہے۔ "اَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَ كُلُّنَا لَكَ الْعَبْدُ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ" (رواہ مسلم) اے تعریف اور بزرگی والے، بندہ نے جو کچھ کہا سچ کہا اور ہم سب تیرے ہی بندے ہیں جس کو تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے تو نہ دے اسے کوئی دینے والا نہیں اور تیرے سامنے کسی مالدار کو اس کی دولت کچھ کام نہیں دے سکتی)

مقتدیوں کی رضامندی کے بغیر امام کیلئے یہ ذکر پڑھنا مکروہ ہے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ کی اقتداء میں "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه" کے بعد ایک صحابی "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْداً كَثِيْراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيْهِ" **ترجمہ:** اے ہمارے رب اور ساری کثیر و پاکیزہ اور بابرکت تعریفیں تیرے ہی لئے ہے۔ پڑھتے ہیں۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تیس سے کچھ اوپر فرشتوں کو اس کی طرف سبقت کرتے دیکھا کہ کون پہلے اسے لکھ لیتا ہے (صحیح بخاری) اعتدال میں ان تمام اذکار کا پڑھنا مستحب ہے جیسا کہ رکوع کے ذکر میں گذرا۔ بعض پر اکتفاء کرنا ہو تو " سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدَ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْأَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَ مِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْد" پڑھے۔ اور اختصار کرنا ہو تو" سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْد "پڑھے۔ یہ سارے اذکار مستحب ہیں ان کا ترک کرنا مکروہ تنزیہ ہے۔ ترک کی وجہ سے سجدہ سہو نہ کرے اعتدال میں تلاوت مکروہ ہے۔ (الاذکار ۔ ۵۲۔۵۳)

امام "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ "جہراً اور" رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ "سراً کہے مقتدی (اور منفرد) دونوں ہی سراً کہے، رکوع کرنے کے بعد کوئی عذر ایسا پیش آئے کہ کھڑا نہیں ہوسکتا تو رکوع ہی سے سجدہ میں جائے اور اس عذر کی وجہ سے اعتدال ساقط ہو جائیگا۔ پیشانی زمین پر ٹیکنے سے پہلے عذر ختم ہو جائے تو واپس اعتدال کی طرف لوٹ کر پھر سجدہ میں جانا واجب ہے۔ اگر پیشانی زمین پر رکھنے کے بعد عذر ختم ہو تو اب اعتدال کی طرف نہ لوٹے بلکہ اعتدال ساقط ہوگا۔ اگر کوئی مسئلہ جاننے کے باوجود لوٹے تو نماز باطل ہوگی۔ لاعلمی کی وجہ سے لوٹا ہے تو نماز باطل نہ ہوگی۔

قنوت

لفظ قنوت عربی زبان میں مختلف معانی میں مستعمل ہے۔ دعاء، خشوع، عبادت، اطاعت، عبودیت کا اقرار، سکوت، نماز، قیام، طول قیام، دوام طاعت، یہاں نماز کے قیام کے مخصوص محل میں دعاء مراد ہے۔ (حاشية الجمل ۱/ ۳۶۸)

احادیث: (۱) آپ ﷺ ایک ماہ تک بئر معونہ میں شہید ہونے والے صحابہ کرامؓ کے قاتلین پر (بددعا کرتے ہوئے) قنوت پڑھتے رہے پھر اسے ترک کیا۔ البتہ فجر میں اس دار فانی سے کوچ کرنے تک قنوت پڑھتے رہے (احمد والدارقطني والبيهقي وصححه الحاكم في كتاب القنوت ۔ تلخيص ۱/ ۲۶۱)

(۲) بیہقی میں ہے عوام بن حمزہ نے ابوعثمان سے قنوت فجر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ رکوع کے بعد، پھر پوچھا کس سے (ثبوت ہے؟) تو فرمایا حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے۔

(۳) حضرت ابورافع فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فجر میں قنوت پڑھا کرتے۔ حضرت اسود نے فرمایا کہ میں نے سفر و حضر میں حضرت عمر کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ صرف فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے۔ (بيهقي) حضرت عبداللہ بن معقل سے بسند صحیح مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے فجر میں قنوت پڑھی (بيهقي والشافعي ۔ تلخيص۔ ۱/ ۲۶۲)

الفاظ قنوت: حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے چند کلمات سکھلائے جسے میں وتر میں پڑھتا ہوں۔" اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ وَاِنَّهٗ لَايَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ " (وقال الترمذي حديث حسن)

ترجمہ: اے اللہ مجھے ہدایت دے ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے ہدایت دی اور مجھے عافیت دے ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے عافیت دی اور میرا ولی بن جا ان لوگوں کے ساتھ جن کا تو والی بنا۔ اور جو کچھ تو نے عطا کیا اس میں برکت دے۔ اور جس کا تو نے فیصلہ کیا اس کے شر سے مجھے بچا اس لئے کہ بیشک تو حکم کرتا ہے۔ اور تجھ پر حکم نہیں کیا جا سکتا اور تو جس کا والی بن گیا وہ ذلیل نہیں ہو سکتا۔ اے ہمارے رب تو برکت والا ہے اور تو بلند ہے۔

بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ فجر میں یہی دعا قنوت پڑھتے تھے۔ نسائی کی ایک روایت کی روشنی میں اس کے بعد " اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَّ عَلىٰ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّسَلِّمْ" کہنا مستحب ہے۔ (الاذکار ۔ ۵۷) بیہقی کی ایک روایت میں "تبارکت" سے قبل "وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ" بھی ہے۔ (تلخیص الحبیر ۱ / ۱۶۵) بعض صحابہ کرام سے قنوت کے بعد درود پڑھنا ثابت ہے، (ارواء الغلیل ،للالبانی ۲/ ۱۷۶) حضرت عمرؓ سے وارد یہ قنوت پڑھنا بھی بہتر ہے۔ "اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْتَعِينُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَخْلَعُ مَنْ يَفْجُرُكَ اَللّٰهُمَّ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّي وَنَسْجُدُ وَإِلَيْكَ نَسْعىٰ وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوا رَحْمَتَكَ وَنَخْشىٰ عَذَابَكَ إِنَّ عَذَابَكَ الْجِدَّ بِاالْكُفَّارِ مُلْحِق. اَللّٰهُمَّ عَذِّبِ الْكَفَرَةِ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِكَ وَيُكَذِّبُوْنَ رُسُلِكَ وَيُقَاتِلُوْنَ اَوْلِيَاءَكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنَهُمْ وَاَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَاجْعَلْ فِي قُلُوْبِهِمُ الْإِيْمَانِ وَالْحِكْمَةَ وَثَبِّتْهُمْ عَلىٰ مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَوْزِعْهُمْ اَنْ يُوْفُوْا بِعَهْدِكَ الَّذِي عَاهَدْتَهُمْ عَلَيْهِ وَانْصُرْهُمْ عَلىٰ عَدُوِّكَ وَعَدُوِّهِمْ اِلٰهِ الْحَقِّ وَاجْعَلْنَا مِنْهُم " دونوں پڑھنا مستحب ہے۔ پہلے "اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي الخ " پھر قنوت عمر پڑھے۔ ایک ہی قنوت پڑھنا ہو تو "اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي الخ " پڑھے۔ دونوں پڑھنا صرف تنہا نمازی یا ایسے امام کیلئے مستحب ہے کہ مقتدی متعین اور تطویل سے راضی ہوں۔ قنوت کی نیت سے کوئی اور دعاء یا ایسی آیت کا پڑھنا جس میں دعاء ہو کافی ہے۔ لیکن حدیث میں وارد قنوت پڑھنا افضل ہے (اذکار ۵۸)

فجر کی دوسری رکعت کے اعتدال میں اور رمضان کے آخری نصف کے وتر کی آخری رکعت کے اعتدال میں دعاء قنوت مستحب ہے۔ امام صرف اپنے لئے دعاء نہ کرے (یہ مکروہ ہے) بلکہ جمع کے الفاظ استعمال کرے۔ (کیونکہ آپ ﷺ نے امام کیلئے صرف اپنے حق میں دعاء کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اسے مقتدیوں کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ (ابوداود ، الترمذی)

قنوت کے بعد درود شریف سنّت ہے۔ (رواہ النسائی) اگر مسلمانوں پر وبا یا قحط جیسی کسی مصیبت کا نزول ہو تو دیگر چاروں فرض نماز میں بھی قنوت (نازلہ) مستحب ہے۔ امام قنوت کو جہراً پڑھے (چاہے قنوت فجر ہو یا قنوت نازلہ) اور منفرد (تنہا نمازی) سراً پڑھے۔ مقتدی امام کے دعائیہ کلمات پر آمین کہے اور ثنا کے کلمات امام کے ساتھ خود بھی پڑھے یا سنے ("فَإِنَّكَ تَقْضِي " سے "فَلَكَ الْحَمْدُ عَلىٰ مَا قَضَيْتَ" تک ثنا ہے۔) اگر امام سے دوری وغیرہ کی وجہ سے اس کی قنوت سنائی نہ دے تو مقتدی بھی خود قنوت پڑھے دعائے قنوت میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے لیکن بعد میں چہرہ وغیرہ پر پھیرنا مستحب نہیں (مجموع میں امام بیہقی کے حوالہ سے نقل ہے کہ نماز میں چہرہ پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق نہ کوئی حدیث ہے نہ کوئی اثر اور نہ قیاس اور نہ یہ اسلاف سے ثابت ہے)

اگر قنوت کی نیت سے کسی ایسی آیت کی تلاوت کرے جو دعاء کو متضمن ہو یا اس کے مشابہ ہو تو صحیح ہے، ورنہ یہ قنوت میں شمار نہ ہوگا۔

اگر رکوع سے پہلے قنوت پڑھے تو یہ معتبر نہ ہوگا۔ بلکہ رکوع کے بعد پھر لوٹائے اور سجدہ سہو بھی کرے جیسا کہ 'الام' میں صراحت ہے۔

فصل سجدہ: سجدہ نماز کا رکن ہے۔ اقل سجدہ: پیشانی زمین پر رکھنا واجب ہے پیشانی کے دونوں

طرف کے کسی کنارے کو رکھنا کافی نہیں، پیشانی کا صرف زمین سے چھو جانا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اپنے سر اور گردن کے بوجھ کو سجدہ کی جگہ ڈالنا ضروری ہے، یہاں تک کہ پیشانی ٹک جائے۔ اگر کپاس یا گھاس پھوس جیسی اشیاء پر سجدہ کرے تو اتنا بوجھ ڈالے کہ وہ دب جائے اور بالفرض اس کے نیچے اس کا ہاتھ ہو تو اس کا اثر اس پر ظاہر ہو ورنہ سجدہ صحیح نہ ہوگا۔ دونوں ہاتھ گھٹنے اور پیروں کا بھی زمین پر رکھنا ضروری ہے، ناک رکھنا واجب نہیں ہے۔ پیشانی کا بھی کچھ حصہ بغیر کسی حائل کے سجدہ کی جگہ چھونا واجب ہے۔ اگر عمامہ کے کنارے یا دامن کے کنارے سجدہ کرے، جو اس کی حرکت سے حرکت کرتا ہو تو سجدہ صحیح نہیں ہوگا۔ اگر نمازی کی حرکت سے کپڑے کے اس حصہ میں حرکت نہ ہوتی ہو تو سجدہ ہو جائے گا۔ پیشانی پر زخم کی وجہ سے پٹی بندھی ہو اور اسی پر سجدہ کرے تو یہ کافی ہے، اور آئندہ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پیشانی کے علاوہ دیگر اعضاء سجدہ کو کھلی حالت میں رکھنا واجب نہیں۔ سجدہ میں بدن کا نچلا حصہ (یعنی کمر اور اطراف کا حصہ) اوپری حصہ کے مقابلے میں اونچا ہونا ضروری ہے۔ اس ہیئت کو تنکیس کہیں گے۔ (رواہ ابوداود، والنسائی صححہ ابن حبان، حاشیۃ الروضہ)

اگر نچلا دھڑ سر وغیرہ کے مقابلے میں نیچا ہو، یا دونوں ایک ہی سیدھ میں ہو تو سجدہ صحیح نہ ہوگا۔ اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے سجدہ میں مطلوبہ ہیئت مشکل ہو اور تکیہ وغیرہ کے سہارے وہ ہیئت ممکن ہو، تو یہ لازم ہے اور اس کے باوجود بھی یہ ہیئت حاصل نہ ہو تو یہ ضروری نہیں۔ سجدہ کیلئے جھکنے سے عاجز ہو تو سر سے اشارہ کرے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو آنکھ سے اشارہ کرے۔

سجدہ میں طمانینت واجب ہے۔ سجدہ کیلئے جھکتے وقت کوئی اور ارادہ نہ ہو، اگر اعتدال سے نیچے گر جائے تو یہ سجدہ شمار نہ ہوگا، بلکہ اعتدال کی طرف لوٹ کر پھر سجدہ میں جانا ضروری ہے۔

سجدہ کیلئے جھکتے وقت پیشانی کے بل گر جائے تو اس وقت اگر سہارے کے ارادے سے پیشانی کو زمین پر رکھا ہے تو سجدہ شمار نہ ہوگا۔ اور ایسا کوئی ارادہ نہیں پایا گیا تو شمار ہوگا۔ اگر سجدہ کیلئے جھکتے وقت پہلو کے بل گر پڑا پھر پلٹ کر سجدہ کے ارادہ سے سجدہ کی ہیئت میں آ گیا، تو یہ سجدہ شمار ہوگا۔ اگر سیدھے ہونے کا ارادہ تھا اور سجدہ کی طرف توجہ نہیں تھی، تو یہ کافی نہیں ہے۔ بلکہ اچھی طرح بیٹھ کر پھر سجدہ میں جائے۔ سجدہ کیلئے کھڑا نہ ہو، بلکہ عمداً کھڑا ہو تو اس زائد قیام کی وجہ سے نماز باطل ہوگی۔ سجدہ اور استقامت (سیدھے ہو جانا) دونوں کا بھی ارادہ نہ ہو تو سجدہ صحیح ہوگا۔ لیکن صرف استقامت کا ارادہ اور ساتھ ساتھ سجدہ نہ ہونے کا ارادہ بھی ہو تو نماز باطل ہوگی۔

اکمل سجدہ: سنت ہے کہ سجدہ کرتے وقت پہلے دونوں گھٹنے پھر دونوں ہاتھ، پھر ناک اور پیشانی زمین پر رکھے۔ اور جھکنے کے ساتھ تکبیر شروع کرے اور سجدہ میں پہنچنے تک اسے دراز کرے، اس تکبیر کے وقت رفع یدین نہ کرے، سجدہ میں پیشانی کے ساتھ ناک بھی کھلی ہوئی زمین پر رکھے، اور دونوں گھٹنوں کو جدا رکھے۔ مرد دونوں کہنیوں کو پہلو سے اور پیٹ کو رانوں سے جدا رکھے۔ اور عورت ان اعضاء کو آپس میں ملائے رکھے۔ دونوں ہاتھ کاندھوں کے بالمقابل رکھے، انگلیاں آپس میں ملی ہوئی ہو اور ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو۔ سجدہ، جلسہ بین السجدتین، اور تشہد میں ہاتھوں کی انگلیاں ملی ہوئی رکھنا سنت ہے، بقیہ حالتوں میں اعتدال کے ساتھ (متوسط طور پر) کھلی رکھنا سنت ہے۔ سجدہ میں کلائی زمین پر نہ بچھائے، بلکہ زمین سے اٹھائے رکھے اور پیروں کی انگلیوں کے پیٹ کو زمین پر اس طرح رکھے کہ ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو۔ دونوں قدم کے درمیان تقریباً ایک بالشت کا فاصلہ رکھے اور قدموں کو دامن سے باہر نکالے۔ اگر موزے نہ پہنا ہو تو پیروں کو کھولے۔ سجدہ میں یا نماز کی کسی اور حالت میں بلا حاجت اپنے بال یا کپڑوں کو سمیٹنا مکروہ ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے قیامت سے متعلق ایک طویل روایت میں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اللہ کی عبادت کرنے والے حضرات کو جہنم سے نکالنے کا حکم دیں گے لہٰذا وہ نکالیں گے۔ اور ان لوگوں میں سجدہ کے آثار سے پہچان لیں گے اور اللہ تعالیٰ نے جہنم پر سجدہ کے اثر

کوجلانا حرام رکھاہے لہٰذا آدمی مکمل جل جائے گا سوائے سجدہ کے اثر کے۔(بخاری و مسلم،عن ابی ھریرہ کما فی عمدۃ القاری)

(۲) حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ رکوع وسجدہ مکمل نہیں ادا کر رہا ہے تو نماز کے بعد اس سے فرمایا: تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اگر اس حالت پر مرگئے تو آپ ﷺ کی سنت کے خلاف مروگے(بخاری)

(۳) آپ ﷺ کو سات اعضاء پر سجدہ کا حکم دیا گیا۔ پیشانی، دونوں ہاتھ، (ہتھیلیاں) دونوں گھٹنے اور دونوں پیر (دونوں قدم کے کنارے) اور یہ کہ اپنے بال یا کپڑے نہ سمیٹیں۔(صحاح ستہ کمافی العینی)

(۴) مسلم کی ایک روایت میں ہے جب سجدہ کروتو دونوں ہتھیلیوں کو رکھو اور کہنیوں کو اٹھاؤ۔ اور ابوداود میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں ہے۔ دونوں ہاتھ بھی چہرہ کی طرح سجدہ کرتے ہیں، تب پھر تم میں سے کوئی چہرہ (زمین پر) رکھے تو ہاتھ بھی رکھے اور چہرہ اٹھائے تو ہاتھ بھی اٹھائے۔(تلخیص الحبیر)

(۵) آپ ﷺ جب سجدہ میں جاتے تو گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھتے اور جب اٹھتے تو ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے (سنن اربعہ، ابن خزیمہ، ابن حبان ، ابن السکن فی صحاحھم کما فی التلخیص)

(۶) حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ سجدہ میں جانے یا سجدہ سے اٹھنے کے لئے رفع یدین نہیں کرتے تھے۔(رواہ البخاری و مسلم والنسائی کما فی عمدۃ القاری)

(۷) آپ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو ناک و پیشانی اچھی طرح (زمین پر) ٹکاتے اور دونوں ہاتھ پہلو سے دور رکھتے اور ہتھیلی کاندھے کے بالمقابل رکھتے۔(ابوداود و ابن خزیمہ فی صحیحہ عن ابی حمید ۔ التلخیص) ابوداود کی ایک روایت میں حضرت ابوحمید نے آپ ﷺ سے سجدہ میں دونوں رانوں کو جدا رکھنا بھی نقل فرمایا ہے۔ اور بیہقی میں حضرت براءؓ کی حدیث میں ہے: آپ ﷺ سجدہ میں انگلیوں کو قبلہ رو کرتے اور قدموں میں فاصلہ کرتے۔

سجدہ کے اذکار: سجدہ کے اذکار کے متعلق بعض روایات رکوع کے ضمن میں گذر چکیں۔صحیح مسلم میں حضرت علیؓ سے آپ ﷺ کا سجدہ میں یہ پڑھنا مروی ہے۔ " اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَ بِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَ صَوَّرَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ "(ترجمہ :اے اللہ میں نے تیرے لئے سجدہ کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرا فرمانبردار ہوا، میری ذات نے اس ہستی کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی صورت گری کی، نیز اس کے کان وآنکھ بنائے، اللہ تعالی کی بڑی برکت جو سب سے بہتر بنانے والا ہے) کتب سنن میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے: تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى تین مرتبہ کہے ۔ اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے آپ ﷺ کا سجدہ میں پڑھنا وارد ہے۔ " اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَ بِمَعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ اِلَّا اَحْصٰى ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ "

ترجمہ : یا اللہ میں تیرے غصہ سے تیری رضامندی کی، اور تیرے سزا سے تیری معافی کی، اور تیری ذات سے تیری ہی ہستی کی پناہ چاہتا ہوں، میں تیری کیا تعریف کرسکوں؟ بس تو ایسا ہی ہے جیسا خود تو نے اپنی تعریف فرمائی۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قرب سجدہ کی حالت میں پاتا ہے لہٰذا خوب دعا کرو، مسلم شریف کی ایک اور روایت میں سجدہ کے دعاء کی قبولیت کی قوی توقع کی وجہ سے دعاء میں خوب کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ

آپ ﷺ سجدہ میں یہ دعاء پڑھتے۔"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ کُلَّہٗ دِقَّہٗ وَجِلَّہٗ وَ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ وَ عَلَانِیَتَہٗ وَسِرَّہٗ"

ترجمہ : یااللہ میرے چھوٹے بڑے اول وآخر ظاہری اور چھپے ہوئے سارے ہی گناہوں کوتو بخش دے) ممکن ہوتو سجدے میں وارد تمام اذکار پڑھے۔ورنہ مختلف اوقات میں مختلف اذکار کو پڑھ کر سبھی پر عمل کی سعادت حاصل کرے۔(الاذکار ۔ ۵۴)

فصل ۔ جلسہ بین السجدتین (دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا)

سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد اچھی طرح طمانینت کے ساتھ بیٹھ جانا واجب ہے۔اٹھتے وقت کوئی اور ارادہ نہ ہو اور اس نشست (یعنی بیٹھنے) کو طویل نہ کرے۔تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھانا مستحب ہے۔اور سنت ہے کہ مفترشا بیٹھے۔(مفترشا یعنی بایاں پیر بچھا کر اس پر بیٹھ جانا اور دایاں قدم کھڑا رکھنا) دونوں ہاتھوں کی مٹھی کھول کر گھٹنے کے پاس رانوں پر رکھنا مستحب ہے۔اگر انگلیوں کے کنارے گھٹنے کی طرف مڑ جائے تو بھی حرج نہیں۔اگر دونوں ہاتھ رانوں کے پاس زمین ہی پر رکھدے تو یہ قیام میں ہاتھ لٹکائے رکھنے کی طرح ہے۔ (یعنی جائز ہے)

احادیث : (۱) حضرت ابوحمید کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد بایاں قدم موڑ کر اس پر بیٹھ گئے۔(ابوداود والترمذی و ابن حبان)

(۲) آپ ﷺ دو سجدوں کے درمیان یہ پڑھتے۔"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَ ارْفَعْنِیْ وَ عَافِنِیْ وَ ارْزُقْنِیْ وَ اھْدِنِیْ" (ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی کی روایتوں سے مجموعی طور پر یہ الفاظ سامنے آتے ہیں۔بعض روایتوں میں الفاظ میں تقدیم وتاخیر ملیگی۔کسی بھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔تلخیص ۔ ۱/۲۷۵)

ترجمہ: یااللہ مجھے معاف فرما، اور مجھ پر رحم فرما، مجھے غنی کردے، مجھے بلندی عطا کر، مجھے عافیت وسلامتی دے، مجھے رزق دے، نیز مجھے ہدایت فرما)

فصل : پھر دوسرا سجدہ بھی پہلے سجدہ کی طرح کرے، اس کے واجبات اور سنت کی وہی تفصیل ہے جو پہلے سجدہ کی ہے۔دوسرے سجدہ سے تکبیر کہتا ہوا سر اٹھائے۔اب تشہد کا محل نہ ہو، تو تھوڑی سی دیر بیٹھنا مستحب ہے، جسے جلسہ استراحت کہتے ہیں۔سجدہ سے اٹھتے وقت تکبیر شروع کرے اور قیام میں پہنچنے تک اسے دراز کرے، اس جلسہ میں بھی افتراش سنت ہے، جلسہ استراحت کے بعد یا اس کے بغیر ہی کھڑا ہو تو دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر کھڑے ہونا سنت ہے۔ایک پیر آگے کر کے اس کے سہارے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نماز کی طاق رکعت میں ہوتے (پہلی یا تیسری رکعت میں) تو اٹھنے سے پہلے اچھی طرح بیٹھ جاتے۔(رواہ البخاری عن مالک بن الحویرث) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں۔جب دوسرے سجدہ سے سر اٹھاتے تو بیٹھ جاتے اور زمین کا سہارا لیتے پھر کھڑے ہو جاتے۔

(۲) ایک مرتبہ حضرت ابوحمید الساعدیؓ نے دس صحابہ کرام کے مجمع میں آپ ﷺ کے نماز کا طریقہ بتلایا جسمیں فرمایا کہ۔پھر آپ ﷺ سجدے میں گئے پھر پیر بچھا کر بیٹھ گئے یہاں تک کہ ہر جوڑ اپنی جگہ لوٹ جائے پھر کھڑے ہوئے۔(رواہ ابوداود، والترمذی ۔ تلخیص ۔ ۲۷۶)

فصل ۔ تشہد اور تشہد کیلئے بیٹھنا

اگر نماز کے آخر میں ہو تو یہ دونوں فرض ہیں اور درمیان میں ہو تو سنت ہیں کسی خاص ہیئت ۔ میں بیٹھنا لازم نہیں ہے بلکہ کسی بھی

طرح بیٹھے تو کافی ہے،لیکن آخری تشہد میں تورّک کی ہیئت پر بیٹھنا اور درمیانی تشہد میں افتراش کی ہیئت میں بیٹھنا سنّت ہے۔

افتراش: بائیں پیر کو اس طرح رکھنا کہ اس کی پشت زمین کی طرف ہو اور اس پر بیٹھ جائے اور دایاں پیر کھڑا رکھ کر اس کی انگلیوں کے کنارے روئے زمین پر قبلہ رو رکھے۔

تورّک: یہ نشست بھی افتراش کی طرح ہی ہے لیکن اس میں بائیں پیر کو دائیں طرف باہر نکال کر بائیں سرین کو زمین سے لگادے۔

مسبوق امام کے آخری تشہد میں مفترشاً بیٹھے۔ کسی کو تشہد کے بعد سجدہ سہو کرنا ہو تو وہ مفترشاً بیٹھے۔(سجدہ سہو کے بعد تورّک کا بیٹھ کر سلام پھیرے) دونوں تشہد میں ہاتھ رانوں پر گھٹنے سے قریب رکھے۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں کھلی اور آپس میں ملی ہوئی قبلہ رو رکھے۔دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں بند کرے اور تشہد کی انگلی کھلی رکھے۔

انگوٹھے کو شہادت کی انگلی کے نیچے ہتھیلی کے کنارے رکھے۔ (رواہ مسلم) تشہد میں جب الّا اللہ کے ہمزہ(الف) پر پہنچے تو شہادت کی انگلی اٹھانا مستحب ہے۔لیکن اسے حرکت نہ دے۔اگر حرکت دیتا رہے تو نماز باطل نہیں ہوگی۔(لیکن مکروہ ہے) بائیں ہاتھ کی انگلی سے اشارہ مکروہ ہے۔اگر دائیں ہاتھ کی انگلی کٹی ہو تب بھی بائیں انگلی سے اشارہ نہ کرے۔

آخری تشہد واجب ہے۔اور اس میں آپ ﷺ پر درود پڑھنا بھی واجب ہے،اور آپ ﷺ کے آل پر درود پڑھنا سنّت ہے۔ پہلے تشہد میں آپ ﷺ پر درود پڑھنا سنّت ہے۔آل النبی ﷺ سے بنو ہاشم اور بنو المطلب مراد ہیں،جیسا کہ امام شافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے بعضوں کے یہاں اس سے سارے مسلمان مراد ہیں۔

اکمل تشهد:"اَلتَّحِیَاتُ الْمُبَارَکَاتُ الصَّلَوٰتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادَ اللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ "(رواہ مسلم ،الشافعی ،الترمذی ،الدارقطنی ،عن ابن عباس ، تلخیص الحبیر ۱/ ۲۸۱) **ترجمه:** زبانی،بدنی،مالی تمام عبادات اللہ ہی کے لئے ہیں،اے نبی آپ پر سلام،اور اللہ کی رحمت و برکت نازل ہو،ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو،میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔)

دونوں جگہ السلام کے بجائے سلام بھی وارد ہے وہ بھی پڑھ سکتا ہے حضرت ابن مسعود یا حضرت عمر سے مروی تشہد بھی پڑھ سکتا ہے۔تشہد ابن مسعود کے الفاظ۔"اَلتَّحِیَاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ "بقیہ حسب بالا،لیکن آخرت میں" اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ "(متفق علیه)

تشهد عمر:"اَلتَّحِیَاتُ لِلّٰهِ الزَّاکِیَاتُ لِلّٰهِ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰهِ الصَّلوٰتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ "بقیہ تشہد ابن مسعود کی طرح (رواہ مالک والشافعی والحاکم والبیهقی)

اقل تشهد:" اَلتَّحِیَاتُ لِلّٰهِ سَلَامٌ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَکَاتُهٗ سَلَامٌ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ ۔ اَشْهَدُ اَنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

درود:"**اقل درود:** اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ یَا صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی مُحَمَّدٍ یَا صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ "آپ ﷺ کے آل پر اقل درود کیلئے آگے وآلہ بڑھائے۔

اکمل درود: " اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْد " (رواه النسائی والحاکم)

احادیث: (۱) حضرت ابوحمید؄ آپ ﷺ کے نماز کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب دوسری رکعت پر بیٹھتے تو بائیں پیر پر بیٹھتے (یعنی افتراش کی ہیئت پر) اور آخری رکعت میں بیٹھتے تو بائیں پیر کو آگے بڑھا کر دوسرا کھڑا رکھتے اور اپنی سرین پر بیٹھتے (یہی تورک کی کیفیت ہے) (رواه البخاری)

(۲) آپ ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو دائیں ہتھیلی دائیں ران پر رکھتے اور ساری انگلیاں بند کرتے اور انگوٹھے سے متصل انگلی (شہادت کی انگلی) سے اشارہ کرتے۔ (مسلم عن ابن عمر)

(۳) آپ ﷺ تشہد میں بیٹھتے تو دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپن (۵۳) گننے والے کی طرح انگلیاں رکھتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔ (مسلم عن ابن عمر)

اس کی صورت یہ ہے کہ انگوٹھا شہادت کی انگلی کی جڑ میں معترضا (یعنی آڑی) ہو۔ (تلخیص ۔ ۲۷۹)

(۴) آپ ﷺ شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے اور اسے حرکت نہ دیتے اور آپ ﷺ کی نگاہ اشارہ سے آگے نہ بڑھتی۔

(احمد و ابو داود وانسائی و ابن حبان فی صحیحه)

افضل درود: "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّیَّتِهٖ کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّیَّتِهٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ " (الاذکار ص ۸۳) **ترجمہ:** اے اللہ اپنی خاص رحمت (درود) نازل فرما حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو تیرے بندے اور رسول اور امی نبی ہیں اور آپ ﷺ کے آل بیبیوں اور اولاد پر جیسی خاص رحمت تو نے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام اور ان کے آل پر نازل فرمائی۔ اے اللہ برکت نازل فرما حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اور آل وازواج واولاد پر جیسی برکت تو نے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام اور ان کی آل پر نازل فرمائی۔ دونوں جہاں میں بلا شبہ تو ہی تعریف کا مستحق ہے، تو بڑی شان والا ہے۔) درود کے بعد دعا مستحب ہے دنیا وآخرت سے متعلق جو دعا بھی چاہے کرسکتا ہے۔ لیکن آخروی دعا افضل ہے اور احادیث سے ثابت دعاؤں کا پڑھنا زیادہ پسندیدہ ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے تشہد کے سکھانے کے بعد فرمایا پھر اپنے پسند کی دعا مانگے (متفق علیه عن ابن مسعود)

(۲) تم میں سے کوئی تشہد اخیر سے فارغ ہونے کے بعد چار چیزوں سے اللہ کی پناہ چاہے، عذاب جہنم، عذاب قبر، زندگی اور موت کے فتنے، مسیح دجال کا شر۔ (متفق علیه عن ابی هریره) مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ مَسِیْحَ الدَّجَّالِ" (اے اللہ! میں عذاب جہنم، عذاب قبر، حیات وموت کے فتنے، اور مسیح دجال کے فتنے کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں)

(۳) آپ ﷺ نماز میں یہ دعا پڑھتے۔ " اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَاثَمِ وَالْمَغْرَمِ " (متفق علیه عن عائشه)

(آخری جملہ کا ترجمہ ہے۔: اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں گناہ اور قرض سے)

(۴) آپ ﷺ تشہد اور سلام کے درمیان یہ پڑھتے۔ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَ مَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّی اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَ اَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ" (رواہ مسلم عن علیؓ) **ترجمہ:** یا اللہ میرے تمام گناہ بخش دے، اگلے، پچھلے، سری، ظاہری، زیادتیاں، اور جن کو تو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے، تو ہی آگے کر دینے والا اور تو ہی (توفیق چھین کر) پیچھے کرنے والا ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۵) حضرت ابوبکر صدیقؓ کی درخواست پر آپ ﷺ نے نماز میں پڑھنے کیلئے یہ دعا سکھلائی۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی ظُلْمًا كَثِيْراً وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِی مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَ ارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" (متفق علیہ عن عبد اللہ بن عمر) مسلم کی بعض روایات میں کبیراً ہے، لہٰذا دونوں کو جمع کر کے "ظُلْماً كَثِيْراً كَبِيْراً" پڑھنا مستحب ہے۔ (الاذکار صفحہ ۶۴) (ترجمہ: یا اللہ! میں نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں، تو اپنی رحمتِ خاص سے مجھ کو بخش دے، تو بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔) امام کیلئے افضل ہے کہ دعا تشہد اور درود سے کم ہو، کیونکہ یہ ان کے تابع ہے۔ امام کیلئے لمبی دعا پڑھنا مکروہ ہے۔ تشہد اول میں صرف آپ ﷺ پر درود تک پڑھے تشہد اوّل کو طویل کرنا اور اس میں دعا پڑھنا مکروہ ہے۔ اگر طویل کیا تو نماز باطل نہیں ہوگی، اور نہ سجدہ سہو کی ضرورت ہے عمداً طویل کیا ہو یا سہواً۔ عربی میں پڑھ سکتا ہو تو اس کا ترجمہ کرنا جائز نہیں۔ اگر عاجز ہو تو ترجمہ کرے۔ اسی طرح جس کو عربی میں دعا یاد نہ ہو وہ ماثورہ دعا (وہ دعا جو حدیث میں ہو) کا ترجمہ کر سکتا ہے۔ اور اگر عربی میں پڑھ سکتا ہے تو ترجمہ جائز نہیں۔ ترجمہ کرے گا تو نماز باطل ہوگی۔ اپنی جانب سے غیر عربی میں دعا بنا کر پڑھنا جائز نہیں ہے۔

دیگر اذکار، جیسے تشہد اول، قنوت، تکبیرات انتقالات اور تسبیحات عربی میں پڑھ سکتا ہو تو ترجمہ ممنوع ہے عاجز ہو تو جائز ہے۔ تشہد اول سے تکبیر کہتا ہوا کھڑا ہو جائے۔ اس وقت بھی رفع یدین کرنا سنّت ہے جیسا کہ صحیح بخاری شریف وغیرہ میں آپ ﷺ سے ثابت ہے۔

چار رکعت والی نماز میں بائیس تکبیریں اور تین رکعت والی میں سترہ اور دو رکعت میں گیارہ تکبیریں مشروع ہیں۔

سلام پھیرنا

سلام بھی نماز کا رکن ہے۔

اقل سلام: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنا ہے۔ اگر کوئی سلام علیک کہے تو ناکافی ہے، اگر "عَلَيْكُمُ السَّلَامُ" کہے تو جائز ہے۔ "سَلَامُ عَلَيْكَ" "سَلَامِی عَلَيْكُمْ" "سَلَامُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ" "سَلَامٌ عَلَيْهِمْ" یہ الفاظ ناکافی ہیں۔ "سَلَامٌ عَلَيْهِمْ" کے علاوہ ان میں سے کوئی لفظ عمداً کہے تو نماز باطل ہوگی۔ سلام کے وقت نماز سے نکلنے کی نیت واجب نہیں ہیں (البتہ سنّت ہے) بیٹھنے کی حالت میں سلام پھیرنا واجب ہے۔

اکمل سلام: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ" ہے۔ دوسرا سلام پھیرنا سنّت ہے۔ پہلا دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف، قبلہ رو حالت میں سلام شروع کرے پھر اس طرح چہرہ پھیرے کہ سلام کے الفاظ مکمل ہونے تک چہرہ کا پھیرنا بھی مکمل ہو جائے، اور چہرہ اتنا پھیرے کہ اس کا ایک رخسار (گال) دکھائی دے (پہلے سلام میں دایاں رخسار اور دوسرے سلام میں بایاں رخسار پیچھے والے کو دکھائی دے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۳۹۳)

امام کیلئے پہلے سلام کے وقت دائیں طرف موجود فرشتے اور مسلمان جنات وانسان پر سلام کی نیت کرنا مستحب ہے اور دوسرے سلام سے بائیں جانب والوں کے حق میں نیت کرے۔ مقتدی بھی اسی طرح نیت کرے۔ مزید اگر وہ امام کے دائیں جانب ہے تو اپنے دوسرے سلام سے امام کے جواب کی نیت کرے اور بائیں جانب ہے تو پہلے سلام سے نیت کرے۔

اور بالکل اس کے پیچھے ہوگا تو کسی بھی سلام سے جواب کی نیت کرے۔ پہلے سلام سے کرنا افضل ہے مقتدی بعض بعض کے جواب کی نیت کرے۔ تنہا نمازی دونوں سلام سے دونوں طرف موجود فرشتوں کی نیت کرے ہر نمازی کیلئے پہلے سلام کے وقت نماز سے نکلنے کی نیت مستحب ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ دائیں طرف " اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ " اور بائیں طرف " اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ " کہہ کر سلام پھیرتے۔ (سنن اربعہ دارقطنی و ابن حبان ،عن ابن مسعود واصلہ فی ،صحیح مسلم تلخیص ۲۸۸)

(۲) آپ ﷺ دائیں طرف سلام پھیرتے "السلام علیکم ورحمة الله" یہاں تک کہ آپ کا دایاں رخسار مبارک نظر آتا۔ "السلام علیکم و رحمة الله" یہاں تک کہ بایاں رخسار نظر آتا (نسائی من حدیث ابن مسعود)

(۳) آپ ﷺ نے ہم کو حکم دیا کہ ہم امام کے سلام کا جواب دیں اور آپس میں محبت کریں اور بعض بعض کو سلام کریں۔ (ابوداود والحاکم (تلخیص ۱/ ۲۸۹)

نماز سے فارغ ہونے کے بعد بکثرت اللہ کا ذکر سنت ہے۔ مستحب اذکار کے متعلق کئی صحیح روایات وارد ہیں جن کو میں نے (امام نوویؒ) 'الاذکار' میں بیان کیا ہے۔ سلام کے بعد سراً (آہستہ) دعاء کرنا سنّت ہے۔ البتہ امام مقتدی کو دعاء سکھانا چاہتا ہو تو جہراً کرے (زور سے پڑھے) اور جب مقتدی سیکھ جائیں تو آہستہ پڑھے۔ (فتح الوھاب)

سنّت کے لئے گھر جانا: فرض نمازوں کے بعد سنت نماز پڑھنے کیلئے اپنے گھر جانا مستحب ہے۔ (کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے "لوگوں اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو، اسلئے کہ افضل نماز آدمی کا اپنے گھر میں پڑھنا ہے سوائے پنجوقتہ فرائض کے" (فتح الوھاب) ورنہ اس جگہ سے ہٹ کر پڑھے۔ (مجموع میں ہے کہ منتقل نہ ہو تو گفتگو کے ذریعہ فصل کرے کیونکہ بغیر کلام یا خروج کے ایک نماز کو دوسرے سے جوڑنا ممنوع ہے۔ حاشیة الجمل)

سنّت کے لئے جگہ بدلنے کا مقصد یہ ہے کہ (قیامت کے دن) یہ سارے مقامات اس کے حق میں عبادت کی گواہی دیں گے۔ البتہ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قبلیہ سنّتوں میں جگہ تبدیل نہ کرے، اس لئے کہ نمازی کو جلدی آنے اور صفِ اوّل میں پہنچنے کی تاکید ہے۔ صف بندی کے بعد بالخصوص جمعہ اور کثرتِ صفوف کی صورت میں منتقل ہونا باعثِ مشقت ہے۔ سنّت کیلئے گھر جانا تب مستحب ہے جبکہ وقت کی تنگی گھر کی دوری بازار وغیرہ کی مصروفیات یا سستی کی وجہ سے ترک ہی ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح معتکف، جمعہ سے پہلے نوافل، طواف کی نماز اور احرام کی نماز جبکہ میقات میں مسجد ہو اس حکم سے مستثنیٰ ہیں (حاشیة الروضہ ۳۷۴ والجمل) مقتدی کو امام کے دونوں سلام کے بعد سلام پھیرنا مستحب ہے) (فتح الوھاب مع الجمل ۱/ ۳۹۵)

عورتیں نماز میں شریک ہوں، تو نماز کے بعد اسی جگہ اتنی دیر بیٹھے رہے کہ عورتیں گذر جائیں۔ نماز کے بعد دائیں یا بائیں جس طرف اپنی ضرورت ہو اس طرف اٹھ کر چل دے۔ کسی طرف ضرورت نہ ہو تو دائیں طرف افضل ہے۔ امام پہلا سلام پھیرتے ہی مقتدی کی اتباع ختم ہو چکی، اب اسے اختیار ہے چاہے تو سلام پھیرے ورنہ مزید دعاء وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرے۔ مسبوق کیلئے تشہد اوّل کا موقع ہے تو

وہ بھی امام کے سلام کے بعد مزید بیٹھ سکتا ہے، لیکن اس کے لئے مکروہ ہے۔ اور تشہد اول کا محل نہیں ہے۔ تو امام کے دوسرے سلام کے بعد فوراً کھڑا ہو جائے جان بوجھ کر عمداً بیٹھا رہا تو نماز باطل ہوگی۔ سلام کے بعد امام ذکر و دعاء کیلئے بیٹھا رہا تو اس کے لئے افضل ہے کہ دائیں طرف مڑ کر بیٹھ جائے، کہ دایاں بازو مقتدیوں کی جانب اور بایاں بازو محراب (قبلہ) کی طرف ہو۔ (فتح الوهاب مع الجمل ۔ ج ۱ ص ۴۰۵)

اگر امام صرف ایک ہی سلام پھیر لے تب بھی مقتدی کو دو سلام مستحب ہے۔ نماز میں خشوع مستحب ہے۔ اور اپنی نگاہ سجدہ کی جگہ رکھے۔ (البتہ تشہد میں انگلی اٹھانے کے بعد اس پر رکھے۔ المجموع) کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو نماز میں آنکھ بند کرنا مکروہ نہیں ہے۔ نماز میں نشاط کے ساتھ اور سارے مشاغل سے دل فارغ کر کے داخل ہونا چاہئے۔

سلام کے بعد کے اذکار

(۱) آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسی (کس وقت کی) دعاء زیادہ مقبول ہے؟ تو فرمایا رات کے آخری حصہ میں اور فرض نمازوں کے بعد"۔ (رواہ الترمذی عن ابی امامه و قال حدیث حسن)

(۲) آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہونے پر تین مرتبہ استغفار پڑھتے اور یہ کہتے۔ " اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَام " (رواہ مسلم عن ثوبان) (اے اللہ تو سلام ہے اور تیری ہی طرف سے سلامتی ہے، بابرکت ہے تیری ذات اے عظمت و بزرگی والے)

(۳) آپ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد یہ ذکر پڑھتے "لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر"

" اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَامَنَعْتَ وَلَايَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدِّ "(متفق علیه) (یااللہ جو تو عطا کرے کوئی اسے نہیں روک سکتا، اور جس سے تو روکے کوئی نہیں دے سکتا، اور کسی کی مالداری اسے تیرے پاس نفع بخش نہیں ہو سکتی)

(۴) آپ ﷺ ہر نماز کے بعد سلام پھیر کر یہ دعاء پڑھتے۔ " لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر " " لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ وَ إِلَّا إِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْكَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ"(مسلم عن عبد الله بن زبیر)

(۵) آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ جو ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ " سُبْحَانَ اللّٰهِ "۳۳ مرتبہ " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ " اور ۳۳ مرتبہ " اَللّٰهُ اَكْبَر" پڑھے، اور سو کی تعداد مکمل کرتے ہوئے " لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر" پڑھے اس کے گناہ معاف ہوں گے خواہ سمندر کے جھاگ کی تعداد میں ہو" (مسلم)

(۶) حضرت عقبہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے ہر نماز کے بعد معوذتین (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس) پڑھنے کا حکم دیا۔ (ابوداود، ترمذی، نسائی) ابوداود کی ایک روایت میں 'مُعَوِّذَات' کا لفظ ہے۔ لہٰذا سورہ اخلاص بھی پڑھے۔

(۷) آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کا ہاتھ پکڑ کر ان کو ہر نماز کے بعد اس دعا کی خصوصی وصیت فرمائی۔ "اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ "۔ (ابوداود النسائی باسناد صحیح) (یااللہ تیرا ذکر و شکر اچھی عبادت کرنے پر میری مدد فرما)

(۸) آپ ﷺ نماز مکمل کرنے کے بعد دایاں دست مبارک پیشانی پر پھیرتے پھر یہ پڑھتے۔"اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم۔ اَللّٰھُمَّ اَذْھَبْ عَنِّی الْھَمَّ وَالْحُزْنَ"(ابن السنی)

(۹) حضرت ابوامامہ کا ارشاد ہے کہ میں جب کبھی کسی فرض یا سنّت نماز میں آپ ﷺ کے قریب رہا تو آپ کو یہ کہتے سنا۔" اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَخَطَایَایَ کُلَّھَا، اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَاھْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّہٗ لَایَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَایَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّااَنْتَ" (ابن السنی)

(۱۰) آپ ﷺ نماز بعد ان کلمات کو پڑھا کرتے تھے۔"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُرَدَّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَ عَذَابَ الْقَبْرِ "(بخاری شریف) یااللہ میں بزدلی، بخل نکمی عمر، دنیاوی فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔)(الاذکار۔ ص ۶۶۔۶۹)

فصل۔ فرض نماز کی قضاء

کسی کی فرض نماز چھوٹ جائے تو اس کی قضاء واجب ہے اسے چاہئے جلد ہی اسے قضاء کرے رات کی نماز رات میں یا دن کی رات میں پڑھے تو قضاء کے وقت کا اعتبار ہوگا لہٰذا رات میں قضاء پڑھے تو جہراً اور دن میں پڑھے تو سراً پڑھے چاہے رات کی نماز ہو یا دن کی۔

نمازوں کو ترتیب سے قضاء کرنا مستحب ہے۔ قضاء نمازوں میں آپس میں اور قضاء اور ادا کے درمیان ترتیب واجب نہیں ہے۔ کسی فرض نماز کا وقت ہو اور قضاء نماز یاد آئے اور وقت میں (دونوں کی) گنجائش ہو تو پہلے قضاء پڑھ لینا مستحب ہے۔ وقت تنگ ہو تو ادا نماز پہلے پڑھنا واجب ہے ادا نماز شروع کرنے کے بعد قضاء یاد آئے تو ہر حال میں اب اسے پہلے مکمل کرے پھر قضاء پڑھ لے۔ اس کے بعد ادا کو پھر دوہرانا مستحب ہے۔ وقت میں گنجائش سمجھتے ہوئے قضاء پہلے شروع کرے پھر دوران نماز پتہ چلا کہ وقت تنگ ہے تو اس نماز کو توڑ کر پہلے ادا پڑھنا واجب ہے۔ (تاکہ یہ بھی قضاء نہ ہو جائے)

اگر جماعت ہو رہی ہو اور وقت میں گنجائش ہو تو پہلے تنہا قضاء پڑھ لینا افضل ہے۔ قضاء نمازوں کا صحیح علم نہیں، اتنا معلوم ہے دس سے کم اور بیس سے زائد نہیں ہے تو بیس نمازیں لازم ہیں۔

نماز شروع کرنے سے پہلے پانچ شرائط لازم ہیں۔:(۱) حدث اور نجاست سے پاکی (۲) ستر عورت (۳) استقبال قبلہ (۴) یقیناً یا ظناً دخول وقت کا علم (۵) نماز کی فرضیت کا علم اور اس کے اعمال کی معرفت: اگر نماز کی فرضیت سے لاعلم ہو یا بعض نمازوں کا فرض ہونا تو معلوم ہے لیکن جو نماز پڑھ رہا ہے اس کی فرضیت کا علم نہیں ہے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ اگر وضو کی فرضیت کا علم نہ ہو تب بھی یہی حکم ہے کسی کو نماز کی فرضیت کا تو علم ہو لیکن ارکان معلوم نہ ہوں تو اس کی تین صورتیں ہونگی۔(۱) سارے افعال کو سنّت سمجھے (۲) بعض افعال کو فرض اور بعض کو سنّت سمجھے لیکن دونوں میں تمیز نہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں نماز صحیح نہ ہوگی۔(۳) سارے افعال کو فرض سمجھ کر انجام دے اس صورت میں نماز صحیح ہو جائیگی۔ امام غزالیؒ نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا ایسا عام آدمی جس کو نماز کے فرائض اور سنتوں کی تمیز نہ ہو اس کی نماز اس شرط کے ساتھ صحیح ہو جائے گی کہ کسی فرض کو نفل کی نیت سے ادا نہ کرے اگر نفل کی نیت سے ادا کرے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ اگر تفصیل سے غافل ہو تو ابتداء میں اجمالی نیت کافی ہے، صحابہ کرامؓ اور بعد والے حضرات کے ظاہری احوال سے یہی بات درست معلوم ہوتی ہے آپ ﷺ سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے اعراب (دیہاتی اور گنوار) کو اسے لازم قرار دیا ہو اور ان سے ناواقف شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم دیا ہو۔

باب - ۵ نماز کے شروط اور ممنوع امور

(نماز کے شرائط اور نماز میں جو امور منع ہیں) شروط شرط کی جمع ہے، لغت میں علامت کو کہتے ہیں، اصطلاحاً شرط وہ ہے جسکے عدم سے عدم لازم ہو اور وجود سے وجود یا عدم لذاتہ لازم نہ ہو۔ (حاشیۃ الروضۃ)

نماز کے آٹھ شروط ھیں۔ (۱) استقبال قبلہ (۲) نماز کا وقت ہونے کا یقین یا گمان غالب ان دونوں کا ذکر اپنے باب میں گذر چکا (۳) طہارت حدث جس کی تفصیل کتاب الطہارت میں گذر چکی۔ اگر کوئی شخص تکبیر تحریمہ کے وقت باوضو نہ ہو، تو نماز منعقد ہی نہ ہوگی۔ عمداً یوں کرے یا سہواً اسی طرح باوضو نماز شروع کرنے کے بعد دوران نماز وضو ٹوٹ جائے، تو ساری صورتوں میں نماز باطل ہو جائے گی۔ (وضو کر کے دوبارہ از سرنو نماز پڑھنی چاہئے)

نماز میں کسی منافی امر کا پیش آنا: حدث کے علاوہ نماز کے منافی کوئی سبب دوران نماز پیش آئے اور یہ نمازی کے اختیار سے ہو، یا بغیر اختیار کے ہو، لیکن اس کی کوتاہی کے سبب ہو جیسے کوئی موزے پر مسح کرے، پھر نماز میں مسح کی مدت ختم ہو جائے تو دونوں صورتوں میں نماز باطل ہوگی۔ اس کے اختیار اور کوتاہی کے بغیر پیش آئے اور فوراً اس کا ازالہ کرے جیسے کپڑا ہٹ جائے اور فوراً وہ اسے درست کرے یا، خشک نجاست گرے اور فوراً اسے جھٹک دے، یا جس کپڑے پر نجاست گرے اس کپڑے کو ہٹا دے تو ان صورتوں میں نماز صحیح ہے، اگر اپنے ہاتھ یا آستین سے نجاست کو ہٹائے، تو نماز باطل ہوگی۔ اگر اس کے زخم سے خون ٹپکتا رہے، لیکن اس کی کھال لت پت نہ ہو، تو نماز باطل نہیں ہوگی۔

شرط (چوتھی) نجاست سے پاکی: جو نجاست معاف نہیں اس سے کپڑے بدن اور جگہ پاک ہونا ضروری ہے۔ کپڑے پر نجاست لگے اور نجاست کی جگہ کو جانتا ہے تو گذرے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کو دور کرے۔ اگر اتنا حصہ کاٹ ڈالے تو یہ بھی کافی ہے۔ اگر نجاست کو دھونا ناممکن ہو اور پاک حصہ سے ستر عورت ممکن ہو، اور کاٹنے کی صورت میں کپڑے کی اجرت سے زیادہ نقصان نہ ہو تو نجس حصہ کاٹ ڈالنا ضروری ہے۔ اگر بدن یا کپڑے میں نجاست کی جگہ کو نہیں جانتا، اور کسی بھی حصہ میں ہونے کا امکان ہو، تو مکمل دھونا واجب ہے، اندازہ لگا کر کسی ایک حصہ کو دھونا کافی نہیں۔ اگر اس کپڑے کو دو حصوں میں چاک کرے، تو دونوں کے درمیان اندازہ لگانا کافی نہیں، البتہ کوئی تر چیز اس کپڑے کے ایک طرف چھو جائے تو وہ تر چیز نجس نہیں ہوگی، اس لئے کہ اسی حصہ کا نجس ہونا یقینی نہیں۔

لباس کی پاکی: نمازی کا لباس پاک ہونا واجب ہے، اور لباس کا کوئی بھی حصہ کسی نجاست کو نہ چھوئے خواہ وہ نمازی کی حرکت سے حرکت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، لہٰذا عمامہ (پگڑی) کا وہ کنارہ جو حرکت نہ کرتا ہو، نجس زمین کو لگے تو نماز باطل ہوگی۔ اگر کسی رسی یا کپڑے کے سرے کو ہاتھ میں پکڑے یا ہاتھ، پیر یا کمر میں باندھے اور دوسرا سرا نجس ہو یا نجاست سے لگا ہو تو نماز باطل ہوگی۔ اگر رسی کا سرا اپنے قدموں تلے رکھے تو نماز صحیح ہوگی۔

ھڈی جوڑنا: ٹوٹی ہوئی ہڈی کو کسی پاک ہڈی سے جوڑنے میں کوئی حرج نہیں، اگر ضرورت کی وجہ سے نجس ہڈی سے جوڑے اور کوئی پاک ہڈی اس کے قائم مقام موجود نہ ہو تو یہ معذور ہے (لہٰذا مجبوری کی وجہ سے اس کی نماز درست ہوگی) اور اس ہڈی کو جدا کرنا اسے لازم نہیں۔

اگر نجس ہڈی کے جوڑنے کا محتاج نہ ہو یا پاک ہڈی اس کے قائم مقام موجود ہو تو اس نجس ہڈی کو الگ کرنا واجب ہے۔ جبکہ ہلاکت

کا، خوف نہ ہو، اور کوئی عضو تلف نہ ہو، اور اسی طرح تیمم کے باب میں مذکورہ کسی تکلیف کا خطرہ نہ ہو۔ وہ خود جدا نہ کرے تو سلطان جبراً جدا کرائے۔ اس ہڈی کے ساتھ اس کی نماز درست نہ ہوگی۔

جدا کرنے میں پیش آنے والی تکلیف و درد کا اعتبار نہیں۔ اسی طرح ہڈی پر گوشت چڑھ چکا ہو یا نہ چڑھ چکا ہو، دونوں برابر ہے۔ جدا کرنے میں ہلاکت جیسے امور کا خطرہ ہو تو جدا کرنا واجب نہیں۔ جن صورتوں میں جدا کرنا واجب تھا۔ بغیر جدائی کے مرگیا تو اب جدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

زخم کیلئے نجس دوائی کا استعمال کرنا، یا نجس دھاگے سے اسے سینا (ٹانکے لگانا) نجس ہڈی جوڑنے کی طرح ہے۔ بدن کے کسی حصے کو چیر کر اس میں خون ڈالے یا گودے تو نجس ہو جائے گا۔ گودنے کے اثرات کو علاج کے ذریعے دور کرے۔ بغیر زخم کے دور نہ ہو تو زخمی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور توبہ کر لینے کے بعد اسکو گناہ نہ ہوگا۔

بالوں میں جوڑ: عورت کا اپنے بالوں میں نجس بالوں کو یا انسانی بالوں کو جوڑنا قطعاً حرام ہے، کیونکہ انسان کی عظمت کی وجہ سے اس کے کسی بھی حصہ سے انتفاع حرام ہے، بلکہ اس کے بال وغیرہ دفن کئے جائیں، اس مسئلہ میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں برابر ہیں۔ انسانی بال کے علاوہ کوئی اور پاک بال ہوں اور عورت غیر شادی شدہ ہو تو ان بالوں کو جوڑنا بھی حرام ہے۔ اور شادی شدہ ہو تو شوہر کی اجازت ہو تو جوڑنا جائز ہے ورنہ حرام ہے۔

غیر شادی شدہ عورت کو اور شادی شدہ عورت کو بغیر شوہر کی اجازت کے رخسار کو سرخ کرنا حرام ہے۔ شوہر کی اجازت ہو تو جائز ہے سیاہ خضاب انگلیوں کو مہندی سے رنگنا اور بالوں کو گھنگھریالے بنانا ان سب میں یہی تفصیل ملحوظ ہوگی۔

نمازی کے بدن اور کپڑے کو اوپر نیچے اور چاروں جانب سے چھونے والی جگہ پاک ہونا واجب ہے۔ اگر ایسا کھڑا ہو کہ نجس دیوار یا چھت کو چھو رہا ہے تو نماز باطل ہوگی۔ اگر چٹائی پر نماز پڑھے اور اس کے نیچے نجاست ہو یا ایک کنارے پر نجاست ہو یا تخت پر نماز پڑھے اور اس کے پائے نجاست پر ہو تو حرج نہیں، چاہے وہ جگہ اس کی حرکت سے حرکت کرے یا نہ کرے۔ نمازی کے بدن اور کپڑے کو لگنے والی جگہ تو پاک ہو، لیکن سامنے یا سجدہ وغیرہ میں بالمقابل جگہ نجس ہو (لیکن بدن یا کپڑے پر نہ لگے) تو نماز درست ہوگی۔ باریک بنا ہوا کپڑا نجاست پر بچھا کر نماز پڑھے اور درمیانی سوراخوں سے نجاست کو چھوئے تو نماز باطل ہوگی ورنہ صحیح ہوگی۔

وہ مقامات جہاں شریعت نے نماز سے روکا ھے۔

(۱) **کوڑا خانہ اور مذبح** (بوچڑ خانہ۔ جہاں جانور ذبح ہو) ان دونوں جگہوں پر نجاست کی وجہ سے ممانعت ہے۔ اگر کپڑا یا پاک بچھونا بچھا کر اس پر نماز پڑھے تو صحیح ہوگی لیکن نیچے نجاست ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔

(۲) **سڑک پر:** اس کے دو سبب ہیں۔ (الف) غلبۂ نجاست۔ (ب) لوگوں کے گذرنے کی وجہ سے توجہ کا بٹنا۔

(۳) **حمام:** نجاست اور میل کچیل کی کثرت یا شیطانی پناہ گاہ ہونے کی وجہ سے

(۴) **کعبہ کے اوپر:** جس کی تفصیل گذر چکی۔

(۵) **وہ جگہ** جہاں رات اونٹوں کو رکھا جاتا ہو، یا پانی پینے کے بعد جمع کیا جاتا ہو البتہ بکریوں کے باڑے میں کراہت نہیں ہے۔ کسی کے بھی باڑے میں ایسی جگہ نماز پڑھے جہاں پیشاب یا مینگنی وغیرہ نجاست ہو تو نماز صحیح نہیں ہے۔

(۶) **مقبرہ** (قبرستان) قبرستان میں نماز ہر حال میں مکروہ ہے، اگر قبر دوبارہ کھودی گئی ہو تو اس جگہ نماز درست نہ ہوگی، اگر کوئی

پاک چیز بچھا کر وہاں نماز پڑھے یا دوبارہ قبر نہ کھودی ہو یا شک ہو تو نماز صحیح ہوگی۔ نماز میں قبر کی طرف رخ کرنا مکروہ ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے (۱) کوڑا خانہ، (۲) مذبح (۳) مقبرہ (۴) سڑک کے بیچ (۵) حمام (۶) اونٹ کا باڑہ (۷) بیت اللہ کے اوپر۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجه و ضعفه الحافظ فی التلخیص۔ حاشیة الروضه)

معاف نجاستوں کی تفصیل

(۱) ڈھیلوں سے استنجاء کے بعد اس جگہ باقی نجاست کا اثر معاف ہے، لیکن قلیل پانی میں وہ جگہ چھو جائے تو پانی نجس ہوگا، نمازی ایسے شخص کو اٹھائے تو اس کی نماز باطل ہوگی، پسینہ کی وجہ سے وہ جگہ تر ہو جائے تو معاف ہے۔ اگر کسی ایسے حیوان کو اٹھائے جس کے بدن پر نجاست نہ ہو تو نماز صحیح ہوگی اگر اس کے منفذ پر نجاست ہو تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ اگر یہ حیوان قلیل پانی میں یا کسی اور مائع میں گر کر زندہ نکل آئے تو وہ چیز نجس نہ ہوگی، نماز میں ایسا انڈا ساتھ ہو جس کے اندر خون ہو ظاہری حصہ پاک ہو یا ایسے انگور کا خوشہ اٹھائے، جسکے دانوں کے اندر شراب بن چکی ہو، تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ نجاست بھری سل بند بوتل ساتھ رکھے تو نماز درست نہ ہوگی، مذبوحہ جانور کا خون وغیرہ اچھی طرح دھو کر اسے نماز میں اٹھائے تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ (کیونکہ اس کے اندر نجاست موجود ہے)

(۲) **راستہ کا کیچڑ اور مٹی:** اگر یہ یقیناً نجس ہو تو قلیل مقدار معاف ہے، نہ کہ کثیر مقدار، قلیل کا مطلب جس سے بچنا کافی دشوار ہو، عادت کے پیش نظر اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسی طرح بدن یا کپڑے کے جس حصہ میں لگا ہے وہ بھی دیکھا جائے گا (لہٰذا پیر اور دامن میں ہاتھ اور آستین کے مقابلے میں زیادہ مقدار معاف ہوگی۔ اس طرح سرما میں گرما کے مقابلے میں اور نابینا کے حق میں بینا کے مقابلے میں زیادہ مقدار معاف رکھی جائے گی۔ (حاشیة الجمل) ائمہ کرام نے سہولت کے طور پر سمجھاتے ہوئے کہا ہے کہ قلیل مقدار وہ ہوگی۔ جس میں آدمی گرنے پڑنے یا لغزش یا قلت احتیاط کی طرف منسوب نہ ہو، اگر منسوب ہو تو یہ مقدار کثیر ہوگی۔ اگر کیچڑ کے نجاست کا یقین نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں (وہ پاک سمجھا جائے گا) موزے یا جوتے کے تلوے میں نجاست لگ جائے اور اسکو زمین سے رگڑ کر اچھی طرح صاف کردے، تب بھی اس کو پہن کر نماز درست نہ ہوگی۔

(۳) **پسو یا مچھر کھٹمل** وغیرہ کا خون اور مکھی کی بیٹ اور چمگاڈر کا پیشاب اس کی قلیل مقدار کپڑے اور بدن میں معاف ہے اسی طرح کثیر مقدار بھی بعض شرائط کے ساتھ معاف ہے۔

شرائط: (۱) اس کے دھونے کی طرف بالکل بے توجہی کی وجہ سے مقدار میں زیادہ اضافہ نہ ہوا ہو (۲) خود اپنے عمل سے ایسا نہ کیا ہو (۳) اس کپڑے کو پہننے کی ضرورت ہو۔

مکمل لباس کو پہننے کے بعد اس کپڑے کو مزید اوپر سے پہنے تو اس میں نماز صحیح نہ ہوگی۔

(۴) یہ معافی نماز کی حد تک ہے، لہٰذا ایسا کپڑا اگر قلیل پانی میں گر جائے تو پانی نجس ہوگا۔ (حاشیة الروضه)

ان اشیاء کی قلیل مقدار پسینہ سے پھیل جائے تو وہ بھی معاف ہے غالباً جتنی مقدار لگ جاتی ہے اور جس سے بچنا مشکل ہوا سے قلیل شمار کریں گے۔

(۵) پھوڑے پھنسی کا خون اور پیپ یہ بھی قلیل اور کثیر معاف ہے اگر خود پھوڑے کو دبا کر اندر کی چیز نکالے تو یہ معاف ہے کسی دوسرے آدمی یا جانور کا خون لگے تو تھوڑا معاف ہے، زیادہ مقدار معاف نہیں ہے، اپنے ہی زخم یا مقام فصد وغیرہ کا خون لگ جائے تو یہ بھی

پھوڑے کے حکم میں ہے، آبلہ اور زخم کا پانی اگر بدبودار ہو تو وہ نجس ہے، ورنہ پاک ہے۔

(۶) نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ کپڑے یا بدن یا محل نماز میں غیر معاف نجاست تھی تو ہر وہ نماز جو یقیناً نجاست کے ساتھ پڑھی گئی ہے، لوٹانا واجب ہے، لیکن جن نمازوں کے بعد اس نجاست کے لگنے کا احتمال ہو، ان نمازوں کا اعادہ لازم نہیں ہے۔

(۷) متفرق انواع کے متعلق: استحاضہ اور سلسل البول کی صورت میں جو نجاست جاری رہتی ہے۔ زخم پر زیادہ خون ہو اور اسکے ازالہ میں خطرہ ہو، شدت خوف کی نماز میں ہتھیاروں پر لگا ہوا خون، یہ سب معاف ہیں۔

شرط (پانچویں) ستر عورت : (شرمگاہ کا چھپانا) (لفظ عورت عربی میں ان انسانی اعضاء کیلئے استعمال ہوتا ہے جن کو شرم وحیاء سے چھپایا جاتا ہے۔ شرعاً جن اعضاء کو عام حالت میں اور نماز میں چھپانا ضروری ہے اسے عورت کہیں گے لہٰذا ان مسائل میں اکثر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوگا یہ ذہن میں رہے) ستر عورت نماز کے علاوہ تنہائی میں بھی واجب ہے، نماز کی صحت کیلئے ستر عورت شرط ہے، اگر چہ تنہائی میں کیوں نہ ہو، باوجود قدرت کے اسے ترک کرے تو نماز باطل ہوگی۔ نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کپڑا ایسی جگہ سے پھٹا تھا جس میں سے عورت (یعنی بدن کا وہ حصہ جسے نماز وغیرہ میں چھپانا ضروری ہے۔) نظر آئے تو نماز کا اعادہ واجب ہے، چاہے اسے پہلے سے معلوم ہی نہ ہو، یا معلوم تھا لیکن بھول کر اس میں نماز پڑھ لی۔ نماز کے بعد پھٹنے کا احتمال ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تنہائی میں نماز کے علاوہ کسی ضرورت سے کشف عورت (محل مخصوص سے کپڑا ہٹانا) کی اجازت ہے (مثلاً غسل قضاء حاجت استنجاء، علاج، موئے زیر ناف کا صاف کرنا اور ختنہ جیسے امور۔ (حاشیۃ الروضہ)

مرد کیلئے عورت ناف اور گھٹنے کے درمیان کی جگہ ہے۔ عورت (مونث) اگر آزاد ہے تو نماز میں چہرہ اور ہتھیلی کے ظاہر وباطن کے علاوہ سارے بدن کا چھپانا واجب ہے۔ باندی کا حکم مردوں کی طرح ہے خنثیٰ مشکل کا حکم عورت کی طرح ہے۔

ستر کی صفت

ستر عورت ایسی چیز سے واجب ہے جو نگاہ کے اور چمڑی کے رنگ کے درمیان حائل ہو، لہٰذا ایسا باریک کپڑا جس سے بدن کا رنگ جھلکے ناکافی ہے۔ کپڑا تو موٹا ہو لیکن ایسا بنا ہوا ہو کہ درمیان میں سوراخ ہو (سوئٹر وغیرہ کے مشابہ) اور اس سوراخ سے بدن جھلکے تو یہ بھی ناکافی ہے۔ رنگ تو چھپ جائے لیکن بدن کے حجم کا احساس ہو تو حرج نہیں شفاف پانی میں کھڑے ہونے سے نماز درست نہ ہوگی۔ پانی گہرا سبز یا گدلا ہو اور اس میں کھڑے ہونے کی صورت میں کھال دکھائی نہ دے تو نماز درست ہے۔ جبکہ اس صورت میں رکوع وسجدہ کر سکے یا مثلاً جنازہ کی نماز کیلئے کھڑا ہو، اگر عورت پر کیچڑ ایسا مل دے کہ رنگ چھپ جائے تو یہ کافی ہے۔ کپڑا ہونے کے باوجود بھی اس سے نماز ہوگی کپڑا وغیرہ نہ ہو اور کیچڑ مل سکتا ہے تو یہ واجب ہے۔

ستر اور پردہ اوپر اور چاروں جانب سے ضروری ہے۔ دامن اور تہبند کے نیچے جانب سے ضروری نہیں پس اگر کوئی وسیع (کشادہ) دامن والا قمیص پہن کر چھت کے کنارے کھڑا ہو اور نیچے سے عورت نظر آئے تب بھی نماز درست ہوگی۔ اگر قمیص کا گریبان کشادہ ہو اور رکوع سجدہ وغیرہ میں اوپر کی جانب سے عورت نظر آئے تو نماز درست نہ ہوگی۔ لہٰذا اسے گریبان میں بٹن لگانا یا درمیان میں باندھ دینا یا کاندھے پر کپڑا وغیرہ ڈال کر گریبان کے حصے کو چھپانا ضروری ہے۔ قمیص سینے یا پشت کی طرف سے پھٹا ہوا ہو اور اس میں سے عورت نظر آئے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (مذکورہ مثالوں کا تعلق ایسی صورت سے ہے کہ صرف لمبی قمیص پہن کر نماز پڑھے مزید تہبند یا پائجامہ

وغیرہ نیچے کے حصہ میں نہ پہنے) اگر گریبان کی کشادگی داڑھی یا سر کے بالوں سے چھپ جائے تو نماز صحیح ہوگی۔

اگر تہبند کے سوراخ کو ہاتھ سے کپڑا سمیٹ کر یا اس کے بغیر بند کرے تو نماز درست ہے۔ کپڑے وغیرہ کا بدن پر ہونا ضروری ہے لہذا کوئی تنگ خیمہ میں ننگا نماز پڑھے تو یہ صحیح نہیں۔ اگر زمین میں گڑھا کھود کر اس میں کھڑا ہو جائے اور اتنی مٹی ڈال دے کہ ستر عورت ہو تو نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے۔ اگر ستر کیلئے ایسا شیشہ (کانچ) استعمال کرے جس سے رنگ واضح ہو تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔

ستر کی غیر موجودگی: ستر عورت کیلئے کچھ بھی میسر نہ ہو تو ننگا ہی نماز پڑھے، تیمم کے باب میں اس کے نماز کی کیفیت وغیرہ گذر چکی ہے۔ کئی ننگے نمازی جمع ہوں تو وہ با جماعت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان کا امام عورتوں کی جماعت کی طرح درمیان میں کھڑا ہوگا۔ ان کیلئے عام حالت میں تنہا اور باجماعت نماز برابر ہے۔ اگر سب نابینا ہوں یا تاریکی میں ہوں تو ان کیلئے بھی جماعت مستحب ہے۔ ان میں ایک کپڑے پہنے ہوئے ہو تو وہی امامت کرے اور بقیہ اس کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوں۔ اس کے برعکس کوئی ننگا امامت کرے اور کپڑے والا اس کی اقتداء کرے تب بھی جائز ہے۔

اگر مرد اور عورتیں اس طرح جمع ہوں تو ایک ساتھ نماز نہ پڑھیں بلکہ صرف مرد پڑھیں اور عورتیں پیچھے قبلے کیطرف پشت کئے بیٹھی رہیں بعد میں عورتیں نماز پڑھیں اور مرد اسی طرح پیچھے بیٹھے رہیں۔

ناکافی ستر: صرف بعض عورت (شرمگاہ) چھپا سکتا ہو تو جتنا ممکن ہے، چھپانا لازم ہے۔ اگر صرف اگلی اور پچھلی شرمگاہ کو چھپا سکتا ہے تو اسے ہی چھپائے۔ اسے چھوڑ کر دوسرے کسی عضو کو نہ چھپائے صرف ایک ہی شرمگاہ کو چھپانا ممکن ہو، تو اگلی شرمگاہ چھپائے۔

بعض متفرق مسائل

ننگا آدمی کسی دوسرے سے زبردستی اس کا کپڑا نہیں لے سکتا (امام اذرعیؒ نے فرمایا یعنی صرف ستر کیلئے لینا جائز نہیں، البتہ سخت گرمی وسردی سے بچنے کیلئے مضطر کی طرح جائز ہوگا۔ اور ایسی صورت میں اس میں نماز پڑھے گا۔ اسی طرح اگر کپڑے کے مالک کو اس ننگے شخص کو کپڑا پہنانا شرعاً واجب ہو، باپ یا بیٹا ہونے کی وجہ سے اور خود وہ اس کپڑے سے بے نیاز ہو اور کپڑا اس قسم کا ہو جو اسے دیا جانا چاہئے، تو ان شرائط کے ساتھ زبردستی لینے کی گنجائش ہوگی۔ (حاشیۃ الروضہ) اگر کوئی ننگے شخص کو کپڑا ہبہ کرے تو اسے قبول کرنا لازم نہیں ہے (امام اذرعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس شخص کو گرمی یا سردی کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو ہبہ قبول کرنا بظاہر قطعاً لازم ہے اور اس صورت میں ہبہ قبول نہ کر کے ننگا ہی نماز پڑھے تو اعادہ لازم ہے۔ (حاشیۃ الروضہ) اگر کوئی عاریۃ (وقتی طور پر استعمال کیلئے) کپڑا دے تو لینا لازم ہے، اگر نہ لے اور عریاں ہی نماز پڑھے تو صحیح نہ ہوگی۔ کوئی کپڑا فروخت کرے یا اجرت (کرایہ) پر دے تو یہ پانی کے فروخت کی طرح ہے۔ جس کی تفصیل تیمم میں گذر چکی۔ اور کپڑا قرض دینا قیمت قرض دینے کی طرح ہے۔ کپڑا اور پانی طہارت کیلئے خریدنے کی ضرورت ہو اور کوئی ایک ہی چیز خرید سکتا ہے تو کپڑا خریدے۔ اگر کوئی اپنا کپڑا سب سے زیادہ مستحق کیلئے وصیت کر جائے تو عورت پھر خنثیٰ مقدم ہے۔ صرف نجس کپڑا ہو اور پاک کرنے کا انتظام نہ ہو تو ننگا ہی بلا اعادہ نماز پڑھ لے، نماز کے علاوہ ستر عورت کے لئے اسے پہننا لازم ہوگا صرف ریشم کا کپڑا موجود ہو تو نماز اور لوگوں کی نگاہوں سے پردے کیلئے اسے پہننا واجب ہے، کیونکہ حاجت کی وجہ سے ریشم مباح (جائز) ہوگا۔ نماز کیلئے اپنی حیثیت کے مطابق بہترین کپڑا پہننا اور عمامہ باندھنا مستحب ہے، دو کپڑے پہنے تو افضل قیص اور چادر یا قیص یا پاجامہ ہے ایک ہی

کپڑا پہنے تو افضل قمیص ہے، ورنہ پھر تہبند اس کے بعد پاجامہ۔ ایک کپڑا اگر کشادہ ہو تو کاندھے کے اوپر سے اسے پہن لے اور دونوں کنارے بالمقابل کاندھے پر ڈالدے، اگر تنگ ہو تو ناف کے اوپر باندھ لے، اور اس کا کچھ حصہ کاندھے پر ڈالدے، عورت کیلئے مکمل بدن چھپانے والا کرتہ اور دوپٹہ میں نماز پڑھنا اور اپنے کپڑوں کے اوپر ایسی ڈھیلی چادر یا قمیص استعمال کرنا جس سے اس کے اعضاء کی ساخت بالکل معلوم نہ ہو مستحب ہے۔

ننگے آدمی کیلئے کسی دوسرے کا کپڑا (بلا اجازت) پہننا حرام ہے بلکہ ایسے ہی نماز پڑھ لے، آئندہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اگر گھاس پتے وغیرہ کے ذریعے بدن چھپانا ممکن ہو تو یہ لازم ہے کسی نجس جگہ مقید ہو اور کپڑا ستر عورت اور نجاست پر بچھانا دونوں کے لئے ناکافی ہو تو اس کپڑے کو نجاست پر بچھا کر ننگا ہی بلا اعادہ نماز پڑھ لے۔ اگر کسی کے پاس کپڑا ہو لیکن نماز کا وقت ہونے کے بعد بلا ضرورت اس کو تلف کردیا یا پھاڑ ڈالے تو گنہگار ہوگا۔ اور ننگا ہی نماز پڑھ لے۔ ایسے کپڑے میں نماز پڑھنا جس میں تصویر ہو مکروہ ہے۔

مرد کو نماز میں ڈھاٹا باندھنا اور عورت کو نقاب سے منہ چھپانا اور دونوں کو منہ ڈھانکنا مکروہ ہے، البتہ جمائی آئے تو سنت ہے کہ اپنا ہاتھ منہ پر رکھے (بائیں ہاتھ کا پشت رکھنا بہتر ہے۔ حاشية الجمل) اشتمال صماء اور اشتمال یہود مکروہ ہے اشتمال صماء یعنی پورے بدن کو کپڑے سے ڈھانپ لینا اور مزید دونوں کنارے اٹھا کر بائیں کاندھے پر ڈال دینا، اشتمال یہود بھی اسی طرح ہوگا البتہ دونوں کناروں کو اٹھائے گا نہیں۔

فصل ۔ چھٹی شرط کلام اور بات چیت نہ کرنا۔

نماز میں گفتگو کی دو حالت ہوگی۔ (۱) بغیر عذر کے، اگر صرف ایک حرف زبان سے نکالے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن اس ایک حرف کا کچھ مفہوم ہو تو باطل ہوگی جیسے (عربی زبان میں) قِ (قوت دے) شِ (چغلی کر) اگر دو حرف نکالے تو نماز باطل ہوگی، چاہے اس کا کچھ مفہوم ہو یا نہ ہو۔ ایک ہی حرف کو مد کرے تو نماز باطل ہوگی، بغیر مجبوری کے کھانسنے میں دو حرف ظاہر ہوں تو نماز باطل ہوگی۔ اگر کھانسنے میں مجبور اور بے بس تھا تو حرج نہیں بغیر کھانسنے اور کھنکھارنے کے تلاوت ممکن نہ ہو تو وہ معذور ہے اگر تلاوت تو ممکن ہو لیکن جہر (زور سے پڑھنا) ممکن نہ ہو تو یہ عذر نہیں ہے۔ (یعنی آہستہ ہی پڑھ لے۔ زور سے پڑھنے کیلئے کھانسنے کی صورت میں دو حرف ظاہر ہوئے تو نماز باطل ہوگی) امام کے کھانسنے سے دو حرف ظاہر ہوں تو اسے معذور سمجھتے ہوئے اقتداء برقرار رکھیں گے۔ ہنسنے، رونے اور پھونکنے میں دو حرف ظاہر ہوں تو نماز باطل ہوگی ورنہ نہیں، چاہے رونا دنیا کے تعلق سے ہو یا آخرت کی وجہ سے۔

(۲) **عذر کی وجہ سے گفتگو:** بغیر قصد و ارادہ کے گفتگو کی طرف سبقت لسانی ہو، یا ہنسی یا کھانسی کے غلبہ کی وجہ سے دو حرف ظاہر ہوں یا (نماز میں ہونا) بھول کر یا نماز میں گفتگو کی حرمت کا مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی سی گفتگو کرے تو نماز باطل نہ ہوگی زیادہ گفتگو ہو تو اس صورت میں بھی نماز باطل ہوگی۔ کم اور زیادہ کا فیصلہ عرف کی روشنی میں کیا جائے گا۔

لاعلمی صرف اس شخص کیلئے عذر ہے جو ابھی ابھی اسلام لایا ہو۔ اگر قدیم مسلمان ہو تو اس کی نماز باطل ہوگی کیونکہ مسائل نہ سیکھنا اس کا قصور ہے۔ کلام کا نماز میں حرام ہونا تو معلوم ہو لیکن اس سے نماز ٹوٹنے کا علم نہ ہو، تو یہ بھی عذر نہیں ہے۔ اگر کھانسی سے نماز کے ٹوٹنے کا علم نہ ہو تو وہ معذور ہے، کیونکہ اس حکم کا علم عوام کو نہیں ہوتا بعض کو گفتگو کا حرام ہونا تو معلوم ہو لیکن جس قسم کی گفتگو اس نے کی ہے اس کا حرام ہونا معلوم نہ ہو تو وہ معذور ہے، کسی کی زبردستی اور اکراہ کی وجہ سے گفتگو کرے تو نماز باطل ہوگی جیسے کوئی زبردستی بے وضو یا بیٹھ کر نماز پڑھنے پر

مجبور کرے تو اس کا اعادہ لازم ہے۔ اگر نماز کی مصلحت سے گفتگو کرے مثلاً امام بیٹھنے کی جگہ کھڑا ہوا تو مقتدی نے کہا بیٹھ جاؤ۔ تو نماز باطل ہوگی۔ یہ عذر نہیں ہے۔ بلکہ اسے تسبیح کے ذریعے تنبیہ کرنا چاہئے۔ کوئی انسان ہلاکت کے قریب ہو (مثلاً کوئی اندھا گڑھے میں گرنے کے قریب ہو) اور بغیر کلام کے اس کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا تو آواز دے کر اسے روکنا واجب ہے لیکن نماز باطل ہوگی۔ آپ ﷺ اپنے دور میں کسی نمازی سے گفتگو کریں تو اسے فوراً جواب دینا لازم ہے اور اس سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی۔ اگر جہنم کے خوف سے آہ کہے تو نماز باطل ہوگی۔

احادیث: (۱) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے چار رکعت کی نماز میں) دو پر سلام پھیر دی تو ذوالیدین نے پوچھا اے اللہ کے رسول کیا نماز قصر ہوگئی یا آپ بھول گئے؟ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا کیا ذوالیدین صحیح کہہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا تب آپ ﷺ نے دوسری دو رکعت پڑھ کر سلام پھیری پھر تکبیر کہہ کر نماز کی طرح یا اس سے طویل دو سجدے کئے۔ (صحاح ستہ)

(۲) حضرت زید بن ارقم فرماتے ہیں ہم نماز میں بات کر لیتے تھے کوئی شخص اپنے پاس والے سے بات کر لیتا یہاں تک کہ آیت: "وَقُوْمُوْلِلّٰهِ قَانِتِيْنَ" نازل ہوئی تو ہم کو سکوت کا حکم ہوا اور کلام سے روکا گیا۔ (بخاری ۔ مسلم، ابوداود)

(۳) ایک صحابی معاویہ بن حکمؓ لاعلمی کی وجہ سے نماز میں کچھ گفتگو کرتے ہیں، لہٰذا فراغت پر آپ ﷺ نے ان کو سمجھایا کہ ان نمازوں میں لوگوں کے گفتگو کے قبیل کی کوئی چیز درست نہیں، نماز میں تو تسبیح و تکبیر اور تلاوت ہوگی۔ (مسلم، ابوداود، نسائی)

(تیسر الوصول)

نماز میں تنبیہ: کسی مرد کو نماز کے دوران تنبیہ کی ضرورت پیش آئے، مثلاً کسی نابینا کو دیکھے کہ کنویں میں گرنے کے قریب ہے، یا کوئی گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہے یا کسی کو کچھ اطلاع دینا ہو تو سنت ہے کہ "سُبْحَانَ اللہ" کہے۔ ان تمام صورتوں میں عورت تالی بجائے گی جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنے دائیں ہتھیلی کے اندرونی حصے (پیٹ) کو بائیں ہتھیلی کے پشت پر مارے اگر دائیں انگلیوں کو بائیں انگلیوں پر مارے یا دائیں انگلیوں کو بائیں ہتھیلی کی پشت پر مارے تو یہ بھی جائز ہے البتہ دونوں ہتھیلی کے پیٹ کو آپس میں مار کر تالی نہ بجائے۔ بطور لہو و لعب (کھیل کود) اس طرح کرے تو نماز باطل ہوگی۔

مبطل کلام: بغیر عذر کلام سے نماز تب باطل ہوگی جبکہ قرآن ذکر اور دعاء جیسے کلام کے علاوہ کلام ہو۔ اگر قرآن کے آیت کو تلاوت کی نیت سے یا تلاوت کے ساتھ کسی اور نیت سے پڑھے جیسے امام یا کسی دوسرے کو متنبہ کرنا، لقمہ دینا، یا کوئی بات سمجھا دینا جیسے اندر آنے کی اجازت چاہنے والوں کو (اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ ۔آیت ۴۶ سورہ الحجر) کہنا یا (يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۔آیت ۱۲۔ سورہ مریم) کہنا یا اس کے مشابہ، تو ان تمام صورتوں میں نماز باطل نہ ہوگی چاہے دوران تلاوت اس آیت تک پہنچا ہو یا موقع کی مناسبت سے ابتداء اس آیت کو پڑھا ہو۔ لیکن صرف افہام اور اطلاع کی نیت سے آیت کی تلاوت کرے (یعنی ساتھ تلاوت کا قصد نہ ہو) تو نماز باطل ہوگی۔ اگر قرآن کے چند کلمات کو بغیر قرآنی ترتیب کے پڑھے۔ جیسے۔ "يَا اِبْرَاهِيْمَ ، سَلَامٌ كُنْ" تو نماز باطل ہوگی اور ان الفاظ کو کسی حال میں قرآن کا حکم نہ ہوگا۔

ذکر و اذکار: تسبیحات اور دعائیں عربی زبان میں پڑھنا جائز ہے، چاہے مسنون ہو یا نہ ہو۔ لیکن جس میں آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور مخلوق کو خطاب ہو، ایسے الفاظ سے اجتناب ضروری ہے، کسی انسان کو خطاب کے لفظ سے سلام کرے یا اس کے سلام کا جواب

دے تو نماز باطل ہوگی۔ کسی نے سلام کیا تو نمازی ہاتھ یا سر کے اشارہ سے جواب دے اگر علیہ السلام کہے۔(یعنی اس پر سلامتی ہو) تو نماز باطل نہ ہوگی۔(کیونکہ اس میں خطاب نہیں ہے) دوسرے کے چھینکنے پر "یَرْحَمُہُ اللّٰہِ"(اللہ اس پر رحم کرے) کہے۔ تو حرج نہیں لیکن "یَرْحَمُکَ اللّٰہِ"(اللہ تجھ پر رحم کرے) کہے تو نماز باطل ہوگی۔

احادیث: حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ہم نماز میں آپ ﷺ کو سلام کہتے تو آپ جواب دیتے۔ پھر جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹے (ہجرت حبشہ کے بعد) تو آپ کو سلام کہا، لیکن جواب نہ دیا، پوچھنے پر فرمایا: یقیناً نماز میں نماز کے اعمال میں مصروفیت ہے۔(بخاری و مسلم) ابوداود ابن حبان کی روایت میں ہے۔ اللہ نے نیا حکم نازل فرمایا ہے۔ کہ نماز میں گفتگو نہ کرو' آپ ﷺ قبا میں نماز پڑھ رہے تھے تو انصار نے آ کر سلام عرض کیا آپ ﷺ نے ہتھیلی کے اشارہ سے جواب دیا۔ (احمد، ترمذی ،نسائی، ابن ماجہ ،ابن حبان ،تلخیص الحبیر)

نماز میں سکوت یا اشارہ: نماز میں تھوڑی دیر یا زیادہ دیر کسی عذر سے یا بغیر عذر کے چپ رہے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی، گونگے شخص کا سمجھ میں آنے والا اشارہ بیع (خرید و فروخت) وغیرہ معاملات میں نطق (گفتگو) کی طرح ہے۔ لیکن ان اشاروں سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی۔

شرط (ساتویں) افعال کثیرہ سے پرہیز (زیادہ حرکت سے بچنا)

نماز کے اعمال کے علاوہ افعال کی دو قسمیں ہیں۔(ا) وہ فعل و عمل جو نماز کی جنس سے ہو۔(جیسے مزید رکوع و سجدہ وغیرہ)(ب) جو نماز کی جنس سے نہ ہو۔

(ا) اگر نماز کے جنس کے عمل کو کوئی بھول کر انجام دے، جیسے ایک رکوع یا سجدہ یا رکعت زائد ادا کرے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن عمداً یوں کرنے تو نماز باطل ہوگی۔(۲) جو عمل اور حرکت نماز کی جنس سے نہ ہو اگر وہ کثیر ہے تو نماز باطل ہوگی اور قلیل ہو تو نماز باطل نہ ہوگی۔ قلیل و کثیر کے فرق کیلئے عادت کی طرف رجوع کریں گے۔ لہٰذا جتنی حرکت کو عموماً لوگ قلیل تصور کرتے ہوں، اس سے نماز باطل نہ ہوگی جیسے اشارۃً سلام کا جواب دینا، چپل اتارنا، ہلکا کپڑا پہننا، یا اتارنا صرف ایک عمل جیسے ایک قدم آگے رکھنا، ایک مار مارنا قلیل ہے، اس طرح دو بھی قلیل ہے لیکن تین کثیر ہے۔ کثیر عمل سے نماز اس وقت باطل ہوگی، جبکہ یہ مسلسل اور پے در پے ادا ہوں۔ اگر ان کے درمیان اتنا فاصلہ ہو کہ یہ اعمال ایک دوسرے سے جدا شمار ہوں، تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی، جیسے ایک قدم یا دو قدم آگے رکھا پھر کچھ دیر کے بعد ایک دو قدم اور آگے رکھا تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی۔

بعض علماء نے فرمایا کہ دو عمل کے درمیان (اقل) ایک رکعت کے بقدر فاصلہ ہو تو یہ جدا شمار ہوں گے۔ ایک عمل سے نماز اس وقت باطل نہیں ہوگی۔ جبکہ وہ حد سے گذرا ہوا نہ ہو۔ لہٰذا کوئی ایک مرتبہ بھی کود ے تو نماز باطل ہوگی اسی طرح بڑی حرکتوں سے نماز باطل ہوگی۔ خفیف اور چھوٹی حرکتوں سے باطل نہ ہوگی، جیسے انگلیوں سے تسبیح گننا، کھجانا یا گرہ لگانا یا کھولنا۔ امام شافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے کہ اگر آیتوں کو نماز میں انگلیوں پر گنتا ہے تو نماز باطل نہ ہوگی، لیکن اولیٰ اس طرح نہ کرنا ہے۔ عمل کثیر عمداً ہو یا سہواً دونوں صورتوں میں نماز باطل ہوگی۔ یہ عام حالت کی نمازوں کا حکم ہے۔ شدت خوف کی نماز میں حاجت کی وجہ سے کچھ گنجائش ہے، جس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

نماز میں قرآن میں دیکھ کر تلاوت نماز میں قرآن شریف میں دیکھ کر تلاوت کرنا جائز ہے، بلکہ سورہ فاتحہ

زبانی یاد نہ ہوتو دیکھ کر پڑھنا واجب ہے، جیسا کہ گذر چکا۔ بیچ میں ورق الٹنے میں حرج نہیں، قرآن کے علاوہ کسی تحریر کو دیکھ کر اپنے دل میں اسے پڑھے (یعنی زبان سے ادا نہ کرے) تو نماز باطل نہ ہوگی۔

احادیث: (۱) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے امامہ بنت ابی العاص (آپ کی نواسی) کو کاندھے پر اٹھا کر نماز پڑھائی (متفق علیہ)

(۲) حضرت ابن عباس تہجد کی نماز میں آپ ﷺ کے بائیں طرف کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے کان پکڑ کر انہیں دائیں طرف کر دیا۔ (متفق علیہ)

(۳) آپ ﷺ نماز میں اشارہ فرماتے۔ (ابو داود ابن خزیمہ)

(۴) حضرت عائشہؓ کے ایک غلام قرآن میں دیکھ کر ان کو تراویح پڑھاتے تھے۔ (امامت کرتے تھے) (ابن ابی شیبہ والبخاری تعلیقاً)(تلخیص الحبیر)

سترہ (نمازی کا سامنے کچھ آڑ رکھنا)

احادیث: (۱) جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اپنے سامنے کوئی چیز (بطور سترہ) رکھے نہ ہو تو عصا (ڈنڈا) کھڑا کر دے عصا نہ ہو تو ایک خط (لکیر) کھینچ دے پھر سامنے سے کسی کے گذرنے میں اسے کوئی نقصان نہیں، (الشافعی، احمد، ابوداود، ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی۔ تلخیص ۱/ ۳۰۵)

(۲) نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کو اس گناہ کی شدت کا علم ہو تو چالیس تک کھڑے رہنا سامنے سے گذرنے سے بہتر ہے۔ (متفق علیہ)

(۳) نماز میں تمہارے سامنے سے کوئی گذرے تو اسے روکو، نہ مانے تو پھر روکو، پھر نہ مانے تو اسے مارو وہ شیطان ہے۔ (رواہ البخاری و مسلم)

نمازی کے سامنے دیوار یا ستون وغیرہ سترہ ہونا مستحب ہے۔ سترہ اور نمازی کے درمیان تین ذراع (ہاتھ) سے زیادہ فاصلہ نہ ہو۔ کھلے میدان وغیرہ میں ہو تو عصا وغیرہ کھڑا کر دے۔ یا اپنا اسباب وغیرہ جمع کر کے سامنے رکھ دے (جس کی اونچائی ایک ذراع یا کم از کم دو تہائی ہاتھ ہو) سامنے رکھنے کچھ میسر نہ ہو تو ایک خط کھینچے یا مصلی (جانماز) بچھالے خط لمبائی میں قبلے کی طرف کھینچے۔

سترہ موجود ہو تو نمازی کے اور سترہ کے درمیان سے گذرنا حرام ہے کوئی گذرے، تو نمازی اسے دفع کر سکتا ہے، نہ مانے تو مار بھی سکتا ہے چاہے نتیجتاً وہ مر بھی جائے۔ گذرنے والے کیلئے دوسرا راستہ ہو، یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں یہی حکم ہے جیسا کے بخاری شریف کی روایت سے واضح ہے۔ اگر سامنے سترہ نہ ہو یا سترہ دور ہو (یعنی نمازی کے اور اس کے درمیان تین ذراع سے زائد فاصلہ ہو) تو خود نمازی کی غلطی ہے لہٰذا اب گذرنے والے کو روکنے کا اختیار نہ ہوگا اور خود گذرنا بھی حرام نہ ہوگا لیکن افضل نہ گذرنا ہے۔

دوران جماعت آنے والے کو پہلی صف میں جگہ خالی نظر آئے تو اسے پر کرنے کے لئے دوسرے صف کے آگے سے گذرنا جائز ہے، کیونکہ یہ ان کا قصور ہے۔

کسی بھی چیز کے نمازی کے سامنے سے گذرنے سے نماز باطل نہ ہوگی، چاہے مرد، عورت، کتا، گدھا یا اور کوئی شئے گذرے۔ نمازی سامنے سترہ رکھے تو سنت ہے کہ اسے بالکل سامنے نہ رکھتے ہوئے معمولی دائیں یا بائیں سمت رکھے۔

حدیث: (۱) حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں میں نے جب بھی آپ ﷺ کو کسی لکڑی یا ستون یا درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا تو اسے دائیں یا بائیں بھنوؤں (آنکھ) کے بالمقابل رکھتے پایا۔ اسے بالکل سامنے نہ رکھتے۔ (تاکہ بت پرستوں سے مشابہت نہ ہو) (رواہ ابوداود)

(۲) نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی (یعنی سامنے سے گذرنے سے) حتی الامکان (گذرنے والے کو) دفع کرو کیونکہ وہ شیطان ہے۔ (ابوداود عن ابی سعید) (مشکوۃ)

شرط (آٹھویں) ۔ کھانے سے باز رہنا

نماز میں کچھ کھالے، چاہے معمولی چیز ہو تو نماز باطل ہوگی۔ دانتوں میں پھنسے ریزے یا سر سے اترے ہوئے بلغم کو عمداً نگلے تو نماز باطل ہوگی۔ مغلوباً اندر چلا جائے تو باطل نہ ہوگی۔ بھول کر یا مسئلہ سے لاعلمی کی وجہ سے تھوڑا کھالیا تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔ زیادہ کھا جائے تو اس صورت میں بھی ٹوٹ جائیگی۔ قلیل و کثیر کا دارومدار عرف پر ہوگا۔ بغیر چبائے اور نگلے بھی کوئی چیز پیٹ میں پہنچ جائے، مثلاً کوئی شکر منہ میں رکھے اور وہ پگھل کر اندر پہنچ جائے تو نماز باطل ہوگی۔ تو خلاصہ یہ کہ جن صورتوں میں روزہ ٹوٹتا ہے نماز بھی ٹوٹ جائے گی۔ چبانا تنہا بھی ایک فعل ہے، جس کی کثرت سے نماز باطل ہوگی، چاہے اندر کوئی چیز نہ جائے یہاں تک کہ گوند چباتا رہے تو نماز باطل ہوگی۔

فصل ۔ مسجد کے بعض احکام

بے وضو شخص مسجد میں ٹھہر سکتا ہے۔ اسی طرح اسے بغیر کراہت کے مسجد میں سونا جائز ہے۔ (لیکن جو نشہ میں ہو وہ مستثنیٰ ہے اسے مسجد میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ حاشیۃ الروضہ) جنبی اور حائضہ کا مسئلہ گذر چکا ہے۔ کسی کافر کو حرم مکہ میں داخلہ کی قطعاً اجازت نہیں ہے، چاہے مسجد ہو یا غیر مسجد۔ حرم پاک کے علاوہ دنیا کے دیگر مساجد میں کافر (کسی مکلف) مسلمان کی اجازت سے جاسکتا ہے، بغیر اجازت کے نہیں جاسکتا۔ اگر گیا تو (اسلامی حکومت) اسے مناسب تعزیری سزا دے گی، اگر حاکم (قاضی) فیصلے کیلئے مسجد میں بیٹھے تو ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم باشندہ) اپنے محاکمے کے لئے (حاکم کے سامنے اپنا جھگڑا اور کیس لے جانے کیلئے) بغیر اجازت کے جاسکتا ہے۔ اور اس کا مسجد میں بیٹھنا ہی اجازت سمجھا جائے گا۔

ذمی کو سونے اور کھانے کیلئے مسجد میں اجازت نہ دی جائے، قرآن یا علمی بات سننے کیلئے اجازت دی جائے، شاید کہ اسلام لے آئے۔ ذمی جنبی ہو تب بھی روکنا ضروری نہیں ہے۔ جن صورتوں میں مسلمان حائضہ کو مسجد سے روکا جاتا ہے، ایک کافرہ حائضہ کو بھی روکا جائے گا۔ بچوں اور پاگلوں کو مسجد میں داخل ہونے سے روکا جائے گا (ایسے بچے مراد ہیں جو مسجد کے احترام وغیرہ کی سمجھ نہیں رکھتے) جنبی اور حائضہ کو مسجد کے علاوہ دیگر نماز کے مقامات (مثلاً عیدگاہ) میں جانا ممنوع نہیں۔ مسجد کو نقش و نگار کرنا اور کنگرے بنانا مکروہ ہے۔ نماز کے علاوہ دیگر اوقات میں مسجد کو بند رکھنے میں کوئی حرج نہیں مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اگر کوئی تھوکے تو اب اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ مسجد کے ریت یا مٹی میں اسے دفن کردے (جبکہ قدیم طرز پر مسجد میں ریت یا مٹی بچھی ہو، پختہ فرش نہ ہو، ورنہ مناسب طریقے سے اس کی صفائی کرے) اگر ہاتھ وغیرہ سے پونچھ کر اچھی طرح صاف کردے تو یہ بہتر ہے۔ جو شخص لہسن یا پیاز یا اور کوئی بدبودار چیز کھالے تو جب تک بدبو ختم نہ ہو، بلا مجبوری کے مسجد میں جانا مکرہ ہے، مسجد کے اندر پیڑ لگانا مکروہ ہے اگر کوئی لگادے تو امام وقت (ذمہ دار) اسے کاٹ دے۔ مسجد میں کنواں کھودنا۔ اور کوئی کاریگری وغیرہ کرتے بیٹھنا مکروہ ہے۔ مسجد میں کھانے پینے میں اور وضو کرنے میں حرج نہیں جبکہ اس سے اوروں

کو تکلیف نہ ہو۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پیر اندر رکھے اور نکلتے وقت بایاں پیر باہر نکالے اور جو مشہور دعائیں احادیث میں موجود ہیں پڑھے۔ مسجد کی دیوار کو باہر کی طرف سے بھی تمام باتوں میں مسجد ہی کی حرمت کا حکم ہے۔

احادیث: (۱) مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے۔ (متفق علیه عن انسؓ) (۲) جو شخص اس بدبودار پودے سے (یعنی پیاز) کھائے وہ ہرگز ہمارے مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو ان چیزوں سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ (متفق علیه عن انسؓ)

(۳) اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب جگہ مساجد ہیں اور سب سے مبغوض (نفرت والی جگہ) بازار ہیں۔ (مسلم عن ابی هریرةؓ)

(۴) جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے مسجد تعمیر کرے اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں مکان تعمیر کرتے ہیں۔ (متفق علیه، عن عثمانؓ)

(۵) تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِی اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ" اور باہر نکلے تو "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ" پڑھے۔ (رواه مسلم عن ابی اسید)

(۶) مجھے مساجد کو (گچ کاری) مزین کرنے کا حکم نہیں دیا گیا حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ تم ضرور مساجد کو مزین کرو گے جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا۔ (رواه ابوداود عن ابن عباس، مشکوة شریف)

باب ۶۔ ان سجدوں کا ذکر جو اصل نماز میں داخل نہیں

ایسے سجدے تین ہیں (۱) **سجدہ سہو** (۲) **سجدہ تلاوت** (۳) **سجدہ شکر**

(۱) **سجدہ سہو:** سجدہ سہو سنت ہے، واجب نہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں (۱) کسی مطلوبہ عمل کا ترک (۲) کسی ممنوعہ عمل کا ارتکاب۔ (۱) **مطلوبہ عمل کا ترک:** اگر کسی رکن کو ترک کرے تو اس کی تلافی اور تدارک ضروری ہے، سجدہ سہو کر لینا کافی نہیں ہے، تلافی کے بعد کبھی تو سجدہ سہو بھی سنت ہوگا اور کبھی نہیں جیسا کہ آئندہ تفصیل آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اگر سنن ابعاض میں سے کوئی سنت عمداً یا سہواً (بھول سے) چھوٹ جائے، تو سجدہ سہو کرنا سنت ہے۔

(۲) **ممنوع عمل کا ارتکاب:** اس کی دو قسمیں ہیں (۱) ایسا عمل جس کے عمداً کرنے سے بھی نماز باطل نہیں ہوتی۔ جیسے التفات (ادھر ادھر دیکھنا) ایک یا دو قدم آگے بڑھنا (۲) ایسا عمل جس کے عمداً کرنے سے نماز باطل ہوتی ہے۔ جیسے کلام، زائد رکوع وغیرہ۔ پہلی صورت میں سجدہ سہو نہ کرے۔ دوسری صورت میں اگر سہواً وہ عمل کرنے سے نماز باطل نہ ہو تو سجدہ سہو کرنا سنت ہے۔ عمل کثیر، زیادہ کھانا، اور کثیر کلام سہواً بھی ہو تو نماز باطل ہوگی اس لئے اس صورت میں سجدہ سہو کا سوال نہیں، اسی طرح عمداً یا سہواً حدث ہو جائے تب بھی نماز باطل ہے اس لئے سجدہ سہو نہیں کرے گا۔ صحیح مسلم شریف کی روایت سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اعتدال کو کافی طویل کیا۔ اس لئے دلیل کی رو سے راجح بات یہی ہے کہ اعتدال کو ذکر کے ذریعے طویل کرنا جائز ہے۔ (امام اذرعیؒ بھی مذهبا و دلیلا اسے صحیح قرار دے رہے ہیں اور نص شافعی سے اسے نقل فرمایا ہے۔ حاشیة الروضه)

کسی رکن ذکری (قولی رکن) کو دوسرے طویل رکن کی طرف منتقل کرے مثلاً سورہ فاتحہ مکمل یا بعض، رکوع یا تشہد میں پڑھے یا بعض تشہد، قیام میں عمداً پڑھے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن عمداً اعتدال کو سورہ فاتحہ یا تشہد کی وجہ سے طویل کرے تو نماز باطل ہوگی۔ سہواً اس طرح ہو تو سجدہ سہو کرے۔ بعض وہ مسائل جن کے عمداً کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی پھر بھی ان کے سہواً کرنے سے سجدہ سہو سنت ہے

(۱)رکوع سے قبل دعاءِ قنوت پڑھنا(۲)رمضان کے نصف آخر کے علاوہ وتر میں دعائے قنوت پڑھنا۔ (حاشية الروضه ۔ ۱/۴۰۶)

فصل - ترتیب کے متعلق

نماز کے ارکان میں ترتیب واجب ہے عمداً ترتیب ترک کرنے سے نماز باطل ہوگی۔ اگر سہواً ترک ہوتو اس متروکہ (چھوٹے ہوئے) رکن کے بعد کے اعمال کا اعتبار نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اسے ادا نہ کرے۔ متروکہ فعل کے مثل ادا کرنے سے قبل یاد آئے تو فوراً اس متروک کو ادا کرے۔ (اور آگے بڑھے۔) اور دوسری رکعت میں اس کے مثل ادا کرنے تک یاد نہ آیا تو اس کے ذریعے وہ ادا ہوگیا، اور اسی طرح ایک رکعت ہوگئی۔ اور درمیانی اعمال لغو ہوئے۔ (ان کو شمار نہیں کرے گے)

مثال ۔ پہلی رکعت کا رکوع ترک کرکے آگے بڑھا اب دوسری رکعت کا رکوع کرنے سے پہلے جب بھی یاد آئے فوراً پہلی رکعت کرے اور پھر ترتیب سے آگے بڑھے۔ دوسری رکعت کے رکوع تک یاد نہ آئے تو دوسری رکعت کا یہ رکوع پہلی رکعت کا رکوع شمار ہوگا۔ درمیان میں جو سجدے وغیرہ ہو چکے ہو غیر معتبر ہیں۔ اب آگے اعتدال سجدے وغیرہ کرے تب پہلی رکعت مکمل ہوگی۔

یہ تفصیل اس وقت ہے کہ چھوٹا ہوا رکن اور اس کی جگہ یاد ہو، ورنہ پھر ادنیٰ ممکن پر عمل کرکے آگے بڑھے۔ ان ساری صورتوں میں سجدہ سہو کرے۔ لیکن از سرنو نماز دہرانی پڑے، مثلاً کوئی رکن چھوٹے اور اس کے نیت یا تکبیر تحریمہ ہونے کا بھی امکان ہو (تو اس صورت میں نماز نئے سرے سے پڑھنا ضروری ہے) تو سجدہ سہو نہ کرے، اسی طرح سلام ترک ہو اور زیادہ وقت گذرنے سے پہلے یاد آجائے تو سلام پھیرے سجدہ سہو کی ضرورت نہیں ہے۔

تشہد اوّل کا ترک : مسئلہ گذر چکا کہ تشہد اول کے ترک سے سجدہ سہو سنت ہے، اگر کوئی دوسری رکعت میں تشہد بھول کر کھڑا ہوگیا یا بیٹھا لیکن تشہد پڑھنا بھول کر کھڑا ہوگیا اور پوری طرح قیام میں پہنچنے کے بعد یاد آیا تو اب تشہد کیلئے بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ اگر مسئلہ معلوم ہوتے ہوئے عمداً بیٹھ گیا تو نماز باطل ہوگی۔ بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے بیٹھا تو نماز باطل نہ ہوگی، لیکن یاد آتے ہی فوراً کھڑا ہونا واجب ہے۔ امام کھڑا ہو جائے تو مقتدی کو تشہد کیلئے پیچھے رہنا جائز نہیں ہے، اگر پیچھے رہا تو اس کی نماز باطل ہوگی، البتہ امام سے جدائی کی نیت کرے تو جائز ہے۔ امام کے ساتھ مقتدی بھی کھڑے ہوا، پھر امام لوٹ گیا تو اب مقتدی کو لوٹنا جائز نہیں، بلکہ یا تو امام سے جدائی کی نیت کرے (اور اپنی نماز تنہا پوری کرے) یا قیام میں امام کا انتظار کرے، کیونکہ ممکن ہے امام نے بھول سے اس طرح کیا ہو۔ مذکورہ صورت میں جان بوجھ کر مقتدی بھی امام کے ساتھ بیٹھ جائے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ بھول کر یا لاعلمی سے بیٹھے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ اگر مقتدی بیٹھا اور امام کھڑا ہوکر پھر بیٹھ گیا تو مقتدی کیلئے کھڑے ہونا لازم ہے۔ اگر امام تشہد اوّل میں بیٹھے اور مقتدی بھول سے کھڑا ہو جائے یا دونوں کھڑے ہوئے لیکن امام قیام میں پہنچنے سے پہلے یاد آنے کی وجہ سے واپس لوٹا اور مقتدی مکمل کھڑا ہو تو دونوں صورتوں میں مقتدی کو امام کی متابعت میں تشہد کیلئے لوٹنا واجب ہے ورنہ نماز باطل ہوگی۔

بھول کر تشہد اوّل چھوڑ کر اٹھنے کے بعد قیام کی حالت کو پہنچنے سے پہلے یاد آجائے تو تشہد کے لئے واپس لوٹنا مستحب ہے اس صورت میں قیام کے زیادہ قریب پہنچ چکا تھا تو سجدہ سہو ادا کرے۔ اور قعود (بیٹھنے) کے زیادہ قریب تھا، یا دونوں طرف برابر تھا، تو سجدہ نہ کرے۔ عمداً تشہد اوّل چھوڑ کر اٹھے اور قیام سے زیادہ قریب ہونے کے بعد لوٹے تو نماز باطل ہوگی۔ اور اس سے پہلے ہی لوٹے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ کوئی بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعت کے بعد تلاوت شروع کرے اور اس کا گمان یہ ہو کہ میں تشہد سے فارغ ہو چکا

ہوں۔اور تیسری رکعت کا وقت آچکا ہے تو اب تشہد کی طرف نہ لوٹے، اگر تشہد کا نہ پڑھنا معلوم ہوا اور سبقت لسانی سے تلاوت ہو جائے تو اسے چھوڑ کر تشہد پڑھ سکتا ہے۔

قنوت کے ترک کو بھی تشہد اوّل پر قیاس کریں گے، لہٰذا قنوت بھول کر سجدہ میں پیشانی رکھدے تو اب واپس لوٹنا جائز نہیں ہے، پیشانی زمین پر رکھنے سے پہلے یاد آ جائے تو لوٹ سکتا ہے، اب رکوع کی حد تک پہنچنے کے بعد لوٹا ہے تو سجدہ سہو کرے، پہلے ہی لوٹ گیا تو سجدہ نہیں کرے گا۔

زائد رکعت شروع کرنا: چار رکعت والی نماز میں بھول کر پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو جب بھی یاد آئے فوراً بیٹھ جائے، اور سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے چاہے قیام میں یاد آئے یا رکوع یا سجدہ میں۔ بیٹھنے کے بعد یاد آیا تو اب سجدہ کر کے سلام پھیر دے۔ پانچویں رکعت میں یا بیٹھنے کے بعد تشہد پڑھنے سے پہلے یاد آ جائے، اور چوتھی رکعت میں تشہد نہیں پڑھا تھا تو اب تشہد پڑھنا واجب ہے۔ اور چوتھی رکعت میں تشہد پڑھ چکا تھا (چاہے تشہد اول سمجھ کر پڑھا ہو۔) تو اب تشہد کے اعادہ کی ضرورت نہیں، صرف سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔رکوع چھوڑ کر سجدہ میں چلا گیا پھر یاد آیا تو واپس قیام میں لوٹ کر پھر رکوع میں جانا واجب ہے۔

فصل : ایک قاعدہ (اصول اور ضابطہ) جس پر فقہی ابواب میں بار ہا عمل ہوتا ہے۔

اصول: کسی چیز کے وجود یا عدم کا یقین ہو، پھر اس کے تغیر و زوال کے متعلق شک ہو جائے، تو سابقہ یقین ہی کو برقرار رکھیں گے، اور شک کو نظر انداز کیا جائے گا۔لہٰذا اس اصول کی روشنی میں کسی سنت بعض کے متعلق شک ہو تو اصل اس کا انجام نہ دینا ہے، لہٰذا سجدہ سہو کرے۔لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ کسی متعین سنت بعض کے متعلق شک ہو۔اگر یہ شک ہو کہ کوئی سنت بعض ترک تو نہیں ہوئی، تو اس صورت میں سجدہ سہو نہ کرے۔جیسا کہ سہو کے ہونے نہ ہونے میں شک ہو تو سجدہ نہیں کریگا۔کسی ممنوع عمل کے ارتکاب میں شک ہو جیسے بھول کر سلام یا کلام، تو چونکہ اصل عدم ہے (یعنی نہ کرنا) اس لئے سجدہ نہ کرے۔ سہو کا یقین ہو لیکن سجدہ سہو کیا یا نہیں اس میں شک ہے تو سجدہ کرے گا اس لئے کہ اصل سجدہ نہ کرنا ہے۔یہ شک ہو جائے کہ ایک سجدہ کیا یا دو تو (ایک سمجھ کر) ایک اور سجدہ کرے سہو کا یقین ہے لیکن سبب کے متعلق شک واقع ہو تو سجدہ ادا کریگا۔

رکعت کی تعداد میں شک

اگر شک ہو جائے کہ تین رکعت ہوئی یا چار تو اقل (کم) پر عمل کر کے باقی کو مکمل کرے (اس مثال میں تین رکعت شمار کرے اور چوتھی رکعت پڑھے) اور سجدہ سہو کرے محض گمان اور اجتہاد کا یہاں دخل نہ ہوگا۔اس طرح دوسرے کے قول پر عمل بھی نہیں کرینگے اس طرح امام چوتھی رکعت سمجھ کر کھڑا ہو اور مقتدی پانچویں سمجھ کر اسے لقمہ دے تو وہ ان کے قول کو اختیار نہیں کرے گا۔(اگر اُسے بھی یاد آ جائے کہ یہ پانچویں رکعت ہے تو اس پر عمل کریگا۔)

نماز ہی میں شک زائل ہو جائے تو شک آنے سے ختم ہونے تک کے اعمال ہر حال میں ضروری تھے تو سجدہ سہو نہ کرے۔اور ان کے زائد ہونے کا احتمال تھا تو سجدہ کرے مثلاً! ظہر کی نماز میں شک ہوا کہ یہ رکعت تیسری ہے یا چوتھی۔اور وہ اسی شک کے ساتھ اس رکعت کو مکمل کرے اس ارادے کے ساتھ کہ ایک رکعت اور ملانا ہے لیکن اس رکعت کے شروع کرنے سے پہلے ہی یاد آ جائے کہ یہ تیسری ہے یا چوتھی (اور شک دور ہوا) تو اس صورت میں سجدہ نہ کرے۔اس لئے کہ یہاں شک کے ساتھ جو رکعت ادا ہوئی ہے وہ ہر حال میں ضروری

تھی۔لیکن مزید ایک رکعت کیلئے کھڑا ہونے کے بعد یاد آیا تو سجدہ سہو کرے، چاہے یہ چوتھی ہی رکعت ہو۔اس لئے کہ کھڑا ہوتے وقت اس کے پانچویں اورزائد ہونے کا احتمال موجود تھا۔

احادیث: آپ ﷺ نے فرمایا!''کسی کو نماز میں شک ہو کہ کتنی رکعت ہوئی تین یا چار تو شک کو ترک کرکے (نظرانداز کرکے) یقین پر بناء کرے پھر سلام سے قبل دو سجدہ کرے۔ (مسلم ابوداود۔ترمذی،نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا!''کسی کو نماز میں بھول ہو اور پتہ نہ چلے کہ ایک رکعت پڑھی یا دو تو ایک پر بناء کرے۔(ایک سمجھ کر آگے بڑھے) پتہ نہ چلے کہ دو پڑھی یا تین تو دو پر بناء کرے، پتہ نہ چلے کہ تین پڑھی یا چار تو تین پر بناء کرے اور سلام سے قبل دو سجدے کرے''۔ (ترمذی)(تیسر الوصول)

نماز کے دوران شک: نماز کے دوران رکعات کی تعداد یا کسی رکن کی ادائیگی میں شک ہو، تو اصل یہ ہے کہ اس نے نہیں کیا، لہٰذا یقین پر عمل کرے، جیسا کہ گذرا۔لیکن سلام پھیرنے کے بعد اس طرح شک ہو تو کوئی حرج نہیں۔اور اسے کسی تلافی کی ضرورت نہیں۔

فصل۔ سجدہ سہو میں تکرار

سہو کے کئی اسباب پائے جائیں تب بھی نماز کے آخر میں صرف دو ہی سجدے کرینگے۔حقیقتاً سجدہ سہو میں تکرار نہیں ہوگا۔لیکن بعض مسائل میں صورۃً سجدہ سہو میں تکرار ہوگا۔

(۱) مسبوق امام کے ساتھ سجدہ سہو کرنے کے بعد اپنی نماز کے آخر میں بھی سجدہ سہو کرے گا۔

(۲) جمعہ کی نماز میں سہو ہوا اور سجدہ کرے پھر سلام سے پہلے ہی یہ بات معلوم ہو جائے کہ ظہر کا وقت نکل چکا ہے تو مزید دو رکعت ظہر کی نیت سے ملالیں گے۔اور آخر میں پھر سجدہ سہو کرینگے۔

(۳) اس گمان سے سجدہ کیا کہ کچھ سہو ہوا تھا، پھر سلام سے پہلے ہی یہ بات واضح ہو جائے کہ سہو نہیں ہوا تھا تو اب سجدہ سہو کرے۔ (کیونکہ پہلے دو سجدے بے محل اور زائد تھے)

(۴) مسافر نماز قصر میں سہو کی وجہ سے سجدہ کرے پھر سلام سے قبل مکمل نماز کی نیت کرے یا کشتی اپنی بستی میں پہنچنے کی وجہ سے وہ مقیم ہو جائے تو اب مکمل نماز پڑھ کے پھر سجدہ کرے۔

مندرجہ ذیل صورتوں میں سجدہ سہو کا اعادہ نہ کرے۔

(۱) سجدہ سہو کے درمیان یا بعد میں سلام سے قبل بھول کر کلام کرے۔

(۲) غلطی سے سہو کے تین سجدے کرے۔

(۳) سہو کے سجدے ایک کیا یا دو شک ہوا، اس لئے ایک ٹھہرا کر دوسرا سجدہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ دو سجدے کر چکا تھا۔(اور یہ تیسرا ہے)

(۴) اس گمان سے سجدہ کیا کہ سہو قنوت کے ترک کی وجہ سے تھا پھر یاد آیا کہ کچھ اور سبب تھا۔

فصل۔مقتدی کے سہو کے متعلق: بحالت اقتداء صرف مقتدی کو سہو ہو تو سجدہ نہ کرے، اس کا سہو امام اٹھالے

گا۔(یعنی امام کی وجہ سے اس کی تلافی ہو جائے گی) امام کے سلام کے بعد سہو ہو تو امام نہیں اٹھائے گا (بلکہ یہ سجدہ سہو کرے) ابتداء سے امام کے ساتھ شامل مقتدی امام کے سلام کے بعد بھول سے کلام کرے تو اب یہ سجدہ سہو کرے۔اس طرح منفرد سے سہو ہو پھر وہ کسی جماعت میں شامل ہو تو امام اس سہو کو نہیں اٹھائے گا (وہ آخر میں اپنا سجدہ کرے) مقتدی یہ سمجھ کر سلام پھیرے کہ امام سلام پھیر چکا ہے پھر پتہ چلا کہ اس نے سلام نہیں پھیرا تو اب اس کے ساتھ سلام پھیرے، سجدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سہو اقتداء کی حالت میں ہوا ہے۔تشہد میں یاد آ جائے کہ اس نے رکوع یا سورہ فاتحہ بھول کر چھوڑ دی تھی تو امام کے سلام کے بعد ایک رکعت پڑھنا لازم ہے، لیکن سجدہ نہ کرے، کیونکہ بحالت اقتداء بھول ہوئی ہے۔مسبوق سہواً امام کے ساتھ سلام پھیرے پھر یاد آئے تو اسی نماز پر بنا کرے (یعنی آگے کی بقیہ رکعات پڑھ لے) اور سجدہ کرے اس لئے کہ یہ سہو اقتداء کے ختم ہونے کے بعد ہوا ہے۔مسبوق کو یوں محسوس ہوا کہ امام سلام پھیر چکا ہے، مثلاً کچھ آواز سنائی دی اور وہ سمجھا کہ امام کے سلام پھیرنے کی آواز ہے اس لئے اپنی بقیہ نماز پوری کرنے کھڑا ہوا اب مثلاً اس کے ذمہ ایک رکعت باقی تھی وہ مکمل کر کے بیٹھا تو پتہ چلا کہ ابھی امام نے سلام نہیں پھیرا اور اس کا گمان غلط تھا تو یہ رکعت چونکہ غیر محل میں ادا ہوئی ہے اس لئے اسے شمار نہیں کرینگے۔کیونکہ بقیہ رکعت کا ادائیگی کا وقت اقتداء ختم ہونے کے بعد ہے۔لہٰذا اب امام کے سلام کے بعد بقیہ نماز مکمل کرے، اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں کیونکہ اقتداء کا حکم باقی تھا۔اس مسئلہ میں اگر اس کے کھڑے ہونے کے بعد امام سلام پھر دے تو اسے چاہیئے کہ واپس تشہد میں بیٹھ جائے اور پھر کھڑا ہو۔لیکن امام کے سلام کا اسے علم نہ ہو، یہاں تک کہ وہ رکعت مکمل کرے تو یہ رکعت شمار نہیں ہوگی۔(پھر ایک رکعت پڑھے) اور سجدہ سہو ادا کرے۔کیونکہ امام کے سلام کے بعد زیادتی پائی گئی۔

فصل۔ امام کا سھو: امام سے نماز میں سہو ہو تو وہ سہو مقتدی کو بھی لاحق ہوگا۔(یعنی مقتدی سے سہو نہ بھی ہو تو امام کے سہو کے وجہ سے وہ بھی سجدہ سہو کریگا) البتہ دو صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

(۱) امام بے وضو ہونا معلوم ہو جائے تو صرف اس کے سہو کی وجہ سے مقتدی سجدہ نہ کرے۔اور اس صورت میں مقتدی کا سہو امام بھی نہیں اٹھائے گا۔(لہٰذا مقتدی سے کچھ سہو ہوا تو وہ اپنا سجدہ سہو کرے)

(۲) مقتدی کو امام کے سجدہ کا سبب معلوم ہو اور اس کی غلطی کا یقین ہو جیسے امام کا گمان ہو کہ میں نے کسی سنت بعض کو ترک کیا ہے۔ اور مقتدی کو معلوم ہو کہ وہ سنت ترک نہیں ہوئی تو سجدہ میں امام کی موافقت نہ کرے۔

ان دو صورتوں کے علاوہ امام سجدہ سہو کرے تو مقتدی کو اس کی موافقت لازم ہے۔عمداً موافقت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ چاہے امام کے سہو کا مقتدی کو پتہ ہو یا نہ ہو، پس جب بھی امام اپنی نماز کے آخر میں سجدہ کرے مقتدی کو اس کی اتباع واجب ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے کچھ سہو ہوا ہوگا۔لیکن امام پانچویں (زائد) رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو مقتدی یہ سوچ کر کہ شاید اس سے کوئی رکن چھوٹ گیا ہوگا، اس کی اتباع نہ کرے، کیونکہ اس صورت میں حقیقت حال کی تحقیق کے باوجود اتباع جائز نہیں ہے۔کیونکہ مقتدی بالیقین اپنی نماز مکمل کر چکا ہے۔اگر مقتدی مسبوق ہو یا کسی رکن مثلاً سورۂ فاتحہ کے ترک میں اسے شک ہوا اور امام پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہو، تو مقتدی کو اس کی اتباع جائز نہیں ہے۔اگر امام ایک ہی سجدہ کرے تو مقتدی دوسرا بھی کرے کہ شاید امام بھولا ہو، اگر امام سجدہ سہو ترک کرے تو مقتدی سجدہ کرے۔امام سلام پھیرے اور مقتدی بھی (سجدہ سہو) بھول کر اس کے ساتھ سلام پھیرے، پھر امام سجدہ کرے تو مقتدی بھی اس کی اتباع کرے۔

اگر مقتدی سہو کا علم ہوتے ہوئے عمداً سلام پھیرے تو اسے امام کی اتباع لازم نہیں ہے۔امام کے سلام کے بعد مقتدی سلام نہ پھیرے اور سجدہ سہو کرے پھر امام لوٹ کر سجدہ کرے تو مقتدی اس کی اتباع نہ کرے اور مقتدی کے سجدہ سے پہلے ہی امام سجدہ کی طرف لوٹے

تب بھی مقتدی اس کی اتباع نہ کرے، بلکہ تنہا اپنا سجدہ ادا کرے، سہو کے بعد امام کو حدث ہو جائے تو مقتدی اپنی نماز مکمل کر کے سجدہ سہو کرے، اگر صرف مقتدی کو سہو ہونے کے بعد امام کو حدث ہو تو مقتدی کو سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ امام سہواً پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہو، اور اس کے رکوع کی حد تک پہنچنے کے بعد مقتدی نے اس سے جدائی کی نیت کی تو مقتدی سجدہ سہو کرے اور رکوع کی حد سے پہلے ہی جدائی کی نیت کر لی تو اب سجدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر امام حنفی ہو اور (اپنے مسلک کے مطابق) سجدہ سہو سے پہلے سلام پھیرے تو مقتدی اس کے ساتھ سلام نہ پھیرے بلکہ اپنے سلام سے قبل سجدہ سہو کرے۔ اور امام کے سجدہ کے انتظار کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے سلام کے وجہ سے دونوں میں جدائی ہو چکی۔

مسبوق کے امام کے ساتھ شامل ہونے سے قبل یا شامل ہونے کے بعد امام سے سہو ہو اور امام اپنی نماز کے آخر میں سجدہ کرے تو مقتدی (مسبوق) کو اس کے ساتھ سجدہ کرنا لازم ہے، بعد میں اپنی نماز کے آخر میں بھی سجدہ سہو کرے گا، اور امام سجدہ نہ کرے تو صرف اپنی نماز کے آخر میں سجدہ کرے گا۔

فصل۔ سجدہ سہو کی کیفیت اور محل کے متعلق

سہو کے دو سجدے ہیں، درمیان میں افتراش کی ہیئت پر بیٹھے، دوسرے سجدے کے بعد سلام پھیرنے تک تورک کی ہیئت پر بیٹھے، اس سجدے کے واجبات اور مستحبات وہی ہیں جو نماز کے سجدے کیلئے ہیں۔ بعض ائمہ نے ان دونوں سجدوں میں "**سُبْحَانَ مَنْ لَّا يَنَامُ وَلَايَسْهُوْ**" (ترجمہ پاک ہے وہ ذات جو نہ سوتی ہے اور نہ بھولتی ہے) پڑھنا مستحب سمجھا ہے، اور یہ ذکر مناسب حال ہے۔ (لیکن حافظ ابن حجرؒ "تلخیص الحبیر" میں فرماتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت مجھے نہیں ملا۔ (حاشیۃ الروضہ) آخری تشہد درود دعا سے فارغ ہونے کے بعد اور سلام پھیرنے سے قبل سجدہ سہو کا محل ہے۔ اگر عمداً سجدہ سے قبل سلام پھیرا تو سجدہ فوت ہو گیا۔ اسی طرح سہواً سلام پھیرنے کے بعد کافی وقت گذر گیا تو سجدہ فوت ہو گیا، اب سجدہ نہ کرے لیکن سہواً سلام کے بعد جلد ہی یاد آئے اور سجدہ نہ کرنا چاہے تو نہ کرے اس کی نماز صحیح ہے (کیونکہ سجدہ سہو سنت ہے) اور سجدہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور یہ بہتر ہے۔ لیکن ان صورتوں میں سجدہ نہیں کر سکتا، جمعہ کا سلام پھیرتے ہی وقت نکل جائے، قصر پڑھنے والا سلام کے بعد اقامت کی نیت کرے، تیمم کر کے نماز پڑھنے والے کو سلام پھیرتے ہی پانی نظر آئے، یا موزے پر مسح کی مدت ختم ہو جائے یا دائم الحدث شفاء پائے۔ (حاشیۃ الروضہ ۴۲۰)

سجدہ کرنے کی صورت میں وہ دوبارہ نماز میں داخل سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اس صورت میں درج ذیل مسائل کا ترتیب ہوگا۔

(۱) اگر عمداً کلام کیا یا حدث ہوا تو نماز باطل ہوگی (۲) جمعہ میں سجدہ کی طرف لوٹنے کے بعد جمعہ کا وقت نکل جائے تو جمعہ فوت ہوگی۔ (اور اب ظہر مکمل کرنا پڑے گی) (۳) مسافر قصر پڑھ رہا تھا اور سجدہ میں مکمل نماز کی نیت کی تو اب پوری نماز پڑھنا واجب ہے۔ اسی طرح سجدہ کی طرف لوٹنے کی صورت میں تکبیر تحریمہ اور دوبارہ تشہد پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ سلام پھیرنا لازم ہے۔

بعض متفرق مسائل

(۱) نفل نماز میں سہو کا حکم فرض ہی کی طرح ہے۔ (۲) ایک نماز کا سلام پھیر کر دوسری نماز شروع کرنے کے بعد یقین ہوا کہ پہلی نماز کا ایک رکن چھوٹ گیا ہے، تو یہ دوسری نماز منعقد نہ ہوگی، پہلی نماز کے بعد زیادہ دیر نہیں گذری تو اسی پر بناء کرے ورنہ از سر نو اس نماز کو پڑھ لے۔ (۳) چار رکعت والی نماز میں تشہد کی حالت میں شک ہوا کہ یہ پہلا تشہد ہے یا دوسرا اور اسی شک کی حالت میں تشہد پڑھ کر کھڑا

ہوا پھر شک دور ہوا تو سجدہ سہو ادا کرے، چاہے پہلا تشہد ثابت ہو یا آخری۔ کیونکہ پہلا تشہد ہونے کی صورت میں بھی اس کا یہ قیام زیادتی کے شک کے ساتھ تھا۔ تشہد میں بیٹھا ہوا ہی تھا اور شک دور ہوا تو سجدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (۴) مسافر قصر کی نیت کرے اور بھول کر چار رکعت پڑھے اور ہر رکعت میں ایک ایک سجدہ بھول جائے تو اسے دو رکعت حاصل ہوئی اب سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے، اس کی نماز مکمل ہے۔ اسے مکمل نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے اس کی نیت نہیں کی ہے۔ اسی طرح جمعہ کی نماز بھول کر اس طرح چار رکعت پڑھے تو سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔ (۵) فجر کے علاوہ کسی نماز میں قنوت نازلہ کا ارادہ تھا لیکن بھول گیا، تو اس کی وجہ سے سجدہ سہو نہ کرے۔ (۶) کسی نماز میں داخل ہونے کے بعد یوں خیال ہوا کہ تکبیر تحریمہ نہیں کہی، اس لئے دوبارہ تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کی پھر یاد آیا کہ پہلی نماز میں تکبیر تحریمہ کہہ چکا تھا تو اب اگر دوسری نماز سے فارغ ہونے کے بعد یاد آیا تو پہلی نماز فاسد نہیں ہوئی اور دوسری نماز کے ذریعہ مکمل ہوئی۔ دوسری نماز سے فارغ ہونے سے قبل یاد آئے تو پہلی نماز کی طرف لوٹ کر اسے مکمل کرے۔

سجدہ تلاوت

احادیث : (۱) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب ابن آدم سجدہ (کی آیت) تلاوت کر کے سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا وہاں سے ہٹتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس! ابن آدم کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کیا لہٰذا اسے جنت ملی اور مجھ سجدے کا حکم ہوا اور میں نے نافرمانی کی اس لئے مجھے جہنم ملی۔ (رواہ مسلم)

(۲) حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ ہمارے سامنے قرآن پڑھتے جب سجدہ آتا۔ تو تکبیر کہہ کر سجدہ ریز ہوتے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کرتے۔ (ابوداود الحاکم)

(۳) آپ ﷺ نے ایک مرتبہ سورۂ النجم میں سجدہ نہ فرمایا۔ (متفق علیه) اس سے معلوم ہوا کہ سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہے۔

(۴) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خطبہ جمعہ میں سورۂ نحل کی تلاوت کی جب آیت سجدہ پر پہنچے تو فرمایا! اے لوگو! ہم سجدہ کی آیت پڑھتے ہیں تو جو سجدہ کرے اس نے ٹھیک کیا، اور جو سجدہ نہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں، اور حضرت عمرؓ نے سجدہ نہیں کیا ایک روایت میں حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ ہیں اللہ نے سجدہ فرض نہیں کیا ہے الاّ یہ کہ ہم چاہیں۔ (بخاری)

سجدۂ تلاوت سنت ہے اور ان کی تعداد ۱۴ ہے۔ سورۂ ص کا سجدہ شکر کا سجدہ ہے۔ جو خارج نماز مستحب ہے۔ کیونکہ نسائی شریف کی روایت میں ہے کہ سیدنا داود علیہ السلام نے یہ سجدہ توبہ کی قبولیت پر کیا اور ہم شکراً کرتے ہیں۔ (فتح الوهاب) نماز میں یہ سجدہ عمداً کرنے سے نماز باطل ہوگی بھول کر یا لاعلمی کے وجہ سے کرے تو نماز باطل نہ ہوگی لیکن سجدہ سہو کرنا سنت ہے۔ اگر امام (مثلاً حنفی ہے اور) سورۂ ص میں سجدہ کرے تو مقتدی اتباع نہ کرے بلکہ اس سے جدائی کی نیت کرے۔ (اور آگے اپنی نماز تنہا مکمل کرے) یا قیام میں اس کا انتظار کرے۔ امام ابھی قیام کے حد میں ہو، اور مقتدی جدائی کی نیت کرے تو سجدہ سہو نہ کرے اگر امام کا انتظار کرے یا رکوع کی ہیئت سے قریب ہونے کے بعد جدائی کی نیت کرے تو سجدۂ سہو کرنا مسنون ہے۔ (نهاية المحتاج ۔ ۲/ ۹۵)

سجدہ کی آیات واضح اور مشہور ہیں۔ حم السجدہ میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ (لَا یَسْئَمُوْنَ) (**فُصِّلَتْ: آیت ۳۸**) پر سجدہ کرے۔

سجدہ کی آیت تلاوت کرنے والے کیلئے (جبکہ اس کی تلاوت مشروع ہو، ناجائز نہ ہو) غور سے بالقصد کان لگا کر اسے سننے

والے کے لئے (جبکہ سننا اس کیلئے مطلوب اور مستحب ہو) اور بلا قصد آیت سننے والے کے لئے سجدہ تلاوت سنت ہے، لیکن بالقصد سننے والے کے حق میں تاکید زیادہ ہے۔ چاہے پڑھنے والا نماز میں پڑھے یا خارج نماز۔ بے وضو شخص بچہ اور کافر کا تلاوت سننے والے کی لئے سجدہ تلاوت سنت ہے۔

امام بلقینی اور زرکشی نے فرمایا کہ فرشتہ اور جن کی تلاوت پر سجدہ سنت ہے جنبی نشہ میں مست بھول کر پڑھنے والے نیند میں پڑھنے والے کسی تربیت یافتہ پرندہ مثلاً طوطے کی تلاوت، نماز جنازہ کے اندر تلاوت، عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں تلاوت، اور رکوع جیسے حالات میں تلاوت، کی صورت میں سجدہ تلاوت، نہ کرے، کیونکہ یہ سب غیر مشروع تلاوت ہیں (نهاية المحتاج ۲/۹۶) تلاوت کرنے والا سجدہ نہ کرے تب بھی سننے والے کیلئے سجدہ مسنون ہے۔ البتہ اس کے کرنے پر تاکید بڑھ جائیگی۔

تنہا نمازی اپنی قرأت کی وجہ سے سجدہ کرے گا۔ سجدہ کے بغیر رکوع میں چلا گیا پھر سجدہ کرنے کا ارادہ ہو تو نہیں کرسکتا۔ رکوع کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی ارادہ کرے تو جائز ہے۔ سجدہ تلاوت کیلئے جھکا پھر ارادہ بدل کر واپس لوٹا تو یہ جائز ہے۔ جیسے کوئی تشہد اول تھوڑا پڑھے اور اسے مکمل نہ کرے تو یہ جائز ہے۔ تنہا نمازی کسی اور کی تلاوت کی طرف توجہ دے۔ (چاہے وہ نماز میں ہو یا نہ ہو) تو اس کی تلاوت پر سجدہ نہ کرے، کیونکہ اسے یہ توجہ ممنوع ہے، اگر سجدہ کرے گا تو نماز باطل ہوگی۔ اگر امام ہے تو مذکورہ مسائل میں وہ بھی منفرد (تنہا نمازی) کی طرح ہے۔ امام کو جہری یا سری نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت مکروہ نہیں ہے۔ (لیکن نماز میں سجدہ کی نیت سے اس طرح تلاوت کرنے میں کچھ تفصیل ہے۔ جس کا بیان آرہا ہے۔)

امام سجدۂ تلاوت کرے تو مقتدی بھی کرے، ورنہ اس کی نماز باطل ہوگی۔ امام سجدہ نہ کرے تو مقتدی بھی نہ کرے ورنہ اس کی نماز باطل ہوگی۔ نماز کے بعد اس سجدہ کی تلافی کر لینا بہتر ہے۔ امام سجدہ میں جائے اور مقتدی کو پتہ نہ چلا یہاں تک کہ اس نے سجدے سے سر اٹھا لیا تو اب مقتدی سجدہ نہ کرے۔ ابھی امام سجدہ میں ہو، اور مقتدی کو معلوم ہوا تو وہ بھی سجدہ کرے مقتدی کے جھکنے کی حالت میں ہی امام سر اٹھائے تو مقتدی اس کے ساتھ واپس لوٹ جائے اور سجدہ نہ کرے۔ اس طرح کوئی کمزور شخص امام کے ساتھ سجدہ تلاوت کیلئے جھکے لیکن اپنی سست حرکت کی وجہ سے اس کے زمین تک پہنچنے سے قبل ہی امام سر اٹھائے تو یہ امام کے ساتھ لوٹ جائے، اور سجدہ نہ کرے۔ مقتدی اپنی تلاوت کی وجہ سے سجدہ نہیں کرسکتا، بلکہ اسے آیت سجدہ کی تلاوت مکروہ ہے۔ امام کے علاوہ کسی دوسرے کی قرأت کی وجہ سے مقتدی سجدہ نہ کرے، بلکہ کسی اور کی تلاوت کی طرف توجہ دینا اسے مکروہ ہے۔ مقتدی اپنی تلاوت یا امام کے علاوہ کسی اور کی تلاوت پر سجدہ کرے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔

سجدہ کی آیت دوھرانا

ایک ہی جگہ سجدہ کی آیتوں کو پڑھے تو ہر ایک کیلئے سجدہ کرے، ایک ہی آیت سجدہ دو بار ایک مجلس میں تلاوت کرے اور پہلی مرتبہ سجدہ نہیں کیا تو اب ایک سجدہ کافی ہے۔ پہلی مرتبہ سجدہ کیا تو دوسری مرتبہ پھر کرے۔ نماز میں ایک ہی رکعت میں آیت سجدہ کو دوہرائے تو ایک مجلس کی طرح ہے۔ اور دو رکعتوں میں دوہرائے تو دو مجلس کی طرح ہے۔

فصل۔ سجدۂ تلاوت کے شرائط اور اس کی کیفیت

طھـــــارت: ستر عورت اور استقبال قبلہ وغیرہ شرائط نماز سجدۂ تلاوت کیلئے بھی ضروری ہیں۔ سجدہ کی کیفیت کی دو حالتیں ہیں

(۱)خارج نماز(۲)داخل نماز

(۱)خارج نماز سجدہ کیلئے پہلے سجدۂ تلاوت کی نیت واجب ہے۔اور تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھا کر ایک تکبیر کہے پھر دوسری تکبیر بغیر ہاتھ اٹھائے ہوئے سجدہ میں جائے پہلی تکبیر ضروری ہے اور دوسری مستحب، سجدہ کیلئے کھڑا ہونا مستحب نہیں ہے۔(جائز ہے)

سجدئہ تلاوت کے اذکار

سجدہ میں یہ ذکر مستحب ھے: " سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَ شَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَ قُوَّتِهِ " **ترجمہ :** میرا چہرہ اس ہستی کے روبرو سجدہ ریز ہوا جس نے اس کی تخلیق اور صورت گری فرمائی، اور اپنی قدرت وقوت سے اس میں سننے و دیکھنے کی طاقت پیدا فرمائی۔(رواه احمد و اصحاب السنن والدارقطني والحاكم والبيهقي و صححه ابن السكن) (ابن السکن کی روایت میں تین مرتبہ پڑھنے کا ذکر ہے۔امام حاکم نے آخر میں" فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ " کا اضافہ فرمایا ہے۔(تلخيص الحبير ۲ / ۱۰)

یہ ذکر بھی پڑھنا مستحب ہے۔" اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْراً وَ اجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخراً، وَضَعْ عَنِّي بِهَا وِزْراً وَ تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗد "(الترمذي والحاكم وابن جان و ابن ماجه)

ترجمہ: " یااللہ اس (سجدہ) کی وجہ سے تو اپنے یہاں میرے حق میں نیکی لکھ دے، اور اسے تیرے پاس میرے لئے ذخیرہ بنا، اور اسکے ذریعے میرا گناہ معاف فرما، اور مجھ سے قبول فرما جسے تو نے اپنے بندے داود علیہ السلام سے اسے قبول فرمایا" اگر نماز کے سجدہ کے اذکار پڑھے تو جائز ہے۔پھر تکبیر کہتا ہوا سر اٹھائے اور سلام پھیرے سلام پھیرنا فرض ہے، تشہد وغیرہ نہ پڑھے۔نماز میں سجدۂ تلاوت کیلئے تکبیر تحریمہ کی ضرورت نہیں ہے نماز کے سجدہ کی طرح بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیر کہتا ہوا سجدہ میں جائے اور تکبیر کہتا ہوا سجدہ سے اٹھے، اور یہاں بھی اوپر کے اذکار پڑھنا مستحب ہے سجدہ تلاوت سے اٹھنے کے بعد کچھ سیدھا کھڑا ہو جائے، جلسۂ استراحت میں نہ بیٹھے، اٹھنے کے بعد کچھ تلاوت کر کے پھر رکوع میں جانا مستحب ہے۔پوری طرح کھڑے ہو کر پھر رکوع میں جانا واجب ہے۔(پورا کھڑا ہو کر بغیر تلاوت کے رکوع میں جائے تو یہ بھی جائز ہے)

فصل

آیت سجدہ کے پڑھنے یا سننے کے فوراً بعد ہی سجدہ کر لینا چاہیے کچھ تاخیر ہو جائے تو سجدہ کر لے زیادہ تاخیر ہو جائے تو سجدہ فوت ہو جائے گا، اب اس کی تلافی اور قضاء نہ کرے، آیت کی تلاوت کے وقت بے وضو تھا پھر فوراً وضو کیا تو سجدہ کر لے، تاخیر ہو گئی ہو تو نہ کرے۔ نماز میں سورہ فاتحہ سے قبل آیت سجدہ پڑھے تو سجدہ کرے، بخلاف اس کے رکوع یا سجدہ میں پڑھے تو سجدہ نہ کرے۔آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیلئے جھکنے کے بعد سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کے متعلق شک ہو تو سجدہ مکمل کر کے پھر قیام میں آ کر سورۂ فاتحہ پڑھ لے خارج نماز فارسی (یا کسی اور زبان میں) آیت سجدہ پڑھے تو سجدہ نہ کرے۔تلاوت کرنے والے کے ساتھ سننے والا سجدہ کرے تو یہ اس کے اقتداء کی نیت نہ کرے۔ سننے والا اس سے قبل بھی سجدہ سے سر اٹھا سکتا ہے۔صرف سجدہ کرنے کی نیت سے ایسی ایک دو آیت یا سورت کی تلاوت کرنا جس میں سجدہ ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر نہ نماز میں ہو اور نہ مکروہ اوقات میں تو کوئی حرج نہیں۔اگر نماز میں یا مکروہ اوقات میں ایسا کرے تو مکروہ ہے۔(اور ممانعت جانتے ہوئے نماز میں اس طرح تلاوت کرے اور سجدہ کرے تو نماز باطل ہو گی۔لیکن جمعہ کی فجر میں چونکہ حدیث کی رو

سے الم سجدہ کی تلاوت سنت ہے اس لئے وہ مستثنیٰ ہے۔ نهاية المحتاج ۱ / ۹۷) مذکورہ کراہت کا حکم اس وقت ہے جبکہ تلاوت سے سجدہ کے علاوہ اور کچھ مقصود نہ ہو، ورنہ قطعاً کوئی کراہت نہیں۔ نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کے بعد سجدہ نہ کرے تو سلام پھیرنے تک اگر زیادہ فاصلہ نہیں ہوا تو سلام کے بعد سجدہ کرے (زیادہ دیر ہو چکی ہو تو اب سجدہ نہ کرے)

آیت سجدہ مکمل ہونے سے قبل سجدہ کرے تو صحیح نہیں، خواہ ایک ہی حرف پہلے کرے، آیت سجدہ کے بعد چند آیات اور پڑھے اور زیادہ تاخیر نہ ہو تو سجدہ کر سکتا ہے۔ سجدہ تلاوت میں آیت سجدہ تلاوت کرے تو دوسرا سجدہ نہ کرے۔ سری نماز میں امام آیت سجدہ تلاوت کرے تو نماز کے فراغت تک سجدہ مؤخر کرنا مستحب ہے۔ (اسی طرح جہری نماز میں تلاوت مقتدیوں کی تشویش کا احتمال ہو تو موخر کرے۔ نهاية المحتاج) اگر خطیب آیت سجدہ پڑھے تو علماء نے اسے سجدہ نہ کرنا مستحب قرار دیا ہے، منبر سے اترنے اور چڑھنے کی تکلیف کے پیش نظر۔ نماز جنازہ میں آیت پڑھے تو نہ نماز میں سجدہ کرے اور نہ بعد نماز اصل یہ ہے کہ غیر مشروع تلاوت میں سجدہ نہ کرے۔

سجدہ شکر

احادیث: (۱) آپ ﷺ کے پاس کوئی خوش کن معاملہ آتا تو آپ ﷺ (بطور شکر) سجدہ ریز ہو جاتے (رواہ ابوداود وابن ماجه والترمذی و قال حدیث حسن غریب)

(۲) آپ ﷺ کو کسی حاجت کی بشارت سنائی گئی تو آپ ﷺ سجدہ میں گر پڑے۔ (ابن ماجه)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بشارت سنائی اور فرمایا آپ کے رب نے آپ سے کہا ہے۔ جو آپ پر درود پڑھے میں اس پر درود بھیجوں گا۔ جو آپ پر سلام بھیجے میں اس پر سلام بھیجوں گا۔ تو میں نے بطور شکر یہ سجدہ کیا۔ (احمد حاکم بیهقی وحسنه البیهقی)

(۴) جب آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت علیؓ کا خط آیا کہ قبیلہ ہمدان نے اسلام قبول کیا ہے تو آپ ﷺ سجدے میں چلے گئے۔ (رواہ البیهقی و صححه)

(۵) جب یمامہ فتح ہوا۔ (اور مسیلمہ کذاب مارا گیا) تو حضرت ابوبکرؓ سجدے میں گر پڑے۔ (ابن ابی شیبه و بیهقی، احمد)

(٦) خوارج کے مردوں میں (آپ ﷺ کی پیشن گوئی کے مطابق) ذا الثدیۃ ملا تو حضرت علیؓ سجدہ میں چلے گئے (کیونکہ حدیث کی رو سے یہ حضرت علیؓ کے برحق ہونے کی دلیل ہے۔ (ابن ابی شیبه، بیهقی، احمد)

(۷) غزوہ تبوک سے تخلف کے بعد جب حضرت کعب بن مالک کو توبہ کی قبولیت کی خوشخبری سنائی گئی تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ (متفق علیه) (ارواء الخلیل للالبانی ۲ / ۲۲٦)

سجدۂ شکر سنت ہے اچانک کسی نعمت کے حصول پر (جیسے بچہ کی پیدائش، مال کا حصول، غائب کا آ جانا یا دشمن پر غلبہ) یا کسی مصیبت کے ٹلنے پر (جیسے ڈوبنے یا جلنے سے نجات) یا کسی مصیبت زدہ کو یا فسق و فجور کے مرتکب کو دیکھ کر۔ نعمتوں کے استمرار (دوام کے ساتھ پائے جانے) کی وجہ سے سجدہ سنت نہیں ہے۔ کسی نعمت کی وجہ سے یا ایسے مصیبت سے نجات کی وجہ سے جس کا دوسرے سے تعلق نہ ہو، سجدہ کرے تو اس کا اظہار مستحب ہے۔ مصیبت کا دوسرے سے تعلق ہو اور اس میں وہ معذور نہ ہو جیسے فاسق تو اس کے سامنے سجدہ کرلے شاید کہ اسے توبہ کی توفیق ہو لیکن وہ معذور ہو (جیسے اپاہج وغیرہ) تو مخفی سجدہ کرے، تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ سجدہ شکر کیلئے نماز کے شرائط ضروری ہیں۔ اور

اس کی کیفیت خارج نماز سجدہ تلاوت کی طرح ہے۔نماز میں سجدہ شکر کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے نماز میں سجدہ شکر سے نماز باطل ہوگی۔ اگر نماز میں آیت سجدہ اس نیت سے پڑھے کہ اس آیت پر سجدہ شکر کرے تو یہ حرام ہے۔اور اس سجدہ سے نماز باطل ہوگی۔سواری پر نفل نماز میں یا خارج نماز سجدہ تلاوت اور سجدہ شکر صرف جھک کر ادا کرنا جائز ہے۔ پیدل مسافر با قاعدہ زمین پر سجدہ کرے جیسا کہ نفل نماز میں کرتا ہے۔مذکورہ صورتوں میں سجدہ شکر کے ساتھ بطور شکر صدقہ وخیرات کرنا، نماز پڑھنا مسنون ہے (لیکن محض نفل کی نیت سے نماز پڑھے نماز شکر کی نیت نہ کرے۔حاشیۃ التحفہ)سجدہ شکر کے سبب کے بعد عرفاً زیادہ فاصلہ ہو جائے تو پھر یہ فوت ہو جائے گا اب اس کی قضاء نہ کرے۔

بغیر سبب کے سجدہ یارکوع

بغیر کسی سبب کے صرف سجدہ یارکوع کے ذریعہ تقرب حرام ہے، چاہے نماز کے بعد ہو یا کسی اور وقت (یعنی سجدہ تلاوت یا شکر کے علاوہ عبادت سمجھ کر صرف سجدہ یارکوع حرام ہے)بعض جاہلوں کا اپنے پیروں کے سامنے سجدہ کرنا قطعاً ہر حال میں حرام ہے۔قبلہ رو کر کے یا کسی اور طرف اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ کی نیت ہو، یا نہ ہو بعض صورتوں میں تو کفر ہو جاتا ہے۔"عافانا اللہ تعالیٰ"

باب: نفل نمازوں کا بیان

سنت، مستحب، مندوب تطوع، نفل، مرغب فیہ اور حسن ان سارے الفاظ کا مفہوم (فی الجملہ) ایک ہی ہے، یعنی جس کا انجام دینا شرعاً ترک کرنے کے مقابلہ میں راجح ہو اور ترک کرنا جائز ہو (یعنی جس کی ادائیگی میں ثواب ہو اور ترک میں گناہ نہ ہو) فرض کا ثواب نفل کے مقابلہ میں ستر گنا زائد ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے۔جس کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔فرائض کی کمی کو پورا کرنے اور عذر کی وجہ سے ترک شدہ فرائض کی قیامت میں تلافی کیلئے نوافل کو مشروع کیا گیا ہے۔ایک صحیح حدیث میں ہے۔" نماز اور زکوۃ وغیرہ کے فرائض مکمل نہ ہوں تو نوافل سے ان کی تکمیل کی جائیگی" کلمہ شہادت کے بعد باقی عبادات میں سب سے افضل نماز ہے فرض نماز تمام فرائض میں افضل، اور نفل نماز تمام نوافل میں افضل ہے۔نماز کے بعد روزہ پھر حج پھر زکوۃ افضل ہے۔مطلب یہ ہے کہ عرفاً پہلے کی کثرت دوسرے کے صرف مؤکدات پر اقتصار کے ساتھ افضل ہے، ورنہ ایک روزہ دو رکعت نماز سے افضل ہے (تحفۃ المحتاج ۲/ ۵۱۱)

نوافل کی دو قسمیں ھیں: (۱) جس میں جماعت سنت ہے، جیسے عیدین، سورج گہن اور چاند گہن کی نماز استسقاء کی نماز ان نمازوں کا ذکر مستقل ابواب میں ہوگا۔

(۲) جس میں جماعت سنت نہیں ہے اس میں فرائض کے آگے پیچھے پڑھی جانے والی سنتیں داخل ہیں۔ان سنتوں کو رواتب کہا جاتا ہے۔

سنن رواتب: (۱) فجر سے قبل دو رکعت ان کو ہلکی پڑھنا سنت ہے پہلی رکعت میں" سورہ کٰفرون "اور دوسری میں سورہ اخلاص یا پہلی میں سورہ بقرہ کی ایک آیت" قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ "الخ۔(آیت ۱۳۶) اور دوسری میں سورۂ آل عمران کی ایک آیت۔"قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا "(آیت ۶۴) پڑھنا سنت ہے۔سنت فجر کے بعد لیٹنا سنت ہے۔کسی بھی طرح لیٹنے سے اصل سنت حاصل ہوگی۔ لیکن دائیں کروٹ قبلہ رو لیٹنا افضل ہے۔اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے قبر میں اس طرح لیٹنا یاد آ جائے، اور آدمی اعمال صالحہ کے ذریعہ اس جگہ کی کامیابی کی پوری کوشش کرے، اگر نہ لیٹے تو ذکر و تلاوت یا گفتگو یا جگہ کی تبدیلی کے ذریعہ سنت اور فرض میں فصل کرے۔اگر

اسے قضاء پڑھے یا فرض فجر کے بعد پڑھے، تب بھی اس کے بعد لیٹنا سنت ہے۔

(۲) ظہر سے قبل چار رکعت اور ظہر کے بعد چار رکعت جس میں پہلے اور بعد میں دو دو رکعت مؤکد اور دو دو غیر مؤکد ہیں۔ جمعہ کی نماز کا بھی یہی حکم ہے۔(۳) عصر سے قبل چار رکعت۔

(۴) مغرب سے قبل دو رکعت اور مغرب کے بعد دو رکعت مغرب کے بعد کی دو رکعت میں سورۂ کافرون اور اخلاص پڑھنا مستحب ہے۔

(۵) عشاء سے قبل دو رکعت اور بعد میں دو رکعت۔

مذکورہ نمازوں میں مؤکدہ (جن کی تاکید اور اہمیت زیادہ ہے) دس رکعتیں ہیں فجر کی دو، ظہر سے قبل اور بعد میں دو، مغرب کے بعد دو اور عشاء کے بعد دو رکعت بقیہ غیر موکدہ ہیں۔(تحفة المحتاج مع الحواشي وغيره و فتح الوهاب)

احادیث : (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ "جو بھی مسلمان بندہ اللہ کیلئے فرض کے علاوہ ۱۲/ رکعات بطور سنت پڑھے، اللہ تعالیٰ ضرور اس کیلئے جنت میں ایک مکان تعمیر فرمائیں گے۔" (رواه مسلم و ترمذی)

(۲) حضرت ابن عمر فرماتے ہیں۔" کہ میں نے آپ ﷺ کے ساتھ (یعنی آپ کی اتباع میں، بطور جماعت پڑھنا مراد نہیں ہے) دو رکعت ظہر سے قبل، دو رکعت ظہر کے بعد، دو رکعت مغرب بعد، اپنے گھر، عشاء کے بعد دو رکعت گھر میں پڑھی اور حضرت حفصہؓ نے مجھ سے کہا کہ آپ ﷺ صبح صادق کے وقت دو ہلکی رکعتیں پڑھا کرتے تھے"۔(متفق عليه)

(۳) حضرت عائشہ کا ارشاد ہے کہ "آپ ﷺ نوافل میں فجر کی دو رکعت سنت کی سب سے زیادہ پابندی فرماتے۔" (متفق عليه)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "فجر کی دو رکعت (سنت) دنیا وما فیہا سے بہتر ہے" (مسلم)

(۵) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھو مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھو تیسری مرتبہ فرمایا جو چاہے اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اسے (مؤکدہ) سنت نہ سمجھیں۔ (متفق عليه)

(۶) آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ "جو ظہر سے قبل اور ظہر کے بعد چار رکعات کی پابندی کرے اللہ تعالیٰ اسے جہنم پر حرام قرار دیں گے۔" (احمد، الترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجه)

(۷) آپ ﷺ نے فرمایا! "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو عصر سے قبل چار رکعت پڑھے"۔(احمد ترمذی ۔ ابوداود)

(۸) آپ ﷺ نے فرمایا! ہر دو اذان (یعنی اذان واقامت) کے درمیان نماز (پڑھنا سنت) ہے۔(بخاری شریف، مسلم شریف)

مغرب کے قبل یہ سنت موذن کا جواب دینے کے بعد پڑھنا سنت ہے، لیکن امام اذان کے بعد فوراً فرض شروع کرتا ہو اور سنت پڑھنے کی صورت میں تکبیر تحریمہ فوت ہوتی ہو تو اس سنت کو بعد میں پڑھے اور موذن کے جواب پر اسے مقدم نہ کرے۔(نهاية المحتاج ۔ ۲/ ۱۱۱)

وتر

وتر کی نماز سنت موکدہ ہے۔ اور یہ ایک یا تین یا پانچ یا سات یا نو یا گیارہ رکعات پڑھ سکتے ہیں۔ گیارہ سے زائد وتر کی نیت سے نہیں پڑھ سکتے۔ ایک رکعت سے زائد ایک ہی سلام سے پڑھنا ہو تو یا تو صرف آخری رکعت میں تشہد کیلئے بیٹھے یا آخری رکعت سے پہلے

والی رکعت میں تشہد اول کے طور پر بیٹھے پھر اٹھ کر آخری رکعت پڑھ کر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرے۔دو تشہد سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ہر دو رکعت پر تشہد پڑھ کر سلام پھیرتا رہے اور آخر میں ایک رکعت پڑھ لے،تو یہ بھی صحیح ہے۔مثال:اگر پانچ رکعات ایک سلام سے پڑھنا ہے تو صرف پانچویں رکعت پر تشہد کے لئے بیٹھے یا چوتھی اور پانچویں رکعت پر تشہد کیلئے بیٹھے یا دو رکعت پر تشہد پڑھ کر سلام پھیرے پھر دو رکعت پر سلام پھیرے۔پھر ایک رکعت پڑھے۔اسی طرح دیگر رکعتوں کو بھی قیاس کرلو۔فصل(یعنی ہر دو رکعت پر سلام پھیر کر آخر میں ایک رکعت تنہا پڑھنا)وصل سے(یعنی ایک ہی سلام سے ساری رکعتیں پڑھنے سے)افضل ہے۔(تحفة المحتاج و غیرہ)

وتر کا وقت: عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد سے صبح صادق تک وتر کا وقت ہے عمداً یا بھول کر عشاء سے قبل وتر پڑھے تو صحیح نہ ہوگی۔کسی نے بھول کر اپنے آپ کو باوضو سمجھ کر عشاء کی نماز پڑھ لی پھر حدث کی وجہ سے وضو کرکے وتر پڑھی پھر معلوم ہوا کہ عشاء بے وضو پڑھی تو یہ وتر صحیح نہ ہوگی۔(عشاء کے بعد پھر پڑھے)عشاء کے بعد کسی اور سنت کے بغیر صرف ایک رکعت وتر پڑھے تو صحیح ہوگی۔مستحب یہ ہے کہ وتر رات کی تمام نمازوں کے بعد ہو۔اگر تہجد نہیں پڑھتا ہے تو عشاء اور سنت عشاء وغیرہ کے بعد وتر پڑھے۔اور اس طرح اس کی وتر رات کی آخری نماز ہوگی۔اگر تہجد پڑھتا ہے(اور رات بیدار ہونے کا اطمینان ہو)تو وتر کو موخر کرنا اور تہجد کے بعد پڑھنا افضل ہے۔اگر سونے سے قبل وتر پڑھ لی،پھر تہجد کو اٹھا تو اب وتر کا دوبارہ اعادہ نہ کرے۔رمضان میں وتر باجماعت پڑھنا مستحب ہے۔غیر رمضان میں جماعت مستحب نہیں ہے۔

دعاء قنوت

رمضان کے آخری نصف میں(یعنی سولھویں شب سے)وتر کی آخری رکعت میں دعاء قنوت مستحب ہے۔صرف ایک رکعت وتر پڑھے۔تو اس میں قنوت پڑھے دیگر ایام میں وتر میں قنوت مکروہ ہے۔رمضان کے نصف آخر میں دعاء قنوت ترک کرے یا دیگر ایام میں دعاء قنوت پڑھے تو سجدہ سہو کرے۔وتر میں بھی فجر کی طرح اعتدال میں قنوت پڑھے۔اور الفاظ بھی وہی ہیں جو قنوت فجر کے ہیں اس کے ساتھ علماء نے قنوت عمر کا اضافہ مستحب قرار دیا ہے۔

قنوت عمر: " اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَ نَسْتَغْفِرُكَ وَ نَسْتَهْدِيْكَ وَ نُؤمِنُ بِكَ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ وَ نُثْنِي عَلَيْكَ الْخَيْرَ كُلَّهُ نَشْكُرُكَ وَلَانَكْفُرُكَ وَ نَخْلَعُ وَ نَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ لَكَ نُصَلِّي وَ نَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَ نَحْفِدُ نَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَ نَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِق . اَللّٰهُمَّ عَذِّبِ الْكَفَرَةَ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِكَ وَ يُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ وَ يُقَاتِلُوْنَ اَوْلِيَائِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤمِنِيْنَ وَالْمُؤمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِهِمْ وَاَلِّفْ قُلُوْبِهِمْ وَاجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَالْحِكْمَةَ وَ ثَبِّتْهُمْ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِكَ وَ اَوْزِعْهُمْ اَنْ يُوفُوْا بِعَهْدِكَ الَّذِيْ عَاهَدْتَهُمْ عَلَيْهِ وَانْصُرْهُمْ عَلٰى عَدُوِّكَ وَ عَدُوِّهِمْ اِلٰهَ الْحَقِّ وَ اِجْعَلْنَا مِنْهُمْ "

پہلے قنوت فجر(اللّٰهم اهدِنی الخ)پڑھے پھر قنوت عمر۔جہراً اور ہاتھ اٹھانے میں فجر کی قنوت کا ہی حکم ہے۔وتر کی تین رکعت پڑھنے کی صورت میں پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد(سبح اسم ربك الاعلیٰ)دوسری میں(قل یا یها الکفرون)اور تیسری میں ("قل هو الله احد" "فلق" اور "سوره ناس")پڑھنا مستحب ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا جو چاہے،وتر کی پانچ رکعت پڑھے اور جو چاہے تین رکعت پڑھے۔اور جو چاہے،ایک

رکعت پڑھے۔(ابوداود ،نسائی ،ابن ماجه، دارقطنی، ابن حبان، حاکم)

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے، وتر کی پانچ یا سات یا نو یا گیارہ رکعتیں پڑھو' (دار قطنی،حاکم ،بیهقی)

(۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں'' آپ ﷺ وتر کی پانچ رکعت ادا کرتے جس میں صرف آخری رکعت میں بیٹھے''۔(مسلم)

(۴) حضرت عائشہؓ نے فرمایا آپ ﷺ وتر کی نو رکعتیں پڑھتے جس میں صرف آٹھویں رکعت پر بیٹھتے پھر اٹھ جاتے اور سلام نہ پھیرتے پھر نویں رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے۔ (مسلم)

(۵) آپ ﷺ وتر کی سات رکعتیں ادا فرماتے جس میں صرف چھٹی اور ساتویں رکعت میں بیٹھتے۔(نسائی)

(۶) آپؐ وتر کی تین رکعت پڑھتے اور صرف آخری رکعت میں بیٹھتے۔ (احمد،نسائی ،حاکم،بیهقی،عن عائشه)

(۷) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وتر رات کے آخری حصہ میں ایک رکعت ہے۔ (مسلم)

(۸) آپ ﷺ وتر کی دو رکعت اور ایک رکعت میں فصل فرماتے۔(یعنی درمیان میں سلام پھیرتے)(احمد ابن ،حبان ، ابن السکن)

(۹) فرمایا آپ ﷺ نے'' رات میں اپنی نماز کے آخر میں وتر پڑھا کرو'' (متفق علیه)

(۱۰) آپ ﷺ نے فرمایا جسے یہ اندیشہ ہو کے رات کے آخری حصہ میں بیدار نہ ہو پائیگا تو وہ ابتداء ہی میں وتر پڑھ لے۔اور جسے آخری حصہ میں اٹھنے کی توقع ہو تو وہ وتر رات کے آخیر میں پڑھے۔کیونکہ وہ وقت فرشتوں کو حضوری کا اور افضل وقت ہے۔(مسلم)

(۱۱) آپ ﷺ وتر کی پہلی رکعت میں''سبح اسم ربك الاعلی ''اور دوسری میں''قل یایها الکفرون ''اور تیسری میں''قل هو الله احد''اور معوذتین پڑھا کرتے۔(ابوداود ،ابن ماجه،ترمذی،دارقطنی،ابن حبان)(خلاصة البدر المنیر ۱/ ۱۷۴)

امام محمد بن نصر ورزی نے کتاب قیام اللیل میں حضرت علیؓ سے نقل فرمایا کہ وہ رمضان کے نصف آخر میں قنوت پڑھتے اس طرح حضرت علیؓ سے یہ بھی نقل فرمایا کہ وہ وتر میں رکوع کے بعد قنوت پڑھتے۔حضرت ابن عمرؓ بھی آخری نصف میں قنوت پڑھتے حضرت ابی بن کعب جب رمضان میں لوگوں کی امامت فرماتے تو نصف اوّل میں قنوت نہ پڑھتے ،اور نصف آخر میں پڑھتے۔(تحفة الاحوذی ۲/ ۵۶۵ ملخصاً)

تمام نوافل میں سب سے افضل دونوں عید کی نماز ہے۔اس کے بعد سورج گہن کی نماز پھر چاند گہن کی نماز پھر استسقاء(بارش کیلئے نماز)

فصل۔ ضحیٰ (چاشت کی نماز)

(۱) آپ ﷺ فتح مکہ کے دن ام ہانی کے گھر تشریف لے گئے اور غسل فرما کر (چاشت کی) آٹھ رکعت ادا کی۔(صحاح سته)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل ﷺ نے مجھے ہر ماہ تین روزے، دو رکعت چاشت، اور سونے سے قبل وتر پڑھنے کی وصیت فرمائی۔ (بخاری،مسلم ، ابوداود ، ترمذی ،نسائی)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ہر جوڑ پر صبح صدقہ ہے، لہٰذا ہر تسبیح صدقہ ہے اور ہر تحمید (الحمد اللہ) صدقہ ہے، ہر تہلیل (لا اله الا الله) صدقہ ہے، ہر تکبیر (اللہ اکبر) صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، اور نہی عن المنکر صدقہ ہے، اور بندہ کا چاشت کی دو رکعت

ادا کرنا ان سب کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔(مسلم ابوداود)

(۴) اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے۔'' ابن آدم دن کے ابتدائی حصہ میں میرے لئے چار رکعت نماز پڑھ لو، میں آخری حصہ میں کفایت کرونگا۔ (ترمذی)

(۵)'' آپ ﷺ سے مروی ہے کہ جو چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں سونے کا ایک محل تعمیر فرمائیں گے''۔(ترمذی وقال ابن حجر اسناده ضعيف)

(۶)'' آپ ﷺ چار رکعت پڑھتے اور اس پر جتنا اللہ تعالیٰ چاہتے اضافہ فرماتے''۔(مسلم)

(۷) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اوابین کی نماز (یعنی اللہ کی طرف رجوع ہونے والے نیک لوگوں کی نماز) کا وقت وہ ہے جبکہ اونٹنی کے بچوں کے پیر دھوپ کی شدت سے جلنے لگے۔(مسلم۔ترمذی)

چاشت کی نماز سنت ہے۔اس میں جماعت سنت نہیں ہے چاشت کی کم سے کم دو رکعت، افضل اٹھ رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں۔ ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا افضل ہے۔ چاشت کا وقت سورج بلند ہونے (مکروہ وقت نکلنے) کے بعد سے استواء تک ہے۔اس کا افضل وقت دن کا چوتھائی حصہ گذرنے کے بعد ہے۔

چاشت کی نماز میں سورہ "والشمس وضحها" اور "والضحیٰ" کی تلاوت مسنون ہے اس کے متعلق بیہقی میں حدیث مروی ہے۔ چاہے ہر دو رکعت میں یہ پڑھے یا پہلے دو رکعت میں یہ پڑھے اور بقیہ ہر دو رکعت میں "سورۂ کافرون" اور "اخلاص" پڑھے۔(تحفة المحتاج ۲/ ۵۳۳)

تحية المسجد

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا'' تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے قبل دو رکعت پڑھ لے۔ (بخاری، مسلم، ابوداود ،موطا،ترمذی، نسائی، تیسرا لوصول ۲ / ۳۱۶)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا'' تم میں سے کوئی جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے دوران آئے تو مختصر دو رکعت پڑھے۔ (بخاری،مسلم ،خلاصة البدر ۱/ ۲۱۴)

مسجد میں داخل ہونے والے کیلئے تحیۃ المسجد کی دو رکعت سنت ہے داخل ہونے کے بعد کسی فرض یا سنت کے ساتھ تحیۃ المسجد کی نیت کر لے تو دونوں کا ثواب ملے گا۔بغیر نیت کے بھی دونوں حاصل ہوں گے جو بار بار مسجد میں داخل ہو ہر مرتبہ اسے تحیۃ المسجد پڑھنا سنت ہے۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت امام فرض نماز پڑھا رہا ہو تو تحیۃ المسجد مکروہ ہے۔ مسجد حرام میں داخل ہونے والے کیلئے طواف چھوڑ کر تحیۃ المسجد پڑھنا مکروہ ہے۔تحیۃ المسجد سے قبل مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ دیر گذر جائے تو یہ فوت ہو جائیگی۔ صحیحین کی روایت کی روشنی میں سہواً (بھول کر) یا لاعلمی کی وجہ سے تھوڑی دیر بیٹھا تو اٹھ کر اس کی تلافی کر سکتا ہے۔

دیگر نوافل (جن میں جماعت مسنون نہیں): احرام کی دو رکعت، طواف کے بعد دو رکعت، وضو کے بعد سنت وضو کی نیت سے دو رکعت، استخارہ کی دو رکعت، صلوٰۃ الحاجہ کی دو رکعت، طلوع شمس کے بعد مکروہ وقت کے بعد اشراق کی دو رکعت، (یہ چاشت کے علاوہ نماز ہے) سفر کے ارادہ کے وقت اپنے گھر میں دو رکعت، اسی طرح دوران سفر جہاں جہاں ٹھہرے، سفر سے واپسی پر مسجد

میں دو رکعت، قتل کے وقت دو رکعت، گھر میں داخل اور خارج ہونے کے وقت دو رکعت، توبہ کے وقت دو رکعت قبل توبہ یا بعد توبہ گرچہ صغیرہ گناہ سے توبہ کرے، مغرب اور عشاء کے درمیان اوابین کی ۲۰ ر رکعتیں، زوال کے بعد صلوۃ الزوال کی دو یا چار رکعتیں، چار رکعت پڑھے تو بقول امام سیوطی ایک ہی سلام سے پڑھے، صلوۃ التسبیح ہر وقت یا دن ورات میں یا کسی ایک وقت میں یا ہفتہ میں یا مہینے میں یا سال میں ورنہ عمر میں چار رکعت، حمام سے نکلنے کے بعد دو رکعت، آپ ﷺ کی مسجد (مسجد نبوی) سے سفر میں نکلتے وقت دو رکعت، ایسے علاقہ میں جانے والے کیلئے جہاں اللہ کی عبادت نہ ہوتی ہو دو رکعت، میاں بیوی کی پہلی ملاقات پر صحبت سے قبل دونوں کیلئے دو رکعت عقد نکاح سے قبل اور حفظ قرآن کے وقت دو رکعت امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کوئی تنگی پریشانی ومصیبت یا روزی کی تنگی پیش آئے، تو یا اولاد یا کوئی اور رشتہ دار انتقال ہو یا کوئی غمگین معاملہ پیش آئے تو دو رکعت سنت ہے۔ کسی کی کوئی شی گم ہو جائے تو دو رکعت پڑھ کر یہ دعاء مانگے۔ "اَللّٰهُمَّ رَادَّ الضَّالَّةِ هَادِيَ الضَّلَالِ تَهْدِي مِنَ الضَّلَالِ رُدَّ عَلَيَّ ضَالَّتِي بِعِزَّتِكَ وَ سُلْطَانِكَ فَإِنَّهَا مِنْ عَطَائِكَ" **ترجمہ:** یا اللہ گمشدہ چیز کو لوٹانے والے، گمراہی سے ہدایت بخشنے والے، آپ ہی گمراہی سے ہدایت کی روشنی عطا فرماتے ہیں، اپنی عزت وقدرت سے میری گمشدہ چیز لوٹا دیجئے کہ وہ آپ ہی کا عطیہ ہے" ہفتہ کے ہر دن کیلئے بعض کتابوں میں جو مخصوص نمازیں درج ہیں، فقہا کرام نے اس کا رد کیا ہے۔ یہ جائز نہیں اور ان نیتوں سے پڑھنے سے صحیح نہ ہوگی۔ حدیث سے اس طرح کی نمازوں کیلئے ثبوت ہونا ضروری ہے۔ لیلۃ الرغائب کی نماز (رجب کی پہلی جمعہ میں مغرب اور عشاء کے درمیان ۱۲ ر رکعت) اور نصف شعبان کی ۱۰۰ ر رکعات بدعت قبیحہ ہے۔ اور ان کے متعلق حدیث موضوع ہے۔ تحفہ مع الحواشی، نہایۃ المحتاج، حاشیۃ الجمل ۱/ ۴۷۸، بشری الکریم ۱/ ۱۱۶)

احادیث

(۱) استخارہ کی نماز: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "آپ ﷺ ہمیں تمام امور میں استخارہ کی تعلیم فرماتے جیسا کہ ہمیں قرآن کی سورت سکھایا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو فرض کے علاوہ دو رکعت پڑھے پھر یہ دعاء پڑھے: "اَللّٰهُمَّ اسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَ اسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَاقْدِرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَ اصْرِفْنِيْ عَنْهُ وَ اقْدِرْلِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ رَضِّنِيْ بِهٖ"

ترجمہ: یا اللہ میں آپ سے آپ کے علم سے خیر کا طلبگار ہوں اور آپ کی قدرت سے مدد کا طلبگار ہوں۔ اور آپ کے فضل عظیم کا سائل ہوں کیونکہ آپ قادر ہیں اور میں قادر نہیں آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا اور آپ علام الغیوب ہیں۔ یا اللہ! اگر یہ معاملہ آپ کے علم میں میرے دین وزندگی اور انجام کے اعتبار سے میرے حق میں بہتر ہے تو اسے مقدر فرمائیں اور آسان کیجئے، پھر اس میں مجھے برکت عنایت فرمائیں، اور اگر آپ جانتے ہوں کہ یہ معاملہ میرے دین، زندگی اور انجام کے اعتبار سے میرے لئے بدتر ہے تو اسے مجھ سے پھیر دیں، اور مجھے اس سے پھیر دیں، اور جہاں بھی ہو میرے حق میں خیر مقدر فرمائیں، پھر مجھے اس پر راضی رکھیں۔

(۲) صلوۃ الحاجۃ: آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف یا کسی انسان کی طرف کوئی حاجت ہو تو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے پھر اللہ کی حمد وثنا اور آپ ﷺ پر درود پاک پڑھ کر یہ دعا پڑھے۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ

سُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اَسْئَلُکَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِکَ وَ عَزَائِمَ مَغْفِرَتِکَ وَالْعِصْمَۃَ مَنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَالْغَنِیْمَۃِ مِنْ کُلِّ بِرٍّ وَ السَّلَامَۃُ مِنْ کُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِیْ ذَنْباً اِلَّا غَفَرْتَہٗ وَلَا ھَمّاً اِلَّا فَرَّجْتَہٗ وَلَا حَاجَۃً ھِیَ لَکَ رِضاً اِلَّا قَضَیْتَھَا یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ" (ترمذی ۔وقال حدیث غریب)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بڑا ہی بردبار کرم کرنے والا ہے پاک ہے اللہ جو عرش عظیم کا رب ہے۔ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری رحمت کے اسباب کا اور تیری مغفرت کو پختہ کرنے والی خصلتوں کا، اور ہر گناہ سے حفاظت کا، اور ہر نیکوکاری کی نعمت کا، اور ہر نافرمانی سے سلامتی کا، اے اللہ تو میرے کسی گناہ کو بغیر بخشے مت چھوڑ، اور میری کسی فکر کو بغیر دور کئے مت چھوڑ اور میری کسی ایسی حاجت کو جو تیری مرضی کے موافق ہو بغیر پورا کئے مت چھوڑ، اے سب سے بڑے رحم کرنے والے"

(۳) صلوۃ التسبیح: آپ ﷺ نے بڑی تاکید اور بیان فضیلت کے ساتھ اپنے چچا حضرت عباسؓ کو اس نماز کی تعلیم دی اور فرمایا کہ ہو سکے تو ہر دن اسے پڑھو، ورنہ ہفتہ میں ایک مرتبہ، ورنہ ہر ماہ ایک مرتبہ، ورنہ سال میں ایک مرتبہ، یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم پوری عمر میں اسے ایک مرتبہ پڑھ لو۔

طریقہ: چار رکعت پڑھو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھو سورت سے فارغ ہونے کے بعد پندرہ/ ۱۵ مرتبہ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُلِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" کہو پھر رکوع میں اسے دس مرتبہ پڑھو۔ پھر رکوع سے سر اٹھا کر دس مرتبہ پڑھو، پھر سجدہ میں چلے جاؤ اور دس مرتبہ اسے پڑھو، پھر سجدہ سے سر اٹھا کر دس مرتبہ پڑھو، پھر سجدہ میں دس مرتبہ پڑھو، پھر سر اٹھا کر اسے دس مرتبہ پڑھو، اس طرح ہر رکعت میں ۷۵/ تسبیح ہوگی۔ چاروں رکعت میں اسی طرح پڑھو (تو کل ۳۰۰ تسبیحات ہوں گی۔ ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ بیہقی) (تیسر الوصول) چاروں رکعات ایک سلام یا دو سلام سے پڑھ سکتا ہے۔ دن میں ایک سلام سے اور رات میں دو سلام سے (یعنی دو دو رکعت) پڑھنا افضل ہے قیام کی ۱۵ تسبیحات کو تلاوت سے قبل بھی پڑھ سکتا ہے۔ اس صورت میں تلاوت کے بعد دس تسبیح پڑھے اور جلسہ استراحت اور تشہد میں تسبیح نہ پڑھے امام سیوطیؒ نے فرمایا کہ اس نماز میں سورہ "الھاکم التکاثر" "والعصر" "کافرون" اور "اخلاص" کی تلاوت کرے سجدہ سے سر اٹھاتے وقت تکبیر کہے اور جلسہ استراحت میں ختم کر کے تسبیحات پڑھے۔ جلسہ سے اٹھتے وقت تکبیر نہ کہے تشہد میں پہلے تسبیحات پڑھ لے پھر تشہد وغیرہ پڑھے۔

اگر رکوع کی تسبیحات ترک ہوں تو اعتدال سے واپس نہ لوٹے، اور نہ اعتدال میں تلافی کرے بلکہ سجدہ میں اس کی تلافی کرے، (اور سجدہ میں رکوع اور سجدہ کی ملا کر ۲۰ تسبیحات پڑھ لے، (اس طرح سجدہ کی تسبیح ترک ہو تو دوسرے سجدہ یا قیام یا تشہد میں تلافی کرے۔ جلسہ استراحت یا جلسہ بین السجدتین میں تلافی نہ کرے) اگر بعض تسبیحات ترک ہوں (اور تلافی نہ کرے) تو اس کی اصل سنت حاصل ہوگی، اور تمام ترک کردے تو نفل مطلق شمار ہوگی۔ ان تسبیحات کو رکوع، اعتدال، سجدہ اور جلسہ بین السجدتین کے عام مشروع اذکار کے بعد پڑھے۔

یہ نماز نفل مطلق میں شمار ہے، لہٰذا مکروہ اوقات میں حرام ہے۔ اور اس کی قضاء مشروع نہیں ہے۔ نیز تکرار (بار بار انجام دینا) سنت ہے۔ خواہ ایک ہی وقت میں کیوں نہ ہو، اس کی تسبیحات ہیئت میں داخل ہیں لہٰذا اس کے ترک کی وجہ سے سجدہ سہو نہ کرے۔ صلوۃ التسبیح کی نیت سے نماز شروع کرے اور تسبیحات نہ پڑھے تو نماز صحیح ہوگی (عام نفل کے طور پر) امام سبکیؒ وغیرہ فرماتے ہیں، کہ اس نماز کی عظیم فضیلت کو سننے کے بعد دین کے متعلق ایک لاپروا آدمی ہی اسے ترک کرسکتا ہے امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سلام سے پہلے

یہ دعا پڑھے۔" اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ تَوْفِیْقَ اَهْلِ الْهُدٰی وَاَعْمَالَ اَهْلِ الْیَقِیْنِ وَمُنَاصَحَةَ اَهْلِ التَّوْبَةِ وَ عَزْمَ اَهْلِ الصَّبْرِ وَجِدَّ اَهْلِ الْخَشْیَةِ وَ طَلَبَ اَهْلِ الرَّغْبَةِ وَ تَعَبُّدَ اَهْلِ الْوَرَعِ، وَعِرْفَانَ اَهْلِ الْعِلْمِ حَتّٰی اَخَافَكَ، اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ مَخَافَةً تَحْجُزُنِیْ عَنْ مَعَاصِیْكَ حَتّٰی اَعْمَلَ بِطَاعَتِكَ عَمَلاً اَسْتَحِقُّ بِهٖ رِضَاكَ وَحَتّٰی اُنَاصِحَكَ بِالتَّوْبَةِ خَوْفاً مِنْكَ وَحَتّٰی اُخْلِصَ لَكَ النَّصِیْحَةَ حَیَاءً مِنْكَ، وَحَتّٰی اَتَوَكَّلَ عَلَیْكَ فِی الْاُمُوْرِ حُسْنَ ظَنٍّ بِكَ سُبْحَانَ خَالِقِ النَّارِ". (تحفه مع الوحواشی نهایه بشری الکریم ، اعانة الطالبین ۱/ ۲۵۹)

(۴) **صلوة الوضو:** آپ ﷺ فجر کی نماز کے وقت حضرت بلالؓ سے دریافت فرمایا کہ اے بلالؓ تم نے اسلام میں سب سے زیادہ پر امید جو عمل کیا ہو ہمیں اس کی خبر دو کیونکہ ہم نے! تمہارے چپل کی آہٹ ہمارے آگے جنت میں سنی تو حضرت بلالؓ نے عرض کیا۔ یہی زیادہ پر امید عمل کیا ہے کہ میں نے رات دن کی کسی بھی گھڑی میں طہارت حاصل کی تو اس طہارت سے جتنا مقدر ہو نماز پڑھی۔ (متفق علیه)

(۵) **صلوٰة التوبه:** "آپ ﷺ نے فرمایا کسی شخص سے گناہ کا ارتکاب ہو پھر وہ وضو کر کے نماز پڑھ لے اور اللہ سے استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مغفرت فرمادینگے۔ (ترمذی ابن ماجه ،مشکوة شریف ۱/ ۱۱۶) (۶) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بندہ کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا اگر وہ صحیح نکلی تو کامیاب و بامراد ہوا اگر وہ فاسد اور غلط نکلی تو نامراد اور نقصان میں رہا۔ اگر اس کے فرض میں کچھ کوتاہی ہو تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو میرے بندہ کے پاس کچھ نوافل بھی ہیں۔ لہٰذا اس کے ذریعہ فرض کی کمی کو پورا کیا جائیگا پھر دیگر اعمال میں بھی یہی صورت ہوگی۔ (ابوداود ،احمد)

(۷) **صلوٰة الزوال:** آپ ﷺ زوال کے بعد ظہر سے قبل چار رکعت ادا فرماتے اور فرمایا کہ یہ ایسا وقت ہے کہ آسمان کے دروازے اس وقت کھل جاتے ہیں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا کوئی نیک عمل اس وقت اٹھالیا جائے۔ (ترمذی ، و قال حسن غریب)

(۸) آپ ﷺ نے فرمایا کہ" جو مغرب کے بعد چھ رکعات اس طرح ادا کرے کہ ان کے درمیان کوئی بری گفتگو نہ کرے تو یہ ۱۲/ سال کی عبادت کے برابر ہوں گے۔" (ترمذی)

(۹) **صلوٰة الاشراق:** آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو فجر جماعت سے پڑھکر سورج نکلنے تک اللہ کے ذکر میں مصروف رہے پھر (مکروہ وقت کے بعد) دو رکعت ادا کرے تو اسے حج وعمرہ کا ثواب ملے گا مکمل مکمل مکمل۔ (ترمذی،حسن غریب)

(۱۰) آپ ﷺ سفر سے چاشت کے وقت تشریف لاتے تشریف آوری پر پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نماز ادا کرتے، پھر مسجد میں بیٹھ جاتے (تاکہ صحابہ کرام ملاقات سے مشرف ہوں) (مسلم) جن نوافل کیلئے جماعت سنت نہیں ان میں سب سے مؤکد سنن رواتب (فرائض کے ساتھ پڑھی جانے والی سنتیں) ہیں ان میں سب سے افضل وتر پھر سنت فجر ہے۔ بعض علماء نے صلوۃ اللیل کو تمام نوافل میں افضل قرار دیا ہے۔ کیونکہ صحیح مسلم شریف میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے فرض نماز کے بعد افضل نماز صلوۃ اللیل (رات کی نماز) ہے"

رواتب کے بعد افضل چاشت کی نماز ہے۔ پھر وہ نماز جو کسی فعل سے متعلق ہو، جیسے طواف کی دو رکعت ،احرام کی دو رکعت، تحیۃ المسجد۔

فصل ۔ تراویح

تراویح کی ۲۰ رکعتیں دس سلام سے پڑھی جائے۔ اگر چار رکعت ایک سلام سے پڑھے تو تراویح صحیح نہ ہوگی۔ اس میں تراویح یا قیام رمضان کی نیت کرے۔ مطلق نیت سے تراویح صحیح نہ ہوگی۔ بلکہ ہر دو رکعت کیلئے تراویح کی نیت کرے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا میں نے اہل مدینہ کو ۳۹ رکعتیں پڑھتے دیکھا جس میں تین وتر کی نماز ہے۔ علماء نے فرمایا کہ دیگر حضرات اس کی پیروی نہیں کرسکتے۔ تراویح کو باجماعت ادا کرنا افضل ہے عشاء کی نماز ہونے کے بعد تراویح کا وقت شروع ہوگا۔ (اور وتر کی طرح صبح صادق تک رہے گا)

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو رمضان میں ایمان واحتساب کے ساتھ (یعنی ثواب کی امید رکھتے ہوئے) قیام کرے تو اس کے گذشتہ گناہوں کی بخشش ہوگی۔ (موطا، بخاری مسلم، ابوداود۔ ترمذی۔ نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی تو آپ ﷺ کی اقتداء میں کافی صحابہ کرام نے بھی نماز پڑھی، پھر دوسرے دن صحابہ کی تعداد میں اور اضافہ ہوا۔ پھر تیسرے دن یہ حضرات جمع ہوئے تو آپ ﷺ ان کی طرف نہ نکلے پھر صبح کے وقت فرمایا کہ تمہاری حرکتوں کو میں دیکھ رہا تھا لیکن اس لئے نہیں نکلا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں تم پر فرض نہ ہوجائے اور یہ واقعہ رمضان کا ہے۔ (بخاری۔ مسلم۔ ابوداود۔ نسائی۔ موطا)(تیسر الاصول)

(۳) صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں رمضان میں ۲۰ رکعت (تراویح) پڑھا کرتے۔ (بیھقی۔ باسناد صحیح) موطا امام مالک میں ۲۳ رکعت کا ذکر ہے۔ امام بیہقیؒ نے فرمایا ۲۳ وتر سمیت ہیں۔ (فتح الوھاب ۱۰ /۵۸)

فصل ۔ نفل مطلق

کسی سبب اور وقت کی قید کے بغیر ایسے ہی سنت نماز (جسے مطلق نفل کہیں گے) جتنی چاہے پڑھ سکتا ہے، صرف ایک رکعت پڑھنا بھی بلا کراہت جائز ہے۔ کسی عدد کی نیت کے بغیر نفل شروع کرے، تو ایک دو یا اس سے زائد کسی بھی رکعت پر سلام پھیر سکتا ہے، کتنی رکعت معلوم نہ ہو اور سلام پھیرے، تو یہ بھی صحیح ہے۔ کسی عدد کی نیت سے نماز شروع کرنے کے بعد اس میں کمی بیشی کرسکتا ہے۔ ایک رکعت کی نیت کے بعد اسے دس رکعت یا دس کی نیت کے بعد ایک رکعت کرسکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ زیادتی یا کمی سے پہلے ہی نیت بدل دے، نیت کی تبدیلی کے بغیر عمداً یوں کرے تو نماز باطل ہوگی مثال۔ کسی نے دو رکعت کی نیت کی پھر زیادتی کی نیت کرکے تیسری کیلئے اٹھ گیا تو جائز ہے، اگر عمداً تیسری کی نیت کے بغیر اٹھا تو نماز باطل ہوگی۔ بھول کر اٹھ گیا تو واپس لوٹے اور سجدہ سہو کرکے سلام پھیرے اس صورت میں اٹھنے کے بعد رکعت کے اضافہ کا اردہ ہوا تو پہلے بیٹھ جائے پھر دوبارہ اٹھے اور آخر میں سجدہ سہو کرے۔ چار رکعت کی نیت سے نماز شروع کرنے کے بعد بدل کر دو کی نیت کرکے دو پر سلام پھیر دے تو جائز ہے۔ نیت کی تبدیلی کے بغیر عمداً یوں سلام پھیر دے تو نماز باطل ہوگی۔ بھول کر سلام پھیرا تو بقیہ رکعتیں پڑھ کر سجدہ سہو کرکے سلام پھیرے۔ اس صورت میں سلام کے بعد دو کا ارادہ ہوگیا تو سجدہ سہو کرکے پھر سلام پھیرے کیونکہ پہلا سلام شمار میں نہیں ہے۔

صرف ایک رکعت پڑھے تو تشہد پڑھنا ہی ہے۔ ایک سے زائد پڑھے تو صرف آخر میں ایک تشہد بھی پڑھ سکتا ہے، اور یہ تشہد رکن ہے۔ اور چار رکعت والی فرض کی طرح دو رکعت پر بھی تشہد پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ہر رکعت میں تشہد پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (البتہ ہر تین رکعت یا

چار رکعت وغیرہ پر تشہد پڑھ سکتا ہے۔(تحفہ) صرف آخر میں ایک تشہد کی صورت میں ہر رکعت میں سورت پڑھے گا۔زائد تشہد کی صورت میں تشہد اول کے بعد صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا رات اور دن کے نوافل میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا افضل ہے۔

احادیث: (۱) ایک حدیث کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا! اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے بہتر نماز ہے۔(دارمی، احمد ، طبرانی فی المعجم الکبیر ،الالبانی) یہ راویت صحیح ہے اور صحابہ کی ایک جماعت حضرت ثوبان، ابن عمرو، ابوامامہ، جابر، ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔

(۲) حضرت ثوبان اور ابودرداء نے آپ ﷺ سے اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے کثرت سجدہ (کثرت نماز) کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ تم ایک سجدہ اللہ کے لئے کرو گے تو اللہ ضرور تمہارا ایک درجہ بلند فرمائیں گے اور ایک گناہ مٹا دینگے۔(مسلم ۔ نسائی ۔ ابو عوانہ ۔ ابن ماجہ ۔بیھقی ۔ترمذی ۔و قال حدیث حسن صحیح)

(۳) ایک صحابی ربیعہ بن کعب اسلمی نے آپ ﷺ سے جنت میں آپ کی رفاقت کا سوال کیا تو آپ ﷺ نے ان کو کثرت سجدہ کا حکم دیا۔(مسلم ابو اعوانہ ۔ ابوداود ۔ نسائی بیھقی)

(۴) ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ نے کئی رکعتیں پڑھی تو سلام کے بعد احنف نے پوچھا کہ تم نے جفت پر سلام پھیری، یا طاق رکعت پر کچھ پتہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے پتہ نہ بھی ہو تو اللہ کو معلوم ہے۔پھر آپ ﷺ کی یہ روایت سنائی جو بھی بندہ اللہ کے لئے ایک سجدہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور اس کا ایک درجہ بلند فرماتے، ایک گناہ معاف فرماتے اور اس کے حق میں ایک نیکی لکھتے ہیں۔(دارمی و احمد ۔و اسنادہ صحیح علی شرط مسلم ارواء الغلیل ج/۲)

(۵) حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک رکعت پڑھی اور فرمایا کہ یہ نفل ہے جو چاہے زائد پڑھے اور جو چاہے کم۔(بیھقی و فیہ راوین)(تلخیص و خلاصہ البدر)

(۶) نماز بہترین عمل ہے، جو چاہے کم پڑھے جو چاہے زیادہ پڑھے۔(احمد ۔بزار ، ابن حبان ،طبرانی، حاکم)

(۷) رات اور دن کی (سنت) نماز دو رکعت ہے(احمد ، سنن اربعہ،و صححہ ابن خزیمہ ،ابن حبان ،الحاکم ،البیھقی ،نقل تصحیحہ،عن البخاری)

(۸) رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔(یعنی سنت نماز دو دو رکعت افضل ہے۔)(متفق علیہ)(تلخیص الجیر)

فصل ۔ سنن رواتب کا وقت

(رواتب یعنی پنجوقتہ فرائض سے قبل و بعد کی سنتیں)

فرض کی قبلیہ سنت کا وقت فرض نماز کا وقت داخل ہوتے ہی ہوگا۔اور وقت باقی رہنے تک جائز ہے۔لیکن فرض سے قبل ہی پڑھنا افضل ہے۔فرض کے بعد یہ سنت کا وقت فرض نماز پڑھنے کے بعد داخل ہوگا، اور وقت ختم ہوتے ہی سنت کا وقت بھی ختم ہوگا۔

نفل کی اقسام

نفل کی دو قسمیں ہیں (۱) جن کا کوئی معین وقت نہیں، سبب کے پائے جانے کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔جیسے گہن، استسقاء، اور تحیۃ المسجد کی نمازیں۔ان نمازوں کی قضاء مشروع نہیں ہے۔

(جوموقت ہیں (یعنی وقت متعین ہے) جیسے عیدالاضحیٰ اور رواتب نمازیں۔ یہ نمازیں اگر فوت ہوان کی قضاء ہمیشہ مستحب ہے۔
سنن رواتب کو سفر میں بھی پڑھنا مستحب ہے۔ فجر کی سنت کے بعد فرض سے قبل لیٹنا سنت ہے۔ اگر نہ لیٹے تو دونوں میں (گفتگو وغیرہ کے ذریعے) فصل کرے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کی وجہ سے کہ آپ ﷺ فجر کی سنت کے بعد اگر میں جاگتی رہتی تو مجھ سے گفتگو فرماتے ورنہ نماز کی اطلاع تک لیٹ جاتے۔ (رواہ البخاری) فجر کی سنت میں مختصر تلاوت سنت ہے۔ صحیح مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد (''قولوا امنا بالله ''سورہ بقرہ آیت ۱۳۶) اور دوسری میں ''قل یااهل الكتاب تعالوا'' سورہ آل عمران آیت ۶۴۔ تلاوت فرماتے۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ پہلی رکعت میں ''قل یایها الکافرون'' اور دوسری میں ''قل هو االله احد'' کی تلاوت فرمائی۔ لہذا دونوں بھی سنت ہے مغرب کی سنت اور استخارہ اور تحیۃ المسجد کی نماز میں بھی ''قل یایها الکافرون'' اور ''قل هو الله احد'' کی تلاوت کر لے۔ رات کی نفل دن کی نفل سے افضل ہے کسی کو نصف رات عبادت کرنا ہے تو آخری نصف افضل ہے۔ اور ایک تہائی رات عبادت کرنا ہو تو درمیانی حصہ افضل ہے اس سے افضل یہ ہے کہ رات کے چھ حصے کر کے چوتھے اور پانچویں حصے میں جاگے، جیسا کہ صحیحین کی ایک روایت سے ثابت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب داود علیہ السلام کی نماز (کا طریقہ) ہے، نصف رات سو جائے، اور ایک تہائی عبادت میں گذارتے، پھر آخری چھٹے حصے میں سو جاتے۔ (بخاری و مسلم)

ہمیشہ ساری رات نماز پڑھنا مکروہ ہے، انسان کو چاہیے کہ رات میں کچھ نہ کچھ نماز ضرور پڑھے۔ نفل نماز گھر میں پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔

لیکن درج ذیل نوافل مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔ (۱) جمعہ کی قبلیہ سنت (۲) چاشت کی نماز (۳) استخارہ کی نماز (۴) معتکف کی نماز (۵) فرض نماز کے بعد سیکھنے یا سکھانے کیلئے مسجد میں رکا ہوا شخص (۶) رواتب کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، وقت کی تنگی یا اپنی سستی کی وجہ سے (۷) سفر میں جاتے وقت نماز (۸) سفر سے لوٹنے پر نماز (۹) طواف کی دو رکعت، کیونکہ ان کا مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کرنا افضل ہے (۱۰) میقات میں مسجد ہو تو احرام کی دو رکعت اس مسجد میں ادا کرنا مستحب ہے۔ (حاشیة الروضه۔عن البکری)

تہجد کی نماز کے لئے اٹھنے والے کیلئے مستحب ہے کہ ایسے آدمی کو جگا دے جس سے تہجد کی توقع ہو، جبکہ کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ صحیح احادیث کی وجہ سے سفر سے واپسی پر مسجد میں دو رکعت کی پابندی مستحب ہے۔ (واللہ اعلم)

کتاب۔صلاۃ الجماعۃ (نماز باجماعت)

آیت: (وَ اِذَا کُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاۃَ (سورہ نساء) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نماز خوف میں جماعت کا حکم دیا، تو عام حالات میں بدرجہ اولیٰ اس کی اہمیت ہوگی۔ **احادیث:** (۱) آپ ﷺ نے فرمایا جماعت کی نماز تنہا نماز سے ستائیس درجہ افضل ہے۔ (متفق علیه)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے نماز کیلئے جو جتنی دور سے پیدل آئے گا، اتنا ہی زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا، اور جو نماز کا انتظار کرتا رہے یہاں تک کہ امام کے ساتھ نماز پڑھے، اسے نماز پڑھ کر سو جانے والے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ (صحیح بخاری)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے ''جس نے عشاء باجماعت ادا کی گویا نصف رات نماز میں گذار دی۔ اور جس نے فجر باجماعت

ادا کی، تو گویا ساری رات نماز میں گذاری۔ (مسلم۔ مالک۔ ابوداود۔ ترمذی)

(۴) ایک نابینا شخص (حضرت ابن ام مکتومؓ) نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے مسجد لانے والا کوئی ہے نہیں، لہذا یہ درخواست ہے کہ (ترک جماعت) کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ ﷺ نے اجازت دی، جب وہ جانے لگے تو بلا کر فرمایا کیا تم اذان سنتے ہو؟" کہا جی ہاں۔ فرمایا۔ پھر جماعت میں شرکت کرو۔ (مسلم۔نسائی)

(۵) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اس ارادے کا اظہار فرمایا کہ لکڑیاں جمع کر کے ان لوگوں کے مکانات جلا ڈالوں جو جماعت میں شریک نہیں ہوتے۔ (موطا۔بخاری۔مسلم۔ ابوداود۔ ترمذی۔نسائی۔) (تیسیر الوصول ۲/۲۶۵)

(۶) کسی شخص کا دوسرے کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے افضل ہے اس کا دو اشخاص کے ساتھ نماز پڑھنا ایک کے ساتھ پڑھنے سے افضل ہے، جتنے زیادہ نمازی ہوں، وہ اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔ (ابوداود۔ نسائی)

(۷) کسی بستی یا صحرا و جنگل میں تین افراد ہوں اور ان میں جماعت کا قیام نہ ہو، تو ضرور شیطان ان پر غلبہ اور قابو پالے گا، لہذا جماعت کی پابندی کرو، کیونکہ بھیڑیا (ریوڑ اور چرواہے سے) دور (تنہا) بکری کو کھاجاتا ہے۔ (احمد۔ ابوداود۔نسائی۔ ابن ماجہ۔ حاکم۔تلخیص الحبیر۔ ۲/۲۷)

تنہا اور جماعت کی نماز کے ارکان و شروط میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن جماعت افضل ہے۔ جمعہ کی نماز میں جماعت فرض عین اور دیگر فرض نمازوں میں فرض کفایہ ہے۔ محدثین شوافع میں سے امام ابن المنذر اور ابن خزیمہ (اور بعض دیگر علماء) نے جماعت کو فرض عین کہا ہے۔ کسی بستی کے لوگ جماعت کا اہتمام نہ کریں تو امام وقت (مسلم حکومت کا بادشاہ) ان سے قتال ولڑائی کرے۔ جماعت کی ذمہ داری سے اہل بستی اسی وقت سبکدوش ہوں گے، جبکہ ایسے انداز میں اس کا قیام ہو کہ ان کے درمیان اس شعار (دینی اہم علامت) کا اظہار ہو لہذا چھوٹی بستی میں ایک جگہ اس کا قیام کافی ہے، بڑی بستیوں اور شہروں میں کئی مقامات میں جماعت ہونی چاہئے۔ تمام لوگ گھروں میں جماعت سے پڑھنے پر اکتفاء کریں تو اس سے فرض ساقط نہ ہوگا۔ بازار یا کسی گھر میں ایسے طور پر جماعت ہو کہ سب شریک ہوتے ہوں اور اظہار حاصل ہو تو یہ کافی ہے۔

بستی یا صحرا کے چند حضرات اظہار کے ساتھ جماعت کا اہتمام کریں اور اکثر حضرات نہ آئیں تو جماعت حاصل ہوگی۔ اور پیچھے رہنے والوں کو گناہ نہ ہوگا۔ (لیکن احادیث میں سخت تاکید کی وجہ سے بغیر معقول اور شرعی عذر کے پیچھے نہیں رہنا چاہئے) جیسا کہ بعض حضرات کا نماز جنازہ پڑھنا کافی ہے۔ (اوروں کو گناہ نہ ہوگا) یہ مردوں کے متعلق تفصیلات تھیں۔ عورتوں کے لئے جماعت سے پڑھنا مستحب ہے۔ لیکن مردوں کے مقابلہ میں تاکید کم ہے، اور جماعت ترک کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے، لیکن مردوں کو ترک جماعت مکروہ ہے۔ عورتوں کی امام (عورت) کو ان کے درمیان میں کھڑی رہنا مستحب ہے (نہ کہ مردوں کے امام کی طرح آگے)۔

حدیث : حضرت عائشہؓ نے عورتوں کی امامت فرمائی تو ان کے درمیان میں کھڑی ہوگئیں۔ (عبدالرزاق، دارقطنی ،بیھقی، تلخیص الحبیر ۲/ ۴۴)

عورتوں کیلئے گھر کی جماعت افضل ہے، مردوں کے ساتھ مسجد میں حاضر ہونا نوجوان عورتوں کو مکروہ ہے، نہ کہ بوڑھی عورتوں کو۔

حدیث ۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ اپنی عورتوں کو مسجد سے نہ روکو اور ان کے حق میں ان کا گھر بہتر ہے۔ (ابوداود و ،صححہ الحاکم)

عورتوں کی امامت مرد کرے یہ افضل ہے، بہ نسبت عورت کی امامت کے، لیکن غیر محرم کو ان کے ساتھ تنہائی جائز نہیں (مقتدیوں

میں کوئی ایک عورت اس مرد امام کی محرم یا بیوی ہو) (ممیز) بچوں کو مساجد اور جماعت کی شرکت کا حکم دیں گے، تاکہ وہ عادی بنیں (مغنی)

قضاء نماز میں جماعت سنت ہے، صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جب وادی میں فجر کی نماز فوت ہوئی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ باجماعت اس کی قضاء کی۔ ادا نماز کے پیچھے قضاء اور قضاء کے پیچھے ادا جائز ہے، لیکن تنہا پڑھنا اس سے افضل ہے، تاکہ علماء کے اختلاف سے نکل جائے۔ کن نوافل میں جماعت مشروع ہے اور کن میں نہیں اس کا ذکر نوافل کے باب میں گذر چکا ہے۔ غیر مشروع ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مستحب نہیں ہے اگر کوئی ایسے نوافل کو باجماعت پڑھے تو جائز ہے، اور اسے مکروہ نہ کہیں گے، کیونکہ احادیث صحیحہ اس کے متعلق موجود ہیں۔

کوئی شخص اپنے گھر میں اپنے ساتھی یا بیوی یا بچے کے ساتھ نماز پڑھے تو اس سے (فی الجملہ) جماعت کی فضیلت حاصل ہوگی، لیکن مسجد میں افضل ہے۔ مسجد میں جتنی بڑی جماعت ہو وہ افضل ہے قریب کی مسجد میں کم جماعت اور دور کی مسجد میں بڑی جماعت ہوتی ہو تو دور کی افضل ہے سوائے دو صورتوں کے۔ (۱) اس کے دور جانے سے قریبی مسجد میں جماعت نہ ہو اس کے وہاں امام ہونے کی وجہ سے یا اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی آتے ہوں تو قریبی مسجد افضل ہے۔ (۲) دور کی مسجد کا امام بدعتی مثلاً معتزلی وغیرہ ہو۔

سلام سے پہلے مقتدی امام کے ساتھ شامل ہو جائے تو اسے (فی الجملہ) جماعت کی فضیلت حاصل ہوگی۔ امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ کی پابندی مستحب ہے، امام کے تکبیر کے بعد ہی اپنے نماز کی ابتداء کرے، تو یہ فضیلت حاصل ہوگی، تکبیر تحریمہ کے فوت ہونے کا ڈر ہو تو رفتار تیز نہ کرے، بلکہ سکینہ کے ساتھ چلے جیسا کہ فوت ہونے کا ڈر نہ ہونے کی صورت میں چلنا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے جب اقامت سنو تو سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ نماز کے لئے چلو تیز رفتاری کی ضرورت نہیں جتنی نماز ملے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے (امام کے سلام کے بعد) اسے مکمل کر لو۔ (مؤطا۔ بخاری۔ مسلم۔ ابوداود۔ ترمذی۔ نسائی۔ (تیسیر الوصول ۲/ ۲۷۴)

فصل: امام کو ابعاض اور ہیئات سنتوں کی پابندی کے ساتھ مختصر اور ہلکی نماز پڑھانا مستحب ہے۔

حدیث: (۱) تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرے تو ہلکی نماز پڑھائے۔ (متفق علیہ)

(۲) حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے ہلکی اور مکمل نماز کسی اور امام کے پیچھے نہیں پڑھی۔ (متفق علیہ) (تلخیص)

امام نوویؒ نے شرح مہذب میں خفیف اور ہلکی نماز کا یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ نہ تو اقل (صرف فرائض) پر اکتفا کرے اور نہ منفرد کیلئے جو اکمل اور مستحب ہے اس پر عمل کرے۔ (حاشیۃ الروضۃ) اگر مقتدی متعین اور محدود ہوں اور تطویل سے راضی ہوں تو لمبی نماز پڑھانا مستحب ہے امام نماز کو طویل کرے، تو اس کی درج ذیل صورتیں ہیں۔ (۱) بازار یا محلہ کی مسجد میں نماز کے دوران مزید مقتدیوں کے آنے کیلئے طویل کرنا یہ مکروہ ہے

(۲) ایسی مسجد میں امامت کرے جہاں کوئی معزز و بلند مرتبہ اور شریف نماز میں آتا ہو، تو اس کے انتظار میں طویل کرنا یہ بھی مکروہ ہے۔

(۳) نماز میں یہ محسوس کرے کہ کوئی شخص آچکا ہے، اور اس کی اقتداء کرنا چاہتا ہے، تو اس صورت میں رکوع اور تشہد اخیر میں اس کا انتظار درج ذیل شرائط کے ساتھ مستحب ہے (تاکہ پہلی صورت میں اسے وہ رکعت اور دوسری صورت میں جماعت کی فضیلت مل جائے)

شرائط: زیادہ طویل نہ کرے، مسبوق مسجد کے اندر ہو، باہر ہو تو قطعاً انتظار نہ کرے، محض تقرب الی اللہ کی نیت سے انتظار کرے، لہذا مقتدیوں میں فرق نہ کرے (کہ بعض کیلئے انتظار کرے اور بعض کیلئے نہ کرے۔)

فصل ۔ فرض نماز کا جماعت کے ساتھ اعادہ

جو شخص تنہا یا با جماعت پنجوقتہ نمازوں میں سے کوئی نماز پڑھ چکا ہو، پھر اُسی نماز کی جماعت ملے تو ایک مرتبہ جماعت کے ساتھ اعادہ کرنا مستحب ہے۔ اس کی فرض پہلی شمار ہوگی، لیکن اعادہ میں بھی نیت فرض ہی کی کرے گا۔ کسی نے نماز پڑھنے کے بعد دوسرے کو وہی نماز تنہا پڑھتے دیکھا تو اسے اس کے ساتھ نماز میں شامل ہونا مستحب ہے تا کہ اسے جماعت کی فضیلت حاصل ہو۔

احادیث: (۱) حجۃ الوداع میں مسجد خیف میں فجر کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے دیکھا کہ دو آدمی نماز میں شریک نہیں ہوئے، دریافت کرنے پر انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اپنے قیام گاہ پر نماز پڑھ لی تھی، تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح نہ کرو جب اپنے قیام گاہ پر نماز پڑھ لو پھر کسی مسجد میں پہنچ جاؤ۔ جہاں جماعت ہو رہی ہو تو پھر ان کے ساتھ پڑھ لو، یہ تمہارے لئے نفل ہوگی۔ (احمد ابوداود، ترمذی، نسائی، قال الترمذی حسن صحیح)

(۲) ایک حدیث میں حضرت ابوذر سے آپ ﷺ نے ایسے امراء کے دور میں جو نماز کو موخر کریں، اپنی نماز وقت پر پڑھنے کے بعد ان کے ساتھ ملے تو دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ وہ تمہارے لئے نفل ہوگی۔ (مسلم)

(۳) ایک مرتبہ ظہر کی جماعت کے بعد ایک شخص آ کر تنہا نماز پڑھنے لگا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ! ہے کوئی جو اس پر صدقہ کرے (یعنی) اس کے ساتھ نماز پڑھے (تا کہ اسے جماعت کا ثواب ملے) ترمذی۔ ابن حبان ۔ حاکم ۔ بیہقی، تلخیص الحبیر)

فصل ۔ جماعت کے اعذار

کسی عام یا خاص عذر کے بغیر جماعت کے ترک کی اجازت نہیں ہے۔

عام اعذار: دن یا رات میں ایسی بارش ہو جس سے مشقت ہو، رات میں تیز و تند ہواؤں کا چلنا، شدید کیچڑ، ظہر کے وقت گرم ہوا اور شدت کی دھوپ و گرمی، اس صورت میں اگر ظہر کو ٹھنڈے وقت میں نہ پڑھیں یا اس کے باوجود شدید گرمی باقی ہو تو جماعت سے پیچھے رہ سکتا ہے، رات یا دن میں شدت کی سردی۔

خاص اعذار: ایسا مرض جس کی وجہ سے جماعت میں حاضری میں مشقت ہو۔ تیمارداری۔ کسی ظالم کی طرف سے اپنے یا متعلقین میں سے کسی کے جان و مال کا خطرہ ہو۔ قرض خواہ کے پیچھے پڑنے یا قید میں ڈالنے کا اندیشہ ہو جبکہ یہ تنگدست ہو۔ اگر قرض کا مطالبہ کرنے والا برحق ہو، (اور یہ ادا کر سکتا ہو) تو نہ دینا ظلم ہے لہٰذا اس پر جماعت کی حاضری اور قرض کی ادائیگی ضروری ہے۔ روٹی تنور میں یا ہانڈی چولہے پر ہو اور دوسرا کوئی اس پر نگاہ رکھنے والا نہ ہو، اس پر قصاص لازم ہو اور چند روز پوشیدہ رہنے سے سامنے والے کی طرف سے معافی کی توقع ہو، پیشاب یا پاخانہ یا اخراج ریح کی ضرورت ہو اس صورت میں پہلے ان ضروریات سے فارغ ہو لے، چاہے اس کی وجہ سے جماعت ترک ہو جائے، انہیں روک کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، لیکن فارغ ہونے تک وقت ہی ختم ہو جائے تو پہلے نماز پڑھ لے، شدید بھوک یا پیاس لگی ہو اور کھانا پینا حاضر ہو، اور طبیعت کا اس طرف میلان ہو تو پہلے کھا پی لے، یعنی اتنے لقمے کھالے کہ بھوک کی شدت کو مار دے، البتہ دودھ اور ستو جیسی ایک ہی مرتبہ میں کھائی جانے والی چیز ہو تو مکمل کر لے۔ کھانے پینے سے وقت نکل جائے تو پھر نماز کو مقدم کرنا لازم ہے۔ اس کے مناسب لباس موجود نہ ہو، چاہے ستر عورت ہو سکتا ہو یا نہ ہو سکتا ہو۔ سفر کا ارادہ ہو، اور سفر کے ساتھی نکل چکے ہوں۔ گمشدہ چیز کی تلاش اور اعلان میں لگا ہو، اور جماعت چھوڑنے سے اس چیز

کے ملنے کا امکان ہو یا وہ آدمی جس نے اس کا مال غصب کیا ہو اور اس سے وہ واپس لینے کا ارادہ ہو، کچی پیاز یا گندنا وغیرہ بدبودار اشیاء کھا چکا ہو اور دھونے وغیرہ سے اس کی بو کا ازالہ نہ ہو۔ نیند کا غلبہ (جس کی وجہ سے جماعت کا انتظار مشکل ہو) برف باری جبکہ اس سے کپڑے تر ہوں۔ زلزلہ۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں حد سے زیادہ موٹاپا (جس سے جماعت میں شریک ہونا بہت شاق ہو) عذر جماعت میں شمار کیا ہے، اور حدیث بیان کی کہ ایک انصاری نے اس عذر کی وجہ سے آپ ﷺ سے اپنے گھر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ (حاشية الروضه)

احادیث: (۱) جو اذان سن کر بغیر عذر کے جماعت میں شریک نہ ہو اس کی نماز نہیں۔ (ابن ماجه ۔طبرانی، دارقطنی ۔ بیهقی۔ حاکم۔ وقال صحیح علی شرط الشیخین)

(۲) جو فارغ اور تندرست ہونے کے باوجود اذان سن کر جماعت میں شریک نہ ہو اس کی نماز نہیں۔ (حاکم ۔ بیهقی)

(۳) آپ ﷺ سفر میں ٹھنڈے رات میں اور بارش کی رات میں موذن کو حکم دیتے کہ اپنی اپنی قیام گاہ پر نماز پڑھنے کا اعلان کرو۔ (بخاری ۔مسلم ابوداود ۔ بیهقی۔)

(۴) اسی طرح دن میں بھی بارش کی وجہ سے ابن عباسؓ کی روایت میں رخصت مروی ہے۔ (بخاری ،مسلم)

(۵) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو پیاز اور لہسن کھائے وہ ہرگز ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ جس سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ (مسلم ۔ نسائی ۔ ترمذی ۔ بیهقی)

(۶) جو لہسن یا پیاز کھائے وہ ہم سے ہماری مسجد سے الگ رہے اور اپنے گھر بیٹھے۔ (بخاری ۔ مسلم ۔ ابوداود بیهقی ۔احمد، ارواء الغلیل)

(۷) کھانے کی موجودگی میں یا بول و براز (پیشاب پاخانہ) روک کر نماز نہیں (یعنی اس طرح نماز مت پڑھو) (مسلم)

(۸) اقامت ہو اور کسی کو حاجت ہو تو پہلے اس سے فارغ ہو جائے۔ (مالک ،شافعی ، احمد ، سنن اربعه)

(۹) شام کا کھانا حاضر ہو اور اقامت ہو تو پہلے کھانا کھالو۔ (متفق علیه)

باب ۔ امام کے صفات

واجب صفات: مقتدی کو معلوم ہو کہ امام بے وضو یا جنبی ہے یا اس کے کپڑے پر نجاست ہے تو ایسے شخص کی اقتداء جائز نہیں ہے، کافر صرف نماز پڑھنے سے مسلمان نہ ہوگا اور اس کی اقتداء کرنا جائز نہ ہوگا۔ اگر امام کسی اور مسلک کا ہو اور مقتدی کے مسلک کے مطابق جو واجبات ہیں، ان کی پابندی کرتا ہو، یا پابندی میں صرف شک ہو، تو اس کے پیچھے نماز صحیح ہوگی ورنہ صحیح نہ ہوگی۔ کسی کی نماز ایسی ہو کہ پھر اس کی قضاء لازم ہو جیسے پانی اور مٹی نہ ہونے کی وجہ سے بلا وضو اور بلا تیمم نماز۔ تو ایسے نمازی کی اقتداء جائز نہیں ہے جو دوسرے کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو اس کو امام بنانا صحیح نہیں ہے دو آدمی باجماعت نماز پڑھ رہے ہوں لیکن ان میں امام سمجھ میں نہ آئے تو ان میں سے کسی کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے۔ جو امی ہو یعنی سورہ فاتحہ صحیح نہیں پڑھ سکتا تو اس کے پیچھے قاری (سورہ فاتحہ صحیح پڑھنے والا) کی نماز صحیح نہ ہوگی۔ بے موقع ادغام کرنے والا راء کو تاء سے بدلنے والا ایک حرف کی جگہ دوسرا پڑھنے والا اور جو تشدید کو ادا نہ کر سکے یہ سب امی ہیں۔ امام اور مقتدی ایک ہی طرح کے امی ہوں تو اقتداء صحیح ہوگی۔ اگر ایک شخص سورہ فاتحہ نصف اول صحیح پڑھتا ہو اور دوسرا نصف ثانی تو ان دونوں کو

ایک دوسرے کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے۔ تمتام (تاء میں ہکلانے والا) اور فافاء (فاء کو بار بار ادا کرنے والا) کی امامت مکروہ ہے اور اس کی اقتداء صحیح ہے۔

تلاوت میں ایسی غلطی کرے جس سے مطلب بدلتا نہ ہو جیسے الحمد للہ پڑھنا، تو اس کی اور اقتداء کرنے والوں کی نماز صحیح ہوگی۔ اور مفہوم بدل جائے۔ جیسے "انعمتُ یا انعمتِ" تو نماز باطل ہوگی۔ اگر زبان پلٹتی ہو اور سیکھنا ممکن ہو تو سیکھنا لازم ہے۔ اگر کوتاہی کرے اور وقت تنگ ہو تو ایسے ہی نماز پڑھ لے اور بعد میں اعادہ کرے، اس کی اقتداء صحیح نہ ہوگی۔ اور اگر زبان پلٹتی نہ ہو یا اتنا وقت نہیں ملا کہ سیکھ سکتا، اور سورہ فاتحہ میں یہ مسئلہ ہو تو اس کی نماز اور اس جیسے آدمی کی اقتداء صحیح ہے۔ لیکن قاری کی اقتداء صحیح نہ ہوگی۔ فاتحہ کے علاوہ میں یہ مسئلہ ہو تو اس کی اور پیچھے والوں کی نماز درست ہے۔ مرد کے پیچھے مرد اور عورتیں اقتداء کرسکتے ہیں۔ عورت کے پیچھے صرف عورت اقتداء کرسکتی ہے۔ مرد اور خنثی کی اقتداء عورت کے پیچھے صحیح نہ ہوگی خنثی کے پیچھے صرف عورت اقتداء کرسکتی ہے مرد اور خنثی کی اقتداء عورت کے پیچھے صحیح نہ ہوگی۔ خنثی کے پیچھے صرف عورت نماز پڑھ سکتی ہے مرد یا دوسرا خنثی نہیں پڑھ سکتے۔

امام تیمم یا مسح موزہ کرے اور مقتدی وضو کرے اور پیر دھوئے تو اقتداء صحیح ہے۔ سلس البول کی اقتداء تندرست کو (جس کو یہ بیماری نہ ہو) اور مستحاضہ غیر متحیرہ کی اقتداء طاہرہ عورت کیلئے صحیح ہے۔ ڈھیلوں سے استنجاء کرنے والے اور جس کے بدن یا کپڑے پر معاف نجاست ہو اس کی اقتداء صحیح ہے۔ کھڑا ہو کر نماز پڑھنے والا بیٹھکر پڑھنے والے کی اور کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر پڑھنے والا لیٹ کر پڑھنے والے کی اقتداء کرسکتے ہیں۔

امام کو باوضو اور پاک سمجھ کر اقتداء کی اور نماز بعد اس کا بے وضو یا جنبی ہونا معلوم ہوا تو مقتدی کو قضا کی ضرورت نہیں ہے۔ امام کا بے وضو ہونا مقتدی کو معلوم تھا، پھر بھول کر اس کی اقتدا کی، تو نماز کا اعادہ ضروری ہے۔ امام کو قاری سمجھ کر اقتداء کی، لیکن وہ امی نکلا، تو اعادہ لازم ہے۔ نماز کے دوران امام کا بے وضو یا جنبی ہونا معلوم ہو، تو فوراً جدائی کی نیت کر کے بقیہ نماز تنہا مکمل کرے، قضاء کی ضرورت نہیں۔ امام کو مرد سمجھ کر کسی مرد نے اقتداء کی، پھر معلوم ہوا کہ عورت ہے، تو اعادہ واجب ہے۔ مسلمان سمجھ کر اقتداء کرے اور وہ کافر نکلے تو اعادہ لازم ہے۔ نماز کے بعد امام کے بدن یا کپڑے میں نجاست کا علم ہو اور وہ خفیہ (غیر ظاہرہ) ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں اور ظاہرہ ہو کہ نظر آسکتی تھی) تو اعادہ لازم ہے۔ ممیز بچہ (باشعور بچہ) کی اقتداء میں فرض اور نفل پڑھ سکتا ہے، لیکن بالغ امام افضل ہے غلام اور نابینا کی امامت صحیح ہے۔

احادیث: (۱) حضرت عمرو بن سلمہ آپ ﷺ کے دور مسعود میں اپنے قوم کی امامت فرمایا کرتے اور اس وقت ان کی عمر سات سال تھی (بعض روایت میں ۶ / یا ۷ / یا ۸ اور ۸ / بھی ہے) (بخاری، ابوداود، نسائی، طبرانی)

(۲) مرض الوصال میں آپ ﷺ نے بیٹھ کر امامت فرمائی اور صحابہ نے کھڑے ہو کر پڑھی"۔ (متفق علیه)

(۳) بعض غزوات میں آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں امامت کی ذمہ داری حضرت ابن ام مکتوم (ایک نابینا صحابی) کو سونپی۔

(ابوداؤد، احمد، ابن حبان، ابو یعلی، طبرانی اسناده حسن) (تلخیص الحبیر)

فصل - امام کے لئے مستحب صفات

درج ذیل چھ اسباب کی وجہ سے امام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ فقہ (مسائل کا علم) قراءۃ۔ ورع۔ (پرہیز گاری) عمر، نسب، ہجرت، فقہ اور قرأت تو واضح ہیں۔ ورع سے مراد عدالت (اللہ کے خوف سے شبہات سے بچنا) اور حسن سیرت اور عفت و پاکدامنی ہے۔

عمر سے اسلام کی حالت میں گذری ہوئی عمر مراد ہے۔ پس آج اسلام لایا ہوا بوڑھا ابتدا سے مسلمان نوجوان پر مقدم نہ ہوگا اور نہ کل اسلام لانے والے جوان پر مقدم ہوگا۔ نسب میں قریش کا نسب تو معتبر ہے ہی، ساتھ ساتھ ہر وہ نسب جو کفاءت (نکاح میں) میں معتبر ہے، جیسے علماء و صلحاء یہاں بھی معتبر ہے۔ ہاشمی اور مطلبی دیگر قریش پر مقدم ہوں گے قریش دیگر عرب پر مقدم ہوں گے، اور دیگر عرب عجم (غیر عرب) پر مقدم ہوں گے۔ جو آپ ﷺ کی طرف ہجرت کر چکا ہو وہ غیر مہاجر پر مقدم ہوگا۔ جو پہلے ہجرت کر چکا وہ بعد والے پر مقدم ہوگا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنیوالے مقدم ہوں گے۔ مہاجرین یا ہجرت میں مقدم حضرات کی اولاد دوسروں کے اولاد پر مقدم ہوگی۔ ان مسائل کی روشنی میں بعض جزئیات سامنے آئیں گے۔ ایک عادل اور ایک فاسق ہو تو امامت کیلئے عادل بہتر ہے، چاہے فاسق فقہ قرأت اور دیگر صفات میں عادل سے بڑھا ہوا ہو، بلکہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہے اسی طرح وہ بدعتی جو اپنی بدعت کی وجہ سے کافر نہ ہوا ہو، اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے اور جو بدعت سے کافر ہو چکا ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہی نہیں۔ اس کا حکم دیگر کافروں کی طرح ہے۔ ایک اَوْرَعْ (متقی) ہو اور دوسرا افقہ یا اقرأ (زیادہ فقہ جاننے والا یا قرأت جاننے والا) تو افقہ اور اقرأ کو ترجیح دیں گے۔ ایک صرف بقدر نماز قراءت جانتا ہو، لیکن فقہ میں ماہر ہو اور دوسرا پورا قرآن پڑھتا ہو لیکن فقہ کم جانتا ہو، تو فقہ (اوّل) بہتر ہے۔ جس میں فقہ اور قرأت دونوں ہو وہ صرف فقہ یا صرف قرأت جاننے والے پر مقدم ہوگا فقہ اور قرأت دونوں بھی نسب عمر اور ہجرت پر مقدم ہیں فقہ اور قرأت کے بعد ورع، ہجرت میں مقدم، پھر جس کی اسلامی عمر زیادہ ہو، اور اس کے بعد نسبی فضیلت مقدم ہوگی۔ ان تمام صفات میں دونوں برابر ہوں تو کپڑے اور بدن کی میل کچیل سے صفائی، اچھی صحت، اچھی آواز جیسے اوصاف کی وجہ سے ترجیح دیں گے (ان صفات کی روشنی میں ترجیح عام حالات میں ہے، کسی جگہ امام متعین ہو تو وہی مقدم ہوگا۔ (حاشیہ الروضہ)

کسی علاقہ کا حاکم و گورنر اس علاقے میں اوروں کی بہ نسبت امامت کا زیادہ مستحق ہے، چاہے اوروں میں مندرجہ بالا صفات ہوں۔ حاکم امام مسجد اور صاحب خانہ پر مقدم ہوگا جب کہ صاحب خانہ اپنے گھر میں جماعت کی اجازت دے۔ حاکم دوسرے کو امامت کی اجازت دے تو حرج نہیں، حاکموں میں فرقِ مراتب کا لحاظ کیا جائے گا امام اعظم (بادشاہ) اوروں پر مقدم ہوگا۔ پھر جو جتنا بڑا حاکم ہوگا وہ مقدم ہوگا۔ کسی جگہ جماعت ہو رہی ہو اور حاکم نہ ہو تو اس جگہ رہنے والا آگے بڑھنے یا کسی کو بڑھانے کا مستحق ہوگا۔ چاہے رہنے والا مالک ہو یا کرایہ دار ہو یا مستعیر ہو (عاریت پر لے کر رہنے والا) گھر دو آدمی میں مشترک ہو تو دونوں کی اجازت کے بغیر تیسرا امامت نہ کرے اور نہ ان میں سے کوئی دوسرے کی اجازت کے بغیر امامت کرے ایک ہی شریک حاضر ہو تو وہی مستحق ہے۔ گھر کا مالک اور کرایہ دار دونوں ہوں تو کرایہ دار مقدم ہے۔ مالک اور مستعیر دونوں ہوں تو مالک مقدم ہے۔ کسی مسجد میں امام متعین ہو (جیسے عام طور پر ہوتا ہے) تو وہی امام مستحق ہے اگر وہ حاضر نہ ہو، تو اسے بلا بھیجنا مستحب ہے۔ اول وقت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، تو دوسرے کو امامت کرنا مستحب ہے، جبکہ فتنے کا ڈر نہ ہو، فتنہ کا ڈر ہو تو لوگ تنہا نماز پڑھیں، بعد میں امام آ جائے تو اس کے ساتھ اعادہ مستحب ہے۔

احادیث: (۱) قوم کی امامت کتاب اللہ کا اقرأ (جو قرآن زیادہ صحیح پڑھے اور جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ) کرے قرأت میں برابر ہوں تو سنت (حدیث) کا زیادہ علم رکھنے والا، سنت میں برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو، ہجرت میں برابر ہوں تو جو عمر میں بڑا ہو (وہ امامت کرے) کوئی آدمی دوسرے کے گھر اس کی امامت نہ کرے اور نہ اس کے دائرہ اختیار میں اس کی امامت کرے، اور اس کی مخصوص نشست گاہ میں نہ بیٹھے مگر اس کی اجازت سے۔ (مسلم و اصحاب السنن)

(۲) حضرت ابن عمر حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ (الشافعی - ابن ابی شیبہ)

(۳) سنت یہ ہے کہ صاحب خانہ ہی امامت کرے۔(الشافعی، عن ابن مسعود)

(۴) قریش کو مقدم کرو۔(الشافعی ،ابن ابی شیبه، بیهقی، طبرانی، تیسرالوصول ، ارواء الغلیل ،تلخیص الحبیر)

نماز میں مسائل کی زیادہ ضرورت پیش آ سکتی ہے،اور مرض الوصال میں آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امام بنایا، حالانکہ خود آپ ﷺ نے حضرت ابی ابن کعب کو اقرأ قرار دیا،اس لئے علماء نے افقہ کو اقراء۔ پر مقدم رکھا۔(تحفة المحتاج وغیره)

فصل ۔ اقتداء کے شرائط اور آداب

اقتداء کے سات شرائط ہیں۔

(۱) مقتدی قبلہ کی طرف امام سے آگے نہ ہو(کیونکہ آپ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے سے یہی ہوتا رہا اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور آگے بڑھنے والا تابع نہیں ہے۔(حاشیة الروضه) اگر مقتدی امام سے آگے بڑھا تو اس کی نماز نہ ہوگی۔اگر ایک ہی مقتدی ہو تو مستحب ہے۔ کہ امام سے معمولی پیچھے رہے۔ دو یا زائد مقتدی ہوں تو پیچھے صف بنالیں۔ امام ومقتدی ایک ہی سیدھ میں ہوں تو نماز صحیح ہوگی۔

آگے بڑھنے اور برابری میں ایڑیوں کا اعتبار ہوگا۔ایڑیاں برابر ہوں اور مقتدی کی انگلیاں آگے ہوں تو حرج نہیں۔(بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں محل نشست یعنی سرین کا اعتبار ہوگا۔اور لیٹ کر پڑھنے میں پہلو کا اعتبار ہوگا۔(حاشیة الروضه) مقتدی کی انگلیاں امام سے پیچھے ہوں لیکن ایڑی آگے ہو تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ مسجد حرام میں امام کے لئے مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہونا مستحب ہے۔لوگ کعبہ کے چاروں طرف کھڑے رہیں امام کی طرف کھڑے ہونے والے آگے نہ بڑھیں۔دوسری طرف کھڑے ہونے والے امام سے زیادہ کعبہ کے قریب ہوں تو حرج نہیں۔

امام کے ساتھ ایک مذکر مقتدی ہو تو اس کے دائیں طرف کھڑا رہے بالغ ہو یا بچہ بائیں طرف یا پیچھے کھڑا ہو جائے تو نماز باطل نہ ہوگی، پھر دوسرا مقتدی آئے تو بائیں طرف تکبیر تحریمہ کہے پھر دونوں مقتدی پیچھے ہٹ کر صف بنالیں۔جگہ کی تنگی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہو تو امام آگے بڑھ جائے۔یہ حکم اسوقت ہے جبکہ دوسرا مقتدی قیام میں آئے۔تشہد یا سجدے میں آئے تو قیام تک آگے پیچھے نہ ہوں۔ ابتداء سے ہی دو مرد یا ایک مرد اور ایک بچہ ہو تو وہ دونوں امام کے پیچھے صف بنالیں،صرف عورتیں ایک یا زائد ہو تو پیچھے صف بنالیں۔ ایک مرد اور ایک عورت ہوں تو مرد امام کے دائیں طرف اور عورت اس مرد کے پیچھے کھڑی ہو جائے۔دو مذکر اور عورت ہو تو دونوں مذکر پیچھے صف بنائیں اور عورت ان کے پیچھے کھڑی رہے ایک مرد ایک خنثیٰ اور ایک عورت ہو تو مرد دائیں طرف خنثیٰ ان کے پیچھے اور عورت خنثیٰ کے پیچھے کھڑی رہے۔کئی مرد اور بچے ہوں تو پہلے مردوں کی صف پھر بچوں کی صف ہوگی۔عورتیں بھی ہوں تو ان کی صف بچوں کے پیچھے ہوگی۔اگر مرد ننگے ہوں تو امام صف کے درمیان کھڑا ہو۔صرف عورتوں کی جماعت ہو تو ان کی امام صف میں درمیان میں کھڑی رہے گی۔ یہ ساری تفصیلات مستحب ہے۔خلاف ورزی سے نماز باطل نہ ہوگی۔

احادیث: (۱) ایک مرتبہ حضرت ابن عباس آپ ﷺ کے بائیں طرف نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں دائیں طرف منتقل کیا۔(تیسرا الوصول،عن مؤطا بخاری ،مسلم ، ابوداود،ترمذی،نسائی)

(۲) حضرت جابر راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ ﷺ کی دائیں طرف نماز پڑھ رہا تھا، پھر دوسرے آدمی آ کر بائیں طرف

کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے ہم دونوں کو ہٹا کر آپ کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ (مسلم)

(۳) حضرت انسؓ کا ارشاد ہے کہ ہمارے گھر میں میں اور ایک یتیم آپ ﷺ کے پیچھے نماز کیلئے کھڑے ہوئے اور ام سلیم ہمارے پیچھے۔ (متفق علیه)

(۴) حضرت عائشہؓ نے عورتوں کی امامت فرمائی تو ان کے درمیان میں کھڑی ہوگئیں۔ (عبد االرزاق، دار قطنی، بیهقی)

(۵) حضرت ام سلمہؓ نے عورتوں کی امامت فرمائی تو ان کے درمیان میں کھڑی ہوگئیں۔ (الشافعی، ابن ابی شیبه، عبدالرزاق) (تلخیص الحبیر)

کوئی شخص دوران جماعت حاضر ہو تو اسے صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہو جانا مکروہ ہے۔ بلکہ صف میں کچھ جگہ خالی ہو یا گنجائش ہو (کہ داخل ہو جائے تو جگہ بن جائے گی) تو صف میں داخل ہو جائے اگر پیچھے کی صف میں جگہ نہ ہو لیکن آگے کی صف میں ہو تو پچھلی صفوں کو چیر کر جانا جائز ہے، ان کی غلطی کی وجہ سے اگلی صفوں میں جگہ نہ ہو تو پیچھے تکبیر باندھنے کے بعد آگے سے ایک نمازی کو پیچھے کھینچ لے اور اس آدمی کو اس کا ساتھ دینا مستحب ہے۔ اگر یہ تنہا ہی کھڑا رہا تب بھی نماز صحیح ہوگی۔

حدیث: (۱) مروی ہے کہ آپ ﷺ نے صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے سے فرمایا۔ کیوں نہ صف میں داخل ہوئے یا صف میں سے کسی کو کھینچ لیا اپنی نماز کو لوٹاؤ۔ (طبرانی، بیهقی، تاریخ اصبهان لابی نعیم، احمد، مراسیل ابی داود)

(۲) حضرت ابوبکرہؓ تشریف لائے تو آپ ﷺ رکوع میں تھے لہٰذا انہوں نے صف سے پہلے ہی رکوع کر لیا پھر آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ ہوا تو فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری حرص بڑھائے دوبارہ ایسا نہ کرنا۔ (بخاری، تلخیص الحبیر)

صف میں دو ہی شخص ہوں تو ان میں سے ایک کو نہ کھینچے کیونکہ دوسرا تنہا ہو جائے گا آگے بڑھ کر امام کے ساتھ صف بنا سکتا ہو تو آگے بڑھے یا پیچھے دو سے زائد آدمی کی گنجائش ہو تو ان دونوں کو پیچھے لے آئے۔ (فتح الوهاب ۱۵۱)

(۲) امام کی نماز کے ظاہری افعال کا علم ہو، امام کے مشاہدہ کے ذریعے، یا بعض صفوں کے مشاہدہ کے ذریعے، یا امام یا مبلغ کی آواز سن کر امام کے افعال کا علم ہونا ضروری ہے۔

(۳) امام اور مقتدی ایک ہی جگہ ہوں اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) امام اور مقتدی دونوں مسجد میں ہوں تو اقتداء صحیح ہے، دونوں کے درمیان کی مسافت کم ہو یا زائد یا دونوں مسجد کے الگ الگ حصے میں ہوں جیسے صحن مسجد اور چبوترہ، منارہ، تہ خانہ، چھت، اور گوشہ بشرطیکہ چھت مسجد میں داخل ہو، مسجد دو عمارتوں میں ہوں تو ایک کا دوسری طرف کھلنے والا دروازہ ہونا شرط ہے، ورنہ دونوں ایک مسجد شمار نہ ہوں گے۔ جب یہ شرط پائی گئی تو اس سے کوئی فرق نہیں کہ دروازہ کھلا ہو یا بند یا مقفل۔ امام و مقتدی ایسے دو مسجدوں میں ہوں کہ درمیان میں کوئی نہر یا راستہ یا مسجد کی ایسی دیوار حائل ہو، جس میں ایک دوسرے کی طرف کھلنے والا دروازہ نہ ہو تو یہ ایک کے مسجد اور دوسرے کے خارج مسجد کھڑے ہونے کی طرح ہے جو آگے انشاء اللہ آئے گا۔ مسجد بننے کے بعد مسجد میں نہر کھودی گئی تو وہ بھی مسجد ہے۔ اور مسجد سے پہلے کھودی گئی تو دو غیر متصل مسجد ہیں۔ ایک دوسرے سے متصل کئی مسجدیں ہوں کہ دروازہ ایک دوسرے میں کھلتا ہو تو یہ ایک ہی مسجد کے حکم میں ہے۔ مسجد کا رحبہ (مسجد سے خارج وہ حصہ جو مسجد کیلئے گھیر لیا گیا ہو) مسجد کے حکم میں ہے۔

(۲) دونوں مسجد سے باہر ہوں۔ اس کی دو صورتیں ہونگی۔

(الف) دونوں کھلے میدان میں ہوں، تو اقتداء صحیح ہے بشرطیکہ دونوں کہ درمیان کا فاصلہ تقریباً ۳۰۰ ذراع (ہاتھ) سے زائد نہ ہو۔ امام کے پیچھے دو آدمی آگے پیچھے کھڑے ہوں تو ان کے درمیان اور دو صف ہوں تو ان صفوں کے درمیان بھی اسی فاصلہ کا اعتبار ہوگا۔ امام کے پیچھے کئی صف ہوں اور امام اور آخری صف کا فاصلہ میلوں کا ہو تب بھی جائز ہے۔ (جبکہ امام اور صف اول کے درمیان اور بقیہ ہر دو صف کے درمیان کا فاصلہ ۳۰۰ ذراع سے زائد نہ ہو) امام ومقتدی یا دو صفوں کے درمیان ایسی نہر جسے تیر کر پار کرنے پڑتا ہو یا ایسا راستہ جس پر لوگ چلتے ہوں حائل ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں ان سارے مسائل میں اس میدان کے اطراف احاطہ ہو یا نہ ہو یا چھت ہو یا ہو نہ سب برابر ہے۔

(ب) دونوں میدان میں (کھلی جگہ) نہ ہوں بلکہ دونوں الگ الگ تعمیر میں ہوں، جیسے ایک صحن میں دوسرا چبوترہ پر یا امام ایک مکان میں اور مقتدی دوسرے مکان میں (یا ایک عمارت میں اور دوسرا میدان میں) تو مذکورہ دیگر شرائط کے ساتھ امام ومقتدی کے درمیان ایسے حائل کا نہ ہونا شرط ہے جو گذرنے یا دیکھنے سے روکے، یا اس حائل میں منفذ (گذرگاہ) ہو تو ایک شخص کا اس منفذ میں کھڑا ہونا شرط ہے۔ اب اس شخص کے پیچھے یا دوسری طرف کھڑے ہونے والوں کی اقتداء صحیح ہے چاہے ان کے اور امام کے درمیان حائل ہو منفذ میں کھڑا شخص پیچھے اور دوسری طرف والوں کیلئے امام کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ان کو اس سے آگے بڑھنا جائز نہیں اور نہ اس سے قبل تکبیر تحریمہ کہیں۔ اگر امام اور مقتدی کے درمیان گزرنے سے مانع جیسے کھڑکی یا دیکھنے سے مانع جیسے بند دروازہ موجود ہو یا منفذ میں کوئی کھڑا نہ ہو تو پھر اس صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کا حائل دونوں کے اجتماع سے مانع ہے۔

(۳) ایک مسجد میں اور دوسرا خارج مسجد ہو، اس صورت میں حائل کے متعلق مندرجہ بالا شرائط ضروری ہیں۔ مسجد اور خارج مسجد شخص دو صفوں کی طرح ہیں۔ لہٰذا وہ شخص جس طرف کھڑا ہے اس طرف مسجد کے آخری کنارے سے اس کے درمیان کا فاصلہ ۳۰۰ ذراع سے زائد نہ ہو، مسجد کے آخری صف یا امام کی جگہ سے فاصلے کا اعتبار نہ ہوگا۔ (فتح الوهاب ۔ ۱/ ٦٦)

(۴) **اقتداء کی نیت:** مقتدی تکبیر تحریمہ کے وقت ہی اقتداء یا جماعت کی نیت کرلے، ورنہ اس کی نماز باجماعت نہ ہوگی۔ اقتداء کی نیت نہ کرے تو اس کی نماز تنہا منعقد ہوگی۔ دوران نماز اقتداء کی نیت میں شک ہو، اور امام کی متابعت میں کسی فعل کو انجام دینے سے قبل یاد آ گیا تو حرج نہیں، کسی فعل کو اس کی متابعت میں انجام دینے کے بعد یاد آئے تو نماز باطل ہے، کیونکہ بحالت شک وہ تنہا نمازی کے حکم میں ہے، اور تنہا نمازی کو متابعت کی اجازت نہیں، حتی کہ آخری تشہد میں شک آئے تو اپنا سلام امام کے سلام پر موقوف رکھنا جائز نہیں ہے۔ متابعت کی وجہ سے نماز اس وقت باطل ہوگی، جبکہ اپنے رکوع یا سجدہ کے لئے امام کا زیادہ انتظار کرے تا کہ اس کے ساتھ رکوع یا سجدہ کرے، اگر دونوں کا عمل اتفاقاً ساتھ ہو تو حرج نہیں ہے۔ جمعہ کی نماز کیلئے اقتداء کی نیت واجب ہے۔

مقتدی کو نیت میں امام کی تعین واجب نہیں ہے، صرف جو بھی امام ہے اس کے ساتھ اقتداء کی نیت کافی ہے۔ اگر مقتدی تعین کرے، پھر اس میں غلطی ہو، مثلاً زید کے اقتداء کی نیت کی لیکن وہ عمر تھا تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی۔ جیسا کہ نماز جنازہ میں میت کی تعین کرے اور غلط نکلے تو نماز صحیح نہیں ہے۔ دل میں یہ سمجھتے ہوئے اقتداء کی کہ یہ زید ہے (لیکن تعین نہیں کی) اور وہ کوئی اور تھا تو اقتداء صحیح ہے۔

امام اور مقتدی الگ الگ نماز کی نیت کریں تو اقتداء صحیح ہوگی۔ لہٰذا قضاء کے پیچھے ادا اور اس کے برعکس اور فرض کے پیچھے نفل اور اس کے برعکس جائز ہے (کیونکہ اختلاف نیت سے نماز کی شکل نہیں بدلتی)

حدیث: حضرت معاذ بن جبل ؓ آپ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کرتے پھر لوٹ کر اپنی قوم کو وہی نماز پڑھایا کرتے۔

(بخاری، مسلم،ابوداود ترمذی، ابن ماجہ) بعض روایات میں آگے یہ صراحت بھی ہے۔یہ ان کیلئے نفل اورقوم کیلئے فرض ہوتی تھی۔(الشافعی،عبدالرزاق،دارقطنی،بیہقی،تیسیر، تلخیص)

اقتداءصحیح ہونے کیلئے امام کوامامت کی نیت شرط نہیں ہے،مقتدی مرد ہوں یاعورت،لیکن اسے بغیر نیت کے جماعت کا ثواب نہ ملے گا۔کوئی تنہا نماز پڑھ رہا ہواور اس کی لاعلمی میں لوگ آ کراس کی اقتداءکریں تو قاضی حسین نے فرمایا کہ اسے جماعت کا ثواب مل جائیگا۔جمعہ کی نماز میں امامت کی نیت نہ کرے تواس کی جمعہ صحیح نہ ہوگی۔نیت میں مقتدی کی تعین کرے اورغلط نکلے تواس میں حرج نہیں۔

(۵) امام اور مقتدی کی نماز افعال وارکان کے اعتبار سے ایک ہی قسم کی ہو، لہٰذا اگر امام اور مقتدی کی نماز ظاہری افعال میں مختلف ہو، جیسے عام فرض نماز جنازہ کی نماز کے پیچھے (یااس کے برعکس) یاسورج گہن کی نماز کے پیچھے تو صحیح نہ ہوگی۔افعال ظاہری میں دونوں نماز یکساں ہوں اور رکعتوں کی تعداد یکساں ہو جیسے ظہر عصر یا عشاء کے پیچھے تو واضح ہے۔امام کے رکعت کی تعداد کم ہو جیسے فجر کے پیچھے ظہر تو امام کے سلام کے بعد مقتدی مسبوق کی طرح اٹھ کر اپنی بقیہ نماز مکمل کرے،قنوت میں امام کی اتباع کرے،اگر قنوت کے وقت امام سے الگ ہونے کی نیت کرے تو جائز ہے۔اگر ظہر کی نماز مغرب کے پیچھے ادا کرے تو امام کے آخری تشہد کے وقت مقتدی کو اختیار ہے کہ اس کی اتباع کرے یا جدائی اختیار کرے۔اگر مقتدی کے رکعت کی تعداد کم ہو، جیسے فجر کی نماز ظہر کے پیچھے تو یہ بھی جائز ہے، جب امام تیسری رکعت کیلئے اٹھے تو مقتدی کو اس سے جدائی یا اس کے انتظار میں اختیار ہے،اور انتظار کرنا افضل ہے۔امام اگر اعتدال میں کچھ رکتا ہواور یہ قنوت پڑھ سکتا ہو تو پڑھ لے، ورنہ کوئی حرج نہیں۔قنوت کے لئے امام سے جدا بھی ہوسکتا ہے۔مغرب کی نماز ظہر کے پیچھے ادا کرے تو جب امام چوتھی رکعت کے لئے اٹھے تو اس سے جدائی کی نیت کر کے تشہد پڑھ کر سلام پھیرے، تشہد میں امام کا انتظار کرنا جائز نہیں ہے۔تراویح کے پیچھے عشاء پڑھنا جائز ہے، امام سلام پھیرے تو اٹھ کر اپنی بقیہ نماز مکمل کرے۔عید یا استسقاء کی نماز کے پیچھے فجر وغیرہ پڑھ سکتا ہے، تکبیرات زوائد میں امام کی اتباع نہ کرے۔اتباع کرنے میں بھی حرج نہیں، کیونکہ اذکار سے نماز میں حرج نہیں ہوتا اگر فجر کی قضاء کے پیچھے عید پڑھے تو جائز ہے،اور زائد تکبیرات کہنا بہتر ہے۔

(۶) نماز کے افعال میں امام کی موافقت : امام کسی فرض کو ترک کرے مثلاً بیٹھنے کی جگہ کھڑا ہو یا اس کے برعکس،اور نہ لوٹے تو مقتدی کو اس کی اتباع جائز نہیں ہے۔کیونکہ امام نے عمداً ایسا کیا ہے۔تو اس کی نماز باطل ہے،سہوا کیا ہے تو اس کا یہ فعل غیر معتبر ہے چاہے نماز باطل نہ ہو۔امام کسی سنت کو ترک کرے اور مقتدی کے اس میں مصروف ہونے میں تخلف فاحش (بہت زیادہ اور قبیح پیچھے رہنا) پایا جاتا ہو جیسے سجدہ تلاوت اور تشہد اول تو مقتدی اس سنت کو نہ ادا کرے۔اگر ادا کرے گا تو نماز باطل ہوگی۔امام سجدہ سہو یا دوسرا سلام ترک کرے تو مقتدی اسے بجالائے۔لیکن سنت کی ادائیگی میں معمولی تخلف (امام سے پیچھے رہنا) پایا جارہا ہو، جیسے جلسہ استراحت تو اس میں حرج نہیں اسی طرح پہلے سجدہ میں امام کے ساتھ شامل ہو جاتا ہو تو قنوت کے لئے پیچھے رہنے میں حرج نہیں۔

(۷) امام کی متابعت : مقتدی پر امام کی متابعت واجب ہے۔افعال میں اس سے آگے نہ بڑھے۔متابعت کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے اس انداز میں نماز پڑھے کہ اس کے ہر فعل کی ابتداء امام کی ابتداء کے بعد اور فارغ ہونے سے قبل ہو۔مخالف کی درج ذیل صورتیں ہوں گی۔

(الف) امام کے ساتھ ساتھ ادا کرنا (مقارنت) تکبیر تحریمہ میں امام کی مقارنت ہو یا مقارنت کا شک ہو، تو نماز منعقد ہی نہ ہوگی۔ مقتدی کی پوری تکبیر تحریمہ امام کی پوری تحریمہ کے بعد ہونا شرط ہے امام صاحب کو مستحب ہے کہ دائیں بائیں رخ کر کے صف بندی کا حکم

دے اور صفیں درست ہونے کے بعد ہی تکبیر کہے۔ موذن کے اقامت سے فارغ ہونے کے بعد لوگ کھڑے ہو کر صف درست کرلیں۔
تکبیر تحریمہ کے علاوہ دیگر افعال میں مقارنت جائز ہے لیکن مکروہ ہے اور اس سے جماعت کی فضیلت فوت ہو جائے گی۔

احادیث: (۱) حضرت ابو مسعودؓ بدریؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نماز میں ہمارے مونڈھوں پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اختلاف نہ کرو کہ تمہارے قلوب میں اختلاف پیدا ہوگا۔ بالغ اور عقلمند حضرات میرے قریب رہیں پھر اس کے بعد والے پھر اس کے بعد والے۔ (مسلم ابوداؤد، ترمذی)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا اپنے صفوں کو سیدھا اور درست رکھو کیونکہ یہ نماز کے اتمام میں داخل ہے۔ (بخاری۔ مسلم)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے: امام اسی لئے ہے کہ اس کی اتباع (واقتداء) کی جائے، پس وہ تکبیر کہے تب تم تکبیر کہو۔ اور وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی) (تیسر الوصول)

(۴) حضرت براءؓ کا ارشاد ہے۔ ہم آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تو جب آپ ﷺ "سمع الله لمن حمده" کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی آپ ﷺ کے پیشانی مبارک کے زمین پر رکھنے تک اپنی پشت نہ جھکاتے۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

امام سے پیچھے رهنا: امام سے بغیر عذر کے ایک رکن پیچھے رہا تو نماز باطل نہ ہوگی۔ دو رکن (فعلی) بلا عذر پیچھے رہا تو نماز باطل ہوگی۔ سورت کے پڑھنے یا رکوع وسجدہ کے تسبیحات کے لئے پیچھے رہنا عذر شمار نہ ہوگا۔ امام رکوع میں جائے بعد میں مقتدی رکوع کرے اور امام کو رکوع میں پالے تو یہ ایک رکن پیچھے رہنا شمار نہ ہوگا، امام رکوع سے اٹھ گیا اور مقتدی ابھی قیام ہی میں ہے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی لیکن امام سجدہ کیلئے قیام کی حد سے آگے جھک چکا ہو اور مقتدی ابھی تک قیام ہی میں ہو تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ لہٰذا دو رکن پیچھے رہنے کا مطلب یہ ہوا کہ امام کے دو رکن مکمل ہو چکے ہوں اور مقتدی ابھی ان دو سے قبل کے رکن میں ہو۔ یہ تفصیل بلا عذر "تخلف" (پیچھے رہنے) میں ہے۔

اعذار کی کئی انواع هیں: خوف، اس کا ذکر نماز خوف میں آئیگا۔

ایک عذر یہ کہ مقتدی کی رفتار تلاوت دھیمی ہو اور امام کی تیز، اس صورت میں امام مقتدی کی سورہ فاتحہ سے قبل رکوع کرے تو مقتدی اسے مکمل کرنے کے لئے پیچھے رہے۔ اور اپنی نماز کے ترتیب پر امام کے پیچھے چلے جب تک کہ امام تین (لذاتہ) مقصود ارکان سے زائد آگے نہ بڑھ جائے۔ اگر امام تین رکن سے آگے بڑھ جائے تو (اپنی ترتیب چھوڑ کر) امام کے ساتھ شامل ہو جائے اور اس کے سلام کے بعد اپنی فوت شدہ رکعت کی تلافی کرے، یا امام سے جدا ہونے کی نیت کرے۔

لذاتہ مقصود رکن کہنے سے اعتدال اور جلسہ بین السجدتین نکل گئے۔ عذر کے مسئلہ میں ان کو شمار نہیں کریں گے۔ لہٰذا مذکورہ مثال میں امام دوسری رکعت کا رکوع کرے اور مقتدی پہلے اعتدال میں ہو یا مقتدی ابھی فاتحہ مکمل نہیں کر چکا اور امام دوسرے سجدے سے اٹھ کر قیام یا تشہد میں پہنچ چکا تو یہ تین ارکان مقصودہ میں تخلف ہو، لہٰذا اب مقتدی یا تو امام کے ساتھ رکوع یا قیام یا تشہد میں شامل ہو جائے یا اس سے جدائی کی نیت کرے۔ (فتح الوهاب، تحفة المحتاج ۳/ ص ۱۷۴)

مقتدی دعاء استفتاح کی وجہ سے فاتحہ مکمل نہ کر پایا اور امام نے رکوع کرلیا تو یہ بھی عذر ہے، لہٰذا فاتحہ مکمل کرلے، یہ ساری تفصیل موافق مقتدی کے لئے ہے (یعنی جس کو امام کے ساتھ قیام میں بقدر سورہ فاتحہ وقت ملے) مسبوق (جس کو امام کے ساتھ سورہ فاتحہ کا وقت نہ ملے) اگر امام کو قیام میں پائے اور (جلد ہی) اس کے رکوع کا احتمال ہو تو اسے استفتاح نہ پڑھتے ہوئے جلد ہی فاتحہ پڑھنا چاہیئے۔ اب

امام اس کی فاتحہ مکمل ہونے سے پہلے ہی رکوع کرے، اور اس نے استفتاح نہیں پڑھی تھی تو فاتحہ روک کر امام کے ساتھ رکوع کرے، اور اس کی وہ رکعت شمار ہوگی۔ اگر فاتحہ مکمل کرنے پیچھے رہا اور امام نے رکوع سے سر اٹھالیا تو وہ رکعت فوت ہوگئی۔ اب رکوع نہ کرے، امام کے ساتھ آگے بڑھے۔ اگر اس نے استفتاح پڑھی تھی تو اس کے بقدر سورۃ فاتحہ پڑھے، اب امام کے ساتھ رکوع نہ ملے تو وہ رکعت فوت ہوگئی اب رکوع نہ کرے۔ بلکہ امام کے ساتھ سجدہ کرلے۔ امام کے سجدہ کے لئے جھکنے تک بھی بقدر استفتاح سورہ فاتحہ نہیں ہوئی تو اب امام سے جدائی کی نیت کرنا لازم ہے۔(فتح الوهاب / ٦٨، تحفة نهاية)

ایک عذر بھول ہے۔ اگر امام کے ساتھ رکوع کرے پھر یاد آئے کہ سورہ فاتحہ بھول گیا یا اس میں شک ہو تو واپس لوٹنا جائز نہیں، کیونکہ محل قرأت فوت ہو چکا۔ اب امام کے سلام کے بعد ایک رکعت پڑھے۔ امام رکوع میں گیا اور مقتدی کو رکوع میں جانے سے پہلے ہی یاد آگیا تو اب پہلے فاتحہ مکمل کرلے، اور اس کیلئے تخلف عذر ہے۔

(ج) رکوع یا کسی ظاهری فعل میں امام سے آگے بڑھنا ۔ اگر کامل ایک رکن آگے نہ بڑھے، مثلاً امام سے قبل رکوع کیا لیکن امام رکوع میں پہنچنے سے قبل رکوع سے سر نہیں اٹھایا تو نماز باطل نہ ہوگی، عمداً اس طرح ہو یا سہواً، اگر عمداً آگے بڑھا ہے تو واپس قیام میں آکر امام کے ساتھ رکوع مستحب ہے۔ اور سہواً ہے تو اسے لوٹنے نہ لوٹنے کا اختیار ہے۔ اگر عمداً دو رکن (فعلی) امام سے آگے بڑھا، اور اس کا حرام ہونا بھی معلوم ہو، تو نماز باطل ہوگی۔ سہواً یا لاعلمی میں اس طرح ہو تو باطل نہ ہوگی، لیکن وہ رکعت شمار نہ ہوگی۔ امام کے سلام کے بعد اس کی تلافی کرے۔

دو رکن آگے بڑھنے کی ایک مثال: امام سے قبل رکوع کرے جب امام رکوع کا ارادہ کرے تو یہ اٹھ جائے۔ جب امام اٹھنے کا ارادہ کرے تو یہ سجدہ میں جائے، نہ تو دونوں رکوع میں جمع ہوئے اور نہ ہی اعتدال میں، امام سے قبل رکوع کر کے اعتدال میں پہنچے، اور امام قیام میں ہو، پھر اعتدال میں امام کے پہنچنے تک رکا رہا تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ صرف ایک رکن آگے بڑھنے سے نماز باطل نہ ہوگی۔ یہ سارے احکام افعال ظاہرہ کے متعلق تھے۔ تکبیر تحریمہ میں سبقت سے نماز باطل ہوگی جیسا کہ گذر چکا۔ سورہ فاتحہ اور تشہد میں آگے بڑھنے سے نقصان نہ ہوگا۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اپنا سر رکوع یا سجدہ سے امام سے قبل اٹھانے کی وجہ سے اللہ اس کا سر گدھے کا سر کردے۔(بخاری، ابوداود، ترمذی، نسائی)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کا ارشاد ہے۔ "امام سے قبل سر اٹھانے اور جھکانے والے کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے۔(مالک) (تیسر الوصول)

مسبوق امام کو رکوع میں (یا تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد) پالے تو تکبیر تحریمہ کہے پھر فاتحہ نہ پڑھے، بلکہ ایک اور تکبیر کہتا ہوا رکوع میں جائے، اسی طرح امام کو قیام میں پالے اور تکبیر تحریمہ کہتے ہی امام رکوع میں جائے تو یہ بھی جائے اگر حالت قیام میں صرف ایک تکبیر تکبیر تحریمہ کی نیت سے کہے تو نماز صحیح ہے (کیونکہ رکوع کی تکبیر سنت ہے۔) لیکن ایک ہی تکبیر دونوں نیت سے یا رکوع کی نیت سے یا بلا کسی نیت کے مطلق کہے تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی آئے تو امام جس حال میں ہو اسی میں اس کے ساتھ شامل ہو جائے"(ترمذی)

بلا عذر یا عذر کی وجہ سے مقتدی امام سے جدا ہونے کی نیت کرے۔ (اور اپنی نماز تنہا مکمل کرے) تو جائز ہے۔ (کیونکہ ذات

الرقاع کے صلاۃ الخوف میں پہلا گروہ ایک رکعت ادا کرنے کے بعد آپ ﷺ سے جدا ہوگیا) بلا عذر اس طرح کرنا مکروہ ہے اور اس سے جماعت کی فضیلت فوت ہو جائے گی۔ جس عذر سے ابتداء جماعت ترک کر سکتے ہیں، وہ یہاں بھی عذر ہے۔ امام نماز کو طویل کر لے اور مقتدی کو کمزوری یا کسی مصروفیت کی وجہ سے ساتھ دینا مشکل ہو تو یہ عذر ہے، کیونکہ حضرت معاذؓ کے ایک مقتدی نے ان کے تطویل کی وجہ سے اپنی نماز تنہا مکمل کی تو آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہ فرمائی۔ امام کا تشہد اول یا قنوت وغیرہ سنت مقصودہ کو ترک کرنا عذر میں داخل ہے۔ (تحفته المحتاج، ۳۔ص ۱۹۱) اگر امام کا وضو ٹوٹ جانے وغیرہ سے اس کی نماز باطل ہو جائے تو مقتدی کی نماز باطل نہ ہوگی۔

کسی کے نماز کے دوران جماعت شروع ہو جائے۔

کوئی تین یا چار رکعت والی نماز میں ہو اور دو رکعت ہونے سے قبل جماعت شروع ہو جائے تو مستحب ہے کہ اسے نفل سے بدل کر دو رکعت پر سلام پھیرے، اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اگر دو رکعت والی نماز ہو یا تین یا چار والی اور تیسری رکعت شروع کر چکا ہو تو اس نماز کو مکمل کر لے اور پھر امام کے ساتھ شامل ہو جائے، قضاء نماز پڑھ رہا ہو تو اس کی جماعت کی وجہ سے دو رکعت پر سلام پھیرنا مستحب نہیں ہے۔ قضاء نماز شروع کرنے کے بعد حاضرہ نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو دو رکعت پر سلام پھیر کر پہلے حاضرہ (وقت والی نماز) ادا کرے۔ دوران سنت جماعت شروع ہو اور فوت ہونے کا خدشہ نہ ہو تو اپنی سنت مکمل کر لے۔ فوت ہونے کا ڈر ہو تو سنت توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے۔

اگر تنہا نمازی سلام نہ پھیر کر دوران نماز ہی جماعت میں شامل ہو جانے کی نیت کر لے، تو یہ جائز ہے، اب امام کی پیروی کرے، اگر اس کی نماز امام سے قبل مکمل ہو، یا تو امام سے جدا ہو جائے، یا تشہد میں دعاء پڑھتا رہے اور امام کا انتظار کرے، تاکہ اس کے ساتھ سلام پھیرے۔ امام کی نماز پہلے پوری ہو تو یہ مقتدی مسبوق کی طرح اپنی نماز مکمل کرے۔ اقتداء کی نیت سے پہلے مقتدی سے سہو ہوا تھا تو اسے امام نہیں اٹھائے گا۔ بلکہ اس کے سلام کے بعد اپنا سجدہ سہو کرے۔ اقتداء کے بعد سہو ہو تو امام اٹھا لے گا۔ اقتداء سے قبل یا بعد امام سے سہو ہو تو وہ مقتدی کو بھی لاحق ہوگا اور امام کے ساتھ سجدہ کرے گا اور مسبوق کی طرح اپنی نماز کے آخر میں بھی کرے گا۔

امام کے ساتھ رکوع میں ملنا

کسی کو امام کے ساتھ رکوع ملے اور امام کا وہ رکوع شمار ہو (یعنی امام بے وضو یا زائد رکعت میں نہ ہو) تو اسے وہ رکعت مل جائے گی۔ امام کے اقل رکوع کی حد سے اٹھنے سے قبل مقتدی کو طمانینت کے ساتھ رکوع ملے، تو رکعت ملے گی ورنہ رکعت نہیں ملے گی (مقتدی جھک رہا تھا اور امام اٹھا یا اس کے اقل رکوع میں پہنچتے ہی طمانینت سے قبل امام اقل رکوع کی حد سے اٹھ گیا تو رکعت نہیں ملے گی) رکوع کے بعد امام کے ساتھ شامل ہونے سے وہ رکعت شمار نہیں ہوگی، لیکن امام جس حال میں ہو اس کے ساتھ شامل ہو کر آگے بڑھے۔ امام آخری تشہد میں ہو تو اس کے ساتھ بیٹھنا لازم ہے۔ تشہد پڑھنا لازم نہیں ہے، لیکن سنت ہے۔

حدیث: (۱) حضرت ابوبکرہؓ مسجد میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ رکوع میں تھے۔ لہٰذا وہ (صف سے پہلے ہی) رکوع کر کے پھر صف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (تو آپ ﷺ نے اس رکعت کے اعادہ کا حکم نہ دیا)۔ (متفق علیه)

(۲) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔ ''امام کے پشت اٹھانے سے قبل کسی کو ایک رکعت (رکوع) مل گئی تو وہ نماز مل گئی۔ (صحیح ابن خزیمه)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم آؤ اور ہم سجدے میں ہوں تو سجدہ کرو اور اسے شمار نہ کرو اور جسے رکعت (رکوع) ملی اسے نماز ملی۔ (صحیح ابن خزیمہ) (تلخیص الحبیر)

مسبوق کا امام کے ساتھ شامل ہونا

مقتدی امام کو سجدہ یا تشہد وغیرہ میں پائے تو تکبیر تحریمہ کہہ کر دوبارہ تکبیر کے بغیر امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ بعد میں امام کے ساتھ تکبیر کہتا ہوا دوسرے رکن کی طرف منتقل ہوگا۔ تشہد اور تسبیحات پڑھنے میں بھی امام کی موافقت کرے۔ امام کے آخری تشہد میں مسبوق کے بیٹھنے کا محل ہو، مثلاً چار رکعت والی نماز میں تیسری رکعت میں یا مغرب کی دوسری رکعت میں شامل ہوا، تو امام کے سلام کے بعد تکبیر کہتا ہوا اٹھے۔ اور مقتدی کے بیٹھنے کا محل نہ ہو مثلاً آخری رکعت میں یا چار رکعت والی نماز کے دوسری رکعت میں شامل ہوا تھا تو بغیر تکبیر کے اٹھ جائے۔ مقتدی کے بیٹھنے کا محل نہ ہو تو امام کے سلام کے بعد رکنا جائز نہیں (اٹھ جائے) ورنہ نماز باطل ہوگی۔ اگر اس کے بیٹھنے کا محل تھا تو حرج نہیں۔ مقتدی امام کے ایک سلام کے بعد اٹھ سکتا ہے لیکن دونوں سلام کے بعد اٹھنا سنت ہے۔ پہلا سلام مکمل ہونے سے پہلے عمداً اٹھ جائے، تو نماز باطل ہوگی۔ امام کے ساتھ جو نماز ملے وہ مسبوق کی نماز کا ابتدائی حصہ ہے، سلام کے بعد جو پڑھے گا، وہ آخری حصہ ہے۔ لہٰذا اگر مغرب کی ایک رکعت ملی اور سلام کے بعد اٹھا تو دوسری رکعت میں جہر کرے اور تشہد پڑھے اور تیسری میں آہستہ تلاوت کرے فجر کے امام کے ساتھ ایک رکعت ملے اور اس میں قنوت پڑھے تو اپنی دوسری رکعت میں پھر قنوت پڑھ لے۔ البتہ امام کے ساتھ سورت نہیں پڑھ پایا تو اپنی نماز میں اس کی تلافی کر لینا مستحب ہے تاکہ اس کی نماز سورت سے خالی نہ رہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم اقامت سنو تو سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ نماز کی طرف بڑھو اور جلدی مت چلو۔ پس جتنی ملے پڑھ لو، اور جو فوت ہو جائے اس کا اتمام کرو۔ (مؤطا۔ بخاری۔ مسلم۔ ابوداود ترمذی نسائی۔ تیسیر)

اور اتمام ابتدا کے بعد ہوگا، لہٰذا معلوم ہوا کہ امام کے ساتھ جو ملی وہ اول نماز ہے۔ (تحفۃ وبھایۃ) صحیح احادیث کی روشنی میں فجر کی جماعت دیگر نمازوں سے افضل ہے، پھر عشاء پھر عصر۔

جماعت ثانیہ (دوسری جماعت)

کسی مسجد میں امام راتب (متعین امام) ہو، تو اس کی جماعت سے قبل یا بعد اس کی اجازت کے بغیر دوسروں کو جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ مسجد مطروق ہو (جہاں لوگوں کی آمد و رفت اور نماز کا سلسلہ جاری رہتا ہو) تو حرج نہیں۔ یہ مسئلہ باب الاذان میں گذر چکا ہے۔

اگر اکثر مقتدی امام کو ناپسند کرتے ہوں، تو اسے امامت مکروہ ہے۔ کم یا نصف ناپسند کریں تو مکروہ نہیں۔ کراہت اس وقت ہے جبکہ کسی شرعی نقص کی وجہ سے اسے ناپسند کریں (مثلاً نجاست سے محتاط نہ رہے۔ نماز کے ھیئات کی پابندی نہ کرے۔ مذموم معیشت اختیار کرے یا فاسقوں کی صحبت اختیار کرے یا اس جیسے امور) (حاشیۃ الروضہ) اگر شرعی کمزوری نہ ہو تو کوئی کراہت نہیں بلکہ ناپسند کرنا باعث ملامت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا تین افراد کی نماز ان کے کان سے آگے نہیں بڑھے گی (بارگاہ الٰہی میں مقبول نہ ہوگی) بھگوڑا غلام جب تک کہ لوٹے نہیں، وہ عورت کہ شوہر کی ناراضگی کی حالت میں رات بسر کرے اور وہ امام کہ لوگ اس سے ناراض ہوں۔ (ترمذی، حسن غریب)

بعض مقتدیوں کا آنا اہل مسجد کو نا گوار ہو، تو ان کو آنے میں کوئی کراہت نہیں، کہ دوسروں کی نماز کا ان سے تعلق نہیں۔ امام اور مقتدی کا ایک دوسرے سے اونچا یا نیچا ہونا مکروہ ہے۔ اگر امام کو صفتِ نماز کی تعلیم کیلئے اونچی جگہ کھڑا ہونا پڑا یا مقتدی کو تکبیر کی آواز پیچھے پہنچانے کیلئے اونچائی پر نماز پڑھنی پڑی تو (حرج نہیں بلکہ) مستحب ہے۔ مردوں کی صف میں سب سے افضل پہلی صف ہے پھر جو جتنی قریب ہو، اسی طرح صرف عورتوں کی صف کا حکم ہے۔ مرد و عورت دونوں ہوں تو عورتوں کی آخری صف سب سے افضل ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ امام کسی چیز کے اوپر کھڑا رہے اور لوگ اس کے پیچھے نیچے ہوں۔ (دار قطنی)

(۲) حضرت حذیفہؓ نے ایک مرتبہ اونچی جگہ امامت فرمائی تو حضرت ابو مسعودؓ نے انکی قمیص پکڑ کر کھینچ لی اور نماز کے بعد فرمایا: "کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اس سے روکا جاتا تھا۔ (ابوداود، صححه ابن خزيمه، ابن حبان، والحاكم)

(۳) منبر نبوی جب پہلی مرتبہ تیار کر کے اپنی جگہ رکھا گیا تو آپ ﷺ نے اس پر نماز پڑھائی اور سجدہ کے لئے نیچے اترے۔ بعد میں لوگوں سے فرمایا: "میں نے یہ اس لئے کیا تاکہ تم میری اقتداء کرو اور نماز سیکھو"۔ (بخاری، مسلم، ابوداود، نسائی، ابن ماجه)

(۴) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر لوگوں کو اذان اور صف اول کی فضیلت معلوم ہو جائے پھر اس کے حصول کیلئے قرعہ اندازی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ ہو تو قرعہ اندازی کریں۔ (متفق عليه)

(۵) آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ مردوں کی بہترین صف پہلی اور بدترین آخری اور عورتوں کی بہترین صف آخری اور بدترین پہلی ہے۔ (مسلم، بزار۔ طبرانی)

(۶) اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پہلے صف پر درود بھیجتے ہیں۔ (احمد۔ بزار) (مجمع الزوائد، تلخيص، مشكوة)

مسافر کی نماز کا بیان

مشروعیت: آیت: "وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ"

ترجمہ: اور جب تم زمین میں سفر کرو، سو تم کو اس میں گناہ نہ ہوگا کہ تم (ظہر اور عصر اور عشاء کے فرض) نماز (کی رکعات) کو کم کرو (یعنی چار کی جگہ دو پڑھا کرو)

احادیث: (۱) حضرت انسؓ فرماتے ہیں "ہم آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو آپ ﷺ مدینہ واپسی تک دو دو رکعت ادا کرتے رہے۔ (متفق عليه)

(۲) حضرت انسؓ فرماتے ہیں ہم نے آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ میں ظہر کی چار رکعات ادا کی اور مقام ذوالحلیفہ میں عصر کی دو رکعت ادا کی۔ (رواه الترمذی)

(۳) حضرت عائشہ سے مروی ہے: آپ ﷺ سفر میں قصر بھی فرماتے اور اتمام بھی افطار بھی کرتے اور روزہ بھی رکھتے۔" (رواه الدارقطني، البيهقي۔ وغيرهما، و قال الدارقطني، اسناده صحيح) قصر کی نماز ۴ھ میں مشروع ہوئی۔ (قاله ابن اثير، حاشيه الجمل)

مسافر کے نماز کی کیفیت: مسافر کی نماز مقیم کی طرح ہے۔ البتہ اسے قصر (یعنی چار رکعت والی فرض نماز میں چار کے بجائے دو رکعت ادا کرنا) اور جمع بین الصلاتین (دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا) جائز ہے۔ قصر بالاجماع جائز ہے۔ سفر طویل (۴۸

میل) اور مباح ہو تو قصر کرنا جائز ہے (اگر طویل نہ ہو یا طویل ہونے میں شک ہو تو قصر کی گنجائش نہیں۔(حاشیۃ الروضہ)

سفر : سفر قصر ہو تو اس میں معین منزل کا قصد ہونا ضروری ہے، لہٰذا ایسا حیران و پریشان آدمی جسے یہ معلوم نہیں کہ کہاں جا رہا ہے، قصر نہیں کر سکتا اگر چہ اس کا سفر لمبا ہو جائے۔

ابتداء سفر : ایسے شہر سے سفر کرے جس کے چاروں جانب خاص اُسی کیلئے دیوار بنائی گئی ہو (یعنی شہر پناہ ہو) تو سفر کی ابتداء کیلئے اسے پار کرنا ضروری ہے، خواہ اس دیوار کے اندرونی حصہ میں کھیتیاں یا ویران پڑی ہوئی جگہ ہو) اس لئے کہ دیوار کے اندر کا تمام حصہ شہر کے حد ہی میں شمار ہوگا۔ (لہٰذا صرف شہر کے مکانات پار کرنا کافی نہیں) بلکہ دیوار پار کرنے کے بعد قصر کر سکتا ہے۔ اگر اس دیوار کے بیرونی حصے میں ملے جلے مکانات یا قبرستان ہوں تو اسے پار کرنا ضروری نہیں۔ شہر کے چاروں جانب دیوار نہ ہو یا دیوار تو ہے لیکن جس جانب سے سفر کرتا ہے اس طرف نہیں ہے، تو سفر کی ابتداء آبادی کو مکمل چھوڑنے سے ہوگی، اور عمارتوں کے درمیان ویران حصہ کو شہر کی حد ہی میں شمار کیا جائے گا۔

اگر شہر کے اطراف میں ویران جگہ (یعنی مکانات ٹوٹ پھوٹ گئے ہوں) پڑی ہوئی ہو اور اس کے بعد آبادی بھی نہ ہو تو سفر کی ابتداء کیلئے اس ویران حصہ کو پار کرنا ضروری ہوگا جبکہ ان پرانے مکانات کی دیواریں ابھی باقی ہوں (یعنی اس کے نشانات بالکل مٹ نہ چکے ہوں۔) اور اس جگہ شہر کی کھیتی بھی نہ کی جاتی ہو۔ اور نہ آبادی کے چاروں جانب شہر پناہ بنا کر اتنے حصہ کو الگ کر دیا ہو، لیکن اگر اس کے برعکس صورت ہو (یعنی مکانوں کے نشانات بالکل مٹ چکے ہوں۔ اور اس جگہ کھیتی کی جاتی ہو۔ یا آبادی کا احاطہ کر کے اتنے حصہ کو الگ کر دیا ہو) تو ویران حصہ کو پار کرنا ضروری نہیں۔

شہر سے متصل باغات اور کھیتیاں ہوں تو انکو پار کرنا ضروری نہیں اگر کسی بستی یا گاؤں سے سفر کر رہا ہو تو (ابتداء سفر کیلئے) اس کا حکم مذکورہ تمام امور میں شہر کے مانند ہے۔ اگر بستی کے باہر کھیل کا میدان وغیرہ ہو تو اسے پار کرنا بھی ضروری ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۵۹)

اگر دو بستیاں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہوں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہ ہو خواہ دونوں کے نام الگ الگ ہوں تو وہ ایک گاؤں کے دو محلہ کے مانند ہیں۔ لہٰذا سفر کی ابتداء ان دونوں بستیوں کو پار کرنے سے ہوگی۔ اور اگر کوئی حد فاصل موجود ہو تو صرف اپنی بستی پار کرنا کافی ہے خواہ دونوں بستیاں بالکل قریب ہوں۔ اگر چند مختلف بستیوں کے چاروں جانب دیوار بنائی گئی ہو، تو ابتداء سفر کیلئے دیوار پار کرنا ضروری نہیں (بلکہ صرف اپنی بستی پار کرنا کافی ہے) اگر کوئی جنگل میں رہتا ہو، تو اس کے لئے اتنا جگہ کا پار کرنا ضروری ہے جتنی جگہ اس کی طرف منسوب ہو۔

خیمہ میں رہنے والوں کے سفر کی ابتداء تمام خیموں کو پار کرنے سے ہوگی، چاہے خیمے ایک ہی جگہ (یعنی بالکل قریب قریب) ہوں یا تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ہوں۔ اور خیموں کے ساتھ اس کے اطراف میں جو اونٹ وغیرہ کے پانی پینے کی جگہ اور کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ ہو اسے بھی پار کرنا ضروری ہے۔

کسی شہر کیلئے دو فصیل (دیوار) ہوں تو سفر کی ابتداء ان دونوں کو پار کرنے سے ہوگی اور اگر دیوار کے بجائے خندق ہو، تو خندق پار کرنا ضروری ہے۔ اور خندق و دیوار دونوں ہوں تو صرف دیوار پار کرنا کافی ہے (حاشیۃ البجیرمی ۲/ ۲۵۳) اگر مٹی وغیرہ کے بند کے ذریعے کسی بستی کا احاطہ کیا گیا ہو تو اس کا حکم دیوار ہی کے مانند ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۵۹۰) مسافر آبادی چھوڑنے کے بعد (اور مسافت قصر طے کرنے سے پہلے) کسی ضرورت سے (مثلاً کسی چیز کو بھول گیا تھا، اس کو لینے کیلئے شہر) واپس لوٹے تو اس کی چند صورتیں ہوگی۔

(۱) وہ شہر مسافر کا نہ وطن ہو اور نہ اس میں اقامت کرے، تو واپس لوٹنے اور شہر میں داخل ہونے سے مقیم نہ ہوگا۔
(۲) وہ شہر اس کا وطن اصلی ہو تو واپس لوٹتے ہوئے قصر وغیرہ نہیں کرسکتا، بلکہ جب دوبارہ اس شہر سے روانہ ہو تو قصر کرسکتا ہے۔
(۳) وہ شہر اس کا وطن، اصلی تو نہ ہو، لیکن وہاں کچھ مدت اقامت کرے تو واپس لوٹتے ہوئے قصر کرسکتا ہے۔ اور اگر مسافت قصر طے کر چکا ہو تو واپس لوٹتے ہوئے از سر نو مسافر شمار ہوگا اب ہر حالت میں قصر کرسکتا ہے۔

سفر کے رخصت کی انتہا

سفر ختم ہونے کی چند صورتیں ہیں۔ (۱) **وطن کی طرف لوٹنا** ۔ اور وطن کی طرف لوٹنے سے مراد ابتداء سفر میں جس جگہ کو پار کرنا ضروری قرار دیا تھا، وہاں پہنچنا ہے۔ اسی طرح وطن کے علاوہ کسی اور جگہ کا سفر ہو اور وہاں مطلقاً یا مکمل چار دن اقامت کی نیت کرے تو ایسی جگہ پہنچنے سے بھی سفر ختم ہوگا۔ لیکن اگر سرے سے نیت ہی نہیں کی یا چار دن سے کم کی نیت کی تو اس جگہ پہنچنے سے سفر ختم نہ ہوگا۔ (بلکہ جانے اور آنے کے دو دن چھوڑ کر مکمل چار دن ٹھہرنے سے سفر ختم ہوگا۔) (حاشیۃ البجیرمی ۱/ ۲۵۳)

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا مہاجر اپنے اعمال حج سے فارغ ہونے کے بعد تین دن مکہ میں رک سکتا ہے۔ (متفق علیہ)
(اور ایک مہاجر کو مکہ میں اقامت ممنوع تھی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تین دن تک کہیں رکنا شرعاً اقامت میں داخل نہیں ہے)
دوران سفر کسی ایسی بستی یا شہر میں اترے۔ جہاں اس کے اھل وعیال اور رشتہ دار ہوں تو اس بستی یا شہر میں داخل ہونے سے مقیم نہ ہوگا۔

حدیث: آپ ﷺ اور حضرات مہاجرین نے حج کے موقع سے مکہ میں قصر کیا۔ (متفق علیہ)
حالانکہ مکہ میں حضرات مہاجرین کے اہل وعیال اور خاندان والے موجود تھے۔ (تلخیص الحبیر) اگر دوران سفر کوئی اپنی بستی سے گذرے تو بستی میں داخل ہوتے ہی مقیم شمار ہوگا۔

(۲) **اقامت کی نیت کرنا:** اگر دوران سفر کسی بستی یا شہر میں مطلقاً اقامت کی نیت کرے تو مقیم ہو جائے گا (مطلقاً اقامت کی نیت سے مراد یہ کہ کسی مدت کی تعیین نہیں کی کہ کتنے دن رکنا ہے صرف وہاں رکنے کی نیت ہے) اور اگر اس کے آگے دوبارہ سفر شروع کرے تو قصر اس وقت کرسکتا ہے جبکہ وہاں سے دو مرحلہ (۴۸ میل) کا سفر کرے اسی طرح اگر کسی چٹیل میدان (ویران علاقہ) میں اقامت کی نیت کرے تب بھی مقیم ہو جائے گا۔ مگر مذکورہ صورت میں اس وقت مقیم ہوگا جبکہ وہاں رُک کر اقامت کی نیت کرلے۔ سفر میں چلتے چلتے اقامت کی نیت کی تو مقیم نہ ہوگا بلکہ مسافر ہی رہے گا۔ (المجموع ۴/ ۳۶۱)

(۳) **صورت اقامت بھی پائی جائے:** اگر کسی بستی یا شہر میں کسی ضرورت سے قیام کرے تو اس کی دو صورتیں ہونگی (۱) تھوڑی دیر میں کام پورا ہونے کی امید ہو اور کام سے فراغت کے بعد کوچ کرنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں چار دن قصر کی اجازت ہے (اور اگر چار دن سے زیادہ وقت لگے تو اٹھارہ دن قصر کی اجازت ہے)۔ (المجموع ۴/ ۳۶۲)

حدیث: آپ ﷺ نے فتح مکہ کے سال قبیلہ ہوازن سے لڑائی کے موقع پر مکہ میں چار دن سے زیادہ قیام کیا اور اس دوران قصر کرتے رہے۔ اور عمران بن حصین کی روایت میں ہے کہ اٹھارہ دن تک قیام کیا۔ (ابوداود، ترمذی وحسنہ، البیھقی، تلخیص)
(۲) اور اگر جانے اور آنے کے دو دن کے علاوہ تین دن میں کام پورا ہونے والا نہ ہو، جیسے علم حاصل کرنے کیلئے یا کسی بڑے

کاروبار کی غرض سے رکا ہے، تو قصر جائز نہیں۔

مسافت قصر: سفر کا طویل ہونا ضروری ہے، اور طوالت کی مقدار ۴۸ میل ہے۔ (کلومیٹر کے اعتبار سے الفقہ المنہجی میں تقریباً ۸۱ کلومیٹر کو مسافت قصر قرار دیا ہے) سمندری سفر میں بھی مسافت قصر کیلئے اسی ۴۸ میل کا اعتبار ہوگا۔ چاہے اس مسافت کو ایک سیکنڈ میں طے کرے۔ اگر مسافت قصر میں شک ہو تو غور وفکر کر کے حد متعین کی جا سکتی ہے۔ بحری سفر میں سخت ہوا چلنے کی وجہ سے کسی جگہ رکنا پڑے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے اپنے کسی کام کے آج کل میں پورا ہونے کی امید پر رکا ہو۔ لہٰذا ایسی صورت میں ۱۸ دن تک قصر کی اجازت ہے۔ (المجموع ۴/۳۶۴) مقدار مسافت میں صرف (یک طرفہ) جانے کی مسافت شمار ہوگی، واپس لوٹنے کی نہیں۔ ابتداء سفر ہی میں مسافت قصر کے طے کرنے کا پختہ ارادہ ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر کسی بھاگے ہوئے نوکر یا گم شدہ جانور یا مقروض کی تلاش میں نکلے اور معلوم نہ ہو کہ کہاں ملے گا تو قصر جائز نہیں، چاہے اس کی تلاش میں سفر طویل ہو جائے۔ لیکن اگر تلاش کرتے کرتے مل گیا پھر اپنے شہر واپس لوٹنے کا ارادہ کیا اور وہاں سے اپنے وطن تک مسافت قصر ہو، تو اس جگہ کو چھوڑنے سے قصر کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اور اگر سفر کی ابتداء سے پہلے ہی معلوم ہو کہ مسافت قصر سے پہلے نہیں ملے گا۔ تو قصر کر سکتا ہے اگر سفر شروع کرنے سے پہلے مسافت قصر کا ارادہ ہو مگر آبادی پار کرنے سے پہلے یہ نیت کر لی کہ مقروض یا نوکر مل جائیگا تو واپس لوٹونگا تو ایسی حالت میں قصر نہیں کر سکتا اور اگر آبادی پار کرنے کے بعد نیت کی ہے تو ملنے تک قصر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد مقیم ہو جائے گا۔ کسی نے مسافت قصر تک جانے کے ارادہ سے سفر شروع کیا، مگر دوران سفر کسی شہر میں چار دن اقامت کی نیت کی تو ایسی صورت میں ابتداء سفر سے اس شہر میں داخل ہونے تک قصر کر سکتا ہے۔ چاہے اس شہر تک مسافت قصر ہو یا نہ ہو، لیکن اگر اس شہر میں چار دن سے کم اقامت کی نیت کی ہے تو دوران سفر اور شہر میں داخل ہونے کے بعد بھی قصر کر سکتا ہے۔

اگر بیوی شوہر کے ساتھ سفر کر رہی ہو، اور اُسے منزل مقصود کا پتہ نہیں، کہاں تک جانا ہے، تو مسافت قصر طے کرنے سے پہلے بیوی قصر نہیں کر سکتی، چاہے بیوی نے مسافت قصر کی نیت کی ہو (البتہ مسافت قصر طے کرنے کے بعد قصر کر سکتی ہے۔ حاشیۃ الروضہ)

اور اگر منزل کا پتہ ہو اور مسافت قصر کی نیت کی ہو تو بیوی بھی شروع سے قصر کر سکتی ہے، اگر کافر (یا پولیس) کسی مسلمان کو قید کر کے لے جائے اور اسے معلوم نہیں کہ کہاں لے جا رہا ہے تو وہ قصر نہیں کر سکتا۔ چاہے ان کے ساتھ مسافت قصر تک چلتا رہے۔ البتہ مسافت قصر طے کرنے کے بعد قصر کر سکتا ہے۔ جس شہر کی طرف لے جا رہا ہے اس کا علم ہو۔ لیکن دوران سفر موقع ملنے پر قیدی کے فرار کا ارادہ ہو، تو مسافت قصر کرنے سے پہلے قصر جائز نہیں۔ اور اگر بھاگنے وغیرہ کا ارادہ نہ ہو۔ اور سفر مسافت قصر تک ہو تو ابتداء سفر ہی سے قصر کر سکتا ہے۔

کسی منزل تک جانے کیلئے دو راستے ہوں۔ ایک مسافت قصر کے بقدر اور دوسرا قصیر (یعنی مسافت قصر سے کم) لہٰذا اگر طویل راستے سے کسی دینی یا دنیاوی غرض سے سفر کر رہا ہو مثلاً راستہ پر امن ہے یا کوئی اور سہولت حاصل ہے تو ایسی صورت میں قصر کر سکتا ہے۔

اور اگر محض قصر وغیرہ رخصتوں کا حاصل کرنا مقصود ہے تو قصر نہیں کر سکتا۔ کوئی طویل سفر کے ارادہ سے نکل جائے مگر دوران سفر واپس لوٹنے کا ارادہ کرے تو اسی وقت سفر ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا جب تک اس مقام پر رکا رہے گا۔ قصر نہیں کر سکتا، بلکہ جب اس مقام کو چھوڑ دے تو وہاں سے نیا سفر شمار ہوگا۔ اب یہ سفر مسافت قصر کے بقدر ہو تو قصر کر سکتا ہے، چاہے اپنے شہر لوٹے یا پہلی منزل کی طرف جائے یا کسی تیسری جگہ کا سفر کرے۔

ایسے شہر کی جانب سفر شروع کرے (جہاں تک مسافت قصر نہ ہونے کی وجہ سے) قصر جائز نہ ہو، لیکن پھر ارادہ بدل کر اس سے اتنا آگے سفر کا ارادہ کرے (کہ وہاں تک مسافت قصر ہونے کی وجہ سے قصر کر سکتا ہے تو جس جگہ سے نیت میں تبدیلی کی، وہیں سے سفر کی ابتدا

ہوگی۔ اگر اس جگہ سے آگے کی منزل تک مسافت قصر ہو، تو قصر کرسکتا ہے (ورنہ نہیں) اگر کوئی طویل سفر کیلئے اس ارادہ سے نکلا کہ ہر مرحلہ پر (یعنی مسافت قصر سے کم پر) چار دن قیام کرے گا تو وہ اس لمبے سفر میں ابتداء ہی سے قصر نہیں کرسکتا۔

قصر کے جواز کیلئے مباح سفر کا ہونا ضروری ہے: مباح سفر سے مراد یہ کہ وہ سفر معصیت (گناہ کے کام) کیلئے نہ ہو، چاہے وہ نیک کام کیلئے ہو یا تجارت کیلئے ہو معصیت کے سفر میں قصر جائز نہیں معصیت کا سفر جیسے بیوی کا شوہر کو چھوڑ کر بھاگ جانا۔ مقروض کا قرض کی ادائیگی پر قدرت ہونے کے باوجود بھاگ جانا۔ ڈاکہ زنی کیلئے سفر کرنا وغیرہ۔

کوئی سفر تو مباح کام کیلئے کرے، لیکن دوران سفر معاصی کا بھی ارتکاب کرے جیسے شراب وغیرہ پیئے تو ایسے شخص کیلئے قصر جائز ہے۔

سفر کی ابتداء تو مباح کام کے ارادہ سے ہو۔ پھر (دوران سفر) اسے معصیت کا بنا دیا (یعنی گناہ کے ارادہ سے سفر کرے) تو جہاں سے معصیت کا ارادہ کیا وہاں سے قصر نہیں کرسکتا، سفر کی ابتداء تو معصیت کے ارادہ سے ہو، مگر پھر معصیت کا ارادہ بدل کر توبہ کر کے پہلی منزل کی طرف ہی سفر جاری رکھا۔ تو سفر کی ابتداء وہاں سے ہوگی جہاں سے توبہ کی۔ اگر محل توبہ سے منزل مقصود تک مسافت قصر ہو، قصر کرسکتا ہے ورنہ نہیں۔

سفر معصیت میں رخصتیں: معصیت کیلئے سفر کرنیوالے کو نہ قصر کی اجازت ہے نہ روزہ چھوڑنے کی، نہ سواری پر نفل پڑھنے کی، اور نہ جمع بین الصلاتین، کی اور نہ تین دن تک موزے پر مسح کرنے کی، بلکہ (مقیم کی طرح) ایک دن ورات مسح کرے۔ اور نہ اسے بھوک سے بے تابی کی حالت میں مردار کھانے کی اجازت ہے، نیز ایسے مسافر سے جمعہ بھی ساقط نہ ہوگی۔

کن نمازوں میں قصر جائز ہے: سفر میں ادا کی جانے والی ہر ایسی چار رکعات والی فرض نماز میں جس کی ادائیگی کا وقت سفر میں ہی ہوا ہو قصر جائز ہے۔ مغرب اور صبح کی نماز میں قصر بالاجماع جائز نہیں۔

قضاء نماز: حالت اقامت کی فوت شدہ نماز سفر میں قضاء کرے، یا شک ہو کہ حالت سفر میں فوت ہوئی یا حالت اقامت میں یا ایسے سفر کی فوت شدہ نماز جس میں قصر جائز نہیں قضاء کرے، چاہے دوسرے سفر میں قضاء کرے یا سفر قصر کی فوت شدہ نماز حضر میں، یا ایسے سفر میں جس میں قصر جائز نہیں۔ قضاء کرے تو ان تمام صورتوں میں قصر جائز نہیں۔ ہاں اگر سفر قصر کی فوت شدہ نماز اُسی سفر میں یا دوسرے سفر قصر میں قضاء کرے تو قصر جائز ہے۔ لیکن اگر حالت حضر میں یا ایسے سفر میں جس میں قصر جائز نہیں قضاء کرے تو قصر نہ کرے بلکہ اتمام کرے۔ (فتح الوھاب) (خلاصہ یہ کہ سفر قصر کی قضاء سفر قصر میں قصر کرنا جائز اور بقیہ تمام صورتوں میں اتمام یعنی مکمل نماز قضاء کرنا لازم ہے)

کوئی شخص اتنا وقت گذرنے کے بعد جس میں نماز کا ادا کرنا ممکن ہو، سفر شروع کرے تو اس نماز میں قصر جائز ہے۔ اسی طرح کسی عورت کو اتنا ہی وقت گذرنے کے بعد حیض شروع ہو جائے، تو اس پر اس نماز کی قضاء کو لازم ہوگی۔

صرف چار رکعات کی ادائیگی کے بقدر وقت باقی رہنے کی صورت میں سفر شروع کرے تو اس نماز میں قصر جائز ہے۔ (بلکہ اگر سفر شروع کرتے وقت صرف ایک رکعت کے بقدر وقت ہو تب بھی قصر جائز ہے۔ مغنی ۱/ ۲۶۳۔ حاشیۃ البجیرمی۔ ۲/ ۱۴۷)

اگر اتنا وقت گذرنے سے پہلے جس میں اس نماز کا ادا کرنا ممکن ہو، سفر کرے تو ایسی نماز میں بھی قصر جائز ہے۔

فصل ۔ قصر کے شرائط

قصر کے چار شرائط ہیں۔ (۱) کسی مقیم کی اقتداء نہ کرے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ مسافر کو تنہا نماز پڑھنے کی صورت میں دو رکعت اور کسی مقیم کی اقتداء

کرنے کی صورت میں چار رکعات پڑھنے کا حکم کیوں؟ تو آپؐ نے فرمایا! کہ یہ سنت ہے۔(مسند احمد۔تلخیص)

اگر کسی مقیم کی اقتداء کی، چاہے ایک لحظہ کیلئے، تو اس پر اتمام (پوری چار رکعات) ادا کرنا لازم ہے۔

لحظہ بھر اقتداء کی چند صورتیں ہیں (۱) امام کو سلام سے پہلے پالے۔ (۲) امام کو مسافر مقتدی کے تکبیر تحریمہ کے بعد حدث لاحق ہو (۳) اقتداء کے بعد امام سے جدا ہونے کی نیت کرے۔ (المجموع ۴۵۶۴ ۳) فجر کی قضاء نماز پڑھنے والے کی اقتداء میں کوئی ظہر ادا کرے تو قصر جائز نہیں، خواہ صبح کی نماز پڑھنے والا مسافر ہو یا مقیم۔

عصر کی نماز قصر کرنے والے کی اقتداء میں نماز ظہر قصر کی نیت سے ادا کرے تو قصر جائز ہے۔ جمعہ ادا کرنے والے کی اقتداء میں ظہر ادا کرے تو قصر جائز نہیں، چاہے جمعہ کا امام مسافر ہو یا مقیم اگر مسافر کو امام کے مقیم ہونے کا یقین یا غالب گمان ہو، تو ایسے امام کی اقتداء میں مسافر کو مکمل نماز ادا کرنا لازم ہے لیکن مسافر نے ایسے امام کی اقتداء میں قصر کی نیت کی تو اس کی نماز تو منعقد ہوگی، البتہ قصر کی نیت باطل ہوگی۔ (یعنی نماز مکمل ادا کرنی ہوگی۔) اور اگر امام کے مسافر ہونے کا یا امام کے قصر کی نیت کرنے کا۔ یقین یا گمان ہو تو اس کی اقتداء میں قصر جائز ہے۔ مسافر امام کی نیت کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ اس نے قصر کی نیت کی ہے یا نہیں، تب بھی اس کی اقتداء میں قصر جائز ہے، خواہ یہ شک دوران نماز پیش آئے۔ امام کی نیت سے ناواقف ہو اور مقتدی اپنی نیت کو امام کی نیت پر معلق رکھتے ہوئے کہے کہ امام نے قصر کیا تو میں بھی قصر کروں گا اور اتمام کیا تو میں بھی اتمام کرونگا تو یہ معلق کرنا صحیح ہے۔ لہٰذا امام اتمام کرے تو مقتدی بھی اتمام کرے اور قصر کرے تو مقتدی بھی قصر کرے، لیکن اگر ایسی صورت میں امام کی نماز فاسد ہو جائے یا خود فاسد کردے اور کہے کہ میں نے قصر یا اتمام کی نیت کی تھی تو مقتدی کو بھی امام کی نیت کے مطابق نماز پوری کرنی ہوگی، اور اگر امام بتلائے بغیر چلا جائے اور مقتدی کو امام کی نیت کا علم نہ ہو سکے تو اتمام ضروری ہے۔ امام کے مسافر یا مقیم ہونے میں شک ہو تو مقتدی کو اتمام لازم ہے۔ اگر مسافر کسی مقیم کی یا ایسے مسافر کی جو اتمام کر رہا ہو اقتداء کرے پھر خود مقتدی کی یا امام کی نماز فاسد ہو جائے، یا امام کا محدث ہونا معلوم ہو جائے اور نئے سرے سے نماز شروع کرے تو مقتدی پر اتمام لازم ہے۔

ایسے امام کی اقتداء کرے جس کے مسافر ہونے کا صرف غالب گمان ہو، لیکن پھر امام کا مقیم ہونا معلوم ہو گیا یا مقیم اور محدث دونوں ہونا معلوم ہوا، البتہ پہلے مقیم ہونا معلوم ہوا تو مقتدی پر اتمام لازم ہے۔ اور اگر پہلے محدث ہونا معلوم ہوا یا دونوں کا بہ یک وقت علم ہو گیا تو مقتدی کیلئے قصر جائز ہے۔

کوئی حالت اقامت میں نماز شروع کرے، بعد میں نمازی کو اپنے محدث (بے وضو) ہونے کا علم ہو گیا اور نماز کے وقت میں سفر شروع کیا تو اس نماز میں قصر جائز ہے بخلاف اس کے اگر حالت اقامت میں ہی نماز شروع کی اور کسی سبب سے نماز فاسد ہو جائے (پھر سفر شروع کرے) تو اس نماز میں اتمام لازم ہے۔

مسافر کسی مقیم کی اقتداء کرے پھر نماز کے بعد مقتدی کو اپنا بے وضو ہونا معلوم ہو گیا، تو مقتدی کیلئے اس نماز میں قصر جائز ہے۔ اسی طرح ایسے امام کی اقتداء کرے جس کے محدث ہونے کا یقین اور مقیم ہونے کا صرف گمان ہے تو مقتدی کیلئے قصر جائز ہے۔

دوران نماز امام کا کسی کو نائب بنانا: امام کی نماز حدث وغیرہ سے فاسد ہو جائے، تو بقیہ نماز پڑھانے کیلئے مقتدیوں میں سے کسی کو اپنا نائب بنانا جائز ہے۔ اگر کوئی ایسا مسافر امام جو مقیم اور مسافر حضرات کو نماز پڑھا رہا ہو، نماز فاسد ہونے کی وجہ سے کسی مقیم کو اپنا نائب بنائے، تو مسافر مقتدیوں کیلئے قصر جائز نہیں۔ بلکہ اگر وہ مسافر امام بھی واپس آ کر اس نائب کی اقتداء کرے تو اس

کے لئے بھی قصر جائز نہیں۔اور اقتداء نہ کرے تو قصر جائز ہے۔امام کے نائب کے اقتداء کی نیت واجب نہیں اگر امام یا مقتدی حضرات کسی کو نائب نہ بنائیں تو تنہا اپنی نماز پوری کریں۔اس صورت میں مسافر حضرات کیلئے قصر جائز ہے۔اور اگر امام یا مقتدی لوگ کسی مسافر کو نائب بنائیں تو مسافر حضرات قصر کریں(اور مقیم حضرات مسافر امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ نماز پوری کریں)

اگر مسافر لوگ کسی مسافر کو، اور مقیم حضرات کسی مقیم کو نائب بنائیں تو یہ بھی جائز ہے اور مسافر اپنے امام کی اقتداء میں قصر کریں۔

(۲) تکبیر تحریمہ کے وقت قصر کی نیت کرنا۔ نماز پوری ہونے تک قصر کی نیت یاد رکھنا ضروری نہیں، لیکن اس کے منافی (مخالف) چیزوں سے بچنا ضروری ہے۔لہٰذا اگر پہلے قصر کی نیت کی، بعد میں اتمام کی یا قصر واتمام کے درمیان تردد ہو (کہ قصر کر رہا ہے یا اتمام) یا شک ہو کہ قصر کی نیت کی یا نہیں، تو ان صورتوں میں اتمام لازم ہے۔

کسی مسافر نے ایسے مسافر امام کی اقتداء کی جس نے قصر کی نیت کی ہے مگر امام دو رکعت کے بعد (سلام پھیرنے کے بجائے) تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا، تو ایسی صورت میں امام نے اتمام کی نیت کی ہے تو مقتدی پر بھی اتمام ضروری ہے۔اور اگر امام بھولے سے کھڑا ہوا ہو مثلاً امام حنفی ہو (جو سفر کی نماز میں اتمام کا قائل نہیں) تو مقتدی پر اتمام ضروری نہیں، بلکہ اختیار ہے چاہے تو اس کی اقتداء سے الگ ہو اور سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔یا امام کے واپس لوٹنے تک انتظار کرتا رہے اور اس کے ساتھ سلام پھیرے۔ اور اگر مقتدی اتمام کرنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے۔لیکن امام کی سہو (بھول) کی حالت میں اقتداء کرنا جائز نہیں، کیونکہ امام سہو کی حالت میں جو فعل ادا کرتا ہے وہ شمار نہیں ہوتا۔اسی طرح امام کی اقتداء اس فعل کی ادائیگی میں بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ فعل شمار نہ ہوگا جیسے کسی مسبوق کو امام کے ساتھ ایک رکعت مل گئی ہو اور امام سہواً زائد رکعت ادا کرنے کیلئے کھڑا ہو گیا، تو مسبوق کیلئے اپنی بقیہ نماز کو پورا کرتے وقت امام کی اس زائد رکعت میں اقتداء کرنا صحیح نہیں۔اگر شک ہو کہ امام بھولے سے یا اتمام کی نیت سے تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو مقتدی پر اتمام لازم ہے۔

کوئی منفرد قصر کی نیت سے نماز پڑھ رہا ہو، اور دو رکعت پڑھ کر تیسری رکعت کیلئے کسی ایسے سبب کی وجہ سے کھڑا ہو گیا جس سے اتمام واجب ہو جائے جیسے مسافر نے اتمام یا اقامت کی نیت کی، یا سواری اقامت کی جگہ پہنچنے کے بعد تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو اس کا کھڑا ہونا صحیح ہے اور اتمام لازم ہے۔اور اگر مذکورہ امور میں سے کوئی بھی امر پیش نہ آیا ہو، اور عمداً تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو نماز باطل ہو گی۔اور اگر سہواً کھڑا ہو گیا تو یاد آنے کے بعد واپس لوٹنا لازم ہے پھر سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔لیکن یاد آنے کے بعد اتمام کا ارادہ ہو جائے تو پہلے بیٹھنا لازم ہے پھر اتمام کیلئے واپس اٹھے۔کوئی مسافر تیسری اور چوتھی رکعت سہواً ادا کرے، اور تشہد میں بیٹھنے کے بعد یاد آ جائے تو سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔اور یہ نماز قصر ہی شمار ہوگی اور سہواً جو زائد رکعات ادا کی، وہ شمار نہ ہوگی۔اور اگر ان دو زائد رکعتوں کے ادا کرنے کے بعد، اور سلام سے پہلے اتمام کی نیت کی تو اب مزید دو رکعت پڑھنا ضروری ہے، اور آخر میں سجدہ سہو کرے (اور درمیان میں جو سہواً دو رکعت پڑھی گئی وہ شمار نہ ہوگی۔)

(۳) نماز کی ابتداء سے سلام پھیرنے تک مسافر ہو۔ لہٰذا اگر مسافر نے درمیان نماز اقامت کی نیت کی یا جہاز میں نماز پڑھ رہا تھا اور درمیان نماز جہاز اقامت کی جگہ پہنچ جائے یا وطن میں جہاز میں نماز شروع کرے اور سلام سے قبل سفر شروع ہو جائے یا شک ہو کہ اس نے اقامت کی نیت کی یا نہیں، یا کسی شہر میں داخل ہونے کے بعد یہ شک ہو جائے کہ یہی اس کی منزل مقصود ہے یا نہیں، تو ان تمام صورتوں میں مکمل چار رکعات ادا کرنا ضروری ہے۔

(۴) **قصر کے جواز کا علم ہو** لہٰذا اگر قصر کے جواز سے ناواقف ہوتے ہوئے نماز میں قصر کرے تو قصر کرنا صحیح نہیں۔

جمع بین الصلاتین کا بیان

(دونمازوں کوایک وقت ادا کرنا) ۹ھ غزوہ تبوک کے موقع پر آپ ﷺ نے دونمازوں کوایک ساتھ ادا فرمایا۔

احادیث: (۱) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے" آپ ﷺ کوسفر میں جلدی ہوتی تو مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرتے (متفق علیه)

(۲) حضرت انسؓ کی روایت ہے" آپ ﷺ زوال شمس سے پہلے کوچ کرتے تو ظہر کوعصر تک مؤخر کرتے پھر (عصر کے وقت سواری سے) اتر کر ظہر اور عصر کے درمیان جمع فرماتے اور زوال شمس کے بعد کوچ کرتے تو پہلے ظہر پڑھتے پھر سوار ہوتے۔ (متفق علیه)

(۳) حضرت انسؓ سے مروی ہے آپ ﷺ جب سفر میں جمع بین الصلاتیں کا ارادہ کرتے تو ظہر کو عصر کا اول وقت شروع ہونے تک مؤخر کرتے، پھر دونوں کو جمع فرماتے۔ (رواہ مسلم)

(۴) حضرت معاذؓ سے مروی ہے" آپ ﷺ غزوہ تبوک کے موقع پر زوال شمس کے بعد سفر فرماتے تو ظہر اور عصر کے درمیان جمع فرماتے (یعنی جمع تقدیم) اور زوال شمس سے پہلے سفر فرماتے تو ظہر کوعصر تک موخر کرتے (یعنی جمع تاخیر کرتے) اور مغرب میں بھی اسی طرح کرتے۔ کہ غروب شمس کے بعد سفر کرتے تو مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرتے (جمع تقدیم) اور اور غروب شمس سے پہلے سفر کرتے تو مغرب کو عشاء تک موخر کرتے پھر عشاء کے وقت اتر کر دونوں میں جمع کرتے (جمع تاخیر) (رواہ ابوداؤد۔ والترمذی۔ وقال حدیث، وقال البیہقی، ھو محفوظ صحیح)۔ (المجموع ۴/۳۷۲)

جمع کا حکم اور اس کی قسمیں: جس سفر میں قصر جائز ہے، اس سفر میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرنا بھی جائز ہے۔

جمع کی دو قسمیں ہیں: (۱) جمع تقدیم (تقدیم سے مراد ظہر وعصر کوظہر کے وقت یا مغرب وعشاء کومغرب کے وقت پڑھنا) (۲) جمع تاخیر (تاخیر سے مراد ظہر وعصر کوعصر کے وقت یا مغرب وعشاء کوعشاء کے وقت پڑھنا) جمعہ میں صرف جمع تقدیم جائز ہے جمع تاخیر جائز نہیں۔ (جمل ۱/۶۰۸) جس سفر میں قصر جائز نہیں اس میں جمع بین الصلاتین بھی جائز نہیں۔ پہلی نماز (مثلاً ظہر یا مغرب) کے وقت سفر جاری ہو تو جمع تاخیر اور اول وقت میں کہیں رکا ہو، تو جمع تقدیم افضل ہے۔ کیونکہ اوپر حدیث میں یہی تفصیل گذری گناہ کے سفر میں جمع کرنا جائز نہیں، فجر کو کسی دوسری نماز کے ساتھ اور عصر کومغرب کے ساتھ جمع کرنا جائز نہیں۔

جمع کی صورت میں جونماز پڑھی جائے، وہ ادا ہی شمار ہوگی، قضاء نہ ہوگی۔ (المجموع ۴/۳۷۸) مسافر حجاج کرام مقام عرفہ میں ظہر اور عصر کے درمیان جمع تقدیم کریں اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء کے درمیان جمع تاخیر کریں۔

جمع تقدیم کے شرائط

جمع تقدیم کے تین شرائط ہیں (۱) دونوں نمازوں کے درمیان ترتیب ہو۔ لہٰذا پہلے اس وقت کی نماز ادا کرے (مثلاً ظہر ہے تو ظہر یا مغرب ہے تو مغرب پڑھے) اس کے بعد دوسری نماز پڑھے، کسی نے دوسری نماز پہلے ادا کی، تو یہ جمع صحیح نہیں۔ اور پہلی نماز کے بعد اس کا اعادہ واجب ہے اگر پہلے اس وقت کی نماز ادا کی، پھر دوسری نماز لیکن بعد میں پہلی نماز کا فاسد ہونا معلوم ہوا تو دوسری نماز بھی فاسد شمار ہوگی۔

(۲) جمع تقدیم کی نیت کرنا: اور نیت پہلی نماز کی تکبیر تحریمہ سے سلام پھیرنے تک کسی بھی وقت کافی ہے، سلام پھیرنے کے بعد کرے تو کافی نہیں (اب دوسری نماز کو اپنے وقت میں ادا کرے)

(۳) دونوں نمازوں کو پے در پے (متصلاً اور تسلسل کے ساتھ) ادا کرنا۔ دونوں نمازوں کے درمیان طویل فاصلہ ہو جائے، تو جمع نہیں کر سکتا، چاہے طویل فاصلہ عذر کی وجہ سے ہو، مثلاً سہو لاحق ہو یا بیہوشی طاری ہو یا بغیر عذر کے ہو۔ ہاں اگر معمولی فاصلہ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ فاصلہ کا کم زیادہ ہونے کا دارومدار عرف عام پر ہوگا۔

حدیث: آپ ﷺ نے جب مقام نمرۃ میں جمع تقدیم کی، تو دونوں نمازوں کو پے در پے ادا کیا اور دونوں کے درمیان کی سنتیں ترک فرمائیں البتہ دونوں کے درمیان اقامت کہی۔ (صحیحین، حاشیہ الروضہ)

دونوں نماز سے فراغت کے بعد پہلی نماز کے کسی رکن کا چھوٹ جانا یاد آ گیا اور نماز سے فراغت کے بعد طویل فاصلہ نہ ہوا ہو، تو اس رکن کی تلافی کر کے نماز مکمل کر لے، اور دونوں نمازیں صحیح ہونگی۔ اور اگر فاصلہ طویل ہو جائے تو دوسری نماز باطل ہوگی، اب جمع جائز نہیں، بلکہ دوسری نماز اپنے وقت میں ادا کرے۔ اور اگر معلوم نہ ہو کہ رکن پہلی نماز سے چھوٹا ہے یا دوسری نماز سے تو دونوں کا اعادہ ضروری ہے اور جمع کرنا جائز نہیں۔ (۴) دوسری نماز کے تکبیر تحریمہ تک سفر باقی رہے۔

جو عصر کی نماز بطور جمع تقدیم ادا کرے، اس پر اب نفل مطلق حرام ہے، گرچہ عصر کا اول وقت شروع نہ ہوا ہو۔ جو عشاء کو جمع تقدیم سے پڑھے، وہ عشاء کا اصل وقت شروع ہونے سے قبل تراویح اور وتر پڑھ سکتا ہے البتہ ابھی سے سَمَر (گفتگو) کو مکروہ نہیں قرار دیا جائے گا۔ قلائد الخرائد ۱/۱۵۷)

جمع تاخیر کے شرائط: جمع تاخیر کے دو شرط ہیں۔ (۱) پہلی نماز کے وقت جمع تاخیر کی نیت کرے اور نیت کے وقت پہلی نماز کا کم از کم اتنا وقت باقی ہو، جس میں وہ نماز مکمل، یا (قصر پڑھنا ہو تو) بطور قصر ادا کی جا سکے۔ اس سے کم وقت ہو (اور جمع کی نیت کر بھی لے) تو وہ نماز قضاء شمار ہوگی اور گنہگار ہوگا۔ امام رملی۔ خطیب ابن قاسم اور شبراملسی وغیرہ متاخرین نے اسی کو ترجیح دی ہے اور بقول صاحب جمل یہی معتمد ہے۔ شیخ زکریا انصاری اور ابن حجر مکی نے فرمایا کہ نیت کے وقت صرف ایک رکعت کا وقت باقی ہو، تب بھی جمع صحیح ہے۔ اور ادا شمار ہوگی، گرچہ اتنی تاخیر کا گناہ ہوگا۔ اور ایک رکعت کا وقت بھی نہ ہو تو سبھی کے نزدیک قضاء شمار ہوگی۔ (جمل ۱/۶۱۳، تحفہ مع الحواشی ۳/۲۶۶، مغنی ۱/۲۷۳)

(۲) دونوں نمازوں کے مکمل ہونے تک سفر باقی رہے۔ جمع تاخیر میں ترتیب، نمازوں کو پے در پے پڑھنا اور نماز کا حالت میں جمع کی نیت کرنا مستحب ہے۔ (المجموع ۔ ۴/ ۳۷۶) نیت کی وجہ سے مقیم ہو جائے یا سواری اقامت کی جگہ پہنچنے سے تو جمع تقدیم نہیں کر سکتا۔ اور دوسری نماز کو اس کے وقت میں پڑھے۔ اور پہلی نماز صحیح شمار ہوگی اگر دوسری نماز کے دوران یا فراغت کے بعد مقیم ہو جائے تو جمع باطل نہ ہوگی۔ جمع تاخیر کی صورت میں دونوں نماز سے فراغت کے بعد مقیم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن فراغت سے پہلے مقیم ہو جائے تو پہلی نماز قضاء شمار ہوگی۔ (گرچہ اس میں گناہ نہ ہوگا۔) (اعانہ ۲/ ۱۰۴)

فصل ۔ بارش کی وجہ سے جمع

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حضرات ابن عمرؓ ابن عباسؓ سے بارش کی وجہ سے جمع مروی ہے۔ (مغنی ۱/ ۲۷۴) بارش، اولہ باری،

برف باری یا پر نم سرد، ہواؤں کی وجہ سے کپڑے تر ہوں تو ایک مقیم کیلئے بھی جمع تقدیم جائز ہے۔اور یہ رخصت ایسے مقیم کے لئے ہے، جو دور سے مسجد میں آ کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہو، اور آتے وقت راستہ میں بارش وغیرہ سے تکلیف ہوتی ہو لہٰذا اگر کوئی گھر میں اکیلا یا باجماعت نماز ادا کر رہا ہو یا مسجد کی طرف سائبان میں چل کر آئے، یا مسجد گھر سے بالکل قریب ہو یا عورتیں اپنے گھروں میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کر رہی ہوں، یا تمام لوگ مسجد میں آ کر تنہا نماز ادا کریں، تو جمع کرنا جائز نہیں، اور اس جمع کیلئے وہی شرائط ہیں جو سفر کی صورت میں جمع تقدیم کیلئے ہیں، البتہ مزید شرط یہ ہے کہ دونوں نمازوں کے تکبیر تحریمہ کے وقت اور پہلی نماز سے فارغ ہونے کے وقت بارش پائی جائے۔اگر پہلی یا دوسری نماز کے دوران یا دونوں کے بعد بارش رُک جائے تو کوئی حرج نہیں۔بارش کی وجہ سے جمعہ اور عصر میں جمع تقدیم جائز ہے اور جمع کی صورت مذکورہ تینوں حالتوں (دونوں نماز کے ابتداء کے وقت اور جمعہ سے فراغت کے وقت) میں بارش کا پایا جانا ضروری ہے۔دونوں خطبوں کے وقت بارش کا ہونا ضروری نہیں۔خوف اور راستے میں کیچڑ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین جائز نہیں۔

جمع کی صورت میں سنت پڑھنے کا بیان

ظہر اور عصر جمع کرنے کی صورت میں پہلے ظہر کی اگلی سنت ادا کرے، پھر دونوں فرض پھر ظہر کے بعد کی سنت، اس کے بعد عصر کی سنت ادا کرے عصر کی سنت کو پہلے بھی ادا کر سکتا ہے اور تمام سنتوں کو دونوں فرض کے بعد بھی ادا کر سکتا ہے۔(قلائد) مغرب وعشاء جمع کرے تو پہلے دونوں فرض ادا کرے پھر مغرب کی بعد والی سنت پھر عشاء کی سنت پھر وتر۔

طویل سفر (جو ۴۸ میل کے بقدر ہو) میں چار رخصتین ہیں (۱) نماز میں قصر (۲) روزہ کا افطار (۳) تین دن اور تین رات موزے پر مسح کرنا (۴) جمع بین الصلاتین اور قصیر سفر میں بھی چار رخصتین ہیں (۱) جمعہ کا ترک کرنا (۲) حالت اضطراری میں مردار کھانا (۳) سواری پر نفل پڑھنا (۴) تیمم

قصر اتمام سے افضل ہے۔

احادیث: (۱) حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں "میں نے آپ ﷺ کے ساتھ حج کیا تو آپ دو رکعت نماز پڑھتے تھے الخ۔(رواہ الترمذی)

(۲) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے اچھے بندے وہ ہیں جو حالت سفر میں قصر کریں۔(فتح العزیز)

(۳) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو رخصتوں پر عمل کرنا پسند ہے، جیسا کہ گناہوں کا ارتکاب ناپسند ہے البتہ یہ چند حالتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔(ابن خزیمہ، وابن حبان، فی صحیحہا)

(۱) جب سفر تین مرحلے سے کم ہو تو اتمام افضل ہے (تاکہ امام ابوحنیفہؒ کے اختلاف سے بچے، کیونکہ اس مسافت پر ان کے نزدیک قصر واجب ہے لیکن علامہ کردی کی تحقیق کے مطابق ان کے تین مرحلوں کی مسافت ہمارے دو مرحلوں کے مساوی ہے۔لہٰذا مطلقاً قصر افضل ہوگا۔(بغیہ ص ۷۶ بشری الکریم ۱/ ۱۳۶)

اگر کوئی قصر کو ناپسند سمجھے تو اس کے لئے قصر افضل ہے بلکہ کراہت زائل ہونے تک اتمام مکروہ ہے یہی حکم دیگر رخصتوں کا بھی ہے۔

(۲) مَلّاح اپنے اہل وعیال کے ساتھ کسی کشتی میں سفر کر رہا ہو، تو اس کے لئے اتمام افضل ہے۔

(۳) کسی آدمی کی ہمیشہ سفر کی عادت ہو، اور اس کا کوئی وطن نہ ہو، تو اس کے لئے بھی اتمام افضل ہے (گرچہ وہ قصر کر سکتا ہے)

سفر میں روزہ کی طاقت ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ ائمہ کرام کے اختلاف سے بچتے ہوئے جمع بین الصلاتین نہ کرنا افضل ہے۔ البتہ ان صورتوں میں جمع افضل ہے۔ حاجی کیلئے عرفہ اور مزدلفہ میں، جمع کے جواز میں شک کرنے والا، رخصت سے اعراض کرنے والا، جمع کی صورت میں جماعت ملتی ہو، یا دائمی حدث کے بغیر نماز ادا ہوتی ہو یا ستر عورت کے ساتھ ادا ہوتی ہو۔(مغنی المحتاج ۱/ ۲۷۲) اگر کافر یا نابالغ بچہ مسافت قصر تک سفر کیلئے نکلے، پھر دوران سفر ہی کافر مسلمان ہو جائے اور بچہ بالغ ہو جائے، تو دونوں بقیہ سفر میں قصر کر سکتے ہیں۔ خوف کی وجہ سے اپنی بستی میں قصر جائز نہیں، اور نہ حالت خوف میں ایک رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے۔

مرض کی وجہ سے جمع: کئی علماء نے مرض کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اپنی حد تک اس پر عمل کر سکتا ہے۔ بیماری کے اعتبار سے تقدیم یا تاخیر جس میں سہولت ہو، اس پر عمل کرے، مثلاً دوسری نماز کے وقت بیماری کا زور بڑھتا ہو تو جمع تقدیم کے شرائط کے ساتھ تقدیم پر عمل کرے، برعکس صورت میں جمع تاخیر کی نیت کے ساتھ تاخیر کرے۔ جمع تقدیم کی صورت میں بارش کی طرح دونوں نماز کی تکبیر تحریمہ، پہلی نماز کے سلام کے وقت اور دونوں کے درمیان بیماری کا پایا جانا شرط ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس مسئلہ میں مرض اس درجہ کا ہو کہ مریض کو ہر نماز کے وقت میں ادا کرنے میں اتنی مشقت ہو، جتنی بارش میں چلنے سے ہو، جبکہ کپڑے تر ہوں۔ اور بعضوں کے نزدیک اتنی مشقت ضروری ہے کہ فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز ہو جائے (ان دونوں ضابطوں میں بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے)(تحفہ مع الحواشی ۳/ ۲۷۴ فتح المعین - مغنی - جمل وغیرہ قلائد ۱/ ۱۵۶)

جمعہ کا بیان

آیت: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"۔ (سورہ جمعہ ۹)

ترجمہ: (اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کیلئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ کی طرف فوراً چل پڑا کرو اور خرید و فروخت (اور اسی طرح دوسرے مشاغل مانعہ عن السعی) چھوڑ دیا کرو (اور تخصیص بیع کی بوجہ زیادہ اہتمام کے ہے کہ اس کے ترک کو فوت نفع سمجھا جاتا ہے) یہ (چل پڑنا مشاغل بیع وغیرہ کو چھوڑ کر) تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیونکہ اس کا نفع باقی ہے اور بیع وغیرہ کا نفع فانی)(بیان القرآن)

احادیث کی روشنی میں جمعہ کی چند خصوصیات (ماخوذ نور اللمعة للسیوطی)

(۱) جمعہ کا دن اس امت کیلئے عید کا دن ہے۔ (ابن ماجہ، طبرانی فی الاوسط)

(۲) صرف جمعہ کا نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ (ساتھ جمعرات یا سنیچر کا بھی رکھے تو کراہت نہ ہوگی)(بخاری، مسلم)

(۳) صرف جمعہ کی رات قیام (نماز و عبادت) کی تخصیص مکروہ ہے۔ (مسلم)

(۴) آپ ﷺ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں "الم تنزیل السجدہ اور ھل اتی علی الانسان کی تلاوت فرمایا کرتے۔ (شیخین)

(۵) جمعہ کے دن فجر کی نماز باجماعت تمام نمازوں میں افضل نماز ہے۔ (بیہقی - بزار - طبرانی)

(۶) جمعہ مساکین کا حج ہے۔ (حمید بن زنجویہ فی فضائل الاعمال حارث بن ابی اسامہ فی مسندہ)

(۷) آپ ﷺ نماز جمعہ میں سورہ جمعہ اور "اذا جاءك المنافقون" تلاوت فرماتے۔(مسلم)

(۸) آپ ﷺ نے ایک مرتبہ جمعہ کی نماز میں شریک نہ ہونے والوں کے متعلق فرمایا: میں نے ارادہ فرمایا کہ کسی آدمی کو امامت کیلئے آگے بڑھاؤں اور ان لوگوں کو جلا ڈالوں جو جمعہ میں نہیں آتے۔ (حاکم)

(۹) آپ ﷺ نے فرمایا! لوگوں کو چاہے کہ جمعہ کے ترک سے باز آجائیں ورنہ یقیناً اللہ انکے دلوں پر مہر لگادیں گے پھر وہ لوگ غافلین میں شمار ہونگے۔(مسلم و نحوه ابودا ود ـ ترمذی)

(۱۰) جو بغیر عذر کے جمعہ ترک کرے وہ ایک دینار صدقہ کرے، نہ ہو تو نصف دینار صدقہ کرے۔(احمد ـ ابوداؤد نسائي ـ ابن ماجه)

(۱۱) جو درمیان خطبہ اپنے ساتھی سے کہے چپ رہ اس نے لغو حرکت کی۔ (صحیحین)

(۱۲) امام کے منبر پر پہنچ کر بیٹھتے ہی (تحیۃ المسجد کے علاوہ) کوئی بھی نماز پڑھنا حرام ہے۔

(۱۳) جمعہ کے دن نصف النہار کے وقت نماز مکروہ نہیں ہے (کیونکہ) جمعہ کے علاوہ دنوں میں جہنم بھڑکائی جاتی ہے۔(ابوداؤد)

(۱۴) جو جمعے کیلئے آئے تو غسل کرے۔(صحیحین)

(۱۵) کیا تم میں سے کوئی اس سے عاجز ہے کہ ہر جمعہ اپنی اہلیہ سے جماع کرے، کیونکہ اسے دوہرا اجر ہے اپنے غسل کا اجر اور بیوی کے غسل کا اجر۔(بیهقی فی الشعب بسند ضعیف)

(۱۶) مسواک اور خوشبو کا استعمال۔(صحیحین) (۱۷) تیل کا استعمال۔(بخاری ـ حاکم)

(۱۸) جمعہ کی نماز سے قبل ناخن اور مونچھ تراشنا۔ (بزار ـ طبرانی ـ بیهقی فی الشعب ـ سعید بن منصور)

(۱۹) اپنے کپڑوں میں سے بہتر کپڑے پہن کر جمعہ کیلئے جانا۔ (احمد ـ ابوداؤد ـ حاکم)

(۲۰) مسجد میں خوشبو کی دھونی دینا۔ (زبیر بن بکار، ابن ماجه، ابن ابی شیبه، ابو یعلی)

(۲۱) جو شخص جمعہ کے دن غسل کر کے پہلی ساعت (گھڑی) میں (مسجد کیلئے) روانہ ہوا گویا اس نے اونٹ کی قربانی پیش کی، جو دوسری ساعت میں روانہ ہوا گویا اس نے بیل کی قربانی پیش کی، جو تیسری ساعت میں روانہ ہوا گویا سینگ والے مینڈھے کی قربانی کی، جو چوتھی ساعت میں روانہ ہوا گویا مرغ کی قربانی پیش کی، جو پانچویں ساعت میں روانہ ہوا، گویا ایک انڈے کے ذریعہ تقرب حاصل کیا پھر جب امام (خطبہ کیلئے) آجائے تو ملائکہ ذکر (خطبہ) سننے کیلئے حاضر ہو جاتے ہیں۔(بخاری، مسلم)

(۲۲) آپ ﷺ جمعہ کے علاوہ شدت گرمی میں (ظہر کی) نماز ٹھنڈے وقت پڑھتے۔(بخاری)

(۲۳) صحابہ کرامؓ (چونکہ جمعہ کیلئے جلد ہی پہنچ جاتے اس لئے) جمعہ کی نماز کے بعد کھانا کھاتے اور قیلولہ فرماتے۔(صحیحین)

(۲۴) آپ ﷺ کا فرمان ہے: جو جمعہ کے دن اچھی طرح مکمل غسل کرے، پھر جلد جمعہ کیلئے پہنچے، ابتداء سے خطبہ میں شریک رہے، پیدل جائے، سوار نہ ہو، امام سے قریب ہو کر خوب توجہ سے (خطبہ وغیرہ) سنے اور کوئی لغو حرکت نہ کرے، تو اُسے ایک قدم پر ایک سال کے روزہ اور نماز کا ثواب حاصل ہوگا۔(احمد، سنن اربعه ـ حاکم)

(۲۵) سورہ کہف کی تلاوت: دو جمعہ کے درمیان باعث نورانیت ہے۔ (حاکم ـ بیهقی) دو جمعہ کے درمیانی گناہ معاف ہونگے (ابن مردویہ) دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔(ابن ماجه، ضیاء فی المختار)

(۲۶) آپ ﷺ نے جمعہ سے قبل حلقہ بندی سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد)

(۲۷) جمعہ کی نماز دوسرے جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہے۔ جبکہ کبائر سے محفوظ رہے گا۔ (ابن ماجه)

(۲۸) جمعہ کے دن انتقال ہونے والا عذاب قبر سے محفوظ رہے گا۔ (ابویعلی، بیهقی، فی کتاب عذاب)

(۲۹) شب جمعہ یا یوم جمعہ میں انتقال کرنے والا فتنہ قبر سے محفوظ رہے گا۔ (ترمذی۔ وحسنه، بیهقی، ابن ابی الدنیا)

(۳۰) سورج طلوع ہونے والے ایام میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے۔ (مسلم)

(۳۱) جمعہ سید الایام (سارے ایام کا سردار) ہے۔ (حاکم، ابوداؤد ونحوه)

(۳۲) جمعہ کے دن مسلمان کی مغفرت ہوتی ہے۔ (ابن عدی، طبرانی فی الاوسط)

(۳۳) جمعہ کے دن رات کے ۲۴ ساعتوں میں سے ہر ساعت میں ۶۰۰ جہنم کے مستحقوں کو جہنم سے خلاصی نصیب ہوتی ہے۔ (بخاری فی تاریخه، ابویعلی)

(۳۴) جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جو دعا مانگی جائے قبول ہوگی۔ (شیخین)

(۳۵) جو شب جمعہ حٰم الدخان، کی تلاوت کرے اس کی بخشش ہوگی۔ (ترمذی)

(۳۶) شب جمعہ "حٰمٓ الدخان" اور "یٰسین" پڑھنے والے کی صبح تک مغفرت ہو جائے گی۔ (بیهقی، فی الشعب)

(۳۷) جمعہ کے دن درود کی خوب کثرت رکھے۔ (ابوداؤد۔ حاکم۔ ابن ماجه، ملخصا، من نور اللمعه، لجلال الدین، السیوطیؒ)

جمعہ مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی مطلوبہ تعداد کی کمی کی وجہ سے یا اظہار اس کا شعار ہے اور مکہ میں یہ ممکن نہ تھا اس لئے مکہ میں اس کا قیام عمل میں نہ آسکا، ہجرت سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے مدینہ منورہ سے ایک میل کے فاصلہ پر نقیع الخضمات نامی بستی میں جمعہ کا اہتمام فرمایا) جس میں ۴۰/ افراد شریک تھے۔

جمعہ اس امت کی خصوصیات میں سے ہے۔ ہفتہ میں افضل ترین دن جمعہ کا دن ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک یہ یوم عرفہ سے بھی افضل ہے گرچہ علماء شافعیہ کے یہاں عرفہ افضل ہے۔ لیلۃ القدر جمعہ سے افضل ہے۔ آپ ﷺ معراج کی شب دیدار الٰہی سے سرفراز ہوئے۔ اس لئے آپ ﷺ کے حق میں وہ رات سب سے افضل تھی۔ (بعض صحابہ نے شب جمعہ کو شب قدر سے افضل قرار دیا ہے۔ بشری الکریم ۲/۲)

جمعہ کی نماز کا بیان

جمعہ کی نماز فرض عین ہے۔ اور ارکان و شرائط میں دیگر پانچوں فرض نماز کے مانند ہے، البتہ جمعہ کو تین چیزوں میں خصوصیت حاصل ہے (۱۔۲) جمعہ کے واجب و صحیح ہونے کیلئے دیگر شرائط کے ساتھ چند مزید شرائط ہیں (۳) جمعہ کے آداب۔

جمعہ صحیح ہونے کیلئے چھ شرائط ھیں :

(۱) وقت ۔ جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے۔

حدیث: (۲) آپ ﷺ جمعہ کی نماز زوال کے بعد ادا فرماتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

(۱) حضرت سہل بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ ہم جمعہ کے بعد قیلولہ اور دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ (صحیحین) اگر کسی کی جمعہ فوت

ہو جائے تو جمعہ کی صورت میں اس کی قضاء نہ کرے۔ (بلکہ ظہر کی مکمل چار رکعت قضاء کرے) اگر وقت نکل جائے یا وقت کے نکل جانے میں شک ہو، یا صرف اتنا وقت باقی ہو، کہ اس میں صرف ارکان پر اکتفاء کرتے ہوئے دو خطبے اور دو رکعت ادا کرنے کی گنجائش نہ ہو، تو جمعہ نہ پڑھیں، بلکہ ظہر ادا کریں۔ وقت میں جمعہ کی نماز شروع کرے اور دوران نماز وقت نکل جائے تو اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر ادا کرے، اور ظہر کی نیت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور جس وقت سے ظہر کا ارادہ کرے اسی وقت سے قراءت سراً پڑھے۔ دوران نماز وقت نکل جانے میں شک ہو تو جمعہ ہی پوری کریں۔ ظہر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

جمعہ کی نماز میں کسی مسبوق کو امام کے ساتھ ایک رکعت مل گئی ہو، اور وہ اپنی دوسری رکعت پوری کرنے کیلئے کھڑا ہونے کے بعد سلام سے پہلے وقت نکل گیا تو اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کرے۔ امام اور مقتدی حضرات پہلا سلام وقت میں پھیریں اور دوسرا سلام وقت نکل جانے کے بعد تو سب کی جمعہ صحیح ہوگی۔ اور اگر امام ہی پہلا سلام وقت نکل جانے کے بعد پھیرے تو سب کی جمعہ باطل ہوگی۔

امام اور بعض (یعنی ۳۹) مقتدی پہلا سلام وقت میں پھیریں، تو انکی تو جمعہ صحیح ہوگی، اور جو مقتدی وقت کے بعد سلام پھیریں تو انکی جمعہ باطل ہوگی۔

اگر وقت میں سلام پھیرنے والوں کی تعداد چالیس سے کم ہو تو انکی بھی جمعہ باطل ہوگی۔ (جمل ۲/۱۴) اگر امام اور مقتدی پہلا سلام وقت کے نکل جانے کو جانتے ہوئے وقت کے بعد پھیریں تو سب کی نماز باطل ہوگی (یعنی اب اسی پر بناء کرتے ہوئے ظہر پڑھنے کی بھی گنجائش نہیں) ہاں اگر نفل کی نیت کر کے سلام پھیرے تو صحیح ہے۔ اور اگر وقت کے نکلنے کا علم نہ ہو تو اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کریں۔ (حاشیۃ الجمل۔ ۲/۱۴)

(۲) اقامت (آبادی) کی جگہ جمعہ ادا کی جائے: یعنی ایسی آبادی میں جو جمعہ ادا کرنے والے حضرات کا وطن اصلی ہو، چاہے شہر ہو یا گاؤں، نیز اس آبادی کی عمارتیں پتھر کی ہوں، یا مٹی یا لکڑی کی، اگر زمین کے اندر یا پہاڑ میں مکانات بنا کر رہتے ہوں اور اسی کو وطن بنائے ہوئے ہوں تو وہاں پر ان کا جمعہ ادا کرنا صحیح ہے۔ (حاشیۃ الجمل)

جو حضرات جنگل میں خیمہ بنا کر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں، چاہے موسم سرما یا گرما میں وہاں سے منتقل ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، وہاں پر ان کا جمعہ ادا کرنا صحیح نہیں۔ کسی بستی یا شہر کی تمام عمارتیں منہدم ہو جائیں اور ان لوگوں کا وہاں عمارتیں بنانے کا قصد ہو تو اس بستی والوں پر وہاں جمعہ ادا کرنا لازم ہے، چاہے فی الحال کسی خیمہ میں رہتے ہوں یا اس کے علاوہ میں۔ کسی جگہ گاؤں بسانے کے ارادہ سے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں۔ تو وہاں پر عمارتیں بننے سے پہلے جمعہ ادا کرنا صحیح نہیں۔ (حاشیہ الجمل ۲/۱۵) جمعہ کا کسی مسجد یا گھر میں ادا کرنا ضروری نہیں، بلکہ ایسے کھلے میدان میں بھی جو شہر کے حدود میں داخل ہو، جمعہ ادا کرنا صحیح ہے۔ لیکن شہر کے باہر ایسے مقام پر جمعہ قائم کرنا درست نہیں جہاں سے مسافر کیلئے نماز میں قصر کی اجازت ملتی ہے۔

(۳) ایک ہی بستی میں ایک سے زائد جمعہ نہ ہو! اس لئے کہ آپ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ ہوتی تھی۔ (حاشیۃ الروضہ) (بلا ضرورت) ایک سے زائد جمعہ ہو جائیں تو اس کی چند صورتیں ہونگی۔

(الف) دونوں جمعہ یکے بعد دیگرے ادا ہوں تو جو جمعہ پہلے ہو، وہ صحیح ہوگی اور دوسری جمعہ باطل ہوگی، اور جس امام کی تکبیر تحریمہ پہلے مکمل ہوگی اس کی جمعہ صحیح ہوگی اگر ایک امام تکبیر تحریمہ کے ہمزہ کو پہلے کہے لیکن دوسرا امام تکبیر کی راء سے اس سے پہلے فارغ ہو جائے تو اس دوسرے امام کی جمعہ صحیح ہوگی۔ کسی جماعت کے جمعہ شروع کرنے کے بعد کسی نے آ کر خبر دی کہ اس سے پہلے ایک جمعہ ہو چکی تو دوسری

جماعت والوں کیلئے مستحب ہے کہ نئے سرے سے ظہر ادا کریں اور اسی پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کرنا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے۔

(ب) دونوں جمعہ ایک ساتھ ادا ہو جائیں تو دونوں باطل ہیں اب جمعہ کی ادئیگی کیلئے وقت میں گنجائش ہو تو از سر نو جمعہ ادا کریں۔ (ورنہ پھر سب ظہر ادا کریں)

(ج) صورتِ حال کچھ سمجھ میں نہ آئے یعنی پتہ نہ چلے کہ آیا دونوں ایک ساتھ ادا ہوئیں یا یکے بعد دیگرے تو جمعہ کا اعادہ ضروری ہے۔(نیز بعد میں ظہر پڑھنا مستحب ہے۔

دونوں میں سے ایک کے بارے میں یقین ہے کہ وہ پہلے ادا ہوئی ہے، بعد میں التباس (شبہ) ہو گیا (یعنی پتہ نہ چلے کہ کون سی پہلے ہوئی) تو دونوں جماعتوں میں سے کوئی بھی جمعہ کی ادائیگی سے بری نہ ہوگا بلکہ سب کو ظہر ادا کرنا پڑے گی۔

(ہ) کسی ایک کے پہلے ہونے کا یقین ہے لیکن پہلے کونسی ادا کی گئی اس کے بارے میں شبہ ہو جائے، مثلاً مسجد کے باہر دو مریض یا دو مسافر کھڑے تھے، انہوں نے دونوں تکبیر تحریمہ کی آواز آگے پیچھے سنی، لیکن پہلے کون سی ہوئی اس کا انہیں علم نہیں ہو سکا، بعد میں آکر انہوں نے نمازیوں کو صورت حال بتادی، تو ایسی صورت میں بھی دونوں جماعتوں کو ظہر ادا کرنا پڑے گی (اگر لوگوں کی کثرت کی وجہ سے ایک جگہ جمعہ پڑھنا دشوار ہو تو بقدر ضرورت ایک سے زائد جمعہ جائز ہے۔ (الفقہ المنھجی)

(۴) چالیس آدمیوں کا ہونا: چالیس سے کم کی صورت میں جمعہ منعقد نہ ہوگی۔

حدیث: حضرت اسعد بن زرارہؓ نے سب سے پہلے چالیس آدمیوں کی موجودگی میں جمعہ پڑھائی۔ (رواہ ابوداؤد) اور چالیس آدمیوں کا مذکر مکلف، آزاد اور متوطن (باشندہ) ہونا ضروری ہے۔ اور بلا ضرورت وہاں سے موسم سرما اور گرما میں منتقل نہ ہوتے ہوں۔ اگر گرمی میں پڑاؤ ڈالیں اور سردی میں کوچ کریں یا اس کے برعکس کریں۔ تو ایسے لوگ متوطن (باشندے) نہیں کہلائیں گے۔ اور صرف ایسے لوگوں کی موجودگی میں جمعہ منعقد نہ ہوگی۔ کوئی شخص کسی بستی کا باشندہ اس وقت کہلائے گا جبکہ اس کا ایک ہی گھر ہو لیکن اگر کسی کا دو مختلف شہر میں دو گھر ہوں تو وہ جہاں زیادہ رہتا ہو۔ وہی کا باشندہ کہلائے گا۔ اور اگر دونوں جگہ برابر رہتا ہو تو جس جگہ اس کے اہل وعیال اور مال ہو۔ وہی کا باشندہ شمار ہوگا، اگر کسی ایک بستی میں اہل وعیال ہوں اور دوسری بستی میں مال ہو تو جہاں اہل وعیال ہوں۔ وہی کا باشندہ ہوگا اور اگر دونوں بستیاں تمام چیزوں میں برابر ہوں تو جمعہ کی ادائیگی کے وقت جہاں ہو وہیں کا باشندہ کہلائے گا۔ (اعانۃ ۲/۵۸، حاشیۃ البجیرمی ۲/۱۷۰) مریضوں سے جمعہ منعقد ہوتی ہے۔ امام کا چالیس آدمیوں میں شمار ہوگا۔ نماز کی طرح دونوں خطبوں کے ارکان سننے کیلئے بھی چالیس آدمیوں کا ہونا ضروری ہے اگر چالیس کی تعداد تو موجود ہو مگر خطبہ شروع کرنے سے پہلے کم ہو جائیں، تو تعداد مکمل ہونے تک خطبہ کی ابتداء نہ کرے۔ اگر دوران خطبہ کم ہو جائیں۔ اور فوری طور پر واپس لوٹیں تو انکی غیر موجودگی میں جو رکن پڑھا گیا اس کا اعادہ کرتے ہوئے اسی خطبہ پر بناء کرے، اور اگر طویل فاصلہ کے بعد لوٹیں یا پہلے لوگوں کے بجائے دوسرے چالیس افراد آئیں، یا پہلے چالیس میں سے بعض آئیں اور بعض نہ آئیں البتہ دیگر بعض نئے افراد شامل ہو کر چالیس کی تعداد پوری ہو جائے تو ان تینوں صورتوں میں نئے سرے سے خطبہ دینا ضروری ہے۔ اگر خطبہ کے بعد کم ہو جائیں، اور فوری طور پر واپس لوٹیں تو اسی خطبہ سے جمعہ ادا کرے۔ اور طویل فاصلہ کے بعد لوٹیں، تو دوبارہ خطبہ دینا ضروری ہے کیونکہ خطبہ اور نماز دونوں کا پے در پے (متصل) ہونا ضروری ہے۔ فاصلہ کم زیادہ ہونے کا دارومدار عرف عام پر ہوگا (شروع ہی سے امام کے ساتھ شریک) چالیس افراد کے جانے سے پہلے دوسرے چالیس افراد آکر امام کے ساتھ مل جائیں پھر پہلے چالیس افراد چلے جائیں، تو اس سے جمعہ پر کوئی اثر نہ ہوگا، بلکہ جمعہ صحیح ہوگی۔ چاہے بعد میں آنے والے

لوگوں نے خطبہ سنا ہو یا نہ سنا ہو۔ پہلے لوگوں کے چلے جانے کے بعد فوراً دوسرے چالیس افراد آ کر امام کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ تو امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جمعہ اس شرط کے ساتھ صحیح ہوگی کہ بعد میں آنے والے افراد خطبہ کے وقت حاضر رہے ہوں۔ (حاشیۃ الجمل ۲ / ۲۲) تکبیر تحریمہ کے بعد کچھ مقتدی چلے جائیں، اور بقیہ نماز میں تعداد چالیس سے کم رہے تو جمعہ باطل ہوگی۔ کیونکہ نماز پوری ہونے تک اتنی تعداد کا ہونا ضروری ہے۔ امام تکبیر تحریمہ کہے۔ اور مقتدی حضرات رکوع کے بعد آ کر امام کے ساتھ شریک ہو جائیں تو جمعہ صحیح نہ ہوگی اور اگر رکوع سے پہلے آ کے ملے تو جمعہ صحیح ہوگی۔

(۵) جمعہ کو باجماعت ادا کیا جائے: اگر چالیس آدمیوں نے بھی اکیلے اکیلے جمعہ کی نماز پڑھی تو صحیح نہ ہوگی۔ اور اس میں جماعت کیلئے وہی شرائط ہیں جو دیگر نماز کیلئے ہیں، جمعہ کی نماز غلام، مسافر ممیز، بچہ متنفل (نفل پڑھنے والا) اور ایسے امام کے پیچھے جس کا نماز کے بعد محدث (بے وضو) ہونا معلوم ہو جائے صحیح ہے۔ جبکہ چالیس کی تعداد ان کے بغیر پوری ہو جائے اور اگر تعداد ان کے سمیت پوری ہوتی ہو تو جمعہ صحیح نہ ہوگی۔ (اور محدث امام جمعہ کا اعادہ نہ کرے بلکہ ظہر ادا کرے۔ (المجموع ۴) جمعہ ادا کرنے کے بعد چالیس یا بعض مقتدیوں کا محدث ہونا ظاہر ہو جائے تو محدث حضرات کی جمعہ صحیح نہ ہوگی۔ البتہ امام اور جو مقتدی محدث نہ ہوں انکی صحیح ہوگی۔ (جمل ۲/۲۳) سارے مقتدی حضرات غلام یا عورتیں ہوں تو اس سے امام کی بھی جمعہ نہ ہوگی۔ امام کا سہواً جمعہ یا جمعہ کے علاوہ کسی نماز میں زائد رکعت کیلئے کھڑے ہونے کے بعد کوئی ایسا شخص جس کو امام کے سہو کا علم ہے۔ آ کر اس رکعت میں امام کی اقتداء کرلے، تو اس کی نماز منعقد نہ ہوگی، چاہے اُسے پوری رکعت ملی ہو اور اگر سہو سے ناواقف ہو اور پوری رکعت ملی ہو تو مقتدی کی وہ رکعت شمار ہوگی۔ (اور جمعہ کی نماز میں وہ رکعت جمعہ ہی کی شمار ہوگی نہ کہ ظہر) اور امام کے سلام کے بعد اسی رکعت پر بناء کرے۔ لیکن اگر پوری رکعت نہ ملے بلکہ صرف رکوع ملے تو وہ رکعت شمار نہ ہوگی۔ محدث امام کو رکوع میں پانے سے وہ رکعت شمار نہیں ہوتی، اسی لئے محدث امام کو جمعہ کے دوسری رکعت کے رکوع میں پانے سے جمعہ حاصل نہ ہوگی۔

امام کے ساتھ ایک رکعت ملنے سے جمعہ مل جاتی ہے (چاہے پھر وہ رکعت ملفقہ کیوں نہ ہو) اور باقی ایک رکعت امام کے سلام کے بعد پوری کرے۔

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے! آپ ﷺ نے" فرمایا جس نے جمعہ کی ایک رکعت بھی پائی تو اس نے جمعہ کو پالیا، اور جسے ایک رکعت سے کم ملے وہ ظہر کی چار رکعات ادا کرے۔ (دار قطنی۔ تلخیص)

اور اگر ایک رکعت بھی نہ ملے مثلاً دوسری رکعت کے رکوع کے بعد امام کو پالے تو جمعہ حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ سلام کے بعد ظہر ادا کرے، اور امام کی موافقت میں نیت جمعہ ہی کے کرے۔

امام کے ساتھ ایک رکعت پانے کی صورت اپنی دوسری رکعت کے تشہد میں بیٹھنے کے بعد یاد آیا کہ دو رکعتوں میں سے کسی ایک سے سجدہ چھوٹ گیا۔ اگر دوسری رکعت سے چھوٹ گیا ہے تو اسے جمعہ حاصل ہوگی مگر پھر ایک سجدہ کر کے تشہد لوٹا کر سجدہ سہو کرے اور سلام پھیرے اور اگر پہلی رکعت سے چھوٹ گیا یا شک ہو جائے تو اسے جمعہ حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ جو رکعت ادا کی ہے وہ ظہر کی شمار ہوگی۔

امام کو دوسری رکعت میں پانے کے بعد سلام سے پہلے شک ہو جائے کہ امام کے ساتھ ایک سجدہ کیا یا دو تو دوسرا سجدہ کر کے امام کے ساتھ مل جائے تو اسے جمعہ مل جائے گی۔ اور اگر سلام پھیرنے کے بعد شک ہو جائے تو جمعہ حاصل نہ ہوگی بلکہ سجدہ کر کے ظہر پوری کرے۔

دوران نماز نائب بنانے کا حکم

حدیث: آپ ﷺ کے مرض کے ایام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، لیکن آپ ﷺ نے جب کچھ افاقہ محسوس کیا تو نماز کیلئے تشریف لائے اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ (دوران نماز) پیچھے ہٹ گئے اور آپ ﷺ کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ (صحیحین)

(۲) حضرت عمرؓ کو جب نماز کی حالت میں نیزہ مارا گیا تو آپ نے اپنا نائب بنایا۔ (رواہ البیھقی۔ مغنی ۲/ ۲۹۷) جمعہ یا جمعہ کے علاوہ کسی اور نماز میں امام عمداً یا بلاعمد کے حدث پیش آنے یا اس کے علاوہ کسی اور سبب یا بلاکسی سبب کے نماز سے نکل جائے تو (بقیہ نماز پوری کرنے کیلئے) کسی کو نائب بنانا جائز ہے۔ چاہے امام کسی کو نائب بنائے یا مقتدی حضرات بنائیں، یا بذات خود کوئی آگے بڑھ کر نماز پڑھائے۔ اور اگر کوئی بھی آگے نہ بڑھے تو تنہا نماز پوری کرے۔

نیابت کی تفصیل

نائب بنانے کا مسئلہ اگر جمعہ کی نماز میں پیش آئے تو اس کی تین حالتیں ہونگی۔ (۱) دوران خطبہ ایسی حالت میں ایسے شخص کو نائب بنانا صحیح ہے جس نے اس خطبہ کے گذرے ہوئے حصہ کو (یعنی جتنے ارکان پڑھے گئے اسے) سنا ہو۔ (۲) خطبہ اور نماز کے دوران (یعنی خطبہ پورا ہونے کے بعد نماز پڑھانے کیلئے نائب بنانا ہو تو) ایسے شخص کو بنائے جس نے پورا خطبہ (خطبہ کے ارکان) سنا ہو۔ (۳) دورانِ نماز ایسے مقتدی کو نائب بنانا صحیح ہے، جس نے امام کو حدث پیش آنے سے پہلے ہی اس کی اقتداء کی ہو۔ اور اس نائب نے اگر امام کو پہلی رکعت میں پایا ہو تو نائب اور مقتدی سب کی جمعہ صحیح ہوگی اور دوسری رکعت میں پایا ہو تو مقتدی کی جمعہ صحیح ہوگی، نائب کی نہیں بلکہ نائب اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کرے۔ منفرد (تنہا نماز پڑھنے والے) کو جمعہ کی نماز میں نائب بنانا صحیح نہیں (لیکن اگر کسی نے بنایا) تو نائب کی جمعہ صحیح نہ ہوگی۔ اس لئے کہ ایک جمعہ کے بعد دوسری جمعہ کا قیام ممنوع ہے۔ اور وہ نائب اگر اہل وجوب میں سے (یعنی ایسا شخص جس پر جمعہ واجب) ہو تو اس کی ظہر بھی صحیح نہ ہوگی کیونکہ جمعہ فوت ہونے سے پہلے ظہر ادا کرنا جائز نہیں ہاں اگر وہ مسئلے سے ناواقف ہو تو اس کی یہ نماز نفل شمار ہوگی۔ اور اگر اہل وجوب میں سے نہ ہو اور ظہر کی نیت کرکے آگے بڑھا ہے تو اس کی ظہر صحیح ہوگی۔ اور مقتدی حضرات اگر اس نائب کی اپنی پہلی رکعت میں اقتداء کریں تو اقتداء صحیح نہ ہوگی۔ اور دوسری رکعت میں کریں تو اقتداء صحیح ہوگی۔ اور جمعہ ہی کی نماز پوری کریں۔ (جمل ۲/ ۶۵) جمعہ کے علاوہ دیگر کسی نماز میں نائب بنانے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں مطلقاً جائز ہے۔ مقتدی کو بنائے یا منفرد کو چاہے کسی بھی رکعت میں بنائے البتہ منفرد کو چار رکعت والی نماز میں دوسری اور چوتھی رکعت میں نائب بنانا ہے۔ تو دوبارہ اقتداء کی نیت کرنا ضروری ہے امام کے مقابلے میں مقتدی حضرات کا کسی کو نائب بنانا زیادہ بہتر ہے نائب ایسا ہونا ضروری ہے جو مقتدی حضرات کے امامت کے لائق ہو۔ مردوں کی امامت کیلئے عورت کو نائب بنائے تو صحیح نہیں، البتہ مردوں کی نماز اس سے باطل نہ ہوگی۔ ہاں اگر اس عورت کی اقتداء کی تو باطل ہوگی، فوری طور پر نائب بنانا ضروری ہے۔ فوری طور پر نہ بنائے بلکہ مقتدیوں کے ایک فعلی رکن ادا کرنے کے بعد یا اتنا زمانہ گذرنے کے بعد جس میں ایک رکن ادا کرنا ممکن ہو بنائے تو ایسی صورت میں جمعہ کے علاوہ دیگر نماز میں دوبارہ اقتداء کی نیت کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نائب بنانا صحیح نہیں۔ البتہ جمعہ کی نماز میں تاخیر کی صورت میں مطلقاً نائب بنانا ممنوع ہے۔ دوبارہ اقتداء کی نیت کرے یا نہ کرے۔ (حاشیۃ البجیرمی ۲/ ۱۹۱) مسبوق کو نائب بنائے تو اس پر امام کے نماز کی ترتیب کی رعایت ضروری ہے۔ لہٰذا امام کے

بیٹھنے کی جگہ بیٹھے اور کھڑے ہونے کی جگہ کھڑے رہے لیکن اگر مسبوق کو امام کے نماز کی ترتیب کا علم نہ ہو، تو ایک رکعت پوری کرنے کے بعد مقتدی حضرات کو دیکھے، اگر مقتدی حضرات کا کھڑے ہونے کا ارادہ ہو تو یہ بھی کھڑا ہو، ورنہ پھر بیٹھ جائے، صبح کی دوسری رکعت میں ایسے مسبوق کو جو اسی رکعت میں شامل ہوا ہو نائب بنائے تو نائب دعائے قنوت بھی پڑھے۔ اور بیٹھ کر تشہد بھی پڑھے پھر اس کی اپنی دوسری رکعت میں بھی دعائے قنوت پڑھے۔ نائب کی اقتداء سے پہلے یا اقتداء کے بعد امام کو سہو پیش آیا، تو نائب اولاً سابق امام کی نماز کے آخر میں، پھر اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرے نائب سابق امام کے ترتیب کے مطابق نماز پوری کرنے کے بعد سلام سے پہلے اپنی بقیہ نماز پوری کرنے کیلئے کھڑا ہو جائے، تو مقتدی حضرات کو اختیار رہے گا، چاہیں تو اس نائب سے مفارقت کی نیت کر کے سلام پھیریں یا بیٹھ کر امام کا انتظار کرتے رہیں اور امام کے ساتھ سلام پھیریں (اور یہی صورت افضل ہے المجموع۔ ۴ / ۵۸۱) دوسری رکعت میں بنائے گئے نائب کی کوئی مسبوق اُسی رکعت میں اقتداء کرے تو مسبوق کی جمعہ صحیح ہوگی، نائب کی نہیں۔ جن لوگوں کو امام کے ساتھ پہلی رکعت ملے انکی ہر حال میں جمعہ صحیح ہوگی، ایسے لوگ اگر کسی ظہر یا نفل پڑھنے والے کی اقتداء کرے، تو کوئی حرج نہیں۔ امام کو حدث پیش آنے سے پہلے نائب کو سہو لاحق ہو تو نائب کو سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ امام اس کا تحمل کرے گا۔ البتہ حدث کے بعد سہو لاحق ہوا تو نائب اور مقتدی حضرات سبھی کو سجدہ سہو کرنا مسنون ہے۔

مقتدی کو امام کے حدث سے پہلے اور نیابت کے بعد سہو لاحق ہوا تو مقتدی کو سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر امام کے حدث کے بعد اور نیابت سے پہلے کسی مقتدی کو سہو پیش آیا تو نائب کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کرلے۔ جمعہ اور دیگر نمازوں میں نائب کے اقتداء کی نیت کرنا ضروری نہیں (کیونکہ نائب پہلے امام کے قائم مقام ہے)

جمعہ کی پہلی رکعت میں امام کو حدث وغیرہ پیش آنے کی صورت میں امام کسی کو نائب نہ بنائے، تو مقتدیوں پر کسی کو نائب بنانا واجب ہے۔ اور دوسری رکعت میں مندوب ہے اگر مسبوق کی طرح تنہا اپنی نماز پوری کریں تب بھی جمعہ صحیح ہوگی۔ امام کے ساتھ ایک رکعت ادا کرنے کے بعد کسی عذر سے یا عذر کے بغیر امام سے الگ ہو جائے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی بلکہ (تنہا) جمعہ پوری کرے۔ جمعہ کی نماز میں امام کی نماز مکمل ہونے کے بعد مسبوق حضرات کسی اور کو امام نہ بنائیں (بلکہ اپنی نماز تنہا مکمل کریں) کیونکہ ایک جمعہ کے بعد دوسری جمعہ کا قیام ممنوع ہے اسی طرح دیگر نمازوں میں بھی مسبوق امام کی نماز کے بعد یا مقیم مقتدی مسافر امام کی دو رکعت پر سلام کے بعد کسی اور کو امام نہ بنائیں کیونکہ جماعت کی فضیلت حاصل ہو چکی اب تنہا اپنی اپنی نماز مکمل کرلینا کافی ہے۔

فصل ۔ ازدحام کا مسئلہ

(فتح الوھاب سے ماخوذ ہے)

جو شخص جمعہ یا دیگر نماز میں بھیڑ یا بھول کی وجہ سے پیچھے رہنے کی صورت میں امام کے ساتھ پہلی رکعت میں زمین پر سجدہ نہ کر سکے، تو جس پر سجدہ کرنا ممکن ہو (مثلاً کسی کی پیٹھ پر) تو اس پر کرنا لازم ہے۔

حدیث: حضرت عمرؓ نے فرمایا! جب سخت بھیڑ ہو جائے (اور تم میں سے کوئی زمین پر سجدہ نہ کر سکے) تو اپنے بھائی کی پیٹھ پر سجدہ کرے (رواہ البیھقی باسنادہ صحیح) کسی چیز پر سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو سجدہ کرنے کیلئے موقع کا انتظار کرتا رہے، اگر دوسری رکعت میں امام کے رکوع میں جانے سے پہلے موقع ملے، تو سجدہ کر کے امام جس حالت میں ہو اس میں جا کر ملے چاہے امام قیام میں ہو یا رکوع میں

(سجدہ کے بعد) امام قیام میں ملے تو مسبوق کی طرح قرأت پڑھنا شروع کردے لیکن امام قرأت پوری ہونے سے پہلے رکوع میں چلا جائے تو قرأت روک کر امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہوجائے، اور اگر (سجدہ کے بعد) امام رکوع میں ملے تو رکوع میں شریک ہوجائے (اور امام کے اقل رکوع کی حد سے اٹھنے سے قبل اسے رکوع میں طمانیت حاصل ہو چکی ہو تو یہ رکعت شمار ہوگی ورنہ نہیں۔) (جمل) اور امام رکوع سے اٹھ چکا ہو تو جس حالت میں ہو اس میں اس کی موافقت کرے۔ اور سلام کے بعد ایک رکعت ادا کرے۔ کیونکہ ایک رکعت فوت ہو چکی اور اگر سجدہ سے سر اٹھانے سے پہلے ہی امام سلام پھیر چکا ہو، تو اس مقتدی کی جمعہ فوت ہوگئی اب اسی نماز کو آگے بڑھاتے ہوئے ظہر پوری کرے (اور سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد امام سلام پھیرے تو جمعہ فوت نہ ہوگی۔) (حاشية الجمل)

اگر امام کے دوسری رکعت میں رکوع میں جانے کے بعد سجدہ کا موقع ملے تو (اب سجدہ نہ کرے بلکہ) امام کے ساتھ رکوع کرے اور اس کی یہ رکعت مُلَفَّقه (یعنی جو پہلی رکعت کے رکوع اور دوسری رکعت کے سجدہ سے مل کر پوری ہوئی) کہلائے گی۔ لیکن اگر امام کے ساتھ رکوع نہیں کیا بلکہ عمداً اور جانتے ہوئے اپنی نماز کی ترتیب کے مطابق سجدہ کیا تو اس کی نماز باطل ہوگی، ایسی صورت میں امام کو رکوع میں پانا ممکن ہو تو دوبارہ جمعہ کیلئے تکبیر تحریمہ باندھنا ضروری ہے۔

البتہ بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے اپنی نماز کی ترتیب کے مطابق سجدہ کیا، تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی، لیکن اس کا یہ سجدہ شمار بھی نہ ہوگا۔ اب سجدہ کے بعد رکوع کو طویل کرنے کی وجہ سے امام کو رکوع میں پائے تو موافقت ضروری ہے۔

اور سجدہ میں پائے تو دوبارہ امام کے ساتھ سجدہ کرے اور یہ سجدہ شمار ہوگا۔ اور یہ رکعت ملفقہ کہلائے گی اور جمعہ بھی حاصل ہوگی۔

امام کو تشہد میں پائے تو موافقت ضروری نہیں بلکہ پہلی رکعت کی تکمیل کیلئے دو سجدیں کرے۔ اور سلام کے بعد ایک رکعت ادا کرے۔ اور اس سے اُسے جمعہ حاصل ہوگی (جمل۔ ۲/ ۲۵) اور اگر کھڑے ہو کر رکوع وغیرہ کر کے دوبارہ سجدہ کرے تو اس کا یہ سجدہ شمار ہوگا اور ان سجدوں کی وجہ سے اس کی ایک رکعت مکمل ہوجائے گی اور یہ ملفقہ رکعت شمار ہوگی (یعنی پہلی رکعت کے رکوع اور ان دوسرے دو سجدوں سے مل کر پوری ہوئی) لیکن یہ سجدے اگر امام کے سلام سے پہلے ادا ہوں تو جمعہ حاصل ہوگی ورنہ نہیں۔ اگر امام کے دوسری رکعت کے سجدہ میں جانے کے بعد سجدہ کا موقع ملے تو سجدہ میں امام کی موافقت کرے۔ اور اسے یہ ملفقہ رکعت حاصل ہوگی۔ (یعنی پہلی رکعت کے رکوع اور دوسری رکعت کے سجدہ سے مل کر مکمل ہوئی۔) اگر امام کے تشہد میں بیٹھنے کے بعد موقع ملے تو سجدہ کرے۔ اب اگر امام کو سلام سے پہلے پائے تو جمعہ مل جائے گی ورنہ نہیں۔ امام کے ساتھ پہلی رکعت مکمل کرنے کے بعد دوسری رکعت کے سجدہ میں بھیڑ ہو جائے تو امام کے سلام سے پہلے یا بعد، جب بھی موقع ملے سجدہ کرے اور اس کی جمعہ صحیح شمار ہوگی۔

چھٹی شرط۔ نماز سے پہلے دو خطبے ہوں

حدیث: حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا! آپ ﷺ دو خطبے دیتے تھے جس میں درمیان میں بیٹھتے تھے۔ (صحیحین)

خطبہ کے ارکان: خطبہ کے پانچ ارکان ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنا۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے۔ (مسلم)

(۲) آپ ﷺ پر درود پڑھنا۔ حمد اور درود میں لفظ حمد اور لفظ صلاۃ کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی ان دونوں کا مادّہ پایا جانا ضروری ہے بعینہ لفظ "اَلْحَمْدُ" اور لفظ الصلاۃ ضروری نہیں جیسے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ. اَحْمَدُ اللّٰهَ. اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ یا اُصَلِّیْ عَلٰى مُحَمَّدٍ" کہے

اور حمد میں لفظ اللہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر " اَلْحَمْدُ لِلرَّحْمٰنِ یَا اَلْحَمْدُ لِلرَّحِیْمِ " کہے۔ تو کافی نہ ہوگا۔ درود میں لفظ محمد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ آپ ﷺ کے اسماء مبارکہ میں سے کوئی بھی اسم ظاہر ہو تو کافی ہے، جیسے "اُصَلِّیْ عَلٰی مُحَمَّدٍ یا اُصَلِّیْ عَلٰی اَحْمَدُ" کہے (حاشیۃ الجمل ۲/ ۲۵) آپ ﷺ کا اسم گرامی نہ لیتے ہوئے صرف " صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ " ضمیر کے ساتھ کہے تو یہ کافی نہیں۔ چاہے اس سے پہلے آپ ﷺ کا ذکر گذر چکا ہو، آپکے آل اور اصحاب کو بھی درود میں شمار کرنا مستحب ہے۔

(۳) تقوی کی وصیت کرنا

حدیث : حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں " آپ ﷺ دو خطبے دیتے اور درمیان میں بیٹھتے۔ قرآن کی تلاوت فرماتے اور لوگوں کو وعظ ونصیحت فرماتے۔" (رواہ مسلم) اور لفظ وصیت کا ہونا ضروری نہیں۔ اسلئے کہ اس سے مقصود وعظ ونصیحت کرنا ہوتا ہے جو دیگر لفظ سے بھی حاصل ہوگا۔

وصیت میں صرف دنیا کے دھوکے اور اس کی خوبصورتی سے ڈرانے پر اکتفاء کرنا کافی نہیں، کیونکہ منکرین شریعت بھی اس کی صیت کرتے ہیں۔ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارنا اور معاصی سے روکنا ضروری ہے۔ اور نصیحت میں طویل کلام کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ صرف "اطیعوا اللہ" کہے۔ تب بھی کافی ہے۔ مذکورہ تینوں ارکان کا دونوں خطبوں میں پایا جانا ضروری ہے۔

(۴) دوسرے خطبہ میں مومنین کیلئے امور آخرت سے متعلق دعا مانگنا۔ اگر صرف پہلے خطبہ میں مانگے تو وہ شمار نہ ہوگی ایسی دعا کا ہونا ضروری ہے۔ جس پر دعا کا اطلاق ہو سکے۔ اور صرف سامعین کیلئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے "رحمکم اللہ" کہنا (اللہ تم پر رحم کرے)

(۵) دو خطبوں میں سے کسی ایک میں قرآن پڑھنا۔ لیکن پہلے خطبہ میں پڑھنا افضل ہے (اور پہلے خطبہ کے آخر میں پڑھنا مسنون ہے۔ حاشیۃ الجمل ۲/۲۶) اور کم سے کم ایک آیت پڑھے۔ اور آیت کا مفہم ہونا ضروری ہے (یعنی ایسی آیت پڑھے جس میں وعدہ وعید۔ قصہ یا کوئی حکم شرعی ہو) اگر کسی نے صرف سورہ مدثر کی آیت "ثم نظر" پڑھی تو یہ کافی نہیں کیونکہ اس میں نہ وعدہ وعید کا ذکر ہے اور نہ قصہ وحکم شرعی گرچہ ایک پوری آیت ہے ہر جمعہ میں پہلے خطبہ کے آخر میں پوری سورہ "ق" پڑھنا مسنون ہے (رواہ مسلم) اور اصل سنت کے حصول کیلئے اس سورۃ کا کچھ حصہ پڑھنا بھی کافی ہے۔ اور اس کے لئے سامعین حضرات کی رضامندی ضروری نہیں جیسے کہ جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور منافقون پڑھنے کیلئے مقتدیوں کی رضامندی ضروری نہیں (جمل ۲/ ۲۶) اگر خطبہ میں کوئی آیت سجدہ پڑھے اور منبر پر سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو نیچے اتر کر کرے۔ اور ممکن ہو تو اس پر ہی سجدہ کرے۔ اگر منبر پر ممکن نہ ہو مگر منبر بھی اتنا بلند ہو کہ نیچے اتر کر سجدہ کرنے تک طویل فاصلہ ہو جائے گا، تو سجدہ نہ کرے۔ اور اس آیت سجدہ کا مذکورہ ارکان میں شمار نہ ہوگا۔ کوئی خطیب آیت موعظت (نصیحت کی آیت) پڑھ کر اسے بیک وقت دو رکن (مثلاً تقوی کی وصیت اور قرأت قرآن) کی طرف سے ادا کرنے کا قصد کرے تو یہ صحیح نہیں۔ اگر خطبہ میں چند ایسی آیتیں پڑھیں جس میں خطبہ کے ارکان کا ذکر ہو تو یہ صحیح نہیں کیونکہ اسے خطبہ نہیں کہا جائے گا۔ البتہ اگر کسی آیت کے ضمن میں بعض ارکان آجائیں تو حرج نہیں۔

خطبہ کا عربی میں ہونا ضروری ہے۔ اگر ان میں ایک بھی عربی میں خطبہ دینے والا نہ ہو تو دوسری زبان میں خطبہ دے۔ اور تمام پر بطور فرض کفایہ عربی خطبہ سیکھنا واجب ہے۔ کسی ایک نے بھی سیکھ لیا تو کافی ہے ورنہ سب گنہگار ہونگے۔ اور ایسی صورت میں انکی جمعہ صحیح نہ ہوگی بلکہ ظہر ادا کرنا پڑے گی۔

خطبہ کے شرائط

خطبہ کے چھ شرائط ہیں (۱)وقت۔خطبہ کا وقت زوال کے بعد سے شروع ہوتا ہے اگر خطبہ کا تھوڑا حصہ بھی وقت سے پہلے پڑھے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

حدیث: حضرت انسؓ سے مروی ہے آپ ﷺ زوال کے بعد جمعہ پڑھتے تھے اور زوال کے بعد خطبہ دیتے تھے۔ (رواہ البخاری)

(۲) دونوں خطبوں کا نماز سے پہلے پایا جانا۔(۳) قیام (کھڑے رہنے پر) قدرت ہوتو دونوں میں قیام کرنا۔

حدیث: حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے آپ ﷺ کھڑے ہوکر خطبہ دیتے تھے۔(رواہ مسلم، ابوداؤد) کھڑے ہونے سے عاجز ہوتو بہتر ہے کہ کسی کو نائب بنائے۔عاجز ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر یا لیٹ کر خطبہ دے تو یہ جائز ہے اور ایسے شخص کی اقتداء بھی جائز ہے۔خطبہ کے بعد معلوم ہو جائے کہ وہ قیام پر قادر تھا تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ امام کا نماز کے بعد محدث ہونا معلوم ہو جائے۔ اور اس کا حکم پیچھے گذر چکا ہے۔

(۴)دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا

حدیث: حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے! آپ ﷺ دو خطبے دیتے تھے اور دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے (مسلم) اور بیٹھنے میں طمانیت واجب ہے عاجز ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر خطبہ دے تو دونوں کے درمیان فصل کیلئے لیٹنے کی ضرورت نہیں بلکہ تھوڑی دیر سکتہ اختیار کرلے اور یہ سکتہ واجب ہے۔

(۵) حدث اصغر و اکبر سے اور بدن، کپڑا و مکان کا نجاست سے پاک ہونا، اور ستر عورت بھی ضروری ہے۔دونوں خطبوں اور ان کے ارکان اور خطبہ و نماز کے درمیان تسلسل (موالات) ضروری ہے۔

دوران خطبہ خطیب کو حدث لاحق ہو جائے، تو حالت حدث میں جو کچھ پڑھا گیا وہ شمار نہ ہوگا (اور دوسرے کو نائب بنانا جائز ہے۔ نائب پڑھے ہوئے خطبہ پر بناء کرے۔جمل ۲/۲۸) اور اگر خطیب خود پاکی حاصل کر کے واپس لوٹے تو نئے سرے سے خطبہ دینا ضروری ہے چاہے فاصلہ طویل ہو یا کم۔

(۶) اتنا بلند آواز میں خطبہ دے کہ اسے ایسے چالیس افراد سن سکیں جنکے ذریعے جمعہ منعقد ہوتی ہے۔اتنا آہستہ خطبہ دے کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی سن نہ سکے تو یہ خطبہ شمار نہ ہوگا۔ تمام حاضرین یا بعض بہرے ہونے یا دور ہونے یا سونے کی وجہ سے خطبہ نہ سن سکیں تو خطبہ صحیح نہ ہوگا (تمام خطبہ سن رہے ہوں لیکن اس کا مفہوم سمجھ میں نہ آ رہا ہو تب بھی خطبہ درست ہوگا)

تمام حضرات خطیب کی جانب متوجہ ہو کر خاموشی سے خطبہ سنیں۔جس آدمی کو خطبہ سنائی دے اسے خاموش رہنا سنت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، کہ ایک شخص آ کر پوچھنے لگا قیامت کب ہے۔تو صحابہؓ نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔لیکن وہ خاموش نہ رہا، تو تیسری مرتبہ کے بعد آپ ﷺ نے اس سے پوچھا'' تو نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ تو اس نے کہا اللہ اور اس کے رسول کی محبت۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو (قیامت کے دن) اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا (رواہ البیھقی، والنسائی) استدلال اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے نہ اس پر نکیر فرمائی اور نہ اس سے کہا کہ خاموش رہنا واجب ہے۔

لیکن جسے خطبہ سنائی نہ دے اسے اختیار ہے چاہے تو خاموش رہے یا ذکر وغیرہ میں مشغول رہے خطیب کیلئے بھی خطبہ کے دوران خاموش رہنا سنت ہے (یعنی خطبہ کے علاوہ کوئی اور گفتگو نہ کرے) ہاں اگر کوئی اہم کام مقصود ہو۔ مثلاً کسی اندھے کو کنویں میں گرتے ہوئے یا کسی آدمی پر بچھو وغیرہ رینگتے ہوئے دیکھے، تو اس کو بچانے کیلئے یا کسی شخص کو خیر کی بات سکھلانا یا کسی گناہ کے کام سے روکنا ہو تو بات کر سکتا ہے لیکن اشارہ پر اکتفاء کرنا مستحب ہے۔ اور جہاں تک ہو سکے بات نہ کرے۔

حدیث: (۱) اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ کے دوران ابن ابی الحقیق کے قاتلوں اور کیفیتِ قتل کے متعلق سوال کیا (رواہ البیھقی ۔ تلخیص الحبیر)

(۲) آپ ﷺ نے خطبہ کے دوران "سلیک غطفانی سے کلام فرمایا تھا" (مسلم) خطبہ کی ابتداء سے پہلے اور فراغت کے بعد اور دونوں کے درمیانی وقفہ میں بات کرنا جائز ہے دوران خطبہ مسجد میں داخل ہونے والے کے لئے بیٹھنے سے پہلے بات کرنا جائز ہے لیکن بیٹھنے کے بعد خاموش رہنا سنت ہے۔

دوران خطبہ داخل ہونے والے کا سلام کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر سلام کرے تو سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ چھینکنے والے کی حمد کا جواب دینا سنت ہے۔ خطیب کے منبر پر چڑھنے کے بعد جو آدمی نماز کی حالت میں نہ ہو، وہ نماز شروع نہ کرے گرچہ اس نے سنت نہ پڑھی ہو۔ اور جو نماز میں ہو وہ اپنی نماز مختصر اور ہلکی پڑھے۔

دوران خطبہ نماز شروع کرنے کی ممانعت ہر ایک کیلئے ہے، چاہے اسے خطبہ سنائی دے یا نہ سنائی دے، دوران خطبہ مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد کی مختصر دو رکعت پڑھنا مستحب ہے (یعنی صرف واجبات ادا کرے۔ قلائد ۱ / ۱۷۱)

حدیث: حضرت سلیک غطفانیؓ جمعہ کے دن دوران خطبہ آ کر بیٹھ گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اے سلیک کھڑے ہو جاؤ۔ اور مختصر سی دو رکعت ادا کرو" اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی خطبہ کے دوران آئے تو مختصر سی دو رکعت ادا کرے۔ (مسلم)

اگر سنت نماز نہیں پڑھی ہے تو سنت نماز پڑھے، اور تحیۃ المسجد کا ثواب سنت کے ضمن میں مل جائے گا (بہتر یہ ہے کہ دونوں کی نیت کرے۔ (جمل) خطبہ کے آخر میں کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ نماز نہ پڑھے، تا کہ امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ فوت نہ ہو جائے (بلکہ نماز شروع ہونے تک کھڑا رہے تا کہ تحیۃ المسجد کا ثواب فوت نہ ہو جائے۔ (جمل ۔ ۲ / ۳۱) خطبہ کی نیت اور خطبہ کے فرض ہونے کی نیت کرنا ضروری نہیں (جمل ۲ ...... / ۲۷)

خطبہ کے ارکان کے درمیان ترتیب ضروری نہیں، بلکہ سنت ہے۔ لہٰذا حمد سے ابتداء کرے پھر درود پڑھے، پھر تقوی کی وصیت پھر قرأت، اور پھر دعا کرے (فتح الوھاب)

خطبہ کی سنتیں

(۱) منبر پر خطبہ دے۔

حدیث: منبر بننے کے بعد آپ ﷺ منبر پر خطبہ دیتے تھے (مفتق علیہ) منبر کا محراب کے دائیں جانب ہونا مستحب ہے۔ اور مسجد کے وسیع نہ ہونے کی صورت میں منبر کا اتنا وسیع ہونا جس سے مصلیوں کی تنگی ہو، مکروہ ہے۔ اگر منبر نہ ہو تو کسی بلند جگہ پر خطبہ دے۔

(۲) امام جب منبر کے پاس پہنچے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرے۔ (۳) منبر پر چڑھتے ہوئے جب اس سیڑھی تک پہنچے جس پر

خطیب بیٹھتا ہے(جسے استراح کہا جاتا ہے) تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر سلام کرے۔(۴) سلام کے بعد اس استراح پر بیٹھے

(۵) امام کے بیٹھنے کے بعد موذن (خطیب کے سامنے کھڑے ہو کر) اذان دینا شروع کرے، اور اذان پوری ہونے تک خطیب بیٹھا رہے۔ مستحب یہ ہے کہ جمعہ کیلئے صرف ایک ہی موذن اذان دے(بخاری)

(۶) خطبہ فصیح و بلیغ ہو اس میں گھٹیا اور بالکل نادر قسم کے کلمات نہ ہو، بلکہ ایسا ہو جو جلد سمجھ میں آئے۔

(۷) خطبہ نہ بہت طویل ہو اور نہ بہت مختصر بلکہ درمیانی ہو۔

حدیث: حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے: آپ ﷺ کی نماز اور خطبہ متوسط ہوا کرتا تھا(مسلم)

(۸) خطبہ کے وقت قبلہ کی طرف پیٹھ اور لوگوں کی جانب چہرہ ہو۔ اور خطبہ دیتے وقت دائیں بائیں نہ مڑے بلکہ خطبہ پورا ہونے تک لوگوں کی طرف متوجہ رہے، اگر قبلہ رو ہو کر خطبہ دے تب بھی جائز ہے۔

حدیث: آپ ﷺ خطبہ کے وقت لوگوں کی طرف رخ فرماتے اور تمام لوگ آپ کی طرف اور آپ دائیں بائیں نہ مڑتے۔ (تلخیص)

(۹) دونوں خطبوں کی درمیانی نشست سورہ اخلاص کے بقدر ہو۔ اور اس نشست میں کچھ تلاوت کرے۔(ابن حبان) سورہ اخلاص کی تلاوت افضل ہے۔(جمل۔ ۲/ ۳۶)

(۱۰) خطبہ دیتے وقت بائیں ہاتھ میں تلوار یا عصا وغیرہ ہو۔ اور دایاں ہاتھ منبر کے کنارے رکھے۔

حدیث: آپ ﷺ خطبہ میں کمان پر ٹیک لگایا کرتے تھے۔(رواہ ابو دائود۔ تلخیص) اگر کوئی چیز نہ ملے تو دونوں ہاتھوں اور جسم کو اس طریقے پر ساکن رکھے، کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے۔ یا دونوں ہاتھ چھوڑے رکھے۔(اور اگر دایاں ہاتھ منبر کے کنارے اور بایاں ہاتھ چھوڑے رکھے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ جمل ۲/ ۳۶) اس سے مقصود یہ ہے کہ خطبہ دیتے وقت خشوع کی کیفیت ہو اور ہاتھ سے کوئی عبث اور فضول حرکت نہ ہو۔

(۱۱) خطیب کی طرف متوجہ ہو کر دھیان و توجہ سے خطبہ سنے، کسی دوسرے چیز میں مشغول نہ ہو یہاں تک کہ لذت کے طور پر کوئی چیز پینا بھی مکروہ ہے، لیکن پیاس کی وجہ سے پینے میں کوئی حرج نہیں، نہ خطیب کیلئے اور نہ دیگر لوگوں کیلئے۔

(۱۲) خطبہ سے فراغت کے بعد منبر سے نیچے اترے اور موذن اقامت شروع کرے اور اقامت پوری ہوتے ہی جلد محراب میں پہنچ کر نماز شروع کرے۔(۱۳) خطبہ کو "استغفر اللہ لی ولکم" سے ختم کرے۔(المجموع۔ ۴/ ۵۲۹)

(۱۴) خطیب کو خطبہ کے وقت حاضر ہونا سنت ہے۔(المجموع ۴/ ۵۲۹) دیگر حضرات کیلئے جلد از جلد مسجد پہنچنا سنت ہے۔(فتح الوھاب)

(۱۵) خطبہ میں آپ ﷺ کا اسم گرامی یا وصف یا آیت "ان اللہ وملائکتہ" الخ پڑھی جائے تو معمولی آواز سے درود پڑھنا مسنون ہے، آواز زیادہ بلند کرنا مکروہ ہے، نیز خطبہ میں صحابہ کرام کے اسماء پر آہستہ رضی اللہ عنہ اور دعاء پر آمین کہنا مستحب ہے۔ (اعانۃ ۲/ ۸۷)

(۱۶) جمعہ کیلئے جاتے وقت طویل راستہ سے چل کر جانا اور چھوٹے راستے سے چل کر یا سوار ہو کر واپس لوٹنا سنت ہے(فتح الوھاب)

خطبہ کے مکروہات

(۱) دوسرے خطبہ میں (بالخصوص) آپ ﷺ پر درود پڑھتے وقت دائیں بائیں مڑنا۔(المجموع ۴/ ۵۲۹)
(۲) منبر پر چڑھتے وقت عصاء وغیرہ منبر کی سیڑھی پر زور سے رکھنا۔
(۳) خطیب کے منبر پر چڑھنے کے بعد اور بیٹھنے سے پہلے دعا کرنا۔بعض جہلاء کا خیال ہے کہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے حالانکہ قبولیت کی گھڑی منبر پر بیٹھنے کے بعد ہوتی ہے۔
(۴) بادشاہوں کیلئے دعاء کرتے وقت انکے اوصاف میں مبالغہ کرنا۔خطبہ میں بادشاہ کیلئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس کی تعریف میں مبالغہ نہ کیا جائے،مسلمان حاکموں کی اصلاح کیلئے دعا کرنا مستحب ہے۔
(۵) دوسرا خطبہ بہت تیزی سے پڑھنا۔
(۶) احتباء (یعنی گوٹ مار کر بیٹھنا) کیونکہ ابوداود اور ترمذی کی روایت میں آپ ﷺ نے اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔منبر وسیع ہو تو (خطبہ کیلئے) اس کے دائیں جانب کھڑا ہونا مستحب ہے۔خطیب کیلئے خطبہ کے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنا مکروہ ہے۔
خطیب پر بیہوشی طاری ہو جائے تو کسی کو اس کا نائب بنا کر اسی خطبہ پر بناء کرنا جائز نہیں بلکہ از سر نو خطبہ دینا ضروری ہوگا۔ (جمل۔۲۲۹)

دوسرا باب۔ کن پر جمعہ فرض ہے۔

حدیث : جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے۔البتہ چار لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔غلام،عورت،بچہ اور مریض (ابوداود) اور دار قطنی کی روایت میں مسافر کا بھی ذکر ہے۔

جمعہ واجب ہونے کیلئے پانچ شرائط ہیں

(۱) **مکلف ہونا،** بچے،مجنون اور بیہوش پر جمعہ فرض نہیں،البتہ جو نشہ کی حالت میں ہو،اس پر دیگر نمازوں کی طرح جمعہ بھی ظہر کی صورت میں قضاء کرنا واجب ہے۔
(۲) **آزاد ہونا :** کسی بھی قسم کے غلام پر جمعہ واجب نہیں۔آقا غلام کو جمعہ کیلئے جانے کی اجازت دے تو غلام کا جمعہ کیلئے آنا مستحب ہے واجب نہیں۔
(۳) **مذکر ہونا :** عورت اور خنثیٰ مشکل پر جمعہ فرض نہیں ہے۔
(۴) **مقیم ہونا:** مسافر پر جمعہ نہیں لیکن جمعہ کیلئے آنا مستحب ہے اسی طرح بچے کیلئے آنا ممکن ہو تو اس کے لئے بھی جمعہ مستحب ہے۔
(۵) **صحت مند ہونا۔** مریض پر جمعہ فرض نہیں خواہ مریض کے نہ آنے کی صورت میں تعداد کم ہونے کی وجہ سے دیگر لوگوں کی جمعہ فوت ہو جائے۔جن پر جمعہ فرض نہیں ہے۔ان سے جمعہ منعقد نہ ہوگی۔(یعنی مطلوبہ چالیس افراد میں ان کا شمار نہ ہوگا) بجز مریض کے (یعنی مریض مشقت برداشت کر کے جمعہ میں حاضر ہو جائے تو اس کا شمار مطلوبہ تعداد میں ہوگا)
غلام، بچے عورت، مسافر، وغیرہ (مسجد میں آکر) جمعہ ادا کریں تو ان کی جمعہ منعقد ہوگی۔ظہر پڑھنے کی ضرورت نہیں،البتہ مجنون اس سے مستثنیٰ ہے۔کیونکہ اس کا نماز پڑھنا ہی صحیح نہیں مذکورہ حضرات (یعنی غلام۔مسافر۔وغیرہ) جمعہ کیلئے آئیں،تو انہیں جمعہ پڑھے بغیر

واپس جاکر ظہر پڑھنے کی اجازت ہے، سوائے مریض کے، کہ وہ وقت شروع ہونے کے بعد آئے اور نماز کھڑی ہو چکی ہو، یا نماز کے انتظار میں زیادہ ضرر کا اندیشہ نہ ہو، تو اسے جمعہ پڑھے بغیر واپس لوٹنے کی اجازت نہیں۔ البتہ اگر ضرر کا اندیشہ ہو، گرچہ جماعت کھڑی ہو چکی ہو مثلاً دست کی شکایت ہو، تو جمعہ پڑھنا لازم نہیں (بلکہ واپس لوٹ کر ظہر پڑھے) اور اگر وقت سے پہلے ہی جمعہ کے لئے آیا ہے تو مریض کیلئے بھی واپس لوٹنا جائز ہے (فتح الوھاب)

مذکورہ حکم میں مریضوں کے ساتھ دیگر عذر والے بھی شامل ہیں جن کا عذر مرض سے مشابہ ہے۔

اور یہ مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ مذکورہ حضرات نے ابھی جمعہ کی نماز شروع نہ کی ہو، اگر شروع کر چکے ہوں۔ تو واپس لوٹنا جائز نہیں (بلکہ جمعہ پوری کرنا ضروری ہے) جن اعذار کی وجہ سے جماعت کا چھوڑنا جائز ہے ان میں سے کوئی بھی ممکن عذر جمعہ میں پایا جائے تو جمعہ کا چھوڑنا بھی جائز ہے۔ راستے میں بہت زیادہ کیچڑ ہونے کی وجہ سے جمعہ اور جماعت چھوڑنا جائز ہے۔

مریض کی تیمارداری کیلئے کوئی قریبی رشتہ دار ہو، اور مریض نزع کے عالم میں ہو، یا نزع کے عالم میں تو نہ ہو، البتہ مریض اس سے مانوس ہو (اور اس کی موجودگی اس کے لئے تسلی واطمینان کا باعث ہو) تو اُسے جمعہ چھوڑ کر مریض کے پاس رہنے کی اجازت ہے، اور اس سے مانوس نہ ہو تو جمعہ چھوڑنا جائز نہیں۔ تیمارداری کرنے والا کوئی اجنبی ہو تو اُسے بھی جمعہ چھوڑنا جائز نہیں۔ غلام، بیوی دوست۔ اور سسرالی رشتہ دار قریبی رشتہ دار کے مانند ہیں۔ مریض کی تیمارداری کیلئے کوئی نہ ہو تو امام الحرمین وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس کے پاس نہ رہنے کی صورت میں اگر اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو اس کی تیمارداری کرنے والے سے بھی جمعہ ساقط ہوگی۔ چاہے مریض قریبی ہو یا اجنبی۔ کیونکہ مسلمان کو ہلاکت سے بچانا فرض کفایہ ہے۔

مریض کو ایسی ظاہری تکلیف ہو، جس کا دور کرنا فرض کفایہ نہ ہو، تب بھی جمعہ کے ساقط ہونے کیلئے یہ ایک عذر ہے۔ (یعنی اس کی تیمارداری کرنے والے سے جمعہ ساقط ہوگی) مریض کی دیکھ بھال کیلئے آدمی تو موجود ہے، البتہ اس کی دوائیاں خریدنے یا قریب المرگ ہونے کی وجہ سے کفن خریدنے اور قبر کھودنے میں مشغول ہو۔ جسکی وجہ سے خدمت کیلئے فارغ نہ ہو تو گویا اس کی تیمارداری کیلئے کوئی نہیں ہے۔

اپاہج پر سواری ملنے کی صورت میں جمعہ واجب ہوگی، چاہے سواری ذاتی ہو یا اجرت پر ملے یا استعمال کیلئے کسی سے لے (یعنی عاریت پر لے) جبکہ سوار ہونے میں اسے کوئی دشواری بھی نہ ہو۔

نابینا کو مسجد تک لے جانے والا کوئی رہبر ملے، چاہے مفت میں ملے یا اجرت پر تو جمعہ واجب ہوگی۔ اجرت پر ملنے کی صورت میں اس کے پاس مال بھی موجود ہو۔ امام قاضی حسینؒ فرماتے ہیں کہ اگر بغیر رہبر کے لاٹھی کے ذریعے اچھی طرح چل سکتا ہو تب بھی جمعہ لازم ہوگی۔

کوئی اجنبی کسی شہر میں آکر بسے اور اسے اپنا وطن بنائے تو اس پر جمعہ واجب ہوگی، اور اس کے ذریعے منعقد بھی ہوگی۔ اور اگر اُسے اپنا وطن نہ بنائے بلکہ اقامت کی مدت کے بعد اپنے شہر لوٹنے کا ارادہ ہو، خواہ یہ مدت کم ہو یا زیادہ۔ جیسے کوئی تجارت یا علم حاصل کرنے کی غرض سے دوسرے شہر چلا گیا تو اس پر جمعہ واجب تو ہوگی، لیکن اس کے ذریعے منعقد نہ ہوگی (یعنی مطلوبہ ۴۰/ اشخاص میں اس کا شمار نہ ہوگا۔) کسی بستی میں اہل کمال (یعنی ایسے افراد جنکے ذریعہ جمعہ منعقد ہوتی ہو) میں سے چالیس افراد موجود ہوں، تو ان پر جمعہ لازم ہوگی۔ لہٰذا یہ لوگ اپنی بستی میں جمعہ ادا کریں تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کسی دوسری بستی (یا شہر) میں جاکر ادا کریں تو ان سے فرض تو ساقط ہو جائیگا۔ البتہ اپنی بستی میں جمعہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہونگے۔

اور کسی بستی میں اہل کمال میں سے چالیس افراد نہ ہوں، تو اس کی دو صورتیں ہونگی (۱) جس شہر یا گاؤں میں جمعہ ادا کی جارہی ہو

وہاں سے ان لوگوں کواذان سنائی دے تو (اس بستی میں جاکر) جمعہ ادا کرنا ان لوگوں پر واجب ہے۔

حدیث: جواذان کی آواز سنے اس پر جمعہ واجب ہے۔(رواہ ابوداؤد ۔ فتح الوھاب)

اذان سنائی دینے کی تفصیل: ایسے وقت جبکہ سناٹا اور ہوا پرسکون ہو جمعہ کی بستی کے اس کنارہ سے جو مذکورہ بستی کی طرف ہو، کوئی بلند آواز موذن عام بلند آواز سے اذان دے، اور اس بستی کے کنارہ سے ایک معتدل سماعت کے شخص کو توجہ دینے کی صورت میں سنائی دے تو اس بستی والوں کو وہاں جمعہ کیلئے حاضر ہونا لازم ہے۔ کوئی بستی کسی پہاڑ کی چوٹی پر آباد ہو، اور بستی والوں کو بلندی پر ہونے کی وجہ سے اذان سنائی دے لیکن اگر وہی بستی کسی ہموار حصہ پر ہوتی تو انھیں اذان سنائی نہ دیتی تو اس بستی والوں پر جمعہ واجب نہیں۔ اور اگر کوئی بستی کسی پست حصہ میں آباد ہو۔ اور پستی میں ہونے کی وجہ سے اذان کی آواز سنائی نہ دے۔ لیکن بالفرض یہی بستی کسی ہموار جگہ پر ہوتی تو آواز سنائی دیتی تو اس بستی والوں پر جمعہ واجب ہوگی۔

(۲) جس شہر میں جمعہ ادا کی جارہی ہے وہاں سے اس بستی والوں کو اذان کی آواز نہ پہنچے تو ان پر جمعہ واجب نہیں۔

خیموں میں رہنے والے حضرات اگر کسی جگہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں، تو اس جگہ پر جمعہ ادا نہ کریں۔ گرچہ وہاں سے کوچ نہ کرتے ہوں۔ بلکہ اگر انہیں قریب کی بستی سے اذان کی آواز سنائی دے، تو وہاں جاکر جمعہ ادا کرنا واجب ہے۔ ورنہ نہیں۔ جیسا کہ کسی بستی میں چالیس سے کم افراد ہونے کی صورت میں حکم ہے۔ (یعنی ایسے افراد اپنی جگہ ظہر ادا کریں) جس بستی میں چالیس سے کم افراد ہوں، اور انہیں دوشہروں سے اذان کی آواز سنائی دے تو جمعہ کیلئے کہیں بھی جانا جائز ہے، لیکن بڑی جماعت میں شرکت افضل ہے۔ جن اعذار کی وجہ سے جمعہ ترک کرنا جائز ہے، وہ زوال کے بعد طاری ہوں، تب بھی جمعہ ترک کرنا جائز ہے بجز سفر کے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جمعہ کے دن زوال کے بعد سفر کا حکم: اگر ساتھیوں سے جدا ہونے کا یا پیچھے رہنے کی صورت میں کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو اور (سفر کی صورت میں) دوران راہ کسی جگہ جمعہ ملنے کا امکان بھی نہ ہو تو زوال کے بعد سفر جائز نہیں ورنہ جائز ہے۔ فجر اور زوال کے درمیان سفر کرنے کی صورت میں اگر کسی جگہ جمعہ ملنے کا امکان نہ ہو تو سفر حرام ہے چاہے مباح سفر ہو۔ یا نیکی کا سفر ہو (مثلاً حج عمرہ وغیرہ) ورنہ جائز ہے۔ (فتح الوھاب) فجر سے پہلے سفر کرنا جائز ہے۔ (المجموع ۔ ۴/۴۹۹)

جس صورت میں زوال کے بعد سفر کرنا حرام ہے کسی نے سفر کیا تو وہ گنہگار ہوگا اور اُسے جمعہ فوت ہونے تک سفر کی رخصت پر عمل کرنا جائز نہیں بلکہ جمعہ فوت ہونے کے بعد سے اور اس کے سفر کی ابتداء ہوگی۔ جن معذورین کو جمعہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ انکی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جمعہ فوت ہونے سے پہلے جس کے عذر کے زائل ہونے کی امید ہو۔ مثلاً ایسا مریض جسکے مرض میں تخفیف کی امید ہو، تو ایسے شخص کیلئے ظہر کو جمعہ فوت ہونے تک مؤخر کرنا مستحب ہے، ممکن ہے وہ عذر ختم ہوجائے اور جمعہ ادا کرنے کا موقع مل جائے امام کے دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد جمعہ فوت ہوجاتی ہے۔

(۲) جس کے عذر کے ختم ہونے کی امید نہ ہو، جیسے کہ عورت اور اپاہج آدمی۔ ایسے لوگوں کیلئے ظہر اول وقت پڑھنا افضل ہے۔ معذورین کسی جگہ جمع ہوں، تو باجماعت ظہر ادا کرنا مستحب ہے۔ معذورین کا عذر مخفی ہو، تو مخفی طور پر ظہر باجماعت ادا کرنا مستحب ہے، تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اور عذر مخفی نہ ہو تو سب کے سامنے جماعت بنانے میں حرج نہیں۔ معذور جمعہ فوت ہونے سے قبل ظہر ادا کرے۔ پھر نماز کے بعد اس کا عذر ختم ہوجائے تو اب اسے جمعہ پڑھنا لازم نہیں، گرچہ اسے جمعہ مل سکتی ہو۔ البتہ خنثیٰ مشکل اس سے مستثنیٰ ہے، ظہر ادا کرنے کے بعد مرد ثابت ہو۔ اور جمعہ مل سکتی ہو تو اس پر لازم ہے۔ معذورین کیلئے ظہر ادا کرنے کے بعد جمعہ کیلئے آنا مستحب ہے۔

آنے کے بعد جمعہ ادا کریں تو فرض انکی ظہر ہی شمار ہوگی، اور جمعہ کی نماز نفل ہوگی۔ دوران ظہر عذر ختم ہوجائے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی۔ بلکہ نماز جاری رکھے۔ بلاعذر جمعہ فوت ہونے سے پہلے ظہر ادا کرنا صحیح نہیں کیونکہ جمعہ کے دن اصلی فرض جمعہ کی نماز ہے نہ کہ ظہر شہر کے تمام یا بعض افراد جمعہ ترک کرکے ظہر ادا کریں تو گنہگار ہونگے۔ اور ظہر صحیح نہ ہوگی کیونکہ جمعہ کا فرض ذمہ میں باقی ہے۔ اور ظہر ادا کی ہے۔ لہٰذا انہیں جمعہ کیلئے آنا واجب ہے اگر آکر جمعہ ادا کریں تو ٹھیک اور جمعہ فوت ہوگئی تو ظہر کی قضاء کریں۔ شہر کے تمام افراد جمعہ کے بجائے ظہر پڑھیں، تو جمعہ کی نماز وقت نکل جانے سے یا اتنا تنگ ہونے سے جس میں صرف دو رکعت ادا کرنے کی گنجائش باقی رہے فوت ہوگی۔

تیسرا باب۔ جمعہ ادا کرنے کی کیفیت کے بیان میں

جمعہ کی نماز دو رکعت ھیں۔

حدیث: حضرت عمرؓ سے مروی ہے جمعہ کی نماز دو رکعت ہیں (رواہ النسائی) اور ارکان میں دیگر نمازوں کی طرح ہیں۔ البتہ چند مستحب امور کی وجہ سے دیگر نمازوں سے ممتاز ہے۔ مستحب امور: (۱) جمعہ کے دن غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: (۱) ''تم میں سے کوئی جمعہ کیلئے آئے تو غسل کرے۔'' (متفق علیہ)

(۲) ''جو شخص جمعہ کے دن وضو کرے تو یہ اچھی بات ہے۔ اور غسل کرے تو غسل کرنا افضل ہے۔'' (رواہ الترمذی، وقال حدیث، حسن) جمعہ کے غسل کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے۔ جمعہ کیلئے جاتے وقت غسل کرنا مستحب ہے۔ اور یہ غسل جمعہ میں شریک ہونے والے کیلئے مستحب ہے، چاہے اس پر جمعہ واجب ہو یا نہ ہو۔

غسل کے بعد حدث اصغر پیش آجائے تو غسل باطل نہ ہوگا، بلکہ صرف وضو کرے، جمعہ کا غسل کرنے کے بعد جماع یا کسی اور وجہ سے جنبی ہوجائے، تو جمعہ کا غسل باطل نہ ہوگا، بلکہ صرف جنابت کا غسل کرے۔

کسی پر جمعہ کے دن جنابت وغیرہ کی وجہ سے غسل واجب ہوجائے تو جنابت اور جمعہ کیلئے ایک غسل کرنا کافی ہے، الگ الگ دو غسل کی ضرورت نہیں۔ البتہ نیت دونوں غسلوں کی کرنا ضروری ہے۔ صرف جمعہ کے غسل کی نیت کرے جنابت کی نہ کرے، تو جنابت کا غسل حاصل نہ ہوگا، اور اگر صرف جنابت کی نیت کرے، تو جمعہ کا غسل حاصل نہ ہوگا (المجموع ۴/ ۵۳۴) کوئی شخص وضو کے بعد پانی ختم ہونے کی وجہ سے، یا بدن پر پھوڑے وغیرہ کی وجہ سے غسل سے عاجز ہو تو تیمم کرے، اس سے غسل کی فضیلت حاصل ہوگی۔ کسی نے جمعہ کیلئے صبح صادق سے پہلے غسل کیا تو صحیح نہیں۔ (المجموع۔ ۴/ ۵۳۶)

مسنون غسل: (۱) میت کو غسل دینے والے کیلئے میت کو غسل دینے کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: (۱) ''جو میت کو غسل دے اسے غسل کرنا چاہئے''۔ (رواہ الترمذی)

(۲) ''میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل کرنا ضروری نہیں''۔ (رواہ الحاکم)

(۲) کافر کا اسلام لانے کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے قیس بن عاصم اور ثمامہ بن اثال کو اسلام لانے کے بعد غسل کا حکم دیا۔ (رواہ ابن حبان و ابن خزیمہ) اور دیگر بہت سارے حضرات کو اسلام لانے کے بعد غسل کا حکم نہیں دیا۔ اگر کافر کو حالت کفر میں ایسا کوئی سبب پیش آیا ہو جس سے غسل واجب ہوتا ہو، مثلاً جنابت وغیرہ تو اسے اسلام لانے کے بعد غسل کرنا لازم ہے

(۳) بے ہوش اور مجنون کو افاقہ کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

(۴) حجامت (پچھنے لگوانے) کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، ''آپ ﷺ چار حالتوں میں غسل کرتے تھے۔'' جنابت کی وجہ سے جمعہ کے دن، پچھنے لگوانے کی وجہ سے اور میت کو غسل دینے کے بعد۔ (رواہ ابوداؤد۔ ابن خزیمہ، والحاکم)

(۵) ہر اجتماع (لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ) میں شرکت کیلئے نیز بدن میں بدبو پیدا ہو تو غسل کرنا سنت ہے۔

تمام مسنون غسلوں میں جمعہ اور غاسلِ میت کے غسل کی زیادہ تاکید آئی ہے۔ اور ان دونوں میں جمعہ کا غسل زیادہ مؤکد ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق بکثرت احادیث وارد ہیں (اور بعض ائمہ نے واجب قرار دیا ہے)

(۲) جمعہ کے دن امام کے علاوہ دیگر لوگوں کیلئے جامع مسجد جلدی جانا مستحب ہے، اور پہلی گھڑی میں جانا افضل ہے۔ پھر دوسری میں پھر تیسری میں اسی طرح ترتیب اور اوران گھڑیوں کا شمار طلوع فجر سے کیا جائے گا۔ اور ان گھڑیوں سے درجات کی ترتیب مراد ہے۔ پہلے گھڑی میں آنے والے کیلئے ایک اونٹ قربان کرنے کا، دوسری میں آنے والے کیلئے ایک گائے یا بیل قربانی کرنے کا، تیسری میں آنے والے کیلئے ایک دنبہ کا، چوتھی میں آنے والے کیلئے ایک مرغی صدقہ کرنے کا، اور پانچویں میں آنے والے کیلئے ایک انڈے کا ثواب ملتا ہے۔

حدیث: جو شخص جمعہ کے دن غسل کرکے پہلی ساعت (گھڑی) میں (مسجد کے لئے) روانہ ہوا گویا اس نے اونٹ کی قربانی پیش کی، جو دوسری ساعت میں روانہ ہوا گویا اس نے بیل کی قربانی پیش کی، جو تیسری ساعت میں روانہ ہوا گویا اس نے سینگ والے مینڈھے کی قربانی کی۔ جو چوتھی ساعت میں روانہ ہوا گویا مرغ کی، قربانی کی جو پانچویں ساعت میں روانہ ہوا گویا ایک انڈے کے ذریعے تقرب حاصل کیا پھر جب امام (خطبہ کے لئے) آجائے تو ملائکہ ذکر (خطبہ) سننے کیلئے حاضر ہو جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم) ایک ہی گھڑی میں پہلے آنے والے کو بعد میں آنے والے کے مقابلے میں زیادہ فضیلت حاصل ہوگی۔ مثلاً ایک شخص گھڑی کے ابتداء میں آیا، اور دوسرا اسی گھڑی کے آخر میں، تو دونوں اصل اونٹ یا گائے بیل وغیرہ کے ثواب میں برابر ہونگے۔ البتہ ابتداء میں آنے والے کو آخر میں آنے والے کے مقابلے میں ایک کامل جانور کا ثواب ملے گا۔ اور درمیان میں آنے والے کو متوسط جانور کا ثواب ملے گا (المجموع۔ ۴/ ۵۴۱) امام کیلئے خطبہ کے وقت آنا مسنون ہے۔ (فتح الوھاب)

(۳) جمعہ کے دن بال کٹوانا، ناخن تراشنا، مسواک کرنا، بدبو زائل کرنا، تیل لگانا، خوشبو لگانا، اچھے کپڑے پہننا سنت ہے۔ سفید کپڑے پہننا افضل ہے۔

احادیث: (۱) جو شخص جمعہ کے دن غسل کرکے اچھے کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر جمعہ کیلئے آئے اور لوگوں کی گردنوں کو نہ پھاندے (پھلانگے) پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر جو نماز فرض کی ہے اُسے ادا کرے، اور امام کے نماز سے فارغ ہونے تک خاموش رہے تو یہ اس کے لئے اس جمعہ اور سابقہ جمعہ کے درمیان (گناہوں کیلئے) کفارہ ہوگا۔ (احمد۔ ابوداؤد۔ ابن حبان۔ والحاکم)

(۲) آپ ﷺ جمعہ کے دن ناخن تراشتے اور مونچھ کترتے۔ (رواہ البزار) امام کے لئے دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ زینت اختیار کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح عمامہ باندھنا بھی مستحب ہے۔ وقت تنگ نہ ہو تو جمعہ اور دیگر نمازوں کیلئے سکون ووقار سے چلے، دوڑ کر نہ جائے۔

حدیث: (۱) ''جب تم نماز کے لئے آؤ تو چل کر آؤ، دوڑ کر نہ آؤ'' (متفق علیہ) جمعہ، عید، جنازہ، اور مریض کی عیادت کے

لئے پیدل جانا مستحب ہے۔

(۲) ''آپ ﷺ عید اور جنازہ میں سوار ہوکر نہیں جاتے تھے (تلخیص) البتہ کوئی عذر ہو تو سوار ہوکر جانے میں کوئی حرج نہیں، اور جب سوار ہوکر جائے تو سواری کو سکون کے ساتھ چلائے۔

(۴) جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورہ منافقون یا پہلی رکعت میں سبح اسم ربك الاعلی اور دوسری میں سورہ غاشیہ پڑھنا سنت ہے۔

حدیث: (۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔''آپ ﷺ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری میں ''سورہ منافقون'' پڑھتے تھے۔'' (مسلم)

(۲) حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے: آپ ﷺ عیدین اور جمعہ میں '' سبح اسم ربك الاعلی اور هل اتاك حديث الغاشيه'' پڑھتے تھے۔ (مسلم) اگر پہلی رکعت میں سورہ جمعہ پڑھنا بھول جائے یا عمداً یا لاعلمی کی وجہ سے ترک کرے۔ تو دوسری رکعت میں سورہ منافقون کے ساتھ پڑھے۔ اگر پہلی رکعت میں سورہ منافقون پڑھے تو دوسری میں سورہ جمعہ پڑھے۔ اور سورہ منافقون لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

جمعہ کے وقت مسجد میں داخل ہونے والا لوگوں کی گردنوں کو پھاندتے ہوئے آگے نہ بڑھے۔

حدیث: آپ ﷺ نے جمعہ کے دن ایک شخص کو گردنوں کو پھاندتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے اسے فرمایا کہ بیٹھ جا۔ تو نے تکلیف دی اور تاخیر کی۔ (ابن حبان۔ حاکم وصححاه)

امام کو آگے جانے کے لئے راستہ نہ ہو تو گردنوں کو پھاند کر جانے میں کوئی حرج نہیں۔ مسجد میں داخل ہونے والے کیلئے پیچھے بیٹھنے کے واسطے جگہ نہ ہو اور آگے جگہ خالی ہو اور وہاں تک جانے کیلئے گردنوں کو پھاند کر جانے کی ضرورت پڑے تو جا سکتا ہے۔ مسجد میں کسی آدمی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھنا جائز نہیں۔

حدیث: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا! کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر وہاں نہ بیٹھے بلکہ کہے، جگہ کشادہ کرو۔ (متفق عليه)

کسی شخص کو جگہ پکڑنے کیلئے بھیجنا جائز ہے۔ اور آنے کے بعد اسے اٹھانا جائز ہے۔ کسی آدمی کے بیٹھنے کے واسطے کپڑا بچھایا گیا تو دوسرے کیلئے اس پر بیٹھنا جائز نہیں، البتہ اس کپڑے کو ہٹا کر اس جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ خطبہ سے پہلے آنے والے کیلئے ذکر، قرآن کی تلاوت اور درود شریف پڑھنے میں مشغول رہنا مستحب ہے جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں کثرت سے درود پڑھنا مستحب ہے نیز جمعہ کے دن کثرت سے دعا کرے، شاید دعا کے قبولیت کی گھڑی حاصل ہو جائے۔ قبولیت کی گھڑی کے سلسلے میں بہت اختلاف ہے۔ البتہ راجح قول وہ ہے جو صحیح مسلم سے ثابت ہے کہ قبولیت کی گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز پوری ہونے تک ہے۔ جمعہ کے دن اور رات میں سورہ کہف پڑھنا مستحب ہے جمعہ کی نماز کے بعد متصلاً کوئی نماز نہ پڑھے بلکہ وہاں سے ہٹ کر پڑھے۔ یا گفتگو کے ذریعہ فصل کرے۔ جمعہ کے دن زوال کے بعد اور نماز سے پہلے خرید و فروخت کرنا مکروہ ہے۔ امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد اذان شروع ہوتے ہی خرید و فروخت کرنا حرام ہے۔ اگر دو آدمی خرید و فروخت کا معاملہ کریں اور ان میں سے ایک پر جمعہ فرض ہو اور دوسرے پر نہ ہو تو دونوں گنہگار ہونگے۔ زوال سے پہلے بیع کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ بیع کے حرام ہونے کے باوجود کسی نے بیع کی تو اس کی بیع صحیح ہوگی۔ بیع کے علاوہ دیگر پیشے

اور معاملات وغیرہ جو جمعہ کی حاضری سے روکنے یا تاخیر کا باعث ہو وہ بھی بیع کی طرح حرام ہیں۔ کسی نے امام کے منبر پر بیٹھنے سے پہلے اذان دی تو بیع حرام نہ ہوگی۔ (مسجد سے دوری کی وجہ سے) جسے جمعہ پانے کیلئے خطبہ کی اذان سے قبل یا زوال سے قبل ہی مسجد کی طرف بڑھنا ضروری ہو، اس کیلئے اسی وقت سے بیع حرام ہے۔ (جمل)

اذان سن کر جمعہ کے ارادہ سے نکلے اور راستے میں چلتے چلتے بیع کرے یا جامع مسجد میں بیٹھ کر بیع کرے تو یہ حرام نہیں کیونکہ مقصود یہ ہے کہ جمعہ کے لئے تاخیر نہ ہو، البتہ جمعہ اور دیگر ایام میں مسجد میں بیع کرنا مکروہ ہے۔ جمعہ اور دیگر نمازوں کیلئے جاتے وقت یا ان نمازوں کے انتظار کے وقت انگلیوں کے درمیان تشبیک نہ کرے۔ (یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل نہ کرے) اور نہ کوئی فضول حرکت کرے۔

حدیث: حضرت کعب بن عجرہؓ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا! تم میں سے کوئی شخص اچھی طرح وضو کر کے (نماز کے ارادہ سے) مسجد کی طرف نکلے، تو اپنی انگلیوں کے درمیان تشبیک نہ کرے، کیونکہ وہ نماز کے حکم میں ہے۔ (رواہ الترمذی)

کوئی جامع مسجد میں امام کی جگہ یا لوگوں کے راستے میں بیٹھے تو اسے اٹھنے کا حکم دے۔ کوئی لوگوں کی طرف رخ کر کے (اور قبلہ کی جانب پیٹھ کر کے) بیٹھے اور جگہ بھی تنگ ہو تو اسے وہاں سے دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم دے۔ جگہ تنگ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ خطیب جب سورہ احزاب کی آیت "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" پڑھے تو سننے والوں کیلئے اتنی بلند آواز سے آپ ﷺ پر درود پڑھنا جائز ہے، جسے قریب کا آدمی سن سکے۔ (بہت زور سے پڑھنا بدعت ہے۔) (جمل) جمعہ کے دن مسجد میں ٹیک لگا کر بیٹھنا یا پاؤں پھیلا کر بیٹھنا مکروہ ہے، البتہ کوئی بیمار ہو تو حرج نہیں، لیکن اس صورت میں ایسی جگہ بیٹھنا مستحب ہے جس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ (المجموع۔ ۴/۵۴۸)

صلاۃ الخوف (خوف کی حالت میں نماز) (من فتح الوھاب)

آیت: وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ (سورہ نساء ۱۰۲)

ترجمہ: اور جب آپؐ ان میں تشریف رکھتے ہوں اور اسی طرح آپ کے بعد جو امام ہو) پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں۔ (اور اندیشہ ہو کہ اگر سب نماز میں لگ جاویں گے تو کوئی دشمن موقع پاکر (حملہ کر بیٹھے گا) تو یوں چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ (نماز میں) کھڑے ہو جاویں اور وہ لوگ ہتھیار لے لیں۔ پھر جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو یہ لوگ (نگہبانی کے لئے) تمہارے پیچھے ہو جاویں اور دوسرا گروہ جنھوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی آجاویں اور آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار لے لیں۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں صلوۃ الخوف کے ۱۶ انواع اور طریقے سامنے آتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے ان میں سے چار کو اختیار کیا ہے (کیونکہ یہ طریقے عام نمازوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں تغیر کم ہے۔ اور ایک طریقے کا ذکر قرآن میں بھی ہے، لہٰذا صحیح روایت سے دوسرے کسی طریقے کی کیفیت معلوم ہو تو اس پر بھی عمل کر سکتا ہے) (تحفہ مع الشروانی ۳/۴۳۰)

(۱) عُسفان کی نماز: دشمن قبلہ کی طرف ہو، اور مسلمانوں میں اتنی کثرت ہو کہ نصف حضرات تنہا دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں،

اور دونوں میں کچھ حائل نہ ہو، تو امام تمام مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تمام کو ایک ساتھ نماز پڑھائے۔ اعتدال کے بعد ایک صف (ایک حصہ) امام کے ساتھ دونوں سجدہ کرے اور دوسری صف اعتدال ہی میں پہرہ دیتی رہے، پہلی صف سجدہ سے اٹھے تو دوسری صف سجدہ کر کے امام کے ساتھ شامل ہو، اور کثرت افعال کے بغیر یہ صف آگے بڑھے اور پہلی صف پیچھے ہٹے، دوسری رکعت میں اب جو پہلی صف ہے وہ سجدہ کرے اور دوسری صف پہرہ دے جب پہلی صف تشہد کے لئے بیٹھے تو یہ لوگ سجدہ کریں اور تشہد پڑھ کر امام سب کے ساتھ سلام پھیرے، یہ نوع مسلم کی حدیث میں ہے۔ اگر دونوں رکعت میں ایک ہی فرقہ (گروہ) پہرہ دے اور بقیہ امام کی متابعت کریں تو یہ جائز ہے۔

(۲) بطن نخل کی نماز: اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، دشمن قبلہ کی سمت نہ ہو، یا قبلہ کی سمت ہو لیکن درمیان میں کچھ حائل ہو، تو امام لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں گروہ کو الگ الگ ایک ایک مرتبہ نماز پڑھائے، اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابلہ پر رہے، دوسری نماز امام کے لئے نفل ہوگی، یہ طریقہ غیر خوف میں بھی جائز ہے، لیکن مسلمانوں کی کثرت اور دشمنوں کی قلت اور دوران نماز اچانک حملہ آور ہونے کا خدشہ ہو تو سنت ہے۔

(۳) ذات الرقاع کی نماز: یہ طریقہ بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ دشمن قبلہ کی طرف نہ ہو یا درمیان میں کچھ حائل ہو تو ایک گروہ دشمن کے مقابلہ پر رہے اور دوسرے کو امام دو رکعت کی نماز میں ایک رکعت پڑھائے۔ پھر امام کے دوسرے رکعت کے قیام میں یہ گروہ امام سے جدا ہونے کی نیت کر کے اپنی ایک رکعت تنہا مکمل کر کے دشمن کے مقابلہ میں چلا جائے، امام قیام میں دوسرے گروہ کا منتظر رہے اور اس کے آنے پر اس کے ساتھ اپنی دوسری رکعت پڑھ کر تشہد میں اس کا انتظار کرے اور وہ گروہ اپنی دوسری رکعت مکمل کر کے امام کے ساتھ تشہد میں مل جائے، پھر امام ان کے ساتھ سلام پھیرے، تاکہ اس گروہ کو امام کے ساتھ سلام کی فضیلت حاصل ہو۔ جیسا کہ پہلے گروہ کو اس کے ساتھ تکبیر تحریمہ کی فضیلت حاصل ہوئی، قیام اور تشہد کے انتظار میں امام تلاوت و تشہد پڑھنے میں مصروف رہے۔ اسطرح جمعہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہر رکعت میں ایسے چالیس افراد ہوں جنھوں نے خطبہ سنا ہو، لیکن دوسری رکعت کے دوران تعداد کم ہو جائے تو حرج نہیں۔ جمعہ کی نماز عُسفان کے طرز پر بدرجہ اولی جائز ہے۔ تین رکعت کی نماز ہو تو پہلے گروہ کو دو رکعت اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھانا افضل ہے۔ اگر چہ اس کے برعکس بھی (یعنی پہلے کو ایک اور دوسرے کو دو) جائز ہے۔ (کیونکہ دوسری صورت میں دوسرے گروہ کے لئے پہلے رکعت میں تشہد کا اضافہ تطویل کا سبب بنے گا اور پہلی صورت میں اس سے سلامتی ہے) پہلی صورت میں پہلے گروہ کے نماز سے فارغ ہو کر دوسرے کے آمد کا انتظار تشہد میں یا تیسرے قیام میں کرے۔ قیام میں انتظار افضل ہے کیونکہ قیام محل تطویل ہے۔ چار رکعت کی نماز میں دونوں فریق کو دو دو رکعت پڑھائے اور دونوں کے ساتھ ایک ایک تشہد پڑھے۔ اور دوسرے فریق کا انتظار تشہد کی نشست میں کرے، یا تیسرے قیام میں اور یہ افضل ہے، جیسا کہ گذرا۔ اگر تین رکعت کی نماز میں تین اور چار رکعت کی نماز میں چار فرقوں میں ان کو تقسیم کر کے ہر ایک فریق کے ساتھ ایک ایک رکعت پڑھتا رہے تو یہ بھی جائز ہے، گر چہ بلا حاجت اس طرح کرے۔ پہلے فرقے ایک ایک رکعت پڑھ کر جدا ہوں اور اپنی نماز مکمل کریں۔ اور امام دوسرے فرقے کا انتظار کرتا رہے۔ اور آخری فریق کا انتظار تشہد میں کرے تاکہ ان کے ساتھ سلام پھیرے۔

ذات الرقاع والی نماز کی کیفیتیں: عسفان اور بطن نخلہ والی نماز سے افضل ہے، کیونکہ اس کی صحت پر فی الجملہ اجماع ہے، بخلاف ان دونوں کے اور مسلمانوں کی کثرت کے وقت یہ طریقہ مسنون ہے۔ ذات الرقاع والی نماز حالتِ امن میں بھی پہلے فرقے کے لئے جائز ہے۔ دوسرا فرقہ اگر اپنی نماز کے تکمیل کے وقت جدائی کی نیت کرے تو اس کے لئے بھی جائز ہے۔

دو رکعت کی نماز ذات الرقاع کے طرز پر ہو تو ہر فریق کا سہو امام اٹھائے گا۔ کیونکہ وہ حساً یا حکماً مقتدی ہیں۔ سوائے پہلے فریق کے دوسرے رکعت کے سہو کے، کیونکہ وہ امام سے جدا ہو چکے۔ پہلی رکعت میں امام کا سہو سب کو لاحق ہوگا، لھذا امام سجدہ نہ بھی کرے تو سب کریں گے دوسری رکعت میں امام کا سہو دوسرے فریق کو لاحق ہوگا نہ کہ پہلے فریق کو، کیونکہ وہ سہو سے قبل امام سے جدا ہو چکے۔ اسی اعتبار سے تین اور چار رکعت کی نماز کے سہو کا اندازہ کرلو۔

صلوٰۃ الخوف کے مذکورہ تینوں طریقوں میں احتیاطاً نمازی کو اپنا ہتھیار ساتھ رکھنا سنت ہے، جو نماز کی صحت کے منافی نہ ہو (جیسے نجس وغیرہ نہ ہو) اور اس سے کسی اور کو تکلیف نہ ہو، اور اس کے ترک میں بظاہر خطرہ نہ ہو، مراد ایسے ہتھیار ہیں جو قتل کرتے ہیں جیسے نیزہ، تلوار، چھری کمان و تیر، نہ کہ وہ دفاع میں مستعمل ہوں جیسے زرہ اور ڈھال۔ درمیانِ صف نیزہ جیسی ایذا رساں چیز رکھنا مکروہ ہے، بلکہ دوسرے کو لگنے کا غالب گمان ہو تو حرام ہے۔ جس ہتھیار کے ترک کرنے میں بظاہر خطرہ موجود ہو اسے ساتھ رکھنا واجب ہے۔ سامنے رکھ کر وقت پر ہاتھ بڑھا کر فوراً اٹھا سکتا ہو، جیسا کہ ساتھ ہونے کی صورت میں، تو اس طرح سامنے رکھنا بھی کافی ہے۔ بلکہ ساتھ رکھنے سے نماز صحیح نہ ہوتی ہو تو سامنے قریب ہی رکھنا چاہیے۔

(۴) شدت خوف کی حالت میں نماز: شدت خوف کی صورت میں ہر کوئی اپنے طور پر جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھے۔ چاہے گھمسان کی لڑائی جاری ہو اور اسے چھوڑ کر ہٹ ہی نہ سکتے ہوں، یا یہ بات تو نہ ہو لیکن وہاں سے ہٹنے یا تقسیم کی صورت میں اچانک دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو۔ سوار یا پیدل جیسے ممکن ہو نماز پڑھے، رکوع سجدہ نہ کر سکتا ہو تو اشارے سے ادا کرے، لیکن نماز کو وقت سے مؤخر نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا" (البقرہ ۲۳۹) (پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ (پیدل) پڑھ لو یا سوار)۔ دشمن کی وجہ سے قبلہ سے رخ ہٹنے میں حرج نہیں۔ لیکن سواری کے اڑیل پن سے زیادہ دیر بغیر قبلہ رو گذرے تو صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا قبلہ رو ہو کر یا بغیر قبلہ رو (جس طرح بن پڑے نماز پڑھو) امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ نے اسے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے آپس میں بعض کی بعض اقتداء کر سکتے ہیں، امام و مقتدی کا رخ الگ الگ بھی ہو تو حرج نہیں جیسا کہ کعبۃ اللہ کے چاروں طرف نماز میں ہوتا ہے۔ حالت امن کی طرح یہاں بھی جماعت افضل ہے۔ حاجت کی وجہ سے عمل کثیر میں معذور سمجھا جائے گا، جیسے مسلسل نیزہ بازی اور تلوار بازی۔ چلانے میں معذور نہ ہوگا کہ اس کی حاجت نہیں۔ ہتھیار میں غیر معاف نجاست ہو تو احتیاج کی صورت میں اُسے اٹھا سکتا ہے۔ البتہ یہ عذر نادر ہے۔ اس لئے بعد میں اس نماز کی قضاء کرلے، احتیاج نہ ہے تو اسے ڈال دے۔

درج ذیل صورتوں میں بھی خوف پایا جاتا ہے اسلئے مسافر ہو یا مقیم ان صورتوں میں صلاۃ الخوف کی اجازت ہوگی۔

(۱) ہر مباح قتال جیسے عادل کا باغی کے ساتھ قتال (۲) صاحب مال کا اس آدمی سے قتال جو ظلماً اس کا مال لینا چاہے (۳) آگ، سیلاب یا درندہ سے بچنے کے لئے بھاگنا اور دوڑنا جبکہ کوئی اور بچاؤ کا راستہ نہ ہو (۴) قرض خواہ پیچھے لگے، اور مقروض تنگدست ہو، اگر اس نے پکڑ لیا تو قید میں ڈال دیگا۔ نہ وہ اس کی تنگدستی کو تسلیم کر رہا ہے اور نہ اس کے پاس پیش کرنے کیلئے گواہ ہیں، لہٰذا اس کے ہاتھ سے بچنے کے لئے بھاگ رہا ہے۔

عشاء کو رک کر پڑھنے کی صورت میں حاجی کو وقوف عرفہ کے فوت ہونے کی وجہ سے حج فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ سفر کرتے ہوئے عشاء نہیں پڑھ سکتا، بلکہ عشاء کو بعد میں قضاء کرلے، کیونکہ نماز کی قضاء حج کی قضاء کے بہ نسبت آسان ہے۔

دور سے کچھ وجود نظر آیا اور اسے دشمن سمجھ کر یا دشمن کو اپنے سے دگنا سے زائد سمجھ کر صلاۃ الخوف پڑھی، بعد میں اس کے برعکس

ظاہر ہوا، مثلاً وجود جانور کا تھا اور دشمن صرف دوگنا تھے، تو اس نماز کو قضاء کریں، کیونکہ جس گمان کی غلطی بالکل واضح ہو جائے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

فصل ۔ لباس وغیرہ کے متعلق

مرد اور خنثیٰ پر خاص ریشم کا کپڑا اور ایسے کپڑا جس میں ریشم کی مقدار وزن کے اعتبار سے زائد ہو حرام ہے۔ صحیحین کی روایت میں مردوں کو اس سے روکا گیا ہے، احتیاطاً خنثیٰ پر بھی وہی حکم لگایا گیا۔ اکثر حصہ دوسرا کپڑا (غیر ریشم) ہو یا دونوں برابر ہوں تو استعمال جائز ہے، کیونکہ اسے ریشمی کپڑا نہیں کہا جائے گا۔ اگر کوئی مجبوری ہو جیسے سخت اور ضرر رساں گرمی وسردی اور اچانک جنگ کا آ جانا، اور دوسرا کوئی کپڑا میسر نہ ہو، تو یہ حرام نہ ہوگا۔ اسی طرح حاجت جیسے خارش ہو اور دوسرا کپڑا تکلیف دہ ہو یا جوں کی کثرت ہو تو جائز ہے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن العوام کو آپ ﷺ نے خارش کی وجہ سے ریشم پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور ان حضرات نے جوں کی شکایت کی تو ریشمی قمیص کی اجازت دی۔ سفر وحضر میں یہی تفصیل ہوگی۔ جنگ جاری ہو اور ہتھیار کے دفاع میں ریشم جیسی کوئی چیز دستیاب نہ ہو تو ریشم کی اجازت ہوگی۔ ولی اور ذمہ دار کو اجازت ہے کہ بچہ اور پاگل کو ریشم پہنائے، کیونکہ وہ غیر مکلف ہے۔ چار انگل کے برابر ریشم کی نقش ونگاری یا پیوند لگا ہو تو یہ حلال ہے۔ (مسلم) یا عادت کے مطابق کپڑے کے کنارے ریشم کا سنجاف (گوٹ) لگایا گیا ہو، تو یہ جائز ہے (مسلم) عورت کو ریشم مطلقاً جائز ہے۔ حتیٰ کہ اس کا بستر وغیرہ بھی کیونکہ حدیث میں ہے۔ ''سونا اور ریشم میری امت کے عورتوں کو حلال ہے اور مردوں پر حرام''۔ (قال الترمذی حسن صحیح)

نجس اور متنجس تیل (جو پاک تیل نجس ہوا ہو) کو چراغ میں جلانا جائز ہے، کیونکہ آپ ﷺ سے اس چوہے کہ متعلق پوچھا گیا جو گھی میں گرا تھا (اور مر گیا تھا) تو آپ ﷺ نے جواب دیا۔ اگر گھی جامد (جما ہوا) ہو تو چوہا اور اطراف کا گھی پھینک دو (بقیہ استعمال کرو) اور اگر مائع (سیال اور پگھلا ہوا) ہو تو اسے چراغ میں استعمال کرو، یا اس سے نفع اٹھاؤ (رواہ الطحاوی، قال رجالہ ثقات) چراغ سے مسجد ملوث ہو تو ایسا تیل مسجد میں جلانا ممنوع ہوگا، اسی طرح دوسرے سے کرایہ یا عاریت پر لئے ہوئے مکان میں بھی منع ہوگا۔ کتے یا خنزیر کا تیل استعمال کرنا اس کے نجاست کی شدت کی وجہ سے مطلقاً منع ہے۔

ایسا متنجس (نجاست لگا ہوا) کپڑا جو تر نہ ہو پہننا جائز ہے۔ کیونکہ یہ نجاست عارضی اور وقتی اور بسہولت زائل ہونے والی ہے، لیکن نماز میں اس کی اجازت نہ ہوگی۔ نجس چیز جیسے مردار کی کھال (جسے دباغت نہ دی گئی ہو) پہننا جائز نہیں ہے، کیونکہ عبادت کی پابندی کے اعتبار سے انسان کو نجاست سے دوری اور اجتناب کا تعبدی حکم ہے۔ البتہ بالکل مجبوری کی صورت میں اجازت ہوگی۔

صلوٰۃ العیدین کا بیان (دونوں عید کی نماز)

عیدین کی مشروعیت: اللہ تعالیٰ اپنے کلام مجید میں ارشاد فرماتے ہیں۔ ''فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ'' (اپنے رب کیلئے نماز ادا کرو اور قربانی کرو) اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں صلوٰۃ سے عید الاضحیٰ کی نماز مراد ہے (الجامع لاحکام القرآن ۲/ ۱۴۸)

حدیث: حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے آپ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ جاتے اور سب سے پہلے نماز

پڑھاتے پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر انھیں وعظ و نصیحت کرتے جبکہ تمام حضرات صف میں بیٹھے ہوئے رہتے (متفق علیه)

عیدین کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے، اور ۲ ھ میں مشروع ہوئی، کیونکہ ایک حدیث میں ہے۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے ۲ ھ میں عیدالفطر کی نماز ادا کی (حاشیة الجمل ۲ ۹۲)

عید کی نماز کا حکم: عید کی نماز سنت موکدہ ہے اگر شہر کے تمام افراد اس نماز کو چھوڑ دیں تب بھی امام وقت (حاکم) ان سے قتال نہیں کر سکتا۔ اور یہ نماز منفرد مسافر، غلام، عورت، ہر ایک کیلئے مشروع ہے چاہے پھر گھر میں پڑھے یا کسی اور جگہ۔

عید کی نماز با جماعت سنت ہے، لیکن حاجی کو منیٰ میں اپنے حج کے اعمال کی کثرت کی وجہ سے تنہا پڑھنا افضل ہے (تحفہ)

بلا حاجت عید کی ایک سے زائد جماعت مکروہ ہے، اور حاکم اس سے روک سکتا ہے (تحفہ ۳/ ۲ ۴۹)

وقت: عید کی نماز کا وقت سورج طلوع ہونے سے شروع ہو جاتا ہے البتہ ایک نیزے کے بقدر سورج بلند ہونے کے بعد پڑھنا افضل ہے (اور اس سے قبل خلاف اولی ہے) اور آخری وقت عید کے دن زوال شمس تک ہے۔

نماز عید پڑھنے کیلئے افضل جگہ

عید کی نماز عید گاہ پڑھنا جائز ہے اور مسجد میں بھی، البتہ ان دونوں کے درمیان افضلیت میں اختلاف ہے۔ اگر مکہ یا بیت المقدس میں ہو تو مسجد حرام اور مسجد اقصی میں پڑھنا افضل ہے (حاشیة الجمل ۲/ ۹۹) اور ان دونوں کے علاوہ کسی شہر (یا بستی) میں پڑھنی ہے اور مسجد کشادہ ہو، یا مسجد کشادہ تو نہ ہو، مگر عید گاہ تک جانے کیلئے کوئی عذر درپیش ہو مثلاً بارش یا راستے میں کیچڑ وغیرہ ہو، تو مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔ اور اگر مسجد تنگ ہو تو عید گاہ میں ادا کرنا افضل ہے، بلکہ ایسی صورت میں مسجد میں ادا کرنا مکروہ ہے۔ امام عید گاہ نماز پڑھنے کیلئے جائے تو بوڑھوں کو نماز پڑھانے کیلئے کسی کو اپنا نائب بنائے۔

عید کے رات و دن کی سنتیں

دونوں عیدوں میں سورج غروب ہونے سے لے کر امام کے عید کی نماز کیلئے تکبیر تحریمہ باندھنے تک تکبیر مُرسَل کا پڑھنا مستحب ہے (تکبیر مُرسَل کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ تکبیر کے بیان میں آئے گا)

عیدین کی رات عبادات کیلئے بیدار رہنا مستحب ہے۔

حدیث: جو شخص عیدین کی رات بیدار رہے تو اس کا دل اس دن نہیں مرے گا جس دن سارے قلوب مردہ ہو جائیں گے۔ (رواہ دار قطنی) اور رات کا اکثر حصہ عبادت کرنے سے پوری رات بیدار رہنے کا ثواب ملے گا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہم تک یہ روایت پہنچی ہے پانچ راتوں میں دعا قبول ہوتی ہے جمعہ کی، عیدین کی، رجب کی پہلی اور نصف شعبان کی رات۔

عیدین کیلئے غسل کرنا، خوشبو لگانا، بالوں کو زائل کرنا (چاہے پھر موئے زیر ناف ہوں یا بغل کے ہوں) ناخن کاٹنا، بدبو زائل کرنا، اور اچھے کپڑے پہننا سنت ہے۔ البتہ سفید کپڑوں کا پہننا افضل ہے۔ عمامہ باندھنا بھی مستحب ہے۔ کسی کے پاس ایک ہی کپڑا ہو تو اسے جمعہ اور عید کیلئے دھو کر پہننا مستحب ہے۔ عید کے غسل کا وقت نصف رات سے شروع ہوتا ہے مذکورہ امور (غسل وغیرہ) ہر آدمی کیلئے مستحب ہے خواہ وہ نماز عید کیلئے جائے یا گھر میں بیٹھا رہے۔

عیدالفطر میں نماز کیلئے جانے سے پہلے کوئی چیز کھانا مستحب ہے۔ اگر ممکن ہو تو کھجور طاق عدد کھانا سنت ہے۔ اور عیدالاضحیٰ میں نماز سے پہلے نہ کھانا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت انسؓ سے مروی ہے'' آپ ﷺ عیدالفطر میں نماز کیلئے جانے سے پہلے طاق عدد کھجور کھاتے تھے۔(رواہ البخاری) **حدیث:** حضرت بریدہؓ سے مروی ہے۔ آپ ﷺ عیدالفطر میں نماز سے پہلے اور عیدالضحیٰ میں نماز کے بعد کچھ نوش فرماتے (رواہ احمد۔ والترمذی۔ وابن حبان) عید کی نماز کیلئے امام کے علاوہ دیگر لوگوں کیلئے فجر بعد صبح سویرے جانا مستحب ہے تاکہ اپنے لئے جگہ پکڑیں اور نماز کا انتظار کرتے رہیں۔ البتہ امام کیلئے نماز کے وقت جانا مستحب ہے۔ پھر مسجد یا عیدگاہ پہنچتے ہی نماز عید شروع کرے۔

عید کی نماز کیلئے چل کر جانا سنت ہے۔ اگر بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے چل کر نہیں جا سکتا ہے تو سوار ہو کر جائے، البتہ واپس لوٹتے وقت تندرست آدمی کیلئے بھی سوار ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ عیدالفطر کی نماز تھوڑی تاخیر سے اور عیدالاضحیٰ کی جلدی پڑھنا مستحب ہے۔

نماز عید سے پہلے نفل کا حکم

امام کیلئے نماز عید سے پہلے اور بعد میں نفل پڑھنا مکروہ ہے، البتہ مقتدی کیلئے مکروہ نہیں ہے۔

حدیث: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: آپ ﷺ نے نماز عید سے پہلے اور بعد میں کوئی نفل نہیں پڑھی، (رواہ البخاری)

نماز عید کیلئے جانے اورلوٹنے کا سنت طریقہ

نماز عید کیلئے لمبے راستے سے جانا اور چھوٹے راستے سے واپس لوٹنا سنت ہے۔

حدیث: حضرت جابرؓ سے مروی ہے: آپ ﷺ عید کے دن ایک راستے سے جاتے اور دوسرے راستے سے واپس لوٹتے۔ (رواہ البخاری)

اذان واقامت کا حکم۔ نماز عید کیلئے نہ اذان ہے اور نہ اقامت بلکہ الصّلوۃ جامعۃ کہہ کر لوگوں کو جمع کیا جائے

حدیث: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے آپ ﷺ نے بغیر اذان واقامت کے نماز عید ادا کی اور خطبہ دیا۔ (متفق علیہ)

نماز عید کا طریقہ

عید کی نماز دو رکعت ہے اور ارکان وسنن وغیرہ میں دیگر نمازوں کی طرح ہے اور نیت نماز عید کی کرے اور یہ اس کا ادنی طریقہ ہے۔

اکمل طریقہ حدیث: آپ ﷺ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ میں پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیر کہا کرتے (احمد۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ و دارقطنی وصححہ احمد وعلی والبخاری/تلخیص

تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے استفتاح (یعنی وجہت) پڑھے اس کے بعد پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ اور رکوع کی تکبیر کے علاوہ مزید سات تکبیریں کہے اور دوسری رکعت میں سجدہ سے اٹھنے اور رکوع کیلئے جھکنے کی تکبیر کے علاوہ پانچ زائد تکبیرات کہے۔ اور ان زائد تکبیرات میں ہر دو تکبیروں کے درمیان ایک متوسط آیت کے بقدر ٹھہرنا مستحب ہے (تقریباً سورہ اخلاص کے بقدر ٹھہرے۔ تحفہ)

اور ہر دو تکبیروں کے درمیان ایسے الفاظ پڑھنا مستحب ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد، کبریائی، بزرگی بیان ہو (بیہقی) اسی لئے ان

الفاظ کا پڑھنا افضل ہے۔ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر "ان کلمات کے ساتھ دیگر کلمات کا اضافہ کرنا بھی جائز ہے۔ (مثلاً "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ "پڑھے لیکن ذکر اتنا بھی طویل نہ ہو جائے کہ تکبیرات کے درمیان عرفاً طویل فاصلہ شمار ہو۔) (حاشیۃ الجمل ۲/ ۹۵) (ایک بات یہ ذہن میں رہے کہ) مذکورہ ذکر (پہلی رکعت میں) ساتویں تکبیر (اور دوسری رکعت میں) پانچویں تکبیر کے بعد نہ پڑھے، بلکہ اس تکبیر کے بعد تعوذ پڑھے۔ اسی طرح (پہلی رکعت میں) تکبیر تحریمہ اور زائد تکبیرات میں سے پہلی تکبیر کے درمیان اور (دوسری رکعت میں) پانچ تکبیروں میں سے پہلی تکبیر سے پہلے نہ پڑھے۔ امام نوویؒ نے المجموع میں امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ان زائد تکبیرات کے درمیان ذکر سے فصل نہ کرتے ہوئے پے در پے ان تکبیرات کو کہنا مکروہ ہے (المجموع ۔۵/۱۷)

ان زائد تکبیرات کے بعد تعوذ پڑھ کر سورہ فاتحہ پڑھے (اگر پہلے تعوذ پڑھ لے تو تکبیرات فوت نہ ہوں گی) اگر سورہ فاتحہ شروع کر چکا تو زائد تکبیریں فوت ہو چکیں، لوٹ کر پڑھنا مسنون نہیں، لیکن رکوع سے قبل لوٹ کر ان تکبیروں کو پڑھے۔ تو نماز باطل نہ ہوگی، رکوع سے ان تکبیروں کیلئے لوٹے تو نماز باطل ہوگی۔ (اعانۃ ۱/ ۲۶۲) سورہ فاتحہ کے بعد پہلی رکعت میں سورہ ق اور دوسری رکعت میں سورہ قمر مکمل یا پہلی رکعت میں سورہ اعلیٰ اور دوسری میں سورہ غاشیہ پڑھنا سنت ہے (خواہ مقتدی راضی نہ ہوں)

حدیث: آپ ﷺ "عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں سورہ ق اور سورہ قمر پڑھا کرتے تھے" (رواہ مسلم)

حدیث۔ (۲) حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے آپ ﷺ سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ پڑھا کرتے تھے (رواہ مسلم) لیکن پہلی دو سورتوں کا پڑھنا افضل ہے (تحفہ)

زائد تکبیرات میں رفع یدین کا حکم

زائد تکبیرات میں رفع یدین (یعنی دونوں ہاتھ کاندھوں تک اٹھانا) سنت ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ ان تکبیرات میں رفع یدین کرتے تھے (رواہ البیہقی) ہر تکبیر کے بعد (عام نمازوں کی طرح سینہ کے نیچے ناف کے اوپر) دایاں ہاتھ بائیں پر رکھے نماز عید میں قرأت اور زائد تکبیرات جہراً کہنا سنت ہے۔ البتہ تکبیرات کے درمیان ذکر سراً کہے۔ (تکبیرات زوائد میں مقتدی کو بھی جہر مسنون ہے نیز قضاء پڑھنے کی صورت میں بھی مسنون ہے (الشروانی ۲/ ۴۹۵)

زائد تکبیرات میں شک: اگر تکبیرات کی تعداد میں شک ہو جائے تو کم سے کم عدد لے کر بقیہ تکبیرات پوری کرے۔ آٹھ تکبیرات کہنے کے بعد شک ہو جائے کہ ان میں سے کسی تکبیر سے تکبیر تحریمہ کی نیت کی یا نہیں، تو نئے سرے سے نماز شروع کرے اور یہ شک پیش آ جائے کہ ان تکبیرات میں کس تکبیر سے تکبیر تحریمہ کی نیت کی، تو آخری تکبیر کو تکبیر تحریمہ قرار دیتے ہوئے زائد تکبیرات کا اعادہ کرے، کسی رکعت میں زائد تکبیرات کہنا بھول جائے، اور رکوع میں یا رکوع کے بعد یاد آ جائے تو نماز جاری رکھے تکبیرات کہنے کیلئے واپس لوٹنے کی ضرورت نہیں، اگر لوٹے گا تو نماز باطل ہوگی۔ اگر قرأت کے بعد اور رکوع سے پہلے یاد آ جائے تب بھی تکبیریں کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور زائد تکبیرات کے چھوٹنے کی صورت میں چاہے بھول سے چھوٹ گئی ہوں یا عمداً دونوں صورتوں میں سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں (بلکہ عالماً عامداً سجدہ سہو کرنے سے نماز باطل ہوگی) امام کو دوران قرأت یا دوران تکبیرات پا لے تو مقتدی کیلئے فوت شدہ تکبیرات کہنے کی ضرورت نہیں۔ امام کو رکوع میں پائے تو مقتدی بھی امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہو جائے، زائد تکبیرات کہتے نہ بیٹھے۔ اگر مسبوق امام

کو دوسری رکعت میں پائے تو امام کے ساتھ پانچ تکبیریں کہے اور پھر اپنی دوسری رکعت میں بھی پانچ ہی تکبیریں کہے۔ اگر ایسے امام کے اقتداء میں جو تین یا چھ تکبیرات کہنے کا قائل ہو نماز ادا کرے تو تکبیرات کی تعداد میں امام کی اقتداء کرے اس سے زائد تکبیریں نہ کہے۔

عید کے خطبہ کا وقت اور اس کا طریقه : عید کا خطبہ نماز کے بعد ہے۔

حدیث: (۱) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے آپ ﷺ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ خطبہ سے پہلے نماز عید ادا کرتے تھے۔ (رواہ البخاری و مسلم)

حدیث: (۲) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، میں آپ ﷺ کے ساتھ عید الفطر اور عید الضحیٰ کے دن نکلا تو سب سے پہلے آپ نے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا (رواہ البخاری) لہٰذا امام نماز سے فراغت کے بعد منبر پر چڑھ کر سلام کرکے (جمعہ کی طرح بقدر اذان) بیٹھ جائے، پھر دوبارہ کھڑے ہو کر دو خطبے دے، اور ان دونوں خطبوں کے ارکان جمعہ کے خطبہ مانند ہیں۔ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا بھی مستحب ہے۔ ان خطبوں کو قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر دینا جائز ہے۔ اگر صرف نماز پڑھے اور خطبہ نہ دے تو اس سے نماز پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ کوئی منفرد (تنہا) نماز عید ادا کرے تو اُسے خطبہ دینے کی ضرورت نہیں۔ عید الفطر کے خطبہ میں صدقہ فطر کے احکام اور عید الضحیٰ میں قربانی کے احکام بتلانا مستحب ہے۔ پہلے خطبہ کے ابتداء میں پے در پے (اور جدا جدا) نو تکبیرات اور دوسرے خطبہ کے ابتداء میں سات تکبیرات پڑھنا مستحب ہے۔ اگر ان تکبیرات کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و تہلیل اور ثنا کے کلمات پڑھنا جائز ہے۔ اور مذکورہ نو اور سات تکبیرات نفس خطبہ میں سے نہیں ہیں، بلکہ یہ خطبہ کیلئے بطور مقدمہ کے ہیں۔ خطبہ کو دھیان و توجہ سے سننا مستحب ہے۔ اور نہ سننا مکروہ ہے عید کی نماز اگر عید گاہ میں پڑھی گئی اور نماز کے بعد دوران خطبہ کوئی آئے تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے بلکہ بیٹھ کر خطبہ سنے اور خطبہ ہونے کے بعد نماز عید چاہے عید گاہ میں ادا کرے یا اپنے گھر جا کر۔ اور اگر عید کی نماز مسجد میں پڑھی گئی اور نماز کے بعد دوران خطبہ کوئی آئے تو سب سے پہلے عید کی نماز ادا کرے، پھر خطبہ سنے اور تحیۃ المسجد الگ سے پڑھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ تحیۃ المسجد ثواب نماز عید کے ضمن میں مل جائے گا۔ امام نماز سے پہلے ہی خطبہ دے تو خطبہ شمار نہ ہوگا جیسا کہ فرض کی پچھلی سنت فرض سے پہلے پڑھے تو شمار نہیں ہوتی۔

قضاء : عید کی نماز فوت ہو جائے تو اس کی قضاء کرنا مستحب ہے۔ رمضان کی تیس تاریخ کو زوال سے اتنی دیر پہلے، جس میں لوگوں کا جمع ہو کر نماز عید ادا کرنا ممکن ہو دو عادل شخص گذشتہ رات (یعنی تیسویں رات) چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو روزہ توڑ کر نماز پڑھیں اور یہ نماز ادا شمار ہوگی۔ قضاء نہ ہوگی۔ اور اگر غروب شمس کے بعد گواہی دیں تو نماز کے سلسلے میں گواہی قبول نہ کریں کیونکہ گواہی قبول کرنے کی صورت میں سوائے نماز چھوڑنے کے کچھ فائدہ نہیں۔ لہٰذا دوسرے دن نماز اداءً پڑھے قضاء نہ ہوگی۔ اور اگر زوال کے بعد غروب سے پہلے، یا زوال سے اتنی دیر پہلے جس میں نماز پڑھنا ممکن نہ ہو گواہی دیں تو روزہ توڑ دیں البتہ نماز فوت ہو جائے گی۔ اب اس کی قضاء کرے، خواہ اسی دن قضاء کرے یا دوسرے دن۔ لیکن اگر شہر کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے لوگوں کا اُسی دن جمع ہونا ممکن ہو تو اسی دن پڑھنا افضل ہے، ورنہ دوسرے دن پڑھنا افضل ہے۔

حدیث: ایک قافلہ آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں آکر گذشتہ رات چاند دیکھنے کی گواہی دینے لگا تو آپ ﷺ نے انہیں روزہ افطار کرنے اور (دوسرے دن) صبح کو نماز ادا کرنے کا حکم دیا (رواہ احمد و نسائی والبیھقی وصححه الخطابی) اور دوسرے دن ہی قضاء کرنا ضروری نہیں، بلکہ اس سے بھی مؤخر کرنا جائز ہے۔ دو آدمیوں نے زوال سے پہلے یا مغرب سے پہلے گواہی دی، اور زوال کے بعد یا مغرب کے بعد عادل قرار دئے گئے تو جس وقت عادل قرار دئے گئے، اس وقت کا اعتبار ہوگا، لہٰذا پہلی صورت میں نماز قضاء پڑھے، اور دوسری

صورت میں اداء پڑھے۔اور یہ مذکورہ ساری تفصیل اس صورت میں ہوگی جبکہ تمام لوگوں کو اشتباہ ہوجائے، اور سب کی نماز فوت ہوجائے۔لیکن اگر چند افراد کو اشتباہ ہونے کی وجہ سے نماز فوت ہوجائے (تو ادا کی گنجائش نہیں) بلکہ قضاء کرے، اور قضاء کبھی بھی کرنا جائز ہے۔

جمعہ کے دن عید آجائے، اور عید کی نماز کیلئے ایسی بستیوں کے لوگ آجائیں، جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے تو ایسے لوگوں کو جمعہ چھوڑ کر واپس اپنی بستی میں جانے کی اجازت ہے۔(لیکن اگر ان لوگوں کے جانے سے پہلے جمعہ کا وقت شروع ہو چکا ہو تو ایسی صورت میں جمعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔(فتح الوھاب)

تکبیرات کا بیان

تکبیرات کی دو قسمیں ہیں۔(۱) ایک قسم تو وہ ہے جو نماز اور خطبہ میں پڑھی جاتی ہے جس کا بیان گذر چکا ہے اور دوسری قسم ان دونوں کے علاوہ ہے پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) تکبیر مرسل (مطلق) (۲) تکبیر مقید

تکبیر مرسل اُسے کہتے ہیں جو کسی ایک حال کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ مسجدوں گھروں، راستوں اور رات و دن میں پڑھی جائے۔ اور تکبیر مقید اُسے کہتے ہیں جو صرف نماز کے بعد پڑھی جائے تکبیر مرسل دونوں عیدوں میں مشروع ہے اور تکبیر مرسل کا وقت عید کی رات سورج غروب ہونے سے لے کر امام کا عید کی نماز کیلئے تکبیر تحریمہ باندھنے تک ہے۔تنہا نمازی کے خود کے تکبیر تحریمہ کا اعتبار ہوگا۔(عید الفطر کی رات میں نماز کے بعد تکبیر پڑھنا مسنون نہیں۔مغنی المحتاج ۲/ ۳۱۴) تکبیر مرسل عیدین کی رات و دن گھروں۔مسجدوں، بازاروں اور راستوں میں چاہے حضر میں ہو، یا سفر میں، عیدگاہ جاتے وقت اور عیدگاہ میں بلند آواز سے کہنا مستحب ہے۔

حدیث: آپ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں عیدگاہ آنے تک بلند آواز سے تکبیر و تہلیل کہتے (رواہ الحاکم والبیھقی) البتہ حاجی حضرات اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ عید الاضحیٰ کی رات میں تکبیر نہ کہیں بلکہ تلبیہ پڑھیں، تکبیر مُقَیَّد صرف عید الاضحیٰ میں مشروع ہے عید الفطر میں نہیں۔تکبیر مرسل اور مقید۔منفرد، باجماعت نماز پڑھنے والا، مرد، عورت، مقیم اور مسافر بھی کو پڑھنا سنت ہے۔

تکبیرات کا وقت: عید الاضحیٰ کے موقع سے لوگوں کی دو قسمیں ہونگی۔(۱) حجاج کرام (۲) حجاج کے علاوہ" حجاج کرام یوم النحر میں ظہر کے بعد سے تکبیر کی ابتداء کریں اور ایام تشریق کے آخری دن صبح کی نماز کے بعد ختم کریں اور حجاج کے علاوہ دیگر لوگ عرفہ کے دن فجر کے بعد سے ابتداء کریں اور ایام تشریق کے آخری دن عصر کے بعد تک پڑھتے رہیں۔

حدیث: حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ سے مروی ہے: آپ ﷺ عرفہ کے دن صبح کی نماز کے بعد سے تکبیر کی ابتداء کرتے اور ایام تشریق کے آخری دن عصر بعد ختم کرتے (رواہ الحاکم) ایام تشریق عید کے بعد تین دن ہیں، ۱۱/ ۱۲/ ۱۳/ ذوالحجہ (الفقہ المنھجی) اگر امام مقتدی کے مسلک کے خلاف تکبیر کہے، مثلاً امام عرفہ کے دن تکبیر کہے اور مقتدی اس دن تکبیر کا قائل نہ ہو یا اس کے برعکس ہو تو مقتدی تکبیر کہنے اور نہ کہنے میں اپنے مسلک پر عمل کر کے امام کی موافقت ضروری نہیں (کیونکہ سلام پھیرتے ہی امام کی اتباع کا حکم اور دونوں کا تعلق ختم ہو چکا)

قضاء نماز اور نوافل کے بعد تکبیر پڑھنے کا حکم

دیگر ایام کی فوت شدہ نماز کی ایام تشریق میں قضاء کرے یا ایام تشریق کی فوت شدہ نماز ان ہی ایام میں قضاء کرے تو اس کے بعد

تکبیر کہنا مستحب ہے۔اسی طرح سنن رواتب، مطلق نوافل، اور نماز جنازہ کے بعد بھی تکبیر کہنا مستحب ہے۔حاصل کلام یہ کہ ایام تشریق میں جو بھی نماز پڑھی جائے اس کے بعد تکبیر کہنا مستحب ہے۔ایام تشریق کی فوت شدہ نماز دیگر ایام میں قضاء کرے تو اس کے بعد تکبیر کہنے کی ضرورت نہیں۔اگر کسی نماز کے بعد تکبیر کہنا بھول جائے تو یاد آنے پر تکبیر کہدے، فاصلہ کم ہو یا زیادہ۔گرچہ اپنی جگہ سے اٹھ چکا ہو۔مسبوق اپنی نماز پوری کرنے کے بعد تکبیر کہے۔

تکبیر مطلق (مرسل) کو نماز کے اذکار کے بعد پڑھے، اور مقید کو پہلے پڑھے۔عمرہ کرنے والا اگر طواف یا سعی کے ذکر میں مشغول نہ ہو تو وہ بھی تکبیر پڑھے جو عید الفطر کی رات حج کا احرام باندھے اسے تلبیہ سنت ہے۔ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں مویشیوں کو دیکھے یا ان کی آواز سنے تو ایک مرتبہ تکبیر سنت ہے۔(بغیہ ۸۹)

تکبیر کے کلمات: تکبیر کا طریقہ یہ ہے کہ۔تین مرتبہ بالترتیب تکبیر کہے۔

"اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔اَللّٰہُ اَکْبَرُ" البتہ افضل اور مشہور الفاظ یہ ہیں۔ "اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ" (فتح الوھاب) مذکورہ تین تکبیروں میں سے تیسری کے بعد ان کلمات کو بھی بڑھانا اچھا ہے۔

"اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْراً وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْراً وَ سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلاً لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہُ صَدَقَ وَعْدَہُ وَنَصَرَ عَبْدَہُ وَ ھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ"

متفرق مسائل: عید کے دن آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دینا اور مصافحہ کرنا مباح ہے۔(جمل ۲ / ۱۰۵) ممیز بچوں کو عید کی نماز کیلئے لانا مباح ہے۔(المجموع ۔۵ / ۹)

عید کے دن اپنے اہل وعیال پر خرچ میں وسعت کرنا۔اپنی حیثیت کے مطابق کثرت سے صدقہ کرنا مسلمان بھائی کی ملاقات کے وقت خوشی کا اظہار کرنا اور خوشی کے اظہار کیلئے رشتہ داروں کی ملاقات کرنا مندوب ہے۔(الفقہ الاسلامی ۔ ۲ /۱۴۱۵)

عید الفطر کی مبارکبادی کا وقت تکبیر کی طرح غروب سے اور عید الاضحیٰ کا عرفہ کے دن فجر سے ہے۔(بغیہ ص ۸۹) عورتوں کو گھر میں باجماعت نماز عید ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔اس صورت میں ایک عورت (نماز بعد) ان کو وعظ ونصیحت کرسکتی ہے۔جو عورتیں نماز کیلئے (عیدگاہ وغیرہ) نہ جائیں انہیں زیب وزینت مندوب ہے۔عید کی طرح دیگر عبادات میں بھی پیدل جانا اور آمدورفت میں راستہ کی تبدیلی، نیز جاتے وقت طویل اور واپسی میں مختصر راستہ اختیار کرنا مستحب ہے۔البتہ حج اور غزوہ میں سوار ہونا مسنون ہے۔عید الفطر میں نماز سے قبل کھانے کی سنت راستہ یا مسجد میں بھی ادا کرے تو عذر کی وجہ سے یہ خلاف مروّت نہیں ہے۔عید کی نماز میں زائد تکبیرات کا ترک اس میں کمی بیشی ان میں رفع یدین نہ کرنا، یا درمیانی ذکر کا ترک کرنا مکروہ ہے۔(بشری الکریم ۲/ ۱۸۔۱۹)

صلوٰۃ الکسوف (سورج اور چاند گھن کی نماز کا بیان)

مشروعیت: ایک حدیث شریف میں ہے۔سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں کسی کے مرنے اور پیدا ہونے سے اس میں گہن نہیں لگتا، لہٰذا جب تم گہن دیکھو تو نماز پڑھ کر دعا کرو یہاں تک کہ گہن ختم ہوجائے۔

گہن کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے۔ سورج گہن کی نماز ۲ھ میں مشروع ہوئی اور چاند گہن کی نماز ۵ھ جمادی الاخری میں مشروع ہوئی۔ (حاشیۃ الجمل ۲/۱۰۵)

نماز گہن کا حکم اوروقت: لفظ کسوف اور خسوف کا چاند گہن اور سورج گہن دونوں پر اطلاق ہوتا ہے سورج اور چاند گہن کی نماز سنت موکدہ ہے۔

اور یہ نماز منفرد، عورت، مسافر غلام ہر ایک کیلئے پڑھنا سنت ہے۔ ممیز بچہ کے ولی کیلئے مسنون ہے کہ وہ بچہ کو نماز پڑھنے کا حکم دے۔ (حاشیۃ الجمل ۲/۱۰۷) اس نماز کو باجماعت اور مسجد میں ادا کرنا مستحب ہے

حدیث: آپ ﷺ نے سورج گہن کی نماز باجماعت ادا کی تھی۔ (متفق علیہ) اس نماز کو مکروہ اوقات میں بھی پڑھنا جائز ہے، اور جامع مسجد میں پڑھنا مستحب ہے اور اس کے لئے اقامت کے بجائے الصلاۃ جامعۃ کہنا مستحب ہے۔

نماز گہن کا طریقہ: صلوٰۃ الکسوف کی نیت سے تکبیر تحریمہ کہہ کر رکعت باندھ لے پھر سورہ فاتحہ پڑھ کر رکوع کرے اور رکوع سے اٹھ کر دوبارہ سورہ فاتحہ پڑھے پھر دوبارہ رکوع کر کے رکوع سے اٹھے۔ اور اعتدال کے بعد سجدہ میں چلا جائے یہ ایک رکعت ہوئی اسی طرح دوسری رکعت بھی پڑھے ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع کرے اور ہر قیام میں سورہ فاتحہ پڑھے۔

حدیث: ''آپ ﷺ نے دو رکعت میں چار رکوع اور چار سجدہ کئے (متفق علیہ) اگر سنت ظہر کی طرح دو رکعت ادا کرے تو یہ بھی کافی ہے۔ سنت ظہر کی طرح ادا کرنے کی نیت سے نماز شروع کرنے کے بعد ہر رکعت میں دو رکوع پر عمل کرنا جائز نہیں۔ (اعانۃ)

نماز گہن کا اکمل طریقہ: (مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق) پہلے قیام میں دعائے استفتاح تعوذ اور سورہ فاتحہ کے بعد سورہ بقرہ پڑھے، سورہ بقرہ اچھی طرح یاد نہ ہو تو کسی اور جگہ سے اس کے بقدر پڑھے۔ اور دوسرے قیام میں سورہ ال عمران یا اس کے بقدر کہیں اور سے پڑھے، تیسرے قیام میں سورہ نساء یا اس کے بقدر کہیں اور سے، اور چوتھے قیام میں سورہ مائدہ یا اس کے بقدر پڑھے۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلے قیام میں سورہ بقرہ پڑھے وہ یاد نہ ہو تو اس کے بقدر کہیں اور سے، اور دوسرے قیام میں سورہ بقرہ کی دوسو آیات کے بقدر، تیسرے قیام میں بقرہ کے ڈیڑھ سو آیات، اور چوتھے قیام میں سو آیات کے بقدر پڑھنا مستحب ہے۔ ہر قیام میں قرأت سے پہلے تعوذ پڑھنا مستحب ہے۔

ان دو رکعت کے پہلے رکوع اور سجدہ میں تقریباً سورہ بقرہ کی سو آیات اور دوسرے رکوع وسجدہ میں بقرہ ہی کی اسّی (۸۰) آیات اور تیسرے رکوع وسجدہ میں ستّر (۷۰) آیات کے اور چوتھے رکوع وسجدہ میں پچاس (۵۰) آیات کے بقدر تسبیح پڑھے۔ (یعنی رکوع وسجدہ کو اتنا طویل کرے کہ اس میں تقریباً سو (۱۰۰) اسّی (۸۰) ستّر (۷۰) اور پچاس (۵۰) آیت کے بقدر تسبیح پڑھ سکے) اور ہر رکوع سے اٹھتے وقت تسمیع (سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ) اور تحمید (رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ الخ) پڑھنا بھی مستحب ہے۔ جلسہ بین السجدتین، دوسرے رکوع کے بعد اعتدال اور تشہد کو طویل نہ کرے گہن کی نماز میں امام کو پہلی رکعت یا دوسری رکعت کے پہلے رکوع میں پانے سے وہ رکعت مل جاتی ہے۔ اور دوسرے قیام یا دوسرے رکوع میں شریک ہونے سے وہ رکعت فوت ہو جاتی ہے۔

دوسری رکعت پانے کی صورت میں امام کے سلام کے بعد اپنی ایک رکعت پوری کرے اور اس میں بھی دو قیام اور دو رکوع کرے۔

گہن کافی دیر تک رہنے کی وجہ سے ایک رکعت میں دو سے زیادہ رکوع کرنا جائز نہیں۔ اگر پہلے ہی قیام میں گہن ختم ہو جائے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی، بلکہ ایسی صورت میں بھی ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع کر کے نماز مکمل کرے۔

سلام پھیرنے کے بعد ابھی گہن باقی ہو تو اس کی وجہ سے دوبارہ نماز پڑھنے کی گنجائش نہیں، البتہ با جماعت اعادہ سنت ہے (بشری الکریم)

نماز گہن کے خطبہ کا حکم: نماز کے بعد دو خطبے دینا بھی مستحب ہے۔

حدیث: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: آپ ﷺ نے سورج گہن کے موقع سے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد خطبہ بھی دیا۔ (متفق علیہ)

دونوں خطبے ارکان وشرائط میں جمعہ کے خطبوں کے مانند ہیں۔ اور یہ خطبہ با جماعت نماز پڑھنے والے کیلئے مسنون ہیں خواہ نماز شہر میں ادا کریں یا مسافر حضرات جنگل میں پڑھیں (منفرد کیلئے خطبہ نہیں ہے۔(مغنی المحتاج)

خطبہ میں امام لوگوں کو گناہوں سے توبہ کرنے، نیک کام کرنے، غلام آزاد کرنے، اور صدقہ کرنے پر ابھارے، اسی طرح غفلت اور دنیا کے دھوکے سے ڈرائے۔

حدیث: حضرت اسماءؓ سے مروی ہے، ''آپ ﷺ نے سورج گہن کے موقع پر غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔(رواہ البخاری)

چاند گہن کی نماز میں قرأت جہراً پڑھے اور سورج گہن میں سراً۔

کسوف کی قضاء

سورج گہن کی نماز (نماز شروع کرنے سے پہلے) مکمل طور پر گہن ختم ہونے یا گہن ہی کی حالت میں سورج غروب ہونے سے فوت ہو جاتی ہے۔ گہن کا کچھ حصہ ختم ہو جائے اور کچھ باقی ہو تو بقیہ کیلئے نماز شروع کرنا جائز ہے، جیسے کہ اتنی ہی مقدار میں گہن لگنے کی صورت میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ دوران نماز گہن ختم ہو جائے تو نماز توڑنے کی ضرورت نہیں، بلکہ نماز پوری کرے۔ (المجموع ۵/ ۵۴) بادل حائل ہونے کی وجہ سے گہن کے ختم ہونے یا گہن لگنے کے متعلق شک ہو جائے تو اس سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ پہلی صورت میں نماز پڑھے، کیونکہ گہن کا باقی رہنا اصل ہے اور دوسری صورت میں نہ پڑھے۔

چاند گہن کی نماز (نماز شروع کرنے سے پہلے) گہن مکمل طور پر ختم ہونے یا سورج طلوع ہونے سے فوت ہو جاتی ہے۔

سورج طلوع ہونے کے بعد بھی گہن لگا ہوا ہے، تب بھی نماز پڑھنا جائز نہیں۔ رات گہن ہی کی حالت میں چاند غائب ہونے اور گہن ہی کی حالت میں طلوع فجر سے یا طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے گہن لگنے سے نماز فوت نہیں ہوتی، بلکہ نماز پڑھنا جائز ہے۔ دوران نماز سورج طلوع ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی، جیسے کہ دوران نماز گہن ختم ہونے کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اگر طلوع شمس کے بعد چاند گہن شروع ہو جائے تو نماز نہ پڑھے گہن کی نماز فوت ہونے پر اسکی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں (الفقہ المنھجی)

گہن کے متعلق نجومیوں کی بات پر عمل نہ کرے۔

ایک ہی وقت میں دو مختلف نمازوں کا جمع ہونا

ایک وقت میں دو مختلف نمازیں جمع ہو جائیں، تو جس نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، اُسے پہلے ادا کرے۔ اگر فوت ہونے میں دونوں برابر ہوں تو جو زیادہ مؤکد ہو، اُسے پہلے ادا کرے، جیسے عید اور کسوف یا جمعہ اور کسوف کی نماز ایک ساتھ جمع ہو جائیں، اور وقت کی تنگی کی وجہ سے عید یا جمعہ کی نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو عید یا جمعہ کی نماز پہلے ادا کرے۔ اور اگر عید یا جمعہ کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر گہن کی نماز پہلے ادا کرے۔ دیگر فرائض کا حکم بھی جمعہ ہی کے مانند ہے۔ گہن اور وتر یا گہن اور تراویح کی نماز ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو گہن کی نماز پہلے ادا کرے۔ اس لئے کہ یہ نماز افضل ہے۔

جنازہ اور کسوف یا جنازہ اور عید کی نماز جمع ہو جائیں تو نماز جنازہ پہلے پڑھے اور نماز جنازہ پوری ہونے کے بعد امام دوسری نماز کی ادائیگی میں مشغول ہو جائے۔ امام قبر تک جنازہ کے ساتھ نہ جائے، اگر جنازہ حاضر نہ ہو یا حاضر تو ہو لیکن اس کا ولی حاضر نہ ہو، تو امام ایک جماعت الگ سے تیار کرے جو جنازہ کا انتظار کرتی رہے۔ اور خود امام دوسری نماز میں مصروف ہو جائے جنازہ اور جمعہ کی نماز جمع ہو جائیں اور وقت تنگ نہ ہو تو نماز جنازہ پہلے ادا کرے۔ پھر جمعہ ادا کرے۔ وقت تنگ ہو تو جمعہ مقدم کرے۔

نماز عید اور کسوف جمع ہو جائیں تو دونوں نمازیں ادا کرنے کے بعد ایسے دو خطبے دے جس میں عید اور کسوف کے احکام ذکر ہو۔

نماز جمعہ اور کسوف ایک ساتھ جمع ہو جائیں۔ اور وقت کی تنگی کی وجہ سے) جمعہ کو مقدم کرنا ہو تو پہلے جمعہ کا خطبہ دے، پھر جمعہ کی نماز ادا کر کے کسوف کی نماز پڑھے اس کے بعد کسوف کا خطبہ دے، اور اگر کسوف کی نماز پہلے ادا کرے تو نماز کسوف کے بعد (جمعہ کی نیت سے) جمعہ کیلئے ایسے دو خطبے دے، جس میں کسوف کے مسائل کا بھی ذکر ہو۔ چار خطبے دینے کی ضرورت نہیں (یعنی دو جمعہ کے اور دو کسوف کے) اور ان خطبوں میں جمعہ اور کسوف دونوں کی ایک ساتھ نیت نہ ہو، (بلکہ صرف جمعہ کے خطبہ کی نیت ہو) اسلئے کہ ایسی صورت میں فرض اور نفل کے درمیان شرکت ہوگی، بخلاف عید اور کسوف میں کہ اس میں دونوں کے خطبوں کی ایک ساتھ نیت جائز ہے۔ کیونکہ دونوں سنت ہیں۔

زلزلہ وغیرہ میں نماز کا حکم

گہن کے علاوہ جتنی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جیسے زلزلے بجلی، کڑک، اور سخت ہوائیں چلنے کی صورت میں باجماعت نماز پڑھنا مشروع نہیں ہے۔ البتہ تنہا نماز پڑھنا مستحب ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ رہے۔ اور خوب آہ وزاری کے ساتھ دعا کرنا بھی مستحب ہے۔ عورتیں بھی گہن کی نماز پڑھ سکتی ہیں۔

استسقاء کی نماز کا بیان

مشروعیت۔ حدیث: حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے مروی ہے "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کی طرف بارش مانگنے کیلئے گئے، پھر قبلہ کی طرف رخ کر کے چادر کو پلٹایا اور دو رکعت نماز ادا کی (رواه الشيخان) استسقاء کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے۔ اور ۶ھ رمضان میں مشروع ہوئی، (حاشية الجمل ۲/ ۱۱۴) استسقاء کے لغوی معنی ہے پانی طلب کرنا۔

شرعی تعریف: ضرورت کے وقت بندوں کا اللہ تعالیٰ سے بارش کا سوال اور دعا کرنا۔

پانی بالکل نہ ہو، کم ہو یا نمکین ہو، تو ان تمام صورتوں میں استسقاء مشروع ہو۔ (فتح المعين)

استسقاء کا حکم اور وقت: استسقاء کی نماز سنت مؤکدہ ہے اس نماز کیلئے کوئی وقت مقرر نہیں، بلکہ رات و دن کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں، یہاں تک کہ مکروہ وقت میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اسلئے کہ یہ سبب والی نماز ہے۔ (فتح الوهاب مع جمل۔ ۲/۱۲۰)

استسقاء کی نماز جنگل (یعنی کھلے میدان) میں پڑھنا سنت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ استسقاء کی نماز کیلئے صحراء کی طرف جایا کرتے تھے۔ (تلخيص الحبير)

نماز استسقاء کے آداب: امام استسقاء کیلئے نکلنے سے پہلے لوگوں کو گناہوں سے توبہ کرنے، نیک کام کرنے، صلہ رحمی، اور فقراء پر صدقہ اور زبردستی کسی کا حق دبایا ہے تو اسے ادا کرنے کا حکم دے، چاہے وہ حق خون کے قبیل کا ہو (یعنی ناحق کسی کو قتل کیا ہو) یا کسی کی آبروریزی کی ہو یا کسی کا مال چھین لیا ہو۔ اسی طرح مسلسل چار دن روزے رکھنے کا بھی حکم دے اور چوتھے دن روزے کی حالت میں ہی

پرانے کپڑوں میں نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ بلا زیب وزینت اور خوشبو لگائے بغیر، میدان کی طرف نکل پڑے۔

حدیث: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے" آپ ﷺ عیدگاہ کی طرف زیب وزینت اختیار کئے بغیر نکلے اور عید کی طرح دو رکعت نماز پڑھائی، (رواہ احمد، حاکم، تلخیص) نماز استسقاء کیلئے جانے سے پہلے غسل کرنا، مسواک کرنا، اور بدبو زائل کرنا مستحب ہے، بچوں، بوڑھوں اور جانوروں کو بھی استسقاء کیلئے ساتھ لے جانا مستحب ہے اگر نماز کیلئے ذمی بھی نکلیں تو وہ مسلمانوں سے الگ تھلگ کھڑے رہیں۔

ہر آدمی کا اپنے نیک عمل کے وسیلے سے دعا مانگنا بھی مستحب ہے۔ اسی طرح اکابر حضرات اور نیک لوگوں کے خصوصاً آپ ﷺ کے رشتہ داروں کے وسیلے سے دعا مانگے (یعنی ایسے حضرات کو دعا کیلئے آگے بڑھائے)

استسقاء کے تین طریقے ہیں: (اور یہ تینوں سنت مؤکدہ ہیں) (۱) کسی نماز کے بغیر محض دعا کرنا، خواہ تنہا دعا کرے یا اجتماعی شکل میں (۲) متوسط طریقہ یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد (فرض ہو یا نفل) اور جمعہ وغیرہ کے خطبہ میں دعا کرے۔

(۳) افضل طریقہ: سب سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے، پھر دو خطبے دے کر بارش کیلئے دعاء کرے۔ اور اس نماز کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی رکعت میں عید کی طرح سات زائد تکبیرات اور دوسری رکعت میں پانچ زائد تکبیرات کہے۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ ق اور دوسری میں سورہ قمر یا پہلی میں سورہ اعلیٰ (سبح اسم ربك) اور دوسری میں سورہ غاشیہ پڑھنا مستحب ہے۔ اور دونوں رکعت میں قراءت جہراً پڑھنا مستحب ہے۔ اور اس نماز کیلئے اقامت کے بجائے اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ کہہ کر لوگوں کو جمع کیا جائے، اور عید کی طرح اس نماز کے زائد تکبیرات کے درمیان ایک متوسط آیت کے بقدر ٹھہرنا اور ذکر پڑھنا مستحب ہے۔ (المجموع ۵/۷۴)

خطبہ ۔ نماز کے بعد دو خطبے دینا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے آپ ﷺ استسقاء کیلئے نکلے اور دو رکعت نماز پڑھا کر خطبہ دیا۔ (رواہ احمد ابن ماجہ والبھیقی) اور یہ خطبے ارکان وشرائط میں عید کے خطبوں کے مانند ہیں۔ البتہ چند امور میں عید اور استسقاء کے خطبوں میں فرق ہے۔

(۱) استسقاء کے خطبے میں ابتداء میں تکبیرات کے بجائے استغفار پڑھے۔ استغفار یہ ہے۔

"اَسْتَغْفِرُ اللّٰهِ الَّذِی لَا اِلٰهَ اَلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ" (پہلے خطبہ میں نو مرتبہ اور دوسرے میں سات مرتبہ استغفار پڑھے) خطبہ کیآخر میں استغفار پڑھے اور دوران خطبہ استغفار اور اس آیت (اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّاراً یُّرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَیْكُمْ مِدْرَاراً) اور اس دعا (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبُّ الْاَرْضِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ) اور (یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ نَسْتَغِیْثُ وَ مِنْ رَّحْمَتِكَ نَرْجُوْا فَلَا تَكِلْنَا اِلٰی اَنْفُسِنَا طَرْفَةَ عَیْنٍ وَ اَصْلِحْ لَنَا شَانَنَا كُلَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ) کو کثرت سے پڑھے۔ (مغنی المحتاج ۔ ۱/۳۲۴)

(۲) دوسرے خطبہ میں قبلہ کی طرف رخ کرے (جس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئیگا)

(۳) پہلے خطبہ میں یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔

اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَیْثاً مُّغِیْثاً هَنِیْئاً مَرِیْئاً مَرِیْعاً غَدَقاً مُجَلِلاً سَحاً طَبَقاً دَائِماً اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا الْغَیْثَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْقَانِطِیْنَ اَللّٰهُمَّ اِنّ بِالْعِبَادِ وَالْبِلَادِ مِنَ اللَّاوَاءِ وَالْجُهْدِ وَالضَّنْكِ مَالَا نَشْكُوْ اِلَّا اِلَیْكَ اَللّٰهُمَّ اَنْبِتْ لَنَا الزَّرْعَ وَاَدِرَّلَنَا الضَّرْعَ وَاسْقِنَا مِنْ بَرَكَاتِ السَّمَاءِ وَ اَنْبِتْ لَنَا مِنْ بَرَكَاتِ الْاَرْضِ اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ عَنَّا الْجُهْدَ وَالْجُوْعَ وَالْعُرٰی

وَاكْشِفْ عَنَّا مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا يَكْشِفُهُ غَيْرُكَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ اِنَّكَ كُنْتَ غَفَاراً فَاَرْسِلِ السَّمَاءِ عَلَيْنَا مِدْرَاراً"

ترجمہ: اے اللہ بارش برسا تکلیف دور کرنے، اور فریادرسی کرنے والی برکت وراحت والی، خوشگوار، شاداب، فراوانی والی شیرین جل تھل کرنے والی، لگاتار عام اور ڈھانپنے والی ہمیشہ اے اللہ ہمیں بارش سے سیراب کر، اور ہم کو مایوس نہ کر، اے اللہ بیشک بندوں اور شہروں میں دشواری، مشقت اور تنگی ہے، جسکی ہم آپ کے پاس فریاد کررہے ہیں اے اللہ ہمارے لئے کھیتی اُگادے، اور جانوروں کے تھن سے دودھ عطا فرما۔ اور ہم پر آسمان کی برکتوں کا نزول فرما۔ اور زمین کی برکتیں ہمارے لئے اُگادیٔ اے اللہ ہم سے تنگی، بھوک اور برہنگی دور فرما۔ اور ہمارے اوپر سے ان آفتوں کو دور فرما جنہیں آپکے سوا کوئی دور کرنے والانہیں۔ اے اللہ ہم مغفرت مانگتے ہیں۔ بیشک آپ غفار ہیں لہٰذا ہمارے اوپر موسلا دھار بارش برسا)۔

پہلے خطبہ میں اور دوسرے خطبہ کے ابتداء میں لوگوں کی طرف رخ اور قبلہ کی طرف پیٹھ ہو البتہ دوسرا خطبہ تقریباً ایک تہائی ہونے کے بعد قبلہ کی طرف رخ کر کے سراً و جہراً خوب دعا کرے۔ اور امام جب آہستہ دعا کرے تو دیگر لوگ بھی آہستہ ہی کریں۔ اور امام جب جہراً دعا کرے تو تمام لوگ اس کی دعا پر آمین کہیں اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگیں، جیسے کہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے جب بارش کیلئے دعا مانگی تو ہتھیلی کی پیٹھ کا رخ آسمان کی طرف تھا کسی مصیبت کے دور ہونے کیلئے دعا کرتے وقت ہتھیلی کی پیٹ کا رخ آسمان کی طرف رکھنا سنت ہے۔ اور کسی چیز کا سوال کرتے وقت ہتھیلی کے پیٹھ کا رخ آسمان کی طرف رکھنا سنت ہے امام نوویؒ المجموع میں امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایسی حالت میں یہ دعا بھی "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اَمَرْتَنَا بِدُعَائِكَ وَ وَعَدْتَنَا اِجَابَتِكَ وَقَدْ دَعَوْنَاكَ كَمَا اَمَرْتَنَا فَاَجِبْنَا كَمَا وَعَدْتَنَا اَللّٰهُمَّ اَمْنُنْ بِمَغْفِرَةِ مَا قَارَفْنَا وَ اِجَابَتِكَ فِى سُقْيَانَا وَسَعَةِ رِزْقِنَا"

ترجمہ: اے اللہ آپ نے ہمیں دعا کا حکم دیا اور اس کی قبولیت کا وعدہ بھی کیا لہٰذا ہم آپ سے دعا کرتے ہیں جیسے آپ نے ہمیں حکم دیا۔ لہٰذا ہماری دعا قبول فرما۔ جیسے کہ آپ نے وعدہ کیا۔ اے اللہ ہم سے جو گناہ ہوئے ہیں انہیں معاف فرما اور بارش سے سیراب فرما اور وسیع رزق عطا کر کے ہم پر احسان فرما۔) امام جب دعا سے فارغ ہو جائے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر انہیں وعظ و نصیحت کرے۔ پھر آپ ﷺ پر درود پڑھ کر مومن مرد و عورت کیلئے دعا کرے اور قرآن کی ایک دو آیات پڑھے اور آخر میں استغفر الله لى ولكم الخ کہہ کر خطبہ کو ختم کرے۔

دوسرے خطبہ میں (دعا کیلئے) قبلہ کی طرف رخ کرتے وقت امام کیلئے چادر کی تحویل مستحب ہے۔ اور چادر اگر چوکور ہو تو تحویل کے ساتھ تنکیس بھی مستحب ہے اور گول ہو تو صرف تحویل مستحب ہے۔

حدیث: حضرت جابرؓ سے مروی ہے آپ ﷺ نے استسقاء کے موقع پر تحویل رداء کی۔ (رواہ الحاکم) اسی طرح حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی روایت میں بھی تحویل کا ذکر ہے جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تحویل۔ یعنی چادر کا وہ حصہ جو دائیں کندھے پر ہو اسے بائیں کندھے پر ڈالے اور جو بائیں کندھے پر ہو اسے دائیں کندھے پر ڈالے۔

تنکیس: یعنی چادر کے اوپری حصہ کو نیچے کرنا اور نچلے حصہ کو اوپر کرنا۔ اگر اس نچلے کنارے کو جو بائیں بازو پر ہے اسے دائیں کندھے پر اور جو دائیں بازو پر ہے اسے بائیں کندھے پر ڈالے تو تحویل و تنکیس ایک ساتھ حاصل ہوگی۔ امام کی طرح دیگر حضرات بھی اس وقت اپنی چادر میں تحویل و تنکیس کریں۔

تحویل وتنکیس کی حکمت: حالات بدل کر سرسبزی و شادابی کی طرف منتقل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اورحدیث میں ہے کہ آپ علیہ السلام نیک فالی کو پسند فرماتے تھے۔(متفق علیہ) کپڑے نکالنے تک چادرکوتحویل ہی کی حالت میں رکھنا مستحب ہے، بارش مانگنے کے بعد بارش برسے تو ٹھیک ہے ورنہ اگر دعا کی قبولیت میں تاخیر ہوجائے، تو دوبارہ سہ بارہ بھی نماز پڑھ کر بارش مانگ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بارش برسائے اور دوبارہ جب بارش مانگنے کے لئے نکلیں تو نکلنے سے پہلے پھر تین دن کے روزے رکھنے کی ضرورت نہیں، نماز کے واسطے تیاری کرنے کے بعد نکلنے سے پہلے ہی بارش برسے تو وعظ ونصیحت، دعا اور شکرادا کرنے کیلئے میدان کی طرف جائے، اور بطور شکر دو رکعت استسقاء کے نماز کی طرح ادا کرے۔ اور نیت بھی استسقاء کی کرے اور خطبہ بھی دے(فتح الوھاب مع حاشیۃ الجمل ۲/ ۱۱۵) بارش کا مانگنا تمام کیلئے مستحب ہے، چاہے وہ کسی بستی ودیہات یا شہر کے رہنے والے ہوں یا مسافر ہوں، پانی ختم ہوجائے اور فی الحال اس کی ضرورت نہ ہو تو پھر بارش مانگنے کی ضرورت نہیں۔ اگر مسلمانوں کی کسی بستی میں پانی ختم ہوجائے اور انہیں پانی کی ضرورت ہو تو دوسری بستی والوں کیلئے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے بارش اور اپنے لئے پانی کی زیادتی کی دعا کرنا مستحب ہے۔ اگر امام استسقاء (بارش مانگنے کو) چھوڑدے تو دیگر حضرات نہ چھوڑیں۔

اگر نماز سے پہلے خطبہ دے تو جائز ہے اور ایسا خطبہ ونماز صحیح ہے۔ ابوداوٗد شریف میں روایت ہے آپ علیہ السلام نے پہلے خطبہ دیا پھر نماز پڑھی اور بخاری ومسلم میں ہے آپ علیہ السلام استسقاء کیلئے نکلے تو آپ نے دعا کی قبلہ کی طرف رخ کیا اور چادر کو پلٹایا پھر دو رکعت نماز ادا کی بارش زیادہ برسنے کی وجہ سے مکانات اور کھیتوں کو نقصان پہنچنے لگے، تو اس کے لئے کوئی نماز مشروع نہیں۔ البتہ بارش کے کم ہونے کی دعا کرنا سنت ہے دعا یہ ہے" اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا "(**ترجمہ:** اے اللہ ہمارے اطراف میں، نہ کہ ہم پر) بعضوں نے بارش دور کرنے کی نیت سے تنہا نماز پڑھنا مسنون قرار دیا ہے۔ (بشری الکریم) سال میں پہلی بار بارش گرنے کے وقت (گھر سے) باہر نکل کر ستر کے علاوہ حصہ کھول کر بدن کو بارش سے تر کرنا مستحب ہے اور یہ اکمل طریقہ ہے ورنہ اگر بدن کے کسی ایک عضو کو مثلاً سر یا ہاتھ کھول کر تر کرے تب بھی اصل سنت حاصل ہوگی۔(حاشیۃ الجمل ۲/ ۱۲۵)

جب بارش کے پانی سے وادی بہہ پڑے تو اس میں غسل اور وضو کرنا مستحب ہے۔ کڑک اور بجلی چمکنے کے وقت یہ تسبیح پڑھے "سُبْحَانَ مَنْ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِکَۃُ مِنْ خِیْفَتِهٖ "(پاک ہے وہ ذات، جس کی تسبیح وتحمید گرج اور فرشتے اس کے خوف سے کرتے رہتے ہیں)

حدیث: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب کڑک کی آواز سنتے تو کلام ترک فرماتے اور (مذکورہ بالا دعا پڑھتے) (رواہ فی الموطا) ترمذی میں اس دعا کے بعد یہ دعا پڑھنا بھی مروی ہے" اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُھْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذَالِكَ "(الفقہ الاسلامی)

ترجمہ: یااللہ ہمیں اپنے غضب سے قتل نہ کر اور اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر، اور اس سے قبل ہی عافیت عطا فرما) بارش برستے وقت یہ دعا پڑھنا سنت ہے" اَللّٰھُمَّ صَیِّباً نَافِعا "(یااللہ نفع بخش بارش ہو) ہوا کو برا بھلا کہنا مکروہ ہے (خواہ ہوا خلاف عادت چلے) بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کے خیر کی دعا اور شر سے پناہ چاہے۔ صحیح مسلم میں ہے۔ آپ علیہ السلام جب ہوا تیز چلتی تو یہ دعا پڑھتے۔" اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَھَا وَ خَیْرَ مَا فِیْھَا وَ خَیْرَمَا اُرْسِلَتْ بِهٖ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّھَا وَ شَرِّ مَا فِیْھَا وَ شَرِّمَا اُرْسِلَتْ بِهٖ "(ترجمہ اے اللہ میں اس ہوا کے خیر کا اور جو کچھ اس میں خیر ہے اور جس خیر کے ساتھ یہ بھیجی گئی ہے اس کا طالب ہوں۔ اور میں آپ کی اس کے شر سے اور جو کچھ اس میں شر ہے اور جس شر کے ساتھ یہ بھیجی گئی اس سے پناہ مانگتا ہوں) بارش برسنے کے بعد یہ دعا پڑھنا مستحب

ہے۔" مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰہِ وَرَحْمَتِہٖ "(اللہ کے فضل رحمت سے ہم پر بارش ہوئی) بارش برستے وقت دعا کرنا مستحب ہے۔اور برسنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرے۔اور "مطرنا بنوء کذا" (یعنی فلاں ستارہ فلاں برج میں جانے کی وجہ سے بارش ہوئی) کہنا مکروہ ہے۔ اگر یہ اعتقاد ہو کہ ستارہ ہی بارش برسانے والا ہے تو یہ کفر ہے اور اس سے آدمی مرتد ہوگا۔کڑک اور بجلی چمکنے کے وقت اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا مستحب ہے۔اس لئے کہ سلف صالحین اس کی طرف دیکھنے کو ناپسند فرماتے تھے۔جب ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھے تو یہ الفاظ پڑھے ۔ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ۔ (رواہ ابن السنی والطبرانی، الفقہ الاسلامی)

کتاب الجنائز (جنازہ کے احکام)

موت کی یاد اوراس کی تمنا کرنے کا حکم: ہر آدمی کیلئے موت کو کثرت سے یاد کرنا مستحب ہے۔

حدیث: لذتوں کو توڑنے والی چیز کا کثرت سے یاد کرو یعنی موت کو"۔(رواہ الترمذی) کسی مصیبت اور تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ ہے اگر تمنا ہی کرنا ہے تو اس طرح کہے۔ "اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیَاۃُ خَیْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ" **ترجمہ:** اے اللہ مجھے زندہ رکھئے جب تک زندگی میرے لئے بہتر ہے، اور موت دیجئے جب موت میرے لئے بہتر ہو۔البتہ اگر دین کے سلسلے میں کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، تو موت کی تمنا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

مرنے سے پہلے گناہوں سے توبہ کرے، اور ناحق کسی کا حق دبایا ہے تو اسے ادا کرے، مریض کیلئے تو مذکورہ دونوں چیزیں بدرجہ اولیٰ کرنا چاہیے۔

بیمار کیلئے بیماری پر صبر کرنا مستحب ہے، اور جہاں تک ہو سکے بیماری کی حالت میں کراہے نہیں علاج کرانا مستحب ہے۔

عیادت کا حکم اوراس کے آداب: اگر کوئی مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت کرنا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے" کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے جنازے کے ساتھ جانے اور مریض کی عیادت کا حکم دیا۔(متفق علیہ) کوئی ذمی بیمار ہو تو اس کے مسلمان رشتہ دار یا پڑوسی یا دوست وغیرہ کیلئے اس کی بھی عیادت کرنا مستحب ہے، جیسا کہ ایک یہودی غلام کے بیمار ہونے پر جو آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، آپ ﷺ نے اس کی عیادت کی۔(رواہ البخاری) ورنہ ذمی کی عیادت کرنا جائز ہے کافر کی بھی عیادت کرنا جائز ہے۔

عیادت کرنے والے کو مریض کے اچھے ہونے کی امید نظر آئے تو اس کے لئے دعا کر کے وہاں سے واپس لوٹے۔اور اچھے ہونے کی امید نہ ہو تو اسے توبہ اور وصیت کی، رغبت دلائے، مریض کے دل کو خوش کرنا مستحب ہے، مریض کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھے۔اور نہ بار بار عیادت کرے، بلکہ کبھی کبھی عیادت کرے لیکن اگر بیمار کو کسی آدمی (مثلاً دوست یا رشتہ دار) کے رہنے سے انسیت حاصل ہوتی ہو، تو ایسے شخص کیلئے بار بار عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔جس وقت عیادت کرنا مریض پر شاق گذرتا ہو، ایسے وقت عیادت کرنا مکروہ ہے۔بیمار سے زیادہ پوچھ تاچھ نہ کرے۔اور اُسے اچھے ہونے کی امید دلائے اور آہ و بکا کرنے سے ڈرائے۔(حاشیۃ الجمل ۲/ ۱۳۴) مریض کا زیادہ شکوہ شکایت کرنا مکروہ ہے۔بیمار پر دوا پینے کیلئے زبردستی کرنا مکروہ ہے۔

سکرات کے وقت مطلوبہ امور: جس کی موت کا وقت قریب آچکا، ہو اسے قبلہ رخ کردے اور اس کا طریقہ یہ ہے

کہ دائیں کروٹ پر قبلہ رخ لٹائے جیسا کہ قبر میں رکھا جاتا ہے، اگر دائیں کروٹ پر لٹانا دشوار ہو تو بائیں کروٹ پر لٹائے۔ اور اگر کسی وجہ سے بائیں کروٹ پر بھی لٹانا دشوار ہو تو پھر چت لٹائے اس صورت میں پیر کے تلوے قبلہ رخ کرے اور سر کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھ کر تھوڑا اوپر اٹھائے تاکہ چہرہ قبلہ رخ ہو جائے۔ (المجموع ۱۱۶/۵) نیز ایسے شخص کو شہادت کا کلمہ تلقین کرنا مستحب ہے۔

حدیث: (۱) اپنے مردوں (یعنی جس کی موت کا وقت قریب آچکا ہو) کو" لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ "تلقین کرو۔ (رواہ مسلم)

(۲) جس کا آخری کلام " لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ "ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (رواہ الحاکم)

مگر کلمہ کی ادائیگی کیلئے اس پر اصرار نہ کرے اور نہ اس سے کہے کہ کلمہ پڑھ، بلکہ اس کے پاس کلمہ پڑھتا رہے، تاکہ وہ کلمہ سن کر خود پڑھ لے، یا اس کے پاس یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک ہے تو چلو ہم سب اللہ کا ذکر کریں، پھر کہے۔"سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر "ایک مرتبہ کلمہ پڑھنے کے بعد دوبارہ اس سے نہ پڑھوایا جائے۔ جب تک کہ اس کے بعد کوئی دوسری بات نہ کرے ورثاء کے علاوہ کسی اور شخص کا کلمہ تلقین کرنا مستحب ہے اور اگر ورثاء کے علاوہ کوئی موجود نہ ہو تو ورثاء میں سے اس پر جو زیادہ مشفق ہو وہ تلقین کرے، اسے ٹھنڈا پانی پلانا بھی مستحب ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱۳۸/۲۔ مغنی المحتاج) اسی طرح اس کے پاس سورہ یٰسین پڑھنا بھی مستحب ہے۔

حدیث: اپنے مردوں (یعنی جن کی موت کا وقت قریب آچکا ہو) پر سورہ یٰسین پڑھا کرو۔ (رواہ ابوداود، ابن حبان)

بعض تابعین نے سورہ رعد پڑھنے کو بھی مستحب قرار دیا ہے۔ سورہ یٰسین کا جہراً پڑھنا مسنون ہے۔ اور سورہ رعد سراً پڑھے گرچہ محتضر (جس کی موت کا وقت آچکا ہو) جہراً پڑھنے کا مطالبہ کرے۔ (حاشیۃ الجمل ۱۳/۲) اور ایسے شخص کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھے۔

حدیث: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو وفات سے تین دن پہلے فرماتے ہوئے سنا تم میں سے ہر ایک کی موت اس حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھتا ہو۔ (رواہ مسلم)

اور اس کے پاس بیٹھنے والے کیلئے مستحب ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے رحمت کی امید دلائے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھنے کی ترغیب دے۔

روح قبض ہونے کے بعد مندوب (مستحب) امور: جب روح قبض ہو جائے تو میت کی آنکھیں بند کر دے۔

حدیث: آپ ﷺ نے حضرت ابو سلمہؓ کے انتقال کے بعد ان کی آنکھیں بند کردیں۔ (رواہ مسلم، تلخیص) اور چوڑی پٹی سے اس کے جبڑوں کو سر کے اوپر باندھے (تاکہ منہ کھلا نہ رہے) اس کے بعد میت کے تمام جوڑوں کو اسطرح نرم کرے کہ اس کی کلائی کو بازو تک، اور پنڈلی کو ران تک، اور ران کو پیٹ تک لے جا کر اس کی اصلی حالت پر لوٹائے۔ اور انگلیوں کو اس طرح نرم کرے کہ انگلیوں کو ہتھیلی کے پیٹ تک لے جا کر واپس اپنی اصلی حالت پر لوٹائے۔

جوڑوں کو نرم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ غسل دینے اور کفن پہنانے میں آسانی ہو۔ پھر جن کپڑوں میں موت واقع ہوئی ہے انہیں نکال دے اور پتلے کپڑے (یعنی چادر وغیرہ) کے ذریعے پورا بدن ڈھانکے۔

حدیث: آپ ﷺ کا جب وصال ہوا تو آپ کے بدن مبارک پر یمنی چادر ڈالی گئی تھی۔ (متفق علیہ، تلخیص)

کپڑا ڈالنے کے بعد اس کے ایک طرف کا کنارہ سر کے نیچے اور دوسرے طرف کا کنارہ دونوں پاؤں کے نیچے دبائے تاکہ ہوا،

وغیرہ کے ذریعے بدن کھل نہ جائے۔ میت کے پیٹ پر قرآن کے علاوہ کوئی معمولی وزنی چیز رکھ دی جائے (تاکہ میت کا پیٹ پھول نہ جائے) پھر میت کو کسی بلند چیز پر مثلاً چارپائی وغیرہ پر اس طرح چت لٹائے کہ پیر کے تلووں کا رُخ قبلہ کی طرف ہو اور سر کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھے تاکہ چہرہ کا رخ بھی قبلہ کی جانب ہو میت کو چارپائی وغیرہ پر رکھنے کی صورت میں اس کے نیچے بستر نہ بچھائے، تاکہ بستر کی گرمی سے میت میں تغیر پیدا نہ ہو۔ (فتح الوهاب مع حاشية الجمل ۔ ۲ / ۱۴۱) ان مذکورہ تمام امور کا میت کے محرم رشتہ داروں میں سے مشفق آدمی کیلئے جتنا سہولت و آسانی کے ساتھ ممکن ہو انجام دینا سنت ہے۔ اگر مرد کی میت ہو تو مرد اور عورت کی میت ہو تو عورت ان امور کو انجام دے۔ اگر محرم مرد کے ان امور کو کوئی محرم عورت انجام دے یا اس کے برعکس ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ اور فی الحال ممکن اور آسان ہو تو میت کے قرض کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ میں جلدی کرے میت کے پاس اچھی باتیں کرنا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا! جب تم مریض یا میت کے پاس آؤ تو خیر کی باتیں کرو۔ اس لئے کہ تم جو کہتے ہو ملائکہ اس پر آمین کہتے ہیں۔ (رواه مسلم)

میت کے پیشانی کو بوسہ لینا

میت کے رشتہ داروں اور دوستوں کیلئے میت کے چہرہ کا بوسہ لینا جائز ہے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کو ان کی وفات کے بعد بوسہ لیا۔ (رواه الترمذی)

(۲) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ ﷺ کی جبین مبارک کو وفات کے بعد بوسہ لیا تھا۔ (رواه البخاری) زمانہ جاہلیت کی طرح میت کے اوصاف بیان کر کے اس کے موت کی خبر دینا مکروہ ہے۔ البتہ اس پر نماز وغیرہ پڑھنے کیلئے خبر دینے میں کوئی حرج نہیں (جیسا کہ بخاری شریف کی روایات سے ثابت ہے)

باب میت کے غسل کا بیان

جب کسی کی موت کا یقین ہو جائے اور موت کی نشانیاں بھی ظاہر ہو جائیں مثلاً اس کے دونوں قدم ڈھیلے پڑ جائیں اور کھڑے نہ ہو سکیں، یا ناک ٹیڑھی ہو جائے یا دونوں کنپٹیاں اندر کو دھنس جائیں، یا چہرہ کی چمڑی پھیل جائے، یا دونوں ہتھیلیاں کلائی سے اکھڑ جائیں، یا دونوں خصیتیں اوپر کی جانب سکڑ جائیں، اور صرف چمڑی لٹکنے لگے، تو غسل اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا مستحب ہے۔ اور اگر موت کا یقین نہ ہو کہ بظاہر مرنے کا کوئی سبب نظر نہ آ رہا ہو، اور احتمال ہو کہ اس پر سکتہ طاری ہوا ہو، یا گھبراہٹ وغیرہ کی نشانیاں ظاہر ہو جائیں، تو ایسی حالت میں جب تک بدن کی بو وغیرہ میں تبدیلی کے ذریعے موت کا یقین نہ ہو غسل وغیرہ میں جلدی نہ کرے۔

میت کو غسل دینے کے حقدار: غسل دینے کے سلسلے میں اصول تو یہ ہے کہ مرد کی میت ہو تو مرد غسل دے اور عورت کی میت ہو تو عورت غسل دے۔

مرد کو غسل دینے کیلئے سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے واسطے امامت کیلئے بہتر ہے۔ لہٰذا نسبی رشتہ دار مرد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہونگے۔ (یعنی سب سے پہلے باپ کا حق ہے۔ پھر دادا پھر بیٹا پھر پوتا اسی طرح نیچے تک پھر حقیقی بھائی پھر علاتی بھائی (باپ شریک بھائی) پھر حقیقی بھتیجہ پھر علاتی بھتیجہ پھر حقیقی چچا پھر علاتی چچا۔ پھر حقیقی چچازاد بھائی پھر علاتی چچازاد بھائی اسی طرح آخر تک) اس کے بعد ذوی الارحام میں جو زیادہ قریبی ہے سب سے پہلے وہ پھر اس کے بعد والے رشتہ دار حقدار ہونگے۔ انکے

بعد اجنبی مردوں کو حق ہے پھر بیوی پھر محرم عورتوں کو حق ہے۔ عورت کو غسل دینے کیلئے ہر حال میں عورت ہی بہتر ہے۔ اور عورتوں میں بھی قریبی عورتیں بہتر ہیں۔ اور اگر قریبی عورتوں میں بھی سب سے بہتر وہ عورت ہے جسکا اس میت عورت کے ساتھ محرمیت کا رشتہ ہو۔ اور محرمیت سے مراد یہ ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک کو مرد قرار دیں تو دوسرے کا اس سے نکاح حرام ہوگا۔ اور محرمیت سے نسبی رشتہ داری مراد ہے نہ کہ رضاعی (دودھ کے رشتے سے محرم) (حاشیہ، الجمل) (جیسے ماں۔ بیٹی۔ پوتی۔ نواسی۔ بہن۔ اگر دونوں عورتیں محرمیت میں برابر ہوں تو جو عورت عصبی اعتبار سے بھی تعلق رکھتی ہو وہ مقدم ہوگی۔ جیسے خالہ کے ساتھ پھوپھی جمع ہو تو پھوپھی مقدم ہوگی۔ اور محرمی رشتہ والی کوئی عورت نہ ہو تو دیگر قریبی رشتہ داروں میں اقرب فالاقرب کے اعتبار سے مقدم ہوگی۔ جیسے چچازاد بہن، پھوپھی زاد بہن، ماموں زاد بہن، خالہ زاد بہن، ان کے بعد اجنبی عورتوں کو حق ہے پھر شوہر کو اور شوہر کے بعد محرم مردوں کو غسل کا حق ہے۔

بہر حال مذکورہ ترتیب کے مطابق غسل جو بھی دے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، اور میت کا قاتل نہ ہو۔ اگر کافر ہو تو اسے غسل دینے کا حق نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک اجنبی مسلمان میت کے قریبی کافر پر مقدم ہوگا۔ غسل دینے کیلئے جسے پہلا حق حاصل ہے اسے اپنا حق بعد والے کو دینا جائز ہے۔ اور بعد والے کو قبول کرنا بھی جائز ہے۔ مگر ایک شرط کے ساتھ کہ دونوں کی جنس ایک ہو مثلاً میت مرد ہے تو اپنا حق مرد ہی کو دے، ایسا نہیں کہ تمام مرد اپنا حق چھوڑ کر عورتوں کے سپرد کر دیں۔ اور عورت کی میت ہو تو عورت ہی کو اپنا حق دے، ایسا نہیں کہ تمام عورتیں اپنا حق چھوڑ کر مرد کے سپرد کر دیں۔

مرد کا عورت کو غسل دینا: تین اسباب میں سے کسی ایک سبب کے پائے جانے کی صورت میں مرد کیلئے عورت کو غسل دینا جائز ہے۔

(۱) زوجیت: مرد کیلئے اپنی مسلمان اور ذمی بیوی کو غسل دینا جائز ہے، خواہ اس مرد نے مرنے والی کی بہن سے یا اس کے علاوہ چار بیویوں سے شادی کی ہو۔

حدیث: آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے پہلے وفات پا گئی تو میں تجھے غسل اور کفن دونگا۔ (رواہ ابن ماجہ۔ احمد۔ دارقطنی۔ والبیھقی) اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو غسل دیا تھا۔ (اخرجہ، الشافعی، دارقطنی)

(۲) محرمیت۔ محرم مرد کیلئے محرم عورت کو غسل دینا جائز ہے۔

(۳) ملک یمین۔ آقا کیلئے اپنے باندی کو غسل دینا جائز ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ وہ کسی کے نکاح یا عدت میں نہ ہو۔

عورت کیلئے اپنے شوہر کو غسل دینا جائز ہے۔ لیکن شوہر نے اسے طلاق رجعی دی ہے اور عدت میں ان دونوں میں سے کوئی ایک مرجائے تو دوسرے کو غسل دینا جائز نہیں، اس لئے کہ طلاق کی وجہ سے زندگی ہی میں ایک دوسرے کو دیکھنا حرام تھا۔

میاں بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے کو غسل دے تو اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر غسل دے تا کہ بدن کے کسی حصہ کو مس نہ ہو جائے۔ ہاتھ پر کپڑا لپیٹے بغیر غسل دے تو غسل تو صحیح ہو جائے گا، البتہ غاسل کا وضو ٹوٹ جائے گا جبکہ میت کو باوضو غسل دینا بہتر ہے۔ (جمل ۱۵۱/۲) کوئی مرد ایسی جگہ وفات پائے جہاں صرف اجنبی عورتیں موجود ہوں یا کوئی عورت مرجائے اور وہاں صرف اجنبی مرد موجود ہوں تو میت کو غسل نہ دے بلکہ تیمم کرا کے دفن کریں۔

اور ہاتھ پر کپڑا وغیرہ لپیٹ کر تیمم کرائیں۔ (حاشیہ الجمل۔ ۱۵۱/۲) اتنا چھوٹا بچہ مرجائے جو ابھی حد شہوت کو نہ پہنچا ہو

(لڑکا ہو یا لڑکی) تو اُسے مرد وعورت دونوں میں سے کوئی بھی غسل دے سکتا ہے۔ غسل دینے والوں میں سے ایک ہی درجہ کے دو آدمی جمع ہو جائیں مثلاً دو بھائی، یا دو بیویاں جمع ہو جائیں، اور ان میں سے ہر ایک غسل دینا چاہتا ہے تو قرعہ اندازی کی جائے جس کے نام قرعہ نکلے وہ غسل دے۔ (فتح الوهاب)

غسل کا حکم اور اس کا طریقه: میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے۔ غسل کا ادنی درجہ یہ ہے کہ بدن پر جہاں نجاست لگی ہو اسے دور کرنے کے بعد مکمل بدن پر پانی بہائے۔ غاسلِ میت (غسل دینے والے) کیلئے غسل کی نیت کرنا ضروری نہیں، سنت ہے۔ کافر کا کسی مسلمان میت کو غسل دینا صحیح ہے۔ کوئی شخص ڈوب کر مر جائے (تو اس کا ڈوبنا غسل کیلئے کافی نہ ہوگا) بلکہ نعش ملنے کے بعد غسل دینا ضروری ہے۔

غسل کے آداب اور اس کا اکمل طریقه: میت کو تنہائی میں غسل دینا واجب ہے۔ غسل کے وقت غسل دینے والے اور اس کا ہاتھ بٹانے والے کے علاوہ کوئی وہاں داخل نہ ہو۔ البتہ امام رویانیؒ اور دیگر حضرات نے ذکر کیا ہے کہ میت کے ولی کو وہاں جانے کی اجازت ہے، گر چہ وہ نہ غسل دے رہا ہو اور نہ اس کا ہاتھ بٹا رہا ہو۔ غسل دینے والوں کا طاق عدد میں ہونا مستحب ہے۔ غسل دینے والا امانت دار ہو، غسل دیتے وقت میت میں کوئی اچھائی دیکھے (مثلاً چہرہ کا روشن ہونا۔ اور بدن سے خوشبو آنا) تو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرنا مستحب ہے۔ اور کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے (مثلاً چہرہ کالا پڑنا۔ بدن سے بدبو کا آنا۔ صورت بدلنا) تو لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کرنا حرام ہے۔ لیکن اگر بیان کرنے میں کوئی مصلحت ہو۔ مثلاً مرنے والا علی الاعلان بدعت کا کام کرتا تھا۔ تو اس کے عیب کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں تا کہ دیگر لوگ بدعت سے رک جائیں۔ (حاشية الروضه)

غسل کیلئے بڑے برتن (مثلاً بالٹی وغیرہ) میں ٹھنڈا پانی لے۔ اور گرم پانی کے مقابلے میں ٹھنڈے پانی سے غسل دینا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن بہت سردی یا بدن میں میل وغیرہ ہونے کی وجہ سے گرم پانی استعمال کرنا چاہے تو جائز ہے۔ کھارے پانی سے غسل دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور کھارے پانی سے مراد وہ پانی جو اصل کے اعتبار سے کھارا ہو (جیسے سمندر یا کھاڑی کا پانی) نہ کہ پانی میں نمک ملا کر کھارا کر دیا ہو۔ (جمل ۱۴۵/۲) پانی کا برتن غسل کی جگہ سے دور رکھے تا کہ غسل کے وقت اس میں پانی کے چھینٹے نہ اُڑیں۔ غسل کا طریقہ یہ ہے کہ میت کو پرانا کرتہ پہنا کر، اگر کرتہ نہ ملے یا کرتہ میں غسل دینا ممکن نہ ہو تو ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصہ کو چھپا کر، غسل دینے کیلئے بنائے گئے تخت پر رکھنے کے بعد آہستہ سے اس طرح بٹھائے کہ پیچھے کی جانب مائل ہو، اور غسل دینے والا اپنا دایاں ہاتھ میت کے کندھے پر رکھے اور انگوٹھا گدی کے گڑھے میں رکھے تا کہ سر کسی طرف جھک نہ جائے۔ اور میت کی پیٹھ کو اپنے داہنے گھٹنے سے ٹیک دے، پھر اپنے بائیں ہاتھ سے میت کے پیٹ کو اچھی طرح ملتا رہے تا کہ اندر سے فضلات نکل جائیں، اور معین شخص (ہاتھ بٹانے والا) کثرت سے پانی ڈالتا رہے تا کہ نکلنے والے فضلات کی بدبو نہ پھیلے۔ اس کے بعد میت کو چت لٹا کر بائیں ہاتھ کو صاف ستھرا کپڑا لپیٹ کر میت کی اگلی پچھلی شرمگاہ دھوڈالے۔ پھر اس کپڑے کو نکال کر بائیں ہاتھ کو صابن وغیرہ سے اچھی طرح دھوئے اور میت کے بدن پر جہاں کہیں گندگی لگی ہو اسکو بھی خوب دھیان سے دھوئے۔ اس کے بعد دوسرا کپڑا لپیٹ کر بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے دانتوں اور نتھنوں کو دھوئے۔ دھوتے وقت دانتوں کو نہ کھولے تا کہ پانی پیٹ میں نہ چلا جائے۔ پھر میت کو وضو کرائے (وضو کی نیت کرنا ضروری ہے اور نیت مسنون وضو کی کرے۔) (حاشية الجمل۔ ۱۴۶/۲)

وضو میں ہر عضو کو تین تین بار دھوئے، مضمضہ اور استنشاق بھی کرائے، مگر مضمضہ اور استنشاق کے وقت سر کو تھوڑا مائل کرے، تا کہ

پانی اندر نہ جائے۔ وضو سے فراغت کے بعد میت کے سر اور داڑھی کو ایسے پانی سے دھوئے جس میں بیری کے پتے ڈالے گئے ہوں۔ اگر سر اور داڑھی کے بال آپس میں چپکے ہوئے ہوں تو کشادہ دندانے والی کنگھی سے نرمی کے ساتھ کنگھی کرے۔ تا کہ کوئی بال اکھڑ نہ جائے۔ اگر کوئی بال اکھڑ جائے تو اسے کفن میں رکھے۔ اس کے بعد چت لٹانے کی حالت ہی میں دائیں اور بائیں بازو کے گردن سینہ ران اور قدم کے اگلے حصہ کو دھو ڈالے۔

اس کے بعد بائیں کروٹ پر لٹا کر دائیں طرف کے پچھلے اعضاء کو گدی سے لے کر قدم تک تمام حصے کو دھو ڈالے۔ پھر دائیں کروٹ پر لٹا کر بائیں طرف اسی طرح دھوئے۔ یہ مکمل غسل ایسے پانی سے دے جس میں بیری کے پتے ڈالے گئے ہوں۔ اس کے بعد خالص پانی سر سے لے کر قدم تک ڈالے۔ پھر تیسری مرتبہ خالص پانی میں تھوڑا کافور ملا کر سر سے پاؤں تک بہائے اور یہ تینوں ملا کر ایک مرتبہ غسل ہوا۔ اس طریقے سے تین مرتبہ غسل دینا مستحب ہے۔ اور تینوں مرتبہ خالص پانی میں کافور ملانا مستحب ہے۔ مگر آخری بار پانی ڈالتے وقت کافور ملانے کی زیادہ تاکید ہے۔ (تخت پر میت کے سر رکھنے کی جگہ تھوڑی اونچی و بلند ہو تا کہ میت کے نیچے پانی جمع نہ رہے)

حدیث: حضرت ام عطیہ انصاریہؓ فرماتی ہیں" اللہ کے رسول ﷺ ہمارے پاس ایسے وقت تشرلف لائے جس وقت ہم آپ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) کو غسل دے رہے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اسے ایسے پانی سے جس میں بیری کے پتے ڈالے ہوئے ہوں" تین یا پانچ مرتبہ یا اگر تم اس سے زیادہ تعداد میں غسل کی ضرورت محسوس کرو تو (زیادہ تعداد میں) غسل دو۔ اور آخری (غسل میں پانی میں) تھوڑا کافور ملاؤ۔ اور دائیں جانب سے اور مواضع وضو (وضو کی جگہوں) سے غسل کی ابتداء کرو۔ (رواہ البخاری و مسلم)

غسل دینے کیلئے سب سے بہترین صورت یہ ہے کہ مذکورہ طریقہ کے مطابق سب سے پہلے ایسے پانی سے غسل دے جس میں بیری کے پتے ڈالے گئے ہوں، پھر خالص پانی سر سے قدم تک بہائے، پھر دوبارہ بیری کے پتے ڈالے ہوئے پانی سے غسل دے، پھر خالص پانی بہائے پھر سہ بارہ بیری کے پتے ڈالے ہوئے پانی سے غسل دے پھر خالص پانی بہائے۔ اس کے بعد خالص پانی میں تھوڑا کافور ملا کر تین مرتبہ سر سے قدم تک بہائے (حاشیۃ الجمل ۔ ۲/۱۴۷) اگر تین مرتبہ غسل دینے کے باوجود بھی صفائی حاصل نہ ہو تو صفائی حاصل ہونے تک غسل دیتا رہے، اگر مکمل صفائی جفت عدد سے غسل دینے سے حاصل ہو تو مزید ایک اور مرتبہ غسل دے کر طاق عدد کرنا مستحب ہے (یعنی مثلاً چار مرتبہ غسل دینے کے بعد مکمل صفائی حاصل ہو تو پانچویں مرتبہ بھی دینا مستحب ہے تا کہ طاق عدد کی رعایت ہو) ہر مرتبہ کے غسل میں پہلی اور دوسری بار جس پانی سے غسل دیا جاتا ہے وہ غسل شمار نہیں ہوتا۔ (کیونکہ پہلی بار استعمال ہونے والا پانی بیری کے پتے ہونے کی وجہ سے متغیر رہتا ہے اور دوسری بار استعمال ہونے والا پانی بدن سے پتوں کا اثر زائل کرنے کی وجہ سے کسی حد تک متغیر ہو جاتا ہے۔) البتہ تیسری مرتبہ کافور ملا کر جس پانی سے غسل دیا جاتا ہے وہ غسل شمار ہوتا ہے۔

غسل کے بعد سابقہ طریقے کے مطابق دوبارہ میت کے جوڑوں کو نرم کرے تا کہ کفن پہنانے میں آسانی ہو۔ غسل کے بعد میت کے بدن کو کسی کپڑے کے ذریعے اچھی طرح پونچھے تا کہ کفن تر نہ ہو جائے۔ میت کو (غسل کے وقت) اوندھا منہ لٹانا جائز نہیں۔ غسل دیتے وقت قریب میں انگیٹھی جلا کر اس میں خوشبو ڈال دے، تا کہ میت کے پیٹ سے نکلنے والے فضلات کی بدبو سے تکلیف نہ ہو۔ غسل دینے والا ہر مرتبہ کے غسل میں میت کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا رہے۔ اور پہلے غسل کے مقابلہ میں بعد والے غسل میں کچھ نرمی سے ہاتھ پھیرے۔ اگر آخری غسل میں غسل کے بعد کوئی نجاست نکلے تو صرف نجاست کا دھونا واجب ہے۔ نئے سرے سے غسل دینے کی ضرورت نہیں، چاہے پھر

وہ نجاست اگلی پچھلی شرمگاہ سے نکلے یا کسی اور راستہ سے نکلے۔ میت کو کفن میں لپیٹنے سے پہلے نکلے یا بعد میں۔ مردہ عورت کو غسل دینے کے بعد اس کے بدن کو کسی مرد کے چھونے کی وجہ سے نہ دوبارہ غسل کی ضرورت ہے اور نہ وضو کی۔ اسی طرح غسل کے بعد کسی مردہ عورت سے صحبت کی گئی تب بھی اس مردہ پر نہ غسل واجب اور نہ وضو۔ غسل دیتے وقت میت کے ستر (یعنی ناف سے گھٹنے تک کے حصہ) کو دیکھنا حرام ہے۔ چھوٹے بچے یا بچی کی میت اس سے مستثنیٰ ہے۔ (جمل) بلکہ غسل دینے والے کیلئے بلا کسی ضرورت میت کے بدن کے کسی حصہ کو دیکھنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر ضرورت ہو جیسے غسل شدہ حصہ کو پہچانا ہو تو دیکھنا جائز ہے۔ جو آدمی غسل دینے والے کے ساتھ بحیثیت معین ہو، وہ بلا ضرورت میت کے کسی بھی حصے کو نہ دیکھے۔

کوئی مسلمان جل کر مرجائے (اور جلنے کی وجہ سے اس کی ایسی حالت ہوگئی ہو) کہ غسل دینے کی صورت میں بدن کے گلنے کا اندیشہ ہو تو غسل نہ دے بلکہ تیمم کرائے۔

اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ غسل دیں گے تو قبر میں جلد بوسیدہ اور سڑ گل جائیگا تو ایسی صورت میں غسل ہی دیا جائے گا تیمم نہ کرائے، کیونکہ قبر میں تو کبھی کو بوسیدہ ہونا ہے۔

جنبی اور حائضہ عورت کو بلا کراہت میت کو غسل دینا جائز ہے۔ اگر جنبی یا حائضہ عورت مرجائے تو ایک ہی غسل کافی ہے (الگ الگ دو غسل دینے کی ضرورت نہیں، یعنی ایک جنابت اور حیض کا اور دوسرا موت کی وجہ سے) اگر کسی میت عورت کے بال لمبے ہوں تو اس کی تین چوٹیاں بنا کر پیٹھ پیچھے ڈالنا سنت ہے، جیسا کہ بخاری شریف میں مروی ہے۔

کسی کی بیک وقت تمام بیویاں گرنے یا ڈوبنے یا کسی اور سبب سے مرجائیں تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی جسکے نام قرعہ نکلے گا اُسے پہلے غسل دے کسی کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں مسلمان عورتیں اور کفار مرد موجود ہوں تو کافر غسل دے اور عورتیں نماز جنازہ پڑھیں۔

میت کے بدن کو کسی کپڑے سے پونچھنے کے بعد وہ کپڑا ناپاک نہیں ہوتا۔

مُحرم میت کا غسل: کوئی حالت احرام میں مرجائے تو اسے خوشبو لگانا، اس کے ناخن اور بال کاٹنا حرام ہے، اگر محرم مرد ہو تو اسے سلا ہوا کپڑا پہنانا اور اس کا سر ڈھانپنا جائز نہیں، عورت کا چہرہ ڈھانپنا جائز نہیں (خلاصہ یہ ہے کہ موت کے بعد بھی احرام کی پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے)

حدیث: ایک شخص کا حالت احرام میں انتقال ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اسے غسل دے کر کفن پہناؤ مگر خوشبو نہ لگانا اور نہ اس کا سر ڈھانپنا اسلئے کہ قیامت کے دن وہ تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا۔ (صحیحین)

محرم کو غسل دیتے وقت خوشبو کی دھونی دینے میں کوئی حرج نہیں جیسے کہ اگر محرم کسی عطر فروش کے پاس بیٹھے تو حرج نہیں (لیکن خوشبو کے لئے کسی محرم کا عطر کی دوکان میں بیٹھنا مکروہ ہے۔ جمل)

محرم کے علاوہ دیگر میت کے بھی ناخن کاٹنا، بغل کے بال اور موئے زیر ناف نکالنا اور مونچھ کترنا مکروہ ہے، کیونکہ اس کے متعلق آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے کوئی معتمد چیز منقول نہیں، نیز میت کے اجزاء قابل احترام ہیں، تو ان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ کوئی ختنہ کرنے سے پہلے مرجائے تو اس کی ختنہ کرنے کی ضرورت نہیں (اگر ختنہ کی چمڑی کے نیچے پانی نہ پہنچ پائے تو اس کی طرف سے تیمم کرائے۔ جمل ۲/ ۱۵۴)

کوئی عورت عدت وسوگ کی حالت میں مرجائے تو اسے خوشبو لگانا جائز ہے۔ اگر کوئی محرم میت کو خوشبو لگائے یا سلا ہوا کپڑا پہنائے تو ایسا شخص گنہگار ہوگا، مگر فدیہ دینے کی ضرورت نہیں۔ مونچھ کا استرے وغیرہ کے ذریعے حلق کرنا مکروہ ہے۔

کفن کا بیان

کفن پہنانا فرض کفایہ ہے۔ سفید رنگ کا کفن ہونا مستحب ہے۔

حدیث: سفید کپڑے پہنا کرو تمہارے بہترین کپڑوں میں سے ہے، اور اسی میں مردوں کو کفنایا کرو، (رواہ الترمذی) میت کو زندگی میں جو کپڑا پہننا جائز تھا۔ اسی جنس کا کفن ہونا ضروری ہے۔ عورت کو ریشم کے، زعفرانی اور زرد رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے میں کفن دینا کراہت کے ساتھ جائز ہے، اور مرد کیلئے حرام ہے۔ لیکن اگر ریشم کے علاوہ دوسرا کپڑا نہ ملے تو مرد کیلئے بھی ریشم کا کفن پہنانا جائز ہے (حاشیۃ الروضہ) مباح کفنوں میں میت کے حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔ میت مالدار ہے تو کفن کیلئے عمدہ کپڑا استعمال کرے اور متوسط ہے تو متوسط اور غریب ہو تو موٹا اور کھردرا قسم کا کپڑا استعمال کرے۔

کفن میں غلو کرنا (یعنی اسراف کرنا) مکروہ ھے: کیونکہ ابوداؤد کی روایت ہے "کفن میں غلو نہ کرو، اس لئے کہ وہ بڑی جلد سڑگل جائے گا" (رواہ ابوداؤد باسناد، حسن) اِمام قاضی حسینؒ فرماتے ہیں کہ کفن کیلئے نئے کپڑے کے بمقابل پرانا دھویا ہوا کپڑا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ کو جدید کپڑوں میں کفنایا گیا اور بظاہر صحابہ کے اتفاق سے تھا اس لئے بعض حضرات نے نقل ودلیل کی رو سے جدید کو بہتر سمجھا ہے۔ (جمل ۱۶۲، ۱۶۳) کفن کا سفید صاف ستھرا اور موٹا ہونا مستحب ہے۔ قیمتی ہونا مستحب نہیں۔

کفن کی اقل واکمل مقدار: کفن کیلئے کم سے کم ایک کپڑا ہونا ضروری ہے اور ایک کپڑا اتنی مقدار میں ہونا ضروری ہے، جس سے ستر عورت ہوسکے۔ اور ستر کی مقدار مذکر ومونث کے لحاظ سے مختلف ہوگی۔ اور کفن کی اکمل مقدار یہ ہے کہ مرد کیلئے تین کپڑے ہوں۔ اور عورت کیلئے پانچ۔ ازار قمیص۔ اوڑھنی۔ اور دو چادریں مرد کو تین کپڑوں میں کفن دینا افضل ہے۔

حدیث: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ آپ ﷺ کو تین سفید یمنی کپڑوں میں کفن دیا گیا اور اس میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا۔ (رواہ الشیخان)

اور اگر پانچ کپڑوں میں کفن دے تو جائز ہے، جیسا کہ ابن عمرؓ نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا۔ (رواہ البیہقی) کہ تین چادریں عمامہ اور قمیص تھا) لیکن یہ مستحب نہیں اور عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دینا مستحب ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے اپنی بیٹی ام کلثومؓ کو پانچ کپڑوں میں کفن دینے کا حکم دیا، (رواہ ابو داؤد) اور پانچ سے زیادہ کپڑے استعمال کرنا مکروہ ہے۔

اگر مرد وعورت کے کفن کیلئے تین کپڑے استعمال کرے، تو مستحب یہ ہے کہ تین چادروں میں کفن دیا جائے اور تینوں چادریں لمبائی چوڑائی میں ایسی ہوں کہ ہر ایک چادر پورے بدن کو چھپائے، اور تین چادریں استعمال کرنے کی صورت میں مرد وعورت کے درمیان کوئی فرق نہیں، البتہ پانچ کپڑے استعمال کرنے کی صورت میں فرق ہے۔ مرد کیلئے پانچ کپڑے استعمال کرے، تو اس میں تین چادریں ایک کرتہ اور عمامہ ہو۔ اور سب سے پہلے عمامہ اور قمیص پہنائے اس کے بعد تین چادریں لپیٹے۔ اور عورت کیلئے پانچ کپڑے استعمال کرے تو اس میں تہبند قمیص اوڑھنی اور دو چادریں ہوں۔ اور سب سے پہلے ازار یعنی تہبند پہنائے (اور تہبند سے ناف سے نیچے تک کے حصہ کو ڈھانکے) پھر

قمیص (اور قمیص سے ناف سے اوپر تک کے حصہ کو ڈھانپے۔) پھر اوڑھنی۔ (اور اوڑھنی سے سر ڈھانپے) اس کے بعد دو چاریں لپیٹے۔(اور چادروں سے پورا بدن ڈھانپے)

چادر لپیٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے اچھی اور کشادہ چادر پہلے بچھائے، پھر دوسری اور تیسری چادر بچھائے۔اور ہر ایک پر خوشبو اور کافور چھڑ کے (خوشبو کا ڈالنا مستحب ہے واجب نہیں) پھر میت کو اس پر آہستہ سے چت رکھے۔اس کے بعد دھنی ہوئی تھوڑی روئی لے کر اس پر خوشبو اور کافور ڈال کر دو سرینوں کے درمیان اتنا ٹھوس دے کہ پچھلی شرمگاہ کے حلقہ تک پہنچ جائے تاکہ شرمگاہ سے کوئی چیز نہ نکل سکے۔ مگر شرمگاہ میں داخل نہ کرے۔اور مزید مضبوطی کیلئے اوپر سے لنگوٹ کی طرح ایک کپڑا باندھے۔پھر روئی میں خوشبو اور کافور ملا کر ناک کے نتھنے، کان، آنکھ، کھلے، زخموں، اور سجدہ کی جگہوں (یعنی ان اعضاء پر جو سجدہ میں زمین پر لگ جاتے ہیں: پیشانی، ناک، دونوں ہتھیلیوں کا پیٹ، دونوں گھٹنے، اور دونوں قدم کی انگلیاں) پر رکھے۔اس کے بعد بائیں جانب سے پھر دائیں جانب سے کفن لپیٹنا شروع کرے۔سب سے پہلے اندرونی چادر لپیٹے پھر دوسری، پھر تیسری، کفن لپیٹنے کے بعد سر کے پاس چادر کا جو زائد حصہ ہوا سے عمامہ کی طرح جمع کر کے چہرہ اور سینہ پر جہاں تک پہنچ سکے ڈال دے، اور پاؤں کے پاس جو زائد حصہ ہوا سے قدم اور پنڈلی پر ڈال دے۔بہتر تو یہ ہے کہ میت کو ابتداءً جب کفن پر رکھے تو اس طرح رکھے کہ کفن کا زائد حصہ سر کے پاس زیادہ رہے پھر کفنوں کو رسی سے باندھے تاکہ اٹھاتے وقت کفن کھل نہ جائے، اور قبر میں اتارنے کے بعد اس رسی کو کھول دے۔اگر میت محرم نہ ہو تو کفن کو عود کے ذریعہ دھونی دینا مستحب ہے۔ بڑے آدمی کی طرح چھوٹے بچہ کو بھی تین کپڑوں میں کفن دینا مستحب ہے۔اگر ایسے کپڑے میں کفن دیا جائے، جس میں سر اور پیر پوری طرح نہیں چھپ رہے ہوں۔تو صرف سر کو ڈھانپ دے۔ کسی میت نے یہ وصیت کی کہ اس کے کفن کیلئے ایک کپڑا بھی استعمال نہ کرے تو اس کی وصیت نافذ نہ ہوگی۔کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔البتہ دوسرے اور تیسرے کپڑے کے ساقط کرنے کی وصیت کی تو یہ وصیت نافذ ہوگی، کیونکہ یہ میت کا حق ہے۔اگر میت نے کفن کے متعلق کچھ وصیت نہ کی ہو مگر ورثاء کے درمیان اختلاف ہو گیا کہ ایک کپڑے میں کفن دیا جائے یا تین کپڑوں میں یا تمام اس پر متفق ہو گئے کہ ایک ہی کپڑے میں کفن دیا جائے، تو ایسی صورت میں کفن کیلئے تین ہی کپڑے استعمال کریں۔

میت پر اتنا قرض ہو کہ اس کی ادائیگی میں سارا مال ختم ہو جائیگا، اور ایسی صورت میں قرض خواہ حضرات ایک ہی کپڑے میں کفن دینے کا مطالبہ کریں، تو ایک ہی کپڑے میں کفن دیا جائے۔

کفن کے مصارف (اخراجات): کفن کا خرچ ترکہ کے راس المال (یعنی کل ترکہ) میں سے لیا جائے اور یہ خرچ قرض کی ادائیگی، وصیت کے نفاذ اور میراث تقسیم کرنے سے پہلے نکالا جائے۔کفن کیلئے شیء مرھون کو (یعنی رھن کے طور پر میت کی کوئی چیز کسی کے قرض کے مقابلہ رکھی ہوئی ہو) اور جانی (کو جانی سے مراد میت کا غلام جس نے کسی پر جنایت کی ہو) اور ایسے مال کو جس میں زکوۃ واجب ہو چکی ہو بیچا نہ جائے۔

اگر میت نے اپنے پیچھے کچھ مال نہ چھوڑا ہو، تو اُس کے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اس شخص پر ہوگی جس کے ذمہ اس کا نان نفقہ تھا۔لہٰذا ایسی میت (یعنی جس نے کچھ مال نہ چھوڑا ہو) کے قریبی آدمی پر اس کے کفن کی ذمہ داری ہوگی۔اور ایسے شخص پر میت کیلئے ایک سے زائد کپڑوں میں کفن دینا ضروری نہیں۔اولاد کے کفن کی ذمہ داری باپ پر ہوگی۔اولاد چھوٹی ہو یا بڑی، کیونکہ بچے موت کی وجہ سے کمانے سے عاجز ہو گئے، اور عاجز بچوں کا نفقہ واجب ہے، بیوی کے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری شوہر پر ہے۔شوہر کے پاس مال نہ ہو، تو پھر بیوی کے مال سے کفن وغیرہ لایا جائے۔میت کے پاس نہ کچھ مال ہے اور نہ اس کا ایسا کوئی قریبی رشتہ دار جس کے ذمہ اس کا نفقہ ہو، تو پھر اس کے تجہیز و

تکفین کی ذمہ داری بیت المال پر ہوگی، لیکن ایسی صورت میں اسے ایک ہی کپڑے میں کفن دیا جائے اور اگر ایسی کسی حالت میں اُس نے ایک ہی کپڑا اپنے پیچھے چھوڑا ہے تو اُسی کپڑے میں کفن دیا جائے اور بیت المال سے دیگر زائد کپڑے نہ لے۔ اور اگر بیت المال میں بھی مال نہ ہو (یا بیت المال کا کوئی نظم ہی نہ ہو) تو عام مسلمانوں پر اس کے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری ہوگی۔ جن کے پاس اپنے سالانہ مصارف سے زائد تجہیز کی گنجائش ہو ایسے جن افراد سے تجہیز کا مطالبہ کیا جائے، ان پر لازم ہے تاکہ ایک دوسرے پر ٹالتے نہ رہیں۔ (جمل ۱۶۴/۲) مگر ایسی صورت میں ایک سے زائد کپڑوں میں کفن دینا ضروری نہیں۔ امام صمیریؒ فرماتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اپنے لئے کفن تیار کرنا مستحب نہیں، تاکہ اس کا حساب دینا نہ پڑے، ہاں اگر کفن کے حلال کمائی سے ہونے کا کامل یقین ہو یا علماء عابدین اور بزرگوں سے بطور ہدیہ ملا ہو تو اس کو کفن کے طور پر محفوظ رکھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسا کرنا بہتر ہے کیونکہ بعض صحابہ کرام سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

باب ۔ جنازہ اٹھانے کا بیان (میت کو کندھا دینا)

جنازہ اٹھانے میں نہ ذلت ہے اور نہ اس سے مروءۃ ختم ہوتی ہے، بلکہ یہ تو ایک نیک کام ہے۔ اور میت کا اکرام ہے۔ اور آپ ﷺ صحابہ کرام اور حضرات تابعینؒ کے فعل سے ثابت ہے۔ جنازہ اٹھانے کے ذمہ دار مرد ہیں، میت مرد کی ہو یا عورت کی۔ جنازہ غافل اور سست آدمی کی طرح نہ اٹھائے، اور نہ اس طریقہ پر اٹھائے جس سے میت کے گرنے کا اندیشہ ہو۔

جنازہ اٹھانے کا طریقہ: جنازہ اٹھانے کے دو طریقے ہیں (۱) دو ستون کے درمیان اور وہ اس طرح کہ آگے کے دو ستونوں کو ایک آدمی اپنے دونوں کندھوں پر اٹھائے اور پچھلے دو ستونوں دو آدمی اٹھائے ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب اور پچھلے ستونوں کے درمیان کوئی نہ رہے کیونکہ اسے چلنے میں دشواری ہوگی۔ اگر آگے کا آدمی اکیلا نہیں اٹھا سکتا تو ستونوں کے باہر سے دو آدمی ایک ایک ستون کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اس کا تعاون کریں۔

(۲) **تربیع:** یعنی آگے کے جانب دو آدمی ہوں ایک دائیں ستون کو اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے اور دوسرا بائیں ستون کو اپنے دائیں کندھے پر اٹھائے۔ اور پیچھے کے ستون کو بھی دو آدمی اسی طرح اٹھائیں۔

کوئی شخص تربیع والے طریقے کے مطابق جنازہ اٹھانا چاہتا ہے، تو آگے کے بائیں ستون سے ابتداء کرے کہ سب سے پہلے آگے کے بائیں ستون کو اپنے دائیں کندھے پر اٹھائے، پھر اُسے دوسرے کے سپرد کرے، اس کے بعد پیچھے کے بائیں ستون کو دائیں کندھے پر اٹھائے، پھر جنازہ کے سامنے سے آگے بڑھ کر آگے کے دائیں ستون کو اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے، پھر پیچھے کے دائیں ستون کو بھی اسی طرح اٹھائے۔ اور اگر پہلے طریقہ کے مطابق اٹھانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے آگے کے دونوں ستون کو اپنے دونوں کندھے پر اٹھائے، پھر پیچھے کے بائیں ستون کو دائیں کندھے پر اٹھائے، اس کے بعد جنازہ کے سامنے سے آگے بڑھکر پیچھے کے دائیں ستون کو بائیں کندھے پر اٹھائے۔ (حاشیہ الجمل ۔ ۱۶۵/۲) جنازہ اٹھانے کے مذکورہ دونوں طریقہ جائز ہیں۔ البتہ افضل یہ ہے کہ دونوں کے درمیان جمع کرے، یعنی کبھی تو پہلے طریقہ کے مطابق اٹھائے۔ اور کبھی دوسرے کے مطابق اگر کسی ایک طریقے کے مطابق ہی اٹھانا ہے تو پہلا طریقہ افضل ہے۔

فصل ۔ جنازہ لے چلنا

سوار اور پیدل چلنے والے کیلئے جنازہ کے آگے چلنا اور اتنا قریب رہنا افضل ہے کہ اگر پیچھے مڑ کر دیکھے تو جنازہ نظر آئے۔

حدیث: (۱) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے میں نے آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمرؓ کو جنازہ کے آگے چلتے دیکھا (احمد۔ اصحاب السنن۔ دارقطنی ۔ بیھقی)

(۲) حضرت عمرؓ لوگوں کو مار کر حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے جنازہ کے آگے چلاتے تھے۔ (مصنف عبد الرزاق)

(۳) حضرت صالح کا ارشاد ہے! میں نے حضرت ابوہریرہؓ، ابوقتادہؓ، ابن عمرؓ، اور ابواسیدؓ کو جنازہ کے آگے چلتے دیکھا ہے۔ (ابن ابی شیبہ) (تحفة الحوذی۔ ۹۰/۴) جنازہ کو چھوڑ کر پہلے ہی قبرستان نہ پہنچے (بلکہ ساتھ رہے) لیکن اگر کوئی جنازہ سے پہلے قبرستان پہنچ جائے تو حرج نہیں۔ پھر چاہے تو (قبرستان میں) کھڑے جنازہ کا انتظار کرتا رہے یا بیٹھ جائے۔ جنازہ کو جلدی جلدی لے چلنا سنت ہے۔

حدیث: جنازہ کو جلدی لے چلو، اس لئے کہ اگر وہ نیک ہے تو وہ بہت اچھی چیز ہے، جس کی طرف تم لے جارہے ہو اور اگر اس کے علاوہ ہو تو بری چیز ہے جس کو تم اپنے کندھوں سے اتار دیتے ہو۔ (متفق علیہ) لیکن اگر جلدی چلنے سے میت میں تغیر پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، تو پھر آہستہ چلے، اور جلدی چلنے سے مراد عادۃً جو چال ہے اس سے کچھ تیز چال کرے۔ بالکل تیز چلنا (دوڑنا) مراد نہیں، ہاں اگر میت میں تغیر پھٹنے یا پھولنے کا اندیشہ ہو تو پھر اور زیادہ تیز چلے۔ بلا عذر جنازہ کے ساتھ سوار ہو کر جانا مکروہ ہے کوئی عذر ہو تو حرج نہیں البتہ واپس لوٹتے وقت سوار ہونے میں کوئی حرج نہیں (کیونکہ مسلم شریف میں آپ ﷺ کا واپسی میں سوار ہونا مذکور ہے۔ فتح الوھاب)

حدیث: ایک جنازہ میں آپ ﷺ نے بعض لوگوں کو سوار دیکھا تو فرمایا! تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟ اللہ تعالیٰ کے فرشتے تو پیدل چل رہے ہیں اور تم لوگ جانوروں کی پشت پر ہو (ترمذی) اگر عورت کی میت ہو تو (مزید) ستر کے لئے اس کی نعش پر قبہ نما بنانا مستحب ہے (جیسا کہ آجکل ہوتا ہے)

جنازہ کے ساتھ جانا: مردوں کیلئے جنازہ کے ساتھ جانا سنت موکدہ ہے۔

حدیث: حضرت براءؓ سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے۔ ہمیں آپ ﷺ نے جنازہ کے ساتھ جانے کا حکم دیا الخ (متفق علیہ) عورتوں کیلئے جانا مکروہ ہے جبکہ جانے کی صورت میں کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، ورنہ حرام ہے۔ مسلمان کیلئے اس کے قریبی (رشتہ دار) کافر کے جنازہ کے ساتھ جانے میں حرج نہیں۔ جنازہ کے ساتھ انگھیٹی وغیرہ میں آگ لے جانا مکروہ ہے۔ اسی طرح قبر کے پاس انگھیٹی کا ہونا، بھی مکروہ ہے جنازہ کے پیچھے نوحہ کرنا، چیخنا، چلانا حرام ہے جنازہ کے ساتھ چلتے وقت شور کرنا دنیاوی باتیں کرنا مکروہ ہے۔ (کیونکہ صحابہ کرامؓ جنازہ کے ساتھ شور وغل کو ناپسند فرماتے تھے۔) (بیھقی) بلکہ مستحب یہ ہے کہ موت اور موت کے بعد آنے والے احوال اور دنیا کے فنا ہونے اور اس کے علاوہ دیگر امور آخرت کے متعلق غور کرے۔ تلاوت وذکر وغیرہ بھی بلند آواز سے نہ کرے۔ آہستہ تلاوت وذکر مسنون ہے (جمل) اگر کسی بیٹھے ہوئے آدمی کے پاس سے جنازہ گذرے اور جنازے کے ساتھ جانے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے لئے کھڑا رہنا مستحب نہیں ہے۔ اور ایسے آدمی کا اس میت کیلئے دعا کرنا اور تعریف کے لائق ہو تو تعریف کرنا اور ان الفاظ کا کہنا مستحب ہے۔ "سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوْتُ ۔ سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ "(مغنی المحتاج ۱/ ۳۴۰) طبرانی میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جب کسی کا جنازہ دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ "هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا اِيْمَاناً وَّ تَسْلِيْماً" نیز طبرانی نے آپ ﷺ سے اس روایت کو پیش کیا ہے: جو کسی جنازہ کو دیکھ کر یہ پڑھے" اَللّٰهُ اَكْبَرُ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا اِيْمَاناً وَّ تَسْلِيْماً" تو اس کے حق میں بیس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ (جمل ۲ ۱۶۵)

باب ۔ نماز جنازہ کا بیان

نماز جنازہ ا ھ میں مدینہ میں فرض ہوئی۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے اسعد بن زرارہ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور سب سے پہلے براء بن معرور کی قبر پر نماز ادا کی۔ اور سب سے پہلے غائبانہ نماز جنازہ نجاشی کی پڑھی۔ (حاشیۃ الجمل ۔ ۶۶/۲) نماز جنازہ فرض کفایہ ہے۔ جس پر نماز ادا کی جاتی ہے اس میں تین امور کا پایا جانا ضروری ہے (۱) میت ہو (۲) مسلمان ہو۔ (۳) شہید نہ ہو۔

کسی زندہ مسلمان (کے بدن) کا کچھ حصہ (مثلاً ہاتھ پیر وغیرہ) مل جائے تو اس ملے ہوئے جز پر نماز نہ پڑھے، بلکہ کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردے اگر کسی مردہ آدمی کا کوئی جز ملے چاہے جز معمولی کیوں نہ ہو اسے غسل دے کر کپڑے میں لپیٹے پھر اس پر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کرے۔

حدیث: واقعہ جمل میں حضرت عبدالرحمٰن بن عتاب بن اسید کا انتقال ہوا تو ان کا ایک ہاتھ پرندہ نے اٹھا کر مکہ میں ڈالا تو صحابہ کرامؓ نے ان کے ہاتھ پر نماز جنازہ ادا کی (فتح الوہاب) اگر صرف ایک بال یا ناخن ملے تو اس کیلئے نہ غسل ہے اور نہ نماز (حاشیۃ الروضہ ۔جمل)

زندگی میں جدا ہونے والے اجزاء کا حکم: زندہ آدمی کے بدن سے نکلے ہوئے ناخن اور بال کو (مثلاً کنگھی وغیرہ کرنے سے بال نکل جائے یا ناخن کاٹنے کی وجہ سے الگ ہو جائے) اور پچھنے لگوانے اور حجامت کروانے کی وجہ سے نکلے ہوئے خون کو اور عورت کے پیٹ سے گرے ہوئے خون اور گوشت کے لوتھڑے کو دفن کرنا مستحب ہے۔

دارالاسلام میں کسی میت کا کوئی عضو یا پوری میت مل جائے، لیکن اس کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہ ہو، تو اس پر نماز جنازہ پڑھے، اسلئے کہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوگا۔

نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار کون: نماز جنازہ پڑھانے کے واسطے سب سے بہتر اس کا ولی ہے۔ اور ولی سے مراد اس کا رشتہ دار۔ لہٰذا کسی اجنبی کو رشتہ دار سے پہلے نماز پڑھانے کا حق نہ ہوگا۔ ہاں اگر قریبی کوئی عورت موجود ہو اور وہاں (قریبی مرد کے بجائے) صرف اجنبی مرد موجود ہو تو اجنبی مرد نماز پڑھانے کیلئے زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ اگر کوئی اجنبی ممیز بچہ بھی موجود ہو، تو وہ اس قریبی عورت پر مقدم ہوگا۔ تمام نمازوں میں عورتوں کی امامت کیلئے عورت کے مقابلہ میں مرد زیادہ بہتر ہے۔ نماز جنازہ کی امامت کے لئے رشتہ داروں میں بھی سب سے بہتر میت کا باپ ہے پھر دادا اسی طرح اوپر تک۔ (یعنی پردادا، سکڑ دادا) پھر بیٹا۔ پھر پوتا ایسے ہی نیچے تک (یعنی پڑپوتا وغیرہ) پھر حقیقی بھائی، پھر علاتی بھائی (باپ شریک بھائی) پھر حقیقی بھتیجہ، پھر علاتی بھتیجہ، پھر حقیقی چچا، پھر علاتی چچا، پھر حقیقی چچا کا بیٹا، پھر علاتی چچا کا بیٹا، پھر باپ کا چچا، پھر باپ کے چچا کا بیٹا، پھر دادا کا چچا، پھر دادا کے چچا کا بیٹا، یعنی وراثت کی ترتیب کے مطابق۔

اگر دو چچازاد بھائی ایک ساتھ جمع ہو جائیں اور ان میں سے ایک ماں شریک بھائی ہو تو ماں شریک بھائی مقدم ہوگا۔ (المجموع ۔ ۲۱۸/۵)

اگر میت کے عصبہ موجود نہ ہوں تو پھر ذوی الارحام کو حق ہوگا۔ اور ذوی الارحام میں پہلے نانا کو حق ہوگا، پھر ماں شریک بھائی کو، پھر ماموں، پھر اخیافی چچا، (باپ کا ماں شریک بھائی) اگر میت کسی اجنبی شخص کو نماز پڑھانے کی وصیت کرے تو اس کی وصیت نافذ نہ ہوگی (یعنی اس وصیت کا نفاذ ضروری نہیں۔ گرچہ میت کی غرض کے پیش نظر اسے امام بنانا بہتر ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کے متعلق اور

حضرت عمرؓ نے صہیبؓ، کے متعلق اپنی نماز جنازہ کے امامت کی وصیت کی تھی۔اوران کے ذمہ داروں نے اس کی اجازت دی(بشری الکریم۔ ۲/۵۳) اگرایک ہی درجہ کے دوآدمی جمع ہوجائیں جیسے دو بیٹے یادو بھائی اوردونوں میں نماز پڑھانے کے متعلق نزاع واختلاف ہوجائے،تودونوں میں عادل(یعنی جو بدعتی وفاسق نہ ہو)اوراسلام میں عمر کے لحاظ سے جو بڑا ہومقدم ہوگا۔اگر عمر میں دونوں برابر ہوں،تو ان میں سے فقیہ کومقدم کرے۔اوراگردونوں فقیہ ہوں تو قاری کومقدم کرے۔(المجموع ۔ ۵/۲۱۹)دونوں میں ایک غلام اورایک آزاد ہوتو آزادمقدم ہوگا،چاہے غلام فقیہ اورقریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔تمام رشتہ دار ہراعتبار سے برابر ہوں اوران میں سے کسی ایک کی امامت پرسب راضی ہوں تو ٹھیک ہے۔ورنہ قرعہ اندازی کریں۔

امام کہاں کھڑا ہو: امام کانماز پڑھاتے وقت عورت کے کمر کے پاس اورمرد کے سر کے پاس کھڑا رہنامستحب ہے۔

حدیث: حضرت انسؓ نے مرد کے جنازہ میں سر کے پاس اورعورت کے جنازہ میں کمر کے پاس کھڑے ہوکرنماز پڑھائی۔تو آپؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ﷺ اس طرح کرتے تھے؟تو آپؓ نے کہا،جی ہاں (رواہ ابوداؤد، بالترمذی، وحسنہ) اگر سامنے موجود جنازہ کے آگے یاقبر کے آگے کھڑے ہوکرنماز پڑھائے توصحیح نہ ہوگی۔

بیک وقت کئی جنائز: اگر بیک وقت کئی جنازے آجائیں،توہرایک پرالگ الگ نماز پڑھنا جائز ہے،اوریہی زیادہ بہتر ہے،اورتمام پرایک ہی نماز پڑھنا بھی جائز ہے،مگرایسی صورت میں تمام جنازوں کو قبلے کی جانب امام کے سامنے ایک کے پیچھے رکھے۔خواہ تمام جنازے ایک ہی نوع کے ہوں(یعنی سارے جنازے مرد کے یاسارے جنازے عورت کے ہوں)یامختلف النوع ہوں (یعنی مرداورعورت دونوں کے ہوں)البتہ مختلف النوع جنازے بیک وقت آئے ہوں تومرد کے جنازے کوامام کے قریب رکھے،پھر بچے کے،پھرخنثی مشکل کے،پھرعورت کے جنازے کورکھے۔

حدیث: (۱)حضرت سعید بن عاصؓ نے حضرت زید بن عمر بن الخطاب اوران کی والدہ ام کلثوم بنت علیؓ کے جنازے پر بیک وقت نماز پڑھائی اورلڑکے کے جنازے کوپہلے(امام کے قریب)رکھا پھران کے والدہ کے جنازہ کورکھا۔اوراسی/۸۰ صحابہ کرامؓ جنازے میں شریک تھے،اورتمام نے تصویب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب سنت ہے۔(رواہ ابوداؤد، والبیھقی،والنسائی،فتح العزیز)

(۲)حضرت ابن عمرؓ نے(بیک وقت)نوجنازوں پرنماز پڑھائی اور(ان میں)مرد کے جنازے امام سے قریب تھےاس کے بعد عورتوں کے تھے۔(رواہ البیھقی ۔والدارقطنی۔ فتح العزیز ۲/۴۳۳، مغنی المحتاج) اوراگر بیک وقت ایک ہی نوع کے جنازے آئے ہوں توان میں سے جوافضل ہوگا،اسے امام کے قریب رکھے۔اوریہاں افضل سے مراد وہ شخص ہے جس میں تقوی، پرہیز گاری وغیرہ ہو،آزادی کی وجہ سے کسی کوآگے نہیں رکھاجائیگا۔اگر مرنے والے بھی تمام صفات میں برابر ہوں۔اوران کے اولیاء کسی ایک جنازے کوامام کے قریب رکھنے پرراضی ہوجائیں،توٹھیک،ورنہ قرعہ اندازی کی جائیگی۔ایک ہی نوع کے جنازے یکے بعددیگرے آئے ہوں۔توجس کا جنازہ پہلے آیا ہو،اسے امام کے قریب رکھےخواہ آخر میں آنے والا افضل ہو۔اگرمختلف النوع جنازوں میں پہلے عورت کا جنازہ آیا ہوپھرمرد کایابچے کاتوعورت کے جنازے کوامام کے قریب نہ رکھے،بلکہ مردیابچے کے جنازے کوامام کے قریب رکھے۔اگر بچے کے جنازے کوپہلے رکھنے کے بعدمرد کاجنازہ آئے،توبچے کے جنازہ کونہ ہٹائے،بلکہ مرد کے ولی سے کہاجائے کہ اپنا جنازہ بچے کے پیچھے رکھ،یادوسری جگہ منتقل کر،تمام جنازے صرف خنثی مشکل ہی کہ ہوں توتمام کوایک قطار میں رکھے(یعنی ہرایک کاسردوسرے کے پاؤں کے پاس رہے آگے پیچھے نہ رکھے)تمام جنازوں پرایک ہی نماز پڑھنے کی صورت میں کسی میت کاولی،دوسرے کی امامت سے

راضی نہ ہو، تو وہ اپنے میت پر نماز پڑھے۔ اگر تمام اولیاء ایک ہی نماز پڑھنے سے راضی ہوں، تو جس کا جنازہ پہلے آیا ہو اس کا ولی امامت کرے۔ چاہے اس ولی کی میت مرد کی ہو یا عورت کی، اور تمام جنازے ایک ساتھ آئے ہوں تو قرعہ اندازی کی جائے، جس کے نام قرعہ نکلے، اس کا ولی نماز پڑھائے۔

فصل ۔ نماز جنازہ کا طریقہ ۔

نماز جنازہ کے سات ارکان ہیں ۔

(۱) **نیت کرنا:** نیت کا وقت وہی ہے جو دیگر نمازوں کے سلسلے میں گذر چکا۔ یعنی تکبیر تحریمہ کے ساتھ ساتھ نیت کرے۔ فرضیت کی نیت کرنا بھی ضروری ہے۔ اور مطلق فرض کی نیت کافی ہے، فرض کفایہ کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ اگر ایک میت ہو تو ایک پر اور ایک سے زائد ہوں تو تمام پر نماز کی نیت کرے۔ نیت میں میت کے تعیین کی اور پہچاننے کی ضرورت نہیں، بلکہ اگر اس طرح نیت کرے کہ امام جس پر نماز پڑھتا ہے میں بھی اس پر نماز پڑھتا ہوں تب بھی کافی ہے۔ اگر میت کی طرف اشارہ کئے بغیر تعیین کرے (مثلاً زید پر نماز پڑھتا ہوں) اور اس میں غلطی ہو جائے (مثلاً عمرو کی میت نکلی) تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ لیکن اگر اشارہ کرے پھر غلطی ہو جائے تو نماز صحیح ہوگی۔ مقتدی پر اقتداء کی نیت کرنا ضروری ہے۔

(۲) **قیام:** قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں (۳) چار تکبیریں۔ (متفق علیه)

حدیث ۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے: آپ ﷺ نے میت پر چار تکبیریں کہیں اور پہلی تکبیر کے بعد ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھی (رواہ الشافعی، والحاکم، تلخیص) اگر کسی نے بھول سے یا عمداً پانچ تکبیریں کہیں تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی اگر امام پانچ تکبیریں کہے تو پانچویں تکبیر میں اس کی اتباع نہ کرے، بلکہ امام سے مفارقت (الگ ہونے) کی نیت کر کے سلام پھیرے۔ یا اس کا انتظار کرتا رہے اور اس کے ساتھ ہی سلام پھیرے، اور یہی صورت افضل ہے۔

(۴) **سلام** ۔ سلام کے ساتھ نماز سے نکلنے کی نیت کرنا سنت ہے، واجب نہیں۔ اور صرف "السلام علیک" کہنا کافی نہیں۔

(۵) پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھنا ۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھی۔ (الشافعی ۔حاکم)

(۲) نماز جنازہ کا سنت طریقہ یہ ہے کہ تکبیر کہنے کے بعد آہستہ سورہ فاتحہ پڑھے۔ پھر درود پڑھے (الشافعی ونحوہ البیهقی)

(۶) دوسری تکبیر کے بعد آپ ﷺ پر درود پڑھنا ۔

حدیث: حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے نماز جنازہ میں آپ ﷺ پر درود پڑھنا آپ ﷺ کی سنت ہے۔ (رواہ الحاکم، صحه علی شرط الشیخین، فتح الوهاب) آپ کے آل پر درود پڑھنا سنت ہے۔ (فتح الوهاب)

(۷) **تیسری تکبیر کے بعد میت کیلئے دعا کرنا** (میت کیلئے بالخصوص اخروی دعا کرنا ضروری ہے، نیز دعا کسی اور تکبیر کے بعد ہو تو یہ کافی نہیں ہے) (حاشیۃ الجمل ۲/۱۷۲)

حدیث: جب تم میت پر نماز پڑھو تو اس کے لئے دعا کرو۔ (رواہ ابو دائود۔ ابن ماجه ۔والبیهقی) اور کم سے کم اتنی دعا کا ہونا ضروری ہے جس پر دعا کا اطلاق ہو سکے۔ اور افضل دعا کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔

نماز جنازہ کا اکمل طریقہ

نماز جنازہ کی سنتیں (۱) چاروں تکبیرات میں رفع یدین کرنا۔

حدیث: حضرت ابن عمرؓ اور حضرت انسؓ تمام تکبیرات میں رفع یدین کرتے تھے۔(رواہ البیھقی)

(۲) دیگر نمازوں کی طرح ہر تکبیر کے بعد دونوں ہاتھ سینہ کے نیچے اور ناف کے اوپر باندھنا۔(۳) سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا (۴) سورہ فاتحہ کے بعد دوسری کوئی سورت نہ پڑھنا۔اگر مقتدی امام سے قبل سورہ فاتحہ سے فارغ ہو جائے تو دعا میں مصروف رہے، اسی طرح درود سے فارغ ہو جائے تو دعا، یا درود پڑھے۔(جمل ۲ / ۱۷۳) نماز جنازہ میں دعائے افتتاح نہ پڑھے۔البتہ تعوذ پڑھ سکتا ہے۔سورہ فاتحہ کو سراً (آہستہ) پڑھے۔دن ہو یا رات۔دوسری تکبیر کے بعد درود سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنا، آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے آل پر درود پڑھنا، اور مومن مردوں وعورتوں کیلئے دعا کرنا سنت ہے۔اوران تینوں کے درمیان ترتیب ضروری نہیں بلکہ بہتر ہے۔تیسری تکبیر کے بعد کثرت سے میت کیلئے دعا کرنا سنت ہے۔دعا کا ادنی درجہ یہ ہے کہ صرف " اَللّٰھُمَّ ارْحَمْهُ یَا اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهُ " کہے(یا اللہ اس پر رحم فرما۔یا اس کی مغفرت فرما) اور اکمل درجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ سے جو منقول دعا ہے، وہ پڑھے۔لہٰذا سب سے پہلے یہ دعا پڑھے " اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَ شَاهِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِیْرِنَا وَ کَبِیْرِنَا وَ ذَکَرِنَا وَ اُنْثَانَا اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَهُ مِنَّا فَاَحْیِهِ عَلَی الْاِسْلَامِ وَ مَنْ تَوَفَّیْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَی الْاِیْمَانِ "(رواہ ابو داؤد والترمذی)

ترجمہ: اے اللہ ہمارے زندہ ومردے کی، حاضر وغائب کی، چھوٹے وبڑے کی، مذکر ومونث کی، مغفرت فرما۔اے اللہ ہم میں سے تو جس کو زندہ رکھے، اسے اسلام پر زندہ رکھ، اور جسے تو موت دے اسے ایمان کی حالت میں موت دے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے۔

"اَللّٰھُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ وَ اِبْنُ عَبْدَیْكَ خَرَجَ مِنْ رُوْحِ الدُّنْیَا وَ سَعَتِهَا مَحْبُوْبِهِ وَ اَحْبَابِهِ فِیْهَا اِلٰی ظُلْمَةِ الْقَبْرِ وَ مَا هُوَ لَاقِیْهِ کَانَ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُكَ وَ رَسُوْلُكَ وَ اَنْتَ اَعْلَمُ بِهِ اَللّٰھُمَّ اِنَّهُ نَزَلَ بِكَ وَ اَنْتَ خَیْرُ مَنْزُوْلٍ بِهٖ وَ اَصْبَحَ فَقِیْراً اِلٰی رَحْمَتِكَ وَ اَنْتَ غَنِیٌّ عَنْ عَذَابِهٖ وَ قَدْ جِئْنَاكَ رَاغِبِیْنَ اِلَیْكَ شُفَعَاءَ لَهُ اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ مُحْسِنًا فَزِدْ فِیْ اِحْسَانِهٖ وَاِنْ کَانَ مُسِیْئاً فَتَجَاوَزْ عَنْهُ وَلَقِّهِ بِرَحْمَتِكَ رِضَاكَ وَ قِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَعَذَابِهٖ وَ افْسَحْ لَهُ فِیْ قَبْرِهٖ وَجَافِ الْاَرْضَ عَنْ جَنْبَیْهِ وَلَقِّهِ بِرَحْمَتِكَ الْاَمْنَ مِنْ عَذَابِكَ حَتّٰی تَبْعَثَهُ اِلٰی جَنَّتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ"

ترجمہ: اے اللہ یہ تیرے بندہ اور تیرے دو بندوں کا بیٹا ہے۔دنیا میں اپنے دوست واحباب کو چھوڑ کر دنیا کے آرام اور وسعت سے قبر کی تاریکی اور جو کچھ قبر میں پیش آنے والا ہے اس کی طرف چلا آیا۔اور اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور حضرت محمد ﷺ تیرے بندے اور رسول ہیں۔اور تو اسے زیادہ جاننے والا ہے اے اللہ یہ تیرا مہمان ہوا، اور تو بہترین مہمان نواز ہے، اور تیری رحمت کا محتاج ہے، اور تو اس کے عذاب سے بے نیاز ہے، اور ہم لوگ تیرے پاس امیدیں لئے ہوئے اس کے لئے سفارشی بن کر آئے ہیں۔اے اللہ اگر وہ نیک ہے تو تو اس کی نیکی میں اضافہ کر۔اگر وہ برا ہے تو تو اس سے درگذر فرما۔اور اپنی رحمت سے اسے اپنی رضا نصیب فرما، قبر کے فتنہ اور اس کے عذاب سے بچا۔اس کی قبر کو کشادہ فرما۔اور زمین کو اس کے پہلوؤں سے دور کردے، اور اپنی رحمت کے ذریعے اسے اپنے عذاب سے امن عطا فرما۔یہاں تک کہ اے ارحم الراحمین اسے جنت میں داخل فرما) اگر عورت کی میت ہو تو اس طرح دعا

پڑھے۔"اَللّٰھُمَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُكَ وَ بِنْتَ عَبْدِيْكِ الخ" یعنی ضمائر مونث لائے، لیکن اگر ضمائر مونث لانے کے بجائے مذکر ہی لائے اور اس سے شخص مراد لے تب بھی حرج نہیں۔

اگر بچے کی میت ہو تو اس ثانی دعا کے بدلے پہلی دعا کے بعد یہ دعا پڑھے۔"اَللّٰھُمَّ اجْعَلْهُ فَرَطاً لِاَبَوَيْهِ وَسَلَفاً وَّ ذُخْراً وَ عِظَةً وَاِعْتِبَاراً وَّ شَفِيْعاً وَّ ثَقِّلْ بِهٖ مَوَازِيْنَهُمَا وَاَفْرِغِ الصَّبْرَ عَلٰى قُلُوْبِهِمَا وَلَا تَفْتِنْهُمَا بَعْدَهٗ وَلَا تَحْرِمْهُمَا اَجْرَهٗ"(الفقه المنهجی)

ترجمہ: اے اللہ اس بچہ کو اس کے والدین کیلئے آگے جانے والا سامان بنا اور انکے لئے ذخیرہ نصیحت، اور عبرت بنا، اور سفارشی بنا، اور اس کے ذریعہ ان کے ترازو کو وزنی بنا، اور ان کے لئے قلوب پر صبر کا فیضان فرما۔ اور اس کے بعد انہیں آزمائش میں نہ ڈال۔ اور اس کے اجر سے انہیں محروم نہ فرما۔)

امام بخاریؒ اور تمام حفاظ حدیثؒ فرماتے ہیں کہ جنازے کی سب سے زیادہ صحیح دعا یہ ہے۔"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَ عَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهٖ وَ اَهْلًا خَيْراً مِنْ اَهْلِهٖ وَ زَوْجاً خَيْراً مِنْ زَوْجِهٖ وَ اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَ اَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ فِتْنَتِهٖ وَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ"(رواه مسلم عن عوف بن مالک)

ترجمہ: اے اللہ اس کی مغفرت فرما، اس پر رحم فرما اسے عافیت عطا فرما، اسے معاف کر اس کی اچھی طرح مہمان نوازی فرما، اور اس کے ٹھکانہ کو کشادہ کر، اور اسے پانی برف اور اولے کے ذریعے دھودے، اور گناہوں سے ایسا صاف کر جیسے کہ تو سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کرتا ہے۔ اور اس کو اس (دنیا) کے گھر سے بہتر گھر اور اس کے گھر والوں سے بہتر گھر والے اور اس کے جوڑے سے بہتر جوڑا عطا فرما اور اسے جنت میں داخل فرما۔ اور قبر کے عذاب سے اور اس کے فتنہ سے اور (جہنم کے آگ کے عذاب سے پناہ دے) اور اس دعا کو پہلی دونوں دعاؤں (اللھم اغفر لحینا و میتنا الخ . اور اللھم ھذا عبدك الخ) سے پہلے پڑھنا مندوب ہے (حاشیة الجمل ۲ / ۱۷۳) چوتھی تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھے۔"اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهٗ وَ اغْفِرْ لَنَا وَلَهٗ"(رواه ابوداؤد ۔ الفقه النهجی)

(اے اللہ اس کے اجر سے ہمیں محروم نہ فرما۔ اور اس کے بعد ہمیں آزمائش میں نہ ڈال۔ اور ہماری اور اس کی مغفرت فرما) یہ ذکر واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔ چوتھی تکبیر کے بعد طویل دعا کرنا مسنون ہے۔ اور یہ آپ ﷺ کے فعل سے ثابت ہے۔

حدیث: حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جب اپنی بیٹی کے جنازہ کی نماز پڑھائی، تو چوتھی تکبیر کے بعد اتنی دیر کھڑے ہو کر دعا استغفار کرتے رہے جتنی دیر دو تکبیروں کے درمیان کھڑے رہے پھر فرمایا کہ آپ ﷺ اس طرح کرتے تھے۔(رواہ الحاكم والبهيقى و قال الحاكم حديث صحيح ۔ حاشية الروضه)

اس کے بعد دو سلام پھیرنا مستحب ہے (جس میں پہلا واجب ہے) اگر مسبوق امام کو نماز کے دوران پائے، تو تکبیر تحریمہ کہہ کر امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور امام کی اگلی تکبیر کا انتظار نہ کرتا رہے۔ تکبیر کہنے کے بعد سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کرے، مسبوق اذکار میں اپنی ترتیب کو ملحوظ رکھے (یعنی مثلاً دوسری تکبیر کے بعد امام کے ساتھ شریک ہوا ہے تو ایسا نہیں کہ مسبوق بھی امام کی طرح درود شریف پڑھنا شروع کرے بلکہ مسبوق سورہ فاتحہ پڑھے)

اگرامام مسبوق کے پہلی تکبیر سے فارغ ہوتے ہی فوراً دوسری تکبیر بھی کہہ ڈالے، تو مسبوق بھی امام کے ساتھ دوسری تکبیر کہے اور مسبوق کو سورہ فاتحہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ دیگر نمازوں میں ہوتا ہے۔ مسبوق سورہ فاتحہ پڑھ رہی رہا تھا کہ امام نے دوسری تکبیر کہہ ڈالی تو بقیہ قراءت روک کرامام کے ساتھ آگے بڑھے اور بعد والی تکبیر میں بقیہ قراءت پوری کرنے کی ضرورت نہیں۔

اگر کسی سے کچھ تکبیریں فوت ہو جائیں، تو امام کے سلام کے بعد ان کا تدارک کرے، لیکن صرف تکبیرات پر اکتفانہ کرے، بلکہ ذکر ودعا بھی پڑھے۔ مسبوق حضرات کی بقیہ نماز پوری ہونے تک جنازہ نہ اٹھانا مستحب ہے۔ اور اگر جنازہ اٹھایا گیا تو اس سے مسبوق کی نماز باطل نہ ہوگی۔ چاہے جنازہ قبلہ کی جانب سے ہٹایا گیا ہو، لیکن اگر جنازہ کی موجودگی میں نماز شروع کرنے سے پہلے ہی قبلہ کی جانب سے ہٹایا گیا تو نماز صحیح نہ ہوگی۔

اگر مقتدی بلا عذر امام سے ایک تکبیر پیچھے رہے اور امام دوسری تکبیر بھی کہہ ڈالے تو اس مقتدی کی نماز باطل ہوگی اور ایک تکبیر پیچھے رہنا ایسا ہے جیسا کہ ایک رکعت پیچھے رہنا (مثلاً امام تیسری تکبیر بھی کہے اور مقتدی ابھی پہلی تکبیر میں ہو دوسری تکبیر نہ کہی ہو)

نماز جنازہ کے شرائط: دیگر نمازوں میں جو شرائط ضروری ہیں، اس نماز میں بھی ضروری ہیں جیسے طہارت ستر عورت، قبلہ کے جانب رخ کرنا، وغیرہ البتہ مزید شرط یہ ہے کہ نماز سے پہلے میت کا غسل ہو چکا ہو کوئی کنویں میں مرجائے یا کان میں دب کر مرجائے اور اسے باہر نکال کر غسل دینا دشوار ہو تو اس پر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ کفن پہنانے سے پہلے نماز پڑھنا کراہت کے ساتھ جائز ہے۔ نماز جنازہ کیلئے جماعت کا ہونا ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے۔ صرف ایک مرد کے نماز ادا کرنے سے بھی فرض ذمہ سے ساقط ہو جائیگا، چاہے وہ ممیز (باشعور) بچہ ہی کیوں نہ ہو، مردوں کی موجودگی میں کوئی عورت یا خنثی مشکل ادا کرے، تو فرض ساقط نہ ہوگا۔ ہاں اگر ایک بھی مرد موجود نہ ہو تو عورتیں تنہا نماز ادا کریں۔ باجماعت ادا کرنا ان کے لئے مستحب نہیں، چاہے مرد کا جنازہ ہو یا عورت کا۔ (لیکن اگر باجماعت ادا کریں تو کوئی حرج نہیں۔ المجموع ۵/۲۱۳) اور ان کے ذریعے فرض بھی ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ صرف عورتیں موجود ہوں، تو فرض کے ادائیگی کی ذمہ داری عورتوں پر نہ ہوگی، اور اگر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ہوں تو فرض کے ادائیگی کی ذمہ داری عورتوں پر نہ ہوگی، بلکہ مردوں پر ہوگی، چاہے ایک ہی مرد کیوں نہ ہو۔

فصل ۔ غائبانہ نماز جنازہ

حدیث: آپ ﷺ نے نجاشی کی موت پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی (صحیحین) اپنے شہر سے غائب میت پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہے اور اسی صورت میں میت کا قبلہ کی جہت میں ہونا یا مسافت قصر کے فاصلہ پر ہونا ضروری نہیں۔ غائبانہ نماز بھی میت کو غسل دینے کے بعد ادا کرنا ضروری ہے، غسل سے پہلے صحیح نہیں (مغنی ۱/ ۲۴۵) اگر مصلی (نمازی) اور میت ایک ہی شہر میں ہو تو میت کا مصلی کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ امام ابو محمد جوینیؒ فرماتے ہیں کہ میت شہر میں ہونے کی صورت میں مصلی اور میت کے درمیان تقریباً تین سو ذراع (ہاتھ) سے زیادہ کا فاصلہ نہ ہو۔

فصل ۔ نماز جنازہ کا تکرار

ایک بار نماز جنازہ باجماعت ادا کرنے کے بعد دیگر حضرات آجائیں (دفن سے پہلے آئیں یا بعد میں) تو انہیں بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ باجماعت ادا کریں یا اکیلے اور ان کی یہ نماز فرض ہی شمار ہوگی۔ البتہ دفن کے بعد آنے کی صورت میں قبر پر نماز ادا کریں۔

حدیث: (۱) رات میں ایک شخص کا انتقال ہوا تو صحابہ کرام نے تاریکی میں آپ ﷺ کو بیدار کرنا نامناسب سمجھا، اور اسے دفن کر دیا تو آپ ﷺ اس کی قبر کے پاس کھڑے ہوگئے، اور صحابہ کرام نے پیچھے صف باندھی پھر اس پر نماز پڑھی۔ (متفق علیہ)
(۲) ایک مسکین عورت (ام محجن) کا رات میں انتقال ہوا، تو صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کو اطلاع دیئے بغیر (رات ہی میں) دفن کر دیا تو (دوسرے دن) آپ ﷺ نے ان کی قبر پر جا کر نماز ادا کری۔ (رواہ النسائی والبیھقی، باسنادہ صحیح)
کسی میت کو نماز پڑھے بغیر دفن کر دیں، تو دفن کرنے والے بھی گنہگار ہونگے، نماز پڑھنے کیلئے قبر کھودنے کی ضرورت نہیں، بلکہ قبر پر ہی نماز پڑھے۔ قبر پر اسی شخص کی نماز صحیح ہوگی جس پر (اس میت کی) موت کے وقت نماز فرض تھی۔ (یعنی جو مسلمان مکلّف طاہر ہو۔ حاشیہ الجمل ۔ ۲ / ۱۸۲) نبی کی قبر پر نماز پڑھنا جائز نہیں۔

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا حکم: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں، بلکہ صحیح مسلم میں سہیل بن بیضاءؓ کے متعلق صحیح حدیث موجود ہونے کی وجہ سے فقہانے مسجد میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے (نیز حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی نماز جنازہ اور حضرت صہیبؓ نے حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ مسجد میں ادا کی۔) (تلخیص)

ابوداؤد میں جو حدیث ہے کہ جو مسجد میں نماز جنازہ پڑھے اس کے لئے کوئی چیز نہیں، اس کے تین جواب ہیں (۱) وہ حدیث ضعیف ہے (۲) سنن ابی داؤد میں فلاشیء علیہ کا لفظ ہے (یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں) اور اگر فلاشیء لہ والی حدیث کو صحیح مان بھی لیں، تب بھی اس کو فلاشی علیہ والی حدیث محمول کریں گے، جیسے کہ قرآن میں ہے " اِنْ اَحسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا۔ اَیْ فَعَلَیْهَا "۳۔ اسے کامل اجر نہیں ملے گا جبکہ دفن تک جنازہ کے ساتھ نہ جائے۔

نماز جنازہ کیلئے تین سے زیادہ صفوں کو بنانا مستحب ہے

حدیث: جب کوئی مسلمان مرتا ہے اور اس پر تین صفیں نماز ادا کرتی ہیں، تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ (رواہ الحاکم وغیرہ وقال صحیح علی شرط مسلم۔ فتح الوھاب) امام اور مقتدی کی نیت الگ الگ ہونے سے نماز پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ مثلاً امام موجود میت پر نماز کی نیت کرے اور مقتدی غائب پر یا اس کے برعکس۔ خودکشی کرنے والے کو غسل بھی دے اور اس پر نماز بھی پڑھے۔

ایک مرتبہ نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد مصلیوں کی زیادتی کیلئے اور (ولی کے علاوہ) کسی کے انتظار میں جنازہ میں تاخیر کرنا صحیح نہیں۔ البتہ میت میں تغیر کا اندیشہ نہ ہو تو ولی کا انتظار کرنے میں حرج نہیں (جبکہ جلد اس کی آمد متوقع ہو، ورنہ انتظار کرنا مندوب نہیں۔) (جمل) بعد میں آنے والے نمازی قبر پر نماز پڑھ لیں۔ اگر وہ قبر پر نہیں پڑھیں گے تو میت کی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض فقہانے نمازیوں کی کثرت کیلئے انتظار کرنا بہتر قرار دیا ہے۔ (جمل ۲/ ۱۸۶)

سقط (ایسا حمل جو چھ مہینے پورے ہونے سے پہلے گر جائے)

سقط کی دو حالتیں ہیں۔ (۱) پیدائش کے بعد زندگی کی کوئی علامت پائی جائے مثلاً چیخے، چلائے، روئے، یا حرکت کرے، پھر مر جائے تو اس کے لئے چار چیزیں واجب ہونگی۔ غسل۔ کفن۔ نماز۔ اور دفن

(۲) زندگی کی کوئی علامت اس میں پائی نہ جائے، البتہ اس میں خلقت کا ظہور ہوا ہو، تو نماز کے علاوہ بقیہ تینوں چیزیں واجب ہیں (یعنی غسل۔ کفن۔ دفن) اور اگر خلقت کا ظہور نہ ہوا ہو، تو اس کے لئے نہ غسل ہے اور نہ نماز بلکہ ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کرنا سنت ہے۔

فصل ۔ کافر پر نماز جنازہ کا حکم

کافر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں، چاہے وہ حربی ہو یا ذمی ۔اور مسلمانوں کو اُسے غسل دینا جائز ہے، واجب نہیں ۔اور غسل دینے کے لئے اس کے کافر رشتہ دار مسلمان رشتہ دار سے زیادہ بہتر ہیں کوئی ذمی مرجائے تو مسلمانوں پر اسے کفن دینا اور دفن کرنا ضروری ہے۔ اگر کافر حربی ہو تو اس کا کفن دفن مسلمانوں پر ضروری نہیں، بلکہ اس کی نعش کتوں کے حوالہ کردینا جائز ہے، البتہ دفن کرنا بہتر ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی بدبو سے تکلیف نہ ہو۔اور مرتد کا حکم بھی کافر حربی کی طرح ہے۔

مسلمان میت کافر کے ساتھ یا شہید غیر شہید کے ساتھ خلط ملط ہو جائیں، اور ان کے درمیان تمیز نہ ہو سکے، تو تمام کو غسل دینا اور تمام پر نماز پڑھنا واجب ہے۔ان تمام پر بیک وقت ایک ہی نماز پڑھنا جائز ہے۔اور یہی افضل ہے، لیکن ایسی صورت میں صرف مسلمان میت کا قصد ہو۔اور اگر ہر ایک پر الگ الگ نماز پڑھے تو یہ بھی جائز ہے البتہ ایسی صورت میں نیت اس طرح کرے اگر یہ میت مسلمان ہو تو دعا اس طرح کرے۔" اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ اِنْ كَانَ مُسْلِماً "(اے اللہ اس کی مغفرت فرما اگر یہ مسلمان ہو)

فصل شہید کا حکم

شہید پر نماز پڑھنا اور اسے غسل دینا دونوں حرام ہیں۔

حدیث: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے احد کے شہیدوں کے متعلق حکم فرمایا کہ انہیں ان کے خون کے ساتھ دفن کیا جائے۔اور انہیں نہ غسل دیا گیا اور نہ ان پر نماز پڑھی گئی۔(رواہ البخاری)

غسل دینے سے شہادت کا خون زائل ہو، یا نہ ہو، اور شہید مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، بالغ ہو یا بچہ، ہر ایک کیلئے یہی حکم ہے۔

شہید کے اقسام

شہید کی دو قسمیں ہیں: (۱) جس پر نماز پڑھنا اور غسل دینا دونوں حرام ہیں۔اور وہ ایسا شہید ہے جو کفار کے ساتھ جنگ کے سبب دوران جنگ ہی مرجائے خواہ اسے کسی کافر نے قتل کیا ہو۔یا غلطی سے کسی مسلمان کا ہتھیار لگا ہو، یا اس کا ہی ہتھیار اس کی طرف لوٹ آیا (جس کی وجہ سے مرگیا) یا گھوڑے پر سے گر کر مرجائے۔یا کسی جانور کے لات مارنے کی وجہ سے مرجائے۔یا جنگ کے اختتام کے بعد مقتول ملے اور اس کے موت کا سبب معلوم نہ ہو سکے اس پر خون کا اثر ہو یا نہ ہو۔

اگر کوئی کفار کے ساتھ جنگ کے دوران کسی بیماری کے سبب یا اچانک موت آنے کی وجہ سے مرجائے تو وہ شہید شمار نہ ہوگا۔ اگر لڑائی کے ختم ہونے کے بعد ایسے زخم سے مرجائے جو جنگ میں ہی پہنچا ہے اور زخمی میں حیاۃ مستقرۃ (یعنی ایسی زندگی جس میں اپنے اختیار اور مرضی سے حرکت پائی جائے) باقی ہو تو وہ شہید نہیں کہلائے گا۔چاہے زخمی ہونے کے بعد کھانا کھایا ہو، بات چیت کی ہو، نماز پڑھی ہو، یا ان تینوں میں سے کچھ بھی نہ کیا ہو، چاہے زمانہ زیادہ گذرا ہو یا کم۔جنگ کے اختتام پر اس میں صرف حرکت مذبوح باقی ہو تو وہ شہید کہلائے گا۔اگر جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس کے زندگی کی امید ہو تو وہ شہید نہیں کہلائے گا۔کوئی کافر حربی دارالاسلام میں داخل ہو کر کسی مسلمان پر حملہ کر کے قتل کر ڈالے، تو ایسا مسلمان شہید شمار نہ ہوگا۔

اگر کوئی باغی اہل عدل (امام برحق کے موافقین) میں سے کسی کو قتل کر ڈالے تو وہ شہید شمار نہ ہوگا، اسے غسل بھی دینا ہوگا، اور نماز بھی

پڑھنی ہوگی۔اسی طرح کسی باغی کوقتل کیا گیا تو اس کے لئے بھی یہی حکم ہوگا۔ڈاکو کسی کوقتل کرے تو مقتول شہید نہیں کہلائے گا۔

۲۔ایسے شہداء جو مذکورہ تمام اوصاف سے خالی ہوں مثلاً پیٹ کے درد سے مرجائے۔طاعون کی بیماری میں مرجائے۔ڈوب کر مرجائے۔حالت اجنبیت اورغریب الوطنی میں مرجائے (یعنی کہیں سفر کیلئے گیا ہوا تھا تو وہیں انتقال ہوگیا) کوئی عورت دردِزہ کی حالت میں مرجائے۔اور ایسا شخص جسے ظلماً کوئی مسلمان یا ذمی یا باغی جنگ کے علاوہ کسی اور موقع سے قتل کرے تو ان تمام کا حکم دیگر میت کے مانند ہے یعنی غسل بھی دے اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھے۔گرچہ حدیث میں ان کے متعلق شہادت کا لفظ واقع ہوا ہے (اور اس سے آخرت میں شہادت کے ثواب کا حصول مراد ہے)

حدیث: شہداء پانچ ہیں۔طاعون کی بیماری میں مرنے والا، پیٹ کی بیماری میں مرنے والا، ڈوب کر مرنے والا، کسی چیز کے نیچے دب کر مرنے والا، اور اللہ کے راستے کا شہید (رواہ احمد، والترمذی) قصاصاً (یعنی کسی کے قتل کی پاداش میں) اور حداً قتل کیا جانے والا آدمی شہید نہیں کہلائے گا، (حد کی مثال محض زانی کو سنگسار کرنا)

کسی تارک صلوۃ (نماز چھوڑنے والے) کوقتل کیا جائے تو اس کے لئے بھی چاروں امور ضروری ہے غسل کفن، نماز اور دفن اور اُسے مسلمان کے قبرستان میں ہی دفن کیا جائے اور دیگر قبروں کی طرح اس کی قبر کو معمولی اٹھایا جائے، جیسا کہ دیگر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ڈاکو کو اولاً قتل کرے، پھر غسل دے کر اس پر نماز جنازہ پڑھے، پھر کفن ہی کی حالت میں سولی پر چڑھائے، پھر تین دن کے بعد سولی پر سے اتارے۔پھر اس میں دفن کردے۔

اگر کوئی جنبی اور حائضہ عورت شہید ہوجائے۔تو اسے بھی غسل دینا اور اس پر نماز پڑھنا حرام ہے۔شہید کے بدن پر شہادت کے خون کے علاوہ کوئی اور نجاست لگی ہو تو اسے دھونا ضروری ہے۔

شہید کو اس کے خون سے لت پت کپڑوں میں کفن دینا افضل ہے (خون نہ لگا ہو تب بھی اسی کپڑے میں کفن دینا مستحب ہے) اور اگر اس کے بدن پر اتنا کپڑا نہ ہو۔جو پورے بدن کو ڈھانپ سکے، تو دوسرے کپڑے کے ذریعے اس کی تکمیل کرے۔اگر ورثاء اس کے بدن کے کپڑوں کو نکال کر دوسرے کپڑوں میں کفن دینا چاہیں تو جائز ہے۔البتہ اس کے بدن سے (لڑائی کے کپڑے) زرہ، چمڑا، پوستین، موزہ وغیرہ نکال دے۔

دفن کا بیان

دفن کرنا فرض کفایہ ہے۔قبرستان کے علاوہ کسی اور جگہ دفن کرنا جائز ہے، البتہ قبرستان میں دفن کرنا افضل ہے۔اگر میت کو عام قبرستان اور اس کی اپنی زمین میں دفن کرنے کے سلسلے میں ورثاء میں اختلاف ہوجائے، تو عام قبرستان میں ہی دفن کرے۔بعض ورثاء نے میت کے ہی زمین میں دفن کیا تو دیگر ورثاء کیلئے میت کو وہاں سے منتقل کرکے عام قبرستان میں ہی دفن کرنا جائز ہے، لیکن ایسا نہ کرنا بہتر ہے۔

ورثاء میں سے کسی کا اپنی زمین میں دفن کرنے کا ارادہ ہو، تو دیگر وارثوں کیلئے اس کا قبول کرنا ضروری نہیں، اور اگر کسی وارث نے اپنی زمین میں دفن کیا۔تو ابن صباغ ؒ فرماتے ہیں کہ میت کو وہاں سے منتقل نہ کرے، کیونکہ ایسی صورت میں میت کی بےحرمتی ہوگی۔اور میت کو وہیں رکھنے سے کسی کا حق بھی ضائع نہیں ہوتا۔ورثاء نے میت کو اس کی زمین میں دفن کرنے کے بعد اس زمین کو بیچ دیا تو مشتری (خریدار) کو

وہاں سے میت منتقل کرنا جائز نہیں۔ہاں اگر مشتری بیع (خرید وفروخت) کے وقت اس بات سے ناواقف تھا تو اسے بیع فسخ کرنا جائز ہے۔ اور میت جب زمین کے اندر بالکل فنا و نابود ہو جائے، یا تمام ورثاء میت کو وہاں سے منتقل کرنے پر متفق ہو جائیں، تو ایسی صورت میں مشتری اس جگہ سے انتفاع کرسکتا ہے۔

قبر کی گهرائی : دفن کے لئے کم سے کم اتنا گہرا گڑھا ہونا ضروری ہے، جس میں سے میت کی بو ظاہر نہ ہو، اور درندوں سے اس کی حفاظت ہو سکے۔

اکمل درجہ یہ ہے کہ قبر کشادہ اور اتنی گہری ہو کہ اس میں ایک معتدل آدمی اپنے دونوں ہاتھ اوپر کی جانب اٹھا کر کھڑے رہ سکے یعنی تقریباً ساڑھے چار ہاتھ گہری ہو۔

حدیث: ''آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبر کو وسیع اور گہری کھودو'' (رواہ ابوداؤد۔ الترمذی) میت کو شق اور لحد میں دفن کرنا جائز ہے۔لحد یعنی قبر کی تہہ میں قبلے کی جانب اتنا کھودے جس میں میت سما (رہ) سکے۔اور شق یعنی درمیان قبر نہر کے مانند کھودے۔اگر زمین سخت ہو تو لحد کھودنا افضل ہے ورنہ شق

تدفین کامسنوں طریقه: میت کو (قبرستان لانے کے بعد) قبر کی پائنتی کے پاس رکھ کر سر کی جانب سے آہستہ سے قبر میں اتارنا سنت ہے۔

حدیث: ''حضرت عبداللہ بن یزید الخطمیؓ نے حضرت حارث کو قبر میں قبر کی پائنتی کی جانب سے اتارا پھر فرمایا کہ'' یہ سنت ہے'' (رواہ ابوداود باسناد صیحح)

مرد کی موجودگی میں مرد ہی قبر میں داخل ہوں، چاہے میت مرد کی ہو یا عورت کی، اور میت کو دفن کرنے کا حقدار وہی ہے، جو نماز پڑھانے کا حقدار ہے۔

البتہ بیوی کو دفن کرنے کیلئے شوہر زیادہ مستحق ہے۔اس کے بعد اس کے محرم رشتہ دار، باپ، دادا، بیٹا، پوتا، بھائی، پھر بھتیجے، پھر چچا، مستحق ہیں پھر غلام پھر ممسوح، پھر مجبوب پھر غیر محرم عصبہ مثلاً، چچازاد بھائی، پھر غیر محرم ذورحم مثلاً ماموں زاد و پھوپھی زاد بھائی، ورنہ پھر کوئی نیک اجنبی شخص (جمل) میت کو قبر میں اگر اکیلا آدمی رکھ سکتا ہو۔مثلاً کسی بچے کی میت ہو، تو اچھی بات ہے، ورنہ میت قبر میں رکھنے والوں کا طاق عدد میں ہونا مستحب ہے، تین یا پانچ جیسے ضرورت ہو۔

بوقت تدفین پرده اور دعا:- دفن کرتے وقت قبر پر پردہ کرنا مستحب ہے، چاہے (میت) مرد کی ہو یا عورت کی، لیکن عورت کی ہو تو زیادہ مؤکد ہے

میت کو قبر میں اتارتے وقت ان الفاظ کا پڑھنا مستحب ہے ''بِاسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ'' (اللہ کے نام سے اور آپ کی ملت پر)

حدیث: حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔آپؐ جب میت کو قبر میں رکھتے تو ''بِاسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ'' کہتے (رواہ ابوداوٗد۔ ابن حبان۔ والحاکم۔ تلخیص) اس کے بعد یہ دعا پڑھتے ''اَللّٰهُمَّ اَسْلَمَهُ اِلَيْكَ الْاَ شِحَّاءُ مِنْ وَّلَدِهٖ وَاَهْلِهٖ وَقَرَابَتِهٖ وَاِخْوَانِهٖ وَفَارَقَهُ مَنْ كَانَ يُحِبُّ قُرْبَهٗ وَخَرَجَ مِنْ سَعَةِ الدُّنْيَا وَالْحَيَاةِ اِلٰى ظُلْمَةِ الْقَبْرِ وَضِيْقِهٖ وَنَزَلَ بِكَ وَاَنْتَ خَيْرُ مَنْزُوْلٍ بِهٖ اِنْ عَاقَبْتَهٗ فَبِذَنْبِهٖ وَاِنْ عَفَوْتَ عَنْهُ فَاَهْلُ الْعَفْوِ اَنْتَ غَنِيٌّ عَنْ عَذَابِهٖ وَهُوَ فَقِيْرٌ اِلٰى رَحْمَتِكَ

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ حَسَنَتَهٗ وَاغْفِرْ سَيِّئَتَهٗ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاجْمَعْ لَهٗ بِرَحْمَتِكَ الْاَمْنَ عَنْ عَذَابِكَ وَاكْفِهٖ كُلَّ هَوْلٍ دُوْنَ الْجَنَّةِ اَللّٰهُمَّ وَاخْلُفْهُ فِیْ تَرِكَتِهٖ فِی الْغَابِرِيْنَ وَارْفَعْهُ فِیْ عِلِّيِّيْنَ وَعُدْ عَلَيْهِ بِفَضْلِ رَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔'' **ترجمہ:** اے اللہ اس کے بچوں، گھر والوں، رشتہ داروں اور بھائیوں نے چاہت کے باوجود اسے تیرے حوالہ کردیا اور یہ اپنے محبوب لوگوں سے جدا ہوگیا۔ دنیا اور زندگی کی وسعتوں سے قبر کے اندھیرے اور اس کی تنگی کی طرف چلا آیا، اور تیرا مہمان ہوا اور تو بہترین مہمان نواز ہے۔ اگر تو اسے سزا دے تو یقیناً اس کے گناہوں کے سبب سے ہوگی، اور اگر تو معاف کردے تو تو ہی معاف کرنے والا ہے۔ تو اس کے عذاب سے بے نیاز ہے۔ اور یہ تیری رحمت کا محتاج ہے۔ اے اللہ تو اس کی نیکیوں کو قبول فرما اور برائیوں کو معاف فرما۔ اور اسے قبر کے عذاب سے بچا، اور اپنی رحمت سے اسے تیرے عذاب سے امن عطا کر اور جنت سے قبل ہر خوف و ہولناکی سے اس کی کفایت فرما۔ اے اللہ اس کے پیچھے والوں میں اس کا جانشین بن۔ اور اعلیٰ علیین میں اس کا درجہ بلند فرما۔ اور اے ارحم الرحمین اس پر بار بار اپنا فضل فرما۔)

میت کو لحد میں قبلہ رخ، دائیں کروٹ پر دیوار سے بالکل قریب رکھے اور پیٹھ پیچھے اینٹ وغیرہ لگا دے تا کہ میت نہ اوندھا منہ ہو جائے اور نہ چت ہو جائے (پشت کے بل پلٹ جائے) میت کو قبر میں قبلہ رخ رکھنا واجب ہے۔ اگر قبلہ کی طرف پیٹھ کرے، یا چت لٹا کر دفن کردیا اور بدن میں تغیر نہ ہوا ہو، تو قبر کھود کر قبلہ رخ رکھنا ضروری ہے۔ اور اگر بدن میں تغیر ہو چکا ہو، تو پھر قبر نہ کھودے (بلکہ اسی حالت میں رہنے دے) قبر میں دائیں کروٹ پر لٹانا واجب نہیں (بلکہ مستحب ہے) میت کو قبر میں بائیں کروٹ پر قبلہ رخ کرنا مکروہ ہے (اور اگر کسی نے ایسا کیا تو دائیں کروٹ پر کرنے کیلئے) قبر کھودنے کی ضرورت نہیں۔

کوئی ذمی حاملہ عورت مرجائے اور اس کے پیٹ کا بچہ مسلمان کا ہو۔ (یعنی کسی مسلمان شوہر سے حاملہ رہ چکی ہو۔ اور ساتھ میں بچہ بھی مرگیا ہو) تو قبر میں اس عورت کی پیٹھ قبلہ کی طرف کردے تا کہ اس جنین کا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے کیونکہ جنین کا چہرہ ماں کی پیٹھ کی طرف ہوتا ہے۔ اور اس ذمی عورت کو مسلمانوں اور کافروں کے قبرستان کے درمیان دفن کرے۔ اگر مسلمان اور کافروں کے مردے آپس میں خلط ملط ہو جائیں تو انھیں بھی دونوں کے قبرستان کے درمیان دفن کردے۔

(قبر میں) میت کے سر کے نیچے کچی اینٹ یا پتھر رکھے، اور تھوڑا سا کفن ہٹا کر دائیں رخسار (گال) کو اینٹ یا مٹی سے لگادے۔

(قبر میں) سر کے نیچے تکیہ رکھنا، بستر بچھانا، اور کسی پیٹی (تابوت) میں رکھ کر دفن کرنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر زمین نرم ہو یا تر ہو تو پیٹی میں رکھ کر دفن کرنا مکروہ نہیں، ایسی صورت میں پیٹی کا خرچ ترکہ کے راس المال میں سے لے۔

مذکورہ صورت کے علاوہ اگر میت اپنی نعش (پیٹی میں دفن کرنے کی) وصیت کرے تو وصیت نافذ نہ ہوگی۔

میت کو لحد میں رکھنے کے بعد لحد کو کچی اینٹوں سے بند کردے۔ اور جہاں کہیں معمولی شگاف (پھٹن) باقی رہ جائے اسے اینٹوں کے ٹکڑوں وغیرہ سے بند کردے۔ پھر ہر آدمی دونوں ہاتھوں سے تین مٹھی مٹی ڈالے (بیہقی) اور پہلی بار مٹی ڈالتے وقت "منها خلقنكم" اور دوسری بار " وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ "اور تیسری بار " وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى "پڑھنا مستحب ہے اس کے بعد بیلچہ وکدال وغیرہ (پھاوڑے) کے ذریعے مٹی ڈالے۔

مستحب یہ ہے کہ (قبر کھودتے وقت) جتنی مٹی نکلی ہے، اس سے زیادہ مٹی قبر پر نہ ڈالے۔ اگر کسی وجہ سے قبر کی مسنون مقدار کے لئے وہ مٹی ناکافی ہو تو مزید مٹی بقدر ضرورت ڈال سکتے ہیں۔ قبر کو ایک بالشت اونچا رکھے تا کہ پتہ چلے کہ یہ قبر ہے اور اس کی زیارت اور

احترام کرنے میں سہولت ہو اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں مرجائے تو اس کی قبر اونچی نہ رکھے بلکہ مخفی رکھے تاکہ مسلمانوں کے وہاں سے لوٹنے کے بعد کافر اس قبر کی بے حرمتی نہ کریں۔

مخفی کو چونا لگانا، اس پر نام لکھنا، قبر کو پختہ بنانا اور اس پر عمارت یا قبہ وغیرہ بنانا مکروہ ہے۔ موقوفہ یا عام قبرستان میں قبر پر عمارت بنانا یا اسے پختہ کرنا حرام ہے ایسی صورت میں اسے منہدم کیا جائے، اگر میت کی زمین میں ہو تو نہ گرائے۔

حدیث: ''آپؐ نے قبر کو چونا لگانے، اس پر عمارت بنانے، اس پر نام لکھنے اور اسے روندنے سے منع فرمایا''۔ (رواہ الترمذی، والحاکم، وقال لترمذی حسن صحیح)

قبر کو مٹی کے گارے سے لیپنے میں کوئی حرج نہیں۔

دفن کے بعد قبر پر (خالص) پانی چھڑکنا اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اس پر ڈالنا اور بطور نشانی اس کے سرہانے پتھر رکھ دینا یا لکڑی وغیرہ گاڑ دینا مستحب ہے۔

حدیث: (۱) آپؐ نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیم کی قبر پر پانی چھڑکا اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں ڈالیں'' (الشافعی، ابوداود فی المراسیل والبیھقی، تلخیص)

(۲) '' آپؐ نے حضرت عثمان بن مظعون کی قبر کے سرہانے (بطور نشانی) پتھر رکھا'' الخ۔ (رواہ ابوداود باسناد حسن)

قبر پر گلاب کا پانی چھڑکنا یا اس پر سائبان بنانا مکروہ ہے۔ قبروں کے درمیان چپل پہن کر چلنے میں کوئی حرج نہیں۔

قبر کو ہموار (مسطح) بنانا کوہان نما بنانے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ (جیسا کہ آپ ﷺ اور شیخین کی قبروں کو کیا گیا۔ ابوداود باسناد حسن)

جنازہ سے واپس لوٹنے والوں کی چار قسمیں ھیں۔

۱) صرف نماز پڑھ کر واپس لوٹا۔ (۲) میت کو قبر میں داخل کرنے تک ساتھ رہا، مگر مٹی ڈالنے سے پہلے واپس لوٹا۔ (۳) دفن ہونے تک ساتھ رہا البتہ دعاء کئے بغیر واپس لوٹا۔ (۴) دفن کے بعد دعا وغیرہ کر کے واپس لوٹا مذکورہ تمام قسموں میں فضیلت کے اعتبار سے یہی اعلیٰ ہے جو آدمی صرف نماز پڑھ کر واپس لوٹے، اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو دفن کے بعد لوٹے اسے دو قیراط ثواب ملتا ہے۔

حدیث: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو نماز ہونے تک جنازے کے ساتھ رہے اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو دفن تک ساتھ رہے اسے دو قیراط ثواب ملتا ہے۔ اور دو قیراط سے دو بڑے پہاڑ مراد ہیں۔ (رواہ بخاری ومسلم)

تلقین دفن کے بعد قبر کے سرہانے بیٹھ کر تلقین پڑھنا مستحب ہے، الفاظ یہ ہیں۔

''یا عبداللہ ابن امۃ اللہ اذکر فاخرجت علیہ من الدنیا شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ و ان الجنۃ حق و ان النار حق وان البعث حق و ان الساعدۃ آتیۃ لا ریب فیھا و ان اللہ یبعث من فی القبور و انک رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا و بمحمد نبیا وبالقرآن امام و بالکعبۃ قبلۃ و بالمومنین اخواتا ''

ترجمہ: اے اللہ کے بندے اور اللہ کی بندی کے بیٹے، اس عہد کو یاد کر جس عہد کے ساتھ دنیا سے لوٹا ہے یعنی اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور جنت وجہنم، اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا حق ہیں اور قیامت

آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبروں سے اٹھانے والے ہیں اور تو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے اور اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے پر اور قرآن کے پیشوا اور کعبۃ اللہ کے قبلہ اور مومنین کے بھائی ہونے پر راضی تھا۔

(بچے کی میت ہو تو تلقین پڑھنے کی ضرورت نہیں) تلقین کے متعلق تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

قبر کے پاس قرآن کا کچھ حصہ پڑھنا بھی مسنون ہے اور پورا قرآن پڑھنا افضل ہے۔(حاشیة ...... ۲/۲۷۴) دفن کے بعد کچھ لوگ قبر کے پاس رک کر میت کے لئے فرشتوں کے سوالات کا صحیح جواب دینے کی دعا کرتے رہیں۔

حدیث : اللہ کے رسول ﷺ جب کسی میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو کھڑے ہو کر کہتے: "اپنے بھائی کے لئے مغفرت کی اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، اسلئے کہ اب اس سے سوالات کئے جائیں گے۔" (رسوال البزاز ،و قال الحاکم صحیح الاسنا)

حالتِ اختیاری (عام حالات) میں مستحب ہے کہ ایک قبر میں ایک ہی میت کو دفن کرے، یا اگر مجبوری ہو، مثلاً کئی جنازے ہوں (جنگ یا وباء وغیرہ کی وجہ سے) اور ہر میت کو الگ الگ قبر میں دفن کرنا دشوار ہو، تو پھر ایک میں دو یا تین کو دفن کر سکتے ہیں البتہ ایسی صورت میں ان میں سے جو افضل ہوگا اسے قبر میں قبلہ کی سمت پہلے رکھے، اور فرع کو اصل سے پہلے نہ رکھنا چاہئے فرع افضل ہو (مثلاً بیٹے یا پوتے کو باپ دادا پر مقدم نہ کرے۔)

مرد و عورت کو ایک ساتھ دفن نہ کرے، ہاں اگر شدید ضرورت ہو (تو پھر اجازت ہے) اور مرد کو پہلے رکھنا چاہئے وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر مرد، عورت، خنثیٰ مشکل اور بچہ کی میت ایک ساتھ ہو جائیں تو مرد کو پہلے رکھے پھر بچہ کو پھر خنثیٰ مشکل پھر عورت کو رکھے۔

دو میت (چاہے دونوں ایک جنس کے ہوں یا الگ الگ) ایک ساتھ دفن کرنے کی صورت میں دونوں کے درمیان مٹی کی آڑ بنانا مندوب ہے۔

قبر پر بیٹھنا ، چلنا وغیرہ : قبر کو میت کے عظمت کی خاطر قابل احترام چیز قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس پر بیٹھنا، ٹیک دینا، اور بلا ضرورت اس پر سے چلنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر اپنی میت کے قبر تک دوسرے کی قبر پر سے چلے بغیر نہیں پہنچ سکتے تو پھر اجازت ہے۔

زیارتِ قبر : مردوں کیلئے قبروں کی زیارت مستحب ہے۔

حدیث : آپ ﷺ نے فرمایا" میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا (لیکن اب) زیارت کرو۔ اس لئے کہ اس سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔" (رواہ ابوداود ، مسلم ، الترمذی)

عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت مکروہ ہے۔ (لیکن آپ ﷺ کے قبر کی زیارت عورت کے لئے بھی سنت ہے۔ الفقه المنهجی)

کافر کے قبر کی زیارت مباح ہے۔ (فتح الوهاب مع حاشیه الجمل ۲/۲۰۹)

زائر کے لئے اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَ اِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ (مسلم ابوداؤد)

ترجمہ: اے مومنین کی جماعت تم پر سلامتی ہو اور ہم بھی انشاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهُمْ وَ لَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ (ابوداؤد)

اے اللہ ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ فرما اور ان کے بعد آزمائش میں نہ ڈال۔

مذکورہ دعا کے بعد ان الفاظ کا پڑھنا بھی مسنون ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبِّ هٰذِهِ الْاَجْسَادِ الْبَالِيَةِ وَالْعِظَامِ النَّخِرَةِ الَّتِيْ خَرَجَتْ مِنَ الدُّنْيَا وَهِيَ بِكَ مُؤْمِنَةٌ اَنْزِلْ عَلَيْهَا رَحْمَةً مِّنْكَ وَ سَلَاماً مِّنِّيْ (حاشية الجمل ۲/۲۰۹)

ترجمہ: اے اللہ، جوان بوسیدہ ہڈیوں اور بوسیدہ جسموں کا رب ہے، یہ لوگ اس حالت میں دنیا سے روانہ ہوئے ہیں کہ تجھ پر ایمان رکھتے تھے، آپ کی طرف سے ان پر رحمتیں اور میری جانب سے سلام نازل فرما۔

قبرستان میں تلاوت کرنا ایک موجودہ شخص کی طرح میت کے لئے رحمت و برکت کا باعث ہے۔ اسی لئے قبرستان میں تلاوت مستحب ہے نیز تلاوت کے بعد دعا جلد قبول ہوگی اور دعا میت کو نفع پہنچائے گی۔ لہٰذا زائر قبلہ رو کھڑا ہو کر جتنا قرآن یاد ہوا سے پڑھنے اور دعا کر کے میت کو ثواب پہنچائے۔ دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا ضروری نہیں اور بیٹھنے کے مقابلے میں کھڑے ہو کر دعا وغیرہ کرنا افضل ہے۔(حاشیہ الجمل ۲/۲۱۰)

تلاوت سے میت کو ان صورتوں میں نفع ہوگا۔

۱) میت (قبر) کے پاس تلاوت کرنا۔ (۲) میت کے قصد سے تلاوت کرنا (گر چہ وہ دور ہو)۔ (۳) میت کے حق میں کرنا۔

(جمل) زیارت کے وقت قبر سے اتنا قریب رہے جتنا زندگی میں اس کی ملاقات کے وقت رہتا۔ قبر کو بوسہ لینا یا ہاتھ سے چومنا مکروہ ہے۔ اسی طرح اولیاء کرام کی زیارت کے لئے داخل ہوتے وقت چوکھٹ کو چومنا بھی مکروہ ہے۔ (حاشية البجيرمي ۲/۲۶۲)

قبر کو کھودنا: کسی قبر کو بوسیدہ ہونے سے پہلے (یعنی میت کے اجزاء مٹی بن جانے سے) کھودنا جائز نہیں۔ ہاں کسی ضرورت کی بناء کھودے تو جائز ہے۔ مثلاً جس میت کو غسل دینا ضروری تھا، اسے بغیر غسل کے دفن کرے یا قبلہ کی طرف رخ کئے بغیر دفن کرے تو قبر کھودنا جائز ہے، لیکن اگر میت میں تغیر پیدا ہو چکا ہو تو پھر کھودنا جائز نہیں۔

یا غصب کی ہوئی زمین میں یا غصب یا چوری کئے ہوئے کپڑے میں کفن پہنا کر دفن کر دیا ہو۔ مالک اسے لوٹانے کا مطالبہ کرے، تو قبر کھودنا جائز ہے۔ لیکن مالک کے لئے مسنون ہے کہ اپنا حق معاف کرے۔

قبر میں کسی انگوٹھی یا مال گر جائے تو اس کو نکالنے کے لئے بھی قبر کھودنا جائز ہے۔

اگر کسی کو ریشم کے کپڑے میں، یا بلا کفن کے دفن کر دے تو کفن پہنانے کے لئے قبر کھودنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا مال نگل کر مر جائے تو مال نکالنے کیلئے پیٹ نہ چیرے۔ ہاں اگر کسی دوسرے کا مال نگل لیا ہو، اور صاحب مال، مال لوٹانے کا مطالبہ کرے تو قبر کھود کر اس کے پیٹ کو چیر کر مال نکالے، لیکن اگر ورثاء اسی کے مثل مال یا اس کی قیمت ادا کرنے کی ضمانت لیں تو پھر قبر نہ کھودے۔

اگر قبر بالکل بوسیدہ ہو جائے اور میت مٹی میں مل جائے تو اسے کھود کر دوسرے کو اس میں دفن کرنا جائز ہے۔ اور قبر کی بوسیدگی کی معلومات کے لئے تجربہ کار حضرات سے رجوع کریں۔

عام قبرستان میں کسی بوسیدہ قبر کو اٹھا کر اس پر مٹی ہموار کرنا جائز نہیں، تا کہ لوگ اسے نئی سمجھ کر وہاں دفن کرنے سے رک نہ جائیں، البتہ صحابہ کرامؓ اور اولیاء کرامؒ کی قبریں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (فتح الوهاب)

اگر کوئی پورے قبرستان میں سیلاب کا پانی پہنچنے کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہوا ہو، تو وہاں سے میت کو منتقل کرنا جائز ہے، چاہے دوسرے شہر میں منتقل کرنا پڑے۔ (حاشیہ الجمل ۲/۲۱۱) اگر کوئی کشتی میں مر جائے اور کشتی کسی ساحل یا جزیرہ کے قریب ہو اور ساحل تک پہنچنا ممکن ہو تو اس کے ساتھیوں کے لئے ساحل کی طرف نکل کر اسے غسل دینا، کفن پہنانا، نماز پڑھنا اور دفن کرنا واجب ہے اور اگر ممکن نہ ہو تو

ساحل پر دفن کرنا ضروری نہیں بلکہ اسے غسل دے کر کفن پہنا کر نماز پڑھے پھر دو تختوں کے درمیان باندھ کر سمندر میں ڈال دے تا کہ سمندر کی موجوں سے کنارے پہنچ جائے شاید کسی کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے دفن کردے چاہے ساحل والے کافر ہوں، اور اگر کسی وزنی چیز سے باندھ کر سمندر میں ڈال دے تا کہ نیچے تہہ تک پہنچ جائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ (مغنی ۳۶۲/۱) قبرستان میں رشتے داروں کو (مختلف جگہوں پر دفن کرنے کے بجائے) ایک ہی جگہ دفن کرنا مستحب ہے۔ (کیونکہ زیارت کرنے والے کے لئے اس میں آسانی ہوگی۔ مغنی)

حدیث : آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کے (قبر پر) سرہانے پتھر رکھ کر فرمایا "میں نے یہ علامت اس لئے رکھی تا کہ اپنے (رضاعی) بھائی کی قبر جان سکوں اور میرے رشتہ داروں میں سے جو بھی وفات پائے اسے وہاں دفن کروں" (رواہ ابوداود باسناد جید)

کسی میت کے مکمل طور پر بوسیدہ ہونے سے پہلے دوسری میت کو وہاں دفن کرنا حرام ہے۔

اگر قبر کھودتے وقت ہڈیاں مل جائیں تو قبر بند کرے، مزید نہ کھودے۔ لیکن اگر مکمل قبر کھودنے کے بعد کچھ ہڈیاں نکل آئیں، تو ان ہڈیوں کو اس قبر کے ایک جانب رکھ کر دوسری میت کو اس کے ساتھ دفن کردے۔

اگر ایک ہی وقت میں کسی کے رشتہ دار مرجائیں اور ہر ایک کو الگ الگ قبر میں دفن کرنا ممکن ہو، تو سب سے پہلے اس میت کو دفن کرے جس میں تغیر ہونے کا اندیشہ ہو، اس کے بعد دوسرے نمبر پر جس میں تغیر کا خدشہ ہو، اور اگر تغیر کا خدشہ نہ ہو تو سب سے پہلے باپ کو دفن کرے، پھر ماں، پھر اقرب الاقرب کے اعتبار سے دفن کرتا جائے اور اگر دونوں بھائی ہوں تو بڑے بھائی کو پہلے دفن کرے، اور دونوں بیویاں ہو تو پھر قرعہ اندازی کی جائے۔

کسی مسلمان کو کافروں کے قبرستان میں دفن نہ کرے اور نہ کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں۔ رات میں دفن کرنا مکروہ نہیں۔ کیونکہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ صحابہؓ نے ایک شخص کو رات میں دفن کردیا پھر آپ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے اس کے قبر پر نماز جنازہ ادا کی۔ (لیکن رات دفن کرنے پر انکار فرمایا) نیز بخاری ہی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو رات دفن کرنے کا ذکر موجود ہے، اسی طرح حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو رات میں دفن فرمایا۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور عائشہؓ رضی اللہ عنہم کی تدفین بھی رات میں عمل میں آئی بلکہ مسند احمد کی ایک روایت میں خود آپ ﷺ کا رات دفن ہونا مروی ہے۔ (فتح الباری، مغنی، فتح الوهاب، تحفة الاحوذی)

البتہ دن میں دفن کرنا مستحب ہے۔ اوقات مکروہہ میں بھی دفن کرنا مکروہ نہیں (لیکن سنت ہے کہ مکروہ وقت کے علاوہ دفن کرے۔ فتح الوهاب)

اور جس حدیث میں ان اوقات میں دفن کرنے سے روکا ہے، وہ اس پر محمول ہے جبکہ بالقصد ان اوقات میں دفن کرے۔ قبرستان میں رات گذارنا مکروہ ہے۔ دفن کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف میت کو منتقل کرنا حرام ہے اور اگر مرنے والے نے اس کی وصیت کی ہو تو اس کی وصیت نافذ نہ ہوگی۔ ہاں اگر مکہ، مدینہ یا بیت المقدس سے قریب ہو، تو وہاں کے دفن کی فضیلت حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اگر کوئی حاملہ عورت مرجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ (جنین) زندہ ہو۔ اور اس کے زندگی کی بھی امید ہو تو اس کے پیٹ کو چیر کر بچہ نکالے پھر دفن کرے اور اگر بچہ کے زندگی کی امید نہ ہو تو پیٹ نہ چیرے بلکہ بچہ مرنے تک اسے ایسے ہی چھوڑ دے، پھر دفن کردے۔

اگر کوئی قافلہ جنگل میں کسی ایسے میت کے پاس سے گزرے، جس کے کپڑوں پر غسل، کفن وغیرہ کا اثر نہ ہو، تو رک کر غسل وغیرہ دینا نماز پڑھنا اور دفن کرنا ضروری ہے، میت عورت کی ہو یا مرد کی۔ اور اگر میت پر غسل، کفن وغیرہ کا اثر ہو تو صرف دفن کرے اور اگر نماز پڑھنے کا ارادہ ہو تو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر پڑھے کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ اس پر نماز پڑھی گئی ہوگی۔

تعزیت کا بیان

حدیث: ''کوئی مسلمان اپنے بھائی کی مصیبت کے وقت تعزیت کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے شرافت کا لباس پہنائیں گے''۔ (رواہ ابن ماجہ ، والبیھقی باسناد حسن)

تعزیت کرنا سنت ہے، تعزیت کے لئے بیٹھنا مکروہ ہے۔ (یعنی گھر والے کسی ایک کمرہ میں اس لئے بیٹھے رہیں، تا کہ لوگ آ کر ان کی تعزیت کریں۔ بلکہ گھر والوں کو چاہئے کہ اپنے کام کاج میں مصروف رہیں) تمام گھر والوں کی تعزیت کرنا مستحب ہے، چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، مرد ہو یا عورت، البتہ جوان عورت کی صرف اس کے محرم رشتہ دار ہی تعزیت کریں۔ تعزیت چاہے نماز اور دفن سے پہلے کرے، یا دونوں کے بعد ہر حال میں مشروع ہے البتہ تعزیت دفن کے بعد کرنا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر میت والے زیادہ جزع وفزع (بے صبر کا مظاہرہ) کر رہے ہوں، تو انہیں صبر دلانے کے لئے دفن سے پہلے تعزیت کرنا بہتر ہے۔

تعزیت کرنے کا وقت موت کے وقت سے تین دن تک ہے، اس کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے۔ البتہ اگر تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جائے وہ فی الحال موجود نہ ہو، (تو پھر اس کے آنے کے بعد تعزیت کرے)

کسی کا مال گم ہونے کی وجہ سے بھی تعزیت کرنا اور اس کے لئے مناسب دعا کرنا مسنون ہے خواہ مال کم ہو لیکن اتنا ہو کہ جس کے گم ہونے سے افسوس ہو، (جمل)

تعزیت کے وقت مصافحہ کرنا بھی مسنون ہے۔ (جمل ۲/۲۱۲)

تعزیت خط و کتابت کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے۔ (حاشیۃ البحیری ۲/۲۷۱)

کسی کافر کی تعزیت کرنا مکروہ ہے۔ (جمل ۲/۲۱۴)

تعزیت کا مطلب یہ ہے کہ (میت کے گھر والوں کو) صبر کا حکم دے (اور صبر پر ملنے والے) اجر کے وعدہ کو یاد دلا کر صبر کی ترغیب دے اور جزع وفزع کے گناہ سے ڈرائے۔ اور میت کے لئے مغفرت کی اور مصیبت زدہ شخص کیلئے مصیبت کے تلافی کی دعا کرے۔

مسلمان کے انتقال پر کسی مسلمان کی تعزیت کرے تو یہ الفاظ ہے۔''اعظم اللہ اجرک و احسن عزائک و غفر لمیتک ''(ترجمہ: اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم اور صبر جمیل عطا کرے اور آپ کے میت کی مغفرت فرمائے۔) اور کسی کافر ذمی کے مرنے پر کسی مسلمان کی تعزیت کرے تو یہ الفاظ کہے۔''اعظم اللہ اجرک واخلف علیک ''(ترجمہ: اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا کرے اور اس کا بدلہ دے۔) یا یہ کہے۔''اعظم اللہ اجرک والھمک الصبر ''(ترجمہ: اللہ تعالیٰ آپ کو بھرپور اجر دے اور صبر کی توفیق دے) یا یہ کہے'' اعظم اللہ اجرک و جبر مصیبتک ''(اللہ تعالیٰ آپ کو خوب ثواب دے اور آپ کی مصیبت دور کرے) اگر کسی مسلمان کے موت پر کسی کافر ذمی کی تعزیت کرے تو یہ الفاظ کہے۔ غفر اللہ لمیتک و احسن عزائک ''مسلمان کسی ذمی کے قریبی ذمی رشتہ دار کی موت پر تعزیت کرسکتا ہے اور ایسی صورت میں یہ الفاظ کہے'' اخلف اللہ علیک و لانقص عددک ''(اللہ تمہیں اس کا بدلہ دے، اور تمہاری

تعداد کم نہ کرے)

حدیث: جب غزوہ موتہ میں حضرت جعفرؓ کے شہادت کی خبر موصول ہوئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کو ایسی خبر ملی ہے کہ (کھانے کی طرف) ان کی توجہ نہیں رہے گی۔" (ابوداؤد وغیرہ و حسنہ الترمذی)

میت کے گھر والوں کا لوگوں کو کھانے کی دعوت دینا بدعت اور غیر مستحب فعل ہے۔

نوحہ کرنے والی عورتیں اگر جمع ہوگئی ہوں تو ان کے لئے کھانا پکانا جائز نہیں، کیونکہ اس میں گناہ کے کام پر تعاون ہے۔ میت پر موت سے پہلے اور موت کے بعد رونا جائز ہے، البتہ موت سے پہلے رونا بہتر ہے۔

حدیث: (۱) "آپ ﷺ اپنے بیٹے حضرت ابراہیمؓ پر موت سے پہلے روئے۔" (رواہ الشیخان) (۲) اور "اپنی بیٹی کے قبر پر روئے" (رواہ البخاری) (۳) اسی طرح آپ ﷺ نے اپنی والدہ کے قبر کی زیارت کی تو اس وقت بھی روئے (رواہ مسلم)

ندب کرنا (یعنی میت کے اوصاف شمار کرنا جیسے واجملاہ، ہائے میرا سہارا تو تو پہاڑ جیسا عظیم الشان شخص تھا وغیرہ) نوحہ (ماتم) کرنا، اور جزع وفزع کرنا (یعنی چہرہ پیٹنا، بال بکھیرنا، گریبان وغیرہ چاک کرنا۔ چہرہ پر سیاہی ملنا، خاک ڈالنا وغیرہ) حرام ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور تقدیر پر رضامندی کے منافی ہے اور آپ ﷺ نے بڑی سختی سے اس سے منع فرمایا ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے "جو چہرہ پیٹے، گریبان چاک کرے اور جاہلیت کی چیخ وپکار پر عمل کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (بخاری شریف) (۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے "نوحہ کرنے والی عورت موت سے قبل توبہ نہ کرے تو بروز قیامت اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کو قطران اور خارش کا کرتہ پہنایا جائے گا۔" (مسلم)

قطران کولتار کے مانند ایک چیز کا نام ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کے بدن پر خارش اور کھجلی کو مسلط کردیا جائے گا۔ (الفقہ المنجی ۱/ ۲۶۲)

رشتہ داروں کے نوحہ وغیرہ کرنے کی وجہ سے میت کو عذاب نہ ہوگا اور جس حدیث میں میت کو عذاب ہونے کا ذکر آیا ہے اسکو اس پر محمول کیا گیا ہے جبکہ وہ نوحہ کرنے کی وصیت کرے۔

تلقین (بالمشافہ سمجھانا)

آپ ﷺ نے فرمایا "تمہارے بھائیوں میں سے کسی کا انتقال ہوجائے اور تم اس کی قبر پر مٹی درست کر چکو، تو ایک شخص اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو اور کہے، یا "فلان بن فلانۃ" (اے فلاں بن فلانہ) کیونکہ وہ سنے گا، لیکن جواب نہ دے گا، پھر کہے، یافلاں بن فلانہ، تو وہ سیدھے بیٹھ جائے گا۔ پھر کہے یافلاں بن فلانہ، تب وہ کہے گا ہماری رہنمائی کیجئے، اللہ آپ پر رحم فرمائے، لیکن تم نہیں جانتے (محسوس نہیں کرتے۔)، پھر (اس طرح تلقین) کہے۔ "اذکر ماخرجت علیه من الدنیا شهادة ان لا اله الاالله وان محمدا عبده و رسوله و انك رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا و بمحمد نبیا وبالقران اماما" تب منکر ونکیر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہیں گے۔ چلو جس شخص کو اس کی حجت (دلیل و برہان) تلقین کی گئی۔ وہاں ہمارا کیا کام:۔

ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ اگر اس کی ماں (کے نام) کا علم نہ ہوتو؟ فرمایا: اس کی ماں حواء کی طرف منسوب کرے، یافلاں بن حواء" (الطبرانی عن ابی امامه و اسناده صالح و قد قواه الضیاء فی احکامه و اخرجه عبدالعزیز فی الشافی)

حضرت راشد بن سود، ضمرۃ بن جیب اور دیگر حضرات فرماتے ہیں: میت کی قبر درست کرکے لوگوں کے جانے کے بعد قبر کے

پاس میت سے یہ کہنا مستحب سمجھا جاتا تھا: یافلاں! قل (کہو) ''لا الہ الا اللہ'' تین مرتبہ۔ قل (کہو) ''ربی الله ودینی الاسلام و نبی محمد'' پھر چلا جائے حضرت حکم بن حارث نے فرمایا میرے دفن کے بعد قبر پر پانی چھڑک دو تو قبر کے پاس قبلہ رو کھڑے ہو کر میرے حق میں دعا کرو۔ (طبرانی)

ابن ماجہ کی ایک روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً دفن کے وقت یہ دعا مروی ہے۔ اللهم جاف الارض عن جنبيها صعد روحها ولقها منك رضوانا ''(رواه الطبرانی) حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے بوقت موت فرمایا: '' میرے دفن کے بعد قبر کے پاس اتنا وقت رکو، جس میں ایک اونٹ کو ذبح کر کے گوشت تقسیم کیا جا سکے تاکہ تمہاری وجہ سے مجھے انسیت حاصل ہو اور پتہ چلے کہ میرے رب کے قاصدوں (منکر نکیر) سے کیا گفتگو ہوئی ہے (اور کیا جواب دیتا ہو) (صحیح مسلم)

آپ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے، تو وہاں رک کر فرماتے: '' اپنے بھائی کیلئے استغفار کرو اور اس کے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، کیونکہ اس وقت اس سے سوال ہوگا'' (ابوداؤد، حاکم، بزار عن عثمان) (تلخیص ۱۴۳/۲)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: دفن کے بعد میت کے تلقین کو ہمارے کئی فقہاء کرام نے مستحب قرار دیا ہے۔ قاضی حسین نے اپنی تعلیق میں، ان کے شاگرد ابوسعد متولی نے اپنی کتاب تتمہ میں، امام ابوالفتح نصر مقدسی اور امام رافعی وغیرہ حضرات نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

اور قاضی حسین نے اسے اصحاب شوافع سے نقل فرمایا ہے۔

امام ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ سے تلقین کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے اپنے فتاوٰی میں فرمایا: ہم تلقین کو اختیار فرماتے ہیں، اور اس پر ہمارا عمل ہے اور ہمارے کئی خراسانی علماء نے اس کا ذکر کیا ہے اس سلسلہ میں حضرت ابوامامہ سے ایک حدیث مروی ہے، جس کی سند قوی نہیں، لیکن دیگر شواہد اور اہل شام کے قدیمی عمل سے اس کی تائید و تقویت ہوئی ہے۔

علامہ بن علان صدیقی فرماتے ہیں: تلقین اس لئے مستحب ہے کہ اس میں میت کے لئے تذکر (یاد دہانی، وعظ و نصیحت) ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، '' وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ '' **ترجمہ**: اور سمجھاتا رہ، کہ سمجھانا مومنین کو کام آتا ہے (نصیحت کرنا مسلمانوں کو نفع بخش ہے) اور اس وقت بندہ سب سے زیادہ تذکر اور نصیحت و سمجھانے کا محتاج ہے۔

علامہ سخاویؒ نے مسئلہ تلقین پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں چاروں مسلک کے ائمہ کرام سے اس کے استحباب کو نقل فرمایا ہے۔ اور کافی طویل کلام کرتے ہوئے ابوامامہ کو متعلقہ روایت کے دس سے بھی زائد شواہد پیش کئے ہیں۔ (الاذکار مع شرح ابن علان ۱۹۴/۴۔۱۹۶)

امام آجری فرماتے ہیں۔ دفن کے بعد کچھ دیر قبلہ رو ہو کر میت کے حق میں ثابت قدمی کی دعا کرنا مستحب ہے۔

امام حکیم ترمذی فرماتے ہیں: بوقت دفن قبر کے پاس کھڑے ہو کر ثابت قدمی کی دعا کرنا نماز جنازہ کے بعد میت کے حق میں مدد (مزید قوت و اعانت) ہے کیونکہ مومنین کی نماز جنازہ اس کے حق میں ایک فوج کی طرح ہے، جو کسی بادشاہ کے در پر اس کی سفارش کے لئے جمع ہوئے ہوں، اور قبر پر ثابت قدمی کی دعا کے لئے رکنا اس فوج کی مدد (مزید اعانت) ہے۔ کیونکہ بڑی ہولناکی اور سوال کا وقت ہے۔ (شرح الصدور ص ۱۰۶)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے تلقین کے متعلق پوچھا گیا تو اسے مستحسن قرار دیا اور (وقت کے) عمل سے استدلال کیا۔ ابن قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ ابوامامہ کی روایت نقل کر کے فرماتے ہیں: اگرچہ یہ روایت ثابت نہیں، '' لیکن علاقوں اور زمانوں میں اس پر مسلسل بلا انکار عمل اس پر عمل

کے لئے کافی ہے" (الروح لابن قیم ص ۱۲)

مکلف کی میت کے دفن کے بعد اس کی قبر کے سرہانے چہرہ کے بالمقابل بیٹھ کر تلقین پڑھنا مستحب ہے۔ دیگر حضرات کو بوقت تلقین وہاں کھڑا رہنا مستحب ہے۔ جو غیر مکلف ہو (یعنی بچہ یا دہ پاگل جو کچھ مکلف نہ رہا ہو) اس کی قبر پر تلقین سنت نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے فتنۂ قبر نہ ہوگا۔ (مغنی المحتاج ۱/۳۶۷/فتاویٰ ابن زیادہ)

(بعض علماء جیسے ابن عبد السلام وغیرہ نے تلقین کو بدعت لکھا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو اثبات یا نفی کے اعتبار سے اچھالنا اور متنازع و اختلاف پیدا کرنا غلط ہے۔)

ایصال ثواب (میت کو ثواب پہنچانا)

کئی حضرات نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ دعا میت کو نفع پہنچاتی ہے قرآن پاک سے اس پر یہ آیت دلیل ہے۔ "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ" (الحشر ۱۰) **ترجمہ**: "اے رب ہم کو بخش اور ہمارے بھائیوں کو، جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں" آپ ﷺ نے فرمایا: "میت تو قبر میں ایک ڈوبنے والے مدد کے لئے پکارنے والے کی طرح ہے، جو اپنے ماں باپ یا اولاد یا معتبر دوست کی دعا کا منتظر ہے، جب یہ دعا پہنچتی ہے تو اسے دنیا و مافیہا سے محبوب ہوتی ہے، نیز اللہ تعالیٰ زمین والوں کی دعا کی وجہ سے پہاڑوں کے مثل اہل قبور پر (ثواب) داخل فرماتے ہیں اور زندوں کا مردوں کے حق میں ہدیہ ان کے لئے استغفار کرنا ہے" (بیہقی، فی الشعب، دیلمی) علامہ خطیب شربینی فرماتے ہیں: "اجماع اور صحیح احادیث کی روشنی میں میت کے حق میں اس کے وارث یا اجنبی کی طرف سے صدقہ دینا، وقف کرنا، مسجد تعمیر کرنا اور کنواں کھودنا وغیرہ اور دعا نفع پہنچاتا ہے۔" (مغنی ۳/۶۹)

احادیث: (۱) ایک شخص نے آپ ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میری ماں کا اچانک انتقال ہوگیا، اور اس نے وصیت نہیں کی، میرا خیال ہے، اگر اسے گفتگو کا موقع ملا ہوتا تو اس نے صدقہ دیا ہوتا، اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کروں تو کیا اسے ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "جی ہاں" (متفق علیہ) (۲) حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ میری ماں کا انتقال ہوا، تو (اس کے حق میں) کون سا صدقہ افضل ہے۔ فرمایا: "پانی" تو انہوں نے ایک کنواں کھودا اور کہا یہ سعد کی ماں کے لئے ہے۔ (احمد، سنن اربعہ)

میت کی جانب سے صدقہ دینے سے جس طرح میت کو نفع ہوتا ہے، صدقہ دینے والے کو بھی ہوتا ہے، اس کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی، اسی لئے صدقہ کے وقت والدین کی طرف سے صدقہ کی نیت کرنا بھی مستحب ہے۔ (مغنی)

حدیث: "تم میں سے کوئی نفلی صدقہ کرے تو اسے والدین کی جانب سے کرے، ان دونوں کو بھی ثواب ملے گا، اور اس کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔" (طبرانی، شرح الصدور صفحہ ۳۰۸)

امام نوویؒ نے شرح مسلم اور فتاویٰ میں امام شافعی رضی اللہ عنہ اور اکثر حضرات سے یہ نقل فرمایا کہ میت کو نماز وغیرہ کی قضاء کا ثواب اور تلاوت کا ثواب نہیں پہنچے گا۔

لیکن شرح مسلم اور اذکار میں انہوں نے ایک قول ائمہ ثلاثہ کی طرح تلاوت کا ثواب پہنچنے کا نقل فرمایا ہے، جس کو کئی شافعی علماء نے اختیار کیا ہے، جیسے ابن الصلاح، محب طبری، ابن ابی الدم صاحب ذخائر اور ابن ابی عصرون، اور لوگوں کا اسی پر عمل ہے اور جو مسلمان اچھا

سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔امام ابن الصلاح فرماتے ہیں: بہتر ہے کہ یہ کہے: یا اللہ ہم نے جو تلاوت کیا اس کا ثواب فلاں کو پہنچا، اس طرح دعا ہو جائے گی، اس میں قریب وبعید کا کوئی فرق نہیں۔ (مغنی)

تعزیت کی رسمی محفلوں میں قرأت اور چالیسویں وغیرہ کا انعقاد بدعت ہے ۔ (الفقه المنهجی ۱/۲۶۳)

مسائل متفرقہ

(۱) قبر کو زیادہ بلند کرنا منع ہے، آپ ﷺ نے حضرت علی کو ایسی قبریں برابر کرنے کا حکم دیا تھا۔(مسلم وغیرہ)

(۲) چالیسویں وغیرہ کی مناسبت سے اہل میت کا لوگوں کی دعوت کرنا بدعت ہے۔ اگر یہ دعوت میت کے ترکہ سے ہو اور وارثوں میں نابالغ بھی ہوں، تو یہ عمل شدید حرام ہے، کیونکہ یتیم کا مال کھانا اور بلا مصلحت ضائع کرنا ہے۔(الفقه المنهجی ۱/۲۶۳ ، اعانة، جمل)

امام احمد اور ابن ماجہ نے بسند صحیح حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا'' ہم اہل میت کے پاس اجتماع اور ان کی طرف سے کھانے کے نظم کو نوحہ (ماتم) شمار کرتے تھے۔''

(۳) وارد ہے کہ جس امتی کی موت طہارت کی حالت میں ہو، حضرت جبرئیل اس کی میت پر حاضر ہوتے ہیں، لہٰذا مریض اس کا اہتمام کرے۔ اگر کراہنے سے کچھ سکون حاصل ہو، یا بلا اختیار کراہ ہے تو یہ مباح ہے اور ورنہ خلاف اولیٰ ہے۔اس کی جگہ تسبیح وغیرہ پڑھنا بہتر ہے۔(بغیہ ۹۲)

(۴) جانوروں کو قبرستان میں داخل کرنا اور قبروں پر چلانا شدید مکروہ ہے، اگر کوئی کسی جانور کو قبر پر پیشاب کرتے دیکھے تو اسے چلا کر ہٹانا واجب ہے۔(بغیہ ص ۹۸)

(۵) موت (نزع) کے وقت مریض کے پاس سورہ یٰسین کی تلاوت مسنون ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے۔(ابوداؤد، صحیحہ ابن حبان)

بعض علماء نے اس کے پاس سورۃ الرعد کی تلاوت کو مستحب کہا ہے۔ کیونکہ حضرت جابرؓ کا فرمان ہے کہ اس سے روح بسہولت نکلتی ہے۔علامہ جیلی فرماتے ہیں کہ اسے ایک ایک گھونٹ سرد پانی مسنون ہے، کیونکہ نزع کی شدت کی وجہ سے شدید پیاس لگتی ہے، تو ایسے وقت شیطان کے گمراہ کرنے کا خدشہ ہے، کیونکہ وارد ہے: شیطان میٹھا خوشگوار پانی لے کر آتا ہے۔اور اس سے کہتا ہے۔ کہو میرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو میں یہ پانی تجھے پلاؤں گا اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اپنے فضل وکرم سے بوقت موت ثابت قدم رکھے(آمین) نزع کے وقت حائضہ کو وہاں رکھنا مکروہ ہے، کیونکہ حدیث میں وارد ہے، ملائکہ (فرشتے) اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں کتا، تصویر اور جنبی ہو۔اس سے معلوم ہوا کہ کتے، تصویر اور دیگر وہ حضرات جن پر غسل واجب ہو، ان کا بھی یہی حکم ہے۔''(مغنی المحتاج ۱/۳۳۱)

(۶) میت کو تحقیر آمیز انداز میں لے جانا حرام ہے۔ مثلاً تھیلے میں، یا ٹوکرے میں، یا بڑے آدمی کی میت کو جنازہ کے بغیر ہاتھ پر یا کاندھے پر لے جانا چھوٹے بچے کو ہاتھ پر لے جانے میں حرج نہیں۔(مغنی ۱/۳۵۹)

(۷) قبر کے پاس یا میت کے ساتھ آگ لے جانا مکروہ ہے، ابوداود کی روایت میں جنازہ کے ساتھ آواز بلند کرنے اور آگ لے جانے سے منع کیا گیا۔ حضرت عمر بن العاص نے فرمایا: میرا انتقال ہو جائے تو ساتھ نہ آگ رہے اور نہ نوحہ کرنے والی(مسلم شریف) اگر رات کی تاریکی میں تدفین کی وجہ سے چراغ ساتھ لے جائیں تو مکروہ نہیں ہے تاکہ تدفین بہتر طور پر ہو سکے۔(نهاية ۳/۳۲)

(۸) کسی مسلمان کو کافروں کے قبرستان میں دفن کرنا اور اس کے برعکس جائز نہیں۔ دونوں کی لاشیں خلط ملط ہو جائیں تو مستقل قبرستان میں دفن کرے، حربیوں کا قبرستان بالکل ختم ہو جائے تو اسے مسلمانوں کا قبرستان یا مسجد بنانا جائز ہے۔ کیونکہ مسجد نبوی ﷺ کی جگہ ایسی ہی تھی۔ کوئی شخص کسی قبرستان میں اپنے لئے قبر کھودے تو دوسرے کسی جنازہ پر یہ مقدم نہ ہوگا۔ کیونکہ پتہ نہیں یہ کس جگہ مرے گا، البتہ اس سے مزاحمت نہ کرنا بہتر ہے۔ (مغنی ۳۶۴/۱)

(۹) قبر کے پاس قرآن کی تلاوت کو علماء نے مشروع قرار دیا ہے۔

امام زعفرانیؒ نے اپنے استاد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے قبر کے پاس تلاوت کے متعلق پوچھا تو ارشاد فرمایا: "اس میں کوئی حرج نہیں۔" امام نوویؒ رحمۃ اللہ شرح المہذب میں فرماتے ہیں: قبر کی زیارت کرنے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہاں جتنا بسہولت ہو سکے تلاوت کرے، اس کے بعد ان کے حق میں دعا کرے۔ امام شافعیؒ نے اس کی صراحت فرمائی ہے اور اصحاب شافعیہ کا اس پر اتفاق ہے۔ ایک جگہ اور فرماتے ہیں" قبر پر مکمل قرآن ختم کریں تو یہ افضل ہے۔

امام شعبیؒ نے فرمایا: انصاریوں میں کوئی انتقال ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر جا کر قرآن پڑھتے رہتے۔ (شرح الصدور صفحہ ۳۱۱)

(۱۰) کفن پر قرآن پاک، اللہ کے اسماء حسنیٰ، دیگر محترم اسماء مثلاً فرشتوں یا انبیاء کرام کے اسماء لکھنا حرام ہے، کیونکہ میت کے پیپ وغیرہ کی نجاست سے آلودہ ہوگا۔ (اعانۃ ۱۱۵/۲)

(۱۱) اگر مرض یا قید وغیرہ عذر کی وجہ سے بستی کے جنازہ پر پہنچنے سے عاجز ہو، تو بعض علماء نے ایسے شخص کو غائبانہ نماز جنازہ کی اجازت دی ہے۔ (اعانۃ ۱۳۳/۲)

(۱۲) آپ ﷺ کا فرمان ہے" مومن کی روح جب تک اس کا قرض ادا نہ کیا جائے معلق رہتی ہے۔ (یعنی اس کے معزز اور پسندیدہ مقام سے روک دیا جاتا ہے) (رواہ الترمذی و حسنہ و صححہ ابن حبان)

لہٰذا میت کے غسل وغیرہ سے پہلے ہی اس کے قرض کی ادائیگی اور اس میں مسارعت مستحب ہے۔

فی الحال ادائیگی مشکل ہو، تو ولی (ذمہ دار) قرض خواہوں سے درخواست کرے کہ میت کے ذمہ سے قرض کو معاف کرو، اور میں اسے اپنے حوالہ لے لیتا ہوں۔ اگر میت کے ترکہ سے ادائیگی ممکن ہو اور قرض خواہ مطالبہ کرے، یا میت ٹال مٹول وغیرہ کی وجہ سے اس تاخیر میں گنہگار ہو تو جلد از جلد ادائیگی واجب ہے، اسی طرح میت کی وصیتوں کو بھی جلد از جلد نافذ کرے۔ (نہایۃ المحتاج ۱۸/۳)

بیماری میں علاج کرنا بالاجماع واجب نہیں ہے، کیونکہ اس سے شفا یقینی نہیں۔ ایک کافر معالج کے علاج اور مشورہ پر اعتماد کرنا جائز ہے، جبکہ کسی عبادت کے ترک وغیرہ کا مسئلہ نہ ہو۔

علامہ ابن المزری کا فتویٰ ہے کہ جس کا توکل قوی ہو، اسے علاج نہ کرنا اولیٰ ہے۔ اور جس کا نفس کمزور اور صبر ناقص ہو، اسے علاج کرنا افضل ہے۔ (نہایۃ ۱۹/۳)

(۱۴) حدیث کی اتباع میں قبر پر سبز ٹہنی لگانا مستحب ہے۔ اور خشک ہونے سے قبل کسی اور کو اسے لینا حرام ہے۔ (نہایۃ ۳۵/۳)

قبر پر درخت لگانا اور اس کو پانی ڈالنا حرام ہے جبکہ پانی کی تری یا درخت کی جڑیں میت تک پہنچتی ہوں۔ ورنہ شدید مکروہ ہے۔

(۱۵) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے تدفین کے بعد اپنے سرہانے سورہ بقرہ کی ابتدائی اور انتہائی آیتوں کے تلاوت کی وصیت فرمائی تھی۔ (بیہقی، ابوبکر خلال بسند حسن بشرح الاذکار ۱۹۴/۴)

(۱۶) کفار کے اولاد میں سے کوئی ممیز شہادتین کا اقرار کرے اور عبادت اور دیگر اسلامی امور کی پابندی کرے۔ پھر بلوغ سے قبل مرجائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاوی ابن زیاد ۱۰۶)

(۱۷) میت کو زمزم کے پانی سے غسل دینا خلاف اولیٰ ہے۔ (حاشیہ الجمل ۱۴۵/۲)

تارک صلوۃ کا بیان

(پنج وقتہ فرض نماز کا چھوڑنے والا)

(۱) سرے سے نماز کے وجوب کا انکار کر کے چھوڑے، تو ایسا شخص مرتد ہوگا۔ (یعنی اسلام سے نکل جائے گا) اور اس پر مرتدین کے احکام جاری ہونگے ہاں اگر ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوا ہو (تو اور بات ہے) کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اسے نماز کے وجوب کے سلسلہ میں کچھ علم نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی ایسے اجماعی (متفق علیہ) حکم کا انکار کرے جس کے متعلق صراحۃً نص موجود ہو اور جس کے حکم شرعی ہونے کا ہر عام وخاص آدمی کو علم ہو (جیسے نماز، زکوٰۃ، حج کا فرض ہونا اور شراب وزنا کا حرام ہونا) تو ایسا شخص بھی کافر ہوگا۔

اور اگر ایسے اجماعی مسئلے کا جس کا صرف خواص کو ہی علم ہو (جیسے میراث میں حقیقی بیٹی کے ساتھ پوتی کا سدس حصہ کا مستحق ہونا۔ معتدہ سے نکاح کا حرام ہونا) یا ایسے نئے مسئلہ کا جس پر اہل زمانہ کا اجماع ہو چکا ہو، انکار کرے تو کافر نہ ہوگا، بلکہ اسے صحیح بات بتلادے تاکہ وہ اس کا قائل ہو جائے۔

(۲) نماز کا انکار کئے بغیر ترک کردے، تو اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) کسی عذر کی وجہ سے چھوڑ دے مثلاً نیند کی وجہ سے یا بھول کی وجہ سے چھوڑ دے۔ تو ایسے شخص پر صرف قضاء ہے، اور قضا کے وقت میں وسعت ہے۔ (۲) شرعی عذر کے بغیر محض سستی اور کاہلی کی وجہ سے چھوڑ دے، تو ایسا آدمی کافر نہیں کہلائیگا۔ البتہ اس سے اولاً توبہ کرائی جائے، اگر توبہ کر کے نماز پڑھے تو ٹھیک، ورنہ پھر کسی ایک نماز کے ترک کے بعد جب اس کا وقت ضرورت بھی نکل جائے تو اسے تلوار کے ذریعہ قتل کر ڈالے۔ مثلاً ظہر کے ترک کی وجہ سے غروب شمس کے بعد قتل کرے اور مغرب کے ترک کی وجہ سے طلوع فجر کے بعد قتل کرے (قتل کا استحقاق اسلامی حکومت کو ہے نہ کہ عام انسان کو توبہ کے لئے اسے مہلت دینا ضروری نہیں بلکہ فی الحال توبہ کا مطالبہ کافی ہے۔ تارک صلوٰۃ کے غسل اور کفن ودفن کا مسئلہ پیچھے گذر چکا۔

حدیث : ''مجھے لوگوں سے قتال کا حکم ہے۔ یہاں تک کہ توحید ورسالت کی گواہی دیں اور نماز قائم کریں'' (متفق علیہ)

کوئی تارک صلوٰۃ یہ کہے کہ میں نے اپنے گھر میں نماز پڑھی، تو اسے قتل نہ کرے۔ (عمداً) بغیر وضو کے نماز پڑھنے پر بھی قتل کیا جائے گا۔

(اسی طرح کسی اجماعی رکن یا شرط کو ترک کرے تو قتل کیا جائے گا۔ جمل) بلا عذر جمعہ ترک کر کے ظہر پڑھے تو اس کی وجہ سے قتل نہ کیا جائے۔

تارک صلوٰۃ کو مہلت کے زمانے میں کوئی قتل کر ڈالے تو قاتل گنہگار تو ہوگا۔ لیکن اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔ اگر کوئی عذر کی وجہ سے نماز چھوڑ دے۔ (مثلاً بھول کر ٹھنڈی کی وجہ سے یا پانی نہ ہونے کی وجہ سے چاہئے وہ اعذار صحیح ہو یا غلط) تو اسے قتل نہ کرے البتہ اسے نماز پڑھنے کا حکم دے۔

اگر کوئی کہے کہ میں نے بلا عذر جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی تو اسے قتل کیا جائے۔ چاہئے وہ یہ کہے کہ میں نماز نہیں پڑھونگا یا خاموش رہے۔

کسی عذر کی وجہ سے نماز فوت ہوجائے تو اسے فوراً قضاء کرنا ضروری نہیں۔
اور جو نماز بلا کسی عذر کے فوت ہوجائے اس کی فوراً قضا کرنا ضروری ہے۔
امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی یہ گمان کرے کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایسی حالت (اور تعلق) ہے کہ اسے نماز (وغیرہ) معاف ہے اور شراب اور لوگوں کا مال حلال ہے (جیسا کہ بعض جاہل صوفیت کے دعویدار کا حال ہے) تو اس کے قتل کے وجوب میں کوئی شبہ نہیں۔ بلکہ ایسے آدمی کا قتل کرنا اللہ کے نزدیک ۱۰۰ کافر کے قتل سے افضل ہے۔ کیونکہ اس سے ضرر اور نقصان (مسلمانوں پر) زیادہ ہوگا۔ (حاشیه الجمل ۱۳۱/۲)

کتاب الزکوٰۃ (زکوٰۃ کا بیان)

زکات کے معنیٰ: عربی زبان میں لفظ 'زکات' تطہیر (پاک صاف کرنا، نشوونما، برکت اور کثرتِ خیر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
شرعاً مخصوص طریقہ سے مال یا بدن کی جانب سے نکالی جانے والی چیز کو 'زکات' کہتے ہیں کیونکہ زکات مال کو پاک کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے کو گناہ سے پاک کرنے اور مال کے اضافہ واصلاح اور آفات سے بچانے کا سبب ہے۔ زکات کی مختلف انواع ہیں، جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

زکات کی فرضیت قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ اور اس کا دینی اہم رکن ہونا بالکل قطعی اور واضح ہے۔ لہٰذا جو زکات کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہوجائے گا۔ (بشری الکریم ۴۰/۲)
جو زکات کی فرضیت کا قائل ہو، لیکن ادا نہ کرے، وہ فاسق و گنہگار ہے۔ آخرت میں سخت عذاب کا سزاوار ہے، اور حکومت اسلامیہ قہراً و جبراً اس سے زکات وصول کرے، چاہے اس کے لئے قتال کی نوبت آئے، جیسا کہ صدیقِ اکبرؓ کے طرز سے واضح ہے۔ (بخاری و مسلم) (الفقه المنهجی ۱۴/۲)

آیات: (۱) وَ اَقِیْمُوْ الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ "اور قائم رکھو نماز کو اور دیتے رہو زکوٰۃ" (البقرہ، آیت ۱۶۰)
(۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا "لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ (صدقہ) کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو" (سورہ توبہ آیت ۱۰۳)
(۳) "وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورہ توبہ آیت ۳۴) (اور جو لوگ گاڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں۔ (مثلاً زکوٰۃ نہ دیں اور حقوقِ واجبہ نہ نکالیں) سو ان کو خوشخبری سنادے دردناک عذاب کی۔"
(۴) وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ" (حم السجدہ آیت ۶-۷)
"ایسے مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں۔"
(۵) "وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْراً وَّ اَعْظَمَ اَجْراً" (المزمل ۲۰۰) "اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اچھی طرح (اخلاق

سے) قرض دو۔ اور جو نیک عمل اپنے آگے (آخرت کا ذخیرہ بنا کر) بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔"

احادیث: (۱) حدیث جبرئیلؑ میں جب انہوں نے آپ ﷺ سے اسلام کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اسلام یہ ہے کہ تم توحید و رسالت کی گواہی دو اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بصورتِ استطاعت بیت اللہ کا حج کیا کرو" (متفق علیہ)

(۲) صحیحین کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے اوپر کی پانچوں باتوں کو اسلام کی بنیاد قرار دیا۔

(۳) جس کو اللہ مال دے پھر وہ اس کی زکوٰۃ نہ دے تو قیامت کے دن اس کا مال گنجا، آنکھوں کے پاس دو سیاہ نقطے والا سانپ بن جائے گا (یعنی خطرناک اور بہت زہریلا سانپ) اور اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا۔ پھر وہ اس کے جبڑے کو گرفت میں لے کر (ڈسے گا) اور کہے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں پھر یہ آیت تلاوت فرمائی (وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الخ)" (بخاری)

(۴) کسی کے پاس اونٹ یا گائے یا بکریاں ہوں اور ان کا حق (زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو بروز قیامت ان جانوروں کو سب سے زیادہ بڑی اور موٹی شکل میں لایا جائے گا۔ (پھر یہ جانور مالک کو) اپنے کھروں سے روندتے اور سینگوں سے مارتے رہیں گے۔ جب آخری جانور گزر جائے گا تو پھر پہلا لایا جائے گا (اور یہ سلسلہ سزا اور رسوائی کا جاری رہے گا۔) جب تک کہ لوگوں کا فیصلہ نہ ہو جائے۔" (متفق علیہ)

(۵) "جس مال میں بھی زکوٰۃ شامل ہوگا (یعنی جس میں سے زکات ادا نہ کی گی یا بغیر حق کے جس نے زکات کے لئے اپنے مال میں اسے شامل کیا) وہ برباد ہو جائے گا۔" (الشافعی، البخاری فی تاریخہ، حمیدی)

زکوٰۃ کے بنیادی مصالح اور اسرار

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:-

"جاننا چاہئے کہ زکات میں سب سے اہم مصالح دو ہیں۔ پہلی مصلحت تہذیب نفس ہے، اس لئے کہ نفس اور حرص و بخل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حرص بدترین اخلاق میں سے ہے۔ جو معاد میں (آخرت میں) انسان کو سخت ہلاکت میں ڈال سکتی ہے۔ جو حریص ہوگا مرتے وقت بھی اس کا دل مال میں اٹکا رہے گا، اور اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ اگر زکوٰۃ کی مشق اس کو ہوگی تو یہ حرص اس سے ختم ہو چکی ہوگی، جو بالآخر اس کو نفع پہنچائے گی۔

انابت اور رجوع الی اللہ کے بعد معاد میں سب سے اعلیٰ اخلاق سخاوت نفس ہے جس طرح رجوع الی اللہ انابت و عبودیت، دعا اور تضرع سے عالم جبروت سے مناسبت اور قرب پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح سخاوت خسیس اور پست دنیاوی صورتوں اور شکلوں کو توڑتی ہے۔ اس لئے کہ وہ بہیمیت کی ضد ہے۔ اور اس کی اصل یہ ہے کہ ملکوتی (فرشتوں والی) صفات غالب ہوں۔ اور بہیمانہ صفات ان سے دب جائیں۔ بلکہ ان کے رنگ میں رنگ جائیں اور ان پر بھی اس حکم کا اطلاق ہونے لگے جو ملکوتی صفات پر ہوتا ہے۔ اس کا راستہ یہی ہے کہ مال کو باوجود ضرورت و احتیاج کے راہ خدا میں خرچ کر دیا جائے۔ ظالم کو معاف کیا جائے، مصائب پر صبر کیا جائے اور دنیاوی تکالیف و مشکلات آخرت کے یقین کی وجہ سے آسان و خوشگوار ہو جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان تمام چیزوں کا حکم دیا ہے اور ان کے حدود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان

میں مال کا خرچ کرنا بھی ہے۔ جو بہت سے حدود وقیود کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اس کی اہمیت اتنی ہے کہ ایمان اور نماز کے ساتھ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل نار کے بارے میں فرماتا ہے:

"قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ ○ (مدثر ۴۳۔۴۵)

ترجمہ: وہ کہیں گے ہم تو نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ ہم غریبوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے، اور مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے۔"

دوسری مصلحت کا تعلق شہر سے ہے۔ اس لئے کہ ضعفاء اور اہل حاجت جمع ہوں گے۔ اگر ان کی ہمدردی اور اعانت کی یہ سنت نہ ہوتو وہ سب بھوک سے ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ شہروں کا نظام مال پر قائم ہوتا ہے۔ اور ان شہروں کی حفاظت کے ذمہ دار اور وہاں کے مدبرین و منتظمین اپنی ان مشغولیات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کوئی باقاعدہ ذریعۂ معاش اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کی معشیت کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے۔ مشترکہ اخراجات یا چندے نہ سب کے لئے آسان ہے نہ ممکن۔ اس لئے رعیت سے ان مصالح کے لئے مقررہ رقم وصول کرنا مناسب دستور ہے۔ اور چونکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ دو مصالح باہم لازم وملزوم رہیں۔ اس کے لئے شرع نے بھی اس کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رکھا ہے۔ (حجة الله البالغه ۔ ۲/۲۹)

علامہ بحر العلوم فرنگی محلی لکھتے ہیں:

"ادائیگی زکوٰۃ کے وقت نیت کی درستی بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ زکوٰۃ بہت بڑی عبادت ہے۔" (رسائل الارکان ص ۱۶۳) (ارکان اربعہ ص ۱۵۰)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:۔

"انفاق کی ترغیب وفضیلت پر جو احادیث آئی ہیں، ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہر عمل سخاوت کے ساتھ ہو جو زکوٰۃ کی روح ہے۔ اور تہذیب نفس کا کام بہت حد تک اس سے انجام پا سکتا ہے بخل کی برائی بار بار اس لئے بیان کی گئی کہ حرص ایسی چیز ہے جو مانع زکوٰۃ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ جس کا اشارہ اس حدیث میں ہے کہ "اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَّ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا" (اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عنایت فرما، اے اللہ روک رکھنے والے کا مال تلف فرما۔) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ حرص سے بچو اس لئے کہ حرص ہی نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کیا ہے، دوسرے موقع پر ارشاد ہے "اَنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِ" "بے شک صدقہ اللہ تعالیٰ کے عقاب کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا" اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ" "بے شک صدقہ گناہوں کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ صدقہ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور اس کو بڑھاتا رہتا ہے۔" (حجة الله البالغه ۲/۳۱، ارکان اربعه ۱۵۶)

باب - مویشیوں کی زکات

مویشیوں میں درج ذیل شرائط کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہے۔

(۱) اونٹ، گائے یا بکری ہو، مذکر ہو یا مونث ہو، لہٰذا دیگر حیوانات جیسے گھوڑا اور غلام وغیرہ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو جانور زکات والے اور غیر زکوٰۃ والے جانور کی جفتی سے پیدا ہو، اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

حدیث : مسلمان پر اس کے گھوڑے اور غلام میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔'' (بخاری و مسلم)

(۲) نصاب مکمل ہو جس کی تفصیل آئندہ پیش ہوگی۔

(۳) اپنی ملکیت میں اس پر مکمل (اسلامی) سال گزر جائے۔ابوداود وغیرہ کی روایت میں وارد ہے کہ'' کسی مال میں سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہے'' یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی صحیح آثار سے اس ضعف کی تلافی ہو جاتی ہے۔(اور قابل اعتماد اور استدلال شمار ہوگی) بلکہ فقہاء و تابعین کا اس پر اجماع ہے۔(بشری الکریم ۲/۴۴) لیکن نصاب کے بقدر مویشیوں کی نسل کے لئے نصاب کا ہی سال شمار ہوگا، چاہے ان کی ماں مرجائے۔(بچوں کے سال کی ابتداء ان کی پیدائش سے شمار نہیں ہوگی بلکہ وہ ماں کے تابع ہوں گے) یعنی جب ان بچوں کی وجہ سے دوسرے نصاب کو پہنچ جائے جیسے ۱۲۰ بکریاں ہوں اور ایک کو بچہ ہوا اور ۱۲۱ ہو جائیں تو زکات میں دو بکری واجب ہوگی۔اگر دوسرے نصاب کو نہ پہنچے تو بچوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا جیسے ۱۰۰ بکریاں ہوں اور ۲۰ بچے پیدا ہوں (تو اس صورت میں ایک ہی بکری واجب ہے۔) امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت عمرؓ کا یہ فرمان نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے ساعی (زکوٰۃ وصول کرنے والا) سے کہا کہ'' بچوں کو بھی شمار کرو'' اور سال کی شرط میں مصلحت یہ ہے کہ مال میں نشو و نما اور اضافہ حاصل ہو اور بچے اہم نفع اور اضافہ میں داخل ہیں۔لہٰذا سال میں اپنے اصل اور ماں کے تابع ہوں گے۔ابتداءً جانور نصاب سے کم ہوں پھر بچے پیدا ہونے کی وجہ سے نصاب کو پہنچ جائیں، تو اب سے سال شروع ہوگا۔

اگر دوران سال مکمل نصاب یا بعض (فروخت وغیرہ کی وجہ سے) ملکیت سے نکل جائے پھر دوبارہ خریدنے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے اس کی ملکیت میں آئے تو اب سے از سر نو سال شروع ہوگا۔اگرچہ زکات سے بچنے کے لئے اس طرح کرے لیکن زکات سے بچنے کی نیت سے اس طرح کرنا مکروہ ہے (بعضوں نے اسے حرام قرار دیا ہے۔) امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا کہ اس سے باطناً (حقیقتاً) زکات سے سبکدوش نہ ہوگا۔(بشری الکریم ۲/۴۴) مگر کسی ضرورت سے یا ایسے ہی کرنا مکروہ نہیں ہے۔

خرید، ھبہ، وراثت اور وصیت وغیرہ کے سبب ملکیت میں آنے والے جانور وغیرہ کا سال اب سے شروع ہوگا۔ پہلے سے موجود جانور کے ساتھ اس کا سال شمار نہ ہوگا۔کیونکہ یہ اولاد اور پیداوار کی طرح نہیں ہے۔لیکن نصاب میں سابقہ مال کے ساتھ اسے شمار کریں گے۔کیونکہ وہ کثرت کی وجہ سے مواسات اور غمگساری کے قابل ہے۔لہٰذا ۳۰ گائے ملکیت میں ۶ ماہ ہوں پھر ۱۰ گائے خریدے تو ۳۰ کا پہلا سال مکمل ہونے پر ایک تبیع (ایک سالہ بیل یا گائے) واجب ہے۔بعد میں ہر سال مسنہ (دو سالہ گائے) کا پونا حصہ اور ۱۰ کا سال مکمل ہونے پر مسنہ کا پاؤ واجب ہے۔ پہلا سال مکمل ہونے کے بعد پیدا ہونے والی اولاد کا اس سال میں شمار نہیں کریں گے بلکہ یہ دوسرے سال میں شمار ہوں گے۔اگر مالک سال مکمل ہونے کے بعد بچوں کی پیدائش کا دعویٰ کرے تو مان لیں گے۔اگر ساعی اسے متہم سمجھتا ہے تو اسے قسم دلانا سنت ہے۔

(۴) مالک یا اس کا قائم مقام سال بھر مویشی کو چراہ گاہ میں چرائے، حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ'' بکری اگر سائمہ ہے (یعنی چراہگاہ پر گزر بسر کرنے والی) تو اس میں ۴۰ سے ۱۲۰ تک ایک بکری واجب ہے۔'' لہٰذا اس کا مفہوم یہ نکلا کہ اگر چارہ وغیرہ لا کر کھلانا پڑتا ہے، تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔بکری پر اونٹ اور گائے کو بھی قیاس کیا جائے گا۔عام جائز چراگاہ میں یا کسی کی مملوکہ چراگاہ (جس کی قیمت معمولی ہو) میں چرنے کی صورت میں چونکہ (خرچ کم) اور فائدہ زیادہ ہو رہا ہے، اس لئے صرف ایسے جانوروں میں زکات واجب کی گئی۔اگر کوئی اپنے طور پر اتنا چارہ کھلائے کہ اس کے بغیر بھی نمایاں نقصان کے بغیر جانور جی سکتا ہو اور اس عمل سے

چراگاہ بھیجنے کو روکنا بھی مقصود نہ ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ (بلکہ زکات واجب ہوگی)

اگر جانور خود چراگاہ میں چرے یا مالک کے علاوہ کوئی اور مثلاً غاصب چرائے، یا سائمہ جانور خود (گھر میں) چارہ کھائے، یا سال کا اکثر حصہ اسے چارہ کھلایا، یا اتنی مقدار کھلایا کہ اس کے بعد یا تو وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا، یا نمایاں واضح ضرر کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے، یا بغیر نمایاں ضرر و نقصان کے زندہ تو رہ سکتا ہے، لیکن اس طرح کھلانے سے مقصود چراگاہ کا سلسلہ ختم کرنا تھا، یا مویشی اسے وراثت میں ملے، اور (چراگاہ میں چرتے ہوئے) سال گذر گیا، لیکن اسے اس کا علم نہیں تھا تو ان تمام صورتوں میں زکات واجب نہیں ہے۔ کیونکہ مالک کی طرف سے شرط کے مطابق چراگاہ میں چرانا پایا نہ گیا۔ مویشی ایک دو دن بغیر چارہ کے گذر کرسکتا ہے نہ کہ تین دن۔

کھیتی باڑی وغیرہ کے کام کاج کے لئے جو جانور ہوں ان میں زکات نہیں ہے۔ کیونکہ وہ استعمال کے لئے پالے گئے ہیں، نہ کہ مال بڑھانے کیلئے جیسا کہ پہننے کے کپڑے اور گھر کے اسباب۔

سائمہ کی زکات ان کے پانی پینے کے لئے آتے وقت لینا مندوب ہے، کیونکہ اس وقت ان کی گنتی بسہولت ممکن ہے لہٰذا ساعی ان کو بستی میں لانے کا مکلف نہ بنائے، جیسا کہ اسے چراگاہ میں ان کی تلاش کرنا لازم نہیں ہے۔ اگر جانور پانی پینے کو نہ آتے ہوں، تو ان کے گھر کے قریب زکوٰۃ وصول کرے، کیونکہ بیہقی کی روایت میں ہے کہ" جنگل وصحراء میں رہنے والوں کی زکوٰۃ پانی کے پاس یا ان کے گھر کے سامنے وصول کی جائے۔"

زکوٰۃ نکالنے والا معتبر ہو تو تعداد کے متعلق اس پر اعتماد کیا جائے گا، ورنہ ان کی گنتی کی جائے گی۔ اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ کسی تنگ راستے سے ان کو ایک ایک کر کے گذارا جائے اور مالک اور ساعی دونوں یا ان کے نائب کے ہاتھ میں چھڑی ہو، جس سے دونوں بھی ہر ایک جانور کی طرف اشارہ کریں اور اس کی پشت کو چھولیں۔ کیونکہ اس طرح شمار کرنے میں غلطی کا امکان بہت کم ہے شمار کے بعد تعداد میں دونوں کا اختلاف ہو اور اس سے زکوٰۃ کی مقدار کا فرق ہوتا ہو تو دوبارہ شمار کریں۔

اگر زکوٰۃ کی اہلیت رکھنے والے دو اشخاص نصاب میں شریک ہوں یا نصاب سے کم میں شریک ہوں اور ایک شریک نصاب کا مالک ہو، چاہے جانور ہوں یا کوئی اور زکوٰۃ کا مال جیسے سونا چاندی تو ایک شخص کی طرح زکات دیں گے۔ (یعنی یہ سارا مال ایک کا ہوتا تو جس طرح زکوٰۃ نکالی جاتی اسی طرح نکالی جائے) کیونکہ بخاری شریف میں حضرت انسؓ کی روایت میں ہے" زکات کے خوف سے نہ تو متفرق کو جمع کیا جائے گا اور نہ مجتمع کو متفرق (جدا) کیا جائے گا" مالک کو زکوٰۃ کے وجوب یا کثرت کے خوف سے اور ساعی کو زکوٰۃ ساقط ہونے یا کم ہونے کے خوف سے جمع اور تفریق سے منع کیا گیا۔ مذکورہ روایت دراصل خلطۃ الجوار (جس کا تذکرہ آئندہ آرہا ہے) کے متعلق ہے۔ لہٰذا خلطۃ شیوع کا (شرکت کی جو مثال گذر چکی) بھی بدرجہ اولیٰ یہی حکم ہوگا۔

نصاب کا اعتبار کرنے سے معلوم ہوا کہ جنس متحد ہونا چاہئے چاہے انواع مختلف ہوں، اور جن اموال میں سال کا اعتبار ہوتا ہے، اس میں مکمل سال شرکت پائی جائے ورنہ وجوب زکوٰۃ کے وقت جیسے پھل و اناج خلطت میں سال کی ابتداء، خلطۃ کے وقت سے شمار ہوگی، نصاب سے کم میں شرکت سے زکات اس وقت واجب ہوگی جب کہ کوئی ایک نصاب کا مالک ہو۔ مثلاً دو آدمی ۲۰ بکری میں برابر شریک ہوں ایک کے پاس الگ ۳۰ بکریاں ہوں تو اسے ایک بکری ۵/۴ اور دوسرے کو ۵/۱ (پانچواں حصہ) زکات میں دینا لازم ہے، لیکن کسی کے بھی پاس بقدر نصاب نہ ہوں چاہے دونوں کا مجموعی مال نصاب تک پہنچ جائے تو زکات واجب نہیں ہے۔ مثلاً دونوں کے پاس ۱۹/۱۹ بکری ہوں اور دو بکری میں دونوں شریک ہوں۔

خلطة جوار :-(دونوں کے جانور یا کوئی اور مال ساتھ رہتے ہیں، لیکن ملکیت الگ الگ ہے اور شرکت نہیں ہے)
خلطہ جوار کی صورت میں درج ذیل امور میں اتحاد ہو تو ایک مالک کی طرح زکات واجب ہوگی۔
۱) مَشرَب (مویشیوں کے پانی پینے کی جگہ) (۲) مُراح (رات آرام کرنے کی جگہ) (۳) چرواہا (۴) ایک نوع کے جانور ہوں تو نر (جو جفتی کے لئے استعمال ہو) ایک ہو، انواع متفرق ہوں تو اس اعتبار سے نر کے الگ ہونے میں حرج نہیں نر ایک ہونے سے مقصود یہ ہے کہ مویشیوں میں آزاد چھوڑا گیا ہو چاہے کسی ایک کی ملکیت ہو۔ یا کسی ایک نے یا دونوں نے عاریت پر لی ہو ۵) مُحلب (دودھ دوہنے اور نکالنے کی جگہ) (۶) ناطور۔ (کھیتی اور باغ کا محافظ) (۷) کھلیان (۸) دوکان (۹) محفوظ رکھنے کی جگہ۔ اسی طرح چراگاہ، چراگاہ کا راستہ، پانی پینے کی نہر، ہل چلانے والا، ترازو، پیمانہ، وزن کرنے والا اور ناپنے والا بھی متحد ہوں۔ اتحاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف ایک ہی ہو، بلکہ دونوں کے مال کے لئے الگ الگ نہ ہوں۔ اب اگر زیادہ بھی ہوں اور دونوں کے لئے مشترک طور پر استعمال ہو تو اس سے خلطہ پر اثر نہ ہوگا۔

دودھ دوہنے والا، دودھ کا برتن، اون کترنے والا اور کترنے کا آلہ متحد ہونا ضروری نہیں ہے۔ خلطہ کی نیت ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ ان سہولتوں کے اتحاد سے خرچ میں جو کمی ہوتی ہے، اس کا قصد اور عدم قصد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مذکورہ امور میں اتحاد اس لئے مشروط ہے، تاکہ دونوں مال جمع ہو کر ایک مال کی طرح ہو جائے۔ اور زکوٰۃ ادا کرنے والے نیک بخت پر خرچہ کا بار کم پڑے۔ جن امور میں اتحاد شرط ہے، دونوں مال میں طویل وقت تک (تین دن یا زائد) اتحاد نہ پایا جائے، یا قلیل مدت تک دونوں مالک یا ایک کی جانب سے بالقصد اتحاد نہ ہو، یا جانور خود جدا ہوں اور یہ اسی حال پر رکھیں، تو خلطہ کا حکم باقی نہ رہے گا۔

دونوں میں ایک مال موقوف یا ذمی کا یا بیت المال کا ہو تو خلطہ کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ بلکہ جو اہلِ زکات ہے اس کا مال نصاب کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ ہے، ورنہ نہیں۔

نصاب

اونٹ کا نصاب :اونٹ کے نصاب کی ابتداء پانچ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ۲۰ تک ہر ۵ میں دو سالہ ایک بکری یا بکرا یا ایک سالہ بھیڑ یا دنبہ واجب ہے۔ ۵ یا زائد اونٹ میں زکات میں نکالا جانے والا اونٹ بھی دے سکتے ہیں۔ ۲۵ اونٹ میں ایک بِنتِ مَخَاض یعنی ایک سالہ اونٹنی، ۳۶ میں ایک بِنتِ لَبُون یعنی دو سالہ اونٹنی، ۴۶ میں حِقَّہ یعنی تین سالہ اونٹنی، ۶۱ میں جَذَعَہ یعنی چار سالہ اونٹنی، ۷۶ میں دو بنت لبون، ۹۱ میں دو حقے، ۱۲۱ میں تین بنت لبون واجب ہیں۔ پھر ۹ کے اضافہ پر اور بعد میں ہر دس کے اضافہ پر واجب بدلتا رہے گا۔ لہٰذا ہر ۴۰ میں بنت لبون اور ہر ۵۰ میں حقہ واجب ہے۔" بخاری شریف میں حضرت انسؓ کی روایت میں ہے"... پھر ۱۲۰ سے آگے زائد ہو تو ہر ۴۰ میں بنت لبون اور ہر ۵۰ میں حقہ واجب ہے" مطلب ایک کا اضافہ ہے نہ کہ اس سے کم جیسا کہ ابوداود کی روایت میں صراحت ہے"... پھر جب ۱۲۱ ہو جائے تو اس میں ۳ بنت لبون آگے ۱۳۰ میں دو بنت لبون اور حقہ، ۱۴۰ میں دو حقے اور ایک بنت لبون، اور ۱۵۰ میں ۳ حقے، اور اسی طرح آگے واجب ہوگا۔

دو نصاب کے درمیان کی تعداد معاف ہے۔ اسے وَقص کہتے ہیں۔ اور اس سے واجب متعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا کسی کے پاس ۹/اونٹ ہوں اور سال مکمل ہونے اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے قبل ۴ تلف ہو جائیں، تب بھی ایک بکری واجب ہے۔ زکات میں ادا ہونے والے جانور

مونث ہوں، تاکہ دودھ اور نسل کا فائدہ حاصل ہو۔

گائے بیل کا نصاب :- ہر ۳۰ میں ایک تبیع یا تبیعہ (ایک سالہ بیل یا گائے) اور ہر ۴۰ میں ایک مُسِنّہ (دوسالہ گائے) واجب ہے۔ ترمذی شریف وغیرہ میں حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ "آپؐ نے مجھے یمن روانہ کیا تو حکم دیا کہ میں ہر ۴۰ گائے میں ایک مسنہ اور ہر ۳۰ میں ایک تبیع وصول کروں" (صححہ الحاکم وغیرہ)

بکری کا نصاب :- ۴۰ بکری میں ایک بکری، ۱۲۱ میں دو، ۲۰۱ میں تین اور ۴۰۰ میں چار بکری واجب ہیں۔ اس کے بعد ہر ۱۰۰ میں ایک بکری، جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ زکات میں نکالی جانے والی بکری دوسالہ ہو، یا ایک سالہ دنبہ ہو، یا دنبہ کے آگے کے دانت گر چکے ہوں۔

خاتمه

ساعی یا مستحق زکات لیتے وقت مالک کے حق میں مناسب دعا کرے۔ مثلاً یہ کہے "اللہ تمہیں اس کا اجر دے اور طہارت کا باعث بنائے اور بقیہ مال میں برکت عطا فرمائے" البتہ درود کے لفظ سے دعا دینا (اللہم صل علیہ کہنا) مکروہ ہے۔ کیونکہ وہ انبیاء کرام اور ملائکہ کے ساتھ خاص ہے، البتہ تبعاً گنجائش ہے۔ انبیاء کرام کے علاوہ دیگر صالحین کے لئے ترضی اور ترحم (رضی اللہ عنہ اور رحمۃ اللہ علیہ جیسے الفاظ کہنا) سنت ہے۔ امام نوویؒ نے مجموع میں فرمایا ہے کہ بعض علماء نے جو ترضی کو صرف صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، یہ ضعیف ہے۔

زکات، صدقہ، تدریس، تصنیف، تلاوت، تسبیح و ذکر اور دیگر عبادات و قربت کے انجام دینے کے بعد "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" کہنا سنت ہے۔

نباتات کی زکات

(زمینی پیداوار یعنی اناج و پھل کی زکات)

آیات : وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (الانعام ۱۴۱) (اور اس میں یعنی پھل اور کھیتی میں) جو حق واجب ہے، وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرو)

(۲) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ ۲۶۷) (اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا ہے۔)

اختیاری حالت میں بطورِ خوراک اور غذا استعمال ہونے والی اشیاء یعنی کھجور، انگور اور اناج (دانے) جیسے گیہوں، چاول، مسور، مکئی، چنا اور لوبیاء میں زکات (عشر) واجب ہے۔

احادیث : (۱) آپ ﷺ نے کھجور کی طرح انگور کے خرص (مقدار کا اندازہ لگانا) کا حکم دیا، اور کھجور کی طرح خشک ہونے کے بعد اس کی زکات وصول کرنے کا حکم دیا۔ (ترمذی ابن حبان، ابوداود، نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے جب حضرت ابوموسیٰؓ اور معاذؓ کو لوگوں کو دین سکھانے کے لئے یمن روانہ کیا تو فرمایا: "صرف ان چار اشیاء کی زکات لو۔ جو، گیہوں، خشک انگور (کشمش) اور کھجور" (حاکم۔ بیہقی)

مذکورہ اشیاء پر قیاس کرتے ہوئے ان کے مثل دیگر اشیاء میں بھی زکات واجب ہوگی۔

دوسری حدیث میں حصر اضافی ہے، کیونکہ حاکم میں حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "بارش، بہنے والے پانی اوراپنے جڑوں سے پانی حاصل کرنے والے اشیاء میں عُشر (دسواں حصہ) اور پانی لاکر سیراب کرنا پڑے تو نصف عُشر (بیسواں حصہ) واجب ہے، اور یہ حکم کھجور، گیہوں اور دیگر دانوں (اناج) کا ہے۔ رہی ککڑی، خربوزہ، انار اور تروتازہ ساگ تو اسے آپ ﷺ نے معاف رکھا ہے۔ (وقال صحیح لاسناد)

مذکورہ اشیاء کی بالقصد کھیتی کرے یا خود بخود اُگ آئے زکات واجب ہے۔ اختیاری خوراک کہنے سے بطور دوا، سالن مجبوری یا شوقیہ کھائی جانے والی اشیاء نکل گئیں، ان میں زکات واجب نہیں جیسے زیتون، زعفران، شفتالو، زرد آلو، انجیر، اخروٹ، بادام، سیب اور اندرائن وغیرہ

نصاب : اناج اور پھل کا نصاب پانچ وسق ہے، اس سے کم میں زکات واجب نہیں ہے۔

حدیث : "پانچ وسق سے کم میں زکات نہیں ہے۔" (رواہ الشیخان)

پانچ وسق بغدادی ۱۶۰۰ رطل کے برابر ہے۔

وسق کی مقدار :- ایک وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے اور صاع ۵ رطل اور ایک تہائی رطل (۵ ۱/۳ رطل) کا اور رطل دور حاضر میں ۶۷۵ گرام ہوگا، لہٰذا ۵ وسق کی مقدار (۶۵۳) کلو گرام ہوگی۔ (الفقہ الاسلامی للدکتور وھبۃ الزحیلی ۲/۸۰۰)

الفقہ المنھجی میں فرمایا: "وسق پیمانہ ہے جس کی مقدار ابن حبان کی روایت میں آپ ﷺ نے ۶۰ صاع بتلائی، ایک صاع ۴ مد کے برابر ہے۔ یعنی چار بڑے (لپ بھر، ایک صاع کو دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۱۴/ ۱۰۵) نے تین لیٹر کے برابر قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے وسق ۱۸۰ لیٹر اور اناج وغیرہ کا نصاب (۹۰۰) لیٹر ہوگا۔ (الفقہ المنھجی ۲/ ۴۰)

ایک صاع وزن کے اعتبار سے تقریباً (۲۴۰۰) گرام (۲ کلو ۴۰۰ گرام) ہوگا۔ (الفقہ المنھجی ۱/ ۲۳۰) (اس اعتبار سے ۵ وسق کا وزن تقریباً ۷۲۰ کلو ہوگا)۔

علامہ ہاشم مجذوب نے بعض اناج کا نصاب کلوگرام میں اس طرح بیان کیا ہے۔ مسور ۷۹۲ کلو، گیہوں ۷۴۴ کلو، چنا ۷۵۶ کلو اور جو ۶۰۶ کلو (ھامش عمدۃ السالک ص ۱۵۳) ایسا مکعب جس کے اضلاع کا طول ۹۷،۶۵ سینٹی میٹر ہو، اس کا حجم ۵ وسق کے برابر ہوگا۔ (ضمیمہ عمدۃ السالک)

علامہ قرضاوی کے تحقیق کے مطابق ایک صاع ۲۱۷۶ گرام (۲ کلو ۱۷۶ گرام) کے برابر ہوتا ہے۔ (گیہوں کے وزن سے) اور یہ مقدار ۲،۷۵ لیٹر پانی کے برابر ہے۔ لہٰذا نصاب تقریباً ۶۵۳ کلوگرام گیہوں کے برابر ہوگا۔ (ترجمہ فقہ الزکوۃ ص ۲۰۰)

کھجور اور انگور بغیر نقص اور عیب کے خشک ہوتے ہوں تو خشک ہونے کے بعد نصاب کا اعتبار ہوگا۔ ورنہ تر حالت میں اندازہ لگایا جائے کہ خشک ہوکر بقدر نصاب ہوگا یا نہیں۔ اور امام (یا عامل) کی اجازت سے اسی حالت میں توڑ کر اس میں سے زکات ادا کرے، جیسا کہ درخت کے نقصان کی صورت میں کیا جائے گا۔

بھوسہ اور جو چھلکا اناج کے ساتھ کھایا نہیں جاتا، اس کی صفائی کے بعد اناج کا بقدر نصاب ہونا ضروری ہے جس اناج کو چھلکے سمیت کھایا جاتا ہو جیسے مکئی، اس کا چھلکے سمیت اعتبار ہوگا۔ چاہے عیش وتنعم کے طور پر اس کا ازالہ کرے۔ جو اناج چھلکے سمیت محفوظ رکھا جاتا ہو اور چھلکا کھایا نہ جاتا ہو جیسے چاول اور گیہوں کے بعض اقسام تو ان میں غالباً دس (۱۰) وسق نصاب ہوگا۔ اگر دس (۱۰) وسق میں خالص پانچ

(۵) وسق سے کم نکلے تو اس میں زکات نہیں ہے۔ اور دس سے کم میں ہی خالص ۵ وسق حاصل ہوں تو زکات واجب ہے۔

ایک ہی جنس کے مختلف انواع کو نصاب کی تکمیل میں آپس میں ملایا جائے گا۔ اور ہر نوع سے اس کی قسط کے مطابق زکات ادا کرے۔ (مثلاً ایک قسم کے چاول دو (۲) وسق اور دوسرے قسم کے تین (۳) وسق ہوں تو یہ بقدر نصاب ہے۔ اس میں زکات واجب ہوگی) (لہٰذا ہماری مثال میں ۲ حصہ زکات پہلی قسم سے اور ۳ حصہ دوسری قسم سے ادا کرے) اگر کثرتِ انواع اور ہر نوع کی مقدار کی کمی کی وجہ سے الگ الگ نکالنا دشوار ہو تو متوسط اور درمیانی قسم سے نکالے۔ لیکن دو مختلف جنسوں کو ملایا نہ جائے گا۔ (لہٰذا چاول دو (۲) وسق اور گیہوں تین (۳) وسق ہو تو زکات واجب نہ ہوگی۔

ایک سال کی پیداوار کو نصاب کی تکمیل کے لئے دوسرے سال کی پیداوار کے ساتھ ملایا نہیں جائے گا، گرچہ پہلے سال کے پھل کٹنے سے پہلے ہی دوسرے سال کے نمودار ہونا شروع ہو جائے۔ لیکن ایک ہی سال میں کٹنے والے اناج اور ظاہر ہونے والے پھلوں کو ملایا جائے گا۔ چاہے انواع اور علاقے کے اختلاف کی وجہ سے پکنے اور تیار ہونے کے اوقات الگ الگ ہی کیوں نہ ہوں۔ پھل کا ظہور ایک ہی سال میں ہو تو اسے آپس میں ملائیں گے اور اناج کا کٹنا ایک ہی سال میں ہو تو اسے ملایا جائے گا۔ سال سے اسلامی ۱۲ ماہ مراد ہیں۔ اگر محرم میں کھیتی لگائے اور رجب میں کاٹے پھر دوسرے سال صفر میں لگا کر جمادی الآخر میں کاٹے تو دونوں کھیتی کے درمیان ایک سال سے زائد عرصہ ہے۔ لیکن کاٹنا ایک ہی سال میں ہوا ہے اس لئے اسے ملایا جائے گا۔ اگر ایک ہی درخت پر سال میں دو مرتبہ کھجور آئیں تو اسے ملایا نہ جائے گا بلکہ اس کا حکم دو سال کے پھولوں کی طرح ہے۔

جن درختوں اور کھیتی کی سیرابی بارش، نہر اور نالی کے پانی سے ہو جائے یا پانی سے قریب ہونے کی وجہ سے اپنے جڑوں سے خود ہی پانی حاصل کرتے ہوں تو پیداوار میں عشر (دسواں حصہ) واجب ہے۔ نالی کھودنے میں اگر خرچ بھی ہو جائے تو عشر واجب ہے۔ کیونکہ یہ خرچ گاؤں کی اصلاح کے لئے ایک مرتبہ ہوگا پھر ہمیشہ بغیر خرچ کے پانی ملتا رہے گا۔

اگر نہر وغیرہ سے جانوروں پر پانی لاکر سیراب کرنا پڑے، یا رہٹ (چرخی) کے ذریعہ (یا مشین سے) سیراب کرنا پڑے تو نصف عشر (بیسواں حصہ) واجب ہے، کیونکہ اس میں خرچ بڑھ جاتا ہے، بخلاف پہلی صورت کے۔

حدیث: ''بارش اور چشموں سے سیرابی ہو، یا جڑوں کے ذریعہ قریبی گڑھے کے پانی سے سیرابی حاصل ہو تو عشر واجب ہے اور اونٹ پر پانی لاکر سینچا گیا ہو تو نصف عشر واجب ہے''۔ (بخاری ابن حبان، ابوداود، نسائی)

اگر دونوں ہی قسم کے پانی سے سیرابی ہو تو مدت کے اعتبار سے تقسیط ہوگی۔ مثلاً کھیتی کی ابتداء سے پختگی تک ۸/ماہ درکار ہوں جس میں ۴ ماہ بارش سے اور بقیہ چار ماہ اونٹ وغیرہ پر پانی لاکر سینچا گیا ہو تو مدت کا اعتبار کرتے ہوئے عشر کا پونا حصہ یعنی (۴۰/۳) حصہ واجب ہوگا۔ یا ابتدائی ۶/ماہ میں دو مرتبہ بارش سے سیرابی ہوئی اور بقیہ دو ماہ میں تین مرتبہ اونٹ کے ذریعہ تو عشر کا پونا حصہ اور عشر کا آٹھواں حصہ یعنی (۸/۷) واجب ہوگا۔ اگر مدت کا صحیح علم نہ ہو تو دونوں مدت کو برابر شمار کریں گے۔ اور پہلی مثال کی طرح ۴۰/۳ حصہ واجب ہوگا۔ مالک اور ساعی کا سیرابی کے متعلق اختلاف ہو کہ کس پانی سے ہوا ہے تو مالک کی بات کو تسلیم کریں گے۔ کیونکہ اصل زائد مقدار کا واجب نہ ہونا ہے۔ اگر ساعی مالک کو متہم سمجھے تو اسے قسم دلانا مستحب ہے۔

کسی شخص کی بعض کھیتی بارش سے اور بعض اونٹ وغیرہ کے ذریعہ (یعنی ذاتی خرچ سے) سینچی گئی ہو اور دونوں بھی تنہا بقدر نصاب نہ ہو لیکن مجموعی طور پر بقدر نصاب ہو تو زکات واجب ہے۔ اوّل میں عشر اور دوسرے میں نصف عشر نکالے۔

پھل میں زکات بُدُوْ صَلَاح (اس کی پختگی اور رنگ بدلنے) کے بعد اور اناج میں دانے سخت ہونے کے بعد واجب ہوگی۔ بعض اناج اور پھل کا اس طرح ہونا کافی ہے۔ وجوب زکوۃ کا یہ مطلب نہیں کہ فی الحال نکالنا واجب ہے، بلکہ زکات کے وجوب کا سبب پایا جاچکا، لہٰذا اب مالک کو اس میں سے کھانا، صدقہ، ہدیہ وغیرہ تصرفات حرام ہیں۔ پھل کے توڑنے وخشک کرنے کا خرچ اور اناج کے کاٹنے اور صفائی وغیرہ کا خرچ مالک کو اپنی طرف سے برداشت کرنا ہے۔ زکات کے مال میں اس کا شمار نہیں ہوگا۔ (لہٰذا مکمل پیداوار میں سے زکوۃ نکالے، خرچ کو اس میں سے نفی نہیں کرسکتا)۔

پھل اور اناج میں ایک ہی مرتبہ زکات واجب ہے، بعد میں (سالہا سال اپنی ملکیت میں ہی باقی ہو، تب بھی) اس میں کچھ واجب نہیں، اناج و پھل توڑتے وقت اس میں سے کچھ فقراء کو خیرات کرنا مستحب ہے۔ (قلائد الخرائد ۱/۲۱۴)

سونے چاندی کی زکات

" وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورہ توبہ، آیت: ۳۴) **ترجمہ**: اور جو لوگ گاڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں۔ سو ان کو خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی۔" آیت میں کنز سے وہ مال مراد ہے جس کی زکات نہ ادا کی گئی ہو۔ زکات ادا کردی جائے تو وہ شرعاً کنز نہیں ہے، چاہے مدفون ہو یا نہ ہو۔ (الحاوی ۳/۷۲)

۲۰ مثقال سونے اور ۲۰۰ درہم چاندی پر سال گذر جائے تو چالیسواں حصہ (۱/۴۰) زکات واجب ہے۔

احادیث: (۱) "پانچ اوقیہ (۲۰۰ درہم) سے کم چاندی میں زکات واجب نہیں ہے۔" (متفق علیہ) (۲) "پانچ اونٹ سے کم میں کچھ واجب نہیں، اور ۲۰ مثقال (سونے) سے کم میں کچھ واجب نہیں، اور ۲۰۰ درہم (چاندی) سے کم میں کچھ واجب نہیں۔" (دارقطنی، واسنادہ ضعیف)

(۳) "(سونے میں) تم پر کچھ واجب نہیں یہاں تک کہ ۲۰ دینار ہوجائے" تمہارے پاس ۲۰ دینار ہو اور اس پر سال گذر جائے تو اس میں نصف دینار واجب ہے۔ زائد ہو تو اس میں بھی اسی حساب سے نکالے۔" (ابوداود، ترمذی) (تلخیص الحبیر ۲/۱۸۴)

بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت میں ہے " چاندی میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔" چونکہ سونا اور چاندی منجانب اللہ سائمہ جانوروں کی طرح اضافہ کے لئے مہیا کئے گئے ہیں، اس لئے اس میں زکات کو واجب کیا گیا ہے۔ سونے چاندی اور زمینی پیداوار میں جانوروں کی طرح وَقص (دو نصاب کے درمیانی تعداد پر زکات کی معافی) نہیں ہے، کیونکہ ان اشیاء میں بلاضرر تقسیم ممکن ہے، بخلاف جانوروں کے۔ مذکورہ نصاب سے کم ہو تو زکات واجب نہ ہوگی۔ اگر ملاوٹ ہو تو ملاوٹ کے بغیر خالص سونے یا چاندی کی مقدار نصاب کے برابر ہو تو زکات واجب ہوگی۔ سونے، چاندی کے علاوہ ہیرے جواہرات وغیرہ میں زکات واجب نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں اس پر زکات کا تذکرہ نہیں ہے، اور یہ اشیاء کام کاج اور استعمال کے جانوروں کی طرح استعمال کے لئے مہیا ہیں۔ اسی طرح سال مکمل ہونے سے قبل زکات واجب نہ ہوگی۔

دور حاضر میں نصاب

(۱) فقہ شافعی میں دورِ حاضر کی ایک مشہور اور معتبر کتاب " **الفقہ المنہجی** " میں سونے کا نصاب ۹۶ گرام اور چاندی کا

نصاب ۶۷۲ گرام قرار دیا ہے۔ (الفقه المنهجي ۲/۳۱)

(۲) دکتور وہبہ زحیلی نے سونے کا نصاب ۹۶ گرام (یا درہم عربی کا اعتبار کرتے ہوئے ۸۵ گرام) اور چاندی کا نصاب تقریباً ۶۴۲ گرام قرار دیا ہے۔ (الفقه الاسلامی ۲/۷۵۹)

(۳) فقہ الزکوٰۃ میں علامہ یوسف القرضاوی کی تحقیق کے مطابق ایک درہم ۲۶۹۷۵ گرام اور ایک دینار ۴۶۲۵ گرام کے مساوی ہے، لہٰذا سونے کا نصاب ۸۵ گرام اور چاندی کا نصاب ۵۹۵ گرام ہوگا۔ (فقه الزکوٰة القرضاوی ۱/۲۶۰)، (احتیاطاً کم مقدار کو اختیار کرنا بہتر ہے)

اگر کوئی برتن سونے چاندی سے مخلوط بنا ہوا ور اکثر مقدار کس کی ہے معلوم نہ ہو تو احتیاط پر عمل کرنے کی صورت میں (جبکہ یہ برتن کسی مجبور یعنی بچے پاگل وغیرہ کا نہ ہو) دونوں کو اکثر فرض کر کے زکات نکالے واجب سے زائد مقدار سنت شمار ہوگی۔ لہٰذا برتن کا وزن ۱۰۰۰ ہو جس میں ایک ۶۰۰ اور دوسرا ۴۰۰ ہے تو ۶۰۰ سونے اور ۶۰۰ چاندی کی زکات نکالے۔ مکمل سونا فرض کر کے زکات نکالنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ایک جنس کی زکات دوسرے جنس سے ادا نہ ہوگی، گرچہ وہ اعلیٰ ہو۔ دوسرا طریقہ زکات کا یہ ہے کہ آگ پر تپا کر دونوں کو الگ کر کے ہر ایک کی زکات نکالے یا پانی کے ذریعہ اکثر و اقل کی تعیین کرے۔ وہ اس طرح کہ پانی میں ۱۰۰۰ سونا ڈالے اور پانی کی بلندی پر نشان لگائے۔ پھر ۱۰۰۰ چاندی ڈال کر نشان لگائے پھر مذکورہ مخلوط برتن کو ڈالے۔ اب پانی کی بلندی جس نشان سے قریب ہوگی وہی اس میں اکثر ہوگا۔

سونے چاندی کی حرام اشیاء جیسے برتن اور مکروہ جیسے زینت کی خاطر چاندی کا معمولی سا جوڑ اور پیوند یا حرام و مکروہ زیور میں زکات واجب ہے۔

زیورات میں زکات: مباح اور جائز زیورات میں زکات واجب نہیں۔ (جیسے عورتوں کے کنگن) جبکہ مالک کو اس کا علم ہو اور ذخیرہ اور خزانہ کی نیت نہ ہو۔ کیونکہ سونا چاندی میں زکات کا تعلق، ان سے جائز انتفاع سے بے نیازی سے ہے نہ کہ ان کے جوہر (اور اصل مادے) سے، کیونکہ ان کی ذات میں کوئی غرض نہیں ہے۔ لہٰذا انتفاع ہی نہ ہو یا مکروہ و حرام انتفاع ہو تو زکوٰۃ واجب ہے۔ اور جائز انتفاع کی صورت میں واجب نہیں ہے کیونکہ وہ کام کاج کے جانوروں کے مشابہ ہے۔

زیورات میں عدم زکات کے دلائل: (۱) حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "ہمارے علم میں کسی بھی خلیفہ نے زیورات کی زکات کا حکم نہیں دیا۔" (ابن ابی شیبه)

(۲) حضرت ابن عمرؓ اپنے بیٹیوں اور کنیزوں کو سونے کے زیورات پہناتے اور اس کی زکات نہ نکالتے۔ (مؤطا امام مالک)

(۳) حضرت عائشہؓ اپنے زیر پرورش یتیم بھتیجیوں کے زیورات کی زکوٰۃ نہ نکالتیں۔" (مالک، الشافعی)

(۴) ایک شخص نے حضرت جابرؓ سے زیورات کے متعلق پوچھا تو فرمایا "اس کی زکات عاریت دینا ہے۔" (الشافعی۔ البیهقی)

(۵) امام بیہقی نے حضرت جابرؓ سے اور امام دارقطنی و بیہقی نے حضرت انسؓ اور حضرت اسماءؓ سے زیورات میں عدم زکات کو نقل فرمایا ہے۔ (تلخیص الحبیر ۲/۱۸۹)

اگر زیور ٹوٹ جائے اور اس کی اصلاح کا ارادہ ہو اور بغیر پگھلائے ممکن ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کی صورت باقی رہنے اور

اصلاح کے ارادے کی وجہ سے، اگر اصلاح کا ارادہ نہ ہو بلکہ بغیر ڈھالے ایسے ہی سونے چاندی کے ٹکڑے (بسکٹ) کے طور پر رکھنے کا ارادہ ہو یا دراہم یا خزانہ کا ارادہ ہو، یا بلا کسی ارادے کے ایسے ہی چھوڑ دے یا اصلاح کے لئے دوبارہ پگھلا کر ڈھالنے کی ضرورت ہو، تو ان تمام صورتوں میں زکات واجب ہے، کیونکہ فی الحال نہ یہ مستعمل ہے اور نہ قابل استعمال، ٹوٹنے کے وقت سے سال شمار کریں گے۔

مالک کو زیورات کا علم نہ ہو مثلاً وراثت میں مباح (جائز) زیور ملے اور سال گزرنے تک اسے اس بات کا علم نہ ہوا تو اس میں زکات واجب ہے، کیونکہ اس نے مباح استعمال کے لئے رکھنے کی نیت نہیں کی، اس طرح اگر کوئی ذخیرہ اور خزانہ کی نیت سے زیورات رکھے تو اس میں زکات واجب ہے۔

مرد یا خنثیٰ کے پہننے کے لئے کنگن اور پازیب بنانا حرام ہے۔ اگر کوئی مرد یہ زیور کسی عورت یا بچے کے پہننے کے لئے یا ان کو عاریت پر یا کرایہ پر دینے کے لئے بنائے یا بلا قصد بنائے یا ذخیرہ کے لئے بنائے تو جائز ہے، لیکن آخری صورت میں زکات واجب ہے۔ سونے چاندی سے کسی ذی روح کی تصویر بنانا ہر کسی کے لئے حرام ہے، اور اس میں زکات واجب ہے۔ مرد اور خنثیٰ کے لئے سونے چاندی کے زیورات حرام ہیں۔ سونے چاندی کے ہاتھ اور انگلیاں عورتوں کو بھی حرام ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "سونا اور ریشم میری امت کے عورتوں کے لئے حلال اور مردوں پر حرام ہیں"۔ (صححہ الترمذی) احتیاطاً خنثیٰ کو بھی مرد کے حکم میں رکھیں گے۔

مردوں کو ناک، انگلی کا پورا اور دانت (ٹوٹنے اور کٹنے کی صورت میں) سونے کا استعمال کرنا جائز ہے، گرچہ چاندی سے ممکن ہو تب بھی، کیونکہ سونا غالباً زنگ آلود نہیں ہوتا اور جگہ کو نہیں بگاڑتا۔

حدیث: حضرت عرفجہ ابن اسعد کی ناک جاہلیت میں ایک جنگ (یوم الکلاب) میں کٹ گئی تو انہوں نے چاندی کی ناک بنالی، اس سے بدبو آنے لگی تو آپ ﷺ کے حکم سے سونے کی ناک بنوالی۔ (ترمذی و حسنہ، ابن حبان و صححہ)

ناک پر دانت اور پورے کو قیاس کیا گیا، چاہے ایک دانت ہو یا زائد اور ایک ہی انگلی کا پورا ہو یا تمام، یہ اعضا کام دیتے ہیں، اس لئے اجازت ملی، لیکن انگلی اور ہاتھ سے یہ مقصد حل نہ ہوگا، لہٰذا ناجائز قرار دیا۔

چاندی کی انگوٹھی: چاندی کی انگوٹھی مردوں کو سنت ہے۔ اس کی مقدار، تعداد، اور پہننے کی جگہ میں اس جیسے لوگوں کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا، لہٰذا ایک عالم صرف چھنگلی (چھوٹی انگلی) میں پہنے اور عامی آدمی ایک اور انگوٹھے میں بھی پہن سکتا ہے۔ عادت کے خلاف استعمال مکروہ یا حرام ہوگا، اور ان دونوں صورتوں میں زکوٰۃ لازم ہوگی۔ انگوٹھی پر سونے کا پانی چڑھانا حرام ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انگوٹھی کا وزن ایک مثقال (تقریباً سوا چار گرام) سے کم ہو۔ مختلف اوقات میں پہننے کی نیت سے کئی انگوٹھیاں بنا کے رکھنا جائز ہے، جبکہ اسراف میں شمار نہ ہو، اور اس میں زکات لازم نہیں ہے۔ لیکن عادت سے زائد پہننے کی نیت ہو تو زکات واجب ہے۔ امام رملیؒ نے فرمایا کہ ایک وقت میں دو یا زائد پہننے کی نیت سے بنائے تو زکات واجب ہے۔

انگشتری دائیں ہاتھ کی چھنگلی اور بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں مستحب ہے، لیکن دائیں میں افضل ہے، کیونکہ یہ زینت ہے، اور دایاں اشرف ہے، مرد کو کسی اور انگلی میں انگشتری پہننا مکروہ ہے۔ (تحفۃ المحتاج ۳۲۸/۴) بہ یک وقت دونوں میں پہننا بھی جائز ہے۔ بعضوں نے ایک سے زائد انگوٹھی پہننا حرام قرار دیا ہے۔ (تحفۃ المحتاج) انگشتری نگینہ کے ساتھ، اور بلا نگینہ دونوں طرح پہن سکتے ہیں، نگینہ ہو تو اسے ہتھیلی کے باطن (پیٹ) کی طرف رکھنا افضل ہے۔ انگشتری پر ذکر اللہ یا کچھ اور نقش کرنا بلا کراہت جائز ہے، اپنا نام نقش

کرے تو اسے مُہر کے لئے بھی استعمال کرسکتا ہے۔ ذکر اللہ کے نقش کی صورت میں اس پرنجاست کے لگنے سے پرہیز واجب ہے۔ اگر بائیں میں پہنے اور استنجاء کے وقت اس پر پانی لگے تو یہ حرام ہے۔

حدیث : آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی استعمال فرمائی۔ (متفق علیه)

آپ ﷺ کے انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ ﷺ تھا پہلی سطر محمد دوسری سطر رسول تیسری سطر اللہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نقش "نِعْمَ الْقَادِرُ اللہ" حضرت عمرؓ کا نقش "کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظاً یَا عُمَر" حضرت عثمانؓ کا نقش "اٰمَنْتُ بِاللہِ مُخْلِصاً" حضرت علیؓ کا نقش "اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ" اور حضرت ابوعبیدہؓ کا نقش "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" تھا۔

مرد کے لئے بغیر اسراف کے چاندی سے جنگی ہتھیار مثلاً تلوار، نیزہ، تیر کا کنارہ وغیرہ آراستہ کرنا حلال ہے، کیونکہ یہ کفار کو غصہ دلانے کا باعث ہے۔ اسراف (حد سے تجاوز، زیادتی) ہو تو حرام ہے۔ زین، لگام اور رکاب جیسی اشیاء جو پہننے میں استعمال نہ ہو، چاندی سے آراستہ کرنا برتن کی طرح ناجائز ہے۔ سونے سے ہتھیار وغیرہ کو آراستہ کرنے میں چونکہ زیادہ تکبر ہے، اس لئے یہ ناجائز ہے۔ عورتوں کو ہتھیار آراستہ کرنا ممنوع ہے، کیونکہ اس میں مردوں سے تشبہ (مشابہت اختیار کرنا) ہے، جو کہ حرام ہے، جیسا کہ مردوں کو عورتوں سے تشبہ حرام ہے، کیونکہ اس پر لعنت وارد ہوئی، اگرچہ بوقت ضرورت عورتوں کو بھی فی الجملہ ہتھیار سے لڑنے کی اجازت ہے۔ عورت کو لڑنے کا اتفاق ہو اور مذکورہ آراستہ ہتھیار کے علاوہ میسر نہ ہو تو اس کا استعمال حلال ہے۔

حدیث : "آپ ﷺ کے تلوار کے قبضہ پر چاندی کی گرہ تھی۔" (نسائی، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ) (تلخیص ۱/۶۴)

عورتوں کے زیور : عورتوں کو سونے چاندی کے مختلف زیورات پہننا جائز ہے جیسے ہار، انگشتری، کنگن، چپل، پازیب اور سونے چاندی سے بنے ہوئے کپڑے، لیکن ان اشیاء میں اسراف (حد سے تجاوز) حرام ہے جس زیور میں اسراف ہو اس کی پوری زکات واجب ہے، نہ کہ صرف زائد مقدار کی۔ مثلاً دونوں پازیب کا مجموعی وزن ۲۰۰ مثقال ہو تو عورت کو یہ پہننا حلال نہیں ہے کیونکہ عورتوں کو زیور کے جواز کا اصل مقصد شوہر کے لئے مزین ہونا ہے، جو کہ شہوت کے لئے محرک اور نتیجۃً کثرت نسل کا باعث ہے اور اسراف کی صورت میں کوئی زینت نہیں ہے، بلکہ اس کی بدصورتی سے نفس کو نفرت ہوگی۔ مذکورہ احکام میں نابالغ بچہ اور پاگل بھی عورت کی طرح ہے۔ (جو زیورات عورت کو جائز ہیں ان کو بھی جائز ہیں)

قرآن کو آراستہ کرنا : ہر کسی کو قرآن پاک چاندی سے آراستہ کرنا بطور اکرام جائز ہے اور عورت کو سونے سے آراستہ کرنا بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں مطلقاً سونا عورتوں کو حلال بتلایا۔ قرآن کے علاوہ حدیث اور دیگر دینی علوم کی کتابوں کو سونے چاندی سے آراستہ کرنا جائز نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی قبر اطہر یا دیگر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء کرام وغیرہ کے قبروں کو بھی سونے چاندی سے آراستہ کرنا جائز نہیں ہے۔

امام غزالیؒ نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا: "جس نے سونے سے قرآن لکھا بڑا اچھا کام کیا اور اس پر زکات واجب نہیں ہے۔ (یعنی اس سونے میں) چاہے مرد لکھے یا عورت، اسی طرح مرد یہ قرآن استعمال کرسکتا ہے۔" "**المجموع**" میں امام نوویؒ نے کئی فقہاء کرام سے نقل کیا کہ جن صورتوں میں سونے کو حرام قرار دیا گیا وہ اس وقت ہے جب کہ وہ زنگ آلود نہ ہو جائے، اگر زنگ آلود ہو جائے تو حرام نہیں ہے۔

معدن اور دفینہ (کان اور خزانہ) کی زکوٰۃ

کوئی اپنی ذاتی زمین یا موات (عام زمین جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو) میں معدن سے سونا یا چاندی بقدر نصاب نکالے تو فوراً اس میں چالیسواں حصہ (۲٫۵ فیصد) زکوٰۃ نکالنا لازم ہے۔ روایت گزر چکی ہے کہ چاندی میں چالیسواں حصہ واجب ہے اور امام حاکم کی صحیح میں روایت ہے کہ ''آپ ﷺ نے معادن قبلیہ (ایک جگہ کا نام) سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کی۔ سال گزرنے کا اعتبار اس لئے کیا جاتا ہے کہ آدمی اس مدت میں اپنا مال بڑھا سکے۔ اور معدن سے حاصل ہونے والی چیز تو مکمل اضافہ ہے، اس لئے یہاں سال گزرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ دیگر اموال زکوٰۃ کی طرح بقدر نصاب ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے کم مقدار ہمدردی اور غمگساری کی متحمل نہیں ہے۔

معدن سے حاصل ہونے والی بعض مقدار کو بعض کے ساتھ ملائیں گے۔ (تکمیلِ نصاب کے لئے جبکہ معدن ایک ہی ہو اور نکالنے کا عمل مسلسل ہو یا کسی عذر سے تسلسل ٹوٹے مثلاً مرض، سفر، اوزار کی اصلاح وغیرہ، اگرچہ عرفاً فاصلہ زیادہ ہو جائے، یا پہلے حاصل شدہ اپنی ملکیت سے نکل چکی ہو، لیکن معدن الگ الگ ہو، یا بلا عذر عمل منقطع ہو، تو تکمیلِ نصاب کے لئے اول دوسرے کے ساتھ نہیں ملائیں گے، چاہے درمیانی فاصلہ کم ہی ہو لیکن دوسرے کو پہلے کے ساتھ ملانے سے بقدر نصاب ہو تو اس دوسرے میں فی الحال زکوٰۃ واجب ہے اور اوّل میں اس پر سال گذرنے کے بعد واجب ہوگی۔

معدن سے نصاب سے کم سونا یا چاندی ملے، لیکن پہلے سے اس کی ملکیت میں موجود سونے چاندی کے ساتھ اسے ملانے سے بقدر نصاب ہو جاتا ہے تو معدن کا بھی اور پہلے سے موجود کا سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کرے۔

مثال: پہلی مرتبہ کان سے ۱۹ مثقال سونا حاصل ہوا اور دوسری مرتبہ ایک مثقال تو ۱۹ مثقال میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، ایک مثقال میں واجب ہوگی۔ اسی طرح ۱۹ مثقال پہلے سے اس کے پاس موجود تھا۔ پھر ایک مثقال کان سے ملا تو ایک مثقال پر زکوٰۃ نکالے۔ دونوں صورتوں میں ایک مثقال ملنے پر دونوں کا سال شروع ہو جائے گا۔

سونے چاندی کے علاوہ لوہا، تانبہ، یاقوت، یا سرمہ وغیرہ معدن سے نکلے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ معدن کی زکوٰۃ اس کی صفائی اور خالص کرنے کے بعد نکالنا واجب ہے، اور یہ تمام مصارف مالک کے ذمہ ہیں۔ (سونے چاندی سے اس خرچ کو نفی نہیں کرے گا)

رِکاز (دفینہ):- دفینہ ملتے ہی اس میں خمس (پانچواں حصہ ۵/۱) نکالنا واجب ہے۔ جبکہ سونا یا چاندی ہو اور بقدر نصاب یا زائد ہو۔ نصاب سے کم ہو لیکن پہلے سے ملکیت میں موجود سونے چاندی کے ساتھ ملا کر نصاب ہو جاتا ہو، تب بھی اس میں خمس نکالے۔ معدن کے برعکس اس میں یا تو کچھ خرچ ہی نہیں ہوتا، یا بہت کم خرچ ہوتا ہے۔ لہٰذا پانچواں حصہ واجب قرار دیا۔ دفینہ کا خمس اور کان کی زکوٰۃ مستحقین زکوٰۃ پر زکوٰۃ کی طرح تقسیم کی جائے گی کیونکہ یہ زمین سے حاصل شدہ فائدہ پر واجب حق ہے، لہٰذا پھل اور کاشت کے مشابہ ہوا۔

رکاز سے وہ دفینہ مراد ہے جو جاہلی ہو، یعنی آپ ﷺ کی بعثت سے قبل مدفون ہو، اس پر کسی علامت کی وجہ سے یہ اندازہ ہو تو کافی ہے۔ اس طرح کا دفینہ کسی اہل زکوٰۃ (جس میں شرعاً زکوٰۃ کی فرضیت کے شرائط موجود ہوں) کو موات میں یا موات کو احیاء (آباد) کرکے مالک بننے کے بعد اس میں، یا کسی قلعہ میں یا جاہلیت کی قبروں یا کھنڈرات میں ملے تو اس کی زکوٰۃ (خمس ۲۰٪) ادا کرے۔

کسی مسجد میں یا سڑک پر ملے یا اسلامی دفینہ ہو (مثلاً اس پر قرآن کی آیت یا کسی مسلمان بادشاہ کا نام کندہ ہو) اور اصل مالک کا علم

ہوتو اسے لوٹانا واجب ہے، اور مالک کا علم نہ ہوتو پھر لقطہ ہے، لہٰذا ایک سال تک اس کا اعلان کرنے کے بعد بھی مالک نہ ملے تو خود اس کا مالک بن سکتا ہے۔ اگر دفینہ پر کوئی خاص علامت نہ ہو، جس سے جاہلی یا اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکے تو وہ بھی لُقطہ ہے۔ اگر دفینہ کسی اور کی زمین میں ملے اور وہ شخص اس کا دعویٰ کرے تو بلا قسم کے اس کے حوالے کریں گے اگر وہ اپنا ہونے کا دعویٰ نہ کرے تو اس سے قبل اس زمین کے مالک کی ورنہ اس سے قبل مالک کی اسی طرح آخر میں اس زمین کو احیاء کرنے والے کی ملکیت ہوگی، چاہے وہ دعویٰ نہ کرے کیونکہ وہ احیاء کی وجہ سے زمین کے اندرونی اشیاء کا مالک بن چکا اور فروخت کی وجہ سے یہ ملکیت زائل نہ ہوگی کیونکہ مدفون منقول شئی ہے۔ اصل مالک اور مستحق اوپر کی صورتوں میں انتقال کر چکا ہو تو اس کے ورثاء اس کے قائم مقام ہوں گے۔ اگر بعض وارث مورث کی ملکیت کا اقرار کریں اور بعض انکار تو اقرار کرنے والوں کا حصہ ان کے حوالے کیا جائے اور بقیہ کے متعلق اوپر کی ترتیب ملحوظ رکھے۔ اگر مالک کے تحقیق سے مایوسی ہو جائے تو امام وقت یا جس کے ہاتھ میں ہے وہ صدقہ کردے۔

کسی دوسرے کی ملکیت میں ملے ہوئے دفینہ کے دو دعویدار ہوں تو مالک جس کی تصدیق کرے اس کے حوالے کریں گے۔

کسی زمین کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا یا کرایہ پر دینے والا اور لینے والا، یا عاریتاً دینے والا اور لینے والا دونوں دعویٰ کریں کہ دفینہ میرا ہے، میں نے دفن کیا تھا، تو جس کے قبضہ میں ہے (یعنی خریدنے والا، کرایہ پر یا عاریتاً لینے والا) اسے قسم دلا کر اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، جبکہ کسی درجہ میں اس کی سچائی ممکن بھی ہو۔ اگر ممکن نہ ہو مثلاً اتنی کم مدت میں وہ دفن نہیں کر سکتا تو اس کی تصدیق نہ کرے۔ مذکورہ فروخت کرنے والے یا کرایہ یا عاریت پر دینے والے کے پاس زمین واپس لوٹنے کے بعد یہ اختلاف ہو اور یہ تینوں یوں کہیں کہ واپس لوٹنے کے بعد میں نے دفن کیا اور یہ ممکن بھی ہو تو قسم کے ساتھ ان کی تصدیق کریں گے، اگر یہ کہیں کہ میرے ہاتھ سے زمین نکلنے سے پہلے دفن کیا تھا تو بالمقابل لوگوں کی تصدیق کریں گے۔

تجارت کی زکوٰۃ [ماخوذ از الفقه المنهجي)

آیت: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ '' (البقرہ ، ۲۶۷)

ترجمہ ''اے ایمان والو خرچ کرو صاف ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے'' امام مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تجارت کے متعلق نازل ہوئی۔

حدیث : آپ ﷺ نے فرمایا: ''اونٹوں میں ان کی زکوٰۃ واجب ہے، گائے بیل میں ان کی زکوٰۃ واجب ہے، بکریوں میں زکوٰۃ واجب ہے، کپڑوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔'' (رواه حاكم باسناد صحيح على شرط الشيخين)

مراد برائے فروخت کپڑے ہیں، اس پر دیگر تجارتی اشیاء کو بھی قیاس کریں گے۔

حضرت سمرہ بن جندبؓ نے فرمایا: '' آپ ﷺ ہم لوگوں کو برائے فروخت اشیاء کا صدقہ (زکوٰۃ) نکالنے کا حکم دیتے تھے۔'' (ابوداود)

اسباب تجارت میں زکوٰۃ کے شرائط : (۱) عقدِ معاوضہ کے ذریعہ ان اسباب واشیاء کا مالک بنا ہو، جیسے خریدنا، کرایہ اور مہر وغیرہ۔ اگر وراثت، وصیت یا ہبہ کے ذریعہ مالک بنا ہو تو یہ اسباب تجارت میں شمار نہ ہوگا۔ (۲) تملک (مالک بننے) کے وقت اس میں تجارت کی نیت ہو اور یہ نیت مستمر (جاری) ہو۔ اگر تملک کے وقت تجارت کی نیت نہ ہو، تو یہ مالِ تجارت شمار نہ ہوگا۔ حتی کہ بعد میں نیت کرنے سے بھی شمار نہ ہوگا۔ اسی طرح تجارت کی نیت سے خریدنے کے بعد تجات کا ارادہ بدل جائے اور اپنی

ہی ملکیت میں رکھنے کی نیت ہو تو مالِ تجارت سے نکل جائے گا۔ اور اس سے زکوٰۃ کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ (مؤدت کے مالِ تجارت میں جب تک وارث تجارت کی نیت سے تصرف نہ کرے، اس پر تجارت کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، تصرف کے وقت سے تجارتی سال کی ابتداء ہوگی، اسی طرح کوئی بطور قرض کوئی چیز تجارت کی نیت سے لے، تو اس میں (فی الحال) زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ قلائد ۱/۲۲۰)

مالِ تجارت کا سال و نصاب اور اس میں واجب مقدار

مالِ تجارت سے وہ اشیاء مراد ہیں، جن کا معاوضہ کے مقابلہ میں نفع کی غرض سے تبادلہ اور لین دین ہوتا ہے۔ یہ اشیاء جس طرح کی بھی ہوں، مالِ تجارت میں اس کا شمار ہوگا لہٰذا ہر تجارتی مال چاہے اس میں براہِ راست زکوٰۃ واجب ہو (جیسے سونا، چاندی، پھل اور مویشی) یا نہ ہو (جیسے کپڑا، مختلف مصنوعات، زمین، جائیداد اور شیرز وغیرہ میں) اپنے شرائط کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے۔ (عورت جائز زیورات تجارت کی نیت سے خریدے، تو یہ مالِ تجارت شمار ہوگا۔ قلائد ۱/۲۱۸)

نصاب، سال کا گذرنا اور واجب مقدار ان تینوں مسائل میں مالِ تجارت سونے چاندی کی طرح ہے۔ مالِ تجارت کی رائج الوقت سکوں میں قیمت لگائی جائے گی، لہٰذا یہ قیمت ۲۰ مثقال سونا (۹۶ گرام) یا ۲۰۰ درہم چاندی کی قیمت کے مساوی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر مالِ تجارت سونے یا چاندی سے خریدا گیا ہو تو جس سے خریدا ہے اسی کے قیمت کا اعتبار ہوگا۔

تجارت شروع کرنے کے بعد اسلامی ایک سال مکمل ہونے پر مذکورہ نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔ ابتداء میں یا درمیان میں نصاب کی ضرورت نہیں ہے۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ تجارت کی نیت سے مالِ تجارت کا مالک بننے سے مکمل ایک قمری سال گذرنا چاہے۔ لیکن مالِ تجارت سونے یا چاندی کے نصاب یا اس سے زائد سے حاصل کیا تھا تو جس نصاب سے سامانِ تجارت کو خریدا ہے اس نصاب کی ملکیت سے ہی سال شروع ہوگا۔

سابقہ تفصیل کی روشنی میں اختتامِ سال پر تاجر اپنے سارے تجارتی مال کی ایک مکمل فہرست بنا کر اس کی کل قیمت (حالیہ قیمت کے اعتبار سے نہ کہ وقت خرید کی قیمت) کا اندازہ لگائے۔ اور یہ قیمت سونے یا چاندی میں سے کسی ایک کے بھی نصاب کے قیمت کے برابر ہو تو قیمت کا چالیسواں حصہ (۱/۴۰ یعنی ۲٫۵ فیصد) زکوٰۃ نکالے۔ اور سونے چاندی کے نصاب سے قیمت کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جو اشیاء برائے فروخت ہوں، صرف ان کی قیمت لگائے۔ دوکان، فرنیچر اور دوسرے وہ اسباب جو محض استعمال اور تجارت میں استعانت اور مدد کے لئے ہوں، برائے فروخت نہ ہوں، ان کی قیمت شمار کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان اشیاء میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ چاہے کتنی ہی قیمتی ہوں۔

قیمت شمار کرنے میں راس المال (اصل پونجی) اور حاصل شدہ نفع دونوں کو شمار کر کے مجموعہ پر زکوٰۃ ادا کرے۔ مثلاً ۲۵ ہزار کی رقم سے تجارت شروع ہوئی اور سال کے آخر میں کل قیمت ۵۰ ہزار ہو تو پورے ۵۰ ہزار کی زکوٰۃ نکالے۔

تجارت کی زکوٰۃ میں کل قیمت کا چالیسواں حصہ دیا جائے جیسا کہ گزرا۔ اشیاء تجارت خود زکوٰۃ میں دینا کافی نہیں ہے، کیونکہ یہ اصل میں ایسی اشیاء نہیں ہیں، جن میں زکوٰۃ واجب ہو، محض تجارت کی نیت کی وجہ سے زکوٰۃ کا حکم صادر ہوا، اور قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوئی، اس لئے قیمت میں سے ہی زکوٰۃ نکالے۔ (الفقہ المنہجی ۲/۴۵)

بعض حالیہ مسائل

(ماخوذ از الفقہ الاسلامی دکتور وھبہ الزحیلی)

دورِ حاضر میں سونے چاندی کے سکوں کا رواج بالکل ختم ہو چکا ہے اور سارے عالم میں لین دین اور تجارت وغیرہ کا مکمل انحصار اور دارومدار نوٹوں پر ہے، لہٰذا علماء کرام کا فیصلہ ہے کہ کسی کے پاس سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر رقم (بشکل نوٹ و کرنسی) موجود ہو، اور اس پر سال گذر جائے تو اس میں چالیسواں حصہ (۲٫۵ فیصد) زکوٰۃ واجب ہے۔ (الفقہ الاسلامی ۔ ۷۷۲/۲)

شیئرز پر ہر سال کے اختتام پر اس کی حالیہ قیمت اور نفع دونوں کے مجموعہ پر ٪۲٫۵ زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ حکم تجارتی شیئرز ہے۔ اگر کسی کارخانہ اور فیکٹری میں چند حضرات شریک ہوں تو عمارت اور فیکٹری میں استعمال ہونے والے آلات اور مشینریوں کو چھوڑ کر شرکت کی جو قیمت ہوگی اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

وہ عمارتیں جن سے کرایہ کے طور پر آمدنی حاصل ہوتی ہو، فیکٹری، جہاز، ہوائی جہاز اور موٹر گاڑیاں جو برائے کرایہ ہوں اور جانوروں کا فارم یا پولٹری فارم جیسے آمدنی کے وسائل میں براہِ راست زکوٰۃ واجب نہیں ہے، بلکہ ان سے ہونے والی آمدنی میں زکوٰۃ واجب ہے، بشرطیکہ وہ بقدر نصاب ہو (یعنی سونے یا چاندی کے نصاب کی حالیہ قیمت کے برابر ہو) اور اس پر مکمل ایک اسلامی سال گذر جائے، اس صورت میں اس میں ٪۲٫۵ (۱/۴۰) زکوٰۃ واجب ہے۔

جو اپنے پیشہ کی بنیاد پر آزادانہ کماتے ہیں جیسے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، درزی اور بڑھئی وغیرہ یا کہیں تنخواہ پر اس طرح گذر بسر کرتے ہیں، ان کی آمدنی بھی جب سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت تو پہنچ جائے اور اس پر سال گذر جائے تو اس میں ٪۲٫۵ (چالیسواں حصہ) زکوٰۃ واجب ہے۔ (الفقہ الاسلامی ۸۶۶/۲) (یعنی مکمل آمدنی پر نہیں، بلکہ اپنے اخراجات وغیرہ کے بعد بچی ہوئی رقم بقدر نصاب یا زائد ہو، اور اس پر سال گذر جائے، تب اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ نصاب یا سال کی تکمیل سے قبل جو بھی رقم خرچ ہو، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح نصاب کے بقدر ہونے کے بعد سال کی تکمیل سے قبل نصاب گھٹ جائے تو بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔)

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کے چند مسائل

۱) سرکاری نیم سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں ملازمین کی ہر ماہ تنخواہ میں سے کچھ رقم کاٹ لی جاتی ہے اور اس پر ادارہ ہر ماہ کچھ رقم کا اضافہ کرتا ہے پھر مجموعہ پر کچھ رقم سالانہ بنام سود جمع کرتا ہے، شرعاً تنخواہ میں سے جو رقم کاٹی جاتی ہے اس کی اصل تنخواہ ہے اور زکوٰۃ اتنے ہی روپیہ پر فرض ہوسکتی ہے اور باقی دونوں رقم ادارہ کی طرف سے بطور امداد کے ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اگر اپنے اختیار سے فنڈ میں رقم کٹوائی جائے تو جو رقم ادارہ بنام سود جمع کرے گا تو وہ سود ہی ہوگا۔

۲) مذکورہ بالا مسئلہ اس وقت ہے جب کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ملازم نے اپنی طرف سے کسی شخص یا کمپنی کی تحویل میں نہ دلوائی ہو بلکہ ادارہ نے اپنے تصرف میں رکھی ہو یا ادارے نے کسی شخص یا کمپنی کو دی ہو تو اپنے طور سے اپنی ذمہ داری پر دی ہو اگر ملازم نے اپنی ذمہ داری پر یہ رقم کسی شخص یا بینک یا بیمہ کمپنی یا کسی اور مستقل کمیٹی مثلاً ملازمین کے نمائندوں پر مشتمل بورڈ وغیرہ کی تحویل میں دلوا دی ہو تو یہ ایسا ہے جیسے خود وصول کر کے اس کی تحویل میں دے دی ہو لہٰذا پوری رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اب اگر بینک یا کمپنی وغیرہ اس رقم پر کچھ سود دیں تو یہ شرعاً

بھی سود ہوگا جس کا لینا ملازم کے لئے قطعاً حرام ہے، فنڈ خواہ جبری ہو یا اختیاری۔

۳) پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم تنخواہ سے لازمی طور پر کٹتی ہے وہ ادارہ کے ذمہ قرض کے حکم میں ہے اور قرض واپس ملنے کی امید ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لہٰذا اپنی تنخواہ سے جمع شدہ رقم اور اپنے پاس جمع شدہ رقم ملا کر نصاب تک پہنچ جائے اور سال پورا ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حکومت کی طرف سے اضافہ شدہ رقم پر جب تک قبضہ نہ ہو جائے اور قبضہ کے بعد سال نہ گذر جائے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

جو لوگ حکومتی ٹیکس کی بچت کے لئے لائف انشورنس کراتے ہیں اور جو رقم جمع کراتے ہیں اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس لئے کہ وہ امانت کے حکم میں ہے۔

پگڑی و ڈپازٹ رقم پر زکوٰۃ

مکان یا دوکان کرایہ پر دیتے وقت مالک ایک رقم ڈپازٹ کے نام سے لیتا ہے اور مکان کی واپسی کے وقت وہ رقم واپس کی جاتی ہے چونکہ وہ ایک امانت یا قرض کے حکم میں ہے لہٰذا رقم دینے والے پر اس کی زکوٰۃ ضروری ہے۔ لینے والا اگر اس کو بطور امانت رکھ دے یا خرچ کردے تو لینے والے پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

پیشگی کرایہ دینے والے پر زکوٰۃ نہیں ہے لینے والے پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ اس پر سال گزر جائے۔

کبھی فون بک کرتے وقت دس ہزار یا تیس ہزار روپیہ ڈپازٹ کے طور پر جمع کیا جاتا ہے وہ پیشگی کرایہ ہوتا ہے لہٰذا اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی پگڑی کی رقم حق استعمال کی قیمت ہوتی ہے لینے والا اس کا مالک ہو جاتا ہے لہٰذا اس کی زکوٰۃ نہیں ہے۔

سیونگ سرٹیفکٹ پر زکوٰۃ

آج کل بعض سرکاری کام کی انجام دہی کے لئے سیونگ سرٹیفکٹ لینا لازمی ہوتا ہے۔ سیونگ سرٹیفکٹ کی رقم بھی قرض کے حکم میں ہے لہٰذا اگر ہماری طرف سے جمع شدہ رقم بقدر نصاب ہو یا ہمارے پاس کی جمع شدہ رقم ملا کر بقدر نصاب ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اس سرٹیفکٹ پر ملنے والی سود کی پوری رقم کو بلانیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔ (ماخوذ از کتاب الزکوٰۃ، مولانا محمد ایوب ندوی شافعی)

متفرقات

سال کی تکمیل کے وقت تجارتی مال جس جگہ ہو وہاں کے سکوں میں قیمت اور نصاب کا اندازہ لگایا جائے، اگر مال تجارت ایسی شئی ہو کہ براہ راست اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہو جیسے سائمہ جانور اور پھل اور صرف ایک زکوٰۃ کا نصاب مکمل ہو مثلاً چالیس بکریاں ہوں اور سال گذرنے پر قیمت نصاب کے برابر نہ ہو یا ۳۹ بکریاں ہوں اور ان کی قیمت بقدر نصاب ہو تو جو نصاب مکمل ہے اس کی زکوٰۃ نکالے۔ (پہلی مثال میں بکریوں کی اور دوسری مثال میں تجارت کی) اور دونوں نصاب مکمل ہوں تو عین کی زکوٰۃ (اس چیز کی زکوٰۃ) نکالے نہ کہ تجارت کی، کیونکہ زکوٰۃ عین پر اتفاق ہے جو اس کی قوت کا باعث ہے۔ بہر حال دونوں زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراض (مضاربت) کے مال کی زکوٰۃ مالک کے ذمہ ہے، چاہے اس میں نفع کا ظہور ہو، کیونکہ فی الحال سارے مال پر مالک کی

ملکیت ہے۔ عامل صرف ظہور سے اپنے حصہ کا مالک نہ بنے گا، بلکہ تقسیم کے بعد بنے گا۔ اگر مالک اس کی زکوٰۃ اپنے دوسرے مال میں سے ادا کرے تو فبہا (یعنی عامل سے وہ رقم نہیں لے سکتا) اور اسی مال میں سے ادا کرے تو وہ نفع میں شمار ہوگا جیسا کہ دیگر اس مال سے متعلقہ اخراجات (جیسے دلال کی اجرت وغیرہ) کا حکم ہے۔ (لہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد اب جو نفع ہوگا اس میں عامل کو مقررہ تناسب سے حصہ ملے گا)

زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد نکالنے سے قبل مالِ تجارت فروخت کرنا صحیح ہے، کیونکہ اس زکوٰۃ کا تعلق قیمت سے ہے جو فروخت کی وجہ سے فوت نہ ہوگا۔ مالک کو اسباب تجارت کے استعمال میں حرج نہیں جیسے سواری کرنا، عمارت میں رہنا، تجارت وحیوان یا پھل وغیرہ میں سے کھانا اسی طرح ھبہ کرنا، صدقہ کرنا، عاریت پر دینا اور اجرت پر دینا جائز ہے او صدقہ یا کھانے وغیرہ کے ذریعہ جو چیز ختم ہو جائے اس میں تجارت باطل ہوگی اور اس پر اس کا بدلہ لازم نہیں ہے۔ خود استعمال کرنے میں اسے اجرت کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے سے حاصل شدہ اجرت کا مال تجارت میں شمار نہ ہوگا (یہ اور بات ہے کہ اجرت سکوں میں ہو تو اس کا حکم سونے چاندی کی طرح ہوگا) (حاشية الجمل مع فتح الوهاب)

باب - زکوٰۃ الفطر (صدقۂ فطر)

احادیث: (۱) ''آپ ﷺ نے رمضان میں زکوٰۃ الفطر کو لوگوں پر فرض فرمایا، ایک صاع کھجور، ایک صاع، جو ہر آزاد یا غلام، مذکر ومؤنث پر مسلمانوں میں سے''۔ (متفق عليه)

(۲) آپ ﷺ نے روزہ دار کی لغو اور فضولیات سے پاکی اور مساکین کو کھلانے کی خاطر زکوٰۃ الفطر کو فرض فرمایا۔ جو نمازِ عید سے قبل ادا کرے تو یہ مقبول زکوٰۃ ہے، اور جو نماز کے بعد ادا کرے تو یہ ایک عام صدقہ ہے۔'' (ابوداؤد، ابن ماجه ، دارقطنی، حاکم)

(۳) ''آپ ﷺ نے صدقۂ فطر کو فرض فرمایا اور لوگوں کے نماز کے لئے جانے سے قبل اسے ادا کرنے کا حکم فرمایا''۔ (متفق عليه) تلخيص الحبير ۲/۱۹۴)

صدقۂ فطر اس امت کی خصوصیت ہے اور مشہور یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کی طرح ہجرت کے دوسرے سال عید سے دو روز قبل فرض ہوا۔ امام وکیع فرماتے ہیں: ''جس طرح سجدہ سہو نماز کے نقصان اور کمی کی تلافی کرتا ہے صدقۂ فطر رمضان کے نقصان کی تلافی کرتا ہے۔'' ابن شاہین نے ترغیب میں اور ضیاء نے حضرت جریرؓ سے نقل فرمایا: ''ماہِ رمضان آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتا ہے، صدقۂ فطر کی ادائیگی کے بغیر بارگاہِ الٰہی میں اٹھایا نہیں جاتا'' مطلب یہ ہے کہ اس ماہ کا عظیم ترین ثواب ایک قادر شخص کو صدقۂ فطر کی ادائیگی کے بغیر حاصل نہیں ہوگا۔

صدقۂ فطر بالاجماع فرض (واجب) ہے۔ ماہِ رمضان کا آخری لحہ اور ماہِ شوال کا اوّل لحہ پانے سے صدقۂ فطر واجب ہوگا۔ صدقۂ فطر ایک مسلمان کو اپنی جانب سے اور شرعاً اپنے زیر کفالت مسلم (جن کا نان نفقہ اور اخراجات اس کے ذمہ واجب ہیں) افراد کی جانب سے نکالنا واجب ہے۔ فطرہ کے وجوب کے وقت جن کا نفقہ اس کے ذمہ ضروری ہے ان کی جانب سے نکالے، چاہے اس سے پہلے یا بعد میں نفقہ کا وجوب نہ پایا جائے۔ کافر پر اپنا فطرہ واجب نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ''من المسلمین'' (مسلمانوں میں سے ہونا) کی قید وارد ہے اور فطرہ پاکی کی خاطر ہے، اور ایک کافر اس کا اہل نہیں ہے

کسی پر اس کے باپ کی بیوی کا فطرہ واجب نہیں ہے۔ اگر چہ اعفاف کی وجہ سے نفقہ واجب ہے۔

رمضان کے آخری دن غروب کے بعد نکاح ہوتو اس بیوی کی جانب سے شوہر پر فطرہ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح غروب کے بعد کوئی اسلام قبول کرے یا بچہ پیدا ہوتو ان کا فطرہ واجب نہیں ہے۔ اگر شک واقع ہو کہ غروب سے قبل یہ امور ہوئے ہیں یا بعد میں تب بھی واجب نہیں۔

آخری دن غروب کے بعد کسی کے انتقال سے فطرہ ساقط نہ ہوگا۔ اگر شوہر غروب کے بعد بیوی کو طلاق دے، چاہے بائنہ طلاق ہی کیوں نہ ہو، اسے اس بیوی کا فطرہ ادا کرنا ہوگا۔ (بشری الکریم ۲/ ۵۲)

فطرہ کے اوقات: (۱) وقتِ وجوب۔ رمضان کے آخری دن کے غروب سے واجب ہوگا۔ (۲) وقتِ جواز۔ رمضان کا پورا مہینہ (۳) وقتِ فضیلت۔ نمازِ عید سے قبل (۴) وقتِ کراہت۔ نمازِ عید کے بعد (۵) وقتِ حرمت۔ عید کا دن گزر جانے کے بعد۔

عید کے دن نمازِ عید سے قبل ہی فطرہ ادا کرنا سنت ہے۔ کیونکہ حدیث میں اس کا حکم گزر چکا۔ اگر نماز خلافِ معمول تاخیر سے ادا ہوتو دن کے ابتدائی حصہ میں ہی ادا کر دینا سنت ہے، تا کہ مستحقین کو کشادگی حاصل ہو جائے۔ بغیر عذر کے عید کا دن گذرنے تک تاخیر کرنا حرام ہے، کیونکہ اصل مقصود عید کے مبارک دن مستحقین کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بے نیاز کرنا ہے۔ فی الحال مال پاس نہ ہونا، یا مستحقین کا ہی موجود نہ ہونا عذر میں شمار ہوگا۔ بلا عذر تاخیر کی وجہ سے گنہگار ہوگا، اور فوراً اس کی قضاء کرنا لازم ہے۔

بوقتِ وجوب تنگدست اور غریب آدمی پر فطرہ واجب نہیں ہے۔ چاہے بعد میں دولت آجائے۔ لیکن عید کا دن گذرنے سے قبل ادائیگی کی قدرت ہو جائے تو ادا کرنا سنت ہے۔

فطرہ کے مسئلہ میں غریب آدمی سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اپنے اور اپنے زیر کفالت افراد کے لئے عید کے دن اور اس کے بعد والی شب کے کھانے پینے کے اخراجات، مناسب کپڑے، مکان، خادم (بصورت ضرورت واحتیاج)، قرض (چاہے موخر ہو اور صاحبِ قرض تاخیر سے متفق ہو) سے زائد مال نہ ہو، جو فطرہ میں ادا کر سکے۔ جس کے پاس مذکورہ اخراجات سے زائد مال ہو، اس پر فطرہ واجب ہے۔ (فطرہ کے لئے زکوٰۃ کی طرح بقدر نصاب مال کی شرط نہیں ہے) اس کے مناسب کپڑے، مکان کہنے سے برعکس صورت نکل گئی۔ لہٰذا اگر کسی کا مکان اعلیٰ درجہ کا ہو جسے فروخت کر کے اپنے مناسب مکان حاصل کرنے کے بعد فطرہ کے لئے رقم بچ سکتی ہے تو یہ لازم ہے کہ اگر کسی کے ذمہ سابقہ (پہلے ہی) فطرہ واجب ہو چکا تھا تو اب ادائیگی کے لئے مکان فروخت کرے، نہ کہ لباس، کیونکہ اس صورت میں یہ قرض کے حکم میں ہے۔ خادم کے احتیاج کا مطلب اپنے یا زیر کفالت افراد کی خدمت کے لئے احتیاج ہے، نہ کہ کھیتی باڑی میں کام کرنے یا جانوروں کی دیکھ ریکھ کا احتیاج۔

کسی عورت کا شوہر غریب ہو تو شوہر پر اس کا فطرہ واجب نہیں ہے۔ اگر عورت کے پاس مال ہو تو اسے اپنا فطرہ ادا کرنا سنت ہے۔

اگر عورت شوہر کی نافرمانی کرے اور نفقہ ساقط ہو جائے تو پھر عورت کو خود اپنا فطرہ ادا کرنا لازم ہے۔

جو شخص فطرہ کی کچھ مقدار ادا کر سکتا ہو، اسے وہ ادا کرنا لازم ہے تا کہ بقدر امکان واجب کی ادائیگی ہو سکے۔ جو شخص چند صاع دے سکتا ہو تو پہلے اپنا فطرہ مقدم کرے۔ کیونکہ مسلم شریف کی حدیث میں اپنی ذات سے ابتداء کا حکم موجود ہے کہ "پہلے اس پر (خود پر) صدقہ کرو پھر کچھ بچے تو اپنے اہل پر، مزید ہو تو دیگر رشتہ داروں پر" پھر بیوی کا فطرہ ادا کرے کیونکہ اس کے اخراجات زیادہ تاکیدی ہیں کہ معاوضہ ہے اور وقت گزر جانے سے ساقط نہیں ہوتا۔ پھر اپنے نابالغ بچے کا فطرہ ادا کرے کہ اس کا نان نفقہ نص اور اجماع سے ثابت ہے۔ پھر باپ

دادا نانا وغیرہ پھر ماں دادی نانی وغیرہ کا فطرہ پھر بالغ اولاد کا جبکہ اپاہج یا پاگل ہوں، نفقہ میں ماں کو باپ پر مقدم کیا جاتا ہے، کیونکہ نفقہ احتیاج کے پیش نظر ہے، اور ماں نسبتاً زیادہ محتاج ہے، اور فطرہ تطہیر (پاکی) اور شرف کے لئے ہے، جس کا باپ زیادہ مستحق ہے، کیونکہ بیٹا اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس کے شرف کی وجہ سے مشرف ہوتا ہے۔

فطرہ کی مقدار: ایک شخص کی طرف سے ایک صاع اناج ادا کرے جیسا کہ حدیث میں گزرا حالیہ اوزان کے اعتبار سے اس کی تعیین کی تفصیل گزر چکی "فقہ منہجی" کے اعتبار سے ایک صاع تین لیٹر (تقریباً ۲ کلو ۴۰۰ گرام) کے مساوی ہے۔ (۱/۲۳۰)

فطرہ کی جنس: ایسا اناج جس میں عشر واجب ہوتا ہے جو صحیح اور بے عیب ہو اور پنیر یا دودھ جن سے مکھن نکالا نہ گیا ہو۔

ایسا عیب دار اناج جس میں خوراک بننے کی صلاحیت (اقتیات) نہ ہو، اور جسے زیادہ دن رکھا نہ جاسکے، اور گھن لگا ہوا اناج، یا تر اناج فطرہ میں ناکافی ہے۔ خشک ہو کر دوبارہ خوراک اور ذخیرہ کی صفت پر آچکا ہو تو کافی ہے۔ اتنا قدیم اناج کہ اس کا مزہ یا رنگ یا بو بدل چکا ہو نا کافی ہے۔ قدیم سستا ہو لیکن تغیر نہ ہو تو کافی ہے۔

جس کا فطرہ ادا کیا جارہا ہو اس کی بستی میں جو اناج سال بھر غالباً (زیادہ اور عموماً) استعمال ہوتا ہو، اس سے ادا کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ اشیاء کی قیمت علاقہ کے سکوں میں ادا کی جاتی ہے اور اسی اناج کی طرف لوگوں کا زیادہ میلان بھی ہوگا۔ لہٰذا علاقوں کے اعتبار سے واجب جنس مختلف ہوگی۔ ادا کرنے والا اور جس کی جانب سے ادا کر رہا ہے دونوں الگ الگ مقام پر ہوں تو جس کا فطرہ ادا کیا جارہا ہے اس کی بستی کا اعتبار ہوگا اور وہیں کے فقراء کو دیا جائے گا۔ (ادا کرنے والے کی بستی کا اعتبار نہ ہوگا)

کسی جگہ مختلف اناج مستعمل ہوں اور کسی کو غلبہ نہ ہو تو اختیار ہے ان میں سے جو چاہے ادا کرے۔ البتہ خوراک کی صلاحیت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا دینا افضل ہے، ان مختلف اناج میں کوئی غالب ہو تو وہی ادا کرے (اس سے کم درجہ کا جائز نہیں)

ادنیٰ اناج واجب ہو تو اس کی جگہ اعلیٰ دینا جائز ہے، کیونکہ اس میں خیر کی زیادتی ہے، اس کے برعکس جائز نہیں ہے، کہ یہ حق سے کم ہے۔

اعلیٰ اور ادنیٰ کی تعیین میں قیمت کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ اناج کے خوراک اور غذائیت کی صلاحیت کا اعتبار ہوگا۔ لہٰذا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اناج کی ترتیب اس طرح ہے گیہوں، جو، مکئی، چاول، چنا، اڑد، مسور، لوبیہ، کھجور، خشک انگور، پنیر، دودھ تو گویا فطرہ میں سب سے اعلیٰ گیہوں اور آخر میں دودھ کا درجہ ہے۔

ایک کی جانب سے واجب اناج اور دوسرے کی طرف سے اس سے اعلیٰ نکالنا جائز ہے۔ ایک ہی صاع جدا جنس سے نہیں ادا کرسکتا۔ (یعنی نصف صاع گیہوں اور نصف چاول ادا کرے تو صحیح نہیں ہے) جیسا کہ قسم کے کفارہ میں پانچ اشخاص کو اناج اور پانچ کو لباس دینا کافی نہیں ہے۔ اگر کہیں گیہوں اور جو ملا کر کھانے کا معمول ہو اور دونوں کی مقدار برابر ہو تو کسی کا بھی ایک صاع ادا کرے ایک زیادہ ہو تو وہ ادا کرے۔ مخلوط دینا کافی نہیں ہے۔

سرپرست (ولی) اپنے مالدار ماتحت (زیر پرستی مولی) کی جانب سے اپنے مال میں سے فطرہ ادا کرسکتا ہے کیونکہ اسے اس پر ولایت حاصل ہے اور یہ براہ راست اسے مالک بنانے پر قادر ہے۔ وہ مال دار ہے تو اصل وجوب اس کے مال میں ہے لہٰذا اس میں سے ادا کرنا بھی صحیح ہے۔ اولاد رشید ہوں (یعنی بالغ ہوں اور مالی تصرفات کی صحیح سدھ بدھ رکھتے ہوں) تو اس کی اجازت کے بغیر اس کی طرف سے فطرہ ادا کرنا جائز نہیں، اس طرح کسی اجنبی کی طرف سے بغیر اجازت فطرہ ادا کرنا جائز نہیں۔ کوئی شخص کسی کے اخراجات مروتاً برداشت

کررہا ہو (شرعاً واجب نہ ہو) تو اس کا فطرہ اس شخص پر واجب نہیں ہے، اور اس کی اجازت کے بغیر ادا کرے تو ادا نہ ہوگا۔

فطرہ میں قیمت، روٹی، ستو یا آٹا وغیرہ دینا کافی نہیں ہے۔ (نهاية المحتاج ۱۲۳/۳)

''الفقہ المنہجی'' میں فرمایا: ''امام شافعیؒ کے مسلک کی رو سے قیمت ادا کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ بستی کے غالب اناج کا ہی ادا کرنا لازم ہے، البتہ دورِ حاضر میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی اتباع کرتے ہوئے قیمت ادا کرنے میں حرج نہیں، کیونکہ آج کل اناج کے مقابلہ میں قیمت فقیر کے لئے زیادہ نفع بخش اور اصل مقصود کے حصول میں بہتر ہے۔'' (الفقه المنهجی ۲۳۰/۱) (لیکن حتی الامکان حدیث کے مطابق اناج ہی دینے کی کوشش کریں اگر کسی جگہ اس پر عمل تقریباً ناممکن ہو تو بدرجہ مجبوری قیمت ادا کریں۔)

باب - زکوٰۃ کن پر واجب ہے۔

زکوٰۃ آزاد مسلمان پر واجب ہے۔ ابتداء سے جو کافر ہے اس پر اس دنیا میں زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہے۔ کوئی مسلم دین سے ہٹ جائے (مرتد ہو جائے) اور اس دوران اس پر زکوٰۃ فرض ہو تو دوبارہ اسلام لانے کی صورت میں اس کی ادائیگی لازم ہے۔

بچہ، پاگل یا سفیہ (جس میں مالی تصرف کی صلاحیت نہ ہو) کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ لہٰذا ولی (سرپرست) ان کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ولی کوتاہی کرے تو گنہگار ہوگا اور صاحبِ مال خود اپنے کامل ہونے کے بعد (یعنی بچہ بالغ ہو یا پاگل اچھا ہو جائے اور سفیہ میں سمجھ بوجھ آ جائے تو) سابقہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ سے مروی ہے ''جو کسی یتیم کا ولی ہو، وہ اس کے مال میں تجارت کرے، اسے ایسے ہی نہ چھوڑے کہ صدقہ اسے کھا جائے'' (یعنی تجارت نہ ہوئی اور ہر سال زکوٰۃ ادا ہوتی رہی تو اسی میں مال ختم ہو جائے گا۔ ترمذی، دارقطنی، بیہقی) نیز ایجابِ زکوٰۃ کے متعلق وارد صحیح احادیث کے اطلاق سے اس کی مزید تائید و تاکید ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ سے صحیح سند سے یتیم کے مال میں زکوٰۃ کا وجوب مروی ہے۔ (بیهقی، شافعی) امام مالک نے مؤطا میں حضرت عائشہؓ سے اور دارقطنی و بیہقی اور ابن عبدالبر نے کئی سندوں سے حضرت علیؓ سے بھی یہی نقل فرمایا ہے۔ (تلخيص الحبير ۱۶۷/۲)

الفقہ المنہجی میں بچے اور پاگل کے مال میں زکوٰۃ کے وجوب کی دلیل میں فرمایا: ''قرآن کی آیات اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو مال کا مالک بنایا اور اس میں محروم افراد کا حق مقرر فرمایا اور آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ اپنے وقت میں یہ حق وصول کریں، کہ مال کی پاکی اور حفاظت کا باعث ہے، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مالکوں کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی، جس طرح کہ مال کی تخصیص نہیں فرمائی۔

آیات: ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً'' (التوبه: ۱۰۳) ''آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے''

(۲) وَ الَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ '' (المعارج۔ ۲۴-۲۵)

''جن کے مالوں میں سوالی اور بے سوالی سب کا حق ہے۔''

اسی طرح بخاری شریف میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل روایت میں یہ لفظ موجود ہے ''هٰذِهٖ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ '' **ترجمہ:** یہ زکوٰۃ کا وہ فریضہ ہے جو آپ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض فرمایا ہے۔'' مسلمان کا لفظ عام ہے، جو بالغ اور نابالغ عاقل و پاگل سبھی کو شامل ہے۔ اور جب تک شارع کی جانب سے تخصیص کی

دلیل نہ ہو، عام کو اپنے عموم پر رکھنا ہی اصل ہے۔
امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الام'' میں آپ ﷺ کا یہ فرمان نقل فرمایا ہے'' یتیموں کے مال میں تجارت کروتا کہ زکوٰۃ اسے ختم نہ کرے۔'' معلوم ہوا کہ بغیر تجارت کے مال کو یوں ہی رکھے تو زکوٰۃ کی وجہ سے ختم ہوگا، ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کے نکالنے سے ہی ختم ہوگا، اور بغیر وجوب کے اس کے نکالنے کا سوال ہی نہیں، کیونکہ ولی کو ان کے مال میں تبرع کا (بلا معاوضہ دینے کا) اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بچے کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے۔ پاگل بھی بچے کے حکم میں ہے۔ اس لئے اس کو بھی اس پر قیاس کریں گے۔
بالا جماع بچے اور پاگل کی جانب سے صدقۂ فطر واجب ہے، تو جب بچپن اور پاگل پن ان کے بدن کی طرف سے صدقۂ فطر کیلئے مانع (رکاوٹ) نہیں ہے، تو ان کے مال میں زکوٰۃ سے مانع نہ ہونا چاہئے جبکہ وجوبِ زکوٰۃ کے شرائط مکمل ہوں۔
زکوٰۃ کا مقصد فقراء کی حاجت روائی اور مال کی پاکی وصفائی ہے، قطع نظر اس سے کہ مالک کون ہے، جبکہ وہ مسلمان اور اسلامی نظام کا متبع ہو، لہٰذا بچے اور پاگل کے مال سے بھی زکوٰۃ متعلق ہونا چاہئے۔
زکوٰۃ محض ایک بدنی عبادت نہیں ہے، کہ اس کے لئے مکلف ہونا ضروری ہو، بلکہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں مال کا پہلو غالب ہے، جس کے ذریعہ اقتصادی عدل اور بشمول کفایت کا تحقق مطلوب ہے۔ لہٰذا اس حکم کی اطاعت میں تمام اصحابِ مال مساوی ہوں گے۔ (الفقه المنهجی ۔ ۲/۱۸ — ۲۰)

غصب و قرض وغیرہ میں زکوٰۃ: غصب شدہ مال واپس مل جائے تو اس کی سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہے۔ کسی کا مال گم ہو جائے یا دفن کر کے بھول جائے تو ملنے کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہے۔ کسی کے ذمہ قرض ہو یا کوئی چیز اس کے پاس ہو اور وہ انکار کر رہا ہو، اور مستحق فی المال وصول کرنے پر قادر نہ ہو تو آئندہ جب بھی وہ مال ملے، اس میں گذشتہ ایام کی زکوٰۃ واجب ہے۔
کسی کا مال کہیں دور ہو تو اس میں بھی بصورتِ قدرت زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔ کسی چیز کے خریدنے کے بعد قبضہ نہ ہوا ہو، تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، (بقیہ شرائط ہوں تو) کیونکہ ملکیت مکمل حاصل ہو چکی۔ کسی کا کسی پر تجارتی مال یا روپیہ پیسہ کا قرض لازم ہو جس کی واپسی کا وقت ہو چکا ہو اور واپسی ممکن بھی ہو تو فی الحال اُس کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔ چاہے وہ واپس نہ لے، کیونکہ وہ واپس لینے پر قادر ہے تو گویا کہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر قرض مؤجل (مؤخر) ہو تو غصب کی طرح ہے یعنی قبضہ اور حصول کے بعد زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر قرض غیر لازم ہو یا مویشی کا ہو یا ایسی اشیاء کا جس میں عشر واجب ہے تو ان میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔ (تحفۃ المحتاج)

مقروض پر زکوٰۃ: کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہو تو کسی بھی طرح کا کسی کا کتنا ہی قرض ہو، یہ زکوٰۃ کے وجوب سے مانع نہیں ہے۔ بلکہ زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ کے دلائل مطلق ہیں اور اسی مال کا قرض میں ادا کرنا کوئی متعین نہیں ہے۔

ترکہ میں زکوٰۃ: کسی کے ذمہ زکوٰۃ اور انسانی قرض باقی ہو اور اس کا انتقال ہو جائے اور ترکہ میں دونوں کی گنجائش نہ ہو تو اللہ کے قرض کو مقدم کرتے ہوئے زکوٰۃ کو مقدم کریں گے۔ صحیحین کی ایک روایت میں ہے'' اللہ کا قرض ادائیگی کا زیادہ مستحق ہے'' زکوٰۃ ہی کی طرح حج اور کفارہ وغیرہ دیگر حقوق اللہ کا حکم ہے۔ (یعنی ان حقوق کی ادائیگی مقدم ہوگی)
کسی زندہ شخص کے مال میں یا ترکہ میں مختلف حقوق اللہ (جیسے زکوٰۃ، حج، کفارہ) واجب ہوں، اور سبھی کی گنجائش نہ ہو، تو ہر ایک کو

بالتقسیط ادا کریں گے لیکن نصاب موجود ہو تو زکوٰۃ مقدم ہوگی۔

باب - زکوٰۃ کی ادائیگی

زکوٰۃ دیگر واجبات کی طرح فوراً ادا کرنا واجب ہے، جبکہ ادائیگی کی قدرت ہو جائے، کیونکہ مستحقین فی الوقت اس کے محتاج اور ضرورت مند ہیں، تاخیر کرنا حرام ہے۔ البتہ کسی رشتہ دار، پڑوسی، زیادہ محتاج شخص یا افضل شخص کے انتظار میں تاخیر کی اجازت ہے، جبکہ حاضرین کو زیادہ ضرر نہ ہو۔ لیکن اس صورت میں ادا کرنے سے قبل مال تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا۔ (اپنے جیب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی)

قدرت کی صورتیں: غائب مال، مغصوبہ مال وغیرہ اپنے پاس آ جائے، زکوٰۃ لینے والے موجود ہوں، پھل خشک ہو جائے، اناج اور معدنیات کی صفائی ہو جائے، مالک اہم دینی یا دنیوی امر جیسے نماز یا کھانے میں مشغول نہ ہو، کسی ایک جگہ موجود غائب مال تک پہنچ سکتا ہو، فی الحال واجب الاداء قرض حاصل کر سکتا ہو، کسی پر مفلسی کی وجہ سے حکومت نے تصرفات کی پابندی عائد کر دی ہو اور اس کے ذمہ زکوٰۃ ہو تو اس پابندی کے ہٹنے کے بعد (اسے ادا کرنا واجب ہے) اسی طرح کرایہ جتنا پختہ ہو جائے اس کی زکوٰۃ واجب ہے۔ مثلاً گھر چار سال کے لئے ۱۰۰ دینار کرایہ پر دے اور کرایہ مکمل ۱۰۰ دینار لے لے تو ہر سال کے گذرنے پر جتنا کرایہ یقینی ہو چکا اس کی زکوٰۃ نکالنا کافی ہے۔ کیونکہ بقیہ کرایہ میں ملکیت ضعیف ہے۔ اگر گھر منہدم ہو جائے تو آئندہ کا کرایہ واپس کرنا ہوگا۔ لہٰذا اس مثال میں پہلا سال گزرنے پر صرف ۲۵ دینار کی زکوٰۃ نکالے اسی طرح آگے بھی۔

مہر کا جماع وغیرہ کے ذریعہ پختہ ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا نکاح میں ۲۰ دینار مہر مقرر ہوئی تو سال مکمل ہونے پر اس میں زکوٰۃ واجب ہے، چاہے ابھی جماع نہ ہوا ہو، یا بیوی کو ادا نہ کی گئی ہو۔

تنبیہ: مہر میں زکوٰۃ کے مسئلہ پر توجہ کی ضرورت ہے، کبھی سالہا سال تک مہر ادا نہ کی جاتی، لیکن بیوی کی ملکیت اس پر مکمل ہے، اس لئے اگر شرائط موجود ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگر بیوی ابھی حاصل کر سکتی ہو تو ابھی واجب ہے۔ اگر شوہر نہ دے تو جب بھی دے سابقہ ایام کی زکوٰۃ بھی واجب ہے۔ واجب ہونے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی پر قدرت سے پہلے ہی مال تلف ہو جائے تو مالک پر کوئی ضمان نہیں ہے۔ لیکن مالک خود تلف کرے یا قدرت کے بعد موخر کرے اور تلف ہو جائے تو مالک کو ضمان لازم ہے۔ عدمِ تلف کی صورت میں جو زکوٰۃ دینی تھی اب بھی دینا لازم ہے، کیونکہ مستحقین کو ادا کرنے میں تاخیر اس کی غلطی ہے۔

مالِ باطن: سونا، چاندی، تجارتی اسباب، خزانہ

مالِ ظاهر: مویشی، کھیتی باڑی، پھل اور معدن

صاحب مال خود یا وکیل کے ذریعہ اپنے ظاہری و باطنی دونوں مال کی زکوٰۃ براہ راست مستحقین کو ادا کر سکتا ہے۔ لیکن ظاہر مال کی زکوٰۃ امام (اسلامی حکومت کا ذمہ دار) طلب کرے تو اس کے حوالہ کرنا واجب ہے۔ امام باطنی مال کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں کر سکتا، البتہ امام کو علم ہو کہ مالک باطنی مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کر رہا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اسے حکم دے کہ خود ادا کرو یا ہمارے حوالہ کرو۔ صدقۂ فطر مالِ باطن کے حکم میں ہے۔

صاحب مال زکوٰۃ امام کے حوالہ بھی کر سکتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ اور خلفائے راشدین ساعی (عامل) کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے روانہ فرماتے تھے۔ خود تقسیم کرنے کے بجائے امام کے سپرد کرنا افضل ہے۔ کیونکہ وہ مستحقین سے زیادہ واقف ہے افضل اس وقت ہے

جبکہ امام زکوٰۃ کی تقسیم ایمانداری اور عدل سے کرتا ہو، ورنہ خود تقسیم کرنا بہتر ہے۔ تقسیم کے لئے وکیل کے سپرد کرنے سے خود مالک کا تقسیم کرنا افضل ہے۔

نیت : زکوٰۃ میں نیت واجب ہے۔ دیگر نیتوں کی طرح یہاں بھی واجب دل سے نیت کرنا ہے۔ جیسے یہ زکوٰۃ ہے، یہ فرض صدقہ ہے، یہ میرے مال کا فرض صدقہ ہے۔

صرف میرا مالی فرض کافی نہیں، کیونکہ یہ کفارہ اور نذر بھی ہوسکتا ہے اور نہ میرا مالی صدقہ کافی ہے۔ کیونکہ صدقہ نفل بھی ہوتا ہے۔

نیت میں کس مال کی طرف سے زکوٰۃ ادا کررہا ہے، اس کی تعیین کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ۲۰۰ دراہم حاضر اور ۲۰۰ دراہم غائب تھے۔ اور مالک نے ۵ دراہم مطلق زکوٰۃ کی نیت سے ادا کئے۔ پھر پتہ چلا کہ غائب مال تلف ہو چکا ہے تو اس ادا کردہ زکوٰۃ کو حاضر کی جانب سے قرار دے سکتا ہے۔ لیکن زکوٰۃ ادا کرتے وقت مخصوص مال کی تعیین کرے، تو وہ زکوٰۃ دوسرے مال کی طرف سے شمار نہیں ہوسکتی مذکورہ مثال میں ۵ دراہم زکوٰۃ میں غائب مال کی تعیین کرچکا تھا۔ تو اب اسے حاضر کی جانب سے نہیں پھیر سکتا۔ (حاضر کی زکوٰۃ مستقل ادا کرنی ہوگی) لیکن تعیین کے ساتھ یہ بھی نیت ہو کہ وہ معین مال تلف شدہ ہو تو پھر دوسرے مال کی طرف سے اور وہ تلف شدہ ظاہر ہو تو دوسرے مال کی طرف سے شمار ہوگا۔ یہاں غائب سے اس مجلس سے غائب ہونا مراد ہے، نہ کہ بستی سے، اس بناء پر کہ زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل کرنا ممنوع ہے، جیسا کہ اپنی جگہ مسئلہ آجائے گا۔

ولی اپنے بچے یا پاگل کی زکوٰۃ ادا کرے تو اسے نیت لازم ہے بغیر نیت کے ادا کیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اور اس پر ضمان لازم ہوگا۔ سفیہ کا ولی نیت اس کے سپرد کرسکتا ہے۔

زکوٰۃ کی مقدار کو اپنے مال سے جدا کرتے وقت یا ادا کرتے وقت یا دونوں کے درمیان یا امام یا وکیل کے سپرد کرتے وقت نیت کافی ہے۔ امام اور وکیل بھی مستحقین کو دیتے وقت نیت کرلیں تو افضل ہے۔ تقسیم کے لئے جسے وکیل بنایا نیت میں بھی اسے وکیل بنا سکتا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والے کی اجازت کے بغیر امام یا کسی اور کا نیت کرلینا کافی نہیں ہے۔ لیکن کوئی زکوٰۃ ادا نہ کرے، اور امام جبراً اس سے زکوٰۃ وصول کرے تو امام کو نیت لازم ہے اور یہ نیت کافی ہے۔ اسے مالک کی نیت کے قائم مقام شمار کریں گے۔

مالک زکوٰۃ کی نیت سے دے اور لینے والا نفلی صدقہ یا ہدیہ وغیرہ کی نیت سے لے تو زکوٰۃ ادا ہوگی، جبکہ وہ مستحق ہو۔

حکومت کے ٹیکس زکوٰۃ کی نیت سے ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

کسی پر ۵ دراہم زکوٰۃ ہو اور وہ ۱۰ دراہم زکوٰۃ اور نفلی صدقہ کی نیت سے ادا کرے، تو تمام نفلی صدقہ شمار ہوگا، زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، کیونکہ اس نے فرض و نفل کو مشترک کردیا، جو مضر ہے۔ (حاشیہ الجمل ۲/۲۹۷)

تعجیل زکوٰۃ (قبل از وقت زکوٰۃ ادا کرنا)

حدیث : حضرت عباسؓ نے آپ ﷺ سے قبل از وقت زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ (احمد، اصحاب سنن، حاکم، درا قطنی، بیهقي، تلخیص الحبیر ۲/۱۷۱)

کوئی شخص نصاب کا مالک ہو تو سال مکمل ہونے سے قبل زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے۔ کسی نے مال تجارت نصاب سے کم مالیت کا بھی خریدا (۲۰۰ دراہم سے کم مالیت کا سامان) ہو، تو وہ سال سے قبل زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے، جبکہ سال کی تکمیل پر مالیت نصاب تک پہنچ چکی ہو یا

۲۰۰ درہم مالیت کی اشیاء خرید کر تکمیل سال سے قبل ہی ۴۰۰ درہم کی زکوٰۃ ادا کرے اور سال مکمل ہونے پر مالیت ۴۰۰ درہم ہو چکی ہو تو یہ زکوٰۃ ادا کرنا معتبر ہوگا، کیونکہ تجارت میں صرف سال کے آخر میں نصاب کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

ایک سال سے زائد کی زکوٰۃ ابھی نہیں دے سکتا، کیونکہ ابھی دوسرا سال شروع ہی نہیں ہوا اور انعقاد حول (سال شروع ہونے) سے قبل تعجیل جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ تجارت کے علاوہ اشیاء میں نصاب کی تکمیل سے پہلے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا کسی کے پاس صرف ۱۰۰ درہم ہو اور وہ ۵ درہم بطور زکوٰۃ دے، تو یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ وجوب کا سبب (نصاب) نہیں پایا گیا۔ دو سال کی زکوٰۃ معجّل دے تو صرف پہلے سال کی طرف سے کافی ہوگی۔ بیہقی کی روایت میں حضرت عباسؓ سے دو سالہ زکوٰۃ لینے کا جو ذکر ہے، تو وہ روایت منقطع ہے۔ اگر معتبر فرض کریں تو یہ تاویل ہوگی کہ دو سال میں صدقۂ فطر ماہِ رمضان شروع ہونے کے بعد دے سکتا ہے، چاہے بالکل ہی ابتداء میں دے۔ کیونکہ فطرہ رمضان اور فطر (رمضان کا اختتام) ان دو اسباب سے واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک سبب (رمضان) پائے جانے کے بعد ادا کرنا معتبر ہوگا۔ رمضان سے قبل ادا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ دونوں سببوں پر مقدم ہوگا۔

پیداوار کی زکوٰۃ وجوب کے وقت سے قبل جائز نہیں ہے، مسئلہ گزر چکا کہ پھلوں میں وقتِ وجوب بُدُوِّ صَلاح (پختگی) اور اناج میں دانوں کا سخت ہونا ہے، کیونکہ وقتِ وجوب سے قبل اس کی مقدار کا کوئی اندازہ نہیں ہو پائے گا۔

مُعَجّلْ زکوٰۃ صحیح اور کافی ہونے کی شرائط: مستحق میں زکوٰۃ لیتے وقت اور واجب ہوتے وقت استحقاق کی صفت موجود ہو، درمیان میں یہ صفت نہ ہو تو حرج نہیں، مثلاً اب درمیان میں اسلام چھوڑ بیٹھا، لیکن سال مکمل ہونے سے قبل پھر اسلام لے آیا، اسی طرح سال کی تکمیل پر یا اس سے قبل وہ غائب ہو جائے اور اس کا زندہ رہنا یا محتاج ہونا معلوم نہ ہو تو یہ کافی ہے۔ مالک کا زکوٰۃ کی ادائیگی سے وجوب تک صفتِ وجوب پر باقی رہنا ضروری ہے۔

اگر دونوں میں سے کوئی وقت وجوب سے قبل مر جائے، یا مستحق مرتد ہو جائے، یا مال تلف ہو جائے، یا فروخت کیا جائے (جبکہ مال تجارت نہ ہو) تو معجّل زکوٰۃ میں شمار نہ ہوگی۔ اگر معجّل زکوٰۃ تلف ہو جائے تو حرج نہیں۔

صرف معجّل زکوٰۃ کی وجہ سے یا معجّل زکوٰۃ اور دوسرے مال کی وجہ سے لینے والا غنی (مالدار) ہو چکا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ زکوٰۃ دینے کا مقصد ہی اسے بے نیاز کرنا ہے۔ لہٰذا جو مقصود ہو، وہ کافی ہونے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ معجّل زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مال کی وجہ سے غنی ہو چکا ہو تو معجّل زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

مذکورہ شرائط میں سے کسی کی کمی کی وجہ سے جب معجّل زکوٰۃ معتبر اور ادا نہ ہو تو سامنے والے سے اسے واپس لے لیں گے، جبکہ وہ چیز موجود ہو، ورنہ اس کا بدل بصورت مثل یا قیمت وصول کیا جائے گا، تلف کے وقت کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ مستحق کے قبضہ کے وقت کا اعتبار ہوگا۔ کیونکہ اضافہ مستحق کی ملکیت میں حاصل ہوا اور اس کا وہ ضامن نہ ہوگا۔ .... زیادتی جیسے دودھ اور اولاد وغیرہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ واپسی کے سبب سے قبل پایا گیا ہو مستحق نے اب تک زکوٰۃ کے جانور کا جو دودھ استعمال کیا یا اس جانور کو بچہ پیدا ہوا تو یہ مستحق کا ہے اسے مالک کو واپس لوٹانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ اضافہ اصل شئی سے جدا ہے، لیکن متصل زیادتی جیسے موٹاپا اور عمر کی زیادتی واپس لوٹائی جائے گی (اتنی مدت میں مستحق کے پاس جانور موٹا تازہ ہو چکا ہے اور اس کی عمر بڑھ چکی جس سے قیمت بھی بڑھ جائے گی، تب بھی مکمل جانور لوٹائیں گے۔ موٹاپے یا عمر کے اضافہ کا کچھ بدلہ اسے نہ ملے گا) اسی طرح واپسی کے سبب سے قبل اس میں جو نقص پیش آئے (جیسے جانور کا بیمار ہونا یا ہاتھ پیر وغیرہ کٹنا) اس کا تاوان ادا کرنے کی ضرورت نہیں (ناقص حالت میں صرف وہ شئی

لوٹادے) لیکن لیتے وقت یہ زکوۃ کا مستحق نہیں تھا، تو زیادتی اور نقصان دونوں کا تاوان لوٹائے۔ واپسی کے سبب کے بعد کی زیادتی اور نقصان کا تاوان لوٹایا جائے گا۔

مذکورہ صورتوں میں معجل زکوۃ واپس لینے کے لئے یہ شرط ہے کہ ادا کرتے وقت یہ شرط لگادی ہو کہ کسی مانع کے پیش آنے کی صورت میں واپس لے لوں گا۔ یا یہ صراحت کردی ہو کہ یہ زکوۃ معجل ہے یا کسی اور ذریعہ سے لینے والے کو اس کا علم ہو کہ یہ معجل زکوۃ ہے۔ تعجیل کا علم ادا کرتے وقت یا بعد میں لیکن اس میں تصرف کرنے سے پہلے ہونا لازم ہے، اگر ان میں سے کوئی شرط نہیں پائی گئی تو واپس نہیں لے سکتا، بلکہ وہ نفلی صدقہ شمار ہوگا۔

مالک اور مستحق کے مابین اختلاف ہو کہ واپسی کی شرائط پائے گئے یا نہیں تو مستحق کو (اور وہ مرچکا ہو تو اس کے وارث کو) قسم دلائی جائے گی اور پھر اس کی تصدیق کریں گے (یعنی مال اسی کے پاس رہے گا واپس نہیں کیا جائے گا)

کل مال میں زکوٰۃ کا تعلق : جس مال میں زکوۃ واجب ہو زکوۃ کا اس مال سے شرکت کا تعلق ہوتا ہے۔ (گویا کہ مستحقین زکوۃ کی مقدار میں صاحب مال کے شریک اور پارٹنر ہیں) کیونکہ اگر مالک خود زکوۃ نہ دے تو امام جبراً اس سے وصول کرتا ہے جیسا کہ بعض شرکاء کے تقسیم سے انکار کی صورت میں جبراً مشترک مال شرکاء کے درمیان تقسیم کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مالک دوسرے مال سے زکوۃ ادا کرے تو ادا ہو جائے گا، کیونکہ اس کی بنیاد تساہل اور نرمی اور نفع رسانی پر ہے۔

چونکہ زکوۃ کا تعلق شرکت کی طرح ہے، اس لئے جس مال میں زکوۃ واجب ہو چکی ہو، اسے کچھ یا مکمل فروخت کرے تو دکان کی مقدار میں بیع (فروخت) باطل ہوگی، چاہے پہلی صورت میں بقدر زکوۃ باقی رکھے، کیونکہ مستحقین کا حق تمام مال میں شائع (پھیلا ہوا) ہے، لہذا جتنا بھی فروخت کرے، مالک اور مستحقین دونوں کا اس میں حق ہے، البتہ فروخت کے وقت زکوۃ کے مقدار کو مستثنیٰ رکھے اور سامنے والے کو اس کی مقدار کا علم بھی ہو، تو بقیہ میں لین دین صحیح ہے۔

مال تجارت کو وجوب زکوۃ کے بعد بھی فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور بیع باطل نہ ہوگی، کیونکہ تجارت کی زکوۃ بجائے تجارتی اشیاء کے ان کی قیمت میں واجب ہے، جو بیع کی وجہ سے فوت نہ ہوگی، لیکن اگر بلا معاوضہ مال تجارت دے تو اتنی مقدار میں باطل ہے، مثلاً ۴۰ مثقال کی چیز ۲۰ مثقال میں فروخت کرے تو نصف مثقال کی چیز میں بیع باطل ہے، جو بقیہ ۲۰ کے زکوۃ کی مقدار ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ (زکوٰۃ کے مستحقین)

آیت : إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورہ توبہ: ۶۰)

ترجمہ: ''(فرض) صدقات یا صرف (ان لوگوں کا حق ہے) غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات پر متعین ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (صرف کیا جاوے) اور قرضداروں کے قرضہ (ادا کرنے) میں اور جہاد کرنے (والوں کے سامان) میں اور مسافروں کی (امداد) میں۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور بڑے حکمت والے ہیں۔''

احادیث : (۱) دو حضرات آپ ﷺ کی خدمت میں صدقہ (زکوۃ) مانگنے حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا ''تم چاہو تو میں دے

دوں۔اس میں کسی مالدار یا قوی کمانے والے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' (احمد ، ابوداؤد، نسائی ، دار قطنی)

(۲) ''صدقہ کسی مالدار اور قوی صحیح الاعضاء شخص کے لئے حلال نہیں ہے''۔ (نسائی ، دار قطنی ، ابن حبان ، حاکم)

(۳) ''صدقہ صرف ان پانچ افراد کو حلال ہے: اللہ کے راستے میں غزوہ کرنے والا ، یا عامل ، مقروض یا جو شخص اپنے مال سے خریدے یا وہ شخص جس کے مسکین پڑوسی کو صدقہ ملے اور وہ اس غنی کو ہدایہ میں دے۔'' (ابوداؤد، ابن ماجہ ، حاکم ، مالک ، احمد ، ابن خزیمہ ، دار قطنی ، بیہقی)

(۴) ''زکوٰۃ پر برحق عامل گھر لوٹنے تک فی سبیل اللہ غازی کی طرح ہے۔'' (ابوداود، ترمذی، مشکوٰۃ)

مستحقین زکوٰۃ کے متعلق مذکورہ آیات میں پہلے چار مستحقین کی طرف زکوٰۃ کو لامِ ملک کے ذریعہ اور بقیہ چار کی طرف ظرفیت کے فی کے ذریعہ منسوب کیا گیا ہے۔جس سے یہ معلوم ہوا کہ پہلے چاروں میں مطلق ملکیت کافی ہے اور آخری چاروں میں مذکورہ مقاصد کے لئے ملکیت ہے۔لہٰذا ان میں متعلقہ مقاصد میں صرف نہ ہوا تو واپس لے لیا جائے گا۔بخلاف پہلے چاروں مستحقین کے۔

زکوٰۃ آٹھ قسم کے لوگوں کا حق ہے

۱) **فقیر** : جس کے پاس اتنا مال نہ ہو اور نہ اس کے مناسب کمائی کا ایسا ذریعہ ہو جس کی آمدنی اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی بھی درجہ میں کفایت کر جائے اگر اس کے مناسب حال حلال آمدنی کا ذریعہ (نوکری وغیرہ) ممکن ہو، اور وہ اسے اختیار نہ کرے تو اسے زکوٰۃ نہ دے۔ضروریات میں کھانا پینا، لباس اور مکان وغیرہ ضروریات میں داخل ہیں جو کہ اس کے اور زیر کفالت افراد کے مناسب ہوں۔ مثلاً کسی کو ۱۰ روپے کی ضرورت ہو اور اس کا مال یا کمائی صرف ۲، ۳ یا ۴ روپے ہوں، (یعنی نصف سے کم ہو) چاہے اس کا مال بقدر نصاب یا کم وبیش ہو، (لیکن اس کے مصارف اور ضروریات کے اعتبار سے اوپر کی تفصیل میں داخل ہو تو وہ فقیر کہلائے گا)

اپاہج ہونا یا اوروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا فقیر کے لئے ضروری نہیں ہے،یعنی جو صحیح الاعضاء ہو اور کسی سے سوال نہ کرتا ہو،لیکن اوپر کی تفصیل پائی جارہی ہو تو وہ فقیر ہے۔

۲) **مسکین** : اوپر کے مقابلہ میں اس کی ضروریات زندگی کے لئے کسی درجہ میں کفایت کر جاتا ہے،لیکن اطمینان سے کافی نہیں ہوتا۔جیسے اصل ضرورت ۱۰ روپے کی ہو لیکن صرف ۷، ۸ روپے ہو (یعنی نصف سے زائد ہو) فقیر اور مسکین دونوں کے غالب عمر کی کفایت مُراد ہے۔مناسب ذریعہ آمدنی کھنے سے غیر مناسب خارج ہو جاتا ہے وہ نہ ہونے کی طرح ہے۔اس کا اعتبار نہ ہوگا۔(یعنی اس شخص کے لئے نامناسب کمائی کا ذریعہ ہو اور وہ نہ اختیار کرے تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں)

کسی کے پاس بھلے مال نہ ہو،لیکن شرعاً اس کا نفقہ دوسرے پر واجب ہو جیسے شوہر، والدین یا اولاد اور وہ ساری ضروریات پوری کریں،تو یہ فقیر و مسکین شمار نہ ہوگا۔اور اُسے زکوٰۃ نہیں دے سکتے ، کیونکہ یہ غیر محتاج ہے، جیسا روز اپنی ضروریات کے بقدر کمانے والا،لیکن مذکورہ ذمہ دار نفقہ اور خرچ نہ دے سکے یا نہ دے یا ناکافی مقدار دے،تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔کوئی نفلی عبادتوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے کما نہ سکے تو یہ فقیر نہ شمار ہوگا۔لیکن کوئی شرعی علوم کی تحصیل میں مشغول ہو اور اس میں اس کی صلاحیت بھی ہو اور کمانا طلب علم میں حرج ڈالتا ہو تو اسے بحیثیت فقیر یا مسکین زکوٰۃ دے سکتے ہیں کیونکہ دینی علوم کا حصول فرض کفایہ ہے۔

کسی شخص کے پاس اس کے مناسب مکان، کپڑے اور کتابیں (جن کی اسے ضرورت ہو) موجود ہوں تو یہ فقیر سے مانع نہیں ہے۔

کسی کے مال دو مرحلہ (منزل) یا اس سے دور ہو تو مال ملنے تک یا کسی کے ذمہ اس کے مؤجل قرض (موخر اور بعد میں ملنے والا قرض ہو تو ادائیگی کا وقت آنے تک ان کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، کیونکہ فی الحال یہ فقیر یا مسکین شمار ہونگے۔

۳) **عامل:** اسلامی حکومت کی جانب سے اجتماعی طور پر زکوٰۃ کے جمع وتقسیم کا نظم ہو، تو اس سلسلہ میں کام کرنے والے افراد مثلاً ساعی (زکوٰۃ جمع کرنے والا)، منشی (جو ان تفاصیل کو لکھے) اور حاسب (حساب کتاب لکھنے والا) عامل کہلائیں گے۔ اور ان کی تنخواہ زکوٰۃ سے ادا کی جائے گی۔ (گرچہ وہ امیر ہوں) امام کے وصولیابی کے بعد مال کی حفاظت اور جانوروں کے چرانے کا خرچ کل مالِ زکوٰۃ سے ادا کرے (صرف عامل کے حصہ سے نہیں)، مالک کے مال سے زکوٰۃ کی مقدار الگ کرنے کے لئے وزن، ناپ یا شمار کرنے والوں کی اجرت مالک کے ذمہ ہے۔ یہی کام زکوٰۃ کے مال میں مستحقین کے حصوں کی تقسیم کے لئے عمل میں آئے تو اس کی اجرت عامل کے حصہ سے ادا ہوگی۔ یہ ساری تفصیل اس وقت ہے جب کہ امام (اسلامی حکومت کا ذمہ دار) مالِ زکوٰۃ جمع کر کے تقسیم کرے اور عامل کے لئے بیت المال سے جدا تنخواہ نہ رکھے۔ اگر مالک خود ہی زکوٰۃ تقسیم کردے یا امام عامل کو بیت المال سے معاوضہ دے تو عامل کا حصہ ساقط ہوجائے گا۔ قاضی (جج) اور حاکم وگورنر کا عامل میں شمار نہ ہوگا اور زکوٰۃ میں ان کا حق نہیں ہے، بلکہ ان کی تنخواہ مالِ غنیمت کے اس خمس سے ادا ہوگی جو مصالحِ عامہ کی خاطر ہو۔

(۴) **مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبُ** (جن کی تالیف قلب اور محبت مقصود ہو) ان کی چار قسمیں ہیں۔

۱) وہ نومسلم جو ابھی اسلام میں پختہ نہ ہو، اسے زکوٰۃ سے تعاون کریں گے تاکہ ایمان پر جم جائے۔

۲) وہ نومسلم جو پختہ ہو لیکن اپنے قوم کے شریف (اور ذمہ دار) لوگوں میں سے ہے، اور اس کے تعاون سے دیگر ہم قوم کے افراد کے اسلام کی توقع ہو تو اسے بھی زکوٰۃ دی جائے گی۔

۳) وہ مسلمان جو اپنے قرب وجوار کے مانعینِ زکوٰۃ (زکوٰۃ نہ دینے والے) کی طرف سے کفایت کرے اور انہیں ڈرا کر یا ان سے لڑکر زکوٰۃ امام تک پہنچائے۔

۴) وہ مسلمان جو اپنے قرب وجوار کے کفار اور باغیوں سے قتال کر کے مسلمانوں کو ان کے شرور سے بچائے۔

آخری دونوں قسموں کو زکوٰۃ اس وقت دیں گے جب کہ اس مقصد کے لئے باقاعدہ فوج روانہ کرنے کے مقابلہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی میں زیادہ سہولت ہو۔ اس طرح ان دو قسموں کا مذکر ہونا شرط ہے۔ پہلی دو قسموں میں یہ شرط نہیں ہے۔ مؤلفۃ القلوب امیر بھی ہو تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔

یہ تفصیلات مؤلفۃ المسلمین کی تھیں۔ کسی کافر کو اس کے اسلام کی امید پر یا اس کے شر کے ڈر سے زکوٰۃ یا کسی اور مد سے مال دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کو عزت وقوت اور سربلندی عطا فرمائی ہے اور ان کی تالیف سے بے نیاز کردیا ہے۔ لیکن اگر مسلمان ایسی مصیبت میں پھنس جائیں کہ ان کو مال دینے پر مجبور ہو جائیں تو گنجائش نکل آئے گی۔

۵) **مُکَاتَبْ کی آزادی میں:** وہ غلام جو صحیح مُکاتَب ہو اور خود زکوٰۃ ادا کرنے والے کا غلام نہ ہو، ان کو بدل کتابت کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ سے تعاون کریں گے، جبکہ ان کے پاس مکمل رقم نہ ہو، ان کے آقاؤں کی اجازت یا رقم کی ادائیگی کا وقت ہونا ضروری نہیں ہے۔

۶) **مقروض:** - (غارم) اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱) جس نے اپنی مباح ضرورت کے لئے قرض لیا ہو، اطاعت کا کام ہو یا نہ ہو، اور چاہے بعد میں غلط کام میں صرف کیا ہو، لیکن یہ معلوم ہو کہ لینا مباح مقصد کے لئے تھا، یا کسی نے غلط کام مثلاً شراب کے لئے قرض لیا اور اب تائب ہو چکا ہے اور بظاہر توبہ میں سچا ہے، بھلے ہی زیادہ مدت نہ گزری ہو، یا غلط کام کے لئے لینے کے بعد (اس میں صرف نہ کرے) بلکہ مباح کام میں استعمال کرے، تو ان لوگوں کو بصورتِ حاجت زکوٰۃ دی جائے۔ یعنی قرض کی ادائیگی کا وقت آ جائے اور ان کے پاس ادائیگی کی سبیل نہ ہو۔ اگر حاجت نہ ہو تو زکوٰۃ نہ دے۔

اگر گناہ کے کام کے لئے قرض لیا اور اس میں صرف بھی کیا اور ابھی تائب نہیں ہوا تو اسے زکوٰۃ نہ دی جائے۔

۲) مسلمانوں کے دو گروہوں میں کسی مسئلہ پر لڑائی کا خطرہ ہو، مثلاً کسی مقتول کے قاتل کے متعلق اختلاف ہو، جس کے نتیجہ میں لڑائی کا اندیشہ ہو، اور کوئی قرض لے کر مقتول کی دیت ادا کر دے، تا کہ فتنہ اور لڑائی ٹل جائے، تو اسے قرض کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ دی جائے گی۔ چاہے وہ شخص مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہاں اگر فقر کا اعتبار کریں گے تو لوگ ایسے اہم کاموں میں آگے نہیں بڑھیں گے۔

اگر اس نے قرض نہیں لیا، بلکہ اپنے ذاتی مال سے ادا کیا، یا قرض لیا تھا لیکن اسے اپنے ذاتی مال سے چکا دیا تو اب اسے زکوٰۃ نہیں دیں گے۔

۳) کوئی شخص کسی دوسرے کے قرض کا ضامن بنے اور کسی تیسرے سے قرض لے کر ضامن اسے ادا کرے تو اس صورت میں اگر اصل مقروض (اصیل) کی اجازت کے بغیر ضامن بنا ہو اور ضامن غریب ہو، یا اجازت سے ضامن رہا ہو اور دونوں غریب ہوں، تو قرض کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ سے تعاون کیا جائے گا۔ اجازت سے ضامن ہو اور اصیل امیر ہو، تو زکوٰۃ نہ دی جائے۔ مقروض کے مدسے جب ضامن کا قرض ادا ہو تو وہ اصیل سے نہیں لے سکتا۔

جو مصالح عامہ مثلاً مہمان نوازی، قیدی کی رہائی اور مسجد کی تعمیر جیسے امور کے لئے قرض لے، اسے زکوٰۃ دی جائے، گرچہ وہ امیر ہو۔ (فتح المعین مع الترشیح ۱۵۴)

۷) **فی سبیل اللہ :-** اس کا لغوی مفہوم ہے اللہ تک پہنچانے والا راستہ، پھر اسکا بکثرت استعمال جہاد کے لئے ہونے لگا، کیونکہ یہ شہادت کا سبب ہے جو اللہ سے ملاتی ہے پھر بلا معاوضہ مجاہدین پر اس کا اطلاق ہوا، کیونکہ یہ اوروں سے افضل ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ سے وہ غازی مراد ہیں جو اللہ کے راستہ میں بلا معاوضہ جہاد کے لئے جاتے، لہٰذا اس کو غزوہ پر تعاون کے طور پر زکوٰۃ دی جائے گی، گرچہ وہ امیر ہو، جس مجاہد کو فئی کے مال سے تنخواہ اور روزی ملتی ہو اسے زکوٰۃ نہ دی جائے گی، اگر فئی کا مال نہ ہو، تب بھی زکوٰۃ نہ دے بلکہ اس کی اعانت و امداد مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

۸) **ابن سبیل** (مسافر): جو زکوٰۃ کی بستی سے سفر شروع کر کے کہیں جا رہا ہو یا بطور مسافر وہاں سے گذر رہا ہو، اور معصیت کا سفر نہ ہو، تو بصورتِ احتیاج اسے زکوٰۃ دی جائے۔ گرچہ کہیں اور اس کا مال موجود ہو، چاہے طاعت کا سفر ہو جیسے حج و زیارت یا مباح سفر ہو جیسے تجارت وغیرہ۔ اگر اس کے پاس اشیاء ضروری موجود ہو، یا معصیت کا سفر ہو یا بلا کسی صحیح مقصد کے آوارہ گردی کر رہا ہو تو ایسے مسافروں کو زکوٰۃ نہ دی جائے۔

مستحقین کے شرائط :

۱) **آزادی :** مکاتب کے علاوہ دیگر کسی غلام کا زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں ہے۔

۲) **اسلام** ۔ کافر کا زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے

''ان کے (مسلمانوں کے) اغنیاء سے لے کر انہیں کے فقراء کو دی جائے گی۔'' البتہ حمال اور ناپ تول وغیرہ کے لئے کافر کو عامل

کے مد سے مزدوری پر رکھ سکتے ہیں، کیونکہ یہ بطور اجرت اور مزدوری ہے زکوٰۃ نہیں ہے۔

۳) ہاشمی یا مطلبی نہ ہو: ہاشمی یا مطلبی سادات کو زکوٰۃ حلال نہیں ہے۔آپ ﷺ کا فرمان ہے:"یہ صدقات (زکوٰۃ) تو لوگوں کا میل کچیل ہے اور یہ نہ محمد ﷺ کے لئے حلال ہے اور نہ آل محمد ﷺ کے لئے" (مسلم شریف) اور فرمایا:"اے اہل بیت! میں تمہارے لئے صدقات میں سے کچھ بھی حلال نہیں قرار دیتا اور نہ ہاتھوں کا غسالہ (یعنی دھوون، مراد قلیل مقدار یا زکوٰۃ ہے) تمہارے لئے خمس کے خمس میں اتنا حق ہے جو تم کو کافی ہو جائے یا مستغنی کردے"۔(طبرانی)

ان حضرات کو خمس کا خمس نہ بھی ملے تو زکوٰۃ نہ دی جائے۔دیگر واجبات جیسے نذر اور کفارہ کا بھی یہی حکم ہے۔نفلی صدقات ان کے لئے حلال ہے، لیکن آپ ﷺ کے مقام عالی کی وجہ سے آپ پر یہ سب حرام تھا لیکن ہدیہ حلال تھا۔(کیونکہ وہ بطور اکرام دیا جاتا ہے)

ہاشمی یا مطلبی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کو بھی زکوٰۃ حلال نہیں ہے، ایک روایت ہے:"کسی قوم کا مولیٰ بھی انہیں کا ایک فرد شمار ہوگا"(صححہ الترمذی وغیرہ)

کئی متقدمین ومتاخرین فقہاء کرام نے جب سادات کو بیت المال سے خمس کا خمس نہ ملے تو زکوٰۃ دینا جائز قرار دیا ہے، جن میں اصطخری، ھروی، ابن یحییٰ، ابن ابی ہریرہ، فخر رازی، قاضی حسین، ابن شکیل ابن زیاد، ناشری اور ابن مطیر داخل ہیں۔(فقہ المنہجی۔ ۶۷/۲)

فاسق کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، البتہ معلوم ہو کہ وہ گناہ میں صرف کرے گا تو دینا حرام ہے۔جو بلوغ کے وقت سے سستی کی وجہ سے نماز ترک کرتا ہو یا بچہ یا پاگل ہو تو ان کا زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔کیونکہ یہ سب شرعاً محجور (تصرفات سے روکے ہوئے) ہیں۔لہٰذا ان کی زکوٰۃ ان کے ولی (سرپرست اور ذمہ دار) کے حوالہ کرے۔

اگر فقیر یا مسکین اپنے مناسب اسباب معیشت اختیار کر کے گذر بسر کی آمدنی حاصل کر سکتے ہوں (چاہے سستی کی وجہ سے نہ کریں) تو ان کو زکوٰۃ دینا اور ان کا قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

رشتہ داروں کو زکوٰۃ: جن لوگوں کا نفقہ (مصارف) زکوٰۃ ادا کرنے والے کے ذمہ واجب ہو وہ انہیں زکوٰۃ نہیں دے سکتا، کیونکہ اس نفقہ کی وجہ سے وہ غیر محتاج ہیں اور ان کو دینا خود اپنے آپ کو دینے کی طرح ہے، کیونکہ اس کا فائدہ اسی کی طرف لوٹ رہا ہے، لہٰذا والدین یا دادا، دادی، نانا، نانی اوپر تک، ان کو زکاۃ نہیں دے سکتا، کیونکہ ان کا نفقہ فرع (اولاد) پر واجب ہے، اسی طرح نابالغ اولاد یا بالغ لیکن پاگل یا اپاہج اولاد کو اپنی زکوٰۃ نہیں دے سکتا، کیونکہ ان کا نفقہ باپ دادا پر واجب ہے، شوہر، بیوی کو زکوٰۃ نہ دے، کہ اس کا نفقہ تو شوہر پر واجب ہے۔

مذکورہ لوگوں کو مسکین یا فقیر کے مد سے زکوٰۃ نہ دی جائے، لیکن ان میں کوئی مقروض یا فی سبیل اللہ وغیرہ صفت میں داخل ہو تو اس وصف کی مناسبت سے جس پر نفقہ واجب ہے، وہ بھی انہیں زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ افراد کو دیا جانے والا نفقہ ناکافی ہو تو دیگر حضرات اپنی زکوٰۃ سے اس کا تعاون کر سکتے ہیں۔(الفقہ المنہجی ۶۵/۲)

بیوی کا شوہر کو زکوٰۃ دینا: اگر بیوی پر زکوٰۃ واجب ہو اور شوہر فقیر ہو تو اسے سنت ہے کہ اپنی زکوٰۃ شوہر کو دے۔اسی طرح اولاد غریب ہوں تو ان پر خرچ کرنا مستحب ہے، کیونکہ شوہر اور اولاد کا نفقہ بیوی اور ماں پر واجب نہیں ہے۔

احادیث : (۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ زینبؓ نے اپنے شوہر اور زیر پرورش یتیموں پر خرچ کرنے کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں، اس کو دوہرا اجر ہے، ایک رشتہ داری کا اور ایک صدقہ کا''۔ (صحیحین)

(۲) حضرت ام سلمہؓ نے اپنی یتیم اولاد پر خرچ کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان پر خرچ کرو تمہیں اس کا اجر ملے گا''۔ (صحیحین)

جن رشتہ داروں کا نفقہ واجب نہیں ان کو زکوٰۃ دینا : زکوٰۃ ادا کرنے والے کے ایسے رشتہ دار جن کا نفقہ اس پر لازم نہیں جیسے بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ اور ان کی اولاد وغیرہ یہ فقیر یا مسکین یا دیگر مستحقین زکوٰۃ میں داخل ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح وہ بڑے بیٹے جن کی آمدنی ان کے گزر بسر کے لئے ناکافی ہو ان کو بھی زکوٰۃ دے سکتا ہے۔ (کیونکہ ان کا نفقہ باپ پر نہیں ہے۔)

حدیث : آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''مسکین کو صدقہ دینا (صرف) صدقہ ہے، اور رشتہ دار کو دینا صدقہ اور صلہ رحمی دونوں ہے۔'' (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) (الفقہ المنہجی ۶۹/۲)

فصل - مستحقین کو زکوٰۃ کی تقسیم

زکوٰۃ ادا کرنے والے کے علم میں جو زکوٰۃ کا مستحق ہو، اسے بلا طلب زکوٰۃ دے، اور جو مستحق نہ ہو، اسے نہ دے، اگر اسے علم نہ ہو اور وہ ضعفِ اسلام، فقر، مسکنت، غازی یا مسافر ہونے کا دعویٰ کرے، تو بلا قسم اور بینہ (گواہوں) کے اسے سچا سمجھ کر زکوٰۃ دے، گرچہ وہ متہم ہو۔ کیونکہ ان امور پر گواہی پیش کرنا اس کے لئے مشکل ہو سکتا ہے۔ دیگر مستحقین استحقاق کا دعویٰ کریں تو گواہی ضروری ہے، کیونکہ بسہولت پیش کر سکتے ہیں۔ فقیر و مسکین اگر اہل و عیال کا دعویٰ کریں یا اس مال کے تلف ہونے کا دعویٰ کریں جس کا ہمیں علم تھا، تو اس پر بینہ کا مطالبہ ہوگا، کیونکہ بسہولت ممکن ہے۔

غازی اور مسافر زکوٰۃ لینے کے بعد غزوہ یا سفر میں نہ جائیں تو ان سے واپس لی جائے، کیونکہ استحقاق کی صفت پائی نہیں گئی۔ اگر جاکے واپس آجائیں اور غازی کی تنگی کے ساتھ خرچ کرنے کی وجہ سے کچھ بچ گیا ہو، یا باقاعدہ خرچ کے باوجود معمولی مقدار بچ گئی ہو تو اس سے بقیہ واپس نہ لے، ورنہ واپس لے، مسافر سے مطلقاً واپس لے۔ اسی طرح مکاتب زکوٰۃ کی رقم کے بغیر ہی آزاد ہو جائے یا مقروض بری ہو جائے تو ان سے زکوٰۃ کی رقم واپس لی جائے گی۔

استحقاق کی صفت کے لئے بینہ سے مراد دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا اس کی اطلاع دینا ہے۔ دیگر معاملات کی طرح قاضی کے پاس دعویٰ، انکار اور گواہی کا مطالبہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صفت استحقاق لوگوں میں مشہور و مستفیض ہو، یا مقروض کی قرض خواہ خود تصدیق کرے یا مکاتب کی آقا تصدیق کرے، تو یہ بھی کافی ہے، بینہ کی ضرورت نہیں۔

مقدار زکوٰۃ ۔ اگر فقیر یا مسکین میں تجارت یا کسی صنعت و حرفت کے ذریعہ گذر بسر کی صلاحیت نہ ہو، تو اس کو اتنی مقدار زکوٰۃ دی جائے کہ اس سے کوئی ایسی جائیداد جانور وغیرہ خرید سکے جس کی آمدنی پر اس کا گذر بسر ہو سکے اور آئندہ زکوٰۃ کا محتاج نہ رہے۔ فقیر و مسکین کے عمر غالب (تقریباً ساٹھ سال) کے مصارف کا اعتبار ہوگا۔ اس کے بعد جو ضرورت مند ہو، اسے ایک ایک سال کا خرچ دیتے رہیں۔ امام خود بھی جائیداد خرید کر اسے دے سکتا ہے۔ اسے مذکورہ جائیداد فروخت کرنا جائز اور صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں عام مصلحت ہے۔

جو کسی پیشہ اور حرفت کے ذریعہ کما سکتا ہو، اسے اتنی رقم دی جائے کہ متعلقہ پیشہ کے آلات خرید سکے اور جو تجارت کرسکتا ہو اسے متعلقہ تجارت کے اسباب خریدنے کے لئے اتنی رقم دی جائے کہ اس کا نفع اس کے گذر بسر کے لئے غالباً کفایت کرجائے۔

مکاتب اور مقروض جتنی رقم کی ادائیگی سے عاجز ہوں، اتنی رقم انہیں دے دی جائے (لیکن گزر چکا کہ اصلاح بین المسلمین کی خاطر جو مقروض ہے، اسے باوجود مالداری کے دی جائے) مسافر کو منزل تک یا اپنے مال تک پہنچنے کے مصارف دیئے جائیں۔ مدتِ مسافر سے زائد اقامت کے مصارف اور واپسی کا ارادہ نہ ہو تو واپسی کے مصارف نہ دیں۔

غازی کو اس کے آمد و رفت اور اقامت میں ضروریات یعنی اس کا اور اس کے اہل و عیال کا نفقہ ولباس، ہتھیار کی قیمت، گھوڑے پر قتال کرے تو گھوڑے کی قیمت وغیرہ دے۔ چاہے دورانِ غزوہ اس کی اقامت کی مدت طویل ہو کیونکہ اس کے باوجود وہ غازی ہی کہلائے گا، بخلاف مسافر کے۔

مذکورہ اشیاء کا غازی مالک بن جائیگا، لہٰذا واپس نہیں لیا جائے گا، بجز اس کے جو بچ جائے جیسا کہ گزر چکا۔ امام اس مد سے ہتھیار وغیرہ خرید کر وقف کردے تو یہ بھی جائز ہے، پھر اسے عاریتاً غازی کو دے یا کہیں سے کرایہ پر حاصل کر کے دے تو جائز ہے۔ بوقت ضرورت سفر اور زادِ راہ کے لئے سواری مہیا کی جائے گی، لیکن یہ واپسی پر لوٹائی جائے گی۔ جیسا کہ مسافر کو بھی بصورت ضرورت مہیا کی جائے گی اور پھر واپس لی جائے گی۔

مؤلفۃ القلوب کو امام یا مالک جتنا مناسب سمجھیں، زکوٰۃ دے۔

عامل کو اس کے خدمات کے مناسب معاوضہ دیا جائے۔ اگر زکوٰۃ میں اس کا حصہ معاوضہ سے زائد ہو تو بقیہ دیگر مستحقین پر صرف کیا جائے اور معاوضہ سے کم ہو تو مال زکوٰۃ سے یا مصالح کے مال سے اسکی تکمیل وتلافی کی جائے۔

کسی شخص میں استحقاقِ زکوٰۃ کی دو صفت ہوں، مثلاً فقیر مقروض ہوں تو کسی ایک ہی صفت کی بنیاد پر لے گا، دونوں صفت کے اعتبار سے نہ لے، جبکہ ایک زکوٰۃ سے لے (دو مختلف زکوٰتوں میں سے ایک سے فقر کی وجہ سے اور دوسرے سے قرض کی وجہ سے لے تو جائز ہے) بیک وقت دونوں صفتوں کے اعتبار سے لینا ممنوع ہے۔ اگر پہلے قرض کے مد سے لے کر قرض خواہ کو دے دیا تو اب دوبارہ فقیر کے مد سے لے سکتا ہے۔

زکوٰۃ کو میت کی تکفین یا مسجد کی تعمیر وغیرہ پر صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ کوئی اپنے مقروض کو اس شرط سے زکوٰۃ دے کہ وہ قرض میں واپس لوٹا دے تو یہ جائز نہیں ہے اور اس سے اداء قرض صحیح نہیں ہے دونوں بلا شرط اس کی نیت رکھیں تو حرج نہیں ہے، اگر مقروض سے کہا کہ تیرے ذمہ جو قرض ہے وہ تمہارے لئے زکوٰۃ سمجھو تو یہ کافی نہیں ہے، جب تک اس پر قبضہ کر کے پھر واپس نہ کردے۔ (الفتح مع الترشیح ص ۱۵۴)

فصل - اصناف کا استیعاب (تمام اصناف کو زکوٰۃ دینا وغیرہ)

بصورتِ امکان زکوٰۃ آیت میں مذکورہ آٹھوں اصناف پر تقسیم کرنا واجب ہے، یعنی جب امام تقسیم کرے اور یہ سارے اصناف پائے جائیں۔ آیت کا ظاہری تقاضہ یہی ہے کہ زکوٰۃ اور فطرہ دونوں کا یہی حکم ہے، لیکن کئی علماء نے صرف ایک کو فطرہ دینا کافی قرار دیا ہے۔

تمام اصناف موجود نہ ہوں مثلاً مالک خود تقسیم کرے تو عامل کا سوال نہیں یا امام ہی تقسیم کرے لیکن بعض اصناف ہی موجود ہوں تو

موجود تمام اصناف کو دے، کیونکہ معدوم (غیر موجود) کا کوئی حصہ نہیں۔ آج کل عام طور پر فقراء، مساکین، مقروض اور مسافر یہ چار صنف پائے جاتے ہیں۔ (بشری الکریم ۲/۵۸) اتفاقاً کوئی بھی صنف موجود نہ ہوں تو ان کے وجود تک زکوٰۃ محفوظ رکھے۔

امام کو ہر صنف کے تمام مستحق افراد تک زکوٰۃ پہنچانا واجب ہے، کیونکہ اس کے حق میں یہ مشکل نہیں ہے، اگر بستی میں مستحقین کی تعداد محدود ہو اور ان کا ضبط وشمار آسان ہو، اور زکوٰۃ ان سب کو ادا کرنے کی مقدار میں ہو، تو مالک کے ذمہ بھی تمام مستحقین تک پہنچانا واجب ہے۔ اور تعداد محدود نہ ہو یا محدود ہو لیکن مقدار زکوٰۃ کم ہو (اور تمام کے حوائج کو کافی نہ ہو) تو پھر صنف کے تین یا زائد افراد کو دینا واجب ہے۔ کیونکہ آیت میں مستحقین کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (اور عربی زبان میں جمع کا صیغہ کم از کم تین کے لئے مستعمل ہے) فی سبیل اللہ اور ابن سبیل جو جنس کے لئے ہے اور اس سے بھی یہی مراد ہے۔ مالک خود تقسیم کرے تو عامل کا سوال نہیں، ایک ہی عامل سے کام چل جائے تو وہ بھی کافی ہے۔ (تین ضروری نہیں)

امام یا مالک کسی صنف یا فرد کو (جسے دینا لازم تھا) نہ دے تو اس کا ضامن ہوگا۔ امام زکوٰۃ کے مال سے اس کا حق ادا کردے اور مالک اپنے ذاتی مال سے، مال کی تھوڑی مقدار دینا بھی کافی ہے۔

عامل کے علاوہ دیگر اصناف میں مساوات لازم ہے، چاہے بعض اصناف زیادہ محتاج ہوں (لیکن ایک صنف پر تقسیم کرنے کے بعد ان کا حصہ ابھی بچا ہو تو دوسرے ضرورت مند صنف پر صرف کرے) کیونکہ آیت میں مستحقین کو واو تشریک کے ساتھ جمع کیا گیا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر صنف کا مساوی حق ہو۔

ایک صنف کے مختلف مستحق افراد میں مساوات لازم نہیں ہے، کمی بیشی کرسکتا ہے۔ لیکن امام تقسیم کرے اور ان کی ضروریات یکساں ہوں تو ایسی صورت میں افراد کے درمیان بھی مساوات لازم ہے۔

جس بستی میں زکوٰۃ واجب ہو، وہاں مستحقین موجود ہوں تو مالک کو دوسری جگہ زکوٰۃ منتقل کرنا تا کہ وہاں کے مستحقین کو تقسیم کرنا جائز نہیں ہے اور اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ کیونکہ صحیحین کی روایت میں ہے ان کے امیروں سے زکوٰۃ لے کر انہیں کے فقراء کو لوٹائی جائے گی'' اور ہر بستی کے مستحقین کی نگاہ اور امیدیں اس بستی کے زکوٰۃ سے وابستہ ہوگی، اور یہ نقل ان کی وحشت کا باعث ہوگا۔

تنبیہ: کئی فقہاء شافعیہ مثلاً ابن الصلاح، ابن الفرکاح وغیرہ نے نقل زکوٰۃ کو جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اپنے ذاتی مسئلہ میں ان کے فتویٰ پر عمل کرے تو جائز ہے۔

اگرچہ امام شافعی کا اصل مسلک زکوٰۃ کے موجودہ تمام مستحقین کو دینے کا وجوب ہے، لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایک ہی صنف کو دینا بھی جائز ہے اور (فقہاء شوافع میں سے) ابن عجیل اور اصبحی نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے اور اکثر متاخرین نے اسے اختیار کیا ہے لہٰذا زکوٰۃ کے منتقل کرنے اور ایک ہی شخص کو زکوٰۃ ادا کرنے کے جواز میں ان حضرات کی تقلید جائز ہے۔ (بغیة المسترشدین ۱۰۵)

اصل مسلک شافعی تو یہ ہے کہ زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہ کرے، صرف امام اور حاکم اپنے زیر ولایت علاقوں میں منتقل کرسکتے ہیں، اسی طرح مذکورہ آٹھوں اصناف کو دینا بھی واجب ہے، لہٰذا مشقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن فقہاء کرام نے منتقل کرنے اور صرف تین یا ایک شخص کو زکوٰۃ دینے کی اجازت دی ہے، ان کی تقلید جائز ہے۔ کسی جگہ زکوٰۃ کے اظہار میں کسی ظالم سے خطرہ ہو تو منتقل کرنا مطلقاً جائز ہے۔ (فتاویٰ ابن زیاد بهامش البغیه ۱۱۰)

ابن عجیل سے منقول ہے کہ زکوٰۃ کے تین مسائل میں خلاف مسلک فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔ (۱) زکوٰۃ کو منتقل کرنا (۲) ایک ہی صنف

کوزکوٰۃ دینا(۳)ایک شخص کی زکوٰۃ کسی ایک ہی آدمی کو دینا۔(ترشیح المستفیدین ۱۵۵)

کسی شخص کی ۲۰ ربکریاں ایک بستی میں اور ۲۰ ربکریاں دوسری بستی میں ہوں تو کسی ایک جگہ ایک بکری ادا کرنا کراہت کے ساتھ کافی ہے، مال پر سال کی تکمیل کے وقت مال کسی صحرا، جنگل (غیر آباد علاقہ) یا سمندر میں ہو تو اس سے قریب ترین بستی کے مستحقین کوزکوٰۃ ادا کی جائے۔

کسی بستی میں مستحقین کی کوئی صنف (قسم) موجود نہ ہو، یا ان کو دینے کے بعد زکوٰۃ باقی ہو، تو اس سے قریب ترین بستی کے مستحقین پر صرف کی جائے۔ اگر بعض اصناف موجود نہ ہوں، یا بعض اصناف کو بقدر کفایت دینے کے بعد ان کا حصہ باقی ہو اور دیگر مستحقین کو اپنے حصہ سے بقدر کفایت نہ مل سکے تو دیگر اصناف کی بقیہ زکوٰۃ ان مستحقین پر صرف کرے، نقل نہ کرے، کیونکہ اصل استحقاق اسی بستی والوں کا ہے، لیکن دیگر مستحقین کو بقدر کفایت مل چکا ہے تو قریب ترین بستی کے انہیں اصناف پر صرف کرے۔

اصل مسلک کے اعتبار سے نقل زکوٰۃ میں یہ ساری تفصیلات اس وقت ہیں، جب کہ مالک خود تقسیم کرے۔ امام (مسلمان حاکم) کے حق میں چونکہ سارے فقراء اسلام ایک بستی کے فقراء کی طرح اور تمام زکوٰۃ ایک زکوٰۃ کی طرح ہے، اور اس کی ولایت (حکومت و گورنری) عام ہے، اس لئے بلا کسی شرط اور تفصیل کے وہ اپنی اور رعایا کی زکوٰۃ منتقل کرسکتا ہے۔

چونکہ زکوٰۃ کا قبول کرنا فرض کفایہ ہے۔ اس لئے سارے ہی مستحقین اگر قبول کرنے سے باز رہیں، تو ان سے قتال کیا جائے گا۔

عامل کے شرائط: گواہی کا اہل ہو، یعنی مسلمان، مکلف، عادل وغیرہ جو گواہ کے شرائط ہیں موجود ہوں۔ زکوٰۃ کے مسائل کا علم ہو کہ کس سے کتنا لینا ہے، کیونکہ یہ شرعی ولایت ہے، لہٰذا قاضی کی طرح یہ امور ضروری ہیں۔ اگر اسے بتادیا جائے کہ کس سے کتنا لینا ہے تو علم زکوٰۃ، آزادی اور مذکر ہونے کی شرط نہیں ہے۔ عامل ہاشمی یا مطلبی نہ ہو اور نہ ان کا مولیٰ، کیونکہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ نہ دی جائے۔ اگر امام نے انہیں عامل بنایا تو مال مصالح سے معاوضہ دے نہ کہ زکوٰۃ سے۔ کیونکہ یہ ان کے حق میں حرام ہے۔

امام کے لئے سنت ہے کہ زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے کسی مہینے کی تعیین کرے تاکہ مالک حضرات بروقت ادائیگی کے لئے اور مستحقین لینے کے لئے تیار رہیں۔ ماہ محرم تعیین سنت ہے، کیونکہ یہ شرعی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ یہ تعیین ان اموال میں ہے جس میں سال کی تکمیل کا اعتبار ہوتا ہے، جو کہ لوگوں کے حق میں مختلف ہوگا۔ جس کا سال متعینہ ماہ سے پہلے ہی مکمل ہو اور مستحقین موجود ہوں، اور کوئی عذر نہ ہو تو اسے فوراً ادا کرنا لازم ہے۔ متعینہ ماہ تک مؤخر کرنا جائز نہیں ہے۔

کھیتی باڑی اور پھلوں میں جب زکوٰۃ واجب ہوتی، اس وقت عامل کو روانہ کرے اور ایک ہی علاقہ میں اس وقت میں زیادہ تفاوت نہیں ہوتا۔ اغنیاء زکوٰۃ نہ دیں یا شک ہو تو امام کوزکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے عامل کا روانہ واجب ہے۔

جانوروں کو داغ لگانا: زکوٰۃ اور فئی کے جانوروں کو بطور علامت داغ لگانا مسنون ہے۔

حدیث: حضرت انسؓ آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو دستِ مبارک میں داغ لگانے کا آلہ تھا، جس سے صدقہ کے اونٹ کو داغ لگا رہے تھے۔(بخاری شریف)

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے جانوروں سے یہ ممتاز ہوگا اور گم ہونے کی صورت میں پانے والا لوٹا دے گا اور خود زکوٰۃ دینے والا اس کا مالک نہیں بنے گا، کیونکہ کسی چیز کو صدقہ کرنے کے بعد دوبارہ سامنے والے سے (خرید وغیرہ کے ذریعہ) اس کا مالک بننا مکروہ ہے، وراثت میں مل جائے تو کراہت نہیں ہے۔

داغ مضبوط اور ٹھوس ظاہری جگہ میں جہاں زیادہ بال نہ ہوں، دے تاکہ جلد نظر آ سکے اور جانوروں کے لئے زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔ بکریوں میں کان اور اونٹ گائے میں ران پر دینا بہتر ہے۔ بکریوں کو بالکل ہلکا، گائے کو اس سے بڑھ کر اور اونٹ کو اس سے بھی بڑھ کر داغ دے۔ زکوٰۃ اور فئی کے علاوہ جانوروں کو داغ دینا مباح ہے، نہ تو مندوب ہے اور نہ ہی مکروہ۔ گھوڑا، خچر، گدھا اور ہاتھی بھی داغ کے مسئلہ میں ان مویشیوں کی طرح ہیں، محل داغ میں اونٹ وگائے کا حکم ہے۔

چہرہ پر داغ لگانا حرام ہے، کیونکہ مسلم شریف کی حدیث میں آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ ایک گدھا جس کے چہرہ پر داغ لگا تھا گذرا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ اسے داغ لگانے والے پر لعنت بھیجے" (مسلم شریف)

زکوٰۃ کے مویشیوں کے داغ میں زکوٰۃ یا صدقہ یا طھرہ (پاکی) یا اللہ (اللہ کے لئے) لکھے "لِلّٰہ لکھنا بہتر اور بابرکت ہے۔

بطور علامت انسان کو داغ لگانا حرام ہے۔ معتبر واقف حضرات کے مشوروں سے بوقت احتیاج (علاج کے لئے) آدمی اور دیگر جانوروں کو داغ لگانا جائز ہے۔ انسان اور دیگر جانوروں کے چہرہ پر مارنا (چاہے ہلکی مار ہو) حرام ہے۔

کمسن ماکول (جس کا گوشت حلال ہے) جانور کو گوشت کی بہتر کے لئے خصی کر سکتے ہیں، دیگر جانوروں کو (یعنی بڑی عمر کے یا جن کا گوشت حرام ہے) خصی کرنا حرام ہے۔ جانوروں میں جفتی کرانا جبکہ مضر نہ ہو جائز ہے۔ حدیث میں گھوڑے اور گدھے کے درمیان جفتی کی ممانعت کراہت کے لئے ہے تاکہ گھوڑوں کی قلت نہ ہو۔

زکوٰۃ میں قیمت کی ادائیگی:

تجارت کی زکوٰۃ میں قیمت کا ادا کرنا اصل ہے، جیسا کہ گزر چکا۔

دیگر اشیاء میں قیمت کا ادا کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ زکوٰۃ اسی چیز میں واجب ہوتی ہے لہٰذا (عموماً) اسی میں سے دینا لازم ہے (جس کی تفصیل گزر چکی) لیکن امام بلقینیؒ نے سونا چاندی کی زکوٰۃ رائج سکوں میں نکالنے کی اجازت دی ہے، لہٰذا حالات اور فقراء کے فائدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے اس فتویٰ پر عمل کرنے میں حرج نہیں۔ کیونکہ ان کا شمار اہل تخریج وترجیح علماء میں ہوتا ہے۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۱۲، ترشیح ص ۱۰۵)

نفلی صدقہ (خیرات)

آیت: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ "(آل عمران۔ ۹۲) تم خیر کامل (یعنی ثواب عظیم) کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی (بہت) پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے۔"

۲) اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲۶۲)

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس جا کر اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ لوگ مغموم ہوں گے۔"

احادیث: (۱) "جو ایک کھجور کے برابر پاک اور حلال مال سے صدقہ کرے، اور اللہ تعالیٰ حلال کے علاوہ قبول نہیں کرتے، تو اللہ

اسے اپنے یمین (دائیں) سے قبول کرتے ہیں، پھر اس کی ایسی پرورش (نگہداشت) کرتے ہیں، جیسا تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے چھوٹے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ (کھجور) پہاڑ کے مانند ہو جاتا ہے۔" (متفق علیه)

۲) صدقہ کی وجہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی۔(مسلم شریف) (یہاں برکت اور آخرت میں بے انتہا ثواب ملے گا)

۳) اے مسلمان خواتین! ہرگز کوئی پڑوسن اپنے پڑوسن کے حق میں (ہدیہ لینے اور دینے میں) حقارت کا جذبہ نہ رکھے، چاہے بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو" (یعنی معمولی سی چیز جو بھی میسر ہو اس کا لین دین رکھیں) (متفق علیه)

۴) "کسی بھی نیکی اور حسن سلوک کو ہرگز حقیر نہ سمجھو، گرچہ اپنے (مسلمان) بھائی سے بشاشت اور خندہ پیشانی سے ملاقات ہی کیوں نہ ہو۔" (مسلم شریف)

۵) "اے لوگو! سلام کو رواج دو اور کھانا کھلاؤ اور صلہ رحمی کرو اور رات میں لوگ جب سو رہے ہوں نماز پڑھو، بڑی سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔" (ترمذی، ابن ماجه، دارمی)

۶) "صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔" (ترمذی)

۷) "ایک مسلمان اللہ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اپنے اہل خانہ پر جو صرف کرے، اس کے لئے صدقہ (کا ثواب) ہے۔" (متفق علیه)

۸) "جب سالن پکاؤ تو پانی کچھ زیادہ ڈال دو، اور پڑوسیوں کا بھی خیال رکھو۔" (مسلم شریف)

۹) حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ اپنا صدقہ دیا ہوا گھوڑا خریدنا چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنا صدقہ واپس نہ لو کیونکہ صدقہ واپس لینے والا قئے کر کے پھر اسے چاٹنے والے کتے کی طرح ہے۔" (متفق علیه)

۱۰) "سائل کو کچھ نہ کچھ دے کر ہی واپس کرو، چاہے ایک جلا ہوا کھر ہی ہو" (جو بھی میسر ہو دے دو) (مالک، نسائی، ترمذی)

۱۱) "مسکین کو صدقہ صدقہ ہے اور رشتہ دار کو صدقہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں ہے۔" (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجه)

۱۲) آپ ﷺ کا فرمان ہے "اگر میرے پاس احد پہاڑی کے مثل سونا ہو تو مجھے یہ بات پسند آتی کہ تین رات تک اس میں سے کچھ باقی نہ رہے، سوائے اس مقدار کے جو قرض کی ادائیگی کے لئے سنبھال رکھوں۔" (بخاری)

۱۳) "اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے "اے ابن آدم (راہِ خدا میں) خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا۔" (متفق علیه)

۱۴) "اے ابن آدم جو کچھ بچ رہے (زائد ہو) اس کا خرچ کرنا تیرے حق میں بہتر ہے، اور روکے رکھنا بدتر ہے، البتہ بقدر کفاف (جو اپنی ضروریات کے بقدر اور سوال سے بچانے والا ہو) روکنے پر کوئی ملامت نہیں (خرچ کرنے میں) اپنے زیر کفالت افراد (کنبہ) سے پہل کرو۔" (مسلم شریف)

۱۵) رب کعبہ کی قسم وہ لوگ بڑے خسارہ اور نقصان میں ہیں جو بڑے مالدار ہیں، سوائے ان کے جو آگے پیچھے دائیں بائیں (جو بھی راہِ خیر میں صرف کے مواقع ہوں اس میں) صرف کرتے رہیں، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔" (متفق علیه)

۱۶) "جو لوگوں سے مال مانگے اپنی دولت بڑھانے کے لئے تو یہ (جہنم کے) آگ کا شعلہ مانگ رہا ہے، چاہے کم مانگے یا زیادہ" (مسلم شریف)

۱۷) ''آدمی لوگوں سے (بھیک) مانگتا رہتا ہے، یہاں تک کہ قیامت میں اس حال میں آئیگا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔'' (وہاں بڑی ذلت ورسوائی کا سامنا ہوگا) (متفق علیه) ، مشکوٰۃ المصابیح ۱/ ۱۶۲-۱۷۱)

صدقہ کی فضیلت میں بکثرت آیات واحادیث وارد ہیں، اس لئے یہ سنت مؤکدہ ہے، کسی عارض کی وجہ سے حرام بھی ہو جائے گا، جیسے یہ معلوم ہو کہ لینے والا اسے گناہ پر صرف کرے گا تو اسے دینا حرام ہے۔

مال یا پیشہ کی وجہ سے جو امیر ہو اسے بھی صدقہ حلال ہے، اور دینے والے کو ثواب ملے گا۔ کیونکہ صحیحین کی حدیث میں امیر کو صدقہ دینے کا ذکر موجود ہے اور اس کا یہ فائدہ مذکورہ ہے کہ شاید اسے عبرت حاصل ہو اور خود بھی اللہ کے راہ میں خرچ کرے، لیکن امیر کو صدقہ لینے کے درپے ہونا مکروہ ہے اور اس سے دور رہنا مستحب ہے۔

کسی شخص میں فقر، صلاح ونیکی، نسب یا علم وغیرہ کسی وصف کی موجودگی کا گمان کرتے ہوئے اس کی وجہ سے اسے صدقہ، ہدیہ، وصیت، ہبہ، نذر یا وقف کا مال دیا جائے، لیکن حقیقتاً اس میں وہ وصف نہ ہو، یا کسی میں ایسا مخفی وصف ہو کہ جس کا علم ہوتا تو اسے نہ دیا جاتا تو ان تمام صورتوں میں اسے لینا حرام ہے۔ کسی صفت کا گمان کر کے دے اور حقیقتاً ایسا نہ ہو، اور حقیقت معلوم ہوتی تو نہ دیا ہوتا، تو اس صورت میں لینے کے باوجود وہ اس کا مالک نہیں بنے گا۔ امیر شخص کو سوال کرنا حرام ہے، سوال کی وجہ سے جو ملے اسے لینا بھی حرام ہے، گرچہ لینے کی صورت میں وہ مالک بن جائے، لیکن اپنی غریبی اور فقر وفاقہ کا اظہار کیا اور سامنے والے نے اسی بنیاد پر دیا ہے، تو مالک نہ بنے گا۔

شرح مسلم وغیرہ میں ہے کہ کسی سے مانگنے میں اپنے آپ کو ذلیل کرے یا بہت...... اور اصرار سے مانگے اور اس طرح مانگے کہ سامنے والے کو ایذاء وتکلیف ہو تو بالاتفاق حرام ہے، چاہے مانگنے والا محتاج ہو۔ (بالکل اضطراری اور مجبوری کی شکل ہو تو جائز ہے) جس کو مانگنا جائز ہو اس سے معلوم ہوا کہ دینے والا اس سے یا دیگر حاضرین سے حیا وشرم کی وجہ سے دے رہا ہے، ورنہ دیا نہ ہوتا تو احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اس کا لینا حرام ہے اور واپس لوٹانا لازم ہے۔

صدقہ کے حلال ہونے میں شک ہو، یا لینے میں ہتک مروت ہو یا خست وذلت کا باعث ہو، یا یہ گمان ہو کہ کسی غرض ومقصد سے دے رہا ہے (چاہے اخروی مقصد ہو) تو قبول نہ کرنا بہتر ہے۔ کسی کے مال میں حرام بھی ہو، بھلے کثیر مقدار میں، اس سے صدقہ لینا حرام نہیں ہے۔ البتہ جو چیز دے رہا ہے وہی حرام ہے تو منع ہے۔ اللہ کے وجہ (چہرہ) کے وسیلہ سے سوال اور سفارش مکروہ ہے۔ (ابوداود کی روایت میں ایسے سوال سے منع کیا گیا ہے) ایسے سوال وسفارش کو رد کرنا بھی مکروہ ہے۔ ایک غریب شخص اپنے ایک سالہ ضروریات کے لئے سوال کرسکتا ہے، لیکن فی الحال اپنا ضرورت مند ہونا ظاہر کرے تو سوال حرام ہے۔ معلوم ہو تو اسے دینا حرام نہیں ہے۔ دوست واحباب آپس میں بے تکلفی کی وجہ سے جو مطالبہ کرتے ہیں اور لیتے دیتے ہیں باوجود مالداری کے یہ حرام نہیں ہے۔

فتاویٰ السیوطی میں ہے کہ مسجد میں مانگنا مکروہ تنزیہہ ہے ''مصرذی روح (کے ساتھ حسن سلوک) میں ثواب ہے۔''

جہراً اور علانیہ صدقہ دینے کے بجائے سراً اور مخفی دینا، غیر رمضان کے بجائے ماہِ رمضان میں دینا، اوروں کے بجائے رشتہ دار، بیوی، دوست پھر پڑوسی (جو قریب ہو وہ مقدم ہوگا) کو دینا افضل ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث سے یہ فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ظاہری اموال کی زکوٰۃ علانیہ دینا افضل ہے۔

ماہِ رمضان میں، اپنے حاجتوں کے وقت، سورج گہن اور چاند گہن کے وقت، بیماری کے وقت، سفر کے وقت، حج میں، جہاد میں اور فاضل وقت اور مقامات جیسے عشرہ ذوالحجہ، جمعہ، رمضان کا آخری عشرہ اور ایام عید نیز مکہ ومدینہ میں صدقہ کی کثرت سنت ہے۔

اپنے اور زیر کفالت افراد کے ضروریات کا صدقہ حرام ہے، اگر خود فقر و فاقہ پر صبر کی ہمت رکھتا ہو تو اپنی ضروریات کا صدقہ وایثار حرام نہیں ہے۔ایک انصاری جوڑے نے اپنے آپ کو بھوکا رکھ کر مہمان کو کھلایا تو اس کی تعریف میں قرآن پاک کی آیت ''وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ''نازل ہوئی۔(ترجمہ آیت) اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں، اگر چہ ان پر فاقہ ہی ہو۔''

اگر قرض ہو تو قرض کی ادائیگی کی رقم صدقہ کرنا حرام ہے، جبکہ کہیں اور سے بظاہر اس کی ادائیگی کی امید نہ ہو، کیونکہ واجب سنت پر مقدم ہے۔قرض کی ادائیگی کی کوئی اور صورت ہو تو صدقہ کرنا حرام نہیں ہے۔

آیت : يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔قُلِ الْعَفْوَ '' (التوبہ) ترجمہ ''لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو۔''

اپنے اور زیر کفالت افراد کے ایک دن رات کے مصارف وضروریات اور متعلقہ موسم کے پوشاک اور اداءِ قرض کی رقم سے زائد مقدار کا صدقہ کر دینا سنت ہے، جبکہ محتاجگی اور تنگی پر صبر ہو سکتا ہو۔ ورنہ مکروہ ہے۔(اسی تفصیل پر بظاہر مختلف ومتعارض روایات کو محمول کیا جائے گا)

اپنے ایک سالہ ضروریات سے زائد مقدار کو روکے رکھنا مکروہ ہے۔ کسی بھی گناہ کے سرزد ہونے کے بعد صدقہ کرنا سنت ہے۔ نیا کپڑا پہننے والے کے لئے پرانا صدقہ کرنا سنت ہے۔

ایک حدیث میں ہے۔''بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی بے نیازی کے بعد ہو۔ (متفق علیہ، ابوداؤد، و صححہ الحاکم)

ترمذی کی ایک صحیح روایت میں ہے کہ (ایک موقع پر) ''حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنا سارا مال صدقہ کر دیا۔'' اپنے ضروریات سے زائد میں سے بعض کا صدقہ مطلقاً مسنون ہے۔لیکن بڑی مقدار ہو جو کل مال کے قریب ہو تو مذکورہ تفصیل کے مطابق حکم ہوگا۔ جہاں پانی کی ضرورت ہو، وہاں پانی کا صدقہ (کنویں یا نل کے انتظام کے ذریعہ یا کسی اور طرح) افضل ہے۔ورنہ پھر کھانے کا صدقہ۔ ہر دن جو بھی میسر ہو، صدقہ کرنا سنت ہے۔ گر چہ قلیل مقدار ہی ہو، اس سے عار کرنے اور رکنے کی ضرورت نہیں۔ (ترشیح)

مَنٌّ (احسان جتلانا) :- آیت : لَاتُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ ۲۶۴) تم احسان جتلا کر یا ایذاء دے کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو۔''

حدیث : ''تین لوگوں سے اللہ نہ گفتگو کریں گے اور نہ ان کی طرف نظر (التفات وکرم) کریں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(۱) کپڑا (ٹخنہ سے نیچے) لٹکانے والا (۲) احسان جتلانے والا (۳) جھوٹی قسم کے ذریعہ سامان فروخت کرنے والا۔(مسلم شریف)

صدقہ کر کے اس پر احسان جتلانا حرام اور ثواب کو ختم کرنے والا ہے۔اپنے صدقہ کا اظہار وتذکرہ، شکر، دعا، خدمت، تعظیم، مجلس میں تقدیم اور اپنی اتباع کے ذریعہ سامنے والے سے (جس کو صدقہ کیا ہے) بدلہ کی خواہش اور تمنا منّ (احسان جتلانا) میں داخل ہے۔(ترشیح)

جس کے پاس حلال وحرام دونوں مال ہوں، اس سے (صدقہ وغیرہ) لینا مکروہ ہے۔ شبہ کی قلت وکثرت کے اعتبار سے کراہت کم وبیش ہوگی۔ جو چیز لے رہا ہے اس کا حرام ہونا معلوم ہو تو لینا حرام ہے۔سنت ہے کہ اپنی پسندیدہ چیز، بشاشت اور خوشدلی سے، اپنی کمائی سے، بسم اللہ کہہ کر اور محض اللہ کی رضا جوئی میں صدقہ کرے، اگر نعمت کے شکر یا مصیبت کے ٹالنے کی نیت سے دے

تو جائز ہے۔(ترشیح :۱۵۸)

بہتر چیز ہوتے ہوئے گھٹیا اور ردی کا صدقہ کرنا مکروہ ہے۔ پرانے کپڑے کا صدقہ کرنا مکروہ نہیں ہے۔ قلیل مقدار صدقہ کرنے کو ناپسند کرنے اور اس سے رُکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو اللہ تعالیٰ قبول کرے وہ کثیر ہے۔ اور قرآن میں ہے" فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَّرَهٗ ۔سورہ زلزال۔ یعنی جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور حدیث میں ہے" جہنم کی آگ سے اپنی حفاظت (کی کوشش کرو) گرچہ ایک ٹکڑا کھجور (صدقہ کرکے) کیوں نہ ہو۔" (بخاری) (بشری الکریم ۲/۶۳)

کتاب الصوم (روزہ کا بیان)

ارشاد باری ہے۔ يٰاَيُّهَاالَّذِينَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔اَيَّاماً مَّعْدُوْدَاتٍ " (البقرہ ۔ ۱۸۳۔۱۸۴) اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہے)

پھر آگے فرمایا" شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَ مَنْ كَانَ مَرِيضاً اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَر "(البقرہ ۔ ۱۸۵) (وہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے) ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے۔ جس کا ایک وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالۃ ہے منجملہ ان کتب کے جو کہ ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں۔ سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے اور جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کرکے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے۔

کچھ آگے ارشاد فرمایا" وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ "(البقرہ ۔۱۸۷) اور کھاؤ اور پیؤ اس وقت تک کہ تم کو سفید خط (کہ وہ نور ہے) صبح (صادق) کا جبکہ وہ بالکل شروع ہی شروع میں طلوع ہوتی ہے) متمیز ہو جائے سیاہ خط سے (کہ عبادت ہے تاریکی کی اس حد فاصل سے جو کہ خطِ نور صبح سے ملا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مراد متمیز ہونے سے یہ کہ صبح صادق طلوع ہو جائے) پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔"(من بیان القرآن)

احادیث : (۱) ماہ رمضان شروع ہو تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین مقید کردیئے جاتے ہیں" (متفق علیہ)

(۲) جنت کے آٹھ دروازے ہیں جس میں ایک دروازے کا نام" الرَّیان" ہے اس میں صرف روزہ دار داخل ہونگے۔ (متفق علیہ)

(۳) جو ماہ رمضان میں ایمان (اخلاص نیت اور تصدیق کامل) اور ثواب کی توقع و امید کی ساتھ روزہ رکھے، اس کے گذشتہ گناہ

معاف ہوجائیں گے اور جو رمضان میں ایمان اور ثواب کی امید کے ساتھ قیام کرے (نماز وعبادات انجام دے) اس کے گذشتہ خطائیں معاف ہونگی۔ اور جو شب قدر میں ایمان اور بہ نیت ثواب قیام کرے اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوں گے۔ (متفق علیہ) (مراد یہاں حقوق اللہ سے متعلق صغیرہ گناہ ہیں۔)

(۴) آپ ﷺ نے فرمایا "ابن آدم کا ہر عمل دو چند ہوتا ہے، ایک نیکی دس گناہ سے ۷۰۰ گنا تک دو چند ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سوائے روزہ کے، کہ وہ تو میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، (روزہ دار) میری خاطر اپنی خواہشات اور کھانے کو ترک کرتا ہے، روزہ دار کو دو خوشی ملے گی، ایک افطار کے وقت اور دوسری اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت، اور روزہ دار کے منہ کی بد بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی بہتر ہے اور روزہ ڈھال ہے، تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو فحش اور قبیح گفتگو نہ کرے، اور چیخے چلائے نہیں، اگر کوئی اسے برا بھلا کہے یا اس سے لڑے تو یہ کہہ دے میں روزہ دار ہوں" (متفق علیہ)

روزہ کے مقاصد اور زندگی پر اس کے اثرات

(از ارکان اربعہ سیدابو الحسن علی ندوی)

امام غزالیؒ نے اپنے مخصوص انداز بیان میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے "روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاق الٰہیہ میں سے ایک اخلاق کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے جس کو "صمدیت" کہتے ہیں۔ وہ امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے، اس لئے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں، اور انسان کا درجہ بھی بہائم سے بلند ہے، نیز خواہشات کے مقابلہ کے لئے اس کو عقل وتمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے۔ البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پالیتی ہیں اور اس کو ان سے آزاد ہونے کے لئے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے چنانچہ جب وہ اپنے خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے اور جانوروں کے ریوڑ سے جا ملتا ہے اور جب اپنی خواہشات پر غالب آتا ہے تو اعلیٰ علیین اور فرشتوں کے آفاق تک پہنچ جاتا ہے۔" (احیاء العلوم ج ۱ ص ۲۱۲)۔

علامہ ابن قیمؒ اسی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفسِ انسانی خواہشات اور عادتوں کے شکنجہ سے آزاد ہو سکے، اس کے شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو اور اس کے ذریعہ سے وہ سعادت ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کر سکے اور حیات ابدی کے حصول کے لئے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے، بھوک اور پیاس سے اس کی ہوس کی تیزی اور شہوت کی حدت میں تخفیف ہو اور یہ بات یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں وہ شیطان کے راستوں کو اس پر تنگ کر دے اور اعضاء وجوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے جن میں اس کی دنیا وآخرت دونوں کا نقصان ہے اس لحاظ سے یہ اہل تقوی کی لگام، مجاہدین کی ڈھال اور ابرار و مقربین کی ریاضت ہے۔ روزہ جوارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے۔ فاسد مادہ کے جمع ہو جانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ جو چیزیں مانع صحت ہیں ان کو خارج کر دیتا ہے۔ اور اعضاء وجوارح میں جو خرابیاں ہوا وہوس کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں وہ اس سے دفع ہوتی ہیں، وہ صحت کے لئے مفید اور تقوی کی زندگی اختیار کرنے میں بہت مدد ومعاون ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **ترجمہ**۔ "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں۔

عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ" (سورہ بقرہ ۔ ۱۸۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" الصوم جُنة " (روزہ ڈھال ہے) چنانچہ ایسے شخص کو جو نکاح کا خواہشمند ہو اور استطاعت نہ رکھتا ہو روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کو اس کا تریاق قرار دیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ روزہ کے مصالح اور فوائد چونکہ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کی رو سے مسلم تھے، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی حفاظت کی خاطر محض اپنی رحمت اور احسان سے فرض کیا ہے" (زاد المعاد ج ۱/ ص ۱۵۲)

اسی سلسلہ کلام میں آگے ایک جگہ لکھتے ہیں۔" چونکہ قلب کی اصلاح اور استقامت حال، سلوک الی اللہ اور جمعیت باطنی پر منحصر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف بالکلیہ توجہ وانابت پر اس کا دارومدار ہے، اس لئے پراگندہ خاطری اس کے حق میں سخت مضر ہے۔ کھانے پینے کی زائد مقدار، لوگوں سے زیادہ میل جول، ضرورت سے زیادہ گفتگو وہ چیزیں ہیں جن سے جمعیت باطنی میں فرق آتا ہے، اور انسان اللہ تعالیٰ سے منقطع ہو کر مختلف راستوں پر بھٹکنے لگتا ہے، بعض وقت محض اسی وجہ سے اس کی راہ کھوئی ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی مقتضی تھی کہ اپنے بندوں پر روزہ فرض کرے اور اس کے ذریعہ کھانوں کی زائد مقدار اور خواہشات کے فضلہ کا ازالہ وتنقیہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے آدمی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے۔ وہ اس سے دنیا وآخرت دونوں جگہ فائدہ اٹھا سکے۔ اور اس کی عارضی اور مستقل کسی مصلحت کو نقصان نہ پہونچے" (زاد المعاد ج ۱/ ص ۱۶۸) (ارکان اربعہ ص ۲۳۲۔۲۳۵)

رمضان کے روزے ہجرت کے دوسرے سال ماہ شعبان میں فرض ہوئے ماہ رمضان افضل ترین ماہ ہے۔ اور یوم عرفہ سال کے تمام ایام میں سب سے افضل دن ہے۔ آپ ﷺ نے ۹ ر سال رمضان کے روزے رکھے جس میں ایک یا دو سال کامل (۳۰ دن) تھے اور بقیہ ناقص (۲۹ ر دن) اس میں امت کے لئے تسلی ہے کہ ایام سے قطع نظر نفس رمضان سے متعلقہ فضائل میں کامل وناقص مساوی ہے۔ البتہ تیسویں دن کے واجب روزے کا ثواب اور سحری وافطار کے مستحبات کا ثواب ناقص کے مقابلہ میں زائد ہے۔ روزے کی فرضیت اور اسلام کا اہم رکن ہونا ایسی قطعی اور واضح حقیقت ہے کہ اس کا منکر کافر ہو جائے گا۔

رمضان کے روزوں کی حکمت:

(۱) حسن بصریؒ فرماتے ہیں:" جنت الفردوس کا ولیمہ تناول کرنے کے لئے اپنے آپ کو بھوکا رکھو"

(۲) بھوک کو لازم قرار دیا تا کہ بھوکوں پر رحم کریں۔ (۳) نیزہ اور کمان وغیرہ ٹیڑھی اشیاء کو آگ میں تپا کر سیدھا کیا جاتا ہے، لہٰذا اطاعت ربانی سے کجی اختیار کرنے اور منہ موڑنے والے نفوس کو سیدھا کرنے اور اصلاح کے لئے بھوک کی آگ اور بھٹی میں تپانے کا حکم دیا، حقیقی آگ کا اللہ نے اپنے فضل وکرم سے حکم نہ دیا۔ (۴) فرشتوں نے مومنین کے گناہوں کی کثرت کی شکایت کی۔ جب رمضان کے روزے رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔" اگر خارج رمضان میری نافرمانی کی تو رمضان میں میری خاطر مشقتوں کو برداشت کیا لہٰذا فرشتوں نے شکایت کے بجائے سفارش شروع کی قرآن میں ان کے الفاظ نقل ہوئے۔ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوا وَ اتَّبَعُوا سَبِيلَكَ ترجمہ:" سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنہوں نے (شرک وکفر سے) توبہ کر لی ہے اور آپ کے رستے پر چلتے ہیں۔" (المومن آیت ۷)

(۵) روزے کی برکت سے واجب اور سنت زہد حاصل ہوتا ہے۔

(۶) خیر خواہ طبیب اور معالج بیماری میں پرہیز کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا اللہ نے گناہوں کے بیمار پر نرمی برتتے ہوئے پرہیز (بھوک پیاس وغیرہ) کا حکم دیا۔

(۷) شیطان انسان کا دشمن ہے جو مستقل اس کے درپے آزار و ہلاکت ہے، لہٰذا ایک مومن کا کام یہ ہے کہ بھوکا پیاسا رہ کر اس کے راستوں کو بند کر دے، یہی مفہوم ہے اس فرمان کا کہ شیطان انسانی بدن میں خون کی طرح چکر لگاتا ہے لہٰذا اس کی گذرگاہ کو بھوک و پیاس سے تنگ کر دو۔

لفظ ''صوم'' (روزہ) کا مفہوم عربی زبان میں روکنا ہے۔ اور شرعی مفہوم ہے'' پیٹ، شرمگاہ اور منہ کی شہوت کو اللہ کی اطاعت میں نیت کے ساتھ قبل فجر سے غروب تک روکنا۔

رمضان کا روزہ ان تین باتوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے سے واجب ہوگا۔(۱) شعبان کے ۳۰ دن مکمل ہو۔(۲) کسی کو ۲۹؍ کو چاند نظر آئے تو اسے روزہ رکھنا واجب ہے چاہے وہ فاسق ہو، آئنہ وغیرہ کے واسطہ سے نظر آنے کا اعتبار نہ ہوگا منجم اور حاسب کی بات کا بھی اعتبار نہ ہوگا۔(۳) جسے خود نظر نہ آئے اس کے حق میں ایک عادل گواہ کے ذریعہ چاند کی رویت کا ثبوت ہونا چاہئے۔

احادیث (۱) '' چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید مناؤ اور بادل وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آسکے تو شعبان کی گنتی ۳۰؍ تک مکمل کرو'' (بخاری و مسلم)

(۲) '' حضرت ابن عمرؓ نے آپ ﷺ کو یہ خبر دی کہ انہوں نے چاند دیکھا تو آپ ﷺ نے بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ کا حکم دیا'' (ابوداود و صححہ ابن حبان)

(۳) ایک اعرابی نے آپ ﷺ کے روبرو چاند کی گواہی دی تو آپ ﷺ نے لوگوں کو روزہ کا حکم دیا (ابوداود، ترمذی ،نسائی ، ابن ماجہ ، ابن خزیمہ ، ابن حبان دار قطنی اور بیہقی)

(اکثر مسائل میں اور دیگر مہینوں کے ثبوت کے لئے دو گواہ ضروری ہیں) لیکن رمضان کے لئے احتیاطاً شریعت نے ایک عادل گواہ بھی کافی قرار دیا ہے گواہ کے لئے جو شرائط ہیں اس کا پایا جانا ضروری ہے، لہٰذا فاسق، غلام اور عورت کی گواہی کافی نہیں ہے، لیکن اس کے اندرونی تقویٰ کا گہرائی سے علم ہونا ضروری نہیں ہے ظاہری عدالت کافی ہے، یعنی بظاہر جو متقی ہو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

رمضان کی گواہی شہادت حسبہ ہے، اسلئے پہلے کسی دعوی کا پایا جانا ضروری نہیں ہے، البتہ کسی ایسے قاضی کے سامنے گواہی ہو جس کے احکام اور فیصلوں کا نفاذ ہوتا ہو۔ امام بغویؒ اور بعض دیگر علماء نے کہا کہ کسی کو ایسا شخص جو اس کے نزدیک معتمد اور معتبر ہو رویت ہلال کی خبر دے اور وہ اسے سچا یقین کرے تو اسے روزہ رکھنا واجب ہے، چاہے وہ قاضی کے سامنے نہ کہے۔ اسی طرح فاسق، غلام یا عورت خبر دے اور یہ ان کی تصدیق کرے تو اسے روزہ واجب ہے۔

شہادت :

شہادت میں یہ کہنا کافی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے چاند دیکھا۔ ایک ہی گواہ سے رمضان کا ثبوت صرف روزے اور اس کے تابع امور جیسے تراویح کے حق میں ہوگا۔ قرض کی ادائیگی کا وقت پہلا رمضان مقرر ہو یا چاند پر طلاق معلق ہو تو ان امور کے لئے ایک گواہ سے ثابت ہونا کافی نہیں۔ (بلکہ دو گواہ ضروری ہیں) لیکن خود گواہ سے متعلق ہو تو کافی ہے کیونکہ وہ خود اعتراف کر رہا ہے کہ رمضان شروع ہو چکا۔

ایک یا دو عادل گواہ کی وجہ سے روزہ شروع کرنے کے بعد ۳۰؍ دن مکمل ہو جائیں اور شوال کا چاند نظر نہ بھی آئے اور بدلی وغیرہ نہ

ہو، تب بھی دوسرے دن عید منائیں گے، کیونکہ ۳۰؍دن گذرنے سے مہینہ مکمل ہوتا ہے۔ یہاں ایک گواہ سے عید منانے کا اشکال وارد نہ ہوگا، کیونکہ ایک چیز مقصوداً ثابت نہ بھی ہو، تو ضمناً ثابت ہو جاتی ہے۔

اتحاد و اختلاف مطالع : ایک جگہ چاند نظر آئے تو اس سے قریب علاقوں میں بھی اسے تسلیم کیا جائیگا، نہ کہ دور دراز علاقوں میں۔قرب وبعد کا دارومدار اختلاف مطالع پر ہے۔جن دو مقامات کے طلوع شمس یا طلوع فجر یا طلوع کواکب (ستارے) اور ان کے غروب کے اوقات مختلف ہوں ان کے درمیان اختلاف مطالع ہوگا ورنہ اتحاد مطالع بعضوں نے کہا کہ دو مقامات اتنے فاصلہ پر ہوں کہ ایک جگہ چاند کی رویت کے باوجود غالباً دوسری جگہ چاند نظر نہ آئے ہوتو ان میں اختلاف مطالع ہوگا اور یہ بعید شمار ہونگے۔لہٰذا ایک جگہ نظر آنے سے دوسری جگہ ثابت نہ ہوگا۔جیسا کہ طلوع فجر وطلوع شمس اور غروب (اور اس کی وجہ سے نماز کے اوقات اور سحری وافطار کے اوقات میں) قریب و بعید علاقہ میں فرق ہوتا ہے۔اگر مشرقی علاقہ میں چاند نظر آئے تو اسی جہت (سمت) اور عرض میں مغربی علاقہ میں نظر آنا لازمی ہے۔(اگر مطالع کے اتفاق و اختلاف میں شک ہو، تو اختلاف پر محمول کریں گے۔تاج تبریزی فرماتے ہیں کہ ۲۴؍فرسخ (۷۲) میل سے کم میں اختلاف مطالع ممکن نہیں۔نہایۃ ۳؍ ۱۵۶)

حدیث : حضرت کریب فرماتے ہیں" میں نے شام میں (رمضان کا) چاند دیکھا پھر مدینہ منورہ آیا تو حضرت ابن عباسؓ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے چاند کب دیکھا، میں نے کہا جمعہ کی شب میں، دریافت فرمایا۔کیا تم نے دیکھا؟ میں نے کہا جی ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور انہوں نے اور حضرت معاویہؓ نے روزہ رکھا۔تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا،لیکن ہم لوگوں نے سنیچر کی شب دیکھا ہے،لہٰذا ہم (۳۰ کی) گنتی مکمل ہونے تک روزہ رکھیں گے۔میں نے عرض کیا،تو کیا حضرت معاویہؓ کی رویت اور ان کا روزہ رکھنا آپ کے لئے کافی نہیں؟ فرمایا نہیں۔آپ ﷺ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے (مسلم) جس جگہ چاند نظر آئے وہاں سے کوئی شخص دوسری جگہ سفر کرے جہاں ۲۹؍کو چاند نظر نہ آیا تھا تو آخری روزہ میں ان کی موافقت کرے۔(چاہے اس کے ۳۱؍روزے ہوجائیں) اگر اپنی بستی میں عید منا کر وہاں پہنچا (اور وہاں ابھی روزہ ہو) تو ان کے ساتھ امساک کرے۔(یعنی روزے دار کی طرح بغیر کھائے پیئے بقیہ دن گذارے) چاہے اس کے ۳۰؍روزے پورے ہو چکے ہوں، کیونکہ اب یہ بھی دوسری بستی والوں کے حکم میں ہے، بعد میں اس روزے کی قضاء کرلے۔(اسی طرح کوئی مثلاً مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد سفر کرکے ایسی جگہ پہنچے جہاں ابھی سورج غروب نہیں ہوا تو وہاں کے غروب کے بعد پھر مغرب پڑھے)

اس کے برعکس جہاں چاند نظر نہیں آیا وہاں سے کوئی نظر آنے والی بستی میں پہنچے تو ان کے ساتھ عید منائے گرچہ ابھی اس کے اٹھائیس ۲۸ روزے ہوئے ہوں۔یعنی رمضان ۲۹؍کا ہو تو اس کی عید ان کے ساتھ ۲۹؍ویں روزے کو ہوگی۔اس کے ۲۹؍روزے ہو چکے ہوں تب بھی یہی حکم ہے۔یہ اس وقت ہوگا جبکہ اس بستی میں رمضان ۳۰؍دن کا ہو۔اسے صرف ۲۸؍روزے ملے ہوں تو بعد میں ایک روزہ قضاء کرے کیونکہ ۲۸؍کا مہینہ نہیں ہوتا۔لیکن اسے ۲۹؍دن مل چکے تو قضا کی ضرورت نہیں۔کیونکہ مہینہ ۲۹ کا بھی ہوتا ہے (چاہے جس بستی سے چلا تھا وہاں رمضان ۳۰؍دن کا ہو تب بھی قضا کی ضرورت نہیں ہے) دن میں چاند نظر آئے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔اگر رمضان کی ۳۰؍تاریخ کو زوال سے پہلے بھی چاند نظر آئے تو روزہ نہ توڑے، اور شعبان کی ۳۰؍کو اس طرح نظر آئے تو امساک کی ضرورت نہیں۔حضرت شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا خط آیا کہ چاند بعض بعض سے بڑا ہوتا ہے۔لہٰذا دن میں نظر آئے تو روزہ نہ توڑو جب تک کہ دو گواہ گواہی نہ دیں کہ ہم نے کل شام چاند دیکھا تھا۔(دار قطنی ،بیہقی باسناد صحیح)

کسی بھی وقت چاند پر نظر پڑے تو یہ دعا پڑھے اَعوذُ باللّٰہِ مِن شَرِّ هٰذَا الغَاسِقِ "(بغیة ص ۱۱۱) کسی بھی ماہ پہلی

تاریخ کا چاند نظر آئے تو یہ دعا پڑھنا سنت ہے : اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ وَالتَّوْفِیْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضیٰ رَبُّنَا وَ رَبُّكَ اللّٰهُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ . اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ هٰذَا الشَّهْرِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ الْقَدْرِ وَ مِنْ شَرِّ الْمَحْشَرِ . هِلَالَ خَیْرٍ وَ رُشْدٍ (دومرتبہ) اٰمَنْتُ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ (تین مرتبہ) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ذَهَبَ بِشَهْرِ كَذَا وَجَاءَ بِشَهْرِ كَذَا (پہلی کذا کی جگہ گذشتہ ماہ کا اور دوسرے کذا کی جگہ جو ماہ شروع ہوا اس کا نام لے) (بغیہ ص ۱۱۱ نہایۃ ۳/۱۵۷)

روزے کے ارکان :

روزے کے تین ارکان ہیں۔(۱) نیت (۲) روزہ دار (۳) امساک (مفطرات سے رکنا)

(۱) نیت : مشہور حدیث ہے ۔ " اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ " (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ صحاح ستہ وغیرہ)

دیگر عبادات کی طرح ہر روزہ کے لئے نیت واجب ہے (رمضان ۔ نذر یا کفارہ کے) فرض روزے کے لئے رات میں نیت کرنا واجب ہے، غروب کے بعد اور صبح صادق سے پہلے کسی بھی وقت نیت کرنا کافی ہے۔

حدیث : جو صبح صادق سے قبل (رات میں) روزے کی نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہے۔ (احمد ۔ابوداود ۔ نسائی۔ ترمذی ۔ ابن ماجہ ۔ ابن خزیمہ ۔ دارقطنی) آگے آنے والی حضرت عائشہ کی روایت کے پیش نظر اس روایت کا تعلق فرض روزے سے ہے فرض روزہ کی نیت میں روزہ کی تعیین (یعنی رمضان یا نذر یا کفارہ کا ہے) بھی لازم ہے۔ اگر دو رمضان کے قضا روزے یا مختلف قسم کے کفارے کے روزے ذمہ میں ہوں اور صرف قضاء رمضان کی یا کفارہ کی نیت کرے، سال اور سبب کفارہ کی تعیین نہ کرے، تو یہ جائز ہے۔

مخصوص ایام کے سنت روزوں میں (جیسے عرفہ، عاشورہ، ایام بیض اور شوال کے چھ ۶ روزے) تعیین لازم نہیں ہے، کیونکہ ان ایام میں روزے اسی میں شمار ہوں گے، بلکہ کسی اور روزے کی نیت کرے تو بھی یہ حاصل ہوں گے۔ جیسا کہ تحیۃ المسجد کا ثواب کسی اور نماز سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل مقصود ان ایام میں روزوں کا پایا جانا ہے۔

نیت کے بعد روزے کے منافی (مخالف عمل) پایا جائے تب بھی نیت صحیح ہوگی جیسے نیت کے بعد جماع کرنا یا از خود قئے کرنا۔ اسی طرح نیت کے بعد سو جائے یا حیض کا سلسلہ اکثر مدت کے بعد یا عادت کے مطابق ختم ہو جائے تو یہ نیت صحیح ہے۔ تجدید نیت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوئی سبب روزے کی نیت کے منافی نہیں ہے۔ اگر فجر سے قبل نیت ہی ختم کر دے تو روزہ نہ ہوگا۔ صبح صادق سے قبل پھر نیت کرنا ضروری ہے۔ لیکن دن میں نیت کے ختم کرنے سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ البتہ ردّت (اسلام چھوڑنا) دن میں بھی ہو تو روزہ ختم ہو جائے گا۔ سنت (نفل) روزوں کی نیت زوال سے قبل کرنا بھی صحیح ہے۔

حدیث : ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا" کیا تمہارے پاس (کھانے کے لئے) کچھ ہے؟ عرض کیا" یارسول اللہ! ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" فرمایا:" پھر میں روزہ رکھتا ہوں۔" (مسلم، ابوداود ۔ابن حبان) ایک روایت میں ہے" کیا تمہارے پاس کچھ ناشتہ ہے"۔

زوال کے قبل نیت کرنے سے نفلی روزہ اس وقت صحیح ہو گا جبکہ صبح صادق کے بعد سے روزے کے منافی کوئی بات (جیسے کھانا۔ جماع ۔ کفر حیض ۔ نفاس ۔ پاگل پن ۔) نہ پائی جائے ورنہ روزہ صحیح نہ ہوگا۔

کامل نیت: نَوَیتُ صَومَ غَدٍ عَنْ اَدَاءِ فَرضِ رَمَضَانِ هٰذِهِ السَّنَةِ لِلّٰهِ تَعَالیٰ۔

ترجمہ: ”میں نے کل اس سال کے رمضان کے فرض روزے کی ادائیگی کی نیت کی“ تا کہ اس کے برعکس صورتوں سے متمیز ہو جائے۔ نیت کا اصل محل دل ہے۔ دل میں نیت ہو اور زبان سے نہ کہے تو کافی ہے لیکن زبان سے کہے اور دل میں نہ ہو تو یہ کافی نہیں۔ اگر سحری کرے تا کہ روزہ رکھے یا پانی پیے تا کہ دن میں پیاس نہ لگے یا صبح صادق کے خوف سے کھانے پینے یا جماع سے باز آئے اور تصور میں روزہ اپنے شرعی صفات کے ساتھ موجود ہو جس کا نیت میں خیال ہونا ضروری ہے تو یہ بھی نیت کہلائے گی۔ کیونکہ روزے کے قصد کو متضمن ہے۔

۳۰ / رمضان کی رات کل رمضان کے روزے کی نیت کرے اور (چاند نظر نہ آیا اور) رمضان ہی تھا تو یہ روزہ صحیح ہے۔ لیکن ۳۰ / شعبان کی شب میں اس طرح نیت کرنے سے روزہ صحیح نہ ہوگا۔ (کیونکہ ابھی رمضان کا ثبوت نہیں ہوا، اس لئے پختہ نیت نہ ہوگی) البتہ اس کے نزدیک کسی معتبر شخص کے کہنے سے رمضان کا گمان ہو تو بالجزم نیت کی وجہ سے روزہ صحیح ہے۔

اگر یوں نیت کرے کہ کل شعبان ہو تو نفل روزہ اور رمضان ہو تو فرض روزہ (اور کوئی علامت نہ ہو) تو شعبان ہونے کی صورت میں نفل روزہ صحیح ہوگا کیونکہ اصل بقاء شعبان ہے اور رمضان ہو تو فرض یا نفل دونوں صحیح نہیں ہے۔

اگر کسی کو قید و بند میں ہونے کی وجہ سے رمضان کا علم نہ ہو سکے تو مختلف علامتوں کی روشنی میں اندازہ لگا کر روزہ رکھے اگر واقعتاً یہ روزے رمضان میں ہی رکھے ہیں تو ادا ہیں اور بعد میں ہیں تو قضاء ہیں۔ اور پہلے ہیں اور پھر رمضان مل جائے تو اس میں ادا کرے ورنہ بعد میں قضا کرے اگر آئندہ سال کے رمضان میں واقع ہو تو اس کی طرف سے ادا ہوں گے نہ کہ سابقہ سال کی قضاء۔

(۲) جو معذور جاہل نہ ہو اور مختار ہو اور روزہ یاد ہو اس شخص کو مندرجہ ذیل امور سے رکنا لازم ہے۔

(الف) جماع

(ب) عمداً قئے کرنا ،لہٰذا جو روزہ دار ہونا یاد ہوتے ہوئے اپنے اختیار سے حرمت کے علم کے باوجود (یا علم نہ ہو لیکن اس میں کوتاہی کی ہو) جماع کر لے یا ازخود قئے نکالے تو اس کا روزہ باطل ہوگا (ٹوٹ جائیگا) جماع کے مسئلہ میں اجماع ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا ”جسے روزہ میں خود بخود قئے ہو جائے تو اس پر قضاء نہیں اور جو ازخود قئے نکالے وہ قضاء کرے“ (سنن۔ دارمی۔ ابن حبان دار قطنی۔ حاکم)

اگر (روزہ ہونا) بھول کر یا کسی کے مجبور اور زبردستی کرنے سے بے اختیار یا مسئلہ کی لاعلمی کی وجہ سے جبکہ اس لاعلمی میں وہ قصوروار نہ ہو یعنی تازہ نومسلم ہو یا علماء سے (یعنی اس مسئلہ کے جاننے والے عالم سے) دور دراز علاقہ میں پلا بڑھا ہو اور جماع یا قئے کرے تو روزہ نہ ٹوٹے گا۔ ازخود قئے ہو جانے سے بھی روزہ باطل نہ ہوگا۔ عمداً قئے کرنا خود ہی مبطل ہے، گر چہ واپس پیٹ میں ایک قطرہ بھی نہ جائے۔ اندر سے بلغم نکال کر تھوکنے میں حرج نہیں اگر دماغ سے بلغم اترے اور منہ کے حد ظاہر تک (یعنی لفظ ’ح‘ کے مخرج تک) پہنچ جائے اور اسے تھوکنے پر قادر تھا اور نہ تھوکا اور پیٹ میں چلا گیا تو روزہ باطل ہوگا۔ اگر تھوک نہ پایا تو باطل نہ ہوگا۔

کسی بھی عین (چیز) کا منفذِ مَفتوح (کھلے ہوئے راستے) سے جوف (خالی جگہ میں) جانا، گر چہ اس جوف میں غذا یا دوا کو بدلنے (اور ہضم کرنے) کی قوت نہ وہ، جیسے حلق، دماغ، کان کا اندرونی حصہ، پیٹ، پیشاب اور پستان کا سوراخ اور مثانہ صرف ہوا داخل ہو یا ذائقہ محسوس ہو تو حرج نہیں، کیونکہ یہ عین نہیں ہیں (دھواں اندر چلا جائے تو روزہ نہ ٹوٹے گا لیکن بیڑی وغیرہ کے دھوئیں سے ٹوٹ جائیگا۔ بشری الکریم ۲ / ۶۸) تیل یا سرمہ مسامات کے ذریعہ اندر پہنچے تو حرج نہیں، جیسا کہ پانی سے غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں

، چاہے اس کا اثر اندر محسوس ہو، کیونکہ یہ منفذِ مفتوح کے ذریعہ نہیں پہنچے۔ خالص پاک تھوک اپنے معدن (منہ) پیٹ میں جائے گرچہ منہ میں جمع کرنے کے بعد یا زبان باہر نکالنے کے بعد اس پر موجود تھوک ہو، اس سے روزہ باطل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے بچنا مشکل ہے۔ تھوک نجس ہو یا اس میں کسی اور چیز کی آمیزش ہو یا منہ سے باہر نکالنے کے بعد (گرچہ ظاہری ہونٹ پر ہی کیوں نہ ہو) پیٹ میں جائے تو روزہ باطل ہوگا۔ جس کے مسوڑھوں سے ہمیشہ خون نکلتا رہے، وہ اچھی طرح تھوک کر منہ کو صاف کرے کہ تھوک سفید ہو جائے تو یہ کافی ہے، اسے مشقت کی وجہ سے کلی کرنے اور منہ دھونے کی ضرورت نہیں۔ کان میں سخت تکلیف کی وجہ سے دوا ڈالنے کی نوبت آئے اور منہ دھونے کی نوبت آئے اور اس میں فائدہ کی تحقیق ہو تو استعمال کی اجازت ہے اور مجبوری کی وجہ سے روزہ صحیح ہوگا۔ معتبر ڈاکٹر کے کہنے سے کسی بیماری میں قئے کرنی پڑے تو اس سے روزہ باطل ہوگا۔ (بغية المسترشدين ص ۱۱۱)

مکھی، مچھر، راستہ کا غبار یا آٹا چھانتے وقت اس کے ذرات پیٹ میں جائے تو روزہ باطل نہ ہوگا، کیونکہ پہلی دونوں صورتوں میں عمداً نہیں کیا اور آخری صورتوں میں اس سے احتیاط کافی دشوار ہے۔ اگر بھول سے کوئی چیز جوف میں پہنچ جائے یا اسے لوٹانے پر قادر نہ ہو یا زبردستی اور جبراً یوں ہو یا مسئلہ سے لاعلمی اس کا سبب ہو جبکہ لاعلمی میں اس کا قصور نہ ہو تو ان صورتوں میں روزہ باطل نہ ہوگا۔

حدیث: کوئی شخص روزہ میں بھول کر کھا پی لے تو وہ اپنا روزہ مکمل کرلے، اسے اللہ نے کھلایا پلایا ہے"۔ (متفق علیہ) ابن حبان اور دار قطنی وغیرہ کی روایت میں ہے "اس پر قضاء لازم نہیں" (تلخيص الحبير ۲ / ۴۰۷) اگر بواسیر کے مسے باہر نکلیں اور انہیں اندر داخل کرے تو حرج نہیں، اگر مجبوراً انگلی بھی ساتھ داخل کرنی پڑے تو وہ بھی معاف ہے۔ مجبوری نہ ہو اور انگلی داخل کرے تو روزہ ٹوٹ جائیگا۔

پانی کے غیر مطلوب استعمال سے وہ پیٹ وغیرہ میں چلا جائے تو روزہ باطل ہوگا، جیسے کلی اور استنشاق میں مبالغہ کرنا، وضو میں چوتھی مرتبہ کلی و استنشاق کرنا۔ اگر منہ سے نجاست دور کرنے کیلئے۔ مبالغہ کرے یا وضو میں مبالغہ نہ کرے اور بلا اختیار پانی پیٹ میں چلا جائے تو روزہ باطل نہ ہوگا

واجب یا مسنون غسل میں پانی کان وغیرہ میں چلا جائے تو حرج نہیں اگر غوطہ لگانے سے کان میں پانی جاتا ہو اور اس سے بچنا مشکل ہو تو غوطہ لگانا حرام ہے۔ اور کان میں پانی جانے سے روزہ باطل ہوگا۔ صرف ٹھنڈک حاصل کرنے یا صفائی و نظافت کے لئے غسل کرے اور کان میں پانی چلا جائے تو روزہ باطل ہوگا۔

(د) استمناء (قصداً اپنی منی نکالنا)۔ اپنے یا بیوی یا کسی اور کے ہاتھ سے بلا حائل یا حائل کے ساتھ منی نکالے تو روزہ باطل ہوگا، کیونکہ بغیر انزال کے جماع سے جب روزہ باطل ہوتا ہے تو شہوت کے اس عمل سے بصورت انزال بدرجہ اولی باطل ہوگا۔ اسی طرح بلا حائل بیوی کو چھونے، بوسہ لینے یا ساتھ لیٹنے سے منی نکلے تو روزہ باطل ہوگا لیکن اگر حائل ہو (چاہے پتلا کپڑا ہی کیوں نہ ہو) تو روزہ باطل نہ ہوگا۔ کھجلی وغیرہ کی وجہ سے شرمگاہ کو کھجائے اور انزال ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

صرف کسی کو دیکھنے یا کچھ سوچنے کی وجہ سے انزال ہو تو روزہ باطل نہ ہوگا۔ جیسا کہ احتلام کی وجہ سے باطل نہیں ہوگا۔ اگر تحریک شہوت (انزال) کا اندیشہ ہو تو (فرض روزے میں) بیوی کو چھونا اور بوسہ لینا وغیرہ حرام ہے، اگر ایسا کوئی خطرہ نہ ہو تو یہ جائز ہے لیکن اسکا ترک اولی اور بہتر ہے، کیونکہ روزہ دار کو شہوتوں کا ترک کرنا مسنون ہے۔ حرمت کا حکم نہیں لگایا کیونکہ اس صورت میں انزال کا احتمال ضعیف ہے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ بعض ازواج مطہرات کا روزہ میں بوسہ لیتے، آپ ﷺ کو اپنی حاجت پر مکمل قابو تھا۔ (متفق علیہ)

(۲) آپ ﷺ نے ایک بوڑھے شخص کو روزہ میں مباشرت (بیوی کے ساتھ صرف لیٹنے وغیرہ کی) اجازت دی اور دوسرے شخص کو جو جوان تھا منع فرمایا۔ (ابوداود۔ بیھقی) ورد وغیرہ کے ذریعے وقت کا اندازہ لگا کر (تحری سے) افطار کرنا جائز ہے صرف ظن (گمان) سے افطار کی اجازت نہیں کیونکہ اصل دن کا باقی رہنا ہے لیکن غروب کا یقین ہو جائے (مشاہدہ وغیرہ سے) پھر افطار کرے تو یہ بہتر ہے۔ تاکہ غلطی سے محفوظ رہے۔ سحری کا وقت باقی رہنے میں شک بھی ہو تو سحری کر سکتا ہے کیونکہ اصل ابھی رات کا باقی ہونا ہے۔ لہٰذا روزہ صحیح ہوگا جبکہ یہ معلوم نہ ہو کہ صبح صادق ہونے کے بعد سحری ہوئی۔

تحری کر کے اندازہ لگا کر سحری یا افطار کرنے کے بعد معلوم ہو جائے کہ اندازہ غلط تھا تو روزہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ایسا ظن و گم جس کی غلطی واضح ہو چکی ہو معتبر نہیں۔ اگر بغیر تحری کے سحری یا افطار کرے اور کچھ پتہ نہ چلے تو سحری تو صحیح ہے لیکن افطار غلط ہے (اور روزہ نہ ہوگا) اگر بعد میں دونوں کا اپنے وقت میں ہونا معلوم ہو تو دونوں صحیح ہیں۔ اور دونوں کی غلطی واضح ہو تو دونوں غیر معتبر ہیں۔ اگر صبح صادق کے وقت منہ میں کھانا ہو اور اس میں سے کچھ بھی نہ نگلے بلکہ پھینک دے یا منہ میں ہی رکھے تو روزہ صحیح ہے۔ پھینکنے کی صورت میں بلا اختیار کچھ اندر چلا بھی جائے تو حرج نہیں لیکن دوسری صورت میں اگر اندر چلا گیا تو روزہ باطل ہوگا۔

دوران جماع صبح صادق ہوا اور فوراً ترک جماع کی نیت سے جدا ہو جائے تو روزہ صحیح ہے۔ گرچہ بعد میں انزال ہو جائے۔ اگر ترک جماع کی نیت کے بغیر یا لذت حاصل کرنے کے لئے جدا ہوا تو روزہ باطل ہوگا۔ اگر صبح صادق ہوتے ہی جدا نہ ہوا چاہے صبح صادق کا علم ہو یا نہ ہو تو روزہ صحیح نہ ہوگا۔

انجکشن : روزہ کی حالت میں بطور علاج انجکشن لگوانے میں کوئی حرج نہیں ہے اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا۔ (من فتاوی الصیام)

(۳) روزہ دار : روزہ دار کے لئے مکمل دن (صبح صادق سے غروب تک) اسلام، عقل، حیض و نفاس سے پاکی شرط ہے لہٰذا دن کے کسی بھی حصہ میں ان صفات میں سے کسی کی ضد پائی گئی تو روزہ صحیح نہیں۔ لہٰذا دن میں ایک سیکنڈ بھی کفر یا پاگل پن پایا گیا تو روزہ نہ ہوگا۔ حائضہ و نفساء کو روزہ کی نیت سے امساک حرام ہے لیکن کسی مفطر (روزے کے منافی عمل جیسے کھانا وغیرہ) پر عمل کرنا واجب نہیں۔ صرف روزہ کی نیت نہ ہونا کافی ہے۔ جیسے عید کا حکم ہے۔ بچہ کی ولادت ہو یا علقہ یا مضغہ کا اسقاط ہو گرچہ بغیر تری کے تو روزہ صحیح نہ ہوگا سارا دن سوتا رہا تو روزہ ہو جائیگا۔ دن کے بعض حصہ میں بے ہوش یا نشہ پایا جائے تو روزہ صحیح ہے۔ لیکن مکمل دن بے ہوش رہا، یا نشہ میں رہا تو روزہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دونوں صفت انسان کو اہلیت خطاب سے خارج کرتے ہیں۔ بخلاف نیند کے کیونکہ نیند سے فوت شدہ نماز کی قضا لازم ہے۔ بخلاف بے ہوش کے اور اس نشہ کے جس میں اس کی غلطی نہ ہو، لہٰذا اگر کوئی رات میں شراب پئے اور دن کے بعض حصے میں ہوش میں ہو تو روزہ صحیح ہوگا۔ ممیز کا روزہ صحیح ہے، غیر ممیز کا صحیح نہیں ہے۔

وقت کے اعتبار سے روزہ کے صحت کی شرط : روزہ دن میں رکھا جائے نہ کہ رات میں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا دن نہ ہو۔ صحیحین کی حدیث میں دونوں عید کے روزے سے منع فرمایا۔ ایام تشریق (یعنی ۱۱/ ۱۲/ ۱۳/ ذی الحجہ) میں بھی روزہ رکھنا منع ہے، چاہے تمتع کے طریقہ پر حج کرنے والا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ ابوداؤد کی ایک صحیح روایت میں ان ایام کے روزوں سے روکا گیا ہے۔ یوم الشک (شک کے دن) میں بغیر معتبر وسبب کے روزہ نہ رکھے۔ کیونکہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے فرمایا کہ جو یوم الشک میں روزہ رکھے اس نے آپ ﷺ کی نافرمانی کی۔ (رواہ الترمذی وغیرہ و صححہ)

فرض یا سنت روزہ کی قضاء، نذر کا روزہ اور ورد کا روزہ شک کے دن رکھنا بلا کراہت صحیح ہے۔ ورد کا مطلب یہ کہ کسی کی روزہ کی کوئی خاص عادت ہو جیسے پیر یا جمعرات کا روزہ رکھنا یا ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا، اور شک کے دن اس کی ترتیب کے مطابق روزہ کا دن ہو تو رکھنا صحیح ہے یوم الشک سے قبل ایک مرتبہ بھی رکھنے سے وہ ورد میں شمار ہوگا۔ مذکورہ روزوں کو کوئی عمداً موخر کرے تا کہ ۱۵؍شعبان کے بعد یا یوم الشک میں رکھے تو حرام ہے، اور صحیح نہ ہوں گے۔

حدیث : رمضان سے ایک یا دو روز قبل روزہ شروع نہ کرو۔ البتہ جو شخص کوئی روزہ رکھتا تھا تو وہ رکھ سکتا ہے" (صحیحین)
مثلاً کوئی ہمیشہ یا داؤدی روزہ کا عادی ہو۔ ورد پر بقیہ روزوں کو بھی قیاس کرلیں گے سببیت میں اشتراک کی وجہ سے۔

یوم الشک : یوم الشک سے مراد شعبان کی ۳۰؍تاریخ ہے، جبکہ لوگوں میں چاند کا چرچا اور افواہ ہو۔ لیکن کسی نے گواہی نہ دی ہو یا ایسے ایک سے زائد لوگوں نے گواہی دی جو قبول نہ ہو، جیسے بچے، عورتیں، غلام اور فاسق و بدکار لوگ لیکن جن لوگوں کو مذکورہ گواہی کی سچائی کا ظن اور گمان ہو ان کے حق میں یہ یوم الشک نہ ہوگا۔ لہٰذا وہ روزہ کی نیت کرسکتے ہیں۔ بلکہ ان پر روزہ واجب ہے۔ اور رمضان ثابت ہو جائے تو یہ روزہ کافی ہو جائے گا۔ (قضاء کی ضرورت نہیں) اگر لوگوں میں چاند دکھائی دینے کا چرچا ہی نہیں ہوا اور کسی نے گواہی بھی نہیں دی یا مذکورہ لوگوں میں سے صرف ایک نے گواہی دی تو یہ یوم الشک نہیں، بلکہ شعبان کی ۳۰؍تاریخ ہے۔ گرچہ مطلع ابر آلود ہو، کیونکہ صحیحین کی روایت میں اس صورت میں شعبان کے ۳۰ دن مکمل کرنے کا حکم موجود ہے۔

۱۵ شعبان کے بعد روزہ : ۱۵؍شعبان کے بعد بلا سبب روزہ رکھنا حرام ہے جبکہ سابق سے نہ ملائے۔ یعنی کوئی ۱۵؍شعبان کو روزہ رکھے اور آگے بھی رکھتا چلا جائے تو جائز ہے۔ اگر ۱۵؍کو نہیں رکھا تو آگے نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح ۱۵؍سے رکھتا رہا پھر مثلاً ۲۰؍کو چھوڑ دیا، تو اب آگے نہیں رکھ سکتا۔ قضاء، نذر اور ورد کے روزے ان ایام میں جائز ہیں۔

روزے کی سنتیں :

(۱) سحری کرنا : ایک حدیث کی رو سے سحری کھجور سے سنت ہے، اس کا وقت نصف شب سے شروع ہوتا ہے، سحری اس امت کی خصوصیت ہے، سابقہ امتیں سونے سے قبل کھا لیا کرتے، عشاء کے وقت سے ان پر کھانا پینا حرام تھا۔ قلیل و کثیر مقدار سے سحری حاصل ہوگی۔ ایک حدیث میں ہے "سحری کرو، اگرچہ ایک گھونٹ پانی ہی کیوں نہ ہو"

احادیث : (۱) سحری کیا کرو کیونکہ اس میں برکت ہے" (متفق علیہ)
(۲) "سحری کے کھانے کے ذریعہ روزے پر اور قیلولہ کے ذریعہ قیام اللیل پر مدد حاصل کرو"۔ (ابن ماجہ، حاکم)
(۳) اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے فرشتہ سحری کرنے والوں پر درود بھیجتے ہیں"۔ (ابن حبان)

سحری میں تاخیر مستحب ہے۔ حدیث میں ہے" آپ ﷺ کی سحری اور نماز (فجر) میں پچاس آیتوں کی تلاوت کے بقدر فاصلہ تھا" (متفق علیہ) سحری کی تاخیر میں یہود ونصاریٰ کی مخالفت ہے۔ اور عبادت پر قوت حاصل کرنے کے لئے بھی معین و مددگار ہے۔ سحری اور تاخیرِ سحری اس وقت مستحب ہے جبکہ ابھی رات باقی ہونے کا یقین ہو۔

افطار جلد کرنا : آپ ﷺ نے فرمایا "لوگ بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کریں گے" (متفق علیہ)۔ ترمذی کی روایت میں ہے "اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نزدیک محبوب ترین بندے جلد افطار کرنے والے ہیں" جب رات

ہونے کا یقین ہو جائے تو افطار میں تعجیل (جلدی کرنا) مستحب ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو افضل ہے کہ تعجیل نہ کرے۔ بلکہ بغیر تحری کے تعجیل حرام ہے۔ جیسا کہ تفصیل گذر چکی۔ قصداً اور فضیلت سمجھ کر افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے، ورنہ کراہت نہیں ہے۔ افطار کے وقت کوئی راستہ سے گذر رہا ہو تب بھی اسے تعجیل سنت ہے اور اس کی وجہ سے اس کی مروت پر اثر نہ پڑے گا۔ (یعنی اس صورت میں راستہ میں کھانے میں حرج نہیں عام حالات میں یہ خلاف مروت ہے)

(۳) کھجور سے افطار کرنا : کھجور سے افطار کرنا سنت ہے اصل سنت ایک کھجور سے حاصل ہوگی اور اقل کمال تین کھجور سے، زائد میں بھی طاق کی رعایت کرے، کھجور نہ ہو تو پانی سے افطار کرے ورنہ کسی اور میٹھی اور شیرین چیز سے۔ دوسروں کو افطار کرانا سنت ہے کسی نے افطار کے لئے کھجور دیا تو اُسے افطار ہی میں استعمال کرنا چاہئے۔ وقت ہونے کے بعد کھجور کا انتظار کرنے کے بجائے پانی سے جلد افطار کرنا افضل ہے۔

اگر رُطب (تازہ کھجور) ہو تو اسے تمر (خشک کھجور) پر مقدم رکھے۔

حدیث : (۱) جسے کھجور میسر ہو وہ اسی سے افطار کرے اور جسے کھجور نہ ملے وہ پانی سے افطار کرے۔ کیونکہ وہ طہور ہے" (پاک اور پاک کرنے والا) (اصحاب السنن، احمد، ابن حبان، حاکم)

(۲) "آپ ﷺ پہلے چند رطب (تر کھجور) پر افطار فرماتے وہ نہ ہو تو تمر (خشک کھجور) پر ورنہ چند گھونٹ پانی پیتے" (احمد، ترمذی، نسائی) کسی روزے دار کو افطار کرانا مسنون ہے، یعنی اسے کھانا کھلائے، اس سے مجبور ہو تو کھجور یا پانی کے گھونٹ سے افطار کرائے، حدیث "جو کسی روزہ دار کو افطار کرائے، اسے اس کی طرح ثواب ملے گا، نیز روزہ دار کے ثواب میں کچھ کمی بھی نہ ہوگی" (ترمذی و صححہ) (المنتھی)

(۴) روزے کے تعلق سے ان امور کا ترک مسنون ہے۔

(الف) ہر قبیح و فحش امر جیسے جھوٹ، غیبت وغیرہ کو ترک کرے گناہ ہونے کے اعتبار سے تو ان کا ترک واجب ہے لیکن روزہ کے کامل ثواب کے حصول کے پیش نظر اسے روزہ کے سنت میں شمار کیا گیا۔

حدیث : (۱) "جو جھوٹی بات اور اس پر عمل کو نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کا اس کے کھانے پینے سے رکنے سے کوئی مطلب نہیں" (بخاری۔ اصحاب السنن)

(۲) روزہ ڈھال ہے، لہٰذا کوئی روزہ میں فحش اور گندی بات اور جہالت (کے کام) نہ کرے، اگر کسی نے اس سے گالی گلوچ یا لڑائی کی تو یہ کہدے کہ میرا روزہ ہے۔ (نسائی) پہلے فقرہ کے علاوہ بخاری و مسلم میں بھی ہے۔

(ب) ایسی خواہش اور رغبتیں جو روزہ کو باطل نہ کرے اسے ترک کرنا سنت ہے، جیسے خوشبو سونگھنا، پھولوں کو چھونا اور دیکھنا وغیرہ۔ رات خوشبو استعمال کرے اور دن میں اس کا اثر باقی ہو تو بعض علماء کے نزدیک یہ مکروہ نہیں ہے۔

(ج) فصد اور سینگی کا ترک مستحب ہے۔ کیونکہ یہ کمزوری کا باعث ہے۔

(د) کھانا وغیرہ نہ چکھے کہ مکروہ ہے، کہیں حلق میں نہ چلا جائے۔ اگر چھوٹے بچے کو کچھ چبا کر دینا پڑے تو کراہت نہیں۔

(ھ) گوند جیسی چیز نہ چبائے، یہ مکروہ ہے۔

(۵) فرض غسل رات ہی (صبح صادق سے پہلے) کر لینا سنت ہے تاکہ روزہ کے ابتداء سے پاکی رہے۔

(۶) افطار کے بعد یہ دعاء پڑھے: (۱) اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَ عَلىٰ رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ (ابوداؤد باسناد حسن مرسل)

ترجمه: اے اللہ میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر افطار کیا۔

(۲) ذَهَبَ الظَّمَأُ وَ ابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ و ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ" (ابوداؤد، نسائی، دار قطنی حاکم)

ترجمه: پیاس ختم ہوئی اور رگیں تر ہوئیں اور انشاء اللہ اجر ثابت ہوا۔

(۷) رمضان میں صدقہ اور تلاوت قرآن کی کثرت رکھے۔ اہل وعیال کے خرچ میں اور دیگر رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک میں مزید توسیع سے کام لے۔ کیونکہ اس ماہ میں نیکیوں کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے۔ آپ ﷺ کا جود وسخا رمضان میں بالکل عروج پر ہوتا (متفق علیه) روزہ داروں کو رات کے کھانے وغیرہ کے ذریعہ افطار کرائے، ورنہ جتنا میسر ہو، کم از کم پانی سے ہی کیوں نہ ہو، تاکہ روزہ کھلوانے کا ثواب ملے۔ یہ سارے امور شرعاً ہمیشہ مطلوب ہیں، لیکن رمضان میں تاکید بڑھ جاتی ہے۔ تلاوت قرآن ہر جگہ (سوائے نجس مقامات کے) مستحب ہے حتی کہ راستہ وغیرہ میں بھی جبکہ اس پر توجہ ہو۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام رمضان میں ہر شب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ایک دوسرے کو قرآن سنایا کرتے۔ (بخاری و مسلم) مصحف شریف میں دیکھ کر، قبلہ رو ہو کر اور جہراً (آواز سے) تلاوت مستحب ہے۔ جبکہ ریا کاری کا اندیشہ نہ ہو اور جہر سے کسی نمازی یا سونے والے کو تکلیف نہ ہو۔ (ورنہ آہستہ تلاوت کرے)

رمضان میں اعتکاف کرنا سنت ہے، اعتکاف اور دیگر مذکورہ عبادات کی تاکید عشرہ اخیرہ میں مزید بڑھ جاتی ہے: آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں وصال تک اعتکاف فرماتے رہے، اور آپ ﷺ کے بعد ازواج مطہرات نے بھی اعتکاف فرمایا"۔ (متفق علیه) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے درمیانی عشرہ میں اعتکاف فرمایا" (متفق علیه) "ایک سال سفر کی وجہ سے آپ ﷺ اعتکاف نہ کر سکے لہٰذا آئندہ سال دو عشرہ کا اعتکاف فرمایا۔ (مستدرک) آپ ﷺ آخری عشرہ میں دیگر ایام کے مقابلہ میں عبادات میں اور بھی کوشش فرماتے (مسلم)

فصل رمضان کے روزہ کے وجوب کے شرائط۔

(۱) **اسلام** ۔ کوئی مرتد ہونے کے بعد پھر اسلام لائے تو ایام ردت کے روزوں کی قضا واجب ہے۔ ابتداء سے ایک کافر شخص اسلام قبول کر لے تو اسے سابقہ روزوں وغیرہ کی قضا کی ضرورت نہیں، بلکہ قضا کرے بھی تو منعقد نہ ہوگی۔

(۲) **مُکلف ہو** ۔ یعنی عاقل اور بالغ ہو۔ بچہ، پاگل، بے ہوش اور نشہ میں مست آدمی پر (فی الحال) روزہ رفرض نہیں ہے لیکن بے ہوش اور مست آدمی کو بعد میں قضا لازم ہے۔ بچہ اور پاگل کو قضا لازم نہیں ہے۔ لیکن ردت یا نشہ میں جو پاگل پن پایا جائے ان ایام کی قضا لازم ہے۔ بچہ یا بچی سات سال کی عمر میں باشعور ہوں اور روزہ رکھنے کی طاقت ہو تو ان کو روزہ کا حکم دینا اور دس سال کی عمر کے بعد اس کے ترک پر ان کو مارنا ولی کے ذمہ واجب ہے، تاکہ ابھی سے روزہ کے عادی بنیں۔

(۳) **روزہ رکھنے کی طاقت ہو** ۔ صحت مند ہو اور مقیم ہو جو حساً یا شرعاً روزہ نہ رکھ سکے۔ بڑھاپے، وہ مرض جس سے شفاء سے مایوسی ہو، حیض وغیرہ کی وجہ سے یا مسافر یا بیمار ہو تو ان پر (فی الحال) روزہ واجب نہیں ہے۔ جس مرض میں روزہ رکھنے سے

ایسا ضرر لاحق ہو جس سے (بجائے وضو کے) تیمم کی اجازت ملتی ہو تو رخصت پر عمل کی نیت سے روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ روزہ رکھنے کے بعد یہ صورت پیش آئے تو توڑ سکتا ہے۔

آیت: وَ مَنْ كَانَ مَرِيضاً اَوْ عَلىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (البقرہ۔ ۱۸۵) ترجمہ: اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا (اس پر واجب ہے) اگر روزہ سے ہلاکت کا یا کسی عضو کے منفعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھنا واجب ہے، اگر مرض کا سلسلہ جاری ہو تو ابتداء سے نیت ہی چھوڑ سکتا ہے، مرض آتا جاتا ہو اور صبح صادق کے وقت ہو تو نیت نہ کرے لیکن صبح صادق کی وقت مرض نہ ہو تو نیت کرلے۔ اگر دن میں مرض آگیا اور تکلیف ہو تو افطار کرسکتا ہے۔

اپنے یا زیر کفالت افراد کے گذر بسر کے لئے ناگریز اور ضروری مقدار کمانا روزہ کی حالت میں ناممکن ہو (اور رات میں نہیں کما سکتا) تو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔ (لیکن صرف بقدر مجبوری) اگر کفار مسلمانوں کے علاقہ پر حملہ آور ہوں اور مقابلہ کے لئے افطار کی ضرورت ہو تو اس کی اجازت ملے گی بلکہ شدید خطرے میں افطار (روزہ نہ رکھنا یا رکھا ہو تو توڑنا) واجب ہے۔

معمولی بیماری جیسے سر درد، دانت درد اور کان درد وغیرہ میں روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ البتہ روزہ کی وجہ سے کسی بیماری کے شدت اور اضافہ کا خطرہ ہو تو اجازت ملے گی۔ جو بھوک یا پیاس کی شدت سے ایسا مغلوب ہو کہ روزہ کی وجہ سے تیمم کو جائز کرنے والی بیماری کا اندیشہ ہو تو روزہ ترک کرسکتا ہے (بشری الکریم ۲/ ۷۲)

سفر: ایسا سفر جس میں نماز قصر کرنا جائز ہے اس میں روزہ ترک کرسکتا ہے۔ اگر روزہ رکھنے میں ضرر ہو تو ترک افضل ہے۔ ضرر اور تکلیف نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔

احادیث: (۱) فتح مکہ کے سفر میں آپ ﷺ رمضان میں روانہ ہوئے اور مقام کدید تک روزہ رکھتے رہے، پھر آپ ﷺ نے افطار فرمایا تو صحابہؓ بھی افطار فرمایا (بخاری)

(۲) ابو سعیدؓ فرماتے ہیں کہ " ہم آپ ﷺ کی مصاحبت میں ۱۶/ رمضان کو غزوہ کے لئے روانہ ہوئے تو بعضوں نے روزہ رکھا اور بعضوں نے نہیں رکھا۔ پس نہ روزہ دار نے بے روزہ پر اعتراض کیا اور نہ اس نے روزہ دار پر" (مسلم)

(۳) حضرت حمزہ بن عمرو بکثرت روزہ رکھا کرتے، انہوں نے آپ ﷺ سے دوران سفر روزہ کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا چاہو تو رکھو، ورنہ مت رکھو، (متفق علیه)

(۴) ایک سفر میں ایک صحابی روزہ کی وجہ سے پریشان اور بدحال ہوئے اور ان کی وجہ سے دیگر صحابہ کرام بھی پریشان ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا "سفر میں روزہ کوئی نیکی نہیں ہے" (متفق علیه) یعنی جب اللہ کی طرف سے رخصت ہے تو اپنے آپ کو اور دوسروں کو اتنی مصیبت میں ڈالنا مطلوب نہیں ہے۔

جو شخص مستقل سفر ہی میں رہتا ہو (کبھی بھی مقیم نہ ہوتا ہو کہ روزہ قضا کرسکے) تو ایسے مسافر کو روزہ ترک کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ورنہ حقیقتِ وجوب ہی بدل جائیگی۔ حالت اقامت میں روزہ شروع کرنے کے بعد سفر پر نکلے یا مسافر روزہ رکھنے کے بعد مقیم ہو جائے یا مریض روزہ رکھنے کے بعد تندرست ہو جائے تو ان حضرات کو روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔

قضا و امساک: مرض، سفر، حیض و نفاس، ردت، نشہ، بے ہوشی اور ترک نیت کی وجہ سے جو روزہ چھوٹ جائے اس کی قضا واجب ہے۔ رمضان کی قضا میں تتابع اور تسلسل واجب نہیں، سنت ہے۔

بچہ روزہ رکھے اور دن میں بالغ ہوجائے تو اس روزہ کی تکمیل واجب ہے۔ بعد میں اسے پھر قضا کی ضرورت نہیں۔ دن کے دوران بچہ بالغ ہوجائے اور اس کا روزہ نہ ہو پاگل اچھا ہوجائے، یا کافر اسلام لائے، تو ان پر اس دن کی قضاء لازم نہیں، کیونکہ جو وقت اب ان کو مل رہا ہے اس میں روزہ ممکن نہیں ہے، البتہ ان کو قضا کرنا مستحب ہے۔ مذکورہ تینوں افراد کو اور اس مسافر و مریض کو جن کا روزہ نہ تھا اور ان کا سفر و مرض کا عذر ختم ہو چکا، رمضان میں بقیہ دن امساک سنت ہے۔ (امساک یعنی روزہ دار کی طرح کھانا پینا وغیرہ ترک کرنا)۔ دن میں عورت کا حیض و نفاس ختم ہوجائے تو اسے بھی امساک سنت ہے۔

جس نے روزہ نہ رکھنے میں خطاء اور غلطی کی ہو اسے امساک لازم ہے۔ مثلاً بغیر عذر کے روزہ نہ رکھنا، یا توڑنا، نیت بھول جانا، ابھی رات باقی سمجھ کر کھالیا پھر معلوم ہوا کہ صبح صادق ہو چکی تھی، یوم الشک میں روزہ نہ رکھا پھر پتہ چلا کہ آج رمضان ہے، یہ حکم وقت کی حرمت کی وجہ سے ہے۔ اور نیت کو بھول جانا عبادت کے معاملہ میں بے توجہی پر دلالت کر رہی ہے۔ جو اس کی کسی حد تک تقصیر ہے، اور یوم الشک کا روزہ درحقیقت اس پر واجب تھا، البتہ لاعلمی کی وجہ سے رکھنا منع تھا اور نہ رکھا، اسی لئے عید کے بعد فوراً اس کی قضاء واجب ہے۔ رمضان کے علاوہ نذر اور قضاء روزہ میں امساک مشروع نہیں ہے۔ امساک کرنے والا درحقیقت شرعی روزہ میں نہیں ہے اگرچہ اس پر اسے ثواب ملے گا، لہٰذا واجب امساک کی خلاف ورزی کی (کھایا، پیایا جماع کیا) تو گناہ کے علاوہ کچھ اور لازم نہ ہوگا۔

مانع حیض گولی: اگر عورت رمضان کے مبارک ماہ میں روزہ اور دیگر عبادات کی فضیلت کی تحصیل کی نیت سے مانع حیض دوائی استعمال کرے۔ (اور اس میں طبی نقطۂ نظر سے اسے کوئی خاص خطرہ و نقصان نہ ہو) تو اس میں حرج نہیں، اگر محض یہ نیت ہو کہ روزہ کا قرض ذمہ میں باقی نہ رہے، تو یہ مناسب نہیں، گرچہ روزہ تو ادا ہوجائے گا۔ (من فتاویٰ الصیام للشیخ ابن جبرین)

صومِ وصال (وصال کا روزہ)

حدیث: ''آپ ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا'' متفق علیہ من حدیث ابن عمر و ابی ھریرۃ و عائشہ و انس) دو روزوں کے درمیان افطار واجب ہے، فرض روزہ ہو یا سنت کیونکہ وصال حرام ہے۔ صوم وصال کا مطلب ہے دو یا زائد دن مسلسل روزہ رکھنا اور رات میں بلا عذر عمداً کچھ کھانا پینا اور جماع وغیرہ نہ کرنا۔ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت تھی کہ آپ کو صوم وصال کی اجازت تھی۔

فصل - روزہ کا فدیہ

کسی کا رمضان، نذر یا کفارہ کا واجب روزہ عذر کی وجہ سے فوت ہوا اور اس کی قضا کے امکان اور قدرت سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوجائے، تو اس کے تدارک اور تلافی کی ضرورت نہیں اور نہ وہ گنہگار ہوگا۔ مثلاً کوئی بیمار ہوجائے اور روزہ فوت ہو اور موت تک بیمار ہی رہے یا سفر میں فوت ہو اور موت تک سفر جاری رہا، یا حاملہ اور دودھ پلانے والی کا روزہ فوت ہوا اور اسی حال میں انتقال ہو، اگر بلا عذر فوت ہو تو گناہ بھی ہوگا اور تدارک بھی لازم ہے جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

اگر بلا عذر یا عذر کی وجہ سے روزہ فوت ہوا اور قضا کے امکان کے بعد انتقال ہو، تو اس کے ترکہ میں سے ہر دن کے روزہ کے بدلے ایک ایک مُد فطرہ کی جنس سے (یعنی گیہوں وغیرہ جس کی تفصیل صدقہ فطر میں گذری) فدیہ ادا کرے، یا ایسا کوئی رشتہ دار اس کی جانب سے روزہ رکھے یا کوئی اجنبی رشتہ دار کی اجازت یا میت کی وصیت سے روزہ رکھے۔ (امکان کے بعد انتقال ہو تو دونوں صورتوں میں گناہ ہوگا۔ اس لئے موقع ملتے ہی فوراً قضا کرنا بہتر ہے)

حدیث (۱) کسی کا انتقال ہوا اور ذمہ میں روزہ ہو تو اس کی جانب سے ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو طعام دیا جائے (الترمذی وصحیح وقفه علی ابن عمر)

(۲) کسی کا انتقال ہوا اور اس کے ذمہ روزہ باقی ہو، تو اس کا ولی اس کی جانب سے روزہ رکھے" (متفق علیه)۔

(۳) ایک عورت کی والدہ کا انتقال ہوا۔ اور اس کے ذمہ نذر کے روزے تھے تو اس کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا "اپنی امی کی جانب سے تم روزہ رکھو" (مسلم) کسی مرنے والے کے ذمہ نماز یا اعتکاف باقی ہو تو یہ عبادات نہ اس کی جانب سے انجام دے اور نہ ہی فدیہ دے، کیونکہ یہ ثابت نہیں۔ ایک قول میں یہ دونوں بھی انجام دے یا ہر نماز کے بدلہ ایک مد اناج دے۔ امام سبکیؒ نے اپنے بعض اقارب کی جانب سے نماز ادا کی۔ اگر کوئی روزہ کے ساتھ اعتکاف کی نذر مانے تو ولی اس کی جانب سے اس نذر کو پورا کرے اسی طرح حج بدل میں طواف کی دو رکعت بھی اس کی جانب سے ادا کرے۔

جو شخص ایسے عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑے جس کے ختم ہونے کی کوئی توقع وامید نہ ہو جیسے بوڑھاپا یا ایسا مرض جس سے شفایابی کی امید نہ ہو تو ہر روزہ کے بدلہ ایک مد اناج دے۔ آئندہ روزہ قضا کرنے کی ضرورت نہیں۔ آیت فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضاً اَوْعَلىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَوَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَه فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينَ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيراً فَهُوَ خَيرٌ لَه وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيرٌ لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ آیت ۱۸۴) **ترجمہ:** جو شخص تم میں سے (ایسا) ہو جو بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا کھلا دینا یا دے دینا ہے اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے کہ زیادہ فدیہ دے) تو اس شخص کے لئے اور بھی بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا (اس حال میں) زیادہ بہتر ہے اگر روزے کی فضیلت سے) خبر رکھتے ہو"۔

اگر مشقت اٹھا کر روزہ رکھے تو یہ کافی ہے۔ فدیہ ادا کرنے سے قبل (اتفاقاً اور خلافِ توقع) عذر زائل ہو جائے تب بھی فدیہ ادا کر سکتا ہے۔ روزہ رکھنا واجب نہیں۔ دن سے قبل رات ہی میں اس دن کا فدیہ ادا کر سکتا ہے۔ رات سے بھی قبل آئندہ کا فدیہ ادا کرنا جائز نہیں۔ درج ذیل افراد کو روزہ کی قضا اور فدیہ (ایک مد) دونوں لازم ہیں۔ (۱) کسی آدمی یا حیوان محترم کی زندگی بچانے یا کسی عضو کو یا منفعت کو تلف ہونے سے بچانے کے لئے روزہ توڑنا پڑے۔ مثلاً کوئی ڈوب رہا تھا اور اس کے بچانے میں پانی اندر چلا گیا اور روزہ ٹوٹ گیا۔

(۲) حاملہ عورت صرف اپنے حمل (جنین) کو نقصان اور خطرہ کی وجہ سے روزہ نہ رکھے۔

(۳) مُرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) شیر خوار بچہ کو نقصان وخطرہ ہونے کی وجہ سے روزہ نہ رکھے۔

جنین اور بچہ کو روزہ سے نقصان ہو تو روزہ نہ رکھنا واجب ہے۔ مرضعہ کا بچہ اپنا ہو یا دوسرے کا یہی حکم ہے۔ مذکورہ تینوں صورتوں میں افطار سے دو اشخاص کو فائدہ پہنچا اس لئے فدیہ سمیت قضاء لازم ہوا۔ آخری دو صورتوں کے لئے آیت سابقہ سے بھی استدلال کیا گیا۔ کیونکہ بقول ابن عباسؓ ان دونوں کے حق میں یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ (رواہ البیهقی)

حاملہ اور مرضعہ کو صرف اپنے جان کا خطرہ ہو یا اپنی اور بچوں کی تکلیف کا مسئلہ ہو یا کوئی بلا عذر روزہ نہ رکھے یا کسی مال کو بربادی سے بچانے کے لئے روزہ توڑنا پڑے یا اوپر کی مثالوں میں متحیرہ عورت (مستحاضہ کی ایک قسم) روزہ نہ رکھے، تو ان تمام صورتوں میں صرف قضا کافی ہے، فدیہ کی ضرورت نہیں۔

جس شخص کو رمضان کے روزوں کے قضا کا موقع ملے (یعنی بلا عذر روزہ رکھنے کے ایام میسر ہوں) اور وہ نہ رکھے، یہاں تک کہ دوسرا رمضان آ گیا، تو اسے قضا کے ساتھ ہر روزہ کے بدلہ ایک مد فدیہ دینا واجب ہے۔ کیونکہ ۶ رصحابہ کرامؓ نے یہی فتویٰ دیا ہے اور ان کے مخالف کسی اور صحابی سے مروی نہیں۔ جتنے سال تاخیر ہوگی اتنے ہی فدیہ واجب ہونگے، جبکہ ہر سال رکھنے کی گنجائش کے باوجود موخر کرے۔ کیونکہ مالی حقوق میں تداخل نہیں ہوتا (مثلاً کسی نے باوجود گنجائش کے ۵ روزے ۳ سال مؤخر کیے تو ۵ روزوں کی قضا کے ساتھ ہر روزہ کے بدلہ تین تین مد اناج لازم ہے۔) بھول کی وجہ سے یا تاخیر کی حرمت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے قضا میں تاخیر ہوئی تو فدیہ کی مقدار میں اضافہ نہ ہوگا۔ مذکورہ صورت میں ایک سال تاخیر کے بعد روزہ کی قضا سے قبل انتقال کر جائے تو اس کے ترکہ سے ہر روزہ کے بدلہ دو مد نکالے ایک روزہ کا اور ایک تاخیر کا۔ اور ولی اس کی جانب سے روزہ رکھے، تو صرف ایک مد تاخیر کا نکالے۔ مذکورہ فدیہ کا مصرف فقیر و مسکین ہیں۔ کیونکہ مسکین کا ذکر آیت وحدیث میں ہے۔ اور فقیر اس سے بھی زیادہ تنگدستی میں ہوتا ہے۔ سارے مد ایک ہی فقیر یا مسکین کو بھی دے سکتا ہے، کیونکہ ہر دن مستقل عبادت ہے لہٰذا سارے مد مختلف کفاروں کی طرح ہے۔ ایک ہی مد دو میں تقسیم نہ کرے۔ (بلکہ ایک مد مکمل ایک شخص کو دے)

رمضان کے روزہ میں جماع

کسی نے رمضان کا روزہ ماہ رمضان میں ایسے وطی (جماع) سے فاسد کیا جس میں روزہ کے تعلق سے وہ گنہگار ہو اور کوئی شبہ نہ ہو تو قضا کے ساتھ کفارہ بھی واجب ہے۔ مذکورہ شرائط کی روشنی میں درج ذیل لوگوں پر کفارہ واجب نہیں ہے۔

(۱) جس سے وطی کی جائے۔ کیونکہ حدیث میں کفارہ کا مُخاطب فاعل (جماع کرنے والا) ہے۔

(۲) بھول کر، اکراہ (زبردستی) کی وجہ سے، یا لاعلمی کی وجہ سے وطی کرنے والا، کیونکہ ان کا روزہ فاسد نہ ہوا۔

(۳) جس پر امساک واجب ہو کیونکہ اس کا روزہ نہیں ہے کہ وطی سے فاسد ہو۔

(۴) جو بلا عذر وطی کرے، پھر دن ہی میں پاگل ہو جائے یا مر جائے کیونکہ اس سے یہ واضح ہوا کہ اس کا ایک مکمل دن کا روزہ فاسد نہیں ہوا۔

(۵) روزہ کے علاوہ نماز وغیرہ کا وطی سے فاسد کرنے والا۔

(۶) دوسرے کا روزہ فاسد کرنے والا جیسے مسافر اپنی بیوی سے وطی کر کے اس کا روزہ فاسد کرے۔

(۷) ماہ رمضان کے علاوہ کوئی روزہ مثلاً قضا یا نذر کا روزہ فاسد کرے، کیونکہ حدیث رمضان کے ماہ میں روزے کے متعلق ہے اور رمضان کے بعض خصوصی فضائل ہیں جس میں کسی اور کی شرکت نہیں۔

(۸) وطی (جماع) کے علاوہ کھانے پینے یا استمناء وغیرہ کے ذریعے فاسد کرے، کیونکہ حدیث وطی کے متعلق ہے، اور دیگر اسباب فساد وطی کی طرح نہیں۔

(۹) رات سمجھ کر وطی (جماع) کرے یا رات کا شک ہو اور وطی کرے اور معلوم ہوا کہ دن کا وقت تھا۔

(۱۰) بھول کر کچھ کھا گیا اور سمجھا کہ روزہ ٹوٹ گیا، پھر وطی کیا۔

(۱۱) بچہ (نابالغ) وطی کرے، کیونکہ بچہ غیر مکلف ہونے کی وجہ سے اسے گناہ نہ ہوگا، اور بقیہ صورتوں میں شبہ کی وجہ سے کفارہ

ساقط ہوگا۔ اور بغیر تحری کے رات شروع سمجھ کر یا شک کے ساتھ وطی کے علاوہ صورتوں میں گناہ بھی نہ ہوگا۔

(۱۲) مسافر زنا کرے بہ نیت ترخص یا جماع کرے بغیر نیت رخصت کے، کیونکہ اس صورت میں محض روزہ کی وجہ سے گنہگار نہیں ہوا۔ بلکہ یا تو زنا کی وجہ سے یا نیت ترخیص نہ ہونے کی وجہ سے گناہ ہوگا۔ بہ نیت ترخص جائز جماع کرے تو کفارہ کا کوئی سوال نہیں۔

جتنے روزے جماع کے ذریعہ مذکورہ شرائط کے ساتھ فاسد کرے اتنے کفارے واجب ہوں گے۔ اگر دو دن جماع کیا تو دو کفارے واجب ہیں، پہلا کفارہ دوسرے جماع سے قبل ادا کر چکا ہو یا نہیں، کیونکہ ہر دن کا روزہ مستقل عبادت ہے، لہٰذا کفارہ میں تداخل نہ ہوگا۔ ایک ہی دن میں دو مرتبہ جماع کرے تو ایک ہی کفارہ واجب ہے، کیونکہ دوسرے جماع سے روزہ فاسد نہیں ہوا۔ جماع کرنے کے بعد سفر، مرض یا ردت پائی جائے تو اس سے کفارہ ساقط نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے تکلیف کی اہلیت کے باوجود روزہ کے حرمت کو پامال کیا ہے۔ البتہ مسافر ایسی جگہ پہنچے جہاں لوگ عید منارہے ہوں اور اس کا مطلع اس کی بستی کے مطلع سے جدا ہو تو کفارہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ ان میں شمار ہوگا۔ جو شخص فجر سے قبل جماع کرے اور طلوع فجر کا علم ہونے کے بعد بھی اسی حالت پر ہو تو اس پر بھی کفارہ لازم ہے۔

کفارہ

حدیث : ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا میں ہلاک ہوگیا دریافت فرمایا کیا بات پیش آئی؟ جواب دیا۔ میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کیا' پوچھا کیا تم غلام آزاد کر سکتے ہو؟ کہا' جی نہیں' دریافت کیا۔ تو کیا دو ماہ مسلسل روزہ رکھ سکتے ہو' جواب دیا نہیں' پوچھا' کیا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ کہا نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گئے۔ بعد میں آپ ﷺ کی خدمت میں ایک ٹوکرا کھجوروں کا آگیا تو اس سے فرمایا' اسے صدقہ کرو' تو کہا' یارسول اللہ! کیا ہم سے بڑھ کر فقیر و نادار پر اللہ کی قسم مدینہ منورہ کے دونوں سیاہ چٹانی سلسلوں کے درمیان (یعنی مدینہ منورہ کی بستی میں) کوئی گھرانہ ہم سے زیادہ محتاج نہیں ہے' تو آپ ﷺ ہنسے یہاں تک کہ دندانِ مبارک نظر آئے۔ پھر فرمایا۔ جاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھلاؤ' (صحیحین) بخاری کی ایک روایت میں امر کا صیغہ وارد ہے۔ یعنی' ایک غلام آزاد کرو (ورنہ) پھر دو ماہ روزہ رکھو (ورنہ) پھر ۶۰ر مساکین کو اناج دو' ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے' کھجوروں کی ٹوکری آئی جس میں ۱۵ر صاع کی مقدار تھی'

جماع کا یہ کفارہ مرتب ہے، پہلے ایک مومن غلام آزاد کرے، اگر غلام میسر نہ ہو تو دو ماہ مسلسل روزہ رکھے، اگر چاند کی ایک تاریخ سے روزہ شروع کرے تو چاند کے اعتبار سے دو ماہ رکھنا کافی ہے (چاہے ۲۹ر کا مہینہ ہو یا ۳۰ر کا) لیکن درمیان سے شروع کرے اور پہلا مہینہ ۲۹ر کا ہو تو تیسرے ماہ سے اتنے ہی روزے رکھے کہ پہلا اور تیسرا مل کر ۳۰ر ہو دوسرے مہینہ میں چاند کا اعتبار ہوگا، اگر درمیان میں ایک روزہ بھی چھوٹ جائے گرچہ عذر سے ہو تو ازسرنو دو ماہ روزہ رکھے۔ البتہ حیض، نفاس، جنون یا مکمل دن بیہوشی کی وجہ سے چھوٹ جائے تو حرج نہیں۔ ان روزوں میں رات ہی سے نیت کرنا اور کفارہ کی نیت کرنا واجب ہے۔ کفارہ کی تعیین ضروری نہیں ہے۔ بوڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے اس طرح مسلسل روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو ۶۰ر فقراء یا مساکین کو اناج دے، جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں، ایک ایک کو ایک مد ایسا اناج دے جو فطرہ میں دیا جاتا ہے۔ (بشری الکریم ۲ / ۷۷)

سنت روزے (نفل روزے)

حدیث : ' جو ایک دن اللہ کے راستہ میں روزہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ جہنم سے ۷۰ سال دور کردیں گے' (صحیحین)

(۱) عرفہ کے دن (۹ ذوالحجہ کو) روزہ سنت ہے۔ البتہ مسافر کے لئے اس دن روزہ نہ رکھنا سنت ہے۔ اگر حاجی اس دن مکہ مکرمہ یا کہیں اور مقیم ہو اور (عید کی) رات میں میدان عرفات پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے یہ روزہ سنت ہے۔ جو حاجی دن میں میدان عرفات پہنچے (جیسے عموماً ہوتا ہے اور افضل بھی یہی ہے) اسے عرفہ کا روزہ سنت نہیں ہے۔ بلکہ نہ رکھنا سنت ہے چاہے قوی ہو۔ تاکہ دعا وغیرہ عبادات کے لئے قوت حاصل ہو۔ اگر روزے سے ان اعمال میں کمزوری نہ آئے تب بھی نہ رکھے۔ اگر رکھے تو خلاف اولیٰ ہے۔

حدیث : (۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے عرفہ کے روزہ کے متعلق اللہ سے امید ہے کہ ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ (کے گناہوں) کا کفارہ ہو جائیگا، اور عاشورہ کے روزہ میں اللہ سے توقع ہے کہ گذشتہ ایک سال کا کفارہ ہو جائیگا (مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے میدان عرفات میں عرفہ کا روزہ نہیں رکھا۔ (متفق علیه)

(۳) آپ ﷺ نے میدان عرفات میں عرفہ کے روزہ سے منع فرمایا۔ (احمد، ابوداؤد۔ نسائی، ابن ماجه) عرفہ کے ساتھ آٹھ تاریخ کا بھی روزہ رکھنا احوط ہے، بلکہ روضہ میں فرمایا کہ ایک سے ۸ رتک رکھنا سنت ہے اور اس میں حاجی وغیر حاجی دونوں برابر ہیں۔

(۲) عاشوراء و تاسوعاء : محرم کی دس اور ۹ رتاریخ کو روزہ سنت ہے اوپر مسلم کی روایت میں عاشورہ کی فضیلت گذر چکی صرف عاشورہ کا روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہے (نهاية عن الام)

حدیث : (۱) عاشورہ کا روزہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے (ابن حبان)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے "اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو بالضرور ۹ رمحرم کو روزہ رکھونگا" (مسلم)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے "اگر میں آئندہ سال تک رہا تو بالضرور عاشوراء سے ایک دن قبل یا ایک دن بعد روزہ کا حکم دوں گا۔ (بیهقی) ۹ رمحرم کا روزہ بطور احتیاط اور یہود کی مخالفت کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے ۹ رکو نہ رکھتا تو ۱۱ رمحرم کو رکھے۔ بلکہ "الام" وغیرہ میں ہے کہ ۹ ر ۱۰ ر اور ۱۱ ر تین روزے مستحب ہیں۔ امام غزالیؒ نے ا رمحرم سے لیکر ۸ رتک کے روزوں کو سنت قرار دیا ہے۔ (نهاية المحتاج)

عاشورہ کی بدعات :

عاشورہ کے دن کی مشہور و شائع نماز، انفاق (خرچ کرنا) خضاب، تیل لگانا سرمہ لگانا اور مخصوص پکوان وغیرہ موضوع و افتراء ہے اس دن سرمہ کا اہتمام بدعت ہے جسے قاتلین حضرت حسینؓ نے گھڑا۔ عاشورا کے دن اپنے اہل وعیال پر خرچ میں توسیع کرنا سنت ہے۔ تاکہ سال بھر اللہ اسے کشادگی عطا فرمائے جیسا کہ حدیث حسن میں ہے بہت سے محدثین نے اسے آزمایا تو مجرب پایا (کردی علی بافضل) امام صاوی فرماتے ہیں کہ اہل وعیال پر توسیع کی حدیث اگر چہ ضعیف ہے، لیکن مختلف سندوں سے وارد ہے اسلئے مجموعی طور پر قوت حاصل ہوئی ہے بعض سند کو زین عراقی اور ابن ناصر الدین نے صحیح قرار دیا۔ (حاشية الشير وانى على تحفة المحتاج۔ ترشيح المستفيدين ص ۱۷۰)

(۳) پیر اور جمعرات کا روزہ

حدیث : آپ ﷺ بالقصد پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے اور فرماتے "اعمال پیر اور جمعرات کو (بارگاہ الٰہی میں) پیش ہوتے ہیں تو مجھے یہ محبوب ہے کہ میرے عمل روزے کی حالت میں پیش ہوں" (ترمذی، ابن ماجه، ابوداؤد، نسائی، احمد)

(۴) ایام بیض کے روزے :

یعنی چاند کی ۱۳ ر ۱۴ ر اور ۱۵ تاریخ کے روزے۔

حدیث : آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو ایام بیض یعنی ۱۳/ ۱۴/ ۱۵ تاریخ کے روزوں کی وصیت فرمائی۔ (نسائی، ترمذی، ابن حبان) احتیاطاً ۱۲/ تاریخ کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔ ذوالحجہ کے مہینہ میں ۱۳/ کے بجائے ۱۶/ کو روزہ رکھے۔ کیونکہ ۱۳/ کو یوم تشریق کی وجہ سے روزہ حرام ہے۔ ان تاریخوں میں چونکہ ساری رات چاندنی ہوتی ہے، اس لئے انہیں ایام بیض (روشن ایام یعنی روشن راتیں) کہا گیا۔

(۵) ایام سود:

یعنی ۲۸/ ۲۹/ اور ۳۰ کا روزہ سنت ہے۔ یہ راتیں چاند کے غائب ہونے کی وجہ سے مکمل تاریک ہوتی ہیں، اس لئے ایام سود (تاریک) کہا گیا۔ ان کے ساتھ ۲۷/ تاریخ کو بھی روزہ رکھنا بہتر ہے۔ اگر ۲۸/ سے شروع کرے اور مہینہ ۲۹/ کا ہو تو آئندہ ماہ کی ایک تاریخ کو رکھ کر تین کی تعداد پوری کریں۔

(۶) شوال میں چھ ۶/ روزے سنت ھیں۔

حدیث: جو رمضان کا روزہ رکھے اور اس کے بعد شوال میں ۶/ روزے رکھے تو یہ ہمیشہ (سال بھر) روزہ رکھنے کی طرح ہے"۔ (مسلم)۔ نسائی کی روایت میں ہے۔ ماہ رمضان کے روزے دس ماہ کے برابر اور ۶/ روزے (شوال کے) دو ماہ کے برابر ہیں۔ اور اس طرح سال بھر کے روزے ہوئے۔ یعنی سال بھر فرض روزے کا ثواب ملیگا۔ ورنہ مذکورہ روزے کی کوئی خصوصیت نہیں، کیونکہ ایک نیکی کا (کم از کم) دس گنا ثواب ہوتا ہے۔ (لہٰذا کسی وقت بھی ۶/ روزے کا ثواب دو ماہ سنت روزے کے برابر ہوگا) ان روزوں کو عید کے بعد متصل اور مسلسل رکھنا افضل ہے، عبادت کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے (شوال میں کسی بھی وقت اور متفرق رکھنے سے بھی اصل سنت حاصل ہوگی)

اگر کسی عذر سے رمضان کا روزہ نہ رکھ سکا تب بھی یہ روزے سنت ہیں۔ جو بلا عذر رمضان کے روزے نہ رکھے اسے یہ روزے حرام ہیں۔ (کیونکہ اسے فوراً رمضان کی قضاء واجب ہے) اگر شوال میں یا عاشوراء وغیرہ کے روز قضا یا نذر کا روزہ رکھے تو ان ایام کے سنت روزہ کا ثواب بھی ملے گا۔ جیسا کہ رملی، بارزی، اسنوی، ناشری، اور فقیہ علی بن صالح الحضرمی وغیرہ علماء کرام کا فتویٰ ہے۔ البتہ مطلوبہ کامل ثواب حاصل نہ ہوگا۔ شوال کا یا کوئی اور سنت روزہ فوت ہوجائے تو آئندہ اس کی قضاء مستحب ہے۔

(۷) صوم دَھر (ھمیشہ روزہ رکھنا)

اگر کسی ضرر و نقصان کا اندیشہ نہ ہو اور کوئی حق فوت نہ ہو تو عیدین اور ایام تشریق کے علاوہ ہمیشہ روزہ رکھنا سنت ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا جو ہمیشہ روزہ رکھے اس پر جہنم یوں تنگ ہوجائے گی اور ۹۰ کا اشارہ کیا۔ یعنی شہادت کی انگلی کو انگوٹھے کے نیچے لگا کر مختصر دائرہ کی شکل میں اشارہ کیا)" (بیھقی) یعنی اتنی تنگ ہوگی کہ داخل نہ ہو پائے گا۔ یا اندر اس کے لئے جگہ نہ ہوگی۔ (گویا جہنم سے محفوظ رہیگا)

اگر صوم دہر سے ضرر کا اندیشہ ہو یا حق فوت ہو تو یہ مکروہ ہے۔ اور اسی صورت پر مسلم کی اس روایت کو محمول کریں گے۔" اس کا روزہ نہیں جو ہمیشہ روزہ رکھے" امام سبکیؒ نے فرمایا کہ اگر صوم دھر سے کوئی واجب حق فوت ہو تو یہ حرام ہے۔ اور روزہ سے بڑھ کر سنت حق فوت ہو تو مکروہ ہے، اور روزے کے برابر درجہ کا ہو تو کراہت نہیں۔

(۸) صوم داؤدی : یعنی ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا (یعنی مسلسل ایک دن آڑ روزہ رکھنا)

حدیث : افضل روزہ داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ (روزہ نہ رکھتے)۔ اس

سے افضل صورت نہیں۔(صحیحین) ۔

امام متولی، سبکی اور اذرعی وغیرہ نے فرمایا کہ صوم دہر کے استحباب کے باوجود صوم داؤدی زیادہ افضل ہے، کیونکہ حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے، اور یہ طریقہ نفس پر زیادہ شاق بھی ہوگا۔ کیونکہ روز عادت بدلتی رہے گی۔ صوم دہر میں مستقل سحری اور رات کھانے کی عادت بن جائیگی تو اتنا احساس نہیں ہوگا۔ امام ابن عبد السلام اور امام غزالی نے صوم دہر کو اس سے افضل قرار دیا ہے۔(نهاية المحتاج - حاشية الجمل)

(۹) ہر ماہ تین روزے سنت ہیں ۔

تا کہ دس گنا کے اعتبار سے مکمل ماہ روزے کا ثواب ملے۔ چاہے یہ روزے ایام بیض میں رکھے یا کسی اور ایام میں۔ ایام بیض میں رکھے تو دونوں سنت پر عمل ہو جائے گا۔(نهاية المحتاج)

حدیث : حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ”میرے خلیل (ﷺ) نے مجھے ہر ماہ تین روزہ کی وصیت فرمائی ہے (متفق عليه)

(۱۰) اشهُر حُرُم (حرمت والے مهینے) :

شعبان و رمضان کے بعد حرام مہینے (یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب) کے روزے افضل ہیں۔ رمضان کے بعد سب سے افضل محرم کے روزے ہیں، پھر بقیہ تین حرام مہینے، پھر شعبان کے روزے، پھر بقیہ مہینے برابر درجہ میں ہیں۔(بشری الکریم ۲/ ۸۲)

حدیث : (۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”میں نے آپ ﷺ کو شعبان سے زیادہ کسی ماہ میں (سنت) روزہ رکھتے نہیں دیکھا“(مالک ، بخاری ، مسلم ، ابوداؤد ، ترمذی ، نسائی)

(۲) حضرت ام سلمہؓ کا ارشاد ہے” میں نے آپ ﷺ کو شعبان او رمضان کے علاوہ مسلسل دو ماہ روزہ رکھتے نہیں دیکھا“(اصحاب السنن)

(۳) رمضان کے بعد افضل روزہ اللہ کے ماہِ محرم کا روزہ ہے، اور فرض نماز کے بعد افضل صلوۃ اللیل (تہجد) ہے۔ (مسلم)

(۱۱) ابتدائی تین روزے ۔

ہر ماہ کے ابتدائی تین دن روزہ رکھنا سنت ہے(تحفة المحتاج ۴/ ۴۳۶)

حدیث : آپ ﷺ ہر ماہ کے ابتدائی تین دن روزہ رکھتے اور جمعہ کے دن بہت کم افطار کرتے (افطار یعنی روزہ نہ رکھنا) (ترمذی ۔ نسائی)(مطلب جمعہ کے آگے یا پیچھے ایک دن ملا کر)

مکروہ روزے

حدیث : (۱) تم میں سے کوئی جمعہ کا روزہ نہ رکھے، الا یہ کہ اس سے قبل ایک دن یا بعد ایک دن روزہ رکھے“(متفق عليه)

(۲) سنیچر کے دن صرف فرض روزہ رکھا کرو“(احمد ، اصحاب السنن ، ابن حبان ، حاکم) صرف جمعہ یا سنیچر یا اتوار کو بلا سبب نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ یہود سنیچر کی اور نصاریٰ اتوار کی تعظیم کے قائل ہیں۔ اگر تینوں دن یا دو دن کو جمع کرے تو مکروہ نہیں، کیونکہ مجموعی طور پر کوئی تعظیم کا قائل نہیں۔ نذر، قضا یا کفارہ کا روزہ ان ایام میں مکروہ نہیں۔ اسی طرح کسی سبب سے رکھے۔ مثلاً کوئی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار (صوم داؤدی) کا عادی ہو اور روزہ کا دن ان ایام میں آئے تو کراہت نہیں، جیسا کہ یوم الشک کا روزہ۔ اور مسلم کی روایت میں ہے” جمعہ کو دیگر ایام میں سے روزہ کے لئے مخصوص نہ کرو، الا یہ کہ تم میں سے کسی کے (عادت کے) روزہ کے دن آجائے“

جمعہ پر دیگر روزوں کو بھی قیاس کیا گیا۔ عرفہ یا عاشورہ جیسے روزے ان ایام میں آئیں، تو رکھنے میں کوئی کراہت نہیں۔

نفل عبادت کو توڑنا

حج اور عمرہ کے علاوہ دیگر نفلی عبادت کو بلا عذر توڑنا جائز ہے، لیکن مکروہ ہے۔

آیت: وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ (سورہ محمد: ص ۳۳)

ترجمہ: اور اپنے اعمال کو برباد مت کرو۔

احادیث: (۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک دن آپ ﷺ تشریف لائے تو ہم نے کہا "ہمارے یہاں حیس (کھجور، گھی اور پنیر سے بنی ہوئی مٹھائی) ہدیہ میں آیا ہے" تو فرمایا "مجھے بتاؤ۔ میں نے آج روزہ رکھا تھا" پھر آپ ﷺ نے وہ نوش فرمایا۔ (مسلم)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "نفلی روزہ دار اپنے نفس کا امیر ہے۔ (اسے اختیار ہے) چاہے تو روزہ رکھے (پورا کرے) اور چاہے تو توڑ دے"۔ (احمد ترمذی، حاکم، و قال صحیح الاسناد) صحابہ کرام میں حضرت عمر، علی، ابن عمر، ابن عباس، اور ابن مسعودؓ سے بھی سنت کو توڑنے کا جواز مروی ہے۔ (الحاوی للماوردی ۳/ ۴۶۸) روزہ پر دیگر عبادتوں کو بھی قیاس کیا گیا۔ اگر کچھ عذر ہو، مثلاً میزبان کا روزہ کی وجہ سے مہمان کے ساتھ کھانے میں عدم شرکت اسے گراں گذرے، یا اس کے برعکس مہمان کا روزہ میزبان کے لئے باعث دل شکنی ہو تو نفلی روزہ توڑنا مکروہ نہیں ہے۔ بلا عذر توڑنے پر سابق پر کچھ ثواب نہ ملے گا، البتہ عذر کی وجہ سے ہو تو ثواب ملے گا۔ حج وعمرہ کے اپنے مخصوص احکامات ہیں، لہٰذا یہ نفل بھی ہوں تو مکمل کرنا لازم ہے۔ اور توڑنا حرام ہے۔

روزے وغیرہ نفلی عبادات کو توڑنے کی صورت میں بعد میں ان کی قضاء واجب نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت ام ہانیؓ کو نفل روزہ قضا توڑنے کی اجازت دی تھی (ابو داود) روزہ پر دیگر عبادات کو بھی قیاس کریں گے۔ لیکن بعد میں قضاء کر لینا مستحب ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے نفل روزہ توڑ دیا تو آپ ﷺ نے اس کی قضاء کا حکم دیا۔ (مؤطا، عبد الرزاق، احمد، ترمذی، بیھقی، الحاوی مع التعلیق ۳/ ۴۶۹)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے ام ہانی نے روزہ توڑا تو فرمایا "چاہو تو قضاء رکھ لو ورنہ مت رکھو۔ (الحاوی ۳/ ۴۶۹)

فرض کو توڑنا

کسی بھی فرض عین عبادت کو شروع کرنے کے بعد توڑنا اور قطع کرنا حرام اور کبیرہ ہے، گرچہ وہ فوری نہ ہو۔ جہاد، نماز جنازہ، حج اور عمرہ کے علاوہ دیگر فرض کفایہ کو توڑنا حرام نہیں۔

عورت کا نفلی روزہ

حدیث: کسی عورت کے لئے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ حلال نہیں ہے (صحیحین) عورت شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ نہ رکھے، شوہر کی رضامندی کا علم بھی، کافی ہے۔ عاشوراء جیسے موکد نفلی روزے اجازت کے بغیر حرام نہیں۔ شوہر کی غیر موجودگی میں روزہ رکھنا قطعاً جائز ہے۔ نفل نماز کیلئے اجازت کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کا وقت بمقابلہ روزہ مختصر ہوتا ہے۔

کتاب الاعتکاف :

آیت : ''وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ'' (البقرہ۔ ۱۸۷)

ترجمہ: اوران بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو (جوکہ) مسجدوں میں (ہوا کرتا ہے) (من بیان القرآن)

حدیث : ''آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں وصال تک اعتکاف فرمایا کرتے'' (متفق علیہ) عربی زبان میں اعتکاف کا مطلب ہے ٹھہرنا، روکے رکھنا، ہمیشہ لازم رہنا۔ شرعاً مخصوص شخص کا نیت کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنا اعتکاف کہلاتا ہے۔ اس کی مشروعیت پر اجماع ہے۔ اعتکاف ہر وقت سنت ہے چاہے بغیر روزے کے یا صرف رات میں اعتکاف کرے، کیونکہ کسی وقت کی قید اور تعین مروی نہیں۔ رمضان کے آخری عشرہ میں دیگر ایام کے مقابلہ میں زیادہ افضل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی پابندی فرمائی ہے۔ (شیخین) اور اس کی اصل حکمت لیلۃ القدر کی تلاش اور اس کے حصول کی کوشش ہے۔ جو قرآن کی رو سے ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ یعنی اس ایک رات کی عبادت ایسے ہزار ماہ کی عبادت سے بہتر ہے، جس میں لیلۃ القدر نہ ہو۔

حدیث : (۱) جو لیلۃ القدر میں ایمان اور ثواب کی نیت سے قیام کرے (اللہ کی عبادت کرتا رہے) اس کے سابقہ گناہ معاف ہوں گے۔ (متفق علیہ) (مراد اس سے حقوق اللہ سے متعلق صغیرہ گناہ ہیں۔

(۲) شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو (متفق علیہ) امام شافعیؒ کے نزدیک آخری عشرہ کے ہر شب میں لیلۃ القدر کا امکان ہے، لیکن زیادہ احتمال طاق راتوں میں اور اس میں بھی ۲۱، یا ۲۳ کی رات میں ہے۔ ۲۱ویں شب پر شیخین کی روایت اور ۲۳ویں شب پر مسلم کی روایت دلالت کرتی ہے۔ امام مزنی اور ابن خزیمہ وغیرہ نے فرمایا کہ شب قدر منتقل ہوتے رہتی ہے۔ (ہر سال ایک ہی متعین رات نہیں ہوتی) امام نوویؒ نے روضہ، مجموع اور فتاویٰ میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ جمع بین الاحادیث میں امام شافعیؒ کے کلام کا بھی یہی تقاضا ہے۔ شب قدر کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کی صبح جب سورج طلوع ہوگا، تو بالکل سفید ہوگا، اسمیں زیادہ شعاع نہ ہوگی۔ شب قدر اس امت کی خصوصیت ہے۔ یہ سال کی سب سے افضل رات اور تا قیامت باقی ہے۔ یہ درحقیقت نظر آتی ہے، جسے نظر آئے اسے یہ چھپانا سنت ہے، کیونکہ یہ نظر آنا ایک کرامت ہے اور کرامت کا پوشیدہ رکھنا سنت ہے۔ شب قدر میں ساری رات نماز، تلاوت، دعا وغیرہ عبادات میں مصروف رہے۔ شب قدر میں یہ دعا بکثرت پڑھے۔ ''اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا'' (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ : اے اللہ! بے شک تو ہی معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے پس ہمیں معاف فرما۔ شب قدر کا علم نہ ہو سکے تب بھی اس رات کی عبادت کرنے سے اس کی فضیلت فی الجملہ حاصل ہوگی (کامل فضیلت بغیر علم کے حاصل نہ ہوگی) اس کی ایک علامت اس میں گرمی و سردی کا نہ ہونا ہے۔ (یعنی رات معتدل ہوگی) شب قدر کے بعد دن میں بھی کثرتِ عبادت مستحب ہے۔

اعتکاف کے ارکان :

اعتکاف کے چار ارکان ہیں۔ (۱) نیت۔ (۲) مسجد (۳) اتنا ٹھہرنا جسے عکوف کہہ سکیں۔ (۴) معتکف

(۱) نیت : دیگر عبادات کی طرح اعتکاف میں نیت واجب ہے۔ اگر نذر کا اعتکاف ہے تو فرضیت کی نیت واجب ہے تا کہ نفل سے متمیز ہو۔

کسی مدت کی تعین کے بغیر مطلق اعتکاف کی نیت کرلے تو یہ کافی ہے، چاہے طویل وقت اعتکاف میں ٹھہرا رہے۔ لیکن واپسی کے ارادے کے بغیر مسجد سے باہر جائے اور بعد میں واپس لوٹے تو دوبارہ نیت کرے، قضاء حاجت کے لئے گیا ہو یا کسی اور کام سے کیونکہ جتنا وقت اعتکاف میں گذرا وہ مکمل عبادت ہے، اگر اعتکاف کے لئے واپس لوٹنے کے ارادے سے جائے تو یہ ارادہ بھی نیت کے قائم مقام ہے۔ (واپسی کے بعد پھر نیت کی ضرورت نہیں)

اگر نیت میں مدت کی تعین کرے مثلاً ایک دن کا اعتکاف یا ایک ماہ کا اعتکاف اور قضاء حاجت کے علاوہ کسی مقصد سے مسجد سے باہر جائے اور لوٹے تو پھر نیت کرلے چاہے زیادہ فاصلہ نہ گذرا ہو، کیونکہ اس سے اعتکاف منقطع ہوتا ہے۔ بول و براز (پیشاب، پاخانہ) کے لئے جائے تو دوبارہ نیت کی ضرورت نہیں، چاہے زیادہ وقت گذر جائے کیونکہ یہ لازمی ضرورت ہے، اس لئے گویا کہ بوقت نیت ہی مستثنیٰ ہے۔

اگر متعین مدت میں مسلسل (متتابع) اعتکاف کی نذر مانے اور کسی ایسے عذر سے نکلے جس سے تسلسل ختم نہیں ہوتا، تو لوٹنے کے بعد تجدید نیت کی ضرورت نہیں۔ قضاء حاجت کے لئے گیا ہو یا کسی اور عذر سے، کیونکہ اس کی نیت اس مکمل مدت کو شامل ہے۔ بول و براز، مرض اور حیض ایسے اعذار ہیں جن سے اعتکاف کا تسلسل ختم نہیں ہوتا۔

عورت کو شوہر کی اجازت کے بغیر اور غلام کو آقا کی اجازت کے بغیر اعتکاف جائز نہیں۔

(۲) مسجد : اعتکاف شرعی مسجد میں ہو، کیونکہ شیخین کی روایت سے آپ ﷺ کا عمل یہی ثابت ہوتا ہے۔ کسی اور جگہ اعتکاف صحیح نہیں، چاہے وہ جگہ نماز کے لئے رکھی گئی ہو۔ لہٰذا امام شافعیؒ کے قول جدید میں عورت اپنے گھر میں نماز کے لئے متعین مخصوص جگہ میں اعتکاف نہیں کرسکتی۔ (قول قدیم کی رو سے اس کی گنجائش ہے)۔

عام مساجد کے بجائے جامع مسجد میں اعتکاف افضل ہے، (عموماً) کثرت جماعت کی وجہ سے، بعض علماء نے جامع مسجد کو واجب کہا ہے ان کے اختلاف سے بچنے کے لئے بھی یہی بہتر ہے۔ اور جمعہ کے لئے مسجد چھوڑ کر جانے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی۔ کسی نے مسلسل اتنے ایام کے اعتکاف کی نذر مانی، جس میں جمعہ کا دن آتا ہو اور اس پر جمعہ واجب ہو اور نذر میں جمعہ کے لئے جانے کی شرط نہ لگائی ہو، تو ایسے شخص کو جامع مسجد ہی میں اعتکاف واجب ہے، کیونکہ جمعہ کے لئے مسجد سے باہر جانے سے تسلسل (تتابع) باطل ہوگا۔

کسی نے نذر میں مسجد مکہ یا مسجد مدینہ یا مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کی تعین کی وہ تو متعین ہو جائے گا۔ دیگر مساجد ان کے قائم مقام نہ ہوں گے۔ کیونکہ ان مساجد میں مزید فضیلت ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''کجاوے نہ کسے جاویں (باقاعدہ سفر نہ کیا جائے) مگر صرف تین مساجد کے لئے، میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ'' (صحیحین) پہلی (مسجد مکہ) بعد والے دونوں کے قائم مقام ہوگی، کیونکہ وہ سب سے افضل ہے اور حج و عمرہ کا تعلق اس سے ہے۔ اور مسجد نبوی بیت المقدس کے قائم مقام ہوگی۔ کیونکہ اسے زیادہ فضیلت حاصل ہے، بہ نسبت بیت المقدس کے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے ''میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز سے بھی افضل ہے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز میری مسجد میں سو نماز سے بھی افضل ہے۔ (رواہ الامام احمد وصححہ ابن ماجہ) اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ آخری دو پہلے کے اور تیسرا دوسرے کے قائم مقام نہ ہوگا۔ (یعنی مسجد حرام کی نذر رکھیں اور پوری نہ ہوگی۔ اور مسجد نبوی کی نذر بیت المقدس میں ادا نہ ہوگی) ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد میں تعین کرے تو وہ متعین نہ ہوگا۔ (کسی بھی مسجد میں اعتکاف کرلینا کافی ہے) اگر اعتکاف کے وقت کی تعین کرے، تو وقت متعین ہوگا۔ متعینہ وقت سے پہلے اعتکاف کرے تو نذر ادا

نہ ہوگی۔اور مؤخر کرے تو قضا شمار ہوگی۔اور عمداً مؤخر کرنا باعث گناہ ہے۔

(۳) **مسجد میں رکوع وغیرہ طمانینت** کی مقدار سے کچھ زائد (ایک ہی لحہ کیوں نہ ہو) ٹھہرنا اور رکنا پایا جائے ،اگر چہ بلا سکون ہو،لہٰذا صرف مسجد میں چلتا پھرتا رہے (ایک جگہ سکون سے نہ بیٹھے) تو یہ بھی کافی ہے۔بغیر ٹھہرے ہوئے صرف گذر جانا کافی نہیں۔اعتکاف مطلق کی نذر ہو (یعنی صرف اعتکاف کی نذر ہو، مدت کا ذکر نہ ہو) تو تھوڑی سی دیر اعتکاف کر لینا کافی ہے،زیادہ دیر کرے تو پورا واجب شمار ہوگا مکمل ایک دن اعتکاف کر لینا مستحب ہے، کیونکہ آپ ﷺ اور کسی صحابی سے اس سے کم اعتکاف ثابت نہیں۔

(۴) **مُعتکف:** (اعتکاف کرنے والا) معتکف کے لئے اسلام، عقل اور حدثِ اکبر سے پاک ہونا شرط ہے، لہٰذا کافر، پاگل اور حدثِ اکبر والے کا اعتکاف صحیح نہ ہوگا۔کیونکہ کافر و پاگل کی نیت کا اعتبار نہیں۔اور حدثِ اکبر میں مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے۔ان صورتوں میں اعتکاف اور اعتکاف کا تتابع (تسلسل) ختم ہو جائے گا: مرتد ہونا، نشہ آنا (جبکہ اس میں گنہ گار ہو) حیض جبکہ مدتِ اعتکاف غالباً اس سے خالی رہتا ہو، بخلاف ایسی مدت کے جو اس سے خالی نہ رہے، جیسے مکمل ایک ماہ۔ایسی جنابت جس سے روزہ باطل ہوتا ہو، ایسی جنابت جس سے روزہ باطل نہ ہو، لیکن فوراً اسے دور نہ کرے۔مذکورہ سارے امور قضاء حاجت کے لئے مسجد سے باہر جانے کے بعد پیش آئیں تب بھی یہی حکم ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک بلا عذر بدنی عبادت کے منافی ہے۔

ایسی جنابت ہو جس سے روزہ نہ ٹوٹے (مثلاً نسیاناً یا لاعلمی میں ہو، یا احتلام ہو جائے) اور جلد ہی پاکی حاصل کرے یا جنون یا بے ہوشی طاری ہو تو اعتکاف اور تتابع منقطع نہ ہوگا۔

حدث اکبر کے بعد بغیر ٹھہرے مسجد ہی میں طہارت کا حصول مشکل ہو تو فوراً نکلنا واجب ہے، کیونکہ اس حالت میں مسجد میں رکنا گناہ ہے۔اگر مسجد میں طہارت ممکن ہو (مثلاً تالاب وغیرہ ہو) تو فوراً نکلنا واجب نہیں۔(بلکہ فوراً وہیں غسل کرے لیکن وہیں غسل واجب نہیں ہے غسل کے لئے باہر جانا بھی) جائز ہے۔اور اسی پر لازم ہے کہ جلد غسل کرے تا کہ اعتکاف کا تتابع ختم نہ ہو ۔نیند اور بے ہوشی کا وقت اعتکاف میں شمار ہوگا، بقیہ امور جو گذر چکے ان سے اعتکاف نہ بھی ٹوٹے تو وہ وقت اعتکاف میں شمار نہ ہوگا۔مثلاً جنون۔حیض وغیرہ (لہٰذا واجب مدت کی تکمیل کے لئے ان اوقات کی تلافی لازم ہے)

اعتکاف میں جائز امور

اعتکاف کی حالت میں خوشبو کا استعمال، زینت (مثلاً غسل، مس کرنا، بالوں میں تیل ڈالنا اور کنگھی کرنا، اچھے لباس پہننا) نکاح کرنا اور نکاح کرانا، اور پیشہ وکاریگری (مثلاً کپڑا سینا) جائز ہے۔کاریگری زیادہ ہو تو مکروہ ہے۔کتابت علم کسی دوسرے کے لئے بھی کثرت کے ساتھ مکروہ نہیں۔مسجد میں اپنے معاشی امور کی اصلاح کا حکم دینا اور جائداد وغیرہ کا خیال اور فکر کرنا اور کھانا پینا جائز ہے۔بہتر ہے کہ دستر خوان پر کھائے ،اور کسی برتن وغیرہ میں ہاتھ دھوئے اور لوگوں کی نگاہوں سے دور ہو۔

مسجد میں فصد اور سینگی برتن میں مکروہ ہے۔استحاضہ وغیرہ کے بدن سے نکلنے والے دیگر خون کا بھی یہی حکم ہے۔اگر مسجد خون سے ملوث ہو، یا پیشاب پاخانہ کرے (گر چہ کسی برتن میں ہو) تو یہ حرام ہے بغیر حاجت کے مسجد میں نجاست کا داخل کرنا حرام ہے۔حاجت ہو تو حرام نہیں، جیسے نجس جوتے چپل اندر لے جاسکتے ہیں جبکہ مسجد کی گندگی کا خطرہ نہ ہو۔

معتکف کے لئے بہتر یہ ہے کہ علم دین، تلاوت، احادیث کا سننا سنانا وغیرہ عبادات میں لگا رہے۔کنگھی کرنے کے بعد جھڑے

ہوئے بال مسجد میں نہ ڈالے۔ اگر بال کاٹنے یا مونڈنے کی ضرورت ہو تو اپنے گھر جائے، مسجد میں نہ انجام دے۔ (گرچہ حائل کی صورت میں گنجائش ہے) اعتکاف بغیر روزہ کے اور صرف رات میں بھی کرسکتا ہے، کیونکہ اعتکاف کے لئے روزہ شرط نہیں ہے۔

حدیث: معتکف کو روزہ لازم نہیں ہے الّا یہ کہ وہ خود لازم کرے (رواہ الحاکم وصححه علی شرط مسلم) یوں نذر مانے کہ کسی ایسے دن اعتکاف کروں گا جس میں روزہ ہو تو روزہ کی حالت میں اعتکاف لازم ہے، اب وہ روزہ رمضان وغیرہ کا فرض روزہ ہو یا کوئی اور نفل روزہ، البتہ روزے کے ساتھ اعتکاف لازم ہے دونوں الگ الگ پایا جانا کافی نہیں۔

اگر نذر یوں ہو کہ روزے کی حالت میں اعتکاف کروں گا یا اعتکاف کی حالت میں روزہ رکھوں گا تو دونوں بھی لازم اور دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا بھی لازم ہے۔ اس صورت میں رمضان وغیرہ کا فرض روزہ کافی نہیں۔

کسی نے نماز کے حالت میں اعتکاف یا اعتکاف کی حالت میں نماز کی نذر مانی تو دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا لازم نہیں۔ الگ الگ ادا کرے تو بھی کافی ہے۔ حج وعمرہ میں قران کی نذر ہو تب بھی دونوں کو الگ الگ ادا کرسکتا ہے، بلکہ وہ افضل ہے، اور دم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (قران یعنی ایک ہی احرام سے حج وعمرہ دونوں کی ادائیگی کی نیت کرنا)

اعتکاف کی نذر

معین یا غیر معین کسی مدت کے اعتکاف کی نذر تتابع کی شرط کے ساتھ مانے مثلاً اللہ کے لئے مجھ پر ایک ماہ کا اعتکاف اور فلاں ماہ کا اعتکاف واجب تو ادا میں ہر حال میں تتابع واجب ہے اور معین مدت کی صورت میں قضا میں بھی واجب ہے، کیونکہ اس نے لفظاً اسے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ اگر شرط نہ لگائے تو صرف معین مدت کے ادا اعتکاف میں لازم ہے۔ (قضا اور غیر معین میں نہیں) صرف دل میں اعتکاف کی نذر مانے یا تتابع کی شرط لگائے (الفاظ میں زبان سے ادا نہ کرے) تو یہ لازم نہیں۔ اگر تفریق کی شرط لگائے (یعنی جدا جدا مدت کی شرط لگائے) تو تتابع کے ساتھ اعتکاف سے بھی نذر ادا ہوگی کیونکہ یہ افضل ہے۔

ایک دن اعتکاف کی نذر ہو تو تفریق جائز نہیں۔ (مثلاً آج نصف دن کرے پھر کل بقیہ کرے تو یہ کافی نہیں) کیونکہ 'ایک دن' کا مفہوم متصل اور ایک ساتھ ایک دن ہے۔ لہٰذا صبح صادق سے غروب ہونے تک اعتکاف کرے۔ البتہ دن کے دوران اعتکاف شروع کرکے دوسرے دن اس وقت تک اعتکاف میں رہے تو یہ کافی ہے)۔ مثلاً آج دوپہر ۱۲ بجے اعتکاف شروع کیا اور دوسرے دن ۱۲ بجے تک اعتکاف میں رہا تو یہ کافی ہے۔)

تتابع اور تسلسل کے شرط کے ساتھ کسی ایسے عارض (سبب) کی وجہ سے نکلنے کی شرط لگادے جو مقصود و جائز ہو، اور اعتکاف کے منافی نہ ہو، تو یہ شرط صحیح ہے (مثلاً بیمار کی عیادت، جنازہ میں شرکت، کسی ضرورت سے بادشاہ کی ملاقات وغیرہ) کیونکہ اعتکاف اپنے لازم کرلینے سے لازم ہوتا ہے لہٰذا جن شرائط کے ساتھ لازم کیا ہے، اس کا اعتبار ہوگا اگر کسی خاص عارض کی تعین کرے مثلاً مریضوں کی عیادت تو صرف اس کے لئے جاسکتا ہے، کسی اور عارض کی وجہ سے نہیں جاسکتا۔ اور مطلقاً عارض کی شرط ہو تو ہر دینی یا جائز دنیوی عارض کی وجہ سے جاسکتا ہے اگر مدت معین ہو (مثلاً اس ماہ کا اعتکاف) تو مذکورہ عارض کے مدت کے تدارک اور تلافی کی ضرورت نہیں کیونکہ درحقیقت نذر اس کے علاوہ مدت کی ہے۔ اگر مدت معین نہ ہو جیسے ایک ماہ تو تدارک واجب ہے تاکہ مدت مکمل ہو۔ اور شرط کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ عارض قضاء حاجت کے حکم میں ہوجائے گا کہ اس کی وجہ سے تتابع منقطع نہ ہوگا۔

عارض کے بغیر یوں شرط لگائے کہ اگر مجھے نکلنا ہوتو نکلوں گا یا حرام عارض کی شرط لگائے مثلاً چوری یا شراب پینا یا غیر مقصود عارض کی شرط لگائے جیسے سیر وتفریح یا اعتکاف کے منافی ہو جیسے جماع تو یہ شرط صحیح نہیں اور سرے سے نذر ہی منعقد نہ ہوگی۔

مجموع میں ہے کہ ایک دن کے اعتکاف کی نذر ہو اور رات اعتکاف کرے یا اس کے برعکس (یعنی رات کی نذر ہو اور دن میں اعتکاف کرے) تو وقت معین کیا اور فوت ہو چکا تو یہ کافی ہے کیونکہ قضا ہے، ورنہ کافی نہیں (بلکہ معین وقت میں ہی کرے)

مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے تتابع منقطع نہ ہوگا:

(۱) بول وبراز کے لئے جانا۔ چاہے اپنے گھر جائے جو مسجد سے بہت زیادہ دور نہ ہو اور اس سے قریب اس کا دوسرا امکان نہ ہو۔ اگر گھر بہت زیادہ دور ہو اور راستے میں اس کے مناسب کوئی اور جگہ نہ ہو تو گھر جا سکتا ہے۔ مسجد کے عام بیت الخلاء میں یا مسجد کے قریب کسی دوست وغیرہ کے گھر جانا واجب نہیں، پہلی صورت میں مشقت اور دوسری صورت میں احسان کی وجہ سے۔ اگر قریب دوسرا گھر ہو یا اپنا گھر بہت دور ہو اور راستہ میں مناسب عدم استنجاء موجود ہو تو تتابع منقطع ہوگا۔ کیونکہ واپسی تک پھر حاجت محسوس ہوسکتی ہے اور لوٹنا پڑے گا اور پورا دن اسی چکر میں گزرے گا۔ گھر بہت دور ہونے سے مطلب اتنا فاصلہ ہونا کہ نصف سے زیادہ آنے جانے میں ہی گذر جائے۔

بول وبراز کے لئے نکلے تو تیز رفتاری کی ضرورت نہیں، اپنی عام رفتار سے آمد ورفت کافی ہے۔ استنجاء سے فراغت کے بعد باہر سے ہی وضو کر کے آسکتا ہے، کیونکہ یہ استنجاء کے تابع ہے۔ لیکن مسجد میں وضو ممکن ہونے کے باوجود وضو کے لئے باہر جانا جائز نہیں۔

(۲) قضاء حاجت کے لئے جانے کے بعد راستہ میں ہی کسی مریض کی عیادت کر لے یا سفر سے آنے والے کی ملاقات کر لے جبکہ وہاں زیادہ نہ رکے، اور اپنا راستہ بدلنا نہ پڑے، اگر راستہ سے ہٹ کر جانا پڑا یا زیادہ رکا تو تتابع ختم ہوگا۔

(۳) جنون یا بے ہوشی یا ایسا مرض جس میں مسجد میں قیام دشوار ہو مثلاً خادم کی یا ڈاکٹر کی آمد ورفت کی ضرورت ہو یا مسجد کے گندگی کا اندیشہ ہو (جلاب وغیرہ کی وجہ سے) اگر مرض ایسا ہو کہ مسجد سے نکلنے کی ضرورت نہیں جیسے سر درد، معمولی بخار وغیرہ تو اس کی وجہ سے تتابع منقطع ہوگا۔

(۴) چور یا آگ کے ڈر سے نکلنا۔

(۵) اعتکاف ہی کو یا تتابع کی قید کو بھول گیا اور مسجد سے نکلا، بھول کر کافی وقت باہر گذرا تب بھی یہ عذر ہے۔

(۶) موذن راتب (وہ مؤذن جو مستقل اذان کی خدمت پر مقرر و متعین ہو) کا اذان کے لئے مسجد سے جدا مسجد ہی کے قریبی منارہ پر جانا، کیونکہ یہ مسجد کے لئے تمیز شدہ اور اسی کی ماتحتی میں ہے۔ اور مؤذن بھی اس کا عادی اور لوگ اس کی اذان سے مانوس ہیں۔ اگر مؤذن راتب کے علاوہ کوئی مذکورہ منارہ پر جائے یا مؤذن راتب مسجد کے مینارہ کے علاوہ دوسری جگہ جائے یا مسجد کے منارہ پر اذان کی ضرورت کے بغیر جائے یا مسجد سے دور منارہ پر جائے تو تتابع ختم ہوگا۔ جو منارہ مسجد سے متصل ہو کہ اس کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہو تو اس پر اذان کے بغیر بھی جانے میں حرج نہیں، کیونکہ وہ مسجد سے خارج شمار نہ ہوگا۔ مسجد کی سمت سے ہٹی ہوئی ہو تب بھی مسجد ہی کے حکم میں ہے۔

(۷) مسجد میں لوگوں کی آمد ورفت رہتی ہو تو کھانے کے لئے باہر جا سکتا ہے گرچہ مسجد میں ممکن ہو، کیونکہ مسجد میں کھانے سے آدمی شرماتا ہے۔ پانی مسجد میں میسر ہو تو پانی پینے باہر نہیں جا سکتا۔

(۸) بغیر حق کے کوئی اکراہ اور جبر سے نکالے۔

(۹) اس حد (سزا) کے لئے نکلنا جو گواہوں سے ثابت ہو، اپنے اقرار سے ثابت ہو تو اس کے لئے نکلنے سے تتابع ختم ہوگا۔

(۱۰) وہ جاہل جو مذکورہ مسائل سے ناواقف ہو۔

مسلسل اعتکاف کے نذر میں جو وقت ایسے عذر کی وجہ سے مسجد سے باہر گذرے جس سے تسلسل ختم نہ ہو، اس کی قضاء واجب ہے جیسے حیض، نفاس مذکورہ جنابت وغیرہ، قضاء حاجت، کھانا اور مؤذن راتب کے اذان کے اوقات کی قضاء واجب نہیں۔ کیونکہ یہ لابدی (ضروری) اور مستثنیٰ ہیں۔ اور ان اوقات میں بھی وہ حکماً معتکف شمار ہوگا۔

کتاب الحج (حج کا بیان)

لفظ 'حج' عربی زبان میں قصد وارادہ اور زیارت یا کسی معظم ومحترم کے بکثرت قصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شرعاً، آئندہ سطروں میں ہونے والی مخصوص عبادت کی خاطر کعبۃ اللہ کے قصد کو حج کہتے ہیں۔

لفظ 'عمرہ' عربی میں زیارت وملاقات اور قصد کے لئے مستعمل ہے، اور شریعت میں آئندہ آنی والی مخصوص عبادت کے لئے کعبۃ اللہ کے قصد وزیارت کو عمرہ کہتے ہیں۔

حج قدیم شریعتوں میں بھی مشروع تھا لیکن اس کیفیت کے ساتھ اس امت کی خصوصیت وارد ہے کہ ہر نبی نے حتی کہ حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی بیت اللہ کا حج کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام جب بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں حج کے اعلان کا حکم دیا۔

انھوں نے عرض کیا کہ میری آواز کہاں تک پہنچ پائیگی؟

ارشاد باری ہوا تم اعلان کرو، پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہوکر بآواز بلند اعلان فرمایا "یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْحَجّ فَحُجُّوْا" (اے لوگوں اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا تم حج کرو۔) اس آواز کو آسمان وزمین والوں نے سنا، حتی کہ جو ابھی باپ کے پشت اور ماں کے رحم میں تھے (یعنی آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں) انھوں نے بھی سنا، پس جس نے ایک مرتبہ جواب دیا وہ ایک مرتبہ حج کریگا جس نے دو مرتبہ دیا وہ دو مرتبہ، اور جس نے تین مرتبہ دیا وہ تین مرتبہ جس نے اس سے زیادہ مرتبہ دیا وہ اتنی ہی مرتبہ حج کریگا۔

وقت فرضیت: راجح قول کے مطابق ۵ھ میں فرض ہوا۔ آپ ﷺ نے ۹ھ کو صدیق اکبرؓ کو امیر حج بنا کر روانہ کیا اور انھوں نے اس فریضہ کو انجام دیا بعض مالدار صحابہ مثلاً حضرت عثمان غنیؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ جہاد اور دشمن کے ساتھ مصروفیت کے بغیر آپ ﷺ کی طرح اس سال حج میں نہ گئے، بلکہ ۱۰ھ آپ ﷺ کی معیت میں حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ آپ ﷺ نے قبل نبوت اور بعد نبوت اور قبل ہجرت کئی حج وعمرے کئے جن کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہجرت کے بعد ایک حج "حجۃ الوداع" ادا فرمایا۔

حج کا حکم: حج اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک ہے۔ اسکا اسلامی رکن ہونا بالکل قطعی اور واضح ہے۔ کوئی اس کا انکار کردے تو کافر ہوگا۔ البتہ تازہ نومسلم ہو، یا ان مسائل سے واقف حضرات سے دور دراز علاقہ میں پلا بڑھا ہو، تو اسے معذور سمجھیں گے۔ (اور معلوم ہونے تک کفر کا حکم نہ لگے گا)

حج نماز کے علاوہ دیگر تمام عبادات سے افضل ہے۔ کیونکہ یہ بدن اور مال دونوں پر مشتمل ہے۔ صحیح اور مبرور حج (جس میں سارے ارکان وآداب کی رعایت ہو اور ابتداء سے انتہاء تک گناہ کا دخل نہ ہو) کی وجہ سے صغیرہ گناہ بالاتفاق معاف ہونگے۔ راجح

قول کے مطابق کبائر بھی معاف ہوں گے۔ جس گناہ کا تاوان وبدلہ یا قضا لازم ہے، (مثلاً کسی کا قرض وغیرہ۔ قضا نمازیں وغیرہ) حج کے بعد ان کو انجام دینا واجب ہے۔ البتہ دوران حج یا فراغت کے بعد ان کی ادائیگی کا موقعہ ملنے سے پہلے ہی مرجائے۔ تو انشاء اللہ یہ بھی معاف ہونے کی امید ہے۔

حج وعمرہ کی فرضیت

حج وعمرہ اصل شرع کی رو سے زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ آئندہ ادائیگی کے ارادے کے ساتھ تاخیر کی گنجائش ہے۔ جبکہ نذر، قضایا بے بس ہونے کے اندیشہ کی وجہ سے وقت تنگ نہ ہو۔ نذر یا قضا کی صورت میں مزید حج یا عمرہ بھی فرض ہوجاتا ہے۔

آیت: (۱) "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا" (آل عمران۔ آیت ۹۷) اور اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے۔ یعنی اس شخص کو جو کہ طاقت رکھے وہاں تک (پہنچنے) کی سبیل کی۔

(۲) "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" (البقرۃ۔ ۱۹۶) اور حج اور عمرہ کو اللہ کے واسطے پورا پورا ادا کیا کرو۔ یعنی ان دونوں کو مکمل اور تام طریقہ سے انجام دو۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا "اے لوگوں اللہ تعالی نے تم پر حج فرض کیا ہے، تو تم حج کرو" تو ایک شخص نے پوچھا "اے اللہ کے نبی! کیا ہر سال؟" تو آپ ﷺ چپ رہے۔ یہاں تک کہ اس نے تین مرتبہ پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں ہاں کہتا تو واجب ہوجاتا اور تم نہ کرپاتے" (مسلم)

(۲) حضرت سراقہؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا "ہمارا یہ عمرہ اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے" تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "نہیں بلکہ ہمیشہ کیلئے" (دار قطنی باسناد صحیح)

حج وعمرہ کی صحت

حج وعمرہ صحیح ہونے کے لئے صرف اسلام شرط ہے۔ کافر ومرتد کا حج صحیح نہ ہوگا۔ صرف صحت کے لئے مکلف ہونا لازم نہیں لہٰذا بچے کا (ولی مال) مالی سرپرست اور ذمہ دار (یعنی باپ پھر دادا پھر وصی پھر حاکم یا اس کا قیم) ممیز یا غیر ممیز بچہ اور پاگل کی طرف سے احرام باندھ کر اسے حج کرا سکتے ہیں۔ مالی ذمہ دار کے علاوہ جیسے بھائی یا چچا وغیرہ تو اس کی اجازت نہیں۔

حدیث: ایک عورت نے ایک بچے کا ہاتھ پکڑ کر آپ ﷺ سے پوچھا "کیا اس کا حج ہوگا" تو جواب دیا "ہاں! اور تم کو اجر ملے گا۔" (موطا، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی۔ ابن حبان)

بچہ و پاگل کی طرف سے احرام کا طریقہ یہ ہے کہ اسے محرم بنانے کی نیت کرلے، تو وہ محرم ہوجائیگا۔ اس کا موجود ہونا یا ولی کی طرف متوجہ ہونا شرط نہیں ہے۔ غیر ممیز بچہ کو لے کر ولی طواف کرائے۔ طواف سے پہلے طواف کے شرائط ستر عورت وضو وغیرہ) بھی کرائے، اس کو سعی بھی کرائے۔ (طواف وسعی خود ولی کا ہونے کے بعد اسے لے کر کرائے) اس کی جانب سے ولی طواف کی دو رکعت ادا کرے۔ ولی اسے مواقف (واقف کے مقامات مثلاً عرفہ، مزدلفہ) میں لے جائے بغیر ولی کے وہ اپنے طور پر جائے تو یہ کافی نہیں ہے۔ اگر وہ رمی کرسکتا ہے۔ تو کنکر اس کو تھمادے۔ تاکہ وہ رمی کرے، نہیں کرسکتا، تو ولی یا اس کی اجازت سے دوسرا کرے، جبکہ خود اس کے ذمہ میں رمی نہ ہو۔ ممیز (باشعور) بچہ خود ہی طواف، نماز، سعی، مواقف کی حاضری اور رمی کے اعمال انجام دے۔ کسی بے ہوش کی بے ہوشی کے ختم ہونے کی امید ہو تو

اس کی جانب سے دوسرا احرام نہ باندھے۔ اگر اب ہوش میں آنے کی امید نہ ہو یا تین دن سے زائد مدت ہو چکی۔ تو ولی اس کی طرف سے احرام باندھ سکتا ہے۔

از خود انجام دینا

بذات خود حج عمرہ کی انجام دہی کے لئے اسلام کے ساتھ تمیز (باشعور ہونا) بھی شرط ہے لہٰذا ایک ممیز بچہ اپنے ولی کی اجازت سے خود ہی احرام باندھ کر حج وعمرہ کے اعمال ادا کر سکتا ہے۔

اسلامی فریضۂ حج

اسلام نے جو ایک حج وعمرہ زندگی میں فرض کیا ہے اس کی ادائیگی اور فرضیت سے سبکدوش ہونے کیلئے یہ شرائط ہیں۔ (۱) اسلام (۲) تمیز (۳) بالغ ہونا (۴) آزادی۔

فریضہ کی ادائیگی کیلئے استطاعت شرط نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی غریب آدمی تکلیف اٹھا کر کسی طرح حج کر لے تو اس کا فریضہ ادا ہو گیا۔ (آئندہ مالدار اور مستطیع ہونے کے بعد دوبارہ ادا کرنا ضروری نہیں)۔ کیونکہ وہ کامل ہے۔ جیسا کہ مریض تکلیف اٹھا کر جمعہ میں شریک ہو تو اس کا جمعہ ہو جائیگا (گرچہ اس پر فرض نہ تھا)۔ بچہ اور غلام کا حج اسلامی فریضہ کی طرف سے ادا نہ ہوگا۔ بچہ بالغ ہونے اور غلام آزاد ہونے کے بعد (بصورت استطاعت) ان پر دوبارہ حج لازم ہے۔ کیونکہ یہ ناقص الحال ہیں۔

حدیث: ''کوئی بچہ حج کرے پھر بالغ ہو تو اس پر اسلامی حج لازم ہے۔ اور کوئی غلام حج کرے پھر آزاد ہو تو اس پر اسلامی حج فرض ہے'' (ابن خزیمہ، حاکم، بیھقی، ابن حزم وصححہ، خطیب)

اگر حج میں وقوف عرفہ سے قبل یا دوران وقوف بچہ بالغ ہو جائے یا غلام آزاد ہو تو یہ اسلامی حج کیلئے کافی ہے۔ اگر سعی طواف قدوم کے بعد کر چکا تھا، تو اب دوبارہ کرے۔ عمرہ میں طواف سے قبل یا دوران طواف بلوغ یا آزادی پائی جائے تو یہ عمرہ فریضہ کی طرف سے کافی ہے۔ البتہ دوران طواف ہے تو طواف از سر نو لوٹائے۔

وجوب حج و عمرہ

حج وعمرہ کے وجوب کے لئے یہ شرائط ہیں (۱) اسلام (۲) تمیز (۳) بالغ ہونا (۴) آزادی (۵) استطاعت۔ لہٰذا ایک کافر پر اس دنیا میں مطالبہ کے اعتبار سے حج واجب نہیں (گرچہ آخرت میں اس پر گرفت ہو) اس لئے کوئی کفر میں حج پر قادر ہو لیکن اسلام قبول کرتے وقت قادر نہ ہو (تنگ دست ہو) تو اس پر حج فرض نہ ہوگا۔ لیکن کوئی مرتد قادر تھا تو دوبارہ اسلام لانے کے بعد یہ فریضہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔ غیر ممیز یا ممیز نابالغ پر اور غلام پر حج فرض نہیں۔ اس طرح جو حج کی قدرت واستطاعت نہ رکھتا ہو، اس پر بھی فرض نہیں:

آیت: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران ۹۸)

حدیث: آپ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ حج کب واجب ہوگا، تو فرمایا ''جب توشہ اور سواری ہو'' (ترمذی و قال حدیث حسن)

حدیث سے قرآن کے لفظ استطاعت کی وضاحت ہوتی ہے۔)

استطاعت۔ (طاقت و قدرت)

استطاعت کی دو قسمیں ہیں۔(الف) بذات خود ادا کرنے کی استطاعت (ب) استطاعت بالغیر۔

استطاعت کے تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس اتنا مال ہو جو حج وعمرہ کی ادائیگی کے لئے کافی ہو۔ یعنی آمد ورفت کا کرایہ اور کھانے پینے کے مصارف اور حکومتیں جن امور کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ مثلاً پاسپورٹ، پروانہ راہ داری، مطوف کا خرچ وغیرہ۔ اور یہ سارا مال اس کے قرض اور اہل وعیال کے مصارف کے علاوہ ہو، جب تک کہ وہ حج وعمرہ کیلئے غائب رہے۔

(الف) **بذات خود ادا کرنے کی استطاعت:** آدمی قادر، تندرست ہو کہ بغیر شدید نقصان اور مشقت کے خود سفر کر کے مناسک کو ادا کرسکتا ہو۔

(ب) **استطاعت بالغیر:** آدمی اتنے مال کا مالک ہو کہ اسکے ذریعہ کسی اور کو نائب بنا کر زندگی میں یا موت کے بعد حج کر سکتا ہے، جبکہ شدید مرض یا بڑھاپے وغیرہ کے وجہ سے خود حج کرنے پر قادر نہ ہو۔

بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی، اور ادائیگی سے قبل وفات پاگئی۔ تو کیا میں ان کی جانب سے حج کروں، تو آپ ﷺ نے جواب دیا۔ ”ہاں تم ان کی طرف سے حج کرو“ نسائی کی روایت میں ہے کہ ایک آدمی نے اپنے وفات شدہ والد کا حج ادا کرنے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی۔

صحیحین میں ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اللہ کے فریضہ حج کے وقت ابا بالکل بوڑھے اور سواری پر بیٹھ کر سفر کرنے کے ناقابل ہیں تو کیا میں ان کی جانب سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”ہاں“۔

ملاحظات

(۱) جس کے پاس تجارت کا رأس المال ہو، اسے حج وعمرہ کی ادائیگی میں صرف کرنا واجب ہے۔ کسی کے پاس زمین ہو اس کی آمدنی پر اس کا گذر بسر ہو تو حج وعمرہ کی ادائیگی کے لئے اسے فروخت کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اگر اس کے ذمہ کسی کا قرض ہوتا تو مال تجارت اس میں ادا کرنا واجب ہوتا۔ تو اسی طرح حج وعمرہ کا حکم ہوگا۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا فروخت کرنا اس پر لازم نہیں۔

(۲) رہنے کا مکان اور گھر کا اثاثہ اور اسباب حج وعمرہ کی ادائیگی کے لئے فروخت کرنا واجب نہیں کیونکہ یہ ان کی ضروریات میں سے ہیں جن سے انسان بے نیاز نہیں، لہٰذا ان کے فروخت کا مکلف نہ ہوگا۔

(۳) جس کے اور مکہ مکرمہ کے درمیان دو مرحلہ سے کم فاصلہ ہو (مسافت قصر سے کم یعنی تقریباً ۸۱ کلو میٹر سے کم) اور وہ چلنے کی قوت رکھتا ہو تو اسے سواری میسر نہ بھی ہو تو پیدل جا کر حج وعمرہ کرنا لازم ہے۔

(۴) جس کے پاس صرف بقدر حج رقم ہو اور وہ اس سے نکاح کا ارادہ رکھتا ہو اس کی دو حالتیں ہونگی۔

(الف) نکاح کی حاجت ہو، لیکن اپنے نفس پر ضبط وقابو (کنٹرول) حاصل ہو، تو اس پر حج واجب ہے۔ اور نکاح سے قبل حج کر لینا افضل ہے۔

(ب) زنا اور گناہوں کے ارتکاب کا اندیشہ ہو، تو اس پر بھی حج واجب ہے، لیکن پہلے نکاح کر لینا افضل ہے۔ خلاصہ یہ کہ نکاح کی

حاجت سے حج کا وجوب ختم نہ ہوگا۔

(۵) عورت پر حج وعمرہ کے وجوب کیلئے سابقہ شرائط کے ساتھ مزید دو شرطیں ہیں۔

(ا)۔(الف) اس کے ساتھ اس سفر میں اس کا شوہر ہو۔

(ب) یا نسبی یا غیر نسبی کوئی مَحرم ہو۔ کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے۔ ''عورت بغیر مَحرم کے سفر نہ کرے۔''

(ج) یا اس کے ساتھ معتبر، پاکباز اور دین دار عورتیں ہوں۔ کم از کم دو اور عورتیں ہوں یعنی کل تین۔ ان عورتوں میں سے کسی کا شوہر یا محرم ہونا شرط نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح معتبر عورتوں کی اجتماعی صورت میں فتنوں سے امن حاصل ہوگا۔

اگر عورت کو حج میں جانے والا کوئی محرم وغیرہ نہ مل سکے تو اس پر محرم کی اجرت بھی واجب ہے۔ جبکہ اسکے پاس موجود ہو۔

یہ شرط حج میں جانے کے وجوب کے لئے تھی۔ جہاں تک جواز کا مسئلہ ہے، تو اس میں صرف ایک عورت بھی کافی ہے۔ بلکہ راستہ پرامن ہو، تو تنہا عورت بھی جاسکتی ہے۔ (لیکن جانا واجب نہیں) یہ مسئلہ فرض حج کا ہے۔ سنت حج یا دیگر اسفار کے لئے شوہر یا محرم کا ہونا ضروری ہے۔ فرض حج کے لئے تنہا عورت کا جانے کے جواز کی دلیل بخاری شریف کی یہ روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے حضرت عدی بن حاتمؓ سے فرمایا۔ ''اگر تم زیادہ عرصہ زندہ رہے تو بالضرور یہ منظر دیکھو گے کہ ایک خاتون تنہا مقام حیرہ (ایک جگہ کا نام) سے آکر کعبۃ اللہ کا طواف کریگی اور اسے اللہ کے علاوہ کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

(۲) عورت طلاق یا وفات کی عدت میں نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ (سورۃ الطلاق – ۱)

آیت: '' لَاتُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ '' (عدت میں) ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں۔ (بیان القرآن)

(۶) عورت شوہر کی اجازت کے بغیر حج میں نہیں جاسکتی، اگر حج پر قدرت کے باجود شوہر کے روکنے کی وجہ سے نہ جاسکی اور پھر اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے ترکہ میں سے اس کا حج بدل کروایا جائے گا، اور اس میں عورت گنہگار شمار نہ ہوگی۔ (الفقه المنهجی ۱۲۶/۳)

میت کا حج بدل: کسی میت کے ذمہ فرض حج یا عمرہ باقی ہو، تو اس کے ترکہ میں سے اسے ادا کروانا واجب ہے۔ جیسا کہ دیگر فرضوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ (اور میت کے ان مالی حقوق کی ادائیگی کے بعد وارثوں میں وراثت تقسیم ہوگی) اگر میت کا ترکہ نہ ہو، تو وارث کے لئے سنت ہے کہ اس کی جانب سے انجام دے۔ اگر کوئی اجنبی وارث کی اجازت یا بغیر اجازت کے انجام دے تو یہ بھی جائز ہے۔

غریب مَعْضُوب (عاجز): جو شخص معضوب ہو، یعنی شدید بڑھاپے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے خود حج کو نہ جاسکتا ہو، اور غریب ہو کہ کسی اور کو بھی روانہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اسکے اصول وفروع میں سے کوئی یا کوئی اجنبی شخص اپنی جانب سے بخوشی اس کا حج کرنے پر راضی ہو، تو فوراً اسے اجازت دے کر حج کروانا واجب ہے، جبکہ وہ شخص خود عاجز نہ ہو اور معتبر ہو اور اس کے ذمہ کوئی فرض حج نہ ہو، البتہ کوئی اسے اپنی جانب سے مال دے، تاکہ یہ کسی کے ذریعہ حج کرائے، تو اس مال کا لینا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نسبتاً زیادہ احسان پایا جاتا ہے کہ تم کسی کو حج کے لئے روانہ کرو، ہم اس کو اجرت دیں گے، تو قبول کرنا لازم ہے، (براہِ راست رقم اسے دے تو لازم نہیں) اور اجنبی شخص کا یہ مطالبہ قبول کرنا لازم نہیں۔

انواعِ نیابت: معضوب یعنی جو خود حج کرنے سے عاجز ہو، وہ فرض اور نفل دونوں میں دوسرے کو نائب بنا سکتا ہے بلکہ فرض

میں واجب ہے، میت کی طرف سے فرض حج مطلقاً جائز ہے، نفل حج میت کی وصیت ہو تو جائز ہے ورنہ صحیح نہیں ہے۔ جو شخص خود حج کر سکتا ہو، اس کے لئے کسی اور کو نائب بنانا مطلقاً منع ہے۔ (یعنی فرض ہو یا نفل)

میقات

میقات لغت میں حد یا کسی فعل کے لئے متعینہ وقت کو کہتے ہیں۔ اور شرعاً اس باب میں عبادت کی ادائیگی کے لئے متعین وقت اور جگہ کو کہا جائے گا۔

میقات زمانی (یعنی حج و عمرہ کا وقت)

آیت: "اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" (البقرہ۔ آیت ۱۹۷)۔ (زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں۔ جو (مشہور و) معلوم ہیں (ایک شوال۔ دوسرا ذی قعدہ تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے اور نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے۔

حج کا احرام ایک شوال سے عید الاضحیٰ (۱۰ ذی الحجہ) کے فجر تک کسی بھی وقت باندھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور وقت کسی نے حج کا یا مطلق (حج و عمرہ کی قید کے بغیر احرام باندھا تو وہ احرام بطور عمرہ منعقد ہوگا۔ کیونکہ احرام کا تعلق کافی قوی اور شدید ہوتا ہے۔ لہٰذا جو احرام باندھا، وقت اسے قبول نہیں کر سکتا، تو جو قبول کرتا ہے وہی شمار ہوگا۔ اور اس عمرہ سے اسلامی فرض عمرہ ادا ہو جائیگا۔ چاہے لاعلمی میں ایسا کرے یا جان بوجھ کر۔

عمرہ کا احرام سال بھر کسی بھی وقت باندھ سکتے ہیں، کیونکہ صحیحین وغیرہ کی روایات میں مختلف اوقات میں عمرے ثابت ہیں، البتہ حاجی کے لئے نفر (منیٰ میں رمی کے اعمال سے فارغ ہو کر چلے آنے) سے قبل عمرہ کی اجازت نہیں۔ (فی الحال گرچہ حاجی احرام میں نہیں لیکن) احرام کے احکام کا باقی رہنا احرام کے باقی رہنے کی طرح ہے۔ اور ابھی تحلل حاصل نہیں ہوا۔ (حج کا احرام نہیں کھلا) تو حج پر عمرہ داخل کرنا منع ہے۔ اور تحلل کے بعد حج کے بقیہ اعمال کی وجہ سے فی الحال عمرہ کے اعمال ادا نہ کر پائے گا۔

میقات مکانی

جو حرم مکہ میں ہو اور عمرہ کرنا چاہے، اسے احرام کے لئے حرم سے باہر حل میں جانا لازم ہے صحیحین کی روایت میں ہے کہ "آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو حج کے بعد تنعیم روانہ فرمایا، اور انھوں نے وہاں سے عمرہ ادا کیا۔" تنعیم مکہ سے سب سے قریبی حل ہے۔ حل میں عمرہ کے احرام کے لئے سب سے افضل مقام "جعرانہ" ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین سے واپسی پر اسی مقام سے رات جا کر عمرہ انجام دیا۔ (صحیحین) یہ طائف کے راستہ میں مکہ مکرمہ سے ۶ فرسخ (۱۸ میل) کے فاصلہ پر ہے۔ پھر تنعیم افضل ہے، کیونکہ حضرت عائشہؓ کو آپ ﷺ نے وہیں سے عمرہ کروایا، اب وہیں مسجد عائشہؓ موجود ہے۔ یہ مکہ مکرمہ سے ایک فرسخ (۳ میل) دور ہے۔ پھر حدیبیہ سے عمرہ افضل ہے، جو مکہ سے ۶ فرسخ کی مسافت پر ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے سال ذوالحلیفہ سے عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد مقام حدیبیہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن مشرکین آڑے آئے۔) لہٰذا امام

شافعیؒ نے جس پر آپ ﷺ نے عمل کیا اسے مقدم رکھا، پھر جس کا آپ ﷺ نے حکم دیا، پھر جس کا آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا۔

اگر کوئی مکہ سے ہی احرام باندھ کر عمرہ کرے اور حل میں نہ جائے تو یہ عمرہ صحیح ہو جائے گا اور اس سے اسلامی فرض عمرہ بھی ادا ہوگا، لیکن میقات سے احرام کے ترک کی وجہ سے اس پر دم واجب ہوگا۔ اور وہ گنہگار بھی ہوگا۔ لیکن احرام باندھنے کے بعد کسی اور عمل کے ادا کرنے سے قبل میقات (حل) میں جا کر آئے تو دم لازم نہیں، کیونکہ اس نے میقات سے مکہ کی مسافت احرام کی حالت میں طے کی۔ اور تمام اعمال بعد میں انجام دے تو گویا کہ میقات سے ہی احرام باندھا، اگر پہلے سے میقات جانے کا ارادہ تھا تو اس تقدیم احرام سے گنہگار نہ ہوگا۔

مکہ سے حج کا احرام باندھنے کے لئے میقات خود مکہ ہی ہے۔ (چاہے قران کا احرام ہو یا وہ شخص غیر ملکی ہو)

آفاقی یعنی دنیا کے مختلف علاقوں سے حج یا عمرہ کے لئے آنے والوں کے میقات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذوالحلیفہ میقات ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے تقریباً دس مرحلہ کے فاصلہ پر اور مدینہ منورہ سے ۶ رمیل کے فاصلہ پر ہے۔ جو آج کل اَبیارِ علی کے نام سے معروف ہے۔

(۲) شام، مصر اور مغرب سے آنے والوں کے لئے جُحفہ میقات ہے۔

(۳) تہامۃ الیمن، چین اور ہندوستان کی طرف سے آنے والوں کے لئے یلملم میقات ہے جو ایک پہاڑی کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر ہے۔

(۴) مشرق یعنی عراق وغیرہ کی طرف سے آنے والوں کا میقات ذاتِ عرق ہے، جو مکہ سے دو مرحلہ پر ہے۔

حدیث ۱: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میقات کی اس طرح تعیین فرمائی۔ ''اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ، اہل شام کے لئے جحفہ، اہلِ نجد کے لئے قرن، اہل یمن کے لئے یلملم اور فرمایا کہ یہ ان علاقوں کے لوگوں کے لئے اور دوسرے علاقوں سے اس طرف سے گذرنے والوں کے لئے میقات ہے۔ جو کہ حج اور عمرے کے ارادے سے آئیں۔ جو ان حدود سے (مکہ مکرمہ کی طرف) اندر ہوں، وہ جہاں سے (حج یا عمرہ کا سفر) شروع کریں (وہی ان کے لئے میقات ہے) یہاں تک کہ اہل مکہ، مکہ ہی سے احرام باندھیں (صحیحین)

۲: حضرت عائشہؓ کا فرمان ہے کہ آپ ﷺ نے اہلِ مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ، اہلِ شام، مصر اور مغرب کے لئے جحفہ کو میقات قرار دیا۔ (الشافعی فی الام)

۳: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''آپ ﷺ نے اہل عراق کے لئے ذاتِ عرق کو میقات مقرر کیا ہے۔ (ابوداود وغیرہ باسناد صحیح کما فی المجموع)

اگر کوئی کسی کی نیابت میں حج کو جائے، تو اس نائب بنانے والے کے میقات کا یا اس سے دور جس مقام کی اس نے تعیین کی ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔

جو شخص میقات سے دور اور پرے رہتا ہو، اسے میقات سے احرام افضل ہے، نہ کہ گھر سے کیونکہ آپ ﷺ نے بالا جماع حجۃ الوداع میں ذوالحلیفہ سے احرام باندھا (نہ کہ مدینہ منورہ سے)، اسی طرح عمرۃ الحدیبیہ میں بھی (رواہ البخاری) اپنے گھر سے بھی احرام باندھ سکتا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے ایسا کیا ہے میقات پر پہنچنے تک عورت کو حیض یا نفاس شروع ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے ہی احرام باندھنا سنت ہے۔

میقات کے ابتدائی حصہ سے (یعنی جو مکہ سے نسبتاً دوری پر ہو) احرام افضل ہے، بہ نسبت درمیانی اور آخری حصے کے، تاکہ بقیہ میقات سے احرام کی حالت میں گذرے، لیکن ذوالحلیفہ میں اس مسجد سے احرام افضل ہے جہاں سے آپ ﷺ نے احرام باندھا تھا۔

جس حاجی کے راستہ میں مذکورہ میقات میں کوئی نہ پڑتا ہو، وہ دورانِ سفر دائیں یا بائیں جانب کسی میقات کے محاذات (سیدھ) میں جب پہنچ جائے، تو وہی اس کے لئے میقات ہے۔ دونوں طرف میقات ہو تو جو زیادہ قریب ہو اس کا اعتبار ہوگا۔ دونوں ایک ہی فاصلہ پر ہو، تو جو مکہ سے زیادہ دور ہو اس کا اعتبار ہوگا۔ اگر کوئی بھی میقات محاذات میں نہ آئے، تو مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ (مسافت قصر) کی دوری پر اس کا میقات شمار ہوگا، کیونکہ مکہ مکرمہ سے اس سے کم فاصلہ پر کوئی میقات نہیں۔

جو شخص میقات سے اندر مکہ کی طرف رہتا ہو اور آگے کوئی اور میقات نہ ہو تو اس کے لئے جہاں سے حج کا ارادہ ہو وہی جگہ میقات ہے اسی طرح کوئی باہر سے آ کر میقات سے گذرے اور فی الحال حج یا عمرہ کا ارادہ نہ ہو پھر میقات گذرنے کے بعد آگے جا کر ارادہ ہوا تو جہاں سے ارادہ ہوا وہیں سے احرام باندھے۔ حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو، اور اپنے میقات سے آگے بغیر احرام کے بڑھ جائے تو اسے اپنی میقات کی طرف، یا اسی مسافت کے کسی اور میقات کی طرف لوٹنا، تاکہ وہاں سے احرام باندھے لازم ہے۔ اگر احرام باندھ چکا ہے، تو اسی حالت میں میقات پر لوٹے۔ اگر کوئی معقول عذر ہو مثلاً وقت تنگ ہو، راستہ پر خطرہ ہو، رفقاء سے کٹ جائے یا پر مشقت بیماری ہو، تو واپسی لازم نہیں۔

عذر کی وجہ سے یا بلا عذر واپس میقات کی طرف نہ لوٹا، اور مطلقاً عمرہ کا یا اسی سال حج کا احرام باندھ چکا تو اس پر دم لازم ہے۔ اسی طرح حج وعمرہ کے کسی عمل کو ادا کرنے کے بعد (چاہے وہ رکن ہو جیسے وقوف عرفہ، یا سنت ہو جیسے طواف قدوم) لوٹے تب بھی دم لازم ہے، ان دونوں صورتوں میں بلا احرام میقات سے گذرنے کا گناہ بھی ہوگا۔ کوئی لاعلمی یا بھول کی وجہ سے بلا احرام میقات سے گذرا تب بھی لازم ہے، البتہ گناہ نہ ہوگا حج وعمرہ کے کسی عمل کو ادا کرنے سے قبل ہی لوٹے تو دم نہ ہوگا۔ اور پہلے سے واپسی کا ارادہ موجود تھا تو گناہ بھی نہ ہوگا۔

احرام

نیت کے ساتھ حج یا عمرہ میں داخل ہونے کو احرام کہتے ہیں۔

پہلے ہی تعیین کر لینا (کہ حج ہے یا عمرہ ہے یا دونوں) زیادہ افضل ہے۔ مطلقاً بھی احرام درست ہے۔ یعنی صرف احرام کی نیت ہو، (حج یا عمرہ وغیرہ کی تعیین نہ ہو)، مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ آپ ﷺ کے ساتھ (حجۃ الوداع میں) نکلے تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”جو حج وعمرہ کا احرام باندھنا چاہے یا باندھے جو حج کا احرام چاہے تو وہ باندھے اور جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ وہی باندھے“ امام شافعیؒ کی روایت میں ہیکہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام احرام باندھ کر (تلبیہ پڑھتے ہوئے) وحی کا انتظار کرتے ہوئے نکلے، تو یہ حکم ہوا کہ جس کے پاس ہدی کا جانور نہ ہو وہ اپنا احرام عمرہ کا کردے، اور جس کے پاس ہدی ہو، وہ حج کا کرے۔“

بغیر تعیین کے مطلقاً حج کے مہینوں میں احرام باندھا تو اس احرام کو حج یا عمرہ یا دونوں، جو چاہے قرار دے، پھر اس کے اعمال انجام دے، تعیین سے قبل عمل معتبر نہ ہوگا، اگر حج کا وقت باقی نہ ہو تو عمرہ قرار دے۔ حج کے مہینوں کے علاوہ ایام میں مطلق احرام باندھے تو وہ عمرہ شمار ہوگا۔ حج کے ایام آنے کے بعد اسے حج کی طرف نہیں پھیر سکتا۔

کسی نے مثلاً یہ کہا کہ میں نے زید کی طرح احرام باندھا، تو یہ صحیح ہے اور زید محرم ہے تو اس کا احرام بھی اسی قسم کا شمار ہوگا اگر محرم نہیں یا احرام فاسد ہے تو مطلق محرم ہوگا۔ اگر زید کے احرام کی معرفت اس کی موت یا جنون وغیرہ کی وجہ سے متعذر اور مشکل ہو، تو قران کی نیت کر کے اس کے اعمال انجام دے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے آپ ﷺ کے احرام کی طرح احرام باندھا، تو آپ ﷺ نے اس کی تحسین فرمائی۔ (شیخین)

احرام کی سنتیں

(۱) دل سے نیت واجب ہے، ساتھ میں زبان سے بھی ادا کرنا سنت ہے لہٰذا یوں کہے: "نَوَیْتُ الْحَجَّ وَاَحْرَمْتُ بِهٖ لِلّٰهِ تَعَالٰی" (میں نے حج کی نیت کی اور اللہ کے لئے اس کا احرام باندھا) عمرہ میں یہ کہے۔ "نَوَیْتُ الْعُمْرَةَ وَاَحْرَمْتُ بِهَا لِلّٰهِ تَعَالٰی" (میں نے عمرہ کی نیت اور اللہ کے لئے اس کا احرام باندھا) قرآن یعنی حج وعمرہ دونوں ایک ساتھ ہوں تو یوں کہے۔ "نَوَیْتُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ وَاَحْرَمْتُ بِهِمَا لِلّٰهِ تَعَالٰی" (میں نے حج وعمرہ کی نیت کی اللہ کے لئے ان دونوں کا احرام باندھا) نیت کے بعد متصلاً تلبیہ پڑھے اور اس تلبیہ میں اپنے احرام کی نوعیت احرام کی نوعیت بھی ذکر کرے۔ مثلاً حج ہے تو "لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ بِحَجَّةٍ الخ" عمرہ ہے تو "لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لِعُمْرَةٍ لَبَّیْكَ الخ" اور دونوں ہے تو لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ بِحَجَّةٍ وَ عُمْرَةٍ لَبَّیْكَ الخ" اس پہلے تلبیہ کو زور سے نہ پڑھے، آہستہ پڑھے۔ آئندہ تلبیہ کے کلمات زور سے پڑھے۔ احرام کی نوعیت کا ذکر صرف اس پہلے تلبیہ میں مستحب ہے۔ آئندہ تلبیہ میں مستحب نہیں اگر کسی دوسرے کی جانب سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ رہا ہے تو یوں نیت کرے۔ "نَوَیْتُ الْحَجَّ (الْعُمْرَةَ) عَنْ فُلَانٍ وَاَحْرَمْتُ بِهٖ عَنْهُ، لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ عَنْ فُلَانٍ الخ" دونوں لفظ فلاں کی جگہ جس کی طرف سے حج یا عمرہ ادا کر رہا ہے۔ اس کا نام لے۔

طواف اور سعی میں تلبیہ مستحب نہیں کیونکہ ان میں مخصوص اذکار پڑھے جاتے ہیں۔

(۲) احرام کے لئے غسل (ورنہ تیمم) کرنا سنت ہے۔ اس غسل کا ترک مکروہ ہے۔ ضابطہ یہ ہے کہ ہر سنت جس کا بالقصد حکم ہو، اس کا ترک مکروہ ہے، امام ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ مطلوبہ مواقع میں غسل ترک نہ کرے، کیونکہ ان غسلوں کا قلوب کی نورانیت اور غفلت کے ازالہ میں بڑا دخل ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے احرام کے لئے کپڑے تبدیل کئے اور غسل فرمایا۔" (ترمذی وحسنہ۔ دار قطنی۔ بیہقی۔ طبرانی)

یہاں اور آئندہ آنے والے غسلوں میں تیمم کو غسل پر قیاس کیا گیا۔ (لہٰذا مطلوبہ مقامات میں غسل سے مجبور ہو تو تیمم کرلے)۔

درج ذیل موقعوں پر غسل سنت ہے۔

مکہ میں داخل ہونے کے لئے احرام میں ہو یا بغیر احرام کے، جو شخص ذوطویٰ کے راستہ داخل ہوا اسے مقام ذی طوی میں غسل کرنا افضل ہے۔

حدیث: آپ ﷺ مقام ذی طوی میں رات بسر فرماتے، پھر فجر پڑھ کر غسل فرماتے" (متفق علیہ)

دوسرے راستہ سے آرہا ہو تو ذوطویٰ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں، بلکہ اپنے راستہ میں اسی فاصلہ پر غسل کرلے۔ اگر مکہ سے قریب ہی غسل احرام کر کے احرام باندھے اور مکہ آئے تو دوبارہ دخول کے لئے غسل سنت نہیں لیکن بدن سے بو آرہی ہو تو پھر غسل مسنون ہے۔ مدینہ منورہ اور حرم پاک داخل ہونے کے لئے غسل مسنون ہے۔

زوال کے بعد وقوف عرفہ کے لئے مزدلفہ میں ۱۰رذوالحجہ کی صبح یا نصف شب کے بعد اور ایام تشریق میں ہر روز رمی کے لئے غسل سنت ہے۔ ہر دن فجر سے غسل کا وقت شروع ہوگا اور غروب یا رمی کرنے سے وقت ختم ہوگا۔ بطور قربت اور لوگوں کے ان مقامات میں اجماع و بھیڑ کی وجہ سے بدبو کے ازالہ اور نظافت کے لئے غسل کو مسنون قرار دیا۔

(۳) احرام سے قبل ہی موئے زیر ناف، بغل کے بال دور کرے اور مونچھ (مسیں) اور ناخن تراشے ان امور کو غسل سے قبل انجام دے، اگر جنبی نہ ہو تو، ورنہ غسل کے بعد انجام دے، جو حاجی قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہونے سے قبل یہ امور انجام دے (کیونکہ ذوالحجہ شروع ہونے کے بعد قربانی سے قبل یہ امور مکروہ ہیں)

(۴) احرام کے لئے (احرام سے قبل) بدن میں خوشبو استعمال کرنا مرد وعورت کو سنت ہے۔ اگر اس کے اجزاء باقی رہیں تو بھی حرج نہیں۔

حدیث: حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے۔ "میں آپ ﷺ کو احرام کے لئے احرام سے قبل خوشبو لگائی تھی اور تحلل (احرام کھولنے کے وقت) کے لئے بیت اللہ کے طواف سے قبل خوشبو لگائی۔" (متفق علیه)

کپڑے میں خوشبو لگانا اور بعد میں بدن یا کپڑے کی اس خوشبو کو باقی رکھنا حلال ہے کیونکہ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ "گویا کہ میں خوشبو کی چمک کو آپ ﷺ کے مانگ میں احرام کی حالت میں دیکھ رہی ہوں۔" اگر احرام کے بعد بدن یا کپڑے سے اس خوشبو کو ہٹا کر دوبارہ استعمال کرے، یا خوشبودار کپڑا اتار کر پھر دوبارہ پہنے، تو فدیہ لازم ہوگا۔ کپڑے میں خوشبو باقی نہ ہو، لیکن پانی چھڑکنے سے ظاہر ہوسکتی ہو، تو پہننا ممنوع ہے ورنہ نہیں۔

(۵) عورت کو احرام کے لئے دونوں ہاتھ گٹوں تک مہندی سے رنگنا مسنون ہے کیونکہ کبھی ان کے کھلنے کی نوبت آتی ہے۔ اور ابن عمر نے اسے سنت قرار دیا ہے۔ چہرے پر بھی کچھ مہندی لگائے، کہ اسکے بعد کھلا رکھنے کا حکم ہے۔ تو چمڑی کا رنگ مہندی کے رنگ سے چھپ جائے گا، (مہندی سے بالجملہ ستر کے باوجود اجنبی مرد کو دیکھنا جائز نہیں) احرام کے بعد مہندی مکروہ ہے، کیونکہ یہ زینت ہے۔ اور محرم پراگندہ اور غبار آلود ہوتا ہے۔ لیکن لگائے تو فدیہ واجب نہیں، مرد اور خنثی کو مہندی سنت نہیں بلکہ حرام ہے۔

احرام اور غیر احرام میں مرد کے لئے عذر کے ہاتھ پیر جیسے اعضاء میں مہندی لگانا حرام ہے، سر، داڑھی کے بالوں میں لگانا جائز بلکہ سنت ہے۔ جیسا کی امام نوویؒ نے شرح مہذب میں صراحت فرمائی ہے۔ شادی شدہ عورت کے لئے نقش ونگار، سیاہ رنگنا، پوروں کو مہندی اور سیاہی ملا کر رنگنا اور چہرہ کو سرخ رنگنا سنت نہیں، شوہر کی اجازت کے بغیر یہ امور حرام ہیں۔ جیسا کہ غیر شادی شدہ کے لئے حرام ہیں۔

(۶) مرد احرام سے پہلے ہی محیط کپڑے (جو بدن کو گھیرے) اتار دے، تا کہ احرام کی حالت میں ان کا پہننا نہ پایا جائے، جو کہ حرام ہے۔ زیادہ معتمد قول یہ ہے کہ یہ اتارنا واجب ہے لیکن بعض علماء نے اسے سنت قرار دیا ہے۔

(۷) مرد کو احرام کے لئے سفید تہبند اور سفید چادر اوڑھنا (اور چپل پہننا) سنت ہے، جو جدید ہوں، ورنہ دھلے ہوئے۔

حدیث: "تم میں سے کوئی تہہ بند، چادر اور چپل میں احرام باندھے" (ابو عوانه فی صحیحه)

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا ہے۔

(۸) احرام سے قبل (یعنی حج یا عمرہ کی نیت سے قبل) احرام کی دو رکعت سنت ادا کرے، جبکہ مکروہ وقت نہ ہو۔ اگر حرم مکہ میں ہے تو کسی بھی وقت پڑھ سکتا ہے۔ اگر نماز اور احرام میں عرفاً زیادہ فاصلہ ہو جائے تو یہ فوت ہو جائے گی۔ دوبارہ اعادہ سنت ہے۔ تا کہ احرام اس

کے بعد پایا جائے۔ کسی فرض نماز یا سنت نماز کے بعد احرام باندھے تو یہ بھی کافی ہے۔ اس نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں اخلاص پڑھنا سنت ہے۔

سنت احرام کی دو رکعت کی روایت مسلم میں حضرت جابر سے، صحیحین میں ابن عمر سے اور ابو داود، احمد اور حاکم میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

(۹) نماز کے بعد جب حاجی مکہ کی طرف اپنا سفر شروع کرلے، (پیدل ہو یا سواری پر) اس وقت احرام (یعنی حج وعمرہ کی نیت) افضل ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کی سواری جب آپ ﷺ کو لے کر اٹھی، اسی وقت آپ ﷺ نے نیت کی (اور تلبیہ شروع کیا)۔ (متفق علیه)

تلبیه

مُحرِم کے لئے تلبیہ کی کثرت سنت ہے، جیسا کہ آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ (رواہ مسلم) مرد کو بلند آواز سے تلبیہ سنت ہے، کیونکہ جبرئیل امین نے آپ ﷺ سے کہا کہ صحابہ کرام کو باآواز بلند کا حکم دیں (موطا، احمد، اصحاب السنن وقال الترمذی هذا حدیث صحیح) اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ تکلیف اور ضرر نہ ہو۔ اگر کسی قاری، ذاکر، نمازی، طائف یا سونے والے کو زور سے تلبیہ پڑھنے سے زیادہ تشویش اور حرج ہو تو یہ حرام ہے، معمولی تشویش ہو تو مکروہ ہے۔

تلبیہ کی تاکید کے اوقات: تغیر احوال کے وقت تلبیہ کی کثرت زیادہ مؤکد ہے، مثلاً سوار ہونا، سواری سے اترنا، بلندی پر چڑھنا، نشیب میں اترنا، رفقاء سے ملاقات واختلاط۔ بعد نماز۔ رات کی آمد۔ دن کی آمد۔ سحری کا وقت۔ نیند، بیداری، ہواؤں کا چلنا زوال شمش۔

احرام باندھتے وقت پہلا تلبیہ آہستہ پڑھنا سنت ہے۔ عورت اور خنثیٰ زور سے نہ پڑھیں بلکہ دوسرں کو آواز جائے تو مکروہ ہے۔ دیگر اذکار کی طرح تلبیہ بھی محل نجاست میں زبان سے ادا کرنا مکروہ تنزیہ ہے۔ دل میں اس کا جاری کرنا مکروہ نہیں ہے۔

تلبیہ کے الفاظ: " لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ وَالْمُلْكَ، لَاشَرِيْكَ لَكَ " (متفق علیه) 'وَالْمُلْكَ ' پر معمولی وقف سنت ہے۔ (تحفه)

ان الفاظ کو تین تین مرتبہ دوہرانا سنت ہے۔ ان کلمات میں کمی بیشی نہ کرنا مستحب ہے ان الفاظ کے پڑھنے کے بعد کچھ اضافہ کرلے تو مکروہ نہیں ہے۔ کیونکہ صحیحین میں ہے۔ کہ حضرت ابن عمرؓ آپ ﷺ کے تلبیہ پر ان الفاظ کا اضافہ فرماتے " لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ بِيَدَيْكَ وَالرَّغْبَاءُ إِلَيْكَ وَالْعَمَلُ " (الشروانی علی التحفه) لبیک کا مطلب ہے میں آپ کی اطاعت کا دم بھرتا ہوں۔ اور بار بار آپ کی پکار کو قبول کر کے اس کا جواب دے رہا ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ " بحکم الٰہی حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام " نے لوگوں کو حج کی دعوت دی، تو آسمان وزمین کے مختلف گوشوں سے تلبیہ پڑھتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔

جب کوئی پسندیدہ یا ناپسندیدہ بات دیکھے تو یہ پڑھنا سنت ہے۔ " لَبَّيْكَ إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشَ الاٰخِرَة " (حقیقی زندگی تو آخرت

کی زندگی ہے) میدان عرفات میں جب صحابۂ کرام کے جم غفیر کو دیکھا تو آپ ﷺ نے یہ کلمات ادا فرمائے۔ (الشافعی وغیرہ عن مجاهد مرسلاً) جنگ خندق کے کھودتے وقت شدید پریشانی کے وقت آپ ﷺ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے (رواہ الشافعی) اگر احرام میں ہے تو لبیک کے ساتھ یہ کلمہ پڑھے، ورنہ "اَللّٰهُمَّ اِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الآخِرَةِ" پڑھے۔

تلبیہ کے بعد آپ ﷺ اور آل واصحاب پر درود پڑھے، اسے بھی تین مرتبہ پڑھنا افضل ہے، کوئی سا درود پڑھ سکتا ہے، لیکن درود ابراہیمی افضل ہے۔ درود کے بعد اللہ تعالیٰ سے جنت اور اس کی رضامندی کی دعا کرے اور جہنم سے اللہ کی پناہ چاہے، (رواہ الشافعی وغیرہ قال فی المجموع وضعفه الجمهور)

مثلاً یوں دعا پڑھے: " اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ سَخَطِكَ وَالنَّارِ " (اے اللہ۔ میں تجھ سے تیری رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں اور تیرے غضب اور جہنم کی آگ سے تیری پناہ چاہتا ہوں) دوران تلبیہ گفتگو مکروہ ہے۔ البتہ سلام کا جواب مستحب ہے۔ لیکن تلبیہ مکمل کر کے جواب دینا بہتر ہے۔ دوران تلبیہ سلام کرنا مکروہ ہے۔ (الشیروانی مع التحفه ۵/ ۱۰۹)

حج کی صفت

(ابتداء سے انتہا تک ترتیب سے مکمل کیفیت)

حاجی کے لئے آپ ﷺ اور صحابہ کرام کی اقتداء میں وقوف عرفہ سے قبل مکہ مکرمہ میں داخل ہونا افضل ہے۔ ثنیۃ کداء کے راستہ مکہ میں داخل ہونا افضل ہے۔ (متفق علیه، عن ابن عمر وعائشه) چاہے یہ اس کے راستے میں نہ پڑے، غیر محرم کے لئے بھی یہی راستہ افضل ہے۔

جب بیت اللہ پر نگاہ پڑے تو دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پڑھے۔

" اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيْفاً وَّ تَعْظِيْماً وَّ تَكْرِيْماً وَّ مَهَابَةً وَزِدْ مَنْ شَرَّفَهُ وَ كَرَّمَهُ مِمَّنْ حَجَّهُ اَوْ اعْتَمَرَهُ تَشْرِيْفاً وَّ تَكْرِيْماً وَّ تَعْظِيْماً وَّ بِرًّا " (رواہ الشافعی والبیهقی وقال انه منقطع) پھر یہ پڑھے۔ "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ" (قاله عمر رضی الله عنه رواه عنه البهيقی قال فی المجموع واسناده ليس بقوی)

پھر مسجد حرام میں باب بنی شیبہ سے داخل ہو (جس کا نام آج کل باب السلام ہے۔ برماوی)

آپ ﷺ اسی دروازے سے داخل ہوئے۔ (رواہ البیهقی باسناد صحیح۔ طبرانی)

یہ دروازہ کعبۃ اللہ کے دروازہ اور حجر اسود کی طرف ہے جب اپنی بستی میں جانے کے لئے مسجد حرام سے نکلے تو باب الحزورہ (باب الوادع) یہاں سے مشکل ہو تو باب بنی سہم (باب العمرۃ) سے نکلے۔

طوافِ قدوم: مسجد حرام میں داخل ہونے کے بعد پہلے طواف قدوم کرے، یہ طواف سنت ہے، بعضوں نے اسے واجب کہا ہے۔ اسی لئے اس کا ترک مکروہ ہے۔

حدیث: مکہ مکرمہ میں تشریف آوری کے بعد آپ ﷺ نے وضو کر کے پہلے بیت اللہ کا طواف کیا۔ (متفق علیه)

بیت اللہ کا تحیہ طواف ہے۔ طواف کے بعد کی دو رکعت سنت ادا کرنے میں تحیۃ المسجد بھی حاصل ہوگی۔ اسی لئے داخل ہونے کے بعد پہلے تحیۃ المسجد پڑھنے کے بجائے طواف کر لے۔

ان اعذار کی صورتوں میں طواف کو ان سے مؤخر کرلے: کسی فرض یا جنازہ یا سنت کی جماعت تیار ہو، کسی نماز کا وقت تنگ ہو (کہ طواف کرنے سے قضاء ہو جائے)، کوئی قضاء نماز یاد آجائے، دورانِ طواف بھی یہ امور پیش آئیں تو پہلے انھیں ادا کرے۔ بیٹھ جانے اور تاخیر کی وجہ سے طوافِ قدوم فوت نہ ہوگا۔ البتہ اس سے قبل وقوفِ عرفہ ہو تو یہ فوت ہوگا۔ طوافِ قدوم کو طوافِ قادم، طوافِ ورود، طوافِ وارد اور طوافِ تحیہ بھی کہتے ہیں۔

طوافِ قدوم حلال (بلکہ احرام شخص) کے لئے اور اس حاجی کے لئے سنت ہے جو وقوفِ عرفہ سے قبل مکہ میں جائے۔ وقوفِ عرفہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والے حاجی اور عمرہ کرنے والے شخص کے لئے یہ مطلوب نہیں، کیونکہ ان دونوں کے لئے فرض طواف کا وقت ہے۔

جو شخص حج عمرہ کے علاوہ کسی اور مقصد سے (مثلاً کسی کی ملاقات یا تجارت وغیرہ کے لئے) حرم مکہ کا ارادہ کرے، اسے حج یا عمرہ کا احرام سنت ہے۔ اس کا ترک مکروہ ہے۔ بار بار جانا پایا جائے یا نہیں۔ (کئی ائمہ کرام اس کے وجوب کے قائل ہیں۔)

طواف کے واجبات

طواف کے واجبات آٹھ ھیں۔

(۱) سترِ عورت (نماز کی طرح)

(۲) حدثِ اصغر اور اکبر سے پاکی (یعنی باوضو ہو اور غسل کی حاجت نہ ہو) اور نجاست سے پاکی۔ کیونکہ آپ ﷺ نے طواف کو نماز قرار دیا۔ (ترمذی، حاکم، دراقطنی، وصححه ابن السکن وابن خزیمه وابن حبان)

اگر دورانِ طواف بے وضو ہو جائے یا کپڑا یا بدن ناپاک ہو جائے، تو دوبارہ پاکی حاصل کر کے سابقہ طواف پر بناء کرے، خواہ عمداً اس طرح کیا ہو، چاہے فاصلہ کم ہو یا زیادہ، کیونکہ طواف میں وضو کی طرح موالات (پے در پے) شرط نہیں۔ (مثلاً تین چکر کے بعد وضو ٹوٹے تو اب وضو کر کے بقیہ چار چکر پورے کر لینا کافی ہے۔) لیکن از سرِ نو طواف دوہرانا سنت ہے تاکہ جن علماء نے اسے واجب کہا ہے ان کے اختلاف سے بچ جائے اگر طوافِ رکن (طوافِ افاضہ) سے قبل عورت کو حیض شروع ہو اور کسی مجبوری کی وجہ سے پاکی تک رکنا ناممکن ہو (مثلاً خرچ کی رقم ختم ہو جائے۔ ساتھی سب نکل جائیں۔ ٹکٹ میں اتنی تاخیر کی گنجائش نہ ہو وغیرہ) تو وہ امام ابو حنیفہؒ یا امام احمدؒ کے ایک روایت کی تقلید کرتے ہوئے اسی حال میں طواف کرلے اور اس پر ایک اونٹ کا دم لازم ہوگا۔ اور اس حال میں مسجد میں داخل ہونے کی وجہ سے گنہگار ٹھہرے گی۔ (حاشیه الشیروانی مع التحفه ۵/۱۳۰)

(۳) طواف میں آگے کی طرف چلتا رہے اور بیت اللہ اس کی بائیں جانب ہو، اس کا مکمل بدن کعبہ سے باہر اور الگ ہونا واجب ہے لہٰذا شاذروان اور حجر (حطیم) کے باہر سے طواف کرے، کعبہ کی دیوار سے باہر تقریباً دو تہائی ہاتھ حصہ قریش نے تعمیر کعبہ کے وقت مصارف کی تنگی کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، جسے کعبہ کے اطراف میں بالکل پشت دیوار نما کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ اسے ہی شاذروان کہتے ہیں۔ اس طرح حطیم کا حصہ بھی حقیقۃً بیت اللہ میں داخل ہے۔ جسے قریش نے قلتِ رقم کی وجہ سے خارج کردیا (صحیحین)

اگر کوئی کعبہ کی طرف رخ کر کے (سرکتا ہوا) طواف کرے یا کعبہ کی طرف پشت کرلے یا کعبہ کو اپنے دائیں طرف کرے یا بائیں طرف کر کے رکن یمانی کی طرف پیچھے چلتا ہوا طواف کرے تو ان میں طواف صحیح نہ ہوگا کیونکہ یہ شرعی طواف کی کیفیت کے مخالف ہے۔

(۴) طواف کی ابتداء حجر اسود سے اس کا بدن حجر اسود کے محاذات میں (بالمقابل) ہو کر گذرے، کسی اور جگہ سے طواف شروع کرے تو معتبر نہ ہوگا، جب طواف کرتے ہوئے حجر اسود کے پاس پہنچے تو اب طواف شروع ہوگا، اگر حجر اسود اپنی جگہ سے زائل ہو جائے۔ (والعیاذ باللہ) تو اس کی جگہ سے طواف شروع کرے اور اس صورت میں اسی جگہ کا استلام، بوسہ اور اس پر سجدہ کرنا (یعنی اپنی پیشانی کا اس پر رکھنا) سنت ہوگا۔

(۵) بالیقین سات چکر ہوں۔ اگر شک ہو تو کم پر بنا کرے جیسا نماز کی رکعت میں (مثلاً ۴ چکر ہوئے یا ۵ شک ہو تو ۴ مان کر مزید ۳ چکر پورے کرے)۔ اس کا خیال ہو کہ طواف مکمل ہو چکا اور دوسرا معتبر شخص کہے کہ ۶ چکر ہوئے تو مزید ایک چکر لگا لینا سنت ہے۔ طواف مکمل ہونے کے بعد تعداد میں شک ہو تو کوئی حرج نہیں۔

(۶) طواف مسجد کے اندر ہو، چاہے مسجد جتنی وسیع ہو، البتہ حرم کے حدود میں طواف ہونا ضروری ہے۔ اگر مسجد کی چھت پر طواف کرے (اگر چہ چھت کعبہ سے بلند ہو)، یا طواف کرنے والے اور کعبہ کے درمیان کچھ حائل ہو، (مثلاً ستون وغیرہ) تب بھی طواف صحیح ہے، لیکن مکروہ ہے بلکہ خارج مطاف طواف مکروہ ہے۔ گر چہ کچھ حائل نہ ہو، کیونکہ بعض علماء کے نزدیک بغیر مطاف کے طواف صحیح نہ ہوگا۔

(۷) نیت: اگر مستقل طواف کرے تو نیت واجب ہے، حج یا عمرہ کا فرض طواف یا طواف قدوم ہو تو نیت واجب نہیں، کیونکہ حج و عمرہ کی نیت اس کو بھی شامل ہے۔

(۸) کعبہ کے گرد اپنے چکر کو کسی اور طرف نہ پھیرے۔ مثلاً مقروض کا پیچھا کرنے کی نیت سے چکر لگائے تو یہ طواف شمار نہ ہوگا۔

طواف کی سنتیں

مرض وغیرہ عذر نہ ہو تو مکمل طواف پیدل کرے، آپ ﷺ کی اتباع میں (رواہ مسلم) اور یہ تواضع اور ادب کے بھی زیادہ مناسب ہے، بلا عذر رینگ کر طواف مکروہ ہے اور سوار ہو کر خلاف اولیٰ ہے۔ کسی عذر کی وجہ سے سوار ہو کر طواف میں حرج نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کو مرض کی وجہ سے سوار ہو کر طواف کرنے کی اجازت دی تھی (صحیحین)

طواف کی ابتداء میں حجر اسود کا استلام کرے، بوسہ لے اور اس پر سجدہ کرے (یعنی اپنی پیشانی رکھے)۔ استلام اور بوسہ کا ذکر بخاری و مسلم کی روایت میں اور سجدہ کا ذکر بیہقی میں موجود ہے، یہ تینوں عورتوں کے لئے مردوں کی غیر موجودگی میں سنت ہے۔ استلام کا مطلب ہے ہاتھ سے چھونا۔ دائیں ہاتھ سے استلام افضل ہے۔ دایاں نہ ہو (یا کچھ مجبوری ہو) تو بائیں سے کریں۔ تینوں ممکن نہ ہو تو جو ممکن ہو اس پر عمل کرے۔ ہاتھ سے استلام نہ کر سکے اور ہاتھ میں لکڑی وغیرہ ہو تو اس سے استلام کر کے اسے بوسہ دے۔ اس سے بھی عاجز ہو تو دائیں ہاتھ سے یا ہاتھ میں جو چیز ہو اس سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر کے اسے بوسہ دے۔ استلام، بوسہ اور سجدہ کو ہر چکر میں تین تین مرتبہ انجام دینا سنت ہے۔ تین مرتبہ استلام، پھر تین مرتبہ بوسہ پھر تین مرتبہ سجدہ افضل ہے یا ایک مرتبہ استلام پھر بوسہ پھر سجدہ کرے اسی ترتیب سے تین مرتبہ۔

حدیث: آپ ﷺ نے اونٹنی پر طواف فرمایا، پس جب بھی حجر اسود پر پہنچتے اپنے پاس کسی چیز سے اس کی طرف اشارہ کرتے اور تکبیر پڑھتے۔ (بخاری)

رکنِ یمانی کا استلام کرے اور بعد میں ہاتھ کو بوسہ دے۔ (صحیحین) اگر استلام نہ کر پائے تو ہاتھ سے یا کسی چیز سے اشارہ کر کے اسے بوسہ دے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ حجر اسود کے علاوہ کہیں بوسہ لینا سنت نہیں اور حجر اسود اور رکنی یمانی کے علاوہ کسی حصہ کا استلام سنت نہیں۔اس کی خلاف ورزی مکروہ نہیں،مباح ہے۔

طواف کی ابتداء میں استلام کے وقت یہ پڑھے۔"بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَر! اَللّٰهُمَّ اِيْمَاناً بِكَ وَ تَصْدِيْقاً بِكِتَابِكَ وَوَفَاءً بِعَهْدِكَ اِتِّبَاعاً لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ "(سلف وخلف کا اس پرعمل رہا ہے۔) کعبہ کے دروازے کے سامنے پہنچے تو یہ پڑھے" اَللّٰهُمَّ الْبَيْتَ بَيْتُكَ .وَالْحَرَمُ حَرَمُكَ ، وَالْاَمْنُ اَمْنُكَ وَ هَذَا مَقَامُ الْعَائِذُ بِكَ مِنَ النَّارِ " (ہٰذا کہتے وقت دل سے مقام ابراہیم کی طرف اشارہ کرے)۔

دونوں رکن یمانی کے درمیان(یعنی رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان)یہ دعا سنت ہے۔"رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (رواہ ابوداود)

اس کے علاوہ اپنے دوسروں کے لئے جائز دعا،جو چاہے مانگتا رہے،آخرت کی دعا پر اکتفاء کرنا افضل ہے۔آپ ﷺ یا صحابہ کرام سے منقولہ دعا وذکر کا پڑھنا افضل ہے۔اس کے بعد تلاوت افضل ہے۔تلاوت کے بعد غیر منقولہ دعا افضل ہے یہ سب سراً(آہستہ آواز میں)سنت ہے،کہ خشوع کے لئے بہتر ہے کسی کو تکلیف نہ ہوتو اوروں کی تعلیم کے لئے جہراً سنت ہے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ وہاں ۱۵ رجگہ دعا مقبول ہوتی ہے۔مطاف میں،ملتزم کے پاس،میزاب تلے،کعبہ میں،زمزم کے پاس،صفا پر،مروہ پر،محل سعی میں،مقام ابراہیم کے پاس،عرفات میں،مزدلفہ میں،منیٰ میں،اور تینوں جمروں کے پاس۔

استلام اور بعد کے سارے امور کی رعایت ہر چکر میں سنت ہے۔لیکن پہلی مرتبہ زیادہ مؤکد ہے۔

رَمَــلُ: جس طواف کے بعد سعی کرنا ہو اس طواف کے پہلے تین چکروں میں مردوں کو رمل سنت ہے۔عمرہ میں آتے ہی جو طواف کریگا،اس میں اور حج میں طواف قدوم کے بعد سعی کرنا ہو تو اس میں اور طواف افاضہ کے بعد سعی کرنا ہو تو طواف افاضہ میں رمل کرے۔(مکہ سے ہی حج کا احرام باندھنے کی صورت میں طواف اضافہ میں رمل ہوگا۔) **حــدیـث:** آپ ﷺ نے حجر اسود سے حجر اسود تک تین چکروں میں رمل کیا اور چار میں(عام رفتار سے) چلے"(متفق علیہ)

رمل کا مطلب ہے قریب قریب قدم رکھتے ہوئے تیز رفتاری سے چلنا،اور کاندھوں کو ہلانا،رمل کو ترک کرنا یا زیادہ تیز رفتاری اختیار کرنا مکروہ ہے۔

بقیہ چار چکر عام رفتار سے چلے۔ابتدائی تین چکروں میں رمل نہ کرے،تو بقیہ میں اس کی تلافی نہ کرے،کیونکہ بقیہ چکروں میں سکینہ سے چلنا مطلوب ہے،لہٰذا اسے تبدیل نہ کرے۔رمل میں یہ دعا پڑھے"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجاً مَبْرُوْراً وَّ ذَنْباً مَغْفُوْراً وَّ سَعْياً مَّشْكُوْراً"بقیہ چار چکروں میں یہ پڑھے۔"رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

جس طواف میں رمل سنت ہے،اس پورے طواف میں مرد کے لئے اضطباع سنت ہے۔(ابـــوداود) اس کے بعد سعی میں بھی اضطباع کرے۔(طواف پر قیاس کرتے ہوئے)

اضطباع: چادر کا درمیانی حصہ دائیں بغل کے نیچے لے اور دونوں کنارے بائیں کاندھے پر ڈال دے۔

طواف اور سعی کے درمیان طواف کی دو رکعت نماز میں اضطباع نہ کرے کہ نماز میں مکروہ ہے۔

مرد تبرکاً کعبہ سے قریب ہو کر طواف کرے، اس سے استلام اور بوسہ میں بھی سہولت رہے گی۔ البتہ بھیڑ وغیرہ کی وجہ سے خود کو تکلیف ہو یا اپنے سے کسی اور تکلیف پہنچے تو دوری بہتر ہے۔ قریب سے طواف کی صورت میں بھیڑ وغیرہ کی وجہ سے رمل نہ کر سکے اور انتظار کرنے کی صورت میں آگے کشادگی حاصل ہو کر رمل کی گنجائش نہ ہو، تو دوری کے ساتھ طواف کرنا تاکہ رمل کی سنت حاصل ہو، زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ رمل کا تعلق براہِ راست عبادت سے ہے۔ اور قرب کا تعلق مقام عبادت سے، دوری میں عورت کے لمس کی وجہ سے وضوٹوٹنے کا اندیشہ ہو، تو قریب طواف کرنا بہتر ہے۔ اگرچہ رمل فوت ہو۔ جب رمل نہ کر سکے تو چلنے میں حرکت کرنا اور سوچنا کہ ممکن ہوتا تو رمل کرنا سنت ہے، یہی مسئلہ سعی کے دوران دوڑنے کا ہے۔ (جیسا کہ آئے گا)

عورت کو رمل واضطباع مکروہ ہے، بلکہ مرد کی مشابہت کے مقصد سے ہو تو حرام ہے۔ عورت کو مطاف کے کنارے سے طواف سنت ہے تاکہ مردوں سے اختلاط نہ ہو، اگر مطاف مردوں سے خالی ہو تو اسے بھی قرب سنت ہے۔

طواف کے تمام چکروں میں، اس کے بعد دو رکعت نماز میں، بعد میں استلام میں اور پھر سعی میں آپس میں موالات (پے در پے اور تسلسل) سنت ہے۔

طواف کے بعد دو رکعت نماز سنت ہے، یہ نماز مقام ابراہیم کے پیچھے افضل ہے۔ (صحیحین)

مقام ابراہیم کے پاس نہ پڑھے تو حجر (حطیم) میں ورنہ پھر مسجد حرام میں، ورنہ پھر حرم پاک میں، ورنہ جہاں چاہے اور جب چاہے پڑھے۔ اس کے موت تک وقت باقی ہے۔ کوئی مقام ابراہیم کے پاس بیٹھا رہے اور اس سے دوسروں کو وہاں سنت طواف کی فضیلت میں رکاوٹ ہو تو یہ حرام ہے۔ (جمل ۳/۵۷۱)

طواف کی دو رکعت میں سورہ کافرون اور سورۂ اخلاص تلاوت کرے (رواہ مسلم) رات میں فجر سے طلوع تک اس نماز کو جہراً پڑھے، طلوع سے غروب تک سراً پڑھے اگر طواف کے بعد کوئی فرض نماز یا نفل پڑھے اور اس کی بھی نیت کرلے تو یہ کافی ہے، نیت نہ ہو تو طلب ساقط ہوگی۔

طواف میں سکون وقار ملحوظ رکھے، بجز خیر کے گفتگو نہ کرے، عمرہ کرنا طواف سے افضل ہے۔ جبکہ دونوں کا وقت مساوی ہو۔ وقوف عرفہ طواف سے افضل ہے۔ طواف میں اپنی نگاہ کی حفاظت کرے، کسی پرائی عورت یا امردِ حسین پر نگاہ نہ ڈالے، اپنے نگاہ و دل کو ضعفاء و ناقص الخلقت افراد کی تحقیر سے محفوظ رکھے، مسائل سے ناواقف افراد کو حقیر نہ جانے، بلکہ نرمی سے اسے مسئلہ سمجھائے۔

طواف کے مکروھات: طواف میں بلا عذر تھوکنا، دونوں ہاتھ پشت پر کندھوں پر باندھنا، ہاتھوں کو منہ پر رکھنا، انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسانا، انگلیاں چٹخانا (بجانا)، بول و براز کی حاجت کو روک کر طواف کرنا، اور کھانا حاضر ہو اور اس کی طرف اشتیاق و میلان ہو تو اسے چھوڑ کر طواف کرنا اور طواف میں کھانا پینا مکروہ ہے۔ جمائی کی وجہ سے منہ پر ہاتھ رکھنا مستحب ہے، تھوک کی ضرورت پیش آئے تو اپنے کپڑے میں تھوکے۔ مطاف میں تھوکنا حرام ہے۔ ہاتھوں کو پشت پر باندھنا طواف کے علاوہ بھی مکروہ ہے۔

کئی طواف مسلسل کرے تو ہر طواف (سات چکر) کے بعد دو رکعت پڑھنا افضل ہے ورنہ پھر سارے طواف کے بعد ہر ہر طواف کی دو دو رکعت پڑھے، سارے طواف کی طرف سے آخر میں دو رکعت پڑھ لے، تو یہ بھی کافی ہے۔ طواف دن رات میں کسی بھی وقت جائز ہے، کسی وقت مکروہ نہیں پیدل، سوار یا رینگتے ہوئے عذر کی وجہ سے یا بلا عذر طواف جائز ہے۔

ملتزم

طواف کی دو رکعت سے قبل ملتزم پر آئے، جو حجر اسود اور دروازہ کے درمیان کی جگہ ہے۔ اپنے چہرے اور سینہ کو کعبہ کی دیوار سے چمٹائے اور دایاں رخسار اس پر رکھیں، دایاں ہاتھ دروازے کی طرف اور بایاں حجر اسود کی طرف پھیلائے اور پردہ سے چمٹ کر دعا مانگے۔ "اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ أَعْتِقْ رَقَبَتِیْ مِنَ النَّارِ وَاَعِذْنِیْ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ وَسَاوِسَۂٖ" (اے اللہ۔ اس بیت عتیق کے رب، میری گردن جہنم سے آزاد کر اور شیطان مردود اور اس کے وساوس سے پناہ عطا فرما) جو جو دعا چاہے مانگے۔

ایک دوسرے کو اٹھا کر طواف کرانا

حامل: اٹھانے والا **محمول:** جس کو اٹھایا جائے (کاندھے پر یا گود میں یا پالکی وغیرہ میں) بیمار یا چھوٹا بچہ ہونے کی وجہ سے یا بغیر کسی عذر کے ایک شخص یا زائد اشخاص دوسرے کو اٹھا کر طواف کریں، تو اس کی مختلف درج ذیل صورتیں ہونگی۔

حامل کی صورتیں: (۱) حلال ہو (۲) محرم ہو اور اپنا طواف کر چکا ہو (۳) محرم ہو اور اپنے طواف کا وقت نہ ہوا ہو (۴) محرم ہو اور اپنے طواف کا وقت ہوا ہو، لیکن ابھی اپنا طواف نہ کر چکا ہو۔

اور محمول محرم ہو، اس کے طواف کا وقت ہو چکا ہو لیکن ابھی طواف باقی ہو، اب حامل محمول کے طواف کی نیت کرے، یا مطلق ہو (کسی کی تعیین نہ ہو)، یا دونوں کی کرے یا صرف اپنی تو یہ چار صورتیں ہوئیں۔ اس کو پہلے چار میں ضرب دیں تو ۱۶ رشکلیں ہوئیں، پھر جن صورتوں میں حامل نے محمول کے لئے نیت کی ہو، یا مطلق نیت ہو تو محمول کا طواف شمار ہوگا، ان دو کو ابتدائی چار میں ضرب دینے سے ۸ رشکلیں نکلیں۔ اس میں ایک شکل میں حامل کا طواف شمار ہوگا۔ جبکہ نیت مطلق ہو اور محرم حامل کے طواف کا وقت ہوا ہو اور ابھی اس کا طواف باقی ہو۔ اور جب اپنے یا دونوں کے طواف کی نیت کرے تو حامل کا طواف شمار ہوگا، ان دو صورتوں کو ابتدائی چار میں ضرب دینے سے آٹھ شکلیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ۱۶ میں ۹ شکلوں میں حامل کا اور ۷ رشکلوں میں محمول کا طواف شمار ہوگا (اور دونوں کا طواف نہ ہوگا۔ کسی ایک ہی کا ہوگا۔) (حاشیتہ الشیروانی علی التحفہ ۵/ ۱۶۶)

اگر سعی میں کوئی دوسرے کو اٹھا کر چلے تو اس میں بھی مذکورہ بالا تفصیل پر عمل ہوگا۔

اگر کسی گاڑی یا سائیکل کرسی وغیرہ پر بٹھا کر کوئی کھینچے یا دھکیلے تو اس صورت میں دونوں کا طواف ایک ساتھ ہوگا۔

صفا ومروہ کی سعی

آیت: "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" (البقرہ۔ ۱۵۸) تحقیقاً صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان میں سعی کرنا) منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں ان دونوں کے درمیان آمد ورفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے)۔

حدیث: آپ ﷺ حج یا عمرہ میں آنے کے بعد پہلے طواف میں تین چکر رمل کرتے اور چار عام رفتار سے چلتے پھر دو رکعت نماز ادا کرتے پھر صفا ومروہ کے درمیان سعی فرماتے (متفق علیہ)

طواف اور نماز طواف سے فارغ ہو کر حجر اسود کا استلام کرنا سنت ہے، پھر باب الصفا سے سعی کرنے کے لئے نکلے، آپ ﷺ کی

اتباع میں۔(رواہ مسلم)

سعی کے شرائط: (۱)صفا سے ابتداء کرے(۲)مروہ پر ختم کرے،اس کے برعکس مروہ سے شروع کرے تو پہلا چکر شمار نہ ہوگا۔

(۳)سات چکر لگائے،صفا سے مروہ تک ایک چکر پھر مروہ صفا تک دوسرا چکر شمار ہوگا،اسی طرح سات چکر مکمل کرے۔جو مروہ پر مکمل ہوگا۔

حدیث: آپ ﷺ نے صفا سے ابتداء فرمائی اور مروہ پر ختم کیا،(مسلم)

(۴)طواف رکن(طواف افاضہ)یا طواف قدوم کے بعد سعی کرے،طواف قدوم اور سعی کے درمیان وقوف عرفہ حائل نہ ہو۔لہٰذا طواف قدوم کے بعد سعی کرنا ہو تو وقوف سے پہلے ہی کرلے کیونکہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا اور آپ کا فرمان ہے کہ" اپنے مناسک(حج وعمرہ کے اعمال)کو مجھ سے حاصل کرو"۔اگر طواف قدوم کے بعد وقوف پایا جائے تو اب طواف فرض کے بعد ہی سعی کرسکتا ہے۔نفلی طواف کے بعد سعی ناکافی ہے۔سعی کو دوہرانا سنت نہیں،بلکہ مکروہ ہے۔اسی لئے طواف قدوم کے بعد سعی کی ہو تو طواف رکن کے بعد دوبارہ نہ کرے، کیونکہ یہ بدعت ہے۔

سعی کے سنن وآداب: مرد کے لئے صفا مروہ پر ایک آدمی کی قامت چڑھ جانا سنت ہے کیونکہ" آپ ﷺ دونوں پر اسی طرح چڑھے یہاں تک کہ کعبہ نظر آگیا"(رواہ مسلم) عورت کے لئے یہ سنت نہیں۔جو اوپر نہ چڑھے اس کے حق میں واجب یہ ہے کہ جہاں سے جارہا ہے اس کو ایڑی اور جہاں جارہا ہے اس کو پنجہ چھو جائے۔

صفا و مروہ دونوں جگہ ہر کسی کو ہر چکر میں درج ذیل حدیث میں وارد ذکر سنت ہے۔

حدیث: حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے......"جب آپ ﷺ صفا کے قریب پہنچے تو" اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ "تلاوت فرمائی،اور فرمایا جہاں سے اللہ نے ابتداء کی(قرآن میں)میں بھی وہیں سے ابتدا کرتا ہوں،پھر صفا پر اتنا چڑھ گئے کہ بیت اللہ نظر آگیا تو قبلہ رو ہو کر توحید وتکبیرت کے کلمات کہے اور پڑھا" لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ اَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ "پھر دعا مانگی۔ اس طرح تین مرتبہ پڑھا(یعنی ذکر ودعا کو تین مرتبہ دوہرایا)......پھر مروہ پر بھی صفا کی طرح عمل کیا"۔(مسلم۔ابوداود)

ہر چکر کے ابتداء وانتہا میں عام رفتار سے چلے درمیان میں دو سبز نشانات کے درمیان(جو معروف ہیں)مرد تیز دوڑے (رواہ مسلم) عورت کو دوڑنا سنت نہیں۔

سعی کے دوران یہ دعا پڑھنا سنت ہے" رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ وَالْاَكْرَمُ "پھر یہ پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجّاً مَّبْرُوْراً وَّ ذَنْباً مَّغْفُوْراً وَّ سَعْياً مَّشْكُوْراً وَّ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ يَا عَزِيْزُ يَا غَفُوْر "سعی میں قرآن کی تلاوت افضل ہے۔سعی کے ساتوں چکروں کو مسلسل(پے درپے)ادا کرے۔اسی طرح طواف اور سعی کے درمیان بھی تسلسل ہو۔

سعی کے لئے طہارت یا ستر شرط نہیں،البتہ طواف کے شرائط اور سنتیں یہاں سنت ہیں سوار ہو کر سعی کرنا جائز ہے،لیکن عذر نہ ہو تو پیدل بہتر ہے،سعی کے دوران گفتگو وغیرہ کے لئے رکنا اور اسکے بعد دو رکعت پڑھنا مکروہ ہے۔

وقوف عرفہ

آیت:(۱)" فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ......"(البقرہ۔۱۹۸) پھر جب تم لوگ

عرفات (میں ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آکر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو۔

(۲) "ثُمَّ اَفِیْضُوا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ" (البقرہ ۱۹۹) پھر (اس میں اور بات بھی یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور رکھا تھا تمام حجاج تو عرفات ہو کہ پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور وہ مزدلفہ میں ہی رہ جاتے تھے عرفات نہ جاتے تھے یہ جائز نہیں بلکہ) تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آو جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے "جو عرفہ ہے۔ جو شب جمع (۱۰رذوالحجہ کی شب) فجر سے قبل (عرفہ) پہنچ جائے، اس کا حج مکمل ہوا"۔ (احمد، اصحاب السنن، ابن حبان حاکم، دارقطنی، بیهقی) (حج عرفہ ہے، یعنی وقوف عرفہ حج کا اہم ترین رکن ہے، کہ وہ فوت ہو گیا تو اس سال حج فوت ہو گیا)

(۲) آپ ﷺ نے یوم الترویۃ (۸رذوالحجہ) سے قبل خطبہ دیا، جس میں مناسک سے آگاہ فرمایا۔ (حاکم۔ بیهقی)

سنت ہے کہ امام یا اس کا نائب ۷رذوالحجہ کو (جس کو یوم الزینۃ کہتے ہیں) ظہر کی نماز کے بعد (اور جمعہ کا دن ہو تو جمعہ کی نماز کے بعد) ایک خطبہ دے، جس میں حجاج کرام کو دوسرے دن ۸رتاریخ کو (جس کا نام یوم الترویۃ ہے) صبح زوال سے قبل منیٰ روانگی کا حکم دے۔ ۹رذی الحجہ کو یوم عرفہ، ۱۰رکو یوم النحر، ۱۱رکو یوم النفر، ۱۲رکو یوم النفر الاول اور ۱۳رذوالحجہ کو یوم النفر الثانی کہا جاتا ہے۔ اس خطبہ میں آئندہ مسجد ابراہیم کے خطبہ تک کے مناسک سکھلائے سارے خطبوں میں آئندہ کے سارے مناسک واعمال سکھائے، تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ تمتع کرنے والے حضرات اور مکی حضرات کو احرام کے بعد مکہ سے روانگی سے قبل طواف وداع کا بھی حکم دے، کہ یہ ان کے کئے مستحب ہے، لیکن مفرد اور قارون کے لئے مستحب نہیں۔

سنت ہے کہ امام دوسرے دن ۸رتاریخ کو نماز فجر کے بعد حجاج کرام تو منیٰ کے لئے روانہ ہو۔ اگر جمعہ کا دن ہو تو جس پر جمعہ لازم ہے وہ قبل فجر ہی روانہ ہو۔ منیٰ میں ظہر سے ۹رتاریخ کی فجر تک پانچ نمازیں ادا کرے اور شب باشی کرے۔

حدیث: آپ ﷺ منیٰ میں سورج طلوع ہونے تک ٹھرے رہے۔ (مسلم)

۹رذوالحجہ کو سورج کی روشنی پھیلنے کے بعد عرفہ کے لئے روانہ ہو اور عرفہ کے قریب میدانِ نمرہ میں زوال تک رُکے۔ پھر امام لوگوں کے ساتھ مسجد ابراہیم علیہ السلام جائے اور دو خطبہ دے، پہلے خطبہ میں عید کے خطبہ تک آئندہ پیش آنے والے مسائل سے آگاہ کرے، اور بکثرت دعا و تہلیل کی ترغیب دے، خطبہ خفیف ہو، پھر بقدر سورۂ اخلاص بیٹھ جائے پھر دوسرے خطبہ کے لئے کھڑا ہو تو موذن اذان شروع کرے، اور اذان ختم ہونے تک خطبہ سے بھی فارغ ہو جائے دوسرے خطبہ میں صرف ذکر و دعا مقصود ہے۔ اس لئے ساتھ ہی اذان کو بھی مشروع کیا گیا تا کہ جلد نماز شروع ہو جائے بعد میں ظہر و عصر بطور جمع تقدیم ادا کرے (مسلم)

عرفات و مزدلفہ میں جمع اور قصر سفر کی وجہ سے ہے، لہٰذا جو شرعی مسافر ہو، وہی اس پر عمل کرے۔ جو مکی ہو یا مکہ میں مقیم ہو، وہ جمع وقصر نہ کرے۔ البتہ جو حج کے اعمال سے فارغ ہو کر مدت اقامت تک مکہ میں رُکے بغیر اپنے وطن لوٹنے کا ارادہ رکھتا ہو، وہ بھی شرعی مسافر ہے اور جمع قصر کر سکتا ہے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد غروب تک آپ ﷺ کی اتباع میں عرفات میں وقوف کرلے (رواہ مسلم)۔ غروب تک تلبیہ، ذکر واذکار، تلاوت و درود اور دعاؤں میں مصروف رہے۔ ترمذی کی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "افضل دعاء عرفہ کے دن ہے۔ اور میں نے اور سابقہ انبیاء کرام نے جو پڑھا اس میں افضل یہ ہے۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ یُحْیِی

وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر" بیہقی میں یہ اضافہ ہے۔"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْراً وَفِيْ سَمْعِيْ نُوْراً وَّفِيْ بَصَرِيْ نُوْراً اَللّٰهُمَّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ (اے اللہ میرے قلب میں نور عطا فرما، اور میرے کان اور میری نگاہ میں، یا اللہ مجھے شرح صدر عطا فرما اور میرے امور آسان فرما)

مستغفری کی روایت میں ہے کہ "جو عرفہ کے دن ہزار مرتبہ قل اللہ احد کی تلاوت کرے، جو مانگے عنایت ہوگا"۔ سورہ حشر کی تلاوت اور تمام مؤمنین اور مؤمنات کے لئے دعا سنت ہے۔

میدانِ عرفات کا یہ مجمع دنیا کا عظیم ترین مجمع ہے، جس میں اللہ کے اولیاء کرام اور مخصوص بندے بے شمار موجود ہیں، اور یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ وقوف کرنے والے حجاج کرام کی وجہ سے ملائکہ کے روبرو فخر فرماتے ہیں، لہٰذا اپنے ظاہر و باطن کو تمام نامناسب اور مذموم صفات سے فارغ اور پاک وصاف کرکے ممکنہ حد تک خشوع وخضوع اور تذلل وزاری کے ساتھ دعا وذکر میں خوب کوشش کرے، یہ ایسی مبارک جگہ ہے جہاں آنسو بہائے جاتے ہیں۔ اور لغزشوں کی معافی ہوتی ہے۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا رہے، دعا وغیرہ کو زیادہ بلند آواز سے نہ پڑھے۔ عذر نہ ہو تو سایہ میں نہ رہے، بلکہ دھوپ میں رہے۔ اس دن خوب صدقہ کرے۔ اور اللہ سے حسنِ ظن رکھے۔ آج کے دن سب سے زیادہ لوگوں کو جہنم سے خلاصی حاصل ہوتی ہے۔ درمیان عرفہ جبل الرحمۃ پر چڑھنے سے گریز کرے، یہ بدعت ہے۔ وقوف عرفہ میں طہارت اور استقبال قبلہ کو ملحوظ رکھے۔

مزدلفہ کی روانگی

آیت: "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰكُمْ" (البقرۃ ۱۹۸) پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر الحرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آخر شب کو وہاں قیام کرکے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور (یاد کرنے کے طریقے میں اپنی رائے کو دخل مت دو بلکہ) اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلایا ہے۔

غروب کے بعد عرفات سے مزدلفہ کے لئے روانہ ہو آپ ﷺ کی اتباع میں مغرب وعشاء کو جمع تاخیر کے طور پر مزدلفہ میں ادا کرے۔ (صحیحین) یہ جمع بھی سفر کی وجہ سے نہ کہ حج کی وجہ سے۔ (اس لئے جو شرعی مسافر ہوں، وہی جمع کریں۔ بقیہ حضرات دونوں نمازیں اپنے وقت میں ادا کریں) سکون و وقار کے ساتھ یہ سفر طے کرے، سامنے راستہ خالی ملے تو رفتار بڑھادے۔

واجب وقوف: وقوف عرفہ میں واجب یہ ہے کہ مُحرِم عبادت کی اہلیت کے ساتھ (گرچہ نیند میں ہو یا کسی اور کام سے وہاں سے گذر جائے) ۹/ذوالحجہ کے زوال سے ۱۰/ذوالحجہ کے صبح صادق کے درمیان کسی بھی وقت عرفہ کے کسی بھی حصہ میں پایا جائے۔ (گرچہ ایک لحظہ ہی کیوں نہ پایا جائے) بے ہوش، مدہوش اور پاگل میں چونکہ عبادت کی اہلیت نہیں، اس کے لئے ان کا وقوف کافی نہ ہوگا۔ البتہ پاگل کا نفل حج شمار ہوگا۔

کوئی غروب سے قبل ہی میدان عرفہ چھوڑ دے اور واپس نہ لوٹے تو اسے دم دینا سنت ہے۔ تاکہ اسے واجب سمجھنے والوں کے اختلاف سے بچ سکے۔ اگر واپس لوٹا گرچہ رات میں ہو تو دم کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس نے وقوف عرفہ میں رات اور دن کے جمع کرنے کی سنت پر عمل کرلیا۔

اگر چاند میں غلطی کی وجہ سے ۱۰/ذوالحجہ کو وقوف ہوا اور ان کی تعداد کم نہ ہو، تو یہ وقوف کافی ہے۔ آئندہ قضا کی ضرورت نہیں۔

مزدلفہ میں شب باشی (مبیت مزدلفہ)

عرفات سے روانہ ہونے کے بعد رات کے دوسرے نصف حصہ میں (کم از کم) ایک لحظہ مزدلفہ میں رکنا واجب ہے۔ جب کہ احادیث صحیح کی رو سے آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ نصف اول گذرنے کے بعد مزدلفہ سے آگے روانہ ہونا جائز ہے، آئندہ حج کے کئی اعمال انجام دینا ہے، لہٰذا اس تخفیف کو روا رکھا گیا۔ جو نصف ثانی میں مزدلفہ میں نہ ہو، یا نصف ثانی سے قبل ہی روانہ ہو جائے، اور واپس نہ لوٹے تو اس پر دم لازم ہے، کیونکہ ایک واجب ترک ہوا کسی عذر کی وجہ سے وقوف مزدلفہ ترک ہو تو گناہ اور دم لازم نہ ہوگا۔ مثلاً خوف، یا ۱۰ ر کی رات کو وقوف عرفات کے لئے پہنچا اور اس میں مصروف ہونے کی وجہ سے وقت پر مزدلفہ نہ پہنچ سکا، یا عرفہ سے طواف رکن کے لئے مکہ مکرمہ چلا گیا، جس سے وقوف فوت ہو گیا تو کچھ لازم نہیں۔

۱۰ ر تاریخ کی رمی کے کنکر مزدلفہ ہی سے رات یا فجر بعد جمع کر لینا سنت ہے، آپ ﷺ نے حضرت فضل بن عباسؓ کو یوم النحر کی صبح اپنی رمی کے لئے کنکر چننے کا حکم دیا۔ (رواہ البیھقی وغیرہ با سناد علی شرط مسلم) عورتوں اور کمزوروں کو نصف شب کے بعد ہی مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دینا سنت ہے، تاکہ بھیڑ بڑھنے سے قبل ہی رمی کر لیں، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت سودہؓ آپ ﷺ کی اجازت سے مزدلفہ سے نصف اخیر (نصف ثانی) میں ہی کوچ کر گئیں، آپ ﷺ نے ان کو اور ساتھ جانے والے دیگر حضرات کو دم کا حکم نہ دیا، صحیحین مین حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے خاندان کے ضعیفوں (کمزوروں) کے ساتھ مجھے شب مزدلفہ جلد ہی روانہ کر دیا۔

دیگر حجاج کرام کو سنت ہے کہ غلس (اول وقت) میں فجر پڑھنے تک مزدلفہ میں رُکیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے کیا۔ (صحیحین) شیخین کی روایت کی روشنی میں یہاں فجر کا وقت ہوتے ہی (تاریکی میں) نماز پڑھنا دیگر ایام کے مقابلہ میں زیادہ مؤکد اور مطلوب ہے تاکہ آئندہ کے اعمال حج کی ادائیگی کے لئے کشادہ وقت میسر ہو۔

فجر کے بعد تلبیہ کے ساتھ منیٰ کے لئے روانہ ہو، اور جب مشعر الحرام پر پہنچے (جو مزدلفہ کے آخر میں ایک پہاڑی ہے) تو قبلہ رو ہو اور رُک کر اسفار تک (روشنی پھیلنے تک) ذکر و اذکار اور دعا میں مصروف رہے۔ (رواہ مسلم)

پھر طلوع سے قبل سکون سے آگے بڑھے، طلوع آفتاب تک رُکنا مکروہ ہے۔ یا آگے کشادگی نظر آئے تو رفتار تیز کرے۔ راستہ وادی محسر میں پہنچے تو پیدل و سوار اپنی رفتار تیز کریں، وادی سے پار ہو جائیں تو پھر سکون سے عام رفتار سے آگے بڑھیں۔

سورج نکلنے کے بعد منیٰ پہنچ جائے تو ہر حاجی جمرہ عقبہ پر سات کنکر مارے۔ (رواہ مسلم) رمی کی ابتدا کے ساتھ ہی تلبیہ کا سلسلہ روک دے۔ کیونکہ اب تحلل کے اسباب پر عمل شروع کر چکا، جیسا کہ عمرہ کرنے والا طواف کی ابتدا کے ساتھ ہی تلبیہ روک دیتا ہے۔ ہر کنکر کے ساتھ تکبیر (اللہ اکبر) کہے۔ (رواہ البخاری ومسلم) یہ رمی منیٰ کا تحیۃ ہے، لہٰذا منیٰ پہنچنے کے بعد کسی اور کام سے قبل فوراً رمی سے فارغ ہو جائے۔ رمی دائیں ہاتھ سے کرے اور مرد ہاتھ اتنا بلند کرے کہ بغل کی سفیدی نظر آئے۔ عورت ہاتھ اوپر نہ اٹھائے، حلق کے وقت اور اسکے بعد بھی تکبیر پڑھتا رہے، جیسا کہ سلف کا عمل رہا ہے۔ جس کے پاس ہدی کا جانور ہو، اسے ذبح کرے اور دوسرے مونڈے یا بال کترے۔ (حلق یا تقصیر کرے)

آیت: "ثُمَّ الْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَالْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَالْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ" (الحج ۲۹) پھر (قربانی کے بعد)

لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں۔ (یعنی احرام کھول ڈالیں اور سر منڈالیں، بال کٹادیں اور ناخن اور لب بنوالیں) اور اپنے واجبات کو (خواہ نذر سے قربانی وغیرہ واجب کرلی ہو، یا نذر ابتداء جو افعال حج کے واجب میں جیسے رمی جمار کہ ایام منیٰ میں ہوتی ہے ان سب کو) پورا کریں اور اس مامون گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا طواف کریں (یہ طواف زیارت کہلاتا ہے، جوکہ فرض ہے۔)

احادیث: (۱) ''حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے اور بعض صحابہ کرام نے سر مونڈا اور بعض صحابہ کرام نے صرف بال کترے'' (متفق علیہ)

(۲) آپ ﷺ نے حجۃ الوادع میں حلق کرنے والوں کو (سر مونڈنے والوں کو) تین مرتبہ اور کترنے والوں کو ایک مرتبہ دعا دی'' (متفق علیہ)

(۳) عورتوں کو حلق مشروع نہیں، وہ صرف بال کتریں'' (ابو داؤد۔ دراقطنی۔ طبرانی۔ اسنادہ حسن کما فی التلخیص)

(۴) '' آپ ﷺ نے عورتوں کو بال منڈانے سے منع فرمایا'' ۔(ترمذی)۔

مذکر کے لئے حلق افضل ہے اور دوسروں کے لئے صرف بال کترنا۔ مجموع میں ہے کہ عورت اور خنثیٰ کو حلق مکروہ ہے۔ عورت کے لئے پیدائش کے ساتویں دن بال کے برابر صدقہ کے لئے اور معالجہ کے لئے حلق مشروع ہے، ورنہ مکروہ ہے، شوہر کی اجازت کے بغیر حرام ہے۔

بال مونڈنے اور کترنے سے مراد احرام کی حالت میں موجود بالوں کا ازالہ کرنا ہے۔ لہٰذا اس وقت (۱۰ رتاریخ کو بال نہ ہوں، تو بعد میں اگنے والے بالوں کا ازالہ واجب نہیں ہے۔ حلق یا تقصیر سے یہ مقصود نہیں کہ احرام ختم ہونے کی وجہ سے جائز ہو گیا، لہٰذا اس پر عمل کررہا ہے۔ (بلکہ یہ ایک مقصود و مطلوب عمل ہے) حج و عمرہ کا مستقل رکن اور باعث ثواب عمل ہے۔

تنبیہ: کوئی حج سے قبل ایسے وقت عمرہ کرے کہ عمرہ میں حلق کرنے کی صورت میں دوبارہ یوم النحر (۱۰ رذوالحجہ) تک دوبارہ سر میں بال نہیں آئیں گے، تو اسے عمرہ میں تقصیر افضل ہے۔

حلق اور تقصیر کی اقل مقدار یہ ہے کہ سر کے تین بال کا ازالہ کرے۔ چاہے لٹک کر سر کے حد سے باہر نکلے ہوں یا الگ الگ مقام سے ازالہ کرے۔ جس کے سر پر بال نہ ہوں اسے استرا پھرالینا مستحب ہے، تاکہ حلق سے مشابہت حاصل ہو۔

پورے سر کا حلق یا تقصیر افضل ہے۔ عورتوں کو بھی پورے سر کے بالوں سے ایک پورے کی مقدار کترنا مستحب ہے۔ داڑھی اور مونچھ کے بال کو کچھ کترنا اور ناخن تراشنا مستحب ہے۔

طواف افاضہ

(طوافِ رکن، طوافِ زیارت، طوافِ فرض، طوافِ صدر)

آیت: '' وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ '' (الحج۔ آیت ۲۹) ۔اور (ان ہی ایام معلومات میں) اس مامون گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا طواف کریں۔ (یہ طواف زیارت کہلاتا ہے جوکہ فرض ہے)۔

منیٰ کے مذکورہ اعمال سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ روانہ ہو اور طوافِ رکن انجام دے (متفق علیہ) طواف کے بعد سعی کرے (سعی حج کا رکن ہے) کوئی حج کے احرام سے مکہ مکرمہ میں آئے اور طواف قدوم کے بعد سعی کر لے تو اسے اب دوبارہ سعی کرنے کی ضرورت

نہیں۔(لیکن اکثر حضرات مکہ سے حج کا احرام باندھ کر نکلتے ہیں اس لئے طواف قدوم کے بعد سعی کا سوال نہیں، لہٰذا ان سبھی حضرات کو طواف افاضہ کے بعد سعی فرض ہے۔منیٰ کی روانگی سے قبل ہی کسی نفل طواف کے بعد سعی نا کافی ہے)

طواف اور سعی سے فارغ ہوکر پھر منیٰ لوٹ جائے، تاکہ وہاں شب گذاری ہو، یوم النحر کے اعمال کو اسی ترتیب سے انجام دینا مستحب ہے، یعنی پہلے رمی پھر ذبح پھر حلق یا تقصیر اور پھر طواف وسعی، یہ ترتیب واجب نہیں ہے۔کیونکہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے رمی سے قبل حلق کرلیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اب رمی کرلو کوئی حرج کی بات نہیں'' دوسرے نے آکر عرض کیا کہ میں نے رمی سے قبل ہی طواف افاضہ کرلیا تو فرمایا ''اب رمی کرلو کوئی بات نہیں۔'' (مسلم) صحیحین کی روایت میں ہے کہ'' آج کے دن (۱۰ ذوالحجہ کو) آپ ﷺ سے کسی بھی عمل کے تقدیم وتاخیر کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا (بقیہ اعمال) انجام دو۔کوئی حرج کی بات نہیں۔'' تقریباً انجام دی جانے والی ہدی کی قربانی کے علاوہ بقیہ مذکورہ اعمال کا وقت ۱۰ ذوالحجہ کی نصف شب کے بعد ہو جائے گا، جبکہ اس سے قبل وقوف عرفہ کا فریضہ انجام دے چکا ہو۔

حدیث: '' آپ ﷺ نے حضرت اُم سلمہؓ کو لیلۃ النحر (عیدالاضحیٰ کی رات) میں (منی) روانہ فرمایا، تو انھوں نے فجر سے قبل رمی کرلی، پھر طواف افاضہ کیا'' (ابوداود، باسناد صحیح علی شرط مسلم کما فی المجموع) بقیہ اعمال کو بھی اس پر قیاس کرلیا گیا۔

یوم النحر کی رمی کا اختیاری وقت اس دن غروب تک ہے۔ایک شخص نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے مَسا کے وقت رمی کی تو آپ نے فرمایا ''کوئی حرج اور مضائقہ نہیں۔'' (بخاری شریف) مَسا زوال سے غروب تک وقت کو کہا جاتا ہے، وقت جواز ایام تشریق کے آخر تک باقی رہے گا۔امام رافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے کہ ۱۰ تاریخ کی رمی کا افضل وقت زوال تک ہے تو گویا ۱۰ تاریخ کی رمی کے تین اوقات ہوئے۔(۱) وقتِ فضیلت طلوع سے زوال تک۔(۲) وقتِ اختیار زوال سے غروب تک۔(۳) وقتِ جواز۔غروب سے ایام تشریق کے آخر تک۔

حلق (یا تقصیر) اور طواف افاضہ (اور سعی باقی ہو تو وہ بھی) کا کوئی آخری وقت نہیں، زندگی میں کبھی بھی ادا کرے تو ادا ہو جائے گا اور حج صحیح ہوگا۔اور اس کی ادائیگی تک احرام کا حکم باقی رہے گا۔لیکن ان امور کو یوم النحر میں ہی انجام دینا افضل ہے۔یوم النحر سے مؤخر کرنا مکروہ ہے، ایام تشریق سے بھی مؤخر کرے تو کراہت شدید ہوگی۔مکہ مکرمہ سے ان امور کو انجام دیئے بغیر نکلنا اور بھی شدید مکروہ ہے۔چونکہ حدیث میں ان اعمال کے لئے وقت کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔اس لئے تاخیر کو جائز قرار دیا۔

ہدی کے وقت کا ذکر محرّمات احرام میں آئے گا۔

تحلّل (حلال ہونا ــ احرام کھولنا)

تحلل کا مطلب ہے احرام کی پابندی کا ختم ہونا۔

چونکہ حج کا وقت طویل اور اعمال حج کثیر ہیں، اس لئے حج میں دو تحلل ہیں۔تحلل اوّل کے بعد بعض پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں اور بقیہ تحلل ثانی کے بعد ختم ہوتی ہیں اس کے برعکس عمرہ میں ایک ہی تحلل ہے۔

تحلل اوّل: یوم النحر کے تین اعمال رمی، حلق (یا تقصیر) اور طواف رکن (سعی باقی ہو تو مع سعی) میں کسی بھی دو عمل کے انجام دینے سے تحلل اوّل حاصل ہوگا۔یعنی اب نکاح، جماع (صحبت) اور جماع کے مقدمات (مثلاً بوس وکنار) کے علاوہ دیگر محرمات احرام

جائز ہو جائیں گے۔یعنی سلا ہوا لباس، حلق یا تقصیر، ناخن تراشنا، شکار، خوشبو، تیل، مرد کو سر چھپانا اور عورت کو چہرہ چھپانا جائز ہو جائے گا۔ نکاح، جماع اور مقدمات جماع اب بھی حرام ہیں۔

کسی کے سر پر بال ہی نہ ہو تو رمی اور طواف میں کسی ایک کے انجام دیتے ہی تحللِ اوّل حاصل ہوگا۔

حدیث : ''جب تم رمی اور حلق کر چکو تو تم کو خوشبو، کپڑے اور ہر چیز حلال ہے، سوائے عورتوں کے۔'' (احمد، ابوداود، دارقطنی، بیہقی)" تلخیص ۲/۲۷۹)

حدیث : حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے احرام سے قبل آپ ﷺ کو خوشبو لگائی اور تحلل کے (کعبہ کے طواف سے قبل بھی خوشبو لگاتی) (متفق علیہ)

تحلل ثانی (تحللِ دوّم): یوم النحر کے مذکورہ تین اعمال میں سے جب تیسرا بھی انجام دے، تو بقیہ تینوں محرمات بھی جائز ہوں گے۔(اب احرام کی پابندی بالکل ختم ہو چکی، صرف منیٰ کی شب باشی۔ اور رمی انجام دینا باقی ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے) کسی کی یوم النحر کی رمی فوت ہو، (ایام تشریق کے آخر تک نہ کر سکا) اور اس کا بدل یعنی دم یا روزہ لازم ہوا، تو جب تک وہ بدل انجام نہ دے تحلل حاصل نہ ہوگا۔

ایامِ تشریق میں منیٰ میں شب باشی

آیت: ''وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ''۔(البقرہ-۲۰۳)

ترجمہ: اور (منیٰ میں) اللہ کا ذکر کرو کئی روز تک پھر جو شخص (کنکریاں) مار کر دسویں تاریخ کے بعد دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل کرے اس پر بھی گناہ نہیں۔ اور جو شخص دو میں تاخیر کرے (یعنی بارھویں کو نہ آئے بلکہ تیرھویں کو آئے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں۔''

ایام تشریق: ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذوالحجہ : مذکورہ تینوں رات کا اکثر حصہ میدان منیٰ میں بسر کرنا واجب ہے۔ (مثلاً غروب سے صبح صادق تک ۱۰ر گھنٹے ہوں تو ۵ر گھنٹہ سے کچھ زائد وقت گذارنا واجب ہے۔) کیونکہ صحیح احادیث سے آپ ﷺ کا یہ عمل ثابت ہے، اور آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے حج وعمرہ کے اعمال کو مجھ سے حاصل کرو۔

ایام تشریق کی رمی

ایام تشریق کے ہر روز زوال کے بعد تینوں جمروں کی رمی واجب ہے، (۱) جمرہ اُولیٰ جو مسجد خیف کے قریب ہے اس کو جمرہ کبریٰ بھی کہتے ہیں۔ جمرہ عقبہ کو بھی جمرہ کبریٰ کہا جاتا ہے۔ (۲) جمرہ وسطیٰ۔ (۳) جمرہ عقبہ۔ یہ منیٰ میں داخل نہیں، بلکہ یہاں منیٰ کی حد ختم ہوتی ہے۔

اگر کوئی ۱۲ر ذوالحجہ کو رمی کے بعد منیٰ سے نفر اوّل کے ارادے سے روانہ ہو جائے اور دوبارہ ۱۳ر کی شب باشی کے لئے لوٹنے کا ارادہ نہ ہو، (اور اس سے قبل دو شب منیٰ میں گذار چکا ہو، یا عذر کی وجہ سے ترک کیا ہو) تو یہ جائز ہے۔ اور ۱۳ر تاریخ کی رمی اور شب باشی ساقط ہو جائے گی۔ اسے نفر اولی کہتے ہیں روانگی کا سفر شروع ہو جائے اور میدان منیٰ سے نکلنے سے قبل ہی غروب ہو جائے۔ یا روانگی کے بعد کسی شب سے یا بلا سبب دوبارہ منیٰ میں جائے تب بھی ۱۳ر تاریخ کی شب باشی اور رمی لازم نہ ہوگی۔

اگر بلا عذر ۱۱ اور ۱۲ کی شب باشی ترک کرے، یا ۱۲ ر کو قبل زوال ہی روانہ ہو جائے، یا بعد زوال بغیر رمی روانہ ہو جائے، تو اُسے نفر اول کی اجازت نہیں۔ اور ۱۳ ر کی شب باشی اور رمی ساقط نہ ہوگی البتہ آخری دو صورتوں میں ۱۲ کو غروب سے قبل منیٰ لوٹ کر رمی کر لے، تو اب نفر اوّل پر عمل کر سکتا ہے۔

۱۳ ر تاریخ کی شب باشی اور رمی کے بعد منیٰ سے روانہ ہونے کو نفرِ ثانی کہتے ہیں امام، ۱۰ ر ذوالحجہ کو نماز ظہر کے بعد ایک خطبہ دے، جس میں حجاج کرام کو ایام تشریق کی رمی اور نفر اوّل کے مسائل وغیرہ اور الوداعی پیغامات دے۔

رمی کی صحت کے شرائط

رمی کے درج ذیل چھ/۶ شرائط ھیں۔

(۱) ترتیب: پہلے جمرہ اولیٰ کی رمی کرے (جو مسجد خیف کے قریب ہے) پھر جمرہ وسطیٰ کی پھر جمرۂ عقبہ کی، جیسا کہ آپ ﷺ سے مروی ہے۔ (بخاری) لہٰذا جمرہ اولیٰ کی رمی مکمل ہونے سے پہلے دوسرے یا تیسرے کی رمی کرے تو یہ معتبر نہ ہوگا اسی طرح وسطیٰ کی تکمیل سے پہلے جمرۂ عقبہ کی رمی کا اعتبار نہ ہوگا۔

(۲) سات مرتبہ رمی کرنا: یہی آپ ﷺ سے صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ اگر سات کنکر ایک ہی مرتبہ مارے تو ایک ہی شمار ہوگا۔ ایک کنکر دائیں ہاتھ سے، اور ایک بائیں ہاتھ سے بہ یک وقت مارے تب بھی ایک ہی شمار ہوگا، اگر یکے بعد دیگرے ہو تو دو شمار ہوں گے۔ ایک ہی کنکر کو سات مرتبہ مارے تو یہ کافی ہے۔ کنکر کو صرف رمی کی جگہ میں رکھ دے تو یہ کافی نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ رمی (پھینکنا اور مارنا) نہیں کہلاتا، اور حدیث میں وارد تفصیل کے خلاف ہے۔

(۳) ھاتھ سے رمی کرے: جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ قدرت کے باوجود کمان، پیر یا گوپھن وغیرہ سے رمی کرنا کافی نہیں۔ اگر ہاتھ سے رمی کرنے سے عاجز ہو (ہاتھ کٹا ہو یا کسی بیماری کی وجہ سے) تو کمان سے ورنہ پیر سے ورنہ پھر منہ سے رمی کرے، ورنہ پھر کسی اور کو نائب بنائے۔

(۴) کنکر وپتھر ھو: کیونکہ احادیث میں حَصیٰ (کنکری) کا ذکر ہے، اور کنکری پتھر سے ہی ہے، لہٰذا پتھر کے بھی انواع کافی ہیں، اگر چہ یاقوت وعقیق وغیرہ ہی کیوں نہ ہو۔ (ان سے رمی تو ہو جائے گی، لیکن اضاعت مال ہو، تو پھر اس اعتبار سے حرام ہے) سونا، چاندی، لوہا (اور جوتے چپل) وغیرہ اشیاء سے رمی حاصل نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ پتھر کے انواع میں داخل نہیں)

(۵) مَرمیٰ (محلِ رمی) کا قصد: اگر کوئی ہوا وغیرہ میں کنکر مارے اور وہ مرمیٰ میں جا گرے تو اس سے رمی حاصل نہ ہوگی۔ جمرہ میں ستون کی شکل میں جو نشانی لگائی گئی ہے، اس کے اطراف احاطہ کے اندر کی جگہ مرمیٰ (محل رمی) ہے۔ اور اسی کو جمرہ کہا جاتا ہے۔ (عوام اس ستون نما علامت کو جمرہ سمجھتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ) کوئی اس ستون کو مارنے کی نیت سے رمی کرے، تو یہ کافی نہیں، بھلے ہی کنکری ستون کو لگ کر مَرمیٰ میں گر جائے۔ اگر مَرمیٰ کے قصد سے ستون پر مارے، اور کنکری اس پر لگ کر مَرمیٰ میں گرے۔ تو یہ کافی ہے۔ جمرہ میں علامتی ستون آپ ﷺ کے دور میں نہیں تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس جگہ کنکریاں جمع ہوتیں اور ان کا ڈھیر لگتا ہے۔ وہ جمرہ ہے۔ (بعض عوام ستون کو مقصود اور شیطان تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے)

(۶) کنکری یقینا جمرہ میں پھنچی ھو، جمرہ میں گرنے کے بعد اچھل کر باہر نکل جائے، تو حرج نہیں۔ اگر جمرہ

میں گرنے میں شک ہو تو یہ کافی نہیں۔

پہلی شرط صرف ایام تشریق کی رمی کے لئے ہے، بقیہ شرائط یوم النحر اور ایام تشریق کی رمی میں ضروری ہیں۔

مسلم کی حدیث کی وجہ سے سنت ہے کہ رمی چھوٹے کنکروں سے (جو کہ گوپھن یا غلیل میں استعمال ہوتے ہیں یا دو انگلیوں سے پھینکنے میں استعمال ہوتے ہیں) کی جائے۔ جو انگلی کے پورے سے کچھ چھوٹی ہو، لوبیا کے دانے کے برابر ہو۔ اس سے چھوٹی یا بڑی کنکری سے رمی مکروہ ہے۔ کنکری انگوٹھے پر رکھ کر شہادت کی انگلی کے سرے سے اسے اڑانا مکروہ ہے۔ صحیح حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ (رمی کے علاوہ بھی یہ حرکت مکروہ ہے)۔

سنت ہے کہ قبلہ رو ہو کر، تکبیر کہتا ہوا، یکے بعد دیگرے سات کنکریاں جمرۂ اولیٰ میں مارے پھر اس سے ہٹ کر کچھ آگے بڑھے اور ایسی جگہ رکے جہاں کنکر آ کر نہ لگے، اور قبلہ رو ہو کر حضور قلبی اور خشوع کے ساتھ اللہ کی حمد، تکبیر، تہلیل، تسبیح اور دعاؤں میں تقریباً سورۂ بقرہ کی تلاوت کے بقدر وقت تک مصروف رہے۔ پھر جمرۂ وسطیٰ کی بھی اسی طرح رمی کرکے دعا و ذکر میں مصروف رہے، پھر جمرۂ عقبہ کی اسی طرح رمی کرے (جس کی یوم النحر میں رمی کی تھی)، اس کے بعد دعا کے لئے نہ رُکے۔ (یہ تفصیل بخاری شریف کی روایت سے سامنے آئی ہے) ایک جمرہ کی ساتوں کنکریوں کی رمی کے درمیان اور ہر جمرہ کی رمی کے درمیان موالات (تسلسل) سنت ہے۔

آخری دن جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد تکبیر و تہلیل پڑھتے ہوئے منیٰ سے نکل جائے۔ اور ظہر منیٰ میں نہ ادا کرے۔ اگر ادا کرے تو جائز ہے لیکن خلاف افضل ہے۔

رمی میں نیابت: جو کسی ایسے عذر کی وجہ سے رمی سے عاجز ہو، جو رمی کا وقت ختم ہونے سے پہلے دور ہونے کی امید نہ ہو، تو کسی اور کو اپنی رمی کا نائب بنانا (کسی اور کے ذمہ رمی سونپنا) واجب ہے، خواہ اسے اجرت دینی پڑے، بعد میں اتفاقاً عذر ختم ہو جائے، تب بھی نائب کی رمی معتبر ہوگی، لیکن اب اسے خود اس کا اعادہ کر لینا سنت ہے۔

نائب جب تک اپنی رمی مکمل نہ کرلے دوسرے کی طرف سے رمی نہیں کرسکتا۔ ایام تشریق کے ہر دن نائب پہلے تینوں جمروں کی اپنی رمی مکمل کرلے۔ پھر دوسرے کی طرف سے نیابت میں رمی کرے۔ ہر دن مستقل شمار ہوگا۔ ایک دن کی اپنی رمی مکمل کر لینے کے بعد دوسرے کی نیابت ادا کرسکتا ہے۔ اگر اپنی رمی کا ایک کنکر بھی باقی ہو تو نیابت ادا نہ ہوگی۔ اپنی رمی سے پہلے دوسرے کی نیت سے رمی کرے تب بھی اپنی ہی رمی شمار ہوگی۔

ایک شخص کو کئی لوگ نائب بنائیں تو یہ جائز ہے، لہٰذا نائب اپنی رمی کے بعد ایک کی مکمل رمی کرنے کے بعد دوسرے کی رمی کرے۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے وغیرہ کی۔

نیابت کی صورت میں ممکن ہو تو سنت ہے کہ اصل شخص نائب کو کنکری تھمائے اور تکبیر کہے۔ ورنہ یہ بھی نائب ہی انجام دے۔

یوم النحر یا ایام تشریق کی کوئی رمی رہ جائے، تو ایام تشریق کے ختم ہونے سے قبل دن یا رات کسی بھی وقت اس کا تدارک کرے، اور یہ ادا ہوگی۔ چرواہوں اور اہل سقایہ کے حق میں یہ اجازت حدیث سے ثابت ہے، اوروں کو ان پر قیاس کرلیا گیا۔ متروکہ رمی اور بعد کی رمی میں ترتیب واجب ہے۔ (مثلاً ۱۰ ر تاریخ کی رمی یا ایک کنکر بھی باقی ہو تو جب تک وہ مکمل نہ ہو ۱۱ ر تاریخ کی رمی معتبر نہ ہوگی)۔ متروکہ رمی رات میں اور زوال سے قبل بھی کرسکتا ہے۔

اگر رمی کی تلافی نہ ہوئی، تو تین یا زائد کنکریوں کے ترک سے دم لازم ہوگا، صرف آخری ایک کنکری ترک ہو تو ایک مد اناج اور دو

کنکری ترک ہوتو دومد اناج لازم ہے۔

ایامِ تشریق کی شب باشی مکمل ترک کردے تو دم لازم ہے، ایک رات ترک کرے تو ایک مد اناج اور نفر اول نہ کرے تو دو رات کے ترک میں دو مد اناج، اور نفر اول کرے تو دو رات کے ترک میں دم لازم ہے، کیونکہ شب باشی کی جنس مکمل ترک ہو رہی ہے۔

کوئی معقول عذر ہو تو (مثلاً جانور چرانا، حجاج کرام کو پانی پلانا، مریض کی دیکھ ریکھ وغیرہ) جس کی وجہ سے منی کی شب باشی ترک ہو، تو دم وغیرہ لازم نہیں۔

طوافِ وداع

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے اعمالِ حج سے فارغ ہونے کے بعد طواف (وداع) فرمایا۔'' (بخاری)

(۲) ''لوگوں کو حکم دیا گیا کہ آخری عمل بیت اللہ کا طواف ہو، البتہ حائضہ عورت کو رخصت ہے۔'' (متفق علیہ)

(۳) ''حضرت صفیہ ؓ کو طوافِ افاضہ کے بعد حیض شروع ہوا، تو آپ ﷺ نے انہیں (طواف وداع کے بغیر) مکہ سے روانگی کی اجازت مرحمت فرمائی۔'' (صحیحین)

جو مکہ مکرمہ سے مسافتِ قصر کے لئے روانہ ہو، اسے طواف وداع واجب ہے۔ چاہے مکی ہو یا غیر مکی، حاجی یا معتمر ہو، یا نہ ہو، جاکر وہاں رکنا ہو یا مکہ لوٹنے کا ارادہ ہو اپنے وطن جارہا ہو یا کہیں اور مسافر قصر سے کم فاصلہ کے لئے وہاں اقامت کی نیت سے روانہ ہو یا وہاں اس کا وطن ہو تو طواف وداع واجب ہے۔ اور اقامت کی نیت نہ ہو، تو سنت ہے حاجی مکہ مکروہ سے منیٰ یا عرفات کے لئے روانہ ہو یا کوئی عمرہ کرنے نکلے (مسجد عائشہ وغیرہ کی طرف) تو ان حضرات کو طواف وداع سنت ہے حاجی منیٰ سے ہی اپنے گھر جانا چاہے تو اسے مکہ آکر طوافِ وداع کرنا لازم ہے۔ (حاجی جب مکہ سے مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے روانہ ہو، تو طوافِ وداع واجب ہے۔

مکہ سے روانگی کے وقت کسی عورت کو حیض یا نفاس ہو تو اس پر طواف وداع واجب نہیں ہے۔ مکہ کے حدود سے نکلنے سے قبل پاک ہوجائے، تو لوٹ کر طواف وداع کرنا لازم ہے۔ مکہ سے باہر جانے کے بعد پاکی حاصل ہو تو لوٹنے کی ضرورت نہیں۔

جس پر طواف وداع لازم ہو وہ اسے ترک کردے تو دم لازم ہے، کیونکہ ایک واجب ترک ہوا۔ بلا طواف روانگی کے بعد اپنے وطن اور مسافتِ قصر سے قبل لوٹ کر طواف کرلے تو دم لازم نہیں۔ طوافِ وداع کے بعد وہیں ٹھہرا رہا تو دوبارہ طواف لازم ہے۔ البتہ سفر کی تیاری میں رکنا پڑا، یا اقامت کی وجہ سے جماعت میں شریک ہوا، تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔

طوافِ وداع کے بعد مقامِ ابراہیم کے پیچھے دو رکعت طواف کی ادا کرے اور ملتزم سے چمٹ کر خوب دعا کرے، اعمالِ حج کی ادائیگی کی توفیق پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے قبولیت کی دعا کرے۔ دیگر دینی واخروی دعا مانگے۔ پھر زمزم کا پانی پیئے، اور لوٹ کر حجر اسود کا استلام اور بوسہ لے کر روانہ ہوجائے۔ حائضہ عورت کو مسجد کے دروازے پر مذکورہ دعا مانگ کر روانہ ہونا مستحب ہے۔ مسجد حرام سے نکلتے وقت کعبہ کی طرف پشت کرکے نکلے، کعبہ کی طرف رخ کرکے الٹے قدم لوٹنا مکروہ ہے، اس کے متعلق کوئی سنت مروی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے روانگی کے وقت مسجد کے دروازہ پر کعبہ کو دیکھتے کھڑا رہنے کی کراہت منقول ہے، بلکہ سب سے آخری عمل طواف کرکے نکل جائے۔

نفلی عمرہ اور طواف کی کثرت اور مکہ کے مشہور مقاماتِ فضل کی زیارت مستحب ہے۔ کعبہ کی طرف ایمان واحتساب (ثواب کی نیت

سے) دیکھتے رہنا سنت ہے۔ بیہقی کی شعب الایمان میں روایت ہے کہ ہر دن رات اللہ تعالیٰ کی ۱۲۰ رحمتیں ہیں، جو کعبہ پر نازل ہوتی ہیں، ۶۰ طواف کرنے والوں کو، ۴۰ نمازی کو اور ۲۰ دیکھنے والوں کو۔ صدقہ و دیگر عبادات و نیکیوں کو بکثرت انجام دینا سنت ہے، کیونکہ یہاں ایک نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔ طواف وداع کو طواف صَدَر کہتے ہیں۔

زمزم

حدیث: (۱) مسلم شریف میں حضرت جابرؓ سے حجۃ الوداع کے متعلق مروی طویل حدیث کے آخر میں ہے کہ "آپ ﷺ نے طواف افاضہ سے فارغ ہو کر زمزم کا پانی نوش فرمایا"

(۲) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "آپ ﷺ سقایہ (پانی پلانے کی جگہ) کے پاس تشریف لے گئے، اور اس میں سے زمزم کا پانی نوش فرمایا"۔ (بخاری)

(۳) "زمزم کا پانی جس مقصد کے لئے پیا جائے وہ مقصد حاصل ہوگا" (احمد، ابن ابی شیبہ، ابن ماجہ، بیہقی)

(۴) حضرت ابن عباسؓ کا فرمان ہے۔ "زمزم کا پانی قبلہ رو ہو کر، بسم اللہ کہہ کر، تین سانس میں خوب سیراب ہو کر پیو، جب فارغ ہو جاؤ تو الحمد للہ کہو، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا" ہمارے اور منافق کی امتیازی نشانی یہ ہے کہ وہ زمزم شکم سیر ہو کر نہیں پیتے۔" (دار قطنی، حاکم)

زمزم کا پانی (جب بھی موقع ملے) پینا سنت ہے۔ کیونکہ یہ مبارک اور قلب کی تقویت کا باعث ہے۔ اس کے کئی نام ہیں۔ زمزم، ہزمۃ جبریل، سُقیا اللہ اسمٰعیل، بَرَکہ، سَیِّدۃ، نافعہ، مصونۃ، عونہ، بشری، صاحبہ، برۃ، عصمۃ، سالمہ، میمونۃ، مغذیہ، کافیہ، طاہرہ، حرمیۃ، مُرَوِیَّۃ، مُومِنسہ، طیبۃ، شباعۃ العیال، طعام طعم، شفاء سقم۔ یہ جنت کے پانی سے ہے، اور آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیان سے بعض مرتبہ بطور معجزہ جو پانی نکلا اس کے بعد زمزم کا پانی سب سے افضل ہے۔ مسلم کی حدیث میں اسے مبارک اور غذا کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ ابوداؤد طیالسی کی روایت میں مزید اسے بیماری سے شفا بھی قرار دیا ہے۔ اس لئے ہر کسی کو زمزم کا پینا سنت ہے۔ اور اس سے اپنے دنیوی و اخروی مقاصد کے حصول کا قصد کرے۔ پیتے وقت قبلہ رو بیٹھنا سنت ہے۔ آپ ﷺ نے بیان جواز کے لئے کھڑے ہو کر پیا تھا۔ پینے سے قبل اللہ سے دعا کرے کہ "یا اللہ مجھے آپ ﷺ سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ زمزم کا پانی جس مقصد سے پی لے، وہ حاصل ہوگا۔ یا اللہ میں اسے فلاں مقصد کے لئے پی رہا ہوں، لہٰذا آپ محض اپنے فضل و کرم سے یہ عنایت فرمادیں۔ پھر بسم اللہ کہہ کر خوب سیراب ہو کر تین سانوں میں اسے پی لے۔ زمزم کے پانی میں سانس چھوڑنا مکروہ ہے۔ زمزم اپنے ساتھ وطن لے جانا، تاکہ خود اور دوسروں کو سنت و برکت حاصل ہو، سنت ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زمزم کا پانی لے جاتیں اور فرماتیں کہ آپ ﷺ بھی لے جایا کرتے تھے۔ (حسنہ الترمذی و صححہ الحاکم، و فی اسنادہ خلاد بن یزید و ھو ضعیف)(تلخیص ۲/۲۰۸)

مکہ کے علاوہ بھی کہیں زمزم پئے تو اپنے مقصد کے لئے دعا کرے۔ حضرت ابن عباسؓ زمزم پیتے وقت یہ دعا پڑھتے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِلْماً نَافِعاً وَّرِزْقاً وَّاسِعاً وَّ شِفَآءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ (یا اللہ مجھے علم نافع، وسیع و کشادہ رزق اور ہر بیماری سے شفا عطا فرما) علماء نے مختلف مقاصد کے لئے پیا اور اپنا مطلوب حاصل کرلیا۔ کنویں کے قریب جا کر نگاہ ڈالنا اور اپنے سر، چہرے اور سینہ پر زمزم کا پانی چھڑکنا سنت ہے۔

مکہ میں مکمل قرآن پاک کی تلاوت کرے۔(قرآن ختم کرے) روانگی کے وقت کعبہ نظروں سے اوجھل ہونے تک اس کے فراق پرافسوس کرتے ہوئے بار بار پلٹ کر کعبہ کا دیدار کرے۔مکہ سے روانگی کے وقت یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَئٍ قَدِيْرٌ اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ۔ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ "(آپ ﷺ غزوہ، حج یا عمرہ سے لوٹتے تو یہ دعا پڑھتے، متفق علیه)

مدینہ منورہ

احادیث : (۱) آپ ﷺ نے فرمایا "میرے قبر اور منبر کے درمیانی جگہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے حوض (یعنی حوض کوثر) پر ہے۔" (صحیحین)

(۲) تین مساجد کے علاوہ کسی اور طرف کجاوے نہ کسے جاویں (یعنی باقاعدہ سفر نہ اختیار کیا جائے) مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) اور میری یہ مسجد" (مسجد نبوی) (صحیحین)

(۳) "جو بھی مجھ کو سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹا دیتے ہیں تاکہ میں اس کو جواب دوں۔(احمد ، ابوداود)

(۴) آپ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن روانہ کرتے وقت فرمایا "معاذ! شاید اس سال کے بعد میری تمہاری ملاقات نہ ہو، شاید کہ تم میری اس مسجد اور قبر کے پاس سے گذرو" (احمد بسند صحیح) ظاہر ہے کہ یہاں لعلّ (شاید) طلب وامید کے معنی میں ہے۔

آپ ﷺ کے قبر اطہر کی زیارت سنت ہے۔یہ اتفاق صحابہ کرام وتابعین عظام یہ بڑی قربت اور نیکی ہے۔ (الفقه المنهجی) ۔حاجی اور معتمر کے حق میں اس کی زیادہ تاکید ہے کیونکہ دور دراز سے مدینہ منورہ کے اتنے قریب آ کر بغیر زیارت کے لوٹ جانا بڑی بُری بات ہے۔آپ ﷺ کے زمانے میں مسجد نبوی کی جو حد تھی اس میں نماز پڑھنے کی بڑی پابندی کرے کہ وہاں ایک نماز ہزار نماز کے برابر ہے۔آپ ﷺ کے قبر اطہر کا طواف نہ کرے۔پشت یا پیٹ قبر کی دیوار (جالی) سے چپکانا شدید مکروہ ہے، اس کا ہاتھ سے مسح اور بوسہ مکروہ ہے، بلکہ ادب یہ ہے کہ دور کھڑا رہے، جیسا کہ آپ ﷺ کی زندگی میں رہتا۔مدینہ کے قیام کے دوران حتی المقدور روزے رکھے اور آپ ﷺ کے پڑوسیوں پر (وہاں کے ہوں یا بیرونی) صدقہ وخیرات کرے۔

مدینہ منورہ کی زیارت کے قصد سے سفر کرنے والا راستہ میں بکثرت درود وسلام پڑھتا رہے۔حرم مدینہ اور وہاں کے درخت دکھائی دیں تو درود وسلام میں اور اضافہ کرے اور اللہ سے اسے نفع بخش بنانے اور قبول کرنے کی دعا کرے۔مدینہ میں داخل ہونے سے قبل غسل کرلے، ورنہ داخل ہونے کے بعد مسجدِ نبوی میں جانے سے قبل کرلے۔پھر سب سے نظیف اور صاف ستھرے (سفید ہو تو وہ بہتر ہے) کپڑے پہن کر مسجد جائے مسجد میں داخل ہونے کے بعد روضہ (قبر اور منبر کے درمیانی جگہ) میں جا کر (ممکن ہو تو منبر کے پاس دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے اور اس نعمتِ عظمیٰ پر اللہ کا شکر ادا کرے۔

نماز کے بعد قبر اطہر کے پاس جا کر قبلہ کی طرف پشت کر کے قبر کی طرف رُخ کرے، نگاہ نیچی رکھے، اور دنیوی علائق سے دل کو بالکل فارغ کر کے پست آواز میں سلام عرض کرے۔

اوّل سلام : السلام علیك یا رسول الله ﷺ

آپ ﷺ پر اکمل سلام : اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَانَبِيَّ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَاحَبِيْبَ اللّٰهِ ۔ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقّاً، بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ نَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ وَجَلَوْتَ الظُّلْمَةَ وَجَاهَدْتَ فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۔ جَزَاكَ اللّٰهُ عَنَّا اَفْضَلَ مَا جُوْزِيَ نَبِيٌّ عَنْ اُمَّتِهٖ وَعَلٰى اٰلِكَ وَاَصْحَابِكَ وَاَزْوَاجِكَ وَاَهْلِ بَيْتِكَ اَجْمَعِيْنَ ۔ اگر کسی نے آپ ﷺ کو اس کی جانب سے عرض کرنے کی درخواست کی ہو تو یوں کہے۔ السلام عليك من فلان بن فلان (فلان بن فلاں کی جگہ اس کا اور اس کے والد کا نام لے)

پھر دائیں جانب تقریباً ایک ہاتھ ہٹ کر (جالی میں دوسرے سوراخ کے سامنے) حضرت صدیق اکبر کی خدمت میں سلام عرض کرے:۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَااَبَابَكْر، جَزَاكَ اللّٰهُ عَنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْراً

پھر ایک ہاتھ آگے بڑھ کر (جالی میں تیسرے سوراخ کے سامنے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام پیش کرے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَاعُمَر، جَزَاكَ اللّٰهُ عَنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْراً

پھر دوبارہ آپ ﷺ کے قبر اطہر کی طرف آکر اپنے لئے آپ ﷺ کا وسیلہ چاہے، اور اللہ کے حضور آپ ﷺ کی شفاعت و سفارش چاہے، پھر قبلہ رو ہو کر اپنے اور امتِ مسلمہ کے لئے مناسب دعائیں کرے۔ (قبلہ رو ہونے میں پشت آپ کی طرف نہ ہو)

جب مدینہ منورہ سے روانگی کا ارادہ ہو تو مسجد میں الوداعی دو رکعت ادا کرے اور حسبِ سابق قبرِ اطہر پر جا کر درود و سلام پیش کرے، اور دارین کی سلامتی و عافیت کے لئے دعا کرے۔ اور بار بار یہ بابرکت موقع نصیب ہونے کی دعا کرے۔ وہاں سے روانہ ہو تو عادت کے مطابق آگے کی طرف چلے۔ عوام کی طرح پیچھے کی طرف چلنے کی ضرورت نہیں۔

مدینہ منورہ جانے والا مسجد نبوی کی زیارت، اس میں نماز اور قبر اطہر کی زیارت کی نیت کرے۔ مدینہ میں داخل ہونے کے بعد واپسی تک آپ ﷺ کی تعظیم اور ہیبت کا استحضار رہے۔

ہر روز آپ ﷺ کی زیارت کے بعد بقیع کی زیارت کیلئے جائے، بالخصوص جمعہ کے دن، وہاں پہنچ کر یوں سلام کرے" اَلسَّلَامُ عَلَيْكُم دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ وَاِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَهْلِ بَقِيْعِ الْغُرْقَدِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلَهُمْ " احادیث میں بقیع کے قبروں کی اور ان کی زیارت کی فضیلت وارد ہے۔

شہداء احد کی قبروں کی زیارت مستحب ہے، جمعرات کے دن افضل ہے۔

مسجد قباء کی زیارت تقرب اور نماز کی نیت سے مؤکدہ مستحبات میں سے ہے، ترمذی وغیرہ کی صحیح روایت میں مسجد قباء میں نماز کو عمرہ کی طرح قرار دیا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ پیدل اور سوار مسجد قباء تشریف لے جاتے، اور اس میں دو رکعت ادا کرتے، ایک صحیح روایت میں ہے کہ آپ ہر سنیچر وہاں تشریف لے جاتے۔

سفر سے واپسی کے آداب : (۱) آپ ﷺ حج یا عمرہ سے لوٹتے تو ہر اونچائی پر تین مرتبہ تکبیر کہتے، پھر یہ پڑھتے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ ۔ آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَائِحُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ، صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَ هَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ " (بخاری و مسلم)

(۲) وطن سے قریب پہنچے تو کسی کو آگے روانہ کر کے پہلے ہی خبر دینا سنت ہے، تاکہ اچانک گھر نہ پہنچے۔ (اگر فون وغیرہ کا انتظام ہو

تو اس سے اطلاع کافی ہے۔)

(۳) (بلا اطلاع کے اچانک) رات میں گھر نہ آئے، صبح یا شام کے وقت آئے۔

(۴) بستی میں پہنچنے پر پہلے مسجد جا کر دو رکعت ادا کرنا سنت ہے، پھر جب گھر پہنچے تو گھر میں بھی دو رکعت پڑھ کر دعا کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے۔

(۵) حاجی کی خدمت میں ملاقات وسلام کے لئے آنے والا اسے یوں دعا دے" قَبَّلَ اللّٰهُ حَجَّكَ واغْفِرْ ذَنْبِكَ وَ اخْلَفَ نَفَقَتَكَ "(اللہ آپ کا حج قبول کرے، اور گناہ معاف کرے اور خرچ کا بدلہ دے)

(۶) آپ ﷺ نے فرمایا ہے" اے اللہ! حاجی کی اور حاجی جس کے حق میں استغفار کرے اس کی مغفرت فرما" (حاکم)

(۷) آپ ﷺ سفر سے واپسی میں گھر میں داخل ہوتے تو یہ پڑھتے تَوْبًا تَوْبًا لِرَبِّنَا اَوْ بًالَا يُغَادِرُ حَوبًا ۔(یعنی ایسی توبہ اور اللہ کی طرف رجوع کا سوال جس کے بعد کوئی گناہ باقی نہ رہے)

(۸) حج سے واپسی کے بعد دینداری اور عبادت ونیکیوں میں ماضی کے مقابلہ میں اضافہ ہو، کہ یہ حج کے قبولیت کی علامت ہے، عبادات کا سلسلہ ہمیشہ بڑھتا رہے۔

(۹) کسی بھی سفر سے واپسی پر اپنے گھر والوں کے لئے ہدیہ لائے (چاہے تو مختصر سفر ہو)

(۱۰) حاجی کو مستحب ہے کہ دوسروں کی مغفرت کی دعا کرے۔ اگر چہ وہ مطالبہ نہ کرے، دوسروں کو حاجی سے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا مستحب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب حاجی سے ملاقات کرو تو سلام ومصافحہ کرو اور اپنے حق میں دعا کی درخواست کرو، کہ اس کے گناہ بخشے گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ حاجی کے اپنے گھر میں داخل ہونے سے قبل ہی درخواست کرے۔

(۱۱) مسافر کو گھر لوٹنے پر دعوت کرنا مستحب ہے۔ (اسے نَقِیعَہ کہتے ہیں) بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے لوٹنے پر دوست واحباب دعوت کریں۔

حج و عمرہ کے ارکان اور ان کی ادائیگی کے طریقے

حج کے ارکان : حج کے ارکان چھ ہیں۔

۱) **احرام :** یعنی حج میں داخل ہونے کی نیت کرنا کیونکہ مشہور حدیث ہے" اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔

۲) **وقوفِ عرفہ :**

۳) **طوافِ افاضہ:**

۴) **سعی**۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔" اے لوگو! سعی کرو۔ کیونکہ سعی تم پر لکھی گئی ہے (یعنی فرض کی گئی ہے) (دار قطنی باسناد حسن کما فی المجموع)

۵) **حلق یا تقصیر** (سر مونڈھنا یا بال کٹوانا) کیونکہ تحلل اس پر موقوف ہے اور طواف کی طرح اس کی بھی دم سے تلافی نہیں ہوتی۔ (وقوف اور طواف کی دلیل گذر چکی)

۶) **اکثر میں ترتیب :** احرام سب پر مقدم ہو، وقوف عرفہ، طوافِ افاضہ اور حلق یا تقصیر پر مقدم ہو۔ اگر طوافِ قدوم کے بعد سعی نہ کی ہو تو اب سعی طوافِ افاضہ کے بعد انجام دے۔ یہی ترتیب آپ ﷺ کے قول وفعل سے سامنے آتی ہے۔

کسی رکن کا تدارک اور تلافی دم سے نہ ہوگی۔

حج کے واجبات : (۱) میقات سے احرام باندھنا (۲) یوم النحر اور ایام تشریق کی رمی (۳) مزدلفہ کی شب باشی (۴) ایام تشریق میں منی کی شب باشی (۵) محرماتِ احرام سے پرہیز کرنا۔ طواف وداع بھی واجب ہے جیسا کہ گذرا۔ لیکن وہ مستقل واجب ہے، اس کا حج وعمرہ کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔

مذکورہ واجبات بھی ضروری ہیں۔ لیکن ان کے ترک سے دم کے ذریعہ ان کی تلافی ہو جائے گی اور حج صحیح ہو جائے گا (بخلاف رکن کے) واجبات کو ابعاض (واحد بعض) بھی کہتے ہیں۔

ارکان و واجبات کے علاوہ جو بھی تفصیلات گذریں، وہ سب سنت اور ہیئت (جمع سنن وہیئات) ہے۔ مثلاً طواف قدوم، اذکار و دعا، حجر اسود کا استلام، رمل، اضطباع وغیرہ۔

عمرہ کے ارکان : وقوف عرفہ کے علاوہ بقیہ عمرہ کے بھی ارکان ہیں، یعنی عمرہ میں پانچ ارکان ہیں (۱) احرام، عمرہ کی نیت (۲) طواف (۳) سعی (۴) حلق یا تقصیر (۵) ترتیب۔ عمرہ میں مطلقاً ترتیب ضروری ہے۔

حج و عمرہ کی ادائیگی کی مختلف صورتیں

حدیث : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ ''ہم حجۃ الوداع میں آپ ﷺ کی معیت میں روانہ ہوئے، بعضوں نے حج کا احرام باندھا، تو بعضوں نے عمرہ کا، اور بعضوں نے حج وعمرہ دونوں کا'' (متفق علیہ)

حج وعمرہ کی ادائیگی کی تین صورتیں ہیں۔

۱) **اِفْرَاد :** پہلے صرف حج کرے، حج سے فارغ ہونے کے بعد عمرہ ادا کرے (اگر عمرہ نہ کرے تب بھی اسے اِفراد کہیں گے)

۲) **تَمَتُّع :** افراد کے برعکس، یعنی پہلے عمرہ کرے، (گرچہ اپنی بستی کی میقات نہ ہو)، پھر حج کرے، خواہ حج کا احرام مکہ ہی سے باندھے، یا عمرہ کے میقات سے، یا اس کے مثل مسافت سے، یا اس سے قریب سے، اس طریقہ سے حج وعمرہ انجام دینے والا مُتَمَتِّع کہلاتا ہے، کیونکہ اسے حج وعمرہ کے درمیان محرماتِ احرام کے تمتع (فائدہ اٹھانے) کا موقع ملا، یا دوبارہ میقات تک نہ لوٹنے کا فائدہ حاصل ہوا۔

۳) **قِرَان :** حج وعمرہ دونوں احرام حج کے مہینوں میں بہ یک وقت (ایک ساتھ) باندھنا، یا پہلے عمرہ کا احرام باندھے، (حج کے مہینے میں ہو یا قبل) پھر حج کے مہینے میں اسی پر حج کا احرام بھی داخل کرے، (یعنی حج کی بھی نیت کرلے) جبکہ عمرہ کا طواف ابھی شروع نہ کیا ہو، ان دونوں صورتوں میں حج وعمرہ کی نیت کے بعد صرف حج کے اعمال ادا کرے، اور اسی سے حج وعمرہ دونوں حاصل ہوگا (عمرہ کی صرف نیت کافی ہے، عمرہ کے اعمال کو اس صورت میں مستقل ادا کرنے کی ضرورت نہیں)۔

حدیث : (۱) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ''میں نے آپ ﷺ کو حج وعمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے سنا'' (متفق علیہ)

(۲) حضرت عائشہؓ نے حجۃ الوداع میں عمرہ کا احرام باندھا۔ لیکن ان کو حیض شروع ہوا تو آپ ﷺ نے حج کے احرام کا اور اعمال حج کی ادائیگی کا (بجز طواف کے) حکم دیا، اور فرمایا کہ (پاکی کے بعد) تمہارا طواف حج وعمرہ دونوں کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ (متفق علیہ)

عمرہ کا طواف شروع کرنے کے بعد اس کے ساتھ حج کی نیت ملانا صحیح نہیں۔ کیونکہ عمرہ کا اصل مقصود اور افضل عمل شروع ہو چکا، تو

اب یہ (احرام) صرف عمرہ ہی کا ہوگا، اب کسی اور طرف پھیرنے سے درست نہیں۔
صرف حج کا احرام باندھنے کے بعد اس کے ساتھ عمرہ کو شامل کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ اس صورت میں مزید کسی عمل کا فائدہ نہ ہوگا، بخلاف برعکس صورت کے کہ اس میں وقوف، رمی اور شب باشی کا اضافہ ہوگا۔
مذکورہ تینوں صورتوں میں سے اِفراد افضل ہے، جبکہ اسی سال (یعنی ذوالحجہ کے اختتام تک) عمرہ بھی کرلے، اگر اس سال عمرہ نہ کرے تو بقیہ دونوں صورتیں اس سے افضل ہوں گی، کیونکہ عمرہ کو اس سال سے مؤخر کرنا مکروہ ہے، پھر تمتع قران کے مقابلہ میں افضل ہے۔
افضلیت کی ترتیب میں علماء کرام کا اختلاف ہے، جس کی بنیاد حجۃ الوداع میں آپ ﷺ کے احرام کی نوعیت میں راویوں کا اختلاف ہے۔
صحیحین میں آپ ﷺ کے احرام کے متعلق افراد اور تمتع اور قران تینوں ہی سے روایتیں ہیں۔ کثرتِ روات کی وجہ سے اول کو ترجیح دی گئی۔ مزید برآں حضرت جابر نے جو قدیم صحابی ہیں، مناسک کی تفصیل اور ضبط وعنایت میں خصوصی توجہ دی ہے، (اور ان سے افراد ہی مروی ہے) اور آپ ﷺ نے ابتداء افراد ہی کو اختیار فرمایا، بعد میں اس پر عمرہ کا داخل کر کے قارن ہوئے، تاکہ اس عظیم مجمع میں جاہلیت کے اس تصور کی تردید ہو جائے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ بدترین برائی ہے، گرچہ قبل بھی اس کی تردید ہو چکی تھی (البتہ آئندہ کسی کے لئے حج عمرہ کا احرام داخل کرنے کی اجازت نہیں جیسا کہ گذر چکا) تمتع میں چونکہ حج وعمرہ کے اعمال اکمل (اور مستقل) ادا ہوتے ہیں (بجز اشتراک میقات کے)، بخلاف قران کے، اس لئے تمتع کو قران سے افضل قرار دیا گیا۔

آیت: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ. ذَٰلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرۃ۔۱۹۶)

ترجمہ: جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہوا (یعنی ایام حج میں عمرہ بھی کیا ہو) تو فقط اس کو ضروری ہے کہ جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو اس (اس کے ذمہ بجائے قربانی کے) تین دن کے روزے ہیں۔ (ایام) حج میں (کہ آخر ان ایام کا نویں تاریخ ذی الحجہ کی ہے) اور سات (دن کے) ہیں جبکہ تم حج سے لوٹو، یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے، یہ اس شخص کے لئے ہیں، جس کے اہل (وعیال مسجد حرام کے قرب (ونواح) میں نہ رہتے ہوں۔ (یعنی قریب ہی کا وطن دار نہ ہو)۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن کی جانب سے یوم النحر میں گائے ذبح فرمائی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ سب حج قران ادا کر رہی تھیں۔
لہٰذا مذکورہ آیت وحدیث کی روشنی میں متمتع اور قارن (تمتع اور قران کے طریقے پر حج کرنے والے) پر دم لازم ہے۔ جبکہ حرم کے حاضرین میں سے نہ ہو۔ اور متمتع نے اپنے حج کے سال ہی حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کیا ہو، اور حج کے احرام کیلئے کسی میقات تک (گرچہ وہ میقات عمرہ کے بہ نسبت مکہ سے قریب ہو) یا میقات عمرہ کی مسافت تک نہ گیا ہو۔ اگر کسی میقات تک یا عمرہ کے میقات کے مسافت کے بقدر لوٹ کر حج کا احرام باندھے یا مکہ سے احرام باندھ کر میقات تک جائے، یا قارن عرفہ سے قبل مکہ میں داخل ہو پھر دوبارہ میقات تک لوٹے تو دم لازم نہ ہوگا۔ حاضرینِ حرم سے مراد وہ حضرات ہیں، جن کا مکان حرمِ مکہ سے دو مرحلہ (مسافتِ قصر) کے اندر ہو۔ حاضرینِ حرم کو تمتع یا قران کی صورت میں دم کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کو ترک میقات (یعنی میقات عامہ) کا فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

آفاقی شخص (میقات کے حدود سے باہر کہیں بھی بسنے والا) میقات سے آگے بڑھ جائے، (گرچہ حج وعمرہ کا ارادہ نہ ہو) پھر ارادہ ہوجائے، اور مکہ میں داخل ہونے سے قبل یا بعد عمرہ کا احرام باندھے، تو اس پر دم تمتع لازم ہے، کیونکہ یہ اس کا وطن نہیں، اسلئے حاضرینِ حرم میں شمار نہ ہوگا۔

اگر عمرہ حج کے مہینوں سے قبل ادا کرے، یا حج کے مہینوں میں ادا کرے اور حج آئندہ سال ادا کرے، یا عمرہ کا احرام حج کے مہینوں سے قبل باندھے لیکن اعمال حج کے مہینوں میں ادا کرے، پھر حج ادا کرے تو ان صورتوں میں دم لازم نہیں۔

دم (ھدی) کا وقت: متمتع حج کا احرام باندھے تو دم واجب ہوگا۔ عمرہ سے فارغ ہو کر حج کے احرام سے قبل دم دینا جائز ہے۔ اس دم کے لئے وقت کی تعیین نہیں ہے، لیکن آپ ﷺ کی اتباع میں یوم النحر میں ذبح کرنا افضل ہے (ائمہ ثلاثہ نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ ان کے اختلاف سے بھی بچ نکلے گا)

روزے: کوئی شخص حساً یا شرعاً ادائیگی کے وقت حرم میں دم سے عاجز ہو، تو (یعنی ہدی کا جانور نہ ملے، عام قیمت سے زیادہ پر ملے، یا موجودہ رقم اپنے خرچ یا قرض کی ادائیگی کے لئے ضروری ہو، یا رقم بستی میں ہو پاس نہ ہو، یا غریب ہو کہ ہدی کا جانور خرید ہی نہیں سکتا تو ان تمام صورتوں میں) اسکے عوض روزے رکھنا واجب ہے، تین روزے یوم النحر سے قبل رکھنا واجب ہے، سنت ہے کہ عرفہ سے قبل ہی ان تینوں روزوں سے فارغ ہوجائے، کیونکہ حاجی کیلئے عرفہ میں روزہ نہ رکھنا سنت ہے۔ یوم النحر (۱۰/ذی الحجہ) یا ایام تشریق (۱۱/ ۱۲/اور ۱۳) میں یہ روزے جائز نہیں، جیسا کہ روزہ کے باب میں گذر چکا۔ اسی طرح حج کے احرام سے قبل بھی یہ روزے نہیں رکھ سکتا، کیونکہ یہ بدنی عبادت ہے، لہٰذا اسے اپنے وقت سے پہلے ادا کرنا جائز نہیں (بخلاف دم کے کہ عمرہ کے بعد جائز ہے کیونکہ وہ مالی عبادت ہے) لہٰذا ۶/ ذی الحجہ سے قبل ہی احرام باندھنا بہتر ہے، تا کہ ۶، ۷ اور ۸ کو روزہ رکھ سکے۔

مذکورہ شخص مزید سات روزے اپنے وطن میں رکھے، راستہ میں یا مکہ مکرمہ میں ان روزوں کا رکھنا کافی نہیں، اگر کوئی مکہ کو ہی وطن بنالے، (وہیں بس جائے) گرچہ فراغت حج کے بعد ہو، تو یہ روزے مکہ مکرمہ میں ہی ادا کرے (کیونکہ یہ اس کا وطن بن چکا) اگر مذکورہ تین روزے ایام حج میں فوت ہوجائیں، تو ان کی قضا اور بقیہ سات روزوں میں بقدر ادا فصل اور تفریق لازم ہے۔ (مسلسل دو روزے نہیں رکھ سکتا) لہٰذا چار دن اور گھر لوٹنے کے لئے عادتاً ممکنہ ایام کے بقدر فاصلہ ضروری ہے۔ (مثلاً کسی کو مکہ سے اپنے گھر پہنچنے میں دو دن لگتے ہوں، تین روزے کی قضا کے بعد درمیان میں کم از کم ۶/دن کا فاصلہ کر کے پھر بقیہ سات روزے رکھے) اگر مکہ ہی کو وطن بنالے، تو صرف چار دن کا فاصلہ کافی ہے۔

تین اور سات روزوں کو ادا و قضا کی شکل میں تتابع (تسلسل) کے ساتھ انجام دینا سنت ہے، جلد سے اس عبادت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے اور اسے (یعنی تسلسل کو) واجب قرار دینے والے علماء کے اختلاف سے بچنے کی خاطر اسے سنت قرار دیا گیا۔

محرمات احرام (احرام کی وجہ سے حرام امور)

احرام میں کئی امور حرام ہیں، حکمت یہ ہے کہ ان میں ایک طرح کا تَــرَفُّـــہ (آرام، آسودہ حالی وخوش حالی) ہے، اور مُحرِم تو حدیث کی رو سے پراگندہ حال وبال اور غبار آلود ہوتا ہے، لہٰذا ترفہ اسے مناسب نہیں۔ مزید اصل مقصد یہ ہے کہ اس ادا کے ذریعہ میدان حشر میں بالکل تہی دست بارگاہِ الٰہی میں حاضری کی یاد تازہ ہو، اور سراپا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے، کسی اور طرف توجہ نہ ہو، حاصل یہ کہ حج

کا اصل مقصود ظاہری تجرد ہے تا کہ اس کے ذریعہ باطنی تجرد حاصل ہو جائے اور روزہ میں اس کے برعکس معاملہ ہے۔

حدیث : (۱) ''مُحرم قمیص نہ پہنے، اور نہ عمامہ، اور نہ پاجامہ، اور نہ بُرانس اور نہ کوئی ایسا کپڑا پہنے جس میں زعفران یا ورس لگی ہو'' (صحیحین) بخاری میں یہ اضافہ بھی ہے۔ ''عورت نقاب سے چہرہ نہ چھپائے اور نہ دستانے پہنے۔'' برانس یہ بُرنُس کی جمع ہے، جولمبی ٹوپی کو کہتے ہیں اور ورس ایک زرد پودہ ہے، جسے رنگنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۲) آپ ﷺ نے قمیص اور قبا اور پاجامہ اور موزہ پہننے سے منع فرمایا، البتہ چپل نہ ہو (تو موزے کی گنجائش ہے)۔ (بیہقی باسناد صحیح) احرام کی وجہ سے (یعنی حج یا عمرہ کی نیت کر لینے سے) درج ذیل امور حرام ہیں

۱) مرد کو سر کا کچھ حصہ چھپانا، (جبکہ ایسی چیز سے چھپائے جسے عام طور پر چھپانے میں شمار کرتے ہوں) مثلاً ٹوپی پہننا، رومال رکھنا، پٹی باندھنا، عمامہ (دستار) باندھنا وغیرہ۔

جو ساتر شمار نہ ہو مثلاً سایہ کے لئے چھتری وغیرہ استعمال کرنا (گرچہ وہ سر سے چھو جائے)، تکیہ یا عمامہ پر سر رکھنا، ٹوکری، صندوق یا کوئی بوجھ سر پر اٹھانا (لیکن یہ مکروہ ہے)، پانی میں غوطہ لگانا یا اپنا یا کسی اور کا ہاتھ سر پر رکھنا حرام نہیں۔ حدیث میں ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی کے وقت ایک صحابی آپ ﷺ کے مبارک سر پر کپڑا تان کر سایہ کر رہے تھے۔ (مسلم ، نسائی ، ابوداود)

۲) مرد کا کسی محیط (پورے عضو کو گھیرنے والا) کو عادت کے مطابق پہننا، سلائی کے ذریعہ محیط ہو جیسے قمیص یا بننے کی وجہ سے (جیسے سوئٹر یا بنیان وغیرہ) یا بٹنے یا باندھنے کی وجہ سے محیط ہو۔ مذکورہ تفصیل کے مطابق محیط نہ ہو تو پہن سکتا ہے، جیسے تہبند (لنگ جبکہ آپس میں سلی نہ ہو) اور چادر۔

تہبند کو گرہ لگانا یا اس پر دھاگہ (پٹہ وغیرہ) باندھنا، تا کہ لٹکا رہے یا اس میں نیفہ جیسا بنا کر اس میں ازار بند ڈال کر باندھنا اور چادر کے کنارے کو تہبند کے اندر داخل کرنا (پھنسانا) جائز ہے، (لیکن آخری دو صورتیں مکروہ ہیں)

سوجے سے چادر کے دو کناروں کو جوڑنا، دونوں کناروں کو سلائی سے جوڑنا یا کاج وبٹن کے ذریعہ جوڑنا جائز نہیں (یہ حکم چادر یعنی اوپری حصے میں اوڑھنے کے کپڑے کا ہے۔) تہبند میں قریب قریب کاج بٹن لگا کر ایک دوسرے میں داخل کر کے جوڑنا جائز نہیں ہے، اگر دور دور ہوں تو بعض علماء نے اجازت دی ہے۔

۳) احرام میں عورت پر دستانے پہننا یا اپنا چہرہ کسی ساتر سے چھپانا حرام ہے، آزاد عورت کو چہرہ کا کنارہ اتنا چھپانا لازم ہے جس کے ذریعہ سر مکمل نہ چھپ سکے۔ عورت کو سر وغیرہ میں محیط کپڑا پہننا جائز ہے۔ کسی لکڑی وغیرہ کے سہارے چہرہ پر کپڑا اس طرح لٹکانا کہ چہرہ کو مس نہ ہو جائے۔ حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ لوگ احرام میں ہمارے پاس سے گذرتے، تو ہم چادر سر سے چہرے پر لٹکا لیتے، جب آگے بڑھ جاتے تو چہرہ کھول دیتے (ابوداود) بلا اختیار یہ کپڑا چہرہ سے مس ہوا اور فوراً ہٹائے تو فدیہ نہیں ہے۔ اگر عمداً مس کرے، یا اتفاقاً مس ہونے کے بعد اسے نہ ہٹائے تو فدیہ واجب ہے، عورت کو پیروں میں موزے پہننا یا آستین کو ہتھیلیوں تک لمبا کر کے اس میں ہتھیلیوں کو چھپانا یا کسی کپڑے کو ہتھیلی پر لپیٹنا جائز ہے، لیکن عورت کو ہتھیلی کھلی رکھنا مستحب ہے۔

نابالغ کا حکم : نابالغ بچہ بھی احرام کی پابندیوں میں بالغ کی طرح ہے، ولی کو لازم ہے کہ بچوں کو ان محرمات سے روکے۔ خلاف ورزی کی صورت میں ولی گنہگار ہوگا۔ اگر بچہ ممیز ہو تو فدیہ ولی پر واجب ہوگا۔ لیکن کسی دوسرے نے بچہ سے یہ کروایا مثلاً اسے خوشبو لگائی، تیل لگایا یا سلا کپڑا پہنایا تو اس شخص پر فدیہ لازم ہوگا۔ غیر ممیز بچہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے فدیہ لازم نہ ہوگا۔

کسی مجبوری یا حاجت کی وجہ سے سر چھپانے کی اور دیگر ممنوعہ امور کی گنجائش ملے گی۔ مثلاً محیط کے علاوہ دوسرا کپڑا میسر نہ ہو، معالجہ کے لئے سر پر پٹی وغیرہ باندھنے کی ضرورت ہو، یا گرمی یا سردی کی پریشانی کی وجہ سے مذکورہ خلاف ورزی ہو، چادر نہ ہونے کی وجہ سے قمیص نہیں پہن سکتا بلکہ اسے چادر کی طرح لپیٹ لے۔ البتہ بلا حاجت مذکورہ امور کی وجہ سے فدیہ کی طرح بصورت حاجت بھی فدیہ لازم ہوگا۔ لیکن غیر محیط کپڑا نہ ہونے کی وجہ سے پاجامہ پہنے (جیسے بطور تہبند نہیں لپیٹ سکتا) یا چپل نہ ہونے کی وجہ سے موزے ٹخنوں سے نیچے کاٹ کر پہنے تو فدیہ لازم نہ ہوگا چپل کی عدم موجودگی میں مذکورہ طریقہ پر موزہ صرف حاجت کی شکل میں پہن سکتا ہے۔

احرام میں وہ چپل جائز ہے جو پورے قدم کا احاطہ نہ کرے یا تمام انگلیوں کو نہ چھپائے جیسے سلیپر۔

۴) **خوشبو:** احرام میں ہر کسی کو اپنے بدن یا کپڑے میں یا کھانے پینے اور چپل وغیرہ میں ایسی اشیاء کا استعمال حرام ہے، جس سے خوشبو مقصود ہوتی ہو۔ جیسے مشک، عود، کافور، صندل زعفران اور عطر وغیرہ، جن اشیاء سے خوشبو مقصود نہ ہو، بھلے اس میں خوشبو ہو، جیسے خوشبودار پھل، سیب، لیمو وغیرہ، وہ حرام نہیں، اسی طرح دار چینی، لونگ، مصالحہ، سونف اور مہندی وغیرہ بھی حرام نہیں۔ خوشبودار سرمہ کا استعمال حرام ہے، جن کھانے کی اشیاء میں خوشبو یا اس کا مزہ ظاہر ہو (بھلے نظر نہ آئے) اسے کھانا حرام ہے، (حلوہ کے بعض اقسام میں زعفران وغیرہ خوشبو کے اثرات ہوتے ہیں۔ احرام میں اسے کھانا حرام ہے) خوشبو اس چیز میں بالکل گھل کر ختم ہو جائے، یا صرف رنگ باقی ہو تو استعمال حرام نہیں۔ خوشبو دوسری کسی چیز میں بالکل مغلوب ہو جائے، مثلاً معمولی گلاب پانی کافی پانی میں گھل جائے اور اس کا کوئی مزہ یا خوشبو محسوس نہ ہو، تو اس کا استعمال حرام نہیں۔

عادت کے مطابق کپڑے یا بدن کے ظاہر یا باطن میں خوشبو کا استعمال حرام ہے۔ عطر کی دوکان میں بیٹھنا یا ایسی جگہ جہاں خوشبو کی دھونی دی جا رہی ہو بیٹھنا حرام نہیں، اگر خوشبو سونگھنے کی نیت سے بیٹھا ہے، تو مکروہ ہے ورنہ مکروہ نہیں۔

اگر خوشبو کسی چیز میں بندھی ہوئی، یا عطر کی بالکل بند بوتل، یا کسی برتن میں گلاب اٹھائے تو یہ جائز ہے۔ خوشبودار بستر یا جگہ میں بیٹھے یا لیٹے، اور اس کا بدن یا کپڑا اسے چھوئے، تو گنہگار ہوگا اور فدیہ لازم ہوگا۔ اگر کوئی کپڑا اچھا کر بیٹھے یا لیٹے تو فدیہ لازم نہیں، لیکن کپڑا باریک (پتلا) ہو تو مکروہ ہے۔ خوشبودار صابون کا استعمال حرام ہے۔ (الفقہ المنھجی۔ ۲/۱۳۴)

قصداً خوشبو کا استعمال حرام، اور فدیہ کے وجوب کا باعث ہے، کسی کو اپنے احرام کا خیال نہ ہو، یا خوشبو کی حرمت کا علم نہ ہو، یا کسی نے زبردستی استعمال کروایا، تو گنہگار نہ ہوگا اور نہ فدیہ لازم ہوگا خوشبو کی حرمت کا علم ہو، لیکن وجوب فدیہ کا علم نہ ہو، تو فدیہ لازم ہے۔ خوشبو کی حرمت کا تو علم ہے، لیکن جو چیز استعمال کر رہا ہے، اس کا خوشبودار ہونا معلوم نہیں۔ تو گناہ اور فدیہ لازم نہیں۔

حرمت کی صورتوں میں بدن یا کپڑے پر خوشبو لگے تو گنہگار ہوگا اور فدیہ لازم ہوگا اور فوراً اس کا ازالہ کرے۔ اگر تاخیر کرے گا تو مزید گنہگار ہوگا، لیکن فدیہ میں اضافہ نہ ہوگا۔ جن صورتوں میں حرام نہیں اور فدیہ لازم نہیں، یعنی بھول کر یا لاعلمی یا زبردستی کی وجہ سے یا ہوا میں آکر خوشبو لگے تو ان صورتوں میں بھی فوراً اس کا ازالہ واجب ہے، ازالہ کے امکان کے باوجود تاخیر کرے تو گناہ اور فدیہ لازم ہے، خشک خوشبو ہے تو اسے فوراً جھٹک کے دور کر دے۔ ورنہ دھو کر یا کسی اور طریقے سے اس کا ازالہ کرے۔ کسی اور کے ذریعہ دھلا کر دور کرنا بہتر ہے، اگر خود بھی کرے تو حرج نہیں۔ کوئی اپاہج یا ہاتھ کٹے ہوئے کی وجہ سے ازالہ نہ کر سکے تو اس پر گناہ اور فدیہ نہیں، کیونکہ وہ معذور ہے۔

غسل: احرام میں غسل یا کر کپڑے دھونا مکروہ نہیں ہے، نہانے کے لئے خطمی یا بیری کے پتے کا استعمال حرام نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے میل کچیل دور کرنا مقصود ہوتا ہے، نہ کہ تزئین اور بالوں کو بڑھانا، لیکن اس کا استعمال خلاف اولیٰ ہے۔

حدیث : آپ ﷺ احرام میں اپنا سر دھوتے تھے۔ (متفق علیه)

۵) **تیل :** سر یا داڑھی کے بال میں تیل گھی وغیرہ لگانا حرام ہے۔ (خوشبودار ہو یا نہ ہو) کیونکہ حدیث کی رو سے مُحرم غبار آلود اور پراگندہ حال ہوتا ہے اور تیل کے استعمال میں اختیارِ زینت ہے، جو اس کے منافی ہے۔ تیل استعمال کیا تو فدیہ لازم ہے۔ چہرہ کے بقیہ بال مثلاً مسیں (مونچھ)، بھنویں، ریش بچہ کا بھی یہی حکم ہے۔ لہٰذا اس بات پر توجہ دینی چاہئے کہ گوشت وغیرہ کھاتے وقت مونچھ یا ریش بچہ پر تیل و چکناہٹ نہ لگے۔ کیونکہ عمداً مسئلہ جانتے ہوئے یہ حرام ہے اور اس سے فدیہ لازم ہوگا۔ پیشانی یا رخسار کے بال، گنجے کے سر میں گنج کی جگہ، امرد کی ٹھوڑی پر اور بدن کے دیگر حصوں پر تیل لگانا جبکہ خوشبودار نہ ہو جائز ہے۔ کیونکہ اس سے تزئین مقصود نہیں ہوتی۔ حضرت ابن عمر کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ احرام میں غیر خوشبودار تیل استعمال فرماتے (ترمذی) کسی کا سر منڈا ہو، تو اس پر تیل لگانا جائز نہیں، کیونکہ یہ آئندہ نکلنے والے کی تحسین کا باعث ہوگا۔

۶) **ناخن اور بال تراشنا :** احرام میں بدن کے کسی بھی حصہ کا بال یا ہاتھ پیر کے ناخن تراشنا حرام ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے" وَلَا تَحْلِقُوْا رُؤُسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (سورہ بقرہ ۱۹۶) اور اپنے سروں کو (احرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ قربانی (کا جانور اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے۔"

آیت میں مذکور پر بقیہ کو قیاس کیا گیا ہے کہ دونوں میں ترفُّہ ہے۔ حاجت کی وجہ سے مثلاً جُو، کی کثرت یا زخم کے علاج کیلئے اس کی اجازت ہوگی، لیکن فدیہ لازم ہوگا۔ اگر مجبوری ہو مثلاً آنکھ میں بال اُگ آئے جس سے تکلیف ہو یا بال آنکھ کو چھپا دے یا ناخن ٹوٹ جائے اور اس سے تکلیف کی وجہ سے صرف اتنا جدا کر دیا تو فدیہ بھی لازم نہیں، جیسا کہ بے ہوش، پاگل اور غیر ممیز بچہ پر ان امور کی وجہ سے فدیہ نہیں۔ اگر چمڑی جدا کرے جس کی وجہ سے اس پر کے بال بھی جدا ہوئے یا ناخن سمیت پورہ کاٹ ڈالے تو اس سے فدیہ لازم نہیں، البتہ سنت ہے۔

بال کو حلق، تقصیر، اکھاڑنا یا جلانا کسی بھی طرح دور کرنا حرام ہے، ایک بال بلکہ بعض حصہ بھی دور کرنا حرام ہے۔ ناخن کا بھی یہی حکم ہے، سر یا داڑھی میں کنگھی کرنے سے بال جھڑیں تو کنگھی کرنا حرام ہے۔ ورنہ مکروہ۔

مُحرم کو غیر مُحرم (حلال) کے بالوں کا ازالہ جائز ہے، اور حلال شخص کو مُحرم کے بالوں کا ازالہ حرام ہے۔

فدیہ : ایک بال یا ایک ناخن یا ایک کا کچھ حصہ زائل کرے تو ایک مد فدیہ دے، دو بال یا دو ناخن میں دو مد دے، روزہ اختیار کرے تو ایک بال یا ایک ناخن میں ایک دن کا روزہ اور دو میں دو دن کا روزہ رکھے۔ اگر تین یا زائد بال یا ناخن متصلاً جدا کرے، (یعنی عرفاً ایک ہی وقت اور جگہ میں) تو مکمل فدیہ لازم ہے۔

آیت : فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضاً اَوْ بِهٖ اَذًى مِنْ رَاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ " (سورہ بقرہ۔ ۱۹۶) "البتہ اگر کوئی تم میں سے (کچھ) بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤں وغیرہ) کی تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑ جاوے) تو (اسکو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے۔ (خواہ تین) روزے سے یا خیرات دینے سے یا (اقلِ درجہ ایک بکری) ذبح کر دینے سے۔"

حدیث : آپ ﷺ نے مقامِ حدیبیہ میں حضرت کعب بن عجرہؓ کو دیکھا کہ جُو ان کے چہرے پر گرے جا رہے تھے، تو ان کو سر مونڈنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ایک فَرَق (تین صاع) اناج چھ مساکین کو دو، یا تین دن روزے رکھو، یا قربانی کرو (بکری ذبح کرو) (متفق علیه)

جب عذر میں فدیہ کا حکم ہے تو بلا عذر تو بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا۔ سر پر ناخن کو بھی قیاس کیا گیا سر اور بدن کے سارے بال ایک ہی وقت میں صاف کرے تو ایک ہی فدیہ لازم ہے، کسی دوسرے نے مُحرم کے بال مونڈے، اور یہ باوجود قدرت کے اسے نہ روکے تو فدیہ اسی مُحرم پر لازم ہے۔

۷) **صحبت :** احرام میں جماع (صحبت) حرام ہے، جبکہ عاقل ہو، مسئلہ معلوم ہو، احرام یاد ہو اور بلا جبر ہو،

آیت: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (سورہ بقرہ ۱۹۷) (سو جو شخص ان ایام میں اپنے ذمہ حج مقرر کرے، حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے اور نہ کسی قسم کا نزاع (و تکرار) زیبا ہے، (بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے)۔

صحبت کے مقدمات (مثلاً بوس و کنار) بھی شہوت کے ساتھ حرام ہیں، اور اس کی وجہ سے بھی دم لازم ہے، لیکن اس کے بعد صحبت کرلے، تو یہ دم ساقط ہوگا کیونکہ وہ جماع کے دم میں داخل ہو جائے گا۔ استمناء بھی حرام ہے اور انزال ہو جائے تو دم لازم ہے (ورنہ نہیں)۔

تحلل اول سے بھی پہلے صحبت کرنے سے حج فاسد ہوگا۔ دیگر محرمات کیوجہ سے، یا تحلل اولیٰ کے بعد تحلل ثانی سے قبل صحبت سے حج فاسد نہ ہوگا۔ عمرہ میں احرام کھلنے سے قبل صحبت کرنے سے عمرہ فاسد ہوگا۔ (چاہے تین بالوں میں سے آخری بال کے ازالہ سے قبل ہو) حج کے ساتھ عمرہ کی نیت ہو تو وہ صحت و فساد میں حج کے تابع ہے۔

حج یا عمرہ کو فاسد کرنے والی صحبت کی وجہ سے مرد پر ایک ایسے اونٹ کی قربانی لازم ہے، جس میں قربانی کے صفات و شرائط ہوں (حج و عمرہ فرض ہو یا نفل) امام مالک نے اسے مؤطا میں کئی صحابہ کرام سے نقل فرمایا ہے، اور ان کا کوئی مخالف بھی نہیں، اگر اونٹ سے عاجز ہو تو گائے (بیل) کی قربانی دے، اس سے بھی عاجز ہو تو سات بکریوں کی قربانی کرے۔ اس سے عاجز ہو تو اونٹ کی مکہ مکرمہ میں جو قیمت ہو، اس سے اناج خرید کر فقراء و مساکینِ حرم کو صدقہ کرے۔ اس سے بھی عاجز ہو تو ہر مُد اناج کی جگہ ایک روزہ رکھے۔ (مثلاً اونٹ کی قیمت میں ۱۰۰ مد اناج ملتا ہو تو ۱۰۰ روزہ رکھے) عورت بھی احرام میں ہو، اور اس گناہ میں شریک ہو، تب بھی اس پر کفارہ لازم نہیں۔

دیگر عبادات فاسد ہو جائیں، تو وہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن حج و عمرہ کی یہ خصوصیت ہے کہ فاسد ہونے کے باوجود اسے ترک کرنا اور احرام سے نکلنا جائز نہیں ہے، بلکہ آخر تک سارے اعمال انجام دینا لازم ہے، کیونکہ حج و عمرہ کے اتمام کے عموم میں فاسد بھی داخل ہے۔

مزید فوراً فاسد کردہ حج یا عمرہ کی قضا (اعادہ) بھی لازم ہے، چاہے فرض ہو یا نفل، کیونکہ نفل حج و عمرہ شروع کرنے کے بعد فرض کی طرح واجب الاتمام ہے۔ دیگر نوافل شروع کرنے سے لازم نہیں ہوتے۔ فاسد عمرہ مکمل کرکے دوبارہ فوراً قضا عمرہ انجام دے، اور حج آئندہ سال انجام دے، اعادہ فاسد کی طرف سے واقع ہوگا اور فاسد نہ ہوگا تو اس سے فریضہ اسلام یا نذر جو بھی مقصود تھا وہ اس اعادہ سے حاصل ہوگا۔ (یعنی کسی نے اپنے اسلامی فرض حج کو صحبت سے فاسد کیا، تو آئندہ سال اس کے اعادہ سے وہ فریضہ ادا ہو جائے گا) کوئی اعادہ میں پھر جماع کرے تو پھر اس کا کفارہ لازم ہوگا۔ لیکن اسکے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ اصل کا پھر اعادہ لازم ہے، اصل اور ادا میں میقات یا اس سے قبل جہاں سے احرام باندھا تھا وہیں سے اعادہ میں بھی احرام ضروری ہے، اعادہ میں دوسرا راستہ اختیار کیا تو ادا کے مَحلِ احرام کے بقدر مسافت کے احرام باندھے۔ لیکن ادا میں بغیر احرام کے میقات سے آگے بڑھا تھا تو بجائے مَحلِ احرام کے میقات سے مسافت کا اعتبار ہوگا۔ ادا میں جس وقت احرام باندھا تھا۔ اعادہ میں اسی وقت سے باندھنا ضروری نہیں ہے۔

۸) **شکار :** احرام میں خشکی کے ماکول وحشی جانور کا شکار اور اس سے تعرض حرام ہے۔

آیت: وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حُرُماً ۔(سورہ مائدہ ۹۶)

ترجمہ : اور تم پر جنگل (خشکی) کا شکار حرام ہوا، جب تک تم احرام میں رہو۔"

حدیث : (۱) حضرت صعب بن جثامہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں جنگلی گدھا بطور ہدیہ پیش کیا تو لوٹا دیا اور اعتذار فرمایا کہ" ہم نے محض احرام میں ہونے کی وجہ سے اسے لوٹایا ہے۔" (متفق علیہ)

(۲)" شکار کا گوشت احرام میں تم لوگوں کو حلال ہے، جبکہ خود شکار نہ کرو، یا تمہارے خاطر شکار نہ کیا جاوے۔" (ابوداود، ترمذی، نسائی ، ابن ماجہ)

(۳) مُحرم حملہ آور درندے (یعنی جو قتل یا زخمی کرتے ہوں جیسے شیر چیتا بھیڑ وغیرہ) کو قتل کرسکتا ہے۔ (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ) مسلم کی ایک روایت میں سانپ کے مارنے کا جواز اور ابوداود کی مرسل روایت میں بھیڑیئے کو مارنے کا جواز موجود ہے۔

جن جانوروں میں نفع ونقصان دونوں ہوں اُسے قتل کرنا نہ مسنون ہے نہ مکروہ، جیسے شکرہ (چرخ)، تتیندوا اور باز وغیرہ

جن جانداروں میں نفع ونقصان ظاہر نہ ہو، اسے مارنا مکروہ ہے، جیسے کیکڑا، گبریلا وغیرہ

نملِ سلیمانی، شہد کی مکھی، مینڈک، بندر، بلی، ہدہد اور بے ضرر کتے کو مارنا حرام ہے (احرام میں ہو یا بغیر احرام کے) سلیمانی چیونٹی کے علاوہ چھوٹی چیونٹی کو بغیر جلائے مارنا جائز ہے۔ اگر بغیر جلائے دفع نہ ہوں، تو جلانے کی گنجائش ہے۔

بحری شکار (یعنی صرف پانی میں زندہ رہنے والے حیوانات) احرام اور حرم میں حلال ہیں، جو خشکی اور تری دونوں جگہ زندہ رہے، وہ خشکی کے حکم میں ہے۔ پالتو جانور (اونٹ، گائے، بیل، بھینس، بکری وغیرہ) احرام میں جائز ہیں۔

حرم پاک میں مُحرم وغیر مُحرم کو شکار (جو احرام میں منع ہے) حرام ہے۔ شکار اور شکاری دونوں حرم میں ہوں یا کوئی ایک، یا صرف پیر حرم میں ہوں یا (دونوں خارج حرم ہوں لیکن) ہتھیار حرم سے ہو کر گذرے (اور شکار کو لگے تو یہ تمام صورتیں حرام ہیں۔ صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا۔" یہ شہر (مکہ) اللہ کے حکم کی وجہ سے حرام ہے۔ یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں اور نہ یہاں کے شکار کو ڈرایا (اور بھگایا) جائے۔" مکہ مکرمہ پر بقیہ حرم کو قیاس کیا جائے گا۔ لیکن خارج حرم کسی حلال (غیر مُحرم) نے شکار کیا، اور حرم میں کوئی اس سے وہ شکار خریدے یا ذبح کر کے کھائے تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ یہ حِل (خارج حرم) کا شکار ہے۔

شکار کے تمام اجزاء سے تعرض حرام ہے، مثلاً دودھ، انڈا، بال و پر، شکار کرنے کی طرح کسی کو شکار میں اعانت کرنا (اشارہ کرنا، آلہ ذبح دینا وغیرہ) بھی حرام ہے۔ اس کے تعرض کی وجہ سے وہ شکار یا کوئی جز تلف ہو جائے تو اس کا ضمان واجب ہے۔

آیت : لَاتَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُم۔ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّداً فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَاقَتَلَ مِنَ النَّعَمِ "(مائدہ ۹۵)

ترجمہ : اے ایمان والو، وحشی شکار کو (باستثناء ان کے کہ جن کو شرع نے مستثنیٰ کردیا) قتل مت کرو، جبکہ تم حالت احرام میں ہو، اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر پاداش واجب ہوگی، جو کہ مساوی ہوگی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے۔"

مُحرم پر حلال مذکور (یعنی حرم میں شکار کرنے والا) قیاس کیا گیا، کہ دونوں کو شکار سے تعرض حرام ہے۔ لہٰذا مُحرم اور حلال مذکور کو (استثنائی صورتوں کے علاوہ) اس کے ہاتھ سے جو تلف ہو، (ودیعت ہی کیوں نہ ہو) اسکا ضمان لازم ہے۔ کسی کی ملکیت میں کوئی شکار ہو اور وہ احرام باندھے تو اس شکار سے اس کی ملکیت ختم ہوگی۔ اور اسے چھوڑ دینا لازم ہے۔ کسی سے شکار خریدے تو مالک نہ ہوگا، کیونکہ اس کا خریدنا صحیح نہیں، بلکہ مالک کو لوٹانا لازم ہے۔ حلال شخص کے حرم میں داخل ہونے سے شکار کی ملکیت ختم نہ ہوگی، اور اسے شکار خریدنا جائز

ہے۔لیکن وہ حرم میں شکار کرے تو اس کا مالک نہ ہوگا۔

شکار عمداً کرے، اختیار سے کرے، کسی کے جبر سے کرے، مسئلہ سے لاعلمی کی وجہ سے کرے، احرام میں ہونا بھول کر یا خطاءً کرے۔سبھی صورتوں میں ضمان لازم ہے۔لیکن جبر واکراہ کی صورت میں جبر کرنے والے سے وصول کرلے۔آیت میں ''مُتَعَمِّداً'' کی قید غالب کے پیشِ نظر لائی گئی ہے،لہٰذا اس کا مفہوم مخالف معتبر نہ ہوگا۔

استثناء : ان صورتوں میں شکار کے قتل وتعرض سے ضمان لازم نہیں ہے،کوئی شکار اس پر حملہ آور ہوا تو اس نے دفاعاً قتل کردیا، کوئی پاگل پن میں شکار کو قتل کرے، ٹڈی راستوں میں اتنی کثرت سے ہوں کہ ان کے روندے بغیر گذرنا مشکل ہو اور روندنے سے وہ مرجائیں، انڈا توڑ دے اور اس میں چوزہ تیار ہوچکا ہو اور وہ اڑ جائے، اسے کوئی نقصان نہ پہنچے، کسی شکار کو درندہ کے چنگل سے نجات دلایا اور اپنے پاس رکھا کہ علاج اور نگہداشت کرے، پھر وہ مرگیا۔

ضمان : جس شکار کا تقریباً ہم مثل موجود ہو، اس کے ضمان میں وہی مثل جانور کی قربانی دے۔اور جس کا مثل نہ ہو، اس کی قیمت کا ضامن ہوگا۔جبکہ اس کے متعلق (اسلاف سے کچھ) نقل نہ ہو۔پہلی قسم میں بعض شکار کے متعلق آپ ﷺ اور بعض اسلاف سے نقل موجود ہے۔لہٰذا اسی کی اتباع کی جائے گی۔

لہٰذا شترمرغ کے شکار میں اونٹ، وحشی گدھے یا نیل گائے میں گائے، ہرن میں بکرا، ہرنی میں بکری، خرگوش میں بکری کا ایک سال کے اندر کا بچہ جو قوی ہو، کبوتر میں (یعنی جو غٹرغوں کرے اور جانوروں کی طرح منہ لگا کر پانی پئے) بکری (بحکم صحابۂ کرامؓ) بطورِ ضمان واجب ہے جس کا شکار کے متعلق اسلاف سے نقل نہ ہو اس کے مثل کا دو عادل اور اس مسئلہ سے واقف حضرات فیصلہ کریں گے۔

آیت : تَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ (مائدہ ۔ ۹۵)

ترجمہ : ''جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کردیں'' (کہ دین داری میں بھی قابلِ اعتبار ہوں اور تجربہ وبصیرت میں بھی)۔

مذکر کے فدیہ میں مؤنث اور اس کے برعکس اور عیب دار کے بدلہ عیب دار (جبکہ ایک ہی طرح کا عیب ہو) کافی ہے۔جن جانداروں کا مثل نہ ہو، (جیسے ٹڈی اور چڑیا وغیرہ) ان کی قیمت کا فیصلہ بھی دو عادل شخص کریں گے۔

۹) **نکاح :** ہر وہ نکاح جس میں ولی، شوہر، بیوی یا وکیل مُحرم ہو باطل ہے۔

میاں بیوی حلال ہوں لیکن گواہ مُحرم ہو تو جائز ہے۔احرام میں رجعت کرنا اور نکاح کا پیغام دینا مکروہ ہے۔(ترشیح ص ۱۹۳) مسلم کی روایت میں ہے ''مُحرم نہ نکاح کرے اور نہ کرائے۔''

حرم کے درخت اور جھاڑیوں کا حکم : حرم پاک کے خودرو جھاڑیوں اور درختوں سے تعرض حرام ہے، (مُحرم ہو یا غیر مُحرم) کیونکہ صحیحین کی روایت میں درخت کاٹنے اور تر گھاس پھوس اکھاڑنے (یا کاٹنے) کی ممانعت وارد ہے۔خشک درخت اور جھاڑیوں سے تعرض جائز ہے، لیکن گھاس پھوس اگر مرے نہ ہوں، تو اکھاڑنا حرام ہے، کاٹنا حرام نہیں، خارج حرم اُگنے والا پودہ حرام نہیں، خواہ بعد میں اسے حرم میں لاکے لگایا جائے، اس کے برعکس حرم کا پودہ خارجِ حرم جانے کے بعد بھی حرام رہے گا۔گیہوں اور جَو وغیرہ جس کی انسان خود کاشت کرتا ہے، اس سے تعرض حرام نہیں، حرم کے نباتات چارہ کیلئے استعمال کرنا یا حرم میں جانور کو چرنے چھوڑ دینا یا دوائی کے لئے لینا یا اذخر (ایک مخصوص گھاس) کا استعمال حرام نہیں، کیونکہ صحیحین کی روایت میں اذخر کی گھروں میں اور لوہاروں کو عام ضرورت کی بنا پر حضرت عباس کی درخواست پر آپ ﷺ نے اس کا استثناء فرمایا۔

درخت کی شاخیں سڑکوں پر آ کر مسافروں کی تکلیف کا باعث بنے تو اسے کاٹ سکتے ہیں، اصلاح کے لئے درختوں کو چھانٹنا اور کترنا جائز ہے، بغیر جھاڑتے ہوئے پتے توڑنا، پھل توڑنا اور مسواک وغیرہ کیلئے چھوٹی ٹہنی توڑنا جائز ہے۔

درختوں سے ناجائز تعرض کی صورت میں شکار کی طرح ضمان لازم ہے، عرفاً بڑے درخت میں اونٹ گائے اور تقریباً اس کے ساتویں حصے کے برابر درخت میں ایک بکری دے۔ اسے امام شافعیؒ نے حضرت ابن زبیرؓ سے نقل فرمایا ہے۔ اب مذکورہ جانور کو حرم میں ذبح کر کے مساکین حرم پر صدقہ کرے۔ یا اس کی قیمت سے اناج خرید کر صدقہ کرے، یا پھر مد کی جگہ ایک روزہ رکھے، تر گھاس پھوس کاٹنے کے بعد پھر اگے تو اس میں ضمان نہیں، ورنہ اس میں اور چھوٹے پودوں اور درختوں میں قیمت واجب ہوتی۔

حرم مدینہ اور، وجّ (طائف کی وادی) شکار اور درختوں سے تعرض کی حرمت میں مکہ کی طرح ہیں۔ صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا۔" حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ کو حرام قرار دیا۔ اور میں نے مدینہ منورہ کو (یعنی اس کے دو طرف کے دو سیاہ چٹانی سلسلہ کے درمیان کی جگہ کو) حرام قرار دیا۔ یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں۔" مسلم میں یہ اضافہ ہے۔" وہاں شکار نہ کیا جائے۔" اور ابوداود میں بسند صحیح روایت ہے۔" وہاں تر گھاس پھوس اکھاڑی (اور کاٹی) نہ جائے۔ اور نہ شکار کو بھگایا جائے۔" اور ابوداود و ترمذی میں ہے۔" آ گاہ رہو! مقام وجّ کا شکار اور درخت حرام ہے۔" ان دونوں مقامات میں خلاف ورزی سے ضمان لازم نہ ہوگا کہ یہ ادا ء حج وعمرہ کی جگہ نہیں۔

تمام محرمات احرام میں گناہ اس وقت ہوگا جب عمداً احرام ہونے کا علم ہوتے ہوئے، اپنے اختیار سے (بلا جبر وزبردستی) اور مکلف ہوتے ہوئے اسکا ارتکاب کرے۔ ورنہ گناہ نہ ہوگا۔ اسی طرح جو امور استمتاع (فائدہ اٹھانے) کے قبیل سے ہیں، ان میں فدیہ بھی لازم نہ ہوگا۔ جیسے لباس، خوشبو، جماع اور تیل کا استعمال۔ جو اتلاف میں شمار ہو اس میں فدیہ لازم ہے، جیسے شکار کا قتل، بال یا ناخن کاٹنا وغیرہ۔ کیونکہ اتلاف کے فدیہ میں جہل اور بھول سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مذکورہ محرمات میں جماع اور شکار کبیرہ ہیں، بقیہ صغیرہ ہیں۔) ترشیح المستفیدین ص ۱۹۲)

محرمات احرام کی چار قسمیں

(۱) جو حاجت کی وجہ سے جائز ہے، اس میں نہ حرمت ہے اور نہ فدیہ۔ تہبند نہ ہونے کی وجہ سے پائجامہ پہننا، چپل نہ ہونے کی وجہ سے موزہ ٹخنوں سے نیچے کاٹ کر پہننا، سلسلۃ البول (پیشاب کے قطرات) کی بیماری کی وجہ سے ذکر (شرم گاہ) پر کپڑا باندھنا جبکہ اس کے بغیر نہ تھمے، بال سمیت چمڑی دور کرنا، آنکھ میں اُگے ہوئے یا آنکھ کو ڈھانکنے والے بال کو دور کرنا، عضو سمیت ناخن کو دور کرنا، ناخن کا کٹا ہوا حصہ تکلیف کی صورت میں دور کرنا، حملہ آور شکار کو بطور دفاع قتل کرنا، اپنے بستر پر شکار کا انڈا ہو تو اسے دور کرنا یا لاعلمی میں اس کا تلف ہونا۔ شکار کو درندہ کے منہ سے نجات دے اور وہ مر جائے۔ ترفہ کے امور یعنی لباس یا خوشبو پر بھول، لاعلمی یا جبر واکراہ (زبردستی) کی وجہ سے عمل ہو جائے۔

(۲) جس میں گناہ ہوگا، فدیہ لازم نہ ہوگا، عقدِ نکاح، شہوت کے ساتھ مباشرت جبکہ کچھ حائل ہو (مباشرت سے بدن کا چھونا مراد ہے نہ کہ جماع) شہوت سے دیکھنا، شکار کے قتل میں تعاون کرنا۔ کسی نے اس کے لئے شکار کیا یا اس کا اس شکار میں دخل ہوا اور پھر یہ اس سے کھائے۔ شکار کو خرید کر یا پکڑ کر اپنے قبضہ میں لینا (جبکہ تلف نہ کرے اور نقصان نہ پہنچے)۔ شکار کو بھگانا، مُحرم کا جنازہ کے ساتھ محرمات احرام

میں سے کسی عمل کو کرنا (مثلاً اسے خوشبو لگانا)

(۳) جس میں فدیہ لازم ہے، لیکن گناہ نہ ہوگا۔ مرض جیسے عذر کی وجہ سے مرد کو لباسِ ممنوعہ کی حاجت ہو، یا عورت کو چہرہ چھپانا پڑے، یا بال و ناخن کاٹنے کی ضرورت پیش آئے، کوئی ممیز لاعلمی میں بال دور کرے، بلا قصد شکار کو بھگایا اور اس میں وہ تلف ہو گیا، بھوک کی وجہ سے شکار کو ذبح کرنے پر مجبور ہوا، خلاصہ یہ کہ سابقہ دو قسموں کے علاوہ جو حاجت کی وجہ سے جائز ہوں وہ اس میں فدیہ ہے، گناہ نہیں، یہاں حاجت سے مراد جس میں شدید مشقت ہو کہ عادۃً اس کا برداشت کرنا مشکل ہو۔

(۴) جس میں گناہ اور فدیہ دونوں لازم ہیں۔ اس میں محرمات کی بقیہ صورتیں سب داخل ہوں گی۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۱۸ و ترشیح المستفیدین ص ۱۹۲ ملخصا)

خلاصہ یہ کہ محرمات میں جو اتلاف کی قسم سے ہو (جیسے شکار کا قتل) یا جس میں فی الجملہ اتلاف اور ترفہ دونوں کا دخل ہو (جیسے بال یا ناخن کا ازالہ) تو اس میں مطلقاً ضامن ہوگا، بھول، لاعلمی وغیرہ اعذار سے یہ ساقط نہ ہوگا۔ اور جو محض ترفہ کی قسم سے ہو (جیسے خوشبو) اس میں عقل، اختیار اور مسئلہ کی واقفیت کی صورت میں ضمان ہوگا۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۱۸)

حرمِ مکہ کی خصوصیات : (۱) شکار کی حرمت (۲) درخت کاٹنے کی حرمت (۳) ہدی کا جانور ذبح کرنا (۴) اس کا گوشت حرم ہی میں تقسیم کرنا (۵) مناسک سے متعلق اناج حرم میں تقسیم کرنا (ان تینوں میں مُحصَر مستثنیٰ ہے) (۶) نذر کی وجہ سے پیدل وہاں جانے کا وجوب (۷) احرام ہی سے داخل ہونا (وجوباً یا استحباباً) (۸) تحلل حرم ہی میں ہوگا۔ (سوائے مُحصَر کے (۹) حرم میں قتل سے دیت مغلظ ہوگی۔ (۱۰) وہاں کے لقطہ کا اٹھانے والا مالک نہ بنے گا۔ (۱۱) کوئی کافر و مشرک وہاں داخل نہیں ہو سکتا (۱۲) کافر و مشرک کو وہاں دفن نہ کیا جائے (۱۳) اگر حل میں جانے کا ارادہ نہ ہو، تو حرم سے عمرہ کا احرام نہیں باندھ سکتا۔ (۱۴) وہاں کے باشندوں پر قران یا تمتع کی صورت میں دم واجب نہ ہوگا۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۱۵)

حج میں کوتاھی اور خلل

حج میں خلل کے اسباب اور ان کے احکام کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱) واجبات حج میں سے کسی واجب کا ترک کرنا : مثلاً میقات سے احرام نہ باندھے، رمی ترک کرے، مزدلفہ میں شب باشی نہ کرے۔ منیٰ کی شب باشی ترک کرے، طواف وداع نہ کرے۔

کسی واجب کے ترک سے جو خلل واقع ہو، اس کی تلافی کے لئے ایک بکری (جو قربانی میں چلے) ذبح کرنا لازم ہے۔ اگر بکری نہیں دے سکتا تو ایام حج میں تین روزے اور گھر لوٹ کر سات روزے رکھے۔

۲) حج کے کسی رکن کو ترک کرنا : اگر وقوف عرفہ ترک ہو جائے، تو درج ذیل امور جائز ہیں۔

الف: بکری ذبح کرے اور عاجز ہو تو روزہ رکھے، (تمتع کی طرح) دم یا روزہ کا وقت قضا کے احرام کے بعد داخل ہوگا۔

ب: عمرہ کے اعمال انجام دے کر احرام کھول دے، یعنی طواف کرے اور طواف قدوم کے بعد سعی نہ کی ہو تو سعی کرے، اور حلق یا تقصیر کرے۔ اگر عمل عمرہ ممکن نہ ہو تو محصر کی طرح حلال ہو۔ لیکن یہ فرض عمرہ میں شمار نہ ہوگا۔

ج: اس حج کو آئندہ سال فوراً قضا کرے۔ برابر یہ ہے کہ فرض حج تھا یا نفل، بغیر عذر کے قضا کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔ وقوف عرفہ نیند

یا بھول وغیرہ عذر سے ترک ہو یا بلا عذر مذکورہ احکام کی پابندی لازم ہے۔ مؤطا امام مالک میں حضرت ہبار بن الاسود سے بسند صحیح مروی ہے کہ وہ یوم النحر میں حضرت عمر کی خدمت میں پہنچے جبکہ وہ ہدی ذبح فرما رہے تھے۔ اور عرض کیا امیر المؤمنین! ہم سے تاریخ کے شمار میں غلطی ہوئی اور ہمارا گمان تھا کہ آج عرفہ کا دن ہے تو حضرت عمر نے فرمایا'' تم اور دیگر احباب مکہ جا کر طواف وسعی کرو اور ہدی کا جانور ہو تو ذبح کرو۔ پھر حلق یا تقصیر کرو۔ پھر لوٹ جاؤ۔ آئندہ سال پھر حج کرو اور ہدی ذبح کرو۔ میسر نہ ہو تو تین روزے ایام حج میں اور سات واپسی کے بعد رکھو'' یہ فیصلہ صحابہؓ کرام میں مشہور ہوا، لیکن کسی نے اس پر نکیر نہ کی، تو گویا اجماع ہو گیا۔

وقوف عرفہ کے علاوہ کوئی رکن (طواف افاضہ وسعی یا حلق) ترک ہو تو اس کا تلافی سے کوئی تعلق نہیں، جب تک اس متروکہ رکن کو ادا نہ کرے، خلل دور نہ ہوگا۔ اور حج اس رکن کی ادائیگی تک معلق رہے گا، چاہے جتنا وقت گذر جائے۔ (زندگی میں جب بھی ان ارکان کو ادا کرے گا حج مکمل ہوگا۔ اس وقت تک احرام کا حکم باقی رہے گا)

دم کے اقسام

دم (خون) سے مراد تغلیباً جانور کی قربانی یا اناج کا صدقہ یا روزہ ہے، حج میں واجب دم کے پانچ اقسام ہیں۔

۱) **مُرتّب و مقدّر دم:** (اس میں ترتیب ضروری ہے، اور تفصیل شریعت کی طرف سے متعین ہے) حج کے واجبات میں سے کسی واجب کے ترک سے یہ واجب ہوتا ہے۔ اگر کوئی واجب ترک ہو تو پہلے ایک بکری (قربانی کے صفات پر) ذبح کرے یا گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ۔ اس میں سے کسی پر عمل نہ کر سکے تو اس کے بدلہ میں ۱۰ روزے رکھے، تین ایام حج میں اور سات اپنے وطن لوٹ کر۔ اسی قسم میں تمتع کا دم، قران کا دم اور وقوف عرفہ کے ترک کی وجہ سے فوات حج کا دم بھی داخل ہے۔

۲) **مُخیّر و مُقدّر دم:** (اس میں ترتیب ضروری نہیں ہے، اختیار ہے کہ کسی پر بھی عمل کرے، لیکن تفصیل شرعاً متعین ہے) حلق و تقصیر یا ناخن کاٹنا یا اس کے مشابہ دیگر ممنوعہ امور کے ارتکاب سے یہ دم لازم ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں ایک بکری ذبح کرے یا تین دن روزہ رکھے یا تین صاع گیہوں یا جَو حرم کے چھے مساکین کو دے، ہر مسکین کو نصف صاع، صرف تین بال یا ناخن کے لئے، تب بھی یہ فدیہ لازم ہوگا۔

۳) **مُخیّر و مُعدّل دم:** نباتات کے کاٹنے اور شکار کے قتل کرنے سے یہ واجب ہے، تفصیل محرمات احرام میں گذر چکی۔

۴) **مُرتّب و مُعدّل دم:** یہ احصار کی وجہ سے لازم ہے، حج کے احرام کے بعد رکاوٹ پیش آئے (اور حج نہ کر سکے) تو اولاً جس جگہ رکاوٹ پیش آئے، ایک بکری ذبح کرے، دینے پر قادر نہ ہو تو اس کی قیمت کا اناج فقراء و مساکین پر تقسیم کرے، اس سے بھی عاجز ہو تو ہر ایک مد اناج کی جگہ ایک روزہ رکھے۔

۵) یہ بھی مرتب اور معدل دم ہے، کوئی تحلل اول سے قبل جماع کرے، اس پر ایک اونٹ کی قربانی واجب ہے، اس سے عاجز ہو تو ایک گائے کی قربانی دے، یہ نہ ہو سکے تو سات بکریوں کو ذبح کرے، اس سے بھی عاجز ہو تو اونٹ کی قیمت کا اناج اہل حرم کو صدقہ کرے، صدقہ پر بھی قادر نہ ہو تو ہر ایک مد کے بدلے ایک روزہ رکھے، (مثلاً اونٹ کی قیمت میں ۲۰۰ مد اناج ملتا ہو تو ۲۰۰ روزے رکھے)۔

مذکورہ تمام صورتوں میں قربانی اور صدقہ حرم پاک ہی میں ضروری ہے، روزہ جہاں چاہے رکھ سکتا ہے (لیکن حرم کی فضیلت کے باعث وہیں رکھنا افضل ہے) مذکورہ دم میں ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اول پر عمل کرنے سے عاجز نہ ہو دوّم کی طرف نہیں منتقل

ہوسکتا۔ یہ تخییر کی ضد ہے، تخییر میں اسے اختیار ہے کہ کسی پر بھی عمل کرلے۔ تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ جس بدل کا حکم ہے، شریعت نے خود اسے مقرر کردیا ہے، چاہے ترتیب ہو یا تخییر۔ اس کے مقابلہ میں تعدیل (معدل) ہے۔ یعنی قیمت کا اندازہ لگا کر بدل کی طرف عدول کیا جائے اور بدل کو مقرر کیا جائے۔ (الفقہ المنھجی۔ ۲/۱۶۴) غیر حاجی کی طرح حاجی کو بھی قربانی سنت ہے۔

کسی مامور کے ترک یا ممنوع کے ارتکاب کی وجہ سے واجب ہونے والے دم کی ادائیگی کیلئے کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ اصل عدمِ تخصیص ہے اور اس کے خلاف کوئی دلیل وارد نہیں، لیکن قربانی کے ایام (۱۰ سے ۱۳) میں ذبح کرنا افضل ہے، البتہ امام سبکی وغیرہ نے فرمایا کہ اگر سبب دم حرام ہو تو فوراً دم دینا واجب ہے۔ احصار کے علاوہ ذبح کا حرم پاک میں ہونا ضروری ہے۔

آیت: هَدْياً بَالِغَ الْكَعْبَةِ " (سورہ مائدہ ۹۵) (وہ پاداش کا جانور) نیاز کے طور پر کعبہ (کے پاس) تک (یعنی حرم کے اندر) پہنچائی جاوے۔"

اور ذبیحہ کا گوشت اور دیگر اجزاء یا اس کے بدلہ میں اناج حرم کے مساکین (حرم کے باشندے ہوں یا بیرون سے آئے ہوئے) پر صرف کرنا لازم ہے۔ حرم کے باشندوں پر صرف کرنا افضل ہے۔ (جبکہ غیر باشندے زیادہ محتاج نہ ہوں)۔ حاجی کو جانور ذبح کرنے کے لئے افضل جگہ منیٰ ہے۔

هَدْی

بطورِ تقرب حرم مکہ میں ذبح کرنے کے لئے جو جانور اپنے ساتھ لے جایا یا کسی کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے، اسے ہَدْی کہتے ہیں۔ اپنی بستی سے ساتھ ہدی کا جانور (اونٹ، گائے یا بکری اور مینڈھا) لے جانا مستحب ہے۔ منیٰ سے خرید لے تو بھی اصل سنت حاصل ہوگی۔ (آج کل عموماً اسی پر عمل ہے)، اگر کوئی نذر مان لے تو واجب ہوگی۔ ہدی کا جانور بھی حرم پاک میں ذبح کرنا واجب ہے۔ (احصار کی صورت میں محل حصر میں ذبح کرے) ہدی کے جانور کے ذبح کا وقت قربانی کا وقت ہے۔ (یعنی ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۳ تک) کوئی اور دن نذر میں متعین کرے تو وہی معین ہوگا۔ بعض علماء کرام نے فرمایا کہ حج کے ایام کے علاوہ عمرہ میں یا ایسے ہی کوئی ہَدْی لے جائے تو اسے اسی وقت ذبح کرنا جائز ہے، قربانی کے ایام تک انتظار کی ضرورت نہیں، حج کی ہَدْی ایامِ قربانی میں ذبح نہ کیا اور واجب تھا (نذر کی وجہ سے) تو بعد میں بطورِ قضا ذبح کرے، واجب نہیں تھا، تو فوت ہوگیا۔ اگر ذبح کرے بھی تو عام گوشت کے حکم میں ہے، واجب ہدی کو مکمل مساکینِ حرم پر صرف کرنا لازم ہے۔ اور نفل کے بطور نفل واقع ہونے کیلئے بھی ان پر صرف لازم ہے، البتہ نفل قربانی کی طرح خود بھی کھا سکتا ہے۔ حج و احرام سے متعلق سارے قربانیوں پر بھی ہدی کا اطلاق ہوتا ہے۔

احصار

آیت: "فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" (سورہ بقرہ ۱۹۶) "پھر اگر (کسی دشمن کی جانب سے حج وعمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرے اور احرام کھولے)"

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ کو جب مشرکین نے عمرہ سے روکا تو مقام حدیبیہ میں ہی حلال ہوئے، (احرام کھولا)، لہٰذا (ہدی کو) نحر فرمایا، پھر حلق کیا اور اپنے صحابہ کرام سے بھی ارشاد فرمایا کہ "اٹھ کر نحر کرو پھر حلق کرو۔"

کسی حاجی یا معتمر کو مسلمان یا غیر مسلم دشمن تمام راستوں سے روک دے جس کی وجہ سے حج وعمرہ کے ارکان کی ادائیگی سے مجبور ہو تو

آئندہ بتائے گئے طریقہ سے احرام کھول سکتا ہے۔تمام کو روکے، یا چند ساتھیوں کو، واپسی سے بھی روکے یا نہ روکے۔اگر وقت طویل ہوتو انتظار کرنا اور تحلل کو مؤخر کرنا افضل ہے۔اگر حج کا احرام ہو اور وقت تنگ ہو، تو جلد تحلل اختیار کرنا افضل ہے۔اگر حج میں ایسے وقت رکاوٹ کے دور ہونے کا یقین ہو کہ اس کے بعد حج مل جائیگا یا عمرہ میں تین دن میں دور ہونے کا یقین ہو تو امام ماوردی نے فرمایا کہ تحلل منع ہے۔ قتال یا مال خرچ کر کے آگے بڑھ سکتا ہو تو یہ لازم نہیں، بلکہ کفار کو اس طرح مال دینا مکروہ ہے، مسلمان کو دینا مکروہ نہیں۔اگر دشمن کفار ہوں اور قتال کی قدرت ہو تو ان سے قتال کر کے آگے بڑھنا بہتر ہے۔تاکہ حج اور جہاد و نصرت اسلام دونوں فضیلت حاصل ہو، اگر قتال سے عاجز ہو یا دشمن مسلمان ہوں تو تحلل بہتر ہے، تاکہ مسلمانوں کی جانیں تلف نہ ہوں۔

اگر رمی یا شب باشی وغیرہ کسی واجب کی ادائیگی میں رکاوٹ پیش آئے تو تحلل کی اجازت نہیں۔کیونکہ وہ طواف و حلق پر عمل کر سکتا ہے اور واجب کے بدلہ دم دینا کافی ہے۔(بشری الکریم ۱۴۱/۲)

اِشتِراط : اگر ابتدا میں احرام کے وقت ہی یہ شرائط لگا دے کہ مرض یا کوئی اور عذر پیش آئے تو میں احرام کھول دوں گا تو مذکورہ عذر کے وقت احرام کھولنا جائز ہے۔

حدیث : آپ ﷺ ضباعہ بنت الزبیر کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا ''کیا حج کا ارادہ ہے؟''اس نے جواب دیا ''واللہ! میں تو اپنے آپ کو بیمار پا رہی ہوں۔''تو آپ ﷺ نے فرمایا''تم حج کرو اور یہ شرط لگا دو کہ اے اللہ! جہاں آپ (یا بیماری وعذر) مجھے روک دیں گے میں حلال ہو جاؤنگی''(صحیحین) علامہ ابن حجر نے فتویٰ دیا کہ کسی نے احرام کے وقت شرط لگائی کہ کوئی بھی دینی یا دنیوی عذر پیش آئے تو میں احرام کھول دونگا، (حلال ہو جاؤنگا) تو یہ شرط صحیح ہے، اب اگر ہدی کی شرط نہیں لگائی تو مذکورہ عذر کی صورت میں بلا ہدی صرف نیت سے حلال ہو جائے۔ہدی کی شرط ہو تو ہدی بھی جائز ہے۔(بغیہ ص ۱۱۶) حج پر عمرہ کو بھی قیاس کیا گیا۔''اگر میں بیمار ہوا تو حلال''تو بیمار ہوتے ہی بغیر تحلل کے خود بخود حلال ہو گیا۔اگر احرام کے وقت شرط نہ لگائی، تو بیماری وغیرہ اعذار کی وجہ سے احرام نہیں کھول سکتا، بلکہ صبر کے ساتھ عذر ختم ہونے کا انتظار کرے، اور اس کے بعد عمرہ کا احرام ہے، تو عمرہ کرے۔اور حج کا احرام ہے اور وقت نکل چکا، تو عمرہ کے اعمال ادا کر کے احرام کھولے۔

احصار یا (بصورت شرط) مرض وغیرہ کی وجہ سے جہاں احصار یا مرض پیش آئے، وہیں بکری یا اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ ذبح کرے پھر حلق (یا تقصیر) کرے، دونوں کام تحلل کی نیت سے انجام دے، مرض وغیرہ اعذار میں ذبح اس وقت ضروری ہے جبکہ شرط میں ذبح کا تذکرہ کیا ہو، ورنہ صرف نیت اور حلق سے حلال ہوگا، مُحصَر کے لئے دم لازم ہے، شرط لگائے یا نہ لگائے۔

اگر احصار خارج حرم ہو تو جانور کو حرم میں روانہ کرنا لازم نہیں، کیونکہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام نے حدیبیہ میں ذبح کیا اور وہ حرم سے باہر ہے، اگر ممکن ہو تو حرم میں روانہ کرنا بہتر ہے۔احصار کی جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ حِل (خارجِ حرم) میں ذبح جائز نہیں، جہاں ذبح کرے وہیں کے فقراء و مساکین پر تقسیم کر دے، وہاں فقراء نہ ہوں تو قریب کے فقراء پر تقسیم کر دے۔

معذور پر جو دم لازم ہو، یا ہدی ساتھ لایا ہو، تو وہ بھی محل عذر میں ذبح کرے۔

اگر دم سے عاجز ہے تو دم کی قیمت کا اناج محل عذر میں صدقہ کرے اور ساتھ حلق و نیت تحلل بھی ہو، اناج سے عاجز ہو تو جہاں چاہے روزے رکھے۔اور تحلل کی نیت کے ساتھ حلق کرے۔ہر مد کے بدلہ ایک روزہ رکھے۔آخری مد کم ہو تو اس کے بدلہ میں بھی ایک روزہ رکھے۔(سابقہ روزوں میں بھی یہی مسئلہ ہے) روزہ کی صورت میں فوراً بھی نیت کے ساتھ حلق کر کے حلال ہو سکتا ہے، تحلل روزہ رکھنے پر

موقوف نہیں، بخلاف ذبح اور اطعام کے۔ کیونکہ روزہ کا وقت بڑھ جائے گا، اور اس سے فارغ ہونے تک احرام کی حالت میں رہنا باعثِ مشقت ہے۔

اگر بیوی شوہر کے بلا اجازت حج یا عمرہ کا احرام باندھے، تو وہ اسے احرام کھولنے کا حکم دے سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے مستحق منافع سے محروم ہو رہا ہے، لہٰذا بیوی مُحصَر کی طرح تحلل اختیار کرے۔ (گویا بغیر اجازت کے اس کا احرام صحیح ہے) اگر بیوی احرام نہ کھولے (حلال نہ ہو) تب بھی شوہر اس سے نفع اٹھا سکتا ہے اور گناہ بیوی کو ہوگا۔ اگر شوہر کی اجازت سے احرام باندھا ہے، تو اسے کھولنے کا حکم دینا جائز نہیں ہے۔ اگر طلاق رجعی یا بائنہ کی عدت میں ہو، تو احرام کھولنے کا حکم نہیں دے سکتا، البتہ عدت تک روک سکتا ہے۔

مُحصَر پر آئندہ اس حج یا عمرہ کا اعادہ لازم نہیں ہے، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں تقریباً ۱۴۰۰ صحابہ کرام کو احصار پیش آیا اور آئندہ سال عُمْرَةُ الْقَضِيَّة میں ان میں سے بعض نے (زیادہ سے زیادہ ۷۰۰ نے) ہی عمرہ کیا، اور جو نہ گئے ان کو قضا کا حکم منقول نہیں ہے، اور یہ فوات احصار کی وجہ سے ہے جس میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ (مُحرم کا کوئی قصور نہیں)

ان صورتوں میں محصر پر قضا لازم ہے (۱) امن کے عدم توقع کے باوجود تحلل کو مؤخر کرے، حالانکہ تحلل ممکن نہیں تھا اور حج فوت ہو جائے (۲) حج فوت ہونے کے بعد احصار پیش آئے (۳) احصار ختم ہونے کے بعد وقت باقی تھا، اس لئے حلال نہ ہوا اور حج کے لئے آگے بڑھا، لیکن حج فوت ہو گیا (۴) دوسرا راستہ جو پہلے کے مساوی یا اس سے مختصر تھا اختیار کیا اور وقوف فوت ہو گیا (پہلے راستہ کے مقابلہ میں اس راستہ کی تطویل یا مزید صعوبتوں کی وجہ سے حج فوت ہو تو اعمالِ عمرہ ادا کر کے احرام کھولے، قضا لازم نہیں) مذکورہ صورتوں میں قضاء کا لزوم فوات کی وجہ سے ہے، نہ کہ احصار کی وجہ سے۔ احصار کے زوال کی امید پر احرام ہی میں رہا اور حج فوت ہو گیا، تو عملِ عمرہ کر کے حلال ہو، اب آئندہ اعادہ واجب نہیں۔

فریضۂ اسلام میں احصار: اگر احصار شدہ حج فرض تھا اور مُستقِر ہو چکا تھا، (یعنی فرضیت پختہ اور اس پر لازم ہو چکی تھی) تو اس کے ذمہ باقی رہے گا۔ حج کے استطاعت و امکان کے بعد پہلا سال گذر جائے یا اعادہ یا نذر کا حج ہو، تو یہ سب مستقر حج ہیں، جیسا کہ کوئی فرض نماز شروع کر کے مکمل نہ کرے، تو اسکے ذمہ باقی رہے گی۔

اگر ابھی مستقر نہیں ہوا (مثلاً حج کے امکان کے بعد پہلے ہی سال فرض حج کی روانگی میں احصار پیش آئے) تو حصر کے ازالہ کے بعد استطاعت کا اعتبار ہوگا، آئندہ پھر استطاعت ہو، تو حج کی ادائیگی واجب ہے، ورنہ نہیں۔

والدین میں سے ہر کوئی (یا دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ اوپر تک) اپنے بیٹے پوتے وغیرہ اولاد کو، جبکہ وہ مکی نہ ہو، نفل حج یا عمرہ کے احرام سے روک سکتا ہے، بلا اجازت احرام باندھے تو اسے کھولنے کا حکم بھی دے سکتا ہے، اس حکم پر اسے حلال ہونا لازم ہے۔ حج و عمرہ کے ساتھ طلبِ علم یا تجارت وغیرہ کا بھی قصد ہو (اور تجارت کا نفع سفر خرچ سے زائد ہو) اور راستہ پر امن ہو، تو اجازت کی ضرورت نہیں۔ مکی اولاد کو حج و عمرہ سے نہ روکے۔ (کہ اس میں زیادہ مشقت و کلفت نہیں) فرض حج و عمرہ (اسلامی رکن ہو یا قضا یا نذر) سے اولاد کو روکنا جائز نہیں، لیکن والدین (اوپر تک) سے اجازت لینا مستحب ہے اگر اجازت نہ دیں تو مؤخر کرنا بہتر ہے، جبکہ شرعاً فوراً ادا کرنا لازم نہ ہو (جیسے قضا)۔ راستہ پر خطر ہو، یا کوئی اور صحیح شرعی غرض ہو (جیسے غیر معتبر لوگوں کے ساتھ سفر کرنا یا قدرت نہ ہونے کے باوجود پیدل سفر کرنا وغیرہ) تو فرض سے بھی روک سکتا ہے۔ کسی پر والدین کا نفقہ واجب ہو، تو جب تک اس کے نفقہ کا معقول انتظام نہ کرے، اولاد کو سفر سے روک سکتے ہیں۔ اسی طرح بیوی کے نفقہ کا بھی انتظام کرے ورنہ (وہ راضی نہ ہو تو) اسے طلاق دے، البتہ حاکم اس پر جبر نہیں کر سکتا۔ (بشری الکریم۔ ۱۲۳/۲)

کسی کوظلماً قید میں ڈالا جائے ، (مثلاً قرض کی وجہ سے کسی غریب کو قید میں ڈالنا) تو وہ احصار کی طرح تحلل پر عمل کرسکتا ہے۔
(ترشیح المستفیدین ص ۱۹۸)

کسی کے قرض کی ادائیگی کا مقررہ وقت آچکا ہو، اور مقروض ادا کرنے کی حیثیت رکھتا ہو، تو صاحب قرض اپنا قرض وصول کرنے کے لئے اسے حج کے سفر میں جانے سے روک سکتا ہے، احرام کھولنے کا حکم نہیں دے سکتا، کیونکہ اسکے احرام سے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اگر قرض کی ادائیگی کا وقت نہ آئے ، یا وقت تو ہو چکا لیکن مقروض غریب ہے، (کہ ادا نہیں کرسکتا) تو اسے نہیں روک سکتا، کیونکہ اس پر (فی الحال) قرض کی ادائیگی لازم نہیں۔ (ترشیح المستفیدین ص ۱۹۸)

حج کی حکمتیں و اسرار

(ماخوذ از ارکان اربعہ ملخصا)

حج اور اس کے تمام اعمال ومناسک نیز اس سلسلہ کے تمام واقعات وحوادث جو ان اعمال کے ساتھ وابستہ ہیں، مظاہر سے بے نیازی اور انانیت وخود پرستی سے رہائی وآزادی کا وہ لباس زیبا جو حاجی زیب تن کرتا ہے اور احرام، وقوف، افاضہ، رجم (رمی) ، سعی اور طواف کے تمام وہ اعمال جو بجالاتا ہے، دراصل توحید، اسباب کی نفی، خدا پر توکل، اس کے راستہ میں قربانی اور اس کی اطاعت وخوشنودی کو اپنی زندگی میں مؤثر، پائدار اور فعال بنانے کی سعی وتدبیر ہے، وہ عادات، رسم ورواج، جھوٹے معیار اور مصنوعی قدروں کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت اور طاقتور ایمان، سچی محبت، بے نظیر قربانی اور اعلیٰ درجہ کے ایثار و بے غرضی کی تجدید ہے۔ حج ان اعلیٰ مقاصد، صالح جذبات، روحانی اور ایمانی قدروں، نیز اس انسانی واسلامی اخوت کی بقاوترقی کا ضامن ہے، جو مصنوعی قوموں اور نسل ووطن کے محدود اور ناقص پیمانوں سے بالاتر ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے راستہ اور مسلک پر چلنے ان کی روح کو اپنے اندر پیدا کرنے اور ہر جگہ اور ہر دور میں ان کی دعوت کے پرچم کو بلند رکھنے کی دعوت ہے۔

’’ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْداً عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوْا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ط هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ‘‘ (سورہ حج ۔ ۷۸)

ترجمہ : ’’تم اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت (پر قائم رہو) اسی نے تمہیں مسلم قرار دیا اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں، اور تم (سب) لوگوں کے مقابلہ گواہ ٹھہرو، سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو، وہی تمہارا کارساز ہے، سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار۔‘‘

حضرت ابراهیم علیه السلام سے تجدید تعلق : حج کا ایک بڑا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملت حنیفی کے امام اور مؤسس حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تجدید تعلق کیا جائے ، ان کی میراث کی حفاظت کی جائے ، ان کی زندگی اپنے سامنے رکھ کر اپنی زندگی کا موازنہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا جائے اور ان کی زندگی میں جو غلطیاں، فساد اور تحریف نظر آئے اس کو دور کیا جائے اور اس کے اصل سرچشمہ کی طرف رجوع کیا جائے ، اسلئے کہ حج ایک قسم کا سالانہ اجتماع ہے۔ جس کے ذریعہ مسلمان اپنے اعمال اور اپنی زندگی کا احتساب وتجزیہ کرسکتے ہیں اور ان قوموں اور سوسائٹیوں کے اثرات سے چھٹکارا پاسکتے ہیں جن کے بیچ میں وہ رہتے ہیں۔

شعائر اللّٰہ اور ان کی حکمت : ایک ایسی چیز کی آرزو اور جستجو ہر بشر کی سرشت میں داخل ہے۔ جس کو وہ اپنی ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ اس کے ذریعہ اپنے جذبہ شوق کی تسکین کر سکے اور قرب و وصال اور تعظیم و تسلیم کے اس شدید تقاضے کی آسودگی کا سامان کر سکے جو ہمیشہ سے اس کے ضمیر میں ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ ظاہری اور محسوس چیزیں مقرر کی ہیں جو اس کی ذات اقدس کے ساتھ کچھ خصوصیت رکھتی ہیں، اسی کی طرف منسوب ہیں، اس کی ہی کہلائی جاتی ہیں اور ان پر اس کی رحمت کی اس قدر تجلی اور عنایت کی ایسی نظر ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے۔ اسکے علاوہ ان کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات و معاملات اور اعمال و احوال وابستہ ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کے انعامات، اس کا دین توحید اور اس کے رسولوں کا جہاد اور صبر یاد دلاتے ہیں۔ ان چیزوں کا نام اس نے ''شعائر اللہ'' رکھا۔ ان کی تعظیم اپنی تعظیم قرار دی اور ان میں کوتاہی اپنے حق میں کوتاہی کے مرادف بتایا۔ اور انسانوں کو اس کی اجازت بلکہ دعوت دی کہ اسکے ذریعہ وہ اپنی پوشیدہ و مستور محبت اور مشاہدہ و قرب کے فطری جذبہ کو تسکین دیں اور اپنی آسودگی کا سامان کریں۔ ارشاد ہے:

'' ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (سورہ حج۔ ۳۲)

ترجمہ : ''یہ بات ہو چکی اور جو کوئی (دین) خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا سو یہ (ادب) دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔''

دوسری جگہ آتا ہے۔

'' ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ '' (سورہ حج۔ ۳۰)

ترجمہ : یہ بات ہو چکی اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا، سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا۔''

جذبۂ عشق کی تسکین : امام غزالیؒ لکھتے ہیں۔ ''اگر اللہ تعالیٰ سے لقا کا شوق ہے تو مسلمان اس کے وسائل و اسباب اختیار کرنے پر لامحالہ مجبور ہوگا۔ عاشق اور محب ہر اس چیز کا مشتاق ہوتا ہے جس کی اضافت اس کے محبوب کی طرف ہو، کعبہ کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف ہے۔ اسلئے مسلمان کو قدرتی طور پر اس کا سب سے زیادہ مشتاق ہونا چاہئے۔ علاوہ اس اجر و ثواب کی طلب و احتیاج کے جس کا وعدہ بھی اس سے کیا گیا ہے۔'' (احیاء العلوم ۱/۲۴)

حضرت شاہ ولی اللہ بھی اسی نکتہ کو حج کی بنیادی حکمت بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''کبھی کبھی انسان کو اپنے رب کی طرف غایت درجہ اشتیاق ہوتا ہے اور محبت جوش مارتی ہے اور وہ اس شوق کی تسکین لئے اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سامان صرف حج ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ ۱۰/۵۹)

عقل و مادیت کے پرستاروں کے خلاف نعرۂ بغاوت : امام غزالیؒ نے حج کی حقیقت و روح کو بڑے عجیب اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''اس (بیت اللہ) کی وضع اور شکل ایک شاہی دربار یا شاہی ایوان کی طرح ہے، جہاں پر عشاق و اہلِ فراق ہر دشوار اور دور و دراز مقام سے افتاں و خیزاں، آشفتہ سر اور پراگندہ مُو ہو کر پہنچتے ہیں۔ رب البیت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے، اپنی حقارت کا احساس لئے ہوئے، اس کی عزت و جلال کے سامنے اپنے کو فراموش کئے ہوئے، اس علم و اعتراف کے ساتھ کہ وہ اس سے پاک اور بلند و برتر ہے کہ کوئی گھر اور چہار دیواری اس کو گھیر سکے، یا کوئی شہر اس کا احاطہ کر سکے تا کہ اس کی عبودیت و رقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور اطاعت و انقیاد اور تسلیم و رضا میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

اسی لئے ان کو ایسے اعمال اور نقل و حرکت کا پابند کیا گیا ہے، جن سے نہ نفس انسانی کو کوئی لگاؤ ہے۔ نہ عقل کی وہاں تک رسائی ہے، مثلاً رمی جمار (شیطان کو ایک خاص جگہ پہنچ کر پتھر مارنا) صفا و مروہ کے درمیان بار بار دوڑنا، اس قسم کے اعمال کمالِ عبودیت اور غایت درجہ فنائیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ایک قسم کی رحم دلی و غمخواری ہے، اس کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، اور عقل بھی اس کو قبول کرتی ہے، روزہ نفس کشی اور ان خواہشاتِ بشری کی سرکوبی کے لئے ہے، جن کو شیطان اپنی مقصد براری کے لئے استعمال کرتا ہے، اس میں دوسرے مشاغل کم کر کے عبادت میں انہماک و اشتغال کا پہلو واضح ہے، نماز میں رکوع و سجود اور ان افعال اور حرکات کے ذریعہ جن سے تواضع کی روح پیدا ہوتی ہے خدا کے سامنے اس کی کبریائی اور اپنے عجز کا اظہار ہے، اور اس سے دلوں کو خاص لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن رمیٔ جمار اور سعی اور اس طرح کے دوسرے اعمال ایسے ہیں، جن سے دل کو کوئی حظ اور سرور حاصل نہیں ہوتا، طبیعت بشری بھی ان کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عقل بھی ان کے معنی و مفہوم سے قاصر رہتی ہے، چنانچہ یہ عمل یا اقدار صرف اطاعت ہی کے جذبہ سے کیا جاتا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ خدا کا ایک حکم ہے جو بہر صورت واجب الاتباع ہے۔ اس سے مقصود عقل کو اس کے اختیارات سے محروم کر دینا اور نفس و طبیعت کو ان چیزوں سے دور رکھنا ہے، جن سے اس کو لگاؤ اور انس پیدا ہو سکتا ہے، اسلئے کہ جب کوئی چیز عقل سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے تو طبیعت اس کی طرف خود بخود چلنے لگتی ہے، اور طبیعت کا یہ رجحان خود اس عمل کا باعث اور محرک بن جاتا ہے اور اس میں کمال عبدیت اور مجرد اطاعت کی شان باقی نہیں، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کے موقع پر خصوصیت سے یہ لفظ کہے: "لَبَّيْكَ بِحَجَّةٍ حَقًّا تَعَبُّدًا وَرِقًّا" (لبیک حج پر سچے دل کے ساتھ غلامی اور عبدیت کے جذبہ کے ساتھ) حج کے علاوہ یہ الفاظ آپ نے کسی اور عبادت حتی کہ نماز کیلئے بھی استعمال نہیں فرمائے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے مخلوق کی نجات کا دار و مدار اس پر رکھا ہے کہ ان کے اعمال اطاعت و انقیاد اور تسلیم و عبودیت کے طریقہ اور سنت پر ہوں، اس لئے وہ اعمال و عبادات (جن کے اسرار و معانی عقل انسانی کی دسترس سے باہر ہیں) تزکیہ نفوس اور رجحان و طبیعت، اخلاق و فضائل سے ہٹا کر عبودیت کاملہ سے روشناس کرنے میں زیادہ مؤثر ہیں اس بات کی تہہ تک پہونچ جانے کے بعد یہ بات ہماری سمجھ میں خوب آجائے گی کہ ان افعال اور حرکات و سکنات پر تعجب دراصل ان عبادتوں کے مخصوص اسرار و مقاصد کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اور حج کی اصل بنیاد اور حقیقت سمجھنے کے لئے انشاء اللہ اتنا ہی کافی ہے۔" (احیاء العلوم ۱/۲۴۰)

رمیٔ جمار کے متعلق کہتے ہیں: "اس سے مقصود مجرد امتثال امر ہے تاکہ مکمل عبودیت کا مظاہرہ ہو سکے۔ عقل اور نفس کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، مزید برآں اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تشبہ ہے۔ اس لئے کہ ابلیس ملعون اسی جگہ ان کے حج میں شبہ پیدا کرنے یا کسی معصیت میں مبتلا کرنے آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اس کو کنکریاں ماریں تاکہ وہ ان کے پاس سے دفع ہو جائے اور اسکو ان سے کوئی توقع ہی باقی نہ رہ جائے، اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ان کے سامنے شیطان حقیقت میں آگیا تھا، اس لئے انہوں نے اس کو مارا، میرے سامنے تو شیطان نہیں ہے میں اس کو ماروں تو اسکو سمجھنا چاہئے کہ یہ خیال بھی شیطان ہی کا پیدا کردہ ہے اور وہی ہے جس نے یہ خیال تمہارے دل میں ڈالا ہے تاکہ شیطان کو ذلیل و خوار کرنے کا جو عزم اور ارادہ تمہارے اندر تھا وہ کمزور پڑ جائے۔

"تم کو جاننا چاہئے کہ ظاہر میں تم جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارتے ہو لیکن حقیقت میں وہ کنکریاں شیطان کے منہ پر پڑتی ہیں، اور اس کی کمر توڑ دیتی ہیں، اسلئے کہ اس کی تذلیل و توہین میں سب سے زیادہ اس تعمیل حکم سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اطاعتِ محض کے جذبہ کے ساتھ ہو، نفس یا عقل کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔" (احیاء العلوم ۱/۲۴۳)

قربانی کے سلسلے میں کھتے ھیں : جاننا چاہئے کہ یہ امتثال امر (یعنی قربانی) تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے، چنانچہ یہ حکم بھی فوراً بجالانا چاہئے اور یہ امید اللہ تعالیٰ کی ذات سے رکھنی چاہئے کہ اس کے ایک ایک جز کے بدلہ میں تمہارا ایک ایک جز آگ سے محفوظ رکھے گا، حدیث میں اسی طرح آیا ہے، قربانی جتنی بڑی ہوگی اور اس کے اجزا جتنے زیادہ ہوں گے آگ سے فدیئے بھی اسی قدر زیادہ ہوسکیں گے۔ (ایضاً)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے: ــ یہ بات بھی طہارت نفس میں داخل ہے کہ آدمی ان جگہوں میں اترے اور قیام کرے جہاں صالحین اور اولیاء اللہ ہمیشہ سے دل کی تعظیم اور ارادت کے ساتھ اترتے آئے ہیں اور اس کو خدا کے نام سے معمور کرتے رہے ہیں۔ یہ اہل خیر کے حق میں ملائکہ اور ملاء اعلیٰ کو متوجہ کرنے کا باعث ہوگا اور جب وہ وہاں اترے گا تو ان کا رنگ اس پر بھی چڑھ جائے گا۔''
(حجة الله البالغه ۱/۵۹)۔(۳۰۳) حج کے مزید فوائد و مصالح کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کریں۔

حجۃ الوداع

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ'' رسول اللہ ﷺ نو برس تک مدینہ میں رہے اور حج نہیں کیا۔ پھر دسویں سال لوگوں میں اعلان ہوا کہ آپ ﷺ حج کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، تو مدینہ منورہ میں بہت سارے لوگ جمع ہوگئے، سب کی خواہش تھی کہ آپ ﷺ کی پیروی کریں اور آپ کی طرح عمل (حج) کریں۔ غرض ہم سب آپ ﷺ کے ساتھ نکلے، یہاں تک کہ ذوالحلیفہ پہنچے، اور وہاں حضرت اسماء بنت عمیس کی زچگی ہوئی اور محمد بن ابی بکرؓ تولد ہوئے، تو انہوں نے آپ ﷺ سے کہلا بھیجا کہ میں کیا کروں؟ فرمایا'' غسل کرلو اور ایک کپڑے کا لنگوٹ باندھ لو اور احرام باندھ لو''۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں دو رکعت پڑھیں، اور قصواء اونٹنی پر سوار ہوئے، یہاں تک کہ جب وہ آپ ﷺ کو لے کر مقام بیداء (ایک مقام ہے مثل ٹیلہ کے) پر سیدھی ہوئی، تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے آگے کی جانب دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف تا حد نظر سوار اور پیادے ہی نظر آرہے تھے، آپ ﷺ ہمارے درمیان تھے، اور آپ ﷺ پر قرآن نازل ہوتا اور آپ اس کی تاویل (وحقیقت) کو خوب جانتے تھے، اور آپ نے جو بھی عمل کیا ہم نے بھی وہی کیا۔ پھر آپ ﷺ نے توحید کے ساتھ لبیک پکاری۔'' لَبَّيْكَ: اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ۔ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ ۔'' اور لوگوں نے بھی یہی لبیک پکاری جواب لوگ پکارتے ہیں اور آپ اپنی لبیک پکارتے رہے۔''

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ'' ہم حج کے سوا اور کچھ ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اور عمرہ کو پہچانتے ہی نہ تھے۔ (بلکہ ایام حج میں عمرہ بجا لانا ایام جاہلیت سے برا سمجھتے تھے۔ لیکن اسلام نے اس جہالت کا قلع قمع فرمایا) یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کے ساتھ ہم بیت اللہ میں آئے تو آپ نے رکن (حجر اسود) کا استلام کیا (چھوا) اور تین چکر میں رمل فرمایا (اچھل اچھل کر چھوٹے چھوٹے ڈگ (قدم) رکھ کر شانیں اچھال اچھال کر چلے) اور چار چکر عادت کے موافق (عام رفتار سے) چلے۔ پھر مقام ابراہیم پر تشریف لائے اور یہ آیت تلاوت فرمائی، (وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى) (یعنی مقرر کرو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ) اور مقام (ابراہیم) کو اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کیا۔ پھر میرے والد کہتے تھے اور میرے علم میں انہوں نے آپ ﷺ سے ہی ذکر کیا ہوگا۔ کہ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں اور ان میں قل ھو اللہ احد اور قل یا ایھا الکفرون کی تلاوت فرمائی۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹے پھر اسے استلام کیا پھر دروازہ سے صفا کی طرف تشریف لے گئے۔ جب صفا (پہاڑی) کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ (یعنی صفا اور

مروہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں) اور فرمایا کہ "جس سے اللہ نے شروع کیا اسی سے ہم شروع کرتے ہیں"۔ لہٰذا صفا سے (سعی) کو شروع کیا۔ تو آپ ﷺ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ کو دیکھا اور قبلہ کی طرف چہرہ انور کیا۔ اور اللہ کی توحید و کبریائی بیان کی۔ (یعنی لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہا) اور کہا۔ " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ اَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ " پھر اس کے بعد دعا کی، پھر ایسا ہی کہا، پھر دعا کی، غرض تین بار ایسا ہی کیا، پھر اتر کر مروہ کی طرف چلے، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کے قدم میدان کے درمیان میں اترے تو دوڑے یہاں تک کہ جب چڑھ گئے، تو پھر آہستہ چلنے لگے یہاں تک کہ وہ مروہ پر پہنچے۔ پھر مروہ پر بھی وہی کیا جو صفا پر کیا تھا۔ (یعنی کلماتِ مذکورہ، دعا، قبلہ رو ہونا وغیرہ) پھر مروہ پر طواف (سعی) مکمل ہوا (یعنی سات چکر ہو چکے)، تو آپ ﷺ نے فرمایا " جو بات بعد میں سامنے آئی، اگر پہلے ہی آ ئی ہوتی تو میں ہدی ساتھ نہ لے آتا (بلکہ مکہ ہی میں خرید لیتا) اور اپنے اس احرام حج کو عمرہ کر ڈالتا، تو اب تم میں سے جس کے ساتھ ہدی نہ ہو وہ احرام کھولدے، اور اس کو عمرہ (شمار) کرلے۔"

پھر سراقہ بن مالک جُعْشُم کھڑے ہوئے اور عرض کی کہ " یا رسول اللہ کیا یہ اسی سال کے لئے خاص ہے یا ہمیشہ کے لئے اجازت ہے" (حج کے ایام میں عمرہ کا جواز مراد ہے۔ نـــووی ؒ) تو آپ ﷺ نے انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر (تشبیک کرکے) ارشاد فرمایا کہ " عمرہ حج میں داخل ہو چکا۔ دو مرتبہ ارشاد فرمایا۔ پھر فرمایا نہیں (یعنی اس سال کی خصوصیت نہیں) بلکہ ہمیشہ کے لئے ہمیشہ کے لئے۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے نبی ﷺ کے اونٹ لے کر آئے، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ احرام کھول دیا ہے، اور رنگین کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور سرمہ لگائے ہوئی ہیں۔ تو حضرت علی نے اسے غلط سمجھا اور برا مانا، تو انہوں نے فرمایا کہ میرے والد محترم نے اس کا حکم فرمایا ہے، راوی نے فرمایا کہ حضرت علی عراق میں فرماتے تھے کہ میں حضرت فاطمہ کے احرام کھولنے کے سبب ان پر غصہ کرتا ہوا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تاکہ ان کی نقل کردہ بات کی تحقیق و استفسار کروں، اور عرض کی کہ میں نے ان کے احرام کھولنے پر ناراضگی کا اظہار کیا، تو آپ نے فرمایا کہ " فاطمہ نے سچ کہا (میں نے ہی ان کو احرام کھولنے کا حکم دیا تھا) تم نے جب حج کا قصد کیا (اور احرام باندھا) تو کیا کہا۔" عرض کیا۔ " یا اللہ میں اہلال کرتا ہوں (احرام باندھتا ہوں) جیسا کہ آپ ﷺ نے اہلال کیا۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ " میرے ساتھ ہدی ہے، (اس لئے میں نے احرام نہیں کھولا)، اب تم بھی احرام نہ کھولو۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: پھر وہ اونٹ جو حضرت علی یمن سے لائے اور جو نبی ﷺ اپنے ساتھ لائے سب مل کر سو اونٹ ہو گئے، فرمایا: پھر سوائے آپ ﷺ کے اور ان صحابہ کے جن کے ساتھ ہدی کے جانور تھے، دیگر تمام صحابہ نے احرام کھول دیا، اور بال کترا لئے۔ پھر جب ترویہ کا دن ہوا، (یعنی ۸ رذوالحجہ) تو سب لوگ منیٰ کو چلے اور حج کا احرام باندھا۔ آپ ﷺ سوار ہو کر نکلے۔ منیٰ میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور (۹ رذی الحجہ کو) فجر کی نماز ادا فرمائی، پھر کچھ دیر ٹھہرے، یہاں تک کہ سورج طلوع ہوا، اور نمرہ (عرفات کے قریب ایک جگہ، جو عرفات میں داخل نہیں ہے) میں بالوں کا ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا۔ پھر آپ ﷺ چلے اور قریش کو یقین تھا کہ آپ ﷺ مشعر حرام (مزدلفہ کی ایک پہاڑی) میں وقوف کریں گے، جیسا کہ قریش جاہلیت میں کیا کرتے تھے، آپ ﷺ وہاں سے آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ عرفہ پہنچ گئے، تو دیکھا کہ مقام نمرہ میں آپ کیلئے خیمہ لگ چکا ہے، لہٰذا آپ ﷺ اس میں اترے، پھر جب زوال ہوا تو آپ کے حکم سے قصواء اونٹنی کسی گئی اور آپ ﷺ وادی کے بیچ میں پہنچے۔

پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا، فرمایا: " تمہارا خون اور تمہارے مال ایک دوسرے پر حرام ہیں، جیسے آج کے دن

(۱۰ ذی الحجہ) کی حرمت ہے، اس مہینے کے اندر، اس شہر کے اندر (یعنی حرم پاک میں) سن لو! زمانہ جاہلیت کی ہر چیز میرے دونوں قدموں تلے پامال ہے، (یعنی اسلام کی روشنی کے آگے اب ان چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں) اور جاہلیت کے خون بے اعتبار ہو گئے، (اب اس کے بدلہ کی گنجائش نہیں)، اور پہلا وہ خون جو میں اپنے خونوں میں سے معاف کئے دیتا ہوں، ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے، جو قبیلۂ بنو سعد میں دودھ پیتا تھا اور اس کو قبیلۂ ہذیل نے قتل کر ڈالا۔"

"زمانۂ جاہلیت کا سود سب چھوڑ دیا گیا، اور سب سے پہلے ہم ہمارا سود یعنی حضرت عباس بن عبدالمطلب کا سود چھوڑ دیتے ہیں، وہ سب معاف کر دیا گیا۔ اور تم لوگ اب ڈرو اللہ سے کہ عورتوں پر زیادتی نہ کرو، اس لئے کہ ان کو تم نے اللہ کی امان میں لیا ہے، اور ان کے ستر (فرج و شرمگاہ) کو اللہ تعالیٰ کے کلمہ سے حلال کیا ہے، اور ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ تمہارے بچھونے پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں (یعنی تمہارے گھر میں) جس کا آنا تم کو ناگوار ہو، پھر اگر وہ ایسا کریں (اور تمہارا یہ حکم نہ مانیں) تو ان کو ایسا مارو کہ سخت چوٹ نہ لگے۔ (یعنی کہ ان کا رزق (کھانا پینا) اور لباس دستور کے موافق تمہارے ذمہ ہے۔"

"اور تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں، کہ اگر تم اسے مضبوط پکڑے رہو، (اس پر قائم اور کاربند رہو) تو ہرگز کبھی گمراہ نہ ہو۔ (اور وہ اہم ترین نور ہدایت) اللہ کی کتاب (ہے۔ یعنی قرآن مجید)۔ اور تم لوگوں سے (بروز قیامت) میرے متعلق سوال ہوگا، تو تم کیا جواب دو گے؟" صحابہ کرام نے عرض کیا۔ "ہم گواہی دیں گے کہ بے شک آپ ﷺ نے (اللہ تبارک وتعالیٰ کا پیغام اور دینِ حق) پہنچایا اور (رسالت کا حق) ادا فرمایا اور (امت کے ساتھ) خیر خواہی کا معاملہ فرمایا"۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی انگشتِ شہادت (کلمہ کی انگلی) سے بایں طور اشارہ فرمایا کہ اسے آسمان کی طرف اٹھاتے تھے اور لوگوں کی جانب جھکاتے تھے اور فرماتے تھے۔ "یا اللہ گواہ رہو" تین بار (یہی فرمایا اور یوں ہی اشارہ کیا)

پھر اذان واقامت ہوئی اور ظہر کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ (سنت وغیرہ) نہیں پڑھی۔ پھر آپ ﷺ سوار ہو کر موقف (وقوف کی جگہ) پہنچے، پھر اپنی قصواء اونٹنی کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور پگڈنڈی کو اپنے آگے کر لیا، اور قبلہ رو ہو کر وقوف فرمایا، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا، زردی تھوڑی تھوڑی جاتی رہی اور سورج کی ٹکیہ ڈوب گئی۔ اور حضرت اسامہ کو (اپنی سواری پر) پیچھے بٹھا لیا اور لوٹے۔ اور قصواء کی مہار اس قدر کھینچی ہوئی تھی کہ اس کا سر کجاوہ کے آگے مَورک میں لگ گیا تھا۔ (مَورک وہ جگہ ہے جہاں بعض وقت سوار تھک کر اپنا لٹکا ہوا پیر رکھتا ہے) اور آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے (اور فرماتے تھے) "اے لوگو! سکون واطمینان سے چلتے رہو۔" اور جب کسی ریت کی ڈھیری پر آتے (جہاں بھیڑ کم پاتے) تو ذرا مہار ڈھیلی کر دیتے، یہاں تک کہ اونٹنی چڑھ جاتی۔

آخر مزدلفہ پہنچ گئے، اور وہاں مغرب وعشاء ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھی، دونوں کے درمیان کوئی سنت نہیں پڑھی، پھر آپ ﷺ لیٹ گئے یہاں تک کہ صبح صادق ہوئی، جب فجر خوب واضح (ظاہر) ہوئی تو اذان واقامت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہو کر مشعر حرام تشریف لائے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کر کے دعاء تکبیر، تہلیل اور توحید میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ خوب روشنی پھیل گئی، تو طلوع آفتاب سے قبل ہی وہاں سے روانہ ہوئے۔ اور حضرت فضل بن عباس کو اپنے پیچھے سوار کر لیا، وہ نوجوان، خوبصورت بالوں والے، گورے چٹے خوبصورت انسان تھے۔ جب آپ روانہ ہوئے تو ایک گروہ عورتوں کا (اونٹ پر سوار) چلا جاتا تھا، اور فضل ان کی طرف دیکھنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فضل کے چہرہ پر اپنا دست مبارک رکھا، اور فضل نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور دیکھنے لگے تو رسول اللہ

ﷺ نے پھر اپنا ہاتھ اِدھر پھیر کر ان کے منہ پر رکھ دیا تو فضل نے وہاں سے چہرہ پھیر لیا اور دیکھنے لگے۔

پھر آپ بطن مُحَسِّر میں پہنچے تو اونٹنی کو ذرا تیز چلایا اور بیچ کی راہ لی جو جمرۂ کبریٰ پر جانکلی ہے، یہاں تک کہ اس جمرہ کے پاس آئے جو درخت کے پاس ہے، (اسی کو جمرۂ عقبہ کہتے ہیں) اور سات کنکریاں اس کو ماریں۔ ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے (ایسی کنکریاں ماریں) جو چٹکی سے ماری جاتی ہیں (اور باقلا کے دانہ کے برابر ہوں) اور بطن وادی سے (وادی کے بیچ سے) کھڑے ہو کر ماریں (کہ منی اور عرفات و مزدلفہ دائیں طرف اور مکہ بائیں طرف تھا)۔ پھر نحر کی جگہ (قربانی کی جگہ) آئے اور اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ نحر فرمائے، بقیہ حضرت علی کے حوالہ کئے اور انہوں نے نحر کئے۔ اور ان کو آپ ﷺ نے اپنے ہدی میں شریک کیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے ہر اونٹ میں سے ایک ایک ٹکڑا کاٹ کر ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا۔ پھر (آپ ﷺ اور حضرت علی) دونوں نے اس میں سے گوشت کھایا اور شوربہ پیا۔

پھر آپ ﷺ سوار ہو کر بیت اللہ شریف تشریف لے گئے، اور طواف افاضہ کیا، اور مکہ میں ظہر پڑھی، اور بنی عبدالمطلب کے پاس آئے کہ وہ لوگ زمزم پر پانی پلا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اے اولادِ عبدالمطلب پانی نکالو (اور بھرو) اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ لوگ بھیڑ کر کے تمہیں پانی بھرنے نہ دیں گے، تو میں بھی تمہارا شریک ہو کر پانی بھرتا۔ (یعنی آپ بھرتے تو سنت ہو جاتا اور ساری امت بھرنے لگتی اور ان کی سقایت جاری رہتی) پھر ان لوگوں نے ایک ڈول آپ کی خدمت میں پیش کیا اور آپ نے اس میں سے پانی پیا۔'' (رواہ مسلم و ابوداود)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ (آمین)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تُحفَـــةُ البَـــارِی

فی الفقہ الشافعی

جلد دوم

مؤلف

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ

ترتیب وپیشکش

محمد یوشع محتشم

کتاب البیوع (خرید و فروخت کا بیان)

آیت: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا " (البقرہ - ۲۷۵) (جن لوگوں نے اپنی حماقت اور ضد سے سود کی حلت کے لئے بیع سے استدلال کرنا چاہا اللہ تعالیٰ نے ان پر رد کرتے ہوئے فرمایا) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا)

۲) لَاتَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء۔ ۲۹) آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (مباح طور پر ہو مثلاً) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے (واقع) ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی شرائط شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں۔

قرآن پاک میں بیع سے متعلق دیگر آیات بھی ہیں جو بطور استدلال متعلقہ مسائل کے ضمن میں پیش ہوں گے۔

احادیث: بیع کے متعلق قولی، فعلی، اور تقریری احادیث بکثرت وارد ہیں جو اس کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں۔

۱) آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی رسی لے جائے اور ایندھن کا ایک گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھالائے اور اسے فروخت کر دے جس سے اللہ اس کے چہرہ کو (سوال اور بھیک کی ذلت سے) بچائے یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت لوگوں کے روبرو ہاتھ پھیلانے کے۔" (بخاری فی الزکاۃ)

۲) آپ ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ اناج قرض (ادھار) خریدا اور اپنی زرہ اس کے پاس رہن رکھی۔ (بخاری فی البیوع۔ مسلم فی المساقاۃ)

۳) صحابۂ کرام آپ ﷺ کے روبرو یا دانستگی میں بیع و شرا کرتے (خرید و فروخت) اور آپ ﷺ اس پر نکیر نہ کرتے۔ جس کی بکثرت مثالیں ہیں۔ (دیکھئے بخاری کتاب البیوع کے ابواب) مختلف مسائل پر بحث کے دوران بطور استدلال کئی روایات کا تذکرہ ہوگا جو بیع کے جواز اور مشروعیت پر واضح دلیل ہوں گی۔

لہٰذا قرآن و سنت اور مختلف زمانوں میں امت کے اجماع سے خرید و فروخت کی مشروعیت اور اسلام میں اس کا جواز ثابت ہے۔

عربی میں لفظ "بیع" کسی کے عوض کسی کے لین دین کو کہتے ہیں خواہ وہ مال ہو یا نہ ہو۔ فقہاء کرام کی اصطلاح میں "بیع" سے ایسا عقد مراد ہے جس میں مال کے مقابلہ میں مال کا لین دین ہو جس سے تابیدی ملکیت حاصل ہو۔ (مستقل اور ہمیشہ کی ملکیت حاصل ہو)

حکمت: انسان مختلف اشیاء کا ضرورتمند ہوتا ہے اور بالعموم ہر شخص بذاتِ خود اپنی ساری ضروریات فراہم نہیں کر سکتا، لہٰذا آپس میں ان اشیاء کا تبادلہ ناگزیر ٹھہرا، اور یہ تبادلہ بغیر طرفین کی رضامندی کے حاصل نہیں ہو سکتا، اسی رضامندی کو عقدِ بیع کہیں گے۔ اسی طرح کسی کے پاس رقم ہوگی لیکن ضرورت کی چیز نہ ہوگی اور دوسرے کے پاس چیز ہے لیکن اسے رقم کی ضرورت ہے، لہٰذا یہ دونوں آپسی تبادلہ سے اپنا مقصد حل کر لیں گے، نیز انسان کی فطرت میں نفع اور فائدہ کی تلاش وسعی داخل ہے، اور اس مقصد کے حصول کا مناسب ذریعہ خرید و فروخت اور تجارت ہے۔ واللہ اعلم۔

عقد بیع کے ارکان

ہر عقد کے وجود کے لئے چند ارکان اور صحت کے لئے ان ارکان کی کچھ شرائط ضروری ہیں تاکہ اللہ کے مقررہ شرعی احکام کا ترتب اور ظہور ہو۔ یہی تفصیلات ذیل میں درج ہیں۔ بیع کے تین ارکان ہیں:

۱) عَاقِدان (طرفین۔فروخت کرنے والا اور خریدنے والا) انہیں دونوں کے اتفاق سے عقد کا ظہور ہوتا ہے، ہر ایک میں درج ذیل شرائط لازمی ہیں۔

(الف) رشید ھو۔ یعنی عاقل بالغ اور مالی تصرفات کی صحیح صلاحیت اور سمجھ بوجھ رکھتا ہو، پس بچہ اور پاگل کا لین دین صحیح نہ ہوگا۔اسی طرح سفاہت (مالی تصرف میں سادہ لوح ہونا) کی وجہ سے جس پر حجر (روک اور پابندی) لگی ہو یعنی جو ناجائز امور میں مال صرف کرے، یا مباحات میں برباد کرے یا کم عقلی اور سادگی ولاعلمی کی وجہ سے کافی نقصان اٹھاتا ہو، اس کی بیع بھی صحیح نہ ہوگی۔اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے'' وَابْتَلُوْا الْيَتَامٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوْا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْداً فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (النساء۔ ٦) اور تم یتیموں کو آزمالیا کرو یہاں تک کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جاویں (یعنی بالغ ہوجائیں کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت بلوغ سے ہوتی ہے) پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو (یعنی حفاظت ورعایتِ مصالح مال سلیقہ اور انتظام ان میں پاؤ) تو ان کے اموال ان کے حوالے کردو (اور اگر ہنوز سلیقہ یا انتظام نہ معلوم ہو تو حوالے نہ کرو)

تو اللہ تعالیٰ نے ذمہ داروں کو اپنے ماتحت یتیموں کو بلوغ کے وقت معاملات میں آزمانے کا حکم دیا، اور مال میں صحیح تصرف کی صلاحیت کی صورت میں مال ان کے حوالے کیا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ رشد (مالی تصرف کی صحیح ہدایت اور سمجھ) مال کی سپردگی اور قبضہ میں دینے اور تصرف کی صحت کے لئے شرط ہے۔اور خرید وفروخت بھی مالی تصرف ہے لہٰذا اس میں بھی رشد شرط ہے۔

بچہ اور پاگل چونکہ غیر مکلف ہیں اس لئے ان میں مالی تصرف کی اہلیت نہیں ہے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے'' تین مرفوع القلم ہیں (۱) پاگل مغلوب العقل شفایاب ہونے تک (۲) سویا ہوا شخص بیدار ہونے تک (۳) بچہ بالغ ہونے تک'' (ابوداود۔ الحدود) مرفوع القلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے مواخذہ اور باز پرس نہ ہوگی اور عقود پر احکام کا ترتب ہوتا ہے، لہٰذا جس کے تصرفات پر مواخذہ نہ ہو سکے، وہ اس تصرف کے کرنے کا اہل نہ ہوگا۔

(ب) بااختیار ھو۔ لین دین کے جس معاملہ کو انجام دے رہا ہے، اپنی مرضی اور اختیار سے بلا کسی جبر واکراہ کے انجام دے، فرمان باری ہے'' اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ '' (النساء : ۲۹) لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں۔''

فرمان رسول ﷺ ہے'' ۔بیع تو (تبھی معتبر اور صحیح ہوگی جبکہ خرید وفروخت کرنے والے کی آپسی) رضامندی سے ہو'' (ابن ماجہ۔ التجارات)

لہٰذا کوئی جبر واکراہ کی وجہ سے خرید وفروخت کرلے تو رضامندی نہ ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں ہے۔کیونکہ رضامندی تو ایک مخفی اور پوشیدہ معاملہ ہے، جس پر بغیر اکراہ اور زبردستی کے قولی یا فعلی تصرف دلالت کرتی ہے بصورت اکراہ یہ ناپید، یا مشکوک ہے۔لہٰذا محض اقوال کا اعتبار نہ ہوگا، اور بیع صحیح نہ ہوگی۔

ہزل (ٹھٹھا، بیہودگی اور بکواس) کے طور پر خرید وفروخت کے الفاظ ادا کرنے سے بھی بیع نہ ہوگی، کیونکہ یہ انداز عدم رضا اور عدم قصد پر دلالت کرتا ہے۔

اگر برحق اکراہ ہو تو بیع صحیح ہے۔ مثلاً کسی پر دوسرے کا قرض ہو اور بلا عذر وہ ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہے اور اپنے اسباب فروخت نہ کرے تو قاضی اسے فروخت کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ تاکہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہو سکے، اور یہ بیع صحیح ہوگی، شارع کے رضا کو اس کے رضا کے قائم مقام سمجھ لیں گے۔

(ج) طرفین کا تعدد (طرفین الگ الگ ہوں) یعنی خریدنے والا اور فروخت کرنے والا جدا جدا ہوں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی مصلحتوں کا دوسرے کی مصلحتوں سے ٹکراؤ ہوگا۔ بائع تو زیادہ سے زیادہ قیمت اور کم سے کم شرائط کا متمنی ہوگا اور مشتری (خریدنے والا) اس کے برعکس، اسی طرح دیگر امور، اسی طرح بیع کے بعض احکام مبیع (فروخت شدہ شئ) کے قبضہ سے متعلق اور بعض احکام قیمت کے قبضہ سے متعلق ہوتے ہیں، اور ہر ایک پر کچھ ذمہ داری اور حق سوال وباز پرس مرتب ہوتا ہے، جو کبھی دوسرے سے متعارض ہوگا، لہٰذا ایک ہی شخص میں دوطرفہ ذمہ داری کا جمع ہونا ناممکن ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں اگر کسی نے دوسرے کو اپنے اموال کے فروخت کے لئے وکیل بنایا تو مذکورہ وکیل خود اپنے لئے وہ اموال نہیں خرید سکتا، یا کسی نے کوئی چیز خریدنے کے لئے وکیل بنایا اور وہ چیز خود وکیل کے پاس موجود ہو تو وکیل اپنی ہی چیز مؤکل کے لئے نہیں خرید سکتا، اسی طرح کوئی دو آدمیوں کی طرف سے وکیل ہو تو وہ ان میں سے ایک کا مال دوسرے کے لئے نہیں خرید سکتا، علت وہی جو گذر چکی۔ (مثلاً زید نے اپنی بکری فروخت کرنے کے لئے بکر کو وکیل بنایا اور خالد نے ایک بکری خریدنے کے لئے بکر کو وکیل بنایا تو بکر زید کی مذکورہ بکری خالد کے لئے نہیں خرید سکتا) کیونکہ مال پر قبضہ یا مال کا سپرد کرنا وغیرہ بیع سے متعلقہ حقوق کا تعلق وکیل سے ہوگا۔ جس میں کبھی نزاع اور قاضی کی طرف فیصلہ کے لئے رجوع کی ضرورت پیش آئے گی۔ لہٰذا ایک وقت میں ایک ہی شخص مدعی اور مدعی علیہ بن جائے یہ ناممکن ہے۔

البتہ جو خود تصرف سے قاصر ہو تو اس کا والد (بطور ولی) اس کا مال خرید لے (یا برعکس صورت ہو) تو جائز ہے۔ کیونکہ اس کی بھرپور شفقت کی وجہ سے غبن (نقصان اور خسارہ میں ڈالنے) کی تہمت کا سوال نہیں۔ اسی طرح قاضی اپنے ماتحت قاصرین کا مال ایک دوسرے کو فروخت کرسکتا ہے، کیونکہ اس کی ولایت عام ہے اور کبھی مجبوراً اس طرح بیع کی نوبت آئے گی۔

(د) بینا ہو ۔ نابینا کا لین دین صحیح نہیں ہے۔ وہ خرید وفروخت کے لئے کسی کو وکیل بنادے۔

(۲) صیغہ ۔ یعنی وہ الفاظ جو عاقدین (خرید وفروخت کرنے والے) بیع کے قصد اور رضامندی کے متعلق ادا کریں۔ یہ بات گذر چکی کہ بیع کی صحت کے لئے رضامندی شرط ہے۔ اور رضامندی ایک مخفی اور پوشیدہ امر ہے، اس کے قائم مقام اس پر دلالت کرنے والے تصرف کو رکھا گیا، جو عاقدین کی زبانی ادا ہوتی ہے۔ اسی کو "صیغہ" کہا جائے گا۔ جو ایجاب اور قبول پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایجاب = مثلاً بائع (فروخت کرنے والے) کا یہ کہنا "میں نے آپ کو یہ کپڑا سو روپے میں فروخت کیا۔"

قبول = مشتری (خریدنے والے) کا یہ کہنا "میں نے اسے قبول کرلیا" یا "میں نے اسے خرید لیا" وغیرہ صیغہ صریح اور کنایہ دونوں ہوسکتا ہے۔

صریح = ہر وہ لفظ جو صراحتاً خرید وفروخت پر دلالت کرے، مثلاً: فروخت کیا، ملکیت میں دے دیا، خرید لیا، ملکیت میں لے لیا،

قبول کرلیا وغیرہ

کنایۃ = ایسے الفاظ جس میں بیع اور غیر بیع دونوں کا احتمال ہو۔ مثلاً بائع کہے میں نے یہ دس روپئے میں تمہیں دے دی یا دس روپئے میں لے لو، یا دس روپئے میں قبضہ کرلو۔ یا خریدار کہے میں نے لے لیا یا قبضہ کرلیا۔

تمام شرائط موجود ہوں تو صریح الفاظ کی ادائیگی سے بیع منعقد ہوگی، نیت کی محتاج نہ ہوگی۔ جبکہ کنایہ الفاظ سے بصورت نیت یا قرائن جو ارادۂ بیع پر دلالت کرے، بیع منعقد ہوگی (ورنہ نہیں)۔

مُعاطَاۃ: بائع بغیر لفظ کے چیز خریدار کے سپرد کرے اور وہ بغیر لفظ کے لے لے یا کسی ایک کی جانب سے لفظ پایا جائے اور دوسرے کی جانب سے نہ پایا جائے، تو اسے بیع معاطاۃ کہا جائے گا۔

شافعی مسلک میں مشہور یہ ہے کہ عاقدین کی طرف سے الفاظ لازم ہیں اور معاطاۃ کے طرز پر بیع (بلا الفاظ کے خرید وفروخت) صحیح نہیں، بعض فقہاء نے چھوٹی موٹی اور کم قیمت اشیاء میں اسے صحیح قرار دیا ہے، البتہ نفیس اور زیادہ قیمتی اشیاء میں غیر صحیح کہا ہے،

امام نووی رحمہ اللہ وغیرہ بعض متاخرین فقہاء شافعیہ نے مطلقاً بیع معاطاۃ کو صحیح قرار دیا ہے، جبکہ یہ طریقہ معروف ہو (اور عام طور پر لوگوں میں اس طرز پر لین دین ہوتا ہو) اور جبکہ دورِ حاضر کا عام ماحول بغیر لفظی ایجاب وقبول کے لین دین کا ہے تو لوگوں کی سہولت کی خاطر اس کے جواز کا فتویٰ ہی بہتر ہے، تاکہ بیع باطل اور لوگ گنہگار نہ شمار ہوں، کیونکہ شاذ ونادر ہی عاقدین ایجاب وقبول کے کلمات ادا کرتے ہیں۔

سابقہ تفصیلات اس کے حق میں تھیں جو گفتگو پر قادر ہو، جو گونگا ہو اس کا واضح اشارہ جو ان تصرفات میں معروف ہو کافی ہے۔ اور اسے ضرورۃً الفاظ کے قائم مقام شمار کریں گے، کیونکہ یہ گفتگو کی طرح مافی الضمیر کی نمائندگی کرتا ہے۔

کسی غائب یا حاضر کو تحریراً فروخت کرے (زبان سے لفظ ادا نہ کرے) تو یہ بھی صحیح ہے۔ سامنے والے کو علم ہوتے ہی وہ قبول کرے تو بیع صحیح ہوگی (حاشیۃ الجمل علی فتح الوھاب ۳/۱۰)

صیغۂ عقد کے شرائط: (۱) ایجاب وقبول کے درمیان اتنا فاصلہ نہ ہو جس سے عرفاً قبول سے اعراض سمجھا جائے، اسی کو مجلس عقد کا اتحاد کہا جاتا ہے، بائع کے کلماتِ ایجاب کے بعد کافی دیر خاموشی رہی یا درمیان میں عقد سے غیر متعلق کوئی گفتگو ہو خواہ فاصلہ کم ہو، پھر خریدار قبول کرے تو عقد صحیح نہ ہوگا۔ اگر ایجاب کے بعد عقد ہی سے متعلق گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا، بعد میں خریدار نے قبول کیا تو عقد صحیح ہے، خواہ فاصلہ طویل ہو۔

(۲) ایجاب وقبول ہر پہلو سے آپس میں متفق اور مطابق ہو۔ کوئی کہے "میں نے تمہیں سو روپئے میں فروخت کیا" تو دوسرے نے کہا "میں نے ۵۰ روپئے میں خریدا" یا کہے "میں نے یہ گھر ہزار میں فروخت کیا" تو اس نے کہا "میں نے نصف گھر ۵۰۰ پانچسو میں خرید لیا" "یا کہے" میں نے نقد ہزار میں بیچا" اور وہ کہے" میں نے ادھار ہزار میں خریدا" تو ان تمام صورتوں میں بیع منعقد نہ ہوگی، کیونکہ ایجاب و قبول میں موافقت نہیں ہے۔ البتہ پہلا شخص دوبارہ دوسرے شخص (خریدار) کے کلمات قبول کے مطابق کلمات ادا کرے تو بیع منعقد ہوگی، ایجابِ اوّل فضول ہو جائے گا، قبولِ اوّل ایجاب ہو جائے گا اور قبولِ ثانی حقیقتاً قبول ہوگا جو ایجاب کے موافق ہے۔ (مذکورہ پہلی مثال میں بعد میں بائع کہے کہ میں نے ۵۰ روپے میں فروخت کردیا تو یہ قبول صحیح ہوا اور بیع منعقد ہوئی۔

(۳) قبول مکمل ایجاب اور اس کے مصالح کے بعد ہو، پس اگر فروخت کنندہ نے کہا: میں نے یہ کپڑا ہزار درہم میں ایک ماہ کی ادھاری پر تین دن کے خیار کے شرط پر فروخت کیا، اور خریدار اس کے ان الفاظ سے فارغ ہونے سے قبل ہی قبول کرے، تو یہ باطل

ہے۔(مغنی ۶/۲)

(۳) بیع کسی شرط پر معلق نہ ہو، یا کسی وقت کے ساتھ محدود نہ ہو، لہٰذا صیغہ ایسا ہو جس سے فوراً ہی عقد منعقد ہونے پر اور ہمیشہ ملکیت کے ثبوت پر دلالت ہو، اگر کسی نے یوں کہا" میں نے آپ کو یہ مکان فروخت کیا اگر فلاں شخص آ جائے تو، یا فلاں ماہ میں" اور دوسرے نے قبول کرلیا تو اس شرط کی وجہ سے عقد صحیح نہ ہوگا، کیونکہ تعلیق سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیع کا حتمی اور پختہ ارادہ نہیں ہے اور اس سے وہ راضی نہیں ہے اور گذر چکا کہ رضامندی شرط ہے۔

اسی طرح یہ کہا کہ" یہ گاڑی سال بھر کے لئے آپ کو فروخت کردی" اور اس نے کہا" میں نے خرید لی" تو مدت کی قید کی وجہ سے یہ بیع منعقد نہ ہوگی، اس لئے کہ اعیان (اشیاء) کی ملکیت میں توقیت (تحدید وقت ومدت) کی گنجائش نہیں۔ (وہ تو ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے)۔

یہ مسئلہ اس وقت ہے جب کہ توقیت یا تعلیق کا تعلق" مبیع" (فروخت شدہ شئی) سے ہو، اگر قیمت میں ہو مثلاً اس شرط پر خریدا کہ قیمت فلاں ماہ کے ابتدا میں، یا دو ماہ بعد ادا کرے گا، تو بیع صحیح ہے، اس لئے کہ قیمت ادھار ہے، جو ذمہ میں ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس میں توقیت وتعلیق کی گنجائش ہے بخلاف اعیان کے۔

اگر بیع مقایضہ ہو یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے بالمقابل فروخت کرے (روپئے پیسے نہ ہوں) مثلاً گاڑی کے عوض گاڑی یا مکان، تو اس صورت میں بھی تعلیق کی گنجائش نہیں۔

۳) معقود علیہ (محل عقد یعنی فروخت شدہ شئی اور قیمت) یہ بیع کا تیسرا رکن ہے۔ اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

(الف) عقد کے وقت مبیع (چیز) موجود ہو۔ لہٰذا معدوم (غیر موجود) چیز کی بیع جائز نہیں، مثلاً ان پھلوں کی بیع جو آئندہ درخت پر لگنے والے ہوں، یا وہ بچے جو بکریاں آئندہ جنیں، جو معدوم کے حکم میں ہو، اس کی بیع بھی جائز نہیں مثلاً جانوروں کا حمل، یا پستان میں موجود دودھ وغیرہ، کیونکہ حدیث میں ایسی چیز کے فروخت سے روکا گیا ہے جو اپنے پاس نہ ہو۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام سے فرمایا" جو چیز تمہارے پاس نہ ہو، وہ فروخت مت کرو۔" (ابوداود، نسائی، ترمذی)

(۲) آپ ﷺ نے بیع الغرر (دھوکہ کے بیع) سے منع فرمایا ہے۔" (مسلم)

مذکورہ بیع وجود وعدم وجود کے درمیان باعثِ ہلاکت اور جہالت کو شامل ہے جو غرر ہی میں شمار ہوگی۔

(ب) شرعاً مال متقوم ہو (شرعاً جو مال شمار ہو اور اسکی کچھ قیمت ہو) نجس اور حرام اشیاء کی خرید وفروخت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا مبیع یا قیمت شراب، مردار، گوبر یا کتا ہو تو بیع صحیح نہیں ہے۔

حدیث (۱): آپ ﷺ نے فرمایا" بے شک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب اور مردار اور سوّر اور بتوں کے فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔" عرض کیا گیا، مردار کی چربی کشتیوں میں لگانے، بدن پر ملنے اور لوگوں کے چراغ میں استعمال ہوتا ہے، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ فرمایا" نہیں، وہ حرام ہے" پھر اس موقع سے آپ ﷺ نے فرمایا" یہودیوں کو اللہ مار ڈالے (ان پر لعنت ہو)، جب اللہ نے ان پر چربی حرام کردی تو انہوں نے اسے پگھلا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھا گئے (استعمال کی)" (بخاری، مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا" (بخاری۔ مسلم)

حدیث میں مذکورہ ممنوعہ اشیاء پر دیگر ایسی اشیاء کو قیاس کیا جائے گا جو حرام اور نجس ہو، وہ متنجس اشیاء (وہ پاک اشیاء جو نجس ہو چکی

ہوں) جن کو اب پاک کرنا ممکن نہ ہو اس کی بیع بھی ممنوع ہے جیسے سرکہ، دودھ، تیل، سیال گھی وغیرہ (جبکہ ان میں نجاست گر جائے)

جن اشیاء کو پاک کرنا ممکن ہو، اس کی خرید وفروخت صحیح ہے، یہ پاک ہی کے حکم میں ہے۔ (مثلاً نجس کپڑا، برتن وغیرہ کہ دھونے سے پاک ہو جائیں گی)

(ج) شرعاً اور عرفاً قابل انتفاع ہو= یعنی عرفاً اس میں کوئی مقصود نفع وفائدہ ہو، جو شرعاً مباح ہو، لہٰذا زمینی کیڑے مکوڑے (حشرات الارض)، موذی حیوانات جن سے کوئی مناسب نفع حاصل نہ کیا جاسکے، آلات لہو (آلات موسیقی) وغیرہ کی خرید وفروخت صحیح نہیں، کیونکہ بغیر مناسب نفع کے مال صرف کرنا، اسے ضائع کرنا ہے، اور آپ ﷺ نے اضاعتِ مال (مال برباد کرنے) سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری الاستقراض)

شکار کے لئے تیندوا، قتال ولڑائی کے لئے ہاتھی، چوکیداری کے لئے بندر اور شہد کے لئے مکھیوں وغیرہ کی بیع جائز ہے، کیونکہ مناسب ومباح نفع ومقصد موجود ہے اور کتے کی طرح ان میں کسی کی بالخصوص ممانعت وارد نہیں ہے۔

بوقتِ عقد کوئی چیز نفع بخش نہ ہو، لیکن مستقبل میں نفع بخش ہو تو بیع جائز ہے۔ مثلاً چھوٹا بچھڑا۔

(د) حساً اور شرعاً اس کے سپرد کرنے پر قادر ہو: اگر عاقد (عقد کرنے والا چاہے خریدار ہو یا فروخت کرنے والا) مبیع یا معین ثمن (قیمت) کی ادائیگی پر بوقتِ عقد قادر نہ ہو تو بیع منعقد نہیں ہوگی، کیونکہ دوسرے شخص کو اپنی رقم یا چیز کے عوض کا یقین نہیں ہے، تو گویا اس کا صرف کرنا، اضاعتِ مال ہے جس کی ممانعت گذر چکی، پس تلف شدہ یا گمشدہ گاڑی کی فروخت، ہوا میں اڑنے والے پرندے یا پانی میں تیرنے والی مچھلی وغیرہ کی بیع صحیح نہیں، البتہ غاصب خود خریدے یا خریدار غاصب سے چھین لینے پر قادر ہو تو بیع صحیح ہے۔

کسی ایسی شئی کا معین حصہ فروخت کرنا جس کی تقسیم سے قیمت گھٹ جائے اور وہ قابل انتفاع نہ رہے۔ (مثلاً کتاب، تلوار، چھوٹا سا مکان وغیرہ) صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ شرعاً اس کے سپرد کرنے پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ سپردگی کے لئے تقسیم کر کے جدا کرنا لازم جس میں اس کا نقص ہے اور منفعت فوت ہو جاتی ہے اور یہ اضاعتِ مال ہے جو کہ ممنوع ہے۔ البتہ اس کا غیر معین جز (بطور شیوع) فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں خریدار تقسیم کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اور دونوں باری باری اس سے نفع اٹھائیں۔

(ھ) عاقد کو ولایت یا ملکیت کی رو سے اس پر اختیار حاصل ہو:- پس خود مالک کی خرید وفروخت صحیح ہے، کیونکہ شریعت نے اسے اپنے مال پر اختیار (اور تصرف کا حق) دیا ہے۔ ولی کا وصی کا اپنے ماتحت قاصرین (بچے وغیرہ) کے حق میں خرید وفروخت صحیح ہے، ان کو بھی شریعت نے یہ حق دیا ہے۔ وکیل اپنے موکل کا مال خرید وفروخت کرسکتا ہے، کیونکہ خود مالک (موکل) نے اسے یہ اختیار سونپا ہے۔

جس کو تصرف کا کوئی حق اور اختیار نہ ہو، وہ خرید وفروخت کرے تو باطل ہے (یعنی کسی اور کی چیز اس کی اجازت کے بغیر فروخت کرے، اور اس پر اسے ولایت وغیرہ بھی نہ ہو تو یہ بیع باطل ہے) فقہاء اسے ''فضولی کی بیع'' سے تعبیر فرماتے ہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے ''جس کا تو مالک نہیں اس کی بیع (صحیح) نہیں۔'' (ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

البتہ کسی نے اپنے موَرث کا مال یہ سمجھتے ہوئے فروخت کیا کہ وہ زندہ ہے، پھر پتہ چلا کہ بوقت عقد وہ مر چکا تھا، تو اس بیع کو صحیح قرار دیں گے، اور بیع کے آثار اس پر مرتب ہوں گے۔ کیونکہ اس کے گمان وخیال کی غلطی واضح ہوگئی، اور درحقیقت وہ اس چیز کا (وراثت میں) مالک بن چکا تھا، تو یہ بیع فضولی نہ ہوئی۔ اور عقود میں اصول یہ ہے کہ نفس الامر اور حقیقت کا اعتبار کیا جائے گا، نہ کہ عاقد کے گمان کا۔

(و) عاقدین معقود علیہ سے واقف ہوں:— اگر مبیع یا قیمت کے متعلق دونوں کو یا کسی ایک کو ایسی لاعلمی ہو جو غالباً نزاع اور جھگڑے واختلاف کا سبب بنے، تو بیع صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ غرر میں داخل ہے جس کی ممانعت گذر چکی۔ لہٰذا جس مبیع یا قیمت میں دونوں یا کسی ایک کو جہالت وناواقفیت ہو، وہ بیع صحیح نہیں ہے۔

مثلاً:- کئی اشیاء میں سے کسی ایک کی بلاتعیین خرید یا فروخت (کسی نے کہہ دیا کہ میں نے ان بکریوں میں سے ایک بکری فروخت کردی لیکن کسی بکری کی تعیین نہ کرے تو یہ غلط ہے)

یا کوئی معین چیز ہزار، میں فروخت کرے لیکن ہزار سے روپے یا پیسے یا کچھ اور، کیا مراد ہے واضح نہ کرے اور علاقہ میں ایسا کوئی عرف بھی نہ ہو جس سے اس کی تعیین ہو تو یہ بیع بھی صحیح نہیں۔ اگر عرفاً مطلقاً ہزار کہنے سے مخصوص سکے مراد لئے جاتے ہوں تو اس پر محمول کریں گے اور بیع صحیح ہوگی۔ یا کوئی چیز یا مکان اتنی قیمت پر فروخت کیا جس قیمت پر فلاں نے اپنا مکان فروخت کیا ہے، حالانکہ عاقدین مذکورہ مکان کی قیمت سے ناواقف ہیں۔

اسی طرح......درج ذیل امور سے معقود علیہ کا علم حاصل ہوسکتا ہے۔

۱. مبیع سامنے موجود ہو، دکھائی دے رہی ہو تو بیع صحیح ہے، خواہ اس کی مقدار اور ظاہری صفت کی وضاحت نہ ہو۔ مثلاً ایک گاڑی جو خریدار کی نظروں کے سامنے ہے، معین قیمت پر فروخت کی جائے، بغیر اس کے نوع وطرز اور کمپنی وغیرہ کے ذکر کے۔ یا غلہ کا ایک ڈھیر جو سامنے موجود ہے، ہزار روپے میں فروخت کردے اور مقدار کی کوئی تعیین نہ ہو، تو بیع صحیح ہے۔ کیونکہ مشاہدہ وتعیین علم ہی کے قائم مقام ہے۔

۲. عاقدین ایک دوسرے کی شئی پہلے دیکھ چکے ہوں، اس کے اوصاف ذہن میں ہوں، اور عقد تک اتنی مدت نہ گذری ہو کہ اس چیز میں غالباً کوئی تبدیلی وتغیر آجائے، جیسے کپڑا، مکان وغیرہ (تو یہ کافی ہے) اگر اتنی مدت گذر چکی کہ عموماً اتنی دیر میں اس میں تغیر آجاتا ہو تو یہ ناکافی ہے۔

۳. عوض کے بعض حصہ کا دیکھنا، جبکہ بقیہ کے دیکھنے کی پھر ضرورت نہ رہے، جیسے تھان میں کپڑے کا ایک حصہ دیکھ لینا جس سے بقیہ کا اندازہ ہوجائے، یا متماثل اشیاء کا نمونہ دیکھ لینا۔ (چاول گیہوں وغیرہ)

۴. عوض کے اس ظاہری حصے کو دیکھ لینا جو بقیہ کی حفاظت کا باعث ہو، جیسے تربوز، انار، انڈا وغیرہ ان کا اوپری چھلکا دیکھ لینا کافی ہے۔ اخروٹ اور بادام جیسی اشیاء کی پختگی کے بعد ان کا اندرونی چھلکا دیکھنا کافی ہے، کیونکہ اس کا رہنا ان اشیاء کے لئے بہتر ہے۔

جو چیز بیرونی چھلکے سمیت کھائی جائے اس کا صرف بیرونی چھلکا دیکھ لینا صحت بیع کے لئے کافی ہے۔

قیمت اگر ادھار ہو تو مدت کی تعیین اور علم ضروری ہے۔ اگر غیر معلوم ہو تو بیع صحیح نہیں مثلاً یوں کہنا۔ دھان کٹنے کے بعد ادا کریں گے، یا فلاں شخص سفر سے لوٹنے کے بعد............

اسی طرح اطمینان کے اسباب ووسائل (مثلاً رہن، ضامن وغیرہ) کی شرط ہو تو اس کا علم بھی ضروری ہے۔ اگر اس شرط پر بیع ہو کہ قیمت کے مقابلہ میں کوئی ضامن یا رہن پیش کرے لیکن کسی ضامن یا رہن کی تعیین نہ ہو، تو یہ عقد صحیح نہیں۔

مبیع پر قبضہ اور اس کا ضمان (تاوان): تمام ارکان وشروط کی رعایت کے ساتھ عقد بیع مکمل ہوجائے، اور مبیع ابھی بائع (فروخت کرنے والے) کے قبضہ میں ہو تو یہ اس کے ضمان میں داخل ہے، یعنی خریدار کے قبضہ سے پہلے ہی بائع کے قبضہ میں وہ چیز تلف ہوجائے یا خود بائع اسے تلف کردے تو بیع فسخ ہوگی، خریدار کو قیمت وغیرہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر قیمت پہلے ہی دے چکا

تھا تو اب واپس لے لے۔ خریدار کے قبضہ کے بعد خریدار کے ضمان میں داخل ہوگیا اور برباد ہوا تو خریدار کا ہی نقصان شمار ہوگا (قیمت کی واپسی یا سقوط کا سوال نہیں)

مبیع کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت جدا ہوگی (۱) اگر منقول چیز ہے (یعنی جسے منتقل کیا جا سکے) اور اسے ہاتھ سے لے لیا جاتا ہو، تو اس کا قبضہ یہی ہے کہ خریدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ جیسے کپڑا کتاب وغیرہ۔ اگر ہاتھ میں لی جانے والی چیز نہ ہو تو اس کا منتقل کر دینا قبضہ ہے، جیسے موٹر کار جانور وغیرہ (۲) غیر منقول اشیاء جیسے گھر، زمین وغیرہ کا قبضہ تخلیہ سے ہوگا یعنی خریدار کے اور اس چیز کے درمیان سے خود ہٹ جائے، اپنا تسلط ختم کر دے اور وہ چیز خریدار کے اختیار وقدرت میں دے دے۔ اس کے قبضہ میں کچھ رکاوٹ ہو تو اسے دور کرے، گھر وغیرہ ہو تو دروازہ کی کنجی عطا کرے۔

قبضہ میں بائع کی اجازت ضروری ہے۔ کیونکہ حقیقتاً یہ اس کی ملکیت ہے، اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس سے نہیں نکلے گی۔

بیع کے خیارات (اختیارات اور پسندیدگی): عقد بیع میں اصل تو یہی ہے کہ جب تمام ارکان اور ان کے شروط پائے جائیں تو پختہ طور پر بیع منعقد ہو جائے، اور مبیع کی ملکیت خریدار کی طرف، اور قیمت کی ملکیت بائع کی طرف منتقل ہو جائے اور کسی کو اس کے توڑنے اور فسخ کرنے کا اختیار نہ رہے۔ لیکن شارع نے مکلفین کی مصلحتوں کی رعایت کی، اور چونکہ بعض مرتبہ عاقد جلد بازی میں اور بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھانے کی وجہ سے اس عقد سے پوری طرح متفق نہ ہوگا، اس لئے شریعت نے ارکان وشروط کے باوجود بیع کو غیر لازم قرار دیا اور عاقدین میں سے ہر کسی کو عقد کے نفاذ یا فسخ کا اختیار دیا، اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتے ہوئے اور پوری رضامندی و رغبت سے معاملہ تکمیل تک پہنچے، اس کی گنجائش رکھی گئی۔ شارع نے خیار کے تین انواع بیان کئے ہیں۔ (۱) خیار مجلس (۲) خیار شرط (۳) خیار عیب۔

۱) خیار مجلس: خرید وفروخت کرنے والوں نے بیع مکمل کر لی (ایجاب وقبول وغیرہ ہو چکا) تو اس کے بعد جب تک دونوں اسی مجلس میں ہوں (بدن کے اعتبار سے)، ہر ایک کو بیع سے رجوع کا حق ہے۔ مجلس سے جدا ہونے کے بعد یہ "خیار مجلس" ختم ہو جائیگا اور بیع لازم ہوگی۔ مجلس کے اتحاد وافتراق کا فیصلہ عرف کی روشنی میں ہوگا۔ اگر دونوں کسی کشادہ مکان میں عقد بیع انجام دیں، پھر دونوں میں سے کوئی ایک اندرونی کوٹھری سے صحن میں آ جائے، یا اسکے برعکس تو اس سے تفرق (جدائی) حاصل ہوگی۔ (یعنی اب بیع لازم ہو چکی۔ خیار مجلس کا حق ختم ہوا)، چھوٹا مکان ہو تو کسی ایک کا مکان سے باہر نکلنا کافی ہے۔ بازار، جنگل وصحرا یا کشتی میں ہوں تو ایک کا دوسرے کی طرف پشت کر کے چند قدم چلنا کافی ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلیں یا چلیں تو مجلس باقی رہے گی اور خیار ساقط نہ ہوگا۔

اسی طرح ایک یا دونوں بیع کے بعد اس کے لزوم وپختگی کو اختیار کریں تو خیار مجلس ساقط ہوگا۔ یعنی دونوں یوں کہیں، ہم نے عقد کو نافذ کیا اور اس کے لزوم کو اختیار کیا۔ اسی طرح ایک نے دوسرے کو اختیار دیا تو اس کا حق ساقط ہوگا۔ مثلاً بائع نے مشتری (خریدار) سے کہا "بیع کے نفاذ یا فسخ کو اختیار کرو" تو بائع کا خیار ساقط ہوا، اب خریدار نے نفاذ بیع کو اختیار کر لیا تو خیار مجلس ساقط ہوگیا، کیونکہ دونوں نے خود ہی شریعت کے عطا کردہ حق کو ساقط کر دیا ایک نے اختیار کیا، دوسرے نے نہ کیا تو اختیار کرنے والے کا حق ساقط ہوگا، دوسرے کا باقی رہے گا۔

حدیث: "عاقدین جب تک (ایک دوسرے سے) جدا نہ ہوں، اور ساتھ ہوں تو انہیں خیار حاصل ہے۔ یا پھر ایک دوسرے کو اختیار دے دے۔ (بخاری۔ مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جو اس حدیث کے راوی ہیں، جب کوئی پسندیدہ چیز خرید لیتے تو بائع سے الگ ہو جاتے (تا کہ وہ خیار

مجلس کی وجہ سے بیع فسخ نہ کردے)(بخاری) اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اس مجلس سے بدن کا جدا ہونا مراد ہے (صرف ایجاب وقبول سے بیع لازم نہ ہوگی)

۲- **خیارِ شرط :-** یعنی عاقدین یا کوئی ایک یہ شرط لگائے کہ متعین ومعلوم مدت کے دوران اسے عقد کے فسخ کا حق حاصل ہوگا، یہ شرط عین عقد کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے، اور عقد کے بعد اس مجلس (نشست) سے جدائی سے پہلے بھی، چونکہ عاقد کے شرط لگانے کی وجہ سے یہ خیار حاصل ہوتا ہے اس لئے اسے ''خیار شرط'' کہتے ہیں۔اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

(الف) مدت معلوم ومتعین ہو، اگر یوں کہے، ''مجھے اختیار رہے گا۔'' لیکن مدت کا ذکر نہ ہو، تو یہ صحیح نہیں ہے۔اسی طرح مجہول مدت کا بھی یہی حکم ہے۔مثلاً، کچھ وقت، فلاں کے آنے تک، وغیرہ اور صحیح یہ ہے کہ ان صورتوں میں غرر (دھوکہ) اور جہالت کی وجہ سے بیع باطل ہوگی۔

(ب) مدت تین دن سے زائد نہ ہو، جبکہ چیز اس مدت میں بگڑنے والی نہ ہو، کیونکہ مزید غور وفکر کے لئے غالباً اس سے زیادہ مدت کی ضرورت نہیں ہے۔تین دن سے زائد مدت کی شرط ہو، خواہ ایک لحظہ ہی کیوں نہ ہو، تو بیع باطل ہوگی۔متعینہ مدت تک وہ چیز سڑتی یا بگڑتی ہو، تب بھی بیع باطل ہے، خواہ مدت تین دن ہو، یا اس سے کم۔

(ج) متعینہ مدت شرط سے متصل اور مسلسل ہو۔اگر تفرق (جدائی) سے ابتدا کی شرط لگائے یا ایام تو معین ہوں لیکن مسلسل نہ ہوں، یا شرط کے وقت سے مدت شمار نہ ہو، تو یہ شرط صحیح نہیں ہے اور عقد باطل ہوگا، کیونکہ اس شرط کا نہ تقاضائے عقد سے کچھ تعلق، اور نہ شریعت میں ایسی کوئی صورت وارد۔

حدیث : حضرت حبان بن منقذ رضی اللہ تعالی عنہ کو فروخت میں بڑا دھوکہ (اور نقصان) ہوتا تھا، انہوں نے اس کی شکایت آپ ﷺ سے کی تو فرمایا۔''جب کچھ فروخت کرو تو کہو۔دھوکہ (اور نقصان) نہ ہو'' ایک روایت میں ہے۔''اور مجھے تین دن تک اختیار رہے گا۔'' (البخاری، البیوع، بیھقی)

حدیث گرچہ حضرت حبان کے سبب وارد ہوئی ہے، لیکن اصل اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، نہ کہ خصوصِ سبب کا، لہٰذا یہ حدیث ہر لین دین کو شامل ہوگی، اور ہر خرید وفروخت کرنے والے کو خیار حاصل ہوگا، سوائے ان کے جن میں عدمِ جواز دوسرے دلائل سے ثابت ہیں، جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔

اجنبی کے لئے خیار شرط: عاقد جس طرح اپنے لئے خیار کی شرط طے کرسکتا ہے، کسی اجنبی کے لئے (یعنی جس کا اس خرید وفروخت سے کوئی تعلق نہیں) بھی کرسکتا ہے۔کیونکہ اس خیار کے مشروعیت کا اصل مقصد حاجت ومصلحت ہے، تاکہ عاقد کے نقصان وخسارہ کو دفع کیا جاسکے، اور بعض اوقات خود کو تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے خیار سے یہ مقصد حاصل نہ ہوگا، بلکہ دوسرے کو اس کی زیادہ معلومات ہوگی، تو اس کی ضرورت پیش آئے گی کہ اس کے حق میں خیار شرط لگائی جائے، ایسی صورت میں بجائے عاقد کے جس اجنبی کے لئے شرط لگائی گئی ہے، اسے خیار حاصل ہوگا۔

یہ خیار کب ساقط ہوگا؟

جسے خیار حاصل تھا اس نے یہ کہا۔''میں نے بیع فسخ کردیا۔'' یا بائع کو خیار ہو، اور وہ کہے ''میں نے اپنی چیز واپس لے لی'' یا خریدار کہے ''میں نے قیمت واپس لے لی'' تو عقد بیع فسخ ہوجائے گا جبکہ خیار ساقط (ختم) ہونے کی صورت میں بیع لازم ہوجائے گی۔خیار شرط مذکورۂ ذیل امور سے ساقط ہوگا۔

۱۔ متعینہ ومقررہ مدت کے اختتام سے، مقررہ مدت مکمل ہو جائے اور اس دوران جسے خیار حاصل تھا (دونوں یا کوئی ایک) اس نے بیع کو فسخ نہیں کیا، تو بیع لازم ہو چکی اور خیار ساقط ہو گیا، اب اس بنیاد پر کوئی بھی بیع فسخ نہیں کر سکتا۔

۲۔ مدتِ خیار میں بیع کو نافذ کرنا اور اس کی اجازت دینا، مثلاً جسے خیار حاصل ہے وہ کہے "میں نے عقد کی اجازت دی" (اسے نافذ کیا) یا "میں نے بیع کو اختیار کیا۔"

۳۔ جسے خیار حاصل تھا اس کا مبیع میں ایسا تصرف کرنا جو عادتاً مالک کے علاوہ نافذ نہیں ہوتا، اب یہ تصرف خریدار کی جانب سے ہے، تو اس کی وجہ سے بیع کو نافذ تسلیم کرینگے، اور نتیجتاً خیار ساقط ہوگا۔ اور بائع کی جانب سے تصرف ہو، تو اسے فسخ سمجھیں گے۔

مدتِ خیار میں مبیع (فروخت شدہ چیز) کا حکم

۱) دوران مدت مبیع کی ملکیت: دونوں کو خیار شرط حاصل ہو، تو مبیع کی ملکیت عقد کے نفاذ یا عدمِ نفاذ کے فیصلہ تک موقوف رہے گی، اگر عقد فسخ ہوا تو مطلب یہ ہوا کہ چیز بائع ہی کی ملکیت میں تھی، منتقل نہیں ہوئی، اور عقد نافذ ہو تو پھر یہ واضح ہوا کہ عقد کے وقت سے مبیع میں ملکیت خریدار کی ہو چکی تھی، اور قیمت بائع کی ملکیت میں داخل ہو چکی تھی، لہٰذا وقتِ عقد کے بعد سے اس کے زوائد و منافع کا بھی وہ مالک ہوگا۔ زوائد یعنی درخت کے پھل، جانوروں کا دودھ وغیرہ اور منافع یعنی گھر کا کرایہ، گاڑی کا کرایہ وغیرہ اسی طرح عقد سے اس چیز پر جو خرچ ہو، اس کا بھی وہی ذمہ دار ہے (مثلاً زید نے ایک گائے بکر کو ایک بکری کے عوض فروخت کی اور دونوں کو خیار شرط حاصل ہے۔ اب کسی ایک نے عقد کو فسخ کیا تو مطلب یہ ہوا کہ گائے زید ہی کی ہے، اور بکری بکر کی۔ لہٰذا اس دوران گائے کو کھلانے پلانے وغیرہ کا خرچ زید کے ذمہ اور بکری کا خرچ بکر کے ذمہ ہے۔ اور گائے کا دودھ وغیرہ زید کی ملکیت اور بکری کا دودھ وغیرہ بکر کی ملکیت ہے۔ اور اگر بیع کو نافذ کیا گیا تو عقد کے وقت سے گائے بکر کی ملکیت میں اور بکری زید کی ملکیت میں منتقل ہو چکی، لہٰذا اس وقت سے بکری کا خرچ زید کے ذمہ اور گائے کا بکر کے ذمہ، اور بکری کا دودھ وغیرہ فوائد زید کی ملکیت اور گائے کے فوائد بکر کی ملکیت ہیں)

اور خیار صرف کسی ایک کو حاصل ہو تو ملکیت اسی کی ہوگی، کیونکہ صرف اسے ہی تصرف کا اختیار ہے، دوسرے کو نہیں، نتیجتاً ثمرات و منافع بھی اسی کو حاصل ہوں گے اور نفقہ وخرچ بھی اسی پر عائد ہوں گے (مثلاً زید نے ایک بکری سو روپے میں بکر کو فروخت کی اور خیار صرف زید کو حاصل ہے تو دورانِ مدت ملکیت زید ہی کی رہے گی، اور اس کے منافع ومصارف کا ذمہ دار بھی وہی ہوگا۔)

۲) دورانِ مدت مبیع برباد ہو جائے:- قبضہ سے پہلے، بائع کے پاس ہی مبیع تلف وبرباد ہو جائے تو بیع فسخ ہوگی اور خیار ساقط ہوگا، خواہ خیار مشتری کو ہو یا بائع کو، کیونکہ اب مبیع کی سپردگی کا کوئی سوال نہیں، لہٰذا بائع کے ضمان میں شمار ہوگا۔

اور اگر قبضہ کے بعد خریدار کے پاس تلف ہو جائے تو بیع فسخ نہ ہوگا، کیونکہ قبضہ کی وجہ سے وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو چکا، اور خیار بھی باقی رہے گا، چاہے بائع کو خیار حاصل ہو یا خریدار کو، اور صاحبِ خیار کو نفاذ یا عدمِ نفاذ کا حق ہے۔ اگر نفاذ کا فیصلہ ہوا تو خریدار کو اس کی قیمت بائع کے حوالہ کرنا لازم ہے، کیونکہ مبیع پر اس کی ملکیت ثابت ہوئی۔ اگر عقد فسخ ہوا اور نافذ نہ ہو تو خریدار پر اس کا مثل یا تلف کے دن کی قیمت ادا کرنا لازم ہے، اور خریدار اصل قیمت واپس لے لے گا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ چیز مشتری کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوئی۔

۳۔ خیار عیب: ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ جب کسی کے ساتھ لین دین اور معاملہ کرے تو پوری خیر خواہی اور ایمانداری کے ساتھ، بغیر فریب دہی اور دھوکہ کے کرے، ورنہ باطل راستہ سے اوروں کا مال ہڑپ کرنا پایا جائے گا، اور آپ ﷺ نے

دھوکہ سے بڑی شدت سے روکا اور ڈرایا ہے۔ فرماتے ہیں۔" جو دھوکہ دے، وہ ہم سے نہیں"۔ مبیع میں عیب اور نقص ہو، جو بائع کو معلوم ہو، اور وہ خریدار کو اس سے آگاہ نہ کرے، تو یہ بھی دھوکہ اور خیانت میں داخل ہے۔ مذکورہ حدیث کا سبب ورود اس پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ بازار میں اناج کے ایک ڈھیر (انبار) کے قریب سے گذرے تو اپنا دست مبارک اس کے اندر داخل کیا، تو کچھ تری محسوس ہوئی، جس پر آپ ﷺ نے باز پرس فرمائی تو مالک نے عذر پیش کیا کہ بارش کا پانی ٹپکنے کی وجہ سے یہ بات پیش آئی ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا" تو تم نے اسے اوپر کی طرف کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیتے؟ جو دھوکہ اور خیانت سے کام لے وہ مجھ سے نہیں۔" (مسلم)

حدیث مبارک سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عیب کا نہ بتانا بھی خیانت ہے، اور بائع کی ذمہ داری ہے کہ عیب کو ظاہر کرے اور لوگوں کو بتلائے۔ آپ ﷺ کے اس فرمان سے اس کی مزید تاکید وتائید ہوتی ہے۔" مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، اور کوئی مسلم اپنے بھائی (مسلم) سے کوئی لین دین کرے، جس میں عیب ہو، تو اس کے لئے یہ حلال نہیں کہ اسے نہ بیان کرے" (اور چھپائے) (ابن ماجہ، التجارات)

سابقہ حدیث کے عموم کے پیش نظر غیر مسلم کا بھی یہی حکم ہوگا اور اسلامی اخلاق ایسے انسانی ذاتی اخلاق ہیں کہ مسلم وغیر مسلم دونوں ہی کے ساتھ اسے اپنایا جائے گا۔

بائع کی طرح عاقدین کے علاوہ کسی اور کو اس عیب کا علم ہو، تو اسے بھی اس عیب کا بیان کرنا واجب ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ "کسی چیز کے فروخت کرنے والے کے لئے یہ حلال نہیں کہ اس میں جو (عیب) ہے اس سے آگاہ نہ کرے، اور جو اس (عیب) سے واقف ہو، اسے بھی بیان نہ کرنا حلال نہیں" (احمد فی مسندہ عن واثلہ)

خرید وفروخت کا معاملہ ہر اعتبار سے مکمل ہو، اور خریدار چیز اپنے قبضہ میں لے لے، اور اس کے سامنے کسی عیب کا ذکر نہ آیا، پھر بعد میں اس چیز کے کسی عیب کا پتہ چلا، تو بیع صحیح ہے، البتہ خریدار کو اختیار حاصل ہے کہ یا تو اس عیب کے ساتھ اس چیز پر راضی رہے، یا پھر وہ چیز بائع کو واپس لوٹا کر بیع فسخ کردے اور اپنی قیمت واپس لے لے۔

حدیث: (۱) ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس کے ذریعے آمدنی حاصل کرتا رہا، پھر اس میں عیب نظر آیا تو اسے لوٹا دیا، بائع نے غلام کی (درمیانی مدت کی) آمدنی کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا" آمدنی (نفع وکرایہ) ضمان کے مقابلہ میں ہے۔" (مسند احمد عن عائشہؓ مطلب یہ کہ اس مدت میں غلام تلف ہوتا تو خریدار کا نقصان شمار ہوتا، اسلئے جو نفع اور آمدنی اس سے حاصل ہوئی ہے وہ بھی خریدار کا حصہ ہے)۔

۲) اس مسئلہ کے لئے حدیث المصراۃ سے بھی استدلال ہو سکتا ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

معقول: لین دین میں اصل سلامتی ہے، اور خریدار مکمل قیمت اسی لئے دے رہا ہے کہ مبیع صحیح سالم اسے مل جائے اور قیمت اور چیز کا صحیح تقابل ہو، اسی بنیاد پر وہ اس بیع سے متفق تھا، اور ظہور عیب سے اس میں خلل واقع ہوا تو اس کا مقصود فوت ہوا، اور رضامندی کا تحقق نہ ہوا، اس لئے اسے فسخ کا حق دیا گیا کہ بیع لوٹا کر قیمت واپس لے لے۔

خیار عیب کے شرائط

۱- عیب قدیم ہو، خریدار کے قبضہ سے پہلے ہی اس چیز میں وہ عیب موجود ہو، چاہے اب عقد سے پہلے ہو یا عقد کے بعد، کیونکہ قبضہ

سے پہلے چیز بائع کے ضمان (ذمہ داری) میں ہوتی ہے ۔
خریدار کے قبضہ کے بعد عیب پیدا ہو تو اس سے حق خیار حاصل نہ ہوگا، البتہ اس عیب کا اصل سبب قبضہ سے قبل ہی پایا گیا تو خیار حاصل ہوگا۔ مثلاً خریدنے اور قبضہ کرنے کے بعد اس پر زنگ لگے، پھر معلوم ہوا کہ دراصل قبضہ سے قبل وہ پانی سے بھیگا تھا، جس کی وجہ سے اب یہ زنگ لگا ہے، تو خریدار کو لوٹانے کا حق ہوگا، کیونکہ اس عیب کا ترتب ایسے سبب پر ہے جو بائع کے پاس پیش آیا تھا، تو گویا بائع ہی کے پاس عیب پیدا ہوا۔
۲- تاجروں کے عرف میں وہ عیب مبیع کی قیمت کی کمی کا باعث ہو، خواہ اصل چیز میں کوئی کمی اور نقص ہو یا نہ ہو، کیونکہ بیع معاوضہ ہے اور معاوضہ میں اعتبار قیمت کا ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں تجربہ کار تاجروں کی طرف رجوع کیا جائے گا۔
اگر عیب کی وجہ سے اصل چیز (عین) میں کمی واقع ہو، لیکن قیمت میں کمی نہ ہو، تو لوٹانے کا حق نہ ہوگا۔ البتہ ایسا نقص ہو جس سے خریدار کا اصل مقصد فوت ہو تو حق حاصل ہوگا مثلاً کسی نے قربانی (اضحیہ) کے لئے بکری خریدی، پھر پتہ چلا کہ اس کے کان کا کچھ حصہ کٹا ہوا ہے، تو اسے لوٹانے کا حق ہوگا، کیونکہ یہ قربانی کے قابل نہیں ہے، اگر کسی واجب ذبح کے لئے نہیں خریدا، تو اس عیب کی وجہ سے لوٹانے کا حق نہ ہوگا، کیونکہ اس سے قیمت پر اثر نہ پڑے گا، اور نہ اس کا مقصد فوت ہو رہا ہے۔
۳- اس طرح کی اشیاء میں عموماً وہ عیب نہ پایا جاتا ہو، مثلاً کسی نے ایجنسی سے نئی گاڑی خریدی، پھر معلوم ہوا کہ اس کے پہیے (ٹائر) بوسیدہ ہیں، تو اسے فسخ کا حق ہوگا۔ لیکن کسی سے مستعمل (سیکنڈ ہینڈ اور پرانی گاڑی خریدی اور اس کے پہیے بوسیدہ ہوں تو اس سے حق فسخ حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ مستعمل گاڑیوں کے پہیے عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں۔

خیار عیب کی بنیاد پر کب لوٹا سکتا ہے۔

عیب کا علم ہونے کے بعد عرف و عادت کے مطابق فوراً لوٹانا ضروری ہے۔ کھاتے وقت یا دوران نماز علم ہوا تو فارغ ہونے تک مؤخر کر سکتا ہے۔ رات میں پتہ چلا تو صبح تک مؤخر کر سکتا ہے، لوٹانے کے امکان اور قدرت کے باوجود تاخیر کرے تو یہ خیار ساقط (ختم) ہو جائے گا۔
اسی طرح عیب معلوم ہونے کے بعد اور لوٹانے کے امکان سے پہلے اسے استعمال کرنا اس کے رضامندی اور عیب کے باوجود مبیع کے اختیار پر دلالت کرتا ہے۔ (لہٰذا لوٹانے کا حق ختم ہوگا)

عیب دار مبیع میں زیادتی

خریدار کے قبضہ کے بعد اس چیز میں کوئی قدیم عیب ظاہر ہو، اور اب تک وقتِ عقد کے مقابلہ میں اس میں کچھ زیادتی اور اضافہ ہو چکا ہو، تو یہ اضافہ عیب کی وجہ سے لوٹانے سے مانع نہیں بنے گا۔ اگر اضافہ متصل ہو۔ مثلاً جانور کا موٹاپا، کپڑے کا سلانا تو اسے اختیار ہے کہ لوٹائے یا نہ لوٹائے دونوں صورتوں میں اسے کچھ ملے گا نہیں، کیونکہ یہ اضافہ اصل کے تابع اور ملکیت میں نمو ہے۔
اگر اضافہ منفصل (جدا) ہو، تو خریدار لوٹانا چاہے تو صرف اصل (خریدی ہوئی چیز) لوٹا دے اضافہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کی ملکیت اور ضمان میں رونما ہوا ہے۔ اور حدیث گذر چکی کہ "آمدنی (اور اضافہ) کا تعلق ضمان (تاوان) سے ہے۔" (مثلاً کسی نے گھوڑا خریدا اور اس پر سواری کرتا رہا یا کرایہ پر سواری کے لئے چلاتا رہا، بعد میں قدیم عیب کی وجہ سے لوٹائے تو اس استعمال کا کرایہ

لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ لوٹانے سے پہلے اگر گھوڑا مر جاتا تو خریدار کا ہی نقصان شمار ہوتا)

قدیم عیب کے ساتھ کسی جدید عیب کا وقوع:

خریدار کو کسی قدیم عیب کا پتہ لگے، اور قبضہ کے بعد اس میں ایک نیا عیب بھی پیدا ہو چکا ہے تو خریدار کو ردِقہری (زبردستی لوٹانے) کا حق نہ ہوگا، اگر بائع اس حال میں واپس لینے پر یا خریدار اسی حال میں اپنے پاس رکھنے پر راضی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں۔

اگر دونوں راضی نہ ہوں، تو خریدار جدید عیب کا عوض اور چیز دونوں بائع کو لوٹا دے، یا پھر بائع خریدار کو قدیم عیب کا معاوضہ دے۔ دونوں میں سے جس پر بھی دونوں متفق ہوں، جائز ہے، کیونکہ حق ان کا ہے، تو انہیں کی رضامندی پر عمل ہوگا۔

اگر دونوں کا اختلاف ہو، کہ بائع جدید عیب کا بدلہ اور چیز لوٹانے کا مطالبہ کرے، اور خریدار چیز اپنے پاس رکھتے ہوئے قدیم عیب کا بدلہ مانگے یا اس کے برعکس ہو یعنی بائع دوسرا مطالبہ اور خریدار پہلا مطالبہ کرے تو اس مطالبہ کے حق میں فیصلہ ہوگا، جس میں عقد اپنی جگہ باقی رہے (اور فسخ نہ ہو) لہٰذا پہلی صورت میں خریدار کا مطالبہ اور دوسری صورت میں بائع کا مطالبہ تسلیم کیا جائے گا۔

اگر قدیم عیب کا علم بغیر جدید عیب کے نہیں ہوسکتا تو اس صورت میں ردقہری کا حق ہوگا مثلاً کسی نے تربوز یا انار وغیرہ خریدا اور اندرونی حال معلوم کرنے کے لئے بقدر ضرورت اسے کاٹا اور اس میں عیب ظاہر ہوا تو اسے لوٹا سکتا ہے۔ ضرورت سے زائد کاٹے تو ردقہری کا حق نہ ہوگا۔

عیوب سے برأت (بری الذمہ ہونے) کی شرط

بوقتِ عقد بائع یہ شرط لگائے کہ میں مبیع میں ظاہر ہونے والے تمام عیوب سے بری ہوں (یعنی کوئی عیب ظاہر ہو تو میری کوئی ذمہ داری نہیں) تو یہ عقد صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس سے بیع کی مزید تاکید ہو رہی ہے، اور فسخ (لوٹانے) کی نفی کی جا رہی ہے، جیسا کہ بظاہر عیب ہے بھی نہیں، لیکن باوجود اس شرط کے اگر عیب ظاہر ہو تو مسئلہ کی نوعیت حسب ذیل ہوگی۔

اگر مبیع حیوان نہیں ہے۔ (یعنی کوئی غیر جاندار چیز ہے) تو یہ شرط لغو اور فضول ہے، لوٹانے کا حق ساقط نہ ہوگا، کسی بھی عیب کا علم ہوا تو سابقہ تفصیل کے مطابق خریدار کو خیار حاصل ہوگا۔

اگر مبیع حیوان ہے، تو بائع حیوان کے اس باطنی عیب سے بری اور سبکدوش ہوگا جو عقد کے وقت موجود تھا، لیکن اسے اس کا علم نہیں تھا کیونکہ حیوان میں غالباً کچھ نہ کچھ مخفی عیوب ہوتے ہیں، لہٰذا مذکورہ شرط کے ذریعہ بائع احتیاطاً اپنی ذمہ داری سے بری ہوسکتا ہے حضرت ابن عمرؓ سے ثابت ہے کہ انہوں نے اپنا ایک غلام ۸۰۰ آٹھ سو درہم میں برأت کی شرط کے ساتھ بیچا، پھر خریدار نے کہا کہ اس میں ایسا عیب ہے جس کا آپ نے تذکرہ نہیں کیا، پس دونوں یہ مسئلہ لے کر حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ حضرت ابن عمرؓ یہ قسم لیں کہ بوقت فروخت کسی عیب کا انہیں علم نہیں تھا، حضرت ابن عمرؓ نے قسم سے انکار کیا اور غلام واپس لے لیا، اور بعد میں اسے ۱۵۰۰ پندرہ سو درہم میں فروخت کیا۔ ابن عمرؓ نے اللہ کی خاطر قسم نہیں لی تو اللہ نے ان کو اس کا معاوضہ عنایت فرمایا۔

پس حضرت عثمانؓ کے مذکورہ فیصلہ سے معلوم ہوا کہ حیوان (ذی روح) کے سلسلہ میں برأت کی شرط صحیح ہے، ان کا یہ فیصلہ صحابہ میں مشہور ہوا، لیکن کسی نے اختلاف نہ کیا، تو گویا اجماعی مسئلہ ہوگیا۔

اگر (حیوان میں) عیب ظاہر ہو تو شرط کی وجہ سے اس سے بری نہ ہوگا، کیونکہ اس کی اطلاع آسان اور سہل ہے۔

اسی طرح (باطنی عیب کو) بائع پہلے سے جانتا تھا تو بری نہ ہوگا، کیونکہ اس کی صراحت واجب ہے ورنہ دھوکہ ہوگا، یہی حکم ہوگا جبکہ ناواقف تھا، لیکن واقفیت آسان تھی۔ عقد کے بعد اور (خریدار کے) قبضہ سے قبل جو عیب پیدا ہو، اس سے بری نہ ہوگا، کیونکہ شرط کا تعلق صرف عقد کے وقت موجودہ عیوب سے ہے، اگر آئندہ پیدا ہونے والے عیب سے بھی برأت کی شرط لگائے تو بری نہ ہوگا، کیونکہ اس میں کسی چیز کے ثبوت سے پہلے اس کا اسقاط پایا جارہا ہے۔

بعض مخصوص بیوع (خرید وفروخت)

گذشتہ اوراق میں عام بیع کی تفصیلات کا ذکر تھا، جس پر اکثر عمل ہوتا رہتا ہے اسکے علاوہ بیع کے کچھ مخصوص انواع واقسام بھی ہیں، جن کے مستقل نام ہیں، ان میں بعض جائز ہیں اور بعض ناجائز، بعض ناجائز ہونے کے باوجود صحیح ہیں، لیکن گنہگار ہوگا اور بعض سرے سے باطل ہیں، آئندہ سطور میں انہیں اقسام کا تذکرہ ہے۔

جائز بیوع

۱- **تَولِیَه**: یعنی خریدار قبضہ کے بعد وہ چیز قیمت خرید میں ہی دوسرے کو فروخت کردے، بغیر اس کے کہ قیمت کا تذکرہ کرے، یا خریدار یوں کہے: وَلَّیْتُكَ هٰذَا الْعَقْدَ (میں نے تم کو اس عقد کا والی وذمہ دار بنایا۔ یعنی یہ عقد تمہارے حوالے سونپ دیا)

۲- **اِشراک**: یہ بھی تولیہ کی طرح ہے، اتنا فرق ہے کہ اس کا تعلق مبیع کے ایک حصے سے ہے نہ کہ کل سے، مثلاً پہلا خریدار دوسرے سے کہے" میں نے نصف قیمت کے مقابلہ میں تم کو اس عقد کے نصف میں شریک کرلیا۔" حصہ کا تعین ضروری ہے۔ (مثلاً نصف، تہائی وغیرہ) اگر تعین نہ ہو مثلاً یوں کہے" میں نے بعض عقد میں تم کو شریک کیا" تو جہالت کی وجہ سے یہ عقد صحیح نہ ہوگا۔ مطلقاً کہہ دے تو صحیح ہے اور نصف پر محمول کریں گے۔ مثلاً یوں کہا" میں نے تم کو اس عقد میں شریک کیا۔"

۳- **مُرابَحه**: خریدار قبضہ کے بعد وہ چیز قیمت خرید مع متعین نفع کے فروخت کرے تو اسے مرابحہ کہیں گے۔ مثلاً کہے: "میں نے یہ گھر تم کو قیمت خرید پر مع دس فیصد نفع کے فروخت کیا یا مع اس گاڑی کے نفع کے فروخت کیا...... وغیرہ...... نفع قیمت کے جنس سے نہ ہو تب بھی جائز ہے۔ (مثلاً ایک مکان ایک لاکھ میں خریدا اور دس فیصد پر بطور مرابحہ فروخت کیا تو ایک لاکھ دس ہزار قیمت ہوگی)

۴- **مُحاطَطَه (وَضِیعَه)**: یعنی قبضہ کے بعد قیمتِ خرید میں متعین ومقرر کمی کے ساتھ فروخت کرنا مثلاً میں نے یہ مکان قیمتِ خرید میں دس فیصدی نقصان اور کمی کے ساتھ تم کو فروخت کیا۔ (تو اس صورت میں اگر پہلی قیمت خرید ایک لاکھ ہے تو دوسری قیمت ۹۰ ہزار ہوگی) یہ قسم سابقہ قسم (مرابحہ) کے بالکل برعکس ہے۔

مذکورہ چاروں بیع جائز اور مشروع ہیں کیونکہ (۱) ان میں عقد بیع کے تمام ارکان وشرائط پائے جارہے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فرمان "احل اللّٰه البیع" (اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے) کے عموم میں یہ بھی داخل ہیں (۲) نیز ہجرت کی طویل حدیث میں آپ ﷺ کا صدیق اکبرؓ سے اونٹ خریدنے کا جو ذکر ہے، اس میں صدیقؓ کی درخواست پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔" قیمت سے" (خریدیں گے) بظاہر یہ عقد تولیہ ہے۔ واللہ اعلم (بخاری)

ان چاروں بیوع کی صحت کے لئے یہ شرط ہے کہ عاقدین پہلی قیمت سے عقد کے وقت واقف ہوں، اگر دونوں یا کوئی ایک پہلی قیمت سے ناواقف ہو، تو بیع منعقد نہ ہوگی، یہاں تک کہ مجلس عقد میں جدائی سے قبل معلوم ہو جائے، تب بھی منعقد نہ ہوگی۔ دوسرا خریدار تو

قیمت سے ناواقف ہو ہی سکتا ہے، بائع (پہلا خریدار) بھی کبھی ممکن ہے قیمتِ خرید بھول چکا ہو۔

تنبیہ :مذکورہ تمام صورتوں میں اگر بائع نے یہ کہا۔"جس قیمت میں خریدا، اسی میں تم کو فروخت کیا" تو قیمت خرید کے علاوہ دیگر مصارف وغیرہ اس میں شامل نہ ہوں گے۔ اور اگر یہ کہا" کہ مجھے جتنے میں پڑی ہے، اتنے ہی میں تمہیں فروخت کیا" تو اس میں قیمت کے ساتھ ساتھ منتقل کرنے کا کرایہ، حفاظت کی اجرت وغیرہ بھی داخل ہوں گی۔

ممنوعہ بیوع

ممنوعہ بیوع کی دو قسمیں ہیں (۱) حرام و باطل (۲) حرام لیکن صحیح

حرام اور باطل بیوع

اس سے وہ بیوع مراد ہیں، جن سے کسی رکن کے خلل یا شرط کے نقص کی وجہ سے شریعت نے روکا ہے، اور فقہا کرام نے اس کے بطلان کا حکم لگایا ہے۔

۱) دودھ دوہنے سے قبل ہی پستان (تھن) میں اسے فروخت کرنا، اون کو جانور کے پشت سے کترنے سے قبل فروخت کرنا اور پھلوں کو بدوِ صلاح سے قبل فروخت کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔" آپ ﷺ نے پھلوں کے فروخت کرنے سے منع فرمایا جب تک کہ کھانے کے قابل نہ ہوں، اور تھن میں دودھ، اور دودھ میں گھی (یعنی دودھ بلو کر گھی نکالنے سے قبل اس گھی کو فروخت کرنے سے منع فرمایا) (دار قطنی فی البیوع)

بطلان کا سبب معقود علیہ یعنی مبیع سے ناواقفیت ہے۔ بدو صلاح (پختگی اور پکنے) سے قبل اس کا علم نہیں ہوگا کہ پکنے کے بعد اس کی کیا مقدار ہوگی، کبھی کافی تفاوت ہو سکتا ہے اسی طرح دودھ اور اون کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس غرر اور جہل کی وجہ سے باطل ہونے کا حکم لگا۔ پھلوں کی بیع میں لوگ کافی مخالفت کے شکار ہیں، لہٰذا اسے قدرے تفصیل سے پیش کیا جارہا ہے۔

بدو صلاح سے قبل پھل کو فروخت کرنا۔

پھل کی پختگی (پکنا) کے ظہور اور کھانے کے قابل ہونے سے قبل اس کی بیع غلط اور باعث گناہ ہے، لوگوں نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر پھل کے وجود سے قبل ہی، محض شگوفہ کی بنیاد پر (بلکہ اس کے بھی بغیر) پھل کی خرید و فروخت شروع کر دی ہے، یہ تو اور بھی بڑا خلل ہے، جو بیع کو مزید باطل کرنے اور آدمی کو مزید گنہگار بنانے کا سبب ہے، کیونکہ یہ ایسے معدوم (غیر موجود) کی بیع ہے، کہ ممکن ہے آئندہ اس کا وجود تک نہ ہو۔

بہر حال ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ مسئلہ کو بالکل واضح طور پر بیان کر دیں، اور ایک ایسے مسلمان پر، جو اللہ پر صحیح ایمان رکھتا ہو، آپ ﷺ کی دل سے تصدیق کرتا ہو، اور اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضری اور پیشی پر مکمل ایمان و یقین رکھتا ہو، جس دن کہ مال و اولاد کچھ بھی نفع نہ پہنچا سکیں گے، سوائے اس شخص کے جو قلبِ سلیم کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو، لازم ہے کہ بغور سن کر شرعی حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرے، اس پر عمل پیرا ہو، اس کی مخالفت سے بالکل کنارہ کش ہو، خواہ اس میں اسے کچھ مصلحت نظر آئے، کیونکہ سارا نقصان اور خسارہ درحقیقت اللہ کے حکم کی خلاف ورزی اور آپ ﷺ کی خلاف ورزی میں پوشیدہ ہے۔

بدو صلاح سے قبل پھل کی فروخت میں مبیع کی مقدار کی لاعلمی کے ساتھ ساتھ کافی غرر (دھوکہ) کا سامان بھی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے

کچھ ایسی آفتیں اور بیماریاں پیدا ہوں، جس کی وجہ سے پھل برباد ہوں، تو اس صورت میں درختوں کا مالک پھل کی قیمت کے نام سے ایسی رقم وصول کر رہا ہے، جس کے مقابلہ میں سامنے والے کو کچھ نہیں حاصل ہو رہا ہے، لہٰذا باطل طریقے سے لوگوں کا مال ہڑپ کرنے میں داخل ہوگا، اسی کی آپ ﷺ نے ایک حدیث میں صراحت فرمائی ہے، فرمایا۔" بھلا بتاؤ تو، اگر اللہ نے پھل پیدا نہ فرمائیں، تو تم اپنے بھائی کا مال کس بنیاد پر لے رہے ہو۔" ایک روایت میں ہے" پھر تو اپنے بھائی کا مال کیوں کر اپنے لئے حلال قرار دیتا ہے؟" (بخاری و مسلم)

پس بدو صلاح سے قبل پھل کی بیع حرام و باطل ہے، اور اس کو صراحتاً روکا گیا ہے، خرید و فروخت کرنے والے دونوں گنہگار ہوں گے، حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ" آپ ﷺ نے پھل کے فروخت سے منع فرمایا، یہاں تک کہ بدو صلاح ہو جائے، بائع اور خریدار دونوں کو منع فرمایا۔" (بخاری۔ مسلم)

اس شرعی حکم کی حکمت واضح ہے اس کی مخالفت مختلف اختلافات، نزاع اور لڑائی تک کا باعث بن جاتی ہے۔ ایک مومن بلکہ ساری انسانیت کو یہی زیبا ہے کہ شرعی حکم کی پیروی کرے، تاکہ سعادت وخوش بختی سے ہم کنار ہو، جو اللہ کے لئے کوئی چیز ترک کر دے، اللہ اس سے بہتر اس کا بدلہ عنایت فرمائیں گے۔

بدو صلاح کے بعد: بدو صلاح اور پختگی کے ظہور کے بعد پھل کی بیع جائز ہے، سابقہ احادیث اور اس موضوع کی دیگر احادیث کے مفہوم سے اس پر دلالت ہوتی ہے، اور اس کی حکمت واضح ہے، کیونکہ اس مرحلہ کے بعد غالباً کسی آفت کا خطرہ نہیں ہوتا، پھل مضبوط اور بڑے ہو جاتے ہیں اور گٹھلیاں اور بیج بھی بڑے ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس اس سے پہلے آفات کا بڑا خطرہ رہتا ہے کہ پھل بھی ابھی چھوٹے اور کمزور ہوئے ہیں اور گٹھلیاں بھی۔

بدو صلاح کے بعد پھلوں کے بیچنے کے بعد خریدار عام عرف اور عادت و معمول کے مطابق ان کو کاٹنے اور توڑنے کے وقت تک مزید درخت پر رکھ سکتا ہے، البتہ بائع فی الحال توڑنے کی شرط لگائے تو مزید رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

بدو صلاح کا ضابطہ

اصل ضابطہ یہ ہے کہ کوئی چیز غالباً جس حالت میں مطلوب ہوتی ہے، اس حالت تک پہنچ جائے تو یہ اس کا بدو صلاح ہے۔

امام ماوردیؒ نے بدو صلاح کے آٹھ انواع بیان کئے ہیں۔

۱) **رنگ** (یعنی پختگی کے بعد رنگت کا بدلنا مثلاً سرخ یا زرد وغیرہ ہونا) جیسے بلح (کچی کھجور)، آلو بخارا، زرد آلو۔

۲) **ذائقہ:** جیسے انگور کی حلاوت وشیرینی اور انار کا کھٹاپن

۳) **پختگی اور نرم و ملائم ہونا:** جیسے انجیر و خربوزہ

۴) **قوت اور سختی:** مثلاً گیہوں، جو

۵) **لمبائی اور پُر ہونا:** جیسے چارہ اور سبزی و ترکاری

۶) **بڑا ہوجانا** جیسے ککڑی

۷) **شگوفہ کے غلاف کا پھٹ جانا اور کھل جانا** جیسے روئی، اخروٹ

۸) **کِھل جانا** جیسے گلاب کا پھول

بعض کا بدو صلاح ظہور کے حکم میں ہے۔ لہٰذا تمام بغیر شرطِ قطع کے فروخت کر سکتا ہے جبکہ باغ، جنس اور عقد متحد ہو ورنہ ہر ایک کا حکم

جدا جدا ہوگا۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۲۰۴)

حدیث میں ہے "کھجوروں کو زھو سے قبل فروخت کرنے سے منع فرمایا۔" عرض کیا گیا کہ زھو کیا ہے؟ تو فرمایا "سرخ ہو جانا یا زرد ہو جانا"............ "اور اسے کھایا جائے" (بخاری۔ مسلم)

پختگی سے قبل اگر پھل قابل انتفاع ہو تو ابھی توڑنے کی شرط کے ساتھ اسے فروخت کرنا جائز ہے (مثلاً کیری، کٹھل وغیرہ) کیونکہ درخت پر باقی رکھنے کی صورت میں جو غرر اور دھوکہ کی شکل تھی وہ یہاں موجود نہیں اور مبیع قابلِ انتفاع بھی ہے۔ اگر ابھی پھل کسی مناسب کام اور نفع کے قابل نہ ہو، یا درخت پر ہی رکھنے کی شرط کے ساتھ خرید و فروخت ہو تو بیع صحیح نہیں۔ بلا شرط فروخت ہو، اور عام عرف درخت ہی پر رکھنے کا ہو، تو یہ باطل ہے کیونکہ معروف کا حکم بھی مشروط کی طرح ہے۔ سابقہ تمام تفصیلات میں کھیت (اناج) کا حکم بھی پھل کی طرح ہے، کیونکہ دونوں سے مقصود ایک ہی ہے۔ واللہ اعلم

بدو صلاح کے بعد درخت پر باقی رکھنے کی شرط کے ساتھ فروخت شدہ پھل وغیرہ کی سیرابی کی ذمہ داری بائع پر ہے (جبکہ ان درختوں کو سیراب کرنا ضروری ہو) خواہ خریدار کے سپرد کر چکا ہو یا نہ کر چکا ہو۔ اتنی سیرابی لازم ہے کہ پھلوں میں نمو ہو اور بربادی سے مامون رہیں۔ اگر خریدار پر سیرابی کی شرط لگائی تو بیع باطل ہے۔ پھل توڑنے کی شرط کے ساتھ فروخت کرے تو سپردگی کے بعد بائع کے ذمہ سیرابی نہیں ہے۔

خریدار کے سپرد ہونے کے بعد اب وہ اس میں تصرف کر سکتا ہے، اور وہ چیز اس کے ضمان میں داخل ہو چکی، خواہ توڑنے کی شرط نہ ہو، کیونکہ اس کا قبضہ ہو چکا۔ (لہٰذا اب کسی وجہ سے پھل ضائع ہوں تو خریدار کا نقصان ہوگا، بائع قیمت نہ لوٹائے گا۔) صحیح مسلم کی حدیث میں نقصان کو معاف کرنے کا جو حکم ہے، وہ استحبابی درجہ میں ہے۔

جو پھل وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہوں اور قدیم و جدید میں اختلاط ہوتا ہو، جیسے انجیر، ککڑی، خربوزہ وغیرہ، ان کو بدو صلاح کے بعد بھی توڑنے کی شرط کے ساتھ ہی فروخت کر سکتا ہے۔ اگر اختلاط کا اندیشہ نہ ہو تو اس شرط کے بغیر بھی جائز ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۲۰۶)

۲) وہ بیوع جن میں مُقَامَرَہ (جوئے بازی) کا پہلو ہو: ان میں مبیع کے متعلق جہالت و لاعلمی یا عاقدین کے ارادے میں خلل ہوتا ہے۔ ان بیوع کی درج ذیل انواع کو صراحتاً منع کیا گیا ہے۔

بیع المُنَابَذَہ یا بیع المُلَامَسہ = یعنی کئی اشیاء میں سے بلاتعین کسی ایک کو فروخت کرنا، پھر بائع کسی ایک کو (خریدار کی طرف) پھینک دے، یا خریدار اس میں سے کسی ایک کو چھولے تو وہی مبیع ہوگی۔ یا کپڑا مثلاً تاریکی میں فروخت کر دے اور خریدار صرف چھولے، دیکھے نہیں یا کسی معین چیز کی خرید و فروخت ہو، اور شرط یہ ہو کہ جب بائع اسے پھینک دے یا خریدار چھولے تو بیع واجب و لازم ہوگی۔ پہلی صورت میں مبیع کے متعلق لاعلمی واضح ہے۔ اور دوسری صورت میں عاقدین کے ارادہ میں خلل ہے، کیونکہ یہ پتہ نہیں کہ وہ کب پھینکے گا یا یہ کب چھولے گا تاکہ بیع لازم ہو جائے۔

ملامسہ اور منابذہ کی ممانعت بخاری و مسلم کی حدیث میں وارد ہے۔

بیع الحَصَاۃ (کنکر والی بیع) = کئی اشیاء میں سے ایک خرید لینا، اس طور پر کہ کوئی ایک کنکر مارے اور جس پر کنکر لگے وہی مبیع قرار پائے۔ مسلم کی حدیث میں ہے کہ "آپ ﷺ نے "بیع الحصاۃ" سے منع فرمایا ہے"۔ فقہاء کرام نے اسے باطل قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں جہالت اور عاقدین کے ارادہ کا خلل پایا جا رہا ہے۔

آج کل اس کی مختلف شکلیں رائج ہیں۔ مثلاً کئی اشیاء ایک جگہ رکھی جاتی ہیں، اور ان پر مخصوص طریقے سے لکڑی یا لوہا وغیرہ گھمایا جاتا ہے، اور جس چیز پر وہ رک جائے وہی متعین قیمت پر خریدار کے ہاتھ فروخت قرار پاتی ہے۔ (بہر حال ہر ایک الل ٹپ بیع جس میں براہ راست مبیع اور قیمت کی تعیین نہ ہو، جوئے کے حکم میں، اور باطل ہے۔)

۳) **ایک ہی بیع میں دو بیع**: یعنی عقد کے صیغہ میں بیک وقت دو عقد کو ذکر کرنا، مثلاً یوں کہے۔ میں نے یہ مکان تمہیں ایک ہزار نقد پر اور دو ہزار قسط وار پر ایک سال کی مدت تک فروخت کیا اور خریدار نقد یا قسط وار قبول کرے۔

یا یوں کہے۔ میں نے یہ گاڑی ہزار میں تمہیں اس شرط پر فروخت کردی کہ تم اپنا مکان دو ہزار میں مجھے فروخت کردو۔

اس طریقے سے بیع ممنوع اور باطل ہے، کیونکہ پہلی صورت میں قیمت کے متعلق لاعلمی ہے (کوئی ایک طے نہیں ہوئی) اور دوسری صورت میں ایک شرط پر معلق ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ''آپ ﷺ نے ایک ہی بیع میں دو بیع سے منع فرمایا ہے۔'' (ترمذی، نسائی، احمد)

بیع بالتقسیط (قیمت کی قسط وار ادائیگی کے ساتھ بیع)

بیع بالتقسیط صحیح ہے، بشرطیکہ صیغہ عقد میں دونوں قیمت کا تذکرہ نہ ہو، ورنہ ایک بیع میں دو بیع ہوگا، جو باطل ہے، جیسا کہ گذر چکا۔

البتہ عاقدین قیمت کے متعلق گفتگو کریں اور آخر میں بیع بالتقسیط پر متفق ہوں، اور اسی پر عقد طے پائے، تو یہ صحیح ہے۔ اس میں کوئی حرمت اور گناہ نہیں۔ چاہے بھاؤ تاؤ کرتے وقت نقد قیمت کا بھی ذکر ہو، لیکن عقد طے پاتے وقت صیغہ میں اس کا کوئی ذکر نہ ہو۔ (بالجزم بیع بالتقسیط طے ہو) تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

مذکورہ صورت سود میں داخل نہیں، بلکہ فی الجملہ لین دین کی سہولت اور تیسیر میں داخل ہے۔

۴) **بیع العُرْبُون** (بیعانہ۔ سائی) = یعنی کوئی چیز اس شرط پر فروخت کرنا کہ خریدار قیمت کا ایک حصہ ابھی دے دے، جو بیع مکمل ہونے کی صورت میں تو قیمت میں شمار ہوگا، اور بیع مکمل نہ ہو تو بائع کے حق میں ہبہ شمار ہوگا، یہ ممنوع اور باطل ہے، کیونکہ اس میں بائع کو ہبہ کی شرط ہے، جو فاسد ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ''آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے'' (ابوداود، ابن ماجہ)

دوران عقد بیعانہ کی شرط ہو تو حرام اور باطل ہے، البتہ عقد میں یہ شرط نہ ہو، بلکہ اتمام عقد کے بعد بائع بطور بیعانہ ایک قسط مانگے تو حرج نہیں، لیکن آئندہ یہ عقد فسخ ہو جائے تو خریدار کی اجازت اور رضامندی کے بغیر وہ رقم بائع کو حلال نہ ہوگی۔

۵) **بیعُ الدَّین بِالدَّین** (قرض کو قرض کے عوض بیچنا): یعنی ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہو، اور ایک تیسرے شخص کا اس سے پہلے پر قرض ہو، لہٰذا یہ شخص اپنا قرض تیسرے کو اس کے قرض کے مقابلہ میں بیچ دے۔ اس طرح کے بیع ممنوع اور باطل ہیں، کیونکہ مبیع کی سپردگی پر قدرت نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح قرض کو بیچنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ (دار قطنی)

اس کی ایک شکل یہ بھی ہے، کہ کوئی چیز خریدی جائے۔ قیمت تو ابھی دے دے لیکن چیز متعین مدت کے بعد سپرد ہوگی۔ متعینہ مدت گذرنے کے بعد بائع چیز پیش نہیں کرسکا اور خریدار سے کہا ''مذکورہ چیز فلاں قیمت پر مجھے فروخت کردو، قیمت فلاں مدت کے بعد ادا کروں

گا یہ بھی باطل ہے۔

جس پر دین ہو، اسی کو وہ دَین (قرض) دوسرے دَین کے بدلے فروخت کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ کسی پر موجود قرض، کسی موجودہ چیز کے مقابلہ میں کسی تیسرے کو فروخت کرنا بھی باطل ہے، کیونکہ مبیع کی سپردگی پر قادر نہیں ہے۔

البتہ جس پر قرض ہو، کسی چیز کے بدلہ وہ قرض اسی کو فروخت کردے، مثلاً ہزار روپئے قرض تھا، گھڑی کے بدلہ وہ اسے فروخت کردیا، یا مقروض پانچ سو ۵۰۰ روپے نکال کر اسے دے دے، تو یہ بیع صحیح ہے۔ کیونکہ یہ صلح کے حکم میں ہے، جو جائز ہے، جس کا ذکر آئندہ انشاء اللہ آئے گا۔ اس جائز صورت کے لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس روایت سے استدلال کیا جاسکتا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا'' میں بقیع میں اونٹ فروخت کرتا ہوں، دینار کے مقابلہ میں فروخت کرکے کبھی اس کی جگہ درہم لیتا ہوں، اور کبھی درہم کے مقابلہ میں فروخت کرکے اس کی جگہ دینار لیتا ہوں''؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''اس دن کے نرخ کے مطابق اس لین دین میں حرج نہیں، جبکہ دونوں کی جدائی تک رقم کا لین دین باقی نہ رہے۔'' (ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، احمد) ابن عمرؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ دینار میں بطور قرض فروخت کرتے، پھر اس کی جگہ درہم لیتے، یہ بعینہ مذکورہ شکل ہوئی۔ بقیع اہلِ مدینہ کے قبرستان کی جگہ کا نام ہے وہاں اس وقت بازار بھی لگتا تھا۔

۶) **قبضہ کرنے سے پہلے مبیع (چیز) دوسرے کو فروخت کرنا:** کوئی شخص ایک چیز خریدلے، اور اس پر قبضہ ہونے سے پہلے ہی کسی دوسرے کو فروخت کردے، تو یہ ممنوع اور باطل ہے، کیونکہ یہ مسئلہ گذر چکا کہ مبیع قبضہ سے پہلے خریدار کے ضمان میں داخل نہیں ہوا، لہٰذا ابھی اسے بیچنے کا اختیار نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''جو اناج خریدے، قبضہ کرنے تک اسے فروخت نہ کرے'' (بخاری، مسلم) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کا یہی حکم ہے۔ (بخاری مسلم)

یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ بائع کے علاوہ کسی اور کو فروخت کرے۔ اگر بائع کو ہی فروخت کردے اور پہلی قیمت یا اس کے مثل کے بغیر ہو تو یہ بھی باطل ہے اور مذکورہ ممانعت میں داخل ہے۔

لیکن بائع کو جس قیمت پر خریدا تھا بعینہ اسی قیمت کے مقابلہ میں، یا اس کے تلف ہونے کی صورت میں اس کے مثل سے فروخت کردے، تو یہ صحیح ہے، کیونکہ یہ درحقیقت پہلی بیع کا اقالہ ہے، کوئی نئی بیع نہیں ہے، گرچہ بظاہر بیع ہے۔

وہ حرام بیوع جو باطل نہیں

ان سے وہ بیوع مراد ہیں، جن کی ممانعت وارد ہے، لیکن کسی رکن میں نقص یا کسی شرط میں خلل کی وجہ سے نہیں، بلکہ کسی خارجی امر اور سبب کی وجہ سے، اسی لئے ان کے صحت کا حکم لگایا جائے گا، البتہ حرام اور باعث گناہ ہوگا۔

۱) **بیع المصرّاۃ:** مصراۃ اس اونٹنی، گائے یا بکری وغیرہ کو کہیں گے جس کا دودھ عمداً چند روز نہ نکالا جائے تاکہ تھن میں جمع ہو، اور خریدار کو زیادہ دودھ والی ہونے کا گمان ہو، جس کی وجہ سے وہ برغبت خریدلے یا قیمت میں اضافہ کرے۔ (کسی بھی ماکول اللحم جانور کو اس طرح فروخت کرے تو بیع المصراۃ میں داخل ہے)

اس طرح خرید وفروخت ہو تو صحیح ہے، لیکن دھوکہ اور خیانت کی وجہ سے بائع کو اس طرح کرنا حرام ہے، خریدار کو اس دھوکہ کا علم

ہوجائے تو فوراً لوٹانے کا اختیار ہے، کیونکہ یہ عیب کی وجہ سے رد کرنے کے حکم میں ہے۔ اگر دودھ نکال چکا ہے تو اس دودھ کے بدلہ میں ایک صاع کھجور بھی واپس کرے، یا بائع راضی ہو تو وہی دودھ لوٹا دے، مصراۃ کا علم ہونے کے باوجود خریدار اس جانور کو لوٹانا نہیں چاہتا تو اسے اس دھوکہ کے بدلہ میں کچھ رقم وغیرہ واپس نہیں ملے گی۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اونٹی اور بکری کا تصریہ مت کرو، (تھنوں میں دودھ روک کے مت رکھو) اس طرح کرنے کے بعد کسی نے خریدا تو دودھ دوہنے کے بعد اسے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے، اگر جانور پسند ہے تو رکھ لے، ناپسند ہو تو لوٹا دے اور ایک صاع کھجور بھی دے۔" (بخاری۔ مسلم) اونٹنی و بکری پر دیگر ایسے جانوروں کو قیاس کیا جائے گا، بالخصوص وہ جن کا گوشت حلال ہے۔

۲) **نَجش** : یعنی کسی کا کسی برائے فروخت چیز کی قیمت بڑھانا، حالانکہ وہ خریدنا نہیں چاہتا، صرف دوسرے خریدار کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ چیز نفیس اور قیمتی ہے، تاکہ وہ زیادہ قیمت پر خرید لے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ "آپ ﷺ نے نجش سے منع فرمایا" (متفق علیہ) لہٰذا یہ حرکت حرام ہے، البتہ بیع صحیح ہوجائے گی۔ اگر بائع اور ناجش (نجش کرنے والا) دونوں کی ملی بھگت سے یہ کام ہو تو دونوں حرمت کے مرتکب ہوں گے، اور بائع دھوکہ باز اور خائن شمار ہوگا، لہٰذا خریدار کو خیار حاصل ہوگا۔ اگر دونوں کی ملی بھگت ثابت نہ ہو تو خریدار کو خیار نہ ہوگا، قیمت کی صحیح تحقیق و تفتیش اور اندازہ اس کی ذمہ داری تھی۔

۳) **بَیعُ الحَاضِرِ لِلبَادی** : کوئی شخص بستی کے باہر سے (صحراو جنگل سے یا کسی اور جگہ سے) اپنے ساتھ کچھ ایسے اسباب فروخت کرنے لائے، جس کی اہل بستی کو حاجت ہو، اور بستی کا کوئی فرداً سے یہ مشورہ دے کہ تم ابھی فروخت نہ کرو، میں وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا فروخت کر کے تم کو زیادہ نفع اور فائدہ پہنچاؤں گا، تو اسے بیع الحاضر للبادی کہتے ہیں۔ (یعنی بستی والے کا صحرانشین کے لئے فروخت کرنا) اس طرح کرنا حرام ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (متفق علیہ عن ابن عباسؓ) ممانعت اور تحریم کا سبب لوگوں کے لئے تنگی اور حرج ہے۔

۴) **تَلَقِّی الرُّکبَان**: تاجر بستی سے باہر نکل کر اسباب لانے والوں سے ملاقات کر کے ان کو یہ تاثر دے کہ یہ اسباب بازار اور بستی میں سستے ہیں، تاکہ ان سے سستے داموں خرید سکے، تو اس عمل کو تلقی رکبان (آنے والے قافلہ کا استقبال اور ملاقات) کہیں گے۔

کوئی اس طرح اسباب خرید لے تو یہ خرید و فروخت صحیح ہے، لیکن حرام ہے، کیونکہ دھوکہ پایا جا رہا ہے، صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

یہ باہر سے اسباب لانے والے افراد بازار میں پہنچ جائیں اور قیمت سے آگاہ ہوں، اور یہ واضح ہو کہ ان کو نقصان ہوا ہے، تو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے تلقی رکبان کی ممانعت کے بعد ارشاد فرمایا کہ کسی نے اس طرح خریدا، تو بائع کو بازار میں پہنچنے کے بعد خیار (فسخ حاصل) ہوگا۔ (مسلم۔ اصحاب السنن)

۵) **اِحتِکَار** (ذخیرہ اندوزی، بندش، روک رکھنا) یعنی جو اشیاء بطور غلہ اور اناج استعمال ہوتے ہوں، انہیں عوام کی ضرورت کے وقت بازار سے خرید خرید کر ذخیرہ کرنا، تاکہ زیادہ سے زیادہ مہنگا ہوجائے اور پھر لوگوں کی مجبوری اور ضرورت سے فائدہ اٹھاتا ہوا رفتہ رفتہ فروخت کرے۔ (تاکہ خوب نفع ہو)

اس طرح کا تصرف حرام ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ "ایک گنہگار شخص ہی احتکار کرے گا۔" (مسلم فی المساقاۃ)

اگر عوام کو اس غلہ کی شدید ضرورت ہو تو ایسے آدمی کو مناسب دام سے اسے فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا، وہ نہ مانے تو قاضی (حاکم) خود اس کی طرف سے فروخت کر کے اسے قیمت دے دے۔ جس وقت بازار میں غلہ وافر مقدار میں ہو، اس وقت خرید کر جمع کرنا، تا کہ آئندہ قیمت بڑھنے پر فروخت کرے اس ممانعت میں داخل نہیں۔

۶) **کسی کی بیع پر بیع کرنا، یا سومٌ علی سومٌ** (کسی کے بھاؤ تاؤ میں ٹانگ اڑانا): بیع پر بیع کرنا، یعنی کسی نے کوئی چیز خریدی اور ابھی مدتِ خیار میں ہو، تو اسے جا کر یہ کہنا کہ اس قیمت میں اس سے بہتر چیز میں تم کو فروخت کرتا ہوں، یا ایسی ہی چیز اس سے کم قیمت پر تم کو دیتا ہوں۔

سوم، یعنی کوئی کسی چیز کی قیمت کر رہا ہو، اور عاقدین کسی قیمت پر متفق ہو جائیں، پھر دوسرا آ کر بائع کو زیادہ قیمت کی پیش کش کرے تا کہ خود خرید لے، یا خریدار کے سامنے ویسی ہی چیز اس سے کم قیمت پر، یا اس سے بہتر چیز اسی قیمت پر پیش کرے۔

یہ ساری صورتیں حرام ہیں، کیونکہ صحیحین میں آپ ﷺ نے بیع پر بیع اور قیمت پر قیمت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ان امور کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ یہ امور مروّت کے خلاف، اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و بغض اور کینہ کپٹ کا، اور عداوت و جھگڑے کا باعث ہے۔ جو آپسی ربط وضبط اور اخوت واتحاد کے منافی ہے، حالانکہ اسلام اتحاد واتفاق اور آپسی محبت والفت کی بڑی تاکید کرتا ہے۔

۷) **جس کا تمام مال حرام ہو اس کے ساتھ معاملہ کرنا:** اگر یہ معلوم ہو کہ فلاں کا سارا مال حرام ہے، مثلاً شراب، سور، مردار یا کتے جیسی حرام اشیاء کی رقم ہو، یا رشوت وغیرہ کوئی ناجائز ذریعہ آمدنی ہو، تو ایسے شخص کے ہاتھ کچھ فروخت کرنا، اس سے کوئی چیز خریدنا یا کرایہ وغیرہ کا لین دین کرنا اور اس کا کھانا کھانا حرام ہے۔

تمام مال حرام نہ ہو، بلکہ حرام اور حلال مخلوط ہو، تو مذکورہ معاملات اس کے ساتھ مکروہ ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے "حلال واضح ہے، اور حرام واضح ہے، اور دونوں کے درمیان بعض مشتبہ امور ہیں، جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے، پس جو شبہات سے پرہیز کرے اس نے اپنے دین وآبرو کی حفاظت کی، اور جو شبہات میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا۔" (متفق علیه)

خرید وفروخت کے آداب

۱) **برتاؤ میں نرمی اور فیاضی:** بائع قیمت کے متعلق کچھ نرمی سے پیش آئے، کم لے، خریدار مبیع میں نرمی برتے، لہٰذا شدید شرائط عائد نہ کرے، قیمت زیادہ دے۔

تنگدست اور غریب شخص سے قیمت وصول کرنے میں تساہل برتے، اسے مہلت دے، قرض کے مطالبہ میں سخت رویہ نہ اختیار کرے۔

آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اس شخص پر جو فروخت کرنے، خریدنے اور قرض کے مطالبہ میں نرمی کا برتاؤ کرے۔" (بخاری)

۲) **معاملات میں سچائی اور دیانت داری:** اشیاء کی صفات اور دیگر تفصیلات کے بتانے میں جھوٹ نہ کہے، قیمتِ خرید وغیرہ حقیقت سے زیادہ نہ بتائے، جن باتوں کو پوچھا جائے سچائی اور خیر خواہی کے ساتھ بتادے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تاجر بروز قیامت فاجر اٹھائے جائینگے، سوائے ان کے جو تقویٰ الٰہی سے متصف ہوں

اور سچ بولیں۔" (ترمذی فی البیوع و صححه)

ایک اور روایت میں فرمایا "سچا اور امانت دار تاجر انبیاء کرام، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔" (ترمذی) ایک حدیث میں فرمایا... "اگر (بائع اور خریدار) دونوں سچائی سے کام لیں اور (عیب وغیرہ کو) واضح کریں تو ان کی بیع میں برکت ہوگی، اور اگر (عیب) چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو برکت مٹادی جائے گی۔" (متفق علیه عن حکیم)

۳) **قسم نہ کھائے**، خواہ سچا ہی ہو لین دین میں زیادہ قسم نہ کھائے، بلکہ بہتر ہے کہ قسم کھائے ہی نہیں، خواہ وہ سچا ہو، کیونکہ اس میں اللہ کے نام کی بے وقعتی ہوتی ہے، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے "وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ تُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ (البقرة: ۲۲۴) ترجمہ: "اور اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین الخلق کے کام کرو۔ (یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہ کریں گے)

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے "قسم سامانِ تجارت کو خوب رائج کرتا اور فروغ دیتا ہے۔ (لیکن) برکت کو مٹا دیتا ہے۔" (متفق علیه)

ان لوگوں کو بڑے احتیاط کی ضرورت ہے، جو جھوٹی قسموں کے ذریعہ اپنے اسباب کو رواج دے کر تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں، اس میں بڑی تباہی اور ہلاکت ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے جھوٹی قسموں کے بل بوتے پر تجارت کو فروغ دینے والے کو سخت وعید اور دھمکی سنائی ہے۔ فرمایا "اللہ تعالیٰ نظر (کرم والفت) نہ فرمائیں گے، نہ ان کا تزکیہ ہوگا، اور ان کو دردناک عذاب ہوگا۔" (مسلم)

۴) **بازاروں میں اور لین دین کے اوقات** میں بکثرت صدقہ وخیرات کرتا رہے، تاکہ بے خیالی میں کھائی جانے والی قسموں کا، یا عیب کی عدم وضاحت، قیمت میں کوتاہی یا بعض ناروا سلوک وغیرہ امور کا کفارہ ہو۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے تاجروں کو خطاب کر کے فرمایا۔ "بلاشبہ شیطان اور گناہ فروخت کے وقت حاضر رہتے ہیں، لہٰذا تم اپنے معاملات میں صدقات کی آمیزش کیا کرو۔" (ترمذی، ابوداود، ابن ماجه)

۵) **تحریر و گواہ:** اگر معاملہ ادھار ہو تو قیمت و مدت وغیرہ تفصیلات کو قلمبند کر لینا مستحب ہے، تاکہ اختلاف وتنازعہ نہ ہو۔

آیت: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ (البقره۔ ۲۸۲) ترجمہ: "اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا (خواہ دام ادھار ہو یا جو چیز خریدنا ہے وہ ادھار ہو) ایک میعاد معین تک (کیلئے) تو اس (کی یادداشت ودستاویز) کو لکھ لیا کرو۔"

اسی طرح اس عقد بیع اور تحریر پر گواہ رکھنا بھی مستحب ہے۔ مذکورہ آیت میں فرمایا "وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (البقره۔ ۲۸۲) ترجمہ: اور (اس معاملہ دین پر علاوہ دستاویز لکھنے کے معاملے کی پختگی کے لئے) دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کرو۔ پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جاویں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو۔

ان امور کی انجام دہی مزید اطمینان اور آپسی تعاون کا باعث ہے۔

آیت: وَلَا تَسۡـئَمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰۤى اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا" (البقره۔ ۲۸۲)

ترجمہ: اور تم اس (دَین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا۔ یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ

قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑھو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے۔)

اس طرح نقد لین دین میں بھی گواہ رکھنا مستحب ہے، تاکہ آئندہ عقد یا اس کے کسی شرط کے متعلق انکار واختلاف اور نتیجتاً نزاع اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے، اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطاعت ہو جائے۔'' وأَشْهِدُوْا إِذَا تَبَايَعْتُمْ (البقرہ : ۲۸۲) (اور تم گواہ کرلیا کرو جب تم سودا کرو)

اِقَالَہ (بیع توڑنا)

'اقالہ' عربی زبان میں اٹھانے (ختم کرنے) کے معنی میں مستعمل ہے۔ عقود میں اس سے مراد عقد کے احکام وآثار کو اٹھا دینا اور ختم کرنا، لہٰذا فقہی اصطلاح میں اقالہ کا مطلب ہے، جو عقد فسخ کی صلاحیت رکھتا ہو، دونوں عاقدین کا اپنے اختیار سے اسے ختم کر دینے پر اتفاق کر لینا۔

مذکورہ تعریف سے یہ واضح ہوا کہ اقالہ کا تعلق لازم عقود سے ہے، یعنی جو اپنے ارکان وشرائط کے ساتھ مکمل ہو جانے پر طرفین میں سے تنہا کوئی ایک اسے فسخ نہیں کر سکتا، دونوں کے اتفاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ جو عقود جائز ہیں، یعنی (لازم نہیں بلکہ) عاقدین میں سے جو بھی چاہے دوسرے کی رضامندی کے بغیر فسخ کر سکتا ہے، اس میں اقالہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

نیز یہ بھی واضح ہے کہ جو عقود شرعاً قابل فسخ ہوں، انہیں میں اقالہ ہو سکتا ہے، جیسے خرید وفروخت اور اجارہ (کرایہ داری) وغیرہ، جو قابل فسخ نہ ہوں، جیسے نکاح، تو اس میں اقالہ کا کوئی دخل نہیں۔

اقالہ کی مشروعیت : اقالہ مشروع ہے، بلکہ ایک مطالبہ کرے تو دوسرے کو اسے قبول کر لینا مستحب ہے، کیونکہ لوگوں کی سہولت، اور موہوم نقصان سے بچنے کے ارادہ میں ساتھ دینا پایا جا رہا ہے۔ کبھی یوں پیش آتا ہے کہ کوئی خرید وفروخت کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں مجھے کافی خسارہ ہو رہا ہے، یا فی الوقت اس لین دین کی ضرورت نہیں تھی، لہٰذا یہ سوچ کر وہ پریشان اور غمگین ہوگا، اور اس کی پیش کش پر اقالہ کرنے میں اسے اس پریشانی سے نجات ملے گی، اور اس عمل میں جو اجر حاصل ہوگا، واضح ہے۔

حدیث : آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔'' جو کسی (نادم) مسلمان کی بیع کا اقالہ کرلے (بیع کو اس کی درخواست پر توڑ دے) اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لغزش سے بروز قیامت درگذر فرمائیں گے۔'' (ابوداود ، ابن ماجه و صححه ابن حبان و الحاکم)

اقالہ کا رکن : اقالہ میں صیغہ کا ہونا لازم ہے، یہی صیغہ اقالہ کا رکن ہے۔ مثلاً ایجاب میں یہ کہے'' میری بیع کا اقالہ کرو'' (بیع کو توڑ دو) دوسرا قبول میں یہ کہے'' میں نے اقالہ کیا'' فسخ، ترک (چھوڑنا) رفع (اٹھانا، ختم کرنا) ان الفاظ سے بھی اقالہ صحیح ہوگا۔ اقالہ بھی چونکہ عقد ہے، اس لئے دیگر عقود کی طرح ایجاب وقبول میں اتحادِ مجلس شرط ہے۔

اقالہ کے شرائط : (۱) اقالہ کرنے والے دونوں اشخاص کی رضامندی، جبراً اقالہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ فسخ عقد ہے، لہٰذا اس کی طرح رضامندی اور اختیار سے ہونا لازم ہے۔

(۲) اصل عقد کے مقابلہ میں کوئی کمی بیشی نہ ہو، کسی ایک بدل میں اضافہ یا نقصان کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ عقد کو ختم کر کے دونوں کا اپنی سابقہ حالت پر لوٹنا ہے۔ اسی لئے بیع میں اقالہ ہو، اور مبیع میں منفصل اضافہ ہو چکا ہو، جو اصل سے پیدا ہوا ہو، مثلاً بکری فروخت

ہوئی، پھر اسے بچہ ہوا، تو اب اقالہ نہیں ہوسکتا۔

سود [رِبا]

"ربا" کا لفظ عربی میں زیادتی اور اضافہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اصطلاح: فقہی اصطلاح میں ربا کا مفہوم ہے عوض مخصوص پر ایسا عقد، جو بوقتِ عقد شرعی معیار میں معلوم التماثل نہ ہو، یا دونوں بدل یا ایک بدل میں تاخیر ہو (تشریح آئندہ تفصیل سے سمجھ میں آئیگی)

عوض مخصوص سے ربوی اموال مراد ہیں، جن کی تفصیل آرہی ہے۔

معلوم التماثل نہ ہو (ایک دوسرے کے برابر ہونا معلوم نہ ہو) یعنی ایک دوسرے سے زائد ہو، یا مساوی ہونا یقینی نہ ہو۔

معیار شرعی یعنی ناپنے والی اشیاء میں ناپ، اور تلنے والی اشیاء میں تول اور وزن

بوقتِ عقد کی قید سے عقد کے بعد تماثل کا علم نکل گیا۔ مثلاً گیہوں کا ایک ڈھیر دوسرے ڈھیر کے بدلہ فروخت کیا، دونوں کی مقدار نامعلوم ہے، تو یہ ربوی عقد (سودی لین دین) ہے، سود کے احکام اس پر لاگو ہوں گے، گو بعد میں ناپنے کے بعد دونوں برابر اور مساوی ہوں، کیونکہ بوقتِ عقد اس کا علم نہیں تھا۔

بدل میں تاخیر کا مطلب یہ کہ دونوں مجلس میں (اپنی اپنی چیزوں پر) قبضہ نہ کریں، یا ادھار کی شرط ہو (یعنی ادائیگی کے لئے مدت متعین ہو)

وہ اموال جن میں سود کا حکم لگے گا

سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور نمک ان چھ اشیاء میں سود کا حکم لاگو ہوگا، کیونکہ ان کے متعلق صراحتاً نص وارد ہے۔

امام بخاری، امام مسلم اور دیگر حضرات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا "سونا سونے کے بدلہ میں سود ہے لیکن یہ کہ مجلس میں ہی لین دین اور قبضہ ہو، اور گیہوں گیہوں کے بدلہ سود ہے الّا یہ کہ مجلس میں ہی لین دین ہو، جَو جَو کے مقابلہ میں سود ہے الّا یہ کہ مجلس میں ہی قبضہ ہو، اور کھجور کھجور کے مقابلہ میں (فروخت کرنا) سود ہے، لیکن یہ کہ مجلس ہی میں قبضہ ہو جائے۔" (متفق علیہ)

ایک روایت میں چاندی اور سونے کے لین دین کا بھی یہی حکم بیان ہوا ہے، دیگر روایات میں بھی ان اشیاء کا نمک سمیت ذکر آیا ہے۔

ان چھ اشیاء کی طرح بعض دیگر اشیاء میں بھی سود ہوگا، کیونکہ یہ حکم علت کی روشنی میں ہے، لہٰذا سود کے وصف کے تحقق میں معتبر علت جن اشیاء میں بھی ہوگی، اس پر انہیں قیاس کیا جائے گا۔

سود کی علت: یعنی وہ وصف جس کی موجودگی میں وہ چیز ربوی (سودی) شمار ہوگی (اور ان کا آپس میں غیر شرعی طریقہ سے لین دین سود میں شمار ہوگا)۔ مذکورہ اشیاء کی روشنی میں فقہاء شافعیہ رحمہم اللہ کے نزدیک سونے چاندی میں علت ثمنیت (یعنی طبعاً و قدرتاً ان کا دیگر اشیاء کے لئے قیمت کی حیثیت رکھنا) اور دیگر اشیاء میں علت طعم (یعنی کھائی جانے والی چیز) ہے۔ ناپ تول سے دی جانے والی چیز ہو یا نہ ہو اس سے کوئی بحث نہیں، لہٰذا ثمن یا مطعوم کو اسی جنس کے مقابلہ میں فروخت کرنے میں بعض خاص شرائط کی رعایت ضروری ہے۔ (ورنہ وہ سود میں داخل ہوگا)

جب یہ بات واضح ہو چکی، تو جو چیز بھی سونے چاندی کی جگہ بطور قیمت استعمال ہو، جیسے آج کل نوٹ و سکے اور کرنسی، اسے بھی

ربوی مال شمار کریں گے اور غالباً انسان جن اشیاء کو کھاتا ہے، وہ بھی ربوی ہوگا، خواہ بطور غذا اور اناج کھائے جیسے چاول، مکئی وغیرہ یا بطور تفکہ (میوہ نوشی) استعمال ہو جیسے کشمش، انجیر، سیب، امرود وغیرہ یا دوائی کے طور پر اور غذا یا بدن کی اصلاح کے لئے استعمال کرے مثلاً ادرک، زعفران، گوند وغیرہ

مذکورہ اشیاء کے علاوہ کوئی چیز ربوی (سودی) نہیں۔ مثلاً سونے چاندی کے علاوہ دیگر دھات اور معدنیات (لوہا، پیتل، تانبہ وغیرہ)، کپڑا، لکڑا، کتاب، گھریلو سامان وغیرہ۔ خواہ وزن یا ناپ سے اس کا تعامل ہو یا کسی اور طریقے سے۔

ربا (سود) کے انواع اور ہر ایک کا حکم

١) **رِبَا الْفَضْل** (سودِ اضافہ): یعنی کسی سودی مال کو اسی جنس کے مقابلہ میں زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا۔ مثلاً ایک سیر گیہوں دو سیر گیہوں کے بدلے فروخت کرنا، یا ١٠٠ رگرام سونا ١١٠ رگرام، یا ٩٠ رگرام سونے کے عوض فروخت کرنا۔ اس طرح کی خرید و فروخت حرام ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''سونے کو سونے کے بدلہ میں فروخت نہ کرو مگر برابر سرابر، بعض بعض کے مقابلہ میں کم وبیش نہ ہو۔ اور چاندی چاندی کے بدلہ فروخت نہ کرو مگر برابر سرابر، بعض کو بعض کے مقابلہ میں کم وبیش نہ کرو'' (متفق علیہ)۔ ایک حدیث میں فرمایا ''سونا سونے کے مقابلہ میں، چاندی چاندی کے عوض، گیہوں گیہوں کے عوض، جَو جَو کے بدلہ میں اور نمک نمک کے عوض ایک دوسرے کے مساوی اور فوری لین دین، و قبضہ ہو، اگر کوئی زائد دے یا زائد کا مطالبہ کرے تو اس نے سود لیا، لینے اور دینے والا دونوں برابر ہیں'' (مسلم)

اس مسئلہ میں ایک نوع بہتر یا دوسرا اکثر و گھٹیا ہو تو اس کا اعتبار نہ ہوگا (بلکہ دونوں طرف مقدار میں مساوات لازم ہے) کیونکہ مذکورہ روایات کے الفاظ عام ہیں۔ نیز ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے گھٹیا قسم کے کھجور دو صاع دے کر اس کے عوض بردنی کھجور (کھجور کی ایک بہترین قسم) ایک صاع خریدی، آپ ﷺ کو پتہ چلا، بڑی تاکید سے اسے منع فرمایا اور سود قرار دیا۔ (بخاری۔ مسلم)

اسی طرح صنعت اور کاریگری کا بھی کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا ایک طرف سونے یا چاندی کے زیورات ہوں اور دوسری طرف صرف سونے یا چاندی کا ڈلا (یا بسکٹ)، تب بھی دونوں کا وزن مساوی ہونا لازم ہے، کمی بیشی جائز نہیں ہے، کیونکہ گذشتہ روایات کے الفاظ عام ہیں۔

(**تنبیہ**:- آج کل عموماً پرانے زیورات دے کر جدید خریدے جاتے ہیں۔ جس میں پرانا صرف سونا شمار ہوتا ہے، اور جدید میں بناوٹ اور کاریگری کی رقم بھی ملانی پڑتی ہے، اس طرح لازماً کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ہوتا ہے، جو قطعاً سود اور شرعاً حرام ہے، نیز اکثر جدید زیور آرڈر اور پسند کے مطابق بعد میں تیار ہو کر ملتا ہے، حالانکہ سونا سونے کے یا چاندی چاندی کے عوض ہو تو دونوں طرف سے نقد اور فوراً قبضہ لازمی ہے ادھار اور تاخیر بھی سود میں داخل ہے، لاعلمی اور بے التفاتی کی وجہ سے بلا وجہ اس طرح سود اور حرام کا ارتکاب ہوتا ہے، اس سے حد درجہ احتیاط لازم ہے۔ بہتر اور آسان ترکیب یہ ہے کہ اپنا زیور وغیرہ فروخت کر کے اس کی قیمت لے لے، پھر اس سے جو زیور چاہے خرید لے، خواہ فوراً ہو یا ادھار، یہ الگ الگ دو عقد ہوں گے، اور اسطرح سود کی نحوست سے نجات ملے گی)

٢) **رِبَا النَّسَا** (سودِ تاخیر): یعنی ایک ہی علت کے دو سودی اشیاء کی ادھار خرید و فروخت، خواہ دونوں اشیاء ایک ہی جنس کی ہوں یا جدا جدا، اور دونوں مساوی مقدار میں ہو یا کمی بیشی کے ساتھ۔

مثالیں: ایک سیر گیہوں ایک سیر گیہوں کے عوض، یا ایک سیر جو کے عوض یا دو سیر چاول کے عوض، ایک ماہ کی مہلت پر فروخت

کرے، یا ۱۰ ارگرام سونا ۱۰ ارگرام سونے کے عوض، یا ۱۰ ارگرام چاندی کے عوض، یا ۱۰۰ ارگرام چاندی کے عوض یا ۵ ارگرام چاندی کے عوض ایک دن یا اس سے زائد مدت پر فروخت کرنا۔

مذکورہ تعامل بھی حرام اور ممنوع ہے، کیونکہ اس میں درحقیقت سود کا مفہوم موجود ہے، گو ظاہر نہ ہو، کیونکہ فوری کو ادھار پر تقدم حاصل ہے، لہٰذا اس تعامل میں ایک عوض میں زیادتی ہے، یعنی جو نقد دیا جارہا ہے (ادھار کے مقابلہ میں گویا وہ زائد ہے)

آپ ﷺ نے ربوی اشیاء کو حاضر کے عوض غائب (ادھار) کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے (متفق علیہ) ایک حدیث میں جنس جدا ہو تو کمی بیشی کے ساتھ لین دین کو جائز قرار دیا، بشرطیکہ نقد معاملہ ہو (مسلم)

۳) **رِبَا الْیَد** (سودِ قبضہ): یعنی کسی سودی شئے کو اسی علت کے کسی شئے کے عوض فروخت کرے، اور نفسِ عقد میں ادھار اور تاخیر کی کوئی شرط نہ ہو، لیکن عملاً دونوں بدل یا کسی ایک بدل پر مجلس ہی میں قبضہ نہ ہو۔ (تو یہ بھی ممنوع ہے) حضرت عمرؓ کی متفق علیہ روایت گزر چکی کہ مجلس ہی میں قبضہ نہ ہو (اور دونوں اپنی اپنی چیز ایک دوسرے کے حوالہ نہ کرے) تو یہ سود ہے۔

جنسِ واحد اور جنسِ دیگر

ایک ہی جنس میں شمار ہونے، نہ ہونے کے متعلق فقہاء کرام نے ایک قاعدہ وضع کیا ہے، فرماتے ہیں: ہر وہ دو اشیاء جو اصل خلقت کے اعتبار سے اسم خاص (خاص نام) میں متفق ہوں، ایک ہی جنس ہیں، اور جو اصل خلقت میں اسم خاص میں مختلف ہوں دو الگ الگ جنس ہیں۔

اسم خاص کا مطلب جو عام اور مشترک نام سے اسے نمایاں کرے، مثلاً لفظ، کھجور، اسم خاص ہے، جو دیگر پھلوں اور میووں سے اسے ممیز اور نمایاں کرتا ہے، جبکہ پھل اور میوہ اسم عام ہے۔

اصلِ خلقت سے مراد وہ ہیئت ہے، جس پر اسے پیدا کیا گیا، لہٰذا کسی صنعت اور تبدیلی و تحویل کے بعد اتفاق کافی نہیں۔

پس سونے کی تمام انواع ایک جنس ہیں، اسی طرح چاندی کی انواع بھی، اور کھجور کی تمام انواع ایک جنس اور کشمش کی تمام انواع، اور گیہوں کی تمام انواع اور جَو کی تمام انواع ایک جنس شمار ہونگی۔

کسی چیز کے تر اور خشک کو ایک ہی جنس میں شمار کریں گے۔ مثلاً انگور و کشمش، تر کھجور اور خشک کھجور۔

کسی چیز سے بنائی جانے والی شئے اور وہ چیز (اصل) ایک ہی جنس ہیں۔ جیسے گیہوں اور اس کا آٹا۔

مختلف حیوانات کا گوشت جدا جنس ہے، مینڈھا ایک جنس ہے، بکری بھی اسی میں شمار ہے، گائے بیل اور بھینس کا گوشت ایک جنس ہے، اور تمام انواع کے اونٹ کا گوشت ایک جنس شمار ہوگا۔

گوشت سرخ ہو یا سفید، اس سے کوئی فرق نہیں، ایک ہی جنس ہیں، گوشت کے ساتھ مخلوط یا چپکی ہوئی چکنائی بھی گوشت کے حکم میں ہے، پیٹ کی چربی، دنبہ کی چکنی، اونٹ کا کوہان، جگر (کلیجہ)، تلی اور اوجھ یہ سب الگ الگ جنس ہیں۔

مختلف اجناس کی فروع (اس سے نکلنے اور بننے والی چیز) بھی جدا جدا جنس شمار ہوں گے، لہٰذا گیہوں کا آٹا اور چاول کا آٹا جدا جنس ہیں۔ انگور کا سرکہ ایک جنس اور کھجور کا سرکہ دوسری جنس ہے، اسی طرح غذا یا دوا میں مستعمل تیل کا حکم ہے۔ (لہٰذا مونگ پھلی کا تیل ایک جنس اور تل کا تیل ایک الگ جنس ہے) دودھ کا بھی یہی حکم ہے۔ پس مینڈھے اور بکری کا دودھ ایک جنس ہے، گائے اور بھینس کا دودھ ایک جنس ہے اونٹنیوں کا دودھ ایک جنس ہے۔ مختلف پرندوں کے انڈے مختلف جنس ہیں۔

ربوی (سودی) اموال کی خرید و فروخت اور اُس کی صحت کے شرائط

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کئی اشیاء کے ربوی (سودی) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان اشیاء کے لین دین اور خرید وفروخت میں شریعت نے مزید کچھ شرائط عائد کئے ہیں، جن کا لحاظ لازم ہے، خلاف ورزی کی صورت میں اس پر سود کا اطلاق ہوگا، اور آدمی گنہگار اور حرام کا مرتکب ہوگا۔

دین اسلام میں اللہ تعالیٰ نے بڑی سہولت اور آسانی رکھی ہے، اور حرج کو دور فرمایا ہے، لہٰذا ربوی اشیاء کے لین دین کی صحت کے شرائط واضح کردیئے ہیں، تا کہ آدمی سود کی حرمت سے بچ سکے۔ سابقہ تفصیل کی روشنی میں اس لین دین کی مختلف صورتیں اور ان کے شرائط درج ذیل ہیں۔

۱) **اتحادِ جنس:** کسی سودی چیز کو اسی جنس کے بدلہ فروخت کرے، مثلاً گیہوں کے بدلہ گیہوں، شکر کے عوض شکر، چاندی کے مقابلہ میں چاندی وغیرہ، تو اس میں تین شرائط لازم ہیں، ورنہ سودی کاروبار شمار ہوگا۔

أ) **دونوں بدل میں تماثل (مساوات۔ برابری):** چیز کیل ہو (یعنی ناپ سے لین دین ہوتا ہو) تو ناپ میں برابر ہو، مثلاً ایک مد کے بدلہ ایک مُد، ایک لیٹر کے بدلہ ایک لیٹر، اگر موزون (وزن سے فروخت ہونے والی) ہو تو وزن میں دونوں برابر ہو، مثلاً ار کلوگرام کے بدلہ ار کلوگرام، اور عددی ہو تو عدد میں برابر ہوں، مثلاً پانچ کے عوض پانچ۔

ب) **عقد حالاً (فوری اور نقد) ہو:** عقد میں دونوں یا کسی ایک بدل کی سپردگی ادھار نہ ہو، خواہ مختصر مدت کے لئے ہو۔

ج) **تَقَابُض (دونوں کا قبضہ کرنا):** دونوں بھی آپس میں ایک دوسرے کو بدل دے دیں اور اس پر قبضہ کرلیں، مجلس عقد سے دونوں کی جدائی سے قبل قبضہ ضروری ہے۔ (دلائل گزر چکے)

۲) **جنس مختلف ہو، اور علت متحد (ایک) ہو:** ایک سودی مال کسی دوسرے جنس کے سودی مال کے عوض فروخت ہو، لیکن دونوں کی علت ایک ہو، مثلاً سونا چاندی کے عوض یا کوئی اناج دوسرے کسی اناج کے عوض یا مطعوم (کھائی جانے والی اشیاء) کے عوض، تو اس عقد کی صحت کے لئے دو شرائط لازم ہیں، تا کہ سود کا ارتکاب نہ ہو۔

(أ) عقد حالاً (فوری اور نقد) ہو، جیسا کہ اتحادِ جنس میں گزر چکا۔

(ب) مجلسِ عقد میں ہی دونوں اپنی اپنی چیزوں پر قبضہ کرلیں۔

اس صورت میں دونوں بدل میں تماثل اور مساوات ضروری نہیں، ایک صاع گیہوں دو صاع جو کے بدلہ میں، اور ایک گرام سونا ۵ر گرام چاندی کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔ اور یہ عقد صحیح ہوگا اور اس پر عقد کے آثار مرتب ہوں گے، جبکہ ادھار معاملہ نہ ہو، اور مجلس میں ہی طرفین سے قبضہ ہوجائے جیسا کہ گذر چکا۔

آپ ﷺ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا..... ''سونا چاندی کے عوض، اور چاندی سونے کے عوض اور گیہوں کے عوض جَو اور جَو کے عوض گیہوں اور کھجور کے عوض نمک اور نمک کے عوض کھجور فوری لین دین ہو تو جیسا چاہو (یعنی کمی بیشی کے ساتھ) فروخت کرو'' (رواہ الشافعی)

۳) **علت مختلف ہو:** یہ ہم جان چکے کہ مال کے سودی ہونے میں فقہاء کرام کے نزدیک علت اس کا ثمن ہونا یا مطعوم ہونا ہے، لہٰذا کسی سودی عقد میں دونوں بدل میں علت کا اختلاف اسی وقت ہوگا جبکہ ایک طرف ثمن (قیمت) اور دوسری طرف مطعوم ہو، اور ایسی صورت میں بیع کے صحت اور جواز کے لئے سابقہ کسی شرط کی قید نہیں، (دیگر اور عام بیع کے جو شرائط ہیں وہ کافی ہیں) لہٰذا مثلاً ۲۰ صاع گیہوں ۱۰ ارگرام سونے کے عوض فروخت کرنا صحیح ہے، خواہ مجلس میں ہی قبضہ ہو یا نہ ہو، ادھار کی شرط ہو یا نہ ہو۔

حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل مقرر فرمادیا، تو وہ جَنِیب کھجور (ایک عمدہ قسم کا کھجور) لے آئے، تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا خیبر کے تمام کھجور ایسے ہی ہیں؟'' تو جواب دیا: نہیں، قسم بخدا، اے اللہ کے رسول! ہم اس کا ایک صاع دو صاع کے عوض، اور دو صاع تین صاع کے عوض حاصل کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو، جمع (یعنی مخلوط یا گھٹیا قسم کے کھجور) کو دراہم کے عوض فروخت کرو، پھر ان دراہم سے جنیب خریدو'' (متفق علیہ)

پس اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ بیع (خرید و فروخت) مطلقاً جائز ہے، جبکہ کوئی ایک بدل اثمان میں سے ہو (یعنی سونا چاندی سے)، اور دوسرا بدل کچھ اور، خواہ مطعوم ہو یا غیر مطعوم۔

۴) **غیر ربوی (غیر سودی) مال کے ساتھ تبادلہ ہو:** جب کوئی ربوی مال غیر ربوی مال کے عوض فروخت ہو، تو بیع مطلقاً صحیح ہے، ربوی تعامل کے شرائط میں سے کسی شرط کی قید نہیں، پس نہ تماثل شرط ہے نہ حلول اور نہ تقابض، کیونکہ ایک بدل غیر ربوی ہو تو عقد ربوی شمار نہ ہوگا۔

لہٰذا طعام کے کسی بھی نوع کو کپڑے وغیرہ کے عوض فروخت کرے تو مطلقاً جائز ہے، تماثل ہو یا نہ ہو، اور بیع حالاً ہو یا مؤجلاً (ادھار)

مماثلت (مساوات): اس کا تحقق اور اعتبار اور مانع

آپ یہ مسئلہ جان چکے کہ کسی ربوی مال کی اسی جنس سے خرید و فروخت کی صورت میں دونوں بدل میں مماثلت اور مساوات کا تحقق اور ثبوت ضروری ہے، تاکہ بیع صحیح ہو اور سود کا ارتکاب نہ ہو۔

اب ان سطور میں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ مساوات کیسے ثابت ہوگی؟ اس کا اعتبار کب ہوگا؟ اور اس ثبوت میں کون سے امور مانع (رکاوٹ) شمار ہوں گے؟

(أ) مماثلت کا ثبوت کس طرح ہوگا: ہر ربوی مال میں دونوں بدل کا شرعی مقدار کے اعتبار سے برابر اور مساوی ہونا شرط ہے، جو چیز کیلی ہو اس میں کیل (ناپ) کا اور جو موزون ہو اس میں وزن کا اعتبار ہوگا، کیلی چیز میں وزن کے فرق کا اور موزون چیز میں کیل کے فرق کا کوئی اثر نہ ہوگا (کیلی سے مراد جو ناپ سے فروخت ہو اور موزون یعنی جس کا لین دین وزن سے ہو) کیلی اشیاء کو اسی جنس سے فروخت کرنے میں کیل (ناپ) میں مساوات لازم ہے، اگر مساوی وزن سے لین دین ہو تو جائز نہیں، اور موزون کا اسی جنس سے وزن میں مساوات کے ساتھ تبادلہ ضروری ہے، ناپ میں مساوات کے ساتھ لین دین جائز نہیں۔

پس یہ واضح ہوا کہ مماثلت کیلی میں کیل اور موزون میں وزن کے ذریعہ ثابت ہوگی۔

کسی مال کے موزون یا مکیل ہونے کا فیصلہ

کسی مال کے موزون یا مکیل ہونے میں آپ ﷺ کے دورِ مسعود میں اہلِ حجاز (مکہ و مدینہ) کے غالب عادت کا اعتبار ہوگا،

کیونکہ اقرب یہی ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی اور آپ ﷺ نے اسے برقرار رکھا، نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے "وزن میں اہل مکہ کا اور ناپ میں اہل مدینہ کا اعتبار ہوگا" (ابوداود ، نسائی عن ابن عمر)

لہٰذا اہل حجاز کا اس وقت جو عرف رہا ہوگا، اسی کا اعتبار ہوگا، خواہ آئندہ لوگ اپنے علاقوں میں کسی جدید عرف پر عمل پیرا ہوں (مثلاً کھجور و گیہوں وغیرہ آپ ﷺ کے دور میں ناپ سے فروخت ہوتی تھیں، لیکن اب ہمارے علاقوں میں عموماً وزن سے لین دین ہوتا ہے، پھر بھی یہ کیلی شمار ہوں گے، اور اسی جنس سے فروخت کے وقت ناپ میں مساوات لازم ہے، نہ کہ وزن میں)

جو شئے آپ ﷺ کے دور مسعود میں نہ تھی جیسے کافی، قہوہ، چائے وغیرہ، یا تھی لیکن اس کا حال نامعلوم ہو، تو اگر اس کا ناپ ممکن نہ ہو، یعنی بڑی اشیاء ہوں کہ درمیان میں کافی خلا باقی رہتا ہو جیسے سیب، انار اور بیگن وغیرہ تو اس میں وزن کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر ناپ ممکن ہو تو اس میں بیع کے علاقہ کے عرف و عادت کا اعتبار ہوگا۔

امام ابو یوسف کا قول: حنفیہ میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کسی بھی شئے کے مکیل یا موزون ہونے میں علاقہ کے عرف اور عادت کا اعتبار کرتے ہیں، پس جس جگہ جو چیز وزن سے فروخت ہوتی ہے وہ موزون اور جو کیل سے فروخت ہوتی ہو وہ مکیل کہلائے گی۔

ان کی رائے میں نص کا تعلق بھی عرف سے ہے، آپ ﷺ نے بعض اشیاء کے کیل اور بعض کے وزن کی صراحت اس وقت کے عرف کے اعتبار سے فرمائی ہے، اگر عرف اس کے برعکس ہوتا تو آپ ﷺ کی صراحت بھی برعکس ہوتی۔

بعض متاخرین حنفیہ نے اس قول پر عمل کو ترجیح دی ہے، اور شاید لوگوں کی سہولت اور انہیں گناہ سے بچانے کے لئے یہی بہتر ہوگا، ورنہ اکثر علاقوں میں لوگوں کے معاملات کو فاسد و باطل قرار دینا پڑے گا، اور انہیں فاسق اور گنہگار ٹھہرانا ہوگا، لہٰذا ہماری رائے میں اس قول پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (یہ اصحاب الفقہ المنہجی کی رائے ہے)

(ب) مماثلت کا اعتبار کب ہوگا:

۱) اگر ربوی چیز کا ناپ یا وزن مختلف حالات میں جدا ہو، اور اس کے تری و خشکی کی حالت مختلف ہو، تو اس میں خشک ہونے کے بعد مماثلت کا اعتبار ہوگا، جو کہ پختگی کے کمال کی حالت ہے،

لہٰذا۔ اناج کو آپس میں خرید و فروخت کرنے کے لئے اس کا خشک اور سخت ہونا ضروری ہے، نیز چھلکوں کی صفائی بھی ہو، تا کہ مماثلت کا تحقق ہو۔

اور کھجور کے کھجور سے تبادلہ کے لئے اس کا تمر بننا (خشک ہونا) ضروری ہے، رُطَب (تر کھجور) کو رُطب کے عوض یا رُطب کو تمر کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

اور انگور کو انگور یا کشمش کے عوض فروخت نہ کرے، کیونکہ اس میں کمال یہ ہے کہ وہ کشمش بنے۔ اسی طرح کسی بھی میوہ کو اسی جنس سے خشک حالت کے بغیر فروخت نہ کرے۔ (جیسے زرد آلو، انجیر) نہ تر کو تر کے عوض فروخت کرے اور نہ تر کو خشک کے عوض۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ سے رُطب (تر کھجور) کے عوض تمر (خشک کھجور) خریدنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے حاضرین سے دریافت فرمایا۔ "کیا رُطب خشک ہونے کے بعد گھٹ جاتا ہے"؟ تو صحابۂ کرام نے عرض کیا: جی ہاں۔ تب آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا اور فرمایا کہ اہلِ علم کا اس پر عمل ہے۔ (ترمذی، ابوداود ، نسائی ،ابن ماجہ ، مؤطا)

۲) اگر وہ چیز خشک نہ ہوتی ہو، جیسے ککڑی، وہ کھجور جو خشک نہ ہو، یا وہ انگور جو کشمش نہ بنے اور زیتون، تو ایسی اشیاء میں تر حالت میں مماثلت کافی ہے، اور وزن سے فروخت کی جائے، چاہے وہ کیلی ہو۔

۳) اناج سے جو چیز بنائی جائے، مثلاً آٹا وغیرہ اسے اسی جنس سے برابری کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں اور نہ اس اناج سے جس سے وہ بنا ہو، کیونکہ وہ حالتِ کمال سے نکل چکا، اور اس حالت میں مماثلت کا علم ممکن نہیں۔

البتہ ایسی چیز کسی دوسرے جنس سے برابر یا کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، مثلاً گیہوں کا آٹا، چاول کے آٹے کے عوض، کیونکہ جنس جدا ہے، لیکن حلول اور تقابض شرط ہے۔

۴) جن دانوں سے تیل نکالا جاتا ہے، ان میں دانے کی حالت میں اور تیل کی حالت میں مماثلت کا اعتبار ہوگا جیسے تل، مونگ پھلی وغیرہ (لہٰذا تل کو تل کے عوض یا تل کے تیل کو تل کے تیل کے عوض فروخت کر سکتے ہیں) لیکن دانے کو تیل کے عوض فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ مساوات کا ثبوت نہ ہوگا (لہٰذا تل کو تل کے تیل کے عوض فروخت کرنا منع ہے)

۵) انگور اور کھجور کے شیروں اور سرکوں میں بھی آپس میں مماثلت کافی ہے۔

۶) دودھ میں پانی یا کسی اور چیز کی آمیزش کے بغیر خالص حالت میں مماثلت کا اعتبار ہوگا۔

ج) مماثلت سے مانع امور (رکاوٹ)

۱) **آگ کی تاثیر :** کسی ربوی چیز کو آگ پر پکایا گیا یا بھونا گیا ہو تو اسے اسی جنس سے فروخت کرنا جائز نہیں (جیسے جوش دیا ہوا دودھ، بُھنا ہوا گوشت وغیرہ) کیونکہ حقیقی مماثلت دشوار ہے۔

موم سے شہد، دودھ سے گھی اور سونے چاندی سے کھوٹ کو جدا کرنے کے لئے آگ میں تپایا یا پکایا ہو تو اس میں حرج نہیں۔

۲) **مُخَالَطَة :** (اختلاط، خلط ملط کرنا اور ملانا): کسی ربوی مال میں اس کے جنس کے علاوہ کوئی اور چیز مخلوط (ملی ہوئی) ہو، خواہ وہ مخلوط ربوی ہو یا غیر ربوی، مماثلت کا تحقق اور یقین نہ ہو سکے گا، نتیجتاً اسے اسی جنس کے عوض فروخت کرنا ممنوع ہوگا، چاہے بالمقابل جنس خالص ہو یا مخلوط۔ اسی لئے پنیر وغیرہ میں مماثلت کا اعتبار نہ ہوگا۔

مماثلت یقینی ہو، محض گمان و تخمین کافی نہیں

مسئلہ گذر چکا کہ کسی ربوی شئے کی اسی جنس کے عوض خرید و فروخت کی صحت کے لئے دونوں بدل میں کیل یا وزن میں مساوات شرط ہے۔ اس مساوات اور مماثلت کا عقد کے وقت بالیقین موجود ہونا ضروری ہے، لین دین سے قبل ہی دونوں بدل کا کیل یا وزن ہو جائے، یا دونوں کی مقدار دونوں عاقدین کو معلوم ہو۔

صرف گمان میں اور اندازاً مماثلت کافی نہیں، مثلاً گیہوں کا ایک ڈھیر دوسرے ڈھیر کے عوض اٹکل سے فروخت کرے، یعنی بغیر کیل یا وزن کے، یہ سمجھتے ہوئے کہ دونوں برابر ہوں گے، یا ۱۰۰ صاع گیہوں ایک ڈھیر گیہوں کے عوض فروخت کرے، جس کے متعلق اندازہ یہ ہو کہ ۱۰۰/صاع ہوگا، تو یہ دونوں بیع ممنوع ہے۔ کیونکہ دونوں میں کمی بیشی کا احتمال ہے، اور اتحادِ جنس کی صورت میں ربوی اشیاء کی فروخت کی صحت کے لئے تفاضل (کمی بیشی) کا احتمال نہ ہونا شرط ہے، کیونکہ تفاضل کا احتمال یقینی تفاضل کی طرح ہے۔

آپ ﷺ نے کھجور کے ایک ڈھیر کو جس کی مقدار نا معلوم ہو، متعین مقدار کھجور کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ کا فرمان ہے۔ ”جب بھی کسی مسئلہ میں حلال و حرام کا اجتماع ہو، تو حرام ہی کو غلبہ ہوگا“، یعنی کسی موقع پر دو امر

وارد ہو: ایک حلت کا اور دوسرا حرمت کا مقتضی ہو، تو تقاضائے حرمت کو مقدم رکھتے ہوئے اس سے روکا جائے گا، تاکہ شبہات کے ارتکاب سے دور رہے اور دینی امور میں احتیاط کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ مذکورہ مسئلہ میں عدمِ تفاضل کا احتمال حلت کا، اور تفاضل کا احتمال حرمت کا مقتضی ہے، لہٰذا حرمت کو ترجیح دی جائے گی۔

مُزَابنَہ: درخت پر موجود تازہ کھجور کو توڑے گئے خشک کھجور کے عوض اندازاً مساوات کے ساتھ فروخت کرنے کو مزابنہ کہتے ہیں، اسی طرح انگور و کشمش کو فروخت کرنا بھی مزابنہ ہے۔

مُحَاقَلَہ: بالیوں میں موجود اناج کے عوض اندازاً اس کے مساوی صاف کیا ہوا اناج فروخت کرنا محاقلہ کہلاتا ہے۔ مزابنہ اور محاقلہ میں دونوں بدل میں یقینی مساوات نہ ہونے کی بناء پر یہ دونوں شرعاً ممنوع ہیں۔ صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے اس طریقِ بیع سے منع فرمایا ہے۔

عَرَایا: صاحبِ باغ اپنے کھانے کے لئے جس درخت کا انتخاب کر کے اسے مستثنیٰ رکھے، اسے لغت میں عَرِیّہ (جمع۔ عَرَایا) کہتے ہیں۔

درخت پر موجود تازہ کھجور کا اندازہ لگا کر اس کے مساوی خشک کھجور کے عوض اسے فروخت کرنا، یا اسی طرح انگور کو کشمش کے عوض فروخت کرنا، جبکہ ۵ وسق سے کم مقدار ہو، (یعنی تقریباً سات سو کلوگرام کے مساوی) تو شرعاً اسے عریہ (عرایا) کہا جاتا ہے۔

لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر مزابنہ کی عام ممانعت سے شریعت نے عرایا کی مذکورہ صورت کو مستثنیٰ قرار دیا، اور اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔

صحیحین میں حضرت سہل بن ابی حثمہ، ابوہریرہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم سے کھجوروں میں بیع العرایا کی رخصت کی روایات موجود ہیں۔ انگوروں کو بھی چونکہ کھجوروں کی طرح خشک کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے، اور اس میں بھی اندازہ لگانا ممکن اور دونوں ہی زکوی مال ہیں، اسلئے انگور کو بھی کھجور پر قیاس کیا گیا۔

گوشت کو گوشت کے عوض، گوشت کو حیوان کے عوض اور حیوان کو حیوان کے عوض فروخت کرنا

گوشت کو گوشت کے عوض فروخت کرنا: مسئلہ گزر چکا کہ گوشت اپنے اصل کے مطابق جنس شمار ہوگا اور یہ ربوی مال ہے، لہٰذا ایک ہی جنس کا گوشت ہو (مثلاً گائے کے گوشت کو گائے کے گوشت کے عوض فروخت کرنا) ہو تو تماثل، حلول اور تقابض کی شرط کے ساتھ جائز ہے۔ اگر جنس مختلف ہو، مثلاً بکری کا گوشت گائے کے گوشت کے عوض، تو تفاضل (کمی بیشی) جائز ہے، البتہ حلول اور تقابض شرط ہے۔

حیوان کے عوض گوشت کو فروخت کرنا: حیوان کے عوض گوشت کی فروخت مطلقاً ناجائز ہے، نقد ہو یا اُدھار، گوشت اسی حیوان کے جنس کا ہو یا کسی اور جنس کا، حیوان ماکول اللحم ہو (جیسے بکری کے عوض گائے کا گوشت) یا غیر ماکول اللحم (جیسے گائے کا گوشت گدھے کے عوض)، پس تمام صورتوں میں یہ بیع ناجائز ہے۔

گوشت ہی کی طرح دیگر کھائے جانے والے اعضاء و اجزاء کا حکم ہے۔ مثلاً چربی، چکنی، جگر، دل، گردہ، تلی وغیرہ۔

چمڑے کو دباغت کے بعد حیوان کے بدلہ فروخت کرنا جائز ہے، کہ اب وہ گوشت کے حکم میں نہ رہا، البتہ دباغت سے پہلے چمڑہ بھی

گوشت کے حکم میں ہے، اس لئے اس کے بدلہ حیوان کی فروخت جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی اصل دلیل حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ "آپ ﷺ نے بکری کو گوشت کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا" (الحاکم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد)

اور امام مالک نے حضرت سعید بن المسیب سے مرسلاً روایت نقل کی ہے کہ "آپ ﷺ نے حیوان کو گوشت کے بالمقابل بیچنے سے منع فرمایا ہے۔" (مؤطا۔ البیوع)

حیوان کو حیوان کے بدلہ بیچنا: گذشتہ تفصیلات سے یہ واضح ہو چکا کہ حیوان ربوی مال نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی حالت اور ہیئت پر کھانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ اثمان میں داخل ہے۔

لہٰذا حیوان کو حیوان کے عوض تفاضل (کمی بیشی) کے ساتھ بیچنا جائز ہوگا، خواہ دونوں ایک ہی نوع کے ہوں یا الگ الگ نوع کے، پس ایک بکری دو کے عوض، ایک بکری ایک اونٹ کے عوض، ایک اونٹ تین بکری کے عوض وغیرہ بیچنا جائز ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ جانور سواری اور بار برداری اور کھانے اور نسل بڑھانے کے قابل ہے، یا صرف کھانے کے قابل ہے۔

اسی طرح حالاً اور مؤجلاً (نقد اور ادھار) بھی جائز ہے، مجلسِ عقد ہی میں قبضہ ہو یا نہ ہو، اور دونوں بدل ایک ہی جنس ہوں یا مختلف جنس۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "آپ ﷺ نے انہیں ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا، تو اونٹ ختم ہو گئے، تب آپ ﷺ نے صدقہ کے اونٹوں کے بدلہ خریدنے کا حکم دیا، لہٰذا وہ ایک اونٹ دو اونٹ کے عوض (ادھار) خریدتے، کہ صدقہ کے اونٹ سے (بعد میں) ادا کریں گے۔" (رواہ ابوداود و ذکرہ البیھقی شاھدا صحیحا)

سودی تعامل (لین دین) کا حکم، اس پر مرتب اثرات کے اعتبار سے

ربوی (سودی) مال کی خرید و فروخت میں شریعت کے مقررہ شرائط کا لحاظ نہ کیا گیا، جس کی تفصیلات سابقاً گذر چکیں، تو یہ عقد باطل قرار پائے گا، لہٰذا اس پر کوئی اثر مرتب نہ ہوگا، گویا کہ عقد ہوا ہی نہیں، کیونکہ معاوضات اور لین دین میں سود اسے باطل کر دیتا ہے۔

اس عقد کے بطلان کا مطلب یہ ہے کہ دونوں عاقدین اپنا اپنا بدل واپس لوٹالیں، پھر از سرِ نو صحت عقد کے تمام شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے عقدِ جدید کریں، ورنہ دونوں بھی گنہگار ہوں گے، اللہ کی طرف سے سخت عذاب و گرفت کے مستحق ہوں گے اور ان دونوں کی یہ کمائی حرام اور خبیث ہوگی۔

ربا القرض (قرض کا سود)

ربا القرض یعنی کسی سے اس شرط پر متعینہ مدت کے لئے مال قرض لینا کہ وہ اسے قرض کو مع متعین اضافہ کے لوٹائے گا، یا قرض کی واپسی تک بطور نفع و فائدہ متعین قسط قرض خواہ کو ادا کرتا رہے گا۔

شریعت کے نصوص و دلائل اولاً اور براہ راست اسی سودی تعامل سے روکنے اور اسے باطل قرار دینے کے لئے وارد ہوئے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں اسی سودی لین دین کا رواج تھا، سرِ مو اس میں اور اُس میں تفاوت نہ تھا، اسی لئے دورِ حاضر کے بعض حریصوں کی طرح اس وقت کے لوگوں نے سود کے حرص اور مالی رغبت میں اس کے جواز کے لئے یہ استدلال پیش کیا کہ یہ نفع حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے،

اس میں اور بیع (خرید و فروخت) میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا قرآن کریم نے بڑی سختی سے اس کی تردید کرتے ہوئے ان کے اس لچر استدلال اور پاگل پن کا پول کھول کر رکھ دیا، اور اس دور از کار قیاس پر سخت دردناک سزا اور ہمیشہ جہنمی زندگی کی دھمکی دی۔

آیت: اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ط وَاَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ ط وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (البقرہ، ۲۷۵، ۲۷۶)

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپٹ کر (یعنی حیران مدہوش) یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے، اور سود کو حرام کر دیا ہے، (تو اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ اس سے باز آ گیا تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے۔ وہ اسی کا رہا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالہ رہا۔ اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جاویں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔ (کبھی تو دنیا میں بھی، ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو۔''

اس طرح مذکورہ آیت نے بڑی صراحت اور وضاحت سے مطلقاً سود کے حرمت کا اعلان کیا، قلیل و کثیر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا، سود سے باز آنے کی ترغیب دی، اور دوبارہ اسے اختیار کرنے پر سخت دھمکی دی۔

پھر اگلی آیات نے مومنوں کو مطلقاً اس سے باز آنے کا حکم دیا، اور اسے ایمان کی صحت کی شرط و دلیل قرار دیا، اور سودی معاملات پر اصرار کی صورت میں ایسی سخت دھمکی دی جو کسی اور گناہ پر نہیں دی، پھر بہتر انسانی سلوک کی رہنمائی کی جس سے آپسی تعاون اور معاشرہ میں محبت و مودت کی فضاء قائم ہو۔

آیت: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ o فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ o وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ o (البقرہ ۲۷۸ تا ۲۸۱)

ترجمہ: ''اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا مقتضا اطاعت کرنا ہے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اعلان سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تم پر جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا۔ اور اگر (مدیون و مقروض) تنگدست ہو (اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک (یعنی جب اسکے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل) معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔ اور (مسلمانوں) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے

گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگذاری درست رکھو اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو)

قرآن کریم کی مذکورہ آیات کے ساتھ ساتھ بکثرت روایات صحیحہ نے بھی سود کی حرمت کو مؤکد کیا ہے، اسے کبیرہ اور مہلک گناہوں میں شمار کیا، اور اس کے مرتکب کو ہلاکت و بربادی سے ڈرایا اور جس معاشرہ میں یہ رواج پایا جائے اس کے ضیاع اور نیست و نابود ہونے سے آگاہ اور متنبہ کیا ہے۔

احادیث : (۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "آپ ﷺ نے سود کھانے والے (لینے والے) اور کھلانے والے (دینے والے)، اور لکھنے والے (سودی کاروبار کے منشی و کلرک) اور دونوں گواہ پر لعنت بھیجی ہے۔ اور فرمایا: وہ سب برابر ہیں (یعنی گناہ میں)" (رواہ مسلم)

۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "سات مہلکات سے بچو" صحابۂ کرام نے پوچھا: یا رسول اللہ، وہ کیا ہیں؟ تو فرمایا: "اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو، جس جان کو اللہ نے حرام قرار دیا اسے بغیر حق (اور شرعی جواز) کے قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، کفار سے جہاد کے دوران میدان سے راہِ فرار اختیار کرنا، عفت مآب پاکیزہ اور بھولی بھالی مومن خواتین پر (زنا کی) تہمت لگانا" (متفق علیہ)

۳) آپ ﷺ نے فرمایا "زنا اور سود کسی بستی میں ظاہر ہو تو انہوں نے اپنے اوپر عذاب الٰہی کو دعوت دی۔" (حاکم فی المستدرک، احمد، طبرانی)

مذکورہ آیات و احادیث سود کی حرمت و شناعت کے لئے کافی ہیں، سود کو شرک و سحر کے ساتھ بیان کیا گیا اور زنا جیسے جرم کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا، اسی لئے تمام مسلمانوں کا سود کی حرمت پر اجماع ہے۔ بالاتفاق یہ اکبر الکبائر میں سے اور موجب فسق ہے۔ اور جب تک آدمی اس سے صحیح توبہ نہ کرے اس کا کوئی عمل صالح مقبول نہ ہوگا، بلکہ تمام آسمانی مذاہب سود اور سودی تعامل کی حرمت پر متفق ہیں، قرآن مجید نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ بنو اسرائیل کو اس سے روکا گیا تھا، اور جس لعنت و عذاب کے وہ مستحق ہوئے، اس کا ایک سبب اس حکم کی خلاف ورزی بھی تھی۔ (دیکھئے۔ سورہ نساء۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱)

سودی تعامل اور لین دین ہر جگہ اور ہر کسی کے ساتھ حرام ہے ،خواہ دار الحرب ہو یا کسی غیر مسلم ذمی یا حربی کے ساتھ معاملہ ہو۔ اسی طرح مروجہ بینک کے ساتھ بھی سودی کاروبار حرام ہے، بعض دنیا پرست مختلف تاویلات اور لچر دلائل کے ذریعے بینکوں کے سود کو، یا غیروں کے بینک سے سود وصول کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، جو قطعاً باطل ہے۔ (البتہ مجبوری کے درجہ میں حکومت کے قوانین اور کاروباری مسائل کے اعتبار سے بینکوں کے ذریعے رقوم کے لین دین کی گنجائش رکھی گئی ہے، لیکن سود کی نیت سے گنجائش نہ ہوگی، جو سود نکلے اسے مفتیان کرام فقراء و مساکین پر صدقہ کر دینے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سود سے متعلق بعض جدید مسائل

دوسرے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۸۹ء میں مندرجہ ذیل امور پر اتفاق کیا گیا۔

۱) **ربوا (سود) قطعی حرام ہے** ، اور جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔

۲) **بعض خاص حالات** میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے، کون سا عذر معتبر ہے اور

کون سانہیں،اس سلسلہ میں معتمد اصحاب افتاء کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔

۳) **ہندوستان میں محض سرکاری قرضے** ایسے ہیں جس میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے،اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے،اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ کے مساوی یا اس سے کم ہو،تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔

۴) **ہندوستان میں حکومت** جب اراضی مملوکہ کو ایکوائر کرتی ہے (یعنی سرکاری حکم سے لوگوں کے ملکیت کی زمین مفاد عامہ کے لئے جبراً خریدی جاتی ہیں) اور حکومت اس کی قیمت مالکوں کو اپنے ضابطوں کے پیش نظر اپنی منشاء کے مطابق ادا کرتی ہے۔ مالکان سرکاری حکم کے خلاف عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں،عدالتیں عادلانہ قیمت کا تعین کرتی ہیں اور مالکان کو ایکوزیشن کی تاریخ سے بذریعہ فیصلہ عدالت اس قیمت کے علاوہ اضافی رقم بھی سود کے نام سے دلاتی ہیں،سیمینار کی رائے میں یہ اضافی رقم سود نہیں، بلکہ قیمت کا جز ہے،جس کا لینا اور اپنے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔

۵) **بینک انٹریسٹ بھی سود ہے** ،اسے بینکوں میں نہ چھوڑا جائے بلکہ نکال کر ثواب کی نیت کے بغیر فقراء و مساکین پر خرچ کردیا جائے ،اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے،سود کی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جاسکتا ، اکثر شرکاء سیمینار کی رائے میں اسے رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء و مساکین تک محدود رکھنا چاہئے۔ (تلخیص از مجلہ فقہ اسلامی - ترتیب مجاھد الاسلام قاسمی ص ۵۷۱-۵۷۲)

بیع سَلَم (سَلَف)

عربی زبان میں سَلَم تقدیم (مقدم کرنا۔ پہلے دینا) کو کہتے ہیں،شرعاً کسی موصوف چیز کی ذمہ میں بیع جو بلفظ سلم یا سلف ہو، بیع سلم کہلاتی ہے یہ معدوم اور بائع کے پاس فی الحال غیر موجود چیز کی بیع ہے،لیکن اسے (بعض مصالح کی وجہ سے) مستثنیٰ اور جائز قرار دیا گیا ہے۔

مشروعیت: معدوم کی بیع ناجائز ہونے کے باوجود لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر،شریعت اسلامیہ نے بیع سلم کی اجازت دی ہے۔

حدیث : (۱) جس وقت آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ ایک سال اور دو سال کی مدت پر پھلوں میں بیع سلم کیا کرتے ، لہٰذا آپ ﷺ نے فرمایا،' جو بیع سلم کرے،تو معلوم پیمانہ (ناپ)،اور معلوم وزن (تول) میں اور معلوم مدت کے لئے کرے'' (متفق علیہ عن ابن عباسؓ)

۲) حضرات عبدالرحمٰن بن ابزیٰ اور عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے'' ہم لوگوں کو آپ ﷺ کی معیت میں مال غنیمت ملتا تھا،اور ہمارے پاس شام کے لوگ آتے تھے تو ہم ان سے گیہوں، جو اور تیل میں ایک متعینہ مدت کے لئے بیع سلم کرتے'' ان سے پوچھا گیا'' کیا ان لوگوں کے پاس کھیتی باڑی تھی بھی یا نہیں؟'' تو فرمایا'' ہم لوگ ان سے یہ سب دریافت نہ کرتے'' (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ نے ادھار (قرض) کے جواز پر قرآن پاک کی آیت (سورۃ البقرہ - آیت ۲۸۲) سے بھی بیع سلم کے جواز کے لئے استدلال کیا، کیونکہ یہ بھی ایک طرح کے ادھار کا معاملہ ہے،لہٰذا آیت کی روشنی میں یہ بھی جائز ہوگا۔(عام طور پر قیمت ادھار ہوتی ہے،لیکن بیع سلم کے اس کے برعکس قیمت فوراً اور چیز ادھار ہوتی ہے)

حکمت : معدوم کی بیع ہونے کے اعتبار سے قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ بیع سلم کی اجازت نہ ہوتی لیکن لوگوں کی حاجتوں کے پیش

نظرا اجازت ملی، کیونکہ مختلف اہل پیشہ اور کاشت کار و باغبانوں کو بعض مرتبہ اپنے پیشہ کو چلانے اور پیداوار کو بڑھانے وغیرہ کے لئے مال کی ضرورت پیش آئے گی اور بوقت ضرورت ممکن ہے بطور قرض دینے والا کوئی نہ ملے، یا کسی وجہ سے وہ خود نہ چاہے، لہٰذا شریعت نے یہ رخصت اور سہولت عنایت فرمائی کہ پہلے ہی بطور قیمت کسی سے مال لے کر اپنی ضروریات میں صرف کرے اور مقررہ وقت پر سامنے والے کو وہ چیز فراہم کرے۔

اسی طرح جو تاجر اسباب خریدنا چاہتے ہیں اور رقم موجود ہے، لیکن فی الحال کوئی فروخت کرنے والا نہیں ہے، تو ان کو یہ سہولت دی کہ مال ابھی صرف کریں اور اسباب بعد میں وصول کریں۔

بہرحال شریعت نے بیع سلم کے ذریعے مختلف مصلحتوں سے لوگوں کو ہمکنار کیا، نفع پہنچایا، اور مال کو بلاوجہ اور بے کار پڑے رہنے سے بچایا، جس پر کہ معاش کا دارومدار ہے، اور جواز کے لئے ایسے شرائط و قیود لگا دیئے کہ معدوم کی بیع میں جو خطرات ہو سکتے تھے، اس کا تدارک اور اس سے حفاظت ہوگئی۔

ارکان و شرائط

بیع سلم کے چار ارکان ہیں، عاقدین، صیغہ، سلم کا رأس المال (یعنی قیمت)، مُسلَم فیہ (یعنی وہ چیز جس کی بیع سلم ہو رہی ہے۔) ان میں سے ہر ایک کے کچھ شرائط ہیں۔

۱) **عاقدین**: یعنی ایک تو خریدار جو مطلوبہ چیز کے مقابلہ میں پہلے ہی قیمت دے رہا ہے۔ اسے مُسلِم کہیں گے۔

اور دوسرا فروخت کرنے والا، جو قیمت وصول کر رہا ہے تاکہ اس کے بدلہ میں چیز ادا کرے، اسے مُسلَم اِلَیہ کہیں گے۔

بائع اور خریدار میں عقل، بلوغ اور اختیار وغیرہ جو شرائط ضروری ہیں ان دونوں میں بھی ضروری ہیں۔ البتہ یہاں بینا ہونا ضروری نہیں، جبکہ عام بیع میں یہ ضروری تھا، کیونکہ بیع میں عاقدین کا مبیع کو دیکھنا ضروری تھا، اور سلم میں مبیع ادھار ہے اور اس کے اوصاف متعین کر دیئے گئے ہیں، جو صرف سماعت (سننے) سے حاصل ہو جائیں گے، چیز کے قبضہ کے وقت کسی بینا کو وکیل بنا دینا کافی ہے، تاکہ مذکورہ صفات کی تحقیق ہو سکے۔

۲) **صیغہ**: یعنی ایجاب وقبول کے الفاظ۔ مثلاً خریدار کہے "میں تم کو یہ ہزار روپے دے رہا ہوں ۲۵ میٹر فلاں فلاں صفت کے کپڑے میں بیع سلم کے طور پر، اور مُسلَم الیہ کہے "میں نے قبول کرلیا" وغیرہ۔ بیع کی طرح ایجاب وقبول میں اتحاد مجلس اور ایک دوسرے کی موافقت وغیرہ ضروری ہیں۔ نیز لفظ سَلَم یا سَلَف کے ساتھ صیغہ شرط ہے، کسی اور لفظ سے صحیح نہ ہوگا۔ مزید عقد سلم حتمی ہو، اس میں خیار شرط کا دخل نہ ہو، البتہ خیار مجلس حاصل ہوگا، کیونکہ یہ خیار دونوں کی جدائی کے ساتھ ہی ختم ہوگا، لہٰذا اس کا سلم کے شرائط سے ٹکراؤ نہ ہوگا۔ بخلاف خیار شرط کے۔

۳) **رأس المال**: یعنی وہ قیمت جو خریدار ادا کرتا ہے، اس میں مندرجہ شرائط ضروری ہیں۔

(الف) عاقدین اس کی مقدار وصفت سے واقف ہوں۔ مثلاً ہزار روپے وغیرہ ناپ تول کی اشیاء بطور قیمت ادا کر رہا ہو تو اسی اعتبار سے مقدار کی تعیین، نیز اس کی صفات کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثلاً سو کلو فلاں قسم کے گیہوں۔ اگر چیز سامنے موجود ہو تو صرف مقدار کی تعیین کافی ہے، صفات کے تذکرہ کی ضرورت نہیں، کہ وہ دکھائی دے رہی ہے۔

(ب) مجلس عقد میں ہی خریدار قیمت ادا کرے اور مُسلَم اِلیہ اس پر قبضہ کرلے، دونوں کے اس مجلس سے جدائی سے قبل یہ لازم ہے، کیونکہ سلم کا اصل مفہوم ہی سپرد کرنا ہے، لہٰذا یہ نہ پایا گیا تو عقد ہی نہ ہوگا، مزید یہ بَیْعُ الدَّیْنُ بِالدَّیْنِ کے مشابہ ہوگا، جوکہ ممنوع ہے۔ حقیقی قبضہ شرط ہے، اگر قیمت کو کسی اور کے حوالہ کرے (کہ مسلم الیہ اس سے وصول کرلے) تو صحیح نہ ہوگا، کیونکہ حوالہ قبضہ نہیں ہے۔

۴) **مُسلَمْ فِیْہ** : یعنی جو چیز فروخت کی جارہی ہے، اور جس کی ادائیگی کا بائع وعدہ کررہا ہے۔ اس میں یہ شرائط ہوں۔

(الف) ایسی چیز ہو کہ اوصاف کے ذریعے اس کا ضبط ممکن ہو، جن کے اختلاف سے اغراض کا فرق ہوتا ہے، اس حد تک ضبط اور تعیین ہوسکے کہ کسی خاص اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہ سکے، معمولی سا تفاوت جس سے لوگ درگذر کرتے ہوں، اس میں حرج نہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں آپ ﷺ اور شیخین کے دور مسعود میں گیہوں، جو، کشمش اور کھجور میں بیع سلم کا ذکر ہے، اور یہ ساری اشیاء ایسی ہیں، جن کا ضبط ممکن ہے، حضرت ابن عباسؓ نے کرابیس (ایک مخصوص قسم کا کپڑا) میں سلم کی اجازت دی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ریشم کے کپڑے میں سلم کی اجازت دی۔ ان پر دیگر ہر اس شئی کو قیاس کیا جائے گا، جس کا وصف کے ذریعہ ضبط ممکن ہو، خواہ پہلے سے پائی جاتی ہو، یا اب پائی جارہی ہے یا ایسی چیز جو کہ آئندہ پائی جائے گی، گو وہ مثلی نہ ہو۔

اگر وصف سے ضبط ممکن نہ ہو تو اس میں بیع سلم جائز اور صحیح نہیں کیونکہ اوصاف کی لاعلمی آئندہ نزاع کا سبب بنے گی۔ مثلاً کھال، نفیس جواہر، وغیرہ............

آگ پر پکی اور بھنی ہوئی اشیاء میں بھی سلم درست نہیں ہے، کیونکہ آگ کی تاثیر کا فرق ہوگا، لہٰذا ضبط ممکن نہیں، اگر صرف تمیز اور جدائی کے لئے آنچ دی گئی ہو، جیسے گھی جدا کرنے کے لئے، شہد سے موم جدا کرنے کے لئے گرم کرنا، تو اس میں بیع سلم صحیح ہے، کیونکہ اس صورت میں آگ کی تاثیر معمولی ہوتی ہے۔

(ب) اس کی جنس، نوع، مقدار اور صفت سے دونوں عاقدین واقف ہوں، جیسا کہ ابتداء میں حدیث میں گزرچکا۔

(ج) مختلف اشیاء سے مرکب ومخلوط چیز نہ ہو، مثلاً جو وغیرہ ملاکر بنایا ہوا چارہ، مشک وعنبر وغیرہ ملاکر بنائی گئی خوشبو، جبکہ اس میں ہر چیز کا تناسب نامعلوم ہو۔

اگر مرکب میں موجود مختلف اشیاء کی مقدار اور ان کا تناسب معلوم ہو، اور وصف سے ضبط ممکن ہو، تو سلم صحیح ہے۔ مثلاً اون اور روئی سے بنا ہوا کپڑا جبکہ دونوں کا تناسب معلوم ومتعین ہو۔ اسی طرح صرف کسی چیز کی حفاظت کے لئے اس میں (نمک وغیرہ) کوئی چیز ملائی گئی ہو تو اس میں سلم صحیح ہے۔

(د) مُسلَم فیہ دین ہو، یعنی معین نہ ہو بلکہ ذمہ میں ہو، صرف اس چیز کے اوصاف بیان ہوئے ہوں، مثلاً ہزار روپئے سپرد کرے فلاں صفات کے دس کپڑوں کے لئے۔ اگر یوں کہے کہ ان دس کپڑوں میں بیع سلم کے طور پر یہ ہزار روپے دے رہا ہوں، اور وہ کپڑے سامنے موجود اور معین ہوں تو یہ عقد سلم صحیح نہیں ہے، کیونکہ سلم کی مشروعیت تعیین کے بغیر صرف اوصاف کی بنیاد پر ذمہ میں فروخت کرنے کے لئے ہے، خود لفظ اس پر دلالت کررہا ہے۔ اور نہ اس طرح (عام) بیع منعقد ہوگی، کیونکہ لفظ سلم استعمال ہوا ہے، جس کا تقاضا ہے کہ چیز دین ہو، اور 'یہ کپڑے' کہنا مبیع کو معین کردیتا ہے، اس طرح دونوں لفظ میں تعارض ہوا، لہٰذا یہ عقد صحیح نہ ہوگا۔

(ھ) اس کی سپردگی پر قادر ہو۔ غالب گمان ہو کہ مقررہ وقت پر طے شدہ چیز حاصل ہوگی، گو دوسری جگہ سے لانا پڑے۔ مقررہ وقت پر غالباً نہ ملنے والی شئی میں بیع سلم صحیح نہیں۔ مثلاً سرما میں آم، انگور یا تازہ وتر کھجور وغیرہ۔ (اگر کسی دور میں یا کسی علاقہ میں اس موسم میں بھی

یہ اشیاء دستیاب ہوں تو صحیح ہے)۔اسی طرح جو نوع نادر و مشکل ہو، اسمیں بھی صحیح نہیں۔ مثلاً مخصوص حجم (سائز) کا خربوزہ، یا ایسی جگہ کا جہاں وہ چیز بہت کم پائی جائے، کیونکہ کسی آفت یا بیماری کیوجہ سے وقت مقررہ پر ممکن ہے ادا نہ کر سکے۔

غالباً موجود شئی کسی سبب سے وقت مقررہ پر مہیا نہ کی جا سکے، تو عقد سلم فسخ نہ ہوگا، مسلم (خریدار) کو اختیار ہے کہ دستیاب ہونے تک انتظار کرے، یا ادا شدہ رقم بلا کسی کمی یا بیشی کے واپس لے اور عقد فسخ کرے۔

ایک مسئلہ کی طرف توجہ ضروری ہے، وہ یہ کہ مسلم فیہ کی جگہ دوسری چیز لینا جائز نہیں ہے۔ مثلاً گیہوں کے بدلہ گھی، کپڑے کے بدلہ لوہا وغیرہ۔ بلکہ مزید انتظار نہیں کرتا ہے تو پہلے عقد سلم فسخ کردے، پھر قیمت واپس لے کر خود اسی مسلم الیہ سے یا کسی دوسرے سے جو چاہے خرید لے، یا قیمت مسلم الیہ کے ذمہ باقی رہے، پھر مسلم الیہ اس کے بدلہ کوئی اور چیز فروخت کرے، یا قیمت ہی لوٹا دے۔

نیز اس کا خیال بھی رہے کہ خریدار مُسْلَم فیہ (چیز) پر قبضہ کرنے سے پہلے کسی دوسرے کو فروخت نہیں کر سکتا، جیسا کہ آج کل کئی تاجر کرتے ہیں۔ اگر اس طرح کرنا ہو تو اس کی جائز اور صحیح شکل یہ ہے کہ خریدار بھی دوسرے کو بطور بیع سلم فروخت کرے، پھر وقت مقررہ پر اس میں سے یا کسی اور جگہ سے موصوفہ چیز ادا کردے۔

(د) مُسْلَم فیہ کی ادائیگی کے وقت کی تعیین، مثلاً ایک ماہ کے بعد دو، ایک رمضان کو ادا کرو وغیرہ۔ مدت کا ذکر نہ ہو، یا ذکر ہو لیکن متعین نہ ہو مثلاً فلاں جب سفر سے لوٹے، میرا دھان جب کٹے وغیرہ تو صحیح نہیں، کیونکہ مدت مجہول ہے۔ فلاں کے لوٹنے اور دھان کٹنے کا وقت متعین نہیں، آگے پیچھے ہو سکتا ہے، پھر آپس میں اختلاف و نزاع ہوگا۔ حدیث میں گزر چکا کہ "معلوم مدت کے لئے ہو"

اگر وقت مقررہ سے پہلے ہی مسلم الیہ، مسلم فیہ (چیز) مُسْلَم (خریدار) کی خدمت میں پیش کردے، تو اسے قبول کر لینا لازم ہے، جبکہ بقیہ مدت میں اس کو مزید خرچ یا کلفت برداشت نہ کرنی پڑے اور متعینہ مدت میں شرعاً اس کی کوئی مناسب و معقول غرض نہ ہو، یا قبول نہ کرنے کا کوئی معقول عذر نہ ہو۔ اگر حیوان ہے، جس میں اسے مزید خرچ ہوگا، یا لوٹ کھسوٹ کے ایام میں سپرد کر رہا ہے تو وہ انکار کر سکتا ہے، اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اپنے وقت میں فروخت کرنے تک رکھنے کا انتظام اس کے پاس نہ ہو تو وہ انکار کر سکتا ہے۔

(ز) سپردگی کی جگہ کی تعیین لازم ہے، جبکہ جس جگہ عقد طے ہوا وہ اس قابل نہ ہو، یا قابل تو ہو، لیکن اسے وہاں منتقل کرنے میں مشقت و خرچ ہو۔ اگر وہ جگہ سپردگی کے قابل بھی ہو اور کوئی خرچ وغیرہ بھی نہ ہو، تو وہیں سپرد کرے، جبکہ عقد میں کسی دوسرے جگہ کی تعیین و صراحت نہ ہوئی ہو، کسی دوسرے جگہ کی صراحت ہو تو وہی متعین ہے۔ اختلاف کی صورت میں عرف کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے۔

عقد استصناع

عقد استصناع یعنی کسی کاریگر اور پیشہ ور سے اس سے متعلق کسی چیز کا حکم (آرڈر) دے کر بنوانا اور اسکے لئے درکار اشیاء بھی اسی کاریگر کی ہوں۔

دور حاضر میں اس کا عام رواج اور چلن ہے، لہٰذا اس مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے، پہلے اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

مثلاً موچی کو جوتے چپل وغیرہ تیار کرنے کا حکم دے، چمڑا اور دیگر ضروری اشیاء بھی اسی کی ہوں۔ بڑھئی سے لکڑی یا المونیم کی کوئی چیز بنوائی جائے (ٹیبل، کرسی، پلنگ وغیرہ) لکڑی وغیرہ اشیاء بھی اسی کی ہوں، اسی طرح شیشہ گر سے گلاس، کپ وغیرہ، لوہار سے چاقو چھری وغیرہ بنوانا۔ بستر، گدا وغیرہ اسباب خانہ بنوانا، جس کے نمونہ اور اوصاف کی وضاحت اور اس پر اتفاق ہو جائے۔

اس نوع عقد میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر عقدِ سلم کے مذکورہ شرائط کا انطباق ہو، یعنی وصف کے ذریعہ ضبط، استعمال ہونے والے مواد اور اشیاء کا ضبط، سپردگی کی مدت کی تعیین، مجلس عقد میں قیمت کی حوالگی وغیرہ شرائط، تو اسے عقد سلم کا حکم دیتے ہوئے صحیح قرار دے سکتے ہیں، گو بیع کا لفظ استعمال ہوا ہو، کیونکہ عقود میں اصل اعتبار معانی و مقاصد کا ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا۔

اگر سلم کے سابقہ شروط پائے نہ جائیں، جیسا کہ آج کل عموماً ہوتا ہے، بالخصوص مجلس عقد میں قیمت کی مکمل ادائیگی، کیونکہ اکثر بنوانے والے (آرڈر دینے والے) بوقتِ عقد قیمت کی ایک قسط ادا کرتے ہیں، بقیہ رقم قسط وار یا چیز تیار ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے، بلکہ کبھی بعد میں بھی رقم باقی ہوتی ہے، اور کاریگر اس کا مطالبہ کرتا ہے، کبھی بوقتِ عقد بالکل ہی قیمت کی ادائیگی نہیں ہوتی، عام معمول یہی سب ہے، تو یہ سلم نہ ہوا، نتیجتاً فقہاء شافعیہ رحمہم اللہ کے نزدیک صحیح نہ ہوگا۔ البتہ سادات حنفیہ رحمہم اللہ کے نزدیک اس طرح کا معاملہ صحیح ہے۔ تعامل اور عام حاجت کے پیش نظر، بشرطیکہ عقد میں ساری باتوں اور چیز کی تفصیلات کی وضاحت ہو، تا کہ آئندہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔

لہٰذا ہمارے نزدیک (بقول مصنفین الفقہ المنہجی) اس مسئلہ میں سادات حنفیہ کے اس فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کی سہولت کی خاطر، اس قسم کے تعامل کو صحیح قرار دینے میں کوئی حرج نہیں، حالات اور لوگوں کے عام تعامل کا یہی تقاضہ ہے۔ سارے ہی فقہاء کرام اور ائمہ عظام حق ہی کی اتباع کرتے ہیں، اور رضائے الٰہی کے مطابق اور سنت رسولؐ کے موافق بندگانِ خدا کی مصلحتوں کو تلاش و جستجو میں کوشاں ہیں۔ واللہ اعلم

فلیٹ کی خرید و فروخت

ہماری رائے میں مکان اور فلیٹ کی، صرف نقشہ اور پلان کی بنیاد پر خرید و فروخت بھی اس قسم میں داخل ہے۔

لہٰذا تمام اوصاف منضبط ہوں، سمنٹ، لوہا اور دیگر مستعمل اشیاء کی تفصیلات واضح ہوں اور قیمت مکمل مجلس عقد میں ادا کر دی جائے تو یہ عقد بطور بیع سلم کے صحیح ہوگا۔

اور اگر بیع سلم کے شروط کا پورا انطباق نہ ہو، جیسا کہ دورِ حاضر میں عام ماحول ہے، کیونکہ بوقتِ عقد پوری قیمت عموماً ادا نہیں کی جاتی، اور کوئی خریدار تعمیر میں مستعمل اشیاء کی تفصیلات سے واقف نہیں ہوتا، تو یہ عقد استصناع میں داخل ہوگا، اور اسے صحیح قرار دیا جائے گا، لوگوں کا مدت سے اس پر عمل ہے، بشرطیکہ متعلقہ ساری تفاصیل پہلے ہی طئے ہو جائے، کوئی کسر اور جہالت باقی نہ رکھے، تا کہ آئندہ نزاع نہ پیدا ہو، اور ایسی کوئی شرط نہ ہو، جو شریعت الٰہی کے مخالف، فاسد و باطل ہو اور جس کی وجہ سے عقد باطل قرار پائے۔

قرض

عربی زبان میں لفظ 'قرض' کا معنی ہے 'کاٹنا' اور فقہی اصطلاح میں قرض کہا جاتا ہے۔ کسی مالی چیز کا دوسرے کو اس شرط پر مالک بنانا کہ وہ اس کا بدل بغیر اضافہ کے لوٹا دے۔ اہلِ حجاز قرض کو سلف کہتے ہیں، لہٰذا اس لفظ سے بھی قرض صحیح ہوگا۔

قرض جائز اور مشروع ہے، قرض کا محتاج قرض کا سوال کرسکتا ہے، اسے مانگنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ جس سے قرض کا سوال ہو، اسے قرض دینا مستحب ہے، کتاب و سنت اور اجماع امت سے یہ ثابت ہے۔

آیت : "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً فَیُضَاعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافاً کَثِیْرَةً" (البقرہ ۲۴۵)

ترجمہ : کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے، اچھے طور پر قرض دینا، پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت

سے حصے کر دیوے"۔اور اللہ کو قرض دینے میں صدقات اور بندوں کو قرض دینا شامل ہیں۔

احادیث: (۱) ایک اعرابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی سختی سے اپنے قرض کا مطالبہ کرنے لگے، تو آپ ﷺ نے حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے دریافت کروایا کہ "اگر تمہارے پاس کھجور ہوں تو ہمیں قرض دو، جب ہمارے پاس کھجور آئیں گے تو قرض ادا کر دیں گے۔" (ابن ماجہ)

۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے "کوئی بھی مسلم دو مرتبہ قرض دے تو ایک مرتبہ صدقہ کی طرح ہے۔" (ابن ماجہ ۔ابن حِبّان)

۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے "جو لوگوں کے اموال ادا کرنے کی نیت سے لے تو اللہ تعالیٰ اس کی جانب سے ادا کر دیں گے۔اور جو تلف کرنے کی نیت سے لے تو اللہ تعالیٰ اسے تلف کر دیں گے۔" (بخاری)

اجماع: آپ ﷺ کے دورِ مسعود سے آج تک امت کا قرض پر عمل رہا ہے اور علماء نے اسے بغیر کسی انکار کے صحیح سمجھا ہے۔

حکمت۔ قرض کی مشروعیت کی حکمت بالکل واضح ہے، نیکی اور تقویٰ کے امور پر مسلمانوں میں باہمی تعاون کو اجاگر کرنا، اور پریشان حال اور فاقہ مست افراد کی طرف دستِ تعاون دراز کر کے آپسی اخوت اور بھائی چارہ کے رشتہ کو مضبوط کرنا اور ایک دوسرے کی پریشانی کو دور کرنے میں جلدی اور پیشقدمی کرنا، کیونکہ کبھی کوئی بطور ہبہ یا صدقہ تعاون کرنے میں پس وپیش کر سکتا ہے، لہٰذا قرض کے ذریعہ یہ مقصد بسہولت حاصل ہو جائیگا۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔'مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ہلاکت کے غار میں دھکیلتا ہے، اور جو اپنے بھائی کی حاجت میں لگا ہو، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی میں ہیں، جو شخص کسی مسلمان کی تکلیف کا ازالہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کے بروز قیامت تکالیف میں سے کسی تکلیف کو دور کریں گے، جو مسلمان کی پردہ پوشی کرے، اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ (رواہ البخاری) ۔ایک جگہ ارشاد گرامی ہے۔"اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد فرماتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنے کسی بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔" (رواہ مسلم)

قرض کی ایک اہم حکمت محتاجوں اور تنگدستوں کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانے کا خاتمہ کرنا ہے، کیونکہ عموماً ایک مکلّف کسی حاجت سے ہی قرض لے گا، اب اگر اسے قرض حَسن نہ مل پائے تو سود اور انسانی خون چوسنے کا رواج چل پڑے گا، جیسا کہ تجربہ شاہد ہے۔اسی لئے ایک حدیث میں قرض کا ثواب صدقہ سے بھی زائد بتلایا، آپ ﷺ فرماتے ہیں، کہ شب معراج میں، میں نے جنت کے دروازے پر یہ لکھا پایا" صدقہ کا ثواب دس گنا اور قرض کا اٹھارہ گنا ہے۔" تو میں نے جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ قرض صدقہ سے افضل کیوں قرار پایا؟ تو جواب دیا کہ سائل اپنے پاس ہوتے ہوئے بھی سوال کرتا ہے اور ایک آدمی قرض حاجت کی وجہ سے ہی مانگے گا۔ (ابن ماجہ)

قرض کا حکم: سابقہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی کہ قرض دینا مستحب ہے، اور لینا مباح ہے، عام حالات میں یہ حکم ہے۔قرض کے مقاصد و اغراض کے تحت اس حکم میں درج ذیل تبدیلی ہوگی۔

۱) **حرام:** اگر یہ معلوم ہو کہ سامنے والا کسی حرام کام میں صرف کرنے کیلئے قرض لے رہا ہے تو ایسی صورت میں قرض دینا حرام ہے مثلاً شراب پینے اور جوا کھیلنے وغیرہ۔

۲) **مکروہ:** اگر یہ معلوم ہو کہ بغیر مصلحت کے صرف کرنے کے لئے قرض لے رہا ہے، یا تکبر کرنے اور بکھیرنے کے لئے لے رہا ہے یا لینے والے کو معلوم ہو کہ میں ادائیگی سے قاصر رہوں گا تو مکروہ ہے۔

۳) **واجب :** جب معلوم ہو کہ قرض مانگنے والا اپنے یا اہل وعیال پر بقدر شروع خرچ کرنے کا محتاج اور ضرورت مند ہے، اور اس سے قرض لینے کے علاوہ اس کا کوئی اور راستہ نہیں ہے تو قرض دینا واجب ہے۔

قرض کے ارکان : قرض کے تین ارکان ہیں (۱) صیغہ (۲) عاقد (۳) مَعْقُود علیہ

۱) **صیغہ :** یعنی ایجاب وقبول کے کلمات۔ مثلاً میں نے تمہیں قرض دیا، میں نے تم سے قرض لیا قرض کا لفظ ہی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ہم معنی دوسرے لفظ بھی صحیح ہیں مثلاً اس کے بدل کے مقابلہ میں تمہیں اس کا مالک بنایا، یا یہ اس کے مثل کے عوض لے لو، اور قرض لینے والا کہے، میں بدل کے عوض اس کا مالک بن گیا وغیرہ۔

ماضی اور امر کے لفظ سے بھی صحیح ہوگا۔ مثلاً مجھے قرض دو، مجھ سے قرض لو، مجھے قرض دیا وغیرہ۔

قرض دینے والے کی طرف سے ایجاب اور لینے کی طرف سے قبول کا کلمہ ضروری ہے، کیونکہ یہی آپسی رضامندی کا عنوان ہے، اور اسی پر دارومدار ہے، صرف معاطاۃ (بلا لفظ کے لین دین) کافی نہیں۔ مثلاً کوئی کہے مجھے قرض دو اور دوسرا بلا لفظ کے دے دے۔

۲) **عاقد :** یعنی قرض لینے والا اور دینے والا، ان دونوں میں درج ذیل شرائط ضروری ہیں۔

(أ) رُشد : یعنی بالغ ہوں اور دینی اور مالی صلاح سے متصف ہوں۔ کیونکہ قرض ایک مالی معاملہ ہے، اور معاوضہ مالیہ میں عاقد میں رشد شرط ہے، لہٰذا کسی بچے یا پاگل یا سفاہت کی وجہ سے مجور شخص کا قرض لینا یا دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ مالی تصرف کا اختیار نہیں رکھتے۔

(ب) اختیار : لہٰذا اکراہ (جبر وزبردستی) کی صورت میں صحیح نہ ہوگا، کیونکہ رضامندی مفقود ہے۔

(ج) قرض دینے والے کو اس چیز میں تبرع (صدقہ۔ مفت کسی کو دینا) کا حق ہو، کیونکہ قرض میں تبرع کا شائبہ ہے، لہٰذا کوئی ولی اپنے ماتحت (بچہ یا پاگل وغیرہ) کے مال سے بلا حاجت یا ضرورت قرض نہیں دے سکتا۔

۳) **معقود علیه :** (محلِ قرض۔ وہ مال جو بطور قرض دیا جائے: قرض کا مال مثلی ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ مال جس کا بیع کے ذریعے مالک بن سکتے ہوں اور اوصاف کی روشنی میں اس کی اس حد تک تعیین ہو سکے کہ خاص تفاوت باقی نہ رہے اور اس میں بیع سلم صحیح ہو، تو اسے بطور قرض دے سکتے ہیں۔

لہٰذا روپے پیسے، درہم ودینار، چاول، گیہوں، جو، انڈے اور گوشت وغیرہ مثلی اشیاء کا قرض دینا صحیح ہے اور حیوانات اور جائیداد وغیرہ ذوات القیم اشیاء جن کا وصف سے ضبط ممکن ہو، قرض دینا صحیح ہے لیکن جن کا وصف سے ضبط وتعیین نہ ہو سکے اور جو ذمہ میں ثابت نہیں ہوتے، ان کا قرض لینا دینا صحیح نہیں، کیونکہ ایسی اشیاء کا بدل لوٹانا تقریباً ناممکن یا کافی مشکل ہوگا۔

حدیث : آپ ﷺ نے ایک شخص سے ایک نوجوان اونٹ قرض لیا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں صدقہ کے اونٹ آئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابورافع کو اس شخص کا اونٹ لوٹانے کا حکم دیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ (ان صدقہ کے اونٹوں میں) بہترین چھ سالہ اونٹوں کے علاوہ موجود نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اسے وہی دے دو، کیونکہ بہترین حضرات قرض کو بہتر طریقے پر لوٹانے والے ہیں'' (متفق علیه)

یہ واضح ہے کہ ''نوجوان اونٹ'' مثلی چیز نہیں ہے، تو معلوم ہوا کہ قرض کا مثلی ہونا ضروری نہیں ہے۔ نیز جس چیز کا وصف سے ضبط ممکن ہو، وہ مثلی کے مشابہ ہونے کی وجہ سے اس کو بھی مثلی کا حکم دیا جائیگا، لہٰذا اس کا قرض دینا صحیح ہوگا۔

معقود علیه کے شرائط : (أ) بوقت قرض اس کی مقدار معلوم ہو، ناپ، وزن، عدد یا پیائش کے ذریعے تا کہ اس کا بدل

لوٹانا ممکن ہو۔

لہٰذا اگر چند روپے قرض دے جن کی تعداد و مقدار معلوم نہ ہو، یا اناج دے جس کا وزن یا ناپ معلوم نہ ہو، تو قرض صحیح نہ ہوگا۔ کسی پکی ہوئی چیز کا قرض دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ پکنے سے اس کی کیت پر اثر پڑے گا اور پکنے کی مقدار کا صحیح علم نہ ہوگا۔

کسی چیز کے کیل یا موزون وغیرہ ہونے میں شریعت کی حد بندی کا اعتبار ہوگا، ورنہ پھر عرف پر دارومدار ہوگا، جیسا کہ سود کے باب میں گذر چکا۔

(ب) وہ چیز کسی اور جنس کے ساتھ مخلوط نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا بدل لوٹانا مشکل ہوگا خصوصاً جبکہ مخلوط اشیاء کی انفرادی مقدار نامعلوم ہو، پس گیہوں اور جو کا مخلوط (آمیزہ)، پانی ملا ہوا دودھ وغیرہ قرض دینا جائز نہیں۔

روٹی قرض دینا: بغیر کسی انکار کے سارے زمانوں میں روٹی کے قرض کا عرف جاری رہا، اس لئے علماء نے اس کا استثناء کیا ہے، اور روٹی کو وزن یا عدد کے ذریعے قرض دینا جائز قرار دیا ہے۔

قرض پر مرتب اثر کے اعتبار سے اس کا حکم: جب قرض صحیح ہو تو اس کا حکم اس پر مرتب ہوگا، یعنی قرض لینے والا جب اس چیز پر قبضہ کرلے گا تو اس کا مالک بن جائے گا۔ اور قرض دینے والا جب بھی مطالبہ کرے اس کا بدل لوٹانا اس پر لازم ہے۔ قبضہ کے بعد ابھی اس نے اس میں کوئی تصرف نہ کیا ہو اور اسی حالت میں باقی ہو اور کسی دوسرے کا کوئی لازمی حق اس سے وابستہ نہ ہو، تو قرض دینے والا اسی چیز کو بھی واپس لے سکتا ہے، کیونکہ اس چیز کی عدم موجودگی میں وہ بدل کا مطالبہ کرسکتا ہے تو وہی چیز موجود ہو تو بعینہ اس کا مطالبہ بدرجہ اولی جائز ہوگا، اور بصورت مطالبہ لوٹانا لازم ہوگا۔

لیکن وہ چیز اسی حالت پر باقی نہ ہو، مثلاً بکری قرض لے کر ذبح کردی، یا گیہوں لے کر اسے پیس دیا، یا اس سے کسی اور کا لازمی حق متعلق ہو، مثلاً قرض لے کر اس نے وہ چیز رہن (گروی) رکھ دی، تو ان صورتوں میں قرض دینے والا بعینہ اسی چیز کے واپسی کا مطالعہ نہیں کرسکتا۔

قرض لے کر وہ چیز کرایہ سے کسی دوسرے کو دے دے تو اسی چیز کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ کرایہ دار کا اس سے کوئی حق لازم وابستہ نہیں بخلاف رہن کے۔

شئے مقروض میں متصل یا منفصل (ملی ہوئی یا جدا) زیادتی واضافہ کے باوجود اسے واپس لینا جائز ہے، کیونکہ متصل اصل کے تابع ہے، اور منفصل اضافہ بھی اصل کی واپسی سے مانع نہیں ہے، گرچہ منفصل اضافہ کا مالک قرض لینے والا ہوگا، کیونکہ یہ اس کی ملکیت میں حاصل ہوا ہے۔ (لہٰذا صرف اصل کی واپسی ہوگی نہ کہ منفصل اضافہ کی)

قرض لینے والا بعینہ وہی چیز لوٹا سکتا ہے، قرض دینے والا اس کے بدل یا قیمت کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

قرض کا بدل کیا لوٹائے؟

اگر قرض مثلی مال ہو، اور موجود و دستیاب ہو تو مثل لوٹائے (مثلاً گیہوں کے بدلے گیہوں چاول کے بدلے چاول وغیرہ)، اگر فی الحال موجود نہ ہو تو اس کی قیمت لوٹائے اور اگر قرض مال متقوم ہو، تو صورۃً اس کا مثل لوٹائے، مثلاً ایک بکری قرض لے، تو اسکی جگہ اس کے اوصاف پر مشتمل بکری لوٹا دے، جیسا کہ ابورافع کی حدیث میں گذر چکا۔

قرض لینے اور دینے والے میں قیمت کی مقدار یا مثل کی صفت میں اختلاف ہو، تو قرض لینے والے کی بات اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کی جائے گی، کیونکہ وہ مدعی علیہ ہے۔

قرض کے مطالبہ کا وقت: قرض دینے والا جس وقت بھی چاہے قرض کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے، خواہ بوقت عقد کوئی مدت متعین ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یا اس سلسلے میں کوئی عرف موجود ہو یا نہ ہو۔

قرض کے شرائط: کبھی عقدِ قرض میں بعض شرائط طے پاتی ہیں، جن میں بعض مفسد ہیں، بعض لغو وفضول اور قرض پر غیر مؤثر ہیں، اور بعض معتبر اور ان کا نبھانا واجب ہے، تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱) شُرُوطِ مُفسِدہ (وہ شرائط جو عقد قرض کو فاسد وباطل کر دیتے ہیں): ہر وہ شرط جو عقد کے موافق ومناسب نہ ہو، اور اس میں قرض دینے والے کا کچھ فائدہ ہو، وہ مُفسِد ہے۔ مثلاً اس شرط پر قرض دے کر مع اضافہ کے لوٹائے، یا عیب دار چیز قرض دے بشرطیکہ بے عیب اور اچھی لوٹائے، اور اس شرط پر قرض دے کہ لینے والا اپنا گھر مثلاً اس کے ہاتھ فروخت کر دے وغیرہ۔ اس طرح کا شرط فاسد اور عقد کو فاسد کرنے والا ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے "ہر وہ قرض جو (دینے والے کے) نفع کا باعث ہو، وہ سود ہے" "مغنی المحتاج" میں تحریر ہے کہ "یہ روایت گرچہ ضعیف ہے، لیکن اس مفہوم کو امام بیہقی نے کئی صحابہ کرام سے نقل فرمایا ہے" صاحب مُہذّب، نے ذکر کیا ہے کہ حضرات ابی بن کعب ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے نفع کے باعث قرض سے منع فرمایا ہے۔ قرض کا اصل مقصود چونکہ ضرورت مند کا تعاون اور اس کے ساتھ ہمدردی ہے، اور اس میں اپنے حق میں نفع کی شرط اس کے منافی ہے، اسلئے اسے غلط قرار دیا گیا۔ نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قرض اور بیع حلال نہیں ہے" (یعنی قرض میں کسی چیز کے فروخت کی شرط لگانا ممنوع ہے) (الحاکم فی المستدرک۔ و زوائد ابن حبان) بہر حال فساد عقد کی وجہ سے یہ بالکل باطل قرار پائے گا اور عقد قرض کا کوئی اثر اس پر مرتب نہ ہوگا۔

غیر مشروط نفع یا اضافہ: بغیر شرط اور عرف کے قرض لینے والا کچھ اضافہ یا ہدیہ پیش کرے تو اس کا حکم حسب ذیل ہے۔

اگر قرض کی واپسی سے قبل اس طرح کا اضافہ وغیرہ پیش کرے تو اس سے احتیاط برتنا (یعنی نہ لینا) افضل ہے۔ اگر قرض سے قبل بھی ان دونوں کے درمیان اس طرح ہدیہ وغیرہ کا معمول تھا تو حرج نہیں۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے ہے "تم میں سے کوئی قرض دے، پھر مقروض اسے کچھ ہدیہ دے یا اپنی سواری پر سوار کرے تو یہ سوار نہ ہو اور قبول نہ کرے، البتہ دونوں کے درمیان اس سے پہلے بھی یہ سلسلہ تھا تو حرج نہیں۔" (ابن ماجہ فی الصدقات)

اسی طرح قرض دینے والا مقروض کے ہدیہ کی مکافات کرے (بدلہ دے) تو یہ کراہت ختم ہوگی۔

اگر قرض کی ادائیگی کے بعد مقروض ہدیہ وغیرہ دے تو کوئی حرج نہیں، قرض دینے والے کو اس کا لینا مکروہ نہیں ہے، کیونکہ ادائیگی کی وجہ سے قرض کا حکم ختم ہو چکا، بلکہ آپ ﷺ کے قول وعمل کی اتباع میں یہ عمل مستحب ہے۔ صحیحین کی ایک روایت کے الفاظ گذر چکے کہ "بہترین لوگ بہتر طریقے سے قرض کو لوٹانے والے ہیں۔" نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آپ ﷺ پر ان کا قرض تھا، تو آپ ﷺ نے وہ ادا فرمایا اور مزید اضافہ بھی فرمایا۔" (متفق علیہ)

مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ لوگوں کا عام عرف قرض کے لوٹانے میں اضافہ یا ہدیہ وغیرہ کا نہ ہو، اسی طرح مقروض اس کا عادی اور اس سلسلہ میں معروف نہ ہو، ورنہ پھر مذکورہ اضافہ یا ہدیہ وغیرہ کا قبول کرنا مکروہ ہوگا، کیونکہ عرف سے معروف مشروط کی طرح ہے۔

۲) **وہ شرائط جو لغو (فضول) ھیں، لیکن عقد کو فاسد نہیں کرتے :** اس سے ہر وہ شرط مراد ہے جو عقدِ قرض کے مناسب نہ ہو، لیکن اس میں کسی کا فائدہ نہ ہو، یا صرف مقروض کا فائدہ ہو، مثلاً یہ شرط لگانا کہ مقروض صحیح سالم اور بے عیب چیز کے بدلہ عیب دار چیز لوٹائے، یا بہتر چیز کے بدلہ بے کار اور نکمی چیز لوٹائے وغیرہ۔ اس طرح کے شرائط لغو قرار پائیں گے اور ان کا نبھانا واجب نہ ہوگا، البتہ عقد فاسد نہ ہوگا، کیونکہ اس میں بظاہر اصل مقصد یعنی مقروض کی اعانت اور سہولت کی تاکید پائی جارہی ہے، قرض خواہ کا کوئی نفع نہیں ہے، بلکہ مقروض ہی کا نفع ہے۔

قرض میں ادائیگی کی مدت متعین کرنا

یہ مسئلہ گذر چکا کہ قرض خواہ جب چاہے قرض کا مطالبہ کرسکتا ہے، خواہ عقد میں مدت متعین ہو یا نہ ہو، تو گویا مدت کی تعیین کو نبھانا لازم نہیں، البتہ اس طرح مدت کی شرط کا عقد قرض پر کچھ اثر بھی پڑے گا یا نہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس شرط میں قرض دینے والے کا کچھ فائدہ ہو، مثلاً لوٹ مار کا زمانہ ہو، اور ادائیگی کے لئے ایسی مدت طے کی گئی جس میں بظاہر امن وامان حاصل ہوجائے گا، تو اس شرط سے عقد فاسد ہوگا، کیونکہ اس میں قرض خواہ کا نفع ہے، تو یہ اضافہ کی شرط کی طرح ہوگیا۔

اگر اس شرط میں قرض خواہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، تو عقد فاسد نہ ہوگا، لیکن یہ شرط لازم بھی نہ ہوگی (جب چاہے مطالبہ کرسکتا ہے) البتہ اس کا نبھانا مستحب ہے۔

۳) **وہ شرائط جن کا ایفا (نبھانا) لازم ھے :** اس سے وہ شرائط مراد ہیں جن میں عقد کی پختگی، حق کا اثبات اور اس کی تاکید ہو۔ مثلاً قرض کے مقابلہ میں رہن کی شرط، کفیل (ضامن) کی شرط، عقد قرض پر گواہ رکھنے کی شرط، یا حاکم کے سامنے اسکے اقرار کی شرط، یا اس معاملہ کو تحریری شکل میں محفوظ کرلینے کی شرط، یہ شرائط جائز ہیں، اور قرض دینے والے کو اس کا حق ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ اپنی ایک زرہ مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے پاس رہن رکھی، اور اس سے اپنے اہلِ خانہ کے لئے جَو (ادھار) خریدا" (بخاری شریف)

مقروض کو ان شرائط کا نبھانا لازم ہے، اگر نہ نبھائے تو قرض دینے والا عقد کو فسخ (توڑ) کرسکتا ہے۔

رہن (گروی)

رہن عربی زبان میں حبس، روکنا اور ثبوت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

تعریف : شرعاً کسی متمول عین (چیز) کو قرض کا وثیقہ (قابل اطمینان واعتماد) قرار دینا، تاکہ ادائیگی کی دشواری کی صورت میں اسے عین کے ذریعہ اس کا حصول ہوسکے، عقد رہن کہلاتا ہے۔

جو شخص (مقروض) بطورِ وثیقہ کوئی چیز رکھے اسے "راہن" اور جس کے پاس رکھا جائے (قرض خواہ) اسے مرتہن، اور جو چیز رکھی جائے اسے مرہون کہتے ہیں۔ مَرہُون کے لئے بھی رہن کا لفظ استعمال ہوتا ہے، متمول کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز شرعاً مال شمار ہو، اور اس عقد کا مقصود یہ ہے کہ قرض یا ادھار دینے والے کو اپنی رقم کی واپسی کا اطمینان ہو، کہ وہ ضائع اور ڈوب نہ جائے گی، پس عین کو قرض کے مقابلہ میں رہن رکھا جاتا ہے، تاکہ کسی سبب سے مقروض ادائیگی سے قاصر ہوجائے، تو اسے فروخت کرکے اپنا قرض وصول کرسکے، تفصیلات

آئندہ سطور میں پیش ہو رہی ہیں

حقوق کے وثائق تین ۳ ہیں: شہادت (گواہی) رہن اور ضمان، اوّل انکار کے خوف سے اور آخری دونوں افلاس کے خطرہ کی وجہ سے ہے۔

مشروعیت: قرآن وحدیث کی روشنی میں رہن بالا جماع جائز اور مشروع ہے۔

آیت: "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ...... وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ" (البقرہ ۔ ۲۸۳)

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو، ادھار کا ایک معیاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو......

اور اگر تم (دَین کا معاملہ کرتے وقت) کہیں سفر میں ہو، اور (دستاویز پر لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ، سو ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مدیون کی طرف سے صاحب حق کے) قبضہ میں دے دی جاویں۔"

پس اس سے دلات ہوئی کہ رہن ادھار کے اطمینان کی خاطر تحریر کے قائم مقام ہے، اور یہ مشروعیت کا عنوان ہے۔

حدیث: "اپنے اہل خانہ کی ضرورت کے لئے ۳۰ صاع جَو کے عوض آپ ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی۔" (صحیحین)

مزید دلائل مسائل پر گفتگو کے وقت پیش ہوں گی۔

حَضَر (اقامت) میں اور کاتب کی موجودگی میں رھن: مذکورہ بالا آیات میں بحالت سفر اور کاتب (لکھنے والے) کی غیر موجودگی میں رہن کا حکم دیا گیا ہے، جس کا مقصد یہ نہیں کہ برعکس صورتوں میں ناجائز ہے۔ بلکہ رہن سفر وحضر اور کاتب کی موجودگی اور غیر موجودگی، تمام صورتوں میں مشروع اور جائز ہے، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ: ایک یہودی سے اناج ادھار خرید کر آپ ﷺ نے لوہے کی زرہ (جنگی لباس) اس کے پاس رہن رکھی، (متفق علیہ) اور بظاہر یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے، نیز وہاں کاتب بکثرت تھے، تو معلوم ہوا کہ سفر اور کاتب نہ ہونا رہن کی صحت کے لئے شرط نہیں۔

چونکہ سفر میں غالباً رہن رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور گواہ اور کاتب مفقود ہوتے ہیں، بالخصوص ابتدائی ادوار میں جبکہ پڑھنے اور لکھنے کی قلت تھی، اس لئے اس عموم اور غالب کے پیشِ نظر آیت میں سفر اور کاتب کی غیر موجودگی کی قید لگائی، یہ عربی زبان کا اسلوب ہے، جس کے اعلیٰ ترین معیار پر قرآن نازل ہوا ہے، اور غالب حالت کے پیشِ نظر جو قید ہو، اس کا مفہوم مخالف مراد نہیں ہوتا۔

رھن کا حکم: رہن ایک جائز عقد ہے، واجب نہیں، کیونکہ یہ حق کے متعلق اطمینان واعتماد کے لئے مشروع ہے، اور انسان کو حق ہے کہ اس اطمینان پر عمل کرے یا نہ کرے، نیز رہن تحریر کا بدل ہے، لہٰذا اس کا بھی وہی حکم ہوگا، تو چونکہ تحریر واجب نہیں، اس لئے رہن بھی واجب نہ ہوگا۔

لیکن تحریر ورہن کے عدم وجوب کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی ان امور میں کوتاہی برتے، اور آپس میں ایک دوسرے کو عدالت میں کھینچنے لگے، یا غیر دیندار لوگ اسے دوسروں کا مال ناحق ہڑپنے کا ذریعہ بنالیں، کیونکہ یہ کم از کم ارشادی امر ہے، یعنی مستحب ہے، لہٰذا ہر حال میں تحریری ثبوت فراہم کرنا ہی بہتر ہے، ورنہ پھر رہن پر عمل کرے، تاکہ لوگ اپنا مال ڈوب جانے اور برباد ہونے کے اندیشہ سے اس فعلِ خیر (قرض، ادھار) سے گریز نہ کریں۔

حکمت: لوگ آپس میں معاملات کرتے رہتے ہیں، بعض مرتبہ کسی کو نقدی کی ضرورت ہے، لیکن موجود نہیں، اور کبھی کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت ہے، (لیکن قیمت ندارد) لہٰذا رقم قرض لینے یا ادھار خریدنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور ایسے حضرات مل نہ پائیں گے جو ان پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے رقم یا اشیاء بغیر وثیقہ کے دے دیں، اور صاحب مال یا چیز فروخت کرنے والا وثیقہ کے دے دیں، اور صاحب مال یا چیز فروخت کرنے والا وثیقہ کا خواہاں ہوگا، تاکہ اپنے حق کی وصولیابی کا اطمینان ہو جائے، اور کسی اختلاف اور جھگڑے و تنازع اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہ آئے، پس کفالت اور تحریر و گواہی سے راضی نہ ہوگا، لہٰذا کسی ایسی چیز کا مطالبہ کرے گا، جو اپنے حق کے بالمقابل بطور وثیقہ اپنے قبضہ میں رکھے، اور ضرورت مند بھی اس سے راضی ہو کر مطلوبہ وثیقہ اس کے سپرد کرے گا، اور اس طرح طرفین کے مصلحت کی رعایت ہو جائے گی، اور بسہولت لوگ آپس میں تعامل کرلیں گے۔

عقد رھن کے ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) مَرْہُون (۴) دَین (قرض یا ادھار)

(۱) عَاقِدَیْن: یعنی راہن اور مُرتہن، راہن یعنی مقروض، اور مرتہن یعنی جس کا راہن پر قرض ہے، اور جس کے قبضہ اور ماتحتی میں مرہون شئی رکھی جائے گی، عاقدین کے شرائط یہ ہیں۔

۱- **مکلف،** یعنی عاقل بالغ ہوں، اور مالی تصرفات کی پابندی عائد نہ ہو، پس بچہ خواہ وہ ممیز ہو، راہن یا مرتہن نہیں بن سکتا، اگر بچہ اپنی کوئی چیز کسی کے پاس رہن رکھے، تو یہ صحیح نہیں، اور مرتہن اس چیز کا ضامن ہوگا، اسی طرح بچہ کے پاس کوئی رہن رکھے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اور اس میں رہن کے احکام ثابت نہ ہوں گے۔ مجنون بھی بچہ کی طرح ہے۔

چونکہ عقدِ رہن پر بعض احکام اور ذمہ داریاں مرتب ہوتی ہیں، اور بچہ اور پاگل اس کے اہل نہیں، اس لئے شریعت نے ان کے اقوال اور عقود سے متعلق تصرفات کا اعتبار نہیں کیا، کیونکہ حدیث میں بھی پاگل کو افاقہ (اور شفا) تک، اور سونے والے کو بیدار ہونے تک، اور بچہ کو تاحدِ بلوغ مرفوع القلم شمار کیا ہے (ابوداود) مرفوع القلم یعنی جس سے مواخذہ نہ ہو اور باز پرس نہ کی جاسکے۔

جو شخص حرام کام میں مال صرف کرے، یا اسراف اور فضول خرچی کرے، اسے شرعاً سفیہ کہا جاتا ہے، اور اس پر (حکومت کی طرف سے) مالی تصرفات کی پابندی عائد کردی جاتی ہے، اس پابندی کی صورت میں اسے مجور کہیں گے، پس ایسا شخص بھی رہن نہیں رکھ سکتا۔

۲- **اکراہ اور جبر و زبردستی نہ ھو:** راہن اپنی مرضی واختیار سے رہن رکھے اور مرتہن اپنی مرضی سے قبول کرلے، اگر دونوں میں سے کسی ایک پر جبر کیا گیا تو رہن صحیح نہ ہوگا، اور اس پر احکام و آثار مرتب نہ ہوں گے، لہٰذا اکراہ اور جبر کے زائل ہوتے ہی سابقہ حال لوٹ آئیگا، اور مرتہن پر اکراہ تھا تو راہن پر واجب ہے کہ اپنی چیز لوٹالے، اور راہن پر اکراہ تھا تو مرتہن پر اس کا لوٹانا واجب ہے، بعد میں ان کا رہن کا ارادہ ہو تو از سرِ نو اسے انجام دیں۔

۳- **رھن رکھی جانے والی چیز میں تبرع کی اھلیت ھو:** مثلاً راہن رہن کا مالک ہو، اور مرتہن متعلقہ قرض کا مالک ہو۔

ولی اور وصی کا رھن رکھنے دینا یا لینا: اس شرط کا منشاء یہ ہے کہ جسے کسی دوسرے پر مالی ولایت حاصل ہو، جیسے ولی اور وصی، وہ اپنے اس ماتحت کا مال کسی کے پاس بطور رہن رکھنے یا قرض کے عوض دوسرے کا مال بطور رہن لینے کا اختیار نہیں رکھتے،

کیونکہ رہن لینا اور دینا دونوں میں تبرع کا مفہوم پایا جارہا ہے۔ جس کی ان کو اجازت نہیں۔ البتہ ظاہری مصلحت کی وجہ سے فقہاء کرام نے درج ذیل دوصورتوں میں ولی اور وصی کو رہن کی اجازت دی ہے۔

۱- **حالتِ ضرورت:** اپنے ماتحت کو نفقہ کی ضرورت ہو، اور فی الحال اس کا کوئی مال قابل صرف نہ ہو، تو نفقہ اور خرچ کے لئے کسی سے لئے جانے والے مال کے عوض اس کی کوئی چیز رہن رکھ سکتا ہے، جبکہ آئندہ اس رقم کی ادائیگی اور رہن کی واپسی کی امید ہو، مثلاً اس کا اناج یا کوئی اور آمدنی متوقع ہو، یا کسی ادھار کی مدت مکمل ہو کر اس کی واپسی کی امید ہو، یا اس کی کوئی چیز جو فی الوقت سستی ہے، آئندہ زائد نرخ پر فروخت ہونے کا امکان ہو۔

اسی طرح اپنے ماتحت کے مال کی چوری یا لوٹ کھسوٹ کے ڈر سے اسے ادھار فروخت کرنا یا قرض دینا، اور اس کی واپسی کے اطمینان کے لئے احتیاطاً سامنے والے سے کوئی چیز بطور رہن رکھنا جائز ہے۔

۲- **ظاهری مصلحت:** مثلاً ۲۰۰/روپے کی چیز ۱۰۰/روپے میں فروخت ہورہی ہے، لیکن خریدنے کے لئے قیمت موجود نہ ہو، تو ان کی ۱۰۰/روپے کی کوئی چیز رہن رکھ کر اسے خرید لینا، اس صورت میں یہ شرط ہے کہ مرہون شئی کسی امانت دار اور تونگر کے پاس ہو، اس پر گواہ رکھے، اور عرفاً طویل مدت کے لئے نہ ہو، اگر ان میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو رہن صحیح نہیں، اسی طرح ان کی ۱۰۰/روپیہ قیمت کی کوئی چیز ۲۰۰ روپیہ میں اُدھار فروخت کرے اور اسکے بالمقابل خریدار کی ۲۰۰/روپے کی چیز بطور رہن وصول کرے، تو یہ صحیح ہے۔ ان صورتوں میں ان ماتحتوں کا کافی نفع ہورہا ہے، اسلئے اس ظاہری مصلحت کے پیش نظر رہن کی گنجائش ملی۔

۲- **صیغه:** عقد رہن کا دوسرا رکن صیغہ یعنی ایجاب وقبول ہے، یعنی ہر وہ کلام جو رہن رکھنے اور قبول کرنے پر دلالت کرے، مثلاً راہن کہے: تمہارے قرض کے بدلہ میں نے میرا یہ مکان رہن رکھا، یا ادھار چیز خرید کر کہے: یہ چیز تمہاری اس چیز کی قیمت کے عوض رہن رکھو، وغیرہ اور قرض خواہ کہے: میں نے قبول کیا یا رہن لے لیا وغیرہ۔

رہن وغیرہ عقود چونکہ مالی تبادلہ ہیں، جس میں طرفین کی رضامندی ضروری ہے، کیونکہ کسی کا مال اس کی خوشی اور رضامندی کے بغیر حلال نہیں، اور رضامندی ایک مخفی امر ہے، اور اس پر دلالت کرنے والے الفاظ سے اس کا اظہار ہوتا ہے، لہٰذا ایجاب وقبول کو شرط قرار دیا جاتا ہے۔

مُعَاطَاۃ: مثلاً کوئی کہے: یہ چیز فلاں مدت تک مجھے ادھار فروخت کردو، اور قیمت کے عوض میری یہ گھڑی رہن رکھو، اور بائع کہے: میں نے فروخت کردیا اور خریدار چیز پر قبضہ کرلے اور بائع کو گھڑی دیدے (لیکن بائع کی طرف سے رہن کی قبولیت کے الفاظ ادا نہ ہوں) تو زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ رہن منعقد نہ ہوگا، کیونکہ دونوں طرف سے رہن سے متعلق صیغہ کا پایا جانا ضروری ہے، گونگے شخص کا رہن رکھنے یا پالینے کے متعلق اشارہ جو سمجھ میں آجائے کافی ہے، یا اسے تحریری شکل میں پیش کرے تو یہ بھی کافی ہے۔

۳) **مَرْهُون:** یعنی وہ چیز جو راہن مرتھن کے پاس اُس کے قرض کے وثیقہ کے طور پر رکھتا ہے۔

شئی مرهون کے شرائط حسب ذیل هے

۱- **مَرْهُون عَیْن (چیز) ہو:** پس کسی منفعت کا رہن صحیح نہیں، مثلاً مکان میں رہائش کیونکہ منفعت وقت گذرنے کے ساتھ تلف ہوگی، اور اس پر رو کے رکھنے والا قبضہ ممکن نہیں۔

۲- **مرھون قابل فروخت ھو:** بیع میں مذکورہ مبیع کے تمام شرائط موجود ہوں، مثلاً بوقتِ عقد موجود ہو، شرعاً مال متقوم ہو، سپردگی پر قادر ہو، اور راہن کی ملکیت یا تسلط میں داخل ہو، لہٰذا بکری کو آئندہ ہونے والا بچہ، کتا، سوّر، ہوا میں اڑنے والا پرندہ، فلاں پر موجود قرض، جو چیز آئندہ خریدے گا، یا جو لکڑی گھاس پھوس وغیرہ جمع کرے گا، رہن رکھنا صحیح نہیں، مرہون کا راہن مالک ہی ہو یہ ضروری نہیں، بلکہ رہن رکھنے کے لئے دوسرے کی چیز عاریتاً لے، تو یہ بھی جائز ہے۔ (اور اس کے شرائط آئندہ پیش ہوں گے)

اگر راہن کا کسی چیز میں حصہ اور اشتراک ہو، مثلاً نصف گاڑی، یا نصف گھر، یا جگہ، جس کی ابھی تقسیم وتمیز نہ ہوئی ہو، (ایسی مشترک چیز کو مشاع کہا جاتا ہے)، تو اس میں اپنا حصہ رہن رکھ سکتا ہے، کیونکہ اس کا حصہ قابل فروخت ہے، لہٰذا قرض کی ادائیگی کے لئے متعینہ وقت ادائیگی دشوار ہو تو مرتہن مقروض کا حصہ اس مشترک اور مشاع چیز میں سے فروخت کر کے اپنا حق حاصل کر سکتا ہے، ایسی مشترکہ شئ پر قبضہ کی تفصیل وکیفیت آئندہ بیان ہوگی۔

۴) **دَین** (مرہُون بِہ): یعنی وہ حق جو مرتہن کا راہن پر ہے، اور جس کے عوض رہن رکھا جا رہا ہے، اس کے شرائط یہ ہیں:

۱- **قرض و ادھار ھو**، یعنی درہم ودینار یا رائج کرنسی وغیرہ ہو، جو ذمہ میں ثابت ہوتی ہوں، اور اشیاء کی قیمت کا تعین اس سے ہوتا ہو، کیونکہ رہن کا مقصد دشواری کی صورت میں مرہون کی قیمت سے اس کی تحصیل ہے، جو کہ دَین میں ممکن ہے۔

دَین کے سبب کا کوئی اعتبار نہیں، خواہ کسی ادھار خرید شدہ شئ کی قیمت ہو، یا قرض لیا ہو، یا مرتہن کی کسی چیز کو تلف کرنے کی وجہ سے ضمان عائد ہوا ہو۔

لہٰذا: مرہون بہ کوئی عین (چیز) نہیں ہو سکتا، مثلاً کسی کی کوئی چیز غصب کر لی، اب مالک اس کا مطالبہ کرے اور غصب شدہ شئ کی واپسی تک کوئی چیز رہن رکھنے کا مطالبہ کرے، یا کسی سے کچھ بطور عاریت لے، اور معیر یہ مطالبہ کرے کہ مستعیر عاریت کے لوٹانے تک کوئی چیز یا کچھ رقم رہن رکھے، تو اس طرح کا رہن صحیح نہیں ہے، جو کہ آج کل کافی عام ہے

''مغنی المحتاج'' کے مصنفؒ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کی جو عادت ہے کہ کتاب وقف کر کے یہ شرط لگاتے ہیں کہ بغیر رہن کے کتاب عاریت میں یا اس جگہ سے لے جانے کی اجازت نہ دی جائے، یہ باطل ہے۔

عین کے عوض رہن صحیح نہ ہونے کا سبب یہی ہے کہ ادائیگی کی دشواری کی صورت میں مرہون کی قیمت سے اس کی تحصیل ممکن نہیں، مثلاً ایک سائیکل سے آپ گھڑی کیسے حاصل کر سکتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ گھڑی کی قیمت حاصل کی جائے تو قیمت کی تعیین واندازہ میں اختلاف پایا جائیگا، جو تنازعہ کا باعث ہوگا، نیز قرآن مجید میں رہن کی مشروعیت دَین کے متعلق وارد ہے، پس کسی اور میں ثابت نہ ہوگی۔

۲- **مُرتھن کا دَین راھن کے ذمہ ثابت ھو:** مثلاً خرید وفروخت مکمل ہونے کے بعد مبیع کی قیمت چاہے ابھی مبیع سپرد نہ ہوئی ہو، بیوی کے گذشتہ ایام کا نفقہ، یا وہ قرض جو راہن کسی سے لے، جس پر قبضہ ہو چکا ہو یا ابھی قبضہ نہ ہوا ہو، وغیرہ...... پس ان میں رہن صحیح ہے، کیونکہ حق ثابت ہو چکا، لہٰذا وثیقہ کی ضرورت پیش آئی، پس رہن دَین کا ضمان ہوگا، اس لئے رہن لینا جائز ہوا۔

اگر دَین کو واجب کرنے والے عقد کے ساتھ ہی رہن پایا جائے تو صحیح ہے، مثلاً یوں کہا: یہ کپڑا مجھے ایک ماہ کی مہلت پر ۱۰۰ روپیہ میں فروخت کر دو، اور میں اس کے عوض یہ گھڑی رہن رکھتا ہوں، تو بائع نے کہا: میں نے قبول کیا، یا تم کو فروخت کر کے رہن رکھ لیا، یا کہا: مجھے ایک سال کے لئے ہزار روپیہ قرض دیجئے، اور اس کے بدلہ یہ گھڑی رہن رکھئے اور وہ کہے: میں نے قبول کیا۔ کیونکہ حاجت اس کی مقتضی ہے، کیونکہ دَین کے ثبوت کے بعد اسے لازم قرار نہ دے سکے، اور اس طرح اپنے دَین کی حفاظت واطمینان کا حق فوت ہو جائے گا۔

اگر حق کے ثبوت سے یا موجب سے قبل ہی عقد رہن ہو تو صحیح نہیں، جیسے بیوی کا مستقبل کے نفقہ کے عوض شوہر سے کوئی چیز بطور رہن وصول کرنا، یا آئندہ جو قرض دے گا اسکے عوض ابھی رہن لینا، یا آئندہ جو چیز خریدے گا اس کے عوض ابھی رہن رکھنا، وغیرہ، ان صورتوں میں رہن صحیح و منعقد نہ ہوگا، کیونکہ رہن حق کا وثیقہ ہے، لہٰذا اس کے ثبوت پر مقدم نہ ہوگا، اسکے تابع ہے، لہٰذا اس سے پہلے نہیں پایا جائیگا، جیسے معاملہ کے ثبوت سے قبل گواہی کا سوال نہیں،

۳- دین کی مقدار و صفت عاقدین کو معلوم ہو: اگر مرتہن کا راہن پر دین ثابت ہو، لیکن مجہول ہو، روپے ہیں یا ریال پتہ نہیں، یا مقدار مجہول ہو، ایک ہزار ہیں یا دو ہزار ہیں پتہ نہیں، اب اس کے عوض کچھ رہن رکھے، تو یہ صحیح نہیں، خواہ دوسرے کو اس کا علم ہو یا نہ ہو، کیونکہ دین مجہول ہو تو رہن کی قیمت سے اس کی تحلیل دشوار ہے۔

عقدِ رھن کا لزوم: جب تمام ارکان مع شرائط موجود ہوں تو عقدِ رہن صحیح اور منعقد ہوگا، اور جب تک مرہون شئی راہن کے پاس ہے، وہ اس سے رجوع کرسکتا ہے، کیونکہ اس پر مرتہن کے قبضہ کے بعد ہی یہ لازم ہوگا، (نہ کہ اس سے قبل)، لہٰذا جب راہن اسے مرتہن کے حوالہ کرے، اور مرتہن کی جانب سے معتبر اور صحیح قبضہ پایا جائے تو عقد رہن لازم ہو جائے گا، اور مرتہن کو اسے روکے رکھنے کا حق ہوگا، اور اس کی رضامندی کے بغیر راہن رجوع کر کے وہ چیز واپس نہیں لے سکتا۔

دلیل: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَة“ اس میں ”فَرِهٰنٌ“، وَإِنْ كُنْتُمْ، شرط کا جواب اور جزاء ہے، پس یہ ایسے رہان کی اجازت ہے جس میں ’مقبوضۃ‘ صفت ہو اور کسی بات کی اجازت اور حکم کسی صفت کے ساتھ ہو، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صفت اس کے تمام صفت و شرط میں داخل ہو، کیونکہ کسی صفت کے ساتھ مشروع امر اس صفت کے بغیر نہیں پایا جاسکتا۔ پس معلوم ہوا کہ عقدِ رہن بغیر قبضہ کے تمام نہ ہوگا، اور جب قبضہ ہوگا تو تمام و مکمل ہوگا۔ تب پھر لازم ہو جائے گا، اسی طرح اگر بغیر قبضہ کے رہن لازم ہوتا تو لفظ ”مقبوضہ“ کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، اور شارع کا کلام لغو اور عدم فائدہ سے محفوظ و مامون ہوگا، لہٰذا لزومِ عقد کے لئے اس صفت کا اعتبار ضروری ہے۔

رھن پر قبضہ کی کیفیت: شئی مرہون یا تو غیرِ منقول ہوگی (جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کی جاسکے) جیسے زمین و مکان، یا منقول ہوگی (جسے منتقل کیا جاسکے) جیسے موٹر گاڑی، گھڑی وغیرہ۔

اگر مرہون غیر منقول ہو تو راہن کا اس کے اور مرتہن کے درمیان تخلیہ کافی ہے، یعنی اسے قبضہ میں لینے میں جو رکاوٹ ہو، اسے دور کردے، مثلاً مکان میں اسباب یا کسی کی رہائش ہو تو اسے خالی کر کے اس کے حوالہ کر دے۔

اگر رہن منقول ہو تو صرف تخلیہ کافی نہیں، بلکہ اس شئی کے مناسب نقل اور مرتہن کا اسے لے لینا ضروری ہے، ورنہ قبضہ معتبر نہ ہوگا۔

مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ وہ منقول یا غیر منقول شئی مکمل رہن ہو، اگر اس کا بعض رہن ہو، یعنی رہنِ مشاع ہو تو یہ تفصیل ہے:

اگر شئی منقول ہے تو اسے مکمل مرتہن کے سپرد کرنا قبضہ کہلائے گا، اور یہ سپردگی شریک کے اجازت کے بعد ہوگی، اگر شریک اجازت نہ دے تو اب مرتہن شریک کے قبضہ میں اسے مکمل رکھنے پر راضی رہے، اور مرہون حصے میں قبضہ کے متعلق شریکِ مرتہن کا نائب شمار ہوگا، اور اس طرح یہ عقد صحیح و مکمل ہوگا، اگر مرتہن اس سے راضی نہ ہو تو معاملہ حاکم و قاضی کے سامنے پیش کیا جائے گا، پھر وہ کسی عادل کے پاس مرتہن اور شریک کی جانب سے وہ چیز رکھ دے گا، اور شریک اپنی ملکیت کے اعتبار سے مرہون سے انتفاع کرسکتا ہے، جبکہ مرتہن کی یا قاضی کی اجازت ہو۔

عقد رہن کے احکام

ان احکام کی ہم چار بڑی تقسیم کر سکتے ہیں۔
۱) مرتہن کے قبضہ میں مرہون کی موجودگی سے متعلق احکام (۲) مرہون کی بربادی اور تلف کے احکام (۳) مرتہن کے قبضہ میں مرہون کے نمو اضافہ کے احکام (۴) رہن کے فرعی احکام

قسم اوّل: مرتہن کے قبضہ میں مرہون کی موجودگی کی حالت میں متعلقہ احکام:

۱) **مرھون کا حبس** (اسے روک رکھنا): جب مرہون مرتہن کے قبضہ میں چلا جائے گا تو قرض کی ادائیگی سے قبل راہن واپس نہیں لے سکتا۔ اب مرتہن کو اسے اپنے پاس روکے رکھنے کا حق حاصل ہے۔

رہن کے اتمام کے لئے پہلا قبضہ کافی ہے، اس قبضہ کا استمرار اور دوام شرط نہیں، اسی لئے مرتہن اپنی مرضی سے مرہون شئی راہن کے حوالہ کر سکتا ہے، اس سے رہن باطل اور ختم نہ ہوگا، اور مرتہن کا حق اس سے متعلق رہے گا، جب چاہے واپس اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے۔
کیونکہ رہن کا مقصد قرض کی تحصیل ہے، اور وہ جس کے دوام کے بغیر بھی ممکن ہے، نیز راہن رہن کے منافع کا مالک ہے لہٰذا مرتہن کی اجازت سے ان منافع کی تحصیل جائز ہوگی اور یہ مرتہن کے قبضہ سے اسے نکالے بغیر نہ ہوسکے گا۔

۲) **رھن کی حفاظت اور اس کے مصارف:** رہن کا مقصد چونکہ قرض کی واپسی کی دشواری کی صورت میں اس سے اس کی تحصیل ہے، جو رہن کی سلامتی پر موقوف ہے، اور یہ مرتہن کی مصلحت کی خاطر ہے اس لئے رہن کی حفاظت و نگہداشت اور مناسب طریقے سے کسی ضرر اور بربادی وغیرہ سے اسے محفوظ رکھنا مرتہن کی ذمہ داری ہے، اسے رکھنے کے لئے محفوظ جگہ کا نظم، یا محافظ کی اجرت وغیرہ مرتہن کے ذمہ ہوگا۔

رھن کے ذاتی مصارف: مرہون شئی کے بقا کے لئے جو اخراجات ہوں، مثلاً جانور کا چارہ، درختوں کی آب پاشی، مکان کی مرمت وغیرہ، وہ راہن کے ذمہ ہے، کیونکہ یہ اس چیز کی بقا کے لئے ضروری ہے، جو کہ اس کی ملکیت ہے، لہٰذا مرتہن کے حق کی حفاظت کے طور پر راہن کو ان مصارف کا پابند بنایا جائیگا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے" جس نے رہن رکھا، اس سے رہن کو روکا نہ جائے، اس کے فوائد اور نقصانات اسی کے ہیں" (الامام الشافعی فی الأمّ، دارقطنی) مصارف بھی غُرم (نقصانات) میں داخل ہیں، ایک روایت میں ہے۔" رہن راہن کے ضمان میں ہے" (ابن حبان، حاکم و قال علی شرط الشیخین۔ فتح الوھاب)

۳) **مرتھن کا قبضه اور تسلط:** ایک مرتبہ رہن مرتہن کے قبضہ اور تسلط میں چلا جائے تو اب اس پر اس کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، یعنی مرتہن کی زیادتی یا تقصیر کے بغیر وہ چیز تلف ہو جائے، تو اس پر اس کا بدل اور تاوان نہ ہوگا، اور نہ اس کی وجہ سے قرض کا کچھ حصہ ساقط ہوگا، کیونکہ ابھی حدیث میں گذر چکا کہ نقصان راہن کا ہوگا، تو مطلب یہ ہوا کہ مرتہن پر نقصان کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

۴) **مرھون سے انتفاع:** (الف) راہن کا مرہون سے انتفاع: مرہون کے منافع مالک یعنی راہن کا حق ہیں، لیکن مرتہن کے پاس محبوس ہونے کی وجہ سے انتفاع سے عاجز ہے، پس اگر وہ راہن کو لوٹا دے تو اسے انتفاع جائز ہے، مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات واضح ہے، نیز آپ ﷺ کا ایک اور فرمان ہے" اگر سواری کا جانور رہن ہو تو اخراجات کے بالمقابل اس کی سواری جائز ہے، اور اخراجات

کے عوض اس کا دودھ استعمال ہوگا، اور جو سوار ہوگا اور دودھ پئے گا، اسی پر اخراجات ہوں گے" اور سوار ہونے والا اور پینے والا منافع کا مالک یعنی راہن ہے، پس اسے انتفاع جائز ہے، اور اسی پر نفقہ اور خرچ لازم ہے، لیکن اس انتفاع کے درج ذیل شرائط ہیں۔

انتفاع کی وجہ سے اس چیز میں کوئی نقص یا بربادی پیش نہ آئے۔ راہن مرہون کو سفر میں نہ لے جائے کہ بلاوجہ خطرہ کے امکانات ہیں۔ اگر مرتہن خود ان امورِ ممنوعہ کی اجازت دے تو جائز ہے۔

اگر مرہون مرتہن کے قبضہ میں رہتے ہوئے انتفاع ممکن ہو تو اسی حالت میں انتفاع کرسکتا ہے، اگر اس کے قبضہ سے نکالے بغیر انتفاع ممکن نہ ہو تو پھر نکال لے، لیکن بہتر ہے کہ مرتہن اس پر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ رکھے، کیونکہ یہ ایک مالی معاملہ ہے، انتفاع سے فارغ ہونے کے بعد راہن پر لازم ہے کہ پھر مرتہن کے قبضہ میں لوٹا دے۔

(ب) مرتهن کا مرهون سے انتفاع : رہن کی وجہ سے مرتہن اس کا مالک نہیں بنے گا، اور نہ اس کے منافع اس کے لئے جائز ہوں گے، بلکہ مرہون اور اس کے منافع کا مالک راہن ہی رہے گا، لہٰذا راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن کو اس سے انتفاع قطعاً جائز نہیں، اگر نفع اٹھائے تو اس کی زیادتی ہے، اور وہ مرہون کا ضامن ہوگا۔

اگر عقدِ رہن کے وقت ہی مرتہن کے انتفاع کی شرط رکھی گئی تو یہ شرط فاسد ہے، جس کی وجہ سے عقدِ رہن بھی فاسد ہوگا، کیونکہ یہ شرط عقد کے تقاضہ کے مخالف ہے۔

اگر عقد میں ایسی کوئی شرط نہ ہو، بلکہ بعد میں راہن اپنی مرضی سے مرتہن کو اجازت دے تو یہ جائز ہے، کیونکہ راہن مالک ہے، اور دوسرے کی حق تلفی کے بغیر اسے اپنی ملکیت میں تصرف کا اختیار ہے۔

۵) مرهون میں تصرف : یعنی ہبہ یا فروخت وغیرہ جیسے تصرفات، اسکی درج ذیل مختلف صورتیں ہیں:

(الف) راهن کا مرهون میں تصرف: اگر راہن مرتہن کی اجازت کے بغیر مرہون میں ایسا تصرف کرے جس سے وہ چیز راہن کی ملکیت سے نکل جائے، تو یہ تصرف باطل ہے، جیسے فروخت کرنا، ہبہ کرنا، وقف کرنا وغیرہ، اور رہن اپنی حالت پر برقرار رہے گا۔

کیونکہ مرتہن کے قرض کے بالمقابل یہ وثیقہ ہے، اگر تصرف نافذ ہو تو وثیقہ فوت ہوگا، لہٰذا اس کے حق کی حفاظت کی خاطر اسے باطل قرار دیا گیا۔

اگر ایسا تصرف کرے کہ ملکیت تو زائل نہ ہو، لیکن مرہون شئی میں حسّی یا معنوی نقص آجائے تو یہ تصرف بھی صحیح نہیں، مثلاً کسی کو استعمال کے لئے عاریت دینا جس سے وہ بوسیدہ ہوجائے، یا اتنی مدت کے لئے کرایہ پر دے کہ اس سے قبل قرض کی ادائیگی کا وقت آجائے، تو یہ معنوی نقص ہے، کیونکہ کرایہ پر دی ہوئی چیز کے خریدنے میں رغبت کم ہوتی ہے، لہٰذا قرض کی تحصیل کیلئے فروخت کرنے کا موقع آئے تو، یا تو فروخت ہی نہ ہوگی، یا کم قیمت پر فروخت ہوگی۔ اگر کرایہ کی مدت قرض کی ادائیگی کی مدت کے ساتھ یا اس سے پہلے ہی ختم ہوئی ہو، تو جائز اور صحیح ہے، کیونکہ اس میں مرتہن کا کچھ نقصان نہیں۔

اسی طرح مرہون کو کسی دوسرے مرتہن کے پاس بھی رہن نہیں رکھ سکتا، کیونکہ دونوں کے حق میں تزاحم وتکرار ہوگا، اور رہن کا مقصد فوت ہوگا۔

اگر مذکورہ مفاسد نہ ہوں تو تصرف صحیح اور نافذ ہوگا جیسے عاریت پر دینا وغیرہ۔ یہ ساری تفصیل اس وقت ہے جب کہ مرتہن کی

اجازت کے بغیر تصرف ہو، اگر اس کی اجازت سے ہو تو تمام تصرفات نافذ اور صحیح ہیں، اور اس پر شرعی آثار کا ترتب ہوگا، کیونکہ ممانعت مرتہن کے حق کے خاطر تھی، اور اجازت سے وہ خود اپنے حق سے دستبردار ہو چکا۔

اب مرتہن اپنی اجازت سے رجوع نہ کرے اور راہن تصرف کرے تو تصرف نافذ ہوگا، اور اس تصرف سے ملکیت زائل ہو جیسے ہبہ وغیرہ تو رہن باطل اور ختم ہو جائیگا، اور ملکیت زائل نہ ہو، جیسے کرایہ و عاریت وغیرہ تو رہن برقرار رہے گا۔

(ب) مرتهن کا تصرف: راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن کا کوئی بھی تصرف باطل ہے۔ اس پر کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہوگا، اگر اس تصرف میں مرہون شئی دوسرے کے سپرد کردے تو یہ اس کی تعدی ہے، اور مرتہن اس کا ضامن ہوگا، کیونکہ یہ دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہے۔

اگر راہن کی اجازت سے مرتہن تصرف کرے تو یہ صحیح اور نافذ ہے، اب اگر اس تصرف سے ملکیت زائل ہو جیسے ہبہ و بیع تو رہن باطل ہوگا، ورنہ برقرار رہے گا، جیسے عاریت اور اجارہ۔

٦) رهن کی واپسی: جب قرض کی مکمل ادائیگی ہو جائے تو عقد رہن ختم ہو جائے گا اور مرتہن پر واجب ہے کہ مرہون شئی راہن کو لوٹا دے، خواہ متعین مدت پر قرض ادا ہو یا اس سے قبل، اگر مرتہن بلا عذر نہ لوٹائے یا کوتاہی برتے تو اس چیز کا ضامن ہوگا، کیونکہ اب اسے روکے رکھنے کا حق حاصل نہیں لہٰذا یہ غصب کی طرح ہو جائے گا۔ اگر معقول عذر ہو، مثلاً مرہون کسی دوسری جگہ ہو جس کے لئے آنے میں کچھ مدت درکار ہو تو ضامن نہ ہوگا، اسی طرح اُسے یہ معلوم ہو کہ لوٹانے کی صورت میں فلاں شخص راہن سے زبردستی غصب کرلے گا، اور اس لئے وہ واپسی سے باز آئے تو ضامن نہ ہوگا۔

اگر قرض کی ادائیگی قسط وار ہو، تو جب تک مکمل قرض ادا نہ ہو یا بقیہ اقساط کو مرتہن معاف نہ کردے، رہن ختم نہ ہوگا، لہٰذا رہن تجزی کے قابل ہو تب بھی راہن ادا کردہ قسط کے بالمقابل رہن کے بعض حصہ کی واپسی اور چھڑانے کا مطالبہ نہیں کرسکتا، کیونکہ رہن دَین کے تمام اجزاء کے عوض وثیقہ ہے، لہٰذا باتفاق فقہاء مکمل ادائیگی کے بغیر اس کا کوئی حصہ نہیں چھوٹے گا۔ (مثلاً ہزار روپے قرض کے عوض دو ۲ گھڑی رہن رکھے، پھر ۵۰۰ روپے کی ادائیگی کے بعد ایک گھڑی چھڑانا چاہے تو اجازت نہ ہوگی)

اگر راہن بوقت عقد یہ شرط رکھے کہ جتنی رقم ادا ہوتی رہے گی اس کے بقدر رہن چھوٹتا رہے گا، تو رہن فاسد ہوگا۔

۷) مرهون کی فروخت: قرض کی واپسی کی متعین مدت پر راہن ادائیگی سے قاصر ہو، اور مرتہن مطالبہ کرے، تو مرہون کو فروخت کرکے اس کی قیمت سے ادائیگی ہوگی۔ چونکہ مرہون راہن کی ملکیت ہے، اسلئے فروخت کا حق اس کو یا اس کے وکیل کو حاصل ہوگا، البتہ مرتہن کی اجازت شرط ہے، کیونکہ اس کی مالیت اور قیمت اس کا بھی حق ہے کہ اسی سے قرض کی تحصیل ہوگی۔

اگر مرتہن فروخت کی اجازت نہ دے تو حاکم کے پاس پہنچے، اور وہ فروخت کی اجازت یا قرض کی معافی کا حکم دے گا، پھر بھی مرتہن نہ مانے تو حاکم فروخت کردے گا، اور اس کا قرض ادا کرے گا۔

اسی طرح راہن فروخت پر راضی نہ ہو، تو قاضی اسے دین کی ادائیگی یا مرہون کے فروخت کا حکم دے، اور انکار کی صورت میں خود ہی فروخت کرکے مرتہن کا قرض اس کی قیمت سے چکائے۔ اگر راہن اپنی کوئی دوسری چیز فروخت کرکے قرض چکانا چاہے تو یہ جائز ہے، اور اس پر مرہون کی فروخت کے لئے جبر نہیں کرسکتے، کیونکہ اصل مقصد قرض چکانا ہے، چاہے کہیں سے چکائے۔

اگر راہن مرتہن کو فروحت کی اجازت دے دے، اور وہ راہن کی موجودگی میں فروخت کرے تو صحیح ہے، کیونکہ بیع میں نقصان نظر

قرض کی مقدار اس سے زائد ہوتو بقیہ راہن سے وصول کرلے، اور دونوں مساوی ہو، تو برابر سرابر ہوگیا، کسی کے ذمہ کچھ نہ ہوگا۔

۳) اگر اجنبی مرہون شئ تلف کردے تو درج ذیل احکام مرتب ہوں گے:

(الف) مرہون کا مثل ہو تو مثل کا ورنہ اتلاف کے دن کی قیمت کا ضامن ہوگا، اور یہ ضمان تلف شدہ مرہون کی جگہ مرتہن کے پاس رہن رہے گا۔

(ب) خصومت اور مطالبہ کا اصل حق راہن کا ہے، کیونکہ وہی مالک ہے، البتہ مرتہن بھی وہاں حاضر رہ سکتا ہے، کیونکہ بدل سے اس کا حق متعلق ہے، جو کہ اس کے پاس رہن رہے گا، راہن مطالبہ نہ کرے تو مرتہن کو مطالبہ کا حق نہیں۔

قسم سوم: رھن کی نشوونما اور اضافه کے متعلق: یعنی درخت کے پھل، کھیت کا غلہ وآمدنی، جانور کا موٹاپا، اولاد، مکان کا کرایہ، گاڑی کی آمدنی وغیرہ۔

مرہون شئ سے اس طرح متصل یا منفصل کوئی اضافہ یا آمدنی حاصل ہو تو وہ راہن کی ملکیت ہے، کیونکہ یہ اس کی ملکیت کا اضافہ ہے، لہٰذا وہی اس کا بھی حکم ہوگا۔

البتہ متصل زیادتی مثلاً رہن کے جانور کا موٹا ہونا وغیرہ، یہ بھی رہن ہی رہے گا، کیونکہ اسے اصل سے جدا نہیں کرسکتے، اور منفصل (جدا) زیادتی اور اضافہ مثلاً اولاد، دودھ اور پھل وغیرہ، رہن میں داخل نہیں، اور مرتہن اسے روک نہیں سکتا، کیونکہ یہ راہن کی ملکیت ہے اور اس کے متعلق عقد رہن جاری نہیں ہوا، حدیث کے لفظ "اس کے منافع راہن کے لئے ہیں" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

قسم چھارم: رہن سے متعلق بعض جزئیات اور فروعی احکام:

۱) مرھون کسی عادل کے قبضه میں رکھنا: کسی وجہ سے بعض اوقات راہن کو مرتہن کے پاس اپنی چیز رکھنے پر اطمینان نہ ہوگا، تو ایسی صورت میں دونوں متفقہ طور پر کسی عادل اور معتبر شخص کے پاس اسے رکھ سکتے ہیں، عادل کا مطلب جو قابل اعتماد اور امانت دار ہو، جس سے راہن اور مرتہن دونوں راضی ہوں، جب وہ عادل مرہون پر قبضہ کرلے تو یہ قبضہ صحیح ہے اور عقد رہن مکمل ہوگا، اور قبضہ میں وہ مرتہن کا وکیل شمار ہوگا۔

کسی عادل کے پاس مرہون شئ رکھنے کی صورت میں یہ احکام متعلق ہوں گے:

۱- وہ عادل شخص شئ مرہون راہن یا مرتہن کے سپرد نہیں کرسکتا، جبکہ دونوں کی اجازت نہ ہو، اجازت کے بغیر کسی کے سپرد کردے تو ضامن ہوگا، اگر وہ چیز تلف ہوجائے تو قیمت یا مثل کا ضمان لازم ہوگا۔

۲- اس کی تعدی یا قصور کے بغیر مرہون تلف ہو تو وہ ضامن نہ ہوگا، کیونکہ اس کا قبضہ مرتہن کے مثل ہے، جو کہ قبضۂ امانت ہے۔

۳- قرض کی ادائیگی کے وقت ادائیگی میں دشواری کی وجہ سے راہن ومرتہن دونوں اسے مرہون کے فروخت کی اجازت دیں یا بوقت عقد ہی دونوں اس کے فروخت کی شرط لگائیں، تو اس صورت میں وہ فروخت کرسکتا ہے، بوقت فروخت راہن سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں، اجازت یا شرط کے بغیر اسے فروخت کا اختیار نہیں، کیونکہ دونوں نے اسے صرف اپنے پاس رکھنے کا حق دیا ہے نہ کہ تصرف کا، اگر راہن اجازت کے بعد اسے بیع سے روکے تو یہ روکنا صحیح ہے، اب اسے فروخت کا حق نہ ہوگا، اسی طرح وہ عادل خود اس حق سے دستبردار ہوسکتا ہے۔

۴- مُستعار (عاریت پر لی ہوئی چیز) کا رہن: اگر رہن رکھنے کے لئے راہن کسی دوسرے کی چیز عاریتاً لے تو اس سے متعلقہ احکام

کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- **راهن یعنی مستعیر اصل مالک** (معیر) کو دَین کا جنس، مقدار، صفت اور مرتہن کی تفصیلات سے آگاہ کرے۔

۲- **راهن اور مالک کی موافقت :** مالک (یعنی معیر اور عاریت پر دینے والے) کے شرائط کے مطابق راہن رہن رکھے تو رہن صحیح ہوگا، اور مرتہن قبضہ کرلے تو یہ عقد مکمل اور لازم ہوگا، اب معیر یا راہن رجوع نہیں کرسکتا، اور رہن کے سابقہ تمام احکام مرتب ہوں گے، منجملہ ان کے یہ کہ اگر مرہون تعدی وتقصیر کے بغیر مرتہن کے پاس ضائع ہو تو اس پر ضمان نہ ہوں گا۔ جیسا کہ راہن پر بھی نہ ہوگا۔

اگر راہن مالک کے شرط کی مخالفت کرے، مثلاً اس نے زید کے پاس رہن رکھنے کے لئے عاریت دی اور اس نے افضل کے پاس رکھا، تو رہن باطل ہے، اسی طرح قرض کی جنس میں مخالفت ہو، مثلاً ریال کے عوض رہن کے لئے دے، اور یہ روپے کے عوض رکھے، یا مقدار میں مخالفت ہو، مثلاً ہزار کے عوض رہن کے لئے دے اور یہ دو ہزار کے عوض رکھے، تو باطل ہے، اگر شرط سے کم مقدار پر رکھے، مثلاً ہزار کے شرط پر دے، اور راہن ۵۰۰ روپے کے عوض رکھے تو صحیح ہے، کیونکہ اس میں مزید سہولت اور معیر کی مصلحت ہے۔

۳- **مُستَعِیر (عاریت پر لینے والا، راهن) کے هاتھوں مستعار کا تلف :** مسئلہ گذر چکا کہ مرتہن کے پاس تلف ہو تو کسی پر ضمان نہیں، لیکن مُستَعِیر (راہن) کے پاس تلف ہو یا عیب دار ہو جائے تو وہ ضامن ہے، خواہ مرتہن کے سپرد کرنے سے قبل تلف ہو یا رہن چھڑانے کے بعد، اس کی تعدی سے ہو یا بلا تعدی۔

۴- **مُعیر کا مُستعار کو رهن سے چھڑانا :** قرض چکانے کی مدت پر راہن چکانے اور رہن چھڑانے سے عاجز ہو، اور معیر قرض چکا کر اپنی چیز رہن سے چھڑانا چاہے تو اس کو اس کا اختیار ہے، اور مرتہن پر اسے قبول کرنا لازم ہے، اس صورت میں معیر راہن سے ادا کردہ رقم مکمل واپس لوٹا لے گا۔

مُعیر یا مُستعیر کی موت : مستعیر (راہن) کی وفات ہو، اور قرض چکانے کیلئے کچھ مال نہ چھوڑے، تو رہن اپنی حالت پر باقی رہے گا، مرہون کو مُعیر کی اجازت کے بغیر فروخت نہیں کرسکتے، اگر وہ فروخت پر راضی ہو اور اس کی قیمت سے قرض مکمل ادا ہوتا ہو تو فروخت کیا جائے، خواہ مرتہن، متفق نہ ہو، لیکن قرض مکمل ادا نہ ہو تو مرتہن کی رضامندی کے بغیر فروخت نہیں کرسکتے، کیونکہ اسے روکنے میں اس کا نفع ہے، ممکن ہے مالک کو اس چیز کی ضرورت پیش آئے اور وہ پورا قرض ادا کر کے چھڑانے کی کوشش کرے، یا آئندہ اس کی قیمت بڑھ جائے اور پورا قرض ادا ہو جائے۔

اگر معیر کا انتقال ہو، اور اس پر قرض ہو، اور ادائیگی کے لئے اس رہن کے علاوہ کوئی چیز نہ چھوڑی ہو، تو راہن کو اسے چھڑانے کا حکم دیں گے، تاکہ معیر کے ورثاء کے سپرد کر کے اس سے قرض ادا کیا جائے، اور ہر کسی کو اپنا حق مل جائے، راہن چھڑانے پر قادر نہ ہو تو وہ رہن ہی رہے گا، اور معیر کے وارثوں کو اس صورت میں راہن کا قرض ادا کر کے اسے چھڑانے کا حق ہوگا، اگر وہ قرض ادا نہ کریں اور وہ اور دیگر قرض خواہ رہن کے فروخت کا مطالبہ کریں تو فروخت کیا جائیگا، جبکہ اس کی قیمت سے مرتہن کا قرض مکمل ادا ہو، خواہ مرتہن راضی نہ ہو، اگر قرض مکمل ادا نہ ہو تو مرتہن کی اجازت کے بغیر فروخت نہ کی جائے۔

۳) مرهون یا دَین میں اضافه :

(الف) عقد رهن کی تکمیل کے بعد مرهون میں اضافه : قرض کے عوض کوئی چیز رہن رکھے اور مرتہن کے مرہون پر قبضہ کے بعد راہن کوئی دوسری چیز بھی اس کے ساتھ بطور رہن رکھنا چاہے، تو صحیح ہے، کیونکہ اس میں مرتہن کے حق کی اور

مضبوطی ہے، جیسا کہ بلا رہن قرض لینے کے بعد پھر کوئی چیز رہن رکھے۔

مرتہن جب اس اضافہ اور دوسری چیز پر قبضہ کرلے تو یہ اور پہلی چیز مل کر مکمل ایک ہی رہن شمار ہوں گے، اور اس پر بھی رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے۔

(ب) دَین (قرض) میں اضافہ: مثلاً ایک ہزار کے عوض کوئی چیز رہن رکھے، اور قبضہ ہوکر عقد مکمل ہو، پھر مزید ہزار روپے قرض لینا چاہے، بشرطیکہ یہی رہن اس ہزار کی جانب سے بھی رہن قرار پائے (یعنی کل دو ہزار کی طرف سے رہن شمار ہو،) تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ اس صورت میں وثیقہ میں کمی پائی جارہی ہے۔

۴) رھن کے طرفین (عاقدین - راھن و مرتھن) میں تعدد:

۱- راھنوں کا تعدد (یعنی ایک سے زائد راھن): مثلاً کسی کا دو یا زائد افراد پر قرض ہو، اور یہ بھی مقروض تمام قرضوں کے عوض ایک ہی عقد میں ایک چیز مثلاً گھر یا گاڑی وغیرہ رہن رکھیں، تو یہ صحیح ہے، چاہے ان سب پر ایک ہی عقد میں قرض ثابت ہو، یا علیحدہ علیحدہ، کیونکہ مرتہن خریدار کی طرح اور راہن فروخت کنندہ کیطرح ہے، اور ایک آدمی کئی لوگوں سے ایک چیز خرید سکتا ہے، اس صورت میں راہن جدا جدا ہونے کی وجہ سے عقد رہن جدا جدا شمار ہوگا، لہٰذا جو بھی اپنا قرض ادا کرے گا، اس کے بالمقابل اس کا حصہ اس مرہون میں سے چھوٹ جائے گا۔

۲- مرتھن کی کثرت: دو یا زائد افراد کا کسی ایک شخص پر قرض ہو، اور وہ ان تمام قرضوں کے عوض اپنا مکان مثلاً اُن سب کے پاس رہن رکھ دے اور وہ قبول کرلیں، تو یہ صحیح ہے، خواہ یہ سب مذکورہ قرض میں شریک ہوں، یا نہ ہوں (بلکہ ہر ایک کا اپنا الگ الگ قرض ہو) راہن ان میں سے جس کا بھی قرض ادا کردے، اسی تناسب سے مرہون کا اتنا حصہ رہن سے آزاد ہوگا، کیونکہ مستحقین کے تعدد کی وجہ سے عقد رہن بھی الگ الگ شمار ہوگا۔

۳- مرھون چیز کا تعدد: مثلاً راہن مرتہن سے کہے: میں نے یہ دونوں گاڑیاں دو لاکھ کے عوض تمہارے پاس رھن رکھیں، اور مرتہن قبول کرکے ان پر قبضہ کرے، تو یہ عقدِ رہن صحیح ہے،

بلا تفریق پورے قرض کے عوض یہ رہن رکھے، تو جب تک مکمل قرض ادا نہ ہو، رہن کا کوئی حصہ، (مثلاً ایک گاڑی) واپس نہیں لے سکتا، اگر رہن کے وقت تفریق کرے اور یوں کہے: ہر گاڑی ایک لاکھ کے عوض، تو یہ دو جدا جدا عقدِ رہن شمار ہوں گے، لہٰذا ایک کے بالمقابل قرض کی رقم (مثلاً ایک لاکھ) ادا کرے تو ایک گاڑی واپس لے سکتا ہے۔

متفرقات

۱) جو چیز جلد بگڑنے یا سڑنے والی ہو، اسے رہن رکھ سکتے ہیں، جبکہ اُسے خشک کرکے محفوظ کیا جاسکتا ہو، جیسے کھجور اور انگور جو خشک ہوسکیں، یا فوری واجب الادا قرض کے عوض رہن رکھے، یا سڑنے سے پہلے قرض کی واپسی کی تاریخ آجائے، یا سڑنے کے وقت کے بعد قرض چکانے کا وقت ہوتا ہو، لیکن ایسی صورت میں بگڑنے سے قبل اسے فروخت کرکے قیمت کو اس کی جگہ رہن رکھنے کی شرط ہو۔

سڑنے سے قبل ادائیگی کا وقت نہ آئے تو پہلی صورت میں خشک کرکے رکھا جائے، اور یہ مصارف اور ذمہ داری مالک (راہن) کی ہے، اور دیگر صورتوں میں فروخت کرکے قیمت کو رہن رکھے۔ (فتح الوهاب مع حاشية الجمل ۳/۳۷۲)

۲) مرہون پر قبضہ سے قبل راہن یا مرتہن میں سے کوئی مرجائے، یا پاگل یا بے ہوش ہوجائے تو رہن باطل نہ ہوگا، موت کی صورت میں وارث اور پاگل کی صورت میں اس کے مال کی نگرانی کا ذمہ دار رہن کے لینے یا دینے میں قائم مقام ہوگا، بے ہوشی میں افاقہ کا انتظار کریں گے۔ (مغنی المحتاج ۱۲۹/۲)

۳) راہن غائب ہو اور شہر میں کوئی شرعی حاکم بھی نہ ہو، تو مرتہن خود رہن فروخت کرکے اپنا حق حاصل کرے (مغنی المحتاج ۱۳۵/۲)

۴) مرتہن غائب ہو، اور راہن قرض کی رقم حاکم کے سپرد کرکے رہن چھڑانے کا مطالبہ کرے تو جائز ہے (مغنی المحتاج ۱۳۵/۲)

۵) کسی کا انتقال ہو، اور اس پر قرض ہو، تو اس قرض کا تعلق اس کے ترکہ سے مرہون سے قرض کے تعلق کی طرح ہے، (یعنی ترکہ کو اس قرض کے عوض رہن سمجھا جائیگا)، اسی میں میت کی بہتری ہے، کیونکہ اس صورت میں وارث کو ترکہ میں تصرف کی اجازت نہ ہوگی، قرض ترکہ کے مساوی ہو یا کم وبیش یہی حکم ہو۔

وارث ترکہ میں تصرف کرے، اور مورث (میت) پر کوئی قرض نہ ہو، پھر قرض طاری ہو، مثلاً عیب کی وجہ سے خریدار چیز لوٹادے جس کی قیمت میت ختم کرچکا، تو اس کی وجہ سے وارث کا تصرف فاسد نہ ہوگا، لیکن وارث اس خریدار کا قرض (قیمت) ادا نہ کرے تو اس تصرف کو فسخ کیا جائے گا۔

اگر وارث ترکہ اپنے پاس رکھ کر اپنے مال میں سے قرض ادا کرنا چاہے تو یہ جائز ہے، لیکن میت خود قرض کے عوض اپنی کسی چیز کو دینے کی وصیت کرجائے، یا اسے فروخت کرکے اس کی قیمت سے قرض چکانے کی وصیت کرے، تو اس وصیت پر عمل کرے، وارث اس چیز کو رکھ کر دوسری جگہ سے قرض ادا نہیں کرسکتا۔

قرض کا ترکہ سے تعلق ہونے کے باوجود وارث اس کے وارث ہوں گے، لہٰذا ترکہ کے زوائد سے قرض کا تعلق نہ ہوگا، مثلاً اولاد وغیرہ (بلکہ وارث کی ملکیت ہوگی) (مغنی المحتاج۔ ۱۴۴/۲)

قرض اور وصیتوں کی دائیگی سے قبل وارث کا ترکہ میں تصرف یا اس کی تقسیم صحیح نہیں، اگر میت پر حج فرض ہو تو اس کی ادائیگی بھی قرض میں داخل ہے، خواہ میت نے حج بدل کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اگر وارث قرض کی مقدار ترکہ میں سے یا کہیں اور سے وصی یا حاکم کے حوالہ کرے تو اب بقیہ مال میں بعض فقہاء کے نزدیک تصرف کی اجازت ملے گی، لیکن ابن حجر اور رملی کا فتویٰ یہ ہے کہ جب تک حج ادا نہ ہو، وارث کا تصرّف صحیح نہ ہوگا۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۳۷)

۶) نقدی، اشیاء اور قرض کی شکل میں جو بھی ترکہ ہے، تمام ورثاء اس میں مشترک ہیں، لہٰذا صحیح حصہ کے بغیر کسی حصہ پر کسی کا تنہا اور مستقل حق نہ ہوگا، حتی کہ ایک وارث قرض کا ایک حصہ وصول کرے تو یہ تنہا اس کا حق نہ ہوگا، خواہ مقروض نے اس وارث کے حصہ کے قرض کی ادائیگی کا قصد کیا ہو، البتہ کوئی وارث اپنے قرض خواہ کو ترکہ کے قرض میں سے وصول کرنے کے لئے حوالہ کرے، اور ترکہ کا مقروض اس کے سپرد کردے تو یہ تنہا اس کا ہوگا، دیگر ورثاء اس میں شریک نہ ہوں گے (حاشیۃ الجمل ۳۰۷/۳)

۷) میت کا کسی پر قرض ہو تو وہ اپنے صفت کے ساتھ وارث کی طرف منتقل ہوگا لہٰذا قرض کے عوض رہن ہو تو وہ حق بھی وارث کی طرف منتقل ہوگا، لیکن راہن پر یہ لازم نہیں کہ رہن وارث کے قبضہ میں دے، کیونکہ یہ مورث کے قبضہ سے راضی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وارث کے قبضہ سے بھی راضی ہو، (حاشیۃ الجمل ۳۰۷/۳)

۸) ضمان اور عدم ضمان میں فاسد عقد بھی صحیح عقد کی طرح ہے، لہٰذا اگر صحیح عقد ضمان کا مقتضی ہو، جیسے فروخت اور عاریت، تو اس کے فاسد میں بدرجہ اولیٰ ضمان ہوگا، اور صحیح عقد ضمان کا مقتضی نہ ہو، جیسے رہن اور ہبہ وغیرہ، تو فاسد میں بھی ضمان نہ ہوگا، نفس ضمان میں برابری مراد ہے، نہ کہ ضامن اور مقدار میں، کیونکہ اس میں کبھی فرق بھی ہوسکتا ہے۔(نهاية المحتاج ۲۸۲/۴)

۹) اگر قرض کی ادائیگی کا وقت آنے پر رہن مرتہن کے حق میں فروخت شدہ شمار کرنے کی شرط لگائی جائے تو رہن اور فروخت دونوں فاسد ہیں، اور مرہون وقت آنے تک امانت اور بعد میں مضمون (ضمانت کا موجب) ہے۔(نهاية ۲۸۳/۴)

حَجر [مالی تصرفات پر پابندی اور ممانعت]

حجر عربی زبان میں روکنے اور منع کرنے کو کہا جاتا ہے، اور شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاح میں " مالی تصرفات میں خلل انداز کسی سبب کی وجہ سے مالی تصرفات سے روکنے کو حجر کہا جاتا ہے۔"

تصرفات میں خلل انداز اسباب کئی اور مختلف ہیں، اور اسی اعتبار سے حجر بھی مختلف ہیں۔ مثلاً: مفلس (دیوالیہ) پر قرض خواہوں کے حق کی وجہ سے پابندی، مرض الموت میں وارث کے حق کی وجہ سے روک، بچے اور پاگل پر ان کے مال کی حفاظت کی خاطر حجر، غلام پر اس کے آقا کی مصلحت کے پیش نظر پابندی، مرتد پر مسلمانوں کی مصلحت کی وجہ سے حجر، راہن پر مرتہن کے حق کی وجہ سے مرہون میں تصرف پر پابندی۔ ان میں سے اکثر انواع متعلقہ ابواب میں مذکور ہیں، اس باب میں اس کے اہم انواع پر گفتگو ہوگی۔

(جس پر مالی تصرف کی پابندی عائد ہوتی ہے، اسے محجور علیہ کہا جائے گا)

مشروعیت : مذکورہ تعریف کے مطابق حجر اور مالی تصرف کی پابندی قرآن وحدیث اور اجماع کی روشنی میں مشروع ہے۔

آیت: " وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰماً " (سوره النساء : ۵)

ترجمہ: " اور مت پکڑادو بے عقلوں (کم عقلوں) کو اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے گذران کا سبب بنایا ہے۔" (سفہاء یہ سفیہ کی جمع ہے، یعنی جس میں مالی تصرف کی صلاحیت اور سمجھ نہ ہو، اور مال کو بے موقع صرف کرتا ہو۔ مال کو تمام کی طرف منسوب کیا؛ کیونکہ یہ اللہ کا مال ہے، اور امت کا اس میں حق ہے، گرچہ کسی فرد کی خالص ملکیت ہو) اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں سرپرستوں اور ذمہ داروں کو اس سے منع فرمایا کہ سفہاء اور بے عقلوں کے قبضہ میں مال دیں، اور یہی ان پر حجر اور پابندی ہے۔

۲) " وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْداً فَادْفَعُوْا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ " (النساء : ۶)

ترجمہ: " اور یتیموں کو سدھاتے رہو، جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو، پھر اگر ان میں ہوشیاری (یک گونہ تمیز) دیکھو، تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو"۔ (یتیم یعنی وہ بچہ اور نابالغ جس کا باپ انتقال کر جائے، اور نکاح کی عمر کو پہنچنے سے مراد بلوغ ہے، اور رشد کا مطلب ہے عقل کی سلامتی حسنِ تصرف اور دینی صلاح) آیت سے معلوم ہوا کہ جس میں ابھی رشد (ہوشیاری اور تمیز) نہ ہو، اس کے سپرد مال نہیں کیا جائے گا، بلکہ رشد کی صفت آنے تک اس پر تصرفات کی پابندی عائد ہوگی (جس میں رشد کی صفت ہو، اسے 'رشید' کہتے ہیں)

۳) " فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهاً اَوْ ضَعِیْفاً اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ " (البقره : ۲۸۲)

ترجمہ: " پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے، بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا آپ نہیں بتلا سکتا، تو بتلاوے کارگذار اس کا انصاف سے "

(یعنی جو مدیون ومقروض ہے، وہ اگر بے عقل بھولا یا ست اور ضعیف ہے، مثلاً بچہ ہے یا بہت بوڑھا ہے کہ معاملہ کے سمجھنے کی سمجھ ہی نہیں ہے، یا معاملہ کو کاتب کو بتلا نہیں سکتا، تو ایسی صورتوں میں مدیون کے مختار اور وارث اور کارگذار کو چاہئے کہ معاملہ کو انصاف سے بلا کم وکاست لکھوا دے) اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ ان لوگوں کی طرف سے ان کے اولیاء (مختار اور سرپرست) تصرف کریں گے، اور یہی حجر کا مطلب ہے۔

احادیث:

۱) آپ ﷺ نے کسی قرض کی وجہ سے حضرت معاذ پر پابندی عائد کی اور ان کا مال فروخت کردیا (تاکہ اس سے قرض ادا ہو) (رواہ البیھقی والحاکم و صححہٗ)

۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں " مجھے غزوۂ احد کے وقت آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا جبکہ میری عمر ۱۴ سال تھی، تو آپ ﷺ نے (غزوہ میں شرکت کی) اجازت نہ دی، اور غزوۂ خندق میں آپ ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو میری عمر ۱۵ سال تھی، تب آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی" (متفق علیه)

۳) اسَیفِع پر لوگوں کا کافی قرض چڑھ گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ اُس پر جس کا بھی قرض ہو وہ کل حاضر ہوجائے، کیونکہ ہم اس کا مال فروخت کر کے (قیمت) قرض خواہوں کے درمیان تقسیم کرنے والے ہیں۔ (امام مالک)

قرآن وحدیث کے نصوص کی روشنی میں حجر کی مشروعیت اور جواز پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

حکمت: حجر ایک سلبی اور احتیاطی عمل ہے، جس میں بعض اوقات مجور علیہ (جس پر پابندی عائد ہے) کی، اور بعض اوقات دوسروں کی مصلحت پیش نظر ہوتی ہے۔

خرید وفروخت اور مالی تصرفات کے لئے صحیح صلاحیت اور مالی اور دینوی امور میں مہارت اور واقفیت ضروری ہے، لہٰذا جن میں یہ صفات نہ ہوں (جیسے بچے پاگل وغیرہ)، ان پر خود تصرف کی پابندی لگا کر، ان کے ذمہ داروں کے حوالہ کرنے میں ان کے مال کی حفاظت اور ان کے حق میں بہتری اور مصلحت ہے۔

ایک مفلس (دیوالیہ) شخص، جس پر دوسروں کے قرض کا بوجھ ہو، اپنے بقیہ مال میں اپنی مرضی سے تصرف کر کے ان قرض خواہوں کو مزید نقصان پہنچائے گا، اور ان کے حقوق فوت ہوجائیں گے لہٰذا حاکم کی جانب سے اس پر حجر لگا کر اس مال کو قرض خواہوں میں تقسیم کرنے میں ان کی بھلائی اور بہتری ہے۔

حجر کے انواع: (۱) نابالغ، سفیہ (کم عقل اور بھولا) اور پاگل پر حجر (۲) مفلس (دیوالیہ) پر حجر (۳) جس مریض کے موت کا خطرہ ہو، اس پر حجر

۱) **نابالغ:** ایک نابالغ کا حجر رشد کی صفت کے ساتھ بالغ ہوتے ہی ختم ہوگا۔

بلوغ: قمری مکمل پندرہ سال کی عمر ہو، یا مکمل قمری نو سال کے بعد انزال ہو، تو اس سے مرد اور عورت پر بلوغ کا حکم لگ جائیگا۔ نیز عورت کو ممکنہ وقت میں حیض آئے یا وہ حاملہ ہوجائے تو یہ بھی اس کے حق میں بلوغ کی علامت ہے۔

کافر کے بچہ اور جس کا اسلام معلوم نہ ہو، اس کے زیر ناف کھر درے اور سخت بال اُگنا، ان کے حق میں بلوغ کی علامت سمجھی جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان کے حق میں یہ بلوغ کی علامت نہیں ہے۔

رُشد (ھدایت): یعنی دینی اور مالی صلاح اور سلامتی ودرستگی، پس ایسے حرام کا ارتکاب نہ کرے کہ عدالت (عادل ہونا) باطل ہو جائے، یعنی کسی کبیرہ کا ارتکاب نہ ہو یا صغیرہ پر اصرار نہ ہو اور اس کی اطاعت ونیکیاں برائیوں پر غالب نہ ہوں، یہ دینی صلاح ہے، اور مالی صلاح یہ ہے کہ تبذیر (فضول خرچی) نہ کرے، یعنی معاملات میں بہت زیادہ نقصان اٹھانا، یا مال کو مثلاً سمندر میں پھینک دینا، یا کسی حرام میں صرف کرنا، خواہ وہ حرام صغیرہ ہی ہو۔ صدقات اور راہِ خیر میں مال صرف کرنا اور اپنی حیثیت سے اونچا لباس اور کھانا پینا استعمال کرنا تبذیر میں داخل نہیں ہے۔

(جس میں مذکورہ تفصیل کے مطابق رشد کی صفت ہو، اسے رشید اور جو اس صفت سے عاری ہو، اسے سفیہ کہا جاتا ہے) (السراج الوهاج ص ۲۲۹)

ائمہ ثلاثہ نے رشد کے لئے صرف مالی صلاح کو کافی سمجھا ہے۔ اور امام ابن عبد السلام کا رجحان بھی یہی ہے۔ (حاشية الجمل ۳۳۹/۳)

رشد کا امتحان اور آزمائش: قرآن نے ''وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى'' (سوره نساء : ۶) (اور یتیموں کو سدھاتے رہو، ان کی آزمائش کرو اور امتحان لو) کہہ کر بچہ کے رشد کے امتحان کا حکم دیا ہے۔ اس کے دینی رشد کا اندازہ عبادات وفرائض کی ادائیگی، محرمات سے اجتناب، شبہات سے پرہیز اور صالحین کی مصاحبت کی روشنی میں حاصل ہوگا۔

مالی رُشد کی آزمائش کے مراتب جدا جدا ہیں، ایک تاجر زادہ کا امتحان خرید وفروخت کے مقدمات کے ذریعہ (مثلاً خریدنے میں قیمت کم کرنا، فروخت میں زائد از زائد پر فروخت کرنا وغیرہ)، ایک کاشتکار کے بیٹے کی آزمائش کاشتکاری اور اس سے متعلق نوکر چاکر کی صحیح نگرانی اور مزدوری کی تعیین اور ادائیگی کے ذریعے اور کسی صنعت وحرفت سے متعلق افراد کی متعلقہ حرفت کی ذمہ داری کے نبھانے کی صلاحیت وغیرہ کے ذریعہ کی جائے گی۔

ایک عورت کے رشد کی آزمائش اس کے مناسب امور میں اس کی مہارت اور سمجھ بوجھ کے ذریعے کی جائے گی، مثلاً ایک عام عورت کے حق میں کھانے کا بلی، چوہا اور مرغی وغیرہ سے حفاظت۔

آزمائش کا دو یا زائد مرتبہ پایا جانا شرط ہے، یہاں تک کہ اس کے رشد کا ظنِ غالب حاصل ہو۔ ایک مرتبہ کافی نہیں، کبھی اتفاقاً بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ آزمائش کا وقت بلوغ سے کچھ قبل ہے۔ لہٰذا اس کا عقد صحیح نہ ہوگا، بلکہ مال اس کے سپرد کر کے بھاؤ تاؤ کرنے میں آزمائیں گے، پھر جب عقد کا ارادہ ہو تو ولی عقد کرے گا۔

آزمائش اور امتحان کا اصل ذمہ دار اس کا ولی اور سرپرست ہے۔ (نهاية المحتاج منها ۳۶۳/۴) بالغ ہوتے وقت بھی رشید نہ ہو، تو حجر باقی رہے گا، لہٰذا جو بلوغ سے قبل اس کے مال میں تصرف کرتا تھا، اب بھی وہی کرے گا۔ اگر بوقت بلوغ رشید ہو، تو بلوغ کے ساتھ ہی حجر خود بخود ختم ہو جائیگا، اور اسکا مال اس کے حوالہ کیا جائے گا، اب اس کے بعد وہ تبذیر (فضول خرچی) کرے، تو قاضی (حاکم) اس پر حجر لگائے گا نہ کہ کوئی اور قاضی کو مستحب ہے کہ اس کا معاملہ باپ یا دادا کے حوالہ کرے، وہ نہ ہوں تو کسی دوسرے رشتہ دار کے سپرد کرے، ایک رشید اور بالغ شخص بعد میں فاسق ہو جائے، تو اس پر حجر نہیں عائد ہوگا (السراج الوهاج ص ۲۳۱)

محجور علیہ سفیہ کے غیر معتبر تصرفات:

کسی سفیہ پر حجر ہو، تو اس کے درج ذیل تصرفات صحیح نہ ہوں گے۔

خرید و فروخت: خواہ کانی نفع کے ساتھ ہو، گرچہ ولی کی اجازت ہواور وہ عوض متعین کرے۔

غلام آزاد کرنا۔ ہبہ کرنا (کسی دوسرے کا ہبہ قبول کرنا صحیح ہے) اپنے حق میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح قبول کرنا (ولی کی اجازت سے نکاح صحیح ہے۔ نیز کسی دوسرے کا نکاح بطور وکالت قبول کرنا صحیح ہے۔ اور ایجاب نکاح کسی بھی صورت میں صحیح نہیں، نہ اصالۃً اور نہ وکالۃً۔ خواہ ولی کی اجازت سے ہو)

اگر یہ سفیہ کسی غیر مجور علیہ سے کچھ خرید لے یا قرض لے، اور اس کی اجازت سے اس پر قبضہ کرلے (خواہ سامنے والے کو اس کا مجور علیہ ہونا معلوم ہو یا نہ ہو) پھر اس کے پاس وہ تلف ہو جائے یا تلف کردے تو اس پر نہ فی الحال ضمان واجب ہے، اور نہ حجر ختم ہونے کے بعد، لیکن وہ گنہگار ہوگا، کیونکہ مکلف ہے۔ اگر رشد کے بعد اسے تلف کردے، یا رشد کے بعد واپسی کے امکان کے بعد تلف ہو جائے، تو ضمان لازم ہے۔ اسی طرح اگر یہ سفیہ اجازت کے بغیر کسی کے مال پر قبضہ کرے، یا سامنے والا واپسی کا مطالبہ کرے اور پھر تلف ہو یا کسی مجور علیہ کے پاس سے لے تو ضامن ہوگا۔

بالکل مجبوری کی صورت میں کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ کا خریدنا اس کے لئے جائز ہے۔ اس کا حجر سے قبل یا بعد کی طرف منسوب کرتے ہوئے کسی قرض یا مال کے تلف کرنے کا اقرار صحیح نہیں، حجر کی حالت میں اس کے پاس موجود کسی چیز کا دوسرے کے حق میں اقرار معتبر نہیں۔

اس کے معتبر اور صحیح تصرفات: طلاق، رجعت۔ خلع (اگرچہ مہر مثل سے کم پر ہو) ظہار، لعان وغیرہ کے ذریعہ بچے کی نفی۔ حد یا قصاص کا اقرار۔

واجب اور مستحب بدنی عبادات میں سفیہ کا حکم رشید کی طرح ہے۔ یہ اپنی زکوٰۃ از خود تقسیم نہیں کرسکتا۔ اگر ولی اجازت دے، اور کسے دینا ہے متعین کردے، تو اس کا ادا کرنا صحیح ہے۔ البتہ امام غزالیؒ نے فرمایا کہ یہ تقسیم ولی یا اس کے نائب کی نگرانی میں ہونا چاہئے۔

حجر کی حالت میں فرض حج یا عمرہ کا احرام باندھے، تو ولی اس کے مصارف کسی معتبر شخص کے سپرد کردے، جو راستے میں اس پر خرچ کرتا رہے، یا ولی خود اس کے ساتھ روانہ ہو، البتہ سفر مسافت قصر سے کم ہو اور ولی مناسب سمجھے تو اسی کے سپرد کرسکتا ہے۔

حجر کی حالت میں نفل حج یا عمرہ کا احرام باندھے، اور اس سفر کے مصارف اسکے عام مصارف سے زائد ہوں تو ولی اسے روک دے۔ اور وہ محصر کی طرح احرام کھولے گا۔ اور مال کے صرف کرنا ممنوع ہونے کی وجہ سے بجائے دم کے روزہ رکھے گا۔ زائد مصارف کو راستہ میں کما کر پورا کرسکتا ہو تو اسے روکنا جائز نہیں ہے۔ (نہایۃ المحتاج۔ ۳۶۶/۴-۳۷۲)

نابالغ کا ولی (سرپرست): -ایک بچہ اور نابالغ کا سرپرست (والی، ذمہ دار) اس کا باپ، پھر دادا......اوپر تک ہوگا۔ بظاہر ان کا عادل (دین دار) ہونا کافی ہے۔ یہ نہ ہوں تو پھر ان میں سے جو آخر میں انتقال کرے، اس کا وصی (وصی یعنی جس کو وصیت کی جائے) وصی کا باطناً (حقیقتاً) بھی عادل ہونا شرط ہے۔ ورنہ پھر عادل وامین قاضی (حاکم) بچہ کا ولی ہوگا۔ کسی جگہ مناسب قاضی نہ ہو تو اس کی ولایت اور سرپرستی نیک مسلمانوں کو حاصل ہوگی۔ امام ابن عبد السلام فرماتے ہیں کہ جس کے پاس اجنبی یتیم اور اس کا مال ہو اور وہ مال حاکم کے سپرد کرنے کی صورت میں وہ خیانت کرے گا، تو اسے مجبوری کی وجہ سے اس کے مال میں تصرف کی اجازت ہوگی، جبکہ یہ عادل اور امین ہو۔

حدیث: ''جس کا کوئی ولی نہیں، اس کا ولی سلطان (حاکم) ہے'' (ترمذی و حسنہ، والحاکم وصححہ)

والدہ اور دیگر رشتہ داروں کو بغیر وصیت کے ولایت حاصل نہ ہوگی۔ لیکن عصبہ (باپ کی جانب سے رشتہ دار) ولی خاص (باپ دادا) کی غیر موجودگی میں بچہ، پاگل اور بالغ سفیہ کا مال ان کی تعلیم وتربیت پر صرف کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ قلیل مقدار ہے، اس لئے تسامح برتا گیا۔

ولی پرلازم ہے کہ مصلحت کے مطابق بچہ کے مال میں تصرف کرے، اور بربادی سے اس کی حفاظت کرے۔

آیت: ''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ '' (بنی اسرائیل : ۳۴)

ترجمہ: ''اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف مت کرو) مگر ایسے طریقہ سے (تصرف کی اجازت ہے) جو کہ (شرعاً) مستحسن ہے۔''

اگر اس کے مال سے زمین وجائیداد خرید لے، جس کی آمدنی اور کرایہ سے اس کا گذر بسر ہو سکے، تو یہ تجارت سے بہتر ہے۔ یتیم کے مناسب روزی کا کوئی ذریعہ (نوکری وغیرہ) ہو، تو ولی اسے اس کے لئے مجبور کرے۔

ولی کو محجور کے مال میں سے (اپنی ذمہ داری نبھانے کا) کوئی معاوضہ وغیرہ نہیں ملے گا، اگر وہ غریب ہے اور اس کے مال کی دیکھ ریکھ میں مصروفیت کی وجہ سے کمانہ پاتا ہو تو مناسب اجرت، یا اپنے خرچ میں سے جو کم مقدار ہو، وہ لے گا۔ (مثلاً اس محنت کی اجرت ۲۵، روپیہ یومیہ اور اس کے گذر بسر کے لئے ۳۰ / روپیہ یومیہ درکار ہو تو ۲۵ روپیہ لے گا۔

آیت ''وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ '' (سورہ نساء : ٦) ترجمہ: اور جس کو حاجت نہ ہو، وہ یتیم کے مال سے بچتا رہے۔ اور جو شخص حاجت مند ہو، تو وہ مناسب مقدار سے کھالے (برت لے)''

ولی یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا سکتا ہے، اور سہولت کی خاطر اپنے ساتھ کھانے پینے کا معمول رکھ سکتا ہے، جبکہ یہ یتیم کے حق میں بہتر ہو۔

بچے کی جائیداد جیسی اشیاء عام حالات میں فروخت نہ کرے (جبکہ اس کی بربادی وغیرہ کا خطرہ نہ ہو) البتہ اس کی آمدنی بچے کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ مصارف کیلئے ناکافی ہوں، یا عام قیمت سے زائد قیمت مل رہی ہو، جس میں اس سے قیمتی جائیداد خریدی جاسکتی ہو، تو فروخت کر سکتا ہے۔ مالِ تجارت مصلحت کی صورت میں فروخت کرے گا۔ دیگر اشیاء (مثلاً جانور وغیرہ) مالی حاجت اور مناسب نفع کے عوض فروخت کر سکتا ہے۔

ولی بچہ کے مال کی زکوٰۃ ادا کرے، اور بچے کی حیثیت کے مطابق معقول انداز میں اس پر خرچ کرتا رہے۔ (تلخیص فتح الوھاب مع الجمل ۳/۳۴۵-۳۴۹)

اگر بچے پر خرچ کرنے میں تنگی سے کام لے تو گنہگار ہوگا، اور اسراف برتے تو ضامن بھی ہوگا (السراج الوھاج ص ۲۳۲)

مُفْلِس (دیوالیہ) پر حجر کے احکام

جس شخص پر اس کے مال سے زائد قرض ہو (جو فی الحال واجب الادا ہو) اسے فقہی اصطلاح میں مفلس کہا جاتا ہے۔ جس کے احکام درج ذیل ہیں:

۱) مُفلس پر حجر اسی وقت جائز ہے، جبکہ اس پر اس کے مال سے زائد قرض ہو چکا ہو، اگر اس کی ملکیت میں موجود مال کے برابر یا اس سے کم قرض ہو، تو حجر جائز نہیں، خواہ اس کا گذر بسر براہِ راست اسی مال سے ہو، یا اس کی روزانہ کمائی میں سے۔

جو قرض مؤجل ہو (یعنی جس کی ادائیگی کا وقت نہ آیا ہو) اس کی وجہ سے حجر عائد نہ ہوگا، نیز حجر کی وجہ سے مؤجل قرض فی الحال ادا کرنا لازم نہ ہوگا (الجمل ۳/۳۱۱)

۲) مفلس پر جن حضرات کا قرض ہے، ان کی طرف سے حجر کا مطالبہ ہو، تب ہی اس پر حجر عائد ہوگا۔
اگر ان میں اختلاف ہو تو حجر عائد ہوگا، جبکہ صرف مطالبہ کرنے والوں کے قرض کی مقدار اس کے مجموعی مال سے زائد ہو۔ کیونکہ آپ ﷺ نے جب حضرت معاذ پر حجر عائد فرمایا تھا، تو قرض خواہوں کا مطالبہ موجود تھا، نیز یہ حجر ان کی مصلحت کے خاطر ہے، لہٰذا جب خود ان کا مطالبہ نہیں ہے تو گویا ان کی نگاہ میں حجر میں کوئی مصلحت نہیں، پس مفلس کو پریشان نہیں کیا جائیگا۔
۳) جب حاکم مفلس پر پابندی عائد کردیگا، تو قرض خواہوں کا حق اس کے ذمہ سے اس کے مال کی طرف منتقل ہوگا، گویا کہ مرہون شئی کی طرح ہوگا، جس سے مرتہن کا حق وابستہ ہوتا ہے۔
اس لئے شریعت ان کو اس مال پر تسلط کا حق دیتی ہے، تاکہ اپنا حق وصول کرسکیں۔
۴) حاکم کو سنت ہے کہ مفلس پر عائد شدہ حجر کی تشہیر کرے، تاکہ لوگ اس کے ساتھ معاملہ کرنے سے پرہیز کریں۔
۵) حاکم یا اس کے نائب پر واجب ہے کہ مفلس کا مال فروخت کردے، پھر قیمت قرض خواہوں کے درمیان ہر ایک کے قرض کے تناسب سے تقسیم کرے (مثلاً ایک کا ۵۰ ہزار روپے اور دوسرے کا ۲۵ ہزار قرض ہو اور مال کی قیمت ۳۰ ہزار ملے تو اول کو ۲۰ ہزار اور دوم کو ۱۰ ہزار دے دے)
حاکم کو مسنون ہے کہ حتی الامکان جلد از جلد یہ کام انجام دے، نیز فروخت کی کیفیت میں محجور علیہ کے مصلحت کی رعایت کرے، مثلاً جلد بگڑنے والی اشیاء پہلے فروخت کردے، جیسے کھانا وغیرہ، پھر قابل انتفاع اشیاء، پھر جائیداد وغیرہ اور ہر چیز اس کے بازار میں اور مناسب دام پر فروخت کرے۔ سنت ہے کہ یہ فروخت محجور علیہ اور قرض خواہوں کے روبرو ہو۔
حاکم پر لازم ہے کہ مفلس اور اس کے اہل وعیال کے مناسب ان کی حاجات یعنی لباس، خوراک اور رہائش کے نظم کو باقی رکھے۔ (اور فروخت نہ کرے، تاکہ ان کا بھی گذر بسر ہوسکے۔)
۶) مال یا قیمت جب قرض خواہوں میں تقسیم کردے، تو اب ان پر لازم ہے کہ اپنے بقیہ قرض کے لئے مفلس کو اس کی تنگدستی دور ہونے تک مہلت دیں، کیونکہ قرآن کا حکم ہے۔ ”وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ : ۲۸۰)
ترجمہ: ”اور اگر (مقروض) تنگدست ہو تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے، آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ کہ بالکل ہی معاف کردو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔
نیز مسلم شریف کی روایت میں ہے: ”آپ ﷺ کے دور مسعود میں ایک شخص پر خرید شدہ پھلوں میں آفت آنے کی وجہ سے کافی قرض ہوگیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس پر صدقہ کرو“، تو لوگوں نے صدقہ کیا، لیکن اس سے قرض مکمل ادا نہ ہوا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو مل گیا لے لو، اور تمہارا (فی الحال) اتنا ہی حق ہے۔“
لہٰذا مفلس کے مال کی تقسیم کے بعد اب وہ لوگ اس سے بقیہ قرض کی ادائیگی کے لئے کمانے کا یا ان کے پاس نوکری کرنے کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔

حجر کے بعد مفلس کا تصرف

۱) محجور علیہ مفلس کا کوئی بھی مالی تصرف، مثلاً خرید وفروخت، رہن، ہبہ وغیرہ صحیح نہیں، جبکہ اس کا تعلق اس کے عین مال سے ہو،

(یعنی اس کے پاس موجود مال کے ذریعہ ہو، مثلاً اس میں سے کچھ فروخت کرے یا کسی کو ہبہ کرے تو یہ صحیح نہ ہوگا)

۲) ہر وہ مالی تصرف جس کا مفلس کے ذمہ سے تعلق ہو، صحیح ہے۔ مثلاً بطور سلم فروخت کرنا۔

۳) مفلس کے تمام غیر مالی تصرفات صحیح ہیں، مثلاً نکاح، طلاق، خلع، قصاص لینا یا معاف کرنا وغیرہ البتہ عورت پر حجر ہو تو اپنے موجودہ مال کے عوض وہ خلع نہیں لے سکتی، کیونکہ اس سے قرض خواہوں کا حق وابستہ ہے۔

۴) اس کا کسی حق یا مال کا اقرار صحیح ہے، جبکہ اس کا وجوب حجر سے پہلے ہو، لہٰذا موجودہ مال میں دیگر قرض خواہوں کی طرح مُقِرّ لہٗ (جس کے مال کا اقرار لیتا ہے) کا بھی حصہ ہوگا۔

البتہ وہ اقرار جس کا تعلق حجر کے مابعد سے ہو، نظر انداز کیا جائے گا، اور ان قرض خواہوں کو اسے اپنے ساتھ شریک کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ حجر کے اختتام کا انتظام کرے۔

متفرقات

۱) جس کے پاس مال ہی نہ ہو، اس پر قرض کی وجہ سے حجر عائد نہ ہوگا (جمل ۳/۳۰۹)

۲) قاضی کے پاس کسی مقروض کا تنگدست ہونا ثابت ہو جائے، تو اسے آسودگی تک مہلت دی جائے گی، جیسا کہ آیت میں گزر چکا، لہٰذا اسے قید میں ڈالنا، اس کے پیچھے پڑے رہنا اور قرض کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔ (جمل ۔ ۳۲۱)

۳) قاضی ایک مقید اور محبوس شخص کو جمعہ، جماعت، بیوی سے جنسی تعلق اور احباب سے گفتگو وغیرہ سے روک سکتا ہے۔ (جمل۔۳۲۲)

۴) اگر کسی مجور علیہ مفلس کے پاس یا کسی مفلس میت کے ترکہ میں کسی قرض خواہ کی چیز بعینہ موجود ہو، تو وہ درج ذیل شرائط کی صورت میں وہ چیز واپس لے سکتا ہے۔

۱) معاوضہ محضہ کے طور پر وہ چیز اس کے قبضہ میں گئی ہو، یعنی ایسا عقد جو عوض کے فساد کی وجہ سے فاسد ہو، جیسے فروخت کرنا (اجارہ قرض وغیرہ) لہٰذا کسی عورت کو ذمہ میں خلع دے، پھر اس پر مفلسی کی وجہ سے حجر لگے، تو شوہر عورت سے رجوع نہیں کر سکتا۔

۲) حجر کا علم ہوتے ہی اپنی چیز واپس لے، مسئلہ معلوم ہوتے ہوئے تاخیر کرے گا تو یہ حق فوت ہوگا، جسے مسئلہ معلوم نہ ہو، اس کا حق فوت نہ ہوگا" میں نے بیع فسخ کر دیا" جیسے الفاظ سے رجوع کرے۔

۳) اس کے عوض پر قبضہ نہ کر چکا ہو، اگر کچھ عوض لے چکا تو بقیہ کے بالمقابل چیز کو واپس لے سکتا ہے۔

۴) افلاس کی وجہ سے عوض کی تحصیل دشوار ہو، اگر اس کے مقابلہ میں رہن ہو جس سے پوری قیمت کا حصول ممکن ہو، یا کوئی آسودہ ضامن جو ضمان کا اقرار کرتا ہو، موجود ہو تو چیز واپس لینا جائز نہیں۔

۵) عوض قرض (دین) ہو (یعنی ذمہ میں ہو) اگر کوئی معین چیز عوض ہو، تو دیگر قرض خواہوں کے بمقابل اسے مقدم رکھتے ہوئے وہ چیز بطور عوض دی جائے گی۔

۶) قرض (دین) کی ادائیگی کا وقت ہو چکا ہو۔ اگر ابھی ادائیگی کا مقررہ وقت نہ ہوا ہو، تو واپس نہیں لے سکتا۔

۷) کوئی لازم حق اس سے متعلق نہ ہو، اگر متعلق ہو، مثلاً اس نے بطور رہن کسی کے قبضہ میں دیا ہے، تو فی الحال رجوع نہیں کر سکتا۔

اگر فروخت شدہ چیز کی صفت تبدیل ہوجائے، مثلاً انڈے سے چوزہ نکلے، یا بیج پودا بن جائے تو بائع اسی حالت میں واپس لے گا، اس فسخ اور واپسی کے لئے قاضی کی طرف رجوع ہونے کی ضرورت نہیں۔ (اعانۃ الطالبین ۳/۶۷)

اگر مبیع میں متصل اضافہ ہو، جیسے (جانور کا) موٹاپا، تو وہ بھی بائع کو بلا عوض ملے گا، اور جدا اضافہ خریدار کا حق ہوگا، جیسے فروخت کے بعد پیدا ہونے والے پھل یا بچے (السراج ص ۲۲۷)

حدیث: ''کوئی شخص مفلس ہوجائے، اور بائع (فروخت کنندہ) کو اپنی چیز بعینہٖ (اس کے پاس) ملے، تو یہ اس کا دیگر قرض خواہوں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق ہے۔'' (بخاری و مسلم)

مرض الموت کے تصرف

تعریف: اس سے وہ مریض مراد ہے، جس کو ایسا مرض لاحق ہو، جو شدت اختیار کرنے کی صورت میں موت کا سبب بنتا ہو، پھر وہ مرض اس حد تک اس پر طاری رہے کہ طبیب (ڈاکٹر) اور تجربہ کار افراد اس کی موت کا خطرہ محسوس کریں۔

گھمسان کی لڑائی، دریا میں طغیانی اور ہواؤں کے تیز جھکڑ اور طوفان اور زچگی کی سخت تکلیف کے اوقات کا بھی یہی حکم ہے۔

دانت درد وغیرہ جیسی بیماری کا یہ حکم نہیں، خواہ کتنا ہی شدید ہو، کیونکہ یہ عموماً موت کا سبب نہیں بنتی۔

احکام: (۱) اگر اس کا کوئی خاص وارث نہ ہو، یا وارث تو ہو لیکن اسے تصرف کا اختیار نہ ہو جیسے چھوٹا بچہ، تو اس مریض کو اپنے تہائی مال سے زیادہ میں تبرعاً تصرف جائز نہیں (یعنی ایسا تصرف جو بلا عوض ہو جیسے ہبہ، صدقہ و خیرات یا وقف وغیرہ کرنا، اگر خرید و فروخت وغیرہ کرے تو جائز ہے) خواہ یہ تصرف فوراً اور نقد کرے یا موت پر معلق ہو جیسے وصیت۔ اگر ثلث (تہائی) سے زائد میں اس طرح تصرف کرے تو صرف تہائی تک نافذ ہوگا۔ اور زائد میں باطل ہوگا، جبکہ یہ تصرفات یکے بعد دیگرے ہوں، اگر یہ ایک وقت ہوں تو بصورت امکان تمام پر تہائی کو اسی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا، ورنہ مکمل باطل ہوگا۔ (مثلاً زید کو دو ہزار اور عمر کو چار ہزار کی وصیت کی، اور کل مال ۹ ہزار ہو، تو زید کو ایک ہزار اور عمر کو دو ہزار ملے گا)

۲) اگر اس کا کوئی وارث خاص موجود ہو (یعنی رشتہ داروں میں سے کوئی وارث ہو، بیت المال اور عام مسلمان وارث نہ ہوں)، اور وہ وارث جائز التصرف ہو (یعنی بالغ اور رشید ہو)، تو تہائی سے زائد تبرع وارث کی اجازت پر موقوف ہے، اگر اجازت دے تو نافذ، ورنہ باطل ہے۔ اس کی اجازت یا عدمِ اجازت کا اعتبار مورث کے موت کے بعد ہوگا۔

حدیث: حضرت سعدؓ بن ابی وقاص حجۃ الوداع میں سخت بیمار ہوئے تو آپ ﷺ سے دو تہائی مال کے صدقہ کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے انکار فرمایا۔ پھر نصف کی اجازت چاہی تو اس کا بھی انکار فرمایا۔ پھر ایک تہائی کی اجازت دی اور فرمایا ''ایک تہائی بہت ہو، تم اپنے وارثوں کو آسودہ اور مال دار چھوڑ جاؤ یہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ ان کو تنگدست چھوڑ جاؤ کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔'' (بخاری۔ مسلم)

۳) گذشتہ حکم کا ترتب اس وقت ہوگا جبکہ مریض پر اتنا قرض نہ ہو، جو اس کے سارے ترکہ کو گھیرے، اگر اتنا قرض ہو تو تہائی وغیرہ کے قید کے بغیر اس کے مکمل ترکہ پر پابندی عائد ہوگی۔

۴) تبرعات اور واجب تصرفات کے درمیان کچھ فرق ہے، سابقہ تینوں احکام کا اصل تعلق تبرعات سے ہے، واجب تصرفات اگر اپنی

زندگی میں انجام دے، تو اس کا اعتبار کل مال سے ہوگا، اور اگر موت کے بعد انجام دینے کے لئے وصیت کرے، مثلاً قرض کی ادائیگی کی وصیت، یا فرض حج یا زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت، اور یہ وصیت مطلق ہو (یعنی تہائی کی قید نہ لگائے)، تو اس کا تعلق بھی کل مال سے ہوگا۔ اگر اسے تہائی ترکہ کے ساتھ مقید کرے اور اس میں ادا نہ ہونے پائے تو حسبِ ضرورت مزید ترکہ اس میں صرف کیا جائے گا (اگر کل لگانا پڑا تو کل ترکہ لگائیں گے) لیکن تہائی کے ساتھ مقید کرنے کا ایک فائدہ وارثوں کے حق میں یہ ہوگا کہ ساتھ میں تبرعات کی وصیت ہو تو ان واجب تصرفات کی ادائیگی کے بعد اگر تہائی میں سے ابھی کچھ باقی ہو، تو اس میں ان تبرعات کا حسبِ گنجائش نفاذ ہوگا۔ اگر تہائی میں سے کچھ نہ بچے تو تبرعات نافذ نہ ہوں گے۔ (اور واجب تصرفات کو تہائی کے ساتھ مقید نہ کرے، تو اس کی ادائیگی کے بعد بقیہ کی تہائی میں تبرعات کا نفاذ ہوگا)

صُلح

صلح لغت میں نزاع کو ختم کر کے فریقین کے مابین اتفاق پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ اور شریعت میں ایسے عقد کو صلح کہتے ہیں، جس سے اتفاق حاصل ہو، اور اختلاف و نزاع دور ہو۔

مشروعیت: صلح جائز اور مشروع ہے، بلکہ کبھی مستحب ہوتا ہے، قرآن مجید نے اسے خیر سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" (النساء : ۱۲۸) اور یہ اس کے مشروعیت کی دلیل ہے، کیونکہ وہ بات جو خیر ہو مشروع ہے، اور جو شر ہو وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں ممنوع ہے۔

آیت: لَاخَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ ، بَيْنَ النَّاسِ۔ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْراً عَظِيْماً (النساء : ۱۱۴) **ترجمہ:** "عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (یعنی ثواب و برکت) نہیں ہوتی۔ ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ (خیر) خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں اور جو شخص یہ کام کرے گا حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم عطا فرمادیں گے۔"

قرآن مجید کے دیگر دلائل بھی اس کی مشروعیت پر آگے بیان ہوں گے۔ نیز حدیث میں بھی اس کی مشروعیت ثابت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: "مسلمانوں کے مابین صلح جائز ہے، سوائے اس صلح کے جو حرام کو حلال، یا حلال کو حرام قرار دے" (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ)

شریعت کے احکام و خطاب سے عموماً مسلمان مقصود ہوتے ہیں اور وہی شرعی احکام کا صحیح اتباع کرتے ہیں، اسلئے حدیث میں مسلمانوں کا ذکر کیا گیا، ورنہ غیر مسلمین کا بھی یہی حکم ہے۔

ہر دور میں مسلمانوں کا صلح کی مشروعیت پر اجماع رہ چکا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "فریقین کو ان کی حالت پر چھوڑ دو، یہاں تک کہ آپس میں صلح کرلیں، کیونکہ فیصلہ کینہ پیدا کرتا ہے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی، اور کسی نے بھی اس پر انکار و نکیر نہ کی، تو یہ صلح کی مشروعیت پر ان کا اجماع ہوا۔

صلح کی مشروعیت کی حکمت: اسلام وحدت و اخوت اور تعاون و بھائی چارگی کا دین ہے، اس نے تفرق، اختلاف اور اس کے اسباب کو بالکل ختم اور نظر انداز کیا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے" وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا

تَفَرَّقُوْا "(آل عمران : ۱۰۳) ترجمہ: "اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو (یعنی اللہ کے دین کو جس میں اصول وفروع آ گئے) اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو۔"

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ اصحاب حقوق کو حقوق کی ادائیگی کی ترغیب دیتی ہے، کیونکہ اس میں کوتاہی ہی عموماً جھگڑا اور نزاع واختلاف کو بھڑکانے کا باعث بنتا ہے۔

آیت : " وَلَاتَاكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْ فَرِيْقاً مِنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ "(البقرہ ۔ ۱۸۸) ترجمہ: "اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (طور پر) مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعے سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ اور تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔"

ایک اور آیت میں اسے اور ظلماً کسی کے قتل کو ساتھ ساتھ بیان کیا، کیونکہ یہ اکثر قتل کا سبب بن جاتا ہے۔

آیت : "يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْ لَاتَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ . اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْماً (النساء ۲۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (مباح طور پر مثلاً) کوئی تجارت ہو، جو باہمی رضامندی سے ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی سب شرائط شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں۔"

آپ ﷺ بھی آپسی بغض اور نزاع سے ڈراتے ہیں، کیونکہ اس کا انجام قتال وخونریزی ہے، جو لوگوں کو کفر تک لے جا سکتا ہے۔ فرمان ہے: "آپس میں بغض اور حسد اور قطع تعلق نہ رکھو، اور اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کے رہو"۔ نیز ارشاد ہے۔ "میرے بعد کہیں کافر نہ بن جانا کہ بعض بعض کی گردن مارنے لگے۔" (بخاری ۔ مسلم)

اور لوگوں کو ان اسباب پر ابھارا اور برانگیختہ کیا، جو آپسی محبت کو قوت ودوام بخشے اور اختلاف کے اثرات کو یکسر ختم کردے، پس آپ ﷺ کا ارشاد ہے" اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو خرید وفروخت اور قرض کے لین دین میں نرمی (فراخ دلی) سے پیش آئے۔" (بخاری شریف) اور چونکہ لوگوں کے درمیان صلح کرانا، اور آپسی ناچاقی (بگاڑ) اور اختلافات کا ازالہ کرنا، پیش کردہ اسلامی مقاصد کا اہم ترین سبب ہے، اس لئے اسلام نے اس کی ترغیب دی، اسے مشروع قرار دیا اور اسے خیر میں شمار کیا۔ آپ ﷺ نے بغرضِ اصلاح ایسی بات کہنے کا جو کہی نہ گئی تھی، اجازت دی ہے، جب کہ وہ بات نزاع کو ختم کر کے اتفاق کی فضا پیدا کرے، پس ارشاد ہے: "وہ جھوٹا نہیں جو لوگوں میں اصلاح کرے، پس اچھی بات کہے اور نقل فرمائے۔" (بخاری مسلم)

صلح کے اقسام

۱) مسلم اور غیر مسلم حکومت کے درمیان صلح : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ "(الانفال : ۶۱) **ترجمہ :** "اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی (اگر اس میں مصلحت دیکھیں تو) اس طرف جھک جائیے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے۔"

۲) **عادل مسلمانوں اور باغی مسلمانوں کے درمیان صلح:** آیت "وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا" (الحجرات: ۹) **ترجمہ:** "اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کرو۔"

۳) **زوجین (شوہر و بیوی) کے درمیان کچھ نزاع و اختلاف پیدا ہو، تو صلح کرانا:**

آیت: "وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا" (النساء: ۱۲۸) **ترجمہ:** "اور اگر کسی عورت کو (قرائن سے) اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی یا بے راہ روی کا ہو سو (ایسی حالت میں) دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کر لیں۔"

۴) **بغاوت سے ہٹ کر کسی غیر مالی معاملہ میں لڑنے والوں میں صلح:**

حدیث: اہل قباء آپس میں لڑ پڑے حتیٰ کہ آپس میں پتھر بازی کی نوبت آئی، جب آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: "چلو چل کر ان میں صلح کروائیں۔" (بخاری شریف)

۵) **وہ امور جن میں مال کا تعلق و دخل ہو، ان میں صلح:** فقہاء کرام صلح کے باب میں اصل گفتگو اسی پر کرتے ہیں، دیگر اقسام کا تذکرہ ضمناً آتا ہے۔

مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان صلح

اگر مدعی علیہ مدعی کے حق کا اقرار کرتا ہو تو اسے "صلح مع الاقرار" کہیں گے۔ اور اگر حق کا انکار کرتا ہو تو اسے "صلح مع الانکار" کہیں گے۔

صلح مع الانکار: یعنی ایک انسان دوسرے پر کسی حق کا (مثلاً ہزار روپے، یا گھر وغیرہ کا) دعویٰ کرے، اور مدعی علیہ اسے تسلیم نہ کرے، بلکہ انکار کرے یا خاموش رہے، پھر مدعی سے صلح کا مطالبہ کرے، تو شرعاً یہ صلح ناجائز ہے۔ اگر واقع ہوا تو باطل ہے، اور صلح کے آثار و احکام (جن کا عنقریب ذکر آئے گا) میں سے کسی کا ترتب نہ ہوگا، کیونکہ یہ حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرنے والی صلح ہے، جو سابقہ حدیث کی رو سے بالکل ممنوع ہے۔

کیونکہ مدعی اگر اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے، تو گویا اس صلح کے ذریعے دوسرے کا مال اپنے لئے حلال قرار دے رہا ہے، حالانکہ وہ اس کے حق میں حرام ہے۔ اور اگر وہ سچا ہے تو اپنے مال کا ایک جزو اپنے اوپر حرام کر رہا ہے، حالانکہ وہ حلال ہے، کیونکہ مدعی علیہ نے (اپنے جھوٹے انکار کی وجہ سے) اسے اپنا یہ حق چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔

صلح مع الاقرار: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے پر اپنے کسی حق کا دعویٰ کرے، خواہ دعویٰ کسی چیز کے متعلق ہو یا قرض وادھار کے متعلق، اور مدعی علیہ اس حق کا اعتراف و اقرار بھی کرے، لیکن مدعی سے مصالحت کی درخواست کرے، اور دونوں میں کسی بات پر صلح ہو جائے، تو یہ جائز اور صحیح ہے، اور اس پر صلح کے آثار و احکام مرتب ہوں گے، کیونکہ یہ صورت صلح کے جواز اور مشروعیت کے دلائل میں سر فہرست داخل ہے۔ اس کی مختلف صورتیں حسب ذیل ہیں۔

صلح عَن العَین: یعنی کسی چیز کے مقابلہ میں صلح کر لینا، کبھی یہ صلح اسی چیز کے بعض حصے پر ہوگی، اسے صُلْحُ الْحَطِيْطَة کہتے ہیں، (یعنی ایسی صلح جس میں صاحب حق کچھ نزول اختیار کر کے حق سے کم لے لیتا ہے) اور کبھی اس چیز کے عوض کسی دوسری چیز پر یا منفعت پر صلح ہوتی ہے، اسے صُلْحُ الْمُعَاوَضَہ کہتے ہیں (کیونکہ اپنے حق کے معاوضہ و بدلہ میں دوسری چیز لے رہا ہے)

صُلحُ الحَطِیطَة: دعویٰ کسی عَین (شئ) کے حق کا ہو، اور فریقین میں اسی عین کے ایک حصہ پر صلح ہو، مثلاً مکان ہو، پھر اس پر صلح ہو کہ مدعی اس کا نصف لے لے (اور بقیہ نصف مدعیٰ علیہ کو چھوڑ دے)، تو بقیہ نصف صاحبِ حق اور مدعی کی جانب سے مدعیٰ علیہ کے لئے ہبہ قرار پائے گا، اور ہبہ کے سارے احکام اس پر عائد ہوں گے، مثلاً مدعیٰ علیہ کی جانب سے قبول کی شرط وغیرہ (جس کی تفصیل ہبہ میں گذر چکی) اس قسم کی صلح کو صلح الحطیطۃ کہا جاتا ہے، کیونکہ صاحبِ حق نے اپنا کچھ حق معاف کر کے کم لے لیا۔

صلح المعاوضہ: اگر دعویٰ کسی عین اور چیز کا ہو، اور فریقین میں اس پر صلح ہو کہ مدعیٰ علیہ اس کے عین کے بدلہ کوئی اور شئی مدعی کو دے، مثلاً دعوی گھر کا ہے، اور صلح میں یہ طے پایا کہ مدعی کو کار (گاڑی) دی جائے، تو یہ جائز اور صحیح ہے، اور در حقیقت کار کے عوض گھر کی بیع (فروخت) ہے، لہٰذا اس میں بیع کے تمام مسائل نافذ ہوں گے، مثلاً قیمت کا معلوم ہونا، شرعاً نفع بخش مال ہونا وغیرہ، اسی طرح خیار مجلس، خیار شرط اور خیار عیب حاصل ہوگا، اور وہ شرائط جو بیع کو فاسد کرتے ہیں، اس صلح کو بھی فاسد کریں گے اور بیع میں غرر (دھوکہ) وغیرہ جو امور حرام ہیں یہاں بھی حرام ہیں۔

اس صلح کو تمام صورتوں میں صلح المعاوضہ کہا جاتا ہے، کیونکہ صاحب حق اپنے حق کے عوض دوسری شئی پر راضی ہوا، خواہ وہ عین (چیز) ہو یا منفعت۔

اگر صلح کسی دوسرے عین کی منفعت پر ہو، مثلاً گھر کے عوض اس کی گاڑی کو ایک سال تک استعمال کرنے کا حق، تو یہ صلح عقدِ اجارہ ہے، لہٰذا اس میں اجارہ کے احکام جاری ہونگے۔ اور اگر صلح اسی عین کی منفعت پر طے پائے، مثلاً گھر کا دعویٰ ہے، پھر یہ طے پایا کہ مدعی اسی گھر میں دس سال رہے پھر مدعیٰ علیہ کو لوٹا دے، تو یہ اعارہ ہے، اور اس میں اعارہ کے احکام ثابت ہوں گے۔

۲) **صلح عَین الدَّین** (یعنی قرض اور ادھار کے مقابلہ میں صلح): مثلاً کوئی شخص دوسرے پر ہزار روپے کے قرض کا دعویٰ کرے اور مدعیٰ علیہ اسے تسلیم کرے، پھر فریقین صلح کرلیں، اگر صلح قرض ہی کے ایک حصہ پر ہو تو یہ صلح الحطیطہ ہے، اور کسی عین یا منفعت پر ہو تو صلح معاوضہ ہے۔

(أ) صلح الحطیطة: مثلاً ہزار روپے کا دعویٰ کرے اور مقروض اسے تسلیم بھی کرے، پھر اس میں سے پانچ سو روپے گھٹا کر بقیہ پانچ سو پر صلح ہو جائے، تو یہ صلح صحیح ہے، اور گویا بقیہ قرض سے اسے بری کر دیا، (بقیہ قرض معاف کر دیا)

حدیث: حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ کے دورِ مسعود میں حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے مسجد میں اپنے قرض کا مطالبہ کیا، جس میں دونوں کی آواز بلند ہوئی اور آپ ﷺ نے اپنے حجرۂ مبارکہ میں سے سنا، تو آپ ﷺ تشریف لائے، یہاں تک کہ اپنے حجرہ کا پردہ ہٹایا، پھر کعب بن مالک کو آواز دے کر اشارہ فرمایا۔ ''نصف قرض معاف کردو'' انہوں نے اسے تسلیم کرلیا، تو آپ ﷺ نے (حضرت عبداللہؓ سے) فرمایا: ''اب تم بقیہ ادا کردو'' (متفق علیہ)

یہ صلح، صلح ابراء (بری کرنا)، کم کرنا اور اسقاط (ساقط کرنا) وغیرہ الفاظ سے صحیح ہے۔

اگر ابراء (بری کرنا اور معاف کرنا) جیسے الفاظ استعمال ہوں تو مقروض کا قبول کرنا شرط نہیں ہے، ابراء کے شرائط ضروری ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱) ابراء کرنے والا اس مال میں اہل تبرع میں سے ہو (یعنی بلا عوض مال دینے کی اہلیت ہو) لہٰذا ولی بچہ کی جانب سے ابراء نہیں کرسکتا، کیونکہ اسے بچے کے مال میں تبرع کا حق نہیں ہے۔

۲) ابراء کی مقدار سے واقف ہو، پس اگر یوں کہا: میں نے قرض کے ایک حصہ سے تم کو بری کردیا تو یہ صحیح نہیں۔ اسی طرح اگر یہ کہا: میں نے رُبع (چوتھائی، پاؤ) مقدار معاف کردی، حالانکہ اسے کل مقدار کا علم نہیں ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے۔

۳) ابراء دَین اور قرض سے ہو، اگر صلح عین ہو تو ابراء کے لفظ سے درست نہ ہوگا۔

۴) نہ کسی شرط پر معلق ہو، اور نہ کسی مدت کے ساتھ مقید ہو۔

اور صلح کا لفظ استعمال کرے تو مقروض کا قبول کرنا شرط ہے۔

اگر مقروض بقیہ دین (قرض) ادا نہ کرے: صاحب حق مقروض سے قرض کا ایک حصہ معاف کردے، تاکہ وہ بقیہ قرض ادا کردے، لیکن مقروض بقیہ بھی ادا نہ کرے، تو اس پر دوبارہ مکمل قرض واجب نہ ہوگا، بلکہ صرف بقیہ ہی واجب ہوگا، اور اسی کا قرض خواہ مطالبہ کرے گا، کیونکہ فقہی قاعدہ ہے کہ جس حق کو آپ نے ساقط کردیا، وہ پھر نہ لوٹے گا (دوبارہ واجب نہ ہوگا) لہٰذا جن کا بھی کسی پر حق ہو، وہ اس سلسلہ میں محتاط اور چوکنا رہیں، اور مقروض سے ابراء، اسقاط یا معاف کردیا (یا حق چھوڑ دیا) وغیرہ الفاظ استعمال نہ کریں، ورنہ قرض ساقط ہوجائے گا، پھر مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، خواہ مقروض نے اس معافی کو قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو، اور یہ الفاظ غصہ کی حالت میں سرزد ہوں یا خوشی اور مسرت کے جوش میں، جیسا کہ کبھی بیوی شوہر پر اس کے کسی حق کو معاف کردیتی ہے۔

ب) دین میں صلح معاوضہ: یعنی کسی پر دَین (قرض) کا دعویٰ کرے، مثلاً ہزار روپے مدعیٰ علیہ بھی اس کا اقرار کرے، پھر اس دین کی طرف سے کسی دوسری شئی پر مصلحت کرلے۔ مثلاً گھڑی پر، تو یہ معاوضہ اور بیع ہے، بیع کے احکام نافذ ہوں گے، اور اگر کسی شئی کے منفعت پر مصالحت ہو، مثلاً مقروض اسے ایک سال کیلئے اپنا مکان رہائش کے لئے دے دے، تو یہ اجارہ ہے، اور اجارہ کے احکام جاری ہوں گے۔

مُدَّعِیٰ اور کسی اجنبی شخص کے درمیان صلح

اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر اپنے کسی حق کا دعویٰ کرے، پھر مدعیٰ علیہ کے علاوہ کوئی تیسرا شخص درمیان میں آکر مدعی سے اس حق کے سلسلہ میں صلح کرلے۔ مُدَّعیٰ علیہ کی حالت اور اس اجنبی کے موقف اور منشا کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱) وہ اجنبی شخص مدعیٰ علیہ کی جانب سے وکیل ہونے کا دعویٰ کرے، مثلاً کہے: مدعیٰ علیہ نے مجھے تم سے صلح کرنے کیلئے وکیل بنایا ہے، اور وہ تمہارے دعوے کا اقرار کررہا ہے، اور مدعیٰ علیہ اس کے بعد اس وکالت کا انکار نہ کرے، اور اجنبی نے صلح کرلی، تو یہ صلح صحیح ہے، اور مدعی نے جس حق کا دعویٰ کیا تھا وہ مدعیٰ علیہ (مؤکل) کی ملکیت ہوگی، اور اگر مدعیٰ علیہ وکالت کا انکار کرے تو صلح باطل ہے۔

۲) اجنبی اپنے لئے صلح کرے، مثلاً کہے: آپ نے فلاں پر جس حق کا دعویٰ کیا ہے، وہ اس کا اقرار کررہا ہے، اور میں اس کی طرف سے فلاں کے عوض آپ سے صلح کرتا ہوں، اور وکالت کا دعویٰ نہ کرے، تو یہ باطل ہے۔

۳) مدعیٰ علیہ حق کا انکار کرے، اور اجنبی کہے: وہ اس انکار میں جھوٹا اور غلط ہے، اور اس حق کی طرف سے اپنے لئے صلح کرلے، تو یہ کسی مغصوب شئی کا غاصب کے علاوہ کسی اور کو فروخت کرنے کی طرح ہے، لہٰذا اگر وہ اجنبی مدعیٰ علیہ کے پاس سے وہ حق حاصل کرنے پر قادر ہے تو صلح صحیح ہے، ورنہ صحیح نہیں۔

۴) مدعیٰ علیہ حق کا انکار کرے، اور اجنبی اس کے انکار کے باطل وغلط ہونے کا اقرار نہ کرے، اور اس حق کے متعلق اپنے لئے صلح کرے، تو یہ صلح باطل ہے۔

صلح کے ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) مُصالَح عنہ (جس حق کی طرف سے صلح ہو) (۴) مُصالَح علیہ (صلح میں جو طے پائے)

۱) **عاقدین** : یعنی مدعی اور مدعیٰ علیہ، ان دونوں کے شرائط یہ ہیں:

۱- دونوں مکلّف یعنی عاقل بالغ ہوں، پس نابالغ اور پاگل کی صلح صحیح نہیں ہے۔

۲- مال میں تصرف کی ولایت ہو، جبکہ کسی نابالغ کی طرف سے صلح ہو، جیسے باپ، دادا، وصی، کیونکہ صلح ایک مالی تصرف ہے، اور بچوں کے مال میں ان کے علاوہ دوسروں کو تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

۳- اگر صلح بچہ کی طرف سے ولی کرے، تو اس میں ظاہری اور واضح نقصان نہ ہو، خواہ وہ مدعی ہو یا مدعیٰ علیہ

۲) **صیغہ** : یعنی فریقین کا ایجاب وقبول، مثلاً مدعیٰ علیہ کہے: میں نے تم سے فلاں حق کے عوض فلاں چیز پر مصالحت کرلی یا تمہارے فلاں دعویٰ کے مقابلہ میں فلاں پر مصالحت کرلی اور مدعی کہے: میں نے قبول کرلیا، یا میں راضی ہوں، یا میں نے مصالحت کرلی وغیرہ جو اس صلح سے اس کی رضامندی پر دلالت کرے۔

۳) **مُصالَح عنہ** : یعنی وہ حق جس کا مدعی دعویٰ کررہا ہے، اور جس کے بدلہ کسی اور چیز پر مصالحت کا مطالبہ ہو، اس کے شرائط یہ ہیں:

۱- کسی آدمی کا حق ہو، مال ہو یا غیر مال جیسے قصاص کا حق، کیونکہ اس کے عوض صلح صحیح ہے، پس کوئی شخص کسی پر قصاص کا مستحق ہو، پھر اس سے قصاص کے بدلہ کسی مال پر مصالحت ہو، تو جائز ہے، خواہ کوئی متعین شیٔ ہو (جیسے گھر) یا غیر متعین (جیسے ہزار دینار)، غیر متعین (دین) ہو تو مجلسِ صلح ہی میں قبضہ شرط ہے تاکہ دین کے عوض دین نہ ہو (جو ممنوع ہے)

قصاص نفس اور جان میں ہو یا صرف زخم اور اعضاء میں، اس کی طرف سے مصالحت صحیح ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رُبَیِّع بنت النضر نے ایک عورت کا دانت توڑ دیا، ان کے مطالبہ پر آپ ﷺ نے قصاص کا حکم دیا، لیکن آخر میں دونوں قصاص سے درگذر کرتے ہوئے تاوان (مال) پر راضی ہوئے (متفق علیہ)

اگر مصالح عنہ حق آدمی کا نہ ہو، بلکہ اللہ کا ہو، جیسے کسی زانی سے صلح کرکے مال وصول کرے تاکہ قاضی کو اطلاع کرکے اس پر سزا کا نفاذ نہ ہو، تو یہ صلح صحیح نہیں ہے۔

حدیث : ایک نوکر نے اپنے مالک کی بیوی سے زنا کرلیا، تو لوگوں نے اس نوکر کے والد کو بتایا کہ تمہارے بیٹے کو سنگسار کیا جائے گا، تو انہوں نے مالک سے سو ۱۰۰ بکریوں اور ایک باندی کے عوض بیٹے کو بچالیا پھر آپ ﷺ کی خدمت میں یہ قضیہ پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا "باندی اور بکریاں تم کو واپس ہوں گی، اور تمہارے بیٹے کو سو کوڑے اور یک سالہ جلاوطنی کی سزا ملے گی........." (بخاری ومسلم۔ مختصراً)

پس آپ ﷺ کا باندی اور بکری کو لوٹانے کا فیصلہ حق اللہ کے سلسلہ میں ہونے والے اس صلح کے باطل ہونے پر واضح دلیل ہے۔

دیگر وہ حدود جن میں اللہ کے حق کا پہلو غالب ہے، جیسے چوری کی حد، حدِ قذف، انہیں بھی حدِ زنا پر قیاس کریں گے، گرچہ ان

دونوں میں بندہ کا حق بھی ہے، لیکن حق اللہ غالب ہے، لہٰذا اسی پر فیصلہ ہوگا۔
کسی شخص سے صلح کرلے تاکہ وہ اس کے خلاف گواہی نہ دے، تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ شہادت اللہ کا حق ہے۔ فرمان باری ہے "وَاَقِيْمُوْا الشَّهَادَةَ لِلّٰہِ" (الطلاق : ۲) (اور تم ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے گواہی دو)
پس ان حقوق کے عوض صلح باطل ہے، اور جس نے اس طرح مال حاصل کیا ہوا سے لوٹانا واجب ہے، کیونکہ یہ ناحق اور ناپاک کمائی ہے، اگر قاضی کو معلوم ہو تو یہ ایسا فسق (گناہ) ہے کہ اس شخص کی گواہی قبول نہ ہوگی۔
۲۔مُصَالِح کا حق ہو، ورنہ صلح صحیح نہیں ہے، البتہ اپنے ماتحت (بچہ وغیرہ) کی طرف سے ہو تو صحیح ہے، جیسا کہ گذر چکا۔ لہٰذا کوئی مطلقہ عورت اپنے بچہ کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ یہ طلاق دینے والے سابقہ شوہر کا بیٹا ہے، اور وہ شوہر انکار کرے، پھر عورت بچہ کے نسب کے متعلق کسی چیز پر صلح کرلے تو یہ باطل ہے، کیونکہ نسب بچہ کا حق ہے، نہ کہ اس کی ماں کا۔
۳۔محل صلح یعنی عقدِ صلح کا جس چیز سے تعلق ہو، اس میں مصالح کا حق ثابت ہو، لہٰذا شفیع اپنے حق شفعہ کے عوض کچھ مال لے کر صلح کرلے تاکہ شریک کسی اور کو فروخت کردے، تو یہ صلح باطل ہے، کیونکہ شریک کے فروخت ہونے والے حصہ میں (محلِ صلح میں) اس شریک (شفیع) کا کوئی حق نہیں کہ اس کی طرف سے یہ صلح کرلے، اسے شریعت نے صرف اتنا حق دیا ہے کہ چاہے تو وہ حصہ یہ خرید سکتا ہے، اسے نہیں خریدنا تو اس کا حق ساقط ہوگیا، اس کے عوض مال لینا جائز نہیں ہے۔
۴۔معلوم ہو، اگر مصالح عنہ دونوں یا کسی ایک کو نامعلوم اور مجہول، تو صلح باطل ہے۔

۴) **چوتھا رکن ہے مُصَالَح علیه :** یعنی وہ بدل اور عوض جو اپنے دعویٰ شدہ حق کے مقابلہ میں مُدَّعی مُدَّعیٰ علیہ سے وصول کرتا ہے۔ اس کے شرائط یہ ہیں:
۱۔شرعی مال ہو، اگر شراب، سور، یا آلات لہو وغیرہ ہو تو صلح صحیح نہیں۔ مصالح علیہ کوئی عین مثلاً گھر، گھڑی، گاڑی وغیرہ یا دَین مثلاً ہزار روپے یا منفعت مثلاً مکان میں یک سالہ رہائش وغیرہ ہوسکتی ہے۔
۲۔مُصَالِح کی ملکیت ہو، صلح کے بعد پتہ چلا کہ وہ مال اُس کی ملکیت نہیں، مثلاً چوری یا غصب وغیرہ کا ہے، تو صلح باطل ہے، گرچہ دوسرا فریق اُس پر قبضہ کرچکا ہو۔
۳۔مُصَالَح علیہ عاقدین کو معلوم ہو، کیونکہ بدل کی جہالت اور ناواقفیت نزاع کا سبب بنے گی۔

حقوق مشترکه میں تَزَاحُم (تنگی اور ٹکراؤ)

۱) **پرناله اور ساباط بنانا :** (ساباط یعنی دو گھروں یا دیواروں کے درمیان راستہ کے اوپر چھت) یہ اشیاء یا تو جاری اور عام مستعمل راستہ کی طرف بنائی جائے گی، یا غیر مستعمل راستہ کی طرف، جس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

أ۔ ان اشیاء کا طریق نافذ (عام مستعمل راسته) کی طرف بنانا : طریقِ نافذ یعنی جس راستے میں ہر کسی کو چلنے اور گذرنے کا حق ہو، کسی کی تخصیص نہ ہو، ایسے راستے میں کوئی ایسا تصرف کرنا جو راہ گیروں کے لئے تکلیف دہ و پریشان کن ہو، جائز نہیں، مثلاً گھر کے باہر راستے کی طرف لکڑ اوغیرہ نکالنا، ساباط بنانا، پرنالہ بنانا وغیرہ، کیونکہ راستہ پر صرف اس کا حق نہیں، بلکہ عام راہ گیروں کا حق ہے، اگر کسی نے اس طرح ممنوع چیز بنائی تو اس کا ازالہ واجب ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ضرر سے منع فرمایا ہے۔ (ابن

ماجہ ، مؤطا امام مالک)

لیکن ازالہ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، تاکہ کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو، البتہ ہر کسی کو اسکے ازالہ کے مطالبہ کی اجازت ہے۔ اگر مذکورہ اشیاء راہ گیروں کے لئے ضرر رساں نہ ہوں، اور راستہ پیدل ہو، تو ان اشیاء کا اتنا اونچا ہونا ضروری ہے کہ ایک لمبا آدمی اپنے سر یا پشت پر کچھ لاد کر چلے تو اسے اس سے کوئی تکلیف نہ ہو، نیز اس کی وجہ سے اس جگہ زیادہ تاریکی نہ چھا جائے۔

اگر اس راہ سے سوار اور گاڑیاں بھی گذرتی ہوں تو اسی مناسبت سے اونچائی شرط ہے۔

حدیث : آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر میں ایک پرنالہ لگایا، جو کہ مسجد نبوی کے راستہ میں تھا۔" (اخرجه احمد والبیهقی والحاکم کما فی نیل الاوطار)

ان اشیاء پر صلح حرام ہے، حاکم کی طرف سے ہو یا کسی دوسرے کی طرف سے۔

ب- ان اشیاء کا غیر نافذ طریق (راستہ) میں بنانا: غیر نافذ راستہ کسی ایک کا ہے تو یہ اس کی ملکیت ہے، اور بعض لوگوں میں مشترک ہے، تو بقیہ شرکاء کی اجازت کے بغیر مذکورہ اشیاء کا بنانا جائز نہیں اور اس پر صلح صحیح نہیں ہے۔

۲) راستہ میں چبوترہ بنانا یا درخت بونا: راستہ میں چبوترہ، یا دیوار کے لئے ستون بنانا یا درخت لگانا حرام ہے، اگر چہ راستہ کشادہ ہو اور گذرنے والوں کو اس سے تکلیف نہ ہو اور حاکم نے اجازت دی ہو، کیونکہ کبھی راہ گیروں کی بھیڑ وغیرہ کی وجہ سے ٹھوکر لگنے اور تنگی کا امکان ہے، نیز زیادہ مدت بیتنے پر ان کی جگہ ذاتی ملکیت سمجھی جائے گی اور عوام کے گذرنے کا حق ختم ہو جائے گا، لہٰذا ان امور کے لئے صلح کی گنجائش نہیں، البتہ کوئی اپنے نفع کے بجائے عام مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر درخت لگائے اور اس سے کوئی ضرر نہ ہو تو اس میں حرج نہیں۔

۳) دوسرے کی دیوار پر لکڑا لگانا: اپنے گھر سے متصل یا پڑوس کی دیوار جو دوسرے کی ملکیت ہو، اس کی اجازت کے بغیر اس پر لکڑا رکھنا یا گاڑنا وغیرہ جائز نہیں، اور وہ منع کرے تو اس پر جبر (زبردستی) کرنا جائز نہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "کسی شخص کو اپنے بھائی کا صرف وہی مال حلال ہے، جو وہ بطیبِ خاطر (برضا و رغبت) دے" (مسند احمد)

اگر مالک بلاعوض لکڑا رکھنے کی اجازت دے تو یہ عاریت ہے، اس میں عاریت کے احکام ثابت ہوں گے، پس اس اجازت سے ایک ہی مرتبہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، لہٰذا اگر لکڑا ہٹا دے، یا گر جائے یا دیوار گر جائے اور مالک اسے دوبارہ بنائے، تو دوبارہ (نئی اجازت کے بغیر) لکڑا نہیں رکھ سکتا۔

اگر مالک عوض لے کر لکڑا رکھنے یا اس پر تعمیر کی اجازت دے، اور دیوار کے سرے کو بطور کرایہ دے، تو یہ اجارہ ہے، اور اگر یہ کہے: میں نے تعمیر کے لئے فروخت کر دیا، یا: اسے اس پر تعمیر کا حق فروخت کر دیا تو یہ ایک ایسا عقد ہے، جس میں بیع اور اجارہ دونوں کا شائبہ ہے۔

صلح کے مُبْطِلات (باطل کرنے والے امور)

۱- اقالہ : صلح کے بعد فریقین میں سے ایک دوسرے سے کہے: اس صلح سے اقالہ کیجئے، یعنی میں اس صلح کو فسخ کرنا چاہتا ہوں، اور دوسرا اسے تسلیم کرلے تو صلح فسخ (ختم) ہو جائے گی۔

لیکن قصاص پر صلح ہوئی تھی اور اسے فسخ کرے تو یہ فسخ نہ ہوگا، بلکہ اب مدعی قاتل سے دیت وصول کرے گا۔

۲- خیار عیب کی وجہ سے صلح کو رد کرنا: جس چیز پر صلح ہو، اس پر قبضہ کے بعد اس میں کوئی ایسا عیب نظر آئے جو عرفاً قیمت کی کمی کا باعث ہو، (جس کی تفصیل بیع میں گذر چکی) تو اسے لوٹانے کی اجازت ہے، اور لوٹانے کی صورت میں صلح باطل ہو جائے گی۔

باطل ہونے کے بعد صلح کا حکم

عقد صلح باطل ہو تو مدعی اپنے اصل دعویٰ کی طرف رجوع کرے گا، جبکہ صلح عن الانکار ہو، اور مسئلہ بیان ہو چکا کہ صلح مع الانکار اصلاً باطل ہے۔

اگر صلح مع الاقرار ہو، تو مدعی نے جس چیز کا دعویٰ کیا تھا، مدعیٰ علیہ سے وہی وصول کرے گا، نہ کہ کچھ اور، کیونکہ بطلان کی وجہ سے گویا صلح ہوئی ہی نہیں، اور پھر پہلی بات لوٹ آئے گی۔

مشترک منافع کے احکام

سڑک کی اصل منفعت، اس پر چلنا ہے، نیز راہ گیروں (گذرنے والوں) کو کوئی حرج اور تکلیف نہ ہو، تو کسی پیشے کے لئے، یا بطور استراحت یا ساتھی کے انتظار میں بیٹھنا یا رکنا بھی منفعت میں داخل ہے۔ (یعنی اس صورت میں یہ امور بھی جائز ہیں) کیونکہ ہمیشہ بلا انکار لوگوں کا اسی پر عمل چلا آ رہا ہے۔

پیشے اور تجارت کیلئے بیٹھنے والا شخص اسباب رکھنے کے لئے چارپائی وغیرہ بچھا سکتا ہے۔ (ہاتھ گاڑی کا بھی یہی حکم ہوگا)، اسی طرح عارضی طور پر سایہ کا نظم بھی کر سکتا ہے، جبکہ راہ گیروں کو حرج نہ ہو، مستقل چبوترہ وغیرہ تعمیر کرنا جائز نہیں جو شخص کسی پیشہ کے لئے کسی جگہ بیٹھے تو اس کی اور اس کے اسباب کی جگہ اس کے ساتھ خاص ہوگی، دوسرا کوئی اس پر تنگی نہیں ڈال سکتا، جو اسکے ناپ تول اور لین دین وغیرہ میں حرج ڈالے۔ اس کے حرج کے بغیر اسی پیشہ والے کو اس کے قرب و جوار میں بیٹھنا جائز ہے، پہلا شخص اسے روک نہیں سکتا، پاس کھڑے ہونے والے کی وجہ سے خریدنے والوں کو قریب آنے یا اسباب نظر آنے میں رکاوٹ ہو رہی ہو تو اسے وہاں سے ہٹا سکتا ہے۔

خرید و فروخت کے لئے اس طرح بیٹھنے والے پیشہ وروں کے پاس سے امام (حکومت) معاوضہ نہیں لے سکتا۔

جو شخص پہلے کسی جگہ اپنی دوکان لگالے، اس نشست گاہ (بیٹھک) میں اس کا حق مقدم ہوگا، ابوداود کی سابقہ حدیث کی رو سے، اگر دو اشخاص بیک وقت آ جائیں تو قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا۔

جو شخص کسی جگہ پیشہ شروع کر دے، پھر واپسی کے ارادہ سے وہاں سے جائے، (جیسے عموماً دوپہر کھانے کے لئے یا شام کاروبار بند کر کے جاتے ہیں، اور جانے کے بعد درمیان میں اتنی مدت نہ گذرے کہ اس جگہ سے اس کی مانوسیت اور تعلق منقطع ہو جائے (یعنی اس کے ساتھ لین دین کرنے والوں کا سلسلہ منقطع ہو جائے، اور دوسروں سے جڑ جائے) تو اس جگہ میں اس کا حق باقی رہے گا، لہٰذا اس بات سے واقف کسی دوسرے شخص کے لئے اس کے علم اور رضامندی کے گمان کے بغیر وہاں بیٹھنا (کاروبار کرنا) حرام ہے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں ہے: "جو شخص اپنی مجلس (نشست گاہ) سے اٹھ کر جائے، پھر وہیں لوٹ آئے، تو وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے۔"

نیز اس جگہ کی تعیین کا مقصد یہ ہے کہ وہاں اس کی جان پہچان رہے، تاکہ لوگ اس سے معاملہ کریں۔

اگر واپسی کا ارادہ نہ ہو، بلکہ پیشہ چھوڑ دے، یا جگہ تبدیل کرنے کے ارادہ سے جائے، یا واپسی کا تو ارادہ ہو، لیکن طویل مدت گذر جائے، کہ اب بظاہر اس کا وہاں سے تعلق ختم ہو چکا، تو ان صورتوں میں اس کے اعراض کی وجہ سے حق باطل ہوگا، خواہ اس جگہ اپنا کچھ اسباب چھوڑ گیا ہو، یا امام نے وہ جگہ اس کے سپرد کی تھی، یا سفر یا مرض جیسے اعذار کی وجہ سے گیا ہو، (تب بھی اس کا حق ختم ہوگا)

اگر کوئی لوٹنے یا نہ لوٹنے کے ارادہ کے بغیر جائے تو بظاہر اس کا حکم بھی لوٹنے کے ارادے کی طرح ہی ہے۔ اگر کوئی صرف آرام کرنے کے لئے، یا کسی دوست وغیرہ کے انتظار میں، یا بھیک مانگنے کے لئے بیٹھے، یا پھیری والا ہو کہ آج یہاں اور کل وہاں چکر لگا تا رہتا ہے، تو ان صورتوں میں اس کے وہاں سے چلے جانے سے اس کا حق ختم ہوگا،

جن صورتوں میں حق باقی رہتا ہے، صاحبِ حق کی غیر موجودگی میں دوسرا وہاں بیٹھ سکتا ہے خواہ تجارت کے لئے کیوں نہ ہو۔

راستہ پر مجلس: گفتگو وغیرہ کے لئے راستہ پر بیٹھنا مکروہ ہے، جبکہ راستہ کا حق ادا نہ کرے، یعنی نگاہ پست رکھنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، سلام کا جواب دینا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنا وغیرہ۔

مسافر خانہ: کوئی شخص کسی موقوفہ مسافر خانہ یا خانقاہ وغیرہ میں کسی جگہ جا کر ٹھہرے، اور اس میں وہاں ٹھہرنے کے شرائط موجود ہوں، پھر کسی حاجت کے لئے باہر جائے مثلاً کھانا خریدنا، تو اس کا حق باقی ہے، خواہ اس جگہ اپنا سامان چھوڑ کر نہ جائے، یا امام نے اسے اجازت نہ دی ہو۔ اگر بلا حاجت نکل کر جائے، یا زیادہ دیر کے لئے غائب رہے، (اگرچہ حاجت کے لئے ہو)، تو اس کا حق باطل ہوگا۔

(مساجد کے متعلق مسائل وقف کے آخر میں بیان ہو چکے)

زمین سے حاصل مشترکہ اَعیان (اشیاء) کا حکم

مَعْدِن (کان): معدن سے نکلنے والی اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔

۱) **ظاھر:** جو بلا کوشش اور محنت کے نکلے، البتہ اس کی تحصیل میں محنت کی ضرورت ہو، جیسے گندھک، تارکول، چکی کے پتھر، چونے کا پتھر، یاقوت، سرمہ کا پتھر، نمک (جبکہ کھودنے اور مشقت اٹھانے کی ضرورت نہ ہو)

۲) **باطن:** جو بلا کوشش اور محنت کے نہ نکلے، جیسے سونا، چاندی، لوہا، تانبہ وغیرہ۔ احیاء کرنے والے کو احیاء سے قبل ہی ظاہری معدن کا علم ہو، تو احیاء کی وجہ سے وہ اس کا مالک نہیں بنے گا، اس پر سلف وخلف کا اتفاق ہے، نیز تَحَجُّر (گھیر کر دوسروں کو منع کرنے)، یا بادشاہ کے کسی کے سپرد کرنے (اور بطور جاگیر دینے) سے اسے اختصاص (خصوصی حق) حاصل نہ ہوگا، کیونکہ یہ اشیاء بہنے والے پانی، ایندھن اور چارہ کی طرح تمام مسلم وغیرہ مسلموں میں مشترک ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ نمک کی کان ایک شخص کے سپرد کی، تو دوسرے نے کہا کہ اس سے پانی کی طرح مستقل نمک حاصل ہوتا ہے، تو آپ ﷺ نے اس اجازت کو منسوخ کر دیا۔ (رواہ اصحاب السنن الاربعہ و صححہ ابن حبان) (مغنی ۲/۳۷۲)

تالاب وغیرہ کی مچھلیاں، بری وبحری شکار اور جواہرات، جنگلات کے درخت اور پھل ظاہری معدن میں شمار ہیں، لہٰذا ان اشیاء میں تحجر، اختصاص، بادشاہ کی طرف سے کسی مخصوص آدمی کے سپرد کرنا (خواہ عارضی طور پر ہو)، اور ان اشیاء کو حاصل کرنے والوں سے معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔

باطنی معدن کو صرف کھودنے سے مالک نہ بنے گا، بلکہ اسے نکالنے کے بعد اس پر استیلاء اور تسلط ہو جائے، تو مالک بنے گا۔

جو کسی موات کا احیاء کرے، (اور اسے اس جگہ میں کسی ظاہری یا باطنی معدن کی موجودگی کا علم نہیں تھا)، بعد میں اس جگہ ظاہری یا باطنی معدن ظاہر ہو تو یہ اس کا مالک بن جائے گا، کیونکہ یہ زمین کے اجزاء میں داخل ہے، اور یہ شخص احیاء کی وجہ سے (نیچے ساتوں زمین تک) اس حصہ کا مالک بن چکا۔ اگر اسے پہلے سے ظاہری یا باطنی معدنی کا علم ہو، تو احیاء کی وجہ سے نہ اس معدنی کا مالک ہوگا، اور نہ ہی اس جگہ کا، کیونکہ اس کا قصد فاسد ہے، اس لئے کہ معدن کو مکان، باغ یا کھیتی باڑی وغیرہ بنانے کا کوئی سوال نہیں۔

پانی: نہر، وادی وندی جیسے مباح پانی میں تمام لوگوں کا یکساں حق ہے، ہر ایک جتنا چاہے لے سکتا ہے، تحجر یا امام کے کسی کو دینے کی وجہ سے کوئی اسکا مالک نہ بنے گا، اسی طرح نہر کے کناروں کا بھی حکم ہے، نہ امام اسے فروخت کر سکتا ہے، نہ کسی کو دے سکتا ہے۔

حدیث: ''تین چیزوں میں تمام لوگ شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ'' (رواہ ابن ماجہ باسناد جید)

بعض لوگ مذکورہ مباح پانی سے اپنی زمین سیراب کرنا چاہیں، اور پانی تمام کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو، اور ان میں سے بعض نے پہلے اپنی زمین کا احیاء کیا ہے، تو جس نے پہلے احیاء کیا، اس کا حق مقدم ہوگا، خواہ پانی سے اس کی جگہ دوسرے کے مقابلہ میں دور ہو، پانی کے مقدار کے متعلق کھیتی، زمین اور وقت کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا، (اس سے زیادہ روکنے کا حق نہ ہوگا، بلکہ دوسرے کے لئے چھوڑ دے)، نشیب وفراز ہو تو ہر حصے کو جدا جدا سیراب کرے۔ اگر تمام نے بیک وقت احیاء کیا، یا ترتیب کا علم نہ ہو، تو جو نہر سے قریب ہوگا، وہ مقدم ہوگا۔

اگر پانی تمام کو کافی ہو، تو جو جب چاہے سیراب کرے۔

مباح پانی کو کوئی شخص اپنے کسی برتن میں یا حوض وغیرہ میں جمع کرے، تو وہ اس پانی کا مالک بن چکا، اگر اس پانی کو پھر اپنی جگہ لوٹا دیا، تو دوبارہ وہ مباح ہو جائے گا۔ اگر کوئی ایندھن اور گھاس پھوس کاٹ کر اپنے قبضہ میں لے، (یا شکار کرے) تو وہ اس کا مالک بن جائے گا۔

کسی نے نہر کھودی تاکہ (وادی کا پانی) اس میں آئے، تو یہ پانی مباح ہی رہے گا، گرچہ نہر کا مالک اس کا زیادہ مستحق ہوگا، البتہ عرف کی روشنی میں دوسروں کو اسے پینا، جانوروں کو پلانا اور استعمال کرنا جائز ہے۔ لیکن وہ نہر کو تملک کی نیت سے بند کر دے، تو وہ مالک ہو جائے گا، گرچہ پانی زیادہ ہو۔

اگر (بارش وغیرہ کا) پانی بہہ کر کسی کی زمین میں پہنچے تو، اس سے وہ مالک نہ بنے گا، لہٰذا کسی دوسرے نے لے لیا، تو وہ مالک ہوگا، گرچہ اجازت کے بغیر دوسرے کی ملکیت میں داخلہ حرام ہے (مغنی ۲/۳۷۴)

کنواں: کسی افتادہ زمین (موات) میں کسی نے انتفاع کیلئے کنواں کھودا، تو اس جگہ سے کوچ کرنے تک اس کے پانی میں اس کا حق مقدم ہے، اگر اس سے اعراض کرے، یا راہ گیروں کے انتفاع کے لئے کھودے یا کسی مخصوص قصد کے بغیر کھودے، تو ان صورتوں میں دیگر لوگوں کو بھی مساوی حق حاصل ہوگا۔ راہ گیروں کے قصد سے کھودے، یا موات میں مسجد بنائے، یا عام قبرستان کے قصد سے احیاء کرے، تو وقف کے الفاظ کے بغیر بھی یہ حکم ثابت ہوگا۔

افتادہ زمین میں کنواں کھودنے کے بعد اسے پاٹ دینا ممنوع ہے، خواہ اپنی ذات کے لئے کھودا ہو، کیونکہ لوگوں کا حق اب سے متعلق ہو چکا، جسے اب یہ باطل نہیں کر سکتا۔

کسی نے اُفتادہ زمین میں مالک بننے کے قصد سے کنواں کھودا، یا اپنی ملکیت میں کنواں کھودا، تو یہ اس پانی کا مالک ہے، کیونکہ یہ اس کی ملکیت کی پیداوار ہے، جیسے پھل و دودھ ملکیت کے باوجود اپنے اور مویشیوں اور کھیتی باڑی کے لئے درکار پانی سے زائد پانی میں صحیحین کی

حدیث کی وجہ سے دیگر مویشیوں کے لئے استعمال کی اجازت دینا ضروری ہے، جبکہ ان کے مالک کو مباح پانی نہ ملے، اور قریب میں مباح گھاس ہو، جسے وہ مویشی چرتے ہوں اور زائد پانی کو مالک نے اپنے برتن وغیرہ میں جمع کر کے نہ رکھا ہو، نیز ان مویشیوں کے کنویں پر آنے کی وجہ سے اس کی کھیتی یا باغات کا نقصان نہ ہو، پانی نکالنے کے لئے اپنا ڈول وغیرہ دینا ضروری نہیں ہے۔ کسی پیاسے آدمی کے پینے کی ضرورت اپنے جانوروں اور کھیتی پر بھی مقدم ہوگی۔ جن صورتوں میں کنویں کا زائد پانی دوسروں کو صرف کرنا واجب ہے، اس پر معاوضہ لینا جائز نہیں ہے، دوسرے کی کھیتی باڑی کے لئے اپنا زائد پانی صرف کرنا واجب نہیں، نیز کسی کو طہارت کے لئے دینا بھی ضروری نہیں۔

مملوکہ نالیوں میں سے پانی پینا اور جانوروں کو پلانا وغیرہ جائز ہے، خواہ کسی بچہ وغیرہ کا ہو، یا موقوف ہو، جبکہ مالک یا موقوف علیہ حضرات کو ضرر نہ ہو، کیونکہ عرفاً اس کی اجازت ہوتی ہے۔ (حاشیة الجمل علی شرح المنهج ۳/۵۶۱-۵۷۵)

حوالہ

عربی میں حوالہ نقل و انتقال کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاحاً حوالہ ایسے عقد کو کہتے ہیں جس کا تقاضا دَین (ادھار، قرض) کو ایک ذمہ سے دوسرے ذمہ کی طرف منتقل کرنا ہوتا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا "مالدار کا (قرض کی ادائیگی میں) ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ اور تم سے کسی کا قرض (مقروض) کسی مالدار (یعنی قرض کی ادائیگی پر قادر) کے حوالہ کردے، تو تم اس حوالہ کو قبول کرلو" (متفق علیه، مسند احمد)

مختلف ادوار میں حوالہ کے جواز اور مشروعیت پر مسلمانوں کا اجماع رہ چکا ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے حوالہ کو قبول کرنے کا جو حکم دیا ہے وہ بطور استحباب ہے، نہ کہ وجوب و فرضیت کے طور پر۔ پس کسی کا دوسرے پر قرض ہو اور وہ کسی تیسرے کے حوالہ اسے کرے، تو قبول کرلینا مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔ استحباب اس صورت میں ہے، جبکہ وہ تیسرا شخص ادائیگی پر قادر ہو، اور اس کے مال میں شبہ نہ ہو، ورنہ پھر مستحب نہیں ہے۔

حوالہ کے ارکان

(۱) مُحِیل (۲) مُحال، (مُحتال)، (۳) مُحال علیہ (۴) مُحال بہٖ (۵) صیغہ

۱) **مُحیل:** یعنی وہ مقروض جو اپنے قرض خواہ سے یہ کہے کہ تم میرے فلاں مقروض سے اپنا قرض وصول کرلو۔ محیل، محال اور محال علیہ کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے۔

۲) **مُحال (مُحتال):** وہ قرض خواہ جس کا قرض مقروض دوسرے کے حوالہ کرے، جو کہ اس مقروض کا مقروض ہو۔

۳) **مُحال علیه:** جس سے قرض خواہ اپنا قرض وصول کرے گا۔

۴) **محال به:** اس سے وہ حق مراد ہے جو محال کا محیل پر ہے۔ جسے وہ محال علیہ کے حوالہ کر رہا ہے۔

محال بہٖ کے شرائط: (۱) قرض و ادھار ہو، عین (کسی شئی) کا حوالہ صحیح نہیں ہے۔ (ب) قرض (دَین) لازم ہو: جیسے مبیع (فروخت شدہ چیز) سپرد کرنے اور مدتِ خیار کے اختتام کے بعد قیمت یا نتیجتاً لازم ہونے والا ہو، جیسے مدتِ خیار میں قیمت، کیونکہ مدتِ خیار کے اختتام کے ساتھ یہ لازم ہوگا، پس بائع کسی کو خریدار کے حوالہ کرے تا کہ اس سے قیمت وصول کرے، تو یہ حوالہ صحیح ہے۔ قرض

کا مستقر اور پختہ ہونا شرط نہیں۔لہٰذا دخول سے قبل مہر، مدت کی تکمیل سے قبل کرایہ، اور مبیع پر قبضہ سے قبل قیمت کا حوالہ صحیح ہے۔(مثال: احمد کا محمد پر ہزار روپیہ قرض ہے، اور محمد کا حامد پر ہزار روپیہ قرض ہے، اب محمد اگر احمد سے کہہ دے کہ تم یہ قرض براہِ راست حامد سے وصول کرلو، تو اس مثال میں محمد محیل، احمد محال (محتال)، اور حامد محال علیہ اور ہزار روپیہ محال بہ ہے)

۵) **صیغہ :** ایجاب وقبول کے کلمات، مثلاً محیل کہے: میں نے تم کو فلاں کے حوالے کردیا، اور محال کہے: میں نے قبول کیا، میں راضی ہوں۔ایجاب وقبول مجلسِ عقد میں ہی پائے جائیں گے۔

خیار شرط اور خیار مجلس

عقدِ حوالہ حتمی ہونا شرط ہے۔لہٰذا اس میں خیارِ شرط اور خیارِ مجلس حاصل نہ ہوگا۔

حوالہ کے صحت کے شرائط۔

۱) مُحال علیہ پر مُحیل کا قرض ہو، اور یہ قرض بھی محال کے قرض کی طرح لازم یا لازم ہونے والا ہو، اور مدت وجنس اور مقدار وصفت میں محال کے قرض کے مُساوی ہو، دونوں کے قرض میں اس میں سے کسی میں اختلاف ہو۔تو حوالہ صحیح نہیں ہے۔

۲) مُحیل اور مُحال اس حوالہ سے راضی ہو، محال علیہ کی رضامندی شرط نہیں ہے۔

۳) مُحیل اور محال کو دونوں قرض کے مقدار، جنس اور صفت کا علم ہو۔

حوالہ کا حکم: تمام ارکان وشرائط کی رو سے جب حوالہ صحیح ہوجائے گا تو مُحیل مُحال کے قرض سے بری اور سبکدوش ہوجائے گا، اور مُحال کا حق اس کے ذمہ سے مُحال علیہ کے ذمہ کی طرف منتقل ہوگا۔اور محال علیہ پر سے محیل کا قرض ساقط ہوجائے گا۔اب محیل اور محال کا آپس میں اس قرض کی رو سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں، بلکہ مُحال اور مُحال علیہ کا تعلق جڑ گیا، اب مُحال اپنے قرض کے لئے مُحیل کی طرف رجوع نہیں کرسکتا، خواہ کسی سبب سے محال علیہ سے وہ قرض وصول نہ کرپائے۔مثلاً وہ مفلس (کنگال) ہو یا دَین (قرض) کا انکار کردے، یا مُحال کو اس کی تنگدستی اور غریبی کا علم ہو یا نہ ہو، یا محال علیہ کے مالداری کی شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو، تمام صورتوں میں محیل کی طرف رجوع نہیں کرسکتا۔

اگر محال نے کسی سبب سے قرض نہ ملنے کی صورت میں مُحیل کی طرف رجوع کی شرط لگائی تو حوالہ باطل ہوجائے گا۔

مُحیل اور مُحال کا حوالہ کے متعلق اختلاف

مُحال اپنا قرض مُحال علیہ سے وصول کرے پھر اس کا مُحیل سے اختلاف ہو، مُحیل کہے: تمہارا مجھ پر کوئی قرض نہیں تھا، میں نے تو صرف قبضہ کرنے کے لئے تم کو وکیل بنایا تھا، اور مُحال کہے: بلکہ تم پر میرے قرض کی جگہ تم نے یہ حوالہ کیا تھا، تو اس صورت میں مُحیل کی بات مع قسم تسلیم کریں گے۔اسی طرح مُحیل قرض کا تو اقرار کرے، لیکن کہے: میں نے اپنے لئے قبضہ کرنے تمہیں وکیل بنایا تھا، اور وہ کہے کہ تم نے حوالہ کیا تھا، تو محیل کی مع قسم تصدیق کریں گے۔

اگر مُحیل صراحۃً حوالہ کے الفاظ استعمال کرے اور کہے کہ میں نے وکالت کی نسبت سے کہا تھا، تو اس کی بات تسلیم نہیں کی جائیگی، بلکہ محال کی بات مع قسم مانی جائے گی۔

مُحال یا مُحال علیہ کا حوالہ : حوالہ صحیح ہونے کے بعد مُحال اپنے کسی قرض خواہ کا قرض اس مُحال علیہ کے حوالہ

کر سکتا ہے، اسی طرح مُحال علیہ مُحال کو اپنے کسی مقروض کے حوالہ کر سکتا ہے۔

متفرق مسائل

کوئی شخص مال کی ایک مقدار کسی دوسرے کے سپرد کرے تاکہ وہ فلاں بستی کے فلاں شخص کو ادا کرے تو:

اگر یہ مال بطور امانت اس کے سپرد کیا ہے تو بلا کراہت جائز ہے، اور منتقل کرنے والا شخص اس کا ضامن نہ ہوگا، جبکہ اس امانت کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہ کرے، اور اسے اپنے مال کے ساتھ خلط ملط نہ کرے۔ (اس طرح نہ ملائے کہ وہ مال الگ معلوم نہ ہو سکے)، اگر اپنے مال کے ساتھ خلط ملط کیا تو ضامن ہوگا۔ (ضامن نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بلا تقصیر و مال تلف ہو، تو وہ ذمہ دار نہیں اور اسے اس کا بدلہ ادا کرنا ضروری نہیں ہے)

دورِ حاضر میں پوسٹ وغیرہ کے سپرد روپیوں کی منتقلی کو سونپنا (مثلاً منی آرڈر وغیرہ) بھی اسی قبیل سے ہے، کیونکہ عوام پوسٹ آفس کے سپرد جو رقم کرتی ہے، ہو بہو وہی رقم دوسرے تک نہیں پہنچتی اور دوسرے رقوم میں مل جاتی ہے، لہٰذا یہ ادارے اس رقم کے ضامن ہوں گے۔

اگر یہ رقم بلا شرط کے کسی کو قرض دے، بعد میں اس سے یہ رقم فلاں تک پہنچانے کی درخواست کرے، (اور وہ اس سے راضی ہو)، تو یہ صورت بھی بلا کراہت جائز ہے۔

اگر بطور قرض دے، بشرطیکہ فلاں بستی میں فلاں شخص کو لے جا کر یہ قرض لوٹا دے، تو قرض کی واپسی کے لئے مدت کی تعین کے مثل ہوگا، لہٰذا قرض دینے والے کا اس میں کوئی فائدہ و مقصد نہ ہو، تو قرض صحیح ہے، لیکن شرط فضول ہے۔ البتہ اسے نبھانا بہتر ہے، اور قرض دینے والے کا اس میں کوئی فائدہ ہو، مثلاً راستہ پر خطر ہو، (اور رقم لٹ جانے کا اندیشہ ہو) تو عقد باطل ہے، کیونکہ قرض خواں کے نفع کا باعث ہے۔

کفالت (ضمان۔ذمہ داری لینا)

تعریف: کسی دوسرے کے ذمہ ثابت حق کو اپنے اوپر واجب و لازم کر لینا، یا جس پر دوسرے کا حق ہو اسے حاضر کرنے کی، یا کسی چیز کو حاضر کرنے کی ذمہ داری لینا کفالت کہلاتا ہے۔

تشریح: ایسا عقد جس میں عاقد یعنی کفیل یا ضامن کسی شخص کا دوسرے پر ثابت حق کے متعلق یہ ذمہ داری لے کہ اگر اس نے حق ادا نہ کیا تو میں خود ادا کردوں گا۔ یا پھر اسے جس پر حق ہے عدالت میں یا صاحب حق کے پاس پیش کروں گا یا کسی کی چیز دوسرے کے پاس غصب وغیرہ کی وجہ سے ہو تو اس چیز کو لا کر مالک کے سپرد کروں گا، تو اسے کفالت کہا جاتا ہے۔

مشروعیت: کفالت مشروع ہے، بلکہ بعض اوقات مستحب ہوگا، جبکہ کفیل کو اپنی ذات پر اعتماد ہو، اور کفالت کے سبب نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

حدیث: (۱) ایک جنازہ لایا گیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: "کیا اس پر قرض ہے؟" صحابہ نے عرض کیا کہ تین دینار قرض ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم لوگ اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو" تب حضرت ابوقتادہ نے عرض کیا: یا رسول ﷺ آپ اس کی نماز پڑھیں، اور وہ قرض میرے ذمہ ہے، تو آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ ادا کی۔ (بخاری شریف)

۲) آپ ﷺ نے ایک شخص کی طرف سے دس دینار کی ذمہ داری لی (حاکم)

حضرت یوسف علیہ السلام کا مفقود پیانہ پیش کرنے والے کے لئے ایک اعلان کرنے والے نے ایک اونٹ کا بوجھ انعام دلوانے کی ذمہ داری لی تھی(دیکھئے سورۂ یوسف آیت ۷۲)اس سے بھی کفالت کی تائید ہوتی ہے۔دیگر دلائل دوران بحث پیش ہوں گے۔

حکمت : کبھی انسان اپنی ضرورت کی چیز خریدتا ہے،لیکن نہ تو قیمت پاس ہے۔اور نہ رہن رکھنے کی سہولت،یا کبھی بائع رہن پر راضی نہیں،اور اس خریدار کو ادھار دینے پر بھی اسے اطمینان نہیں،ایسی صورت میں کفیل کی ضرورت پیش آئے گی۔(جن کی کفالت وذمہ داری سے بائع مطمئن ہوجائے گا)بعض اوقات قرض لینے کی ضرورت پیش آئے گی اور دینے والا کفیل کا مطالبہ کرے گا۔کبھی کسی غلطی اور خیانت کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا،لیکن بعض دیگر ذمہ داریوں کی ادائیگی کی خاطر مہلت کا مطالبہ کرے گا،لہٰذا اس کی واپسی اور حاضری کے اطمینان کے لئے کسی کی کفالت کی ضرورت پیش آئے گی،کبھی انسان کو کوئی چیز عاریت پر لینے کی نوبت آئے گی،لیکن مالک صحیح سلامت اس چیز کی واپسی کی ذمہ داری لینے والے کفیل کے بغیر دینے پر رضامند نہ ہوگا۔اور کبھی کسی کے پاس کسی کی غصب شدہ چیز ہوگی۔جس کے لاکر واپس کرنے میں مہلت درکار ہے،لیکن مالک کے بغیر کفیل کے اس غاصب کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنے پر راضی نہیں،وغیرہ وغیرہ......،لہٰذا انسانی مصالح کے پیش نظر سہولت اور حاجت کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت نے کفالت کو مشروع قرار دیا۔کیونکہ دین اسلام میں کوئی حرج کا پہلو نہیں،اور اللہ تبارک وتعالیٰ تو مخلوق کی سہولت اور آسانی کا ارادہ فرماتے ہیں نہ کہ تنگی کا(دیکھئے سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵ ، اور سورۂ حج ۷۸)اور آپ ﷺ نے سہولت کا حکم فرمایا اور تنگی سے منع فرمایا(بخاری شریف)

کفالت کے انواع

۱) **دَین (قرض) کی کفالت :** کسی مقروض کے قرض کی کفالت اور ذمہ داری لینا کہ وقت مقررہ پر وہ ادا نہ کرے تو میں ادا کردونگا۔اسے ضمان بھی کہا جاتا ہے۔

۲) **نفس کی کفالت :** کسی پر قرض یا قصاص وغیرہ کوئی حق ثابت ہو تو اس کو حاضر اور پیش کرنے کی ذمہ داری لینا،بدون اس کے کہ اس حق کی ادائیگی کی ذمہ داری لے۔(بعضوں کے نزدیک مالی ذمہ داری کو ضمان اور بدنی ذمہ داری کو کفالت کہا جاتا ہے)

کفالت کے ارکان

(۱) کَفِیل (۲) مَکْفُول لَہٗ (۳) مَکْفُول عنہ (۴) مَکْفُول بہٖ (۵) صیغہ

۱) **کفیل :** یعنی وہ ضامن شخص جو کسی کے حق کی ادائیگی یا خود اس شخص کی پیشی کی ذمہ داری لے۔

کفیل کے شرائط یہ ھیں

وہ تبرع کا اھل ھو، یعنی عاقل بالغ اور رشید ہو،کیونکہ کفالت تبرع ہے،پس پاگل اور بچے کی کفالت صحیح نہیں۔اسی طرح جس پر بے جا تصرفات کی وجہ سے مالی تصرفات کی پابندی عائد ہو،وہ بھی مالی کفیل نہیں بن سکتا،کیونکہ مالی کفالت مالی تصرف ہے۔اسی لئے جو مرض الموت میں ہو وہ اپنے مال کے تہائی حصے سے زائد مقدار میں کفیل نہیں بن سکتا،تہائی تک گنجائش ہے۔

۲) **مَکْفُول لَہٗ :** یعنی صاحب حق،جس کے حق کی حفاظت اور اطمینان کے لئے کفیل یہ ذمہ داری لیتا ہے۔کفیل کا مکفول لہٗ کو براہِ راست جاننا شرط ہے۔صرف اس کے نسب سے واقفیت کافی نہیں،کیونکہ یہی آئندہ اپنے حق کا مطالبہ کرے گا۔اور مطالبہ کے انداز میں بعض سخت اور بعض نرم ہوتے ہیں،لہٰذا ذمہ داری لینے والے کا اسے جاننا ضروری ہے۔

اگر اس کا کوئی وکیل ہو تو اسے جاننا شرط ہے۔ مکفول لہ کا موجود ہونا یا کفالت سے اس کا متفق ہونا شرط نہیں۔

۳) **مَکفُول عنه :** یعنی جس سے مکفول لہ کی جانب سے حق کا مطالبہ ہو، جسے کفیل کے مقابلہ میں اصیل سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ذمہ قرض وغیرہ کوئی ایسا حق جس کا ضمان درست ہو۔ ثابت ہونا شرط ہے۔

کسی کی مالی ضمان میں مضمون عنہ (مکفول عنہ۔ مقروض) کی رضامندی شرط نہیں کیونکہ بغیر اجازت کے دوسرے کا قرض ادا کرنا جائز ہے، لہٰذا اس کی ذمہ داری لینا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، اس لئے میت کے قرض کا ضمان صحیح ہے، خواہ میت نے ترکہ وغیرہ نہ چھوڑا ہو۔ مکفول عنہ کی معرفت بھی ضروری نہیں، کیونکہ اس کا اور کفیل کا کوئی معاملہ ہی نہیں۔

۴) **مکفول به :** وہ حق جس کی ذمہ داری لی جائے مکفول بہ کہلاتا ہے۔ (چاہے قرض ہو یا کچھ اور) اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱) **بوقت عقد حق ثابت ہو،** جو حق ابھی ثابت نہ ہو اس کا ضمان صحیح نہیں، خواہ اس کے وجوب کا سبب پایا گیا ہو، جیسے بیوی کے مستقبل کا نفقہ، یا نہ پایا گیا ہو، جیسے فلاں کو جو قرض دے گا اس کا ضمان، کیونکہ ضمان حق کا وثیقہ ہے۔ لہٰذا اس پر مقدم نہ ہوگا، جیسے گواہی۔

حق کے ثبوت کے لئے ضامن کا اعتراف کافی ہے۔ چاہے مضمون پر کچھ ثابت نہ ہو، لہٰذا اگر کہے۔ زید کے انور پر ۱۰۰ / دینار ہیں اور میں اس کا ضامن ہوں اور انور اس قرض کا انکار کرے تب بھی زید ضامن سے ۱۰۰ / دینار کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آئندہ واجب ہونے والے حق کا ضمان صحیح ہے، جیسے کہے: اسے ۱۰۰ / روپئے قرض دو میں اس کا ضامن ہوں اور اس نے دے دیئے تو یہ صحیح ہے، کیونکہ اس کی ضرورت پیش آئی ہے۔

رشتہ داروں کے آئندہ نفقہ کا ضمان صحیح نہیں، کیونکہ یہ ایک احسان اور حسن سلوک ہے۔ نہ کہ دَین۔

ضمان الدرک: مذکورہ شرط سے ضمان درک مستثنیٰ ہے۔ یعنی کسی چیز کے خریدار کے لئے یہ ذمہ داری لینا کہ اگر وہ چیز عیب دار ہے یا ناقص یا کسی اور کی ثابت ہو (یعنی غصب شدہ یا چوری وغیرہ کا مال ثابت ہو) تو قیمت لوٹائی جائے گی، تو ان صورتوں میں خریدار ضامن سے (اس چیز کی قیمت) وصول کرے گا۔ اس ضمان کا بائع کی جانب سے قیمت پر قبضہ کے بعد ہونا شرط ہے۔

۲) **حق لازم ہو:** خواہ مستقر (پختہ) ہو، جیسے قبضہ اور مدت خیار کے بعد مبیع کی قیمت، دخول کے بعد مہر، یا غیر مستقر ہو جیسے قبضہ سے قبل قیمت، یا دخول سے قبل مہر۔

جو حق آئندہ لازم ہونے والا ہو، یعنی بذات خود لازم ہو جائے اور کسی دوسرے پر اس کا لزوم موقوف نہ ہو۔ اس کا ضمان صحیح ہے، جیسے مدت خیار میں قیمت، کیونکہ مدت کے اختتام کے ساتھ ہی خود بخود یہ لازم ہوگا۔ لہٰذا اس کا ضمان صحیح ہے۔ گرچہ ابھی لازم نہیں ہوا۔

لازم یا آئندہ لازم ہونے والے کا مطلب وہ دین ہے جسے بلا سبب فسخ کرنے کا اختیار نہ ہو، جیسا کہ سابقہ مثالوں میں ہے۔ اگر دَین لازم یا لازم ہونے والا نہ ہو، یعنی جس پر دَین ہے۔ وہ بغیر سبب کے اسے فسخ کرسکتا ہو جیسے جعالہ کا معاوضہ۔ یعنی اپنی گمشدہ شئی لانے والے کے لئے متعین مال کی ادائیگی کی ذمہ داری، تو کسی کے لانے سے قبل وہ اس سے رجوع کرسکتا ہے، لہٰذا اس کا ضمان صحیح نہیں۔ کیونکہ عمل سے فارغ ہونے کے بعد یہ معاوضہ ثابت ہوگا۔ جیسا کہ "باب الجعالہ" میں گذر چکا۔

۳) **ضامن کو دَین کی جنس**، مقدار اور صفت معلوم ہو۔ جنس یعنی مثلاً درہم و دینار روپئے پیسے۔ مقدار یعنی ایک ہزار، دو ہزار وغیرہ، صفت یعنی اچھے قسم کے یا گھٹیا قسم کے جبکہ چیز مختلف صفات کی ہو۔ مغضوب وغیرہ کسی چیز کا ضمان ہو تو اس چیز کا جاننا شرط ہے۔

مجہول کا ضمان صحیح نہیں۔ جیسے آپ کا اس پر جو بھی قرض ہے، میں اس کا ضامن ہوں۔

۴) **حق تبرع کے قابل ہو،** یعنی جس پر حق ہے بلا معاوضہ وہاں سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے قابل ہو، جیسے مذکورہ بالا حقوق، اگر قابل انتقال نہ ہو تو ضمان صحیح نہیں۔ مثلاً حق شفعہ، یہ شفیع کا حق ہے۔ جس کی بنیاد پر شریک اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کرے تو یہ قیمت دے کر لے سکتا ہے، لیکن یہ حق دوسرے کو منتقل نہیں کر سکتا، لہٰذا اس کا ضمان صحیح نہیں۔

۵) **صیغہ :** یعنی ضامن وکفیل کی جانب سے ایجاب اور مکفول لہ کی جانب سے قبول

کفالت کی تحقق اور وجود کے لئے کفیل کی جانب سے ایجاب کافی ہے۔ مکفول لہ کی طرف سے قبول یا رضا مندی شرط نہیں، جیسا کہ گذر چکا۔

صیغہ کے شرائط : ۱) ایسا لفظ ہو جو صراحتاً یا کنایۃً التزام (اپنے ذمہ لینے) پر دلالت کرے،

صریح الفاظ : فلاں پر آپ کے قرض کا میں ضامن بنتا ہوں، میں نے وہ قرض اپنے اوپر لے لیا، میں نے اس کا تکفل کیا، میں اس کا کفیل ہوں، فلاں کے بدن کا میں کفیل ہوں، فلاں کو حاضر کرنے کا میں کفیل (یا ضامن) ہوں وغیرہ۔

کنایہ : تم فلاں کو چھوڑ دو، اور اس پر آپ کا جو قرض ہے۔ وہ میرے ذمہ۔ وغیرہ

اگر لفظ التزام (اپنے اوپر لازم اور واجب کر لینے) پر دلالت نہ کرے، تو کفالت صحیح نہیں۔ مثلاً کہے، فلاں پر جو مال ہے میں ادا کروں گا، یا میں فلاں کو حاضر کروں گا۔ وغیرہ۔ کیونکہ اس طرح کے الفاظ التزام پر دلالت نہیں کرتے، صرف وعدہ ہے، جس کا نبھاؤ لازم نہیں، لیکن کوئی قرینہ ضمان کی طرف پھیرنے والا موجود ہو تو ضمان صحیح ہوگا۔ جیسے کسی نے دیکھا کہ صاحب حق مقروض کو قید کرنا چاہتا ہے، تو اس نے کہا: میں اس کا قرض ادا کرتا ہوں، تو یہ قرینہ ہے کہ وہ ضمان کے ارادہ سے کہہ رہا ہے، تو گویا کہ اس نے کہا: میں اس کا ضامن ہوں، تم اسے چھوڑ دو، اس سے تعرض نہ کرو۔

گونگے کا معروف ومفہم اشارہ اور تحریر الفاظ کے قائم مقام ہے۔

۲) **عقد مُنَجّز ہو** (فوری ہو): یعنی کسی شرط پر معلق نہ ہو، خواہ مالی کفالت ہو یا بدنی کفالت، پس کوئی کہے: اگر زید آیا تو میں تمہارے فلاں پر قرض کا کفیل، تو یہ ضمان صحیح نہیں، اسی طرح اگر کہا: تم فلاں کام کرو تو میں فلاں کو حاضر کرنے کی کفالت لیتا ہوں، تو یہ کفالت صحیح نہیں، کیونکہ کفالت ایک عقد ہے اور عقود میں تعلیق کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۳) **مالی کفالت میں توقیت** (مدت کی قید) نہ ہو، کیونکہ مقصد حق ادا کرنا ہے، لہٰذا یہ قید صحیح نہیں، اسی طرح بدنی کفالت میں بھی صحیح قول کے مطابق توقیت صحیح نہیں، کہ اصل مقصد حاضر کرنا ہے۔

اگر کفالت منجز ہو، اور کسی مدت متعینہ تک مکفول کی حاضری کی تاخیر کی شرط لگائے تو جائز ہے، مثلاً یوں کہا: میں اسے حاضر کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، لیکن ایک ماہ کے بعد اسے حاضر کروں گا۔

اسی طرح فی الوقت واجب الاداقرض کو مخصوص مدت کے بعد ادا کرنے کی شرط کے ساتھ ضامن بننا صحیح ہے کیونکہ ضامن متبرع ہے (بلاعوض وفائدہ مفت میں یہ ذمہ داری نبھا رہا ہے) اور ممکن ہے فی الوقت ادائیگی کی حیثیت نہ ہو، اور ضمان کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کے شرط کے مطابق ضمان صحیح ہوگا، اب یہ مدت صرف ضامن کے حق میں ثابت ہوگی، لہٰذا مکفول لہ فی الحال (مدت سے قبل) اس سے اپنے حق کا مطالبہ نہیں کر سکتا، لیکن یہ مدت مکفول عنہ (اصیل) کے حق میں ثابت نہ ہوگی، لہٰذا صاحب حق اس سے فی الوقت مطالبہ کر سکتا ہے۔

حدیث : آپ ﷺ کے دور مسعود میں ایک شخص اپنے ایک مقروض کے ساتھ چمٹے رہے، جس پر دس دینار قرض تھا، تو اس نے

کہا: میرے پاس ادائیگی کے لئے کچھ بھی نہیں؟ تب اس نے کہا: واللہ (قسم بخدا) میں تم سے جدا ہونے والا نہیں جب تک کہ میرا قرض نہ چکا دو یا کسی ضامن کو پیش نہ کرو، پس وہ اسے آپ ﷺ کی بارگاہ میں لے آیا، تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم اس سے کتنی مہلت طلب کرتے ہو؟'' جواب دیا: ایک ماہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب پھر میں اس کی طرف سے ضامن بنتا ہوں''......(ابن ماجه)

اسی طرح مؤخر دین کوفی الوقت، ادا کرنے کی ضمانت لینا صحیح ہے، لیکن فوری ادا لازم نہیں۔ بلکہ اصل مقروض کو جو مہلت اور مدت ملی ہے۔ وہ اس کے حق میں بھی ثابت ہوگی۔ اگر ضامن فوراً ادا کردے تو اصیل سے تکمیلِ مدت سے قبل واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

کفالت بالنفس (بدنی کفالت) کے احکام

۱۔ **کفالت بالنفس** بھی ایک طرح کی کفالت ہے، جس میں کفیل اس بات کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ مکفول کو مکفول لہ کے پاس حاضر اور پیش کرے گا، کفالت کی یہ قسم بھی مشروع ہے، اور کفالت کے دلائل کے عموم میں بھی یہ داخل ہے۔ نیز اس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آثار مروی ہیں۔ منجملہ ان کے مختصراً ایک واقعہ یہ ہے کہ بعض لوگ مرتد ہوئے تو حضرت ابن مسعود نے عدی بن حاتم، جریر بن عبداللہ اور اشعث بن قیس رضی اللہ عنہم صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو مؤخر الذکر دونوں نے کہا: ان سے توبہ کا مطالبہ کرو۔ اگر تائب ہوں تو ان کے اہل خاندان کو کفیل بناؤ، پس مطالبہ پر انہوں نے توبہ کی اور ان کے اہلِ خاندان کو کفیل بنایا گیا (اخرج البیهقی ۔ والبخاری بعضه تعلیقافی صحیحه)

نیز حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس فرمان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ''لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِي مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهٖ'' (سورہ یوسف ۶۶) ترجمہ: ''(جب یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے عزیز مصر کے مطالبہ پر اپنے بھائی بنیامین کو ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی تو انہوں نے فرمایا) اس وقت تک ہرگز اس کو تمہارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ اللہ کی قسم کھا کر مجھ کو پکا قول نہ دو گے کہ تم اس کو ضرور ہی لے آؤ گے''

۲) **جس پر کوئی مالی حق ہو،** اسے حاضر کرنے کی کفالت صحیح ہے، خواہ مال کی مقدار سے واقف ہو یا ناواقف، کیونکہ اس نے کفالت بالبدن یعنی اس شخص کو حاضر کرنے کی ذمہ داری لی ہے، (نہ کہ مال ادا کرنے کی) اسی لئے اس کفیل سے مال کا مطالبہ نہ ہوگا، بلکہ صرف اس شخص کو پیش کرنے کا مطالبہ ہوگا۔ بس اتنا کافی ہے کہ مکفول پر جو مال ہے، اس کی طرف سے ضمان صحیح ہو۔ جیسا کہ مکفول بہ پر گفتگو کے دوران گذر چکا۔

اگر کسی پر کوئی سزا عائد ہو رہی ہو، تو اس کے بدنی کفالت میں حسب ذیل تفصیل:

اگر یہ عقوبت اور سزا کسی انسان کا حق ہے، جیسے قصاص اور حد قذف تو اس میں بدنی کفالت صحیح ہے۔

اگر عقوبت اللہ تعالیٰ کا حق ہو، جیسے شراب، چوری یا زنا کی حد، تو اس میں بدنی کفالت صحیح نہیں۔ کیونکہ حدود کی بنیاد رفع دفع واسقاط اور درگذر پر ہے، جبکہ یہ حقوق اللہ تعالیٰ سے متعلق ہوں، لہٰذا ان میں پردہ پوشی اور حتی الامکان درگذر کی کوشش مطلوب ہے۔ اور اس کی کفالت اس مطلوب کے برعکس اظہار اور تاکید و توسیع کی کوشش ہے لہٰذا یہ صحیح نہیں۔

۳) **پیشی کی جگہ اور وقت:** اگر کفیل مکفول کو لا کر پیش کرنے کا کوئی وقت مقرر کرے تو اس مقررہ وقت میں اسے پیش کرنا لازم ہے، جبکہ مکفول لہ مطالبہ کرے، اگر اسے حاضر کر دیا تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا اور حاضر نہ کرے تو حاکم اسے قید

کردے۔

اگر مکفول غائب ہو، اور کفیل ناواقف ہو کہ وہ کدھر ہے تو اس پر پیشی لازم نہیں، کیونکہ وہ معذور ہے اور اس کی ناواقفیت کے دعویٰ کو اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔

اگر اس کی جگہ سے واقف ہو تو پیشی لازم ہے، جبکہ راستہ باسلامت ہو اور اس کی جانب کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، اور عام طور پر آمدورفت میں جو وقت درکار ہو اتنی مہلت دی جائے گی۔ مہلت کے گذرنے کے باوجود وہ حاضر نہ کرے تو پھر قید میں ڈال دیا جائے، کیونکہ کفالت کی وجہ سے اس پر مکفول کی سپردگی لازم تھی، جس میں وہ کوتاہی برت رہا ہے، البتہ مکفول کا دَین وہ خود ادا کردے تو قید نہیں کیا جائے گا۔

جب کفیل کو قید کیا جائے گا تو وہ مستقل قید میں رہے گا، الّا یہ کہ موت، یا اس کی جگہ سے ناواقفیت کی وجہ سے یا کسی ایسے کے پناہ میں ہو کہ اس تک پہنچنا ممکن نہ ہو، اور اسے حاضر کرنا دشوار ہو جائے۔

قید سے بچنے کے لئے کفیل خود ہی قرض ادا کردے، پھر مکفول آجائے، اور ادا کردہ قرض اس حالت پر باقی ہو تو وہ، ورنہ اس کا بدل مکفول لہٗ سے واپس لے سکتا ہے (کیونکہ اصل ذمہ داری مکفول کو پیش کرنا تھی اور وہ آچکا)

جگہ: اگر سپردگی کے لئے کفیل کسی جگہ کی تعیین کرے اور وہ سپردگی کے مناسب ہو، تو وہی جگہ متعین ہوگی، اگر مناسب نہ ہو، یا اس میں خرچ ہو تو اس سے قریب مناسب جگہ پر محمول کیا جائیگا۔ اس کے لئے مکفول کی اجازت شرط ہے، ورنہ یہ فاسد ہے۔ کسی جگہ کی تعیین نہ ہو، تو کفالت کی جگہ مراد ہوگی جبکہ وہ اس قابل ہو، ورنہ وہاں سے قریب تر مناسب وقابل جگہ متعین ہوگی۔

۴) مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کفیل مناسب جگہ مکفول کو سپرد کرے، اور وہاں کوئی ایسی رکاوٹ نہ ہو جو مکفول لہٗ کو اپنا حق وصول کرنے سے روکے، تو کفیل بری ہو جائے گا (اب اس کی کوئی ذمہ داری نہیں) لیکن کوئی رکاوٹ ہو، مثلاً کوئی طاقت ور شخص جو اسے حق وصول کرنے سے روکے، تو کفیل بری نہ ہوگا، سپردگی کے لئے متعین جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ سپرد کرے اور مکفول لہٗ کسی سبب سے اس سے راضی نہ ہو، مثلاً متعین جگہ اس کے گواہ ہوں۔ یا حق کی وصولیابی کے لئے کوئی معاون ہو، تو اس دوسری جگہ اسے تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا۔ اگر کسی معقول سبب اور مقصد کے بغیر وہ تسلیم کرنے پر راضی نہ ہو، تو حاکم اس پر جبر کرے گا، وہ نہ مانے تو خود اس کی طرف سے تسلیم کرے گا۔ اگر حاکم نہ ہو تو کفیل اس سپردگی پر گواہ رکھے، اور وہ بری ہو جائے گا۔

اور جس طرح سابقہ شرائط کے مطابق سپردگی سے کفیل بری ہو جاتا ہے، اس طرح خود مکفول اپنے آپ کو پیش کرے تب بھی بری ہو جائے گا۔ اگر مکفول لہٗ تسلیم کرنے سے انکار کرے تو سابقہ تفصیل کے مطابق اس پر جبر کیا جائیگا۔ مکفول کا صرف حاضر ہو جانا کافی نہیں، بلکہ اسے یوں کہنا لازم ہے: میں نے فلاں کی طرف سے اپنے آپ کو سپرد کیا۔

۵) اگر مکفول کی وفات وتدفین ہو جائے یا وہ روپوش یا فرار ہو اور اس کی جگہ کا علم نہ ہو تو کفیل بری ہوگا، اور اس سے مکفول پر موجود حق کا مطالبہ نہ ہوگا (دفن کی قید اس لئے کہ اس سے قبل اس کے حاضری کا مطالبہ کبھی ہو سکتا ہے۔ تاکہ اس کی صورت پر گواہ رکھے۔ تحفۃ المحتاج/۶۵۶)

۶) بدنی کفالت میں اگر یہ شرط رکھی جائے کہ کفیل مکفول کو پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو اس پر ثابت حق کا ضامن ہوگا، تو یہ کفالت باطل ہے، کیونکہ یہ شرط بدنی کفالت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

۷) مکفول لہٗ اپنا حق معاف کردے تو کفیل بھی پیش کرنے کی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔

۸) بدنی کفالت میں مکفول کی رضامندی شرط ہے، کیونکہ اس کفالت میں کفیل مال کا ذمہ دار نہیں ہے، اس کا صرف یہی فائدہ ہے کہ مکفول کو حاضر کردے گا، اور وہ اس کفیل کی کفالت سے راضی نہ ہو تو اسے کفیل کے ساتھ آنا لازم نہیں ہے۔

مکفول لہ کی رضامندی شرط نہیں، کیونکہ یہ ایک وثیقہ ہے، لہٰذا اس کی رضامندی کے بغیر بھی صحیح ہے۔ جیسے گواہی

مالی کفالت (ضمان) کے احکام

کسی کے ذمہ جو مالی حق ہو، اس کے متعلق یہ ذمہ داری لینا کہ اس نے ادا نہ کیا تو میں ادا کردوں گا، اسے کفالت بالمال (مالی کفالت) اور ضمان کہتے ہیں۔ اس کی مشروعیت پر ہر دور میں مسلمانوں کا اجماع رہا ہے۔ اس کے بعض احکام گذر چکے۔ اب بعض دیگر احکام بیان ہورہے ہیں۔

۱) **کفیل اور مکفول عنہ سے مطالبہ :** کوئی کسی کے مالی حق کا ضامن بن جائے تو صاحب حق، کفیل (وضامن) اور اصیل (مکفول عنہ۔ جس پر حق ہے) دونوں سے مطالبہ کرسکتا ہے (یا بعض حق کا کفیل سے اور بعض کا اصل سے بھی مطالبہ کرسکتا ہے۔ فتح الوہاب)

اسی لئے عقد ضمان میں اصیل کے قرض سے بری ہونے کی شرط لگائے تو یہ ضمان صحیح نہیں، کیونکہ ضمان اس قرض کی مزید پختگی اور اطمینان کے لئے ہے، اور یہ شرط اس کے منافی ہے۔ کیونکہ یہ پختگی اصیل کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی ذمہ دار بنانے میں ہے۔ نہ کہ اسے بری کرنے میں۔

حضرت ابوقتادہؓ نے ایک میت کا قرض اپنے ذمہ لینے کے بعد دو دن سے اسے چکایا تو آپ ﷺ نے فرمایا" اب تم نے اس میت کی جلد ٹھنڈی کردی" (مسند احمد) آپ ﷺ کا یہ فرمان اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ محض ضمان کی وجہ سے وہ مقروض قرض سے سبکدوش نہیں ہوا۔ ورنہ بوقت ضمان ہی اس کی جلد ٹھنڈی ہوچکی ہوتی، لہٰذا جب اصیل اور مقروض قرض سے بری نہیں ہوا، تو صاحب حق اس سے مطالبہ کرسکتا ہے۔ جیسا کہ ضامن سے مطالبہ کرسکتا ہے، کیونکہ اس نے ذمہ داری لی ہے۔ اگر کفیل (ضامن) اور اصیل (مضمون عنہ۔ مقروض) دونوں حاضر و موجود ہوں، اور دونوں بھی قرض ادا کرنے پر قادر ہو، تو صاحب حق کو دونوں میں سے کسی سے بھی مطالبہ کرنے اور لینے کا حق حاصل ہے۔ اصیل سے اس لئے کہ قرض اس کے ذمہ ہے۔ اور کفیل سے آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ: "زَعِيمٌ غَارِمٌ" (ترمذی شریف) یعنی کفیل سے قرض کا مطالبہ کیا جائیگا۔ (واخرجه ابن حبان و صححه كما فى فتح الوهاب)

۲) **اصیل کی برأت سے کفیل کی برأت :** اگر صاحب حق اصیل کو اپنے دَین اور حق سے بری و سبکدوش کردے تو کفیل بھی اس سے بری ہوگا، اب اس سے بھی مطالبہ کا سوال نہیں، لیکن کفیل کو ضمان سے یا دَین اور اس کے مطالبہ سے بری کردے، تو اس سے اصیل بری نہ ہوگا، بلکہ صرف کفیل ہی بری ہوگا۔

اگر ایک ضامن کی طرف سے دوسرا شخص ضامن بن جائے تو یہ بھی صحیح ہے، اور اس صورت میں یہ دین تین اشخاص کے ذمہ ثابت ہوگا، اصیل، اوّل ضامن اور دوّم ضامن، اور صاحب حق ان تینوں میں سے کسی سے بھی مطالبہ کرسکتا ہے، اگر اس نے اصیل کو بری کردیا تو تینوں بری ہوجائیں گے، اوّل ضامن کو بری کردیا تو دوّم ضامن بھی بری ہوگا، لیکن اصیل بری نہ ہوگا، اگر دوم ضامن کو بری کردے تو صرف وہی بری ہوگا، اول ضامن اور اصیل بری نہ ہوں گے۔

۳) کفیل کا اصیل سے اپنی خلاصی (یعنی حق کی ادائیگی) کا مطالبہ : اگر صاحب حق کفیل سے دین کا مطالبہ کرے، اور اس نے اصل کی اجازت سے کفالت لی تھی تو کفیل اصل سے یہ مطالبہ کرسکتا ہے کہ دین ادا کر کے مجھے کفالت سے آزاد کردو، صاحب حق جب تک کفیل سے مطالبہ نہ کرے، وہ اصیل سے اپنی خلاصی اور دین کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اور اصیل کی اجازت کے بغیر کفیل بنا تھا، تو یہ اصیل سے ادائیگی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

۴) موت کی وجہ سے ادھار کی مہلت کا خاتمہ : کفیل یا اصیل کا انتقال ہو تو اس کے حق میں دَین کی مہلت ختم ہوجائے گی اور فوری واجب الادا ہوجائے گی، کیونکہ موت مہلت اور مدت کو ختم کردیتی ہے۔ لیکن جو زندہ ہے اس کے حق میں ابھی مہلت کا اعتبار ہوگا، کیونکہ مہلت بھی ایک منفعت ہے، پس اس کے حق میں وہ باطل نہ ہوگی۔

اگر اصیل کا انتقال ہو، تو کفیل صاحب حق سے اس بات کا مطالبہ کرسکتا ہے کہ ترکہ کی تقسیم سے قبل اس میں سے اپنا حق وصول کرے، یا پھر اسے کفالت سے بری کردے، کیونکہ قرض کی مدت ختم ہونے تک ممکن ہے ترکہ ختم ہوجائے اور اسے قرض ادا کرنا پڑے۔

اگر کفیل کی موت ہو، اور اصحاب حق اس کے ترکہ سے اپنا حق وصول کرلے، تو اس کے وارثوں کو مکفول عنہ (اصیل) سے قرض کی مدت پوری ہونے تک واپسی کا مطالبہ کا حق نہ ہوگا، کیونکہ اس کے حق میں مدت ابھی باقی ہے۔

۵) کفیل کا مکفول عنه سے ادا کردہ حق وصول کرنا : کفیل یا مکفول عنہ میں سے کسی نے بھی حق ادا کردیا تو دونوں بھی بری ہوگئے۔ کفیل حق ادا کرے تو مکفول عنہ سے واپسی اور وصولیابی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(الف) : اگر مکفول عنہ (اصیل) کی اجازت سے کفیل بنا ہے، تو اس سے واپس لے گا، خواہ ادائیگی اس کی اجازت سے ہو، یا بغیر اجازت کے۔

(ب) : اگر کفالت اور ادائیگی دونوں ہی اصیل کی اجازت کے بغیر ہو، یا کفالت تو بغیر اجازت کے ہو اور ادائیگی اجازت سے ہو تو اس سے واپس نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اجازت کے بغیر کفیل وضامن بنا ہے، تو گویا اس نے تبرعاً (مفت میں اپنی جانب سے) قرض ادا کیا ہے۔

واپسی کی صورت میں مکفول عنه سے کیا واپس لے ؟ : اصیل پر جو قرض تھا، اسی صفت کے ساتھ وہ قرض ضامن نے ادا کردیا، تو وہی اصیل (مکفول عنہ) سے واپس لے گا، اگر اس کے علاوہ کوئی اور چیز ادا کرے، اور وہ دَین سے کم ہو تو وہی ادا کردہ واپس لے، اگر دَین سے زائد ہے تو دَین کی مقدار واپس لے، کیونکہ یہی مقدار اصیل کے ذمہ واجب تھی۔ مثلاً اصیل پر صحیح سو (۱۰۰) دینار قرض تھا اور ضامن نے ۱۰۰/ دینار عیب دار ادا کئے، تو اصیل سے عیب دار واپس لے۔ اگر ضامن ۵۰/ دینار پر صلح کرلے، تو اصیل سے ۵۰/ دینار ہی لے سکتا ہے۔ اگر کسی چیز پر جس کی قیمت ۸۰/ دینار ہو صلح کرلے تو ۸۰/ دینار واپس لے، صلح میں ادا کردہ چیز کی قیمت ۱۲۰/ دینار ہو، تو صرف ۱۰۰ دینار ہی لے گا۔

۶) ضامن کا ادائیگی کا دعویٰ : اگر ضامن وکفیل یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اصیل کی جانب سے دَین چکا دیا تو اگر مکفول لہ اسے تسلیم کرتا ہے، تو ضامن اصیل (مکفول عنہ) سے واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے، کیونکہ جب صاحب حق نے خود اقرار کرلیا تو اس کے ذمہ سے دَین ساقط ہوچکا، اگر اصیل انکار کرے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر مکفول له انکار کرے تو : (۱) ضامن کے پاس ادائیگی کا بیِّنہ (گواہ) ہو تو اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، اور وہ اصیل سے یہ رقم لوٹا لے گا۔

۲) ادائیگی کا بینہ نہ ہو، تو مکفول لہ کی بات مع قسم قبول کی جائیگی، اب قسم کے بعد وہ ضامن یا اصیل کسی سے بھی مطالبہ کرسکتا ہے۔
(بینہ سے مراد دو عادل مرد گواہ، یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک مرد اور ضامن کی قسم)

مذکورہ صورت میں مکفول عنہ کی غیر موجودگی میں کفیل نے یہ حق ادا کیا تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتا، خواہ وہ اس کی تصدیق کرے یا اسے جھٹلائے، کیونکہ اس ادائیگی سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور صاحب حق کا مطالبہ ابھی باقی ہے، اور گواہ نہ رکھنا کفیل کی غلطی ہے۔

اگر مکفول عنہ (اصیل) کے روبرو ادا کرے تو اس سے واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ گرچہ اس ادائیگی سے وہ دَین سے سبکدوش نہیں ہوا (کیونکہ صاحب حق انکار کر رہا ہے) کیونکہ اس صورت میں اس کی کوتاہی ہے کہ احتیاط پر عمل نہیں کیا، اور ادائیگی پر گواہی کا مطالبہ نہ کیا۔

أعیان (معین اشیاء) کا ضمان

کسی کی کوئی چیز دوسرے کے ہاتھ میں ہو اور کوئی تیسرا شخص اس کی واپسی کی ضمانت لے، تو یہ تفصیل ہے۔

اگر اس کے پاس وہ چیز بطور امانت ہو (جیسے ودیعت) تو ضمان صحیح نہیں، کیونکہ جس کے قبضہ میں ہے (بصورت تلف) خود اس پر ضمان واجب نہیں، تو کسی دوسرے پر بدرجہ اولیٰ واجب نہ ہوگا۔

اگر اس کا قبضہ ضمانت کا ہو (یعنی بصورت تلف اس پر ضمان اور تاوان واجب ہوتا ہو) جیسے غصب شدہ شئی، مستعار، بطور بھاؤ تاؤ خریدنے کے لئے ہاتھ میں لی ہوئی چیز اور خریدار کے قبضہ سے قبل مبیع وغیرہ، تو اس کا ضمان صحیح ہے۔

اس ضمان میں یہ شرط ہے کہ جس کے قبضہ میں چیز ہے، اس کی اجازت ہو، یا پھر ضامن اس سے وہ چیز لینے کی قدرت رکھتا ہو، ضمان صحیح ہونے کے بعد، جب وہ چیز مضمون لہ (مکفول لہ) کے پاس لوٹ جائے، تو یہ ضامن بری الذمہ ہو جائے گا۔

اس چیز کے تلف ہونے کی صورت میں قیمت کے لوٹانے کا ضمان لے تو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایسے دَین کا ضمان ہے، جو ثابت نہیں ہوا۔ اور ضمان کے صحت کے شرائط میں گذر چکا کہ مضمون ثابت دَین ہو، اور اس چیز کی قیمت اس کے تلف کے بعد ہی ثابت ہوگی، لہٰذا اس کی موجودگی میں قیمت کا ضمان صحیح نہ ہوگا۔

متفرقات

۱) کسی کا قرض اس کی اجازت کے بغیر ضمان کے ادا کرے، تو مقروض سے واپس لے گا، خواہ واپسی کی شرط نہ لگائے، اس کے برعکس بغیر اجازت کے ادا کرے تو واپس نہیں لے سکتا کیونکہ یہ تبرّع ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۳۹۱)

۲) کوئی مضطر ہو (شدتِ بھوک سے زندگی و موت کی کشمکش میں ہو) اور کوئی اس کے منہ میں جبراً اپنا کھانا رکھے، یا وہ بے ہوش ہو (اور اسے کھلائے) تو آئندہ واپس لے سکتا ہے، کیونکہ اس کی جان بچانا واجب ہے (حاشیۃ الجمل ۳/۳۹۱)

۳) کسی پر واجب زکات یا کفارہ کی ادائیگی کا ضامن بننا صحیح ہے۔ وہ زندہ ہو تو ادائیگی کے لئے اس کی اجازت ضروری ہے، کیونکہ نیت ضروری ہے۔ اگر مردہ کی طرف سے ہے تو اجازت کے بغیر ادا ہو جائے گا۔ (تحفۃ المحتاج ۶/۲۲۲)

۴) بدنی کفالت میں کفیل کی موت ہو، تو کفالت باطل ہوگی، اور مکفول لہ کو اس کے ترکہ میں سے کچھ نہ ملے گا، اور اگر مکفول لہ کا انتقال ہو، تو کفالت باطل نہ ہوگی۔ بلکہ وارثوں کو یہ حق حاصل ہوگا جیسا کہ مالی ضمانت میں ہوتا ہے (تحفۃ المحتاج ۶/۲۵۸)

۵) مقروض بغیر کسی قصد کے قرض خواہ کو (قرض کی رقم) ادا کرے تو یہ کچھ بھی نہیں، اور وہ اس کا مالک نہ ہوگا، بلکہ قرض کی ادائیگی کی نیت ہونا ضروری ہے۔ اگر قرض کی مقدار الگ کرتے وقت بھی نیت ہو تو کافی ہے، جیسا کہ زکات میں (تحفة المحتاج ٦/٦٧٢)

٦) کسی نے کہا: میرے جانور کو چارہ کھلاؤ، یا قیدی نے کہا: میرا فدیہ دے کر مجھے آزاد کرو۔ تو یہ رقم واپس لے سکتا ہے۔ اگر کوئی کہے: مجھے ایک روٹی کھلاؤ، تو اس کا بدلہ عام عرف کی وجہ سے نہیں لے سکتا، اگر کسی سے کہا کہ میرا کپڑا دھودو، تو وہ اجرت کا مستحق نہ ہوگا (تحفة المحتاج ٦/٦٧٧)

۷) اگر کوئی کہے: میں تمہارے زید پر قرض کا اس چیز میں ضامن ہوں، تو یہ صحیح ہے اور اس قرض کا تعلق اس چیز سے ہوگا۔ لہٰذا وہ چیز تلف ہوجائے تو ضمان بھی ختم ہوگا (ترشیح المستفیدین ص ۲۴۳)

شرکت

اقسام : (۱) شرکت املاک (۲) شرکتِ عقد

۱) **شرکت املاک :** دو (۲) یا زائد افراد ایک شئی کے مالک ہوں، خواہ قہراً یعنی ان کے اختیار وارادہ کے بغیر ہو، جیسے دونوں کا اس شئی کا وارث بن جانا، یا اختیار وارادہ سے ہو، مثلاً دونوں مشترک طور پر کوئی شئی خرید لیں، یا کوئی شخص ایک شئی دونوں کو ہبہ کرے اور وہ قبول کریں۔

اس میں ہر شریک دوسرے کے حصے میں اجنبی اور بے تعلق ہے، لہٰذا اس کی اجازت کے بغیر اس کے حصے میں تصرف جائز نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا مقصد شرکت کے باب میں اس شرکت کے متعلق بحث کرنا نہیں ہوتا، اس کی ہر صورت اس سے متعلقہ باب میں بیان ہوتی ہے، مثلاً ہبہ، وراثت یا وصیت وغیرہ میں۔

۲) **شرکت عقد :** یعنی وہ شرکت جو بالاختیار بقصد تصرف اور تحصیل نفع کے لئے انجام دی جائے۔ شرکت کے اس باب میں اصل مقصود اسی کے انواع مسائل واحکام کا ذکر ہے۔

احادیث : (۱) آپ ﷺ فرماتے ہیں" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں دو شرکاء میں تیسرا ہوں، جب تک کہ ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے، اگر اس نے خیانت کی تو میں دونوں کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔" (ابوداود)

مفہوم : اللہ تعالیٰ کی حفاظت ومدد، اور اس کی طرف سے برکت ان دونوں کی تجارت اور ان کے مال سے متعلق ہوتی ہے، جبکہ وہ سچائی اور امانت پر قائم ہوں، جب اس کے بجائے خیانت آجائے تو برکت واعانت اٹھ جاتی ہے، اور نزاع وخصومت اور نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔

۲) حضرت سائب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے شریک تجارت تھے، جب فتح مکہ کے دن وہ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا" مرحبا (خوش آمدید) میرے بھائی اور شریک کو، جو نہ دفع کرتے اور نہ جھگڑا" (یعنی بڑے خوش اخلاق شریک تھے، موافق کرتے، مخالفت اور جھگڑا نہ کرتے) (ابوداود) اگر یہ آپ ﷺ کے الفاظ ہیں تو میرے شریک کہنا اس کی مشروعیت پر دال ہے اور حضرت سائبؓ کے الفاظ ہیں تو آپ ﷺ کا سکوت بھی مشروعیت پر دال ہے۔

۳) حضرت براء اور زید رضی اللہ عنہما شریک تھے، لہٰذا دونوں نے چاندی (کچھ) نقد اور (کچھ) ادھار خریدی، آپ ﷺ کو پتہ

چلاتو فرمایا" جونقد ہے، اسے باقی رکھو، اور جو اُدھرا ہے اسے رد کردو" (مسند احمد) یہ حدیث بھی شرکت کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس پر انکار نہ فرمایا۔

اسی طرح آپ ﷺ کے وقت سے ہر دور میں بلا کسی انکار کے شرکت کا تعامل امت میں جاری ہے، لہٰذا بالا جماع جائز ہے۔

حکمت: کبھی مال کی قلت اور کبھی مطلوبہ تجربہ اور معلومات میں کمی کے باعث ایک آدمی کے تنہا تجارت نہیں کر پاتا، لہٰذا مصلحت کے پیشِ نظر مناسب اصول وضوابط کی روشنی میں شریعت نے شرکت کو جائز قرار دیا، تاکہ لوگ صحیح انداز پر اپنے معاشی مسائل کو حل کرسکیں اور مطلوبہ ترقی حاصل ہو۔

شرکت کے انواع

(۱) شرکتِ عِنان (شرکت مُفاوضہ (۳) شرکتِ اَبْدَان (۴) شرکتِ وُجُوہ

۱) **شرکت عنان:** یعنی دو یا زائد افراد اپنی اپنی رقم کے ساتھ مشترک تجارت کریں، تاکہ نفع بھی ان میں مشترک ہو، شرکت کی یہ قسم بالاتفاق مشروع اور جائز ہے۔

۲) **شرکت مفاوضہ:** یعنی دو (۲) یا زائد افراد اپنی تمام ملکیت میں مشترک ہوجائیں، اور ہر ایک دوسرے کی طرف سے وکیل وکفیل ہو، اور تمام نفع ونقصان میں شریک ہو، یہ قسم شافعی مسلک میں باطل ہے (بعض دیگر ائمہ کرام نے اسے جائز قرار دیا ہے)

۳) **شرکتِ اَبْدَان (شرکت اعمال):** یعنی دو (۲) یا زائد افراد بغیر مال کے اعمال کے قبول کرنے اور انجام دینے میں شرکت کریں، خواہ ان کے اعمال متفق ہوں یا مختلف، بشرطیکہ نفع (کمائی) آپس میں مساوی یا متفاوت تقسیم کریں گے۔ مثلاً دو حمال یا درزی یا کسی اور صنعت وحرفت والوں کی شرکت، یہ شرکت بھی باطل ہے، کیونکہ کبھی بعض شریک دوسرے کے مقابلہ کافی زیادہ کام کرے گا، کبھی سارا کام ایک شریک کرے گا اور دوسرا کچھ نہ کرے گا، لہٰذا ممنوعہ ضرر ونقصان پایا جائے گا، اور عمل کا نفع اور کمائی کی تقسیم منصفانہ نہیں ہوگی۔ (بعض دیگر ائمہ کرام نے اس شرکت کو جائز قرار دیا ہے)

۴) **شرکت وجوہ:** یعنی دو یا زائد افراد بغیر مال کے شرکت کریں، کہ اپنے مقام وحیثیت اور تعلقات وپہچان (کریڈٹ) کی بنیاد پر ادھار سامان خریدیں، خواہ مشترک خریدیں یا انفرادی طور پر، اب یہ خریدی ہوئی اشیاء مشترک ہوں اور فروخت کے بعد نفع متعینہ تناسب سے آپس میں تقسیم کرلیں، چونکہ مشترک مال نہیں پایا جارہا ہے، اور شرکت میں اصل مال ہے، اس لئے یہ نوع بھی باطل ہے۔ (اس شرکت کو بھی بعض دیگر فقہاء کرام نے جائز قرار دیا ہے)

شرکت عنان: یہ قسم تمام فقہاء کرام کے نزدیک مشروع اور صحیح ہے، اور عام طور پر شائع اور معروف یہی ہے، اس شرکت کی صحت کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱) **صیغہ:** ہر شریک کی طرف سے دوسروں کے لئے ایسے الفاظ پایا جانا ضروری ہے جو خرید وفروخت وغیرہ تجارتی معاملات کی اجازت پر دلالت کرے۔

۲) **وکالت کی اهلیت:** ہر شریک عاقل وبالغ ہو اور اس پر مالی تصرفات کی پابندی نہ ہو، کیونکہ ہر شریک اپنے حصہ میں اصالۃً اور دوسرے کے حصے میں وکالۃً تصرف کررہا ہے۔

۳) شرکت کامال مثلی ہو: آپس میں شرکاء کا مال خلط ملط کرنے کے بعد بعض بعض سے نمایاں نہ ہو، مثلاً دور حاضر میں رائج کرنسی اور سکے وغیرہ، موزون یا مکیل اشیاء جبکہ ہر ایک شریک کا مال ایک ہی جنس کا ہو، جیسے گیہوں، جو، لوہا وغیرہ۔

اگر شرکت کا مال، یا کسی ایک شریک کا مال ایسے اسباب وسامان کے قبیل سے ہو جو نمایاں اور متمیز ہو، مثلی نہ ہو، تو شرکت صحیح نہیں، کیونکہ اسے اس طرح خلط کرنا کہ متمیز اور جدا معلوم نہ ہو، ممکن نہیں اور کبھی ایک کا مال تلف یا کم ہوگا، تو اس کی تلافی دوسروں کے مال سے نہیں ہوسکتی، اگر رأس المال (شرکت میں لگنے والی اصل پونجی اور مال) اسباب کے قبیل سے ہو تو اس کے صحت کی شکل یہ ہوگی کہ ہر ایک اپنے سامان کا ایک حصہ دوسروں کے سامان کے ایک حصہ کے عوض فروخت کردے، اس طرح دونوں تمام اسباب میں شریک ہوں گے، اب ہر ایک دوسرے کو اپنے حصہ میں تصرف کا اختیار دے دے، اس صورت میں فروخت کے بعد قیمت میں دونوں شریک رہیں گے۔

اسی طرح ایک شریک کا مال مثلی ہو اور دوسرے کا اسباب وسامان، تو اسباب والا اپنا ایک حصہ مثلی کے ایک حصہ کے بدلہ فروخت کردے تا کہ دونوں تمام مال میں شریک ہو جائیں۔

اسی طرح دونوں کسی سامان کے بطور وراثت، یا خرید وغیرہ کے مالک بن جائیں اور ایک دوسرے کو اپنے حصے میں بغرض تجارت تصرف کی اجازت دیں، تو شرکت صحیح ہے،

۴) شرکت کے مال کو خلط کرنا (آپس میں ملانا): ابتداء مشترک مال نہ ہو، تو تمام شرکاء اپنا اپنا مال لا کر آپس میں اس طرح ملائیں کہ بعض کا حصہ بعض سے جدا معلوم اور متمیز نہ ہو، اب عقد شرکت جاری ہوگی۔ مال کے خلط سے پہلے عقد شرکت طے ہو تو صحیح نہیں چاہے بعد میں اسی مجلس میں اموال کا خلط ہو، خلط کے بعد دوبارہ عقد کا اعادہ ضروری ہے تا کہ شرکت صحیح ہو۔

مشترک طور پر کسی چیز کے خریدنے، بطور ہبہ قبول کرنے یا وارث بننے کی وجہ سے پہلے سے کسی مال میں مشترک ہوں، پھر عقدِ شرکت طے پائے تو صحیح ہے، اسے تقسیم کر کے پھر ملا لینا کوئی شرط نہیں۔

۵) نفع و نقصان کا تناسب مال کی مقدار کے مطابق ہو: لہٰذا کسی کے لئے اس کے مال کے مقابلہ میں کم یا زائد نفع ونقصان کا تناسب مقرر کرنا صحیح نہیں۔ تمام شرکاء کا مال مساوی اور برابر مقدار میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر تین شرکاء میں ایک کا مال نصف اور دوسرے دونوں کا پاؤ پاؤ ہو تو صحیح ہے۔ اب نفع کی صورت میں نفع میں سے پہلے شریک کو نصف حصہ اور دوسرے دونوں کو پاؤ پاؤ حصہ ملے گا، اور نقصان ہو تب بھی اسی تناسب سے برداشت کریں گے، چاہے عمل میں سب شریک ہوں یا نہ ہوں، یا بعض کا عمل کم اور بعض کا زیادہ ہو (پس شرکاء کے نفع ونقصان کی تقسیم کا تعلق صرف مال کی مقدار سے ہے، عمل اور محنت سے نہیں)

اگر خسارہ اور نقصان میں تفاوت کی شرط ہو تو شرکت باطل ہے، اور اگر نفع میں مال کے تناسب کے برعکس تفاوت ہو تب بھی شرکت صحیح نہیں، پس شرکاء کی جانب سے خرید وفروخت پائی جائے تو اجازت کی وجہ سے یہ تصرف نافذ ہوگا، اور ہر ایک کو اس کے رأس المال کی نسبت سے نفع ملے گا، اور دوسروں سے اجرتِ مثل واپس لے گا۔ (یعنی دوسرے کے مال میں تصرف اور محنت کا بدلہ اجرت لے گا)

حنفیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے درج ذیل صورتوں میں مال کے تناسب سے زائد نفع کے شرط کی اجازت دی ہے:

۱۔ تمام شرکاء کے مال کی مقدار مساوی ہو، مثلاً ہر ایک کا تہائی حصہ ہو، اور تمام عمل اور محنت میں شریک ہوں، تو کسی کو اس کی مقدار سے زائد تناسب کی شرط صحیح ہے، کیونکہ کبھی وہ محنت میں زیادہ ماہر اور واقف کار ہوگا، تو یہ اضافہ اس کے مہارت ومحنت کے بالمقابل ہو جائے گا۔

۲۔ شرکاء مال میں شریک ہوں اور عمل ومحنت بعض انجام دیں، تو محنت کرنے والوں کو زیادہ تناسب طے کرنا صحیح ہے۔

۳-شرکاء کے مشترک مال کے مقدار میں تفاوت ہو، مثلاً ایک کا تہائی حصہ اور دوسرے کا دوتہائی، اور دونوں عمل میں شریک ہوں، تو ایک کو اس کے مال کے مقدار کے تناسب سے زائد نفع طے کرنا جائز ہے۔ مثلاً دونوں نفع میں مساوی ہوں، یا ایک کو دوسرے سے زائد ملے، کیونکہ اس کی محنت ومہارت کی زیادتی کا احتمال ہے، تو یہ زیادتی اس کے مقابل ہوگی۔

۴-رأس المال میں سابقہ مال کی طرح تفاوت ہو، اور عمل اس کے ذمہ ہو جس کی مقدار کم ہے، اور یہ شرط ٹھہرے کہ نفع میں دونوں مساوی ہوں، یا عمل انجام دینے والے کو زائد نفع ملے تو یہ صحیح ہے۔

تنبیہ : مذکورہ صورتوں میں زائد مقدار اس وقت صحیح ہوگی، جبکہ اس کے حق میں متعین کردہ نفع کے تناسب کے ضمن میں ہو، مثلاً اس کا پورا حصہ عام اور کل نفع سے فی صدی کے تناسب سے ہو، مثلاً ۵۰ فیصد، یا ۶۰ یا کم یا بیش، اگر عمل کے بالمقابل مستقل الگ نسبت یا الگ مقدار مثلاً ہزار روپیہ ماہانہ مقرر کرے تو باتفاق فقہاء صحیح نہیں۔

اس کی روشنی میں دورِ حاضر کے بہت سے شرکت کے عقد، جو لوگ انجام دیتے ہیں، اس کا فساد واضح ہو جاتا ہے، بعض مرتبہ محنت کرنے والے شریک کے لئے نفع میں اس کے حصہ کے علاوہ جدا تنخواہ رکھی جاتی ہے۔ اور کبھی محنت کے مقابلہ میں نفع کی ایک مقدار مثلاً نصف یا پاؤ اس کے لئے طے کی جاتی ہے، پھر بقیہ نفع سارے شرکاء حسبِ تناسب تقسیم کر لیتے ہیں، لہٰذا معاملات میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے اس کے عتاب وگرفت سے ڈریں، اور یہ جان لیں کہ عقدِ فاسد کی کمائی خبیث ہے، جس میں اللہ تعالیٰ برکت نہیں عطا فرماتے۔

بہرحال، دورِ حاضر میں حالات کے پیشِ نظر، جس میں سخاوت اور مالی قربانی کا جذبہ کم سے کمتر ہوتا جا رہا ہے، "الفقہ المنہجی" کے مصنفوں کی رائے میں حنفیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے مذکورہ مسائل پر عمل کرنے میں حرج نہیں، اگرچہ بہتر اور تقویٰ کے مناسب یہی ہے کہ عمل ایسے انجام دے کہ تمام فقہاء امت کے نزدیک صحیح ہو، یہی دین میں احوط طریقہ ہے۔

عقدِ شرکت کے آثار

جب شرکتِ عنان کے شرائط موجود ہوں، تو وہ صحیح ہوگی، اور اس پر درج ذیل آثار مرتب ہوں گے:

۱-ہر شریک کو شرکت کے مال میں عرف اور عدم ضرر کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تصرف کا اختیار ہوگا، کیونکہ وہ اپنی طرف سے اصیل اور شریک کی طرف سے وکیل ہے۔

لہٰذا دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر ادھار فروخت کرنا، بستی میں رائج سکوں کے علاوہ سے فروخت کرنا، زیادہ نقصان اٹھا کر خرید وفروخت کرنا اور شرکت کا مال سفر میں لے جانا جائز نہ ہوگا، بلا اجازت اس طرح کا تصرف باطل ہوگا، اور دیگر شرکاء کی اجازت تھی تو صحیح ہوگا۔

۲-شرکاء پر طے شدہ شرائط کے مطابق عمل واجب ہے۔

۳-شرائط مذکورہ کے مطابق کسی شریک نے شرکت کے مال سے کچھ خریدا، تو یہ خرید تمام کے لئے ہے۔ لیکن بائع (قیمت وغیرہ کا) مطالبہ صرف خریدار سے کرے گا۔

شرکت کا فساد اور اس کے آثار

شرکت کے مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو شرکت فاسد ہوگی، اعمالِ شرکت کی ابتداء سے قبل ہی فساد کا علم ہو جائے تو اس پر عقد کا کوئی اثر مرتب نہ ہوگا، اگر شرکت باقی رکھنا ہے تو ازسرِنو صحیح طریقے سے اس کی تجدید کرے۔

اعمالِ شرکت کی ابتداء کے بعد خلل اور فساد کا پتہ چلے تو شرکت کو وہیں روک دے، آگے جاری نہ رکھے، آگے جاری رکھنا ہو تو صحیح طریقے سے اس کی تجدید کرے، گذشتہ فساد کی وجہ سے درج ذیل آثار مرتب ہوں گے:

۱- جو نفع ظاہر ہو چکا ہو، ہر شریک کو اس کے مال کے تناسب سے تقسیم کر کے دیا جائے۔

۲- ہر شریک دوسرے شرکاء سے ان کے اموال میں محنت کے عوض اجرت لیگا، کیونکہ یہ واضح ہو گیا کہ وہ ان کا اجیر تھا، نہ کہ شریک۔

۳- شرکاء کے تصرفات معتبر اور نافذ ہوں گے، کیونکہ ہر ایک نے دیگر شرکاء کی اجازت سے تصرف کیا ہے۔

صحیح شرکت کی انتھاء اور اختتام

درج ذیل امور سے عقدِ شرکت ختم ہو جائے گی:

۱- **تمام شرکاء یا بعض کی طرف سے** عقدِ شرکت کو فسخ کرنا، کیونکہ یہ ایک جائز عقد ہے، یعنی ہر شریک جب چاہے فسخ کر سکتا ہے، اور فسخ کرنا اسکا اختتام ہے، اگر دو شریک ہوں اور کسی ایک نے فسخ کر دیا تو شرکت ختم ہو گئی، اگر زائد شرکاء ہوں اور ان میں سے ایک نے فسخ کر دیا تو دیگر شرکاء کی شرکت باقی رہے گی، فسخ نہ ہو گی۔

۲- **موت،** اگر شرکاء کی موت واقع ہو تو شرکت ختم ہو گی، وارثوں کی طرف منتقل نہ ہو گی، اگر دو شریک میں سے ایک مر جائے تو شرکت ختم ہو گی، زائد شرکاء میں ایک مر جائے تو اس کی شرکت ختم ہو گئی، بقیہ شرکاء کی شرکت باقی رہے گی۔

فسخ اور اختتام وفات کے وقت سے ہو گی، چاہے شرکاء کو اس کا علم نہ ہو۔

۳- **جنون اور بے ہوشی:** کوئی شریک پاگل یا بیہوش ہو جائے تو اس کی شرکت فسخ اور ختم ہو جائے گی، لیکن بے ہوشی سے شرکت اس وقت ختم ہو گی جبکہ ایک فرض نماز کا وقت مکمل اسی حالت میں گذرے، ورنہ حرج نہ ہو گا۔

جنون کی صورت میں حکم ولی کی طرف منتقل ہو گا، اب چاہے تو مال کی تقسیم کا مطالبہ کرے، یا نئے سرے سے عقدِ شرکت کرے۔

بے ہوشی کے عنقریب ختم ہونے کا احتمال ہو تو حکم ولی کی طرف منتقل نہ ہو گا، اگر اُسے افاقہ ہو تو، تقسیم کو اختیار کرے، یا پھر جدید عقدِ شرکت کرے، اگر چہ سابق کو برقرار رکھنے کے الفاظ سے ہو، اگر عنقریب بے ہوشی سے افاقہ کی امید نہ ہو، یا بے ہوشی تین دن یا زائد طاری رہے، تو جنون کی طرح حکم ولی کی طرف منتقل ہو گا۔ اب وہ تقسیم کو اختیار کرے یا از سرِ نو شرکت کو۔

مُتفرّقات

۱- کوئی شخص انتقال کر جائے اور اولاد اس کے ترکہ میں (بلا تقسیم) خرید و فروخت، کاشتکاری، حج، شادی بیاہ، وغیرہ تصرف کرتے رہے، پھر بعد میں وراثت کی تقسیم کا مطالبہ ہو، تو اس صورت میں جس نے حج یا شادی بیاہ نہیں کی وہ حج یا شادی میں خرچ کرنے والے سے اپنا حصہ واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اگر اجازت تھی اور اس کی اجازت معتبر بھی ہو، یعنی عاقل، بالغ اور رشید ہو تو واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا اسی طرح بظاہر رضامندی کا قرینہ موجود ہو، تب بھی واپس نہیں لے سکتا۔ اگر اجازت بھی نہ ہو اور رضامندی کا قرینہ بھی نہ ہو، یا ایسے آدمی نے اجازت دی جس کی اجازت کا اعتبار نہیں، تو خرچ کرنے والے سے اپنے حصے کی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے (حاشیة الشروانی علی تحفة المحتاج ۲۰/۷)

۲- امام نووی اور ابن الصلاح نے فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص سونا، چاندی یا گیہوں (وغیرہ) غصب کر کے اپنے مال میں ملالے اور وہ

الگ سمجھ میں نہ آئے، تو مغصوبہ مقدار کو الگ کر کے بقیہ میں تصرف کرنا حلال ہے۔(تحفة المحتاج ۲۳/۷)

۳- زمین کا مالک، بیج کا مالک، ہل کا مالک اور عامل (محنت کرنے والا) چاروں شرکت کریں کہ اناج چاروں میں تقسیم ہوگا، تو یہ شرکت صحیح نہیں، اور نہ یہ اجارہ اور قرض شمار ہوگا، بلکہ کھیتی مکمل بیج کے مالک کی ہوگی، اگر پیداوار حاصل ہو تو اس پر دیگر لوگوں کو اجرت مثل دینا لازم ہے، ورنہ کچھ لازم نہیں (الشروانی علی التحفة ـ ۲۳/۷)

وکالت

عربی میں لفظ 'وکالت' حفاظت اور سپرد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

فقھی تعریف : کوئی شخص جو کام خود کر سکتا ہو، اور اس میں نیابت کی گنجائش ہو، صیغہ کے ساتھ کسی دوسرے کے سپرد کرے، تاکہ وہ اس کی زندگی میں اسے انجام دے، وکالت کہلاتا ہے۔

مشروعیت : قرآن وحدیث کی روشنی میں وکالت کی مشروعیت پر اجماع ہے۔

آیت : " وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَماً مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَماً مِنْ اَهْلِهَا " (سورہ نساء ۳۵) **ترجمہ:** "اور اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (کہ اس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، عورت کے خاندان سے (تجویز کرکے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو۔" اور یہ دونوں آدمی میاں بیوی کی طرف سے وکیل ہوں گے، جو درپیش مسئلہ میں غور وفکر کریں گے، یہ آیت گرچہ زوجین کے متعلق خاص ہے، لیکن وکالت کی مشروعیت کے تعلق سے عام ہے۔

نیز اصحاب کہف کا ایک شخص کو سکہ دے کر سب کے لئے کھانا لانے کے لئے روانہ کرنا بھی توکیل (وکیل بنانا) ہے۔(دیکھئے سورۂ کھف آیت ۱۹) اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی قمیص بھائیوں کے سپرد کرنا تاکہ والد محترم کے چہرے پر ڈال دیں اور بینائی لوٹ آئے۔ اس میں انہیں قمیص لے جانے اور والد کے چہرے پر ڈالنے کے لئے وکیل بنایا جارہا ہے۔(دیکھئے سورہ یوسف آیت ۹۳) ان دونوں واقعات سے بھی وکالت کی تائید وتقویت ہوتی ہے۔ لیکن یہ براہ راست دلیل نہ ہوگی۔ کیونکہ سابقہ شریعت کئی علماء کے نزدیک ہمارے لئے شریعت نہیں ہے۔

احادیث : ۱) سیرت کی کتابوں میں ہے کہ "آپ ﷺ نے حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے حق میں قبول کرنے کے لئے حضرت عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ عنہ کو وکیل بنایا"

۲) حضرت رافع رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: "آپ ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے حلال حالت میں (بغیر احرام کے) نکاح کیا، اور حلال حالت میں ہی دخول ہوا، اور میں ان دونوں کے درمیان سفیر تھا" (ترمذی)

۳) آپ ﷺ نے حضرت عروۃ البارقی رضی اللہ عنہ کے سپرد ایک دینار کیا تاکہ آپ ﷺ کے لئے ایک بکری خریدیں"...... (بخاری ـ ترمذی)

حکمت : اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کی صلاحیت وقوت اور تونگری میں تفاوت رکھا ہے، اور ان کے لئے رزق کے مختلف اسباب فراہم فرمائے ہیں۔

بعض حضرات اپنے تمام امور بذات خود انجام دینے کی قدرت وصلاحیت رکھتے ہیں، لیکن مشاغل وذمہ داریوں کی کثرت دوسروں سے تعاون پر مجبور کرتی ہے، بعضوں کو اپنی ضرورت کے بعض اعمال انجام دینے کی خود قدرت وصلاحیت نہیں ہوتی، بعض متعلقہ ذمہ داری اور اعمال کے متعلق کماینبغی واقفیت اور تجربہ نہیں رکھتے۔ کوئی بے چارہ صاحب حق ہوتا ہے، لیکن دلیل وزبان اور فصاحت وبیان اور قوت گویائی میں کمی کی وجہ سے اپنے حق کے اظہار اور اپنے دفاع پر قادر نہیں ہوتا، اس کے برعکس اس کا مدمقابل اپنی چرب زبانی کی وجہ سے اس کا حق لے ڈوبے گا۔ ان متعدد اسباب کی وجہ سے لوگوں کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اپنے بعض امور میں دوسروں پر اعتماد کریں، اوران کے تجربات اور لیاقت واستعداد سے استفادہ کریں، لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وکالت کو مشروع قرار دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کے حوائج کی تکمیل اور معاملات کی انجام دہی میں سہولت وتیسیر حاصل ہو، اور حرج ومشقت کا ازالہ ودفعیہ ہو۔

حکم : عام حالات میں وکالت جائز ومشروع اور مباح ہے، اگر کسی مستحب کام کی اعانت میں ہو تو مستحب ہے، مکروہ کی اعانت میں مکروہ اور کسی حرام کے تعاون میں ہو تو حرام ہے۔ کبھی حالات کے تحت واجب بھی ہوسکتی ہے، مثلاً کوئی مضطر ہو، اور خود کھانا خریدنے سے عاجز ہو، اور کسی کو وکیل بنائے تو یہ وکالت قبول کرنا واجب ہے، (ورنہ وہ بھوک سے مرجائے گا، اوراسے بچانا واجب ہے)

وکالت کے ارکان

(۱) مُؤَکِّل (۲) وَکیل (۳) صیغه (۴) مُؤَکَّل فیه

۱) مُؤَکِّل : یعنی وہ شخص جو بطور نیابت اپنے بعض امور کی انجام دہی کے لئے کسی دوسرے سے تعاون لے۔ جس تصرف میں وکیل بنا رہا ہے، خود مؤکل کا ملکیت یا ولایت کی وجہ سے اس کا انجام دینا صحیح ہونا شرط ہے۔ یعنی وکیل کو جس تصرف کا اختیار دے رہا ہے۔ شرعاً خود اسے اس تصرف کا حق حاصل ہو، شریعت اس کے تصرف کو صحیح تسلیم کرے اور اس پر آثار واحکام کا ترتب ہو۔

دوسرے کو جس تصرف کا نائب بنا رہا ہے خود ہی شرعاً اسے انجام نہیں دے سکتا، تو اس کی نیابت وتوکیل صحیح نہیں، کیونکہ مؤکل تو اصل ہے۔ جب اصل ہی تصرف پر قادر نہ ہو تو نائب کہاں سے ہوگا۔

لہٰذا کسی مال کے مالک کو اس میں تصرف کے لئے وکیل بنانا جائز ہے۔ جبکہ وہ عاقل بالغ اور نافذ التصرف ہو (یعنی شرعاً اس کا تصرف نافذ ہو) اس پر تصرفات کی پابندی عائد نہ ہو۔

اسی طرح کسی کے مال کے ولی کے لئے، جیسے باپ، دادا، اور وصی، اپنے ماتحت کے مال میں تصرف کے لئے وکیل بنانا جائز ہے۔ کیونکہ ولی خود ولایت کی وجہ سے تصرف کرسکتا ہے۔

ایک عاقل بالغ شخص اپنے نکاح کے لئے کسی کو وکیل بناسکتا ہے، کیونکہ وہ خود اپنا نکاح کرسکتا ہے اور کسی باکرہ لڑکی کے عادل ولی کو اس لڑکی کے نکاح کیلئے دوسرے کو وکیل بنانا جائز ہے۔ کیونکہ وہ خود اس کا نکاح کراسکتا ہے۔

لہٰذا ان تفصیلات کی روشنی میں کسی بچہ، پاگل یا بے ہوش کو وکیل بنانا صحیح نہیں۔ کیونکہ شرعاً یہ بذات خود کوئی تصرف نہیں کرسکتے۔ مال کے بجا تصرف کی وجہ سے جس پر مالی تصرفات کی پابندی عائد ہو، وہ کسی مالی تصرف میں دوسرے کو وکیل نہیں بناسکتا۔ ایک فاسق باپ اپنی بیٹی کے نکاح کے لئے دوسرے کو وکیل نہیں بناسکتا، کیونکہ وہ خود (فاسق ہونے کی وجہ سے) بیٹی کا نکاح نہیں کراسکتا۔

عورت چونکہ بذات خود اپنا نکاح نہیں کرسکتی، لہٰذا کسی کو اپنے نکاح کا وکیل بھی نہیں بناسکتی۔ حج یا عمرہ کے احرام میں کوئی اپنا نکاح نہیں

کرسکتا، اسی طرح کسی کو احرام کی حالت میں عقد نکاح کے لئے وکیل نہیں بنا سکتا۔ اگر احرام کے بعد نکاح کے لئے وکیل بنائے تو صحیح ہے۔

اس اصول سے نابینا خارج ہے، وہ خرید وفروخت وغیرہ امور جو دیکھنے پر موقوف ہیں، بذات خود انجام نہیں دے سکتا، لیکن کسی دوسرے کو ان امور میں مجبوری کی وجہ سے وکیل بنا سکتا ہے۔ اگر اسے توکیل کی بھی اجازت نہ ہو تو شدید مصیبت ومشقت کا شکار ہوگا۔

۲) **وکیل :** یعنی جو دوسرے کی جانب سے بطور نیابت اس کی اجازت وتوکیل سے تصرف کرے۔

وکیل میں یہ شرط ہے کہ متعلقہ تصرف اور ذمہ داری کا بذات خود اپنے لئے انجام دینا صحیح ہو، اگر خود اپنے لئے وہ تصرف نہیں کرسکتا، تو اس میں کسی دوسرے کا وکیل بھی نہیں بن سکتا، کیونکہ ایک انسان کا اپنی ذات کے لئے تصرف دوسروں کے لئے تصرف کے مقابلہ میں قوی ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنے لئے اصالۃً اور دوسرے کے لئے نیابۃً انجام دیتا ہے۔ اور اصالت نیابت سے قوی تر ہوتا ہے۔ لہٰذا جب قوی تر کی بنیاد پر تصرف صحیح نہ ہو تو ضعیف میں بدرجہ اولیٰ صحیح نہ ہوگا۔

اسی لئے بچے، پاگل اور بے ہوش کو وکیل بنانا صحیح نہیں۔ ایک باشعور بچے کو نفل حج، قربانی کے جانور کو ذبح کرنا، اور زکات کی تقسیم کے لئے وکیل بنانا صحیح ہے، کیونکہ خود اپنے حق میں وہ ان تصرفات کو انجام دے سکتا ہے۔ سفیہ مالی تصرفات میں وکیل نہیں بن سکتا۔ اور ایک نابینا ایسے تصرف میں وکیل نہیں بن سکتا جس کی صحت مشاہدہ پر موقوف ہو۔ جو شخص حج یا عمرہ کے احرام میں ہو، اسے نکاح کے لئے وکیل نہیں بنا سکتے، جیسا کہ ایک عورت کو نہیں بنا سکتے، کیونکہ یہ خود اپنا نکاح نہیں کرسکتے۔

البتہ ایک باشعور اور اطمینان بخش بچہ گھر میں داخلہ کی اجازت، اور کسی کو ہدیہ پہنچانے وغیرہ میں وکیل بن سکتا ہے۔ کیونکہ اسلاف نے ایسے امور میں چشم پوشی سے کام لیا ہے، لہٰذا ان امور میں بچے کی بات پر اعتماد کیا جائے گا۔ اسی طرح کسی کی دعوت ولیمہ کی خبر میں بھی اس پر اعتبار کریں گے۔ نیز ایک فاسق اور غیر مسلم بھی ان امور میں بچے کی طرح ہے، بقول امام نوویؒ ان دونوں پر اعتماد میں کوئی اختلاف نہیں۔

وکیل معین ہونا بھی شرط ہے۔ اگر دو آدمیوں سے کہے: تم میں سے ایک کو اپنا گھر فروخت کرنے کے لئے وکیل بنایا، یا جو بھی میرا گھر فروخت کرنا چاہے، میں نے اسے فروخت کے لئے وکیل بنایا تو صحیح نہیں۔

اگر قاضی یا ولی کی جانب سے ان کے ماتحتوں کے مال کے فروخت کے لئے وکیل بنایا جائے تو اس کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔

۳) **صیغہ :** ایجاب وقبول کے درج ذیل شرائط ہیں۔

۱) مؤکل کی جانب سے صراحتاً یا کنایتاً ایسا لفظ پایا جائے جو توکیل سے اس کی رضامندی پر دلالت کرے، کیونکہ ایک مکلف کو دوسرے کی اجازت کے بغیر اس کے حق میں تصرف ممنوع ہے۔

صریح: مثلاً میں نے تم کو اپنا مکان فروخت کرنے کے لئے وکیل بنایا، میں نے مکان کا فروخت کرنا تمہارے سپرد کردیا۔

کنایتہ: مثلاً میں نے اس کے فروخت میں تم کو اپنا قائم مقام بنایا، یا نائب بنایا

وکالت میں تحریر اور خط بھی گفتگو والفاظ کے قائم مقام ہیں۔

وکیل کی جانب سے قبول پایا جانا کافی ہے، باقاعدہ لفظ شرط نہیں، بلکہ فعل بھی کافی ہے۔

۲۔ کسی شرط پر معلق نہ ہو، مثلاً یوں کہا: اگر زید سفر سے آگیا تو تم فلاں کام میں میرے وکیل، یا اگر ماہ رمضان آجائے تو تم کو فلاں میں وکیل بنایا۔

اگر اس صورت میں شرط کے مطابق وکیل تصرف کرے، تو اس کا تصرف صحیح ہوگا، کیونکہ تصرف کی اجازت تھی۔

اگر وکالت فوراً ہو، لیکن تصرف کو معلق کرے، تو صحیح ہے مثلاً یوں کہا: میں نے تمہیں وکیل برائے فروخت مکان بنایا، بشرطیکہ فلاں کی آمد کے بعد اسے فروخت کرو، یا فلاں ماہ میں فروخت کرو۔

اسی طرح وکالت کو محدود کرنے میں حرج نہیں۔ مثلاً تم ایک ماہ کے لئے میرے وکیل ہو، تو یہ وکالت صحیح ہے۔ اور ماہ ختم ہوتے ہی وکالت بھی ختم ہوگی۔ اس کے بعد وکیل کو تصرف کا حق نہ ہوگا۔

۴) **مؤکل فیه** : یعنی وہ عمل اور تصرف جو وکیل مؤکل کی جانب سے انجام دے، اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱) بوقت توکیل اس میں مؤکل کو تصرف کا حق ثابت ہو، جیسے کسی ایسی چیز کے فروخت کے لئے وکیل بنانا جس کا بوقت توکیل مالک ہے۔ یا اپنے زیر ولایت بچے کا گھر کرایہ پر دینے کے لئے وکیل بنانا، جس کا بچہ بوقتِ عقد مالک ہے۔ لہٰذا جس کا مالک نہیں، یا آئندہ مالک بننے والا ہے۔ اس میں تصرف کے لئے وکیل نہیں بنا سکتا۔ مثلاً اپنے دوست کا مکان فروخت کرنے کے لئے وکیل بنانا، جس کا یہ مالک نہیں ہے۔ یا زید کا وہ مکان فروخت کرنے کیلئے وکیل بنائے، جو آئندہ یہ اس سے خریدنے والا ہے، یا فلاں عورت کو طلاق دینے وکیل بنائے۔ جس سے آئندہ نکاح کرنے والا ہے، تو ان تمام صورتوں میں وکالت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بوقت توکیل وہ خود ان امور کو انجام نہیں دے سکتا، تو کسی دوسرے کو وکیل کیسے بنا سکتا ہے؟

اگر فی الحال مملوکہ چیز کے تابع آئندہ ملکیت میں آنے والی چیز میں تصرف کے لئے وکیل بنائے، تو یہ وکالت صحیح ہے۔ مثلاً اپنے درختوں پر آئندہ آنے والے پھل کے فروخت کے لئے وکیل بنانا صحیح ہے۔ کیونکہ اصل یعنی درختوں کا مالک ہے۔ یا فی الحال موجود کپڑوں کے فروخت کے لئے اور آئندہ خریدے جانے والے کپڑوں کے فروخت کے لئے وکیل بنائے۔ تو فی الحال غیر موجود کپڑوں میں بھی تبعا توکیل صحیح ہے۔ اگر اپنی کوئی چیز فروخت کر کے اس کی قیمت سے دوسری چیز خریدنے کے لئے وکیل بنائے تو صحیح ہے۔

۲) مؤکل فیہ فی الجملہ معلوم ہو، ہر اعتبار سے معلوم ہونا شرط نہیں، کہ یہ دشوار ہے۔ نیز وکالت کی مشروعیت حاجت کی وجہ سے ہے۔ جس کا تقاضہ یہ ہے کہ کچھ تسامح و درگذر سے کام لیا جائے۔

اگر کہے: میں نے تمہیں اپنا مال فروخت کرنے، اور قرض وصول کرنے، اور میرے ودیعتوں کو واپس لینے کے لئے وکیل بنایا، تو یہ صحیح ہے، خواہ اموال، قرض اور مقروض ودیعت اور اصحاب ودیعت نامعلوم ہوں، کیونکہ اس میں ضرر کم ہے۔ اور مؤکل فیہ کسی درج میں معلوم ہو چکا۔

اگر کہے: میرے چھوٹے بڑے سارے امور میں تم کو وکیل بنایا، یا ہر چیز تمہارے سپرد کردی، یا تم میرے وکیل ہو بس جیسا چاہو تصرف کرو، تو توکیل صحیح نہیں، کثرت ضرر اور بالکل ہی جہالت کی وجہ سے۔

لہٰذا دور حاضر کا وکالت عامہ صحیح نہیں، جس کے نقصانات واضح ہیں کہ بعض مرتبہ وکیل ایسے اشیاء میں تصرف کرتا ہے، جو مؤکل کو پسند نہیں ہوتے۔

اسی طرح اپنا بعض مال فروخت کرنے وکیل بنائے، لیکن اس بعض کی تعیین نہ کرے تو کثرت جہالت اور کافی دھوکہ وغرر کی وجہ سے صحیح نہیں۔

۳) مؤکل فیہ نیابت کے قابل ہو، تو جو کام نیابت کو قبول نہ کرے، اس میں توکیل صحیح نہیں۔ اسی لئے خالص بدنی عبادات مثلاً روزہ ونماز وغیرہ میں وکالت صحیح نہیں، کیونکہ ان کی تشریع کا مقصد وحکمت نفس کے مجاہدہ کے ذریعہ امتحان وآزمائش ہے۔ جو دوسرے کے انجام

دینے سے حاصل نہ ہوگا۔

جن عبادات کی ادائیگی کے لئے جسمانی قدرت شرط ہو، نہ کہ وجوب کے لئے، اس میں بذاتِ خود انجام دہی سے عاجز ہو، تو توکیل صحیح ہے۔ جیسے حج وعمرہ

اسی طرح مالی عبادات کی تکمیل اور اس پر اعانت کے قبیل سے جو امور ہوں، ان میں توکیل صحیح ہے، جیسے مستحقین پر زکات کی تقسیم، نذر یا کفارہ کے مال کی تقسیم، قربانی کے جانور ذبح کرنا، ولیمہ کی بکری ذبح کرنا وغیرہ۔

کن امور میں وکالت صحیح ہے، اور کن میں نہیں، اس کی تفصیل: وکالت یا تو حقوق اللہ میں ہوگی یا حقوق العباد میں۔

حقوق اللہ میں وکالت: حق اللہ یعنی جو احکام مصلحت عامہ کے پیش نظر مشروع ہوں، نہ کہ کسی معین فرد کے مصلحت کے لئے، پس یہ ایسا عام نظام ہے جس سے ہر کسی کا حق متعلق ہو، اسی لئے تمام انسانیت کے رب کی طرف منسوب ہوا۔ اور اسے حق اللہ کہا گیا۔ کیونکہ وہی تنہا اس کے مستحق ہیں، کوئی انسان اسے ساقط نہیں کر سکتا۔ خالص عبادات اس میں داخل ہیں۔ اور ہم جان چکے کہ اس میں توکیل صحیح نہیں۔ اسی میں کامل عقوبتیں یعنی حدود داخل ہیں۔ اس میں وکالت یا تو اثبات کے لئے ہوگی یا نفاذ کے لئے۔

اگر حدود کے اثبات (ثابت کرنے) کے لئے وکالت ہو تو صحیح نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد درگذر پر ہے۔ یعنی شارع نے اس کے درگذر اور اسقاط کو ترجیح دی ہے، لہٰذا معمولی شبہ کی وجہ سے بھی ساقط ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کے اثبات کے لئے توکیل اس بات کے منافی ہے، کیونکہ اس سے اس کا نفاذ واجب ہوگا۔

اور اگر حدود کے نفاذ اور جاری کرنے کے لئے وکیل بنائے تو یہ جائز اور صحیح ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے زنا کے ثبوت کے بعد رجم کے لئے اور شراب کے ثبوت کے بعد کوڑے برسانے کے لئے وکیل بنایا۔ (دیکھئے بخاری شریف، الوکالۃ، باب: الوکالۃ فی الحدود)

حقوق العباد (بندوں کے حقوق) میں وکالت: انفرادی حیثیت سے بندوں سے متعلقہ حقوق کو حقوق العباد کہا جائے گا، جیسے خرید وفروخت، شادی بیاہ، طلاق، شرکت اور صلح وغیرہ، ان حقوق میں باتفاق علماء وکالت صحیح ہے۔ اسی میں اپنے حق کے اثبات کے لئے جھگڑنا اور دلیل پیش کرنا داخل ہے، اور اس میں بھی وکالت جائز ہے، دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عقیل کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس وکیل بنایا اور فرمایا: "یہ جو کچھ اپنے حق میں فیصلہ کریں وہ میرے حق میں ہوگا۔ اور جو کچھ اپنے خلاف فیصلہ کریں۔ وہ میرے خلاف ہوگا۔" اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روبرو حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کو وکیل بنایا اور کہا: "خصومت انسان کو مکروہات پر برانگیختہ کرتا ہے، اور شیطان وہاں حاضر ہوتا ہے۔ اور مجھے وہاں حاضر ہونا ناپسند ہے۔" (البیھقی: باب: التوکل فی الخصومات)

قصاص میں وکالت: قصاص کے اثبات اور نفاذ کے لئے وکالت صحیح ہے، کیونکہ اس میں حق العبد (بندہ کے حق) کا پہلو غالب ہے، یعنی مقتول کے اولیاء کا حق غالب ہے، اسی لئے وہ اسے ساقط اور معاف کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بجائے دیت وصول کر سکتے ہیں۔

گواہی، قسم اور نذر میں وکالت: شہادت (گواہی) میں وکالت صحیح نہیں۔ مثلاً یوں کہنا: "میں نے تمہیں

وکیل بنایا کہ تم میری جانب سے یوں گواہی دو۔" کیونکہ شہادت کا تعلق شاہد (گواہ) کے علم سے ہے۔ اس لئے کہ شہادت دیکھی یا سنی بات کی خبر دینا ہے، جو وکیل کو حاصل نہیں، لہٰذا شہادت کا تعلق براہ راست شاہد سے ہوگا، یہ توکیل کو قبول نہ کرے گا، اگر اس میں وکیل بنائے تو وکیل شہادت پر شاہد ہوگا۔

اسی طرح قسم اور نذر میں وکالت صحیح نہیں، مثلاً یوں کہنا: میں نے تمہیں میری جانب سے قسم لینے کے لئے یا نذر ماننے کے لئے وکیل بنایا، کیونکہ اس میں اللہ کی تعظیم ہے، لہٰذا یہ خالص عبادت کے مشابہ ہوا، تو اس کا تعلق براہ راست قسم لینے اور نذر ماننے والے سے ہوا۔

ایلاء۔ لعان، قَسَامَۃ اور ظہار میں وکالت: ان امور میں بھی وکالت صحیح نہیں، کیونکہ یہ (سب مختلف قسم کے) قسم ہیں۔

اقرار میں وکالت: مثلاً یوں کہنا: میں نے تمہیں وکیل بنایا کہ تم میری جانب سے اس بات کا اقرار کرو کہ فلاں کے میرے ذمہ ہزار روپے ہیں، اس طرح اقرار میں توکیل صحیح نہیں، اور اگر یہ اقرار کرے تو مؤکل پر وہ رقم لازم نہ ہوگی، کیونکہ اقرار گواہی کی طرح اثبات حق کی خبر دینا ہے، لہٰذا توکیل کو قبول نہ کرے گا۔

مباحات (مثلاً شکار، جنگل کی لکڑیاں وغیرہ) کا مالک بننے میں وکالت: اگر کسی کو اپنی جانب سے شکار کرنے، یا لکڑی وایندھن چننے کے لئے وکیل بنائے، تو صحیح ہے، اور وکیل مؤکل کی نیت سے جو شکار اور لکڑیاں جمع کرے، مؤکل اس کا مالک ہوگا۔

کسی حرام کام میں وکالت: کسی چیز کی چوری یا غصب کے لئے، یا کسی گناہ وظلم کے لئے وکیل بنانا صحیح نہیں، اگر وکیل نے ان میں سے کوئی کام انجام دیا، تو وہی اس کا ضامن و ذمہ دار اور گنہگار ہوگا، کیونکہ حرام امور کا حکم ارتکاب کرنے والے کے ساتھ خاص ہے، نیز شارع کا مقصد اس کی تحریم سے ہر کسی کو اس سے روکنا ہے۔

وکیل کے تصرفات کے حدود

۱) **خصومت (جھگڑے و نزاع) میں وکالت:** یعنی عدالت میں دعویٰ دائر کرنے اور انصاف وفیصلہ کے مطالبہ کے لئے توکیل، (جیسا کہ عموماً کیس میں ہوتا ہے) یہ وکیل اپنے مؤکل کے حق کے اثبات یا مدمقابل کے دعویٰ کی تردید ودفاع سے متعلق تمام تصرفات کا مالک ہے، البتہ اسے اپنے مؤکل کی جانب سے اقرار کا حق حاصل نہیں۔

کسی مالی معاملہ میں وکیل اپنے مؤکل کا حق ثابت کرے اور اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے تو اسے اس حق پر قبضہ کا اختیار نہ ہوگا، کیونکہ حق کے اثبات میں توکیل سے قبضہ کی اجازت نہ ہوگی، نہ تو لفظاً اور نہ عرفاً، کیونکہ جھگڑے اور حق کو ثابت کرنے میں کسی کی توکیل سے رضامندی سے یہ لازم نہیں کہ وہ قبضہ کے مناسب امانت دار اور اطمینان بخش بھی ہو، اور اس کے قبضہ سے راضی ہو۔

۲) **قبضہ کے لئے توکیل:** اگر ایک شخص دوسرے کو وکیل بنائے تاکہ وہ فلاں کے پاس اس کا جو حق ہے، اس پر قبضہ کرے، اور وہ فلاں مؤکل کے اس حق کا انکار کرے، تو ایک قول یہ ہے کہ وکیل اس حق کے اثبات کے لئے لڑسکتا ہے، لیکن راجح قول یہ ہے کہ محض قبضہ کی توکیل میں اس طرح اثبات کے لئے خصومت کی گنجائش نہیں۔

۳) **خرید و فروخت کے لئے وکیل: (الف)** فروخت کرنے کے لئے وکالت۔ یہ وکالت یا تو مطلق ہوگی یا

مقید۔

مطلق وکالت: یعنی بغیر کسی قید کے کسی چیز کے فروخت کرنے کے لئے وکیل بنانا، اس صورت میں وکیل درج ذیل امور کا پابند ہوگا۔

۱) شہر میں عام طور پر رائج سکوں کے عوض ہی فروخت کرے، مثلاً روپے رائج ہوں تو ریال وغیرہ سے فروخت نہ کرے۔

۲) ادھار فروخت نہ کرے، خواہ اس میں قیمت زیادہ ملے، کیونکہ مطلق توکیل ہے۔ تو نقد فروخت کرنا چاہئے، اس لئے کہ غالباً یہی معتاد ہے۔

اگر ادھار فروخت کرنے وکیل بنائے اور مدت متعین کی ہو، تو اس مدت تک ادھار فروخت کرسکتا ہے، اس سے زائد نہیں، اگر اس سے کم مدت کے لئے یا نقد فروخت کرے تو صحیح ہے، لیکن نقد فروخت کرنے میں مؤکل کا نقصان ہو، مثلاً قیمت کی کمی یا قیمت پر خطرہ وغیرہ تو صحیح نہیں، اگر مؤکل کی جانب سے مدت متعین نہ ہو، تو اس جیسی چیز میں عرفاً جو مدت ہوتی ہے، اس پر محمول کریں گے۔ اور کوئی عرف نہ ہو تو مؤکل کے لئے زیادہ نفع بخش صورت کی رعایت کرے۔

۳) **غَبَنِ فاحش** (زیادہ نقصان) کے ساتھ فروخت نہ کرے، یعنی قیمت اتنی کم نہ ہو جس سے غالباً چشم پوشی نہ برتی جاتی ہو، اور اس کا ضابطہ یہ بیان کیا گیا کہ قیمت کا اندازہ لگانے والوں کے اندازہ سے کم ہو، مثلاً ۷ ر سے ۱۰ ر کے درمیان کا اندازہ لگائیں، اور اسے ۵ یا ۶ میں فروخت کرے تو یہ غبن فاحش ہے۔ (۷ ر یا زائد میں فروخت کرے تو غبن فاحش نہیں)

مذکورہ تینوں قید میں سے کسی کی مخالفت کرے اور بیچے تو یہ بیع صحیح نہیں، اگر مبیع (چیز) خریدار کے سپرد کردے، تو وکیل اس کا ضامن ہے، کیونکہ تصرف میں تعدی وزیادتی کی ہے۔ اب اگر مبیع موجود ہو تو اسے واپس لوٹا لے، ورنہ مؤکل وکیل یا خریدار میں سے جس سے چاہے اپنی قیمت وصول کرے آخر میں ضمان خریدار پر ہی ہوگا۔ اگر وکیل کے سپرد قیمت کرچکا تھا، تو اس سے لوٹا لے۔

مقید وکالت: یعنی کسی چیز کے فروخت کے لئے وکیل بنائے، اور اسے کسی شخص، یا جگہ، یا وقت یا قیمت کے ساتھ مقید کرے، اگر کسی شخص کے ساتھ مقید کرے، مثلاً یوں کہا: یہ چیز زید کے ہاتھ فروخت کرو، تو اسی کو فروخت کرنا چاہئے، کیونکہ یہ تخصیص کسی خاص مقصد کے تحت ہوگی، مثلاً زید کا مال شبہ سے بالاتر ہوگا، اگر قرینہ سے یہ واضح ہو کہ اصل مقصد نفع کی تحصیل ہے، تو کسی دوسرے کو فروخت کرنا بھی جائز ہے۔

اگر وقت کے ساتھ مقید کرے: مثلاً کہا: یہ چیز بروز جمعہ فروخت کرو، تو اسی دن فروخت کرے، اس سے قبل یا بعد نہیں کرسکتا، ممکن ہے اس وقت کوئی خاص بات ہو جس کی وجہ سے یہ اس وقت فروخت کو ترجیح دے رہا ہے۔

اگر کسی جگہ، مثلاً فلاں بازار کے ساتھ مقید کرے، اور اس میں کچھ صحیح مقصد ہو، مثلاً وہاں زیادہ قیمت ملتی ہے، تو دوسری جگہ فروخت کرنا جائز نہیں، تا کہ مؤکل کی غرض فوت نہ ہو، اور اس تعیین میں کوئی صحیح غرض نہ ہو، مثلاً وہاں اور دوسری جگہ قیمت مساوی ہو، تو راجح یہ ہے کہ وہ دوسری جگہ بھی فروخت کرسکتا ہے، کیونکہ مقصد دونوں جگہ یکساں حاصل ہو رہا ہے۔ اس لئے ایک جگہ فروخت کی اجازت دیگر مقامات میں بھی اجازت سمجھی جائے گی۔

اگر قیمت متعین کردے، مثلاً ۱۰۰ ر روپے میں فروخت کرو۔ تو اس سے کم قیمت میں، گرچہ معمولی کمی کیوں نہ ہو، فروخت نہیں کرسکتا۔ لیکن اس سے زائد قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ عرفاً اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ متعینہ قیمت سے کم میں فروخت نہ کرے،

بلکہ زائد قیمت پر خریدار موجود ہوتو اسے ۱۰۰ ار روپے میں فروخت کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ وکیل مؤکل کے حق میں زیادہ نفع بخش صورت کا پابند ہے۔ بلکہ اگر خیار شرط کی مدت میں بھی کوئی زائد قیمت دے کر خریدنا چاہتا ہے تو اسے فسخ کر کے اسکے ہاتھ فروخت کرے، اگر اس نے فسخ نہ کیا تو خود بخود فسخ ہو جائے گا۔

اگر مؤکل صراحتاً اضافہ سے منع کر دے، مثلاً یوں کہے، ۱۰۰ ار روپے میں فروخت کرو، اس سے زائد قیمت نہ لینا، تو اب زائد قیمت پر فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ صراحت کے آگے عرف کا کوئی اعتبار نہیں۔

ایسے شخص کو فروخت کرنا جہاں سہولت اور قیمت کی کمی کی تہمت لگے : کسی چیز کے فروخت کے لئے جو وکیل ہو، وہ خود اپنی ذات کے لئے، یا اپنے نابالغ اولاد یا کسی ماتحت (زیر ولایت) کے لئے نہیں خرید سکتا، کیونکہ ایسی وکالت میں اصل عرف یہ ہے کہ دوسرے کو فروخت کرے، حتی کہ مؤکل اجازت دے تب بھی یہ خریدنا صحیح نہیں، کیونکہ فروخت کنندہ اور خریدار کے اغراض جدا ہوتے ہیں۔ خریدار کم سے کم دام کا متمنی ہوگا، اور وکیل کی ذمہ داری ہے کہ مؤکل کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے زائد دام پر فروخت کرے، لہٰذا دونوں ایک ہوں تو یہ غرض فوت ہوگی۔

ان کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کو فروخت کرنا جائز ہے۔ مثلاً باپ، دادا، بیوی، بھائی، بالغ اولاد وغیرہ، جبکہ ایک اجنبی کو جس قیمت پر فروخت کیا ہوتا، اسی پر انہیں فروخت کرے، اس صورت میں تہمت کا سوال نہیں، لہٰذا یہ بیع صحیح ہوگی، جیسا کہ اپنے کسی دوست کو جو رشتہ دار نہ ہو فروخت کرنا صحیح ہے۔

بیع فاسد کی توکیل : اگر کسی عقد فاسد کے ذریعہ فروخت کے لئے وکیل بنائے، تو وکیل کو یہ عقد انجام دینا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہیں دی، تو مؤکل کو خود اس کا اختیار نہیں۔ پھر وکیل کو کیسے سونپ سکتا ہے۔ جیسے ربوی مال اسی جنس کے عوض کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا۔ (مثلاً ایک صاع گیہوں دو صاع کے عوض) یا حرام قیمت کے عوض فروخت کرنا (مثلاً آلات لہو، شراب وغیرہ)

مذکورہ صورت میں وکیل کو صحیح عقد کے ذریعہ بھی فروخت کا اختیار نہ ہوگا، کیونکہ مؤکل نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

(ب) خریدنے کے لئے وکالت:

مطلق وکالت : یعنی کسی موصوف شئی کو قیمت ونوع کی تعیین کے بغیر خریدنے کے لئے وکیل بنانا، مثلاً: میں نے تمہیں ایک کار خریدنے کے لئے وکیل بنایا، اس صورت میں وکیل ان امور کا پابند ہوگا۔

۱- عیب دار چیز نہ خریدے، اگر عیب دار چیز خریدے تو یہ تفصیل ملحوظ رہے گی:

اگر وکیل عیب سے واقف تھا: تو یہ خریدی وکیل کے حق میں ہوگی، نہ کہ مؤکل کے حق میں۔

اگر وکیل عیب سے ناواقف تھا : اور قیمت عیب دار چیز کے مناسب ہے، تو یہ خریدی مؤکل کے حق میں ہوگی، کیونکہ قیمت کے اعتبار سے اسکا کوئی نقصان نہیں، نیز وہ چاہے تو بائع کو واپس بھی کر سکتا ہے، اور وکیل کا کوئی قصور نہیں، کہ وہ تو عیب سے ناواقف تھا۔ اگر چیز عیب سمیت ادا کردہ قیمت کے مساوی نہ ہو، تب بھی اصح یہی ہے کہ خریدی مؤکل کے حق میں ہوگی، جیسا کہ وہ خود ناواقفیت کی وجہ سے خریدتا تو ہوتا، اس صورت میں اگر وہ چیز موکل کے مال سے خریدی گئی ہے، تو صرف مؤکل کو عیب کی وجہ سے رد کرنے کا اختیار ہوگا، اگر وہ راضی ہے تو وکیل کو رد کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر وکیل کے ذمہ میں خریدا ہو، تو اسے بھی رد کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۲- **ثمن مثل سے ھی خریدے،** یعنی اس چیز کی عام طور پر جو مناسب قیمت ہو، اس سے مہنگی نہ خریدے، اگر معمولی اضافہ ہو، جس سے عموماً چشم پوشی برتی جاتی ہے، تو حرج نہیں، اگر زیادہ تفاوت ہو تو یہ خرید مؤکل کے حق میں نہ ہوگی۔

مقید وکالت: مؤکل چیز کی نوعیت کا قیمت وغیرہ کی قید لگائے، تو وکیل کو اس کی پابندی لازم ہے۔ اگر اس نے قید کی مخالفت کی تو یہ خریدی اسی کی ہوگی نہ کہ مؤکل کی۔ الا یہ کہ مخالفت مزید خیر کا باعث ہو۔

نوع کی مثال: مجھے فلاں قسم کی ایک کار جو فلاں سن کا ماڈل ہو، خرید دیجئے، اب اس تفصیل کے مطابق خریدے تو وہ کار مؤکل کی ہے، ورنہ وکیل کی ہے۔

قیمت کی مثال: میرے لئے ایک لاکھ میں ایک مکان خرید کر دیجئے۔ اب اگر وکیل نے دو لاکھ میں خریدا تو یہ مؤکل کے لئے نہیں، بلکہ وکیل کے لئے ہے۔

مزید چیز اور بھتری کی مثال: مخصوص اوصاف کی چیز ایک لاکھ میں خریدنے کہے اور وکیل انہیں اوصاف سے متصف چیز ۸۰ ؍ ہزار میں خریدے تو اس میں مزید خیر کا پہلو ہے۔ اس لئے مؤکل کے حق میں ہوگی، اسی طرح معین اوصاف کی ایک چیز متعین قیمت سے خریدنے وکیل بنائے اور وکیل اس قیمت میں ویسی ہی دو چیزیں خریدے، تو یہ خریدی بھی مؤکل کے حق میں صحیح ہوگی۔ کیونکہ اس مخالفت میں مؤکل ہی کا نفع ہے۔ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اس پر دلالت ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''آپ ﷺ نے ایک دینار میرے سپرد کیا، تا کہ میں آپ کے لئے ایک بکری خریدوں تو میں نے دو بکریاں خریدیں۔ پھر اس میں سے ایک کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا۔ اور ایک بکری اور ایک دینار لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور تفصیل بیان کی، تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تمہارے خرید وفروخت میں برکت عطا فرمائے۔'' (بخاری، ترمذی)

وکیل کا خیار شرط لگانا۔ جو فروخت کے لئے وکیل ہو، وہ خریدار کے لئے، اور جو خریدی کے لئے وکیل ہو، وہ فروخت کنندہ کے لئے، خیار شرط کا حق نہیں دے سکتا، کیونکہ اس میں مؤکل کا کوئی فائدہ ومصلحت نہیں، اگر مؤکل اجازت دے تو جائز ہے۔
وکیل اپنے یا مؤکل کے لئے خیار شرط کی قید لگا سکتا ہے، کیونکہ اس میں مؤکل کے حق میں مصلحت اور احتیاط کا پہلو پایا جا رہا ہے۔

عقدِ وکالت کے حقوق اور اس کا حکم

حقوق عقد سے مراد وہ تصرفات ہیں، جو عقد کے غایت ومقصود کے لئے لازمی ہیں۔ مثلاً بیع میں چیز کی سپردگی اور قیمت پر قبضہ، نکاح میں مہر کا مطالبہ وغیرہ اور حکم کا مطلب عقد کی غرض وغایت اور مقصود، جیسے مبیع میں خریدار کی ملکیت کا ثبوت، عقد نکاح میں بیوی سے جنسی تعلقات کی حلت وغیرہ۔ اس وقت ان حقوق اور احکام کے مستحق کے متعلق گفتگو کرنا ہے۔

حکم عقد: عقد کا حکم مؤکل کے لئے ثابت ہوگا، نہ کہ وکیل کے لئے۔ کیونکہ وکیل تو صرف ایک واسطہ ہے۔ اور وہ مؤکل کے حوالہ اور نام سے ہی گفتگو اور عقد کرتا ہے۔ پس عقد پر اس کی ولایت مؤکل سے مستفاد ہے۔ تو گویا درحقیقت عاقد مؤکل ہی ہے۔
لہٰذا وکیل کی جانب سے جیسے ہی عقد مکمل اور صحیح ہوگا، فوراً اس کا حکم مؤکل کے حق میں ثابت ہوگا۔

حقوقِ عقد: عقد کے اعتبار سے ان کی دو قسمیں ہیں، کیونکہ وکیل جس عقد کے انجام دے گا، یا تو اسے اپنی جانب منسوب کرے گا یا مؤکل کی جانب۔

وہ عقود جنھیں وکیل اپنی جانب منسوب کرتا ھے: جیسے خرید وفروخت اجارہ وغیرہ، کیونکہ وکیل بوقت عقد کہے گا، میں نے فروخت کیا، میں نے خریدا، میں نے اجرت پر دی، یہ نہیں کہے گا کہ مؤکل کی جانب سے یا مؤکل کے لئے لہٰذا ان عقود کے احکام وکیل سے متعلق ہونگے نہ کہ مؤکل سے، پس عقد سے قبل چیز (مبیع) کے دیکھنے میں وکیل کا اعتبار ہوگا اور وکیل کے مجلسِ عقد سے جدائی کی صورت میں عقد لازم ہوگا۔ وہی مبیع یا قیمت کا مطالبہ کرے گا اور سامنے والے سے بدل اپنے قبضہ میں لے گا.........وغیرہ

وہ عقود جو مؤکل کی جانب منسوب کرتا ھے: مثلاً نکاح، خلع، قتل کے عوض صلح وغیرہ، کیونکہ وکیل بوقت عقد کہے گا: مثلاً میں نے تمہاری بیٹی کا نکاح اپنے مؤکل فلاں کے حق میں قبول کیا، تمہاری فلانی بیوی کی جانب سے تمہارے ساتھ خلع کا معاملہ کرتا ہوں، وغیرہ۔

ان عقود کے احکام کا تعلق مؤکل سے ہوگا۔ نہ کہ وکیل سے، لہٰذا نکاح کی صورت میں مہر کا مطالبہ مؤکل سے ہوگا، نہ کہ وکیل سے اور خلع میں بدل خلع کا مطالبہ مؤکلہ بیوی سے ہوگا، جسے خلع دیا جارہا ہے، نہ کہ وکیل سے..........

وکالت سے متعلق احکام

۱) **وکیل کی توکیل:** مؤکل فیہ یعنی جو کام وکیل کے سپرد کیا گیا ہے، وکیل خود اسے انجام دے سکتا ہو، اور وہ کام اس کی سطح کے افراد کے شایانِ شان بھی ہو، (خلاف شان نہ ہو، تو وکیل خود ہی اسے انجام دے گا) کسی دوسرے کو مؤکل کی اجازت کے بغیر وکیل نہیں بنا سکتا، کیونکہ مؤکل اس کے تصرف سے راضی ہے، نہ کہ کسی دوسرے کے، اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

اگر متعلقہ ذمہ داری اور کام وکیل سے بذاتِ خود انجام نہ پاسکے، اس کی عدم صلاحیت کی وجہ سے، یا براہِ راست انجام دینا اسے زیبا نہ دینے کی وجہ سے، تو اس صورت میں یہ وکیل اس کی انجام دہی کے لئے کسی دوسرے کو وکیل بنا سکتا ہے، کیونکہ مؤکل کی جانب سے ایسی ذمہ داری اسے سونپنے کا اصل مقصد یہی ہوگا کہ وہ دوسرے کے ذریعے اسے کروائے۔

اگر مؤکل فیہ وکیل کو زیبا بھی ہو اور صلاحیت بھی ہو، لیکن کثرت کی وجہ سے تنہا انجام دینا دشوار ہو، تو اپنے بس سے زائد امور میں دوسرے کو وکیل بنا سکتا ہے، کیونکہ مجبوری کا یہی تقاضا ہے۔

جن صورتوں میں وکیل کو توکیل جائز ہے، شرط یہ کہ امانت دار کو وکیل بنائے، تا کہ مؤکل کی مصلحت کی رعایت ہو سکے، البتہ مؤکل خود کسی غیر امین کی تعیین کرے، تو اسے وکیل بنا سکتا ہے۔

اگر مؤکل نے کہا: تم کسی کو اپنا وکیل بناؤ تو یہ دوم وکیل اوّل وکیل کا وکیل ہے، لہٰذا اوّل دوّم کو معزول (برخاست) کرسکتا ہے، جیسا کہ اوّل کے معزول ہونے سے وہ بھی معزول ہوجائے گا۔

اور اگر مؤکل نے کہا: میری جانب سے کسی کو وکیل بناؤ، یا مطلق اسے توکیل کی اجازت دی (میری جانب سے یا تمہاری جانب سے کوئی قید نہ لگائی) تو دوّم وکیل مؤکل کا وکیل ہے، لہٰذا یہ دونوں وکیل ایک دوسرے کو وکالت سے ہٹا نہیں سکتے، اور مؤکل دونوں میں سے جسے بھی چاہے برخاست کردے، نیز اوّل کے ہٹنے یا ہٹانے سے دوّم کی وکالت ختم نہ ہوگی۔

۲) **معاوضہ کے ساتھ توکیل:** وکالت کے عوض مؤکل وکیل کے لئے کچھ معاوضہ طے کرے، یا نہ کرے، وکالت صحیح ہے۔ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے وکیل بنایا اور عمل پر کچھ عوض نہ دیا، اسی طرح آپ ﷺ زکوٰۃ کے جمع کرنے کے لئے صحابہؓ

کرام کو وکیل بناتے اور ان کی محنت کے عوض ان کو اجرت مرحمت فرماتے، اگر معاوضہ کے ساتھ توکیل ہو، تو معاوضہ متعین ہونا شرط ہے، لہٰذا دورِ حاضر میں مختلف معاملات میں فی صد کی نسبت سے عوض مقرر کرنا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً: کسی کیس اور قضیہ میں وکیل جو کیس لڑے، جیتنے کی صورت میں اس رقم میں سے ۲۵ فیصد وغیرہ اس کا معاوضہ مقرر کرنا، مختلف اداروں میں چندہ جمع کرنے والوں کے لئے ان کی جمع شدہ رقم سے فی صدی کے اعتبار سے عوض دینا، اسی طرح جائیداد وغیرہ فروخت کرنے والے وکلاء (دلال) کے لئے اس کی قیمت میں سے نسبت سے طے کرنا وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں صحیح اور شرعی طریقہ یہ ہے کہ دونوں کے اتفاق سے ایک معین عوض عمل شروع کرنے سے قبل توکیل کے وقت ہی مقرر کیا جائے۔ اور متعلقہ ذمہ داری اور عمل انجام دینے کے بعد وکیل اس مقرر کردہ عوض کا مستحق ہوگا۔

۳) **وکیل کے قبضہ کی صفت:** مؤکل فیہ میں وکیل کا قبضہ امانت کا ہے، اسلئے تعدی کے بغیر ضامن نہ ہوگا، گرچہ توکیل بالعوض ہو، کیونکہ مؤکل فیہ میں تصرف کرنے میں وکیل مؤکل کا نائب ہے، لہٰذا اس کی حیثیت بھی اسی کی طرح ہوگی، پس مالک جس طرح تلف شدہ اشیاء کا ضامن نہ ہوگا، وہ بھی نہیں ہوگا۔

نیز وکالت وکیل کی جانب سے ایک تعاون وسہولت ہے، اور ضمان اس کے منافی ہے، پھر لوگ وکالت سے کنارہ کش رہیں گے، جو حرج کا باعث ہوگا۔

اگر وکیل تعدی اور زیادتی سے پیش آئے تو ضامن ہوگا، مثلاً برائے فروخت دی ہوئی شئی استعمال کرنا، یا اس سے ضائع اور گم ہو جائے ، اور اسے پتہ نہ ہو کہ کیسے ضائع ہوا، یا کسی جگہ رکھ کر اسے بھول جائے، یا مؤکل کی مخالفت کرے، تو ان تمام صورتوں میں ضامن ہوگا۔

۴) **وکالت کا دعویٰ:** جس پر کسی کا حق ہو، اس کے پاس کوئی آ کر یہ دعویٰ کرے کہ وہ صاحبِ حق کی طرف سے وکیل بن کر اس حق پر قبضہ کرنے کے لئے آیا ہے، اور یہ اس کی تصدیق کرے، تب بھی اس کے سپرد کرنا واجب نہیں، کیونکہ اس سے وہ بری الذمہ نہ ہوگا، اگر وکیل اپنے دعویٰ پر بینہ (گواہ) پیش کردے تو دینا لازم ہے۔

وکیل کے سپرد حق کردے، اور صاحبِ حق آنے کے بعد وکالت کی تصدیق کرے، تو یہ بری الذمہ ہو جائیگا، اور اگر وہ توکیل کا انکار کرے تو اس انکار پر قسم لے کر اس کی تصدیق کی جائے گی، کیونکہ اصل عدمِ توکیل ہے،

اب صاحبِ حق کے قسم کے بعد اگر حق عین (کوئی چیز) ہے، اور ابھی باقی ہے تو اسے لے لے، اگر تلف شدہ ہے تو اس کا بدل لے۔ وہ جس حق پر تھا اس سے، یا جس نے وکالت کا دعویٰ کر کے چیز اپنے قبضہ میں لیا اس سے مطالبہ کر سکتا ہے، دونوں میں سے جس سے بھی اپنا حق وصول کرے، تو وہ دوسرے سے اس کے متعلق رجوع نہیں کر سکتا، (یعنی وہ چیز یا بدل واپس نہیں لے سکتا) کیونکہ دونوں کا نظریہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کا اس سے وصول کرنا ظلم ہے، لہٰذا اپنے ظلم کو دفع کرنے کے لئے دوسرے سے واپس نہیں لے سکتا۔

اگر حق قرض (دَین) تھا، تو مقروض سے ہی مطالبہ کرے، کیونکہ اس کے اعتبار سے وہ حق ابھی اسی کے ذمہ باقی ہے، دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوا، لہٰذا وہ وکالت کے مدعی سے مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۵) **قرض کی ادائیگی کے لئے وکالت:** اگر کسی کو قرض کی ادائیگی کے لئے وکیل بنائے تو وکیل پر لازم ہے کہ ادائیگی پر گواہ رکھے، کیونکہ مؤکل کی مصلحت کو پیش نظر رکھنا اس پر واجب ہے، اور یہ گواہی بھی مصلحت واحتیاط میں داخل ہے، تاکہ کل صاحبِ حق ادائیگی کا انکار کر کے دوبارہ مقروض سے قرض وصول نہ کرے۔

وکیل بغیر گواہی کے قرض ادا کرے، اور صاحبِ حق ادائیگی کا انکار کرے، تو اس کے خلاف وکیل کی بات تسلیم نہ ہوگی، اور قرض ابھی

مؤکل کے ذمہ باقی رہیگا۔

اب اگر وکیل نے مؤکل کی غیر موجودگی میں یہ قرض ادا کیا تھا، تو اس مقدار کا مؤکل کے حق میں ضامن ہوگا، کیونکہ گواہ نہ رکھنا اُس کی غلطی ہے اور اگر مؤکل کی حاضری میں ادا کیا تھا تو ضامن نہ ہوگا، کیونکہ غلطی مؤکل کی ہے، اسے تو چاہئے تھا کہ ادائیگی پر گواہ رکھے، کیونکہ اس میں اسی کی مصلحت تھی۔

۲) **دو کو وکیل بنانا:** کسی تصرف کے لئے (بہ یک وقت) دو آدمی کو وکیل بنائے اور بوقتِ توکیل یہ صراحت کر دے کہ ان میں سے ہر کوئی تنہا تصرف کرسکتا ہے، تو کسی ایک کا تنہا تصرف بھی صحیح ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے دونوں کو وکیل بنائے، یا انفرادی طور پر دونوں کو وکیل بنائے (ایک ہی لفظ میں نہ بنائے) تو ہر ایک کو دوسرے کی طرف مراجعت کے بغیر تصرف کرنا جائز ہے۔

اگر ایک ہی لفظ سے دونوں کو وکیل بنائے (اور تنہا تصرف کی اجازت اور صراحت نہ ہو) اور معاملہ ایسا ہو، جس میں مالی بدل ہوتا ہو، جیسے خرید وفروخت قرض وصول کرنا، نکاح، مال کے عوض طلاق وغیرہ، تو ایک وکیل تنہا دوسرے کے بغیر تصرف نہ کرے، اگر تصرف کرے تو یہ دوسرے کی اجازت پر موقوف ہے، کیونکہ ان تصرفات میں مزید رائے مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور مؤکل دونوں کی مجموعی رائے سے راضی تھا نہ کہ صرف ایک کے، اور دونوں کا اتفاق ممکن بھی ہے، اسلئے تنہا ایک کا تصرف دوسرے سے مراجعت کے بغیر نافذ نہ ہوگا، کیونکہ مؤکل نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اگر تصرف ایسے معاملہ سے نہ ہو، جس میں مال بدلی ہو، جیسے بلا مال کے طلاق، ہبہ سپرد کرنا، قرض کی ادائیگی وغیرہ، تو ان میں سے ہر ایک انفرادی طور پر بھی تصرف کرسکتا ہے، کیونکہ ان امور میں مزید رائے وفکر کی ضرورت نہیں، لہٰذا دونوں کو مستقل اختیار حاصل ہوگا۔

اسی طرح کسی خصومت اور کیس میں دو کو وکیل بنائے تو دونوں کو مستقل اور انفرادی طور پر حق حاصل ہوگا، کیونکہ اصل مقصد قاضی کو مؤکل کے حق کی اطلاع دینا اور اس کے سامنے معاملہ کو رکھنا ہے، اور کبھی دونوں کا بہ یک وقت اس کے روبرو حاضر ہونا خلل کا باعث بن سکتا ہے۔

۷) **مؤکل اور وکیل میں اختلاف:**

(الف) اگر وکیل سپرد کردہ مال وغیرہ کے تلف کا دعویٰ کرے، اور مؤکل اسے جھٹلائے اور کہے کہ کچھ بھی تلف نہیں ہوا، تو وکیل کو مع قسم اپنے دعویٰ میں سچا سمجھا جائے گا، کیونکہ وہ امین ہے اور تلف پر گواہ کا پیش کرنا مشکل ہوگا، لہٰذا وہ اس کا مکلف نہ ہوگا۔

البتہ وکیل کسی ظاہری اور مخفی سبب سے تلف کا دعویٰ کرے، مثلاً آگ لگنا، سیلاب، لوٹ وغیرہ، تو اس پر گواہ پیش کرنا لازم ہے، کیونکہ ان صورتوں میں یہ دشوار نہیں، اگر گواہ نہ پیش کرے تو ضامن ہوگا۔

(ب) تعدی یا کوتاہی میں اختلاف: تلف پر دونوں متفق ہوں، لیکن تعدی اور کوتاہی میں اختلاف ہو، مثلاً مؤکل دعویٰ کرے کہ وکیل نے اس کے شرائط کی مخالفت کی، یا حفاظت میں کوتاہی برتی، یا وہ چیز خود استعمال کی وغیرہ ایسے امور جو وکیل کی جانب سے کوتاہی یا تعدی شمار ہوتی ہے، اور وکیل ان باتوں کا انکار کرے اور دعویٰ کرے کہ اس سے کوئی زیادتی اور کوتاہی سرزد نہیں ہوئی، تو وکیل کی بات مع قسم معتبر ہوگی، کیونکہ مؤکل اس پر ضمان کا دعویٰ کر رہا ہے اور وہ انکار کر رہا ہے، اور ہمیشہ منکر کی بات مع قسم معتبر ہوتی ہے، لہٰذا وکیل قسم لے تو اس پر ضمان نہ ہوگا۔

(ج) تصرف میں اختلاف: وکیل جو چیز برائے فروخت سپرد ہوئی تھی، اس کے فروخت کا دعویٰ کرے، اور مؤکل

فروخت کا انکار کرے، یا وکیل کا دعویٰ ہو کہ بیچنے کے بعد قیمت وصول کرلی جو تلف ہوئی اور مؤکل کہے کہ تم نے ابھی قیمت وصول نہیں کی، تو یہاں بھی وکیل کی بات مع قسم معتبر ہوگی۔

(د) واپسی میں اختلاف: وکیل مؤکل کے تمام حقوق جو اس کے قبضہ میں تھے، مؤکل کو لوٹانے کا دعویٰ کرے، مثلاً برائے فروخت دی ہوئی چیز لوٹانے کا، یا فروخت کے بعد قیمت لوٹانے کا دعویٰ کرے اور مؤکل اس بات کا انکار کرے تو:

اگر وکالت بلاعوض ہو تو وکیل کی بات مع قسم معتبر ہوگی اور اگر بالعوض وکالت ہو تب بھی راجح قول یہی ہے کہ وکیل کی بات مع قسم قبول کی جائے گی۔

(ھ) توکیل میں اختلاف: نفس وکالت ہی میں اختلاف ہو، وکیل کہے کہ تم نے فلاں مسئلہ میں مجھے وکیل بنایا، اور یہ وکالت کا انکار کرے تو:

یہ اختلاف تصرف سے قبل ہو، تو کسی خصومت اور کیس کا سوال ہی نہیں، یعنی قاضی کے سامنے پیش بھی ہو تو وہ خارج کردے گا کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر اس نے وکیل بنایا بھی ہو تو اس انکار کی وجہ سے وہ معزول ہو چکا۔

اور اگر یہ اختلاف تصرف کے بعد ہو، تو مؤکل کی بات مع اس کے قسم کے معتبر ہوگی کیونکہ اصل عدم اجازت اور عدم توکیل ہے، نیز وکیل دعویٰ کررہا ہے اور مؤکل انکار، اور بات منکر کی مع قسم معتبر ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں طرفین کو وکیل و مؤکل صرف مجازاً دعویٰ کے اعتبار سے کہا جارہا ہے۔

(و) وکالت کی صفت میں اختلاف: نفسِ وکالت پر دونوں متفق ہوں، لیکن اس کی صفت میں اختلاف ہو، مثلاً وکیل کہے آپ نے مجھے ادھار بیچنے کے لئے وکیل بنایا، اور مؤکل کہے نہیں، بلکہ نقداً فروخت کرنے کے لئے، یا وکیل کہے: تم نے فلاں چیز ہزار روپے میں خریدنے کے لئے مجھے وکیل بنایا، اور مؤکل کہے: بلکہ، پانچ سو میں، یا وکیل کہے: تم نے مجھے کار خریدنے کے لئے وکیل بنایا، اور مؤکل کہے: بلکہ مکان خریدنے..........وغیرہ......

تو ان صورتوں میں مؤکل کی بات مع قسم تسلیم کی جائے گی، کیونکہ اس سے صادر ہونے والی اجازت اور اس کی گفتگو اور الفاظ سے وہ خود زیادہ واقف ہوگا۔

عقدِ وکالت کا اختتام

درج ذیل صورتوں میں عقد وکالت کی انتہا ہوگی۔

۱) **فسخ:** عقد وکالت طرفین کی جانب سے ایک جائز عقد ہے لہٰذا مؤکل یا وکیل جب چاہے اسے فسخ کرسکتے ہیں، خواہ وکالت بالعوض ہو یا بلاعوض پس مؤکل وکیل کو برخاست اور علیٰحدہ کردے، تو وکالت ختم ہوگی، اور یہ علیٰحدگی ان الفاظ سے ہوگی: میں نے وکالت ختم کردی یا تمہیں اس سے نکال دیا، علیٰحدہ کردیا، میں نے وکیل تو تصرف سے جدا کردیا، یا معزول کردیا، یا کسی قاصد کے ذریعہ اسے یہ پیغام پہنچائے یا خط کے ذریعہ عزل کی اطلاع دے۔

جب مؤکل اسے معزول کرے گا تو وکیل فوراً معزول ہوجائے گا، اور تصرف کی اجازت ختم ہوجائے گی، چاہے وہ حاضر ہو یا غائب، اس معزولی کی اطلاع اسے موصول ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، کیونکہ معزولی عقد کو ختم کرتی ہے، لہٰذا اس میں رضامندی اور واقفیت شرط نہیں۔

معزولی کے بعد، معزولی کا علم ہونے سے قبل، وکیل تصرف کرے تو یہ تصرف باطل ہے۔

اسی طرح وکیل خود علیحدہ ہوجائے مثلاً کہے: میں نے اپنے آپ کو وکالت سے علیحدہ کرلیا، علیحدگی اختیار کی، یا وکالت کو لوٹا دیا وغیرہ، تو فوراً وکالت سے معزول ہوگا اور وکالت ختم ہوجائیگی، گرچہ مؤکل غائب ہو اور اسے اس علیحدگی کا علم نہ ہو۔

۲) **طرفین میں سے کسی کا تصرف کی اہلیت سے نکل جانا:** وکالت کی صحت کے لئے مؤکل اور وکیل میں بعض شرائط لازمی ہیں جن کا ذکر ہوچکا۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط مؤکل یا وکیل میں مفقود ہوجائے تو وہ تصرف کی اہلیت سے نکل جائے گا اور نتیجہ میں وکالت باطل اور ختم ہوجائے گی۔ جیسے پاگل پن، بے ہوشی وغیرہ۔

اسی طرح کسی ایک کی موت سے بھی وکالت ختم ہوگی، دوسرے کو اس موت کا علم ہو یا نہ ہو۔

۳) **محل تصرف کامؤکل کی ملکیت یا ولایت سے نکل جانا:** اس صورت میں بھی وکالت ختم ہوگی مثلاً: جس چیز کے فروخت کرنے کے لئے وکیل بنایا، خود ہی اسے فروخت کردیا، یا کسی کو ہبہ کردیا، یا اپنے ماتحت بچہ کا مال فروخت کرنے وکیل بنایا، پھر بچہ تصرف کی صلاحیت کے ساتھ بالغ ہوا تو اس کی پابندی اور ماتحتی ختم ہوجائے گی اور مؤکل کی اس پر ولایت نہ رہے گی، لہٰذا اس کے مال میں اس کی جانب سے تصرف کی اجازت بھی باطل ہوجائے گی، اور نتیجتاً وکالت باطل اور ختم ہوجائے گی۔

اسی طرح وہ چیز تلف ہوجائے، مثلاً گاڑی کے فروخت کے لئے وکیل بنایا اور گاڑی چوری ہوگئی یا برائے فروخت مکان منہدم ہوگیا، یا بیٹی کے نکاح کیلئے وکیل بنایا اور بیٹی وفات پاگئی، تو ان تمام صورتوں میں چونکہ اصل محلِ تصرف ہی باقی نہ رہا، اس لئے وکالت بھی ختم ہوگئی۔

۴) **وکیل کا متعلقہ ذمہ داری اور تصرف کو انجام دینا:** وکیل اپنی ذمہ داری پوری کرے، تو وکالت ختم ہوگی، مثلاً مکان بیچنے کے لئے وکیل بنایا اور وکیل نے بیچ دیا، یا کسی چیز کے خریدنے کے لئے اور وکیل خرید چکا، یا فلاں کا فلاں سے نکاح کرنے کے لئے اور اس نے نکاح کرادیا۔۔۔ تو ان صورتوں میں وکالت ختم ہوچکی، کیونکہ جو کام سپرد ہوا تھا وہ انجام دے چکا، اب کسی تصرف کا سوال نہیں۔

متفرق مسائل

۱) عورت کو کسی کے نکاح کے ایجاب یا قبول کے لئے یا کسی مطلقہ سے رجعت کے لئے وکیل نہیں بناسکتے۔ (حاشية الجمل ۴۰۲/۳)

۲) جن امور میں گھر سے باہر جانے کی ضرورت پیش آتی ہو، یا شوہر کا حق فوت ہوتا ہو، ان میں شوہر کو اجازت کے بغیر بیوی وکالت قبول نہیں کرسکتی۔ (حاشية الجمل ۴۰۲/۳)

۳) عورت کو کسی دوسری عورت کے طلاق کے لئے وکیل بنانا صحیح ہے۔ (حاشية الجمل ۴۰۲/۳)

۴) کسی نے اپنے مقروض سے کہا کہ فلاں یتیم پر روز میرے قرض میں سے ۱۰/روپے خرچ کرو، اور وہ اس پر عمل کرے، تو صحیح ہے، اور اس طرح قرض سے بری ہوگا، (یعنی جب قرض کی مقدار اس یتیم پر صرف کرے) اگر مقروض سے کہے کہ اس قرض کی رقم سے میرے لئے اناج خریدو اور وہ اناج خرید کر قیمت ادا کرے اور اناج پر قبضہ کرے، پھر وہ اناج اس کے پاس تلف ہوجائے تو وہ قرض سے بری ہوچکا۔ (فتح المعين مع اعانه ۹۷/۳)

۵) کوئی خرید وفروخت، یا نکاح وغیرہ کے متعلق وکالت کا دعویٰ کرے اور سامنے والا اسے سچا سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کرے، پھر وہ وکیل خود اپنے آپ کو جھٹلائے اور کہے کہ مجھے اس کی اجازت نہیں تھی تو اس سے کوئی اثر نہیں ہوگا۔ (اعانہ ۹۸/۳)

اکراہ (مجبور کرنا)

اکراہ: کسی کو قہراً اور زبردستی ایسے کام پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرے، اکراہ کہلاتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ ''الام'' میں فرماتے ہیں: (اکراہ یعنی) کسی آدمی کا ایسے شخص کے اختیار و قبضہ میں ہونا کہ اس سے اپنا بچاؤ نہ کر سکے۔

کسی نقصان اور خطرہ کی دھمکی سے اکراہ حاصل ہوگا، جیسے مارنا، قید کرنا، مال تلف کرنا وغیرہ۔ لوگوں کے احوال کے اعتبار سے اکراہ کا اختلاف ہوگا۔

پس ایک ذی جاہت اور بڑی شخصیت کو لوگوں کے سامنے حقیر کرنے کی دھمکی، اور مختصر قید کی دھمکی اکراہ ہے۔ جبکہ یہ دھمکی دوسروں کے حق میں اکراہ شمار نہ ہوگی۔

جو اہل مروت وہیئہ میں سے ہو (جس کا شمار شرفاء میں ہو) اسے معمولی مار اور سزا کی دھمکی اکراہ ہے، جبکہ یہ دوسروں کے حق میں اکراہ نہیں ہے۔

اور مال برباد کرنے کی دھمکی میں سامنے والے کی مالی حیثیت کے اعتبار سے مال کی مقدار کا اعتبار ہوگا لہٰذا ایک غریب شخص کے لئے مال کی جو مقدار اکراہ شمار ہوگی، امیر کے لئے وہ اکراہ نہ ہوگی، کسی کی مالی حیثیت کے مطابق اگر دھمکی کی مقدار اس کے لئے مالی تنگی کا باعث ہے تو یہ اس کے حق میں اکراہ ہے ورنہ نہیں۔

جو اسباب کسی کے حق میں اکراہ ہو تو دوسروں کے متعلق بھی وہ اکراہ ہے، جبکہ اس کا معاملہ اس کے لئے باعث اہتمام وفکر اور رنج وغم ہو جیسے اصول وفروغ (باپ دادا اور بیٹے پوتے وغیرہ)، بھائی بہن وغیرہ لہٰذا کسی بات پر ان میں سے کسی کے قتل کی دھمکی خود اس کے قتل کی دھمکی کی طرح ہے (اگر زید نے بکر کو کسی کام پر مجبور کیا اور نہ کرنے پر قتل وغیرہ کی دھمکی دے تو زید مکرہ اور بکر مُکرہ۔ (یا مستکرہ) کہلائے گا اور اس کام کو مکرہ علیہ کہیں گے۔

اکراہ کے تحقق کے شرائط: (۱) مکرہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے پر قادر ہو، ورنہ یہ اس کی بکواس ہوگی۔

(۲) مستکرہ کو غالب گمان ہو کہ اگر میں نے مکرہ کی بات نہ مانی تو اس دھمکی پر عمل کر بیٹھے گا۔

(۳) بھاگ کر، یا مقابلہ کر کے یا کسی دوسرے کی مدد سے مستکرہ مکرہ سے خلاصی اور چھٹکارا نہ حاصل کر سکے۔

(۴) مکرہ علیہ کام (یعنی جس کے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے) سے مستکرہ کسی حق کی وجہ سے باز آ رہا ہو یعنی یا تو اپنے حق کی وجہ سے جیسے اپنا مال تلف کرنا یا کسی دوسرے کے حق کی وجہ سے جیسے دوسرے کا مال تلف کرنا یا شریعت کے حق کی وجہ سے جیسے شراب پینا، زنا کرنا وغیرہ۔

۵) مکروہ علیہ کام کے مقابلہ میں جس کی دھمکی دی جا رہی ہے وہ زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہو، لہٰذا کوئی مال تلف نہ کرنے کی صورت میں طمانچہ لگانے کی دھمکی دے، اور اس کے حق میں یہ طمانچہ نسبتاً کم نقصان دہ ہو تو اسے اکراہ شمار نہ کریں گے۔

اگر ہاتھ نہ کاٹے تو قتل کی دھمکی دے، تو یہ اکراہ ہے کیونکہ قتل ہونا ہاتھ کٹنے سے زیادہ پر خطر اور نقصان دہ ہے۔ لہٰذا وہ نسبتاً آسان اور خفیف کو اختیار کرسکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: ''جب بھی آپ ﷺ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا، جس میں ایک زیادہ آسان ہو، تو آپ ﷺ آسان صورت کو ہی اختیار فرماتے تھے۔'' متفق علیہ

(۶) مکرہ علیہ پر عمل کی صورت میں جس چیز کی دھمکی دی ہے اس سے نجات مل جائے۔

اگر کسی نے دوسرے سے کہا: خود کو قتل کرو ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گا تو یہ اکراہ شمار نہ ہوگا کیونکہ خود کو قتل کرو اور دھمکی سے (قتل سے) نجات کا سوال نہیں۔

اسی طرح کسی کو ہاتھ کاٹنے پر مجبور کرے کہ ورنہ میں تمہارا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ لہٰذا اس صورت میں مستکرہ کو مکرہ علیہ پر عمل کرنا جائز نہیں، کیونکہ اسے حقیقتاً مکرہ (مستکرہ) نہیں کہا جائیگا۔ کیونکہ حقیقی مکرہ وہ ہے جو مکرہ علیہ پر عمل کرنے سے دھمکی سے نجات پاجائے بلکہ خود قتل کرنے یا ہاتھ کاٹنے میں تو نقصان یقینی ہے کہ وہ خود انجام دے رہا ہے۔ اگر وہ خود انجام نہ دے تو دھمکی یقینی نہیں، ممکن ہے مکرہ صرف ڈرا کر چھوڑ دے اور دھمکی پر عمل نہ کرے۔

۷) مُهَدَّدٌ بِه (یعنی جب نقصان اور خطرہ کی دھمکی دی ہے) فوری ہو، اگر آئندہ ہو تو یہ اکراہ نہیں، کیونکہ اس دوران کسی مدد یا پناہ وغیرہ کے ذریعہ خلاصی اور نجات کے امکانات ہیں۔

۸) مستکرہ مکرہ کے حکم کے خلاف نہ کرے، یعنی مکرہ علیہ کے بجائے کوئی دوسرا کام کرنا، یا اس میں اضافہ یا کمی کرنا، کیونکہ ان صورتوں میں وہ اپنی مرضی سے عمل کررہا ہے، لہٰذا مکرہ شمار نہیں ہوگا۔

اگر کسی نے کسی شخص کو اپنی بیوی کے طلاق پر اکراہ کیا اور وہ اپنا مکان فروخت کردے، یا ایک طلاق رجعی پر مجبور کیا اور اس نے تین طاق دے دی، یا تین طلاق پر مجبور کیا اور اس نے ایک ہی دی، تو یہ تینوں صورتیں نافذ ہونگی یعنی اس کے احکام مرتب ہوں گے جیسا کہ اپنے اختیار سے کرنے پر ہوتے ہیں کیونکہ اس کا اکراہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۹) مکرہ علیہ مُعَیّن ہو، یعنی ایک ہی چیز ہو، پس اگر کسی کو دو بیویوں میں سے ایک کے طلاق پر مجبور کیا جائے یا زید اور انور میں سے کسی ایک کو قتل کرنے پر مجبور کیا جائے، تو یہ اکراہ نہ ہوگا۔

۱۰) مکرہ علیہ معاملہ یا جس بات کی دھمکی دی گئی وہ مکرہ پر لازم نہ ہو۔ مثلاً مجور مفلس کو اس کے مال کے فروخت کرنے کی دھمکی دینا، یا اپنی بیوی سے ایلاء کرنے والے کو اس کی جانب سے بیوی کو طلاق دینے کی دھمکی دینا یا عمداً کسی کو قتل کرنے والے کو قصاص (بدلہ میں قتل کی سزا) کی دھمکی دینا، تو یہ اکراہ نہیں ہے۔ کیوں کہ مکرہ پر اس کا استحقاق حاصل ہے۔ (ایلاء کی تفصیل کتاب النکاح کے ضمن میں آئے گی، مذکورہ مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شخص چار ماہ سے زائد اپنی بیوی سے جماع نہ کرنے کی قسم کھالے اور بیوی قاضی (حاکم) سے شکایت کرے، تو قاضی چار (۴) ماہ کے بعد اسے اپنی قسم سے رجوع ہونے کا یا بیوی کو طلاق دینے کا حکم کرے گا اگر وہ دونوں کا انکار کرے تو قاضی خود اس کی جانب سے ایک طلاق دے گا۔)

۱۱) جس بات کی دھمکی دے رہا ہے وہ مکرہ کا حق نہ ہو، جس کے ذریعہ ایسی چیز حاصل کرنا چاہے جو اس کا حق نہیں ہے، مثلاً شوہر پر بیوی کا قرض ہو اور شوہر اسے یہ دھمکی دے کہ اگر قرض معاف نہ کرے تو اسے طلاق دے دیگا، تو یہ اکراہ نہیں، لہٰذا بیوی نے اسے معاف

کردیا تو قرض ساقط ہوجائے گا اور آئندہ اسے مطالبہ کا حق نہ ہوگا۔
بعض علماء نے اسے بھی اکراہ شمار کیا ہے، کیونکہ شوہر بیوی کا سلطان ہے، لہٰذا اس کی جانب سے اکراہ کا تحقق ہوگا، اور اس قول کی بنیاد پر طلاق کی دھمکی سے ڈر کر وہ قرض معاف کرے تو شوہر کے ذمہ سے معاف نہ ہوگا، وہ بعد میں پھر مطالبہ کرسکتی ہے۔

مختلف تصرفات اور ان میں اکراہ کے آثار

وہ تصرفات جن کے انجام دینے یا نہ دینے پر اکراہ ہوسکتا ہو، ان کی دو (۲) قسمیں ہیں۔

۱) **حسّی تصرفات:** یعنی وہ امور جو حواس سے معلوم ہوں، خواہ قولی ہوں یا فعلی، جیسے کھانا پینا قتل کرنا، تلف کرنا، گالی گلوچ اور کفر

۲) **شرعی تصرفات:** یعنی جن امور کا تعلق شریعت سے ہو، کہ اس نے اس کا کوئی خاص نام رکھا ہو اور اس پر بعض متعین احکام مرتب کئے ہوں، جیسے خرید وفروخت، نکاح اور طلاق اور دیگر عقود اور فسوخ

حسی تصرفات اور ان پر اکراہ کے آثار: ان تصرفات سے دو قسم کے احکام متعلق ہیں، ایک کا تعلق قیامت اور آخرت سے ہے، یعنی اس پر گرفت ہوگی یا نہ ہوگی اور ایک کا تعلق دنیوی اعتبار سے ہے، کہ ضمان اور سزا مرتب ہوگی یا نہ ہوگی۔

مکرہ علیہ تصرفات کے اعتبار سے حسی تصرفات میں اکراہ کے آثار مختلف ہوں گے، بعض تصرفات جو حرام اور ممنوع تھے، اکراہ کی وجہ سے مباح (جائز) ہوں گے، کبھی اصل ممانعت باقی رہے گی، لیکن اس کے انجام دینے کی رخصت مل جائے گی، اور کبھی اس کی حرمت باقی رہے گی، نہ مباح ہوگی اور نہ اس کی رخصت ہوگی۔ ان تینوں انواع کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اوّل نوع: وہ حسی تصرفات جو اکراہ کی وجہ سے مباح ہوجاتے ہیں:-

اس نوع میں مردار، خون، سوّر کا گوشت اور شراب نوش کرنا داخل ہے، نیز اس طرح کے دیگر محرمات اگر کسی مسلمان کو ان میں سے کسی پر عمل پر مجبور کیا جائے تو وہ اسے مباح ہوجائے گا، کیونکہ اضطرار کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اسے مباح قرار دیا ہے، اس لئے کہ ان چیزوں کی حرمت کے ذکر کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِلَّا مَااضْطُرِرْتُمْ اِلَیْہِ" (الانعام: ۱۱۹)

ترجمہ: "مگر جب کہ مجبور ہوجاؤ اس کے کھانے پر" تحریم سے استثناء اباحت کی دلیل ہے۔

نیز ارشاد باری ہے: (فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ) (البقرہ: ۱۷۳) **ترجمہ:** "پھر جو کوئی بے اختیار ہوجائے، نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی، تو اس پر کچھ گناہ نہیں" (یعنی اس سے قبل مذکورہ اشیاء مردار خون وغیرہ حرام ہیں، لیکن جب کوئی بھوک سے مرنے لگے تو اس کو لاچاری کی حالت میں کھالینے کی اجازت ہے) گناہ کی نفی کرنا بھی اباحت کی دلیل ہے اور کسی عمل پر مجبور کیا جائے تو وہ بھی مضطر ہے۔ لہٰذا اس کا بھی یہی حکم ہوگا۔ اگر مکرہ اس عمل سے باز رہے، جس سے اسے تکلیف پہنچے تو اس پر مواخذہ ہوگا۔ کیونکہ بازرہ کر وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے، حالانکہ یہ ممنوع ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (البقرہ: ۱۹۵) **ترجمہ:** "اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں" یہ اخروی مواخذہ کے اعتبار سے ہے۔

دنیوی احکام: اگر کسی کو شراب نوشی پر مجبور کیا جائے تو اس پر حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ حد کا ایک اہم مقصد مستقبل میں اس گناہ سے روکنا ہے، اور مکرہ کا یہ عمل گناہ شمار نہ ہوگا، بلکہ (اپنی جان کی حفاظت کی خاطر) اس پر واجب تھا، کیونکہ اس کے شراب نہ پینے پر اگر

سامنے والا اپنی دھمکی پر عمل کرے تو یہ گنہگار ہوگا۔اسی طرح اکراہ کی وجہ سے شراب پی کر نشہ میں آئے تو اس حالت میں اس کے تصرفات نافذ نہ ہوں گے، کیونکہ نشہ میں تصرفات اس وقت نافذ ہوتے ہیں، جبکہ وہ شخص اس سے گنہگار ہو، یعنی اپنے اختیار سے شراب پیئے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے خطاء، بھول اور اکراہ کے امور کو وضع (معاف) فرمایا ہے۔'' (ابن ماجه ، و قد جاء الحديث من طرق عند غيره مع اختلاف في بعض الالفاظ)

وضع فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام اور مرتب اثرات کو ختم کر دیا ہے، لہٰذا اس حدیث کی روشنی میں دنیوی اور اخروی دونوں اثرات غیر معتبر ہیں۔

دوم نوع: وہ حسی تصرفات جن کی اکراہ کی وجہ سے رخصت مل جاتی ہے:

الف) ایسا قول یا فعل جو بظاہرہ کفر ہو: مثلاً زبان سے کفریہ کلمات ادا کرنا، یا آپ ﷺ کی شان میں گستاخی، یا بت کو سجدہ کرنا، یا کفار جس کی تعظیم کرتے ہوں بطور عبادت وتقدیس اس کی تعظیم کرنا وغیرہ۔ تو اس طرح کے اقوال وافعال کو اکراہ کی وجہ سے انجام دینے کی رخصت ملے گی، جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن و برقرار ہو۔

آیت: '' مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ '' (النحل : ۱۰۶)

ترجمہ: ''جو شخص ایمان لائے پیچھے (یعنی ایمان لانے کے بعد) اللہ کے ساتھ کفر کرے (اس میں کفر بالرسول بھی داخل ہے) مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جاوے (کہ تو اگر کفر کا فلاں کام یا فلاں کام نہ کرے گا تو تجھ کو قتل کر دیں گے مثلاً) بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدہ میں فتور نہ آئے اور اس قول یا فعل کو برا سمجھتا ہو تو وہ مستثنیٰ ہے کہ اس کو ظاہری کفر کا ارتکاب جائز ہے اور اسکے لئے وہ وعید آئندہ نہیں ہے) لیکن ہاں جو جی کھول کر (یعنی اس کو صحیح اور مستحسن سمجھ کر) کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا اور ان کو بڑی سزا ہوگی۔''

حدیث: مشرکین نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پکڑ کر آپ ﷺ کی شان میں گستاخی اور اپنے باطل معبودوں کے حق میں ذکرِ خیر پر مجبور کیا، پھر آپ ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اپنے دل کی حالت کیسے پا رہے ہو'' تو انہوں نے جواب دیا ''ایمان پر مطمئن'' تو فرمایا: ''وہ پھر اس طرح کریں تو تم بھی یہی کرنا'' (یعنی زبان سے خلاف اسلام بات نکالنا۔ تا کہ ان کی ایذاء رسانی سے چھٹکارا حاصل ہو) (حاکم في المستدرك و قال صحيح على شرط الشيخين)

اس کی صرف رخصت دی گئی، اور اسے مباح نہ قرار دیا، کیونکہ کسی بھی صورت میں کفر کے اباحت کا سوال نہیں، پس اس کی حرمت تو باقی رہے گی، لیکن اکراہ کی وجہ سے مواخذہ اور گناہ نہ ہوگا، لہٰذا اکراہ کی وجہ سے اصل وصف یعنی حرمت میں تغیر نہ ہوگا، صرف اس کے حکم یعنی اس پر مرتب مواخذۃ وغیرہ پر اثر پڑے گا۔

چونکہ حرمت باقی ہے، اور صرف مجبوری کی وجہ سے رخصت ہے، اس لئے اس سے باز رہنا افضل ہے۔ اگر باز رہنے اور رکنے کی وجہ سے اس کی جان چلی جائے تو فی سبیل اللہ جہاد کرنے کا ثواب حاصل ہوگا، کیونکہ اس نے دینِ اسلام کی سربلندی اور اظہارِ اعزاز کے لئے اپنی جان کو داؤ پر لگا دیا۔

حدیث: حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے آپ ﷺ سے (مشرکین کی ایذاء رسانی) کی شکایت کی، اور کہا: کیا

آپ اللہ سے ہم لوگوں کی مدد اور نصرت کے لئے دعاء نہ کرینگے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "تم سے قبل (سابقہ امت میں) کسی آدمی کو زمین میں گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیتے، اور آری لاکر اس کے سر پر چلاتے اور اس کے دو حصے کردیتے، لیکن یہ مصیبت اسے اپنے دین سے نہ ہٹاتی۔ (بخاری شریف) آپ ﷺ نے اس حدیث میں سابقہ امت کے افراد کے صبر واستقلال کی تعریف فرمائی کہ انہوں نے تمام عذاب وقتل کو برداشت کرلیا، لیکن ظاہراً بھی کفر کے ارتکاب سے گریز کیا، تو معلوم ہوا کہ صبر کرنا اور مصیبتوں کو جھیلنا رخصت پر عمل کرنے سے افضل ہے۔

مروی ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابہ کرام کو پکڑ کر ایک سے پوچھا: محمد ﷺ کے متعلق تمہارا کیا نظریہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: وہ اللہ کے رسول ہیں، پھر پوچھا: میرے متعلق کیا کہتے ہو؟ جواب دیا: تم بھی، تو انہیں چھوڑ دیا.........اور دوسرے سے اپنے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: میں بہرہ ہوں، سن نہیں پاتا۔ دو تین مرتبہ اس نے پوچھا تو یہی جواب دیا، تو انہیں قتل کردیا، پھر آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: "پہلے نے رخصتِ الٰہی پر عمل کیا، اور دوسرے نے حق کا اعلان کیا، اسے مبارک ہو" (دیکھئے تفسیر قرطبی آیت۔ الا من اکرہ ...... مسئلہ ۱۸، ۱۰/۱۸۹)

اسی طرح حضرت خبیبؓ کو قید کرکے کفار ستانے اور عذاب دینے لگے تا کہ آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کریں، لیکن انہوں نے اسے تسلیم نہ کیا، تو ان کو قتل کردیا۔ یہ خبر آپ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے اس اقدام پر نکیر نہ فرمائی (دیکھئے بخاری شریف، کتاب المغازی باب فضل من شهد به را) بلکہ مروی ہیکہ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ شہداء کے سردار ہیں اور وہ جنت میں میرے رفیق ہیں۔

مذکورہ تمام تفصیلات آخرت سے متعلق تھیں۔

دنیوی اعتبار سے مُکرہ پر کفر کا حکم نہ لگے گا اور اس کے ساتھ مُرتد کا معاملہ نہ ہوگا۔

امام شافعی علیہ الرحمہ آیت (اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ) پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کفر کے مختلف احکام ہیں جیسے بیوی سے جدائی، کافر کو قتل کیا جائے، اور اس کا مال غنیمت شمار ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اکراہ کی وجہ سے گناہ کو ساقط کردیا تو دیگر احکام بھی ساقط ہوں گے، کیونکہ جب اعظم ساقط ہوا تو اصغر (چھوٹی چیزیں) بھی ساقط ہونگی۔

اسلام پر اکراہ: اگر کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا جائے اور وہ اسلام لے آئے تو اس کا اسلام صحیح اور معتبر ہوگا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک اور معاملہ کیا جائیگا کیونکہ یہ برحق اکراہ ہے۔ بالخصوص ایک مرتد اور حربی کے حق میں، اگرچہ اُس کے دل میں کفر کا احتمال ہو، اسلام کی جانب کو ترجیح دیتے ہوئے، کیونکہ اس میں دین حق کی سربلندی ہے، جو کہ واجب ہے۔ (نیز ہم ظواہر کے مکلف ہیں اور سرائر اور اندرونی معاملات کی ذمہ داریاں ہم پر نہیں، اس کا حساب کتاب بارگاہِ الٰہی میں ہوگا)

(ب) کسی مسلمان کا مال تلف کرنا یا اس کی آبروریزی:

اگر کسی مسلمان کا مال تلف کرنے پر اکراہ اور جبر کیا جائے تو اس کی رخصت ہوگی، اور اس سے وہ گنہگار نہ ہوگا، کیونکہ شدت بھوک کی وجہ سے ہلاکت کا خوف ہو تو اس اضطراری کیفیت میں دوسرے کا مال استعمال کرنے کی رخصت ہے، لہٰذا اکراہ میں بھی رخصت ہوگی، کیونکہ یہ بھی ایک اضطراری کیفیت ہے۔ اسی طرح اکراہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو گالی دینا اور اس کی آبروریزی کی رخصت ہوگی۔

اگر مُکرہ مال تلف کرنے اور آبروریزی سے باز رہے تو یہ افضل ہے۔ اور اس کی وجہ سے اسے تکلیف پہنچے تو اس پر ثواب کا مستحق ہوگا، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "ایک مسلمان ہر طرح دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کی جان، اس کا مال اور اس کی عزت وآبرو" (سب کچھ حرام ہے) (مسلم شریف) لہٰذا کسی صورت میں اس سے تعرض جائز نہیں، اکراہ کی وجہ سے صرف رخصت حاصل ہوگی، یعنی

اس پر مواخذہ اور گرفت نہ ہوگی، لیکن حرمت باقی رہے گی، لہٰذا اپنے حق پر ایک مسلمان بھائی کے حق کو ترجیح دیتے ہوئے اس رخصت پر عمل نہ کرے تو باعثِ ثواب ہے۔ نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے "جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے" (ابوداود ترمذی) اس سے یہ ثابت ہوا کہ خود اپنے مال کے تلف اور ضائع کرنے پر اکراہ ہو، اور وہ اس سے باز رہے تو یہ افضل ہے، تو دوسرے کے مال کے اتلاف سے بچنا بدرجۂ اولیٰ افضل ہوگا۔

دنیوی حکم: اکراہ کی وجہ سے کسی دوسرے کا مال تلف کردے، تو صاحبِ مال مُکرہ اور مُستکرَہ (مُکرَہ) دونوں میں سے جس سے چاہے ضمان اور بدلہ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ مکرہ اصل سبب ہے اور مکرہ تلف کرنے والا ہے اور دونوں برابر ہیں، لیکن آخر میں ضمان مُکرہ پر ہی عائد ہوگا، یعنی صاحبِ مال مستکرہ سے ضمان وصول کرے، تو وہ مکرہ سے وہ رقم واپس لے گا۔

سوم نوع: وہ حسی تصرفات جن کی اکراہ کی وجہ سے نہ رخصت ہے اور نہ وہ مباح ہیں۔

بعض تصرفات ایسے ہیں جو شرعاً حرام ہیں، اور عقل بھی اس کی حرمت کی گواہی دیتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی صورت میں اس کی رخصت نہ ہوگی۔

(الف) بغیر حق کے کسی مسلمان کا قتل: کیونکہ قتل بالکل حرام ہے۔ کسی مجبوری کی وجہ سے بھی اس کی اباحت اور رخصت نہ ہوگی۔

آیت: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (الانعام: ۱۵۱) **ترجمہ:** "جس کا خون کرنا اللہ نے حرام کردیا ہے، اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق (شرعی) پر قتل جائز ہے، (مثلاً قصاص یا رجم میں، پس قتلِ ناحق حرام ہوا)

حدیث: توحید ورسالت کی گواہی دینے والے ایک مسلمان شخص کا خون تین اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر حلال نہیں۔ جان کے بدلہ جان (یعنی کسی کو قتل کرنے کی سزا میں قصاص میں اسے قتل کرنا)، ثیب زانی (یعنی نکاح صحیح میں جو صحبت کرچکا ہو، وہ زنا کرے تو اسے سنگسار کیا جائیگا)، اور اپنا دین چھوڑ کر جماعت سے جدا ہونیوالا" (صحیحین)

قتل ہی کی طرح اکراہ کی وجہ سے کسی مسلمان کا کوئی عضو کاٹنا، یا مہلک مار، یا ایسی مار جو شدید ایذا رساں ہو، مباح نہیں اور نہ ان امور کی رخصت ہے۔

آیت: وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَاناً وَّ إِثْماً مُّبِیْناً (الاحزاب: ۵۸) **ترجمہ:** "اور جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ کیا ہو، ایذاء پہنچاتے ہیں، تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا بار لیتے ہیں:

لہٰذا تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ مذکورہ امور میں سے کسی پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا، خواہ اکراہ تام ہو یا ناقص۔

دنیوی احکام: مُکرہ اور مُستکرہ دونوں سے قصاص لیا جائیگا، کیونکہ ایک اس کا سبب اور دوسرا در حقیقت انجام دینے والا ہے، لہٰذا لوگوں کے جان کی اہمیت کے پیشِ نظر اور ایسی زیادتیوں سے تنبیہ کے لئے دونوں سے قصاص لیا جائیگا۔

(ب) زنا: زنا کے فحش اور منکر ہونے کی وجہ سے تمام شرائع اور عقل اس کی حرمت پر متفق ہیں، لہٰذا کسی بھی صورت میں اس کے رخصت یا اباحت کی گنجائش نہیں۔

آیت: "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّ سَاءَ سَبِیْلاً" (الاسراء: ۳۲) ترجمہ: "اور زنا کے پاس نہ جاؤ، وہ

بے حیائی ہے، اور بری راہ ہے"

لہٰذا اکراہ کی وجہ سے کسی مرد یا عورت کو زنا کے ارتکاب کی گنجائش نہ ہوگی، اگر اس نے زنا کیا تو گنہگار ہوگا، لیکن اکراہ کی صورت میں زانی پر حد نافذ نہ ہوگی، کیونکہ شبہ موجود ہے، اور حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہوجاتے ہیں، اور یہاں اکراہ کے سبب شبہ قائم ہے۔

۲) **شرعی تصرفات اور ان میں اکراہ کا اثر:** شرعی تصرفات یا تو انشاء ہوں گے یا اقرار (یعنی فی الحال کسی تصرف کو انجام دینا یا سابقہ کسی تصرف کے وقوع کا اقرار)

انشائیہ تصرفات کے دو انواع ہیں۔

۱) **جس میں فسخ اور رد کا احتمال نہ ہو:** جیسے طلاق، نکاح، رضاعت، رجعت، قسم، نذر، ظہار، ایلاء سے رجوع، قصاص کی معافی۔ یہ ایسے تصرفات ہیں کہ انعقاد ہوتے ہی لازم ہوں گے، اور فسخ یا رد کو قبول نہ کریں گے۔

۲) **جس میں فسخ اور رد کا احتمال ہو،** جیسے خرید و فروخت، اجارہ، ہبہ، وغیرہ یہ تصرفات محض انعقاد کی وجہ سے لازم نہ ہوں گے بلکہ فسخ یا رد کو قبول کریں گے۔

وہ انشائیہ تصرفات جس میں فسخ کا احتمال نہ ہو، اس میں اکراہ کا اثر

ان تصرفات میں سے کسی کو اکراہ کی وجہ سے انجام دے تو فاسد اور غیر معتبر ہوگا اور اس پر کسی شرعی اثر کا ترتب نہ ہوگا، اکراہ کی وجہ سے کالعدم قرار پائے گا۔

عمومی دلیل: اکراہ کی وجہ سے کفریہ کلمات کی ادائیگی کو شریعت نے غیر معتبر قرار دیا اور اس پر کوئی اثر مرتب نہ ہوا، حالانکہ شرعاً کفر شدید ترین قول ہے اور جب اکراہ کی وجہ سے یہ ساقط ہوا، تو خفیف اور ہلکے درجے کے تصرفات بدرجۂ اولیٰ ساقط ہوں گے۔

لہٰذا نکاح پر اکراہ ہو تو یہ عقد نکاح ثابت نہ ہوگا، اور اس کے آثار، یعنی مہر کا وجوب اور استمتاع کی حلت وغیرہ کا ترتب نہ ہوگا۔

حدیث: حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے والد نے ان کا نکاح کردیا اور وہ ثیبہ (پہلے شادی شدہ) تھیں۔ اور یہ نکاح انہیں ناگوار تھا،... تو آپ ﷺ نے اس نکاح کو رد کردیا (بخاری شریف۔ نسائی)

اسی طرح اکراہ کی وجہ سے طلاق دے تو واقع نہ ہوگی۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے "اکراہ کے ساتھ نہ طلاق ہوگی اور نہ آزادی" (ابوداود۔ حاکم۔ ابن ماجہ) اسی طرح اس نوع کے دیگر تصرفات کا بھی اکراہ کی صورت میں اعتبار نہ ہوگا، اور اس پر کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہوگا، عمومی وخصوصی دلائل کی وجہ سے، جس میں سابقہ وہ روایت بھی داخل ہے، جس میں بتایا گیا کہ اکراہ والا عمل غیر معتبر ہوگا۔

لیکن کسی عورت کو رضاعت (بچے کو دودھ پلانے پر) مجبور کیا جائے، یا آدمی کو صحبت کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس پر اثر مرتب ہوگا، لہٰذا تمام شرائط موجود ہوں تو رضاعت کی وجہ سے حرمت ثابت ہوگی، جیسا کہ نکاح کے بعد وطی (صحبت) کی وجہ سے کامل مہر لازم ہوگی۔

قابل فسخ انشائیہ تصرفات میں اکراہ کا اثر: اس نوع کے کسی تصرف پر اکراہ ہو تو وہ باطل ہوگا۔ لہٰذا اس سے متعلق کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہوگا، کیونکہ ان کے صحت کی شرط رضامندی ہے، اور بصورت اکراہ وہ موجود نہیں، پس یہ تصرف صحیح نہ ہوگا۔

"مغنی المحتاج" میں فرمایا: بلا حق مکرہ کا مالی عقد صحیح نہ ہوگا۔

کیونکہ ارشاد باری ہے: (اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ) (النساء: ۲۹) ترجمہ: "مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی

خوشی سے"

مالی عقد میں خرید وفروخت، اجارہ، ہبہ، حوالہ اور وکالت وغیرہ وہ سارے عقود داخل ہیں، جن کا مال سے تعلق ہے۔

اقرار پر اکراہ کا اثر : اکراہ کی وجہ سے کسی بھی قسم کے تصرف کا اقرار لغو اور فضول ہے۔ اور اس پر کسی اثر کا ترتب نہ ہوگا، سابقہ دلائل کے ساتھ اس کے مزید دلائل یہ ہیں۔

۱) **اقرار ایک خبر ھے،** جس میں سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال ہے۔ اختیاری حالت میں سچائی کے جانب کو ترجیح دی گئی کیونکہ انسان اپنے متعلق جھوٹ سے متہم نہیں ہوتا اور اکراہ کی حالت میں دھمکی کی وجہ سے جھوٹ کے جانب کو ترجیح حاصل ہوگی، لہٰذا اقرار صحیح نہ ہوگا۔

۲) **اقرار ایک طرح کی گواھی ھے** ۔ ارشاد باری ہے۔("يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ")(النساء : ۱۳۵)

ترجمہ : "اے ایمان والوں قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف سے اگر چہ نقصان ہو تمہارا" (یعنی اگر چہ وہ گواہی تمہاری ذات کے خلاف کیوں نہ ہو)

اور اپنے نفس اور ذات کے متعلق گواہی اقرار ہی ہے، تو اقرار گواہی کے حکم میں ہوا، اور تہمت کی صورت میں گواہی رد ہوتی ہے اور اکراہ کی صورت میں اقرار میں تہمت موجود ہے، لہٰذا اقرار مقبول نہ ہوگا۔

مُخَيَّر فِيهَا تصرفات میں اکراہ کا اثر : (یعنی ایک سے زائد امور میں مکرہ کے اختیار سے کسی ایک کے کرنے پر اکراہ ہو)

گذشتہ مسائل کا تعلق ان تصرفات سے ہے، جبکہ مکرہ علیہ کوئی ایک چیز ہے۔ اگر اکراہ غیر معین امر پر ہو، مثلاً شراب نوشی یا اتلاف مال پر اکراہ، یا طلاق یا ایلاء میں سے کسی ایک پر اکراہ یا فروخت یا اجارہ پر اکراہ، پھر مستکرہ ان میں سے کسی ایک کو انجام دے، تو ان صورتوں میں اکراہ کا کوئی اثر نہ ہوگا، بلکہ وہ تصرف صحیح اور شرعاً معتبر ہوگا، اور اس پر متعلقہ شرعی آثار مرتب ہوں گے، جیسا کہ بذاتِ خود بلا اکراہ انجام دینے کی صورت میں ہوتا، کیونکہ اختیار دینے کے بعد مکرہ کا کسی ایک کو انجام دینا اس کا قرینہ ہے کہ اس نے اکراہ سے ہٹ کر اپنے اختیار سے اسے انجام دیا ہے۔

اس مسئلہ میں تمام تصرفات کا یہی حکم ہے، خواہ وہ حسی ہوں یا شرعی یا دیگر

اقرار

اقرار لغت میں اثبات کو کہتے ہیں

شرعی تعریف : کسی کا اپنے ذمہ کسی حق کے متعلق خبر دینا، اقرار کو اعتراف بھی کہا جاتا ہے۔

اقرار کے مشروعیت کی دلیل : اقرار مشروع ہے، اس کی مشروعیت قرآن مجید، احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

آیت : " قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي، قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ "
(آل عمران ۸۱)

ترجمہ : فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا، اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا، بولے ہم نے اقرار کیا، تو فرمایا اب گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

۲) "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ" (النساء: ۱۳۵)

ترجمہ : اے ایمان والو قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف کی اگر چہ نقصان ہو تمہارا (یعنی گرچہ وہ گواہی تمہارے خلاف ہو)

علماء کرام نے کہا کہ کسی کا اپنی ذات کے خلاف گواہی کا مطلب اقرار ہے۔

حدیث : آپ ﷺ نے (زنا کے ایک واقعہ میں) فرمایا: "اُنیس، تم اس کی بیوی کے پاس جاؤ، پس اگر وہ (زنا کا) اعتراف کرے تو اسے رجم کردو"، تو انیس اس کے پاس گئے اور اس نے اعتراف کرلیا، لہٰذا آپ ﷺ کے حکم سے اسے رجم (سنگسار) کیا گیا۔ (صحیحین)

علماء نے اقرار کی مشروعیت پر اجماع نقل فرمایا ہے، اور یہ کہ اقرار کے مطابق اس سے مواخذہ ہوگا (جو آدمی کسی حق کا اقرار کرے اسے 'مقر' جس کے حق کا اقرار کرے اسے مُقَرّ لَہ، اور جس حق کا اقرار کرے اسے مُقَرّ بِہ کہا جائیگا۔ مثلاً: زید نے اقرار کیا کہ انس کے میرے ذمہ ۵۰۰ روپے ہیں، تو اس مثال میں زید 'مقر' انس مُقَرّ لہ اور ۵۰۰ روپے مقر بہ کہلائیں گے)

حکمت : انسانوں کی ضرورت وحاجت کے پیش نظر اکثر احکام مشروع ہوتے ہیں، بعض اوقات کسی کا کسی پر حق ہوتا ہے، اور صاحب حق کے پاس کوئی گواہ نہیں ہوتا، اب اگر اقرار مشروع نہ ہو، تو کئی حقوق ضائع اور تلف ہوں گے اور جیسا کہ واضح ہے، اسلام حقوق متعلقہ افراد تک پہنچانے اور اس کے اثبات کا حریص اور حامی ہے۔ اسلام ہمیشہ لوگوں کا مالی اور ان کے حقوق کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجتاً اقرار کی مشروعیت اور اس کا اعتبار شریعت کے اس مزاج کے عین مواقع ہے۔

حقوق اللہ ہوں یا انسانی حقوق، اقرار کی وجہ سے ظاہر وواضح ہوتے ہیں، تاکہ اس کی تحصیل اور ادائیگی ہوسکے۔

حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ ﷺ کے روبرو زنا کا اقرار کیا اور ان پر حد نافذ کرنے اور انہیں اس گناہ سے پاک و صاف کرنے کی درخواست کی، تاکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حق ادا ہو، لہٰذا آپ ﷺ کے حکم سے انہیں سنگسار کیا گیا۔ اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک خاتون نے زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ کے حکم سے اسے سنگسار کیا گیا۔ (بخاری۔ مسلم)

حقوق

جن حقوق کا اقرار کیا جاتا ہے (مُقَرّ بِہ) ان کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حق اللہ عزوجل (۲) حق العباد (انسانی حقوق، بندہ کا حق)

۱) حق اللہ تعالیٰ : مثلاً حد زنا، چوری کی حد، ردت کی حد، شراب کی حد، زکات، کفارہ وغیرہ۔ ان حقوق کی مشروعیت دین کی اقامت اور معاشرہ کی اجتماعی مصلحت کے پیش نظر ہیں۔

حق اللہ کے سلسلہ میں بندہ براہ راست اللہ سے توبہ کرے، تو یہ اسکے لئے نفع بخش ہے۔ اور اقرار کے بعد اگر اس سے رجوع کرے تو صحیح ہے۔ (یعنی اس کے اقرار کے مطابق اس سے مواخذہ نہ ہوگا) کیونکہ حق اللہ کی بنیاد پردہ پوشی اور رفع دفع کرنے پر ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ماعز سے رجوع کے متعلق تعریض فرمائی، جبکہ انہوں نے زنا کا اقرار کیا، پس آپ ﷺ نے فرمایا: ''شاید تم نے بوسہ لیا ہوگا، یا دبایا ہوگا'' اس گفتگو کا مقصد انہیں زنا کے اقرار سے رجوع کا اشارہ کرنا، اور پھر رجوع کو شبہ سمجھتے ہوئے انہیں معذور قرار دینا تھا۔

نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ''حتی الامکان مسلمانوں پر سے حدود کو دفع کرو (ہٹاؤ)، اگر اس کے نجات کی کوئی شکل ہو تو اسے چھوڑ دو، کیونکہ امام (حاکم) کا معافی میں غلطی کر جانا سزا میں غلطی کرنے سے بہتر ہے۔'' (ترمذی فی الحدود)

اور بلاشبہ اقرار سے رجوع کر لینا ایسا شبہ ہے، جو حد کو ساقط کر دیتا ہے۔

قاضی (جج) کو مستحب ہے کہ مُقِرّ کو رجوع کی تعریض (اشارہ) کرے، البتہ اس سے یوں نہ کہے: تم اقرار سے رجوع کر لو، کیونکہ یہ ایک جھوٹ کا حکم ہوگا۔

پس اگر مُقِرّ اقرار کے بعد حق اللہ سے رجوع کرے، تو یہ رجوع صحیح ہے، اور جس بات کا اقرار کیا تھا، اس کا حکم ساقط و زائل ہو جائے گا، حضرت ماعز رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں ہے کہ جب ان پر پتھر پڑنے لگے تو وہ بھاگے، تو لوگوں نے ان کا پیچھا کر کے انہیں سنگسار کر دیا، اور آپ ﷺ کو اسکی اطلاع ہوئی تو فرمایا: ''تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا؟'' (بخاری۔مسلم۔ترمذی)

۲) حق العباد (بندوں کا حق): اس میں ایک مرتبہ اقرار کرنے کے بعد رجوع کرنا اور اقرار سے پھر جانا صحیح نہیں، کیونکہ مقرلہ کا اس حق سے تعلق ہے، البتہ خود مقرلہ اس حق کا انکار کرے اور مقر کو جھٹلائے، تو رجوع کرنا صحیح ہوگا۔

اگر کسی نے اپنے ذمہ زید کے قرض کا، یا اس کے مال تلف کرنے، یا اسے زنا کی تہمت لگانے کا اقرار کیا، تو اس سے رجوع صحیح نہیں، بلکہ جس بات کا اقرار کیا، وہ اس پر لازم ہے، الا یہ کہ زید خود اسے جھٹلائے۔

مُقِرّ کے شرائط

قاضی کے روبرو اور عدالت میں کسی کا اقرار صحیح اور معتبر ہونے کیلئے درج ذیل شرائط لازم ہیں۔

۱) **بلوغ**، لہٰذا کسی نابالغ کا اقرار صحیح نہیں، گرچہ وہ ممیز (باشعور) ہو، کیونکہ وہ مرفوع القلم ہے۔ اور اسے تصرفات کا حق نہیں۔

۲) **عقل**، پس کسی پاگل یا بیہوش شخص کا اقرار صحیح نہیں، کیونکہ وہ ممنوع التصرف ہیں، نیز انھیں شعور و سمجھ نہیں اور وہ مرفوع القلم ہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''تین لوگ مرفوع القلم ہیں (یعنی ان کے تصرف کا کوئی اعتبار نہیں اور ان پر گناہ لکھا نہ جائیگا): سونے والا جب تک بیدار نہ ہو، بچہ جب تک بالغ نہ ہو، اور پاگل جب تک اسے عقل نہ آئے۔ (ابوداود وغیرہ)

۳) **اختیار**، (یعنی اپنی مرضی اور اختیار سے اقرار کرے)، لہٰذا اگر کوئی اکراہ اور جبر کی وجہ سے اقرار کرے تو معتبر نہیں، کیونکہ حدیث کی رو سے یہ معاف ہے۔ (ابن ماجہ) (اکراہ کی تفصیل گزر چکی)

۴) **مَحجُور علیہ نہ ہو**: (یعنی اس پر مالی تصرف کی پابندی عائد نہ ہو)، محجور علیہ حجر اور پابندی سے پہلے یا بعد میں کسی معاملہ کی وجہ سے قرض کا اقرار کرے (لیکن اقرار حجر کے بعد ہو) یا کسی کا مال تلف کرنے کا اقرار کرے، تو یہ اقرار صحیح نہیں، کیونکہ وہ مالی تصرف سے عاجز ہے۔

اگر محجور علیہ کسی حد یا قصاص کا اقرار کرے تو صحیح ہے، کیونکہ اس کا مال سے تعلق نہیں، اور اس میں تہمت کا بھی سوال نہیں، اگر چوری کا

اقرار کرے، تو ہاتھ کٹے گا، لیکن اقرار شدہ مال اس پر لازم نہ ہوگا۔

مُقِرّ لہ کے شرائط (جس کے حق کا اقرار کرے ، اس کے شرائط)

۱) مقرلہ کسی حد تک متعین ہو کہ اس کی جانب سے دعویٰ اور مطالبہ کی توقع ہو۔

اگر کہے: کسی انسان کا مجھ پر ہزار روپیہ قرض ہے، تو یہ اقرار صحیح نہیں، کیونکہ مبہم اور غیر معین شخص کے لئے اقرار ہے، اور ابہام کی وجہ سے اقرار باطل ہوتا ہے۔

اگر یوں کہا: ان تینوں میں سے ایک کا مجھ پر ہزار روپیہ قرض ہے، تو یہ اقرار صحیح ہے، کیونکہ فی الجملہ تعیین پائی گئی، اب ان میں سے کوئی دعویٰ کرے کہ اس اقرار سے میں مراد ہوں، تو قسم کے ساتھ اس کی تصدیق کی جائے گی، جبکہ مقر اسے نہ جھٹلائے، کیونکہ اس کا احتمال موجود ہے، نیز قسم کی وجہ سے مزید تاکید حاصل ہوئی، اور جب مقر نے خود اسے نہیں جھٹلایا تو اس میں مزید پختگی حاصل ہوئی۔

۲) مُقَرّ لہ میں مُقَرّ بہ (اقرار شدہ حق) کے استحقاق کی اہلیت ہو، تب جاکر اقرار برمحل ہوگا، اور اس کی صداقت کا احتمال ہوگا، اگر کوئی کہے: اس جانور کے میرے ذمہ ۱۰۰۰ روپے ہیں، تو اقرار صحیح نہیں، کیونکہ جانور میں اس استحقاق کی اہلیت نہیں، وہ نہ فی الحال ملکیت کی صلاحیت رکھتا ہے، اور نہ آئندہ۔

۳) مُقَرّ لہ، مُقِرّ کو نہ جھٹلائے، اگر اسے جھٹلائے تو اقرار باطل ہوگا، اور جس مال کا اقرار کیا ہے وہ مقر کے پاس ہی رہے گا، کیونکہ اس کے قبضہ میں ہونا بظاہر اس کی ملکیت پر دلالت کر رہا ہے، اور بعد میں طاری اقرار کے بمقابل تکذیب (جھٹلانا) موجود ہے، اس لئے وہ ساقط ہو جائے گا۔

صیغہ کے شرائط

اقرار کے صیغہ میں ایسا صریح یا کنایہ لفظ شرط ہے، جو التزام (اپنے اوپر کسی کا حق لازم ہونا) پر دلالت کرے، نیت کے ساتھ تحریر اور گونگے کا بامعنی اشارہ بھی اسی حکم میں ہے۔

پس اگر کہا: زید کے مجھ پر ہزار روپے ہیں، یا اس کے میرے ذمہ ہزار روپے ہیں، تو یہ اقرار ہے، اور اسے ذِمہ پر لازم قرض (دَین) پر محمول کرینگے، کیونکہ صیغہ سے عرفاً یہی بات ذہن میں آتی ہے۔

اگر یوں کہا: زید کے میرے پاس ہزار روپے ہیں، تو یہ بھی اقرار ہے، اور اسے عین پر محمول کریں گے، (یعنی وہی ہزار روپے امانت وغیرہ کے طور پر اس کے پاس رکھے ہوئے ہیں)

اگر کوئی دوسرے سے کہے: میرا تم پر ہزار روپیہ قرض ہے، اور وہ جواب دے،: جی ہاں یا صحیح ہے، یا آپ نے سچ کہا، تو یہ اقرار ہے۔ اگر اس نے جواب میں کہا کہ: تم وہ قرض معاف کر چکے ہو یا میں ادا کر چکا ہوں، تو یہ بھی اقرار ہے، کیونکہ اس حق کا اپنے ذمہ ہونا اس نے قبول کر لیا، پھر اس کے اسقاط کا دعویٰ کر رہا ہے، اور اصل عدم اور نفی ہے۔

مُقَرّبہٖ کے شرائط (جس حق کا اقرار کیا جائے، اس کے شرائط)

۱) **مقر بہ بوقت اقرار مقر کی ملکیت نہ ہو،** کیونکہ اقرار ملکیت کا ازالہ نہیں ہے، بلکہ مقر بہ کے متعلق یہ اطلاع دینا ہے کہ وہ مقر لہ کی ہے۔

لہٰذا اگر کوئی کہے: میرا کپڑا زید کا ہے، یا میرا جو قرض زید پر ہے وہ جمیل کا ہے، تو یہ اقرار صحیح نہیں ہے کیونکہ ان حقوق کا اپنی طرف منسوب کرنا اس کی ملکیت ہونے پر دلالت کر رہا ہے (یعنی میرا کپڑا اور میرا قرض کہنا)، لہٰذا اس کا کسی دوسرے کے لئے اقرار کرنا اس کے منافی ہے۔ (اس لئے معتبر نہ ہوگا)

۲) **مقر به (اقرار کردہ حق) مقر کے قبضہ میں ہو،** تاکہ اقرار کے مطابق مقرلہ کے سپرد کر سکے، کیونکہ اگر وہ حق اس کے قبضہ میں نہیں ہے، تو یہ یا تو بغیر اجازت کے دوسرے کی جانب سے دعویٰ ہوگا، یا گواہی کے لفظ کے بغیر گواہی ہوگی، لہٰذا قبول نہ کی جائیگی۔

اقرار کے وقت وہ حق اس کے قبضہ میں نہ ہو، پھر اس کے قبضہ میں آجائے تو اس کے اقرار کے مطابق مقرلہ کے سپرد کی جائے گی، کیونکہ شرط پائی گئی (یعنی مقر کے قبضہ میں ہونا)

مجہول (غیر معلوم) کا اقرار

مجہول کا اقرار صحیح ہے، کیونکہ اقرار سابقہ حق کی اطلاع ہے، اور کسی چیز کے متعلق کبھی مفصلاً اطلاع اور خبر دی جاتی ہے اور کبھی اجمالاً اور مختصراً

لہٰذا اگر کوئی کہے: میرے ذمہ اختر کا مال ہے، تو یہ اقرار صحیح ہے، اور اس مال کی وضاحت و تفصیل کے لئے اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ اور وہ کسی بھی مالیت والی چیز کی تعیین کرے، تو اسے تسلیم کریں گے، خواہ کم ہی کیوں نہ ہو، مثلاً ایک روپیہ وغیرہ، کیونکہ مال کا لفظ اس پر بھی صادق آتا ہے۔

مجہول کے اقرار کے بعد اس کی وضاحت سے انکار کرے تو اسے قید میں ڈال دیا جائے، یہاں تک کہ وضاحت کر دے، کیونکہ یہ اس پر واجب ہے۔

اقرار میں استثناء اور اس کا حکم

چونکہ قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور کلام عرب کے نظم و نثر میں (اسی طرح اردو وغیرہ دیگر زبانوں میں بھی) استثناء بکثرت وارد ہے، اسلئے اقرار میں استثناء صحیح ہے۔

لہٰذا اگر کوئی کہے: مجھ پر ہزار روپے ہیں سوائے ۱۰۰ روپیہ (یا مگر ۱۰۰ روپیہ) تو اقرار صحیح ہے، اور اس پر ۹۰۰ روپے لازم ہیں۔

استثناء کی صحت کے شرائط حسب ذیل ہیں:

۱) گفتگو میں استثناء اقرار کے جملہ سے اس طور پر متصل ہو، کہ عرفاً ایک ہی کلام شمار ہو، لہٰذا سانس لینے یا یادداشت کے لئے معمولی وقفہ ہو جائے تو حرج نہیں۔

اگر زیادہ وقفہ اور دیر گذر جائے، اور پہلا جملہ دوسرے جملہ سے (استثناء سے) جدا شمار ہو تو استثناء صحیح نہیں، بلکہ اس سے قبل اقرار کردہ حق مکمل ثابت ہوگا۔

۲) استثناء کو معتبر ماننے کی صورت میں مکمل حق اور مقر به ساقط نہ ہو جائے۔

مثلاً یوں کہا: مجھ پر اس کے پانچ ہیں مگر چار (چار چھوڑ کر، سوائے چار) تو اقرار صحیح ہے، اور ایک لازم ہوگا۔

لیکن اگر یوں کہا: مجھ پر اس کے پانچ ہیں مگر پانچ (پانچ کے علاوہ، سوائے پانچ) تو استثناء باطل اور غیر معتبر ہے، اور پانچ پورے لازم ہوں گے (کیونکہ استثناء کو ماننے کی صورت میں مکمل اقرار ساقط ہو جاتا ہے۔)

منقطع استثناء

کسی جملہ کے بعد دوسری جنس کا استثناء کرے تو اسے منقطع استثناء کہیں گے، اور یہ بھی صحیح اور معتبر ہے، کیونکہ قرآن حکیم وغیرہ میں وارد ہے

آیت: "قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّاکُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ○ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ○ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ" (الشعراء ۷۵۔۷۷)

ترجمہ: "کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے باپ دادے اگلے، سو وہ میرے دشمن ہیں، مگر جہان کا رب"۔

(اس آیت میں کفار کے معبدوں سے رب العلمین کا استثناء کیا، حالانکہ وہ ان کے باطل معبدوں میں داخل ہی نہیں، تو یہ استثناء منقطع ہوا)

(منقطع استثناء کی مثال: میری ساری رقم دیدو سوائے گھڑی کے، تو اس میں گھڑی کا استثناء کیا جو رقم کی جنس میں داخل نہیں، تو اسے استثناء منقطع کہیں گے)

لہٰذا اگر کہے: مجھ پر اکرم کے ہزار روپے ہیں، سوائے کپڑے کے، تو یہ اقرار صحیح ہے، اور اس پر واجب ہے کہ کپڑے کی قیمت بتائے، جو ہزار سے کم ہو، تاکہ مکمل مقربہ ساقط نہ ہو جائے، اگر اس نے کپڑے کی قیمت ہزار روپے بتلائی تو یہ استثناء غیر معتبر ہوگا، اور مکمل ہزار روپے لازم ہوں گے۔ (اگر اس نے کپڑے کی قیمت ۵۰۰ روپے بتلائی تو اسے نفی کر کے بقیہ ۵۰۰ روپے اس پر لازم ہوں گے)۔

معین چیز سے استثناء: کسی معین چیز سے بھی استثناء صحیح ہے، مثلاً یوں کہا: یہ مکان رضوان کا ہے، سوائے اس کمرہ کے، تو یہ متصل لفظوں میں اقرار واخراج ہے، لہٰذا تخصیص کی طرح ہوگا (اور اس کمرہ کے علاوہ بقیہ مکان رضوان کا ہوگا)

مرض (بیماری) میں اقرار: عام مرض یا مرض الموت کا اقرار بھی صحت اور تندرستی کی حالت کے اقرار کی طرح ہے۔ اگر بحالت صحت کسی کے قرض کا اقرار کرے، پھر مرض میں کسی دوسرے کے قرض کا اقرار کرے، تو یہ اقرار بھی صحیح ہے، اور صحت کا قرض اس پر مقدم نہ ہوگا۔ مرض میں جس طرح کسی اجنبی (غیر وارث) کے حق میں اقرار صحیح ہے۔ اسی طرح وارث کے حق میں بھی صحیح ہے، کیونکہ اس وقت وہ اس حالت پر پہنچ چکا ہے (یعنی دنیا سے کوچ کرنے کا وقت) کہ ایسی حالت میں ایک جھوٹا آدمی بھی سچ کہتا ہے، اور فاسق وفاجر شخص بھی توبہ کرتا ہے۔ (لہٰذا وارث کے متعلق کسی حق کا اقرار کرے تو اسے متہم سمجھ کر اس اقرار کو جھٹلانے اور باطل قرار دینے کی ضرورت نہیں)

کوئی اپنی صحت یا مرض میں کسی شخص کے قرض کا اقرار کرے، اور اس کے موت کے بعد وارث کسی دوسرے کے قرض کا اقرار کرے تو پہلا قرض مقدم نہ ہوگا (دونوں مساوی درجہ میں ہوں گے) کیونکہ وارث کا اقرار مورث کے اقرار کی طرح ہے۔ (نہایۃ المحتاج ۵/۷۰)

متفرق مسائل

۱) اگر کوئی دوسرے سے کہے: میرے تم پر ہزار روپے ہیں یا تمہارے ذمہ جو میرے ہزار روپے ہیں، وہ ادا کرو اور دوسرا شخص یہ کلمات کہے تو یہ اقرار نہیں: آج وہ ادا کرنا مجھ پر لازم نہیں ہے، تمہارا ہزار روپے سے زائد نہیں، لے لو، وہ لے لو، وہ تمہارے بٹوہ (تھیلی

پاکٹ) میں رکھ لو۔

اگر دوسرا شخص جواب میں یہ الفاظ کہے تو یہ اقرار ہے۔ جی ہاں، آپ نے سچ کہا، تم نے مجھے اس سے بری کردیا (معاف کردیا)، میں نے وہ ادا کردیا، میں وہ کل ادا کرونگا، میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے دعویٰ سے انکار نہیں، البتہ ان میں سے کسی لفظ کے ساتھ استہزاء (ٹھٹھا، مذاق اڑانا) کا قرینہ ہو، مثلاً سر ہلانا اور ایسا ہنسنا جو تعجب اور انکار پر دلالت کرے، تو یہ اقرار نہ ہوگا (نهاية المحتاج ۷۶/۵)

۲) کسی شخص کی زبان سے ایسے الفاظ کہلوائے جائیں جن کے معانی و مطالب سے وہ ناواقف ہو، تو اس پر اس کی گرفت نہ ہوگی، کیونکہ بلا مطلب سمجھے مفہوم کے قصد کا سوال نہیں۔ (نهاية ۸۰/۵)

۳) اگر کوئی کہے: "لکھو کہ میرے ذمہ ہزار روپے ہیں" تو یہ اقرار نہیں، کیونکہ اسنے صرف لکھنے کا حکم دیا ہے ۔ (نهاية ۸۰/۵)

۴) امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسباب خانہ کے متعلق میاں بیوی کا اختلاف ہو، تو ان میں سے جو بھی کسی چیز کے متعلق بیّنہ (گواہ) پیش کرے، وہ چیز اس کی ہوگی، ...... اور بینہ پیش نہ کرے تو ہر ایک دوسرے کے لئے اپنے دعویٰ پر قسم لے، اگر دونوں قسم لیں تو وہ دونوں میں نصف نصف ہوگی، صرف ایک قسم لے اور دوسرا نہ لے تو قسم لینے والے کے حق میں فیصلہ دیا جائیگا (اور مکمل اس کا ہوگا)، یہ اختلاف زوجیت کا رشتہ برقرار رہتے ہوئے، یا آپس میں جدائی کے بعد، (مسئلہ کی نوعیت یہی ہوگی)، دونوں کے ورثاء یا ایک اور دوسرے کے ورثاء کے اختلاف کا بھی یہی حکم ہے۔ خواہ وہ چیز صرف شوہر کے مناسب ہو جیسے تلوار وغیرہ، یا بیوی کے مناسب ہو، جیسے زیورات وغیرہ، یا دونوں کے مناسب ہو، جیسے روپے پیسے یا دونوں کے مناسب نہ ہو جیسے قرآن شریف جبکہ دونوں ان پڑھ ہوں (نهاية ۸۷/۵)

۵) ایک دن کسی کے لئے ایک ہزار کا اقرار کرے، پھر کسی دوسرے دن اسی کے لئے ہزار کا اقرار کرے تو صرف ہزار ہی لازم ہوں گے، اگر مقدار جدا ہو، مثلاً پہلے ہزار کا اور پھر پانچ سو کا اقرار کرے، تو قلیل کثیر میں داخل ہوگا۔

(یعنی مذکورہ صورت میں ہزار لازم ہوں گے)، اگر دونوں کی الگ الگ صفت بیان کرے مثلاً ہزار روپے اور ۵۰۰ ریال، یا دو مختلف جہت کی طرف منسب کرے، مثلاً ایک کسی چیز کی قیمت کے طور پر اور دوسرا قرض لیا ہو، یا (مختلف وقت کی طرف نسبت کرے مثلاً) کہے کہ میں نے سنیچر کو اس سے ہزار روپے لئے، پھر کہے کہ اِتوار کو ۵۰۰ روپے لئے تو تینوں صورتوں میں دونوں اقرار و مقدار لازم ہوں گے۔(نهاية ۱۰۰/۵)

۶) **نسب کا اقرار:** (مثال: اگر عثمان یہ اقرار کرے کہ عمر میرا بیٹا ہے، تو اس اقرار کو "اِستحقاق" عثمان کو مُستَلحِق اور عمر کو مُستَلحَق کہا جائیگا)

اگر کوئی کسی کا نسب خود سے جوڑے، مثلاً کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، تو اس اقرار کی صحت کے لئے یہ شرط ہے کہ حس سے نہ جھٹلائے، یعنی عمر کے تفاوت کے اعتبار سے یہ اس کا بیٹا ہوسکتا ہو، اور نہ شریعت اسے جھٹلائے، یعنی کسی اور سے اس کا نسب پہلے سے ثابت نہ ہو (معروف النسب نہ ہو)، نیز وہ مُستَلحَق مکلف ہو تو اس کی تصدیق کرے اگر وہ اس کو جھٹلائے یا چپ رہے (نہ تصدیق کرے اور نہ تکذیب) تو بغیر بیّنہ (گواہ) کے نسب ثابت نہ ہوگا، اگر بیّنہ نہ ہو تو اسے قسم دلائے، وہ قسم نہ کھائے تو خود مُستَلحِق (اقرار کرنے والا) قسم لے، اور اس طرح اس سے نسب ثابت ہوگا۔

اگر کسی نابالغ کا استلحاق کرے، تو انہیں شرائط کے ساتھ نسب ثابت ہوگا۔ (سوائے تصدیق کے) بالغ ہونے کے بعد وہ تکذیب کرے تو نسب باطل نہ ہوگا۔

بالغ یا نابالغ میت کا استلحاق بھی صحیح ہے، اور یہ اس میت کا وارث بنے گا، تہمت کو نظر انداز کیا جائے گا۔

کسی بالغ کا دو شخص استلحاق کریں تو وہ جس کے حق میں تصدیق کرے گا اس سے نسب ثابت ہوگا۔

اگر کوئی کسی کا نسب کسی دوسرے کے ساتھ جوڑے، مثلاً یہ شخص میرا بھائی ہے، یا میرا چچا ہے (تو پہلی صورت میں نسب اپنے باپ سے اور دوسری صورت میں دادا سے جوڑ رہا ہے) تو نسب کے ثبوت کے لئے سابقہ شرائط کے ساتھ درج ذیل شرائط بھی ضروری ہیں۔

(الف) جس کے ساتھ جوڑرہا ہے، وہ انتقال کر چکا ہو، (پہلی مثال میں مستلحق کا باپ اور دوسری مثال میں دادا زندہ نہ ہوں)، لہٰذا کسی زندہ کے ساتھ دوسرے کا استلحاق معتبر نہیں، خواہ وہ پاگل ہو، یہ ضروری نہیں کہ میت (اپنی زندگی میں) اس مستلحق کی نفی نہ کر چکا ہو،

(ب) اقرار کرنے والا جس کے ساتھ نسب جوڑ رہا ہے، اس کے ترکہ کا مکمل وارث ہو، خواہ ایک شخص اقرار کرے یا زائد، (مثلاً۔ زید کا انتقال ہوا اور ورثاء میں صرف دو بیٹے ہوں، تو ان دونوں کا اقرار ضروری ہے کہ فلاں زید کا بیٹا ہے) اس صورت میں اس کا نسب بھی ثابت ہوگا۔ اور وہ وارث بھی بنے گا (مذکورہ مثال میں صرف ایک بیٹا تیسرے بیٹے کا اقرار کرے، اور دوسرا انکار کرے، تو نسب ثابت نہ ہوگا۔ اسلئے وہ وارث نہ ہوگا، اور نہ ظاہراً اقرار کرنے والے کے حصہ میں شریک ہوگا، البتہ باطناً اسے لازم ہے کہ اسے بھی اپنے حصے میں شریک کرے)

وارثوں میں نابالغ بھی ہوں، تو صرف بالغ کا اقرار کافی نہیں، بلکہ ان کے بلوغ کا انتظار کیا جائے گا، جب وہ بالغ ہو کر اقرار میں موافقت کریں تو نسب ثابت ہوگا۔

اگر دو وارثوں میں ایک اقرار کرے اور دوسرا انکار، پھر دوسرا مر جائے اور اس کا وارث صرف اقرار کرنے والا ہو، تو (اب) نسب ثابت ہوگا، خواہ اس کی موت کے بعد یہ پھر اقرار کو نہ دوہرائے۔

بظاہر جو وارث بن رہا ہے، سہ مستلحق کی وجہ سے محجوب ہوتا ہو (اسے وراثت نہ ملتی ہو)، مثلاً ایک بھائی میت کے حق میں بیٹے کا اقرار کرے، تو اس کا نسب ثابت ہوگا،

لیکن اسے وراثت نہ ملے گی۔ (السراج الوهاج ص ۲۶۱-۲۶۲)

عاریّت

تعریف : جس چیز سے انتفاع حلال ہو، اسے باقی رکھتے ہوئے اس سے انتفاع کو کسی کے لئے مباح قرار دینا عاریت کہلاتا ہے۔ اس چیز کو بھی عاریت کہا جاتا ہے اور اس عقد کو بھی۔

عقد عاریت کی وجہ سے مستعیر (عاریت پر کسی کی چیز لینے والا) اس کی منفعت کا مالک نہیں بنتا، صرف اس چیز سے انتفاع جائز ہے۔ اسی لئے اس چیز کو کسی دوسرے کو کرایہ سے یا رعایت پر نہیں دے سکتا۔

عاریت میں صرف شرعاً قابل انتفاع چیز ہی دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا سوَر اور آلات لہو کو عاریت پر دینا صحیح نہیں، جیسا کہ حائضہ اور نفساء کو قرآن مجید عاریت دینا صحیح نہیں، کیونکہ انہیں اسے چھونے اور اس میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

مشروعیت : اعارہ کی مشروعیت پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اجماع قائم ہے۔

اعارہ (عاریت پر دینا): ان اشیاء کا ہوگا جو استعمال سے ختم نہ ہو۔ اگر ختم ہو جیسے صابون، موم بتی وغیرہ اور ان کا اعارہ صحیح نہیں ہے۔

آیت: "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاؤُوْنَ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔" (الماعون ۴-۶)

ترجمہ: "ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ (یعنی ترک کرتے ہیں) جو ایسے ہیں کہ ریا کاری کرتے ہیں اور مانگی نہیں دیتے برتنے کی چیز"

اکثر مفسرین نے ماعون کا مطلب یہ بیان کیا کہ جو چیزیں پڑوسی آپس میں ایک دوسرے سے عاریتاً لیتے ہیں۔ جیسے ڈول، سوئی، ہانڈی وغیرہ۔ بس اللہ تبارک وتعالیٰ نے ماعون سے انکار کرنا قیامت کے منکرین کا شیوہ بتلایا اور اس پر سخت عذاب وہلاکت کی دھمکی دی، تو معلوم ہوا کہ اعارہ ایک مشروع ومطلوب عمل ہے۔

حدیث: (۱) "آپ ﷺ نے حضرت ابوطلحہؓ سے ایک گھوڑا عاریتاً لیا اور اس پر سوار ہوئے۔" (متفق علیه)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا: "جس کے پاس زمین ہو وہ ہبہ کرے یا عاریتاً دے دے" (مسلم شریف)

دیگر احادیث مسائل پر گفتگو کے دوران پیش ہوں گی، جن میں عاریت کے مشروعیت واحکام کا تذکرہ ہوگا۔

حکم: عاریت مستحب اور مطلوب ہے، جیسا کہ دلائل گذر چکے۔ ابتداء اسلام میں یہ واجب تھا، کیونکہ اس سے انکار پر سخت وعید ودھمکی گزر چکی۔ البتہ یہ وجوب بالاجماع منسوخ ہو چکا۔ اور عام حالات میں اس کا استحباب باقی ہے۔ (عاریت پر دینے کے لئے لفظ اعارہ استعمال ہوتا ہے)

بعض مخصوص حالات میں یہ واجب ہو جائیگا۔ جبکہ کسی معصوم (غیر حربی) انسان کی زندگی کا بچانا اس پر موقوف ہو۔ مثلاً شدید اور مہلک سردی یا گرمی سے بچاؤ کے لئے کپڑا اعاریۃً دینا۔ کسی ڈوبنے والے کے لئے رسی کا اعارہ، کاری زخم کے مرہم کے لئے مطلوبہ اسباب کا اعارہ وغیرہ۔

جس اعارہ سے مال محترم کی حفاظت ہو وہ بھی واجب ہے۔ مثلاً ماکول اللحم جانور کے ذبح کی خاطر چھری کا اعارہ جبکہ ذبح نہ کرنے کی صورت میں اس کے ہلاکت کا اندیشہ ہو، کیونکہ ذبح نہ کرنے میں مال کی بربادی ہے جو کہ شرعاً منع ہے۔ (لیکن ان صورتوں میں مفت دینا لازم نہیں، مالک چاہے تو اجرت مانگ سکتا ہے۔ ترشیح ص ۲۵۷)

کسی حرام کے تعاون میں اعارہ حرام اور کسی مکروہ کے تعاون میں اعارہ مکروہ ہے۔

عقد اعارہ کے ارکان

(۱) مُعِیر (عاریت دینے والا) (۲) مُستَعِیر (عاریت لینے والا) (۳) صیغہ (۴) شئی مُستَعار (عاریت پر دی جانے والی شئی)

۱) **مُعِیر:** یعنی جو اپنے قبضہ کی چیز سے انتفاع دوسرے کو مباح اور جائز قرار دے، اس کے شرائط یہ ہیں:

ألف: اس عاریت کی چیز کی منفعت کا مالک ہو، چاہے اس چیز کا مالک ہو یا نہ ہو، مثلاً کرایہ پر لی ہو یا اس کے حق میں وصیت ہو یا اس پر وقف ہو۔ چونکہ وہ ان اشیاء کی منفعت کا مالک ہے، لہٰذا اسے اعارہ کا حق ہے۔ کیونکہ عاریت کا تعلق منفعت سے ہے نہ کہ اس چیز سے۔ اسی لئے مستعیر عاریت کی چیز کسی اور کو عاریتاً نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ منفعت کا مالک نہیں، اسے صرف نفع اٹھانا مباح ہے۔

ب: اسے تبرع کا حق ہو، لہٰذا بچے اور پاگل کا اعارہ درست نہیں۔ اسی طرح منفعت اگر قابلِ معاوضہ ہو تو محجور علیہ کا اعارہ بھی درست نہیں۔

ج: اپنی مرضی اور اختیار سے ہو، لہٰذا مُکرَہ (جس پر جبر کیا جائے) کا اعارہ صحیح نہیں۔ کیونکہ حدیث کی رو سے کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی اور رضامندی کے بغیر حلال نہیں (دار قطنی)

(۲) **مُستَعِیر:** جس کے لئے عاریت کی چیز سے انتفاع کو مباح قرار دیا گیا ہو۔ وہ مستعیر ہے اور اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:

الف) عاقل بالغ ہو، پس بچے اور پاگل کو اعارہ صحیح نہیں، اگر ان کو اعارہ کی ضرورت پیش آئے تو ان کی جانب سے ان کا ولی ذمہ دار ہوگا۔

ب) معین ہو، اگر دو اشخاص سے کہا: میں نے تم میں سے ایک کو میری کتاب عاریت دی یا ایک جماعت سے کہا: میں نے تم میں سے ایک کو کتاب عاریت دی، تو یہ اعارہ صحیح نہیں۔ کیونکہ مستعیر معین نہیں ہے۔

(۳) **صیغہ:** یعنی ایجاب وقبول پر مشتمل وہ عبارت جو اس عقد پر دلالت کرے، معیر اور مستعیر دونوں کی جانب سے لفظ شرط نہیں، بلکہ ایک کی جانب سے لفظ اور دوسرے کی طرف سے فعل کافی ہے۔ پس اگر مالک نے کہا یہ کتاب لو اور پڑھو، یا میں نے یہ کتاب تمہیں عاریتاً دی۔ اور مستعیر اسے لے لے تو یہ اعارہ صحیح ہے۔ اسی طرح اگر مستعیر نے کہا: مجھے فلاں چیز عاریت دو اور مالک نے وہ چیز اس کے سپرد کر دی تو عقد صحیح ہوگا۔

کسی ایک کی جانب سے لفظ ضروری ہے، لہٰذا اگر مستعیر بغیر کسی گفتگو کے وہ چیز لے لے اور معیر بھی خاموش رہے تو اعارہ صحیح نہیں، اور مستعیر کو اس سے انتفاع جائز نہیں، لیکن اگر کوئی چیز خریدے اور بائع کسی برتن میں وہ دے تو وہ برتن عاریت ہے۔ اگرچہ دونوں طرف سے صیغہ نہیں پایا گیا۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۴۵۷)

طرفین کے صیغے میں تتابع واتصال ضروری نہیں۔ لہٰذا کسی نے کہا مجھے فلاں چیز عاریتاً دیجئے۔ اور مالک کچھ مدت کے بعد وہ چیز اسے دے تو صحیح ہے۔ جبکہ معیر کی طرف سے رجوع یا مستعیر کی طرف سے رد کی کوئی دلالت اس دوران نہ پائی گئی ہو۔

اعارہ کسی وقت یا شرط کی قید کے بغیر صحیح ہے۔ جیسا کہ کسی شرط پر معلق رکھنا اور کسی مدت کے ساتھ مقید کرنا بھی صحیح ہے۔ مثلاً یوں کہا۔ میں نے یہ گھر تمہیں ایک سال رہائش کے لئے عاریۃً دیا۔ یا فلاں جو اس میں رہتا ہے وہ نکل گیا تو تمہیں دیا۔

(۴) **مُستَعَار:** اس سے وہ عین (شئ) مراد ہے، جس کی منفعت مستعیر کے حق میں مباح کی گئی ہو، (یعنی عاریت میں دی جانے والی چیز) اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:

الف: اس کی منفعت کا معیر مالک ہو، بس مستعیر کسی اور کو اعارہ نہیں کر سکتا۔

ب: اس سے انتفاع ممکن ہو، لہٰذا بالکل بوسیدہ کپڑا جو کسی وقت پہننے کے لائق نہ ہو، یا بالکل مریض یا اپاہج جانور سواری کے لئے یا بغیر انجن اور مشین کی گاڑی وغیرہ کا اعارہ صحیح نہیں۔

بوقت عقد نفع کا وجود شرط نہیں، پس جانور کا بچہ سواری کے لئے دینا صحیح ہے جبکہ اعارہ مطلق ہو (وقت کی قید نہ ہو) یا اتنی مدت کے لئے ہو کہ وہ بچہ اس دوران سواری کے قابل ہو جائے گا۔ اسی طرح کپڑا جو پہننے کے لائق نہ ہو، لیکن اس کی اصلاح ممکن ہو تو اس کا اعارہ صحیح ہے۔

ج: اس چیز سے انتفاع شرعاً جائز ہو، لہٰذا آلاتِ لہو کا اعارہ، عورت کو غیروں کے سامنے آرائش کے لئے

زیورات کا اعارہ، شراب بنانے کے لئے برتن کا اعارہ، کھانے کی خاطر سور ذبح کرنے کے لئے چھری کا اعارہ، کسی کو ناحق مارنے والے کو ہتھیار کا اعارہ وغیرہ......صحیح نہیں، کیونکہ اس طرح کا انتفاع شرعاً ممنوع اور حرام ہے۔

د: انتفاع کی وجہ سے وہ چیز گھٹتی نہ ہو جیسے کپڑے، مکانات اور برتن وغیرہ۔ اگر استعمال کرنے سے گھٹتی اور ختم ہوتی ہو تو اس کا اعارہ صحیح نہیں۔ لہٰذا جلانے کے لئے موم بتی، غسل وغیرہ کے لئے صابون وغیرہ کا اعارہ صحیح نہیں۔ کیونکہ ان سے انتفاع کی صورت میں رفتہ رفتہ وہ چیز گھٹتی اور ختم ہوتی رہے گی۔

مستعار کی تعیین شرط نہیں، اگر کہہ دے کہ میرے جانوروں میں سے جو چاہے لو، تو کافی ہے، بخلاف اجارہ کے (ترشیح ص ۲۵۷)

عاریت کے بعض احکام

۱) مستعار شئی سے انتفاع کے حدود : مالک کی اجازت کے دائرہ میں مستعیر اس شئی سے نفع اٹھائیگا۔ اجازت کے علاوہ کسی امر میں نفع اٹھانا جائز نہیں۔ البتہ اس انتفاع واستعمال سے اجازت والے انتفاع سے نسبتاً کم نقصان ہوتا ہو تو حرج نہیں۔ اگر انتفاع کی مطلق اجازت دے دے یعنی کسی خاص نوعیت کے انتفاع کی قید کے بغیر عاریت دے تو عادتاً اس سے جو انتفاع ہوتا ہے وہ جائز ہوگا۔ اگر کسی انتفاع سے صراحتاً منع کرے تو وہ ممنوع ہوگا۔ خواہ اس کی تاثیر اور نقصان اجازت شدہ انتفاع سے کم ہو، لہٰذا:

اگر تعمیر یا درخت لگانے کے لئے زمین عاریت دے تو کاشتکاری جائز ہے، کیونکہ یہ نسبتاً کم نقصان دہ ہے، لیکن صراحتاً کاشتکاری سے روک دے تو اس کی اجازت نہ ہوگی۔

اگر انتفاع کے لئے زمین عاریت دے (بغیر کسی قید کے) تو اس میں تعمیر، درخت بونا اور کاشتکاری جائز ہے۔

اگر یوں کہا: میں نے یہ زمین تمہیں عاریتاً دی، آگے یہ الفاظ نہ کہے تا کہ تم انتفاع کرو، تو صحیح بات یہ ہے کہ یہ اعارہ صحیح نہیں ہے۔

اگر کاشتکاری کے لئے زمین عاریتاً دے، تو اس میں تعمیر اور درخت لگانا جائز نہیں، کیونکہ یہ دونوں کاشتکاری کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ ہے۔

اگر مطلقاً کاشت کاری کے لئے اعارہ کرے، تو جو چاہے کاشت کرسکتا ہے، اگر کسی خاص نوع کی کاشت کیلئے اعارہ ہو تو وہ نوع اور اس کے مثل یا اس سے کم ضرر رساں نوع کی کاشت کرسکتا ہے، اس نوع سے زیادہ ضرر رساں نوع کی کاشت نہیں کرسکتا۔

اسی طرح دیگر اشیاء کی عاریت کا حکم ہوگا۔ لہٰذا سواری کے لئے موٹر کار وغیرہ عاریتاً دے تو اسے سامان لادنے کے لئے استعمال نہیں کرسکتا۔ اگر ہلکے پھلکے سامان لادنے کے لئے عاریت پر لے تو اس میں وزنی اشیاء لادنے کی اجازت نہ ہوگی، مثلاً کپڑے لادنے کے لئے دیا تھا تو اس میں لوہا اور سیمنٹ وغیرہ نہیں لاد سکتا۔

مستعیر براہ راست خود ہی انتفاع کرے یا اپنے کسی نائب اور قائم مقام (مثلاً وکیل) کے ذریعہ، کیونکہ یہ نفع بھی اسی کی طرف لوٹے گا، لیکن بشرطیکہ شئی مستعار پر اثر انداز ہونے کے اعتبار سے وہ نائب مستعیر کے مثل یا اس سے کم تر ہو۔ اگر سائیکل عاریت پر لے کر اپنے کام سے نوکر یا وکیل کو وہ سائیکل سواری کے لئے دے تو جائز ہے۔ جبکہ اس کا وزن اور بوجھ اس سے زائد نہ ہو، ورنہ اجازت نہ ہوگی۔

۲) شئی مستعار پر مستعیر کے قبضہ کی نوعیت : مستعیر کا قبضہ ضمان کا قبضہ ہے، پس جب وہ شئی مستعار اپنے قبضہ میں لے لے تو وہ اس کے ضمان میں داخل ہو چکی۔ یعنی اب اگر وہ شئی تلف ہو جائے تو مستعیر اس کا ضامن ہوگا۔ (اس کا بدل دینا

ہوگا) خواہ اس نے استعمال میں زیادتی سے کام لیا ہو یا نہ لیا ہو، اسکی حفاظت میں کوتاہی کی ہو یا نہ کی ہو، کیونکہ اس نے اپنے نفع کی خاطر دوسرے کے مال پر قبضہ کیا ہے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے کچھ زرہیں حنین کے دن بطور عاریت لئے تو انہوں نے کہا: آپ غصب کررہے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا "نہیں" بلکہ عاریت ہے جو مضمون ہوگی۔ (جس کا ضمان بصورتِ تلف ادا کیا جائے گا) (ابوداود)

شئی مستعار کے تلف کے دن اس کی جو قیمت ہوگی وہ مستعیر بطور ضمان ادا کرے گا، جبکہ وہ تلف اور ختم ہوجائے، خواہ کسی ناگہانی مصیبت اور آسمانی آفت سے ہی تلف کیوں نہ ہو، اجازت کے مطابق استعمال کی وجہ سے اس کے بوسیدہ پن یا قیمت کی کمی کا ضامن نہ ہوگا۔ اجازت کے علاوہ استعمال کی وجہ سے قیمت کا جو نقصان ہوگا، اس کا ضامن ہوگا۔ اسی طرح کسی ایسے کام میں استعمال کرے جس میں عادتاً وہ شئی استعمال نہیں ہوتی اور اس سے نقصان ہو تو اس کا ضامن ہوگا۔ مثلاً مکان لوہاری، یا بڑھئی کے پیشہ میں استعمال کرے۔ یا کھانے پینے کے برتن ریت اور پتھر ڈھونے میں استعمال کرے۔

معیر کے اعارہ سے رجوع اور مستعار چیز کے واپسی کے مطالبہ کے بعد اگر اسے استعمال کرے تو ضامن ہوگا۔ خواہ مالوف استعمال ہو یا سابقاً اس کی اجازت کے مطابق استعمال کرے۔ اسی طرح عاریت موقت ہو اور مدت کے اختتام کے بعد استعمال کرے تو ضامن ہوگا۔ (مثلاً ایک ماہ کے لئے عاریت پر دے اور مستعیر ماہ کی تکمیل کے بعد بھی استعمال کرے تو ضامن ہوگا)

ضمان کی مذکورہ تفصیل کے برعکس شرط لگائی جائے۔ یعنی ضمان کی صورتوں میں یا عدم ضمان کی صورتوں میں ضمان کی، تو یہ شرط لغو ہے، نبھانے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ عقدِ عاریت اپنی جگہ صحیح ہوگی۔

۳) مستعار کا خرچ اور واپسی کے مصارف: اگر مستعار پر کچھ خرچ ہو، مثلاً جانور کا چارہ، مکان کی مرمت وغیرہ، تو یہ مصارف اس چیز کے مالک پر ہوں گے۔

مدت کے اختتام یا اعارہ کے فسخ کے بعد جب مستعیر پر لوٹانا لازم ہو اور لوٹانے میں خرچ ہو مثلاً گاڑی کا کرایہ وغیرہ، تو یہ مستعیر پر لازم ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے "کسی ہاتھ نے جو لیا، ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے" اور حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "عاریت لوٹائی جائے گی" (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ)

یہ حکم اس وقت ہے جب کہ براہ راست معیر کو لوٹائے لہٰذا اگر کسی مستاجر (کرایہ دار) سے عاریت لے، پھر وہ عاریت کرایہ پر دینے والے (یعنی اس چیز کے مالک) کو لوٹائے تو اس صورت میں مصارف مالک کے ذمہ ہیں۔ کیونکہ یہاں مستعیر لوٹانے میں کرایہ دار کے قائم مقام ہے ا۔ اور اجارہ میں لوٹانے کے مصارف مالک کے ذمہ ہیں، نہ کہ کرایہ دار کے۔

۴) عاریت سے رجوع اور اسے لوٹانا: عقد عاریت طرفین کی جانب سے ایک جائز عقد ہے۔ (نہ کہ لازم) یعنی معیر اور مستعیر میں سے کوئی بھی جب چاہے اسے فسخ کرسکتا ہے۔ چاہے دوسرا راضی نہ ہو یا اسے اس کا علم نہ ہو۔ اگر عاریت میں مدت متعین ہو تب بھی معیر جب چاہے واپس لے سکتا ہے۔ اور مستعیر جب چاہے لوٹا سکتا ہے۔ کسی پر بھی اسے باقی رکھنا لازم نہیں ہے۔

البتہ میت کی تدفین کے لئے زمین عاریتاً لے تو اس دفن شدہ زمین کا اعارہ دونوں بھی فسخ نہیں کرسکتے، جب تک کہ وہ میت بوسیدہ

ہوکر سڑگل کر مٹی نہ بن جائے، اور اس کا کوئی بھی حصہ باقی نہ رہے۔ کیونکہ تدفین اجازت سے تھی۔ اب قبر کھودنے اور اسے نکالنے میں اس کی بے حرمتی ہے۔ اس صورت میں مستعیر پر اجرت لازم نہ ہوگی۔

اسی طرح معیر مستعار کو کسی خاص کام میں استعمال کی اجازت دے اور تکمیل سے قبل رجوع کرنے میں مستعیر کا نقصان ہو تو یہ رجوع صحیح نہیں۔ جیسے اسباب منتقل کرنے کے لئے کشتی عاریتاً دے اور بیچ دریا میں واپسی کا مطالبہ کرے یا اس کام کے لئے موٹر عاریت پر دے اور کسی صحرا جیسی جگہ میں جہاں دوسری گاڑی کا انتظام نہ ہوسکے واپسی کا مطالبہ کرے تو ان صورتوں میں مستعیر پر فی الحال مستعار کا لوٹانا لازم نہیں، اس سے انتفاع کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے، جب تک کہ بغیر ضرر کے لوٹا سکے۔ لیکن ان صورتوں میں واپسی کے مطالبہ سے واپسی تک کے مدت کی اجرت مثل مستعیر پر لازم ہے۔ معیر کے رجوع کے بعد مستعیر رجوع سے لاعلمی کی وجہ سے وہ چیز استعمال کرے تو اس پر اجرت لازم نہیں، لیکن معیر کی موت یا جنون یا بے ہوشی سے لاعلمی کی وجہ سے ان امور کے بعد بھی استعمال کرتا رہا تو اجرت لازم ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۴۶۰)

مستعار زمین کی واپسی: اگر تعمیر یا درخت لگانے کے لئے زمین عاریت دے، پھر تعمیر یا درخت لگانے کے بعد معیر اعارہ سے رجوع کرے تو مسئلہ کی تفصیل اس طرح ہوگی:

اگر معیر نے پہلے ہی شرط رکھی ہو کہ رجوع کے وقت تعمیر اور درخت کو مستعیر اکھاڑ دے، تو شرط کی وجہ سے اس پر یہ واجب ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے "مسلمانوں پر اپنے شرائط کی پابندی لازم ہے"۔ اگر مستعیر انکار کرے تو معیر خود ہی نکال ڈالے۔

اگر اکھیڑنے کے بعد زمین کو ہموار کرنے کی شرط تھی تو دونوں صورتوں میں زمین ہموار کر کے دینا لازم ہے۔ اگر شرط نہ تھی تو لازم نہیں۔

اگر معیر نے اکھیڑنے کی شرط نہ رکھی تھی تو مستعیر کو اکھیڑنے نہ اکھیڑنے کا اختیار ہے۔ اب اگر وہ اکھاڑنے کو اختیار کرے تو فبہا، اور اس سے تعمیر یا درخت میں جو نقصان ہوگا اس کا کوئی بدلہ نہ ملے گا، نیز زمین کو صحیح اور ہموار کرنا بھی اس پر لازم ہے۔

اگر مستعیر اکھاڑنے کو اختیار نہ کرے تو معیر کو درج ذیل تین باتوں کا اختیار ہے۔

۱) عمارت یا درخت کو باقی رہنے دے۔ اور آئندہ مناسب کرایہ (اجرت مثل) وصول کرے۔

۲) درخت اکھاڑ دے یا عمارت ڈھادے۔ اکھاڑنے اور ڈھانے کے مصارف اسی کے ذمہ ہوں گے۔ نیز اس کی وجہ سے قیمت میں جو نقصان ہوا سکا ضامن ہوگا۔ (یعنی اتنی رقم مستعیر کو ادا کرے گا)

۳) درخت یا عمارت واجب الازالہ ہونیکی صورت میں اس کی جو قیمت ہو اس قیمت سے اسے خرید کر مالک بن جائے۔ جو باقاعدہ ایجاب وقبول پر مشتمل عقد کے ذریعے طے پانا لازم ہے۔

معیر مذکورہ تینوں شکلوں میں سے جسے بھی اختیار کرے، مستعیر پر اس کی موافقت لازم ہے۔ اگر معیر کسی بھی شکل کو اختیار نہ کرے تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قاضی (حاکم) ان دونوں سے اعراض کرے، یہاں تک کہ وہ دونوں کسی بات پر اتفاق وصلح کرلیں، یا معیر کسی شکل کو اختیار کرلے۔

اعارہ مطلق ہو یا کسی مدت کے ساتھ مقید، دونوں صورتوں میں یہی تفصیل ہوگی۔ البتہ اعارہ مطلقہ میں ایک مرتبہ تعمیری کام یا درخت بونے کے بعد اسے اکھاڑ دے۔ تو اب دوبارہ نئی اجازت کے بغیر اس کی اجازت نہ ہوگی۔ (اگر نئی اجازت کے بغیر اس نے تعمیر یا درخت بوئے تو معیر مطلقاً اکھاڑ کر زمین ہموار کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ اور اعارہ مخصوص مدت کے لئے ہو تو اس مدت میں جتنی مرتبہ چاہے درخت

بوئے اور اکھاڑ دے یا تعمیری کام ڈھائے، جب تک کہ معیر رجوع نہ کرے، یا مدت ختم نہ ہو جائے۔

اگر زمین کا اعارہ کاشت کاری کے لئے ہو، پھر اناج کی پختگی اور تیار ہونے سے قبل رجوع کرے تو مستعیر تیار ہونے تک رک سکتا ہے، جبکہ اس سے قبل نکالنے میں نقصان ہو۔ اور اس دوران معیر کو اجرت مثل دی جائے گی۔ اعارہ مطلق ہو یا مؤقت یہی حکم ہے۔ لیکن مؤقت ہونے کی صورت میں مدت کی تکمیل تک مستعیر کی کوتاہی کی وجہ سے پختگی اور پکنے میں تاخیر ہو تو معیر اسے کھیتی اکھاڑ کر زمین ہموار کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ خواہ اس میں اسے نقصان ہو۔ کیونکہ مستعیر کی طرف سے تعدی اور زیادتی ہے۔ اور حدیث کی رو سے ظالم جڑوں کا کوئی حق نہیں۔ (ابوداود۔ ترمذی)

۵) مستعار شئی کو لوٹانے کی کیفیت : مستعار شئی کی نوعیت کے اعتبار سے عرف اور عادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے لوٹایا جائیگا۔ لہٰذا منقولہ اشیاء (جو چیزیں منتقل کی جاتی ہیں) کو منتقل کر کے معیر کے سپرد کرنا ضروری ہے، بالخصوص جبکہ وہ شئی نفیس اور قیمتی بھی ہو، اس کی نفاست کے اعتبار سے سپردگی میں اختلاف ہوگا۔ جواہر اور سونا چاندی جیسے اشیاء کو براہ راست معیر ہی کے ہاتھ واپس کرنا چاہئے، بعض دیگر اشیاء کا اس کے گھر پہنچانا یا کسی اور قائم مقام کے سپرد کرنا بھی کافی ہوگا، جیسے برتن وغیرہ۔

اگر مستعار غیر منقول ہو جیسے مکان زمین وغیرہ تو اسے خالی کر دینا، نیز اسے قبضہ میں لینے اور نفع اٹھانے میں جو رکاوٹ ہو اسے دور کرنا کافی ہے۔

۶) معیر اور مستعیر کا اختلاف :

(الف) واپسی میں اختلاف : مثلاً مستعیر دعویٰ کرے کہ وہ مستعار شئی لوٹا چکا اور معیر انکار کرے۔ تو معیر کو قسم دلائی جائے گی۔ اور اسکی بات مانی جائیگی۔

(ب) تلف کی صورت میں اختلاف : اگر مستعار شئی تلف ہوا اور مستعیر یہ دعویٰ کرے کہ حسب اجازت استعمال میں تلف ہوئی، اور معیر اس کا انکار کرے۔ اور کہے: بلکہ بغیر استعمال کے تلف ہوئی یا اجازت کے علاوہ استعمال سے تلف ہوئی۔ تو مستعیر کا دعویٰ مع قسم تسلیم کیا جائے گا۔ پس وہ اپنے دعویٰ پر قسم لے تو ضمان سے بری ہو جائے گا۔

۷) اصل عقد میں اختلاف : مثلاً مالک اجارہ کا دعویٰ کرے۔ اور منتفع استعارہ کا (یعنی نفع اٹھانے والا عاریت پر لینے کا دعویٰ کرے) یا منتفع کہے: آپ نے مجھے عاریتاً دی، اور مالک کہے: بلکہ تم نے مجھ سے غصب کیا، تو مالک کا دعویٰ اس کے قسم کے ساتھ تسلیم ہوگا۔ جب مالک قسم لے تو اجرتِ مثل کا مستحق ہوگا، جبکہ اتنی مدت گذر چکی ہو جس میں اس چیز کی اجرت ملتی ہو، اگر وہ چیز باقی ہے تو اسے لوٹا دے۔ اور لوٹانے سے پہلے تلف ہو جائے تو غصب کے دعوے میں منتفع اس کا ضامن ہوگا۔ اب ضمان کی مقدار میں مالک منتفع کے مقابلہ میں زائد کا دعویٰ کرے تو مالک کو اس زیادتی پر قسم دلائی جائے۔ (پھر وہ اس زیادتی کا مستحق ہوگا)

عقد اعارہ کا اختتام

درج ذیل صورتوں میں یہ عقد اختتام پذیر ہوگا۔

(الف) معیر کا عاریت کا مطالبہ کرنا اور اعارہ سے رجوع کرنا، چاہے اعارہ کی متعینہ مدت کی تکمیل سے قبل ہو یا بعد۔

(ب) مستعیر کا شئی مستعار کو معیر کے حوالہ کر دینا اور لوٹانا۔ مدت پوری ہونے کے بعد ہو یا پہلے ہی۔

(ج) دونوں میں سے کسی ایک کا پاگل یا بے ہوش ہوجانا۔
(د) کسی ایک کا انتقال کرجانا۔
(ھ) سفاہت کی وجہ سے معیر یا مستعیر پر حجر (پابندی اور روک) لگ جانا۔
(و) فلس کی وجہ سے مالک پر حجر لگ جانا۔

متفرق مسائل

۱) کسی ظرف اور برتن میں کوئی شئ خریدے تو وہ ظرف عاریت ہے۔اسی طرح کسی برتن میں ہدیہ آئے اور اس میں کھانا معتاد ہو تو کھاتے وقت وہ برتن عاریت ہے۔اور اس سے قبل امانت ہے۔

۲) مالک ودیع (جس کے پاس ودیعت وامانت رکھی گئی ہو) کو (مثلاً) ودیعت کے کپڑے پہننے کی اجازت دے تو پہننے کے بعد وہ عاریت ہے۔

۳) بعض مرتبہ تیل یا گھی خریدنے کے لئے اپنا برتن گھی فروش کے سپرد کیا جاتا ہے۔اب اس میں مبیع (تیل گھی وغیرہ) ڈالنے سے قبل وہ برتن تلف ہوجائے تو اس کا ضمان نہیں ہوگا۔کیونکہ وہ امانت ہے، اور مبیع ڈالنے کے بعد تلف ہو تو ضامن ہوگا، کیونکہ یہ عاریت ہے۔

۴) اگر کسی کو پانی پلانے کہے اور وہ پانی کا گلاس دے، جو پانی پینے سے قبل اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جائے، تو اگر بلاعوض پلانے کہا تھا تو پانی غیر مضمون اور گلاس مضمون ہوگا۔اور عوض کی شرط تھی تو پانی مضمون اور گلاس غیر مضمون ہوگا۔(اور اطلاق کی صورت میں عرف کو مدنظر رکھے) اگر پانی پینے کے بعد گلاس ٹوٹ جائے اور عوض کی شرط نہ تھی تو گلاس مضمون اور پانی غیر مضمون ہے۔اور عوض کی شرط تھی تو نہ گلاس کا ضامن ہوگا اور نہ گلاس میں باقی پانی کا۔

۵) مستعار مصحف شریف میں خطا وار غلطی نظر آئے تو اس کی اصلاح واجب ہے، دیگر کتب میں اس کی اجازت نہیں، وقف میں خطا یقینی ہو تو اس کی اصلاح واجب ہے۔کنارے پر حواشی وغیرہ کی اجازت نہیں، دوسرے کی کتاب میں غلطی دیکھے تو اصلاح نہ کرے۔اگر مالک کی رضامندی کا گمان ہو تو اصلاح میں حرج نہیں۔کسی لفظ یا حکم میں تردد وشک ہو تو اس کی اصلاح نہ کرے۔کاتب کی اپنی ملکیت میں وہ ''شاید یہ لفظ یا حکم اس طرح ہے'' لکھ سکتا ہے۔(حاشیۃ الجمل ۴۵۹/۳ و ۴۵۷)

غصب

عربی زبان میں بطور ظلم کسی چیز کو لینا غصب کہلاتا ہے۔
شریعت میں کسی دوسرے کے حق پر ظلماً تسلط اور قبضہ کو غصب کہا جاتا ہے۔
دوسرے کا حق کوئی عین (چیز) ہو۔جیسے گھر وغیرہ یا منفعت جیسے کسی کی رضامندی کے بغیر اس کے مکان میں رہائش یا اختصاص جیسے شکاری کتا وغیرہ، اور سیرابی کا حق وغیرہ، ان حقوق پر تعدی اور ظلم کے طور پر صاحب حق کی رضامندی کے بغیر جبراً وقہراً اپنا قبضہ اور تسلط (استیلاء) غصب کہلائے گا۔
لہٰذا بغیر کسی عقد اور اباحت کے دوسرے کا کھانا کھا گیا تو یہ غصب ہے۔کسی کے مکان میں اس کی رضامندی کے بغیر رہے تو یہ

غصب ہے، خواہ اسے کرایہ بھر دے۔ اسی طرح بلا اجازت دوسرے کے بستر وغیرہ پر بیٹھے تو یہ غصب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں دورِ حاضر کے ایک عام عادت کے متعلق تنبیہ کی جاتی ہے کہ۔ لوگ عموماً دوسروں کے مکانات اور دوکانوں کا مالکوں کی مرضی کے بغیر قدیم معمولی کرایہ دے کر اس پر قبضہ جمائے رہتے ہیں، اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں اور دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم کرایہ دار ہیں۔ اس پر اجارہ کا انطباق نہ ہوگا، بلکہ یہ تو صحیح غصب ہے۔ اور اس پر غصب کے دینوی و اخروی احکام کا انطباق ہوگا (حکومتوں کے غیر شرعی قانون کے سہارے دوسروں کی حق تلفی جائز نہ ہوگی)

(غصب کرنے والے کو غاصب، جس کا حق غصب کیا جائے اسے مَغْصُوبٌ مِنْہ اور جو حق غصب کیا جائے اسے مغصوب کہا جاتا ہے۔)

تحریم : قرآنی آیات اور احادیث کی رو سے غصب شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

آیات : وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقاً مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ : ۱۸۸)

ترجمہ : ''آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک، کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔'' (یعنی کسی کے مال کی خبر نہ دو ظالم حاکموں کو، یا اپنا مال بطریق رشوت حاکم تک نہ پہنچاؤ کہ حاکم کو موافق بنا کر کسی کا مال کھالو)

۲) اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْماً اِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَاراً وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْراً (النساء : ۱۰)

ترجمہ : ''جو لوگوں کے یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں، اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے۔''

احادیث : ۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے'' بلاشبہ تمہاری جان اور تمہارا مال اور تمہاری عزت اور آبرو آپس میں حرام ہے...... (بخاری۔ مسلم)

۲) ارشاد نبوی ہے'' کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی اور رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔'' (دار قطنی)

۳) آپ ﷺ کا ارشاد ہے'' جو ظلماً بالشت بھر زمین پر قبضہ کرے تو اسے بروزِ قیامت ساتوں زمین کا طوق پہنایا جائے گا۔ (بخاری۔ مسلم)

آپ ﷺ کے دور مسعود سے لے کر دور حاضر تک تمام مسلمانوں کا غصب کی تمام انواع و اقسام کی حرمت پر اجماع ہے۔

غصب کے احکام

اخروی حکم : آخرت میں گناہ اور سزا کا مستحق قرار پائے گا، کیونکہ غصب کبیرہ گناہ ہے، اور عمداً جان بوجھ کر گناہوں کا ارتکاب آخرت میں عذاب اور گرفت کا سبب بنتا ہے، جبکہ توبہ کی مہلت گزرنے سے پہلے ہی دنیا میں صحیح توبہ نہ کرے۔

دنیاوی احکام : ۱) حاکم کا غاصب کی تادیب : حاکم غاصب کو بطور تادیب مناسب سزا (مار، قید وغیرہ) دے، جو آئندہ اسے اور دوسروں کو اس حرکت سے باز رکھے، یہاں تک کہ مغصوب منہ غاصب کو معاف کردے تب بھی حاکم کو اس کا

اختیار ہوگا، کیونکہ یہ حق اللہ ہے، تا کہ آئندہ ظلم اور تعدی کا دروازہ بند ہو جائے۔

۲) غصب سے فوراً باز آنا: غصب ایک گناہ ہے، اور گناہ سے حتی الامکان فوراً باز آنا واجب ہے۔ لہٰذا مغصوب (غصب شدہ حق) اگر موجود ہے، تو اسے فوراً واپس کردے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ہرگز کسی کی کوئی چیز حقیقتاً یا بطور مزاح وتماشہ نہ لے، اگر کسی نے (مثلاً) اپنے بھائی کی لاٹھی (بھی) لی ہو تو اسے واپس کردے۔'' (ابوداود ۔ ترمذی)

جس جگہ سے غصب کیا تھا، مغصوبہ شئی کو وہاں لے جا کر لوٹادے، لوٹانے کی ذمہ داری اور اخراجات غاصب کے ذمہ ہیں، کیونکہ لوٹانا اس پر واجب ہے، اور جب لوٹانے کے لئے خرچ ہو تو وہ بھی اس پر واجب ہوگا، کیونکہ واجب کی ادائیگی اور تکمیل کے لئے جو امور ضروری ہوں، وہ بھی واجب ہوتے ہیں۔

مغصوب چیز کو جس سے غصب کیا تھا، اس کے سامنے لے جا کر پیش کردینا کہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اسے اپنے قبضہ میں لے سکے، یہ ضروری ہے، دیگر حقوق میں صاحب حق کو اس پر قبضہ اور اس سے استفادہ کی راہ میں جو رکاوٹ اور موانع ہوں، ان کا ازالہ اور دور کرنا ضروری ہے۔

مغصوب صاحب حق کے سپرد کرے، تو اب غاصب غصب کے حکم سے نکل گیا اور ضمان سے بری ہوگیا۔

۳) غاصب کے پاس مغصوب تلف ہونے کی صورت میں ضمان: اگر مغصوب غاصب کے پاس تلف ہو جائے تو وہ اس کا ضامن ہوگا، خواہ وہ تلف کرے یا وہ خود بخود تلف ہو جائے، یا کسی آسمانی ونا گہانی آفت کی وجہ سے تلف ہو یا کسی اور سبب سے، کیونکہ اس پر اپنا قبضہ جمانا خود اس کی زیادتی اور ظلم ہے، اور آپ ﷺ کا فرمان ہے'' جس نے کوئی چیز لی وہ اس کے ذمہ ہے ۔یہاں تک کہ اسے لوٹادے، (ترمذی ۔ ابوداود ۔ ابن ماجہ) اس سے صراحتاً ثابت ہوا کہ لوٹانا غاصب کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا تلف کی وجہ سے وہ چیز نہ لوٹا سکے تو ضامن ہوگا، اور اس کا بدل یعنی مثل یا قیمت لوٹانا لازم ہے۔

مغصوب کے ضمان کی کیفیت: جب مغصوب تلف ہو جائے تو غاصب پر لازم ہے کہ بدل میں اس کے زیادہ مشابہ اور قریب تر چیز لوٹائے۔

پس اگر مغصوب مثلی ہے، تو مثل کا لوٹانا واجب ہے، کیونکہ ارشاد ربانی ہے: ''وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ'' (النحل : ۱۲۶)

ترجمہ: ''اور اگر بدلہ لو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر تم کو تکلیف پہنچائی جائے۔'' (دونوں کی رضامندی سے مثلی کے بدلہ قیمت لینا جائز ہے۔ (فتح المعین)

مثلی اشیاء: یعنی وہ اشیاء جن کے مثل بازار وغیرہ میں دستیاب ہو، اور دونوں میں کوئی خاص تفاوت نہ ہو، دور حاضر میں کئی اشیاء مثلی شمار ہوں گی، بالخصوص مصنوعات (کمپنی اور فیکٹری میں تیار ہونے والی اشیاء)، کیونکہ یہ اشیاء ایک ہی مشین سے تیار کی جاتی ہیں۔ جو چیز کیل کے ذریعہ یعنی ناپ کے ذریعہ فروخت ہو جیسے تیل وغیرہ یا وزن کے ذریعہ جیسے شکر وغیرہ تو یہ بھی مثلی ہیں۔ جس میں تعداد اور شمار کا اعتبار ہوتا ہو اور تقریباً ایک طرح کے ہوں جیسے انڈے، اخروٹ وغیرہ اور جو گز یا میٹر وغیرہ سے ناپے جاتے ہوں جیسے کپڑے، جبکہ ایک ہی نوع کے ہوں، مثلی شمار ہوں گے۔

اگر مذکورہ تفصیل کے مطابق اس کا مثل نہ ہو تو ایسی چیز کو قیمتی کہا جائے گا۔لہٰذا اگر مغصوب قیمتی ہو، یا مثلی ہو لیکن مثل کا لوٹانا دشوار ہو، تو اس مغصوب کی قیمت لوٹانا لازم ہے۔حیوانات، مکانات، گاڑیاں اور دیگر ساز وسامان وغیرہ جو مختلف صفات کی وجہ سے مختلف قیمت کے ہونے میں قیمتی کہلاتے ہیں۔

مثلی کے لوٹانے کی دشواری کی صورت: وہ چیز بازار میں بالکل نایاب ہو، یا اس کی عام اور مناسب قیمت سے بہت زیادہ مہنگی مل رہی ہو، تو قیمت لوٹانا کافی ہے۔

قیمت کی تعیین: اگر مغصوب مثلی ہے، اور بوقتِ تلف بازار میں دستیاب تھی، تو غصب کے وقت سے لے کر ادائیگی کی دشواری کے درمیان اس کی زیادہ سے زیادہ جو قیمت رہی ہوگی، وہ لوٹانا لازم ہے۔اگر وقتِ تلف بازار میں مفقود تھی، تو غصب سے تلف کے دوران جو اعلیٰ قیمت ہوگی، وہ لوٹانا واجب ہے۔

اگر مغصوب قیمتی ہے، تو غصب سے تلف کے دوران جو اعلیٰ قیمت ہو، اس کا لوٹانا واجب ہے۔اگر بوقتِ غصب ۱۰۰۰ روپے قیمت ہو، پھر اس کی قیمت گھٹ جائے، تو ۱۰۰۰ روپے دینا لازم ہے۔اگر بوقت غصب قیمت ۵۰۰ روپے، پھر درمیان میں ۱۰۰۰ ہو جائے، پھر اتر کر ۷۰۰ تک پہنچے تو غاصب پر ۱۰۰۰ روپے لوٹانا لازم ہے۔

جس وقت قیمت بڑھ گئی اس وقت بھی وہ غاصب تھا، اور لوٹانا اس پر واجب تھا، لہٰذا وہی قیمت بطورِ ضمان اس پر لازم ہوگی۔

ضمان کے اثرات: غاصب مغصوب کا بدل اور ضمان ادا کرے، تو درج ذیل احکام مرتب ہوں گے۔

(الف) مغصوب منہ اس بدل کا مالک بن جائیگا، لہٰذا اس میں خرید وفروخت اور ہبہ واجارہ وغیرہ تصرفات انجام دے سکتا ہے۔

(ب) غاصب ضمان کی وجہ سے مغصوب کا مالک نہ ہوگا، لہٰذا مغصوبہ چیز کو برباد سمجھ کر اس کا بدل ادا کرے (مثلاً وہ چیز گم ہو جائے، یا چوری ہو جائے) پھر وہ چیز مل جائے اور غاصب کے قبضہ میں آجائے تو ادا کردہ ضمان کے عوض غاصب اس کا مالک نہ بنے گا، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ چیز مغصوب منہ کو لوٹا دے، کیونکہ اصل میں مغصوب چیز کا لوٹانا واجب تھا۔وہ دشوار ہونے کی وجہ سے بدل کا حکم دیا گیا۔پس جب اصل کو لوٹانا ممکن ہو گیا تو اسے ہی لوٹانا واجب ہے، جس سے یہ واضح ہوا کہ غاصب اس کا مالک نہیں بنا۔

اب غاصب نے اصل چیز لوٹا دی تو مغصوب منہ پر لازم ہے کہ پہلے جو بدل اس نے بطور ضمان لیا تھا وہ غاصب کو واپس لوٹا دے، اگر اس میں متصل اضافہ ہو چکا ہو (مثلاً جانور کا موٹا ہونا) تو اسے بھی لوٹائے گا، اگر اضافہ منفصل اور جدا ہو، جیسے بچہ، مکان کا کرایہ وغیرہ تو بدل کے ساتھ اس اضافہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ اس کی ملکیت میں پائے گئے ہیں۔(لیکن اتصال کی صورت میں اضافہ کو اصل سے الگ کرنا ممکن نہیں، اس لئے مجبوراً مکمل لوٹایا جائے گا۔)

۴) مغصوب شئی میں غاصب کے تصرفات: اگر غاصب مغصوب میں کوئی تصرف کرے، مثلاً فروخت کرنا، ہبہ، اجارہ، اعارہ یا ودیعت وغیرہ تو اس کا یہ تصرف باطل ہوگا، اور اس پر اس تصرف کا کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہوگا، اور وہ شئی جس کے قبضہ میں چلی گئی ہے، اس پر غصب کا حکم نافذ ہوگا، لہٰذا وہ مغصوب شئی کا ضامن ہوگا، کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی ملکیت پر اس کی اجازت کے بغیر قبضہ جمایا ہے، گرچہ وہ شخص اس شئی کے مغصوبہ ہونے سے لاعلم ہو، کیونکہ لاعلمی کی وجہ سے گناہ نہ ہوگا، لیکن ضمان ساقط نہ ہوگا، جیسا کہ کسی دوسرے کا مال لاعلمی میں یا بلا قصد تلف کر دے تو ضامن ہوگا، گرچہ گنہگار نہ ہوگا۔

لہٰذا اگر مغصوب تلف ہو جائے تو مغصوب منہ غاصب اور جس کی طرف وہ چیز منتقل ہوئی تھی، دونوں میں سے کسی سے بھی ضمان کا مطالبہ کرسکتا ہے، اگر غاصب کے علاوہ سے مطالبہ کر کے ضمان وصول کرے، تو یہ مقدار غاصب سے لوٹا لے گا، جبکہ اسے غصب کا علم نہ ہو، اور اس کا قبضہ امانت کا قبضہ ہو، جیسے مُودع اور مُستاجر، اور اگر اس کا قبضہ اصل میں ضمان والا ہو جیسے مستعیر خریدار اور مقروض وغیرہ تو غاصب سے واپس نہ لیگا۔ کیونکہ غاصب کے ساتھ ان کا معاملہ ہی ضمان کی بنیاد پر ہے، لہٰذا اس کی جانب سے دھوکہ دہی نہیں پائی گئی، اگر اسے غصب کا علم ہو، تو غاصب سے واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ جب اسے خود غصب کا علم ہے تو غاصب کی طرف سے دھوکہ کا سلوک نہیں پایا گیا۔

۵) مغصوب شئی میں تغیر: اگر وہ چیز بذات خود متغیر ہو جائے، مثلاً انڈا غصب کیا تھا پھر وہ چوزہ بن چکا، یا کھیتی غصب کے بعد اناج بن چکا، تو مغصوب منہ اسے واپس لے گا کیونکہ یہ اسی کا مال ہے، اگر تغیر کی وجہ سے قیمت گھٹ گئی ہو تو وہ غاصب سے اس نقص کی قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ کمی غاصب کے قبضہ میں پائی گئی، اگر قیمت میں اضافہ ہوا ہے تو غاصب کو کچھ نہ ملے گا، کیونکہ یہ اضافہ اصل کی نشو ونما کی وجہ سے اور اس کے تابع ہے، لہٰذا اصل کے مالک کی ملکیت ہوگی۔

اگر غاصب کی کسی حرکت سے مغصوب شئی میں تغیر اور تبدیلی پیدا ہو، تو اس کی تفصیل اس طرح ہے:

اگر کسی دوسری چیز کو اس میں ملائے بغیر صرف غاصب کے عمل کی وجہ سے تغیر ہو، جیسے کپڑے کو دھونا، یا اون کو کاتنا، یا لکڑے سے دروازہ بنانا، تو اسے مالک کو لوٹا دے، کہ یہ اسی کی ملکیت ہے، اور غاصب کو اس کے عمل کا کوئی بدلہ اور اجرت نہ ملے گی، گرچہ اس چیز کی قیمت بڑھ جائے، کیونکہ اس نے بلا اجازت یہ عمل انجام دیا ہے، اس لئے یہ مفت شمار ہوگا، اور عامل کسی اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔

اور اگر کسی دوسری چیز کو بھی ملا کر تغیر پیدا ہو، جیسے کپڑا غصب کر کے رنگنا، یا مکان کو رنگ وروغن لگانا یا پلاسٹر کرنا وغیرہ تو:

اس تغیر کی وجہ سے مغصوب کی قیمت میں اضافہ نہ ہو، تو مغصوب منہ اسے واپس لے گا اور غاصب کو کچھ بدلہ نہ ملے گا، کیونکہ اس ملائی ہوئی چیز کی قیمت اسی کے عمل سے ختم ہو چکی۔

اور اگر اس تغیر کی وجہ سے قیمت میں کمی ہو تو غاصب پر اس کمی کا ضمان لازم ہے، کیونکہ اس کی حرکت سے یہ کمی ہوئی ہے۔

تغیر کے بعد قیمت بڑھ جائے، اور اب اس کی قیمت مغصوب کی قیمت اور ملائی ہوئی چیز کی قیمت مساوی ہو چکی ہے، تو دونوں اس کی قیمت میں اپنے اپنے حصہ کے تناسب سے شریک ہوں گے۔ لہٰذا اگر مغصوب کی قیمت ۱۰۰ روپے ہو اور ملائی ہوئی چیز ۵۰ روپے تو اس کی قیمت کا دو تہائی مالک کا اور ایک تہائی غاصب کا ہے، اگر ہر ایک کی قیمت ۱۰۰، ۱۰۰ روپے ہے تو اس کی قیمت دونوں میں نصف نصف ہوگی اور اسی طرح......

اور اگر اس کی قیمت دونوں کی مجموعی قیمت کے برابر نہ ہو، مثلاً اب قیمت ۱۵۰ روپے ہو چکی ہے، اور مغصوب کی قیمت ۱۰۰ اور ملائی ہوئی چیز کی قیمت ۱۰۰ ہے۔ تو مغصوب منہ کو اس کی ملکیت کی قیمت ملے گی (یعنی ۱۰۰) اور غاصب کو ۵۰، یعنی اس کے عمل اور چیز کی وجہ سے جتنا اضافہ ہوا وہ مقدار۔

اگر قیمت دونوں کی مجموعی قیمت سے بھی بڑھ جائے، مثلاً سابقہ مثال میں قیمت ۳۰۰ ہو جائے تو ہر ایک کو اس کی چیز کی قیمت کے تناسب سے اس میں سے ملے گا۔ اگر دونوں کی ملکیت ۱۰۰، ۱۰۰ تھی تو نصف نصف ملے گا۔ اگر ایک کی قیمت دوسرے سے دوگنا تھی تو اسے دو تہائی اور دوسرے کو ایک تہائی ملے گا۔

اگر غاصب کے عمل سے مغصوب کی ذات اور اس کے نام ہی میں تغیر ہو، جیسے گیہوں غصب کر کے اسے پیسنا، یا بکری غصب کر کے

اسے ذبح کرنا تو مالک کی ملکیت اس میں ختم نہ ہوگی، مالک اسے واپس لے سکتا ہے، اگر اس عمل سے قیمت میں کمی ہو تو اس کمی کے بدل کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

اگر مغصوب منہ اس صورت میں اس کے بدل کا مطالبہ کرے تو اسے اس کا حق نہ ہوگا، کیونکہ اس کا مال خود موجود ہے، لہٰذا بدلی کے مطالبہ کا اختیار نہ ہوگا۔

٦) مغصوب میں نقص اور کمی:

حسّی نقص: اگر نقص ایسا ہو، جس کا ضمان بطور بدل مقرر ہو، جیسے عین (چیز) کے کسی جز کا نقص، تو غاصب کو اس کا ضمان ادا کرنا لازم ہے، خواہ اس کی وجہ سے اس چیز کی قیمت کم نہ ہو، مثلاً کوئی مثلی اشیاء غصب کرے اور اس میں سے کچھ تلف ہو، اور بقیہ کی قیمت مجموعی قیمت کے مساوی ہو، یا بکری غصب کرے اور اس کی آنکھ چلی جائے، اور اس کی وجہ سے اس کی قیمت کم نہ ہو، تو ان صورتوں میں غاصب پر تلف شدہ کا مثل یا نقص کی قیمت لازم ہے۔

اگر حسی نقص کا بدل اور ضمان مقرر نہ ہو، تو قیمت کم ہو جائیگی تو اسکا ضمان ہوگا ورنہ نہیں، مثلاً بکری موٹی تھی پھر دبلی ہوگئی، اب اس کی وجہ سے قیمت میں کمی ہو، تو اس نقص کا ضامن ہوگا، اور قیمت پر اثر نہ پڑے تو غاصب پر کچھ لازم نہیں۔

معنوی نقص: یعنی قیمت میں کمی ہو، اور مغصوب شئی میں کوئی کمی نہ ہو، اور یہ بازار میں اس چیز کی قیمت گرنے کی وجہ سے ہوگا، اس صورت میں غاصب اسی حالت میں مغصوب شئی لوٹا دے تو اس نقص کا ضامن نہ ہوگا، کیونکہ شئی اپنی حالت پر باقی ہے، فرق لوگوں کی مانگ کا ہے، البتہ مغصوب یا اس کا ایک جز تلف ہو جائے، تو مغصوب کی یا تلف شدہ جزء کی اعلیٰ قیمت کا ضامن ہوگا، جیسا کہ گذر چکا۔

مغصوب کے زوائد: غاصب کے قبضہ میں مغصوب شئی میں اضافہ اور زیادتی ہو، تو یہ اضافہ مغصوب منہ کا ہوگا، کیونکہ اسی کی ملکیت کی آمدنی ہے، اور اصل کی طرح یہ بھی غصب کے حکم میں ہوگا اور غاصب اس کا ضامن ہوگا، کیونکہ اصل کے تابع ہے، اس لئے حکم میں بھی تابع ہوگا۔

اضافہ متصل ہو جیسے موٹاپا یا منفصل (جدا) جیسے درخت کے پھل، جانور کے بچے وغیرہ، دونوں صورت میں یہی حکم ہوگا۔

پس اگر منفصل اضافہ غاصب کے پاس تلف ہو جائے تو اصل کی طرح اس کا بھی ضامن ہوگا، اسی طرح غاصب کے پاس جانور موٹا ہونے کے بعد پھر دبلا ہو جائے تو قیمت کے تفاوت کا ضامن ہوگا۔

مغصوب کے منافع: اگر مغصوبہ چیز کی کوئی منفعت ہو، جیسے مکان کی رہائش جانور کی سواری، کار کی سواری وغیرہ، تو یہ بھی غاصب کے ضمان میں داخل ہے، خواہ وہ خود انتفاع کرے یا کسی اور کے سپرد کرے یا انتفاع ہی نہ کرے۔ لہٰذا غاصب پر غصب سے واپسی یا تلف تک کی جو اعلیٰ اجرتِ مثل ہوگی، وہ لازم ہے، جبکہ اتنی مدت گزر چکی ہو، جس کے مقابلہ میں عموماً اجرت اور کرایہ ہوتا ہے۔ کیونکہ منافع بھی مال ہیں۔ اس نے اصل کو غصب کر کے مالک کو اس سے محروم کردیا، لہٰذا منافع کا بھی غاصب شمار ہوگا، اور اس کا بدل یعنی اجرت مثل لوٹانا واجب ہوگا۔ اور اعلیٰ اجرتِ مثل لازم ہے کیونکہ یہ ظالم اور غاصب ہے اور اس اعلیٰ اجرت کو اس نے مالک سے فوت کردیا، تو یہ اس کا بھی غاصب ہے۔

یہ اجرت منافع کا بدل ہے، لہٰذا اگر چیز تلف ہو جائے تو اس کا بھی ضمان لازم ہے۔

مغصوبہ زمین میں تعمیر اور باغبانی یا کاشتکاری: اگر زمین غصب کر کے اس پر عمارت بنائے، یا درخت لگائے تو عمارت کو ڈھانے اور درختوں کو اکھاڑنے کا حکم دیا جائیگا، اور حسبِ سابق زمین کو درست کرنا ضروری ہوگا، اگر اس سبب سے

زمین کی قیمت کم ہوجائے تو اس کمی کا بدل بھی دینا لازم ہے، نیز اتنی مدت گزر چکی کہ اس کے مقابلہ میں کرایہ وصول کیا جاتا ہو، تو اس مدت کا معقول کرایہ بھی غاصب پر لازم ہے، کیونکہ ان سارے امور میں اس کی تعدی کو دخل ہے، اور آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ''ظالم جڑ کا کوئی حق نہیں'' (ابوداود، ترمذی)

اگر مالک عمارت یا درخت کی قیمت دے کر اسے خریدنا چاہے، تو غاصب پر یہ لازم نہیں، کیونکہ یہ اس کی ملکیت ہے، لہٰذا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے لیا نہیں جاسکتا، اگر دونوں اس پر متفق ہوں تو صحیح ہے۔

اگر عمارت اور درخت بھی زمین کے مالک سے غصب شدہ ہو، اور مالک انہیں اپنی زمین میں باقی رکھنا چاہتا ہو، تو غاصب کو عمارت ڈھانے یا درخت اکھاڑنے کا اختیار نہ ہوگا، اور (عمارت کے بنانے اور درختوں کے لگانے میں) اس کی محنت کا کوئی معاوضہ نہ ملے گا، کیونکہ مالک کی اجازت نہ تھی۔ اگر اس عمل کی وجہ سے مجموعی قیمت میں کمی نہ آئے تو غاصب پر کچھ لازم نہیں، اگر کمی آئے تو اس کا بدل لازم ہے۔

اگر غاصب زمین میں اناج بوئے تو مالک اسے بیج نکال کر زمین درست کر کے دینے پر مجبور کرسکتا ہے، نیز نقص کا بدل اور اس مدت کی اجرتِ مثل بھی غاصب پر لازم ہوگی۔

اگر مالک بیج کی قیمت دے کر اسے زمین میں باقی رکھنا چاہے، تو غاصب اسے نکال نہیں سکتا، کیونکہ عموماً غاصب کو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا۔

مغصوب کو دوسرے کے ساتھ خلط کرنا (ملانا): اگر مغصوب شئی کسی دوسری چیز میں مل جائے، یا ملائی جائے، اور اسے جدا کیا جاسکتا ہو تو غاصب پر جدا کرنا لازم ہے، خواہ اس میں مشقت درپیش ہو، اور جدا کرنا ممکن نہ ہو تو اب اس کا لوٹانا بالکل دشوار ہوچکا، لہٰذا تلف شدہ چیز کے مشابہ ہوگا (اور غاصب اس کا مالک بن جائے گا، لیکن جب تک بدل نہ ادا کرے اس میں تصرف نہیں کرسکتا) (فتح المعین) تو مالک کو بطور بدل اس کا مثل یا اس کی قیمت لوٹانا لازم ہے۔ جس کی تفصیل گزر چکی۔

اگر مغصوب کی جنس کے ساتھ ہی خلط کرے، اور خلط شدہ چیز مغصوب ہی کے مثل یا اس سے بہتر ہو تو غاصب اسی مخلوط سے بدل ادا کرسکتا ہے، اگر مغصوب سے کمتر درجہ کی چیز مخلوط ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر اس میں سے بدل ادا نہیں کرسکتا (مثلاً گیہوں غصب کر کے اسی طرح کے، یا اس سے بہتر گیہوں میں شامل کردے تو اسی میں سے بدل دے سکتا ہے، لیکن اس سے کمتر گیہوں میں شامل کرے تو مالک کی مرضی ضروری ہے)

مغصوب کو لوٹانا، خواہ غاصب کا ضرر ہو: اگر مغصوب کے لوٹانے میں غاصب کو کافی ضرر اور نقصان ہو، تب بھی فوراً لوٹانا اس پر لازم ہے، اور اس ضرر کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ غصب کی وجہ سے وہ ظالم اور متعدی ہے، لہٰذا لکڑی غصب کر کے مکان یا کشتی میں استعمال کرے، تو وہاں سے نکال کر واپس کرنا لازم ہے، خواہ مکان منہدم ہوجائے یا کشتی ڈوب جائے، نیز غاصب پر نقص کا تاوان اور اجرتِ مثل لازم ہے، اور مکان یا کشتی کسی دوسرے کی ہو اور اسے غصب کا علم نہ تھا، تو اسے بھی نقص کا تاوان دینا لازم ہے۔

اگر اس مغصوب کے لوٹانے سے معصوم الدم شخص (یعنی جسے مارنا شرعاً جائز نہ ہو) یا محترم حیوان (یعنی شرعاً جسے مارنے کا حکم نہ ہو، اور اس کا مالک بننا یا پالنا جائز ہو) کی موت ہوتی ہو، یا کسی مسلمان یا ذمی کا مال برباد ہوتا ہو، تو اسے لوٹانا لازم نہیں، بلکہ مثل یا قیمت کی شکل میں ضمان ادا کرے گا۔

غاصب اور مغصوب منہ کا اختلاف:

(الف) مغصوب کے تلف ہونے نہ ہونے کے متعلق اختلاف: غاصب مغصوب شئی کے تلف ہونے کا

دعویٰ کرے اور مغصوب منہ (مالک) اس کا انکار کرے، تو غاصب سے قسم لے کر اس کی تصدیق کی جائے گی، اور مالک کو اس کا بدل ادا کرے گا۔

(ب) مغصوب کی قیمت : مغصوب کے تلف پر دونوں متفق ہوں، لیکن اس کی قیمت میں اختلاف ہو، مثلاً مالک کہے: قیمت ۱۰۰۰ روپے تھی، اور غاصب کہے: ۸۰۰ روپے کی چیز تھی تو غاصب کی بات اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کریں گے، کیونکہ مالک زیادتی کا دعویٰ کر رہا ہے اور غاصب اس کا انکار کر رہا ہے اور اصل اس کا زیادتی سے بری ہونا ہے۔ لہٰذا قسم کے ساتھ اس کی بات مانی جائے گی، اگر زیادتی کے بارے میں مالک بیّنہ (گواہ) پیش کرے تو غاصب پر وہ لازم ہے۔

(ج) مغصوب کی صفت یا مقدار : مثلاً مالک کہے کہ مغصوبہ مکان پلاسٹر شدہ تھا، اور غاصب اس کا انکار کرے، یا مالک دعویٰ کرے کہ ۲۰ رکلو گیہوں غصب کیا اور غاصب صرف ۱۰ رکلو غصب کا اقرار کرے وغیرہ تو ان صورتوں میں غاصب کی تصدیق مع قسم کی جائے گی۔

اگر مغصوب میں کسی نئے عیب کے متعلق اختلاف ہو، یعنی صفتِ نقص کے متعلق اختلاف ہو، مثلاً مالک کا دعویٰ ہو کہ مغصوب میں کوئی عیب نہ تھا، اور غاصب دعویٰ کرے کہ مغصوب عیب دار تھا:

تو اس صورت میں اگر مغصوب چیز تلف ہو چکی ہو، تو مالک کی مع قسم تصدیق کی جائے گی، کیونکہ اصل اور غالب عیب کا نہ ہونا ہے، اور جس کا دعویٰ اصل کے مطابق ہو اس کا اعتبار ہوگا۔

اور اگر مغصوب موجود ہے، اور غاصب اپنے دعویٰ کے مطابق عیب دار حالت میں لوٹائے، تو غاصب کی مع قسم تصدیق کی جائے گی، کیونکہ اصل اس سے زائد کے ضمان سے بری ہونا ہے۔

(د) مغصوبہ شئی کا لوٹانا : اگر غاصب واپسی کا دعویٰ کرے، اور مالک انکار کرے، تو مالک کی بات کو مع قسم تسلیم کیا جائے گا، کیونکہ مغصوب غاصب کے قبضہ میں تھا اور اصل نہ لوٹانا ہے، لہٰذا جو اصل کے مطابق دعویٰ کرے یعنی مغصوب منہ، اس کی بات مانی جائے گی، لہٰذا غاصب وہ چیز، ورنہ اس کا بدل مغصوب منہ کو لوٹائے۔

متفرق مسائل

۱) تین اشخاص میں مشترک مال میں سے ایک تہائی پر یا اس کی آمدنی کے ایک تہائی پر کوئی جبراً اس نیت سے تسلط جمائے کہ یہ اس میں سے ایک کا حصہ ہے، تو بقیہ دو تہائی میں تینوں مشترک ہوں گے (تینوں کا حق ہوگا) اور تسلط جمانے کے والے کے قصد اور تقسیم کر کے ایک تہائی جدا کرنے سے کوئی اثر نہ ہوگا کیونکہ اس کی یہ تقسیم غیر معتبر ہے۔ جیسا کہ کوئی ظالم زید کا مال یہ سمجھ کر غصب کرے کہ یہ جمیل کا مال ہے، تو زید جمیل سے رجوع نہیں کر سکتا، کیونکہ اصول یہ ہے کہ مظلوم ظالم کے علاوہ سے رجوع نہیں کر سکتا (اپنا حق نہیں لے سکتا)، اس کے برعکس اگر دو شخص کسی غلام (وغیرہ) میں شریک ہوں اور ایک اپنا حصہ غاصب کو فروخت کر کے قیمت وصول کر لے، تو دوسرا شریک اس قیمت میں شریک نہ ہوگا، کیونکہ اس کا حصہ ابھی باقی ہے، فروخت نہیں ہوا (بغية المسترشدين ص ۱۵۶)

۲) بادشاہ عوام پر ایک مخصوص رقم مصالح پر صرف کرنے کے لئے مقرر کرے، اور وہ اپنی خوشی سے اسے ادا کریں نہ کہ خوف یا حیاء کی وجہ سے، تو اس کا لینا جائز ہے، ورنہ باطل طریقے پر لوگوں کا مال کھانا شمار ہوگا، اور اسے اس میں کسی بھی طرح کا تصرف حلال نہیں، مصالح اور کارِ خیر میں صرف کرنے کے ارادہ سے وہ حلال نہ ہوگا۔ (بغية ـ ۱۵۸)

۳) کسی سے درخت خرید کر اس کا پھل استعمال کرتا رہا، پھر معلوم ہوا کہ درخت وقف تھا، تو استعمال شدہ پھلوں کا ضامن ہوگا۔ ....فروخت کرنے والے کو صرف قیمت لوٹانا لازم ہے، نیز وہ گنہگار ہوگا۔(بغیۃ ۱۵۷)

۴) امام غزالیؒ نے فرمایا کہ جو لوگوں کے سامنے کسی سے مال طلب کرے، اور وہ محض حیاء کی وجہ سے دے (نہ کہ برضاو رغبت) تو یہ اس کا مالک نہ بنے گا، اور اسے اس میں تصرف کرنا حلال نہیں، بلکہ ناحق دوسروں کا مال کھانے میں شامل ہے (اعانۃ الطالبین ۱۳۷/۳)

۵) مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کو، یا بازار وغیرہ میں بیٹھے شخص کو اٹھانا، یا جس مسافر خانہ میں کسی کو رہنے کا حق ہو، اسے اس سے روکنا غصب میں داخل ہے(اعانۃ ۱۳۷/۳)

۶) غصب کی قسمیں :

(۱) کسی کے متمول مال پر ظلماً قبضہ جمائے تو گناہ اور ضمان دونوں ہوگا۔

(۲) کسی کے اختصاص یا غیر متمول مال پر ظلماً تسلط کی صورت میں گناہ ہوگا، نہ کہ ضمان۔

(۳) کسی کے متمول مال کو اپنا مال سمجھ کر اس پر قبضہ کرے تو ضمان لازم ہے، گناہ نہ ہوگا۔

(۴) کسی دوسرے کے اختصاص کو اپنا سمجھ کر قبضہ کرے تو نہ ضمان لازم ہے اور نہ گناہ ہوگا(اعانہ ۱۳۷/۳)

(۷) کسی کے بستر پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھنا غصب میں شمار ہے، اگر چہ اسے منتقل نہ کرے، اس کے اٹھنے کے بعد دوسرا بیٹھے تو اب وہ غاصب ہے، اور جس کے ہاتھ سے بھی وہ تلف ہو، وہ ضامن ہوگا، اگر دونوں کے منتقل ہونے کے بعد تلف ہو تو مالک کسی سے بھی ضمان لے سکتا ہے، پھر وہ دوسرے سے وصول نہیں کر سکتا(اعانۃ ۱۳۷/۳)

(۸) کسی کو اس کے مکان سے نکالنا، یا داخل ہونے نہ دینا، غصب میں داخل ہے، (خواہ یہ شخص خود داخل نہ ہو) اجازت کے بغیر کسی کی سواری پر سوار ہونا بھی غصب میں داخل ہے، خواہ مالک کے سامنے ہو(اعانۃ ۱۳۷/۳)

(۹) کوئی لوہار کی بھٹی میں داخل ہو، اور چنگاری اڑ کر اس کا لباس جلائے تو لوہار ضامن نہ ہوگا۔ اگر کسی کے چپل مسجد سے گم ہو جائے اور دوسرے وہاں موجود ہوں تو اسے پہننا جائز نہیں، خواہ جو اس کی چپل لے گیا ہے، اس کے ہو البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ اس کے چپل لے جانے والے کے چپل ہیں، تو اسے فروخت کر کے اپنے چپل کی قیمت کے بقدر اس میں سے لے سکتا ہے ورنہ یہ لقطہ ہے۔ (الشروانی علی التحفۃ ۲۹۳/۷)

(۱۰) کوئی حربی کسی مسلمان یا ذمّی کا مال غصب کرنے کے بعد اسلام لائے، اور وہ مال موجود ہو تو لوٹانا لازم ہے، اور موجود نہ ہو تو ضمان لازم نہ ہوگا(تحفۃ المحتاج ۲۹۹/۷)

(۱۱) غاصب غصب شدہ شئی مالک کے سامنے اسی حالت میں رکھے اور وہ کھا جائے، تو غاصب بری ہو جائے گا، خواہ اسے معلوم نہ ہو کہ یہ میری ہی چیز ہے، البتہ اسے کسی چیز میں ملا کر اور پکا کر کھلائے (مثلاً آٹا غصب کر کے اس سے حلوہ بنا کر کھلائے) تو بری نہ ہوگا۔ (تحفۃ ۳۰۸/۷)

(۱۲) ہر مکلف پر منکر (حرام اور خلاف شرع امور) کا ازالہ اور اس سے روکنا واجب ہے، جبکہ وہ اس پر قادر ہو، گرچہ عورت یا فاسق ہی کیوں نہ ہو، اور ایک ممیز کو بھی اس پر بالغ کی طرح ثواب ملے گا۔ بت اور آلاتِ موسیقی اور حرام برتنوں کو توڑنے پر کچھ واجب نہ ہوگا،

البتہ صرف اتنا توڑے کہ حرام استعمال کی شکل بالکل ختم ہوجائے، بلاوجہ اس سے زیادہ توڑے تو اس زیادتی کا ضامن ہوگا۔ (تحفة ۳۳۲/۷)

(۱۳) کئی لوگوں کے مثلاً روپئے غصب کر کے خلط ملط کرے کہ ہر ایک کے جدا سمجھ میں نہ آئے، پھر اسے تقسیم کر کے ہر ایک کو اس کے حق کے بقدر واپس کردے، تو یہ ان کے لئے جائز ہے، اگر کسی ایک ہی کو اس کا حصہ دے، تو اس پر لازم ہے کہ اپنے اور بقیہ لوگوں کے مقدار کے تناسب سے وہ رقم آپس میں بانٹ لیں۔ اگر اصحابِ حقوق کا علم نہ ہو، اور نہ آئندہ علم کا امکان ہو، تو یہ مال بیت المال کے سپرد ہوگا۔ (اور بیت المال کے مصارف پر صرف ہوگا) اور اگر آئندہ علم کا امکان ہو تو حفاظت کی خاطر امام (حاکم) کے سپرد کرے (تحفة ۳۶۲/۷)

(۱۴) کوئی مرگی کی وجہ سے کسی کے مال پر گرجائے اور مال تلف ہو، تو وہ ضامن ہوگا، جیسا کہ بچہ جھولے سے مال پر گرنے کی صورت میں ہوگا (نهاية المحتاج ۱۵۲/۵)

(۱۵) کسی کی بکری یا کبوتر کو ذبح کرنے کی وجہ سے ان کا بچہ مرجائے تو دونوں کا ضامن ہوگا (نهاية ۱۵۳/۵)

(۱۶) کسی پرندے کا پنجرہ کھول کر اسے اکسائے اور وہ اڑ جائے، یا بغیر اکسائے فوراً اڑ جائے تو اس کا ضامن ہوگا، اگر کچھ دیر کے بعد اڑے تو ضامن نہ ہوگا۔ (نهاية ۱۵۴/۵)

شُفعہ

شُفعہ شُفع سے ہے، جس کا مطلب لغت میں ضم کرنا، جوڑنا اور جمع کرنا ہے۔ فقہی اصطلاح میں شفعہ کا مطلب ہے: قہراً (جبراً) مالک بننے کا حق، جو قدیم شریک کو جدید شریک پر حاصل ہوتا ہے، اس شئی میں جس کا وہ عوض سے مالک ہوا ہے، اسی عوض کے بالمقابل، تا کہ اس (قدیم شریک) کے ضرر کو دور کیا جاسکے۔

مثلاً کسی کے گھر میں دو اشخاص شریک ہوں، پھر ایک شریک اپنا حصہ دوسرے شریک کے بجائے کسی اور کو فروخت کرے، تو اس شریک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خریدار (نئے شریک) سے اسی قیمت پر اس کی رضامندی کے بغیر وہ حصہ لے لے۔

اس حق کے ذریعہ چونکہ قدیم شریک اپنے حصہ کے ساتھ جدید شریک کے حصہ کو بھی ملا لیتا اور جمع کرلیتا ہے، اس لئے اسے شفعہ کہا گیا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: "ہر وہ شئی جس کی تقسیم نہ ہوئی ہو، اس میں حق شفعہ کا فیصلہ دیا ہے، جب (تقسیم اور) حد بندی ہوجائے اور راستے جدا متمیز ہوجائیں تو پھر حق شفعہ نہیں" (متفق عليه)

حِکمت مشروعیت: شریعتِ اسلامیہ ہمیشہ لوگوں کے مصالح کو پیش نظر رکھتی ہے، لہٰذا جب ایک شریک کسی مصلحت سے اپنا حصہ بیچتا ہے تو شریعت اس کے آڑے نہیں آتی، البتہ دوسرے شریک کے مصلحت کو بھی مدنظر رکھتی ہے، کیونکہ کسی اور کو بیچنے کی صورت میں ممکن ہے اس کی بداخلاقی وغیرہ سے یہ پریشان ہوجائے، یا وہ تقسیم کا مطالبہ کرے، جس کی وجہ سے تقسیم کے مصارف اور جدا حمام و بیت الخلاء جیسے اسبابِ ضرورت وسہولت کی تعمیر کا بوجھ پڑے، جو اس کے ضرر کا باعث ہے، نیز یہ اسباب آپسی نزاع اور نااتفاقی کا باعث ہوں گے، لہٰذا شریعت نے اپنا حصہ فروخت کرنے والے شریک کو یہ حکم دیا کہ وہ پہلے یہ بات قدیم شرکاء کے سامنے رکھے۔ اگر وہ خریدنا چاہیں تو وہ اس کے اوّلین مستحق ہیں اور ان کا ارادہ نہ ہو تو پھر کسی کو بھی فروخت کرسکتا ہے۔

حدیث : آپ ﷺ کا فرمان ہے" کسی کے مکان (یا زمین) یا کھجور کے درخت (وباغ) میں کوئی شریک ہو تو یہ اپنے شریک سے اجازت کے بغیر (اپنا حصہ) فروخت نہیں کرسکتا، پس اگر وہ شریک راضی ہے، تو لے لے ورنہ چھوڑ دے۔" (مسلم)

شفعه کے ارکان

(۱) شَفِیع (۲) مَشفُوع عَلَیہ (۳) مَشفُوع فِیہ

۱) **شفیع :** (جسے حقِ شفعہ حاصل ہوتا ہے): حق شفعہ شریک کو حاصل ہوگا، جب تک تقسیم نہ ہوجائے، شریک کا مطلب جو کسی اصل یا اس کے ملحقات میں کسی دوسرے کا شریک ہو، مثلاً کسی گھر اور اس کے مرافق (ضروریات، ناگزیر لوازم مثلاً حمام، بیت الخلاء وغیرہ) اور اس کے راستہ میں شریک ہو، یا کسی زمین میں اور اس کے گھاٹ اور سیرابی کے حق میں اور باڑہ میں شریک ہو۔

جب گھر یا زمین کی تقسیم ہو اور ہر شریک کا حصہ بالکل جدا ہوجائے، پھر کوئی اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کرے (ان قدیم شرکاء کے علاوہ) ،تو یہ قدیم شرکاء وحصہ حق شفعہ کی بنیاد پر نہیں لے سکتے، خواہ مرافق مثلاً گذرگاہ اور سیرابی کا حق وغیرہ مشترک ہو، کیونکہ حدیث میں گذر چکا کہ حد بندی کے بعد حقِ شفعہ نہ ملے گا، ایسے اشخاص جن کے حصے جدا جدا ہوں، لیکن مرافق میں مشترک ہوں، ان کو شریک مخالط کہا جاتا ہے۔

جب شریک مخالط کو حق شفعہ نہ ملے گا، تو محض پڑوسی وغیرہ کا تو بدرجہ اولیٰ نہیں ملے گا۔

ایک سے زائد شفیع : اپنا حصہ فروخت کرنے والے کے ایک سے زائد شرکاء ہوں، تو ان میں سے ہر ایک کو حق شفعہ حاصل ہوگا، اور ہر ایک کو اپنے حصہ کے تناسب سے استحقاق حاصل ہوگا۔ مثلاً: تین شرکاء ہوں، ایک کا پاؤ حصہ، دوسرے کا پاؤ حصہ اور تیسرے کا نصف حصہ، اب پہلا اپنا حصہ فروحت کرے اور دوسرے دونوں حقِ شفعہ کی بنیاد پر لینا چاہیں تو دوسرے کو (پاؤ حصے والے کو) ایک تہائی اور تیسرے کو (نصف والے کو) دو تہائی ملے گا۔ کیونکہ استحقاق کا سبب ملکیت ہے، اور اس میں تفاوت ہے شفیع اپنے شریک کا حصہ پورا خریدے یا پورا چھوڑ دے، بعض حصہ خریدے اور بعض ترک کردے تو یہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ایک سے زائد شفیع ہوں، لیکن دیگر حضرات نہ خریدیں، تو اسے مکمل خریدنا یا مکمل چھوڑ دینا ضروری ہے۔

شفعاء میں بعض کی غیر موجودگی: شفعاء میں سے کوئی فی الحال موجود نہ ہو، تو بقیہ حضرات اپنے حق کا مطالبہ کرکے وہ حصہ مکمل خرید سکتے ہیں، پھر موجود شفعاء اپنے حصوں کے اعتبار سے تقسیم کرلیں گے، صرف حاضرین اپنا حصہ لیں اور غائب کا چھوڑ دیں، یہ جائز نہیں، مکمل لینے کے بعد جب وہ غائب آجائے گا تو ان شرکاء سے اپنے حصے کا مطالبہ کرسکتا ہے اور اپنی ملکیت کے تناسب سے اس میں سے حصہ حاصل کرلے گا۔

اگر موجود شفعاء فی الحال فروخت شدہ حصہ نہ لے کر غائب کا انتظار کریں، تو یہ بھی جائز ہے اور اس کے آنے کے بعد سب مل کر مطالبہ کرسکتے ہیں۔

۲) **مشفوع علیه :** اس سے وہ شخص مراد ہے، جس کی ملکیت میں شریکِ قدیم کا حصہ (یعنی محل شفعہ) منتقل ہوا ہے۔ اس کی طرف ملکیت کا یہ انتقال عوض سے ہونا شرط ہے، کبھی یہ عوض مال ہوگا، جیسے خریدنا اور کبھی غیر مال ہوگا، مثلاً شریک نے وہ حصہ مہر مقرر کیا، یا بیوی نے بدلِ خلع مقرر کیا، اگر مشفوع علیہ نے وہ حصہ خریدا ہے، اور قیمت مثلی ہے تو شفیع اسی قیمت سے لیگا۔ اور متقوم ہے مثلاً کپڑا تو بروزِ فروخت اس (کپڑے) کی جو قیمت ہو، اس قیمت کے بدلہ لے گا۔ اگر مہر مقرر کیا ہے تو بوقتِ نکاح کا مہر مثل، اور بدلِ خلع مقرر کیا ہے تو

خلع کے وقت کا مہرِ مثل ادا کر کے وہ حصہ لے لے گا۔ خواہ یہ مقدار اس حصہ کی (عام) قیمت سے کم ہو یا زائد۔
شریکِ جدید کی ملکیت میں وہ حصہ بلاعوض منتقل ہوا ہے، تو قدیم شریک کو حقِ شفعہ کی بنیاد پر لینے کا حق نہیں، مثلاً بلاعوض ہبہ، صدقہ، وصیت، وراثت وغیرہ کے ذریعہ اس کی طرف منتقل ہو۔

۳) مشفوع فیه : یعنی جو چیز حقِ شفعہ کی بنیاد پر شفیع لینا چاہتا ہے۔
مشفوع فیہ کا غیر منقول ہونا شرط ہے (یعنی ایسی چیز ہو جو منتقل نہ ہوتی ہو) جیسے مکان، زمین، باغ وغیرہ۔ منقول شئی مثلاً جانور، ساز و سامان وغیرہ میں یہ حق نہ ملے گا۔

حدیث : آپ ﷺ ”شفعہ ہر مشترک شئی میں ہے: (یعنی) زمین میں یا مکان میں یا باغ میں.....“ (مسلم شریف)
نیز حقِ شفعہ مستقل بُرے ساتھی کے ضرر سے بچنے کے لئے دیا گیا ہے، اور منقول میں مستقل اور دائم ضرر نہ ہوگا۔ کوئی عمارت یا درخت زمین سمیت فروخت ہو، تو تبعاً اس میں بھی حقِ شفعہ حاصل ہوگا۔
کسی چیز میں حقِ شفعہ اس وقت حاصل ہوگا، جبکہ وہ قابلِ تقسیم ہو، اور تقسیم شدہ حصہ سے مقصود نفع حاصل ہو سکے، تقسیم کے بعد منفعت باطل ہوتی ہو، تو وہ چیز ناقابلِ تقسیم سمجھی جائیگی، اور اس میں حقِ شفعہ نہ ملے گا۔ مثلاً چھوٹا سا حمام، چھوٹی چکی وغیرہ کیونکہ روایت میں گذر چکا کہ غیر منقسم چیز میں حقِ شفعہ ہوگا۔ تقسیم کے بعد نہ ہوگا۔ تو معلوم ہوا کہ جو قابلِ تقسیم ہو، اسی میں حقِ شفعہ ہے، کیونکہ پھر نئے شریک کی وجہ سے تقسیم کرنے کا ضرر اور اپنے حصہ میں مرافق کی تعمیر کا خرچ وغیرہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اور جو شئی قابلِ تقسیم نہ ہو، اس میں اس طرح ضرر کا سوال نہیں۔

بعض دیگر شرائط : ۱) مشفوع فیہ میں شریکِ اوّل کی ملکیت اور حق ختم ہو جائے۔ اگر یہ اپنا حصہ کسی دوسرے کو فروخت کرے اور اپنے لئے یا دونوں کے لئے خیار کی شرط لگائے، تو مدتِ خیار تک شفعہ ثابت نہ ہوگا، جب مدتِ خیار مکمل ہو اور بیع فسخ نہ کرے تو اب بیع مکمل ہو چکی، لہٰذا شفعہ ثابت ہوگا، اگر صرف خریدار کے لئے شرطِ خیار ہو تو عقدِ بیع کے فوراً بعد شفیع کو وہ حصہ لینے کا حق ہے۔
اگر عقدِ تملیک (یعنی جس عقد کے ذریعے شریک اول نے کسی دوسرے کو اپنے حصے کا مالک بنایا ہے) کا فساد و بطلان ظاہر ہو، تو حقِ شفعہ نہ ملے گا، کیونکہ بائع (قدیم شریک) کی ملکیت ابھی زائل نہیں ہوئی۔
۲) جدید شریک کے تملیک کے عقد کے وقت شفیع اپنی شرکت کا مالک ہو، اور شفعہ کے فیصلہ تک اس کی ملکیت برقرار ہے۔ اگر شفیع اپنا حصہ، بیع، ہبہ وغیرہ کے ذریعہ اپنی ملکیت سے خارج کر دے، قبل اس کے کہ اس کے حق میں شفعہ کا فیصلہ ہو، تو اس کا حقِ شفعہ باطل ہوگا۔ خواہ وہ اس سے واقف ہو یا نہ ہو، اور حقِ شفعہ کا مطالبہ کر چکا یا نہ کیا، کیونکہ سببِ شفعہ یعنی شرکت ختم ہو چکی۔
اس شفیع سے وہ حصہ جس ملکیت میں گیا، وہ شفیع کا حق استعمال کرتے ہوئے دوسرا حصہ لینا چاہے، تو اسے اجازت نہ ہوگی، کیونکہ اس حصہ کے فروخت کے وقت یہ شریک اور مالک نہ تھا۔
البتہ شفعہ کے فیصلہ سے قبل شفیع انتقال کر جائے، تو وارثوں کو یہ حق ملے گا، کیونکہ شفعہ ان حقوق میں سے ہے، جن میں وراثت چلتی ہے۔ موت سے قبل شفیع نے شفعہ کا مطالبہ کیا ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں وراثت کو حق ملے گا۔
۳) شفیع کی جانب سے کوئی ایسی بات نہ پائی جائے جو شفعہ سے اعراض اور درگذر پر دلالت کرے، مثلاً وہ یہ اعلان کر دے کہ شریکِ جدید کی ملکیت سے وہ راضی ہے، یا اس کے کسی قول یا عمل یا سکوت و خاموشی سے یوں معلوم ہو کہ اسے شفعہ کی رغبت نہیں، مثلاً اس

کے سامنے خرید وفروخت ہو، پھر وہ مجلس سے اٹھ کر چلا جائے اور مطالبہ نہ کرے، یا فروخت کی اطلاع ملنے کے باوجود کافی عرصہ تک بلا کسی عذر کے وہ شفعہ کا مطالبہ نہ کرے، ان صورتوں میں اب آئندہ اسے مطالبہ کا حق نہ ہوگا۔

البتہ درج ذیل صورتوں میں بظاہر اعراض کے باوجود اسے شفعہ کے مطالبہ کا حق ہوگا:

(الف) صحیح عوضِ تملیک کا علم نہ ہو، مثلاً اسے بتایا گیا کہ ایک لاکھ میں فروخت کیا، چنانچہ اس نے مطالبہ نہ کیا پھر یہ راز کھلا کہ مثلاً نوے ہزار میں فروخت ہوا ہے۔ کیونکہ پہلے اس کا اعراض رضامندی سے نہ تھا۔ عوض کی زیادتی کی وجہ سے تھا۔ لہٰذا یہ اعراض شریکِ جدید کی رضامندی کی دلیل نہیں۔ (اگر بعد میں معلوم ہوا کہ قیمت زیادہ تھی تو حق نہ ملے گا)

(ب) اسے بتایا گیا کہ خریدار فلاں شخص ہے، پس اس نے مطالبہ نہ کیا، پھر پتا چلا کہ خریدار کوئی دوسرا شخص ہے، تو اب وہ شفعہ کا مطالبہ کرسکتا ہے، کیونکہ کبھی انسان ایک کی شرکت کو پسند کرتا ہے اور دوسرے کی شرکت کو ناپسند کرتا ہے۔

(ج) شفیع کو یہ کہا گیا کہ عوض معجّل (نقد) ہے پھر یہ حقیقت کھلی کہ عوض مؤجل (اُدھار) ہے، تو اب وہ شفعہ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ گرچہ پہلے اعراض کر چکا ہو، کیونکہ انسان ادھار خریدنے پر قادر ہے، لیکن نقد پر قادر نہیں ہے۔

(د) شریک نے دوسرے کو کتنا حصہ دیا ہے، اس کی صحیح مقدار معلوم نہ ہو، مثلاً پہلے بتایا کہ صرف نصف حصہ دیا ہے، پھر پتہ چلا کہ مکمل حصہ دیا ہے، یا اس کے برعکس، تو شفیع نے پہلے اعراض برتا ہو تو اب حقیقت کھلنے کے بعد مطالبہ کرسکتا ہے۔

(۴) شفیع حقِ شفعہ کے مطالبہ میں ممکنہ مبادرت (جلدی) کرے، کیونکہ یہ فوری حق ہے۔ لہٰذا ضعیف حق ہے، حدیث میں وارد ہے: ”شفعہ اونٹ کی رسی کھولنے کی طرح ہے“ (ابن ماجہ) یعنی: جلد مطالبہ نہ کرے تو فوت ہو جائے گا۔ جیسا کہ رسی کھلتے ہی اونٹ بدک کر بھاگ جاتا ہے اسی لئے شفیع کو جیسے ہی پتہ چلے کہ شریک کا حصہ دوسرے کی طرف منتقل ہوا ہے، تو عادت وامکان کے مطابق فوراً مطالبہ واجب ہے، اگر رات میں پتہ چلا تو دن نکلنے تک تاخیر کرسکتا ہے۔ اگر بیمار ہے یا بستی میں نہیں ہے تو کسی کو وکیل بنادے، ورنہ کسی کو اس پر گواہ رکھے کہ مجھے شفعہ چاہئے۔ (گواہ دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک مرد اور پھر شفیع کی قسم)

شفعہ کے ثبوت کے لئے کسی حاکم کا فیصلہ، یا خریدار کی حاضری اور اس کی رضامندی اور قیمت حاضر کرنا شرط نہیں، بلکہ ایسے الفاظ سے مطالبہ کرنا، جو حقِ شفعہ کی بنیاد پر اس حصہ کو اپنی ملکیت میں لینے پر دلالت کرے، شرط ہے مثلاً میں شفعہ کی رو سے اس چیز کا مالک بنا، یا وہ چیز میں نے لی۔

قیمت کا خریدار کے حوالہ کرنا، یا شفیع کے ذمہ بطور قرض رہنے پر اس کا راضی ہونا شرط ہے، اگر یہ نہ ہوا اور قاضی (حاکم) شفعہ کا فیصلہ دے، تو اس سے بھی مالک بن جائے گا۔

شفعہ کے احکام

۱) **حق شُفعہ کا ساقط ہونا:** بعض اسباب سقوط گذر چکے، مزید ایک سبب معاوضہ لے کر صلح کرنا ہے، مثلاً شفیع خریدار سے کچھ مال لے کر صلح کرلے تاکہ اس کا حصہ اسی کو چھوڑ دے، تو یہ صلح باطل ہے شفیع کو کوئی معاوضہ نہ ملے گا، اور اس کا حقِ شفعہ بھی ساقط ہوگا۔

۲) **خریدار کا مشفوع فیہ میں تصرّف کرنا:** کسی مشترک مکان یا زمین وغیرہ کا ایک حصہ خریدنے والے کو

چاہئے کہ اس میں کوئی تصرف نہ کرے، جب تک کہ شفیع کا نظریہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ حقِ شفعہ کا مطالبہ کرنا چاہتا ہے یا نہیں، کیونکہ اس کا حق اس خریدار پر مقدم ہے، اور شفیع جب اپنا حق ترک کردے، تبھی اِس خریدار کی ملکیت اس میں پختہ ہوگی، البتہ شفیع کا مطالبہ یا موقوف کی وضاحت سے قبل یہ جدید خریدار اُس میں کچھ تصرف کرلے، تو یہ صحیح اور نافذ ہوگا، لیکن اِس سے شفیع کا حق باطل نہ ہوگا، بلکہ ہر وہ تصرف جس میں ابتداءً پائے جانے کی صورت میں شُفعہ نہیں ہوتا، اُسے ختم کرسکتا ہے، جیسے ہبہ وقف اور اجارہ، اور پھر وہ چیز شفعہ کے سبب لے لے گا، کیونکہ اس کا حق ان تصرفات پر مقدم ہے، لہٰذا ان سے باطل نہ ہوگا۔

لیکن خریدار جدید کا تصرف بھی ایسا ہو، جس سے شُفعہ حاصل ہوتا ہے، جیسے فروخت کرنا، تو شفیع کو اختیار ہے، چاہے تو اس جدید تصرف کی بنیاد پر حقِ شفعہ کی وجہ سے لے لے، یا اسے ختم کرکے پہلے ثابت حق کی وجہ سے لے۔ اس اختیار کا ایک فائدہ اسے یہ ہوگا کہ کسی ایک میں عوض کم، یا کوئی اور سہولت ہوگی، پس جو بہتر ہو، اسے وہ اختیار کرلے گا۔

اگر خریدار اپنے حصے میں کوئی ایسا تصرف کرے، جو اس میں اضافہ یا نقص وکمی کا باعث ہو، مثلاً زمین میں کاشت کرنا، پودے لگانا یا مکان تعمیر کرنا، تو شفیع اسے ان چیزوں کو ہٹا کر زمین درست کرنے کا مکلف بناسکتا ہے، یا ان چیزوں کی ہٹا کر جو قیمت ہو، وہ ادا کرکے وہ بھی لے لے۔

اگر زمین میں کوئی عمارت یا درخت ہو، پھر عمارت ڈھادے یا درخت کاٹ ڈالے، تو شفیع وہ حصہ لے سکتا ہے، البتہ بروزِ عقد مکان یا درخت کی جو قیمت ہوگی، اسے نفی کرے گا، اسی طرح زمین کا ایک حصہ غرقابی یا دھنسنے کی وجہ سے تلف ہوجائے، تو اسی تناسب سے قیمت کا ایک حصہ ساقط ہوجائے گا۔

البتہ عمارت یا درخت کسی کی دخل انداز کے بغیر خود بخود تلف ہوجائے، تو شفیع یا تو مکمل قیمت سے زمین لے لے یا چھوڑ دے، قیمت میں سے کچھ ساقط نہ ہوگا۔

۳) **قیمت کی کمی بیشی :** بیع لازم اور پختہ ہونے کے بعد اگر بائع مشتری کو قیمت کچھ معاف کردے، یا اضافہ کردے تو اس کمی بیشی کا شفیع سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ عقد اس سے پہلے مکمل ہوچکا، لیکن یہ کمی یا بیشی لزوم سے قبل ہو، مثلاً مجلس عقد میں اور جدائی سے قبل، یا خیارِ شرط کی مدت کے دوران، تو شفیع کے ساتھ بھی یہ کمی بیشی لاحق ہوگی، لہٰذا جتنی قیمت گھٹائی گئی ہے، شفیع سے بھی ساقط ہوگی یا جتنی بڑھائی گئی ہے، شفیع پر بھی لازم ہوگی۔

۴) **ادھار فروخت شدہ شئی لینا:** شریک نے اپنا حصہ اُدھار فروخت کیا ہو، تو شفیع کو اختیار ہے کہ یا تو فی الحال وہ چیز لے اور فوراً قیمت ادا کرے، یا ادھاری کی مدت تک انتظار کرے، جب مدت مکمل ہو تو قیمت ادا کرکے وہ چیز لے لے، اس تاخیر میں وہ معذور ہے، لہٰذا اس سے اس کا حق باطل نہ ہوگا۔

اگر خریدار اس پر راضی ہو کہ شفیع اپنا شفعہ ابھی لے لے اور قیمت تکمیلِ مدت پر ادا کرے، اور شفیع انکار کرے اور شفعہ کو بھی مؤخر کرے تو اس کا حقِ شفعہ باطل ہوگا۔

۵) **خریدار اور شفیع کا اختلاف:** اگر شفیع اور خریدار میں قیمت میں اختلاف ہو، مثلاً شفیع کہے: آپ نے ہزار میں خریدا ہے اور خریدار کہے: میں نے ۱۵۰۰ میں خریدا ہے، اور دونوں کے پاس گواہ نہ ہوں، تو خریدار کی بات مع قسم تسلیم کی جائے گی۔

اگر دونوں میں نفسِ بیع میں ہی اختلاف ہو، شفیع بیع کا دعویٰ کرے اور خریدار انکار کرے تو خریدار کی بات مع قسم معتبر ہوگی، البتہ

شریکِ قدیم خود بیع کا اعتراف کرے تو اسے تسلیم کریں گے۔

قِرَاض (مُضَارَبَت)

تعریف: مال کا مالک کسی دوسرے کو مال دے، تا کہ وہ شخص اس میں محنت وتجارت کرے، بشرطیکہ نفع دونوں میں مشترک ہو، قراض کہلاتا ہے۔

حدیث: (۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہ جب بطورِ مضاربت (قراض) مال سپرد کرتے تو یہ شرط لگاتے: مال لے کر سمندری سفر نہ کرے، کسی وادی میں پڑاؤ نہ ڈالے، اور کوئی تر جگر والا جاندار (یعنی زندہ حیوان) نہ خریدے، ورنہ وہ ضامن ہوگا، ان کی شرط کا آپ علیہ السلام کو علم ہوا تو آپ علیہ السلام نے اس کی اجازت دی۔ (بیھقی فی کتاب القراض)

(۲) آپ علیہ السلام نے فرمایا: "تین باتوں میں برکت ہے: ادھار فروخت کرنا، مقارضہ (قراض) اور گیہوں کو جو کے ساتھ ملانا (گھر کے استعمال کے لئے) نہ کہ فروخت کے لئے" (ابن ماجه، باب الشرکة)

مذکورہ دونوں روایتوں کی سند میں اگرچہ ضعف ہے، لیکن مجموعی طور پر قوت حاصل ہو کر مقبول اور قابلِ استدلال ہو جائے گی، بالخصوص جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے تعامل اور اجماع سے اس کی تائید بھی ہو جائے۔ اس تعامل کی بعض امثلہ درج ذیل ہیں۔

(۱) ایک طویل روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیت المال کا مال حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ اور عُبید اللہ بن عمرؓ کے سپرد کیا کہ اس میں تجارت کرتے جائیں اور مدینہ پہنچ کر اصل رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ (خلیفۂ وقت) کے سپرد کریں، اور نفع خود لیں، ...... بعد میں حضرت عمرؓ نے اس کو قراض قرار دیتے ہوئے نصف نفع بیت المال میں داخل کیا، اور نصف ان کو دیا۔ (موطا امام مالک، بیھقی)

۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علاء بن عبد الرحمٰن کے دادا کو بطور قراض تجارت کیلئے مال دیا اور یہ شرط لگائی کہ نفع دونوں میں تقسیم ہوگا (مؤطا امام مالک، سنن بیھقی)

(۳) حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ جب کسی کو بطور قراض مال دیتے تو یہ شرط لگاتے: اس سے کوئی جانور نہ خریدے، سمندری سفر میں لے کر نہ جائے، کسی آبی وادی میں نہ ٹھہرے، خلاف ورزی میں مال کا ضامن ہوگا (سنن بیھقی)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے یہ آثار قراض کے تعامل پر دلالت کر رہے ہیں، جو دیگر حضرات کے روبرو اور ان کی واقفیت کے ساتھ ہو رہے ہیں، لیکن کسی نے بھی اس پر انکار نہ فرمایا، گویا اس پر اجماع ہو گیا، تمام زمانوں میں امت کا اس کی مشروعیت پر اجماع ہو رہا ہے۔

حکمت: بعض لوگ تجارت میں کافی تجربہ کار اور ماہر ہوتے ہیں، لیکن مطلوبہ رقم اور اسباب مہیا نہیں ہوتے، دریں اثنا بعض دیگر لوگوں کے پاس مال واسباب تو موجود ہوتے ہیں، لیکن تجارت کے متعلق تجربہ اور صحیح واقفیت نہیں ہوتی، (یا وہ کسی وجہ سے بذاتِ خود اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے) لہٰذا شریعت نے طرفین کی مصلحت اور رعایت کے پیش نظر قراض کو مشروع فرمایا، تا کہ دونوں بھی مناسب طریقے سے معاشی فوائد کو حاصل کر سکیں۔

حکم: عقدِ قراض ایک جائز عقد ہے، نہ کہ لازم، یعنی عاقدین (صاحب مال اور عامل) میں سے ہر ایک جب چاہے اسے فسخ (ختم) کر سکتا ہے، خواہ عامل تصرف شروع کر چکا ہو یا نہیں۔

عمل کی ابتداء سے پہلے ہی فسخ ہو تو اب عامل کو مال میں کسی طرح کے تصرف کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ غیر کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہوگا۔ عمل شروع کرنے کے بعد فسخ ہو تو اب عامل کوئی نئی شئی خریدنے سے رک جائیگا، اور اس پر خرید شدہ اسباب کا مناسب دام پر فروخت کرنا اور اس شرکت سے متعلق قرضوں کو وصول کرنا واجب ہے۔ پھر حساب کر کے اصل رقم مالک کے سپرد کرے، اور نفع دونوں میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے۔

عقدِ قراض کے ارکان

(۱) صیغہ (۲) عاقدین (۳) رأس المال

۱) **صیغہ :** یعنی اس عقد سے رضامندی پر دلالت کرنے والے ایجاب وقبول کے کلمات۔

ایجاب : مثلاً، میں نے تمہارے ساتھ مضاربت کا معاملہ کیا، یا قراض کا معاملہ کیا، یا ان روپیوں سے تجارت کرو، جو نفع ہو ہم نصف نصف تقسیم کرلیں گے، یا ایک تہائی نفع میرا اور دو تہائی تمہارا وغیرہ۔

قبول : میں نے قبول کیا، میں راضی ہوں وغیرہ

صیغہ منجز (فوری) ہو، کسی شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں، مثلاً ماہِ رمضان آجائے تو ہمارا قراض کا معاملہ رہیگا، وغیرہ

اسی طرح قبول ایجاب سے عرفاً متصل ہو، اگر طویل سکوت یا عقد سے غیر متعلق کلام کے ذریعہ ایجاب وقبول میں فاصلہ ہو تو عقد صحیح نہ ہوگا۔

۲) **عاقدین :** یعنی صاحب مال اور عامل (تجارت اور محنت کرنے والا)

صاحب مال میں مؤکل (وکیل بنانے والا) اور عامل میں وکیل کے شرائط ضروری ہیں، کیونکہ صاحب مال مؤکل کی طرح اور عامل وکیل کی طرح ہے۔ کیونکہ عامل مالک کی اجازت سے اس کے مال میں تصرّف کرتا ہے۔ اگر کسی ایک پر مالی تصرفات کی نااہلی کی وجہ سے تصرفات کی پابندی عائد ہو چکی ہو، تو عقدِ قراض صحیح نہ ہوگا، اگر عامل نابینا ہو تو حرج نہیں، کیونکہ نابینا کسی دوسرے کو لین دین میں وکیل بنا سکتا ہے۔

۳) **رأس المال** (تجارت میں لگنے والی پونجی اور رقم): اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:

۱۔ نقود ہو، یعنی درہم ودینار یا دورِ حاضر کی کرنسی، سامانِ تجارت رأس المال نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس میں بہت غرر ہے، کہ رأس المال اور نفع دونوں مجہول ہوں گے، کیونکہ اسبابِ تجارت کی قیمت قبضہ کے دن اور فروخت یا واپسی کے دن کے دوران بدل جائے گی اور اصل بات یہ ہے کہ قراض میں ویسے بھی غرر ہے، کیونکہ نہ عمل بالکل متعین اور منضبط' اور نہ نفع یقینی، پھر بھی لوگوں کی حاجت کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا، لہٰذا جو ہر حال میں رائج اور جس سے تجارت میں سہولت ہو یعنی نقود، اسی پر اقتصار کیا جائے۔

۲۔ رأس المال کی مقدار معلوم ہو، مال کی مقدار مجہول اور نامعلوم ہو تو عقدِ قراض صحیح نہیں، کیونکہ نفع بھی مجہول ہوگا۔

۳۔ معین ہو، ذمہ میں ہو تو صحیح نہیں، الّا یہ کہ مجلس عقد میں ہی اُسے سامنے کر کے متعین کردے، اسی طرح عامل کے اوپر مالک کا قرض ہو، تو اس پر بھی مضاربت صحیح نہیں، البتہ مجلس میں وہ قرض ادا کردے، اور اسے معین کردیا جائے تو جائز ہے۔

۴۔ رأس المال عامل کے سپرد کردیا جائے، اسے براہ راست اس میں تصرف کا اختیار حاصل ہو، سو مالک یا کسی دوسرے کے قبضہ میں مال رکھنے کی شرط صحیح نہیں، اور نہ ہر تصرف کے لئے مالک کی طرف رجوع کی شرط صحیح ہے، کیونکہ ممکن ہے بوقتِ تصرف اور حاجت مالک

جگہ پر نہ ہو اور یہ عامل کے لئے تنگی اور نقصان کا باعث ہوگا۔

عقدِقراض کے شرائط

۱) **عقدِ قراض مطلق ہو،** یعنی عامل کو تصرف میں آزادی حاصل ہو، لہٰذا کسی معین چیز کے خریدنے کی قید، یا کسی متعین شخص سے کوئی مخصوص مال خریدنے کی قید مثلاً زید کے گیہوں، یا کسی چھوٹی بستی کا مال، مثلاً اس بستی کے گیہوں (اور بستی چھوٹی ہو اور وہاں پیداوار کافی کم ہو) یا کسی مخصوص شخص سے ہی معاملہ ہو، مثلاً جمیل سے ہی خریدنے، جمیل ہی کو فروخت کرلے یا ایسی چیز کی تجارت کی قید جس کا وجود نادر اور بہت ہی کم ہو، تو ان صورتوں میں عقدِ قراض صحیح نہ ہوگا۔

کسی مدت کی تعیین شرط نہیں، اگر ایسی مدت متعین ہو جس میں مقصد حاصل نہ ہو، یعنی عامل تجارت کر کے نفع نہ حاصل کر سکے، تو یہ عقدِ فاسد ہوگا۔

ایسی مدت متعین ہو کہ اس میں خرید ممکن ہو، اور اس کے بعد خریدنے سے روک دے، فروخت سے نہ روکے، تو یہ صحیح ہے۔

۲) **نفع میں دونوں شریک ہوں،** اور نفع ان کے ساتھ ہی مخصوص ہو:

نفع مالک اور عامل میں مشترک ہونا شرط ہے، تاکہ مالک کو مال کا اور عامل کو اپنے عمل کا ثمرہ حاصل ہو، پس اگر تمام نفع کسی ایک کے لئے طے کریں تو یہ عقد فاسد ہوگا۔

اگر عامل کے لئے تمام نفع کی شرط ہو، تو عقد فاسد ہے، اور تمام نفع مالک کا ہوگا۔ اور عامل کو اجرتِ مثل ملے گی، کیونکہ اس نے نفع کی امید پر محنت کی ہے۔

تمام نفع مالک کے لئے طے ہو، تب بھی عقد فاسد ہے، اور عامل کو کچھ نہ ملے گا، چونکہ عامل نے نفع کی امید اور طمع کے بغیر محنت کی ہے، لہٰذا اس کی محنت تبرعاً (مفت میں) سمجھی جائے گی۔

دونوں کا نفع میں حصہ جزئیت اور نسبت کے اعتبار سے متعین ہو، مثلاً پاؤ حصہ، نصف حصہ، یا دس فی صد یا پچاس فیصد وغیرہ۔

اگر نفع میں ہر ایک کا حصہ معلوم نہ ہو تو عقد صحیح نہیں، کیونکہ اس میں اصل مقصد نفع ہی ہے، لہٰذا وہی معقود علیہ یعنی محلِ عقد ہے اور محلِ عقد کی جہالت فسادِ عقد کا موجب ہے۔

کسی ایک کے لئے نفع کی مقدار عدد سے متعین کردی جائے تو عقد صحیح نہیں، مثلاً کسی ایک کو ہزار روپیہ یا کم وبیش، ممکن ہے کہ نفع اس سے زائد نہ ہو، پھر جس کے لئے یہ طے ہوا ہے اسی کو ملے گا، اور دونوں کا اشتراک پایا نہ جائے گا، تو یہ قراض نہ ہوا، سو عقد فاسد ہوگا، اور ایسی صورت میں تمام نفع مالک کا ہوگا، اور عامل کو اجرتِ مثل ملے گی۔

اسی طرح عامل کے لئے جزئیت کی اعتبار سے بھی نفع طے ہو، اور ساتھ میں ایک متعین مقدار بھی، مثلاً ٪۵ اور ہزار روپیہ ماہانہ تو عقد فاسد ہوگا۔

نفع ان دونوں کے ساتھ ہی مخصوص ہو، یعنی عامل اور مالک کے ساتھ، کسی دوسرے کے لئے نفع کے ایک حصہ کی شرط صحیح نہیں، البتہ وہ عامل کے ساتھ محنت میں شریک ہونے کی شرط ہو تو صحیح ہے، اور یہ مالک اور دو عامل یا زائد عامل کے درمیان قراض ہوگا۔

۳) **تصرف اور محنت میں عامل مستقل ہو:** لہٰذا عامل کے ساتھ محنت اور تصرف میں مالک کی شرکت و

شمولیت کی شرط ہو تو قراض صحیح نہیں، شرط کے بغیر عامل مالک کا تعاون حاصل کرے تو یہ جائز ہے۔

عامل کا قبضہ : مالِ قراض میں عامل کا قبضہ، قبضۂ امانت ہے، اسی طرح خرید شدہ اشیاء میں بھی۔ قبضۂ امانت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس یہ مال اس کی بے توجہی ولا پرواہی اور زیادتی کے بغیر تلف ہو تو وہ اس کا ضامن نہ ہوگا۔ (قبضہ ضمان میں بغیر کوتاہی کے بھی مال تلف ہو تو وہ آدمی ذمہ دار اور ضامن قرار پائے گا)

نقصان : جب یہ معلوم ہو چکا کہ عامل کا قبضہ بطور امانت ہے، تو قراض کے اختتام پر تمام نقصان صاحب مال پر ہوگا، عامل پر کچھ نہ ہوگا۔

وہ امور جو مضاربت انجام نہیں دے سکتا۔

۱- رأس المال اور اس سے حاصل شدہ نفع کی مقدار سے زائد رقم کی اشیاء نہ خریدے۔

۲- صاحب مال کی اجازت کے بغیر مال لے کر سفر میں نہ جائے، اگر اجازت ہو تو اجازت کے مطابق جا سکتا ہے، اجازت مطلق ہو تو عادتاً تاجر حضرات جن محفوظ علاقوں تک جاتے ہیں، وہاں تک اجازت ہوگی۔

۳- مالک کی اجازت کے بغیر ادھار فروخت نہ کرے۔

۴- عامل کسی اور کے ساتھ اس مال میں قراض کا معاملہ نہ کرے، تاکہ وہ بھی اس کے ساتھ محنت اور نفع میں شریک ہو، خواہ مالک کی اجازت سے ہو، اگر کسی نے اس طرح کیا تو دوسرا عقد باطل ہے، اور پہلا صحیح، اب دوسرے عامل نے اس کے سپرد کی گئی رقم میں تصرف کیا تو اسے مالک کی طرف سے اجرتِ مثل ملے گی، اور اس کا نفع مکمل مالک کا ہوگا، اوّل عامل کو اس میں سے کچھ نہ ملے گا، کیونکہ اس کی طرف سے محنت وغیرہ نہیں پائی گئی۔

۵- اپنی بستی میں قیام کے دوران قراض کے مال سے اپنی ذات پر خرچ کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، اور اظہر قول یہ ہے کہ سفر میں بھی اس کی گنجائش نہیں، ایک قول یہ ہے کہ سفر کی وجہ سے عام خرچ سے جو مزید رقم صرف ہوگی، وہ لے سکتا ہے۔

اور حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سفر کی صورت میں تمام اخراجات مالِ قراض سے وصول کر سکتا ہے، کیونکہ سفر کی وجہ سے وہ اسی مقصد کے لئے مقید ہو چکا ہے، لہٰذا اسکے بالمقابل اخراجات کا مستحق ہوگا۔

اصحاب ''الفقہ المنہجی'' فرماتے ہیں ''بوقتِ حاجت اس مسئلہ پر عمل کرنے میں ہماری رائے میں کوئی حرج نہیں، جبکہ عقد میں اس کی شرط نہ ہو، شرط کی صورت میں عقد فاسد ہوگا''

عامل کی ذمہ داری : عادتاً عامل اور تاجر جن امور کو بذاتِ خود انجام دیتے ہیں، عامل پر لازم ہے کہ وہ بھی بذاتِ خود ان کو انجام دے، گرچہ وہ ان کا عادی نہ ہو، اگر کسی کو ان امور کی انجام دہی کے لئے نوکر رکھا تو تنخواہ عامل کو اپنی جیب سے ادا کرنی ہوگی، نہ کہ مالِ قراض سے، اگر مالِ قراض سے ادائیگی کی شرط لگائے تو عقد صحیح نہ ہوگا۔

عرف اور عادت کی رو سے جو امور خود انجام دینا لازم نہیں، ان کے لئے مالِ قراض سے تنخواہ دے کر نوکر وغیرہ رکھ سکتا ہے۔ لیکن کسی نے خود ہی ان امور کو انجام دیا تو اس کے عوض اجرت نہیں لے سکتا، بلکہ یہ اس کی جانب سے تبرع (مفت خدمت) ہوگی۔

عامل اپنے حصہ کے نفع کا مالک کب بنے گا : عامل مال قبضہ میں لے کر خرید و فروخت اور تجارت شروع

کرے اور اس تصرف سے اس میں نفع ظاہر ہو، تو جب تک سارا مال نقدی میں تبدیل نہیں ہوتا (مثلاً آج کل روپے پیسے کی شکل میں نہ آجائے) عامل اپنے حصہ کا مالک نہ بنے گا، تمام مال فروخت ہو کر جب نقدی میں بدل جائے تو رأس المال کو جدا کر کے بقیہ رقم (نفع) دونوں آپس میں تقسیم کرلیں، اب عامل اپنے نفع کا مالک بن گیا، کیوں کہ اس سے قبل نقصان کا احتمال ہے، ایسی صورت میں نفع سے اس کی تلافی کی جائے گی۔

اس کے باوجود تقسیم سے قبل عامل کا حق مؤکد ہے، اسی لئے مالک قراض کا مال تلف کرڈالے یا تقسیم سے قبل واپس لے لے تو عامل کو ظاہر شدہ نفع کا حصہ دینا لازم ہے، اسی طرح تقسیم سے قبل عامل مرجائے تو وہ حصہ وارثوں کو ملے گا۔

رأس المال کا نقصان: عامل کی کوتاہی کے بغیر تصرف سے قبل ہی جو نقصان ہو، وہ رأس المال سے ہوگا، اور مالک اسے برداشت کرے گا، (عامل پر کچھ نہ آئیگا۔)

تصرف کے بعد دام گرنے کی وجہ سے، یا عیب پیدا ہونے کی وجہ سے مثلاً جانور کی بیماری، پھلوں کا نقصان وغیرہ، کا نقصان ہو تو نفع میں سے اس کی تلافی ہوگی (نفع ختم ہو تو رأس المال سے) کوئی ناگہانی آفت مثلاً سیلاب، آگ لگنا وغیرہ یا غصب یا چوری اس نقصان کا سبب ہو تو اس کی تلافی بھی نفع سے ہوگی۔

عقد قراض کی انتہاء (اختتام)

درج ذیل صورتوں میں یہ عقد اختتام پذیر ہوگا:

۱) **فسخ:** دونوں میں سے کوئی بھی کسی وقت بھی اس عقد کو فسخ کرے، تو یہ فسخ جائز ہوگا، عامل کے تصرف سے قبل ہو یا بعد، فریقِ ثانی موجود ہو یا غائب، راضی ہو یا نہ ہو۔

دونوں یا کسی ایک کے فسخ کرتے ہی عقد قراض ختم ہوگیا، خواہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہو، مالک نے مثلاً کہا: میں نے قراض کو فسخ کیا، یا باطل کردیا یا ختم کردیا، یا اب سے تم تصرف نہ کرو...... تو فسخ حاصل ہوگا۔

فسخ کے بعد عامل کو قراض کے مال سے کچھ خریدنا جائز نہیں، فسخ کے علم سے پہلے کچھ خریدا ہو تو یہ نافذ نہ ہوگا، فسخ کے وقت موجودہ اسباب کو فروخت کرسکتا ہے، جبکہ ظاہری نفع کی توقع ہو، مالک کا مطالبہ ہو تو فروخت کرکے رأس المال کو نقدی میں تبدیل کرنا تاکہ نفع ظاہر ہو لازم ہے، جیسا کہ قراض سے متعلق قرضوں کی وصولی اس پر لازم ہے۔

۲) **عاقدین میں سے کسی ایک کی موت:** چونکہ قراض کی شرائط میں سے عاقدین میں وکالت کی اہمیت ہے، اور موت سے وکالت باطل ہوتی ہے۔ (اس لئے قراض کی انتہا ہوگئی) (البتہ مالک کے انتقال کی صورت میں وارثوں کی اجازت کے بغیر عامل موجودہ اسباب فروخت کرے گا تاکہ وہ نقدی میں تبدیل ہوجائے اور نفع ظاہر ہو۔ اس کے برعکس عامل کا انتقال ہو تو اس کے ورثاء مالک کی اجازت کے بغیر اسے نقدی سے نہیں بدل سکتے کیونکہ ان کے تصرف سے مالک راضی نہ تھا، بلکہ مورث کے تصرف سے راضی تھا۔

۳) **عاقدین میں سے کسی کا جنون یا بے ہوشی:** خواہ جلد ہی جنون یا بے ہوشی کا ازالہ ہوجائے، مالک پاگل یا بے ہوش ہو تو عامل موجودہ اسباب کو نقدی میں تبدیل کرے، اور عامل پاگل یا بے ہوش ہو تو اس کا ولی مالک کی اجازت سے یہ خدمت انجام دے۔

۴) **رأس المال کی بربادی:** کیونکہ رأس المال ہی محلِ عقد ہے، جب یہی تلف ہوجائے تو عقد کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں، خواہ یہ تلف بربادی سیلاب وغیرہ کسی ناگہانی آفت سے ہو، یا مالک یا عامل کے تلف کرنے کی وجہ سے۔ لیکن مالک تلف کرے تو عامل کا حصہ مقرر ہوجائے گا۔ اگر عامل نے تلف کیا ہو، اور اس سے اس کا بدل وصول نہ کیا جائے تو عقد ختم ہوجائے گا اور بدل لیا جائے تو عقد جاری رہے گا، ان دو کے علاوہ کسی تیسرے نے تلف کیا، تب بھی یہی حکم ہے، یعنی بدل وصول کیا جائے تو عقد جاری رہے گا ورنہ نہیں، اس صورت میں مالک بدل کا مطالبہ کرے گا جبکہ نفع ظاہر نہ ہو، اور نفع ظاہر ہو تو مالک و عامل دونوں مطالبہ کریں گے، کیونکہ بدل میں دونوں مشترک ہیں۔

مالک اور عامل کا اختلاف

(۱) اگر نفع میں دونوں کا اختلاف ہو، عامل کہے کہ نفع نہیں ہوا، یا اتنا ہی نفع ہوا ہے، تو عامل کی بات مع قسم تصدیق کی جائے گی۔ کیونکہ اصل یہی ہے اگر عامل کسی معیّن نفع کا اقرار کرے، پھر حساب کی غلطی کا دعویٰ کرے (اور کہے کہ اس سے کم نفع ہوا ہے) تو اس کی بات قبول نہ ہوگی، کیونکہ یہ دوسرے کے حق کا اقرار کرنے کے بعد رجوع ہے، جو مقبول نہیں ہوتا۔

۲) اگر کسی چیز میں اختلاف ہو: پس مالک کہے: یہ تم نے قراض کیلئے خریدا ہے، اور عامل کہے: میں نے اپنی ذات کے لئے خریدا ہے، یا اس کے برعکس، تو مع قسم عامل کی تصدیق کی جائے، جبکہ خریدی ذمہ میں ہو، اور اگر قراض کے مال سے خریدے تو اس کی بات تسلیم نہ ہوگی، چاہے وہ اپنی نیت سے خریدے، پس یہ خرید شدہ شئی قراض میں شمار ہوگی۔

۳) رأس المال کی مقدار یا جنس میں اختلاف ہو، تب بھی عامل کی مع قسم تصدیق کی جائے گی۔

۴) اگر رأس المال کے تلف کے دعویٰ میں اختلاف ہو: پس مالک کہے: تمہاری تعدی یا کوتاہی سے تلف ہوا، اور عامل کہے: نہیں: بلکہ بلا تعدی اور کوتاہی کے تلف ہوا، تو عامل کی مع قسم تصدیق کی جائے گی۔

۵) رأس المال کے لوٹانے میں اختلاف ہو: اور عامل تو لوٹانے کا دعویٰ کرے اور مالک نہ لوٹانے کا، تو عامل کی مع قسم تصدیق ہوگی، کیونکہ وہ مؤتمن ہے، اور ہر امین جو سامنے والے کو لوٹانے کا دعویٰ کرے، اس کی بات تسلیم کی جائے گی۔

۶) مال کے تلف ہونے کے بعد مالک دعویٰ کرے کہ قرض تھا، اور عامل دعویٰ کرے کہ قراض تھا، تو مالک کی بات مع اس کے قسم کے مقبول ہوگی۔ اسی طرح مالک توکیل کا اور عامل قراض کا دعویٰ کرے تو مالک کی بات مع قسم کے معتبر ہوگی، کیونکہ اس کے قصد کو وہی زیادہ جانتا ہے، اور عامل کو اجرت نہ ملے گی، کیونکہ وہ اجرت کے عدم استحقاق کا اقرار کر رہا ہے۔

۷) نفع کے متعینہ نسبت میں اختلاف ہو: مثلاً پاؤ حصہ یا تہائی حصہ وغیرہ؟ تو دونوں اپنے دعویٰ کے اثبات میں اور دوسرے فریق کے دعویٰ کے نفی پر قسم لیں گے، دونوں کی قسم کے بعد نفع تمام مالک کا ہوگا، اور عامل کو اس کے عمل کی اجرتِ مثل ملے گی۔

مُساقاۃ

یہ لفظ سَقْیٌ (پلانا) سے ماخوذ ہے۔

شرعی تعریف: درخت کے مالک کا کسی دوسرے کے ساتھ یہ معاملہ کرنا کہ وہ اس کی اصلاح ودیکھ ریکھ اور متعلقہ ضروری

اعمال انجام دے اور حاصل ہونے والے پھلوں میں سے ایک متعین حصہ اس کے عوض اسے دیا جائے گا۔

عموماً اس عمل میں پانی ڈالنے اور سیرابی کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے اسے مساقات کہا گیا۔

مشروعیت : مساقات مشروع اور جائز ہے۔

حدیث : آپ ﷺ نے خیبر کو اس شرط پر (یہودیوں کے) سپرد کیا کہ پھل اور کھیتی کی پیداوار کا نصف ان کو دیا جائے گا۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ کے بعد شیخین رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا اور کسی بھی صحابی نے اس پر نکیر نہ فرمائی، جیسا کہ صحیحین سے واضح ہے۔ تو گویا صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہو گیا۔

حکمت : لوگوں کی سہولت اور بغیر کسی ضرر انگیزی کے مشترک مصالح کی تحقیق کے لئے اسے مشروع قرار دیا گیا، کیونکہ بعض اوقات کھیتی اور باغ کا مالک اس کی دیکھ ریکھ اور اس سے انتفاع نہیں کر پاتا اور دوسرا شخص جس کے پاس کھیتی وغیرہ تو نہیں ہے لیکن جسمانی محنت، اور کاشتکاری اور باغبانی کی مہارت وصلاحیت سے متصف ہے۔ اب اسے بطور اجرت ومزدوری کے رکھے تو ممکن ہے مطلوبہ اعمال میں کوتاہی کرے اور نتیجتاً مالک کو نقصان اٹھانا پڑے۔ لیکن جب پیداوار میں خود اس کا حصہ رکھا جائے گا تو خود بھی تندہی اور توجہ سے ذمہ داری انجام دے گا۔ اور ہونے والے نفع میں مالک کی طرح یہ بھی شریک ہو جائے گا۔ لہٰذا دو طرفہ مصلحت، بلکہ پورے معاشرہ کی مصلحت کے پیش نظر اسے روا رکھا گیا۔

مساقاۃ کے ارکان

(۱) مالک، (۲) عامل، (۳) صیغہ، (۴) مَورِد، (۵) عمل، (۶) پیداوار (پھل)

(۱) مالک : مالک خود یہ معاملہ طے کرے تو اس میں کامل اہلیت (عقل وبلوغ وغیرہ) شرط ہے۔ اگر بچہ، پاگل، یا مجور، سفیہ مالک ہو اور مصلحت مساقات کی متقاضی ہو تو اس مالک پر جسے ولایت حاصل ہو وہ اسے انجام دے۔ (مثلاً باپ، دادا)

اگر مالک غیر معین ہو جیسے وقف یا بیت المال کا مال تو یہ ذمہ داری وقف کے ناظر، حاکم، یا اس کے نائب کی ہے۔

(۲) عامل : یہ بھی مالک کی طرح کامل اہلیت سے متصف ہو، بچہ یا پاگل عامل نہیں بن سکتا۔

(۳) صیغہ : مساقات میں ایجاب وقبول لازم ہے۔ ایجاب کا صریح لفظ مثلاً ''میں نے اس کھجور کے باغ میں تمہارے ساتھ نصف پھل پر مساقات کا معاملہ کیا'' کنایہ لفظ مثلاً ''میں نے یہ درخت دیکھ ریکھ کیلئے تمہارے حوالے کیا یا تم اس درخت پر نصف پھل کے عوض محنت کرو وغیرہ۔

پھر مالک کے الفاظ سے رضامندی پر دلالت کرنے والے الفاظ سے عامل قبول کر لے تو مساقات صحیح ہوگی۔

اجارہ کے لفظ سے مساقات منعقد نہ ہوگی۔ اور اجرت مجہول ہونے کی وجہ سے اجارہ بھی شمار نہ ہوگا۔

مَورِد : یعنی صیغہ جس پر وارد ہو رہا ہے، اور جس کی دیکھ ریکھ اور اصلاح کے متعلق یہ عقد ہو رہا ہے، اور وہ ہے انگور اور کھجور کا درخت۔ کیونکہ حدیث میں کھجور کے درخت کی صراحت ہے، اور انگور بھی اسی کی طرح ہے، کیونکہ باتفاق فقہاء ان دونوں میں زکات واجب ہے، اور دونوں خشک وتر پائے جاتے ہیں اور ذخیرہ کر کے رکھ سکتے ہیں، نیز بطور قوت (خوراک۔ گذارہ کے لائق کھانا) استعمال کر سکتے

ہیں۔اس لئے انگور کو بھی کھجور پر قیاس کیا گیا۔

امام شافعیؒ کا قولِ قدیم، جسے بعض اصحاب ترجیح نے اختیار کیا ہے، اور جو دیگر اکثر فقہاء کرام کا مسلک ہے، وہ یہ کہ تمام پھل آور درختوں میں مساقات صحیح ہے، اور بعض روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، نیز بلادِ عرب بالخصوص حجازِ مقدس اور خیبر میں اکثر و بیشتر چونکہ کھجور کے ہی درخت پائے جاتے تھے، اس لئے شاید بعض احادیث میں اس کی صراحت ہوئی۔

لہٰذا'' الفقہ المنہجی '' کے مصنفین کا خیال یہ ہے کہ دورِ حاضر میں، جبکہ مختلف النوع پھل آور درختوں کی کثرت ہے، اور ضرورت و حالات تمام درختوں میں مساقات کے صحت کی متقاضی ہے، حکمت تشریع کے زیادہ موافق اور بہتر اور راجح یہی ہے کہ تمام درختوں میں اسے جائز اور صحیح قرار دیا جائے، (امام نوویؒ نے'' تصحیح التنبیہ''میں تمام پھل آور درختوں میں مساقات کے قول کو اختیار کیا ہے)۔'' (نہایۃ المحتاج ۵/۲۴۶)''

(۵) عمل : پھلوں کی بہتری اور اضافہ کے لئے مطلوبہ ہر عمل انجام دینا لازم ہے، جو کہ ہر سال دوہرایا جاتا ہو۔

پس سیرابی اور اس سے متعلقہ امور، مثلاً پانی جاری کرنا، بند کرنا، پانی کے نالوں کو صاف کرنا، درخت کے جڑ میں پانی کے گڑھے کی اصلاح وغیرہ انجام دے، مضر پودے اور گھاس پھوس کا ازالہ کرے، چور اور کیڑے مکوڑوں سے حفاظت کے لئے ضروری امور پر عمل کرے، نیز پھلوں کو توڑے، اور خشک کئے جاتے ہوں تو خشک کرے۔

ان میں سے بعض امور کی انجام دہی سے عاجز ہو، مثلاً درختوں کی کثرت وغیرہ کی وجہ سے، تو دوسروں کا تعاون حاصل کرے، اور یہ خرچ اسی کے ذمہ ہوگا۔

ہر وہ عمل جس سے درخت کی حفاظت مقصود ہو، اور وہ ہر سال انجام نہ دیا جاتا ہو، عامل پر لازم نہیں ہے، لہٰذا احاطہ (کمپاؤنڈ) بنانا، جدید نہر یا کنواں کھودنا، دروازہ لگانا وغیرہ عامل پر لازم نہیں، بلکہ یہ مصارف مالک پر ہیں۔

اگر مالک نے عامل پر غیر لازم کسی عمل کو لازم قرار دیا، یا عامل نے اپنے اوپر واجب کوئی عمل مالک کے انجام دینے کی شرط لگائی تو مساقات صحیح نہ ہوگی۔

مساقات کی صحت کے لئے شرط ہے کہ :

مَورِد (معقود علیہ، باغ) عامل کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ براہِ راست اس میں جب چاہے اپنی ذمہ داری انجام دے سکے، اگر مالک کے قبضہ میں یا دونوں کے قبضہ میں رہنے کی شرط ہو، تو مساقاۃ صحیح نہیں، البتہ مالک اس سے متعلق اعمال کی انجام دہی کے لئے نوکر کو رکھنے کی شرط لگائے تو یہ صحیح ہے۔

عمل کی مدت فی الجملہ معلوم ہونا شرط ہے، یعنی ایسی مدت کا ذکر ہو جس میں عموماً وہ درخت پھل لائے، اور درخت میں پھل لانے کی صلاحیت باقی رہے۔

مدت کی تعیین کے بغیر، یا ایسی مدت جس میں وہ درخت عموماً پھل نہ لاتے ہوں، یا اتنی مدت کہ جب تک اس میں پھل کی صلاحیت باقی نہ رہے گی، طے پائے تو مساقاۃ صحیح نہ ہوگی۔ پھلوں کی پختگی کے ساتھ مقید کرنا صحیح نہیں، کیونکہ مدت مجہول ہے، پختگی مقدم، یا مؤخر بھی ہوسکتی ہے۔

(۶) پھل : یعنی جن درختوں کی عقد مساقاۃ ہوتی ہے، ان کے پھل، اس میں شرط ہے کہ:

۱-مالک اور عامل کے ساتھ خاص ہو، کسی تیسرے کے لئے ایک ہی حصہ کی شرط لگائے تو عقد فاسد ہوگا۔

۲-پھل میں دونوں شریک ہوں، کسی ایک ہی کے لئے سارے پھل کی شرط ہو تو عقد فاسد ہے۔

۳-مالک اور عامل، دونوں کا حصہ جزئیت (نسبت) کے اعتبار سے معلوم ومتعین ہو، مثلاً نصف، ایک تہائی، پاؤ حصہ وغیرہ۔اگر یہ طے پایا کہ پھل ہم دونوں میں، تو نصف نصف پر محمول کریں گے۔کسی ایک کے لئے متعین مقدار کی شرط ہو، مثلاً ہزار کلو یا ہزار من، تو صحیح نہ ہوگا۔کسی ایک کے لئے مخصوص رقم متعین کریں، تب بھی یہی حکم ہے۔

پھل کے ظہور سے عامل کا حق اس میں ثابت ہوگا، لہٰذا مدت کی تکمیل سے پہلے پھل نمودار ہوں، خواہ پوری طرح ظاہر نہ ہوں، تو اس میں عامل کا حق ثابت ہوگا۔

پھل بالکل نمودار ہونے سے پہلے، یا اس کے بعد لیکن بُدُوِّ صَلاح سے قبل مساقات صحیح ہے، کیونکہ اکثر عمل ابھی باقی ہے۔(بدوّ صلاح کے بعد مساقات قطعاً ممنوع ہے۔النہایۃ ۲۵۲/۵)

عقد مساقات کا وصف: یہ عقد طرفین کی جانب سے لازم عقد ہے، پس تمام ارکان وشرائط کے ساتھ جب پایا جائے تو ہر ایک پر اس کی تنفید لازم ہے، دوسرے کی رضامندی کے بغیر فسخ اور رجوع کا حق نہیں، خواہ عمل کے بعد ہو یا قبل، کسی آفت وغیرہ سے تمام پھل تلف بھی ہو جائیں تو عمل کو مکمل کرنا لازم ہے۔

تکمیلِ عمل سے قبل عامل فسخ کردے، تو مالک کا نقصان ہے، اور مالک فسخ کردے تو عامل کا نقصان ہے، کیونکہ پھل کا مقررہ حصہ نہ ملے گا، جو اکثر اجرت مثل سے زائد ہوگا۔

فاسد مساقاۃ کا حکم: مساقات کے بیان کردہ احکام صحیح مساقاۃ پر مرتب ہونگے جس میں تمام ارکان وشرائط کی رعایت ہو، اگر کوئی رکن یا شرط نہ پائی گئی تو مساقاۃ فاسد ہوگی، جس کا تذکرہ اپنی جگہ آتا رہا، یعنی جہاں پر بھی یہ کہا گیا کہ مساقاۃ صحیح نہیں: مثلاً کسی پر اس عمل کی شرط جو اس کے ذمہ نہیں ہے، یا حصہ غیر معلوم ہو، یا نسبت کے اعتبار سے متعین نہ ہو، یا ایسے درختوں میں مساقاۃ ہو جو پھل آور نہ ہو......وغیرہ

جب مساقاۃ فاسد ہو، تو تمام پھل مالک کے ہوں گے، کیونکہ یہ اس کی ملکیت کی پیداوار ہے، اور عامل نے جو اعمال انجام دیئے ہیں، اسے ان کی اجرتِ مثل ملے گی۔

عامل کا قبضہ: عامل کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، لہٰذا اپنی کوتاہی یا زیادتی کے بغیر درخت، پھل یا کسی اور چیز کے تلف کا دعویٰ کرے تو مع قسم تسلیم کیا جائے گا، اسی طرح مالک اس کی خیانت کا دعویٰ کرے اور وہ انکار کرے، تو اسکا انکار مع قسم تسلیم کیا جائے گا۔

مساقاۃ کی انتہاء (اختتام وتکمیل): مقررہ مدت کے اختتام کے ساتھ مساقاۃ کی انتہاء ہو جائے گی، جبکہ پھل پختہ ہو چکے ہوں، اور چنے گئے ہوں (توڑے اور جمع کئے جا چکے ہوں) اگر مدت کے اختتام پر پھل نمودار ہو چکے ہوں تو اس سے عامل کا حق متعلق ہو چکا، لہٰذا ابھی مساقاۃ کا سلسلہ اس کی پختگی اور توڑنے تک جاری رہے گا، اور اس وقت تک عامل پر عمل جاری رکھنا لازم ہے۔

عاقدین میں سے کسی ایک کی موت کی وجہ سے مساقاۃ ختم نہ ہوگی، بلکہ مالک کے انتقال کی صورت میں عامل اپنا عمل جاری رکھے گا اور تکمیل پر اپنا حصہ لے لے گا۔

اگر عامل کا انتقال ہو، تو اس کا وارث خود عمل کی تکمیل کرسکتا ہے، اور مالک پر لازم ہے کہ اسے اس کا موقع دے جبکہ وہ معتبر ہو،

اور مطلوبہ عمل سے واقف بھی ہو، ورنہ مالک حاکم کی اجازت سے کسی کو اعمال کی انجام دہی کیلئے مزدور رکھے، جس کی مزدوری عامل کے ترکہ سے ادا ہوگی، وارث پر عمل کے لئے جبر (زبردستی) نہیں کرسکتے، بلکہ وہ عامل کے ترکہ یا اپنے ذاتی مال سے بھی (مزدور رکھ کر) عمل کی تکمیل کرسکتا ہے۔

عامل ترکہ چھوڑ کر مرا ہے، تو وارث پر اتمامِ عمل لازم ہے۔ (بذاتِ خود یا مزدور کے ذریعے)، اسے اس پر مجبور کیا جائیگا، کیونکہ یہ عامل کے ذمہ واجب حق ہے، لہٰذا دیگر حقوق کی طرح اس کے ترکہ سے ادا ہوگا، اگر عامل نے ترکہ نہ چھوڑا تو وارث پر بذاتِ خود یا اپنے مال سے عمل کی تکمیل لازم نہیں ہے، مالک اسے فسخ کرسکتا ہے۔ اور ابھی پھل نمودار نہ ہوئے ہوں، تو ورثاء عامل کے ابھی تک کے عمل کے اجرتِ مثل کے مستحق ہوں گے اور پھل نمودار ہو چکے ہوں تو فی الحال ان پھلوں میں عامل کے حصے کی قیمت کے مستحق ہوں گے۔

عامل کی خیانت کی وجہ سے مساقاۃ ختم نہ ہوگی، جبکہ اقرار یا گواہوں کے ذریعہ اس کی خیانت ثابت ہو، بلکہ کسی (نگہبان، سپروائزر) کو اس پر نگاہ رکھنے کیلئے متعین کیا جائے گا۔ عامل کو عمل سے نہ روکیں گے، اس نگہبان کی اجرت (تنخواہ) عامل پر ہوگی، کیونکہ اسی کی وجہ سے اس کی ضرورت پیش آئی۔ (بلاثبوتِ خیانت صرف شک وشبہ کی وجہ سے مالک کسی کو نگہبان مقرر کرے، تو اجرت مالک پر لازم ہوگی)۔ (فتح الوهاب ۔ نهاية المحتاج)

نگہبان رکھنے کے باوجود عامل خیانت سے باز نہ آئے تو اس کا قبضہ بالکل ختم کردیں گے، اور اس کے مال سے کسی کو عمل کی تکمیل کے لئے مزدور رکھیں گے۔

تکمیلِ عمل سے قبل عامل کہیں بھاگ جائے، یا قید ہو جائے یا بیمار ہو جائے تو مساقاۃ فسخ نہ ہوگی، بلکہ حاکم اس کی طرف سے کسی مزدور کو تکمیلِ عمل کے لئے مقرر کرے گا، الّا یہ کہ مالک یا کوئی اور اپنی جانب سے تبرعاً (مفت میں) اسے انجام دے۔ (یعنی عمل کرے یا خود ہی اجرت و مزدوری دے) پس پھل کے متعینہ حصہ کا عامل مستحق ہوگا۔

حاکم کی طرف رجوع ممکن نہ ہو، یا وہ اس پر توجہ نہ دے، تو مالک خود کسی کو عمل کے لئے نوکر رکھے، اور مزدوری کی رقم پر، نیز عامل سے یہ رقم واپس لینے کی نیت سے صرف کررہا ہے، اس پر گواہ رکھے، گواہ رکھنے کی صورت میں آئندہ یہ رقم عامل سے واپس لے سکتا ہے، ورنہ نہیں۔

حاکم اور مالک کو کوئی مزدور نہ ملے تو، مالک مساقاۃ کو فسخ کرسکتا ہے۔ اگر پھل ظاہر نہ ہوئے ہوں تو عامل کو باعتبارِ عمل اجرتِ مثل ملے گی، اور ظاہر ہوئے ہوں تو فی الحال اس کے حصہ کی قیمت کا مستحق ہوگا۔

عامل اور مالک کا اختلاف: مقررہ عوض کے متعلق دونوں کا اختلاف ہو، مالک کہے: میں نے تمہارے لئے ایک تہائی (۱/۳) مقرر کیا تھا۔ اور عامل کہے: تم نے میرے لئے نصف کی شرط لگائی تھی، تو دونوں کو اپنے دعویٰ کے اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کی نفی کے متعلق قسم دلائی جائے گی، جب دونوں قسم لیں تو عقدِ مساقاۃ فسخ ہوگا اور تمام پھل مالک کے ہوں گے، اور عامل کو اجرتِ مثل ملے گی۔

مزارعہ اور مخابرہ (بٹائی پر معاملہ کرنا)

مزارعہ دراصل زَرْع (کھیت، بونا، جوتنا) سے ماخوذ ہے، فقہی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ "مالک زمین کسی دوسرے کے ساتھ یہ معاملہ کرے کہ وہ کھیتی لگائے اور دیکھ ریکھ وغیرہ انجام دے، اور حاصل پیداوار میں دونوں شریک رہیں گے، اور بیج مالک کی طرف

سے ہوں گے۔"

مخابرہ لغت میں خَبَار سے ماخوذ ہے، یعنی نرم زمین، اور اصطلاح میں یہ بھی مزارعہ کی طرح ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں بیج عامل کی طرف سے ہوں گے۔

حکم: مزارعہ اور مخابرہ دونوں باطل ہیں، جبکہ عقد سے براہِ راست یہی مطلوب ہوں، یعنی اس زمین میں درخت نہ ہوں، یا درخت تو ہوں لیکن معاملہ مساقاہ کے بغیر کھیت کی بٹائی پر طے پایا ہو۔ صحیحین میں حضرت رافع بن خدیجؓ سے مرفوعاً اس کی ممانعت مروی ہے۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مخابرہ سے منع فرمایا" (متفق علیه)

اگر درختوں کے درمیان زمین ہو، تو ان درختوں میں مساقاۃ کے تابع درمیانی زمین میں مزارعہ صحیح ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے خیبر کی زمین ان کے حوالہ اس شرط پر کی کہ پھل اور کھیت کی پیداوار نصف نصف تقسیم ہوگی۔ اس طرح مزارعہ کی صحت کے شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) اتحادِ عامل، مساقاہ اور مزارعہ کا معاملہ ایک ہی شخص سے طے ہو۔

(۲) صرف درختوں کی آب پاشی وغیرہ زمین کے بغیر مشکل ہو، اگر ممکن ہو تو مزارعہ صحیح نہیں۔

(۳) مزارعہ اصل مقصودِ عقد نہ ہو، یعنی مساقاۃ اور مزارعہ کا معاملہ ایک ہی وقت میں طے ہو، اگر مساقاۃ پر معاملہ طے ہو، پھر مزارعہ پر تو صحیح نہیں، کیونکہ دونوں مستقل ہونے کی وجہ سے تبعیت نہ رہی۔

اسی لئے مزارعہ کا مساقاۃ پر مقدم نہ ہونا شرط ہے، اگر یوں کہے: میں نے تم سے اس زمین میں مزارعہ کا معاملہ کیا، اور ان درختوں میں مساقاۃ کا تو صحیح نہیں، کیونکہ تابع مقدم نہیں ہوا کرتا۔ زمین کی قلت وکثرت سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ بصورت حاجت دونوں صورتوں میں جائز ہوگا۔

مساقاۃ اور مزارعہ میں طے شدہ حصہ مساوی ہونا ضروری نہیں، مختلف بھی ہوسکتا ہے، مثلاً مساقاۃ میں نصف پر معاملہ ہو، اور مزارعہ میں تہائی پر، کیونکہ مزارعہ تابع ہونے کے باوجود مستقل عقد کے حکم میں ہے۔

مخابرہ: مخابرہ مطلقاً باطل ہے، اگرچہ مساقاۃ کے تابع ہو، کیونکہ یہ شریعت میں وارد نہیں، نیز مزارعت مساقاۃ کے مثل ہے۔ کہ دونوں میں عامل پر صرف عمل ہے، بخلاف مخابرہ کے، کہ اس میں عمل کے ساتھ بیج بھی عامل کے ذمہ ہے۔

فاسد مزارعه اور مخابره کا حکم: اگر فاسد طریقہ پر مزارعہ یا مخابرہ کا معاملہ طے پائے، پھر عامل نے محنت کی اور کھیتی صحیح سلامت ہو، تو مزارعہ میں پیداوار صاحبِ زمین کی ہے، اور عامل کو اس کے عمل کی اجرت نیز اسباب ہل وغیرہ اگر اس کے ہوں تو ان کی اجرت ملے گی، اور مخابرہ کی صورت میں پیداوار عامل کی ہوگی، کیونکہ بیج اس کے تھے، اور پیداوار بیج کے تابع ہوتی ہے، اور اس پر زمین کے مالک کو اجرت مثل (زمین کا معقول ومناسب کرایہ) لازم ہے، اگر بیج دونوں کے ہوں تو، پیداوار میں دونوں اسی تناسب سے شریک ہوں گے اور ہر ایک دوسرے سے اس کے حصہ میں صرف شدہ منافع کی اجرت لے گا، لہٰذا اگر بیج نصف نصف ہوں تو: مالک عامل سے زمین کی نصف اجرتِ مثل (کرایہ) وصول کرے گا، اور عامل مالک سے اس کے عمل کا نصف اجرتِ مثل وصول کرے گا۔

مزارعہ ومخابرہ کو مالک وعامل کے درمیان حلال اور صحیح قرار دینے کی صورت:

(۱) مالک عامل کو اجرت پر رکھے، اور اجرت بوئے جانے والے بیج کا ایک متعین حصہ (مثلاً نصف، پاؤ وغیرہ) شائع طریقے پر قرار دے، (یعنی اجرت کے بیج الگ اور جدا نہ ہوں) تاکہ وہ مالک کی نصف زمین میں کاشت کر کے دے، اور اسی وقت اجرت میں متعین

بیج کی نسبت سے زمین کا حصہ شائع طریقہ پر اسے کاشت کے لئے بطور عاریت دے دے، اس طرح عامل محنت کرے تو پیداوار دونوں میں بیج کے تناسب سے تقسیم ہوگی۔

(۲) یا شائع طریقہ پر نصف بیج اور زمین کی نصف منفعت کو اجرت ٹھہرائے۔ تاکہ عامل بقیہ نصف میں بقیہ نصف بیج کی کاشت کرے۔ اس صورت میں بھی پیداوار میں دونوں شریک ہوں گے، ایک دوسرے پر اجرت یا کرایہ نہ ہوگا۔

(۳) اگر بیج عامل کے ہوں، تو وہ مالک سے زمین کا ایک شائع حصہ (مثلاً نصف) بیج کے شائع حصے (نصف) اور دوسرے نصف میں اپنے عمل کے عوض اجرت پر لے لے، یا نصف زمین نصف بیج کے عوض لے اور بقیہ نصف میں، تبرعاً (مفت میں اپنی جانب سے) عمل انجام دے۔

اس صورت میں بھی ہر ایک بیج اور زمین کی منفعت میں اپنے حصے کی نسبت سے پیداوار کا مالک ہوگا، اور ایک دوسرے پر کرایہ وغیرہ نہ ہوگا۔

امام ابن المنذر، امام ابن خزیمہ، امام خطابی، امام نووی، امام سبکی اور کئی دیگر علماء کرام نے مطلقاً دونوں (مخابرہ ومزارعہ) کو جائز قرار دیا ہے۔ (ترشیح المستفیدین ص ۲۶۵)

اِجَارَہ (کرایہ، اجرت و مزدوری)

شریعت میں اجارہ مقصود و معلوم منفعت، جس میں اباحت کی قابلیت ہو، کی معلوم عوض کے ذریعے تملیک کو کہتے ہیں۔

اجارہ کی مشروعیت پر قرآن وحدیث کے دلائل کی روشنی میں اجماع ہے۔

آیات: ''فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ'' (الطلاق : ٦)

ترجمہ: ''پھر اگر (عدت کے بعد) وہ (مطلقہ) عورتیں تمہارے لئے (بچہ کو اجرت پر) دودھ پلا دیں تو تم ان کو (مقررہ) اجرت دو''

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دودھ پلانے کی اجرت کا حکم دیا، تو معلوم ہوا کہ یہ اس عورت کا حق ہے، وہ بغیر عقد کے اس کی مستحق نہ ہوگی، کیونکہ بغیر عقد کے پلانے کی صورت میں مفت میں پلانے والی شمار ہوگی، تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ عقدِ اجارہ مشروع ہے۔

۲) ''قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ'' (القصص ۲۶) ترجمہ: ''ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے تو) آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے۔ کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط، امانت دار ہو۔''

احادیث : ۱) آپ ﷺ نے (سفرِ ہجرت کے وقت) ایک ماہر واقف کار کو بطور رہبر اجرت پر ساتھ لیا (بخاری شریف)

۲) آپ ﷺ نے زمین (کھیتی) کو کرایہ پر دینے کی اجازت دی (مسلم شریف)

۳) آپ ﷺ نے فرمایا ''اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: بروز قیامت تین اشخاص کا میں مدمقابل (خصم) رہوں گا: ایک وہ جو میرے نام سے معاہدہ کرے پھر غداری کرے، دوسرا وہ جو آزاد کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھا جائے، اور تیسرا وہ جو کسی کو نوکر رکھ کر اس سے مکمل خدمت لے اور اس کی اجرت ومزدوری نہ دے'' (بخاری شریف)

اجارہ کے ارکان و شرائط

اجارہ کے چار ارکان ہیں (۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) منفعت (۴) اجرت (کرایہ)

۱) **عاقدین :** یعنی مُؤجِر اور مُستَأجِر (موجر یعنی کرایہ پر دینے والا اور مستاجر یعنی کرایہ پر لینے والا)۔ دونوں میں عقد کی صلاحیت ہو، یعنی عاقل و بالغ ہوں، پس پاگل و بچہ کا عقد اجارہ صحیح نہیں، کہ دونوں کو اپنے آپ اور اپنے مال پر ولایت حاصل نہیں ہے، اسی طرح اس پر مالی تصرفات کی پابندی نہ ہو۔

۲) **صیغہ :** یعنی ایجاب وقبول، ایجاب سے مراد موجر سے صادر ہونے والا ہر وہ لفظ جو بظاہر بالعوض منفعت کی تملیک پر دلالت کرے، خواہ صریح ہو یا کنایہ۔

صریح الفاظ: میں نے یہ تمہیں بطور اجارہ دیا، کرایہ پر دیا، اس کے منافع کا فلاں مال کے عوض تم کو ایک سال کے لئے مالک بنادیا۔

کنایہ الفاظ : میرے گھر میں اتنے روپے کے عوض ایک ماہ قیام کرو، یا اس کی منفعت فلاں کے عوض تمہارے لئے کردی۔

قبول : مستاجر سے صادر ہونیوالا وہ لفظ جو بظاہر منفعت کا مالک بننے کی رضامندی پر دلالت کرے۔ مثلاً میں نے قبول کیا، کرایہ پر لے لیا، وغیرہ۔

جن امور میں مُعَاطَاۃ (بلا لفظ بطور کرایہ استعمال اور لین دین) کا عرف ہو، وہ بھی صیغہ کے قائم مقام ہے، مثلاً بلا عقد کے بس وغیرہ میں سفر کرنا اور متعینہ کرایہ دینا، کہ یہ صحیح ہے، کیونکہ ایسے مقامات میں معاطاۃ سے بھی رضامندی پر دلالت ہوتی ہے، لہٰذا یہ ایجاب وقبول کے حکم میں ہوگا۔

صیغہ کے شرائط :

(أ)۔ ایجاب وقبول میں موافقت ومطابقت، لہٰذا کسی نے کہا: میں نے اپنا گھر سو ۱۰۰/روپے میں ایک ماہ کے لئے تمہیں کرایہ پر دیا اور مستاجر کہے: میں نے ۹۰/روپیہ میں قبول کیا، تو یہ عقد صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایجاب وقبول میں مخالفت ہے۔

(ب)۔ طویل سکوت یا کلامِ اجنبی (اجارہ سے غیر متعلق گفتگو) کے ذریعے ایجاب وقبول کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔

(ج)۔ کسی شرط پر معلق نہ ہو۔ مثلاً جب زید آجائے تو میں نے یہ کرایہ پر دے دیا۔

۳) **منفعت :** اس کے شرائط درج ذیل ہیں۔

(أ): منفعت متقوم ہو، یعنی شرعاً یا عرفاً معتبر ومقصود ہو، تا کہ اس کے عوض مال صرف کرنا صحیح ہو، مثلاً رہنے کے لئے مکان کرایہ پر لینا، یا کوئی جانور یا گاڑی سواری کے لئے لینا، کیونکہ شرعاً متقوم نہ ہو تو اس کے عوض مال کا صرف کرنا بے وقوفی اور مال کی بربادی ہے، جس سے شریعت نے روکا ہے، لہٰذا لہو ولعب کے آلات (آلاتِ موسیقی) کرایہ پر لینا، ذی روح (جاندار) کی تصویر بنانے کے لئے کرایہ پر رکھنا، وغیرہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ حرام ہیں۔

کتے کو شکار یا پاسبانی کیلئے اجرت پر دینا صحیح نہیں، کیونکہ اس کے عین (خود کتے) کی شرعاً کوئی قیمت نہیں، اسلئے اس کے منفعت کی بھی قیمت نہیں۔

بغیر کلفت و پریشانی کے ایک لفظ کی ادائیگی کے لئے کسی کو اجرت پر رکھنا صحیح نہیں، گر چہ اس سے سامان بکے، یا کوئی اور نفع حاصل ہو۔ اسی طرح دراہم ودنانیر مزین کے لئے دینا صحیح نہیں۔

(ب) اس کا سپرد کرنا موجر کے بس میں ہو، تا کہ مستاجر اس سے نفع اٹھا سکے، اگر موجر شرعاً یا حساً منفعت کے سپردگی سے عاجز ہو تو

اجارہ صحیح نہیں۔لہٰذا کسی مغصوب شی کو غاصب کے علاوہ کسی اور کو کرایہ پر دینا صحیح نہیں جبکہ عقد کے بعد اس سے واپس لینے پر قادر نہ ہو، گمشدہ گاڑی کو کرایہ پر دینا صحیح نہیں، ایسی زمین کاشت کاری کے لئے کرایہ پر دینا صحیح نہیں جس کے لئے مناسب پانی کا کوئی انتظام نہ ہو، کیونکہ ان اشیاء میں حسًا منفعت کی سپردگی سے عاجز ہے۔

شرعاً عاجز کی مثال : حائضہ یا نفاس والی مسلمان عورت کو مسجد کی اندرونی خدمت کے لئے نوکر رکھنا، کیونکہ اس کا لازمی تقاضا مسجد میں آمد و رفت وٹھہرنا ہوگا، جو اسے جائز نہیں، لہٰذا شرعاً وہ عورت اس منفعت کی سپردگی (خدمت) سے عاجز ہے۔اگر غیر حائضہ عورت کو اس خدمت کے لئے رکھا، پھر اسے حیض یا نفاس شروع ہوا، تو یہ عقد اجارہ فسخ ہو جائے گا، اگر اس نے حیض کی حالت میں مسجد میں رک کر خدمت انجام دی تو گنہگار ہوگی، اور اجرت کی مستحق نہ ہوگی۔قرآن کی تعلیم بھی خدمتِ مسجد کی طرح ہے۔

کسی شادی شدہ عورت کو دودھ پلانے یا کسی اور خدمت کے لئے اس کے شوہر کی اجازت کے بغیر اجرت پر رکھنا صحیح نہیں، کیونکہ اس کے سارے اوقات شوہر کا حق ہے، لہٰذا اس کی اجازت کے بغیر اس کے حق کے علاوہ میں صرف وقت جائز نہیں۔

اسی طرح کسی بھی عورت کو ایسے کام پر رکھنا جائز نہیں، جس میں شوہر یا کسی محرم کے بغیر سفر کی ضرورت پیش آتی ہو، یا کسی اجنبی (غیر محرم اور پرائے) مرد کے ساتھ خلوت (تنہائی) کا موقع آتا ہو، کیونکہ صریح اور صحیح احادیث کی رو سے یہ حرام ہے، تو عورت شرعاً اس طرح کے منفعت کی سپردگی پر قادر نہیں ہے۔

(ج) منفعت مستاجر کو حاصل ہو، نہ کہ موجر کو: لہٰذا ان قربتوں (نیکیوں اور عبادتوں) میں اجارہ صحیح نہیں جو نیت کی محتاج ہوں، اور جن میں نیابت کا کوئی دخل نہ ہو، جیسے روزہ، نماز کیونکہ ان کی منفعت (یعنی ثواب) موجر کو ملے گی، نہ کہ مستاجر کو، نیز ان سے اصل مقصد ایک مکلف کے اطاعت و امتثال کی آزمائش و امتحان اور نفس کی اصلاح ہے، اور اس میں دوسرا اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ ہر وہ قربت و عبادت جس میں نیابت (دوسرے کو نائب بنانا اور اس کے ذریعہ کروانا) کی گنجائش ہو، اس میں اجارہ صحیح ہے، گرچہ نیت کی ضرورت ہو۔پس عاجز اور مردہ کی طرف سے حج بدل کے لئے، میت کی جانب سے روزہ رکھنے کے لئے، قربانی کا جانور ذبح کرنے اور زکات کی تقسیم کے لئے اجارہ صحیح ہے، کیونکہ شریعت میں ان عبادات میں نیابت ثابت ہے۔

وہ عبادات جو نیت کی محتاج نہ ہوں جیسے فروض کفایہ : تو اگر یہ اصل میں شائع ہو، یعنی ہر مسلمان اس کا مخاطب ہو، لیکن بعض کے انجام دینے سے بقیہ سے ساقط ہو جائے، جیسے جہاد، تو اس کے لئے اجارہ صحیح نہیں، کیونکہ جو مسلمان جہاد کے لئے اپنے آپ کو اجرت پر دے، وہ میدانِ جنگ میں حاضر ہوگا تو جہاد اس پر فرضِ عین ہو جائے گا، تو یہ جہاد خود اس کی جانب سے ادا ہوگا، نہ کہ مستاجر کی جانب سے، لہٰذا منفعت مستاجر کے بجائے موجود کو حاصل ہوگی، تو یہ اجارہ صحیح نہیں۔

لیکن وہ فرض کفایہ اصل میں شائع نہ ہو، تو اجارہ صحیح ہے، جیسے کسی میت کی تجہیز (غسل، تکفین اور دفن)، کیونکہ یہ دراصل اس میت کے ترکہ سے متعلق ہے، ترکہ نہ ہو تو جن پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے، ورنہ پھر مسلمان مالداروں کے ذمہ واجب ہے کہ اسے انجام دے۔

بعض یا مکمل قرآن کی تعلیم کے لئے اجارہ صحیح ہے، کیونکہ تعلیم میں اصل یہ ہے کہ خود متعلم یا پھر اس کا نفقہ جس کے ذمہ لازم ہے اس کے مال سے متعلق ہے، اور آپ ﷺ کا فرمان ہے "بے شک کتاب اللہ پر اجرت لینے کا زیادہ حق ہے" (بخاری)

دیگر علمی مسائل اور قضاء وغیرہ فرض کفایہ کا بھی یہی حکم ہے۔غیر واجب شعار جیسے اذان کے لئے اجارہ صحیح ہے۔

(د)- چوتھی شرط یہ ہے کہ منفعت میں قصداً عین کا استیفاء نہ ہو، (یعنی صرف منفعت کے بجائے براہ راست کسی چیز کا حاصل کرنا

نہ ہو) لہٰذا باغ کو پھلوں کے لئے استعمال کے لئے، یا بکری دنبہ وغیرہ کو اون حاصل کرنے یا دودھ یا نسل حاصل کرنے کے لئے کرایہ سے نہیں دے سکتے۔ کیونکہ عقد اجارہ میں اصل منافع کی تملیک ہے، نہ کہ عین کی، لہٰذا عقد اجارہ کے ذریعہ کسی عین (چیز) کی ملکیت حاصل نہ ہوگی (مذکورہ مثالوں میں پھل، اون، دودھ وغیرہ عین ہیں) نیز یہ درحقیقت استہلاک (ختم کرنا) ہے، نہ کہ انتفاع، اور اجارہ میں اصل انتفاع ہے۔ نہ کہ استہلاک (تالاب مچھلی کے لئے اور موم بتی جلانے کے لئے کرایہ پر دینا صحیح نہیں ہے۔) (جمل)

البتہ عقدِ اجارہ میں تبعاً استیفاء عین پایا جائے تو جائز ہے، مثلاً کسی عورت کو دودھ پلانے کیلئے اجرت پر رکھنا، کیونکہ اس میں ضمناً اور تبعاً دودھ کا استعمال پایا جارہا ہے، جو عین ہے۔

اسی طرح کوئی مکان رہنے کے لئے کرایہ سے لے، اور اس کے احاطہ میں پھل اور درخت ہوں تو ان پھلوں کا استعمال جائز ہے، کیونکہ یہ تبعاً ہے۔ (اصل مقصود گھر میں رہنا ہے)

(ھ)۔ منفعت کی پانچویں شرط یہ ہے کہ: منفعت عاقدین (موجر اور مستاجر) میں سے دونوں کو عین (وہ چیز)، اس کی صفت اور مقدار کے اعتبار سے معلوم ہو۔

منفعت کے عین کا علم: بغیر تعیین کے کسی ایک گھر کو کرایہ پر دینا صحیح نہیں، کیونکہ عینِ منفعت مجہول ہے، یا کہا کہ میں نے ایک گھر تمہیں کرایہ سے دیا، بغیر اس کے اوصاف کے ذکر کے یا اس کی طرف اشارہ کے تو یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اجارہ میں اصل منفعت ہے، لیکن وہ کوئی مادی چیز نہیں کہ اس کی طرف اشارہ وغیرہ کیا جاسکے، لہٰذا اس کی جگہ محلِ منفعت (کرایہ پر دی جانے والی چیز) کا ذکر ضروری ہوا۔

منفعت کی نوعیت وصفت کا علم: جب مُستأجَر (کرایہ پر دی جانیوالی شئی) سے انتفاع کے مختلف طریقے ہوں، اور اس کے اثر کے تفاوت کی وجہ سے عادتاً ایک انتفاع کے بجائے دوسرے کی اجازت نہ رہتی ہو تو منفعت کی نوعیت وصفت کو متعین کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا زمین کو کاشت کے لئے کرایہ سے دینا صحیح نہیں جبکہ کس چیز کی کاشت ہوگی اسے متعین نہ کرے، کیونکہ مختلف اشیاء کی کاشت کا اثر زمین اور کھیتی پر الگ الگ پڑے گا، اگر یہ صراحت کردی جائے کہ جو چیز چاہے کاشت کرسکتا ہے تو عقد صحیح ہو جائے گا۔

اگر منفعت مقصودہ میں بظاہر اتنا زیادہ اختلاف نہ ہو، جو آئندہ نزاع و جھگڑے کا سبب بنے، تو نوعیت کی وضاحت کے بغیر بھی اجارہ صحیح ہوگا، مثلاً رہنے کے لئے مکان کرایہ سے دینا، تو اس میں اس کے ساتھ مزید کون افراد رہیں گے، یا گھر میں کیا کیا اسباب رکھے گا وغیرہ کی وضاحت ضروری نہیں، اگر مکان غالب اور معتاد کے خلاف استعمال کرے تو (بغیر وضاحت کے) اس کی اجازت نہ ہوگی، مثلاً کسی صنعت یا تجارت کے لئے استعمال کرنا۔ اگر مکان ایسی جگہ ہو کہ رہائش اور دیگر امور کے لئے استعمال ہوسکتا ہو، تب منفعت کی نوعیت یعنی رہائش، تجارت یا صنعت کی وضاحت، نیز تجارت وصنعت کی نوعیت کی صراحت ضروری ہے۔ اسی طرح کسی کام اور عمل کے لئے کسی کو نوکر رکھے تو اس کے عمل اور کام کی جسے وہ انجام دے گا۔ وضاحت ضروری ہے۔

منفعت کے مقدار کا علم: بعض کی تعیین وقت کے ذریعے، بعض کی عمل کے ذریعے اور بعض دونوں طریقے سے صحیح ہوگی۔

(اُ) وقت اور مدت کے اعتبار سے تعیین اس منفعت کی ہوگی جس کا اس کے بغیر ضبط ممکن نہ ہو، اور جس میں کمی بیشی اور قلت و کثرت پائی جاتی ہو، مثلاً رہائش کے لئے مکان، کیونکہ رہائش کی مدت کم اور زیادہ ہوسکتی ہے، یا دودھ پلانے کے لئے دائی رکھنا، کیونکہ

دودھ کی مقدار قلیل وکثیر ہوسکتی ہے، اس طرح کے منافع کا تعین وقت سے ہی ہوسکتا ہے۔

جب منفعت کو مدت کے ذریعے مقید کیا جائے تو مدت کا علم واجب ہے، اور اتنی مدت تک وہ چیز عموماً باقی رہتی ہو، تاکہ متعینہ نفع اٹھایا جاسکے۔ اس چیز کے بقا کی مدت کا اندازہ عرف اور واقف حضرات کے تجربہ کی روشنی میں کیا جائے گا۔ لہٰذا زمین مثلاً سو یا زائد سال کے لئے کرایہ سے دے سکتے ہیں، جانور تقریباً دس سال کے لئے وغیرہ۔

مدت میں استثناء: کسی کو مدت کے اعتبار سے اجرت پر (نوکر) رکھا گیا ہو (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) تو اس مدت کے اندر واجب عبادات کی ادائیگی کا وقت (مثلاً فرض نماز کا وقت) اور عادتاً کھانے پینے کے اوقات مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی طرح مدت طویل ہو تو شرعاً ثابت عید کے ایام، اور عرفاً ثابت تعطیل کے ایام بھی مستثنیٰ ہوں گے، پس اجیر (نوکر۔ مزدور) ان اوقات اور ایام کی تنخواہ کا بھی مستحق ہوگا، گرچہ عقد میں اس کی صراحت نہ کی گئی ہو، لہٰذا یومیہ، ماہانہ یا سالانہ متعینہ اجرت وتنخواہ میں کمی نہیں کرسکتا۔

(ب) عمل کے ذریعے تعیین: یہ اس وقت ہے جبکہ منفعت اپنی ذات سے معلوم ہو، اور وقت اس کے لئے کبھی کم اور کبھی زیادہ درکار ہو، جس کی وجہ سے وقت سے تعیین مشکل ہو مثلاً پوشاک سینا، کھانا پکانا وغیرہ ان امور کو عمل کے ذریعے متعین کریں گے، نہ کہ مدت کے ذریعے۔

(ج) جس میں منفعت کو وقت یا عمل (دونوں) کے ذریعے مقید کیا جاسکتا ہو: مثلاً کسی درزی کو سینے کے لئے رکھنا، یا کار وغیرہ گاڑی سواری کے لئے کرایہ سے لینا، لہٰذا درزی کو ایک دن کی مزدوری کے اعتبار سے بھی طے کرسکتے ہیں اور فلاں فلاں کپڑے سینے کے اعتبار سے بھی، اور گاڑی فلاں مقام سے فلاں جگہ تک سفر کیلئے بھی کرایہ سے لے سکتے ہیں، یا ایک دن یا دو دن کے لئے بھی لے سکتے ہیں۔

لیکن ایک ہی منفعت کو بہ یک وقت مدت اور عمل دونوں کے ذریعے مقید نہیں کرسکتے، مثلاً یہ کپڑا ایک دن میں سی کردو، یا یہ دیوار دو دن میں تیار کر کے دو، یا مجھے تین روز میں دمشق سے مکہ پہنچاؤ، کیونکہ کبھی وہ عمل مقررہ مدت سے کم میں انجام پائے گا اور کبھی اسے زائد مدت درکار ہوگی، جو غرر (دھوکہ) کا باعث ہے، لہٰذا یہ عقد صحیح نہ ہوگا۔

۴۔ چوتھا رکن اجرت (مزدوری، تنخواہ) ہے: بیع میں جو قیمت کے شرائط ہیں، وہی اجرت کے شرائط ہیں، کیونکہ اجرت درحقیقت منفعت کی قیمت ہے، لہٰذا اجرت میں شرط ہے کہ :

(أ) وہ پاک ہو! اگر اجرت میں کتا، سور، مردار کی غیر مدبوغ کھال یا شراب مقرر کرے تو یہ عقد صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ اشیاء نجس العین ہیں، آپ ﷺ نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا ہے (متفق علیہ) نیز صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب اور مردار اور سور اور بتوں کے فروخت کو حرام قرار دیا ہے'' اسی طرح وہ متنجس اشیاء جسے اب پاک کرنا ممکن نہ ہو، اجرت مقرر نہیں کرسکتے، مثلاً وہ سرکہ، دودھ، تیل، وغیرہ جس میں نجاست شامل ہو، کیونکہ آپ ﷺ نے مائع (سیال) گھی کو نجس ہونے کی صورت میں بہادینے کا حکم دیا۔ (ابن حبان) بہانے کے حکم سے معلوم ہوا کہ اسے پاک نہیں کیا جاسکتا، تب پھر اس کی بیع، اور اسے اجرت متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔

(ب) اجرت نفع بخش ہو: جو چیز نفع بخش نہ ہو، اسے اجرت قرار نہیں دیا جاسکتا؛ تو اس کی خِسّت اور حقارت کی وجہ سے جیسے کیڑے مکوڑے اور گیہوں کے دو دانے، یا اس کی ایذا رسانی کی وجہ سے جیسے درندے، یا شرعاً استعمال حرام ہونے کی وجہ سے، جیسے آلات لہو، بت، جانداروں کی تصویر کیونکہ یہ اور ان کے مثل اشیاء میں کوئی (معتبر) نفع نہیں اور یہ مال میں شمار نہیں، لہٰذا اس کے مقابلہ

میں مال لینا صحیح نہیں، اور منفعت بھی درحقیت مالِ متقوم ہے، لہٰذا ان اشیاء کو اجرت نہیں قرار دے سکتے۔

(ج) اس کی سپردگی ممکن ہو: لہٰذا ہوا میں اڑتے پرندے، پانی میں تیرتی مچھلی وغیرہ اجرت نہیں ہو سکتی۔

(د) عاقد کو اجرت ادا کرنے کی ولایت (شرعی اختیار) ہو: ملکیت یا وکالت کی وجہ سے اسے اس کا اختیار ہو، ورنہ اجارہ صحیح نہیں۔

(ھ) عاقدین کو معلوم ہو: لہٰذا گھر کو اس کی تعمیر و اصلاح کے عوض، گاڑی درکار پٹرول، ڈیزل وغیرہ کے عوض، یا جانور کو اس کے چارہ کے عوض کرایہ پر دینا صحیح نہیں، کیونکہ اجرت مجہول (نامعلوم) ہے۔

مزدور کے عمل سے حاصل ہونے والی چیز ہی کا ایک حصہ اجرت متعین کرنا صحیح نہیں، مثلاً بکری کے ذبح و کھال اتارنے کی اجرت اس کھال کو یا گوشت کے ایک حصہ کو قرار دینا، یا گیہوں پیسنے کی اجرت اسی آٹے کا ایک حصہ (مثلاً پاؤ یا پانچواں حصہ) مقرر کرنا، کیونکہ اس میں جہالت ہے، نیز مزدور کا خود اپنے عمل سے انتفاع پایا جا رہا ہے، تو گویا ایک طرح خود اپنا کام کر رہا ہے، لہٰذا اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔

دارقطنی کی ایک روایت اس آخری مثال کی ممانعت کے متعلق وارد ہے۔

گیہوں کا ایک حصہ اجرت مقرر کرے تا کہ بقیہ پیس کر دے تو یہ صحیح ہے، کیونکہ ممانعت کے دونوں اسباب (جہالت اور اپنا کام کرنا) مفقود ہیں۔

درج ذیل صورتیں بھی بدرجہ اولی اس ممانعت میں داخل ہیں۔

کھیتی اور اناج کی کٹائی کی اجرت اسی سے حاصل اناج کا ایک حصہ مقرر کرنا۔

مختلف انجمنوں اور اداروں کے سفیروں اور چندہ اکٹھا کرنیوالوں کو اسی چندہ کا ایک حصہ اجرت و تنخواہ مقرر کرنا مثلاً ۲ فی صد یا ۵ فی صد وغیرہ۔

گھر وغیرہ کے دلالوں کو فروخت کی جانے والی شئی (جس میں وہ دلالی کر رہے ہیں) کی قیمت کا ایک حصہ دلالی اور اجرت مقرر کرنا۔ مثلاً ایک فی صد یا ۳ فیصد وغیرہ۔

اجارہ کے یہ تینوں طریقے غلط ہیں، کیونکہ اجرت مجہول ہے، لہٰذا لوگ یہی جان لیں کہ اس طرح کی کمائی ناپاک اور غیر مشروع ہے، لینے اور دینے والے دونوں کی گرفت ہوگی، پس شریعت الٰہی کی مخالفت کرنے والے متنبہ ہو جائیں اور اس سے پرہیز کریں، بالخصوص مختلف انجمنوں کے سفیر کہ ان کی جمع کردہ رقوم اکثر فقراء و مساکین کا حق ہوتی ہیں، جسے غلط اور ظالمانہ طریقے سے استعمال کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا نیک اور اچھا کام کر رہے ہیں، ایسے لوگ اللہ کی ناراضگی اور عقاب سے ڈریں!

اجارہ کے اقسام

(۱) اجارہ عَین (۲) اجارہ ذِمہ

(۱) اجارہ عین: یعنی جس کا تعلق کسی معین چیز کی منفعت سے ہو۔ مثلاً: میں نے تمہیں یہ گھر کرایہ پر دیا۔ یا فلاں گاڑی (جو معین ہو اور دونوں اس سے واقف ہوں) کرایہ سے دی۔ یا کسی معین شخص کو کسی بھی کام کے لئے مزدور رکھے، یا تا کہ وہ کپڑا سی کر دے۔

(۲) اجارہ ذمہ: اس اجارہ کا تعلق ذمہ سے متعلق منفعت سے ہوتا ہے، مثلاً: فلاں قسم کی سواری سے معین مقام تک پہنچانے

کی ذمہ داری، یا موصوف گاڑی متعین مدت کے لئے کرایہ سے دینے کا ذمہ لے۔(اس میں گاڑی معین نہیں۔گاڑی کے اوصاف بیان کردے۔ان اوصاف کی کسی بھی گاڑی سے متعینہ مقام تک پہنچانا یا اسے متعین مدت کے لئے دینا کافی ہے)۔یا مستأ جر موجر کے ذمہ کوئی عمل لازم قرار دے(کنٹریکٹ دینا) مثلاً گھر کی تعمیر، سلائی وغیرہ اور وہ قبول کرلے۔(اب چاہے وہ خود کرے یا کسی اور سے کروا کردے

اجارہ عین کے شرائط: (۱) کرایہ سے دی جانے والی چیز متعین ہو، پس دونوں میں سے کوئی ایک گاڑی کرایہ سے دینا صحیح نہیں (بلکہ کوئی ایک متعین کرلے)

(۲) چیز حاضر ہو اور عقد کے وقت دونوں کے سامنے ہو۔اگر کوئی کہے: میں نے تمہیں گھر، یا کار، یا کپڑا کرایہ سے دیا اور یہ چیزیں سامنے نہ ہوں، تو یہ اجارہ صحیح نہیں ہے، البتہ چیز پہلے دونوں دیکھ چکے ہوں، اور اتنی مدت میں بظاہر اس میں کوئی تبدیلی نہ آتی ہو، تو اجارہ صحیح ہے۔

۳) منفعت کی تحصیل عقد سے مؤخر نہ ہو، مثلاً گھر آئندہ سال کے لئے (ابھی سے) کرایہ سے دینا، یا خود کو مزدوری کے لئے پیش کرنا کہ کام ایک تاریخ سے شروع کروں گا، یا کار کل کرایہ سے دینا، یا گھر ایک ماہ یا سال کے لئے کرایہ سے دینا اور مدت کی ابتداء آئندہ ایک تاریخ سے ہوگی وغیرہ۔البتہ فی الحال جس نے کرایہ سے لیا ہے، مستقبل میں بھی اسی کے ساتھ معاملہ طے کرے، اور وہ مدت اس مدت کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہو، تو یہ عقد صحیح ہے۔

اجارہ ذمہ کے شرائط: (۱) اجرت نقد ہو اور مجلس عقد ہی میں سپرد ہو، کیونکہ یہ اجارہ منافع کا سَلَم ہے، لہٰذا رأس المال (یعنی اجرت) مجلسِ عقد ہی میں ادا کرنا شرط ہے، ادھار کی شرط سپرد نہ کرنے کی طرح ہے۔

اگر دونوں اجرت کو ادھار رکھنے پر متفق ہوں تو یہ اجارہ صحیح نہ ہوگا، خواہ اجرت مجلس ہی میں ادا کردے، اسی طرح ادھار پر اتفاق تو نہ ہو، لیکن اجرت بالفعل مجلس میں ادا نہ کرے تو یہ عقد صحیح نہ ہوگا۔

۲) اس عَین (چیز) کی جنس، نوع، اور صفت کی وضاحت اور تذکرہ جس سے انتفاع کرنا ہے، مثلاً کسی دفترِ حمل ونقل (ٹراویل ایجنسی) سے کسی متعین شہر تک پہنچانے کے متعلق معاملہ طے پائے تو وسیلۂ نقل کہ ہوائی ہے یا بحری یا بری؟ کار ہے یا بس؟ قدیم ہے یا جدید؟ وغیرہ ایسے امور کی وضاحت ضروری ہے جن سے اغراض میں تفاوت ہوتا ہے۔

اجارہ کا حکم

عقد اجارہ جب تمام ارکان وشروط کے ساتھ پایا جائے تو صحیح ہو جائے گا اور اس پر درج ذیل احکام مرتب ہوں گے۔

اس چیز کی منفعت میں کرایہ دار (مستاجر) کی ملکیت ثابت ہوگی، نفع میں اس کا تصرف اور انتفاع جائز ہوگا۔اجرت پر موجر کی ملکیت ثابت ہوگی، اس ملکیت کی ترتیب یہ ہوگی کہ جتنا وقت گذر جائے گا، اور وہ چیز مستاجر کے قبضہ میں صحیح سلامت ہو، اس نفع یا وقت کے مقابلہ کی اجرت پر اس کی ملکیت پختہ اور مستقر ہوگی، جب مستاجر مکمل (طے شدہ) نفع اٹھائے، یا اجارہ کی مدت مکمل گذر جائے تو پوری اجرت پر ملکیت مستقر ہو چکی، چاہے مستاجر نے اس مدت میں نفع نہ اٹھایا ہو، جبکہ وہ چیز اس کے قبضہ میں صحیح سلامت تھی، کیونکہ اسی کے ماتحت میں اسکے منافع تلف ہو چکے، لہٰذا اس کا عوض اس پر لازم ہو چکا، جیسا کہ مبیع خریدار کے قبضہ میں تلف ہو جائے تو قیمت اس پر لازم ہے۔

اگر عَین مُستَاجَرہ (کرایہ اور اجرت پر لی ہوئی چیز) طئے شدہ منفعت کا ایک جُز حاصل کرنے کے بعد یا اس کے امکان کے بعد تلف

ہو جائے، اور یہ جز (حصہ) عادتاً نفع بخش ہو، تو اس کے بالمقابل اجرت پر مالک (موجر) کی ملکیت مستقر ہوگی، جیسے کسی مخصوص مقام کے سفر کے لئے کار کرایہ سے لی، لیکن منزل تک پہنچنے سے قبل وہ بگڑ جائے اور مزید سفر کے قابل نہ ہو، تو طے شدہ مسافت کا کرایہ لازم ہے، جبکہ بغیر کسی مشقت کے وہاں سے آگے کا سفر جاری رکھ سکتا ہو، یا اس جگہ مستأجر کا کوئی کام ہو۔ اور اگر یہ جز عادتاً نفع بخش نہ ہو، مثلاً کار بگڑنے کی جگہ مقصود نہ ہو، یا وہاں سے آگے سفر کا تسلسل مشکل ہو، تو موجر کو کوئی اجرت نہ ملے گی، اور یہ سپردگی سے قبل یا انتفاع سے قبل یا امکانِ انتفاع سے قبل ہی اس چیز کے برباد ہونے کے مثل ہوگا۔ اجرت نقد ہو یا ادھار اس میں ملکیت ثابت ہوگی، اور یہ مسئلہ بیان ہو چکا کہ اجارہ ذمہ میں اجرت ادھار جائز نہیں اور اگر اجارہ عین ہو اور اجرت متعین شئی ہو، مثلاً ان دراہم کے عوض یا اس گھڑی کے عوض میرا گھر تمہیں ایک سال کے لئے کرایہ سے دے دیا، تو اس معین اجرت کی تعجیل واجب ہے، تاخیر وادھار جائز نہیں، کیونکہ معین اشیاء میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہوتی، اور اجرت ذمہ میں ہو، مثلاً اپنا گھر ہزار روپے میں ایک سال کرایہ سے دے دیا، تو اجرت میں تعجیل اور تاخیر دونوں جائز ہیں، جیسا کہ بعض کی تعجیل (فوری ادائیگی) اور بعض کی تاخیر، یا ہر ماہ قسط وار ادائیگی، جیسے بھی دونوں کے اتفاق سے طے پائے، جائز ہے۔ عقد میں تعجیل یا تاخیر کی صراحت نہ ہو تو تعجیل مراد ہوگی۔

منفعت کی تحصیل کا حق: مستاجر براہ راست خود انتفاع کرے، یا کسی اور کے ذریعے، دونوں جائز ہیں۔ اگر مکان کرایہ سے لیا تو خود اس میں سکونت اختیار کرے، یا کسی اور کے ساتھ یا کسی اور کو عاریۃً یا کرایہ سے رہنے دے۔ اگر موجر یہ شرط لگائے کہ مستاجر خود ہی انتفاع کر سکتا، تو یہ اجارہ صحیح نہیں، یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی چیز اس شرط پر فروخت کرے کہ خریدار کسی اور کو فروخت نہ کرے، تو یہ بیع بھی صحیح نہیں ہے۔

مستاجر کسی اور کے ذریعے انتفاع کرے تو درج ذیل شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔

۱۔ جس کے سپرد انتفاع کے لئے کرے وہ امین (امانت دار شخص) ہو۔

۲۔ تحصیلِ منفعت میں وہ شخص اس کرایہ کے چیز کے حق میں مستاجر کے مساوی یا اس سے کم ضرر ونقصان پہنچانے والا ہو۔ پس کسی نے مکان رہائش کے لئے کرایہ سے لیا تو کسی دوسرے کو صنعت یا تجارت کے لئے نہیں دے سکتا، کوئی گاڑی سواری کی غرض سے کرایہ پر لے تو کسی دوسرے کو بوجھ وغیرہ منتقل کرنے کے لئے نہیں دے سکتا، جبکہ اس کا نقصان سواری کی بہ نسبت زیادہ ہو، اگر کپڑا پہننے کے لئے کرایہ سے لے تو اپنے سے موٹے شخص کو وہ نہیں دے سکتا......

اجارۂ فاسدہ اور اجرت مِثل: اجارہ کے شرائط میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو اجارہ فاسد ہوگا، اور مستاجر پر واجب ہے کہ وہ چیز واپس لوٹا دے، لوٹانے سے قبل منافع حاصل کر چکا، یا اتنا وقت گذر چکا کہ منافع حاصل کر سکتا تھا، تو اس پر مکمل اجرت مثل واجب ہوگی، خواہ یہ اجرت، اجرتِ مُسمّٰی (متعینہ اجرت) کے مساوی ہو یا اس سے کم یا بیش۔ اسی طرح بعض منفعت کی تحصیل کے بعد فسادِ عقد کی وجہ سے اسے فسخ کر دیا جائے تو اسی قدر اجرت مثل واجب ہوگی، (مثلاً ایک سال کے لئے اجرت پر لینے کے بعد چھ ماہ میں فسخ کیا تو نصف اجرت مثل واجب ہے)

کسی کام اور عمل کے لئے مزدور رکھا (یعنی فاسد طریقے سے) اور مزدور نے متعلقہ عمل مکمل یا بعض انجام دیا تو بقدر عمل اجرتِ مثل کا مستحق ہوگا۔

اُجرتِ مِثل: واقف اور تجربہ کار حضرات اس چیز یا اس عمل کی جو مناسب اور عام اجرت قرار دیں، اسے اجرتِ مثل

کہتے ہیں۔

اجرتِ مسمّی : عاقدین آپس میں جو بھی اجرت طے کرلیں، اسے اجرت مسمی کہیں گے، یہ اجرت مثل سے کم وبیش بھی ہوسکتا ہے۔

(دورِ حاضر میں معمول ڈپازٹ وپگڑی کے مسائل وقف کے بعد بعض متفرق جدید مسائل ص ۲۲۸ میں ملاحظہ فرمائیں)

عَینِ مُستَاجَرَہ کا ضمان (اجرت اور کرایہ پر لی ہوئی چیز کا ضمان): عین مستاجرہ پر مستاجر اور کرایہ دار کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، لہٰذا اس کے تلف ہونے یا عیب دار ہونے سے کرایہ دار پر اس کا ضمان (تاوان) نہیں آئیگا، خواہ یہ نقصان انتفاع کے دوران پیش آئے یا اس سے قبل یا بعد، عدمِ ضمان کا حکم اس وقت تک ہے جبکہ اس چیز کے استعمال میں یہ تعدّی نہ کرے (حد سے تجاوز نہ کرے) یا حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہ لے۔

رہائش کے لئے مکان کرایہ سے لیا، پھر عادتاً مکان میں چولھا یا چراغ وغیرہ جو جلایا جاتا ہے، اس سے اس کی غفلت ولا پرواہی اور کوتاہی کے بغیر مکان میں آگ لگ جائے تو کرایہ دار ان نقصانات کا ذمہ دار نہیں، البتہ عادت کے برخلاف استعمال سے یہ نقصان ہو، مثلاً لوہاری کام وغیرہ کے لئے بھٹی جلایا اور اس سے آگ لگ گئی تو یہ ضامن ہوگا، کیونکہ رہائشی مکان میں یہ کام تعدّی ہے۔

اسی طرح اس کی لاپرواہی کی وجہ سے آگ لگ جائے، مثلاً سوتے وقت اسٹو یا انگیٹھی کو جلتا ہی چھوڑ دے اور اس سے آگ لگ جائے تو وہ ضامن ہوگا، کیونکہ یہ غالب عادت کے بھی برعکس ہے اور شرعاً بھی ممنوع ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے" سوتے وقت گھر میں آگ باقی نہ رکھو (بجھادو)" ایک مرتبہ آپ ﷺ کو پتہ چلا کہ رات میں مدینہ منورہ میں ایک گھر جل گیا، تو ارشاد فرمایا" بلاشبہ یہ آگ تو تمہاری دشمن ہے، لہٰذا سوتے وقت اسے بجھادیا کرو" (بخاری مسلم) اسی طرح چھوٹے بچوں وغیرہ کے ہاتھ میں جلانے والی چیزوں کو رہنے دے (اور آگ لگے) تو ضامن ہوگا۔

کسی بھی غلط اور نا مناسب استعمال کی وجہ سے نقصان ہو، تو ضمان لازم ہے، مثلاً کرایہ کی گاڑی بھیڑ کے مقامات یا مشکل اور پرخطر راستوں میں زیادہ تیز چلائے، اور اس سے کچھ حادثہ ونقصان ہو تو ضمان لازم ہوگا۔

حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے نقصان ہو، تب بھی ضمان لازم ہے، مثلاً وہ چیز ایسی جگہ رکھ دے کہ عادتاً وہاں نہیں رکھی جاتی، مثلاً گاڑی کو سڑک کے بیچ میں رکھنا، یا کسی غیر مامون علاقے میں بلا پاسبانی کے چھوڑ دینا وغیرہ۔ اس صورت میں کچھ نقصان وحادثہ پیش آئے تو کرایہ دار ضامن ہوگا، لیکن اس چیز کو مناسب اور محفوظ مقام میں رکھنے کے باوجود کوئی نقصان پہنچے تو اس کا ذمہ دار نہیں۔

اسی طرح اجارہ کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی وہ چیز استعمال کرے، یا استعمال تو نہ کرے لیکن مالک کے سپرد کرنے میں اپنی رکاوٹ کو ختم نہ کرے (پھر مثلاً وہ تلف ہوجائے) تو ضامن ہوگا، اگر استعمال نہ کرے اور واپسی کے امکان وقدرت سے قبل ہی کچھ نقصان پیش آئے تو ضامن نہ ہوگا۔

اَجِیر کا ضمان (اجیر یعنی مزدور، نوکر، یا جس کے ذمہ اجرت پر کوئی کام سونپا جائے): اس کی دو قسمیں ہیں۔

(أ) اَجِیرِ خاص : اس سے وہ اجیر اور مزدور مراد ہے جس سے مستاجر کسی خاص مدت کے لئے کسی کام کے انجام دینے کا معاملہ کرے، اور اس پوری مدت کے نفع کا مستاجر مستحق ہوگا، اور اجیر اس کی اجرت کا مستحق ہوجائیگا، چاہے مستاجر اس سے کام نہ لے۔ یا

مستاجر اسکے ساتھ کسی خاص اور معین کام اور عمل کے سلسلہ میں معاملہ طے کرلے، کہ اس کی تکمیل کے بغیر کسی اور کا کام نہ لے، جیسے فیکٹری اور مل کے کاریگر، دوکان کا مزدور، کسی پیشہ ور کے یہاں کاریگر مثلاً درزی وغیرہ، اسی طرح گھروں میں رنگ وروغن کرنے والا، تعمیری کام کرنے والا اور بڑھئی وغیرہ وہ اشخاص جو مستاجر کی موجودگی یا اس کی ماتحتی وتابعداری میں کام کرتے ہیں، اگر اس طرح کے مزدوروں اور کاریگروں کے ہاتھوں کچھ نقصان ہوجائے تو وہ اس کے ضامن نہیں، لیکن ان کی بے احتیاطی وتساہل، زیادتی کی وجہ سے یا عمداً نقصان کریں تو ضامن ہوں گے۔

(ب) أجیر مشترک: اس سے وہ اجیر مراد ہے، جس کے ساتھ مستاجر کسی خاص عمل اور کام کے لئے معاملہ طے کرلے، جس کے مکمل کرنے پر وہ اجرت کا مستحق ہوگا، اور ایک ہی وقت کئی افراد کے ساتھ اس عمل کے لئے یا کسی اور عمل کے لئے وہ معاملہ کرسکتا ہے، اور عموماً مستاجر کی تابعداری یا حاضری میں کام انجام نہیں دے گا، بلکہ اپنے گھر یا دوکان یا کارخانہ میں اپنے طور پر وہ کام مکمل کرے گا، جیسے درزی، رنگ ریز، گیرج فٹر وغیرہ۔ یہ اجیر بھی تعدی اور زیادتی کے بغیر ہونے والے نقصان کے ذمہ دار نہیں، اور وہ چیز ان کے پاس بطور امانت ہوگی، کیونکہ ان کا قبضہ مستاجر کی مصلحت کی خاطر ہے۔

حنفیہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجیر مشترک اس کے ہاتھوں پیش آنے والے نقصان اور تلف کا ضامن ہوگا، الا یہ کہ سبب ایسا عام ہو کہ اس سے احتراز ناممکن ہو، جیسے آگ لگ جانا، عام غرقابی یا سیلاب وغیرہ، اور ایسا سبب نہ ہو، مثلاً چوری وغیرہ تو وہ ضامن ہوگا۔ ان کی اصل دلیل وحجت یہ ہے کہ انہیں اس صورت میں ضامن نہ قرار دیں تو لوگوں کے مال کے متعلق تساہل اور لاپرواہی سے کام لیں گے، اور اتنی ذمہ داری لیں گے جو ان کے بس سے باہر اور حفاظت مشکل ہو، لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ انہیں ضامن قرار دیں، تاکہ لوگوں کے مال کی حفاظت میں کسی طرح کی کوتاہی نہ برتیں۔ آج کل کے حالات کے اعتبار سے ''الفقہ المنہجی'' کے مؤلفین کا خیال یہ ہے کہ اسی قول پر عمل کرنا زیادہ راجح اور بہتر ہے

اجارہ کی انتہا اور اختتام

۱) عقد اجارہ طرفین کی جانب سے عقد لازم ہے، یعنی ایک مرتبہ صحیح منعقد ہوجائے تو مستاجر یا موجر جب چاہے بلاعذر فسخ نہیں کرسکتے، اگر فسخ کردے تو اجارہ ختم ہوجائے گا۔ فسخ کے اعذار درج ذیل ہیں۔

(أ) اجارہ عین میں اس شئی کا ہلاک اور تلف ہوجانا، پس معین گھر یا گاڑی کرایہ سے لے، پھر کسی انتفاع سے قبل ہی گھر منہدم ہوجائے یا گاڑی ناکارہ ہوجائے تو اجارہ فسخ ہوجائے گا۔ اگر شئی تلف نہ ہو لیکن ایسی عیب دار ہوجائے کہ اس سے مقصود انتفاع متعذر و مشکل ہو، تب بھی فسخ ہوگا۔ کسی قدر انتفاع کے بعد تلف یا عیب پیدا ہو، تو آئندہ کے لئے اجارہ فسخ ہوگا، اور طے شدہ اجرت میں سے بقدر انتفاع حصہ ادا کردے (مثلاً ایک سال کے لئے مکان کرایہ سے لیا اور ۶ ماہ بعد منہدم ہوگیا تو نصف کرایہ ادا کرے)

اگر اجارہ ذمہ ہو، مثلاً کسی سے فلاں مقام تک موصوف گاڑی کے ذریعہ پہنچانے پر معاملہ طے پائے، اس کے مطابق وہ گاڑی لے آئے لیکن پہلے ہی یا دورانِ سفر وہ گاڑی بگڑ کر ناقابلِ سفر ہوجائے، تو اس سے اجارہ فسخ نہ ہوگا، بلکہ موجر دوسری گاڑی کے ذریعے اسے پہنچادے، کیونکہ عقد کسی معین گاڑی کے متعلق نہیں تھا، بلکہ موصوف گاڑی کے متعلق تھا۔

عین مستاجرہ (کرایہ کی چیز) ہی کی طرح گذشتہ سارے مسائل میں اجیر (مزدور، کاریگر) کا حکم ہے لہٰذا کسی معین شخص کو کسی کام کے

لئے مزدور رکھے، پھر وہ مر جائے یا ایسا بیمار ہو جائے کہ مقررہ کام انجام نہیں دے سکتا، تو اجارہ فسخ ہوگا۔ اور اجارہ ذمہ اس سے فسخ نہ ہوگا، بلکہ دوسرے کے ذریعہ وہ کام کروا کے دے سکتا ہے۔

(ب) عین مؤجرہ (کرایہ کی چیز) کا مدت میں سپرد نہ کرنا: اجارہ عین میں منفعت مدت کے ساتھ مقید ہو، اور مدت گذر جانے تک مُوجر عین مؤجرہ (کرایہ پر دی جانے والی شئی) سپرد نہ کرے تو اجارہ فسخ ہوگیا۔

اجارہ ذمہ میں وقت متعین ہو، اور موجر اس وقت میں وہ چیز جس سے انتفاع ہو سکے پیش نہ کرے، تو اجارہ فسخ ہو جائے گا۔ اگر تحصیل منفعت کے لئے کوئی وقت متعین نہ کرے، اور اس چیز کے پیش کرنے سے قبل اتنی مدت گذر جائے جس میں انتفاع ہو سکتا تھا، تو نہ فسخ ہوگا اور نہ فسخ کرے گا۔ اگر موجر مدتِ اجارہ کا بعض حصہ گذرنے کے بعد وہ شئی پیش کرے تو گذشتہ مدت میں اجارہ فسخ ہو چکا، اور بقیہ مدت کے لئے مستاجر کو اختیار ہے (کہ چاہے تو باقی رکھے ورنہ فسخ کرے)۔

اگر منفعت عمل کے ساتھ مقید ہو (نہ کہ مدت کے ساتھ) اور اس شئی کی سپردگی میں اتنی تاخیر ہو کہ اس میں وہ عمل انجام پا سکتا تھا، تو اجارہ فسخ نہ ہوگا۔

جن اسباب سے اجارہ فسخ نہ ہوگا۔

(أ) کرایہ کی چیز موجر کی ملکیت سے نکل جائے تو اجارہ فسخ نہ ہوگا، مثلاً مکان کرایہ سے دیا پھر اسے کسی کو ہبہ کیا یا فروخت کر دیا، کیونکہ عقد اجارہ کا تعلق منفعت سے ہے (نہ کہ عین اور چیز سے) لہٰذا اس چیز کی ملکیت بیع یا ہبہ کی وجہ سے خریدار یا موہوب لہٗ کی طرف منتقل ہوگی، نہ کہ منفعت، کیونکہ بائع یا واہب (فروخت کرنے والا یا ہبہ کرنے والا) خود بوقت عقد منفعت کا مالک نہیں تھا، اور وہ چیز اجارہ کی مدت کے اختتام تک مستاجر کے قبضہ میں رہے گی۔ البتہ خریدار کو اجارہ کا علم نہ تھا، یا اجارہ کی مدت کا علم نہ تھا تو اسے خیار حاصل ہوگا۔ (وہ بیع فسخ کر سکتا ہے)

(ب) موجر یا مستاجر میں سے کسی ایک یا دونوں کے انتقال سے اجارہ فسخ نہ ہوگا، بلکہ اختتامِ مدت تک باقی رہے گا، اور تحصیل منفعت میں مستاجر کے وارث اس کے قائم مقام ہوں گے۔

(ج) معقود علیہ (یعنی جس پر عقد ہوا ہے) کے علاوہ میں کسی خلل یا عذر کے طاری ہونے سے اجارہ فسخ نہ ہوگا، مثلاً اپنی کار کرایہ سے دیا اور خود ہی اس کا ڈرائیور بھی ہے، اب مالک بیمار ہو جائے اور کرایہ دار کے ساتھ نہ نکل سکے تو اجارہ فسخ نہ ہوگا، کیونکہ کسی اور ڈرائیور کو روانہ کر کے بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے اسی طرح کسی نے گاڑی کرایہ سے لی اور مستاجر (کرایہ دار) بیماری کی وجہ سے سفر میں نہ جا سکے، یا مکان رہائش کیلئے کرایہ پر لے، پھر سفر کی ضرورت پیش آئے تو اجارہ فسخ نہ ہوگا، کیونکہ معقود علیہ (مکان یا گاڑی) میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا، اور کرایہ دار کسی اور ذریعے یہ منفعت حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) مقررہ منفعت کی تحصیل: عقد اجارہ میں جس عمل کی قید لگائی گئی ہو، اس کے اتمام پر یا جس مدت کی قید ہو، اس کے گذرنے کے ساتھ عقد اجارہ اپنے اختتام وانتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد کرایہ دار اس چیز کو استعمال کرے تو اس مزید استعمال کی اجرت مثل واجب ہوگی، اور یہ اس چیز کا ضامن ہوگا، کیونکہ بغیر عقد کے اس کا استعمال تعدی ہے۔

کھیتی کسی خاص کاشت کے لئے کرایہ سے لے، اور مدت کے اختتام تک اس کے کاٹنے کا وقت نہ ہو، تو اسے اکھاڑنے پر مجبور نہیں

کیا جائے گا، کیونکہ کرایہ دار کا نقصان ہے، بلکہ مزید مدت کی اجرت مثل واجب ہوگی، البتہ زمین کا ضامن نہ ہوگا، کیونکہ یہ تعدی میں داخل نہیں ہے۔

عقد اجارہ کے خیارات

۱) خیار مجلس اور خیارِ شرط: عقد اجارہ میں خیار مجلس اور خیار شرط حاصل نہ ہوگا، کیونکہ یہ ایک طرح کا عقد غرر ہے، جسے لوگوں کی عام ضرورت کے پیش نظر جائز قرار دیا گیا، اور خیار بھی ایک قسم کے غرر ہے، لہٰذا یہ حاصل نہ ہوگا، کیونکہ کثیر غرر کی صورت میں عقد صحیح نہیں ہوتا۔

۲) خیارِ عیب: اجارۂ عین میں خیار عیب حاصل ہوگا، لہٰذا کرایہ کی چیز میں ایسا عیب پیدا ہو، جس سے منفعت پر واضح اثر پڑتا ہو، اور بے عیب اور پیدا شدہ عیب کے درمیان کرایہ کا تفاوت ہوتا ہو، جیسے کاشت کے لئے کھیت کرایہ سے لے پھر اس کا پانی ختم ہوجائے، یا سفر کے لئے ایرکنڈیشن سواری کرایہ سے لے، پھر اس کا ایرکنڈیشن سسٹم بگڑ جائے اور مالک اس عیب کو فوراً درست نہ کرے، تو کرایہ دار کو اجارہ کے باقی رکھنے کا یا فسخ کرنے کا اختیار ہے، اگر کچھ وقت گذرنے سے قبل ہی فسخ کرے تو اس پر کچھ لازم نہیں، اور اتنا وقت گذر چکا ہو کہ اس کے عوض عموماً کرایہ ہوتا ہے، تو مقررہ کرایہ میں سے اس تناسب سے ادا کرے۔

اجارہ ذمہ میں خیار عیب حاصل نہیں ہوتا، موجر متعینہ اوصاف کے مطابق چیز پیش کرے، پھر وہ عیب دار ہوجائے تو موجر پر لازم ہے کہ اس کا بدل پیش کرے، کیونکہ اس کے ذمہ عیب سے صحیح سالم پیش کرنا طے پایا تھا، اب اس میں عیب ہے تو دوسرا پیش کرے، لیکن عقد اجارہ فسخ نہ ہوگا۔

واپسی یا تلف کے دعویٰ میں موجر اور مستاجر کا اختلاف

(ا) تلف کا دعویٰ: اگر کرایہ کی چیز کرایہ دار کے ہاتھوں تلف ہوجائے یا عیب دار ہوجائے، اور یہ دعویٰ کرے کہ اس سے تعدی نہیں ہوئی، بلکہ ناگہانی آفت اور اس کے ارادے کے بغیر قہری سبب سے یہ پیش آیا، یا عادتاً جس استعمال کی اجازت ہوتی ہے اس استعمال سے یہ نقصان پیش آیا، اور موجر کا دعویٰ ہو کہ کرایہ دار کی تعدی اور تساہل ولاپرواہی کی وجہ سے یہ پیش آیا ہے، تو مستاجر (کرایہ دار) کی بات کو اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کیا جائیگا، کیونکہ موجر تعدی کا دعویٰ کر رہا ہے اور مستاجر اس کا انکار کر رہا ہے، اور اصل عدم تعدی اور ضمان سے بری الذمہ ہونا ہے، لہٰذا اصل کے مدعی کی بات مع قسم کے تسلیم کرلیں گے۔

(ب) واپسی کا دعویٰ: اگر کرایہ دار چیز مالک کو واپس کرنے کا دعویٰ کرے، اور موجر (مالک) اس کا انکار کرے، تو موجر کی بات اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کرلیں گے، کیونکہ کرایہ دار اپنے نفع کے لئے چیز پر قبضہ کر چکا تھا، اور اصل نہ لوٹانا ہے، اور مستاجر لوٹانے کا دعویٰ کر رہا ہے، پس موجر کا قول مع قسم قبول کریں گے، کیونکہ وہ واپسی کا انکار کر رہا ہے اور وہی اصل ہے۔

متفرقات

قبر کے پاس قرآن کی تلاوت کے لئے، یا قبر کے علاوہ کہیں اور لیکن اس کے ساتھ میت کے لئے یا مستاجر کے لئے تلاوت کے بعد تلاوت کے مثل ثواب یا مغفرت وغیرہ کی دعا کے لئے (چاہے کوئی جگہ یا وقت معین کرے یا نہ کرے) یا مستاجر کے روبرو تلاوت کے لئے

یا مستاجر کا خیال دل میں رکھے ہوئے تلاوت کے لئے کسی کو اجرت پر متعین کرنا جائز ہے، کسی اور ذکر اور اس کے بعد دعاء کے لئے بھی اجارہ جائز ہے۔(نهاية المحتاج مع الحواشی ۵/۲۹۳ ۔ بغية المسترشدين ص ۱۶۶ ۔ حاشية الجمل ۳/۵۴۱ ۔ فتح المعين مع الترشيح ۲۵۳)

جُعَالَة

جُعالہ عربی زبان میں اجرت اور مزدوری کو کہتے ہیں، اور شرعاً: کسی معین عمل کو جو معلوم ہو یا مجہول کسی معین یا مجہول شخص کے ذریعہ انجام دینے کی صورت میں معلوم عوض کو اپنے اوپر واجب اور لازم قرار دینے کو کہتے ہیں۔ جُعالہ کے ارکان کی تفصیل سے اس تعریف کا مطلب واضح ہو جائے گا۔

جُعالہ مشروع اور جائز ہے، اور اس کی ایک دلیل صحیحین کی وہ حدیث ہے، جس میں وارد ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے ایک سفر میں ایک قبیلے کے سردار کے بچھو کے زہر کو بکریوں کی ایک تعداد کی شرط پر اتارا، اور اتارنے کے بعد شرط کے مطابق ان بکریوں پر قبضہ کیا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تفصیل پیش کی تو آپ ﷺ نے اس کی تصویب فرمائی۔

آیت : قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ (یوسف ۷۲) **ترجمہ :** ”انہوں نے کہا کہ ہم کو بادشاہی پیمانہ نہیں ملتا، اور جو شخص اس کو حاضر کرے، اس کو ایک بار شتر (اونٹ کا بوجھ) غلہ (بطور انعام کے خزانہ سے) ملے گا۔ اور میں اس کے دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔“ یہ سابقہ شریعت کا حکم ہے، اور درج بالا حدیث سے ہماری شریعت کا بھی یہی حکم باقی معلوم ہوا۔

حکمت : حاجت کی وجہ سے اسے مشروع کیا گیا، کیونکہ کبھی کوئی چیز گم ہو جاتی ہے اور اس کی تحقیق و تلاش اور جستجو کر کے مفت میں لوٹانے والا کوئی مل نہیں پاتا، اور خود بھی اس عمل سے عاجز ہوگا، جہالت کی وجہ سے اجارہ بھی صحیح نہ ہوگا، لہٰذا اس کی تحصیل کے لئے متعین عوض کے التزام و اعلان کا سہارا لے گا، لہٰذا اسی حاجت کے رفع کرنے اور مصلحت کے حصول کے لئے اسے مشروع کیا گیا۔

ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) عمل (۴) عوض (جُعْل)

۱) **عاقدین :** یعنی جاعل اور عامل = جاعل سے مراد وہ شخص ہے جو عوض کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے، اس کا مکلف یعنی عاقل و بالغ اور رشید ہونا شرط ہے۔

اور عامل یعنی عمل اور کام کر کے عوض کا مستحق بننے والا، عامل کا معین ہونا شرط نہیں، مثلاً یوں کہے: جو بھی میری گاڑی یا گھڑی وغیرہ واپس لا کر دے اسے اتنی رقم دوں گا۔

۲) **صیغہ :** یعنی وہ الفاظ جو عوض کے بالمقابل مطلوبہ عمل کی اجازت پر دلالت کرے، مثلاً جاعل کہے: میری سائیکل جو بھی لا کر دے اسے ۱۰۰/روپیہ دوں گا، یا معالج (ڈاکٹر) سے کہے: اگر میرے مریض کا علاج کر کے وہ شفایاب ہو جائے تو تمہیں ہزار ۱۰۰۰ روپئے، یا معلم سے کہے: میرے بچہ کو قرأت و کتابت سکھا دو تو تمہیں اتنی اتنی رقم دوں گا وغیرہ......

عامل کی جانب سے قبول کرنا شرط نہیں، خواہ عامل معین ہو، کیونکہ جُعالہ عامل کے ابہام اور جہالت (نامعلوم وغیرہ متعین ہونے) کے باوجود جائز ہے، پس اس کا عمل کرنا کافی ہے۔

۳) **عمل :** یعنی عوض کے استحقاق کے لئے جاعل اور صاحب مال جو بھی شرط لگائے، مثلاً گمشدہ چیز کا لوٹانا، بچہ کی تعلیم، مریض کا علاج وغیرہ۔

عمل معلوم ہونا شرط نہیں، مجہول ہو تب بھی جعالہ صحیح ہے، یعنی خاص فعل یا مدت کے ساتھ مقید نہ ہو تب بھی صحیح ہے، کبھی تو اس گمشدہ چیز کے لوٹانے یا بچہ کی تعلیم میں زیادہ وقت اور محنت درکار ہوگی اور کبھی کم، حاجت کی وجہ سے اس جہالت کے باوجود اس کی چھوٹ دی گئی۔

۴) **عوض :** یعنی وہ معاوضہ جو جاعل عامل کے لئے اپنے ذمہ مقرر کرتا ہے، عوض معلوم ہونا شرط ہے، کیونکہ یہ ایک عقدِ معاوضہ ہے۔ لہٰذا مجہول عوض کے بالمقابل جائز نہیں، اگر مجہول عوض کی شرط ہو تو عقد فاسد ہوگا، اور عامل نے انجام دیا تو اجرت مثل کا مستحق ہوگا، اگر مجہول عوض کی شرط ہو تو عقد فاسد ہوگا، اور عامل نے عمل انجام دیا تو اجرت مثل کا مستحق ہوگا، کیونکہ ہر وہ عقد جس کے صحیح ہونے پر معین و مقرر عوض واجب ہوتا ہے۔ اس کے فاسد ہونے پر اجرت مثل واجب ہوتی ہے۔

احکام

۱- **جعالہ ایک جائز عقد ہے** یعنی لازم نہیں ہے، بلکہ جاعل جب چاہے فسخ کرسکتا ہے، جیسا کہ عامل جب چاہے اپنے عمل سے رجوع کرسکتا ہے، فریقِ ثانی متفق اور راضی ہو یا نہ ہو، اسے اس کا علم ہو یا نہ ہو۔

اگر عامل نے فسخ کیا تو اسے کچھ نہ ملے گا، خواہ کچھ عمل انجام دے چکا ہو، کیونکہ وہ عمل مکمل ہونے کے بعد ہی عوض کا مستحق ہوتا ہے، اور اس نے مکمل کیا نہیں، لہٰذا اس کا حق ساقط ہوگیا۔

اور اگر جاعل (صاحب مال) نے فسخ کیا ہے: اور عمل کی ابتداء سے قبل ہی فسخ کیا ہے، تو اس پر کچھ لازم نہیں، اور اگر عمل شروع کرنے کے بعد فسخ کیا ہے تو عمل کی اجرت مثل لازم ہوگی۔

۲- **صاحبِ مال اور جاعل کی اجازت کے بغیر** جُعل (عوض) کا مستحق نہ ہوگا، مثلاً جاعل یہ اعلان کرے جو میری فلاں گمشدہ شئے لادے اسے سو ۱۰۰ روپے دونگا، کوئی شخص جاعل کے اعلان کے بغیر ہی کام کرے تو کسی جُعل کا مستحق نہ ہوگا، جیسا کہ کسی کو کوئی گمشدہ شئے مل جائے اور وہ مالک کو لوٹا دے تو کسی معاوضہ کا مستحق نہیں ہوگا، یہ کسی کے بچہ کو جاعل کی اجازت کے بغیر پڑھا دے تو یہی حکم ہے۔

اگر عمل کی اجازت تو دے، لیکن کسی جعل کی شرط نہ لگائے، تو راجح یہ ہے کہ وہ کسی عوض کا مستحق نہ ہوگا، کسی معین شخص کو عمل کی اجازت دے، اور دوسرا شخص اسے انجام دے تو اسے کچھ نہ ملے گا۔

۳) **عامل عمل سے فارغ ہونے کے بعد** ہی جُعل کا مستحق ہوگا: اگر جُعل مریض کی شفا پر ہے تو اس کے شفایاب ہونے کے بعد، قرأت وکتابت کی مہارت پر ہے تو مہارت حاصل ہونے کے بعد، گمشدہ کے لوٹانے پر ہے تو اسے لوٹانے کے بعد ہی جُعل کا مستحق ہوگا (صرف علاج کیا ابھی شفا نہیں ہوئی تو کسی جُعل کا مستحق نہیں......وغیرہ......)

عمل میں ایک سے زائد افراد شریک ہوں تو جُعل میں سب برابر شریک رہیں گے، خواہ ان کے عمل میں تفاوت ہو، کیونکہ اس کا ضبط اور اسکے مطابق تقسیم متعذر و مشکل ہے۔

۴) **عمل سے فراغت سے قبل جُعل میں کمی بیشی جائز ہے :** کسی سے کہا: فلاں کام کرو تمہیں

دس روپے دوں گا، پھر کہا: وہ کام کرو تو بیس روپے دونگا یا پانچ روپے دوں گا، تو عمل سے فراغت کے بعد آخری بات یعنی بیس یا پانچ لازم ہیں، جبکہ عمل شروع کرنے سے قبل ہی جُعل کی مقدار تبدیل کر چکا ہو، اور عامل معین ہونے کی صورت میں اسے اطلاع بھی مل چکی ہو، اور غیر معین ہونے کی صورت میں اس کا اعلان کر چکا ہو۔

عمل شروع کرنے کے بعد یہ تبدیلی ہو، تو عامل اجرت مثل کا مستحق ہوگا، کیونکہ دوسرا اعلان پہلے کو فسخ کر دے گا، اور دورانِ عمل فسخ کا تقاضا یہ ہے کہ اجرت مثل کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسی طرح تبدیلی تو عمل کے ابتداء سے قبل ہو، لیکن عامل معین اس سے ناواقف ہو، یا جاعل نے اس کا اعلان نہ کیا ہو، تو عامل اجرتِ مثل کا مستحق ہوگا۔

۵) عامل اورجاعل کا اختلاف: اگر دونوں کا جُعل کی شرط میں اختلاف ہو، عامل کہے کہ تم نے اس عمل پر جُعل کی شرط لگائی تھی، اور صاحبِ مال اس کا انکار کرے، تو صاحبِ مال کی بات مع قسم کے تسلیم کی جائے گی۔ اسی طرح دونوں کا عمل کے متعلق اختلاف ہو، مثلاً جاعل کہے کہ میں نے گمشدہ گاڑی کے لوٹانے پر جُعل کا اعلان کیا تھا، اور عامل کہے کہ تم نے گمشدہ گھڑی پر یہ اعلان کیا تھا، یا عمل انجام دینے والے کے متعلق اختلاف ہو! مثلاً زید دعویٰ کرے کہ میں نے انجام دیا، اور جاعل کہے بلکہ انور نے انجام دیا، تو ان دونوں صورتوں میں جاعل (صاحبِ مال) کی مع قسم تصدیق کی جائے گی۔

اگر جُعل کی مقدار یا صفت یا جنس کے متعلق اختلاف ہو، مثلاً عامل کہے: آپ نے ہزار (۱۰۰۰) روپے کا وعدہ کیا تھا، اور صاحبِ مال کہے بلکہ میں نے تو پانچ سو روپے کا وعدہ کیا تھا، یا عامل کہے کہ آپ نے دس دینار کا وعدہ کیا تھا، اور صاحبِ مال کہے میں نے تو دس درہم کا وعدہ کیا تھا، تو دونوں بھی اپنے دعویٰ کے اثبات اور فریقِ ثانی کے دعوی کی نفی پر قسم لیں، پھر دونوں کی بات ساقط اور کالعدم ہو جائیگی، اور عامل اجرتِ مثل کا مستحق ہوگا۔ یہی حکم عمل میں دونوں کے اختلاف کا ہے۔ مثلاً عامل کہے: تم نے تنہا اس عمل پر یہ عوض مقرر کیا تھا، اور جاعل کہے: بلکہ میں نے تو اس کے ساتھ فلاں عمل سمیت یہ عوض مقرر کیا تھا۔

جُعالہ اور اجارہ کا فرق

۱- جُعالہ مجہول عمل پر بھی جائز ہے، جبکہ اجارہ صرف معلوم عمل پر جائز ہے۔
۲- جُعالہ غیر معین عامل کے ساتھ بھی صحیح ہے، اور اجارہ مجہول (غیر معین) کے ساتھ صحیح نہیں۔
۳- اجارہ میں عمل کرنے والے اجیر کا قبول کرنا لازم ہے، جبکہ جعالہ میں عامل کا قبول کرنا لازم نہیں۔
۴- جعالہ میں عمل سے فارغ ہونے کے بعد ہی جُعل (عوض) کا مستحق ہوگا، اگر تعجیل (فراغت سے قبل ہی عوض) کی شرط لگائے تو عقد فاسد ہوگا، اور اجارہ میں اجرت کے تعجیل کی شرط جائز ہے۔
۵- جعالہ عقدِ جائز ہے (لازم نہیں)، جبکہ اجارہ عقدِ لازم ہے، طرفین میں سے کوئی ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر اسے فسخ نہیں کرسکتا۔

متفرقات

جائز جھاڑ (افسوں، تعویذ) پر جعالہ جائز ہے۔ اگر حج وعمرہ اور زیارت پر عقد جعالہ ہو، اور عامل بعض ادا کرے تو اجرتِ مسمّی سے مثل کے تناسب سے تقسیم کر کے دیا جائے گا۔ عامل کو جاعل کی جانب سے عوض کے اعلان کا علم نہ ہو تو وہ جُعل کا مستحق نہ ہوگا۔ مثلاً کسی نے

کہا: زید نے گمشدہ چیز لوٹائی تو اسے اتنی رقم دوں گا، پھر وہ لوٹائے لیکن اسے اس اعلان کا علم نہ تھا، یا یہ کہا: جو بھی گمشدہ چیز لوٹا دے، اسے اتنی رقم ملے گی، پھر وہ شخص لوٹائے جسے اس جعل کا علم نہیں تھا، تو کسی عوض کا مستحق نہ ہوگا۔

عامل میں فی الجملہ اس عمل کی قدرت اور اہلیت ہونی چاہئے، لہٰذا غلام، بچہ، پاگل (جن میں کچھ تمیز وشعور ہو) یا جس پر مالی تصرف کی پابندی ہو، وہ بھی عمل کرے تو صحیح ہے۔

عمل میں کچھ کلفت ومشقت ہونا شرط ہے، لہٰذا جس میں کلفت نہ ہو، وہ جُعل کا مستحق نہ ہوگا۔

کوئی ظلماً مقید ہو، اور اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کر کے اس کی رہائی کے لئے کوشش اور گفتگو کرنے والے کے لئے جعل مقرر کرے تو یہ جائز ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۶۳۴)

اذکار ودعوات پر جُعل لینا جائز ہے۔ (ترشیح ص ۲۵۶)

اِحْیَاءُ الْمَوَاتِ

(افتادہ و بنجر زمین کی آباد کاری)

احادیث: (۱) ''جو زمین کسی کی نہیں، جو بھی اسے آباد کرے، تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے'' (بخاری شریف)

(۲) ''جو کسی مردہ (غیر آباد) زمین کو زندہ کرے (آباد کرے اور کام میں لائے)، تو اسے اس میں ثواب ملے گا، اور جو بھی روزی کی تلاش کرنے والا (انسان، جانور یا پرندہ) اس (کی پیداوار) میں سے کھائے، وہ اس کے حق میں صدقہ ہے'' (رواہ النسائی وغیرہ و صححہ ابن حبان)

امام زرکشی نے فرمایا: زمین یا تو کسی کی ملکیت میں ہوگی، یا کسی عام یا خاص حقوق کے لئے محبوس ہوگی، یا اس کے علاوہ ہوگی، اور یہی موات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے، پھر شارع کو اسکا مالک بنایا، پھر شارع نے اسے اپنی مسلمان امت کے سپرد کیا۔

مذکورہ دوسری حدیث کی وجہ سے احیاء موات سنت ہے۔

مَوَات (اُفتادہ وبنجر اور غیر آباد زمین): جس زمین کی اسلام میں کسی مسلمان یا ذمی کی طرف سے آباد کاری یقینی نہ ہو، اور جو کسی آباد جگہ کے حقوق میں داخل نہ ہو (حریم نہ ہو، اردگرد کی ضرورت کی جگہ نہ ہو) اور نہ مسلمانوں کے حقوق میں داخل ہو، اس زمین کو مَوات کہا جاتا ہے۔ اگر موات مسلم وطن میں ہو، تو کسی مسلمان کے احیاء (اسے آباد کرنے) کی صورت میں وہ اس کا مالک بن جائے گا گرچہ غیر مکلف ہی کیوں نہ ہو، بشرطیکہ ممیز ہو، امام (حاکم) کی اجازت ہو، یا نہ ہو (احیاء کرنے والا مالک بن جائے گا)۔

ایک کافر کو اسلامی علاقہ میں احیاء کا حق حاصل نہیں، خواہ امام اسے اجازت دے، کیونکہ یہ غلبہ اور تسلط کے مثل ہے، جو اسے ہمارے علاقے میں ممنوع ہے۔

ایک ذمی اور مستأمن کو ہمارے علاقہ میں ایندھن، گھاس پھوس جمع کرنے اور شکار کی اجازت ہے۔

اگر کفار نے مسلمانوں سے اپنے علاقے کے دفاع میں صلح کر لی ہو، تو وہاں مسلمان احیاء کر کے مالک نہیں بن سکتا، البتہ ایک کافر اس طرح مالک بنے گا، اگر وہ دفاع نہ کریں، یا مصالحت نہ ہو (بلکہ دار الحرب ہو تو دفاع کے باوجود) احیاء کی وجہ سے مسلمان مالک ہوگا۔

جس زمین کا ایک مرتبہ احیاء ہو چکا ہو، خواہ فی الحال ویران وبنجر پڑی ہو، وہ اس کے مالک کی ہے، مالک مسلمان ہو یا کافر، اگر

مالک کا علم نہ ہو، اور اسلامی دور میں آبادکاری ہوئی ہو، تو اس کا حکم ضائع مال کا ہے، یعنی وہ بیت المال اور امام کے حوالہ ہے، اگر مالک کا پتہ لگنے کا امکان ہو، تو امام اس کی حفاظت کرے، یا فروخت کر کے قیمت محفوظ کر لے یا بیت المال کی طرف سے بطور قرض دے، اگر مالک کے ظہور کی کوئی امید نہ ہو، تو وہ بیت المال کی ملکیت ہے، امام کو بطور جاگیر کسی کی ملکیت میں دینے کا یا عارضی طور پر انتفاع کے لئے کسی کے سپرد کرنے کا اختیار ہے، دوسری صورت میں وہ شخص صرف مقررہ مدت تک ہی انتفاع کر سکتا ہے۔

اگر زمین جاہلیت میں (یعنی اسلامی دور سے قبل) آباد کردہ تھی، تو احیاء کی وجہ سے ملکیت حاصل ہوگی۔

حریم: کسی آباد جگہ کے اردگرد کی وہ جگہ، جو اس آباد جگہ سے مکمل انتفاع کے لئے ضروری ہو، اس کا حریم کہلاتا ہے۔ کسی جگہ کا حریم بھی تبعاً اس جگہ کے مالک کی ملکیت ہے، اس لئے کوئی دوسرا شخص اس کا احیاء کر کے مالک نہیں بن سکتا، (چونکہ اس جگہ کسی دوسرے کو تصرف حرام ہے، اس لئے اسے حریم کہا جاتا ہے)

بستی کا حریم: کسی جگہ نئی بستی آباد کریں، تو وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر گفتگو وغیرہ کے لئے بیٹھتے ہوں، گھوڑ دوڑ کا میدان، کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ، قرب وجوار کی مستقل چراگاہ اور بچوں کے کھیل کود کا میدان، اس بستی کا حریم کہلائے گا۔

گھر کا حریم: کسی موات میں مکان تعمیر کرے، تو گذرگاہ اور راستہ، دیوار کے اطراف کا میدان، کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ وغیرہ اس کا حریم شمار ہوگا۔ درمیانی گلی اور تنگ راستے کسی خاص مکان کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ سڑک کی طرح مشترک ہوگا۔

کوئی مکان چاروں طرف سے مکانات سے گھرا ہوا ہو، (مثلاً سبھی نے بیک وقت موات میں اسطرح مکان تعمیر کیا)، تو اس مکان کا خصوصی حریم نہ ہوگا، گرچہ تمام کا مشترک حریم ہوگا۔

تصرف کا حق: ہر مالک اپنی ملکیت میں عادت (وعرف) کے مطابق تصرف کر سکتا ہے، خواہ اس سے پڑوسی کو ضرر ہو، یا اسکا مال تلف ہو، مثلاً کسی نے اپنی جگہ پانی کا کنواں کھودا، جس سے پڑوسی کی دیوار کو نقصان پہنچا، یا بیت الخلاء بنایا جس سے پڑوسی کے کنویں کے پانی میں تغیر پیدا ہوا، یا اپنی ملکیت میں چراغ جلایا جس کے دھویں سے پڑوسی کی دیوار آلودہ ہوئی وغیرہ۔

اگر عادت سے تجاوز کر جائے، تو اس کی وجہ سے جو نقصان ہوگا، اس کا ضامن ہوگا۔ مثلاً اپنی ملکیت میں پانی روک کے رکھا، جس کی وجہ سے تری پڑوسی کے دیوار تک پہنچی۔ اگر کوئی پانی کا گھڑا کھودے یا درخت لگائے تو جائز ہے، آئندہ پانی کی تری یا درخت کی جڑیں دوسروں کی ملکیت میں داخل ہوں، تو اس ضرر کا ازالہ ضروری ہوگا۔

کوئی شخص اپنی جگہ اصطبل چکی یا لوہار کی دوکان بنا سکتا ہے، جبکہ متعلقہ مقصد کے مطابق دیواروں کو مضبوط و پختہ بنائے، کیونکہ اس سے دوسرے کی ملکیت کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ خواہ بدبو وغیرہ کی وجہ سے مالک کو تکلیف پہنچے۔

کسی شخص نے اپنی جگہ موری کھودی، جس سے پڑوسی کے کنویں کا پانی بگڑ گیا، یا کنواں کھودا، جس سے اس کے کنویں کا پانی گھٹ گیا، تو یہ ضامن نہ ہوگا، جبکہ عادت کے برعکس کنواں زیادہ کشادہ نہ ہو، یا دیوار سے بالکل قریب نہ بنائے۔ اسی طرح اگر زمین نرم ہو کہ مَن کے بغیر منہدم ہوئی ہو، اور وہ مَن نہ باندھے تو ضامن ہوگا اور خلاف عادت تصرف سے روکا جائے گا۔

احیاء کی صورتیں

موات کے کسی زمین کو قبضہ میں لے کر آباد کرنا ہو تو جس مقصد کے لئے قبضہ کر رہا ہے، اس اعتبار سے احیاء کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مکان: مکان کی غرض سے کسی موات کا احیاء کرنا ہو، تو اس جگہ (علاقہ کی) عادت کے مطابق کچی یا پکی اینٹ کی، یا مٹی، یا تختے یا بانس وغیرہ کی دیوار بنانا، دروازہ لگانا، کچھ حصے میں چھت ڈالنا، تاکہ قابلِ سکونت ہو جائے ضروری ہے۔

باڑہ: جانوروں یا پھل واناج کے لئے باڑہ بنانا ہو، تو دیوار اور دروازہ کافی ہے، چھت ضروری نہیں۔

کھیتی: احیاء کا مقصد کھیتی باڑی ہو، تو مٹی، بانس، پتھر یا کانٹوں کے ذریعے اطراف میں باڑ (باندھ) لگا دے، تاکہ احیاء شدہ حصہ دوسرے حصوں سے جدا ہو جائے، نیز وہاں کے نشیب وفراز کو ختم کر کے زمین درست کر دے، اور صرف بارش کا پانی ناکافی ہو تو پانی کا معقول انتظام کرے۔ باقاعدہ کاشتکاری کرنا ضروری نہیں، یہ احیاء میں داخل نہیں۔

باغ: باغ کے لئے احیاء کر رہا ہے، تو مٹی وغیرہ سے مناسب کمپاؤنڈ (احاطہ) یا باندھ بنائے، اور پانی کا نظم کرے، (جبکہ بارش ناکافی ہو) اور کم از کم اتنے درخت لگائے، جس پر باغ کا اطلاق ہو۔

تحجُّر (زمین روک کر رکھنا): کسی نے اپنی حیثیت کے مطابق اتنے حصے کا احیاء شروع کیا، جو اس کی کفایت سے زائد نہ ہو، یا اس جگہ پتھر لگا کر یا لکڑیاں گاڑ کر (احیاء کی) نشانی لگا دی، یا امام نے بطور جاگیر (اِقْطاع) اسے عنایت کیا، یا کافروں کے علاقے میں اس حصے پر مسلط ہو کر قبضہ جما لیا، تو وہ اس حصے کا متحجر (تحجر کرنے والا) ہے، یعنی دوسروں کو اس سے روکنے والا ہے، اور وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے، کیونکہ ابوداود کی حدیث میں ہے: "جو کسی ایسی چیز کی طرف سبقت لے جائے، جس کی طرف ابھی تک کسی مسلمان نے سبقت نہیں کی، تو وہ اس کی ہے" (یعنی اسے اس کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے، یہ مراد نہیں کہ وہ مالک بن گیا) لیکن کسی دوسرے نے ایسی جگہ کا باقاعدہ احیاء کیا، تو وہ مالک بن جائے گا، گرچہ اس طرح ظلم کرتا ہے، (کیونکہ متحجر مالک نہیں بنا تھا، لیکن اس کا حق مقدم تھا)، متحجر احیاء سے قبل اسے فروخت نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی اتنی جگہ روک رکھے، جس کا احیاء اس کے بس میں نہیں، یا اپنی کفایت سے زائد جگہ گھیر رکھے، تو یہ حرام ہے، جبکہ اس سے دوسرے کو ضرر ہو، اور دوسرا شخص اس صورت میں زائد جگہ کا احیاء کر سکتا ہے۔

کفایت سے مراد احیاء سے جو غرض ومقصد ہے، اس کی کفایت ہے۔ اگر رہائشی مکان کے لئے احیاء کر رہا ہے، تو اس کے اور اہل وعیال کی رہائش کے لئے کافی جگہ مراد ہے۔ اگر اپنی آمدنی کے لئے کئی مکانات تعمیر کرنا چاہتا ہے تو اس کے گذر بسر کے لئے درکار آمدنی کے بقدر مکانات مراد ہیں۔

عرفاً طویل مدت تک کوئی کسی زمین کو روک کر رکھے، اور بلا عذر احیاء نہ کرے، تو امام (حاکم) پر واجب ہے کہ اسے حکم دے کہ یا تو احیاء کرو ورنہ وہ جگہ چھوڑ دو، کیونکہ اس کی یہ حرکت مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے وہ احیاء کے لئے کچھ مدت مانگے، تو امام اپنی صواب دید سے مناسب اور مختصر مدت تک مہلت دے، جس میں وہ احیاء کی تیاری کر سکے، مقررہ مدت کے گذرنے تک اس نے احیاء کا سلسلہ شروع نہ کیا، تو اس کا حق باطل ہو جائے گا۔ اگر وہ کوئی عذر پیش نہ کرے، تو مہلت دینے کی ضرورت نہیں،

حِمٰی (چراہ گاہ کو محفوظ کرنا)

جزیہ، فئی، زکات اور مالک سے بھٹکے ہوئے جانوروں کو اور کمزوری کی وجہ سے جو جانوروں کو دور نہیں لے جا سکتے، ان کے جانوروں کو چرانے کے لئے امام (خلیفہ۔ حاکم) موات کی چراگاہ کو محفوظ کر کے لوگوں کو وہاں چرانے سے روک سکتا ہے، جبکہ ان کو

ضرر رساں نہ ہو، (اسی کو حمیٰ کہتے ہیں)، کیونکہ آپ ﷺ نے نقیع (مدینہ منورہ سے تقریباً ۲۰ میل دور ایک جگہ کا نام) کو مسلمانوں کے گھوڑوں کی خاطر حمیٰ بنایا تھا۔" (امام احمد و ابن حبان فی صحیحہ)

عوام اور رعایا کو، یا امام کو اپنی ذات کے لئے اس کی اجازت نہیں، کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں اس کی ممانعت وارد ہے۔

چشمے اور کنویں وغیرہ کے جاری وغیرہ منقطع پانی کو امام جزیہ وغیرہ کے جانوروں کے پینے کے لئے محفوظ نہیں کرسکتا۔ آپ ﷺ کے حمیٰ کے علاوہ، دیگر حمیٰ کو، امامِ وقت اگر مصلحت سمجھے تو منسوخ کرسکتا ہے۔

وَقْف

وقف عربی زبان میں حبس اور روکنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

جس مال کے عین (اصل چیز) کے بقاء کے ساتھ اس سے انتفاع (نفع اٹھانا) ممکن ہو، اس میں براہ راست اپنے تصرف کو ختم کرکے، اسے کسی موجود مباح مصرف کے لئے روک دینا، شرعاً وقف کہلاتا ہے۔ شرعی تعریف کے قیود کی وضاحت آئندہ سطروں میں آجائیگی۔

مشروعیت کی دلیل : قرآن وحدیث کی روشنی میں وقف ایک قربت اور محبوب عمل ہے۔

آیت: "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (آل عمران : ۹۲)

ترجمہ : ہرگز نہ حاصل کرسکو گے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ، اور جو چیز خرچ کرو گے، سو اللہ کو معلوم ہے۔"

حضرت ابوطلحہؓ نے جب یہ آیت کریمہ سنی، تو وقف کی رغبت لئے ہوئے آپ ﷺ سے مشورہ کرنے آئے۔ (جس کی تفصیل صحیحین میں موجود ہے)

۲) وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ" (آل عمران : ۱۱۵)

ترجمہ:" اور جو کچھ کریں گے وہ لوگ نیک کام، اس کی ہرگز ناقدری نہ ہوگی، اور اللہ کو خبر ہے پرہیزگاروں کی"

احادیث : ۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے:" جب انسان انتقال کرجاتا ہے، تو اس کے اعمال کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے، سوائے تین اسباب کے: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے (اوروں کو) نفع ہو، یا صالح اولاد جو اس کے حق میں دعا کرے" (مسلم)

صدقہ جاریہ کو علماء نے وقف پر محمول کیا ہے۔ صالح (نیک) سے مراد جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پابند ہو۔

۲) حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے خیبر میں ایسی زمین ملی ہے کہ میری نگاہ میں اس سے بہتر مال مجھے قطعاً نہیں ملا، آپ کا اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا:" چاہو تو اسکے اصل کو روکے رکھو، اور اس کا صدقہ کرو" (یعنی اسے وقف کردو)......

(متفق علیہ)

مشہور یہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ وقف اسلام میں پہلا وقف ہے۔

وقف صحابۂ کرام میں مشہور ومعروف تھا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: جس صحابی کو بھی کچھ حیثیت حاصل رہی، اس نے وقف سے دریغ نہیں کیا، امام شافعیؒ کا ارشاد ہے: اسی (۸۰) انصاریوں نے اپنا مال وقف کیا تھا۔

حکمت: وقف کے ذریعہ ایک انسان اپنی زندگی میں اور وفات کے بعد مستقل اپنے لئے ثواب اور نیکیوں کا سلسلہ جاری کرتا ہے، اور اس کے قبر میں مدفون ہونے کے بعد بھی اس کا ثواب اسے ملتا رہے گا، نیز اس کے ذریعہ امت کے مختلف مصالح کا تحقق ہوتا ہے، کیونکہ اوقاف کا صحیح استعمال ہو، تو مساجد اور مدارس کی تعمیر وترقی، علمی نشو ونما اور دیگر اسلامی شعائر اور مصالح کے بقا کا سبب بنتا ہے، اور فقراء ومساکین اور یتیموں اور مسافروں کی ضروریات کا تکفل ہوتا ہے۔

وقف کے ارکان

(۱) وَاقِف (۲) مَوْقُوْف (۳) مَوْقُوْف عَلَیہ (۴) صیغہ

۱) وَاقِف (وقف کرنے والا): شرعاً کسی کا وقف صحیح ہونے کے لئے درج ذیل شرائط لازم ہیں۔

(الف) اس کی عبارت (اور الفاظ) شرعاً صحیح اور معتبر ہو، یعنی وہ آزاد اور عاقل اور بالغ ہو۔ لہٰذا ایک غلام یا بچہ یا پاگل کا وقف صحیح نہیں۔ بچہ ممیز ہو، یا یہ لوگ ولی کی اجازت سے وقف کرے، یا خود ولی ان کا مال وقف کرے، تب بھی یہ وقف باطل ہوگا۔

(ب) تبرع کی اهلیت هو (یعنی بلاعوض مال صرف کرنے کا اختیار ہو)، لہٰذا جو سفاہت یا مفلسی کی وجہ سے مجور ہو، اس کا وقف صحیح نہیں، کیونکہ انہیں اپنے مال میں تصرف کی اجازت نہیں۔

(ج) اختیــار، لہٰذا مکرہ کا وقف صحیح نہیں، کیونکہ اختیار بھی مکلف ہونے کے لئے ایک شرط ہے۔ (یعنی آدمی اپنے اختیار اور مرضی سے وقف کرے، کسی نے جبراً دھمکی دے کر وقف کروایا تو یہ صحیح نہیں)

مـرض الـموت میں وقف: ترکہ میں وارثوں کے حق کی رعایت کے پیش نظر مرض الموت میں ایک مریض اپنے ایک تہائی سے زائد مال کو وقف نہیں کرسکتا، اس کی اپنی مصلحت کی خاطر ایک تہائی یا اس سے کم مال کو وقف کرسکتا ہے، تاکہ موت کے بعد بھی اسے اجر وثواب ملتا رہے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے، تو آپ ﷺ سے اپنے سارے مال کی وصیت کی اجازت چاہی، لیکن آپ ﷺ نے وارثوں کی مصلحت کے پیش نظر اس کی اجازت نہ دی، آخر میں آپ ﷺ نے ایک تہائی کے وصیت کی اجازت دی (متفق علیه)

کـافر کا وقف: کافر کا وقف صحیح ہے، خواہ مسجد کے لئے ہو، اور وہ اسے نیکی نہ سمجھے، کافر کو راہِ خیر میں صرف کرنے کا بدلہ اسی دنیا میں ملے گا، آخرت میں اس کا کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک مومن کو اس کی نیکی کا بدلہ دنیا وآخرت دونوں جگہ حاصل ہوگا، البتہ ایک کافر کو اس کی نیکی کا بدلہ دنیا میں کھلا دیا جائے گا، پھر جب آخرت میں پہنچے گا، تو اس کے پاس ثواب کے قابل کوئی نیکی نہ ہوگی۔

۲) موقوف (جو چیز وقف کی جائے) اس کے شرائط درج ذیل ہیں۔

(الف) مـوقوف معین شئی هو، صرف کسی چیز کے منافع کا وقف، خود اس چیز کے بغیر صحیح نہیں، خواہ یہ منافع مُؤَقّت (ایک محدود وقت کے لئے) ہوں، مثلاً اپنے مکان کی رہائش کو ایک سال کے لئے وقف کرنا، یا مُؤبّد (ہمیشہ کے لئے) ہو، مثلاً رہائش کو ہمیشہ کے لئے وقف کرنا۔

اگر موقوفہ شئی معین نہ ہو، تب بھی وقف صحیح نہیں ہے، اگر کسی نے بلاتعیین دومکان میں سے ایک مکان، اور دو گاڑیوں میں سے ایک گاڑی وقف کردی، تو یہ وقف صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ موقوف معین نہیں ہے۔

(ب) موقوف پر واقف کو ایسی ملکیت حاصل ہو، جسے منتقل کیا جاسکتا ہو، اور اس سے کچھ نفع یا فائدہ حاصل ہو، لہٰذا کسی کا ایسی شئی وقف کرنا، جس کا وہ مالک نہیں، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وقف میں اپنے قبضہ سے ملکیت کو منتقل کرنا ہے، جب خود ہی مالک نہیں، تو کسی دوسری طرف منتقل کیسے کرسکتا ہے؟ اسی طرح ایک آزاد شخص اپنے آپ کو وقف نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ خود اپنا مالک نہیں، بلکہ اس کی ملکیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

کسی حاملہ جانور کے صرف حمل کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ حمل جب تک اپنی ماں کے پیٹ میں ہے، اس کی ملکیت منتقل نہیں ہوسکتی، البتہ ماں کو وقف کیا جائے تو تبعاً حمل کا وقف بھی درست ہوگا۔

اسی طرح موقوف کا مفید و نافع ہونا واجب ہے، اگر ایسی زمین وقف کرے جو تعمیر یا کاشتکاری وغیرہ کسی بھی کام کی نہ ہو، یا بالکل تار تار کپڑے، جس میں کوئی نفع نہ ہو، وقف کرے، تو یہ وقف صحیح نہیں ہے۔

(ج) موقوف سے ہمیشہ انتفاع ہو، لہٰذا کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ کا وقف صحیح نہیں ہے، جن کا فائدہ ان کو ختم کرکے ہی حاصل ہوتا ہے۔

دائم اور ہمیشہ انتفاع سے مراد ابدی دوام نہیں، بلکہ نسبی دوام ہے، یعنی موقوف اتنی مدت تک باقی رہ سکے، کہ اس منفعت کے عوض اجرت حاصل ہوسکتی ہو، لہٰذا گاڑی یا جانور کا وقف صحیح ہے۔ گرچہ یہ ہمیشہ رہنے والی نہیں۔

موقوف سے فی الحال (بوقت وقف) انتفاع شرط نہیں، آئندہ انتفاع ممکن ہو، تو یہ بھی کافی ہے، پس اگر کمسن جانور کو وقف کرے تو صحیح ہے، کیونکہ آئندہ اس سے انتفاع ممکن ہے۔

(د) موقوف کی منفعت مباح اور جائز ہو، اس میں کوئی حرمت نہ ہو، لہٰذا آلات لہو (گانے بجانے کے آلات) کا وقف صحیح نہیں، کیونکہ وقف ایک قربت اور نیکی ہے، اور معصیت اس کے بالکل منافی اور برعکس ہے۔

زمین، باغ، مکان، تجارت گاہ، کنواں اور پانی کا چشمہ وغیرہ وقف کرنا جائز ہے، جبکہ یہ اشیاء فی الحال یا آئندہ قابلِ انتفاع ہوں۔

مَنقُولہ اشیاء کا وقف

منقولہ شئی یعنی جو چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی ہے، جیسے موٹر کار، جانور، ہتھیار، بستر، برتن، کتابیں وغیرہ۔

منقولہ اشیاء کا بھی وقف صحیح ہے۔

حدیث : (۱) آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ''جو اللہ کے راستے میں (جہاد کے لئے) گھوڑا روک کر رکھے (وقف کرے)، اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدہ پر بھروسہ کرتے ہوئے، تو اس کا کھانا، پینا، لید اور پیشاب بروز قیامت اس کے میزان (نیکیوں کے پلڑے) میں ہوگا۔'' (بخاری، نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا...... '' رہا خالد کا معاملہ، تو تم اس پر ظلم کررہے ہو، اس نے تو اپنی زرہیں اور ہتھیار اور آلاتِ حرب اللہ کے راستہ میں وقف کردیئے ہیں۔'' (متفق علیہ)

مُشَاعُ کا وقف

مُشاع یعنی ایسی مشترک چیز، جس کی ابھی تقسیم نہ ہوئی ہو۔

مُشاع کا وقف بھی صحیح ہے، خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، چاہے ایک شخص اپنا حصہ شائع طور پر وقف کرے، (یعنی تقسیم کر کے اپنا حصہ جدا کرنے کے بغیر)، یا ایک جماعت اپنے حصے شائع طور پر وقف کریں، شرعاً سب جائز ہے۔

حدیث :۱) حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: ''خیبر میں میرے جو سو (۱۰۰) حصے ہیں، اس سے بہتر اور پسندیدہ مال مجھے بالکل نہیں ملا میں اسے صدقہ کر دینا چاہتا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے اصل کو باقی رکھ کے پھلوں کو خیرات کر دو، (وقف کر دو) (نسائی)

۲) آپ ﷺ نے مسجد (نبوی) کی تعمیر کا حکم دیا، تو فرمایا: ''اے بنونجار، تمہارے اس باغ کی قیمت طے کرلو'' انہوں نے عرض کیا: واللہ (قسم بخدا)، ہم تو اس کی قیمت اللہ تعالیٰ ہی سے لیں گے (بخاری شریف)

خطیب شربینی، مغنی المحتاج' میں فرماتے ہیں: مساجد میں چٹائیاں اور قندیلیں وقف کرنے پر ہر دور میں امت کا اتفاق رہا ہے۔

۳) مَوقُوف عَلَیه : یعنی جس پر وقف کیا جائے، اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱) مُعیّن، ایک ہو یا اس سے زائد (۲) غیر معین، جیسے کسی جہت پر وقف کرنا، مثلاً فقراء پر

مُعیّن موقوف علیه کے شرائط : وقف کے وقت اسے مالک بنایا جا سکتا ہو، یعنی وہ حقیقتاً موجود ہو، لہٰذا کسی لاولد کا اپنے بیٹے پر وقف صحیح نہیں، اسی طرح فلاں شخص کے فقیر (غریب) اولاد پر وقف کرے، اور بوقتِ وقف ان میں کوئی بھی فقیر نہ ہو، تو یہ وقف صحیح نہیں ہے۔ جنین، میت جانور اور مکان وغیرہ وہ اشیاء جن کا بوقت وقف مالک بننے کا کوئی تصور ہی نہ ہو، ان پر وقف صحیح نہیں ہے۔

لہٰذا، قرآن مجید اور شرعی علوم کی کتابیں کسی غیر مسلم پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اسے ان کا مالک بنانا صحیح نہیں ہے۔

واقف کا براہِ راست اپنی ذات پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے، (البتہ وہ مثلاً کنواں مسلمانوں پر وقف کر دے، تو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے خود وہ بھی اس سے انتفاع کر سکتا ہے) جب معین پر وقف ہو، تو اس کا قبول کرنا شرط ہے، اور یہ قبول ایجاب سے متصل ہونا واجب ہے۔ اگر وہ قبول نہ کرے، یا رد کر دے، تو یہ وقف باطل ہوگا، لیکن اگر غیر معین پر وقف ہو، مثلاً فقراء پر، یا مسجد پر وقف ہو، تو اس کی صحت کے لئے قبول شرط نہیں ہے۔

کافر پر وقف : اگر کافر معین ذمّی ہو، تو اس پر وقف صحیح ہے۔ جبکہ اس سے کوئی گناہ مقصود نہ ہو، کیونکہ ذمی کو صدقہ دینا جائز ہے، تو اسی طرح وقف بھی جائز ہوگا۔

اگر ذمّی پر وقف کے وقت کوئی معصیت پیش نظر ہو، مثلاً کسی گرجا کے خادم پر اس کی خدمت کے پیش نظر وقف کرنا، تو یہ وقف صحیح نہیں ہے۔

ایک مُعاہَد اور مُستأمَن جب تک مسلمانوں کے علاقہ میں ہوں، وہ بھی ذمی کی طرح ہیں۔ ایک حربی کافر یا مرتد پر وقف صحیح نہیں۔

غیر معین موقوف علیه کے شرائط :

موقوف علیہ غیر معین ہو، مثلاً فقراء، مساجد، مدارس وغیرہ، تو اس کی صحت کی خاص شرط یہ ہے کہ کسی معصیت اور گناہ پر وقف نہ ہو،

ورنہ یہ گناہ پر تعاون ہوگا، اور وقف تو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، تو یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جو آپس میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

لہٰذا کفار کی عبادت گاہوں کے لئے اور اس کی خدمت اور چٹائی اور قندیل وغیرہ کے لئے یا اس کی تعمیر یا ترمیم کے لئے وقف صحیح نہیں ہے۔

فتنہ پرور افراد یا ڈاکوؤں پر ہتھیاروں کا وقف صحیح نہیں ہے۔

فقراء، علماء، قراء، مجاہدین، کعبہ، مساجد، مدارس، سرحد، شفاخانے (دواخانے، ہاسپٹل) اور میت کی تکفین وغیرہ کے لئے وقف جائز، بلکہ مستحب ہے، جس کی شریعت نے تعلیم دی ہے، اور اس پر ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

اغنیاء (مالداروں) پر وقف: شرعاً اغنیاء پر وقف صحیح ہے، کیونکہ ان پر نفلی صدقہ جائز ہے، اور ان پر وقف میں کوئی معصیت کا پہلو بھی نہیں۔

غِنیٰ اور فقر (مالداری اور غریبی) کی حد:

اگر کوئی شخص اپنا مکان وقف کرے، اور کہے: اس کی آمدنی فقراء کے لئے ہے، یا اغنیا کے لئے ہے، تو اس صورت میں فقیر اور غنی سے کون مراد ہوں گے۔

فقیر: فقیر یعنی وہ شخص جسے فقر کی وجہ سے زکاۃ دی جاسکتی ہو، لہٰذا جو زکات کے بارے میں فقیر شمار ہوگا، وہی وقف میں بھی فقیر شمار ہوگا۔

البتہ جو شخص اپنی ضروریات کے بقدر کما سکتا ہے، لیکن اس کے پاس مال نہیں ہے، وہ وقف میں فقیر شمار ہوگا (بخلاف زکات کے) (حاشیة الجمل ۳/۵۷۸)

کسی فقیرہ عورت کا شوہر اس کا نان نفقہ سنبھال رہا ہو، یا اولاد کی کفایت والد کی طرف سے ہورہی ہو، تو ان پر اس وقف سے صرف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ان کو زکات دینا جائز نہیں ہے۔

غنی: (مالدار) جس پر زکات حرام ہو، وہ غنی شمار ہوگا۔

راہِ خیر میں یا فی سبیل اللہ وقف: اگر واقف یہ کہے: میں نے یہ زمین راہِ خیر میں یا نیکی کے راستہ میں، یا ثواب کے لئے وقف کیا، تو اس کی آمدنی کے مستحق واقف کے رشتہ دار ہوں گے۔ اگر وہ نہ ہوں، تو عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے علاوہ دیگر مستحقین زکوٰۃ اس آمدنی کے مستحق ہوں گے۔

اگر فی سبیل اللہ (راہِ خدا میں) وقف کرے، تو اس آمدنی کے مستحق وہ غازی (مجاہدین) ہیں، جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں۔

اگر فی سبیل اللہ، راہِ خیر اور راہِ ثواب، تینوں کو جمع کرے، تو اس وقف کا ایک تہائی غازیوں کا، ایک تہائی واقف کے رشتہ داروں کا اور ایک تہائی عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے علاوہ دیگر مستحقین زکات کا حق ہوگا۔

مسجد کے نقش و نگار اور تزئین اور قبر کی تعمیر کے لئے وقف

فقہاء کرام نے فرمایا: مسجد کی تزئین اور نقش و نگار کے لئے، اور قبر پر تعمیر کے لئے وقف صحیح نہیں ہے، کیونکہ مُردے تو سڑگل کرمٹی

میں ملنے والے ہیں، لہٰذا اس پر تعمیر کرنا اور بلا فائدہ اس میں مال ضائع کرنا جائز نہیں ہے۔

دورِ حاضر میں عموماً مسلمان، علماء کے اس فیصلہ کے خلاف عمل کرتے ہیں، اور اکثر ان کے علماء اسے صحیح قرار دیتے ہیں، یا سکوت اختیار کرتے ہیں۔

امیروں اور غریبوں سے، وقف کی آمدنی سے، نیز لوگوں کے عطیات کی شکل میں کتنی رقمیں سمیٹی جاتی ہیں، تاکہ مسجد کو مزیّن کیا جائے، اس میں نقش و نگار کیا جائے، یا گنبد تعمیر کیا جائے، یا بڑے اور منقش محراب بنائیں جائیں، حالانکہ یہ ناپسندیدہ فضول خرچی اور اضاعتِ مال ہے، جس کے ذریعے لوگوں کو فتنہ میں ڈال کر، نماز میں ان کی توجہات کو ہٹایا جاتا ہے، کیا ان لوگوں نے اللہ کا یہ فرمان نہیں پڑھا" قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ "(المؤمنون: ۱-۲) جس میں خشوع کے ساتھ نماز پڑھنے والے مومنوں کے لئے فلاح اور کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ جب نمازی کے چاروں طرف ایسے نقش و نگار ہوں، جو اس کے دل و دماغ کو اپنی جانب مائل کرے، تو خشوع کہاں سے حاصل ہوگا؟

اسی طرح قبروں کی تعمیر، اس کی پختگی اور اس پر قبے وغیرہ کی تعمیر میں مال صرف کرنا بھی بالکل فضول خرچی اور اسراف میں داخل ہے، ان تعمیرات سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ محل ہیں، نہ کہ قبریں، گویا کہ اصحابِ قبور ان تعمیرات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

۴) **صیغہ**: یعنی وہ الفاظ جو مقصود پر دلالت کرے، یا ان الفاظ کے قائم مقام ہو، جیسے گونگے کا مناسب اشارہ یا تحریر۔ وقف کی صحت کے لئے صیغہ ضروری ہے۔

صیغہ کے اقسام:

(الف) صریح: جس میں صرف مقصود مفہوم کا ہی احتمال ہو، مثلاً میں نے اپنا گھر فقراء پر وقف کر دیا، صریح لفظ کی ادائیگی سے ہی وقف صحیح اور منعقد ہوگا، اس کے ساتھ نیت کا ہونا لازم نہیں۔

(ب) کِنایہ: جس میں مقصود مفہوم کے علاوہ دیگر مفہوم کا احتمال بھی ہو، مثلاً میرا مال فقراء پر صدقہ ہے، یا ان کی خاطر حرام کر دیا، یا ہمیشہ کے لئے ان پر صرف کر دیا، وغیرہ۔ گفتگو پر قادر شخص کی تحریر بھی کنایہ کے حکم میں ہے۔

کنایہ صیغہ کی ادائیگی کے ساتھ وقف کی نیت بھی ہو، تو وقف صحیح ہوگا۔

وقف کے صیغہ کے شرائط: (۱) ایسے الفاظ ہوں جو مقصود پر دلالت کریں یا پھر اسی طرح گونگے کا اشارہ

(۲) صیغہ میں توقیت نہ ہو (متعین مدت کے لئے نہ ہو)، مثلاً یوں کہا: میں نے میری زمین ایک سال کے لئے طلبہ پر وقف کی، تو یہ وقف باطل ہے، کیونکہ صیغہ میں توقیت ہے، حالانکہ وقت کا تقاضہ دوام ہے۔

لیکن مسجد، قبرستان اور رباط وغیرہ وہ امور جو غلام کی آزادی کے مشابہ ہوں، اس شرط سے مستثنیٰ ہیں، یہ امور توقیت کے باوجود صحیح ہیں، البتہ شرط لغو قرار پائے گی، اور ہمیشہ کے لئے وقف ہو جائے گا۔ پس اگر کسی نے کہا: میں نے یہ زمین ایک سال کے لئے بطورِ مسجد وقف کر دی، یا بطور قبرستان، یا رباط، تو وقف صحیح ہوگا، ایک سال کی قید فضول سمجھی جائے گی، اور ہمیشہ کے لئے وقف ہو جائے گا۔

۳) وقف کے مصرف کا تذکرہ: اگر کوئی کہے کہ میں نے فلاں چیز وقف کر دی، لیکن مصرف بیان نہ کرے، تو وقف منعقد نہ ہوگا، کیونکہ وقف کی جہت معلوم نہیں۔

۴) مُعلق نہ ہو، کیونکہ وقف ایسا عقد ہے، جو فی الحال ملکیت کا تقاضہ کرتا ہے، لہٰذا اسے کسی شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔

پس اگر کوئی کہے: جب زید آ جائے تو میرا گھر فقراء پر وقف ہے، یا میری بیوی راضی ہو تو میری کاران پر وقف ہے، تو یہ وقف باطل ہے۔ البتہ اس شرط میں بھی حسب سابق مسجد جیسے امور کا وقف مستثنیٰ ہے، لہٰذا اگر کوئی کہے کہ جب ماہِ رمضان آ جائے تو میں نے اپنا مکان بطور مسجد وقف کر دیا، تو یہ وقف صحیح ہے۔

(اسی طرح موت پر بھی معلق کرنا صحیح ہے، جس کی تفصیل وقف کے بعض مسائل کے ذیل میں آ رہی ہے)

۵) اِلزام (لازم قرار دینا)، لہٰذا وقف میں خیارِ شرط یا خیارِ مجلس کی گنجائش نہیں، اگر کہے: میں نے اپنا جانور فقراء پر وقف کیا، اور مجھے تین دن اختیار رہے گا، یا مجھے اختیار ہے کہ جب چاہوں فروخت کر دوں، تو یہ وقف باطل ہے۔

وقف سے خود واقف کا انتفاع

چونکہ وقف میں موقوف چیز اپنی ملکیت سے خارج کی جاتی ہے، اس لئے خود واقف کو اس سے انتفاع ممنوع ہے، **البتہ** اگر کوئی شخص اپنی ملکیت بطورِ مسجد، یا قبرستان یا کنواں وقف کر دے، تو اسے بھی ایک عام مسلمان کی حیثیت سے اس موقوف سے انتفاع جائز ہے لہٰذا واقف کو اس مسجد میں نماز پڑھنا، کنویں سے پانی لینا اور اس قبرستان میں دفن ہونا جائز ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: ''کون ہے، جو رومہ کنواں خرید لے، اور اپنا ڈول بھی مسلمانوں کے ڈول کی طرح رکھے، اور اس کے مقابلہ میں جنت میں خیر حاصل کرلے'' (ترمذی بسند حسن ،نسائی ، وللبخاری تعلیقاً)

بئر رُومہ (رومہ کنواں) مدینہ منورہ میں شیرین پانی کا کنواں تھا، جو ایک یہودی کی ملکیت تھا، اور وہ مسلمانوں کے ہاتھ اس کا پانی ایک درہم میں ایک مشک فروخت کیا کرتا، لہٰذا آپ ﷺ کی اس ترغیب پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خالص اپنے مال سے اسے خرید کر مسلمانوں پر وقف کر دیا کہ وہ خود بھی دیگر مسلمانوں کی طرح اس کا پانی استعمال کریں گے۔

وقف کا لزوم اور اس پر مرتب احکام

وقف ایک لازم عقد ہے، یعنی صحیح طریقہ پر اس کے انعقاد کی صورت میں اس کے آثار مرتب ہوں گے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱) صحیح طور پر وقف کرے، تو اب واقف کو خیارِ مجلس یا خیارِ شرط حاصل نہیں۔

۲) موقوف کی ملکیت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف منتقل ہوگی، پس اب واقف کو فروخت، ہبہ وغیرہ کسی تصرف کا حق نہ ہوگا۔

۳) جس جہت پر وقف کیا ہے، انتفاع کا حق اس طرف منتقل ہوگا، خواہ جہت عام ہو یا خاص۔

موقوف کی ملکیت: واقف زمین، کار، ہتھیار وغیرہ کوئی چیز وقف کر دے تو اس موقوف کی اصل ملکیت اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہوئی، اب نہ واقف کو ملکیت حاصل ہے اور نہ موقوف علیہ کو۔

موقوف کے فوائد و منافع: اگر موقوف علیہ معین ہو، تو موقوف کے منافع موقوف علیہ کی ملکیت ہے، اسے بذاتِ خود یا کسی دوسرے کے ذریعہ (مثلاً کسی کو عاریۃً یا کرایہ پر دے کر) اس کی تحصیل جائز ہے۔

اسی طرح وقف کے بعد اس سے جو فوائد حاصل ہوں، مثلاً موقوفہ درختوں کے پھل، جانوروں کا اون، دودھ اور اولاد وغیرہ کا بھی وہ مالک ہوگا۔

اگر موقوف علیہ غیر معین ہو، مثلاً فقراء یا علماء وغیرہ، تو وہ منافع کے مالک نہ ہونگے، بلکہ انہیں صرف انتفاع کا حق حاصل ہوگا۔

موقوف میں تصرف : براہ راست موقوف چیز میں خرید وفروخت، ہبہ وغیرہ تصرفات جائز نہیں، نہ واقف کی جانب سے اور نہ موقوف علیہ کی جانب سے، خواہ موقوف علیہ معین ہو، یا غیر معین، بلکہ وہ ہمیشہ اللہ کی ملکیت پر باقی رہے گا، اور اس کے منافع موقوف علیہ پر صرف ہوں گے، اور ممکنہ حد تک واقف کی صراحت پر عمل کریں گے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے وقف کے متعلق صراحت فرمائی تھی۔ :''نہ فروخت کیا جائے، نہ ہبہ کیا جائے اور نہ اس میں وراثت چلے گی'' (صحیحین)

موقوف کے مصارف : اگر موقوف پر کچھ صرف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہو، مثلاً جانوروں کا چارہ، عمارت کی مرمت اور آلات کی اصلاح، تو یہ مصارف واقف کی شرط کے مطابق اس کے مال یا وقف کے مال سے ادا کئے جائیں گے، اگر اس نے کوئی شرط نہ لگائی ہو، اور وقف سے آمدنی حاصل ہوتی ہو، تو اس سے ادا کریں گے، اگر کوئی آمدنی نہ ہو، یا منافع معطل ہوں، تو یہ مصارف مسلمانوں کے بیت المال سے ادا ہوں گے۔

موقوف کی ہلاکت وبربادی : اگر موقوف شئی ہلاک وتلف ہو جائے، تو درج ذیل احکام متعلق ہوں گے۔

۱) اگر موقوف غیر مأکول جانور ہو، (یعنی جس کا گوشت حرام ہے)، اور وہ مر جائے، تو اس کی کھال موقوف علیہ کے ساتھ مختص ہوگی، اسے دباغت دی جائے تو دوبارہ اس پر وقف شمار ہوگا، لہٰذا اس سے انتفاع کرسکتا ہے، لیکن فروخت کرنا جائز نہیں، تاکہ حتی الامکان واقف کے مقصد کی تعمیل ہو۔

۲) اگر موقوف مأکول جانور ہو، (یعنی جس کا گوشت حلال ہے)، اور موقوف علیہ کو کسی سبب سے یہ یقین ہو کہ یہ مر جائیگا، تو اسے ذبح کرنا مجبوراً جائز ہے، پھر اس کا گوشت فروخت کر کے اس قیمت سے اسی جنس کا دوسرا جانور خرید کر اس کی جگہ وقف قرار دے۔

۳) اگر کوئی موقوف شئی تلف کردے، اور اس پر قیمت کا ضمان عائد ہوتا ہو، مثلاً کسی نے تعدی اور ظلم کے طور پر تلف کردیا، تو موقوف علیہ اس تلف شدہ شئی کی قیمت (ضمان) کا مالک نہ ہوگا، بلکہ اس قیمت سے اسی کے مثل دوسری چیز خریدی جائے، جو اس کی جگہ وقف شمار ہوگا، تاکہ واقف کے مقصد کے مطابق ثواب کا سلسلہ جاری رہے، اگر اس کے مثل چیز اس قیمت میں دستیاب نہ ہو، تو اس کا بعض خرید لے، اگر وہ بھی ممکن نہ ہو، لیکن آئندہ توقع ہو، تو محفوظ رکھے، ورنہ وہ موقوف علیہ کا ہے، اگر وہ موجود نہ ہو، تو واقف کے سب سے قریبی رشتہ دار کا حق ہے، اس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو، تو فقراء ومساکین کا حق ہے (جمل ۳/۵۹۰)

اگر موقوف خود بخود تلف ہو جائے، یا بغیر ضمان کے تلف ہو، تو اس کے تلف کے ساتھ ہی وقف کی انتہا ہوگئی۔

۴) ضمان کے سبب کے بغیر موقوفہ شئی کی منفعت ختم ہو جائے، مثلاً درخت وقف کیا تھا، اب وہ خشک ہوگیا یا سیلاب یا ہوا کی وجہ سے اکھڑ گیا اور دوبارہ لگایا نہیں جاسکتا، تو اس صورت میں وقف منقطع نہ ہوگا، بلکہ ایک لکڑے کی حیثیت سے بطور وقف اس سے کرایہ وغیرہ کے ذریعہ انتفاع کیا جائے گا، تاکہ اسی چیز کو بطور وقف باقی رکھا جائے، اسے فروخت کرنا یا ہبہ کرنا، جائز نہیں ہے، اگر جلانے وغیرہ کے ذریعہ (جس سے وہ ختم ہو جائے) ہی انتفاع ممکن ہو، تو موقوف علیہ اسی طرح انتفاع کرے، لیکن فروخت کرنا یا ہبہ کرنا جائز نہیں ہے۔

۵) اگر موقوف شئی مسجد کی چٹائی وغیرہ ہو، جو بالکل بوسیدہ ہو چکی ہو، یا لکڑا ہو، جو بوسیدہ ہو چکا ہو، اور جلانے کے علاوہ کسی اور کام کا نہ ہو، تو اسے فروخت کرنا جائز ہے، تاکہ وہ ضائع نہ ہو، اور بلا فائدہ کے جگہ اس سے گھری نہ رہے، اس کی کچھ نہ کچھ قیمت حاصل کرنا، جو وقف کے کام آئے، اس کی بربادی سے بہتر ہے، اس صورت میں یہ قیمت مصالح مسجد پر صرف کی جائے اگر تلف شدہ کے مثل خریدنا ممکن

ہو، تو اسے ہی مقدم رکھے۔
اگر جلانے کے علاوہ کسی اور مقصد میں کام آسکتا ہے، تو اسے فروخت کرنا جائز نہیں، تاکہ واقف کی غرض کے مطابق وہی چیز مستعمل ہو، مسجد کے لئے ہبہ شدہ یا بغیر وقف کے خریدی ہوئی چٹائی ہو، تو بوقتِ حاجت فروخت کرسکتے ہیں (فتح الوھاب ۱/۲۵۹)
۶) اگر کوئی مسجد منہدم ہوجائے، اور اس کا اعادہ دشوار ہو، تو اسے فروخت کرنا جائز نہیں، ممکن ہے کسی نہ کسی وقت وہ پھر تعمیر ہو، اگر اس مسجد کی کوئی آمدنی ہو، جو اس کے مصالح پر صرف ہوتی ہو، اور آئندہ پھر اس کی تعمیر کی توقع ہو، تو اس آمدنی کو محفوظ رکھا جائے، اگر پھر تعمیر کی توقع نہ ہو، تو یہ آمدنی اس کے قریب ترین دوسری مسجد پر صرف کرنا جائز ہے۔
۷) کسی مسجد کے متعلق خطرہ ہو، تو حاکم اسے توڑ کر ان پتھروں سے دوسری مسجد بنا سکتا ہے۔ لیکن ان پتھروں وغیرہ کو دیگر کسی تعمیر میں استعمال نہ کرے، تاکہ واقف کے مقصد کی رعایت ہو اس مسجد سے قریب تر دوسری مسجد بنانا بہتر ہے۔

موقوف علیہ کی موت

۱) اگر موقوف علیہ کی موت ہو، اور واقف نے پہلے ہی اس موقوف علیہ کی موت کی صورت میں دوسرے مصرف کی تعیین کی ہو، تو وقف اس کی طرف منتقل ہوگا، مثلاً واقف نے کہا: میں نے یہ مکان یا کار میرے بیٹے پر وقف کیا، پھر فقراء پر، (تو اس صورت میں بیٹے کی موت کے بعد یہ وقف فقراء کی طرف منتقل ہوگا)
اگر دوسرے مصرف کی تعیین نہ کرے، تو یہ وقف وقف ہی رہے گا، اور اول موقوف علیہ کے انتقال کے وقت جو رحم کے اعتبار سے واقف کا قریبی رشتہ دار ہوگا، اس پر صرف ہوگا (جبکہ وہ فقیر ہو) لہٰذا، نواسہ، چچازاد بھائی پر مقدم ہوگا (کیونکہ وراثت کی ترتیب کا اعتبار نہ ہوگا) (مغنی ۲/۳۸۴)
۲) اگر دو افراد پر وقف کرے، پھر فقراء پر، مثلاً کہے: میں نے اپنی زمین زید اور عمر پر وقف کی، بعد میں فقراء پر، پھر زید کا انتقال ہو، تو اس کے حصہ کا وقف بھی عمر کو ملے گا، (عمر کے بھی انتقال کے بعد فقراء کو ملے گا)
۳) اگر دو (۲) شخصوں پر جدا کر کے وقف کرے، مثلاً: میں نے دونوں میں سے ہر ایک پر اس گھر کا نصف حصہ وقف کیا، پھر فقراء پر، تو یہ دو وقف ہیں، لہٰذا ایک کے انتقال کی صورت میں وہ حصہ دوسرے کی طرف منتقل نہ ہوگا، بلکہ فقراء کی طرف منتقل ہوگا۔

ابتداء اور دوام کے اعتبار سے وقف کا حکم

۱) اگر وقف کسی موجود پر ہو، لیکن وہ منقطع الآخر ہو، (یعنی آئندہ اس موقوف علیہ کا سلسلہ ختم ہوتا ہو)، مثلاً: میں نے یہ کتب خانہ میری اولاد پر وقف کیا، یا زید پر، پھر اس کی نسل پر وقف کیا، اور اس کے آگے کچھ نہ کہے، تو یہ وقف صحیح ہے، کیونکہ وقف کا مقصد قربت (نیکی) اور دوام (ہمیشگی) ہے، پس جب اس نے ابتدائی مصرف کی وضاحت کردی، تو آئندہ راہِ خیر میں اس کا دوام آسان ہے، لہٰذا مذکورہ موقوف علیہ کا سلسلہ ختم ہوجائے، تو وہ شئی وقف ہی رہے گی، اور اس وقت واقف کا سب سے قریبی جو رشتہ دار موجود ہو، اس پر صرف کیا جائیگا، کیونکہ رشتہ داروں پر صدقہ افضل نیکیوں میں سے ہے، اس لئے کہ یہ بیک وقت صدقہ اور صلہ رحمی دونوں ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے "مسکین پر صدقہ صدقہ ہے اور ذورحم (رشتہ دار) پر دو چیزیں ہیں: صدقہ اور صلۂ رحمی" (ترمذی بسند حسن، نسائی، ابن ماجہ)

اس صورت میں یہ وقف قرابتِ رحم کے فقراء کے ساتھ مخصوص ہے، نہ کہ قرابت وراثت کے، پس نواسہ چچازاد بھائی پر مقدم ہوگا (حالانکہ وراثت میں اس کے برعکس ہوگا) اگر قرابت میں کوئی فقیر نہ ہو، تو مصالح مسلمین پر یا فقراء ومساکین پر صرف ہوگا۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۸۰)

۲) اگر وقف منقطع الاول ہو، (یعنی پہلے جس پر وقف کررہا ہے، وہ وقف کے وقت موجود نہ ہو) مثلاً واقف کہے: یہ مکان آئندہ مجھے پیدا ہونے والے بچوں پر وقف ہے، پھر فقراء پر، تو یہ وقف باطل ہے۔

۳) اگر وقف منقطع الوسط ہو، (یعنی درمیان میں موقوف علیہ نہ ہو)، مثلاً واقف کہے یہ دوکان خالد کے اولاد پر وقف ہے، پھر ایک شخص پر (جس کی کوئی صراحت نہیں) پھر فقراء پر تو یہ وقف صحیح ہے، کیونکہ فی الحال اور آخر میں مصرف موجود ہے، اور خالد کی اولاد کے بعد یہ فقراء پر صرف ہوگا۔

موقوف کا ناظم (والی، منتظم، ناظر)

اگر واقف خود کسی کو ناظم مقرر کردے، تو وہی اس کا مستحق ہے، واقف خود اپنے لئے انتظام ونگرانی کی شرط لگائے، تو یہ اس کا حق ہے، اگر کسی دوسرے کیلئے شرط لگائے، ایک ہو یا زائد، تو اس کی پابندی کی جائے گی، خواہ اپنی زندگی میں ہی یہ ذمہ داری سونپے، یا وصیت کرجائے، اگر واقف کہے، پہلے فلاں ناظم ہوگا، اس کی موت کے بعد فلاں، تو یہ جائز ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بذاتِ خود اپنے وقف کے ناظر تھے، پھر اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد تاحیات کیا، پھر ان کے خاندان کے صاحبِ بصیرت افراد کے سپرد کیا (ابوداود)

اگر واقف ناظر کے متعلق کوئی شرط نہ لگائے، تو اس صورت میں انتظام اور نگرانی کا حق قاضی (حاکم) کو حاصل ہوگا، کیونکہ اسے عام ولایت حاصل ہے پس وقف کی نگرانی کے لئے بھی وہی بہتر ہے۔

وقف کے ناظر کے شرائط

۱) عادل اور دیندار ہو

۲) کفایت، یعنی متعلقہ ذمہ داری کو بہتر طریقہ پر انجام دینے کی قابلیت وصلاحیت موجود ہو۔

اگر کسی ناظم میں ان میں سے کوئی شرط مفقود ہوجائے تو حاکم اسے ہٹا کر خود ناظم بنے، یا کسی دوسرے مناسب شخص کو ناظم بنائے، اگر کسی ناظم کا خلل دور ہو، اور دوبارہ نظامت کے شرائط اس میں پائے جائیں، اور واقف نے اسے ناظم بنانے کی صراحت اور شرط رکھی ہو، تو دوبارہ اسے ناظم بنایا جائیگا۔

وقف کے ناظم کو چونکہ دوسروں کی مصلحت کی تدبیر کرنا ہے، لہٰذا یہ یتیم کے والی کے مثل ہوا، اس لئے اسے مصلحت کے تقاضوں اور احتیاط کو پیشِ نظر رکھ کر تصرف کرنا ضروری ہے۔

ناظر کی ذمہ داری

۱) وقف کی تعمیر، کرایہ پر دینا، آمدنی وصول کرنا، مستحقین پر اسے تقسیم کرنا، اصل چیز اور آمدنی کو بہ احتیاط محفوظ رکھنا۔ یہ اس وقت ہے جبکہ تمام ذمہ داری اس کے سپرد ہو، یا مطلق ناظم بنایا جائے، اگر صرف بعض امور میں ناظم ہو، تو صرف ان امور کو انجام دے۔

۲) واقف نے دو کو ناظم بنانے کی شرط لگائی ہو، تو ایک تنہا تصرف نہیں کرسکتا، البتہ ایک کے تصرف کی صراحت کردے تو تنہا تصرف جائز ہے۔

ناظم کا معاوضہ (اجرت)

اگر واقف آمدنی میں سے ناظر کے حق میں کسی حصہ کی شرط لگائے، تو یہ جائز ہے، اور ناظر وہ مقررہ حصہ لے سکتا ہے، اگر ناظر کے لئے کسی اجرت کا تذکرہ نہ کرے، تو اسے اجرت نہیں ملے گی۔

اگر ناظر معاملہ کو حاکم کے روبرو پیش کر کے اجرت متعین کرنے کا مطالبہ کرے، تو حاکم اس کی محنت اور عمل کے مناسب اجرت مقرر کرسکتا ہے، جبکہ کوئی مناسب ناظر بلا معاوضہ ذمہ داری نہ سنبھالے، ناظر خود وقف کے مال سے کچھ لے نہیں سکتا، اگر لے تو ضامن ہوگا، اگر حاکم نہ ہو تو کسی دین دار عالم کو ذمہ دار بنالے جو اس کی اجرت مقرر کرے (الشروانی علی التحفہ ۸/۲۶۴)

ناظر اور موقوف علیہ کا اختلاف

اگر ناظر آمدنی و فوائد کو مستحقین پر صرف کرنے کا دعویٰ کرے، اور وہ انکار کریں، پس اگر وہ معین ہوں، تو ان کی بات تسلیم کی جائیگی، اور وہ ناظر سے حساب کا مطالبہ کرسکتے ہیں، اور اگر مستحقین (موقوف علیہ) غیر معین ہوں، تو حاکم کو حساب کے مطالبہ کا اختیار ہے، اور صرف شدہ مقدار کے متعلق بصورتِ احتمال ناظر کی تصدیق کرے گا، اور اگر اسے متہم سمجھے تو اسے قسم دلائے گا۔

ناظر کو معزول کرنا

اگر ناظر نااہل ہو جائے تو معزول ہوگا، اسی طرح واقف اسے معزول کردے، تو وہ معزول ہو جائے گا، اس صورت میں واقف کسی دوسرے کو ناظر مقرر کرسکتا ہے، کیونکہ ناظر کی حیثیت وکیل کی ہے، اور موکل وکیل کو کسی بھی وقت ہٹا سکتا ہے، لیکن واقف نے بوقتِ وقف کسی کے ناظر ہونے کی شرط لگائی ہو، تو اسے ہٹانا جائز نہیں، گرچہ اس میں مصلحت ہو، کیونکہ عقدِ وقف کے وقت کے شرائط کی خلاف ورزی جائز نہیں، جیسا کہ اپنے غریب اولاد پر وقف کرے، تو بعد میں اسے مالداروں کے حق میں نہیں کرسکتا۔

وقف کے بعض مسائل

۱) اگر واقف کہے: میں نے یہ مکان میری اولاد اور اولاد کے اولاد پر وقف کیا، تو یہ تمام لوگ وقف کے مستحق ہوں گے، اور وقف کے منافع ان کے درمیان مساوی (و برابر) تقسیم کئے جائیں گے، اس میں مذکر و مؤنث یا اولاد اور اولاد کے اولاد میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

۲) اگر واقف نے کہا: میں نے یہ مکان میری اولاد پر وقف کیا، تو اولاد کی اولاد اس وقف میں داخل نہیں ہونگی، لیکن اگر واقف کی اولاد نہ ہو، اور اولاد کی اولاد ہو تو پھر وہ اس لفظ میں داخل ہوں گے اور وقف کے مستحق ہوں گے، کیونکہ قرینہ موجود ہے، نیز ایک مکلف کا کلام لغو نہ قرار پائے۔

۳) اگر کہے: یہ باغ میری ذرّیت، یا نسل پر وقف ہے، تو اس میں بیٹیوں کی اولاد، اور قریب اور بعید اولاد کی اولاد، مذکر و مؤنث سب داخل ہوں گے کیونکہ لفظ ان کو شامل ہے۔

۴) اگر کہے میرا مال فقراء قرابت (رشتہ دار) پر وقف کیا، تو واقف کے نسب سے جڑنے والے تمام افراد جو فقراء ہوں، اس میں داخل ہیں، خواہ قریب ہوں یا بعید، مذکر ہوں یا مؤنث، وارث ہوں یا غیر وارث، مَحرم ہو یا غیر مَحرم

۵) کئی عطف شدہ الفاظ سے قبل یا بعد کوئی صفت ہو، تو تمام میں اس کا اعتبار کیا جائے گا، مثلاً واقف نے کہا: میں نے یہ زمین میرے محتاج اولاد، پوتے اور بھائیوں پر وقف کی، تو ان تمام میں حاجت کی صفت ضروری ہے، یا کہا: میں نے یہ مکان میری اولاد، پوتے اور بھائی جو فقیر ہوں، ان پر وقف کیا، تو ان تمام میں فقر کی صفت شرط ہے۔

۶) رشتہ دار، اولاد، پوتے وغیرہ پر وقف کو وقف ذُرّی، یا وقفِ اہلی کا کہا جاتا ہے اور مصالح اور جہت، مثلاً مساجد، مدارس اور علماء و فقراء وغیرہ پر وقف کو 'وقف خیری' کہا جاتا ہے۔

۷) اگر کوئی کہے: میں نے زمین کا یہ حصہ مسجد بنادیا، تو اتنا کہنے سے وہ مسجد ہوجائیگا، گرچہ وقف کی صراحت نہ کرے، اگر کہے: میں نے یہ نماز کیلئے وقف کیا، تو یہ صریح وقف ہے، لیکن بطور مسجد وقف ہونے میں کنایہ ہے، لہٰذا نیت کی ضرورت ہے، اگر ایک مکان تعمیر کرکے اس میں نماز کی اجازت دے تو وہ مسجد نہ ہوگی، خواہ اس میں نماز ہو اور اسے مسجد کرنے کی نیت ہو، البتہ موات (عام زمین جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو) میں صرف نیت کافی ہے (لفظ کی ضرورت نہیں) (مغنی المحتاج ۲/۳۸۳)

۸) قبرستان میں درخت اگے، تو اس کے پھل قبرستان کی طرح لوگوں کے لئے مباح ہیں، لیکن اسے قبرستان کی مصلحت پر صرف کرنا بہتر ہے۔ مسجد میں مسجد کی خاطر جو درخت لگائے جائیں، اس کے پھل بلاعوض جائز نہیں، بلکہ اس کا عوض مسجد کی مصلحتوں میں صرف کیا جائے، اگر عام استعمال کیلئے درخت لگائے، یا نیت معلوم نہ ہو اور عادت عام استعمال کی جاری ہو، تو پھولوں کو بلاعوض استعمال کرسکتے ہیں۔ اگر مناسب سمجھے تو امام (حاکم۔ذمہ دار) مسجد سے درخت کاٹ سکتا ہے، بلکہ کسی قطعۂ زمین کو مسجد بنایا جائے، اور اس میں درخت ہوں، تو امام انہیں کاٹ سکتا ہے، خواہ واقف نے انہیں وقف میں داخل کیا ہو۔

وقف، موقوف علیہ کے پاس بطور امانت ہے، پس اگر کسی دوسرے مقصد میں استعمال کرے، تو ضامن ہوگا (مغنی ۲/۳۹۶)

۹) موقوفہ کتاب پر ایک طالب علم کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، جن صورتوں میں ودیعت کا ضامن ہوگا، یہاں بھی ضامن ہوگا، اگر بلا تقصیر تلف ہونے کا دعویٰ کرے، تو ودیعت کی تفصیل کے مطابق اس کی قسم کے ساتھ اس دعویٰ کی تصدیق کی جائیگی۔ کسی مصلحت کی وجہ سے ناظر اس کتاب کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے مثلاً اس سے زیادہ ضرورت مند کو دینا وغیرہ (بغیہ ص ۱۷۵)

۱۰) وقف کو کرایہ پر دینے میں مدت وغیرہ کے اعتبار سے مصلحت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، ورنہ وقف ختم ہوکر سامنے والا اس کا مالک بن بیٹھے گا۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۷۳)

۱۱) اگر مسجد یا مسافر خانہ وغیرہ ویران ہوجائے، تو اس پر وقف کی آمدنی کو اسی کے مثل پر صرف کرے۔ مسجد کی آمدنی کسی دوسری مسجد پر، مسافر خانہ کی مسافر خانہ پر...... اس سے قریب تر پر صرف کرنا بہتر ہے۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۸۰)

۱۲) مسجد یا مصالحِ مسجد پر وقف میں سے مؤذن، امام اور روشنی کا نظم وغیرہ پر صرف کیا جائیگا، لیکن تعمیرِ مسجد پر وقف میں سے ان امور پر صرف کرنا جائز نہیں۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۸۴)

۱۳) ناظر کو واجب ہے کہ جو بہتر اور واقف کے اغراض سے اقرب شکل ہو، اس پر عمل کرے، گرچہ اس کی صراحت نہ ہو، جب کہ اس کے شرائط کے خلاف نہ ہو۔ لہٰذا اگر کسی مدرسہ میں مدرس (استاد) مقرر کرنا ہو، اور اس کی اہلیت رکھنے والے کئی علماء ہوں، جن کے رتبہ سے یہ واقف ہے، تو ان میں جو افضل اور زیادہ صاحب علم ہو، اس کا تقرر لازم ہے، لیکن افضل کے متعلق تحقیق کرنا ضروری نہیں۔

کسی استاد کو اس سے افضل عالم موجود ہونے کی وجہ سے معزول کرنا جائز نہیں (ص ۱۸۸)

۱۴) مالک اپنا غصب شدہ مال وقف کرسکتا ہے، گرچہ غاصب کے قبضہ سے اسے چھڑانے پر قادر نہ ہو (فتح المعین)
۱۵) عمارت کے صرف اوپری حصے کو وقف کرے، نچلے حصہ کو نہ کرے، خواہ بطور مسجد وقف کرے، یہ صحیح ہے۔ (اعانہ)
۱۶) مسجد کی طرح عمارت بنا کر اس میں نماز کے قیام کی اجازت دے، تو یہ اس کی ملکیت سے نہ نکلے گا (وقف شمار نہ ہوگا)، جیسا کہ کسی جگہ کو قبرستان کے مثل بنا کر اس میں دفن کی اجازت دینے سے وہ ملکیت سے نہ نکلے گا۔ (اعانہ ۳/۱۶۱)
۱۷) وقف کو موت پر معلق کرنا صحیح ہے، مثلاً کوئی کہے: میں نے اپنا مکان میری موت کے بعد فقراء پر وقف کیا، یا جب میں مر جاؤں تو میرا مکان فلاں مصرف پر وقف ہے، یا وقف کر چکا، تو یہ وقف صحیح ہے۔ اوران مسائل میں اس کا حکم وصیت کی طرح ہے: ایک تہائی میں اس کا اعتبار ہوگا موت سے قبل رجوع کرسکتا ہے، اور وارث کے حق میں نہیں کیا جاسکتا۔
انتقال کے بعد وقف کا حکم ہوگا، یعنی ہمیشہ وقف رہے گا، اسے فروخت کرنا یا ہبہ کرنا جائز نہیں، نیز اس میں وراثت نہ چلے گی۔ (اعانۃ ۳/۱۶۲)
۱۸) اگر فقراء علماء یا مجاہدین پر وقف کرے، پھر واقف خود فقیر یا عالم یا مجاہد ہو جائے یا وقف کے وقت ہی اس صفت پر تھا، تو اسے بھی وقف سے انتفاع جائز ہے۔ (اعانۃ ۳/۱۶۴)
۱۹) اگر وقف کے مستحقین کا علم نہ ہو، تو اسے واقف کے قریبی رشتہ داروں پر صرف کریں گے، جو کہ فقراء ہوں (اعانہ)
۲۰) واقف کی شرط مجمل ہو، واضح نہ ہو، تو اس کے زمانے کے عام عرف پر عمل کیا جائے گا، اگر ایسا عرف نہ ہو، تو واقف حضرات کے مقاصد سے قریب تر امر پر محمول کیا جائے گا۔ (فتح المعین)
۲۱) موقوفہ قبرستان کے آثار بالکل مٹ جائیں، تو اسے کاشتکاری کیلئے کرایہ پر دے کر آمدنی اس کی مصلحت پر صرف کرنا جائز نہیں، مملوکہ قبرستان اصل مالک کا ہی رہے گا، وہ جیسا چاہے تصرف کرسکتا ہے جبکہ مالک معلوم ہو، مالک کا پتہ نہ ہو، یا قبرستان مملوکہ تھا یا موقوفہ اس کا علم نہ ہو، تو وہ مال ضائع کے حکم میں ہے، لہٰذا امام اس میں مصلحت کے مطابق تصرف کرے۔ (اعانہ ۳/۱۸۳)
۲۲) کسی ذمہ داری مثلاً امامت یا تدریس کی انجام دہی پر وقف ہو، اور متعلقہ ذمہ دار کسی عذر (مثلاً مرض) کی وجہ سے ناغہ کرے اور دوسرے کو اس غیر حاضری کی مدت میں نائب رکھے، تو مکمل مدت کے وقف کا مستحق ہوگا، اگر کسی کو نائب نہ رکھے، یا بلا عذر ناغہ کرے (گرچہ نائب رکھے) تو غیر حاضری کی مدت کا مستحق نہ ہوگا۔ (اعانہ۔ ۳/۱۷۵)

مسجد کے بعض احکام

کسی نے اپنا سامان مسجد میں رکھا تو اس پر اس کا کرایہ لازم ہے، جو مسجد کے مصالح پر صرف ہوگا۔ جو پہلے پہنچ کر مسجد کی کسی جگہ میں قرآن، حدیث یا کوئی شرعی علم سکھانے یا سیکھنے کے لئے بیٹھے پھر اٹھ کر جائے، تاکہ پھر لوٹے، اور اس کی جدائی اتنی طویل نہ ہو، کہ اس جگہ سے اس کی اُنسیت و تعلق ختم ہو جائے، تو اسکا حق باقی ہے۔ لیکن اس کی غیر موجودگی میں دوسرے کے لئے وہاں بیٹھنا جائز ہے، تاکہ فی الحال اس جگہ کی منفعت معطل نہ ہو۔

حدیث: ''جو اپنی مجلس سے اٹھے، پھر لوٹ کر آئے، تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے۔'' (مسلم)

جو نماز کیلئے مسجد میں کسی جگہ بیٹھے، یا ذکر یا تلاوت کے لئے، پھر کسی عذر (مثلاً قضاء حاجت) سے اٹھ کر جائے، تو اس نماز میں اس کا

حق باقی ہے، خواہ بچہ ہو اور پہلی صف میں ہو، اور اپنی چادر (یا رومال) وغیرہ وہاں رکھ کر نہ گیا ہو، لہٰذا کسی دوسرے کو جو اس مسئلہ سے واقف ہو، وہاں بیٹھنا حرام ہے۔ اگر اس کی اجازت ہو، یا یہ گمان ہو کہ وہ راضی ہے (اسے بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں) تو حرج نہیں، اسی طرح صرف اس کی غیر موجودگی میں بیٹھے اور اس کے آنے پر اٹھ جائے تو اس میں حرج نہیں، اگر اس کے آنے سے قبل جماعت کھڑی ہو جائے تو صف کی تکمیل کے لئے اس جگہ کو پُر کریں گے، اور وہ اس جگہ کوئی چادر وغیرہ رکھ کر گیا ہو، تو اپنے پیر سے اسے سرکائے، لیکن زمین سے اٹھائے نہیں، تاکہ اس کے ضمان میں داخل نہ ہو۔ اگر کوئی مدت کی تعیین کے بغیر اعتکاف کے لئے بیٹھے، تو اس کے مسجد سے نکلنے سے اس کا حق ختم ہوگا، خواہ حاجت کے لئے نکلے، اگر مدت متعین ہو، تو دورانِ مدت حاجت کے لئے نکلنے سے حق ختم نہ ہوگا۔

امام قفال رحمۃ اللہ علیہ نے بچوں کو مسجد میں تعلیم دینے سے منع فرمایا ہے۔ بچے اگر پوری طرح باشعور ہوں اور استاد مسجد کے نامناسب حرکات سے ان کو روکے تو حرج نہیں۔ جو خرید و فروخت یا کسی حرفت کے لئے مسجد میں بیٹھے، تو اسے منع کرنا مستحب ہے، کیونکہ یہ مسجد کے احترام کے خلاف اور مکروہ ہے، مسجد کی چٹائی وغیرہ کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنا ممنوع ہے۔ اگر کوئی مسجد کو لکڑی وغیرہ ہبہ کرے، اور ناظر قبول کرے تو یہ ہبہ صحیح ہے، اگر وہ قبول نہ کرے تو صحیح نہیں۔ اگر ناظر مسجد کے لئے لکڑے خریدے، یا کوئی ہبہ کرے اور ناظر قبول کرے تو اسے مصلحت کی وجہ سے فروخت کرنا جائز ہے، مثلاً چوری کا خدشہ ہو، لیکن موقوف ہو تو مسجد کے لئے محفوظ رکھنا واجب ہے۔

مسجد میں حرفت و معاملہ میں اس کی تحقیر و تذلیل ہو رہی ہو تو یہ حرام ہے، اور اس سے روکنا واجب ہے، اسی طرح اس کی وجہ سے اگر لوگوں کو تنگی ہو رہی ہو، تو یہ حرام ہے۔ جو شخص علماء یا قراء کے حلقہ کے درمیان سے گذرے، اسے ان حضرات کے احترام میں روکنا مستحب ہے۔

کوئی شخص رمضان یا جمعہ وغیرہ میں قرآن شریف لے کر مسجد میں تلاوت کے لئے بیٹھے، پھر وضو ٹوٹنے کی وجہ سے وضو کرنے کے لئے جائے تو اس وقت اس کا حق ختم نہ ہوگا، خواہ اس نے اپنی کوئی چیز وہاں نہ رکھی ہو، البتہ اس وقت تلاوت مکمل کر کے اٹھ جائے، تو پھر آئندہ آنے کے بعد اس کا حق باقی نہ رہے گا۔

دن میں مسجد میں روشنی کرنا حرام ہے، کیونکہ اس میں اسراف (فضول خرچی) اور عیسائیوں کی مشابہت ہے۔ رات میں اگر کسی (نمازی وغیرہ) کو ضرورت پیش آنے کی توقع ہو تو روشنی رکھنا جائز ہے، ورنہ اسراف کی وجہ سے حرام ہے۔

کسی کے لئے اس کے آنے سے قبل جائے نماز بچھا کر رکھنے کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا دوسرا شخص زمین سے اٹھائے بغیر اپنے پیروں سے سرکا سکتا ہے۔ (بعضوں نے اس طرح بچھانے کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ دیگر لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہے، نیز خود بھی صرف بچھا کر چلا جائے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا) (حاشیۃ الجمل ۳/۵۷۰۔ اعانہ ۳/۱۷۶)

ایک مسلمان کو کسی کنیسہ (گرجا چرچ وغیرہ) میں ان لوگوں کی اجازت کے بغیر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ (جمل ۳/۵۷۲)

ہبہ (ھدیہ)

شرعاً ہبہ ایسے عقد کو کہیں گے جس کی رو سے اپنی زندگی میں کسی کو بلا عوض تطوعاً (اپنی مرضی و اختیار سے بلا وجوب شرعی کے) کسی چیز کا مالک بنایا جائے۔

(ہبہ کرنے والے کو واہب، جس کو ہبہ کیا جائے اسے "مَوْهُوْب لَہٗ" اور جو شئے ہبہ کی جائے اسے "موہوب" کہا جاتا ہے)

ہبہ میں موہوب لہٗ موہوب چیز کا مالک بن جائے گا، اور بدلہ میں اسے کچھ لوٹانا واجب نہیں ہے، بخلاف بیع کے کہ وہ تملیک (مالک بنانا) بالعوض ہے۔ ہبہ میں تملیک زندگی میں ہوگی، بخلاف وصیت کے کہ اس کا تعلق بعد الموت سے ہے۔ زکات میں بھی تملیک بلا عوض ہے، لیکن وہ واجب ہے، بخلاف ہبہ کے، کہ اس میں تملیک بلاعوض ہے، لیکن وہ واجب ہے، بخلاف ہبہ کے کہ اس میں تملیک بلاعوض اپنی مرضی اور خوشی سے ہے۔

مذکورہ تعریف کے اعتبار سے اس میں ہدیہ اور صدقہ بھی داخل ہوگئے، کیونکہ ان میں بھی زندگی میں بلاعوض تطوعاً تملیک پائی جاتی ہے، گرچہ ان تینوں میں بعض مفہوم واحکام کے اعتبار سے کچھ اختلاف بھی ہے۔

پس: ہبہ اپنے مذکورہ تعریف کے اعتبار سے عام ہے، امیر کی طرف سے غریب کو ہو یا اسکے برعکس، آخرت کے اجر وثواب کے قصد سے ہو یا نہ ہو، شئی موہوب، موہوب لہٗ کی طرف منتقل کی گئی ہو یا نہ ہو۔

جبکہ صدقہ سے بظاہر غالباً تقرب الی اللہ کی نیت سے، آخرت کے ثواب کی خاطر کسی محتاج اور ضرورت مند کی تملیک مراد ہے۔

اور کسی کے اکرام کے طور پر اس کی خدمت میں کوئی شئی (منتقل کر کے) پیش کی جائے تو اسے ''ہدیہ'' کہا جائے گا۔

صدقہ اور ہدیہ کے درمیان یہ فرق آپ ﷺ کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ، جبکہ آپ ﷺ نے ہانڈی میں پکنے والا گوشت طلب فرمایا اور یہ کہا گیا کہ یہ گوشت حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو صدقہ میں ملا ہوا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا'' وہ ان کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔'' (متفق علیہ) اسی لئے آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور نوش کرتے، جبکہ صدقہ استعمال نہ کرتے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں کوئی کھانا لایا جاتا تو دریافت فرماتے، اگر کہا جاتا کہ ہدیہ ہے تو تناول فرماتے اور کہا جاتا کہ صدقہ ہے تو تناول نہ فرماتے۔

کسی حاکم وغیرہ کو خوف کی وجہ سے ہدیہ پیش کرے تو دراصل یہ رشوت ہے (لہٰذا اسے لینا حرام ہوگا)۔ کسی کو اس شرط سے ہدیہ دے کہ وہ اس کی کوئی ضرورت پوری کرے، لیکن اس نے پوری نہ کی تو وہ ہدیہ لوٹانا لازم ہے، اگر ختم ہو چکی ہو تو اس کا بدل لوٹانا لازم ہے۔ کسی نے مثلاً کسی کو اس مقصد سے ہدیہ دیا کہ وہ اس کے قیدی کو قید سے چھڑائے، اور اس نے کوشش بھی کی لیکن نجات نہ دلا سکا تو ہدیہ واپس کرنا لازم ہے، کیونکہ مقصد حل نہیں ہوا، البتہ صرف شفارش کرنے کے لئے دیا تھا اور اس نے سفارش کردی تو اب لوٹانا واجب نہیں، سفارش قبول ہو یا رد ہو۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۵۹۴-۵۹۵)

ہبہ میں ایجاب وقبول ضروری ہے، جبکہ ہدیہ وصدقہ میں یہ شرط نہیں، آپ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بکثرت صدقہ کیا کرتے، لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ لینے و دینے والوں کے درمیان ایجاب وقبول بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح صحیحین میں روایت ہے کہ صحابہ کرام جس روز آپ ﷺ کا قیام حضرت عائشہؓ کے گھر ہوتا، ہدایا خدمتِ اقدس میں روانہ کرنے کا اہتمام فرماتے، لیکن یہ منقول نہیں کہ آپس میں ایجاب وقبول بھی ہوا کرتا تھا۔

مشروعیت: ہبہ اپنے سابقہ عام مفہوم کے اعتبار سے (یعنی بشمول صدقہ وہدیہ) قرآن وحدیث اور اجماع کی روشنی میں مستحب ومطلوب ہے۔

آیات: ''وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ، فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْساً فَكُلُوهُ هَنِيئاً مَّرِيئاً'' (النساء ۴) **ترجمہ:** ''اور تم لوگ بیبیوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ بیبیاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر

میں کا کوئی جزو (اور یہی حکم کل کا ہے) تو تم اسکو کھاؤ (برتو) مزہ دار خوشگوار سمجھ کر" یعنی بیویوں کو ان کا فرض حق (مہر) دینے کے بعد اپنی خوشی سے اگر وہ تم کو ہبہ کرے تو یہ تمہارے لئے حلال ہے، اس کے لینے اور استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲) "لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ" (البقرہ۔ ۱۷۷) **ترجمہ:** "کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہیکہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مر گیا ہو) اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو)"......

آیت محتاج وغیر محتاج دونوں کو عطا کرنے پر مشتمل ہے، محتاج کو عطا کرنا صدقہ اور غیر محتاج کو عطا کرنا ہبہ ہے۔

احادیث: ۱) حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ کے انصاری پڑوسی آپ کی خدمت میں اپنے مویشیوں کا دودھ بطور عطیہ (ہدیہ) پیش کرتے، تو آپ ہمیں پلایا کرتے" (متفق علیہ)

۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے" اے مسلم خواتین! کوئی پڑوسن اپنے پڑوسن کے حق میں قطعاً حقارت کا نظریہ نہ رکھے، گرچہ ایک بکری کا کھر (یا معمولی گوشت لگی ہوئی ہڈی) ہی کیوں نہ ہو" (متفق علیہ) (یعنی اپنی حیثیت کے مطابق معمولی سے معمولی چیز کے بھی دینے یا لینے کو حقیر نہ سمجھے، بلکہ پیش کرے اور دوسرا لے، تاکہ یہ سنت زندہ رہے اور محبت والفت کا سبب بنے)

۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے:" اگر مجھے (گائے بکری وغیرہ کے) دست یا پائے کی دعوت کی جائے تو میں قبول کرلوں، اور اگر دست یا پایا ہدیہ میں پیش ہو، تو قبول کرلوں" (بخاری)

اجماع: تمام زمانوں میں فقہا کرام کا ہبہ کے تمام انواع کے استحباب پر اجماع رہا ہے، کیونکہ یہ تعاون کے قبیل سے ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" (المائدہ : ۲) اور نیکی اور تقویٰ (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو"

رشتہ داروں کو ہبہ: ہبہ جب مطلق مستحب ہے، تو رشتہ داروں کے حق میں اس کا استحباب وتاکید اور فضیلت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ صلۂ رحمی بھی ہے اور قرآن وحدیث نے اس کی ترغیب دی ہے۔

آیت:" وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ" (النساء : ۱) ترجمہ:" اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کیا کرتے ہو، اور قرابت (کے حقوق ضائع کرنے) سے بھی ڈرو۔" (یعنی صلہ رحمی کیا کرو، قطع رحمی نہ کرو)

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا" جسے اپنے رزق کی کشادگی وبرکت اور درازی عمر محبوب ہو وہ صلہ رحمی کیا کرے"۔ (متفق علیہ)

ہبہ پر مکافات (بدلہ دینا): کوئی ہبہ دے، اور گنجائش ہو تو خود بھی اسے ہبہ دے، کیونکہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ہدیہ قبول کیا کرتے اور اس پر بدلہ عنایت فرماتے۔

حکمت : اسلام ایک مثالی اور کامل معاشرہ کی تشکیل کو بڑی اہمیت دیتا ہے، جو آپسی محبت ومودت اور الفت واتفاق کی بنیادوں پر قائم ہو، اسی لئے ہر اس عمل اور محرک کو مشروع قرار دیتا ہے جو افراد کے درمیان محبت والفت کو پیدا کرنے اور قوی کرنے میں معین ومددگار ہو۔ ہبہ بھی اس مقصد کے حصول کا ایک اہم سبب اور کڑی ہے، کیونکہ اس میں اکرام واحترام اور محبت کا جذبہ پایا جارہا ہے، اور انسان فطرتاً اپنے ساتھ حسن سلوک پیش آنے اور اکرام کرنے والے کے ساتھ محبت والفت کا برتاؤ کرتا ہے۔

احادیث سے صراحتاً اس مقصد کی تائید ہوتی ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے" آپس میں ہدیے کا لین دین رکھو، آپس میں محبت پیدا ہوگی"(اخرجه مالک مرسلاً) ایک حدیث میں ارشاد ہے" ہدیے کا لین دین رکھو، کیونکہ ہدیہ سینہ کے کینہ وکپٹ کو دور کرتا ہے۔" (ترمذی)

اسی مقصود کے تحقق کی خاطر آپ ﷺ نے ہبہ کو قبول کرنے کی تاکید فرمائی اور لوٹانے سے منع فرمایا، کیونکہ اس میں واہب کی دل شکنی اور تذلیل ہے۔ صحیحین کی ایک روایت عنقریب گذر چکی، مسند احمد کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے ہبہ کو قبول کرنے کی تاکید فرمائی اور لوٹانے سے منع فرمایا، کیونکہ اس میں واہب کی دل شکنی اور تذلیل ہے۔ صحیحین کی ایک روایت عنقریب گذر چکی، مسند احمد کی ایک روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے" بغیر سوال اور حرص ولالچ کے کسی کو اپنے (مسلمان) بھائی کی جانب سے کوئی بھلائی پہنچے (وہ کچھ مال وغیرہ ہبہ کرے) تو اسے قبول کرلے اور رد نہ کرے، کیونکہ یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے پہنچایا ہے" (مسند احمد ۴/۲۲۱)

کسی معقول شرعی سبب کی وجہ سے ہبہ قبول نہ کرے تو اس کی وضاحت کردے، تاکہ واہب کی دل شکنی اور بدگمانی نہ ہو۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت صَعْب بن جُثامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں ایک جنگلی گدھا بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے لوٹا دیا، پھر ان کے چہرہ پر افسردگی کے آثار دیکھ کر انہیں تسلی دی کہ" ہم چونکہ احرام میں ہیں، اس لئے تمہارا ہدیہ واپس کردیا (کیونکہ احرام میں شکار وغیرہ منع ہے)" (متفق علیه)

ہبہ کے ارکان و شرائط

ہبہ کے تین ارکان ہیں۔ (۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) موہوب

۱) **عاقدین : یعنی واہب اور مَوْھوب لَهٗ :** واہب کے لئے شرط ہے کہ وہ موہوب کا مالک ہو، تبرع کی اہلیت رکھتا ہو، اپنے مال میں تصرف کا اسے مکمل اختیار ہو۔ جس شئے کا مالک نہ ہو، اس کا ہبہ صحیح نہیں، اسی طرح بچہ یا پاگل کا ہبہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کو تبرع (مفت کوئی چیز دینا) کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ محض ضرر ونقصان ہے، اسی لئے ان کا ولی بھی ان کے مال میں سے کچھ ہبہ نہیں کرسکتا، کیونکہ اس کے مقابلہ میں کوئی دنیوی نفع نہیں ہے، صرف نقصان ہے، جس کا ولی کو اختیار نہیں، اس کے ولایت کا تعلق صرف ماتحتوں کے نفع کی حد تک ہے۔ قلاش ومفلس یا سفیہ ہونے کی وجہ سے قاضی نے جس پر مالی تصرفات کی پابندی عائد کردی ہو، وہ بھی ہبہ نہیں کرسکتا۔

موہوب لہ میں موہوب کے مالک بننے کی اہلیت شرط ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو جو پیدا ہوچکا ہو ہبہ کیا جاسکتا ہے، بچہ اور پاگل کی جانب سے اس کا ولی قبول کرلے گا۔ حمل کے حق میں ہبہ صحیح نہیں ہے۔ کسی ممیز (باشعور) بچہ کو صدقہ دینا جائز ہے، لیکن جب ولی قبضہ کرلے اس وقت وہ اس کا مالک بنے گا۔ لیکن اس کی عادت کے بگڑنے کے خوف سے ولی بچہ کو صدقہ دینے سے ناراض ہو، تو اسے دینا حرام ہے۔ مجور (بچہ یا پاگل) کو کوئی شئی ہبہ کی جائے تو ولی کو قبول کرنا واجب ہے۔ باپ یا دادا ہبہ کریں تو خود ہی اس کی جانب سے قبضہ بھی کریں

گے۔(حاشية الجمل ۳/۵۹۶)

۲) **صیغہ :** یعنی ایجاب وقبول (واہب کے الفاظ ایجاب وموہوب لہٗ کے الفاظ قبول کہلائیں گے)۔

ایجاب کے کلمات : میں نے تمہیں ہبہ کیا، میں نے تمہیں عطا کر دیا، دے دیا، بلا قیمت تمہیں مالک بنا دیا، یہ کھانا تم لے جا کر کھالو، وغیرہ۔ ان میں بعض الفاظ ہبہ کے سلسلے میں صریح اور بعض صریح کی طرح ہی ہیں، لہٰذا نیت کے بغیر بھی ان الفاظ سے ہبہ صحیح ہو جائے گا، اگر ان کا کہنے والا یہ دعویٰ کرے کہ میری نیت ہبہ کی نہیں تھی تو اسے قبول نہ کریں گے۔ (بلکہ ہبہ قرار دیں گے)

بعض دیگر الفاظ ہبہ کے سلسلہ میں صریح یا صریح کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کپڑا میں نے تمہیں پہننے دیا، یہ جانور سواری کے لئے دے دی، وغیرہ۔ یہ الفاظ کنایہ ہیں، اگر ہبہ کی نیت سے کہے، تو ہبہ منعقد ہوگا، اور اگر کہے کہ میری مراد ہبہ نہیں تھی تو اسے تسلیم کرتے ہوئے عاریت قرار دیں گے، کیونکہ الفاظ میں اس کی بھی گنجائش ہے۔

قبول کے کلمات : میں نے قبول کیا، میں راضی ہوں، راضی ہوا، یا میں نے ہبہ لے لیا۔

صیغہ کے شرائط : (۱) عرف کے اعتبار سے ایجاب وقبول کے درمیان فصل (تاخیر) نہ ہو۔

۲) کسی شرط کے ساتھ مقید نہ ہو، مثلاً یوں کہا: اگر زید آ گیا تو میں نے یہ کپڑا تمہیں ہبہ کیا، تو یہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ہبہ تملیک ہے۔ (یعنی مالک بنانا) اور تملیک کو ایسے شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں ہے جس کے وجود وعدم دونوں کا احتمال ہو۔

۳) کسی وقت یا مدت کے ساتھ مقید نہ کرے۔ مثلاً میں نے یہ کتاب ایک ماہ یا سال کے لئے تمہیں ہبہ کر دی، کیونکہ ہبہ کا تقاضا فی الحال تملیک مطلق ہے، اور یہ شرط اس کے منافی ہے۔

موہوب کا بعض حصہ قبول کرے، یا دو کو ہبہ کرے اور صرف ایک قبول کرے تو یہ صحیح ہے (حاشية الجمل ۳/۵۹۷) کسی نے اپنی بیوی یا بچی کے لئے زیورات بنا کر اسے آراستہ ومزین کیا (لیکن اسے ہبہ کرنے کے کوئی الفاظ نہیں کہے) تو یہ تملیک نہیں ہے۔ (بلکہ وہ زیورات شوہر ہی کی ملکیت میں ہیں)۔ کوئی بیوی اپنی باری سوکن کو ہبہ کرے تو اس میں قبول شرط نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کے نکاح کے وقت کچھ اسباب اس کے ساتھ روانہ کر دے (جہیز دے) لیکن ہبہ وتملیک کی صراحت نہ ہو، تو وہ عاریت ہے، اگر کہے کہ یہ بیٹی کا جہیز ہے، تو پھر بیٹی کی ملکیت ہے، اگر کسی نے خادم یا بیوی کی بیٹی کو مثلاً ان کی ضرورت یا ثواب کے قصد سے کچھ دیا تو یہ صدقہ ہے، اور ایجاب وقبول کی ضرورت نہیں، ورنہ ہبہ ہے اور ایجاب وقبول ضروری ہے۔ قصد کا علم دینے والے کی طرف سے یا قرائن سے ہوگا۔ (حاشية الجمل ۳/۵۹۵)

قرض خواہ اگر مقروض کو ہبہ کر دے تو یہ دراصل ابراء ہے۔ (یعنی قرض کو معاف کر دینا) اس لئے قبول کی ضرورت نہیں ہے (فتح الوهاب)

عمری اور رقبیٰ

۱) **عُمریٰ :** یہ عمر سے ماخوذ ہے، یعنی واہب موہوب لہ سے کہے، یہ گھر (یا کوئی اور چیز) میں نے تجھے عمر بھر کے لئے دیا، یا تمہاری حیات تک تمہارا ہے پھر تم مر جاؤ تو میرے ورثاء کا ہے۔

یہ بھی ہبہ کا صیغہ ہے، لیکن موہوب لہ کے عمر کے ساتھ مقید ہے، اس کے باوجود یہ ہبہ صحیح ہے، لیکن شرط باطل اور لغو ہے، احادیث کی

روشنی میں وقت کے ساتھ مقید ہونے کے باوجود اسے صحیح قرار دیا گیا۔

احادیث : (۱) آپ ﷺ نے فرمایا "عُمریٰ جائز ہے" (متفق علیہ)

(۲) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "آپ ﷺ نے عُمریٰ کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ وہ موہوب لہ کا ہے" (متفق علیہ)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا "اپنے اموال اپنے پاس رکھو اور اسے برباد نہ کرو، کیونکہ جو بطور عمریٰ (کوئی شئی) کسی کو دے دے تو وہ زندگی میں اور موت کے بعد اس کی اور اس کے ورثاء کی ہے" (مسلم)

امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں "اس سے مراد یہ اطلاع دینی ہے کہ عمریٰ صحیح اور نافذ ہبہ ہے، موہوب لہ اس کا کامل مالک بن جائے گا، آئندہ کبھی واہب کی طرف نہ لوٹے گا، جب یہ مسئلہ معلوم ہو چکا تو اب جو چاہے سوچ سمجھ کر اس پر عمل کرے، جو نہ چاہے ترک کرے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ عمریٰ عاریت کی طرح ہے اور اسے واپس لے سکتے ہیں۔"

اگر واہب ہبہ کو اپنی یا کسی اجنبی کی عمر کے ساتھ مقید کرے مثلاً میری حیات تک تجھے ہبہ کیا یا زید کی زندگی تک تجھے ہبہ کیا تو یہ صحیح نہ ہوگا (فتح المعین)

۲) **رُقبیٰ :** یعنی واہب موہوب لہ سے کہے "دَارِیْ لَكَ رُقْبیٰ" (میرا گھر بطور رُقبیٰ تمہارا ہے) یا "اَرْقَبْتُكَ هٰذِهِ الدَّار" (یہ گھر میں نے تمہیں رقبیٰ دے دیا) وغیرہ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اگر تو مجھ سے پہلے مرگیا تو میں واپس لے لوں گا، اور میں تجھ سے قبل مرگیا تو مستقل تمہارا ہو جائیگا۔ یہ رُقُوب اور تَرَقُّب سے ماخوذ ہے یعنی انتظار کرنا، کیونکہ واہب وموہوب لہ دونوں بھی ایک دوسرے کے موت کے منتظر ہیں۔ اس شرط کے باوجود حدیث کی وجہ سے یہ صیغہ بھی معتبر ہے، اور ان الفاظ سے کسی چیز کا ہبہ کرنا صحیح ہے، اور شرط لغو ہوگی۔

حدیث : آپ ﷺ کا فرمان ہے "عمریٰ جن کے لئے کیا گیا انہیں جائز ہے اور رقبیٰ جن کے لئے کیا گیا انہیں جائز ہے" (یعنی نافذ اور جاری وصحیح ہیں) (ترمذی ابوداود، ابن ماجہ)

صاحب مغنی المحتاج، فرماتے ہیں۔ "امام سبکیؒ نے فرمایا کہ عمریٰ ورقبیٰ کی صحت قیاس سے بعید ہے، لیکن حدیث ہر اصل اور قیاس پر مقدم ہے۔"

۳) **موہوب :** ہبہ کا تیسرا رکن محل عقد یعنی موہوب (ہبہ کی جانے والی چیز) ہے۔ اس میں اصل یہ ہے کہ "جس چیز کی بیع و فروخت جائز ہے، اس کا ہبہ بھی جائز ہے" جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

أ- بوقت ہبہ موجود ہو ، لہٰذا فی الحال مفقود وغیر موجود شئی کا ہبہ صحیح نہیں، کیونکہ ہبہ کا تقاضا فی الحال تملیک ہے، اور معدوم میں یہ بات محال ہے، تو یہ ہبہ باطل ہوگا۔

مثال : اس سال درخت جو پھل دے گا اسے ہبہ کرنا، اس سال بکریوں کو جو اولاد ہوگی اسے ہبہ کرنا حکماً مفقود بھی حقیقۃً مفقود کی طرح ہے، مثلاً اس بکری کے پیٹ کا بچہ (حمل) ہبہ کر دیا، یا اس کے تھن کا دودھ ہبہ کر دیا، تو یہ ہبہ صحیح نہیں ہے۔

ب- مال متقوم ہو (شرعاً وہ مال اور قابل قیمت ہو)، پس مردار، خون، سور، شراب، مُحرَم کا یا مُحرِم کا شکار وغیرہ کا ہبہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ شرعاً مال متقوم نہیں ہیں۔

ج- واہب اس کا مال ہو، لہٰذا جو چیز واہب کی ملکیت میں نہ ہو اس کا ہبہ صحیح نہیں۔ مثلاً بغیر اجازت دوسرے کا مال

ہبہ کرنا، مباحات کا ہبہ (مباحات سے مراد وہ اشیاء جو کوئی بھی اپنے قبضہ میں لے کر اس کا مالک بن سکتا ہے، جیسے خشکی وتری کے عام جانور (جو کسی کی ملکیت میں نہ ہوں) عام زمین کی گھاس، لکڑی وغیرہ، ایسی اشیاء اپنے قبضہ میں لینے سے قبل ان کا ہبہ صحیح نہیں، کیونکہ قبضہ سے قبل اس کا مالک نہیں بنا)

دوسرے کے ساتھ متصل شئی کا ھبہ : موہوب شئ دوسرے کے ساتھ متصل اور ملی ہوئی ہو، اور بغیر کسی نقصان اور ضرر کے اسے اس سے جدا کر سکتے ہوں اور اس میں دھوکہ اور خطرہ کی کوئی شکل نہ ہو، تو یہ ہبہ صحیح ہے، کیونکہ اس کی بیع صحیح ہے۔

مثلاً زمین میں سے ایک گز ہبہ کر دیا، یا کپڑے میں سے ایک گز ہبہ کر دیا کہ اسے کاٹ کر دینے سے قیمت پر اثر نہ پڑے۔ (تو یہ صحیح ہے)

اگر دوسرے کے ساتھ متصل چیز کو بغیر نقصان کے جدا کرنا ناممکن ہے، مثلاً نصف تلوار ہبہ کرنا، یا جدا کرنے میں دشواری یا غرر کا پہلو ہو، مثلاً دنبے کے پشت پر موجود اون کا ہبہ، کیونکہ اس صورت میں موہوب کو غیر موہوب سے الگ کرنا دشوار ہے، اس لئے کہ اون کا بالکل جڑ سے کترنا چاہئے، جو ناممکن ہے نیز جدید بال نکل کر ان کے ساتھ مخلوط ہو سکتے ہیں، جن کی تفریق ممکن نہیں، اس میں غرر بھی ہے، اس لئے اس کا ہبہ صحیح نہیں جیسا کہ بیع درست نہیں۔

اگر درخت پر موجود پھل ہبہ کرے، اور پھل ایسے ہوں کہ نئے نکلتے رہتے ہیں اور موجودہ اور نئے پھلوں میں تمیز دشوار ہو تو یہ ہبہ صحیح نہیں، ورنہ صحیح ہے۔

گیہوں کے چند دانے وغیرہ محقرات کی بیع صحیح نہیں، لیکن ان کا ہبہ صحیح ہو جاتا ہے۔ (فتح المعین)

غیر کے ساتھ مشغول کا ھبہ : مثلاً گھر ہبہ کرے اور گھر میں خود واہب کے اسباب موجود ہوں، یا جانور ہبہ کرے جس پر واہب کا سامان لدا ہو، یا درخت ہبہ کرے جس پر پھل ہوں، تو اس طرح کا ہبہ صحیح اور جائز ہے، کیونکہ موہوب اور غیر موہوب میں بغیر کسی ضرر وغرر اور دشواری کے تمیز ممکن ہے، اور اس کی بیع جائز ہے۔

مُشاع کا ھبہ (مشترک اور غیر منقسم کا ھبہ) : یعنی کسی چیز میں کسی انسان کا ایک غیر معین حصہ ہو، اور وہ اسے (بغیر تقسیم وتعیین کے) کسی کو ہبہ کردے، یا کسی چیز کو دو یا زائد افراد کو ہبہ کردے تو یہ ہبہ صحیح ہے، کیونکہ مُشاع کی فروخت صحیح ہے، اور موہوب لہٗ مکمل اس چیز پر قبصہ کرے گا تو اسے (ہبہ میں مطلوب) قبضہ قرار دیا جائیگا، پھر اپنے حصے کے برابر حق وصول کرے گا اور باقی حصہ اس کے پاس بطور امانت ہوگا۔

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے ایک سفر میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک جنگلی گدھے کا شکار کیا، (تو وہ اس کے مالک بن گئے) پھر تمام صحابہ کرام نے مل کر کھایا (تو گویا شائع حصے ان کو ہبہ کر دیئے) اور آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو کوئی نکیر نہ فرمائی۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک جنگلی گدھا آپ ﷺ وصحابۂ کرام کو ہبہ کیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے صحابۂ کرام کے درمیان تقسیم کردیا (مؤطا امام مالک ، نسائی) اس سے صراحتاً ایک چیز کا کئی لوگوں کو ہبہ کرنا ثابت ہوتا ہے۔

قبضہ سے ھبہ لازم ھوگا : عقد ہبہ محض ایجاب وقبول سے مکمل ولازم نہ ہوگا، بلکہ واہب کی طرف سے ابھی غیر لازم ہے، پس واہب ہبہ سے رجوع کرنے اور اس میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ اور جب تک موہوب لہٗ کا اس پر قبضہ نہ ہو، اسے کامل وپختہ ملکیت حاصل نہ ہوگی۔

آئندہ مذکورہ شرائط کے مطابق جب قبضہ حاصل ہوگا، تو عقد ہبہ مکمل اور لازم ہوجائے گا اور موہوبہ شئی میں موہوب لہ کو کامل اور پختہ ملکیت حاصل ہوگی۔

امام حاکم نے مستدرک میں ایک روایت نقل فرمائی ہے (اور اسے صحیح بھی قرار دیا) کہ آپ ﷺ نے جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو ارشاد فرمایا: "میں نے نجاشی کی خدمت میں چند اوقیے مشک اور ایک جوڑا ہدیہ روانہ کیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے، اور میرے خیال میں مذکورہ ہدیہ واپس آجائے گا، پس جب میرے پاس واپس ہو تو وہ تمہارا ہے یا تم سب (ازواج مطہرات) کا ہے۔" پس آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہی ہوا، نجاشی کا انتقال ہوا، پھر جب ہدیہ واپس پہنچا تو آپ ﷺ نے اپنی ہر زوجہ مطہرہ (بیوی) کو اس میں سے ایک اوقیہ (۴۰ درہم) مشک عنایت فرمایا، اور بقیہ حضرت ام سلمہ کو دیا، اور جوڑا بھی انہیں عطا فرمایا۔

اگر ہبہ بغیر قبضہ کے لازم ہوتا (ہدیہ بھی ہبہ کی طرح ہے) تو آپ ﷺ نے وہ ہدیہ واپس قبول نہ کیا ہوتا، بلکہ نجاشی کے وارثوں کو لوٹایا ہوتا، تو آپ ﷺ کے قبول کرنے سے ثابت ہوا کہ سامنے والے کے قبضہ سے قبل اس کی ملکیت ثابت نہ ہوگی۔

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ۲۰ روسق اناج (ایک وسق تقریباً ۱۴۰ کلوگرام ہوتا ہے) اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عطا فرمایا، پھر ان کی وفات کا وقت آیا تو فرمایا کہ تم نے اس پر قبضہ کرلیا ہوتا تو وہ تمہارا تھا، (چونکہ قبضہ نہیں ہوا تھا) اس لئے اب وہ مال (تمام) وارثوں کا ہے،...... قرآن کی روشنی میں اسے آپس میں تقسیم کرلو۔ (موطا امام مالک) اس سے بھی صراحتاً ملکیت کے لئے قبضہ ضروری معلوم ہوا۔

قبضہ کے شرائط: (أ) واہب کی اجازت: قبضہ کی صحت کے لئے واہب کی اجازت شرط ہے، اگر موہوب لہ اس کی اجازت سے قبل قبضہ کرلے تو یہ قبضہ معتبر نہیں، اس سے ہبہ مکمل اور لازم نہ ہوگا، بلکہ واہب کی ملکیت ہی میں رہے گا۔

اجازت صراحتاً ہونا ضروری ہے، یا واہب اپنے ہاتھوں ہی اسے موہوب لہ کے سپرد کردے، خواہ عقدِ ہبہ کی مجلس میں یا بعد میں، اور چاہے موہوب، موہوب لۂ کے قبضہ میں ہو یا نہ ہو، صریح اجازت یا قبضہ میں دیئے بغیر موہوب لہ اس پر قبضہ کرے تو یہ قبضہ صحیح نہیں، گرچہ واہب اسے دیکھے اور خاموش رہے (تب بھی یہ قبضہ ناکافی ہے)

(ب) موہوب غیر موہوب کے ساتھ مشغول نہ ہو: کیونکہ غیر موہوب سے فارغ اور خالی ہونا سپردگی اور قبضہ کے لئے شرط ہے، اور قبضہ کا مقصد مقبوض میں تصرف کا اختیار ہونا ہے، اور اس صورت میں یہ حاصل نہیں۔ لہٰذا موہوب خالی ہونے کے بعد سپرد کردے تو قبضہ صحیح ہے۔ اسی طرح موہوب خِلقۃً غیر کے ساتھ متصل ہو، مثلاً زمین میں کھیتی ہو، یا درخت پر پھل ہوں، تو انہیں جدا کرنے کے بعد سپرد کردے تو قبضہ صحیح ہوگا۔

(ج) قبضہ کی اہلیت (صلاحیت): یعنی قبضہ کرنے والا عاقل و بالغ ہو، پس بچہ یا پاگل کا قبضہ کرنا صحیح نہیں، کیونکہ یہ ولایت ہے اور انہیں نفس یا مال پر ولایت حاصل نہیں، اس لئے ان کا قبضہ بھی معتبر نہیں۔ (بلکہ ان کی طرف سے ان کا ولی قبضہ کرے)

بطورِ نیابت قبضہ: یعنی جن کا خود قبضہ صحیح نہیں جیسے بچہ و پاگل، ان کی طرف سے قبضہ کرنا، اس قبضہ کی صحت کے لئے قبضہ کرنے والے کو ان پر ولایت کا حق ہونا شرط ہے، یا وہ اس کے عیال (رعایت و تربیت) میں داخل ہوں۔

شوہر اپنے نابالغ بیوی کی جانب سے قبضہ کرسکتا ہے، جبکہ بیوی کو اس کے سپرد کیا گیا ہو، (بدائی ہو چکی ہو)، کیونکہ وہ اس کے عیال

میں داخل ہو چکی، سپردگی سے قبل اسے قبضہ کا حق نہ ہوگا۔ اولیاء (شرعی سرپرستوں) میں سے کوئی اپنے ماتحت (زیر سرپرست) کو کچھ ہبہ کرے تو یہ صحیح ہے، اور صرف عقد سے موہوب لہ اس کا مالک بنے گا، کیونکہ موہوب ولی کے قبضہ میں ہے، یہ ہبہ کے قبضہ کے قائم مقام ہوگا، صرف کیا ہبہ کیا ہے معلوم ہونا چاہئے، اگر اس پر گواہ رکھے تو بہتر ہے تاکہ آئندہ اس کے انکار یا اس کے موت کے بعد وارثوں کے انکار کی گنجائش نہ ہو۔

ولی کے علاوہ بچہ وغیرہ جس کی پرورش ونگہداشت میں ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے۔

ہبہ کا حکم اور اسے واپس لینا: مذکورہ تمام ارکان وشرائط کے ساتھ جب ہبہ اور موہوبہ شئی پر قبضہ پایا جائے تو موہوب لہٗ اس چیز کا مالک بن جائے گا، اب واہب اسے واپس نہیں لے سکتا۔

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے "ہبہ کر کے واپس لینے والا قے کر کے چاٹنے والے کی طرح ہے۔" (متفق علیه) ایک اور حدیث میں اسے قے کر کے چاٹنے والے کتے کی طرح قرار دیا ہے۔ (متفق علیه)

البتہ اصل اپنی فرع کے پاس سے ہبہ کے حکم کے ثبوت کے بعد بھی واپس لے سکتا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: "کسی شخص کو حلال نہیں کہ کسی چیز کا عطیہ یا ہبہ دینے کے بعد واپس لے، البتہ والد اپنی اولاد سے واپس لے سکتا ہے" (ترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔ ابوداود) والد پر دیگر اصول (دادا، نانا، ماں، نانی وغیرہ اوپر تک) اور اولاد پر دیگر فروع (پوتا، پوتی، نواسا، نواسی وغیرہ نیچے تک) کو قیاس کیا گیا۔ فوراً واپس لینا ضروری نہیں، جب چاہے لے سکتا ہے گرچہ اولاد غریب، کمسن، دین میں مخالف ہو، البتہ بلا عذر واپس لینا مکروہ ہے۔ اگر اولاد نافرمان ہو، یا اسے گناہ میں صرف کرے اور سمجھانے کے باوجود نہ سنے تو واپس لینا مکروہ نہیں ہے۔ بلکہ گناہ کی صورت میں واپسی مستحب ہے۔ نذر، زکات، کفارہ یا قربانی کا گوشت فرع کو دینے کے بعد واپس لینا جائز نہیں ہے۔ (حاشیة الجمل ۳/۵۹۹)

اگر موہوب فرع کی ملکیت سے نکل جائے، مثلاً اسے فروخت کر دے، وقف کر دے یا کسی دوسرے کو ہبہ کر دے اور وہ قبضہ بھی کر لے تو اب اصل واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

فرع موہوب کو صرف کرایہ پر دے، یا رہن رکھے، یا کسی کو ہبہ کرے لیکن ابھی قبضہ نہیں ہوا تو اصل کو واپسی کا حق باقی ہے۔

موہوب میں متصل یا منفصل (غیر متصل اور جدا) اضافہ کے باوجود اصل کو واپس لینے کا اختیار ہے، واہب متصل اضافہ کے ساتھ موہوب کو واپس لے سکتا ہے، مثلاً جانور کا موٹاپا، کھیت میں ہل چلانا منفصل اضافہ مثلاً جانور کا بچہ یا درخت کا پھل بوقت ہبہ موجود تھا تو اس اضافہ سمیت واپس لے سکتا ہے، لیکن یہ اضافہ ہبہ کے بعد وجود میں آیا ہو تو اس اضافہ کو نہیں لے سکتا، بلکہ وہ موہوب لہ ہی کا حق ہے۔

اسی طرح غیر حاملہ جانور یا بغیر پھل کے درخت ہبہ کرے، پھر رجوع سے قبل جانور حاملہ ہو یا درخت پھل لائے، تو حمل اور پھل کو نہیں لوٹا سکتا، گرچہ ابھی وضع حمل نہ ہوا ہو اور پھل توڑے نہ گئے ہوں، صرف اصل (یعنی جانور اور درخت) واپس لے سکتا ہے، اضافہ موہوب لہ کی ملکیت میں رہے گا۔

موہوب سے فرع کی ملکیت ختم ہونے کے بعد دوبارہ کسی اور سبب سے وہ اس کی ملکیت میں آئے مثلاً خرید لیا، یا ہبہ یا وراثت میں ملا، تو اب اصل (والد وغیرہ) کو واپس لینے کا اختیار نہیں ہے، کیونکہ ملکیت کا سبب بدل چکا، تو گویا چیز ہی بدل گئی۔

رجوع اور واپسی کے الفاظ' میں نے ہبہ سے رجوع کرلیا، اسے ختم کردیا، اسے باطل قرار دیا، یا موہوب کو واپس میری ملکیت میں لے لیا۔ اگر نیت کے ساتھ کنایہ لفظ استعمال کرے تو یہ بھی کافی ہے۔ مثلاً میں نے موہوب لے لیا۔ اس پر قبضہ کرلیا۔ (فتح المعین)

مطلق هبه اور هبه بثواب (یعنی بالعوض هبه ۔ بدله والا هبه)

کوئی شخص کسی کو کچھ ہبہ کرے، اور اس میں بدلہ اور عوض کی کوئی شرط نہ ہو، تو وہ کسی بدلہ کا مستحق نہیں، اور موہوب لہ کو اسے اس ہبہ کا عوض دینا لازم نہیں ہے، خواہ واہب موہوب لہ سے (کسی بھی اعتبار سے) برتر ہو، یا مساوی ہو یا کمتر ہو۔

اگر ہبہ بثواب ہو، مثلاً یوں کہے میں نے یہ چیز اس شرط پر تجھے ہبہ کردی کہ تم فلاں چیز مجھے ہبہ کردو، یا میں نے یہ کتاب تمہیں ہبہ کردی بشرطیکہ تم یہ کپڑا مجھے عوض میں دے دو وغیرہ تو اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اگر مشروط عوض اور بدل معلوم ہے تو یہ عقد صحیح ہے، اور مفہوم کو دیکھتے ہوئے در حقیقت بیع ہے، کیونکہ یہ معلوم مال کے ذریعہ عقدِ معاوضہ ہے، تو گویا مطلب ہوا میں نے فلاں چیز فلاں کے عوض تمہیں فروخت کردی، کیونکہ عقود میں اصل اعتبار مقاصد و معانی کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا، اسی لئے ہبہ بثواب میں بیع کے احکام ثابت ہوں گے۔ مثلاً خیار مجلس، خیار شرط، رد بالعیب وغیرہ کا ثبوت۔

اگر مشروط عوض مجہول (غیر معلوم) ہو، مثلاً میں نے یہ کتاب تمہیں ہبہ کی بشرطیکہ تم (کوئی سا) ایک کپڑا مجھے ہبہ کرو (کپڑے کی کوئی تفصیل و تعیین نہ ہو) یا بشرطیکہ تم اس کا کچھ بھی بدلہ دو، تو ان صورتوں میں یہ عقد باطل ہوگا، کیونکہ عوض کی جہالت کی وجہ سے بیع نہیں قرار دیا جاسکتا، اور عوض کے شرط کی وجہ سے ہبہ بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اولاد کے هبه اور عطایا میں مساوات : ہبہ اور عطایا سے واجب نفقہ اور مصارف کے علاوہ مراد ہے، والد اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو اس میں ان کے درمیان مساوات مستحب ہے، اولاد مذکر ہوں یا مؤنث، کمسن ہوں یا بڑے، ان کے درمیان ہبہ میں کمی بیشی اور فرق برتنا مکروہ ہے۔ (اور بعض علماء نے اسے حرام قرار دیا ہے)، کیونکہ یہ ان میں آپسی حسد و بغض کا سبب بنے گا، اور خاندانی یکجہتی اور اتفاق میں دراڑ پیدا کرے گا۔ پوتے نواسے وغیرہ نیچے تک اس حکم میں اولاد ہی کی طرح ہیں، خواہ اولاد موجود ہوں (جمل)

ایک مرتبہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کے والد نے صرف حضرت نعمان کو کچھ عطیہ (ہبہ) عنایت فرمایا، دیگر اولاد کو نہ دیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا'' اللہ سے ڈرو اور اپنے اولاد میں عدل و انصاف برتو'' تو انہوں نے وہ عطیہ واپس لے لیا۔ (متفق علیه)

حدیث کے ظاہری الفاظ کی روشنی میں اس مساوات سے مراد لڑکے اور لڑکی کو یکساں دینا ہے۔ (نہ کہ وراثت کی طرح لڑکے کو لڑکی سے دوگنا) ہدیہ، صدقہ، وقف وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔ (حاشية الجمل ۵۹۸/۳)

مساوات کا حکم اس وقت ہے، جبکہ اولاد کی ضروریات بھی یکساں ہوں، یا دیگر اولاد کسی کو زائد دینے سے متفق نہ ہوں، اگر کوئی زیادہ ضرورت مند ہو، یا دیگر اولاد زائد دینے سے راضی ہوں، تو اس میں کوئی کراہت اور حرج نہیں ہے۔ اسی پر صحابۂ کرام کے عمل کو محمول کریں گے، کیونکہ صدیق اکبرؓ نے حضرت عائشہؓ کو، حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عاصم کو اور حضرت ابن عمرؓ نے اپنے بعض بیٹوں کو عطیہ میں ترجیح دی۔ (الاقناع ۸۹/۲)

کراہت کی صورت میں بھی والد اگر کسی کو زیادہ کسی کو کم دے، یا کسی کو ہبہ کرے دوسرے کو نہ کرے تو ہبہ صحیح ہوگا اور موہوب لہ اس کا

مالک بن جائے گا، گرچہ والد کا یہ عمل نامناسب اور غیر مطلوب ہے۔

علم، تقویٰ و ورع، والدین کی اطاعت و فرمانبرداری اور گناہ میں صرف کرنے نہ کرنے کے اعتبار سے تخصیص و کمی بیشی مکروہ نہیں ہے۔(حاشیۃ الجمل ۵۹۹/۳)

والدین کو ھبہ اور عطایا میں مساوات

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی سے پیش آنا اولاد پر واجب ولازم ہے۔قرآن وحدیث نے اس کا بارہا حکم دیا ہے۔(مثلاً سورۃ النساء آیت ۳۶، سورۃ الاسراء آیت ۲۳)

حسن سلوک میں ان کے مصارف برداشت کرنا، اور مخصوص موقعوں پر ان کی خدمت میں تحفے اور ہدیہ پیش کرنا بھی داخل ہے، بالخصوص عید الفطر وعید الاضحیٰ کی مناسبت سے۔

اولاد کی طرح والدین کے عطیوں میں بھی مساوات مسنون ہے، البتہ کبھی والدہ کی تخصیص یا اسے مزید دینے میں حرج نہیں، کیونکہ ایک صحابی نے اپنے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ سوال کیا تو آپ ﷺ نے تین مرتبہ والدہ کا ذکر کیا پھر چوتھی مرتبہ پوچھنے پر والد کا ذکر کیا۔(متفق علیہ)

بھائی بھنوں کے ھبہ میں مساوات : ایک مسلمان پر واجب ہے کہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئے۔(دیکھئے النساء ، آیت ۳۶، البقرۃ آیت ۱۷۷)

والدین اور اولاد کے بعد انسان کے سب سے قریبی رشتہ دار بھائی بہن ہیں، لہٰذا ان کی خدمات میں بھی ہبہ اور ہدیہ پیش کرے بالخصوص خاص موقعوں پر، اور جب یوں کرے تو ان میں مساوات مستحب ہے(لیکن اولاد کے بمقابلہ کمتر درجہ میں) جبکہ سب کی ضروریات یکساں ہوں، (کوئی محتاج ہو تو اس کی تخصیص میں حرج نہیں) اگر کسی کی تخصیص کرنا ہو تو سب سے بڑے کو ترجیح دے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے "بڑا بھائی باپ کے درجہ میں ہے"(رواہ البیھقی فی شعب الایمان) صلہ رحمی شرعاً مطلوب و مامور ہے، یعنی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ چاہے دور کے ہوں ایسا (بہتر) سلوک کرنا کہ قطع رحمی شمار نہ ہو۔مثلاً مالی تعاون، ان کے مختلف مسائل حل کرنا، ملاقات، خط وکتابت، غائبانہ سلام وغیرہ روانہ کرنا وغیرہ(ترشیح المستفیدین ص ۲۶۳ الاقناع ۸۹/۲)

بعض متفرق مسائل

امام عبادیؒ نے فرمایا کہ اگر کسی نے دوسرے سے کہا کہ تم میرے مال سے جو بھی لو یا کسی کو دو یا کھاؤ تمہارے لئے حلال اور جائز ہے تو وہ صرف کھا سکتا ہے، کیونکہ یہ اباحت ہے(تملیک نہیں) اور اباحت مجہول کی بھی صحیح ہے بخلاف لینے یا کسی اور کو دینے کے۔اگر کسی نے کہا کہ میں نے سارا مال یا نصف مال تم کو ہبہ کیا، تو مال کی مقدار دونوں کو معلوم ہو تو یہ ہبہ صحیح ہے ورنہ نہیں۔'انوار' میں ہے کہ کسی نے دوسرے سے کہا کہ میرے گھر میں جو کچھ ہے یا باغ میں جو انگور ہیں وہ میں نے تمہارے لئے مباح (جائز وحلال) قرار دیا، تو وہ صرف کھا سکتا ہے، اسے فروخت کرنا، لے جانا اور کسی دوسرے کو کھلانا جائز نہ ہوگا۔نیز اس اباحت (جواز) کا تعلق اس کے کہنے کے وقت گھر یا باغ میں موجود چیز سے ہوگا (بعد میں پائے جانے والے پھل وغیرہ جائز نہ ہوں گے(فتح المعین)

ہبہ کا ظرف (برتن) لوٹانے کی عادت اور ماحول نہ ہو، مثلاً عطر کی شیشی، کھجور کا بکس، کتابوں کا بکس (کارٹون) وغیرہ تو وہ ظرف

بھی ہبہ شمار ہوگا (صراحتاً ظرف کو مستثنیٰ کردے تو الگ بات ہے)، اور ظرف عادتاً لوٹایا جاتا ہو تو وہ ہبہ نہ ہوگا، مثلاً طشت میں کھانا پیش کرنا۔ گلاس و کپ میں کسی مشروب کا ہدیہ پیش کرنا وغیرہ۔ ظرف جب ہبہ نہ ہو تو اس کا استعمال حرام ہے، البتہ اس میں کھانے کا معمول ہو، تو اس ہبہ اور ہدیہ کے کھانے کی حد تک اسے استعمال کرسکتے ہیں، اور اسے عاریت سمجھا جائے گا۔ (حاشیۃ الجمل ۲۰۱/۳) اگر کسی نے خط میں سلام روانہ کیا تو وہ خط ہدیہ ہے، الّا یہ کہ اسی کی پشت پر جواب مانگے، اگر خط میں ایسی بات ہو جس کا دوسرے کے سامنے اظہار واطلاع کاتب (خط لکھنے والے) کو پسند نہ ہو، تو کسی اور کو بتانا جائز نہیں ہے، اسی طرح کسی نے کسی کو ایسی بات کی اطلاع دی جس کا کسی اور کے سامنے ذکر کرنا اسے پسند نہیں تو اس بات کا افشاء جائز نہیں، گرچہ اس کی موت کے بعد ہو، البتہ اظہار کی کراہت کا تعلق صرف زندگی سے ہو تو حرج نہیں، مثلاً اس کے اظہار سے اسے کچھ خطرہ ہو تو اب موت کے بعد کسی خطرہ کا سوال نہیں۔

کسی نے کسی غریب کو کسی خاص مقصد سے رقم دی (مثلاً کپڑا دھونے، بال کٹوانے وغیرہ کے لئے) اور قرینہ سے اس کا پتہ چلے، (یا اس نے مقصد کی صراحت کردی) تو اسی میں وہ رقم استعمال کرنا لازم ہے۔ کسی نے جھوٹی شکایت کی کہ تم نے میری اجرت اور تنخواہ نہیں دی تو اس نے اسے رقم دے دی، یا کسی صفت کے گمان سے کچھ ہبہ کیا (مثلاً عالم یا سید سمجھ کر) حالانکہ درحقیقت اس میں وہ صفت نہ تھی، تو اسے قبول کرنا جائز نہیں، اور وہ اس کا مالک نہ بنے گا۔ دینے والے کے خیال وگمان کے متعلق قرینہ کافی ہے (یعنی صرف قرائن سے یہ محسوس ہو کہ اس نے مجھے عالم سمجھ کر یہ رقم ہبہ کی ہے، حالانکہ میں عالم نہیں ہوں، تو یہ رقم لینا حلال نہیں) کسی لڑکی کو پیغام دینے کے بعد اسے، یا اسکے ولی یا وکیل کو کچھ عطا کرے، تاکہ اس لڑکی سے نکاح کرے اور پیغام رد ہوگیا تو وہ چیز واپس لے سکتا ہے۔

اگر قرائن سے یہ اندازہ ہو کہ سامنے والا محض حیا وشرم کی وجہ سے عطا کررہا ہے (دل سے برضا ورغبت نہیں دے رہا ہے) تو امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ بالاجماع اس عطیہ کا لینا حرام ہے، اور لینے کے باوجود یہ مالک نہ بنے گا۔ (حاشیۃ الجمل علی فتح الوھاب ۲۰۱/۳)

کسی خیر کے وعدہ کا نبھانا اکثر ائمہ کرام کے نزدیک مستحب ہے، اور خلاف ورزی شدید مکروہ ہے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کسی سبب سے وعدہ ہو مثلاً تم شادی کرلو میں اتنی رقم دے دوں گا تو نبھانا واجب ہے، اور مطلق ہو تو واجب نہیں۔ فقہاء شافعیہ میں امام تقی الدین السبکیؒ نے ایفاء وعدہ کو واجب قرار دیا ہے۔ (ترشیح المستفیدین ص ۲۶۴)

علامہ شوبریؒ نے ابن حجرؒ سے نقل فرمایا ہے کہ نہ نبھانے کی نیت کے ساتھ وعدہ کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ (شبر املسی علی النھایۃ ۴۲۲/۵)

لُقَطَہ

تعریف: لُقطہ وہ مال ہے یا اختصاص محترم ہے، جو کسی غیر مملوک جگہ ملے، اور غیر محفوظ ہو اور پانے والا اس کے مستحق سے ناواقف ہو۔

اِختصاص: یعنی وہ شئی جس میں شرعاً ملکیت تو حاصل نہیں ہوتی لیکن کسی کے قبضۂ تصرف میں اور اس کے ساتھ مختص ہوسکتی ہے، مثلاً کتا، گوبر وغیرہ۔

محترم: یہ مال اور اختصاص کی صفت ہے، یعنی مال محترم ہو، یعنی شرعاً معتبر ہو، پس آلات لہو ولعب، شراب اور سور وغیرہ محترم مال نہیں، اسی طرح حربی کا مال بھی محترم نہیں ہے۔ اختصاص محترم یعنی شکاری کتا، حفاظت کا کتا وغیرہ۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ محترم نہیں۔

غیر مملوک جگہ یعنی ایسی جگہ جو کسی کی ملکیت نہ ہو، غیر محفوظ ہو یعنی اس پر حفاظت کی کوئی علامت نہ ہو، اور یہ کہ اس جگہ حفاظت کی

خاطر اسے رکھا گیا ہے، یا جگہ غیر محفوظ ہو، یعنی احاطہ بندی وغیرہ نہ ہو، اور اسے اشیاء کی حفاظت کے اعتبار سے بنایا اور متعین کیا گیا نہ ہو۔

مشروعیت : لُقطہ ملے تو اٹھالینا مشروع ہے، کیونکہ جب آپ ﷺ سے اس کے متعلق سوال ہوا، تو ارشاد فرمایا: ''اس کے بندھن اور ظرف کو پہچان لو (اور ذہن میں محفوظ رکھو)، پھر ایک سال تک اس کا اعلان کرو، اگر (مالک کو) نہ پہچان سکو تو (خود اس کا مالک بن کر) اسے خرچ کرے (استعمال کرے)، اور یہ (یعنی اس کی قیمت گویا) تمہارے پاس ودیعت ہوگی، پھر زندگی میں کسی بھی وقت اس کا مالک آ کر مطالبہ کرے تو اسے دے دو'' (متفق علیه)

حکمت : یہ تو ظاہر ہے کہ اپنی کسی چیز کے گم ہو جانے سے انسان کو غم اور افسوس ہوگا، پھر براہ راست اس تک پہنچ نہ پائے گا، کہاں کھو گیا یا بھول گیا کچھ پتہ نہیں، کبھی خیانت دار آدمی کے ہاتھ لگ جائے تو مالک اس سے بالکل ہی محروم ہو جائے گا، کبھی بے کار ایسے ہی پڑے پڑے وہ چیز بیکار ہو جائے گی، لہٰذا اس کے اٹھالنے میں لوگوں کو سہولت اور مصلحت کی تحصیل ہے، اٹھانے والا اصل مالک کو اس تک پہنچنے کا راستہ ہموار کرتا اور لوگوں کے مال پر ناحق قبضہ جمانے والوں کے لئے رکاوٹ بنتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نیکی اور تقویٰ کے امور پر معاون بنتا ہے، نہ کہ گناہ اور ظلم پر (المائدۃ : ۲) نیز اس حدیث پر عمل پیرا ہوتا ہے: ''اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد کرتے ہیں، جب تک بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔'' (مسلم شریف)

اس طرح جب گمشدہ شئی مالک کو مل جائے گی، تو وہ خوش ہوگا، اور اس کی رنجیدگی ختم ہو جائے گی، اور اٹھا کر پہچانے والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب کا مستحق ہوگا، آپ ﷺ فرماتے ہیں'' جو کسی مسلمان کی کسی دنیوی گھٹن اور مصیبت کو دور کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے مصائب میں سے اس کی ایک مصیبت دور کریں گے'' (مسلم شریف)

اسی طرح لوگ امن واطمینان کی زندگی بسر کریں گے، انہیں اپنے مال کی حفاظت کا یقین ہوگا، اگر گم بھی ہو جائے تو شریف نفوس اور امانت دار ہاتھ اسے اٹھا کر مستحق تک پہنچا دیں گے۔ اور آپسی محبت ومودّت اور بھائی چارگی کی فضا عام ہوگی۔

حکم : سابقہ تعریف کے مطابق کسی مسلمان کو لُقطہ نظر آئے تو اسے اٹھالینا مستحب ہے، جبکہ اپنی امانت داری پر اسے اطمینان ہو، اور نہ اٹھانے کی صورت میں اس چیز کے ضائع ہو جانے اور مالک تک نہ پہنچنے کا اندیشہ ہو، تاکہ اپنے بھائی کا مال محفوظ رہے۔

اگر ضائع اور برباد ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اٹھالینا مباح ہے، اٹھالے خواہ چھوڑ دے، اس جگہ اس کے علاوہ کوئی اور امانت دار شخص نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بربادی یقینی ہو تو پھر اٹھالینا واجب ہے، کیونکہ مسلمان کے مال کی حفاظت واجب ہے۔

کسی کو مستقبل میں اپنی امانت داری پر اطمینان نہ ہو، یہ خدشہ ہو کہ کہیں نفس اسے ہضم کر جانے پر نہ اکسائے، تو لقطہ اٹھانا مکروہ ہے۔ اگر یقین ہو کہ میرا نفس خیانت کرے گا، اور اٹھانے کی صورت میں حفاظت کے ساتھ مالک تک پہنچانے کی کوشش کے بجائے تو خود ہی قبضہ کر لے گا، تو اس صورت میں اٹھانا حرام ہے، اسی کے متعلق آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے'' گمشدہ چیز کو گمراہ ہی اٹھائے گا، جبکہ اس کا اعلان نہ کرے'' (مسند احمد)

حیوان کا لُقطہ: (الف) اگر چھوٹے درندوں سے اپنی حفاظت کر سکتا ہو، اپنی قوت کی وجہ سے، جیسے گھوڑا اور اونٹ، یا تیز رفتاری کی وجہ سے، جیسے ہرن اور خرگوش، تو صحرا میں ان کو پائے تو اپنے قبضہ میں لینا جائز نہیں، آپ ﷺ سے گمشدہ اونٹ کے متعلق سوال ہوا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ اور اسے اپنے حال پر چھوڑنے کا حکم دیا۔'' (بخاری شریف)

اونٹ پر دیگر ان حیوانات کو قیاس کیا جائے گا جو اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہوں۔ البتہ امن وامان کے دور میں حفاظت کی خاطر

اور مالک تک پہنچانے کی نیت سے ان حیوانات کو قبضہ میں لینے کی گنجائش ہے۔

اگر کسی بستی یا شہر میں یہ حیوانات ملیں تو مطلقاً قبضہ میں لینا جائز ہے۔

(ب) اگر حیوان اپنے دفاع اور حفاظت پر قادر نہ ہو: خواہ کمزور ہونے کی وجہ سے جیسے بکری وغیرہ، یا اپنی ظاہری مجبوری کی وجہ سے مثلاً بیمار اونٹ یا لنگڑا گھوڑا وغیرہ تو انہیں صحرا وغیرہ میں بھی لینا جائز ہے۔ آپ ﷺ سے گمشدہ بکری کے متعلق سوال ہوا تو اسے قبضہ میں لینے کی اجازت دی (بخاری شریف) دیگر کمزور جانوروں کو بھی بکری پر قیاس کیا جائے گا۔

غیر حیوان کا لُقطہ: حیوان کے علاوہ کوئی لقطہ ملے تو کمزور حیوان کی طرح مطلقاً اٹھالینا جائز ہے (سابقہ تفصیل کے مطابق)

حدیث: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: ایک مرتبہ مجھے سو دینار کا ایک بٹوہ ملا، تو میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ارشاد فرمایا: "ایک سال تک اس کا اعلان کرو" ایک سال اعلان کے باوجود اسے جاننے والا (مالک) نہ ملا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو فرمایا "ایک سال اعلان کرو" باوجود اس کے کوئی نہ ملا تو پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ارشاد فرمایا "اس کا ظرف، اور بندھن یاد رکھو، اگر مالک آجائے تو فبہا، ورنہ تم استعمال کرو" پس میں نے استعمال کیا۔ (متفق علیہ)

حرم کا لُقطہ: حرمِ مکہ میں کوئی لقطہ ملے تو، صرف حفاظت اور مالک تک پہنچانے کی نیت سے اسے اٹھا سکتا ہے، کبھی بھی وہ اسکا مالک نہیں بن سکتا، فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے حرم پاک کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا" یہاں کا لقطہ صرف اعلان کرنے والے کے لئے حلال ہے" (یعنی جو ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے) (متفق علیہ) اعلان کے لئے خود وہاں رکے، اگر مکہ سے کوچ کرنا ہو تو حاکم یا اس کے نائب کے سپرد کرے، تاکہ وہ اعلان کرکے بحفاظت مالک تک پہنچا سکے۔ (دور حاضر میں سعودی حکومت کی جانب سے ایسی اشیاء کے جمع کرنے کا مستقل دفتر ہے۔ وہاں جمع کردے، مالک خود تلاش کرنے پہنچ جائیگا، اور حاصل کرلے گا)

لقطہ اٹھانے پر گواہ رکھنا: یہ واجب نہیں ہے، کیونکہ لقطہ کی اکثر احادیث میں اسکا حکم نہیں ہے، البتہ مستحب ہے، گرچہ اٹھانے والا عادل ہو، تاکہ اس کا نفس مستقبل میں خیانت نہ کرے، یا اس کی موت کے بعد اس کے قبضہ میں ہونے کی وجہ سے وارث اپنی ملکیت میں نہ لے لے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جو کوئی لقطہ اٹھائے تو اس پر ایک یا دو (۲) عادل شخص کو گواہ بنالے۔" (ابوداود)

ایک یا دو میں اختیار استحباب پر دلالت کررہا ہے، اگر واجب ہوتا تو ایک ناکافی ہوتا، گواہوں کو لقطہ کے بعض صفات سے آگاہ کرے، نہ کہ تمام صفات اور تفصیلات سے، زیادہ وضاحت کرنا مکروہ ہے، گواہ رکھنے کی صورت میں غیر امانت دار کو پتہ چلنے اور ظلماً چھین لینے کا اندیشہ ہو تو گواہ رکھنا ممنوع ہے۔

لُقطہ کا اعلان: (۱) اگر لقطہ بالکل حقیر اور معمولی چیز ہو کہ عادتاً اس کے گم ہونے پر کوئی فکر اور کوئی جستجو نہیں کرتا، مثلاً ایک لقمہ، ایک کھجور وغیرہ (علاقہ اور وقت کے عرف کے مطابق) تو اٹھانے والا بغیر کسی اعلان کے ہی اس کا اعلان بن جائیگا۔ (فوراً وہ خود استعمال کرسکتا ہے)

حدیث: آپ ﷺ راہ میں ایک کھجور کے پاس سے گذرے تو فرمایا "اگر یہ صدقہ کا ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں نے کھالیا ہوتا۔" (متفق علیہ)

لیکن اگر مالک ظاہر ہو اور کہے کہ میں نے اس چیز کی طرف سے اعراض نہیں برتا تو اسے لوٹانا اور تلف ہو تو بدل لوٹانا واجب ہے۔ (الشروانی علی التحفۃ ۸/۲۴۵)

۲) اگر لقطہ کی کچھ قیمت اور اہمیت ہو، یعنی گم ہو جانے پر ایسی چیز کی تلاش اور جستجو ہوئی ہو، تو اٹھانے والے پر گذشتہ روایات کی رو سے اس کا اعلان واجب ہے، صرف حفاظت کی نیت سے اٹھائے، یا حفاظت کے بعد خود مالک بننے کی نیت سے، دونوں صورتوں میں اعلان واجب ہے۔

اعلان کی کیفیت: (۱) لقطہ کے تمام اوصاف کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے، تاکہ کوئی آکر دعویٰ کرے تو اس کی گمشدہ چیز کی تفصیلات کی روشنی میں صحیح فیصلہ کر سکے، کہ یہ لقطہ اسی کا ہے یا نہیں۔

لہٰذا لقطہ کسی برتن یا ظرف وغیرہ میں ہے تو اُسے یاد رکھے، اگر رسی وغیرہ سے بندھا ہوا ہو تو اس کی تفصیل یاد رکھے، چیز متعدد ہو تو گن کر تعداد معلوم کرلے، اسی طرح اس کی جنس ونوعیت اور دیگر صفات کو ذہن نشین کرلے۔

۲) جب خود لقطہ کے نمایاں اوصاف کو ذہن نشین کر چکا تو اب اس کے بعض صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا اعلان کرے، جس سے اصل مالک متنبہ ہو، صفات کو بالتفصیل نہ بتائے، ورنہ کوئی بدنیت غیر مستحق آکر ظلماً اپنی بتلا کرلے لے گا۔

۳) اگر لقطہ زیادہ قیمتی ہو، اور گم کرنے والا زیادہ مدت تک اس کی تلاش اور فکر وغم میں رہے گا، تو حدیث کی رو سے، ایک سال تک اس کا اعلان کرے (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے تین سال اعلان کا حکم دیا، یہ ورع اور فضیلت کے طور پر تھا، ورنہ بالاجماع ایک سال اعلان کافی ہے، کسی نے بھی تین سال اعلان کی شرط نہیں لگائی۔ شرح مسلم للنوویؒ)

ابتداءً ایک ہفتہ تک صبح وشام دو وقت اعلان کرے، پھر دوسرے ہفتہ میں دن میں ایک بار، پھر پانچ ہفتہ تک ہر ہفتہ میں ایک یا دو (۲) بار، پھر ہر ماہ ایک بار اعلان کرے، چونکہ ابتداءً تلاش شدید ہوگی، اس لئے اعلان بار بار رکھا گیا، اور یہ تفصیل علماء نے اپنے اجتہاد سے مستحب سمجھی ہے، ورنہ اصل مطلوب یہ ہے کہ صاحب حق کو اطلاع اور متنبہ ہو سکے، اور وہ اپنے حق تک رسائی حاصل کر سکے۔

اگر چیز زیادہ قیمتی نہ ہو، تو اتنی مدت تک اعلان کرے جب تک عموماً مالک ایسی چیز کی تلاش میں ہی رہے گا، جب اتنی مدت گذر جائے کہ گمان غالب یہ ہو کہ اب مالک اس کی تلاش ترک کر چکا ہوگا، تو مزید اعلان کی ضرورت نہیں۔ عرف اور قرائن سے غلبۂ ظن کے اعتبار سے لقطہ کے مناسب مدت کا اندازہ لگایا جائے گا، پس سو ۱۰۰ دینار اونٹ اور بکری وغیرہ ایسی قیمتی اشیاء ہیں کہ ایک سال ان کا اعلان ضروری ہے۔

۴) عام مقامات، بازار اور مسجد کے دروازے پر اعلان کرے، جہاں پر لوگ جمع رہتے ہیں۔ جہاں لقطہ ملا ہو، وہاں زیادہ اعلان کرے، کیونکہ اس جگہ مستحق کے تلاش کرنے کا زیادہ امکان ہے۔

مسجد میں اعلان مکروہ ہے۔ (بعض علماء نے اسے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے) کیونکہ اس میں آواز کا بلند کرنا، اور نمازی اور ذاکرین کے حق میں تشویش اور خلل پایا جا رہا ہے۔ حدیث میں اس پر ڈانٹ اور تنبیہ موجود ہے۔ فرمایا "جو مسجد میں کسی کو گمشدہ چیز کا اعلان کرتے سنے تو کہے، اللہ تعالیٰ تمہاری چیز تم کو نہ لوٹائے، کیونکہ مساجد اسلئے تعمیر نہیں ہوئیں" (مسلم شریف) اس ممانعت سے مسجد حرام مستثنیٰ ہے، وہاں اعلان جائز ہے۔

'الفقہ المنہجی' کے مؤلفین کی رائے میں اذان کے لاؤڈ اسپیکر (اور مائک) سے اس طرح کا اعلان حالات اور ماحول کے پیش نظر

اس ممانعت میں داخل نہیں، کیونکہ یہ آواز مسجد میں نہ گونجے گی، نیز باہر دور تک پہنچ جائے گی، جہاں تک عام انسانی آواز کی رسائی دشوار ہے، گرچہ اس سے احتیاط اور گریز بہتر ہے۔ البتہ اعلان کسی گمشدہ بچہ کی وجہ سے ہو تو کبھی یہ اعلان وجوب تک بھی پہنچ جائے گا۔

اعلان کے اخراجات: لقطہ اٹھانے والا خود اعلان کرے، یا کسی اور کے ذریعہ کرائے اگر خرچ آئے تو یہ مالک کے ذمہ ہے، کیونکہ اس کی ملکیت کی مصلحت کے لئے ہے۔ اب یہ مصارف قاضی بیت المال سے ادا کرے، یا مالک کے نام سے کسی سے قرض لے، یا خود اٹھانے والے کو خرچ کی اجازت دے تاکہ بعد میں مالک سے وصول کرے، یا لقطہ ہی کا ایک حصہ اس مقصد سے فروخت کرے، اگر لقطہ اٹھانے والا قاضی (حاکم) کی اجازت کے بغیر اپنے مال سے صرف کرے تو یہ اسکی جانب سے تبرع ہے، بعد میں مالک کا پتہ چلے تو اس پر اس کی ادائیگی لازم نہیں۔

لقطہ کے انواع اور تصرف کی کیفیت

۱) **اگر لقطہ حیوان ہو:** تو اسے باقی رکھ کر حاکم کی اجازت سے اس پر خرچ کرتا رہے، تاکہ مالک ظاہر ہونے پر یہ رقم اس سے وصول کرلے، اگر حاکم نہ ہو تو اس پر گواہ رکھے، اگر حاکم کی اجازت یا گواہ کے بغیر صرف کرتا ہے تو تبرع (مہربانی) شمار ہوگی، آئندہ مالک سے وصول نہیں کر سکتا۔

یا پھر۔ حاکم کی اجازت سے فروخت کر کے اس کی قیمت محفوظ رکھے، اگر ایسی جگہ ملے جہاں فروخت کی گنجائش نہ ہو، تو فی الحال اس کا مالک بن کر اسے کھا سکتا ہے، بعد میں مالک ظاہر ہو تو جس دن اس نے اپنی ملکیت میں لی، اس دن کی قیمت ادا کرے۔

۲) **اگر لقطہ حیوان نہ ہو،** لیکن فوراً بگڑنے یا سڑنے والی چیز ہو، تو اسے کھا جائے اور قیمت کا ضامن بنے یا حاکم کی اجازت سے فروخت کر کے قیمت محفوظ رکھے۔

۳) **اگر کسی طریقہ اور عمل سے لقطہ محفوظ رہے:** مثلاً تر کھجور کو خشک کرنا، دودھ کو پنیر بنانا، تو درج ذیل امور میں سے جو مالک کے حق میں بہتر ہو اس پر عمل واجب ہے۔

حاکم کی اجازت سے تمام فروخت کر کے قیمت محفوظ رکھے، یا اپنے طور پر حفاظت کا جو طریقہ ہے (یعنی خشک کرنا یا پنیر بنانا وغیرہ) اس پر عمل کرے (اور اس عمل کی اجرت نہ ملے گی)، مفت یہ خدمت انجام نہ دینا چاہے تو حاکم کی اجازت سے اتنا حصہ فروخت کردے کہ اس رقم سے بقیہ کی حفاظت کا طریقہ انجام پاسکے۔

۴) **اگر لُقَطہ بغیر کسی عمل کے اپنی حالت پر محفوظ رہ سکتا ہو:** تو اس پر اعلان کی لازمی مدت تک اس کی حفاظت واجب ہے۔ (جیسے سونا، چاندی، روپیہ، پیسہ، کتاب، گھڑی وغیرہ)

تنبیہ: یہ بات مدنظر رہے کہ جن صورتوں میں لقطہ فروخت کر کے قیمت محفوظ رکھی جاتی ہے، لازمی مدت تک اس لقطہ کا اعلان ضروری ہے، اعلان لقطہ کے متعلق ہی ہوگا، نہ کہ قیمت کے متعلق۔

لُقطہ کا مالک بن جانا

لازمی مدت تک اعلان کرنے کے باوجود مالک نہ ملے، اور وہ چیز ابھی باقی ہو یا بصورتِ فروخت اس کی قیمت، تو جسے لقطہ ملا ہے، وہ اس چیز کا مالک بن سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں گذر چکا، بعد میں بھی اصل مالک کا پتہ چل گیا تو مالک بننے کے دن کی قیمت اسے ادا

کرے گا۔ (اگر لقطہ مثلی ہو تو اس کا مثل ادا کرے گا، فتح الوھاب)

صریح لفظ مثلاً '' میں اس کا مالک بن گیا'' یا'' میں نے یہ چیز اپنی ملکیت میں لے لی'' یا کنایہ لفظ مع نیت جیسے'' میں نے لے لیا'' وغیرہ کے ذریعہ اس لقطہ کا مالک بن جائے گا، ایک قول یہ ہے کہ اعلان کی مدت گذر جانے کے بعد ملکیت کے قصد سے ہی بلا لفظ مالک بن جائے گا۔

لقطہ اٹھانے والے کا قبضہ اور لقطہ کی حفاظت: اٹھانے والے کو لقطہ کی اس کے مناسب محفوظ مقام میں حفاظت ضروری ہے، یہی بصورتِ فروخت اس کی قیمت کا حکم ہے، اب اس کی کوتاہی یا زیادتی کے بغیر کچھ نقصان وغیرہ ہو تو یہ ضامن نہ ہوگا، جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے'' تمہارے پاس بطور ودیعت کے رہے'' پس اعلان کی مدت کے دوران یہ اس کا ضامن نہیں، اسی طرح مدت کے بعد مالک بننے کا ارادہ نہ ہو تب بھی ضامن نہیں، لیکن لقطہ یا اس کی قیمت کو اپنی ملکیت میں لے تو ضامن بن جائیگا، لہٰذا آئندہ کسی بھی وقت مالک ظاہر ہو تو اسے اس کا بدل (مثل یا قیمت) ادا کرے گا۔

لُقطہ مُدّعِی کے سپرد کرنا: کسی نے آکر لقطہ کی ملکیت کا دعویٰ کیا تو اس سے تمام اوصاف دریافت کرے، اگر اس نے بالکل صحیح تمام اوصاف بتادیئے اور اٹھانے والے کو غالب گمان ہو کہ یہ سچا ہے تو لقطہ اس کے سپرد کرنا جائز ہے، بلکہ سنت ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا:'' پس اگر اس کا مالک آئے، اور لقطہ کے ظرف، بندھن اور تعداد (یعنی ساری تفصیلات) کو پہچانے وہ اس کے حوالے کردو'' (مسلم شریف)

مذکورہ صورت میں سپردگی کی اجازت اس وقت ہے، جبکہ ایک ہی شخص دعویٰ کرے، اگر صحیح وصف بیان کرنے والے زائد ہوں، تو بغیر حُجّت (گواہ) کے کسی کو بھی نہیں دیا جائے گا۔

اوصاف کی بنیاد پر کسی کو دینے کے بعد دوسرا کوئی حُجّت (گواہ وغیرہ) کے ذریعہ اپنی ملکیت ثابت کرے تو پہلے کے پاس سے لے کر اس کے سپرد کردیں گے، اگر اسکے پاس تلف ہو چکی ہو تو، اصل مالک لُقطہ اٹھانے والے اور پہلے مدّعی میں سے کسی کو بھی ضامن بنا سکتا ہے، اگر لقطہ اٹھانے والے کو ضامن بنائے تو وہ پہلے مدعی سے ضمان کی مقدار وصول کرے گا، جبکہ اس کی ملکیت کا اقرار نہ کیا ہو، اگر اس پہلے مدعی کی ملکیت کا اقرار کر چکا ہو تو اس سے وصول نہیں کر سکتا (فتح الوھاب)

بالکل صحیح اور باریکی کے ساتھ بھی مُدّعی اوصاف بیان کرے، تو اس کے سپرد کرنا واجب نہیں ہے۔ خواہ اسے اس کی ملکیت کا غلبہ ظن حاصل ہو، اگر وہ قاضی کے پاس گواہ پیش کرے، اور قاضی واپسی کا فیصلہ صادر کرے تب سپرد کرنا لازم ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے،'' ......بینہ (گواہ) مدعی پر ہے......'' (بخاری و مسلم) ، لہٰذا جب تک بینہ سے ثبوت پیش نہ کرے، محض دعویٰ کی وجہ سے دینا لازم نہ ہوگا۔

تنبیہ: جن مسائل میں قاضی کی اجازت یا اسے اطلاع وغیرہ کا تذکرہ ہوا، وہ اس وقت ہے جب کہ اس کا امکان بھی ہو، اور خود اس کی طرف سے ظلماً وہ چیز لینے اور مالک کی بربادی کا خطرہ نہ ہو، ورنہ قاضی کی طرف رجوع نہ کرے۔

متفرقات

۱) کھیتی کی گری پڑی بالیاں جس کے اٹھانے کا مالک کی طرف سے اہتمام نہیں ہوتا، ریتی کرتے وقت لوہے کے گرے ہوئے

ذرات اور روٹی وغیرہ کا رشید شخص کے ہاتھ سے گرا ہوا ٹکڑا، وغیرہ، جن کی طرف سے بے توجہی اور اعراض برتا جاتا ہے، اٹھا لینا جائز ہے، جو اٹھالے مالک بن جائیگا اور وہ اس میں تصرف کر سکتا ہے، اگر درخت کسی کمپاؤنڈ اور احاطہ میں ہو، تو اس کے اندر گرے ہوئے پھل اٹھانا حرام ہے، احاطہ نہ ہو لیکن عادتاً اس کے اٹھانے کی اجازت اور اس میں مسامحت نہ ہو تب بھی حرام ہے، احاطہ کے باہر گرے ہوئے پھل عرف و عادت کے اعتبار سے مباح ہوں تو حلال ہے ورنہ حرام ہیں۔ (ترشیح مع فتح المعین ص ۲۹۵ ، تحفہ ۸/۲۴۶)

۲) کسی کی مملوکہ زمین میں جو چیز ملے وہ اس زمین کے مالک کی ہے، جبکہ وہ اس کا دعویٰ کرے، ورنہ اس سے قبل مالک کی اسی طرح آخر تک پہنچے گا، آخری مالک اور زمین کو آباد کرنے والا بھی دعویٰ نہ کرے، تب وہ لقطہ شمار ہوگا، (تحفۃ المحتاج ۸/۲۱۲)

۳) مسلمان دار الحرب میں بغیر امان کے داخل ہو، اور وہاں کوئی مسلمان نہ ہو، تو جو چیز ملے وہ غنیمت ہے، اور امان سے داخل ہو، تو وہ لقطہ ہے (ء۔ م)

۴) ہوا میں اڑ کر کوئی چیز کسی کے گھر یا گود میں آ گرے، یا کسی بھاگتے ہوئے شخص نے گھر میں یا گود میں پھینک دیا، یا مورث کچھ ودیعت چھوڑ کر مر جائے اور مالک کا علم نہ ہو، تو یہ سب 'ضائع مال' ہے، نہ کہ لقطہ۔ اس طرح کا مال امام کی ذمہ داری میں جائیگا، وہ اس کی حفاظت کرے یا مناسب سمجھے تو فروخت کر کے قیمت محفوظ رکھے، یا بیت المال کے لئے قرض لے، جبکہ مالک کے ظہور کی توقع ہو، ورنہ بیت المال کے مصارف پر صرف کرے، اگر کہیں حاکم نہ ہو یا ظالم ہو، تو جس کے بھی قبضہ میں اس طرح کا ضائع مال موجود ہے، وہ خود یہ امور انجام دے۔ (تحفۃ المحتاج)

۵) کسی کے چپل بدل جائے، تو یہ دوسرے چپل لقطہ ہے، لہٰذا گذشتہ تفصیلات کے مطابق اعلان کے بعد یا مالک کے اعراض کے تحقق کے بعد ہی استعمال کر سکتا ہے، اس سے پہلے استعمال جائز نہیں، لیکن یہ معلوم ہو کہ سامنے والے نے عمداً اس کے چپل لئے ہیں، تو ظرف کے شرائط کے ساتھ اس کا فروخت جائز ہے۔ (تحفۃ المحتاج ۸/۲۱۳)

۶) چیل کوّے وغیرہ کے گھونسلے میں کوئی چیز ملے، اور یہ گھونسلہ کسی کی ملکیت کے اندر ہو تو بظاہر یہ ضائع مال کے حکم میں ہے، اور کسی کی ملکیت میں نہ ہو، مثلاً موات کی زمین، یا مسجد وغیرہ تو بظاہر یہ لُقطہ ہے۔ (حاشیۃ الشروانی علی التحفہ ۔ ۸/۲۳۴)

۷) کسی کا جانور چلنے سے عاجز ہو جائے اور مالک مجبوراً کسی جنگل یا صحرا میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے، پھر دوسرا شخص وہاں پہنچ کر اس کی دیکھ بھال کرے اور وہ قوی ہو جائے تو اب بھی اصل مالک کی ملکیت میں ہی رہے گا، اور اس شخص نے جو کچھ خرچ کیا وہ مالک سے واپس نہیں لے سکتا، کوئی شخص دوسرے کے ڈوبنے یا جلنے والے مال کو بچا کر نکال لے، یا کسی کا مال سمندر میں غرق ہو گیا، اور مالک اسے نکالنے اور سمندر کے باہر اسے پھینکنے تک وہیں قیام کرنے سے عاجز ہو، اور بعد میں سمندر اسے باہر پھینک دے، تو اصل مالک کی ملکیت میں ہی باقی رہے گا۔ (حاشیۃ الجمل ۔ ۳/۶۱۲)

لَقِیط (لاوارث بچہ ،گرا پڑا بچہ)

تعریف : سڑک وغیرہ پر پھینکا ہوا بچہ، جس کا کوئی مدعی (دعویدار) نہ ہو، اسے لقیط (اور مَلْقُوط یا مَنْبُوذ) کہا جاتا ہے۔

کسی لقیط کے اٹھانے اور پرورش کے متعلق قرآن وحدیث کے عام دلائل بکثرت موجود ہیں۔

آیات : (۱) وَافْعَلُوْا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ '' (الحج : ۷۷)

ترجمہ: "اور (تم ایسے) نیک کام (بھی) کیا کرو امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔"

(۲) وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى "(المائدہ : ۲) **ترجمہ:** "اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو۔"

(۳) وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً "(المائدہ۔ ۳۲) **ترجمہ:** "اور جو شخص کسی شخص کو بچالیوے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچالیا۔"

احادیث: (۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جو کسی مومن کی دنیوی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی کو دور کرے، اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی دور فرمائیں گے۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد کرتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے" (مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے اپنی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے" (یعنی اسے آپ ﷺ سے کافی قرب نصیب ہوگا) (بخاری شریف)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کریں گے" (ترمذی)

لقیط کو اٹھانے کا حکم: کہیں کوئی لقیط مل جائے، اور اس کا کوئی ذمہ دار اور سرپرست معلوم نہ ہو، تو اسے اٹھانا، اور اس کی تربیت وکفالت کرنا فرض کفایہ ہے۔ اگر کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی، اور وہ وہیں پڑا رہا، تو اس علاقہ کے وہ تمام افراد، جو اس واقعہ سے واقف تھے، گنہگار ہوں گے، اور کسی ایک نے بھی اسے اٹھا کر اس کی تربیت وپرورش وغیرہ کا نظم کیا، تو تمام سے گناہ ساقط ہوگا۔

جو شخص کسی لقیط کو اٹھالے، اسے لَاقِطْ یا مُلْتَقِطْ کہتے ہیں۔

اٹھانے پر گواہ رکھنا: جو پرورش وکفالت کی خاطر کسی لقیط کو اٹھالے، اسے اپنے اس عمل (یعنی اٹھانے پر) دو معتبر حضرات کو گواہ رکھنا واجب ہے، تاکہ لقیط کی آزادی ونسب کی حفاظت ہو، نیز اس کے ساتھ مال ہو، تو اس پر بھی گواہی واجب ہے، تاکہ تہمت کی گنجائش نہ رہے، اور لقیط کے مال کے حفاظت کی ضمانت حاصل ہو۔

لاقط کے شرائط: جہاں بھی لقیط کسی کو ملے، بلا کسی قید اور شرط کے اس کا اٹھانا فرض کفایہ ہے، اور کسی کے بھی اٹھانے سے دیگر حضرات سے یہ فریضہ ساقط ہوگا، البتہ لاقط کے پاس ہی اس بچہ کو رکھنے کے لئے درج ذیل شرائط ضروری ہیں۔

(۱) **اسلام:** لہٰذا کسی کافر کے پاس اسے نہیں رکھا جائے گا، اگر لقیط پر کفر کا حکم ہو، مثلاً کسی بھی طریقے سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے والدین کافر ہیں، تو اس صورت میں اسے کافر کے قبضہ میں رکھنے میں حرج نہیں۔

(۲) **عدالت:** لاقط عادل (دیندار ومعتبر) شخص ہو، اگر وہ فاسق وفاجر ہو، تو اس سے لے کر کسی دیندار وامانتدار شخص کے سپرد کریں گے۔

(۳) **رُشد:** اگر لاقط رشید نہ ہو، تو لقیط کو اس کے قبضہ میں نہیں رکھ سکتے۔

مذکورہ تفصیل کے مطابق لقیط کو لاقط کے قبضہ میں رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کرنا قاضی یا حاکم کی ذمہ داری ہے، کیونکہ جس کا کوئی ولی (ذمہ دار) نہ ہو، حاکم اس کا ولی ہوتا ہے۔

لاقط لقیط کو جنگل سے دیہات کی طرف، یا جنگل ودیہات سے شہر کی طرف منتقل کرسکتا ہے، کیونکہ یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے،

اس کے برعکس منتقل کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ لقیط کے لئے پریشانی اور دینی ودنیوی علوم کی تحصیل سے محرومی کا سبب بنے گا، اسے کسی جگہ سے اسی طرح کے دوسری جگہ منتقل کرسکتا ہے۔ مذکورہ انتقال کی اجازت اس وقت ہے، جبکہ راستہ اور مقصود منزل پرامن ہو، وہاں سے اخبار موصول ہوتے رہیں اور لاقط کی امانت داری آزمودہ ہو (فتح الوھاب)

لقیط کے مصارف: اگر لقیط کے ساتھ مال موجود ہو، تو یہ مال اس کی ملکیت شمار ہوگی، اور اسی مال کو اس پر صرف کیا جائے گا، حاکم لاقط کو اجازت دے کہ وہ اس مال میں سے لقیط کی ضروریات پر خرچ کرتا رہے، اگر لاقط حاکم یا قاضی کی اجازت کے بغیر بذات خود وہ مال لقیط پر خرچ کردے، تو ضامن ہوگا، اور خرچ کردہ مقدار بچہ کو لوٹانا لازم ہوگا، جیسے کسی یتیم کی ودیعت (امانت) اس کے ولی (سرپرست) کے پاس ہو، اور ولی حاکم کی اجازت کے بغیر اس پر صرف کرے، تو صرف شدہ مال کا ضامن ہوگا۔ اگر حاکم کی سہولت نہ ہو تو گواہ ٹھہرا کر صرف کرے۔

اس مال کا صرف کرنا حاکم کی اجازت پر اس لئے موقوف رکھا گیا ہے، کہ مالی ولایت اجنبی تو درکنار، باپ دادا کے علاوہ کسی دوسرے رشتہ دار کو بھی حاصل نہیں ہوتی، اور جن کا بھی ولی نہیں، حاکم ان کا مطلق ولی ہے، لہٰذا ان کے مختلف مالی تصرفات میں اس کی طرف رجوع کریں گے، اب یا تو وہ براہ راست خرچ کرے، یا لاقط کو اجازت دے۔

اگر لقیط کے ساتھ مال نہ ہو، تو مسلمانوں کے بیت المال میں مصالح عامہ کے مد سے اس کے مصارف کا انتظام کیا جائے گا، یہ مسئلہ بالاجماع ثابت ہے، نیز مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا، تو سب کا اس پر اتفاق ہوا کہ بیت المال ذمہ دار ہے۔

بیت المال سے ادا ہونے والی یہ رقم اس لقیط کا حق ہے، اس پر قرض نہیں ہے، لہٰذا آئندہ اس کے بالغ اور مالدار ہونے کے بعد یہ مصارف اس سے واپس نہیں لئے جائیں گے۔

اگر بیت المال میں گنجائش نہ ہو، تو حاکم اس لقیط کے نام سے قرض لے، یہ بھی ممکن نہ ہو، (یا حاکم وبیت المال کا نظم ہی نہ ہو)، تو مالدار مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کے مصارف برداشت کریں، اور یہ اس لقیط پر ان کا قرض شمار ہوگا۔ (جمل ۳/۶۱۶)

لقیط کا نسب: سابقہ تفاصیل سے یہ واضح ہو چکا کہ شریعتِ اسلامیہ نے لقیط کی تربیت وپرورش کو بڑی اہمیت دی ہے، اور اس میں کوتاہی کی وجہ سے وہ ضائع ہوجائے تو متعلقہ تمام افراد مجرم اور گنہگار ہوں گے، نیز حکومت نے اس مسئلہ پر توجہ نہ دی، اور والدین کی غیر موجودگی کی حتی الامکان تلافی کی کوشش نہ کی تو وہ بھی گناہ میں شریک ہوگی۔

اس اہتمام وترغیب کے باوجود، شریعت اس کی قطعاً روادار نہیں کہ کوئی بھی شخص اس لقیط کا نسب اپنے ساتھ جوڑے، اور اسے اپنا بیٹا قرار دے، لاقط ہو یا کوئی دوسرا، مرد ہو یا عورت۔

اسلامی بھائی چارگی اور انسانیت کے ناطے اس کی تربیت وکفالت واجب ہے، لیکن تبنی (اپنا بیٹا بنالینا) حرام وباطل ہے، کیونکہ نسب کی بنیاد ولادت یا نکاح پر ہے، اور ان دونوں میں ایسا کوئی رشتہ نہیں۔

تَبَنِّی کی حرمت: آیت: وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَاءَ کُمْ اَبْنَاءَ کُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاھِکُمْ " ترجمہ: " اور تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (سچ مچ کے) بیٹے نہیں بنادیا، یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے۔" (الاحزاب: ۴)

لقیط کا مذہب: اگر دارالسلام میں لقیط ملے، گرچہ وہاں ذمی آباد ہوں، یا ایسے علاقے میں ملے جسے مسلمانوں نے فتح

کرنے کے بعد کافروں کے قبضہ میں ہی رکھا ہو، اور وہاں کوئی مسلم موجود ہو، جس کو یہ لقیط پیدا ہونا ممکن ہو، تو اس لقیط کو مسلمان شمار کریں گے، یہی اسلام کے غلبہ کا تقاضا ہے، نیز حدیث میں ہے: ''اسلام برتر و غالب رہے گا۔ اس کے برعکس نہ ہوگا'' (احمد، دار قطنی)

اگر لقیط دار الحرب (کفار کے وطن) میں ملے، اور وہاں کوئی مسلم موجود نہ ہو، تو یہ لقیط کافر شمار ہوگا، اگر وہاں کئی مذاہب ہوں، تو اسلام سے قریب تر مذہب میں شمار ہوگا۔ اگر وہاں کوئی مسلم موجود ہو، جیسے تاجر، قیدی وغیرہ تو اسے مسلمان شمار کرینگے، اگر وہ مسلمان اس بچہ کی نفی کرے، تو نسب کی نفی میں اس کی بات معتبر ہوگی، نہ کہ اسلام کی نفی میں (مغنی: ۲/۴۲۳)

علاقہ کی وجہ سے اسلام کا حکم لگانے کے بعد کوئی ذمی، معاہد یا مستأمن اس لقیط کے اپنے ساتھ نسب کے متعلق بیّنہ (گواہ) پیش کرے، تو (نسب اور) کفر میں لقیط اس کے تابع ہوگا، اگر صرف بیٹا ہونے کا دعویٰ کرے، تو نسب ثابت ہوگا، لیکن کفر میں تابع نہ ہوگا۔ (بلکہ مسلمان ہی شمار ہوگا)۔ (مغنی المحتاج ۲/۴۲۲)

بچہ کا مذہب: لقیط کے علاوہ کسی بچہ کے اسلام کا فیصلہ درج ذیل دو (۲) اسباب کی بنا پر ہوگا۔

۱) ولادت: کسی بچہ کا نطفہ قرار پاتے وقت (یعنی اس کی ماں کے حاملہ ہوتے وقت) اس کے والدین میں سے کوئی ایک بھی مسلم ہو، تو بالاجماع وہ بچہ (یا بچی) مسلم ہے، بعد میں والدین کے ترکِ اسلام سے یہ فیصلہ تبدیل نہ ہوگا، یہ بچہ آئندہ بالغ ہونے کے بعد کفر اختیار کرے، تو یہ مرتد شمار ہوگا۔ والدین کی طرف سے اس بچہ کے نسب میں اوپر تک خاندان کے اندر کوئی بھی مسلم ہو، تو یہ بچہ اس کے تابع مسلم شمار ہوگا، خواہ اس سے قریبی رشتہ دار زندہ ہو۔

اگر حمل کے وقت والدین کافر ہوں، پھر اس بچہ کے بالغ ہونے سے قبل کسی بھی وقت ان میں سے ایک اسلام لائے، تو فوراً بچہ بھی مسلمان شمار ہوگا، خواہ زچگی سے قبل ہو یا بعد، حدِ تمیز سے پہلے ہو یا بعد میں۔

آیت: ''وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِإِیْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ'' ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا۔ ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ) میں ان کے ساتھ شامل کر دیں گے۔''

(۲) قید کرنا: اگر کوئی مسلمان کسی بچہ یا پاگل کو قید کر لے، تو اس کے تابع وہ بچہ بھی ظاہراً و باطناً مسلمان شمار ہوگا، جبکہ اسی فوج نے اس کے والدین میں سے کسی ایک کو قید نہ کیا ہو، اگر اس کے والدین میں سے کوئی ایک بھی قید ہوا ہو، تو بچہ اسی کے تابع اس کے مذہب پر شمار ہوگا۔

کوئی ذمی بچہ کو قید کر کے دار الاسلام لے آئے تو اسے مسلمان قرار نہیں دیں گے، بلکہ قید کرنے والے ذمی کے مذہب پر شمار ہوگا۔ (مغنی ۲/۴۲۳)

بچہ کا اسلام قبول کرنا: کوئی ممیز (باشعور نابالغ) بچہ بذاتِ خود اسلام قبول کر لے، تو (دنیوی اعتبار سے) یہ صحیح اور معتبر نہ ہوگا، جیسا کہ ایک غیر ممیز بچہ یا پاگل کا اسلام لانا بالاتفاق غیر معتبر ہے، کیونکہ یہ سب غیر مکلف ہیں۔ جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ ہے، امام احمد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، کہ وہ اس وقت بالغ تھے، بالفرض بالغ نہ بھی ہوں تو امام بیہقیؒ ''معرفۃ السنن والآثار'' میں فرماتے ہیں کہ ہجرت کے بعد احکام کا دارومدار بلوغ پر رکھا گیا، امام سبکیؒ فرماتے ہیں: یہ بات صحیح ہے، کیونکہ پندرہ سال کی عمر کے ساتھ احکام کا تعلق غزوۂ خندق کے سال جوڑا گیا۔ (جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق موجود ہے کہ اس سے قبل انہیں غزوہ میں شرکت کی اجازت نہ ملی، غزوہ خندق میں پندرہ (۱۵) سال کے ہو چکے تھے، اس لئے اجازت ملی)

اگر بلوغ سے قبل کوئی بچہ اسلام کا کلمہ پڑھتا ہو، تو مستحب ہے کہ نرمی سے اس کے والدین کو سمجھا بجھا کر اسے ان سے جدا کرے، تا کہ وہ اسے اسلام سے ہٹانے کی کوشش نہ کریں، لیکن وہ انکار کریں، تو جدا نہ کرے، امام سبکیؒ وغیرہ بعض علماء نے جدا کرنا واجب قرار دیا ہے۔

باطنی اور اخروی اعتبار سے اس کا اسلام معتبر ہوگا، اور وہ اس کی وجہ سے جنت میں جائے گا، لہٰذا ہم اسے روزہ نماز وغیرہ عبادتوں سے منع نہیں کریں گے۔

بالغ ہونے کے بعد وہ کفر پر چلے، تو ڈرا دھمکا کر اسلام کا مطالبہ کریں گے، اگر پھر بھی نہ مانے، تو اسے والدین کے سپرد کریں گے۔

ایک مکلّف شخص گفتگو پر قادر ہو، تو زبان سے اسلام قبول کرے، اگر گونگا ہو تو صرف اشارہ سے اس کا اسلام صحیح ہوگا۔

کفار کے بچے : زبان سے اسلام قبول کئے بغیر کافر کی اولاد مرے، تو اس کے متعلق کافی اختلاف ہے، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، کیونکہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، (اور چونکہ بالغ ہو کر اس فطرت کے بگڑنے کا وقت آنے سے قبل ہی مر گیا، جبکہ غیر مکلف ہی تھا، تو جنت میں جائیگا)، لہٰذا اس دنیا میں تو ان کا حکم کافروں کی طرح ہے، پس نہ ان کی نماز جنازہ ہوگی، اور نہ مسلمانوں کے مقبرہ میں دفنایا جائے گا، اور آخرت میں مسلمانوں کا حکم ہوگا۔ (مغنی ۔ ۲/۴۲۴) (اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں فتح الباری شرح البخاری ۳/۲۴۶)

لقیط کا استلحاق: (یعنی کسی کا اس کے نسب سے خود کو جوڑنا): اگر کوئی آزاد شخص کسی لقیط کا نسب خود سے الحاق کرے، تو یہ اس کے ساتھ لاحق ہو جائے گا۔ (اس کا نسب اس سے جڑ جائے گا)، جبکہ اقرار کے باب میں مذکورہ شرائط موجود ہوں، اب اس کی تربیت وغیرہ کا یہی مستحق ہوگا۔ اگر کسی عورت نے اس طرح استلحاق کیا تو بغیر گواہوں کے تسلیم نہ کریں گے۔

اگر دو آدمی استلحاق کریں تو جس کے پاس بینہ ہو، اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، اگر بینہ نہ ہو تو لقیط اور دونوں مدعی کو قائف (قیافہ شناس) کے روبرو پیش کریں گے، اب وہ جس سے نسب جوڑے، اس سے جڑے گا، اگر قائف نہ ہو، یا وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے، یا دونوں سے نفی کرے، یا دونوں سے الحاق کرے تو ان صورتوں میں اس بچہ کے بالغ ہونے کے بعد اسے حکم دیا جائیگا کہ ان دونوں میں سے جس کی طرف اس کا طبعی میلان ہو، اس سے اپنے نسب کا الحاق کرے، محض اس کی خواہش کا (بغیر طبعی میلان کے) اعتبار نہ ہوگا، بیہقی میں بسندِ صحیح مروی ہے، کہ ''دو آدمیوں نے ایک کے بارے میں دعویٰ کیا، اور ان میں سے کون اس کا باپ ہے، پتہ نہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ دونوں میں سے جس کی چاہو اتباع کرو''۔ بلوغ سے پہلے اس کے اختیار کا اعتبار نہ ہوگا۔

اگر کسی کی طرف بھی اس کا میلان نہ ہو، تو معاملہ موقوف ہی رہے گا، اگر اس نے کسی تیسرے کی طرف نسبت کی اور وہ تصدیق کرے، تو اس سے نسب ملحق ہوگا۔ اگر یہ ایک کی طرف انتساب کرے، اور قائف دوسرے کی طرف، تو قائف کا فیصلہ مقدم ہوگا۔

اگر دونوں متعارض بینہ پیش کریں، تو یہ ساقط ہوگا، اور قائف کے فیصلہ کا اعتبار ہوگا۔ (مغنی ۔ ۲/۴۲۷)

اسلام : لوگوں میں اصل اسلام ہے، لہٰذا کسی بچہ یا پاگل پر کفر کا حکم عائد نہ ہوگا، ہاں اگر اس کے اصول (ماں باپ وغیرہ) کا کافر ہونا معلوم ہو، یا ایسے دار الکفر میں ملے جہاں ایسا کوئی مسلمان نہ ہو، جس کا یہ بچہ ہو سکتا ہو، (تو اس پر کفر کا حکم ہوگا)۔

اگر بچہ کے والدین کا مذہب جدا ہو، تو اس میں جو اسلام سے زیادہ قریب ہوگا، وہی اس بچہ کا مذہب قرار پائے گا۔

(قلائد الحزائد ۱/۶۶۵)

وصیت

آیت : (۱) كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْراَ الْوَصِيَّةُ ۔(البقرۃ : ۱۸۰) **ترجمہ:** ”تم پرفرض کیا جاتا ہے، کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے، بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو، تو وصیت کر جائے۔“

(۲) میراث کی تقسیم کی تفصیل کے بعد ارشاد فرمایا: ”مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِي بِهَا اَوْدَيْنٍ “(النساء : ۱۱) **ترجمہ :** (وارثوں کے یہ سب حصے) وصیت (کے قدر مال) نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جائے یا دَین (اگر ہو تو اس کے بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے)

(۳) يَاآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ......“ (المائدہ : ۱۰۶)

ترجمہ : ”اے ایمان والو! تمہارے آپس میں دو شخص وصی ہونا مناسب ہے، جبکہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے (یعنی) جب وصیت کرنے کا وقت ہو (اور) وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں“

احادیث : (۱) ”کسی مسلمان کے لئے یہ زیبا اور مناسب نہیں کہ اس کے پاس وصیت کے قابل کوئی چیز ہو، اور وہ دوراتیں بھی اس حالت میں بسر کرے، کہ وصیت اس کے پاس تحریر شدہ نہ ہو۔“ (متفق علیہ)

۲) ”محروم وہ ہے، جو وصیت سے محروم ہے“ (ابن ماجہ)

صحابہ کرام کے مقدس دور سے آج تک تمام فقہاء کرام وصیت کے جواز پر متفق ہیں، کسی سے بھی اس اجماعی مسئلہ سے اختلاف مروی نہیں۔

تعریف : عربی زبان میں وصیت کا لفظ ایصال یعنی ملانے اور جوڑنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ شرعاً، موت کے بعد کی طرف منسوب کرتے ہوئے کسی حق کے تبرع کو وصیت کہا جاتا ہے۔ (تبرع یعنی بلا عوض تصرف، جیسے صدقہ، ہدیہ وغیرہ)

چونکہ ایک آدمی وصیت کے ذریعے اپنے عاقبت کی بھلائی کو دنیاوی بھلائی کے ساتھ جوڑتا ہے اس لئے اسے وصیت کہا جاتا ہے۔

عام تصرفات مثلاً ہبہ وغیرہ میں اپنی زندگی میں ہی تملیک ہوتی ہے، جبکہ وصیت میں یہ تملیک موت کے بعد کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

وصیت کرنے والے کو مُوصِی، جس کے حق میں وصیت ہوا سے مُوصیٰ لہٗ، اور جس چیز کی وصیت کی جائے اسے مُوصیٰ بِہٖ کہا جاتا ہے۔

زندگی میں صدقہ : اپنی زندگی میں ہی صدقہ ادا کرنا وصیت کے مقابلہ میں افضل اور مزید ثواب واجر کا باعث ہے، کیونکہ اس سے جلد ثواب کا حصول ہوتا ہے، نیز یہ ایک انسان کے ایمانی قوت اور نیک اعمال سے اس کے تعلق اور محبت پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ صحت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے۔ (قلائد ۲/۱۲)

ارشاد باری ہے: ”فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ “(المائدۃ : ۴۸) ترجمہ: ”......تو مفید باتوں کی طرف دوڑو۔“ نیز فرمایا ”وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ “(المنافقون : ۱۰) ترجمہ: ”اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے، اس میں سے اس سے پہلے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو۔“

اور آپ ﷺ سے ایک شخص نے افضل صدقہ کے متعلق پوچھا، تو ارشاد فرمایا: ”ایسے وقت تمہارا صدقہ کرنا جبکہ تم تندرست اور مال

کے حریص ہو، تمہیں فقر و فاقہ کا اندیشہ ہو، اور مالداری کی امید ہو، اور اتنی تاخیر نہ کرو کہ روح حلق میں پہنچ جائے (یعنی بظاہر موت بالکل قریب معلوم ہو) اور اس وقت کہنے لگو: فلاں کو اتنا، اور فلاں کو اتنا، حالانکہ وہ تو فلاں کا (یعنی وارثوں کا حق) ہو چکا'' (متفق علیہ)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے موت کے وقت غلام آزاد کرنے والے کو شکم سیر ہونے کے بعد ہدیہ دینے والے کے مثل قرار دیا ہے۔ (ترمذی)

حکمت: شریعت کے عام اصول کی رو سے وصیت جائز نہیں ہونی چاہئے تھی، کیونکہ یہ ایسے وقت کی طرف منسوب ہے، جس میں وصیت کرنیوالے کا اپنے مال میں درحقیقت کوئی حق باقی نہیں رہتا، کیونکہ موت سے ملکیت ختم ہو جاتی ہے، لیکن موصی اسکے رشتہ دار اور اسلامی معاشرہ کے مصلحت کے پیش نظر شریعتِ اسلامیہ نے وصیت کو جائز قرار دیا ہے۔

وصیت کے ذریعے موصی ثواب حاصل کرتا ہے، اور اس کی موت کے بعد بھی اس کا ذکر خیر باقی رہتا ہے اور وصیت چونکہ عموماً ایسے رشتہ داروں کے حق میں ہوتی ہے، جو شریعت کے نظامِ وراثت کی رو سے وراثت سے محروم رہتے ہیں، اور محتاج ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا فائدہ ہوتا ہے۔

نیز وصیت اکثر مساجد، مدارس، اسپتال وغیرہ عمومی نفع کے وسائل کے متعلق ہوتی ہے، اور کبھی فقراء یتیم بچے اور اہل خیر حضرات کے حق میں ہوتی ہے، جس سے اجتماعی امور کے مصلحت کی تحصیل اور بڑی خیر و برکت وابستہ ہے۔

وصیت کا حکم: ابتداء اسلام میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۰ کی رو سے سارے مال کی والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت واجب تھی۔ بعد میں میراث کی آیات نازل ہوئیں تو یہ وجوب منسوخ ہو گیا، اور مختلف خیر کے راستوں میں ایک تہائی یا اس سے کم کی وصیت کا استحباب باقی رہا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''بلاشبہ اللہ عز و جل نے ہر صاحبِ حق کو اسکا حق دے دیا (یعنی وارثوں کے حصے متعین کر دیئے)، تو اب کسی وارث کے حق میں وصیت کی گنجائش نہیں'' (ترمذی، نسائی)

مختلف صورتوں میں وصیت کا حکم

عام حالات میں وصیت مستحب ہے۔ بعض حالات میں اس کا حکم بدل جاتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱) **وجوب:** اگر کسی انسان کے ذمہ اللہ کا یا کسی آدمی کا کوئی شرعی حق ہو، مثلاً زکات، حج، ودیعت یا دَین وغیرہ، اور وصیت نہ کرنے کی صورت میں اس کے ضائع ہونے اور عدمِ ادائیگی کا خطرہ ہو، تو وصیت کر جانا واجب ہے، جبکہ ایسے حضرات کو اس کا علم نہ ہو، جن کے ذریعے یہ حق ثابت ہو سکے۔

۲) **حرمت:** کسی ایسے چیز کی یا ایسے مصرف کے لئے وصیت کرنا، جو شرعاً حرام ہے، جائز نہیں مثلاً شراب کی وصیت یا مندر کے لئے وصیت، ایسی وصیت باطل ہے، اور نافذ نہ ہوگی۔

وارثوں کو نقصان پہنچانے اور شریعت سے ان کے لئے مقررہ حصے سے روکنے کے ارادہ سے وصیت کرنا بھی حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے وصیت کے ذریعے ضرر پہنچانے سے منع فرمایا ہے۔ (دیکھئے سورۃ النساء ۱۲)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص اور ایک عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، پھر جب موت کا وقت آتا ہے، تو

وصیت میں (دوسروں کو) ضرر پہنچاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے لئے جہنم واجب ہو جاتی ہے، (ابوداود، ترمذی)

۳) **اباحت:** اپنے کسی دوست یا کسی مالدار کیلئے وصیت کرنا، جس میں کوئی علمی فضیلت یا بزرگی نہ ہو، اگر اس وصیت سے حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کا ارادہ ہو، تو یہ مندوب (مستحب) شمار ہوگا۔

۴) **کراھت:** موصی کا مال کم ہو، اور اس کے ورثاء غریب اور محتاج ہوں، تو وصیت مکروہ ہے، اسی طرح نافرمانوں اور بدکاروں کے لئے بھی وصیت مکروہ ہے، جبکہ موصی کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ لوگ اس مال کو گناہ اور معصیت کے کام پر صرف کریں گے۔

وصیت کے ارکان

(۱) **مُوصِي** (وصیت کرنے والا) (۲) **مُوصٰی لَهٗ** (جس کے حق میں وصیت ہو) (۳) **مُوصٰی بِهٖ** (جس چیز کی وصیت کی جائے) (۴) **صیغه**۔

۱) مُوصِی کے شرائط:

(الف) عقل: لہٰذا کسی پاگل یا بے ہوش کی وصیت درست نہیں، اسی طرح جسے بغیر گناہ کے نشہ آئے، اس کی وصیت بھی معتبر نہیں۔

(ب) بلوغ: کسی بچہ کی وصیت، خواہ وہ ممیز ہو، معتبر نہیں۔ (بعض شافعی فقہاء کے نزدیک ممیز بچہ کی وصیت صحیح ہے، کیونکہ اس سے فی الحال ملکیت کا خاتمہ نہیں ہوتا، نیز موت کے بعد اسے ثواب کا فائدہ حاصل ہوگا۔ مغنی المحتاج ۳۹/۳)

(ج) اختیار: وصیت موصی کے اختیار اور مرضی سے ہو، اگر کسی کے جبر و اکراہ سے ہو تو صحیح نہیں۔

(د) آزادی: کسی بھی قسم کے غلام کی وصیت صحیح نہیں ہے۔

کسی کافر یا سفاہت کی وجہ مجحور شخص کی وصیت صحیح ہے۔

(۲) مُوصیٰ لَهٗ کے شرائط:
اس کی دو قسمیں ہیں (۱) معین (۲) غیر معین

(۱) معین موصیٰ له کی شرائط:

(الف) موصیٰ کے انتقال کے وقت اس کا مالک بننا متصور ہو، پس کسی میت یا جانور کے لئے وصیت درست نہیں، اگر یہ صراحت کرے کہ جانور کے چارہ پر صرف کرنے کے لئے وصیت کر رہا ہے، تو درست ہے، اور اس صورت میں اس جانور کے مالک کے حق میں وصیت سمجھی جائے گی، کیونکہ چارہ اسی پر لازم ہے، اور موصیٰ کے غرض کی رعایت کرتے ہوئے اس رقم کو اس کے چارہ پر ہی صرف کرنا لازم ہے۔

اگر ایسے حمل کے لئے وصیت کرے، جو بوقتِ وصیت موجود ہو، تو صحیح ہے۔ لہٰذا وصیت سے چھ ماہ کے اندر پیدا ہو تو وصیت نافذ ہوگی، کیونکہ یہ حمل کی کم سے کم مدت ہے اگر اس کے بعد پیدا ہو، اور عورت کسی کی بیوی ہو، تو نافذ نہ ہوگی۔ عورت کسی کے نکاح میں نہ ہو، اور وصیت سے چار سال کے بعد بچہ پیدا ہو، تو یہ وصیت کا مستحق نہ ہوگا، لیکن چار سال کے اندر پیدا ہو، تو مستحق ہوگا۔ (مغنی ۴۱/۳)

(ب) عدمِ معصیت: لہٰذا کسی کافر کے لئے مسلمان غلام یا قرآن مجید کی وصیت صحیح نہیں۔ نیز کسی حربی کے لئے ہتھیار کی وصیت درست نہیں، کیونکہ ان صورتوں میں معصیت پائی جارہی ہے۔

(ج) معین ھو: اگر کہے: ان دو میں سے ایک کے لئے وصیت، تو یہ درست نہیں، کیونکہ موصیٰ لہ مجہول ہے۔

(د) وصیت کے وقت موجود ہو، لہٰذا آئندہ قرار پکڑنے والے حمل کے لئے، یا تعمیر ہونے والی مسجد کے لئے وصیت صحیح نہیں۔

کسی مسجد، مدرسہ، مسافر خانہ یا اسپتال کی تعمیر، یا ترمیم یا مصالح کے لئے وصیت کرنا معین کے حق میں وصیت کی طرح ہے۔

اگر وصیت کے الفاظ مطلق ہوں (یعنی اس میں کوئی قید نہ ہو)، صرف یوں کہا کہ ''میں نے اس مسجد کے لئے وصیت کی''، تعمیر یا مصالح وغیرہ کا تذکرہ نہ کیا، تو یہ وصیت صحیح ہے، اور مسجد کے مصالح پر صرف کیا جائے گا، جیسا کہ عرف کا تقاضا ہے۔

قاتل کے حق میں وصیت صحیح ہے، نیز وارث کے حق میں بھی صحیح ہے، جبکہ دیگر ورثاء اجازت دیں، جیسا کہ تفصیل آئے گی۔ قاتل کے لئے وصیت کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کے لئے وصیت کرے، پھر وہی اسے قتل کردے، اگر یوں وصیت کرے کہ جو دوسرے کو ظلماً قتل کرے، اس کے لئے تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ معصیت ہے۔ (جمل)

(۲) غیر معین مُوصیٰ لہ کے شرائط: اگر وصیت کسی معین کے لئے نہ ہو، بلکہ کسی عام جہت کے لئے ہو، مثلاً فقراء، علماء، مساجد، مدارس وغیرہ، تو یہ ضروری ہے کہ کسی گناہ کی جہت کے لئے وصیت نہ ہو، لہٰذا غیر مسلموں کے عبادت خانہ کے لئے وصیت صحیح نہیں جن عام جہتوں کے لئے وصیت صحیح ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:

الف— فی سبیل اللہ (راہِ خدا میں)، اگر کوئی کہے: میں نے تہائی مال کی فی سبیل اللہ وصیت کی، تو صحیح ہے، اور زکات کے مصارف میں جن غازیوں اور مجاہدین کا تذکرہ ہوا، ان پر صرف کیا جائے گا، کیونکہ یہی شریعت کا عرف ہے۔

ب— علماء، اگر علماء کے لئے وقف کرے تو صحیح ہے، کیونکہ ان پر صرف کرنا قربت ہے، لیکن یہ وصیت علماء اسلام یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقیدہ وغیرہ اسلامی علوم کے حاملین علماء پر صرف کریں گے، کیونکہ عرفاً یہ لفظ انہیں کے لئے مشہور ہے، لہٰذا ادیبوں، انجینئروں اور ڈاکٹروں وغیرہ پر جو دنیوی فنون کے ماہر ہیں، صرف نہیں کیا جائے گا،

اگر کسی دور میں عرف بدل جائے، اور لفظ 'علماء' کا اطلاق عام طور پر کسی بھی علم وفن کے ماہر کے لئے مستعمل ہو، تو اس صورت میں تمام علماء پر صرف کیا جاسکتا ہے۔

ج— فقراء، فقراء کو وصیت میں مساکین بھی شامل ہونگے، اسی طرح مساکین کے لئے وصیت کرے تو اس میں فقراء بھی شمار ہوں گے۔ ان میں سے کسی تین کو دینا کافی ہے، کیونکہ یہ (عربی زبان میں) اقل جمع ہے۔

د— اہل بیت، اگر آپ ﷺ کے اہلِ بیت کے لئے وصیت کرے تو بنو ہاشم اور بنو المطلب کے افراد کو دیا جائے گا، ان میں سے کسی تین کو دینا بھی کافی ہے۔

ھ— اقارب (رشتہ دار)، اس میں والدین کی جانب سے موصی کے تمام رشتہ دار داخل ہوں گے، جو کہ وارث نہ بن رہے ہوں۔

و— حج و عمرہ: اگر اپنے مال کی ایک مقدار حج وعمرہ کے لئے وصیت کر جائے، تو یہ صحیح ہے، اور یہ رقم حج وعمرہ کرنے والوں کے سپرد کی جائے گی۔

اگر اپنی جانب سے حج کرانے کی وصیت کرے، تو صحیح ہے، وصیت کے مطابق اس کی بستی یا میقات سے حج کرائیں گے، اگر وصیت میں کچھ صراحت نہ کرے، تو میقات سے حج کرائیں گے، کیونکہ یہ کم سے کم درجہ ہے، اور عام عمل اسی پر تھا، لیکن اب عمل اور عرف

بدل چکا ہے، لہٰذا موصی کی بستی سے حج کرایا جائے۔

۳) موصیٰ بہ کے شرائط :

الف – موصیٰ بہ شرعاً قابلِ انتفاع ہو، جس سے انتفاع حرام ہو، اس کی وصیت صحیح نہیں، مثلاً آلاتِ موسیقی، جوا وغیرہ۔

ب – موصیٰ بہ دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے قابل ہو، لہٰذا قصاص یا حقِ شفعہ کی وصیت درست نہیں، کیونکہ ان کا مستحق دوسرے کی طرف یہ حق منتقل نہیں کرسکتا۔

مذکورہ دونوں شرائط کی روشنی میں درج ذیل امور میں وصیت درست ہے۔

(۱) مجہول مال کی وصیت صحیح ہے، مثلاً جانور کے پیٹ کا حمل، تھن کا دودھ، پشت پر موجود اون وغیرہ۔

۲) بوقتِ وصیت جو چیز معدوم (غیر موجود) ہو، اس کی وصیت صحیح ہے، مثلاً آئندہ پیدا ہونے والے پھل یا حمل کی وصیت۔

۳) مبہم کی وصیت صحیح ہے، مثلاً: میرا ایک کپڑا وصیت کرتا ہوں، بعد میں وارث معین کرے گا۔

۴) منافع کی وصیت مؤقت (عارضی ووقتی) اور مؤبد (مستقل اور ہمیشہ کے لئے) صحیح ہے۔ لہٰذا ایک چیز کی وصیت کسی کے لئے اور اس کی منفعت دوسرے کے حق میں وصیت کرسکتا ہے مثلاً اپنے مکان کو زید کیلئے اور اس کی رہائش خالد کے لئے وصیت کرے۔

۵) ایسی نجاست جس سے انتفاع حلال ہو، اس کی وصیت صحیح ہے، مثلاً مُعلَّم کتا (شکار کے لئے سدھایا ہوا کتا)، گوبر، سرکہ کی نیت سے بنائی ہوئی شراب وغیرہ، کیونکہ یہ اشیاء وراثت میں منتقل ہوتی ہیں۔

۴) صیغہ کے شرائط:

(الف) وصیت صریح یا کنایہ لفظ کے ذریعے ہو۔

صریح الفاظ : میں نے اس کے لئے ہزار روپے کی وصیت کی، اسے میری موت کے بعد ہزار دے دو، یہ ہزار میرے مرنے کے بعد اس کے ہیں۔

صریح لفظ کے محض ادا کرنے سے وصیت منعقد اور صحیح ہوگی، کسی کا یہ کہنا معتبر نہ ہوگا کہ اس نے وصیت کی نیت سے نہیں کیا تھا۔

کسی گونگے کے واضح اور سمجھ میں آنے والے اشارہ کا بھی یہی حکم ہے۔

کنایہ میں لفظ کے ساتھ نیت بھی ضروری ہے، کیونکہ لفظ میں غیر وصیت کی بھی گنجائش ہے، لہٰذا نیت سے مفہوم کی تعیین ہوگی۔

کنایہ : میری یہ کتاب زید کی ہے۔

گفتگو پر قادر شخص کی تحریر کنایہ ہے، نیت ہو تو اس سے وصیت منعقد ہوگی، جیسا کہ بیع کا حکم ہے۔

(ب) - اگر موصیٰ لہٗ معین ہو، تو اس کا قبول کرنا شرط ہے اگر جہت عامہ کے لئے ہو، جیسے فقراء علماء وغیرہ، تو قبول شرط نہیں، کیونکہ دشوار ہے، اس صورت میں موصیٰ کے مرنے سے وصیت لازم ہوگی۔

(ج) مُوصیٰ لہٗ کا قبول کرنا موصی کی موت کے بعد، پس موصی کی زندگی میں اس کا قبول یا رد کرنا معتبر نہ ہوگا، کیونکہ ابھی اسکا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر موصی کی زندگی میں قبول کرے اور موت کے بعد رد کرے، یا اس کے برعکس کرے، تو یہ صحیح ہے، اور موت کے بعد کا فیصلہ معتبر ہوگا۔

اگر مُوصیٰ لہٗ مُوصی سے قبل مرجائے تو وصیت باطل ہوگی، اگر موصی کے بعد لیکن قبول کرنے سے قبل جائے تو وصیت صحیح ہے، اب

اس کے ورثاء کو قبول یا رد کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

وصیت کے حدود

۱) موصی کے لئے بہتر اور مستحب یہ ہے کہ اپنے تہائی مال سے زائد کی وصیت نہ کرے، کیونکہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اس سے زائد کی وصیت کرنا چاہی، تو آپ ﷺ نے اجازت نہ دی، صرف ایک تہائی کی اجازت دی (متفق علیه)

ایک تہائی سے زائد کی وصیت مکروہ ہے، اگر کسی نے زائد وصیت کی اور وارثوں نے اس اضافہ کی اجازت نہ دی، تو یہ باطل ہے، کیونکہ یہ ان کا حق ہے، اور اگر انہوں نے اجازت دی، تو یہ اضافہ نافذ اور صحیح ہوگا۔

اگر موصیٰ کا کوئی وارث نہ ہو، اور وہ ایک تہائی سے زائد وصیت کرے، تو یہ اضافہ لغو ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کا حق ہے، لہٰذا اجازت کا سوال نہیں۔

وارثوں کی رعایت کرتے ہوئے ایک تہائی سے بھی کچھ کم وصیت کرنا مستحب ہے، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ایک تہائی کی اجازت مرحمت فرمائی اور فرمایا: ''تہائی بہت ہے'' نیز اسی روایت میں وارثوں کو مالداری کی حالت میں چھوڑ جانا محتاج اور بھیک مانگتے ہوئے چھوڑنے سے بہتر بتلایا۔

۲) موصیٰ کی موت کے وقت مال کا اعتبار ہوگا، نہ کہ وصیت کے وقت، کیونکہ وصیت موت کے بعد تملیک ہے۔ پس اگر کسی نے دو ہزار کی وصیت کی، اور اس وقت اس کے پاس کل ۶ ہزار ہو، لیکن بوقت موت یہ مقدار گھٹ کر تین ہزار کو پہنچ چکی، تو تین ہزار کا تہائی یعنی ایک ہزار کی وصیت صحیح، اور مزید ایک ہزار کی وصیت وارثوں کی اجازت پر موقوف ہوگی، اگر اجازت دیں تو نافذ، ورنہ باطل قرار پائے گی۔

۳) میت کے ذمہ جو قرض ہو، اس کی ادائیگی کے بعد بقیہ کے ایک تہائی کا اعتبار رہوگا۔ دین (قرض) بالاجماع وصیت پر مقدم ہے۔ اگر تمام ترکہ قرض میں چلا جائے، تو اس کی وصیت بالکل نافذ نہ ہوگی۔

اگر موصیٰ کی وصیت اور مرض الموت کے تبرعات (صدقہ، ہبہ وغیرہ) کی مجموعی مقدار ایک تہائی سے زائد ہو، اور ورثاء اضافہ کی اجازت نہ دیں، تو ان امور میں حسب ذیل ترتیب ملحوظ ہوگی۔

۱) اگر ان تبرعات میں بعض معلق اور بعض مُـنَـجَّزْ (فوری اور نقد) ہو، تو منجز کو مقدم رکھا جائے گا۔ مثلاً کسی نے اپنا ایک لاکھ کا مکان وقف کیا، اور ایک لاکھ کی وصیت کی اور بوقتِ موت اس کا کل ترکہ تین لاکھ ہو، تو وقف مقدم ہوگا، اور وصیت لغو قرار پائے گی، البتہ وارث اجازت دیں تو نافذ ہوگی، کیونکہ مرض الموت کے تبرع کا بھی ترکہ کی ایک تہائی میں شمار ہوگا۔

۲) اگر اس کے سارے تبرعات مابعد الموت سے متعلق ہوں، اور مقدار تہائی سے زائد ہو، اور وارث اجازت نہ دیں، تو ایک تہائی کو تمام پر ان کی مقدار کے تناسب سے تقسیم کریں گے۔ مثلاً: زید کے لئے ۱۰۰، خالد کے لئے ۵۰، اور عقیل کے لئے ۵۰ کی وصیت کرے اور ترکہ کا تہائی ۱۰۰ ہو، تو زید کو ۵۰، خالد کو ۲۵ اور عقیل کو ۲۵ دیا جائے گا۔

۳) مرض الموت میں منجز تبرعات مثلاً وقف، صدقہ وغیرہ کی مجموعی مقدار ایک تہائی سے بڑھ جائے، تو اوّل فالاوّل مقدم ہوگا، یہاں تک کہ تہائی مکمل ہوجائے (اس کے بعد کے تبرعات کا نفاذ وارث کی اجازت پر موقوف ہوگا)

۴) مرض الموت کے کئی منجز تبرعات بیک وقت ہوں، اور تہائی سے زائد ہوں، تو قیمت کے اعتبار سے تقسیط ہوگی، (جس کی مثال

اوپر ۲ میں گذر چکی)

وارث کے حق میں وصیت

۱) وصیت میں اصل یہ ہے کہ وارث کے علاوہ کے لئے ہو، کیونکہ اس کا مقصد نیکی اور تقرب کی تحصیل اور زندگی کی کوتاہی کا تدارک ہے، اور وارث ترکہ سے اپنا حصہ حاصل کر ہی رہا ہے۔ لیکن اسکی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی اپنے کسی وارث کے لئے وصیت کرے تو اس کے احکام درج ذیل ہیں۔

وصیت تو جائز ہوگی، لیکن اسکا نفاذ دیگر وارثوں کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ''وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، ہاں البتہ دیگر ورثاء چاہیں تو'' (دار قطنی)

۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''وارث کے لئے وصیت نہیں، اِلّا یہ کہ (دیگر) ورثاء اجازت دیں'' (بیھقی باسناد قال الذھبی صالح۔ مغنی ۴۳/۳)

۲) موصی کسی وارث کے حق میں وصیت کرے، تو اس کی زندگی میں دیگر وارثوں کا قبول کرنا یا رد کرنا معتبر نہیں، کیونکہ فی الحال اس کے مال میں ان کا کوئی حق نہیں، لہٰذا اس کی زندگی میں کسی نے اس وصیت کو قبول کیا ہو تو وہ موت کے بعد انکار کر سکتا ہے، اور اس کے برعکس زندگی میں انکار کیا ہو، تو موت کے بعد قبول کر سکتا ہے۔

۳) موصی لہ موصی کی موت کے وقت وارث ہو تو ان مسائل کی رعایت ضروری ہے، وصیت کے وقت کا اعتبار نہیں، لہٰذا کسی نے اپنے بھائی کے لئے وصیت کی، اور اس وقت اس کی کوئی اولاد نہیں تھی، (اور بھائی بظاہر وارث بن رہا ہے)، پھر موت سے قبل بیٹا پیدا ہوا، تو یہ وصیت صحیح اور نافذ ہوگی، کیونکہ درحقیقت یہ وصیت غیر وارث کے لئے ہے۔ (کیونکہ بیٹے کی موجودگی میں بھائی وارث نہ ہوگا)

۴) موصی کی موت کے بعد بعض وارث وصیت قبول کریں، اور بعض نہ کریں، تو ہر ایک کا مستقل حکم ہوگا، جس نے انکار کیا، اس کے حصے میں نافذ نہ ہوگی، اور جس نے قبول کیا، اس کے حصے میں نافذ ہوگی، اور اس ترکہ میں ان کے حق کے مقدار کو پیش نظر رکھیں گے۔ (مثلاً تین بیٹوں میں ایک کے لئے تین سو ۳۰۰ کی وصیت کرے، ایک قبول کرے اور ایک انکار، تو قبول کرنے والے کے سو (۱۰۰) میں نافذ اور دوسرے کے سو (۱۰۰) میں نافذ نہ ہوگی)

۵) وصیت ہی کی طرح مرض الموت میں کسی وارث کے لئے وقف یا ہبہ کرنے اور مؤرث کا اس وارث کے ذمہ قرض کو معاف کرنے کا حکم ہے، یعنی وارثوں کی اجازت کے بغیر یہ نافذ نہ ہوں گے۔

۶) اگر کوئی ایک تہائی تک وارثوں پر ان کے حصوں کے تناسب سے وقف کرے، تو ان کی اجازت کے بغیر نافذ ہوگا۔ انہیں اس وقف کو باطل کرنے کا حق نہیں (مثلاً ایک مکان تہائی مال کے برابر ہے۔ اور وارثوں میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے، اور اس نے مکان کا ایک تہائی بیٹی کے لئے اور دو تہائی بیٹے کے لئے وقف کیا تو یہ صحیح ہے) ہر وارث کے حق میں اس کے حصے کے بقدر وصیت لغو ہے، کیونکہ وہ بغیر وصیت کے ہی اس کا مستحق ہے، لیکن اس وصیت سے گنہگار نہ ہوگا، کیونکہ شرعی حکم کے موافق ہے اگر وارثوں کے لئے ان کے حصے کے برابر اشیاء متعین کر کے وصیت کرے (مثلاً دو بیٹے وارث ہوں اور ترکہ میں ایک مکان اور ایک کھیت ہو جو مساوی قیمت کے ہوں، اور ایک کے لئے مکان کی اور دوسرے کے لئے کھیت کی وصیت کرے) تو ان کی اجازت سے یہ وصیت صحیح ہوگی، (ورنہ نہیں) کیونکہ اشیاء کے

اغراض مختلف ہوتے ہیں۔ (فتح المعین مع الاعانۃ ۳/۲۰۴)

وصیت سے رجوع (وصیت منسوخ اور ختم کرنا)

وصیت بیع اور نکاح کی طرح لازم عقد نہیں ہے، بلکہ ایک جائز عقد ہے، لہٰذا موصی کا اپنی تمام وصیت یا بعض وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے، اسی طرح وصیت میں آئندہ مزید شرائط یا قیود کا داخل کرنا بھی صحیح ہے، کیونکہ جب تک وہ زندہ ہے، وصیت کے مال میں اس کی ملکیت اور تصرف کی آزادی باقی ہے، پس وہ کسی بھی مناسب تصرف کا مختار ہے، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ''آدمی اپنی وصیت میں جو چاہے تبدیلی کرسکتا ہے'' (بیہقی)

رجوع کی کیفیت: مناسب الفاظ کے ذریعہ رجوع کرے، مثلاً: میں نے وصیت کو ختم کردیا، اسے باطل قرار دیا، اس سے رجوع کیا، اسے فسخ کردیا، کالعدم قرار دیا، یا یہ چیز میرے وارثوں کے لئے ہے۔

مُوصیٰ بہ میں ایسا تصرف کرنا، جو وصیت کے ابطال اور اس سے اعراض پر دلالت کرتا ہو، رجوع سمجھا جائے گا، مثلاً: موصیٰ بہ کو فروخت کردینا، اسے مہر میں دینا، کسی کو ہبہ کرکے اس کے سپرد کرنا، قرض کے عوض اسے رہن رکھنا، وصیت میں ان تصرفات کا مطلب یہ ہوا کہ اسنے وصیت سے رجوع کیا۔

رجوع کی بعض صورتیں: (۱) کسی نے معین گیہوں کی وصیت کی، پھر اسے دوسرے گیہوں میں ملادیا، تو یہ وصیت سے رجوع سمجھا جائے گا، کیونکہ اب موصی بہ کا سپرد کرنا مُتعذّر رہے۔

(۲) گیہوں کے ایک ڈھیر میں سے ایک کلو دینے کی وصیت کی، پھر اس میں اس سے بہتر گیہوں ملادیئے، تو یہ رجوع شمار ہوگا، لیکن اسی کے مثل یا اس سے گھٹیا گیہوں ملادیئے، تو یہ رجوع نہ ہوگا۔

(۳) گیہوں کے متعلق وصیت کے بعد اسے پیس دیا یا بودیا، آٹے کی وصیت کے بعد اسے گوندھ دیا، کپاس کی وصیت کے بعد اسے کاتا، کپڑے کی وصیت کے بعد اسے سی دیا یا کسی کھلی جگہ کی وصیت کرنے کے بعد اس میں مکان تعمیر کیا یا باغ لگایا، تو ان تمام صورتوں میں وصیت سے رجوع سمجھا جائیگا۔

عدمِ رجوع کی صورتیں: موصی بہ کو کرایہ پر دینا، عاریتاً دینا، خود استعمال کرنا، وصیت کی سواری پر سوار ہونا، یا وصیت کا کپڑا پہننا رجوع نہیں ہے۔ اگر کسی نے موصی سے وصیت کے متعلق پوچھا اور اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو یہ بھی رجوع نہیں ہے۔

کسی نے اپنے تہائی مال کی وصیت کی (یعنی موصیٰ بہ معین نہیں ہے)، پھر اس کا مال برباد ہوجائے یا تمام مال میں فروخت وغیرہ کے ذریعے تصرف کرے، تو رجوع شمار نہ ہوگا، بلکہ موت کے وقت جو مال ہوگا، اس کا ایک تہائی معتبر ہوگا۔ (مغنی ۳/۷۲)

مرضِ مخُوف (خوفناک بیماری): یعنی ایسی بیماری جس کی وجہ سے موت نادر نہ ہو، خواہ غالب بھی نہ ہو (مغنی ۳/۵۰)

مرض مخوف اور اس سے ملحق صورتوں میں تہائی سے زائد تبرع پر پابندی عائد ہوتی ہے۔ اگر کوئی زائد میں تبرع کرے، پھر اس بیماری میں مرجائے، گرچہ کسی اور سبب سے ہو، تو تہائی سے زائد تبرع نافذ نہ ہوگا، اگر اس بیماری سے شفایاب ہوجائے تو زائد تبرع بھی نافذ ہوگا۔

اگر مرض غیر مخوف ہو، پھر وہ مرجائے، اور موت اتفاق پر محمول نہ ہو، یا کسی دوسرے سبب سے نہ ہو (مثلاً ڈوب جانا، حادثہ وغیرہ)،

تب بھی تہائی سے زائد کا نفاذ نہ ہوگا، مثلاً ایک دوروز اسہال کے بعد مر جانا۔

اگر کسی دوسرے سبب سے موت ہو جائے، یا اتفاق پر محمول ہو، مثلاً خارش، دانت درد یا آنکھ درد کی حالت میں انتقال ہو، تو تہائی سے زائد تبرعات بھی نافذ ہوں گے۔

اگر بیماری کا مخوف پر خطرہ ہونا مشکوک ہو، تو دو ایسے ڈاکٹروں (طبیبوں) کے کہنے سے ہی ثابت ہوگا، جن کی گواہی مقبول ہو۔

مرض مخوف کی مثالیں: قولنج، ذات الجنب (نمونیہ)، دائم نکسیر، مسلسل اسہال (جلاب، پیٹ جلنا)، دق، ابتداء فالج، (یعنی ایک ہفتہ تک، بعد میں غیر مخوف شمار ہوگا)''مختلف قسم کے بخار، (البتہ چوتھیا بخار یعنی جو ایک روز آئے پھر دوروز نہ آئے، یہ غیر مخوف ہے، اسی طرح ایک دوروز کا معمولی بخار بھی غیر مخوف ہے)

مخوف سے ملحق صورتیں: کسی ایسے آدمی کے قید میں ہونا جو عموماً قیدی کو قتل کرتا ہو، دو ہمسروں میں قتال، کسی کو قتل کے لئے لانا، کشتی میں سوار شخص کے حق میں سمندر یا بڑی نہر میں طوفانی ہواؤں کا چلنا، زچگی کے وقت دردِ زہ، مشیمہ کا پیٹ میں رہ جانا (مشیمہ یعنی بچہ کی جھلی جس میں بچہ پیدائش کے وقت لپٹا ہوا ہوتا ہے)، اگر مشیمہ نکل آئے اور ولادت کی وجہ سے زخم وغیرہ نہ ہو، تو خطرہ ٹل چکا۔ (چونکہ مذکورہ صورتوں میں غالباً موت آتی ہے، اس لئے تبرعات کے مسئلہ میں یہ بھی مرضِ مخوف کے مثل ہوں گی) (حاشیۃ الجمل ۴/۵۳)

طاعون اور وبا کے زمانہ میں تمام لوگوں کے تصرفات میں ایک تہائی کا اعتبار ہوگا۔ (فتح المعین)

بعض لفظی احکام: (۱) اونٹ یا بکری کی وصیت میں بچہ شمار نہ ہوگا، البتہ جسامت کے اعتبار سے چھوٹا بڑا، عیب دار و بے عیب شمار ہوگا۔ بیل کی وصیت میں گائے یا گائے کی وصیت میں بیل شمار نہ ہوگا۔

۲) اگر اپنی بکریوں میں سے ایک بکری کی وصیت کرے، اور موت کے وقت اسکے پاس بکریاں نہ ہوں تو یہ وصیت لغو ہوگی۔

۳) اپنے مال میں سے ایک بکری کی وصیت کرے، اور بوقتِ موت اس کی ملکیت میں بکری نہ ہو، تو بکری خرید کر دی جائے گی۔

۴) کسی کے حمل کے لئے وصیت کرے، تو زندہ پیدا ہونے کی صورت میں مستحق ہوگا، اگر دو بچے پیدا ہوں تو دونوں میں برابر تقسیم ہوگا، مذکر و مؤنث کو یکساں ملے گا، ایک زندہ اور ایک مردہ پیدا ہو، تو مکمل وصیت زندہ کو ملے گی، اگر کہے: حمل مؤنث ہو تو اسے اتنی رقم یا کہے: مذکر ہو تو اتنی رقم، پھر دونوں بھی پیدا ہو، تو وصیت لغو قرار پائے گی۔

۵) اگر اپنے پڑوسیوں کے لئے وصیت کرے، تو اسکے گھر کے چاروں طرف سے چالیس چالیس گھروں تک اس وصیت کو صرف کیا جائے گا، جیسا کہ ابوداود اور بیہقی وغیرہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے، موصی بہ کو گھر کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے گا، نہ کہ افراد کے اعتبار سے، البتہ ہر گھر کا حصہ اس کے مکینوں کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔ اگر موصی کے دو گھر ہوں تو جہاں زیادہ رہتا ہو، اس کا اعتبار ہوگا، دونوں جگہ رہائش مساوی ہو، تو دونوں کے پڑوسیوں کا حق ہوگا۔

۶) زید اور عارف کے اولاد کے لئے وصیت کرے، تو ان کی تعداد کے مطابق تقسیم ہوگا، نہ کہ دونوں کی اولاد پر نصف نصف۔

۷) کسی معین بستی کے فقراء یا علماء کے لئے وصیت کرے، اور موت کے وقت اس بستی میں فقراء یا علماء کا وجود نہ ہو، تو وصیت باطل ہوگی، اگر کسی بستی کی تخصیص نہ کرے، تو جہاں بھی مستحق موجود ہوں، ان کو دیا جائے گا، خواہ دور ہی ہوں۔'' (حاشیۃ الجمل ۴/۶۰)

حج: میت کے ذمہ فرض حج ہو تو اس کا تعلق اس کے تمام ترکہ سے ہوگا، وصیت کرے یا نہ کرے اگر مال میقات سے حج کے لئے

ناکافی ہو، تو جہاں سے بھی ممکن ہو، واجب ہے، مال میں گنجائش ہو تو میقات سے ہی احرام واجب ہے، اگر میت نے حج کی ادائیگی کو تہائی کے ساتھ مقید کیا ہو، تو اس کا اعتبار ہوگا، اور اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دوسری وصیتوں کے ساتھ مزاحمت ہوگی، (یعنی حج کے مصارف میں ایک تہائی صرف ہو، تو دیگر وصیتیں نافذ نہ ہوں گی، لیکن تہائی سے حج ادا نہ ہو، تو مزید درکار رقم کل مال سے لی جائے گی۔

حج ہی کی طرح اصلِ شرع سے واجب تمام اعمال کا حکم ہے، مثلاً عمرہ، زکات اور صحت کی حالت کی نذر لیکن بیماری کی نذر کا ایک تہائی سے اعتبار ہوگا۔

وارث یا دوسرا کوئی شخص وارث کی اجازت کے بغیر، میت کا فرض حج اپنی جانب سے ادا کر سکتے ہیں، جیسا کہ اس کا قرض ادا کر سکتے ہیں، اگر میت اپنی زندگی میں حج پر قادر نہ تھا، تب بھی اس کی جانب سے حج ادا کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ واجب ہی شمار ہوگا۔

نفلی حج وارث یا اجنبی میت کی وصیت کے بغیر انجام نہیں دے سکتے۔

میت کے ذمہ مالی کفاروں کو اس کے ترکہ سے ادا کرنا واجب ہے وارث یا غیر وارث کو اپنے مال میں سے ادا کرنا جائز ہے۔ (خواہ میت کا مال ہو یا نہ ہو)۔ (جمل ۶۶/۴)

ایصاء

لغت میں ایصاء بھی وصیت کے معنی میں ہے، لیکن فقہی اعتبار سے دونوں کی تعریف میں فرق ہے۔

تعریف: موت سے قبل کسی کو اپنے اولاد کی رعایت ودیکھ ریکھ، وصیت کا نفاذ، قرض کی ادائیگی، ودیعت (امانت) کی واپسی وغیرہ کا ذمہ دار بنانا، ایصاء، کہلاتا ہے۔

وصی: جو شخص کسی کی موت کے بعد مذکورہ ذمہ داری کو میت کی وصیت کے مطابق اس کی نیابت میں انجام دے، اسے 'وصی' کہا جائے گا۔

حکم: ایصاء دراصل مستحب ہے، بعض اوقات واجب بھی ہو جاتا ہے۔

امام اذرعیؒ فرماتے ہیں: ''والد پر اپنی اولاد کے سلسلہ میں وصیت بظاہر واجب ہے، جبکہ ولایت کی اہلیت رکھنے والا دادا موجود نہ ہو، اور معتبر اور مناسب وصی موجود ہو، اور اس کا غالب گمان یہ ہو کہ وصیت نہ کرنے کی صورت میں کوئی خیانت دار اور ظالم اس کے مال پر قبضہ جمالے گا، کیونکہ بچے کے مال کی حفاظت اس پر واجب ہے۔''

امام باجوریؒ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں: ''ایصاء مذکور سنت ہے، البتہ جس حق کی ادائیگی سے فی الحال عاجز ہو اور اس کے گواہ نہ ہوں، تو اس صورت میں واجب ہے ورنہ وہ حق ضائع ہو جائے گا۔''

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اگر موصی پر کچھ حق ہو، جو ایصاء کے ترک سے فوت ہو جائے گا، یا کمسن اولاد کے ضائع ہونے یا ان کو ضرر و نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو ایصاء واجب ہے، ورنہ عام حالات میں مستحب ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو وصی بنایا اور اسے تحریر کیا (بیهقی ، باسناد حسن)

حکمت: کبھی انسان بظاہر قریب المرگ ہو جاتا ہے، اور لوگوں سے مختلف مادی و مالی تعلقات کی وجہ سے ودیعت، عاریت، قرض وغیرہ کی ذمہ داری سر رہ جائے گی۔ نیز کمسن اولاد، جو مالی تصرفات کی صلاحیت سے عاری ہوں، چھوڑ جا رہا ہوگا، جس

کالازمی تقاضایہ ہے کہ کسی مناسب شخص کوان امور کا ذمہ دار ٹھہرا کر جائے ،اسی مصلحت کی تحصیل کے لئے اسلام نے ایصاء کو مشروع فرمایا ،اوراس کی ترغیب دی۔

وصی کے شرائط

(۱) مکلف ہو، (۲) آزاد ہو۔(۳) مسلمانوں کا معاملہ ہو، تو وصی بھی مسلم ہو، کسی کافر کو مسلمانوں کے معاملات کا وصی بنانا صحیح نہیں، کیونکہ وہ متہم ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے مسلمانوں پر ولایت نہیں دی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ’’وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا‘‘ (النساء : ۱۴۱) **ترجمہ**: ’’اور ہر گز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرماویں گے‘‘ نیز فرمایا: ’’يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا‘‘ (آل عمران : ۱۱۸) **ترجمہ**: ’’اے ایمان والوں اپنے (لوگوں کے) سوا (اور مذہب والوں میں سے) کسی کو (محبت میں برتاؤ میں) صاحبِ خصوصیت مت بناؤ (کیونکہ) وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔‘‘

البتہ ایک ذمی کسی ذمی کو وصی بنا سکتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی وصی بنا سکتا ہے۔

۴) عادل ہو، کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو، اور نہ صغیرہ گناہوں پر اصرار ہو، صرف ظاہری عدالت کافی ہے، یعنی اس کی ظاہری حالت اس طرح ہو، (باطنی اور اندرونی حالت کی تحقیق ضروری نہیں) لہٰذا کسی فاسق (بدکار) کو وصی نہیں بنا سکتے۔

۵) جن امور کی ذمہ داری سونپی جارہی ہے، اس کی اس میں صلاحیت بھی ہو، اور وہ اس کی ادائیگی پر قادر ہو، لہٰذا کسی سفیہ مریض، بالکل بوڑھا، دماغی خلل میں مبتلا یا غفلت کے شکار آدمی کو وصی بنانا درست نہیں، کیونکہ اس میں کوئی مصلحت نہیں۔

۶) جس معاملہ میں وصی بنارہا ہے۔ اس کا تذکرہ ضروری ہے، اگر صرف اتنا کہا کہ تجھے وصی بنایا، یا میرے قائم مقام بنایا، تو یہ کافی نہیں (قلائد)

مذکورہ شرائط کی روشنی میں معلوم ہوا کہ:

۱) کسی نابینا کو وصی بنانا درست ہے، کیونکہ جس معاملہ کو وہ بذاتِ خود انجام نہ دے سکے، کسی کو وکیل بنا کر انجام دے سکتا ہے۔

۲) عورت کو وصی بنا سکتے ہیں، کیونکہ اس میں تصرف کی صلاحیت ہے، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوقتِ وفات اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو وصی بنایا، (ابوداود)

اگر ماں میں وصی کے شرائط ہوں، تو اسے وصی بنانا بہتر ہے، کیونکہ وہ زیادہ شفیق رہے گی، بلکہ امام اصطخری کے نزدیک تو باپ دادا کے بعد اسے ولایت حاصل ہے، دورِ حاضر میں تو بعض مرتبہ انہیں کے قول پر عمل کرنا پڑے گا۔ (جمل۔ ۴/۷۱)

مذکورہ شرائط کا موصی کے موت کے وقت پایا جانا ضروری ہے، کیونکہ یہی قبول پر تسلط کا وقت ہے، ایصاء کے وقت یا اس کے موت کے درمیان کوئی شرط مفقود ہو، لیکن موت کے وقت موجود ہو تو ایصاء صحیح ہے۔ (جمل ۴/۷۱)

وصی اور ایصا کے احکام

۱) ایک وصی دوسرے کسی کو وصی نہیں بنا سکتا، کیونکہ موصی نے اسے اختیار کیا ہے، اور کسی دوسرے کے تصرف پر رضامند نہیں ہے، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ موصی نے اس کی اجازت نہ دی ہو، یا اس سے منع کیا ہو، اگر خود موصی کی اجازت ہو تو دوسرے کو وصی بنانا جائز ہے۔

۲) ایصاء میں توقیت وتعلیق صحیح ہے (یعنی وقت کی قید یا کسی شرط پر معلق کرنا) مثلاً کسی نے کہا: میں نے فلاں کو میرا بیٹا بالغ ہونے تک وصی بنایا، یا بھائی کے آنے تک، تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر کہا: اگر میں مرگیا تو تجھے وصی بنایا، تو یہ جائز ہے۔

۳) اگر دو آدمی کو وصی بنائے، اور دونوں مل کر تصرف کرنے کی شرط لگائے، یا اس شرط کا ذکر نہ کرے، تو ایک وصی تنہا تصرف نہیں کرسکتا، لیکن ہر ایک کو تنہا تصرف کی اجازت دے دے، تو تنہا تصرف کرنا جائز ہے۔

اگر دو کو وصی بنائے، اور ایک ہی قبول کرے، تو تنہا وہ تصرف کرے گا، اسی طرح دو وصی میں سے ایک مرجائے یا فاسق ہوجائے، تو دوسرا تنہا تصرف کرسکتا ہے۔ (قلائد ۲/ ۶۳)

۴) عقد ایصاء طرفین کے لئے صرف ایک جائز عقد ہے، لہٰذا وصی جب چاہے خود کو اس منصب سے معزول کرسکتا ہے، کیونکہ وہ موصی کا وکیل ہے، لیکن اس صورت میں متعلقہ یتیموں کے مال پر کسی ظالم کے قبضہ یا اس کے تلف وغیرہ کا اندیشہ ہو، تو ان کی رعایت کرتے ہوئے اس کی سبکدوشی نافذ نہ ہوگی، اور اسے اس طرح کرنا جائز نہ ہوگا۔

۵) بچوں کے معاملات میں ایصاء کرنے والا وہ شخص ہو، جسے بچے پر ولایت حاصل ہو، جیسے باپ، دادا۔

دادا میں ولایت کی صفت موجود ہو، تو باپ کا کسی دوسرے کو وصی بنانا درست نہیں ہے، کیونکہ دادا کو شرعاً ولایت حاصل ہے، لہٰذا یہ اسے منتقل نہیں کرسکتا، جیسا کہ نکاح کی ولایت کا حکم ہے، اگر دادا غائب ہو، اور اس کی آمد تک کے لئے کسی کو وصی بنائے، تو بعض علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے، اگر دادا کی زندگی میں وصی بنائے، پھر دادا باپ سے پہلے مرجائے تو یہ ایصاء نافذ ہوگا (قلائد)

۶) بچہ بالغ ہونے کے بعد خرچ کے متعلق وصی سے اختلاف کرے، اور دعویٰ کرے کہ اس نے اسراف (فضول خرچی) سے کام لیا ہے، تو وصی کی بات مع قسم معتبر ہوگی۔

اگر بلوغ کے بعد مال کی سپردگی میں اختلاف ہو، وصی سپردگی کا دعویٰ کرے، اور بچہ انکار کرے، تو بچہ کی بات (جو بالغ ہو چکا ہے) مع قسم تسلیم کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ" (النساء: ۶) ترجمہ: "پھر جب (بلوغ اور رشد کے بعد) ان کے اموال ان کے حوالے کرنے لگو تو (بہتر ہے کہ) ان (کے مال ان کو دے دینے) پر گواہ بھی کرلیا کرو۔ (شاید کسی وقت کچھ اختلاف واقع ہو تو گواہ کام آویں)۔ نیز مال کی سپردگی پہ گواہ رکھنا وصی کے لئے کوئی مشکل بات نہیں۔ (بخلاف پہلی صورت کے)

متفرق مسائل

ایک تہائی وارث کے لئے اور ایک تہائی اجنبی کے لئے وصیت کرے، اور دیگر وارث تہائی سے زائد کو رد کریں، تو صرف وارث کا تہائی رد ہوگا، اور اگر تمام ترکہ دونوں میں نصف نصف وصیت کرے، تو اجنبی کے حق میں تہائی صحیح ہوگا، اور بقیہ وارث کی اجازت پر موقوف ہوگا (قلائد۔ ۲/ ۲۳)

۲) کسی نے تہائی مال کی اللہ کے لئے وصیت کی، تو صحیح ہے، اور اس مال کو مختلف نیک کاموں میں صرف کیا جائے گا، اگر صرف اتنا کہا: "میں نے تہائی مال کی وصیت کی" تو یہ بھی صحیح ہے، (وقف کے برعکس)، اور مساکین پر صرف کیا جائے گا: اگر یوں کہا! "فلاں شخص اپنے ہاتھ سے جہاں مصلحت سمجھے صرف کرے۔" تو مذکورہ شخص مناسب مصارف میں صرف کرے، مثلاً مساکین کو کھلانا، جائیداد خرید کر

آمدنی کو نیک کام میں صرف کرنا، مسلمانوں کی تلاوت کے لئے قرآن کا انتظام کرنا، فقراء و اہل خیر اور مسجد میں لگانا، جس کا نفع دائم ہو، وہ صورت افضل ہے۔ (قلائد۔ ۲/۲۹)

۳) کسی چیز کے متعلق یہ وصیت کرے کہ اسے زید کے ہاتھ فروخت کیا جائے، تو یہ لازم ہے، اگر وہ نہ خریدے تو وصیت باطل ہوگی، البتہ بیچ کر قیمت صدقہ وغیرہ کرنے کہے، تو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر کے اس کے وصیت کو نافذ کیا جائے گا، مخصوص رقم دے کر فلاں کے ذریعے حج کرانے کی وصیت کرے، اور وہ فلاں انکار کرے، تو کسی دوسرے کے ذریعے حج کرائے، حج کی وصیت کرے، اور اس کے لئے ایک تہائی سے زائد رقم کی وارث اجازت نہ دیں، تو یہ رقم وارث کی طرف لوٹے گی (قلائد)

۴) اگر موصی کہے: میں نے فلاں کی اولاد کے لئے وصیت کی، تو وصیت کے وقت اس کی جو اولاد موجود ہو، ان پر صرف ہوگا، بعد میں پیدا ہونے والے مستحق نہ ہوں گے، گرچہ حمل کی حالت میں ہو۔ (یعنی بوقت وصیت جو بچہ پیٹ میں ہو، وہ بھی مستحق نہ ہوگا) (قلائد ۲/۴۳)

۵) کسی کو سو(۱۰۰) روپے کی وصیت کرے، پھر کسی دوسرے وقت سو(۱۰۰) روپے کی وصیت کرے، تو صرف سو(۱۰۰) روپے کا مستحق ہوگا، اگر دوسری مرتبہ زائد رقم کی وصیت ہو، تو صرف اسی کا مستحق ہوگا، اگر دونوں صحیح ہوں تو دونوں صحیح ہیں، (یعنی پہلے کہا کہ یہ سو(۱۰۰) روپے پھر دوسری مرتبہ دوسرے سو(۱۰۰) روپے معین کرے، تو دونوں مستقل وصیت شمار ہوں گے)، اگر ایک مطلق اور ایک معین ہو، تو مطلق کو بھی معین پر محمول کریں گے، (یعنی صرف معین کا مستحق ہوگا)، پہلے سو کی پھر پچاس کی وصیت کرے، تو اسے صرف پچاس کا حق ہوگا، اور بقیہ پچاس سے گویا اس نے رجوع کیا، جیسا کہ امام نوویؒ نے فتویٰ دیا ہے (قلائد)

۶) قرض کی وصیت صحیح ہے، پس اگر اپنے مقروض سے کہے: میں مرجاؤں تو میرا قرض فلاں کو دینا یا فقراء کو صدقہ کرنا، تو یہ صحیح ہے۔ (قلائد الخرائد ۲/۵۱)

۷) جس کی زبان بند ہو جائے، تو اس کے عقود اور وصیت کے لئے تحریر یا با مفہوم اشارہ معتبر ہوگا (قلائد)

۸) وصیت کو معلق کرنا جائز ہے، اور اس میں جو شرط لگائے، وہ معتبر ہوگا، لہٰذا کسی نے اپنے پوتوں کے حق میں وصیت کی، بشرطیکہ وہ اپنے والد کو نہ ستائیں، اگر ستائیں، تو پھر ان کے حق میں وصیت نہیں، پھر انہوں نے قبول کیا، تو صحیح ہے، بعد میں اگر والد کو ستائیں، تو واپس لیا جائے گا، خواہ وہ فروخت کر چکے ہوں، تو گویا ان کا فروخت کرنا صحیح سمجھا گیا، لیکن ستانے کی وجہ سے اس کا باطل ہونا ظاہر ہوا (قلائد ۲/۶۱)

۹) اگر خالد کو وصی بنائے پھر بعد میں کہے کہ جس معاملہ میں خالد کو وصی بنایا تھا، اس میں زید کو بھی وصی بنایا، تو خالد معزول ہو جائے گا۔ (قلائد ۲/۶۳)

۱۰) کسی معین چیز میں سے قرض کی ادائیگی کے لئے کسی کو وصی بنائے، تو وارث اس چیز کو روک نہیں سکتے، اور وصی بذاتِ خود تنہا اس میں سے ادا کر سکتا ہے، اگر موصی معین نہ کرے، تو وارث اس کا ترکہ روک کر اپنی جانب سے بھی قرض ادا کر سکتے ہیں، لہٰذا وصی ان سے مطالبہ کرے گا کہ یا تو قرض ادا کرو، یا ترکہ میں سے اتنا میرے سپرد کردو کہ فروخت کر کے قرض ادا کرسکوں اس صورت میں وصی وارث سے رجوع کئے بغیر خود ہی ترکہ فروخت کرے، تو یہ بیع باطل ہے (قلائد)

۱۱) وصی کسی ظالم کے پنجہ سے مال آزاد کرنے کے لئے اس میں سے کچھ اسے دے سکتا ہے، حتی الامکان کم سے کم پر اسے راضی

کرنے کی کوشش کرے، اسی طرح اس چیز میں عیب پیدا کرنے سے اس کی سلامتی کی امید ہو، تو یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ سے ثابت ہوتا ہے، ودیع اور مُقارض (قراض میں عامل) کا بھی یہی حکم ہوگا (قلائد)

۱۲) کسی نے کسی بچے کے لئے کسی چیز کی وصیت کی، اور کہا: اس کے بالغ ہونے سے پہلے اس کے سپرد نہ کرو تو اس شرط پر عمل کیا جائے گا، اور اسکے ولی کے سپرد نہ کریں گے، اگر وہ بلوغ سے قبل مرجائے، تو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ (قلائد ۲/ ٦٦)

۱۳) کسی کافر نے تعمیر مسجد کے لئے وصیت کی، تو یہ صحیح ہے (تحفة المحتاج ۸/ ۴۳۴)

۱۴) اپنی زندگی یا موت کے بعد کسی شرط پر وصیت کو معلق کرنا صحیح ہے، مثلاً: میں نے فلاں چیز کی فلاں کو وصیت کی، اگر وہ میری بیٹی سے نکاح کرے، یا سفر سے لوٹ آئے، یا میں اس بیماری میں مرجاؤں تو، یا اگر زید چاہے تو۔ (لہٰذا ان صورتوں میں شرط پائی گئی، تو وصیت نافذ ہوگی، ورنہ نہیں) (تحفة المحتاج)

۱۵) کسی نے اپنی بستی کے کسی بزرگ کے قبر کے قریب دفن کرنے کی وصیت کی، تو وہیں دفنانا واجب ہے۔ (بغیه ۔ ص ۱۸۵)

۱٦) مسلکِ شافعی میں صرف تحریر عقود، اخبار (خبر دینا) اور انشاء (فی الحال انجام دینا) میں شرعی حجت نہیں، ائمہ کرام نے تحریر کو کنایہ قرار دیا ہے، پس وصیت وغیرہ نیت کے ساتھ تحریر کرے، تو منعقد ہوگی، گرچہ وہ کہنے پر قادر ہو، نیز اس کی جانب سے، یا وارثوں کی طرف سے نیت کا اعتراف ضروری ہے، لہٰذا کسی نذر، طلاق یا وصیت کے متعلق میت کی صرف تحریر پر کوئی حکم مرتب نہ ہوگا، گرچہ وارثوں کو میت کی تحریر ہونے کا یقین ہو، بلکہ اس نے خود پہلے یہ اقرار کیا ہو کہ یہ میری تحریر ہے، اور اس میں میری وصیت ہے۔ (لیکن نیت کا اعتراف نہ ہو، تو یہ معتبر نہ ہوگا)، اور وارثوں کو اس پر عمل پیرا ہونا قطعاً لازم نہیں، کیونکہ وہ معدوم کے حکم میں ہے، جو کہ شرعی حجت و دلیل نہیں، اگر اس صورت میں موجودہ وارثین نے میت کی تحریر کی بنیاد پر ترکہ میں عادت کے مطابق تصرف کیا، تو غائب کامل وارث آنے کے بعد اجازت دے تو فبہا، (ٹھیک ہے) ورنہ تجہیز وتکفین کے واجب مصارف کے علاوہ دیگر رقم کا تصرف کرنے والا ذمہ دار ہوگا۔ (بغیه ص ۱۸٦)

۱۷) اگر اشراف کے لئے، یا لوگوں میں سے اشرف کے حق میں وصیت کرے تو حضرات حسنین (حضرات حسن اور حسین علیہما الصلوٰۃ والسلام) کی اولاد پر محمول ہوگا، ان کی اولاد میں اشرف کیلئے وصیت کرے، تو علم وتقویٰ وغیرہ معنوی وصف میں تفوق کا اعتبار ہوگا۔ (بغیه ۔ ص ۱۸۸)

۱۸) رشتہ دار وغیرہ کے حق میں وصیت کرے تو صرف وصیت کے وقت موجود افراد اس میں داخل ہوں گے، جبکہ وہ موصی کی موت تک زندہ ہوں، اگر موصی سے قبل انتقال کر جائے، یا اس میں شک ہو (کہ پہلے ہوا یا بعد میں) تو اس کے حصہ میں وصیت باطل ہوگی، اور وہ موصی کے وارثوں کو ملے گا، نہ کہ دیگر رشتہ داروں کو، وصیت کے وقت موجود حمل بھی مستحق نہ ہوگا، خواہ وہ موصی کی زندگی میں ہی پیدا ہو۔ (بغیه ۱۸۹)

۱۹) کتابوں کی وصیت میں قرآن (مصاحف) بھی داخل ہے، لیکن قرآن کی وصیت میں کتابیں داخل نہ ہوں گی۔ (بغیه ص ۱۹۳)

۲۰) اگر وصی خود کو معزول کرے (سبکدوش ہو)، یا کہیں سفر کا ارادہ ہو، تو مال امانت دار قاضی کے سپرد کرنا لازم ہے، اگر امین قاضی موجود نہ ہو، جیسا کہ عموماً دورِ حاضر کا حال ہے، تو اس پر لازم ہے کہ بستی کے نیک حضرات کو جمع کر کے ان کے سپرد کردے، اور ان پر کسی ایک کو ذمہ دار منتخب کرنا لازم ہے، جیسا کہ ان پر وصی کے خیانت یا فسق کی صورت میں (جبکہ قاضی نہ ہو) اس وصی کو معزول کر کے کسی دوسرے کو ذمہ دار بنانا لازم ہے۔ خود وصی موصی کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو وصی نہیں بنا سکتا، صاحبِ تحفہ اور نہایہ فرماتے ہیں کہ دورِ حاضر میں

خیانت کی کثرت کی وجہ سے وصی اور ہر امین کے لئے ہر سال گواہ پیش کرنا اور محاسبہ لازم ہے۔(بغیہ ص ۱۹۹)

۲۱) فقراء کے حق میں وصیت کرے، تو وصی اس میں سے میت کے وارث کو کچھ نہیں دے سکتا، خواہ وہ فقیر ہو، جیسا کہ "الام" میں صراحت ہے۔(فتح المعین)

۲۲) میت جو مال چھوڑ جائے مثلاً کسی پر قرض تھا، اور وارث نے اسے وصول نہیں کیا، تو اس کا ثواب میت کو ملے گا، گرچہ وارث کو مطالبہ جائز ہے، کیونکہ اس میں اس کا حق ہے، لیکن بغیر قبضہ کے وہ مالک نہ بنے گا۔(ترشیح المستفیدین ص ۲۷۵)

وَدِیعت (اَمانت)

تعریف : کسی مملوک یا مخصوص محترم کی مخصوص انداز پر حفاظت کے لئے وکیل بنانے کو ودیعت کہتے ہیں۔ ودیعت میں رکھی جانے والی چیز کو بھی ودیعت کہا جاتا ہے۔

مملوک: یعنی جن کا مالک بننا شرعاً صحیح ہے، جیسے پاک اور مباح مستعمل اشیاء،

مخصوص محترم : جس کا مالک بننا شرعاً صحیح نہیں، لیکن اس پر اپنا قبضہ اور اسے اپنے ساتھ مخصوص کرنا صحیح ہے، جیسے شکاری کتا، اور محترم کا مطلب یہ ہے کہ جس کے تلف اور ختم کرنے کا شرعی حکم نہ ہو، ارکان پر گفتگو کے دوران مزید وضاحت آجائے گی۔

مشروعیت : ودیعت کی مشروعیت پر قرآن، حدیث اور اجماع سے دلائل موجود ہیں،

آیت (۱) "اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا "(النساء : ۵۸)

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچادو امانتیں امانت والوں کو"

(۲) فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ "(البقرہ : ۲۸۳)

ترجمہ : "پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا تو چاہئے کہ پورا ادا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا، اپنی امانت کو"

'امانت' ایک عام لفظ ہے، جس میں انسان کی حفاظت میں سونپی گئی ہر چیز اور قرض داخل ہے، کسی چیز کو حفاظت کے لئے دینا ہی ودیعت ہے، امانت کی واپسی اور حفاظت کا حکم اس کی مشروعیت کو متضمن ہے۔

حدیث : آپ ﷺ نے فرمایا" جو تمہارے پاس امانت رکھے، اس کی امانت اسے لوٹادو، اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے، تم اس کے ساتھ خیانت مت کرو"(ابوداود ، ترمذی شریف)

مروی ہے کہ آپ ﷺ کے پاس اہل مکہ کی امانتیں تھیں، پس جب ہجرت کا ارادہ ہوا تو اسے حضرت اُمّ ایمنؓ برکۃ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ان کے مالکوں کو لوٹادیں۔

اجماع : آپ ﷺ اور صحابہ کرام کے دور سے آج تک ہمیشہ اس کی مشروعیت اور جواز پر علماء کرام متفق ہیں۔

حکمت : تمام شرعی احکام کی طرح یہ حکم بھی لوگوں کی مصلحت اور سہولت کی خاطر مشروع کیا گیا ہے۔ کبھی کسی کے پاس مال ہوگا، لیکن حفاظت کیلئے محفوظ جگہ نہ ہوگی، یا اس پر ظالمانہ قبضہ جمانے والوں کو روکنے سے عاجز ہوگا، کبھی اپنی کسی مصلحت اور ضرورت سے سفر پر جارہا ہوگا، اور بغیر نگرانی کے مال چھوڑ جانے میں خطرہ ہوگا، کبھی آدمی بازار میں ضرورت کی اشیاء مختلف دوکانوں سے خریدتا رہتا ہے، سارا سامان ساتھ سمیٹ کر دوکانوں کا چکر مشکل ہوگا، ایسی صورت میں کسی کے پاس حفاظت سے رکھے گا تاکہ اطمینان سے دیگر مشغولیات سے

فارغ ہو، اسی طرح کبھی ایسی اشیاء حاصل کرے گا جس کی فی الحال ضرورت نہیں، مستقبل میں ضرورت ہے، لیکن اپنے پاس اس وقت تک رکھنے کے لئے محفوظ جگہ نہیں، لہٰذا ان تمام صورتوں میں کسی معتبر شخص اور محفوظ مقام پر بطور ودیعت رکھنے کی ضرورت پیش آئے گی، اور دینِ اسلام میں سہولت ہے، نہ کہ تنگی، لہٰذا اسے مشروع قرار دیا گیا، تاکہ نیکی اور تقویٰ پر آپسی تعاون پایا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ودیعت کا حکم

۱) **استحباب:** عام حالات میں یہ مستحب ہے، جبکہ ودیع (جس کے پاس ودیعت رکھی جائے) اس چیز کی حفاظت پر قادر ہو، اپنے نفس کی امانتداری پر اطمینان ہو، اس کی طرح حفاظت کرنے والا امانت دار شخص دوسرا موجود ہو، کیونکہ اس میں اپنے ایک مسلمان بھائی کا تعاون ہے اور آپ ﷺ کا فرمان ہے ''جب تک ایک شخص اپنے (کسی مسلمان) بھائی کے تعاون میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شاملِ حال ہوتی ہے'' (رواہ مسلم)

۲) **وجوب:** جو شخص امین ہو، اپنے نفس کی امانتداری سے مطمئن ہو، اس کے پاس کوئی ودیعت رکھنے کی درخواست کرے، جس کی حفاظت اس کے بس میں ہو، اور دوسرا کوئی مناسب شخص ودیعت کو قبول کرنے والا موجود نہ ہو (اور اس کے سبب اپنے جان یا مال یا اولاد کا بظاہر کوئی ضرر نہ ہو۔ حاشیۃ الجمل) تو ایسی صورت میں ودیعت کا قبول کرنا واجب ہے، کیونکہ نہ قبول کرنے میں مال کی اضاعت و بربادی، اور قبول کرنے میں اس کی حفاظت ہے، اور آپ ﷺ نے مال برباد کرنے سے منع فرمایا ہے (صحیحین) اور ایک مسلمان کے مال کی حرمت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ''مومن کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے'' (مسند احمد)

لہٰذا جس طرح اپنے مسلمان بھائی کے جان کی طرف سے دفاع اور اس کی حفاظت لازم ہے، اسی طرح اس کے مال کو ضائع ہونے سے بچانا بھی لازم ہے۔

وجوب کا مطلب یہ نہیں کہ مفت میں یہ ذمہ داری ادا کرنا واجب ہے، بلکہ وہ چاہے تو حفاظت اور جگہ کی اجرت لے سکتا ہے۔ (نھایۃ، ۱۱۱/٦)

۳) **کراھت:** کوئی شخص امین ہو، لیکن آئندہ کے لئے اسے اپنے اوپر اطمینان نہ ہو، تو ودیعت کا قبول کرنا مکروہ ہے، تاکہ کہیں خیانت کا مرتکب نہ ہو اور مالک کا نقصان نہ ہو

۴) **تحریک (حرمت):** جو شخص ودیعت کی حفاظت سے عاجز اور قاصر ہو، اسے ودیعت قبول کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ اضاعت مال کا سبب بنے گا، جو ممنوع ہے۔ اسی طرح کسی کو خیانت کے صدور کا غلبہ ظن ہو تو ودیعت کا قبول کرنا حرام ہے۔ (نھایۃ المحتاج ۱۱۱/٦)

۵) **اباحت (جواز):** یعنی ودیعت کا قبول کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ جبکہ مستقبل میں اسے اپنے امانتداری کا اطمینان نہ ہو، یا حفاظت سے قاصر ہو، لیکن مالک خود اس کی حالت سے واقف ہو، اور پھر بھی اس کے پاس ودیعت رکھنے پر راضی ہو۔

وَدیعت کے ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) مُودَع شئ۔ ان میں سے ہر ایک کے کچھ شرائط ہیں۔

۱) **عاقدین:** یعنی مُودِع (چیز کا مالک، ودیعت رکھنے والا) اور وَدِیع (جس کے پاس ودیعت رکھی جائے)، ودیعت چونکہ

حفاظت کے لئے وکیل بنانا ہے، اس لئے مُودِع میں مؤکل کے صفات اور وَدِیْع میں وکیل کے صفات شرط ہیں۔

وکالت کے بیان میں یہ مسئلہ پیش ہوگا کہ وکیل اور مؤکل کا عاقل اور بالغ ہونا شرط ہے، اور جس امر میں وکالت ہو، مؤکل اور وکیل بذاتِ خود وہ تصرف انجام دینا صحیح ہو۔

پس کوئی بچہ یا پاگل مودع یا ودیع نہیں بن سکتا، اسی طرح جس سفیر پر مالی تصرف کی روک ہو، وہ ودیع نہیں بن سکتا، کیونکہ ودیعت ایک مالی تصرف ہے، جس کی اس پر پابندی ہے۔

اسی طرح کسی غیر مسلم کے پاس قرآن مجید ودیعت رکھنا صحیح نہیں، کیونکہ اسے مصحف کے اٹھانے اور چھونے کا موقع نہیں دیا جاسکتا۔

اگر کسی نے ان میں سے کسی کے پاس ودیعت رکھی، پھر وہ تلف ہو، تو وہ ضامن نہیں، خواہ ودیع نے حفاظت میں کوتاہی برتی ہو، کیونکہ اس کے پاس ودیعت رکھنا خود مودع کی کوتاہی ہے۔

۲) **صیغہ :** یعنی ایجاب وقبول، مثلاً مالک اور مودع کہے: میں نے کپڑا تمہارے پاس ودیعت رکھا، اور ودیع کہے: میں نے قبول کیا۔ ودیع کا کلام مودع کے کلام پر مقدم ہوسکتا ہے، مثلاً وہ کہے: آپ کا یہ کپڑا میرے پاس ودیعت رکھئے، تو وہ کہے: میں نے ودیعت رکھا۔

دونوں کی جانب سے الفاظ ضروری نہیں، ایک کی طرف سے الفاظ اور دوسرے کی طرف سے فعل ہو تب بھی کافی ہے، سو اگر مودع نے کہا: میں نے میری یہ کتاب تمہارے پاس ودیعت رکھی (ودیعت رکھ رہا ہوں) اور ودیع اسے اپنے قبضہ میں لے لے، تو کافی ہے اسی طرح اگر ودیع نے کہا: آپ کا یہ سامان میرے پاس ودیعت رکھ دیجئے، اور مالک نے بلا کسی لفظ کے وہ سامان اس کے سپرد کردیا، تو ودیعت صحیح ہے۔

صریح لفظ ہونا ضروری نہیں، ودیعت کی نیت اور قرینہ کے ساتھ کنایہ لفظ بھی کافی ہے، مثلاً یوں کہے: میری یہ چیز اپنے پاس رکھئے، یا بطورِ امانت یہ لیجئے، یا تمہیں میں نے اس کی حفاظت کے لئے نائب بنادیا اور ودیع اپنے قبضہ میں لے لے، تو یہ کافی ہے۔

۳) **مُودَع شئی :** یعنی جو چیز ودیعت اور امانت رکھی جائے، اس پر اکثر 'ودیعت' کا اطلاق ہوتا ہے، یہ شرعاً محترم ہونا شرط ہے، گرچہ مال نہ ہو (یعنی شرعاً اسے مالی حیثیت حاصل نہ ہو)، جیسے گیہوں کے چند دانے یا نجس ہو، جیسے شکاری کتا یا گوبر وغیرہ۔

اگر شرعاً غیر محترم ہو، جیسے سوّر اور آلاتِ لہو ولعب، تو ان کو ودیعت رکھنا یا قبول کرنا جائز نہیں، اور اس پر ودیعت کے احکام کا نفاذ نہ ہوگا۔

ودیعت پر مُرتب احکام

صحیح طریقہ پر عقدِ ودیعت پایا جائے تو اس پر درج ذیل احکام کا ترتب ہوگا۔

۱) **حفاظت کا وجوب :** ودیعت دراصل مالک حفاظت کی خاطر دیتا ہے، اور ودیع اسی اعتبار سے قبول کرتا ہے، لہٰذا اس پر اس کی حفاظت لازم ہے، حدیث میں ہے کہ مسلمانوں پر طے شدہ شرائط کی پابندی لازم ہے۔ (ترمذی)

عادتاً ودیعت کی حفاظت کے مناسب جو جگہ سمجھی جاتی ہے، ایسی جگہ میں اس کی حفاظت لازم ہے۔ (کسی چیز کے مناسب محفوظ مقام کو 'حِرزِ مِثل' کہا جاتا ہے) اسی طرح ودیع پر لازم ہے کہ خود ہی اس کی حفاظت کرے، بیوی، اولاد یا نوکر وغیرہ کے ذریعہ حفاظت کافی نہیں، اگر مالک خود دوسروں کے ذریعہ حفاظت کی اجازت دے تو جائز ہے۔

اگر کوئی عذر درپیش ہو، مثلاً اسے سفر پر جانا ہے یا آگ لگ گئی، اور مالک کے سپرد کرنے کی گنجائش نہ ہو، اور نہ اس کے وکیل کے یا

قاضی کے حوالہ کرنا ممکن ہو، تو ایسی صورت میں کسی اور کے سپرد حفاظت کی غرض سے دینا جائز ہے۔
۲) **عقدِ ودیعت** ایک جائز عقد ہے، یعنی طرفین سے میں سے کوئی بھی فریقِ ثانی کی اجازت ورضامندی کے بغیر اسے فسخ کرسکتا ہے۔ مودع جب چاہے اپنی ودیعت واپس لے سکتا، اور ودیع جب بھی چاہے واپس لوٹا سکتا ہے۔
مالک جب ودیعت کا مطالبہ کرے تو اسی وقت بقدرِ امکان اس کے سپرد کردے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امانتیں امانت والوں کو پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ (سورہ نساء۔۵۸)
لوٹانے اور سپرد کرنے سے اس کی خدمت میں لے جانا مراد نہیں، بلکہ تخلیہ مراد ہے، یعنی مالک کو اسے لیجانے میں کوئی رکاوٹ اور حائل باقی نہ رکھے۔
۳) **ودیع کے قبضہ کی صفت:** ودیع کا قبضہ از قبیل امانت ہے، یعنی حفاظت میں کوتاہی یا کسی زیادتی کے بغیر وہ چیز تلف ہوجائے، تو ودیع اسکا ضامن نہیں۔
نیز اسے ضامن قرار دیا جائے تو لوگ ودیعت قبول کرنے سے کترائیں گے، جو عوام کی مشقت کا باعث ہوگا، مزید یہ کہ حفاظت کی خدمت انجام دے کر وہ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آرہا ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ" (التوبہ: ۹۱)، (نیکوکاروں پر کسی قسم کا الزام نہیں)، نیز ودیع کا ودیعت پر قبضہ مالک کے قبضہ کے قائم مقام ہے، لہٰذا مالک کے قبضہ میں تلف ہونے کی طرح ہے۔ لہٰذا مطلقاً ضمانت یا مطلقاً عدمِ ضمانت کی شرط پر ودیعت رکھے تو صحیح نہیں۔
ودیعت کے ضمان کی صورتیں: درج ذیل صورتوں میں ودیع پر ودیعت کا ضمان عائد ہوگا۔
۱) **مودع کی اجازت** اور عذر کے بغیر کسی دوسرے کے پاس ودیعت رکھے، اس صورت میں دوسرے کے پاس وہ چیز تلف ہوجائے تو مالک دونوں میں سے کسی سے بھی ضمان (تاوان، بدلہ) وصول کرسکتا ہے۔
اگر دوسرے کو ضامن بنادیا اور صورتِ حال سے ناواقف تھا، تو اول سے یہ ضمان واپس لے گا، کیونکہ اس دوسرے ودیع کا کوئی قصور نہیں، کہ وہ ضامن بن جائے، اور اسے صورتِ حال کی تفصیل معلوم ہو، تو اول سے ضمان واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ اس صورت میں وہ ودیع نہیں، بلکہ غاصب ہے۔
۲) **ترکِ حفاظت:** ودیعت کی حفاظت چونکہ ودیع کی ذمہ داری ہے، لہٰذا حفاظت کی کوتاہی کے سبب ودیعت تلف ہوجائے تو وہ ضامن ہو۔ اس کوتاہی اور ترکِ حفاظت کی صورتیں درج ذیل ہیں:
الف— ودیعت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے، اور دوسری جگہ پہلے کے بمقابل کم محفوظ ہو، کیونکہ وہ اسے بربادی کے لئے پیش کرتا پایا جارہا ہے۔ دوسری جگہ بھی پہلے کی طرح محفوظ یا اس سے بھی بہتر ہو، تو ضمان نہ آئے گا۔ البتہ مودع منتقل کرنے سے منع کردے یا راستہ پرخطر ہو تو منتقل کرنے سے تلف ہونے کی صورت میں ضامن ہوگا۔
ب— ودیعت کو درپیش خطرات کا دفاع نہ کرنا، کیونکہ حتی الامکان اسبابِ تلف کو دفع کرنا بھی حفاظت میں داخل اور ودیع پر واجب ہے۔ مثلاً کسی حیوان کو ودیعت رکھا اور اس نے اتنی مدت تک چارہ پانی نہ دیا جس میں عموماً وہ مرجاتا ہے، پھر اس سے مرگیا تو ضامن ہوگا، خواہ مالک نے کھلانے کا حکم دیا ہو، یا نہ دیا ہو، کیونکہ اس نے جب ودیعت قبول کرلیا تو یہ بطورِ حق اللہ اس پر واجب ہے۔
اسی طرح ودیعت کو دھوپ یا ہوا میں رکھنا ضروری ہو تو اسے بھی انجام دے، (ورنہ تلف ہوجائے تو ضامن ہوگا) اگر مالک خود

اسباب تلف کے دفاع سے منع کرے تو پھر تلف سے ضامن نہ ہوگا، لیکن ودیعت حیوان ہو تو روح کی حرمت کی وجہ سے دفع نہ کرنا گناہ ہے، گرچہ مالک کے حکم کی وجہ سے ضامن نہ ہوگا۔

۳) **ودیعت کا استعمال اور اس سے انتفاع:** کسی بھی طرح کے استعمال کے بعد وہ تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا، گرچہ استعمال کے ترک کے بعد تلف ہو، کیونکہ بلا اجازت غیر کی چیز کا استعمال تعدی ہے، اور اس تعدی سے اسکا اصل حکم یعنی امانت ختم ہو گیا، اب تجدید عقد کے بغیر دوبارہ امانت کا حکم نہ لوٹے گا، لہٰذا تجدید سے قبل تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا۔

۴) **ودیعت کو سفر میں لے جانا:** ودیع کو ودیعت کی بستی سے کہیں کا سفر در پیش ہو، تو ودیعت ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں، کیونکہ محفوظ مقام پر اس کی حفاظت واجب ہے، اور سفر میں یہ بات نہیں ہے، لہٰذا اس صورت میں مالک کو لوٹا دے، وہ نہ ہو تو اس کے وکیل کے سپرد کرے، ورنہ پھر کسی امانتدار شخص کے پاس حفاظت کے لئے رکھ دے۔

مذکورہ افراد میں سے کسی کے سپرد کرنا ممکن ہو، پھر بھی وہ ساتھ لے جائے تو ضامن ہوگا، لیکن ان میں سے کوئی موجود نہ ہو تو مجبوری ہے پس غیر معتبر لوگوں کے حوالہ کرنے سے ساتھ لے جانا بہتر ہے۔

مسافر ہی کی طرح اس ودیع کا حکم ہے، جو ایسا بیمار ہو کہ موت کا اندیشہ ہو، یا جس کے اسباب موت پائے گئے، اسے سپرد کرنے کے لئے مناسب شخص نہ ملے تو اس کی وصیت کرے، ورنہ موت کے بعد تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا، کیونکہ ورنہ وارث اس کی چیز سمجھ کر ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے گا۔ اور اس طرح مالک کا نقصان ہوگا۔

اگر اچانک موت یا قتل کی وجہ سے وصیت نہ کر پایا تو ضامن نہ ہوگا، (نہایة ۱۱۹/۶)

۵) **بلا عذر ودیعت کا انکار:** مودع کے مطالبہ پر ودیع ودیعت ہی کا انکار کر دے، پھر وہ تلف ہو جائے تو اس کا ضامن ہوگا، گرچہ بعد میں اپنے انکار سے رجوع کر کے اعتراف کر چکا ہو، کیونکہ انکار کی وجہ سے وہ اس چیز کا غاصب ہوگا، اور غاصب کا قبضہ باعث ضمان ہوتا ہے، اور انکار کے بعد اب تجدید عقد کے بغیر ودیعت کا حکم نافذ نہ ہوگا۔

کسی عذر سے انکار کرے تو عقد ودیعت کا حکم ختم نہ ہوگا، بلکہ بطور امانت اس کے قبضہ میں ہوگی، پس بصورت تلف ضامن نہ ہوگا، مثلاً کوئی غاصب یا ظالم مالک کو مطالبہ پر مجبور کرے، اور ودیع کو معلوم ہو کہ اگر اس نے اعتراف کیا تو مالک واپس لے گا، پھر مالک سے وہ چیز ناحق چھین لی جائے گی، لہٰذا مالک کو اس نقصان سے بچانے کے لئے وقتی طور پر ودیع اس کا انکار کر دے، پھر وہ تلف ہو جائے تو وہ ضامن نہ ہوگا، کیونکہ تعدی و زیادتی نہیں پائی گئی۔

۶) **واپسی کے مطالبہ کے باوجود واپسی سے باز آنا:** مسئلہ گذر چکا کہ مودع جب چاہے ودیعت کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس صورت میں فوراً واپس کرنا لازم ہے۔ یعنی تخلیہ (واپسی کی رکاوٹوں کا دور کرنا) اگر بلا عذر واپسی سے باز آئے یا اس میں تاخیر کرے، تو وہ ضامن ہوگا، کسی عذر سے مؤخر کرے، مثلاً مطالبہ ایسے وقت ہو کہ اسی وقت واپسی ممکن نہ ہو، یا مودع کے پاس سے کسی ظالم کے غصب کر لینے کا اندیشہ ہو...... وغیرہ، تو ضامن نہ ہوگا۔

۷) **ودیعت کو دوسرے کے ساتھ خلط کرنا:** ودیع کی ذمہ داری ہے کہ ودیعت کو اپنے کسی ایسے مال میں نہ ملائے جس کی وجہ سے پھر وہ متمیز نہ ہو سکے (الگ تھلگ سمجھ میں نہ آئے)، (مثلاً گیہوں کو گیہوں میں، یا روپے کو روپے کے ساتھ ملانا) اگر اس نے ملا لیا، یا بلا ارادہ اس طرح مل گیا، تو وہ ضامن ہوگا، لیکن آپس میں خلط ملط کے باوجود متمیز ہو مثلاً دینار کو درہم کے ساتھ، روپے کو

ریال کے ساتھ، (یا گھڑی کو اپنی گھڑی کے ساتھ) ملادیا، تو ضامن نہ ہوگا، کیونکہ بسہولت پہچان کر جدا کر سکتے ہیں۔ اگر جدا کرنا کافی دشوار ہو، جیسے گیہوں کو جو میں ملا دیا، تو یہ بھی عدم تمیز کے حکم میں ہے۔ (یعنی ضامن ہوگا)

۸) **مودع کے شرط کی مخالفت:** مثلاً مودع کسی خاص جگہ یا کسی خاص انداز سے حفاظت کا حکم دے، لیکن ودیع اس کی مخالفت کرے، اور اس سبب سے وہ تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا۔

حفاظت کے معتاد طریقے سے بھی محتاط پہلو اختیار کرے، اور وہ تلف ہو جائے تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ضامن نہ ہوگا، مثلاً ودیعت صندوق میں رکھ کر ایک کے بجائے دو تالہ لگا دیا۔

دواشخاص کے پاس ودیعت: اگر کسی نے دواشخاص کے سپرد ودیعت کی: اور وہ قابل تقسیم ہو، مثلاً نقدی اور روپے پیسے وغیرہ، تو دونوں تقسیم کر کے نصف، نصف اپنی حفاظت میں رکھ سکتے ہیں، اگر ان میں سے ایک اپنا نصف بھی دوسرے کے سپرد کر دے کہ وہی مکمل ودیعت رکھے، تو یہ نصف کا ضامن ہوگا۔

اگر ودیعت قابلِ تقسیم نہ ہو تو ہر ایک دوسرے کے سپرد کر سکتا ہے، اور اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔

دو اشخاص کا ایک کے پاس ودیعت رکھنا: دواشخاص کوئی چیز کسی کے پاس ودیعت رکھیں، پھر ان میں سے ایک آ کر واپسی کا مطالبہ کرے، یا اس میں سے اپنے حصے کی واپسی کا مطالبہ کرے، تو ودیع اس کے سپرد نہیں کرے گا، کیونکہ ودیعت دونوں نے مل کر رکھی ہے، اس لئے واپسی میں بھی دونوں کا اتفاق ضروری ہے۔ اگر صرف اپنے حصہ کا مطالبہ کر رہا ہے تو مسئلہ قاضی (حاکم) کے پاس لے جائے، تاکہ وہ تقسیم کر کے اس کا حصہ اُسے دے دے۔

ودیعت کی انتہا: مودع کے ودیعت کو واپس لینے یا ودیع کے لوٹانے سے اس کی انتہا ہوگئی اگر چہ ودیعت کے قبولیت کے وجوب کی صورت میں مالک کے ارادے کے بغیر لوٹانا حرام، اور استحباب کی صورت میں مکروہ ہے، دونوں میں سے کسی ایک کے انتقال سے بھی ودیعت کی انتہا ہوگئی، نیز کسی ایک کے جنون یا بے ہوشی کی وجہ سے، اور مودع پر سفاہت کی وجہ سے حجر اور پابندی سے، اور ودیع پر فلس کی وجہ سے حجر سے اس کی انتہا ہوگئی۔ فروخت یا ہبہ وغیرہ کے ذریعہ مالک کی ملکیت منتقل ہو جائے تو اس سے بھی ودیعت کی انتہاء ہوگی۔

ودیعت کے انتہاء واختتام کے ساتھ ہی اس کا حکم بھی ختم ہو جائے گا، واپس لینے یا دینے کے علاوہ انتہائی صورتوں میں گمشدہ چیز کی طرح اس کے قبضہ میں بطورِ شرعی امانت کے ہو جائے گی، لہٰذا بصورتِ امکان فوراً مالک کے یا اس کے ولی کے سپرد کرنا واجب ہے، گر چہ وہ مطالبہ نہ کرے، سپردگی کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس ودیعت کی یا اس کے جگہ کی اطلاع دے، (اور وہ آ کر لے جائے)۔ مذکورہ افراد نہ ہوں تو امانت دار قاضی (حاکم) کے سپرد کرے، اگر اس میں کوتاہی سے کام لے تو ودیعت کی انتہاء کے بعد تلف ہو جائے تو ودیع ضامن ہوگا۔

مُتفرقات

۱) کسی کے پاس ودیعت ہو، اور اس کا مالک نہ ملے، تو لقطہ کی طرح اس کا اعلان کرتا رہے، یا امانت دار قاضی یا حاکم ہو، تو اس کے سپرد حفاظت کے لئے کر دے۔ تحقیق کے باوجود مالک کی ملاقات سے ناامید ہو جائے اور اب بظاہر اس کے ملنے کا امکان نہ ہو، تو یہ بیت المال کے اموال میں شمار ہوگا، لہٰذا جس کے پاس بھی ہے وہ مسلمانوں کے اہم مصالح پر اسے صرف کرے، خود مصلحت سے واقف نہ ہو، تو

واقف سے پوچھے (یا اس کے سپرد کردے کہ وہ صرف کرے) تعمیرِ مسجد کے علاوہ پر صرف افضل ہے، لیکن مسجد کے لئے بھی صرف کر سکتا ہے، جیسا کہ فقہاءِ کرام نے اس شخص کے ترکہ کے متعلق صراحت فرمائی ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو کہ اس سے مسجد تعمیر کی جائے یا حاکم ظالم نہ ہو تو اس کے سپرد کردے۔ (نهاية المحتاج ۱۳۲/۶، فتح المعين ص ۲۹۴)

۲) اگر کسی نے کسی چیز پر لکھا: ''یہ فلاں شخص کی ودیعت ہے'' یا اپنی ڈائری میں لکھا: ''میرے پاس فلاں کی فلاں امانت ہے'' تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، جب تک کہ وہ شخص اس کا اقرار نہ کرے، یا اس بات پر گواہ پیش ہوں، یا وارث اس کا اقرار کرے۔ (حاشية الجمل ۷۸/۴)

۳) کوئی امین مثلاً ودیع یا چرواہا اپنے ماتحت کسی ماکول اللحم جانور کو دیکھے کہ خطرہ میں ہے (ذبح نہ کرنے کی صورت میں مر کر رائیگاں جائیگا) اس لئے ذبح کرے تو جائز ہے (نهاية ۱۲۱/۶)

۴) فائدہ: جھوٹ حرام ہے، لیکن کبھی واجب ہوتا ہے، جیسے کوئی ظالم کسی ودیعت کے متعلق دریافت کرے۔ تا کہ ظلماً چھین لے، تو ودیعت کا انکار واجب ہے، گرچہ جھوٹ ہو، اور اس پر توریہ کے ساتھ قسم بھی جائز ہے، اگر انکار نہ کرے اور اپنی کوشش اور امکان کے حد تک اس کی اطلاع سے باز نہ آئے، تو ضامن ہوگا، اسی طرح کوئی معصوم الدم (جس کا قتل شرعاً حرام ہے) کسی ظالم سے روپوش ہو، جو اس کے قتل کے درپے ہے، تب بھی یہی حکم ہے (یعنی اس کا پتہ نہ بتانا اور اپنی لاعلمی کا اظہار ضروری ہے)

جنگ کا مقصد یا مسلمانوں میں آپسی صلح یا بیوی کو راضی کرنا بغیر جھوٹ کے ممکن نہ ہو تو یہ مباح ہے۔

''احیاء'' میں فرمایا کہ اگر کسی سے بادشاہ کسی گناہ مثلاً زنا یا شراب کے متعلق باز پرس کرے، جو اس سے تنہائی میں صادر ہوئی ہے، تو وہ جھوٹ کہہ سکتا ہے کہ میں نے یہ برائی نہیں کی، اور وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے راز کا انکار کر سکتا ہے۔ (ترشيح المستفيدين ۲۹۴)

بعض متفرق جدید مسائل

(دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۱۹۸۹ء کے اہم فیصلے)

اعضاء کی پیوند کاری: (۱) کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو، اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کے لئے کسی متبادل کی ضرورت ہو، تو اس ضرورت کا پورا کرنے کے لے:

(الف) غیر حیوانی اجزاء کا استعمال (جائز ہے)۔

(ب) ایسے جانوروں کے اعضاء کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے اور بطریقۂ شرعی ذبح کئے گئے ہوں (جائز ہے)

(ج) جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو، اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے، جن کا کھانا حرام ہے، یا حلال تو ہے لیکن بطریقِ شرعی ذبح نہیں کئے گئے ہیں، تو ایسی صورت میں ان غیر ماکول اللحم یا ماکول اللحم مگر غیر مذبوح جانوروں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے۔ اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو، تو خنزیر (سور) کے اجزاء کا استعمال جائز نہیں۔

۲) اسی طرح ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔

۳) اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔

۴) اگر کوئی مریض ایسی حالت کو پہنچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ دوسرا عضو اس

کے جسم میں پیوند نہ کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائیگی اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کی کو پورا نہیں کرسکتا۔ اور ماہر قابل اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضوانسانی کی پیوندکاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے۔ اور عضوانسانی کی پیوند کاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضوانسانی اس مریض کیلئے فراہم ہے، تو ایسی ضرورت، مجبوری اور بے کسی کے عالم میں عضوانسانی کی پیوندکاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کیلئے مباح ہوگا۔

۵) اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر اس کے دوگردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر حال اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے، اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچالے۔

۶) اگر کسی شخص نے یہ ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوندکاری کے لئے استعمال کئے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جاسکتا ہے اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابل اعتبار نہیں۔(مجلہ فقہ اسلامی - ص ۵۶۳)

پگڑی کا مسئلہ : (۱) مالک مکان زرضمانت وڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے، بہتر ہے کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھا جائے، اگر مالک اس کو خرچ کردے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کردے۔

۲) اگر کوئی مکان یا دکان کرایہ پر دیا جائے اور مالک مکان مروجہ پگڑی کے نام پر اصل ماہوار کرایہ کے علاوہ بھی نقد رقم کرایہ دار سے وصول کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالک مکان نے بحیثیت مالک اپنے مکان کو کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دست برداری کا عوض وصول کرلیا ہے اور یہ رقم اسکے لئے اس حق کے عوض ہونے کی بنیاد پر جائز ہوگی۔ آئندہ اگر مالک مکان کرایہ دار سے مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مکان خالی کرنے کا عوض جس پر ہر دو فریق راضی ہوجائیں مالک مکان سے وصول کرے اور اس صورت میں کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کے حق میں باہمی طے شدہ رقم کے عوض اپنے اس حق سے جو اس نے اصل مالک سے عوض دے کر حاصل کیا تھا دست بردار ہوسکتا ہے۔

۳) مالک مکان نے پگڑی لئے بغیر مکان کرایہ پر دیا اور اجارہ کی مدت اصل معاہدہ میں مقرر نہیں کی گئی ہو تو اس صورت میں مالک مکان کو حق ہوگا کہ جب چاہے مکان خالی کرالے۔ البتہ مالک مکان کو چاہئے کہ خالی کرانے کی نوٹس اور خالی کرنے کی تاریخ کے درمیان ایسی مہلت دے جو مقامی حالات کے پیش نظر مناسب ہو اور جس میں مالک اور کرایہ دار کو کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو اور کرایہ دار کو بھی چاہئے کہ اس مناسب مہلت میں مکان خالی کردے۔

۴) جو مکان یا دکان بغیر پگڑی لئے کرایہ پر دی گئی ہو، مالک مکان کو واپس کرتے وقت کرایہ دار کے لئے اس سے پگڑی طلب کرنا جائز نہ ہوگا۔

۵) سیمینار مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے معاملات میں شریعت کا خاص خیال رکھیں، شریعت چاہتی ہے کہ کسی بھی معاہدہ کے بارے میں معاہدہ کے ہر دو فریق تمام ضروری متعلق امور کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ باہم طے کرلیں تاکہ آئندہ کوئی نزاع نہ پیدا ہو، اور فریقین ضرر سے محفوظ رہیں۔ اس سلسلہ میں سیمینار خصوصیت سے یہ سفارش کرتا ہے کہ کرایہ داری کا معاملہ طے کرتے وقت

مدت کاتعین کرلیا جائے، اور اگر مالک مکان عوض لے کر ہمیشہ کے لئے اپنے خالی کرانے کے حق سے دستبردار ہونا چاہتا ہے تو فریقین صراحتاً آپس میں طے کرلیں۔ (مجلہ فقہ اسلامی ص ۵۶۷)

کرنسی نوٹ کا مسئلہ: (۱) کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں ہے بلکہ ثمن ہے، اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی وقانونی کی ہے۔

۲) عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا چاندی) کی جگہ لے لی ہے۔ اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے۔ لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے، نہ ادھار۔

۳) دوملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں، اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے۔ ۴) کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ لازم ہے۔

۵) نوٹوں میں زکات کا نصاب، چاندی کے نصاب کی قیمت کے مساوی ہوگا۔ (علامہ یوسف قرضاوی اور بعض دیگر علماء کے نزدیک نوٹوں میں نصاب، سونے کے نصاب کی قیمت کے مساوی ہوگا۔ دیکھئے فقہ الزکاۃ للقرضاوی ج/۱، ص ۲۶۴)

۶) اس اجلاس کا احساس ہے کہ مہر کی تعیین سونے اور چاندی کے ذریعہ عمل میں آئے تاکہ پوری طرح عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہوسکے اور سکوں کی قوت خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہونچے۔ (مجلہ فقہ اسلامی ۵۶۸)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (آمین) وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

تُحفَـــةُ البَـــارِی

فی الفقه الشافعی

جلدسوم

مؤلف

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ

ترتیب وپیشکش

محمد یوشع محتشم

کتاب النکاح (نکاح کا بیان)

آیت : وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ..." (النور : ۳۲)

ترجمہ : اورتم میں جو بے نکاح ہوں (خواہ مرد، خواہ عورت اور خواہ ابھی نکاح ہی نہ ہوا ہو، یا وفات وطلاق سے اب تجرد ہو گیا ہو) تم ان کا نکاح کر دیا کرو"

حدیث : آپ ﷺ کا فرمان ہے:" ... اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ" (صحیحین کتاب النکاح) (میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، پس تو جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی، تو وہ مجھ سے نہیں)

اسلام اور نکاح : اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، ان سب میں عورت کو اور عورت ومرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق وروح کی ترقی مدارج کے لئے عائق ومانع تسلیم کیا گیا تھا۔ اسلام نے آ کر اس نظریہ کو باطل قرار دیا، اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ تعلقِ ازدواج میں ممکن ہے، کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت بلکہ آزاد وغلام ہر ایک کے لئے بہتر، بلکہ خیر وبرکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا "وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" (النور ۳۲)

(اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ کنواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحین کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا، اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم رکھنے والا ہے)

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا، اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو، تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے (دیکھئے سورہ نساء آیت ۴)

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے، اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، (اور اسلام عین دینِ فطرت ہے) چنانچہ زن وشوہر (میاں بیوی) کے باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔

فرمایا:" وَمِنْ آيٰتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ " (الروم ۲۱)

(اور اس (خدا) کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان کے پاس سکون پاؤ، اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر ومحبت پیدا کر دیا، بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی نشانیاں ہیں)

قرآن پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن، سکون اور چین کا گوشہ ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے، جو زن وشوہر کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت میں فرق ڈالیں، فرمایا: (تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں.....اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ بقرہ) مرد وعورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کے معاشی

اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کردیا ہے۔

''هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ'' (بقرہ ۱۸۷) (عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو) اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا، بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت و مرد کی تخلیق اور ان کی باہمی فرائض کی تشریح کی ہے فرمایا: (اے لوگوں اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو، جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس اللہ جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور رَحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھوں، اللہ تمہاری دیکھ بھال کررہا ہے۔ سورہ نساء ۱)

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے، اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا اور ان رَحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا واسطہ اور ذریعہ ہیں۔

غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوتا، اور اس نقطۂ خیال سے ہی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے، کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودّت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح و عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے، ''مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ'' (المائدہ: ۵)

''پاکدامنی کے لئے، نہ شہوت رانی کے لئے''۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے (نکاح کے فائدہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک حدیث میں) ارشاد فرمایا: اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی۔ (متفق علیہ) نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں: ''فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ'' (النساء: ۳۴) (تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر (کے مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں)

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے، اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کردے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔ (ابن ماجہ۔ نکاح)

مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہے''۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ) انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بنادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کرسکتا، وہ دوسروں کے ساتھ کیا کرسکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر

فرمایا: "وَلِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقاً "(بخاری کتاب النکاح) ۔" اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر ومنزلت نہ تھی،

حضرت عمرؓ کا فرمان ہے:" ....ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار وقطار میں نہیں سمجھتے تھے۔اسلام آیا تو اس نے ان کے بارے میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کئے"(بخاری شریف ۔ تفسیر سورۃ تحریم)

اسلام نے ان کی قدر ومنزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا،اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا،البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی،ارشاد ہوا،وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ "(بقرہ ۲۲۸)(اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر،اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے)اور یہ منزلت اس لئے ہے تا کہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں ،یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں،اسی اعزازی منصب کے لئے شوہر کے انتخاب کی مصلحتیں بھی قرآن پاک نے بتادی ہیں،فرمایا:" اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ "(نساء : ۳۴)(مرد عورتوں کے نگراں ہیں،اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے،اور اس لئے کہ انھوں نے اپنا مال خرچ کیا)یعنی مردوں کی اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم وطاقت اور عقل وفراست وغیرہ میں جسمانی وذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے،طبی تحقیقات،انسانیت کی پوری تاریخ،اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اسی لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرتاً ملنا چاہئے،دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دینِ مہر،نان ونفقہ اور پرورشِ اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے،اسی لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے،کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے،تا کہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

بعض مرد عورتوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کے مقابلہ میں سختی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ پن وکجی کو نکالنا چاہتے ہیں،آپ ﷺ نے ان کی ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی،کہ:" عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو،کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے،جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ کام لے سکو تو لے سکتے ہو،اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے"(صحیحین)۔آپ ﷺ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا،فرمایا:" اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو،بلکہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی"۔(صحیح مسلم ۔ کتاب النکاح) یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے۔" وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا "(نساء : ۱۹)

(اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو،اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو۔)اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے،خانگی اور بیرونی،خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر،اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے،اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون،موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے،مرد پر واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو،اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومتِ وقت کے ذریعے عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے،اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو

اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جسکی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

ایک مشہور حدیث ہے، جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا: ''تم میں ہر ایک اپنی رعایا (ماتحت) کا نگہبان ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اسی کی پوچھ ہوگی، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی (بخاری) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

شریعت نے آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی اجازت خاص حالات میں دی ہے، اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ مار ایسی ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے (تفسیر طبری ۵/۴۱۔ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا چوٹ نہیں آسکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایک حدیث میں فرمایا: ''یہ (یعنی بیویوں سے بدسلوکی کرنے اور مارنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں''۔ (ابوداود، ابن ماجہ، دارمی)

ایک موقع پر فرمایا: ''کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہمبستر ہو''۔ (صحیحین) (ملخص از سیرت النبی للندوی۔ ۶/ ۲۷۰)

مشروعیت نکاح کی حکمتیں

۱۔ انسان کی فطرت میں جنسی میلان وجذبات موجود ہیں، لہٰذا اسلام نے جو عینِ دینِ فطرت ہے، اس کی صحیح تکمیل کے لئے نکاح کو مشروع قرار دیا۔ اسے پامال کر کے رہبانیت وتبتل کو اختیار کرنے سے منع فرمایا۔ لیکن اسلام نے ان جذبات کی تکمیل وتسکین کے لئے انسان کو حیوانات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ اپنے آپ کو اور سارے معاشرہ اور اخلاق کو برباد کر کے شیطانی گمراہی کے لئے راہ ہموار کرے، بلکہ فطرت کی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے معتدل اور شریفانہ اصول وضوابط کا اسے پابند بنایا۔

۲۔ اسلام نے کثرتِ نسل کی ترغیب دی ہے، جس سے ایک بارُعب ومضبوط اسلامی معاشرہ وجود میں آسکے، اور ظاہر ہے کہ شفیق والدین کی پرورش ونگہداشت میں ہی یہ ممکن ہے، جس کی اولین بنیاد نکاح ہے۔

اپنی من مانی شہوت رانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کا نہ کوئی باپ ہوگا، نہ کوئی تادیب وتربیت کا نظم، اور انجام کار ایک بدترین معاشرہ کے وجود کا سبب بنے گا۔

۳۔ شرعی نکاح کے ذریعے انسان صحیح سکونِ نفس اور اطمینان کی زندگی حاصل کرے گا، قرآن نے نہایت بلیغ انداز میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پوشاک (لباس) قرار دیا۔

جس طرح ظاہری لباس جسمانی مصائب کو چھپاتا اور تکلیف دہ امور سے بچاتا ہے، میاں بیوی ایک دوسرے کے شرف وعزت کی حفاظت اور راحت وانسیت کا باعث ہوتے ہیں۔

۴۔ شرعی نکاح سے رکاوٹ کی صورت میں انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے بدکاری کا راستہ اختیار کرے گا، جس کے

خطرناک اور گھناؤنے نتائج سے ہر کوئی واقف ہے، لہٰذا اخلاقی تباہی اور معاشرہ کی بربادی سے حفاظت کے لئے مشروع نکاح لازم ہے، اسی لئے ایک حدیث میں فرمایا: "دین دار و با اخلاق شخص کا رشتہ آئے تو نکاح کر دو ورنہ روئے زمین میں فتنہ و فساد ہوگا" (ترمذی ۔ نکاح)

۵۔ نسل انسانی کی صحیح بقا: عادت اللہ یہی جاری ہے کہ انسان والدین کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، لہٰذا اس نسل کے تسلسل کا صحیح ضامن مشروع نکاح ہے،

۶۔ نکاح کے ذریعہ آپسی رشتہ داریاں اور قرابت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے، اور آپس میں روابط و محبت اور تعاون کی بنیاد پڑتی ہے۔ (ملخص از الفقه المنهجی ۔ ۱۱/۴)

نکاح : نکاح کا لفظ عربی زبان میں ضم (جمع کرنے) اور وطی (صحبت) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شرعی اصطلاح میں نکاح ایسے عقد کو کہیں گے جو لفظِ النکاح (نکاح کر دینا) یا تزویج (زوجیت میں دینا) یا اس کے ترجمہ کے ذریعہ منعقد ہو، اور اسی کی وجہ سے وطی (صحبت) جائز ہو جائے۔

عربی میں نکاح کے لئے (۱۰۴۰) الفاظ ہیں۔ شرعاً نکاح درحقیقت عقد کے لئے مستعمل ہے، البتہ مجازاً صحبت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

مشروعیت ، نکاح کی حلت و مشروعیت قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ (مغنی ۲۳/۳)

آیات : ۱۔ "... فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ..." (النساء : ۳)

ترجمه : "تو نکاح کرلو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں دو دو تین تین چار چار"

۲۔ "وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ" (النور : ۳۲)

ترجمه : "اور تم میں جو بے نکاح ہوں، اور تمہارے نیک غلام و باندیوں کا نکاح کر دو"۔

احادیث : ۱۔ آپ ﷺ نے نوجوانوں کو خطاب فرمایا: "اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو (اسبابِ نکاح پر قدرت کی وجہ سے) جماع (صحبت) پر قادر ہو، وہ نکاح کرلے، کیونکہ اس سے نگاہیں پست اور شرمگاہ محفوظ رہیں گی، اور جو قادر نہ ہو، تو اسے چاہیئے کہ روزے رکھے، کیونکہ یہ اس کے حق میں وِجاء (خصی ہونے کی طرح) ہے، (یعنی روزے کے ذریعے اسے نفس پر قابو حاصل ہوگا، اور بے راہروی کا خطرہ ٹل جائے گا، اس طرح اس کی پاکیزگی برقرار رہے گی) (صحاح سته)

۲۔ "حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے نکاح سے بچنا چاہا، تو آپ ﷺ نے انھیں اس سے منع فرمایا" (متفق علیه)

۳۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "... میں عورتوں سے نکاح (بھی) کرتا ہوں، تو جو میرے طریقے سے اعراض برتے، وہ مجھ میں سے نہیں" (مقفق علیه)

۴۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے نیک عورت کو دنیا کی بہترین دولت قرار دیا۔ (مسلم)

۵۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "تمہاری دنیا میں سے عورت اور خوشبو مجھے محبوب ہیں، اور میرے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے"۔ (نسائی ، طبرانی باسناد حسن ۔ نیل الاوطار ۱۱۴/۶)

۶۔ ارشاد نبوی ہے: "چار باتیں رسولوں کی سنت میں داخل ہیں: حیاء، خوشبو، مسواک، اور نکاح" (ترمذی شریف)

نکاح کا حکم

کسی شخص کی حالت کے پیش نظر نکاح کے حکم کی درج ذیل نوعیتیں ہوں گی۔

۱- **مستحب :** کوئی شخص نکاح کا محتاج ہو، یعنی اس کا جی نکاح وصحبت کا مشتاق وآرزومند ہو، اور اسے اس کی رغبت ہو، نیز وہ نکاح کے اسباب ومصارف پر قادر ہو، یعنی مہر اور بیوی کی دیگر ذمہ داریاں نبھا سکتا ہو، اور نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا وبدکاری میں گرفتار ہونے کا اندیشہ نہ ہو، تو اسے نکاح کرنا مستحب ہے، کیونکہ اس سے نسل کی بقا اور نسب کی حفاظت، نیز مختلف مصالح کی ادائیگی پر تعاون حاصل ہوگا۔ (اوپر کی پہلی حدیث اس شق کی دلیل ہے)

اسی صورت میں عبادت کے لئے یکسو ہونے اور وقت فارغ کرنے کے مقابلہ میں نکاح کر لینا افضل ہے، صحیحین وغیرہ کی روایات میں آپ ﷺ نے جو بعض صحابہ کو بے نکاح رہ کر عبادات کی مشغولیت کے ارادہ سے منع فرمایا، اور نکاح کی ترغیب دی، اسے اسی صورت پر محمول کریں گے، لہٰذا جو بطور اعراض اسے ترک کرے، اس کی آپ ﷺ نے اپنے سے نفی فرمائی ہے۔

۲- **نکاح نہ کرنا مستحب** (یعنی نکاح کرنا خلاف اولیٰ): کوئی نکاح کا تو محتاج ہو، لیکن متعلقہ اسباب ومصارف پر قادر نہ ہو، تو اس کے حق میں بہتر یہ ہے کہ نکاح نہ کرے، بلکہ عبادات وروزوں کے ذریعے اپنی عفت وپاکدامنی کی حفاظت کرے، کیونکہ عبادات میں مشغولی اسے نکاح کے خیالات سے باز رکھے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے دولت سے نوازے (اگر روزے سے قابو حاصل نہ ہو تو پھر نکاح کرلے) (نہایہ) ارشادِ باری ہے: ''وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحاً حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ'' (النور ۳۳)

ترجمہ : ''اور ایسے لوگوں کو کہ جن کو نکاح کا مقدور نہیں، ان کو چاہیے کہ (اپنے نفس کو) ضبط کریں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے (پھر نکاح کرلیں)''۔

نیز صحیحین وغیرہ کی حدیث میں بھی (جیسا کہ گذر چکا) آپ ﷺ نے قادر ومستطیع نوجوانوں کو نکاح کا حکم دیا، اور جو قادر نہ ہو، اسے روزہ کا حکم دیا، لہٰذا یہ شخص بکثرت روزے رکھ کر اپنے جذبات کو قابو میں کرلے۔

تنبیہ : کافور وغیرہ کسی دوائی سے شہوت کو کمزور کرنا مکروہ، اور بالکل نابود وختم کرنا حرام ہے۔ (مغنی ۳/ ۱۲۶)

۳- **مکروہ :** اگر کوئی نکاح کا محتاج نہ ہو، یعنی فطرتاً وطبعاً ہی اُسے اس کی رغبت نہ ہو، یا کسی بیماری وعارضہ کی وجہ سے رغبت نہ ہو، نیز اسبابِ نکاح بھی میسّر نہ ہوں، تو اس کے لئے نکاح مکروہ ہے، کیونکہ بلاضرورت مہر ونفقہ وغیرہ ذمہ داریاں اپنے سر لادرہا ہے، حالانکہ ان کی ادائیگی پر قادر بھی نہیں ہے۔

۴- **نکاح نہ کرنا افضل :** کسی کے پاس اسبابِ نکاح تو ہیں، لیکن اسے نکاح کی احتیاج نہیں، کیونکہ اس کے نفس میں نکاح وصحبت کی طرف کوئی میلان ورغبت نہیں، نیز عبادات یا طلبِ علم میں مشغول ہے، تو ایسے شخص کے لئے نکاح نہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ وقت عبادت وتعلّم میں صرف کرنا افضل ہے، ممکن ہے کہ نکاح کے بعد مصروفیت بڑھ جائے اور اتنا وقت نہ دے سکے۔

۵- **نکاح کرنا افضل :** اوپر چوتھے نمبر پر درج شخص اگر اپنے فارغ اوقات کو علم وعبادات کی نذر نہیں کرتا، تو اس کے حق میں نکاح کر لینا افضل ہے، تا کہ نکاح کے فوائد ومصالح بھی حاصل ہوں، اور بے کاری اور فارغ البالی کہیں اسے غلط راستے پر نہ ڈال دے،

۶۔ **حرام :** اگر کوئی شخص نکاح کا محتاج نہ ہو، اور اسے معلوم ہو کہ نکاح کے بعد وہ بیوی کے حقوق ادا نہیں کرے گا، تو اسے نکاح کرنا حرام ہے۔ (گرچہ نکاح صحیح ہوگا) (الشروانی علی التحفہ ۹/۱۲، الفقہ المنھجی ۴/۱۷)

عورت کے لئے نکاح کا حکم

ہر عورت جو نکاح کی رغبت رکھتی ہو، یا نان نفقہ کی محتاج ہو، یا جسے بے نکاح رہنے کی صورت میں بدکار اور اوباش لوگوں کی دست درازی کا اندیشہ ہو، اسے نکاح کر لینا مستحب ہے۔ صاحبِ تنبیہ فرماتے ہیں: ''جس عورت کو نکاح کرنا جائز ہے بصورت احتیاج اسے مندوب ہے، ورنہ مکروہ ہے''۔

بعضوں نے فرمایا کہ اگر بدمعاشوں کی دست درازی اور عزت و آبرو پر حملہ سے بچنے کا نکاح کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، تو اسے نکاح کرنا واجب ہے۔

کوئی عورت نکاح کی محتاج نہ ہو، اور اسے اندازہ ہو کہ بصورت نکاح وہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نہیں کرے گی، تو اسے نکاح کرنا حرام ہے۔ (کیونکہ بلاوجہ خود کو گناہ میں مبتلا کرنا ہے) حقوق سے نکاح سے متعلقہ حقوق مراد ہیں، مثلاً شوہر کے حکم کے مطابق خوشبو اور دیگر بناؤ سنگھار کا استعمال، شوہر کے لئے کھانا وغیرہ تیار کرنا مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ اس پر واجب نہیں ہے۔

تنبیہ : عورت کا ایسا کوئی طریقہ استعمال کرنا جس سے استقرار حمل میں تاخیر ہو، مکروہ ہے اور حمل کی صلاحیت بالکل ختم ہو جائے تو حرام ہے۔ (تحفہ مع الشروانی ۹/۱۲، نھایہ ۶/۱۸۳، مغنی ۳/۱۲۵، شرح التنبیہ ۲/۵۹۰، الفقہ المنھجی ۴/۱۷، ترشیح المستفیدین ص ۲۹۶)

نکاح کے مقدمات

ایک نئے جوڑے کی نئی زندگی کی سعادت، ازدواجی زندگی کی پائیداری اور اولاد کی نجابت و شرافت کا دارومدار میاں بیوی کے ایک دوسرے کے صحیح انتخاب پر ہے۔ عارضی جذبات، وقتی مصلحت اور جلد بازی کا فیصلہ مطلوبہ سعادت و فوائد کا ضامن نہ ہوگا، اسی لئے مستقبل کے اس اہم فیصلہ سے پہلے چند مقدمات کو مشروع کیا گیا ہے، جس کی روشنی میں طرفین ایک دوسرے کے متعلق اطمینان حاصل کر کے آئندہ کا سفر بڑی خوش بختی کے ساتھ طئے کر سکتے ہیں:

اوّل : میاں بیوی میں مطلوبہ صفات

دوّم : نکاح سے قبل ایک دوسرے کو دیکھ لینا

سوّم : خِطبہ (پیغام، منگنی)

اوّل : زَوْجَیْن (میاں بیوی) میں مطلوبہ صفات : اسلام نے ایک جوڑے کے انتخاب میں درجِ ذیل صفات کو مدنظر رکھنے کی ترغیب دی ہے۔

۱۔ **دین داری :** دونوں دیندار اور بااخلاق ہوں، اسی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے: ''جب تم کو ایسے شخص کا پیغام آئے، جس کا دین اور اخلاق اطمینان بخش ہو، تو اس سے نکاح کر دو، ورنہ روئے زمین میں فتنہ اور طویل فساد پھیل پڑے گا'' (ترمذی)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''کسی عورت سے چار اسباب کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے،

اس کے مال، حسب، حُسن اور دین کی وجہ سے پس تم دیندار کا انتخاب کر کے کامیابی حاصل کرو۔ (صحیحین) اخلاق و دینداری کو معیار بنانے کی صورت میں آپسی محبت و مودت کی برقراری نصیب ہوگی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان حسب اور حُسن و جمال سے بالکل صرف نظر کرے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اصل نظر دینداری پر ہو، اگر اس کے ساتھ دیگر پسندیدہ صفات ہوں تو نورٌ علی نور، ابن ماجہ کی ایک حدیث میں ہے: ''عورتوں سے ان کے حسن کی بنیاد پر نکاح نہ کرو، بعید نہیں کہ یہ حسن ان کو ہلاک کردے، اور نہ ان کے مال کی خاطر نکاح کرو، شاید یہ مال انہیں سرکش بنادے، بلکہ ان کی دینداری کی بنیاد پر ان سے نکاح کرو، ایک سیاہ دین دار باندی زیادہ افضل ہے''۔ (فتح الباری ۹/۱۳۵)

۲-**نسب:** یعنی دونوں پاکیزہ اور شریف نسب والے ہوں، جیسا کہ اوپر صحیحین کی روایت سے معلوم ہوا، کیونکہ ازدواجی زندگی کی پائداری اور بہتری کے لئے یہ مفید ہے۔ اس لئے کہ ایک صحیح النسب شخص کا برتاؤ نیک رہے گا، صحبت کی صورت میں اکرام سے پیش آئے گا، ورنہ کم از کم ظلم نہ ڈھائے گا۔

صاحب نہایہ فرماتے ہیں: ''یعنی لڑکی معروف الاصل ہو، علماء وصلحاء کی طرف انتساب ہو، زنا کی لڑکی اور فاسق کی بیٹی سے نکاح مکروہ ہے''۔ (۱۸۴/۶)

۳-**زوجین میں قریبی رشتہ داری نہ ہو:** کیونکہ نکاح کا ایک مقصد خاندانوں کا آپس میں اتصال وتعلق ہے، تا کہ تعاونِ باہمی کی فضا قائم ہو، اور قریبی رشتہ داریوں میں یہ بغیر نکاح کے ہی حاصل ہے، نیز شہوت کی کمزوری کی وجہ سے اولاد کمزور پیدا ہوگی۔

دورِ صحابہ کے بعض نکاح سے اس مسئلہ پر زد نہیں پڑتی، کیونکہ جواز میں کوئی کلام نہیں۔

۴-**کَفَاءَت** (برابری، مساوات): یعنی درج ذیل امور میں شوہر بیوی کے مساوی اور اس کے معیار کا ہو:

(الف) صلاح ودینداری، لہٰذا ایک فاسق شخص نیک و پاکدامن عورت کا کُفو (ہمسر، مثل) نہیں ہوسکتا۔ اللہ سبحانہ وتقدس کا ارشاد ہے: ''اَفَمَنْ کَانَ مُؤمِناً کَمَنْ کَانَ فَاسِقاً لَایَسْتَوُوْنَ'' (السجدة ۱۸)

ترجمہ: تو جو شخص مومن ہو، کیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو فاسق (بے حکم) ہو (نہیں) وہ آپس میں برابر نہیں ہوسکتے''۔

(ب) پیشہ، لہٰذا ایک گھٹیا اور حقیر پیشہ والا شخص، مثلاً بھنگی، جھاڑو دینے والا، چرواہا وغیرہ کسی عالم، قاضی اور تاجر کی بیٹی کا کفو نہیں ہوسکتا ہے۔

(ج) جن عیوب سے نکاح کے فسخ کا حق حاصل ہوتا ہے (جسکی تفصیل آئندہ آئے گی) اگر شوہر میں ان میں سے کوئی عیب موجود ہو، مثلاً پاگل پن، برص (سفید داغ) تو وہ کفو نہ ہوگا۔

نکاح میں کفاءت دراصل بیوی اور اس کے اولیاء (ذمہ داروں) کا حق ہے، جو نکاح کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے، البتہ بیوی اور اس کے اولیاء کو عار دور کرنے کے لئے اس کی گنجائش دی گئی ہے، نیز عموماً اس کو پیشِ نظر رکھنا زوجین کی خانگی زندگی کی سہولت کا ضامن ہوگا۔ کیونکہ دونوں کی زندگی کا ڈھنگ، اور گذر بسر کا طریقہ یکساں ہونے کی وجہ سے اپنی عادت کو بدلنے کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ عورت اور اولیاء اس حق کو نظر انداز کرسکتے ہیں، لہٰذا ولی لڑکی کی رضامندی سے غیر کفو میں نکاح کردے، تو نکاح صحیح ہوگا، ان پر کسی طرح کا اعتراض وارد نہ ہوگا۔

اپنے نطفہ کے لئے بہتر انتخاب اور کفو میں نکاح کے متعلق روایت بقول امام ابن الصلاح مختلف سندوں سے مروی ہے۔ جس میں کچھ کلام ہے، گرچہ حاکم نے اس کی تصحیح فرمائی ہے۔ (مغنی ۱۲۷/۳ نہایه)

۵- بکارت (دوشیزگی، کنوارا پن): زوجین کا کنوارا ہونا مستحب ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: ''کنواری سے نکاح کیوں نہ کیا، کہ ایک دوسرے سے دل لگی و تفریح کرتے'' (متفق علیه)

نیز ایک اور حدیث میں فرمایا: ''کنواریوں سے نکاح کرو، کیونکہ وہ شیرین کلام، کثیر الاولاد اور راضی بقلیل ہوتی ہیں'' (ابن ماجه فی النکاح)

احیاء العلوم میں فرمایا: ''سنت ہے کہ اپنی بیٹی کا نکاح بھی کنوارے سے ہی کرے، جسکا اب تک نکاح نہ ہوا ہو، کیونکہ فطرتاً اول مانوس ہستی سے زیادہ انسیت و محبت ہوگی''۔ (نہایہ) اسی طرح دیگر صفات میں بھی شوہر میں ان کی موجودگی کو ترجیح دی جائے گی۔ (بجیرمی علی الاقناع ۳۰۵/۳، تحفه)

حیض وغیرہ کی وجہ سے کسی عورت کا پردہ بکارت زائل ہو، تب بھی وہ کنواری ہی شمار ہوگی۔ جو شخص جنسی کمزوری کی وجہ سے ایک کنواری سے صحبت کرنے اور اسے مطمئن کرنے پر قادر نہ ہو، یا گھر کے دیگر افراد کی نگہداشت و تربیت کے پیش نظر کسی تجربہ کار عورت کا محتاج ہو، تو یہ شخص کسی ثیبہ (جس کی پہلے شادی ہو چکی ہو) سے نکاح کرلے۔ (الاقناع مع البجیرمی ۳۰۵/۳)

بقیہ مطلوبہ صفات: وَلُود (یعنی جس سے اولاد پیدا ہو، بانجھ نہ ہو): آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''اولاد کی صلاحیت اور محبت کرنے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ بروز قیامت دیگر امتوں کے مقابلہ میں اس امت کی کثرت پر فخر کروں گا، (ابوداود، حاکم وصححه واحمد وابن حبان) کنواری لڑکی کے رشتہ داروں کے حالات سے اُس کے ولود ہونے کا اندازہ ہوگا۔

خوبصورتی: جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں گذرا، نیز حاکم کی روایت میں ہے۔ ''بہترین عورت وہ ہے کہ اسے دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ، اور اسے کچھ حکم دو تو وہ مان لے، اور اپنے نفس و مال کے متعلق خلاف ورزی نہ کرے۔''

امام ماوردیؒ نے فرمایا: علماء نے بہت زیادہ حسین عورت کو مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ (بعض مرتبہ) یہ حسن جمال اسے خود پسندی اور تکبر و غرور میں مبتلا کردے گی، اسی لئے امام احمدؒ نے اپنے بعض شاگردوں کو اس سے بچنے کی وصیت کی۔

عقل: عورت عقلمند و سمجھدار ہو۔ کسی ایسے شخص کی مطلقہ نہ ہو، جو دوبارہ اس سے نکاح کرنا چاہتا ہو، یا یہ اس سے نکاح کی خواہش رکھتی ہو۔

قلت مهر: اس کا مہر کم ہو، ایسی عورت کو آپ ﷺ نے زیادہ بابرکت قرار دیا ہے۔ (حاکم)

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ بیوی کی پہلی نحوست اس کا مہر زیادہ ہونا ہے۔ نیز بالغہ ہو، اور کسی دوسرے سے اس کی اولاد نہ ہو۔ اسی طرح اس عورت کے حلال ہونے میں کسی دوسرے امام کا اختلاف نہ ہو (مثلاً اس کے ماں یا بیٹی سے زنا، کیونکہ اس صورت میں بعض دیگر ائمہ کرام کے نزدیک اس سے نکاح صحیح نہیں، گرچہ عند الشافعیہ صحیح ہے) یا رضاعت وغیرہ کی وجہ سے شک نہ ہو۔

مذکورہ صفات میں تعارض کی صورت میں تقدیم کی ترتیب یہ ہے: دینداری تمام صفات پر مقدم، پھر عقل اور خوش خلقی، پھر نسب، پھر کنوارا پن، پھر اولاد کی صلاحیت، پھر حسن و جمال، پھر اپنی مصلحت کے اعتبار سے غور و فکر کر کے فیصلہ کرے۔ کسی ظاہری حاجت کے بغیر ایک سے زائد عورت سے نکاح نہ کرنا سنت ہے۔

اگر ماہ شوال وغیر شوال میں نکاح یکساں ممکن ہوتو ماہ شوال میں کرنا سنت ہے، اور بدائی (دخول) بھی ماہ شوال میں سنت ہے، کیونکہ آپ علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے شوال میں نکاح کیا۔اور دخول بھی شوال میں ہوا۔(ترمذی وصححہ) اگر نکاح کا سبب کسی اور ماہ میں پایا جائے تو اسی وقت نکاح کرلے (شوال تک موخر کرنے کی ضرورت نہیں) نیز نکاح مسجد میں بروز جمعہ لوگوں کے مجمع کے روبرو اور دن کے ابتدائی حصے میں سنت ہے، کیونکہ دن کے ابتدائی حصے میں آپ علیہ السلام نے اپنی امت کے حق میں برکت کی دعا فرمائی ہے۔(ترمذی وصححہ) (مغنی الحتاج ۳/۱۲۷، نہایۃ المحتاج ۶/۱۸۵)

مسجد میں نکاح کا حکم : طبرانی میں وارد ہے۔زیادہ لوگوں کی شرکت خصوصاً علماء وصالحین کی شرکت کی نیت سے جمعہ کے بعد نکاح رکھنا اولی ہے (تحفہ المحتاج ۹/۶۵)

دوم : نکاح سے قبل طرفین کا ایک دوسرے کو دیکھ لینا : کسی سے نکاح کا ارادہ ہو، اور بظاہر وہاں اپنے پیغام کی قبولیت کا امکان ہو، تو اسلام نے اس لڑکی کو دیکھنا مستحب قرار دیا ہے، گرچہ اس لڑکی کی اجازت نہ ہو، یا اسے اس کا علم نہ ہو، شریعت نے جو اجازت دی ہے وہ کافی ہے، نیز اطلاع کی صورت میں وہ بناؤ سنگھار کرے گی، (جس سے صحیح اندازہ نہ ہو پائے گا) اور اس کی غرض فوت ہوگی۔ایک نگاہ میں اس کی شکل وصورت کا صحیح اندازہ نہ ہو پائے، تو دوسری اور تیسری مرتبہ بھی دیکھ سکتا ہے، تاکہ نکاح کے بعد پچھتاوا نہ ہو۔

حضرت مُغیرہؓ نے ایک عورت کو پیغام دیا، تو آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''اسے دیکھ لو، کیونکہ اس سے آپسی مؤدت ومحبت کی پائداری کے زیادہ امکانات ہیں'' ۔(نسائی ، ترمذی ، ابن ماجہ ، دارمی ، ابن حبان)اسی طرح مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے دار قطنی ، حاکم ، ابوعوانہ اور ابن حبان نے مع تصحیح حضرت انسؓ سے ، ابن ماجہ وابن حبان نے محمد بن مَسلمہؓ سے اور ابوداود بزار اور حاکم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس مفہوم کی روایات کو پیش کیا ہے۔آپ علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''کوئی کسی عورت کو پیغام دے (یا ارادہ ہو) تو اسے دیکھ لینے میں کوئی گناہ نہیں، جبکہ پیغام کی خاطر دیکھ رہا ہو۔'' (احمد ۔طبرانی ۔بزار) مسند احمد میں ہے: ''گرچہ اس عورت کو علم نہ ہو'' (تلخیص الحبیر ۳/۱۴۷) اسی طرح نکاح کا ارادہ ہو تو عورت کے لئے بھی مرد کو دیکھ لینے کا حق ہے، تاکہ اپنی پسند اور معیار کے مطابق فیصلہ کرے، اور آئندہ ندامت نہ ہو۔(دونوں کو ایک دوسرے کو چھونا جائز نہیں ہے، جمل)

نظر کے حدود: مذکورہ صورت میں لڑکی کے صرف چہرہ اور دونوں ہتھیلیوں کو دیکھ سکتا ہے، کیونکہ اللہ کا فرمان ہے، ''وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا'' (النور ۳۱)

ترجمہ: (اور (عورتیں) اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں، مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہے۔) اس آیت میں مذکورہ ظاہری زینت سے یہی مراد ہے۔ ہتھیلی کے پیٹ اور پشت دونوں کو دیکھ سکتا ہے۔ چہرہ سے حسن وجمال کا اور ہتھیلی سے موٹاپے اور نرمی وغیرہ کا اندازہ ہوجائے گا۔اگر براہِ راست دیکھنا دشوار ہو، تو کسی عورت یا اس کے محرم مرد کو روانہ کرے، تاکہ وہ دیکھ کر اس کے سامنے تفصیلات بیان کرے، جیسا کہ آپ علیہ السلام نے حضرت اُم سُلیم کو اس مقصد سے ایک عورت کے پاس روانہ کیا، اور فرمایا: ''اس کے دونوں ایڑی کے اوپر کے پٹھے دیکھ لو، اور اس کے بدن کی خوشبو سونگھو'' (رواہ الحاکم وصححہ) ۔اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ عورت نسبتاً زیادہ تفصیلات سے آگاہ کرسکتی ہے، اس اعتبار سے اس میں مزید معلومات ملتی ہیں۔

ایک مرتبہ دیکھنے سے اندازہ مل جائے تو مزید دیکھنا حرام ہے، ورنہ بار بار دیکھ سکتا ہے، گرچہ تین سے بڑھ جائے۔سنت یہ ہے کہ

پیغام سے پہلے ہی دیکھ لے، تاکہ ناپسندیدگی کی صورت میں اعراض یا انکار کی وجہ سے اس کو تکلیف نہ پہنچے۔ایک روایت میں دل میں پیغام کی بات آنے کی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے۔(ابوداود) ۔اگر پہلے نہ دیکھے، تو پیغام کے بعد بھی دیکھ سکتا ہے، بعضوں نے اسے مندوب قرار دیا ہے، اور بعضوں نے صرف مباح (نہایہ ۱۸۶/۶)اس صورت میں لڑکی ناپسند ہو، تو چپ رہے، صراحتاً انکار نہ کرے۔

ایک عورت نکاح کے ارادہ کی صورت میں مرد کے ناف اور گھٹنے کے درمیان کے علاوہ دیگر بدن کو دیکھ سکتی ہے۔(خلاصہ یہ کہ دونوں کو نماز میں جن اعضاء کا کھلا رکھنا جائز ہے، انہیں دیکھ سکتے ہیں)۔اگر خود نہیں دیکھ سکتی تو کسی کو بھیج کر اس کے اوصاف معلوم کرلے۔(حاشیته الجمل ۱۲۰/۴) (الفقه المنجی ۴۱/۴)

نظر کے اقسام (من الاقناع مع البجیرمی)

کسی کو دیکھنے کی درج ذیل صورتیں ہوں گی۔

۱) کسی عاقل بالغ مرد کا عام حالات میں (بلا کسی معقول وشرعی حاجت کے) کسی بڑی اجنبی (غیر مَحرم ۔ پرائی) عورت کے بدن کو قصداً دیکھنا حرام ہے، گرچہ وہ قابلِ اشتہا نہ ہو، اور فتنہ کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اگر اتفاقاً نگاہ پڑ جائے تو گناہ نہ ہوگا (البتہ فوراً نگاہ پھیر لے)۔ مجبوب (مقطوع الذکر ۔جس کا آلہ تناسل کٹا ہو، لیکن خصیتین باقی ہو)، بوڑھا کھوسٹ ، (پیرفرتوت ۔کہن سال)اور مُخَنَّث (عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والا) کا بھی یہی حکم ہے۔(یعنی ان لوگوں کو بھی اجنبی عورت کی طرف دیکھنا حرام ہے)

مَمْسُوح (جس کی شرمگاہ خصیتین سمیت غائب ہو اور بالکل شہوت نہ ہو) کسی اجنبی عورت کو دیکھ سکتا ہے، جیسا کہ ایک محرم دیکھ سکتا ہے، یعنی ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو دیکھ سکتا ہے، جبکہ وہ عادل ومسلمان ہو اور عورت بھی عادلہ ہو، اور اس میں عورتوں کی طرف بالکل میلان موجود نہ ہو۔ایک قول میں ممسوح کے لئے بھی اجنبی عورت کو دیکھنا حرام ہے، یہی امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ کا مسلک ہے، اور امام سبکیؒ کا میلان بھی اسی طرف ہے۔کسی پاگل کی نگاہ کو حرام نہیں کہا جائے گا۔لیکن ایک عاقلہ بالغہ عورت کو اسے دیکھنا حرام ہے،

نابالغ کی چار قسمیں ہوں گی : ۱-مُراہق (قریب البلوغ)اس کا حکم بالغ کی طرح ہے۔یعنی ولی پر ضروری ہے کہ اسے دیکھنے سے روکے، نیز عورت کو اس کے سامنے آنا حرام ہے۔

۲-وہ نابالغ جو اپنے مشاہدہ کو بلاشہوت بیان کرسکتا ہو، یہ محرم کی طرح ہے،

۳-وہ نابالغ جو اپنا مشاہدہ شہوت کے ساتھ بیان کرے، یہ بالغ کی طرح ہے۔

۴-وہ نابالغ جو بیان کرنے پر ہی قادر نہ، اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

ایک بالغ کے لئے اجنبی عورت کے بدن کا کوئی بھی حصہ دیکھنا حرام ہے، یہاں تک کہ ناخن اور بال وغیرہ بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی دیکھنا حرام ہے۔اس کی آواز سننا حرام ہے، گرچہ تلاوت کی آواز ہو، جبکہ فتنہ کا خوف ہو، یا آواز سے لطف اندوز ہو، ورنہ حرام نہیں، اس میں اَمرد کا بھی یہی حکم ہے۔(عورت کے لئے سنت ہے کہ اجنبی سے بات کرتے وقت آواز کچھ موٹی اور بھاری نکالے یا منہ پر ہاتھ رکھے۔قلائد)

آیت : ''قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِ هِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْ جَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ''۔(النور : ۳۰)

ترجمه : آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ

صفائی کی بات ہے''۔

احادیث : ۱-حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے اتفاق نگاہ کے متعلق سوال کیا، تو فرمایا: '' نگاہ پھیرلو'' (احمد ، مسلم ، ابوداود ، ترمذی)

۲-آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: '' اے علی! ایک نگاہ کے بعد دوسری نگاہ نہ ڈالو....'' (احمد ، ابوداود، ترمذی)

۳-حجۃ الوداع میں ایک عورت آپ ﷺ سے مسئلہ پوچھنے آئی، تو حضرت فضل اس کی طرف دیکھنے لگے، تو آپ ﷺ نے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ دوسری طرف پھیر دیا...(بخاری) (نیل الاوطار ۱۲۸/۶)

۲) **کسی کا اپنی بیوی کو دیکھنا :** زندگی میں اپنی بیوی کے مکمل بدن کو دیکھنا جائز ہے، کیونکہ یہ اس کے لطف اندوزی کا سامان ہے، شرم گاہ کی طرف بلا حاجت دیکھنا مکروہ ہے، اس کے باطن (اندرون) کو دیکھنا شدید مکروہ ہے۔ پچھلی شرمگاہ (دُبُر) کو دیکھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا جائز ہے، البتہ اس جگہ صحبت حرام ہے، کوئی عورت کسی دوسرے کے وطی بُشبہ (غلطی وشبہ سے صحبت) کی وجہ سے عدت گذار رہی ہو تو شوہر کے لئے اس کے ناف و گھٹنے کے درمیان دیکھنا حرام ہے، دیگر اعضاء کو دیکھنا جائز ہے۔

بیوی بھی شوہر کے مکمل بدن کو دیکھ سکتی ہے، البتہ وہ منع کرے تو شرم گاہ کی طرف نہیں دیکھ سکتی۔ (یعنی اس کے ناف و گھٹنے کے درمیان)

بیوی کے انتقال کے بعد اب شوہر ایک محرم کی طرح صرف ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن بغیر شہوت کے دیکھ سکتا ہے۔

۳) **مَحرَم کو دیکھنا** (محرم یعنی جس سے نکاح حرام ہو، جیسے ماں بیٹی بہن وغیرہ): کسی محرم کے ناف و گھٹنے کے درمیانی اعضاء کے علاوہ بدن کے دیگر حصوں کو بغیر شہوت کے دیکھنا جائز ہے۔ ناف و گھٹنے کے درمیان دیکھنا بالا جماع حرام ہے۔ شہوت کے ساتھ محرم کو یا کسی دوسرے کو جس سے لطف اندوزی جائز نہیں، دیکھنا حرام ہے، امام قفال وغیرہ نے فرمایا کہ محرم کے جو اعضاء عموماً کام کاج کے وقت کھلے رہتے ہیں، صرف انھیں دیکھ سکتے ہیں، دیگر اعضاء کو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں (لہٰذا یہ جائز نہیں) (المجموع ۱۴۰/۱۶)

آیت: '' وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ...(النور ۳۱)

ترجمہ : (عورتیں) اپنی زینت (کے مواقع) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں، مگر اپنے شوہروں پر یا (اپنے محارم پر یعنی) اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر، یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر، یا اپنے (حقیقی وعلاتی واخیافی) بھائیوں پر (نہ کہ چچازاد، ماموں زاد وغیرہ پر) یا اپنے (مذکورہ) بھائیوں کے بیٹوں پر، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی (یعنی اپنی دین کی شریک) عورتوں پر (مطلب یہ کہ مسلمان عورتوں پر، کیونکہ کافر عورت کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے۔ (رواہ فی الدرر عن عمر بن الخطاب وابن عباس ومجاهد) یا اپنے ملک یمین (یعنی غلام باندی) پر، یا ان مردوں پر جو (محض کھانے پینے کے واسطے) طفیلی (کے طور پر رہتے) ہوں اور ان کو (عورتوں کی طرف) ذرا توجہ نہ ہو، یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے...''

۴) **مسنون نظر :** یعنی نکاح کا ارادہ ہو تو دیکھنا، جس کی تفصیل گذر چکی۔

۵) **علاج کے لئے دیکھنا :** بغرضِ علاج جن اعضاء کو دیکھنے کی ضرورت ہو، دیکھ سکتے ہیں، لہٰذا ایک مرد وعورت ایک دوسرے کا علاج کر سکتے ہیں، لیکن کسی محرم یا شوہر یا معتبر عورت کی موجودگی میں ہو۔ نیز مناسب علاج کرنے والی خاتون ڈاکٹر نہ ہو، تب مرد

کے پاس جاسکتی ہے، اسی طرح مناسب مرد طبیب نہ ہو، تب ایک مرد کسی خاتون کے پاس جاسکتا ہے۔ (یعنی ہم جنس ڈاکٹر کی موجودگی میں غیر جنس کے پاس نہیں جاسکتے)

ایک مسلم مُعالج (ڈاکٹر) کی موجودگی میں کسی غیر مسلم سے رجوع ہونا جائز نہیں، اگر ایک غیر مسلم عورت اور ایک مسلم مرد معالج ہو، تو کسی عورت کے علاج کے لئے غیر مسلم عورت مقدم ہوگی۔ حتی الامکان عادل معالج سے رجوع ہو، عادل کے ہوتے ہوئے غیر عادل کے پاس نہ جائے۔

امام ماوردی نے فتنہ سے اطمینان کی بھی شرط لگائی ہے۔ معالج کے سامنے صرف بقدر ضرورت حصہ کھولے۔

ایک عورت کے طبیب کی ترتیب: مسلمان عورت سب پر مقدم ہوگی، پھر غیر مراہق مسلم بچہ، پھر غیر مراہق کافر بچہ، پھر کافرہ عورت، پھر محرم مسلم مرد، پھر کافر محرم، پھر اجنبی مسلمان، پھر (سب سے آخر میں) غیر مسلم مرد، بعضوں نے کافرہ عورت کو محرم کے بعد رکھا ہے۔

ختنہ کرنے والے کا سامنے والے کی شرمگاہ کو اور دائی کا حاملہ عورت کی شرمگاہ کو دیکھنے کا بھی یہی حکم ہے۔

اجنبی ڈاکٹر کے سامنے عورت کو چہرہ یا ہتھیلی کھولنے کے لئے صرف حاجت کافی ہے، (یعنی عام بیماری میں بھی گنجائش ہوگی) اگلی پچھلی شرمگاہ کے علاوہ بدن کے دیگر حصے پر دیکھنے کی نوبت آتی ہو، تو شدتِ حاجت شرط ہے، یعنی ایسی بیماری و تکلیف ہو کہ اس کی وجہ سے تیمم کی رخصت مل جائے، مثلاً سخت لاغری و بیماری اور شرمگاہ کی طرف نگاہ کے لئے ایسی سخت تکلیف شرط ہے، کہ اس کی وجہ سے ان اعضاء کو کھولنا مروت کے خلاف نہ سمجھا جائے۔

حدیث: حضرت اُم سلمہ نے آپ ﷺ سے پچھنے لگوانے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے ابوطَیبَہ کو حکم دیا کہ انھیں پچھنے لگائیں (مسلم شریف)

۶) گواہی کے لئے دیکھنا: گواہ بننے، یا گواہی دینے، یا خرید و فروخت وغیرہ معاملات کے لئے دیکھنا جائز ہے۔ حتی کہ زنا اور ولادت کی گواہی کے لئے شرمگاہ کی طرف اور رضاعت کی گواہی کے لئے پستان کی طرف بھی دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح دیکھ کر گواہ بنے، اور گواہی دیتے وقت نقاب میں عورت کو پہچان نہ سکے، تو اسے چہرہ کھولنا ضروری ہے، اور نقاب کے باوجود پہچان رہا ہو تو اس کی ضرورت نہیں، بلکہ اس صورت میں دیکھنا حرام ہے۔

معاملات میں صرف چہرہ کی طرف دیکھ سکتا ہے۔

۷) غلام باندی خریدنا: ایک مرد کسی باندی کو یا ایک عورت کسی غلام کو خریدنا چاہے تو ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو دیکھ سکتے ہیں، چھونے کی اجازت نہیں۔

۸) تعلیم: فرض یا مستحب تعلیم کے لئے عورت اور اَمرَد کی طرف دیکھنا جائز ہے۔

عورت کو بغرض تعلیم دیکھنا اس وقت جائز ہے، جبکہ کسی مناسب عورت یا محرم کے ذریعہ یہ ممکن نہ ہو، اور پس پردہ دشوار ہو، نیز خلوتِ محرمہ نہ پائی جائے۔ (یعنی کسی جگہ صرف ایک عورت اور اجنبی مرد نہ ہو) (نہایة ۶ / ۱۹۹)

۹) عورت کا اپنے محرم مردوں کو دیکھنا: ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو دیکھ سکتی ہے۔

۱۰) عورت کا کسی اجنبی مرد کو دیکھنا: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اسے اجنبی مرد

کے کسی بھی حصّہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

آیت: ''وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ ''.....(النور ۳۱)

ترجمہ: ''اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں....''

حدیث: ایک مرتبہ حضرت ابن اُم مکتوم ؓ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو ان سے پردہ کا حکم دیا، اس پر حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ وہ تو نابینا ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: '' کیا تم دونوں بھی نابینا ہو، تم انھیں نہیں دیکھ رہی ہو؟'' (ابوداود، نسائی، ترمذی، ابن حبان)

امام بلقینی وغیرہ کا قول ہے کہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو تو اسے مرد کے چہرہ اور ہتھیلی کو دیکھنا جائز ہے۔(مغنی ۱۳۲/۳)

۱۱) مرد کا مرد کو دیکھنا: ناف اور گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو بغیر شہوت کے دیکھ سکتا ہے۔ فتنہ کا ڈر نہ ہو تو حائل کے ساتھ ایک مرد دوسرے مرد کے ران کو رگڑ سکتا ہے۔

۱۲) اَمرَد کو دیکھنا: (اَمرَد یعنی وہ نوعمر لڑکا جسے ابھی داڑھی نہ آئی ہو، اور غالباً داڑھی اگنے کی عمر تک نہ پہنچا ہو، اور اگر لڑکی ہوتا تو شہوت ابھری ہوتی) بڑی عمر کے باوجود داڑھی نہ ہو تو وہ امرد نہیں کہلائے گا۔

شہوت کے ساتھ خوبصورت امرد کی طرف نگاہ بالا جماع حرام ہے، بلکہ شہوت کے ساتھ تو باریش شخص اور محرم عورتوں کی طرف بھی نگاہ قطعاً حرام ہے، اگر دیکھنے سے لطف اندوز ہو (لذت حاصل ہو) تو اسے شہوت کی نگاہ شمار کرینگے۔ شہوت تو نہ ہو، لیکن فتنہ کا اندیشہ ہو، تب بھی امرد کی طرف نگاہ حرام ہے۔

امام نوویؒ کے نزدیک شہوت اور فتنہ کے خوف کے بغیر بھی امرد کو دیکھنا حرام ہے، جبکہ وہ محرم نہ ہو، اکثر حضرات کے نزدیک اس صورت میں دیکھنا حرام نہیں۔ امرد کے ساتھ خلوت یا اس کے بدن کے کسی حصّہ کو چھونا حرام ہے۔(اعانۃ ۲۶۳/۳)

۱۳) باندی کو دیکھنا: اس کا حکم بھی محققین کے نزدیک آزاد عورت کی طرح ہے۔

۱۴) ایک عورت کا دوسری عورت کو دیکھنا: ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ وہ بدن کو بلا شہوت دیکھ سکتی ہے۔

۱۵) خُنثٰی مشکل: اسے عورتوں کے حق میں مرد، اور مردوں کے حق میں عورت شمار کرینگے۔ کسی اجنبی مرد یا عورت کو تنہائی میں اس کے ساتھ رہنا جائز نہیں۔

۱۶) کافرہ عورت کا مسلمان عورت کو دیکھنا: سورۃ نور کی آیت ۳۱ جو (۳) نمبر پر گذر چکی، اس میں ''اَوْ نِسَآءِ هِنَّ (اپنی عورتوں پر) لفظ گذر چکا، لہٰذا کسی مسلمان عورت کو غیر مسلم عورت کے سامنے بے پردہ ہونا جائز نہیں ورنہ 'اپنی عورتیں' کہنے کی ضرورت نہ تھی، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ وہ غیر عورتوں کو مسلم عورتوں کے ساتھ حمام میں داخل ہونے سے روکتے تھے۔ عام طور پر کام کاج کے وقت جو اعضاء کھلے رہتے ہیں، اسے دیکھنے میں حرج نہیں۔ نیز یہ حکم اس کافرہ کا ہے جو اس مسلم عورت کی محرم یا باندی نہ ہو۔(البجیرمی مع الاقناع ۳۲۵/۳)

۱۷) نابالغ بچی: جو بچی ابھی اتنی کم سن ہو کہ ایک طبع سلیم (سلیم الفطرت) شخص کو اسے دیکھ کر شہوت (جنسی خواہش ورغبت) نہ ابھرے، اسے دیکھنا جائز ہے بدصورتی کی وجہ سے رغبت نہ ہو، تو اس کے بغیر اس کا اندازہ لگایا جائے گا۔ یعنی اتنی عمر ہو جائے کہ

اگر بدشکل نہ ہوتی تو رغبت ابھری ہوتی تو دیکھنا حرام ہوگا، ورنہ نہیں۔

ایسی بچی کی اگلی وپچھلی شرمگاہ کی طرف دیکھنا جائز نہیں (خواہ وہ محرم ہو یا غیر محرم) البتہ والدہ یا دیگر اس کی پرورش کرنے والے دودھ پلانے اور تربیت کے دوران شرمگاہ کی طرف دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ نجاست دھونے، غسل کرانے وغیرہ میں اس کی ضرورت پڑے گی۔

چھوٹے بچے کی شرمگاہ کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض علماء نے بچے کی شرمگاہ میں اجازت دی ہے۔ (نہایة ۱۸۹/۶ ۔ تحفہ ۲۶/۹)

۱۸) اپنی شرم گاہ: کسی انسان کو عبث اپنی شرمگاہ دیکھنا مکروہ ہے (نہایة ۲۰۱/۶) (تحفة ۵۱/۹)

مَسّ (چھونا)

جہاں دیکھنا ممنوع ہے، چھونا بھی حرام ہے، کیونکہ چھونا شہوت بھڑکانے میں دیکھنے سے بڑھ کر ہے، اسی لئے چھونے سے انزال ہوجائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اور صرف دیکھنے سے انزال ہوجائے تو نہیں ٹوٹتا۔

لہٰذا کسی امرد کو چھونا، اور بلا حائل کسی آدمی کی ران رگڑنا حرام ہے۔ حائل کے ساتھ کسی آدمی کی ران رگڑنا جائز ہے، جبکہ بلاشہوت ہو اور فتنہ کا خوف نہ ہو۔ امرد کی ران حائل کے ساتھ بھی چھونا حرام ہے۔

کبھی چھونا جائز اور دیکھنا حرام ہوتا ہے، مثلاً طبیب جبکہ صرف چھو کر مرض کا پتہ لگا سکتا ہو۔

نکاح کے قصد، گواہی اور تعلیم کے لئے دیکھنے کی اجازت کے باوجود چھونا حرام ہے۔ اسی طرح عورت کو اپنے غلام کو دیکھنا جائز لیکن چھونا منع ہے، اور غلام کے حق میں اپنی آقا کا بھی یہی حکم ہے، ممسوح کو بھی چھونا حرام ہے۔

مَحرم کے پیٹ، پشت اور پیر وغیرہ کو بلا حائل بغیر حاجت وشفقت کے چھونا یا اس کا بوسہ لینا حرام ہے۔ حاجت یا شفقت کی صورت میں جائز ہے، جبکہ شہوت یا فتنہ کا خوف نہ ہو۔ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کا اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا بوسہ لیا تھا۔ (بخاری شریف)

صاحبِ مغنی نے حاجت وشفقت کے بغیر بھی جواز کو ترجیح دی ہے۔ والدہ وغیرہ محرم کا پیر دبانا حاجت کی صورت میں جائز ہے۔

صحبت کے وقت کسی اور کا تصور: اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کے وقت کسی دوسری عورت کے محاسن کا تصور کرے، یہاں تک کہ یوں سمجھے کہ اس سے صحبت کررہا ہوں، تو کئی متاخرین محققین مثلاً ابن الفرکاح، جمال الاسلام ابن البنزری، کمال رواد اور امام سیوطی وغیرہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

بال وناخن: جن اشیاء کا بدن پر ہوتے ہوئے دیکھنا حرام ہے، جدائی کے بعد بھی حرام ہے، اسی لئے علماء نے موئے زیر ناف اور عورت کے ناخن وبال کو دفن کرنا واجب قرار دیا ہے۔

ساتھ لیٹنا: دو مرد یا دو عورت کا برہنہ ایک ہی کپڑے میں لیٹنا حرام ہے، جبکہ بستر ایک ہو، گرچہ ایک دوسرے سے مس نہ ہوں، یا ماں باپ کے ساتھ ہوں، جبکہ بچے دس سال کا ہو چکا ہو، کیونکہ مسلم شریف کی حدیث میں دو مردوں کو یا دو عورتوں کو اس طرح ایک ہی کپڑے (چادر) میں سونے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث: ''سات سال کی عمر میں اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو، دس سال کے ہوجائیں تو نماز (میں کوتاہی) پر مارو، اور ان کا بستر جدا کردو'' (ابوداود حاکم ۔ تلخیص)

دار قطنی اور حاکم کی ایک روایت میں سات سال میں بستر کی جدائی کا حکم دیا ہے۔

بچہ جب دس سال (یا بعضوں کے نزدیک سات سال) کا ہو جائے، تو والدین و بھائی بہنوں سے جدا سلانا واجب ہے، جبکہ بدن میں کپڑا نہ ہو، ورنہ گنجائش ہوگی۔(مغنی المحتاج ۔ ۱۳۵/۳، نہایۃ المحتاج ۲۰۱/۶، تحفۃ المحتاج ۵۱/۹، اعانۃ الطالبین ۲۶۳/۳)

مصافحہ وغیرہ

احادیث : ۱) حضرت انسؓ سے قتادہؒ نے پوچھا کہ کیا صحابہ کرام میں مصافحہ کا معمول تھا؟ انہوں نے فرمایا: "جی ہاں" (بخاری)

۲) آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا، ملاقات پر اپنے بھائی کے لئے جھک جائیں؟

فرمایا: "نہیں"۔ پوچھا: تو کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرلیں؟ فرمایا: "ہاں"۔(ترمذی وحسنہ)

۳) ارشاد نبوی ﷺ ہے: "جو بھی دو مسلمان بوقت ملاقات مصافحہ کرلیں، بچھڑنے سے پہلے ضرور ان کی مغفرت ہوگی" (احمد، ابوداود، ترمذی) ابوداود کی ایک روایت میں ہے: "اور دونوں اللہ کی حمد اور استغفار کریں"۔(فتح الباری ۔ ۵۵/۱۱)

دو مردوں اور دو عورتوں کو بوقت ملاقات مصافحہ مسنون ہے۔ اگر ایک مرد عورت آپس میں محرم یا میاں بیوی ہوں یا ایک حدِ شہوت سے کمسن ہو، تو مصافحہ جائز ہے۔ حسین امرد سے مصافحہ حرام ہے۔ جسے جذام یا برص جیسی بیماری ہو، اس سے مصافحہ مکروہ ہے۔

معانقہ (گلے ملنا۔ بغلگیر ہونا) اور سر میں بوسہ لینا مکروہ ہے، البتہ کوئی سفر سے آیا ہو، یا عرفاً کافی مدت کے بعد ملاقات ہو تو حدیث کی روشنی میں یہ سنت ہے، جبکہ جنس متحد ہو (یعنی مرد کو مرد سے اور عورت کو عورت سے گلے ملنا اس صورت میں سنت ہوگا) لیکن امرد مستثنیٰ ہے، جیسا کہ گذر چکا۔

کسی زندہ آدمی کے ہاتھ کو بوسہ دینا سنت ہے، جبکہ کسی دینی فضیلت و بزرگی کی وجہ سے ہو، کسی دنیوی امر مثلاً مالداری، وزارت وغیرہ کی وجہ سے مکروہ ہے، کسی مجبوری کی وجہ سے حرج نہیں۔

اہل فضل کے لئے اکراماً کھڑے ہونا مستحب ہے، ریا اور تفخیم کے طور پر منع ہے۔(بجیرمی مع الاقناع ۳۲۶/۳۔ اعانۃ مع الفتح ۲۶۳/۳)

تنبیہ : (بعض علاقوں میں عید، شادی اور جنازہ کے موقع پر معانقہ کا معمول و اہتمام ہے، لیکن حدیث و فقہ کی کسی کتاب میں ان اوقات میں معانقہ کی مشروعیت احقر کی نظر سے نہیں گذری۔ شرعی ثبوت کے بغیر کسی چیز کا اہتمام کرنا اور رسم بنالینا کہ وہ کوئی مطلوب اور شرعی عمل محسوس ہونے لگے، قطعاً مناسب نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب)

خِطبَہ (منگنی ۔ پیغام)

خِطبہ یعنی کسی لڑکی سے نکاح کا التماس اور نکاح کے لئے پیغام دینا۔

خِطبہ کے احکام : ۱) اگر لڑکی نہ کسی کے نکاح میں ہو، اور نہ عدت گذار رہی ہو، تو اسے تصریحاً و تعریضاً پیغام دینا حلال ہے، جبکہ کوئی دوسرا مانع نہ پایا جائے (جس کا ذکر آئندہ آئے گا)

۲) اگر لڑکی پہلے شوہر کی وفات یا طلاقِ بائن کی عدت میں ہو تو تعریضاً پیغام حلال ہے، نہ کہ تصریحاً۔

آیت: "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ...." (البقرہ ۔ ۲۳۵)

ترجمہ:'' اورتم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو پیغام دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہو یا اپنے دل میں پوشیدہ رکھو''۔عورت جسکی عدت میں ہو، اسے دوبارہ اس سے نکاح حلال ہو، تو وہ عدت میں تصریحاً بھی پیغام دے سکتا ہے(مغنی ۱۳۶/۳)

۳)مذکورہ دونوں قسم کی عورتوں کے علاوہ کو تصریحاً یا تعریضاً دونوں طرح پیغام دینا حرام ہے، جب تک کوئی عورت کسی شخص کے نکاح میں ہو، اسے پیغام دینا حرام ہے۔اسی طرح محرمات نکاح میں بیان ہونے والی ہر عورت کو پیغام دینا حرام ہے، خواہ حرمت ابدی ہو یا عارضی۔

کوئی عورت طلاقِ رجعی کی عدت میں ہو، تو اسے بھی تصریحاً یا تعریضاً پیغام دینا حرام ہے، کیونکہ وہ بیوی کے حکم میں ہے، کیونکہ اس کے شوہر کو اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لینے کا حق حاصل ہے، ارشاد باری ہے!'' وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّ هِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْ اِصْلَاحاً''۔(البقرۃ : ۲۲۸)

ترجمہ : '' اور ان عورتوں کے شوہران کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصدر کھتے ہوں''۔

تصریح : تصریحاً پیغام یعنی ہر وہ لفظ جو قطعاً وصراحتاً نکاح کی رغبت پر دلالت کرے: مثلاً میرا تجھ سے نکاح کا ارادہ ہے، تیری عدت ختم ہو تو میں تجھ سے نکاح کرلوں گا۔

تعریض : یعنی ایسا لفظ جس میں نکاح کی رغبت اور عدم رغبت دونوں کا احتمال ہو: مثلاً تو خوبصورت ہے، تیرے کئی لوگ خواہاں ہیں، تجھ جیسی عورت کسے ملے گی وغیرہ

پیغام کا جواب : مذکورہ صورتوں میں عورت یا ولی کی جانب سے پیغام کے جواب کا حکم بھی پیغام کی طرح ہے۔(یعنی تصریحاً پیغام جائز ہو تو جواب بھی جائز صرف تعریضاً جائز ہو تو جواب بھی صرف تعریض میں ہی جائز ہوگا اگر پیغام حرام ہو، تو ہاں میں جواب بھی حرام ہوگا)(مغنی ۔ فتح الوھاب ۔ الفقه المنهجي ۵۰/۴)

پیغام پر پیغام

حدیث :۱)''کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ دے، یہاں تک کہ وہ نکاح کرلے یا ترک کردے''(بخاری ، نسائی)

۲)''کوئی شخص کسی دوسرے کے پیغام پر پیغام نہ چڑھائے یہاں تک کہ وہ پہلا شخص پیغام ترک کردے یا اسے اجازت دے۔

(بخاری ۔نسائی ۔ نیل الاوطار)

کسی لڑکی کو ایک شخص کا پیغام جا چکا ہو، تو دوسرے کو اس پر پیغام چڑھانا حرام ہے، جبکہ درج ذیل شرائط موجود ہوں۔

۱) پہلے شخص کا پیغام جائز ہو، خواہ مکروہ ہو۔ ۲) پہلے پیغام کا صراحتاً اثبات میں جواب مل چکا ہو۔ ۳) اجازت وغیرہ کے ذریعے طرفین میں سے کسی کی جانب سے اس رشتہ سے اعراض نہ پایا گیا ہو۔ ۴) دوسرے شخص کو ان تمام شرائط کا، نیز اس صورت میں دوسرا پیغام دینے کی حرمت کا علم ہو۔

لہٰذا مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو دوسرا پیغام حرام نہ ہوگا۔مثلاً: ابھی اس لڑکی کو کسی کا پیغام نہیں گیا، پہلے پیغام کا جواب نہیں ملا، جواب تعریضاً ملا ہو، جواب تو تصریحاً مل چکا ہے لیکن دوسرے شخص کو اس پیغام کا، یا جواب کا، یا جواب کے صریح ہونے کا، یا اس

صورت میں دوسرے پیغام کی حرمت کا علم نہ ہو، پیغام دینے والے نے کسی خوف یا شرم کے بغیر دوسرے شخص کو پیغام کی اجازت دی، پہلے شخص یا لڑکی کی جانب سے اعراض پایا گیا، پہلے پیغام حرام ہو، مثلاً: کسی کی عدت میں اس نے پیغام دیا تھا، تو ان تمام صورتوں میں دوسرے کو پیغام دینا جائز ہے۔

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کو حضرت معاویہؓ اور ابوجہمؓ اور اسامہؓ نے پیغام دیا، تو آپ ﷺ نے حضرات اسامہؓ کے متعلق مشورہ دیا۔

(مسلم ، ابوداود ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجه . نیل الاوطار ۱۲۳/۶)

اگر لڑکی مُجبرہ ہے تو ولی مُجبرہ کی، غیر مجبرہ ہے تو لڑکی کی اور غیر کفو کا پیغام ہو تو دونوں کی قبولیت کا اعتبار ہوگا۔ (کسی اور کے پیغام قبول کرنے کا کوئی اعتبار نہیں)۔ جس صورت میں پیغام پر پیغام حرام ہے، اگر کوئی اس صورت میں پیغام دے اور نکاح ہو جائے تو یہ نکاح صحیح ہوگا، صرف پیغام دینا گناہ شمار ہوگا۔

مشورہ

حدیث : کسی سے اس کا بھائی خیر خواہی چاہے (مشورہ طلب کرے) تو اس کے ساتھ خیر خواہی سے پیش آوے'' (بیھقی بسند حسن)

مسلم کی ایک حدیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق شمار کئے جس میں ایک یہی خیر خواہی کا سلوک ہے۔ (تلخیص الحبیر ۱۵۱۹/۳)

کوئی شخص کسی دوسرے سے نکاح، خرید وفروخت، یا تعلیم وغیرہ کسی مقصد کے لئے تعلق جوڑنا چاہتا ہو، تو اس شخص کو اس کے عیوب سے آگاہ کرنا لازم ہے، جبکہ آگاہ کرنے والے کے جان ومال اور عزت وآبرو وغیرہ کو اس سے خطرہ لاحق نہ ہو، اور یہ اطلاع محض خیر خواہی کی نیت سے ہو اور سچائی کے ساتھ ہو۔ مذکورہ شخص اس سے مشورہ طلب نہ کرے، تب بھی اسے اطلاع دینا واجب ہے۔

اگر عیوب کو بیان کرنے کے بجائے صرف اسے منع کرنے سے وہ رک جائے تو بیان کرنا جائز نہیں، یا بعض عیب کا ذکر کافی ہو تو بقیہ کا ذکر حرام ہے، اسی طرح صرف متعلقہ عیب کا ذکر کرے، یعنی کسی کا نکاح کا ارادہ ہے، تو صرف اس سے متعلق عیب بیان کرے، معاملات کے عیب کے ذکر کی اجازت نہ ہوگی۔ اگر اسے اندازہ ہو کہ عیوب کے ذکر سے بھی وہ باز نہ آئے گا، تو کسی عیب کا ذکر نہ کرے۔

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کو جب حضرت ابوجہمؓ اور معاویہؓ کا پیغام آیا، اور آپ ﷺ سے مشورہ کیا تو فرمایا کہ، ابوجہم تو ڈنڈا ہاتھ سے نہیں رکھتے (یعنی بہت مارتے ہیں، یا سفر کرتے ہیں)، اور معاویہ تو فقیر ہیں، ان کے پاس کچھ مال نہیں (مسلم)

اپنی ذات کے متعلق مشورہ : کسی سلسلہ میں خود اپنی ذات کے متعلق کوئی مشورہ کرے، اور اپنی ذات میں عیوب ہوں تو میں اس قابل نہیں ہوں کہنا واجب ہے۔ اس جواب سے وہ راضی نہ ہو، تو یہ اس معاملہ کو ترک کردے، یا شرعی وعرفی جو مذموم امور اس میں ہیں، وہ بیان کردے۔

غیبت

کسی کی ذات، یا اس کے اولاد، بیوی یا مال وغیرہ سے متعلق کوئی بات جو اسے عرفاً یا شرعاً ناپسند ہو، اسکا تذکرہ غیبت کہلاتا ہے۔ (جو حرام ہے) اگر چہ صرف اشارہ سے ہو، یا دل میں اس کا استحضار ہو، لیکن درج ذیل صورتوں میں غیبت جائز ہے۔

۱) خیر خواہی اور مشورہ کے طور پر ذکر کرنا، جس کی تفصیل ابھی گذر چکی (گواہوں اور حدیث کے راویوں پر کلام بھی اس میں داخل ہے)

۲) جو انصاف دلانے کی قدرت رکھتا ہو، اس سے ظلم کی شکایت کرنا۔

۳) استفتاء، یعنی اپنے اور مخالف کی تفصیل مفتی کے سامنے پیش کرنا تاکہ شرعی مسئلہ بتادے، گرچہ مخالف کی تعیین ضروری نہ ہو، کیونکہ کبھی تعیین میں کچھ فائدہ ہوسکتا ہے،

۵) جو کسی فسق یا بدعت کو علی الاعلان کرلے، اور کسی کے کہنے کی اسے کوئی پروانہ ہو، تو اس کا احترام ساقط ہو چکا، لہٰذا اسکے اس علانیہ گناہ کا ذکر کرسکتے ہیں، دیگر گناہوں کے ذکر کی اجازت نہیں۔

۶) کوئی کسی ایسے وصف کے ساتھ مشہور ہو، جو اسے ناپسند ہو، تو محض تعارف کے طور پر اس کا مشہور نام لینا جائز ہے، گرچہ دوسرے نام کے ساتھ تعارف ممکن ہو، تنقیص کے طور پر مکروہ نام کی گنجائش نہ ہوگی (حاشیة الجمل ۱۳۱/۴، مغنی ۱۳۷/۳، تحفہ ۶۰/۹، اعانة ۲۶۹/۳، نهاية ۲۰۶/۶، الفقه المنهجی ۵۰/۴)

کسی نیک اور متقی شخص کو اپنی بچی سے نکاح کی پیشکش

کسی عورت کے ولی کو، جو اس کا نکاح کرانا چاہتا ہو، سنت ہے کہ کسی صالح اور متقی شخص سے اس سے نکاح کی درخواست کرے، جیسا کہ حضرت شعیب علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی امانت وعفت کو دیکھتے ہوئے ان کے سامنے اپنی بیٹی سے نکاح کی پیشکش رکھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قَالَ اِنِّی اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَكَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰی اَنْ تَاْجُرَنِی ثَمٰنِیَ حِجَجٍ'' (القصص ۲۷)

ترجمہ: ''(وہ بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دولڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو''۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے نکاح کے متعلق پہلے حضرت عثمانؓ سے، پھر حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو فرمائی، پھر آپ ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔ (بخاری)

خُطبَة

منگنی سے پہلے پیغام دینے والے یا اس کے نائب کو خطبہ پڑھنا سنت ہے جس میں پہلے (اللہ کی ثنا اور درود) اور تقویٰ کی وصیت ہو، پھر اپنا مقصد پیش کرے، مثلاً: میں تمہاری دختر کو نکاح کا پیغام دینے آیا ہوں۔

لڑکی کے ولی کیلئے بھی اسی طرح خطبہ سنت ہے، جس میں وہ مناسب جواب دے، مثلاً: مجھے بھی اس سے اتفاق ہے، یا اعراض نہیں ہے۔

حدیث: ''ہر اہم کام جو اللہ کی حمد سے شروع نہ ہو، بے برکت ہے''۔ (ابن ماجہ)

عقد نکاح سے قبل بھی خطبہ سنت ہے جو زیادہ مؤکد ہے، کیونکہ سلفِ صالحینؒ سے وارد ہے۔

ائمہ کرام نے حضرت ابن مسعودؓ سے موقوفاً ومرفوعاً مروی خطبہ کو پڑھنا بابرکت قرار دیا ہے، فرمایا جب کوئی نکاح یا کسی دوسرے حاجت کا ارادہ کرے تو یہ (خطبہ) پڑھے: ''اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ (نَحْمَدُهٗ) وَنَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا

وَمِنْ سَيِّأْتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ پھر تین آیات تلاوت کرے، بقول سفیان ثوریؒ آیات یہ ہیں: اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَاتَمُوْتُنَّ اِلَّاوَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ، اِتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا، اِتَّقُوْا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْداً الْآيَة "(رواه الترمذی وصححه ، وابوداود، نسائی ، حاكم ، بيهقی ، وصححه ابواعوانه ، وابن حبان ۔ فتح الباری ۹/۲۰۲، نيل الاوطار ۱۴۸/۶)

ترجمه : "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اسی سے مدد مانگتے ہیں، استغفار کرتے ہیں، اپنے نفس کے شرور اور برے اعمال سے اللہ کی پناہ، جسے اللہ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، اور جسے وہ گمراہ کردے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا"... اسی خطبہ کو "خطبہ حاجت" کہتے ہیں۔

مذکورہ آیات مکمل اس طرح ہیں:

۱) "يَآاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْ اتَّقُو اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَاتَمُوْتُنَّ اِلَّاوَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ "(آل عمران ۱۰۲)

۲)" يَـآاَيُّهَاالنَّاسُ اتَّقُوْارَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَاوَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْراً وَّنِساءً واتَّقُواللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِن اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً "(النساء ۔ ۱)

۳)" يَـآاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُو اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْمًا "۔(الاحزاب ۷۰۔۷۱)

امام قفال فرماتے ہیں: خطبہ کے بعد یہ پڑھے: "اَمَّابَعْدُ فَاِنَّ الْاُمُوْرَكُلَّهَا بِيَدِاللّٰهِ يَقْضِیْ فِيْهَا مَايَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَايُرِيْدُ لَامُؤَخِّرَ لِمَا قَدَّمَ وَلَامُقَدِّمَ لِمَا اَخَّرَوَلَايَجْتَمِعُ اثْنَانِ فَلَايَفْتَرِقَانِ اِلَّا بِقَضَاءٍ وَّقَدْرٍوَّكِتَابِ قَدْسَبَقَ وَاِنَّ مِمَّاقَضَى اللّٰهُ وَقَدَّرُ اَنْ خَطَبَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ فُلَانَه بِنْتَ فُلَانٍ عَلٰى صَدَاقٍ كذا اَقُوْلُ قَوْلِ هٰذَاوَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهِ لِیْ وَلَكُمْ اَجْمَعِيْنَ "۔فلاں بن فلاں کی جگہ شوہر کا اور فلانہ بنت فلاں کی جگہ بیوی کا نام اور کذا کی جگہ مہر کی مقدار بیان کرے۔

عقد نکاح کے الفاظ (ایجاب وقبول) سے پہلے خطبہ پڑھے۔ولی، شوہر یا اجنبی کسی بھی شخص کے پڑھنے سے خطبہ کی سنت حاصل ہوگی۔

عقد سے پہلے (یعنی باقاعدہ ایجاب کے کلمات سے پہلے) ولی کو یہ کہنا مستحب ہے: "زَوَّجْتُكَ عَلٰى مَااَمَرَاللّٰهُ بِهٖ مِنْ اِمْسَاكٍ بِمَرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ " (اللہ کے حکم کے مطابق معروف وبھلے طریقے سے اپنے نکاح میں رکھنے، یا بہتر طریقے سے آزاد کرنے کی شرط کے ساتھ میں تمہارے نکاح میں دے رہا ہوں) کیونکہ حضرت عمرؓ اس طرح کہا کرتے تھے(ابن ابی شیبه) پھر ایجاب کے کلمات کہے۔(جمل ۱۳۲/۴۔ مغنی ۱۳۸/۳، شرح التنبيه ۵۹۹/۲، الفقه المنهجی/۵۲)

منگیتر کے ساتھ تنہائی

اسلامی تعلیمات اور روح سے دور بعض مسلم معاشروں میں محض منگنی کی بنیاد پر دونوں کا ایک دوسرے سے بے تکلف ملاقات، خلوت اور سیر وتفریح کا رواج عام ہے اور دعوی یہ ہوتا ہے کہ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے اخلاق وعادات اور مزاج سے روشناس ہوں گے، حالانکہ دونوں اپنے آپ کو ریاکاری اور اداکاری کے طور پر حقیقت کے خلاف بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے

ہیں، اور حقیقت بعد میں بے نقاب ہوتی ہے۔

بہر حال نکاح سے قبل اس طرح کا اختلاط وخلوت قطعاً حرام ہے، شریعت میں اس کی کوئی اجازت نہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''کوئی مرد کسی عورت سے ہرگز تنہائی میں بغیر محرم کے نہ پایا جائے'' (متفق علیه) اور ایک منگیتر بھی نکاح ہونے تک بالکل پرایا اور اجنبی ہے۔

عقلمند لڑکی وہی ہے، جو ایک مرتبہ پیغام کیلئے دیکھنے کے بعد، دوبارہ نکاح ہونے تک اپنے منگیتر کے سامنے بھی نہ آئے۔ دوراندیشی کا بھی یہی تقاضا ہے، ممکن ہے ساتھ گھومنے پھرنے کے بعد اس کا ارادہ بدل جائے، تب پھر اس سے ان تعلقات کو جانتے ہوئے دوسرا کوئی شریف شخص اسے پیغام دینے کی ہمت نہ کرے گا۔ (الفقه المنهجي ۴/۵۳)

منگنی کے بعد تحفہ

منگنی طے ہونے کے بعد منگیتر خود، یا اس کا وکیل یا ولی لڑکی یا اس کے ولی کو (آئندہ نکاح کے ارادہ کی وجہ سے) کوئی چیز عطا کرے، خواہ کھانے پینے کی اشیاء ہوں، یا نقدی (روپیہ پیسہ)، کپڑے یا زیورات، پھر جانبین سے یا کسی ایک جانب سے (اس رشتہ سے) اعراض پایا جائے، یا دونوں یا ایک انتقال کر جائے تو دینے والا یا (اس کی موت کے صورت میں اس کا) وارث عطا کردہ تمام اشیاء واپس لے سکتا ہے، جبکہ عقدِ نکاح سے قبل ہو یا عقد کے بعد دخول سے قبل طلاق ہو جائے، یا شوہر مر جائے، دخول کے بعد واپسی کا مطلقاً حق نہیں۔

اگر عطا کردہ چیز تلف ہو چکی ہو، تو اسکا بدل لوٹانا لازم ہے (جمل ۴/ ۱۲۹)

عقد نکاح کے ارکان

نکاح کے پانچ ارکان ہیں: صیغہ، بیوی، شوہر، ولی، دو گواہ

۱) **صیغه:** یعنی ولی کی جانب سے ایجاب کے کلمات، مثلاً: زَوَّجْتُكَ اِبْنَتِيْ (میں نے اپنی بیٹی تمہارے زوجیت میں دی) یا اَنْکَحْتُكَ اِبْنَتِيْ (میں نے اپنی بیٹی تمہارے نکاح میں دی۔ اور شوہر کی جانب سے قبول کرنا، مثلاً: تَزَوَّجْتُ اِبْنَتَكَ (میں نے تمہاری بیٹی کو اپنی زوجیت میں لیا) یا اَنْکَحْتُ اِبْنَتَكَ (میں نے تمہاری بیٹی سے نکاح کرلیا)

حکمت: چونکہ عقد نکاح میں جانبین کی رضامندی ضروری ہے، اور رضامندی تو ایک مخفی امر ہے، جس کی اطلاع نہیں ہوسکتی، لہٰذا شریعت نے ایجاب وقبول کے صیغہ کو جانبین کی اندرونی رضامندی کی ظاہری دلیل قرار دیا (بیع کے صیغے کے شرائط یہاں بھی ضروری ہیں)

شرائط: ۱) تزویج یا نکاح یا ان دونوں سے مشتق لفظ ہو، مثلاً زَوَّجْتُكَ اَنْكَحْتُكَ، قَبِلْتُ تَزْوِيْجَهَا، یا قَبِلْتُ نِكَاحَهَا (میں نے اس کا نکاح قبول کرلیا)

دراصل تزویج اور نکاح یہی دو لفظ لغت اور شریعت میں عقد نکاح پر دلالت کے لئے وضع کئے گئے ہیں، نیز قرآن وحدیث کے نصوص میں بھی یہی دو لفظ مستعمل ہیں، (دیکھئے سورہ نساء۔ آیت۔ ۳، سورہ احزاب۔ آیت ۳۷) مسلم کی ایک روایت میں ہے'' ...عورتوں کی شرم گاہوں کو تم نے کلمۃ اللہ کے ذریعے حلال کیا ہے''۔ اور کلمۃ اللہ تزویج اور نکاح ہے، کیونکہ قرآن میں یہی دو لفظ وارد ہیں، لہٰذا تعبداً و احتیاطاً اسی پر اکتفا واجب ہے۔ (مغنی ۳/ ۱۴۰)

۲) **ایجاب وقبول میں لفظ زواج یا نکاح کی صراحت:** اگر ولی کہے: زَوَّجْتُكَ ابْنَتِيْ، پھر شوہر کہے: قَبِلْتُ (آگے نکاحها نہ کہے) تو نکاح منعقد نہ ہوگا۔

اگرشوہر کہے:زَوِّجْنِیْ ابْنَتَكَ (تمہاری بیٹی میری زوجیت میں دے دو)اورولی کہے:قَبِلْتُ (میں نے قبول کیا)تو نکاح منعقد نہ ہوگا، کیونکہ جانبین نے زواج یا نکاح کی صراحت نہیں کی (صرف ایک جانب صراحت پائی گئی)

غیر عربی میں صیغے : عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی نکاح صحیح ہوگا، گرچہ شوہر اور ولی عربی جانتے ہوں، کیونکہ اصل اعتبار مفہوم کا ہے، لہٰذا ان دو کا ترجمہ بھی کافی ہے۔

جس زبان میں بھی صیغے ادا ہوں، جانبین اور گواہوں کا اس کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے، نیز ایسا لفظ ہو کہ اہلِ زبان اسے نکاح کیلئے صریح لفظ شمار کرتے ہوں، ایجاب وقبول الگ الگ زبان میں ہوں، تب بھی جائز ہے، جبکہ دونوں ایکدوسرے کے کلمات کا مفہوم سمجھے ہوں، اگر جانبین یا شاہدین (گواہ) مفہوم سے واقف نہ ہوں، لیکن کوئی معتبر شخص واقف ہو اور ان کو مفہوم سے آگاہ کرے، پھر زیادہ فاصلہ کے بغیر جلد ہی صیغے ادا ہوں، تو نکاح صحیح ہوگا، فاصلہ زیادہ ہو جائے، یا صیغے کی ادائیگی کے بعد مفہوم سمجھائے، تو صحیح نہ ہوگا (جمل مع فتح الوهاب ۴/۱۳۴، اعانة ۳/۲۷۶، الفقه المنهجي ۴/۵۶)

کنایہ الفاظ : کسی بھی زبان کے کنایہ الفاظ سے نکاح منعقد نہ ہوگا، کنایہ سے وہ الفاظ مراد ہیں، جن میں نکاح وغیر نکاح دونوں کا احتمال ہو، مثلاً! میری بیٹی تمہارے لئے حلال کر دی، یا اسے تم کو ہبہ کر دیا، کیونکہ کنایہ میں نیت کی ضرورت ہے، اور محلِ نیت دل ہے ،اور نکاح میں گواہوں کا ہونا شرط ہے، اور گواہوں کو دل کی نیت کی اطلاع نہیں کہ اس کے متعلق گواہی دے سکیں۔

تحریر : تحریر وکتابت کے ذریعے عقد نکاح منعقد نہ ہوگا، خواہ طرفین حاضر ہوں یا غائب، لہٰذا اگر ولی کسی غائب یا حاضر کو لکھے: میں نے میری بیٹی تمہارے نکاح میں دی پھر تحریر شوہر کے پاس پہنچی اور اس نے پڑھ کر کہا: میں نے تمہاری بیٹی کا نکاح قبول کرلیا، تو عقد صحیح نہ ہوگا، کیونکہ تحریر کنایہ ہے، اور نکاح کنایہ سے منعقد نہیں ہوتا۔

گونگے کا اشارہ : اگر گونگے کا اشارہ مفہمہ ہو، یعنی ایسا اشارہ ہو، جسے صرف ذہین وفطین لوگ ہی نہ سمجھے (بلکہ عام انسان بھی سمجھ سکے) تو اس سے نکاح منعقد ہوگا، کیونکہ ایسا اشارہ صریح لفظ کے قائم مقام ہے۔

اگر اشارہ واضح نہ ہو، بلکہ خفی ہو، جسے صرف ذہین لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں تو اس سے نکاح منعقد نہ ہوگا، کیونکہ یہ کنایہ شمار ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اشارہ مُفہمہ نہ کر سکے، اور کسی کو وکیل بنانا بھی دشوار ہو، تو ایسا اشارہ جسے صرف ذہین سمجھیں، یا تحریر کے ذریعے بھی اس کا نکاح صحیح ہوگا۔(جمل ۔ الفقه المنهجي ۴/۵۶)

۳) **ایجاب وقبول میں اتصال :** صیغہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایجاب وقبول متصل ہو، اگر لڑکی کا ولی کہے: میں نے بیٹی تیرے نکاح میں دی، پھر شوہر (لڑکا) کافی دیر تک چپ رہا، پھر کہا: میں نے اس کا نکاح قبول کرلیا، تو نکاح صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ایجاب وقبول میں طویل فاصلہ ہو چکا۔ اگر معمولی فاصلہ ہو، مثلاً سانس لینے یا چھینک کی وجہ سے، تو اس میں حرج نہیں، نکاح صحیح ہوگا۔

۴) **صیغہ کی تکمیل تک جانبین کی اہلیت کا باقی رہنا :** لہٰذا ولی کے ایجاب کے بعد شوہر کے قبول سے پہلے ولی پاگل یا بے ہوش یا (نعوذ باللہ) مرتد ہو جائے پھر شوہر قبول کرے، تو نکاح صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح شوہر ولی سے کہے: تمہاری بیٹی میرے نکاح میں دے دو، پھر ولی کے الفاظ سے قبل شوہر بے ہوش ہو جائے یا مرتد (نعوذ باللہ) ہو جائے تو نکاح صحیح نہ ہوگا۔

۵) **صیغہ مُنَجَّزْ (فوری ونقد) ہو :** پس عقد نکاح کو مستقبل کی طرف منسوب کرنا، یا کسی شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔

اگر ولی کہے: جب رمضان آجائے تو میں نے اپنی بیٹی کا تم سے نکاح کر دیا، پھر شوہر قبول کرے، تو عقد صحیح نہ ہوگا۔
یا ولی کہے: اگر میری بیٹی امتحان میں کامیاب ہو چکی ہو تو میں نے تم سے اسکا نکاح کر دیا، اور شوہر قبول کرلے، تو نکاح صحیح نہ ہوا، کیونکہ عقد نکاح کا منجز (یعنی فی الحال ہی مکمل) ہونا واجب ہے۔

۶) **صیغہ مُطلَق ہو** (یعنی عارضی اور کسی مدت کے ساتھ مقید نہ ہو): اگر کسی نے متعینہ مدت کی قید کے ساتھ نکاح کیا تو صحیح نہ ہوگا، مثلاً ولی کہے: میں نے تم سے بیٹی کا نکاح ایک ماہ یا ایک سال یا فلاں کے آنے تک کے لئے کیا، اور شوہر نے قبول بھی کرلیا تو یہ نکاح صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ نکاح متعہ ہے، جو حرام ہے، صحیحین وغیرہ میں موجود ہے کہ نکاح متعہ پہلے جائز تھا، پھر منسوخ ہو گیا۔ (تلخیص ۳/۱۵۴) کیونکہ اس سے مجرد لطف اندوزی مقصود ہے اولاد اور دیگر اغراضِ نکاح مقصود نہیں۔ اگر تبرکاً یا اس نیت سے کہ تمام امور اللہ کی مشیت سے ہیں، صیغہ کے ساتھ انشاء اللہ کہے، تو نکاح صحیح ہوگا، اور تعلیق کے قصد سے یا مطلقاً (بلا کسی قصد کے) کہے تو صحیح نہ ہوگا۔ (فتح الوہاب مع الجمل ۴/۱۳۳)

نکاحِ شغار

حدیث: ''آپ ﷺ نے شِغار سے منع فرمایا اور شغار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی (دوسرے کو) اس شرط پر بیاہ دے کہ وہ اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے، دونوں کے درمیان کوئی مہر نہ ہو''۔ (صحاح ستہ۔ المجموع ۱۶/۲۶۴)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کا، یا کسی ایسی لڑکی جس کا یہ ولی ہے، خواہ کوئی بھی ہو، کسی سے اس شرط پر نکاح کر دے، کہ وہ اپنی بیٹی یا کسی بھی زیر ولایت لڑکی کا نکاح اس سے کر دے، بشرطیکہ ہر ایک کا مہر دوسری کی شرم گاہ ہوگی، اور کسی ایک کیلئے بھی (صحیح) مہر مقرر نہ ہو، تو یہ وہی شِغار ہے، جس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے، پس یہ نکاح حلال نہیں، بلکہ مفسوخ (فسخ) ہے۔'' اگر ہر ایک اس نکاح میں متعلقہ لڑکی سے صحبت کرے، تو ہر ایک لڑکی کو مہر مثل ملے گا، اور عدت گذارنی ہوگی، تمام احکام میں یہ نکاح فاسد کی طرح ہے''۔ (اُلام۔ ۵/۱۱۳)

اگر شرم گاہ کے ساتھ ساتھ کچھ اور مہر بھی متعین کریں، مثلاً دونوں یوں کہیں: ہر ایک کی شرم گاہ اور ہزار روپے دوسری کا مہر، تب بھی یہ نکاح صحیح نہ ہوگا۔

اگر شرم گاہ کو مہر متعین نہ کریں، صرف یوں کہے: میری بیٹی اس شرط پر تمہارے نکاح میں دی کہ تم اپنی بیٹی میرے نکاح میں دو، (اور دوسرا قبول کرے) تو نکاح صحیح ہوگا، اور دونوں کو مہر مثل واجب ہوگا۔

اگر شرم گاہ کے علاوہ کچھ اور مہر متعین کریں: مثلاً کہے: میری بیٹی تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ تمہاری بیٹی میرے نکاح میں، اور دونوں کا مہر ہزار ہزار روپیہ ہوگا (اور دوسرا قبول کرلے) تو دونوں نکاح صحیح ہیں، لیکن مقررہ مہر کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ دونوں کیلئے مہر مثل واجب ہوگا۔

اگر صرف ایک کے فرج (شرمگاہ) کو مہر ٹھہرائے تو صرف اسی کا نکاح باطل ہوگا، لہٰذا اگر اس طرح کہے: میری بہن کا تم سے نکاح کر دیا بشرطیکہ تم اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دو اور تمہاری بیٹی کا فرج میری بیٹی کا مہر ہوگا، تو پہلا نکاح (یعنی کہنے والی کی بیٹی کا) مہر مثل پر صحیح اور دوسرا باطل ہے۔ اس کے برعکس اپنی بیٹی کا فرج مخاطب کی بیٹی کا مہر قرار دے، تو پہلا باطل اور دوسرا صحیح ہوگا۔ اور مہر مثل واجب ہوگا۔

(المجموع ۲۴۸/۱۶، المغنی ۱۴۳/۳، نہایۃ ۲۱۵/۶، تحفہ ۸۲/۹، جمل ۱۳۶/۴)

۲- نکاح کا دوسرا رکن 'بیوی' ھے : جس کے شرائط حسب ذیل ہیں:

الف : اس میں نکاح کے موانع میں سے کوئی مانع موجود نہ ہو (بعض کا ذکر پیغام میں گذر چکا، اور بعض موانع کا تذکرہ آئندہ ہوگا) (لہٰذا کسی کی منکوحہ یا معتدہ سے نکاح صحیح نہ ہوگا (جمل)

ب: بیوی معین ہو، اگر ولی یوں کہے: میں نے اپنی بیٹیوں میں سے ایک بیٹی تمہارے نکاح میں دی، تو نکاح صحیح نہ ہوگا۔

ج: بیوی حج یا عمرہ کے احرام میں نہ ہو، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''محرم نہ نکاح کرے، اور نہ نکاح کرائے'' (مسلم شریف) یعنی لڑکا یا لڑکی احرام میں نکاح نہ کریں، اور کسی محرم کے ساتھ کوئی کسی محرمہ یا غیر محرمہ کا نکاح نہ کرائے۔

حضرت عمرؓ اور زید بن ثابتؓ نے احرام کے نکاح کو ختم کر دیا تھا (مالک، بیہقی۔ الحاوی مع التعلیق ۳۳۶/۹)

کوئی عورت زنا سے حاملہ ہو، تو اس سے زانی یا دوسرا کوئی کراہت کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے، (بغیہ ۲۰۱)

۳- شوھر : اس کے شرائط درج ذیل ہیں:

الف: شوہر ایسا ہو کہ متعلقہ لڑکی کے ساتھ اسے نکاح حلال ہو، یعنی اس پر حرام مردوں میں سے نہ ہو۔

ب: معین ہو، لہٰذا ولی دو آدمیوں کو مخاطب کر کے کہے کہ: میں نے تم میں سے ایک کے نکاح میں بیٹی دے دی، تو نکاح صحیح نہ ہوگا۔

ج: شوہر احرام میں نہ ہو، جیسا کہ مسلم کی روایت میں گذرا، شوہر محرم ہو تو وکیل کے ذریعے بھی نکاح صحیح نہ ہوگا (فتح الوهاب)

د: اختیار، شوہر اپنے اختیار سے نکاح کرے، لہٰذا جبراً کسی لڑکی کے ساتھ اس کا نکاح کریں، تو صحیح نہ ہوگا، اگر کسی نے باری کے سلسلے میں کسی بیوی کا حق مار کر اسے طلاق دی، پھر اس حق کی تلافی کیلئے جبراً نکاح کرایا گیا، تو نکاح صحیح ہوگا، کیونکہ یہ جبر واکراہ برحق ہے۔ (جمل ۱۳۸/۴)

۴- ولی : جس کا قول وفیصلہ کسی دوسرے پر نافذ ہو، خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو اسے ولی (سرپرست) کہا جائے گا۔

حکمت : جو خود نااہل ہوں، ان کی مصلحت کی رعایت کرتے ہوئے ولایت کو مشروع کیا گیا ہے، تاکہ ان کے حقوق کی صحیح حفاظت ہو سکے۔

لڑکی چاہے بالغہ ہو یا نابالغہ (کمسن)، ثیبہ (شادی شدہ) ہو، یا باکرہ (کنواری) ہر حال میں اس کے نکاح کے لئے ولی ضروری ہے۔ لہٰذا کوئی عورت بذاتِ خود نہ اپنا نکاح کر سکتی ہے، اور نہ کسی دوسرے کا نکاح کرا سکتی ہے، خواہ (ولی کی) اجازت سے ہو یا بغیر اجازت، نیز اس سے ایجاب صادر ہو، یا قبول۔

احادیث : ۱) حضرت معقلؓ کی بہن کو شوہر نے طلاق دی، پھر عدت کے بعد دوبارہ پیغام دیا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا، حالانکہ وہ عورت خود بھی ان کے نکاح میں جانا چاہتی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ) (پھر ان کو نکاح سے نہ روکو) (بخاری) (مذکورہ آیت کیلئے دیکھئے سورہ بقرہ ۲۳۲)

امام شافعیؒ کتاب الام میں مذکورہ آیت وروایت کی روشنی میں فرماتے ہے کہ یہ قرآن کی واضح ترین آیت ہے کہ عورت کے متعلق اس کے ساتھ ولی کو بھی حق حاصل ہے۔ اور روکنے سے اسی کو منع کریں گے جسے اس کا حق حاصل ہو، اور اس کی اجازت کے بغیر نکاح مکمل نہ ہو۔ (الام۔ ۲۱/۶)

۲) آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''بغیر ولی کے نکاح (درست) نہیں'' (احمد ، ابوداؤد، ترمذی ،ابن ماجہ ، ابن حبان ، حاکم واطال فی تخریج طرقه ...ثم سرد تمام ثلاثین صحابیا)

۳) ''جو عورت بھی اپنا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر کر لے، تو اس کا نکاح باطل ہے'' ...(الشافعی ، احمد ، ابوداود ، ترمذی ، ابن ماجه ، ابوعوانه ، ابن حبان ،حاکم)

۴) آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہ تو عورت کسی عورت کا نکاح کرے، اور نہ خود اپنا'' (دارقطنی باسناد علی شرط الشیخین کمافی ارشاد الساری ، وابن ماجه والبیهقی) (تلخیص الحبیر ۱۵۷/۳)

حکمت : حیا عورت کا زیور ہے، اور خود اپنا نکاح انجام دینا اس کے منافی اور محاسنِ عادات کے خلاف ہے، لہٰذا اس کے حق میں ولی کو مشروط قرار دیا گیا۔

بغیر ولی کے نکاح : اگر کوئی عورت بغیر ولی کے خود ہی نکاح کر لے، تو یہ نکاح باطل ہے، اب اگر اس نکاح میں دخول (صحبت) ہو جائے، تو دونوں میں جدائی واجب ہے، کیونکہ عقد باطل ہے، اور عورت مہر مثل کی مستحق ہوگی۔ بغیر ولی کے نکاح کی صحبت میں علماء کے اختلاف کی وجہ سے ایسے نکاح میں صحبت کرنے والے پر حدِ زنا کا نفاذ نہ ہوگا، کیونکہ یہ اختلاف شبہ کا باعث بن گیا، اور حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہوتی ہیں، البتہ تعزیری سزا کا مستحق ہوگا یعنی حاکم کوئی مناسب سزا تجویز کرے جو حد سے کم ہو۔

نکاح میں اولیاء (جمع والی) کی ترتیب : باپ سب پر مقدم ہوگا، پھر دادا (پھر پردادا اور پرتک) پھر حقیقی بھائی یعنی لڑکی اور اس بھائی کے ماں باپ ایک ہوں) پھر باپ شریک بھائی (دونوں کا باپ ایک ہو، اور ماں جدا ہوں) پھر حقیقی بھائی کا بیٹا (حقیقی بھتیجہ) پھر باپ شریک بھائی کا بیٹا، پھر حقیقی چچا، (باپ کا حقیقی بھائی) پھر علاتی چچا (باپ کا باپ شریک بھائی) پھر حقیقی چچا کا بیٹا، پھر علاتی چچا کا بیٹا، اسی طرح میراث کی ترتیب پر دیگر عصبات ولی بنیں گے۔

اگر کوئی عصبہ ماں شریک بھائی بھی ہو اور عصبہ ہونے میں دونوں برابر ہوں تو ماں شریک بھائی مقدم ہوگا (مثلاً کسی لڑکی کے دو چچا زاد بھائی میں ایک اس کا ماں شریک بھائی بھی ہو تو وہ مقدم ہوگا)

اگر عصبات میں سے کوئی نہ ہو، اور یہ لڑکی پہلے باندی رہ چکی ہو تو اس کو آزاد کرنے والا آقا ولی بنے گا، پھر اس کے عصبہ وراثت کی ترتیب سے ولی ہوں گے۔ مذکورہ اولیاء میں سے کوئی نہ ہو، تو سلطان (بادشاہ) ولی ہوگا۔ یہاں اور آئندہ مسائل میں سلطان میں قاضی (جج حاکم) اور (حکومت کی جانب سے) نکاح کا ذمہ دار بھی داخل ہے۔ لہٰذا یہ حضرات ان لڑکیوں کا نکاح کرا سکتے ہیں، جو ان کے محلِ ولایت اور دائرہ حکمرانی میں ہوں گرچہ وہاں سے گذر رہی ہو (مستقل اس علاقہ میں سکونت نہ ہو)، یا محل ولایت سے باہر ہوتے ہوئے اسے اجازت دی ہو، پھر علاقہ میں لوٹنے کے بعد اس کا نکاح کر دے۔ (جمل ۱۵۰/۴ ، تحفه ۱۲۷/۹)

حدیث : ''.... بس سلطان اس کا ولی ہے، جسکا کوئی ولی نہیں'' (ابوداود ، ترمذی ، ابن ماجه)

تنبیہ : (آج کل نکاح پڑھانے کیلئے عموماً جو قاضی مقرر ہوتے ہیں وہ مذکورہ سلطان و قاضی کے حکم میں داخل نہیں ہیں۔ اور شرعاً نکاح کیلئے وہ کوئی شرط نہیں ہیں۔ عموماً چونکہ لوگ صیغے وغیرہ کی صحیح ادائیگی سے واقف نہیں ہوتے ، اس لئے انھیں مقرر کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب)

بیٹا : کسی عورت کا بیٹا، بیٹا ہونے کے ناطے اس کا ولی نہیں بن سکتا۔ اگر ولایت کا کوئی سبب اس میں ہو، تو ولی بنے گا، بیٹا ہونا

ولایت سے مانع نہ ہوگا، مثلاً چچازاد بھائی سے نکاح ہو، تو پیدا ہونے والا بیٹا آئندہ چچازاد بھائی کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ولی بنے گا۔ اسی طرح بیٹا قاضی یا سلطان ہو تو اس اعتبار سے اپنی والدہ کا ولی بنے گا۔ (فتح الوھاب) اگر کہیں حاکم ہی نہ ہو تو جانبین کسی عادل شخص کو حَکَم (فیصل) بنائیں، جوان کا نکاح کردے، خواہ وہ مجتہد نہ ہو، اگر حاکم موجود ہو تو کسی مجتہد کو ہی حکم بنا سکتے ہیں، لیکن حاکم نکاح کیلئے عرفاً بڑی رقم وصول کرتا ہو، تو کسی عادل کو حکم بنانا کافی ہے گرچہ وہ مجتہد نہ ہو مسئلہ سفر میں درپیش ہو یا اقامت میں۔ اگر کوئی بھی نہ ملے اور لڑکی کو زنا کا اندیشہ ہو تو لڑکی خود اپنا نکاح کرلے، بشرطیکہ اسکے اور ولی کے درمیان مسافتِ قصر ہو، پھر آبادی میں پہنچ جائیں، تو تجدید عقد کرلیں، جبکہ سابقہ نکاح کو صحیح قرار دینے والے امام کی تقلید نہ کی ہو۔

حکم (فیصل) بنانے کی صورت میں جانبین کی طرف سے لفظ ضروری ہے، مثلاً لڑکا اور لڑکی دونوں اسے کہیں، میں نے میرے نکاح کے لئے تم کو حکم بنایا یا تمہیں نکاح کی اجازت دی، یا میرا فلاں سے نکاح کردو، یا میں نے تمہیں وکیل بنایا وغیرہ۔ اگر کنواری لڑکی سے حکم یہ کہے کہ مجھے حکم بناؤ اور وہ چپ رہے، تو یہ بھی کافی ہے، امام اذرعی کے نزدیک ولی غائب ہو، تب بھی حکم بنا سکتے ہیں۔ (بجیرمی علی الاقناع ۳/۳۴۲۔ بغیة المسترشدین ۲۰۷)

ولی کے شرائط :

(الف) اسلام : ایک کافر کسی مسلمان عورت کا نکاح نہیں کرا سکتا، کیونکہ اسے کسی مسلمان پر ولایت نہیں، ارشاد باری ہے: " وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُوْءْ مِنِيْنَ سَبِيْلًا " (النساء ۱۴۱) ترجمہ: " اور اللہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ ہرگز نہ دے گا۔"

نیز ولایت کی بنیاد میراث میں عصبیت پر ہے، اور ایک مسلمان و کافر کے درمیان میراث نہیں چلتی۔

ایک کافر کسی کافرہ کا نکاح پڑھا سکتا ہے، خواہ دونوں کا عقیدہ الگ الگ ہو، پس یہودی نصرانی کا، اور نصران یہودیہ عورت کا نکاح کرا سکتا ہے، کیونکہ کفر کے تمام اقسام ایک ہی ملت ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: " وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْ ابَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْض "۔ (الانفال ۷۳)

ترجمہ: " اور جو لوگ کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں "۔

(ب) عدمِ فسق : ولی کا فاسق نہ ہونا شرط ہے۔

حدیث : بغیر مُرشِد ولی کے نکاح (صحیح) نہیں' (رواہ الشافعی فی مسندہ بسند صحیح) امام شافعیؒ نے فرمایا: حدیث میں مرشد سے عادل ہونا مراد ہے۔

نیز فسق ایسی کمی ہے، جو گواہی کے منافی ہے، لہٰذا ولایت کے بھی منافی ہوگی اکثر متاخرین (اصحاب نے فاسق کی ولایت کو اختیار کیا ہے۔ امام غزالی" فرماتے ہیں کہ فاسق کی ولایت ختم کرنے کی صورت میں اگر فاسق حاکم کی طرف منتقل ہو، تو یہ ولی بنے گا، ورنہ نہیں، یعنی فاسق کی ولایت ختم کرنے کی صورت میں اگر اس کے دور کا غیر فاسق ولی (ولی ابعد) یا غیر فاسق حاکم ولی بنتا ہو، تو ولایت ختم کریں گے، ورنہ اس کی ولایت برقرار رہے گی، کیونکہ فسق کافی عام ہو چکا ہے، روضہ میں اس قول کو مستحسن قرار دیا، اور فرمایا کہ اسی پر عمل ہونا چاہیے، اور ابن الصلاح، سبکی اور اذرعی رحمہم اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، دیگر کئی حضرات نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ لیکن منہج، مغنی المحتاج اور نہایۃ المحتاج میں پہلے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

اقرب ولی فاسق ہو تو ولایت ابعد (اس کے بعد والے ولی) کی طرف منتقل ہوگی۔ امام اعظم (خلیفہ، بادشاہ) فسق کی وجہ سے معزول نہ ہوگا، لہٰذا اپنی اور دیگر لڑکیوں کا نکاح ولایت عامہ کے تحت کرے گا، اسکے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو یہ خصوصیت دی گئی۔ اگر

کوئی فاسق صحیح توبہ کرلے تو فوراً نکاح کراسکتا ہے، گرچہ مظالم کولوٹانا اور نمازوں کی قضاء وغیرہ شروع نہ کی ہو جبکہ توبہ کے شرائط پائے جائیں، اسلئے کہ اصل شرط فاسق نہ ہونا ہے، نہ کہ عادل ہونا، اور ان کے درمیان واسطہ ہے، اسی لئے مستور جو ظاہر العدالۃ ہو، نکاح کراسکتا ہے۔
(نہایۃ ۲۳۹/۶۔ مغنی ۱۵۵/۳، تحفہ ۱۳۹/۹، جمل ۱۵۵/۴، قلائد ۱۰۶/۲، بغیہ ۲۰۳)

(ج) بلوغ : پس بچہ کسی کا ولی نہیں بن سکتا، اسے جب اپنی ذات پر ولایت نہیں، تو کسی دوسرے پر تو بدرجہ اولی نہ ہوگی۔

(د) عقل : لہذا کسی پاگل کو ولایت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ اسے تو اپنے آپ پر بھی ولایت نہیں ہے۔

(ھ) غوروفکر اور توجہ پر خلل انداز آفات سے سلامتی : انتہائی بڑھاپے یا عقل سٹھیا جانے کی وجہ سے جو صحیح سوچ اور غوروفکر پر قادر نہ ہو، اسے ولایت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ یہ حضرات مناسب رشتے کے اختیار سے عاجز ہیں۔

اگر کوئی بے ہوش ہو تو اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں گے کیونکہ یہ نیند کی طرح جلد ختم ہونے والا عذر ہے، اگر تین دن تک بھی افاقہ نہ ہو، تو ولایت اس کے بعد والے کی طرف منتقل ہوگی (بجیرمی)

نابینا شخص ولی بن سکتا ہے، کیونکہ وہ سن کر مصلحت اور بہتری کو سمجھ سکتا ہے (شرح التنبہ للسیوطی ۵۹۵/۲)

(و) سفاھت کی وجہ سے محجور نہ ھو : یعنی مالی فضول خرچی کی وجہ سے اس پر پابندی عائد نہ ہو، کیونکہ ایسا شخص خود اپنا ولی نہیں، تو دوسرے پر کیسے ولی بنے گا۔

اگر سفاہت اور اسراف وفضول خرچی کی وجہ سے اس پر پابندی نہ ہو تو وہ ولی بنے گا مفلسی کی وجہ سے پابندی ولایت سے مانع نہیں، کیونکہ یہ پابندی قرض خواہوں کی وجہ سے تھے، نہ کہ اس میں کسی نقص کی وجہ سے (جمل مع فتح الوھاب ۱۵۶/۴)

(ز) حلال ھو (احرام میں نہ ہو) : جو حج یا عمرہ کے احرام میں ہو، وہ نکاح نہیں کراسکتا، جیسا کہ مسلم کی حدیث میں گذر چکا۔

شوہر یا ولی احرام میں ہوں، تو ان کا وکیل نکاح نہیں کرسکتا، گرچہ وہ احرام میں نہ ہو، کیونکہ وہ تو محض ایک سفیر اور واسطہ ہے، اور حقیقتاً عقد مؤکل انجام دے رہا ہے، وکیل مؤکل کے احرام کی وجہ سے معزول نہ ہوگا بلکہ اس کا احرام مکمل کھلنے کے بعد نکاح کرائے گا اگر کسی نے احرام سے قبل وکیل بنایا، تب بھی احرام کے بعد (بحالتِ احرام) وہ نکاح نہیں کراسکتا۔ اگر احرام میں کسی کو وکیل بنائے اور وہ احرام کھلنے کے بعد نکاح کرائے تو جائز ہے۔

اگر سلطان یا قاضی احرام باندھیں تو ان کے نائبین نکاح کراسکتے ہیں، کیونکہ ان کا تصرف ولایت کی وجہ سے ہے، نہ کہ وکالت کی بنیاد پر (فتح الوھاب مع الجمل ۱۵۸/۴)

تنبیہ : کسی قریبی ولی میں مذکورہ بالا شرائط میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو ولایت اس کے بعد والے کی طرف منتقل ہوگی۔ (مثلاً باپ پاگل ہے تو دادا ولی بنے گا) جس میں تمام شرائط موجود ہوں سوائے محرم کے، بلکہ ولی احرام میں ہو تو یہ حق سلطان کی طرف منتقل ہوگا۔

ولایت کے اقسام : نکاح کے ولایت کی دو قسمیں ہیں: ۱) ولایتِ اِجبار (۲) ولایتِ اختیار

۱) ولایت اجبار : (یعنی لڑکی کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کا نکاح کردینے کا حق) یہ ولایت صرف باپ اور دادا (اوپر تک) کو حاصل ہے، دیگر اولیاء کو حاصل نہیں۔

ولایتِ اجبار صرف باکرہ (کنواری) بیٹی پر حاصل ہے، خواہ وہ کمسن ہو یا بالغہ، عاقلہ ہو یا پاگل، پس باپ دادا کو اس کی اجازت ومرضی کے بغیر اسکے نکاح کا حق حاصل ہے، کیونکہ یہ اس کی مصلحت سے زیادہ واقف ہوگا، اور اس کے حق میں حد درجہ شفقت کی وجہ سے

اس کی مصلحت کا پہلو اختیار کرے گا۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''ثیبہ (پہلے شادی شدہ) اپنے نفس کا ولی کے مقابلہ میں زیادہ حق رکھتی ہے ...'' (مسلم وغیرہ) اس کا مفہوم یہ بتلا رہا ہے کہ کنواری کا ولی اس کے مقابلے میں زیادہ اختیار رکھتا ہے، البتہ اس اجبار کی صحت کے چند شرائط ہیں: (الف) لڑکی کے اور ولی کے درمیان ظاہری دشمنی نہ ہو (یعنی ایسی دشمنی جس کی اہل محلہ کو خبر ہو) (ب) شوہر لڑکی کا کفو ہو (ج) شوہر معجّل مہر کی ادائیگی پر قادر ہو۔ (د) لڑکی اور شوہر میں عداوت و دشمنی نہ ہو۔ ان میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو لڑکی کی اجازت کے بغیر نکاح صحیح نہ ہوگا۔

اجبار کے جواز کیلئے شرط ہے کہ نکاح مہر مثل پر ہو جو معجّل (فوری) اور بستی میں رائج نقدی میں ہو، اگر وہاں کی عادت ادھار یا غیر رائج نقدی کی ہو تو حرج نہیں، اس شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں نکاح صحیح ہوگا، لیکن اس طرح کرنا جائز نہیں، اور مہر مثل واجب ہوگا۔ (جمل ۱۴۸/۴)

کنواری لڑکی کی اجازت کی ترغیب: باپ دادا کو گرچہ اجبار کا حق حاصل ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی مرضی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس طرح جبراً نکاح کرنا افضل ہے، بلکہ افضل اور مستحب یہ ہے کہ اس کی خوشی اور مرضی کو پیش نظر رکھتے ہوئے نکاح کے سلسلہ میں اس سے اجازت لی جائے، لڑکی کو رشتہ ناپسند ہو تو وہاں نکاح کرانا مکروہ ہے، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا'' ...کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور اس کی اجازت چپ رہنا ہے''۔ (مسلم۔ترمذی) اجازت کا یہ حکم بطور سنت کے ہے، جبکہ وہ مکلفہ ہو، کیونکہ کمسن لڑکی کی اجازت کا سوال نہیں، بعض علماء نے ممیزہ لڑکی سے اجازت کو مستحب قرار دیا ہے، اسی طرح لڑکی کی والدہ سے بھی مشورہ کرنا اور اجازت لینا سنت ہے۔

بہتر ہے کہ لڑکی کے پاس کسی ایسے معتبر عورت کو روانہ کرے، جس سے وہ ہچکچائے نہیں، تا کہ اس کے دل کی بات معلوم کرلے، والدہ کے ذمہ سونپنا زیادہ بہتر ہے۔

باپ یا دیگر اولیاء کی جانب سے اجازت چاہنے کی صورت میں کنواری لڑکی کا چپ رہنا بھی اجازت ہے (یعنی زبان سے اثبات میں جواب ضروری نہیں) جبکہ کوئی ظاہری قرینہ انکار کا نہ ہو مثلاً چلا کر رونا، چہرہ پیٹنا وغیرہ، صرف سکوت کے ساتھ رونا، اجازت سمجھا جائے گا۔

چپ رہنا صرف نکاح کی حد تک اجازت سمجھیں گے، گرچہ غیر کفو میں ہو، مہر مثل سے کم یا نقدِ بلد کے علاوہ مہر کے سلسلہ میں صرف سکوت کافی نہیں، بلکہ زبانی اجازت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اجازت میں شوہر کی تعیین ضروری نہیں ہے (تحفہ ۱۱۶/۹، مغنی ۱۵۰/۳، نہایۃ ۲۳۱/۶، قلائد ۱۰۰/۲)

۲) ولایت اختیار: (اس ولایت میں ولی لڑکی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کرا سکتا): باپ دادا کے علاوہ گذشتہ ترتیب کے مطابق دیگر تمام اولیاء کو ولایتِ اختیار حاصل ہے۔ (یہ اولیاء کسی کا بھی نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتے) نیز ثیبہ (شادی شدہ) عورت کا نکاح باپ دادا بھی دیگر اولیاء کی طرح اس کی صریح اجازت کے بغیر نہیں کر سکتے۔

حدیث:۱- ''بیوہ کا نکاح اس کا امر (حکم) لے کر ہی کیا جا سکتا ہے'' (بخاری، مسلم)

۲- حکمت: چونکہ ثیبہ نکاح کے مقاصد سے واقف ہو چکی، اور اسے تجربہ حاصل ہو چکا، اس لئے اس کی اجازت ضروری ہوگی نیز شوہر سے ازدواجی تعلقات کی وجہ سے کنواری جیسی حیاء باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اس کی جانب سے صراحت کو لازم قرار دیا گیا۔

(صرف سکوت کافی نہیں)

ثیبہ : (درحقیقت شادی شدہ عورت کو کہا جاتا ہے، لیکن مسئلہ کے اعتبار سے اس کے مفہوم میں کچھ توسیع ہیں)

جس عورت کی دوشیزگی (کنوار پن) حلال، یا حرام صحبت سے یا شبہ کی صحبت سے ختم ہو جائے، وہ ثیبہ کہلائے گی، خواہ عدت بوقت صحبت نیند وغیرہ کی کیفیت میں ہو۔ بغیر صحبت کے اس کا ازالہ ہو، تب بھی باکرہ (کنواری) ہی کہلائیگی، مثلاً تیز ٹھوکر یا گرنا، حیض کی تیزی، یا انگلی وغیرہ کے ذریعہ اسے ختم کرے تو وہ ثیبہ نہ ہوگی۔ نیز پچھلی شرم گاہ میں صحبت سے بھی ثیبہ شمار نہ ہوگی جو عورت اس پردہ کے بغیر پیدا ہو، وہ باکرہ ہی شمار ہوگی۔ جس کی بکارت کا ازالہ انسان کے علاوہ کسی جانور کی صحبت سے ہو، وہ ثیبہ شمار ہوگی۔ صحبت کے باد جود کسی عورت کا پردہ بکارت (فرج کے اندر ہونے کی وجہ سے) باقی ہو، تو بعض فقہاء اسے ثیبہ اور بعض باکرہ ہی شمار کرتے ہیں۔ کوئی مکلفہ عورت باکرہ ہونے کا دعویٰ کرے، تو بغیر قسم کے مان لیں گے، گرچہ وہ فاسقہ ہو، لہٰذا اس کی اجازت میں سکوت کافی ہوگا، اور باپ دادا کو بغیر اجازت کے اس کے نکاح کا اختیار ہوگا۔

شادی سے قبل کوئی عورت اپنے ثیبہ ہونے کا دعویٰ کرے، تو قسم کے ساتھ اس کا دعویٰ تسلیم کیا جائے گا، گرچہ اس سے قبل اس کی شادی نہ ہوئی ہو اور صحبت کے متعلق اس سے پوچھنے اور تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں اگر ولی کسی عورت کا نکاح زبان سے اس کی اجازت کے بغیر کردے، پھر وہ عورت ثیبہ ہونے کا دعویٰ کرے، تو اس صورت میں ولی کی بات مع قسم معتبر ہوگی، کیونکہ عورت کی تصدیق کی صورت میں نکاح کا ابطال لازم آتا ہے (نهاية ۲۳۰/۶، مغني ۱۵۰/۳، تحفة ۱۱۸/۹، جمل ۱۵۰/۴، بجيرمي على الاقناع ۳۵۲/۳)

کمسن ثیبہ : جو ثیبہ ابھی نابالغہ ہو، اس کا نکاح باپ دادا یا کوئی اور ولی بلوغ تک نہیں کر سکتے، کیونکہ اجازت کے بغیر اس کا نکاح جائز نہیں، اور بغیر بلوغ کے اجازت معتبر نہیں۔

ولی کا لڑکی کو نکاح سے روکنا : ایک عاقلہ بالغہ لڑکی کفو میں نکاح کا مطالبہ کرے تو ولی پر اس کا نکاح کرا دینا لازم ہے، لڑکی کنواری ہو یا ثیبہ، نکاح مہر مثل ہو، یا کم پر، اگر ولی نہ کرے، گرچہ باپ ہو، تو سلطان اس کا نکاح کرائے گا، کیونکہ یہ ولی کی ذمہ داری تھی، جب وہ نہیں نبھاتا، تو حاکم نبھائے گا حاکم کے نکاح کرانے کے لئے ولی کا روکنا ثابت ہونا ضروری ہے، یعنی حاکم اسے حکم دینے کے باوجود وہ انکار کرے، یا چپ رہے، اور جانبین یا ان کے وکیل حاضر ہوں، اور اس کی روپوشی کی صورت میں گواہوں کے ذریعے انکار ثابت ہو۔ اگر ولی تین مرتبہ لڑکی کو نکاح سے روکے، گرچہ ایک ہی نکاح میں ہو، اور اس کی اطاعت اس کے گناہوں پر غالب نہ ہوں، تو اس کی وجہ سے ولی فاسق ہوگا، اور بعد والا ولی نکاح کرائے گا، غیر کفو میں نکاح کا مطالبہ کرے تو ولی روک سکتا ہے۔ نابالغہ کے مطالبہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر لڑکی ایک رشتہ پسند کرے، اور باپ دوسرا، (اور دونوں کفو میں ہوں)، تو باپ لڑکی کی پسند کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنی پسند میں نکاح کرا سکتا ہے، جبکہ لڑکی کنواری ہو، کیونکہ باپ تفصیل اور مصلحت سے زیادہ واقف ہوگا۔ (شرح التنبيه للسيوطي ۵۹۲/۲، ترشيح المستفيدين ۳۱۳)

ولی کی غیر موجودگی : قریبی ولی مسافت قصر یا اس سے دور ہو، تو ولایت بعد والے کی طرف منتقل نہ ہوگی، بلکہ بستی کا حاکم اس کا نکاح پڑھائے گا، کیونکہ غائب ولی ہے، اور یہ اس کا حق ہے، لہٰذا فی الحال اس حق کی تحصیل دشوار ہو، تو حاکم اس کا نائب ہوگا۔ اگر ولی مسافتِ قصر کے اندر ہی ہو، تو سلطان اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرائے، کیونکہ مسافتِ قریب ہونے کی وجہ سے اس سے

مراجعت سہل ہے، لہٰذا یا تو وہ خود حاضر ہو جائے یا کسی دوسرے کو وکیل بنادے لیکن کسی خوف یا فتنہ کی وجہ سے ولی تک پہنچنا متعذر دشوار ہو، یا بستی میں قیدیوں میں ہو، اور وہاں پہنچنا متعذر رہو، تو قاضی نکاح کراسکتا ہے اسی طرح جو مفقود الخبر ہو، کہاں ہے اور زندہ ہے یا نہیں کچھ پتہ نہ ہو، تو قاضی نکاح کرائے۔ لیکن مفقود کے موت کا فیصلہ ہو جائے تو بعد والے ولی کو حق ملے گا (مغنی ۳/۱۵۷، تحفہ ۹/۱۴۴)

ایک سے زائد اولیاء: کسی عورت کے ایک ہی درجہ کے کئی ولی ہوں، مثلاً کئی بھائی، یا چچا وغیرہ تو ان میں جو نکاح کے مسائل سے زیادہ واقف ہو، اس کا نکاح کرانا مستحب ہے، کیونکہ اسے شرائط کا زیادہ علم ہے۔ اس کے بعد جو زیادہ متقی و نیک ہو وہ پڑھائے، پھر جو عمر میں آگے ہو، وہ مقدم ہوگا، کیونکہ اسکا تجربہ زیادہ بہتر ہے کہ ان میں سے ہر کوئی دیگر ولیوں کی رضامندی سے نکاح کرائے تاکہ تمام کی رائے متفق ہو اگر اولیاء میں اختلاف ہو، اور ہر کوئی نکاح کرانا چاہے، تو اس نزاع کے حل کے لئے قرعہ اندازی کرنا واجب ہے، جس کے نام قرعہ نکلے، وہ نکاح کرائے۔

اگر فضیلت میں کم درجہ کا ولی، یا جس کے نام قرعہ نہیں نکلا، وہ نکاح کرائے، اور لڑکی ہر ولی کو اجازت دے چکی تھی، تو یہ نکاح صحیح ہوگا۔ اگر لڑکی کسی ایک ولی کو اجازت دے، تو دوسرے کسی کا نکاح کرانا صحیح نہ ہوگا۔

اگر بالغہ لڑکی باپ دادا سے، یا دوسرا کوئی ولی ہو تو اس سے کسی کفو کے رشتہ میں نکاح کرانے کی درخواست کرے، تو اسے تسلیم کرنا واجب ہے، تاکہ اس کی آبرو محفوظ رہے، اگر انکار کرے تو گنہگار ہوگا، (مغنی المحتاج ۳/۱۶۰)

وکالت: باپ دادا اپنی کنواری بچی کے نکاح کے لئے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو وکیل بناسکتے ہیں لیکن اجازت لینا سنت ہے اس وکالت میں ولی کو شوہر کی تعیین کرنا لازم نہیں، پس اگر بغیر تعیین کے وکیل بنائے، تو وکیل پر اس لڑکی کی مصلحت کی خاطر احتیاط پر عمل واجب ہے، لہٰذا وہ غیر کفو میں نکاح نہیں کراسکتا، اسی طرح کفو سے بہتر رشتہ ہو، تو کفو میں نہیں کراسکتا، ورنہ نکاح صحیح نہ ہوگا۔ دیگر اولیاء کی توکیل اور باپ دادا کی جانب سے ثیبہ لڑکی کے نکاح کی توکیل کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱) نکاح اور توکیل دونوں کی اجازت دے، تو دونوں جائز ہیں۔ (خود نکاح کرانا بھی یا کسی کو وکیل بنانا)۔ ۲) وکیل بنانے کی اجازت دی، تو وکیل بھی بناسکتا ہے۔ ۳) وکیل بنانے کی اجازت دی، لیکن ولی کو خود نکاح کرانے سے روکا، تو دونوں کی اجازت نہ ہوگی۔ ۴) ولی کو نکاح کی اجازت دے، لیکن وکالت سے منع کرے، تو کسی کو وکیل بنانا جائز نہیں۔ ۵) ولی کو نکاح کی اجازت دی، آگے وکالت کا کچھ تذکرہ نہ کیا، تو ولی وکیل بناسکتا ہے۔

اگر اس نے اجازت کے وقت شوہر کی تعیین کی ہے، تو وکالت میں بھی یہ تعیین ضروری ہے، ورنہ نکاح صحیح نہ ہوگا، خواہ اتفاقی طور پر وکیل اسی معین شخص سے نکاح کرائے۔ کسی کو وکیل بنانے کے بعد ولی لڑکی سے اجازت لے تو یہ وکالت صحیح نہیں ہے۔

وکیل کا صیغہ: ولی کا وکیل شوہر سے کہے: میں نے فلاں کی بیٹی تمہارے نکاح میں دی۔ اگر شوہر کی جانب سے وکیل نکاح قبول کررہا ہو، تو ولی اس سے یوں کہے: میں نے اپنی بیٹی فلاں کے نکاح میں دی (فلاں کی جگہ موکل یعنی شوہر کا نام لے) اور شوہر کا وکیل اس طرح قبول کرلے: میں نے اِس کا نکاح اُس کے لئے قبول کیا (یعنی موکل کے حق میں)۔ اگر "اس کے لئے" فقرہ ترک کردے تو نکاح صحیح نہ ہوگا۔ مذکورہ بالا صیغوں سے نکاح اس وقت درست ہوگا، جبکہ پہلی صورت میں گواہوں اور شوہر کو وکالت کا علم ہو، اور دوسری صورت میں ولی اور گواہوں کو وکالت کا علم ہو، ورنہ دونوں میں وکیل کو صیغوں میں وکالت کی صراحت کرنا ضروری ہے۔ مثلاً: آگے یوں کہے اس کی جانب سے بطور وکالت، یا فلاں موکل کی طرف سے۔ اگر دونوں طرف وکیل ہوں، تو ولی کا وکیل کہے: میں نے فلاں کی بیٹی فلاں کے نکاح

میں دی، اور شوہر کا وکیل کہے: میں نے اس کا نکاح فلاں کے حق میں قبول کیا۔(تحفة المحتاج ۱۵۳/۹۔ مغنی المحتاج ۱۵۸/۳)

حاکم کے نکاح کرانے کی صورتیں

۱-(عصبات میں سے) کوئی ولی موجود نہ ہو۔ ۲-ولی مفقود ہو، اور اس کی موت وزندگی اور جگہ کا کچھ پتہ نہ ہو، جبکہ اس کی موت کا فیصلہ نہ دیا گیا ہو۔ ۳-ولی خود لڑکی سے نکاح کرنا چاہے، مثلاً اس کی چچازاد بہن کا یہ ولی ہے، اور دوسرا کوئی اسی درجہ میں (یعنی چچازاد بھائی) اس کا ولی نہیں، تو اس صورت میں حاکم نکاح کرائے گا۔ ۴-ولی مسافتِ قصر کے اندر نہ ہو، (مسافتِ قصر کے فاصلہ پر ہو) ۵-ولی مسافت قصر کے اندر ہی ہو، لیکن اس تک پہنچنا بالکل دشوار ہو۔ ۶-ولی مقید ہو، اور وہاں تک رسائی دشوار ہو (اگر رسائی ممکن ہو، تو وہ کسی کو وکیل بنائے) ۷-ولی روپوش اور مخفی ہو اور نکاح نہ کرائے۔ ۸-ولی حج یا عمرہ کے احرام میں ہو۔ ۹-ولی اپنی طاقت وغلبہ کی بنیاد پر نکاح کرانے سے انکار کردے۔ ۱۰-بالغہ پاگل لڑکی کا باپ دادا نہ ہو، تو حاکم اس کا نکاح کرائے گا۔(جبکہ شرائط موجود ہوں)(بجیرمی علی الاقناع ۳۴۴/۳)

ولی کی غیر موجودگی وغیرہ صورتوں میں حاکم کیلئے اس کے بعد والے ولی کے سپرد کرنا، یا اس سے اجازت لینا (لڑکی کی اجازت کے بعد) سنت ہے (قلائد ۱۰۶/۲)

سلطان کا عدمِ وجود

اگر سلطان ہی نہ ہو تو اہل حل وعقد ذمہ داروں پر لازم ہے کہ ایک قاضی مقرر کریں، مجبوری کی وجہ سے اس صورت میں اس کے احکام وفیصلے نافذ ہوں گے، امام الحرمین نے اسے امام اشعری وغیرہ سے نقل فرمایا ہے، امام خطابیؒ نے اس کے لئے غزوہ موتہ میں حضرت خالدؓ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، کیونکہ یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کی جانب سے متعینہ تینوں سپہ سالار حضرات زیدؓ، جعفرؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ شہید ہوئے، تو حضرت خالدؓ حالات کی سنگینی اور خطرے کو دیکھتے ہوئے خود ہی امیر بن گئے، جس پر آپ ﷺ راضی ہوئے، اور یہ حق کے موافق قرار پایا، لہٰذا مجبوری کی شکلوں میں دینی امور کے قیام کے لئے یہ ایک اصل بن گئی۔(تحفة المحتاج ۱۴۶/۹)

کوئی حاکم نہ ہو، تو لڑکی کسی عادل کو اپنے نکاح کی ذمہ داری سونپ سکتی ہے۔(اسے ولی بنا سکتی ہے)(قلائد ۹۸/۲)

۵) نکاح کا پانچواں رکن دو گواہ ہیں:

حدیث: ۱-"ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح (صحیح) نہیں، اور جو اس کے بغیر ہوگا، وہ باطل ہے" (ابن حبان)

۲-زانیہ عورتیں اپنا نکاح خود بغیر گواہوں کے کرتی ہیں۔(ترمذی)

تمہید: چونکہ نکاح کے نتیجہ میں میاں بیوی کی معاشرتی زندگی، مہر ونفقہ کا وجوب، اور اولاد کے نسب کا ثبوت، میراث کا استحقاق، اور شوہر کی اطاعت وغیرہ احکام مرتب ہوتے ہیں، جو کافی اہمیت کے حامل ہیں، اور بعض صورتوں میں جانبین کی طرف سے اس کے انکار کی گنجائش تھی، اس لئے احتیاط کے پیش نظر شریعت نے اس موقع پر کم از کم دو گواہوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا، اور ان میں چند شرائط کو لازمی قرار دیا، تاکہ ان کی گواہی قابلِ اطمینان ہو۔

گواہوں کے شرائط (۱) اسلام: غیر مسلموں کی گواہی سے نکاح صحیح نہ ہوگا۔ **(۲) مذکر** (مرد) ہونا، عورتوں کی یا ایک مرد دو عورتوں کی گواہی سے نکاح منعقد نہ ہوگا۔ امام زہری کا فرمان ہے: "آپ ﷺ سے طریقہ یہی چلا آرہا ہے کہ حدود نکاح اور

طلاق میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں‘‘۔(۳) **عقل وبلوغ:** پاگل اور نابالغ بچوں کی گواہی سے نکاح منعقد نہ ہوگا۔(۴) **عادل ہونا** دونوں گواہ عادل ہوں، گرچہ ظاہری حیثیت سے، یعنی انکی اندرونی حالت کا علم نہ ہو (مستور الحال ہوں)، اور بظاہر فاسق نہ ہوں، مستور الحال کو بوقت عقد توبہ کرانا مستحب ہے اگر ایک عادل ایسے مستور الحال پر عقد سے قبل جرح کرے (اسے فاسق قرار دے) تو اس کی گواہی کافی نہیں۔فاسق گواہوں کے ذریعے نکاح منعقد نہ ہوگا۔۵) **سننا:** بہرے یا سوئے ہوئے حضرات کے ذریعے نکاح کا انعقاد نہ ہوگا۔۶) **دیکھنا:** نابینا کی گواہی بھی ناکافی ہے، اس سے نکاح نہ ہوگا، کیونکہ اقوال دیکھنے اور سننے سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔

عدالت: عدالت ایسے مَلَکہ (نفس کے اندر راسخ صفت) کو کہیں گے جو گناہوں کے ارتکاب سے روکے، گرچہ ذلیل وخسیس صغائر (مثلاً ایک لقمہ کی چوری، وزن میں ایک کھجور کم دینا یا زائد لینا) اور مباح رذیل امور ہوں، رذیل یعنی جس کا ترک مستحسن اور پسندیدہ ہو، جیسے کسی عالم کا ننگے سر باہر چلنا وغیرہ (بجیرمی ۳۳۰/۳)

عادل: جو کسی کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے، جیسے قتل، زنا، قذف، جھوٹی گواہی اور صغیرہ گناہ پر اصرار نہ کرے (ایک ہی صغیرہ پر اصرار ہو یا مختلف انواع پر) یا اصرار کی صورت میں اس کی اطاعت ونیکیاں گناہوں پر غالب ہوں، تو ایسا شخص عادل کہلائے گا۔لہٰذا کسی ایک کبیرہ کے ارتکاب سے، یا صغائر پر اصرار سے، جبکہ اطاعت غالب نہ ہوں، اس کی عدالت ختم ہوگی۔(فتح الوھاب ۲۲/۲)

دیگر شرائط: گواہ ناطق (گفتگو پر قادر) رشید اور ضبط کرنے والے (یعنی ایجاب وقبول کو یاد رکھنے والے) ہوں گرچہ بعد میں جلد ہی بھول جائیں، نیز جانبین کے ایجاب وقبول کے کلمات کا مفہوم سمجھتے ہوں۔اگر کوئی معتبر شخص گواہوں کو عقد سے پہلے صیغوں کا مفہوم سمجھائے، پھر جلد ہی ایجاب وقبول ہو، تو کافی ہے۔

(دو محرم گواہ سے نکاح منعقد ہوگا، لیکن ان کا حاضر نہ ہونا بہتر ہے) بالکل تاریکی ہو اور جانبین نظر نہ آرہے ہوں، تو صرف آواز پر اعتماد کرتے ہوئے گواہ بننا صحیح نہیں۔میاں بیوی کے دو بیٹوں، یا ایک کے دو بیٹوں، یا ایک کا ایک بیٹا اور دوسرے کا ایک بیٹا گواہ ہوں، یا دونوں کے یا کسی ایک کے دشمن گواہ ہوں، تب بھی نکاح منعقد ہوگا۔

گواہ کا ولایت کے لئے متعین نہ ہونا شرط ہے۔جیسے باپ یا تنہا بھائی ولی ہو اور وہ کسی دوسرے کو وکیل بنا کر خود ایک گواہ بن جائے، تو نکاح صحیح نہ ہوگا، خواہ اس میں گواہی کے شرائط موجود ہوں، کیونکہ اصل نکاح کرانے والا ولی تو یہ ہے، اور وکیل تو محض ایک سفیر اور واسطہ ہے، لہٰذا ولی خود گواہ نہیں بن سکتا، اسی طرح شوہر کسی کو اپنا وکیل بنا کر خود گواہ کی حیثیت سے حاضر ہو، تو اس کی گواہی معتبر نہیں۔کسی عورت کے تین بھائی ولی ہوں اور وہ اس میں سے صرف ایک کو اپنے نکاح کی اجازت دے، اور دوسرے دونوں بھائی گواہ بنیں تو صحیح ہے، اگر تینوں کو اجازت ہو، یا دو کو اجازت ہو اور وہ تیسرے کو وکیل بنا کر خود گواہ بنیں تو نکاح صحیح نہ ہوگا۔

عقد کے بعد (کبھی بھی) ولی یا گواہ کا عقد کے وقت فاسق ہونا ظاہر ہو جائے (یعنی یہ ثابت ہو جائے کہ یہ عقد کے وقت فاسق تھے) یا کوئی اور مانع نکاح موجود تھا، مثلاً ’’جنون یا بے ہوشی‘‘ تو یہ نکاح باطل ہے، جیسا کہ گواہ کا فر ظاہر ہوں تو حکم ہے، کیونکہ عقود میں اصل اعتبار نفس الامر اور حقیقت کا ہوتا ہے (نہ کہ مکلف کے گمان کا)

فاسق وغیرہ ہونا حاکم کے علم سے ظاہر ہوگا، جبکہ اسے اپنے علم پر فیصلہ کی گنجائش ہو، لہٰذا جانبین اپنا مسئلہ اسکے سامنے پیش نہ بھی کریں، تو اس پر لازم ہے کہ ان میں جدائی کرائے نیز دو مرد گواہ کی گواہی سے بھی ثابت ہوگا۔اسی طرح جانبین (میاں بیوی) نکاح کے بطلان کے کسی سبب کا اقرار کریں، مثلاً گواہ کا فسق، تو ان کے حقوق کی حد تک نکاح باطل قرار پائے گا، حق اللہ کے سلسلہ میں یہ اقرار معتبر نہ

ہوگا، لہٰذا شوہر کے تین طلاق کے بعد دونوں بطلان کا اقرار کریں تو تہمت کی وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا، اس لئے محلل کے بغیر اس شوہر سے پھر نکاح جائز نہ ہوگا۔

گواہ نکاح کو باطل کرنے والے کسی سبب کا اقرار کریں، مثلاً کہیں کہ ہم اس وقت فاسق تھے، تو اس سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

اگر صرف شوہر باطل ہونے کا اقرار کرے، بیوی نہ کرے، تو نکاح فسخ کر دیا جائے گا، دخول ہو چکا ہو تو مکمل مہر ورنہ نصف مہر واجب ہوگا۔ اگر صرف بیوی ولی یا گواہ کے فسق کا اقرار کرلے، شوہر نہ کرے، تو شوہر کو قسم دلا کر اس کی بات تسلیم کریں گے (اور نکاح باقی رہے گا)

لڑکی کی رضامندی پر گواھی : لڑکی نکاح سے اپنی رضامندی کا اظہار کرے، تو اس وقت، دو گواہ کا ہونا سنت ہے (جمل ۱۴۴/۴، تحفہ ۹۵/۹، بجیرمی ۳۳۵/۳، اعانہ ۳۰۰/۳، مغنی ۱۴۷/۳، نہایۃ ۲۲۳/۶، الفقہ المنہجی ۵۵/۴۔۷۱)

باپ یا دادا کا اعفاف (یعنی ان کو پاکدامن رکھنے کیلئے انکا نکاح کردینا)

اولاد پر، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، مسلمان ہو یا غیر مسلم، اپنے باپ یا دادا و نانا کو پاکدامن رکھنا واجب ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، یعنی ان کو بیوی کا مہر دے دے یا کہے کہ تم نکاح کرو، میں تمہیں مہر کی رقم دیتا ہوں۔ اس وجوب کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱) اولاد مہر دینے پر قادر ہو (مالی اعتبار سے اس کی گنجائش ہو)

۲) باپ یا دادا (جسکی شادی کا مسئلہ ہو) خود مہر دینے سے عاجز ہوں۔

۳) باپ دادا نکاح کے محتاج ہوں، یعنی ان کا نفس اس طرف مائل و مشتاق ہو،

اس صورت میں یہ اعفاف بھی نفقہ و لباس کی طرح اس کی اہم ضرورتوں میں شمار ہوگا، نیز ورنہ زنا کی ہلاکت میں پڑنے کا خطرہ بھی ہے، لہٰذا اس پر عدم توجہ مصاحبت بالمعروف کے خلاف ہے، جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ " وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً (لقمان : ۱۵)

ترجمہ : "اور دنیا میں انکے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا"۔

کفار کے نکاح

کافروں کا آپس میں نکاح صحیح ہے، حضرت غیلانؓ وغیرہ کی حدیث اس پر دلیل ہے، جن کے اسلام کے وقت، ان کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے چار کو رکھ کر بقیہ کو جدا کرنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے ان سے ان کے نکاح کے شرائط کی کوئی تحقیق نہیں کی۔ اگر کسی مسئلہ میں وہ ہمارے پاس معاملہ لے آئیں، تو ان کے نکاح کو باطل قرار نہیں دیں گے، اگر وہ اسلام لائیں تو ان کا نکاح باقی رہے گا۔ (الفقہ المنہجی ۷۲/۴)

نکاح کے بعد کافر کا اسلام

کوئی کافر اسلام لائے اور اس کے نکاح میں ایسی اہل کتاب عورت ہو، جو ایک مسلمان کے لئے جائز ہو، تو یہ نکاح برقرار رہے گا۔

مذکورہ اہلِ کتاب کے علاوہ کوئی عورت نکاح میں ہو، مثلاً مجوسیہ، بت پرست وغیرہ اور ابھی دخول (صحبت) نہ ہوا ہو، اور شوہر اسلام لائے اور

بیوی نہ لائے تو فوراً دونوں میں جدائی ہوگی، اسی طرح صحبت سے قبل بیوی (اہل کتاب ہو یا کوئی اور) اسلام لائے اور شوہر نہ لائے تو فوراً دونوں میں جدائی ہوگی۔ اگر دخول کے بعد دونوں میں سے ایک اسلام قبول کرے، اور دوسرا عورت کی عدت کے اندر اسلام قبول نہ کرے، تو اسلام کے وقت سے دونوں میں جدائی ہو چکی۔ اگر عدت کے بعد اسلام قبول کرے تو (نکاح کے تمام شرائط کے ساتھ) از سرِ نو نکاح کر سکتے ہیں۔ ورنہ دونوں کا کوئی رشتہ نہیں، ترمذی میں حدیث ہے کہ " (حضرت ابوالعاص جب اسلام لائے تو) آپ ﷺ نے نئے مہر اور نکاح کے ذریعے دوبارہ اپنی بیٹی حضرت زینبؓ کو ان کے نکاح میں دی"۔ ان تمام صورتوں میں یہ مفارقت، اور جدائی بطور فسخ ہے، نہ کہ طلاق، لہٰذا اس سے طلاق کی تعداد کم نہ ہوگی۔ اگر عدت کے اندر دوسرا بھی اسلام لے آئے تو دونوں کا نکاح باقی رہے گا۔

دخول سے قبل یا بعد دونوں ساتھ اسلام قبول کریں تو نکاح باقی رہے گا، کیونکہ اس سلسلہ میں صحیح روایت موجود ہے، اور معیت (ساتھ ہونے) کا اعتبار آخری لفظ سے ہوگا، یعنی دونوں کا کلمۂ شہادت کا آخری لفظ ساتھ ادا ہو، ابتدا آگے پیچھے ہو تو حرج نہیں۔

ایک عورت آپ ﷺ کے دورِ مسعود میں اسلام قبول کر کے شادی کر لیتی ہے، پھر اس کا (پہلا) شوہر آ کر آپ ﷺ سے عرض کرتا ہے کہ میں اسلام لا چکا تھا، اور بیوی کو اس بات کا علم تھا، تو آپ ﷺ نے اسے (دوسرے) شوہر سے واپس لے کر پہلے شوہر کو لوٹا دیا (ابوداود)

حضرت امام شافعیؒ سے مروی ہے کہ: حضرات صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل اور حکیم بن حزام کی بیویاں پہلے اسلام لاتی ہیں، پھر یہ حضرات تقریباً ایک ماہ بعد اسلام لاتے ہیں، اور ان کا نکاح برقرار رہتا ہے۔

جن صورتوں میں اسلام کے بعد نکاح برقرار رہتا ہے، ان صورتوں میں اگر حالتِ کفر میں نکاح کے وقت اسلام کے اعتبار سے کوئی مُفسد پایا جائے، جو اسلام لاتے وقت باقی نہیں، اور اس طرح کا نکاح اُن کے مذہب میں فاسد نہ ہو، تو اسلام کی وجہ سے تخفیفاً اس میں کوئی حرج نہ سمجھا جائے گا، اگر وہ مفسد قبولِ اسلام کے وقت بھی موجود ہو، یا موجود نہ ہو، لیکن ان کے مذہب میں بھی وہ مفسد ہو، تو یہ نکاح باقی نہیں رکھیں گے اسلام میں مُفسد ہونے سے تمام علماء کے نزدیک بالاتفاق مفسد ہونا مراد ہے۔ خلاصہ یہ کہ صرف اسلام میں، یا صرف ان کے مذہب میں مفسد ہو، تو حرج نہیں، اگر دونوں کے نزدیک مفسد ہو، تو ایسا نکاح باقی نہ رہے گا۔

لہٰذا ان کا جو نکاح بغیر ولی یا گواہ کے ہو، یا عدت میں ہو اور اسلام کے وقت عدت ختم ہو چکی ہو، یا عارضی نکاح ہو لیکن وہ اسے ابدی و مستقل سمجھتے ہوں، تو ان صورتوں میں نکاح باقی رہے گا۔ اسلام کے وقت عدت باقی ہو، یا عارضی کو عارضی ہی سمجھتے ہوں اور ابھی مقررہ مدت باقی ہو، تو یہ نکاح برقرار نہیں رکھیں گے۔ جانبین میں سے ایک اسلام لا کر حج کا احرام باندھے، پھر عدت میں دوسرا اسلام لے آئے اور یہ ابھی احرام میں ہو، تو نکاح باقی رہے گا، کیونکہ احرام سے دوامِ نکاح پر اثر نہ پڑے گا۔

اگر کوئی کافر مَحرم سے (مثلاً ماں، بیٹی، بہن، باپ کی بیوی، بہو وغیرہ) سے نکاح کرے تو یہ نکاح اسلام کے بعد باقی نہ رہے گا۔ کیونکہ مُفسد (یعنی مَحرم ہونا) اسلام کے وقت بھی موجود ہے۔

اگر کوئی حربی یا ذمی کسی حربیہ عورت کو غصب کرے، اور اسے وہ نکاح مانتے ہوں، تو یہ رشتہ باقی رہے گا۔ لیکن ذمیہ عورت کو غصب کرے، تو اسلام کے بعد اسے برقرار نہیں رکھیں گے، خواہ وہ اسے نکاح مانتے ہوں۔

کسی آزاد شخص کے اسلام لاتے وقت اس کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں ہوں، اور وہ سب بھی ساتھ اسلام قبول کریں، یا بصورتِ دخول عدت کے اندر اسلام قبول کر لیں، یا بیویوں کے اسلام کے بعد عدت میں شوہر اسلام لائے، تو اس پر لازم ہے کہ ان میں سے کسی بھی چار کو اختیار کر لے خواہ ان سے ایک ساتھ نکاح ہوا ہو، یا آگے پیچھے، خواہ جن سے پہلے نکاح ہوا ہے انھیں اختیار کرے یا بعد والیوں

کو، بقیہ کا نکاح اسلام کے وقت سے فسخ ہوجائے گا، حضرت غیلانؓ کے اسلام کے وقت ان کی زوجیت میں دس بیویاں تھیں، تو آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: چار کو نکاح میں روک لو، اور بقیہ کو جدا کردو (الشافعي ، احمد ، ترمذي، ابن ماجه وصححه ابن حبان والحاكم ـ تلخيص وفتح الوهاب)

اختیار کے الفاظ : میں نے تیرا نکاح اختیار کیا، باقی رکھا، تجھے اختیار کیا، روک لیا۔ اگر کسی بیوی کو طلاق دے، تو یہ بھی اختیار ہے۔ لہٰذا چار کو طلاق دے، تو طلاق سے ان کا نکاح ٹوٹ گیا، اور بقیہ کا فسخ ہوگیا۔ طلاق کی نیت کے بغیر فراق (مفارقت ـ جدائی) کا لفظ، یا صحبت، ظہار یا ایلاء اختیار نہیں ہیں۔

کسی کے اسلام کے وقت اس کے نکاح میں ماں اور بیٹی ہوں، اور یہ دونوں اہلِ کتاب ہوں، یا یہ بھی اسلام قبول کرلیں، اور شوہر دونوں سے یا صرف ماں سے صحبت کرچکا ہے، تو دونوں ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئیں، اور اگر کسی سے صحبت نہ کی ہو، یا صرف بیٹی سے صحبت کی ہو، تو ماں ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی، اور بیٹی کا نکاح باقی رہے گا۔ (مغنى المحتاج ۱۹۶/۳ ، حاشية الجمل ۲۰۹/۴)

چار سے زائد کی صورت میں اسلام کے بعد چونکہ چار کا نکاح باقی ہے، لہٰذا شوہر کو چار سے کم اختیار کرنا جائز نہیں، کیونکہ کفار کا نکاح صحیح ہے، اس لئے اسلام کے بعد چار کا نکاح باقی رہے گا، تعیین کرنا اس کی ذمہ داری ہے (تحفه مع الحواشى ۲۸۸/۹)

مُحَرَّمات (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے)

آیت : حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ ... الى .... وأُحِلَّ لَكُمْ مَاوَرَاءَ ذٰلِكُمْ (النساء : ۲۳ـ۲۴)

ترجمه : ”تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں، اور تمہاری بہنیں، اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے، اور تمہاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے ہیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہارے بیویوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں، ان بیویوں سے کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو، اور اگر تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو تو تم کو کوئی گناہ نہیں، اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو کہ تمہاری نسل سے ہوں (اور نسل کی قید کا مطلب یہ ہے کہ منہ بولے یعنی لے پالک جس کو متبنّٰی کہتے ہیں، اس کی بیوی حرام نہیں) اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو، لیکن جو پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے)، بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے رحمت والے ہیں۔ اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں (وہ بھی حرام ہیں) مگر جو کہ (شرعاً) تمہاری مملوک (باندی) ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے ان حکام کو تم پر فرض کردیا ہے، اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں“ (یعنی انکے ساتھ شرعی شرائط کے مطابق نکاح کرنا جائز ہے)“۔

اسلام نے بطور احترام واکرام، طبع سلیم کی رعایت اور معاشرہ کی صحیح تنظیم وترتیب کے پیشِ نظر بعض عورتوں سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔

حرمت کے اقسام : (۱) ابدی حرمت۔ (۲) وقتی وعارضی حرمت (حرمت مُؤَقَّتَه) ابدی حرم (حرمت مُؤَبَّدَه): اس سے وہ عورتیں مراد ہیں، جن سے کبھی بھی کسی بھی صورت میں نکاح جائز نہیں۔ اس حرمت کے تین اسباب ہیں: قرابت (نسبی رشتہ داری)، سرالی رشتہ داری (مُصَاهَرَت)، رضاعی رشتہ داری (دودھ کا رشتہ)

قرابت کی وجہ سے حرام عورتیں : (۱) ماں، نانی، دادی (اسی طرح اوپر تک) ان رشتوں کو اصول سے تعبیر کیا

جاتا ہے۔(۲) بیٹی، پوتی، نواسی، (اسی طرح نیچے تک) ان کو فروع سے تعبیر کیا جاتا ہے (کسی کے زنا سے پیدا ہونے والی بچی اس پر حرام نہیں کیونکہ اس نطفہ کی کوئی حرمت نہیں، لیکن دیگر ائمہ کے اختلاف کی وجہ سے اسے مکروہ قرار دیا جائے گا۔ کسی عورت کے زنا کا بچہ اس عورت پر حرام ہے، کیونکہ دونوں میں نسب اور میراث جاری ہوگا)(فتح الوهاب) (۳) بہن، خواہ سگی ہو، یا باپ شریک، یا ماں شریک، ان کے والدین کے فروع کیا جائے گا۔(۴) بھتیجی، یعنی حقیقی یا باپ شریک یا ماں شریک بھائی کی بیٹی (اسی طرح ان کی پوتی نواسی نیچے تک۔ فتح الوهاب)

(۵) بھانجی، یعنی حقیقی یا باپ شریک یا ماں شریک، بہن کی بیٹی، (اسی طرح انکی پوتی نواسی نیچے تک۔فتح الوهاب)

(۶) پھوپھی، یعنی باپ کی بہن یا دادا، نانا کی بہن (یعنی اصول میں کسی بھی مذکر کی حقیقی، باپ شریک یا ماں شریک بہن۔ جمل)

(۷) خالہ، یعنی ماں کی بہن، اسی طرح دادی نانی کی بہن (یعنی اوپر تک کسی بھی مونث اصل کی حقیقی، باپ شریک یا ماں شریک بہن ،جمل)

ان میں سے کسی سے بھی عقد کرے تو باطل ہے، اگر حلال سمجھے تو وہ کافر ہے۔

اسی طرح ایک عورت پر اس کا باپ، دادا، نانا وغیرہ تمام اصول، بیٹا، پوتا، نواسہ وغیرہ تمام فروع، حقیقی، باپ شریک اور ماں شریک بھائی، بھائی بہنوں کی اولاد ذکور چچا، ماں باپ کے چچا اوپر تک، ماموں، اور ماں باپ کے ماموں اوپر تک حرام ہیں۔

ضابطہ: نسبی ورضاعی حرمت کا ایک مختصر ضابطہ یہ ہے کہ ایک شخص پر اس کے اصول، فروع، اول اصل کے تمام فروع اور دیگر تمام اصول کی (صرف) ایک فرع (نہ کہ نیچے تک تمام فروع) حرام ہیں۔ پس اصول میں اوپر تک مائیں، فروع میں نیچے تک بیٹیاں، اول اصل کے فروع میں بہنیں اور بھانجیاں وبھتیجیاں، اور دیگر اصول کے فرع میں پھوپھیاں اور خالائیں داخل ہوئیں (الاقناع ۔ مغنی ۳/۱۷۴)

رضاعی حرمت: مذکورہ بالا تمام رشتے رضاعت (دودھ پینے) کی وجہ سے بھی حرام ہوں گے۔ جن میں سے دو (یعنی رضاعی ماں اور بہن) کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے، اور بقیہ کو حدیث پاک نے انکے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

حدیث: (۱) رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوتے ہیں، جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، (متفق علیه ۔ عن ابن عباسؓ)

(۲) حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت ہے: "بلاشبہ رضاعت ان رشتوں کو حرام قرار دیتا ہے، جنکو ولادت حرام کرتا ہے" (متفق علیه)

رضاعی رشتوں کی تفصیل: (۱) رضاعی ماں، جو تم کو اپنا دودھ پلائے، وہ تمہاری رضاعی ماں ہے، اسی طرح اس رضاعی ماں کی نسبی یا رضاعی ماں اوپر تک، رضاعی باپ (یعنی رضاعی ماں کا شوہر جس کے تعلق سے وہ دودھ ہے) کی نسبی یا رضاعی ماں اوپر تک (یعنی بالواسطہ یا بلاواسطہ) اور اوپر تک نسبی والدین کی رضاعی ماں بھی تمہاری رضاعی ماں کہلائے گی۔

کچھ مثالیں: رضاعی ماں کی والدہ، رضاعی ماں کی رضاعی ماں، اپنے نانا کی رضاعی ماں، اپنے دادا کی رضاعی ماں وغیرہ حرام ہیں۔

۲- رضاعی بیٹی: جو تمہارا (یعنی تمہاری بیوی کا) دودھ پئے، یا تمہارے کسی نسبی یا رضاعی فرع کا دودھ پئے، اور ان سب کی بیٹیاں نیچے تک تمہاری رضاعی بیٹی کہلائیگی

مثالیں: جو تمہاری پوتی کا دودھ پئے وہ، اور اس کی بیٹی پوتی نواسی اور جو ان سے دودھ پئے، یہ سب تمہاری رضاعی بیٹیاں ہیں۔

۳- **رضاعی بہن :** جولڑکی تمہارے نسبی یا رضاعی والدین میں سے کسی کا دودھ پیے تو وہ تمہاری رضاعی بہن ہے۔ (والدہ کا دودھ کسی دوسرے شوہر سے ہو اور پیے، یا والد کی کسی دوسری بیوی کا دودھ پیے، تب بھی یہی حکم ہے)، اسی طرح رضاعی ماں یا باپ کی نسبی بیٹی بھی تمہاری رضاعی بہن ہے۔

۴- **رضاعی بھانجی وبھتیجی** ، رضاعی ماں یا باپ کے اولاد کی بیٹی نیچے تک، خواہ نسبی ہو یا رضاعی، اور جسے تمہاری نسبی یا رضاعی بہن نے دودھ پلایا، یا جو تمہارے نسبی یا رضاعی بھائی (کے بیوی) کا دودھ پیے، یا ان بھائی بہنوں کی نسبی یا رضاعی بیٹیوں نے جسے دودھ پلایا، گرچہ نیچے کے درجے میں ہوں، اور جسے تمہارے نسبی ماں نے دودھ پلایا، اس کی رضاعی ونسبی بیٹیاں نیچے تک، یا تمہارے باپ (کی دوسری بیوی) سے جو دودھ پیے، اس کی رضاعی ونسبی بیٹیاں نیچے تک رضاعی بھتیجیاں یا بھانجیاں ہوں گی۔

۵- **رضاعی پھوپھی :** رضاعی باپ کی یا اسکے باپ کی (رضاعی دادا کی) یا رضاعی ماں کے باپ (رضاعی نانا) کی (اسی طرح اوپر تک) ان لوگوں کی نسبی یا رضاعی بہن رضاعی پھوپھی کہلائیگی۔

۶- **رضاعی خالہ :** رضاعی ماں کی اور بالواسطہ یا بلا واسطہ رضاعی نانی یا رضاعی دادی کی نسبی یا رضاعی بہن رضاعی خالہ کہلائیگی۔ (الفتح مع حاشیۃ الجمل ۱۷۸/۴ ، الاقناع مع حاشیۃ البجیرمی ۳۵۵/۳)

(۴ نمبر پر رضاعی بھانجی وبھتیجی کو ایک ساتھ شمار کرنے کی وجہ سے ان کی تعداد ۶ ہوئی ورنہ حقیقتاً یہ سات ہیں) اسی طرح ایک عورت پر اس کا رضاعی باپ، رضاعی بیٹا، رضاعی بھائی، رضاعی بھانجہ وبھتیجہ اور رضاعی چچا و ماموں حرام ہیں۔

تنبیہ : (۱) جو بچہ کسی عورت کا دودھ پیے، تو اس عورت کی گذشتہ بچیاں اور مستقبل میں پیدا ہونے والی بچیاں بھی اس کی رضاعی بہنیں ہوں گی (الاقناع)

(۲) تمہارے بھائی یا بہن کی رضاعی ماں اور بہن تم پر حرام نہیں، اسی طرح پوتے ونواسی کی رضاعی ماں، اولاد کی رضاعی نانی اور اولاد کی رضاعی بہن تم پر حرام نہیں، حالانکہ نسب میں یہ رشتے حرام ہیں، کیونکہ نسب میں حرمت کا جو سبب پایا جا رہا ہے، رضاعت میں وہ موجود ہی نہیں، اسی طرح نسبی چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی رضاعی مائیں حرام نہیں ہے، کسی عورت کا بیٹا دوسری عورت کا دودھ پیے تو اس کا بیٹا اس کا رضاعی بھائی ہے، لیکن پہلی عورت اپنے بیٹے کے اس رضاعی بھائی سے نکاح کر سکتی ہے۔ زید کا ایک باپ شریک بھائی جمیل ہو، اور جمیل کی ماں شریک بہن صفیہ ہو، تو زید صفیہ سے نکاح کر سکتا ہے، نیز اسکے برعکس زید کا ماں شریک بھائی جمیل ہو، اور جمیل کی باپ شریک بہن صفیہ ہو، تب بھی زید صفیہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ (جمل ۱۸۰/۴ ، بجیرمی ۳۵۷/۳)

مُصَاهَرَت (سسرالی رشته) کی وجہ سے مُحَرَّمَات: سسرالی رشتہ سے چار عورتیں حرام ہیں۔ (۱) باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) اسی طرح دادا، نانا کی بیویاں اوپر تک، یعنی اصول کی بیویاں۔ ارشاد باری ہے: "وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ ..." (النساء ۲۲) (اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہے) (۲) بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی بیویاں (نیچے تک یعنی) تمام فروع کی بیویاں۔ فرمانِ باری ہے: "وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ" (النساء ۲۳)

(اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو تمہاری نسل سے ہوں) اللہ کے ارشاد جو تمہاری نسل سے ہوں، کی قید سے متبنّٰی (لے پالک) کی بیوی نکل گئی، جاہلیت میں متبنّٰی کی بیوی بھی حرام سمجھتے تھے، اسلام نے اسے باطل کیا اور اس کی بیوی سے نکاح کو حلال قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ" (الاحزاب : ۴)

(اور تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (سچ مچ کا) بیٹا (بھی) نہیں بنا دیا)

نیز ارشاد فرمایا"لِکَیْ لَایَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْ اَزْوَاجِ اَدْعِیَائِھِمْ اِذَاقَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا ..(احزاب ۳۷)

(تا کہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے (نکاح کے) بارہ میں کچھ تنگی نہ رہے، جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دیدیں)

(۳) بیوی کی ماں، نانی، دادی اوپر تک تمام اصول، ارشاد ربانی ہے" وَاُمَّھَاتُ نِسَائِکُمْ" (النساء ۲۳) (اور تمہارے بیویوں کی مائیں (تم پر حرام ہیں) مذکورہ تینوں رشتے محض عقدِ نکاح سے حرام ہو جاتے ہیں جبکہ عقد صحیح ہو، خواہ اسکے بعد دخول وصحبت پائی جائے یا نہ پائی جائے اور ان محرمات میں سے کسی سے عقد کرے تو وہ عقد باطل ہوگا۔ اگر عقد فاسد کے بعد دخول پایا جائے تو دخول کی وجہ سے یہ رشتے حرام ہوں گے (مغنی ۱۷۷/۳)

(۴) بیوی کی بیٹی، جسے رَبِیْبَہ کہتے ہیں، یہ اپنی ماں کے شوہر پر حرام ہے لیکن محض عقد کی وجہ سے نہیں، بلکہ جب شوہر ماں کے ساتھ دخول کرے، تب جا کر ربیبہ حرام ہوگی۔ ابتدا میں آیت میں اس کا تذکرہ گذر چکا، جس میں اس حرمت کو صحبت کے ساتھ مقید کیا گیا، پھر یہ صراحت کردی کہ اگر دخول نہ ہو تو کوئی حرج نہیں (دیکھئے سورہ نساء آیت ۲۳)

البتہ رَبِیبہ کی حرمت کے لئے اس کا اپنی ماں کے شوہر (سوتیلے باپ) کے زیر پرورش ہونا کوئی شرط نہیں، بلکہ یہ ہر حال میں اس پر حرام ہے، خواہ اس کے زیر پرورش ہو، یا اس سے دور اور الگ تھلگ زندگی گذار رہی ہو۔ آیت میں زیر پرورش کی قید غالبی حالت کے پیش نظر ہے، کیونکہ عموماً ربیبہ اپنے سوتیلے باپ کی زیر پرورش ونگہداشت رہتی ہے۔ (عقد فاسد ہو، تب بھی دخول سے ربیبہ، حرام ہوگی، مغنی)

اسی طرح ایک عورت پر اپنی ماں کا شوہر، بیٹی کا شوہر، شوہر کا بیٹا اور شوہر کا باپ حرام ہے۔ مصاہرت کے یہ چاروں رشتے رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہوں گے، لہٰذا: (۱) بیوی کی رضاعی ماں (اوپر تک) (۲) بیوی کی رضاعی بیٹی جبکہ اس کے ساتھ دخول ہوا ہو، یعنی بیوی نے کسی دوسرے شوہر کے تعلق سے جس کو دودھ پلایا ہو۔ (اگر اس کا دودھ ہے تو خود اس کی بھی رضاعی بیٹی ہوئی) (۳) رضاعی باپ کی بیوی، یعنی تمہاری رضاعی ماں کی سوکن۔ (۴) رضاعی بیٹے کی بیوی (اسی طرح رضاعی پوتے ونواسے نیچے تک کی بیویاں) حرام ہوں گی،

تنبیہ: ماں کے شوہر کی بیٹی (سوتیلے باپ کی بیٹی جو اس کی ماں سے نہ ہو) ماں کے شوہر کی ماں، باپ کے بیوی کی ماں (سوتیلی ماں کی ماں) باپ کے بیوی کی بیٹی، بیٹے کے بیوی کی ماں (بہو کی ماں) بہو کی بیٹی (جو اپنے بیٹے سے نہ ہو) بیٹی کے شوہر کی بیٹی (داماد کی بیٹی جو اپنی بیٹی کے علاوہ دوسری بیوی سے ہو)' داماد کی ماں، ربیب (یعنی سوتیلے بیٹے) کی بیوی، اور ماں کے شوہر کی بیوی (یعنی سوتیلے باپ کی دوسری بیوی) حرام نہیں ہیں، ان سے نکاح جائز ہے۔ (اعانۃ ۲۹۲/۳، قلائد ۱۱۸/۲)

شبہ کی وطی (صحبت): کسی کو اپنی بیوی سمجھ کر وطی کرے، یا نکاح فاسد میں وطی کرے تو اسے وطی بشبہ کہا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے شبہ کی وطی کرے (خواہ عورت کی جانب سے شبہ نہ پایا جائے) تو اس عورت کی ماں (اوپر تک) اور بیٹی (نیچے تک) اس شخص پر حرام ہوگی، نیز یہ عورت اس شخص کے باپ اور بیٹے پر حرام ہوں گی، کیونکہ اس وطی سے نسب اور عدت کا ثبوت ہوتا ہے، لہٰذا تحریم بھی پائی جائے گی، لیکن اس کی وجہ سے مَحْرَمِیَّت ثابت نہ ہوگی لہٰذا اِس پر اُس عورت کی ماں بیٹی کو دیکھنا حرام ہے، اور ان کو چھونے سے وضو ٹوٹ جائے گا، اسی طرح اجنبیہ کے دیگر احکام ثابت ہوں گے (اگر کسی کو اس عورت سے زنا پر مجبور کیا گیا یا پاگل پن کی حالت میں زنا کیا، تو مذکورہ مسائل کا یہی حکم ہوگا۔ بغیہ ۲۰۱)

بطور زنا وطی کرے، یا صحبت کے علاوہ دیگر امور مثلاً بوس وکنار وغیرہ انجام دے، تو اس سے یہ حرمت ثابت نہ ہوگی۔ (فتح الوهاب مع الجمل ۱۸۱/۴)

عورت زنا سے راضی نہ ہو، یا وطی بالشبہ کرے تو مہر لازم ہے، عورت بھی زنا سے راضی ہو، تو مہر نہ ملے گا، کیونکہ بدکار عورت (زانیہ) کے لئے مہر نہیں۔ (بغیه ۲۰۱)

اشتباہ: کسی پر حرام عورت غیر محصور (یعنی جنکو بادی النظر میں باقاعدہ شمار کرنا دشوار ہو، جیسے ۷۰۰ یا ہزار) عورتوں میں خلط ملط ہو جائے تو ان عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرنا جائز ہے، ورنہ اسکے لئے نکاح مشکل ہو جائے گا، کیونکہ یہ کہیں دوسری جگہ چلا جائے تو اس عورت کے وہاں پہنچنے کا بھی امکان ہے۔ اگر محصور عورتوں میں (مثلاً ۱۰، ۲۰ وغیرہ) اختلاط ہو، تو ان میں سے کسی سے بھی نکاح نہیں کر سکتا (تحریم کے پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے) بعضوں نے کہا کہ پانچ سو اور زائد تعداد غیر محصور، اور دو سو یا اس سے کم محصور ہے، درمیانی تعداد کے لئے اپنے دل سے فتویٰ طلب کرے، فرمایا کہ دل تحریم کی طرف زیادہ مائل ہے۔

اگر کسی کی بیوی کسی وجہ سے دیگر عورتوں میں خلط ملط ہو جائے (اور پہچان نہ پائے) تو اجتہاد کر کے بھی ان میں سے کسی عورت سے صحبت نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں، اور صحبت تو عقد سے حلال ہوتی ہے، نہ کہ اجتہاد سے (جمل ۱۸۲/۴)

نکاح ٹوٹ جانا: نکاح کے بعد ابدی حرمت کا کوئی سبب پایا جائے تو نکاح ٹوٹ جائے گا مثلاً شوہر بیوی کی ماں یا بیٹی سے وطی بالشبہ کرے، یا کوئی اپنے بیٹے یا باپ کی بیوی سے شبہ کی وجہ سے صحبت کرے، تو (پہلی صورت میں وطی کرنے والے شوہر کا، اور دوسری صورت میں باپ یا بیٹے کا) نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اگر صحبت کرنے والا اور جس عورت سے کیا ہے، دونوں آپس میں پہلے سے مَحرم ہوں، تب بھی یہی حکم ہے، مثلاً کسی کے بیٹے کی بیوی اس کی بھتیجی ہو، تب بھی اس بہو سے وطی بالشبہ کی وجہ سے بیٹے کا نکاح فسخ ہو جائے گا"۔

اگر کوئی بیٹے کی بیوی سے وطی بالشبہ کرے تو اس عورت کو مکمل مہر مثل، اور بیٹے کے دخول کے بعد واقعہ پیش آیا ہے تو بیٹے کو بھی مکمل مہر، اور دخول سے قبل ہے، تو نصف مہر دینا وطی کرنے والے پر واجب ہے (فتح الوهاب مع الجمل ۱۸۳/۴، تحفه ۲۳۰/۹) (الفقه المنهجی ۲۵/۴۔۳۰)

حرمتِ مُؤَقّتَه (وقتی وعارضی حرمت)

اس سے ایسی حرمت مراد ہے، جو کسی سبب سے ہو، لہٰذا جب یہ سبب زائل ہو جائے، تو حرمت بھی ختم ہوگی، اور اس عورت سے نکاح حلال ہوگا، سبب حرمت کے زوال سے قبل کسی سے نکاح کرے، تو یہ نکاح باطل ہوگا۔

(۱) دو بہنوں کو جمع کرنا: نسبی یا رضاعی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے، اگر دونوں سے ایک ساتھ عقد کرے، تو دونوں عقد باطل ہیں اور آگے پیچھے (الگ الگ) عقد کرے تو پہلا صحیح اور دوسرا باطل ہے۔

ایک سے نکاح کے بعد وہ انتقال کر جائے یا اسے طلاقِ بائنہ ہو جائے (خواہ عدت میں ہو)، یا طلاقِ رجعی کے بعد عدت ختم ہو جائے، تو ان صورتوں میں اس کی بہن سے نکاح کرنا حلال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ ..." (النساء: ۲۳)

ترجمه: "اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو"۔

(۲) کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ، یا بھانجی یا بھتیجی یا پوتی یا نواسی

کو جمع کرنا: فقہائے کرام نے ایک قاعدہ پیش کیا ہے، جو دو عورتوں کو جمع کرنے کی حرمت کو ضبط کرے۔

قاعدہ: ''ان دو عورتوں کو (ایک ساتھ نکاح میں) جمع کرنا حرام ہے، جن میں ایسا نسبی یا رضاعی رشتہ ہو، کہ ان میں سے ایک مذکر (مرد) فرض کریں، تو ان دونوں کا آپس میں نکاح حرام ہو''۔

لہٰذا ایک عورت اور اس کی بہن، یا اس کی بالواسطہ یا بلا واسطہ نسبی یا رضاعی خالہ یا پھوپھی یا بھانجی اور بھتیجی وغیرہ کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے، اگر دونوں نکاح ایک ہی عقد میں ہوں، تو دونوں باطل ہیں، آگے پیچھے ہوں اور پہلا نکاح (شرائط کے اعتبار سے) صحیح ہو، تو دوسرا باطل اور پہلا (شرائط میں کوتاہی کی وجہ سے) فاسد، تو دوسرا صحیح ہوگا، خواہ پہلے سے اس کا علم تھا یا نہ تھا، ایک کی موت یا طلاق کے بعد دوسری سے نکاح کرنا جائز ہے، جیسا کہ بہن کے سلسلہ میں تفصیل گذر چکی۔

نسب اور رضاعت کی قید سے مصاہرت کا رشتہ نکل گیا، لہٰذا کسی عورت اور اس کے (سابقہ) شوہر کی ماں یا بیٹی کو جمع کرنا جائز ہے، گرچہ ایک کو مرد فرض کرنے کی صورت میں آپس میں ان کا نکاح حرام ہے۔(جمل ۱۸۳/۴، مغنی ۱۸۰/۳، بجیرمی ۳۶۰/۳)

کسی شخص کی بیٹی اور اس کی ربیبہ (سوتیلی بیٹی) کو (جو آپس میں ماں شریک بہن نہ ہوں)، جمع کرنا جائز ہے۔(قلائد ۱۱۸/۲) کسی عورت اور اس کے شوہر کی ربیبہ (جو دوسری بیوی سے ہو)، یا کسی شخص کی ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن کو جمع کرنا جائز ہے (مغنی ۱۸۰/۳)

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی عورت اور اس کی پھوپھی، اور کسی عورت اور اس کی خالہ کو جمع نہیں کیا جائے گا'' (متفق علیه عن ابی هريرة وبنحوه البخاری عن جابر)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر نکاح نہ کیا جائے'' نہ بھتیجی پر پھوپھی سے، نہ کسی عورت کی خالہ پر، اور نہ بھانجی پر خالہ سے، نہ چھوٹی پر بڑی سے، اور نہ بڑی پر چھوٹی سے (نکاح کیا جائے)، (ابوداود، ترمذی وصححه، نسائی بعضه، ودارمی)

نیز حضرت ابن عباس سے مسند احمد، ابوداود، ترمذی، ابن حبان، اور حضرت ابوسعید سے بسند ضعیف ابن ماجہ حضرت علی سے بزار، حضرت ابن عمرؓ سے ابن حبان میں اور حضرات سعدؓ بن ابی وقاص، زینبؓ زوجۂ ابن مسعودؓ، ابوامامہؓ، عائشہؓ، ابوموسیٰؓ اور سمرۃؓ بن جندب سے اس سلسلہ میں روایات مروی ہیں۔(تلخیص الحبیر ۱۶۷/۳، خلاصته البدر ۱۹۳/۲، فتح الباری ۱۶۰/۹)

حکمت: مذکورہ رشتوں کا تقاضا ہے کہ آپس میں صلہ رحمی ہو، اور عموماً سوکن بننے کی صورت میں طبعاً کچھ نہ کچھ نوک جھونک اور خلش پیش آتی رہے گی، جو آپس میں کینہ کپٹ کا سبب بن سکتی ہے، اور اس طرح صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی پائی جائے گی، اس لئے اسلام نے ان رشتوں کی عورتوں کو سوکن بنانے سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے خود اس حدیث میں اس علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے: ''تم لوگ اس طرح کروگے تو قطع رحمی کروگے'' (ابن حبان، ابن عبدالبر فی التحمید)، مراسیل ابوداود کی ایک روایت میں بھی قطع رحمی کے اندیشہ کو ممانعت کی علت قرار دیا ہے۔(تلخیص ۱۶۷/۳)

(۳) چار سے زائد بیویاں: کسی آزاد شخص کے لئے ایک وقت میں اپنے نکاح میں صرف چار بیویاں رکھنا جائز ہے، چار سے زائد بیویاں رکھنا جائز نہیں ہے، ارشاد باری ہے: ''فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وثُلَاثَ وَرُبَاعَ ..'' (النساء : ۳)

ترجمہ: ''تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کرلو، دو دو عورتوں سے، اور تین تین عورتوں سے، اور چار چار عورتوں سے...''

حضرت غیلانؓ کے اسلام کے وقت ان کے نکاح میں دس بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: ''ان میں سے چار کو اختیار کرلو، اور بقیہ کو جدا کردو'' (الشافعی، احمد، ترمذی، ابن ماجه، ابن حبان، حاکم، بیهقی، وصححه الالبانی) اسی طرح حضرت نوفلؓ کے نکاح میں پانچ بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے انھیں ایک کو جدا کرنے کا حکم دیا (الشافعی) اور حضرت قیس بن حارثؓ کے نکاح میں بوقت اسلام آٹھ بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے ان میں چار کو اختیار کرنے کا حکم دیا۔ (ابوداود ابن ماجه، بیهقی، ابن ابی شیبه وحسنه الالبانی) (تلخیص ۳/۱۶۹۰ ارواء الغلیل ۶/۲۹۱)

اگر ایک آزاد شخص ایک ہی عقد میں چار سے زائد نکاح کرے، تو تمام نکاح باطل ہونگے، اگر آگے پیچھے کرے تو ابتدا کے چار صحیح اور اس کے بعد کے باطل ہیں۔ چار بیویوں تک ایک ہی عقد میں کرے، تب بھی صحیح ہے۔

چار میں سے کسی کے انتقال، یا طلاقِ بائنہ کے بعد (گرچہ عدت باقی ہو) یا طلاق رجعی کی عدت ختم ہونے کے بعد دوسری سے نکاح کرسکتا ہے۔ (جمل ۴/۱۸۵)

(۴) غیر مسلم عورت: کسی مسلمان کو خالص کتابیہ عورت (یعنی جس کے والدین دونوں کتابی ہوں) کے علاوہ کسی بھی غیر مسلم عورت سے نکاح حلال نہیں ہے، خواہ مجوسی (آتش پرست) ہو یا بُت پرست یا کسی اور مذہب پر، جب یہ اسلام لے آئے تو اس سے نکاح جائز ہوجائے گا۔

آیت: ''وَلَاتَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ'' (البقرة: ۲۲۱)

ترجمه: ''اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں''۔

تنبیه: ایک مسلمان عورت کو کسی بھی مذہب کے غیر مسلم سے نکاح جائز نہیں، کیونکہ شوہر کو بیوی پر ولایت وحاکمیت حاصل ہوتی ہے، اور ایک کافر کو مسلمان پر کوئی ولایت نہیں، نیز اس کی ماتحتی میں اسکے دین واسلام کے حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں، ارشاد باری ہے'' وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا '' (النساء: ۱۴۱) **ترجمه:** اور ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے''۔ نیز ارشاد ہے۔'' وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ...'' (البقره: ۲۲۱) **ترجمه:** ''اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو، جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں، اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے، کافر مرد سے، گو وہ تم کو اچھا ہی معلوم ہو، یہ لوگ دوزخ کی تحریک دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں''۔

ایک کافرہ عورت جب اسلام لے آئے، تو اس سے نکاح حلال ہے، اسلام سے قبل نکاح ہو، تو یہ باطل ہے، اور فوراً دونوں میں جدائی کرنا واجب ہے، اگر صحبت کرے تو یہ زنا ہے۔

کتابیه عورت: ایک مسلمان مرد کو کسی یہودیہ یا نصرانیہ (عیسائی) عورت سے نکاح جائز ہے کیونکہ ممکن ہے اس طرح اسلام اور اس کے محاسن پر اطلاع پاکر وہ اور اس کے رشتہ دار اسلام قبول کرلیں۔ لیکن یہ مکروہ ہے، کیونکہ (بیوی ہونے کی حیثیت سے) اس کی طرف میلان کی وجہ سے اِس کا اسلام خطرہ میں پڑسکتا ہے۔ حربیہ ہو تو کراہت اور شدید ہوگی، امام زرکشی کی تحقیق یہ ہو کہ اگر کتابیہ کے اسلام کی اُمید ہو تو اس سے نکاح کرنا مندوب ہے، جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے ایک عیسائی خاتون سے نکاح فرمایا، پھر وہ اسلام لے آئیں۔

آیت: '' وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُو االْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِیْ اَخْدَانٍ'' (المائدہ : ۵) **ترجمہ :** ''اور جو لوگ کتاب دیے گئے ہیں (یعنی یہود و نصاریٰ) ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے، اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے، اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں (تم کو حلال ہیں) اور پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے **پہلے** (آسمانی) کتاب دیئے گئے ہیں، (تم کو حلال ہیں) جب کہ تم ان کو انکا معاوضہ دے دو (یعنی مہر) اس طرح سے کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (یعنی نکاح کرو جس کی شرطیں شرع میں معلوم ہیں) نہ تو علانیہ بدکاری کرو، اور نہ خفیہ آشنائی کرو''۔

شرائط : کتابیہ سے صرف یہودیہ یا نصرانیہ مراد ہے، زبور یا دیگر انبیائے کرام کے صحفیوں کے ماننے کا جو دعویٰ کریں، وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ اگر کتابیہ عورت اسرائیلیہ ہو، (یہ حضرت اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی طرف نسبت ہے) تو یہ شرط ہے کہ اس کے اول اصل کا (خواہ باپ کی طرف سے یا ماں کی طرف سے) اس دین میں اس کے منسوخ ہونے کے بعد داخل ہونا معلوم نہ ہو، (یعنی یا تو نسخ سے پہلے داخل ہوا ہو، یا پتہ نہ ہو کہ کب داخل ہوا، اگرچہ تحریف کے بعد داخل ہوا ہو) اگر معلوم ہو کہ نسخ کے بعد داخل ہوا تھا، تو اس کتابیہ سے نکاح حلال نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ سلام کی بعثت کے بعد کوئی یہودیت میں داخل ہو یا آپ ﷺ کی بعثت کے بعد کوئی یہودیت یا عیسائیت میں داخل ہو، تو یہ معتبر نہیں، (اور اس نسل کی کتابیہ سے نکاح جائز نہیں)

غیر اسرائیل کتابیہ عورت کے اول اصل کا اس دین میں اس کے منسوخ ہونے سے قبل داخل ہونا معلوم ہونا شرط ہے، خواہ اس دین کے تحریف کے بعد ہو، جبکہ محرّفات سے مجتنب ہو، اگر نسخ کے بعد داخل ہو، یا شک ہو، یا تحریفی امور سے نہ بچے تو ان صورتوں میں ایسی کتابیہ سے نکاح جائز نہیں ہے۔ خالص کتابیہ بیوی نفقہ، لباس، باری اور طلاق وغیرہ امور میں ایک مسلمان بیوی کی طرح ہے'' (البتہ دونوں میں میراث نہ چلے گی) لہٰذا وہ اسے حیض و جنابت کے غسل، اور میل کچیل و نجاست کے ازالہ و صفائی پر، اور خبیث اشیاء مثلاً سور، شراب وغیرہ کے تناول سے رکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ کیونکہ بیوی سے انتفاع یا کمال انتفاع اس پر موقوف ہے۔

اس کا مسلمان شوہر اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اسے عبادت کرنے سے روک نہیں سکتا۔ والدین میں ایک کتابی اور دوسرا غیر کتابی ہو، تو اس لڑکی سے نکاح حلال نہیں، لیکن لڑکی بالغہ ہونے کے بعد ان میں سے کتابی کے دین کی اتباع کرے، تو اس میں شمار ہوگی اور اکثر علماء کے نزدیک اُس سے نکاح حلال ہے، امام اسنوی وغیرہ اس کے باوجود حرمت کے قائل ہیں۔

ایک دین سے دوسرے دین کی طرف انتقال : جو ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرے، تو اب اسے اسلام ہی قبول کرنا ضروری ہے، ورنہ اگر اسے امان ہے تو اسے اپنے مقام امن پر بھیج دیا جائے گا، پھر وہ حربی شمار ہوگا، ہم اس پر قابو پالیں تو اسے قتل کر سکتے ہیں۔

اگر کوئی یہودیہ عورت نصرانیہ ہو جائے، یا اس کے برعکس تو یہ عورت کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں، اگر کسی کے نکاح میں تھی، تو اس کا حکم مرتدہ کی طرح ہے۔

مرتدہ : جو عورت اسلام چھوڑ دے، وہ نہ کسی مسلمان کے لئے حلال ہے، اور نہ کسی کافر کے لئے۔

ارتداد : شوہر بیوی دونوں، یا کوئی اسلام چھوڑ دے، اور ابھی دخول نہ ہوا، تو فوراً نکاح ختم ہو جائے گا، اور دخول کے بعد یہ واقعہ پیش آئے، تو انتظار کریں گے، اگر عدت کے اندر دوبارہ اسلام لے آئے تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ ردّت کے وقت سے دونوں میں جدائی ہو چکی، عدت کے توقف کی مدت میں صحبت کرنا حرام ہے، لیکن شبہ کی وجہ سے حد جاری نہ ہوگی، صرف تعزیری سزا ملے گی، نیز اس

صحبت کی وجہ سے عدت واجب ہے، جیسا کہ طلاق رجعی کی عدت میں صحبت کرنے سے واجب ہے کیونکہ یہ دونوں شبہ کی وطی ہے، (جمل ۱۹۹/۴، مغنی ۱۹۰/۳، تحفہ ۲۷۰/۹)

(۵) شادی شدہ عورت : جو عورت کسی کی بیوی ہو، اس سے کسی کو نکاح جائز نہیں، اگر شوہر کا انتقال ہو جائے، یا وہ طلاق دے دے، پھر عدت گذر جائے تو اس سے نکاح حلال ہے۔ محرمات کو شمار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''..وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ ..'' (النساء ۲۴)

ترجمہ : ''اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں'' (وہ بھی حرام ہیں)

(۶) مُعْتَدَّہ عورت : جو عورت شوہر کی موت یا طلاق کی عدت میں ہو، اس سے نکاح کرنا جائز نہیں، عدت ختم ہونے کے بعد نکاح جائز ہے۔ قران کریم میں ہے: وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهٗ '' (البقرہ ۲۳۵)

ترجمہ : ''اور تم تعلق نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مت کرو، یہاں تک کہ عدت مقررہ اپنے ختم کو پہنچ جائے''۔

(خود صاحب عدت یعنی جس شخص کی عدت میں ہے، اس کے لئے بعض صورتوں میں معتدہ سے نکاح جائز ہے)

(۷) مُطَلَّقَہ ثَلاثَہ (جس عورت کی تینوں طلاق ہو چکی ہو): کسی عورت کو شوہر تین طلاق دے چکے، تو اسے آئندہ اُس عورت سے نکاح کے جواز کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱- اس کی عدت ختم ہو۔ ۲- دوسری جگہ صحیح نکاح ہو، گو غلام یا پاگل سے ہو اگر نکاح فاسد میں صحبت ہو یا شبہ کی وطی ہو تو یہ کافی نہیں۔ ۳- دوسرے شوہر کا حشفہ (سپاری) یا اس کے بقدر (جبکہ یہ کٹا ہو) عضو تناسل بیوی کی اگلی شرم گاہ میں غائب ہو، خواہ عضو تناسل پر حائل مثلاً کپڑا وغیرہ لپیٹا ہو، یا دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں نیند میں ہوں، پچھلی شرم گاہ وغیرہ میں غائب ہونا کافی نہیں۔ اگر عورت کنواری ہے تو صحبت سے اس کے پردہ بکارت کا ازالہ ضروری ہے۔

آلہ تناسل میں انتشار (استادگی) بھی ضروری ہے، گو انتشار ضعیف ہو، اور انگلی کی مدد سے داخل کرنا پڑے، اگر شل ہونے یا عنین ہونے کی وجہ سے بالکل انتشار نہ ہو تو یہ کافی نہیں۔ (۴) دوسرا شوہر کم از کم اتنی عمر کا ہو کہ اس کا صحبت کرنا ممکن ہو، یعنی طبعاً اس میں شہوت ہو، اور عادتاً محبت سے لطف اندوز ہو سکے، اس سے بھی کم سن ہو، تو اس کا صحبت کرنا کافی نہیں، لیکن مطلقہ اگر چھوٹی بچی ہو کہ عام طور پر اس سے صحبت نہ ہو سکے، لیکن کسی کم سن نے صحبت کر لی، تو یہ کافی ہے، بعض علماء کے نزدیک دوسرے شوہر کا مراہق یعنی قریب البلوغ ہونا شرط ہے، اس سے کم سن کافی نہیں، دوسرا شوہر نابالغ ہو، تو اس کا عاقل اور آزاد ہونا شرط ہے، بالغ ہو تو یہ دونوں شرط نہیں،

(۵) دوسرے شوہر کی صحبت کے بعد اس کی وفات یا طلاق وغیرہ کے ذریعے اس سے جدائی ہو۔

(۶) جدائی کے بعد عدت گذر جائے۔

ان تمام شرائط کے پائے جانے کے بعد اب پہلا شوہر دوبارہ اس سے نکاح کر سکتا تھا۔ (اور اس نکاح میں اسے ازسر نو مکمل تین طلاق کا اختیار حاصل ہوگا)

اگر دوسرے شوہر کے صحبت کے وقت دونوں میں سے کوئی احرام میں ہو، یا روزہ دار ہو، یا شوہر خصی ہو، یا بیوی سے ظہار کر چکا ہو، یا بیوی حائضہ ہو، تب بھی تحلیل (پہلے شوہر کے لئے حلال ہونے) کیلئے یہ صحبت کافی ہے۔ کیونکہ صحیح نکاح میں شوہر کی جانب سے صحبت پائی جا رہی ہے (گرچہ صورتیں حرام ہیں)

آیت : ".... فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجاً غَيْرَه ..." (البقرہ: ۲۳۰)

ترجمہ : "پھر اگر اس عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار، تو اب اُس کو وہ عورت اُسکے بعد حلال نہیں، جب تک اس کے سوا کسی خاوند سے نکاح نہ کرے"۔

حدیث : حضرت رفاعہؓ نے اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دی تو انھوں نے بعد میں عبدالرحمٰن بن زبیرؓ سے نکاح کیا، پھر آپ ﷺ سے ان کی جنسی کمزوری کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم رفاعہ کے پاس واپس لوٹنا چاہتی ہو؟ نہیں جب تک کہ تم اس کا عُسَیلَہ اور وہ تمہارا عُسَیلَہ نہ چکھے" (صحاح ستہ، دارمی، ابن ابی شیبہ، بیھقی، احمد عن عائشہ)

عُسَیلَہ عَسل (شہد) کی تصغیر ہے، یعنی تھوڑا سا شہد، تو حدیث میں لذتِ جماع کے لئے یہ تشبیہ استعمال کی گئی ہے۔ یہ حدیث حضرات عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور عبدالرحمٰن بن زبیرؓ سے بھی مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً مروی ہے: "عُسَیلَہ یعنی جماع (صحبت)" (احمد نسائی ابویعلی فی مسندہ وھو صحیح المغنی) (ارواء الغلیل ۶/۲۹۲، ۷/۱۶۳۔ تلخیص ۳/۱۷۰، خلاصۃ البدر ۲/۱۹۴)

لہٰذا صرف صحبت کافی ہے، انزال ہونا شرط نہیں ہے۔ اور شریعت نے یہ حکم تیسری طلاق سے روکنے اور نفرت دلانے کیلئے دیا ہے، (آئندہ اسے اپنانے کا ارادہ ہو، تو ان سارے مراحل سے گذرنا لازم ہوگا، لہٰذا خوب سوچ سمجھ کر تیسری طلاق دے)

حدیث : "اللہ نے مُحَلِّل اور مُحَلَّل لَہٗ پر لعنت فرمائی ہے" (ترمذی، نسائی وصححه ابن القطان وابن دقيق العيد علی شرط البخاری) نیز دیگر کئی صحابہ کرامؓ سے بھی اِس طرح مختلف کتب حدیث میں روایت موجود ہے (تلخیص ۳/۱۷۰) (مُحَلِّل یعنی دوسرا شوہر اور مُحَلَّل لَہٗ پہلا شوہر)

اگر دوسرا شوہر اس شرط پر نکاح کرے کہ وہ صحبت کرنے کے بعد طلاق دے گا، یا بیوی اس سے بائنہ (جدا) ہو جائے گی، یا دونوں میں نکاح باقی نہ رہے گا، اور یہ شرط عقد میں لگائی جائے تو یہ نکاح ہی باطل ہے، کیونکہ یہ ایسی شرط ہے جو نکاح کے دوام سے مانع ہے، لہٰذا مؤقت (وقتی) نکاح کی طرح ہوا، اگر عقد سے پہلے جانبین آپس میں ایسی کسی شرط پر متفق ہوں، پھر اس قصد کے ساتھ نکاح ہو، لیکن عقد میں شرط نہ لگائی جائے تو مکروہ ہے، تاکہ جن علماء نے اسے بھی باطل قرار دیا ہے، ان کے مسلک کی رعایت ہو، نیز اصول یہ ہے کہ جس شرط کی صراحت باطل کرتی ہے، اس کا جی میں ارادہ کرنا مکروہ ہے۔ اسی طرح بلا شرط نکاح کرے، لیکن دل میں نیت یہ ہو کہ صحبت کرنے کے بعد طلاق دوں گا، تو یہ مکروہ ہے۔ (مغنی ۳/۱۸۳، تحفہ ۹/۲۴۰، نہایہ ۶/۲۸۲، جمل ۴/۱۸۷، الفقہ امنہجی ۴/۳۰-۳۴)

تعدد ازواج (ایک سے زائد بیویاں)

حکم : اصل میں تعدد ازواج مباح ہے، ارشاد باری ہے: "فَإِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّاتُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامٰى فَانْكِحُوا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ" (النساء: ۳)

ترجمہ : "اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کرلو، جو اور عورتیں تم کو خوش آویں، دو دو، تین تین، چار چار"

یعنی اگر یتیم لڑکیوں سے نکاح کی صورت میں ان کے ساتھ بے انصافی کا ڈر ہو تو تم کو اس کی اجازت ہے کہ ان کے سوا دیگر عورتوں سے نکاح کرو، (یہ اجازت صرف چار تک ہے، جیسا کہ گذر چکا، بالا جماع ایک وقت میں اس سے زائد جائز نہیں)

زائد نکاح کرنے والے کے احوال کے اعتبار سے کبھی تعدد مستحب کبھی مکروہ اور بعض اوقات حرام ہوگا۔(۱) اگر کسی کو دوسری بیوی کی ضرورت ہو، مثلاً ایک سے عفت کا مقصد حل نہ ہو، یا پہلی بیوی بیمار رہتی ہو، یا بانجھ ہو، اور اسے اولاد کی خواہش ہو، اور اس کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ بیویوں میں عدل وانصاف برتے گا، تو یہ تعدد مستحب ہے، کیونکہ اس میں مشروع مصلحت موجود ہے، کئی صحابہ کرامؓ نے ایک سے زائد نکاح کئے ہیں۔

(۲) بغیر حاجت کے محض تنعم اور تعیش کے طور پر زائد بیویاں رکھے، اور اُن میں انصاف کر پائے گا یا نہیں، اس میں شک ہو تو یہ تعدد مکروہ ہے۔

(۳) اپنی غربی، ضعف وکمزوری یا کسی طرف میلان کی وجہ سے کسی پر ظلم کے متعلق اپنے نفس پر اطمینان نہ ہو، اور غالب گمان یہ ہو کہ ایک سے زائد بیویوں میں عدل وانصاف نہیں کر پائے گا، تو اسے تعدد حرام ہے، بے انصافی کے اندیشہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک پر اکتفا کا حکم دیا ہے (دیکھئے سورۂ نساء آیت ۳)

آخری دونوں صورتوں میں کوئی مزید نکاح کرے، تو یہ عقد صحیح ہوگا، اور تمام آثار مثلاً مہر کا وجوب، نفقہ کا وجوب وغیرہ مرتب ہوں گے، گرچہ دوسری صورت میں مکروہ اور تیسری صورت میں حرام ہے۔ اور حرمت سے گناہ ہوگا۔ لیکن عقد باطل نہ ہوگا۔

مطلوبہ عدل: بیویوں کا نفقہ، رہائش، ان کے ساتھ شب باشی، حسن معاشرت اور دیگر ازدواجی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اسلام نے عدل ومساوات کو واجب قرار دیا ہے۔ جہاں تک قلبی محبت کا تعلق ہے، تو اس میں مساوات واجب نہیں ہے، جبکہ عملاً کسی ظلم کا باعث نہ بنے، کیونکہ محبت کے باب میں انسان کو اپنے دل پر کوئی اختیار نہیں، شاید قرآن کریم کی اس آیت سے یہی مراد ہے:

آیت: "وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَو حَرَصْتُمْ ..." (النساء: ۱۲۹)

ترجمہ: اور تم ہرگز عورتوں کو برابر نہ رکھ سکو گے، اگرچہ اس کی حرص کرو"۔

دیگر مذکورہ بالا امور میں عدل وانصاف لوگوں کے بس اور اختیار میں ہے۔ آپ ﷺ مطلوبہ مساوات وانصاف کے بعد فرمایا کرتے: "یا اللہ یہ میرے بس کی تقسیم تھی، بس جس کا تو مالک ہے، اور میرے بس میں نہیں، اس پر مجھے ملامت نہ کر"۔ (ابوداود، ترمذی وغیرہ) اس سے دلی محبت اور میلان مراد ہے۔

حکمت: اسلام نے تعدد کی اجازت دی ہے، اسے کوئی فرض نہیں قرار دیا، تعدد کی اس اجازت کے مختلف فوائد ہیں، جن کا ادراک ایک دوررس نگاہ ہی کر سکتی ہے، مثلاً: (۱) ایک بیوی اپنی عفت وتکمیلِ جذبات کے لئے ناکافی ہو، تو یہ ناجائز راستے کی طرف قدم بڑھانے کا سبب بنے گا، تو اس کے اور معاشرہ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ کسی دوسری عورت سے نکاح کر کے دونوں شریف زندگی گذاریں، اور زنا کی گمراہی وتاریکی سے محفوظ رہیں۔

(۲) تعدد کی وجہ سے ایک بے نکاح عورت کو صحیح سہارا نصیب ہوتا ہے، اور اس بات سے اس کی حفاظت ہوتی ہے کہ بدکار لوگ اس کا پیچھا کر کے اسے اپنے ہوس کا نشانہ بنائیں، اور ہر ہر حق سے محروم اور ذلیل قرار پائے، نیز اس کی اولاد بھی نسب کے حقوق اور پدری شفقت کی محرومی کا شکار نہ ہوئیں گے۔

بہر حال تعدد سے اسلام کا مقصد دونوں کو زنا و بدکاری کے دلدل سے بچا کر ایک شریفانہ زندگی سے ہمکنار کرنا، اور ایک صالح معاشرہ کا وجود ہے۔

ایک شخص میں بیویوں کی رغبت ہو، اور اس کی بیوی فطرتاً یا کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے اس کے برعکس ہو، تو اس شخص کے لئے کیا بہتر ہے؟ کیا زنا کر کے اپنی دین و دنیا و صحت کو تباہ کردے، یا اپنے جذبات کو دبا کر گھلتا اور گھٹتا رہے، یا پھر دوسرا نکاح کرلے، ظاہر ہے کہ تیسری ہی شکل بہتر ہے۔

جنگ کے شعلے ہمیشہ بھڑکتے رہتے ہیں، گویا کہ یہ ضروریات زندگی میں داخل ہے، جس کے نتیجے میں مردوں کی قلت، اور ان کے مقابلہ میں عورتوں کی کثرت ایک بدیہی امر ہے، تو کیا ہر شخص صرف ایک بیوی کا پابند بن کر دیگر عورتوں کو اسی طرح ازدواجی مسرتوں اور اولاد کی شفقت سے محروم رکھا جائے اور اپنی پیری میں بالکل بے سہارا ہو جائے، نیز اکثر و بیشتر وہ بے راہ روی اختیار کر کے بالکل ہی برباد ہو جائے گی، ایسے ماحول میں تعدد کو مروت و غیرت کا ایک انسانی فریضہ قرار دینا مبالغہ نہ ہوگا۔

شوہر کو بیوی سے محبت ہو، لیکن اس کی تقدیر میں اولاد کی خوشی نہ ہو، تو کیا اسے اس خوشی سے محروم رہنے پر مجبور کریں، یا اس محبوب بیوی کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیں، یا اسے زوجیت میں رکھ کر دوسرے نکاح کی اجازت دیں اور دونوں میں عدل و انصاف کو ضروری قرار دیں، ظاہر ہے کہ تیسری ہی شکل معتدل اور بہتر ہے۔

جو معاشرے تعدد ازواج کو جرم سمجھتے ہیں، وہ بے انتہا ضرر و خطرات اور بربادی کا شکار ہوتے ہیں، جو ان کے گمان کے مطابق تعدد ازواج کے ضرر سے بہت زیادہ ہیں، ان میں ازدواجی خیانت، علانیہ بدکاری اور خفیہ آشنائی عام ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے ان کے سنجیدہ افراد خود تعدد ازواج کی اجازت کیلئے چیخ رہے ہیں۔

تنبیہ : اسلام نے تعدد کی اجازت کسی پر ظلم و ستم ڈھانے اور پریشانی کرنے کے لئے نہیں دی، بلکہ افراد و معاشرہ کی ضرورت اور اصلاح کے پیش نظر مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، اب اگر بعض جاہل اور بددین افراد اس کا غلط استعمال کریں، تو اس سے اسلام کے اس حکم پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ (الفقه المنهجي ۴/۳۵۔۴۰)

مہر (صَدَاق)

تعریف : عقد نکاح (یا وطی) کی وجہ سے شوہر پر جو مال بیوی کو دینا واجب ہے، اسے مہر کہا جاتا ہے۔

حکم : عقد نکاح مکمل ہوتے ہی شوہر پر مہر واجب ہوگا، خواہ عقد میں مہر مقرر کیا جائے یا نہ کیا جائے، بلکہ جانبین مہر کی نفی پر متفق بھی ہوں، تو یہ اتفاق باطل اور مہر لازم ہے۔

وجوب کی دلیل : مہر کا وجوب قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔

آیت : (۱) ''وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ...'' (النساء : ۴)

ترجمہ : ''اور تم لوگ بیویوں کو ان کے مہر خوشدلی سے دے دیا کرو''۔

(۲) ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً...'' (النساء : ۲۴)

ترجمہ : ''پھر (نکاح کے بعد) جس طریق سے تم ان عورتوں سے منتفع ہوئے ہو، سو ان کو (اس کے عوض) ان کے مہر دو جو

کچھ مقرر ہو چکے ہیں''۔

(۳)''لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً''(البقرہ : ۲۳۶)

ترجمہ : ''تم پر کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لیے کچھ مہر مقرر کیا ہے''۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کرانے کے متعلق درخواست کی تو آپ ﷺ نے مہر ادا کرنے کا حکم دیا، کچھ نہ ملا تو اسے کم از کم ایک لوہے کی انگوٹھی تلاش کر کے لانے کا حکم دیا، وہ بھی نہ ملا تو آخر میں آپ ﷺ اس کو یاد چند سورتوں کی تعلیم کی شرط کے عوض اس عورت کا نکاح اس سے کر دیا۔

ہر دور میں بغیر کسی انکار کے تمام علماء کا مہر کے وجوب پر اتفاق ہے۔

عقد میں مہر کا ذکر : عقد میں مہر کی مقدار کا ذکر سنت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے کسی نکاح کو مہر کی تعیین کے بغیر انجام نہیں دیا، نیز اس صورت میں آئندہ دونوں میں اختلاف وتنازع کا موقع نہ آئے گا۔ عقد میں مہر کا ذکر نہ کرنا مکروہ ہے۔ (اوپر کی تیسری آیت۔البقرہ:۲۳۶ سے ثابت ہوتا ہے کہ مہر کے ذکر کے بغیر بھی نکاح صحیح ہے)

مہر کی ملکیت : مہر خالص بیوی کا حق ہے، کسی ولی کا اس میں کوئی حق نہیں، گرچہ ان کو قبضہ کا حق ہے، لیکن یہ قبضہ اسی کی ملکیت کے طور پر ہے۔

مہر کی مقدار: مہر کی اقل واکثر (کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ) مقدار کی کوئی حد نہیں، (جو چیز کسی چیز کی قیمت بن سکتی ہے، وہ مہر بن سکتی ہے، منہج الطلاب) قلیل یا کثیر، کوئی معین چیز، یا ذمہ میں بطور قرض، (مثلاً ہزار روپیہ) یا منفعت (گھر کی رہائش یا تعلیم) مہر مقرر کی جا سکتی ہے۔

آیت:''اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ...''(النساء ۲۴)

ترجمہ: اور (سابقہ آیت میں بیان کئے گئے) ان (محرّم) عورتوں کے سوا اور (باقی) عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو ان کے مالوں کے ذریعہ سے (نکاح میں لانا) چاہو (یعنی مہر ہونا نکاح میں ضرور ہے) اس آیت میں مال کو مطلق بیان کیا، کسی خاص مقدار کی قید نہیں لگائی، صحیحین کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے لوہے کی انگوٹھی مہر مقرر کرنے فرمایا، پھر چند سورتوں کی تعلیم کو مہر مقرر کیا، ترمذی کی حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے ایک جوڑ چپل (کے مہر) پر نکاح کیا، تو آپ ﷺ نے پوچھا:''کیا تو اپنے نفس ومال کے مقابلہ میں چپل کے جوڑ پر راضی ہے؟''اس نے اثبات میں جواب دیا، تو آپ ﷺ نے اس نکاح کو جائز قرار دیا۔ (اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔'' وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا''(النساء : ۲۰)

ترجمہ : ''اور اگر تم بجائے ایک بیوی کے (یعنی پہلی کے) دوسری بیوی کرنا چاہو، اور تم اس کو (مہر میں یا ویسے ہی بطور ہبہ کے) انبار کا انبار مال دے چکے ہو، تو تم اس میں سے کچھ بھی مت لو''۔

لیکن مستحب یہ ہے کہ مہر کی مقدار دس درہم سے کم نہ ہو، تا کہ حنفیہ کے اختلاف سے بچ سکیں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ واجب ہے۔

اسی طرح ۵۰۰ درہم سے زائد نہ ہونا مستحب ہے، کیونکہ آپ ﷺ کے (اکثر) ازواجِ مطہرات اور پاکیزہ دختروں کا مہر یہی وارد ہے۔

حدیث : حضرت عمرؓ نے فرمایا:''عورتوں کے مہر میں غلو نہ کرو، کیونکہ یہ بات دنیا میں بزرگی اور آخرت میں تقویٰ کا باعث

ہوتی، تواس کے آپ ﷺ زیادہ مستحق تھے، آپ ﷺ کے ازواجِ مطہرات اور بیٹیوں کا مہر ۱۲ اُوقیہ سے زائد نہ تھا'' (احمد، اصحاب السنن وصححہ الترمذی)

صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے ازواجِ مطہرات کا مہر ۱۲ اُوقیہ اور نصف اُوقیہ (۱۲،۵ اُوقیہ) مروی ہے (تلخیص ۳/۱۹۱) ایک اوقیہ ۴۰ درہم کا ہوتا ہے، لہٰذا ساڑھے بارہ اوقیہ ۵۰۰ درہم کے برابر ہوا۔ یہ چاندی کی زکات کے نصاب کے ڈھائی گنا ہوا۔ (آپ ﷺ کی اتباع میں مہر چاندی میں ہونا سنت ہے۔ نیز مہر میں سے کچھ مقدار بیوی کے سپرد کرنے سے پہلے دخول نہ کرنا سنت ہے، تاکہ جن علماء نے اسے واجب قرار دیا ہے ان کے اختلاف سے بچ جائیں۔ جمل ۴/۲۳۶)

نقد یا ادھار مہر (معجّل یا مؤجل): مہر معجّل اور فوری ہونا شرط نہیں، پورا مہر دخول سے قبل معجّل، یا پورا مؤجل، یا بعض معجّل اور بعض مؤجل ہو، تو صحیح ہے۔ لیکن مؤجل (ادھار) ہو تو مدت متعین ہونا شرط ہے۔

اگر مہر نقد ہو، تو اس پر قبضہ کرنے تک بیوی اپنے آپ کو شوہر سے روک سکتی ہے۔ لیکن ادھار ہو، تو اسے خود کو روکنے کا حق حاصل نہ ہوگا، کیونکہ وہ خود تاخیر پر راضی ہوئی ہے، اس لئے خود کو روکنے کا حق ساقط ہوگا۔

مہر کا استقرار (پختہ ہونا): (۱) شوہر بیوی سے صحبت کرے تو اس پر کل مہر بالکل لازم ہوگیا۔ خواہ یہ صحبت حلال حالت میں ہو، جیسے بیوی حیض سے پاک ہو، یا حرام حالت میں، مثلاً حیض کی حالت میں، اس آیت سے اس پر دلالت ہوتی ہے۔ ترجمہ: ''پھر (نکاح کے بعد) جس طریق سے تم ان عورتوں سے متمتع ہوئے ہو، سو ان کو (اس کے عوض) ان کے مہر دو، جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں'' (النساء ۲۴) استمتاع اور انتفاع سے یہاں دخول اور صحبت سے لطف اندوز ہونا مراد ہے۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے: ''جو شخص بھی کسی عورت سے نکاح کرے... پھر اسے مَس کرے۔ (یعنی اس سے جماع کرے) تو اسے کامل مہر ملے گا۔ (مؤطا مالک۔ النکاح)

(۲) دخول سے قبل یا بعد میاں بیوی میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے، تو مکمل مہر لازم ہوگا، اس پر صحابۂ کرامؓ کا اجماع ہو چکا ہے۔

نصف مہر کا استقرار: صحیح عقدِ نکاح ہو، اور عقد میں صحیح طریقے سے مہر متعین ہو، پھر صحبت سے قبل ہی شوہر بیوی کو طلاق دے، تو نصفِ مہر لازم ہوگا۔

آیت: ''وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ ....'' (البقرہ: ۲۳۷)

ترجمہ: ''اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو مَس کرو (یعنی صحبت کرو) اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو، اس کا نصف (واجب) ہے۔ (اگر شوہر انگلی وغیرہ سے پردہ بکارت کا ازالہ کرے، پھر دخول سے قبل طلاق دے دے، تو صرف نصف مہر واجب ہوگا۔ لیکن یہ حرکت حرام ہے، اور اسے تعزیری سزا ملے گی (فتاوی ابن زیاد ۲۱۵) اگر شوہر طلاق بیوی کے سپرد کرے اور وہ خود کو طلاق دے دے، یا بیوی کے عمل پر معلق کرے اور بیوی وہ عمل کرے، یا شوہر کے اسلام یا ارتداد کی وجہ سے یا لعان کی وجہ سے جدائی ہوئی ہو، یا شوہر کی ماں دو سال سے کم عمر بیوی کو دودھ پلائے یا بیوی کی ماں اس طرح شوہر کو دودھ پلائے تو ان تمام صورتوں میں بھی نصف مہر ساقط ہوگا (جب کہ صحبت سے قبول ہو) (فتح الوھاب)

کل مہر کا سقوط: اگر صحبت سے پہلے ہی میاں بیوی میں جدائی ہو جائے، اور یہ جدائی بیوی کے سبب سے ہو، تو کل مہر

ساقط ہوگا۔ مثلاً بیوی میں عیب کی وجہ سے شوہر نکاح فسخ کرے، تو ان تمام حالات میں کل مہر ساقط ہوگا۔ (فسخ کن عیوب کی وجہ سے ہوسکتا ہے، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی)

مہر مثل : بیوی کے مثل عورتوں کا عموماً جو مہر مقرر ہوتا ہے، اسے اس مہر مثل کہیں گے۔ اس کی تعیین کے لئے لڑکی کے والد کی طرف سے نسبی رشتہ دار لڑکیوں کو پیش نظر رکھیں گے۔ پس جس لڑکی کے مہر مثل کی تعیین کرتا ہو، عصبات میں سے سب سے قریبی عورت کا اس سلسلہ میں اعتبار کیا جائے گا۔ سب سے قریبی سگی بہن ہے، پھر باپ شریک بہن، پھر بھتیجیاں (نیچے تک) پھر پھوپھیاں (پہلے سگی پھر باپ شریک) نیز آئندہ آنے والی صفات میں بھی متعلقہ لڑکی کے مساوی ہونے کی رعایت کی جائے گی۔

اگر عصبات عورتیں نہ ہوں، یا ان کا نکاح نہ ہوا ہو، تو ارحام میں سے (یعنی والدہ کی جانب سے) قریبی رشتہ دار کا اعتبار کیا جائے گا۔ مثلاً والدہ، نانی، خالہ، بھانجیاں، کیونکہ اجنبی اور پرائی عورتوں سے یہ بہتر ہیں۔ اگر یہ بھی مفقود ہوں، تو درج ذیل صفات میں اس لڑکی کے مثل بستی کی دیگر لڑکیوں کا اعتبار کیا جائے گا۔

مہر مثل کی تعیین میں معتبر صفات : عمر، عقل، جمال، مالداری، عفت و پاکدامنی، دین، تقویٰ، علم، کنوارا پن، شادی شدہ ہونا، نیز ہر وہ صفت جس سے صحیح غرض کا اختلاف ہو، کیونکہ ان صفات کے اختلاف سے مہر بھی مختلف ہوتا ہے۔

حدیث : حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے نکاح کیا، اور کچھ مہر مقرر نہ کیا، پھر صحبت سے پہلے انتقال کر گیا، تو ابن مسعودؓ نے فرمایا: اسے اس جیسی عورتوں کی مہر کے مثل مہر ملے گا، نہ کم نہ زائد....تو حضرت معقل نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ ﷺ نے بھی ایسا ہی فیصلہ دیا تھا...(ابو داود، ترمذی بسند حسن صحیح وغیرہ)

مہر مثل کے مُوجبات : درج ذیل صورتوں میں مہر مثل واجب ہوگا۔

(۱) نکاح فاسد ہو، یعنی شرائط صحت میں سے کوئی شرط مفقود ہو، مثلاً بغیر گواہوں یا ولی کے نکاح ہوا پھر اس فاسد عقد میں دخول (جماع) بھی پایا گیا، تو مہر مثل واجب ہوگا، کیونکہ عقد اور معین مہر فاسد ہیں، نیز دونوں میں تفریق بھی واجب ہے۔ دخول کے وقت کے اعتبار سے مہر مثل مقرر ہوگا، نہ کہ عقد کے وقت، کیونکہ فاسد عقد کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۲) اگر مہر کی تعیین میں جانبین کا اختلاف ہو، بیوی کہے: آپ نے عقد میں مہر متعین کیا تھا، اور شوہر انکار کرے، تو بیوی اپنے دعویٰ پر قسم لے گی، اور شوہر اپنے دعویٰ پر قسم لے گا۔ پھر مہر کو فسخ کریں گے اور مہر مثل واجب ہوگا۔

(۳) مہر کا ذکر فاسد ہو: اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہوں گی۔

(۱) مقررہ مہر شرعاً مال نہ ہو : مثلاً شراب، سور، آلات لہو وغیرہ جو شریعت کے عرف میں مال شمار نہیں ہوتے۔

(۲) مقررہ مہر اس کی ملکیت نہ ہو، مثلاً کسی کی گھڑی غصب کر کے مہر مقرر کرے۔

(۳) دو یا زائد عورتوں سے ایک ہی مہر پر نکاح کرے، تو یہ نکاح صحیح ہے، لیکن مہر فاسد ہے، بس ہر ایک کے لیے مہر مثل واجب ہوگا۔

(۴) ولی نابالغ بچہ کا نکاح مہر مثل سے زائد پر کرے اور مہر بچے ہی کے مال سے متعین ہو، یا ولی کمسن بچی کا نکاح، یا بالغہ کنواری کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر مہر مثل سے کم پر کرے، تو مہر فاسد ہوگا اور مہر مثل واجب ہوگا، کیونکہ ولی اس بات کا مکلف ہے کہ دونوں کی مصلحت پیش نظر رکھے، جو کہ یہاں رکھی نہ گئی۔

(۵) مفوِّضہ : یعنی وہ رشیدہ لڑکی (کنواری ہو یا شادی شدہ) جو اپنے ولی سے کہے کہ میرا نکاح بغیر مہر کے کردو، پھر ولی اس کا

نکاح کرائے اور مہر کی نفی کرے، یا مہر کے متعلق سکوت اختیار کرے تو اسے مہر مثل دینا واجب ہے، لیکن صرف عقد سے نہیں، بلکہ دخول سے (یا کسی ایک کی موت سے) اور عقد کے وقت کا مہر مثل معتبر ہوگا، نہ کہ دخول کے وقت کا (اگر ولی مہر مثل پر ہی نکاح کرے تو وہی واجب ہے)

عورت شوہر سے یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ وہ دخول سے پہلے مہر متعین کرے، اور مہر مثل متعین کرنے سے پہلے اپنے نفس کو اس سے روک سکتی ہے (شوہر مہر متعین کرنے سے انکار کرے یا مقدار میں دونوں کا اختلاف ہو، تو قاضی مہر مثل مقرر کرے۔فتح الوهاب)

(۶) اگر عقد میں مہر کے ایک حصّہ کی بیوی کے علاوہ کسی کے حق میں شرط لگائی گئی، مثلاً اس کا باپ، یا بھائی، تو نکاح صحیح ہے، لیکن مہر فاسد ہے اور اسے مہر مثل دینا واجب ہے۔

(۷) نکاح فاسد کی وطی سے وطی بالشبہ سے مہر واجب ہوگا۔اسی طرح زنا بالجبر سے بھی واجب ہوگا، حربیہ سے وطی کی وجہ سے مہر واجب نہیں۔نیز جو عورت رضامندی سے زنا کرے گرچہ کسی انکار کے بغیر صرف سکوت اختیار کرلے تو مہر واجب نہیں ہے (قلائد)

سری وعلانیہ مہر: آپس میں جانبین سراً کچھ مہر مقرر کریں، پھر علانیہ اس سے زائد ذکر کریں، تو عقد میں جس مقدار کا ذکر ہو، وہ معتبر ہوگا، لہٰذا سراً باقاعدہ عقد نکاح ہو، جس میں ایک ہزار مہر معین ہو، پھر علانیہ دو ہزار پر دوبارہ عقد ہو (تا کہ مہر کی قلت سے شرمندگی نہ ہو) تو ایک ہزار لازم ہے، دونوں کے عقد کے گواہ متحد ہوں یا مختلف (کیونکہ اصل عقد پہلا ہے)۔اگر سراً ایک ہزار مہر پر اتفاق کریں، (لیکن عقد نہ ہو) پھر علانیہ عقد میں دو ہزار طے ہو، تو دو ہزار لازم ہیں۔(فتح الوهاب مع الجمل ۲۴۶/۴)

مہر میں معین چیز دینا: کوئی متعین شئ (مثلاً ایک معین بکری یا کار) مہر مقرر کرے، تو بیوی کے قبضہ سے قبل یہ شوہر کے ضمان میں داخل ہے، یعنی بطور ضمان عقد، (لہٰذا تلف کی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا) گرچہ بیوی مطالبہ کرے اور وہ نہ دے، جیسا کہ مبیع فروخت کنندہ کے قبضہ میں بطور ضمان عقد ہوتا ہے، لہٰذا قبضہ سے قبل بیوی اس میں کوئی تصرّف (مثلاً فروخت کرنا، ہبہ کرنا، کرایہ پر دینا وغیرہ) نہیں کرسکتی، اگر اس کے ہاتھوں خود بخود تلف ہوجائے، یا وہ خود تلف کردے، تو مہر مثل واجب ہوگا، اور اگر رشیدہ بیوی خود تلف کردے، تو گویا اپنے حق پر قبضہ کرلیا (اب مزید کوئی مہر نہ ملے گا)۔اگر کسی تیسرے آدمی (اجنبی) نے تلف کیا، یا بیوی کے دخل کے بغیر عیب دار ہوا، تو بیوی کو اختیار ہے کہ یا تو مہر فسخ کر کے شوہر سے مہر مثل لے، اور شوہر اجنبی سے وصول کرے گا، اگر فسخ نہ کرے تو اجنبی سے تاوان لے، (مکمل تلف کیا ہے تو مکمل بدل لے، عیب دار کیا ہے تو اس کا تاوان لے۔اجنبی کے علاوہ عیب کی شکل میں اسے عیب کے بدلہ میں کچھ نہ ملے گا)

اگر مہر میں دو چیزیں متعین ہوں، پھر قبضہ سے پہلے ایک تلف ہوجائے، تو اس چیز کا مہر ہونا فسخ ہوگا، نہ کہ باقی میں، اب بیوی مکمل فسخ کرے تو مہر مثل ملے گا، ورنہ باقی چیز اور تلف شدہ کی نسبت سے مہر مثل ملے گا۔(اگر بیوی یا اجنبی کے ذریعے تلف ہو تو وہی سابقہ تفصیل ہوگی)

شوہر بیوی کے سپرد کرنے سے قبل متعینہ مہر کے منافع سے استفادہ کرلے، مثلاً سوار ہونا، تب بھی ان منافع کا ضامن نہ ہوگا (یعنی اس استعمال کے عوض بیوی کو کرایہ دینے کی ضرورت نہیں) گرچہ بیوی سپردگی کا مطالبہ کرچکی ہو، البتہ زوائد (مثلاً دودھ، اون وغیرہ) شوہر کے ہاتھ میں امانت ہیں، یہاں تک کہ بیوی کے مطالبہ پر سپرد نہ کرے، اور کچھ عذر بھی نہ ہو، تو پھر ان کا ضامن ہوگا (جمل ۲۳۹/۴)

بیوی کی سپردگی: اگر لڑکی یا ولی (شوہر کے مطالبہ پر) لڑکی کی سپردگی کے لئے کچھ مدت ومہلت طلب کریں، تا کہ وہ نظافت وطہارت حاصل کرسکے، مثلاً میل کچیل کا ازالہ، موئے زیر ناف وبغل کی صفائی تو تین دن تک کی مہلت دینا واجب ہے، اس سے زائد کی ضرورت نہیں۔(یعنی قاضی ایک یا دو یا تین دن جو بھی مناسب سمجھے فیصلہ کرے، اس سے زائد مدت کا فیصلہ نہ دے) حیض ونفاس

کے ختم ہونے کے لئے مہلت کی ضرورت نہیں گرچہ مدت کم ہو، بلکہ اسی حال میں سپرد کرے، کیونکہ فی الجملہ انتفاع ممکن ہے، امام غزالیؒ نے فرمایا: اگر اس کی عادت معلوم ہو کہ حیض میں بھی صحبت کرے گا، تو بیوی اس کے ساتھ لیٹنے سے باز آ سکتی ہے، جو لڑکی کمسن ہو، اور ابھی صحبت کو برداشت نہیں کر سکتی، یا مریضہ یا دبلی ہو کہ صحبت سے نقصان ہوگا، تو ان کو عوارض کے ختم ہونے تک سپرد کرنا مکروہ ہے، اگر شوہر وعدہ کرے کہ میں فی الحال صحبت نہیں کروں گا، اور معتبر شخص ہو، تب بھی سپرد نہ کرے، پتہ نہیں شہوت کے ہیجان میں کیا کر بیٹھے۔ امام بغوی اور ابن المقری کا خیال ہے کہ شوہر معتبر ہو تو مریضہ کو سپرد کرے نہ کہ کمسن لڑکی کو۔

جو عورت جنون، مرض، دبلا پن، کمسنی وغیرہ کی وجہ سے وطی (صحبت) کو برداشت نہ کر سکے، اس سے وطی کرنا حرام ہے۔ بلکہ برداشت کی طاقت تک مہلت دینا واجب ہے۔ اگر کمسن لڑکی جو ابھی صحبت کے قابل نہ ہو شوہر کے سپرد کی جائے، تو اسے قبول کرنا ضروری نہیں۔ اگر قبول کرے تو ہر نفقہ کی طرح سپرد کرنا ضروری نہیں، اگر مریضہ یا دبلی بیوی کو سپرد کرے تو شوہر انکار نہیں کر سکتا جیسا کہ بیوی کی بیماری میں اسے اپنے گھر سے نہیں نکال سکتا، (بلکہ) اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہے۔ (مغنی المحتاج ۳/۲۲۴، جمل ۳/۲۴۱، نہایۃ ۶/۳۴۱)

سپردگی کی جگہ: جس بستی میں عقد نکاح ہوا اور شوہر موجود ہو، اس بستی میں شوہر جس مکان میں کہے، بیوی کو سپرد کرنا ضروری ہے۔ گرچہ بوقت عقد بیوی کسی اور جگہ ہو، اگر وکیل کے ذریعے عقد ہوا اور شوہر کسی دوسری جگہ ہو تو شوہر کی بستی کا اعتبار ہوگا (لہٰذا بیوی مدراس میں ہو اور شوہر بمبئی میں اس سے نکاح کرے، تو اسے بمبئی لے جا کر شوہر کے سپرد کیا جائے گا، سفر کا خرچ اور ان ایام کا نفقہ بیوی پر ہی ہوگا، اگر شوہر دہلی میں سپردگی کا مطالبہ کرے، تو بمبئی سے دہلی تک مصارف اور نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا) (جمل ۴/۲۴۰، مغنی ۳/۲۲۴، تحفہ ۹/۳۷۳، نہایہ ۶/۳۴۰)

بیوی کے گھر رہنا: کسی عورت کو اسی کے گھر شوہر کے سپرد کریں، اور شوہر بیوی کی اجازت سے اسکے گھر میں داخل ہو، تو قیام کی مدت کا کرایہ اس پر لازم نہیں، اگر بیوی سفیہ ہو (رشیدہ نہ ہو) یا بالغہ ہو اور چپ رہے، اور اس کے گھر والوں کی اجازت سے داخل ہو، اور وہ چپ ہو، تو قیام کی مدت کا کرایہ شوہر پر لازم ہے، اگر گھر بیوی کے گھر والوں کا ہو، اور وہ داخل ہونے کی اجازت دیں، اور کرایہ کا کچھ ذکر نہ کریں، تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ کرایہ واجب ہوگا۔

بیوی کے برتنوں کا استعمال: اگر شوہر بیوی کے برتن استعمال کرے، اور وہ عادت کے مطابق چپ ہو، تو اس پر کرایہ لازم ہوگا۔ (جمل مع فتح الوہاب ۴/۲۴۰۔ الفقہ المنہجی ۴/۷۵)

عقد نکاح میں شرائط کی قسمیں

(۱) شرط نکاح کے تقاضے کے مطابق ہو، مثلاً بیوی کے نفقہ یا باری کی شرط لگانا ہو تو یہ شرط فضول ہے (کیونکہ اس کے بغیر بھی یہ حق حاصل ہے)، اور عقد و مہر کی تعیین صحیح ہے۔

(۲) شرط نکاح کے مقتضی کے مخالف ہو، لیکن نکاح کے اصل مقصد یعنی صحبت میں خلل انداز نہ ہو، مثلاً یہ شرط کہ شوہر سوکن نہیں لائے گا، یا بیوی کا نفقہ نہ دے گا، تو نکاح صحیح ہوگا، اور شرط فاسد ہے، خواہ شوہر کے حق میں ہو، یا بیوی کے حق میں، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ''ہر وہ شرط جو قرآن مجید میں نہیں، وہ باطل ہے۔'' (بخاری) (بیوی کو باری نہ دینا، یا سوکن کے ساتھ رہنا، یا اسے سفر میں نہ لے

جائے وغیرہ شرط کا بھی یہی حکم ہے۔قلائد ۲/ ۱۳۶) شرط کے فساد کی وجہ سے مہر بھی فاسد ہوگا۔(اور مہر مثل واجب ہوگا)

(۳) شرط نکاح کے اصل مقصود یعنی جماع میں خلل انداز ہو، مثلاً بیوی کی طرف سے یہ شرط کہ اس سے جماع نہیں کرے گا یا صرف دن میں جماع کرے گا، یا صرف ایک مرتبہ جماع کرے گا یا نکاح کے بعد طلاق دے دے گا، تو یہ نکاح ہی باطل ہے۔اگر شوہر کی طرف سے جماع نہ کرنے کی شرط ہو تو حرج نہیں،(مغنی ۳/ ۱۸۳)(اصل نکاح میں خیار شرط سے بھی نکاح باطل ہوگا۔قلائد)

کسی دوسرے کا مہر دینا : اگر بچے کی طرف سے باپ دادا مہر ادا کریں، پھر دخول سے قبل مفارقت ہو جائے، تو مہر بچے کی طرف لوٹے گی، لیکن اگر باپ دادا کے علاوہ کوئی ادا کرے، یا باپ دادا بالغ بیٹے کی طرف سے ادا کریں، تو ادا کرنے والے کی طرف لوٹے گی(قلائد ۲/ ۱۴۳)

مُتعَہ : متعہ دراصل متاع سے مشتق ہے، یعنی وہ چیز جس سے انتفاع واستفادہ ہو سکے۔اس باب میں متعہ کا مطلب وہ مال ہے، جو شوہر پر بیوی کے حق میں واجب ہوتا ہے، جبکہ طلاق وغیرہ کے ذریعے وہ جدا کی گئی ہو۔

متعہ کب واجب ھے : (۱) دخول اور صحبت کے بعد طلاق ہو (۲) صحبت سے قبل طلاق ہو اور عقد نکاح میں مہر مقرر نہ ہو (۳) بیوی کی شوہر سے جدائی کا فیصلہ ہو، اور یہ جدائی صرف شوہر کے سبب ہو، مثلاً اس کا ارتداد، (اسلام چھوڑ دینا)، لعان کرنا، اور یہ جدائی دخول کے بعد ہو، یا قبل دخول ہو بشرطیکہ عقد میں مہر مقرر نہ ہو۔

کسی عورت کا مہر عقد میں مقرر ہو جائے، پھر دخول سے قبل طلاق ہو، تو اسے متعہ نہیں ملے گا، کیونکہ اسے نصف مہر مل چکا، اور شوہر کو اس کی طرف سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔اگر بیوی کے سبب جدائی ہو، مثلاً اس کا ارتداد یا اسلام، عیب کی وجہ سے جانبین میں سے کسی کا نکاح فسخ کرنا، یا دونوں کے سبب سے ہو، مثلاً دونوں کا ارتداد یا دونوں کی یا کسی ایک کی موت ہو جائے، تو ان صورتوں میں متعہ واجب نہیں، خواہ صحبت ہو چکی ہو یا نہیں۔(فتح الوھاب)

وجوب مُتعہ کے دلائل

آیات : (۱)''لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ أَوْتَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعاً بِالْمَعْرُوْفِ حَقاً عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ(البقرہ : ۲۳۶)

ترجمہ : ''تم پر (مہر کا) کچھ مؤاخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے، اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے اور ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ (یعنی متعہ دو)۔صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگدست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے۔ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا، جو قاعدہ کے موافق خوش معاملہ لوگوں پر واجب ہے (یعنی سب مسلمانوں پر کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے)''

(۲)''وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقاً عَلَى الْمُتَّقِيْنِ (البقرۃ : ۲۴۱)

ترجمہ : ''اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، ان پر جو (شرک وکفر سے) پرہیز کرتے ہیں''۔(یعنی مسلمانوں پر)

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:''ہر مطلقہ کے لئے (واجب ہے) سوائے اس کے جس کا مہر مقرر ہو اور دخول نہ ہوا ہو، اسے نصف

مہر کافی ہے'' (مؤطا، بیہقی) یہی امام قاسم بن محمد اور امام زہری سے بھی مروی ہے (معرفة السنن مع التعلیق ۵/۴۰۱)

متعہ کی مقدار: میاں بیوی قلیل یا کثیر جس مقدار پر بھی متفق ہوجائیں، وہ متعہ صحیح ہوگا۔ اگر مقدار میں دونوں کا اختلاف ہو، تو قاضی شوہر کی مالداری و تنگدستی اور بیوی کے نسب وصفات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب مقدار متعین کرے گا۔ جیسا کہ ابھی آیت میں گذرا۔

مستحب یہ ہے کہ متعہ کی مقدار ۳۰ درہم یا اس کی قیمت سے کم نہ ہو، اور عورت کے مہر مثل کے نصف تک نہ پہنچے۔ (۳۰ درہم کی مقدار حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے۔ بیہقی)

حکمت ازدواجی رشتہ کے خاتمہ کے وقت بیوی کی دل دہی وتطییب خاطر، اس سے لاحق وحشت کی کمی، اور غم والم اور کراہت کی شدت کو کم کرنا، متعہ کے مشروعیت کی حکمت ہے۔

طلاق رجعی میں متعہ: طلاق رجعی کی عدت میں شوہر کی موت ہوجائے، تو متعہ نہ ملے گا، کیونکہ (اس صورت میں بیوی وارث بنے گی اور) میراث اور متعہ جمع نہیں ہوسکتے۔

عدت میں ہی رجوع کرلے، تو ابن حجر کے نزدیک متعہ واجب نہ ہوگا، لہٰذا عدت ختم ہونے پر متعہ واجب ہوگا، اسی طرح عدت میں دوسری تیسری طلاق دینے سے مزید متعہ واجب نہ ہوگا، لیکن رملی کے نزدیک محض طلاق رجعی سے بھی متعہ واجب ہوگا، نیز عدت میں بار بار طلاق دے، تو اتنے متعہ بھی واجب ہیں، امام نوویؒ نے فرمایا کہ متعہ کے مسئلہ سے عورتیں عموماً ناواقف ہوتی ہیں، لہٰذا اس مسئلہ کی وضاحت واشاعت ہونی چاہئے، تاکہ انھیں یہ معلوم ہوجائے۔ (الفقه النهجی ۴/۸۵، تحفه ۹/۴۳۳، نهایه ۶/۳۶۴، فتح الوهاب مع الجمل ۴/۲۶۵، بغیه ۲۱۴)

مہر میں مبالغہ

کئی افراد مہر کو عورت کی قیمت تصور کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ مہر کی زیادتی عورت کیلئے قدر ومنزلت اور بڑائی ورفعت کا سبب ہے، اسی لئے بڑی سے بڑی مہر مقرر کی جاتی ہے۔ ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ مہر کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو شوہر کے نکاح کی رغبت کی سچائی کی ایک نشانی ہے، اور عورت کی تکریم اور ایک نئی خانگی زندگی کی ابتداء کے لئے اس کے حق میں ایک عطیہ اور تحفہ ہے۔ مہر کے سلسلہ میں فضول مبالغہ کی وجہ سے کئی مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اس میں سرفہرست آپ ﷺ کے طریقے کی مخالفت ہے۔ اس کی وجہ سے کئی نوجوان بالخصوص غریب افراد نکاح کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، پھر نتیجے میں شیطان کی پیروی میں مختلف فواحشات کا شکار ہوتے ہیں، نیکی کی فضا اور عزت وآبرو داؤ پر لگ جاتی ہے۔ نسب میں اختلاط اور مختلف امراض کی کثرت ہوتی ہے۔ اگر مناسب بیوی ہوتی تو ان کی عفت واخلاق کی حفاظت ہوئی ہوتی۔

اسی طرح عورت کے والد وغیرہ کی جانب سے کثیر مہر کے مطالبہ کی وجہ سے کئی لڑکیاں ایسے ہی ترس ترس کی زندگی گذار دیتی ہیں، کیونکہ اتنی بڑی مہر پر کوئی نوجوان آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرپاتا، اور اگر اس عورت نے اپنی حیا کو بھی خیرباد کردیا تو تباہی کی کوئی انتہا نہیں۔

آپ ﷺ نے کم خرچ والے نکاح کو زیادہ بابرکت قرار دیا ہے (احمد، ابوداود وحاکم وصححه) لہٰذا مہر تجارت اور آپسی مفاخرہ کا سامان بن جائے تو اس میں کوئی خیر وبرکت نہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک کھجور کی گٹھلی برابر سونے کے مہر پر نکاح کیا، اور آپ ﷺ نے اس نکاح میں خیر و برکت کی دعا فرمائی (مقفق علیه) اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی روایت گذر چکی۔

خلاصہ یہ کہ مہر میں غلو شرعاً ناپسندیدہ و مکروہ ہے، اور سہولت و آسانی مندوب اور جانبین اور پورے معاشرہ کے حق میں خیر و برکت کا باعث ہے۔ (الفقه المنهجی ۸۶/۴)

عقد نکاح کی سنتیں

(۱) عقد سے قبل خطبہ جس کی تفصیل گذر چکی۔

(۲) میاں بیوی کے حق میں دعا: نکاح کے وقت میاں بیوی کو دعا دینا سنت ہے، آپ ﷺ نکاح کے تعلق سے اس طرح دعا دیتے: بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَ بَارَكَ عَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي الْخَيْرِ (ترمذی وصححه، ابوداود، ابن ماجه) (اللہ آپ کو برکت دے، اور آپ پر برکت نازل کرے، اور دونوں کو خیر میں ملائے) اسی طرح صحیحین میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حق میں بھی آپ ﷺ سے برکت کی دعا منقول ہے۔

الرِفَاءُ وَالْبَنِيْنَ (آپسی ملاپ اور بیٹے کی دعا) کے ذریعہ دعا دینا مکروہ ہے۔ (نهاية)

(۳) عقد نکاح کا اعلان اور دف بجاکر خوشی کا اظہار: عقد نکاح کا اعلان اور لوگوں کے مجمع میں اسے انجام دینا مستحب ہے، سراً نکاح کرنا مکروہ ہے۔

اسی طرح خوشی کا اظہار، دف بجانا اور ایسے گیت جو اچھے مفہوم پر مشتمل ہوں، مستحب ہے، ابن ماجہ کی روایت میں نکاح کے اعلان اور دف بجانے کا حکم موجود ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "اس نکاح کا اعلان کیا کرو، اور اسے مساجد میں انجام دو، اور اس موقع پر دف بجاؤ" اعلان کا حکم مسند احمد میں بھی ہے، جس کی ابن حبان و حاکم نے تصحیح فرمائی ہے۔

شریف اور مناسب لہو بھی مشروع ہے، ایک انصاری کے دولہن کی بدائی کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا: "عائشہ تمہارے ساتھ لہو نہیں تھا؟ کیونکہ انصار کو لہو پسند ہے"۔ نسائی کی حدیث میں ہے۔ "شادی کے موقع سے ہم لوگوں کو لہو کی رخصت دی گئی" (صححه الحاكم)

فسق و فجور، اور فحاشی پر مشتمل گانے، جو جذبات کو بھڑکانے اور لوگوں کو برباد کرنے کا باعث ہوتے ہیں، بلاشبہ شادی بیاہ اور دیگر تمام مواقع میں حرام ہیں قوی احادیث میں دف کی اجازت عورتوں کے لئے ہے، لہٰذا مردوں کو اس کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ مردوں کو عورتوں کی مشابہت ممنوع ہے۔ (فتح الباری ۲۲۶/۹)

(۴) دخول کے وقت کی دعا: نکاح کے بعد جب پہلی مرتبہ بیوی سے ملاقات ہو، تو شوہر اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَاجَبَلْتَهَا عَلَيْه" (ابو داؤد نسائی ابن ماجه۔ نیل الاوطار ۲۱۳/۶) (یا اللہ! میں اس کے خیر اور جو خیر تو نے اس کی فطرت میں رکھ دی ہے، اسکا سوال کرتا ہوں، اور اس کے شر اور جو شر اس کی فطرت میں رکھ دی ہے، اس سے پناہ چاہتا ہوں) ایک روایت میں برکت کی دعا کا حکم ہے، لہٰذا یوں دعا کرے

۔ ''بَارَكَ اللّٰهُ لِكُلِّ مِنَّا فِي صَاحِبِهِ (اللہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے ساتھی میں برکت عطا فرمائے)(تحفہ ۹/ ۲۶۱) (الفقہ المنہجی ۴/ ۹۴)

جماع (صحبت) کے آداب

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''اگر تم میں سے کوئی جماع کے (ارادہ کے) وقت یہ کہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَارَزَقْتَنَا ''پھر اس میں بچہ مقدر ہو، تو شیطان اسے کبھی ضرر نہ پہنچائے گا''۔ (احمد، بخاری، مسلم)

ضرر سے جسمانی و دینی دونوں ضرر مراد ہو سکتے ہیں۔ داودیؒ فرماتے ہیں کہ دین سے گمراہ کر کے کفر کی طرف نہیں لے جائے گا۔ یا یہ منشا ہے کہ شیطان باپ کے ساتھ جماع میں شریک نہ ہوگا، کیونکہ امام مجاہدؒ سے مروی ہے کہ جو جماع کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے، شیطان اس کی شرم گاہ سے لپٹ کر ساتھ جماع کرتا ہے۔ (فتح الباری ۹/ ۲۲۹)

سنت یہ ہے کہ جب جماع کا ارادہ ہو تو دونوں اپنے اوپر ایک کپڑا اوڑھ لیں، اور جماع سے قبل دونوں پاکی وصفائی حاصل کر لیں، اور خوشبو استعمال کریں، نیز بوس وکنار وغیرہ ایسے امور جن سے نشاط پیدا ہو، انجام دیں، بخاری وغیرہ کی روایات میں آپ ﷺ نے سفر سے واپسی پر بیوی کے صفائی تک رات گھر پہنچنے سے منع فرمایا، حضرت ابن عباسؓ۔ آیت ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ ''(اور (مردوں پر) عورتوں کے بھی حقوق ہیں، جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''مجھے بیوی کی خاطر مزین ہونا محبوب ہے، جیسا کہ اس کا میرے لئے مزین ہونا پسندیدہ ہے''۔

ابن ماجہ کی ایک ضعیف روایت میں جماع کے وقت گدھے کی طرح برہنہ ہونے کی ممانعت، مروی ہے۔ جماع کے ارادہ کے وقت دونوں (اور بعضوں کے نزدیک صرف شوہر) اوپر کی دعا بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الخ پڑھیں گرچہ بظاہر اولاد کی کوئی توقع نہ ہو، انزال کے وقت مذکورہ دعا کو سچائی کے ساتھ دل میں متحضر رکھنے کی کوشش کرے، کیونکہ اولاد کی صلاح وغیرہ میں اس کا واضح اثر ہے، قبلہ کی طرف رخ کر کے صحبت کرنا مکروہ نہیں ہے، خواہ صحرا (کھلی جگہ) میں ہو، (لیکن امام غزالی نے احیاء العلوم۔ آداب الجماع میں فرمایا ہے کہ جماع کے وقت قبلہ کی تکریم کے طور پر قبلہ کے رخ سے مڑ جائے اور استقبال نہ کرے)

جماع کے وقت گفتگو مکروہ ہے، جماع کے تعلق سے کچھ کہنے کی ضرورت ہو، تو حرج نہیں، مثلاً بیوی سے کسی خاص صفت کو اختیار کرنے کے لئے کہنا، جماع کی کوئی کیفیت مکروہ نہیں، خواہ بیوی پہلو پر لیٹی ہو، یا چت لیٹی ہو، یا کھڑی ہو، آگے کی طرف سے کرے یا پیچھے کی جانب سے وغیرہ، لیکن پچھلی شرم گاہ (دُبر) میں صحبت کرنا سخت حرام ہے، عادل طبیب (ڈاکٹر) صحبت کا جو طریقہ نقصان دہ بتلائے، اس سے پرہیز کرے، صحبت کی تفاصیل مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ایسا شخص بروز قیامت اللہ کے نزدیک بدترین درجہ میں ہوگا، بغیر فائدہ کے صرف جماع کا ذکر مکروہ ہے، کیونکہ یہ خلافِ مروت ہے۔ اگر کسی حاجت یا فائدے کے لئے کرے، تو مکروہ نہیں، جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ جماع کے وقت کسی دوسری عورت کے تصور کا حکم گذر چکا کہ کئی محققین نے جائز قرار دیا ہے، احیاء العلوم وغیرہ میں چاند کی پہلی، درمیانی اور آخری تاریخ میں صحبت کرنا مکروہ قرار دیا ہے، صاحب قوت نے بعض صحابہ سے اس کی کراہت کو نقل کیا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ ان راتوں میں شیطان حاضر ہوتا ہے اور جماع کرتا ہے، لیکن علامہ ابن حجرؒ اور رملیؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی ممانعت

ثابت نہیں، اگر بالفرض شیطان کا جماع کرنا ثابت ہوتو حدیث میں وارد ذکر پڑھنا اس سے حفاظت کیلئے کافی ہے۔

اگر شوہر کا انزال پہلے ہو جائے تو بیوی کے انزال تک رکنا بہتر ہے، جو بیوی کے کہنے یا قرائن سے معلوم ہوگا۔ سحر کے وقت صحبت کرنا حدیث کی اتباع میں مندوب ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ اس وقت نہ شکم بالکل پُر ہوگا، اور نہ بالکل خالی، کیونکہ ان دونوں حالتوں میں جماع عموماً نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس طرح تکلف کے ساتھ صحبت کی افراط بھی نقصان دہ ہے۔ بعض اطباء نے انفع جماع کا یہ ضابطہ پیش کیا ہے کہ تفکر وغیرہ وسائل کے بغیر نفس میں جماع کا داعیہ ہو، تو جماع کرلے البتہ ایک صحیح حدیث میں کسی عورت پر نظر پڑے اور وہ پسند آئے تو اپنی بیوی کے پاس جا کر صحبت کرنے کا حکم موجود ہے۔ لہٰذا یہ صورت مستثنیٰ ہوگی۔

بعض حضرات نے اگر کوئی عذر نہ ہو (اور محبت وتندرستی اجازت دے) تو چار راتوں میں ایک رات جماع کرنا مسنون قرار دیا ہے۔ اگر بیوی کے جذبات کی وجہ سے اس کی عفت وپاکدامنی کیلئے مزید کی ضرورت ہوتو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ بطور انسیت بیوی سے ملاعبہ ودل لگی مسنون ہے۔ جمعہ کی نماز کو جانے سے قبل، یا جمعہ کی رات صحبت مندوب ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد جماع کرنا سنت ہے، اگر دن میں واپسی ہو اور تنہائی کا موقع ہو تو دن میں کرے، ورنہ رات میں۔

طبی قوانین کی رعایت کرتے ہوئے عفت اور نسل وغیرہ نیک مقصد سے دوائیوں کے ذریعہ قوتِ باہ کے اضافہ کی کوشش مندوب ہے، کیونکہ یہ محبوب امر کا وسیلہ ہے، لہٰذا یہ بھی محبوب ہوگا۔ کئی افراد اس میں غلطی کرتے اور اسے ترک کرتے ہیں، جس کی وجہ سے محبت کے نتیجہ میں کافی مضر نتائج سامنے آتے ہیں۔

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے وطی مکروہ ہے، جبکہ بچہ کو نقصان کا اندیشہ ہو بلکہ ضرر یقینی ہو، یا ایسا غلبہ ظن ہو جو یقین کے قریب ہو، تو جماع حرام ہے۔ اگر کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو جماع مکروہ نہیں ہے۔

شوہر کو بیوی کے بدن سے ہر طرح کا انتفاع واستمتاع (لطف اندوزی) جائز ہے، صرف دُبر (پچھلی شرمگاہ) میں صحبت حرام ہے، (اسی طرح حیض ونفاس کی حالت میں ناف سے گھٹنے کے درمیان استمتاع ممنوع ہے)، بیوی کے ہاتھ سے استمناء (یعنی اپنی منی نکالنا) جائز ہے، اپنے یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے حرام ہے، خواہ زنا کا اندیشہ ہو، بیوی کے پردہ بکارت کو اپنی انگلی وغیرہ سے زائل کرنا جائز نہیں، اگر کچھ عذر نہ ہو تو میاں بیوی کو ایک ہی بستر پر سونا سنت ہے۔ بالخصوص جبکہ بیوی اسے پسند کرے۔ شوہر کو جائز انتفاع سے روکنا بیوی کے لئے حرام ہے۔ (جبکہ کوئی معقول عذر مثلاً بیماری وغیرہ نہ ہو) جو عورت کسی کے نکاح میں نہ ہو، اس کے اوصاف بلا حاجت شوہر یا کسی دوسرے کے سامنے ذکر کرنا مکروہ ہے، اگر حاجت ہو، مثلاً نکاح کے ارادہ سے اسے دیکھنے روانہ کیا ہو، تو اس میں کوئی کراہت نہیں، جیسا کہ منگنی کے بحث میں گذر چکا۔ کسی کی منکوحہ کے اوصاف بیان کرنا، جبکہ فتنہ کا غالب گمان ہو، حرام ہے۔ (گھر میں) ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سے جماع کرنا مکروہ ہے۔

حیض کی حالت میں گھٹنے اور ناف کے درمیان کے علاوہ بدن سے انتفاع اور بیوی کے ہاتھ سے انتفاع جائز ہے۔ نیز اس کے ساتھ لیٹنے اور کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں (جیسا کہ صحاح ستہ وغیرہ کی حدیث سے ثابت ہے)

صحیحین وغیرہ کی احادیث کی رو سے جنابت کی حالت میں غسل کے بغیر سونا کھانا پینا اور دوبارہ جماع کرنا جائز ہے، البتہ ان امور کے لئے شرم گاہ کو دھونا اور وضو کرلینا مستحب ہے بالخصوص دوسری مرتبہ دوسری بیوی سے جماع کرنا ہو تو شرم گاہ کو دھونے کی زیادہ تاکید ہے، وضو کے بغیر جنابت کی حالت میں مذکورہ امور کو انجام دینا مکروہ ہے۔

صحاح ستہ کی روایت کی رو سے جب لیٹنے کے لئے بستر پر آئے تو پہلے تہبند کے کنارہ (وغیرہ) سے بستر کو جھاڑ دے، پتہ نہیں اس کے پیچھے اُس پر کون سی نقصان دہ چیز ہو۔

عزل (یعنی انزال کے وقت بیوی سے جدا ہو جانا تا کہ منی رحم میں نہ پہنچے): صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ہم آپ ﷺ کے عہد میں عزل کیا کرتے تھے، مسلم کی ایک روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے منع نہ فرمایا۔

عزل کرنا جائز ہے، خواہ بیوی کی اجازت ہو یا نہ ہو، لیکن ادب یہ ہے کہ عزل نہ کرے۔ بعض علماء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، عزل میں مندرجہ ذیل چار نیتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) بیوی کے حسن و جمال اور صحت کو باقی رکھنا، تا کہ انتفاع دائم رہے، اور اس کی زندگی کو زچگی وغیرہ سے خطرہ نہ لاحق ہو، یہ نیت ممنوع نہیں ہے۔

(۲) کثرتِ اولاد کی وجہ سے کمانے کی زیادہ فکر سے احتراز، یہ بھی منع نہیں، کیونکہ خرچ کی کمی دین کے لئے معاون ہے، لیکن بہتر وافضل اللہ پر توکل و بھروسہ کرنا ہے۔

(۳) لڑکیوں کی پیدائش کے خوف سے، تا کہ ان کی شادی کا عار لاحق نہ ہو، یہ جاہلیت کا عقیدہ اور فاسد نیت ہے۔

(۴) عورت نظافت میں غلو کرتے ہوئے اس طرح کرنا چاہئے تا کہ زچگی، نفاس اور دودھ پلانے کے مراحل سے بچ سکے، یہ بھی فاسد نیت ہے۔

فائدہ: شوہر بیوی کو ان امور پر مجبور کر سکتا ہے: غسلِ جنابت، نجاست و میل کچیل کو دھونا، موئے زیر ناف و بغل کی صفائی، ناخن تراشنا، مضر چیز جیسے زہر کے کھانے سے رکنا، بیمار کرنے والی یا تکلیف دہ چیز کے کھانے سے رکنا، جیسے لہسن، بدبودار کپڑے اتارنا، مسجد یا جماعت کی حاضری سے ممانعت۔

صرف اتنا وقت ہو کہ جماع سے فارغ ہو کر غسل کر کے نماز ادا ہو سکتی ہے، اور شوہر کو معلوم ہو کہ بیوی جماع کے بعد غسل نہیں کرے گی (اور اس طرح اس کی نماز قضا ہو گی) تب بھی شوہر اس سے جماع کر سکتا ہے۔ بیوی کے اوصاف بیان کرنا مناسب نہیں، بلکہ باعث حیا ہوں، تو حرام بھی ہو سکتا ہے۔ (شرح مسلم للنووی۔ ۱/۱۴۴، ۴۶۴، فتح الباری ۹/۳۰۸، جمل ۴/۱۳۳، تحفہ ۹/۶۷، نہایۃ ۶/۲۰۹، اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء العلوم ۵/۳۸۲، قلائد ۲/۱۲۹، ترشیح ۳۲۰، اعانۃ ۳/۳۴۱)

تنبیہ: شوہر کی پراگندگی اور میلا کچیلا ہونے کی وجہ سے بیوی شوہر کو اپنے اوپر قابو دینے سے باز آئے تو یہ ناشزہ (شوہر کی نافرمان) نہیں شمار ہو گی۔ جن چیزوں کے ازالہ پر بیوی کو مجبور کیا جا سکتا ہے، شوہر کو بھی مجبور کیا جائے گا، کیونکہ جن امور سے کسی انسان کو ایسی تکلیف پہنچے، جو عادتاً برداشت نہیں کی جاتی، شوہر پر اس کا ازالہ واجب ہے۔ (حاشیہ الجمل ۴/۱۹۷)

وَلِیمہ (دعوت)

ولیمہ وَلْم سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے اجتماع، اور شرعاً اس کا اطلاق شادی وغیرہ کسی بھی نئی خوشی کے موقع پر کھانے کی دعوت پر ہوتا ہے۔ البتہ مطلقاً شادی کی دعوت کے لئے عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دوسری دعوتوں میں قید لگائی جائے گی مثلاً ولیمۂ ختان۔

ولیمہ کے اقسام : (۱) اِملاک: عقد نکاح کی دعوت (۲) ولیمہ: نکاح کے بعد دخول کی دعوت (۳) خُرس: ولادت کی خوشی میں دعوت (۴) عقیقہ: نوزائیدہ بچہ کی وجہ سے دعوت (۵) اِعذار: ختنہ کی دعوت، یہ لڑکے کے ختنہ میں مستحب ہے، لڑکی کے ختنہ میں عورتوں کو دعوت دینے میں حرج نہیں۔ (۶) حِذاق: تکمیل حفظِ قرآن یا کسی اور کتاب کی تکمیل کی خوشی میں دعوت (۷) وَکِیرَہ: نئے مکان (میں داخلے) کی دعوت۔ (۸) نَقِیعَہ: طویل سفر سے واپسی پر دعوت خواہ یہ دعوت مسافر کرے یا دوسرا اس کی آمد پر۔ (۹) وَضِیمَہ: مصیبت کی وجہ سے دعوت (جو پڑوسیوں کی طرف سے ہوگی) (۱۰) مَأدُبَہ: بلا کسی سبب کے دعوت۔

وَلیمَہ عُرس (شادی کا ولیمہ)

نکاح کی مناسبت سے رشید شوہر کو اور غیر رشید شوہر کے باپ دادا کو اپنے مال سے ولیمہ کی دعوت کرنا سنت ہے۔ ایک **قول** میں اسے واجب شمار کیا ہے۔

احادیث : (۱) ''آپ ﷺ نے حضرت زینبؓ سے زائد کسی اور زوجہ مطہرہ کے موقع پر ولیمہ نہیں کیا'' (متفق علیہ، ابوداود، ابن ماجہ، بیہقی، احمد)

(۲) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے نکاح کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ولیمہ کرو، گرچہ ایک بکری ہو'' (متفق علیہ) (ارواء الغلیل ۷/۳، تلخیص ۳/۱۶۴) باپ دادا وغیرہ کو بچے کے مال سے ختنہ، ختم قرآن اور شادی کی دعوت کرنا جائز نہیں ہے۔

کسی بھی کھانے پینے کی چیز سے ولیمہ ادا ہو جائے گا، لہٰذا عقد نکاح کے بعد شربت وغیرہ پلانے سے بھی اس کی سنت حاصل ہوگی۔ جو قادر ہو، یعنی ایک شب و روز کے مصارف سے زائد اتنا مال ہو کہ ایک بکری دے سکتا ہے، تو اس کے حق میں اقل کمال ایک بکری کا ولیمہ ہے، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں گذرا، دیگر حضرات جتنا ہو سکے کریں، آپ ﷺ نے بعض ازواج مطہرات کا ولیمہ دو مُدّ جَو پر کیا، اور حضرت صفیہ کا ولیمہ ستو اور کھجور پر انجام دیا (احمد، اصحاب السنن، ابن حبان) صحیحین میں انکے ولیمہ میں گھی، کھجور اور پنیر کا ذکر ہے۔

شادی کے ولیمہ کی دعوت قبول کرنا (اور پہنچنا) فرض عین ہے، دیگر دعوتوں کو قبول کرنا سنت ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے: ''تم میں سے کسی کو ولیمہ کی دعوت ہو، تو دعوت میں پہنچ جائے'' نیز صحیحین میں ہے۔ ''جو دعوت میں نہ آئے اس نے اللہ و رسول کی نافرمانی کی''۔ علماء نے کہا کہ اس سے شادی کا ولیمہ مراد ہے۔ ابوداود کی روایت میں ہے: ''کسی کو اس کا بھائی دعوت دے تو قبول کرے، شادی کی دعوت ہو یا کوئی دوسری دعوت''۔ اس روایت میں دیگر دعوت کی حاضری کا حکم استحبابی طور پر ہے، بعض علماء نے تمام دعوتوں کو قبول کرنا واجب کہا ہے۔

شوہر کی اجازت سے کوئی دوسرا شخص، مثلاً بیوی یا خسر ولیمہ کرے تو اس سے سنت حاصل ہوگی، اور قبول کرنا واجب ہوگا، اجازت نہ دے تو حاصل نہ ہوگی۔

دعوت قبول کرنے کے وجوب یا استحباب کے شرائط

(۱) دونوں مسلمان ہوں، اگر دعوت دینے والا، یا مدعو غیر مسلم ہو تو وجوب یا استحباب باقی نہ رہے گا، کیونکہ اس کے ساتھ مودت موجود نہیں، البتہ ذمی کسی مسلمان کو دعوت دے، اور اس کے اسلام کو توقع ہو یا رشتہ ہو، یا پڑوسی ہو، تو قبول کرنا سنت ہے (لیکن مسلمان کی دعوت کے مقابلہ میں کمتر درجہ میں) ورنہ مکروہ ہے۔

(۲) دعوت عام ہو، یعنی مالداروں وغیرہ کی تخصیص نہ ہو، بلکہ گنجائش کی صورت میں تمام اہلِ خاندان، یا تمام پڑوسی، یا اسکے تمام

اہلِ حرفت کو دعوت دے، گرچہ وہ تمام اغنیاء ہوں، بہر حال اصل شرط یہ ہے کہ تخصیص کا قصد ظاہر نہ ہو،

حدیث : بدترین کھانا، ولیمہ کا کھانا ہے، جس میں اغنیاء کو دعوت دی جائے، اور غریبوں کو چھوڑ دیا جائے" (متفق علیه)

(۳) داعی خود، یا اپنے نائب یا خط کے ذریعے بالخصوص اسے دعوت دے، اگر عام اعلان کردے کہ جو چاہے حاضر ہو جائے، تو قبول کرنا ضروری نہیں، اگر کسی معین شخص سے کہے کہ آپ چاہیں تو حاضر ہو جائیں، تو حاضری ضروری نہیں، البتہ بظاہر اس کے ادب واحترام کے طور پر اس کی حاضری کی رغبت وخواہش کے ساتھ درخواست ہو، تو لازم ہے۔

(۴) شادی کے ولیمہ میں پہلے دن دعوت دے، تین یا زائد ایام تک دعوت کرے تو صرف پہلے دن دعوت قبول کرنا واجب ہے۔ لیکن جگہ کی تنگی اور لوگوں کی کثرت وغیرہ کسی عذر کی وجہ سے ایک سے زائد دن دعوت کرے، تو یہ ایک ہی دن میں الگ الگ جماعت کی یکے بعد دیگرے دعوت کی طرح ہوگا، لہٰذا جسے پہلے دن دعوت نہ ملے، دوسرے یا تیسرے دن قبول کرنا لازم ہے۔

بلا عذر ایک سے زائد دن دعوت کی صورت میں دوسرے دن کی دعوت قبول کرنا سنت ہے، شادی کا ولیمہ ہو، یا کوئی اور دعوت، لیکن عام دعوتوں کے پہلے دن کی سنت کے مقابلہ میں کم درجہ میں۔ **حدیث :** "پہلے دن کا کھانا حق ہے، دوسرے دن سنت، اور تیسرے دن شہرت کی خاطر ہے" (ترمذی) اس حدیث میں ضعف ہے، البتہ امام احمد، دارمی، بزاز، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، دار قطنی بیہقی اور طبرانی وغیرہ میں مختلف طرق سے مروی ہے، لہٰذا مجموعی طور پر قوت حاصل ہوگی (دیکھئے تلخیص ۳/۱۹۵)

(۵) کسی خوف یا اس کے مقام ومرتبہ سے کچھ غرض وابستہ ہونے کی وجہ سے دعوت نہ دے، اگر اس طرح کے کسی غرض سے دعوت دے، تو قبول کرنا لازم نہیں، بلکہ دعوت مطلوب تقرب ومحبت کے لئے، یا اس کے علم وفضل، بزرگی یا تقویٰ کی وجہ سے ہو، یا کسی خاص قصد کے بغیر ہو۔

احیاء العلوم میں فرمایا کہ دعوت قبول کرنے میں سنت کی پیروی کی نیت کرے، تاکہ ثواب ملے، نیز اپنے مسلمان بھائی کی ملاقات واکرام کی نیت رکھے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں محبت وملاقات کرنے والوں میں شامل ہو (جن کی فضیلت وارد ہے) یا یہ نیت ہو کہ کسی کو اس کے متعلق تکبر یا ایک مسلم کی تحقیر کا گمان نہ ہو۔

(۶) کوئی معقول عذر نہ ہو، ورنہ واجب (یا سنت) نہ ہوگا، بعض اعذار درج ذیل ہیں۔ (الف) کسی دوسرے کی جانب سے پہلے ہی ایسی دعوت نہ ہو، جس کا قبول کرنا لازم ہو، اگر لازم نہ ہو تو وہ کالعدم (نہ ہونے کی طرح) ہے، لزوم کی صورت میں پہلی دعوت قبول کرے، دونوں دعوت ساتھ آجائیں، تو قریبی رشتہ دار کی مقدم ہوگی، پھر جس کا گھر قریب ہو (اس میں بھی دونوں برابر ہوں تو) پھر قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا، اس ترتیب کی رعایت بظاہر واجب ہے، بعضوں نے اس کے استحباب کا بھی امکان ظاہر کیا ہے۔

(۷) دعوت میں کوئی ایسا شخص نہ ہو، جس سے اسے دشمنی وغیرہ کی وجہ سے ایذاء پہنچے، یا جو فحش گوئی اور جھوٹ کے ذریعہ لوگوں کو ہنساتا اور سامان تفریح فراہم کرتا ہو۔

(۸) دعوت کی جگہ کوئی منکر اور حرام کام نہ ہو، خواہ صغیرہ ہو، اگر مدعو اور فاعل دونوں حرمت کے قائل ہوں، تو حاضری حرام ہے، اِلّا یہ کہ ازالہ کے لئے جائے" اگر فاعل حرمت کا قائل ہو، تو جا کر اسے روکے، نہ مانے تو نکل جائے، صرف مدعو حرمت کا قائل ہو، تو جانا جائز ہے، واجب نہیں، کسی کام کے کرنے والے کے مسلک میں وہ حرام ہے، تو اسے روکا جائے گا، صرف روکنے والے کے مسلک میں حرام ہو، نہ کہ کرنے والے کے مسلک میں، تو روکا نہیں جائے گا۔ مثلاً: پرائی عورت کا مرد کو جھانکنا، یا اس کے برعکس شراب نوشی فرش حرام ہو یعنی

مغصوبہ ہو، یا مردوں کیلئے ریشم کا ہو یا چیتے کی کھال کا ہو، آلاتِ لہو اور موسیقی جو اسے سنائی دے، گرچہ دعوت کی جگہ سے ہٹ کر ہو، جبکہ داعی کے گھر ہو، نہ کہ پڑوس میں، کسی جاندار (حیوان ـ ذی روح) کی تصویر مرفوع (بلند ہو)، یعنی چھت، دیوار، پہننے کے کپڑے یا پردے یا کھڑے رکھے ہوئے تکیئے پر ہو، جبکہ تصویر ایسے اعضاء پر مشتمل ہو، جس کے بغیر اس کی زندگی ممکن نہ ہو، نہ کہ اس کے علاوہ، گرچہ اس کی نظیر نہ ہو، جیسے پردار گھوڑا، نیز جبکہ تصویر محلِ دعوت میں ہو، نہ کہ دروازہ یا گذرگاہیں، اگر تصویر کسی فرش یا بچھونے پر ہو، (جسے روندا جاتا ہو، یا ایسے تکیہ پر ہو، جس پر ٹیک لگایا جائے یا مرفوع ہو، لیکن سر کٹا ہوا ہو، یا درخت، سورج چاند (وغیرہ غیر جاندار) کی تصویر ہو، تو دعوت کے قبول کا حکم باقی رہے گا، کیونکہ روندے اور پھینکے ہوئے تصویروں کی ذلت ہورہی ہے، اور دیگر ذی روح حیوان کے مشابہ نہیں، بخلاف بلند مرفوع تصویروں کے، کیونکہ یہ بتوں کے مشابہ ہے۔

اگر حرام امر، دعوت میں حاضری کی جگہ ہو، تو قبول کرنا واجب نہیں، اور حاضر ہونا حرام ہے۔ گذرگاہ میں ہو، تو واجب ہے، کسی ایسی جگہ صرف داخل ہونا حرام نہیں (جبکہ وہ ٹھہرے اور، رکے نہیں)

اگر مدعو (کی بزرگی، علم یا رعب وغیرہ کی وجہ سے اس) کی حاضری سے منکر اور حرام امور کا ازالہ ہوتا ہو، تو پہنچنا واجب ہے، تاکہ منکر ختم ہو جائے، اگر دعوت شادی کے ولیمہ کی نہیں ہے، تو دعوت کے اعتبار سے سنت ہے لیکن منکر کے ازالہ کے اعتبار سے واجب ہے۔ اگر دعوت میں حاضری کے بعد منکر کا علم ہو، تو انھیں روکے، روکنے سے مجبور ہو، تو نکل جائے، کسی خوف وغیرہ کی وجہ سے نکلنے سے مجبور ہو، تو ناگواری کے ساتھ رک جائے، لیکن حتی الامکان منکر انجام دینے والوں کے ساتھ نہ بیٹھے۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو، وہ ہرگز ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جہاں شراب کا دور چل رہا ہو"۔ (ترمذی وقال حسن غریب وصححه الحاکم علی شرط مسلم)

(۹) مدعو (جسے دعوت ملی ہے وہ) قاضی (حاکم، جج) نہ ہو،

(۱۰) کوئی ایسا عذر نہ ہو، جس سے جماعت کے ترک کی رخصت ملتی ہے۔

(۱۱) داعی کے مال میں قوی شبہ ہو، یعنی یہ معلوم ہو کہ اس کے مال میں حرام بھی ہے، لیکن کونسا مال حرام ہے پتہ نہیں، گرچہ اس کا اکثر مال حرام نہ ہو، اس صورت میں دعوت قبول کرنا مکروہ ہے، جو چیز کھلائی جائے اس کا حرام ہونا معلوم ہو تو قبول کرنا حرام ہے۔

(۱۲) داعی سے عذر خواہی کرے، اور وہ بشاشت سے قبول کرلے، تو حاضری واجب نہیں، غصہ اور ناراضگی کے ساتھ قبول کرے تو حاضری واجب ہے۔

(۱۳) دعوت اجنبی عورت کی طرف سے نہ ہو، اگر وہاں اس کا یا اس عورت کا کوئی محرم ہو، اور شادی شدہ عورت کے شوہر کی اجازت ہو، اور اسے ولیمہ کرنا سنت ہو تو قبول کرنا واجب ہے۔ ورنہ واجب نہیں۔ گرچہ خلوت محرمہ نہ ہو، کیونکہ فتنہ وتہمت کا اندیشہ ہے۔

(۱۴) دعوت عقد نکاح کے بعد ہو، اگر عقد سے بھی پہلے ہو تو اسے ولیمہ نکاح نہ کہیں گے، لہٰذا قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

(۱۵) مدعو پر کوئی حق متعین نہ ہو، جیسے گواہی دینا، نماز جنازہ وغیرہ

(۱۶) داعی ظالم یا فاسق، یا تو زیادہ شر انگیز نہ ہو، یا فخر ومباہات کے طور پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر دعوت نہ کر رہا ہو۔

(۱۷) کسی باطل کام پر تعاون کے مقصد سے دعوت نہ دے۔

(۱۸) کسی بدعت کا داعی وہاں نہ ہو، جس پر یہ رد نہ کر سکے۔

(۱۹) ہر وہ شخص جس سے قطع تعلق جائز ہو، اس کی دعوت قبول کرنا واجب نہیں۔

مسافت وجوب: کتنی دور تک ولیمہ کی دعوت میں پہنچنا واجب ہے، اس سلسلہ میں ہر علاقہ کے عام عرف کو پیش نظر رکھا جانا بہتر ہے۔ اگر کسی جگہ مسافتِ عدْویٰ تک دعوت میں شرکت کا معمول ہو، اور عدمِ شرکت قطع تعلق سمجھا جاتا ہو، تو قادر شخص پر اس مسافت تک حاضری واجب ہوگی، (مسافتِ عدوی یعنی اتنا فاصلہ کہ سویرے نکل کر شام تک واپس پہنچ سکے) اتنی دور جانے کا عرف نہ ہو، تو واجب نہیں، بعضوں نے وجو بھی طرح یہ معیار مقرر کیا کہ جہاں تک اذان کی آواز پہنچے، ان حضرات کو شرکت واجب ہے، جہاں نہ پہنچے ان پر واجب نہیں، لیکن پہلے قول کے اعتبار سے اگر بستی کے باہر سے دعوت میں شرکت کا عام ماحول نہ ہو، تو اذان سننے کے باوجود شرکت واجب نہیں۔

روزہ اور دعوت

احادیث: (۱) ''کسی کو دعوت دی جائے، تو قبول کرلے، اب اگر روزہ سے ہو، تو دعا دے، ورنہ کھالے'' (مسلم، ابوداود، نسائی فی الکبری، الحاوی فی المشکل، بیہقی، احمد، ترمذی)

(۲) حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں: ''میں نے آپ ﷺ کے لئے کھانا تیار کیا، پھر آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ تشریف لائے، جب کھانا رکھا گیا تو ایک شخص نے کہا کہ میرا روزہ ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بھائی نے تم کو دعوت دی، اور تمہارے لئے تکلف کیا'' پھر فرمایا: ''روزہ توڑ دو اور اس کی جگہ چاہو تو ایک دن روزہ رکھو، (بیہقی، طبرانی، وحسنہ الحافظ والالبانی)

(۳) حضرت ابن عمرؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں: ''اس دعوت کو قبول کرلو، جبکہ دعوت دی جائے'' حضرت ابن عمرؓ شادی کی اور دیگر دعوتوں میں حاضر ہوتے تھے، وہ روزہ کی حالت میں بھی حاضر ہوتے تھے''۔ (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، طحاوی، بیہقی، احمد ارواء الغلیل ۵/۷)

روزہ کی وجہ سے دعوت کی قبولیت ساقط نہ ہوگی، گرچہ فرض روزہ ہو، روزہ دار کو دعوت کی صورت میں یہ کہنا کہ میرا روزہ ہے، مکروہ نہیں ہے، شاید کہ داعی اسے معذور سمجھ کر چھوڑ دے، روزہ اگر نفلی ہو، گرچہ مؤکد ہو، اور داعی کو گراں اور شاق ہو (اور وہ یہ چاہے کہ ہمارا کھانا کھائے) تو روزہ توڑنا افضل ہے، خواہ شام کے قریب ہو، اس سے نیت یہ ہو کہ داعی خوش ہو جائے اور اسے جتنا روزہ ہوا، اسکا ثواب ملے گا، اس کی قضا کرلینا مستحب ہے۔ اگر اسے شاق نہ ہو تو روزہ مکمل کرنا افضل ہے۔ کسی بھی فرض روزہ کو دعوت کی وجہ سے توڑنا جائز نہیں ہے۔

جس کا روزہ نہ ہو، اسے دعوت میں شرکت کے بعد کھانا سنت ہے،) ایک قول وجوب کا ہے، امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اسے صحیح قرار دیا ہے، لیکن معتمد پہلا قول ہے، دونوں قول پر اس کی اقل مقدار ایک لقمہ ہے۔

ایک سے زائد نکاح: ایک سے زائد بیویوں کی طرف سے ایک ہی ولیمہ کرے، تو امام اذرعی ورملی کے نزدیک یہ کافی ہے، لیکن خطیب اور ابن حجر ہر ایک کے لئے مستقل ولیمہ کے قائل ہیں۔

امام بخاری نے ازواجِ مطہرات کے ولیمہ کے اختلاف کے پیشِ نظر بیویوں کے ولیمہ میں کمی بیشی کے جواز کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ولیمہ کا وقت: ولیمہ کا وقت عقد نکاح کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ (لہٰذا نکاح کے فوراً بعد کھانا کھلانے یا شربت وغیرہ کی تقسیم سے بھی اس کی اصل سنت حاصل ہوگی) اور اس کا کوئی آخری وقت نہیں، دخول کے بعد ولیمہ انجام دینا افضل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے

ازواج مطہرات کا ولیمہ دخول کے بعد ہی انجام دیا ہے، جیسا کہ حضرت زینب کے ولیمہ میں بخاری میں صراحت ہے۔ پس عقد کے بعد سے کسی بھی وقت دعوت دے، تو قبول کرنا واجب ہے، گرچہ افضل وقت نہ ہو، طلاق، موت یا زیادہ مدت گذرنے کی وجہ سے یہ فوت نہ ہوگا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ مدت زفاف میں ہونی چاہیے، یعنی کنواری کیلئے سات دن تک اور دوسروں کے لئے تین دن تک اس کے بعد قضا شمار ہوگی۔

اگر کسی کو عقد سے پہلے ہی دعوت دی جائے، لیکن دعوت کا نظم اور کھانا عقد کے بعد ہو، تو بظاہر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ عقد سے قبل دعوت کھلانے سے ولیمہ حاصل نہ ہوگا، اور اس دعوت کا قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

عورتوں اور بچوں کی شرکت: بخاری کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے چند عورتوں اور بچوں کو شادی سے آتے دیکھا، تو (خوشی میں) جلد کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''اللّٰھم! تم لوگ میرے محبوب ترین لوگوں میں ہو''۔ اس حدیث سے امام بخاری نے عورتوں اور بچوں کی شرکت کے جواز کے لئے استدلال کیا ہے، اسی طرح بخاری شریف میں حضرت رُبَیِّعْ بنت مُعَوِّذ کے بدائی کے بعد بچیوں کا جمع ہونا حضرت عائشہؓ کی بدائی کے وقت انصاری خواتین کا اجتماع اور حضرت عائشہؓ کا ایک نکاح میں شریک ہونا وارد ہے۔ (البتہ پردہ وغیرہ کے شرعی اصول کا لحاظ ضروری ہے)

تصویر کا حکم

احادیث: (۱) ''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جس میں کتا اور تصویر ہو'' (مؤطا، متفق علیه)

(۲) ''بروزِ قیامت بارگاہِ الٰہی میں مصوروں (تصویر گروں) کو یقیناً شدید ترین عذاب ہوگا''۔ (متفق علیه)

(۳) ''بلاشبہ جو یہ تصویریں بناتے ہیں، بروز قیامت ان کو عذاب ہوگا'' ان سے کہا جائے گا: تم نے جو پیدا کیا اس میں روح پھونکو'' (اسے زندہ کرو) (متفق علیه)

(۴) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: آپ ﷺ ایک مرتبہ سفر سے تشریف لائے، اور میں نے ایک باتصویر پردہ لٹکا رکھا تھا، پس جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا تو اسے ہٹانے کا حکم دیا اور فرمایا: ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت اختیار کرتے ہیں، انھیں بُروزِ قیامت سخت ترین عذاب ہوگا'' (متفق علیه)

(۵) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مصوروں سمیت کئی گنہگاروں پر لعنت فرمائی ہے (بخاری)

امام نوویؒ نے فرمایا: علماء فرماتے ہیں کہ کسی حیوان کی تصویر بنانا سخت حرام ہے، یہ کبائر میں داخل ہے، کیونکہ اس پر مذکورہ بالا شدید ترین وعید وارد ہے، چاہے تحقیر وتذلیل کے طور پر استعمال کے لئے بنائے، یا کسی اور مقصد سے، بنانا ہر حال میں حرام ہے، خواہ کپڑے میں بنائے یا بچھونے، درہم ودینار (نوٹ وغیرہ پر) یا برتن ودیوار پر۔

غیر جاندار کی تصویر بنانا حرام نہیں، مسلم وغیرہ میں ابن عباسؓ سے اس کی اجازت منقول ہے۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ مصوروں کو اتنی سخت وعید اس لئے ہے کہ تصویریں اللہ کے علاوہ پوجی جاتی تھیں، نیز اس کو دیکھنا فتنہ کا باعث ہے، اور بعض نفوس اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اگر تصویر سایہ دار نہ ہو (یعنی کاغذ کپڑے وغیرہ پر ہو) اور اسے روندا جاتا ہو، (چلنے پھرنے کی جگہ ہو) یا استعمال کے ذریعے اس کی تحقیر وتذلیل ہوتی ہو، تو اس چیز کا استعمال جائز ہے، (گرچہ اس تصویر کا بنانا حرام ہے) اگر دیوار پر آویزاں یا پوشاک اور عمامہ وغیرہ پر ہو جس میں تحقیر کا پہلو نہ ہو، تو استعمال بھی حرام ہے۔ امام رافعیؒ نے جمہور سے نقل فرمایا کہ تصویر کا سر کاٹ دیا جائے، تو ممانعت ختم ہو جائے گی، لیکن امام متولی اس سے متفق

نہیں، نہایہ، فتح الوھاب وتحفہ وغیرہ میں بچیوں کے لئے گڑیا کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ اس سے کھیلا کرتی تھیں اس میں حکمت یہ ہے کہ اولاد کی تربیت کی مشق حاصل ہو جائے، بعض علماء نے ممانعت کی روایات کے پیش نظر اس اجازت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ سکوں پر مکمل تصویر ہو تب بھی اسے استعمال کرنے اور ساتھ رکھنے میں حرج نہیں، اسلاف اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔

تنبیہ - ویڈیو سے متعلق : دور حاضر میں تصویر ہی کی ایک ترقی یافتہ اور بسہولت دستیاب لعنت ومصیبت ویڈیو ہے جس کا نشہ باوجود کئی مفاسد کے لوگوں کے دماغ پر چھا چکا ہے، اس کے ذریعہ شادی کی عام مجلسوں کی تصویر کشی تو ایک عام سی بات بن ہی چکی ہے، مزید آگے بڑھ کر عورتوں کے کھانے پینے وغیرہ کی اداؤں کو بھی محفوظ کیا جا رہا ہے۔ بلکہ شیطان نے تو ایسا مخمور کر دیا ہے کہ حجلۂ عروسی اور فراشِ عروسی کے مناظر تک اس کیمرہ اور کیمرہ مین کو رسائی حاصل ہو رہی ہے، کیا یہی نکاح کے سنت کی ادائیگی کا طریقہ ہے، کہ حیاء کو بالکل بالائے طاق رکھ کر فحاشی اور بے پردگی کو یوں مظاہرہ کیا جائے" یہ مقدس مذہب اسلام کی عفت مآب بیٹیاں ہیں، یا نعوذ باللہ کسی قحبہ خانہ کی عصمت فروش اور بے حیا عورتیں، ذرا تو ہوش کے ناخن لیجئے، مردوں اور عورتوں کی غیرت اور حیا کہاں مر گئی؟ اللہ تعالیٰ امت کو تمام فتنوں سے بچ کر سنت کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (واللہ اعلم بالصواب)

کھانے پینے کے آداب

آیت : (۱)" يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ "
(البقرہ: ۱۷۲)

ترجمہ : "اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں، انہیں کھاؤ پیو اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے ہو"۔

آیت : (۲)" يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ..." (المؤمنون : ۵۱)

ترجمہ : "اے پیغمبرو! اور تم نفیس چیزیں کھاؤ (کہ خدا کی نعمت ہے) اور نیک کام (یعنی عبادت) کرو۔

وصول الی اللہ کے لئے علم وعمل ضروری، اور اس پر مداومت اور ہمیشگی بغیر جسمانی صحت وتندرستی کے ناممکن، اور صحت کی تحصیل (عادتاً) اناج وغذا کے بغیر مشکل ہے، اسی لئے امام احمدؒ نے فرمایا کہ کھانا دین میں داخل ہے، لہٰذا جو علم وعمل پر استعانت ومدد اور تقویٰ کے لئے قوت حاصل کرنے کی نیت سے کھائے پئے، اسے چاہئے کہ اپنے نفس کو بالکل آزاد نہ چھوڑے کہ جانوروں کی طرح چرتا رہے، شرعی آداب ومسائل کی رعایت کرتے ہوئے اس عمل کو انجام دے گا، تو اس سے بھی نورانیت اور ثواب کا مستحق ہوگا، گرچہ اس میں نفس کا نفع ہے، جیسا کہ بخاری کی حدیث میں آپ ﷺ نے بیوی کی طرف بڑھائے جانے والے لقمہ میں بھی ثواب کی خوشخبری سنائی ہے۔

کھانے کے متعلق سرفہرست یہ تاکیدی حکم پیش نظر رہے کہ کھانا اپنے طور پر بھی حلال ہو، نیز اس کی تحصیل کے اسباب بھی حلال وجائز ہوں، کمائی کا ذریعہ حرام یا مکروہ نہ ہو۔

کھانے سے قبل دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوئے، صرف دایاں ہاتھ یا انگلیاں دھونے پر اکتفا نہ کرے، حدیث میں ہے: "کھانے سے قبل اور بعد وضو کرنا (ہاتھ دھونا) برکت کا باعث ہے"۔ (ابوداود، ترمذی، احمد، حاکم) نیز مختلف اشغال کی وجہ سے ہاتھوں پر کچھ نہ کچھ میل کچیل وغیرہ ہوگا، لہٰذا دھونا نظافت کے مناسب ہے۔ کھانا شروع کرتے وقت مالک (یعنی دعوت دینے والا) پہلے اور آخر میں

سب کے بعد ہاتھ دھوئے۔

کھانا ٹیبل وغیرہ کسی اونچی جگہ رکھنے کے بجائے زمین پر بچھے دسترخوان پر رکھ کر کھائے، آپ ﷺ کا معمول زمین پر رکھنے کا تھا۔ (احمد فی کتاب الزهد مرسلاً، والبزار عن ابی هريرة) یہ کیفیت تواضع سے قریب تر ہے، بخاری شریف میں ہے کہ آپ ﷺ خوان پر نہیں کھاتے تھے (یعنی ٹیبل جیسی کسی بلند چیز پر رکھ کر نہ کھاتے، کہ یہ عجمیوں اور عیش پسندوں کا طریقہ ہے) جو ان پر کھانا بدعت ہے، گرچہ جائز ہے۔

کھانے کے لئے ابتداء سے آخر تک ایک ہی ہیئت اور نشست پر بیٹھے، آپ ﷺ کبھی دوزانو بیٹھتے (ابوداؤد)، یا دائیں قدم کو کھڑا کرے اور بائیں پر بیٹھے (ابوالحسن بن المقری فی الشمائل) لیٹ کر یا ٹیک لگا کر ایک طرف جھک کر کھانا پینا مکروہ ہے۔

کھانے سے تلذذ و تنعم کے بجائے اللہ کی عبادت کے لئے قوت حاصل کرنے کی نیت کرے، اسی لئے کم کھانے کی عادت ڈالے، کیونکہ شکم سیری عبادت سے روک دے گی، آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ کوئی آدمی پیٹ سے بدتر کوئی برتن نہیں بھرتا، ابن آدم کے لئے چند لقمے کافی ہیں، جو اس کی پشت کو سیدھی رکھے (یعنی عبادت کیلئے قوت کا باعث ہو) اگر اس سے زیادہ کھانا ہے، تو ایک تہائی حصہ کھانے کے لئے، ایک تہائی پینے کے لئے، اور ایک تہائی (اطمینان سے) سانس کے لئے۔ (ترمذی وقال حسن، نسائی، ابن ماجه وغيره) لہٰذا بغیر بھوک کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے، اور شکم سیری سے قبل ہی ہاتھ روک دے، جو اس کی پابندی کرے گا، وہ طبیب (ڈاکٹر) سے بے نیاز ہوگا۔

جو کچھ موجود ہو، اسی پر قناعت کرے اور راضی رہے، مزید کی کوشش اور تنعم کی ضرورت نہیں، روٹی مل چکی تو اس کے اکرام کا تقاضا یہ ہے کہ سالن کا منتظر نہ رہے، جو چیز بھی صحت وقوت کی حفاظت ودوام کے کام آئے، بڑی خیر ہے، اسے حقیر نہ سمجھے۔

اگر کھانا حاضر ہو اور نماز کا وقت ہو جائے تو کھانے کو مقدم کرلے (صحیحین) جبکہ وقت میں گنجائش ہو، اگر نفس کو کھانے کی طرف میلان نہ ہو، اور تاخیر میں کوئی ضرر نہ ہو، تو نماز کو مقدم کرلے۔

کھانے پر زیادہ ہاتھوں (یعنی زیادہ افراد کی شرکت) کی کوشش کرے، یہ کھانا اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے (ابویعلی، ابن حبان، بیهقی وسنده حسن) خواہ گھر کے افراد ہوں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''سب مل کر کھایا کرو، اس میں برکت حاصل ہوگی''۔ (ابوداود، ابن ماجه باسناد حسن)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب کھانا کھاؤ تو بسم اللہ کہو، اگر ابتداء میں بھول جائے تو اس طرح کہے: بسم الله فِيْ أَوَّلِهٖ وَآخِرِهٖ'' (ابوداود، ترمذی)، بسم اللہ کے استحباب پر تمام علماء متفق ہیں، بلکہ بعضوں نے اسے واجب قرار دیا ہے، (حائضہ یا جنبی وغیرہ بھی کھاتے وقت بسم اللہ پڑھے)، ایک حدیث میں ہے۔ ''بسم اللہ کہو، اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ'' (بخاری) ہر لقمہ کے ساتھ بسم اللہ کہنا اچھا ہے، اقل درجہ بسم اللہ کہنا، اور اکمل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا ہے، یہ سنت کفایہ ہے، اس کے باوجود ہر ایک کیلئے سنت ہے، اگر ابتداء میں ترک ہو، تو درمیان میں، اور درمیان میں ترک ہو، تو آخر میں پڑھ لے، کیونکہ اس کی وجہ سے شیطان نے ساتھ شامل ہو کر جو کچھ کھایا پیا ہے، سب قئے کردے گا۔

دائیں ہاتھ سے کھانا پینا اور اپنے سامنے سے کھانا سنت ہے، چونکہ احادیث میں اس کا حکم ہے، اس لئے امام شافعیؒ نے بعض جگہ اور امام بُویطیؒ نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ میوے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ بڑھا سکتے ہیں (یعنی جبکہ پلیٹ میں مختلف انواع کے میوے ہوں)

لقمہ چھوٹا لے اور اچھی طرح چبا کر نگلنے کے بعد دوسرے لقمہ کی طرف ہاتھ بڑھائے، کسی کھانے کو عیب نہ لگائے، ''آپ ﷺ کسی کھانے کی چیز کو عیب نہ لگاتے، پسند آتی تو کھالیتے، ورنہ چھوڑ دیتے'' (متفق علیہ) مجھے اس کھانے کی رغبت نہیں، یا اسے کھانے کی عادت نہیں، اس طرح کہنا مکروہ نہیں ہے۔ اپنا منہ کھانے کے قریب لے جانا مکروہ ہے۔ پیالہ کی اونچائی اور کھانے کے درمیان سے نہ کھائے، بلکہ روٹی کو گولائی کی طرف سے (کنارے سے) کھائے، اگر روٹی کم ہو تو توڑ لے، روٹی و گوشت چھری سے نہ کاٹے (یعنی کھاتے وقت)، آپ ﷺ نے دانت سے بوٹی کو جدا کر کے کھانے کا حکم دیا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ) بخاری میں آپ ﷺ کا خود یہ عمل مروی ہے، نیز بخاری میں گوشت کو چھری سے کاٹنا بھی وارد ہے، (لہٰذا بڑے ٹکڑے کو چھری سے کاٹ کر چھوٹا کرنے میں حرج نہیں۔ واللہ اعلم)

کھاتے وقت ایسا قول و فعل جس سے دوسروں کو گھن آئے مکروہ ہے، برتن و پیالہ میں ہاتھ نہ جھاڑے، منہ سے کچھ نکالے تو چہرہ کھانے سے پھیر کر بائیں ہاتھ سے نکالے۔ روٹی وغیرہ منہ سے توڑنے کے بعد شوربے وغیرہ میں نہ ڈبوئے۔ روٹی پر پیالہ وغیرہ نہ رکھے، جس سالن سے کھانا ہو، اسے رکھنے میں حرج نہیں، روٹی سے اپنا ہاتھ نہ پوچھئے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ لقمہ گر جائے تو اسے اٹھا کر لگی ہوئی گندگی دور کر لے (اور کھالے) اسے شیطان کے لئے نہ چھوڑ دے، برتن چاٹ کر صاف کر لے، حدیث کی رو سے تین انگلیوں سے کھانا سنت ہے (مسلم)

مالک اور ذمہ دار حضرات دوسروں کو ابھی کھانے کی حاجت باقی ہو، تو کھانا چھوڑ کر نہ اٹھیں، کھانے کے گرے ہوئے دانے اور ذرات اٹھا کر کھالے۔ کھانا اطمینان سے کھائے الّا یہ کہ کوئی مشغولی ہو۔

حدیث میں ہے: ''کھانے کے بعد تولیہ سے ہاتھ پونچھ کر صاف نہ کرے، جب تک کہ اسے چاٹ نہ لے، یا چٹوا نہ لے، (یعنی شاگرد یا بچوں وغیرہ کو چٹوا دے، جنھیں اس میں کوئی کراہت محسوس نہ ہو) اسے کیا پتہ کہ اس کے کھانے کے کس حصہ میں برکت ہے''۔ (مسلم، احمد، نسائی)

آپ ﷺ نے کھانے پینے کی اشیاء و برتن میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے (احمد، ابوداود، ترمذی)

کھاتے وقت تھوڑی بہت اچھی باتیں کرنا، دیگر ساتھیوں کی طرف نگاہ نہ اٹھانا، اور آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کی ترغیب دینا مسنون ہے۔ کھجور طاق عدد میں کھانا مستحب ہے، ایک ہی پلیٹ میں کھجور اور گٹھلیاں جمع نہ کرے، (بلکہ بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر پھینک دے) دیگر گٹھلی دار اشیاء کا بھی یہی حکم ہے، کھانے کے دوران پانی زیادہ نہ پئے، اطباء اسے ہاضمہ کے لئے مضر بتلاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ کھانے والا پہلے میوے کھائے، پھر گوشت، پھر شیرینی، (یعنی تینوں کھانا ہے، تو اسے ترتیب سے کھائے)

کھانے کے بعد خلال کرے اور جو ذرات دانتوں سے نکلیں انھیں پھینک دے، نگلے نہیں، زبان کے ذریعہ دانتوں سے جو ذرات نکلیں، انھیں نگل لے۔ خلال کے بعد کلی کر لے، گوشت کھانے سے قبل روٹی کے دو تین لقمے کھالے، کھانے کو سونگھے نہیں، گرم کھانا جو تکلیف دے، نہ کھائے، یہاں تک کہ ٹھنڈا ہو جائے، گرم کھانے میں پھونک نہ مارے، کھاتے وقت بلا مجبوری کے تھوکنا اور بلغم صاف کرنا مکروہ ہے، دیگر لوگوں کے ساتھ کھجور وغیرہ دو دو کھانا ان کی رضامندی کے بغیر مکروہ ہے، اگر کھجور سب کی مشترک ملکیت ہو، تو دیگر مالکوں کی اجازت کے بغیر اس طرح کھانا حرام ہے۔

مسلم شریف میں حضرات انس، ابوسعید، اور ابوھریرۃؓ سے مرفوعاً کھڑے ہو کر پینے سے ممانعت وارد ہے، صحیحین وغیرہ میں کھڑے ہو کر پینا بھی وارد ہے، لہٰذا بیٹھ کر پینا سنت شمار ہوگا، اور کھڑے ہونا کسی عذر کی وجہ سے یا بیان جواز کے لئے ہوگا، عام حالات میں کھڑے

ہوکر پینا خلافِ اولی ہے، بلاعذر کھڑے ہوکر پی لے تو اسے قئے کردینا مندوب ہے، مسلم وغیرہ میں اس کا حکم موجود ہے۔ پینے سے قبل گلاس میں نگاہ ڈالے تا کہ کوئی نقصان دہ چیز نہ ہو، گلاس میں نہ ڈکار لے اور نہ سانس لے، بلکہ اسے منہ سے جدا کر کے یہ امور انجام دے۔ کسی مشروب وغیرہ کی مجلس میں تقسیم اور دور کی صورت میں دائیں طرف سے تقسیم کریں گے، جیسا کہ صحاحِ ستہ کی روایات سے ثابت ہے۔

پانی تین سانس میں پینا سنت ہے۔(احمد، صحاح ستہ) یعنی ایک مرتبہ کچھ پی کر برتن منہ سے جدا کر کے سانس لے، پھر دوبارہ اسی طرح کرلے، ہر مرتبہ الحمد للہ کہہ کر شکر ادا کرے، کھانے پینے سے فراغت پر ماثورہ دعاؤں کا اہتمام کرلے:

(۱) آپ ﷺ جب کھاتے اور پیتے تو کہتے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَ سَقٰی وَ سَوَّغَہٗ وَ جَعَلَ لَہٗ مَخْرَجاً'' (ابوداود باسنادِ صحیح) (شکر اس خدا کا جس نے کھلایا، پلایا اور اسے خوشگوار بنایا اور اس کے نکلنے کا راستہ مہیا کیا)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو کھانے کے بعد یہ دعا پڑھے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ ھٰذَا الطَّعَامَ وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ''۔ اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوجائیں گے'' (ابوداود ، ابن ماجہ ، ترمذی وحسنہ) (شکر اس خدا کا جس نے میری قدرت اور قوت کے بغیر مجھے یہ کھانا کھلایا اور رزق عنایت فرمایا)۔

(۳) آپ ﷺ کھانے سے فارغ ہوتے تو کہتے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ'' (ابوداود ،نسائی ، ابن ماجہ ، سنن وشمائل ، ترمذی) (حمد وتعریف اس اللہ کی جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا)

(۴) آپ ﷺ کھانے کے بعد یہ دعا پڑھتے: ''اَللّٰھُمَّ اَطْعَمْتَ وَسَقَیْتَ وَاَغْنَیْتَ وَاَقْنَیْتَ وَھَدَیْتَ وَاَحْیَیْتَ فَلَکَ الْحَمْدُ عَلٰی مَا اَعْطَیْتَ'' (نسائی ،ابن السنی بسند صحیح) یا اللہ، تو نے کھلایا، پلایا، بے نیاز کیا، غنی وراضی کیا، ہدایت بخشی، اور زندہ کیا، بس تمام عطایا پر تیرا ہی شکر ہے)

(۵) دسترخوان اٹھ جانے پر آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْراً طَیِّباً مُبَارَکاً فِیْہِ غَیْرَ مَکْفِیٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا'' (بخاری ، ابوداود ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجہ ، ابن حبان) (اس دعا میں اللہ بکثرت، پاکیزہ اور مبارک حمد کی گئی ہے، جو کسی کا محتاج نہیں، اور اس سے کوئی مستغنی نہیں)

(۶) آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی کھانا کھائے تو یہ کہے: ''اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْہِ وَاَطْعِمْنَا خَیْراً مِّنْہُ'' (یا اللہ ہمیں اس میں برکت عطا فرما اور اس سے بہتر کھلا اور دودھ پیئے تو یہ کہے: ''اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْہِ وَزِدْنَا مِنْہُ'' (یا اللہ ہمیں اس میں برکت عطا فرما اور مزید عنایت فرما)(ابوداود ، ابن السنی ، ترمذی و حسنہ)

مہمان: مہمان کو خوش آمدید کہے، اور اس کا اکرام کرے، اور اس کی آمد پر اللہ کا شکر ادا کرے، مہمان اور بیوی بچے وغیرہ کھانے سے ہاتھ روک دیں، تو مالک ان کو کھانے کے لئے اصرار کرے، اگر وہ بقدر کفایت کھا چکے ہوں تو ضرورت نہیں، تین سے زائد مرتبہ اصرار کی ضرورت نہیں۔ مہمان کے آداب میں یہ داخل ہے کہ صاحبِ خانہ کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، عورتوں کے کمروں اور پردے کے بالمقابل نہ بیٹھے، اور جس جگہ سے کھانا لایا جارہا ہو، وہاں زیادہ نگاہ نہ ڈالے، اور ٹھہرانے والے مہمان کو قبلہ کا رخ اور دیگر ضروریات کی جگہ بتلادے۔ مہمان کے سامنے جو چیز پیش کی جائے، مالک کی طرف سے زبانی اجازت کے بغیر اس میں سے تناول کرسکتا ہے، عرفی قرینہ کافی ہے جن صحیح احادیث میں اجازت کا ذکر ہے، وہ استحباب پر محمول ہے، البتہ کسی دوسرے کی آمد کا انتظار ہو، لفظی اجازت یا اس کی آمد کے بغیر کھانا شروع نہ کرے۔ دعوت میں کوئی غیر مدعو ساتھ آئے تو اسے روکنے یا اجازت دینے کی یا اس سے تنگ دل ہونے کی ضرورت نہیں،

بلکہ داعی کو اس کی اطلاع دے، اگر وہ اجازت دے تو شریک ہو، ورنہ لوٹ جائے، کوئی حرج نہ ہو تو بہتر ہے کہ داعی اجازت دے، کسی کے کھانے کے دوران کوئی داخل ہو، اور وہ شرکت کی دعوت دے، تو شریک ہو جائے، حیا کی وجہ سے کہے تو شریک نہ ہو۔

بعض مخصوص اور بڑے حضرات کے سامنے کوئی خصوصی اور نفیس چیز رکھی ہو، تو دیگر حضرات کو اس میں سے کھانا جائز نہیں ہے، آپس میں کینہ کپٹ کا اندیشہ ہو تو حاضرین میں اس طرح تفاوت برتنا مکروہ ہے، سامنے رکھی ہوئی چیز تمام کھانے یا کچھ باقی رکھنے کے بارے میں عرف کا لحاظ کیا جائے گا، مالک کی رضامندی کے علم کے بغیر شکم سیری سے زائد کھانا حرام ہے، رضامندی کا علم ہو، یا اپنے حلال مال سے کھائے، تو مکروہ ہے، جبکہ نقصان دہ نہ ہو ورنہ حرام ہے، اگر مہمان بہت زیادہ کھاتا ہو، اور مالک کو اس کا علم نہ ہو، تو اسے عرف کی مقدار سے زائد کھانا جائز نہیں ہے، کھانا کم ہو، اور دیگر ساتھیوں کو محروم کر کے خود زیادہ کھا جانے کے لئے بڑے لقمے جلد جلد کھائے، تو یہ جائز نہیں ہے۔

طفیلی بننا یعنی بغیر دعوت اور بلاوے کے کسی کی دعوت میں شریک ہونا حرام ہے، اگر آپسی تعلقات وانسیت اور بے تکلفی کی وجہ سے مالک کی رضامندی کا علم ہو، تو حرج نہیں۔ میزبان جو کھانا پیش کرے، مہمان اس میں کوئی اور تصرف نہ کرے، مثلاً فروخت کرنا، سائل کو دینا، بلی وغیرہ کو کھلانا، مہمان آپس میں ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں، جبکہ ان کے انواع میں تفاوت نہ برتا گیا ہو۔

مہمان جب لقمہ منہ میں رکھ لے گا، تو اس کا مالک بن جائے گا۔ مہمان پیش کردہ کھانا، برتن اور بیٹھنے کی چٹائی وغیرہ کا ضامن نہ ہوگا۔ کھانے کے قبل یا بعد بغیر اجازت کے برتن اٹھائے تو ضامن ہوگا، اور واپس اپنی جگہ رکھنے سے بری ہوگا۔ کسی عالم یا بزرگ وغیرہ کو دعوت ہو، تو اپنے ساتھ صرف ان لوگوں کو لے جا سکتا ہے، جن سے مالک کی رضامندی کا علم ہو، بغیر رضامندی کے کسی کو لے جانا حرام ہے۔

کوئی شخص دوسرے شخص کا مال، خواہ نقدی ہو یا کھانا پینا یا کچھ اور، لے سکتا ہے، جبکہ اس کی رضامندی کا علم یا گمان ہو، گرچہ قوی قرینہ کی وجہ سے ہو، کبھی ایک کے حق میں رضامندی ہوگی، اور دوسرے کے حق میں نہ ہوگی، یا کسی وقت یا نوع یا جگہ میں ہوگی، نہ کہ دوسرے میں، تو ہر ایک کا اس کے مطابق حکم ہوگا۔ (یعنی رضامندی کی صورت میں جواز ورنہ حرمت) لی ہوئی چیز میں کھانے یا دیگر تصرف میں مالک کی طرف سے جواز کے گمان کے مطابق اجازت ہوگی۔ (یعنی جس تصرف سے مالک کی رضامندی کا گمان ہو وہ جائز اور دیگر تصرف ناجائز ہوگا) (مذکورہ مسائل میں اکثر جگہ مہمان سے کسی دوسرے کا کھانا کھانے والا مراد ہے، باقاعدہ مہمان ہو یا نہ ہو)

میزبان کے لئے دعا: (۱) ایک صحابی کے گھر کھانے پینے کے بعد ان کی درخواست پر آپ ﷺ نے انہیں یہ دعا دی: ''اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَا رَزَقْتَهُمْ وَاغْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ ''(مسلم، ترمذی، نسائی) (یا اللہ ان کے رزق میں برکت عطا فرما، اور ان کی مغفرت اور ان پر رحم فرما)

(۲) حضرت سعد بن عبادہؓ کے یہاں ایک مرتبہ آپ ﷺ نے روٹی تناول فرمائی اور یہ دعا دی: ''اَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ وَاَكَلَ طَعَامَكُمُ الْاَبْرَارُ، وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ ''(ابوداود وغیرہ بالاسناد الصحیح) (تمہارے گھر روزہ دار افطار کریں، اور تمہارا کھانا نیک لوگ کھائیں، اور فرشتے تم کو دعائیں دیں) ابن السنی کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ جب کسی قوم کے پاس روزہ افطار کرتے، تو یہ دعا پڑھتے۔ (۳)''اَللّٰھُمَّ اَطْعِمْ مَنْ اَطْعَمَنِيْ وَاسْقِ مَنْ سَقَانِيْ ''(مسلم) (یا اللہ جس نے مجھے کھلایا اسے کھلا اور جس نے پلایا اُسے پلا)

مختلف احادیث کی روشنی میں حسن سلوک اور احسان کرنے والے کو بدلہ دینا اور مکافات مسنون ہے، اگر اس کی قدرت نہ ہو تو اس کے حق میں دعا کرے، تا کہ اس کا شکر ادا ہو جائے، ایک حدیث میں کسی کے احسان کے بدلے میں ''جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْراً ''(اللہ تمہیں

جزائے خیر دے) کہنے کو بہترین بدلہ قرار دیا ہے۔ (ترمذی ، نسائی فی الیوم واللیلۃ ۔ صحیح)
مہمان کے لئے سنت ہے کہ میزبان کو دعا دے، گو وہ نہ کھائے۔

نثار (شادی وغیر کے موقع پر کسی چیز کا بکھیرنا)

امام شافعیؒ نے فرمایا: ''نکاح کے موقع پر اخروٹ، بادام اور شکر (وغیرہ) نہ بکھیرنا مجھے زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ یہ چھینا جھپٹی اور لوٹ کے ذریعے اٹھایا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر نہیں کہ یہ حرام ہو، البتہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی بعض بعض پر غالب آتے ہیں، اور ایسے لوگ لیتے ہیں کہ مالک کے نزدیک دوسرے کا لینا اس سے محبوب تر ہوتا ہے''۔

نکاح کے وقت کھجور، سکے یا دیگر اشیاء کے نچھاور کرنے اور بکھیر کر پھینک دینے کے متعلق کوئی معتبر حدیث موجود نہیں ہے، اس سلسلہ میں وارد حدیث کافی ضعیف ہے۔ حضرات ابو مسعود انصاری، عطار، عکرمہ اور ابراہیم اسے مکروہ سمجھتے تھے۔

درہم و دینار (سکے)، بادام، اخروٹ اور کھجور وغیرہ نکاح و ختنہ کے موقع پر بکھیرنا جائز ہے۔ عرف کی روشنی میں دیگر دعوتوں کا بھی بظاہر یہی حکم ہوگا، زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ مکروہ نہیں، لیکن خلافِ اولی ہے، بعض حضرات نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔

ایسی اشیاء کو زمین سے اٹھالینا خلاف اولیٰ ہے، الأم میں امام شافعیؒ کے الفاظ کراہت پر دلالت کرتے ہیں، انابہ، تتمہ، نہایہ کے کلام کا تقاضا بھی یہی ہے، نیز امام زرکشی نے بھی کراہت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ لوٹنے کے مشابہ ہے، جس سے مسلم و احمد وغیرہ کی احادیث میں ممانعت فرمائی گئی ہے، نیز اٹھانے والا دوسرے پر غلبہ پا کر ہی اٹھاتا ہے، یا تو مزید قوت کی وجہ سے یا قلتِ حیاء کے سبب، اور مالک نے صرف اس کا قصد نہیں کیا، پس اٹھانے والے کا مالک کے قصد کے اعتبار سے کتنا حصہ ہے، پتہ نہیں، مزید یہ کہ اس طرح اٹھانے میں ذلت وحقارت اور کم عقلی و بے وقوفی پائی جارہی ہے۔

اگر یہ معلوم ہو کہ مالک بعض کو بعض پر ترجیح نہیں دیتا (کوئی بھی اٹھالے، اس کی نظر میں سب یکساں ہیں) اور اٹھالینا اس کی مروت کے خلاف نہ ہو، تو اٹھانا خلاف اولی نہ ہوگا۔ (زمین پر گرنے سے قبل) ہوا ہی سے اپنی چادر وغیرہ کے ذریعہ نثار کا لینا مکروہ ہے، اگر اس طرح لے لیا، یا زمین سے اٹھالیا یا اس مقصد سے دامن پھیلا لیا اور اس میں آکر گر گیا، تو ان صورتوں میں یہ شخص اس چیز کا مالک نہ بنے گا، کیونکہ گرتے وقت اس کی جانب سے نہ ملکیت کا قصد پایا گیا، اور نہ کوئی فعل، لیکن یہ اس کا زیادہ مستحق ہوگا (اور اسے اختصاص حاصل ہوگا) لہٰذا کسی دوسرے کو اس کی رضامندی کے بغیر اٹھالینا حرام ہے، اور اٹھالے تو وہ مالک نہ بنے گا۔ اگر اٹھانے کے قصد سے پہلے وہ چیز کسی عذر سے یا بلا عذر سے گر جائے یا وہ کھڑا ہو جائے اور وہ چیز گر جائے یا وہ خود جھاڑ دے، تو اس کا اختصاص ختم ہو جائے گا، اب جو بھی اٹھالے مالک بن جائے گا۔ اگر نیچ اور کمینہ لوگوں کا ایک دوسرے کو ڈھکیل کر ضرر پہنچانے کا اندیشہ و گمان ہو، تو نثار حرام ہے (ولیمہ سے نثار تک اجمالی حوالہ، فتح الباری ۱۰/۳۸۰-۳۹۲، ارواء الغلیل ۷/۳، خلاصۃ البدر ۲/۲۰۷، معرفۃ السنن والاثار ۵/۴۰۱-۴۲۰، شرح مسلم ۱/۱۴۴-۴۶۴، تلخیص ۳/۱۹۴، فتح الباری ۹/۳۰۸، ۲۲۱-۲۴۹، الحاوی الماوردی ۹/۵۵۵-۵۶۷، جمل ۴/۲۷۰-۲۷۹، المجموع ۱۶/۳۹۲-۴۰۶، تحفۃ المحتاج مع الحواشی ۹/۴۴۷-۴۷۵، نہایہ المحتاج مع الحواشی ۶/۳۶۹-۳۷۸، اعانہ ۳/۳۵۷-۳۷۰، ترشیح المستفیدین ۳۲۳-۳۲۶، مغنی المحتاج ۳/۲۴۴-۲۵۰، بجیرمی ۳/۳۸۳-۳۹۳، اتحاف شرح الاحیاء ۵/۲۱۰-۲۲۷، قلائد ۲/۱۴۷-۱۵۳، بغیۃ المسترشدین ۲۱۴، فتاوی

ابن زیاد ۲۱۶، الاذکار مع الفتوحات الربانیه ۵/۱۷۸-۲۶۵، ۴/۳۴۲، الفقه المنهجی ۴/۹۶)

خِیَار (نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار)

فسخ کے فوائد: (۱) اس سے طلاق کی تعداد کم نہ ہوگی۔(۲) دخول سے قبل ہی فسخ ہو جائے تو مہر لازم نہ ہوگی، طلاق دے تو نصف مہر لازم ہے۔(۳) دخول کے بعد عیب کا علم ہو، اور نکاح فسخ کرے تو مقررہ مہر ساقط ہوگی، اور مہر مثل لازم ہوگی، اگر طلاق دے تو مقررہ مہر لازم ہے۔

فسخ کے بعد دوبارہ اسے بیوی بنانا ہو، تو جدید عقد ضروری ہے، خواہ عدت میں ہو، نیز مُحَلِّل کی ضرورت نہیں، نیز اسے (عدت کا) نفقہ نہ ملے گا، گو وہ حاملہ ہو، بخلاف طلاق کے۔

فسخ کے اسباب: (۱) نکاح کا عیب (۲) شرط کی عدم موجودگی (۳) شوہر غریبی کی وجہ سے نفقہ پر قادر نہ ہو (۴) بیوی آزاد ہو جائے اور شوہر غلام ہو (۵) بیوی شوہر کو آزاد سمجھے اور وہ غلام نکلے۔

جن عیوب سے فسخ کا حق حاصل ہوتا ہے۔

(۱) جنون: خاوند و بیوی میں سے کوئی ایک پاگل ہو، خواہ قابلِ علاج ہو یا لا علاج، گو عقد اور دخول کے بعد پاگل ہو جائے یا جنون کا دورہ پڑتا ہو، تو دوسرے کو فسخ کا حق ہے۔ اگر بہت ہلکا دورہ پڑتا ہو، مثلاً سال میں ایک دن، تو خیار حاصل نہ ہوگا۔ اگر بے ہوشی سے افاقہ کی امید نہ ہو تو خیار حاصل ہوگا ورنہ نہیں۔ مرگی کو بھی بعض علماء نے جنون کی نوع قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے بھی خیار ثابت ہوگا۔

(۲) جذام (کوڑھ کا مرض): کسی ایک کو جذام کی بیماری ہو، جو پختہ ہو، یعنی عضو سیاہ پڑ جائے اور کٹنا شروع ہو تو دوسرے کو خیار حاصل ہوگا (بعضوں نے صرف سیاہ پڑنا کافی سمجھا ہے، جبکہ واقف حضرات اسے پختہ بتلائیں) ابتدائی حالت میں خیار حاصل نہ ہوگا۔

(۳) بَرَص (سفید داغ): کسی ایک کو سفید داغ کی بیماری ہو، تو دوسرے کو خیار حاصل ہوگا، جبکہ مُسْتَحْکَم (مضبوط اور پختہ) ہو، یعنی ہڈی تک اثر پہنچ جائے، کہ خوب رگڑنے کے باوجود وہ جگہ سرخ نہ ہو۔

مذکورہ تینوں عیب جانبین میں مشترکہ ہیں، دونوں میں سے جس میں بھی پایا جائے، دوسرے کو خیار ثابت ہوگا۔ اگر دونوں میں یہ بیماری ہو، تب بھی خیار حاصل ہوگا، کیونکہ اپنی ایک بیماری سے گھن اور کراہت محسوس نہ بھی ہو، تو سامنے والے کی وجہ سے انسان کراہت محسوس کرتا ہے۔

مذکورہ تینوں عیب میں سے کوئی عیب بوقتِ عقد شوہر میں موجود ہو تو بیوی کے ولی کو بھی اس کی وجہ سے خیار حاصل ہوگا، گو بیوی راضی ہو، بخلاف اس کے عقد کے بعد پیدا ہو، تو ولی کو حق نہ ہوگا۔

(۴) رَتَق: بیوی کو رتق ہو، یعنی صحبت کی جگہ گوشت (بڑھنے کی وجہ) سے بند ہو جائے، اور صحبت ممکن نہ ہو، تو شوہر کو خیار حاصل ہوگا، بیوی بالغہ ہو تو اسے اس جگہ کے چیرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، اگر بیوی اپنی مرضی سے چیرے (آپریشن وغیرہ کے ذریعے) اور صحبت ممکن ہو، تو خیار حاصل نہ ہوگا، اگر بیوی کمسن ہو، اور راستہ بنانے میں خطرہ کے بغیر مصلحت ہو، تو ولی کو اس کی اجازت ہوگی۔

(۵) قَرَن: یعنی صحبت کی جگہ ہڈی (بڑھنے) کی وجہ سے بند ہو جائے تو شوہر کو خیار ہے

(۶) جَبّ : اگر شوہر مجبوب ہو، یعنی اس کا پورا ذکر (عضو تناسل) کٹا ہوا ہو، یا حَشفہ (عضو تناسل کی سپاری) کی مقدار سے بھی کم حصّہ باقی ہو، تو بیوی کو خیار حاصل ہوگا۔ گو بیوی خود کاٹ دے، یا صحبت کرنے کے بعد مجبوب ہو۔ اگر حشفہ کے بقدر باقی ہے، لیکن صحبت نہیں کرسکتا تو اسکا حکم عِنّین کی طرح ہے (جو آئندہ آرہا ہے)

(۷) عِنِّین : اگر شوہر عنین ہو، یعنی عضو مخصوص میں انتشار (استادگی) نہ ہونے کی وجہ سے بیوی سے صحبت سے عاجز ہو، اور شوہر پاگل یا نابالغ نہ ہو، تو بیوی کو فسخ کا حق حاصل ہوگا، جب کہ اس نکاح میں ابھی تک صحبت نہ کرچکا ہو، اس سے پہلے نکاح میں صحبت کرچکا ہو، تو اس کا اعتبار نہیں۔ اگر کسی دوسری عورت سے صحبت پر قادر ہو، لیکن اس بیوی کی صحبت سے عاجز ہو، تب بھی اسے خیار حاصل ہوگا۔

مذکورہ بالا عیوب کی وجہ سے خیار کے متعلق مختلف آثار وارد ہیں، ابتدائی تین (یعنی جنون، برص اور جذام) میں حضرت عمرؓ سے صحیح سند سے ثابت ہے، آخری دو کے متعلق صحابہ کرام کا اجماع ہے، نیز خرید وفروخت میں اس سے کم کی وجہ سے خیار حاصل ہوتا ہے، حالانکہ وہاں معمولی مالیت کا فرق پڑے گا، اور یہاں تو اصل مقصد وانتفاع ہے، لہٰذا قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی وجہ سے خیار حاصل ہو، نیز جذام وبرص کی بیماری (تقدیر سے اسباب کے درجہ میں) ایک دوسرے کو اور اولاد کی عموماً متعدی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا عیوب کے علاوہ کسی دوسرے عیب سے خیار حاصل نہ ہوگا، مثلاً خنثیٰ واضح ہونا، استحاضہ، رسنے والے زخم، خارش، بوقتِ صحبت پاخانہ ہونا، شوہر سے قبل انزال، برص کی بیماری کے علاوہ جسم پر سفید داغ، گندہ دہنی، بوقت صحبت پیشاب نکلنا، گندہ بغل، نابینائی، لنجاپن، بیوقوفی وغیرہ۔

اگر عیب ختم ہونے کے یا موت کے بعد عیب کا علم ہو تو خیار حاصل نہ ہوگا۔

فسخ کی صورت میں مہر : شوہر یا بیوی کے عیب کی وجہ سے صحبت سے قبل ہی نکاح فسخ ہو، تو کوئی مہر واجب نہیں، خواہ عیب عقد سے پہلے ہی موجود تھا، یا بعد میں پیدا ہوا، اس صورت میں مُتعہ بھی واجب نہ ہوگا۔

اگر صحبت کے بعد عیب پیدا ہونے کی وجہ سے نکاح فسخ ہو، تو مقررہ مہر واجب ہوگا۔ بقیہ صورتوں میں مہر مثل واجب ہوگا، یعنی صحبت کے بعد یا صحبت کے وقت فسخ کرے اور عیب عقد کے وقت ہی موجود ہو، یا عقد اور صحبت کے درمیان پیدا ہوا اور شوہر کو علم نہ ہو یا صحبت کے وقت پیدا ہو (خلاصہ یہ کہ فسخ صحبت سے پہلے اور عیب صحبت کے بعد نہ ہو، یہ کل چھ صورتیں ہوئیں)

اگر صحبت کے بعد عورت کی وجہ سے نکاح فسخ ہو، تو مقررہ مہر واجب ہوگا۔

عیب کی وجہ سے فسخ کی صورت میں ولی، وکیل یا لڑکی سے شوہر مہر کی رقم واپس نہیں لے سکتا۔ ان تمام عیوب کے سبب فسخ کی صورت میں ولی، وکیل یا لڑکی سے شوہر مہر کی رقم واپس نہیں لے سکتا۔ ان تمام عیوب کے سبب فسخ کے لئے قاضی سے رجوع ہونا شرط ہے، قاضی نہ ہو تو اپنے شرائط کے ساتھ مُحَکَّم کافی ہے، شوہر کی غریبی کی وجہ سے فسخ کی صورت میں قاضی اور محکم نہ ہو تو عورت خود فسخ کرسکتی ہے، اس مسئلہ پر قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں بھی قاضی اور محکم نہ ہونے کی صورت میں یہی حکم ہونا چاہئے۔

شوہر کا عنین (جماع سے عاجز) ہونا قاضی کے پاس اس کے اقرار سے، یا دو گواہوں کے سامنے اقرار اور ان کی گواہی سے، یا شوہر کے انکار کے بعد قسم نہ لینے پر وہ قسم بیوی پر لوٹ جائے اور بیوی قسم لے تو ثابت ہو جائے گا۔ عنین ہونا ثابت ہو، تو قاضی بیوی کے مطالبہ پر اس کیلئے ایک سال کی مہلت دے گا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کہا، (رواہ الشافعی) اور آئندہ علماء نے اسی کی اتباع کی، کیونکہ یہ عاجزی کسی عارض کی وجہ سے ہوسکتا ہے، لہٰذا مختلف موسم گذرنے پر دور بھی ہوسکتا ہے، اگر بیوی مسئلہ سے لاعلمی یا دہشت کی وجہ سے چپ رہے، تو اسے

متنبہ کرنے میں حرج نہیں، سال مکمل ہوتے ہی فوراً بیوی پھر مسئلہ قاضی کے پاس لے جائے، اب شوہر اس دوران صحبت کرنے کا دعویٰ کرے اور بیوی ثیبہ ہو اور انکار کرے، تو شوہر کو قسم دلائی جائے کہ وہ صحبت کر چکا اور اس کی تصدیق کی جائے گی، اگر بیوی باکرہ ہو، اور چار عورتیں اسکے بکارت کی گواہی دے، تو بیوی کو قسم دلائی جائے کہ اس نے صحبت نہیں کی، اور اس کی بات تسلیم کی جائے۔ اسی طرح شوہر قسم سے انکار کرے تو بیوی کو قسم دے، شوہر کے اقرار یا بیوی کے قسم کے بعد قاضی کہے کہ عنین ہونا ثابت ہوا، تو اب بیوی نکاح فسخ کر دے۔

اگر سال بھر بیوی شوہر سے جدا رہی، یا بیمار رہی تو یہ مدت شمار نہ ہوگی لہٰذا دوبارہ ایک سال کا موقع دے۔ لیکن یہی عذر شوہر میں پایا جائے تو مدت شمار ہوگی۔

خیار شرط

میاں بیوی میں سے کسی ایک میں کسی وصف کی شرط لگائی جائے، جو صحبت نکاح کے منافی نہ ہو، خواہ کمال ہو جیسے خوبصورت، کنوارا پن، آزادی یا نقص جیسے ان کی ضد، یا دونوں نہ ہو جیسے سفیدی، گندمی رنگ پھر وہ شرط موجود نہ ہو، تو نکاح صحیح ہوگا، لیکن دونوں کو خیار حاصل ہوگا، لہٰذا قاضی کے بغیر بھی فسخ کر سکتے ہیں، جبکہ جو شرط لگائی گئی، اس سے کم درجہ میں ہو، مثلاً آزادی کی شرط ہو اور غلام یا باندی نکلے، اگر شرط کے مطابق یا اس سے برتر ہو تو خیار نہ ہوگا۔

اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے میں کسی وصف کی موجودگی کا گمان کریں (شرط نہ لگائیں) لیکن وہ وصف موجود نہ ہو، تو خیار نہ ہوگا۔ مثلاً شوہر لڑکی کو مسلمان سمجھے اور وہ کتابیہ تھی، یا بیوی کفو سمجھ کر نکاح کی اجازت دے، پھر شوہر کا فاسق، یا غلام، یا کمتر نسب یا حرفت والا ہونا معلوم ہو کیونکہ تحقیق کرنا یا شرط لگانا چاہئے تھا، خلاف ورزی اس کی غلطی ہے (عیب کا مسئلہ گذر چکا کہ بعد میں علم ہوتے ہی خیار حاصل ہوگا)

شرط میں تخلف کی وجہ سے فسخ کی صورت میں وجوب مہر اور مہر کی واپسی کی وہی تفصیل ہے، جو خیار عیب میں گذر چکی۔

عقد نکاح میں شرط لگائی جائے اور تخلف ہو، تبھی فسخ کی گنجائش ملے گی، اگر عقد سے پہلے شرط لگائی جائے، اور عقد میں ایسی کسی شرط کا ذکر نہ ہو تو فسخ کی گنجائش نہ ہوگی۔

خیار عیب اور خیار شرط فوری ہے، لہٰذا عیب یا شرط کی مخالفت کا علم ہوتے ہی قاضی کے روبرو مسئلہ پیش کرنا، اور قاضی کے پاس ثابت ہونے کے بعد فوراً فسخ کرنا ضروری ہے (عنین میں سال گذرنے کے بعد فسخ کیا جائے گا) ورنہ خیار ساقط ہو جائے گا۔ البتہ اگر کوئی بچہ یا پاگل ہو تو انکے کمال تک خیار مؤخر ہوگا۔

جسے خیار حاصل ہے، وہ اس خیار کے استحقاق سے ناواقفیت کا، یا فوری ہونے سے ناواقفیت کا دعویٰ کرے، تو اسے قسم دلا کر تسلیم کریں گے، خواہ طویل مدت گذر چکی ہو، جبکہ یہ ممکن ہو، مثلاً اس مسئلہ سے واقف حضرات سے زیادہ میل جول نہ ہو۔

مسخ : جانبین میں سے کوئی مسخ ہو جائے، تو نکاح فسخ ہوگا، اگر شوہر پتھر بن جائے، تو مکمل مہر واجب ہو چکا، اگر بیوی حیوان کی صورت میں مسخ ہو، تو مہر ساقط ہوگا، یا شوہر حیوان ہو جائے تو پورا مہر بیوی کا ہے، گو دخول سے قبل ہو۔ (جمل ۲۲۴/۴، قلائد ۱۲۷/۲، مغنی ۲۰۹/۳، نہایہ ۳۱۸/۶، بجیرمی ۳۶۷/۳، تحفہ ۳۲۵/۹، الفقہ المنھجی ۱۱۱/۴۔۱۱۵)

مُعاشَرَت، قَسْم اور نُشُوز (خانگی زندگی، عدل اور نافرمانی)

قسم : بیویوں کے درمیان عدل وانصاف اور باری کی صحیح تقسیم وحفاظت۔

نُشوز: میاں بیوی کا ایکدوسرے کی نافرمانی اور ادائے حق میں کوتاہی۔

بیویوں کے ساتھ قیام وشب باشی: کسی کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، اور کسی کے ساتھ رات گذارے، تو دوسرے بیویوں کے ساتھ بھی رات گذارنا واجب ہے۔ گوانکو کچھ عذر لاحق ہو، مثلاً بیماری، حیض، نفاس، رَتَق، قَرن، احرام، جنون (جبکہ اس سے کوئی خطرہ نہ ہو) جس سے ظہار یا ایلاء کیا ہو، اور دیگر شرعی یا طبعی عذر، کیونکہ اصل مقصد انسیت ہے نہ کہ صحبت۔

اگر کوئی بیویوں کو لے کر سفر میں جائے، اور ایک بیوی مرض کی وجہ سے نہ جاسکے تو اس کی باری ساقط ہوگی۔

مرض میں جذام بھی داخل ہے، وہ بھی باری کی مستحق ہوگی، یہ بات جذامی سے دور رہنے کے حکم کے منافی نہیں، کیونکہ یہ حق خود اس نے اپنے اوپر لادلیا ہے، حالانکہ طلاق وغیرہ کے ذریعہ خلاصی حاصل کرسکتا ہے، نیز اس کے ساتھ ایک گھر میں رہنا کافی ہے، خواہ ایک گوشہ میں الگ تھلگ رات بسر کرے۔

رات بسر کرنے میں مساوات اور برابری واجب ہے، صحبت یا دیگر انتفاع میں مساوات واجب نہیں، البتہ سنت ہے۔

آیت: ''وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ'' (النساء ۱۲۹)

ترجمہ: ''اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہوسکے گا کہ سب بیویوں میں (ہر طرح سے) برابری رکھو (حتی کہ رغبت قلب میں بھی) گو (اس برابری کو) تمہارا کتنا ہی جی چاہے، تو تم (پر واجب ہے کہ) تم بالکل تو ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ، جس سے اُس کو ایسا کردو جیسے کوئی اُدھر (یعنی بیچ) میں لٹکی ہو،

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: آپ ﷺ کی سنت اور عام مسلمانوں کا عمل اس پر دلالت کرتا ہے کہ شوہر پر بیوی کے شب وروز کی باری لازم ہے، اور اس میں عدل ضروری ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ آیت میں (جس برابری کی نفی کی ہے اس سے) قلبی محبت کی کمی بیشی مراد ہے، جو اللہ نے معاف رکھی ہے۔

امام شافعیؒ نے عورتوں کے حقوق سے متعلق آیات کو پیش کرنے کے بعد فرمایا: آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کے لئے حضَر میں باری کی ترتیب کے ذریعہ مسلمانوں پر اسے شروع فرمایا، نیز آپ ﷺ باری میں عدل وانصاف کے بعد یہ دعا کرتے: '' یا اللہ! یہ میرے بس کی تقسیم ہے، اور جو بس میں نہیں اس سے آپ واقف ہیں''۔ یعنی آپ ﷺ کا دل نیز آپ ﷺ کو مرض الوصال میں سہارے سے روزانہ ایک ایک زوجہ مطہرہ کے حجرہ میں لے جایا جاتا، حتی کہ انھوں نے اپنا حق معاف کردیا۔.. آپ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ آپ کو لوگوں میں سب سے محبوب کون ہے؟ تو فرمایا:'' عائشہ (متفق علیه) (معرفة السنن والآثار ۴۲۳/۵، والام ۱۵۸/۵)

آپ ﷺ نے فرمایا:'' جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی طرف مائل ہو تو بروز قیامت مفلوج اٹھے گا، (ایک بازو گھسٹ کر چلے گا) (احمد سنن اربعه، ابن حبان، حاکم، بیهقی، صحیح علی شرط الشیخین۔ ارواء ۸۰/۷، تلخیص ۲۰۱/۳)

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے: آپ ﷺ باری میں عدل برتنے کے بعد کہتے:'' یا اللہ یہ میرے بس کی تقسیم ہے، پس جو میرے بس میں نہیں، اس پر ملامت نہ فرما'' (سنن اربعه)

امام شافعیؒ کا فرمان ہے:'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: (وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ) (البقرہ: ۲۲۸) (اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر) اور زوجین میں معروف ودستور کا جامع یہ ہے کہ مکروہ

وتکلیف کو روکے، اور بغیر اظہار کراہت کے (خوشدلی کے ساتھ) صاحبِ حق کا حق پورے طریقے سے ادا کرے (اور قاضی کے پاس پہنچنے کیلئے مجبور نہ کرے) پس دونوں میں سے جو بھی تاخیر کرکے ٹال مٹول کرے، تو غنی (قدرت والے) کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ (الحاوی ۹/۵۶۸)

نشوز کی صورت میں قسم: اگر بیوی نشوز اختیار کرے (گو اس سے گنہگار نہ ہو، مثلاً پاگل ہو) یعنی شوہر کی اطاعت سے نکل جائے، مثلاً اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا، یا دروازہ بند کردے اور اسے آنے نہ دے یا اسے استمتاع کا موقع نہ دے، تو اس صورت میں وہ قسم اور نفقہ کی مستحق نہ ہوگی، آئندہ پھر شوہر کی فرمانبرداری کرے، تو سابقہ باری کی قضا نہیں کی جائے گی، جو عورت وطی بالشبہ کی عدت میں ہو، یا اتنی کمسن ہو کہ صحبت کو برداشت نہ کرسکے، ان کا بھی یہی حکم ہے۔

شوھر: قسم کی ترتیب ہر عاقل شوہر پر واجب ہے (کوئی نشہ میں ہو تو اسکا بھی یہی حکم ہے) گو سفیہ ہو یا نابالغ، جبکہ صحبت پر قادر ہو، نابالغ کی ناانصافی پر اس کا ولی گنہگار ہوگا، بالغ ہونے کے بعد اسے باری کی قضا ضروری نہیں ہے۔ اگر نابالغ ابھی صحبت پر قادر نہ ہو، اور کسی بیوی کے پاس رہے، پھر دوسری بیوی بھی مطالبہ کرے، تو ولی پر لازم ہے کہ اس مطالبہ کو پورا کرے۔

شوھر کا اعراض: اگر شوہر ابتداء سے یا تمام کی باری مکمل ہونے کے بعد کسی بھی بیوی کے پاس نہ رہے تو یہ جائز ہے، کیونکہ شب باشی اس کا حق ہے، تو وہ اس حق کو ترک کرسکتا ہے، لیکن یہ مکروہ ہے۔ بلکہ سنت یہ ہے کہ ان کو ایسے ہی نہ چھوڑ دے، بلکہ ان کے ساتھ رات گذارے اور ان کے ساتھ صحبت وغیرہ کے ذریعہ ان کی پاکدامنی کی حفاظت کرے، تاکہ ان کو ضرر نہ ہو اور غلط راہ پر نہ چلیں اور آپس میں دشمنی واختلاف کا سبب نہ بنے، نیز بغیر عذر کے الگ نہ سوئے، بلکہ دونوں ایک ہی بستر پر آرام کریں۔

باری کی ترتیب کے دوران کسی بیوی کی باری باقی رکھ کر اعراض کرنا جائز نہیں، حتی کہ اسے طلاق دے، تو تجدید نکاح واجب ہے، تاکہ اس کی باری کا حق ادا کرسکے۔

(امام صمیری نے کہا کہ امام مالکؒ کا فرمان ہے: طویل مدت تک بیوی سے صحبت نہ کرے، تو صحبت کا حکم دیا جائے گا، انکار کرے تو بیوی نکاح فسخ کرسکتی ہے)

کسی کی ایک ہی بیوی ہو، تب بھی اعراض وغیرہ میں یہی تفصیل ہے۔ ایک بیوی ہو تو ساتھ رہنے کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ چار دن میں ایک دن رہے، جیسا کہ چار بیویوں کی صورت میں ہوا ہوتا۔

باری کی جگہ: شوہر تنہا کسی مکان میں رہتا ہو، اور بیویوں کو باری باری شب گذاری کیلئے اپنے مکان میں بلائے تو یہ جائز ہے، اور بیوی کو جانا ضروری ہے، جبکہ مکان اس کے مناسب حال ہو' اگر جانے سے انکار کرے، تو نشوز شمار ہوگا، البتہ ایسی شرف والی خاتون ہو کہ اس کا اپنا گھر سے باہر نکلنے کا معمول نہ ہو، تو ماوردیؒ واذرعیؒ وغیرہ نے فرمایا کہ شوہر اسکے گھر جائے۔ اگر بیوی بیماری وغیرہ کی وجہ سے معذور ہو، اور سواری پر آسکتی ہو، تو سواری کا نظم شوہر کے ذمہ ہے۔

شوہر کے لئے بیویوں کو اپنے گھر بلانے کے بجائے، انکے گھر خود پہنچنا افضل ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا، نیز وہ باہر نکلنے سے بچ جائیں گی۔

بیویوں کی رضامندی یا قرعہ اندازی کے بغیر بعضوں کو اپنے مکان پر بلانا، اور بعضوں کی باری میں انکے پاس حاضر ہونا جائز نہیں، کیونکہ اس تخصیص سے دوسروں کو وحشت ونفرت پیدا ہوگی اگر کسی غرض سے اس طرح کرے تو جائز ہے، مثلاً جس کے گھر گیا اس کا مکان

قریب ہے، اور دوسری کا دور، یا پہلی نوجوان ہے اور اس کے نکلنے میں خطرہ ہے، اور دوسری بوڑھی ہے کہ کوئی خطرہ نہیں۔

شوہر بیویوں کی رضامندی کے بغیر کسی ایک بیوی کے گھر دوسروں کو نہیں بلاسکتا، خواہ بیوی کا مکان ہو یا شوہر کا، یا دوسری کو بلاتے وقت خود صاحبۂ خانہ موجود نہ ہو، کیونکہ اس میں ان پر مشقت، اور اسے ان پر فضیلت بخشنا اور بغیر رضامندی کے ایک مکان میں بیویوں کا جمع کرنا پایا جارہا ہے۔

بیویوں کی رھائش: ایک سے زائد بیویوں کو ان کی رضامندی کے بغیر ایک ہی مکان میں رکھنا جائز نہیں، کیونکہ یہ آپس میں بکثرت جھگڑے واختلاف کا سبب بنے گا، اور خانگی سکون برباد ہوگا۔ اگر بیویاں راضی ہوں، تو ایک ساتھ رکھنا جائز ہے، لیکن کسی ایک سے صحبت کرنا، جبکہ دوسری کو اس کا علم ہو، مکروہ ہے کیونکہ یہ خلاف مروت ہے، اور بیوی انکار کرسکتی ہے، اگر دوسری کو ایذا پہنچانا مقصود ہو، یا قابلِ ستر حصہ پر ناجائز نگاہ پڑتی ہو، تو صحبت کرنا حرام ہے۔

اگر ایک ہی مکان میں الگ الگ کمرے ہوں، یا نچلا حصہ اور اوپری منزل الگ الگ ہو، اور ہر ایک کے مَرَافِق (یعنی منافع واسباب آسائش) جیسے باورچی خانہ، بیت الخلاء، حمام اور موری وغیرہ جدا ہوں، نیز مکان انکے شایانِ شان ہو، تو اس میں بیویوں کو جدا جدا رکھنا جائز ہے۔ سفر میں عارضی طور پر ایک ہی خیمہ یا جہاز میں ایک ہی جگہ رکھنا جائز ہے۔

باری کا وقت: جو دن میں کام کاج میں مشغول ہو، اس کے حق میں باری کا اصل وقت رات ہے، کیونکہ رات سکون وآرام کا وقت ہے، اور اس کے قبل یا بعد دن اس کے تابع ہے (بعد والے دن کو تابع قرار دینا بہتر ہے) کیونکہ دن ذریعہ معاش کا وقت ہے۔

آیت: ''هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِراً '' (یونس ۶۷)

ترجمہ: ''وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو، اور دن بھی اسی طور پر بنایا کہ دیکھنے بھالنے کا ذریعہ ہے''۔

(۲) ''وَجَعَلْنَا اللَّیْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا '' (النباء ۱۰، ۱۱)

ترجمہ: ''اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا، اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا''۔

جو رات کام کاج کرتا ہو، جیسے پہرہ دار، تو اس کے حق میں باری کا اصل وقت دن ہے، کیونکہ یہی اسکے آرام کا وقت ہے، اور رات تابع ہے۔ اور ایک مسافر کے لئے کہیں رکنے اور پڑاؤ ڈالنے کا وقت اصل ہے، کیونکہ یہی اس کے خلوت کا وقت ہے، قلیل وقت ہو یا زیادہ، گرچہ بیویوں کے اوقات میں تفاوت حاصل ہو، دورانِ سفر کہیں اتنا مقیم ہو کہ باقاعدہ باری ممکن ہے، تو قسم واجب ہے۔

باری کے دن یا رات کے ابتداء وانتہا میں ہر شخص اپنے کاروبار وغیرہ کی مصروفیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ باجماعت نماز یا دعوت کی شرکت میں مساوات لازم ہے، بعض کی باری میں شریک ہو اور بعض میں نہ ہو تو یہ حرام ہے۔

ایک بیوی کی باری کے اصل وقت میں کسی شدید ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے دوسری کے پاس جاسکتا ہے، اس کے بغیر نہیں جاسکتا، مثلاً: وہ شدید بیمار ہو۔ اگر وہ بیمار ہے یا اس کی زچگی ہو، اور کوئی خبر گیر موجود نہ ہو، تو پوری رات وہاں گذار سکتا ہے، پھر اس کی قضا کرے، تابع وقت میں محض حاجت کی وجہ سے بھی دوسری کے یہاں جاسکتا ہے، مثلاً کچھ اسباب وہاں رکھنا، یا وہاں سے اٹھانا، یا نفقہ اس کے سپرد کرنا وغیرہ اس صورت میں زیادہ دیر کرنا جائز ہے، لیکن بہتر نہیں ہے، جب دوسری کے پاس جائے گا، تو اس سے صحبت کے علاوہ تمتع (انتفاع) جائز ہے، صحبت کرنا حرام ہے۔

حدیث: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''آپ ﷺ ہم ازواجِ مطہرات کے پاس قیام کے سلسلہ میں بعض کو بعض پر فوقیت نہ دیتے،

اور بہت کم ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ دن میں ہم سب کے پاس سے ہو کر نہ گذرتے ہوں، پس ہر زوجہ مطہرہ سے قرب حاصل کرتے، البتہ صحبت نہ کرتے حتی کہ جس کی باری ہے، اس کے پاس پہنچ کر وہیں رات بسر کرتے"۔(ابوداود، احمد، بیہقی، صححہ الحاکم، تلخیص)

ایک کی باری میں دوسری کے یہاں جا کر صحبت یا انتفاع کرے، تو اس کی قضالازم نہیں، خواہ گناہ ہو، اور جا کر زیادہ نہ رکے تو اس مدت کی بھی قضا نہیں، خواہ جواز کے بغیر گیا ہو، اگر ضرورت یا حاجت کے لئے درکار وقت رکے، تو اس کی بھی قضالازم نہیں، اس سے زائد وقت رکے تو اصل میں تمام وقت کی، اور تابع میں خود جو زائد وقت رکے، اس کی قضالازم ہے، اگر دن میں بلا سبب داخل ہو تو گنہگار ہوگا، اور اس مدت کی قضالازم ہے، جبکہ زیادہ دیر رکے۔

اصل کے علاوہ وقت میں (یعنی جس کے حق میں رات اصل ہو اور دن تابع تو دن میں یا اس کے برعکس) باری والی کے یہاں قیام میں مساوات لازم نہیں، کیونکہ یہ تابع وقت ہے، اور اس کے آمد ورفت اور مختلف مصروفیات کا وقت ہے، جو کم وبیش ہوتا رہے گا، اس لئے ہر ایک کے یہاں یکساں مدت کی رعایت کافی مشکل ہے، اصل وقت میں ہر ایک کے پاس رکنے کی مدت مساوی ہونا لازم ہے۔

ایک باری کی مدت: جو دن میں مصروف رہتا ہے ہو، اس کیلئے ایک بیوی کے حق میں کم از کم باری کی مدت ایک رات ہے، اور یہی افضل ہے، کیونکہ بخاری ومسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت سودہؓ نے اپنا دن حضرت عائشہؓ کو ہبہ کیا، تو آپ ﷺ ان کے پاس دو دن رہا کرتے تھے، جو رات کا بعض حصہ یا مثلاً نصف رات اور نصف دن مقرر کرنا جائز نہیں"۔

بیویوں کی رضامندی کے بغیر ایک ایک کے لئے مسلسل دو دو رات یا تین تین رات باری مقرر کر سکتا ہے، اس سے زائد بلا اجازت جائز نہیں، خواہ بیویاں مختلف مقامات میں ہوں، اگر بیویاں راضی ہیں تو زائد مدت کی باری بھی جائز ہے، خواہ ایک ایک ماہ یا ایک ایک سال ہو۔

باری کی ابتداء: باری شروع کرنے کے لئے قرعہ اندازی واجب ہے خواہ عقد سب سے ایک ہی ساتھ ہوا ہو، یا آگے پیچھے، اگر بیویاں قرعہ اندازی کے بغیر ابتداء کی اجازت دیں، تو قرعہ اندازی واجب نہیں، قرعہ اندازی سے یکے بعد دیگرے باری کی تکمیل کے بعد آئندہ اسی ترتیب کی رعایت کافی ہے دوبارہ قرعہ اندازی کی ضرورت نہیں اگر قرعہ کے بغیر کسی بیوی کی باری شروع کرے، تو یہ ظلم ہے، اب بقیہ کے لئے قرعہ اندازی کرے، اس کی تکمیل کے بعد آئندہ ابتداء کیلئے از سرِ نو قرعہ کے ذریعہ ترتیب قائم کرے۔ باری کی مقدار میں ہر بیوی کے درمیان مساوات واجب ہے، حتی کہ مسلم عورت اور کتابیہ کے درمیان بھی۔

دولھن کی باری: (حقِ زِفاف) حدیث: حضرت انسؓ نے فرمایا: "سنت طریقہ یہ ہے کہ جب ایک شخص کسی باکرہ سے نکاح کرے اور ثیبہ نکاح میں ہو، تو اس (باکرہ) کے پاس سات دن رہے، پھر قسم پر عمل کرے، اور ثیبہ سے نکاح کرے، تو اس کے پاس تین دن رہے، پھر باری کی تقسیم کرے، (حضرت انسؓ کے شاگرد) ابوقلابہ کہتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو کہدوں کہ حضرت انسؓ نے اسے آپ ﷺ تک مرفوع کیا" (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، بیہقی) بعض روایات میں صراحت ہے کہ: "آپ ﷺ نے فرمایا..." (بیہقی، دارمی، ابن ماجہ، دارقطنی) (ارواء ۷/۸۸)

ایک کنواری لڑکی سے نئی شادی ہو، اور پہلے سے نکاح میں ایک یا زائد بیویاں ہوں، اور ان کی باری جاری ہو، تو اس کے پاس مسلسل سات دن رہنا، اور کسی ثیبہ سے نکاح ہو، تو اس کے پاس مسلسل تین دن رہنا واجب ہے، ان ایام کی قدیم بیویوں کے حق میں قضا نہیں کی جائے گی۔ بلکہ یہ دولھن کا حق زِفاف ہے تا کہ ایک دوسرے سے شرم وحیا اور انقباض ختم ہو جائے۔ اگر مسلسل نہ رہے، بلکہ متفرق

ایّام رہے، تو اس کا اعتبار نہیں، از سرِ نو مسلسل اس مدت کو مکمل کرے، اور متفرق ایّام کی دیگر بیویوں کے حق میں قضا کرے۔ اگر پہلے سے نکاح میں دوسری بیوی نہ ہو، تو یہ حقِ زِفاف ادا کرنا مستحب ہے۔

ثیبہ کو اس بات کا اختیار دینا سنت ہے، کہ وہ چاہے تو تین دن اس کے پاس رہے، اور ان ایام کی دیگر بیویوں کیلئے قضا نہ ہوگی، اور چاہے تو سات دن رہے، اور اس صورت میں ان ایّام کی قضا ہوگی، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ سے فرمایا تھا۔ ''اگر تم چاہو تو تمہارے پاس سات دن رہوں، اور دیگر بیویوں کے پاس بھی سات دن رہوں گا ، اور تم چاہو تو تین دن تمہارے پاس رہوں، پھر دور جاری ہوگا'' (یعنی پرانی ترتیب کے مطابق بغیر قضا کے باری کا سلسلہ جاری رہے گا) (مالک مسلم)

ثیبہ بیوی سات دن اختیار کرے، تو دوسروں کیلئے مکمل سات دن کی قضا کرے، اگر سات دن سے کم اختیار کرے، مثلاً پانچ دن، یا اس کے اختیار کے بغیر شوہر اپنی مرضی سے سات دن رہے، تو اس صورت میں صرف تین سے زائد ایّام کی قضا کرے۔

قضا کی ترتیب اس طرح ہوگی کہ قرعہ اندازی سے باری شروع کرے، نئی بیوی کی باری کا وقت، قرعہ اندازی سے دوسری بیوی کو دے، دوسرے چکر میں پھر قرعہ اندازی سے اِس کی باری تیسری بیوی، پھر تیسرے چکر میں چوتھی بیوی کو دے، اسی طرح ۱۲ بارہ ایّام میں ہر ایک کی ایک باری کی قضا ہوگی، لہٰذا چار بیویاں ہوں اور سات دن کی قضا ہو، تو ۸۴ دن میں اس کی تکمیل ہوگی۔

طلاق کے بعد عدت میں ہی رجعت کرلے، تو اسے حقِ زفاف نہ ملے گا، اگر کسی عورت سے طلاق کے بعد دوبارہ نکاح ہوا، تو اسے دوبارہ حقِ زفاف ملے گا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: '' (حقِ زفاف کی وجہ سے) فرض نماز (کی جماعت) میں حاضری، جنازہ میں شرکت، دیگر جو نیک کام کیا کرتا تھا اور دعوت میں جانا ترک کرنا مجھے پسند نہیں ہے''۔ (الام المزنی)

حقِ زفاف کی وجہ سے اس مدت میں جماعت اور دیگر نیک اعمال مثلاً مریض کی عیادت، جنازہ میں شرکت وغیرہ سے باز نہ آئے، بجز رات کے، واجب کو مقدم رکھتے ہوئے رات کو ان امور کیلئے جانے سے رکنا واجب ہے، لیکن امام اذرعیؒ وغیرہ نے اسے شاذ قرار دیا اور فرمایا کہ امام شافعیؒ کے نصوص اور قاضی و بغوی وغیرہ کے کلام کا تقاضا یہ ہے کہ ان امور کی ادائیگی کے لئے نکلنے کے استحباب میں رات بھی دن ہی کی طرح ہے، امام جوینیؒ نے تبصرہ اور امام غزالیؒ نے خلاصہ میں بھی اس کی صراحت فرمائی ہے، بجیرمی نے بھی اسے معتمد قرار دیا ہے۔ البتہ یہ عادت جاری ہے کہ مدتِ زِفاف میں عام باری کی مدت کے مقابلہ میں زیادہ قیام رہتا ہے، تو اس کی رعایت کرے، تا کہ جلد انسیت و رغبت بڑھ جائے۔ باری کے عام ایّام میں ان امور کے لئے جانے نہ جانے میں مساوات لازم ہے، یا تو ہر کسی کی باری میں جائے، ورنہ کسی کی باری میں نہ جائے، بعض کی تخصیص کرے، تو گنہگار ہوگا۔

سفر میں باری : جس عورت کے ساتھ سفر میں شوہر نہ ہو، اور وہ شوہر کی اجازت کے بغیر سفر میں جائے، گو شوہر کے کسی کام سے جائے، یا شوہر کی اجازت سے جائے، لیکن شوہر کے کام سے نہ جائے، مثلاً حج، عمرہ، یا تجارت کا سفر، تو یہ باری کی مستحق نہ ہوگی۔ اگر شوہر کے ساتھ سفر کرے، گو اجازت نہ ملے۔ (اور شوہر منع بھی نہ کرے) یا شوہر کے بغیر، اس کی اجازت سے شوہر کے کام سے سفر کرے (گو ساتھ اپنا یا کسی اور کا بھی کچھ کام ہو) تو باری کی مستحق ہوگی، لہٰذا اس کی قضا کرے، شوہر کے منع کرنے کے باوجود وہ شوہر کے ساتھ سفر کرے، تو باری کی مستحق نہ ہوگی، البتہ سفر میں اس سے انتفاع کرے تو باری کی مستحق ہوگی۔

اگر کوئی دوسری جگہ منتقل (شفٹ) ہو، تو صرف بعض بیویوں کو ساتھ نہیں لے جاسکتا، (گو قرعہ اندازی سے ہو) اور نہ سب کو چھوڑ

جائے (یعنی جبکہ وہ راضی نہ ہوں) بلکہ سب کو منتقل کرے، یا سب کو طلاق دے دے، یا بعض کو لے جائے اور بقیہ کو طلاق دے دے، اگر بعض کے ساتھ سفر کرے، تو پیچھے رہنے والیوں کے حق میں قضا لازم ہے۔

منتقلی کے بغیر عام مُباح سفر میں جاتے وقت، صرف بعض کو ساتھ لے جانا بھی جائز ہے، خواہ سفر طویل ہو، یا قصیر، لیکن قرعہ اندازی کے ذریعہ انتخاب لازم ہے، کیونکہ صحیحین وغیرہ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ: "آپ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواجِ مطہرات میں قرعہ اندازی کرتے، اور جس کے نام قرعہ نکلتا، اسے ساتھ لے جاتے"۔ دیگر بیویاں راضی ہوں تو قرعہ اندازی ضروری نہیں سفر میں نکلنے سے قبل وہ اپنی اجازت سے رجوع کرسکتی ہیں۔

واپسی کے بعد سفر کے آمد و رفت کے ایام کی دیگر بیویوں کے حق میں قضا نہ کرے، کیونکہ یہ آپ ﷺ سے مروی نہیں، تو یہ قضا کا سقوط بھی سفر کی رخصتوں میں سے ایک ہے نیز اسے ایک طرف شوہر کا ساتھ نصیب ہوا ہے تو دوسری طرف دیگر بیویوں کے برعکس سفر کی مشقتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔ قصر کے اعتبار سے اقامت کی مدت میں اگر اس کے ساتھ رہا، تو اس مدت کی قضا دیگر بیویوں کے حق میں لازم ہے، کسی ناجائز سفر میں مطلقاً کسی کو ساتھ لے جانا جائز نہیں، اگر لے گیا تو پیچھے رہنے والیوں کے حق میں قضا لازم ہے۔

شوہر کی اجازت سے بیوی بستی میں ہی اپنی کسی ضرورت سے جائے مثلاً دایہ جنائی ہو اور کسی کی زچگی پر پہنچے تو اس کی باری ونفقہ ساقط نہ ہوگا۔ شوہر بیوی کو سفر میں ساتھ لے جائے اور راستہ اور منزل پُر امن ہو، تو اسے جانا ضروری ہے، اگر بلا عذر انکار کرے تو یہ نشوز ہے، اگر بیماری، یا راستے میں شدید گرمی یا سردی جو قابلِ برداشت نہ ہو، یا کچھ اور مناسب عذر ہو تو انکار کرنا نشوز نہیں ہے، اپنے رشتہ داروں سے دوری عذر میں داخل نہیں۔

اپنی باری کا هبه: کوئی بیوی اپنی باری کا ہبہ کرے تو شوہر کو اسے قبول کرنا لازم نہیں، کیونکہ تمتع اس کا حق ہے، اگر شوہر اس ہبہ سے متفق ہو، اور کسی معین بیوی کے حق میں ہبہ کرے تو اس کے پاس دو[۲] باری گذارے گا، ایک اس کا اپنا اور ایک واہبہ کا، جس کے حق میں ہبہ کرے، اس کا راضی ہونا ضروری نہیں، واہبہ کی باری کے وقت دوسری کے پاس رہے، اس کی باری سے متصل ہو یا جدا، صحیحین میں ہے کہ حضرت سودہؓ نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو بخش دی، لہٰذا آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے پاس دو باری گذارتے، اگر تمام بیویوں کے حق میں ہبہ کرے یا اپنی باری ساقط کردے، تو اب (اسے کالعدم سمجھ کر) بقیہ میں مساوات کے ساتھ باری رکھے، اس کی باری کو کسی ایک کے ساتھ خاص نہ کرے، اگر شوہر کو ہبہ کرے، تو شوہر اس باری کو کسی کے حق میں بھی استعمال کرسکتا ہے، واہبہ جب چاہے، اپنے ہبہ سے رجوع کرسکتی ہے، لہٰذا اب آئندہ اس کی باری اسے ہی ملے گی، سابقہ ایام کی قضا نہیں کی جائے گی، نیز شوہر کو رجوع کی اطلاع ملنے سے قبل جو باری گذر چکی، اس کی بھی قضا لازم نہیں۔ واہبہ اپنی باری کے مقابلہ میں کچھ معاوضہ نہیں لے سکتی، اگر معاوضہ لیا ہو تو اسے لوٹانا لازم ہے، اور اپنی باری کے قضا کی مستحق ہوگی۔

نشوز: آیت: "وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا" (النساء: ۳۴) ترجمہ: "اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو (قرائن سے) ان کی بد دماغی کا احتمال (قوی) ہو تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور (نہ مانیں تو) ان کو لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو) اور ان کو (اعتدال کے سات) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کردیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈو"۔

نشوز یعنی شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری سے انکار کرنا، (نہ کہ ناز کے طور پر) یہ بڑا گناہ ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "اگر بیوی

(شوہر کے بلانے کے باوجود) شوہر کے بستر سے الگ رات بسر کرے (یعنی صحبت سے بلاعذر انکار کرے اور شوہر اس سے غصہ میں رات گذار دے) تو اس کے اس فعل سے باز آنے تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں" (صحیحین) ابن خزیمہ اور ابن حبان کی ایک حدیث میں ہے کہ: "جس عورت سے شوہر ناراض ہو، اس کی رضامندی تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی، اور نہ کوئی نیکی آسمان کی طرف بلند ہوگی" (فتح الباری ۹/۲۹۴) ایک حدیث میں ہے: "شوہر کا بیوی پر یہ حق ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے" (ابن ابی شیبہ)

بغیر اجازت گھر سے نکلنا اور صحبت یا دیگر انتفاع سے شوہر کو روکنا نشوز ہے، قاضی کے پاس اپنے حق کے مطالبہ کیلئے جائے یا مسئلہ معلوم کرنے کے لئے جانا پڑے یا شوہر کی غریبی کی وجہ سے اپنے گذارے اور نفقہ کیلئے جائے، تو یہ نشوز نہیں ہے۔ اگر شوہر کو سب وشتم (گالی گلوچ) کرے اور زبانی ایذا پہنچائے تو یہ گناہ ہے۔ اور شوہر اس پر تادیب کرسکتا ہے، لیکن نشوز میں شمار نہ ہوگا۔ بیوی کا کوئی رشتہ دار انتقال ہو، تو شوہر کو اسے جانے کی اجازت دینا مستحب ہے۔

اگر بیوی کے نشوز کی علامت ظاہر ہو اور قرائن سے اس کی بد دماغی کا احتمال قوی ہو، مثلاً نرم گفتار تھی، لیکن اب تلخ وتیز جواب دے، یا بڑی خندہ رو اور ہنس مکھ تھی، اور اب اعراض وترش روئی محسوس کرے تو مستحب ہے کہ اسے وعظ ونصیحت کرے اور سمجھائے، اعراض وقطع تعلق نہ کرے اور نہ مارے، شاید کہ کچھ عذر بتلائے، یا اپنی اس حرکت سے باز آجائے، اسے اس طرح سمجھائے کہ میرے واجب حق کے متعلق اللہ سے ڈرو، دنیا وآخرت کی سزا سے بچو، تمہارا نفقہ وباری ساقط ہوگی، بہتر ہے کہ اسے اوپر کی حدیث سنائے، نیز اسے یہ حدیث سنائے کہ: "جو عورت بھی اس حال میں انتقال کر جائے کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہو، وہ جنت میں داخل ہوگی" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

اگر بیوی کے نشوز کا علم ہو (یعنی نشوز کا تحقق ہو) تو اسے سمجھائے اور بستر سے الگ کردے اور مارنے سے کچھ فائدہ ہو، تو مار سکتا ہے، بالخصوص بار بار نشوز پایا جائے تو، لیکن بہتر یہ ہے کہ معاف کردے، نہ مارے، جیسا کہ بعض احادیث میں ممانعت وارد ہے، لیکن بچے کے سرپرست کو بطور تادیب مارنا بہتر ہے، کیونکہ اس میں بچہ کی مصلحت ہے اور یہاں شوہر اپنی مصلحت سے مارتا ہے، ایسی مار کہ خون نکلے یا کسی عضو کو بے کار کردے، یا حلیہ بگاڑ دے، یا زیادہ تکلیف دہ ہو، جائز نہیں، چہرہ پر اور نازک مقامات پر مارنا مطلقاً منع ہے، جو لاغر وکمزور ہو اور مار برداشت نہ کرے، اسے مارنا جائز نہیں، نیز ایک آزاد عورت کی مار چالیس تک نہ پہنچے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ مارنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، تو مارنا حرام ہے۔ بعض علماء نے کوڑے اور لکڑی سے مارنا ناجائز قرار دیا ہے، بلکہ ہاتھ سے یا کپڑا لپیٹ کر اس سے مارے۔

ترک کلام: آپ ﷺ نے ایک حدیث میں مسلمانوں کو آپسی بغض وکینہ اور حسد سے منع فرمایا اور بھائی بھائی بن کر رہنے کا حکم دیا اور فرمایا: "ایک مسلمان کو حلال نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین (دن) سے زائد قطع تعلق رکھے" (صحیحین) صحیحین کی ایک روایت میں آگے یہ الفاظ ہیں: "دونوں ملاقات پر ایک دوسرے سے اعراض کرتے ہیں، ان میں جو پہلے سلام کرے، وہ بہتر ہے"۔ ایک حدیث میں مزید یہ ہے: "...جو تین دن سے زیادہ قطع تعلق (وگفتگو) کرے، پھر مر جائے، تو جہنم میں داخل ہوگا" (ابوداود علی شرط البخاری ومسلم)

نشوز وغیرہ کی وجہ سے بیوی کے ساتھ یا کسی دوسرے کے ساتھ تین دن تک گفتگو چھوڑ دینا جائز ہے البتہ والدین اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سلوک جائز نہیں نشوز کی وجہ سے بیوی سے یا کسی سبب سے دوسروں سے تین دن سے زائد بات چیت بند کرنا جائز نہیں ہے، اگر صرف بیوی یا دوسرے کو گناہ سے روکنا اور اس کی دینی اصلاح مقصود ہو، نہ کہ اپنا نفسانی حظ اور نہ دونوں، تو اس کی گنجائش ہوگی، کیونکہ کسی دینی عذر سے تین روز سے زائد ترک کلام جائز بلکہ مندوب ہے، مثلاً اس کا فاسق یا بدعتی ہونا، گو ترکِ کلام سے وہ اپنی

روش نہ بدلے، البتہ ترکِ کلام کیوجہ سے اسکا فسق اور بڑھتا ہو، تو ایسا نہ کرے، اسی طرح اپنے یا اس کے دینی اصلاح کے لئے بھی ترکِ کلام مندوب ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے والے تین صحابہؓ کرام حضرات کعبؓ بن مالک، مرارہؓ بن ربیع اور ہلال بن اُمیہؓ سے دیگر صحابہ کرامؓ کو قطعِ تعلق کو حکم دیا، (بخاری وغیرہ) اسلاف کے ترکِ کلام کو بھی انھیں شرعی اعذار پر محمول کیا جائے گا۔

شوہر کا نشوز

اگر ظلم وزیادتی شوہر کی جانب سے ہو، مثلاً باری اور نفقہ وغیرہ کا حق ادا نہ کرے، یا قول وفعل میں سختی تلخی سے پیش آئے، تو بیوی اپنا حق یاد دلا کر اسے سمجھائے، مثلاً یہ آیت سنائے:

آیت: ”وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئاً وَّ يَجْعَلَ اللهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْراً“ (النساء: ۱۹)

ترجمہ: ”اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو، اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں، تو ممکن ہے کہ تم ایک شئے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں کوئی بڑی منفعت رکھ دے“۔

نیز آپ ﷺ کا یہ فرمان سنائے: ”تم میں سب سے بہتر وہ ہے، جو اپنی بیوی اور گھر والوں کے حق میں بہتر ہے، اور میں گھر والوں کے حق میں تم سب سے بہتر ہوں“ (ترمذی) نیز یہ فرمان سنائے۔ ”بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق میری وصیت قبول کرو“۔ (متفق علیه) اور اسے ظلم کے مذموم نتائج سے چوکنا کرے، اگر معاملہ درست ہوگیا تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر مسئلہ قاضی کے روبرو پیش کرے، کیونکہ مستحقین کو انکا حق دلوانا ہی اس کی اہم ذمہ داری ہے، نیز بیوی براہِ راست اپنا حق وصول نہیں کرسکتی۔ قاضی پر واجب ہے کہ وہ شوہر پر حقوق کی ادائیگی اور ظلم سے بچنا لازم قرار دے۔ اگر وہ بدخلقی سے پیش آئے، بلاسبب بیوی کو مارے یا گالی گلوج کرے، تو قاضی اسے اس سے روک دے، دوبارہ یہی روش اختیار کرے، اور بیوی سزا کا مطالبہ کرے، تو قاضی شوہر پر مناسب تعزیری سزا نافذ کرلے۔

اختلاف کی شدت اور حکم: آیت: ”وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَماً مِّنْ أَهْلِهٖ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُّرِيْدَا إِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا ...“ (النساء: ۳۵)

ترجمہ: ”اور اگر اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں کشاکش (ضد، مخالفت ودشمنی) کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک منصف (جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو) مرد کے خاندان سے اور ایک منصف عورت کے خاندان سے بھیجو اگر دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق فرمادینگے“۔

اگر میاں بیوی کا اختلاف بڑھ جائے، اور مسئلہ قاضی تک لے جائیں، اور حل نہ نکلے، (خواہ اس میں دونوں کے نشوز کو دخل ہو یا کسی ایک کے) تو قاضی (حاکم) پر واجب ہے، کہ دونوں کے تصفیہ کیلئے دو مسلمان، عادل اور اصلاح کے انداز سے واقف حکم (فیصل، پنچ) کو واسطہ بنائے، مستحب ہے کہ ایک حکم شوہر کے کنبہ سے، اور دوسرا بیوی کے خاندان سے ہو، یہ دونوں حکم میاں بیوی کے وکیل ہیں، لہٰذا دونوں کی اپنے اپنے وکیل سے رضامندی شرط ہے، اب دونوں حتی المقدور زوجین میں صلح پیدا کرنے کی کوشش کریں، اگر کامیاب ہوگئے تو بڑی اچھی بات ہے، ورنہ شوہر اپنے حکم کو بیوی کی طلاق، اور بدلِ خلع قبول کرنے میں وکیل بنائے، اور بیوی اپنے حکم کو بدل خلع کی ادائیگی اور اس کے عوض طلاق قبول کرنے میں وکیل بنائے۔ اور پھر دونوں حکم بہتر سمجھیں تو زوجین میں جدائی کردے۔

اگر دونوں حکم کا اختلاف ہو، اور کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں، تو قاضی دوسرے دو حکم روانہ کرے، یہاں تک کہ دونوں کسی فیصلہ پر متفق ہوجائیں۔ اگر میاں بیوی حکم کے روانہ کرنے پر راضی نہ ہوں، یا کسی بات پر متفق نہ ہوں، تو جو ان میں ظالم ہو، قاضی اس کی تادیب کرے،

(اسے مناسب سزا دے) اور مظلوم کو اس کا پورا حق دلوائے، اور دونوں حکم کی گواہی پر عمل کرلے۔ (جمل ۴/۲۷۹۔۲۹۱، المجموع ۱۶/۴۲۵۔۴۵۵، الحاوی ۹/۵۶۸۔۶۰۸، مغنی ۳/۲۵۱۔۲۶۱، نهایه ۶/۳۷۹۔۳۹۲، تحفه ۹/۴۶۷۔۵۱۰، قلائد ۲/۱۵۴۔۱۵۹، شرح التنبیه ۲/۱۳۲، تحفه الحبیب علی شرح الخطیب ۳/۳۹۴۔۴۰۹، اعانه ۳/۳۷۰۔۳۷۸، الفقه المنهجی ۴/۱۰۱۔۱۱۰)

خُلع

خُلع : عربی لفظ میں لفظ خلع (لباس، چپل وغیرہ) نکالنے اور اتارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شرعاً : شوہر کی طرف راجع مقصود عوض کے مقابلہ میں طلاق کے کسی لفظ یا خلع کے لفظ سے زوجین کے مابین جدائی کو خلع کہا جائے گا (مغنی وفتح الوهاب والسراج الوهاج)

سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۷، میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پوشاک قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا گویا مذکورہ طریقے سے جدائی کے ذریعہ دونوں اپنا یہ ازدواجی پوشاک اتار دیتے ہیں۔

اس کی مشروعیت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

آیت: ’’ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ‘‘(البقرہ : ۲۲۹)

ترجمہ: ’’اور تم لوگوں کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی کو قائم نہ کرسکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑالے‘‘۔

حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی نے بعض وجوہات کی بنا پر آپ ﷺ سے اپنے نکاح کو ختم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو، آپ ﷺ نے پوچھا: ’’کیا تم اس کا باغ اسے واپس کردوگی؟‘‘ اس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے حضرت ثابت سے فرمایا: ’’باغ لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو‘‘ (بخاری، ابوداؤد)

خلع کا حکم : خلع مکروہ ہے، کیونکہ اس میں نکاح کا خاتمہ ہے، اور نکاح شرعاً مطلوب ہے، نسائی کی ایک حدیث میں خلع لینے والی خواتین کو منافق قرار دیا ہے۔ البتہ دو صورتوں میں مکروہ نہیں۔

(۱) دونوں کو یا ایک کو یہ اندیشہ ہو کہ اللہ کے ان ضوابط وحدود کو، جو نکاح میں فرض ہیں، قائم نہ رکھ سکیں گے۔

(۲) شوہر بیوی کے تین طلاق کو کسی ایسے عمل پر معلق کرے، جس کا انجام دینا ناگزیر ہو، مثلاً: کھانا، پینا، قضائے حاجت وغیرہ (مثلاً شوہر کہے: اگر میں نے کچھ کھالیا تو میری بیوی کو تین طلاق) تو ایسی صورت میں بیوی کو خلع دے کر وہ عمل انجام دے، پھر دوبارہ نکاح کرلے۔ اب اس عمل سے طلاق واقع نہ ہوگی، اور اس طرح تین طلاق کی قسم ختم ہوجائے گی۔

خلع کے ارکان

(۱) شوہر (۲) عوض کا ملتزم (عوض اپنے ذمہ لینے اور لازم کرلینے والا) (۳) بضع (اس سے عورت مراد ہے) (۴) عوض (۵) صیغہ

(۱) شوهر : شوہر کا طلاق دینا صحیح ہو، لہٰذا سفاہت کی وجہ سے محجور، اور جو نشہ میں ہو اس کا خلع دینا صحیح ہے، بچہ، مجنون اور مکرہ کا

خلع صحیح نہ ہوگا۔

(۲) عوض کا ملتزم: جوعوض اپنے ذمہ لے خواہ ابتداء اپنی جانب سے خلع کی درخواست کرے، یا شوہر کے خلع کے مطالبہ کو قبول کرے، خواہ بیوی ہو یا کوئی دوسرا، اس کا مالی تصرفات میں مطلق ہونا شرط ہے۔ یعنی مالی تصرفات میں آزاد ہو، اس پر پابندی نہ ہو اور وہ مکلف ہو۔ بیوی پس سفاہت کی وجہ سے حجر ہو اور وہ خلع لے تو طلاقِ رجعی واقع ہوگی جبکہ دخول کے بعد ہو اور مال کا ذکر لغو قرار پائے گا اور دخول سے پہلے ہو تو بائنہ طلاق واقع ہوگی۔

بیوی مرض الموت میں خلع لے تو صحیح ہے، اور عوض کی مقدار مہر مثل سے زائد ہو، تو وہ زائد مقدار تہائی میں شمار ہوگی، مہر مثل کی مقدار یا اس سے کم کا شمار کل مال سے ہوگا۔

(۳) بُضع: بضع میں یہ شرط ہے کہ شوہر اس کا مالک ہو، لہٰذا (بیوی کی طرح) رجعیہ سے خلع صحیح ہے (رجعیہ یعنی جو رجعی طلاق کی عدت میں ہو) کیونکہ وہ کئی احکام میں بیوی کی طرح ہے۔ مطلقہ بائنہ سے خلع صحیح نہیں (خواہ رجعی عدت ختم ہونے سے بائنہ ہو) کیونکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں۔

(۴) عوض: عوض ایسا ہونا شرط ہے، جو بطور مہر ادا کیا جاسکے (جس میں ثمن کے شرائط موجود ہوں) اگر عوض فاسد لیکن مقصود ہو، جیسے مجہول، شراب، مردار اور بیوی سے خلع کی گفتگو ہو، تو مہر مثل پر بائنہ ہوگی، کیونکہ عوض فاسد ہو تو مہر مثل کی طرف لوٹیں گے، جیسا کہ مہر کے فساد میں ہوتا ہے، اگر عوض فاسد وغیرہ مقصود ہو، جیسے خون، کیڑے مکوڑے (حشرات الارض) تو رجعی طلاق ہوگی (اور کچھ عوض لازم نہ ہوگا) عوض معلوم و مجہول ہو تو مہر مثل واجب ہوگا۔ اگر شوہر بیوی سے کہے کہ اگر میرا قرض معاف کردو، تو تجھے طلاق، اور اس نے معاف کیا، لیکن قرض مجہول ہو، تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ مجہول کا معاف کرنا صحیح نہیں۔ اگر اجنبی سے فاسد و مقصود عوض پر خلع کی گفتگو ہو، تو طلاق رجعی واقع ہوگی۔

توکیل: میاں بیوی خلع میں کسی کو وکیل بنا سکتے ہیں۔ اور شوہر وکیل کو مال کی معین مقدار پر خلع کی اجازت دے۔ اور وہ اس سے کم پر یا کسی دوسری چیز پر خلع دے، تو طلاق نہ ہوگی، اگر معین مقدار پر خلع دے، یا اس سے زائد پر (گو زائد کوئی دوسری چیز ہو) تو صحیح ہے۔ عوض متعین نہ کرے اور وکیل مہر مثل سے کافی کم پر خلع دے، تو مہر مثل پر بائنہ ہوگی، اگر مہر مثل پر یا زائد پر خلع دے تو صحیح ہے۔

اگر بیوی عوض کی مقدار متعین کرے، اور وکیل اس پر اضافہ کرے، اور خلع کو بیوی کی طرف منسوب کرے، یعنی یہ کہے کہ اس کے مال میں سے بطور وکالت، تو مہر مثل پر بائنہ ہوگی، اگر وکیل خلع اپنی طرف منسوب کرے، یعنی کہے کہ میرے مال سے تو وکیل پر مقررہ رقم واجب ہوگی کیونکہ یہ اجنبی کا خلع ہے (اس لئے کہ بیوی کے بجائے اپنی طرف منسوب کیا ہے) اگر وکیل نہ بیوی کی طرف منسوب کرے اور نہ اپنی طرف، تب بھی جو مقدار وکیل مقرر کرے، وہ اس پر لازم ہے۔ بعد میں جتنی مقدار بیوی نے مقرر کی تھی، اتنی اس سے لے لے گا، اور اضافہ وکیل کی جیب سے جائے گا، اگر بیوی کی مقررہ رقم پر یا اس سے کم پر خلع لے تو اسی پر نافذ ہوگی۔ بیوی مقدار مقرر نہ کرے، تو وکیل مہر مثل پر اضافہ نہ کرے، اگر اضافہ کرے گا تو مقررہ مقدار پر اضافہ کی مانند ہوگا۔

میاں بیوی کسی کافر یا عورت کو بھی خلع میں وکیل بنا سکتے ہیں۔ دونوں ایک ہی شخص کو وکیل بنائے، تو وہ صرف کسی ایک کی طرف سے ہی وکالت انجام دے سکتا ہے۔

(۵) صیغہ: صیغہ میں بیع کے صیغہ کے شرائط ضروری ہیں (یعنی معلق نہ ہونا، مؤقت نہ ہونا، ایجاب وقبول کے درمیان غیر متعلق

گفتگو کا نہ آنا، طویل خاموشی و فاصلہ کا نہ ہونا۔ اور معنوی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے مطابق وموافق ہونا) لیکن خلع میں معمولی فرق ہے، جو آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگی۔

خلع میں ایجاب وقبول کے درمیان معمولی گفتگو کے ذریعہ فصل ہو تو حرج نہیں۔ خلع کے صریح وکنایہ الفاظ طلاق کے صریح وکنایہ الفاظ ہیں۔ فسخ اور فروخت کا لفظ کنایہ ہے مثلاً: میں نے ہزار روپے میں تمہارا نکاح فسخ کیا، یا تمہارے نفس ہزار روپے میں تمہیں فروخت کردیا، پھر بیوی قبول کرے اور دونوں کی نیت طلاق کی ہو، تو خلع صحیح ہوگا۔ دونوں کی یا ایک کی نیت نہ ہو تو صحیح نہیں۔

مفادة (فدیہ لے کر چھوڑ دینا) سے مشتق لفظ صریح ہے، کیونکہ قرآن میں اس مفہوم کے لئے وارد ہے۔ (دیکھئے سورہ بقرہ، آیت ۲۲۹)، نیز خلع سے مشتق لفظ بھی صریح ہے۔ کیونکہ عرف واستعمال میں طلاق کے لئے شائع اور اس کا مفہوم (افتداء) قرآن میں وارد ہے۔ لیکن ان دونوں لفظ کے صریح شمار ہونے کے لئے اِن تینوں میں سے کوئی ایک شرط لازم ہے نہ مال کا تذکرہ ہو، یا مال کی نیت ہو، یا بیوی کے قبول کے التماس کی نیت ہو اور تمام صورتوں میں بیوی قبول کرے تو بائنہ ہوگی، اگر قبول نہ کرے تو آخری صورت میں طلاق نہ ہوگی، بقیہ میں کنایہ ہوگا، بصورت نیت طلاق ہوگی۔ اگر ان دو میں سے کوئی لفظ عوض کے تذکرہ کے بغیر قبول کرنے کی درخواست کی نیت کے ساتھ ادا کرے، مثلاً کہے میں نے تجھے خلع دیا، فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اور بیوی کے قبول کے التماس کی نیت ہو، (یعنی مستقلاً اپنی جانب سے طلاق کا ارادہ نہ ہو، بلکہ مقصود یہ ہو کہ اگر تم کو قبول ہو تو میں دے رہا ہوں) پھر بیوی قبول کرلے تو عرف کے پیشِ نظر مہر مثل واجب ہوگا، قبول نہ کرے تو طلاق نہ ہوگی۔ اگر یہی گفتگو اجنبی (یعنی بیوی کے علاوہ کسی دوسرے) کے ساتھ ہو تو بلا عوض طلاق ہوگی۔

اگر شوہر کہے: میں نے تجھے بلاعوض خلع دیا، تو طلاق رجعی ہوگی۔

اگر شوہر کہے: تجھے ہزار روپے کے عوض طلاق، تو یہ معاوضہ کا صیغہ ہے جس میں تعلیق کا بھی شائبہ ہے۔ کیونکہ طلاق بیوی کے قبول کرنے پر موقوف ہے۔ پس معاوضہ کی طرف نظر کرتے ہوئے بیوی کے قبول سے قبل شوہر رجوع کرسکتا ہے۔ (پھر بیوی کے قبول کرنے سے طلاق نہ ہوگی)

اگر ایجاب وقبول میں اختلاف ہو، تو لغو ہے نہ طلاق واقع ہوگی، نہ مال واجب ہوگا۔ مثلاً شوہر کہے: میں نے تجھے ہزار میں طلاق دی، اور بیوی دو ہزار میں قبول کرے یا اس کے برعکس، یا شوہر کہے: میں نے ہزار میں تین طلاق دی اور بیوی ہزار کے تہائی میں ایک طلاق قبول کرے، اگر اس آخری صورت میں بیوی ہزار میں ایک طلاق قبول کرے، تو ہزار میں تینوں طلاق واقع ہوگی۔ کیونکہ طلاق تو شوہر تنہا دے سکتا ہے، قبول کا اعتبار مال کے سبب ہے، اور اس میں مال کی مقدار میں وہ شوہر کے موافق ہے۔

اگر مثبت پہلو میں تعلیق کا صیغہ استعمال کرے، تو یہ تعلیق کہلائے گا لہٰذا رجوع کا حق نہ ہوگا (تعلیق یعنی کسی چیز کو کسی پر موقوف رکھنا، مثلاً تو گھر سے نکلی تو تجھے طلاق، اس میں طلاق کو گھر سے نکلنے پر موقوف رکھا ہے، لہٰذا اسے تعلیق طلاق کہیں گے)

مثلاً: تو جب (یا جب بھی، یا جس وقت بھی) مجھے ہزار روپے دے گی، تو تجھے طلاق ہے۔ چونکہ یہ تعلیق ہے، اس لئے بیوی کے دینے سے قبل شوہر کو رجوع کا حق نہیں (یعنی جب بھی بیوی مذکورہ رقم دے طلاق ہوجائے گی، گو شوہر نہ چاہے یا انکار کرے) ان الفاظ میں لفظاً قبول کرنا یا فوراً مذکورہ رقم ادا کرنا ضروری نہیں۔

اگر شوہر کہے: اگر تو ہزار روپے دے، تو تجھے طلاق، تو فوراً ہونا شرط ہے، جیسا کہ عوض کے ساتھ لفظ کا تقاضا ہے، پس اتنا وقت گذر جائے کہ اس میں دے سکتی تھی اور نہ دے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔

اگر بیوی مطالبہ کرے اور کہے: مجھے ہزار کے عوض طلاق دو، یا اگر مجھے طلاق دو تو تمہارے لئے میرے اوپر ہزار لازم یا جب تم طلاق دو تو تمہارے لئے میرے اوپر ہزار لازم، تو شوہر کا فوراً قبول کرنا ضروری ہے، اور بیوی اس کے قبول سے قبل رجوع کر سکتی ہے۔ اگر شوہر تاخیر سے یا بعد میں طلاق دے، تو ابتداء طلاق شمار ہوگی۔ اور رجعی ہوگی (کوئی عوض نہ ملے گا) اگر بیوی تاخیری صراحت کردے تو فوراً قبول شرط نہیں۔ مثلاً کہے ایک ماہ بعد بھی دو تو تمہیں ایک ہزار۔

شوہر کو تین طلاق کا اختیار ہو، اور بیوی اس سے ہزار کے مقابلہ میں تین طلاق کا مطالبہ کرے۔ اور وہ ایک طلاق دے، تو ہزار کا ایک تہائی لازم ہوگا۔

اگر خلع یا عوض کے مقابلہ میں طلاق دے، تو شوہر کو رجعت کا حق نہیں (بیوی بائنہ ہو چکی) اگر خلع میں رجعت کی شرط لگائے تو خلع فاسد ہوگا مثلاً شوہر کہے: تجھے ایک دینار میں طلاق دی، بشرطیکہ مجھے رجعت کا حق ہوگا اور بیوی قبول کرے تو یہ رجعی طلاق ہوگی۔ اور کوئی مال نہ ملے گا۔ اگر ایک دینار پر اس شرط پر خلع دے کہ جب چاہے دینار لوٹا کر رجعت کرے گا تو رجعت کا حق نہ ہوگا، بلکہ مہر مثل پر بائنہ ہوگی۔

اگر شوہر طلاق کو مال عطا کرنے پر معلق کرے اور بیوی اسی نیت سے مال اس کے سامنے رکھ دے اور وہ اسے قبضہ میں لینے پر قادر ہو (گو نہ لے) تو بیوی بائنہ ہوگی اور شوہر اس مال کا مالک ہوگا۔

اگر بیوی ہزار میں تین طلاق مانگے، اور شوہر صرف ایک یا دو طلاق کا مالک ہو، اور ملکیت کی ساری طلاق دے دے، تو ہزار کا مستحق ہوگا، اگر ہزار میں ایک طلاق کا مطالبہ کرے اور شوہر ہزار میں مطلقاً (ہزار کی صراحت کے بغیر) ایک یا زائد طلاق دے، تو ہزار کا مستحق ہوگا، اگر سو میں طلاق دے، تو سو کا مستحق ہوگا، اگر بیوی آئندہ کل ہزار میں طلاق طلب کرے اور شوہر کل یا پہلے ہی طلاق دے، تو بیوی مہر مثل پر بائنہ ہوگی۔

اجنبی کا خلع: اگر بیوی کے بجائے اس کا ولی یا دوسرا کوئی شخص اپنی جانب سے اس کو خلع دلوائے تو یہ سابقہ الفاظ واحکام میں بیوی کے خلع کی طرح ہے، گو بیوی اس خلع کو ناپسند کرے۔ (یعنی کوئی دوسرا شخص شوہر سے کہے کہ تم ہزار میں بیوی کو خلع دو، اور وہ قبول کرے تو خلع ہو جائے گا، اور وہ شخص ہزار دے گا، گو بیوی خلع لینا نہ چاہتی ہو) لیکن یہ مسئلہ گذر چکا کہ اجنبی فاسد عوض پر خلع لے تو طلاق رجعی ہوگی (اور بیوی لے تو مہر مثل واجب ہوگا)

اگر شوہر کسی شخص سے کہے کہ میں نے بیوی کو اس شرط پر طلاق دی کہ تمہارے ذمہ ہزار روپئے۔ اور وہ قبول کرے، یا وہ شخص شوہر سے کہے: اپنی بیوی کو طلاق دو اس شرط پر کہ میرے ذمہ ہزار، اور شوہر قبول کرے، تو مقررہ عوض (ہزار) پر بیوی بائنہ ہوگی۔

بیوی کسی کو اپنی خلع کے لئے وکیل بنائے، تو وہ بیوی کی طرف سے وکالت کی صراحت یا نیت سے، نیز اپنی جانب سے بھی صراحتاً یا نیت سے خلع لے سکتا ہے، اگر کوئی صراحت یا نیت نہ ہو، تو بیوی کی جانب سے شمار ہوگا، اور اس پر عوض لازم ہوگا۔ اگر کوئی اجنبی کسی عورت کو وکیل بنائے کہ وہ عورت شوہر سے خلع لے لے، تو اسے بھی اختیار ہے کہ اجنبی کی طرف سے لے، یا خود اپنی طرف سے، یعنی کسی ایک کی صراحت ہو یا نیت، دونوں نہ ہو تو بیوی کی جانب سے شمار ہوگا۔ دونوں مسئلہ میں اگر وکالت کی صراحت ہے تو شوہر موکل سے (یعنی پہلی صورت میں بیوی اور دوسری صورت میں اجنبی سے) مطالبہ کرے گا، ورنہ جو شوہر سے گفتگو کر کے معاملہ طے کرے (یعنی پہلی صورت میں اجنبی اور دوسری صورت میں بیوی) اس سے مطالبہ کرے گا، پھر اس نے موکل کی نیت کی ہو، یا بلا کسی نیت کے ہو، تو موکل سے رقم وصول کرے گا۔ اگر اجنبی جھوٹی وکالت کی صراحت کر کے بیوی کے مال سے خلع لے تو طلاق نہ ہوگی۔

اختلاف : بیوی خلع کا دعوی کرے اور شوہر انکار کرے، تو شوہر کو قسم دلا کر اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اگر بیوی دو مرد گواہ پیش کرے تو اس پر عمل ہوگا، لیکن شوہر کو مال (بدلِ خلع) نہ ملے گا، کیونکہ وہ انکار کر رہا ہے، البتہ اگر وہ اپنی بات سے رجوع کر کے خلع کا اقرار کرے، تو مال کا مستحق ہوگا۔

اگر شوہر خلع کا دعویٰ کرے، اور بیوی انکار کرے اور کہے کہ تم نے طلاق نہیں دی، یا مفت میں دی ہے، تو شوہر کے دعوی کی وجہ سے وہ بائنہ ہوگی، اور کوئی عوض نہ ملے گا۔ اور بیوی مال کی نفی پر قسم لے گی، بیوی کو عدت کا نفقہ ولباس ملے گا۔ اگر شوہر گواہ (یعنی دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں) پیش کرے، یا ایک مرد گواہ پیش کرے اور خود قسم لے، یا بعد میں بیوی خود خلع کا اعتراف کرے تو مال لازم ہوگا۔

اگر دونوں میں طلاق کی تعداد میں اختلاف ہو، مثلاً بیوی کہے: میں نے ہزار میں تین طلاق طلب کی تھی، اور تم نے قبول کیا، اور شوہر کہے: ایک طلب کی تھی، اور میں نے وہی دی، یا عوض کی صفت یا مقدار میں اختلاف ہو، تو جس کے پاس گواہ ہوں، اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، اگر دونوں کے پاس گواہ نہ ہوں، یا دونوں کے پاس ہوں اور دونوں ایک دوسرے سے متعارض ہوں، تو میاں بیوی دونوں قسم لیں گے۔ (جس کی تفصیل وہی ہے جو بائع ومشتری کے اختلاف میں قسم کی ہے) اور عوض کو فسخ کر دیا جائے گا، اور بائنہ ہونے کی وجہ سے مہر مثل واجب ہوگا۔ طلاق کی تعداد کے اختلاف میں شوہر کو ایک اور قسم دلا کر اس کی بات مانی جائے گی۔

خلاصہ : (۱) اگر صیغہ وعوض صحیح ہے، تو مقررہ عوض پر طلاق بائنہ ہوگی، صرف عوض فاسد ہوگا، تو مہر مثل پر بائنہ ہوگی، اگر صیغہ فاسد ہو تو رجعی طلاق ہوگی، جبکہ شوہر اسی وقت طلاق دے چکا ہو، اگر ایسے امر پر معلق ہو، جو پایا نہیں گیا، تو طلاق ہی نہ ہوگی۔ (شرح التنبیہ ۲۲۶۲، جمل ۳۱۹/۴)

(۲) بیوی کو خلع دینے کے بعد اب شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں، اور عدت میں رجعت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ طلاق بائن ہے، ایک نئے نکاح کی طرح بیوی کے اختیار ومرضی اور نئے مہر کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ (۳) خلع دینے کے بعد عدت میں کسی طرح کی طلاق، یا ایلاء یا ظہار واقع نہ ہوں گے، کیونکہ وہ شوہر سے بالکل جدا ہو چکی، طلاق رجعی کی عدت میں یہ امور واقع ہوں گے (۴) حیض میں یا جس پاکی میں صحبت کی ہو بیوی کو خلع دے سکتا ہے (حالانکہ طلاق دینا ممنوع ہے)۔ لیکن اجنبی کو اس حال میں خلع دینا ممنوع ہے۔ (الفقہ المنہجی ۱۲۸/۴)

طلاق

آیت : (۱) ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ '' (البقرہ ۲۲۹)

ترجمہ : ''وہ طلاق (جس میں رجوع کرنا درست ہے) دو مرتبہ (کی) ہے، پھر خواہ (رجعت کر کے عورت کا) رکھ لینا قاعدہ کے موافق، خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ''۔

(۲) ''يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ '' (الطلاق ۱)

ترجمہ: ''اے پیغمبر (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دینے لگو، تو ان کو ان کی عدت پر طلاق دو''۔

تعریف : لغت میں بندش وگرہ وغیرہ کے کھلنے یا کھولنے اور آزاد کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

شرعاً، نکاح کے بندش کو طلاق جیسے الفاظ سے ختم کر دینا طلاق کہلاتا ہے۔

مشروعیت : طلاق کی مشروعیت پر کتاب وسنت اور اجماع سے دلیل موجود ہے۔

حکمت ومصلحت : علامہ قسطلانی فرماتے ہیں:'' نکاح کی مشروعیت میں بندوں کی دینی ودنیوی مصلحتیں ہیں، اور طلاق میں اس کی تکمیل ہے۔ کیونکہ بعض اوقات نکاح اسے راس نہ آئے گا، لہٰذا دونوں کے اخلاق وعادات کا اختلاف اور آپسی بغض ونفرت کی وجہ سے حدودِ الٰہی کی صحیح پابندی نہ ہو پائے گی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے خلاصی کی شکل مشروع فرمائی۔ نیز طلاق کی تعداد تین رکھنے میں بڑی لطیف حکمت ہے، بلاشبہ نفس بڑا جھوٹا ہے، بعض مرتبہ یوں ظاہر کرے گا کہ تجھے اس بیوی کی کوئی ضرورت نہیں، یا اسے چھوڑنے میں بہتری ہے، اور اس نظریہ کو اس کے دل ودماغ میں مزین کرکے بٹھادے گا، بس جب دونوں میں جدائی ہوجائے گی، تو نادم ہوگا، سینہ تنگ ہوگا، اور صبر مشکل ہوگا، لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تین طلاق کو مشروع فرمایا، تاکہ پہلی مرتبہ نفس کو آزمالے، اور فیصلہ صحیح ہے، تو عدت ختم ہونے تک اس پر قائم رہے، ورنہ عدت میں رجعت کے ذریعہ تلافی کرلے، پھر دوبارہ نفس سابقہ حالت کی طرف لوٹے، اور وہی بات اس پر غالب آئے، حتیٰ کہ دوسری طلاق دے، تو پھر جانچ لے کہ کیا کیفیت پیش آتی ہے، پھر تیسری طلاق دے گا تو خوب تجربہ کرکے اپنے نفس کی حالت کو سمجھ کردے گا، اب ساری طلاقیں دے چکا تو کسی دوسرے کو نکاح میں جانے کے بعد (آئندہ وہاں سے جدائی ہوتب) ہی اس کے لئے حلال ہوگی، تاکہ اسے ایسا بدلہ ملے جس میں اس کے لئے غصہ (وغیرت) ہو، یعنی دوسرا شوہر، جیسا کہ ایک مرد کی فطرت ہے، بہرحال (دیگر تمام احکام کی طرح) اس میں بندوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور لطف وکرم ہے'' (ارشاد الساری شرح بخاری ۱۲۵/۸)

نکاح کا مقصد تو دراصل یہ ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی قائم دائم رہے، اسی مقصد سے شریعت نے کافی احکام وآداب مشروع فرمائے ہیں، لیکن بعض اوقات دونوں یا کوئی ایک ان احکام وآداب کی صحیح رعایت وپابندی نہیں کرتے، جو رفتہ رفتہ آپسی نفرت اور شدید اختلاف تک پہنچادیتا ہے، اور بظاہر اصلاح اور ازدواجی رشتہ کے بقا کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، لہٰذا ایسے سنگین حالات کے لئے ایک احتیاطی قانون کی تشریح لازمی تھی، جس کے سہارے اس رشتہ سے دونوں کو آزاد کردیا جائے، تاکہ ایک دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔ اللہ کا فرمان ہے۔

'' وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِہٖ وَکَانَ اللّٰہُ وَاسِعاً حَکِیْماً '' (النساء ۱۳۰)

(اور اگر دونوں میاں بیوی جدا ہوجائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے احتیاج کردے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑے حکمت والے ہیں)

پس اگر ایک شوہر بالفعل آخری اور مجبوری کے درجہ میں اسے استعمال کرے، تو یہ ایک لازمی علاج ہے، جس کے بغیر چارہ نہیں، خواہ بعض اوقات کافی تلخ محسوس ہو۔ اگر کوئی بلاوجہ خواہشات کی پیروی میں حماقت وبیوقوفی سے اس کا غلط استعمال کرے، تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے، اور اس کے حق میں اللہ کے نزدیک ابغض الحلال شمار ہوگا۔

انواع طلاق

مختلف اعتبار سے طلاق کی تین تقسیم ہوگی (۱) طلاق کے لئے مستعمل الفاظ کی طلاق پر دلالت کے سلسلہ میں وضاحت وعدم وضاحت کے اعتبار سے صریح اور کنایہ دو تقسیم ہوگی۔ (۲) بیوی کی حالت کے اعتبار سے بدعی، سنی، یا نہ بدعی نہ سنی، تین تقسیم ہوگی (۳) مال کے عوض میں ہونے، نہ ہونے کے اعتبار سے خلع، اور عام طلاق، دو تقسیم ہوگی۔ (خلع کا تذکرہ گذر چکا)

پہلی قسم : صریح اور کنایہ

(۱) صریح طلاق : طلاق کے لئے مستعمل لفظ قطعاً طلاق پر دلالت کرے، اور دوسرے کسی مفہوم کا اس میں احتمال نہ ہو، تو اسے صریح کہا جائے گا، طلاق کے صریح الفاظ تین ہیں طلاق، سَرَاح اور فِرَاق اور ان سے مشتق الفاظ، مثلاً: أَنتِ طَالِقٌ (تو مطلقہ ہے) فَارَقْتُكِ (میں نے تجھے جدا کردیا) یہ الفاظ صریح اس لئے ہیں کہ شریعت میں بکثرت وارد، اور قرآن میں بارہا طلاق کے لئے مستعمل ہیں۔ مثلاً دیکھئے سورہ طلاق آیت ۲۔۱، سورہ احزاب، آیت ۲۸، دیگر زبانوں میں لفظ طلاق کا ترجمہ بھی صریح کہلائے گا۔

(۲) طلاقِ کنایہ : اس سے ہر وہ لفظ مراد ہے جس میں طلاق اور غیر طلاق، دونوں مفہوم کا احتمال ہو، (اور قریبی درجہ میں طلاق پر دلالت کرسکے) مثلاً: تو خالی ہے (یعنی مجھ سے خالی ہے) تو بَرِیَہ ہے (مجھ سے خالی اور جدا ہے) تو بَتَّہ ہے (مجھ سے کٹی ہوئی ہے) اپنے گھر چلی جاؤ، جہاں جی چاہے جاؤ، مجھ سے دور ہو جاؤ، میرے لئے اجنبی بن جاؤ، تیری رسّی تیرے کندھے پر (یعنی میں نے تجھ اونٹ کی طرح آزاد چھوڑ دیا) تو مجھ پر حرام ہے۔ وغیرہ طلاق میں کنایہ لفظ کے استعمال کی دلیل بخاری کی حدیث ہے، جس میں ایک عورت سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا ''اِلْحَقِي بِأَهْلِكِ '' (اپنے گھر چلی جاؤ)

حکم : صریح لفظ کے استعمال سے طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ طلاق کی نیت ہو یا نہ ہو، کیونکہ لفظ کی صراحت اور مفہوم پر اس کی قطعی دلالت نے تلفظ کے وقت اسے نیت سے بے نیاز کردیا۔

کنایہ لفظ سے شوہر اگر طلاق کا قصد کرے، تبھی طلاق ہوگی، گرچہ لوگوں میں وہ لفظ طلاق کے لئے مشہور ہو، لیکن طلاق کی نیت نہ ہو، کچھ اور ارادہ ہو، یا کسی ارادہ کے بغیر یہ لفظ کہے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ حضرت کعب بن مالک جب غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے انھیں بیوی سے اعتزال (کنارہ کشی) کا حکم دیا، تو انھوں نے بیوی سے کہا: ''اپنے گھر والوں میں جا کر رہو'' (بخاری) اس سے طلاق نہ ہوئی، بلکہ جب ان کی توبہ نازل ہوئی تو بیوی بغیر جدید عقد کے ان کے پاس آ گئی، کیونکہ انھوں نے یہ لفظ طلاق کی نیت سے نہیں کہے تھے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ فی الحال وہ ان سے الگ تھلگ رہے۔

دوسری قسم : سُنّی، بدعی، نہ سنی نہ بدعی

(۱) سُنّی طلاق : عورت حیض ونفاس سے پاک ہو، اور اس پاکی میں شوہر نے اس سے صحبت نہ کی ہو، تو ایسی پاکی میں طلاق دینا سنی طلاق کہلائے گا۔

(۲) بدعی طلاق : اگر بیوی حیض، یا نفاس میں ہو، یا ایسی پاکی میں ہو، جس میں شوہر نے اس سے صحبت کی ہو، تو اس حالت کی طلاق بدعی طلاق ہوگی۔

(۳) نہ سُنّی نہ بدعی : بیوی ابھی کمسن ہو کہ حیض کا سلسلہ شروع ہی نہ ہوا ہو، یا آئیسہ ہو یعنی اتنی عمر دراز ہو کہ حیض سے ناامید ہو چکی، یا حاملہ ہو، یا نکاح کے بعد ابھی تک، بیوی سے صحبت نہ ہوئی ہو، یا بیوی خلع کا مطالبہ کرے، تو ان حالتوں میں دی جانے والی طلاق بدعی و سنی دونوں بھی نہیں کہلائے گی۔

تینوں انواع کا حکم : (۱) سُنّی طلاق : یہ جائز ہے، اور طلاق دینے کا شرعی طریقہ ہے، جبکہ شوہر کو طلاق ہی دینا ہو، خواہ ایک طلاق دے، یا تینوں ایک ساتھ۔ لیکن سنت یہ ہے کہ ایک پاکی میں صرف ایک یا دو طلاق پر اکتفا کرے، تا کہ ندامت کی صورت میں رجوع کرسکے۔

ابتداء میں سورہ طلاق کی پہلی آیت گذری، جس میں بیویوں کو عدت پر طلاق دینے کا حکم دیا، یعنی ایسے وقت کہ وہ عدت شروع کرسکیں، اور وہ طہر (پاکی) ہے، کیونکہ حیض کی مدت عدت میں شمار نہ ہوگی۔

(۲) بدعی طلاق : یہ طلاق حرام ہے، لیکن واقع ہوگی، البتہ شریعت کے مقررہ اصول کے خلاف ہے، اس لئے گناہ ہوگا۔ اگر کوئی ایسی طلاق دے، تو اسے رجعت کرلینا سنت ہے، حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض میں طلاق دے دی تو آپ ﷺ نے رجعت کا حکم دیا (یعنی دوبارہ اسے نکاح میں واپس لینا) پھر ایک پاکی کے بعد حیض اور اس کے بعد پاکی آئے تو اس میں جی چاہے تو صحبت سے قبل طلاق کی اجازت دی، اور فرمایا کہ یہی وہ عدت ہے جس میں اللہ نے عورتوں کے طلاق کا حکم دیا ہے"۔(متفق علیہ)

حیض میں طلاق سے عورت کی عدت کی مدت بڑھ جائے گی، کیونکہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اور کسی کو ضرر پہنچانا شرعاً منع ہے، اور صحبت شدہ پاکی میں حمل کے استقرار کا احتمال ہے، اور ممکن ہے کہ حاملہ ہونے کی صورت میں طلاق کا ارادہ نہ ہو۔

(۳) نہ سنی نہ بدعی : یہ طلاق جائز ہے اور واقع ہوگی، کیونکہ اس میں بیوی کا کوئی نقصان نہیں، اس لئے کہ کمسن اور بڑھیا (جو حیض سے مایوس ہوچکی ہو) کی عدت مہینوں کے اعتبار سے ہے، حاملہ کی عدت ہر حال میں وضع حمل ہے، اور بیوی کا رقم دے کر خلع لینا اس پر دلیل ہے کہ شوہر سے چھٹکارا چاہتی ہے، گو عدت بڑھ جائے، اس میں کوئی حرج نہیں،

طلاق کے ارکان : (۱) مُطلِّق (طلاق دینے والا) (۲) صیغہ (۳) محل (جسے طلاق دی جائے) (۴) ولایت (سلطنت وقبضہ) (۵) قصد

مُطلِق (طلاق دینے والا) : مطلق کا مکلف ہونا شرط ہے، گو طلاق کو معلق کرے، پس غیر مکلف کی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ حدیث کی رو سے تین افراد مرفوع القلم ہیں: "بچہ بالغ ہونے تک، پاگل افاقہ ہونے تک اور سونے والا بیدار ہونے تک" (صححہ ابوداود وغیرہ) اور جب یہ مرفوع القلم ہیں، تو ان کا تصرف باطل وغیر معتبر ہوگا، البتہ جو نشہ میں ہو، اس کی طلاق واقع ہوگی، جبکہ اس طرح نشہ اور زوال عقل میں اس کا قصور ہو، اگر کسی کو شراب پینے پر مجبور کیا جائے، یا اسے علم نہ ہو کہ اس مشروب میں نشہ ہے، یا بطور علاج کوئی نشہ آور چیز استعمال کرے، تو ان صورتوں میں نشہ آنے پر طلاق دے تو نافذ نہ ہوگی۔

مطلق اپنے اختیار سے طلاق دے، اگر اکراہ (جبر) کی وجہ سے دے، تو طلاق واقع نہ ہوگی گو وہ توریہ نہ کرے (یعنی بظاہر طلاق کے الفاظ ادا کرنا اور دل میں کسی اور مفہوم کا ارادہ کرنا جس کے الفاظ میں گنجائش ہو، یہ ضروری نہیں) کیونکہ حدیث میں ہے "اکراہ میں طلاق نہیں" (واقع ہوگی) (ابوداود، والحاکم علی شرط مسلم) توریہ کی ایک شکل یہ ہوگی کہ بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کی نیت کرے، یا بندھن کھولنا مراد لے، یا ماضی میں طلاق کے بارے میں جھوٹی خبر کے ارادہ سے کہے۔

اکراہ کے شرائط : (اس کی تفصیل باب الاکراہ میں گذر چکی) اکراہ اور جبر کرنے والا جس بات کی دھمکی دے فوراً اور ظلماً اس کے کرگذرنے پر اپنی حکومت یا طاقت وغلبہ کی بنیاد پر قادر ہو، اور مکرہ (مجبور) بھاگ کر، یا کسی کی مدد سے اس کے دفاع سے عاجز ہو، نیز اس کا گمان یہ ہو کہ متعلقہ وماموره کام اگر انجام نہ دوں گا تو یہ دھمکی پر باقاعدہ عمل کرے گا (دھمکی صرف برائے دھمکی نہیں ہے)

اکراہ کسی تکلیف دہ وخطرناک چیز سے ڈرانا و دھمکی دینا ہو، مثلاً سخت مار، قید، مال برباد کرنا، کسی منصب سے معزولی جبکہ یہ اس منصب کا مستحق واہل ہو، وغیرہ امور، اور لوگوں کے درجات واحوال کے اعتبار سے اس میں اختلاف ہوگا۔ ایک شریف شخص کے لئے معمولی مار بھی اکراہ ہوگی، ایک مالدار کے حق میں معمولی رقم کی دھمکی اکراہ نہ ہوگی۔ اگر مستقبل کے متعلق دھمکی ہو، مثلاً میں تمہیں کل سزا دوں گا، یا ظلماً نہ ہو،

مثلاً جس پر قصاص عائد ہواس سے یہ کہنا کہ بیوی کو طلاق دو، ورنہ تم سے قصاص لوں گا، تو یہ اکراہ نہیں ہے (اور طلاق دے تو نافذ ہوگی)

اگر مُکرَہ کی جانب سے اختیار و مرضی پایا جائے تو طلاق نافذ ہوگی۔ مثلاً تین طلاق پر جبر ہو، اور یہ ایک یا دو دے، صریح پر اکراہ ہو اور یہ کنایہ دے، یا معلق طلاق کے لئے اکراہ ہو، اور یہ فوراً دے دے، یا طَلَّقْتُ کہنے پر اکراہ ہو اور یہ سَرَّحْتُ کہے، یا مبہم طلاق پر اکراہ ہو، اور یہ معین بیوی کو طلاق دے، تو ان صورتوں میں طلاق نافذ ہوگی۔

اگر اکراہ کے مطابق طلاق دے، لیکن خود طلاق کی نیت سے دے تو طلاق ہوگی

اگر کوئی کہے: میری بیوی کو طلاق دو ورنہ قتل کروں گا (گویا جبراً طلاق کے لئے وکیل بنا رہا ہے) اور مکرَہ طلاق دے تو طلاق واقع ہوگی۔ (کیونکہ خود اکراہ کرنے والے کی بیوی کا مسئلہ ہے)

صیغہ: (صیغہ کی کچھ تفصیل گذر چکی) صیغہ ایسا ہو جو صراحتاً یا کنایۃً آپس میں جدائی پر دلالت کرے۔ صریح لفظ سے بغیر نیت کے بھی طلاق ہوگی، طلاق، فراق، اور سراح اور ان کے ترجے سے مشتق الفاظ صریح ہیں۔ (مفاداۃ اور خلع سے مشتق الفاظ کی صراحت کا تذکرہ خلع میں گذر چکا)

مثلاً: میں نے تجھے طلاق دی، تو طالق، (طلاق شدہ) ہے، تو مُطلَّقہ ہے، اے طالق وغیرہ۔

کنایہ لفظ (یعنی جس میں طلاق وغیرہ طلاق دونوں مفہوم کا احتمال ہو) کی ادائیگی کے وقت جملہ کے ابتداء سے انتہا تک کسی بھی حصہ میں طلاق کی نیت ہو، تو طلاق ہوگی، ورنہ نہیں (کنایہ کی کچھ مثالیں گذر چکیں) تم طلاق ہو، تم مطلَقہ ہو (بغیر تشدید کے) تم بائنہ ہو عدت گذارو مجھے چھوڑ دو، نکل جاؤ، مجھ سے دور ہو جاؤ، اپنا توشہ لے لو، سفر کرو، مجھ سے پرائی واجنبی بن جاؤ، مجھ سے پردہ کرو، میں تم سے بری ہوں، مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، تم جانو تمہارا کام جانے، تم اپنے نفس کی ذمہ دار ہو، تم نکاح کرلو، تمہیں (دوسرے شوہروں کے لئے) حلال کردیا، تمہیں تمہارے گھر والوں کو یا لوگوں کو، یا شوہروں کو یا پرائے لوگوں کو ہبہ کیا، تمہیں آزاد کردیا، میرا تم پر کوئی اختیار نہیں وغیرہ الفاظ طلاق کی نیت سے ادا کرے، تو طلاق ہوگی

صرف دل میں طلاق کے قصد اور نیت سے طلاق نہ ہوگی، اسی طرح صرف زبان کو حرکت دینا کافی نہیں، بلکہ اتنی آواز سے طلاق دینا شرط ہے کہ اگر اس کی سماعت صحیح ہو، اور کوئی شور وعارضی نہ ہو، تو خود سن سکے (جیسا کہ نماز کے قولی ارکان میں شرط ہے)

اگر شوہر کہے: تیسری طلاق عیب ہے، یا نقص ہے، تو کھڑی ہوجا، بیٹھ جا، دروازہ کھلا ہے وغیرہ تو اس سے طلاق نہ ہوگی، گو نیت ہو، کیونکہ یہ الفاظ ایسے نہیں کہ بلا تاسف طلاق کے مفہوم کو محتمل ہو، اگر یہ الفاظ کسی علاقہ میں طلاق کے لئے مشہور ہوں تب بھی اس سے طلاق نہ ہوگی۔ کنایہ سے طلاق کے لئے یہ ضروری ہے کہ قریبی درجہ میں اس میں طلاق کا احتمال ہو۔

کنایہ لفظ سے قبل بیوی کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہو، یا غصہ کی حالت میں یہ لفظ کہے، یا ان میں سے کوئی لفظ کسی علاقہ میں طلاق کے لئے کافی مشہور ہو، تو اس وجہ سے کنایہ صریح نہ کہلائے گا (پس ان صورتوں میں بھی کنایہ سے بغیر نیت کے طلاق نہ ہوگی)

طلاق کا لفظ ظہار کے لئے یا ظہار کا لفظ طلاق کے لئے کنایہ نہیں، گو دونوں تحریم کی افادیت میں مشترک ہیں، کیونکہ دونوں کا اپنی اپنی جگہ نفاذ ممکن ہے، لہٰذا دوسرے مفہوم میں نہیں لیا جائے گا، کیونکہ اصول یہ ہے کہ جو اپنے باب میں صریح ہو، اور وہ اپنی جگہ اس کا نفاذ ممکن ہو، تو دوسرے مفہوم میں بطور کنایہ اسے نہیں لیا جائے گا۔

تحریم: اگر بیوی سے کہے: تو مجھ پر حرام، یا میں نے تجھے حرام قرار دیا، اور اس جملہ سے طلاق کی نیت ہو تو طلاق اور ظہار کی

نیت ہو تو ظہار، اور دونوں کی نیت ہو تو، اسے اختیار ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی ایک قرار دے، اور اگر طلاق وظہار کی نیت نہ ہو، مثلاً اس کے بدن، صحبت، فرج یا سر کے تحریم کی نیت ہو، یا کوئی نیت نہ ہو، تو اس جملہ سے بیوی اس پر حرام نہ ہوگی، لیکن اس پر قسم کا کفارہ لازم ہے، جیسا کہ حضرت ماریہؓ کے واقع سے مستفاد ہوتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے انھیں اپنے اوپر حرام قرار دیا تو سورہ تحریم کی ابتدائی آیات میں کفارہ یمین کو فرض قرار دیا گیا (نسائی)

بیوی یا باندی کے علاوہ کسی چیز کو حرام قرار دے، مثلاً یہ کپڑا مجھ پر حرام، یہ کھانا مجھ پر حرام، تو یہ لغو ہے، اس میں کوئی کفارہ لازم نہیں۔

اشارہ: جو گفتگو پر قادر ہو، اس کا اشارہ طلاق کے متعلق لغو وغیر معتبر ہے۔ مثلاً بیوی طلاق کا مطالبہ کرے تو شوہر ہاتھ سے اشارہ کرے کہ تو چلی جا، تو اس سے طلاق نہ ہوگی، کیونکہ زبان استعمال نہ کرتے ہوئے صرف اشارہ کرنا یہ بتلاتا ہے کہ اس کا طلاق کا ارادہ نہیں، اگر ارادہ ہو بھی تو اشارہ افہام کے لئے نادر طور پر استعمال ہوتا ہے، اور درحقیقت یہ افہام کے لئے موضوع بھی نہیں، بخلاف تحریر کے، کہ وہ الفاظ کی طرح افہام کے لئے موضوع حروف ہیں۔

فائدہ: گفتگو پر قادر شخص کا اشارہ صرف امان، فتویٰ اور اجازت میں گفتگو کی طرح معتبر ہے، دیگر مسائل میں طلاق کی طرح غیر معتبر ہے۔

گونگے کا اشارہ: گونگے کا اشارہ طلاق، خرید وفروخت، نکاح، اقرار، دعویٰ وغیرہ میں معتبر ہے، گو وہ تحریر پر قادر ہو، خواہ گونگا پن اصلی ہو یا عارضی، گونگا شخص نماز میں اشارہ کرے، تو اس سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی (اسے کلام نہ سمجھیں گے) گونگا گواہ بنے تو معتبر ہے، لیکن اشارہ میں گواہی ادا کرے تو معتبر نہیں، کوئی شخص گفتگو نہ کرنے کی قسم کھائے، پھر گونگا ہونے کے بعد اشارہ میں کلام کرے، تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اگر گونگے کا اشارہ ایسا واضح ہو کہ ہر کوئی اس کا مطلب سمجھتا ہے، تو یہ صریح ہے، اور صرف ذہین وفطین ہی سمجھ سکتے ہوں، تو کنایہ ہے، لہٰذا نیت کی ضرورت ہوگی، اور اس کے اشارہ یا تحریر سے نیت کا اندازہ ہوگا۔

تحریر: تحریر کنایہ ہے جبکہ ایسی جگہ لکھے جس پر تحریر ثبت ہو، جیسے کاغذ، کپڑا وغیرہ، خواہ لکھنے والا بات کرسکتا ہو، یا گونگا ہو، نیز صریح لفظ لکھے یا کنایہ (دونوں صورتوں میں تحریر کنایہ شمار ہوگی) لہٰذا طلاق کی نیت سے لکھے تو طلاق ہوگی، ورنہ نہیں، صریح طلاق کی تحریر لکھتے وقت یا بعد میں زبان سے ادا کرے تو طلاق ہوگی، اگر وہ دعویٰ کرے کہ محض تحریر پڑھنے کا ارادہ تھا، نہ کہ طلاق کا، تو اس کی بات مان لی جائے گی، کنایہ تحریر کو زبان سے پڑھنے سے بغیر نیت کے طلاق نہ ہوگی۔ گونگا شخص تحریر میں آگے یہ بھی لکھے کہ میں نے طلاق کا قصد کیا ہے، یا (طلاق کی نیت کے بارہ میں) اشارہ کرے۔ اگر ہوا یا پانی پر لکھے تو یہ کنایہ نہیں ہے (اس سے طلاق نہ ہوگی)

اگر شوہر یہ لکھے کہ تجھے خط ملے، تو تجھے طلاق، تو خط ملنے پر طلاق ہوگی، اگر لکھے کہ تو جب خط پڑھے تو تجھے طلاق، پھر بیوی خط پڑھے، یا صرف مطالعہ کرکے سمجھ لے (زبان سے الفاظ ادا نہ کرے) تو طلاق ہوگی۔ اگر بیوی پڑھنا نہ جانتی ہو، اور شوہر اس بات سے واقف بھی ہو، تو کسی دوسرے کے اس کو خط پڑھ کر سنانے سے طلاق ہوگی۔ اگر بیوی خود پڑھ سکتی ہے، یا اس کا ان پڑھ ہونا شوہر کو معلوم نہ ہو، تو اس طرح دوسرے کے سنانے سے طلاق نہ ہوگی۔

شوہر کسی دوسرے سے طلاق کی تحریر لکھوائے اور اسے نیت کا بھی حکم دے، تو یہ کافی ہے اور طلاق ہوگی، اگر دوسرا لکھے اور شوہر نیت کرے یا اس کے برعکس تو طلاق نہ ہوگی۔

محل : یہ شرط ہے کہ طلاق کا محل بیوی ہو، گو رجعی عدت میں ہے، پس طلاق کو بیوی کی طرف یا اس کے کسی متصل جز کی طرف منسوب کرے، تو طلاق واقع ہوگی، متصل جز یعنی مثلاً: چوتھائی حصہ، ہاتھ، بال، ناخن، خون، دانت وغیرہ، پس پہلے مذکورہ جز پر طلاق واقع ہوگی، پھر بطور سرایت بقیہ پر بھی واقع ہوگی۔ فضلہ (یعنی جو چیز طبعی طور پر بدن کے منافذ سے نکلے) کی طرف، مثلاً تھوک، منی، دودھ یا پسینہ وغیرہ کی طرف طلاق کی نسبت کرے تو طلاق نہ ہوگی۔

(اگر کوئی بیوی سے کہے: تیرے دانت کو طلاق، یا بال کو طلاق، تو طلاق ہوگی، اگر کہے: تیرے پسینہ کو طلاق تو طلاق نہ ہوگی)

ولایت : (طلاق کے الفاظ ادا کرتے وقت) طلاق کے محل پر عقد کے ذریعہ مُطلِّق کی ملکیت ہو، پس کسی اجنبی عورت پر یا بائنہ پر طلاق واقع ہوگی گو معلق کرے، اگر اجنبیہ سے، یا طلاقِ بائنہ کے بعد کہے: تجھے طلاق ہے، یا میں نے تجھ سے نکاح کیا تو تجھے طلاق، یا تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق یا جس عورت سے بھی میں نکاح کروں اسے طلاق، تو ان صورتوں میں آئندہ اس عورت سے نکاح کے بعد اور گھر میں داخل ہونے کے بعد بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ کہنے والے کو فی الحال محل پر ولایت حاصل نہیں ہے۔ معلق طلاق دے تو تعلیق کے وقت سے طلاق تک (معلق علیہ کے وجود تک) ملکیت کا پایا جانا شرط ہے، (درمیان میں بھی ملکیت ختم نہ ہو)

حدیث : (۱) ''جس (محل) کے تم مالک ہو، وہیں طلاق واقع ہوگی'' (صحیح اخرجه ابوداود، ترمذی، ابن ماجه، ابن ابی شیبه، طحاوی فی المشکل، ابن الجاور، دار قطنی، حاکم، بیهقی، احمد)

(۲) ''جس نے نکاح نہیں کیا اس کی طلاق نہیں (واقع ہوگی)'' (حاکم وقال صحیح علی شرط الشیخین ووافقه الذهبی والالبانی، طیالسی، بیهقی)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: کوئی شخص کہے کہ میں نے فلانی عورت سے نکاح کیا تو اسے طلاق، تو نکاح سے قبل اس طرح کہنے سے طلاق نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (یَآ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَکَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ) (یعنی اے ایمان والو! جب تم مؤمنات سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دو) یہ نہیں فرمایا کہ جب تم انھیں طلاق دو پھر ان سے نکاح کرو''۔ امام بخاری و بیہقی وغیرہ نے بعض صحابہ اور کئی تابعین ائمہ کرام سے اس مسئلہ کو نقل فرمایا ہے کہ نکاح سے قبل طلاق کا کوئی اعتبار نہیں۔ (فتح الباری ۹/۳۸۱، معرفه السنن ۵/۴۴۶، تلخیص ۳/۲۱۰، ارواء الغلیل ۶/۱۷۳، ۷/۱۵۲)

جو عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو، اس پر طلاق واقع ہوگی، کیونکہ رجعت کے حق کی وجہ سے ابھی اس پر ولایت باقی ہے۔

اگر طلاق کو کسی صفت پر معلق کرے، پھر بیوی شوہر سے بائنہ (جدا) ہو جائے، پھر دوبارہ نکاح کے بعد وہ صفت پائی جائے، تو طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ جس نکاح میں معلق کیا تھا وہ ختم ہو چکا۔ (مثلاً کوئی کہے تو نے زید سے بات کی تو تجھے طلاق، پھر اپنی بیوی کو طلاق دے، آئندہ دوبارہ اس سے نکاح کرے، اور وہ زید سے بات کرے تو اس سے طلاق نہ ہوگی)

طلاق کی تعداد : ایک آزاد شخص تین طلاق (تک) دے سکتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ سے تیسری طلاق کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: ''اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَان'' (بقره: ۲۲۹)۔ اگر کسی نے ایک یا دو طلاق کے بعد رجعت کی یا از سرِ نو نکاح کیا، تو درمیان میں وہ عورت دوسرے شوہر سے نکاح کر چکی ہو، تو اب صرف بقیہ طلاق کا مالک ہوگا (یعنی ایک دیا تو دو کا، اور دو دے چکا تو ایک کا) اگر کوئی مکمل تین طلاق دے چکا، پھر تمام شرائط پائے جانے کے بعد آئندہ دوبارہ اس سے نکاح کرے، تو اب از سرِ نو تین طلاق کا اختیار ہوگا۔

مرض الموت میں طلاق : صحت کی طرح مرض الموت میں بھی طلاق واقع ہوگی۔ اگر بیوی رجعی عدت میں ہو، اور

زوجین میں سے کوئی مرجائے تو دوسرا اس کا وارث ہوگا، کیونکہ ابھی زوجیت کے آثار باقی ہیں، اسی لئے اسے طلاق واقع ہوتی ہے، نیز اس سے ایلاء، ظہار اور لعان کرنا صحیح ہے، اور اس کا نفقہ واجب ہے۔

اگر بیوی بائنہ ہو چکی ہو، تو عدت میں دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے، کیونکہ زوجیت کا تعلق کٹ چکا۔

قصد : طلاق کا لفظ اُسی مفہوم و مطلب کے قصد سے زبان سے ادا کرنا شرط ہے۔ لہٰذا کوئی دوسرے کی طلاق نقل کرے، کہ فلاں نے کہا میری بیوی پر طلاق، یا نیند میں زبان سے طلاق کا جملہ نکلے، تو طلاق نہ ہوگی۔ اسی طرح جو طلاق کے الفاظ کے مفہوم سے ناواقف ہو، گو طلاق کی نیت سے ادا کرے، یا بلا قصد زبان ان الفاظ کی طرف سبقت کر جائے (سبقت لسانی ہو) تو طلاق نہ ہوگی، لیکن شوہر ایسی بات کا دعویٰ کرے، جو طلاق کے نفاذ سے مانع ہو، تو ظاہراً بغیر قرینہ کے اس کی تصدیق نہ کی جائے گی، کیونکہ اس سے دوسرے کا حق متعلق ہے۔ (مثلاً کوئی کہے: تجھے طلاق ہے، پھر دعویٰ کرے کہ سبقت لسانی ہوئی تو بغیر قرینہ کے قبول نہ کریں گے) البتہ درحقیقت وہ سچا ہو، تو اسے نفع پہنچائے گا اور بیوی اسے سچا سمجھ رہی ہے تو اس کی بات مان سکتی ہے (اور طلاق نہ ہوگی)

قرینہ : مثلاً کسی کی بیوی کا نام طالق ہو، وہ اسے، یا طالق (اے طالق) کہے اور طلاق کا قصد نہ ہو، تو طلاق نہ ہوگی، بلکہ پکارنے پر محمول کریں گے، اگر طلاق کی قصد ہو تو طلاق ہوگی۔

کسی کی بیوی کا نام طارق، طالب، یا طالع ہو، اور وہ اسے ''یا طالق'' کہے اور کہے کہ میں اسے پکار رہا تھا، لیکن زبان پلٹ گئی (اور آخری حرف قاف نکلا) تو طلاق نہ ہوگی، اگر وہ یہ عذر پیش نہ کرے، تو طلاق ہوگی۔

تفریحاً طلاق : اگر کوئی بطور تفریح و مذاق یا بکواس بیوی کو طلاق دے (یعنی اپنے قصد و اختیار سے طلاق کے صریح الفاظ ادا کرے، لیکن طلاق کے وقوع کی نیت نہ ہو) یا بیوی استہزاء یا ناز کے طور پر طلاق کا مطالبہ کرے اور شوہر بطور استہزاء یا تفریح کہہ دے: میں نے تمہیں طلاق دی، تو طلاق واقع ہوگی۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: '' تین مسائل ایسے ہیں کہ ان میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے، اور ٹھٹھا و بکواس بھی سنجیدگی ہے: طلاق، اور نکاح اور رجعت'' (ابوداود ، ابن ماجه طحاوی ، دار قطنی ، حاکم ، شرح السنته ، وحسنه الترمذی والالبان ۔ الارواء ۲۲۴/۶) (یعنی سنجیدگی کے طور پر انجام دے یا بطور تفریح نفاذ ہوگا)

بیوی تاریکی میں، یا پردہ کے پیچھے ہو، یا اس کے ولی یا وکیل نے نکاح کرایا تھا اور یہ بیوی کو جانتا نہ تھا، لہٰذا اسے اجنبی عورت سمجھ کر طلاق دے دے، تو طلاق واقع ہوگی۔

بیوی کو طلاق کی تفویض (طلاق کا اختیار بیوی کو سونپنا)

منجز فوری (فی الحال) طلاق بیوی کے سپرد کرنا دراصل اسے طلاق کا مالک بنانا ہے۔ خواہ صریح لفظ ہو یا کنایہ، مثلاً یوں کہنا: تو اپنے آپ کو طلاق دے، یا اپنے نفس کو جدا کر، پس اس طلاق کے واقع ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ بیوی فوراً خود کو طلاق دے، گو کنایہ لفظ سے ہو، اگر بیوی یہ کہے: میں خود کو کیسے طلاق دوں، پھر دے دے، یا معمولی غیر متعلق گفتگو ہو، پھر طلاق دے دے، تو طلاق واقع ہوگی، زیادہ تاخیر ہو تو واقع نہ ہوگی۔ بیوی کے طلاق دینے سے قبل شوہر کا رجوع کرنا صحیح ہے، (پھر طلاق نہ ہوگی)

اگر شوهر کهے : تم جب بھی چاہو اپنے آپ کو طلاق دو، تو اس صورت میں کئی علماء کے نزدیک فوراً دینا ضروری نہیں، کبھی بھی دے تو طلاق ہوگی، لیکن بعض علماء یہاں بھی فوراً دینا ضروری سمجھتے ہیں، مگر شوہر بیوی کو اپنی طلاق کا وکیل بنائے تو فوراً دینا شرط نہیں۔

اگر شوہر کہے: تم ہزار میں خود کو طلاق دو تو بیوی نے دے دی تو ہزار میں بائنہ ہوگی۔ اگر شوہر کہے: تم خود کو طلاق دو اور کسی خاص عدد کی نیت کی (دو طلاق یا تین طلاق) اور بیوی نے اسی عدد یا اس سے کم وبیش کی نیت سے طلاق دی، تو جس عدد پر دونوں متفق ہوں، اس کا اعتبار ہوگا، (یعنی جس نے کم کی نیت کی وہ واقع ہوگی) اگر دونوں نے یا کسی ایک نے کسی عدد کی نیت نہیں کی، تو ایک طلاق ہوگی۔

اگر شوہر تین طلاق کا اختیار دے اور بیوی ایک دے یا اس کے برعکس، تو ایک واقع ہوگی۔ پہلی صورت میں فوراً بیوی دوسری اور تیسری طلاق بھی دے سکتی ہے۔ اگر شوہر کہے: تین طلاق دو، اور بیوی کہے: میں نے خود کو طلاق دی، لیکن کسی عدد کا ذکر یا نیت نہ ہو تو تین ہوگی۔

طلاق کی تعداد

اگر شوہر صریح یا کنایہ لفظ سے طلاق دے، اور تعداد کی نیت ہو، تو جتنی نیت ہے، اتنی طلاق واقع ہوگی، اگر تجھے طلاق دیا، کہے اور نیت تین طلاق کی ہو، تو تین واقع ہوگی۔

اگر شوہر تجھے طلاق دیا تین طلاق، کہنے کا ارادہ کرے، اور طلاق دیا کہنے سے قبل بیوی مرجائے، تو طلاق نہ ہوگی، کیونکہ لفظ مکمل ہونے سے قبل بیوی محلِ طلاق نہ رہی، اگر طلاق کے الفاظ مکمل ہونے کے بعد مرے (گو تین طلاق کہنے سے قبل) تو تین طلاق واقع ہوگی۔

جس بیوی سے صحبت ہو چکی ہو، اسے یوں کہے: تو مطلقہ ہے، مطلقہ ہے، مطلقہ ہے، یا تو مطلقہ ہے، تو مطلقہ ہے، تو مطلقہ ہے، اور ان کلمات کے درمیان سانس سے زیادہ فاصلہ ہو، یا (فاصلہ تو نہ ہو) لیکن تاکید کی نیت سے نہ کہے (بلکہ مستقل جدا جدا طلاق کی نیت سے یا بلا کسی نیت کے کہے)، یا تیسرے طلاق کے ذریعہ پہلے کی تاکید کی نیت کرے، تو تین طلاق واقع ہوگی۔ اگر پہلی صورت میں تاکید کا دعویٰ کرے تو ظاہراً قبول نہیں کریں گے (لیکن دعویٰ میں سچا ہو تو باطناً ایک ہی ہوگی) اگر اوّل کو دوسرے و تیسرے سے مؤکد کرے، تو ایک ہوگی، صرف دوسرے سے مؤکد کرے، یا دوسرے کو تیسرے سے مؤکد کرے تو دو طلاق ہوگی۔ طلاق کے الفاظ الگ الگ استعمال کرے، یا کنایہ الفاظ بہ نیت طلاق اس طرح ادا کرے، تب بھی یہی تفصیل ہوگی۔ اگر بیوی سے صحبت نہ ہوئی ہو تو مذکورہ تمام صورتوں میں ایک ہی طلاق ہوگی، کیونکہ پہلی طلاق سے ہی وہ بائنہ ہو جائے گی۔

اگر معلق طلاق کو اس طرح دہرائے مثلاً تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، اور ہر جملہ سے مستقل طلاق کی نیت ہو، تو تعداد پر محمول ہوگا، ورنہ ایک ہی طلاق ہوگی۔

اگر نصف یا پاؤ طلاق دے تو ایک طلاق ہوگی۔

ان الفاظ سے ایک ہی طلاق ہوگی: تجھے طلاق ہے دنیا بھر کر، پہاڑ کے مثل، اعظم طلاق، اکبر طلاق، سب سے لمبی، سب سے چوڑی طلاق، اشد طلاق وغیرہ۔

استثناء

دیگر مسائل کی طرح طلاق میں بھی استثناء معتبر صحیح ہے، جبکہ شرائط موجود ہوں، جن کا تذکرہ 'اقرار' کے باب میں گذر چکا، یعنی مستثنیٰ منہ (جس جملہ سے استثناء کرنا ہے) مکمل ہونے سے قبل استثناء کی نیت ہو، سانس لینے کے وقت سے زیادہ فاصلہ و تاخیر نہ ہو، اور مستثنیٰ منہ کا استغراق نہ ہو (یعنی نتیجہ صفر نہ ہو)

اگر شوہر کہے: تجھے تین طلاق مگر دو (سوائے دو) تو ایک طلاق ہوگی۔

اگر کہے: تجھے تین طلاق مگر دو اور ایک، تو ایک ہوگی۔
اگر کہے: تجھے دو اور ایک طلاق مگر ایک، تو تین ہوگی۔
اگر معلق یا منجز طلاق کے پہلے یا بعد میں فوراً انشاء اللہ (اگر اللہ چاہے) یا اِنْ لَمْ یَشَاءُ اللّٰہُ (اگر اللہ نہ چاہے) کہے، اور طلاق کو اللہ کی مشیت یا عدم مشیت پر معلق کرنے کے قصد سے کہے تو طلاق منعقد ہی نہ ہوگی۔ مثلاً تجھے طلاق ہے انشاء اللہ، اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو انشاء اللہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے اگر اللہ نہ چاہے۔ تعلیق کے قصد سے نہ کہے تو طلاق ہوگی، یعنی عادت کی وجہ سے سبقت لسانی ہوئی اور یہ کلمہ نکلا یا تبرک کا کہا، یا یہ کہ ہر بات اللہ کے ارادہ سے ہی ہوتی ہے، یا پتہ نہ ہو کہ تعلیق کا ارادہ تھا یا نہیں، یا بلا کسی قصد کے کہے۔ نذر، قسم، بیع، فسخ، اور نماز وغیرہ مسائل میں بھی انشاء اللہ ساتھ ملائے تو یہی تفصیل جاری ہوگی۔
اگر کہے، اے طالق انشاء اللہ تو طلاق ہوگی۔

شک

منجز یا معلق طلاق کے وقوع میں شک ہو، تو واقع نہ ہوگی، اگر تعداد میں شک ہو، مثلاً ایک دیا یا زائد، تو اقل پر عمل ہوگا (یعنی اس مثال میں ایک ہوگی) لیکن تقوی واحتیاط کا پہلو تو واضح ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے، ''جو تمہیں شک (یا بیقراری) میں ڈالے اسے چھوڑ کر ایسا پہلو اختیار کرو، جو شک (وبیقراری) میں نہ ڈالے، (ترمذی وصححہ) پس اگر رجعی طلاق میں شک ہے تو رجعت کر لے، یا تین سے کم بائن میں شک ہے، تو تجدید نکاح کر لے۔ یا تین میں شک ہے، تو خود رُک جائے اور طلاق دے دے، تا کہ یقیناً دوسرے کے لئے حلال ہو جائے، تعداد میں شک ہو، تو زائد پر محمول کر لے، دو یا تین میں شک ہو تو مغلظہ سے دوبارہ نکاح کے شرائط پائے جانے تک اس سے نکاح نہ کرے۔

طلاق وقت پر معلق کرنا

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ مسلمان اپنے شرائط کے پابند ہیں (الحاکم ونحوہ البخاری معلقاً فی الشروط والنکاح)
اگر کہے: تجھے فلاں ماہ میں یا اس کی ابتداء میں یا شروع میں طلاق، تو اس ماہ کے شروع ہوتے ہی، یعنی اس سے پہلے ماہ کے آخری دن سورج غروب ہو کر رات شروع ہوتے ہی طلاق واقع ہوگی۔ اگر اس طرح کہے: فلاں ماہ کے دن میں، یا پہلے دن، تو پہلی تاریخ کے صبح صادق کے ساتھ طلاق ہوگی۔ اگر کہے: فلاں ماہ کے آخر میں، تو ماہ کے آخری جز میں (یعنی آخری تاریخ کو غروب سے پہلے پہلے) ہوگی۔ تجھے گذشتہ کل طلاق کہے، تو ابھی ہوگی۔ تعلیق کے الفاظ، جو اگر، جب، جب بھی، جب جب بھی، جب کبھی، جس، وغیرہ۔
مثالیں: میری بیویوں میں سے جو بھی گھر میں داخل ہوئی اسے طلاق، تو جس وقت (جب) بھی داخل ہوئی، تجھے طلاق، اگر زید چاہے تو تجھے طلاق، تو جب کبھی گھر سے نکلے، تجھے طلاق۔
تعلیق کے الفاظ مثبت پہلو میں عوض اور بیوی کی مشیت کے بغیر استعمال ہوں، تو معلق علیہ کا فوراً پایا جانا ضروری نہیں، جب بھی معلق علیہ پایا جائے طلاق ہوگی۔ اگر عوض کے ساتھ ہو تو بعض الفاظ میں فوراً ہونا ضروری ہے (جس کی کچھ تفصیل خلع میں گذر چکی)
کلما (جب جب بھی، جب کبھی) کے علاوہ دیگر الفاظ تکرار کا تقاضہ نہیں کرتے، یعنی ایک مرتبہ معلق علیہ پایا گیا، تو اب تعلیق کا اثر ختم ہو گیا، دوبارہ پایا جائے، تو دوسری طلاق نہ ہوگی۔ لیکن کلما کے مفہوم کا خود تقاضا یہ ہے کہ بار بار پایا جائے تو بار بار طلاق ہوگی۔

اگر کوئی کہے : اگر تجھے طلاق دوں تو تو مطلقہ ہے، پھر ایک طلاق دے، تو صحبت شدہ بیوی کو دو طلاق ہوگی (اگر ابھی صحبت نہ ہوئی ہو، یا طلاق بالعوض ہو، یا وکیل طلاق دے تو ایک ہی ہوگی)

اگر کہے: جب جب بھی تجھ پر میری طلاق واقع ہو، تو مطلقہ ہے، پھر ایک طلاق دے، تو صحبت شدہ بیوی کو تین طلاق ہوگی (صحبت نہ ہوئی ہو تو ایک ہوگی)

اِنْ (اگر) کے علاوہ دیگر الفاظ منفی پہلو میں استعمال ہوں، تو فوراً معلق علیہ پایا جانا ضروری ہے، کوئی کہے: اگر تو گھر میں داخل نہ ہوئی، تو تجھے طلاق، تو داخلہ سے ناامیدی کے بغیر طلاق نہ ہوگی، پس عورت کی موت سے قبل طلاق کے وقوع کا حکم لگایا جائے گا۔

دیگر الفاظ میں فوراً ضروری ہے، پس کوئی کہے: جب تم گھر میں داخل نہ ہو، تو تمہیں طلاق ہے، پھر اتنا وقت گذر جائے کہ داخل ہو سکتی تھی، لیکن نہ ہوئی تو طلاق ہوگی۔

کسی کو مشیئت پر معلق : اگر بیوی سے خطاب کے جملہ میں بیوی کی مشیت پر طلاق معلق کرے، مثلاً: اگر تو چاہے تو تجھے طلاق، یا تجھے طلاق اگر تو چاہے، تو بیوی کو فوراً جواب دینا ضروری ہے، یعنی کسی غیر متعلق گفتگو یا طویل سکوت کے بغیر جواب دے، تو طلاق نافذ ہوگی، ورنہ نہیں، البتہ، جب بھی تو چاہے، جیسے الفاظ استعمال کرے تو فوراً جواب ضروری نہیں،

اگر بیوی کی مشیت پر غائبانہ صیغہ سے معلق کرے، (گو وہ موجود ہو) مثلاً اگر میری بیوی چاہے تو اسے طلاق، یا بیوی کے علاوہ کسی دوسرے کی مشیت پر معلق کرے، مثلاً: اگر تو چاہے تو میری بیوی کو طلاق تو فوراً جواب ضروری نہیں۔

جس کی مشیت پر طلاق معلق ہو، (بیوی ہو یا کوئی دوسرا) وہ اگر کہہ دے کہ "میں نے چاہا، تو ظاہراً و باطناً طلاق ہو جائے گی، جبکہ وہ بچہ یا پاگل نہ ہو، گو نشہ میں ہو یا دل میں نہ چاہے، کیونکہ تعلیق میں باطن مقصود نہیں ہوتا، کہ وہ تو مخفی ہے، بلکہ اس پر دلالت کرنے والا لفظ مقصود ہوتا ہے۔ اگر بچہ یا پاگل کی مشیت پر معلق کرے، تو اس کے چاہنے سے طلاق نہ ہوگی، کیونکہ تصرفات میں ان کے قول کا اعتبار نہیں۔ مندرجہ بالا جملوں میں سامنے والے کی مشیت سے قبل معلق کرنے والے کو رجوع کا حق نہیں ہے، کیونکہ بظاہر یہ تعلیق ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی طلاق اپنے کسی فعل پر معلق کرے، یا کسی ایسے شخص کے فعل پر جو اس کے تعلیق کی فکر و پرواہ کرے، یعنی دوستی وغیرہ کسی تعلق کی وجہ سے اسے یہ پسند نہ ہو کہ اُس کے فعل کی وجہ سے اس کی بیوی کو طلاق ہو، اور تعلیق کرنے والے کا ارادہ یہ ہو کہ اسے اِس تعلیق سے باخبر کرے، گو ابھی اسے خبر نہ ہوئی ہو، پھر پہلی صورت میں خود مطلق نے یا دوسری صورت میں اس متعلقہ شخص نے بھول کر، یا جبر و اکراہ کی وجہ سے، یا لاعلمی میں (کہ اس فعل پر طلاق معلق ہے) وہ فعل انجام دیا، تو طلاق نہ ہوگی۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہے، "بلاشبہ اللہ نے میری امت سے خطا، بھول چوک، اور وہ کام جو جبراً کروایا جائے معاف رکھا ہے" (ابن ماجه وصححه ابن حبان والحاكم)، یعنی ان امور پر مؤاخذہ و گرفت نہ ہوگی، جبکہ کسی مسئلہ میں کسی دوسری دلیل سے اس کے برعکس ثابت نہ ہو۔

اگر ایسے شخص کے فعل پر معلق کرے، جس کو اس تعلیق کی کچھ پرواہ نہ ہو، یا پرواہ تو ہو، لیکن اس کا ارادہ اسے باخبر کرنے کا نہ ہو، تو کسی بھی صورت میں اس شخص کے معلق علیہ فعل کو انجام دینے سے طلاق ہوگی، کیونکہ اس صورت میں مقصود نری تعلیق ہے، اور پہلی صورت میں مذکورہ فعل سے روکنا بھی مقصود تھا۔

جو چیز ہو چکی ہو، لاعلمی کی وجہ سے، یا بھول کر اس کی نفی پر قسم کھائے مثلاً یوں کہے: اگر زید گھر میں ہو تو میری بیوی کو طلاق، تو طلاق نہ ہوگی، لیکن اس کا مقصد یہ ہو کہ نفس الامر اور حقیقت میں ایسا ہی ہے، تو اکثر علماء کے نزدیک طلاق ہوگی۔

اشارہ

بیوی سے کہے تجھے طلاق ہے، اور دو یا تین انگلی سے اشارہ کرے، تو بغیر نیت کے زائد طلاق نہ ہوگی، اگر انگلی کے اشارہ سے طلاق کے تعداد کی نیت ہے تو اس کے مطابق طلاق ہوگی۔

اگر تو اس طرح ہے، کہے اور انگلی سے اشارہ کرے تو طلاق نہ ہوگی، اگر، تجھے اس طرح طلاق ہے، کہتے ہوئے انگلی سے تعداد کی طرف ایسا اشارہ ہو جو قصداً ہو اور سمجھ میں آئے تو تعداد بغیر نیت کے معتبر ہوگی، پس دو انگلی سے اشارہ کرے تو دو، اور تین سے کرے تو تین طلاق ہوگی۔ ایسے ہی دورانِ گفتگو عادت کے اعتبار سے انگلی کو حرکت دے تو اس کا اعتبار نہیں۔ اگر تین انگلی سے اشارہ کرے، پھر دعویٰ کرے کہ میری مراد بند دو انگلیاں تھیں، تو قسم دلا کر تصدیق کریں گے، اور دو ہی ہوگی۔

متفرقات

(۱) اگر شوہر بیوی کے ولی سے کہہ دے کہ اس کا نکاح کر دو، تو گویا وہ طلاق اور اختتامِ عدت کا اقرار کر رہا ہے۔

(۲) اگر شوہر اپنی بیوی کے متعلق کہے کہ یہ فلاں کی بیوی ہے، تو یہ بھی طلاق کا اقرار ہے۔

(۳) اگر شوہر کہے : اگر میں بیوی سے ایک سال تک غائب رہا، تو میں اس کا شوہر نہیں، تو یہ ظاہر میں یک سالہ غیر حاضری کے بعد طلاق کا اقرار ہے، لہٰذا بیوی کو اس کے ایک سال غائب رہنے کے بعد عدت گذار کر دوسرے سے نکاح کرنا جائز ہے۔

(۴) اگر طلاق کی درخواست والتماس کے طور پر شوہر سے کہے : کیا تم نے بیوی کو طلاق دے دی۔ پھر وہ کہے: جی ہاں، تو طلاق ہوگی، اور یہ صریح ہے، اگر شوہر پہلے طلاق دے چکا ہے یا نہیں، اس کی تحقیق کے طور پر پوچھے، اور شوہر اثبات میں جواب دے، تو یہ طلاق کا اقرار ہے، اگر اس اقرار دمیں جھوٹا ہے تو بظاہر اس سے طلاق ہوگی، لیکن باطناً طلاق نہ ہوگی۔ اگر شوہر یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ماضی کے طلاق کا اقرار کیا تھا جس سے رجوع کر لیا تھا، تو قسم کے ساتھ اس کا دعویٰ تسلیم کریں گے۔

(۵) کسی کی بیوی کا نام زینب ہو، اور وہ کہے : زینب کو طلاق، اور دعویٰ کرے کہ میں نے دوسری زینب (اجنبی عورت) مراد لی تھی تو ظاہراً اس کی بات قبول نہ ہوگی، البتہ حقیقتاً اس نے پرائی عورت کے نیت سے ہی کہا تھا، تو نکاح باقی ہے (اور بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہنے پر اسے گناہ نہ ہوگا)

(۶) عام آدمی کی زبان سے طلاق کے حروف صحیح ادا نہ ہو پائے، مثلاً تلاق، یا طلاک کہے، یا اس کی لغت ہی اس طرح ہو، تو اس سے طلاق ہوگی، اور اس کے حق میں یہ صریح کہلائے گی۔ ورنہ کنایہ ہوگی۔

(۷) اگر کوئی اپنی بیوی سے مخاطب ہو: اے زینب تجھے طلاق ہے اور اس کا نام جمیلہ ہو تو اشارہ کی وجہ سے طلاق ہوگی۔ اگر کوئی کہے: میری بیوی عائشہ بنت محمد مطلقہ ہے، حالانکہ اس کی بیوی خدیجہ بنت محمد ہے، تو طلاق ہوگی، کیونکہ نام کی غلطی میں حرج نہیں (جبکہ صراحتاً میری بیوی کہہ چکا ہے)

(۸) توکیل : کسی کو طلاق دینے کے لئے وکیل بنایا تو جب وکیل طلاق دے گا، مثلاً کہے گا: میں نے فلانی کو طلاق دی، تب طلاق واقع ہوگی، گو مؤکل کے جانب سے طلاق کی نیت نہ کرے۔

اگر کسی نے دوسرے سے کہا: میں نے میری بیوی کی طلاق تمہیں دی، یا تمہارے ہاتھ میں دی، یا اس کی طلاق لے جاؤ، یا اسے

طلاق دو، تو یہ توکیل ہے، لہٰذا جب بھی وکیل طلاق دے گا، تب طلاق ہوگی، شوہر کے اس طرح کہنے سے، یا اس عورت کو شوہر کے اس توکیل کی اطلاع سے طلاق نہ ہوگی۔

اگر شوہر وکیل سے کہے کہ فلاں دن ہی طلاق دینا، تو اس دن یا اس کے بعد دے، تو واقع ہوگی، اگر اس سے پہلے ہی دے تو واقع نہ ہوگی، اگر اسی ایک دن دینا مقصد ہو، تو بعد میں بھی دینا جائز نہیں، اسی دن دے۔ طلاق دینے میں توکیل صحیح ہے۔ معلق کرنے میں توکیل صحیح نہیں۔

(۹) طلاق کا ثبوت : اگر شوہر طلاق کا انکار کرے یا اقرار کرنے کے بعد انکار کرے، تو طلاق یا طلاق کے اقرار کے ثبوت کے لئے دو آزاد اور عادل گواہوں کی گواہی ضروری ہے۔ عورتوں کی، یا ایک مرد اور عورتوں کی، گو چار عورتیں ہوں، یا غلاموں کی گو وہ نیک ہوں، یا فاسقوں کی گواہی سے ثابت نہ ہوگا۔ گواہی کو حاکم کے روبرو ادا کرنے اور قبول کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں گواہ طلاق کے الفاظ ادا کرتے وقت اسے دیکھیں اور اس کی آواز سنیں،

صرف طلاق دینے والے کی آواز سن کر اسے دیکھے بغیر گواہ بننا صحیح نہیں، کیونکہ آواز میں اشتباہ ہوسکتا ہے۔ نیز یہ بھی شرط ہے کہ گواہ یہ بھی بیان کریں کہ صریح لفظ سے طلاق دی یا کنایہ سے۔

(۱۰) طلاق کا ارادہ ہو تو افضل یہ ہے کہ ایک سے زائد طلاق نہ دے، کیونکہ ممکن ہے اس پر نادم ہو، تو ایسی صورت میں رجعت کرسکتا ہے، اگر تین طلاق دینا ہو، تو افضل یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے، تاکہ جو علماء بہ یک وقت تین طلاق دینا حرام سمجھتے ہیں، ان کے اختلاف سے بچ نکلے، ایک ہی طہر میں تینوں طلاق دینا مکروہ ہے۔

(۱۱) طلاق کو کسی صفت پر معلق کرے، تو اس صفت کے وجود سے طلاق ہوگی، لیکن چار صورتوں میں نہ ہوگی: تعلیق اور صفت یا کوئی ایک نکاح کی حالت میں نہ ہو، مثلاً اجنبیہ عورت سے کہے: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، پھر اس سے نکاح سے قبل یا نکاح کے بعد وہ داخل ہو، تو طلاق نہ ہوگی۔ یا بیوی سے کہا: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، پھر وہ بائنہ ہوئی، پھر داخل ہوئی تو طلاق نہ ہوگی، یا صفت دوسرے نکاح میں ہو، مثلاً بیوی سے کہا: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہے، پھر اسے جدا کیا، پھر آئندہ دوبارہ اس سے نکاح کیا، پھر وہ داخل ہوئی، تو طلاق نہ ہوگی۔ اجنبیہ کی طلاق معلق کرنے کی صورت میں آئندہ نکاح کے بعد (حنفی مسلک کا کوئی) حاکم طلاق کا فیصلہ دے، تو یہ فیصلہ معتبر نہ ہوگا۔

(۱۲) کسی اجنبی عورت سے کہا : تو مجھ پر حرام ہے میں تجھ سے نکاح نہ کروں گا، تو اس سے کچھ لازم نہیں، اور اس سے نکاح کرنا جائز ہے، اور کسی کفارہ کی ضرورت نہیں۔

(۱۳) طلاق کا حکم : ۱-واجب : ایلاء کی صورت میں جبکہ صحبت کا ارادہ نہ ہو، اور شقاق کے وقت جب کہ دونوں حکم طلاق دینا مناسب سمجھیں۔ **۲-مستحب :** جو بیوی کے حقوق کی ادائیگی سے عاجز ہو، یا اس کی طرف بالکل ہی میلان نہ ہو، یا بلا تعنت اور بلا وجہ مشقت میں ڈالے بغیر کسی صحیح غرض سے والدین میں سے کسی کا حکم ہو، یا ایسی بداخلاق ہو کہ اس کے ساتھ گذر بسر وصبر مشکل ہو، یا عفیفہ نہ ہو۔ **۳-حرام :** بدعی طلاق۔ **۴-مکروہ :** سابقہ کوئی شکل نہ ہو، تو طلاق مکروہ ہے، کیونکہ اسے حدیث میں ابغض حلال قرار دیا گیا ہے۔ **۵-مباح :** بیوی کی طرف کامل میلان نہ ہو، گو کسی درجہ میں ہو۔

کسی صحیح غرض کے بعد بطورِ تعنت (دشواری ومشقت میں ڈالنے کے لئے) والدین یا کوئی ایک طلاق کا حکم دے، تو طلاق دینا مستحب نہیں ہے۔

(۱۴) تین طلاق : ایک ہی وقت تین طلاق دے، مثلاً: تجھے تین طلاق ہے، تو طلاق واقع ہوگی نیز یہ حرام نہیں ہے، گو مکروہ ہے۔

حدیث:۱- حضرت رکانہ نے طلاق بتہ دی (ایسی طلاق کہ رشتہ کٹ جائے) پھر انھوں نے رجعت کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے ان کو قسم دلا کر پوچھا کہ: کیا تم نے ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا تھا؟ انھوں نے کہ: قسم بخدا میں نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا، تو آپ ﷺ نے بیوی ان کو لوٹا دی" (شافعی ، ابوداود ، ترمذی ، ابن ماجه ، وصححه ابوداود وابن حبان والحاکم ۔ تلخیص ۲۱۳/۳)

حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر رکانہ لفظ "البتۃ" سے تین کا ارادہ کرتے، تو تین نافذ ہوتی، اور رجعت کی اجازت نہ ملتی، ورنہ استفسار اور قسم دلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

۲- صحیحین وغیرہ میں لعان کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضرت عویمرؓ نے لعان سے فراغت کے بعد اپنی بیوی کو تین طلاق دی۔

گرچہ لعان سے خود دونوں میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہو جاتی ہے، اور طلاق کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ عویمرؓ نے اس مسئلہ سے واقفیت سے پہلے ہی تین طلاق دی۔ تو آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہ فرمائی، اگر حرام ہوتا تو عویمرؓ اور دیگر صحابۂ کرام کی معلومات کے لئے آپ ﷺ نے فوراً انکار فرمایا ہوتا۔

(۱۵) کسی شرط یا صفت پر طلاق معلق کرنے کی صورت میں اس شرط یا صفت کی موجودگی میں خود بخود طلاق ہوگی، دوبارہ طلاق کے الفاظ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔

(خلع وطلاق کے حوالے) (المجموع ۱۷/۲-۲۶۱، اعانته ۳،۴/۲-۲۸، بجیرمی ۴۱۰/۳-۴۴۱، تحفه ۹-۱۰/۳-۲۶۲، شرح التنبیه ۶۴۰/۲-۶۷۵، جمل ۲۹۱/۴-۳۸۵، ترشیح ۳۳۰-۳۴۱، مغنی ۲۶۲/۳-۳۳۴، بغیه ۲۱۶-۲۳۴، نهایه ۶-۳/۷-۵۶، الفقه المنهجی ۱۱۹/۴-۱۳۹)

رَجْعَت

رجعت ایک مرتبہ رجوع (واپسی، لوٹنا) کو کہا جاتا ہے، شرعاً جو مطلقہ بائنہ نہ ہو، اسے آئندہ مذکورہ شرائط کے ساتھ عدت میں دوبارہ نکاح میں لوٹانے کو رَجعت کہا جاتا ہے۔

آیت : (۱) "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَان" (البقره ۲۲۹)

ترجمہ: "وہ طلاق (جس میں رجوع کرنا درست ہے) دو مرتبہ (کی) ہے، پھر خواہ (رجعت کر کے عورت کا) رکھ لینا قاعدہ کے موافق، خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ"

(۲) "وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحاً" (البقره ۲۲۸)

ترجمہ : "اور ان عورتوں کے شوہر (جبکہ ان کو طلاق رجعی ملی ہو) ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں"۔

(۳) "وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَاتُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه" (البقره : ۲۳۱)

ترجمہ: "اور جب تم نے عورتوں کو (رجعی) طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گذرنے کے قریب پہنچ جاویں (اور عدت ختم نہ ہوئی ہو)

توتم (پرواجب ہے کہ یاتو) ان کو قاعدے کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو، اوران کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رکھو، اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا کروگے اور جو شخص ایسا (برتاؤ) کرے گا سو وہ (آخرت میں) اپنا ہی نقصان کرے گا (کیونکہ ظلم کی سزا بھگتے گا)''۔

صحیحین وغیرہ کی روایات میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض میں طلاق دی، تو آپ ﷺ نے ان کو رجعت کا حکم دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت حفصہؓ کو طلاق دی، پھر ان سے رجعت کرلی۔(ابوداود ،نسائی ،ابن ماجہ ، حاکم تلخیص ۲۱۸/۳)

امام شافعیؒ رجعت سے متعلق آیات کو پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں: جو رجعت کرنا چاہے اسے اس کا حق ہے، کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اسے اس کا اختیار دیا ہے۔ فرمایا: سو جو آزاد شوہر بھی صحبت کے بعد اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دے، اسے کتاب وسنت کی روشنی میں مطلقہ بیوی کو واپس لوٹا لینے کا استحقاق حاصل ہے، کیونکہ رُکانہ نے ایک طلاق کی نیت سے طلاقِ بتہ دی، تو آپ ﷺ نے بیوی کو ان کے سپرد کیا، اور یہ ہمارے نزدیک عدت کے اندر کا واقعہ ہے۔ تمام بیویوں کا یہی حکم ہے، جو آزاد شوہر کی زوجیت میں ہو، خواہ بیوی مسلمان ہو، یا ذمیہ یا باندی، کافر آزاد کا حکم بھی طلاق ورجعت میں مسلمان آزاد کی طرح ہے، خواہ ذمی ہو یا غیر ذمی۔ پس جب عدت گذر جائے تو جدید نکاح کے بغیر بیوی پر شوہر کا کوئی اختیار نہیں، کیونکہ عزوجل نے جب عدت میں شوہر کو رجعت کا اختیار دیا، تو واضح کردیا کہ عدت کے بعد رجعت کا کوئی حق نہیں، نیز اللہ عزوجل کا فرمان ہے: فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ''(البقرہ : ۲۳۴)

ترجمہ:'' پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کرلیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا۔ ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے قاعدہ کے موافق کچھ کاروائی (نکاح کی) کریں''(الامّ ۳۵۲/۵)

رجعت کے ارکان

(۱) مُرتَجِع (رجعت کرنے والا) : مرتجع میں خود نکاح کرنے کی اہلیت موجود ہو، گو دوسرے کی اجازت پر موقوف ہو، لہٰذا مدہوش، غلام، سفیہ اور مُحرِم (جو احرام میں ہو) کا رجعت کرنا صحیح ہے۔ مرتد، بچہ، پاگل اور مُکرَہ کا رجعت کرنا درست نہیں۔

محرم بھی فی الجملہ نکاح کا اہل ہے، احرام (عارضی طور پر) صرف مانع ہے، (اس لئے اس کا رجعت کرنا صحیح ہوا)

مجنون کی بیوی کو طلاق ہوئی ہو، تو اس کا ولی رجعت کرسکتا ہے، جب کہ وہ اس کا نکاح کرا سکتا ہو، یعنی جب کہ وہ نکاح کا محتاج ہو، اگر طلاق میں شک کی وجہ سے احتیاطاً رجعت کرلے، پھر معلوم ہوا کہ طلاق ہوئی تھی، تو یہ رجعت کافی ہے۔

(۲) صیغہ : صیغہ میں شرط یہ ہے کہ ایسا لفظ ہو جو مقصد پر دلالت کرے ،

صریح الفاظ : تجھے اپنی طرف لوٹالیا، تجھ سے رجوع کرلیا، تجھ سے مراجعت کرلی، تجھے (اپنے نکاح میں) روک لیا۔ کیونکہ یہ الفاظ رجعت کے لئے مشہور اور کتاب وسنت میں وارد ہیں۔ ان کے مصادر سے مشتق دیگر الفاظ کا بھی یہی حکم ہوگا۔ عربی زبان جاننے کے باوجود بھی کوئی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کہے تو وہ صریح ہے۔ لوٹانے کے لفظ میں'' میری طرف'' (اپنی طرف) کہنا ضروری ہے، دیگر الفاظ میں 'میری طرف' یا میرے نکاح میں بڑھا دینا سنت ہے۔

کنایہ الفاظ: میں نے تجھ سے نکاح کیا تجھے اپنی زوجیت میں لیا، وغیرہ (اگر رجعت کی نیت سے یہ جملہ کہا، تو رجعت صحیح ہوگی، ورنہ نہیں)

رجعت منجز ہو (فوراً ہو، معلق نہ ہو) نیز مؤقت نہ ہو، پس اگر کسی نے کہا: اگر تو چاہے تو تجھ سے رجعت کرلیا، اور بیوی کہے: میں نے چاہا، یا کہا: ایک ماہ کے لئے تجھ سے رجعت کرلیا، تو رجعت حاصل نہ ہوگی۔

گواہ: رجعت کے صیغہ کی ادائیگی کے وقت دو گواہ کا ہونا سنت ہے، کیونکہ آیت میں اس کا حکم ہے:

آیت: ''فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ'' (الطلاق-۲)

ترجمہ: ''پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں اپنی عدت گذرنے کے قریب پہنچ جاویں تو ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کرکے) نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرلو''۔

آیت کو وجوب پر محمول نہیں کیا، کیونکہ طلاق کے وقت گواہ کے عدمِ وجوب پر اجماع ہے، پس امساک (رجعت) کا بھی یہی حکم ہوگا، اور صرف استحباب پر محمول کریں گے، جیسا کہ لین دین کے وقت گواہ کے قرآنی حکم کو استحباب پر محمول کیا گیا، نیز رجعت نیا نکاح نہیں ہے، بلکہ سابقہ نکاح کو ہی برقرار رکھنا ہے، نکاح میں چونکہ فراش کا اثبات ہے، اس لئے گواہ رکھنا واجب ہے، جو یہاں پہلے سے ثابت ہے۔ اگر رجعت کے وقت گواہ نہ رکھے، تو اس کے اقرار کے وقت رکھنا مستحب ہے، تاکہ آئندہ بیوی کے انکار کی گنجائش نہ رہے، کیونکہ عدت میں شوہر کا رجعت کا اقرار کرنا معتبر ہے۔

کسی فعل مثلاً صحبت یا اس کے مقدمات (بوس وکنار وغیرہ) سے رجعت حاصل نہ ہوگی، گو رجعت کی نیت سے ان امور کو انجام دے، کیونکہ یہ رجعت پر دلالت نہیں کرتا، اور جیسا کہ اس سے نکاح نہ ہوگا، نیز صحبت سے تو عدت واجب ہوتی ہے، پھر یہ عدت کو ختم کیسے کرے گا، البتہ تحریر اور گونگے کے مُفہم اشارہ سے رجعت حاصل ہوگی، اور دونوں کنایہ شمار ہوں گے، لیکن اشارہ ہر کوئی سمجھ سکے تو صریح شمار ہوگا۔

(۳) محل: محلِ رجعت میں شرط یہ ہے کہ ایسی بیوی ہو، جس سے صحبت ہو چکی ہو، (گو دُبُر یعنی پچھلی شرم گاہ میں ہو) معین ہو، حلت کو قبول کرلے، بلاعوض اسے طلاق دی گئی ہو اور تمام طلاقیں نہ دے چکا ہو، لہٰذا عدت ختم ہونے کے بعد رجعت نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ اجنبیہ ہو چکی، اور نہ صحبت سے قبل، کیونکہ اس پر عدت ہی نہ آئے گی، اور نہ مبہم بیوی سے، مثلاً دو بیویوں میں سے ایک کو بلاتعین طلاق دے، پھر اسے معین کرنے سے قبل رجعت کرلے، تو یہ رجعت صحیح نہیں، اگر دونوں سے رجعت کرلے۔ یا مطلقہ کو معین کرنے کے بعد اس سے رجعت کرلے تو صحیح ہے۔

زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے، تو اس حال میں رجعت صحیح نہیں۔ گو مرتد عدت کے اختتام سے قبل اسلام کی طرف لوٹ جائے، نیز فسخ کی صورت میں بھی رجعت نہیں کرسکتا، اگر طلاق بالعوض ہو، تو بائنہ ہونے کی وجہ سے رجعت کا حق نہ ہوگا، اسی طرح شوہر تمام طلاق دے دے، (یعنی ایک آزاد شخص تیسری طلاق بھی دے دے) تو اب رجعت نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ بالکل بائنہ ہو چکی، نیز پھر نکاح میں رکھنے سے اب یہ نکاح بلا طلاق کے ہو جائے گا۔

اگر مطلقہ کی عدت پاکی یا وضع حمل ہو، اور وہ عدت کے اختتام کا دعویٰ کرے، اور شوہر انکار کرے، تو عورت کو قسم دلائی جائے گی (اور اس کی بات تسلیم کی جائے گی) جب کہ اتنی مدت میں یہ ممکن بھی ہو، گو اس کی عام عادت کے خلاف ہو۔

اگر شوہر رجعیہ سے صحبت کرے، تو اس وطی بالشبہ کی وجہ سے ازسرِنو عدت ضروری ہے، جسمیں طلاق کی بقیہ عدت بھی داخل ہوگی، مثلاً طلاق کے عدت کی دو پاکی گذرنے کے بعد صحبت کرے تو اب دوبارہ تین پاکی عدت گذارے، جس میں پہلی پاکی طلاق اور شبہ دونوں کی مشترکہ عدت ہے، تو شوہر اس پہلی پاکی میں رجعت کرسکتا ہے، بقیہ دو پاکی میں نہیں، لیکن اگر اس صحبت سے بیوی حاملہ ہوجائے تو اب دونوں کی عدت وضعِ حمل (زچگی) ہے، لہٰذا وضعِ حمل سے قبل رجعت کرسکتا ہے۔

بیوی یا اس کے ولی کی رضامندی یا علم کے بغیر بھی رجعت صحیح ہے۔

رجعیہ کے احکام: عورت کو طلاقِ رجعی دینے کے بعد عدت میں اس سے تمتع وانتفاع حرام ہے، اور حرام سمجھنے والا شخص ایسی کوئی حرکت کرے تو تعزیری سزا کا مستحق ہوگا علماء کے اختلاف کی وجہ سے صحبت کرنے سے حد نافذ نہ ہوگی۔ صحبت کرنے کی وجہ سے شوہر پر مہر مثل واجب ہوگی، گو وہ بعد میں رجعت کرلے، کیونکہ رجعیہ صحبت کی حرمت میں بائنہ کے مثل ہے، لہٰذا مہر میں بھی اس کے مثل ہوگی۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ رجعیہ عورت قرآن کی پانچ آیتوں میں بیوی ہے، یعنی اُن آیات میں مذکورہ مسائل میں بیوی کی طرح رجعیہ بھی شامل ہے: ایلاء، میراث، لعان، ظہار اور طلاق (گو بالعوض ہو) لیکن ظہار اور ایلاء کا حکم رجعت کے بعد ہی ثابت ہوگا۔

مذکورہ پانچ آیات یہ ہیں:

(۱) ''لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ ''۔(البقرہ : ۲۲۶) (۲) ''وَلَكُمْ نِصْفُ مَاتَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ ''(النساء : ۱۲)

(۳) ''وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ ''(النور : ۶) (۴) وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَائِهِمْ ''(المجادلة : ۳)

(۵) ''وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ ''(البقرہ : ۲۳۲)

زوجین میں جدائی کے انواع

(۱) ایسی جدائی جس سے بیوی حرام ہو، اور رجعت سے یہ حرمت ختم ہو، یعنی طلاق رجعی

(۲) وہ جدائی جس کی حرمت جدید نکاح سے ختم ہو، یعنی صحبت سے پہلے ایک یا دو طلاق، یا صحبت کے بعد بلاعوض ایک یا دو طلاق دے اور عدت ختم ہونے تک رجعت نہ کرے، یا ایک یا دو طلاق بالعوض دے، یا کسی عیب یا شوہر کی تنگ دستی کی وجہ سے نکاح فسخ کیا جائے تو ان صورتوں میں دوسرے شوہر سے نکاح کے بغیر بھی یہ شوہر جدید نکاح کرے تو حرمت ختم ہوگی۔

(۳) ایسی جدائی جس کی حرمت اسی وقت ختم ہوگی کہ بیوی کا دوسرے کسی شوہر سے نکاح وصحبت ہو، پھر وہاں سے جدائی کے بعد اب پہلا شوہر جدید نکاح کرے، یہ اپنی بیوی کو تین طلاق دینے کی صورت میں مسئلہ ہے، خواہ بیوی سے صحبت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

(۴) ایسی جدائی کہ حرمت آئندہ کبھی بھی ختم نہ ہو، جبکہ شوہر لعان کرے۔

پہلی صورت میں بیوی رجعیہ کہلائے گی، اور بقیہ صورتوں میں بائنہ کہلائے گی۔ (بائنہ یعنی جو جدا ہو چکی) دوسری صورت کو بَيْنُوْنَه صُغْرىٰ (چھوٹی جدائی) اور تیسری صورت کو بَيْنُوْنَه كُبْرىٰ (بڑی جدائی) کہا جاتا ہے۔ (المجموع ۱۷/۲۶۲–۲۸۸، فتح الوهاب مع الجمل ۴/۳۸۵–۳۹۴، تحفه مع الحواشی ۱۰/۲۶۳–۲۷۸، الفقه المنهجی ۴/۱۳۹، شرح التنبه ۲/۶۷۶، نهایه ۷/۵۷–۶۴)

ایلاء

آیت: لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَائِہِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَاءُوْ فَاِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ”(البقرہ : ۲۲۶-۲۲۷)

ترجمہ : ”جو لوگ (بلا قید مدت یا چار ماہ سے زائد مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیویوں (کے پاس جانے) سے ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے، پھر اگر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کرلیں تو اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے، رحمت فرمائیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے تو اللہ تعالیٰ سنتے ہیں جانتے ہیں۔“

عربی میں ایلاء حلف (قسم) کو کہتے ہیں، یہ جاہلیت میں بائنہ طلاق شمار ہوتی تھی، تو شریعت نے اس کا حکم بدل کر آیت کے مطابق چار ماہ تک انتظار اور رجوع یا طلاق کی طرف منتقل کیا۔ شرعاً شوہر کا مطلقاً (یعنی بلا قید مدت) یا چار ماہ سے زائد مدت تک اپنی بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھانا ایلاء کہلاتا ہے، اور ایذاء و تکلیف کی وجہ سے یہ حرام ہے۔

ایلاء کے ارکان

(۱) زوجین (۲) محلوف بہ (۳) محلوف علیہ (۴) مدت (۵) صیغہ

(۱) زوجین : زوجین میں یہ شرط ہے کہ شرعاً وحساً صحبت ممکن ہو، اور شوہر میں طلاق کی صحت کے شرائط موجود ہوں، گو وہ غلام یا مریض یا خصی یا کافر یا نشہ میں ہو، یا بیوی باندی یا بیمار یا کمسن ہو، لیکن ایلاء کی مدت میں صحبت کے قابل ہو، اور اس قابلیت کے بعد ایلاء کے بقدر مدت باقی ہو۔

بچہ، پاگل، مکرہ اور ایسے شخص کا ایلاء صحیح نہیں جس کا ذکر (عضو تناسل) شل (خشک ولنجا) ہو چکا ہو، یا اتنا کٹا ہو کہ حشفہ (سپاری) کے بقدر بھی باقی نہ ہو، کیونکہ ان صورتوں میں بیوی کی ایذاء کا قصد موجود نہیں ہے، کیونکہ ویسے بھی صحبت ممکن نہیں ہے۔

شوہر کے علاوہ ایلاء صحیح نہیں، کسی پرائی عورت سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھالے، پھر اس سے نکاح کرلے، تب بھی ایلاء نہ ہوگا، بلکہ صرف عام قسم شمار ہوگا، رتقاء اور قرناء بیوی سے ایلاء صحیح نہیں، رجعیہ سے ایلاء صحیح ہے، کیونکہ صحبت ممکن ہے، گرچہ رجعت پر موقوف ہو۔

(۲) مَحلُوف بِہ (جس کی قسم لی جائے): محلوف بہ کی شرط یہ ہے کہ اللہ کا نام یا اس کی صفت ہو، جیسے اللہ کی قسم، یا رحمٰن کی قسم، میں تجھ سے صحبت نہ کروں گا۔

یا محلوف بہ ایسی چیز کا التزام ہو جو نذر کی وجہ سے لازم ہوتی ہو، یا طلاق یا آزادی کو معلق کرنا ہو، اور چار ماہ کے بعد ہی قسم سے آزاد ہوجاتا ہے (نہ کہ چار ماہ میں یا کم میں) مثلاً: اگر میں نے تجھ سے صحبت کی تو اللہ کے لئے مجھ پر نماز لازم، یا روزہ، یا حج، یا (غلام کی) آزادی، یا میں نے تجھ سے صحبت کی تو تیری سوکن کو طلاق، یا میرا غلام آزاد، کیونکہ ان صورتوں میں شوہر مذکورہ امور کے لازم ہونے یا طلاق وآزادی کی وجہ سے بیوی سے صحبت کرنے سے رکے گا جیسا کہ اللہ کی قسم لینے میں رکے گا۔

اگر چار ماہ تک قسم ختم ہوجائے تو ایلاء نہ ہوگا۔ (کسی چیز کو لازم کرنے، یا طلاق آزادی کو معلق کرنے کو بھی عموماً فقہی اصطلاح میں حلف اور قسم کہا جاتا ہے)۔ (مثلاً: مُحرّم میں کوئی بیوی سے کہے: اگر میں نے تجھ سے صحبت کی تو مجھ پر ماہِ ربیع الاول کے روزے لازم، تو یہ

ایلاء نہیں، کیونکہ ربیع الاول کے گذرنے کے بعد صحبت سے روزہ وغیرہ لازم نہ ہوگا، اور یہ چار ماہ میں ہی گذر رہا ہے۔ اگر اس کے بجائے جمادی الاول یا بعد کے روزے لازم قرار دے تو ایلاء ہوگا، کیونکہ چار ماہ کے بعد بھی قسم باقی رہے گی)

(۳) محلوف علیہ (جس بات پر قسم لی جائے): یہ شرط ہے کہ محلوف علیہ شرعی صحبت کا ترک کرنا ہو۔

لہٰذا محلوف علیہ یہ امور ہوں تو ایلاء نہ ہوگا: صحبت کے علاوہ دیگر لطف اندوزی (بوس وکنار وغیرہ) کا ترک، پچھلی شرم گاہ میں صحبت کا ترک، حیض یا احرام میں صحبت کا ترک،

اگر کوئی کہے: واللہ میں تو تم سے پچھلی شرم گاہ کے علاوہ کہیں اور صحبت نہ کروں گا، تو یہ ایلاء ہوگا۔

(۴) مدت : ایک قسم میں چار ماہ سے زائد مدت ہونا شرط ہے۔

اگر کوئی مطلقاً (کسی مدت کی قید کے بغیر) کہے: واللہ (قسم بخدا) میں تجھ سے صحبت نہ کروں گا، یا ہمیشہ کی قید لگائے کہ کبھی بھی نہ کروں گا، یا چار ماہ سے زائد کی قید لگائے، مثلاً: قسم بخدا میں تجھ سے پانچ ماہ صحبت نہ کروں گا، یا ایسی قید لگائے کہ اس مدت میں اس کا حصول بعید ہو، مثلاً: قسم خدا کی حضرت عیسیٰ نبینا وعلیہ السلاۃ والسلام کے نزول تک تجھ سے صحبت نہ کروں گا، یا میری موت تک، یا تیری موت تک، یا فلاں کی موت تک تو ان تمام صورتوں میں ایلاء ہوگا۔

اگر کوئی کہے: قسم بخدا میں تجھ سے پانچ ماہ صحبت نہ کروں گا، پھر یہ مدت گذر جائے تو پھر قسم بخدا تجھ سے ایک سال صحبت نہ کروں گا، تو یہ دو ایلاء ہوئے، لہٰذا بیوی پانچویں ماہ پہلے ایلاء کے مُوجب یعنی رجوع یا طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ اگر رجوع کر لیا، تو اس کے موجب سے بری ہوگیا۔ پانچویں ماہ کے ختم ہوتے ہی دوسرے ایلاء کی مدت شروع ہوگی، اب اس کے چار ماہ گذرنے کے بعد اس ایلاء کے موجب کا تقاضا کرسکتی ہے۔ اگر پہلے ایلاء میں پانچ ماہ گذر گئے تو اب مطالبہ نہیں کرسکتی، کیونکہ وہ ایلاء ختم ہو چکا، اسی طرح دوسرے ایلاء کا ایک سال گذر جائے تو اب مطالبہ کا حق ختم ہوگیا۔

اگر کوئی صرف چار ماہ یا اس سے کم مدت کے لئے ترکِ صحبت کی قسم کھائے، تو یہ ایلاء نہ ہوگا، بلکہ صرف قسم شمار ہوگی (اور مقررہ مدت کے اندر صحبت کرے تو قسم کا کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا) اسی طرح ایک سے زائد قسم میں چار ماہ سے زائد مدت کی قید ہو، تو ایلاء نہ ہوگا، گو اسے ایذاء رسانی کا گناہ ہوگا، لیکن ایلاء کا خصوصی گناہ نہ ہوگا، مثلاً اس طرح کہا، واللہ میں تجھ سے چار ماہ صحبت نہ کروں گا، پھر یہ مدت گذر جائے تو واللہ مزید چار ماہ تجھ سے صحبت نہ کروں گا، تو یہ ایلاء نہیں ہے، کیونکہ پہلے چار ماہ کے گذرنے پر وہ قسم ختم ہوگئی، اس لئے مطالبہ کا سوال نہیں، اور دوسرے قسم کی چار ماہ کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ اگر دوسری مرتبہ قسم کا لفظ نہ دوہرائے، مثلاً اس طرح کہے: واللہ میں تجھ سے چار ماہ صحبت نہ کروں گا، پھر یہ مدت گذر جائے تو پھر مزید چار ماہ تجھ سے صحبت نہ کروں گا، تو یہ ایلاء ہے، کیونکہ ایک ہی قسم میں چار ماہ سے زائد مدت کی قید آ گئی۔

ایلاء میں چار ماہ کی مدت تک رخصت اس لئے دی گئی کہ اس کے بعد شوہر کے تعلق سے ایک عورت کی قوتِ برداشت جواب دے گی، یا کم ہو جائے گی۔

(۵) صیغہ : صیغہ ایسا ہو جو ایلاء پر دلالت کرے۔

صریح الفاظ ، حشفہ کو فرج میں غائب کرنا، وطی کرنا، جماع کرنا وغیرہ مثلاً اس طرح کہنا: قسم بخدا میں اپنا حشفہ تیرے فرج (شرم گاہ) میں غائب نہ کروں گا، یا تجھ سے وطی (صحبت) نہ کروں گا، یا تجھ سے جماع نہ کروں گا۔

کنایہ الفاظ : مُلامَسہ، مُباضعَۃ، مُباشَرت، آنا، ڈھانکنا وغیرہ، مثلاً: میں تجھ سے مباشرت نہ کروں گا، یا تیرے پاس نہ آؤں گا، یا تجھے نہ ڈھانکوں گا (مباشرت کا لفظ عربی میں عام ہے) کنایہ لفظ صحبت کی نیت سے ادا کرے تو ایلاء ہوگا ورنہ نہیں۔

اگر کوئی اپنی بیوی سے کہے: اگر تجھ سے صحبت کروں تو تیری سوکن کو طلاق، تو مخاطبہ بیوی سے ایلاء شمار ہوگا، اگر اس سے صحبت کرلے تو سوکن کو طلاق ہوگی، اور ایلاء ختم ہو جائے گا۔

اگر مثلاً کوئی کہے: واللہ میں تجھ سے سال میں صرف ایک مرتبہ صحبت کروں گا، پھر ایک مرتبہ صحبت کے بعد چار ماہ سے زائد مدت باقی ہو، تو ایلاء ہے ورنہ نہیں۔

ایلاء کے احکام

(جو شوہر ایلاء کرے اسے مُولی کہا جائے گا)

مُولی کو ایلاء کے وقت سے مسلسل (پے در پے) چار ماہ کی مدت مہلت دینا واجب ہے، اس مہلت کے لئے قاضی و حاکم کوئی ضروری نہیں، کیونکہ قرآن پاک نے خود صراحتاً اس کا فیصلہ دیا ہے۔ رجعیہ سے ایلاء کرے تو رجعت سے مدت شمار ہوگی۔

اگر شوہر کے اندر صحبت سے مانع کوئی امر موجود ہو، جو نکاح کے لئے مخل نہ ہو، تو اس کے باوجود ایلاء کی مدت شمار ہوگی، خواہ ابتداء سے موجود ہو، یا درمیان میں طاری ہو، نیز خواہ مانع شرعی ہو، جیسے فرض روزہ، فرض اعتکاف، احرام یا حسی ہو، جیسے مرض قید یا پاگل پن وغیرہ۔

اگر عورت میں صحبت سے مانع حسی سبب موجود ہو، مثلاً نشوز، اتنی کمسن یا ایسا مرض کہ صحبت ممکن نہ ہو، یا شرعی سبب موجود ہو مثلاً فرض روزہ، فرض اعتکاف، احرام (فرض ہو یا نفل) تو ان اسباب کے خاتمہ کے بعد مدت شروع ہوگی، اگر دورانِ مدت ان میں سے کوئی مانع پایا جائے تو سابقہ مدت کا اعتبار نہ ہوگا، اب مانع ختم ہونے کے بعد چار ماہ سے زائد مدت باقی ہو، تو ازسرِ نو مہلت کی مدت (چار ماہ) شمار ہوگی، کیونکہ مدت میں تسلسل ضروری ہے۔ چار ماہ کی مدت مکمل ہونے کے بعد ان میں سے کوئی مانع طاری ہو، تو اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا، عورت مطالبہ کرسکتی ہے، نفل روزہ، حیض و نفاس وغیرہ سے ایلاء کی مدت پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ (اس کے باوجود مدت شمار ہوگی)

چار ماہ کی مدت گذر جائے اور شوہر صحبت نہ کرے، اور بیوی میں کوئی مانع موجود نہ ہو، تو وہ قاضی کے توسط سے شوہر سے فِیْئَہ (رجوع کرنے یعنی صحبت) کا یا طلاق کا مطالبہ کرے، (بعض علماء کے نزدیک پہلے فیئۃ کا مطالبہ کرے، اس سے انکار کرے تو پھر طلاق کا مطالبہ کرے) اگر شوہر دونوں سے انکار کرے، تو قاضی عورت کے مطالبہ پر شوہر کی طرف سے بطور نیابت ایک طلاق دے، قاضی اس طرح طلاق دے: میں نے اس عورت پر اس کے شوہر کی طرف سے ایک طلاق واقع کی، میں نے فلاں پر اس کی بیوی کے بارہ میں ایک طلاق کا فیصلہ دیا، میں نے اسے اس کے شوہر کی طرف سے طلاق دی، قاضی شوہر کی طرف منسوب نہ کرے تو طلاق نہ ہوگی۔

اگر بیوی مطالبہ کا حق ترک کردے، تو آئندہ بھی مطالبہ کرسکتی۔

فیئہ : حشفہ یا بقدر حشفہ (جبکہ حشفہ نہ ہو) بیوی کی اگلی شرم گاہ میں انتشار کے ساتھ غائب کرے (داخل کرے) تو اس سے فیئۃ حاصل ہوگی، گو صحبت حرام ہو، حشفہ سے کم مقدار کا غائب کرنا کافی نہیں، اگر ایلاء میں اگلی شرم گاہ کی صراحت اور نیت نہ ہو، بلکہ مطلق ہو، تو پچھلی شرم گاہ میں صحبت سے بھی قسم ختم ہو جائے گی اگر چہ یہ عمل حرام ہے۔ مدت کے بعد عورت میں حیض، مرض یا کمسنی وغیرہ کوئی مانع موجود ہو تو فی الحال مطالبہ نہیں کرسکتی، کیونکہ فی الحال صحبتِ مطلوبہ ممکن نہیں، مانع کے زائل ہونے کے بعد مطالبہ کرسکتی ہے۔

اگر شوہر میں کوئی طبعی مانع مثلاً مرض موجود ہو، تو زبان سے فیئة کا مطالبہ کرے، یعنی شوہر یہ کہے کہ جب بھی صحبت پر قادر ہو جاؤں گا، فیئة پر عمل کروں گا، اگر نہ مانے تو طلاق کا مطالبہ کرے۔ اگر شرعی مانع ہو، مثلاً احرام، فرض روزہ، تو طلاق کا مطالبہ کرے، کیونکہ اس وقت صحبت کی حرمت کی وجہ سے صرف یہی ممکن ہے۔

اگر شوہر حیض یا نفاس میں جماع کرے، یا دونوں میں سے کسی ایک کے احرام یا فرض روزہ کی حالت میں صحبت کرے، تو ایلاء ختم ہوا، (فیئة حاصل ہوا) گو گناہ ہوگا، اور بیوی کو ان صورتوں میں صحبت کا موقع دینا گناہ ہے۔

شوہر فیئة کے لئے کچھ مہلت مانگے، تو ایک دن تک مہلت دی جائے گی، اس سے زائد نہیں، زبان سے فیئة کرنا ہو، تو مہلت نہ دی جائے۔

شوہر نے اللہ کی قسم کھائی ہو، تو ایلاء کی مدت میں صحبت کرنے سے قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔ اگر نذر میں لازم ہونے والی چیز کا التزام کیا ہو، تو وہ لازم ہوگی مثلاً صحبت کی صورت میں روزہ کا التزام کیا تو روزہ واجب ہوگا یا قسم کا کفارہ، اور طلاق یا آزادی کو معلق کا ہو تو وہ واقع ہوں گے۔

وقف : قسم کے بعد چار ماہ گذرنے سے خود بخود طلاق واقع نہ ہوگی، بلکہ مولی کے ساتھ وقف کا معاملہ کیا جائے گا، یعنی حسب تفصیل بالا اس سے فیئة یا طلاق کا مطالبہ کیا جائے گا، کیونکہ اللہ نے اسے چار ماہ کی مہلت دی ہے۔ تو اس مدت میں مطالبہ کا حق نہ ہوگا، جیسا کہ کوئی چار ماہ کی مہلت پر کوئی چیز خریدے، تو اس مدت کے گذرنے کے بعد ہی فروخت کرنے والا قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے، نہ کہ چار ماہ کے اندر، نیز آیت میں فیئة کو مدتِ مہلت کے بعد فاء تعقیب کے ساتھ ذکر کیا ہے (جو فیئة کا مدت مذکورہ کے بعد ہونے پر دلالت کرتا ہے) نیز طلاق کو شوہر کے عزم کے ساتھ متعلق قرار دیا ہے، نہ کہ مدت کے گذرنے کے ساتھ، مزید اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں فیئة اور طلاق میں اختیار دیا ہے، اور یہ ایک ہی حالت میں ہوتا ہے، آگے پیچھے ہو تو ترتیب ہوگا، نہ کہ تخییر، نیز عزیمتِ طلاق کے ساتھ اللہ کے سمیع ہونے کو (یعنی اللہ سننے والے ہیں) بیان کرنا اس طرف اشارہ کررہا ہے کہ طلاق الفاظ مسموعہ سے ہوگی (نہ کہ محض مدت گذرنے سے)

جمہور صحابہ وامت کا مسلک یہی ہے کہ محض چار ماہ گذرنے سے طلاق نہ ہوگی، بلکہ اس کے بعد فیئة یا طلاق کا مطالبہ ہوگا، امام بخاری نے اپنی صحیح میں نیز موطا میں امام مالک نے اسے ابن عمرؓ سے موصولاً پیش کیا ہے۔ نیز حضرات علیؓ 'ابو الدرداءؓ عائشہؓ عثمانؓ سے بسند صحیح وقف کا قول مروی ہے۔ امام بخاری نے تاریخ میں اور امام بیہقی نے بسند صحیح ثابت بن عبید سے ۱۲ صحابہ کرام کا فتویٰ یہی پیش کیا ہے، حضرت ابو صالح فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ صحابہ کرام سے ایلاء کا مسئلہ پوچھا تو انھوں نے فرمایا: "چار ماہ گذرنے تک اس پر کچھ بھی نہیں، پھر وقف پر عمل ہوگا، پس اگر وہ رجوع کرے تو ٹھیک ورنہ طلاق دے دے" (دارقطني - بيهقي واسناده صحيح على شرط مسلم)

حضرت سلیمانؒ بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے دس سے کچھ زائد صحابہ کرام سے ملاقات کی، جو تمام مولی کے وقف کے قائل تھے" (الشافعي والدار قطني ، ابن ابي شيبه بسند صحيح على شرط الشيخين) (بخاري مع فتح الباري ۹/ ۴۲۶، ارواء الغليل ۷/ ۱۶۹ ، معرفة السنن ۵/ ۵۱۷ ، الام ۵/ ۳۸۲، الحاوي ۱۰/ ۳۳۶، المجموع ۱۷/ ۲۸۸، جمل مع الفتح ۴/ ۳۹۴، الفقه المنهجي ۴/ ۱۴۴ ، اعانة ۴/ ۳۴، تحفه ۱۰/ ۲۸۶ ، نهاية ۷/ ۶۸، مغني ۳/ ۳۴۳)

ظِهَار

آیات: "وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ

تُوعَظُونَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيْر o فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاسَّا ۔ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْناً ۔ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ''

(المجادلة : ۳،۴)

ترجمہ : ''اور جولوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اپنی کہی ہوئی بات میں عود کرتے ہیں، تو ان کے ذمہ ایک غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ دونوں باہم اختلاط کریں، اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔ پھر جس کو (غلام لونڈی) میسر نہ ہو تو اس کے ذمہ پیا پے (یعنی مسلسل لگاتار) دو مہینے کے روزے ہیں قبل اس کے کہ دونوں باہم اختلاط کریں، پھر جس سے یہ بھی نہ ہو سکیں تو اس کے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ حکم اس لئے ہے، تاکہ اللہ اور رسول پر ایمان لے آؤ، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور کافروں کے لئے سخت دردناک عذاب ہوگا''۔

فائدہ : سورہ مجادلہ کی ہر آیت میں ایک یا دو تین مرتبہ اللہ کا نام موجود ہے، یہ بات کسی دوسری سورت میں نہیں ہے، سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ نصف قرآن اور اجزاء کے اعتبار سے دسواں حصہ ہے۔

ظہار دراصل ظہر (پشت) سے ماخوذ ہے، کیونکہ اس کی اصلی صورت یہ ہوتی تھی کہ اپنی بیوی سے کہا جاتا: ''اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّی '' (تو مجھ پر میرے والدہ کی پشت کی طرح ہے) امام ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرمایا کہ، جاہلیت میں کوئی اپنی بیوی سے مذکورہ جملہ کہتا تو وہ اس پر حرام ہو جاتی، پھر اسلام میں سب سے پہلے حضرت اوسؓ نے اپنی بیوی سے ظہار کیا، اور یہ معاملہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہوا، تو سورہ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اور اس کا شرعی حل بتایا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر سورہ مجادلۃ ملخصاً)

حقیقت شرعی : ظہار کی شرعی حقیقت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو حرمت میں اپنے کسی محرم کے ساتھ تشبیہ دے۔ ظہار حرام اور کبیرہ گناہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے قولِ منکر وزور (نامعقول اور جھوٹ بات) قرار دیا ہے۔

ظہار کے ارکان

(۱) مُظاہِر (ظہار کرنے والا) (۲) مُظاہَرٌ مِنھا (جس عورت سے ظہار کیا جائے) (۳) مُشَبَّہ بِہٖ (جس سے تشبیہ دی جائے) (۴) صیغہ

(۱) مُظَاهِر : ظہار کرنے والا ایسا شوہر ہو، جس کا طلاق دینا صحیح ہو (یعنی مظاہر میں مُطلِّق کے شرائط ضروری ہیں) گو وہ غلام، کافر، خصی، مجبوب، یا نشہ میں ہو، شوہر کے سوا کسی کا ظہار صحیح نہیں، گو ظہار کرنے والا بعد میں اس عورت سے نکاح کرلے۔

اسی طرح بچہ، پاگل، اور مُکرَہ کا ظہار بھی صحیح نہیں۔

(۲) مُظَاهر منها : مُظاہَر مِنھا کا بیوی ہونا شرط ہے، گو وہ باندی، کمسن، پاگل، بیمار، رتقاء، قرناء، کافرہ یا رجعیہ ہو۔ اجنبیہ عورت سے ظہار درست نہیں، گو خلع شدہ ہو۔ اگر کسی پرائی عورت سے کہے: جب میں تم سے نکاح کرلوں، تو تم مجھ پر میری والدہ کی طرح ہو، تو ظہار صحیح نہ ہوگا گو بعد میں اس سے نکاح کرلے۔

ظہار کا تعلق صرف شوہر سے ہے، لہٰذا اگر بیوی شوہر سے کہے کہ تم مجھ پر میرے باپ کی پشت کی طرح ہو، یا میں تم پر تمہاری والدہ کی پشت کی طرح ہوں، تو بیوی پر کچھ لازم نہیں (اور اس سے ظہار نہ ہوگا)

(۳) **مُشَبَّہ بِہ :** مشبہ بہ میں یہ شرط ہے کہ نسب، رضاعت، یا مصاہرت کی وجہ سے محرم ہو ایسی عورت سے یا اس کے جزء سے تشبیہ دی جائے، جو اس کے لئے کبھی بھی حلال نہ تھی۔ مثلاً مظاہر کی نسبی بیٹی، بہن، اس کے ماں یا باپ کو دودھ پلانے والی عورت، باپ کی وہ بیوی جس سے اس کی پیدائش سے قبل باپ نے نکاح کیا ہو۔

کسی مرد یا خنثیٰ سے تشبیہ ظہار نہیں، نیز آپ ﷺ کی ازواج مطہراتؓ سے تشبیہ بھی ظہار نہیں، کیونکہ ان سے نکاح کی حرمت محرم ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ کے شرف کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح جو عورت کبھی اس کے لئے حلال رہ چکی ہو، اس سے تشبیہ بھی ظہار شمار نہ ہوگا، جیسے بہو، خود مظاہر کو دودھ پلانے والی، والد کی بیوی جس سے مظاہر کی ولادت کے بعد نکاح کیا ہو، وہ رضاعی بہن جو اس کے دودھ پینے سے قبل پیدا ہو چکی ہو وغیرہ

(۴) **صیغہ :** صیغہ ایسا لفظ ہونا شرط ہے، جو ظہار پر دلالت کرے، صریح الفاظ سے بلا نیت بھی اور کنایہ سے بصورت نیت ظہار صحیح ہوگا۔

صریح : تم، یا تمہارا سر یا ہاتھ یا بال یا ناخن، میرے ماں کی پشت یا جسم یا ہاتھ کی طرح ہے۔ یا مجھ پر میرے ماں کی پشت...کی طرح ہے، (مجھ پر کہنا ضروری نہیں)

کنایہ : تو میری والدہ کی طرح ہے، یا اس کے آنکھ کی طرح، یا کسی ایسے عضو کی طرح جو بطور کرامت (تعظیم وتکریم اور محبت) ذکر کیا جاتا ہو، جیسے سر روح وغیرہ، کیونکہ اس میں ظہار وغیر ظہار دونوں کا احتمال ہے۔

ظہار مؤقت : ظہار میں توقیت (مدت کی قید) صحیح ہے، مثلاً تو ایک ماہ یا ایک دن کے لئے میرے اوپر میری والدہ کی پشت کی طرح ہے، کیونکہ ایک صحابی مسلمہ بن صخرؓ نے صرف رمضان گذرنے تک اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا، لیکن درمیان میں ہی اس سے صحبت کر بیٹھے تو آپ ﷺ نے انھیں کفارہ کا حکم دیا(احمد، ابوداود ، ترمذی،ابن ماجہ ، حاکم بیھقی ۔ تلخیص ۳/۲۲۱، وصححه الالبانی فی الارواء ۷/۱۷٦)

اگر کوئی اس طرح کہے: تم پانچ ماہ تک میری ماں کی پشت کی طرح ہو، تو یہ ظہار مؤقت بھی ہے اور ایلاء بھی، کیونکہ اس ظہار کی وجہ سے وہ چار ماہ سے زائد اس سے صحبت کرنے سے رکے گا۔

تعلیق : ظہار کو معلق کرنا (کسی امر پر موقوف رکھنا) صحیح ہے، کیونکہ اس سے طلاق کی طرح تحریم اور قسم کی طرح کفارہ متعلق ہے، اور یہ دونوں بھی تعلیق کو قبول کرتے ہیں، لہٰذا اگر بیوی سے کہا کہ تم گھر میں داخل ہوئی تو تم مجھ پر میری والدہ کی پیٹھ کی طرح ہو، پھر بیوی داخل ہوئی تو ظہار ہوا، یا یہ کہا کہ تیری سوکن سے ظہار کیا تو تو میری ماں کے پشت کی طرح، پھر سوکن سے ظہار کیا تو دونوں سے ظہار ہوا۔

ظہار کے احکام

اگر مظاہر عود کرے تو اس پر کفارہ لازم ہے، گو بعد میں طلاق وغیرہ کے ذریعہ اسے جدا کردے۔

عود : ظہار کے بعد بیوی کو اتنی دیر اپنے نکاح میں باقی رکھنا، جس میں اسے (طلاق وغیرہ سے) جدا کر سکتا تھا، اور نہ کیا، تو یہ عود کہلائے گا۔ کیونکہ قول میں عود کا مطلب ہے، اس قول کی مخالفت، اور ظہار کا مقصود عورت کو تحریم سے موصوف کرنا ہے اور اسے اپنے نکاح میں باقی رکھنا اس تحریم کے خلاف ہے۔ اگر ظہار سے متصل شوہر پاگل ہو، یا بے ہوش ہو، یا موت کی وجہ سے یا کسی سبب فسخ کی وجہ سے یا

طلاق بائن یا رجعی کی وجہ (جبکہ رجعت نہ کرے) دونوں میں جدائی ہو جائے، تو عود نہ پایا گیا۔

رجعیہ سے عود یہ ہے کہ اس سے رجعت کر لے، خواہ ظہار سے قبل طلاق دی ہو، یا ظہار سے متصل بعد میں۔

اگر ظہار مؤقت ہو تو متعینہ مدت کی اندر حشفہ ورنہ بقدر حشفہ بیوی کی شرم گاہ میں غائب ہونے سے عود حاصل ہوگا، صرف مدت گذرنے تک نکاح میں باقی رکھنے سے عود نہ ہوگا، اس طرح مدت کے اندر صحبت کرتے ہی فوراً جدا ہونا ضروری ہے، گو پہلی مرتبہ صحبت حلال ہے، کیونکہ ابھی تک عود نہیں ہوا تھا۔

تمتع : کفارہ کی ادائیگی سے قبل یا مؤقت ظہار میں مدت ظہار گذرنے سے قبل بیوی سے وہ تمام تمتع (انتفاع ولطف واندوزی) حرام ہے، جو حیض میں حرام ہے، (یعنی صرف ناف و گھٹنے کے درمیان تمتع حرام ہے) کیونکہ آیت میں دو کفاروں کو 'تماس' (دونوں کے اختلاط) سے قبل واجب قرار دیا، تیسرے کو بھی اسی پر محمول کریں گے، ایک شخص نے ظہار کے بعد صحبت کی تو آپ ﷺ نے کفارہ کی ادائیگی تک کنارہ کشی کا حکم دیا۔ (اصحاب السنن وصححه الترمذی ۔ تلخیص ۳/۲۲۱)

ظہار مؤقت میں ایک مرتبہ صحبت کے ذریعہ عود کے بعد کفارہ کی ادائیگی اور مدت کے گذرنے سے پہلے تمتع حرام ہے، کسی ایک کے بعد حلال ہے، پس اگر کفارہ ادا کر دے، اور ابھی مدت باقی ہو، تب بھی تمتع حلال ہے، اسی طرح مدت گذر جائے اور ابھی کفارہ نہ دیا ہو، تو تمتع حلال ہے، اور کفارہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔ اگر عود ہی نہ کرے، یعنی مکمل مدت گذرنے تک بالکل صحبت نہ کرے، تو اب مدت کے بعد صحبت حرام نہیں، اور نہ کفارہ واجب ہوگا۔

عود کی وجہ سے کفارہ واجب ہونے کے بعد میاں بیوی یا کوئی ایک مر جائے، یا اسے بائنہ کر دے، یا طلاق رجعی دے یا نکاح فسخ ہو جائے تو اس سے کفارہ ساقط نہ ہوگا۔ بیوی کو جدا کرنے کے بعد دوبارہ اس سے نکاح کرے تو کفارہ کی ادائیگی تک صحبت حرام ہے۔

معتمد قول یہ ہے کہ ظہار اور دیگر امور کا کفارہ علی التراخی ہے (یعنی فوراً ادا کرنا لازم نہیں، تاخیر کی گنجائش ہے) گو کفارہ کا سبب گناہ کا باعث ہو۔ لیکن ظہار میں صحبت کرنے کے بعد بظاہر فوراً کفارہ کی ادائیگی واجب ہے۔

(فتح الوهاب مع الجمل ۴/۴۰۴-۴۱۳، تحفه مع الحواشی ۱۰/۳۱۸-۳۳۷، اعانه ۴/۳۶، نهایه مع الحواشی ۷/۸۱-۹۰، مغنی ۳/۳۵۳-۳۵۸، الفقه المنهجی ۴/۱۴۶، اکمجموع ۱۷/۳۴۱-۳۶۶)

کَفّارہ

کفارہ دراصل کفر سے مشتق ہے، یعنی محو کرنا (مٹا دینا) یا چھپانا یا مؤاخذہ نہ کرنا، چونکہ کفارہ گناہ کو مٹاتا اور چھپاتا ہے، اور مؤاخذہ سے بچاتا ہے، اس لئے اسے کفارہ کہا گیا۔

نیت : کفارہ کی نیت واجب ہے، یعنی کفارہ کے طور پر غلام کی آزادی، روزہ، کھانا کھلانا یا لباس عطا کرنا کی نیت ہو، تاکہ نذر وغیرہ سے تمیز حاصل ہو، محض اپنے اوپر واجب روزہ وغیرہ کی نیت کافی نہیں، آزادی یا اطعام (اناج دینا) کے ساتھ متصلاً نیت واجب نہیں، بلکہ مقدم بھی کر سکتا ہے، مال کی تعین کے وقت نیت کر لے کہ یہ غلام کفارہ کی طرف سے آزاد کر دوں گا، یا یہ اناج کفارہ میں دوں گا، تو پھر آزادی یا اطعام کے وقت اس نیت کا پیش نظر ہونا ضروری نہیں، روزہ کی نیت رات میں ہونا شرط ہے۔

ظہار کا کفارہ ہے یا کسی اور چیز کا اس کی تعیین ضروری نہیں، اگر کسی کے ذمہ ظہار اور قتل کے دو کفارے ہوں، اور (بلا تعیین محض)

کفارہ کی نیت سے غلام آزاد کرے، یا روزہ رکھے، تو کسی ایک کی طرف سے ادا ہوگا، لیکن کوئی تعیین کرے اور اس میں غلطی ہو جائے، تو یہ کفارہ کافی نہ ہوگا، مثلاً کفارۂ قتل کی نیت کرے، حالانکہ اس کے ذمہ ظہار کا کفارہ تھا، تو یہ ظہار کی طرف سے ادا نہ ہوگا۔ کفارہ میں فرضیت کی نیت کرنا واجب نہیں ہے۔

قسم میں کفارہ ابتداء میں مُخَیَّر ہے۔ (یعنی مختلف کفاروں میں اختیار ہے) اور آخر میں مرتب ہے۔ جس کا تذکرہ قسم میں ہوگا۔ ظہار، قتل، اور رمضان میں جماع کی وجہ سے واجب کفارہ مرتب ہے (یعنی پہلی صورت پر قادر ہو تو اسی کو انجام دینا ہے، عاجز ہو تو دوسری شکل اختیار کرے، وہ بھی ممکن نہ ہو تب جا کر تیسری خصلت پر عمل کرسکتا ہے)

ظہار اور رمضان میں جماع کے کفارہ کے تین خصال (خصلتیں وقسمیں) ہیں یعنی آزادی، پھر روزہ، پھر اطعام، اور قتل کے کفارہ میں پہلے کی دو خصلتیں ہیں۔

(۱) مومن غلام یا باندی کی آزادی: ظہار وغیرہ کے کفارہ میں سرِ فہرست آزادی ہے، قتل کے کفارہ میں قرآن میں "رقبہ مؤمنہ" (مومن بردہ) کی قید آئی ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے اور مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہوئے ظہار وغیرہ کی آزادی میں بھی یہ قید شرط ہے، جیسا کہ ایک آیت میں مردوں کی گواہی کے حکم کو دوسری آیت کی روشنی میں عادل کے ساتھ مقید کیا گیا۔

غلام باندی کو بلاعوض کفارہ کی جانب سے آزاد کرنا ضروری ہے، نیز ان میں ایسا کوئی عیب نہ ہو، جو کام کاج میں واضح خلل کا باعث ہو۔

(۲) روزے: اگر کفارہ کی ادائیگی کے وقت حساً یا شرعاً آزادی سے عاجز ہو، (جیسا کہ آج کل عموماً ان کا وجود ہی نہیں کہ اس پر عمل کرسکیں)، تو مسلسل (پیاپے اور لگاتار) قمری دو ماہ کے روزے واجب ہیں۔ صرف کفارہ کی جانب سے روزے کی نیت کافی ہے، تسلسل کی نیت ضروری نہیں، اگر روزے کسی ماہ کے درمیان سے شروع کرے اور وہ مہینہ ۲۹ کا ہو، تب بھی تیسرے ماہ اتنے روزے رکھنا ضروری ہیں کہ مجموعہ ۳۰ ہو جائے (دوسرا ماہ ۲۹ کا ہو تو وہ کافی ہے)

اگر مرض، سفر، یا نیت بھول جانے کی وجہ سے ایک روزہ چھوٹ جائے، گو آخری ہو، تو تسلسل ختم ہو جائے گا حاملہ یا مرضعہ خوف کی وجہ سے روزہ ترک کرے، یا دوسرے کسی ایسے عذر کی وجہ سے روزہ ترک ہو، جس کے ساتھ روزہ رکھنا صحیح ہو، تب بھی تسلسل ختم ہوگا۔

اگر بلاعذر فاسد کیا ہے، تو تمام روزے باطل قرار پائیں گے، عذر کی وجہ سے ہو تو نفل شمار ہوں گے۔ تسلسل ختم ہونے کی صورت میں از سرِ نو مکمل دو ماہ کے روزے واجب ہیں، بلاعذر تسلسل کو قطع کرنا حرام ہے، کیونکہ دو ماہ ایک دن کی طرح ہے، نیز اس دوران رات میں مظاہر کو مظاہر منہا سے صحبت کرنا حرام ہے، البتہ رات صحبت کرنے سے تسلسل ختم نہ ہوگا۔

حیض، نفاس، جنون اور مکمل دن بے ہوشی کی وجہ سے (روزہ ترک ہو) تو تسلسل ختم نہ ہوگا۔

(۳) اطعام (مساکین کو اناج دینا): اگر بوڑھاپے، یا ایسی بیماری کی وجہ سے جس کے متعلق عادت کی وجہ سے یا عادل طبیب کے کہنے کی وجہ سے یہ گمان ہو کہ (کم از کم) دو ماہ تک اس مرض کا سلسلہ جاری رہے گا، روزہ رکھنے سے یا تسلسل کے ساتھ رکھنے سے عاجز ہو، یا کافی مشقت لاحق ہوتی ہو، گو یہ مشقت شہوت کی قوت کی وجہ سے ہو، یا روزہ کی وجہ سے مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہو، تو ظہار کے اور رمضان میں جماع کے کفارہ میں اطعام پر عمل کرے، یعنی زکات کے مستحق ساٹھ (۶۰) فقراء ومساکین کو صدقۂ فطر کے جنس سے ایک ایک مد اناج کا مالک بنائے، اگر تیس مساکین کو دو دو مد دے تو یہ کافی نہیں، مزید ۳۰ مساکین کو ایک ایک مد دینا ضروری ہے، کیونکہ مساکین کی تعداد ۶۰ ہونا اور ہر ایک کو ایک مُد یا ایک مُد سے کم نہ ہونا ضروری ہے۔

کافر کو یا سادات کو دینا، جس کا نفقہ خود کفارہ ادا کرنے والے پر واجب ہو، اسے دینا کافی نہیں۔ اگر کھانا پکا کر فقراء ومساکین کو دو وقت کھلادے تو یہ کافی نہیں، کیونکہ یہ دعوت ہے، جس میں صرف، اباحت ہوتی ہے، تملیک نہیں ہوتی۔

کفارہ کے تمام خصال سے عاجز ہو، تو کفارہ ساقط نہ ہوگا، بلکہ اس کے ذمہ باقی رہے گا، جب بھی کسی خصلت پر قادر ہو، اسے ادا کرے، کیونکہ اعرابی کے اپنے آپ کو تینوں خصلتوں سے عاجز بتلانے کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے سپرد اناج کر کے کفارہ کی ادائیگی کا حکم دیا، اس سے پتہ چلا کہ کفارہ اس پر باقی تھا، غلام کا کچھ حصہ آزاد کرنا یا چند روزے رکھنا، کافی نہیں، لیکن چند مد اناج دے سکتا ہو، تو اتنے دے دے، بقیہ جب بھی گنجائش نکلے ادا کرے، بعض مد کی ادائیگی کے بعد آزادی یا روزہ پر قدرت حاصل ہو، تو وہ لازم نہیں کیونکہ اطعام شروع کر چکا ہے۔ (المجموع ۶/۳۴۷–۳۸۴، فتح الوهاب مع الجمل ۴/۴۱۳–۴۲۳، الفقه المهنجی ۴/۱۴۷، تحفه مع الحواشی ۱۰/۳۳۸–۳۶۲، مغنی ۳/۳۵۹–۳۶۷، نهایه مع الحواشی ۷/۹۰–۱۰۲)

لِعَانُ وَقَذْف

قَذف: قذف عربی زبان میں پھینکنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، شرعاً کسی شخص کو عار دلانے کے طور پر زنا کی تہمت لگانا قذف کہلاتا ہے۔

لِعَان: لعان دراصل لَاعَنَ کا مصدر ہے، جس کا مطلب ہے دور کرنا، دھتکارنا، رسوا کرنا، اور گالی دینا

اپنے فراش (بستر) کو آلودہ کرنے والی (یعنی بیوی) اور عار لاحق کرنے والی کو قذف کرنے پر یا بچے کے نسب کی اپنی ذات سے نفی کرنے پر جو مجبور ہو، اس کے حق میں بطور حجت ودلیل جو کلمات (جملے) معلوم ومخصوص ہیں، اسے لعان کہا جاتا ہے۔

اسے لعان کہنے کا سبب یہ ہے کہ اس میں لعنت کا لفظ پایا جاتا ہے، نیز میاں بیوی لعان کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا اور دور ہو جاتے ہیں۔

لعان کے کلمات دراصل قسم ہیں، گو شہادت (گواہی) کے الفاظ میں ہیں، اسی لئے جو اس میں جھوٹا ہو اس پر چار کفارے لازم ہیں۔

حکمت: عام حالات میں کسی کو قذف کرنے کی صورت میں حد قذف عائد ہوگی، (جبکہ گواہوں کو پیش نہ کرے) لیکن کوئی شخص اپنی بیوی کو قذف کرے تو لعان کے مخصوص احکام عائد ہوتے ہیں۔ اس فرق وامتیاز کا سبب یہ ہے کہ کسی دوسرے کو قذف کرنے کی ضرورت نہیں، خواہ سچا ہو یا جھوٹا، بلکہ اسلامی وآداب کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالے، اور تنہائی میں اسے نصیحت کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

لیکن کسی کی بیوی بدکاری کا ارتکاب کر کے اس کی عزت پر دھبہ لگائے تو یہ ایک ایسا عذر شرعی ہے کہ شریعت نے لعان کی شکل میں نجات کا راستہ بتلایا۔ اگر طلاق دے کر اسے جدا کر دے، تو بیوی کی اس حرکت کے مقابلہ میں کسی بدلہ کے بغیر محض شوہر کو مہر وغیرہ کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے، لہٰذا زوجین کے تعلق سے قذف کی صورت میں لعان کے امتیازی حکم کے ذریعے دونوں کا حق میں ایک منصفانہ فیصلہ دیا گیا، اور دونوں کو ایک دوسرے کے بے جا ظلم کا شکار ہونے سے بچایا گیا۔

آیت: ”وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ ... اِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ“ (النور ۶–۹)

ترجمہ: ”اور جو لوگ اپنی بیویوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں اور ان کے پاس بجز اپنے اور کوئی گواہ نہ ہوں (جن کا عدد میں چار ہونا

چاہیئے) تو ان کی شہادت (جو کہ حبس یا حد قذف کو دفع کرے) یہی ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ دے کہ بیشک میں سچا ہوں اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اور (اس کے بعد) اس عورت سے سزا (یعنی حبس یا حد زنا) اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار بار قسم کھا کر کہے کہ بے شک یہ مرد جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ سچا ہو"

صحیحین وغیرہ میں حضرت ہلال بن اُمَیَّہ اور حضرت عُوَیمر عَجْلانی اور ان کی بیویوں کے لعان کی تفصیلات موجود ہیں۔

قذف کے صریح الفاظ : تونے زنا کیا، اے زانی، اے زانیہ، تیرے عضو تناسل نے یا تیرے فرج (شرم گاہ) نے یا تیرے بدن نے زنا کیا، تونے اپنے حشفہ کو حرام فرج میں داخل کیا، یا دبر (پچھلی شرم گاہ) میں داخل کیا۔

کسی دوسرے کے اولاد کو یہ کہے کہ تو اس کی اولاد نہیں ہے، تو یہ اس کے ماں پر صریح تہمت ہوگی۔

قذف کے کنایہ الفاظ : تیرے ہاتھ یا پیر نے زنا کیا، اے فاجر (فاجرہ)، اے فاسق (فاسقہ) تجھے تنہائی پسند ہے، (کسی عورت سے جس کا مباح طریقہ سے ثیبہ ہونا معلوم نہ ہو یہ کہنا کہ) میں نے تجھے باکرہ (کنوراى، دوشیزہ) نہیں پایا، کسی عربی کو نبطی کہہ کر پکارنا (جو عراق کی ایک قوم ہے) یا اسکے برعکس، اپنے بیٹے سے یہ کہنا کہ تو میرا بیٹا نہیں، (والد کی یہ بات بطور تادیب وتنبیہ بھی ہوسکتی ہے، اس لئے یہ کنایہ ہے، اگر پوچھنے پر کہے کہ زنا کی اولاد ہے تو قذف ہے۔ یا یہ کہے کہ شکل وصورت یا اخلاق میں میرے مشابہ نہیں، تو قسم کے ساتھ اس دعوی کو تسلیم کریں گے)

تعریض : اے حلال زادہ، میں زانی نہیں ہوں، یہ الفاظ کوئی قذف کی نیت سے کہے، تب بھی قذف شمار نہ ہوں گے، کیونکہ نیت کا اعتبار اس وقت ہوگا، جب کہ الفاظ میں اس مفہوم کی کچھ گنجائش بھی ہو، اور ان الفاظ میں ایسا کوئی احتمال موجود نہیں، اس سے اگر ایسا مفہوم ذہن میں آئے تو قرائن احوال کی وجہ سے ہے (نہ کہ الفاظ کے احتمال کی وجہ سے)

قذف کے قصد سے مستعمل لفظ میں دوسرے مفہوم کا احتمال نہ ہو، تو یہ صریح کہلائے گا، ورنہ اگر اپنی وضع کے اعتبار سے قذف کا مفہوم نکل آئے تو کنایہ ہے (یعنی جس میں وضع کے اعتبار سے قذف اور غیر قذف دونوں کا احتمال ہو تو کنایہ کہلائے گا) ورنہ تعریض کہلائے گا (یعنی جو بالکل قذف کے لئے موضوع نہ ہو، بلکہ صرف قرائن سے مقصود سمجھ میں آئے، تو تعریض ہے امام ابن السبکی فرماتے ہیں کہ تعریض وہ لفظ ہے جو اپنے معنی میں مستعمل ہوتا کہ دوسرے معنی کی طرف اشارہ کرے)

قذف کی سزا : جو کسی محصن کو قذف کرے، اس پر حد نافذ ہوگی، فرمانِ باری ہے: " وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ الخ (النور : ۴)

ترجمہ : "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں کو تہمت لگائے پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ایسے لوگوں کو اَسّی دُرّے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول مت کرو، اور یہ لوگ فاسق ہیں"۔

اور کسی غیر محصن کو قذف کرے تو اس کی تعزیری سزا ملے گی، کیونکہ اس نے ایسی معصیت کا ارتکاب کیا ہے، جس میں حد یا کفارہ نہیں ہے۔ بیوی کو قذف کرے یا کسی دوسرے کو، یہی تفصیل رہے گی (حد وتعزیر کی تفصیل متعلقہ ابواب میں موجود ہے)

محصن : جس شخص کو قذف کرنے سے حد نافذ ہوتی ہے، اس سے مکلف، آزاد اور زنا اور بیوی کے دُبر میں صحبت سے پاکدامن مسلمان مرد (حدِ قذف کے مسئلہ میں اسی کو محصن کہا جاتا ہے) اپنی بیوی سے حیض یا نفاس میں صحبت کرے، تب بھی محصن شمار ہوگا (گو یہ فعل حرام ہے)

اگر کوئی شخص مذکورہ بالاشرائط کے مطابق محصن نہ ہو،تو اسے قذف کرنے والے پر حدِ قذف نافذ نہ ہوگی، گو وہ شخص توبہ کر کے ایک صالح زندگی گذار رہا ہو۔

شوھر کا بیوی کو قذف کرنا : ان دوصورتوں میں شوہر بیوی کو قذف کرسکتا ہے:

(۱) بیوی کے زنا کا یقین ہو، مثلاً اپنی آنکھ سے اس حرکت کو دیکھا،

(۲) زنا کا پختہ گمان حاصل ہو، مثلاً اس کا زید کے ساتھ زنا مشہور ہو اور ساتھ کوئی قرینہ بھی ہو، جیسے دونوں کو تنہائی میں دیکھا، یا زید کو اس کے پاس سے نکلتے دیکھا، صرف شہرت یا صرف قرینہ کافی نہیں۔

مذکورہ صورتوں میں اگر بچہ کی نفی کا مسئلہ نہ ہو، تو اس مسئلہ پر پردہ ڈالنا اور اس کے ساتھ رہنا گوارہ نہ ہو، تو اسے طلاق دینا بہتر ہے، (بہ نسبت اس کے کہ قذف کر کے لعان کرے)

بچه کا انکار : اگر بیوی کو بچے پیدا ہو، اور شوہر کو یقین ہو، یا پختہ گمان ہو، کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے، (اور انکار نہ کرے تو بظاہر اس کا شمار ہوسکتا ہو) تو اس بچہ کا انکار کرنا کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے، لازم ہے، کیونکہ ورنہ بچہ کا نسب اس سے جڑے گا، اور غیر کے بچہ کو اپنی طرف منسوب کرنا حرام ہے، جیسا کہ اپنے بچہ کا انکار حرام ہے۔

بچه اپنا نه هونے کے یقین یا پخته گمان کی صورتیں : ابھی تک بیوی سے صحبت ہی نہیں کی، یا صحبت کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ تولد ہو، یا صحبت سے چار سال کے بعد بچہ پیدا ہو۔

بچہ کے انکار کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بیوی کو قذف کرے (جب کہ زنا کا یقین یا پختہ گمان ہو) پھر لعان کرے، بچہ کے انکار کے لئے یہ دونوں بھی لازم ہیں، اگر زنا کا یقین یا پختہ گمان نہ ہو، تو قذف نہ کرے، کیونکہ بچہ شبہ کی وطی وغیرہ سے بھی ہوسکتا ہے، لیکن بچہ کی نفی لازم ہے، لہٰذا (لعان کے مشہور الفاظ کے بجائے) اس طرح کہے: میرے بستر پر دوسرے کی اس کے ساتھ صحبت کی تہمت میں میں سچا ہوں، اور یہ بچہ اسی صحبت سے ہے۔ (یہاں بستر سے ظاہری مفہوم کے بجائے باقاعدہ اپنی زوجیت میں ہونا مراد ہے)

اگر بچہ اپنا نہ ہونے کا یقین یا پختہ گمان نہ ہو، تو اس کی نفی نیز قذف ولعان حرام ہے مثلاً زنا سے چھ ماہ کے اندر بچہ پیدا ہو، اور دل میں کچھ تردد وغیرہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اگر کوئی صحبت کرے اور عزل کرے (باہر انزال کرے) تب بھی بچہ کی نفی کرنا جائز نہیں۔

لعَان

شوھر کے لعان کی کیفیت : چار مرتبہ اس طرح کہے: ''اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اِنِّیْ لَمِنَ الصَّادِقِیْنَ فِیْمَا رَمَیْتُ بِهٖ هٰذِهٖ مِنَ الزِّنَا '' (میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اسے (اپنی بیوی کو) جو زنا کی تہمت لگائی ہے اس میں میں بلاشبہ سچا ہوں)

پھر پانچویں مرتبہ کہے: ''اِنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَیَّ اِنْ کُنْتُ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ فِیْهِ '' (بے شک مجھ پر اللہ کی لعنت ہو، اگر میں اس میں (یعنی بیوی کو زنا کی تہمت لگانے میں) جھوٹا ہوں)

مذکورہ الفاظ اس وقت کہے گا، جب کہ بیوی روبرو حاضر ہو۔ اگر حاضر نہ ہو تو اس کا نام ونسب بیان کرے کہ وضاحت ویقین ہوجائے۔ لعان میں معاملہ کی تاکید کے پیش نظر چار مرتبہ شہادت کو دوہرایا گیا، نیز شوہر کی جانب سے یہ کلمات چار گواہوں کے قائم مقام

ہے، یہ درحقیقت قسمیں ہیں۔اور پانچواں جملہ پہلے جملوں کے مفاد کی تاکید کے لئے ہے۔

اگر بچہ کا انکار بھی کرنا ہو، تو پانچویں جملوں میں اس کا بھی ذکر کرے، یعنی یہ کہے کہ اس کا بچہ (یا یہ بچہ) زنا سے ہے (بہتر ہے کہ آگے یہ بھی کہہ دے، میرا نہیں ہے) صرف یہ کہنا کہ میرا نہیں ہے، کافی نہیں، پانچویں مرتبہ یہ بڑھادے:...اگر میں...اس دعوی میں جھوٹا ہوں کہ بچہ زنا سے ہے، میرا نہیں ہے...

اگر لعان کے کسی جملہ میں بچہ کی نفی نہ کرے تو اس کے لئے شوہر کو ازسرِ نو لعان کرنا ضروری ہے۔ بیوی کو دوبارہ لعان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بیوی کا لعان: شوہر لعان سے فارغ ہوجائے تو بیوی اس طرح لعان کرے:

چارمرتبہ یہ جملے کہے: ’’أَشْهَدُ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ فِيْمَا رَمَانِيْ بِهٖ مِنَ الزِّنَا‘‘

(میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتی ہوں کہ بے شک اس نے مجھ پر زنا کی جو تہمت لگائی ہے، اس میں یہ جھوٹا ہے)

پانچوں مرتبہ یہ جملہ کہے: ’’إِنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيَّ إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ فِيْهِ‘‘ (بے شک اللہ کا غضب ہو مجھ پر، اگر اس تہمت میں یہ سچا ہو)

عورت کو اپنے لعان میں بچہ کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تفصیل اس صورت میں ہے جب کہ شوہر نے بیوی کو قذف کیا ہو، اور بیوی نے گواہوں کے ذریعہ قذف کو ثابت نہ کیا ہو، اگر صرف بچہ کا انکار مقصد ہو، مثلاً وطی بالشبہ سے بھی ہوسکتا ہو، یا گواہوں کے ذریعہ بیوی نے شوہر کا قذف ثابت کیا ہو، تو پہلی صورت میں اس طرح کہے...میرے فراش پر اس کے ساتھ دوسرے کے صحبت کی تہمت...اور یہ کہ یہ بچہ اسی صحبت سے ہے...اور دوسری صورت میں اس طرح کہے:...اُس نے مجھ پر جو زنا کی تہمت کو ثابت کیا ہے...

پہلی صورت (یعنی وطی بالشبہ کی نسبت) میں عورت لعان نہ کرے، کیونکہ اس میں اس پر حد عائد نہیں ہوتی کہ اس کے دفع کرنے کے لئے لعان کرنا پڑے۔

شرائط: (۱) بیوی کا لعان شوہر کے لعان کے بعد ہونا شرط ہے، کیونکہ بیوی کا لعان اس پر عائد ہونے والی سزا کو دور کرنے کے لئے ہے، اور یہ سزا شوہر کے لعان سے واجب ہوگی، لہٰذا اس سے قبل لعان کی کوئی ضرورت نہیں ہے (۲) لعنت اور غضب کا لفظ پہلے کے چار جملوں کے بعد ہی ہونا شرط ہے (۳) مذکورہ جملوں میں شہادت، لعنت، اور غضب کے الفاظ کی جگہ کسی دوسرے الفاظ کا استعمال کرے تو لعان صحیح نہ ہوگا، تاکہ قرآنی الفاظ کی اتباع ورعایت ہو۔ (۴) لعان کے پانچوں جملے مسلسل ادا ہوں، درمیان میں زیادہ فاصلہ نہ ہو، زوجین کا لعان مسلسل ہونا ضروری نہیں، دونوں میں کافی فصل ہوجائے، تب بھی کافی ہے۔

(۵) قاضی (حاکم) لعان کے کلمات کی تلقین کرے (یعنی کہلوائے) شوہر اور بیوی سے کہے کہ اس طرح کہو...(قاضی اجمالاً صرف کلمات لعان کی ادائیگی کا حکم دے تو بظاہر یہ بھی کافی ہے، قاضی کا باقاعدہ مکمل جملے ادا کرنا ضروری نہیں) قاضی کی تلقین کے بغیر ہی لعان کے جملے ادا کرنا معتبر نہیں زنا کے سلسلہ میں لعان کے لئے محکم بھی کافی ہے، غیر مکلف بچہ کے انکار کے لئے محکم کافی نہیں، اگر مکلف ہو اور تحکیم سے راضی ہو تو کافی ہے۔قذف ولعان غیر عربی زبان میں بھی صحیح ہے، گو وہ عربی سے واقف ہو، اسی طرح گونگے کے بامفہوم اشارہ یا تحریر کے ذریعہ بھی قذف ولعان صحیح ہے۔لہٰذا اشارہ یا تحریر کو لعان میں پانچ مرتبہ ادا کرے، اگر بامفہوم اشارہ اور تحریر پر قادر نہ ہو، تو اس کا قذف ولعان صحیح نہیں، جیسا کہ دیگر تصرفات صحیح نہیں، کیونکہ اس کا منشاء معلوم ہونا دشوار ہے۔

سنتیں : (۱) وقت اور جگہ کے اعتبار سے تغلیظ (موکد کرنا) سنت ہے، پس عصر کے بعد لعان کروائے، کیونکہ صحیحین کی حدیث کی رو سے اس وقت جھوٹی قسم کی سزا زیادہ سخت ہے، ممکن ہو تو بروز جمعہ عصر بعد کرانا بہتر ہے۔ لعان کے لئے بستی کی اشرف و زیادہ بابرکت جگہ کا انتخاب کرے، پس مکہ میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان، بیت المقدس میں صخرہ کے پاس، اور دیگر بستیوں میں جامع مسجد کے منبر پر لعان کروائے۔

یہود و نصاریٰ اور آتش پرستوں کو ان کی عبادت گاہوں میں لعان کروائے لیکن بت پرستوں کے لعان کے لئے ان کے بت کدہ میں نہ جائے، بلکہ فیصلہ کی جگہ میں ہی لعان کروائے۔

(۲) بوقت لعان بستی کے معتبر و نیک افراد موجود ہوں، کم از کم چار افراد ہوں، جو گواہی کے قابل اور لعان کی زبان سے واقف ہوں۔

(۳) ایک شخص پیچھے سے آکر شوہر کے منہ پر اور ایک عورت بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے حکم دیا تھا، قاضی یا اس کا نائب ان دونوں کو وعظ و نصیحت کرے، اور قرآن کی آیت پڑھ کر سمجھائے کہ دنیوی سزا آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور معمولی ہے۔

(۴) پانچویں جملہ سے قبل پر زور انداز میں سمجھائے، شوہر سے کہے کہ اللہ سے ڈرو، کیونکہ پانچواں جملہ اللہ کی لعنت کو واجب کردے گا، بیوی سے بھی اس طرح کہے کہ غضب کو واجب کردے گا، شاید کہ وہ باز آجائیں، ایک شخص کو شوہر کے منہ پر اور ایک عورت کو بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھنے کا حکم دے، جیسا کہ ابوداود میں یہ حکم موجود ہے۔ بقول امام الحرمین وغزالی ہاتھ رکھنے والا پیچھے سے آئے۔ اگر باز نہ آئیں تو پانچواں جملہ بھی تلقین کرے۔

(۵) میاں بیوی ایک دوسرے کے روبرو ہوں، اور ایک دوسرے کا کلام سن سکتے ہوں۔

(۶) شوہر کھڑا ہو کر لعان کے کلمات ادا کرے، اور بیوی بیٹھی رہے، پھر وہ کھڑی ہو کر ادا کرے اور شوہر بیٹھا رہے۔

بغیر عذر کے مذکورہ کسی سنت کی خلاف ورزی مکروہ ہے۔

مُلَاعِنْ (لعان کرنے والا) : مُلَاعِن ایسا شوہر ہو، جس کا طلاق دینا درست ہو، گو ذمی ہو یا نشہ میں ہو، شوہر بیوی کے زنا پر گواہوں کو پیش کرسکتا ہو، تب بھی (پیش نہ کرتے ہوئے) لعان کرنا بالاجماع جائز ہے، جب کہ بچہ کی نفی کرنا ہو، گو بیوی کا حد قذف معاف کرے اور طلاق وغیرہ کے ذریعہ اس سے جدا ہو چکی ہو، اسی طرح بیوی سزا کا مطالبہ کرے، تو اسے دفع کرنے کے لئے لعان کرسکتا ہے، گو وہ جدا ہو چکی ہو اور بچہ نہ ہو۔

اگر کسی چھوٹی بچی کو تہمت لگائے، جس سے صحبت ممکن نہ ہو، یا بڑی عورت کا زنا گواہوں یا اس کے اقرار سے ثابت ہونے کے بعد اسے تہمت لگائے، تو شوہر کو تادیبا تعزیری سزا ملے گی، اور اس سزا کے دفع کرنے کے لئے لعان کی اجازت نہیں۔

اگر بیوی کا زنا گواہوں سے یا اقرار سے ثابت ہو، یا بیوی سزا معاف کردے، یا سزا کا مطالبہ ہی نہ کرے، یا قذف کے بعد بیوی پاگل ہو جائے، اور ان تمام صورتوں میں بچہ نہ ہو، تو لعان نہیں کیا جائے گا۔

شوھر کے لعان پر مرتبہ احکام : شوہر لعان کے تمام الفاظ سے فارغ ہو جائے تو درج ذیل احکام مرتب ہوں گے (گو بیوی لعان نہ کرے)

(۱) ظاہراً باطناً نکاح فسخ ہوگا (۲) دونوں ہمیشہ ہمیش کے لئے ایک دوسرے پر حرام ہوں گے، گو بعد میں شوہر خود کو جھٹلائے (کہ

میں اس تہمت ولعان میں جھوٹا تھا) بیہقی کی روایت میں ہے کہ "دولعان کرنے والے کبھی بھی آپس میں جمع نہ ہوں گے" (بعضوں نے کہا کہ جنت میں بھی یہ دونوں جمع نہ ہوں گے)

اگر شوہر خود کو جھٹلائے، تو اس پر سزا عائد ہوگی، نیز بچہ کا نسب ثابت ہوگا، اور پرورش کی ذمہ داری عائد ہوگی، اور بیوی کی سزا ساقط ہوگی۔

(۳) لعان میں جس بچہ کی نفی کی ہو، اس کا نسب اس سے کٹ جائے گا، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ "آپ ﷺ نے دونوں (میاں بیوی) کو جدا کر دیا، اور بچہ کو عورت کے ساتھ جوڑ دیا"

(۴) بیوی کی جانب سے جو سزا (قذف کی وجہ سے) شوہر پر عائد ہو رہی تھی، وہ ساقط ہوگی، اگر لعان میں زانی کا بھی نام لے تو اس کے قذف کی سزا بھی ساقط ہوگی۔

(۵) اگر بیوی لعان نہ کرے تو اس شوہر کے حق میں وہ مُحْصَن شمار نہ ہوگی۔

(۶) شوہر کے لعان کرنے سے بیوی زنا کے سزا کی مستحق ہوگی، اور اس سزا کو دفع کرنے کے لئے بیوی لعان کر سکتی ہے، اگر گواہوں سے زنا ثابت ہو، تو لعان سے سزا ساقط نہ ہوگی، اگر بظاہر بچہ کسی درجہ میں شوہر کا ہو سکتا ہو، تب اس کی نفی کرے گا، اگر اس کا امکان ہی نہ ہوا (مثلاً نکاح سے چھ ماہ کے اندر ہی بچہ پیدا ہو، یا مجلس نکاح میں ہی طلاق دی تھی، یا شوہر ممسوح ہو، یا نکاح کے وقت سے شوہر مشرق میں اور بیوی مغرب میں ہو) تو بچہ کی نفی کے لئے لعان نہ کرے، کیونکہ جب شوہر کا ہو ہی نہیں سکتا، تو لعان کے بغیر بھی اس کا نسب اس سے نہ جڑے گا۔

بچہ کا انکار: بچہ کا انکار کرنا ہو، تو فوراً حاکم کو اس کی اطلاع دینا ضروری ہے، (گویا قاعدہ لعان کے ذریعہ انکار کے مطابق فیصلہ بعد میں ہو) اگر فوراً حاکم تک پہنچنے میں کچھ عذر درپیش ہو مثلاً (بچہ کی پیدائش کی) خبر رات کو ملی، اس لئے صبح تک مؤخر کیا، یا نماز کا وقت ہو چکا تھا، اس لئے نماز کی ادائیگی، یا بھوکا تھا لہٰذا پہلے کھانا کھالیا، تو (اس تاخیر میں) وہ معذور سمجھا جائے گا۔

اگر وہ قید میں ہو یا مریض ہو، یا مال ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، تو کسی کو قاضی کے پاس روانہ کرے، تاکہ وہ اپنا نائب اس کے پاس روانہ کر دے، تاکہ یہ اس نائب کے سامنے لعان کر لے، یا قاضی کو اطلاع دے کہ میں بچہ کے انکار پر قائم ہوں، اگر اس طرح نہ کرے تو اس کا حق باطل ہوگا، اگر کسی کو روانہ کرنا بھی دشوار ہو، تو اپنے انکار پر گواہ قائم کرے، جبکہ یہ ممکن ہو، امکان کے باوجود کسی کو گواہ نہ رکھا، تو حق باطل ہوگا، اگر گواہوں کا قائم کرنا بھی دشوار ہو، تو حق باطل نہ ہوگا۔

حمل کا انکار: شوہر حمل کی حالت میں ہی حمل کا انکار کر سکتا ہے (یعنی یہ کہ بیوی کے پیٹ کا بچہ میرا نہیں ہے) جیسا کہ صحیحین میں حضرت ہلال بن امیہ کا حمل کی طرف سے لعان کرنا موجود ہے۔

بیوی کے پیٹ میں حمل ہی ہے اس بات کے یقین کے لئے زچگی تک لعان مؤخر کر سکتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے پیٹ میں حمل کے علاوہ کچھ اور بیماری ہو۔ اگر اس لئے لعان مؤخر کرے کہ بچہ مردہ پیدا ہو، تو لعان کی نوبت ہی نہ آئے، تو اس کا حق باطل ہوگا۔

اگر انکار کو مؤخر کرے، اور کہے کہ مجھے زچگی کا علم نہیں تھا، اور اس کی لاعلمی ممکن ہو، تو قسم دلا کر تصدیق کی جائے گی، اگر لاعلمی کا امکان نہ ہو تو تسلیم نہ کریں گے، اگر نفی کے مسئلہ سے یا فوراً نفی کرنے سے لاعلمی کا دعوی کرے، اور وہ شخص تازہ ہی اسلام میں داخل ہوا ہو، یا علماء سے دور پرورش پایا ہو، یا عام آدمی ہو، تو قسم کے ساتھ اس کا دعوی تسلیم کیا جائے گا۔

جڑواں بچے: اگر دو بچوں کی پیدائش کے درمیان چھ ماہ سے کم مدت ہو، تو یہ جڑواں شمار ہوں گے، لہٰذا صرف ایک کا انکار

کرنا قبول نہ ہوگا، بلکہ پہلے بچے کے وقت اس کا انکار کرے، پھر دوسرا پیدا ہوا اور سکوت اختیار کرے، تو دونوں کا نسب اس سے جڑے گا، اگر دوسرے کا بھی فوراً انکار کرے تو دونوں مُنتفی ہوں گے۔ دونوں کے انکار کے بعد ایک کا بھی اقرار کرے تو دونوں کا نسب اس سے جڑے گا۔

اگر دو بچوں کی پیدائش میں چھ ماہ یا زائد مدت کا فاصلہ ہو جائے تو یہ دونوں جدا جدا حمل ہیں، لہٰذا صرف کسی ایک کی نفی کرنا صحیح ہے۔

(فتح الوهاب مع الجمل ۴/۴۲۳-۴۴۰، مغنی ۳/۳۶۷-۳۸۳، تحفه مع الحواشی ۱۰/۳۶۳-۴۱۱، نهایه مع الحواشی ۷/۱۰۳-۱۲۵، الام ۵/۴۱۰-۴۲۴، المجموع ۱۷/۳۸۵-۴۵۸، الفقه المنهجی ۴/۱۵۰، معرفة السنن ۵/۵۴۱-۵۶۷)

عِدّت

تعریف: عدت عَدَد (شمار۔ گنتی) سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ غالباً چند پاکی یا ماہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اصطلاحاً عدت اس معین مدت کا نام ہے جو ایک عورت اللہ تعالیٰ کے لئے تعبّداً یا شوہر پر رنج وغم کے طور پر یا برأت رحم (یعنی پیٹ میں حمل نہ ہونے) کے اطمینان کے لئے گذارتی اور انتظار کرتی اور اپنے آپ کو (نکاح سے) روکتی ہے۔ (جس حکم کا مقصد بظاہر انسانی عقل میں نہ آئے، اسے تعبدی حکم کہیں گے، خواہ عبادت ہو یا کچھ اور)

دلیل: قرآن کریم کی کئی آیات اور بکثرت، احادیث سے عدت کی مشروعیت ثابت ہے، اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ آئندہ عدت کے مختلف احکام اور تفاصیل کے دوران متعلقہ آیات وروایات کا تذکرہ ہوگا۔

عدت کے اقسام: (۱) حمل، یہ سب سے قوی عدت ہے، اور اس میں استبراء (برأت رحم) کا پہلو تعبد کے بمقابلہ قوی ہے۔

(۲) پاکی (طہر۔ اقراء) یہ درمیانی درجہ کی عدت ہے، اس میں استبراء وتعبد دونوں مساوی درجہ میں ہیں۔

(۳) ماہ، یہ ضعیف عدت ہے، اگر صحبت کے بعد ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ممکن ہو، تو تعبد واستبراء دونوں ہیں، اور صحبت سے قبل وفات کی وجہ سے ہو تو محض تعبدی عدت ہے۔

حکمت: (۱) اگر شوہر کی وفات کی وجہ سے عدت لازم ہو، تو یہ جدا ہونے والے شوہر کے حق کی وفا ہے، نیز جاہلیت کے مختلف ظلم وستم اور زیادتی کے احکام کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک مناسب اور معقول حکم کی مشروعیت ہے۔

(۲) زندگی میں طلاق وغیرہ کی وجہ سے جدائی ہو، اور عدت لازم ہو، تو اس میں یہ حکمتیں ہیں: نسب کی حفاظت، برأت رحم کا اطمینان، تعبدی پہلو، نکاح کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور اس کے مناسب شرعی اہمیت کو واضح کرنا۔

زندگی میں جدائی کی عدت

اگر شوہر کی زندگی میں زوجیت کا رشتہ طلاق یا فسخ کی وجہ سے ختم ہو جائے تو بیوی پر عدت واجب ہے، جب کہ شوہر کی محترم منی (عورت کی شرم گاہ میں) داخل ہو، یا اُس سے صحبت کرے، گو دُبُر میں صحبت کرے۔ اسی طرح برأت رحم کا یقین ہو تب بھی عدت لازم ہے، مثلاً شوہر یا بیوی کمسن ہو، کیونکہ دلائل عام ہیں، نیز انزال نگاہ سے پوشیدہ ہے، جس پر حمل کا دارومدار ہے، لہٰذا اس سے قطع نظر اس کے سبب یعنی صحبت یا منی کے داخل کرنے کو کافی سمجھا گیا، جیسا کہ سفر کی رخصتوں میں مشقت سے قطع نظر صرف سفر کو بنیاد بنایا گیا۔

اگر صحبت اور منی کا دخول نہ پایا گیا، تو عدت واجب نہیں، گو خلوت ہو چکی ہو، (یعنی دونوں تنہائی میں مل چکے ہوں)

آیت : ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ''(الاحزاب : ۴۹)

ترجمہ : ''اے ایمان والو! تم جب مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر تم ان کو ہاتھ لگانے کے قبل (کسی اتفاق سے) طلاق دے دو، تو تمہاری ان پر کوئی عدت (واجب) نہیں، جس کو تم شمار کرنے لگو''۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے وطی بالشبہ کرے، تو اس سے بھی عدت واجب ہوگی۔

وطی بالشبہ : شُبہ کی وطی سے وہ وطی مراد ہے جس میں وطی کرنے والے پر حد نہ آئے (مثلاً نکاح فاسد میں وطی، یا اپنی بیوی سمجھ کر پرائی عورت سے وطی وغیرہ) گو عورت پر حد آئے، مثلاً کسی قریب البلوغ شخص کا کسی بالغہ سے یا کسی پاگل کا کسی عاقلہ سے صحبت کرنا۔ البتہ اکراہ کی وجہ سے کوئی زنا کرے تو اس سے نہ عدت واجب ہوگی، اور نہ نسب ثابت ہوگا، گو زانی پر حد نافذ نہ ہوگی۔

محترم منی کا مطلب یہ ہے کہ منی کے نکلتے وقت اس کے گمان میں یا حقیقت میں وہ لذاتہ حرام نہ ہو۔ پس زنا یا بیوی کے علاوہ کسی کے استمناء کی وجہ سے نکلنے والی منی محترم نہیں، اور اس کے دخول سے عدت واجب نہ ہوگی۔

حائضہ کی عدت : مذکورہ بالا صورت میں اگر عورت آزاد ہو، اور اسے حیض آتا ہو (گو کسی دوا کے استعمال سے حیض شروع ہو) تو اس کی عدت تین قُـرُوْءَ ہوگی، اور یہاں قروء سے دو حیض کے درمیان، یا حیض و نفاس کے درمیان یا دو نفاس کے درمیان کی پاکی مراد ہے۔

آیت: (۱) ''وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ'' (البقرۃ : ۲۲۸)

ترجمہ: ''اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین طُہر (ختم ہونے) تک (نکاح سے) روکے رکھیں''۔

(۲) ''إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ'' (الطلاق : ۱) یعنی بیویوں کو طلاق دینا ہو تو عدت کے وقت میں دی جائے، اور وہ پاکی کا وقت ہے، کیونکہ حیض میں طلاق حرام ہے، صحیحین وغیرہ کی احادیث میں آپ ﷺ نے پاکی میں طلاق کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہی وہ عدت ہے، جس میں اللہ نے طلاق کا حکم دیا ہے۔ نیز طلاق کے ساتھ ہی عدت کی ابتداء بھی ہوگی، جب کہ طہر کو عدت شمار کیا جائے۔

لفظ قرء عربی میں حیض وطہر دونوں میں بطور اشتراک مستعمل ہے، مؤطا امام مالک اور بیہقی میں حضرت عائشہؓ سے اور امام مالک وشافعی نے حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر سے یہ نقل فرمایا ہے کہ طلاق کے بعد عورت کا تیسرا حیض شروع ہوتے ہی دونوں ایک دوسرے سے بری ہو جائیں گے (یعنی تین طہر گذرتے ہی عدت ختم ہوگی) (تلخیص الحبیر ۳/۲۳۳)

اگر پاکی میں طلاق دے، اور طلاق کے بعد پاکی کا کچھ وقت باقی ہو (گو ایک لحہ ہی ہو) تو تیسرا حیض شروع ہوتے ہی عدت ختم ہو جائے گی، کیونکہ بقیہ طہر (پاکی) بھی ایک 'قرء' شمار ہوگی، اور اس طرح تین طہر حاصل ہو چکے، جس پاکی میں طلاق دی ہے، اس میں صحبت کر چکا ہو، تب بھی وہ پاکی ایک قرء شمار ہوگی، دو پاکی اور ایک کے کچھ حصہ پر تین پاکی کے اطلاق میں حرج نہیں، جیسا کہ حج کے اشہر معلومات سے شوال، ذوالقعدہ، اور بعض ذوالحجہ مراد ہیں (حالانکہ اشہر جمع ہے، جس کا اطلاق عربی میں کم از کم تین پر ہوتا ہے)

اگر پاکی کے بالکل آخری لحہ میں طلاق دے (کہ طلاق کے بعد پاکی کا وقت بالکل نہ ملے) یا حیض کے دوران یا آخر میں طلاق دے، تو مکمل تین پاکی گذرنے کے بعد حیض شروع ہوتے ہی عدت ختم ہوگی۔ حیض ابتدائی لحہ عدت میں داخل نہیں ہے، بلکہ اس سے عدت کے اختتام کا علم ہوگا۔

جس عورت کو ابھی تک حیض یا نفاس نہ آیا ہو، تو پاکی کی یہ مدت قرء شمار نہ ہوگی۔ غیر آزاد عورت کی عدت دو قرء ہے۔

غیر حائضہ کی عدت: جس آزاد عورت کو ابھی تک حیض کا سلسلہ شروع نہ ہوا ہو، یا (بوڑھی ہونے کی وجہ سے حیض کا سلسلہ ختم ہو چکا ہو اور) حیض سے ناامید ہو چکی ہو (جسے آیسہ کہا جاتا ہے) تو اس کی عدت قمری تین ماہ ہیں۔ اگر ماہ کے ابتداء میں طلاق ہو، تو چاند کے اعتبار سے مکمل تین ماہ گذارے، خواہ مہینہ ۲۹ کا ہو یا ۳۰ کا اور اگر درمیان میں طلاق ہو، تو چوتھے ماہ میں اتنے ایام گذارے کے پہلے ماہ کے ایام سمیت ۳۰ دن مکمل ہوں، خواہ چاند انتیس کا ہو، یا تیس کا۔

آیت: ''وَالّٰئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَائِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ'' (الطلاق : ۴)

ترجمہ: ''اور تمہاری (مطلقہ) بیویوں میں سے جو عورتیں (زیادہ عمر کی وجہ سے) حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں، اگر تم کو (ان کی عدت کی تعیین میں) شبہ ہو، تو ان کی عدت تین مہینے ہیں اور اسی طرح جن عورتوں کو (اب تک کم عمری کی وجہ سے) حیض نہیں آیا (ان کی عدت بھی تین مہینے ہیں)''

اس صورت میں ایک غیر آزاد عورت ڈیڑھ ماہ عدت گذارے گی۔ اگر کسی عورت کا حیض رُک جائے تو حیض شروع ہونے تک یا آیسہ کی عمر تک پہنچنے تک انتظار کرے، گو طویل مدت گذر جائے، کیونکہ یہ مذکورہ دونوں صورتوں میں داخل نہیں، کہ فی الحال تین ماہ عدت گذارے۔

جسے ابھی تک حیض نہ آیا ہو وہ آیسہ مہینے کے اعتبار سے عدت گذارے، اور عدت ختم ہونے سے قبل حیض شروع ہو جائے، تو از سرِ نو پاکی کے ذریعہ عدت گذارے، سابقہ ایام شمار نہ ہوں گے، جسے ابھی تک حیض نہ آیا ہو وہ مہینوں کے اعتبار سے عدت مکمل کر لے۔ پھر حیض شروع ہو، تو اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا (اس کی عدت ختم ہو چکی، از سرِ نو گذارنے کی ضرورت نہیں)

آیسہ مہینوں میں عدت گذارے، پھر دوسرے نکاح سے قبل حیض شروع ہو جائے، تو از سرِ نو قرء (پاکی) کے ذریعہ عدت گذارے، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وہ آیسہ نہیں ہے، لیکن دوسرا نکاح ہو چکا ہو، تو اب اس پر کوئی عدت واجب نہیں۔

یاس یعنی حیض سے نااُمیدی کے سلسلہ میں جس حد تک ہمیں علم ہو سکتا ہو، ان تمام عورتوں کی عمر کا اعتبار کیا جائے گا، نہ کہ صرف اس عورت کے رشتہ دار عورتوں کا، اور نہ دنیا کے تمام عورتوں کا، غالباً یاس کی انتہائی عمر ۶۲ سال ہے۔

فائدہ: ابن النحوی کی 'عُجالہ' میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے حیض کو روکنے کے لئے دوا استعمال کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا، اس پر قیاس کرتے ہوئے اگر یاس کی عمر سے قبل کسی کا حیض رک جائے، تو اسے جاری کرنے کے لئے دوا کا استعمال جائز ہے۔ اگر کوئی یتیم لڑکی نکاح کی ضرورت مند ہو، تو دوا کے ذریعہ جلد حیض جاری کرنا (تا کہ بالغ ہونے کی وجہ سے نکاح ہو سکے) جائز ہونا قوی معلوم ہوتا ہے (قلائد ۲/۲۷۵)

حاملہ کی عدت: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'' (طلاق : ۴)

ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے''۔

حاملہ عورت کی عدت وضع حمل (زچگی) ہے، یعنی بچہ مکمل ماں کے پیٹ سے باہر نکل جائے، بعض حصہ نکلنے سے عدت ختم نہ ہوگی، اگر (حمل کا علم نہ ہونے کی وجہ سے) پاکی یا مہینوں میں عدت گذرانے کے بعد بھی حمل ظاہر ہو، تو زچگی کے بعد ہی عدت ختم ہوگی۔

اگر حمل میں ایک سے زائد بچے ہوں، تو آخری بچے کے مکمل جدا ہونے کے بعد عدت ختم ہوگی (پہلے بچے اور دیگر بچوں کی پیدائش کے درمیان چھے ماہ سے کم کا فاصلہ ہو، تو وہ ایک ہی حمل کے شمار ہوں گے، اس سے زائد فاصلہ ہو تو عدت پر موقوف نہ ہوگی)

اگر بچہ مردہ پیدا ہو، یا مُضغہ کی حالت میں اسقاط ہوا ور پیٹ میں باقی رہتا تو بظاہر شکل وصورت کا ظہور ہوا ہوتا، یعنی ہاتھ، انگلی یا ناخن وغیرہ ظاہر ہوں، یا دایہ یہ خبر دے کہ مزید رکتا تو صورت ظاہر ہوتی، تو ان صورتوں میں بھی عدت ختم ہوگی۔ اگر یہ شک ہو کہ یہ انسانی گوشت ہے، یا علقہ نکلے تو اس سے عدت ختم نہ ہوگی۔

اگر بچہ پیٹ میں مرجائے، تو اس کے نکلنے کے بعد ہی عدت ختم ہوگی، گو زیادہ مدت گذر جائے،

اگر بچہ کسی غیر انسانی شکل میں پیدا ہو، تو اس سے بھی عدت ختم ہوگی۔

وضع حمل سے عدت اسی صورت میں ختم ہوگی، جب کہ وہ حمل صاحبِ عدت (یعنی شوہر یا شبہ سے صحبت کرنے والے) کی طرف منسوب ہو، گو احتمال کے درجہ میں، جیسے لعان کے ذریعہ جس بچہ کی نفی کی گئی، لہٰذا کسی حاملہ سے لعان کر کے اس کے حمل کی نفی کرے، تو وضع حمل سے اس عورت کی عدت ختم ہوگی۔ حمل کی نسبت صاحبِ عدت کی طرف ممکن نہ ہو، تو اس سے عدت ختم نہ ہوگی، مثلاً شوہر موت کے وقت ۹ سال سے کم عمر ہو، یا ممسوح ہوا ور اس کی بیوی حاملہ ہو، تو وضعِ حمل سے عدت ختم نہ ہوگی۔ خصی یا مجبوب ہو، تو عدت ختم ہوگی اور بچہ اس کی طرف منسوب ہوگا۔

مسئلہ: کسی کی صحبتِ شبہ کی وجہ سے عورت عدت میں ہو، تو وہ شخص اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ جو عورت زنا سے حاملہ ہو، اس سے نکاح صحیح ہے، اور (وضع حمل تک) صحبت کرنا مکروہ ہے، اگر اس کے دخول کے امکان کے بعد چھے ماہ سے زائد عرصہ میں بچہ پیدا ہو تو اس (شوہر) کا شمار ہوگا، اگر نفی کرنا ہو، تو لعان لازم ہے۔ (قلائد: ۲/۲۷۵)

اگر عدت کے دوران عورت کو پیٹ میں گرانی یا حرکت کی وجہ سے حمل کا شک ہو، تو اس کے شک کے ازالہ تک دوسرا نکاح نہ کرے، اگر نکاح کرے تو باطل ہوگا، جب کہ بعد میں حمل ظاہر ہو، اگر حمل نہ ہو، تو ابن حجرؒ نے فرمایا کہ نکاح صحیح ہے، کیونکہ عقود میں اصل یہ ہے کہ نفس الامر اور حقیقت کا اعتبار ہوگا، بعض دیگر علماء نے دونوں صورتوں میں نکاح کو باطل قرار دیا ہے۔

اگر (مہینوں یا پاکی کی) عدت ختم ہونے کے بعد حمل کا شک ہو، تو اس کے ازالہ تک صبر کرنا سنت ہے۔ اگر شک کے ازالہ سے قبل نکاح کرلے، یا نکاح کے بعد یہ شک ہوا ہو تو نکاح باطل نہ ہوگا، البتہ نکاح کے بعد چھے ماہ کے اندر اسے بچہ پیدا ہو، تو معلوم ہوا کہ نکاح باطل تھا، اور بچہ پہلے شوہر کا ہوگا، جب کہ اس کی طرف نسبت ممکن ہو، اگر چھے ماہ یا زائد مدت میں بچہ پیدا ہو تو دوسرے شوہر کا شمار ہوگا (اور نکاح بھی صحیح شمار ہوگا)

اگر موت یا طلاق وغیرہ کی وجہ سے بیوی کی جدائی ہو، پھر اس جدائی سے قبل حاملہ ہونے کے امکان کے وقت سے چار سال یا اس سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو، تو یہ بچہ اسی کی طرف منسوب ہوگا۔ جب کہ اس عورت نے کسی دوسرے سے نکاح نہ کیا ہو یا نکاح تو کیا ہو، لیکن بچہ کے اس کی طرف نسبت کا امکان نہ ہو۔ اگر چار سال کے بعد بچہ پیدا ہو، تو اس کی طرف منسوب نہ ہوگا۔ اگر عورت (مہینے یا پاکی کی) عدت گذار کر دوسرا نکاح کرے، پھر حمل کے امکان سے چھ ماہ یا زائد مدت کے بعد بچہ پیدا ہو، تو اس دوسرے شوہر کا شمار ہوگا، اگر عدت میں نکاح فاسد کرے، اور دوسرے شوہر کو اس کا علم نہ ہو اور اتنی مدت میں بچہ پیدا ہو کہ اسی دوسرے شوہر کا ہو سکتا ہے، پہلے کا نہیں ہو سکتا تو دوسرے کی طرف منسوب ہوگا، اگر پہلے کا ہو سکتا ہے، نہ کہ دوسرے کا، تو پہلے کی طرف منسوب ہوگا۔ اگر اتنی مدت میں پیدا ہو کہ دونوں کا

ہوسکتا ہے، تو قائف (قیافہ شناس) کے روبرو پیش کریں گے، اگر وہ کسی ایک کے ساتھ جوڑے، تو اسی کی طرف منسوب ہوگا، اگر وہ دونوں سے جوڑے، یا دونوں سے نفی کرے، یا اسے بھی اشتباہ ہو، یا اس جگہ مسافتِ قصر کے اندر کوئی قائف ہی نہ ہو، تو اس بچہ کے بالغ ہونے اور خود کسی ایک کی طرف نسبت کرنے کا انتظار کریں گے، اگر وہ کسی کی بھی طرف نسبت نہ کرے تو اس پر کوئی جبر نہ کیا جائے۔

اگر دوسرا شوہر یہ سمجھ کر نکاح کرے کہ عدت ختم ہو چکی، یا اس کا گمان یہ ہو کہ عدت میں نکاح حرام نہیں، اور وہ ابھی ابھی اسلام لایا ہو یا علماء سے دور پلا بڑھا ہو، اور صحبت کرے تب یہ ساری تفصیل ہوگی، ورنہ دانستہ اس طرح کرے تو یہ زنا شمار ہوگا۔

اگر بچہ اتنی مدت میں پیدا ہو کہ دونوں کا نہیں ہوسکتا، یعنی دوسرے کی صحبت سے چھ ماہ کے اندر اور پہلے کی جدائی کے چار سال کے بعد پیدا ہو، تو کسی کی طرف بھی منسوب نہ ہوگا۔

ایک عورت کی دو عدتوں میں تداخل

اگر کسی عورت پر ایک ہی شخص کی ایک ہی جنس کی دو عدتیں لازم ہوں، تو دونوں میں تداخل ہوگا۔ مثلاً: کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے، پھر مہینوں یا پاکی والی رجعی عدت میں اس سے صحبت کرے، یا بائنہ عدت میں اسے مطلقہ کے بجائے اپنی بیوی سمجھتے ہوئے، یا قربِ اسلام یا بُعدِ علماء کی وجہ سے صحبت کی حرمت سے لاعلمی کی وجہ سے صحبت کرے، تو طلاق کی اور اس شبہ کی صحبت کی عدت میں تداخل ہوگا، لہٰذا اس صحبت سے فارغ ہونے کے بعد وہ از سرِ نو صحبتِ شبہ کی عدت شروع کرے گی، اور اسی میں طلاق کی بقیہ عدت بھی شمار ہوگی۔ طلاق رجعی کی صورت میں طلاق کی بقیہ عدت میں رجعت کرسکتا ہے، نہ کہ بعد میں۔

مثال: طلاق کی عدت کے دو ماہ گذرنے کے بعد صحبتِ شبہ کرے، تو اب مزید تین ماہ عدت گذارے، جس میں پہلا مہینہ بہ یک وقت طلاق کی عدت کا تیسرا مہینہ اور شبہ کی عدت کا پہلا مہینہ شمار ہوگا۔ اب اگر طلاقِ رجعی تھی تو طلاق کی عدت کے تیسرے ماہ کی تکمیل تک رجعت کرسکتا ہے، بقیہ دو ماہ جو خالص شبہ کی عدت ہے، اس میں رجعت نہیں کرسکتا (بائنہ عدت میں دانستہ صحبت کرے تو یہ زنا ہے)

اگر دونوں عدت دو جنس کی ہوں، مثلاً حمل اور پاکی، تب بھی تداخل ہوگا۔ لہٰذا کسی غیر حاملہ عورت کو طلاق دے، پھر پاکی کی عدت میں صحبتِ شبہ کرے جس سے وہ حاملہ ہو جائے، یا حاملہ کو طلاق دے اور دورانِ عدت صحبتِ شبہ کرے، تو پاکی کی عدت بھی وضعِ حمل میں داخل ہو جائے گی، اور وضعِ حمل سے دونوں عدت ختم ہوں گی، اور طلاقِ رجعی ہو، تو وضعِ حمل سے قبل رجعت کرسکتا ہے، خواہ حمل طلاق سے قبل ہو، یا صحبتِ شبہ کی وجہ سے ہو، اگر کسی عورت کو دورانِ حمل حیض آتا ہو، تب بھی اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ بلکہ وضعِ حمل ہی سے دونوں عدت ختم ہوں گی۔

دو اشخاص کی عدت: کسی عورت پر دو اشخاص کی دو عدت لازم ہوں، تو تداخل نہ ہوگا، کیونکہ عدت کے مستحق جدا ہیں بلکہ ہر ایک کے لئے مستقل مکمل عدت گذارے گی، جیسا کہ امام مالکؒ و شافعیؒ نے حضرت عمرؓ سے اور امام شافعیؒ، دار قطنیؒ و بیہقیؒ نے حضرت علیؓ سے نقل فرمایا ہے۔ (تلخیص ۳/۲۳۶) مثلاً: شوہر کی عدت کے دوران یا شبہ کی عدت کے دوران دوسرا شخص صحبتِ شبہ کرے، یا کوئی شبہ کی عدت کے دوران اپنی بیوی کو طلاق دے، تو تداخل نہ ہوگا۔ اس صورت میں حمل والی عدت مقدم ہوگی، خواہ اس کا سبب مقدم ہو، یا مؤخر، کیونکہ اس عدت میں تاخیر کی گنجائش نہیں، اگر طلاق دینے والے کا حمل ہو، پھر صحبت شبہ ہو، تو وضع حمل سے طلاق کی عدت ختم ہوگی، اب نفاس کے بعد پاکی کے ذریعہ شبہ کی عدت گذارے۔

اگر حمل نہ ہو، تو طلاق کی عدت شبہ کی عدت پر مقدم ہوگی، گو صحبتِ شبہ طلاق پر مقدم ہو، کیونکہ عقدِ جائز کی طرف منسوب ہونے کی

وجہ سے یہ قوی ہے۔

اگر رجعی طلاق ہو تو شوہر مذکورہ صورتوں میں اپنی عدت میں یا اس سے قبل اس سے رجعت کرسکتا ہے، گو وہ نفاس میں ہو، البتہ صحبت شبہ کے تعلق سے جتنی مدت وہ عورت اس کا فراش شمار ہوگی، اس میں رجعت درست نہیں، اسی طرح دوسرے کی عدت میں تجدید نکاح صحیح نہیں ہے۔ رجعت کے بعد اب اگر وہ حاملہ نہ ہو، تو طلاق کی عدت ختم ہوگی اب شبہ کی عدت گذارے، اگر طلاق مقدم ہو تو مکمل عدت شبہ گذارے، اور مؤخر ہو، تو بقیہ عدت کی تکمیل کرے، رجعت کے بعد عدتِ شبہ کی تکمیل تک بیوی سے استمتاع (صحبت وغیرہ) جائز نہیں، اگر شوہر سے حاملہ تھی، تب بھی وہ عدت ختم ہوچکی، اب وضع حمل اور نفاس کے بعد شبہ کی عدت گذارے، اس صورت میں نفاس کے ختم ہونے تک تمتع جائز ہے۔ کیونکہ وہ ایسی بیوی ہے، جو کسی دوسرے کی عدت میں نہیں ہے، اگر صحبتِ شبہ کی وجہ سے حاملہ عورت سے رجعت کرے، تو وضع حمل تک تمتع جائز نہیں۔

معتدہ کے ساتھ معاشرت (گذر بسر اور مل جل کر رہنا)

اگر رجعی عدت میں شوہر اس مطلقہ کے ساتھ معاشرت رکھے، یعنی دونوں میاں بیوی کی طرح رہیں، تنہائی یا ساتھ سونا وغیرہ پایا جائے، اور صحبت وغیرہ کرنا چاہے تو ممکن ہو، اور اس عورت کی عدت مہینوں یا پاکی والی ہو، تو اس کی عدت ختم نہ ہوگی، خواہ صحبت کرے یا نہ کرے، گو کتنا ہی عرصہ اس حال میں گذر جائے، جب یہ معاشرت ختم ہوجائے، یعنی شوہر یہ نیت کرلے کہ اب اس کے پاس نہیں لوٹنا ہے، تو سابقہ عدت پر بنا کرتے ہوئے بقیہ کی تکمیل کرے، اگر طلاق کے وقت سے ہی معاشرت جاری ہو تو مکمل عدت گذارے۔ لیکن طلاق کے وقت سے تین ماہ یا پاکی گذرنے کے بعد شوہر کو احتیاطاً رجعت کا حق نہ ملے گا، گو عدت بھی احتیاطاً ختم نہ ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ طلاق کے وقت سے عدت کی مقدار میں تمام احکام میں وہ بالکل رجعیہ کی طرح ہے۔ معاشرت کی وجہ سے مزید مدت میں ۶/ (چھ) احکام میں رجعیہ کی طرح ہے۔ اس پر طلاق واقع ہوگی، اس کا سکنیٰ (رہائش) واجب ہے، اس سے صحبت کی وجہ سے حد نہ لگے گی، اس کی بہن وغیرہ سے یا اس کے علاوہ چار سے نکاح جائز نہیں، اس سے نکاح جائز نہیں، اور ۹/ (نو) احکام میں وہ بائنہ کی طرح ہے: اس سے رجعت صحیح نہیں، (اگر اس دوران دونوں میں سے کوئی مرجائے تو) آپس میں میراث نہ چلے گی، اس سے ایلاء، ظہار اور لعان صحیح نہ ہوگا، اسے نفقہ اور کسوۃ (لباس) نہ ملے گا، اس سے خلع صحیح نہ ہوگا، یعنی خلع دینے کی صورت میں طلاق رجعی واقع ہوگی اور عوض لازم نہ ہوگا ۔ بائنہ مطلقہ کے ساتھ اس طرح معاشرت رکھی، تب بھی عدت ختم ہوگی، لیکن اس سے صحبتِ شبہ کرے تو بعد میں جب تک معاشرت ہو، اور شبہ باقی ہو، وہ نکاح نہیں کرسکتی، لیکن اسے طلاق دے تو واقع نہ ہوگی، نیز اس کے بہن وغیرہ سے نکاح کرسکتا ہے۔ اگر بائنہ سے بغیر شبہ کے صحبت کرے تو یہ زنا ہے۔ جس سے مسئلہ پر کوئی فرق نہ پڑے گا، اور اس کے باوجود عدت ختم ہوگی۔

شوہر کے علاوہ کوئی شخص رجعی یا بائنہ عدت میں اس کے ساتھ معاشرت رکھے، تو شوہر کے بائنہ کے ساتھ معاشرت رکھنے کی طرح ہے، پس اگر زنا کے طور پر صحبت کرے تو کوئی فرق نہیں (عدت ختم ہوگی) اور شبہ کی وجہ سے صحبت کرے، تو عدت ختم نہ ہوگی۔

اگر عورت حمل کی عدت میں ہو تو وضع حمل سے مطلقاً اس کی عدت ختم ہوگی۔

عدت میں نکاح: عدت میں صاحبِ عدت کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نکاح کو جائز سمجھتے ہوئے اس سے نکاح کرے اور صحبت کرلے تو صحبت کے وقت سے اس کی عدت رک جائے گی، دونوں میں تفریق کے بعد، یا وہ شخص خود دوبارہ اس کے پاس نہ آنے کی

نیت کر لے، تو اس کے بعد سابقہ عدت کی بقیہ مدت مکمل کرے، پھر اس شبہ کی صحبت کی مکمل عدت گذارے، اگر وہ حاملہ تھی یا صحبتِ شبہ سے حاملہ ہوئی، تو حمل والی عدت تفریق کے بغیر بھی وضع حمل سے ختم ہوگی۔ اگر صرف نکاح کرے، صحبت نہ ہو، تو اس سے عدت منقطع نہ ہوگی، گو معاشرت پائی جائے۔

عدت میں رجعت : کوئی شخص اپنی رجعیہ مطلقہ سے رجوع کرے اور وہ غیر حاملہ ہو اور پھر اسے طلاق دے، یا حاملہ ہو اور وضعِ حمل کے بعد طلاق دے، تو از سرِ نو مکمل عدت گذارے، گو رجعت کے بعد صحبت نہ کرے، اگر وضعِ حمل سے قبل ہی طلاق دے، تو وضعِ حمل سے عدت ختم ہوگی، گو رجعت کے بعد صحبت بھی کرلی ہو، اگر رجعی عدت میں رجعت کے بغیر دوسری طلاق دے، تو پہلے طلاق کی عدت دونوں کی طرف سے کافی ہے، گویا کہ دونوں طلاق ساتھ واقع ہوئے ہیں، گرچہ دوسری طلاق عوض کے مقابلہ میں ہو۔

عوض کے مقابل طلاق کی وجہ سے بیوی بائنہ ہوجائے تو شوہر عدت میں دوبارہ نکاح کرسکتا ہے، اگر نکاح کے بعد صحبت کرنے کے بعد پھر طلاق دے، تو اسے از سرِ نو مکمل عدت گذارنی لازم ہے، اگر صحبت سے قبل ہی طلاق دے، تو سابقہ عدت پر بناء کرے (یعنی نکاح ثانی سے قبل کی عدت کو شمار کر کے بقیہ کی تکمیل کرے) اس دوسری طلاق کی وجہ سے کوئی عدت لازم نہیں، کیونکہ یہ جدید نکاح تھا، جس میں صحبت سے قبل ہی طلاق دی گئی۔

وفات کی عدت

شوہر کا انتقال ہوجائے تو بیوی پر عدت گذارنا لازم ہے۔ اگر بیوی آزاد اور غیر حاملہ ہو، تو اس کی عدت چار ماہ دس روز ہیں، خواہ صحبت نہ ہوئی ہو۔ اگر بیوی رجعی عدت میں ہو، اور شوہر کا انتقال ہو، تو رجعی عدت ختم ہوجائے گی، اور از سرِ نو وفات کی مکمل عدت گذارے گی۔ اگر بیوی حاملہ ہو، لیکن حمل شوہر کا نہ ہو، مثلاً بچہ یا ممسوخ انتقال کرجائے اور اس کی بیوی حاملہ ہو، تو اس کی عدت بھی چار ماہ اور دس دن ہیں۔

مہینوں کا اعتبار چار سے ہوگا، اگر مہینہ کے بالکل ابتداء میں انتقال ہو تو چاند کے اعتبار سے چار ماہ (گو ۲۹ کے مہینے ہوں) پھر مزید دس دن گذارے، اگر انتقال کے بعد اس ماہ کے صرف دس روز باقی ہیں، تو اس کے بعد قمری چار ماہ گذارے (گو ناقص ہوں) اگر دس روز سے کم ہوں، تو چار ماہ کے بعد مزید اتنے دن گذارے کہ مجموعہ دس روز ہوجائے اگر دس روز سے زائد باقی ہوں تو آئندہ تین ماہ چاند کے اعتبار سے گذارنے کے بعد چوتھے ماہ میں اتنے دن گذارے کہ ابتدائی ایام سمیت مجموعہ ۴۰ (چالیس) دن ہوجائے، جس ماہ چاند کا علم نہ ہو اسے کامل شمار کرے۔

غیر آزاد عورت کی عدت مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ۲ ماہ اور ۵ دن ہوگی۔

آیت : ''وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ : ۲۳۴)

ترجمہ : ''اور جو لوگ تم میں وفات پاجاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں، وہ بیویاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) چار مہینے اور دس دن روکے رکھیں''۔

حاملہ متوفی عنہا : اگر بیوی شوہر سے حاملہ ہو، اور شوہر کی وفات ہو، تو عدت وضع حمل ہے، (اور وضع حمل میں وہی تفصیل ہوگی، جو طلاق کی عدت میں گذر چکی) خواہ شوہر کو صرف خصیتین ہوں، اور ذکر (آلہ تناسل) کٹا ہو، یا اس کے برعکس ہو، نیز بیوی آزاد ہو یا غیر آزاد اس کی عدت وضع حمل ہے۔

آیت: ''وَأُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ''(الطلاق : ۴)

ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے''۔

حدیث: ''حضرت سُبَیْعَہ الاَسْلَمِیَّہ شوہر کے انتقال کے وقت حاملہ تھیں پھر چند ایام میں (یعنی چار ماہ دس روز سے قبل ہی) ان کی زچگی ہوئی، تو آپ ﷺ نے انھیں نکاح کی اجازت دی''۔(مالک صحیحین ، احمد ، نسائی ، تلخیص ۳/۲۳۲)

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ابھی شوہر کا جنازہ تخت پر دھرا ہو، تدفین نہ ہوئی ہو، اور بیوی کی زچگی ہو جائے، تو اس کی عدت ختم ہو گی (مالک ، شافعی عبدالرزاق ، ابن ابی شیبہ ، تلخیص ۳/۲۳۶)

مفقود الخبر

اگر کوئی شخص سفر وغیرہ میں جا کر بالکل مفقود الخبر اور لاپتہ ہو جائے، تو اس کی بیوی اس کے موت یا طلاق کے ثبوت اور پھر عدت کے بغیر دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ اگر قاضی کے پاس گواہ اس کے موت کی گواہی دیں تو اس سے اس کی موت ثابت ہو گی۔ اس کی پیدائش سے اتنی مدت گذرنے کے بعد کہ بظاہر اس سے زائد اس کے جینے کا گمان نہ ہو، قاضی اس کی موت کا فیصلہ دے، تو اس سے بھی اس کی موت ثابت ہو گی، اور اب عدت گذار کر بیوی نکاح کر سکتی ہے، امام شافعی و بیہقی وغیرہ نے حضرت علیؓ سے نقل فرمایا ہے کہ مفقود کی بیوی آزمائش سے دوچار ہے، اس کے موت کی یقینی خبر یا طلاق تک اسے صبر کرنا چاہئے۔ بقول ابن جریج ابن مسعودؓ نے بھی ان سے اتفاق کیا (تلخیص ۳/۲۳۷)

اگر اس کی موت یا طلاق کے ثبوت سے قبل کوئی قاضی اس عورت کے نکاح کا فیصلہ دے، تو قیاس جلی کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہ نافذ نہ ہو گا۔ اگر عورت ثبوت سے قبل نکاح کر لے، پھر پتہ چلا کہ نکاح سے قبل اس شوہر کا انتقال ہو کر عدت کی مدت گذر چکی، تو یہ نکاح صحیح ہو گا۔ اگر پتہ چلا کہ پہلا شوہر (مفقود) ابھی زندہ ہے، تو یہ اسی کی بیوی ہے، گو اُس نے دوسرے شوہر سے نکاح کیا ہو اور حاکم نے اس کا فیصلہ دیا ہو، لیکن دوسرے شوہر کی صحبت چونکہ شبہ پر مبنی ہے اس لئے شبہ کی عدت گذارنے سے قبل پہلا شوہر اس سے تمتع نہیں کر سکتا۔ اس نکاح ثانی اور صحبت کی وجہ سے کسی پر حد نہ آئے گی، اور نہ دونوں شوہروں میں سے کسی پر ان کا نفقہ لازم ہے، البتہ ان میں جدائی کے بعد عورت پہلے شوہر کے گھر لوٹ جائے اور اسے اس کا علم ہو جائے، تو اب سے نفقہ واجب ہے۔

امام شافعی کے قولِ قدیم میں (جو بعض دیگر ائمہ کرام کا بھی مسلک ہے) مفقود الخبر کی بیوی، اپنا مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کرنے کے بعد وہ چار سال انتظار کا فیصلہ دے، قاضی کے فیصلہ کے بعد چار سال گذرنے کے بعد عورت وفات کی عدت گذار کر بعد میں نکاح کر سکتی ہے۔ جیسا کہ موطا میں امام مالک نے، اور امام شافعی، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ دار قطنی اور بیہقی نے حضرت عمرؓ سے، ابن ابی شیبہ و ابو عُبَید نے حضرت عمرؓ و عثمانؓ سے اور ابو عبیدؓ نے حضرت ابن عباسؓ و ابن عمرؓ سے نقل فرمایا ہے۔(تلخیص ۳/۲۳۷) لیکن جدید قول (جو پہلے گذر چکا) کے اعتبار سے کوئی قاضی اس قولِ قدیم کے مطابق فیصلہ دے تو اصح وجہ یہ ہے کہ اسے ختم کیا جائے گا (نافذ نہ ہو گا) دوسری وجہ میں فیصلہ نافذ ہو گا۔

(دورِ حاضر کے مسائل اور وسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے محققین نے دلائل کی روشنی میں ایسی عورت کے لئے گنجائش کی راہ متعین کی ہے۔ اگر کسی کو ایسا مسئلہ درپیش ہو تو وہ متعلقہ ذمہ داروں اور علماء سے رجوع ہوں، مناسب فیصلہ حاصل ہو گا)

مسئلہ : کسی عورت کو کوئی ایک عادل شخص یا عورت خبر دے کہ اس کا شوہر مر چکا، تو وہ (عدت کے بعد) نکاح کر سکتی ہے۔ کسی کا

وطن سے دور انتقال ہو، اور بعضوں کو اس کا علم ہو، تو اس کی اطلاع دینا واجب ہے، جب کہ اس سے کوئی فوری حق متعلق ہو، جیسے بیوی کا سوگ کرنا، یا کسی ضرر کا اندیشہ ہو، جیسے اس کے نائب کا اس کے مال میں تصرف کرنا۔(قلائد ۲/۲۷۸)

اِحْدَاد (سوگ کرنا)

حدیث : آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والی کسی عورت کے لئے یہ حلال نہیں کہ کسی میت پر تین روز سے زائد سوگ کرے، بجز شوہر کے، (اس پر) چار ماہ دس روز (سوگ کرے گی)'' (مالک ، بخاری ، مسلم ، ابوداود ، نسائی ترمذی طحاوی ، بیهقی ۔ارواء الغلیل ۷/۱۹۳)

شوہر کی وفات کی عدت میں بیوی پر احداد (سوگ کرنا) بالا جماع واجب ہے۔ کمسن بچی اور پاگل عورت کے ولی پر لازم ہے کہ ان کو ان امور سے روکے جو احداد کی وجہ سے منع ہیں۔ اگر زندگی میں طلاق یا فسخ وغیرہ سے بائنہ ہو جائے تو احداد سنت ہے، واجب نہیں، اگر رجعی عدت میں شوہر کے رجعت کی توقع نہ ہو، تو بائنہ کی طرح اسے بھی احداد مستحب ہے۔ اور اگر رجعت کی امید ہو تو بہتر ہے کہ زیب وزینت اختیار کرے، جب کہ طلاق پر خوشی کی بدگمانی نہ ہو۔

احداد لغت میں روکنے کو کہتے ہیں، اصطلاحاً اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ایسا رنگا ہوا کپڑا جو زینت کے طور پر استعمال ہوتا ہو نہ پہنے، خواہ بننے سے قبل رنگا ہو یا موٹا ہو، کیونکہ صحیحین میں حضرت ام عطیہ سے مروی ہے کہ: ''...ہمیں سرمہ لگانے'' خوشبو استعمال کرنے اور رنگین لباس استعمال کرنے سے روکا جاتا تھا''۔ جس رنگ میں زینت نہ ہو، بلکہ مصیبت کے طور پر یا جلد میلا نہ ہونے کے لئے مستعمل ہو، جیسے سیاہ یا سرمگیں رنگ، تو اسے استعمال کرنا جائز ہے۔ اگر رنگ زینت وغیرہ زینت کے بین بین ہو، جیسے سبز یا آسمانی رنگ، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ صاف ستھرا اور روشن ہو، تو حرام ہے، اگر خوب گہرا یا مٹیالا رنگا ہوا ہو تو حرج نہیں کتان، سوت، ریشم اور اون وغیرہ کے وہ کپڑے جو رنگے ہوئے نہ ہوں اور نقش وغیرہ کے ذریعہ ان میں زینت نہ پیدا ہو، جائز ہیں، گو بہترین ہوں، یا خلقتاً کسی بھی رنگ کے ہوں (یعنی جو دھاگے وکپڑے ابتداء سے رنگے بغیر ہی رنگین ہوں، وہ ممنوع نہیں)

احداد میں ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے زیورات دن میں پہننا حرام ہے۔ نسائی وابوداود وغیرہ کی ایک حسن حدیث میں وفات کی عدت میں زیورات، مہندی اور سرمہ سے ممانت موجود ہے۔ زیورات کا کپڑوں کے اندر پہننا بھی حرام ہے۔ سیسہ یا تانبہ وغیرہ پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھایا جائے، یا عورت ایسی ہو کہ پانی کے بغیر بھی ان دھاتوں کی اشیاء بطور زیور استعمال کرتی ہو، تو یہ زیورات بھی منع ہیں، ورنہ منع نہیں۔ رات میں حفاظت وغیرہ حاجت کی وجہ سے پہننا جائز ہے، اور بلا حاجت مکروہ ہے، دن میں بھی اس کی حفاظت کے لئے مجبوراً پہننا پڑے، دوسرا کوئی راستہ نہ ہو، تو گنجائش ملے گی۔ اگر رات میں ولیمہ وغیرہ کی مناسبت سے عورتوں کا مجمع ہو، تو رات میں بھی پہننا حرام ہے۔

وفات کی عدت میں عورت اپنے بدن، کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء اور سرمہ میں خوشبو استعمال نہ کرے، مسلم کی ایک حدیث کی رو سے حیض سے پاکی کے وقت تھوڑا سا قسط یا اظفار استعمال کرنا جائز ہے۔ (یہ دونوں دھونی کے خوشبو کا نام ہے) اسی طرح سر کے بالوں میں اور داڑھی ہو تو اس میں تیل لگانا منع ہے، بدن کے دیگر حصوں میں تیل لگانا حرام نہیں، ضابطہ یہ ہے کہ احرام میں خوشبو وتیل جن صورتوں میں حرام ہے، یہاں بھی حرام ہے، لیکن فدیہ لازم نہ ہوگا، جو وہاں حلال ہے، یہاں بھی حلال ہے، احداد میں زینت کے لئے مستعمل سرمہ حرام

ہے، اگر آشوب چشم وغیرہ حاجت ہو، تو رات میں لگائے اور دن میں پونچھ کر صاف کر دے، مجبوری کی صورت میں دن میں بھی استعمال جائز ہے، ایک صحابیہ نے احداد میں ایلوا آنکھوں میں لگایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: رات کو لگالیا کرو، اور دن میں پونچھ ڈالو" (ابــــــو داود ، نسائی)

چہرہ پر سفید قلعی (اسفیداج۔ پاؤڈر) د، لالی وغیرہ لگانا اور بدن کے جو اعضاء کام کاج کے وقت کھلے رہتے ہیں ان میں مہندی ،ورس یا زعفران وغیرہ لگا کر رنگنا منع ہے۔

احداد کا تعلق عورت کے بدن سے ہے، لہٰذا اپنے گھر، دیگر اسباب اور بستر وغیرہ کو مزین کرنا حلال ہے۔ اسی طرح غسل، سر دھونا، ناخن تراشنا، میل کچیل دور کرنا، کنگھی کرنا اور موئے زیر ناف کا دور کرنا بھی جائز ہے۔

احــداد کــا تــرک : اگر کوئی عورت عدت میں سوگ نہ کرے، گو اسے شوہر کی وفات کا علم ہی عدت کی مدت کے بعد ہو، تو عدت کا عرصہ گذرنے سے عدت ختم ہو جائے گی، گرچہ دانستہ احداد نہ کرنے سے گناہ ہوگا۔

شوهر کے علاوہ کسی پر سوگ کرنا : ایک عورت شوہر کے علاوہ کسی دوسرے رشتہ دار وغیرہ کی موت پر، جس کی موت سے اسے صدمہ وغم لاحق ہو، تین دن یا اس سے کم سوگ کر سکتی ہے، تین دن سے زائد سوگ کی نیت سے زینت وغیرہ کا ترک حرام ہے۔ سوگ کے قصد کے بغیر ایسے ہی ترک کرے تو حرام نہیں۔ مرد کے لئے کسی کی وفات پر سوگ حرام ہے، اسے ہر اس عمل سے جو (اس مصیبت پر) رنج اور تنگدل ہونے پر دلالت کرے، اجتناب واجب ہے۔

تنبیه : دور حاضر میں بعض عورتیں شوہر کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کی موت پر اپنے غم کے اظہار کے طور پر سیاہ کپڑا وغیرہ پہنتی، اور عام مواقع اور خوشی کی محفلوں میں شرکت سے کافی عرصہ تک گریز کرتی ہیں، اور بعض مرتبہ تو غم وصدمہ کا نام ونشان تک نہیں رہتا محض رسما اور تصنعا یہ پابندی کرتی ہیں یہ رسم آپ ﷺ کے گذشتہ فرمان کے صریح مخالف اور حرام ہے، بلکہ حضرت زینب بنت جحش اسی فرمان کی وجہ سے اپنے بھائی کے انتقال کے وقت خوشبو منگوا کر استعمال کرتی ہیں، پھر اسی روایت کا حوالہ پیش کرتی ہیں (صحیحین)

اسی طرح غیروں کی تقلید میں مردوں کا رنج وغم کے اظہار کے لئے مخصوص شعار (سیاہ پٹی وغیرہ) کا اپنانا حرام وممنوع ہے۔

عدت میں سُکنیٰ (رهائش کا نظم ۔ رهنے کی جگه)

مطلقہ عورتوں کے متعلق ارشاد باری ہے: "لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ ... " (الطلاق ۱)

ترجمہ: "ان (مطلقہ) عورتوں کو (عدت میں) ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں" کچھ آگے مزید ارشاد ہے:

"اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ... " (الطلاق : ٦)

ترجمہ: " تم ان (مطلقہ) عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لئے (سکنی کے بارہ میں) تکلیف مت پہنچاؤ" (مثلاً کوئی ایسی بات کرنے لگو جس سے وہ پریشان ہو کر نکل جائیں)

حضرت فُرَیْعَہ کے شوہر قتل ہوئے، تو انھوں نے اپنے اہل کی طرف لوٹنے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے عدت کے اختتام تک گھر میں رکنے کا حکم دیا۔ (مالک ، شافعی ، احمد ، سنن اربعہ ، ابن حبان ، طبرانی وصححہ الترمذی ، والذهلی

والحاکم ۔ تلخیص ، وخلاصہ البدر ۲/۲۴۵)

جدائی نہ ہونے کی صورت میں جس عورت کا نفقہ شوہر پر واجب ہو، طلاق، فسخ یا وفات کی وجہ سے ایسی عورت کا سکنی عدت میں شوہر پر واجب ہے۔ ناشزہ کا سکنی واجب نہیں، خواہ طلاق سے قبل نشوز اختیار کرے یا دورانِ عدت، اگر وہ دوبارہ اطاعت اختیار کرے، تو سکنی کا حق بھی لوٹے گا۔

اگر میت کا کچھ ترکہ نہ ہو اور وارث تبرعاً سکنی نہ دے تو حاکم کو بیت المال سے اس کی سکنی کا نظم سنت ہے، ورنہ پھر جہاں چاہے رہے۔

جدائی کے وقت بیوی جس مکان میں ہو، اسی میں اسے رکھنا واجب ہے، جب کہ اس کے مناسب حال ہو، اور شوہر کے استحقاق میں ہو۔ بغیر عذر کے دوران عدت عورت کو اس گھر سے نکالنا یا اس کا نکلنا جائز نہیں، خواہ شوہر بھی نکلنے سے متفق ہو، جب کے بلا حاجت ہو، اور حاکم کو روکنا لازم ہے، کیونکہ عدت میں اللہ کا بھی حق ہے۔ جس کا نفقہ شوہر پر لازم نہ ہو، وہ عورت دن میں کھانا، کپاس وکتان وغیرہ خریدنے جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت جابر کی خالہ سلمٰی کو عدت میں کھجور توڑنے کے لئے باغ میں جانے کی اجازت دی تھی (مسلم) اور سوت کاتنے یا گفتگو وانسیت کے لئے رات کا کچھ حصہ اپنے پڑوسن کے پاس گذار سکتی ہے، جب کہ شب باشی کے لئے اپنے گھر لوٹے، جیسا کہ شہداء احد کی بیویوں کو آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی تھی (شافعی ، بیہقی)

رجعیہ اور حاملہ بائنہ نفقہ کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں نکل سکتی، کیونکہ نفقہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ دیگر امور کے لئے بصورتِ حاجت نکل سکتی ہے۔

اگر اس مکان میں رکنے میں جان یا مال کا خطرہ ہو (جلنے، منہدم ہونے، غرق ہونے یا بدکار پڑوسیوں کی وجہ سے) یا پڑوسیوں یا شوہر کے رشتہ داروں سے اسے بڑی تکلیف پہنچتی ہو یا اس سے ان لوگوں کو شدید تکلیف پہنچتی ہو، تو وہاں سے منتقل ہونا جائز ہے۔ ابوداود میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس کو پُر خطر جگہ میں ہونے کی وجہ سے منتقل ہونے کی اجازت دی تھی۔ صحیح مسلم کی حدیث میں اس کا ایک سبب شوہر کے رشتہ داروں کے ساتھ ان کی سخت گوئی کو بتلایا ہے۔ معمولی تکلیف کی وجہ سے اجازت نہ ملے گی۔ بیوی اپنے والدین کے گھر ہو، اور طلاق ہو، اور آپس میں ایذا رسانی کا مسئلہ آئے، تب بھی منتقل نہ کی جائے، کیونکہ یہ سلسلہ زیادہ طول نہ پکڑے گا۔

اگر شوہر کی اجازت سے کسی دوسری بستی یا مکان کی طرف منتقل ہو، پھر عدت واجب ہو جائے، گو ابھی وہاں پہنچی نہ ہو، تو وہیں عدت گذارے، خواہ پہلی جگہ سے اسباب منتقل کر چکی ہو یا نہ کر چکی ہو، اگر شوہر کی اجازت کے بغیر منتقل ہوئی ہے، تو پہلی جگہ ہی عدت گذارے، اگر شوہر بعد میں اجازت دے، تو منتقل شدہ جگہ عدت گذارے۔ منتقل ہونے کی اجازت کے بعد یہاں سے نکلنے سے قبل ہی عدت واجب ہو جائے تو یہیں گذارے۔

اگر بیوی شوہر کی اجازت سے سفر میں جائے، پھر راستہ میں عدت واجب ہو جائے، تو واپس لوٹنا بہتر ہے، لازم نہیں، اگر سفر کسی ضرورت سے تھا تو ضرورت کی تکمیل کے بعد، یا مدت مقرر تھی تو مدت کے بعد، ورنہ ایک مسافر کے اقامت کی مدت (یعنی دخول وخروج کے علاوہ چار دن) کے بعد لوٹنا واجب ہے، بلا عذر تاخیر کرے تو گنہگار ہوگی۔ اسی طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے کے بعد لوٹنا واجب ہے۔

اگر مکان شوہر کی ملکیت یا استحقاق میں ہو، اور بیوی کے شایانِ شان ہو، تو اسی میں عدت گذارنا لازم ہے۔ اگر مکان کرایہ کا ہو، اور مقررہ مدت ختم ہو جائے، اور مناسب کرایہ پر مزید دینے پر مالک راضی نہ ہو، یا عاریت کا ہو اور مالک واپس لے، اور مناسب کرایہ پر بھی دینے پر راضی نہ ہو، یا مالک سفیہ یا پاگل ہونے کی وجہ سے تبرع کی اہلیت سے نکل جائے، تو وہاں سے منتقل کر کے ممکنہ حد تک اس سے قریب

ترین مناسب جگہ اس کے سکنی کا نظم کرے۔ اگر مکان خود بیوی کی ملکیت ہو، تو اسے اختیار ہے کہ عاریت یا کرایہ کے طور پر اس میں عدت گذارے، یا وہاں سے منتقل ہو جائے، کیونکہ اسے اپنا مکان شوہر کو عاریت سے یا کرایہ پر دینا لازم نہیں ہے۔

اگر مکان بیوی کے مرتبہ سے گھٹیا (فروتر) ہو، تو اسے اختیار ہے کہ اسی میں عدت گذارے، یا اس کے مناسب مکان میں منتقل کرنے کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح بیوی کے مرتبہ سے اعلیٰ درجہ کا مکان ہو، تو شوہر کو اختیار ہے کہ اسی میں رکھے، یا اس کے مناسب مکان میں منتقل کرے۔ مذکورہ تمام صورتوں میں قریب ترین ممکنہ مکان میں منتقل کرنا واجب ہے۔

شوھر کو مطلقہ کے سکنی میں رھنا : بیوی جس جگہ عدت گذارے، شوہر کو وہاں اس کے ساتھ رہنا، یا وہاں داخل ہونا اور جانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں خلوت (تنہائی) واقع ہوگی، جو عام اجنبیہ کی طرح مطلقہ کے ساتھ بھی حرام ہے، گو شوہر نابینا ہو، یا طلاق رجعی ہو اور بیوی اس کی آمد ورفت سے راضی ہو۔

اگر مکان کافی کشادہ ہو کہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوئے اور ایک کو دوسرے کی اطلاع نہ ہوتی ہو، اور وہاں بیوی کا کوئی بالغ یا ایسا ممیز محرم جس کی موجودگی میں شرم وحیا کی وجہ سے خلوت کا امکان نہ ہو (مرد ہو یا عورت) یا اسی طرح شوہر کی مؤنث محرم یا بیوی یا کوئی پرائی عورت موجود ہو (جب کہ یہ سب ثقہ اور معتمد ہوں) تو کراہت کے ساتھ شوہر کو اس گھر میں رہنا یا داخل ہونا جائز ہے۔

اگر مکان کشادہ ہو اور اس میں جدا جدا کمرے ہوں، بالائی اور تحتانی حصہ جدا جدا ہو، اور ہر ایک کے امور آسائش (باورچی خانہ، آرام گاہ، گذرگاہ، غسل خانہ وغیرہ) بھی جدا ہو اور درمیانی دروازہ بند کر کے میخ سے بالکل مضبوط کر دیا جائے یا بالکل ختم کر دیا جائے، تو دونوں کا جدا حصہ میں رہنا جائز ہے، لیکن مکروہ ہے، اگر امور آسائش مشترک ہوں، تو اوپر کی طرح محرم وغیرہ کا ہونا ضروری ہے۔ (لیکن دور حاضر میں احوط یہی ہے کہ محرم وغیرہ کے ساتھ بھی اس گھر میں نہ رہے، جیسا کہ امام اذرعی نے فرمایا ہے، کیونکہ وہ کبھی کسی ضرورت سے باہر نکل جائے گا، کبھی بے تو جہی ہوگی، بالخصوص جبکہ زوجین یا کوئی ایک دیندار نہ ہو۔ فتاوی ابن زیاد : ۲۴۲)

خَلوَت (تنھائی) : کسی ایک یا زائد مرد کا ایک پرائی عورت کے ساتھ کسی جگہ خلوت (تنہا پایا جانا) حرام ہے۔ ایک شخص کو دو یا زائد ثقہ (معتبر اور قابل بھروسہ) عورتوں کے ساتھ خلوت جائز ہے۔ غیر ثقہ عورتوں کے ساتھ خلوت جائز نہیں ہے۔ کسی مرد کو ایسے مردوں کے ساتھ خلوت جائز نہیں۔ جن کو دیکھنا حرام ہو، ایک مرد کو دوسرے مرد کے ساتھ خلوت جائز نہیں ہے۔

(فتح الوهاب مع الجمل ۴/۱۴۱-۴۶۷، نهايه مع الحواشي ۷/۱۲۶-۱۶۳، تحفه مع الحواشي ۱۰/۴۱۲-۴۸۷، مغني المحتاج ۳/۳۸۴-۴۰۷، الفقه المنهجي ۴/۱۵۷-۱۶۶، المجموع ۱۸/۱۲۴-۱۹۴، فتح المعين مع الاعانه ۳/۳۷-۵۳)

رَضَاعَت (دودھ پلانا۔شیر خواری)

تعریف : رَضَاع اور رَضَاعت کا لفظ عربی زبان میں پستان سے چوس کر دودھ پینے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

اور شرعاً : کسی عورت کے دودھ یا دودھ سے حاصل شئی کے کسی بچہ کے معدہ یا دماغ میں پہنچنے کو رضاعت کہا جاتا ہے۔

مشروعیت : کسی بچہ کا اپنی والدہ کے علاوہ کسی دوسری عورت سے دودھ پینا شرعاً جائز ہے، اسلام سے قبل یہ دستور معروف تھا، پھر جب اسلام کی روشنی نمودار ہوئی، تو اسے برقرار رکھا، حرام نہ قرار دیا، کیونکہ بعض مصلحتوں اور مجبوریوں کا یہی تقاضہ ہے، مثلاً کبھی والدہ

کا انتقال ہو جاتا ہے، یا کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے خود دودھ پلانے سے عاجز ہوتی ہے۔

جواز کی دلیل : آیت:۱۔ "وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى" (الطلاق : ٦)

ترجمہ: "اور اگر تم (بچہ کی رضاعت کے سلسلہ میں) باہم کش مکش کرو گے، تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی"۔

۲۔ "وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ..." (البقرہ: ۲۳۳)

ترجمہ: "اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو کسی اور انا کا دودھ پلوانا چاہو، تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں"۔

والدہ کا دودھ پلانا : رضاعت اور دودھ پلانا والدہ کا حق ہے، جب چاہے اس کا مطالبہ کر سکتی ہے، اس پر واجب نہیں ہے، (البتہ دوسری عورت میسر نہ ہو، تو والدہ پر واجب ہوگا) اوپر کی آیات، نیز درج ذیل آیات کی روشنی میں یہی ثابت ہوتا ہے۔

آیت:۱۔ "وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ" (البقرہ : ۲۳۳)

ترجمہ: "اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں، یہ مدت اس کے لئے ہے جو کوئی شیر خوروں کی تکمیل کرنا چاہے"۔

۲۔ "... فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ..." (الطلاق : ٦)

ترجمہ: "پھر اگر وہ عورتیں تمہارے لئے (بچہ کو اجرت پر) دودھ پلادیں، تو تم ان کو (مقررہ) اجرت دو"۔

جب یہ مسئلہ واضح ہو چکا کہ رضاعت والدہ پر واجب نہیں ہے، تو اس پر درج ذیل احکام مرتب ہوں گے۔

۱۔ شوہر بچہ کو دودھ پلانے کے لئے اپنی بیوی کو مجبور نہیں کر سکتا، اگر وہ جبر کرے اور بیوی نہ مانے تو گنہگار اور ناشرہ شمار نہ ہوگی، لیکن وہاں دوسری کوئی مناسب عورت جو اسے دودھ پلا سکے موجود نہ ہو، تو بچہ کی زندگی کے بقا کے پیش نظر والدہ پر رضاعت واجب ہوگی۔

۲۔ اگر بیوی مطالبہ کرے تو اسے دودھ پلانے کی مناسب اجرت دینا شوہر پر واجب ہے۔ اگر وہ اجرت طلب نہ کرے، جیسا کہ عام ماحول ہے، تو اجرت واجب نہ ہوگی، جب کہ وہ شرعاً اور اجرت کی بے رغبتی کے اظہار کے ساتھ اسے انجام دے:

رضاعی حرمت : رضاعت کی وجہ سے حرمت اور محرم رشتوں کی تفصیل اور دلائل محرمات کے باب میں گذر چکے۔ اس باب میں رضاعت کے حصول اور دیگر مسائل کا تذکرہ ہوگا۔

سببِ حرمت : دودھ چونکہ مرضعہ کا ایک جز ہے، جو رضیع کے اجزاء میں شامل ہو گیا، تو یہ نسب میں اس کی منی کے مشابہ ہوا۔

اثرات : رضائی محرمیت کی وجہ سے ابتداً و دواماً نکاح حرام ہوگا، نیز خلوت اور دیکھنا جائز ہوگا، اور چھونے کی وجہ سے وضو ختم نہ ہوگا۔ دیگر نسبی احکام، مثلاً: میراث، نفقہ، قصاص کا سقوط اور گواہی کا رد ہونا وغیرہ ثابت نہ ہوں گے۔

رضاعت کا ارکان

(۱) مُرْضِع (انّا۔ دایہ) (۲) رَضِیع (۳) دودھ

(۱) مُرْضِع (دایہ یعنی دودھ پلانے والی خاتون) : مرضع کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ انسانی عورت ہو، ۲۔ زندہ ہو، یعنی اس سے حیات مستقرہ ہو۔ ۳۔ حیض کی عمر کو پہنچ چکی ہو، یعنی اس کی عمر تقریباً ۹ سال اسلامی ہو، گو ابھی باکرہ (کنواری) ہو۔

کسی مرد خنثیٰ (کو دودھ پیدا ہو تو ان) کا دودھ پینے کی وجہ سے رضائی حرمت ثابت نہ ہوگی، کیونکہ در حقیقت بچہ کی غذائیت کے

لئے پیدا شدہ نہیں، لہٰذا دیگر مائع کی طرح حکم ہوگا، نیز دودھ ولادت کا اثر ہے، اور ان میں ولادت کا کوئی سوال نہیں، البتہ ان سے دودھ پینے والی بچیوں سے انھیں اور ان کے اصول وفروغ اور حواشی کے لئے نکاح مکروہ ہے۔

کسی جانور (گائے بھینس وغیرہ) کے دودھ سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی، ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی جانور کا دودھ پئیں تو یہ آپس میں رضاعی بھائی بہن شمار نہ ہوں گے، اسی طرح کسی جنّیہ (جنات میں کی عورت) کے دودھ سے بھی حرمت ثابت ہوگی، کیونکہ رضاعت سے نسب ثابت ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جن وانس میں نسب کو منقطع کیا ہے۔ جن علماء کے نزدیک جنّیہ سے نکاح جائز ہے، ان کے اعتبار سے اس کے دودھ سے حرمت بھی ثابت ہوگی۔

جو عورت کسی جنایت (یعنی کسی کے مارنے وغیرہ) کی وجہ سے حرکت مذبوح تک پہنچ چکی ہو، اس کے دودھ سے حرمت ثابت نہ ہوگی، البتہ نکاح کرنا مکروہ ہوگا۔ اگر بعد میں شفا ہو جائے تو حرمت ثابت ہوگی۔ کسی مرض کی وجہ سے حرکت مذبوح تک پہنچ جائے، تب بھی حرمت ثابت ہوگی۔ مردہ عورت کے دودھ سے حرمت ثابت نہ ہوگی، لیکن (نکاح کرنا) شدید مکروہ ہے، کیونکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس سے حرمت ثابت ہوتی ہے جو عورت ابھی سنِ حیض کو نہ پہنچی ہو، (کمسن ہو) اس کا دودھ پینے سے حرمت ثابت نہ ہوگی۔

(۲) رَضیع (دودھ پینے والا بچہ) : رضیع کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱- رضیع زندہ ہو، اس میں حیات مستقرہ ہو، مردہ بچہ کے یا حیات مذبوحہ کو پہنچنے کے بعد اس کے جوف میں دودھ پہنچنے سے رضاعی حرمت ثابت نہ ہوگی۔

۲- رضیع کی عمر بالیقین (قمری واسلامی) دوسال سے کم ہو، اگر دوسال ہو، یا شک ہو، تو رضاعی حرمت ثابت نہ ہوگی، پانچویں مرتبہ دودھ شروع کرتے وقت عمر دوسال سے کم ہو، پھر دوران میں ہی دوسال ہو جائے، تو حرمت ثابت ہوگی، آیت میں گذر چکا کہ شیر خوارگی کی تکمیل کرنا ہو تو کامل دوسال دودھ پلائے (البقرہ : ۲۳۳)

حدیث:۱- آپ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت تو بھوک میں (معتبر) ہے،(متفق علیه ، نسائی ، احمد ،درامی)

تشریح : یعنی ایسی رضاعت جس سے حرمت ثابت ہو، اور خلوت حلال ہو، وہ ہے کہ رضیع بچہ ہو، کیونکہ اس صورت میں دودھ اس کی بھوک مٹاتا ہے، کیونکہ اس کا معدہ کمزور ہوتا ہے، اور صرف دودھ کافی ہو جاتا ہے، اس سے اس کا گوشت بنتا ہے، تو وہ مرضعہ کے ایک جز کی طرح ہو جاتا ہے، لہٰذا حرمت میں اولاد کی طرح ہو جاتا ہے۔(فتح الباری ۱۴۸/۹)

۲- ''رضاعت (معتبر) نہیں، مگر جو دوسال کے اندر ہو''(دار قطنی ۔ بیهقی)

۳- ''رضاعت وہی (معتبر) ہے، جو انتڑیوں (یعنی معدہ) میں پہنچ جائے اور دوسال سے پہلے ہو''۔(ترمذی وصححه وقال اورلبانی صحیح علی شرطا ، واخرج خوه ابن حبان وابن ماجه)

امام بیہقی نے حضرات عمرؓ وابن مسعودؓ سے بھی دوسال کی تحدید روایت کی ہے۔(تلخیص الجبیر ۴/۴، ارواء الغلیل ۲۲۱/۷)

چاند کے اعتبار سے دوسال مراد ہیں، اگر کسی ماہ کے دوران پیدا ہو، تو اس ماہ اور پچیسویں ماہ کے مجموعی ایّام سے شمار ہوں گے۔ سال کی ابتداء بچہ مکمل ماں سے جدا ہونے کے بعد ہوگی۔

(۳) دودھ : دودھ یا دودھ سے بنی ہوئی چیز مثلاً پنیر کا جوف میں یعنی معدہ یا دماغ میں پہنچنا شرط ہے۔ زخم کے ذریعہ جوف تک پہنچے تو اس سے حرمت ثابت ہوگی، مسامات سے پہنچے تو ثابت نہ ہوگی۔ جوف تک پہنچنے سے پہلے بالیقین قئی کرے تو حرمت ثابت نہ ہوگی۔

اگر دودھ کسی دوسرے مائع یا جامد میں مختلط (گھلی ملی) ہو، اور دودھ غالب ہو، یعنی اس کا رنگ، بو یا مزہ ظاہر ہو، تو اس کے پینے سے حرمت ثابت ہوگی، اگر دودھ مغلوب ہو، یعنی تینوں وصف میں سے کوئی بھی حسا اور تقدیراً موجود نہ ہو، اور دودھ کا کچھ حصہ جوف میں پہنچنا یقینی ہو، مثلاً بقیہ مقدار دودھ سے کم ہو، ڈالی کا خلیط کے تمام اجزاء میں منتشر ہونا یقینی ہو، تو حرمت ثابت ہوگی۔ دو عورتوں کا دودھ ملا کر پلایا جائے تو دونوں سے رضائی رشتہ ثابت ہوگا۔ ایک کا دودھ غالب اور دوسری کا مغلوب ہو تو اوپر کی تفصیل کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ دودھ سے آٹا گوندھ کر اس کی روٹی بچہ کو کھلائی جائے تو حرمت ثابت ہوگی۔ اگر دودھ حلق میں ٹپکایا جائے اور معدہ میں پہنچ جائے، یا ناک کے راستہ دماغ میں پہنچے، تو حرمت ثابت ہوگی۔ زندگی میں عورت کا دودھ نکال کر اس کے مرنے کے بعد بچہ کو پلایا جائے تو حرمت ثابت ہوگی۔ اگلی یا پچھلی شرم گاہ میں یا کان میں دودھ ٹپکانے سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔ بعض علماء کے نزدیک اس طرح ٹپکانے سے معدہ یا دماغ میں پہنچے تو حرمت ثابت ہوگی۔

حرمت کی شرط: رضائی حرمت کے ثبوت کے لئے یہ شرط ہے کہ دودھ بالیقین پانچ مرتبہ عورت سے جدا ہوا ہو، اور پانچ مرتبہ بچہ کے جوف میں پہنچا ہو، اس سے کم کا اعتبار نہیں، اگر پانچ مرتبہ میں شک ہو، تو بھی حرمت ثابت نہ ہوگی، مثلاً مخلوط میں سے اتنی مقدار استعمال کرے کہ خالص دودھ پانچ مرتبہ ہونا محقق نہ ہو۔

حدیث: حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے: ''پہلے قرآن میں یہ نازل ہوا تھا، دس معلوم مرتبہ رضاعت حرام کرتی ہے، پھر یہ (حکم) پانچ معلومات کے ذریعہ منسوخ ہوا، اور آپ ﷺ کا وصال ہوا، تو اس کی قرآن میں تلاوت ہوتی تھی'' (مالک، شافعی، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، دارمی، بیہقی۔ ارواء ۷/۲۱۸)

اس کی تلاوت ہوتی تھی، یعنی اس حکم پر عمل جاری تھا، یا اس کی تلاوت بالکل آخر میں منسوخ ہونے کی وجہ سے جسے نسخ کا علم نہیں تھا، وہ تلاوت کیا کرتا تھا۔

رضاعت عرفاً پانچ متفریق مرتبہ ہونا شرط ہے، پس اگر رضیع پستان سے اعراض کرتے ہوئے دودھ پینا چھوڑ دے، یا دایہ پلانا چھوڑ دے، پھر دوبارہ پینا شروع کرے، تو یہ دوسری مرتبہ شمار ہوگا، گو جوف میں صرف ایک ہی قطرہ پہنچے۔ اگر لہو اور کھیل کے طور پر، یا سانس لینے کے لئے، یا ہلکی نیند کی وجہ سے، یا منہ میں جمع شدہ دودھ کو نگلنے کے لئے دودھ پینا چھوڑ دے، پھر فوراً دوبارہ پینا شروع کرے، یا ایک پستان سے دوسرے کی طرف منتقل ہو، یا دایہ منتقل کرے، یا دایہ کسی معمولی وسرسری کام کے لئے چلی جائے، پھر لوٹ کر پلائے، تو ان صورتوں میں ایک ہی مرتبہ شمار ہوگا۔ زیادہ دیر کھیلتا یا سوتا رہا اور پستان اس کے منہ میں ہی ہو، تو ایک ہی شمار ہوگا، ورنہ دو شمار ہوں گے۔

اگر پانچ مرتبہ دودھ نکال کر ایک ہی مرتبہ دودھ بچہ کو پلا دیا جائے، یا ایک مرتبہ نکال کر پانچ مرتبہ پلایا جائے، تو ایک شمار ہوگا۔ اگر پانچ عورتوں کا دودھ جمع کر کے بہ یک وقت پلا دیا جائے، تو ہر ایک عورت سے ایک مرتبہ پینا شمار ہوگا۔

رضاعی والدین اور دیگر رشتہ دار: مُرضعہ (دایہ) رضیع کی رضائی ماں، اور جس شوہر (یا صحبت شبہ کرنے والے) کے تعلق سے یہ دودھ ہے، وہ اس کا رضائی باپ شمار ہوگا، رضائی والدین کی طرف سے یہ حرمت ان کے اصول، فروع اور حواشی کی طرف بھی منتقل ہوگی، خواہ نسبی اعتبار سے ہو یا رضائی اعتبار سے اور رضیع (شیر خوار بچہ) کی طرف سے صرف اس کے فروع کی طرف منتقل ہوگی، اصول اور حواشی کی طرف منتقل نہ ہوگی، (اصول یعنی والدین اوپر تک، فروع یعنی اولاد در اولاد نیچے تک اور حواشی یعنی بھائی بہن اور ان کی اولاد نیچے تک)

لہٰذا مرضعہ کے والدین اس بچہ کا نانا نانی، مرضعہ کی اولاد اس کے بھائی بہن، اور مرضعہ کے بھائی بہن اس کے ماموں اور خالہ شمار ہوں گے۔ رضاعی والد کے والدین دادا دادی، اس کی اولاد بھائی بہن، اور رضاعی والد کے بھائی بہن رضیع کے چچا اور پھوپھی شمار ہوں گے، اور رضیع کی اولاد رضاعی والدین کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں شمار ہوں گے۔ رضیع کے بھائی بہن یا نسبی والدین کے اس کے رضاعی والدین سے محرمیت کا کوئی رشتہ نہ ہوگا۔

کوئی بچہ کسی کے چار بیویوں سے ایک ایک مرتبہ دودھ پیئے، پھر ایک کے طلاق یا موت کی وجہ سے پانچویں بیوی سے ایک مرتبہ ہے، تو یہ بچہ اس شخص کا بیٹا بن جائے گا، کیونکہ تمام کا دودھ اسی سے ہے، اور وہ ساری بیویاں رضاعی باپ کی صحبت شدہ بیوی ہونے کی وجہ سے حرام ہوں گی، ان کا رضاعی ماں ہونا ثابت نہ ہوگا، کیونکہ ایک عورت سے پانچ مرتبہ دودھ نہیں پیا ہے۔ کسی شخص کے پانچ بیٹیوں یا بہنوں سے ایک ایک مرتبہ دودھ پینے سے اس کے اور رضیع کے درمیان کوئی حرمت نہ ہوگی، یعنی وہ اس بچہ کا رضاعی نانا یا ماموں نہ ہوگا، کیونکہ رشتہ ماں کے توسط سے ثابت ہوتے ہیں، اور ایک ایک مرتبہ پینے کی وجہ سے رضاعی ماں ہونا ثابت نہ ہوگا۔

جس بچہ کی پیدائش سے دودھ شروع ہو، وہ بچہ شرعاً جس شخص کا ہوگا، دودھ اسی کی طرف منسوب ہوگا، (یعنی وہ رضاعی باپ ہوگا) خواہ وہ شوہر پر ہو یا آقا یا شبہ کی وجہ سے صحبت کرے، اگر زنا کی وجہ سے دودھ آئے تو زانی کی طرف منسوب نہ ہوگا۔ اور وہ رضاعی باپ نہ ہوگا، کیونکہ اسی کے دودھ کا کوئی احترام نہیں، اسی لئے اُس دودھ سے پرورش پانے والی لڑکی سے زانی نکاح کرسکتا ہے، لیکن مکروہ ہے۔

شوہر کے صحبت سے قبل، یا صحبت کے بعد لیکن حمل سے قبل بیوی کو دودھ آئے تو اس دودھ کو پلانے کی وجہ سے بیوی تو رضاعی ماں بن جائے گی، لیکن شوہر کے حق میں حرمت ثابت نہ ہوگی۔

دودھ جس شخص کی طرف منسوب ہو، اس کی طرف دودھ کی یہ نسبت اس وقت ختم نہ ہوگی، جب تک کہ اس عورت کو دوسرے شخص سے بچہ پیدا نہ ہو، گو طویل مدت گذر جائے، یا درمیان میں دودھ ختم ہوجائے اور بعد میں پھر شروع ہوجائے، دوسرے سے نکاح اور حمل کے باوجود زچگی سے قبل تک دودھ کی نسبت اوّل کی طرف ہوگی، خواہ دوسرے کے حمل کے دوران کے ظہور کا وقت ہو چکا ہو، گو پہلے کے مقابلہ میں دودھ بڑھ جائے یا نہ بڑھے۔

نکاح پر رضاعت کا طاری ہونا

کسی کے نکاح میں کمسن بچی (دوسال سے کم عمر) ہو، اور کوئی ایسی عورت اس بچی کو دودھ پلائے جس کی بیٹی اس شخص پر حرام ہو، تو یہ نکاح فسخ ہوجائے گا۔ مثلاً شوہر کی بہن یا ماں اس بچی کو دودھ پلائے، کیونکہ وہ بچی اس کی بھانجی یا بہن بن چکی۔ اس بچی کے حق میں شوہر پر نصف مہر لازم ہوگا کیونکہ صحبت سے قبل جدائی ہوگئی۔ اور مُرضعہ کو شوہر نے رضاعت کی اجازت نہ دی تھی، تو شوہر اس سے نصف مہر مثل وصول کرے گا۔ اگر نیند میں بچی جا کر خود دودھ پی لے، یا وہ بیدار ہو، لیکن چپ ہو (یعنی خود نہ پلائے) تو نہ بچی کو شوہر سے مہر ملے گا اور نہ شوہر مرضعہ سے کچھ وصول کرے گا۔

کسی کے نکاح میں ایک بڑی عورت اور ایک کمسن بچی ہو، اور بڑی کی ماں کمسن کو دودھ پلائے، تو دونوں کا نکاح فسخ ہوا۔ کیونکہ دونوں رضاعی بہن ہو چکیں اور ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں، اور کسی ایک کو دوسری پر ترجیح بھی نہیں، بعد میں ان میں سے کسی ایک سے نکاح کرسکتا ہے کیونکہ صرف دونوں کو جمع کرنا حرام ہے۔ اگر بڑی بیوی کی بیٹی چھوٹی بیوی کو دودھ پلائے تو بڑی ہمیشہ کے

لئے حرام ہوچکی، کیونکہ وہ بیوی کی نانی بن چکی، اور چھوٹی ربیبہ ہے، پس اگر بڑی سے صحبت کر چکا ہے تو یہ بھی ہمیشہ کے لئے حرام ہوچکی، ورنہ حرام نہ ہوگی۔ چھوٹی کو اور بڑی کو جب کہ صحبت نہ ہوئی ہو نصف مہر دے گا۔ اور مرضعہ سے دونوں کے مہر مثل کو نصف وصول کرلے گا۔ اگر بڑی سے صحبت ہوچکی ہو تو مکمل مہر ادا کرے گا۔ اور مرضعہ سے اس کا مکمل مہر مثل وصول کرے گا۔ اگر بڑی بیوی چھوٹی کو دودھ پلائے تو بڑی ہمیشہ کے لئے حرام ہوچکی، کیونکہ وہ بیوی کی ماں ہے (یعنی چھوٹی کی رضاعی ماں ہے) اور دودھ اس شوہر کی طرف منسوب ہو، تو چھوٹی بھی رضاعی بیٹی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے حرام ہے، ورنہ حرام نہیں، لیکن یہ نکاح فسخ ہوگا، کیونکہ ماں بیٹی ایک ساتھ نکاح میں جمع ہیں۔

کسی کی دو چھوٹی بیویوں کو کوئی پرائی عورت دودھ پلائے تو دونوں کا نکاح فسخ ہوگا، کیونکہ دونوں بہنیں بن چکیں، بعد میں کسی ایک سے نکاح کرسکتا ہے، مرضعہ ساس ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حرام رہے گی۔ کوئی اپنی کمسن بیوی کو طلاق دے، بعد میں کوئی عورت اسے دودھ پلائے تو مرضعہ اس شخص کی ساس شمار ہوگی، لہٰذا ہمیشہ کے لئے حرام ہوگی۔ کسی کی مطلقہ کسی کمسن (دو سال سے کم) لڑکے سے شادی کرلے، اور سابقہ شوہر کی طرف منسوب دودھ اس لڑکے (حالیہ شوہر) کو پلائے، تو دونوں پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوچکی، کیونکہ وہ طلاق دینے والے کے رضاعی بیٹے کی بیوی، اور کمسن کی ماں اور باپ کی بیوی بن چکی یعنی بڑے شوہر پر ایک اعتبار سے اور کمسن پر دو اعتبار سے حرام ہے۔

(مذکورہ مسائل میں دودھ پلانے سے رضاعی حرمت کے تمام شرائط کے ساتھ پلانا مراد ہے)

رضاعت کا اقرار

اگر کوئی مرد یا عورت دونوں میں رضاعی حرمت کا اقرار کریں، مثلاً زید یہ کہے کہ مریم میری رضاعی بیٹی ہے، یا بہن ہے، یا اس کے برعکس، اور یہ ممکن بھی ہو، یعنی حس اسے نہ جھٹلائے، تو دونوں کا آپس میں نکاح حرام ہے، اگر ممکن نہ ہو تو حرام نہیں، مثلاً کہے کہ فلانی میری بیٹی ہے، حالانکہ وہ اس سے عمر دراز ہے۔ اگر زوجین رضاعی حرمت کا اقرار کریں، تو دونوں میں تفریق کردی جائے گی۔ اور بیوی کو مکمل مہر ملے گا، جب کہ صحبت ہوچکی ہو، اور اس میں بیوی معذور ہو، مثلاً اسے اس حقیقت کا علم نہ تھا یا جبراً صحبت کی ہو، صرف شوہر اقرار کرے اور بیوی انکار کرے تو نکاح فسخ ہوگا، اور صحبت کی صورت میں کل مہر، ورنہ نصف مہر لازم ہوگا۔ صرف بیوی اقرار کرے اور شوہر انکار کرے، تو شوہر کو قسم دلا کر اس کی تصدیق کی جائے گی، جب کہ بیوی کی رضامندی سے یہ نکاح ہوا ہو، اور اجازت میں اس نے شوہر کی تعیین کی ہو یا شوہر کو اپنے آپ پر قدرت دی ہو، اگر باپ دادا نے بلا اجازت نکاح کیا ہو، یا دوسروں نے اس کی اجازت سے کیا، لیکن کسی شوہر کی تعیین نہیں کی، اور خود پر اسے قدرت نہ دی، تو بیوی کو قسم دلا کر تصدیق کی جائے گی، مذکورہ صورتوں میں صحبت ہوچکی ہو اور بیوی معذور ہو تو اسے مہر مثل ملے گا، ورنہ اسے کچھ نہ ملے گا، اگر وہ متعین مہر پہلے ہی لے چکی ہو تو شوہر واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ بیوی رضاعت کا اقرار کرے تو شوہر سے مہر پہلے ہی لے چکی ہو تو شوہر واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ بیوی رضاعت کا اقرار کرے تو شوہر کے لئے بہتر یہ ہے کہ اسے ایک طلاق دے دے، تاکہ وہ چھوٹی ہو تو دوسرے کے لئے حلال ہوجائے۔

جو رضاعت کا انکار کرے۔ وہ اپنے علم کی نفی پر قسم لے، اور جو دعویٰ کرے وہ حتمی قسم لے، خواہ مرد ہو یا عورت۔

رضاعت کا ثبوت: دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا چار عورتوں کی گواہی سے رضاعت ثابت ہوگی۔ اگر کسی برتن سے پینے کے متعلق اختلاف ہو تو صرف عورتوں کی گواہی کافی نہیں ہے۔ اگر کوئی رضاعت کا اقرار کرے، تو اس اقرار کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی گواہی ضروری ہے۔

اگر خود مرضعہ گواہی دے تو مقبول ہوگی، جبکہ وہ رضاعت کی اجرت کا مطالبہ نہ کر رہی ہو، گو وہ اپنے فعل کا تذکرہ کرے کہ میں نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ اگر اپنی اجرت طلب کر رہی ہو تو تہمت کی وجہ سے اس کی گواہی معتبر نہ ہوگی۔

رضاعت کی گواہی کے شرائط : ۱- رضاعت کے وقت کا ذکر کرنا، تاکہ رضیع کے دو سال کے بعد، یا مُرضعہ کے ۹ سال سے پہلے یا دونوں کی موت کے بعد ہو تو اسے رد کر دیا جائے۔

۲- اس بات کا ذکر کرنا کہ کتنی مرتبہ دودھ پیا ہے، تاکہ پانچ سے کم ہو تو غیر معتبر قرار دیا جائے۔

۳- یہ وضاحت کہ متفرق پانچ مرتبہ پیا ہے۔

۴- اس بات کی صراحت کہ دودھ اس کے جوف میں پہنچ گیا تھا، نکالے ہوئے دودھ، اور ٹپکانے و نگلنے کو دیکھ کر اس کا اندازہ ہوگا، یا دیگر قرائن سے پتہ چلے گا، مثلاً پستان چوسنا اور بچہ کے حلق کی حرکت، جبکہ عورت کے پستان میں دودھ کی موجودگی کا علم ہو، اگر اس کا علم نہ ہو، تو گواہی دینا جائز نہیں۔ شہادت کی ادائیگی میں قرائن کا تذکرہ کافی نہیں، بلکہ قرائن پر اعتماد کرتے ہوئے بالجزم (حتمی) گواہی دے۔

اگر مسلک کے موافق فقیہ شخص رضاعت کی گواہی دے، تو ان شرائط کا تذکرہ ضروری نہیں، (کیونکہ وہ اپنے علم کی روشنی میں تمام شرائط موجود ہوں، تبھی گواہی دے گا) اگر دوسرے مسلک کا یا غیر فقیہ ہو، تو ان شرائط کا ذکر ضروری ہے۔ اس کا صرف اتنا کہنا کافی نہیں کہ ان دونوں میں رضائی حرمت کا رشتہ ہے۔ رضاعت کے اقرار یا اقرار کی گواہی کے لئے ان شرائط کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

(تحفہ مع الحواشی ۱۰/۵۱۱-۵۴۳، نهایه مع الحواشی ۷/۱۷۲، ۱۸۶، مغنی ۳/۴۱۴-۴۲۵، فتح الوهاب مع الجمل ۴/۴۷۴-۴۸۷، الاقناع مع تحفة الحبيب ۴/۵۹-۶۵، المجموع ۱۸/۲۰۷، الفقه المنهجي ۴/۲۰۳-۲۱۲، شرح التنبيه للسيرطى ۲/۷۳۷)

نفقات (ضروریاتِ زندگی ۔ نان نفقہ)

تعریف : نَفَقَات دراصل نَفَقَہ کی جمع ہے، جو انفاق سے ماخوذ ہے، یعنی اخراج (نکالنا و خرچ کرنا) اور ختم ہونا، یہ لفظ صرف خیر میں خرچ کرنے کے لئے مستعمل ہے۔

شرعی اصطلاح میں انسان کی ضروریات زندگی، یعنی کھانا پینا اور لباس وغیرہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

نفقات کے انواع : (۱) اپنی ذات کا نفقہ (۲) شوہر پر بیوی کا نفقہ (۳) اصول پر فروع کا نفقہ (۴) فروع پر اصول کا نفقہ (۵) دیگر نفقات

(۱) اپنی ذات کا نفقہ : جب ایک انسان قادر ہو، اس کے پاس مال ہو، تو سب سے پہلے اس کے ذمہ خود اپنا نفقہ واجب ہے۔ اس میں ایک انسان کی تمام ضرریات داخل ہیں، یعنی مکان، لباس اور کھانا پینا وغیرہ صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنی ذات سے شروع کرنے اور اس کی ضروریات پر صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۲) شوہر پر بیوی کا نفقہ : بعض شرائط کے ساتھ جن کا تذکرہ آئندہ ہوگا، شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ بالاجماع واجب ہے۔

آیات: ۱) ''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ''

(النساء : ۳۴)

ترجمہ: ''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنے مال (مہر میں نان نفقہ میں) خرچ کئے ہیں''۔

۲) ''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ''(البقرہ : ۲۳۳)

ترجمہ: ''اور (شرعاً نسب کے اعتبار سے) جس کا بچہ ہے (یعنی باپ) اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق''۔

احادیث: ۱) حجۃ الوداع سے متعلق حضرت جابرؓ کی طویل روایت میں آپ ﷺ نے اپنے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے، فرمایا: ''اور ان (عورتوں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق تم (مردوں) پر لازم ہے''(مسلم)

یہی مفہوم سنن کی روایات میں حضرت عمرو بن العاص سے بھی مروی ہے۔

۲) حضرت معاویہ قشیری نے آپ ﷺ سے بیوی کے حق کے متعلق پوچھا تو ارشاد فرمایا جب تم کھاؤ تو اسے کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اسے پہناؤ'' (نسائی ، ابن ماجہ ، ابوداود ، ابن حبان وحاکم وصحاہ وصححہ الدار قطنی)

۳) آپ ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ایک شخص نے کہا: میرے پاس ایک دینار ہے، فرمایا: اسے اپنی ذات پر صرف کرو، کہا ایک اور دینار ہے، ارشاد فرمایا: اسے اپنی بیوی پر صرف کرو، کہا کہ میرے پاس ایک دینار اور ہے: کہا اپنی اولاد پر خرچ کرو، کہا کہ مزید ایک دینا ہے، تو فرمایا: اسے اپنے خادم پر صرف کرو، کہا: ایک دینار اور ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے متعلق تم زیادہ جانتے ہو۔(یعنی اپنی صوابدید سے مناسب موقع محل میں اسے صرف کرو)(احمد ، نسائی)

ابوداود کی روایت میں اولاد کو بیوی پر مقدم رکھا ہے

حکمت: نفقات کے سلسلہ میں ازدواجی زندگی کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: (۱) شوہر اپنی بیوی اور اولاد کی ضروریات کا ذمہ دار ہو، (۲) اس کے برعکس بیوی ان ذمہ داریوں کو انجام دے۔ (۳) زوجین باہمی تعاون واشتراک سے مادی وسائل اور مصارف کا بار اٹھائیں۔

ہم اگر شریعت اسلامیہ کی مقرر کردہ پہلی صورت کو چھوڑ کر بقیہ دو کو اختیار کریں تو نتیجہ میں مہر کا حکم بھی بدل جانا چاہیئے کہ بیوی شوہر کو دے، یا دونوں مشترک طور پر اسے برداشت کریں، نیز مختلف خارجی میدانوں میں معیشت کی بھاگ دوڑ میں عورت کی عزت، اس کا شرف اور احترام، اور زیور حیا، سب کچھ برباد ہو جائے گا، اور وہ ہوا پرستوں کے ہاتھ کھلونا بن جائے گی نیز گھر ایک ایسے ذمہ دار سے خالی ہو جائے گا جو امور خانہ داری کو اور گھریلو نظم ونسق کو صحیح ترتیب سے انجام دے، اور کمسن اولاد کو ماتا کے آغوش میں زیور تعلیم وتربیت سے آراستہ کر سکے، لہٰذا گھر آرام گاہ اور محلِ انسیت ہونے کے بجائے، ویران اور وحشت ناک جگہ بن جائیگی، جہاں قلق واضطراب کا راج ہوگا، واقعات اور مشاہدات ان سنگین نتائج کے سب سے بڑے گواہ ہیں۔

نیز مذکورہ صورتوں میں طلاق کا اختیار بھی عورتوں کو مل جانا چاہئے، حالانکہ شریعت کا حکیمانہ قانون یہ ہے کہ یہ حق عام حالات میں شوہر کو حاصل ہے۔

لہٰذا زوجین ایک دوسرے کی خوش بختی کا عنصر قرار پائیں، اور خانگی ماحول ایک خالص شریفانہ واسلامی ہو، جہاں صحیح تربیت ونگرانی اور انسیت حاصل ہو، نیز عورت کا اپنا صحیح مقام اور عزت وشرف باقی رہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک مرد اپنی بیوی اور خانگی ضروریات کا کفیل وذمہ دار قرار پائے۔

بیوی کے حقوق : اناج، سالن، گوشت، لباس، سامانِ نشست (بیٹھنے کا نظم) اوڑھنا بچھونا، کھانے پینے اور پکانے کے برتن وغیرہ، نظافت کے اسباب ووسائل اور خادم۔

نفقہ کا وقت : ہرروز صبح صادق ہوتے ہی اس کے بعد آنے والی رات سمیت بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔ اگر اس رات میں بھی وہ نشوز اختیار کرے تو اس دن کا نفقہ ساقط ہوجائے گا۔ اگر دن یا رات کسی دوران تمکین وسپردگی پائی گئی تو اسی قسط کے اعتبار سے واجب ہوگا۔ لیکن نشوز کے بعد پھر اطاعت کرے تب بھی اس دن کا نفقہ بالکل واجب نہ ہوگا۔ اگر دے چکا ہے تو واپس لے سکتا ہے۔ اگر بیوی وجوب کے بعد مطالبہ کرے تو (فوراً) دینا واجب ہے، بلاعذر نہ دے، تو گنہگار ہوگا۔

مقدار : بیوی کے نفقہ کی مقدار متعین ہے، جو شوہر کی مالی حالت کے پیشِ نظر مقرر کی جائے گی، نہ کہ بیوی کے مالی معیار کے مطابق، جس کی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے:

''لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللّٰهُ '' (الطلاق : ۷)

ترجمہ: ''وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہئے، اور جس کی آمدنی کم ہو تو اس کو چاہئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں خرچ کرے''

شرعاً مالی نفقہ نظر سے شوہر کے تین درجات قائم ہوں گے:

(۱) مُعسِر (تنگدست، غریب) (۲) مُتوسِّط (درمیانی درجہ) (۳) مُوسِر (دولت مند، آسودہ)

جس دن کا نفقہ دینا ہے، اس دن فجر کے وقت کسی کے پاس موجود مال اس کے غالب عمر کے مصارف (یعنی اس کے اور دیگر زیر کفالت افراد کے خرچ) سے زائد نہ ہو، یا صرف ڈیڑھ مُد سے کم بچتا ہو، تو (اس دن) وہ معسر شمار ہوگا، اگر ڈیڑھ مد بچتا ہو، لیکن دو مد تک نہ پہنچے تو متوسط اور دو مد یا زائد بچے تو موسر اور مالدار شمار ہوگا۔ غالب عمر گذر چکی ہو تو ایک سال کا اعتبار ہوگا۔ لباس کے متعلق موسم کے ابتداء کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کافی مقدار کمانے پر قادر ہو، (لیکن مال جمع نہ ہو) تب بھی وہ نفقہ کے مسئلہ میں معسر شمار ہوگا، گو زکات کے مسئلہ میں مسکین شمار نہ ہوگا۔ جو شخص کما کر موسر کی مقدار ادا کرسکتا ہو، اس پر یہ لازم نہیں ہے۔

(۱) مُعسر : ایک معسر پر اپنی بیوی کے لئے (ایک دن کا نفقہ) ایک مد اناج لازم ہے، گو بیوی ذمیہ (یعنی اہلِ کتاب) یا بیمار یا اونچے درجہ کی ہو۔ بیوی جس جگہ رہتی ہے، وہاں غالباً جو اناج استعمال ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔ اگر مختلف اناج مستعمل ہوں، اور کچھ غالب نہ ہو تو شوہر کے مناسب حال اناج کا اعتبار ہوگا۔

(۲) متوسط : جو فجر کے وقت متوسط مالیت کا حامل ہو، اس پر اس دن ڈیڑھ مد نفقہ واجب ہے۔

(۳) موسر : ایک غنی اور مالدار شخص پر اپنی بیوی کے حق میں دو مد اناج بطور نفقہ واجب ہے۔

علماء نے اصل تفادت کے لئے مذکورہ بالا آیت (سورہ طلاق : ۷) سے استدلال کیا ہے۔ اور نفقہ کو کفارہ پر قیاس کرلیا، کیونکہ دونوں بھی شریعت کی جانب سے واجب ہونے والا مال ہے، اور ذمہ مستقر ہوتا ہے، کفارہ میں ایک مسکین کے لئے زیادہ سے زیادہ دو مد واجب ہوتا ہے، جو حج کے اذٰی کا کفارہ ہے اور اقل مقدار ایک مسکین کے لئے ایک مد ہے جو قسم کے کفارہ وغیرہ میں واجب ہے۔ لہٰذا موسر پر اکثر معسر پر اقل اور متوسط پر دونوں کا اوسط واجب کیا گیا۔ دیگر رشتہ داروں کے نفقہ کی طرح بیوی کے نفقہ میں کفایت (جو کافی اور دوسرے سے مستغنی کرنے والی ہو) کا اعتبار نہ کیا گیا، کیونکہ بیوی اپنی بیماری اور استغناء و مالداری اور شکم سیری کے باوجود نفقہ کی مستحق ہے۔ نیز قرآن

وحدیث نے معروف اور قاعدہ کے موافق خرچ کا حکم دیا ہے، اور یہ تفاوت وتفصیل اسی معروف کی وضاحت ہے، مزید یہ کہ بغیر تعیین کے محض کفایت کے سپرد کردیا جائے تو کافی اختلاف وتنازع کھڑا ہوجائے گا۔

بیوی کا امورِ خانہ داری کو انجام دینا : عموماً بیوی جو گھریلو کام کاج انجام دیتی ہے، مثلاً: پکانا، جھاڑو دینا وغیرہ، جو کہ اس پر واجب نہیں، تو بیوی کو یہ مسئلہ بتادینا ضروری ہے، کیونکہ اسے مسئلہ معلوم نہ ہو، تو وہ یہ سمجھے گی کہ یہ امور مجھ پر واجب ہیں، اور انجام نہ دوں تو مجھے نان نفقہ وغیرہ کا استحقاق نہ ہوگا۔ تو ایک طرح سے وہ مُکرَہ شمار ہوگی، اس کے باوجود وہ ان خدمات کو انجام دے تو اس کا احتمال ہے کہ اس کے حق میں اس کے عوض اجرت واجب نہ ہو، کیونکہ مسئلہ کی تحقیق نہ کرنا اس کی غلطی ہے۔

تنبیہ : اصل مسئلہ تو یہی ہے، جو بیان ہوا، لیکن صحیحین وغیرہ کی احادیث سے جو بات سامنے آتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ رسالت وصحابہ میں صحابیات خوش اخلاقی اور معاشرت بالمعروف کے طور پر گھر کے اندرونی نظام کو اپنی خوشی ومرضی سے سنبھالا کرتی تھیں، اس لئے ایک مسلمان خاتون کو انہیں کے اسوہ کو اپنانا چاہئے، تاہم یہ اس پر واجب نہیں، لہٰذا اس پر ان امور کے لئے جبر جائز نہ ہوگا، اور اسے بنیاد بنا کر ایک شوہر کے لئے اس کے خلاف کوئی اقدام روا نہ ہوگا۔ شوہر کے دیگر رشتہ داروں (ساس سسرے دیور نند وغیرہ) کی خدمت از روئے فقہ اس پر واجب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

پیسنا وغیرہ : اگر اناج واجب ہو رہا ہو تو شوہر پر بے عیب اناج ہی دینا واجب ہے، کیونکہ اس کا نفع اکمل ہے، پس آٹا یا روٹی یا گھن لگا ہوا اناج دینا کافی نہیں، اگر بیوی کچھ اور طلب کرے تو شوہر کو دینا، یا شوہر کچھ اور دے تو بیوی کو قبول کرنا لازم نہیں ہے۔ اناج کے پیسنے اور گوندنے اور روٹی بنانے (کے مصارف) کا ذمہ دار شوہر ہے۔ گو بیوی از خود ان امور کو انجام دینے کی عادی ہو، اگر بیوی اناج فروخت کردے یا اسی شکل میں استعمال کرلے، تب بھی ان مصارف کی مستحق ہوگی۔

اعتیاض : بیوی اپنے سابقہ یا حالیہ نفقہ کے عوض شوہر سے درہم ودینار یا کپڑا وغیرہ کوئی دوسری چیز لے سکتی ہے۔ جب کہ اس میں سود کی شکل نہ ہو۔ جیسا کہ جو کی جگہ گیہوں دینا۔ اگر سود لازم آئے تو جائز نہیں۔ مثلاً گیہوں کا آٹا یا روٹی (لیکن امام بغوی واذرعی وغیرہ نے سہولت اور تسامح کے طور پر اسے بھی کافی قرار دیا ہے۔) مستقبل کے نفقہ کے عوض دوسری کوئی چیز لینا جائز نہیں ہے۔

شوهر کے ساتھ کھانا پینا: عام عادت کے مطابق بیوی اپنی خوشی سے شوہر کے ساتھ کھائے پئے اور وہ رشیدہ ہو، یا غیر رشیدہ ہو، لیکن ولی نے اس کی اجازت دی ہو، تو یہ کافی ہے، اور اس سے اس کا نفقہ ساقط ہوگا، کیونکہ قدیم زمانہ سے عموماً لوگوں کا یہی معمول چلا آرہا ہے۔ اگر بیوی رشیدہ نہ ہو، مثلاً پاگل یا کمسن ہو، اور ولی کی اجازت نہ ہو، تو ساتھ کھانے پینے سے اس کا نفقہ ساقط نہ ہوگا۔ اگر بیوی اپنی کفایت سے کم استعمال کرے تو بقیہ مقدار کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

اگر صرف شوہر کے اکرام کے طور پر کہیں ضیافت میں کھالے تو اس سے بھی نفقہ ساقط ہوگا، صرف بیوی کے تعلق اور اکرام کی وجہ سے ضیافت ہو تو نفقہ ساقط نہ ہوگا، اگر دونوں کا اکرام شامل ہو، تو نصف نفقہ ساقط اور نصف واجب ہوگا۔

سالن وغیرہ : موقع محل، ماحول، موسم، معاشرہ اور شوہر کی مالی حیثیت کے اعتبار سے قاعدہ وعادت اور عرف کے مطابق سالن، گوشت وغیرہ اشیاء بھی واجب ہوں گی، گو بیوی انھیں استعمال نہ کرے۔ اگر بعض اوقات میوہ اور پھل وغیرہ مستعمل ہوں تو وہ بھی ضروری ہیں۔ ان امور میں میاں بیوی میں اختلاف ونزاع ہو، تو قاضی شوہر کی مالی حیثیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے اجتہاد اور صوابدید سے مناسب مقدار متعین کرے۔

عیدوغیرہ کے موقع پر جن مخصوص چیزوں کے استعمال کی عادت ہو، بظاہر وہ بھی واجب ہیں۔

لباس

(سورہ بقرہ کی آیت: ۲۳۳ میں بیوی کے لئے لباس اور کپڑے کی ذمہ داری کا ذکر گذر چکا)

بیوی کے لئے مناسب لباس وپوشاک بھی شوہر پر واجب ہے۔ علاقہ کی گرمی وسردی اور بیوی کی جسمانی ساخت کے اعتبار سے اس میں تفاوت واختلاف ہوگا۔ اگر کسی جگہ سونے کے لئے الگ لباس کا عرف ہو، تو وہ بھی واجب ہے۔

قمیص (جواوپری بدن چھپائے) شلوار (وغیرہ جو نچلے حصہ میں مستعمل ہو) دوپٹہ (جس سے سر چھپا سکے) اور پیروں میں پہننے کے لئے چپل وغیرہ لباس میں داخل ہیں۔ موسم سرما میں سوئٹر وغیرہ کا اضافہ کیا جائے گا۔ اگر سردی کی شدت کی وجہ سے آگ تاپنے کا معمول ہو تو ایندھن یا کوئلہ وغیرہ بھی فراہم کرلے۔

کپڑے کی جنس ونوعیت کے متعلق شوہر کے طبقہ کی عادت کا لحاظ کیا جائے گا۔ کپڑے کی دیگر ضروریات مثلاً ازار بند، بٹن وغیرہ بھی شوہر کے ذمہ ہے۔ نیز سلائی کے مصارف بھی شوہر پر لازم ہیں، گو بیوی خود اپنے کپڑے سی ڈالے۔

عام اوقات میں بیوی کے بیٹھنے کیلئے مناسب انتظام (چٹائی وغیرہ) نیز آرام کے لئے بستر لحاف، چادر، تکیہ وغیرہ کا نظام بھی شوہر پر واجب ہے۔ ان امور کی تفصیلات میں علاقہ، موسم اور شوہر کے طبقہ کا عام رواج ومعمول اور اس کی مالی حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

عام لباس اور پوشاک سال میں دو مرتبہ دینا واجب ہے، یعنی ایک سردی میں اور ایک گرمی میں۔ سوئٹر، بیٹھنے کا نظم اور بستر وغیرہ میں عادت کے مطابق اصلاح اور تجدید کی جائے گی۔

کھانے پینے اور پکانے کے اسباب: بیوی کے لئے کھانے پینے اور پکانے کے برتن وغیرہ مثلاً پیالہ، کوزہ، گھڑا، ہانڈی اور چمچ کی فراہمی شوہر کے ذمہ ہے۔ شوہر کے طبقہ میں عادت کے مطابق مٹی، پتھر لکڑی یا تانبے وغیرہ کے بنے ہوئے ظروف فراہم کرے۔ اسی طرح مذکورہ امور میں بیوی کے مراتب، مثلاً دیہاتی یا شہری ہونے وغیرہ کے اعتبار سے بھی تفاوت ہوگا۔

روشنی کا نظم اور کپڑے دھونے کے لئے بالٹی وغیرہ اور بصورت عادت وضو کے لئے لوٹا وغیرہ بھی فراہم کرے۔ معتمد قول یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام اشیاء بطور تملیک ہے (یعنی بیوی ان کی مالکہ ہوگی) شوہر کا بیوی کے حق کی نیت سے دے دینا اور بیوی کا لینا اور قبضہ کرلینا کافی ہے۔ (باقاعدہ ایجاب وقبول ضروری نہیں)

تنبیہ: مذکورہ تمام اشیاء جب بیوی کو عطا کرے، تو بیوی شوہر کو ان کے استعمال سے روک سکتی ہے، خواہ کھانے پینے وغیرہ میں استعمال کرے۔ اگر شوہر خلاف ورزی کرتے ہوئے خود استعمال کرے تو اس پر کرایہ اور نقصان کی تلافی لازم ہے۔ (اگر بیوی اپنے برتنوں میں پکا کر خود شوہر کے یا اس کے ساتھیوں کے سامنے پیش کرے تو اجرت نہ ملے گی) نیز بیوی ان اشیاء کا مطالبہ کرسکتی ہے، گو حاکم کے ذریعہ یا دونوں میں جدائی کے بعد ہو، اگر بیوی اپنے مال سے یہ ضروریات پوری کرے، تو اس سے یہ ساقط نہ ہوگا۔

اگر یہ اشیاء ٹوٹ پھوٹ جائیں، تو جس مدت میں اس کے بدلنے کی عادت ہو، اس وقت بدلنا کافی ہے۔ فی الحال دوسری اشیاء کی فراہمی واجب نہیں ہے۔

صفائی ونظافت کے اسباب: بیوی کے لئے نظافت کے اسباب مثلاً: کنگھی، تیل اور (بدن، کپڑے اور برتن کی

صفائی کے لئے) صابن وغیرہ کا انتظام کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ زچگی اور صحبت کی وجہ سے واجب غسل کے لئے درکار پانی بھی شوہر کے ذمہ ہے۔ حیض واحتلام کے غسل کا شوہر ذمہ دار نہیں ہے۔

شوہر بیوی کو بدبودار اشیاء کے کھانے یا بدبودار لباس کے پہننے سے منع کرسکتا ہے اور وہ خلاف ورزی کرے تو ناشزہ شمار ہوگی۔

اسبابِ زینت: سرمہ اور مہندی وغیرہ زینت کی اشیاء شوہر پر واجب نہیں، اور شوہر کو بیوی کا مزیّن ہونا مطلوب ہو، تو وہ ان اشیاء کو فراہم کرے، اور اس صورت میں ان کا استعمال بیوی پر واجب ہے۔

علاج ودوا: بیوی کا علاج اور طبیب (ڈاکٹر) کی اجرت (فیس) وغیرہ شوہر پر واجب نہیں، کیونکہ یہ بدن کی حفاظت کی خاطر ہے۔ زچگی کے بعد پیٹ وغیرہ میں پیش آنے والی تکلیف کے ازالہ کا بھی یہی حکم ہے، کیونکہ یہ بھی دوا میں داخل ہے۔ نیز بیوی کے پاس عورتوں کے جمع ہونے کے وقت ان کی ضیافت وغیرہ کا نظم شوہر کی ذمہ داری میں داخل نہیں ہے، اگر بیوی چاہے تو اپنے جیب سے ان امور کو انجام دے۔ بیماری کے ایّام میں نفقہ وغیرہ مذکورہ بالا تمام امور کی بیوی مستحق ہوگی، ان کو وہ اپنے معالجہ پر صرف کرسکتی ہے۔

تنبیہ: دورِ حاضر کے محقق علامہ ڈکتور وھبۃ الزحیلی کا خیال یہ ہے کہ علاج معالجہ ماضی میں بنیادی حاجت میں داخل نہ تھا، پس ایک انسان غالباً علاج کا محتاج نہ رہتا، کیونکہ وہ صحت وحفاظت کے اصول کو اپنا کر زندگی گذارتا تھا، لہٰذا فقہاء کرام کا اجتہاد ان کے دور کے عرف پر مبنی ہے، لیکن دورِ حاضر میں علاج کی ضرورت بھی غذا کی طرح ہوچکی ہے، بلکہ (بعض اوقات) اس سے بھی اہم، کیونکہ مریض اپنے علاج کو اکثر دیگر تمام امور پر ترجیح دیتا ہے... لہٰذا موصوف کی رائے میں دیگر نفقات ضروریہ کی طرح دوا وعلاج کے مصارف بھی شوہر پر واجب ہیں، جیسا کہ ایک والد پر اولاد کے دوا کا خرچ بھی بالاجماع لازم ہے۔ کیا یہ حسن اخلاق اور اچھے برتاؤ میں داخل ہوگا کہ بحالتِ صحت تو شوہر بیوی سے انتفاع کرے، اور بحالتِ مرض علاج کے لئے اس کے گھر والوں کے سپرد کردے؟ (من الفقہ الاسلامی ۷/۷۹۴) واللہ اعلم بالصواب

مَسکَن (مکان۔گھر)

عدت کے باب میں سورہ طلاق کی آیت ۱ اور ۶ کی تشریح گذر چکی، جس میں مطلقہ کے لئے دورانِ عدت رہائش کے نظم کا حکم ہے، لہٰذا ایک بیوی کے لئے بدرجہ اولیٰ یہ حکم ہوگا۔ نیز قرآن نے بیوی کے ساتھ معاشرت بالمعروف کا حکم دیا، لہٰذا اس کا بھی تقاضا ہے کہ بیوی کے لئے مکان کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہو۔

بیوی کیلئے اس کے مناسبِ حال رہنے کا انتظام (مکان یا کمرہ وغیرہ) شوہر پر واجب ہے، جہاں شوہر کی غیر موجودگی میں بھی اس کے جان ومال کو کوئی خطرہ نہ ہو، مکان شوہر کی ملکیت ہونا کوئی ضروری نہیں، اگر عاریت، یا کرایہ، یا وقف کا ہو تب بھی کافی ہے۔ نان نفقہ اور لباس میں چونکہ تملیک ہے۔ اس لئے شوہر کی حالت کا اعتبار کیا گیا، اور رہائش میں صرف انتفاع ہے، اس لئے بیوی کے مناسبِ حال اس کا اعتبار کیا گیا، نیز نفقہ ولباس اگر بیوی کے مناسب نہ ہو تو وہ اسے تبدیل کرسکتی ہے، لہٰذا کسی ضرر کا سوال نہیں، بخلاف مسکن کے، کیونکہ اسی میں رہنا اس پر لازم ہے، پس اس کے مناسب حال تجویز کیا گیا۔

اگر شوہر بیوی کے ساتھ اس کی اجازت سے اسی کے گھر رہے، یا وہ شوہر کے ساتھ منتقل ہونے سے انکار کرے اور اس وجہ سے شوہر اس کے گھر رہے، یا مثلاً بیوی کے باپ کے گھر میں اس کی اجازت سے رہے، یا باپ منتقل کرنے سے روکے (تو اس مدت کا سکنیٰ ساقط

ہوگا) اور شوہر پر کرایہ لازم نہ ہوگا، کیونکہ اجازت میں عوض کا تذکرہ نہ ہو تو اسے عاریت واباحت پر محمول کیا جائے گا۔ بیوی یا اس کا باپ سکوت اختیار کرے (یعنی زبان سے اجازت نہ دیں اور شوہر بیوی کے ساتھ وہاں رہے) تو کرایہ لازم ہوگا۔

خادم

جو آزاد عورت ایسے طبقہ کی ہو کہ اس کے والد کے گھر عادتاً کام کاج کے لئے نوکر رہتے ہیں، تو ایسی عورت کے خدمت کا انتظام شوہر پر لازم ہے، گو شوہر غریب ہو، کیونکہ یہ معاشرت بالمعروف میں داخل ہے، شوہر کے گھر آنے کے بعد اس معیار پر پہنچی ہو تو یہ لازم نہیں ہے۔

گھر کے اندرونی کام کے لئے شوہر ایسے خادم کا انتظام کرے جسے اس عورت کو دیکھنا جائز ہو۔ مثلاً: کوئی عورت ممیز بچہ جو مراہق (قریب البلوغ) نہ ہو ممسوخ یا عورت کا کوئی محرم رشتہ دار۔

تنبیہ: نوکروں کے متعلق کئی علاقوں میں کافی کوتاہی اور شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ بالکل اجنبی اور غیر محرم ہونے کے باوجود گھر کے اندر اور مستورات میں بڑی آزادی سے اس کی آمد ورفت رہتی ہے، اور اس سے پردہ وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات تو یہ غیر مسلم ہوتے ہیں، جن کی عورتوں تک سے مسلم عورتوں کو کسی درجہ میں پردہ ضروری ہے، جس کی تفصیل نظر کے احکام میں گذر چکی، لیکن الامان والحفیظ غیر مسلم اور نیم برہنہ نوکروں کو محرم سے بھی بڑھ کر سمجھا جاتا ہے، اور ایک محرم مرد کے سامنے جس پردہ کا اہتمام اور حیا کا احساس ہوتا ہے، ان غیر مسلم مردوں کے ساتھ اتنی بھی رعایت نہیں کی جاتی، بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔

اگر شوہر خود بیوی کے کام کاج کو انجام دینا چاہے، تاکہ نوکر کے خرچ سے بچ سکے، تو بیوی کو قبول کرنا ضروری نہیں، خواہ کپڑے دھونے، پانی فراہم کرنے یا پکانے کا کام ہو، کیونکہ اس سے اسے حیا وشرم محسوس ہوگی، اور لوگ عار دلائیں گے۔ اگر بیوی اپنا کام کاج خود انجام دے کر خادم کی اجرت لینا چاہے، تو شوہر کو ماننا ضروری نہیں ہے۔ اگر وہ متفق ہو تو گنجائش ہے۔ خادم کا انتظام ہو تو شوہر بیوی کو کام کاج سے روک سکتا ہے۔ جس بیوی کے لئے بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ایک یا زائد خادمہ کی ضرورت ہو اس کا انتظام کرنا واجب ہے، خواہ عام حالات میں بیوی اس معیار وطبقہ کی نہ ہو کہ خادمہ فراہم کرنا واجب ہو۔

خادم اور مسکن میں واجب امتاع (انتفاع، نفع اٹھانا) ہے۔ اور دیگر اشیاء یعنی کھانا پینا، سالن، لباس، اسباب نظافت وظروف وغیرہ میں تملیک واجب ہے، بغیر صیغہ کے شوہر متعلقہ حق کی نیت سے ادا کرے تو یہ بھی کافی ہے، بیوی اسے لے کر جی چاہا تصرف کر سکتی ہے، یعنی اپنے دیگر اموال کی طرح فروخت وغیرہ کرنا بھی جائز ہے۔ اگر یہ حقوق فوت ہوں تو بیوی قیمت کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اگر بیوی ان اشیاء کے استعمال سے تنگی سے کام لے، جو اس کے لئے مضر ہو یا جس کی وجہ سے شوہر کو اس سے نفرت پیدا ہو تو شوہر اسے اس تنگی و بخیلی سے روک سکتا ہے۔

مسئلہ: (۱) بیوی کے لئے زیور وغیرہ خرید کر اسے پہنائے تو اس سے بیوی مالکہ نہ بنے گی، اگر ان اشیاء کے ہدیہ یا عاریت ہونے میں دونوں میں اختلاف ہو تو شوہر کی تصدیق کی جائے گی (اور اس کے وفات کی صورت میں اس کے وارث کی تصدیق کی جائے گی)

(۲) باپ اپنی بیٹی کو جہیز دے، تو بغیر ایجاب وقبول کے بیٹی اس کی مالکہ نہ بنے گی، اور باپ کہے کہ میں نے اسے مالکہ نہیں بنایا تو اس کی بات تسلیم کی جائے گی۔

لباس وغیرہ کی مدت: ہر چھ ماہ کے ابتداء میں بیوی کو لباس دیا جائے گا (گویا سال میں دو لباس، سردی وگرمی کی

مناسبت سے) امام دَمیری فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ ترتیب ومقدار اکثر علاقوں کے اعتبار سے ہے، جہاں اس مدت تک لباس محفوظ رہتا ہے۔ اگر کسی علاقہ میں گرمی کی شدت یا کپڑا گھٹیا ہونے کی وجہ سے اتنی مدت تک نہ رہتا ہو، تو ان کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسی طرح کسی علاقہ میں ایسے کپڑوں کی عادت ہو، جو مثلاً ایک سال تک محفوظ رہے، تو بظاہر ان کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر ہر چھ ماہ میں نئے جوڑے کا عرف ہو، اور اس مدت میں لباس بوسیدہ نہ ہو، تب بھی عادت کے مطابق نیا جوڑا دینا واجب ہے۔

اگر چھ ماہ کے اندر کپڑا تلف ہو، خواہ بیوی کی غلطی کے بغیر، تو اس کی جگہ دوسرا دینا لازم نہیں، اگر مدت کے دوران بیوی کی وفات ہو تو جوڑا واپس نہیں لے سکتا، اور اگر کافی عرصہ تک بیوی کو لباس نہ دیا، تو یہ شوہر پر قرض رہے گا۔

بستر اور کنگھی وغیرہ عام طور پر جس مدت میں تبدیل کی جاتی ہیں، اس وقت تبدیل کی جائیں۔

تنبیہ : اگر زوجین یا دونوں کے وارث، یا ایک کے وارث اور دوسرے میں گھر کے اسباب میں اختلاف ہو، (شوہر کا ہے یا بیوی کا) تو وہ چیز صرف کسی ایک کے مناسب ہو، تو اس کا ہوگا، ورنہ بیّنہ نہ ہو، اور قبضہ میں ہونے کے اعتبار سے اختصاص نہ ہو، تو دونوں ایک دوسرے کو قسم دلا سکتے ہیں، اگر دونوں قسم لیں، تو دونوں میں (برابر) تقسیم ہوگا، اگر ایک قسم سے انکار کرے، تو دوسرا قسم لے، پھر اسی کے حق میں فیصلہ ہوگا۔

نفقہ وغیرہ کے وجوب کا وقت

صرف عقد نکاح سے نفقہ واجب نہ ہوگا، بلکہ تمکین (قدرت دینا، بیوی کو شوہر کے حوالہ کرنا) سے واجب ہوگا، گو شوہر کمسن ہو اور صحبت پر قادر نہ ہو، اگر اتنی کمسن ہو کہ صحبت نہیں کر سکتی تو اسکا نفقہ واجب نہیں ہے۔ پاگل اور قریب البلوغ بیوی کی سپردگی کے بارہ میں ان کے ولی کا اعتبار ہوگا۔ اگر قریب البلوغ بیوی خود ہی اپنے آپ کو سپرد کرے اور شوہر اسے اپنے گھر منتقل کرے، تو اس کے مصارف واجب ہوں گے۔ اگر بیوی نقد مہر کے لئے اپنے آپ کو روکے اور کہے کہ جب بھی مہر دو گے، میں خود کو سپرد کروں گی، تو یہ بھی تمکین (کی طرح) ہے، لہٰذا نفقہ واجب ہوگا۔

اگر تمکین کے سلسلہ میں اختلاف ہو، تو شوہر کو عدم تمکین کے متعلق قسم دلا کر اس کی تصدیق کریں گے۔ اگر مکلف بیوی خود کو یا غیر مکلف کا ولی اسے شوہر پر پیش کرے، مثلاً اسے کہلا بھیجے کہ میں اپنا نفس تمہارے حوالہ کرتی ہوں، تو جب شوہر کو یہ خبر ملے، اس وقت سے نفقہ لازم ہے۔

مسئلہ : جس پر نفقہ واجب ہے، وہ بیوی وغیرہ کا نفقہ نہ دے، تو اس کی مال میں سے اپنا حق لینا جائز ہے۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ کو آپ ﷺ نے معروف کے مطابق لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

نفقہ وغیرہ کا سقوط

اگر بیوی نشوز اختیار کرے، یعنی شوہر کی اطاعت سے نکل جائے، گو دن کے کچھ حصہ میں ہو، اور اس سے گنہگار نہ ہو، مثلاً پاگل یا نابالغہ ہے، تو نان نفقہ، لباس اور سکنی وغیرہ گذشتہ تمام حقوق ساقط ہو جائیں گے۔ اگر دن یا رات کے کسی ایک لحظہ میں بھی نشوز ہو، تو اس دن رات کا نفقہ اور اس موسم کا لباس مکمل ساقط ہوگا، جب کہ شوہر بیوی سے انتفاع نہ کرے، اگر ایک لحہ بھی انتفاع کرے، تو نفقہ ولباس مکمل واجب ہوگا نشوز کے بعد پھر اطاعت کرے تو دن کے باقی حصہ کا نفقہ یا موسم کے بقیہ ایام کا لباس نہ ملے گا، جب کہ استمتاع نہ کرے۔

نشوز کی مثالیں : (۱) شوہر کو تمتع (انتفاع، لطف اندوزی) سے روکنا، گو صرف چھونا ہی کیوں نہ ہو، اگر بطور ناز روکے، یا

کسی عذر سے روکے، مثلاً ایسی بیماری کہ صحبت کو برداشت نہ کر سکے۔

(۲) شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانا۔

اگر کسی عذر سے نکلے، مثلاً گھر کے منہدم ہونے کے خوف سے، یا کسی پیش آمدہ مسئلہ کا جواب معلوم کرنا ہو، اور شوہر خود یہ کام انجام نہ دے، تو نفقہ ساقط نہ ہوگا۔

فی الحال ضرورت کے بغیر محض تحصیل علم کے لئے علمی مجالس میں حاضری یا وعظ کی مجلس میں حاضری عذر میں شمار نہیں۔ اگر شوہر بستی میں موجود نہ ہو، تو بیوی اپنے رشتہ داروں کی ملاقات اور عیادت کے لئے جاسکتی ہے، جب کہ اس کی طرف سے ممانعت نہ ہو، اور اس کی ناراضگی کا علم نہ ہو، اس کی موجودگی میں بھی عرفاً اس طرح جانے میں اسے اعتراض نہ ہو، تو حرج نہیں، نیز صبح گھر سے نکل کر شوہر شام میں آنے کا عادی ہو، تب بھی وہ عیادت وغیرہ کے لئے جاسکتی ہے، جبکہ شوہر کے لوٹنے سے قبل لوٹ جائے، اور اس کی رضامندی کا علم ہو۔

تنبیہ: شوہر اپنے حق کیلئے (مثلاً نشوز، پڑوسیوں کے ساتھ زبان درازی، روشن دان سے تاک جھانک وغیرہ) بیوی کی سرزنش کرسکتا ہے، نہ کہ اللہ کے حق کی وجہ سے، نماز کے وقت بیوی کو نماز کا حکم دینا واجب ہے، لیکن علامہ رملی وغیرہ کے نزدیک نماز کے ترک پر بیوی کو مارنا جائز نہیں، تاہم ابن حجر وغیرہ نے اجازت دی (جمل ۱۶۵/۵، نہایہ ۲۲/۸، مغنی ۱۹۳/۴، ترشیح ۳۸۷)

سفر: اگر بیوی شوہر کے ساتھ سفر میں ہو، یا اس کے ساتھ نہ ہو، لیکن اس کی اجازت سے اس کی ضرورت سے سفر کرے تو نان نفقہ ساقط نہ ہوگا، لیکن شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے ساتھ سفر کرے تو گنہگار ہوگی، شوہر کے روکنے کے باوجود بیوی اس کے ساتھ سفر کرے، تو نفقہ ساقط ہوگا۔

اگر بیوی شوہر کے بغیر سفر میں جائے، گو اس کی اجازت سے جائے، لیکن شوہر کی ضرورت سے نہ ہو، بلکہ اپنی یا کسی دوسرے کی ضرورت سے ہو تو نفقہ ساقط ہوگا۔

احرام: حج یا عمرہ کا یا مطلقاً صرف احرام باندھنے سے نفقہ ساقط نہ ہوگا، گو شوہر کی اجازت کے بغیر باندھے، جب تک کہ گھر سے نہ نکلے، اگر اجازت کے بغیر احرام باندھے تو شوہر اسے کھلوا سکتا ہے (حلال کرسکتا ہے) حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لئے گھر سے نکل جائے اور شوہر ساتھ نہ ہو، تو نفقہ ساقط ہوگا۔

نفل وقضا: شوہر نفل عبادت (روزہ ہو یا کچھ اور) سے بیوی کو روک سکتا ہے، اسی طرح بیوی نفل شروع کرے تو اسے توڑ سکتا ہے۔ لیکن امام ماوردی کا خیال ہے کہ اگر شوہر کا تمتع کا ارادہ ہو، تب منع کرے۔

فرض روزہ وغیرہ کی قضا موسّع ہو، یعنی فوراً قضا لازم نہ ہو، تو فی الحال قضا کرنے سے منع کرسکتا ہے۔ اگر منع کرنے کے باوجود بیوی اسے انجام دے تو ناشزہ ہوگی۔

راتب سنتیں جیسے سنت ظہر، عرفہ وعاشوراء کا روزہ یا عیدین، ضحیٰ کسوف، خسوف، استسقاء، کی نماز، نمازوں کے بعد مطلوبہ اذکار، ادا عبادتیں، اور جن کی قضا میں تاخیر کی گنجائش نہ ہو، ایسے امور سے روکنا جائز نہیں ہے۔ پنجوقتہ فرائض اور ان کی سنتوں کو اول وقت پڑھنے سے بھی نہ روکے۔

فائدہ: شوہر بیوی کو گھر سے نکلنے سے روک سکتا ہے، گو والدین کی ملاقات یا ان کے جنازہ میں شرکت کے لئے ہو، اسی طرح کسی کو اس کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت سے بھی روک سکتا ہے، خواہ اس کے والدین یا کسی دوسرے شوہر کی اولاد ہو، لیکن بلا عذر

والدین کو آنے سے روکنا مکروہ ہے۔ اگر والدین فاسق یا بداخلاق ہوں اور اسے شوہر کی نافرمانی پر ابھاریں، تو روکنا ممنوع نہیں ہے، اگر بیوی اس معیار کی ہو کہ اسے خادمہ کی ضرورت ہو تو ایک خادمہ کو نہیں روک سکتا، ایک سے زائد کو روک سکتا ہے۔ اگر مکان بیوی کی ملکیت ہو، تو شک وتہمت کے بغیر مذکورہ کسی امر سے روک نہیں سکتا۔

عدّت میں نفقہ وغیرہ کا حکم

(عدت میں سکنی ورہائش کی تفصیل عدت کے باب میں گذر چکی)

(۱) رجعیہ : اگر بیوی طلاق رجعی کی عدت میں ہو تو اسباب نظافت کے علاوہ دیگر تمام مصارف (یعنی کھانا، پینا، لباس، رہائش وغیرہ) اختتام عدت تک لازم ہیں خواہ بیوی حاملہ ہو یا غیر حاملہ، کیونکہ ابھی تک وہ شوہر کے قابو میں ہے۔

(۲) بائنہ : اگر بیوی بائنہ ہو، اور حاملہ ہو، تو اسے عدت میں نفقہ اور لباس وغیرہ دینا واجب ہے۔

آیت : ''...وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ..'' (الطلاق : ۶)

ترجمہ : ''اور اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان کو (کھانے پینے کا) خرچ دو''

اگر حاملہ صحبت شُبہ کی عدت میں ہو، یا عقد کے ساتھ پائے جانے والے کسی سبب سے فسخِ نکاح کی عدت میں ہو، تو نفقہ نہ ملے گا۔ رضاعت وغیرہ کسی عارض کی وجہ سے فسخ ہو، تو نفقہ ملے گا۔

اگر بائنہ حاملہ نہ ہو تو اسے بھی نفقہ نہ ملے گا۔

حدیث : ''حضرت فاطمہ بنتِ قیسؓ کو جب ان کے شوہر نے آخری طلاق دے دی (اور وہ بائنہ ہو گئیں) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں نفقہ نہیں ملے گا البتہ اگر حاملہ ہو (تو ملے گا) (مالک، مسلم، ابوداود، نسائی، طحاوی، بیہقی، احمد، حاکم، بطولها مع الفاظ مختلفه ۔ ارواء الغلیل ۶/۲۰۸)

(۳) وفات کی عدت : وفات کی عدت میں نفقہ نہ ملے گا گو بیوی حاملہ ہو، حدیث میں ہے کہ جس حاملہ کا شوہر انتقال ہو، اسے نفقہ نہ ملے گا۔ (رواه الدار قطنی باسناد صحیح) اگر رجعی عدت میں شوہر کی وفات ہو تب بھی یہی حکم ہوگا، کیونکہ اب اس کی عدت وفات کی عدت ہوگی۔

جو بیوی شوہر کے انتقال سے قبل ہی بائنہ ہو اور وہ حاملہ ہو تو اسکا نفقہ ساقط نہ ہوگا۔

عدت کے تمام اخراجات کی تفصیل وہی ہے، جو ایک بیوی کے اخراجات کی ہے۔ حاملہ کے لئے جو نفقہ واجب ہوتا ہے حمل کے ظہور سے قبل یا شوہر کے اقرار حمل سے قبل ادا کرنا لازم نہیں، اگر حاملہ سمجھ کر نفقہ دیتا رہا، پھر پتہ چلا کہ حمل نہیں ہے، تو اس سے واپس لے سکتا ہے۔

تنگ دستی کی وجہ سے فسخ نکاح

آیت: ''وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا ..'' (البقرہ : ۲۳۱)

ترجمہ : ''اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رکھو، اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا کروگے''

نفقہ کے متعلق ایک حدیث کے ضمن میں حضرت ابو ہریرۃؓ کا ارشاد ہے:

''بیوی کہے گی: یا تو آپ مجھ کھلائیں یا پھر مجھے طلاق دے دیں'' (بخاری ، احمد ، دارقطنی)

حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا '' جو شخص اپنی بیوی کا نفقہ دینے پر قادر نہ ہو، تو دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے'' (دارقطنی ، بیہقی) امام سعید بن المسیب سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے بھی تفریق کا فتوی دیا اور فرمایا کہ یہ سنت ہے (الشافعی) (سنت کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ سے ثابت ہے) جو حضرات اپنی بیویوں سے دور تھے، ان کے متعلق حضرت عمرؓ نے (مختلف علاقوں میں متعین) لشکر کے امراء کو یہ خط روانہ فرمایا کہ یا تو وہ لوگ بیویوں کو نفقہ دیں، ورنہ پھر انھیں طلاق دے دیں، اور جتنی مدت انہیں روک رکھا ہے، اس کا نفقہ روانہ کردیں'' (الشافعی ، عبدالرزاق ، ابن المنذر ، بیہقی وصححہ ابن الملقن والالبانی)
(ارواء الغلیل ۷/۲۲۸ ، تلخیص الحبیر ۴/۸ ، فتح الباری ۹/۵۰۰ ، خلاصہ ، البدر المنیر ۲/۲۵۴)

قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں بیوی کے ضرر کو دور کرنے کے لئے شوہر کی تنگدستی، (اعسار) کی صورت میں اسے فسخ نکاح کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگر وہ شوہر کے اعسار پر راضی ہو، گو ہمیشہ کے لئے، یا تنگدستی کا علم ہوتے ہوئے اس سے نکاح کرے تب بھی آئندہ نفقہ کی وجہ سے وہ نکاح فسخ کرسکتی ہے۔

بیوی مکلفہ (یعنی عاقلہ وبالغہ) ہو تو وہ اپنا نکاح فسخ کرسکتی ہے، جب کہ شوہر کے پاس اتنا حلال مال نہ ہو، یا حلال کمائی کا ذریعہ نہ ہو، جس سے بیوی کے اقل نفقہ، لباس یا مسکن کا بار اٹھا سکے، کیونکہ ان کے بغیر نفس کا بقا ممکن نہیں۔

اقل نفقہ یعنی ایک مد اناج، اور اقل لباس یعنی قمیص، دوپٹہ اور سرما کا جبہ (سوئٹر وغیرہ)۔ اگر چپل، بستر، تکیہ، سالن اور خادم کے مصارف سے عاجز ہو تو فسخ کا حق نہ ہوگا۔ نیز سابقہ ایام کے مصارف کی وجہ سے بھی حقِ فسخ نہ ہوگا، البتہ یہ تمام مصارف شوہر پر قرض ہوں گے، خواہ وہ معتبر ہو۔

اگر صبح نصف مد اور شام نصف مد دے سکے تو فسخ کا حق نہ ہوگا، اگر ایک دن ایک مد اور دوسرے دن نصف مد دے۔ یا ہر دن نصف مد سے زائد دے تو فسخ کا حق ہوگا۔

امام شافعی کا فرمان ہے کہ شوہر کے اعسار کی وجہ سے فسخ کا فیصلہ حضرات عمرؓ، علیؓ اور ابو ہریرۃؓ سے منقول ہے، ان حضرات کے اس فیصلہ کے انتشار کے باوجود کسی صحابی سے اس کے مخالف مروی نہیں، تو گویا کہ اجماع سکوتی حاصل ہو چکا۔

اگر شوہر واجب اور نقد مہر کے دینے پر قادر نہ ہو تو، اس کی وجہ سے بھی بیوی نکاح فسخ کرسکتی ہے۔ جبکہ بیوی کی رضامندی سے اب تک صحبت نہ ہوئی ہو۔ مہر پر عدم قدرت کی وجہ سے فسخ کرنا ہو، تو فوراً قاضی کے روبرو پیش کرنا ضروری ہے، اگر بلا عذر مؤخر کرے تو یہ حق ختم ہوجائے گا۔ اگر کچھ عذر ہو، مثلاً مسئلہ معلوم نہ تھا یا فوراً فسخ کرنے کی شرط کا علم نہ تھا اسلئے مؤخر ہوا۔ تو حق ساقط نہ ہوگا۔ اگر بیوی کی رضامندی سے صحبت ہو جاتی، تو اب فسخ کا حق نہیں، لیکن رضامندی کے بغیر جبراً صحبت کرے، تو حق باقی رہے گا، اسی طرح اگر بیوی کمسن یا پاگل ہو، اور ولی بغیر مصلحت کے اسے شوہر کے سپرد کرے، پھر بالغ ہونے یا افاقہ کے بعد اپنے آپ کو شوہر سے روکے، تو اب یہ مہر سے عاجز ہونے کی وجہ سے نکاح فسخ کرسکتی ہے، گو اس سے قبل صحبت ہو چکی ہو۔

اگر بیوی مہر کا بعض حصہ لے چکی ہو، تو بعض علماء کے نزدیک اسے فسخ کا حق نہ ہوگا، لیکن بارزیؒ جوجریؒ، اذرعیؒ اور خطیبؒ وغیرہ کے نزدیک فسخ کا حق باقی رہے گا۔ مفوضہ کا مہر جب تک مقررہ نہ ہو، وہ مہر سے عاجز ہونے کی وجہ سے فسخ نہیں کرسکتی۔ اگر شوہر کے مہر پر قادر نہ ہونے کا علم ہوتے ہوئے بیوی اس سے نکاح کرے، یا اس پر راضی ہو جائے تو آئندہ اس کی وجہ سے فسخ کا حق نہ ہوگا۔

اگر شوہر کا مال مسافتِ قصر کی دوری پر ہو تو اسے نفقہ سے عاجز سمجھا جائے گا۔ اور اس مال کے آنے تک بیوی پر صبر لازم نہیں، بلکہ وہ فسخ کر سکتی ہے۔ اگر شوہر مہلت کی مدت (یعنی تین دن) میں مال لے آنے کا وعدہ کرے، تو اسے رخصت دی جائے گی۔ پھر اس مدت میں نہ لائے تو مزید تین دن کی مہلت دے کر، اس دوران مال نہ آئے تو نکاح فسخ کر یگی۔ اسی طرح کسی پر شوہر کا قرض ہو، یا شوہر کے پاس جائداد زمین یا دیگر اسباب ہوں، یا اس کا مال غصب شدہ ہو، اور ان تمام صورتوں میں تین دن میں نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، تو نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ ولی کو فسخِ نکاح کا اختیار نہیں، بیوی کا مال ہو تو اس میں سے اس پر صرف کرے، ورنہ نکاح سے قبل جس پر نفقہ تھا، اب بھی اس پر اس کا نفقہ ہوگا۔

اگر شوہر کو کوئی کام نہ ملے (اور یہ نادر نہ ہو) یا بیماری وغیرہ کا عارضہ پیش آئے جس کی وجہ سے کام کر کے کما نہیں سکتا، اور تین دن سے قبل اس عارضہ کے ازالہ کی امید نہ ہو، یا حرام مال پیش کرے تو یہ بھی معسر وعاجز شمار ہوگا۔

اگر شوہر اقل نفقہ وغیرہ یا اس سے زائد پر قادر ہو، لیکن ادا نہ کرے، خواہ موجود ہو، یا کہیں گیا ہوا ہو، اس کی کچھ خبر ہو یا بالکل کوئی خبر نہ ہو، نکاح کے فسخ کا حق نہ ہوگا کیونکہ اعسار منتفی ہے، جس کی بنیاد پر فسخ کا حق ملتا ہے، اور بیوی حاکم کے ذریعہ اپنا حق وصول کر سکتی ہے۔ اگر شوہر کی کچھ خبر نہ ہو، اور اس کا کچھ مال بستی میں یا مسافتِ قصر کے اندر موجود نہ ہو تو بیوی کو فسخ کا حق ہوگا۔ (بعض علماء نے فرمایا ہے کہ فسخ کا حق نہ ہوگا)

جو شوہر غائب ہو، اور اس کے تنگدستی یا مالداری کا کچھ علم نہ ہو، تو فسخ کا حق نہ ہوگا۔

تنبیہ: کئی متاخرین محققین نے اس کو ترجیح دی ہے کہ شوہر غائب ہو، اور اس سے نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، تو فسخ جائز ہے۔ اور ابن الصّلاح نے اسی کو قوی قرار دیا ہے، وہ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ "شوہر کا مال حاضر نہ ہو، اور وہ جہاں پر ہے، حاکم کے خط کے ذریعہ وہاں سے بھی نفقہ کی تحصیل دشوار ہو تو حاکم کے ذریعہ فسخ کر سکتی ہے، خواہ اس کی تنگدستی یا مالداری کا علم ہو یا نہ ہو، اور (**اس صورت میں**) فسخ کا فتویٰ ہی صحیح ہے"۔

صاحب قلائدعلامہ باقشیر حضرمی فرماتے ہیں: ابن الصباغ نے فرمایا: فتوی اس پر ہے کہ مال نہ ہونے کی وجہ سے نفقہ دشوار ہو، یا حاکم وغیرہ کے ذریعہ نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، خواہ شوہر مالدار ہو یا تنگدست، اس کی مالداری کا علم ہو یا نہ ہو، تو فسخ کا حق ثابت ہوگا۔ اور یہی امام غزالی کے نزدیک زیادہ صحیح ہے، اور یمن کے کئی علماء نے اسی کے موافق فتویٰ دیا ہے، اور احمد بن عُجَیل سے یہی منقول ہے، صاحب عُباب نے اسے مختار قرار دیا ہے (قلائد ۲/۲۹۴)

سید علوی السقاف فرماتے ہیں "کئی حضرات نے اسے اختیار کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق ابن عُجَیل، ابن کبن، ابن الصباغ اور رویانی نے فتویٰ دیا ہے کہ تین دن میں شوہر سے نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، تو بیوی نکاح فسخ کر سکتی ہے، شوہر موجود ہو یا غائب، اور ابن الصلاح نے اسی کو قوی قرار دیا ہے۔ اور ابن زیاد، طنبداوی، مزجد، صاحب مہذب اور صاحب کافی وغیرہ حضرات نے اسے ترجیح دی ہے، جب کہ شوہر غائب ہو، اور اس سے نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، ابن قاسم فرماتے ہیں کہ صرف شوہر کا مال غائب ہونے کی صورت میں فسخ جائز ہے، تو اس صورت میں بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہئے۔ شوہر کی طویل غیر حاضری اور صحبت کی خواہش کے ضرر کی وجہ سے فسخ نکاح بالاتفاق جائز نہیں ہے، گو اسے زنا کا خطرہ ہو" (ترشیح المستفیدین : ۳۵۸) سید علوی فرماتے ہیں کہ بیوی کے ضرر کی وجہ سے مجبوراً درج بالا مسئلہ کے مطابق فتوی دینا اور اس پر عمل کرنا جائز ہے (بغیہ المسترشدین : ۲۴۳)

فسخ کے شرائط: مہر یا نفقہ وغیرہ سے اعسار کی وجہ سے فسخ کے لئے قاضی یا محکّم کے پاس اعسار کا ثبوت شرط ہے۔اس سے قبل فسخ نہ ہوگا۔شوہر کے اقرار یا گواہوں کے ذریعہ ثبوت حاصل ہوگا۔فی الحال تنگدستی کے متعلق گواہی ضروری ہے، اگر گواہ یہ کہیں کہ شوہر غائب ہوتے وقت تنگدست تھا تو یہ کافی نہیں، البتہ اُس وقت کی تنگدستی کے پیش نظر اسی حالت کو برقرار سمجھتے ہوئے فی الحال تنگدستی کی گواہی دے سکتے ہیں، لیکن وہ اپنے دلیل کی صراحت کریں تو گواہی باطل ہوگی۔قاضی کے پاس معاملہ پیش کرنے سے قبل فسخ نافذ نہ ہوگا۔ بستی میں قاضی کی موجودگی میں کسی مجتہد کو محکم بنائے یا قاضی کی غیر موجودگی کی صورت میں کسی مقلد کو بھی محکم بنائے تو یہ کافی ہے (شرائط کے اور جب فسخ ہوگا اس وقت سے سے عدت شمار ہوگی) اگر کسی جگہ قاضی یا محکّم نہ ہوں، یا قاضی کے سامنے پیش کرنے سے عاجز ہو، مثلاً بغیر مال کے قاضی فسخ نہ کرے، یا گواہ نہ ہوں، تو مجبوراً بیوی خود ہی اپنا نکاح فسخ کرسکتی ہے، جیسا کہ امام الحرمین وغزالی وغیرہ نے فرمایا، جب کہ اسے شوہر کے اعسار کا علم ہو اور یہ کہ وہ نفقہ کی مستحق ہے، اور یہ فسخ ظاہراً و باطناً نافذ ہوگا، ابن زیاد کے فتاوی میں ہے کہ اگر عورت تنگدستی کے بینہ (گواہ) سے عاجز ہو تو خود ہی فسخ کرسکتی ہے، شیخ عطیہ مکی اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں کہ "اگر قاضی متعذر ہو، یا گواہوں کے مفقود یا غائب ہونے کی وجہ سے اس کے روبرو ثابت کرنا دشوار ہو تو بیوی خود فسخ پر گواہ رکھ کر نکاح فسخ کرسکتی ہے۔کوئی بیوی کو شوہر کے اعسار کی خبر دے، اور یہ دل میں اسے سچ سمجھے تو اس بنیاد پر بھی فسخ کرسکتی ہے۔

شوہر جس (مناسب) مکان میں رکھ کر جائے، بیوی کا وہیں رہنا، اور کسی نشوز کا ارتکاب نہ کرنا اور ان دونوں باتوں پر اور اس پر کہ اس کا کوئی حاضر مال موجود نہیں اور نہ نفقہ چھوڑ گیا ہے، بیوی کو قسم دلانا اور نفقہ سے عاجز ہونا یا اس کی تحصیل کا دشوار ہونا ثابت کرنا شرط ہے۔

مذکورہ تمام شرائط اور ثبوت کے بعد قاضی یا محکم پر واجب ہے کہ شوہر کو تین روز کی مہلت دے، گو وہ مہلت نہ مانگے اور اس دوران نفقہ کے حصول کی کوئی امید نہ ہو (مہر سے عاجز ہو تو مہلت نہ دے، فوراً فسخ کردے، اسی طرح غائب کے نکاح کے فسخ میں بھی مہلت کی ضرورت نہیں، بلکہ ثبوت کے بعد فوراً فسخ ہوگا) مہلت کے تین دن گذر جائیں (اور شوہر نفقہ وغیرہ نہ دے سکے) تو چوتھے دن قاضی یا محکم خود نکاح فسخ کردے، یا اس کی اجازت سے بیوی فسخ کردے، یعنی اس طرح کہے: "میں نے نکاح فسخ کردیا"۔

اگر شوہر چوتھے دن کا نفقہ سپرد کرے، تو گذشتہ ایاّم کے نفقہ کی وجہ سے فسخ نہیں کرسکتی، کیونکہ وہ شوہر پر قرض ہوچکا، چوتھے دن کا نفقہ دینے کے بعد پانچویں دن دینے پر قادر نہ ہو، تو سابقہ مدت پر بناء کرتے ہوئے آج فسخ کرسکتی ہے، شوہر کو از سرِ نو تین دن کی مہلت نہ ملے گی، اگر درمیان میں تین روز تک نفقہ دیتا رہا، پھر عاجز ہوا، تو از سرِ نو مہلت دی جائے گی۔

کوئی شخص اپنی جانب سے مفت میں نفقہ دینے کی ذمہ داری لے، تو بیوی کو قبول کرنا لازم نہیں، بلکہ وہ فسخ کرسکتی ہے، کیونکہ اس میں کسی کا احسان لینا ہے۔اگر وہ شخص شوہر کو دے اور شوہر بیوی کو دے تو لینا لازم ہے، اگر باپ یا دادا نفقہ دیں، اور شوہر ان کی ماتحتی میں ہو، (کمسن وغیرہ ہو) تو قبول کرنا لازم ہے۔

بیوی کا کمانا: شوہر تنگدست ہو اور بیوی اس پر راضی ہو (فسخ نہ کرے) تو ان ایاّم میں، یا فسخ کے مطالبہ کے بعد قاضی تین دن کی مہلت دے، تو اس مدت میں اپنے گذر بسر کے انتظام اور کمانے کے لئے بیوی گھر سے باہر جاسکتی ہے، شوہر اسے روک نہیں سکتا، گو بیوی کے پاس اپنا ذاتی مال ہو، یا گھر بیٹھے ہی کمانے پر قادر ہو، کیونکہ شوہر کو اسے گھر میں روکنے کا حق اس پر خرچ کرنے کے مقابلہ میں حاصل ہوتا ہے، جب خود خرچ نہیں کرسکتا، تو روک بھی نہیں سکتا، رات میں بیوی کو گھر لوٹنا لازم ہے، کیونکہ یہ آرام کا وقت ہے، نہ کہ کام کاج کا، (اگر نفقہ کی تحصیل رات میں ہی ممکن ہو، تو بظاہر رات میں جانے کی اجازت ہوگی) دن میں نفقہ کی تحصیل کے وقت وہ شوہر کو تمتع سے روک

سکتی ہے، رات میں نہیں روک سکتی، اگر رات میں روکے تو اس کا نفقہ ساقط ہوگا۔

فسخِ نکاح کے شرائط کا خلاصہ : شوہر موجود ہو یا غائب، مندرجہ ذیل ۹ شرائط ہوں تو بیوی نکاح فسخ کر سکتی ہے : شوہر اقل نفقہ، لباس اور مسکن کی فراہمی سے عاجز ہو، (نہ کہ سالن سے) مثلاً کچھ کمائی ہی نہ ہو، یا کمائی مذکورہ ضروریات کے لئے ناکافی ہو، یا کوئی کام نہ ملے، یا ایسی بیماری ہو کہ تین روز تک کما نہیں سکتا، یا کام اس کے شایانِ شان نہ ہو، اس لئے وہ انکار کرے، یا حرام کمائی ہو، یا شوہر موجود ہو اور مال دو مرحلہ (مسافتِ قصر) کی دوری پر ہو، یا زمین واسباب کی شکل میں ہو (کہ فوراً بک کر رقم نہ مل سکے) یا مؤخر قرض ہو، یا مقروض تنگدست ہو، یا مال غصب ہو چکا ہو، اور ان تمام صورتوں میں تین دن میں نفقہ کی تحصیل دشوار ہو اور یہ بات حاکم کے پاس ثابت ہو، یعنی دو گواہوں کے ذریعہ، یا حاکم کے علم کی وجہ سے، یا یمین مردودہ کی وجہ سے جب کہ وہ لوٹائی جائے، اور بینہ کے ساتھ بیوی قسم لے کہ وہ نفقہ کی مستحق ہے اور شوہر نے کوئی مال نہیں چھوڑا، اور بیوی گھر میں رہے اور نشوز نہ اختیار کرے، اور معاملہ حاکم کے سامنے رکھے، اور وہ تین دن کی مہلت دے، شاید کہ وہ نفقہ لے آئے یا غائب کا کچھ مال وغیرہ ظاہر ہو، اور گذشتہ تمام امور کے پائے جانے کے بعد صحیح لفظ کے ساتھ فسخ صادر ہو، مثلاً : میں نے فلاں کا نکاح فسخ کیا، عورت کے مطالبہ پر حاکم فسخ کر دے، یا حاکم کی اجازت سے عورت فسخ کر دے، اور عورت مکلف ہو، غیر مکلف کے ولی کو فسخ کا حق نہیں) (من بغية المسترشدين : ۲۴۲)

(۳) اصول پر فروع کا نفقہ

(اصول یعنی باپ دادا اوپر تک اور فروع یعنی اولاد اور ان کی اولاد نیچے تک)

والد پر گو اوپر کے درجہ کا ہو، اپنی اولاد کا نفقہ واجب ہے، گو نیچے کے درجہ کا ہو (یعنی پوتا وغیرہ ہو) پس والد نہ ہو، تو دادا (اوپر تک) نفقہ کا ذمہ دار ہے، اولاد مذکر ہو یا مؤنث۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ'' (الطلاق : ۶)

ترجمہ : ''پھر اگر وہ عورتیں تمہارے لئے (بچہ کی اجرت پر) دودھ پلائیں تو تم ان کو اجرت دو''۔ جب بچہ کو دودھ پلانے کی وجہ سے والد پر مرضعہ کی اجرت واجب ہوئی، تو معلوم ہوا کہ بچہ کے نان نفقہ کا والد ذمہ دار ہے۔ نیز فرمانِ باری ہے: ''وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ'' (البقرہ : ۲۳۳) ،ترجمہ: اور جس کا (شرعاً نسب کے اعتبار سے) بچہ ہے (یعنی باپ) اس کے ذمہ دار ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق''۔ آیت کے لفظ ''لَہٗ'' میں لام اختصاص کے ذریعہ بچہ کی والد کی طرف نسبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے نفقہ و دیگر مصارف کا وہ ذمہ دار قرار پائے۔ اسی طرح بچہ کی مُرضِعہ (والدہ) کے نفقہ ولباس کا وجوب بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بچہ کے یہ مصارف بدرجہ اولیٰ واجب ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ھندہ نے اپنے شوہر ابوسفیان کی شکایت کی کہ وہ میرے اور اولاد کا مکمل خرچ نہیں دیتے، تو آپ ﷺ نے انھیں ان کے مال سے اتنا لینے کی اجازت دی، جو معروف و قاعدہ کے مطابق ھندہ اور اولاد کو کافی ہو جائے (متفق علیہ)

پوتے وغیرہ بھی اولاد کے حکم میں ہیں۔

اصول پر فروع کے نفقہ کے وجوب کے شرائط : (۱) اصل کے پاس اپنے اور بیوی کے یک روزہ مصارف سے زائد رقم موجود ہو، اگر اس سے زائد مال نہ ہو تو وہ اپنے فرع پر خرچ کرنے کا مکلف نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی ذات سے ابتدا

کرنے کا حکم دیا ہے(مسلم)

(۲) فرع خود فقیر (غریب) ہو، نیز فقیر ہونے کے ساتھ کمسن، یا اپاہج یا مریض یا پاگل بھی ہو۔ اگر اولاد بالغ وتندرست اور کمانے پر قادر ہو تو اس کا نفقہ باپ پر واجب نہیں، گو وہ (سُستی وغیرہ کی وجہ سے) نہ کمائے۔

اگر فرع کسی فرض عین علم کی تحصیل میں مشغول ہونے کی وجہ سے کمانہ پائے تو اس کا نفقہ والد پر واجب ہے۔ اگر عام معاشرہ کی ضروریات کا کفایہ علم ہو جیسے ڈاکٹری، انجینیئرنگ وغیرہ، تو اس کی تحصیل میں مشغولی کے باوجود وہ کمانے پر قادر شمار ہوگا، لہٰذا اصل (والد وغیرہ) کو اختیار ہے کہ اسے اس مشغولی کی اجازت دے اور اس کے مصارف برداشت کرے، یا اس کے مصارف سے دست بردار ہو جائے، اور وہ خود محنت کر کے گذر بسر کرے۔

مقدار: اس نفقہ کی کوئی مقدار متعین نہیں، اپنی حیثیت اور عرف کے مطابق بقدر کفایت (جو کافی ہو اور دوسرے سے بے نیاز کرے) دینا ضروری ہے۔ سورہ طلاق کی آیت ۷ میں فرمایا "وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہئے۔ اور جس کی آمدنی کم ہو، اس کو چاہئے کہ اللہ نے اس کو جتنا دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے"

وقت گذر جائے اور اصول فروع کے مصارف ادا نہ کریں، تو یہ ان کے ذمہ بطور قرض باقی نہ رہے گا، کیونکہ یہ بطور مُواساۃ واحسان کے ہے، کسی معین حق کی تملیک نہیں ہے، (جیسا کہ بیوی کے نفقہ میں ہوتا ہے) جس پر نفقہ واجب ہے، وہ کسی دوسرے کو خرچ کرنے کی اجازت دے اور وہ خرچ کرے، تو اجازت دینے والے پر قرض ہوگا، اگر وہ خرچ نہ کرے تو قرض نہ ہوگا۔

اگر مسئلہ قاضی کے روبرو پیش ہو، اور فرع کا احتیاج اور اصل کی مالداری (یعنی جس مالداری پر فرع کا نفقہ واجب ہو) ثابت ہو جائے، پھر اصل کی غیر موجودگی یا مصارف نہ دینے کی وجہ سے قاضی خود اس کی اجازت سے دوسرا شخص فرع کو قرض لے کر دے، تو یہ مقدار اصل پر قرض ہوگا۔

مقدار کے عنوان کے تحت درج تینوں مسائل میں فرع کے ذمہ اصل کے نفقہ کی تفصیلات کا بھی یہی حکم ہوگا۔

دودھ پلانا: والدہ پر واجب ہے کہ پیدائش کے بعد بچہ کو پیوسی کا دودھ پلائے (یعنی پیدائش کے بعد ابتدائی دودھ، جس کی مدت معمولی ہے جو عرف سے متعین ہوگی) اس کے بعد بچہ کو دودھ پلانے کے لئے صرف والدہ ہی موجود ہو، یا صرف کوئی دوسری ایک عورت موجود ہو، تو جو بھی موجود ہے، اس پر دودھ پلانا واجب ہے، اور وہ اس کی اجرت لے سکتی ہے۔ گو باپ کے نکاح میں ہو، اگر بچہ کا مال (میراث میں یا ہبہ وغیرہ کے ذریعہ ملا ہوا) تو اسی میں سے اجرت دی جائے، ورنہ باپ پر واجب ہے (جیسا کہ نفقہ کا حکم ہے)

اگر دوسری عورت بھی دودھ پلانے کے لئے میسر ہو، تو والدہ پر جبر کرنا جائز نہیں، گو وہ بچہ کے باپ کے نکاح میں ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرىٰ" (الطلاق ٦)

ترجمہ: "اور اگر تم باہم کشمکش کرو گے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی"۔

اگر بچہ کی والدہ خود دودھ پلانا چاہے، تو والد اسے اس سے نہیں روک سکتا، گو مناسب اجرت طلب کرے، یا والد کے نکاح میں ہو، کیونکہ وہ بچہ کے حق میں زیادہ شفیق ہوگی اور اس کا دودھ (عموماً) زیادہ بہتر وموافق ہوگا، اگر والدہ کسی دوسرے کے نکاح میں ہو تو والد اسے رضاعت سے روک سکتا ہے۔

اگر والدہ اجرتِ مثل سے زائد طلب کرے، یا کوئی دوسری عورت مفت یا اجرت مثل سے کم پر دودھ پلانے پر راضی ہو اور والدہ اس

بات کے لئے راضی ہوتو والد والدہ کو رضاعت سے منع کر کے دوسری عورت کے سپرد کر سکتا ہے، جب کہ اس کا دودھ اسے راس آئے، ورنہ والدہ مقدم ہوگی،

آیت: ''وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ'' (البقرہ: ۲۳۳)

ترجمہ: اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو کسی اور انّا کا دودھ پلوانا چاہو، تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں''

اگر والدہ اجرت کے مطالبہ کے بغیر دودھ پلاتی رہے، تو اسے اجرت نہ ملے گی، اگر وہ مطالبہ کرے اور والد چپ رہے، اور وہ دودھ پلاتی رہی، تو مطالبہ کے بعد کی رضاعت کے اجرتِ مثل کی مستحق ہوگی۔

اصول کی ترتیب: فروع کے نفقہ کے سلسلہ میں والد سب پر مقدم ہے، پھر دادا، پھر اس کے والد او پر تک، پھر والدہ، پھر نانا اور دادی و نانی لوگ، یہ ایک سے زائد ہوں تو جو قریب تر ہو، اگر ایک ہی درجہ میں ایک سے زائد ہوں اور ان میں ایک وارث ہو، تو وارث مثلاً دادا اور نانا ہو، تو دادا نفقہ کا ذمہ دار ہے (کیونکہ وہ وارث بنتا ہے)

بچہ کا مسئلہ: والدہ بچہ کا مال اس پر صرف کر سکتی ہے، گو قاضی اجازت نہ دے، والد آ جائے تو اس کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے، اگر بچہ کا مال کہیں اور ہو، یا فی الحال اس میں سے صرف کرنا مشکل ہو، اور والدہ اس کے مال میں سے واپس لینے کی نیت سے اپنا مال صرف کرتی رہی، تو واپس لے سکتی ہے، جب کہ اس خرچ اور واپس لینے کے ارادہ پر گواہ رکھے، اگر گواہ نہ رکھے تو واپس نہ لے، اگر گواہ موجود نہ ہوں، تو باطنی طور پر اس میں سے واپس لے سکتی ہے۔

اگر بچہ والد کے زیرِ خرچ ہو، اور وہ کہیں گیا ہوا ہو، یا خرچ نہ دے، تو والدہ گواہ رکھ کر والد سے مصارف واپس لینے کی نیت سے خرچ کر سکتی ہے۔ پس اس کا بدل والد پر لازم ہوگا، اگر والد کا مال موجود ہو تو اس میں سے صرف کر سکتی ہے، گو قاضی سے اجازت نہ لے۔

فروع پر اصول کا نفقہ

اصول یعنی باپ، دادا، نانا، نانی وغیرہ کا نفقہ فروع پر واجب ہے۔

آیت: (۱) ''وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفاً'' (لقمان ۱۵)

ترجمہ: ''اور دنیا میں ان کے (یعنی والدین کے) ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا''۔

(۲) ''وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً'' (الاسراء ۲۳)

ترجمہ: ''اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو، اور تم ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو''۔

مطلوبہ معروف اور احسان (خوبی کے ساتھ بسر کرنا اور حسن سلوک کرنا) بوقتِ ضرورت واحتیاج ان کے مصارف برداشت کئے بغیر ممکن نہیں۔

احادیث: (۱) ''بلاشبہ پاکیزہ ترین مال جو آدمی کھائے، وہ اس کی اپنی کمائی سے کھانا ہے، کسی کی اولاد بھی اس کی کمائی میں داخل ہے'' (ابوداود، ترمذی)

(۲) ''دینے والے کا ہاتھ اونچا ہے، اور جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہے، اس سے ابتداء کرو تمہارے ماں اور باپ، اور بہن اور بھائی، پھر جو تم سے قریب ہو، جو تم سے قریب ہو'' (نسائی)

نیز جب بصورتِ احتیاج فروع کا نفقہ اصول پر واجب ہے، تو قیاس کا تقاضہ یہی ہے کہ اصول کے احتیاج کی صورت میں بعضیت کی وجہ سے اس کا نفقہ فروع پر واجب ہو۔

شرائط : (۱) فرع کے پاس اپنے اور بیوی کے یک روزہ مصارف سے زائد مال ہو، اگر اس سے زائد نہ ہو، تو وہ والدین وغیرہ کے مصارف کا مکلّف نہیں، کیونکہ ایک فقیر پر دوسرے فقیر کا نفقہ واجب نہیں، اگر کچھ مقدار دے سکتا ہو، تو اتنا ہی دے دے، صرف ایک کا خرچ ہو، تو ماں کو باپ پر مقدم رکھے۔

(۲) اصل فقیر (غریب) ہو، یعنی اپنی ضروریات کے بقدر کما تا نہ ہو، خواہ کما سکتا ہو، یا نہ کما سکتا ہو، بخلاف اس کے فرع کما سکتا ہو اور نہ کمائے تو اس کا نفقہ اصل پر واجب نہ تھا، یہ فرق دراصل اس وجہ سے ہے کہ اصل کا فرع کو کمانے پر مجبور کرنے میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اس کے برعکس ایک فرع کا اپنے اصل کو کمانے پر مجبور کرنا قبیح اور بری بات ہے، بالخصوص جب کہ وہ عمر دراز بھی ہو۔

(۳) ماں کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا، جب کہ باپ اس پر خرچ کرنے سے عاجز ہو، یا باپ انتقال کر چکا ہو اور ماں کا کوئی شوہر نہ ہو، اگر والدہ کے لئے کوئی مناسب رشتہ ہو، اور وہ قبول نہ کرے، تب بھی اولاد پر اس کا نفقہ واجب ہے۔

اگر باپ ماں کے مصارف پر قادر ہو، یا ماں کا کسی دوسرے شوہر سے نکاح ہو چکا ہو، تو اولاد نفقہ کی ذمہ دار نہیں، اگر دوسرا شوہر غریبی کی وجہ سے خرچ برداشت نہ کر سکے، تب بھی ماں کا نفقہ واجب نہیں، جب تک کہ وہ اعسار (تنگدست) کی بنیاد پر یہ نکاح فسخ نہ کر دے۔

دین : اصول وفروع پر ایک دوسرے کے نفقہ کے شرائط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دونوں کا دین ایک ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا ایک مسلمان بیٹا اپنے غیر مسلم والدین کا، اور ایک مسلمان باپ اپنی غیر مسلم اولاد کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ البتہ مرتد مستثنیٰ ہے، اس کا نفقہ واجب نہیں، خواہ اصل ہو یا فرع۔

سورہ لقمان کی مذکورہ بالا آیت کے سیاق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ والدین غیر مسلم ہوں، تب بھی ان کے ساتھ دنیا میں حسنِ سلوک سے پیش آنا ہے۔ نیز صحیحین وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت اسماءؓ کو ان کی مشرک والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا۔

اصول وفروع کے مصارف کی ترتیب

اگر والدین فقیر ہوں، اور ایک ہی درجہ میں ان کے کئی فروع ہوں، خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، وارث ہوں یا غیر وارث (مثلاً ایک سے زائد بیٹے یا بیٹیاں یا نواسے) تو تمام برابر برابر ان کے مصارف برداشت کریں گے، گو بعض زیادہ مالدار ہوں، یا ایک کے پاس مال موجود ہو، اور دوسرا کماتا ہو، اگر ایک غائب ہو، تو اس کا حصہ اس کے مال میں سے لیا جائے، مال نہ ہو تو اس کے نام سے قرض لے، یہ ممکن نہ ہو تو حاکم مثلاً حاضر کو خرچ کرنے کا حکم دے، پھر غائب کے پاس سے وہ رقم اسے واپس کردی جائے۔

اگر ایک فرع قریبی اور دوسرا بعید ہو، تو قریبی فرع پر نفقہ واجب ہوگا، گو یہ مؤنث اور غیر وارث ہو، اور بعید مذکر اور وارث ہو، اگر ایک ہی درجہ میں بعض وارث اور بعض غیر وارث ہوں، تو وراث پر نفقہ واجب ہوگا اگر دونوں کی وراثت کے تناسب میں فرق ہو، جیسے بیٹا اور بیٹی (کیونکہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے گا) تو بعض علماء کے نزدیک اس صورت میں بھی دونوں برابر ذمہ دار ہوں گے (گویا اس مثال میں نصف، نصف نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے)، اور بعض کے نزدیک وراثت کے اعتبار سے ذمہ دار ہوں گے (پس اس مثال میں بیٹے پر نفقہ کا دو تہائی اور بیٹی پر ایک تہائی لازم ہوگا)

اگر کسی کے اصول وفروع میں کئی افراد محتاج ہوں، اور یہ تمام کا بار نہیں اٹھا سکتا، تو درج ذیل ترتیب کوملحوظ رکھے۔

سب سے پہلے اپنی ذات، پھر بیوی کا نفقہ، پھر کمسن بچہ اور پاگل بالغ اولاد، پھر ماں، پھر باپ (امام بُلقینی فرماتے ہیں کہ اگر اپاہج یا پاگل ہو تو کمسن اولاد کے درجہ میں شمار ہوگا) پھر مکلف اولاد، پھر دادا، نانا پھر اس کا باپ آگے تک، اگر آگے والا اپاہج ہو، تو وہ مقدم ہوگا، اگر ایک درجہ میں دو ہوں تو دونوں برابر مستحق ہوں گے، اور وارث غیر وارث پر مقدم ہوگا، مثلاً نواسہ اور پوتی ہو تو پوتی مقدم ہوگی، یا نانا اور دادا ہو تو دادا مقدم ہوگا، اسی طرح مثلاً دودھ پینے والا یا مریض دوسروں پر مقدم ہوگا، دو جہت والے اصل یا فرع کو اسی درجہ کے ایک جہت والے پر مقدم رکھیں گے، درجہ الگ ہو تو قریب تر مقدم ہوگا، ایک درجہ میں کئی مستحقین ہوں اور موجود نفقہ سب کے گذر بسر کے لئے کسی حد تک کام دے، تو سب پر تقسیم ہوگا، ورنہ قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا۔

کسی محتاج کے اصل وفرع دونوں ہوں، تو فرع نفقہ کا ذمہ دار ہے، گو نیچے کے درجہ کا ہو، کیونکہ اصل کے عظمت واحترام کے اعتبار سے فرع اس بات کا زیادہ ذمہ دار ہے کہ اس کا خیال رکھے۔

جائداد کی فروخت :اصول وفروع کا نفقہ قرض کی ادائیگی پر مقدم ہے، لہٰذا قرض کی ادائیگی کے لئے جو چیزیں (جائداد وغیرہ) فروخت کی جاتی ہیں، اُن کے واجب نفقہ کی ادائیگی کے لئے بھی فروخت کی جائیں گی۔

کمانا :جو مناسب طریقہ سے کمانے پر قادر ہو، اس پر اپنے اصول یا فروع کے مصارف کے لئے کمانا لازم ہے، کیونکہ حدیث کی رو سے ان کو ضائع کرنا باعث گناہ ہے، نیز کمانے کی قدرت مال پر قدرت کی طرح ہے، اسی لئے اسے زکات لینا حرام ہے، نفقہ کیلئے یہ لوگوں سے مانگنے، یا ہبہ اور وصیت قبول کرنے کا مکلف نہیں ہے، لیکن اس طرح مال حاصل کرلے، تو اب حیثیت ہونے کی وجہ سے اس پر نفقہ واجب ہوگا۔

براہِ راست نفقہ لینا : جس رشتہ دار پر کسی کا نفقہ لازم ہے، وہ دینے سے انکار کرے یا غائب ہو، (کہیں گیا ہو) اور یہاں اس کا مال ہو، تو یہ اپنے نفقہ کے بقدر اس میں سے لے سکتا ہے، جو جنس واجب ہے، وہ موجود ہے، تو اس میں سے لے، ورنہ پھر دوسرے قسم کے مال سے یہ حق وصولی کرے، مال نہ ہو تو قاضی اس رشتہ دار کی طرف سے قرض لے کر دے (بعض علماء کے نزدیک قاضی اس کی طرف سے قرض لینے کی اجازت دے، اور یہ لے لے تب بھی اس کو آئندہ وہ قرض ادا کرنا لازم ہے) اگر قاضی کی اجازت نہ ہو، تو اس کے نام سے قرض نہیں لے سکتے، اگر قاضی نہ ہو، اور یہ خود اس غائب کے نام سے قرض لے اور اس پر گواہ رکھے تو یہ قرض اس غائب سے وصول کیا جائے گا، اگر گواہ نہ رکھے تو اس سے وصول نہیں کرسکتا، البتہ گواہ میسّر ہی نہ ہوں، تو وصول کرسکتا ہے، فرع اگر کمسن یا پاگل ہو تو باپ دادا، ولایت کی وجہ سے براہِ راست ان کے مال سے اپنا نفقہ لے سکتے ہیں۔ نیز اپنے نفقہ کے لئے فرع کو اجرت پر کام پر بھی لگا سکتے ہیں، جب کہ کام اس کے بس میں ہو، ماں کمسن یا پاگل فرع کے مال سے اپنا نفقہ حاکم کے بغیر نہیں لے سکتی، اسی طرح اصل پاگل ہو تو فرع حاکم کے بغیر اس کے مال سے اپنا نفقہ نہیں لے سکتا۔

نفقہ ومصارف کی تفصیل :اصول یا فروع پر جو نفقہ وکفایت واجب ہے، اس میں مناسب لباس، رہائش کا نظم، کھانا، پینا، سالن، علاج، دوائی، اور مرض وغیرہ کی وجہ سے بصورتِ احتیاج خادم کا نظم داخل ہے۔ کھانا پینا کسی حد تک شکم سیری کے بقدر واجب ہے، جس کی وجہ سے اس کی صحت اور آمد ورفت اور مختلف تصرفات کی قوت باقی رہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز تلف ہو جائے تو اس کا بدل دینا لازم ہے۔

حضانت (پرورش)

تعریف: حَضانت لغت میں ضم (ملا لینے اور سمیٹنے) اور گود میں لینے کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل حِضن سے ماخوذ ہے، یعنی گود۔

جو خود اپنے امور انجام دینے پر قادر نہ ہو، (مثلاً بچہ یا پاگل) اس کی تربیت و پرورش، اس کے معاملات کی اصلاح و درستگی اور ضرر ونقصانات سے اس کی حفاظت کو شریعت میں حضانت کہا جاتا ہے۔ مثلاً اسے نہلانا، اس کے کپڑے دھونا، تیل لگانا اور کنگھی کرنا، سرمہ لگانا، بچہ کو جھولے میں ڈالنا اور جھلا کر سُلانا وغیرہ۔ حد تمیز کے بعد بلوغ تک پرورش کے لئے کفالت بھی کہتے ہیں۔ حضانت ایک قسم کی ولایت واختیار ہے، لیکن فی الجملہ عورتیں اس میں مردوں پر مقدم ہیں۔ کیونکہ وہ زیادہ شفیق و مہربان، تربیت سے واقف اور اس سلسلہ میں پیش آمد پریشانیوں پر صبر گذار ہوتی ہیں (جس کی حضانت کی جائے اسے مَحْضُون اور حضانت کرنے والے کو حَاضِن کہیں گے)

حکمت: بعض اوقات میاں بیوی میں جدائی ہوتی ہے، یا بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، اس صورت میں معاملہ اس اختلاف و جھگڑے کے سپرد کر دیا جائے، یا جو بھی غالب آ جائے، اس کی مرضی چلے، تو نونہالوں پر بڑا ظلم اور ان کی حق تلفی و مصلحت تلفی ہوگی، جو ان کی بدبختی و بربادی کا سبب بنے گی، لہٰذا ضروری ہوا کہ ایک ضابطہ مقرر کیا جائے، جو ان کی پرورش و نگہداشت کی ذمہ داری کی تفصیل اور ترتیب و تقدیم کو واضح کر دے، اور اولیاء و سرپرستوں کے کسی اختلاف کی وجہ سے ان کی مصلحت پامال نہ ہو۔

حضانت کے مصارف: مَحضون کا نفقہ جس پر واجب ہو، حضانت کے مصارف بھی اسی پر ہیں، لہٰذا جس کو یہ حق ملے، وہ اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے، حتی کہ ماں بھی مطالبہ کر سکتی ہے، اگر ماں دودھ پلائے اور رضاعت و حضانت دونوں کی اجرت مانگے، تو منظور کرنا ہوگا۔ محضون کا مال ہو تو یہ مصارف اس میں واجب ہوں گے ورنہ پھر باپ پر اگر بچہ خدمت کا محتاج ہو تو عرف کے مطابق مناسب نظم کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، ماں کے ذمہ یہ لازم نہیں ہے۔

مستحقین: جب تک والدین کے زوجیت کا رشتہ باقی ہو، بچہ ان کے ساتھ ہی رہے گا، والد کفالت کا ذمہ دار ہوگا، اور والدہ پرورش و تربیت کرتی رہے گی، جب کہ بچہ اس کے مذہب پر ہو۔ رضاعی یا سسرالی مَحْرَمیت کی وجہ سے حضانت کا حق نہ ملے گا۔

طلاق، فسخ یا لعان کے ذریعہ شوہر بیوی میں جدائی ہو، اور شوہر کو اس بیوی سے غیر ممیز بچہ ہو، خواہ مذکر ہو یا مؤنث تو اس کے حضانت کا حق والدہ کو ہوگا، کیونکہ اس کی شفقت سب سے بڑھ کر ہوگی۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے بیوی کو طلاق دینے کے بعد بچہ اپنی پرورش میں لینا چاہا، تو آپ ﷺ نے بچہ کی ماں سے فرمایا: "تم اس کی زیادہ مستحق ہو، جب تک نکاح نہ کرو" (احمد، ابوداود، بیہقی، حاکم) اس کے بعد نانی، پھر نانی کی ماں اوپر تک، قریبی نانی بعد والی پر مقدم ہوگی، پھر باپ مقدم ہوگا، پھر باپ کی ماں، پھر اس کی ماں، اس طرح ماؤں کا سلسلہ اوپر تک، پھر دادا، پھر اس کی مائیں اوپر تک، پھر دادا کے ابا، پھر اس کی مائیں... قریبی بعید پر مقدم ہوگی، (نانیوں اور دادیوں میں جو وارث نہیں بنتی، اسے حضانت کا حق نہیں، یعنی جس کے اور محضون کے درمیان ایسے مذکر کا واسطہ ہو، کہ اس مذکر اور محضون کے درمیان کوئی مؤنث ہو، جیسے نانا کی ماں، دادی کی دادی) پھر سگی بہن (حقیقی بہن) پھر باپ شریک بہن، پھر ماں شریک بہن، پھر اسی ترتیب سے بھائی، پھر اس ترتیب سے خالہ، پھر اسی ترتیب سے بھانجی، (بھانجہ کو حضانت کا حق نہیں) پھر اسی ترتیب سے بھتیجی، پھر حقیقی بھائی کا بیٹا، پھر باپ شریک بھائی کا بیٹا، پھر حقیقی پھوپھی، پھر باپ شریک پھوپھی (یعنی باپ کی باپ شریک بہن) پھر ماں شریک پھوپھی، (ابن رفعہ اور رُویانی وغیرہ نے پھوپھی کو بھائی بہن کی اولاد پر مقدم رکھا ہے) پھر حقیقی چچا، پھر باپ شریک چچا (ماں شریک چچا کو حق حاصل نہیں) پھر خالہ

کی بیٹیاں، پھر پھوپھی کی بیٹیاں، ان کے ماؤں کی طرح (یعنی حقیقی کی بیٹی باپ شریک کی بیٹی پر اور وہ ماں شریک کی بیٹی پر مقدم ہوگی) پھر حقیقی چچا کی بیٹی، پھر باپ شریک چچا کی بیٹی...

بعض ضابطے : (۱) (مذکورہ مؤنث حاضنات کے علاوہ) ان عورتوں کو حضانت کا حق ملے گا، جو غیر محرم رشتہ دار ہوں، اور ان کے اور محضون کے درمیان غیر وارث مذکر کا واسطہ نہ ہو، یعنی یا تو مؤنث کا واسطہ ہو، جیسے خالہ اور پھوپھی کی بیٹی، یا وارث مذکر کا واسطہ، جیسے حقیقی یا باپ شریک، چچا کی بیٹی، تاہم محضون شہوت کی عمر کو پہنچا ہوا مذکر ہو، تو اس پر ان عورتوں کو حضانت کا حق نہ ہوگا۔ اگر غیر وارث مذکر کا واسطہ ہو، تو حق نہ ملے گا، جیسے ماموں کی بیٹی، یا ماں شریک چچا کی بیٹی۔

(۲) ان مردوں کی حضانت کا حق حاصل ہوگا، جو رشتہ دار اور وارث ہوں، خواہ محرم ہوں، جیسے بھائی بھتیجہ، چچا، یا غیر محرم جیسے چچازاد بھائی، ان کی ترتیب میں (کسی حد تک) نکاح کے ولایت کی ترتیب ملحوظ ہوگی، (البتہ ماں شریک بھائی چچا پر مقدم ہوگا، حالانکہ اسے نکاح میں ولایت حاصل نہیں) تاہم خَلْوتِ مُحَرَّمَہ سے گریز کرتے ہوئے شہوت کی عمر کو پہنچی ہوئی بچی کو غیر محرم کے سپرد نہیں کیا جائے گا، بلکہ کسی معتبر خاتون کے سپرد کریں گے، گو اس کے مال سے اجرت دے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے، اور یہ غیر محرم حاضن اس کا تعاون کرتا ہے۔

جو مرد وارث اور محرم نہ ہو، جیسے ماموں کا یا پھوپھی کا بیٹا، یا وارث نہ ہو، گو محرم ہو، جیسے ماموں، ماں شریک چچا، یا نانا، تو ان کو حضانت کا حق نہ ملے گا۔

(۳) ایک ہی درجہ کے مذکر و مؤنث، میں مؤنث مقدم ہوگی، لہٰذا بہن بھائی پر اور بھتیجی بھتیجہ پر مقدم ہوگی۔

(۴) ایک درجہ کی وہ عورت جسکے اور محضون کے درمیان عورت کا واسطہ ہو، اس درجہ کی اس عورت پر مقدم ہوگی جس کا واسطہ مرد ہو، پس بھانجی بھتیجی پر مقدم ہوگی۔

(۵) ایک ہی درجہ میں ایک سے زائد مرد یا عورتیں ہوں، مثلاً کئی بھائی یا کئی بہنیں، تو قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا، (اس صورت میں خنثی بھی مرد کی طرح ہوگا)

مسئلہ : (۱) اگر محضون کی بیٹی ہو تو والدین کی غیر موجودگی میں دیگر لوگوں (نانی دادی وغیرہ) کے مقابلہ میں وہ مقدم ہوگی۔

(۲) اگر محضون مذکر ہو، اور اس کی بیوی ہو، یا محضون مؤنث ہو، اور اس کا شوہر ہو، تو تمام لوگوں پر (حتی کہ والدہ پر بھی) بیوی یا شوہر حضانت میں مقدم ہوگا، جب کہ صحبت کرنا ممکن ہو (اتنی کمسنی نہ ہو کہ شوہر صحبت نہ کر سکے، یا بیوی برداشت نہ کر سکے)

(۳) اگر میاں بیوی دونوں محضون ہوں، تو شوہر کے حاضن کو بیوی کی حضانت کا بھی حق ملے گا۔

مُمَیِّز کا حکم : حضانت کی مندرجہ بالا ترتیب و تفصیل غیر ممیز محضون کے متعلق تھی، جو بذاتِ خود تنہا کھانے پینے اور استنجاء جیسے امور پر قادر نہ ہو، اسے غیر ممیز کہا جائے گا، اور جو اتنی سمجھ کو پہنچ جائے کہ بذاتِ خود تنہا ان امور کو انجام دے سکے، اسے ممیز کہا جائے گا۔ سات سالہ عمر کی کوئی قید نہیں، سات سال کے بعد بھی ممیز نہ ہو، تو جس کی حضانت میں تھا اسی کے پاس رہے گا۔

محضون ممیز ہو (اور والدین میں جدائی ہو) تو مستحب ہے کہ اسے والدین کے درمیان اختیار دیا جائے، جب کہ دونوں میں حضانت کے شرائط موجود ہوں (جو آئندہ بیان ہوں گے) گو ایک دوسرے کے مقابلہ میں، دینداری، مال یا محبت میں فائق ہو، پھر وہ جسے بھی اختیار کرے، اس کے سپرد کیا جائے گا کیونکہ آپ ﷺ نے ایک بچہ کو والدین کے درمیان اختیار دیا۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی و حسنہ) نیز ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرۃ کا عمل اور امام شافعی اور بیہقی نے حضرت عمر کا عمل یہی نقل فرمایا ہے۔ اور

الأم میں حضرت عمارۃ سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے انھیں والدہ اور چچا کے درمیان اختیار دیا، اور اس وقت ان کی عمر ۷ یا ۸ سال تھی، اور ان کے ایک چھوٹے بھائی کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ اس عمر میں ہوتا تو اسے بھی اختیار دیتا (تلخیص ۱۲/۴)

اگر حضانت کے شرائط ایک میں ہی ہوں، تو وہی متعین ہے، لہٰذا اختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اختیار دینے سے قبل ایک اپنا حق ساقط کر چکا ہو، تب بھی اختیار دیا جائے گا۔ محضون جسے اختیار کرے وہ حضانت سے انکار کرے، تو دوسرا کفالت کرے، انکار کرنے والا رجوع کرے، تو دوبارہ محضون کو اختیار دیا جائے گا۔ اگر دونوں انکار کریں، اور بعد میں دو مستحق مثلاً دادا اور دادی ہوں ان دونوں میں اختیار دیا جائے، ورنہ پھر جس پر نفقہ واجب ہے، اسے اس کی کفالت و پرورش پر مجبور کیا جائے گا۔

(باپ نہ ہوتو) باپ کی طرح دیگر مذکر حاضنوں میں جو مقدم ہو اس کے اور ماں کے درمیان بھی اختیار دیا جائے گا، البتہ محضون مؤنث ہو، تو ماں مقدم ہوگی، لیکن اس مذکر رشتہ دار کی کوئی بیٹی ہو، جو محضون کی کفالت کر سکے، تو بعضوں کے نزدیک اختیار دیا جائے گا۔

ابن رفعہ نے فرمایا کہ ممیز اختیار وانتخاب کے اسباب سے واقف ہو، ورنہ اس واقفیت تک اختیار کو مؤخر کیا جائے گا، جس کا اندازہ کرنا قاضی کی ذمہ داری ہے۔

اختیار میں تبدیلی: کسی ایک کو اختیار کرنے کے بعد وہ دوسرے کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، گو بار بار اس طرح کرے، کیونکہ معاملہ اس کے گمان کے برعکس بھی سامنے آ سکتا ہے، یا جسے پہلے اختیار کیا تھا، اس کی حالت بدل بھی سکتی ہے، تاہم اس کے بار بار منتقل ہونے سے یہ گمان غالب ہو کہ اسکا سبب تمیز کی کمی ہے، تو ممیز ہونے سے قبل جس کے پاس تھا، اسی کے پاس رکھا جائے گا۔

ملاقات: اگر مؤنث محضون باپ (یا کسی مذکر) کو اختیار کرے، تو وہ اسے والدہ کی ملاقات کے لئے جانے سے روک سکتا ہے، تا کہ پردہ سے مانوس ہو اور بے پردگی کی عادت نہ پڑے۔ اور والدہ کا ادھر آنا زیادہ بہتر ہے، لیکن مذکر کو والدہ کی ملاقات سے نہیں روک سکتا، تا کہ اسے نافرمانی کی عادت نہ پڑے، نیز اس کے جانے میں کوئی بے پردگی کا سوال نہیں، مؤنث کو والدہ کی عیادت اور بصورتِ احتیاج تیمارداری وخدمت سے روکنا صحیح نہیں ہے، البتہ شک وتہمت کی صورت میں جانے کی اجازت نہ دے۔

ماں کو عرف وعادت کے مطابق مذکر ومؤنث کی ملاقات سے روکنا صحیح نہیں، مثلاً چند دنوں میں ایک دن، نہ کہ روز روز، البتہ اس کا گھر قریب ہی ہو، تو روز آنے میں (عرف کی وجہ سے) حرج نہیں، ماں کو بچوں کی ملاقات کے لئے اپنے گھر میں داخل ہونے سے روکنا حرام ہے، جب وہ داخل ہو، تو زیادہ وقت نہ رکے،

محضون کی تیمارداری: اگر مذکر یا مؤنث محضون بیمار ہو (اور باپ کے گھر ہو) تو وہاں ان کی تیمارداری کے سلسلہ میں ماں مقدم ہوگی، جبکہ باپ راضی ہو، ورنہ ماں اپنے گھر ان کی تیمارداری کرے، اور باپ ان کی عیادت کیا کرے، بہر حال دونوں صورتوں میں خلوت محرمہ سے پرہیز کرے، محضون کے انتقال کی صورت میں باپ اس کی ماں کو جنازہ میں حاضری سے نہیں روک سکتا۔ اگر قبر کے سلسلہ میں والدین میں اختلاف ہو، تو باپ کی بات مقدم ہوگی، جبکہ جنازہ کا نقلِ محرم نہ پایا جائے۔

مسئلہ: اگر مذکر ماں کو اختیار کرے، تو رات اس کے پاس گذارے، اور دن میں والد کے پاس چلا جائے تا کہ وہ اس کے مناسب دینی ودنیوی تعلیم سے اسے آراستہ کرے، کہ اس میں اس کی مصلحت ہے۔ مؤنث ماں کو اختیار کرے، تو دن رات وہیں رہے، اور والد عادت کے مطابق اس کی ملاقات کو جایا کرے، وہ بیٹی کو اپنے گھر لانے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اگر ممیز دونوں کو اختیار کرے، تو قرعہ اندازی کر کے جس کا نام نکلے، اس کے حوالہ کرے، اور کسی کو اختیار نہ کرے تو ماں کے پاس رکھے۔

حاضن کا سفر : اگر دونوں میں سے ایک عارضی سفر میں جائے، مثلاً حج، تجارت یا تفریح وغیرہ، تو جو مقیم ہے، دوسرے کے لوٹنے تک وہ بچہ کی پرورش کا زیادہ مستحق ہے، بچہ ممیز ہو یا غیر ممیز نیز سفر طویل ہو یا مختصر، اگر دونوں سفر میں جا رہے ہوں، تو ماں مقدم ہوگی۔

اگر ان میں سے ایک مستقل منتقل ہونے کے لئے سفر میں جائے، تو عصبہ ماں کے مقابلہ میں مقدم ہوگا، (باپ ہو یا کوئی اور) گو غیر محرم ہو، تا کہ نسب کی حفاظت ہو۔ اگر عصبہ خود سفر کر کے منتقل ہو رہا ہو تو اس وقت مقدم ہوگا جب کہ بستی میں دوسرا کوئی عصبہ نہ ہو، لہٰذا اگر باپ جائے اور دادا ہو یا دادا جائے اور بھائی ہو، تو ماں مقدم ہوگی، اسی طرح راستہ اور منزل پُر امن ہو، تو سفر میں جانے والا عصبہ مقدم ہوگا، ورنہ ماں مقدم ہوگی۔

نفقہ : غیر ممیز والدہ کے پاس ہو، تو اس کا نفقہ اس کے سپرد کر دے، اسی طرح مؤنث ممیز والدہ کو اختیار کرے تو نفقہ اس کے سپرد کر دے، مذکر ممیز کو والد کھانے کے لئے اپنے پاس بلائے، تو والد کے پاس جا کر کھائے، جب کہ باعث مشقت نہ ہو، (مثلاً دونوں کے گھر میں طویل فاصلہ ہو)

حضانت کے شرائط : کسی کو حضانت کا استحقاق تبھی ہوگا، جب کہ اس میں درج ذیل شرائط موجود ہوں:

۱- عقل، پس کسی پاگل کو حضانت کا استحقاق نہیں گو صرف دورہ پڑتا رہتا ہو، اگر بہت کم ہو، مثلاً سال میں ایک دن، تو حضانت، ساقط نہ ہوگی۔

۲- بلوغ، نابالغ کو یہ حق نہ ملے گا۔

۳- آزادی، کسی بھی قسم کے غلام، باندی کو حضانت کا حق نہ ملے گا۔

۴- دین، پس کسی کافر کو کسی مسلم پر حضانت کا استحقاق نہیں، کیونکہ اسے اس پر ولایت حاصل نہیں، نیز ممکن ہے کہ وہ اسے دین کے سلسلہ میں فتنہ میں مبتلا کرے، پس گذشتہ ترتیب کے مطابق اس کے مسلم رشتہ دار اس کی پرورش کریں گے، اگر ان میں کوئی نہ ہو، تو یہ تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اس کے مصارف اسی کے مال سے متعلق ہوں گے، ورنہ جس پر اس کا نفقہ لازم ہے، ورنہ محتاج مسلمانوں کی طرح بیت المال ذمہ دار ہے، بیت المال کا نظم نہ ہو، تو صاحب حیثیت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ ذمی بچہ اگر اسلام کا اقرار کرے تو اسے اس کی ذمی رشتہ داروں سے لے لینا مندوب ہے۔

ایک کافر کو ایک کافر پر حضانت کا حق ہے، ایک مسلمان کو بدرجہ اولیٰ کافر پر حضانت کا حق ہے، کیونکہ اس میں اس محضون کی مصلحت و بہتری ہے۔

۵- فاسق نہ ہو، کیونکہ فاسق کو ولایت حاصل نہیں، اور اس سے اطمینان نہیں، نیز اس میں محضون کو کوئی بھلائی نہیں، کیونکہ یہ بھی اس کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ صرف ظاہری عدالت کافی ہے تاہم اہلیت میں اختلاف ہو، تو قاضی کے پاس عدالت کا ثبوت ضروری ہے۔

۶- امانت، یعنی بچہ کی پرورش وحفاظت کے سلسلہ میں اس سے کوئی خطرہ نہ ہو۔

۷- اقامت، سفر واقامت کی تفصیلات گذر چکیں۔

۸- حاضنہ عورت کسی ایسے شخص کے نکاح میں نہ ہو، جس کو اس محضون پر حضانت کا حق نہ ہو، (جیسا کہ ابتداء میں حدیث گذر چکی) لہٰذا ایسے کسی شخص سے محض نکاح کر لینے سے حق حضانت ختم ہوگا، گو دخول نہ ہو، یا شوہر محضون کو اپنے گھر رکھنے پر راضی ہو، اگر شوہر اور باپ دونوں راضی ہوں تو حق ختم نہ ہوگا، اور دونوں میں ہر ایک جب چاہے رجوع کر سکتا ہے۔ اگر اس شخص کو بھی حضانت کا حق ہو، تو اس سے

نکاح کی وجہ سے عورت کا حق باطل نہ ہوگا، جب کہ وہ راضی ہو، جیسے محضون کا چچا یا چچازاد بھائی، خواہ اس کا باپ موجود ہو، کیونکہ اسے بھی حضانت کا حق ہے، تو اس کی شفقت کی وجہ سے دونوں اس کی کفالت میں ایکدوسرے کا تعاون کریں گے۔

۹- اگر محضون دودھ پیتا بچہ ہو، اور حاضنہ کو دودھ ہو، تو اس کا دودھ پلانا شرط ہے، اگر وہ دودھ پلانے سے انکار کرے تو اسے حضانت کا حق نہ ملے گا، اگر اسے دودھ نہ ہو، تو حق ملے گا۔

۱۰- سِل یا فالج وغیرہ کسی دائمی مرض کا شکار نہ ہو، جس کی تکلیف محضون کی نگہداشت سے غافل کرے۔ اگر ایسی تکلیف ہو کہ بذاتِ خود اس کی پرورش ونگہداشت نہ ہو سکے، تو بذاتِ خود انجام دینے والے کو حق نہ ملے گا، لیکن جو اپنی نگرانی میں دوسرے شخص سے پرورش کروائے، اسے حق ملے گا۔

۱۱- حاضن ابرص یا اجذم نہ ہو، جیسا کہ قواعد علائی میں ہے، (یعنی سفید داغ یا کوڑھ کے مرض میں مبتلا نہ ہو)

۱۲- نابینا نہ ہو، جبکہ خود براہِ راست پرورش کرے، اگر دوسرے کے ذریعہ کرواسکے، تو حق ملے گا۔

۱۳- مُغَفَّل (بے خبر وسادہ لوح) شخص نہ ہو۔

مذکورہ شرائط میں سے کوئی ایک بھی شرط نہ ہو، تو حضانت کا حق ساقط ہوگا، البتہ محضون کا باپ اس کی ماں کو مثلاً اس شرط پر خلع دے کہ ایک سال تک اس کی پرورش کرے، پھر دورانِ سال ماں نکاح کرلے، تب بھی یہ حق ساقط نہ ہوگا، کیونکہ اجارہ عقد لازم ہے،

حضانت کی کوئی شرط موجود نہ ہو، پھر بعد میں پائی جائے، تو حضانت کا حق ملے گا، مثلاً غیر مسلم کا اسلام لانا، فاسق کا تائب ہونا، پاگل پن ختم ہونا، یا منکوحہ کو طلاق ہونا، خواہ بائنہ ہو یا رجعی، مطلقہ کو عدت کے اختتام سے قبل ہی حضانت کا حق ملے گا، لیکن صاحبِ عدت کے جس مکان میں مطلقہ عدت گذارے، وہاں داخل کرنے سے وہ منع کرسکتا ہے، البتہ وہ اجازت دے تو یہ حضانت کی مستحق ہوگی۔

حضانت سے انکار: حضانت کا حق جسے حاصل ہے، وہ انکار کرے یا غائب ہو، تو یہ حق اس کے بعد والے کو ملے گا، پس ماں غائب ہو یا انکار کرے، تو یہ حق نانی کو ملے گا، معلوم ہوا کہ جو انکار کرے، اسپر جبر نہیں، تاہم نفقہ بھی اسی پر واجب ہو، تو جبر کیا جائے گا، مثلاً محضون کا باپ اور مال نہ ہو، تو مادہ پر حضانت کے لئے جبر ہوگا۔

سرزنش: باپ، دادا، ماں اور وہ شخص جس کی کفالت میں بچہ ہو وہ تعلیم وتربیت اور تادیب کے لئے بچہ، پاگل اور سفیہ کو سزا دے سکتے ہیں۔ ایک استاد شاگرد کو اس کے ولی کی اجازت سے سرزنش کرسکتا ہے، گرچہ شاگرد بالغ ہو، کسی دوسرے کے حق کی ادائیگی سے انکار کی وجہ سے شاگرد کو مارنا وغیرہ حرام ہے (جمل ۱۶۵/۵)

بالغ کا حکم: سابقہ مسائل کا تعلق بلوغ تک تھا، اگر کوئی مذکر محضون بالغ ہو جائے اور وہ رشید ہو، تو دوسروں کی کفالت سے بے نیاز ہو چکا، لہٰذا اپنے معاملات کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، اب والدین میں سے کسی کے ساتھ رہنے کا پابند نہ ہوگا، لیکن افضل یہ ہے کہ ان سے جدا نہ رہے، تاکہ حسنِ سلوک اور خدمت کی سعادت سے بہرہ در ہو، اگر امرد ہو اور تنہا رہنے میں خطرہ ہو تو والدین سے جدا رہنا ممنوع ہے، اگر عاقل وبالغ تو ہو، لیکن رشید نہ ہو، تو اسے مالی اختیار حاصل نہ ہوگا، بلکہ مالی ولایت باپ کے ہی حق میں برقرار رہے گی، البتہ خطرہ نہ ہو تو رہائش میں اسے اختیار ہے۔

مؤنث بالغہ اور رشیدہ ہو، تو بہتر ہے کہ نکاح تک والدین یا کسی ایک کے پاس رہے، کیونکہ یہ تہمت سے بعید ہے، گو وہ جہاں چاہے رہ سکتی ہے، خواہ باکرہ (کنواری) ہو، جبکہ کوئی تہمت وخطرہ نہ ہو، شک وتہمت کی صورت میں والدہ کو اپنے ساتھ رکھنا واجب ہے، اس طرح

عصبات میں سے جو ولی ہو، وہ اپنے ساتھ رکھے، جب کہ اس کا محرم ہو، ورنہ کسی مناسب ومحفوظ مقام پر اسے رکھ کر اس کی نگہداشت کرے۔ اس سلسلہ میں اس پر جبر کیا جائے گا، ولی تہمت کا دعوی کرے، تو اس کی قسم لے کر تصدیق کی جائے گی، بینہ کا مکلّف نہ ہوگا، اگر رشیدہ نہ ہو، تو وہی تفصیل ہوگی، جو گذر چکی۔

دودھ چھڑانا: رضاعت کی مکمل مدت دو سال ہے، لہٰذا والدین میں سے کوئی ایک بلا ضرر نہ دو سال سے قبل رضاعت کو ختم کر سکتے ہیں، اور نہ دو سال کے بعد یہ سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں، دونوں رضامندی سے دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑانا چاہیں، یا دو سال کے بعد بھی پلانا چاہیں، تو جائز ہے، جبکہ بچہ اور ماں کو یا کسی ایک کو ضرر نہ ہو، بغیر حاجت کے دو سال کے بعد دودھ نہ پلانا مسنون ہے۔ دونوں میں اختلاف ہو، تو جو دو سال کی مدت مکمل کرنا چاہے، اس کی بات منظور کی جائے گی، لیکن اس سے قبل دودھ چھڑانا بچہ کے حق میں بہتر ہو، تو چھڑانے کا مطالبہ منظور ہوگا، جیسے ماں کے حمل یا بیماری کی صورت میں، جبکہ دوسری مرضعہ میسر نہ ہو، دو سال کے بعد ہر ایک کو دوسرے کی رضامندی کے بغیر دودھ چھڑانے کا حق ہے، جبکہ اس سے کوئی ضرر نہ ہو، کیونکہ دو سال رضاعت کی مکمل مدت ہے۔

(۵) دیگر نفقات

گذشتہ نفقات کے علاوہ انسان اپنی ملکیت کے اعتبار سے درج ذیل نفقات کا بھی ذمہ دار ہے۔

۱-حیوانات (ذی روح): ان کی تین قسمیں ہیں: (۱) ماکول جانور (وہ جانور جن کا گوشت حلال ہے)
(۲) محترم وغیر ماکول جانور (۳) غیر محترم جانور

(۱) ماکول جانور: گائے بیل وغیرہ ماکول جانوروں کے متعلق مالک کو اختیار ہے کہ ان کو صحیح طریقہ سے کھلاتا پلاتا رہے، جس سے ان کی زندگی محفوظ رہے، ابتدائی درجہ میں شکم سیری اور سیرابی تک کھلانا پلانا واجب ہے۔ یا کھانے کے لئے ان کو ذبح کرے، یا انھیں فروخت یا ہبہ کردے اگر وہ ان میں سے کسی پر عمل نہ کرے، تو اسے مناسب مقدار میں کھلانے پلانے پر جبر کریں گے، نہ مانے تو بیچنے یا کرایہ سے دینے کا حکم دیں گے، نہ مانے تو (حاکم) جبراً بیچ دے گا یا کرایہ پر دے گا، یہ بھی ممکن نہ ہو، تو بیت المال ورنہ مسلمان ذمہ دار ہیں، چراگاہ میں آزاد چھوڑ دینے سے کھا پی لے تو یہ کافی ہے، اس سے واجب مقدار حاصل نہ ہو، تو بقیہ مقدار خود کھلائے پلائے، اگر چارہ بغیر غصب کے حاصل نہ ہو، تو غصب کر کے کھلائے، جبکہ دوسرا کوئی راستہ نہ ہو، اور غصب کے وقت کا بدل لازم ہے۔

(۲) محترم وغیر ماکول جانور: (محترم یعنی وہ جاندار جن کو بلا سبب مارنے کی اجازت نہیں): مثلاً بلی، شہد کی مکھی، ریشم کا کیڑا، گدھا، خچر وغیرہ۔ ان جانوروں کو بھی مناسب انداز میں کھلانا پلانا لازم ہے، ورنہ فروخت کردے، اگر فروخت نہ کرے یا کوئی خریدے نہیں، تو کسی ایسے شخص کو دے دے، جو اس سے فائدہ اٹھائے اور اسے کھلاتا پلاتا رہے، تاکہ وہ ہلاک نہ ہو، ان جانوروں کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ کھانے کے مقصد کے بغیر جانوروں کو ذبح کی ممانعت وارد ہے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ "ایک عورت ایک بلی (پر ظلم) کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوئی۔ اس نے اسے باندھ رکھا، پھر نہ تو اسے کھلایا، اور نہ ہی آزاد چھوڑ دیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھالیتی، یہاں تک کہ وہ بھوک سے مرگئی"۔

اگر ایسا جانور ہو، جو ملکیت میں داخل نہیں ہوتا، جیسے شکاری کتا، تو اسے یا تو کھلائے، یا کسی ایسے شخص کو دے دے، جو اس سے انتفاع کرے (فروخت نہیں کرسکتا) یا آزاد چھوڑ دے،

دونوں قسم کے جانوروں کے عام احکام : جانوروں سے مستقل اتنا کام لینا کہ اس پر دوام ان کے بس میں نہ ہو، حرام ہے، حاجت سے زائد ان کو مارنا حلال نہیں، گھوڑا، گدھا اور خچر وغیرہ کو ایسی چیز پہنانا جو شدید گرمی و سردی سے ان کی حفاظت کرے، لازم ہے، جبکہ اس سے ان کو کافی تکلیف ہو، اصل مقصد کے علاوہ دیگر امور میں بھی جانوروں کو استعمال کر سکتے ہیں، جبکہ اسے ضرر نہ ہو، مثلاً بیل کو سواری یا بوجھ ڈھونے میں اور اونٹ و گدھے کو کھیتی باڑی کے لئے۔

جانور بالکل اپاہج یا بوڑھا ہو جائے اور اس سے کسی طرح انتفاع ممکن نہ ہو، تو بھی اسے کھلانا پلانا ضروری ہے۔ جانور کا دودھ اتنا دوہنا (نکالنا) جو اسے یا اس کی اولاد کو مضر ہو، حرام ہے، اولاد کی نشوونما کے لئے مناسب مقدار سے زائد دودھ دوہ سکتا ہے، اگر ماں کا دودھ اسے ناکافی ہو، تو مالک پر تکمیل ضروری ہے۔

اگر ماں کے دودھ کے بدلہ دوسرا اسے خوشگوار اور موافق ہو، تو دوسرا انتظام کر کے ماں کا دودھ نکال سکتا ہے، کیونکہ اصل مقصد اسے ایسی چیز پلانا ہے کہ زندہ رہے، اگر بچہ انکار کرے اور قبول نہ کرے، تو ماں کے دودھ کا وہ زیادہ مستحق ہے، چارہ کی قلت وغیرہ کی وجہ سے جس دودھ کا نکالنا جانور کو مضر ہو، وہ حرام ہے۔ دودھ نہ نکالنا جانور کو مضر ہو، تو نہ نکالنا حرام ہے۔ ورنہ اضاعتِ مال کی وجہ سے حرام ہے۔ مستحب ہے کہ کچھ دودھ تھن میں چھوڑ دے، مکمل نہ نکالے، اور ناخن تراش لے، تا کہ اسے تکلیف نہ ہو، اگر ناخن زیادہ لمبے ہوں اور جانور کو تکلیف دے، تو اس کو دوہنا حرام ہے، اُون کو بالکل جڑ سے کترنا یا مونڈنا حرام ہے، کیونکہ اس سے حیوان کو تکلیف ہوگی۔

شہد کی مکھیوں کو پالنے والے پر لازم ہے کہ اس کے لئے بنائے ہوئے گھروندہ میں اس کی حاجت کے بقدر شہد چھوڑ دے، جبکہ دوسری چیز اسے کافی نہ ہو، ورنہ یہ لازم نہیں۔

جانوروں کو ایک دوسرے کے خلاف برانگیختہ کرنا اور آپس میں لڑانا حرام ہے۔ جفتی کے اوقات میں مذکر و مؤنث جانوروں کو ایک ساتھ رکھنا ان کے حق میں داخل ہے۔ گدھے کی گھوڑی کے ساتھ جفتی کرانا مکروہ، اور گائے کے ساتھ جفتی کرانا حرام ہے، شکار کے ذریعہ کسی جانور کا مالک بنے، اور اسے یہ معلوم ہو، کہ اس کے بچے ہیں جنھیں اس کی غیر موجودگی سے تکلیف ہوگی، تو اسے چھوڑ دینا تا کہ بچوں کے پاس چلی جائے جائز ہے۔

تنبیہ : مسلم و ابوداود میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے، ''اپنے نفوس پر بددعا نہ کرو، اور اپنی اولاد پر بددعا نہ کرو، اور اپنے خدام کو بددعا نہ دو، اور اپنے اموال پر بددعا نہ کرو، کہیں اللہ تعالیٰ کی اس گھڑی کی موافقت نہ ہو جائے، جس میں جو چیز مانگی جائے، عطا ہوتی ہے'' اس حدیث کی روشنی میں تادیب وغیرہ کسی حاجت کے وقت مذکورہ لوگوں کو موت وغیرہ کی بددعا دینا مکروہ ہے۔ ورنہ بلا حاجت بظاہر اولاد یا خدام کے حق میں بددعا دینا جائز نہیں ہے۔

(۳) غیر محترم جانور : صحیحین وغیرہ میں آپ ﷺ کی یہ حدیث موجود ہے: ''پانچ (حیوانات) فاسق ہیں، انھیں حل و حرم میں (یعنی حرم میں اور خارج حرم، ہر کسی جگہ) قتل کیا جائے گا: سانپ، کوا، چوہا، کاٹ کھانے والا کتا اور چیل''۔

مذکورہ اور دیگر موذی حیوانات کو کھلانا پلانا وغیرہ ضروری نہیں، کیونکہ ایذاء رسانی کی وجہ سے ان کے قتل میں کوئی حرج نہیں، لیکن ان جانداروں کو بھی بھوکا پیاسا محبوس رکھ کر تکلیف پہنچانا ممنوع ہے، کیونکہ حدیث میں کسی کو قتل کرنا ہو، تو بہتر طریقہ پر قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

۲- غیر حیوان (غیر ذی روح) : غیر ذی روح اشیاء مثلاً مکان وغیرہ کے رشید مالک پر اس کی تعمیر و اصلاح واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ مال کے بڑھانے میں داخل ہے، جو واجب نہیں، البتہ بلا عذر ان اشیاء کو ایسے ہی چھوڑ دینا کہ ویران اور اجاڑ ہو جائے،

مکروہ ہے، کھیتی باڑی اور درختوں کو سیراب نہ کرنا مکروہ ہے، جبکہ اس کی آمدنی سے سیرابی کی مصارف کی تلافی ہو جائے، ورنہ قطعاً کوئی کراہت نہیں۔ اگر درختوں کو سیراب نہ کرنے کا مقصد یہ ہو کہ خشک ہونے کے بعد کاٹ کر وہاں عمارت وغیرہ بنانا ہے، یا بطورِ ایندھن استعمال کرنا ہے، تب بھی کوئی کراہت نہیں۔ زمین (بے کار پڑی ہو تو اس) میں درخت نہ لگانا، یا کاشتکاری وغیرہ نہ کرنا مکروہ نہیں ہے۔ خود اپنے عمل سے مال ضائع کرنا حرام ہے، مثلاً بلا وجہ مال سمندر میں پھینک دینا، اور کسی عمل کے نہ کرنے سے مال ضائع ہو تو عمل کی مشقت کے پیشِ نظر یہ مکروہ ہے۔ اگر عمل میں کوئی مشقت نہ ہو، مثلاً: اپنے پاس پڑا ہوا دینار اٹھا لینا، یا جیب سے گرنے والی رقم کو روک لینا وغیرہ، اور ان اعمال کے نہ کرنے سے مال ضائع ہو، تو یہ حرام ہے۔

جو رشید نہ ہو (مجور ہو) اس کے ولی پر اس کے گھر و زمین وغیرہ کی تعمیر و اصلاح، اور کاشت اور پھلوں کی حفاظت لازم ہے۔ اسی طرح وقف کے وکیل اور ناظر پر موقوفہ اشیاء کی تعمیر و اصلاح اور حفاظت ضروری ہے۔ تاکہ مستحقین کا حق فوت نہ ہو۔

تعمیر: اپنی حاجت کے لئے عمارت بنانا مکروہ نہیں، گو طویل ہو، جن روایات میں سات ہاتھ سے زائد کی ممانعت ہے، اور اس میں شدید وعید وارد ہے، اسے لوگوں کے اوپر فخر تکبر کے طور پر بنانے پر محمول کریں گے، اپنی حاجت سے زائد تعمیر مکروہ ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ انسان جو بھی خرچ کرتا ہے، اس میں اسے ثواب ملے گا، بجز اس کے جو اس مٹی میں ڈالے (یعنی تعمیر میں صرف کرے) البتہ اس سے کوئی نیک مقصد کی نیت ہو، تو یہ مستثنیٰ ہے، مثلاً اس کی آمدنی مختلف نیک کاموں میں یا اہل و عیال کے مصارف میں صرف ہو۔ (تلخیص الحبیر ۴/۱۰-۱۳، فتح الوهاب مع الجمل ۴/۴۸۷-۵۲۹، تحفه مع الحواشی ۱۰/۵۴۴-۶۷۵، مغنی المحتاج ۳/۴۲۵-۴۶۴، الفقه المنهجی ۴/۱۶۹-۲۱۲، الاقناع مع البجیرمی ۴/۶۵-۹۹، نهایه المحتاج مع الحواشی ۷/۱۸۷-۲۴۵، ترشیح المستفیدین ۳۴۹-۳۶۳، فتح المعین مع الاعانه ۴/۵۹-۱۰۹، قلائد ۲/۲۸۴-۳۰۸، بغیه ص ۲۳۹-۲۴۵)

نسب (قرابت۔ رشتہ داری)

نسب کئی مختلف اہم احکام کی بنیاد ہے۔ مثلاً: وراثت، نکاح کی حلت و حرمت، ولایت، وصیت وغیرہ۔ لہٰذا ان دلائل کا تذکرہ ضروری ہے، جن سے نسب کا ثبوت ہوتا ہے۔

نسب کا ثبوت: شرعاً درج ذیل کسی ایک طریقہ سے نسب ثابت ہوگا۔

(۱) گواہی: ایسے دو مرد گواہوں کی گواہی سے نسب ثابت ہوگا، جن میں گواہ بننے اور گواہی دینے کے شرائط موجود ہوں، (جن کا تذکرہ نکاح میں گذر چکا) صرف عورتوں کی، یا ایک مرد اور عورتوں کی گواہی سے نسب ثابت نہ ہوگا۔

(۲) اقرار: (اقرار کرنے والے کو مُقِر کہیں گے) مثلاً کسی کا یہ اقرار کرنا کہ میں زید کا والد ہوں یا جمیل کا بیٹا ہوں، اقرار اس وقت معتبر و مقبول ہوگا جبکہ درج ذیل شرائط موجود ہوں (کسی کے نسب کے اقرار کرنے والے کو مستلحِق اور جس کے نسب کا اقرار کیا جائے اسے مستلحَق کہا جائے گا)

۱۔ جس اس اقرار کی تکذیب نہ کرے (اسے غلط اور جھوٹ نہ بتائے) یعنی دونوں عمر کے اعتبار سے ایک دوسرے کے باپ بیٹے ہو سکتے ہوں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو، مثلاً دونوں کی عمر ایک ہی ہو، تو یہ اقرار صحیح نہ ہوگا، اور اس سے نسب ثابت نہ ہوگا۔

۲-شریعت اس اقرار کی تکذیب نہ کرے، شریعت کی تکذیب کا مطلب یہ ہے کہ مستلحق پہلے سے کسی دوسرے سے معروف النسب نہ ہو، کیونکہ ایک شخص سے ثابت نسب اقرار کی وجہ سے دوسرے کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ خواہ مستلحق اس اقرار کو تسلیم کرے یا انکار کرے۔

۳-اگر مستلحق تصدیق کا اہل (یعنی مکلف) ہو تو وہ مقر (مستلحق) کی تصدیق کرے، کیونکہ اس کے نسب میں اس کا بھی حق ہے، اور دوسروں کے مقابلہ میں وہ اس سے زیادہ واقف ہوگا۔

۴-مقر اس اقرار کے ذریعہ اپنا کوئی نفع حاصل نہ کرے، یا کسی نقصان کو دفع نہ کرے، اگر ان میں سے کوئی بات لازم آ رہی ہو، تو یہ اقرار کے بجائے اِدّعاء (دعویٰ) ہے، جو گواہی وغیرہ کے بغیر مقبول نہیں۔

مثال: کافی مال چھوڑ کر مرنے والا کسی جوان کے متعلق یہ کہا'' کہ یہ میرا بیٹا ہے، تو یہ اقرار نہ ہوگا، کیونکہ اقرار کی تو یہ شان ہے کہ مقر پر کچھ تاوان یا ذمہ داری لازم آئے، اور نہ گواہی ہوگی، کیونکہ گواہی تبھی معتبر ہے، کہ گواہ کے نفع یا دفعِ ضرر کو مستلزم نہ ہو، کیونکہ ظَنّین کی شہادت کو آپ ﷺ نے غیر معتبر قرار دیا ہے۔ (ترمذی) (ظنین یعنی متہم، اور اپنے لئے نفع اٹھانے یا نقصان دور کرنے والا متہم ہوتا ہے)

اس کا یہ کلام دعویٰ ہے، جو بغیر شرعی بینہ کے مقبول نہ ہوگا۔ مثلاً دو عادل گواہ اس کے سچائی کی گواہی دیں۔

(۳) استفاضہ: (پھیلنا ومشھور ھونا): یعنی عرصہ سے کوئی شخص اپنی نسبت کسی شخص یا قبیلہ (خاندان) کی طرف کرے اور اس بستی کے لوگ بھی اسے اسی طرف منسوب کریں، اور کوئی اس میں اختلاف نہ کرے تو یہ استفاضہ (شہرت) صحیح گواہی کی طرح معاملہ کی صحت وصداقت پر ایک شرعی دلیل قرار پائے گی، بشرطیکہ جن لوگوں میں یہ مستفیض اور مشہور ومعروف ہے، وہ اتنی کثرت میں ہوں کہ جھوٹ پر ان کا اتفاق عقلاً محال ہو۔

چونکہ نسب کا معاملہ طویل عرصہ سے ثابت ومستمر رہتا ہے، اسلئے مدتوں کے بعد اس کی ابتداء پر باقاعدہ گواہوں کا پیش کرنا کافی دشوار ہوگا، لہٰذا حاجت کے پیش نظر استفاضہ سے اس کا ثبوت کافی سمجھا گیا، نیز آپ ﷺ کے روبرو صحابہ کرامؓ اپنے قبائل اور اجداد کی طرف خود کو منسوب کیا کرتے، تو آپ ﷺ ان سے گواہوں کا مطالبہ نہ کرتے، بلکہ بغیر کسی مخالفت کے استفاضہ کو کافی سمجھتے، اور اسی اعتبار سے احکام مرتب ہوئے۔

رضاعت کا ثبوت: چونکہ رضاعت بھی تحریم میں نسب کی طرح ہے، لہٰذا اس کے ثبوت کے بھی وہی طریقے ہیں، جو نسب کے ہیں، یعنی گواہی، اقرار اور استفاضہ، لیکن رضاعت کے گواہوں کا مذکر ہونا شرط نہیں، رضاعت میں مقبول گواہی درج ذیل ہیں:

(۱) دو عادل مرد (۲) ایک عادل مرد اور دو عادل عورتیں (۳) چار عادل عورتیں

نسب سے متعلق احکام: کافی احکام کا ترتب دو اشخاص کے درمیان نسب کے ثبوت کی بنیاد پر ہوتا ہے:

مثلاً: نکاح کی حلت وحرمت کے احکام، نفقہ اور اس سے متعلقہ دیگر ذمہ داریوں کے احکام، ولایت اور اس کے درجات، میراث اور حصوں کی تقسیم، وصیت اور اس کی صحت وبطلان کے احکام۔

یہ نسب کے ثبوت پر مرتب اہم احکام کا ایک مختصر سا خاکہ ہے، ان بعض احکام میں رضاعت بھی نسب کی طرح ہے۔ ان احکام کی تفصیلات کا اصل میدان متعلقہ ابواب ہیں۔ (الفقہ المنھجی ۲۱۵/۴-۲۱۸)

جنایت

اس باب میں کسی کو قتل کرنے یا کسی اور طریقہ سے تکلیف پہنچانے اور زخمی وغیرہ کرنے سے متعلق مسائل واحکام کا ذکر ہوتا ہے۔ بعض مصنفین اسے "جراح" (زخم) کے عنوان سے بھی پیش کرتے ہیں۔

قتل : کسی شرعی جواز کے بغیر کسی مسلمان کا قتل بہت بڑا کبیرہ گناہ ہے، جیسا کہ امام رافعیؒ ونوویؒ نے فرمایا، امام بغوی فرماتے ہیں کہ یہ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے۔ بکثرت آیات واحادیث میں اس سے ڈرایا اور روکا گیا ہے۔

آیت : "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ ..." ترجمہ: "اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے۔" (سورۃ النساء : ۹۲)

دیکھئے۔ بلاحق قتل کرنے والے کی سزا ہمیشہ کے لئے جہنم، غضب، دوری اور عظیم عذاب قرار دی گئی ہے۔ اللہ ہم سب کو بچائے رکھے (آمین)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: "کسی مسلمان کا قتل ان تین اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر حلال نہیں: ایمان کے بعد کفر، مُحْصَن (شادی شدہ) ہونے کے باوجود زنا، اور بغیر حق کے ظلماً کسی نفس کو قتل کرنا" (صحیح مسلم)

ایک حدیث میں ایک مؤمن کے قتل کو اللہ کے نزدیک تمام دنیا کے فنا و زوال سے بھی بڑھ کر بتلایا۔ (ترمذی ، نسائی ، واسنادهما صحیح)

قتل کی قسمیں : قتل کی تین قسمیں ہیں، (۱) **عَمْد** (۲) **خَطأ** (۳) **شِبْهُ عَمْد** (عمد خطا)

۱ – **قتل عمد :** (اسے عمد محض بھی کہتے ہیں): کسی معین شخص کو ایسی چیز سے قصداً قتل کرنا جو یقیناً یا غالباً قتل کرتی ہو۔ اگر قتل کا قصد نہ ہو، مثلاً کوئی پھسل کر دوسرے شخص پر گر جائے اور وہ مرے تو یہ قتل عمد میں داخل نہیں، اور قصاص واجب نہ ہوگا۔ اسی طرح کسی معین شخص کا قصد نہ ہو، مثلاً کسی گروہ پر تیر چلائے اور کسی مخصوص آدمی کا قصد نہ ہو، تو اس میں بھی راجح قول یہ ہے کہ قصاص واجب نہ ہوگا۔ غالباً قتل کرنے والی چیز کوئی ہتھیار و آلہ ہو یا کچھ اور، نیز دھاردار ہو یا نہ ہو، دھاردار آلہ کی مثال چھری، تلوار وغیرہ اور غیر دھاردار جیسے آہنی گرز وغیرہ اسی طرح جلانا، ڈبونا، سولی دینا، دیوار وغیرہ بدن پر گرا دینا، جانور کے ذریعہ روند ڈالنا، زندہ دفن کرنا اور خصیتین کو سختی سے دبا کر مار ڈالنا بھی عمد میں داخل ہے۔

اور ان صورتوں میں قصاص واجب ہے۔ کسی کو قید میں بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالے، یا کپڑے اتار دے اور وہ سردی سے مر جائے، تو قصاص واجب ہے۔ اگر کسی کے خلاف ایسی گواہی دیں جس سے اس پر قتل کی سزا عائد ہو، مثلاً: قتل عمد، ردت یا مُحْصَن کا زنا، اور قاضی گواہی کے مطابق اس شخص کو قتل کرے، پھر گواہ اپنی گواہی سے رجوع کریں اور کہیں کہ ہم نے دانستہ ایسی گواہی دی تھی، اور ہمیں علم تھا کہ ہماری گواہی سے وہ قتل ہوگا، تو ان جھوٹے گواہوں پر قصاص لازم ہے۔

کوئی شخص کسی بچہ یا پاگل کو زہر آلود کھانا کھلائے اور وہ مر جائے تو اس پر قصاص لازم ہے۔ اگر کوئی کسی پر جادو کرے اور وہ مر جائے، تو ہم جادوگر سے تحقیق کریں گے، اگر وہ کہے کہ میں نے اسے میرے جادو سے قتل کیا، اور میرا جادو غالباً قتل کرتا ہے، تو اس پر قصاص لازم ہے۔

قتل عمد اور قصاص کے لزوم کے لئے قاتل کا قتل کا قصد کرنا شرط نہیں، قتل کرنے والے فعل کا قصد کافی ہے۔

(۲) شبہِ عمد: اگر کسی معین شخص کو قصداً ایسی چیز سے قتل کرے، جو غالباً قتل نہیں کرتا، تو یہ شبہ عمد ہے۔ اسے عمد خطا یا خطا عمد بھی کہتے ہیں۔ مثلاً کوڑے یا چھڑی سے مارنا، جب کہ یہ دونوں خفیف ہوں، اور مسلسل نہ مارے، اور کسی نازک جگہ نہ مارے (یعنی ایسی پرخطر جگہ جہاں نسبتاً معمولی مار لگنے سے بھی آدمی مر جائے)، نیز جسے مارا جائے وہ بچہ یا کمزور نہ ہو اور سردی وگرمی میں نہ مارے، اور سخت درد نہ ہو، جو موت تک برقرار ہے، ورنہ پھر یہ قتل عمد شمار ہوگا۔

(۳) قتل خطا: جس کا قتل ہو، اس کا قصد نہ تھا، مثلاً پھسل کر کسی پر گرا اور وہ مر گیا، یا کسی کو مارا اور دوسرے کو جا لگا، تو یہ قتل خطا ہے۔

اگر پُرخطر ونازک مقام مثلاً آنکھ یا خصیتین میں سوئی چبھونے سے مر جائے تو یہ قتل عمد ہے۔ اسی طرح کسی دوسری جگہ سوئی چبھونے سے ورم آئے اور درد ہو، جو موت تک باقی رہے تو یہ بھی عمد شمار ہوگا۔ اگر کوئی اثر ظاہر نہ ہو، مثلاً شدید درد نہ ہو، اور اسی وقت مر جائے، تو یہ شبہ عمد ہے۔

اگر کسی ایسی جگہ سوئی چبھوئے جہاں درد نہ ہو، مثلاً ایڑی کی کھال میں، اور وہ مر جائے تو کچھ لازم نہیں، فوراً انتقال ہو یا بعد میں۔

کسی عاقل بالغ کو زہر آلود کھانا کھلائے اور کھانے والے کو اس کا علم نہ ہو، تو کھلانے والے پر دیت لازم ہے، نہ کہ قصاص، اور اسے زہر کا علم ہو، تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہے۔ اگر زخمی شخص اپنے مُہلک زخم کا علاج نہ کرے اور مر جائے تو زخمی کرنے والے پر قصاص واجب ہے، کیونکہ جس پر جنایت کی جائے، اس پر اس کا علاج واجب نہیں ہے اگر مہلک زخم نہ ہو، اور پٹی نہ لگانے کی وجہ سے مر جائے ضمان لازم نہیں ہے۔

کوئی شخص کسی کو پکڑ کر رکھے اور دوسرا قتل کرے، یا ایک شخص کنواں کھودے اور دوسرا کسی کو اس میں ڈھکیل کر مار دے، یا ایک شخص کسی کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینکے اور دوسرا راستہ میں ہی (زمین پر گرنے سے قبل) اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے، تو صرف قاتل، ڈھکیلنے والا، اور دو ٹکڑے کرنے والے پر قصاص لازم ہوگا، نہ کہ پکڑنے، کھودنے اور پھینکنے والے پر،

کوئی شخص کسی پر جبر واکراہ کرے کہ تم فلاں شخص کو قتل کرو، اور وہ قتل کرے، تو مُکرِہ اور مُکرَہ دونوں پر قصاص لازم ہے۔ اگر کوئی بالغ شخص کسی قریب البلوغ پر اکراہ کرے تو صرف اس بالغ پر قصاص لازم ہے، کسی کو جبراً کسی درخت پر چڑھائے اور وہ گر کر مر جائے تو یہ شبہ عمد ہے۔ اگر کسی پر اپنے آپ کو قتل کرنے کے لئے (خودکشی کے لئے) کرے، اور وہ کر گذرے، تو قصاص لازم نہیں ہے۔ اگر کسی نے کہا کہ تم مجھے قتل کرو، اور اس نے قتل کر دیا، تو نہ قصاص لازم ہے، اور نہ دیت۔

قتل میں زائد افراد کی شرکت: اگر کسی شخص کے قتل میں کئی افراد شریک ہوں، تو اس کی سزا میں تمام کو قتل کیا جائے گا، جب کہ ہر ایک کا تنہا فعل قتل کرنے والا ہو، کیونکہ اس سلسلہ میں آیت عام ہے، اور حضرت عمرؓ نے یمن کے سات یا پانچ افراد کو ایک کے قتل کی پاداش میں قتل کیا، اور فرمایا کہ وہاں کے تمام افراد اس میں شریک ہوتے تو تمام کو قتل کر دیتا۔ اسی طرح حضرات علی، مغیرہ اور ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے، اور کسی نے اس کا انکار نہ کیا، تو گویا اجماع ہو چکا۔

اگر کسی کو ہر کوئی کوڑے یا عصا سے ہلکی مار مارے، جس سے وہ مر جائے، تو راجح یہ ہے کہ اگر ان تمام نے آپس میں اتفاق و پلان سے اس طرح کیا ہے، تو ان پر قصاص لازم ہے، ورنہ نہیں۔

قصاص کے شرائط: قصاص مماثلت اور برابری کو کہتے ہیں، چونکہ ظالم سے اس کے ظلم وجنایت کے مثل بدلہ لیا جاتا ہے،

اس لئے اسے قصاص کہا جاتا ہے۔قصاص کے وجوب کے لئے کئی امور میں قاتل ومقتول میں برابری ضروری ہے۔قصاص کے شرائط درج ذیل ہیں۔

(۱) قاتل بالغ عاقل ہو(۲) مقتول کا والد نہ ہو۔(۳) مقتول قاتل کے مقابلہ میں کفر یا غلامی کی وجہ سے ناقص نہ ہو۔لہٰذا ایک مسلمان کو کافر کی وجہ سے، ایک آزاد کو غلام کی وجہ سے اور کسی والد کو اس کے بیٹے کے قتل کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا۔اسی طرح بچہ یا پاگل کسی کو قتل کرے تو اس پر قصاص نہ آئے گا۔اگر قاتل اپنے نابالغ ہونے کا دعوی کرے تو تصدیق کی جائے گی۔

مسلمان کسی کافر کو قتل کرے، خواہ وہ کافر حربی ہو، یا ذمی یا مُعاھد تو اس کے قصاص میں اس مسلمان کو قتل نہ کیا جائے گا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:''مسلمان کو کافر کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا'' (بخاری)

آزاد شخص کو غلام کے قتل کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا۔

فائدہ: (۱) کوئی آزاد مسلمان کسی شخص کو قتل کرے، جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کافر ہے یا مسلم، یا آزاد ہے یا غلام تو شبہ کی وجہ سے قصاص نہ ہوگا۔

(۲) مسلمان کسی مرتد یا محصن زانی کو قتل کرے تو قاتل پر قصاص نہ ہوگا۔

زخم میں قصاص: مندرجہ بالا شرائط کے مطابق جن دو شخصوں کے درمیان جان میں قصاص جاری ہوتا ہے، ان میں اعضاء کے کاٹنے اور زخم میں بھی قصاص جاری ہوگا، جب کہ مزید دو شرائط موجود ہوں:

۱- اسمِ خاص میں اشتراک ہو، مثلاً دایاں بائیں کے عوض اور بایاں بائیں کے عوض، لہٰذا دائیں کے عوض بایاں عضو اور اوپری ہونٹ کے عوض نچلا ہونٹ اور اس کے برعکس کاٹا نہیں جائے گا۔ جنایت کے بعد پیدا ہونے والا عضو بھی کاٹا نہیں جائے گا، پس کسی کا دانت اکھاڑ دے اور اس کو اس طرح کے دانت نہ ہوں، تو قصاص نہ ہوگا، گرچہ بعد میں دانت آجائے۔ بدن میں اشتراک شرط نہیں، پس مرد کا عضو عورت کی وجہ سے اور اس کے برعکس کاٹا جائے گا۔ذمی کا عضو مسلم کے بدلہ میں کٹے گا، نہ کہ اس کے برعکس۔

۲- جنایت کرنے والے کا عضو صحیح اور سامنے والے کا شل (لنجا) نہ ہو، لہٰذا کسی کے شل ہاتھ یا پیر کو کاٹنے کی وجہ سے اس کا صحیح ہاتھ یا پیر کاٹا نہ جائے گا۔شل عضو کے بدلہ شل عضو کاٹا جائے گا، جبکہ دونوں میں یہ صفت مساوی درجہ میں ہو، یا جنایت کرنے والے کے عضو زائد ہو، صحیح عضو کے عوض شل عضو کٹے گا، تاہم تجربہ کار حضرات کا یہ فیصلہ ہو کہ کاٹنے کی صورت میں کسی بھی طرح خون رک نہ پائے گا، تو کاٹا نہیں جائے گا۔

ہر وہ عضو جو جوڑ سے کاٹا جائے، اس میں قصاص ہوگا، مثلاً کہنی، پورا، گٹا، گھٹنا وغیرہ زخموں میں صرف مُوضحہ میں قصاص ہوگا، یعنی وہ زخم جو ہڈی تک پہنچ جائے، کیونکہ بقیہ زخموں میں مساوات اور صحیح ضبط دشوار ہے۔موضحہ کے قصاص میں اس کے لمبائی و چوڑائی کے اعتبار سے بدلہ لیا جائے گا، نہ کہ نسبت کے اعتبار سے مثلاً کسی نے نصف سر میں زخم کیا تو، اس کے نصف سر میں زخم نہیں کیا جائے گا، بلکہ زخم کی لمبائی و چوڑائی مطابق زخم لگایا جائے، خواہ نصف سے کم یا بیش ہو جائے۔

دِیَت

تعریف: کسی آزاد کو قتل کرنے یا کسی عضو کو کاٹنے یا زخمی کرنے کی وجہ سے جو مال واجب ہوتا ہے، اسے دِیَت کہا جاتا ہے۔

اس کی مشروعیت قرآن وحدیث اوراجماع سے ثابت ہے۔

دیت کی قسمیں: (۱) دیتِ مُغلَّظہ: یہ قتل عمد میں واجب ہوتا ہے، خواہ قصاص واجب ہونے کے بعد اسے معاف کر کے دیت پر راضی ہو جائے، یا قصاص واجب نہ ہو، جیسے والد کا بیٹے کو قتل کرنا اس دیت میں ۱۰۰/اونٹ واجب ہیں، جن میں ۳۰/حِقّہ (تین سالہ)، ۳۰/جذعہ (چار سالہ) ۴۰/خَلِفہ (یعنی حاملہ) ہوں۔ دیت کی یہ تفصیل ترمذی میں وارد ہے۔ مذکورہ دیت ایک آزاد، محقون الدم (یعنی جس کا قتل ممنوع ہو) مسلمان مرد کی ہے، اگر کوئی محقون الدم نہ ہو، مثلاً بستی سے فرض نماز ترک کرنے والا یا محصن زانی، تو ان کو قتل کرنے والے مسلم پر نہ دیت ہے اور نہ کفارہ (گرچہ انفرادی طور پر حکومت کے بغیر کسی کو اس طرح قتل کی اجازت نہیں ہے)

(۲) دیتِ مخففہ: قتل خطا کی صورت میں تین حیثیت سے دیت میں تخفیف ہوگی۔

۱-یہ دیت مُخمَّسہ ہوگی، یعنی ۱۰۰/اونٹ پانچ قسموں پر مشتمل ہوں گے۔ ۲۰ حِقہ، ۲۰ جذعۃ، ۲۰ بنت لبون (دوسالہ اونٹنی)، ۲۰ بنت مخاض (ایک سالہ اونٹنی) اور ۲۰/ابن البون (دوسالہ اونٹ) ۲-یہ دیت عاقلہ پر واجب ہوگی۔ ۳-۱سے تین سال میں قسط وار ادا کرنا ہے۔

اگر قتل شبہ عمد ہو، تو دیت دو اعتبار سے مخفف ہوگی، یعنی عاقلہ پر اور تین سال میں ادائیگی لازم ہے۔ اگر کسی جگہ اونٹ موجود ہی نہ ہو، تو اس کی قیمت ادا کی جائیگی۔

اگر قتل خطا میں درج ذیل تین اسباب میں کوئی سبب پایا جائے، تو دیت میں ایک اعتبار سے تغلیظ (سختی) ہوگی، یعنی قتل عمد کی طرح تین قسموں کے اونٹ لازم ہوں گے۔ (۱) حرم مکہ میں قتل کرے۔ (۲) حرام مہینوں میں قتل کرے، حرام مہینے چار ہیں: ذوالقعدۃ، ذوالحجہ محرم اور رجب۔ (۳) کسی ذورحم محرم کو قتل کرے، مثلاً بہن، ماں، چچا، خالہ وغیرہ۔

عورت: عورت کے جان یا زخم کی دیت مرد کے مقابلہ میں نصف ہوگی، جیسا کہ بیہقی کی حدیث میں ہے۔

اھلِ کتاب: یہودی ونصرانی کی دیت ایک مسلم کی دیت کا ایک تہائی ہوگا، جو مرفوعاً مروی ہے، نیز بقول امام شافعی حضرات عمرؓ وعثمانؓ نے یہی فیصلہ دیا تھا۔

مجوسی: جس مجوی (آتش پرست) کو امان ہو، اس کی دیت ایک مسلمان کی دیت کا پندرھواں حصہ (۱/۱۵) ہوگا، جیسا کہ حضرات عمرؓ، عثمانؓ وابن مسعودؓ سے مروی ہے۔

بت پرست، سورج پرست وغیرہ افراد کی بھی یہی دیت ہوگی، جبکہ انھیں امان ہو، جسے امان نہ ہو، اس کا خون مهدر ورائیگاں ہے۔

مذکورہ تمام افراد کے عورتوں کی دیت ان کے مردوں کے نصف ہوگی۔

جس شخص کو ابھی تک اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو، اسے قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

دارالحرب میں اسلام قبول کرے اور وہاں سے ہجرت نہ کرے، تو اس کی طرف سے قصاص لیا جائے گا۔

زخم وغیرہ کی دیت: درج ذیل صورتوں میں اس شخص کی مکمل دیت (جان کی دیت) لازم ہوگی۔

(۱) دونوں ہاتھ گٹوں سے ہتھیلی وانگلیوں سمیت کاٹ کر جدا کر دینا، (۲) دونوں پیروں کو ٹخنوں سے کاٹ دینا، (۳) ناک کاٹ کر جدا کرنا، (۴) دونوں کان کاٹ کر جدا کرنا، خواہ بہرہ ہو، (۵) دونوں آنکھوں کو جدا کرنا، (۶) چاروں پپوٹوں کو جدا کرنا، (۷) گفتگو پر قادر شخص کی زبان جدا کرنا، (۸) دونوں ہونٹ جدا کرنا، (۹) زبان پر جنایت کی وجہ سے گفتگو کی صلاحیت ختم ہو جائے، (۱۰) دونوں آنکھوں کی بینائی چلی جائے، (۱۱) سننے کی قوت ختم ہو جائے، (۱۲) سونگھنے کی قوت ختم ہو جائے، (۱۳) عقل چلی جائے، (۱۴) عضو تناسل

(ذکر) کو کاٹنا، صرف حشفہ (سپاری) کے کاٹنے کا بھی یہی حکم ہے، (۱۵) دونوں خصیوں کو جدا کرنا (یعنی دونوں بیضے، کیونکہ عربی میں خصیہ اس کی کھال کو کہتے ہیں)

دیگر اعضاء و زخموں کا حکم: ایک ہاتھ، ایک پیر، ایک کان، ایک آنکھ، ایک ہونٹ، ایک آنکھ کی بینائی، ایک کان کی بینائی، ایک کان کی قوتِ سماعت، اور ایک خصیہ کے تلف کرنے میں اس شخص کی جان کی دیت کا نصف واجب ہوگا۔ ایک پپوٹے میں دیت کا چوتھائی حصّہ واجب ہوگا۔

مُوضحہ: (یعنی جو زخم ہڈی تک پہنچ جائے): سر یا چہرہ کے موضحہ میں اس زخمی شخص کی دیت کا بیسواں حصّہ واجب ہوگا، گو زخم چھوٹا ہو، بس ایک آزاد مسلمان کو موضحہ میں پانچ اونٹ واجب ہوں گے، جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے، موضحہ کے چھوٹا بڑا ہونے سے اس مقدار میں کوئی تفاوت نہ ہوگا۔

دانت: اصلی اور مکمل ایک دانت (جب کہ دودھ دانت نہ ہو) کے اکھاڑنے میں بیسواں حصّہ واجب ہوگا، لہٰذا ایک آزاد مسلمان مرد کے ایک دانت میں پانچ اونٹ لازم ہوں گے۔

انگلی: ہاتھ و پیر کے ہر ایک اصل انگلی میں اس شخص کے دیت کا دسواں حصّہ واجب ہوگا، پس ایک مذکر آزاد مسلمان کی ایک انگلی کے جدا کرنے میں ۱۰/اونٹ واجب ہوں گے۔ انگوٹھے کے ایک پورے میں انگلی کا نصف اور دیگر انگلیوں کے ایک پورے میں انگلی کا ایک تہائی واجب ہوگا۔

حُکومَة: ہر وہ عضو جس میں کوئی منفعت نہ ہو، اس کی وجہ سے حکومۃ لازم ہے۔ اسی طرح ہڈی توڑنے اور ان تمام جنایات میں بھی، جن میں کوئی دیت متعین نہ ہو۔ مثلاً: گردن اور چہرہ کو ٹیڑھا کر دینا، یا سیاہ کر دینا یا چھوٹا کر دینا۔

جس شخص پر جنایت ہو، جنایت کے بعد زخم وغیرہ مندمل ہونے کے بعد اسے غلام فرض کرتے ہوئے اس کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے، ماقبل کی اور اس قیمت میں جو تفاوت ہو، اسی نسبت سے دیت کی مقدار کو حکومۃ کہا جاتا ہے۔ مثلاً: جنایت سے قبل قیمت سو ہو اور جنایت و مندمل ہونے کے بعد ۹۰/تا ۱۰/کا تفاوت ہوا لہٰذا دیت کا دسواں حصہ واجب ہوگا، اور اسی کو حکومت کہیں گے۔

غلام: کوئی شخص کسی غلام باندی کو قتل کرے تو اس پر ان کی قیمت لازم ہے، جتنی بھی ہو۔

جَنین: مملوک جنین کی دیت اس کی ماں کے قیمت کا دسواں حصّہ ہے۔ اور ایک آزاد مسلمان جنین جنایت کی وجہ سے مردہ پیدا ہو، تو اس کی دیت غُرّہ یعنی ایک غلام یا باندی ہے، جو باپ کی دیت کے بیسویں حصّہ تک پہنچنا شرط ہے۔

فوائد: (۱) بچے کو تیراکی سکھلانے کے لئے کسی ماہر کے سپرد کرے اور بچہ غرق ہو جائے تو شبہ عمد کی دیت واجب ہے۔

(۲) معلّم شاگرد کو تادیباً سزا دے اور وہ مر جائے تو شبہ عمد کی دیت واجب ہے۔

(۳) ختنہ کرنے والے کے ہاتھ سے حشفہ کو نقصان پہنچے تو ضمان واجب ہے، جو عاقلہ کے ذمہ ہوگا۔

(۴) گھر کا کوڑا کرکٹ اور تربوزہ کے چھلکے وغیرہ موات کی زمین (بنجر زمین) میں پھینک دے، اور اسی سے کسی کی جان یا مال تلف ہو، تو کوئی ضمان عائد نہ ہوگا، اگر راستہ میں پھینکے اور کچھ نقصان ہو، تو ضمان واجب ہے، لیکن کوئی قصداً اس پر چلے، تو ضمان نہ ہوگا۔

(۵) راستہ میں عام مصلحت کی خاطر پانی چھڑکے، مثلاً راہ گیروں سے گرد و غبار کو دور کرنے کے لئے اور اس کی وجہ سے کوئی انسان یا جانور پھسل جائے، تو کوئی ضمان نہیں، اور اگر اپنی مصلحت کے لئے چھڑکے یا عادت سے تجاوز کر جائے، یا کیچڑ کر دے، تو تلف کا ضامن ہوگا۔

قَسامَہ : یعنی قتل کے مقدمہ میں قسمیں کھانا، اس کی شکل یہ ہے کہ کوئی مقتول کسی جگہ ملے اور قاتل کا کوئی علم نہ ہو، اور نہ گواہ ہوں اور مقتول کا ولی کسی معین شخص یا جماعت کے متعلق قتل کا دعوی کرے اور ایسا کوئی قرینہ بھی موجود ہو، جو اس کے دعوی کی صداقت پر دلالت کرے، (ایسے قرینہ کو لَوث کہتے ہیں) تو ولی اپنے دعوی پر پچاس قسمیں کھائے گا، پھر جب قسم کھالے تو عمد میں جس کے خلاف قسمیں کھائی ہیں، اس پر، اور خطا وشبہ عمد میں اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی، اگر مقتول کے ایک سے زائد ورثاء ہوں تو ان کی میراث کے تناسب سے یہ پچاس قسمیں ان پر منقسم ہوں گی۔

لَوث کی مثالیں : مقتول کسی قبیلہ، قلعہ، چھوٹی بستی یا بڑی بستی کے جدا حصہ میں پایا جائے اور اس کے اور وہاں بسنے والوں کے درمیان ظاہری دشمنی ہو، چند افراد کسی گھر، مسجد، باغ، راستہ یا صحراء سے ہٹ جائیں اور وہاں مقتول موجود ہو، کوئی ایک عادل گواہی دے کہ زید نے فلاں کو قتل کیا، چند غلام، عورتیں، بچے، فاسق لوگ یا ذمی لوگ قتل کی گواہی دیں، عام وخاص میں یہ مشہور ہو کہ فلاں نے زید کو قتل کیا۔

قسامہ کے متعلق حضرت سہل سے صحیحین میں روایت موجود ہے۔

اگر لَوث نہ ہو، تو یہ پچاس قسمیں مدعیٰ علیہ (جس پر قاتل ہونے کا دعوی ہے) پر آئیں گی۔ (کفایۃ الاخیار ۲/۲۹۱–۳۳۱، الاقناع مع البجیرمی ۴/۹۹–۱۳۷، المنہاج مع السراج الوھاب ۴۷۷–۵۱۱)

قتل کا کفارہ

کسی بھی محترم جان کو قتل کرنے والے پر کفارہ واجب ہے، خواہ قاتل مسلم ہو یا کافر آزاد ہو یا غلام، بچہ ہو یا پاگل، براہِ راست قتل کرے یا سبب بنے، عمداً ہو یا خطأ یا بطور شبہ عمد۔ اللہ کے حق کی وجہ سے جسے قتل کرنا حرام ہے، اس کے قتل کی وجہ سے کفارہ واجب ہے، خواہ مقتول مسلم ہو یا کافر، ذمی ہو یا معاہد، آزاد ہو یا غلام، اپنا غلام ہو یا کسی دوسرے کا، عاقل ہو یا پاگل، چھوٹا ہو یا جنین، مقتول کے متعلق ضابطہ یہ ہے کہ وہ ایمان یا امان کی وجہ سے معصوم آدمی ہو (معصوم یعنی جسے مارنا جائز نہ ہو) پس کسی حربی، مرتد، ڈاکو اور محض زانی کے قتل کی وجہ سے کفارہ واجب نہ ہوگا۔ حربی خواتین یا بچوں کے قتل سے بھی واجب نہ ہوگا، گرچہ ان کا قتل حرام ہے، کیونکہ یہ ان کی حرمت کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی مصلحت کی وجہ سے ہے۔

کسی کے قتل میں کئی افراد شریک ہوں، تو ان میں ہر ایک پر مستقل کفارہ لازم ہے۔

کفارہ : قتل کے کفارہ میں ایک مؤمن غلام آزاد کرنا لازم ہے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو مسلسل دو ماہ کے روزے لازم ہیں، جیسا کہ نص قرآن سے، ثابت ہے۔ اگر روزے پر قادر نہ ہو، تو قتل کے کفارہ میں مساکین کو اناج دینا کافی نہیں ہے (دیکھئے سورہ نساء آیت : ۹۲)

تنبیہ : کسی کے چشم بد (نظر لگنے) کی وجہ سے کوئی مرجائے، تو اس پر کفارہ لازم نہیں ہے، جس کی نظر لگتی ہے، اسے اس طرح برکت کی دعا کرنا مستحب ہے: اَللّٰھُمَّ بَارِكْ فِيْهِ وَلَا تَضُرَّهُ، مَاشَاءَ اللهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ ، کیونکہ اس صورت میں اس کی نظر سے نقصان نہ ہوگا۔ (کفایہ الاخیار ۲/۳۳۲–۳۳۴، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۳۸–۱۴۰)

بُغاۃ (باغیوں کا مسئلہ)

بغاۃ دراصل باغی کی جمع ہے، اور بُغی کا مطلب ہے ظلم اور حد سے تجاوز کرنا۔ جو مسلمان حکومت اسلامیہ کے حاکم کی مخالفت کریں اور اس کے خلاف خروج کریں اور اس کی اطاعت نہ کریں، یا ان پر واجب حق کی ادائیگی سے انکار کریں (گو خروج نہ کریں) تو یہ درج ذیل شرائط کے ساتھ باغی کہلائیں گے۔

۱- ان کی کثرت یا قوت وغیرہ کی وجہ سے ان کو ایک شوکت وغلبہ حاصل ہو، کہ اطاعت پر لانے کے لئے کچھ مشقت اٹھانے کی نوبت آئے۔

۲- ان کے پاس کوئی ایسی تاویل ہو، جس کی وجہ سے حاکم کی مخالفت کو روا سمجھ رہے ہیں۔

۳- ان کا کوئی رہنما وقائد ہو، جس کی وہ اطاعت کرتے ہوں۔

اگر مخالفین چند افراد ہوں، جن کو راہِ راست پر لانا بالکل آسان ہو، تو یہ باغی نہیں کہلائیں گے۔ اگر بلا تاویل کے مخالفت کریں، یا تاویل قطعاً باطل ہو، تب بھی یہ باغی نہیں کہلائیں گے۔ تاویل محتمل ہونا شرط ہے، یعنی کسی درجہ میں اس کی گنجائش بھی ہو۔

باغیوں کے احکام: (۱) پہلے حاکم ان کے پاس کسی امانتدار وذہین خیر خواہ کو روانہ کرے، تاکہ ان کے اعتراض وشبہات کو سن کر اس کا ازالہ کرے، اس کے باوجود وہ اپنے موقف پر مصر ہوں تو ان کو نصیحت کرے اور سمجھائے۔

(۲) نصیحت کے باوجود نہ مانیں تو ان کے ساتھ اعلانِ جنگ کرے۔

(۳) ان کا جو شخص میدان چھوڑ کر بھاگے اسے قتل نہ کیا جائے جو زخمی ہو جائے اس قتل نہ کرے، ان کے قیدیوں کو نہ تو قتل کرے اور نہ تو جنگ کے اختتام اور ان کے تتر بتر ہونے تک آزاد کرے۔ اگر وہ بذاتِ خود بغاوت کا راستہ ترک کر کے حاکم کی اطاعت اختیار کرے، تو آزاد کر دیا جائے۔

(۴) ان کے ہتھیار وغیرہ جنگ کے خاتمہ اور ان کی طرف سے خطرات وشرارت کے ٹلنے اور اطمینان کے بعد ان کو لوٹا دیے جائیں، بغیر شدید مجبوری کے ان کے ہتھیاروں کو استعمال نہ کیا جائے۔

(۵) بغیر شدید مجبوری کے عام مہلک ہتھیاروں کا استعمال نہ کیا جائے، اور نہ ان کے خلاف کافروں سے تعاون لیا جائے۔

(۶) باغیوں کا کوئی مال غنیمت کا مال شمار نہ ہوگا، بلکہ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی ان کو لوٹا دینا واجب ہے۔ (المنہاج مع السراج : ۵۱۶، الفقہ المنہجی ۹۸/۸، الاقناع مع البجیرمی ، ۱۹۱/۴، کفایۃ الاخیار ۳۷۳/۳)

رِدّت (اسلام کو چھوڑ دینا)

تعریف: عربی زبان میں کسی چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز اختیار کرنے کو رِدّۃ کہا جاتا ہے، اور شریعت میں کسی مکلف اور مختار مسلمان کا مذہب اسلام چھوڑ دینا رِدّۃ (مرتد ہونا۔ ارتداد) کہلاتا ہے (اعاذنا اللہ منہ)

ارتداد کفر کی بدترین قسم ہے، اور اس کا حکم شدید ترین ہے، اگر اسی پر موت ہوئی، تو سارے اعمال اکارت جائیں گے (حبط ہوں

گے) لہٰذا دوبارہ اسلام قبول کرلے تو ردّت سے قبل ادا کردہ عبادات کا اعادہ واجب نہیں ہے، البتہ اعمال کا ثواب بالاتفاق محض ردّت کی وجہ سے حبط اور برباد ہو جائے گا۔

آیت: ’’ وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ، وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ‘‘(البقرہ : ۲۱۷)

ترجمہ: ’’اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مر جائے، تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں، اور ایسے لوگ دوزخی ہوتے ہیں، یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے‘‘۔

ردّت کے اسباب: مندرجہ ذیل کسی سبب کے پائے جانے سے آدمی مرتد (غیر مسلم) ہو جائے گا۔ فی الحال یا آئندہ کافر ہونے کا عزم وارادہ کرنا، اس طرح کا ارادہ کرتے ہی کافر ہو جائے گا، صرف کسی کفریہ عمل کے کرنے کے ارادے سے کافر نہ ہوگا۔ کسی کفریہ قول یا عمل کو انجام دینا، خواہ بطور استہزا، ٹھٹھا کے ہو یا عناداً ہو (یعنی باطن میں برحق سمجھتے ہوئے مخالفت کرنا) یا اعتقاداً ہو، مثلاً، صانع (یعنی تمام جہاں کے خالق) کے وجود کا انکار کرنا، اللہ کے قادر یا عالم ہونے کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ کو حادث ماننا، دنیا کے قدیم ماننا (یعنی یہ کہ ہمیشہ سے موجود ہے، کسی نے پیدا نہیں کیا) کسی نبی کا انکار کرنا، کسی نبی کو جھٹلانا، اگر سبقت لسانی یا خوف کی وجہ سے کوئی کفریہ کلمہ زبان سے نکلے تو کافر نہ ہوگا، نیز کسی کے کفریہ کلمہ کو نقل کرنے سے کافر نہ ہوگا، تاہم گواہی وغیرہ کی ضرورت کے بغیر ایسا کلمہ نقل نہ کرے، اگر کوئی صراحتاً کفریہ کلمہ ادا کرے اور توریہ کرے (یعنی دل میں کوئی اور مفہوم مراد لے، جو کفر نہ ہو) تب بھی اس عمل کو ہلکا سمجھنے کی وجہ سے وہ ظاہراً و باطناً کافر ہوگا۔

دیگر اسباب: کسی مسلمان کے کافر ہونے کی تمنا (تاہم اس کے ظالم ہونے کی وجہ سے اس پر سختی کے طور پر یہ تمنا کفر نہ ہوگا) حضرت ابوبکرؓ کے صحابی ہونے کا انکار، حضرت عائشہؓ کی اللہ نے جو برأت فرمائی اس میں انھیں ملوث سمجھنا (دیگر کسی صحابی کے صحبت کا انکار کرنا، شیخین یعنی صدیقؓ وفاروقؓ کو برا بھلا کہنا یا حسنین کو برا کہنا کفر نہیں ہے) کسی نبی کی تحقیر، اسے برا بھلا کہنا فرشتوں کو گالی دینا، نبوت کے جھوٹے دعویدار کی تصدیق کرنا۔ تمام امت کو گمراہ قرار دینا، صحابہ کرام کو کافر قرار دینا، جو معذور جاہل نہ ہو، اس کا دوبارہ جی اٹھنے کا، مکہ کا، کعبہ، مسجد حرام، جنت وجہنم، حساب وکتاب، ثواب یا عذاب کا انکار کرنا۔ کسی سنت کی تحقیر کرنا، مثلاً کسی سے کہا جائے کہ آپ ﷺ کھانے کے بعد اپنی تینوں انگلیاں چاٹ لیتے تھے، تو وہ کہے: یہ کوئی ادب نہیں ہے۔

جس بات کا دینِ اسلام سے ہونا بالکل اجماعی وواضح اور ہر خاص وعام کو معلوم ہو، اس کا انکار کرنا مثلاً: پنج وقتہ فرض نماز، یا کوئی ایک نماز، یا ان میں سے ایک رکعت یا سجدہ کا انکار، چھٹی نماز کو فرض قرار دینا، زکات، روزہ، حج کے وجوب کا انکار، شراب، سود اور زنا کی حرمت کا انکار، قرآن کو اللہ کا کلام نہ ماننا، قرآن کے اعجاز کا انکار کرنا، قرآن شریف، کتب حدیث یا علوم دینیہ کے اوراق کو تحقیراً نجاست یا گندگی میں ڈالنا، بت کو سجدہ کرنا، سورج یا کسی بھی مخلوق کو سجدہ کرنا، خواہ کسی نبی کو سجدہ کرے یا اس کا دل اعضاء کے مطابق نہ ہو، کیونکہ اس کی ظاہری حالت اس کے مخالف ہے (اگر اللہ کی طرح تعظیم کے قصد سے کسی مخلوق کو رکوع کرے تو کفر ہے ورنہ کفر نہیں، گرچہ حرام ہے، صرف سر کو جھکانا یا معمولی سا جھکنا جو کہ اقل رکوع تک نہ پہنچے، مکروہ ہے)

یہ کہنا کہ نبی یا فرشتہ بھی فلاں بات کی گواہی دے تو میں قبول نہ کروں گا، یا اگر انبیاء کی باتیں سچی ہیں تو ہم نجات پا گئے، یا بطور تحقیر یہ کہا کہ مجھے پتہ نہیں ایمان کیا ہے، یا جو لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھے، اسے یہ کہنا یہ تمہاری بھوک مٹانے والا نہیں ہے، کسی مسلمان کو کفر کا مشورہ دینا، یا جو کافر اسلام لانا چاہے اسے کفر پر باقی رہنے کا مشورہ دینا، یا کوئی اسلام بتانے کی درخواست کرے تو یہ نہ مانے، کسی مسلمان کو

بغیر کسی تاویل کے کافر قرار دینا، کسی نے اسے یہودی وغیرہ کہہ کر آواز دی اور اس نے جواب دیا، کسی سے پوچھا گیا کہ کیا تو مسلمان نہیں؟ تو جواب دیا: نہیں، شراب نوشی یا زنا کی وقت تحقیراً بسم اللہ پڑھنا، تحقیراً یہ کہنا کہ مجھے قیامت کا کوئی ڈر نہیں۔ موذن کی اذان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، یہ کہنا کہ ایک پیالہ سالن علم سے بہتر ہے، جو اسلام کے علاوہ کسی مذہب کا پیرو ہو اسے کافر نہ سمجھنا یا اس کے کفر میں شک کرنا، جس سنت کی مشروعیت پر اجماع ہو اسکے انکار سے کافر ہوگا، جیسے روایت اور عیدین کی نماز (کیونکہ تواتر کا انکار پایا جارہا ہے، اور یہ حکم ان اجماعی مسائل میں ہے جس کا دین میں داخل ہونا ہر کس وناکس کو معلوم ہے)

تنبیہ: (۱) جو بات اجماعی ہو، تاہم اسے صرف خواص ہی جانتے ہوں تو اس کے انکار سے کافر نہ ہوگا گو اس کے متعلق نص وارد ہو، مثلاً: ایک بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو میراث میں چھٹا حصہ ملنا، نکاح متعہ کی حرمت، البتہ ایسے شخص کو صحیح مسئلہ سے آگاہ کیا جائے گا تاکہ اس کا اعتقاد رکھے۔

(۲) کوئی کافر شخص کسی مسلمان سے درخواست کرے کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان کرو، اور یہ اس سے کہے کہ تم تھوڑی دیر رکو، تو یہ کافر ہوجائے گا، جب کہ بلا عذر تاخیر کرے، اگر عذر ہو مثلاً کسی فرض یا نفل نماز میں ہو، اور اس کے اسلام کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، تو فوراً کلمہ پڑھانا واجب نہیں ہے، اگر فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو فوراً کلمہ پڑھانا واجب ہے، اور اس میں اس سے خطاب کی ضرورت ہو، مثلاً آپ یوں پڑھیئے، تو نماز باطل ہوگی، ورنہ ذکر کی نیت سے صرف شہادتین کو ادا کرے تو نماز باطل نہ ہوگی (اس مسئلہ میں لاعلمی کی وجہ سے کافی کوتاہی برتی جاتی ہے، غسل وغیرہ کو مقدم کیا جاتا ہے، حالانکہ کوئی اسلام قبول کرنا چاہے تو بلا تاخیر فوراً اسے کلمہ پڑھا دینا چاہیے، اگر قانونی خطرات ہوں تو تحریری ضوابط کو آگے مکمل کیا جائے)

(۳) ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ برحق بات یہ ہے کہ اجماعی مسائل کے ساتھ تواتر موجود ہو تو اس کا منکر تواتر کی مخالفت کی وجہ سے کافر ہوگا نہ کہ اجماع کی مخالفت کی وجہ سے اور تواتر موجود نہ ہو تو کافر نہ ہوگا۔

(۴) اگر کوئی تازہ نومسلم ہو، یا اہلِ علم سے دور پلا بڑھا ہو، اس لئے لاعلمی کی وجہ سے کسی حلال کو حرام یا اس کے برعکس قرار دے، تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہ ہوگا۔

نشہ: کوئی نشہ کی حالت میں ردّت اختیار کرے، تو وہ مرتد ہوگا

بچہ وپاگل: بچہ یا پاگل کے ردّت کا کوئی اعتبار نہیں۔

اکراہ: کوئی شخص اکراہ اور جبر کی وجہ سے کفریہ قول یا فعل کا ارتکاب کرے، حالانکہ دل میں ایسی کوئی بات نہ ہو، تو وہ کافر نہ ہوگا۔

آیت: ''مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ...'' (النحل: ۱۰۶)

ترجمہ: جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے، مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جائے، بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدہ میں فتور نہ کرے اور اس قول یا فعل کو برا سمجھتا ہو تو وہ مستثنیٰ ہے، کہ اسکو ظاہری کفر کا ارتکاب جائز ہے اور اس کے لئے وہ وعید آئندہ نہیں ہے)

اگر کوئی شخص مرتد ہوتے ہی پاگل ہوجائے تو احتیاطاً اسے مہلت دینا واجب ہے، ممکن ہے کہ پھر عقل لوٹ جائے اور اسلام قبول کرلے، اگر جنون میں ہی کوئی اسے قتل کردے، تو اس کا خون رائگاں ہے، کیونکہ وہ مرتد ہے، البتہ اس کے قاتل کو تعزیری سزا ملے گی، کیونکہ

اس نے توبہ کے مطالبہ کو فوت کر دیا۔

اگر ردّت کے بعد توبہ کے مطالبہ کے باوجود وہ نہ مانے، پھر بعد میں پاگل ہو جائے، تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

توبہ کی ترغیب: مرتد مرد یا عورت کو توبہ کی ترغیب دینا واجب ہے، کیونکہ وہ اسلام کی وجہ سے محترم تھا، ممکن ہے اسے کچھ شبہ پیش آیا ہو، پس اس شبہ کا ازالہ کیا جائے گا، یہ ترغیب فی الحال ہی دی جائے، کیونکہ اس پر مرتب قتل کی سزا حد ہے، لہٰذا دیگر حدود کی طرح اسے بھی مؤخر نہ کیا جائے، تاہم وہ نشہ میں ہو، تو پوری طرح ہوش میں آنے تک مؤخر کرنا سنت ہے۔

توبہ کی ترغیب اور سمجھانے کے باوجود وہ ردّت پر اصرار کرے، تو اسے قتل کیا جائے گا، بخاری شریف کی حدیث ہے: ''جو اپنا دین بدل دے، تو اسے قتل کر دو، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک عورت پر اسلام پیش کرنے کا حکم دیا، اگر قبول کرے تو فبھا، ورنہ اسے قتل کیا جائے (دار قطنی)

چونکہ مرتد کا قتل کفر کی وجہ سے ہے، لہٰذا اس کا غسل یا تکفین واجب نہیں، جائز ہے، اس پر نماز پڑھنا حرام ہے، نیز مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین بھی ناجائز ہے، کفار کے قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں، لیکن ایک حربی کی طرح اس کی بھی تدفین واجب نہیں ہے۔

اگر وہ اسلام قبول کرے، تو اس کا اسلام صحیح ہوگا، اور اسے چھوڑ دیا جائے گا خواہ وہ زندیق ہو یا بار بار اس طرح کر چکا ہو، جو پہلی مرتبہ ردّت کے بعد تائب ہو کر اسلام لائے، اسے تعزیری سزا نہ دی جائے، جو بار بار اس طرح کرے، اسے تعزیری سزا دی جائے گی۔

آیت: ''قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ...'' (الانفال: ۳۸)

ترجمہ: آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو ان کے سارے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائیں گے''۔

نیز صحیحین وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے کہ آدمی کلمہ شہادت کا اقرار کر لے تو اس کا جان و مال محفوظ ہو چکا، البتہ کسی حق کی وجہ سے۔

جو بظاہر مسلمان ہو اور بباطن کافر ہو اسے زندیق کہا جائے گا جیسے دور اول میں منافق کہا جاتا تھا، یا زندیق سے مراد وہ شخص ہے کہ جو کسی بھی مذہب کا قائل اور پیرو نہ ہو۔

مرتد کی فرع (اولاد): اگر مرتد کے بچہ کا حمل ردّت سے پہلے قرار پائے تو وہ مسلم ہے اگر ردّت کی مدت میں قرار پائے بعد میں اور اس کے اصول (ماں باپ اوپر تک) میں سے کوئی مسلمان ہو، تو تبعاً یہ بچہ بھی مسلمان شمار ہوگا، اگر اصول بھی مرتد ہوں، تو یہ مرتد شمار ہوگا، نہ کہ مسلم اور نہ اصلی کافر (یعنی جو ابتداء سے کافر ہو، اسلام سے پھر کر کافر نہ ہوا ہو) لہٰذا بالغ ہونے کے بعد اسے تائب ہو کر اسلام کی ترغیب دیں گے، اب نہ مانے تو قتل کیا جائے گا۔

مرتد کی ملکیت: مرتد کی ملکیت موقوف رہے گی، اگر اسی حال پر مرے، تو پتہ چلا کہ ردّت کے وقت ہی اس کی ملکیت زائل ہو چکی تھی، اور وہ فئی شمار ہوگی، اگر اسلام قبول کرے تو ملکیت زائل نہ ہوگی۔

جو قرض ردّت سے قبل اس پر لازم ہو چکا ہو، نیز ردّت میں کسی چیز کو تلف کرے تو اس کا بدل اس کے مال سے ادا کیا جائے گا، اس طرح اس کے زیر کفالت افراد کے مصارف بھی اسی سے ادا ہوں گے، اس کے جن تصرفات میں توقف و تعلیق کی گنجائش نہیں، جیسے فروخت کرنا، ہبہ اور رہن، یہ باطل ہوں گے، اور جن میں تعلیق کی گنجائش ہو جیسے وصیت، وہ موقوف رہیں گے اگر اسلام قبول کر لے، تو نافذ ہوں گے ورنہ نہیں۔ مرتد کا مال (فی الحال) کسی عادل شخص کے پاس رکھیں گے۔

وہ امور جن سے کافر نہ ہوگا: مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے ایک مسلمان کافر نہ ہوگا۔ دارالحرب میں داخل ہونا اور ران کے ساتھ شراب پینا اور سور کا گوشت کھانا، یہ کہنا کہ تم کو دیکھنا موت کے فرشتہ کو دیکھنے کی طرح ہے، دف وغیرہ کی آواز پر قرآن کی تلاوت، سفر میں جاتے ہوئے کوئے (وغیرہ) کی آواز سن کر لوٹنا، دانستہ بلا وضو یا نجاست کے ساتھ یا قبلہ کی طرف رخ کے بغیر نماز پڑھنا، جب کہ اسے حلال نہ سمجھے، جو چیز تحریم سے قبل بھی حلال رہ چکی ہو اس کے متعلق یہ تمنا کرنا کہ کاش وہ حلال ہوتی، اپنے کمر میں زُنّار (جنیؤ) باندھنا، یا مجوسی ٹوپی سر پر رکھنا عیسائیت کو آتش پرستی سے بہتر کہنا یوں کہنا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت دی تو میں اس میں داخل نہ ہوں گا۔ (تاہم تحقیراً یا بے نیازی کے ساتھ کہے تو کافر ہوگا)

طالب علم کا تختی پر قرآنی آیت کو تھوک سے مٹانا، (بعضوں نے اسے حرام قرار دیا ہے، بعضوں نے غیر حرام، اور بعضوں نے یہ تفصیل فرمائی کہ براہ راست اس پر تھوک کو مسح کرے تو حرام ہے اور کسی دوسری چیز پر تھوک کر پھر اس سے مٹائے تو جائز ہے۔ اسی طرح قرآن لکھی ہوئی کوئی چیز تبرکاً یا نجاست سے بچانے کے لئے چبا کر کھا جانا جائز ہے۔)

اسلام قبول کرنا: اسلام قبول کرنے کے لئے شہادتین کا اقرار ضروری ہے یعنی:

"اَشْهَدُ اَنْ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ" کہنا، بعضوں نے صرف "لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کافی قرار دیا ہے۔ امام شربینی فرماتے ہیں کہ اسے اقل پر محمول کریں گے (یعنی وہ اقل جملہ جس سے اسلام صحیح ہو جائے) شہادتین میں ترتیب ضروری ہے یعنی پہلے توحید پھر رسالت کی گواہی، اگر اس کے برعکس کرے تو صحیح نہیں، بعضوں نے دونوں میں موالات وتسلسل کو لازم قرار دیا ہے، تاہم حلیمی فرماتے ہیں کہ یہ شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ پر ایمان کے کافی مدت بعد رسول پر ایمان لائے تو صحیح ہے۔

جو کسی فرض یا حرام کے انکار کی وجہ سے کافر ہو جائے، اسے کلمہ کے اقرار کے ساتھ اپنے اس عقیدہ سے رجوع کرنا بھی لازم ہے ورنہ اس کا اسلام صحیح نہ ہوگا۔

عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں اسلام لانا بھی صحیح ہے، گرچہ وہ عربی جانتا ہو، اسی طرح گونگے کا اشارہ کافی ہے۔

اگر کسی غیر عربی شخص کو کلمہ عربی میں پڑھایا جائے اور وہ اس کے مفہوم سے آگاہ نہ ہو تو یہ کافی نہیں ہے۔ اگر محمد رسول اللہ کی جگہ، احمد رسول اللہ یا ابوالقاسم رسول اللہ پڑھے تو کافی ہے، اگر کہے: "میں محمد النبی پر ایمان لے آیا" تو یہ کافی ہے "اگر محمد الرسول پر ایمان لے آیا"، کہے تو کافی نہیں۔ الا اللہ میں اِلاَّ کی جگہ اس کے ہم معنی دیگر الفاظ مثلاً: غَیْرَ، سِوٰی، مَا عَدَا یا مَا خَلَا استعمال کرے تو یہ کافی ہے، مثلاً اِلٰهَ غَیْرُ اللّٰهِ۔

اگر کوئی کافر کہے: میں تم میں سے ہوں یا تمہارے مثل ہوں یا مسلم ہوں یا میرے ولی محمد ہیں یا مجھے ان سے محبت ہے، یا میں اسلام لے آیا، یا میں ایمان لے آیا، یا میں تمہاری طرح اسلام لایا، یا ایمان لایا، یا میں تمہاری طرح مسلم ہوں یا مومن ہوں یا میں محمد ﷺ کی امت میں داخل ہوں، یا تمہارا دین برحق ہے، یا جو کوئی اسلام کے مخالف ہو میں اس سے بری اور بیزار ہوں، تو یہ اسلام کا اعتراف نہ ہوگا۔

اگر کوئی لَارَحْمٰنَ اِلاَّ اللّٰه، یا لا باری الااللہ کہے (یعنی اللہ کے سوا کوئی رحمٰن نہیں، یا خالق نہیں) تو اسلام کے لئے یہ کافی نہیں ہے۔

اگر کہے: میں اس ذات پر ایمان لایا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں یا لاالٰہ الا الملک، یا لا الٰہ الا الرزاق، کہے تو اس

سے مسلمان نہ ہوگا۔

اگر کوئی کہے: آمَنْتُ بِاللّٰہِ (میں اللہ پر ایمان لے آیا) اوراس سے قبل کسی مذہب پر نہ تھا، تو اللہ پر ایمان لانے والا ہوا، اب آپ ﷺ کے رسالت کی گواہی دے، اور اگر مشرک تھا، تو اس سے مومن نہ ہوگا، بلکہ یہ بھی کہے: میں جو شرک کرتا تھا اس کا انکار کرتا ہوں۔

تنبیہ: عوام کی زبان سے لاعلمی کی وجہ سے بعض مرتبہ ایسے الفاظ ادا ہوتے ہیں، جو کفر کا سبب ہوتے ہیں، لہٰذا اہلِ علم پر لازم ہے کہ اُن کو اس سے تنبیہ کریں، شاید کہ معلوم ہونے کے بعد وہ اس سے اجتناب برتیں، تا کہ ان کے اعمال اکارت نہ جائیں، اور ہمیشہ کے شدید ترین عذاب میں مبتلا نہ ہوں، اس سے واقفیت کافی اہم ہے، کیونکہ جو شر سے واقف نہ ہوں، تو لاعلمی میں اس میں گرفتار ہو جائے گا۔ ہر شر کا سبب جہل اور ہر خیر کا سبب علم ہے۔

تکفیر: (کسی پر کفر کا حکم لگانا): مفتی پر لازم ہے کہ کسی کی تکفیر کے متعلق کافی احتیاط سے کام لئے، مکمل تحقیق کے بعد جب پختہ یقین حاصل ہو، تب جا کر کسی کی تکفیر کرے کیونکہ یہ بڑا پُر خطر اور اہم مسئلہ ہے، نیز عموماً کہنے والے کا قصد وہ نہیں ہوتا بالخصوص عوام کا، لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ حقیقتاً کسی کفریہ لفظ وعمل کے بغیر کسی کو کافر قرار دے اور اس طرح خود ہی کفر کا ارتکاب کر بیٹھے، ہمارے ائمہ کرام ہمیشہ اس سلسلہ میں احتیاط برتتے رہتے ہیں۔

کسی قوم کا لباس: کفار کی طرح ہیئت اور لباس کے استعمال کے متعلق علماء کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ان جیسا لباس ان کے مذہب کی طرف میلان اور شعائر کفر میں ان کے ساتھ تشبیہ کے قصد سے ہو یا اس لباس میں ان کے ساتھ ان کی عبادت گاہوں کی طرف جاتے ہو تو اس سے کافر ہو جائے گا، اگر ایسا قصد نہ ہو، بلکہ ان کے شعائر عید میں ان کو مشابہت کا قصد ہو، یا ان کے ساتھ کسی جائز معاملہ تک رسائی کا قصد ہو، تو گنہگار ہوگا اور اگر بلا قصد ایسا اتفاق ہو جائے، تو یہ مکروہ ہے۔ (اعانہ ۴/۱۳۲-۱۴۲، الفقہ المنہجی ۸/۱۰۴-۱۰۸، تحفہ مع الحواشی ۱۱/۳۵۷-۳۹۴، فتح الوھاب مع الجمل ۵/۱۲۱-۱۲۷، الاقناع مع البجیرمی ۴/۹۹-۲۰۷، بصیہ ۲۴۸، ترشیح ۳۷۴-۳۷۸، مغنی ۴/۱۳۳-۱۴۳)

حُدُود

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت انسان کو اپنی کثیر مخلوقات پر ایک خاص تکریم وتفضیل سے نوازا، جس کا ایک اہم مظہر یہ ہے کہ اس کے سر پر اس کائناتِ ارضی کی خلافت کا تاج رکھا۔ اس اہم ترین ذمہ داری کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے، جب کہ بنی نوع انسان کے مصالح کی ضمانت اور ان کے مفاسد کا دفاع وازالہ حاصل ہو، اور اس کے لئے بالکل لازم ہے کہ دین، نفس (جان)، عقل، نسل اور مال کی صحیح حفاظت و نگہداشت ہو، کیونکہ یہ پانچوں وہ بنیادی امور ہیں، جو اس روئے زمین پر اس نسل انسانی کی بقا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر واجب ذمہ داریوں کی ادائیگی وقیام کے لئے بالکل ضروری ہیں۔

دینِ اسلام ان پانچوں بنیادی امور کی مکمل محافظت اور اس پر حملہ آور مفاسد کے دفاع کا ضامن ہے اسی لئے کہا گیا کہ: اسلام مصالح کی تحصیل اور مفاسد کے ازالہ کے لئے آیا ہے، اور اس کے لئے مختلف احکام کو مشروع فرمایا، انہیں احکام میں حدود وتعزیرات بھی ہیں، جو ان امور خمسہ (پانچ بنیادی امور) کے خلاف ظلم وتعدی کا قدم اٹھانے والے نفوس کی تنبیہ کا باعث ہیں۔

سزاؤں کی قسمیں : اسلامی عقوبات وسزا کی دو قسمیں ہیں: حدود اور تعزیرات۔

حد : جو سزا شریعت کی جانب سے متعین ومقرر ہو، اسے حد کہیں گے، پس حد کے نام سے اس میں کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے۔ حدود چھ ہیں: حدزنا، حدقذف، چوری کی حد، شراب کی حد، ڈاکہ کی حد اور ردّت کی حد۔

تعزیر : جس سزا کی مقدار متعین نہ ہو، بلکہ حاکمِ وقت کی صوابدید پر موقوف ہو اسے تعزیر کہیں گے۔

زنا کی حد

زنا کبیرہ گناہ ہے، اور اس کی وجہ سے حد واجب ہوتی ہے۔

زنا کا ضابطہ جس میں حد واجب ہو: عضو مخصوص (ذکر) میں سے حشفہ (سپاری) کے بقدر کسی حرام فرج میں داخل کرنا جو طبعًا قابلِ شہوت ہو، اور اس میں کوئی شبہ نہ ہو۔ مذکر یا مؤنث کے دبر (پچھلی شرم گاہ) میں داخل کرے، تب بھی حد واجب ہے۔ بوس وکنار وغیرہ کی وجہ سے حد نہ آئے گی، صرف تعزیری سزا ملے گی۔

اپنی بیوی سے حیض، روزہ یا احرام میں صحبت کرنے سے حد نہ آئے گی۔ (گرچہ یہ صحبت حرام ہے)

صحبت شبہ : صحبتِ شبہ کی وجہ سے حدزنا کا نفاذ نہ ہوگا۔ مثلاً: اپنی شادی شدہ یا مجوسی یا محرم باندی سے صحبت، بیوی گمان کر کے پرائی عورت سے صحبت، مُکرَہ کی صحبت، ہر وہ صورت جس کو کسی عالم نے مباح قرار دیا ہو، جیسے بغیر گواہوں کے نکاح، یا بغیر ولی کے نکاح اور اسی طرح ہر وہ مخالف مسئلہ جس کی دلیل مضبوط ہو کسی جانور یا مردہ عورت سے صحبت کی وجہ سے حد عائد نہ ہوگی، کسی محرم سے نکاح کرے، تب بھی اس سے صحبت کی وجہ سے حد نافذ ہوگی۔

حد کے شرائط : زانی مکلف ہو، البتہ جو نشہ میں ہو، اسے حد لگے گی (گو وہ مکلف نہیں ہے) زنا کی حرمت کا علم ہو، اگر نو مسلم ہونے، یا مسلمانوں سے دور بسنے کی وجہ سے زنا کی حرمت سے لاعلم ہو، تو اسے حد نہیں لگے گی، بینہ یا اقرار کے ذریعہ زنا کا ثبوت۔

مُحصَن کی حد : اگر زانی مُحصَن ہو، تو اس کی حد سنگسار کرنا ہے، حتی کہ مر جائے جیسا کہ صحیحین وغیرہ سے ثابت ہے۔

مُحصَن : جو آزاد مکلف (گو ذمی ہو) نکاح صحیح میں اپنی بیوی کی اگلی شرم گاہ میں صحبت کر چکا ہو، وہ (اس باب میں) مُحصَن کہلائے گا، اسی طرح ان شرائط کے ساتھ جس بیوی سے صحبت ہو چکی ہو، وہ مُحصَنہ کہلائیگی۔ نکاح فاسد میں صحبت کرے، یا بچہ، پاگل یا غلام صحبت کرے، تو وہ محصن شمار نہ ہوگا۔ میاں بیوی میں سے ایک کامل اور ایک ناقص ہو، تو کامل محصن ہوگا۔ مثلاً کامل شخص نابالغہ سے نکاح کر کے صحبت کرے تو شوہر محصن اور بیوی غیر محصن ہوگی۔ اس کے برعکس ہو، تو بیوی محصن اور شوہر غیر محصن ہوگا۔

غیر محصن کی حد : غیر محصن کی حد سو کوڑے اور ایک سالہ جلاوطنی ہے۔ کوڑوں کا ذکر قرآن مجید میں ہے (دیکھئے سورہ نور آیت : ۲) اور جلاوطنی کا ذکر صحیحین وغیرہ کی بکثرت روایات میں موجود ہے۔ اور آئندہ خلفاء راشدین کا عمل بھی اس پر ثابت ہے۔ مسافت قصر یا اس سے زائد مسافت کے لئے جلاوطن کیا جائے۔

کسی بھی قسم کے غلام باندی کی سزا پچاس کوڑے اور نصف سالہ جلاوطنی ہے۔

زنا کا ثبوت : زنا کا ثبوت چار گواہوں کے ذریعہ یا خود زانی کے اقرار سے ہوگا۔ اگر اقرار کے بعد رجوع کرے تو حد ساقط ہوگی۔ اگر چار گواہ کسی عورت کے زنا کی گواہی دیں، اور چار عورت یہ گواہی دیں کہ وہ باکرہ ہے، تو شبہ کی وجہ سے اس پر حد نہ آئے گی۔ اگر

ایک گواہ زنا کا مقام گھر کا ایک گوشہ بتائے، اور دیگر گواہ دوسرا گوشہ، تو اس پر حد نہ آئے گی، بلکہ قاذف اور گواہوں پر حدِ قذف نافذ ہوگی۔

حدود کے نفاذ کا اصل حق حاکم وقت کو ہے، تاہم آقا اپنے غلام پر حد نافذ کرسکتا ہے۔

متفرقات: حد جاری کرتے وقت امام (حاکم) اور گواہوں اور مسلمانوں کی ایک جماعت کا وہاں موجود ہونا مستحب ہے۔

اگر اقرار سے ثبوت ہو، تو پہلے امام پھر دیگر لوگ رجم کریں، اور گواہوں سے ثبوت ہو، تو پہلے گواہ پھر امام پھر دیگر لوگ رجم کریں، اگر عورت کا زنا گواہوں کے ذریعہ ثابت ہو، تو سنگساری کی سزا میں اس کے لئے گڑھا کھودنا مستحب ہے، اقرار کی صورت میں مستحب نہیں ہے۔

بیماری یا شدید گرمی وسردی کی وجہ سے سنگساری کی سزا کو مؤخر نہ کیا جائے، تاہم کوڑوں کی سزا کو مؤخر کیا جائے۔ رجم سے قبل اسے توبہ کروائے، اگر نماز کا وقت ہو چکا ہو، تو اس کا حکم دے، اگر وہ سنت پڑھنا چاہے، تو دو رکعت کی مہلت دے، پانی مانگے تو پلائے، کھانا مانگے تو کھلانے کی ضرورت نہیں۔

لواطت: یعنی کسی مرد یا عورت کی پچھلی شرم گاہ میں بدکاری کرنا، فاعل کے حق میں یہ بھی صحیح قول کے مطابق زنا کے حکم میں ہے، لہٰذا لوطی محصن ہو تو سنگساری، ورنہ سو کوڑے اور یک سالہ جلاوطنی اس کی سزا ہوگی۔ بیوی کے علاوہ جس کے ساتھ یہ فعل کیا جائے (یعنی مفعول بہ) اسے سو کوڑے اور یک سالہ جلاوطنی کی سزا ملے گی، خواہ محصن ہو یا غیر محصن، نیز عورت ہو یا مرد۔

بیوی کے ساتھ لواطت کا عمل کافی احادیث کی روشنی میں کبیرہ گناہ ہے، تاہم اس کی وجہ سے حد نافذ نہ ہوگی، بلکہ حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا، جبکہ بار بار اس کا صدور ہو۔

جانوروں کے ساتھ بدکاری: راجح قول کے اعتبار سے کسی جانور کے ساتھ بدکاری کی صورت میں تعزیری سزا کا نفاذ ہوگا، حد عائد نہ ہوگی، کیونکہ یہ عمل سلیم الفطرت ذوق کے مطابق قابل میلان وشہوت نہیں ہے، نیز ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس میں حد کی نفی فرمائی ہے۔ (ترمذی نسائی) (الفقہ المنہجی ۸/۵۵-۶۴، المنہاج مع السراج ۵۲۱-۵۲۴، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۴۱-۱۴۹، اکفایۃ الاخیار ۲/۳۳۵-۳۴۶)

حد قذف (زنا کی تہمت کی سزا)

شریعت اسلامیہ لوگوں کے عزت وآبرو کی حفاظت کی بڑی اہمیت دیتی ہے، بس جو اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کی عزت پر کیچڑ اچھالے اور اس کے پاکیزہ دامن کو داغدار کرنا چاہے، اس پر حد کو مشروع فرمایا۔

تعریف: عربی میں قذف پھینکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اصطلاح شریعت میں کسی کی طرف بطور عار دلانے اور شتم کے زنا کی نسبت قذف کہلاتی ہے۔

حکم: کسی مسلمان پر زنا کی تہمت حرام ہے، خواہ سچا ہو یا جھوٹا، صحیحین وغیرہ کی حدیث میں اسے سات مہلک کبائر میں شمار کیا ہے۔

حد: تمام شرائط موجود ہوں تو قذف کی وجہ سے اسی (۸۰) کوڑے بطور حد مارے جائیں گے۔ (دیکھئے سورۃ نور: ۴-۵) غلام باندی کو چالیس (۴۰) کوڑے مارے جائیں گے۔

شرائط: قذف کرنے والے پر حد قذف کے نفاذ کے لئے قاذف (قذف کرنے والے) میں پانچ اور مقذوف (جس پر تہمت لگائی جائے) میں پانچ، اس طرح کل دس شرائط ضروری ہیں۔

قاذف کے شرائط: ۱- بلوغ، پس نابالغ پر حد نافذ نہ ہوگی، کیونکہ وہ غیر مکلف ہے، تاہم وہ ممیز ہو، تو تعزیری سزا دی جائے گی۔

۲- عقل، پس کسی پاگل قاذف پر حد نافذ نہ ہوگی۔ ناجائز طریقہ سے نشہ کرنے والے پر حد کا نفاذ ہوگا۔

۳- قاذف مقذوف کا اصل نہ ہو، پس کوئی اپنے بیٹے پوتے وغیرہ کو تہمت لگائے تو اس پر حد نہ آئے گی، لیکن حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا۔

۴- اپنے اختیار سے قذف کرے، پس جبر و اکراہ کی وجہ سے کرے، تو حد واجب نہ ہوگی۔

۵- قذف کی حرمت کا علم ہو، اگر کوئی نو مسلم ہونے کی وجہ سے یا علماء کرام سے دور دراز بسنے کی وجہ سے اس کی حرمت سے ناواقف ہو، اس پر حد نافذ نہ ہوگی، جو شخص حرمت سے واقف ہو، لیکن حد کے وجوب سے ناواقف ہو، تو حد نافذ ہوگی۔

مقذوف کے شرائط: (۱) مسلمان ہو، (۲) بالغ ہو، (۳) عاقل ہو، (۴) عفیف و پاکدامن ہو، یعنی اس سے قبل اس پر زنا ثابت نہ ہو، (۵) مقذوف اسے قذف کرنے کی اجازت نہ دے، اجازت کی وجہ سے گرچہ قذف جائز نہ ہوگا، لیکن شبہ کی وجہ سے حد ساقط ہوگی۔

تعزیر: مذکورہ بالا شرائط میں سے کوئی شرط ناپید ہو، تو حد ساقط ہوگی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ قاذف بالکل سزا سے بری ہو جائے گا، بلکہ حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا۔

قذف کے بعض الفاظ: تونے زنا کیا، اے زانی، تونے لواطت کی، اے لوطی، زید کے بیٹے سے کہنا کہ تو زید کا بیٹا نہیں ہے۔

سقوط حد: درج ذیل تین امور میں سے کسی ایک کی صورت میں حدِ قذف ساقط ہوگی۔

۱) مقذوف کے زنا پر گواہ قائم کرے یا خود مقذوف زنا کا اقرار کرے۔ قاذف مزید تین گواہ پیش کرے، یعنی قاذف سمیت چار گواہ ہوں، اور صراحتاً اس کے زنا کی گواہی دیں، تو حد قذف ساقط ہوگی اور مقذوف پر زنا کی حد نافذ ہوگی۔ اگر گواہوں کی کل تعداد چار سے کم ہو، تو یہ کافی نہیں، بلکہ ان تمام پر حد قذف نافذ ہوگی۔

۲) چونکہ یہ بندہ کا حق ہے، اس لئے اگر مقذوف معاف کردے، تو ساقط ہوگی۔

۳) اگر شوہر بیوی پر زنا کی تہمت لگائے، پھر لعان کرے، تو حد قذف ساقط ہوگی۔ (الفقه المنهجی ۸/۶۵-۷۰)

سَرِقَہ (چوری) کی حد

شریعت نے لوگوں کے مال کی حفاظت کے پیش نظر اس پر دست درازی کرنے والوں پر حد مقرر فرمائی ہے۔

سَرقہ: عربی میں سرقہ (چوری) خفیہ طور پر مال لینے کو کہا جاتا ہے۔ اور شرعاً: دوسرے کا مال ظلماً حرزِ مثل میں سے مقررہ شرائط کے ساتھ خفیہ طور پر لینے کو سرقہ (چوری) کہا جاتا ہے۔ (کسی چیز کے مناسب حفاظت کی جگہ کو اس کا حرزِ مثل کہا جائے گا)

پس غصب کرنا، اچک لینا، لوٹ لینا اور خیانت کرنا سرقہ نہ کہلائے گا۔

حد: آئندہ ذکر ہونے والے شرائط کے ساتھ حاکم کے سامنے چوری ثابت ہو جائے، تو اس چور پر حد کا نفاذ واجب ہے، یعنی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو جوڑ سے کاٹا جائے گا، (دیکھئے مائدہ : ۳۸) طبرانی میں ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے ایک چور لایا گیا تو ہتھیلی کے

طرف نکل جانا قطع طریق کہلاتا ہے، جبکہ آبادی سے دوری یا لوگوں کی کمزوری کی وجہ سے امداد کی گنجائش نہ ہو۔ چونکہ ان لوگوں کے ڈر سے لوگ اس راستہ سے گذرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے اسے قطع طریق (راستے سے روکنے والا) کہا گیا۔

قاطع طریق (ڈاکو): جو مکلف، احکام کا پابند شخص مال لوٹنے، یا قتل کرنے اور ڈرانے دھمکانے کے لئے بطور مخالفت وغلبہ اپنی قوت وشوکت پر اعتماد کرتے ہوئے میدان میں نکل آئے اور سامنے والوں کو کوئی مدد نہ حاصل ہو سکے، تو اس شخص کو قاطع طریق کہا جائے گا، خواہ ذمی، مرتد، مدہوش، غلام یا عورت ہو، نیز ایک شخص ہو، یا زائد۔

اگر بستی والے مدد کے لئے پہنچ سکتے ہوں، تو یہ قطع طریق نہ کہلائے گا۔ احکام کا پابند کہنے سے حربی کافر نکل گیا۔ وہ ہر حال میں مہدر الدم ہے، ان حرکات کے بعد بھی اسلام قبول کرے تو سابقہ گناہوں پر گرفت نہ ہوگی۔

قاطع طریق کے اقسام: ان کی شرارتوں کے اعتبار سے درج ذیل چار اقسام ہیں۔

۱- جو گذرنے والوں کو قتل کریں اور ان کا مال لوٹ لیں، ان کو قتل کر کے کسی اونچی جگہ تین روز تک سولی پر لٹکا دینا واجب ہے۔ اگر مسلمان ہیں تو غسل، تکفین اور نماز جنازہ کے بعد سولی پر لٹکائیں گے، کیونکہ اس عمل کی وجہ سے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوئے۔

۲- جو صرف قتل کریں (مال نہ لوٹیں)، ان کو بغیر سولی کے صرف قتل کیا جائے، یہ قتل حق اللہ کے قبیل سے ہے، لہٰذا مقتول کے ورثاء کے معاف کرنے سے ساقط نہ ہوگا۔

۳- جو صرف مال لوٹیں (قتل نہ کریں) ان کی سزا یہ ہے کہ دایاں ہاتھ ہتھیلی کے جوڑ سے اور بایاں پیر قدم کے جوڑ سے کاٹا جائے، دوبارہ ایسی حرکت کریں تو بایاں ہاتھ اور دایاں پیر کاٹا جائے۔ اس سزا کے لئے یہ شرط ہے کہ مال کی مقدار کم از کم پاؤ دینار کے برابر ہو، اس سے کم ہو تو قاضی تعزیری سزا دے۔

۴- جو صرف راہ گیروں کو ڈرائے دھمکائے، نہ قتل کرے اور نہ مال لوٹے، اسے جلاوطنی، قید یا کوئی اور مناسب تعزیری سزا دی جائے۔ اگر امام مصلحت سمجھے تو اسے معاف بھی کر سکتا ہے۔

توبہ: حکومت کی گرفت میں آنے سے قبل قاطع طریق اپنی حرکت سے تائب ہو جائے، تو قطع طریق اور ڈاکہ کے تعلق سے جو سزائیں ہیں، وہ ساقط ہو جائیں گی، یعنی قتل وسولی اور ہاتھ پیر کاٹنے کا وجوب، اب اس کا معاملہ ایک عام قاتل یا غاصب کی طرح ہوگا۔ پس ایک قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا، اگر مقتول کے ورثاء معاف کر دیں یا دیت وغیرہ پر راضی ہوں تو قتل ساقط ہو جائے گا۔ غاصب سے لوٹا ہوا مال وصول کر کے مستحقین کے حوالہ کیا جائے گا۔ اگر ڈاکہ کی اس مدت میں اس نے چوری، زنا یا شراب نوشی وغیرہ کا ارتکاب کیا ہو، تو توبہ کی وجہ سے ان جرموں کی سزا معاف نہ ہوگی۔ (دیکھئے سورہ مائدہ آیت: ۳۳-۳۴) (الفقہ المنہجی ۸/۸۲-۸۵، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۷۸-۱۸۳، منہاج مع السراج ۵۳۱، کفایۃ الاخیار ۲/۳۶۴-۳۶۶)

حرام مشروبات اور منشیات

کھانے پینے کی اشیاء میں اصل اباحت وحلت ہے، تاہم جن اشیاء کی حرمت پر کوئی دلیل موجود ہو، وہ حرام ہوں گی۔

حرام مشروبات: (۱) جو مضر ومہلک ہو، جیسے زہر وغیرہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ (دیکھئے البقرہ: ۱۹۳، اور النساء: ۲۹)

جوڑ (گٹے) سے اسے کاٹا گیا۔ دوسری مرتبہ چوری کرے تو بایاں پیر، تیسری مرتبہ بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ دایاں پیر کاٹا جائے، اس کے بعد بھی چوری کرے تو حاکم مناسب تعزیری سزا نافذ کرے۔

شرائط: چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے درج ذیل شرائط ضروری ہیں:

۱- چور مکلف یعنی عاقل و بالغ ہو، پس بچہ و پاگل پر حد عائد نہ ہوگی۔

۲- جبر و اکراہ کی وجہ سے چوری نہ کرے۔

۳- چوری شدہ مال بقدر نصاب ہو، یعنی ¼ دینار کے مساوی یا اس سے زائد (صحیحین وغیرہ)

۴- مال حرزِ مثل سے چوری کیا گیا ہو، حرز مثل یعنی وہ مال عادتاً جس جگہ محفوظ رکھا جاتا ہو، اس کا فیصلہ عرف کی روشنی میں ہوگا۔ مثلاً روپیہ کے لئے تجوری، کپڑوں کے لئے پیٹی (صندوق) وغیرہ، برتن اور بوسیدہ کپڑوں کے لئے گھر کا صحن، جانوروں کے لئے اصطبل تمام اصطبل کپڑوں کے لئے حرز مثل نہ ہوگا۔

۵- اس مال میں چور کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ نہ ہو، مثلاً مشترک مال کی چوری جس میں اس کی بھی شرکت ہو، اصول یا فروع کے مال کی چوری، بیت المال کے مال میں اس کا حق ہو تو ہاتھ نہ کٹے گا، ورنہ کٹے گا۔

۶- چوری شدہ مال پاک ہو، اگر شراب سور، کتا یا مردار کی بلا دباغت کھال کی چوری کرے تو ہاتھ نہ کٹے گا۔ نیز وہ مال شرعاً استعمال کرنا جائز بھی ہو، پس طنبور، آلاتِ موسیقی، بت اور صلیب کی چوری میں ہاتھ نہ کٹے گا۔

مندرجہ بالا شرائط میں سے کچھ مفقود ہو، تو حد تو نافذ نہ ہوگی، لیکن حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا۔

چوری کا ثبوت: درج ذیل کسی ایک طریقہ سے چوری کا ثبوت ہوگا۔

(۱) خود چور کا اقرار کرنا، اگر وہ اقرار سے رجوع کرے تو ہاتھ نہ کٹے گا، البتہ مال لازم ہوگا۔ چوری کا اقرار اس وقت مقبول ہوگا جب کہ مالک حاضر ہو اور مطالبہ کرے۔

(۲) بینہ، یعنی دو عادل مردوں کی گواہی، اگر ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں، تو مال ثابت ہوگا، لیکن ہاتھ نہ کٹے گا۔

(۳) مدعی کی یمین مردودہ، یعنی مدعی کسی پر چوری کا دعوی کرے، پھر مدعی علیہ انکار پر قسم نہ لے، جس کی وجہ سے یہ قسم مدعی کی طرف لوٹے اور وہ قسم لے تو مال کے ثبوت کی حد تک یہ قسم مقبول ہوگی، لیکن معتمد قول کے اعتبار سے اس کی وجہ سے اس کا ہاتھ نہ کٹے گا۔

مال کا ضمان: چوری ثابت ہو جائے اور مال موجود ہو، تو اسے لوٹانا ضروری ہے، اگر موجود نہ ہو، تو اس کا بدل دینا لازم ہے۔

تنبیہ: چور کا ہاتھ کاٹنا حق اللہ ہے، لہٰذا چوری کے ثبوت اور قاضی کے سامنے معاملہ پیش ہونے کے بعد اس حد کا نفاذ واجب ہے، اس کے اسقاط کی کوشش جائز نہیں ہے، لیکن قاضی تک پہنچنے سے قبل اسے معاف کرنا یا کرانے کی کوشش کرنا جائز ہے، جیسا کہ نسائی کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (الفقہ المنہجی ۸/۷۴-۸۱، منہاج مع السراج ۵۲۵-۵۳۱، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۶۳-۱۷۸، کفایہ ۲/۳۵۵-۳۶۴)

قاطع طریق (ڈاکو)

قطعِ طریق (ڈاکہ): مال لوٹنے، یا قتل کرنے یا ڈرانے کے لئے اپنی قوت وشوکت پر اعتماد کرتے ہوئے علانیہ میدان کی

(۲) جونجس ہو، جیسے خون پیشاب، حرام جانوروں کا دودھ، وہ سیال جس میں نجاست گرنے کی وجہ سے وہ متنجس ہو جائے۔

(۳) جونشہ آور ہو، یعنی مستی لانے والی مدہوش کرنے والی ہو، خواہ انگور سے بنی شراب ہو یا کسی اور چیز سے (دیکھئے سورہ مائدہ : ۹۰، ۹۱)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر نشہ آور مشروب حرام ہے'' (صحیحین)

مُسکِر (نشہ آور) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس جنس میں نشہ اور مستی لانے کی صفت موجود ہو پس اس کی قلیل مقدار اور ایک قطرہ بھی حرام ہوگا، گو اس سے نشہ نہ آئے، کیونکہ سنن وغیرہ کی احادیث میں صراحت ہے کہ: ''جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو، اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے''۔

تمام نشہ آور مشروب شافعی مسلک میں نجس ہیں۔

حکمت: انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے انتہا نعمتوں میں سے ایک عظیم ترین نعمت عقل ہے۔ جس کی وجہ سے اسے دیگر حیوانات پر خاص تفوق و برتری اور شرافت حاصل ہے، اور اسی کی روشنی میں اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی صحیح اصول اور ضابطہ کے مطابق گذر سکتی ہے۔

اور یہ نشہ آور اشیاء اس عظیم نعمت سے محروم کر کے حیوانیت سے بھی ذلیل تر گہرے گڑھے میں دھکیل دیتی ہیں، نتیجہ میں شہوات وفواحش، سب وشتم، دشمنی وبغض اور لڑائی جھگڑے جیسے سموم اثرات جنم لیتے ہیں، اور آپسی اخوت ومحبت کا رشتہ تار تار ہو جاتا ہے۔ مزید برآں اللہ کے ذکر وعبادت سے روک کر اس کی رحمت اور فضل واحسان سے دور لے جا کر پھینک دیتی ہیں اور شیاطین کے صف میں کھڑی کر دیتی ہیں۔ اسی لئے حاکم کی روایت میں آپ ﷺ اسے ہر شر کی کنجی قرار دیا، اور نسائی کی ایک حدیث میں حضرت عثمانؓ نے اسے ام الخبائث (سارے شر وفساد کی جڑ) قرار دیا۔ لہٰذا شراب نوشی کبیرہ گناہ اور دنیا وآخرت کی بربادی کا سبب ہے۔

حد: شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے ہیں، تاہم حاکم مناسب سمجھے تو اسے بڑھا کر اسی (۸۰) تک لے جا سکتا ہے، اور یہ زائد مقدار تعزیری سزا ہوگی۔ آپ ﷺ وصدیق اکبر سے چالیس، حضرت عمرؓ سے اسی (۸۰) اور حضرت عثمانؓ سے چالیس کوڑے مروی ہیں۔ (مسلم) پس فقہائے کرام نے چالیس کو اصل حد اور مزید کو تعزیر قرار دیا ہے۔ شرابی کو نشہ کی حالت میں سزا نہ دی جائے کہ اس سے عبرت وتنبیہ حاصل نہ ہوگی، بلکہ نشہ ختم ہونے کے بعد سزا دی جائے۔

حد کے شرائط: حد کے نفاذ کے لئے درج ذیل کسی ایک طریقہ سے شراب نوشی کا ثبوت ہونا چاہئے۔

(۱) دو عادل مرد کی گواہی، صرف ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی یا حاکم کے علم کی بنیاد پر حد نافذ نہ ہوگی۔

(۲) اقرار: شرابی خود اقرار کرے کہ میں نے شراب پی ہے۔

درج ذیل صورتوں میں حد کا نفاذ نہ ہوگا۔

جبراً کوئی پلائے، اسے پتہ ہی نہ ہو کہ یہ شراب ہے، شراب کی قئی کرنا، منہ سے شراب کی بو محسوس ہونا، کیونکہ غلطی یا اکراہ کا بھی احتمال موجود ہے۔

نفاذ کا مستحق: اس حد کو نافذ کرنے کا اصل حق دیگر حدود کی طرح حاکمِ وقت کو ہے۔ عوام الناس کو حد جاری کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تنبیہ: شراب یا کسی دوسرے گناہ کی حد کے مستحق شخص پر یہ لازم نہیں ہے کہ اپنے آپ کو سزا کے لئے علالت میں قاضی کے سامنے پیش کرے، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے پکی اور سچی توبہ کر کے اسے معاف کرا لے، جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

مُخدِّرات

تعریف : جس چیز کی وجہ سے عقل وفکر پر سستی وکسل مندی اور فتور طاری ہو (اور اسے سن کردے) اسے مخدر کہا جائے گا۔ جیسے ، بھنگ، افیون، اور حشیش وغیرہ منشیات۔

حکم : ان مخدرات کا کسی بھی طرح استعمال حرام ہے، کیونکہ یہ عقل وجسم کے لئے نقصان دہ اور مختلف امراض کا باعث ہیں۔ ابوداود کی حدیث میں اس کی ممانعت موجود ہے۔

سزا : مخدرات کی دنیوی سزا تعزیر ہے۔ جس کی نوعیت وشدت کی تعیین اسلامی عادلانہ عدالت کی صوابدید پر موقوف ہے، مثلاً قید وبند، مار وغیرہ، بشرطیکہ ادنی ترین حد تک نہ پہنچ جائے۔

تنبیہ : (۱) کسی شراب کو بطور علاج ودوا پینا جائز نہیں ہے، کیونکہ حدیث کی رو سے اللہ نے اس میں شفا نہیں رکھی ہے۔ (ابن ماجہ ، مسند احمد ، والبخاری تعلیقا) لیکن کسی دوسری دوا میں شراب شامل ہو اور اس کی کوئی صفت وخاصیت باقی نہ ہو، بلکہ اس میں ناپید ہو چکی ہو، اور معتبر ڈاکٹر کے بقول دوسری کوئی دوا اس کے قائم مقام موجود نہ ہو، تو ضرورت وحاجت کی وجہ سے اسے استعمال کرنا جائز ہے۔

(۲) جراحی (آپریشن) : اگر ڈاکٹر مریض کے آپریشن کے لئے سن کرنے پر مجبور ہو، اور اس کے لئے کسی مخدر کا استعمال ناگزیر ہو، تو اس کی گنجائش نکل آئے گی، خواہ اسے شرم گاہ کے راستہ داخل کرے یا پئے یا نگل لے۔ (الفقہ المنہجی ۳/۷۴-۸۶)

صِیال (حملہ کرنا، زبردستی کرنا، کود پڑنا)

آیت : " فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَااعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ..." (البقرۃ : ۱۹۴)

ترجمہ : "سو جو تم پر زیادتی کرے، تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے"۔

احادیث : (۱) "جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے، تو وہ شہید ہے" (متفق علیہ)

ایک حدیث میں ہے: "جس کا مال بلاحق کوئی چاہے، تو وہ قتال کرے اور قتل ہو جائے، تو وہ شہید ہے" (ابوداود ،نسائی ، ترمذی وصححہ)

(۲) "جو اپنے دین کی (طرف سے دفاع کی) وجہ سے قتل کیا گیا، وہ شہید ہے، جو اپنی جان بچانے میں قتل ہو جائے، وہ شہید ہے، جو اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے، وہ شہید ہے، جو اپنے گھر والوں (کی حفاظت اور ان کی طرف سے دفاع) کی وجہ سے مارا جائے تو وہ شہید ہے" (ابوداود ،نسائی ، ابن ماجہ ، ترمذی وصححہ ابن حبان ، والحاکم)

بیہقی کی ایک روایت میں ہے " (اس طرح دفاع کرنے میں حملہ آور کا اور ظالم کا جو نقصان ہو) تم پر اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں ہے" ابوداود وغیرہ کی روایت میں ہے: " نہ قصاص ہے اور نہ دیت" (نیل الاوطار ۵/۳۶۶)

صائل : جو ظلماً کسی کی جان، عضو، کا مال یا عزت وآبرو پر حملہ آور ہو اور اسے تکلیف پہنچانا چاہے، اسے صائل کہیں گے۔

دفاع : کوئی مسلم یا غیر مسلم، آزاد یا غلام، اور مکلف یا غیر مکلف شخص کسی معصوم جان، عضو، منفعت، بُضع (شرم گاہ)، اس کے مقدمات مثلاً: بوس وکنار اور معانقہ وغیرہ، مال، گو، تھوڑا ہو، یا اختصاص جیسے مردار کی کھال پر (ظلماً اور ناجائز طریقے سے) حملہ آور ہو، (یعنی اس کے حملہ آور ہونے کا غالب گمان ہو) تو اس کا دفاع کیا جائے، خواہ مذکورہ اشیاء دفاع کرنے والے کی ہوں یا کسی دوسرے کی، بخاری میں ہے: "اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم" اور صائل وحملہ آور ظالم ہے، لہٰذا اسے ظلم سے روکا جائے گا، یہی اُس کی نصرت ومدد ہے۔ محض کسی کی ایذاء رسانی کے وہم وشک کی بنیاد پر دفاع جائز نہیں ہے (معصوم یعنی شرعاً جو محفوظ ہے اور اسے تلف کرنا جائز نہیں ہے)

تنبیہ : اکراہ کی وجہ سے مجبوراً کوئی دوسرے کا مال تلف کرے تو مالک کو دفاع جائز نہیں ہے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ اپنے مال سے اس کی جان بچائے، جیسا کہ مضطر کو اپنا کھانا کھلاتا ہے، مالک اور مُکرَہ مُکرِہ (اکراہ کرنے والے) کا دفاع کر سکتے ہیں۔

بُضع (شرم گاہ)، آبرو، عصمت : کوئی اپنی بیوی کے علاوہ کسی سے صحبت وابرو ریزی یا اس کے مقدمات مثلاً بوس وکنار وغیرہ کا ارادہ کرے، تو اسے روکنا اور دفاع کرنا واجب ہے، چاہے وہ عورت اس کی بیوی ہو یا کوئی اور کیونکہ یہ امور مباح کرنے سے مباح نہ ہوں گے، اور زنا اکراہ کی وجہ سے مباح نہ ہوگا، پس کسی عورت پر حرام ہے کہ جو زنا کیلئے اس پر کود پڑے، اس کی موافقت وتابعداری کرے، خواہ اسے اپنی جان کا خطرہ ہو۔

جان : محقون الدم (جس کو قتل کرنا ممنوع ہے) مسلمان کے علاوہ کوئی (مثلاً: کافر، جانور، غیر محقون الدم مسلمان جیسے محض زانی، تارک نماز) کسی کے جان پر حملہ آور ہو (اور اسے قتل کرنا چاہے) تو اس کا دفاع واجب ہے، اگر یہ امکان ہو کہ کافر کے تابع ہونے سے وہ قید کرلے گا (قتل نہ کرے گا) تو یہ جائز ہے، دفاع واجب نہیں ہے، جب کہ دفاع وانکار کی صورت میں کافر اسے قتل کردے۔

اگر کوئی محقون الدم مسلم ایسا قصد کرے تو اس کا دفاع واجب نہیں ہے، بلکہ دفاع سے رک کر قتل ہو جانا جائز ہے، بلکہ روضہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسنون ہے، کیونکہ ابوداود کی حدیث میں ایسی صورت میں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں (قابیل وہابیل) میں سے بہتر کی طرح ہونے کا حکم موجود ہے۔ جن کا قصہ قرآن مجید میں موجود ہے (دیکھئے سورہ مائدہ، آیت: ۲۷-۳۰)، نیز حضرت عثمانؓ کو جب بلوائیوں نے محاصرہ کر کے گھر میں مقید کردیا، تو اپنے غلاموں کو دفاع سے منع فرمایا، جن کی تعداد (۴۰۰) تھی، اور فرمایا کہ جو ہتھیار پھینک دے وہ آزاد ہے، یہ واقعہ صحابۂ کرام میں مشہور ہوا، لیکن کسی نے نکیر نہیں فرمائی، تاہم محقون الدم مسلم کسی مسلمان کے عضو پر زیادتی کرنا چاہے تو دفاع واجب ہے، کیونکہ اس صورت میں شہادت حاصل نہ ہوگی (جس کی وجہ سے مر جانے کی اجازت تھی) اسی طرح اپنے قتل سے اھل وعیال اور بچوں کے حق میں مفاسد کا غالب گمان ہو تو اپنے جان کی طرف سے دفاع بصورت امکان واجب ہے۔

دوسرے کی شرم گاہ یا جان کی طرف سے دفاع اس وقت واجب ہے، جب کہ اسے اپنی جان کا خطرہ نہ ہو۔ اپنی جان کا خطرہ ہو تو بیٹے پر باپ کی طرف سے دفاع واجب نہیں ہے۔

دوسرے محترم شخص کی جان کی طرف سے دفاع کا حکم بھی اپنی طرف سے دفاع کی طرح ہے، جن صورتوں میں اپنا دفاع واجب ہے، اس کا بھی واجب ہے، اور جہاں اپنا دفاع واجب نہیں، دوسرے کا بھی واجب نہیں، بعض علماء کے خیال میں دوسرے کا دفاع قطعاً واجب ہے (جب کہ اپنی جان کا خطرہ نہ ہو) کیونکہ ایک احادیث میں ہے: "کسی کے سامنے کسی مسلمان کی تذلیل ہو، اور یہ اس کی نصرت نہ کرے، حالانکہ یہ اس کی نصرت پر قادر ہے تو اللہ تعالیٰ بروز قیامت برسر عالم اس کو ذلیل کریں گے"۔ (مسند احمد)

بادشاہ اور حکام پر عوام کے جان کی حفاظت اور اس کی طرف سے دفاع قطعاً واجب ہے۔

مال: مال پر کوئی حملہ کرے (اور لوٹنا یا برباد کرنا چاہے) تو اس کا دفاع واجب نہیں ہے (جب کہ غیر ذی روح ہو، یعنی گائے بکری وغیرہ نہ ہو) کیونکہ مال دوسرے کے لئے مباح کرنا جائز ہے۔ تاہم حاکم اور اس کے ماتحتوں کو رعایا کے مال کی جانب سے دفاع واجب ہے، اسی طرح اپنے مال سے دوسرے کا حق متعلق ہو، مثلاً رہن، اجارہ، تو دفاع واجب ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کسی کے پاس محجور علیہ (بچہ پاگل وغیرہ) وقف یا ودیعت کا مال ہو، تو اس کی طرف سے دفاع واجب ہے۔

صائل کسی جاندار کو تلف کرنا چاہے تو دفاع واجب ہے، جب کہ اپنی جان، یا آبروریزی کا خطرہ نہ ہو، بلکہ کوئی شخص خود اپنے جانور کو ناجائز طریقہ سے تلف کرنا چاہے، تو اسے روکنا واجب ہے۔

صائل کا ضمان: شرعی طریقہ سے دفاع کرنے میں صائل مارا جائے، تو اس کا خون رائیگاں جائے گا۔ قاتل پر قصاص، دیت، کفارہ، قیمت یا گناہ نہ ہوگا، کیونکہ شریعت کی جانب سے اسے دفاع کا حکم ہے اور اس طرح کا کوئی ضمان اس کے منافی ہے۔

فائدہ: اگر جان، عصمت اور مال پر حملہ ہو، اور بہ یک وقت تمام کی طرف سے دفاع ممکن نہ ہو تو جان کا دفاع بقیہ پر مقدم ہوگا، اور عصمت کی حفاظت مال پر مقدم ہوگی، اور زائد مال کم پر، مال پر مقدم ہوگا، اگر بہ یک وقت دو صائل دو جان یا دو شرمگاہ یا دو مال پر حملہ آور ہوں اور دونوں کا ایک ساتھ دفاع نہ ہو سکے، تو جس کا چاہے دفاع کرے۔

مسئلہ: کسی پر مثلاً گھڑا گرے اور وہ اسے توڑ دے، تو اس کا ضمان واجب ہے، گو اسے اپنے اوپر گرنے سے روکنا واجب ہو، یا بغیر توڑے اس سے بچنا ممکن نہ ہو، کیونکہ گھڑے کا اپنا کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ تاہم ایسی جگہ یا ایسی حالت پر رکھا ہوا ہو کہ رکھنے والے کی غلطی ہو اور وہ نقصان کا ذمہ دار ہو (مثلاً ڈھلان جگہ پر یا گرنے کی حالت پر) تو اس صورت میں اپنے اوپر گرنے کی وجہ سے توڑنے سے ضامن نہ ہوگا، بلکہ گھڑا گرنے سے کچھ نقصان ہو، تو رکھنے والا ضامن ہوگا۔

دفاع کی ترتیب: اگر ممکن ہو تو الأخف فالأخف طریقہ سے صائل کا دفاع کرے یعنی پہلے خفیف طریقہ سے دفاع کی کوشش کرے وہ کارگر نہ ہو تو اس سے شدید، ورنہ اس سے بھی شدید تر طریقہ سے دفاع کرے۔

مثلاً: پہلے بھاگ کر دفاع کرے (یا کسی قلعہ یا لوگوں کی پناہ لے) ورنہ اسے ڈانٹے پھر دوسروں سے مدد طلب کرے، پھر ہاتھ سے مارے، پھر کوڑے سے، پھر ڈنڈے سے، پھر اس کا کوئی عضو کاٹ دے (اس سے بھی مسئلہ نہ ہو تو) پھر آخر میں اسے قتل کر دے، کیونکہ یہ دفاعی کاروائی مجبوری وضرورت کی وجہ سے جائز قرار پائی، لہٰذا خفیف اور ہلکے دفاع سے مقصد حل ہو جائے، تو شدید وسخت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اگر دونوں باہم گتھم گتھا ہو جائے اور معاملہ اتنا سنگین ہو جائے کہ قابو میں نہ رہے تو ترتیب کی رعایت ساقط ہو جائے گی۔ اگر صائل حربی یا مرتد ہو، تو ترتیب کی رعایت کے بغیر ہی قتل کر سکتا ہے، کیونکہ اس کی کوئی حرمت نہیں اسی طرح خفیف طریقہ اپنانا ممکن نہ ہو، مثلاً حملہ کے وقت اس کے پاس صرف تلوار ہو، کوڑا یا ڈنڈا نہ ہو تو اسی سے دفاع کرے۔

اگر مال کی خاطر حملہ ہو، تو مال چھوڑ کر بھاگنا ضروری نہیں ہے، اگر مال سمیت بھاگ کر بچاؤ مشکل نہ ہو تو اس پر عمل کرے۔

ترتیب کا فائدہ: مذکورہ ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ خفیف اور کم درجہ کا دفاع کافی ہونے کے باوجود شدید درجہ کو اختیار کرے، تو یہ ضامن ہوگا۔

منہ سے کاٹنا: کوئی شخص کسی کا ہاتھ مثلاً اپنے دانت سے کاٹے، تو دونوں جبڑے جدا کر کے منہ کھولے اور چھڑائے اس طرح نہ ہو سکے تو جبڑے پر مار کر چھڑائے، پھر ہاتھ کھینچ لے، پھر اس کی آنکھ پھوڑے پھر جبڑا کاٹے، پھر اس کا خصیہ (فوطہ) دبائے، پھر اس

کا پیٹ پھاڑ دے۔

اگر ہاتھ کھینچنے کی وجہ سے کاٹنے والے کے دانت گر جائیں تو اسکے جان کی طرح سے رائیگاں ہے، گو کاٹنے والا معصوم ہو، کیونکہ کاٹنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، تاہم بغیر کاٹے اپنا بچاؤ اور خلاصی ناممکن ہو، تو بقول ابن ابی عصرون اس ایک صورت میں کاٹنا جائز ہوگا۔

حدیث: ''ایک شخص نے دوسرے کا ہاتھ کاٹا، تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ میں سے کھینچ لیا، تو اس کے دانت گر گئے، یہ جھگڑا آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں (دانتوں کی) دیت نہیں ملے گی'' (صحیحین)

کسی مکان میں جھانکنا: کوئی شخص گھر میں عریاں ہو، یا گھر میں اس کی بیوی یا کوئی محرم عورت موجود ہو، گو کپڑے پہنی ہو، اور کوئی بالغ یا قریب البلوغ شخص سوراخ، چھت، منارہ یا روشن دان وغیرہ سے اندر مکان میں عمداً جھانکے، اور یہ کسی ہلکی چیز جیسے کنکر پھینک کر جھانکنے والے کو مارے، اور اس سے وہ اندھا ہو جائے یا آنکھ کے قریب لگے، اور اس زخم سے وہ مر جائے، تو یہ نقصان رائگاں جائے گا، پھینکنے والے پر کوئی ضمان نہیں آئے گا، جب کہ جھانکنے والے کی بیوی، یا کپڑے پہنی ہوئی محرم یا کچھ اسباب اس گھر میں نہ ہو، مارنے سے قبل اسے ڈرانا مفید ہو تو پہلے ڈرانا واجب ہے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے: ''اگر کوئی تمہارے مکان میں جھانکے، اور تم نے اسے اجازت نہ دی ہو پھر اسے کنکر پھینک کر مارو، اور اس کی آنکھ پھوٹ جائے، تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا''۔

ایک حدیث میں ہے: ''نہ قود ہے اور نہ دیت'' (صححه، ابن حبان، والبیهقی)

اگر بیوی وغیرہ لباس میں ہو، یا کسی آڑ میں ہو تب بھی کنکر مارنا جائز ہے۔

اگر اتفاقاً یا خطاً نظر پڑے، یا مرد لباس میں ہو (ناف سے گھٹنے تک) یا مذکورہ لوگوں کے علاوہ کسی پر جھانکے، یا مسجد، غصب شدہ مکان، یا سڑک وغیرہ پر جھانکے، یا کھلے دروازے یا کشادہ روشن دان یا کشادہ جالی والی کھڑکی سے جھانکے، یا کنکر وغیرہ جیسی ہلکی چیز موجود ہوتے ہوئے ثقیل چیز مثلاً پتھر یا تیر پھینکے، یا اس مکان میں جھانکنے والے کی کوئی محرم عورت لباس میں موجود ہو یا اس کی بیوی یا کچھ اسباب موجود ہو یا آنکھ سے دور کسی حصہ پر کنکر لگے، تو ان تمام صورتوں میں اس کا نقصان رائگاں نہ ہوگا، بلکہ مارنے والا ضامن ہوگا، کیونکہ پھینکنے و مارنے والے کی غلطی ہے اگر جھانکنے والے کی محرم عورت کے بدن پر لباس نہ ہو، تو اسے کنکر وغیرہ مار سکتے ہیں۔ اگر عورت کسی ناجائز چیز کی طرف جھانکے تو اسے مارنے کی بھی یہی تفصیل ہوگی۔

کسی کی گفتگو پر کان لگانے والے کے کان پر، نابینا کی آنکھ پر اور تاریکی میں جھانکنے والے کی آنکھ پر کنکر وغیرہ مارنا جائز نہیں ہے۔

امام اذرعی کے بقول گھر میں مرد لباس میں ہو، تب بھی کنکر مار سکتا ہے، جیسا کہ حدیث کے عموم کا تقاضا ہے، جھانکنے والا ہٹ چکا ہو، تو اس پر کنکر مارنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ کوئی صائل حملہ سے رک جائے تو اب اسے مارنا جائز نہیں ہے، کنکر وغیرہ ہو تو پتھر وغیرہ سے مار سکتا ہے۔ اگر آنکھ پر یا اس کے قریب مارنا ممکن نہ ہو، یا اس سے وہ نہ ہٹے تو راجح یہ ہے کہ دوسرے کسی عضو کو مار سکتا ہے، اگر کنکر وغیرہ مارنے سے وہ نہ ہٹے تو دوسروں کو مدد کے لئے پکارے اگر وہاں کوئی نہ ہو تو مستحب ہے کہ اللہ کا واسطہ دے کر ہٹنے کے لئے کہے، اب بھی نہ ہٹے تو اسے ہتھیار وغیرہ سے مارنا جائز ہوگا، صحراء میں خیمہ کا حکم بستی میں مکان کے حکم کی طرح ہے۔

اگر اصول (یعنی والدین او پر تک) میں سے کوئی جھانکے، تو اسے مارنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ امام ماوردی ورویانی نے فرمایا، اگر مارے اور آنکھ پھوٹے تو ضامن ہوگا۔

تعزیر: سرپرست اپنے ماتحت کو، حاکم مجرم کو، شوہر بیوی کو یا استاد اپنے شاگرد کو بطور تعزیر و تادیب سزا دے، اور اس سے وہ مرجائے تو ان کے عاقلہ پر اس کا ضمان لازم ہوگا۔ کیونکہ اصل مقصد تادیب ہے، نہ کہ مارنا، اسی لئے یہ سزا انجام کی سلامتی کے ساتھ مشروط ہے، پس جب وہ مرگیا تو معلوم ہوا کہ یہ سزا میں حد سے تجاوز کرگیا، اگر ایسی مار سے مرے جو غالباً قتل کا سبب بنتی ہو تو اس پر قصاص عائد ہوگا (البتہ باپ دادا اوپر تک قصاص سے مستثنیٰ ہیں)

جراحی (آپریشن): ایک عاقل بالغ شخص اپنے بدن میں کھال اور گوشت کے درمیان جو پھوڑا (رسولی) اسے کاٹ سکتا ہے، تاکہ بدنمائی کا ازالہ ہو، جبکہ اس کا کاٹنا باقی رکھنے کے مقابلہ میں زیادہ پرخطر نہ ہو، یعنی کاٹنے میں کوئی خطرہ نہ ہو، یا نہ کاٹنے میں زیادہ خطرہ ہو، یا خطرہ صرف نہ کاٹنے میں ہو، یا دونوں خطرے برابر ہوں۔ اگر کاٹنا زیادہ پرخطر ہو، یا صرف اس میں خطرہ ہو، یا خطرہ کا صحیح اندازہ نہ ہو تو کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔

کوئی عضو سڑے گلے، یا کسی اور بیماری کے لئے آپریشن کی نوبت آئے، تو اس میں بھی اسی تفصیل کو مدنظر رکھا جائے گا۔

باپ دادا کمسن بچہ اور پاگل کے پھوڑے کو کاٹ سکتے ہیں، گو کاٹنے میں خطرہ ہو، جب کہ نہ کاٹنا زیادہ پرخطر ہو، دیگر لوگوں کو اس کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ انھیں غور و فکر کرنے کے لئے اتنی فرصت اور ان میں اتنی شفقت نہ ہوگی۔ اگر دونوں خطرے برابر ہوں، یا کاٹنے میں زیادہ خطرہ ہو یا خطرہ صرف کاٹنے میں ہو، تو کاٹنے کی اجازت نہ ہوگی۔

مجنون یا بچہ کے باپ دادا اور دیگر ولی مثلاً بادشاہ، اس کے نائب، وصی وغیرہ کو ایسے علاج کی اجازت ہے، جس میں کوئی خطرہ نہ ہو، گرچہ ترکِ علاج میں بھی خطرہ نہ ہو، مثلاً ایسا پھوڑا کاٹنا جس میں کوئی خطرہ نہ ہو، پچھنے یا سینگی لگوانا وغیرہ، مذکورہ جائز علاج کی وجہ سے اگر وہ بچہ یا مجنون مرجائے تو ان پر کوئی ضمان نہ آئے گا۔ اگر ولی ممنوعہ علاج کرے اور وہ مرجائے تو اس کے مال میں اس کی مغلظ دیت واجب ہوگی، کسی پر قصاص واجب نہ ہوگا۔

کان ناک میں سوراخ کرنا: امام غزالی وغیرہ نے صراحت فرمائی ہے کہ بچے اور بچیوں کے کان میں (زیورات کے لئے) سوراخ کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ بلا حاجت تکلیف پہنچانا ہے، لیکن طبرانی کی ایک روایت میں، جس کی سند کے راوی ثقہ و معتبر ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے ساتویں دن بچہ کے کان میں سوراخ کرنا سنت شمار کیا ہے، جو بچہ کے لئے جواز پر صریح دلیل ہے، تو بچی کے لئے بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، لہٰذا علامہ رملی وغیرہ بعض علماء نے جواز کو ترجیح دی ہے، ناک میں حلقہ (وغیرہ) ڈالنے کے لئے سوراخ کرنے کو علامہ ابن حجر مکی نے حرام قرار دیا ہے، بعض لوگ اسے زینت سمجھتے ہوں تو ان کا کوئی اعتبار نہیں، اس کے باوجود اگر کسی نے اس طرح سوراخ کرلیا ہو، تو اس میں زینت کے لئے نتھ ڈالنا اور اسے دیکھنا حرام نہیں ہے۔

طبیب (ڈاکٹر) کا ضمان: کسی عاقل بالغ شخص کی صریح اجازت سے طبیب اس کا علاج (یا آپریشن) کرے، جو تلف کا باعث بنے تو طبیب ضامن نہ ہوگا، جبکہ اس فن سے واقف و ماہر ہو یعنی اہلِ فن کے نزدیک اس سلسلہ میں اسکی خطا بالکل شاذ و نادر ہو۔

(۲) کسی کا کپڑا مثلاً ہوا میں اُڑ کر کسی شخص کے گود میں گر جائے، اور یہ اسے پھینک دے، تو ضامن ہوگا، کیونکہ اس پر واجب تھا کہ کپڑا مالک یا نائب ورنہ حاکم کے سپرد کرے۔

(۳) کسی کا جانور اپنی کھیتی میں داخل ہو، اور خود مالک نے اسے نہ چھوڑا ہو تو واجب ہے کہ جانور کو مالک کے سپرد کرے، مالک نہ ملے تو حاکم کے سپرد کرے، اگر اپنی جگہ سے بھگادے تو یہ ضامن ہوگا۔

(۴) کسی کا جانور دوسری کی ملکیت میں داخل ہو کر اسے لات مارے اور وہ مر جائے تو کھیتی باڑی تلف کرنے کی طرح ہے، یعنی جن صورتوں میں کھیتی باڑی کے تلف میں ضمان ہوگا، یہاں بھی ہوگا، ورنہ یہاں بھی نہ ہوگا۔

(۵) اگر اپنا جانور کسی کی کھیتی میں اس کی اجازت کے بغیر داخل کردے، اور وہ حاجت سے زائد اسے باہر نکال دے اور جانور ضائع ہو تو معتمد یہ ہے کہ اس پر ضمان لازم نہ ہوگا۔

ایذا رساں حیوان : جو حیوان مثلاً بلی، گدھا، کتا وغیرہ کسی کی چیز اچکنے وجھپٹنے یا مارنے اور زخمی کرنے وغیرہ کا عادی ہو، (یعنی دو تین مرتبہ ایسی حرکت کر چکا ہو، بعضوں کے نزدیک ایک مرتبہ بھی ایسا تجربہ ہو چکا ہو) تو دن یا رات میں وہ جو بھی نقصان پہنچاتے۔ (مثلاً بلی پرندے کو پکڑے، کھانا کھا جائے،) مالک یعنی جو اسے پال رکھا ہے، وہ اس نقصان کا ضامن ہوگا، جب کہ اسے باندھنے میں کوتاہی برتے، کیونکہ ایسے جانوروں کو باندھ کر دوسروں کو اس کے شر سے محفوظ رکھنا اس کی ذمہ داری تھی، اگر حیوان ایذاء رسانی کا عادی نہ ہو، اور اسے عموماً باندھنے کا معمول نہ ہو جیسے بلی وغیرہ، تو مطلق ضامن نہ ہوگا، ورنہ دن میں ضامن ہوگا، نہ کہ رات میں۔

بلی کسی کے مکان پر آکر رہنے لگے، لیکن وہ اس پر توجہ نہ دے، تو وہ ذمہ دار نہ ہوگا، لیکن اگر وہ پناہ دینے کے قصد سے اسے رکھے غائب ہو تو اس کی فکر و تلاش کرے تو یہ ضامن ہوگا۔ معتمد قول یہ ہے کہ اس طرح کے موذی جانوروں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، تاہم جس وقت وہ ایذاء پہنچا رہے ہوں، اس وقت صائل کی طرح اخف فالاخف طریقہ سے اسے دفع کریں گے، قاضی حسین نے ایسے موذی جانوروں کو فواسق خمس کی طرح مطلق مارنا جائز قرار دیا ہے۔ امام ابن عبدالسلامؒ نے بلی بار بار حد سے زیادہ ستائے تو اسے مارنے کا فتویٰ دیا، امام اذرعی نے اسی قول کو ایسی بلی کے متعلق اختیار کیا ہے، جو مہمل ہو، اسکا کوئی مالک نہ ہو۔

فوائد : (۱) امام قفالؒ نے فرمایا کہ پرندے کو اس کی خوش نوائی وچہچہاہٹ وغیرہ کے لئے پنجرہ میں مقید کرنا جائز ہے، جبکہ اس کی مناسب دیکھ بھال کرے۔

(۲) کسی کے گھر میں کاٹنے والا کتا یا سرکش جانور موجود ہو، اور کوئی شخص اس کی اجازت سے گھر میں آئے، اور یہ اسے اس بات سے آگاہ نہ کرے اور کتا اسے کاٹے، یا جانور لات مارے، تو صاحب خانہ ضامن ہوگا، اگر وہ شخص بلا اجازت داخل ہو، یا صاحب خانہ اسے جانور کی عادت سے باخبر کر چکا تھا، تو ضامن نہ ہوگا۔

(۳) امام نوویؒ نے امام ابن عبدالسلامؒ سے نقل فرمایا ہے کہ جو (ناجائز) ٹیکس وصول کرنے والے اور دیگر ظالم حاکموں کو زہر وغیرہ کھلا کر مار سکتا ہو، تو یہ جائز ہے، تاکہ لوگ اس کے ظلم سے نجات پائیں، کیونکہ جب صائل کو دفع کر سکتے ہیں، گو ایک درہم کی خاطر ہو اور قتل کی نوبت آئے تو ایسے سرکش ظالموں کو تو بدرجہ اولیٰ قتل کر سکتے ہیں، واللہ اعلم (بغیہ : ۲۵۰)

(۴) کسی مسلمان کو ڈرانا حرام ہے، گو بطور مزاح و مذاق ہو، کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے۔

موٹر کار کا حادثہ : موٹر گاڑیوں کے ذریعہ کسی کا مال، کھیتی باڑی وغیرہ تلف ہو، یا کوئی مر جائے یا زخمی ہو جائے، تو ڈرائیور پر مال اور کھیتی باڑ کا ضمان واجب ہوگا، خواہ گاڑی اس کی ہو یا کسی دوسرے کی، اور دیت ڈرائیور کے عاقلہ پر واجب ہوگی۔

اگر گاڑی چلاتے ہوئے ڈرائیور کی موت واقع ہو، اور نتیجہ میں حادثہ کی وجہ سے کسی کا جانی یا مالی نقصان ہو، تو ڈرائیور یا اس کے ورثاء وغیرہ اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

تنبیہ : جو دکھ درد میں ہو، اسے موت کی تعجیل (جلدی کرنا) حرام ہے، گو شدید اور برداشت سے باہر تکلیف ہو، کیونکہ شفا کا

امکان وامید موجود ہے۔

فائدہ: خطیب شربینی نے فرمایا کہ جو شخص جلتی ہوئی آگ میں ہو اور اس سے صرف غرقاب کرنے والے پانی کی طرف ہی ہٹ سکتا ہے (یعنی زندگی بچانے کی کوئی شکل ہی نہیں) اور آگ کے شعلوں پر صبر کے مقابلہ میں پانی میں غرق ہونا اس کے نزدیک ہلکا اور آسان ہو، تو وہ پانی کی طرف ہٹ سکتا ہے۔

(تحفہ مع الحواشی ۱۱/۵۴۳-۵۹۶، فتح الوہاب الجمل ۵/۱۶۵-۱۷۹، مغنی ۴/۱۹۴-۲۰۸، نہایہ مع الحواشی ۸/۲۳-۴۴، قلائد ۲/۳۴۶-۳۵۲، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۸۴-۱۹۱، الفقہ المنہجی ۸/۸۹-۹۷، بغیہ: ۲۵، ترشیح: ۳۹۰)

جہاد اور بعض دیگر فروضِ کفایہ

فرض کفایہ: یعنی ایسا فرض جس میں اصل مقصد اس عمل کی ادائیگی ہو، سواتنے افراد اسے انجام دیں کہ مقصد حاصل ہو جائے، تو یہ کافی ہے اور دیگر حضرات سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا، تاہم ثواب صرف انجام دینے والوں کو حاصل ہوگا۔

جہاد: کافروں سے جہاد فرض کفایہ ہے، اور عام حالات میں سال میں کم از کم ایک مرتبہ جہاد کرنا فرض ہے۔ جہاد وسیلہ ہے، اصل مقصد ہدایت ہے، کفار کا قتل مقصد نہیں ہے، حتی کہ جہاد کے بغیر دلائل پیش کر کے ہدایت پر لانا ممکن ہو، تو وہ جہاد سے بہتر ہوگا۔

غسل میت، تکفین وتدفین، نماز جنازہ اور لقیط کو اٹھالینا، یہ سب بھی فرضِ کفایہ ہیں، جن کا متعلقہ ابواب میں تذکرہ ہو چکا۔

علمی دلائل قائم کرنا: اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود، اللہ کے لئے واجب صفات، اللہ تعالیٰ کے حق میں محال صفات، نبوت کا اثبات، رسولوں کی صداقت، حساب کتاب، معاد اور میزان وغیرہ شریعت میں وارد امور پر علمی دلائل اور قطعی براہین قائم وپیش کرنا فرض کفایہ ہے۔ دینی مشکلات کو حل کرنا اور شبہات کو دفع کرنا بھی فرضِ کفایہ ہے۔ کسی مکلّف کے دل میں شک وشبہ داخل ہو، تو اس کا ازالہ اس پر متعین ہے، یعنی عقلی دلائل کی واقفیت حاصل کرے اور حسد، ریا، کبر وغیرہ قلبی بیماری کا علاج اور اس کے حدود واسباب کا علم حاصل کرے۔

قرآن وحدیث کے مطابق صحیح اور پختہ عقیدہ رکھنا ہر کسی پر فرض عین ہے علم کلام فرضِ عین نہیں ہے، اور صحابۂ کرام کبھی اس میں مشغول نہیں ہوئے، امام الحرمین فرماتے ہیں کہ دورِ اول کی طرح پاکیزہ اور صاف ستھرا ماحول ہوتا، تو ہم نے علم کلام میں مشغولی کو واجب نہ قرار دیا ہوتا، بلکہ شاید اس سے روکا ہوتا، لیکن اب جب کہ بدعات سر اٹھا رہے تھے، تو اس کی لہروں اور موجوں کو آزاد چھوڑ دینے کی گنجائش نہیں، بلکہ ایسی تیاری اور اسباب کی فراہمی ضروری ہے، جس کے ذریعہ دین حق کی طرف دعوت، اس کی صحیح ترجمانی اور مخالفین کے پیدا کردہ شبہات کا ازالہ ہو سکے، سو عقلی دلائل کی تحصیل، اس میں مشغولی اور شبہات کی تردید فرض کفایہ شمار ہوگی۔ امام شافعیؒ نے علم کلام کو جو حرام قرار دیا ہے، وہ اس میں زیادہ غلو اور حد سے آگے بڑھنے پر محمول ہے۔

فائدہ: فلسفہ، شعبدہ بازی، تنجیم (علم نجوم، احوال عالم معلوم کرنے کے لئے ستاروں کو دیکھنا) رَمَل (ایک علم ہے جس میں ریت پر لکیریں کھینچ کر آئندہ کے احوال کو معلوم کرتے ہیں) اور سحر (جادو) کا سیکھنا حرام ہے۔

اسلامی علوم: تفسیر وحدیث کی تحصیل اور فقہی علوم میں اتنی مہارت کہ قاضی (اسلامی جج) اور مفتی کے قابل ہو، فرض کفایہ ہے۔ ہر ایک کو اپنی حد تک ضروری مسائل کا علم حاصل کرنا فرضِ عین ہے۔ امام شافعیؒ نے تحصیل علم کو نفل نماز اور جہاد سے افضل قرار دیا ہے۔

تنبیه : بدنی علاج کیلئے علم طب (ڈاکٹری)، میراث وصیت کی تقسیم اور معاملات میں ضرورت کے بقدر علم حساب، **اصول فقہ**، نحو، لغت، صَرف، حدیث کے راویوں کے نام، جرح وتعدیل اور علماء کے اختلاف واتفاق سے واقفیت بھی فرض کفایہ ہے۔ علم منطق میں مشغولی کو کئی علماء نے حرام قرار دیا ہے۔

فائدہ : علمی فرض کفایہ کا مخاطب وہ شخص ہوگا، جو آزاد، مرد اور مکلف ہو، اور کند ذہن نہ ہو، نیز دیگر مشاغل سے کٹ کر یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں مصروف رہ سکتا ہو۔

امر بالمعروف اور نهی عن المنکر (بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا): معروف اور واجبات کا حکم کرنا اور حرام امور سے روکنا بالا جماع فرض ہے، جب کہ اپنے جان مال، عضو یا عزت وآبرو پر کوئی خطرہ نہ ہو، اسے کسی دوسرے پر اس منکر سے برتر مفسدہ وبگاڑ کا اندیشہ نہ ہو، اسی طرح اس بات کا امکان نہ ہو کہ برائی کا مرتکب ہٹ دھرمی اور ضد میں آکر مزید اس طرح کی برائی کریگا۔ امر بالمعروف کے لئے اس کا عادل ہونا شرط نہیں ہے۔ کسی کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے والا خود ان امور کا پابند ہو، یہ ضروری نہیں، کیونکہ اس پر خود اپنے نفس کو اور دوسروں کو سمجھانا ضروری ہے، اب اگر ایک میں (یعنی خود کو سمجھانے اور روکنے میں) کوتاہی ہو، تو اس سے دوسری ذمہ داری ساقط نہ ہوگی۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف حکومت کے ذمہ داروں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر مکلف مرد، عورت، آزاد اور غلام پر جبکہ وہ قادر ہو، یہ واجب ہے۔ نابالغ پر واجب نہیں تاہم وہ انجام دے تو ثواب ملے گا۔ یہ فریضہ بصورت امکان ہاتھ اور طاقت سے انجام دینا چاہئے، اگر اس سے عاجز ولاچار ہو، تو زبان سے، اس سے بھی عاجز ہو، تو آخری درجہ میں کم از کم اپنے دل میں اس پر کڑھے اور انکار کرے۔ جس کی طرف سے شرارت کا اندیشہ ہو، تو نرمی سے کام لے، اگر فتنہ کا ڈر ہو، تو دوسروں کا تعاون لے، ورنہ حاکم تک معاملہ پہنچائے۔ یہ کوئی شرط نہیں کہ سامنے والا اس کی بات مان لے، بلکہ ایک مکلف پر لازم ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے، گرچہ عبادت کے اعتبار سے یہ جانتا ہو کہ کچھ فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ آیت کی رو سے سمجھانا اور نصیحت کرنا مؤمنین کو نفع پہنچاتا ہے (دیکھئے سورہ ذاریات : ۵۵)

دقیق اور باریک امور میں امر ونہی صرف علماء کا کام ہے، نہ کہ عوام کا۔ ایک عالم صرف اسی بات سے روکے جس کے انکار پر تمام علماء متفق ہوں، اختلافی امور میں نہ روکے، تاہم کرنے والا خود اس عمل کو حرام سمجھتا ہو، تو روکے۔ جس عمل کی حرمت اختلافی ہو، اس کے مرتکب کو بطور خیر خواہی نرمی کے ساتھ اختلاف سے بچنے کی ترغیب دے تو اچھی بات ہے، جب کہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے اختلاف کا شکار نہ ہو، یا کوئی ثابت سنت ترک نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں اختلاف سے بچ نکلنا تمام علماء کے نزدیک مستحب ہے (یعنی مثلاً ایک عمل اپنے مسلک میں جائز ہو، لیکن کسی دوسرے مسلک میں حرام ہو، تو احتیاطاً اس سے بچنا بہتر ہے)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دینے والے کے لئے تحقیق وتجسس کرنا اور محض گمان کی وجہ سے کسی کے گھر میں گھس جانا منع ہے، بلکہ کوئی غلط بات سامنے آئے تو اسے روکے اور بدل دے۔ البتہ کوئی معتبر شخص مخفی انجام دی جانے والے کسی ایسے منکر کی خبر دے، جس میں حرمت کی پامالی ہو، اور آئندہ اسکا تدارک نہ ہو سکے، جیسے زنا، قتل، تو گھر میں گھس جانا اور تجسس کرنا واجب ہے۔

تنبیه : امام (حاکم) پر واجب ہے کہ محتسب مقرر کرے، جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے۔ محتسب پر لازم ہے کہ جو ظاہری شعائر میں سے کسی چیز میں کوتاہی کرے، اسے روکے، گو سنت ہو، جیسے نماز عید، اذان۔

کعبہ کا احیاء : ہر سال بعض مکلفین کا حج اور عمرہ کے ذریعہ کعبہ کو آباد رکھنا فرض کفایہ ہے، اتنی مقدار ہو کہ جس سے اس

شعار کا اظہار ہو۔

دفعِ ضرر: صاحب حیثیت لوگوں پر مسلمانوں کے ضرر کا دور کرنا فرض کفایہ ہے، جبکہ زکات اور بیت المال اور وقف وغیرہ کے ذریعہ یہ ضرورت پوری نہ ہو۔ مثلاً: برہنہ کے لئے لباس کا انتظام، بھوکوں کو کھلانا، علاج کے مصارف، معذور کے لئے خادم وغیرہ۔ لباس بدن کی ضرورت اور گرمی سردی کی مناسبت سے ہو، مذکورہ مواسات وغمگساری اور امداد اس پر واجب ہے، جس کے پاس اپنی یک سالہ ضروریات سے زائد مال ہو۔ (مضطر کی امداد کے لئے یہ قید نہیں ہے، جیس کہ گذر چکا)۔ اگر کسی کے پاس اتنا مال تو نہ ہو، لیکن مثلاً ماہانہ تنخواہ اتنی ملتی ہے، کہ ضروریات سے زائد ہو، تو اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی۔

تنبیہ: مذکورہ کسی ضرر کے ازالہ کے لئے کسی قادر شخص سے مطالبہ ہو، تو وہ انکار نہیں کرسکتا، گو وہاں دوسرا شخص موجود ہو، تا کہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے اور ٹالنے کی نوبت نہ آئے۔ لیکن کسی مفتی سے مسئلہ پوچھا جائے اور اس جگہ دوسرا مفتی موجود ہو، تو اسے جواب دینا ضروری نہیں ہے، کیونکہ نفس فطرتاً علم اور اس کی افادیت کو محبوب رکھتا ہے، لہٰذا اس میں ایک دوسرے پر ٹالتے رہنا کافی بعید ہے، بخلاف مال کے۔

گواهی: شرعی قاضی اور ججوں کو لوگوں کے حقوق دلوانے میں تعاون کرنا، گواہ بننا اور گواہی دینا فرضِ کفایہ ہے۔

صنعت وحرفت: تجارت، درزی کا پیشہ، خرید وفروخت، کاشت کاری وغیرہ امور فرض کفایہ ہیں۔ کیونکہ دنیا کا قیام انھیں اسباب پر موقوف ہے، اور دین کا قیام دنیا کے معاملہ پر موقوف ہے۔

سلام کا جواب: کوئی عاقل مسلمان (گو ممیز بچہ ہو) مکلف مسلمانوں کی جماعت کو (یعنی ایک سے زائد افراد کو) سلام کرے، (اور سلام کرنا اور جواب دینا مطلوب ومشروع ہو)، تو اس صورت میں جواب دینا فرض کفایہ ہے، مجمع میں سے کسی ایک شخص کا جواب دینا کافی ہے۔ اگر کسی ایک شخص کو سلام کرے، تو اس پر جواب دینا فرضِ عین ہے۔ کسی مسلمان کو جو کہ فاسق وبدعتی نہ ہو سلام کرنا مسنون ہے، ابوداود کی حدیث میں سلام کی ابتداء کرنے والے کو اللہ (کی رحمت) سے زیادہ قریب بتلایا ہے۔

آیت: "وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا" (النساء: ۸۶)

ترجمه: "اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو"۔

ایک حدیث میں ہے کہ گذرنے والے مجمع میں سے ایک شخص کا سلام کرنا، اور بیٹھے ہوئے حضرات میں سے ایک کا جواب دینا کافی ہے (ابوداود) ایک شخص جواب دے تو ثواب صرف اسے ملے گا، اور دوسروں سے گناہ وحرج ساقط ہوگا۔ صرف ممیز بچہ کے جواب دینے سے فرض ساقط نہ ہوگا۔

سلام کرنے کے الفاظ (ابتداء کے الفاظ): اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ، سَلَامُ اللهِ عَلَيْكَ، سَلَامِيْ عَلَيْكُمْ، سَلَامٌ عَلَيْكُمْ، عَلَيْكُمُ السَّلَامُ، عَلَيْكُمْ سَلَام (آخری دونوں الفاظ مکروہ ہیں تاہم جواب دینا فرض ہے)

اگر تنہا شخص کو سلام کرے یا جواب دے تو علیکم کی جگہ صرف علیک (تجھ پر) کہنا کافی ہے، لیکن ساتھ موجود فرشتوں کی وجہ سے جمع کا صیغہ یعنی علیکم (تم پر) کہنا مستحب ہے، مجمع کے سلام یا جواب میں صرف علیک کہنا کافی نہیں، بلکہ علیکم کہنا ضروری ہے۔

جواب کے الفاظ: وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ، عَلَيْكُمُ السَّلَامُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ، وَعَلَيْكُمْ سَلَام، عَلَيْكُمْ سَلَام، سَلَام عَلَيْكُمْ

جواب میں وعلیکم السلام کہنا (یعنی ابتداء میں واو کے ساتھ) افضل ہے، ابتداءً وعلیکم السلام کہنا صحیح نہیں، اور اس سلام کا جواب فرض نہیں ہے۔ سلام یا جواب میں صرف السلام یا صرف علیکم کہنا کافی نہیں ہے خواہ دوسرے لفظ کی دل میں نیت ہو۔ اگر کوئی السلام علیٰ سیدنا یا مولانا یا السلام عَلیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدیٰ یا السلامُ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ کہے تو جواب دینا فرض نہیں ہے، کیونکہ یہ سلام کا شرعی صیغہ نہیں ہے۔

اگر ملاقات پر دونوں بہ یک وقت علیکم السلام کہیں تو جو ان میں سے جواب کی نیت سے یہ نہ کہے، اسے دوسرے کا جواب دینا فرض ہے۔

کوئی شخص آتے وقت سلام کرے، یا جدا ہوتے وقت، دونوں صورتوں میں جواب فرض ہے، جیسا کہ سلام کرنا سنت ہے۔

سلام اور جواب کے الفاظ میں وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ وَمَغْفِرَتُهٗ کا اضافہ مسنون ہے، اگر سلام کرنے والا یہ اضافہ کرے، تب بھی جواب میں یہ اضافہ واجب نہیں ہے۔

بهره : کسی بہرہ کو سلام کرے تو الفاظ کے ساتھ اشارہ بھی کرے، تا کہ وہ سمجھے اور جواب دے۔ بہرہ کسی کو سلام کرے تو جواب میں الفاظ اور اشارہ دونوں واجب ہیں، اگر اس کے منہ پر دیکھنے کی وجہ سے مثلاً اسے اس کے جواب کا اندازہ ہو جائے تو اشارہ واجب نہیں ہے۔

گونگا : گونگے کا اشارہ میں سلام کرنا اور جواب دینا معتبر ہوگا۔

اتصال : سلام اور جواب میں عقد (خرید وفروخت وغیرہ) کے ایجاب وقبول کی طرح اتصال شرط ہے۔ (یعنی زیادہ فاصلہ نہ ہو) اگر فاصلہ ہوا تو (جواب فوت ہو گیا اب) اس کی قضا نہیں۔

کسی کو مختلف گروہ (بہ یک وقت) سلام کریں، اور یہ سب کے جواب کی نیت سے ایک مرتبہ وعلیکم السلام کہے تو کافی ہے۔ اگر یکے بعد دیگرے سلام کریں، اور زیادہ افراد ہوں تو ایک جواب سب کے لئے کافی نہ ہوگا۔ کیونکہ مشروط اتصال موجود نہیں ہے۔

فائده : پاگل اور نشہ میں مست شخص کو جواب دینا واجب نہیں ہے، اسی طرح فاسق اور بدعتی کے سلام کا جواب بھی واجب نہیں تا کہ اس سے ان کو یا دوسروں کو زجر وتنبیہ حاصل ہو۔

تنبيه : اگر کوئی ذمی کسی مسلم کو سلام کرے تو، اسے وَعَلَيْكَ، یا عَلَيْكَ کہنا واجب ہے، جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی حدیث میں اس کا حکم موجود ہے، لیکن امام بلقینیؒ، اذرعیؒ، اور زرکشیؒ نے اسے مسنون قرار دیا ہے۔

اشاره : صرف ہاتھ وغیرہ کے اشارہ سے سلام کرنا خلاف اولیٰ ہے اور اس کا جواب فرض نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح سلام سے ترمذی ونسائی کی حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ لفظ اور اشارہ کو جمع کرنا افضل ہے۔ جو نماز میں یا دور ہونے یا گونگا ہونے کی وجہ سے لفظاً جواب نہیں دے سکتا، اسے اشارہ میں جواب دینا مشروع ہے۔

فائده : اگر دو آدمی ایک دوسرے کو بہ یک وقت سلام کریں، تو دونوں پر جواب لازم ہے، اگر آگے پیچھے کریں، تو دوسرے کا سلام بطور جواب کافی ہے، البتہ وہ اس سے ابتدا کا یا ابتدا و جواب دونوں کا قصد کرے، تو جس نے پہلے سلام کیا، اس پر جواب لازم ہے۔

سلام کے آداب : آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''چھوٹا بڑے کو، سوار شخص چلنے والے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے شخص کو اور قلیل، کثیر کو (چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو) سلام کرے''۔ (صحیحین) حدیث کی ترتیب کے مطابق سلام کرنا مستحب ہے۔ اگر کوئی اس کے برعکس کرے، تو یہ مکروہ نہیں ہے، گو خلاف سنت ہے، مذکورہ ترتیب اس وقت ہے، جبکہ راستہ میں ملاقات ہو، لیکن اگر کسی بیٹھے ہوئے

شخص کے پاس کوئی آئے تو آنے والا سلام کرے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا قلیل ہو یا کثیر، جوڑکا ہوا ہو یا لیٹا ہوا ہو، وہ بھی بیٹھے ہوئے کی طرح ہے۔ اگر قلیل پیدل اور کثیر سواروں میں ملاقات ہو، تو دونوں میں تعارض ہے۔ (اور ابتداء میں دونوں برابر ہوں گے، اور جو پہل کرے اسے فضیلت حاصل ہوگی)

غائبانہ سلام: اگر کسی کے ذریعہ سلام کہلوائے یا خط میں سلام لکھ کر روانہ کرے تو اس کا جواب بھی لازم ہے۔ جو قاصد دوسرے کا سلام لائے جواب میں اسے بھی شامل کرنا مستحب ہے، پس اس طرح جواب دے: وَعَلَيْكَ وَعَلَيْهِ السَّلَامُ ۔کوئی شخص کسی کے سلام کو دوسرے تک پہنچانے کی ذمہ داری لے، تو پہنچانا اس پر لازم ہے، کیونکہ یہ ایک امانت ہے۔

نمازی کا سلام: نمازی سلام پھیرتے وقت پاس موجود حضرات پر سلام کی نیت کرے، تب بھی اس کا جواب لازم نہیں ہے۔

عورت اور سلام: کسی عورت کا عورت کو، یا اپنے محرم رشتہ دار کو، یا آقا کو، یا شوہر کو سلام کرنا مسنون ہے۔ اسی طرح غیر محرم کو بھی جب کہ عورت بوڑھی ہو اور قابلِ شہوت نہ ہو۔ ان تمام صورتوں میں مرد کے سلام کا جواب اس پر لازم ہے۔ اگر کوئی قابلِ شہوت عورت تنہا ہو، تو اسے کسی اجنبی مرد (غیر محرم) کو سلام کرنا، یا اس کے سلام کا جواب دینا حرام ہے، اور اس مرد پر اس عورت کو سلام کرنا، یا اس کے سلام کا جواب دینا مکروہ ہے۔ اگر عورت ایک سے زائد ہوں، یا مرد ایک سے زائد ہوں، تو سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

فائدہ: درج ذیل لوگوں کو سلام کرنا مسنون نہیں ہے۔

قضاء حاجت کرنے والا جو کھانا کھا رہا ہو، سونے والا، صحبت کرنے والا، جو حمام میں نظافت حاصل کر رہا ہو، نمازی، سجدہ کرنے والا، تلبیہ پڑھنے والا، مؤذن، جو اقامت کہہ رہا ہو، اونگھنے والا، خطیب، جو خطبہ سن رہا ہو، جو دعا میں کھویا ہوا ہو، حاکم کے روبرو موجود فریقین۔

مذکورہ افراد کو کوئی سلام کرے تو ان پر جواب واجب نہیں ہے، بجز اس شخص کے جو خطبہ سن رہا ہو، کیونکہ اس پر جواب لازم ہے، تلبیہ پڑھنے والے کو لفظاً سلام کا جواب دینا مستحب ہے، مؤذن اور نمازی کو مستحب ہے کہ اشارہ سے جواب دیں ورنہ فارغ ہونے کے بعد لفظاً جواب دیں جب کہ زیادہ دیر نہ گذری ہو۔ کھانے والا شخص لقمہ نگلنے کے بعد دوسرا لقمہ منہ میں رکھنے سے پہلے اسے سلام کرنا مسنون ہے۔ اور اس صورت میں جواب واجب ہے، لقمہ چباتے یا نگلتے وقت سلام مسنون نہیں ہے۔ قضاء حاجت اور جماع کی حالت میں جواب مکروہ ہے۔

قرآن کی تلاوت کرنے والا، مدرس اور طلبہ کو سلام کرنا مسنون اور ان کو جواب دینا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص تلاوت میں بالکل محو اور تدبر میں مستغرق ہو، تو امام اذرعی کا خیال ہے کہ یہ بھی دعا میں محو شخص کی طرح ہے۔ (یعنی اسے سلام کرنا مستحب نہیں ہے۔)

فوائد: (۱) کسی گروہ میں بعض کی تخصیص کر کے سلام کرنا یا جواب دینا مکروہ ہے۔

(۲) عجمی (غیر عربی) زبان میں سلام کرنا جائز ہے جبکہ مخاطب سمجھے، گو عربی میں سلام پر قادر ہو، اور اس سلام کا جواب فرض ہے، کیونکہ یہ بھی سلام ہی کہلائے گا۔

(۳) کسی ذمی (غیر مسلم) کو سلام کرنا حرام ہے، اگر سلام کے بعد پتہ چلا کہ وہ ذمی ہے، تو اس سے یہ کہنا مستحب ہے: میں نے اپنا سلام واپس لیا، یا میرا سلام لوٹا دو۔

(۴) اگر مسلمانوں کے درمیان کوئی غیر مسلم بھی ہو، تو سلام کرتے وقت دل میں اس کا استثناء کرے۔

(۵) کسی گھر میں داخل ہو، تو گھر والوں کو سلام کہنا سنت ہے۔

(۶) انسانوں سے خالی کسی جگہ داخل ہو، تو یہ کہنا مستحب ہے: اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِيْنَ

(۷) بلا عذر سلام کے علاوہ کسی دوسرے الفاظ سے ابتداء نہ کرے: مثلاً صبح بخیر، اوران الفاظ کا جواب واجب نہیں ہے، اگر جواب میں دعا دے تو بہتر ہے، البتہ اس کے سلام نہ کرنے کی وجہ سے تادیباً جواب نہ دینا بہتر ہے۔

(۸) ''اَطَالَ اللّٰہُ بَقَاءَكَ '' (اللہ تمہیں طویل زندگی دے) کے ذریعہ کسی بزرگ، صاحب علم یا عادل حکمراں کے لئے دعا دینا بہتر ہے، ورنہ مکروہ ہے۔

(۹) کسی سے ملاقات پر پشت جُھکانا مکروہ ہے، کسی کی دینی فضیلت مثلاً زہد وتقوی، وغیرہ کی وجہ سے اس کا ہاتھ چومنا (بوسہ لینا) مستحب ہے، مال ودولت اور جاہ وغیرہ کی وجہ سے مکروہ ہے، کمسن بچہ کے گال کا بوسہ لینا، گو دوسرے کا بچہ ہو، مستحب ہے، نیز اپنے اصول وفروغ کا شفقت ورحمت سے بوسہ لینا مستحب ہے۔ تبرکاً کسی نیک میت کے چہرہ کا بوسہ لینے میں حرج نہیں۔

(۱۰) آنے والے میں کوئی ظاہری فضیلت ہو، مثلاً: علم، دین داری، شرف، باپ دادا وغیرہ ہونا تو اکرام واحترام کے طور پر اس کے لئے کھڑے ہونا مستحب ہے، نہ کہ ریا و بڑائی کے طور پر۔ آنے والے کو یہ تمنا کرنا کہ لوگ مجھے دیکھ کر کھڑے رہیں، یعنی وہ بیٹھ جائے اور دیگر لوگ کھڑے ہی رہیں جیسا کہ جابروں کی عادت ہوتی ہے، حرام ہے۔

(۱۱) ملاقات کے وقت بشاشت کے ساتھ مصافحہ اور مغفرت وغیرہ کی دعا مستحب ہے۔

(۱۲) کسی کے گھر جانا ہو اور دروازہ بند ہو، تو سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے سلام کرے، پھر اجازت چاہے، اگر جواب نہ ملے تو تین مرتبہ اس عمل کو دوہرائے، اگر اجازت مل جائے تو ٹھیک، ورنہ لوٹ جائے، اگر اندر سے پوچھا جائے کہ کون ہے؟ تو اپنا نام وغیرہ لیکر صراحت کرے، کہ وہ پہچان سکے، میں فلاں شیخ یا فلاں قاضی ہوں کہنا، یا اپنی کنیت بیان کرنے میں حرج نہیں، جبکہ اس کے بغیر پہچانا نہ جائے۔ صرف میں ہوں، یا خادم ہے وغیرہ کہنا مکروہ ہے۔

(۱۳) نیک حضرات، پڑوسی جو کہ بدکار نہ ہوں، بھائی بند اور رشتہ داروں کی ملاقات اور ان کا اکرام کرنا مستحب ہے، بایں طور پر کہ نہ اسے پریشانی ہو اور نہ انھیں ان سے اپنی ملاقات کا مطالبہ بھی مستحب ہے۔ مریض کی عیادت مستحب ہے۔

(۱۴) چھینک آئے تو ہاتھ یا کپڑا وغیرہ منہ پر رکھنا، اور حتی الامکان آواز پست کرنا مستحب ہے، چھینک کے بعد الحمد الله کہے، اگر نماز میں ہے، تو آہستہ کہے، اگر پیشاب یا صحبت وغیرہ کررہا ہو، تو دل میں کہے، چھینکنے والا الحمدالله کہے، تو تین مرتبہ تک اسے جواب دے، یعنی يَرْحَمُكَ الله (اللہ تجھ پر رحم فرمائے) کہے، اور چھینکنے والا جواب میں کہے: يَهْدِيكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ (اللہ تمہیں ہدایت بخشے اور تمہارے احوال درست کرے) یا کہے: يَغْفِرُ اللهُ لَنَاوَلَكُمْ (اللہ ہمیں اور تمہیں بخش دے) دونوں کو جمع کرنا بہتر ہے، کوئی مسلسل تین سے زائد مرتبہ چھینکے، تو بعد میں جواب سنت نہیں، بلکہ کہے کہ آپ کو زکام ہے، اور اسے عافیت کی دعا دے۔ جو شخص چھینکنے والے سے پہلے ہی الحمدالله کہے، وہ دانت، پیٹ اور کان درد سے محفوظ رہے گا۔

(۱۵) جمائی ناپسندیدہ ہے، حتی الامکان اسے روکنے کی کوشش کرے، نہ رکے تو ہاتھ وغیرہ سے منہ چھپائے۔ آہ کرتے ہوئے منہ کھول کے اطمینان سے جمائی لینے کی مذمت وارد ہوئی ہے، اور اس ہیئت سے شیطان خوش ہوکر ہنستا ہے۔

(۱۶) کسی سے للہ محبت ہو، تو اسے اس کی اطلاع دینا مستحب ہے، جو اپنے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اسے دعا دے۔ جلیل القدر عالم یا بزرگ جیسی شخصیت کو اس طرح کہنے میں حرج نہیں: فِدَاکَ اَبِی وَاُمّی (میرے والدین آپ پر قربان)

مذکورہ بالا مسائل کے دلائل میں صحیح احادیث بکثرت موجود ہیں۔

جہاد

تعریف: کسی بھی مقصد کی تحصیل کے لئے کوشش وسعی اور جدوجہد کرنا لغت میں جہاد کہلاتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں اسلامی نظام کے قیام، اسلام کی سربلندی اور تمام دنیا میں شریعتِ اسلامیہ کی بالادستی وقیادت کے لئے جدوجہد کرنا جہاد کہلاتا ہے۔

جہاد کے انواع: (۱) تعلیمی جہاد، یعنی اسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت کرنا اور اس کے خلاف پیدا کئے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ اور اس کی تردید۔

(۲) اسلامی معاشرہ میں امن وامان کے قیام کی خاطر مالی قربانی۔

(۳) دفاعی قتال: مسلمانوں کے دین پر حملہ آور دشمنوں سے قتال کرنا۔

(۴) ہجومی قتال: دیگر اقوام کو اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لئے ان کے علاقوں میں پہنچنے کی صورت میں جو حُکّام اور عوام اس میں آڑے آئیں، ان سے قتال کرنا۔

(۵) نفیرِ عام (دشمن کے مقابلہ کے لئے عوام کا اٹھ کھڑا ہونا) جس وقت دشمنانِ اسلام ظلماً مسلمانوں کے علاقہ پر ٹوٹ پڑیں، اور ان کو اپنے وطن وعقیدہ سے بے دخل کرنا چاہیں، تو تمام مسلمانوں کو اجتماعی طور پر مقابلہ ضروری ہے۔

ترغیب وفضیلت: جہاد کی فضیلت واہمیت اور شہیدوں کے مرتبہ کے متعلق بکثرت آیات واحادیث وارد ہیں۔

فرمانِ باری ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ'' (التوبۃ : ۱۱۱)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی، وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں...'' ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو، اور اللہ سے عافیت مانگو، پھر جب دشمن سے ملاقات ہو تو صبر کرو، اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ تلے ہے'' (صحیحین) ایک روایت میں اللہ کے راستے میں صبح یا شام ایک مرتبہ نکلنا دنیا ومافیہا سے بہتر بتلایا۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ نے نیک وبد ہر امیر کی ماتحتی میں جہاد کو واجب قرار دیا ہے۔ (ابوداود) اور ایک جگہ ارشاد ہے: ''اپنے جان ومال اور زبان سے مشرکین سے جہاد کرو'' (ابوداود نسائی)

جہاد کی تدریجی تاریخ

آپ ﷺ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں دعوتِ اسلام پیش کرتے رہے، اس دور میں تمام مظالم کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہے اور کوئی جوابی کاروائی انجام نہ دی، ہجرت کے بعد دفاعی قتال کی اجازت ملی (دیکھئے سورہ بقرہ : آیت : ۱۹۰، اور سورہ حج : آیت : ۳۹-۴۰)

پھر اللہ تعالیٰ نے بصورت ضرورت ابتداءً بھی مشرکین سے قتال کی اجازت مرحمت فرمائی، سوائے حرام مہینوں کے (یعنی محرم، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے علاوہ) (دیکھئے سورۃ توبہ : ۵) یہ صلح حُدَیبیہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس بعد بغیر کسی وقت اور جگہ کی قید

وبند کے جہاد کو مشروع قرار دیا۔(دیکھئے سورۃ بقرہ : ۱۹۱)

جہاد کی حکمت : مسلمانوں کے ایمان کا امتحان، انسانیت کو لوگوں کی بندگی اور ظلم وستم اور گمراہی کی تاریکی سے نجات دلانا اور ایمان کی روشنی اور عدل وانصاف کی فضا کو عام کرنا، لوگوں میں اس شعور کو بیدار کرنا کہ روئے زمین اور سلطنت حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی ہے، لہٰذا یہاں اسی کے احکام کا نفاذ ہونا چاہیے، انسانی احکام وقوانین کے نفاذ اور احکام الٰہی سے روگردانی کی وجہ سے طاری مسموم وشیطانی وظالمانہ ماحول کا خاتمہ کر کے ایک عادلانہ وسکون بخش ماحول کو پیدا کرنا...وغیرہ...

شرائط : جس صورت میں جہاد فرض کفایہ ہو، درج ذیل شرائط جس میں ہوں گے، اس پر جہاد واجب ہوگا،

(۱) اسلام (۲) تکلیف، سو کسی بچہ یا پاگل پر جہاد واجب نہیں، جنگ احد کی موقع پر حضرات ابن عمر کی عمر ۱۴ برس ہی تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے انھیں شرکت کی اجازت نہ دی (صحیحین) (۳) مرد ہونا، عورت کی کمزوری کی وجہ سے ان پر واجب نہیں، نیز فرض کفایہ کی ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے مرد کافی ہیں، حضرت عائشہؓ نے جہاد کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے حج مبرور کو عورتوں کے حق میں بہترین جہاد قرار دیا (بخاری شریف) نیز ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں، ایسا جہاد جس میں قتال نہیں ہے، حج وعمرہ" (ابن خزیمہ)

(۴) **استطاعت :** جسمانی اعتبار سے جہاد میں جانے پر قادر ہو، اسی طرح اگر حکومت مجاہدین کے مالی مصارف پر قادر نہ ہو، تو مالی استطاعت بھی حاصل ہو، پس جو نابینا، اپاہج ولنگڑا ہو یا مصارف پر قادر نہ ہو، اس پر جہاد واجب نہیں ہے۔(دیکھئے سورۃ توبہ، آیت : ۹۱-۹۲)

(۵) **والدین کی رضا مندی :** اگر والدین جہاد میں جانے سے راضی نہ ہوں، تو ان کی مخالفت جائز نہیں ہے، کیونکہ ہماری گفتگو فرض کفایہ جہاد کے متعلق ہے اور والدین کی اطاعت فرض عین ہے۔

کفار سے متعلق شرائط : مسلمانوں پر کفار سے جہاد وقتال اس وقت واجب ہے، جب کہ درج ذیل شرائط موجود ہوں:

(۱) کفار مُستأمن، معاہد یا ذمی نہ ہو (دیکھئے سورۃ توبہ، آیۃ : ۶ اور سورہ انفال، آیت : ۵۸) آپ ﷺ کا فرمان ہے:" جو کسی ذمی کو قتل کرے، وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا، حالانکہ اس کی خوشبو ستر (۷۰) سال کی مسافت سے محسوس ہوتی ہے" (ابوداؤد)

(۲) قتال سے قبل ان کو اسلام کی دعوت دی جائے، اس کی حقیقت کو ان پر واضح کیا جائے اگر انھیں کچھ شبہات درپیش ہوں، تو ان کا معقول جواب دے کر مطمئن کیا جائے، اب ان پر حجت تام ہونے کے باوجود اپنی ضد وہٹ دھرمی سے باز نہ آئیں اور کفر پر اڑے رہیں تو ان سے قتال کیا جائے۔ آپ ﷺ نے پہلے مختلف سالاطین وحکمرانوں کے نام اسلام کا تعارف پیش کرتے ہوئے دعوت اسلام کے خطوط روانہ فرمائے۔

جہاد کے مراحل وآداب

(۱) کفار سے قتال اصل مقصود نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی کو ترک کر کے اسلام کو گلے لگالیں، لہٰذا پہلے مناسب انداز سے ان کو اسلام سے روشناس کرا کے اسلام کی ترغیب ودعوت دیں، اگر وہ قبول کرلیں تو اب ان کی زمین اور جان ومال وغیرہ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، تمام حقوق واحکام میں وہ بھی دیگر مسلمانوں کی طرح ہیں۔

(۲) اسلام کی دعوت کے باوجود وہ مخالفت اور انکار و دشمنی پر ڈٹے رہیں، تو مسلمانوں کو چاہئے کہ بصورت قدرت مسلم حکمران کی اجازت سے قتال کے لئے آگے بڑھیں، اور دشمن جزیہ (ایک متعینہ عوض) دے کر اسلامی حکومت کے تابع رہنے پر راضی ہوں تو اسے قبول کرلیں۔

(۳) اسلام اور جزیہ دونوں کا انکار کر بیٹھیں تو آخری درجہ میں ان سے قتال کیا جائے۔ (دیکھئے سورۃ توبہ : ۲۹)

جزیہ : اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ (عیسائی) اور مجوس (آتش پرست) اور صحفِ ابراہیم علیہ السلام اور زبورِ داؤد علیہ السلام کو ماننے کے جو دعویدار ہیں، ان سے جزیہ قبول کیا جائے گا۔

دیگر کفار مثلاً ملاحدہ، بت پرست وغیرہ سے جزیہ قبول نہ کریں گے، ان سے صرف اسلام قبول کیا جائے گا، ورنہ پھر قتل کیا جائے گا۔

جہاد پر مرتب آثار

قیـــــدی : جہاد میں کفار مسلمانوں کی قید میں آجائیں تو بچے اور عورتیں محض قید ہوتے ہی غلام باندی بن جائیں گے۔ بالغ مردوں کے متعلق امام (بادشاہ) کو حق ہوگا کہ مندرجہ ذیل چار امور میں سے جو مسلمانوں کے حق میں بہتر شکل ہو، اسے اختیار کرے۔

قتل کرنا، مفت آزاد کرنا، فدیہ لے کر آزاد کرنا یا غلام بنالینا۔ (دیکھئے سورہ محمد، آیت : ۴، اور الانفال، آیت : ۶۷) نیز صحیحین وغیرہ میں آپ ﷺ سے قیدیوں کو غلام باندی بنانا مروی ہے۔

جو قید ہونے سے قبل اسلام قبول کرلے، گو شکست کے بعد ہو، تو وہ قتل، اور غلامی سے محفوظ ہوگیا، نیز اس کا مال اور نابالغ اولاد بھی محفوظ ہوگئے۔ نابالغ بچوں کو درج ذیل تین اسباب میں سے کسی ایک سبب کی وجہ سے مسلمان شمار کیا جائے گا: والدین میں سے کوئی ایک اسلام قبول کرلے، والدین کے بغیر تنہا اسے کوئی مسلمان قید کرلے، دارالاسلام میں بطور لقیط مل جائے۔

غنیمت

جو مال اہلِ حرب سے قہراً حاصل ہو، اسے غنیمت کہا جاتا ہے، منقولہ ہو یا غیر منقولہ، نیز دوران جہاد حاصل ہو یا ان کے فرار ہونے کے وقت (جو چیز منتقل نہ کی جاسکے اسے غیر منقولہ اور جو منتقل کی جاسکے اسے منقولہ کہا جائے گا۔ زمین، مکان اور باغ غیر منقولہ اور سونا، چاندی، برتن، کپڑے اور جانور منقولہ اشیاء ہیں)

غنیمت کا حکم : غنیمت کے پانچ حصے کرنا واجب ہے، جن میں سے چار حصے مقاتلین اور لڑنے والوں میں تقسیم کئے جائیں گے، آپ ﷺ کے دور میں پیدل مجاہد کو ایک حصہ اور شہسوار کو تین حصے ملتے تھے جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی حدیث سے ثابت ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ کی کیفیت اور جنگی آلات کی تبدیلی کی وجہ سے عموماً اس تقسیم کے نفاذ کا سوال نہیں آئے گا، لہٰذا ایک پیدل اور شہسوار کے درمیان تفاوت کا اندازہ لگا کر ادنیٰ طریقہ پر لڑنے والے کو اعلیٰ کے مقابلہ میں ایک تہائی (۱/۳) حصہ دیا جائے۔ بہرحال اس میں سے حکومت کو اپنے لئے کوئی حصہ روک لینا جائز نہیں ہے، غنیمت کی مذکورہ تقسیم کا استحقاق اسی مجاہد کو ہوگا، جس میں یہ شرائط موجود ہوں: اسلام، بلوغ، عقل، آزادی، مذکر ہونا، اگر ان میں سے ایک بھی شرط مفقود ہو، تو امام ان کو اپنی صوابدید سے تقسیم سے قبل ہی کچھ حصہ دے دے، (جسے رَضخ کہا جاتا ہے) اور اس کی مقدار ایک پیدل غازی کے حصے سے کم ہو۔

خُمُس (پانچواں حصہ) : غنیمت کے پانچویں حصہ کے مزید پانچ حصے کرکے آپ ﷺ، ذوی القربیٰ (آپ ﷺ کے رشتہ دار) یتیم، مساکین اور مسافروں پر تقسیم کیا جائے گا، جیسا کہ سورۃ انفال، آیت: ۴۱ میں بیان فرمایا۔

آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ کا حصہ مسلمانوں کے مصالح پر صرف کیا جائے گا۔ ذوی القربی سے بنو ہاشم اور بنو المطلب مراد ہیں، جیسا کہ بخاری کی حدیث سے واضح ہے، یتیم سے وہ نابالغ مراد ہے، جس کا والد نہ ہو، بالغ ہونے کے بعد یتیم نہ کہلائے گا (ابو داود) اور مسافر سے وہ مسافر مراد ہے جس کے پاس خرچ نہ ہو اور وہ اپنے مال سے دور دراز علاقہ میں ہو۔

سَلَب : کسی حربی کو قتل کیا جائے تو اس کے ساتھ جو مال اور ہتھیار وغیرہ موجود ہو، اسے سَلَب کہا جائے گا، جو مجاہد خطرات میں کود کر حربی کو قتل کرے، اس کا سلب اس مجاہد کا حق ہے، اسے عام غنیمت کی تقسیم میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔

فَئ

کافروں اور دشمنوں سے جو مال بغیر قتال اور لڑائی کے ملے، اسے فَئ کہا جاتا ہے۔

حکم : فی میں سے خمس (پانچواں حصہ) جدا کر کے انھیں حضرات پر تقسیم کریں گے، جن پر غنیمت کا خمس تقسیم کیا جاتا ہے، بقیہ چار حصے امت مسلمہ کے مختلف مصالح پر صرف کیا جائے گا۔

جزیہ

اہلِ کتاب اور جو ان کے حکم میں ہیں، یہ لوگ اسلامی حکومت کی تابعداری اختیار کریں، تو اس حفاظت کے صلہ میں جو رقم بیت المال کو ادا کریں گے اسے جزیہ کہا جاتا ہے۔

شرائط : کسی سے جزیہ لینے کے شرائط حسب ذیل ہیں:

(۱) جزیہ دینے والا یہودی، نصرانی (عیسائی) یا مجوسی (آتش پرست) ہو اسی طرح جن کا یہ دعوی ہو کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں یا حضرت داؤد علیہ السلام کے زبور پر عمل کرتے ہیں، ان سے بھی جزیہ لے سکتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے ذمہ دار اور ان کے درمیان باقاعدہ ایجاب وقبول کے ساتھ عقد جزیہ طئے پائے۔

(۳) جزیہ کی مقدار، اور فقراء و مالداروں کے اعتبار سے اس کا تناسب واضح کیا جائے۔

(۴) کسی مخصوص مدت کے ساتھ مقید نہ ہو۔

جزیہ دینے والے کے شرائط : عقل، بلوغ، آزادی، مرد ہونا اور اہلِ کتاب ہو یا ان کے حکم میں ہو لہٰذا عورتوں، غلاموں، بچوں اور پاگلوں پر جزیہ عائد نہ ہوگا۔

مقدار : جزیہ کی کم سے کم مقدار ایک دینار سالانہ ہے، اگر متوسط طبقہ کا شخص ہو تو بہتر ہے کہ اس پر دو دینار اور مالدار شخص پر چار دینار سالانہ طئے کرلے۔ اگر یہ لوگ ایک دینار سے زائد پر راضی نہ ہوں، تو ایک دینار پر طئے کر سکتا ہے کیونکہ یہی واجب مقدار ہے۔ جزیہ

کی مقدار کے علاوہ مزید گذرنے والوں کی ضیافت ومہمان نوازی کی شرط بھی ان پر عائد کر سکتے ہیں (مؤطا ابوداود اور بیہقی وغیرہ میں یہ تفصیلات مروی ہیں)

عقد جزیہ پر مرتب آثار

عقد جزیہ کی وجہ سے ذمی لوگوں پر درج ذیل چار امور کی پابندی لازم ہے۔

(۱) جزیہ کی طئے شدہ رقم کی ادائیگی۔

(۲) اسلامی احکام کا ان پر نفاذ، جس کے وہ خود قائل ہوں، گرچہ ضمناً ہو، مثلاً زنا کی حرمت، اسی لئے آپ ﷺ نے زنا کرنے والے ایک یہودی مرد وعورت کو سنگسار کروایا (صحیحین) ۔اسی طرح سودی لین دین، فواحش کے ارتکاب اور دیگر فسق وفجور کے اسباب سے ان کو روکا جائے گا، کیونکہ وہ ان امور کی حرمت کے قائل ہیں۔تاہم شراب نوشی کو وہ اپنی شریعت میں حرام نہیں سمجھتے، لہٰذا اس میں ان پر ہمارے احکام کا نفاذ نہ ہوگا، لیکن اگر وہ ہمارے قاضی کے پاس مسئلہ لے آئیں، تو قاضی شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کرے گا۔

(۳) دینِ اسلام کے خلاف بات نہ کریں، اگر قرآن مجید، یا آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کریں، یا دین اسلام کو بدنام کریں، تو تعزیری سزا دی جائے گی، اگر ان امور کی وجہ سے معاہدہ کے فسخ کی شرط لگائی ہو، تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا۔اگر اندرونی طور پر اسلام کے خلاف ان کے کسی قولی یا فعلی ریشہ دوانی پر مطلع ہوں، تو اس عقد ذمہ کو ختم کردیں گے، تاہم ان کے عقیدہ کے اعتبار سے ان کی جو گفتگو ہوگی، اس کی وجہ سے عقد ذمہ ختم نہ ہوگا، گو اس کا بطلان یقینی ہو۔

(۴) کوئی ایسا کام نہ کریں، جو مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ہو، مثلاً کفار کے جاسوس کو پناہ دینا، اہل حرب کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے اندارسانی کی کوشش وغیرہ۔

اگر وہ طے شدہ جزیہ کی رقم نہ دیں، گو ایک دینار سے زائد مقدار ہو، یا اللہ ورسول کے متعلق بدگوئی بدکلامی کریں، یا مسلمانوں کے خلاف حربیوں کا ساتھ دیں، تو عقد جزیہ ختم ہوگا۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

اہلِ کتاب کو ذمی بنائیں، تو ان کے متعلق مسلمانوں کو درج ذیل چار امور کی پابندی لازم ہے۔

(۱) ان کے ساتھ جنگ سے باز آجانا، کیونکہ مسلم کی حدیث میں اس کا حکم موجود ہے۔

(۲) ان کے جان ومال کی حفاظت، کوئی بھی مسلم یا غیر مسلم ان پر یا ان کے مال پر ظلماً حملہ آور ہو، تو اس کا دفاع کرنا واجب ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے آخری وقت وصیت فرمائی تھی۔(بخاری شریف)

(۳) ان کے عبادت خانوں اور دینی شعائر اور شراب وخنزیر سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، جب تک کہ وہ ان امور کا اظہار نہ کریں، یا اس پر فخر نہ کریں۔

(۴) مسلمانوں کے حق میں اس عقد ذمہ کا لزوم، یعنی ایک مرتبہ جب کسی کو ذمی بنالیا تو امام یا کوئی دوسرا شخص اس عقد کو ختم نہیں کرسکتا، جب تک گذشتہ اسباب فسخ میں کوئی سبب نہ پایا جائے۔

(الفقہ المنھجی ۸/۱۱۵-۱۴۳، فتح الوھاب مع الجمل ۵/۱۷۹-۲۲۸، الاقناع مع البجیرمی

۴/۲۱۰-۲۴۶، مغنی المحتاج ۴/۲۰۸-۲۳۶، تحفہ مع الحواشی ۱۲/۳-۱۰۱)

مصالحت اور امان دینا

مصالحت: اہل حرب سے مقررہ مدت تک جنگ بندی کی صلح کو ھدنہ (مصالحت) کہا جاتا ہے۔ اجماع سے قبل قرآن مجید کی آیات (سوۃ توبہ: ۱، وسورہ انفال: ۶۱) اور صلح حدیبیہ کا واقعہ اس کی مشروعیت کے واضح دلائل ہیں۔

اِستِئمَان (امان وپناہ دینا): کوئی حربی کسی بھی مسلمان سے امان طلب کرے، تو اسے استئمان کہیں گے۔ کسی بھی مسلمان نے کسی دشمن کو امان دی، خواہ دینے والا حاکم ہو یا رعایا کا کوئی فرد، مذکر ہو یا مؤنث، تو یہ امان معتبر ہوگا، اور اس کی وجہ سے اس کی جان محفوظ ہو جائے گی، اب کسی بھی مسلمان کو اسے کسی طرح کی تکلیف پہنچانا حرام ہے (دیکھئے سورہ توبہ، آیت: ۶)

فرق: مصالحت ایک اجتماعی صلح ہے، جو فریقین کے ذمہ داروں کے ذریعہ طئے پاتی ہے، جبکہ امان انفرادی واجتماعی دونوں طریقہ سے ہوسکتی ہے، اور حاکم ورعایا ہر کوئی اسے انجام دے سکتا ہے۔ نیز مصالحت کی وجہ سے جنگ کا سلسلہ رک جاتا ہے، جبکہ بعضوں کے امان کے باوجود دیگر حربیوں سے جنگ جاری رہ سکتی ہے۔

مصالحت کا حکم: (۱) اگر دشمن مصالحت کا مطالبہ کریں، تو امام وقت کو احتیاط سے اور چوکنا رہتے ہوئے اسے قبول کرنا لازم ہے۔ اس کی مدت چار ماہ سے زائد رکھنا جائز نہیں ہے (سورہ توبہ: ۲)

(۲) اگر بغیر کسی مصلحت کے مسلمان صلح کی طرف پیش قدمی کریں تو یہ صلح منعقد ہی نہ ہوگی۔ اگر مسلمانوں میں کمزوری کی وجہ سے یہ پیشقدمی ہو، تو زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت کے لئے صلح کی اجازت ہے۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ میں ہوا تھا (صحیحین وغیرہ) اگر مسلمانوں کی کمزوری کی بجائے کوئی دوسری مصلحت ہو، مثلاً دشمنوں کے اسلام قبول کرنے کی توقع، یا جزیہ دینے پر رضامندی، تو اس صورت میں چار ماہ سے زائد مدت کے لئے صلح کی اجازت نہ ہوگی (دیکھئے سورہ توبہ، آیت: ۲)

استئمان کا حکم: اگر امن طلب کرنے والے کے حق میں یا مسلمانوں کے حق میں اس میں مصلحت ہو، تو امن دینا واجب ہے (دیکھئے سورۃ توبہ: ۶) کسی بھی مسلمان کا امان دینا معتبر ہے (ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، مسنداحمد) فتح مکہ کے وقت حضرت اُم ہانی نے ایک شخص کو پناہ دی تو آپ ﷺ نے اسے معتبر قرار دیا۔ (صحیحین) کوئی ذمی کسی غیر مسلم دشمن کو پناہ دے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

تنبیہ: ایک مسلمان کسی حربی کو اس کے مطالبہ کے بغیر پناہ نہیں دے سکتا۔ ذمہ دار کو پناہ کا علم ہونا اور اسے معتبر قرار دینا ضروری ہے۔ اگر اسے علم نہ ہو، یا علم تو ہو لیکن کسی معقول سبب اور خطرہ کی وجہ سے (مثلاً وہ شخص دشمن کا جاسوس ہو) وہ اس پناہ کو لغو اور کالعدم قرار دے، تو اس پناہ کا اعتبار نہ ہوگا۔ اگر تحقیق کے باوجود اس شخص میں امان کے خلاف کوئی سبب نہ ہو۔ تو حاکم اور ذمہ دار کو اسے لغو قرار دینے کی اجازت نہیں، بلکہ اس کے لئے امان کا اعلان کرنا واجب ہے، تاکہ تمام مسلمانوں پر یہ لاگو ہو جائے۔ جسے امان دی جائے، کسی بھی مسلمان کو اسے کسی بھی طرح کی تکلیف دینا جائز نہیں ہے۔ جب امان کی مدت ختم ہو، یا پہلے ہی وہ خود امان سے نکل جانا چاہے، تو حاکم پر لازم ہے کہ اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دے، یعنی جہاں اس کی جان ومال پر کوئی تعدی نہ کرے (دیکھئے سورۃ توبہ: ۶) جب تک اس شخص کی طرف سے کوئی معقول سبب نہ پایا جائے، امن دینے والے شخص کو امن سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔

مصالحت کے آثار : جن لوگوں سے مصالحت ہو، کسی بھی طرح ان کی ایذاء رسانی سے رکنا واجب ہے۔ دوسرے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی حفاظت وتعاون واجب نہیں ہے۔ اگر کفار مصالحت کو ختم کردیں، مثلاً اس کی صراحت کردیں، یا جنگ شروع کردیں، یا ہمارے دشمنوں کو ہمارے راز سے آگاہ کریں، یا ان کے ہاتھوں مسلمان کا قتل ہو، تو مصالحت ختم ہوجائے گی۔ اگر ان کی طرف سے کوئی خلاف ورزی نہ ہو، تو مقررہ مدت کے اختتام کے ساتھ یہ مصالحت بھی اختتام پذیر ہوگی۔ اگر امام وقت کو ان کی جانب سے خیانت کے آثار ظاہر ہوں، اور محسوس ہو، لیکن باقاعدہ کوئی خیانت ثابت نہ ہو، تو ان کے سامنے علانیہ وضاحت کرکے اس عقدِ مصالت کے توڑنے کا اعلان کردے، تمام شرائط وارکان کے ساتھ عقدِ مصالحت پائی جائے تو یہ ایک لازم عقد ہوگا، لہٰذا بغیر سبب کے مدت کی تکمیل تک اسے توڑنا جائز نہ ہوگا۔ (دیکھئے سورۃ توبہ : ۷، سورۃ انفال ۵۶-۵۷)

عقد مصالحت میں طئے شدہ تمام شرائط کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہے، سوائے ان شرائط کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے، ایسے شرائط کی پابندی جائز نہیں ہے، بلکہ اس عقد میں ان شرائط کا داخلہ ہی ناجائز ہے۔ (الفقہ المنہجی ۸/۱۴۴-۱۵۱)

ذبح اور شکار

آیت : " حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ..." (المائدۃ : ۳)

ترجمہ : "تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور خنزیر (سور) کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو، اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جو ضرب (مار) سے مر گیا ہو، اور جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو، اور جو کسی کے سینگ مارنے (اور ٹکر) سے مرا ہو اور جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو، لیکن (ان مذکورہ جانوروں میں سے جسے اس حال میں پالو کہ اس میں زندگی کی آثار موجود ہوں اور پھر) اسے تم (شرعی طریقے سے) ذبح کرڈالو، تو حرام نہیں، اور جو آستانوں (پرستش گاہوں) پر ذبح کیا گیا ہو (وہ بھی حرام ہے)

تَذْکِیہ : جس جانور کو حلق یا چنبر گردن (سینے کے اوپر ہار پڑنے کی جگہ) میں ذبح کرسکتے ہو، اسے ان مقامات میں ذبح کرنا، ورنہ شکار کی طرح بدن کے کسی بھی حصہ کو زخمی کرکے مارنا تذکیہ کہلاتا ہے۔ مچھلی وٹڈی کے علاوہ کوئی ماکول جانور بغیر تذکیہ کے حلال نہیں۔

ذبح : گردن میں کاٹ دینا، جس سے موت واقع ہو، خواہ شرعی شرائط موجود ہوں، یا نہ ہوں، ذبح کہلاتا ہے (ذبح کرنے والے کو ذابح اور جس جانور کو ذبح کیا جائے اس ذبیح ومذبوح کہیں گے)

حکمت : حیوان کے حلال ہونے کے لئے اس کے تذکیہ کی شرط دراصل ایک تعبدی حکم ہے، گو اس میں بعض حکمتیں بھی ہیں: مثلاً تمام ملتوں میں مردار، نجس اور حرام ہیں، لہٰذا نجس وغیر نجس حیوانات میں تفریق ضروری ہے، لہٰذا شریعت نے تذکیہ کو اس کا بنیادی پہلو وفرق قرار دیا ہے، نیز شریعتِ اسلامیہ میں خون کے نقصانات کی وجہ سے وہ نجس اور اس سے پرہیز واجب ہے۔ اور شرعی تذکیہ حیوان کو اس خون سے پاک کرتا ہے۔

ذبح کے ارکان

(۱) ذبح کرنا : جس حیوان کو باقاعدہ ذبح کرسکتے ہوں، (خواہ پالتو ہو یا وحشی) اس کے حلقوم (سانس کی نالی) اور مَرِیٔ (غذا

کی نالی) کومکمل کاٹنا ضروری ہے۔اگران کا کچھ حصہ بھی کٹنے سے رہ جائے، یا کچھ حصہ کٹنے کے بعد جانور حرکت مذبوح کی حالت کو پہنچ جائے ،پھر کچھ تاخیر سے بقیہ حصہ کاٹے،تو تو جانور حلال نہ ہوگا،اگر کچھ حصہ کٹنے کے بعد چھری اٹھائے اور فوراً دوبارہ پھیرے، یا چھری گر جائے اور فوراً اٹھا کر ذبح مکمل کرے، یادھار کم ہونے کی وجہ سے وہ چھری رکھ کر فوراً دوسری چھری سے ذبح مکمل کرے،تو جانور حلال ہے۔

حلقوم ومرئ اور وَدَجَیْن (گردن کی دونوں رگیں) سے زائد کاٹنا مکروہ ہے۔اگر گدی کی جانب سے یا گردن کے کنارے سے، یا کان میں چھری داخل کر کے ذبح کرے تو گنہگار ہوگا، کیونکہ جانور کو زائد تکلیف پہنچا رہا ہے،اب اس طرح ذبح کرتے وقت حلقوم اور مرئ کاٹنا شروع کرتے وقت جانور میں حیات مستقرہ ہو،تو وہ حلال ہوگا، گواس کے اوپر کی چمڑی نہ کٹے، بعد میں حیات مستقرہ باقی نہ رہے تو حرج نہیں،اگر حلقوم ومرئ تک پہنچنے سے قبل ہی حیات مستقرہ ختم ہو، یاان کو کاٹے ہی نہیں (اور جانور مرجائے) تو حلال نہ ہوگا۔

جسے باقاعدہ ذبح کرنا ممکن نہ ہو(مثلاً شکار، یا جو پالتو جانور بدک کر وحشی بن جائے اور ہاتھ نہ آئے یا کنویں میں گر جائے اور باقاعدہ ذبح نہ ہو سکے) اسے کسی بھی عضو کو زخمی کر کے قتل کر دینا کافی ہے، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔(جسے باقاعدہ ذبح کر سکتے ہیں اسے مَقْدُوْرعلَیْہِ اور جسے باقاعدہ ذبح نہیں کر سکتے اسے غیر مقدور علیہ کہتے ہیں)

ذبح میں (فی الجملہ) قصد کا پایا جانا شرط ہے،لہٰذا چھری ہاتھ سے جانور کے گلے پر گر جائے اور گلا کٹ جائے، یا جانور چھری سے گردن رگڑ کر کاٹ لے، یا کوئی شکاری جانور بذاتِ خود جا کر شکار کرے، یا تیر شکار کے علاوہ کسی نشانہ پر یا اس کی قوت کو آزمانے کے لئے چلائے اور اس سے کوئی شکار مرجائے توان صورتوں میں جانور حرام ہے۔اگر کسی شکار پر پتھر یا غیر ماکول جانور سمجھ کر تیر چلائے، یا ہرن وغیرہ کے غول میں تیر چلائے اور کسی ایک کولگ جائے، یا ایک کے ارادہ سے چلائے اور دوسرے کو لگے،توان صورتوں میں جانور حلال ہے، کیونکہ صحیح قصد پایا گیا،اس کے مذکورہ گمان کا کوئی اعتبار نہیں۔

سنتیں : (۱)اونٹ کو کھڑا کر کے بایاں گھٹنا باندھ کر گردن کے نچلے حصہ میں نحر کرے، کیونکہ اس کی لمبی گردن کے اعتبار سے اس صورت سے روح نکلنے میں سہولت ہوتی ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:"فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ "(حج : ۳۶)(پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:یعنی تین پیروں پر کھڑا کر کے"امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس طرح اس کے بدک کر بھاگنے کا خطرہ ہو تو بٹھا کر نحر کرے،نہ کہ لٹا کر،شتر مرغ وغیرہ لمبی گردن والے دیگر حیوانات کو بھی نحر کرے۔

(۲) گائے بیل، بکری، نیل گائے اور گھوڑے جیسے حیوانات کو بائیں کروٹ لٹا کر حلق میں یعنی گردن کے اوپری حصہ میں ذبح کرے،اور اس کے دائیں پیر کے علاوہ بقیہ تینوں پیر باندھے،اگر اونٹ کو ذبح یا گائے وغیرہ کو نحر کرے،تو خلاف اولیٰ ہے،مکروہ نہیں"۔

(۳)وَدَجَیْن یعنی گردن کے دونوں طرف محیط دونوں رگوں کو بھی کاٹے۔(۴) چھری تیز کرلے(مسلم)(۵) جانور کا رخ یعنی ذبح کی جگہ کو قبلہ رو کرے اور خود بھی قبلہ رو ہو،(۶) ذبح یا شکار کے وقت صرف ایک اللہ کا نام لے(یعنی بسم اللہ پڑھے) اکمل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا ہے،عمداً بسم اللہ کا ترک مکروہ ہے،لیکن ذبح حلال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے(دیکھئے سورہ مائدہ ، آیت : ۵) حالانکہ وہ بسم اللہ نہیں پڑھتے۔نیز ذابح کے بسم اللہ پڑھنے کے بارہ میں شک کی صورت میں آپ ﷺ نے اللہ کا نام لے کر کھانے کی اجازت دی(بخاری ابوداود ،نسائی ، ابن ماجہ)اگر یہ شرط ہوتا تو شک کی صورت میں حلال نہ ہوا ہوتا۔

آیت:"فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِيْنَ "(الانعام : ۱۱۸)

ترجمہ:"جس جانور پر اللہ کا نام لیا جائے ،اس میں سے کھاؤ،اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو"

جس آیت میں اللہ کا نام نہ لیا ہو تو کھانے کی ممانعت وارد ہے اور اسے فسق قرار دیا ہے، تو آیت کے سیاق کی روشنی میں اس سے بتوں کے لئے ذبح شدہ جانور مراد ہیں، کیونکہ ایک دوسری آیت کی روشنی میں یہی فسق ہے، نیز اس پر اجماع ہے کہ بغیر بسم اللہ کے مسلمان ذبح کرے، تو اس کا کھانا فسق نہیں ہے۔

صحیحین میں رافع بن خدیج کی مرفوع حدیث میں بوقتِ ذبح اور عدی بن حاتم کی مرفوع حدیث میں بوقت شکار بسم اللہ پڑھنے کا ذکر موجود ہے۔ (اگر شکار کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے تو) تیر لگنے کے وقت یا شکاری جانور کا شکار پر حملہ آور ہونے اور کاٹنے کے وقت بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔ امام رویانیؒ نے مچھلی اور ٹڈی کے شکار کے وقت بھی اسے مستحب قرار دیا ہے۔

ذبح کے وقت بسم اللہ واسم محمد یا باسم محمد یا بسم اللہ ومحمد رسول اللہ کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں تشریک کا ابہام ہے، البتہ ذبیح حلال ہوگا۔ اگر تشریک کا ارادہ ہو، تو کفر ہوگا، اور ذبیحہ حرام ہوگا اور اگر اس ارادہ سے کہے کہ محمد ﷺ کے اسم گرامی سے تبرک حاصل کر رہا ہوں، تو مکروہ ہے، اور ذبیحہ حلال ہے۔

کسی اہل کتاب کا مسیح کے لئے ذبیحہ، اور مسلمان کا مثلاً محمد یا کعبہ کے لئے ذبیحہ حلال نہیں، اگر کعبہ کے لئے بیت اللہ ہونے کی نسبت سے، یا رسول اللہ کا رسول ہونے کی نسبت سے بطورِ تعظیم ذبح کرے تو جائز ہے۔ (اگر کعبہ کا استحقاق سمجھتے ہوئے ذبح کرے تو حرام، اور بطورِ عبادت وتعظیم ادا کرے تو کفر ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ بوقت ذبح مطلقاً (یعنی بغیر کسی ارادہ کے) صرف محمد نام لینا، یا عطف کے ساتھ لینا حرام ہے، اور تبرکاً حرام نہیں، اور ان دونوں صورتوں میں ذبیحہ حلال ہوگا، اگر مطلقاً آپ کے لئے ذبح کا قصد ہو، تو یہ عمل اور ذبیحہ دونوں حرام ہیں، اور تعظیم وعبادت کے قصد سے ہو تو کفر ہے، اور ذبیحہ حرام ہے۔

بادشاہ سے ملاقات کے وقت اس سے تقرب کے لئے، یا جن سے تقرب کے لئے ذبح کرے تو ذبیحہ حلال نہیں، اگر بطورِ تعظیم وعبادت ذبح کرے تو کفر ہے۔ اگر بادشاہ کی آمد وغیرہ پر خوشی کے اظہار کے طور پر یا کسی ناراض کو یا جن کو راضی کرنے کے لئے اللہ سے تقریب کے قصد سے ذبح کرے، تاکہ وہ ان کے شر سے محفوظ رکھے، تو یہ حرام نہیں، کیونکہ اس میں غیر اللہ کا قصد نہیں پایا جا رہا ہے۔

(۷) آپ ﷺ پر درود وسلام پڑھے، کیونکہ اس وقت اللہ کا ذکر مشروع ہے۔ لہٰذا نبی کا ذکر بھی مشروع ہوگا، جیسا کہ اذان ونماز میں۔

(۸) ذبح سے قبل جانور کے سامنے (پینے کے لئے) پانی پیش کرے، پھر نرمی سے لٹائے، اور چھری کو قوت اور تیزی سے پھرائے، ذبح کے بعد مرنے تک جانور کو ایسا ہی چھوڑ دے، جانور کے سامنے چھری تیز نہ کرے، ایک کو دوسرے کے سامنے ذبح نہ کرے۔

(۲) ذابح: ذبح کا دوسرا رکن ذابح یعنی ذبح کرنے والا ہے، ذابح نحر کرنے والے اور شکار وغیرہ کرنے والے کے شرائط حسبِ ذیل ہیں:

۱- اس کے مذہب کی عورتوں سے ہمارا نکاح حلال ہو یعنی مسلمان ہو، یا ایسا اہل کتاب جس کی تفصیل نکاح کے شرائط میں گذر چکی، مذکر یا مؤنث، آزاد ہو یا غلام باندی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ''۔ (مائدہ: ۵) (اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لئے حلال ہے) مجوسی اور دیگر غیر مسلموں کا ذبیحہ حلال نہیں۔

شکار کرنے والا اور جس جانور کو باقاعدہ ذبح نہیں کر سکتے، اس پر حملہ کرنے والا بینا ہو، اگر نابینا شکار کرے تو حلال نہ ہوگا، نابینا غیر ممیز و پاگل، اور مدہوش (جو نشہ میں ہو اس) کا ذبح کرنا مکروہ ہے، کیونکہ ان میں فی الجملہ قصد وارادہ موجود ہے۔ جو نیند میں ہو اس کا ذبیحہ

حلال نہیں۔

جس جانور کے ذبح وغیرہ میں دو آدمی شریک ہوں، جن میں ایک کا ذبیحہ حلال اور دوسرے کا حرام ہے تو یہ ذبیحہ حرام ہے۔ مثلاً ایک مسلم اور ایک مجوسی مل کر بکری کے گردن پر چھری چلائیں یا دونوں تیر یا شکاری جانور کے ذریعہ کوئی جانور شکار کریں جس کا ذبیحہ حلال ہے اس کا تیر اگر پہلے لگ جائے اور شکار کو قتل کرے، یا حرکت مذبوح تک پہنچائے، تو حرام نہ ہوگا (جیسا کہ مسلمان بکری ذبح کرے پھر مجوسی اسے چیرے) اگر اس کے برعکس ہو یا دونوں ساتھ زخمی کریں، یا کچھ پتہ نہ چلے، یا مرتب زخمی کریں، لیکن کسی ایک کا زخم اسے نہ مارے، پھر وہ شکار مرجائے، تو حرام ہوگا۔

(۳) ذبیح: ذبح کا تیسرا رکن ذبیح ہے۔ ذبیحہ کا ماکول حیوان ہونا شرط ہے (یعنی جس کا گوشت کھانا حلال ہو)) جس میں ابتداءً ذبح کے وقت حیاتِ مستقرہ موجود ہو، ورنہ وہ حلال نہ ہوگا کیونکہ وہ مردار ہے۔ البتہ بیمار جانور کو آخری رمق میں ذبح کرے، تب بھی حلال ہے، جبکہ کوئی ایسا فعل یعنی زخم وغیرہ نہ پایا جائے جس کی طرف ہلاکت کو منسوب کریں۔

حیات مستقرہ: یعنی روح حیوان کے بدن میں ہو، اور اختیاری حرکت پائی جائے، اس کی علامت خون کا بہنا اور شدید حرکت کرنا (تڑپنا) ہے، شدید حرکت ہو اور خون نہ بہے، تو یہ بھی کافی ہے۔

حیات مستقرہ کا یقین یا غالب گمان شرط ہے۔ اگر اس کے وجود میں شک ہو تو حرام ہے۔ حیاتِ مذبوح (حرکت مذبوح) یعنی جانور کی وہ کیفیت جس میں دیکھنے سننے کی قوت اور اختیاری حرکت باقی نہ رہے۔

کسی بکری پر چھت گر پڑے، یا درندہ اسے زخمی کردے، اور اسے ذبح کردیا جائے، تو حلال ہے، جب کہ اس میں حیات مستقرہ موجود ہو، گو کچھ دیر کے بعد اس کی موت یقینی ہو، اگر حیاتِ مستقرہ نہ ہو، تو حلال نہ ہوگا۔

غیر ماکول جانور کو ذبح کرنا حرام ہے، مثلاً اپاہج گدھا، گو راحت کی نیت سے ہو اگر اضطرار (بالکل مجبوری) کی صورت میں کسی غیر ماکول کو کھانے کی نوبت آئے، تو اسے ذبح کرنا واجب نہیں ہے۔

غیر مقدور علیہ پر تیر وغیرہ چلا کر اسے زخمی کردے، پھر اسے ذبح نہ کرنے میں اس کی کوئی کوتاہی نہ ہو، اور وہ مرجائے، تو بالاجماع حلال ہے۔ مثلاً حیوان دو حصوں میں کٹ جائے، فوراً مارنے والا کاری زخم لگ جائے اور اس کا ایک عضو جدا ہو جائے، زخم معمولی ہو، جس کی وجہ سے حیوان بے بس ہو کر رکا نہیں، لہٰذا دوبارہ زخمی کیا اور فوراً مرگیا، یا حیوان کو زندہ پا کر اسے ذبح کرے، یا بلا تقصیر کوتاہی ذبح نہ ہو پائے، مثلاً اسے قبلہ رو کر رہا تھا، یا چھری نکال ہی رہا تھا اور جانور ذبح کے امکان سے پہلے ہی مرجائے، تو ان تمام صورتوں میں وہ جانور حلال ہے۔ جیسا کہ ایک بدکے اور بھرے ہوئے اونٹ کو تیر سے شکار کرنے کے متعلق صحیحین میں موجود ہے۔

اگر حیوان میں تیر وغیرہ لگنے کے بعد حیات مستقرہ نہ ہو، تو گلے میں چھری پھیر کر ذبح کرنا مستحب ہے۔ اگر نہ پھیرے اور وہ مرجائے، تب بھی حلال ہے، کیونکہ اس حالت میں (مزید) تذکیہ ضروری نہیں۔ حیوان کے زخمی ہونے کے بعد شکاری کا دوڑنا شرط نہیں ہے، اگر اس کے محلِ ذبح کی تلاش میں رہا، یا جانور الٹا گرا اور اسے سیدھا کرنا پڑا، اور وہ (ذبح سے قبل) مرگیا، تو حلال ہے۔

اگر جانور کو زخمی کر کے اس کا ایک عضو جدا کردے، لیکن زخم فوراً قتل کرنے والا نہ ہو، پھر دوسرے حملہ اور زخم سے اسے مار ڈالے یا ذبح کا موقع ملا اور ذبح کردے، یا ذبح کا موقع ہی نہ ملا اور وہ مرگیا تو جانور حلال ہوگا، لیکن جدا شدہ عضو حرام ہوگا، کیونکہ وہ ایک زندہ کا جدا شدہ عضو ہے۔

اگر اپنی کوتاہی سے زخمی جانور کو ذبح نہ کرے (اور وہ مر جائے) تو حلال نہ ہوگا۔ مثلاً پاس چھری ہی نہ ہو، یا کوئی چھری چھین لے، یا چھری غلاف میں پھنس جائے کہ نکلے ہی نہیں، یا معمولی زخم کے ذریعہ اسے بے بس کردے پھر دوبارہ زخمی کر کے اسے ماردے، تو ان صورتوں میں حلال نہ ہوگا، اگر چھری کا غلاف عادت کے مطابق اور مناسب ہو، تو تنگ نہ ہو، لیکن اتفاقاً پھنس جائے، تو امام بلقینی نے حلت کو ترجیح دی ہے۔

جس حیوان کو ذبح کرنا متعذر رودشوار ہو، مثلاً کسی کنویں میں گر جائے، اور حلقوم ومری، کا کاٹنا ممکن نہ ہو، تو اسے نیزہ یا تلوار وغیرہ کسی بھی ہتھیار سے مُہلک زخم پہنچا کر مار دے، تو وہ حلال ہوگا، کیونکہ یہ بدکے ہوئے اونٹ کے مانند ہے، (جس کو اس طرح مارنے سے اس کی حلت صحیحین کی روایت سے ثابت ہے) کسی شکاری جانور کے ذریعہ اسے قتل کرنے سے وہ حلال نہ ہوگا۔ اگر ایسے جانور کو باقاعدہ ذبح کرنا ممکن ہو تو وہی ضروری ہے، کسی بھی طرح قتل کردینے سے وہ حلال نہ ہوگا۔

اگر ایک اونٹ پر دوسرا اونٹ گرے، اور اوپر کے اونٹ میں نیزہ گھونپا، جو نیچے کے اونٹ کو بھی لگے اور اس سے وہ مر جائے، تو دونوں حلال ہیں، گو اسے دوسرے اونٹ کا علم نہ ہو، اگر اوپر کے اونٹ کے بوجھ سے مر جائے، یا شک ہو کہ نیزہ سے مرا یا بوجھ سے، تو حلال نہ ہوگا۔

(۴) ذبح کا آلہ : آلہ ایسا دھاردار ہو، جو زخمی کرے، جیسے دھاردار لوہا، بانس پتھر، سیسہ وغیرہ۔ سوائے ہڈی، ناخن، اور دانت کے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جو (چیز بھی) خون بہائے اور اس (جانور) پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اسے کھالو، بجز دانت اور ناخن کے (صحیحین) دانت اور ناخن کے ساتھ دیگر ہڈیوں کو بھی ملحق کیا گیا۔ (شکاری جانور اپنے دانت یا ناخن سے جس شکار کو قتل کرے، وہ حلال ہوگا)

اگر کسی چیز کے بار، دباؤ اور بوجھ سے جانور مر جائے، تو حلال نہ ہوگا گو خون بہے اور سر جدا ہو مثلاً کوڑے یا لاٹھی سے مارے، یا جال میں گلا گھٹ کر مر جائے، یا کند چھری بہت قوت سے چلائے اور اس دباؤ سے وہ مر جائے (گو محض قوت کی وجہ سے گلا کٹ جائے) تو حرام ہوگا۔ اگر شکاری جانور حملہ آور ہو اور اس کے بوجھ سے شکار مر جائے تو حلال ہے، شکاری جانور کو دیکھ کر گھبراہٹ میں، یا تیز دوڑنے کی وجہ سے مر جائے تو قطعاً حلال نہیں۔

اگر شکار کو ہوا میں یا درخت پر تیر لگے اور مؤثر زخمی ہو، پھر زمین پر گر کر مرے، یا تیز ہوا کی مدد سے تیر شکار کو لگے اور قتل کرے، تو یہ شکار حلال ہے، اگر زخمی نہ ہو، مثلاً صرف بازو ٹوٹ جائے، یا زخمی ہو، لیکن زخم مؤثر نہ ہو، تو حلال نہ ہوگا۔

تیر لگنے کے بعد شکار کسی اونچی زمین یا پہاڑی پر گر کر وہاں سے نیچے لڑھکے اور مرے، یا ایسی شاخ سے ٹکرا کر نیچے گرے اور مرے کہ اس کی طرف موت کی نسبت ممکن ہو، یا پانی میں گرے اور مرے تو حرام ہے، خواہ زخمی ہو یا نہ ہو۔

پانی کے پرندہ پر پانی میں تیر چلائے (گو خشکی سے چلائے) اور تیر لگنے سے وہ مرے تو حلال ہے، پانی اس کے حق میں دیگر کے لئے زمین کی طرح ہے، اگر پرندہ پانی کے ہوا (فضا) میں ہو، اور تیر انداز پانی میں ہو (گو کشتی وغیرہ میں ہو) تو حلال ہے، اور تیر اندازی خشکی میں ہو تو حرام ہے، اور اگر پرندہ پانی سے باہر ہو، اور تیر لگنے کے بعد پانی میں گرے (اور مرے) تو حرام ہے۔ تیر پانی سے چلائے یا باہر ہے۔

پانی کی مذکورہ صورتوں میں اس وقت حلال ہوگا، جبکہ تیر شکار کو پانی میں نہ لے ڈوبے، یا وہ خود اپنے بوجھ کی وجہ سے ڈوبے، اگر اس طرح ڈوب کر مرے تو یہ غریق ہے، جو قطعاً حلال نہیں، جو آگ میں گر جائے وہ بھی حرام ہے۔ تیر لگ کر گرنے والی مذکورہ بالا تمام صورتوں

میں تیر لگنے کی وجہ سے شکار حرکتِ مذبوح تک پہنچ جائے، تو حلال ہوگا (بعد میں کہیں بھی کسی بھی طرح سے گرنے سے کوئی فرق نہیں)

شکار

آیت: (۱) ''.... وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْ ...'' (مائدۃ : ۲)

ترجمہ: اور جس وقت تم احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کیا کرو'' (یعنی اب شکار کی ممانعت ختم ہو چکی)

(۲).. ''قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ '' (المائدہ : ٦)

ترجمہ: ''آپ فرمادیجئے کہ تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، اور جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو اور تم ان کو چھوڑو بھی، اور ان کو اس طریقہ سے تعلیم دو، جو تم کو اللہ نے تعلیم دیا ہے، تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لئے پکڑ رکھیں، اس کو کھاؤ، اور اس پر اللہ کا نام بھی لیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں،

صحیحین وغیرہ میں حضرت عدی بن حاتم اور ابو ثعلبہ سے مرفوعاً شکاری جانوروں کے ذریعہ شکار کا جواز اور اس کے آداب واحکام موجود ہیں۔

شکار یا تو ہتھیار سے ہوگا، جس کے احکام گذر چکے، یا شکاری حیوان کے ذریعہ یہاں اسی کے احکام کا ذکر ہے۔

غیر مقدور علیہ حیوان کے شکار کے لئے بطورِ آلہ شکاری درندہ یا پرندہ کو استعمال کرنا جائز ہے، جیسے کتا، تیندوا، چیتا، شکرہ، باز، شاہین وغیرہ، جبکہ وہ سدھایا اور شکار کی تعلیم دیا ہوا ہو، گو کسی غیر مسلم نے تعلیم دی ہو۔ (جس حیوان کو شکار کے لئے سدھایا گیا ہو، اسے مُعلَّم کہیں گے)

تعلیم کے شرائط

۱- شکار کے لئے جاتے وقت، جب ذمہ دار ابتداء میں یا بعد میں اسے ڈانٹے اور روکے تو وہ رک جائے۔

۲- جب شکار پر بھیجے اور برانگیختہ کرے، تو شکار کے لئے جائے اور برانگیختہ ہو۔

۳- شکار کو روک رکھے، اسے جانے نہ دے، تاکہ اسے بھیجنے والا شکار پکڑ لے۔

۴- قتل سے قبل یا بعد میں خود شکار کا گوشت پوست آنت وغیرہ نہ کھائے، اگر خون پیئے تو حرج نہیں۔

۵- مذکورہ بالا امور پر بار بار عمل ہو، یہاں تک کہ اس فن کے ماہرین کے اعتبار سے اس کے مُعلَّم ہونے کا گمان حاصل ہو جائے۔

معتمد قول یہ ہے کہ شکاری پرندہ کی تعلیم میں صرف دوسری اور چوتھی شرط کافی ہے مُعلَّم ہونے کے بعد شکاری جانور کسی شکار کا گوشت وغیرہ کھائے یا کوئی اور شرط مفقود ہو جائے تو وہ شکار حرام ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر وہ اس میں سے کھالے تو تم مت کھاؤ (صحیحین) اس سے قبل اس نے جو شکار کئے ہیں، وہ حرام نہ ہوں گے۔ اب از سر نو اس کی تعلیم شرط ہے۔

شکار کرنے میں مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو، پھر حیاتِ مستقرہ کی حالت میں شکار ہاتھ آئے اور اسے ذبح کرے تو وہ حلال ہے۔ اگر شکار کے بعد اتنا وقت گذر جائے کہ عرفاً شکاری درندہ کا جوش وغصہ ٹھنڈا ہو چکا یا وہ چلا گیا پھر آ کر اس میں سے کھالیا، یا مالک نے خود اسے کھلایا تو یہ شکار حرام نہیں، اگر کوئی مُعلَّم درندہ اپنے طور پر کسی جانور کو شکار کر کے کھائے، تو اس سے اس کی تعلیم پر اثر نہ پڑے گا۔ کوئی شخص اجازت کے بغیر دوسرے کے شکاری درندہ کو شکار پر چھوڑے، تو وہ شکار حلال ہے۔ شکار کے بعد شکاری جانور مالک (بھیجنے والے

)کوشکار سے روکے، تو یہ بھی کھانے کی طرح ہے۔

کتے کا منہ یا کوئی دوسرا عضوتر حالت میں شکار کے جس حصہ میں لگے، وہ نجس بنجاست مغلظہ ہو چکا۔ اسے سات مرتبہ پانی اور اس میں ایک مرتبہ مٹی ملا کر دھونا کافی ہے اتنا حصہ کاٹ کر پھینکنے کی ضرورت نہیں۔

اگر روانہ کردہ کتا شکار کو زخمی کرنے سے قبل دونوں نگاہوں سے غائب ہو جائیں، پھر شکار مردہ ملے، یا کتے یا تیر نے ایسا زخمی کیا کہ موت کو اس کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، پھر وہ غائب ہو جائے اور بعد میں مردہ حالت میں ملے، تو حرام ہے۔

درندہ شکار پر حملہ آور ہو، اور اس کے بوجھ سے، یا ٹکراؤ سے، یا کاٹنے کی وجہ سے یا قوت سے پکڑنے کی وجہ سے بغیر زخم کے وہ مرجائے، یا حرکت مذبوح تک پہنچ جائے تو حلال ہے۔

اگر معلم درندہ بذاتِ خود شکار کر کے اسے مارے، یا اس کے شکار پر جانے کے بعد مالک وغیرہ اسے برانگیختہ کرے، جس سے اس کی رفتار بڑھ جائے، تو یہ شکار حلال نہ ہوگا، کوئی مسلمان معلم شکاری کو شکار پر روانہ کرے، پھر کسی غیر مسلم کے برانگیختہ کرنے کی وجہ سے رفتار بڑھ جائے، تو یہ حلال ہے، اس کے برعکس غیر مسلم روانہ کرے، اور مسلمان کے برانگیختہ کرنے سے رفتار بڑھ جائے تو یہ شکار حرام ہے۔

شکار کی ملکیت

بقول امام رافعیؒ اصل ضابطہ یہ ہے کہ کسی طریقہ سے شکار کی قوت ختم کر کے اس پر غالب ہو جائے (اور اسے بس میں کر لے) تو اسکا مالک بن جائے گا، (گو غیر ممیز ہو)

اگر شکار حرم کا نہ ہو، اور اس پر کسی کی ملکیت کا کوئی اثر نہ ہو، مثلاً رنگ، پر کترنا بالی اور شکاری محرم یا مرتد نہ ہو تو حساً یا حکماً اس کی (دفاعی اور بچاؤ کی) قوت باطل کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنے سے اس شکار کا مالک ہو جائے گا، جس کی تفصیل وامثلہ حسب ذیل ہیں۔

اگر کوئی شکار کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر قابو میں کر لے، تو اس کا مالک ہوگا، گو ملکیت کا قصد نہ ہو، حتی کہ صرف اسے دیکھنے کے لئے پکڑ لے، تب بھی مالک ہوگا، کیونکہ یہ ایک مباح چیز ہے (یعنی کسی کی ملکیت میں نہیں ہے، جو بھی چاہے لے سکتا ہے) لہٰذا دیگر مباحات کی طرح اس پر قبضہ کر لینے سے مالک ہوگا، لیکن دوسرے کی اجازت سے بطورِ نیابت اس کے لئے پکڑ لے تو وہ دوسرا شخص مالک ہوگا۔ اگر شکار پر کسی دوسرے کی ملکیت کا اثر ہو، تو وہ گمشدہ حیوان یا لقطہ شمار ہوگا۔ حرم کے اور محرم کے شکار کا مالک نہ بنے گا۔ مرتد کی ملکیت موقوف رہے گی، اگر اسلام لائے تو اس کی ملکیت ہے، ورنہ مباح ہی رہے گا، غیر ممیز کسی کے حکم سے شکار کرے تو حکم دینے والا مالک ہوگا، اور ممیز کسی کے حکم سے حکم دینے والے کے قصد سے شکار کرے تو حکم دینے والا مالک ہوگا، ورنہ شکار کرنے والا مالک ہوگا۔

شکاری کو کاری زخم پہنچائے کہ اس سے فوراً مر جائے یا اسے اپاہج کردے یا بازو توڑ دے یا کتر دے (جس کی وجہ سے دوڑ کر بچاؤ کرنے والا دوڑنے سے، اڑ کر بچاؤ کرنے والا اڑنے سے، اور دونوں طریقے سے بچاؤ کرنے والا دونوں سے عاجز ہو جائے) تو اس کا مالک ہوگا گو ابھی اس پر قبضہ نہ کیا ہو، شکار کی یہ حالت ہو جائے کہ اب تیز نہیں دوڑ سکتا، اور بہ آسانی پیچھا کر کے اسے پکڑ نا ممکن ہو، تو اس سے بھی مالک بنے گا۔ اگر شکار کو دوڑائے اور وہ تھک کر رک جائے، یا زخمی کردے اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاس سے رک جائے تو اسے پکڑ لینے تک مالک نہ بنے گا، اگر زخمی کرنے کے بعد پانی تک پہنچے پر قادر نہ ہو اور پیاس سے رک جائے تو مالک بن جائے گا۔

شکاری شکار کے لئے جال لگائے، تو شکار کے اس میں پھنسنے سے یہ مالک بن جائے گا، جب کہ شکار جال میں سے رہائی نہ حاصل

کر سکے۔ گو اس پر قبضہ نہ کرلے، خواہ خود وہاں موجود ہو یا نہ ہو، اور شکار کو اس طرف کسی نے دوڑایا ہو یا نہ دوڑایا ہو، نیز جال مباح ہو یا غصب کا۔ پھنسنے کے بعد شکار جال کتر کر مثلاً رہائی حاصل کرلے، تو وہ مباح ہے جو بھی شکار کرے، مالک ہوگا، اگر دوسرا کوئی جال کترے اور شکار بھاگ جائے تو ملکیت باقی رہے گی، دوسرا مالک نہ بنے گا۔

اگر جال شکار کے لئے نہ لگائے، یا کسی خاص نوع کے شکار کے لئے لگائے اور دوسرا جانور پھنس جائے، یا بلا قصد ہاتھ سے گر جائے اور اس میں شکار پھنس جائے، تو اس سے مالک نہ ہوگا۔ اگر شکار جال سمیت چلا جائے، اور اپنے بچاؤ پر قادر ہو، تو جو بھی اسے پکڑ لے، مالک ہوگا، اور اگر جال کا وزن اس کے بچاؤ کی قوت ختم کردے کہ بہ آسانی پکڑنا ممکن ہو، تو جال والے کی ملکیت باقی رہے گی۔

اگر شکار کو کسی تنگ جگہ مجبور و بےبس کردے، کہ وہاں سے بھاگنے اور چھٹکارا حاصل کرنے پر قادر نہ ہو اور بہ آسانی اسے پکڑ سکے، مثلاً گھر میں داخل کردے، یا مچھلی کو چھوٹے حوض میں یا جانور کو گڑھے میں داخل کرے، تو مالک بنے گا، اگر بھاگ کر رہائی حاصل کرسکتا ہو یا کافی تھکن و مشقت کے بغیر پکڑنا ممکن نہ ہو، تو مالک نہ ہوگا، کوئی دوسرا پکڑ لے تو وہ مالک ہوگا، پرندہ کے آشیانہ (گھونسلہ) بنانے کے قصد سے کچھ تعمیر کرنے اور اس طرح شکار کی عادت و ماحول ہو، تو اس میں آشیانہ بنانے سے اس پرندہ اور اسکے انڈے و چوزے کا مالک بنے گا۔ اس کے بغیر محض کسی کی زمین میں گھونسلا بنانے سے وہ مالک نہ ہوگا، البتہ اس کا زیادہ مستحق ہوگا۔

مچھلی کسی کے حوض میں داخل ہو اور وہ نکلنے کا راستہ بند کردے، اور حوض چھوٹا ہو کہ بہ آسانی ہاتھ سے مچھلی کو پکڑ سکتا ہے، تو اس مچھلی کا مالک ہوگا، اگر حوض اتنا بڑا ہو کہ بغیر مشقت و محنت کے یا جالا ڈالے مچھلی کا حصول ممکن نہ ہو، تو اس سے وہ مچھلی کا مالک نہ ہوگا، البتہ دوسرں کے مقابلہ میں اس کا حق مقدم ہوگا، پس اسکی اجازت کے بغیر کسی کو اس کا شکار کرنا حرام ہے، گرچہ وہ مالک بن جائے گا۔ شکار گھر میں داخل ہونے کے بعد، گھر پر جس کا قبضہ واختیار ہے، وہ دروازہ بند کردے، تا کہ شکار نکل نہ سکے، تو اس کا مالک ہوگا، کوئی اجنبی شخص بند کردے تو مالک نہ ہوگا۔ کوئی اپنی زمین میں اس مقصد سے کیچڑ کرے کہ شکار اس میں لت پت ہو کر پھنس جائے تو اس میں شکار پھنسنے سے وہ مالک ہوگا، اگر اس مقصد سے کیچڑ نہ کرے، تو وہ مالک نہ ہوگا البتہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق قرار پائے گا، لہٰذا دوسرا کوئی پکڑ لے تو مالک بن جائے گا، لیکن گنہگار ہوگا۔

مچھلی کے پیٹ میں موتی: اگر مچھلی کے پیٹ میں بغیر سوراخ کا موتی ملے، تو وہ شکاری کی ملکیت ہے، اگر مچھلی فروخت کردے تو خریدار مالک بنے گا (بعضوں کے نزدیک موتی شکاری کی ہی ملکیت رہے گی) اگر موتی سوراخ دار ہو، تو فروخت کنندہ کا ہوگا، جب کہ وہ اس کا دعوی کرے، اگر فروخت نہ کرے، یا فروخت تو کرے لیکن دعوی نہ کرے تو لقطہ شمار ہوگا۔

شکار کو چھوڑ دینا: احرام کی وجہ سے اپنی ملکیت کے شکاروں پر سے ملکیت ختم ہو جاتی ہے، اور ان کو آزاد کردینا لازم ہے، مذکورہ بالا کسی طریقہ سے شکار کا مالک بننے کے بعد وہ نکل بھاگے، تو ملکیت زائل نہ ہوگی، جو بھی اسے پکڑ لے، اس پر لازم ہے کہ مالک کے سپرد کردے، خواہ بستی میں گھوم رہا ہو، یا جنگل بیابان میں وحشی جانوروں میں شامل ہو جائے، مالک بننے کے بعد از خود شکار کو آزاد کرنے سے اس کی ملکیت زائل نہ ہوگی، اور اس طرح آزاد کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں جاہل رسم کی مشابہت ہے، (وہ سائبہ کے نام سے اپنے باطل معبودوں کے نام جانور چھوڑ دیتے تھے) نیز وہ مباح حیوانوں کے ساتھ خلط ملط ہوگا، اور اس کا شکار ہوگا، البتہ ماں یا اولاد میں سے کسی ایک کا شکار کرے، اور اسے روک رکھنے میں اولاد کی جان کا خطرہ ہو، تو اس کی روح کی حفاظت کے لئے شکار کو آزاد کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ حدیث میں اولاد کی خاطر ایک ہرنی کو چھوڑنے کا ذکر موجود ہے، نیز ایک سرخ رنگ کے پرندہ کے بچوں کے شکار کے بعد وہ قریب

آ کر پھڑ پھڑانے لگی تو آپ ﷺ نے انھیں چھوڑنے کا حکم دیا تھا (امام زرکشی وغیرہ نے دونوں حدیث کو معتبر قرار دیا ہے، دوسری روایت بسند صحیح ابوداود میں موجود ہے) اگر شکار شدہ اولاد کا گوشت حلال ہو، تو اسے ذبح کرنا بھی جائز ہے (آزاد کرنا ہی لازم نہیں)

اگر مطلق التصرف (جسے مالی تصرفات کا اختیار ہو) شکار کو آزاد کرتے وقت کہے، میں نے اسے مباح قرار دیا، تو جو بھی پکڑ لے اسے بلا ضمان اسے کھانا اور دوسرے کو کھلانا حلال ہے، فروخت وغیرہ کرنا صحیح ونافذ نہ ہوگا (اس طرح آزاد کرنا حلال ہے) کسی کے پاس پرندہ وغیرہ ہو، اور اسے ذبح کرنے یا کھلانے کی کوئی صورت نہ ہو، تو اسے آزاد کرنا لازم ہے۔ جو پرندہ وغیرہ آزاد کرنے کے بعد پھر لوٹنے کا عادی ہو، اسے آزاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ: روٹی کے ٹکڑے اور اناج کی بالیاں وغیرہ جو مالک پھینک دیتا ہے، جو بھی اسے اٹھالے مالک ہوگا، اور فروخت وغیرہ کرے تو صحیح ہوگا، کوئی مردار کی کھال سے اعراض کرے، تو جو بھی اسے دباغت دے، اس کا مالک ہو جائے گا۔

پانچ فواسق (یعنی چیل، سانپ وغیرہ جن کا تذکرہ گذر چکا) میں سے کسی کو پالنے کے لئے روک رکھنا حرام ہے، کسی جاندار کی آواز یا رنگ سے انتفاع کے لئے اسے قید میں رکھنا حلال ہے۔

پرندوں کا اختلاط: کسی کے کبوتر مثلاً دوسرے کے گنبد وغیرہ پر جائیں (اور اس کے کبوتروں میں شامل ہو جائیں) تو مالک کو اس کی اطلاع دینا اور لے جانے دینا لازم ہے، اگر نہ لوٹائے تو ضامن ہوگا، اگر دونوں کے درمیان انڈے یا چوزے وجود میں آئیں تو وہ مؤنث کے تابع ہوں گے، لہٰذا مؤنث کے مالک کے ہوں گے۔ آنے والے کبوتر کے بارہ میں شک ہو کہ کسی کی ملکیت ہیں یا مباح، تو اسے تصرف جائز ہے، کیونکہ اصل اباحت ہے۔

اگر ایک کے کبوتر دوسرے کے کبوتروں میں شامل ہونے کے بعد دونوں کے جدا سمجھ میں نہ آئیں، تو کسی تیسرے کو معین کبوتر فروخت وغیرہ کرنا صحیح نہیں، انہیں میں سے ایک دوسرے کو مالک بنائے تو صحیح ہے، اگر دونوں کو اپنے کبوتر کی تعداد معلوم ہو اور ہر ایک کی قیمت برابر ہو، اور دونوں بھی کسی تیسرے شخص کو فروخت کریں، تو یہ صحیح ہے، اور تعداد کے مطابق قیمت تقسیم ہوگی، مثلاً ایک کے سو اور دوسرے کے دو سو ہوں، اور قیمت تین ہزار ہو، تو اول کو ایک ہزار اور دوسرے کو دو ہزار ملیں گے، اسی طرح دونوں نسبت کے اعتبار سے معین کر کے بعض کبوتر فروخت کریں، تب بھی صحیح ہے، اگر تعداد کا علم نہ ہو، یا قیمت مساوی نہ ہو تو بیع صحیح نہ ہوگی۔ تاہم ہر ایک اس طرح کہے کہ اس میں جتنے بھی میرے کبوتر ہوں، فلاں قیمت پر تم کو فروخت کر دیا، تو صحیح ہے۔ اگر کسی دوسرے کی ملکیت کا ایک کبوتر اپنے کبوتروں میں شامل ہو جائے، تو اجتہاد کر کے ایک کے علاوہ بقیہ کبوتروں کو کھا سکتے ہیں، اگر کسی کا پھل اپنے پھلوں میں، یا کسی کے محصور یا غیر محصور کبوتر بستی کے مباح (یعنی جو کسی کی ملکیت میں نہیں) وغیرہ محصور کبوتروں میں گھل مل جائیں، یا کسی کا پانی نہر میں گر جائے، تو کسی پر اُن کا شکار یا نہر کا پانی کا استعمال حرام نہیں۔ گو مالک کی ملکیت زائل نہ ہوگی، اگر مباح محصور ہوں تو حرام ہے۔

حلال وحرام کا اختلاط: کسی کے درہم و دینار یا کسی اور مال میں دوسرا حرام مال شامل ہو (اور دونوں میں فرق معلوم نہ ہو) تو حرام کی مقدار جدا کر کے اسے جس مصرف میں صرف کرنا واجب ہے، اس میں صرف کر دے، تو بقیہ میں (اپنا ذاتی مال سمجھ کر) تصرف کرنا جائز ہے۔ تاہم تقوی کا پہلو واضح ہے، جدا کردہ حرام مال اصل مالک سے واقف ہو تو اسے لوٹا دے، ورنہ بیت المال کے سپرد کرے یا بذاتِ خود بیت المال کے مصالح میں صرف کرے، جب کہ اس سے واقف ہو۔

شکار میں دو کی شرکت: دو اشخاص بہ یک وقت ایک شکار کو زخمی کر کے اس کی قوت ختم کر دیں، تو دونوں اس کے مالک

ہیں، اگر ایک نے قوت ختم کردی، تو وہی مالک ہے، اگر دونوں یکے بعد دیگرے زخمی کریں، اور صرف ایک قوت ختم کرے، تو وہ مالک ہوگا۔

خاتمہ : (۱) اگر تیر اور کتا روانہ کرے، اور کتا اسے لنجا کردے، پھر تیر ذبح کردے تو حلال ہے، اور تیر سے لنجا کرے، پھر کتا قتل کرے تو حرام ہے، کسی فاسق یا اہل کتاب نے یہ خبر دی کہ میں نے مثلاً یہ بکری ذبح کی ہے، تو اسے کھانا حلال ہے، اگر کسی بستی میں مسلمان اور مجوسی وغیرہ (جن کا ذبیحہ حلال نہیں) موجود ہوں، اور یہ معلوم نہ ہو کہ ذابح مسلم ہے یا دوسرا، تو اس کا کھانا حلال نہیں، اگر بستی میں صرف مسلمان ہوں، یا مسلمان غالب ہوں، جیسا کہ اسلامی بستیاں، تو حلال ہے۔

(۲) غیر دھار دار کسی ایسے ہتھیار سے شکار کرنا کہ عموماً شکار اس سے مرنہ جائے (بلکہ باقاعدہ ذبح کرکے حلال ہوگا) تو اس سے شکار جائز ہے، اگر عموماً شکار مرجاتا ہو، تو ایسے ہتھیار سے شکار حرام ہے، (کیونکہ وہ مردار شمار ہوگا، حلال نہ ہوگا) ایسے ہتھیار اپنی قوت سے (نہ کہ دھار سے) شکار کو ذبح کرے، یا اس کی گردن الگ کردے، تو یہ حرام ہے۔

(۳) ذبح شدہ جانور کا شل عضو بھی دیگر اجزاء کی طرح حلال ہوگا۔

(۴) کسی زندہ حیوان کا کوئی جزو کاٹ کر الگ کیا جائے تو طہارت ونجاست میں اس حیوان کے مردہ کی طرح ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: ''جو حصہ زندہ سے کاٹا جائے وہ مردہ ہے'' (حاکم وصححہ) لہٰذا انسان، مچھلی، اور ٹڈی کے اجزاء پاک ہوں گے، اور بقیہ کے نجس، لیکن حلال جانوروں کے بال وپر، اون اور ریشم پاک ہیں، جبکہ ان کی زندگی میں یا شرعی تذکیہ کے بعد جدا ہوں، البتہ زندگی میں جدا شدہ عضو پر جو بال ہوں وہ نجس ہیں، انسان کے علاوہ تمام مردار جانداروں کے بال نجس ہیں، اور پاک نہیں ہوسکتے، کیونکہ یہ دباغت کو قبول نہیں کرتے۔

(تلخیص ۱۳۳/۴، فتح الوھاب مع الجمل ۲۳۳/۵-۲۵۰، نھایہ مع الحواشی ۱۱۱/۸-۱۳۰، مغنی المحتاج ۲۶۵/۴-۲۸۲، الاقناع مع البجیرمی ۲۴۶/۴-۲۵۶، بغیہ: ۲۵۶، المجموع ۷۲/۹-۱۴۵، ترشیح ۲۰۵، ۲۰۸، تحفہ مع الحواشی ۱۸۸/۱۲-۲۴۴)

اُضحیہ (قربانی)

۱۰ ذوالحجہ سے ایامِ تشریق کے آخر تک اللہ سے تقرب حاصل کرنے کے لئے جو مویشی ذبح کیا جاتا ہے، اسے اضحیہ (قربانی) کہتے ہیں۔ اس کے لئے اُضحِیَہ، اِضحِیَہ، اُضحِیَّہ، اِضحِیَّہ، ضَحِیَّہ، ضِحِیَّہ، اَضحَاۃ اور اِضحَاۃ آٹھ لغات مستعمل ہیں۔ یہ دراصل ضَحوَۃٌ سے ماخوذ ہے، یعنی دن کا ابتدائی حصہ، کیونکہ اس کا ابتدائی وقت وہی ہے۔ یہ عیدین اور زکات وصدقہ فطر کی طرح ۲ھ میں مشروع ہوا، قرآن وحدیث اور اجماع سے اس کی مشروعیت ثابت ہے۔

آیت : ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ'' (الکوثر: ۲)

ترجمہ : ''سو آپ اپنے پروردگار کے واسطے نماز پڑھیے اور قربانی کیجئے''۔ اس آیت میں اصح قول کے اعتبار سے نحر سے قربانی کے جانوروں کو نحر کرنا مراد ہے۔

احادیث : (۱) آپ ﷺ نے فرمایا: یوم النحر (۱۰/ ذوالحجہ) میں ابن آدم نے (قربانی کے جانور کا) خون بہانے سے محبوب تر کوئی عمل نہیں کیا، اور بلاشبہ وہ بروزِ قیامت اپنے سینگ، کھر اور بالوں سمیت آئے گا اور یقیناً اس کا خون روئے زمین پر گرنے

سے قبل بارگاہ الٰہی میں پہنچ جائے گا (اور قبولیت سے سرفراز ہوگا) پس اسے خوش دلی سے انجام دو'' (ابن ماجه ، والترمذی وحسنه)

(۲) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے قربانی کو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت قرار دیا، اور فرمایا کہ اس کے ہر بال اور اون میں ایک ایک نیکی ملے گی (احمد ۔ ابن ماجه)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو حیثیت وگنجائش کے باوجود قربانی نہ کرے، وہ ہرگز ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے'' (احمد وابن ماجه ، ورجح الائمة وقفه) (نیل الاوطار ۵/۱۲۳)

(۴) آپ ﷺ نے دو سفید (یا سفید وسیاہ) سینگ دار مینڈھوں کی قربانی کی، اپنے دست مبارک سے انھیں ذبح کیا اور اللہ کا نام لیا، اور تکبیر پڑھی، اور اپنا مبارک قدم ان کے گردن کے کنارے پر رکھا'' (مسلم)

حکمت: اُضحیہ ایک عظیم عبادت ہے، جو اللہ کی بندگی کے طور پر انجام دینا ہے۔ اس کی ایک عظیم ترین حکمت حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی عظیم ترین قربانی کے مقصد کو تازہ کرنا اور اس کا احیاء ہے۔ نیز اس میں فقراء ومحتاجوں کی غمگساری وتعاون اور عید کے موقع سے ان کے اہلِ وعیال کو خوشی کی فراہمی ہے، اور نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کی بھائی چارگی کا تعلق قوی تر ہوتا ہے، اور اجتماعیت اور آپسی محبت کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

حکم: جس رشید مسلمان کے پاس ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۳ ذوالحجہ تک اپنے مصارف وضروریات سے زائد اتنا مال ہو، کہ قربانی کرسکتا ہو، تو اس پر قربانی کرنا سنت مؤکدہ ہے، خواہ حج میں ہو، مقیم ہو، مسافر ہو، شہری ہو یا دیہاتی، اگر ایک شخص پر متعدد افراد کا نفقہ واجب ہو (مثلاً بیوی بچے وغیرہ) تو ان پر قربانی سنت کفایہ ہے، یعنی ان میں سے کوئی ایک انجام دے، تو بقیہ سے اس کا مطالبہ ساقط ہوگا، گرچہ ثواب صرف قربانی کرنے والے کو ملے گا۔ البتہ امام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا کہ اگر وہ دوسروں کو ثواب میں شریک کرے تو یہ جائز ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ کے دور مسعود میں ایک شخص اپنے اور اہل خانہ کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دیا کرتا تھا'' (مؤطا مالک ، ابن ماجه ، والترمذی ، وصححه)

کسی تنہا شخص کے حق میں قربانی سنت عین ہے، حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ قربانی نہ کرتے، تاکہ عوام اسے واجب نہ سمجھیں (بیهقی باسناد حسن) نیز ترمذی کی ایک روایت میں اسے سنت قرار دیا ہے، اور دار قطنی وغیرہ کی روایت میں ہے: ''قربانی مجھ پر فرض ہے اور تم لوگوں پر واجب نہیں'' آپ ﷺ کے حق میں قربانی واجب تھی۔

چونکہ قربانی کے وجوب میں اختلاف ہے، اس لئے جس کے حق میں یہ سنت ہو، اسے ترک کرنا مکروہ ہے، اور اسی لئے نفلی صدقہ کے مقابلہ میں یہ افضل ہے۔

نذر یا التزام (اپنے اوپر واجب کرلینے) سے قربانی واجب ہوگی: مثلاً میں نے یہ بکری قربانی کے لئے متعین کردی، یہ قربانی کا جانور ہے، اللہ کے لئے مجھ پر قربانی کرنا لازم ہے۔ وغیرہ، اگر کسی نے کہا کہ میں اس بکری کا مالک بنا تو مجھ پر اللہ کے لئے اس کی قربانی لازم، تو اس پر اس کی قربانی لازم نہ ہوگی، خواہ وہ اس کا مالک بنے، لیکن اگر یہ کہے: میں کسی بکری کا مالک بنا (یعنی بکری معین نہ کرے) تو اللہ کے واسطے اس کی قربانی مجھ پر لازم ہے، تو بکری کا مالک بنے تو اس کی قربانی لازم ہے، لیکن محض خرید نے یا نیت کرنے سے وہ بکری قربانی کی شمار نہ ہوگی جب تک کہ خریدنے کے بعد لفظاً التزام نہ پایا جائے۔

تنبیہ: عوام اکثر وقت سے کافی قبل قربانی کا جانور خرید کر یہ کہتے ہیں کہ یہ قربانی کا جانور ہے (یا میں اس کی قربانی کروں گا

وغیرہ) حالانکہ وہ اس جملہ پر مرتب احکام سے ناواقف ہوتے ہیں، کیونکہ یہ التزام کا جملہ ہے، لہذا وہ واجب قربانی ہوگی، اور اسے کھانے کی اجازت نہ ہوگی، اگر وہ یہ کہے کہ میری مراد یہ تھی کہ سنت قربانی ہے، تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

لیکن علامہ حضرمی فرماتے ہیں کہ لوگوں کا عام عرف اس سے سنت قربانی کا ارادہ ہوتا ہے اسے لازم قربانی قرار دینے میں شدید حرج ہے، ائمہ کرام نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ عقیقہ میں اس طرح کہے: بسم اللہ یہ فلاں کا عقیقہ ہے، پھر سنت عقیقہ کی طرح اس میں سے کھانا وغیرہ جائز قرار دیتے ہیں، اور دونوں کا حکم بلاشبہ ایک ہی ہے، شیخ الاسلام امام بلقینی اور ابوبکر مراغی وغیرہ نے فتوی دیا کہ یہ میری قربانی ہے، کہنے سے نذر کی قربانی (اور لازم) نہ ہوگی یہ فلاں کا عقیقہ کی مانند ہے (قلائد ۲/۳۸۴) (اکثر فقہاء نے چونکہ پہلے قول کو ترجیح دی ہے، لہذا احتیاط کا پہلو اختیار کرنے میں بہتری ہے)

بعض مسائل: (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھو اور کسی کا قربانی کا ارادہ ہو، تو قربانی کرنے تک اپنے بال و ناخن نہ تراشے" (مسلم وسنن اربعہ)

جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، اسے ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہونے کے بعد قربانی کرنے تک اپنے بدن کے کسی بھی حصہ کے بال و ناخن اور چمڑی وغیرہ جب کہ کوئی ضرر و حاجت نہ ہو، زائل کرنا مکروہ ہے حتی کہ جمعہ کے دن بھی، اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ مغفرت اور آگ سے خلاصی ان تمام اجزاء کو شامل ہو۔

ایک سے زائد قربانی کا ارادہ ہو، تو پہلی قربانی سے کراہت ختم ہوگی۔ (جو احرام میں ہو، اسے یہ امور حرام ہیں) ختنہ کرنا، چور کا ہاتھ کاٹنا، درد کی وجہ سے دانت نکالنا، یا تکلیف کی وجہ سے کسی عضو کو کاٹنا (آپریشن) وغیرہ مکروہ نہیں ہے۔

(۲) جو مرد بذات خود صحیح طریقہ سے ذبح کرنے پر قادر ہو اسے خود ذبح کرنا سنت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے خود اپنی قربانی ذبح فرمائی (صحیحین) نیز یہ ایک قربت ہے، لہذا خود انجام دینا بہتر ہے۔ کسی دوسرے کو نائب بنانا بھی جائز ہے، کیونکہ ایک مرتبہ بعض جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو نائب بنایا"۔ نائب کا قربانی کے مسائل سے واقف اور مسلم ہونا بہتر ہے۔ اہل کتاب، نابینا، یا بچہ کو نائب بنانا مکروہ ہے۔ حائضہ ونفساء کو نائب بنانا خلاف اولی ہے، مؤنث اور خنثی کے لئے دوسرے کو وکیل بنانا افضل ہے۔

(۳) جو دوسرے کو ذبح کے لئے وکیل بنائے اسے ذبح کے وقت وہاں حاضر رہنا سنت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو اس کا حکم دیا تھا (حاکم وصححہ)

قربانی کے جانور: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: "وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ" (الحج: ۳۴)

ترجمہ: اور ہم نے ہر امت کے لئے اس غرض سے قربانی کرنا مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے"۔

صرف اونٹ، بیل، بھینس اور بھیڑ بکری پر ہی قربانی ہو سکتی ہے، خواہ مذکر ہوں، یا مؤنث، یا خنثی، یا خصی، کیونکہ آپ ﷺ اور کسی صحابی سے ان کے علاوہ کی قربانی منقول نہیں ہے۔ اسمیں افضل اونٹ، پھر بیل، پھر بھیڑ، پھر بکری ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قربانی میں خون بہانا کافی ہے گو مرغی یا بط کا ہو، ہمارے شیخ غریب شخص کو اس کی تقلید کا حکم دیتے تھے، اور عقیقہ کو قربانی پر قیاس کر کے کہتے کہ جس کے گھر بچہ پیدا ہو وہ ابن عباس کے مسلک پر مرغ ذبح کرے۔ باجوری،

(بغیہ : ۳۵۷)

قربانی کے دو جدا جنسوں کی جفتی و میل سے پیدا شدہ جانور قربانی وہدی میں کافی ہے۔ والدین میں قربانی کی معتبر عمروں میں سے زائد عمر والے کا اعتبار ہوگا، لہٰذا بھیڑ اور بکری سے پیدا شدہ جانور کا دو سالہ ہونا ضروری ہے، نیل گائے، ہرن وغیرہ دیگر جانوروں کی قربانی صحیح نہیں،

شرائط : (۱) بھیڑ اور دنبہ کی عمر ایک سال ہو چکی ہو، یا اس سے قبل اس کے دانت گر چکے ہوں، اور گائے بیل اور بکری دو سال کی ہو چکی ہو اور اونٹ پانچ سال کا ہو چکا ہو، مسلم کی حدیث میں آپ ﷺ نے مُسِنَّۃ کے ذبح کا حکم دیا ہے، اور اس کا مطلب وہ اونٹ ہے، جس کو پانچ سال مکمل ہو کر چھٹا شروع ہو چکا ہو، اور وہ گائے و بکری ہے جس کو دو سال مکمل ہو کر تیسرا سال شروع ہو چکا ہو۔ اس سے زائد عمر کی قربانی جائز ہے۔ ایک حدیث میں بھیڑ کے جَذَع کی قربانی کی تعریف فرمائی (ترمذی۔ احمد) ایک حدیث میں فرمایا کہ اس کی قربانی جائز ہے (احمد و ابن ماجہ) جَذَع یعنی جسے ایک سال ہو چکا ہو، یا اس سے قبل دانت گر جائے۔

جانور کے عمر کے متعلق فروخت کنندہ کی خبر معتبر ہوگی، جبکہ اس کے پاس پیدا ہوئی ہو، ورنہ واقف و تجربہ کار حضرات کے گمان کی طرف رجوع کریں گے۔

تنبیہ : امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر تہائی سے کم کان کٹا ہو، تو قربانی صحیح ہے، صحیح کان والے جانور دشوار ہونے کی وجہ سے قاضی حسین اس پر فتویٰ دیتے تھے، امام اذرعی شرح منہاج میں فرماتے ہیں کہ ایک دقیقہ یاد رہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۱۳/ ذوالحجہ کو قربانی جائز نہیں، لہٰذا کان کے مسئلہ میں جو ان کی تقلید کرنا چاہے، اس میں بھی تقلید کے دیگر شرائط کی طرح ان کے مسلک کا لحاظ رکھے (بغیہ : ۲۵۸)

(۲) قربانی کے جانور میں کوئی ایسا عیب نہ ہو، جس سے ماکول (یعنی کھائے جانے والے کسی) حصہ میں نقص وکمی پیدا ہو،

ناکافی جانور : درج ذیل جانوروں کی قربانی صحیح نہیں ہے۔

پیدائشی بلا کان، کان، تھن، دم، یا زبان کا کچھ حصہ کٹ کر جدا ہوا ہو، گو قلیل ہو اور دور سے نظر نہ آئے، چکتی کٹی ہوئی (تاہم اس کے موٹاپے کے لئے اسے معمولی سا کاٹے تو حرج نہیں) جو چراگاہ سے بھاگے اور بہت کم چرے، جس کی وجہ سے دبلی ہو جائے، شدید لاغری کی وجہ سے جس کے ہڈی میں گودا نہ رہے، خارش زدہ، گو کم مقدار میں ہو، پھوڑے پھنسی والا، جو واضح طور پر بیمار ہو، کانا، (ایک آنکھ سے اندھا) یا لنگڑا ہو، جب کہ لنگڑے پن کی وجہ سے چراگاہ میں دیگر مویشیوں سے پیچھے رہے، گرچہ قربانی کے لئے لٹاتے وقت اس کے اضطراب واچھل سے لنگڑا ہو جائے، نابینا، حاملہ، (اگر حمل سے ابھی گوشت میں بالکل نقص نہ ہوا ہو، تو بعضوں کے نزدیک قربانی صحیح ہے) تمام دانت گرے ہوئے، ران وغیرہ سے بڑا حصہ کٹا ہوا، سینگ ٹوٹا ہوا جب کہ گوشت متاثر ہو، کوئی عضو شل ہو،

آپ ﷺ نے فرمایا: "چار جانوروں کی قربانی جائز نہیں، بالکل کانا، جو واضح طور پر بیمار ہو، جو کافی لنگڑا ہو، جس (کی ہڈی) میں مغز نہ ہو" (مالک، احمد سنن اربعہ، ابن حبان، حاکم، بیھقی، وصححہ، الترمذی) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے (قربانی کے جانوروں کے) آنکھ اور کان کو بغور دیکھنے کا حکم دیا (احمد، سنن اربعہ) ایک روایت میں لاغر (دبلے) جانور کی قربانی سے منع فرمایا (ابوداود، حاکم)

جائز جانور : درج ذیل جانوروں کی قربان جائز ہے۔

بے سینگ، شکستہ سینگ (سینگ ٹوٹا ہوا) جب کہ ماکول میں کوئی نقص نہ پیدا ہو، کان میں سوراخ ہو یا پھٹا ہوا ہو، (یعنی کان کا کوئی حصہ الگ نہ ہوا ہو) بعض دانت گرا ہوا، جبکہ اس سے چرنے پر اور گوشت پر اثر نہ پڑے، جو پیدائشی بلا چکتی، یا تھن، یا دم کے ہو جس کے کان چھوٹے ہوں، بینائی کی کمزوری جو چرنے میں مانع نہ ہو، رات میں نظر نہ آئے، داغ دیا ہوا، عنقریب جسکی زچگی ہوئی ہو (علامہ زرکشی اور خطیب نے اسے اور دودھ پلانے والی کو نا کافی قرار دیا ہے) کسی بڑے عضو مثلاً ران سے تھوڑا سا کٹا ہو (اگر کٹی ہوئی مقدار کے قلیل وکثیر میں شک ہو، تو قلیل شمار کرے) معمولی بیمار، معمولی لنگڑا پن جس کی وجہ سے چراگاہ میں دیگر جانوروں سے پیچھے نہ رہے، ذکر (عضو تناسل) کٹا ہوا، خصی، کیونکہ آپ ﷺ نے دو خصی مینڈھوں کی قربانی دی تھی (احمد، ابوداود، ابن ماجہ، بیہقی)

سینگ دار جانور کی قربانی افضل ہے، کیونکہ مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں آپ ﷺ کا یہ معمول ہے، نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''بہترین قربانی سینگ دار مینڈھا ہے'' (ابوداود، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی) بلکہ بے سینگ کی قربانی مکروہ ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث کی وجہ سے کان میں شگاف وغیرہ ہو (لیکن ٹکڑا جدا نہ ہوا ہو) تو اس کی قربانی مکروہ تنزیہہ ہے۔

جانور کو خصی کرنا: تین شرائط کے ساتھ خصی کرنا جائز ہے: (۱) جانور کا گوشت حلال ہو (۲) جانور کمسن ہو (۳) معتدل زمانہ میں کرے۔ اگر ایک بھی شرط مفقود ہو، تو خصی کرنا حرام ہے۔

فائدہ: اگر کسی دوسرے سے کہا کہ میری جانب سے قربانی کرو، اور اس نے کی، تو صحیح ہے، اور قیمت اس پر فرض ہے۔

(۳) قربانی کی تیسری شرط یہ ہے کہ اسے ذبح کرتے وقت یا اس سے قبل اسے قربانی کے لئے متعین کرتے وقت قربانی کی نیت کرے، خواہ سنت قربانی ہو یا فرض۔ اگر ذمہ میں نذر کی قربانی ہو اور قربانی کے جانور کو اس کی طرف متعین کر دے، تو یہ بھی کافی ہے، جس جانور کو نذر کے ذریعہ قربانی کے لئے معین کر چکا ہو، اس میں نیت شرط نہیں (مثلاً یوں کہنا: میں نے اس بکری کی قربانی کی نذر مانی) اگر ذبح کیلئے کسی کو وکیل بنائے، تو اس کے سپرد کرتے وقت مالک کی نیت کافی ہے لیکن اگر ذبح کے لئے کسی اہل کتاب وکیل ہو تو ذبح کے وقت مالک کی نیت شرط ہے۔ وکیل کی نیت ضروری نہیں بلکہ اسے یہ پتہ نہ ہو کہ قربانی کا جانور ہے، تب بھی حرج نہیں، اگر ذبح کے وکیل یا کسی دوسرے کو نیت کی ذمہ داری دے تو جائز ہے، جبکہ وہ ممیز و مسلم ہو، کسی کافر وغیرہ ممیز کو نیت کا ذمہ دار نہیں بنا سکتا۔

جانور میں شرکت: حضرت جابر فرماتے ہیں ''ہم نے حُدیبیہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ایک اونٹ سات کی جانب سے، اور گائے کو سات کی جانب سے نحر (ذبح) کیا'' (مسلم سنن اربعہ)

ایک اونٹ یا گائے کی قربانی میں مستقل سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں، اسی طرح حج کے موقع پر (تمتع یا احرام کی مخالفت وغیرہ کی وجہ سے) مشروع قربانیوں کا بھی یہی حکم ہے، خواہ اسباب ایک ہوں، یا مختلف، قربانی واجب ہو، یا سنت، اگر بعض قربانی کی نیت سے شریک ہوں، اور بعض محض کھانے کے لئے گوشت کی نیت سے، تب بھی صحیح ہے، قربانی کے ہر شریک کو اپنے حصہ سے کچھ گوشت کچا صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگر سات سے زائد مثلاً آٹھ آدمی ایک یا زائد اونٹ میں شریک ہوں، تو کسی کی قربانی صحیح نہ ہوگی، گو مسئلہ معلوم نہ ہو، یا ساتھ ایک بکری بھی ملا لیں، جیسا کہ ایک بکری کو دو کی طرف سے قربانی صحیح نہیں، بکری یا اونٹ وغیرہ کے ثواب میں دوسروں کو شریک کر سکتے ہیں۔

ایک بکری (بھیڑ، دنبہ) کی قربانی صرف ایک کی جانب سے ہوگی، اگر دو آدمی دو بکری کی قربانی یا ہدی وغیرہ میں شریک ہوں، تو جائز نہیں۔ ایک واجب بکری کے بدلہ اونٹ یا گائے کی قربانی دے، تو بقیہ چھ حصے نفل شمار ہوں گے، لہٰذا انھیں نفل کے مصرف میں صرف کر سکتا ہے۔ ایک شخص کئی جانوروں کی قربانی کر سکتا ہے۔

ترتیب: سب سے افضل سات مینڈھوں کی قربانی ہے، پھر سات بکریوں کی، پھر ایک اونٹ کی، پھر ایک گائے کی، پھر ایک مینڈھے کی، پھر ایک بکری کی، پھر اونٹ کا ایک حصہ، پھر گائے کا ایک حصہ،

رنگ: سب سے افضل سفید رنگ کا جانور ہے، پھر زرد، پھر خاکستری، پر سرخ، پھر سفید وسیاہ (یا سفید کے ساتھ کوئی دوسرا رنگ) پھر سیاہ۔

مذکر مؤنث سے افضل ہے گو رنگ میں اس سے پیچھے ہو، جبکہ زیادہ جفتی نہ کی ہو، ورنہ نہ جنی ہوئی مؤنث افضل ہے۔ جو جانور مذکر، سفید اور موٹا ہو وہ مطلقاً افضل ہے، پھر جس میں دو صفت ہوں، تعارض کی صورت میں موٹا مقدم ہوگا، پھر مذکر۔ مذکر جانور مؤنث وخنثی سے افضل ہے، جس مؤنث کو بچے ہو چکے ہوں، اس کے مقابلہ میں جسے ابھی تک بچہ نہ ہوا ہو، وہ افضل ہے، اور جس مذکر نے جفتی نہ کی ہو، وہ افضل ہے، بہ نسبت اس کے جو جفتی کر چکا ہو۔ کثرتِ تعداد سے موٹاپا کی زیادتی افضل ہے، پس ایک موٹا دو دبلے سے افضل ہے۔ چربی کی زیادتی سے گوشت کی زیادتی افضل ہے۔

وقت: یوم النحر (۱۰/ ذوالحجہ) کو سورج نکلنے کے بعد خفیف دو رکعت اور دو خطبوں کے بقدر وقت گذرنے کے بعد قربانی کا وقت شروع ہوتا ہے، اور ۱۳/ ذوالحجہ کو سورج غروب ہونے تک باقی رہتا ہے۔ آپ ﷺ نے عید الاضحیٰ کے خطبہ میں فرمایا: آج سب سے پہلے ہم نماز پڑھتے ہیں، پھر لوٹ کر قربانی کریں گے، جس نے اس طرح کیا، اس نے ہمارے طریقہ کو اپنایا، اور جو اس سے قبل ذبح کرے، تو بس وہ (صرف کھانے کے لئے) گوشت ہے، جو گھر والوں کے لئے مقدم کیا، اس کا قربانی کی عبادت سے کوئی واسطہ نہیں'' (صحیحین) ایک حدیث میں ہے: ''تمام ایامِ منیٰ میں قربانی (کرنا جائز) ہے''۔ (بیھقی وصححہ ابن حبان) (ایامِ منیٰ یعنی ۱۰ سے ۱۳/ ذوالحجہ) ابن حبان کی ایک روایت میں ہے: ''ایامِ تشریق کے ہر دن قربانی کر سکتے ہیں'' یوم النحر کو سورج بقدر نیزہ بلند ہونے کے بعد (کراہت کا وقت ختم ہونے کے بعد) مذکورہ مدت گذرنے تک مؤخر کرنا افضل ہے۔ تاکہ دیگر علماء کے اختلاف سے بچ نکلیں۔ بغیر حاجت کے رات میں ذبح کرنا مکروہ ہے، اگر دن میں فرصت نہ ملے، یا فقراء رات میں بہ آسانی میسر ہوں، تو کراہت نہ ہوگی۔ اگر ۱۳/ تاریخ کو غروب مکمل ہونے سے قبل جانور کا حلقوم اور مری کاٹ دے (ذبح کرے) تو قربانی صحیح ہے۔ مذکورہ مدت سے قبل یا بعد ذبح کرے تو وہ قربانی شمار نہ ہوگی۔ یوم النحر میں قربانی کرنا مستحب ہے، گو ایک سے زائد جانور ہوں، تاکہ خیر کی طرف مسارعت وسبقت ہو۔

قربانی کی نذر: کوئی شخص اپنی ملکیت کے قربانی کی جنس کے کسی معین جانور کے قربانی کی نذر مانے، تو اس پر اس کی ملکیت ختم ہو جائے گی۔ مثلاً: مجھ پر اللہ کے لئے اس کی قربانی لازم ہے، مجھ پر اس کی قربانی واجب ہے، یہ قربانی کا جانور ہے، میں نے اسے قربانی کے لئے مقرر کر دیا وغیرہ۔ ان الفاظ کے ساتھ نیت نہ ہو یا کچھ اور نیت ہو، تب بھی لفظ کی صراحت کی وجہ سے نذر منعقد ہوگی (لہٰذا ان الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتے) گو وہ قربانی کے لئے ناکافی ہو، مثلاً عیب دار، کمسن وغیرہ، ناکافی جانور قربانی کی طرف سے کافی نہ ہوگا، (تاہم اس پر ثواب ملے گا) (لیکن قربانی کی مشابہت کی وجہ سے) نذر کے بعد پہلے آنے والی قربانی کی مدت میں اسے ذبح کرنا لازم ہے، اگر وقت نکل جائے تو بعد میں بطور قضاء ذبح کرنا لازم ہے، جو جانور قربانی کی جنس سے نہ ہو، مثلاً ہرن، خرگوش وغیرہ، اس کی قربانی کی نذر صحیح نہیں۔ قربانی کے جانور کے نذر کی نیت کرے (اور لفظ میں ادا نہ کرے) تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر اس کی کوتاہی کے بغیر قربانی کے وقت سے قبل یا قربانی کی مدت میں جانور تلف ہو جائے، یا چوری ہو، یا کھو جائے، تو اس پر بدل لازم نہیں، اگر اس کی کوتاہی سے تلف ہو، تو یوم النحر اور یومِ تلف کی قیمتوں میں سے زائد قیمت اس پر لازم ہے، تاکہ اس سے تلف شدہ سے

عمدہ جانور، یا اس کے مثل دو یا زائد جانور خرید سکے، اگر کچھ رقم باقی ہو تو دوسرے جانور میں شرکت کرے، بقیہ رقم کی قلت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو، تو اس سے گوشت خرید لے، یا رقم ہی صدقہ کردے، اگر مکمل قیمت سے اس کی مثل جانور نہ مل سکے، تو اس سے کمتر درجہ کا خرید ے۔ کسی دوسرے شخص نے تلف کیا تو اس پر قیمت ادا کرنا لازم ہے۔ تاکہ یہ اس سے اس کا مثل خرید ے۔ اگر معین نذر کے جانور میں اس کی کوتاہی کے بغیر قربانی کی مدت سے قبل قربانی کے منافی عیب پیدا ہو، تو وقت میں اسے ہی ذبح کرنا کافی ہے، عیب کی وجہ سے اس پر کچھ لازم نہیں، اگر وقت سے پہلے ذبح کرے تو گوشت صدقہ کردے۔ اور خود اس میں سے کچھ نہ کھائے نیز اس کی قیمت بھی صدقہ کرے، اس سے دوسرا جانور خریدنا لازم نہیں، ذبح کی قدرت کے بعد عیب پیدا ہو، تو یہ کافی نہیں ہے (لیکن) اسے ذبح کرنا واجب ہے، اور اس کا گوشت صدقہ کردے، خود بالکل نہ کھائے، نیز اس کی جگہ بے عیب جانور ذبح کرنا واجب ہے، اگر نذر ماننے والا خود اسے عیب دار کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، اب اس کے بدلہ دوسرا صحیح جانور ذبح کرے۔

ذمہ میں نذر: کوئی اپنے ذمہ میں قربانی کی نذر مانے (یعنی ابتداء میں جانور متعین نہ ہو) مثلاً: مجھ پر اللہ کے لئے قربانی لازم پھر اسے معین کرے، مثلاً کہے: میں نے اس بکری کو اپنے نذر کی طرف سے معین کیا، تو اسے بھی قربانی کی مدت میں ذبح کرنا لازم ہے، وقت نکل جائے، تو بطور قضاء ذبح کرے۔ اسے بے عیب جانور کی تعیین لازم ہے۔ اور محض تعیین سے اس کی ملکیت ختم ہوگی، معین کرنے کے بعد اس کی کوتاہی سے یا بلا کوتاہی کے تلف ہو جائے، تو اصل نذر اس کے ذمہ باقی رہے گی، اسی طرح اس میں کوئی عیب پیدا ہو، گو بوقت ذبح ہو، تو اس کی تعیین باطل ہوگئی، اب اسے فروخت کرنا اور دیگر تصرفات جائز ہیں۔ اصل نذر اس کے ذمہ باقی ہے، لہٰذا دوسرا صحیح جانور ذبح کرنا لازم ہے۔

جانور گم ہونا: اگر نفل قربانی کا جانور کھو جائے تو اس پر کچھ لازم نہیں، لیکن جب وہ مل جائے، تو اسے ذبح کرنا اور صدقہ کرنا مستحب ہے۔ ایام تشریق کے بعد ذبح کرے تو وہ گوشت ہے، جسے صدقہ کر رہا ہے۔ (قربانی شمار نہ ہوگی)

سنت قربانی کا مصرف: اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ'' (الحج: ۲۸)

ترجمہ: ''سوان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو'' نیز فرمایا: ''فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ'' (الحج: ۳۶) ترجمہ: پس جب وہ (جانور کروٹ کے بل گر پڑیں تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی کو بھی کھانے دو''۔

ابتداء میں آپ ﷺ نے لوگوں کی غریبی وضرورت کے پیش نظر قربانی کرنے والوں کو صرف تین دن تک گوشت رکھنے اور کھانے کی اجازت دی تھی، بقیہ تمام صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا، بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''کھاؤ، ذخیرہ کر رکھو، اور صدقہ کرو'' (متفق علیہ) ایک حدیث میں فرمایا: کھاؤ اور کھلاؤ اور روک کر ذخیرہ کر رکھو'' (مسلم) ایک روایت میں فرمایا: ''جتنا چاہو کھاؤ اور کھلاؤ اور جمع کر رکھو'' (احمد، مسلم، ترمذی وصححہ) ایک حدیث میں صدقہ کر کے ثواب حاصل کرنے کا حکم دیا۔ (احمد، ابوداود)

آیات واحادیث کی روشنی میں اپنی سنت قربانی کے گوشت میں سے کچھ کھانا سنت ہے، جگر میں سے کھانا افضل ہے، جیسا کہ آپ ﷺ سے مروی ہے (بیہقی) قربانی وہدی کا گوشت آئندہ کے لئے بچا رکھنا مکروہ نہیں ہے، اگر رکھنا ہو تو مستحب یہ ہے کہ اپنے تہائی میں سے رکھے، نہ کہ دوسرے دو تہائی سے، ابتداء میں اپنی قربانی کا گوشت تین روز سے زائد بچا رکھنا حرام تھا، پھر اجازت ملی، اپنے گھر پر گھر والوں کے روبرو قربانی کرنا مستحب ہے، تاکہ وہ خوش ہوں اور گوشت سے مستفید ہوں۔

اغنیاء کو نفلی قربانی میں سے بطور ہدیہ دینا جائز ہے۔ وہ اغنیاء اسے کھانے، مسلمان کو صدقہ کرنے اور کسی مسلمان غنی یا فقیر کی مہمان نوازی میں استعمال کر سکتے ہیں، فروخت نہیں کر سکتے۔

آیت کے حکم کے پیش نظر نفل قربانی کا کچھ کچا گوشت صدقہ کرنا واجب ہے، گو صرف ایک فقیر یا مسکین کو دے۔ پکا کر یا خشک کر کے دینا کافی نہیں، کسی مالدار کو ہدیہ میں دینا صدقہ کی طرف سے کافی نہ ہوگا۔ افضل یہ ہے کہ صرف چند لقمے بطور تبرک کھائے، اور بقیہ تمام صدقہ کر دے، ادنیٰ کمال یہ ہے کہ ایک تہائی سے زائد خود استعمال نہ کرے، اگر کھانا، ہدیہ اور صدقہ تینوں انجام دینا ہو، تو سنت یہ ہے کہ ایک تہائی سے زائد نہ کھائے۔ اور ایک تہائی سے کم صدقہ نہ کرے، صرف کھانا اور صدقہ کرنا ہو تب بھی ایک تہائی سے زائد نہ کھائے۔ (دونوں صورت میں جتنا زیادہ صدقہ کرے، وہ بہتر ہے) بعض حصہ کھائے اور بعض صدقہ کرے، تو قربانی کا ثواب مکمل ملے گا، اور صدقہ کی مقدار پر صدقہ کا ثواب (بھی) ملے گا۔ جتنی مقدار کا صدقہ واجب ہے، اسے قربانی کی بستی سے منتقل کرنا ممنوع ہے۔ اگر واجب مقدار کا صدقہ نہ کیا تو اس کی قیمت سے گوشت خرید کر صدقہ کرنا لازم ہے۔

سنت قربانی کی کھال یا کسی دوسرے حصہ کو فروخت کرنا، کرایہ پر دینا، یا قصاب کو بطور اجرت دینا حرام ہے، صحیحین میں قصاب کو جانور میں سے کچھ دینے کی ممانعت ثابت ہے، مسند احمد کہ ایک حدیث میں گوشت و کھال کے فروخت کی ممانعت اور کھال سے انتفاع کی اجازت ثابت ہے، اجرت اپنی جیب سے ادا کر کے بطور صدقہ اسے گوشت وغیرہ دے تو کوئی حرج نہیں ، حدیث میں ہے کہ "جو اپنی قربانی کی کھال فروخت کرے اس کی قربانی نہیں" قربانی کی کھال سے ہر طرح کا انتفاع صحیح ہے، مثلاً جوتا، چپل، موزہ، ڈول، اور پوستین وغیرہ بنانا۔

واجب قربانی کا مصرف : نذر وغیرہ کی وجہ سے واجب قربانی کو مکمل صدقہ کرنا واجب ہے، حتی کہ کھال وغیرہ بھی۔ خود کھانا کسی مالدار کو ہدیہ دینا، یا فروخت کرنا وغیرہ حرام ہے۔ اگر اس میں سے کچھ کھالیا تو اس کا بدل فقراء کو دینا لازم ہے، واجب قربانی کو بستی سے منتقل کرنا ممنوع ہے، زکات کی طرح مکمل وہیں صدقہ کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے جگہ قربانی یا عقیقہ کروائے (یعنی کسی کو مثلاً جانور خرید کر قربانی کرنے کے لئے وکیل بنائے، گو کسی دوسری بستی میں) تو یہ جائز ہے۔

تنبیہ : کسی بھی قربانی کا گوشت کسی غیر مسلم کو دینا یا کھلانا وغیرہ منع ہے۔ اسی طرح کوئی غریب خود کو صدقہ میں ملا ہوا، یا امیر ہدیہ میں ملا ہوا گوشت کافر کو بیچ یا کھلا نہیں سکتا اور نہ ہدیہ میں دے سکتا ہے۔

اولاد : واجب قربانی کے بچہ کا حکم بھی ماں کی طرح ہے یعنی اسے بھی ذبح کر کے مکمل صدقہ کرے، خواہ نذر کے وقت ہی حاملہ ہو، یا بعد میں حاملہ ہو (علامہ رملی وخطیب وغیرہ کے نزدیک ماں باقی ہو، تو واجب کا بچہ مکمل بھی کھا سکتے ہیں، ماں تلف ہو تو بچہ کی تقسیم واجب ہے۔ غیر واجب کا بچہ کھانا جائز ہے، (یعنی حمل کی حالت میں قربانی کی نیت کرے، پھر ذبح سے قبل ہی زچگی ہو)

دودھ : واجب اور غیر واجب قربانی کے جانور کا دودھ جو بچہ کی ضرورت سے زائد ہو، کراہت کے ساتھ پینا، یا کسی دوسرے کے بچہ کو پلانا جائز ہے، جب کہ اس کی وجہ سے گوشت پر اثر نہ پڑے۔ سنت یہ ہے کہ فاضل وزائد دودھ اور جھول وقلادہ وغیرہ صدقہ کر دے، اسے فروخت وغیرہ کرنا حرام ہے۔

اون : اگر اون وغیرہ کو ذبح تک باقی رکھنے سے جانور کو تکلیف ہو، تو اسے کتر کر اس سے انتفاع کر سکتا ہے، فروخت وغیرہ کرنا حرام ہے، اگر جانور کو تکلیف نہ ہو، تو واجب قربانی کا اون نہ کترے، کیونکہ ذبح کے بعد مساکین کو اس سے نفع ہوگا۔

سواری : اپنی واجب قربانی پر بصورت حاجت سواری کرسکتا ہے، یعنی جب کہ چلنا دشوار ہو، اور دوسری کوئی سواری میسر نہ ہو، یا اس کے پاس اجرت نہ ہو، اسی طرح دوسرے محتاج کو سواری کے لئے بلا اجرت دے سکتا ہے۔ اجرت پر دینا جائز نہیں، سواری کی وجہ سے کچھ نقص پیدا ہو، تو سوار ہونے والا ضامن ہوگا، اسی طرح وقت ہونے اور ذبح پر قدرت کے بعد تلف ہو، تو ضامن ہوگا، اس سے قبل ضامن نہ ہوگا۔

دوسرے کی جانب سے قربانی : کوئی شخص دوسرے کی جانب سے اس کی اجازت کے بغیر قربانی نہیں کرسکتا، خواہ وہ شخص زندہ ہو یا مردہ، اگر کوئی کرے اور جانور معین تھا تو کرنے والے کی طرف سے واقع ہوگی، ورنہ نہیں، اگر زندہ شخص کی اجازت ہو، یا میت وصیت کر چکا تھا، تو ان کی طرف سے قربانی صحیح ہے۔ حضرت علیؓ آپ ﷺ کی طرف سے دو مینڈھوں کی قربانی کرتے اور فرماتے کہ آپ ﷺ نے مجھ ہمیشہ آپ ﷺ کی جانب سے قربانی کا حکم دیا" (ابوداود، ترمذی، بیہقی) زندہ کی اجازت سے قربانی کرے، تو بظاہر تقسیم میں بھی یہ نائب شمار ہوگا، تقسیم اس کی اجازت پر موقوف نہ ہوگی، میت کی وصیت سے قربانی کرے تو مکمل صدقہ کردینا واجب ہے، اپنے اور اپنے زیرِ کفالت افراد پر صدقہ نہیں کرسکتا۔ اور نہ کسی مالدار کو دے سکتا ہے۔

اجازت کی شرط سے درج ذیل صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

(۱) جو جانور نذر کی وجہ سے معین ہو، اسے کوئی دوسرا شخص اجازت کے بغیر قربانی کی مدت میں ذبح کرے، تو قربانی صحیح ہوگی، مالک گوشت تقسیم کردے، کیونکہ اس میں بوقتِ ذبح نیت شرط نہیں، تاہم ذبح کرنے والے پر زندہ اور مذبوحہ جانور کے قیمت میں جو تفاوت ہو، وہ ادا کرنا لازم ہے، جس سے بکری، یا ایک حصہ اور یہ ممکن نہ ہو، تو گوشت خرید کر صدقہ کرے۔

(۲) باپ ورنہ دادا اپنی کمسن یا پاگل اولاد کی طرف سے اپنے مال میں سے قربانی کرسکتے ہیں، دیگر اولیاء کو اس کی اجازت نہیں، نیز اُن کے مال میں سے کسی کہ قربانی کی اجازت نہیں۔

(۳) امام (خلیفہ وحاکم) بیت المال سے مسلمانوں کی جانب سے عیدگاہ میں اونٹ یا بیل ورنہ بکری کی قربانی کرلے۔ جب کہ بیت المال میں گنجائش ہو، اس کی وجہ سے مسلمانوں کو ثواب ملے گا، لیکن صاحبِ حیثیت لوگوں سے قربانی کا مطالبہ ساقط نہ ہوگا۔

(۴) واقف اپنے وقف سے قربانی کی شرط لگائے، تو وقف کی آمدنی سے قربانی کر کے اسکے متعینہ افراد پر صرف کریں گے، اس کی وجہ سے ان سے قربانی ساقط نہ ہوگی، وہ افراد اس قربانی سے کھاسکتے ہیں گو مالدار ہوں، یہ دراصل واقف کی قربانی نہیں ہے، بلکہ محض صدقہ شمار ہوگا۔

(۵) کسی دوسرے کو اپنی قربانی کے ثواب میں شریک کرنا (نہ کہ اس کی طرف سے قربانی کرنا)

(۶) گھر کے ایک شخص کا دیگر اہل خانہ کو بھی اپنی قربانی میں (ثواب کے اعتبار سے) شامل کرنا۔

فائدہ : ایک بکری قربانی وعقیقہ کی نیت سے ذبح کرے، تو علامہ رملی نے اسے کافی قرار دیا ہے، لیکن علامہ ابن حجر نے ناکافی قرار دیا ہے۔

بعض سنتیں : (۱) قربانی کے جانور کو موٹا تازہ کرنا، حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں: "ہم اور دیگر مسلمان حضرات قربانی کو فربہ کرتے تھے (بخاری) (۲) نماز عید (وخطبہ) کے بعد ذبح کرے۔ (۳) ذابح مسلم ہو (۴) دن میں ذبح کرے (۵) ذبح کے لئے نرم جگہ منتخب کرے۔ (۶) ذابح اور ذبیح کا رخ قبلہ کی طرف ہو، یہ تمام ذبح میں سنت ہے، لیکن قربانی میں اس کی زیادہ تاکید ہے (۷) صحیحین میں حضرت انسؓ کی مرفوع حدیث کی وجہ سے قربانی کے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کہنا سنت ہے۔ امام ماوردی فرماتے ہیں، بسم اللہ سے پہلے اور

بعد میں تین مرتبہ تکبیر (اللہ اکبر) کہے۔

(۸) بوقت قربانی، بسم اللہ کے بعد تکبیر، پھر درود کے بعد یہ کہے: "اَللّٰھُمَّ مِنْكَ وَاِلَيْكَ فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ" (یا اللہ، یہ تیری ہی نعمت ہے اور تیرے ہی حضور پیش ہے، پس تو میری طرف سے قبول فرما) آپ ﷺ نے ایک دنبہ ذبح فرمایا اور (قبل ذبح) کہا: بسم اللہ، اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ" (یا اللہ، محمد، آل محمد اور امتِ محمد کی طرف سے قبول فرما) پھر اس کی قربانی کی"۔ (مسلم) نیز حضرات ابن عباسؓ و ابن عمرؓ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔

(۹) مسلمانوں کے حاکم کو بیت المال سے تمام مسلمانوں کی جانب سے قربانی کرنا سنت ہے، جیسا کہ مسلم کی حدیث سے آپ ﷺ کا امت کی جانب سے قربانی کرنا ثابت ہے۔ نیز اسے عیدگاہ میں جہاں لوگ نمازِ عید کے لئے جمع ہوں، اپنے ہاتھوں سے ذبح کرے، جیسا کہ بخاری کی حدیث سے ثابت ہے۔

(تلخیص الحبیر ۴/۱۳۷-۱۴۶، خلاصة البدر ۲/۳۷۷-۳۸۹، نیل الاوطار ۵/۱۲۳-۱۴۹، المجموع ۸/۳۸۲-۴۲۶، الفقه المهنجی ۱/۲۳۱-۲۳۶، فتح الوهاب مع الجمل ۵/۲۵۰-۲۶۲، نهایه مع الحواشی ۸/۱۳۰-۱۴۴ قلائد ۲/۳۸۳-۳۹۱، تحفه مع الحواشی ۱۲/۲۴۵-۲۹۰، بشری الکریم ۲/۱۲۵-۱۲۹، ترشیح علی الفتح ۲۰۲-۲۰۵، فتح المعین مع الاعانة ۲/۳۳۰-۳۳۵، بغیه : ۲۵۷، الاقناع مع البجیرمی ۴/۲۷۷-۲۸۶، مغنی المحتاج ۴/۲۸۲-۲۹۳)

عقیقہ

تعریف: عقیقہ عَقّ سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے، قطع کرنا، کاٹنا، جدا کرنا، پھاڑنا۔ دراصل اس کا اطلاق نوزائیدہ بچے کے پیدائشی بال پر ہوتا ہے، کیونکہ اسے مونڈ کر جدا کیا جاتا ہے۔ بچہ کی پیدائش کے تعلق سے ذبح کئے جانے والے جانور کو شرعاً عقیقہ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے گلے کو کاٹا اور پھاڑا جاتا ہے، نیز (افضل طریقہ کے اعتبار سے) بچہ کے بال مونڈنے اور جدا کرنے کے وقت اسے انجام دیا جاتا ہے، ابوداود کی ایک حدیث کی وجہ سے عقیقہ کو نَسِیکَہ یا ذبیحہ کہنا مستحب ہے، لیکن معتمد قول کے اعتبار سے عقیقہ کہنے میں کوئی کراہت نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے (کتابوں میں عام طور پر مستعمل و مشہور لفظ عقیقہ ہے)

حکمت: عقیقہ کی مشروعیت میں مختلف اسرار و مصالح اور گوناگوں فوائد ہیں۔ مثلاً:

۱- اولاد اللہ کی بڑی نعمت ہے، لہٰذا اس پر خوشی اور شکر کا اظہار

۲- بچہ کے نسب کی نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے۔

۳- سخاوت و بخشش اور فیاضی کی خصلت کو پروان دینا، اور اس کے برعکس بخل و حرص کی صفت کو مات دینا۔

۴- اہل و عیال و رشتہ دار اور فقراء و احباب کو عقیقہ کی دعوت میں جمع کر کے ان کا دل خوش کرنا، اور آپسی محبت و الفت اور اجتماعیت کی جڑوں کو مضبوط کرنا۔

حکم: عقیقہ کرنا سنت مؤکدہ ہے، آپ ﷺ کے قول و عمل اور صحابہ کرام کے تعامل سے یہ ثابت ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "بچہ کے ساتھ عقیقہ (مشروع) ہے، پس اس کی جانب سے خون بہاؤ اور اس کی تکلیف کو دور کرو" (یعنی بال اور میل کچیل و گندگی دور

کرو) (بخاری ،ابوداود ، ترمذی ، نسائی ،ابن ماجه) ایک دوسری حدیث میں فرمایا: ''بچہ اپنے عقیقہ کے عوض مرتھن ہے، اس کی جانب سے ساتویں دن (عقیقہ) ذبح کیا جائے، سر مونڈا جائے اور اس کا نام رکھا جائے'' (احمد، سنن اربعة وصححه الترمذی) امام احمد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ مرتھن ہے، یعنی بروزِ قیامت والدین کے حق میں شفاعت نہ کرے گا، بعضوں نے کہا کہ اس کی صحیح نشوونما نہ ہوگی۔

عقیقه کا مخاطب: جس کے ذمہ اپنے فرع کا نفقہ لازم ہے، اسے اس فرع کی طرف سے عقیقہ کرنا سنت ہے (یعنی اگر بچہ کے پاس مال نہ ہوتا، تو جس پر نفقہ واجب ہوتا ہے، وہ اس کے عقیقہ کا ذمہ دار ہے، گو بچہ کے پاس میراث وغیرہ کے ذریعہ مال ہونے کی وجہ سے نفقہ اس پر واجب نہ ہو) بچہ کے مال سے عقیقہ کرنا ممنوع ہے، اگر کرے تو ضامن ہوگا۔

نفقہ کا ذمہ دار ایسا مالدار ہو، جو صدقہ فطر کے وجوب کے لئے ضروری ہے، تو وہ عقیقہ کا مخاطب ہے اگر غریب ہو، لیکن اکثر مدتِ نفاس (یعنی ۶۰ روز) سے قبل مذکورہ مالداری حاصل ہو جائے، تو اس سے عقیقہ مطلوب ہے، ۶۰ روز کے بعد مالداری حاصل ہو، تو اب وہ عقیقہ کا مامور نہیں گو بچہ کے بلوغ سے قبل مالدار حاصل ہو، اس صورت میں عقیقہ کرے، تو وہ عقیقہ شمار نہ ہوگا، بلکہ محض گوشت ہے (امام بجیری فرماتے ہیں کہ اب اسے تاکیدی حکم نہیں) بچہ کی پیدائش سے ۶۰ روز کے اندر حیثیت حاصل ہو، تو عقیقہ اسی درمیان کرنا ضروری نہیں، بچہ کے بلوغ تک کبھی بھی کر سکتا ہے، بلوغ کے بعد اصل (باپ وغیرہ) کی طرف سے عقیقہ ساقط ہو چکا، اب اسے خود اپنا عقیقہ کرنا سنت ہے۔

وقت: بچہ کی مکمل پیدائش سے بلوغ تک عقیقہ کا وقت ہے، علامہ ابن حجرؒ کے نزدیک پیدائش سے قبل بھی اصل سنت ادا ہوگی جبکہ وجود باحیات محقق ہو، لیکن صاحب مغنی واسنیٰ وغیرہ کے نزدیک اس سے عقیقہ ادا نہ ہوگا، یہ محض گوشت ہوگا۔

احکام: درج ذیل امور میں عقیقہ کے احکام بھی قربانی کی طرح ہیں:

جانور کی جنس (اونٹ، گائے، بیل اور بکری وغیرہ) جانور کی عمر، عیوب سے سلامتی، نیت، افضل کی ترتیب، کھانا، صدقہ کرنا، ہدیہ دینا، ذخیرہ کر رکھنا، فروخت کی ممانعت، ایک بکرے سے اس سنت کا حصول، گو لڑکے کی طرف سے ہو، عقیقہ کی نذر ماننے یا عقیقہ کے لئے جانور کو متعین کرے، تو قربانی کی طرح متعین ہوگا، اور تمام صدقہ کر دینا واجب ہے، خود کھانا یا امیروں کو کھلانا جائز نہیں، البتہ قربانی وعقیقہ کے نذر میں یہ فرق ہے کہ قربانی کا تمام گوشت کچا تقسیم کرنا لازم ہے، اور عقیقہ کا کچھ پکا کر اور کچھ کچا تقسیم کر سکتے ہیں، تمام پکا کر صدقہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ (بعضوں کے نزدیک مکمل کچا صدقہ کرنا واجب ہے، اور بعض دیگر حضرات کے نزدیک مکمل پکا کر صدقہ کر سکتے ہیں)

سنتیں: (۱) لڑکے اور خُنثیٰ کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا مسنون ہے۔ آپ ﷺ نے لڑکی کی طرف سے ایک بکرا اور لڑکے کی طرف سے دو بکرے کے عقیقہ کا حکم دیا (احمد، ابن ماجه وصححه الترمذی) ایک حدیث میں فرمایا کہ مذکر ہوں یا مؤنث (یعنی بکرا ہو یا بکری) کوئی حرج نہیں (احمد ، ترمذی ، وصححه)

لڑکے کی طرف سے صرف ایک بکرا بھی عقیقہ کرے، تو اصل سنت حاصل ہوگی، کیونکہ آپ ﷺ نے حسنینؓ کی طرف سے ایک ایک مینڈھا عقیقہ فرمایا تھا (ابوداود ،نسائی ، وصححه، عبدالحق وابن دقیق العید) اونٹ یا بیل کا ساتواں حصہ بھی ایک بکری کے حکم میں ہے۔ فضیلت کے اعتبار سے وہی ترتیب ہوگی، جو قربانی میں گذری، یعنی سات بکرے پھر اونٹ اس طرح آخر تک۔ اگر ایک اونٹ یا بیل سات بچوں کی طرف سے ذبح کرے تو جائز ہے۔ اس طرح مختلف لوگ مل کر کریں، تب بھی جائز ہے، خواہ بعض کا حصہ عقیقہ کا، بعض کا قربانی کا، اور بعض کا صرف گوشت کا ارادہ ہو۔

(۲) اسے پکانا سنت ہے، کیونکہ حضرت عائشہؓ نے اسے سنت قرار دیا ہے، پکا کر سالن سمیت فقراء کی خدمت میں بطورِ صدقہ روانہ کرنا ان کو دعوت دے کر کھلانے سے افضل ہے۔

(۳) اس کا ایک پچھلا پیر ران کی ابتدا تک دایہ کو کچا دینا سنت ہے، دایاں دینا بہتر ہے۔ کئی بکرے ذبح ہوں، تب بھی ایک پیر دینے سے سنت ادا ہوگی، ایک سے زائد دایہ ہوں تو تمام کو مل کر ایک پیر دینا کافی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ کو حکم دیا کہ عقیقہ کا پیر دایہ کو دیں (بیہقی ، ابوداود ، فی مراسیلہ والحاکم)

(۴) عقیقہ کا گوشت میٹھا پکانا سنت ہے (۵) عقیقہ کے جانور کی ہڈیاں نہ توڑے، بلکہ ہر ہڈی جوڑ سے جدا کرے، توڑنا خلاف اولیٰ ہے۔ (۶) بچہ کی پیدائش کے ساتویں روز عقیقہ کرنا سنت ہے، جیسا کہ مسند احمد و سنن کی روایت میں گذر چکا۔ اگر غروب سے قبل پیدا ہو، تو وہ دن شمار ہوگا، اگر رات میں پیدا ہو، تو بعد والا دن پہلا دن شمار ہوگا، ساتویں دن نہ کرے تو چودھویں دن ورنہ اکیسویں روز کرے، آئندہ بھی کرے تو سات کا اعتبار کرنا بہتر ہے۔ (یعنی یومِ پیدائش سے ایک روز قبل کرے۔ مثلاً پیر کو پیدا ہوا، تو آئندہ جب بھی کرنا ہو، اتوار کو کرے)

ذبح کی قدرت کے بعد بچہ کا انتقال ہو، گو سات روز سے قبل ہو، تو اس کا عقیقہ کرنا مسنون ہے۔ بعضوں نے کہا کہ روح پھونکنے کے امکان کے بعد حمل ساقط ہو، تو اس کا عقیقہ بھی مسنون ہے

(۷) ذبح کے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کے بعد یہ کہنا مسنون ہے: ''اللهم مِنْكَ وَاِلَيْكَ عَقِيجَةُ فُلَان '' (بیہقی باسنادِ حسن) (یا اللہ یہ تیری نعمت ہے، اور فلاں کے عقیقہ کے طور پر تیری خدمت میں پیش ہے) (فلاں کی جگہ بچہ کا نام لے)

(۸) دن کے ابتداء میں طلوع شمس کے وقت ذبح کرنا افضل ہے۔

(۱) قربانی کے برعکس عقیقہ کا گوشت مال دار کو دیا جائے، تو وہ جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ (۲) ایک ہی بکری سے عقیقہ و قربانی دونوں کی نیت کرے تو علامہ رملیؒ کے نزدیک دونوں حاصل ہوں گے، لیکن علامہ ابن حجر مکیؒ نے فرمایا کہ ایک بھی حاصل نہ ہوگا کیونکہ دونوں مقصود سنت ہیں، نیز قربانی سے عام ضیافت اور عقیقہ سے خاص ضیافت مقصود ہے، مزید برآں دونوں میں بعض مسائل میں اختلاف ہے۔

دردِ زہ کی دعا: دردِ زہ کے وقت عورت کے پاس یہ پڑھنا مسنون ہے: آیۃ الکرسی، سورہ اعراف کی آیت: ''اِنَّ رَبَّكُمُ اللهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ وَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثاً وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنَّجُوْمَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَالَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ)، معوذتین نیز یہ دعاء کرب بکثرت پکڑھے: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه الْعَظِيْمُ الْحَلِيْم ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ، نیز یونس علیہ السلام کی دعا والی یہ آیت پڑھے: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ '' (الانبیاء : ۸۷)

بچہ کے کان میں '' قل ہو اللہ احد'' پڑھنا مسنون ہے، اس کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنی زندگی میں زنا نہ کرے گا۔

وضع حمل (زچگی) کے لئے: نئے برتن میں لکھے: اُخْرُجْ اَيُّهَا الْوَلَدُ مِنْ بَطْنٍ ضَيِّقَةٍ اِلٰى سَعَةِ هٰذِهِ الدُّنْيَا اُخْرُجْ بِقُدْرَةِ اللهِ تَعَالٰى الَّذِىْ جَعَلَكَ فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ اِلٰى قَدْرٍ مَّعْلُوْمٍ ' لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ '' سورت کے آخر تک (یعنی سورۂ حشر کی اکیسویں آیت سے ۲۴ تک)'' وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ '' اور

پانی سے دھوکر حاملہ کو پلائے اور کچھ اس کے چہرہ پر چھڑکے (بجیرمی علی الاقناع ۲۸۸/۴، اعانہ مع الفتح ۳۳۹/۴)

نوزائیدہ کے بعض آداب ومسائل

نام رکھنا: حضرت ابوموسی اشعریؓ فرماتے ہیں: ”مجھے بیٹا پیدا ہوا تو میں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں لے گیا، تو آپ ﷺ نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور سے اس کی تحنیک فرمائی اور اس کے لئے برکت کی دعا فرمائی“ (بخاری ومسلم) مسلم میں برکت کی دعا کا ذکر نہیں ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”آج کی شب مجھے بیٹا پیدا ہوا، تو میں نے اسے حضرت ابراہیمؑ کا نام رکھا“ (مسلم) حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ”حضرت ابوطلحہ کو بیٹا پیدا ہوا، تو میں اسے آپ ﷺ کی خدمت میں لے گیا، تو آپ ﷺ نے اس کی تحنیک فرمائی اور اس کا نام عبداللہ رکھا“ (صحیحین)

مذکورہ روایات سے پیدائش کے روز نام رکھنا ثابت ہوا، سننِ اربعہ وغیرہ کی صحیح روایات میں ساتویں روز نام رکھنے کا حکم موجود ہے، لہٰذا علماء فرماتے ہیں کہ بچہ کا نام پیدائش سے ساتویں روز رکھنا مستحب ہے، اس سے قبل اور بعد بھی رکھ سکتے ہیں، امام بخاریؒ نے یوں تطبیق دی ہے کہ اگر عقیقہ کرنا ہو تو (عقیقہ سے قبل) ساتویں دن نام رکھے، ورنہ اول روز ہی نام رکھے۔

نام کی تفصیل: اپنے بیٹے کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن رکھنا مستحب ہے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں اسے اللہ کے نزدیک محبوب ترین نام بتلایا ہے، نیز ایک شخص کو آپ ﷺ نے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھنے کا حکم دیا (متفق علیہ) کسی نبی یا فرشتہ کا نام رکھنا یا یٰسین وطٰہٰ نام رکھنا مکروہ نہیں ہے۔ ایک حدیث میں انبیاء کرام کا نام رکھنے کا حکم فرمایا'...اور حارث وہمام کو سب سے سچ نام اور حَرب اور مُرّہ کو سب سے قبیح نام شمار فرمایا (ابوداود، نسائی) ایک حدیث میں ہے: ”بروز قیامت تم کو تمہارے اور والدوں کے نام سے بلایا جائے گا، پس اپنے نام بہتر رکھو“ (ابوداود باسناد جید) نافع، یسار، نجیح، رباح، افلح، اور برکت نام رکھنا مکروہ ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے (مسلم) دیگر بھی جس نام کی نفی میں بدشگونی ذہن میں آئے، وہ مکروہ ہے۔

قبیح نام رکھنا مکروہ ہے، اگر رکھا گیا تو اسے بدل کر بہتر نام رکھا جائے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیٹی کا نام عاصیہ تھا، تو آپ ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھا (مسلم) اسی طرح حضرت زینب بنت جحش کا نام بَرّہ تھا، تو آپ ﷺ نے ان کا نام زینب رکھا (صحیحین) حضرت جویریہ کا نام بھی برہ تھا، آپ ﷺ نے بدل کر جُویریہ رکھا (مسلم) ابواُسید کے ایک بیٹے کا نام بدل کر منذر رکھا“ (صحیحین)

اپنے اولاد شاگرد وغیرہ کو تنبیہ وتادیب کے طور پر قبیح نام سے آواز دینا جائز ہے، جیسا کہ ایک مرتبہ صدیق اکبر نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو یا غُنثَر (بیوقوف) کہہ کر آواز دی اور انھیں بُرا بھلا کہا (صحیحین)

بچہ کی موت: اگر نام رکھنے سے قبل بچہ انتقال کر جائے، تب بھی اس کا نام رکھنا مستحب ہے، امام بغوی وغیرہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث کی وجہ سے اس ساقط بچہ کا بھی نام رکھنا مستحب ہے، جس میں روح پھونکی گئی ہو، اگر لڑکا ہے یا لڑکی پتہ نہ ہو، تو مشترک نام رکھے، مثلاً طلحہ، ھند، خارجہ،

حرام نام: آپ ﷺ نے ملك الاملاك کو عنداللہ ذلیل ترین نام قرار دیا ہے۔ (صحیحین) مَلِكُ الْمُلُوك، مَلِكُ الْاَمْلَاك (بادشاہوں کا بادشاہ، شہنشاہ) اَقْضَی الْقُضَاۃ عبدالکعبہ (کعبہ کا بندہ)، عبدالنار (آگ کا بندہ) عبدالحسین (حسین کا بندہ) وغیرہ نام حرام ہیں، کیونکہ شرک کا وہم ہوتا ہے، اسی لئے جاراللہ (اللہ کا پڑوسی) اور رفیق اللہ (اللہ کا رفیق) جیسے نام بھی ممنوع ہیں بعضوں نے

قاضی القضاۃ اور حاکم الحاکم کو بھی ممنوع قرار دیا ہے۔ بجیرمی نے قاضی القضاۃ کو مکروہ قرار دیا ہے۔

لقب : (اصل نام کے علاوہ کوئی دوسرا نام جو اپنے وضع اول کے اعتبار سے مدح یا ذم کی طرف مشعر ہو): اچھے لقب میں حرج نہیں، البتہ عوام کی طرح بے جا توسع نہیں ہونا چاہئے کہ ہر کس و ناکس کے لئے علاء الدین (دین کی سربلندی) ضیاء الدین (دین کی روشنی) جیسے لقب مستعمل ہوں، یہ مکروہ ہے۔

کنیت : اَبٌ یا اُمٌّ کے ساتھ جو نام مشروع ہو، اسے کنیت کہتے ہیں، مثلاً ابو عبداللہ (عبداللہ کا باپ) ام عبداللہ (عبداللہ کی ماں)، اہل فضل مذکر و مؤنث کے لئے کنیت مندوب ہے، گو ان کو اولاد نہ ہو، خواہ اپنے بچہ کا نام سے کنیت رکھے یا کسی دوسرے نام سے، لڑکے کے نام سے ہو یا لڑکی کے نام سے۔ آدمی کے نام کے علاوہ بھی کنیت جائز ہے۔ مثلاً ابو ہریرہ (بلی کے ابا) ابو المکارم، ابو الفضائل، ابو المحاسن وغیرہ۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو حضرت عبداللہ (حضرت عائشہؓ کے بھانجے عبداللہ بن زبیر) کے نام سے کنیت کی اجازت دی، لہٰذا ان کی کنیت ام عبداللہ تھی (ابوداود) کسی کافر، فاسق یا مبتدع کے لئے کنیت کا استعمال جائز نہیں تاہم فتنہ کے خوف کی وجہ سے، یا تعریف (یعنی کوئی کنیت سے ہی مشہور ہو، تو اس سے واقف کرانے) کے لئے گنجائش ملے گی۔ ابو القاسم دراصل آپ ﷺ کی کنیت ہے، اور صحیح احادیث میں کسی دوسرے کے لئے اس کی ممانعت وارد ہے، لہٰذا کسی کو بھی یہ کنیت رکھنا حرام ہے۔ ابو عیسیٰ کنیت رکھنے میں حرج نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت مغیرہؓ کی کنیت ابو عیسیٰ رکھی تھی (ابوداود باسناد جید)

کمسن کے لئے بھی کنیت رکھ سکتے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت انسؓ کے ایک کمسن بھائی کو 'ابو عمیر' کہہ کر پکارا (صحیحین)

جس کی کئی اولاد ہو، اسے اپنے بڑے بچہ کے نام پر کنیت رکھنا مندوب ہے، گو وہ لڑکی ہو، ادب یہ ہے کہ خود اپنے لئے کتاب و خط وغیرہ میں کنیت استعمال نہ کرے، اگر کنیت نام سے زیادہ مشہور ہو، یا لوگ اس کے بغیر پہچانتے نہ ہوں، تو حرج نہیں، جیسا کہ صحیحین میں حضرت ام ہانی اور حضرت ابوذر کا آپ ﷺ کے سامنے اپنے لئے کنیت کا ذکر کرنا موجود ہے۔

جو کنیت کسی کو ناپسند ہو، اسی کے لئے وہ کنیت استعمال کرنا حرام ہے، گو اس میں موجود ہو، البتہ اسکے بغیر وہ پہچانا ہی نہ جائے، تو گنجائش ہوگی۔

مستحب ہے کہ کوئی اپنے استاد یا والد کو نام سے نہ پکارے، گو خط میں ہو، بلکہ مثلاً یوں کہے: اے میرے والد محترم، ہمارے استاد، ہمارے شیخ وغیرہ... آپ ﷺ نے ایک شخص کو ان کے والد کے متعلق فرمایا: ''اس سے آگے نہ چلو، کوئی ایسا کام نہ کرو کہ تمہارے والد کو کوئی برا بھلا کہے، اس سے پہلے نہ بیٹھو، اور اسے نام سے نہ پکارو'' (ابن السنی)

نام کا حق : نام اور کنیت رکھنے کا حق اسے حاصل ہے، جسے بچہ پر ولایت ہو، یعنی باپ ورنہ دادا۔

فائدہ : (۱) کسی کو پکارنا ہو، اور اس کا نام معلوم نہ ہو، تو ایسے الفاظ سے آواز دے، کہ اسے ناگوار نہ ہو، مثلاً اے بھائی، اے فقیہ، اے فلاں کپڑے والے وغیرہ، آپ ﷺ کو کسی شخص کا نام معلوم نہ ہوتا تو فرماتے: ''یا ابن عبداللہ'' (اے اللہ کے بندے کے بیٹے) (ابن السنی)

(۲) کسی کے نام کی ترخیم (نام کو مختصر کرنا) جائز ہے، جب کہ اسے ناگوار نہ ہو، آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ ابو ہریرۃ کو یا اباہر اور حضرت عائشہؓ کو یا عائش کہہ کر آواز دی۔

سر مونڈنا : پیدائش کے ساتویں دن بچہ کا بال مونڈنا مسنون ہے، جیسا کہ احمد و سنن اربعہ کی حدیث سے گذر چکا، عقیقہ ذبح کرنے کے بعد مونڈنے، لڑکے اور لڑکی دونوں کا بال مونڈا جائے گا، اگر سر پر بال نہ ہوں، تو استرا پھرانا مستحب ہے، عقیقہ کے خون سے سر کو

آلودہ کرنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ جاہلیت کا عمل ہے، حرام نہیں ہے، کیونکہ بعض ضعیف روایات میں اس کا ذکر ہے۔اور بعض مجتہدین کا یہ قول ہے، قزع مکروہ ہے یعنی سر کے ایک یا کئی حصہ کے بال مونڈنا، اور بعض باقی رکھنا، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ مونڈنے کے بعد سر پر خلوق اور زعفران لگانا مستحب ہے۔

مونڈنے کے بعد بالوں کے وزن کے برابر سونا ورنہ چاندی صدقہ کرنا سنت ہے، آپ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے عقیقہ کے بعد حضرت فاطمہؓ کو ان کے بال مونڈ کر اس کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا(مالک ،ترمذی ، حاکم ، بیهقی)

حضرت ابن عباسؓ نے ساتویں روز کے سات سنتوں میں بالوں کے وزن برابر سونا یا چاندی صدقہ کرنا شمار کیا۔عام حالات میں نظافت وصفائی کی نیت سے سر مونڈنا جائز ہے۔اور جو تیل کنگھی کی فکر رکھے، اسے بال رکھنے میں کوئی حرج نہیں، سر مونڈنا صرف حج وعمرہ میں، کافر کے اسلام لاتے وقت، اور نومولود کے حق میں سنت ہے، ابن قیم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صرف چار مرتبہ (یعنی حج وعمرہ کے موقع پر) سر مونڈا ہے۔عورتوں کے لئے بغیر مجبوری کے سر مونڈنا مکروہ ہے۔

اذان : آپ ﷺ نے حضرت حسنؓ کی ولادت کے بعد ان کے کان میں اذان دی(احمد، ابوداود ، ترمذی ، حاکم، طبرانی ، بیهقی) حاکم کی روایت میں حُسین ہے۔اور ابونعیم نے دونوں کا نام ذکر کیا ہے۔

بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنا مستحب ہے، اس تفصیل کو ابن المنذر نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے نقل کیا ہے، نیز مروی ہے کہ اس کی وجہ سے بچہ کو اُم الصِّبیان کو تکلیف نہ ہوگی(ابن السنی) (اُم الصبیان ایک بیماری ہے، جس سے بچے بیہوش ہو جاتے ہیں) اگر عورت کہے، تب بھی کافی ہے کیونکہ یہ محض تبرک کا ذکر ہے، تا کہ اس کے کان سب سے پہلے توحید اور اللہ کی کبریائی سے آشنا ہو، نیز اس وقت شیطان اسے پریشان کرنے اور بھڑکانے کے چکر میں رہتا ہے، لہٰذا اذان واقامت مشروع کی گئی، کیونکہ وہ یہ سن کر بھاگ جاتا ہے، دائیں کان میں یہ بھی پڑھیے: ’’وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ‘‘(اگر لڑکا ہو، تب بھی آیت کو تبرکا اسی طرح پڑھے) آپ ﷺ سے نومولود کے کان میں سورہ اخلاص کا پڑھنا بھی مروی ہے، لہٰذا یہ بھی مسنون ہوگا(ابن السنی)

تحنیک : (یعنی کچھ چبا کر نرم کر کے بچہ کے تالوں میں لگا دینا تا کہ پیٹ میں چلا جائے) صحیحین کے حوالہ سے ابوموسی اشعری اور ابوطلحہ کے بیٹوں کی تحنیک کا ذکر گذر چکا۔بچہ کی پیدائش پر کھجور کے ذریعہ اس کی تحنیک سنت ہے، کھجور نہ ہو تو کوئی دوسری میٹھی چیز جو آگ پر پکی ہوئی نہ ہو، بہتر ہے کہ کسی نیک اور بزرگ شخص کے ذریعہ تحنیک کروائے، مرد نہ ہو تو کسی نیک عورت کے ذریعہ کروائے، تا کہ اس کے لعاب کی برکت حاصل ہو۔

مبارکبادی: اولاد (یا بھائی وغیرہ) کی پیدائش پر مناسب الفاظ سے مبارکباد دینا (تَهْنِئَة) مستحب ہے، حضرت حسینؓ سے منقول یہ الفاظ بہتر ہیں: ’’بَارَكَ اللهُ لَكَ فِي الْمُوْهُوْبِ لَكَ وَشَكَرْتَ الْوَاهِبَ وَبَلَغَ أَشُدَّهُ وَرُزِقْتَ بِرَّهُ ‘‘(اللہ تمھیں اس عطیہ میں برکت عطا فرمائے، اور اس پر اس کے شکر کی توفیق عطا کرے، اور یہ اپنی جوانی تک پہنچے اور تمھیں اس کی اطاعت وحسن سلوک نصیب ہو)

مبارکباد دینے والے کو جواب دینا مستحب ہے، مثلاً: ’’بَارَكَ اللهُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَيْكَ يَاجَزَاكَ اللهُ خَيْراً ‘‘یا’’رَزَقَكَ اللهُ مِثْلَهٗ‘‘ (اللہ تمھیں بھی ایسی دولت عنایت فرمائے)، یا’’أَحْسَنَ اللهُ ثَوَابَكَ وَجَزَائَكَ ‘‘(اللہ تمھیں بہترین بدلہ وجزا عطا فرمائے)وغیرہ۔پیدائش کا علم ہونے یا سفر سے آنے کے بعد تین دن تک مبارکبادی کی مہلت ہے۔

خاتمہ

بعض مسنون امور: یہ امور ہر کسی کے لئے مستحب ہیں: وقتاً فوقتاً سر، داڑھی اور بدن میں تیل لگانا (یعنی پہلا خشک ہونے پر دوبارہ لگائے) ہر آنکھ میں سوتے وقت طاق مرتبہ سرمہ لگانا، تین تین مرتبہ سرمہ لگانا افضل ہے، اگلی پچھلی شرم گاہ کے اطراف کے بال مونڈنا، ناخن تراشنا، بغل کے بال نوچنا (اکھیڑنا)، اگر شرم گاہ کے بال نوچے یا بغل کے مونڈے، تب بھی اصل سنت حاصل ہوگی، (تہذیب میں ہے کہ مردوں کو شرم گاہ کے بال مونڈنا اور عورتوں کو نوچنا سنت ہے) مونچ کترنا یہاں تک کہ ہونٹ کا کنارہ خوب کھل جائے، اسے جڑ سے صاف نہ کرے (ان امور کو حاجت سے مؤخر کرنا مکروہ ہے، اور چالیس روز سے مؤخر کرنا شدید مکروہ ہے) انگلیوں کے جوڑ اور جوڑ کے پشت کو دھونا (وضو کے علاوہ بھی) کان کے سلوٹوں اور سوراخ کو دھو کر میل کچیل پونچھ کر صاف کرنا، ناک کا اندرونی حصہ دھونا، مذکورہ تمام امور میں دائیں کو مقدم کرے، سر کے بال میں مانگ نکالنا، اور تیل یا پانی وغیرہ ڈال کر کنگھی کرنا، داڑھی میں کنگھی کرنا۔ رات کے ابتداء (شام) میں بچوں کو روکے رکھنا کیونکہ یہ شیاطین کے پھیلنے کا وقت ہے، رات کی ایک گھڑی گذرنے کے بعد انھیں چھوڑ دیں (مسلم)

رات (سوتے وقت) چراغ گل کرنا (تاکہ چوہے وغیرہ کی شرارت سے آگ نہ لگ جائے لہٰذا جس روشنی میں یہ خطرہ نہ ہو، اس میں حرج نہیں) دروازہ بند کرنا، برتن کو ڈھانکنا، گو ایک لکڑی ہی اوپر رکھ دے، یا اسے الٹ دے اور مشک کا منہ باندھ دے، اور ان امور کو بسم اللہ کہہ کر انجام دے، سوتے وقت آگ بجھادے۔

داڑھی: صحیحین وغیرہ کی احادیث میں داڑھی بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے، امام رافعیؒ و نوویؒ نے داڑھی مونڈنا مکروہ قرار دیا ہے، لیکن اس پر ابن الرفعہ نے حاشیۃ الکافیہ میں اعتراض کیا اور فرمایا کہ امام شافعیؒ نے الأم میں تحریم کی صراحت فرمائی ہے۔ امام زرکشی فرماتے ہیں کہ اس طرح حلیمی نے شعب الایمان اور ان کے استاد قفال شاشی نے محاسن الشریعۃ میں، (بھی تحریم کو لکھا ہے) امام اذرعی کا قول ہے: درست بات یہ ہے کہ بغیر علت کے مکمل مونڈنا حرام ہے، البتہ امام غزالی، شیخ الاسلام، (تحفہ میں) ابن حجر، رملی اور خطیب وغیرہ کے نزدیک کراہت کا قول معتمد ہے۔

داڑھی میں گرہ لگانا (جبکہ پانی پہنچنے سے مانع نہ ہو) اسے تتر بتر پراگندہ چھوڑ دینا اس کے لٹوں کو تصنعاً یا زینت کے لئے تہہ بہ تہہ ترتیب دینا۔ اسے نوچنا و اکھیڑنا، داڑھی بچہ کے کنارے اور داڑھی کے دونوں طرف کے بال مونڈنا، نوچنا، یا کترنا اور داڑھی وغیرہ کو گندھک وغیرہ کے ذریعہ جلد سفید کرنے کی کوشش کرنا اور اس کی سفیدی یا سیاہی کو خود بینی و فخر کے طور پر دیکھنا مکروہ ہے۔ حلقوم کے اوپر کے بال صاف کرنے میں حرج نہیں، سفید بالوں کو اکھیڑنا مکروہ ہے۔ احیاء میں فرمایا کہ داڑھی طویل ہو تو اس کے کترنے میں اسلاف کا اختلاف ہے، بعضوں کے نزدیک ایک مشت پکڑ کر زائد کتر سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے کیا تھا، بعض تابعین نے اسے مستحسن اور بعض نے مکروہ سمجھا ہے، کیونکہ حدیث میں مطلقاً داڑھی بڑھانے کا حکم ہے۔ بقول امام نووی وغیرہ صحیح بات یہ ہے کہ داڑھی کترنا مطلقاً مکروہ ہے، بلکہ اسے اپنی حالت پر چھوڑ دے جیسی بھی ہو (جتنی بھی بڑھے)

عورت کو داڑھی، مونچھ اور داڑھی بچہ (اگر نکل آئے تو اسے) صاف کرنا سنت ہے۔

خضاب (مہندی وغیرہ سے رنگنا): مرد اور خنثیٰ کو بلا عذر مہندی وغیرہ سے ہاتھ پیر رنگنا حرام ہے۔ کیونکہ اس میں عورتوں سے مشابہت ہے، جس پر صحیح احادیث میں لعنت کی وعید وارد ہے۔ اگر کچھ عذر ہو تو کوئی حرمت و کراہت نہ ہوگی، عورتوں میں یہ تفصیل ہے کہ

احرام کے لئے مستحب ہے، خواہ شادی شدہ ہو یا کنواری، نوجوان ہو یا بوڑھی، جب خضاب لگائے تو دونوں ہاتھ پر مکمل لگائے، سوگ کی مدت میں مہندی وغیرہ لگانا حرام ہے۔ عام حالات میں اگر عورت کسی کی بیوی ہو تو اسے مہندی لگانا مسنون ہے، ورنہ مکروہ ہے۔ (بعضوں نے عورتوں کے لئے مطلقاً مسنون قرار دیا ہے) نقش، کالا رنگنا، تطریف (پوروں کو رنگنا) اور رخسار کو سرخ رنگنا عورت کو مسنون نہیں ہے، بلکہ غیر شادی شدہ کو اور جسے شوہر نے اجازت نہ دی ہو، اسے یہ حرام ہے۔

مرد اور عورت کو سر کے سفید بال اور مرد کو داڑھی کے سفید بال، سرخ یا زرد رنگنا سنت ہے، سیاہ خضاب کا استعمال حرام ہے، کیونکہ ایسی ایک قوم کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ جنت کی خوشبو (تک) نہ پائیں گے (ابوداود، نسائی، ابن حبان، حاکم) نیز ایک روایت میں سیاہ سے اجتناب کا حکم ہے۔ کافروں سے جہاد کرنے والے کے لئے سیاہ خضاب کی رخصت ہے۔ امام رملی کی رائے میں عورت شوہر کی اجازت سے سیاہ خضاب استعمال کرسکتی ہے۔

ختنہ : مردوں اور عورتوں کے حق میں ختنہ واجب ہے، صحیحین وغیرہ کی احادیث میں اسے فطرت میں شمار کیا ہے (ایک قول میں عورتوں کے لئے واجب نہیں، اور عام عمل اسی پر ہے)

مرد کی ختنہ میں حشفہ (سپاری) کے اوپر کی کھال اتاری جائے، جس سے حشفہ مکمل کھل جائے، اور عورت کے فرج کے اوپر کے حصہ میں پیشاب کے سوراخ کے اوپر مرغ کی کلغی کے مانند گوشت کے ٹکڑے کو کاٹا جائے، اور کاٹنے کے بعد اس کی اصل گٹھلی کے مانند باقی رہتی ہے، ختنہ بلوغ کے بعد واجب ہے، پیدائش سے ساتویں روز ختنہ کرنا مستحب ہے (اگر مؤخر کرے تو چالیسوں روز ورنہ ساتوں سال، ساتویں دن سے قبل ختنہ مکروہ ہے) (جمل ۵/۱۷۴) اگر بچہ کمزور ہو اور برداشت نہ کر پائے تو مناسب وقت تک مؤخر کرے۔ ختنہ کے مصارف خود مختون (جس کا ختنہ کیا جائے) کے مال سے ادا ہوں گے، بغیر ختنہ کے بالغ ہو جائے، تو حاکم اسے ختنہ کا حکم دے، انکار کرے، تو جبر کرے، حاکم کے ختنہ کرانے سے وہ مرجائے تو اس پر کوئی ضمان نہیں، تاہم شدید گرمی یا سردی میں کرائے تو ضامن ہوگا۔ لڑکے کے ختنہ میں اظہار اور لڑکی کے ختنہ میں اس کے برعکس (اخفاء واسرا) سنت ہے، اگر کوئی ختنہ شدہ ہی پیدا ہو تو اس پر ختنہ واجب نہیں۔

اگر بچہ طاقتور ہو اور ختنہ کو برداشت کرسکتا ہو، اور ولی ختنہ کرائے جس سے وہ مرجائے تو ولی ضامن نہ ہوگا، ولی کے علاوہ کوئی کرائے تو ضامن ہوگا، اسی طرح بچہ میں برداشت کی قوت نہ ہو، تو ختنہ کرانے والا قود یا دیت کا ضامن ہوگا۔

متفرق مسائل : گودنا، کسی سے گودنے کے لئے کہنا، ابرو کے بال اکھیڑنا، دانتوں کو تیز اور باریک کرنا، دانتوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرنا، بالوں کو گھنگھریالے (پیچدار) بنانا حرام ہے، عورتوں کو اپنے بالوں میں انسانی بال یا نجس بال جوڑنا یا ان سے باندھنا حرام ہے۔ خواہ شوہر والی ہو یا بے شوہر، شوہر کی اجازت ہو یا نہ ہو، اسی طرح دیگر پاک بالوں کو جوڑنا بھی بغیر شوہر والی پر اور شوہر والی پر شوہر کی اجازت کے بغیر حرام ہے۔ شوہر کی اجازت سے دیگر پاک بالوں کو جوڑنا حرام نہیں۔ نیز ریشم یا اون کے ریشوں اور دھاگوں سے جوڑنا بھی حرام نہیں۔

امام غزالی وغیرہ نے کمسن بچی کے کان میں زیورات کے لئے سوراخ کرنا حرام قرار دیا ہے، لیکن علامہ رملی وغیرہ نے جواز کو ترجیح دی ہے، اور یہی معتمد ہے۔

(خلاصة البدر ۲/۳۹۰-۳۹۲، تلخيص الحبير ۴/۱۴۶-۱۴۹، نيل الاوطار ۵/۱۴۹-۱۵۶، المجموع ۸/۴۲۶-۴۴۸، الاقناع مع البجيرمي ۴/۲۸۶-۲۹۲، الفقه المنهجي ۳/۵۵-۶۳، قلائد ۲/۳۹۱-۳۹۶، فتح

المعین مع الاعانۃ ۲/۳۳۵-۳۴۰، بشری الکریم ۲/۱۲۹-۱۳۱، تحفہ مع الحواشی ۱۲/۲۹۱-۳۰۵، مغنی ۴/۲۹۳-۲۹۷، بغیہ : ۲۵۸، ترشیح ۲۰۵-۲۰۸، فتح الوھاب مع الجمل ۵/۲۶۲-۲۷۷، ۵/۱۷۴، نھایہ مع الحواشی ۸/۱۴۵-۱۵۰)

اَطْعِمَۃ (کھانے کی اشیاء)

آیات : (۱)''یٰاَیُّھَاالنَّاسُ کُلُوْا مِمَّافِی الْاَرْضِ حَلَالاً طَیِّباً وَّلَاتَتَّبِعُوْ اخُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُو مُّبِیْن''(البقرہ : ۱۶۸)

ترجمہ : ''اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجو ہیں، ان میں سے حلال پاک چیزوں کو کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ تمہارا صریح دشمن ہے''۔

(۲)''وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبَاتُ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰئِثَ ...''(الاعراف ۲۳۶)

ترجمہ : ''اور (آپ ﷺ) پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتے ہیں، اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں''۔

(۳)''قُلْ لَّآاَجِدُ فِیْ مَآاُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّماً عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗ اِلَّا اَنْ یَکُوْنَ مَیْتَۃً اَوْ دَماً مَّسْفُوْحاً اَوْلَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقاً اُھِلَّ لِغَیْرِاللّٰہِ بِہٖ فَمَنِ اضْطُرَّغَیْرَ بَاغٍ وَّلَاعَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوْر رَّحِیْمٌ ''(الانعام : ۱۴۵)

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں، ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے، جو اس کو کھائے، مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے، یا جو شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص بے تاب ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو، تو واقعی آپ کا رب غفور رحیم ہے''(بخشنے والا، مہربان ہے)

حلال وحرام غذا سے واقفیت کافی اہم اور فرض عین ہے، حرام غذا کے استعمال پر سخت وعید وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں حرام سے پیدا شدہ گوشت کے لئے مناسب جگہ جہنم کو قرار دیا۔(ترمذی)

کیڑے اور گھن : کھانے کی اشیاء مثلاً گوشت، سرکہ، میوے وغیرہ میں جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں، ان اشیاء سمیت انھیں کھانا حلال ہے، خواہ زندے ہوں یا مردہ، قلیل ہو یا کثیر، کیونکہ ان کو جدا کرنا (اکثر) دشوار ہوتا ہے، اگر کیڑوں کی کثرت کی وجہ سے گندا محسوس ہو تو کھانا جائز نہ ہوگا۔ صرف کیڑوں کو جدا کر کے تنہا یا کسی چیز کے ساتھ کھانا حرام ہے۔ نیز اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائے، یا خود ہٹ جائے پھر اس میں لوٹ جائے، حالانکہ اس سے حفاظت ممکن تھی، تو اسے کھانا حرام ہے، گھن لگا ہوا کھجور اور لوبیا گھن سمیت کھانا امام رملیؒ وغیرہ نے جائز قرار دیا ہے۔

اگر شہد وغیرہ میں مکھی یا چیونٹی ہو، تو اسے کھانا جائز نہیں، اگر ایک مکھی، چیونٹی، یا شہد کی مکھی کسی چیز میں گر کر اس کے اجزاء اس میں گل جائیں، تو اسے کھانا حرام نہیں، کیونکہ ان کی حرمت گندگی کی وجہ سے تھی، اور یہ گندہ شمار نہ ہوگا۔

ٹڈی : ٹڈی حلال ہے، خواہ کوئی مسلم اس کا شکار کرے، یا غیر مسلم، یا اپنی طبعی موت مر جائے، حضرت ابن ابی اوفی فرماتے ہیں:

"ہم نے آپ ﷺ کے ساتھ سات غزوات کئے، جس میں آپ ﷺ کے ساتھ ٹڈی کھایا کرتے تھے" (صحیحین) ایک حدیث میں اس کے مردہ کو بھی حلال قرار دیا گیا ہے (الشافعی بیھقی) امام رملیؒ نے فرمایا کہ محرم ٹڈی کا شکار کرے تو اس کے لئے حرام ہے، لیکن دوسرا شخص کھا سکتا ہے، گو وہ بھی محرم ہو، کسی دوسرے جانور کا شکار کرے تو ہر کسی کے لئے وہ حرام ہے۔

بحری حیوان (سمندری حیوان): قرآن میں فرمایا: "أُحِلَّ لَكُم صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ" (مائدہ: ۹۶) ترجمہ: تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا حلال ہے "صید سے مراد زندہ جانور اور طعام سے مراد وہ مردہ (مچھلی وغیرہ) ہے، جسے سمندر یا دریا باہر پھینک دے یا پانی کے اوپر آ جائے۔ ایک حدیث میں سمندر کے مردار کو حلال قرار دیا گیا (ترمذی) نیز ایک سفر میں صحابہ کرام نے سمندر کی مری ہوئی مچھلی (عنبر) کھائی، اور ران کے مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ نے بھی اس میں سے نوش فرمایا (صحیحین) ابن عمرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سمندر نے مردہ مچھلی پھینک دی (بیھقی باسناد صحیح)

سَمَک یعنی مچھلی حلال ہے (اور سمک کا اطلاق تمام بحری جانداروں پر ہوتا ہے جبکہ وہ صرف اسی میں زندہ رہیں یا باہر ان کی زندگی حیاتِ مذبوح ہو) گو مشہور مچھلیوں کے مشابہ نہ ہو، مثلاً کتے، سور، گھوڑے (وغیرہ کے مشابہ جاندار سمندر میں پائے جائیں تو وہ بھی حلال ہیں) یہ حیوانات، زندہ و مردہ، دونوں حلال ہیں، نیز ان کا شکار مسلمان کرے یا کوئی غیر مسلم۔ جو مچھلی طبعی موت مر کر پانی کے اوپر آ جائے وہ بھی حلال ہے اگر پھول جائے، اور نقصان دہ ہو، تو کھانا حرام ہے۔

قرش نامی مچھلی (جسے کلب البحر بھی کہتے ہیں، یعنی سمندر کا کتا) جو پانی کے اندر جانوروں کو اپنے دانت سے تلوار کی طرح کاٹ دیتی ہے، حلال ہے، مچھلی اور ٹڈی کو زندہ نگل لینا جائز ہے۔ مچھلی کو زندہ تلنا، پکانا یا بھوننا مکروہ ہے، کسی مچھلی کے پیٹ میں دوسری مچھلی ہو، اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر فضلہ کی طرف متغیر نہ ہوئی ہو تو وہ حلال ہے، مچھلی کو ذبح کرنا خلافِ اولیٰ ہے، تاہم مچھلی بڑی ہو اور تادیر زندہ رہتی ہو، تو اسے دم کی طرف سے کاٹ کر راحت پہنچانا مستحب ہے، اگر وہ خشکی کے کسی ذبح کئے جانے والے جانور کے مشابہ ہو، تو اسے گردن میں کاٹ کر قتل کرے کسی زندہ مچھلی یا ٹڈی کا ایک حصہ کاٹ لینا مکروہ ہے، امام اذرعیؒ وغیرہ نے تکلیف کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا ہے، لیکن جدا شدہ حصہ حلال ہے، کیونکہ زندہ سے جدا شدہ حصہ مردار کے حکم میں ہے (اور مچھلی کا مردار بھی حلال ہے) (واللہ اعلم بالصواب)

ٹڈی اور چھوٹی مچھلیوں کے پیٹ کی آلائش صاف کئے بغیر انھیں کھانا کراہت کے ساتھ جائز ہے، انھیں تیل میں تلنے سے وہ تیل نجس نہ ہوگا۔ بدبودار (سڑی ہوئی) مچھلی و گوشت مکروہ ہے، جبکہ اس کے کھانے میں کوئی خاص نقصان نہ ہو، ورنہ حرام ہے۔

جو جاندار خشکی اور سمندر دونوں جگہ زندہ رہتے ہیں، وہ حرام ہیں، مثلاً مینڈک کیکڑا، سانپ، کچھوا، اور گھڑیال (مگرمچھ) بالفرض بعض سانپ و بچھو صرف سمندر میں ہی زندہ رہتے ہوں، تب بھی وہ زہر کی وجہ سے حرام ہیں۔ ایک حدیث میں مینڈک کے قتل سے منع فرمایا گیا ہے (احمد، ابوداود، نسائی، حاکم و صححہ)

جنین (بچہ جو ابھی پیٹ میں ہو) یہ خشکی کے کسی حلال جانور (مثلاً گائے، بکری وغیرہ) کے تذکیہ (ذبح وغیرہ کرنے) کی وجہ سے اس کے پیٹ کا بچہ مر جائے، یا اس کی زندگی حیاتِ مذبوحہ ہو، پھر وہ مر جائے، یا شک ہو کہ ماں کے ذبح سے مرا یا کسی دوسرے سبب سے، تو ان صورتوں میں وہ جنین حلال ہے، (اسے کھا سکتے ہیں) اگر ماں کے ذبح سے قبل ہی بالیقین وہ مر چکا ہو، یا مردہ حالت میں وہ سر باہر نکالے، یا زندہ حالت میں نکالے پھر مر جائے، پھر ماں کو ذبح کیا جائے، یا ماں کے ذبح کے بعد کافی عرصہ تک وہ اندر پھڑ پھڑاتا سے رہا، یا شدید حرکت کرنے کے بعد پھر ٹھنڈا ہو گیا، تو ان صورتوں میں وہ حلال نہ ہوگا، (خلاصہ یہ کہ جنین کی موت ماں کے تذکیہ کی طرف منسوب ہو،

گو احتمال کے درجہ میں تو حلال ہے، ورنہ نہیں) اگر جنین میں شکل تیار ہو چکی ہو، اور ابھی روح نہ پھونکی گئی ہو تب بھی وہ حلال ہے۔ علقہ اور وہ مضغہ جس میں ابھی جانور کی شکل نہ بنی ہو، حلال نہیں، گو پاک ہیں۔

صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے ذبح کے بعد جانور کے پیٹ سے نکلنے والے جنین کے کھانے یا پھینکنے کے متعلق سوال کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "چاہو تو اسے کھا لو، کیونکہ اس کا تذکیہ اس کی ماں کا تذکیہ ہے" (یعنی ماں کے تذکیہ کے ضمن میں اس کا بھی تذکیہ حاصل ہو چکا لہٰذا اسے کھانا حلال ہے) (ترمذی، ابوداود، دار قطنی، حاکم، احمد، طبرانی، بیھقی وغیرہ، وصححہ ،ابن حبان وابن دقیق العید) ابن کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ کرام اسی کے قائل تھے (ابن حزم) امام بیہقی نے اسے کئی صحابہ کرام سے موقوفاً نقل فرمایا ہے، امام ابن المنذر فرماتے ہیں کہ کسی بھی صحابی سے اس کے برعکس مروی نہیں ہے۔

بری حیوان (خشکی کے جانور): درج ذیل بری حیوان حلال ہیں:

اونٹ، گائے، بیل، بھیڑ بکری ودنبہ، کیونکہ قرآن نے **بھیمۃ الانعام** کو حلال قرار دیا ہے (دیکھئے سورۂ مائدۃ ، آیت : ۱) (اس سے یہی چوپایے مراد ہیں) گھوڑا، کیونکہ بروز خیبر آپ ﷺ نے اس کے کھانے کی اجازت مرحمت فرمائی (صحیحین) نیل گائے، جنگلی گدھا، کیونکہ آپ ﷺ نے اسے کھانے کی اجازت دی اور خود بھی نوش فرمایا (صحیحین) ہرن، اس کی حلت پر اجماع ہے، بجو، حدیث میں اسے حلال قرار دیا ہے، (الشافعی، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیھقی، وصححہ البخاری والترمذی وابن حبان وابن خزیمہ والبیھقی) گوہ (جسے کوکن میں عموماً گوڑ پھل کہتے ہیں) یہ آپ ﷺ کے دسترخوان پر کھایا گیا (صحیحین) خرگوش، کیونکہ اس کا گوشت آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، تو آپ نے قبول فرمایا (صحیحین) بخاری میں مزید آپ ﷺ کا نوش فرمانا بھی مذکورہ ہے، لومڑی، کیونکہ اس کے کچلی کے دانت مضبوط نہیں ہوتے، نیز یہ طیبات میں سے ہے، فنک (لومڑی کی جنس سے ایک جانور ہے جو لومڑی سے چھوٹا ہوتا ہے، اور جس کی کھال کی پوستین بہت اچھی ہوتی ہے) سیہی، نیولا، پہاڑی بکرا، کیونکہ یہ سب طیبات میں داخل ہیں۔

حلال پرندے: شتر مرغ، سارس، بط، مرغابی، مرغی، حمام (کبوتر، نیز اس میں جانوروں کی طرح منہ لگا کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے والے اور کوکو اور گنگری کرنے والے تمام پرندے داخل ہیں، مثلاً جنگلی کبوتر، تیتر، فاختہ، سرخاب، چکور، قمری وغیرہ) چڑیا کے شکل کے پرندوں کی تمام انواع (مثلاً: بلبل، چھوٹے چڑے (مولا) وغیرہ) پانی کے تمام پرندے (بجز لقلق کے یہ سارس کی قسم کا ایک پرندہ ہے، جس کی گردن اور ٹانگیں لابنی ہوتی ہیں، اور سانپوں کو کھاتا ہے، یہ خباثت وگندگی کی وجہ سے حرام ہے) اور چونچ سے دانہ چگنے والے پرندے۔ کیونکہ یہ سب طیبات (پاکیزہ چیزوں) میں داخل ہیں، جسے قرآن نے حلال قرار دیا ہے۔

حرام حیوان: پالتو گدھا، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں اس کی ممانعت موجود ہے، خچر، کیونکہ ابوداود اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ بروز خیبر آپ ﷺ نے اس سے اور گدھے سے منع فرمایا، نیز خچر گھوڑی اور پالتو گدھے کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے، جب تک گھوڑی کو خچر کا حمل ہو اسے ذبح کرنا حرام ہے، کیونکہ وہ بھی مر جائے گا، اگر کوئی خچر جنگلی گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے پیدا ہو، تو وہ حرام نہیں ہے۔ ہر کچلی والا درندہ جو اپنی کچلی سے تقویت حاصل کرتا اور دیگر جانداروں پر حملہ آور ہوتا ہے، کیونکہ صحیحین کی روایت میں اس سے منع کیا گیا ہے، مثلاً: شیر، بندر، لنگور، ریچھ، ہاتھی، چیتا، تینداوا، بھیڑیا، کتا، سور، گیدڑ، پالتو اور جنگلی بلی۔

ہر چنگل والا پرندہ کیونکہ مسلم وغیرہ کی حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے، مثلاً باز، شاہین، گدھ، عقاب اور تمام شکاری پرندے

۔ چگاڈر، طوطا، مور، مکھی، زمین کے کیڑ مکوڑے (حشرات الارض) مثلاً گبریلا، گرگٹ، ہر وہ حیوان جس کے قتل کا حکم ہے، کیونکہ کسی حیوان کے قتل کا حکم اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے، مثلاً بچھو، سانپ، چیل، چوہا، اور حملہ آور وشکاری درندے۔ صحیحین میں ہے کہ کوا، چیل، چوہا، بچھو اور کاٹ کھانے والا کتا حل اور حرم میں قتل کیا جائے، مسلم کی حدیث میں سیاہ سفید کوے اور سانپ کا ذکر ہے، اور ابوداود وترمذی کی ایک حدیث میں حملہ آور درندے کا بھی ذکر ہے۔

ہر وہ حیوان جس کا قتل ممنوع ہے، کیونکہ یہ ممانعت کھانے کی حرمت پر دلالت کررہی ہے: مثلاً شہد کی مکھی، چیونٹے، لٹورا، ہدہد وغیرہ۔ ایک حدیث میں شہد کی مکھی، چیونٹی، ہدہد اور لٹورا کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے (احمد، ابوداود، ابن ماجه، ابن حبان) امام خطابی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں چیونٹی سے نمل سلیمانی (سلیمانی چیونٹی) یعنی بڑے (چیونٹے) مراد ہیں، چھوٹی چیونٹیوں کو تکلیف دہ ہونے کی وجہ سے قتل کرنا حلال ہے، بلکہ بغیر جلائے ان کی چچڑی کی اور دیگر کیڑوں مکوڑوں کی تکلیف دور نہ ہو، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ اگر بڑے چیونٹے گھروں میں آ کر تکلیف دے تو انھیں مارنا جائز ہے۔

مخلوط نسل: جو حیوان حلال اور حرام جانور کے ملاپ اور جفتی سے پیدا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ (کیونکہ حرمت کے پہلو کو ترجیح دی جائے گی) مثلاً کتے اور بکری یا گھوڑے اور پالتو گدھے کی جفتی سے جو بچہ پیدا ہو، وہ حرام ہوگا۔ اگر کسی بکری کو کتے کے مشابہ بچہ پیدا ہو، لیکن اس کے ساتھ کتے کی جفتی کا علم نہ ہو، تو یہ بچہ حلال ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ اسے نہ کھائے۔

فائدہ: (۱) کسی گھوڑی سے خچر یا کسی بکری سے کتا پیدا ہو، تو اس گھوڑی یا بکری کا دودھ پینا جائز ہے۔ (۲) صحیح حدیث کی رو سے جگر اور تلی بالاتفاق حلال ہیں۔

مکروہ اعضاء: پتا، عضو تناسل، غدۃ (رسولی۔ گوشت کا سخت ٹکڑا جو مرض کی وجہ سے کھال اور گوشت کے درمیان پیدا ہوتا ہے) مثانہ (پیشاب جمع ہونے کی جھلی)

دیگر حیوان کا حکم: جن حیوانات کے حلال وحرام ہونے کے متعلق کوئی دلیل اور صراحت نہ ہو، ان کے فیصلہ کے لئے عرب حضرات کی طرف رجوع کریں گے۔ جس حیوان کو آسودہ حال اور سلیم الفطرت عرب حضرات خوشحالی میں پاکیزہ سمجھتے ہوں وہ حلال اور جسے گندہ وناپاک شمار کرتے ہوں، حرام ہوگا، کیونکہ عرب دیگر اقوام پر مقدم ہیں۔ کیونکہ شریعت کے اولین مخاطب وہی ہیں، نیز دینِ اسلام عربی ہے۔ محتاج اور تنگ دست افراد کا اجڈ جنگلی لوگ جو ہر جینے مرنے والی چیز کو بلا جھجک کھا جاتے ہیں، ان کا اور مجبوری کی حالت میں کھانے کا اعتبار نہ ہوگا۔

اگر عرب حضرات میں اختلاف ہو، تو اکثر کی رائے کو ترجیح دیں گے، اگر کسی جانب اکثریت نہ ہو، تو قریش کے نظریہ کو مقدم رکھا جائے گا، کیونکہ وہ عرب کے سردار ہیں اور اصل دارومدار انھیں پر ہے، نیز وہ مکارم اخلاق وشرف سے متصف ہیں، اگر قریش میں اختلاف ہو، اور کوئی وجہ ترجیح نہ ہو یا وہ کوئی فیصلہ نہ دیں یعنی خود انھیں بھی شک ہو، یا علاقہ میں عرب نہ ہوں، یا اس جانور کا ان کے پاس کوئی نام ہی نہ ہو، تو ان صورتوں میں اس جانور کی شکل وصورت یا عادت یا اس کے گوشت کے ذائقہ میں زیادہ مشابہ جانور کا اعتبار کریں گے، پہلے عادت، پھر ذائقہ، ورنہ شکل وصورت کا اعتبار ہوگا۔ (یعنی اس کی عادت وغیرہ کسی حلال جانور کے مشابہ ہے تو حلال اور حرام جانور کے مشابہ ہے تو حرام قرار دیں گے) اگر دونوں طرف یکساں مشابہت ہو، یا کسی کے مشابہ نہ ہو، تو وہ حلال ہے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت: ۱۴۵، کا تقاضہ ہے (جو باب کے ابتداء میں تیسرے نمبر پر گذر چکی) سابقہ کسی شریعت کا اعتبار نہ ہوگا۔

جس حیوان کے متعلق آپ ﷺ کے وقت سے اب تک کسی بھی دور کے عرب کا فیصلہ موجود ہو، تو اس کی پیروی کریں گے، اگر ماضی کا فیصلہ موجود نہ ہو، تو فی الحال موجود عرب کا اعتبار ہوگا۔ دو عادل عرب کا خبر دینا کافی ہے۔

حیوان کا نام : کسی حیوان کا حکم معلوم نہ ہو، تو اس کا نام عرب حضرات سے دریافت کریں، پھر اس نام کے حیوان کا شریعت میں جو حکم ہو، اس پر عمل کریں۔

متنجس : جو پاک چیز (سیال ہو یا جامد اور ٹھوس) نجاست کے ملاوٹ کی وجہ سے نجس ہو جائے، اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ غلہ کوگاہ ہے (پاؤں سے ملتے اور روندتے) وقت بیل کا پیشاب پاخانہ اسے لگے تو یہ معاف ہے، اس کے کھانے کے بعد منہ کا دھونا مستحب ہے۔

جلالۃ : جلالۃ یعنی نجاست کھانے والا جانور، نجاست کے کھانے کی وجہ سے جس جانور کے گوشت کے ذائقہ، رنگ یا بو میں تغیر پیدا ہو، اس کا گوشت، دودھ اور انڈا وغیرہ کھانا اور بغیر حائل اور آڑ کے اس پر سواری کرنا مکروہ ہے، ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ میں مردہ بچہ ملے یا زندہ ملے لیکن اس میں بھی تغیر ہو، تو وہ بھی مکروہ ہے، اگر زندہ ملے اور تغیر نہ ہو اور اسے ذبح کرے تو وہ مکروہ نہیں ہے۔

دیگر اشیاء کے کھانے وغیرہ سے یہ تغیر ختم ہو جائے تو کراہت ختم ہوگی، دھونے یا پکانے وغیرہ سے تغیر ختم ہو، تو کراہت ختم نہ ہوگی آپ ﷺ نے جلّالۃ کے کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ چالیس روز اسے چارہ کھلایا جائے۔ (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح) ابوداود کی حدیث میں سواری کی ممانعت بھی موجود ہے۔ چالیس روز کی قید غالب کے اعتبار سے ہے۔ (اصل دارومدار تغیر ختم ہو کر گوشت بہتر ہونے پر ہے۔)

فائدہ : حلال جانوروں کو نجس العین چیز کھلانا مکروہ ہے، جو پاک چیز نجاست ملنے کی وجہ سے نجس ہوگئی ہو (جیسے نجس آٹا، پانی وغیرہ) اسے کھلانا مکروہ نہیں ہے، کس جانور کی طویل مدت تک حرام مال سے پرورش ہو، تو اس سے اس کا گوشت حرام نہ ہوگا۔

ذبح شدہ جانور کے گوشت میں بو آنے لگے تو اس کا کھانا مکروہ ہے۔

جس درخت یا کاشت میں گوبر، نجس کھاد، یا نجس پانی استعمال ہو اس کے پھل اور اناج میں کوئی کراہت نہیں، تاہم جس چیز پر نجاست لگ جائے، اسے دھونے سے وہ پاک ہوگا اگر پھل میں نجاست کی بو وغیرہ محسوس ہو تو وہ مکروہ ہے۔

نجاست کی کمائی : نجاست کے اختلاط سے جو کمائی حاصل ہو، کسی آزاد شخص کو اس کا استعمال مکروہ ہے، مثلاً: پچھنے لگانا، گوبر وغیرہ کی صفائی دباغت (چمڑہ کی پکائی کا پیشہ) قصاب (قصائی) کی کمائی وغیرہ۔ اس کمائی کو اپنے جانوروں کو کھلانا مسنون ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ سے پچھنے لگانے کی اجرت کے متعلق پوچھا گیا تو، آپ ﷺ نے اسے غلام اور سیرابی کے اونٹ کو کھلانے کا حکم دیا (ترمذی وحسنہ وابن حبان وصححہ) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پچھنے لگوائے اور اسے اس کی اجرت دی، اگر (اجرت دینا) حرام ہوتا تو آپ ﷺ نے نہ دیا ہوتا۔ (صحیحین) کیونکہ جس کا لینا حرام ہوگا دینا بھی حرام ہوگا، بجز مجبوری کے مثلاً خوف کی وجہ سے کسی ظالم یا شاعر یا قاضی کو دینا، کیونکہ اس صورت میں صرف لینا حرام ہے۔

اپنے اور زیر کفالت افراد کے مصارف کے لئے حتی الامکان خالص پاکیزہ معاش کی کوشش کرنا مستحب ہے۔ اگر اس سے عاجز ہو، تو کم از کم اپنی حد تک کوشش کرے۔ جس کا اکثر مال حرام ہو، اس کے ساتھ لین دین اور اس کے مال میں سے کھانا حرام نہیں ہے۔ افضل ذریعہ معاش کاشت کاری ہے۔ گو نوکروں کے ذریعہ انجام دے، پھر اپنے ہاتھ کی کاریگری سے کمائی، پھر تجارت۔

نائی (حجام) کپڑا بننا، چوکیداری (پاسبانی وحفاظت) رنگریزی، زرگری ستاری اور کنگھی کرنے کے پیشہ میں کوئی کراہت نہیں،

کیونکہ اس میں نجاست سے کوئی تعلق نہیں۔

حیوان کا قتل : بعض حیوانات کے قتل کے حکم اور ممانعت کا تذکرہ گذر چکا۔

ہر وہ حیوان جس میں کوئی نفع نہ ہو اور وہ تکلیف دہ اور موذی ہو، اسے قتل کرنا مندوب ہے۔ مثلاً: مچھر، جوں، چچڑی، چھپکلی، مسلم کی حدیث میں ہے کہ پہلی مار میں چھپکلی کو قتل کرنے پر ۱۰۰ نیکیاں لکھی جاتی ہیں، دوسری میں اس سے کم، اور تیسری میں اس سے بھی کم۔

جس حیوان میں نفع ونقصان دونوں ہو، اسے مارنا مندوب ہے اور نہ مکروہ۔ جیسے تیندوا، باز، شکرہ۔

حلال جانوروں کو صرف کھانے کے لئے ذبح کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی جانور کسی پر حملہ کر بیٹھے تو اپنے بچاؤ اور دفاع کے لئے قتل کی گنجائش ملے گی۔ ان دو اسباب کے بغیر اسے قتل کرنا حرام ہے۔

جس حیوان میں کوئی نفع اور نقصان نہ ہو، اسے قتل کرنا مکروہ ہے، جیسے گبریلا کیڑے، مکھی وغیرہ (مکھیوں سے تکلیف ہو تو بظاہر قتل کرنا مکروہ نہ ہوگا)

کتے کو قتل کرنے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے خواہ سیاہ ہو یا کسی اور رنگ کا، لہٰذا پاگل اور کاٹ کھانے والے کتے کے علاوہ کسی کتے کو مارنا جائز نہیں، گو اس میں کوئی نفع نہ ہو۔ اسی کو المجموع وغیرہ میں صحیح قرار دیا ہے۔ (بعض علماء نے جس کتے میں کوئی نفع نہ ہو اسے مارنا مکروہ قرار دیا ہے)

جس جانور میں نفع ہو، اور کوئی نقصان نہ ہو، اس کا قتل جائز نہیں ہے۔ (الاشباہ للسیوطی : ۴۴۸)

جمادات : (جماد یعنی غیر ذی روح اشیاء جیسے پتھر، مٹی وغیرہ): درج ذیل اشیاء کے علاوہ تمام پاک جمادات حلال ہیں۔

(۱) نشہ آور اشیاء جیسے افیون یا زعفران کی کثیر مقدار

(۲) اپنی اصل کے اعتبار سے اکثر سلیم الفطرت اشخاص کے نزدیک گندی اشیاء، جیسے، منی، رینٹ، تھوک، پسینہ وغیرہ، منہ سے جدا ہونے سے قبل تھوک حرام نہیں ہے۔

(۳) جو بدن یا عقل کے لئے واضح ونمایاں نقصان دہ ہو، جیسے کانچ، نقصان دہ مٹی، گارا اور پتھر، زہر وغیرہ۔

اگر زہر کی قلیل مقدار کسی کو نقصان دہ نہ ہو، یا حاجت کی وجہ سے دوسری چیز کے ساتھ استعمال کرے، تو سلامتی کے غلبہ کی صورت میں جائز ہے۔

اگر مٹی کا گارا کسی کو نقصان نہ کرے، تو اس کے حق میں جائز ہے۔ حمل میں عورتیں جو مٹی استعمال کرتی ہیں، ان کے لئے وہ جائز ہے۔ مجبوری کی وجہ سے نشہ آور نباتات کا علاج کے لئے استعمال جائز ہے۔ جبکہ اس کا کچھ بدل نہ ہو، گو اس سے نشہ آ جائے۔

تمباکو نوشی : نقصان دہ اشیاء کی حرمت کے اصول کے پیشِ نظر کئی علماء نے تمباکو کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے۔

کھال : مردار کی چمڑی حرام ہے، گو دباغت شدہ ہو، اور حلال جانور کی ہو، مذبوح جانور کی کھال بھی کھا سکتے ہیں، خواہ دباغت سے پہلے ہو یا بعد میں۔

انڈا : حرام پرندوں کے انڈوں کو (جبکہ اس میں کوئی ضرر نہ ہو) مجموع میں حلال قرار دیا ہے۔ (البتہ امام بلقینی کا میلان حرمت کی طرف ہے)

نجس چیز : تمام غیر معاف نجس اشیاء کا کھانا حرام ہے۔ (تاہم کسی چیز میں پیدا شدہ کیڑوں سمیت اس چیز کو کھانا حلال ہے،

جیسا کہ گذر چکا) اگر کسی کا منہ نجس ہو جائے تو اسے پاک کرنے سے قبل کوئی چیز کھانا پینا جائز نہیں ہے۔

فوائد: (۱) گھی میں گر کر مرے ہوئے چوہے کے متعلق آپ ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اس چوہے اور اس کے اطراف کے گھی کو پھینک کر بقیہ کو کھانے کا حکم دیا (بخاری) ابوداود کی حدیث میں مزید ہے کہ اگر وہ مائع (سیال) ہو تو اس کے قریب نہ جاؤ۔ لہٰذا اگر کسی جامد (ٹھوس) اور جمی ہوئی چیز میں نجاست گر جائے تو نجاست اور اس کے اطراف کا حصہ الگ کر کے بقیہ کو کھا سکتے ہیں۔ اگر کسی سیال چیز (مثلاً تیل۔ دودھ وغیرہ) میں گرے تو مکمل نجس ہوگا، اسے کھانا پینا اور فروخت کرنا حرام ہے۔ دوسرا کوئی استعمال ہو تو جائز ہے۔ مثلاً تیل کو چراغ میں جلانا وغیرہ۔

(۲) کسی گوشت کے سالن میں کوئی پرندہ گر کر مر جائے (یا کوئی اور نجاست گرے) تو پورا سالن نجس ہو چکا، شوربا پھینک کر گوشت کو دھو کر استعمال کر سکتے ہیں۔

(۳) قلتین یا زائد پانی میں پیشاب وغیرہ شامل ہو، اور کوئی تغیر نہ آئے، تو تمام پانی کا استعمال جائز ہے۔

(۴) چھوٹی چڑیا وغیرہ کو زندہ نگل جانا حرام ہے، کیونکہ یہ بغیر تذکیہ (ذبح وغیرہ) کے حلال نہیں، تاہم مچھلی اور ٹڈی کو زندہ نگل جانا جائز ہے۔

(۵) گوشت وغیرہ کو ابتداء سے آخر تک بالکل ڈھانک کر بھونا جائے کہ نہ اس کے ابخرات باہر نکلیں اور نہ ہوا اندر داخل ہو، تو اس کا کھانا مکروہ ہے۔

(۶) کسی سبزی ونباتات کے زہریلے ہونے میں شک ہو یا کسی دودھ کے متعلق حلال یا حرام جانور کا ہونے میں شک ہو، تو اس کا کھانا پینا حرام ہے، کسی جامد چیز میں، جو پہلے سیال تھی، کوئی نجس چیز نظر آئے، لیکن یہ علم نہ ہو کہ پہلے گری یا جامد ہونے کے بعد تو اس چیز کا استعمال حلال ہے۔

مجبور وبے تاب کا حکم

آیت: (۱) ''وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ..'' (الانعام: ۱۱۹)

ترجمہ: ''اور تحقیق اللہ نے ان سب جانوروں کی تفصیل بتلا دی ہے، جن کو تم پر حرام کیا ہے مگر وہ بھی جب تم کو سخت ضرورت پڑ جائے تو حلال ہے''

(۲) ''... فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' (مائدہ: ۳)

ترجمہ: پس جو شخص شدت کی بھوک میں بیتاب ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو، تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، رحمت والے ہیں''۔

(۳) ''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ...(البقرہ: ۱۷۳)

ترجمہ: ''اللہ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو اور خون کو اور خنزیر (سور) کے گوشت کو اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر بھی جو شخص بے تاب ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو، اور نہ تجاوز (زیادتی) کرنے والا ہو، تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں''۔

مضطر: (بے تاب و بے بس): اگر نہ کھانے پینے کی وجہ سے موت یا پُر خطر بیماری، یا بیماری میں اضافہ یا بیماری کی مدت میں اضافہ یا کسی ظاہری عضو میں کافی بدنمائی کا خطرہ ہو، تو اسے مضطر کہا جائے گا۔ (خلاصہ یہ کہ بیماری کی ہر وہ صورت جس میں تیمم جائز ہو، وہ مضطر کہلائے گا)

جو مضطر و بے تاب ہو، اور کوئی حلال چیز میسر نہ ہو، تو کسی حرام چیز کو کھاپی کر اپنی زندگی کو بچانا اس پر واجب ہے۔ مثلاً آدمی یا کسی جانور کا مردار، خون، سور پیشاب وغیرہ، تاہم کوئی نشہ آور چیز نہ کھائے۔ حرام چیز کو شکم سیر ہو کر کھانا جائز نہیں، گو عنقریب حلال کی توقع نہ ہو، کیونکہ سَدِّ رَمَق سے فی الحال بے تابی کا ازالہ ہو چکا۔ البتہ سَدِّ رَمَق پر اکتفا کرنے سے خطرہ کا اندیشہ ہو، تو شکم سیری واجب ہے، یعنی اتنا کھانا کہ بھوک کی شدت ختم ہو جائے، یہ مطلب نہیں کہ بالکل پیٹ بھر کر کھا جائے اور کھانے کے لئے جگہ باقی نہ رہے، اس حد تک کھانا قطعاً حرام ہے، اگر کچھ حلال کھانا میسر ہو، گو ایک لقمہ ہو، تو پہلے اسے کھالینا واجب ہے۔

جو مضطر بالکل جاں بلب، ہو چکا ہو، یعنی کھانے کے باوجود موت یقینی ہو، تو اسے کوئی حرام چیز کھانا جائز نہیں، کیونکہ اس سے اسے کوئی نفع نہ ہوگا۔

جو سفر میں اس طرح مجبور و بے تاب ہو اور اس سفر کی وجہ سے وہ گنہگار ہو، تو جب تک وہ اپنے گناہ سے توبہ نہ کرے، اسے کسی حرام کے کھانے کی رخصت نہ ہوگی۔

اگر آدمی کا مردار اور کسی دوسرے جانور کا مردار دونوں میسر ہوں، تو دوسرے مردار کو مقدم کیا جائے گا، کسی محترم آدمی کے مردار کو پکانا یا بھوننا جائز نہیں، کیونکہ یہ اس کے احترام کے خلاف ہے، البتہ اسکے بغیر کھانا ممکن نہ ہو، تو گنجائش ہوگی، دیگر مردار میں اسے اختیار ہے کہ پکا کر کھائے یا کسی اور طرح۔

جانور یا کسی آدمی کا قتل: مضطر اپنی بقا اور کھانے کے لئے کسی جانور کو یا ایسے شخص کو قتل کر سکتا ہے، جو معصوم نہ ہو، (یعنی شرعاً جس کو قتل کیا جا سکتا ہو) گو صرف مضطر کے حق میں معصوم نہ ہو، مثلاً جس پر اسے قصاص کا حق حاصل ہو، مرتد حربی، خواہ عورت یا بچہ ہو، محصن زانی، تارکِ نماز، گو حاکم کی اجازت نہ ہو، کیونکہ ان لوگوں کو قتل کرنے کا حق حاصل ہے، ان کو قتل کرنے کے لئے حاکم کی اجازت عام حالات میں اس کے ادب کے طور پر ضروری ہے، مجبوری کی صورت میں اس ادب کی رعایت ضروری نہیں ہے۔ کسی معصوم شخص کا قتل جائز نہیں ہے، خواہ ذمّی یا مستامن ہو۔

دوسرے کا کھانا: مضطر کو کسی دوسرے کا کھانا میسر ہو، اور مالک وہاں موجود نہ ہو تو وہی چیز کھانا واجب ہے، کیونکہ وہ پاک چیز پر قادر ہے، اور اس چیز کی قیمت مالک کو ادا کرنا لازم ہے، فی الحال قیمت کی ادائیگی پر قادر نہ ہو، تب بھی وہی چیز کھائے، قیمت اس کے ذمہ قرض رہے گا۔ (اگر مثلی چیز ہے، تو مثل ادا کرنا لازم ہے)

اگر کسی مضطر کے پاس کھانا موجود ہو، تو دوسرے مضطر کو دینا لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر کس معصوم مسلمان مضطر کو اپنے مقابلہ میں ترجیح دے، تو یہ جائز، بلکہ مستحب ہے، گرچہ وہ خود اسکا زیادہ مستحق ہے۔ کیونکہ قرآن نے انصاریوں کے اس صفت کی تعریف فرمائی ہے کہ وہ اپنی فاقہ مستی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرتے ہیں (دیکھئے سورہ حشر، آیت: ۹۹) نیز یہ ہمیشہ صالحین کی فطرت و عادت رہی ہے۔ کسی غیر مسلم یا جانور کو اپنے اوپر مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر مالک موجود ہو، اور مضطر نہ ہو، تو اسے کسی معصوم مضطر کو کھانا دینا لازم ہے، تاہم مفت دینا لازم نہیں ہے۔ بلکہ ثمنِ مثل (مناسب

قیمت) وصول کر سکتا ہے، اگر مضطر کے پاس قیمت نہ ہو، تو اسکے ذمہ قرض رہے گا، کیونکہ ایک کے ضرر کو دفع کرنے کیلئے دوسرے کو ضرر میں مبتلا نہ کیا جائے گا۔ اگر قیمت کا کوئی تذکرہ نہ کرے، تو قیمت لازم نہیں، کیونکہ کھانے پینے کی اشیاء میں عموماً تسامح برتا جاتا ہے، لہٰذا اسے اسی پر محمول کریں گے، بالخصوص مضطر کے حق میں۔

اگر مالک مضطر نہ ہونے کے باوجود مضطر کو قیمت کے عوض بھی کھانا نہ دے، تو مضطر جبراً اور زبردستی اس کا کھانا لے سکتا ہے، گو اسے قتل کرنے کی نوبت آ جائے، اور اس قتل کی وجہ سے ضامن نہ ہوگا، کوئی غیر مسلم مضطر کھانا حاصل کرنے کے لئے کسی مسلمان کو قتل نہیں کر سکتا۔

دوسرے کا کھانا اور مردار: اگر کسی مضطر کے سامنے مردار اور دوسرے کا کھانا ہو، جو وہ دینے پر راضی نہ ہو، تو اس پر مردار کھانا لازم ہے۔ کیونکہ اس کی حلت صراحتاً قرآن میں موجود ہے، اور جبراً دوسرے کا کھانا لینے کا جواز اجتہاد سے ثابت ہے، اگر مالک کھانا مفت دے، یا مناسب قیمت (یا کچھ زائد قیمت) پر دے اور مضطر کے پاس قیمت موجود ہو یا موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ ادھار رکھنے پر راضی ہو تو ان صورتوں میں مردار حلال نہ ہوگا، اگر بہت زیادہ قیمت کا مطالبہ کرے، تو دینا لازم نہیں، مستحب ہے۔

مردار اور دوسری چیز: اگر کوئی مضطر احرام میں یا حرم میں ہو، اور اسے مردار اور زندہ شکار میسر ہو، تو اسے مردار کھانا لازم ہے، کیونکہ شکار ممنوع ہے، اور اسے ذبح کرنے سے وہ بھی مردار ہی قرار پائے گا، اور اس کا کھانا حرام اور اس میں جزء واجب ہوگی۔ اگر اس کے سامنے مردار اور کسی محرم کے ذبح کردہ شکار کا گوشت موجود ہو، تو دونوں میں سے جو چاہے کھالے، اگر صرف زندہ شکار میسر ہو، تو اسے ذبح کر کے کھالے اور اسکا فدیہ ادا کرے۔

اپنا عضو کاٹنا: اگر مردار وغیرہ میسر نہ ہو، تو مضطر کھانے کے لئے خود اپنے بدن کا کوئی حصہ مثلاً ران کا ایک ٹکڑا، کاٹ سکتا ہے، جب کہ اس میں کوئی خطرہ نہ ہو، یا نہ کھانے کے مقابلہ میں کم خطرہ ہو، اگر مردار وغیرہ کچھ میسر ہو، یا خطرہ صرف کاٹنے میں ہو (بھوکا رہنے میں فی الحال خطرہ نہ ہو) یا دونوں میں برابر خطرہ ہو، یا کاٹنے میں زیادہ خطرہ ہو، تو ان صورتوں میں کاٹنا حرام ہے۔ کسی دوسرے معصوم شخص کا گوشت اپنے لئے کاٹنا یا اپنا گوشت دوسرے کے لئے کاٹنا حلال نہیں ہے۔ غیر معصوم کا گوشت کاٹ کر کھا سکتا ہے، (جیسا کہ اسے قتل کرنے کا جواز گذر چکا)

فائدہ: اگر کھانے کا مالک کسی بے تاب عورت کو بغیر زنا کے کھانا نہ دے، تو اس عورت کو زنا کی اجازت نہ ہوگی۔

نجس پانی اور پیشاب: اگر صرف نجس پانی اور پیشاب میسر ہو، تو نجس پانی کو استعمال کرے۔ اگر حلال و حرام جانور کا پیشاب موجود ہو، تو حلال جانور کا پیشاب مقدم کرے، کیونکہ یہ کئی علماء کے نزدیک پاک ہے، صرف پیشاب میسر ہو، تو وہ پی سکتا ہے۔

شراب: پیاس یا علاج کی خاطر شراب پینا حرام ہے، کیونکہ شراب کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ دوا نہیں ہے، بلکہ وہ تو بیماری ہے (مسلم، احمد، ابوداود، ابن ماجہ) ابن حبان کی روایت میں ہے کہ "وہ تو بیماری ہے، نہ کہ شفا" ایک حدیث میں ہے کہ شراب سے علاج کے متعلق سوال ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "یقیناً اللہ نے جو چیز تم پر حرام قرار دی ہے اس میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی ہے" (ابن حبان - بیھقی) اگر کسی دوا میں شراب شامل ہو اور اس کے صفات ختم ہو چکے ہوں، اور بظاہر دوسری کوئی دوا اس کا بدل نہ ہو، تو مجبوری کی وجہ سے اس دوا کا استعمال جائز ہے۔ نیز شراب سے پیاس بجھنے کے بجائے، اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر لقمہ گلے میں پھنس جائے (اچھولگ جائے) اور شراب کے علاوہ کوئی چیز اسے گلے سے اتارنے کے لئے موجود نہ ہو تو شراب کا گھونٹ لے کر اسے اتارنا واجب ہے، کیونکہ اس سے موت سے سلامتی (کسی حد تک بظاہر) یقینی ہے۔

حرام سے علاج: شراب کے علاوہ دیگر نجاستوں سے علاج جائز ہے، جبکہ کوئی پاک چیز اس کی جگہ علاج کے لئے موجود نہ ہو، اگر پاک چیز میسر ہو، تو نجاست سے علاج حرام ہے، اور اوپر ممانعت کی جو حدیث گذری، اسے اسی صورت پر محمول کریں گے۔ نجاست سے علاج اس وقت جائز ہے جبکہ مریض خود اس سے واقف ہو کہ دوسری کوئی پاک چیز اسکا بدل موجود نہیں ہے، یا کوئی معتبر مسلمان ڈاکٹر اسے یہ بات بتادے۔ اگر نجاست کے استعمال سے جلد شفا حاصل ہو، ورنہ شفا کے حصول میں تاخیر ہو تو بظاہر نجاست کے استعمال کی گنجائش مل جائے گی۔

صحیحین وغیرہ کی روایات میں ہے کہ بعض لوگوں کو علاج کے لئے آپ ﷺ نے اونٹ کا پیشاب پینے کی اجازت دی تھی۔ اس حدیث کو علماء نے مجبوری کی شکل پر محمول کیا ہے۔

فوائد: (۱) اگر کسی مریض کو ایسا کھانا میسر ہو، جو اس کے لئے نقصان دہ ہو، تو وہ اسے چھوڑ کر مردار کھا سکتا ہے۔

(۲) ہر طرف حرام مال ہی کا دور دورہ ہو، تو بقدر حاجت استعمال کر سکتا ہے، نہ کہ اس سے زائد، جبکہ اصل مالکوں کے معرفت کی توقع ہو، ورنہ وہ بیت المال کا مال شمار ہوگا۔ لہٰذا اپنے استحقاق کے بقدر اس میں سے لے سکتا ہے۔

(۳) امام شافعی نے فرمایا کہ سانپوں کے گوشت سے تیار شدہ تریاق بغیر شدید مجبور کے کھانا جائز نہیں ہے۔ یعنی اس حالت پر پہنچ جائے کہ مردار کھانا جائز ہو جائے۔

(۴) بغیر مجبوری کے بھی مردار وغیرہ حرام چیز کا توشہ سفر میں ساتھ رکھنا جائز ہے۔ (تاکہ بصورتِ مجبوری استعمال کر سکے)

(۵) مضطر کو ایک حلال جانور اور ایک حرام جانور کا مردار میسر ہو، مثلاً بکری اور گدھا تو اسے اختیار ہے، اگر گدھا اور کتا میسر ہو، تو کتے کو چھوڑ کر گدھے کو مقدم کرے۔

(۶) دوسرے کے کھانے کو عیب لگانا مکروہ ہے۔

(۷) حلال کھانا شکم سیری سے زائد کھانا مکروہ ہے، جب کہ خود کا ہو، دوسرے کا ہو تو اس کی رضامندی کی صورت میں مکرہ، ورنہ حرام ہے۔

(۸) نفس کی جائز شہتوں اور لذتوں کے بارے میں اعتدال سے کام لینا بہتر ہے۔

(۹) مردار وغیرہ کھانے کے بعد مضطر کو حلال غذا ملے تو قئی کرنا لازم ہے، جب کہ ضرر کا اندیشہ نہ ہو، اسی طرح کسی کے جبر و زبردستی کی وجہ سے کوئی شراب پئے یا حرام چیز کھائے تو بصورتِ امکان بعد میں قئی کردے۔

دوسرے کا باغ: کوئی شخص کسی دوسرے کے باغ یا کھیتی کے پاس سے گذرے تو مالک کی اجازت کے بغیر اس کا پھل یا اناج لینا یا کھانا جائز نہیں ہے۔ اگر مضطر ہے تو کھا سکتا ہے، لیکن قیمت ادا کرے گا، اگر احاطہ (کمپاونڈ) کے اندر پھل گرے ہوئے ہوں تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر باہر گرے ہوئے پھل ہوں، اور علاقہ میں ایسے پھلوں کے اباحت کی عادت ہو (یعنی عام ماحول یہ ہو کہ ایسے پھلوں کے اٹھانے و کھانے میں مالک کو کوئی اعتراض نہ ہو) تو وہ جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''کسی شخص کو اپنے (مسلمان) بھائی کے مال میں سے وہی حلال ہے، جو وہ اپنی خوش دلی سے دے'' (بیھقی فی کتاب الغصب باسناد و صحیح) جن روایات سے جواز معلوم ہوتا ہے، علماء نے اسے عرف و ماحول پر یا مضطر پر محمول کیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔

اگر کسی رشتہ دار یا دوست کے متعلق گمان غالب ہو کہ اس کے باغ، کھیت یا مکان سے کسی چیز کا کھانا اسے ناگوار نہ ہوگا، اور وہ اس سے راضی ہوگا تو کھانے میں حرج نہیں، اشخاص، وقت، احوال اور مال کے اعتبار سے اس مقدار میں اختلاف ہوگا۔ اگر اس کی رضامندی میں شک ہو، تو کھانا جائز نہیں، کتاب وسنت اور امت کے قدیم وجدید افراد کے تعامل سے یہی تفصیل سامنے آتی ہے۔

ضیافت : (مہمان نوازی) کوئی مسلم جو مضطر نہ ہو، کسی مسلمان کا مہمان بنے، تو اس کی مہمان نوازی مستحب ہے، واجب نہیں ہے، صحیحین وسنن کی احادیث میں اس کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے، احادیث کی رو سے ایک دن اپنی حیثیت کے مطابق مہمان کے لئے خصوصی اہتمام کرے، بقیہ، دوروز اپنی روزانہ کی عادت کے مطابق کھلائے پلائے، تین دن کے بعد جو ہو، وہ صدقہ ہے، جو میزبان کی مرضی پر موقوف ہے، مہمان کے لئے مناسب نہیں کہ میزبان کے مطالبہ والتماس کے بغیر تین روز سے زائد اس کے پاس ٹھہرے۔

داغ دینا : صحیحین وغیرہ کے احادیث کی رو سے علاج کی خاطر داغ دینے کی گنجائش ہے، لیکن حتی الامکان اس طریقہ علاج کو نہ اپنانا بہتر اور مستحب ہے۔

پرھیز : حضرت علیؓ میں ایک مرتبہ بیماری کی نقاہت باقی تھی، پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے، اور کھجور کھانے لگے تو آپ ﷺ نے انھیں منع فرمایا (ابوداود، ترمذی) لہٰذا بیماری کے اعتبار سے مناسب پرہیز مشروع ہے۔

جھاڑ پھونک : (منتر۔تعویذ): "آپ ﷺ نے ہرزہریلے جانور (کا زہر اتارنے) کے لئے جھاڑ پھونک کی اجازت دی" (بخاری، مسلم)

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے "آپ ﷺ نے مجھے نظر بد کے منتر کی اجازت دی" (بخاری۔مسلم) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں، جب کہ اس میں شرک (کا کوئی کلمہ) نہ ہو (مسلم) ایک یہودی عورت حضرت عائشہؓ کو جھاڑ پھونک کر رہی تھی، تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "اسے کتاب اللہ کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرو" (بیھقی باسنادہ الصحیح)

امام شافعیؒ نے فرمایا: "کوئی شخص کتاب اللہ سے یا اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے ذکر سے جو اسے معلوم ہو، جھاڑ پھونک کر سکتا ہے، نیز اہل کتاب (یہودی وعیسائی) بھی مسلمانوں کو جھاڑ پھونک کر سکتے ہیں، جبکہ اللہ کی کتاب یا اللہ کے ذکر سے کریں جو معروف ہو، اور اس کے متعلق کافی دلائل موجود ہیں" امام بیہقی فرماتے ہیں کہ جھاڑ پھونک اور دوائی وعلاج کے متعلق آپ ﷺ سے بکثرت روایات مروی ہیں۔

تعویذ لٹکانا : مختلف روایات کی روشنی میں ایسے تعویذ کا استعمال جس کا مطلب معلوم نہ ہو، یا آدمی جاہلیت کی طرح براہ راست تعویذ کو شفا اور مقصد برآری میں مؤثر سمجھے، ممنوع ہے۔ اگر اللہ کی کتاب یا کسی معلوم ذکر الٰہی کو تبرکا استعمال کرے، اور شفا کو صرف اللہ کی طرف سے سمجھے، تو ایسے تعویذ میں حرج نہیں۔

چشم بد (نظر لگنا) : صحیحین وغیرہ کی احادیث میں چشم بد کو آپ ﷺ نے برحق قرار دیا ہے، اور اس کے لئے جھاڑ پھونک کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

نظر کے اثر کا ازالہ : مسلم کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر تم سے غسل کا مطالبہ کیا جائے، تو تم غسل کرو" یعنی بظاہر جس شخص کی نظر لگی ہے، مریض اس سے مطالبہ کرے تو وہ انکار نہ کرے، بلکہ اعضاء وضو، گھٹنے، تہہ بند کی اندرونی سطح دھو کر دہ پانی مریض کو دے، اور پیچھے کی طرف سے اس پانی کو مریض کے سر پر انڈیل دیا جائے۔

فائدہ : امام سیوطیؒ نے فرمایا کہ مراتب پانچ ہیں: ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول۔

۱- **ضرورت :** یعنی اس حد تک پہنچ جانا کہ کچھ نہ کھائے تو مر جائے گا، یا قریب المرگ ہوگا، اس حالت میں حرام چیز کھانا جائز ہے۔

۲- **حاجت :** مثلاً ایسا بھوکا شخص کہ کچھ نہ کھانے ملے تو مرے گا تو نہیں، تاہم کافی تکلیف و مشقت پیش آئے گی، اس صورت میں حرام کی اجازت نہ ہوگی، البتہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش ملے گی۔

۳- **منفعت :** مثلاً وہ شخص جسے بکری کا گوشت، اور مرغن غذا کی خواہش ہو۔

۴- **زینت :** مثلاً مٹھائی، ریشم اور کتان سے بنے ہوئے کپڑے کی خواہش۔

۵- **فضول :** حرام اور مشکوک اشیاء کے استعمال تک پہنچ جانا۔

(تلخیص ۲/۲۹۴-۲۹۷، ۴/۷۴، ۱۴۹-۱۶۰، المجموع ۹/۲-۷۱، مغنی ۴/۲۹۷-۳۱۰، فتح الوهاب مع الجمل ۵/۲۶۸-۲۷۹، الاقناع مع البجیرمی ۴/۲۵۶-۲۷۷، نهایه مع الحواشی ۸/۱۵۰-۱۶۴، ترشیح ۲۰۹-۲۱۱، بغیه ۲۵۸-۲۶۰، الفقه المنهجی ۳/۶۷-۸۶، تحفه مع الحواشی ۱۲/۳۰۶-۳۴۱، قلائد ۲/۳۹۸-۴۰۴، اعانه ۲/۳۴۹-۳۵۶)

مقابلہ (مسابقہ)

اس باب میں تیر اندازی اور شہسواری وغیرہ میں مقابلہ کے مسائل درج ہیں۔

مشروعیت : مسابقہ (مقابلہ) مسلمان مردوں کو جہاد کے قصد سے بالاجماع مشروع اور سنت ہے۔ (فتح الوهاب ۲/۱۹۴) فخر و تکبر اور ظلم و تعدی کی نیت سے مسابقہ حرام ہے۔ ان دونوں ارادوں کے بغیر یہ مباح ہے۔ کیونکہ اس میں جسم کی ورزش اور طبیعت کے لئے تقویت کا سامان ہے۔

آیت : وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ " (سوره انفال : ۶۰)

ترجمہ: "اور ان کافروں (سے مقابلہ کرنے) کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے، ہتھیار سے، اور پلے ہوئے گھوڑوں سے، سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں۔ اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم (بالتعیین) نہیں جانتے، (بلکہ) ان کو اللہ ہی جانتا ہے۔"

حدیث :۱) آپ ﷺ نے گھوڑ دوڑ کا مقابلہ کروایا (بخاری۔ مسلم)

۲) مذکورہ آیت میں لفظ 'قوۃ' کی تفسیر آپ ﷺ نے تیر انداز سے فرمائی۔" (مسلم شریف)

۳) قبیلہ اسلم کے ایک گروہ پر آپ ﷺ کا گذر ہوا، جو تیر اندازی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "اے بنی اسماعیل (اسماعیل علیہ السلام کی نسل) تیر اندازی کرو۔ کیونکہ تمہارے والد بھی تیر انداز تھے۔" (بخاری شریف)

۴) آپ ﷺ نے فرمایا: "عوض کے ساتھ (انعام و شرط کے ساتھ) مقابلہ صرف اونٹ، گھوڑا اور تیر اندازی (جیسے امور) میں مشروع ہے۔" (الشافعی۔ ترمذی۔ و صححهٗ ابن حبان)

۵) جو تیر اندازی سیکھنے کے بعد اسے چھوڑ دے وہ ہم میں سے نہیں یا اس نے نافرمانی کی۔'' (مسلم)
بالعوض مقابلہ صرف ایسے امور میں جائز ہے، جو اسباب جنگ میں داخل اور معاون ہوں، مثلاً گھوڑے، خچر، گدھے، اونٹ، ہاتھی، تیر اندازی، نیزہ بازی اور پتھر بازی کے مقابلے امام صمیری فرماتے ہیں کہ عورتوں کو بالعوض مسابقہ جائز نہیں، کیونکہ وہ جنگ کے اہل نہیں۔ (فتح الوهاب ۲/۱۹۴)

امام نوویؒ نے روضہ میں فرمایا کہ تیر اندازی سیکھ کر چھوڑ دینا شدید مکروہ ہے۔ (مغني المحتاج ۴/۳۱۱)

جانوروں کے مقابلہ کے اقسام

۱) دو یا زائد افراد میں مقابلہ ہو، اور آگے بڑھنے والے (جیتنے والے) کے لئے انعام مقرر ہو، جو حاکم یا کسی تیسرے شخص کی جانب سے ہو، جو اس مقابلہ میں شریک نہ ہو، یہ قسم جائز ہے۔
۲) دو افراد کے مقابلہ میں ایک یہ کہے کہ اگر تم جیت گئے تو میں تمہیں انعام دوں گا، لیکن میں جیت جاؤں تو تم کچھ نہ دینا، یہ قسم جائز ہے۔
۳) دو افراد کا مقابلہ ہو، اور اس میں جو بھی ہارے وہ جیتنے والے کو انعام دے، (یعنی دو طرفہ شرط ہو) یہ قسم حرام اور جوئے میں شامل ہے۔
۴) تیسری قسم کی طرح، لیکن ایک تیسرا ساتھی بھی شامل کرلیں، جس کا جانور بھی ان دونوں کے جانوروں کے مثل ہو (یعنی بقیہ دو کی طرح اس کے بھی ہار جیت کا امکان ہو)، اور شرط یہ طے پائے کہ تیسرا ساتھی جیت گیا، تو ان دونوں سے مقررہ انعام لے گا، لیکن یہ ہار جائے تو اس پر کچھ لازم نہ ہوگا، اس تیسرے ساتھی کو محلّل کہیں گے۔ (کیونکہ اس کی شرکت کی وجہ سے یہ قسم حلال ہوگئی) اگر محلل اور ان میں سے ایک ساتھ میں پہنچیں اور دوسرا ہار جائے، تو ہارنے والے کی رقم ان دونوں میں تقسیم ہوگی۔ یہ قسم جائز ہے۔
حدیث: ''جو دو گھوڑے کے درمیان ایک گھوڑا (اخل (شامل) کرے، اگر اس کا آگے نکلنے کا (جیتنے کا) خطرہ نہ ہو، تو اس میں کوئی بھلائی نہیں، اور آگے نکلنے کا امکان ہو، تو حرج نہیں (رواہ فی شرح السنة) ابوداود شریف کی روایت میں پہلی صورت کو قمار (جوا) فرمایا اور دوسری صورت میں قمار کی نفی فرمائی (مشکوۃ شریف ص ۳۳۷)

مذکورہ مقابلہ کے شرائط

۱) مقابلہ میں شامل تمام افراد مسافت کی ابتداء اور انتہاء سے واقف ہوں، نیز ہر ایک کے لئے ایک ہی مسافت متعین ہو۔
۲) گھوڑے، اونٹ وغیرہ پہلے سے متعین ہوں، ایک مرتبہ متعین ہونے کے بعد ان کی تبدیلی جائز نہیں، اگر کوئی تبدیلی کرے تو یہ مسابقہ فاسد ہوگا۔
۳) ہر شریک کا جانور ایسا ہو کہ اس کے جیتنے اور ہارنے کا احتمال ہو، اگر کوئی جانور اتنا کمزور ہو کہ اسکا ہارنا یقینی ہو، یا کوئی جانور اتنا چست اور سبک (چالاک اور تیز رفتار) ہو کہ اس کا جیتنا یقینی ہو، تو یہ مسابقہ جائز نہیں۔
۴) تمام شرکاء اوّل، دوّم وغیرہ کے لئے متعین و مشروط انعام کی مقدار سے واقف ہوں، اگر ان میں کوئی ناواقف ہو، تو مسابقہ صحیح نہیں۔
۵) انعام کی رقم مسابقہ میں غیر شریک (اجنبی) کی طرف سے ہو، مثلاً حکومت کی جانب سے، کسی اور مالدار شخص کی جانب سے۔ شرکاء میں سے کسی ایک کی جانب سے ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ دوسروں کے ہارنے کی صورت میں ان پر کچھ لازم نہ ہو۔ اگر ان پر بھی مال لازم ہو تو ایک محلل کا شامل ہونا ضروری ہے، جس کی تفصیل پانچویں قسم میں گذر چکی۔

۶) مسابقہ اور مقابلہ ہر ان جانوروں میں جائز ہے، جو جنگ میں کارآمد اور کرّ وفرّ (پینترا بدلنے کے لئے پیچھے ہٹنا اور پھر دوبارہ حملہ آور ہونا) کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جیسے گھوڑا، خچر، اونٹ وغیرہ، جو جنگ میں کارآمد نہ ہوں، جیسے بیل، پرندے وغیرہ ان میں مسابقہ جائز نہیں، جیسا کہ حدیث میں اونٹ اور گھوڑے وغیرہ میں مقابلہ کا ذکر گزر چکا۔ اُس دور میں چونکہ وہی آلاتِ جنگ تھے اسلئے ان کا تذکرہ کیا گیا، لہٰذا ہر دور اور علاقہ کے اعتبار سے جو بھی آلاتِ جنگ میں داخل اور دشمن کو شکست دینے میں معاون ہو، اس کا یہی حکم ہوگا۔ (اور اس میں مقابلہ کی اجازت ہوگی)

کتوں، مرغوں اور مینڈھوں کو لڑانا، بالعوض ہو یا بلاعوض، بالاتفاق ممنوع ہے۔ کیونکہ یہ بے وقوفی ہے اور قوم لوط کا عمل ہے، جن کو گناہوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ہلاک کردیا۔ (مغنی المحتاج ۴/۳۱۲)

۷) تمام شرکاء کے جانور ایک جنس کے ہوں، خواہ انواع جدا ہوں، (مثلاً تمام گھوڑے یا اونٹ ہوں۔ اگر ایک کا گھوڑا ترکی اور دوسرے کا عربی ہے تو حرج نہیں) البتہ ایک کا خچر اور دوسرے کا گدھا ہو، تو جائز ہے، کیونکہ ان دونوں میں خاص تفاوت نہیں۔ (فتح الوہاب ۲/۱۹۴)

۸) ہر شخص اپنے جانور پر سوار ہو، اگر بلا سواری کے صرف جانوروں کو دوڑانے کی شرط ہو تو صحیح نہیں۔

۹) سوار متعین ہوں، اگر ہر ایک یہ شرط لگائے کہ اپنی سواری پر جسے چاہے سوار کرے، تو یہ جائز نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج ۔۴/۳۱۳)

تین یا زائد شرکاء کی صورت میں دوّم کو اوّل کے مساوی انعام رکھنا جائز ہے، زائد رکھے تو عقد فاسد ہوگا آخری نمبر آنے والے کو اس کے ماقبل کے مساوی نہیں رکھتے، اس سے کم رکھنے میں حرج نہیں۔ دوّم کو اوّل سے کم انعام رکھنا مستحب ہے۔ اگر مثلاً دس افراد مسابقہ میں شریک ہوں، اور آخر میں آنے والے کے علاوہ دیگر ۹ شرکاء کو مساوی انعام رکھا جائے تو یہ جائز ہے۔ (مغنی المحتاج ۴/۳۱۴)

۱۰) کسی مفسد شرط سے اجتناب: مثلاً ''اگر تم جیت گئے تو یہ دینار تم کو انعام، بشرطیکہ اپنے ساتھیوں کو کھلاؤ، تو عقد فاسد ہوگا، کیونکہ یہ تملیک ایسی شرط کے ساتھ ہے جو کمالِ تصرف سے مانع ہے۔ (مغنی المحتاج ۴/۳۱۴)

(مُنَاضَلَہ) نشانہ بازی [مختلف ہتھیاروں میں مقابلہ]

جہاد اور دشمنوں سے مقابلہ کی نیت سے نشانہ بازی کا مقابلہ سنت ہے۔ اور اگر مفاخرہ اور بے گناہ لوگوں پر ظلم کے ارادہ سے ہو، تو حرام ہو جائے گا، کیونکہ اصول ہے: ''ہر امر کا فیصلہ اور حکم اس کے مقاصد پر موقوف ہے۔''

جانوروں کا مقابلہ کی طرح اس کی بھی چار قسمیں ہیں، اور تیسری قسم باطل ہے اور ناجائز ہے۔ یعنی مثلاً دو شرکاء میں سے جو بھی جیتے، دوسرا اسے انعام دے، یہ جوئے میں داخل ہے، جو حرام اور ناپاک کمائی ہے۔

شرائط: (۱) تیر جیسے ہتھیاروں میں مقابلہ ہو، تو اصل مطلوب کی وضاحت شرط ہے، یعنی صرف نشانہ پر تیر لگنا کافی ہے، یا اسے پھاڑ دے، آر پار نکل جائے، اگر کوئی صراحت نہ ہو، تو صرف چھونے پر محمول کرتے ہوئے اس مقابلہ کو صحیح قرار دیں گے۔

۲) تمام شرکاء کے ہتھیار ایک ہی جنس کے ہوں، مثلاً تیر، بندوق وغیرہ، اگر دونوں کے بندوق مختلف جنس کے ہوں تو یہ مقابلہ صحیح نہیں، خواہ دونوں اس سے راضی ہوں۔

۳) ہتھیار چلانے والے، نشانہ، چلانے کی جگہ اور (تیر یا فائر وغیرہ کی) تعداد کی تعیین ضروری ہے۔

۴) مال (انعام) کی مقدار ہر شریک کو معلوم ہو۔

ناجائز مناضلہ

ایک عام قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ عوض اور مال کے ساتھ مناضلہ (ہتھیار وغیرہ کا مقابلہ) ہر اس چیز میں جائز ہے، جو جنگ میں نافع ہو، لہٰذا جو آلات وغیرہ جنگ میں کارآمد نہ ہوں، ان میں بالعوض مقابلہ جائز نہیں ہے۔

گیند (بال) کے تمام اقسام وانواع میں بالعوض مقابلہ جائز نہیں۔ اور تیرنے میں، شطرنج کی بازی میں، ایک قدم پر کھڑے ہونے کے کرتب میں، اور چھوٹی کشتیوں کے دوڑ میں (جو کہ جنگ میں کام نہ آئے) مقابلہ جائز نہیں ہے۔

کیونکہ یہ امور جنگ میں بالکل فائدہ مند نہیں، لہٰذا یہ خواہ جائز ہوں، یا مطلوب جیسے تیراکی، ان میں انعامی مقابلہ جائز نہیں ہے۔

عقد مسابقہ اور عقد مناضلہ ایک لازم عقد ہے، یعنی سابقہ شرائط کے ساتھ مشروع طریقے پر یہ پایا جائے، تو جس نے مال کا ذمہ لیا ہے، وہ اسے فسخ یا عمل ترک نہیں کرسکتا۔ لازم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایک دیگر کی موافقت اور رضامندی کے بغیر اسے فسخ نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ بیع واجارہ وغیرہ

اگر مسابقہ ومناضلہ میں مال مشروط نہ ہو، تو یہ عقد صرف جائز ہے (لازم نہیں ہے) لہٰذا کوئی بھی تنہا فسخ کرسکتا ہے۔

کھیل کود اور اسباب تفریح [لہو]

ہر وہ امر جو بے قراری، تفکرات اور مختلف پریشان کن باتوں کی طرف سے انسان کی توجہ ہٹائے اسے لہو (کھیل کود) کہا جائے گا، مثلاً کھیل، خوش طبعی، گپ شپ اور موسیقی وگانے وغیرہ۔

لہو کے اقسام

۱) جو لہو انسانی زندگی پر کوئی اچھا یا برا اثر نہ چھوڑے، وہ مکروہ ہے، مثلاً ہنسی مذاق اور خوش طبعی کی مجلسیں آباد رکھنا، کہ بلا کسی فائدہ کے اپنا وقت اس میں برباد کرے۔

۲) جو لہو ایک انسان اور معاشرہ پر اپنے برے اور نقصان دہ اثرات چھوڑے وہ حرام ہے، اور اس کا اپنانا جائز نہیں ہے۔

مثلاً: پہلی قسم کا لہو جبکہ اس میں آزادی سے اتنا وقت برباد کرے کہ اس کے واجبات، یعنی فرض عبادات، یا معاش کی فکر اور تگ ودو فوت ہو جائے، یا برے نہج پر ہو جیسے جھوٹ، اور لوگوں کے ساتھ اخلاقی سلوک میں لاپرواہی۔

نیز آلاتِ موسیقی کے ساتھ گانے کی مجلس، یا عورتوں اور امردوں کے ساتھ گانے کی مجلس بھی اس میں داخل ہے۔

۳) وہ لہو اور کھیل، جو ایک انسان اور معاشرہ میں فائدہ اور نفع کا باعث ہو، مباح ہے، بلکہ کبھی اس سے برآمد نتیجہ اور فائدہ کی اہمیت کے اعتبار سے مستحب بھی قرار پائے گا۔

مثلاً شہسواری، تیراندازی، اور دیگر وہ امور جو جنگ میں کارآمد ہوں۔

ان احکام کی مزید مثالیں

۱) عوام میں شائع پرسکون کھیل، جیسے شطرنج، نرد، تاش وغیرہ۔ ان کھیلوں کا حکم درج ذیل قاعدہ کی روشنی میں لگایا جائے گا۔

(الف) ان میں سے جو کھیل فکر وتدبر، اور نتیجہ اور اس میں مصروفیت کے اعتبار سے اباحت یا کراہت کا حکم لگے گا۔

انہیں کھیلوں میں شطرنج کا شمار ہوتا ہے، اس میں ذہنی ورزش اور عقل وفکر کو تحریک حاصل ہوتی ہے۔ اور بلاشبہ یہ ذہن وعقل کے لئے فی الجملہ نفع بخش ہے، اب کوئی اس فائدے سے زائد اس میں مشغول رہے تو یہ مکروہ ہے، اگر یہ زیادتی اس حد تک پہنچ جائے کہ اس کی وجہ سے بعض واجبات ترک ہونے لگیں تو حرام قرار دیا جائے گا (یہ واضح رہے کہ اس میں انعامی مقابلہ قطعاً اور بالاتفاق حرام اور جوئے میں داخل ہے۔ اور بعض ائمہ کرام کے نزدیک یہ مطلقاً حرام ہے)

(ب) جن کھیلوں کی بنیاد اتفاق پر ہو، اور فکر وعقل کی کارکردگی کا اس میں کوئی دخل نہ ہو جیسے نرد اور تاش وغیرہ۔ وہ حرام ہیں، کیونکہ ایسے کھیل ایک انسان کو تمام احوال وامور میں اتفاقات کا عادی بنا دیتا ہے اور اس کی عقل اس کائنات کے نظام میں اتفاقات ہی کو عاملِ اول اور اصل محرک تصور کرتی ہے، لہٰذا یہ ایسا لہو ہے، جو نفس پر برا اور مضر اثر چھوڑتا ہے۔

۲) **حیوانات کے تماشے**: مثلاً آپس میں مرغ کو لڑانا، مویشیوں میں سینگ بازی اور مقابلہ، بیلوں کی کشتی وغیرہ۔ یہ تماشے حرام ہیں کیونکہ جانوروں کی یا انسانوں کی زندگی پر مضر اثرات کا باعث ہیں۔

۳) **کشتی**۔ اس کی مختلف انواع ہیں۔

(الف) جو کشتی جسم کو نقصان دہ نہ ہو، نیز وہ ایک انسان کو قوت، فنونِ جنگ اور اپنے دفاع کا ماہر بنائے، وہ مباح ہے، بلکہ بعض اوقات مستحب شمار ہوگا، مروی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت رکانہ سے کشتی لڑی اور انہیں پچھاڑ دیا۔

(ب) جو کشتی جسمانی اعتبار سے نقصان دہ، ہو مثلاً زخمی کردے، ہڈی توڑ دے یا کسی عضو کی صورت بگاڑ دے، وہ حرام ہے۔ جیسے باکسنگ، آزاد کشتی وغیرہ۔

قسم (یمین)

تعریف: یمین (قسم) لغت میں 'قوت' کو کہتے ہیں، جیسے قرآن کی آیت میں فرمایا: "لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ" (الحاقۃ: ۴۵) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں یمین قوت کے معنی میں ہے۔ قوت کی مناسبت سے دائیں ہاتھ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کسی معظم کی قسم اور حلف کو بھی یمین کہا جاتا ہے، کیونکہ عرب حضرات عہد وپیمان کے وقت آپس میں دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرتے۔ (جو اس کی مضبوطی وقوت پر دلالت ہوتا)

اصطلاح میں کسی ایسے کلام کو جس کا مضمون ومفہوم ثابت نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے کسی نام یا صفت کے ذکر کے ساتھ مخصوص پیرایہ وانداز میں قوی ومضبوط کرنے اور توثیق کو یمین کہا جاتا ہے۔

لہٰذا توثیق کی قید سے یمین لغو نکل گیا، یعنی وہ قسم جو دوران گفتگو توثیق وتحقیق کے قصد کے بغیر غیر ارادی اور عادت کے طور پر زبان پر آجاتا ہے۔ مثلاً: نہیں قسم بخدا، بالکل قسم بخدا، یہ شرعاً منعقدہ قسم شمار نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے" لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ" (مائدہ: ۸۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو قسم پر (یعنی جو پختہ نہ ہو اس پر) مؤاخذہ نہیں فرماتا"۔

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے:" بات بات میں (یعنی دورانِ گفتگو) نہیں قسم بخدا، بالکل قسم بخدا کے کہنے کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی" (بخاری) آپ ﷺ کا فرمان ہے:" اس سے کسی شخص کا اپنے گھر میں (بات چیت کے دوران) كَلَّا وَاللّٰهِ اور بَلٰى وَاللّٰهِ

(ہرگز نہیں قسم بخدا، یقیناً قسم بخدا) کہنا مراد ہے" (ابوداود، وصححه ابن حبان)

نیز جس کلام کا مضمون ومفہوم لامحالہ ثابت ہو، وہ بھی شرعاً قسم شمار نہ ہوگا، مثلاً کوئی کہے: قسم بخدا میں ضرور مروں گا، کیونکہ یہ بات فی نفسہٖ ثابت اور یقینی ہے، نیز اس میں حنث یعنی قسم کے توڑنے وخلاف ورزی کا کوئی سوال نہیں۔

ماضی ومستقبل: قسم ماضی کے متعلق بھی ہوسکتی ہے، جیسے: واللہ میں نے فلاں کام کیا، یا نہیں کیا، جیسا کہ مستقبل کے متعلق ہوتی ہے۔ مثلاً: قسم بخدا میں ضرور فلاں کام کروں گا، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "قسم بخدا میں یقیناً قریش سے غزوہ کروں گا" (ابوداود)

قسم کا حکم: عام حالات میں اور بلا حاجت قسم کے الفاظ ادا کرنا مکروہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُم ..." (البقرہ: ۲۲۴) (اور اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ) یعنی کثرت سے اللہ کی قسم نہ کھاؤ، کیونکہ بعض اوقات اس کو نبھانا مشکل ہوگا۔

امام شافعی نے فرمایا: "میں نے اللہ کی قسم نہیں کھائی، نہ سچی نہ جھوٹی" البتہ بعض دیگر عوارض واسباب اور نتائج کے اعتبار سے قسم کے احکام کی تفصیل درج ذیل ہوگی۔

۱- **حرام:** جبکہ کسی حرام کے ارتکاب، یا واجب کے ترک پر قسم کھائے، یا جھوٹی قسم لے جس کے کچھ حقیقت نہ ہو۔

۲- **واجب:** جب کہ کسی مظلوم کے ساتھ انصاف یا حق کی وضاحت قسم کے بغیر ممکن نہ ہو۔

۳- **مباح:** جب کہ کسی نیکی کے انجام دینے، گناہ سے باز رہنے، حق کی رہنمائی یا باطل سے چوکنا کرنے کے لئے ہو۔

۴- **مستحب:** جب کہ قسم کسی وعظ ونصیحت کی سامعین پر اثر اندازی کا وسیلہ اور انکی تصدیق کا سبب ہو۔

تنبیہ: ایک مومن کی شان یہ ہے کہ اس کا دل ودماغ اللہ تعالیٰ کے تعظیم اور اس کی خشیت وہیبت سے لبریز ہو، لہٰذا قرآنی حکم کے خلاف ورزی کرتے ہوئے اللہ کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ بنانا، اور عام بول چال میں بلاضرورت سامنے والے پر اثر ڈالنے کے لئے بات بات پر قسم کھانے اور اسے تکیہ کلام بنالینے سے گریز واحتیاط برتنا چاہئے، کیونکہ یہ انداز تعظیم وخشیت کے منافی ہے، نیز اس عادت کا ایک بدترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ آدمی جھوٹ قسم پر بھی جری ہوجائے گا، جو گناہ کبیرہ ہے، صحیحین میں ہے کہ "قسم کی وجہ سے سامانِ تجارت تو خوب نکل جائے گا، (یعنی بظاہر تو تجارت کو فروغ حاصل ہوگا) لیکن برکت بالکل ختم ہوجائے گی" نیز بخاری کی ایک حدیث میں جھوٹ قسم کو کبائر کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

قسم منعقد ہونے کے شرائط: قسم شرعاً منعقد ہونے کے لئے درج ذیل شرائط ضروری ہیں (یعنی ان میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو وہ شرعاً قسم نہ کہلائے گی اور اس کی خلاف ورزی سے کفارہ لازم نہ ہوگا)

۱- قسم کھانے والا عاقل بالغ ہو، کیونکہ ابوداود وغیرہ کی حدیث کی رو سے نابالغ اور پاگل مرفوع القلم ہیں (یعنی ان پر مواخذہ نہیں، اور وہ غیر مکلف ہیں)

۲- یمین لغو (یعنی غیر پختہ قسم) نہ ہو، جیسا کہ گذر چکا۔

۳- قسم درج ذیل کسی لفظ کے ساتھ ہو:

(الف) اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات: مثلاً میں اللہ کے ذات کی قسم کھاتا ہوں، یا میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔

(ب) اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ناموں میں سے کوئی نام: مثلاً میں رَبُّ العالمین (تمام جہاں کے پروردگار) یا مالکُ یوم الدین،

(روزِ قیامت کے مالک) یا رحمٰن کی قسم کھاتا ہوں۔

(ج) اللہ تعالیٰ کے صفات میں سے کوئی صفت: مثلاً، اللہ کے عزت کی، یا علم، یا ارادہ کی یا قدرت کی قسم۔

مذکورہ تفصیل کے متعلق صحیح احادیث مروی ہیں:

۱-ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے والد کی قسم کھائی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''آگاہ ہو جاؤ! بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے آباواجداد کی قسم سے منع فرماتے ہیں، جسے قسم کھانا ہو، وہ اللہ کی قسم کھائے، ورنہ چپ رہے'' (متفق علیه)

۲-آپ ﷺ یوں قسم کھایا کرتے: ''نہیں، قسم ہے مقلب القلوب کی'' (دلوں کو الٹنے پلٹنے والے ذات کی قسم) (بخاری)

۳-بخاری وغیرہ میں آپ ﷺ سے بکثرت یہ قسم وارد ہے: ''قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے'' اور ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے''۔

اگر کوئی شخص کسی دوسرے الفاظ سے قسم کھائے تو منعقد نہ ہوگی، کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت گذر چکی، نیز اس میں کمالِ تعظیم مفقود ہے، اور ایک مومن کو کسی غیر اللہ کی ذاتی تعظیم ممنوع ہے۔ دوسرے نام سے قسم کھانا مکروہ ہے، گو معظم ہو، جیسے نبی یا کعبہ کی قسم، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ گناہ ہو، کئی علماء نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ایک حدیث میں غیر اللہ کی قسم کو کفر قرار دیا ہے (ترمذی، حاکم علیٰ شرط الشیخین) تاہم اسے ایسی صورت پر محمول کیا گیا ہے جب کہ اس میں اللہ کی طرح تعظیم کا عقیدہ رکھے۔

صریح و کنایه قسم: قسم کی دو قسمیں ہیں: (۱) صریح (۲) کنایہ

(۱) صریح قسم: اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کسی نام سے کھائے، تو اسے صریح قسم کہیں گے مثلاً: اللہ کی قسم، رب العالمین کی قسم

صریح قسم محض الفاظ کی ادائیگی سے منعقد ہوگی، اور اگر قسم کھانے والا یہ کہے کہ میرا قسم کا ارادہ نہ تھا، تو اس کی بات تسلیم نہیں کریں گے، کیونکہ ان الفاظ میں قسم کے علاوہ کا احتمال ہی نہیں، البتہ بلا ارادہ سبقتِ لسانی سے یہ الفاظ ادا ہوں تو وہ لغو یمین شمار ہوگا۔

(۲) کنایه قسم: درج ذیل الفاظ سے قسم کنایہ شمار ہوگی:

(الف) جن الفاظ سے اطلاق کی صورت میں (یعنی عام حالات میں جب کہ دوسری کوئی نیت نہ ہو) اللہ سبحانہ وتعالیٰ مراد ہوں، جیسے خالق، رازق، رب، ان الفاظ سے قسم منعقد ہوگی، البتہ اگر ان سے اللہ کی ذات کے علاوہ مراد لے، تو قسم منعقد نہ ہوگی، کیونکہ یہ الفاظ قید کے ساتھ اللہ کے علاوہ کے لئے بھی مستعمل ہے۔ (دیکھئے سورہ عنبوت، آیت: ۱۷، سورہ نساء، آیت: ۸ اور سورہ یوسف، آیت: ۵۰)

(ب) جو الفاظ اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسروں کے لئے مساوی درجہ میں مستعمل ہوں، مثلاً موجود، عالم، حیّ (زندہ) ان الفاظ سے اللہ کے ذات کی نیت ہو، تو قسم منعقد ہوگی، ورنہ نہیں۔

(ج) اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت، مثلاً: اللہ کی قدرت، اللہ کا علم، اللہ کا کلام ان الفاظ سے قسم منعقد ہوگی، لیکن علم سے معلوم، قدرت سے مقدور، اور کلام سے حروف اور آواز مراد ہو، تو قسم منعقد نہ ہوگی۔

بِرّ اور حِنث (قسم پوری کرنا اور توڑنا)

بِرّ: یعنی جس بات کی قسم کھائی ہے، اسے پورا کرنا اور نبھانا، یا کسی بات کی خبر دی ہو، تو اس میں سچا ہونا۔

حِنث: یعنی جس بات کی قسم کھائی ہے، اسے پورا نہ کرنا اور قسم کی خلاف ورزی کرنا اور ایسے توڑنا، یا قسم میں کسی بات کی خبر دی ہو، تو اس میں جھوٹا ہونا۔ قسم توڑنے والے کو حانث کہیں گے۔ (لہٰذا اگر کسی نے قسم کھائی کہ کل روزہ رکھوں گا، اور رکھا تو بِرّ پر عمل ہوا اور نہ رکھا تو حنث پر عمل ہوا، اسی طرح کوئی قسم کھائے کہ یہ گھڑی میری ہے، اور حقیقتاً اسی کی ہو، تو یہ بِرّ ہے، اور وہ جھوٹا ہو، گھڑی اس کی نہ ہو، تو یہ حنث کی شکل ہے)

قسم پوری کرے یا قسم میں سچا ہو، تو آدمی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا، اس پر مزید کچھ لازم نہیں، لیکن حنث پر عمل کرے، یعنی قسم توڑ دے، یا جھوٹی قسم کھائے تو اس پر کفارہ لازم ہے۔

قسم کا کفارہ: حِنث کی مذکورہ دونوں صورتوں میں کفارہ واجب ہے، اور قسم کے اس کفارہ میں ابتداء درج ذیل تین باتوں میں اختیار ہے، یعنی اپنی مرضی سے تینوں میں سے کسی بھی ایک پر عمل کرے:

۱- ایک مسلمان غلام یا باندی آزاد کرے۔

۲- دس مسکینوں کو اناج دے، یعنی (صدقہ فطر کی طرح) علاقہ کے غالب اناج میں سے ہر مسکین کو ایک مد یعنی تقریباً (۶۰۰) گرام اناج ادا کرے، اور ان کو اس کا مالک بنادے، ان کو بلا کر دو پہر یا رات کھانا کھلا دینا کافی نہیں ہے۔

۳- دس مساکین کو ایسا لباس دے، جس کو عرف میں لباس کہا جاتا ہو، مثلاً قمیض، پاجامہ، تہہ بند، عمامہ، تولیہ وغیرہ۔ چڈی، ٹوپی یا موزہ وغیرہ کافی نہیں، بڑے شخص کو چھوٹا لباس یا استعمال شدہ لباس جو بوسیدہ اور پھٹا ہوا نہ ہو، دینا کافی ہے۔ پانچ مسکین کو اناج اور پانچ کو لباس ادا کرنا کافی نہیں ہے۔ کسی میت کے ذمہ کفارہ باقی ہو، تو سب سے کم قیمت کفارہ اس کے ترکہ سے ادا کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص مذکورہ تینوں کفاروں میں سے کوئی بھی ادا نہ کر سکے، یعنی غریب و تنگدست ہو، تو اس پر تین دن کے روزے واجب ہیں، ان روزوں کو مسلسل رکھنا ضروری نہیں ہے، جدا جدا بھی رکھ سکتا ہے۔

آیت: "لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ . فَكَفَّارَتُهٗ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ أَهْلِيْكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ . ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ ..." (المائدۃ : ۸۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو (غیر پختہ) قسم پر تم سے مؤاخذہ نہیں فرماتے، لیکن مؤاخذہ اس پر فرماتے ہیں کہ تم قسموں کو مستحکم (مضبوط و پختہ) کر دو، سو اس کا کفارہ (یہ ہے) دس محتاجوں کو کھانا دینا اوسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا، یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا، اور جس کو مقدور نہ ہو، تو تین دن کے روزے ہیں، یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب کہ تم قسم کھالو"

خاتمہ

(۱) اگر کوئی شخص کہے: میں نے اللہ کی قسم کھائی کہ میں فلاں کام کروں گا، تو یہ قسم ہے، جب کہ قسم کی نیت ہو، یا مطلق ہو (یعنی کوئی نیت نہ ہو) اگر اس سے ماضی کے قسم کی خبر مقصود ہو، (یعنی میں نے پہلے کسی وقت قسم کھائی تھی)، تو قسم شمار نہ ہوگا۔

(۲) اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے: "میں تجھ پر اللہ کی قسم ڈالتا ہوں کہ تو فلاں کام کر" تو یہ قسم ہے جب کہ اپنی قسم کا ارادہ ہو، کیونکہ یہ شرعاً اسی میں مشہور ہے، اور سامنے والے کے لئے سنت ہے کہ قسم کھانے والے کی قسم پوری کرے (یعنی اس نے جس بات کی قسم ڈالی ہے، وہ انجام دے) جب کہ اس میں کسی حرام یا مکروہ کا ارتکاب نہ پایا جائے، کیونکہ بخاری کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔

اگر مذکورہ لفظ سے سامنے والے کو قسم کا ارادہ ہو یا محض اس سے سفارش کرنا مقصود ہو، نہ کہ قسم، تو یہ قسم شمار نہ ہوگی۔

(۳) اگر کوئی کسی واجب کے چھوڑنے کی قسم کھائے، مثلاً نماز یا روزہ چھوڑنے کی، یا کسی حرام کے ارتکاب کی قسم کھائے، مثلاً: چوری کرنے یا قتل کرنے کی، تو دونوں صورتوں میں اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور دونوں قسموں کو توڑنا لازم ہے، کیونکہ اس پر قائم رہنا گناہ ہے، نیز اس قسم کو توڑنے کا کفارہ بھی ادا کرے گا۔

صحیحین کی حدیث میں ہے: "جو قسم کھائے، پھر اس کے علاوہ کو اس سے بہتر پائے تو اس بہتری پر عمل کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے"۔

اگر کسی سنت کے ترک یا مکروہ کے ارتکاب کی قسم کھائے، مثلاً چاشت کی نماز نہ پڑھوں گا، یا نماز میں التفات کروں گا، تو حنث سنت ہے، اور کفارہ ادا کرنا واجب ہے، کیونکہ یہ قسم اور اس پر برقرار رہنا مکروہ ہے۔

کسی مباح عمل کے کرنے یا چھوڑنے کی قسم کھائے، تو سنت یہ ہے کہ اسے نہ توڑے، کیونکہ اس میں اللہ کی تعظیم ہے۔

کسی مستحب عمل کے کرنے یا مکروہ کے ترک کی قسم کھائے، تو حنث مکروہ ہے اور حنث کی صورت میں کفارہ واجب ہے۔

(۴) اگر کسی کام کے نہ کرنے کی قسم کھائے: مثلاً خریدنا، فروخت کرنا وغیرہ، پھر کسی دوسرے کو اس کام کے لئے وکیل بنائے، تو وکیل کے انجام دینے کی وجہ سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، کیونکہ اس نے اپنے فعل کے بارے میں قسم کھائی ہے، لہٰذا دوسرے کے اس فعل کو انجام دینے سے یہ حانث نہ ہوگا، کیونکہ کوئی فعل براہ راست انجام دینے والے کی طرف منسوب ہوگا، تاہم قسم کھاتے وقت وکیل کے ذریعہ بھی انجام نہ دینے کی نیت ہو، تو وکیل کے انجام دینے سے بھی حانث ہوگا۔

(۵) اگر فلانی عورت سے نکاح نہ کرنے کی قسم کھالے، پھر اپنے لئے اس کا نکاح قبول کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنائے، تو وکیل کے قبول کرنے سے بھی حانث ہوگا۔

(۶) کوئی شخص دو کام کے چھوڑنے کی قسم کھائے، پھر اس میں سے کوئی ایک انجام دے، تو حانث نہ ہوگا، مثلاً: قسم بخدا میں یہ دونوں کپڑے نہیں پہنوں گا، یا ان دو اشخاص سے گفتگو نہ کروں گا، پھر ان میں سے ایک کپڑا پہنے، یا ایک آدمی سے گفتگو کرے تو حانث نہ ہوگا۔

اگر یوں کہے: قسم بخدا میں نہ یہ کپڑا پہنوں گا، اور نہ یہ پہنوں گا، یا کہے: نہ اس سے گفتگو کروں گا، نہ اس سے، تو کسی ایک کپڑے کے پہننے یا ایک شخص سے بات کرنے سے حانث ہوگا۔

(۷) اگر کوئی کہے: قسم بخدا میں یہ دونوں روٹی کھاؤں گا، یا کہے: میں ان دونوں سے بات کروں گا، تو صرف ایک روٹی کھانے سے، یا ایک سے بات کرنے سے قسم پوری نہ ہوگی، بلکہ پہلی صورت میں دونوں روٹی کھانا، اور دوسری صورت میں دونوں سے بات کرنا ضروری ہے۔

(۸) قسم کے ابتدائی تین کفارہ (آزادی، اناج دینا، لباس دینا) کو حنث سے پہلے بھی ادا کرنا جائز ہے، نہ کہ قسم سے پہلے، روزہ حنث سے پہلے رکھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بدنی عبادت ہے، لہٰذا بلا حاجت وقتِ وجوب پر مقدم کرنا صحیح نہیں ہے۔ کفارہ کو حنث پر مقدم کرنے کے بعد حانث نہ ہو، تو کفارہ واپس لے سکتا ہے۔

(۹) اگر کوئی مثلاً کہے: میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی، یا اسلام سے بری، تو یہ سخت حرام ہے، یہ قسم شمار نہ ہوگی اور اس میں کفارہ واجب نہ ہوگا، اور اس سے تعلیق مراد ہو، (یعنی حقیقتاً فلاں کام کرنے کی صورت میں یہودی بن جانے کا عزم ہو) تو فی الحال کافر ہو جائے گا، اور اس کام سے اپنے آپ کو دور رکھنا مقصد ہو (کہ وہ کام تو مجھے بالکل مبغوض ہے، جیسا کہ یہودی بن جانا) تو کافر نہ ہوگا، اسے چاہے کہ استغفار اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھے۔

(۱۰) جو اللہ کا واسطہ دے کر سوال کرے (کچھ مانگے) تو اسے لوٹانا مکروہ ہے۔ جبکہ اس کا سوال پورا کرنے میں کوئی کراہت نہ ہو، نیز اس طرح سوال کرنا بھی مکروہ ہے۔

(الفقه المنهجی ۳/۹-۲۰، مغنی ۴/۳۲۰-۳۲۸، قلائد ۲/۲۲۷-۲۳۹، تحفه ۱۲/۳۶۴-۳۹۲، فتح الوهاب مع الجمل ۵/۲۸۶-۲۹۸)

نذر (منّت)

تعریف: عربی زبان میں لفظ نذر شرط کے ساتھ وعدہ کو، (مثلاً اگر آپ آئیں تو ہم آپ کا اکرام کریں گے) یا غیر لازم کو اپنے اوپر لازم کر لینے کو، یا خیر یا شر کو وعدہ کو (یعنی معلق ہو یا غیر معلق اور فوری) کہا جاتا ہے۔

کسی ایسی قربت (نیکی، عبادت) کو جو واجب و متعین نہ ہو، اپنے اوپر لازم کر لینے کو شرعاً نذر کہا جاتا ہے۔

آیت: (۱) "يُوفُونَ بِالنَّذْرِ ..." (الدهر: ۷)

ترجمه: (اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے صفات میں بیان فرماتے ہیں) "وہ لوگ نذر (منت) پوری کرتے ہیں"۔

(۲) "وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ..." (حج: ۲۹)

ترجمه: (لوگوں کو چاہیئے کہ) اور اپنی نذریں پوری کریں"۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جو اللہ تعالیٰ کے اطاعت کی نذر مانے، تو اللہ کی اطاعت کرے (اس نذر کو پورا کرے) اور جو اللہ کے نافرمانی (گناہ) کی نذر مانے، وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے (اس نذر کو پورا نہ کرے)" (بخاری شریف)

(۲) آئندہ آنے والے بعض لوگوں کی مذموم صفات کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: "... اور وہ لوگ نذر مانیں گے، لیکن اسے پورا نہ کریں گے..." (متفق علیه)

ارکان

نذر کے تین ارکان: (۱) ناذر (نذر کو ماننے والا) (۲) صیغہ (۳) مَنذور (جس چیز کو نذر مانے)

ناذر: جو شخص نذر مانے، اس کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱- اسلام، پس کسی کافر کی نذر صحیح نہ ہوگی، کیونکہ وہ نیکی کرنے کا اہل نہیں ہے۔ کافر کی نذر لجاج صحیح ہوگی۔

۲- مکلف ہو، یعنی عاقل و بالغ ہو، لہٰذا کسی بچہ یا پاگل کی نذر صحیح نہ ہوگی، اور ان لوگوں کے کسی نیکی کو اپنے اوپر لازم کر لینے سے وہ واجب نہ ہوگی، کیونکہ حدیث کی رو سے یہ غیر مکلف اور مرفوع القلم ہیں (ابوداؤد)

۳-اختیار، پس کسی کے جبر وزبردستی سے کوئی نذر مانے، تو یہ صحیح نہ ہوگی، کیونکہ حدیث کی رو سے اکراہ معاف اور مرفوع ہے(ابن ماجہ وصححہ ابن حبان والحاکم)

۴-جس چیز کی نذر مانے، اس میں شرعاً ناذر کا تصرف نافذ ہو، (اسے تصرف کا اختیار حاصل ہو)، لہٰذا مجور سفیہ یا مفلس متعین مال کی نذر مانے، تو صحیح نہیں، اگر ذمہ میں ہو تو صحیح ہے، اور سفیہ رشید ہونے کے بعد اسے ادا کرے، اور ادائیگی سے قبل مرجائے تو اس کے ترکہ سے ادا کیا جائے، مجور بدنی عبادت کی نذر مانے تو صحیح ہے (کیونکہ اس میں اس پر کوئی پابندی نہیں ہے)

صیغہ: صیغہ میں ایسے الفاظ ہوں، جو اپنے اوپر لازم کرلینے پر دلالت کرے، مثلاً: اللہ کے لئے مجھ پر فلاں نیکی لازم ہے، یا مجھ پر نماز یا روزہ یا حج لازم ہے، یا میں نے فلاں نیکی اپنے اوپر لازم کرلی، یا اپنے اوپر واجب کرلی وغیرہ۔

زبان سے صیغہ کی ادائیگی کے بغیر صرف دل میں نیت کرنے سے نذر صحیح نہ ہوگی، اور اس پر عمل ضروری نہیں ہے، لیکن نیت کے مطابق نیکی کا ادا کرنا بہتر ہے۔نیت کی وجہ سے دیگر نیکیوں کی ادائیگی کا بھی تاکیدی حکم ہوگا (گرچہ واجب نہ ہوگی)

منذور: جس چیز کی نذر مانے وہ ایسی نیکی ہونا شرط ہے، جو (نذر کے بغیر بھی) ناذر پر ادا کرنا لازم ہو، خواہ نفل ہو، یا ایسا فرض کفایہ جس کی ادائیگی اسی پر متعین نہ ہو، مثلاً: غلام آزاد کرنا، عیادت (بیمار پرسی) سلام جنازہ کے ساتھ جانا، نمازِ جنازہ تجہیز وتکفین، ایام بیض یا پیر کے روزے، چاشت کی نماز، تحیۃ المسجد، طواف، کسی نماز میں کسی معین سورت کی تلاوت، نماز میں طویل تلاوت (جبکہ اس نماز میں مختصر تلاوت مستحب نہ ہو) یا باجماعت نماز کی ادائیگی (نماز کے کسی حصہ میں بھی اقتدار سے یہ نذر پوری ہوگی)

منذور کے مذکورہ شرائط کی روشنی میں درج ذیل صورتوں میں نذر صحیح نہ ہوگی۔

۱- **کسی فرض عین کی نذر:** مثلاً ظہر کی نماز، کیونکہ یہ تو شرعاً بغیر نذر کے بھی فرض ہے۔

۲- **گناہ کی نذر:** مثلاً: شراب پینا، بے وضو نماز پڑھنا، فرض نماز چھوڑنا، غصب کی زمین میں نماز پڑھنا، مکروہ وقت یا نجس کپڑوں میں نماز پڑھنا، عید یا ایامِ تشریق میں روزہ رکھنا وغیرہ کی نذر، کیونکہ حدیث میں گناہ کی نذر کو غیر معتبر قرار دیا ہے (مسلم) امام زرکشی فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر میں قسم کی نیت ہو تو حنث کی صورت میں کفارہ لازم ہوگا۔

۳- **کسی مکروہ کی نذر:** مثلاً: ضرر کی صورت میں ہمیشہ روزہ کی نذر، یا صرف جمعہ کے نفل روزہ کی نذر

۴- **کسی مباح کے کرنے یا نہ کرنے کی نذر:** مثلاً بیٹھنا۔نہ بیٹھنا، کھڑے رہنا، فلاں چیز کھانا، سونا وغیرہ، حدیث میں ہے کہ نذر وہی معتبر ہے جس سے اللہ کی رضا جوئی مقصود ہو (ابوداود، احمد، بیہقی) حضرت ابواسرائیل نے نذر مانی کہ وہ نہ بیٹھیں گے، نہ سایہ میں رہیں گے اور نہ گفتگو کریں گے، اور روزہ رکھیں گے، تو آپ ﷺ نے گفتگو کرنے، سایہ میں رہنے اور بیٹھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ مکمل کریں۔(بخاری، ابوداود، ابن ماجہ، ابن حبان)

مذکورہ بالا غیر صحیح نذروں کی خلاف ورزی سے کفارہ لازم نہ ہوگا، جس حدیث میں معصیت کی نذر میں کفارہ کا حکم دیا ہے، اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، اگر مباح نذر تبرر کو اللہ کی طرف منسوب کرے (مثلاً: اللہ کے لئے مجھ پر فلاں چیز کھانا لازم) یا کسی مباح کی نذر لجاج مانے، تو یہ منعقد ہوگا، کیونکہ یہ قسم کے حکم میں ہے، اور حنث کی صورت میں قسم کا کفارہ واجب ہوگا۔اور مباح نذر تبرر کو اللہ کی طرف منسوب نہ کرے، تو یہ منعقد نہ ہوگا۔

منذور میں یہ بھی شرط ہے کہ اس کا انجام دینا ممکن ہو، لہٰذا جو روزہ پر قادر نہ ہو، اس کا روزہ کی نذر ماننا، یا جو مکہ سے دور ہو اور اس

سال حج کے لئے نہیں پہنچ سکتا، اس کا اس سال حج کی نذر ماننا صحیح نہیں ہے۔

نذر کا کسی شرعی رخصت کو باطل نہ کرنا ضروری ہے، لہٰذا جن صورتوں میں سفر میں رمضان کا روزہ نہ رکھنا اور قصر افضل ہو، روزہ رکھنے اور پوری نماز پڑھنے کی نذر منعقد نہ ہوگی۔

فائدہ : تلاوت قرآن دیگر اذکار کی طرح نیت کی محتاج نہیں، تاہم خارج نماز تلاوت کی نذر ہو، تو نذر کی یا فرض تلاوت کی نیت ضروری ہے، گو تلاوت کے وقت کو متعین کیا ہو۔

نذر کی قسمیں : (۱) نذر لجاج (۲) نذر تبرُّر

(۱) نذر لَجاج : (لجاج یعنی دشمنی و جھگڑے میں مداوت کرنا) اسے نذر غضب، یمین لجاج، یمین غضب، نذر الغلق اور یمین الغلق بھی کہتے ہیں۔

غصہ میں کسی قربت کو واجب کرتے ہوئے اپنے نفس کو، یا کسی دوسرے کو کسی چیز سے روکنا، یا کسی چیز پر ابھارنا، یا کسی خبر کی تحقیق کرنا نذر لجاج کہلاتا ہے۔

مثلاً : (۱) اگر میں نے زید سے بات کی تو مجھ پر ہر نماز لازم ہے (گویا اپنے آپ کو اس سے گفتگو سے روکنا چاہتا ہے) (۲) اگر میں نے جمیل سے بات نہ کی تو مجھ پر روزہ لازم ہے (گویا خود کو بات کرنے پر ابھار رہا ہے) (۳) اگر کلیم گھر پر نہیں ہے، تو مجھ پر صدقہ کرنا لازم ہے (اس میں اپنے خبر کو حق بتلانا چاہتا ہے) (۴) اگر میں نے فلاں کام کیا تو اللہ کے لئے مجھ پر تجھے طلاق دینا لازم ہے، (۵) اگر میں نے فلاں کام کیا تو مجھ پر اللہ کے لئے روٹی کھانا لازم ہے۔

نذر لجاج میں جب صفت پائی جائے، تو اسے اختیار ہے کہ یا تو جس قربت کو لازم کیا ہے، اسے ادا کرے، (مثلاً پہلی مثال میں زید سے بات کی، تو نماز ادا کرے) یا قسم کا کفارہ ادا کرے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں ہے: "نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے" اور قسم کا کفارہ نذر تبرر میں بالاتفاق ناکافی ہے، لہٰذا اسے نذر لجاج پر ہی محمول کیا جائے گا۔

اگر کسی نے کہا: میں نے زید سے بات کی تو مجھ پر قسم کا کفارہ، یا کہا: مجھ پر نذر کا کفارہ، تو اس پر (زید سے بات کرنے کی صورت میں) دو قسم کا کفارہ واجب ہے، اگر صرف مجھ پر قسم کہا، (قسم کا کفارہ نہ کہا) تو یہ مہمل ہے، (کفارہ واجب نہ ہوگا) اور صرف مجھ پر نذر کہا، تو اسے اختیار ہے کہ یا تو کوئی سی نیکی (مثلاً تسبیح، دو رکعت نماز یا ایک روزہ) ادا کرے۔ یا قسم کا کفارہ ادا کرے۔

(۲) نذر تَبرُّر : تبرر دراصل بِرّ سے ہے، یعنی نیکی، چونکہ ناذر اس نذر کے ذریعہ نیکی کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لئے اسے نذر تبرر کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں:

(الف) نذر مُجازَاۃ (بدله کی نذر) : کسی نعمت کے حصول یا کسی مصیبت کے ازالہ پر کسی قربت کو معلق کرے، تو اسے نذر مجازاۃ کہیں گے۔ مثلاً اگر اللہ نے میرے مریض کو شفا دی تو مجھ پر ایک روزہ لازم ہے، اس نذر میں جس غرض پر نذر معلق کی گئی، وہ پائی گئی، تو لازم کردہ نیکی کو انجام دینا (یعنی نذر پوری کرنا) لازم ہے۔ (مذکورہ مثال میں مریض شفایاب ہو جائے تو ایک روزہ رکھنا لازم ہوگا)

معتمد قول یہ ہے کہ مالی نذر کو معلق علیہ کے وجود سے قبل ادا کرنا بھی جائز ہے، گو امام رافعیؒ و نوویؒ نے تعجیل زکات کے باب میں اسے ناجائز قرار دیا ہے۔

فائدہ : قسم کا مالی کفارہ حنث پر، ظہار کا مالی کفارہ عَوْد پر، قتل کا کفارہ، موت پر مقدم کرنا جائز ہے۔ رمضان، حج، یا عمرہ میں

جماع کا کفار جماع پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز (احرام میں) حلق، لباس، اور خوشبو کا فدیہ سبب سے پہلے ادا کرنا جائز نہیں ہے، اگر یہ تینوں مرض وغیرہ کسی عذر کی وجہ سے جائز ہوں، تو فدیہ کو مقدم کرنا جائز ہے (مغنی ۴/۳۲۷)

(۲) نذر مُطلَق : بغیر تعلیق کے ابتداءً کے لئے کسی بھی نیکی کو اپنے اوپر لازم کر لینا نذر مطلق کہلاتا ہے۔ مثلاً: اللہ کے لئے مجھ پر جمعرات کا روزہ لازم، یا دو رکعت لازم، یا کوئی مریض صحت یابی کے بعد کہے: چونکہ اللہ نے مجھے صحت بخشی، لہٰذا اللہ کے لئے مجھ پر ایک روزہ لازم۔

نذر مطلق میں نذر مانتے ہی، جس نیکی کی نذر مانی ہے وہ واجب ہوگی، لیکن فوراً ادائیگی واجب نہیں ہے، تاہم کسی معین شخص کے حق میں نذر ہو، (مثلاً زید کو ۱۰۰ روپے کی نذر) اور وہ مطالبہ کرے، تو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔

نذر تبرر کی دونوں قسموں میں جس کے حق میں نذر مانی ہو، اس کا قبول کرنا شرط نہیں ہے، صرف یہ شرط ہے کہ وہ رد نہ کرے۔ (پس کوئی زید کو ۱۰۰ روپے دینے کی نذر مانے اور وہ رد کردے، تو نذر صحیح نہ ہوگی، ورنہ صحیح ہوگی)

اگر کوئی کہے: اگر میرا مریض صحتیاب ہوا، تو مجھ پر نذر لازم ہے، یا ابتداءً کہے: مجھ پر اللہ کے لئے نذر ہے، تو اس پر کوئی بھی نیکی لازم ہے۔

نذر لجاج ومجازاۃ کا فرق : خلاصہ یہ کہ کسی ناپسندیدہ چیز پر معلق ہو تو، تو نذر لجاج اور کسی پسندیدہ اور مقصود ومطلوب چیز پر معلق ہو، تو نذر مجازاۃ ہوگا۔ بعض صورتوں میں ناذر کے منشا کے اعتبار سے فیصلہ ہوگا، مثلاً عورت شوہر سے کہے کہ اگر تم نے مجھ سے ہمبستری کی تو مجھ پر روزہ لازم، تو اگر شوہر کو صحبت سے روکنے کے لئے کہے تو نذر لجاج ہے، اور اس استمتاع پر اللہ کے شکر کی نیت سے کہے تو نذر مجازاۃ اور نذر پوری کرنا لازم ہے، یا کسی نے کہا: اگر زید نظر آ گیا تو مجھ پر نماز لازم، تو اس سے نفرت کے اظہار کے طور پر کہے، تو یہ نذر لجاج ہے اور اس سے محبت کی وجہ سے کہے، تو نذر تبرر ہے۔

روزے کی نذر : چند ایام کے روزوں کی نذر ہو، تو انھیں جلد رکھنا سنت ہے، جب کہ کوئی عذر نہ ہو، تا کہ جلد بری الذمہ ہو جائے۔ اگر جدا جدا یا مسلسل رکھنے کی قید لگائے، تو وہ واجب ہے، ورنہ جدا رکھے یا مسلسل، اسے اختیار ہے، سو کوئی دس دن جدا جدا روزہ رکھنے کی نذر مانے اور مسلسل دس دن رکھے، تو نذر کے پانچ روزے ادا ہوئے (یعنی پہلا، تیسرا، پانچواں، ساتواں اور نواں) دانستہ اس طرح کرے تو بقیہ پانچ روزے باطل اور نادانستہ کرے تو نفل مطلق شمار ہوں گے۔ اگر مسلسل دس روزوں کی نذر ہو، اور جدا جدا ادا کرے، تو ایک بھی نذر کا شمار نہ ہوگا، اگر دانستہ اس طرح کرے تو یہ روزے باطل ورنہ نفل ہوں گے۔

کسی معین سال (یا ماہ یا ہفتہ) کے روزوں کی نذر مانے (مثلاً ۱۴۳۰ھ کے روزے، یا کل سے ایک سال کے روزے، یا ایک محرم سے ایک سال کے روزے) تو اس نذر میں دونوں عید ایام تشریق، ماہِ رمضان، اور حیض ونفاس کے ایام داخل نہیں ہیں، لہٰذا ان ایام کی نذر کی طرف سے قضا لازم نہیں ہے۔ بعض علماء نے حیض ونفاس کے ایام کی قضا کو واجب قرار دیا ہے۔ پاگل پن یا بے ہوشی کے ایام کی قضا بھی ضروری نہیں ہے۔ سفر کی وجہ سے جو روزے ترک ہوں، ان کی قضا لازم ہے، بلقینیؒ، ابن حجرؒ وخطیبؒ نے مرض کی وجہ سے ترک شدہ روزوں کی قضا کو واجب قرار دیا ہے، اور ابن المقریؒ اور رملیؒ نے غیر واجب قرار دیا ہے۔ مذکورہ اعذار کے بغیر جو روزے قضا ہوں، ان کی قضا لازم ہے، لیکن تسلسل ضروری نہیں ہے۔ تاہم نذر میں تتابع وتسلسل کی شرط لگائے (مثلاً مجھ پر فلاں سال کے مسلسل روزے لازم) تو قضا کو مسلسل رکھنا لازم ہے۔ محض تتابع کی نیت سے تتابع لازم نہ ہوگا۔

اگر مطلقاً ایک سال کے روزے کی نذر ہو، (کسی سال کو معین نہ کرے) تو تسلسل کے ساتھ رکھنا واجب ہے، جبکہ نذر میں اس کی شرط لگائے، یا صرف نیت کرلے، (گو لفظاً شرط نہ لگائے) ورنہ تسلسل واجب نہیں ہے، اس صورت میں جیسے بھی چاہے ۳۶۰ روزے رکھے، یا چاند کے اعتبار سے ۱۲ ماہ کے روزے رکھے، اگر کوئی ماہ مکمل نہ ملے، تو ۳۰ کی تعداد پوری کرے، اور عید، تشریق اور رمضان کے ایام کی قضا کرے۔ معین سال کی نذر میں جو روزے داخل نہیں تھے (یعنی رمضان، عید، ایام تشریق اور حیض ونفاس) ان کی وجہ سے تسلسل منقطع نہ ہوگا، کیونکہ وہ ایام شرعاً مستثنیٰ ہیں۔ تاہم حیض ونفاس کے علاوہ دیگر ایام کی سال کے آخر میں متصلاً قضا لازم ہے۔ بعض علماء نے حیض ونفاس کے ایام کی قضا بھی لازم قرار دی ہے۔ اگر سفر یا مرض کی وجہ سے یا بلا عذر روزے ترک ہوں، تو از سر نو تسلسل کے ساتھ روزے رکھنا واجب ہے۔

ناذر مطلقاً سال کہے (قمری یا شمسی نہ کہے) تو قمری سال مراد ہوگا، کیونکہ وہی شرعی سال ہے۔ (اگر شمسی سال کی صراحت کرے تو شمسی سال مراد ہوگا)

اگر ہمیشہ (مثلاً) پیر کے دن روزہ کی نذر ہو، تو عید، ایام تشریق، ماہِ رمضان اور حیض ونفاس کے ایام میں آنے والے پیر کی قضا لازم نہیں ہے۔ اگر کفارہ کی وجہ سے مثلاً دو ماہ کے مسلسل روزے لازم ہوں، یا کسی نذر کی وجہ سے ایک ہفتہ، یا ماہ وغیرہ کے مسلسل روزے لازم ہوں، اور ان کے اسباب پیر کے نذر پر مقدم ہوں، تو ان ایام کے پیر کی قضا لازم نہیں ہے۔ اور اگر پیر کی نذر مقدم ہو، تو ان ایام کے پیر کی قضا لازم ہے۔

ہفتہ کے کسی معین دن روزہ کی نذر مانے، تو اسی دن رکھنا لازم ہے۔ اس سے پہلے نہیں رکھ سکتا، اگر بعد میں رکھے تو قضا شمار ہوگی، اگر متعینہ دن بھول جائے، تو جمعہ کے دن رکھے، اگر اسی دن کی نذر تھی، تو ادا ہوگی، ورنہ قضا (کیونکہ ہفتہ کا اول دن سنیچر ہے، لہٰذا آخری دن جمعہ ہوگا)

اگر زید کی سفر سے واپسی کے دن روزہ کی نذر مانے تو منعقد ہوگی۔ اب رات میں پتہ چلے کہ زید کل آنے والا ہے، تو رات نیت کرکے روزہ رکھ لے، اگر زید رات میں، یا عید، رمضان یا ایام تشریق میں آیا تو یہ روزہ ساقط ہوگیا، ان ایام کے علاوہ کسی دن آیا اور اس کا نفل یا رمضان کے علاوہ کوئی فرض روزہ ہو، یا بغیر روزہ کے ہو، تو آئندہ اس کی قضا لازم ہے۔

کسی نفل کے تکمیل کی نذر: روزہ نماز وغیرہ کسی نفلی عبادت کو شروع کرنے سے پہلے یا شروع کرنے کے بعد اسے مکمل کرنے کی نذر مانے تو اسے مکمل کرنا لازم ہے۔ دن کے بعض حصہ کے روزہ کی، ایک رکعت سے کم نماز کی اور صرف سجدہ یا رکوع کی نذر مانے تو منعقد نہ ہوگی۔

حج وعمرہ یا حرم پاک جانے کی نذر: اگر حرم پاک، یا بیت الحرام، یا بیت اللہ الحرام، یا صفا یا مسجد خیف (منی کی مسجد) جانے کی نذر مانے تو نسک (یعنی حج یا عمرہ) کے ساتھ جانا لازم ہے، کیونکہ تبھی قربت مکمل ہوگی، لہٰذا ناذر کے کلام کو اسی پر محمول کریں گے۔ اگر ان مقامات کی طرف پیدل جانے کی نذر مانے تو نسک کے ساتھ اپنے گھر سے پیدل جانا لازم ہے۔ اگر پیدل حج یا عمرہ کی نذر ہو، تو جہاں سے احرام باندھے، وہاں سے پیدل جانا لازم ہے۔ (خواہ میقات سے باندھے، یا پہلے یا بعد میں) تاہم گھر سے پیدل چلنے کی صراحت کرے تو گھر سے ہی پیدل چلنا ضروری ہے۔ عمرہ کا آخری رکن ادا ہونے تک، اور حج کے دونوں تحلل حاصل ہونے تک پیدل چلنا ضروری ہے، اس کے بعد رمی باقی ہو، تو پیدل چلنا ضروری نہیں ہے، حج وعمرہ کے دوران تجارت وغیرہ کے لئے سوار ہونے میں حرج نہیں ہے۔ اگر مذکورہ دونوں صورتوں میں عذر کی وجہ سے یا بلا عذر سوار ہوکر جائے، تب بھی کافی ہے، البتہ دم یعنی ایک بکری کی

قربانی لازم ہوگی۔

کوئی سوار ہوکر حج یا عمرہ کی نذر مانے پھر پیدل ادا کرے تو اسے دم لازم ہے، اگر ننگے پیر حج کی نذر مانے تو حج لازم ہے، نہ کہ ننگے پیر کرنا، البتہ جن مقامات میں ننگے پیر چلنا مسنون ہے، وہاں ننگے پیر چلنا لازم ہے۔

حج یا عمرہ کی نذر کے بعد بذات خود انجام دینے سے عاجز ہو جائے، تو دوسرے کو نائب بنا کر بطور بدل ادا کروانا لازم ہے، اور اس حج بدل کی بھی وہی تفصیل ہوگی جو اسلامی فریضہ حج کے بدل کی ہے۔ نذر کے حج کو امکان کے بعد فوراً ادا کرنا سنت ہے۔ اگر آئندہ حج سے عاجز ہونے کا خطرہ ہو، تو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔ اگر امکان کے بعد بغیر حج کے مرجائے تو اس کے مال سے حج کروایا جائے۔ اگر امکان سے قبل ہی مرجائے تو کچھ لازم نہیں ہے۔ افراد، تمتع، یا قران کسی بھی طریقہ سے حج ادا کرنے سے نذر پوری ہوگی، اور نذر کے تعلق سے کوئی دم واجب نہ ہوگا۔

اگر اس سال یا کسی اور معین سال میں حج یا عمرہ کرنے کی نذر مانے، اور ادا کرنا ممکن بھی ہو، یعنی اتنی مسافت پر ہو کہ اس سال وہاں سے پہنچ کر حج ادا کر سکے، تو اسی متعینہ سال میں ادا کرنا لازم ہے۔ اس سے پہلے یا بعد میں ادا کرنا جائز نہیں ہے، مؤخر کرے تو قضا لازم ہے۔ اگر اس پر اسلامی فریضہ حج باقی ہو اور نذر سے اس فرض حج کے علاوہ کی نیت ہو، تب نذر منعقد ہوگی، اسلامی فرض حج کو نذر پر مقدم کرے، اگر پہلے نذر کا حج کرے، تو اسلامی فرض حج ادا ہوگا۔ اگر نذر سے اسلامی فرض حج کی نیت ہو یا مطلق ہو (یعنی نہ اسلامی فرض حج کی نیت ہو، نہ مستقل الگ حج کی) تو نذر منعقد نہ ہوگی۔ اگر اس سال حج کی نذر ہو، لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے پہنچنا اور ادا کرنا ممکن نہ ہو، تو نذر منعقد نہ ہوگی۔ اگر وقت میں گنجائش ہو، لیکن احرام سے قبل مرض وغیر عذر لاحق ہو، تو اس کی قضا لازم نہیں ہے۔ اگر بلا عذر فوت ہو جائے، یا احرام کے بعد مرض، راستہ میں یا وقت میں غلطی، راستہ یا وقت یا نسک کو بھولنے کی وجہ سے فوت ہو جائے، تو قضا واجب ہے۔ احرام سے قبل ان اعذار کی وجہ سے فوت ہو تو قضا لازم نہیں ہے۔ احرام سے قبل یا بعد میں دشمن یا بادشاہ کے روکنے کی وجہ سے فوت ہو جائے، تو قضا لازم نہیں ہے۔ اسی طرح اس پر کسی کا قرض ہو، اور قرض خواہ اسے روک دے اور یہ فی الحال قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو، تب بھی قضا لازم نہیں ہے۔ اگر حج یا عمرہ کی نذر میں کسی سال کی تعیین نہ کرے، تو کسی بھی سال ادا کر سکتا ہے۔

نماز وغیرہ کی نذر: اگر کسی ایسے وقت نماز پڑھنے، یا روزہ رکھنے کی نذر مانے، جس میں نماز یا روزہ ممنوع نہ ہو، اور فوت ہو جائے (یعنی اس متعین وقت میں ادا نہ کرے) گو مرض وغیرہ کسی عذر کی وجہ سے ہو، تو اس کی قضا لازم ہے۔

کسی جگہ کی تعیین: کسی مخصوص بستی والوں کو صدقہ کرنے کی نذر مانے، تو اسی بستی کے مسلمان فقراء ومساکین کو دینا لازم ہے، وہاں سے منتقل نہیں کر سکتا۔ اگر حرم پاک میں ذبح کی نذر ہو، تو وہاں ذبح کرکے وہیں کے مساکین پر صرف کرنا لازم ہے۔ کسی دوسری جگہ (صرف) ذبح کی نذر ہو تو کچھ لازم نہیں، کسی دوسری بستی میں ذبح و تقسیم دونوں کی نذر ہو، یا تقسیم کی نیت ہو، یا قربانی کی نذر ہو، تو اسی بستی میں ذبح کرکے وہیں تقسیم کرنا لازم ہے۔

کسی مخصوص جگہ روزہ رکھنے کی نذر مانے، تو وہ جگہ متعین نہ ہوگی، خواہ حرم پاک کو متعین کرے یا کسی دوسری جگہ کو، کہیں بھی ان روزوں کو رکھ سکتا ہے۔

کسی مخصوص جگہ نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس کا حکم اعتکاف کی طرح ہے۔ یعنی اسی جگہ نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ تاہم مسجد حرام، مسجد مدینہ یا مسجد اقصی کی تعیین کرے، تو یہ متعین ہوں گے، اور انھیں مساجد میں ادا کرنا لازم ہے، کیونکہ ان کی خصوصی فضیلت وارد ہے، مسجد

مدینہ یا اقصی کی تعیین کی ہو، تو مسجد حرام میں بھی اسے ادا کرسکتا ہے۔ اور مسجد اقصی کی تعیین کی ہو، تو مسجد نبوی میں بھی اسے ادا کرسکتا ہے، مسجد حرام کی نماز بقیہ دونوں میں یا مسجد نبوی کی مسجد اقصی میں نہیں ادا کرسکتا۔ (یہ حکم ان مساجد میں نماز کی فضیلت کی ترتیب کے پیش نظر ہے)

اسی طرح کسی فرض نماز یا ایسی نفل کے لئے جو مسجد میں ادا کرنا مسنون ہے، کسی مسجد کو متعین کرے، تو اس نماز کو مسجد میں ادا کرنا لازم ہے، گو کسی دوسری مسجد میں ادا کرے۔

فوائد: (۱) مطلق روزہ کی نذر ہو یعنی ایام کی تعیین نہ ہو، تو ایک روزہ مراد ہوگا۔ (۲) صدقہ کی نذر ماننے (مقدار کی تعیین نہ ہو) تو کسی بھی مال کی تھوڑی مقدار بھی کافی ہے۔ (۳) اپنے تمام مال کے صدقہ کی نذر ماننے، تو ستر عورت کے علاوہ بقیہ مال کا صدقہ لازم ہے۔ گو اس پر قرض ہو، (جبکہ قرض کی وجہ سے حجر و پابندی عائد نہ ہو) (۴) اگر نماز کی نذر ماننے (اور رکعتوں کی تعداد ذکر نہ کرے) تو دو رکعت کافی ہیں، انھیں ایک ہی سلام میں ادا کرنا واجب ہے۔ صرف ایک رکعت، سجدہ تلاوت، سجدہ شکر یا نماز جنازہ کافی نہیں۔ اور دو نماز کی نذر ہو، تو ہر دو رکعت پر سلام پھیرے۔ قدرت ہو تو نذر کی نماز کو کھڑے ہو کر پڑھنا واجب ہے، خواہ نفل مطلق ہو، یا رواتب و چاشت وغیرہ۔ اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی نذر مانے تو بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے، لیکن کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے۔ اسی طرح ایک رکعت ادا کرنے کی نذر کو مانے تو ایک رکعت ادا کرنا کافی ہے۔

اگر چار رکعت کی نذر ہو، تو ایک سلام سے بھی ادا کرسکتا ہے اور دو سلام سے بھی لیکن دو سلام سے ادا کرنے کی صراحت ہو، تو یہی لازم ہے

(۵) کسی معین شخص کے لئے روپے پیسے وغیرہ کی نذر ماننے، تو وہ شخص ناذر سے اس رقم کا مطالبہ کرسکتا ہے، اگر ناذر کے ادا کرنے پر وہ نہ لے، تو ناذر بری ہو چکا، اس شخص کو لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، لیکن زکات کے مستحقین اگر زکات لینے سے انکار کریں، تو جبر کیا جائے گا، کیونکہ وہ اس کے مالک بن چکے، نیز زکات اسلام کا ایک رکن ہے، جسے معطل نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ شخص ناذر نے اپنے ذمہ جو نذر مانی ہے، اسے اس سے بری کردے، تو وہ بری ہو جائے گا، کسی معین چیز کی نذر ماننے، مثلاً یہ بکری، یہ کپڑا، یہ رقم وغیرہ، تو محض نذر مانتے ہی ناذر کی ملکیت اس چیز پر ختم ہو جائے گی، خواہ کسی غیر معین کے لئے نذر مانے یا معین کے لئے اور وہ رد کردے۔ اگر نذر ذمہ میں ہو اور معین کے لئے ہو، تو اس کے رد کرنے سے ناذر بری ہو جائے گا، اگر ذمہ میں نذر ماننے کے بعد اسے متعین کردے، مثلاً مجھ پر زید کو ۲۰ دینار صدقہ کرنا لازم، یا میرا بیٹا صحت یاب ہوا، تو مجھ پر زید کے لئے ۲۰ دینار کو متعین کردے، تو زید اس کا مالک ہو چکا، گو قبضہ اور قبول نہ کرے، بلکہ رد کرے تب بھی مالک ہوگا، تو زید اس میں تصرف کرسکتا ہے، اور نذر کے وقت سے ۲۰ دینار کی زکات کا سال شروع ہوگا، اسی طرح ۲۰ دینار معین نہ کرے تب بھی زید نذر کے وقت سے اس کا مالک ہوگا، جبکہ اسے رد نہ کرے، لہٰذا ناذر پر یہ زید کا قرض ہوگا اور زکات وغیرہ مسائل میں قرض کے احکام اس پر ثابت ہوں گے، اگر قبضہ سے قبل زید اسے رد کردے تو ناذر بری ہوگا، اور نذر باطل ہوگی، خلاصہ یہ کہ کسی معین شخص کو کسی معین چیز کی نذر مانے تو اس کے رد کرنے سے رد نہ ہوگی، اور غیر معین کی نذر ہو تو رد کرنے سے رد ہوگی، اگر معین چیز ناذر کے پاس تلف ہو جائے تو وہ ضامن نہ ہوگا، البتہ اس کی کوتاہی کو دخل ہو، تو ضامن ہوگا، مثلاً وہ معین شخص مانگے اور یہ نہ دے، پھر تلف ہو جائے، تو ضامن ہوگا۔

(۶) کسی مسجد کو معطر اور خوشبودار کرنے کی نذر صحیح ہے، گھر یا مزاروں کو معطر کرنے کے نذر صحیح نہیں ہے۔

(۷) اگر کہے: میرا بیٹا صحت یاب ہوا تو مجھ پر اللہ کے لئے ۱۰۰ روپے صدقہ کرنا لازم، پھر دوسرے دن بھی یہی جملہ کہے: تو ۲۰۰ روپے کا صدقہ لازم ہے، تاہم تکرار کی نیت سے کہے تو صرف ۱۰۰ روپیہ لازم ہوگا۔

(۸) اگر غیر مسلم کو صدقہ کی نذر مانے تو مسلمان کو دینا، اور بدعتی یا رافضی کو صدقہ کی نذر مانے تو اہل سنت کو دینا اور مالداروں کو صدقہ کی نذر مانے تو غریبوں کو دینا جائز ہے۔

(۹) کافر نذر مانے تو اسلام لانے کے بعد اسے پورا کرنا لازم نہیں ہے، البتہ مستحب ہے (جب کہ شرعاً وہ نیکی ہو) جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو قبلِ اسلام مسجد حرام میں اعتکاف کی نذر کو پورا کرنے کا حکم دیا تھا (بخاری شریف)

(۱۰) مسجد یا کسی اور جگہ روشنی کے لئے تیل وغیرہ کی نذر مانے، یا اس مقصد کے لئے کچھ وقف کرے، تو یہ نذر اور وقف صحیح ہے، جبکہ اس مسجد یا جگہ میں نمازی یا سونے والے وغیرہ اس روشنی سے انتفاع کریں، ورنہ یہ نذر اور وقف صحیح نہ ہوگا، کیونکہ مال کی بربادی ہے۔

(۱۱) کوئی تیل یا موم بتی (وغیرہ) مسجد کو دے اور نذر کی صراحت کرے، تو نذر کی جہت میں صرف کرنا واجب ہے، اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، گو کافی مقدار میں ہو اگر وہ تبرع (عطیہ) کی صراحت کرے، تو اس کی اجازت کے مطابق ہی اس میں تصرف کیا جاسکتا ہے، اور وہ اسی (دینے والے) کی ملکیت میں باقی رہے گا، اگر کافی مدت گذر جائے، اور بظاہر دینے والا مر چکا ہوگا، تو اس کی اجازت باطل ہو چکی، اور وہ چیز اس کے وارث کو لوٹانا واجب ہے، اگر وارث کا پتہ نہ ہو، تو مسلمانوں کے مصالح پر صرف کرے، اگر دینے والے کے قصد کا علم نہ ہو تو اس پر نذر کے گذشتہ احکام جاری ہوں گے، یا مسلمانوں کے مصالح پر صرف کریں گے (مغنی ۴/۳۷۱)

(۱۲) کوئی شخص اپنے مقروض کے لئے اس کے ذمہ موجود قرض کی نذر مانے تو صحیح ہے، گو ناذر کو مقدار کا علم نہ ہو، اور مقروض فوراً قرض سے بری ہو جائے گا، گو وہ قبول نہ کرے، یا رد کردے۔

(۱۳) اگر افضل ترین وقت یا اللہ کے نزدیک محبوب ترین وقت میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو شب قدر مراد ہوگی، لہٰذا رمضان کے آخری عشرہ کے تمام راتوں میں نماز پڑھے، تاکہ بالیقین نذر پوری ہو۔

(۱۴) اگر صرف یہ کہے: میں نے اس چیز کی اللہ کے لئے نذر مانی یا اس چیز کی اللہ کے لئے وصیت کی، تو وقف کی طرح صحیح ہے، اور فقراء پر صرف کیا جائے۔

(۱۵) مجہول، معدوم (غیر موجود) اور غائب کی نذر اور جنین کے حق میں نذر صحیح ہے۔ میت کے لئے نذر صحیح نہیں ہے۔

(۱۶) نذر میں جن امور کا التزام کیا ہے، اسی کے مطابق لازم ہوگی، جب کہ شرعاً اس میں کوئی حرج نہ ہو، اگر مطلق ہو، تو شرعی عرف پر محمول کریں گے۔

(۱۷) موت یا مرض الموت پر معلق نذر، یا مرض الموت میں مانی ہوئی نذر ایک تہائی سے معتبر ہوگی۔ اگر کسی صفت پر نذر معلق کرے، اور وہ ناذر کی موت کے بعد پائی جائے، تو یہ نذر باطل ہے، کیونکہ موت کی وجہ سے وارث مالک بن چکا۔ اور اگر وہ صفت مرض الموت میں ناذر کے اختیار کے بغیر پائی گئی، تو ایک تہائی سے معتبر نہ ہوگی (بلکہ کل مال سے معتبر ہوگی) کیونکہ وہ غیر متہم ہے، اور اگر اس کے اختیار سے پائی گئی، مثلاً اس کا گھر میں داخل ہونا، تو ایک تہائی سے معتبر ہوگی۔

(۱۸) کسی مقام پر تعمیر مسجد کی نذر مانے تو صحیح ہے، کسی دوسری جگہ بنانا کافی نہ ہوگا۔

تنبیہ: قرآنی آیات، احادیث، اجماع اور قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ نذر قربت اور نیکی ہے۔ قیاس اس طرح کہ نذر قربت کا وسیلہ ہے، اور وسائل کو مقاصد کا حکم ہوتا ہے، نیز اس پر فرض کا ثواب ملے گا، جو نفل سے ستر گنا زائد ہے، لیکن صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے نذر سے منع فرمایا اور کہا: ''بلاشبہ یہ (نذر) کسی چیز کو روکتا نہیں ہے، اس سے تو بس بخیل سے مال نکلوایا جاتا ہے''۔ لہٰذا بظاہر

نذر تبرر نیکی ہے اور نذر لجاج مکروہ ہے، یا ممانعت اس وقت ہے، جبکہ نذر پوری نہ کرنے کا خطرہ ہو، یا یہ نظریہ ہو کہ نذر میں براہِ راست (کسی مصیبت کے ٹالنے وغیرہ کی) تاثیر ہے، جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے، یا جب کہ نیکی کو کسی چیز پر معلق کیا جائے۔ (کیونکہ نیکیاں تو ویسے ہی جتنی بھی ہوسکے انجام دینا سعادت مندی ہے)

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ معلق نذر (نذر مجازاۃ) تقدیر کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتی، وہ صرف بخیل کے جیب سے نیک راستہ میں مال نکالنے کا سبب ہے، کیونکہ وہ اپنے بخل کی وجہ سے بغیر نذر و وجوب کے اللہ کے راستے میں صدقہ وخیرات وغیرہ نہیں کرپائے گا۔

(تلخیص ۱۷۵/۴، الفقه المنهجی ۲۱/۳-۳۰، مغنی المحتاج ۳۵۴/۴-۳۷۱، قلائد ۴۲۶-۴-۷/۲، تحفه مع الحواشی ۴۸۳/۱۲-۵۴۸، فتح الوهاب مع الجمل ۳۲۱/۵-۳۳۴، فتح المعین مع الاعانة ۳۵۶/۲-۳۷۰، الاقناع مع البجیرمی ۳۱۰/۴-۳۱۶، نهایة مع الحواشی ۲۱۸/۸-۲۳۵، ترشیح ۲۱۱-۲۱۴)

قضاء (فیصلہ)

لفظ قضاء عربی میں حکم، فیصلہ، فراغت وانتہا، ادائیگی اور تقدیر وغیرہ کئی معانی کیلئے مستعمل ہے۔

شرعاً دو یا زائد افراد کے درمیان خصومت وجھگڑے کا اللہ عزوجل کے حکم کے مطابق فیصلہ کرنا قضاء کہلاتا ہے۔

مشروعیت: قضاء کی مشروعیت پر قرآن وحدیث اور اجماع وعقل کے دلائل موجود ہیں۔ (دیکھئے مائدہ آیت: ۴۹، نساء آیت: ۵۸، ۱۰۵)

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ: ”حاکم اجتہاد وکوشش کر کے فیصلہ کرے، اور فیصلہ صحیح ہو، تو اسے دوہرا اجر ملے گا، اور اجتہاد کر کے فیصلہ کرے، اور غلطی کر جائے تو ایک اجر ملے گا“ (متفق علیه)

آپ ﷺ کے دورِ مسعود سے آج تک اس کی مشروعیت پر تمام کا اتفاق ہے، کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔ عقل کا بھی یہی فیصلہ ہے، کیونکہ انسانی طبیعتیں اور مزاج مختلف ہیں، لہٰذا آپسی اختلاف، ظلم وستم اور دوسرے کی حق تلفی واقع ہوتی رہتی ہے، اور حاکم تنہا بذاتِ خود تمام رعایا کے فیصلے کرے، یہ ناممکن ہے، لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ مختلف علاقوں میں قاضی (منصف۔جج) متعین کئے جائیں“ جو لوگوں کے ان مسائل کو حل کریں۔

منصب قضاء کی اہمیت: یہ ایک عظیم منصب ہے۔ اور انبیاء کرام اور خلفاء وعلماء کا وظیفہ رہا ہے۔ جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ نے برحق فیصلہ کا حکم فرمایا (سورۃ صٓ: ۲۶)

خطرہ: اس اہمیت کے ساتھ فی نفسہ یہ منصب بڑا پرخطر بھی ہے، اس کی ذمہ داریوں کو نبھانا بڑی احتیاط اور باریکی کو چاہتا ہے، اس کا صحیح حق ادا کر کے نجات پانے والے کم، اور خلاف ورزی کر کے ہلاک ہونے والے زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”قاضی تین (قسم کے) ہیں: ایک جنت میں اور دو جہنم میں، جنت میں وہ قاضی ہوگا، جو حق کو پہچان کر اس کے مطابق فیصلہ دے اور جو حق کو جان کر بھی ناانصافی کرے، وہ جہنم میں ہے اور جو جہل کے ساتھ لوگوں کے فیصلے کرے، وہ بھی جہنم میں ہے“۔ (ابوداود) ایک حدیث میں فرمایا: ”جسے لوگوں کا قاضی بنایا گیا، وہ بلا چھری کے ذبح ہوگیا“ (ابوداود، ترمذی)۔ (بلا چھری کے ذبح ہونے سے اس منصب کے حرص ومطالبہ سے ڈرانا اور اس کے خطرات سے متنبہ کرنا مراد ہے) اسی لئے کئی صحابہ وعلماء اس منصب سے ڈرتے اور اپنے آپ کو باز رکھتے رہے کہ کہیں اس میں کوتاہی نہ ہو۔

حکم: ہر علاقہ میں ایک ایسا قاضی ہونا، جو فریقین میں منصفانہ فیصلہ کرکے ظلم وستم کو دور کرے، فرض کفایہ ہے۔ اس منصب کے قابل تمام حضرات اس سے باز آئیں، تو تمام گنہگار ہوں گے، اور امام پر واجب ہوگا کہ کسی مناسب وقابل شخص پر اس ذمہ داری کے نبھانے کے لئے جبر (زبردستی) کرے۔

اسی لئے فقہائے شوافع فرماتے ہیں کہ ہر مسافتِ عدوی پر ایک قاضی اور مسافت قصر میں ایک مفتی کا تقرر امام پر واجب ہے۔ مسافت عدوی سے مراد اتنی دوری کے ایک شخص صبح گھر سے نکلے تو وہاں جاکر رات تک واپس لوٹ سکے۔

اگر کسی علاقہ میں اس منصب کے قابل صرف ایک ہی شخص ہو، تو قاضی بننا اس پر فرض عین ہوگا۔ اگر اسے یہ منصب عطا نہ ہو، تو خود اس کا مطالبہ کرنا لازم ہے۔ اگر اپنے مثل یا اپنے سے بہتر شخص علاقہ میں موجود ہو، تو اس منصب کا مطالبہ مکروہ ہے، احادیث میں اس سے منع کیا اور ڈرایا ہے۔ تاہم درج ذیل صورتوں میں کراہت نہ ہوگی، بلکہ مستحب قرار پائے گا۔

۱- کوئی عالم گمنامی میں ہو، اور قضا کے ذریعہ اپنے علمی فیضان کو عام کرنا چاہتا ہو۔

۲- غریب ومحتاج ہو، اور قاضی بننے کی صورت میں بیت المال سے نظم ہوجائے گا، لہٰذا اس عظیم نیکی کے ذریعہ گذر بسر کا بھی سامان ہوجائے گا۔

۳- دوسروں کے ظلم یا کمزوری کی وجہ سے لوگوں کے حقوق ضائع ہو رہے ہوں۔

اگر دشمنوں سے انتقام، رشوت خوری، فخر وتکبر اور برتری وغیرہ مذموم مقاصد ہوں، تو اس کا مطالبہ حرام ہوگا۔

قاضی کے شرائط: (۱) اسلام، پس شرعاً کسی کافر کو قاضی نہیں بنایا جاسکتا۔

(۲) مکلف: یعنی عاقل وبالغ ہو، کسی پاگل یا بچہ کو قاضی بنانا جائز نہیں ہے، قاضی کے لئے عام عقل کافی نہیں بلکہ مزید ذہانت وفطانت اور قوتِ فکر ضروری ہے، تاکہ مشکل مسائل کا صحیح حل تلاش کرسکے۔

(۳) آزادی، پس ایک غلام قاضی نہیں بن سکتا۔

(۴) مذکر ہونا، لہٰذا کوئی عورت قاضی نہیں بن سکتی، حدیث میں ہے کہ ''جو قوم کسی عورت کو اپنے معاملات کا ذمہ دار بنائے، وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی'' (بخاری)، نیز اس میں ان کو اپنی اصل ذمہ داری سے باز رکھنا پایا جارہا ہے، یعنی خانگی امور کی اصلاح ونگہداشت اور اولاد کی تربیت۔

(۵) قاضی عادل ہو، کوئی فاسق قاضی نہ بنایا جائے، کیونکہ اس کی باتوں اور فیصلوں کا کوئی اعتبار واطمینان نہیں، کسی میں درج ذیل صفات ہوں تو وہ عادل کہلائے گا۔

کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتا ہوں، (کبیرہ گناہ یعنی جس کے ارتکاب پر قرآن یا حدیث میں سخت وعید وارد ہو، اور اس کا ارتکاب دین سے لاپروائی پر دلالت کرے، جیسے قتل، شراب نوشی، زنا، سودخواری وغیرہ)

صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے (مثلاً غیر محرم کو دیکھنا) صحیح العقیدہ ہو اور اس کے ہم طبقہ لوگوں کے مروت کا پابند ہو، یعنی زمان ومکان کے اعتبار سے دیندار لوگوں کے اخلاق وآداب کی رعات کرے۔ نیز اطمینان بخش شخص ہو، اور اس منصب کے ذریعہ غیر شرعی طریقہ پر کسی نفع کی تحصیل سے متہم نہ ہو۔

(۶) قوتِ سماعت صحیح ہو، گو زور سے کہنا پڑتا ہے، پس کسی بہرہ کو قاضی بنانا درست نہیں ہے۔

(۷) بینا ہو، ایک نابینا قاضی نہیں بن سکتا۔
(۸) گویا ہو، پس کسی گونگے کو قاضی بنانا درست نہیں، خواہ اس کے اشارے سمجھ میں آئیں۔
(۹) قضاء سے متعلقہ ذمہ داریوں کو انجام دینے اور حق کے نفاذ کی قوت وصلاحیت ہو۔
(۱۰) مجتہد ہو، یعنی احکام سے متعلق قرآنی آیات واحادیث اور ان سے متعلقہ علوم سے واقف ہو، نیز عربی زبان اور نحو وصرف وغیرہ اور صحابہ کرام اور مابعد کے علماء کے اجماع واختلاف اور قیاس کے انواع سے واقف ہو۔ جس کسی امام کے مسلک کا مقلد ہو، تو اس پر صرف اپنے امام کے قواعد کی معرفت کافی ہے، اور ان قواعد کی ایسی ہی رعایت کرے، جیسے ایک مجتہد مطلق شرعی قوانین کی رعایت کرتا ہے۔
اگر کسی میں قاضی کے تمام شرائط موجود ہوں، اور اسے جانتے ہوئے حاکم کسی دوسرے کو مقرر کرے جو قابل نہ ہو، تو دونوں گنہگار ہوں گے اور اس کے فیصلے نافذ نہ ہوں گے۔ اگر کسی بھی شخص میں مندرجہ بالا تمام شرائط جمع نہ ہوں، اور کوئی صاحبِ شوکت حاکم کسی مسلمان کو قاضی مقرر کرے، تو مجبوری کی وجہ سے اس کے فیصلے نافذ ہوں گے، تاکہ مصالح معطل نہ ہوں۔

قاضی کے حق میں مستحب صفات: قریشی ہو، نسب کے بمقابلہ علم وتقوی کو ترجیح دی جائے؛ باوقار ہو، حلیم وبردبار اور ذہین وفطین اور بیدار مغز ہو، اعضاء وحواس صحیح ہوں، علاقہ کی زبان سے واقف ہو، قناعت پسند ہو۔

قاضی کی ذمہ داریاں: لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کرنا، فریقین کی رضامندی سے صلح کرانا، قید وبند اور تعزیری سزا کا نفاذ، حدود کا قیام، جس عورت کا ولی نہ ہو اس کا نکاح کرانا، نابالغ، پاگل اور سفہاء کے مال پر ولایت ونگرانی، قرض کے لئے ترکہ کی فروخت، غائب شخص کے مال کی حفاظت وقف کی نگرانی اور مستحقین پر اس کی آمدنی کا صرف وصیتوں پر نگاہ رکھنا، مفتی اور محتسب حضرات کا تقرر، زکات کی وصولیابی، ترکوں کی تقسیم، مساجد میں ائمہ کا تقرر وغیرہ۔

قاضی کا محلِ قیام: قاضی بن کر کسی بستی میں پہنچے تو سنت ہے کہ دن میں پہنچے، اور جامع مسجد جاکر دوگانہ ادا کرے، اور شہر کے درمیان میں کوئی مناسب جگہ ہو، تو وہیں اپنا قیام رکھے، تاکہ تمام لوگوں کے لئے مراجعت میں سہولت ہو، ورنہ جہاں اسے سہولت ہو، قیام کرے، تاہم قاضی کے قیام وفیصلے کے لئے جگہ متعین ہو (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) تو وہیں ٹھہرے۔ بہر حال اپنے عمل کی جگہ پہنچ کر اپنی آمد کے متعلق اعلان کروادے کہ جسے کوئی حاجت ہو، حاضر ہو جائے، اور پھر آنے والے حضرات کے معاملات کو حل کرنا شروع کرے، اس طرح اس کی خدمات شروع ہو جائے گی، اور اپنے وظیفہ کا مستحق قرار پائے گا۔

ذمہ داری کی ترتیب: سب سے پہلے قاضی جیل میں مقید لوگوں کے معاملات پر نظر کرے، اور جو جس سزا کا مستحق ہے، اس پر اس کا نفاذ کرے، اور اسے آزاد کردے، جو بلا جواز ظلماً مقید ہو، اسے آزاد کردے۔
پھر بچوں، پاگل اور سفہاء کے اوصیاء اور ذمہ داروں کی تحقیق کرے، جو صحیح طریقہ سے اس ذمہ داری کو نبھا رہا ہو، اسے برقرار رکھے، کوئی فاسق وغیرہ ہو تو اس سے مال لے کر کسی عادل کے سپرد کرنا واجب ہے، کوئی عادل ہو لیکن کمزور ہو تو دوسرے معاون کے ذریعے اس کی مدد کرے۔
پھر (سابقہ) قاضی کی طرف سے بچوں پر اور وصیتوں کی تقسیم پر مقرر اُمَنَاء کی تحقیق کرے، اور فاسق کو معزول کرے، نیز کمزور کے لئے ایک معاون فراہم کرے۔ اس کے بعد عام وخاص اوقات اور اس کے ناظرین کی تحقیق وفکر کرے۔ اور بعد میں اپنے دیگر امور کو الأَهَم فالأهَم کی ترتیب سے انجام دے۔ (یعنی جو معاملہ سب سے اہم ہو اسے پہلے انجام دے، پھر اس کے بعد جو اہم ہو... اسی ترتیب سے)
ایک قاضی بہر حال لوگوں کی مصلحتوں اور حقوق کا ضامن اور ذمہ دار ہے، لہٰذا اس پر لازم ہے کہ پوری جانفشانی کے ساتھ جلد از جلد

تمام امور میں عدل وانصاف کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے اور ظلم وستم بے توجہی اور تساہل سے گریز کرے۔

تحکیم (کسی کو حکم اور فیصل بنانا): اگر دو یا زائد افراد اپنے کسی معاملہ میں (خصومت ہو یا کچھ اور) کسی ایک یا زائد اشخاص کو حَکَم بنائیں، تو یہ جائز ہے، جب کہ حَکَم میں قاضی کی اہلیت موجود ہو اور اللہ کی عقوبت (حد یا تعزیر) میں نہ ہو، اللہ کے حق کی وجہ سے عائد ہونے والے حد یا تعزیر میں حَکَم بنانے کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس کا کوئی معین مطالبہ کرنے والا نہیں ہے، اسی لئے اللہ کے مالی حق میں بھی حَکَم بنانا جائز نہیں ہے۔ جس فیصل میں قاضی کے شرائط ہوں، حکومت کی طرف سے قاضی مقرر ہونے کے باوجود اسے حَکَم وفیصل بنا سکتے ہیں، خواہ قصاص یا نکاح وغیرہ میں بنائے (نکاح میں یعنی جس لڑکی کا خاص ولی نہ ہو اس کے عقد نکاح میں)

اگر قاضی موجود ہو، گو مجبوری کے درجہ کا ہو، تو کسی غیر اہل (یعنی جس میں قاضی کی اہلیت نہ ہو اس) کو حَکَم بنانا جائز نہیں، تاہم اس تک پہنچنا دشوار ہو، یا وہ مال کی معقول مقدار وصول کرتا ہو، تو اس کی موجودگی کے باوجود غیر اہل کو حَکَم بنانا جائز ہے۔

اگر مطلقاً قاضی مفقود ہو، تو موجودہ عادل افراد میں سے افضل وبہتر کو حَکَم بنانا جائز ہے۔

حَکَم کا فیصلہ اسی وقت نافذ ہوگا، جب کہ فریقین فیصلہ سے قبل اس سے راضی ہوں، البتہ فریقین میں ایک قاضی ہو، تو یہ ضروری نہیں ہے، دونوں کا الفاظ میں رضامندی کا اظہار ضروری ہے، نکاح کے مسئلہ میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے، اور تحکیم کی اجازت کے سلسلہ میں باکرہ کا سکوت بھی کافی ہے۔ فیصلہ کے بعد فریقین کی رضامندی شرط نہیں ہے۔

اگر دو اشخاص کو حَکَم مقرر کریں تو دونوں فیصلہ پر متفق ہوں، تبھی فیصلہ نافذ ہوگا، عاقلہ پر دیت کے فیصلہ میں صرف قاتل کی رضامندی کافی نہیں، بلکہ عاقلہ کی رضامندی بھی ضروری ہے۔

اگر فیصلہ سے قبل ایک فریق رجوع کرے، گو مدعی کے گواہ پیش کرنے کے بعد ہو، تو حَکَم کو فیصلہ کا اختیار نہ ہوگا۔ حَکَم کا کام صرف فیصلہ کرنا ہے، کسی کو قید وغیرہ کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر قصاص، حد قذف وغیرہ سزاؤں کا فیصلہ کرے، تو خود اس کا نفاذ نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ حاکموں کی عظمت وشوکت کے منافی ہے۔ بقول امام زرکشیؒ رمضان کے چاند کے ثبوت کے لئے تحکیم جائز ہے، اور جو اس کے فیصلہ سے راضی ہو، اس پر نافذ ہوگا، پس اس پر روزہ واجب ہوگا۔ (الاقناع مع البجیرمی ۳۲۲/۴، تحفہ مع الحواشی ۳۲/۱۳، فتح الوہاب مع الجمل ۳۳۹/۵، مغنی ۳۷۸/۴)

مُزَکّی (یعنی جو گواہوں کے عادل یا غیر عادل ہونے کی خبر دے): قاضی کے لئے مستحب ہے کہ مُزَکّی حضرات کو اختیار کرے، تاکہ جن گواہوں کے حالات سے وہ واقف نہیں ہے، مزکی حضرات کے ذریعہ ان کی تحقیق کر سکے۔ مزکی مسلمان، عاقل، بالغ، عادل اور جرح وتعدیل کے اسباب سے واقف ہو، نیز متعلقہ گواہ کی مصاحبت پڑوس پن یا اس کے ساتھ معاملہ کی وجہ سے اس کے حالات سے واقف ہو۔

کاتب: قاضی کو اپنے منصب کی مصروفیت کی وجہ سے لکھنے کے فرائض انجام دینے کے لئے کاتب کی ضرورت پیش آئے گی لہٰذا کاتب کا تقرر مستحب ہے، جس کا مسلمان، عادل مرد اور آزاد ہونا شرط ہے، نیز مَحَاضِر وسِجِلَّات کی تحریر سے واقف ہو (عدالت میں فریقین کی گفتگو کی تفصیلات جس میں قلمبند کی جائے، اسے محاضر (دستاویز) اور جس میں فیصلہ قلمبند کیا جائے اسے سجل (رجسٹر) کہا جائے گا۔

کاتب کا فقیہ، کامل العقل، خوشخط، فریقین کی زبان سے واقف، فصیح اور حساب کتاب سے واقف ہونا مستحب ہے۔

مترجم: قاضی کے لئے مترجم کا تقرر مستحب ہے، جو فریقین کے کلام کے ترجمہ سے قاضی کو آگاہ کرے۔ مترجم کا مسلمان، آزاد اور عادل ہونا شرط ہے۔

درّہ وجیل: قاضی کیلئے لوگوں کی تادیب کے لئے حضرت عمرؓ کی اتباع میں درہ رکھنا مستحب ہے۔ نیز حقوق کے ادائیگی اور سزا کے لئے جیل خانہ کا نظم کرے۔

مجلس: قاضی کی مجلس (یعنی عدالت) کشادہ، عام وظاہر ہو، اور آرام دہ ہو کہ آنے والے ضرورت مندوں کو مشقت نہ ہو۔

مسجد: فیصلے کے لئے قاضی کو مسجد میں بیٹھنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ مجلس غالباً فریقین کے شور غل سے خالی نہ ہوگی، نیز حائضہ، بچے، پاگل اور کافروں کی حاضری کے مواقع بھی آئیں گے۔ بہتر ہے کہ قاضی کسی اونچی جگہ بیٹھے تا کہ تمام حاضرین پر نگاہ رہے، اور قبلہ رو بیٹھے، کیونکہ یہ اشرف ترین جہت ہے، نیز بیٹھنے کے بعد اللہ سے توفیق اور صحیح فیصلوں کے لئے دعا کرے۔

دربان (حاجب): فیصلوں کی مجلس میں ضرورت مندوں کو آنے سے روکنے کے لئے دربان رکھنا مکروہ ہے، بلکہ اپنا دروازہ ہر آنے والے کے لئے کھلا رکھے، تاہم لوگوں کی بھیڑ ہو تو ان کے نظم وترتیب کے لئے کسی کو متعین کرنے میں حرج نہیں، ابوداود وترمذی کی احادیث سے ثابت ہے کہ جو ذمہ دار ضرورت مندوں کے ضرورت کے وقت اپنا دروازہ بند رکھے، بروز قیامت اس کے حوائج کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔

مشورہ: قاضی کے لئے مستحب ہے کہ پیچیدہ مسائل میں فقہاء کرام اور اصحاب بصیرت سے مشورہ کرے۔

فریقین میں مساوات: قاضی کے لئے درج ذیل امور میں فریقین میں مساوات واجب ہے۔

(۱) قاضی کے پاس داخلہ میں، پس ایک فریق کے لئے قاضی کھڑا ہو، اور دوسرے کے لئے کھڑا نہ ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عدل کے منافی، اور دوسرے کے دل شکنی کا باعث ہے، لہٰذا یا تو دونوں کے لئے کھڑا ہو، ورنہ دونوں کیلئے کھڑا نہ ہو۔

(۲) دونوں کی گفتگو سننا، دونوں کے ساتھ خندہ پیشانی، دونوں کے سلام کا جواب۔

(۳) اپنے سامنے دونوں کی نشست، یعنی یا تو دونوں کو اپنے سامنے بٹھائے، یا ایک کو دائیں اور دوسرے کو بائیں۔

فیصلہ کے بعض آداب: مُدَّعِیْ کے اپنے دعوی سے فارغ ہونے سے قبل قاضی کو مُدَّعٰی عَلَیْہِ سے پوچھنا جائز نہیں ہے، مدعی کے مطالبہ کے بعد ہی قاضی مدعی علیہ کو قسم دلوائے، کسی فریق کو اس کی حجت ودلیل تلقین نہ کرے، یا ایسی بات نہ کرے کہ اس سے وہ دعوی یا جواب کی کیفیت کو تاڑ جائے، یا انکار واقرار کی کیفیت کو سمجھے، کیونکہ اس میں اس کی طرف میلان اور دوسرے فریق کے حق میں ضرر رسانی کا اظہار ہے، اور یہ حرام ہے۔

قاضی گواہوں کے ساتھ بلا وجہ تشدد کے ساتھ پیش نہ آئے اور نہ اپنی کسی بات وغیرہ سے ان کو تکلیف پہنچائے، کیونکہ ایسی صورت میں لوگ گواہ بننے اور گواہی دینے سے دور بھاگیں گے۔ گواہی اسی کی قبول کرے، جس کی عدالت سے خود واقف ہو، یا دو عادل افراد (مزکی) اسے گواہی کے قابل قرار دیں، دشمن کے خلاف دشمن کی، اور والد کے حق میں اولاد کی یا اس کے برعکس گواہی قبول نہ کرے۔

فیصلہ سے اجتناب کے مواقع: دس مواقع میں قاضی فیصلہ کرنے سے رکے، غصہ بھوک، پیاس، شہوت کی شدت، غم، بے انتہا خوشی، بیماری، بول وبراز کی حاجت کو روک کر، اونگھ، اور گرمی اور سردی کی شدت، ان کے علاوہ دیگر ان صورتوں کا بھی یہی حکم ہوگا، جن میں نفس پریشان ہو، اور بد خلقی اور خلل فکر حاصل ہو۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے غصہ کی حالت میں فیصلہ سے منع فرمایا ہے (صحیحین) اور یہ ممانعت کراہت پر محمول ہے، لہٰذا اس حال میں کوئی قاضی فیصلہ کرے تو نافذ ہوگا۔

قاضی کی خرید وفروخت: بہتر ہے کہ قاضی بذات خود خرید وفروخت نہ کرے، تا کہ اپنی عظیم ذمہ داری میں کوتاہی

نہ ہو، نیز سامنے والا قاضی ہونے کے ناطے اس کی رعایت کرے گا، اور کل عدالت میں اس کا کوئی مسئلہ پیش ہوگا، تو قاضی کے اس کی طرف میلان کا خطرہ ہے۔

قاضی کا اپنے یا شریک کے یا اصل وفرع کے حق میں فیصلہ: (۱) قاضی خود اپنے حق میں فیصلہ نہیں کرسکتا، اور یہ فیصلہ نافذ نہ ہوگا۔

(۲) مشترک مال میں اپنے شریک کے حق میں بھی قاضی فیصلہ نہیں کرسکتا۔

(۳) اسی طرح قاضی کو اپنے اصل وفرع (باپ دادا اور بیٹے پوتے وغیرہ) کے حق میں فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے، اور نہ یہ فیصلہ نافذ ہوگا، کیونکہ ان تمام صورتوں میں تہمت اور طرفداری کا احتمال موجود ہے۔ تاہم ان لوگوں کے خلاف قاضی کا فیصلہ جائز اور نافذ ہوگا، کیونکہ تہمت کا کوئی سوال نہیں۔

(۴) قاضی کو اپنے دشمن کے خلاف فیصلہ جائز نہیں، البتہ اس کے حق میں فیصلہ جائز ہے۔ جن صورتوں میں قاضی کو فیصلہ کرنا منع ہے ، حاکم یا کوئی دوسرا قاضی فیصلہ کرے گا۔

قاضی کے لئے ھدیہ : (۱) قاضی کی عدالت میں جس کا قضیہ پیش ہو، اس کی طرف سے کسی بھی صورت میں ہدیہ قبول کرنا قاضی کے لئے جائز نہیں ہے، خواہ کم ہو یا زائد، قاضی بننے سے پہلے اس کی ہدیہ کی عادت تھی یا نہ تھی، قاضی کے زیر تصرف علاقہ کا ہو یا خارج کا، کیونکہ اس صورت میں فیصلہ میں ان کی طرفداری ومیلان کا قوی امکان ہے۔

(۲) قاضی بننے سے قبل جس شخص کے ساتھ ہدیہ کے لین دین کا معاملہ نہ رہا ہو، اب قاضی بننے کے بعد وہ ہدیہ پیش کرے تو لینا جائز نہیں ہے، گو اس کا کوئی جھگڑا اور مسئلہ عدالت میں نہ ہو۔

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو عامل بنا کر روانہ کیا اور کچھ مال وہ ہدیہ کے نام سے لئے آئے، تو اس پر آپ ﷺ نے بڑی سخت تنبیہ ووعید ارشاد فرمائی۔ مسند احمد کی حدیث میں آپ ﷺ نے عامل کے ہدیہ کو خیانت سے تعبیر فرمایا ہے۔

(۳) قاضی بننے سے قبل جو شخص اسے ہدیہ پیش کرتا رہا ہو، اب قاضی بننے کے بعد بھی اسی عادت کے مطابق پیش کرے، کیت وکیفیت میں اضافہ نہ ہو، اور اس کا کوئی مسئلہ وتنازعہ اس کی عدالت میں نہ ہو، تو یہ ہدیہ قبول کرسکتا ہے۔ لیکن اسے سنت ہے کہ اس ہدیہ کا بدلہ دے، یا مالک کو لوٹا دے یا بیت المال کے سپرد کردے۔

تنبیہ : اگر کسی غلط ارادہ وقصد سے ہدیہ ہو، مثلاً اپنے حق میں ناجائز فیصلہ کروانا وغیرہ، تو یہ ہدیہ کے نام پر رشوت ہے، جو کبیرہ گناہ ہے، اور اسے دینے والا، لینے والا اور اس سلسلہ میں کوشاں اور واسطہ تینوں گنہگار ہوں گے، احادیث میں ان تینوں کو ملعون قرار دیا ہے۔

ھدیہ کی ملکیت : مذکورہ ناجائز صورتوں میں قاضی ہدیہ قبول کرے، تو مالک نہ ہوگا، بلکہ اسے دینے والے کو واپس کردے، اگر یہ دشوار ہو تو بیت المال کے سپرد کردے۔

ولیمہ میں شرکت : فریقین کا تنازعہ عدالت میں جاری ہو، تو ان میں سے کسی کی دعوت میں شرکت قاضی کے لئے جائز نہیں ہے۔ قضا سے قبل جہاں دعوت کی عادت جاری تھی، اگر ان کا کوئی تنازعہ نہ ہو تو ان کی دعوت میں شریک ہوسکتا ہے۔ اگر ولیمہ وغیرہ کی عام دعوت ہو، اور اس کا کوئی تنازعہ نہ ہو، تو اس کی دعوت قبول کرنا مستحب ہے۔ بشرطیکہ اپنی ذمہ داری میں خلل نہ پڑے، کیونکہ اس صورت میں تہمت کا گذر نہیں، نیز میزبانوں کا دل خوش ہوگا۔

مسئلہ : قاضی کے لئے مریض کی عیادت اور جنازہ میں شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ نیکی ہے، اور اس میں کوئی تہمت بھی نہیں ہے۔

قاضی کا فیصلہ سے رجوع : اگر قاضی کا فیصلہ قرآن، حدیث، اجماع یا قیاس جلی کے مخالف ہو، تو (اس فیصلہ کی غلطی کا علم ہوتے ہی) اسے توڑ دیا جائے گا، اور صحیح فیصلہ کے مطابق عمل ہوگا، صحابہ وغیرہ سے اس کی کافی مثالیں وارد ہیں۔

اگر فیصلہ قیاسِ خفی کے مخالف ہو، تو سابقہ فیصلہ اپنے حال پر باقی رہے گا، آئندہ کا فیصلہ جدید اجتہاد کے مطابق ہوگا، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔

قاضی کے فیصلہ کی حقیقت : جو فیصلہ کسی کاذب اصل (جھوٹی بنیاد) پر مرتب ہو، (یعنی باطن اور حقیقت ظاہر کے خلاف ہو) وہ صرف ظاہراً نافذ ہوگا، نہ کہ باطناً، پس نہ تو کسی حرام کو حلال کرے گا اور نہ اس کے برعکس، لہٰذا گواہ بظاہر عادل ہوں، اس لئے ان کی گواہی کے مطابق فیصلہ دے، لیکن درحقیقت ان کی گواہی جھوٹی تھی، تو باطناً اور حقیقتاً اس سے حلت وجواز حاصل نہ ہوگا، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔ خواہ مال کا مسئلہ ہو یا نکاح کا یا کچھ اور۔

اگر فیصلہ (اصلِ صادق (سچی بنیاد) پر مرتب ہو، تو وہ باطناً بھی نافذ ہوگا گو جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے، اس کے مسلک کے مطابق نہ ہو، تاکہ اتفاق قائم رہے اور کامل انتفاع ہو، لہٰذا کوئی حنفی قاضی (اپنے مسلک کے مطابق) کسی شافعی شخص کے حق میں پڑوسی ہونے کی وجہ سے شفعہ کا فیصلہ دے، یا ذورحم ہونے کی وجہ سے وارث قرار دے، تو اس شافعی کو اسے لینا حلال ہے۔ اسی لئے قاضی کے مسلک کو دیکھتے ہوئے شافعی شخص اس سلسلہ میں دعوی دائر کرے تو دعوی سے اور فیصلہ کے بعد اس چیز کے لینے سے قاضی اسے منع نہیں کرسکتا۔

(جو فیصلہ صرف ظاہراً نافذ ہو اسے قضاءً نافذ اور جو باطناً بھی نافذ ہو اسے دیانتاً نافذ کہا جاتا ہے)

اس اصول پر مرتب بعض مسائل : (۱) کوئی شخص کسی عورت کے متعلق اپنی بیوی ہونے کا جھوٹا دعوی کرے اور اس پر گواہ پیش کرے اور قاضی اس کے حق میں فیصلہ دے، تو اس فیصلہ کی وجہ سے اس عورت سے استمتاع وتعلق اسے حلال نہ ہوگا، اور اس عورت پر واجب ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچائے۔

(۲) کوئی شخص کسی پر اپنے مالی حق کا جھوٹا دعوی کرے، اور قاضی اس کے حق میں فیصلہ دے دے، تو وہ مال اس کے لئے حلال نہ ہوگا، اور دیانتاً اس کا مالک نہ بنے گا، بلکہ اسے مالک کو لوٹانا واجب ہے۔

(۳) شریک اپنا حق شفعہ معاف کرچکا تھا، بعد میں اس کا انکار کرکے گواہ پیش کرے، تو حقیقتاً وہ حق شفعہ کا مستحق نہ ہوگا، گو بظاہر مستحق قرار پائے۔

قاضی کا معزول ہونا : درج ذیل صورتوں میں قاضی خود بخود اس منصب سے معزول ہوجائیگا۔

(۱) اس کا مرتد ہوجانا (۲) اہلیت کا زائل ہونا، مثلاً: پاگل، بے ہوش، نابینا، گونگا یا بہرہ ہوجانا، (۳) فسق، اگر قاضی فاسق ہوجائے تو معزول ہوجائے گا، اور اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا۔

اگر یہ عوارض ختم ہوجائیں، تب بھی خود بخود دوبارہ قاضی نہ بنے گا، حاکم دوبارہ اسے اس منصب پر مقرر کرے تب قاضی قرار پائے گا۔

معزول کرنا : (۱) اگر قاضی میں ایسا خلل ظاہر ہو، جس سے خود بخود وہ معزول نہیں ہوتا، تو امام اسے معزول کرسکتا ہے۔ (۲) اس سے افضل قاضی دستیاب ہونے کی وجہ سے بھی اسے معزول کرسکتا ہے۔ (۳) اگر اس کے مثل یا کمتر درجہ کا قاضی دوسرا موجود ہو، اور اسے معزول کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت ہو، مثلاً فتنہ کو فرو کرنا، تو اسے معزول کرنا جائز ہے۔ (۴) اگر ان میں سے کوئی سبب نہ ہو، تو قاضی کو معزول کرنا حرام ہے، تاہم حاکم کی اطاعت کے پیش نظر وہ معزول قرار پائے گا، جب کہ اس کی جگہ دوسرا مناسب قاضی میسر ہو، ورنہ

یہ سبکدوشی نافذ نہ ہوگی، کیونکہ اس صورت میں مسلمانوں کی مصلحت پر شدید زد پڑے گی۔

قاضی کو جب اپنی معزولی کی خبر پہنچے، تب وہ معزول ہوگا۔ قاضی خود سبکدوش و مستعفی ہونا چاہے، تو یہ جائز ہے، کیونکہ اس کی حیثیت ایک وکیل کی طرح ہے، تاہم اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس منصب کے لائق موجود ہی نہ ہو، تو اسے مستعفی ہونا جائز نہیں ہے۔ حاکم کے مرنے کی وجہ سے قاضی معزول نہ ہوگا۔

مسئلہ : اگر قاضی کو کسی کاغذ پر اپنا فیصلہ تحریر شدہ ملے، یا دو گواہ گواہی دیں کہ قاضی نے فلاں فیصلہ دیا تھا، تو جب تک اسے خود یاد نہ آئے اس تحریر یا گواہی پر عمل نہیں کرسکتا۔ (فتح الوهاب مع الجمل ۵/۳۳۴-۳۵۲، الفقه المنهجي ۸/۱۷۱-۱۹۹، كفاية الاخيار ۲/۴۸۴-۵۰۳، الاقناع مع البجيرمي ۴/۳۱۶-۳۳۶)

قِسۡمَۃ (تقسیم)

قسمۃ یعنی شرکاء کی مصلحت کے لئے مخصوص شرائط اور معین کیفیت کے ساتھ بعض حصوں کو بعض سے جدا کرنا، یہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مشروع ہے۔ (دیکھئے سورہ نساء: ۸) صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے تقسیم ہونے تک حق شفعہ کا فیصلہ دیا ہے، حد بندی ہوجائے اور راستے جدا و واضح ہوجائیں تو شفعہ نہ ملے گا، نیز صحیحین میں آپ ﷺ سے مجاہدین میں مال غنیمت کی تقسیم کا ذکر موجود ہے۔

قاسم : شرکاء خود اپنا مال تقسیم کرسکتے ہیں، یا حاکم خود تقسیم کرے یا کسی کو اس خدمت کے لئے متعین کرے۔ حاکم کی طرف سے مقرر قاسم میں گواہی کے شرائط ضروری ہیں، نیز وہ تقسیم سے متعلق امور سے بھی واقف ہو۔ تقسیم میں قیمت کا اندازہ بھی لگانا ہو، تو دو قاسم ضروری ہیں، ورنہ ایک کافی ہے، اگر قیمت طئے کرنے کے لئے حاکم اسے حاکم بنادے، تو وہ تنہا بھی کافی ہے۔ قاسم کا معاوضہ بیت المال میں مصالح کے حصے سے دیا جائے۔ اگر یہ دشوار ہو تو شرکاء خود ادا کریں۔ اگر ہر ایک نے اپنا معاوضہ متعین کیا ہو تو فبہا، ورنہ کل رقم طئے ہوتی ہو، تو ہر ایک حصے کے تناسب سے معاوضہ ادا کریں۔

تقسیم کا حکم : اگر تقسیم میں عظیم ضرر ہو، تو حاکم تقسیم سے منع کردے، اگر نفع میں نقص ہو، یا اصل مقصود نفع باطل ہو، تو انھیں تقسیم سے نہ روکے، اور نہ خود ان کے مطالبہ پر عمل کرے۔

انواع : جس کی تقسیم میں زیادہ نقصان نہ ہو، اس کی تقسیم کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) قِسۡمَۃُ بِالۡاَجۡزَہ (اجزا کے اعتبار سے تقسیم): مثلاً: مثلی اشیاء جیسے اناج دراہم، تیل، یکساں تعمیر شدہ عمارت، یکساں صفات والی زمین وغیرہ۔ اس تقسیم میں انکار کرنے والے شریک پر تقسیم کے لئے جبر کیا جائے گا۔ تمام شرکاء کامل ہوں اور اتفاق سے ایک ایک حصہ لیں تو فبہا، ورنہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ہر ایک کے حصہ کی تعیین ہوگی، اگر کوئی شریک مجور علیہ (مثلاً: بچہ یا پاگل) ہو، تب بھی قرعہ اندازی سے تعیین ہوگی۔

تمام شرکاء کامل ہوں اور کمی بیشی پر راضی ہوں، تو جائز ہے۔

(۲) قِسۡمَۃُ بِالتَّعۡدِیۡل : یعنی قیمت کے اعتبار سے حصوں کی تعیین کرنا، مثلاً زمین کے مختلف حصوں کی قیمت (زرخیزی کے فرق، پانی سے قرب وبعد، درختوں کے اختلاف، بستی سے قرب وبعد وغیرہ کی وجہ سے) مختلف ہو، جیسے ایک زمین دو میں نصف نصف مشترک ہو، اور اس کے ایک تہائی کی قیمت دوسرے دو تہائی کے برابر ہو، تو پہلا تہائی ایک حصہ اور دوسرے دو تہائی ایک حصہ شمار ہوں گے،

اورقرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا(اگردونوں رضامندی سے ایک ایک حصہ لیں تو قرعہ اندازی کی ضرورت نہیں ہے)

درج ذیل صورتوں میں قسمۃ تعدیل کے لئے انکارکرنے والے پر جبر کیا جائے گا۔

(۱) زمین کی مذکورہ مثال، تاہم قیمتی اور گھٹیادونوں زمینوں کو مستقل تقسیم کیا جاسکتا ہو، تو تعدیل پر جبر نہ ہوگا۔(بلکہ پہلے نوع کے مطابق قسمۃ اجزاء پرعمل ہوگا)

(۲) ایک ہی صنف کی منقولہ اشیاء ہوں، جن کی قیمت مختلف نہ ہو، اور تقسیم کی وجہ سے شرکت ختم ہوجائے۔ مثلاً یکساں قیمت کی تین گائیں تین شرکاء میں۔ اگر صنف جدا ہو، جیسے شامی ومصری دنبہ، یا انواع جدا ہوں جیسے ریشم، اون اور سوت کا کپڑا یا تقسیم کے باوجود شرکت ختم نہ ہو، جیسے دوغلام کہ ایک کے دوتہائی کی قیمت دوسرے غلام اور بقیہ ایک تہائی کے برابر ہو، تو ان صورتوں میں تقسیم پر جبر نہ ہوگا۔

(۳) ایک دوسرے سے متصل چھوٹی چھوٹی دکانیں، جن میں سے ہرایک کی مستقل تقسیم کی گنجائش نہ ہواور تقسیم کی وجہ سے شرکت ختم ہوجائے، تو جبر ہوگا، ان میں سے کوئی صفت نہ ہو، تو جبر نہ ہوگا۔

(۳) **قِسمَۃ بالرَّد**: یعنی ایسی تقسیم جس میں خارج سے مال لوٹانے کی ضرورت پیش آئے۔ مثلاً ایک طرف ایسا کنواں، درخت یا کمرہ ہو، جس کی تقسیم ممکن نہ ہو، اور دوسری طرف اس کے بالمقابل کوئی چیز نہ ہو۔۔ اس کے کہ خارج سے کچھ ملایا جائے، لہٰذا قرعہ اندازی میں وہ چیز جس کے حصہ میں آئے اس کے قیمت کی قسط وہ سامنے والے کو ادا کرے گا۔ مثلاً دو میں نصف نصف تقسیم کرنا ہو، اور کنویں کی قیمت ۵۰ ہزار ہو، تو کنواں جس کے حصہ میں آئے، وہ دوسرے شریک کو ۲۵ ہزار روپے لوٹائے، اس تقسیم کے لئے شریک پر جبر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس میں غیر مشترک مال کی تملیک پائی جارہی ہے۔

رضامندی: جس تقسیم کا تعلق رضامندی سے ہو، اس میں قرعہ اندازی کے بعد اس سے رضامندی شرط ہے۔ مثلاً یوں کہنا: ہم اس تقسیم سے راضی ہیں۔ اگر قرعہ اندازی کے بغیر ہی ایک ایک حصہ لینے پر راضی ہوجائیں، تو پھر دوسری مرتبہ رضامندی کی ضرورت نہیں۔ جس تقسیم میں جبر ہوتا ہے، اس میں قرعہ اندازی سے قبل یا بعد رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

فائدہ: قسمۃ بالاجزاء حق کا افراز (جدا کرنا) ہے، اور آخری دونوں نوع بیع ہے۔(یعنی پہلی نوع میں دونوں کے حصوں کو جدا کیا جاتا ہے۔ لیکن بقیہ دونوں انواع میں آپس میں ایک دوسرے کے حصہ میں خرید وفروخت کی صورت پائی جارہی ہے)

(الفقه المنهجي ۸/۲۲۹-۲۳۳، فتح الوهاب مع الجمل ۵/۳۷۰-۳۷۶)

شہادت (گواہی)

شہادت: لغت میں قطعی خبر کو شہادت کہا جاتا ہے۔ اور شرعاً: خاص لفظ کے ساتھ کسی چیز کے متعلق خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں۔

دلیل: شہادت (گواہی) قرآن وحدیث اور اجماع سے مشروع ہے (دیکھئے سورہ بقرہ: ۲۸۲، ۲۸۳) احادیث سابقہ باب میں گذرچکیں۔ نیز اس کی مشروعیت پر اجماع ہے، کسی عالم کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

حکمت: گواہی کی مشروعیت کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق کا اثبات وحفاظت ہو، اگر یہ مشروع نہ ہوتا تو کافی حقوق کو ثابت کرنا دشوار ہوتا اور اس طرح وہ حقوق ضائع ہوگئے ہوتے جو اسلامی روح کے منافی ہے۔

گواہوں کی تعداد: جن حقوق کے متعلق گواہی ہو، اس کی دوقسمیں ہیں: حق اللہ اور حق العباد

(الف) حق اللہ تعالیٰ : اس قسم میں دو(۲)عورتوں کی گواہی مقبول نہیں ہے، بلکہ مردوں کی گواہی ہی ضروری ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔جس میں چار گواہوں سے کم مقبول نہیں، گواہی کا یہ نصاب زنا کا ہے۔(دیکھئے سورہ نور : ۴، سورہ نساء : ۱۵ ، اور سورہ نور ۱۳) نیز مسلم وغیرہ کی احادیث سے بھی یہ نصاب ثابت ہوتا ہے۔

۲-دو مردوں کی گواہی مقبول ہوگی، یعنی زنا کے علاوہ دیگر حقوق اللہ میں، مثلاً : ردّت، قطع طریق (ڈاکہ زنی) قتل، چوری اور شراب نوشی۔سورہ بقرہ کی آیت: ۲۸۲،اور طلاق کی آیت: ۲، میں دو گواہوں کا حکم موجود ہے۔ مسلم کی حدیث میں دو گواہوں کی شرط موجود ہے۔نیز امام زہری کا فرمان ہے۔مسئلہ یہی جاری ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔

۳-روزہ کی حد تک رمضان کے چاند کے بارے میں صرف ایک مرد کی گواہی بھی کافی ہے (جس کی تفصیل روزہ کے مسائل میں گذر چکی ہے)

(ب) حَقُّ الْعِبَادْ (بندوں کے حقوق):اس کی بھی تین قسمیں ہیں:

(۱) جس میں مال مقصود نہ ہو، اور مردوں کو اس پر اطلاع ہوتی ہو، تو ایسے معاملہ میں دو مردوں کی گواہی مقبول ہوگی، جیسے طلاق، رجعت، اسلام ورجعت، اسلام وردت، جرح وتعدیل، وقف، وصیت وغیرہ۔

(۲) جس معاملہ میں مال مقصد ہو(خواہ کوئی چیز ہو، یا قرض یا منفعت)اس میں دو مرد، ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک مرد اور مدعی کی قسم مقبول ہوگی، جیسے خرید وفروخت، اقالہ، حوالہ، ضمان، اجارہ، رہن شفعہ وغیرہ۔ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کا ذکر مسلم کی حدیث میں موجود ہے۔

(۳) ہر وہ انسانی حق جس کی غالباً مردوں کو اطلاع نہیں ہوتی، اس میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں یا چار عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی جیسے ولادت، رضاعت، بکارت (دوشیزگی) حیض، اور عورتوں کے عیوب وغیرہ۔امام زہری نے اسے سنت (شرعی) طریقہ قرار دیا کہ جن امور پر عورتوں کے علاوہ کو اطلاع وآگہی نہیں ہوتی، اس میں عورتوں کی گواہی جائز ہے۔جیسے ولادت اور ان کے عیوب (ابن ابی شیبہ۔ الاقناع ۲/۲۹۷)

گواهی کے شرائط : قاضی کے سامنے گواہی دیتے وقت گواہ میں درج ذیل شرائط ہوں، تب گواہی مقبول ہوگی۔

۱ - **اسلام:** کسی کافر کی گواہی کسی مسلمان یا کافر کے خلاف قبول نہ ہوگی۔

۲- **بلوغ :** کسی بچہ کی گواہی قبول نہ ہوگی، گو ممیز وباشعور ہو۔

۳- **عقل :** پاگل کی گواہی بالاجماع مقبول نہیں ہے۔

۴- **آزادی :** کسی غلام کی گواہی مقبول نہ ہوگی۔

۵- **عدالت ،** گواہ عادل نہ ہو، بلکہ فاسق ہو، تو اس کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

۶- **گواهی** میں متہم نہ ہو، لہذا کسی دشمن کے خلاف یا باپ دادا یا اولاد کے حق میں گواہی قبول نہ ہوگی۔

۷- **گویا هو،** کسی گونگے کی گواہی قبول نہ ہوگی، گو اس کا اشارہ سمجھ میں آجائے۔

۸- **گواہ** بیدار مغز ہو پس کسی مغفل وسادہ لوح کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

۹- **سفاهت** کی وجہ سے مجور نہ ہو۔

تنبیہ: نکاح کے علاوہ دیگر امور میں گواہ بننے کے لئے صرف تمیز شرط ہے، لہٰذا کوئی فاسق، غلام، یا نابالغ گواہ بنے، پھر کامل ہونے کے بعد گواہی دے تو مقبول ہوگی۔

عدالت کے شرائط: ایک گواہ کے عادل ہونے کے لئے درج ذیل شرائط لازم ہیں:

۱-کبیرہ گناہوں سے اجتناب برتے۔

۲-صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ ہو، تاہم مجموعی طور پر کسی کے صغائر کے مقابلہ میں اس کی نیکیاں غالب ہوں، تو وہ عادل شمار ہوگا۔

۳-سلیم العقیدہ ہو، لہٰذا جو صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کو برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں، ان کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

۴-غصہ کے وقت قابو میں رہتا ہو، یعنی اپنے تصرفات میں حد سے تجاوز نہ کرے، اور باطل وجھوٹ میں نہ پڑ جائے۔

۵-اس جیسے افراد کے مروت کا لحاظ رکھے، یعنی اس کے طبقہ کے افراد کے اخلاق سے متصف ہو، جو وقت اور جگہ کے اعتبار سے عرف پر محمول ہوگا، اور اپنی شان کے خلاف کام نہ کرے، پس ایک شریف وعالم شخص بازار میں کھائے پیے یا سر کھلا رکھے، تو یہ اس کے حق میں مروت کے خلاف ہے (لیکن ایک قلی کے لئے خلاف مروت نہ ہوگا)

نابینا کی گواہی: صرف درج ذیل امور میں نابینا کی گواہی معتبر ہوگی۔

(۱) فریقین اور گواہوں کے کلام کا قاضی کے سامنے ترجمہ کر کے سمجھانا، کیونکہ اس میں دیکھنے وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) نسب، موت اور ملکیت وغیرہ وہ امور جو استفاضہ وشہرت سے ثابت ہوتے ہیں، جب کہ جس کے حق میں گواہی دے وہ نام ونسب کے اعتبار سے معروف ہو۔

(۳) نابینا ہونے سے قبل جس مسئلہ میں گواہ بنا تھا، نابینا ہونے کے بعد اس گواہی کو پیش کرسکتا ہے، جبکہ فریقین کا نام ونسب معروف ہو، دونوں یا کسی ایک کا نام ونسب مجہول ہو تو یہ گواہی معتبر نہیں۔

(۴) کوئی شخص اس کے پاس طلاق، آزادی یا کسی معروف شخص کے لئے مال وغیرہ کا اقرار کرے، اور یہ نابینا فوراً اس اقرار کرنے والے کو پکڑ لے اور قاضی کے سامنے اس اقرار کی گواہی دے تو یہ معتبر ہوگی۔ (ارشاد الساری شرح البخاری ۳۸۶/۴)

گواہی سے رجوع: سچی گواہی سے گواہوں کا رجوع کرنا حرام ہے، کیونکہ اس میں حقوق کی بربادی ہے، اور یہ رجوع شہادت کے چھپانے کی طرح ہوگا، جس سے قرآن نے روکا ہے اور اسے گناہ قرار دیا ہے۔ (دیکھئے سورہ بقرہ: ۲۸۳)

اگر جھوٹی گواہی ہو، تو اس سے رجوع کرنا واجب ہے، کیونکہ یہ کبیرہ گناہ ہے۔ حاکم کے فیصلہ سے قبل گواہ گواہی سے رجوع کریں، تو ان کی گواہی پر کسی بھی صورت میں فیصلہ کرنا ممنوع ہے۔ اگر زنا کی گواہی سے رجوع کریں، تو گواہوں پر حد قذف لگے گی۔ اگر مالی مسئلہ میں فیصلہ کے بعد اور مالی حق کے وصولیابی سے قبل رجوع کریں، تو یہ فیصلہ نافذ ہوگا، اور جس پر مال ثابت ہوا ہے، اس سے وصول کیا جائے گا، اگر کسی سزا کے فیصلہ کے بعد (چاہے سزا اللہ کا حق ہو یا بندہ کا) اور نفاذ سے قبل رجوع کریں تو سزا ساقط ہوگی، کیونکہ عقوبتیں شبہ کی وجہ سے ساقط ہوتی ہیں۔

فیصلہ اور اس پر عمل کے بعد گواہ رجوع کریں تو اس سے فیصلہ پر کچھ زد نہ پڑے گی، اب اگر حق سزا کے تعلق سے تھا، اور گواہ یہ کہیں کہ ہم نے عمداً وقصداً جھوٹی گواہی دی تھی تو ان پر دیت مغلظہ یا قصاص واجب ہوگا۔ اگر طلاق بائن یا لعان کی گواہی کی وجہ سے قاضی نے میاں بیوی میں تفریق کردی، پھر گواہ رجوع کریں، تو یہ جدائی ختم نہ ہوگی۔ اور ان رجوع کرنے والے گواہوں پر شوہر کو مہر مثل دینا لازم

ہے۔اسی طرح مال کے متعلق گواہی کے مطابق فیصلہ اور مال کی ادائیگی کے بعد رجوع کریں، تو ان گواہوں پر لازم ہے کہ جس کے خلاف مال کا فیصلہ ہوا، اسے مال کی وہ مقدار ادا کریں۔(فتح الوهاب مع الجمل ۵/۳۷۷، الفقه المنهجی ۸/۲۱۱-۲۲۱)

دَعْوٰی اور بَیِّنَہ

دَعْوٰی : عربی میں دعوی رغبت اور طلب کرنے کو کہتے ہیں، اور شرعاً: حاکم کے سامنے دوسرے کے اوپر اپنے حق کے وجوب کی خبر دینے کو دعوی کہتے ہیں۔

بَیِّنَه : بینہ یعنی واضح حجت و دلیل اور شرعاً: گواہوں کو بینہ کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے حق ظاہر و واضح ہوتا ہے۔

مشروعیت: اس کی مشروعیت کے لئے دیکھئے: سورۃ النور آیت: ۴۸، اور آل عمران، آیت: ۲۳۔ نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''قسم مُدَّعیٰ علیہ پر ہوگی'' (متفق علیه) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مُدَّعی سے فرمایا: ''تمہارے دو گواہوں یا اس (مُدَّعیٰ علیہ) کی قسم'' (پر فیصلہ ہوگا) (مسلم) ایک حدیث میں ارشاد ہے: ''بینہ مدعی کے ذمہ ہے۔ اور قسم مُدَّعیٰ علیہ پر'' (ترمذی)

مُدَّعِیْ اور مُدَّعیٰ علیه : جس کی بات ظاہر کے مخالف ہو، وہ مُدَّعی اور جس کی بات ظاہر کے موافق ہو، وہ مُدَّعیٰ علیہ کہلائے گا (دعوی کرنے والا مُدَّعی اور جس کے خلاف دعوی ہو وہ مدعی علیہ ہوگا۔ مثلاً جمیل یہ دعوی کرے کہ زید پر میرے ہزار روپے ہیں، تو جمیل مدعی اور زید مدعی علیہ کہلائے گا)

مدعی کی جانب چونکہ کمزور ہے، کیونکہ اس کا دعوی اصل کے یعنی برأت کے مخالف ہے، اس لئے قوی حجت یعنی بینہ کا مکلف قرار پایا اور مدعی علیہ کی جانب قوی ہے، کیونکہ اس کی بات اصل کے موافق ہے، لہٰذا اس کے لئے کمزور حجت یعنی قسم کو کافی سمجھا گیا۔

دعوی کی صحت کے شرائط : قاضی کے سامنے کسی بھی دعوی کی صحت کے (خواہ خون کا ہو یا غصب چوری وغیرہ کا) چھ شرائط ہیں:

(۱) دعوی معلوم ہو، یعنی مدعی اپنے دعوی کو مفصل پیش کرے، مثلاً یوں کہے: فلاں نے میرے رشتہ دار کو عمداً قتل کیا۔ اگر صرف یہ کہے کہ اس نے میرے رشتہ دار کو قتل کیا، تو دعوی قبول نہ ہوگا، تاہم قاضی کو سنت ہے کہ اس سے دعوی کی تفصیل کا مطالبہ کرے۔

(۲) دعوی لازم کرنے والا ہو، پس صرف ہبہ کا دعوی ہو، قبضہ کرانے کا دعوی نہ ہو، تو سنا نہ جائے گا، کیونکہ ہبہ بغیر قبضہ کے لازم نہیں ہوتا۔ اگر مدعی کہے: فلاں نے مجھے ہبہ کیا اور اس کی اجازت سے میں نے اس پر قبضہ کرلیا، تو اب دعوی مقبول ہوگا۔

(۳) دعوی میں مدعی علیہ کی تعیین ہو، ایک ہو یا زائد، اگر دعوی کرے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک نے قتل کیا، تو ابہام کی وجہ سے یہ دعوی مقبول نہ ہوگا، اور مدعی ان لوگوں کو قسم دلانے کا مطالبہ کرے تو قاضی ان کو قسم نہیں دلائے گا، کیونکہ دعوی ہی صحیح نہیں ہے۔

(۴) مدعی مکلف یعنی عاقل بالغ ہو، پس کسی بچہ یا پاگل کا دعوی مقبول نہ ہوگا۔

(۵) مدعی یا مدعی علیہ ایسا حربی نہ ہو، جس کو امان نہ ہو، کیونکہ وہ قصاص وغیرہ کا مستحق نہیں، اس کے سارے حقوق مہدر (رائیگاں) ہیں۔

(۶) اس کا ایک دعوی دوسرے دعوی کے منافی نہ ہو، پس ایک شخص پر تنہا قاتل ہونے کا دعوی کرے، پھر دعوی کرے کہ دوسرا بھی اس کا شریک تھا یا دوسرے نے تنہا قتل کیا، تو دوسرا دعوی معتبر نہ ہوگا، تاہم دوسرا مدعی علیہ مدعی کی تصدیق کرے، تو اس کے اقرار کی وجہ سے گرفت کرتے ہوئے یہ دعوی سنا جائے گا۔

مقدمہ کی سماعت : جب دعوی میں مذکورہ تمام شرائط موجود ہوں، تو دعوی صحیح ہوگا، اور قاضی اس کی سماعت کرے گا، پھر مدعی سے اپنے دعوی کی صحت پر بینہ کا مطالبہ کرے گا، اگر بینہ پیش کرے، تو اس کے دعوی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

اگر مدعی کے پاس اپنے دعوی کے متعلق بینہ نہ ہو، تو قاضی مدعی علیہ سے مطالبہ کرے گا کہ مدعی کے دعوی کی نفی پر قسم کھائے، اور وہ قسم کھالے تو قاضی اس کی برأت کا فیصلہ کرے گا۔ اگر مدعی علیہ قسم لینے سے انکار کرے، تو یہی قسم مُدعی کی طرف لوٹے گی، اور قاضی اس سے اپنے دعوی پر قسم کا مطالبہ کرے گا، اور وہ قسم کھالے تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ کرے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے قسم کو حق کے طالب کی طرف لوٹا دیا۔ (حاکم) (مدعی کی طرف لوٹنے والی اس قسم کو یمین رَدّ یا یمین مَرْدُوْدَہ کہا جاتا ہے)

یمین رد مدعی علیہ کے اقرار کی طرح ہے، پس مدعی کے قسم سے فارغ ہونے کے بعد قاضی کے فیصلہ کے بغیر ہی حق مدعی کے لئے واجب ہوگا اور بعد میں اس حق کو ساقط یا بری کرنے والے حجت کو سُنا نہ جائے گا۔ قاضی قسم کو مدعی کی طرف لوٹائے اور وہ بلاعذر قسم سے انکار کرے تو اس کا حق ساقط ہو جائے گا۔

دو کا دعوی : اگر کسی چیز کے متعلق دو آدمی دعوی کریں کہ یہ چیز میری ہے، اور کسی کے پاس گواہ نہ ہوں، تو وہ چیز جس کے قبضہ میں ہے، اس کی قسم کے ساتھ اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، اگر دونوں کے قبضہ میں ہو، تو دونوں بھی اس بات پر قسم لیں کہ یہ چیز دوسرے کی ملکیت نہیں ہے، پھر اسے دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا، جیسا کہ ایک جانور کے متعلق اس صورت میں آپ ﷺ نے فیصلہ فرمایا تھا (ابوداود، حاکم) (الفقہ المنہجی ۸/۲۰۳-۲۱۰)

قائف (قیافہ شناس)

لغت میں قائف اتباع و پیروی کرنے والے کو کہتے ہیں، اور شریعت میں اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم کی روشنی میں اشتباہ کی صورت میں جو نسب کا فیصلہ کرتا ہے، اسے قائف کہتے ہیں۔

شرائط : قائف میں گواہی کے تمام شرائط موجود ہوں، نیز نسب کی معرفت کا تجربہ بھی ہو، لہٰذا مختلف عورتوں اور ایک بچہ کو تین مرتبہ اس کے سامنے پیش کریں، جن میں اس کی ماں نہ ہو، چوتھی مرتبہ ماں کو بھی پیش کرے، اگر تمام مرتبہ وہ صحیح فیصلہ دے، تو آئندہ اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔ (اگر ہر مرتبہ الگ الگ عورت کا بچہ پیش کرتے رہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے) اگر مردوں کے ساتھ باپ کو اسی ترتیب سے پیش کریں تو یہ بھی کافی ہے۔

مسئلہ : اگر کسی لقیط وغیرہ مجہول النسب کے متعلق دو شخص دعوی کریں، یا دو اشخاص کسی عورت سے وطی بالشبہ کریں، اور پھر پیدا ہونے والے بچہ کا دونوں دعوی کریں، اور دونوں سے ہونے کا امکان ہو، یا کوئی شخص کسی کی بیوی سے وطی بالشبہ (صحبت شبہ) کرے اور اتنی مدت میں بچہ پیدا ہو کہ دونوں کا ہو سکتا ہے، تو اس صورت میں قائف کے سامنے پیش کریں گے، اور وہ جس شخص کے ساتھ بھی اس کا نسب جوڑ دے، جڑ جائے گا۔

اگر ایک کی صحبت کے بعد حیض آئے، پھر دوسرا صحبت کرے، تو بچہ دوسرے کا شمار ہوگا، تاہم پہلا شوہر ہو، جس کا نکاح صحیح ہو، تو اس کا تعلق ختم نہ ہوگا (یعنی قائف کے روبرو پیش کریں گے) لیکن نکاح فاسد ہو، تو اس کا تعلق ختم ہوگا (اور بچہ دوسرے کا ہوگا)۔ (فتح الوھاب مع حاشیۃ الجمل ۵/۴۳۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم الفرائض (میراث کا بیان)

مذہب اسلام دینِ فطرت ہونے کے ساتھ ایک جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے۔ اس میں صرف انسانی زندگی سے متعلق پیش آنے والے ہمہ جہت ورنگارنگ مسائل کے عادلانہ ومنصفانہ قوانین پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ عارضی زندگی کے خاتمہ کے بعد کے لئے بھی احکام و ضوابط دیئے گئے ہیں جس کی واضح مثال مسائل فرائض کے وسیع اور جامع نظام میں ملتی ہے۔ یہ خوش عقیدگی پر مبنی بے بنیاد خیال نہیں بلکہ دلائل وشواہد سے ثابت شدہ ایک واضح حقیقت ہے۔ اور قوانین میراث کے متوازن ومبنی برعدل ہونے کا مزید کشفِ حجاب اس وقت ہوگا جبکہ دیگر مذاہب وملتوں کے پیش کردہ قوانین کے ساتھ اس کا تقابل وموازنہ کیا جائے۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت میں استحقاقِ ارث کا اصلی و بنیادی سبب قوت اور رجولیت تھا۔ اسی طرح یہودی نظریہ میں بھی مردانگی کو اساسی حیثیت حاصل تھی۔ نیز ہندو مذہب کے ساتھ مبنی برعدل و انصاف سمجھے جانے والے قوانین ''رومن لاء'' میں بھی مرد ہی کو میراث کا حقیقی مستحق قرار دے کر قدرتی صنفِ نازک (عورتوں) سے یکسر صرف نظر کرلی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف مذہبِ اسلام نے اپنے قوانینِ میراث میں مرد وعورت کے طبعی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک کو اپنے تقاضوں کے مطابق مستحق میراث قرار دیا۔

مسائلِ فرائض کی اہمیت کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ میراث میں ایک ہی مقام پر تقریباً اکثر احکام نہایت اہتمام اور تعیین حصص کے ساتھ بیان فرمائے۔ اور آگے مزید اہتمام شان ''فَرِيضَةً مِّنَ اللهِ'' سے واضح فرمایا، چہ جائیکہ اس کے علاوہ بہت سی روایات میں نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے اس کی فضیلت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔ لیکن آج دین سے بیزاری اور احکامِ شرعیہ سے تغافل ولاپرواہی کی بناء پر اس اہم علم سے بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ جس کے نتیجہ میں مورث کے انتقال کے بعد فوراً تقسیمِ میراث کو معاشرہ میں بہت ہی زیادہ معیوب اور قابلِ ملامت سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کے لئے کچھ اقدام کرے تو اس علم کی اہمیت اور عدم تقسیم کے نتائج کی سنگینی سے ناواقف ہونے کی بناء پر وہ بے چارہ ہدف ملامت اور معتوب و مطعون قرار پاتا ہے۔ حالانکہ فوراً میراث تقسیم نہ کرنے سے کسی وارث کی حق تلفی یا اس پر ظلم یا اس کی رضامندی کے بغیر ناحق اس کے حق کو استعمال کرنے کے علاوہ اور بھی بہت پیچیدہ اور پریشان کن مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ حضرات عمرؓ، ابن مسعودؓ کا فرمان ہے کہ فرائض کا علم حاصل کرو کیونکہ یہ تمہارے دین میں داخل ہے۔ (دارمی)

لہٰذا حکم خداوندی پر عمل پیرا ہونے اور سنت نبوی کی کامل اتباع کا تقاضہ یہ ہے کہ معاشرہ کو اس علم کی ضرورت واہمیت سے متنبہ و چوکنا کرکے اس کے تعلق سے بے اعتنائی ولاپرواہی کے رجحانات کو دور کرنے کی کامیاب جدوجہد میں مصروف رہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس اہم فریضہ کو اپنے بندوں میں سو فیصد زندہ کرے اور اس کی خلاف ورزی کے گناہ ونقصانات سے مکمل حفاظت فرمائے۔ آمین

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''فرائض اور قرآن کا علم حاصل کرو، اور لوگوں کو سکھلاؤ، کیونکہ مجھے (اس دنیا سے عنقریب) اٹھالیا جائے گا۔ (ترمذی شریف ج/۲، ص ۲۹)

لغوی تعریف: فرائض یہ فریضۃ کی جمع ہے۔ اور لفظ فرض لغوی اعتبار سے چند معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً: ایک معنی ہے ''تقدیر'' (متعین کرنا) اور وارث کے متعینہ حصہ کو شرعاً فرض کہتے ہیں۔

اصطلاحی تعریف: تقسیمِ میراث کے مسائل اور حساب کے ان اصولوں کے جاننے کا نام ہے جن سے وارث کے متعینہ حصہ میت کے ترکہ سے معلوم کیا جاسکے۔

موضوع : میت کا ترکہ

اب چونکہ اس علم میں دراصل میت کے ترکہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس لئے یہاں پر ترکہ کی تعریف اور اس کے متعلقات کو مختصراً معلوم کریں۔

ترکہ کی تعریف : ہر وہ چیز جو موت کے وقت میت کی ملکیت میں ہو وہ ترکہ کہلاتی ہے۔ مثلاً مال وغیرہ، غیر منقولہ جائیداد جیسے زمین، مکان، باغ وغیرہ اور منقولہ جائیداد جیسے سونا، چاندی، سامانِ تجارت وغیرہ سب مال میں داخل ہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے اعتبار سے روپیوں کی مندرجہ ذیل صورتیں بھی ترکہ میں شامل ہیں۔

(الف) بینک میں رکھی ہوئی اصل رقم چاہے F.D. (فکسڈ ڈپازٹ) یا اس کے علاوہ کسی بھی اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی ہو۔ اس کی اصل رقم ترکہ میں شامل ہوگی البتہ رقم پر ملنے والا سود ترکہ میں شامل نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ بلانیت ثواب مستحقین زکوٰۃ پر خرچ کردے۔

(ب) سروس گریجویٹی، بونس، اسی طرح P.F. (پراویڈنٹ فنڈ) کے طور پر ملنے والی پوری رقم ترکہ میں شامل ہوگی۔

تنبیہ : Death Compensation (موت کی تلافی کے طور پر) ملنے والی رقم ترکہ میں شامل نہیں ہوگی۔ میت کے ورثہ میں سے جس کے بھی نام کمپنی وہ رقم جاری کرے تو وہی شخص اس رقم کا مالک ہوگا۔

ترکہ میت سے متعلق ہونے والے حقوق :

ورثہ میں ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے اس سے مندرجہ ذیل پانچ حقوق متعلق ہوتے ہیں، سب سے پہلے ان کی ادائیگی ضروری ہے۔

۱) وہ حق جو عین ترکہ سے متعلق ہو، جیسے موت سے پہلے اس کے موجودہ مال میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہو، اسی طرح ''رہن'' کے طور پر رکھی ہوئی چیز وغیرہ۔

۲) اسراف اور کفایت کے بغیر تجہیز و تکفین کا خرچ۔ البتہ بیوی کی تجہیز و تکفین کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہوگا، اگر بیوی موت سے پہلے شوہر کی نافرمانی (ناشزہ) ہوئی ہو تو پھر اس کا خرچ شوہر پر لازم نہیں ہوگا۔

۳) پھر میت کے ذمہ میں ثابت ہونے والے حقوق۔ جیسے گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ، کفارہ، حج بدل وغیرہ۔ اسی طرح میت کے ذمہ میں کسی کا قرض ہو تو اس کو بھی ادا کیا جائے گا۔ البتہ بندہ کے حق (قرض) پر اللہ کے حق (کفارہ، حج بدل وغیرہ) کو مقدم کیا جائے گا۔

۴) وارث کے علاوہ کسی شخص کے لئے وصیت کی ہو تو ثلث مال (ایک تہائی) میں اس کی وصیت نافذ ہوگی۔ اگر وصیت کی ہوئی چیز چیز ایک تہائی مال سے زائد ہو تو زائد میں نفاذ ورثہ کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

۵) ان مذکورہ حقوق کی ادائیگی کے بعد اگر مال بچتا ہو تو بقیہ مال کو میت کے ورثہ کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

ارکانِ ارث : ارکانِ ارث تین ہیں۔

۱) **مورث :** وہ شخص جس کا انتقال ہو گیا ہو۔

۲) **وارث :** جو مورث کے انتقال کے وقت زندہ ہو یا اس کا زندوں میں شمار ہو، جیسے حمل

۳) **میراث :**

اسبابِ ارث : اسبابِ ارث تین ہیں۔

۱) **نسب** (قرابت ورشتہ داری) ۲) **نکاح** ۳) **ولاء** (آزاد کرنا)

شرائطِ ارث : شرائطِ ارث تین ہیں۔

۱) مورث کی موت کے بعد وارث کی زندگی کا یقین ہو۔

۲) مورث کی موت کا یقین ہو۔

۳) وارث اور مورث کے درمیان سببِ ارث کا علم ہو۔

موانعِ ارث: مانع کی جمع موانع ہے۔اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے وارث مورث کی میراث سے کلی طور پر محروم ہوتا ہے۔

متفقہ موانع کل تین ہیں۔

۱) **غلامی:** یہ ایسا مانع ہے کہ غلام نہ تو خود وارث بن سکتا ہے اور نہ وہ کسی کو اپنا وارث بنا سکتا ہے۔اسلئے کہ غلام کا اپنی ملکیت میں کچھ نہیں۔جو کچھ اس کے پاس آئے اس پر آقا ہی کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔

۲) **قتل :** قاتل بھی اپنے مقتول کی وراثت سے محروم رہتا ہے۔چنانچہ حدیث میں وارث ہے" قاتل کے لئے (میراث میں سے) کچھ بھی حصہ نہیں ہے۔" (سنن دارمی ج/۲، ص ۳۸۵، مصنف عبدالرحمن ج/۹، ص ۴۰۴)

۳) **اختلافِ دین :** ایک مسلم کافر کا وارث نہیں بنتا اسی طرح کافر بھی کسی مسلم کا وارث نہیں بن سکتا۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:" مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔" (بخاری شریف، مسلم شریف جلد ۲، ص ۳۳)

نوٹ : میراث پانے کے لئے جیسے اسباب، ارکان اور شرائطِ ارث کا پایا جانا ضروری ہے اسی طرح موانع میں سے کسی مانع کا نہ پایا جانا بھی ضروری ہے، اگر تمام ارکان وغیرہ کے پائے جانے کے ساتھ کسی وارث میں کوئی مانع بھی پایا جاتا ہو تو پھر ایسا شخص مورث کے میراث کا مستحق نہیں ہوگا۔

ورثہ کی تعداد : مردوں میں سے کل پندرہ مرد وارث ہوتے ہیں۔

۱) بیٹا، ۲) پوتا پر پوتا تا آخر، ۳) باپ، ۴) دادا، پردادا، تا آخر، ۵) حقیقی بھائی، ۶) علاتی بھائی، ۷) اخیافی بھائی، ۸) حقیقی بھائی کا بیٹا، پوتا تا آخر، ۹) علاتی بھائی کا بیٹا پوتا تا آخر، ۱۰) حقیقی چچا، ۱۱) علاتی چچا، ۱۲) حقیقی چچازاد بھائی، ۱۳) علاتی چچازاد بھائی، ۱۴) شوہر، ۱۵) آزاد کرنے والا،

عورتوں میں سے کل دس عورتیں وارث ہوتی ہیں: ۱) بیٹی، ۲) پوتی، پر پوتی تا آخر، ۳) ماں، ۴) نانی، ۵) دادی، ۶) حقیقی بہن، ۷) علاتی بہن، ۸) اخیافی بہن، ۹) بیوی، ۱۰) آزاد کرنے والی۔

حقیقی ، عَلّاتِی، اَخیَافِیْ بھائی بھن کا مطلب :

جن بھائی اور بہنوں کے ماں باپ دونوں ایک ہی ہوان کو" حقیقی بھائی بہن" کہتے ہیں۔اور جن کے باپ ایک ہی اور ماں الگ الگ ہوں، گویا وہ آپس میں" باپ شریک" ہوں تو انہیں علاتی، اور جن کی ماں ایک ہی اور باپ جدا جدا ہوں گویا" ماں شریک" کو" اخیافی بھائی بہن" کہتے ہیں۔)

ان ورثہ میں سے تمام کے تمام بیک وقت وارث نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض ورثہ بعض کی موجودگی میں میراث نہیں پاتے۔ البتہ ان میں سے بعض ورثا ایسے ہیں جو کبھی بھی محجوب نہیں ہوتے۔ چاہے کوئی بھی وارث موجود ہے۔ بہرصورت میراث کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اور یہ کل چھ ہیں۔

۱) شوہر ۲) بیوی ۳) باپ ۴) ماں ۵) بیٹا ۶) بیٹی

ورثہ کی قسمیں : مذکورہ ورثہ میں تمام کی حیثیت ایک ہی نہیں ہے، بلکہ بعض ورثہ ذوی الفروض کی حیثیت سے میراث پاتے ہیں تو بعض کا شمار عصبات میں ہوتا ہے۔ البتہ بعض افراد کبھی فرضیت کے طور پر تو کبھی عصبیت کے طور پر مستحق میراث ہوتے ہیں۔ اور بعض بیک وقت فرضیت وعصبیت دونوں اعتبار سے وارث ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تمام ورثہ کو کل تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱) محض فرضیت کے طور پر میراث پانے والے جیسے، شوہر، بیوی

۲) محض عصبیت کے طور پر میراث پانے والے جیسے بیٹا، بھائی وغیرہ

۳) کبھی فرضیت تو کبھی بحیثیت عصبیت میراث پانے والے جیسے بیٹی، پوتی، بہن وغیرہ یا فرضیت وعصبیت دونوں اعتبار سے میراث پانے والے جیسے باپ، دادا

فرضیت و تعصیب کا مطلب : شرعاً وارث کے مقررہ حصہ کو فرض اور غیر متعینہ حصہ کو تعصیب کہتے ہیں۔

ذوی الفروض کی تعریف: جن ورثہ کا حصہ شرعاً متعین ہے ان کو 'ذوی الفروض' کہتے ہیں۔ اور چونکہ ذوی الفروض کی تعداد عصبات کے مقابلہ میں زیادہ ہے اسی مناسبت سے "تقسیم میراث" کے علم کو بھی "علم الفرائض" کا نام دیا جاتا ہے۔

ذوی الفروض کی تعریف کے بعد اب یہ ذہن نشین کرلیا جائے کہ قرآن مجید میں کل مقررہ حصے (فروض مقدرہ) چھ (۶) ہیں۔

۱) نصف (آدھا)- $\frac{۱}{۲} = \frac{۵۰}{۱۰۰}$ ۴) ثُلثان (دو تہائی)- $\frac{۲}{۳} = \frac{۶۶٫۶۶}{۱۰۰}$

۲) رُبع (چوتھائی)- $\frac{۱}{۴} = \frac{۲۵}{۱۰۰}$ ۵) ثُلث (ایک تہائی)- $\frac{۱}{۳} = \frac{۳۳٫۳۳}{۱۰۰}$

۳) ثُمن (آٹھواں حصہ)- $\frac{۱}{۸} = \frac{۱۲٫۵۰}{۱۰۰}$ ۶) سُدُس (چھٹا حصہ)- $\frac{۱}{۶} = \frac{۱۶٫۶۶}{۱۰۰}$

ورثہ میں سے کل بارہ افراد ذوی الفروض ہیں۔ ان میں سے چار مرد اور آٹھ عورتیں ہیں۔

مذکر ذوی الفروض: ۱) باپ، ۲) دادا، ۳) اخیافی بھائی، ۴) شوہر

عورتوں میں ذوی الفروض یہ ہیں: ۱) بیٹی، ۲) پوتی، پر پوتی تا آخر، ۳) بیوی، ۴) حقیقی بہن، ۵) علاتی بہن، ۶) اخیافی بہن، ۷) ماں، ۸) جدۂ صحیحہ (نانی دادی)

ذوی الفروض کی حالتیں:

باپ : باپ کی تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	سدس $\frac{۱}{۶}$	جبکہ لڑکا یا پوتا، یا پر پوتا (صرف مذکر اولاد) موجود ہو۔
۲	سدس $\frac{۱}{۶}$ اور عصبیۃ باقی	جبکہ لڑکی، پوتی یا پر پوتی تا آخر (صرف مؤنث اولاد) موجود ہو۔
۳	محض عصبہ	جبکہ میت کی مذکر ومؤنث کوئی بھی اولاد نہ ہو۔

دادا: دادا کی چار حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	سدس ۱/۶	جبکہ لڑکا یا پوتا، یا پرپوتا (صرف مذکر اولاد) ہو۔
۲	سدس ۱/۶ اور عصبیۃ باقی	جبکہ لڑکی، پوتی یا پرپوتی تا آخر (صرف مؤنث اولاد) ہو۔
۳	محض عصبہ	جبکہ کوئی بھی اولاد نہ ہو
۴	محجوب	جبکہ میت کا باپ موجود ہو

شوهر: شوہر کی دو حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	ربع ۱/۴	جبکہ میت بیوی کی مذکر و مؤنث اولاد میں سے کوئی بھی موجود ہو
۲	نصف ۱/۲	جبکہ بیوی کی کوئی اولاد موجود نہ ہو۔

اخیافی بهائی بهن: (یعنی ماں شریک بھائی بہن)

اخیافی بھائی بہن دونوں کا حصہ برابر ہے، یعنی بھائی کو بہن کا دوگنا حصہ نہیں ملتا اس لئے دونوں کو ایک ساتھ بیان کیا جارہا ہے، ان کی کل تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	سدس ۱/۶	جبکہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک ہو۔
۲	ثلث ۱/۳	جبکہ دو یا دو سے زیادہ ہوں۔
۳	محجوب	بیٹی یا پوتی میں سے کوئی موجود ہو۔

بیٹی: بیٹی کی تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف ۱/۲	جبکہ ایک ہو
۲	ثلثان ۲/۳	جبکہ دو (۲) یا دو سے زائد ہوں
۳	محض عصبہ	جبکہ میت کا بیٹا یعنی اس کا بھائی ہو اور بیٹے کو بیٹی کا دوگنا حصہ ملے گا۔

پوتی: پوتی کی چھ حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف ۱/۲	جبکہ ایک ہو

۲	ثلثان $\frac{۲}{۳}$	جبکہ دو یا دو سے زائد ہو
۳	سدس $\frac{۱}{۶}$	جبکہ میت کی ایک بیٹی موجود ہو، چاہے ایک ہی درجہ کی ایک یا ایک سے زائد پوتیاں ہوں۔
۴	عصبہ بغیرہ	جبکہ اس کے ساتھ اسی درجہ کا پوتا ہو اور پوتے کو پوتی کا دوگنا ملے گا۔
۵	محجوب	جبکہ میت کا بیٹا یا بیٹیاں ہوں۔
۶	عصبہ	جب دو بیٹیوں کی موجودگی میں پوتی محجوب ہو رہی ہو تو اس سے نچلے درجہ کا کوئی بھی پوتا اس کو اپنے ساتھ عصبہ بنائے گا گویا اعلیٰ درجہ کی محجوب ہونے والی پوتی کو اسفل درجہ کا پوتا عصبہ بنائیگا، پوتے سے نچلے درجہ میں محجوب ہونے والی پوتی کو عصبہ نہیں بنائے گا۔

بیوی : بیوی کی دو (۲) حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	ثمن $\frac{۱}{۸}$	جبکہ میت کی کسی بھی بیوی کی کوئی بھی اولاد موجود ہو۔
۲	ربع $\frac{۱}{۴}$	جبکہ کوئی اولاد نہ ہو

حقیقی بهن : حقیقی بہن کی چھ حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف $\frac{۱}{۲}$	جبکہ ایک ہو
۲	ثلثان $\frac{۲}{۳}$	جبکہ دو یا دو سے زائد ہوں
۳	عصبہ مع غیرہ	جبکہ میت کی بیٹی یا پوتی موجود ہو
۴	عصبہ بغیرہ	جبکہ میت کا حقیقی بھائی ہو اور بھائی کو بہن کا دوگنا حصہ ملے گا
۵	محجوب	جبکہ بیٹا، پوتا، یا باپ موجود ہو
۶	مقاسمہ	جبکہ میت کا دادا موجود ہو۔

علاتی بهن : علاتی بہن کی سات (۷) حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف $\frac{۱}{۲}$	جبکہ ایک ہو
۲	ثلثان $\frac{۲}{۳}$	جبکہ دو یا دو سے زائد ہوں۔

۳	سدس $\frac{1}{6}$	جبکہ میت کی ایک حقیقی بہن موجود ہو۔
۴	عصبہ بغیرہ	جبکہ اس کے ساتھ علاتی بھائی ہو، تو بھائی کو بہن کا دوگنا ملے گا۔
۵	عصبہ مع غیرہ	جبکہ میت کی بیٹی یا پوتی موجود ہو، بشرطیکہ حقیقی بہن موجود نہ ہو۔
۶	محجوب	جبکہ دو حقیقی بہنیں موجود ہوں اسی طرح میت کا بیٹا، پوتا، باپ یا حقیقی بھائی ہو نیز ایک حقیقی بہن عصبہ ہو رہی ہو تب بھی یہ محجوب ہوگی۔
۷	مقاسمہ	جبکہ میت کا دادا موجود ہو۔

ماں : ماں کی تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	سدس $\frac{1}{6}$	جبکہ میت کی اولاد یا کسی بھی قسم کے دو بھائی بہن موجود ہوں
۲	ثلث $\frac{1}{3}$	جبکہ اولاد یا دو بھائی بہن نہ ہوں۔
۳	ثلث ماقی	جبکہ میت کا شوہر اور باپ ہو یا میت کی بیوی اور باپ ہو۔

صرف ان دو حالتوں میں (۱-شوہر، ماں، باپ)، ۲-بیوی، ماں باپ)
ذوی الفروض (یعنی شوہر یا بیوی) کو اپنا حصہ دینے کے بعد بقیہ مال کا ثلث ($\frac{1}{3}$) ماں کو ملے گا۔

جدہ (نانی، دادی)

جدہ کی دو قسمیں ہیں۔(۱) جدۂ صحیحہ (۲) جدۂ فاسدہ

جس عورت کا میت سے رشتہ جوڑنے میں کہیں بھی دو عورتوں کے درمیان مرد نہ آتا ہو، اسے ''جدۂ صحیحہ کہتے ہیں۔جیسے، نانی، دادی ،نانی کی ماں وغیرہ اور اگر درمیان میں مرد کا واسطہ آتا ہو تو اسے جدۂ فاسدہ کہتے ہیں جیسے: نانا کی ماں، وغیرہ۔یہاں جدہ سے مراد یہی جدۂ صحیحہ ہے۔

جدۂ فاسدہ کا شمار ذوی الفروض میں نہیں ہوتا۔

جدۂ صحیحه کی دو (۲) حالتیں هیں۔

۱) سدس ($\frac{1}{6}$) جبکہ ایک یا ایک سے زائد ہوں۔

(نانی، دادی دونوں کا حصہ برابر ہے)

۲) محجوب۔اس کی چند صورتیں ہیں۔

الف :-ماں کی موجودگی میں تمام نانیاں اور دادیاں محجوب ہوتی ہیں۔

ب:-باپ کی موجودگی میں صرف تمام دادیاں محجوب ہوتی ہیں۔

ج:-قریب کی نانی دور کی نانی کو محجوب نہیں کرتی، بلکہ دونوں کو برابر حصہ ملتا ہے۔جیسے دادی پرنانی کو محجوب نہیں کرے گی۔

نوٹ : ذوی الفروض کی حالتوں میں ورثہ کے متعینہ حصے جس کیفیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر حصوں کا ذکر

خود قرآن مجید کی آیتِ میراث" يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ "ترجمہ: اللہ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے۔(سورۂ نساء پ۴، آیت ۱۱)

اور آیت کلالہ" يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ "ترجمہ: لوگ آپ سے پوچھتے ہیں آپ کہئے اللہ تم کو حکم دیتا ہے کلالہ کے بارے میں (کلالہ جس کے نہ ماں باپ ہوں اور نہ اولاد ہو)"(سورہ نساء، پ ۶، آیت ۱۷۷)

وغیرہ میں موجود ہے۔ اس لئے دلیل کے بغیر صرف حصوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔ صرف "جدہ" کا حصہ حدیث اور اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔

چنانچہ قبیصہ بن ذؤیبؓ سے مروی ہے: کہ ایک "جدہ" حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آ کر اپنی میراث کا مطالبہ کرنے لگی تو آپ نے فرمایا: کہ تیرا کتاب اللہ میں کوئی مقررہ حصہ نہیں اور سنتِ رسول میں بھی تیرے حصہ کا مجھے علم نہیں۔ لہٰذا فی الحال لوٹ جاؤ یہاں تک کہ دیگر صحابۂ کرام سے اس کی تحقیق کروں۔ چنانچہ جب صحابۂ کرام سے دریافت فرمایا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے "سدس" کا فیصلہ فرمایا۔ اور ان کے اس قول کی تائید حضرت محمد بن مسلمہؓ نے بھی فرمائی۔ اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے "جدہ" کے لئے "سدس" کو نافذ فرمایا۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں بھی پیش آیا۔ تو آپ نے بھی اس کے حق میں "سدس" ہی کا فیصلہ فرمایا۔

(ابوداؤد ج/۲، ص ۴۰۱، ترمذی ج/۲، ص ۳۰ و قال هذا حديث حسن صحيح)

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حقیقی وعلاتی بہن کی حالتوں میں "مقاسمہ" کی حالت بھی بیان کی گئی اس کا حاصل یہ کہ دادا کی موجودگی میں بھائی بہن محجوب نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ بھی میراث کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اس میں قدرے تفصیل ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اس کو حذف کیا جا رہا ہے۔

عصبات :

عصبہ سے مراد وہ ورثہ ہیں جن کا شرعاً کوئی حصہ مقرر نہیں بلکہ ذوی الفروض کی موجودگی میں بچا ہوا مال اور ذوی الفروض کے نہ ہونے کی صورت میں پورے مال کے مستحق ہوتے ہیں۔

عصبہ کی مشروعیت: عصبہ کے طور پر میراث پانے کی مشروعیت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (سورہ نساء، پ ۴، آیت ۱۱)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد باری ہے۔"وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ "ترجمہ: اور اگر (چند وارث) بھائی (بہن) ہوں مرد اور عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (ملیگا) (نساء پ ۴، آیت ۱۷۷)

یہ دونوں آیتیں بیٹے اور بھائی کی عصبیت کے طور پر میراث پانے پر دلالت کر رہی ہے۔ بایں طور کہ ہر ایک اپنی بہن کو عصبہ بنا رہا ہے۔

اس طرح حدیث شریف میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:" الحقو الفرائض باهلها، فما بقى فلا ولى رجل ذكر "(بخاری و مسلم)

ترجمہ: مقررہ حصوں کو ذوی الفروض کے ساتھ لاحق کرو، اور جو کچھ بچے وہ سب سے قریبی مذکر مرد کے لئے ہے۔

اس حدیث سے بطور عصبیت میراث پانے کا ثبوت فراہم ہو رہا ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوا کہ اگر متعدد عصبات جمع ہو جائیں تو میت سے جو زیادہ قریبی ہوگا اس کو ابعد پر مقدم کیا جائے گا۔

عصبہ کے اقسام :

عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱) عصبہ سببی: جیسے آزاد کرنے والا

۲) عصبہ نسبی: جیسے تمام مذکر ورثہ سوائے شوہر اور اخیافی بھائی کے عصبہ نسبی تین قسموں پر مشتمل ہیں۔

۱) عصبہ بالنفس (۲) عصبہ بالغیر (۳) عصبہ مع الغیر

عصبہ بالنفس: ہر وہ مرد جس کے اور میت کے درمیان کوئی عورت کا واسطہ نہ ہو، اس کی چار قسمیں ہیں۔

۱) اصول یعنی باپ، دادا تا آخر (۲) فروع یعنی بیٹا، پوتا تا آخر، (۳) باپ کے فروع یعنی بھائی اور بھائی کی مذکر اولاد تا آخر، (۴) دادا کے فروع یعنی چچا اور چچا کی مذکر اولاد تا آخر

عصبہ بنفسہ صرف مرد ہی ہیں اور وہ ترتیب وار یہ ہیں۔ ان میں سے اقرب (پہلے) کی موجودگی میں ابعد (بعد والا) وارث نہیں ہوتا۔

(۱) بیٹا	(۲) پوتا	(۳) باپ	(۴) دادا
(۵) حقیقی بھائی	(۶) علاتی بھائی	(۷) حقیقی بھائی کا بیٹا	(۸) علاتی بھائی کا بیٹا
(۹) حقیقی چچا	(۱۰) علاتی چچا	(۱۱) حقیقی چچا کا بیٹا	(۱۲) علاتی چچا کا بیٹا
(۱۳) دادا کا حقیقی بھائی	(۱۴) دادا کا علاتی بھائی	(۱۵) دادا کے حقیقی بھائی کا بیٹا	(۱۶) دادا کے علاتی بھائی کا بیٹا

اسی طرح آگے یہ سلسلہ چلتا ہے۔

عصبہ بالغیر: اس سے مراد وہ حصہ پانے والی عورتیں ہیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں۔

یہ کل چار ہیں (۱) بیٹی (۲) پوتی (۳) حقیقی بہن (۴) علاتی بہن

عصبہ مع الغیر: وہ عورتیں جو بیٹی یا پوتی کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں۔

یہ کل دو ہیں (۱) حقیقی بہن (۲) علاتی بہن

حجب

حجب کے لغوی معنی: روکنا جیسے قرآن مجید میں ہے۔ ”كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ “ (المطففین)

اصطلاحی تعریف: وارث کا وراثت سے کلی یا جزئی طور پر محروم ہو جانا۔

حجب کے احکامات اور اس کی تفصیلات کے جاننے کو ”علم فرائض“ میں بہت ہی زیادہ اہمیت ہے اور علم فرائض جاننے والے کو ان احکامات سے واقفیت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء کرام نے یہاں تک فرمایا ”جو حجب کی تفصیلات سے ناواقف ہو، تو اسے فرائض میں فتویٰ دینا حرام ہے۔“ اور یہ حقیقت ہے کہ اس کا علم نہ ہونے کی وجہ سے مستحق وارث کو محروم کرنا یا محروم وارث کو مستحق

قرار دینالازم آئے گا۔اس لئے ہم بھی یہاں نہایت مختصر انداز میں اس کے بنیادی اجزاء پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حجب کی اقسام : حجب کی دوقسمیں ہیں۔

(۱) حجب بالاوصاف (۲) حجب الاشخاص

حجب بالاوصاف : موانع ارث میں سے کسی مانع کے پائے جانے کی وجہ سے وارث وراثت سے محروم ہو جائے، ایسے وارث کومحروم بھی کہتے ہیں۔

حجب بالاشخاص: کوئی وارث کسی دوسرے قریبی وارث کے موجود ہونے کی وجہ سے بالکل میراث نہ پائے یا میراث میں سے کم حصہ پائے، ایسے وارث کو مجوب بھی کہتے ہیں۔

اس آخر کی دوقسمیں ہیں۔

(۱) حجب حرمان (۲) حجب نقصان

حجب حرمان : کسی قریبی وارث کی وجہ سے کلی طور پر میراث سے مجوب ہو جائے جیسے پوتے کا مجوب ہونا بیٹے کی موجودگی میں۔

حجب نقصان : کوئی وارث بڑے حصے سے مجوب ہو کر چھوٹا حصہ پائے جیسے۔اولاد کی موجودگی میں شوہر بڑا حصہ ($\frac{1}{2}$) سے مجوب ہو کر چھوٹا حصہ ربع ($\frac{1}{4}$) پاتا ہے۔

مخصوص احوال میں حجب نقصان تو تمام ورثہ پر طاری ہوسکتا ہے۔تاہم ان میں کل چھ افراد ایسے ہیں کہ جن پر کبھی بھی حجب حرمان طاری نہیں ہوتا یعنی یہ افراد کسی قریبی وارث کی وجہ سے کلی طور پر مجوب نہیں ہوتے۔وہ یہ ہیں۔

(۱) باپ (۲) ماں (۳) بیٹا (۴) بیٹی (۵) شوہر (۶) بیوی

ان چھ کے علاوہ دیگر ورثہ پر حجب نقصان کی طرح حجب حرمان بھی طاری ہوسکتا ہے یعنی کسی قریبی وارث کی موجودگی میں بالکل بھی میراث سے مجوب ہوسکتے ہیں۔

مثلاً: حجب حرمان کے طور پر مجوب ہونے والے وہ ورثہ ہیں جن کو "ذوی الفروض" کے حالات میں "مجوب" کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

محروم و محجوب میں فرق :

مانع ارث کے پائے جانے کی وجہ سے محروم ہونے والا شخص کسی دوسرے وارث کے نہ حجب حرمان کا سبب بنتا ہے اور نہ ہی حجب نقصان کا۔گویا محروم کالمعدوم ہے۔اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔جیسے بیٹا قاتل یا کافر ہو تو وہ نہ پوتے کو مجوب کرے گا اور نہ ہی کسی دوسرے وارث کو۔

اس کے برخلاف کسی فرد کی وجہ سے مجوب ہونے والا وارث کسی دوسرے وارث کے حجب نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔جیسے: دو بھائی باپ کی موجودگی میں مجوب ہوتے ہیں لیکن یہی ماں کے بڑے حصہ ($\frac{1}{3}$) کو چھوٹا حصہ ($\frac{1}{6}$) کردیتے ہیں۔

مخارج

اس عنوان کے تحت ہم یہ بیان کرنے جارہے ہیں کہ کسی میت کے متعدد ورثاء ہوں تو اس کا ترکہ ان میں حصوں کے تناسب سے کیسے تقسیم کیا جائے گا، یہاں تقسیم میراث کے لئے مسئلہ بناتے وقت ''مخرج'' متعین کرنے کی ضرورت پیش آئیگی۔ اسی لئے ''فرائض'' کی تعریف میں ''حساب'' کے اصولوں کے جاننے کا بھی ذکر کیا گیا۔ ''اصول حساب'' سے ناواقفیت کے ساتھ ورثہ کے مقررہ حصوں کو ترکہ سے معلوم کرنا ممکن نہیں۔

مخرج کی تعریف: اس سب سے چھوٹے عدد کو کہتے ہیں جس سے وارثوں کے تمام مقررہ حصے ان میں بلا کسر تقسیم ہوسکیں۔

قرآن میں مقررہ حصے کل چھ ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم میں تین حصے	اسی طرح	دوسری قسم میں بھی تین حصے ہیں
نصف		ثلثان
ربع		ثلث
ثمن		سدس

کل سات اعداد مخرج بن سکتے ہیں۔

۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۲، ۲۴

اگر مسئلہ میں ذوی الفروض میں سے کوئی ایک ہی وارث ہو تو اسی وارث کے حصہ سے مخرج متعین کریں گے۔ جیسے: صرف نصف والا وارث ہو تو مخرج ''۲'' صرف ثلث والا ہو تو ''۳'' اسی طرح ثلثان والے میں بھی ''۳'' اگر صرف ربع ہو ''۴'' صرف سدس ہو تو ''۶'' اور صرف ثمن ہو تو مخرج ''۸'' آئیگا۔

اگر متعدد ورثہ جمع ہوجائیں، ان میں صرف پہلی ہی قسم کے حصہ والے ہوں تو ان میں سب سے چھوٹے حصہ کا جو عدد ہو وہ ''مخرج'' ہوگا جیسے:

۱) المسئلہ

بیوی	بیٹی

۲) المسئلہ

بیوی	حقیقی بہن

پہلی مثال میں ''نصف'' اور ''ثمن'' جمع ہے، تو ان میں چھوٹے حصہ کا عدد ''۸'' کو مخرج بنائے۔

دوسری مثال میں ''نصف'' اور ''ربع'' جمع ہے تو ان میں چھوٹے حصہ کا عدد ''۴'' کو مخرج بنائے۔

☆ اسی طرح مختلف ورثہ میں صرف دوسری قسم کے حصہ والے ہوں تو ان میں بھی جو سب سے چھوٹے حصہ کا عدد ہوگا اس کو ''مخرج'' بنائیں گے۔ جیسے:

المسئلہ

حقیقی بہنیں ۲	دادی	اخیافی بھائی ۳

اس مثال میں دوسری قسم کے تینوں حصے جمع ہوئے تو ان میں چھوٹے حصہ کے عدد "۶" کو مخرج بنائے۔

☆ اگر پہلی اور دوسری دونوں قسم کے حصہ والے ورثہ جمع ہو جائیں تو مخرج بنانے کی ترتیب یہ ہے اگر پہلی قسم کا صرف "نصف" دوسری قسم کے تمام حصوں یا بعض حصوں کے ساتھ آئے تو مخرج "۶" ہوگا جیسے:

المـــــــــــــــــــــ

شوہر   اخیافی بھائی ۳   دادی   حقیقی بہنیں ۳

اس مثال میں پہلی قسم کا "نصف" دوسری قسم کے تمام حصوں کے ساتھ جمع ہے۔ اس لئے مخرج "۶" آیا ہے۔

☆ اگر پہلی قسم کا صرف "ربع" دوسری قسم کے تمام یا بعض حصوں کے ساتھ جمع ہو تو مخرج "۱۲" ہوگا جیسے

المـــــــــــــــــــــ

بیوی   اخیافی بہنیں ۳   ماں

اس مثال میں "ربع" دوسری قسم کے بعض کے ساتھ جمع ہے، اس لئے مخرج "۱۲" آیا ہے۔

☆ اسی طرح پہلی قسم کا صرف "ثمن" دوسری قسم کے تمام یا بعض حصوں کے ساتھ جمع ہو تو مخرج "۲۴" ہوگا۔ جیسے:

المـــــــــــــــــــــ

بیوی   بیٹیاں ۳   ماں

اس مثال میں "ثمن" دوسری قسم کے بعض کے ساتھ جمع ہے اس لئے مخرج "۲۴" آیا ہے۔

☆ اگر پہلی قسم کے بھی متعدد حصے والے دوسری قسم کے تمام یا بعض حصوں کے ساتھ جمع ہوں تو پہلی قسم کے چھوٹے حصے کے عدد کا لحاظ ہوگا۔ جیسے:

المـــــــــــــــــــــ

بیوی   حقیقی بہن   علاتی بہن   دادی

اس مثال میں پہلی قسم کے "ربع" اور "نصف" دوسری قسم کے بعض کے ساتھ جمع ہو رہے ہیں۔ اس لئے پہلی قسم کے چھوٹے حصہ (ربع) کے عدد کا لحاظ کرتے ہوئے مخرج "۱۲" متعین کئے ہیں۔

اب تک متعدد مخارج متعین کرنے کا جو طریقہ بیان ہوا وہ اس وقت جبکہ مسئلہ میں ذوی الفروض میں سے ورثہ موجود ہوں۔ اگر ذوی الفروض میں سے کوئی نہ ہو۔ صرف عصبات ہوں تو مخرج عصبات کے عدد رؤس سے متعین کریں گے۔ جیسے

المـــــــــــــــــــــ

بیٹے ۵

اس مثال میں صرف عصبہ ہے۔ اس لئے ان کے عدد رؤس ۵ ہونے کی بناء پر مخرج ''۵'' آیا ہے۔

ایک قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مذکر و مؤنث دونوں جمع ہو جائیں مثلاً بیٹا، بیٹی یا بھائی، بہن تو ایسی صورت میں مؤنث کے مقابلہ میں مذکر کو دوگنا شمار کریں گے۔ جیسے

الم ۱۳

بیٹے ۵	بیٹیاں ۳
ع	

اس مسئلہ میں پانچ بیٹوں کو دوگنا (دس) اور بیٹیوں کو تین ہی شمار کر کے مخرج ''۱۳'' آیا۔

البتہ اخیافی بہنوں میں مذکر کو دوگنا شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ ان میں مذکر و مؤنث دونوں کو برابر حصہ ملے گا۔

مسئلہ بنانے کا طریقہ: میت کے ورثہ کا ترکہ میں سے حصہ معلوم کرنا ہو تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ایک لمبی لکیر کھینچیے اور اس کے نیچے اس کے تمام ورثہ کو الگ الگ لکھے۔ پھر جس وارث کو بیان کردہ حالتوں کے مطابق جو حصہ ملتا ہے وہ حصہ اس کے نیچے لکھے۔ اگر کوئی وارث عصبہ بنتا ہو تو اس کے نیچے ''ع'' کا نشان لگائے۔ اسی طرح کوئی شخص محجوب ہوتا ہو تو اس کے نیچے ''م'' کا نشان لگائے۔ اس کے بعد ذوی الفروض کے حصوں میں غور کر کے ماقبل کے بیان کردہ قاعدوں کے مطابق کوئی ایک مخرج متعین کرے۔

مخرج میں سے ہر وارث کا حصہ معلوم کرنے کا طریقہ: ہر وارث کا حصہ معلوم کرنا ہے تو اس کے دو طریقہ ہیں (۱) وارث کے حصہ کے ''نسب نما'' سے کل مخرج کو تقسیم کرے اور حاصل قسمت کو اس کے ''شمار کنندہ'' میں ضرب دیں، جو حاصلِ ضرب ہو وہی اس وارث کا حصہ ہوگا۔

(۲) حصہ کے ''نسب نما'' میں جو عدد ہے اس کے پہاڑے کو مخرج کا عدد آنے تک شمار کرتے رہے، جتنی مرتبہ میں مخرج کا عدد آئے وہی ''عدد'' اس وارث کا حصہ ہوگا۔ مثلاً کسی وارث کو ثلث ۱/۳ ملا ہو اور اس مسئلہ کا مخرج ''۱۲'' ہو تو ۳ کا پہاڑہ شمار کرتے ہوئے چوتھی مرتبہ (چوتھے عدد) میں ''۱۲'' پر پہنچیں گے لہٰذا اس وارث کے لئے ''۱۲'' میں سے ''۴'' لکھا جائے گا۔ اسی طرح دیگر ورثہ کا حصہ معلوم کریں۔

مخرج میں سے ذوی الفروض کو حصہ دینے کے بعد جتنے حصے باقی ہوں وہ تمام عصبہ کو ملیں گے۔ اگر ذوی الفروض کو حصہ دینے کے بعد جب جتنے حصے باقی ہوں وہ تمام عصبہ کو ملیں گے۔ اگر ذوی الفروض کو دینے کے بعد مخرج میں سے کچھ نہ بچتا ہو تو عصبہ کو کچھ نہیں ملے گا۔

نوٹ: مخرج میں سے حاصل شدہ حصوں کو ''سہم'' اور ایک ہی وارث میں متعدد افراد ہوں تو انہیں ''عدد رؤس'' کہتے ہیں۔

مثلاً (۱) الم ۱۲

شوہر	بیٹی	پوتی	حقیقی بھائی	علاتی بھائی
۱/۴	۱/۲	۱/۶	ع	م
۳	۶	۲	۱	

مثال (۲) الم ۱۲

علاتی بھائی	حقیقی بہن ۱	اخیافی بہن	اخیافی بھائی	ماں	نانی	دادی
ع	۱/۲	۱/۳	۱/۳	۱/۶		م
-	۳	۲		۱		

عول

عول کے لغوی معنی : بلند ہونا، زیادہ ہونا

اصطلاحی تعریف: ذوی الفروض کے مجموعی سہام ''مخرج'' سے بڑھ جائیں جس کی بناء پر تمام ورثہ کے ''سہام'' میں ان کے حصوں کے تناسب سے کمی واقع ہو۔

اگر کسی مسئلہ میں ''عول'' ہو رہا ہو تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اولاً تمام ورثہ کو ''مخرج'' میں سے اپنا متعینہ حصہ دے دیں پھر مجموعی سہام کی تعداد کے بقدر ''مخرج'' کو زیادہ کریں۔

مثلاً:

الم

شوہر	حقیقی بہن	اخیافی بھائی ۳	علاتی بہن	دادی
۱/۲	۱/۲	۱/۳	۱/۶	۱/۶
۳	۳	۲	۱	۱

اس مثال میں مخرج ''۶'' تھا، لیکن ذوی الفروض ہی کے مجموعی سہام اس سے زیادہ ہوئے اس لئے ورثہ کے حصوں کی تعداد کے بقدر ''عو'' کا نشان بنا کر مخرج کو زیادہ کیا، اب کل جائیداد کے ''۶'' حصے کرنے کے بجائے ''۱۰'' حصے کریں گے، جس کی وجہ سے لازماً ہر وارث کا حصہ اس کے تناسب سے کم ہوگا۔

مشروعیت عول : ''عول'' کا مسئلہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آیا تو آپ نے اس بارے میں صحابۂ کرام سے مشورہ فرمایا تو حضرت زید بن ثابتؓ نے ''عول'' کی رائے پیش کی پھر اس پر حضرت عمرؓ کی رائے بھی متفق ہوئی اور صحابۂ کرام نے بھی اس سے موافقت کی۔ گویا اجماع صحابہ سے اس کی مشروعیت ثابت ہے اسی لئے امام شافعی کے ساتھ جمہور علمائے امت نے اسی کو اختیار کیا۔

مخارج کا عول : کل مخارج سات ہیں ان میں سے ۲/۳/۴/۸ کا کبھی عول نہیں آتا۔ ان کے علاوہ ۶/۱۲/۲۴ میں کبھی عول ہوسکتا ہے۔

۶ کے عول کل چار (۴) آتے ہیں = ۷/۸/۹/۱۰

۱۲ کے عول کل تین (۳) آتے ہیں = ۱۳/۱۵/۱۷

۲۴ کا عول صرف ایک ہی آتا ہے = اور وہ ''۲۷'' ہے۔

مثلاً (۱)

۶ عـو ۹

الم

شوہر	حقیقی بہنیں ۳	اخیافی بہنیں ۴	علاتی بہن
۱/۲	۲/۳	۱/۳	م
۳	۴	۲	

(۲) المسئلہ ۱۲ عو ۱۷

بیوی	اخیافی بھائی ۳	حقیقی بہنیں ۵	ماں
۱/۴	۱/۳	۲/۳	۱/۶
۳	۴	۸	۲

(۳) المسئلہ ۲۴ عو ۲۷

بیوی	بیٹیاں ۴	ماں	باپ
۱/۸	۲/۳	۱/۶	۱/۶ ع
۳	۱۶	۴	۴

پہلی مثال میں "۶" کا عول "۹" دوسری مثال میں "۱۲" کا عول "۱۷" اور تیسری مثال میں "۲۴" کا عول "۲۷" آیا ہے۔

نوٹ: عول میں جو اعداد بیان کئے گئے ہیں ان ہی میں سے کسی ایک عدد سے عول آسکتا ہے، اس کے علاوہ کسی اور عدد سے عول نہیں آسکتا۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ جس مسئلہ میں "عول" ہو رہا ہو اس میں "عصبہ" موجود ہو تو اسے میراث سے کچھ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ ترکہ خود ذوی الفروض ہی کے لئے ناکافی ہوا جس کے نتیجہ میں مخرج زیادہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

رد

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ورثہ کے حصے متعین فرمائے اور ساتھ ہی ورثہ کے درمیان فرضیت وتعصیب کے طور پر تقسیم میراث کی کیفیت واضح فرمائی۔ مزید برآں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی اس کی تصریح کرتا ہے۔ "اَلْحِقُوْا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَلَا وَلَى رَجُلٌ ذکر (بخاری شریف ۲/۹۹۷، مسلم شریف، ج/۲، ص ۳۴)

لہٰذا ورثہ میں ذوی الفروض کے ساتھ عصبہ موجود ہو تو حکم بالکل واضح ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد مابقی کا عصبہ مستحق قرار پائے گا، اور یہی صورت کثیر الوقوع ہے۔

لیکن کبھی ورثہ میں عصبہ نہ ہونے کی وجہ سے ذوی الفروض کو اپنے سہام دینے کے بعد کچھ سہام بچ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں بقیہ سہام متقدمین کے قول کے مطابق بیت المال میں جمع کئے جائیں گے۔ تاہم ہمارے زمانہ میں بیت المال کا مستقل نظم درست نہ ہونے کی بناء پر بقیہ ترکہ ان ہی ذوی الفروض پر ان کے حصوں کے تناسب سے دوبارہ تقسیم کیا جائے گا جیسا کہ متاخرین کے قول سے مستفاد ہوتا ہے۔ (تحفۃ المحتاج ج ۶، ص ۳۹۰)

رد کی تعریف: مخرج کا زیادہ ہونا اور ورثہ کے سہام کا کم ہو جانا مخرج سے باقی ماندہ سہام ذوی الفروض پر دوبارہ تقسیم کرنے کو "رد" کہتے ہیں۔

"عول" کی ضد "رد" ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ کسی مسئلہ میں عصبہ موجود ہو تو رد کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ کیونکہ باقی ماندہ سہام عصبہ بطور عصبیت لے گا۔

رد میں ذوی الفروض کی قسمیں: زوجین کے علاوہ دیگر ذوی الفروض پر "رد" ہو سکتا ہے، لہٰذا اس میں ورثہ کی

دو قسمیں ہیں۔(۱) زوجین (مَنْ لَا یُرَدُّ عَلَیْهِمْ یعنی جن پر رد نہیں کیا جاتا) (۲) غیر زوجین (مَنْ یُرَدُّ عَلَیْهِمْ یعنی جن پر رد کیا جاتا ہے)

رد کے قواعد: اگر کسی مسئلہ میں رد ہو تو اس کو بنانے کے چار قواعد ہیں۔

۱) زوجین میں سے کوئی نہ ہو اور بقیہ ذوی الفروض میں سے ایک قسم کا وارث موجود ہو تو مسئلہ ان کے عدد رؤس سے بنے گا جیسے

المسئلہ ۳ رد سے پہلے	المسئلہ ۸ رد کے بعد
بیٹیاں ۸	بیٹیاں ۸
۲/۳	۸
۲	

اس مثال میں بیٹیوں کو "ثلثان" دینے کے بعد ایک ثلث لینے کے لئے کوئی وارث نہیں تھا، اس لئے ایک ہی قسم کا وارث ہونے کی بناء پر مخرج ان کے عدد رؤس سے متعین کیا گیا۔

۲) زوجین میں سے کوئی نہ ہو اور بقیہ ذوی الفروض دو یا دو سے زیادہ قسم کے ہوں تو ان کے مجموعی سہام کو مخرج کے طور پر متعین کریں گے۔ جیسے

المسئلہ ۶	رد سے پہلے	المسئلہ ۶	رد الی ۵
حقیقی بہن	اخیافی بھائی ۲	حقیقی بہن	اخیافی بھائی ۲
۱/۲	۱/۳	۱/۲	۱/۳
۳	۲	۳	۲

اس مثال میں "۶" مخرج سے کل پانچ سہام تقسیم ہوئے۔ ایک حصہ کو لینے والا کوئی نہیں اس لئے ورثہ کے مجموعی سہام "۵" کو اصل مسئلہ کے آگے "ردالی" لکھ کر مخرج بنایا گیا۔ گویا رد کے بعد مخرج "۶" کے بجائے "۵" ہی سمجھا جائے گا۔

۳) زوجین میں سے کوئی اور بقیہ ذوی الفروض ایک ہی قسم کے ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱) سب سے پہلے زوجین کے حصہ سے مخرج متعین کریں گے۔ اس میں سے شوہر یا بیوی کا حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ سہام بقیہ ذوی الفروض کے عدد رؤس پر برابر تقسیم ہوں تو تصحیح کی ضرورت نہیں۔ جیسے:

المسئلہ ۱۲	رد سے پہلے	المسئلہ ۴	رد کے بعد
شوہر	بیٹیاں ۳	شوہر	بیٹیاں ۳
۱/۴	۲/۳	۱/۴ (۳)	
۳	۸	۱	۳

اس مثال میں شوہر کے حصہ (۱/۴) سے "۴" مخرج متعین کر کے شوہر کا حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ سہام "۳" بقیہ ذوی الفروض میں سے تین بیٹیوں کے عدد رؤس پر برابر تقسیم ہو رہے ہیں اس لئے مزید کچھ عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲) اگر باقی ماندہ سہام بقیہ ذوی الفروض کے عدد رؤس پر برابر تقسیم نہ ہوتے ہوں تو عدد رؤس کو زوجین میں کے مسئلہ میں ضرب دے کر اس میں سے شوہر یا بیوی کا حصہ دیں گے۔ اور باقی ماندہ تمام حصے اس دوسرے وارث کو دیں گے۔ جیسے

المــــ ۱۲	رد سے پہلے	المــــ ۴×۴=۱۶	رد کے بعد
بیوی	اخیافی بھائی ۴	بیوی	اخیافی بھائی ۴
۱/۴	۱/۳	۱/۴ (۳)	۳
۳	۴	۴	۱۲

اس مثال میں بیوی کو اپنا حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ ''۳'' سہام دوسرے وارث کے رؤس پر برابر تقسیم نہیں ہورہے تھے۔ اس لئے کل عدد رؤس سے اصل مسئلہ میں ضرب دے کر کل تصحیح ''۱۶'' ہوئی۔ اس میں بیوی کا ''ربع'' چار حصے دیئے اور باقی ماندہ ''۱۲'' حصے دوسرے وارث کو دیئے گئے۔

۴) زوجین میں سے کوئی ہو اور بقیہ ذوی الفروض دو یا دو سے زیادہ قسم کے ہوں زوجین وغیر زوجین دونوں کا الگ الگ مسئلہ بنائیں گے۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ زوجین کے لئے شوہر یا بیوی کے حصہ کو مخرج بنا کر اس میں سے اس کا حصہ دیں گے۔ پھر بقیہ ذوی الفروض کا مسئلہ'' دوسرے قاعدے'' یعنی اس کے سہام سے بنائیں گے۔ اب یہ دیکھیں کہ شوہر یا بیوی کا حصہ دینے کے بعد جو باقی ماندہ ہے وہ بقیہ ذوی الفروض کے مخرج پر برابر تقسیم ہورہا ہے یا نہیں۔ اگر باقی ماندہ برابر تقسیم ہوتا ہو تو تصحیح کا عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ زوجین کے ہی مخرج کو دونوں مسئلوں کا'' مشترکہ مخرج'' تصور ہوگا۔ اس سے شوہر یا بیوی اور بقیہ ذوی الفروض کا حصہ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر یا بیوی کو جو اپنے مخرج سے جو حصہ ملا ہے اسے بقیہ ذوی الفروض کے مخرج میں ضرب دیں۔ حاصل ضرب اس کا حصہ ہوگا۔'' مشترکہ مخرج'' میں سے۔

اور دوسرے مسئلہ کے ورثہ کو جو حصہ ملا ہے، ہر ایک کے حصہ کو شوہر یا بیوی کے مخرج سے'' باقی ماندہ عدد'' میں ضرب دیں۔ حاصل ضرب ہر وارث کا مشترکہ مخرج میں سے حصہ شمار کیا جاوے گا۔ جیسے

المــــ ۱۲	رد سے پہلے	
بیوی	اخیافی بھائی ۳	ماں
۱/۴	۱/۳	۱/۶
۳	۴	۲

المــــ ۴	۶ رد الی ۳	رد کے بعد
بیوی	اخیافی بھائی ۳	ماں
۱/۴ (۳)	۱/۳	۱/۶
۱	۲	۱

اس مثال میں پہلے زوجین کے مسئلہ میں بیوی کے حصہ سے مخرج متعین کیا گیا۔ اس میں سے بیوی کو ایک حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ ''۳'' ہیں۔ پھر بقیہ ذوی الفروض کے مسئلہ میں مخرج ''۶'' سے ''۳'' پر رد ہوا یعنی ان کے سہام سے مخرج بنایا گیا۔ اور یہ دوسرے مسئلہ کا مخرج ''۳'' زوجین کے مسئلہ سے باقی ماندہ ''۳'' پر برابر تقسیم ہورہا ہے اس لئے تصحیح کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ''۴'' عدد ہیں دونوں کا

مشترکہ مخرج سمجھا جائے گا۔

المــــ ۲۴ — رد سے پہلے

بیوی	بیٹی	پوتی	دادی نانی
۱/۸	۱/۲	۱/۶	۱/۶
۳	۱۲	۴	۴

المــــ ۸×۵=۴۰ — ۶ رد الی ۵ — رد کے بعد

	بیوی	بیٹی	پوتی	دادی نانی
	۱/۸	۱/۲	۱/۶	۱/۶
(۷)	۱	۳	۱	۱
	۵	۲۱	۷	۷

اس مثال میں سب سے پہلے زوجین کے مسئلہ میں بیوی کے حصہ سے مخرج بنایا، اس سے بیوی کا حصہ دینے کے بعد "۷" باقی ماندہ ہے۔ پھر بقیہ ذوی الفروض کا مسئلہ ان کے سہام سے بنایا گیا۔ اس کے بعد دیکھا کہ "باقی ماندہ" بقیہ ذوی الفروض کے مخرج پر برابر تقسیم نہیں ہوتا۔ اس لئے دوسرے مسئلے کے "۵" مخرج کو زوجین کے مخرج "۸" میں ضرب دینے سے مشترکہ مخرج "۴۰" حاصل ہوا۔ بیوی کے حصہ کو "۵" میں ضرب دیا گیا پھر بیٹی، پوتی کے حصہ کو باقی ماندہ "۷" میں ضرب دینے سے ہر ایک کا مشترکہ مخرج سے حصہ معلوم ہوا۔

بحمد للہ وبعون اللہ التوفیق یہاں تحفۃ الباری فی الفقہ الشافعی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ کتاب کی طباعت، کتابت میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ کوئی غلطی نہ رہے۔ باوجود اس کے بتقاضائے بشریت اگر کوئی غلطی، سہو رہ گیا ہو تو گزارش ہے کہ ہمیں مطلع فرمائیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح کی جائے گی۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ الدَّائِمَةَ فِی الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (آمين) وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

بحمد اللہ تعالیٰ